ؔ فرشتہ ہو تو بہک جائے آدمی کیا ہے

فوٹو۔ محفوظ شاہد۔ لاہور

ایڈیٹر: خوش گرامی

تیر و نشتر

تیر و نشتر

"دلی کو دہلی سے موسوم کیا جائے گا" ایک خبر ——— ملک کو دورِ جدید کے لئے شریمتی سچیتا کرپلانی کا شکریہ۔

"خوراک اور بیکاری کے مسئلوں کو حل کرنا ضروری ہے" شہری کا عزم ——— اس لئے کہ دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ خالی بیٹھا بیٹھا آدمی زیادہ کھاتا ہے۔

"اڑیسہ کے بعض لیڈر وزارتوں کو موروثی جائیداد سمجھتے ہیں" ایک عنوان ——— جو انھیں جیل جانے کے سلسلہ میں ملی ہے۔

"ہندوستانی صنعتوں کی نمائش" ایک خبر ——— ان میں رشوت خوری۔ گراں فروشی۔ اقرباپروری۔ خوشامد نوازی اور ملاوٹ کی ترقی یافتہ صنعتیں خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

"وَیدا ور حکیم اپنے اپنے نام رجسٹر کرائیں" ایک خبر ——— تاکہ پتہ چل سکے قبرستان کی آبادی اور شمشان بھومی میں راکھ کے ڈھیر کون بڑھا رہا ہے۔

"عوام کو روٹی کپڑا اور مکان مہیا کرو۔ کانگریس کے کھلے اجلاس میں مطالبہ" ایک خبر ——— کیا کانگریسیوں کو عہدوں کی الاٹمنٹ سے بھی پہلے۔

"سوشلزم کا مقصد عوام کا معیار بلند کرنا ہے" ایک مقالہ ——— بس اتنی بات ہے تو عوام انھیں قطب مینار پر چڑھا کر بھی بلند ہو سکتا ہے۔

"چاول اور دالوں کا ملنا بہت دشوار ہو گیا" ایک خبر ——— کوئی حرج نہیں کیک۔ پیسٹری۔ انڈا۔ مچھلی۔ کباب اب بھی بہ آسانی مل جاتے ہیں۔

"ہمارے سرکاری کارخانے" ایک عنوان ——— کرپشن کی پیداوار بڑھا رہے ہیں۔

"ہند سرکار ہنگامی پلان پر غور کر رہی ہے" ایک خبر ——— جسے منافع خور ہنگامی طور پر تارپیڈو کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

"مرکزی اخراجات میں ستر کروڑ کی کمی کے باوجود ۸۶ کروڑ کا گھاٹا" ایک خبر ـــــــ نئے ٹیکس لگانے کے لئے معقول جواز۔

"سیکولر ملک ہیں!" ایک عنوان ـــــــ ہندو مہاسبھا، جن سنگھ، اکالی، مسلم لیگ سبھی کچھ ہے ہمارے۔

"دیش میں چھپا ہوا دھن" ایک عنوان ـــــــ پتہ لگانا ہے تو کھدر مالکاؤں کے یہاں تلاش کیجئے۔

"بھوک ہڑتال" ایک عنوان ـــــــ ہر طرف عام ہو جائے تو وزیر خوراک اس کی ہر طرح سے ہمت افزائی فرمائیں گے۔

"کامراج سے کوئی اختلاف نہیں" شری شاستری کا اعلان ـــــــ بلکہ ان کا تو میں ہمیشہ شکر گزار رہوں گا۔

"طلباء ہڑتال کے جذبے کو خیرباد کہہ دیں" ایک عنوان ـــــــ مگر ایک شرط ہے کہ انھیں پھر پڑھنا نہ پڑے بلکہ بغیر پڑھے سند مل جائے۔

"عوام پر ٹیکسوں کا بوجھ کم کیا جائیگا" ایک خبر ـــــــ مگر نئے ٹیکس لگا کر۔

"حالات کتنے ہی خراب ہوں مایوس نہ ہونا چاہیئے" ایک عنوان ـــــــ کبھی نہ کبھی آپ کے حصّے میں بھی وزارت، سفارت، کوٹا یا پرمٹ آ ہی جائے گا۔

"یہ گھڑی ہمارے لئے امتحان کی گھڑی ہے" صدر کانگرس ـــــــ ارے ہمیں وقت کا پتہ نہیں چلتا۔

"جنتا کالونی میں فساد" ایک خبر ـــــــ جنتا راج کے نظارے۔

"مریخ پر زندگی موجود ہے" ایک خبر ـــــــ اسی لئے تو دنیا پر مُردنی چھائی ہے۔

"گورے گاؤں میں پولیس" ایک خبر ـــــــ اور کالے گاؤں میں ڈاکو۔

"ہندوستان کی سب سے مقبول صنعت" ایک عنوان ـــــــ کرپشن جو پرائیویٹ اور پبلک سیکٹر دونوں میں چل رہی ہے۔

بیسویں صدی دہلی

"تبت کے لئے پنچن لامہ کی جگہ خالی۔" ایک عنوان
—— کامریڈ گوپالن درخواست ڈال دیں۔

"طلباء صرف ہندی میں ہی اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔" دہلی کے ایک کالج
کے پرنسپل کا اعلان —— اردو بھی صرف گریڈ کنٹرول، اردو مرحوم لازمی
ہمت سکتی ہے۔

"ہندوستان میں کشتی لڑنے کا معیار بلند کرنے کی کوشش۔" ایک عنوان
—— اس کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو سیاسی لیڈروں کی دن رات کی کشتیوں
سے بڑی تیزی سے نہ صرف بلند ہو رہا ہے بلکہ فروغ بھی پا رہا ہے۔

"چینیوں کا سفید جھوٹ، ہند کا ماننے سے انکار۔" ایک عنوان ——
سفید نہیں، زرد چینیوں کا پیلا جھوٹ۔

"فیملی پلاننگ دو پہیوں والی گاڑی۔" ڈاکٹر سوشیلا نائر کا نظریہ ——
جس میں سوار ہو کر میاں بیوی اولاد سے محروم ہو سکتے ہیں۔

"ملک کے اندر غذائی بحران نہیں بلکہ قیمتوں کا بحران ہے۔" مسٹر شاستری کا
بیان —— ٹھیک اسی طرح جیسا آپ کے دور وزارت میں چینی حملہ نہیں ہوا
بلکہ سرحدی خلاف ورزی ہوئی تھی۔

"سینما کا شوقین سردی کا شکار۔" ایک خبر —— شہید ناز ہو گیا۔ سردی
تو ہر سال آتی ہے، فلم پھر ملتی نہ ملتی۔

"کانگرس اجلاس میں حکومت کی غذائی پالیسی پر نکتہ چینی۔" ایک عنوان ——
اجلاس میں کھانے کا انتظام اچھا نہ ہونے کا نتیجہ۔

"گراں فروشوں کے ساتھ سختی سے نپٹا جائے گا۔" حکومت کا اعلان ——
مگر گرانی اس سے پہلے عوام سے نپٹ چکے گی۔

"دلی میں گیہوں کے بھاؤ گر گئے۔" ایک خبر —— گیہوں کا دانہ ایک نہ
گرا، اگر کسی بیچارے غریب کا بھلا ہو جاتا۔

"لندن میں سونے کی قیمت میں اضافہ" ایک خبر —— برطانوی حکومت شری مرارجی ڈیسائی کو وزارت میں شامل کرے۔ وہ گولڈ کنٹرول نافذ کر کے سب ٹھیک کر دیں گے

"طلباء کو انتظامی صلاحیت کی تعلیم دی جائیگی" شری چھاگلہ کی تقریر —— اِس لئے کہ آج کل اُن کے ہنگاموں، ہڑتالوں اور استادوں کے ساتھ گستاخیوں میں بڑی بدانتظامی ہوتی ہے۔

"پولیس نظم و نسق کو بہتر بنانے کے اقدامات" ایک عنوان —— چوروں کو پولیس کی تربیت کے لئے انسٹرکٹر مقرر کیا جائیگا۔

"نئے ٹیکسوں کی گنجائش کہاں ہے" کامراج —— پرانے ہی ٹیکسوں نے کچومر نکال دیا ہے۔

"مہاراشٹر کے متعدد وزرا اناج کی خریداری کے لئے روانہ" ایک خبر —— خدا کرے چار چار گھنٹے لائن میں کھڑے ہوں۔ دھکا پیل کا ذائقہ چکھیں۔ پولیس کے ڈنڈے کھائیں اور پھر خالی ہاتھ واپس آئیں۔

"مہنگائی کی ذمہ داری کس پر ہے؟" ایک سوال —— بیچارے عوام پر جو چیزیں خریدتے ہیں اور گرانی کا دُکھ سہتے ہیں۔

"قومی تعمیر کے مقصد کے لئے عوام سے رابطہ ضروری" ایک عنوان —— اور اِس رابطے کے لئے وزارت اشد ضروری تاکہ لوگ ڈنر، ایٹ ہوم اور ری سیپشن کا انتظام کریں جنہیں اُن سے رابطہ قائم ہو۔

"خوراک کے جرائم کی روک تھام پر غور" ایک عنوان —— حالانکہ ضرورت خوراک کے استعمال کی روک تھام کی تھی۔

"مال روڈ لاہور کا نام بدلنے کی تجویز" ایک خبر —— نہایت معقول ہے۔ اب مسافر روڈ رکھا جائے۔

"لاہور میں ۲۴ گھنٹے کے دوران چوری اور نقب زنی کی سات وارداتیں" ایک خبر —— پُوئر ریکارڈ، ہماری راجدھانی میں تو چوبیس کا معاملہ ہو جاتا ہے۔

"بجلی کی قلت سے تنگ آکر کمیونسٹ روحانیت پسند ہوگیا: ایک خبر
—— یعنی وہ —— جب دیا رنج بتوں نے تو خدا یاد آیا

… کے بعد آپ کے بھائی راجہ مہدی علی خاں نے فیصلہ کیا
کہ منگل کے دن چاول نہیں کھایا کریں گے: خط خوشتر گرامی
نام —— تاکہ منگل ستارے کے اثرات سے محفوظ رہیں۔

"ڈیفنس کالونی میں کار کی چوری: ایک خبر —— وہاں ڈیفنس کا یہ عالم
تو باقی کیا ہوگا۔

"ہندوستان ایٹم بم کی دوڑ میں شامل نہ ہوگا" شری لال بہادر شاستری کا
اعلان —— اس لئے کہ اسے ابھی تک کوئی اچھا دوڑنے والا گھوڑا نہیں ملا۔

"چھپے ہوئے اناج پر قبضہ" ایک خبر —— غیر مطبوعہ اناج آزاد ہے۔

"سارا گاؤں لوٹ لیا گیا: ایک خبر —— ڈاکو اب چوری کا درس دیتے ہیں
مجرموں کو۔

"تیس آدمی … کے بعد … گئے" ایک خبر —— … پاکستانی
تو مل گئے۔

"مرنے کے بعد کیا ہوگا" ایک اشتہار —— پلاؤ کھائیے گا جب خاتمہ ہوگا۔

"چین کا روس سے مطالبہ" ایک عنوان —— مرنے کے بعد خروشچیف کی
تربت بھی استالن کی طرح سے اکھڑوائی جائے۔

"پولیس کے لئے خطرہ کون ہے" ایک سوال —— ہم آپ سب جو بلیک، منافع
خوری، رشوت ستانی وغیرہ قسم کے جرائم کرتے ہیں۔

"کانگرس ملک کی سب سے مضبوط جماعت ہے" ایک عنوان —— اور کانگرس میں ہی
ملک کی سب جماعتوں سے زیادہ گڑبڑ، رسہ کشی، اور دھڑے بندی ہے۔

ای بی ۹۸۴، پریم نگر، جالندھر

۳۰ر دسمبر ۹۴ء

مکرمی و محترمی خوشتر صاحب! آداب

سالنامہ ملا اور بے اختیار مُنہ سے نکل گیا ——

"ستیم شوم سُندرم"

شاید کسی اعلیٰ ادبی کارنامے کی پرکھ کے لئے یہ الفاظ آپ کے سالنامے ہی کے لئے ہیں۔ میری طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمایئے —— ایک افسانہ "خوشبو سی اُڑی" ارسالِ خدمت ہے۔ اُمید ہے قارئین اور خصوصاً بیسویں صدی کی خاتون قارئین کچھ باتوں کے لئے مجھے معاف کریں گی —— غزل کے بارے میں ایک طبقہ خاص ناراض نظر آتا ہے۔ لیکن پھوڑے پر نشتر رکھ دینے سے درد تو ہوگا ہی۔ آپ خود ہی سوچئے کہ محض نام نمود کی خاطر آپ بعض غزل گویوں کو مخاطب نہیں بنا دیتے! —— خدا کرے نیا سال آپ کے لئے صحت اور شادمانی کے جام بھر کر لائے!۔۔۔

خیر اندیش —— م۔ک۔ مہتاب

ایک خوشبو سی اُڑی اور یہ بات سارے کالج میں پھیل گئی۔

"شکنتلا کے خشک بالوں کے بڑے سے جوڑے میں دو سبز پتّیوں کے درمیان موتیے کا تازہ پھول!"

اور اُس روز کالج کی شاید ہی کوئی ایسی نگاہ ہو جس نے کسی نہ کسی بہانے ریت کے اِس لق و دق صحرا میں اِس پھول کو کھلتے نہ دیکھا ہو۔

لنچ کے وقفے میں تو سارے پروفیسروں اور لڑکیوں کے پاس صرف ایک ہی موضوع تھا کہ شکنتلا کے گیسوؤں میں اِن دو پتّیوں اور سفید پھول کی کیا سگنیفیکنس ہے۔ کون ہے جس نے اُس کی بے آب و گیاہ زندگی کے آنگن میں قدم رکھا ہے۔ کون سے مبارک ہاتھ ہیں جو یہاں تک پہنچ پائے ہیں۔ یا کون ہے وہ خوش نصیب جسے رجھانے کے لئے پرنسپل شکنتلا نے صحرا کی دہلیز پر پھول رکھا ہے۔

جب سے شکنتلا پرنسپل ہو کر کالج میں آئی تھی کسی نے اُسے رنگین ریشمی یا سوتی ساڑی، بغیر ایڑی کے چپّل اور کس کر باندھے ہوئے خشک بالوں کے جوڑے کے سوا کسی اور لباس میں نہیں دیکھا تھا۔ بغیر آرائش کے خالی دیوار کا سا چہرہ جس پر دو بڑی بڑی سخت گیر آنکھیں ہمیشہ جھانکتی رہتیں، جن سے آنکھ ملانے کا حوصلہ کبھی کسی لیکچرر یا طالبہ کو نہ ہوتا تھا۔

جب سے وہ کالج میں آئی تھی کالج کی رنگین زندگی پر اوس پڑ گئی تھی۔ عہدِ تراش خراش کی دلدادہ سٹاف ممبروں کا رنگ و روغن اُس کے سامنے بیٹھے بیٹھے پسینے کی دھاروں میں بہہ جاتا تھا اور کلاسوں میں چہکتی کلیوں کے [illegible] ہونٹوں ہی میں دبک کر رہ گئے تھے۔

جب اِس خزاں دیدہ فضا میں ایک شبھ موتیے کا دو پتیاں اور ایک تازہ پھول نظر آیا تو نظروں ہی نظروں میں کئی سوال ایک سے دوسرے ذہن میں منتقل ہوگئے۔

کیا شکنتلا کی سگائی ہو گئی ہے؟

کیا شکنتلا نے [illegible] لگا لیا ہے؟

کیا شکنتلا کو کوئی رشتہ [illegible] گیا ہے؟

ای جی ۳۴۸۴۹، پریم نگر، جالندھر

۲۷ر دسمبر ۱۹۶۳ء

مکرمی و محترمی خوشتر صاحب! آداب

سال نامہ ملا اور بے اختیار منہ سے نکل گیا ——

"مستیم شوم شستدم"

شاید کسی اعلیٰ ادبی کارنامے کی پرکھ کے لئے یہ الفاظ آپ کے سالنامے ہی کے لئے ہیں۔ میری طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمایئے —— ایک افسانہ "خوشبو سی اُڑی" ارسالِ خدمت ہے۔ اُمید ہے قارئین اور خصوصاً بیسویں صدی کی خاتون قارئین کچھ باتوں کے لئے مجھے معاف کریں گی —— "غزل" کے بارے میں ایک طبقہ خاصہ ناراض نظر آتا ہے۔ لیکن پھوڑے پر نشتر رکھ دینے سے درد تو ہوگا ہی۔ آپ خود ہی سوچئے کہ محض نام و نمود کی خاطر آپ بعض زندگیوں کو عذاب نہیں بنا دیتے!؟ —— خدا کرے نیا سال آپ کے لئے صحت اور شادمانی کے جام بھر کر لائے!...

خیراندیش —— م۔ک۔ مہتاب

ایک خوشبو سی اُڑی اور بات سارے کالج میں پھیل گئی۔

"شگفتہ کے خشک بالوں کے بڑے سے جوڑے میں دو سبز پتیوں کے درمیان تیبے کا تازہ پھول!"

اور اُس روز کالج کی شاید ہی کوئی ایسی نگاہ ہو جس نے کسی نہ کسی بہانے ریت کے اِس لق و دق صحرا میں اِس پھول کو کھلتے نہ دیکھا ہو۔

لنچ کے وقفے میں تو سارے پروفیسروں اور لڑکیوں کے پاس صرف ایک ہی موضوع تھا کہ شگفتہ کے گیسوؤں میں اِن دو پتیوں اور سفید پھول کی کیا سگنیفیکنس ہے۔ کون ہے جس نے اُس کی بے آب و گیاہ زندگی کے آنگن میں قدم رکھا ہے۔ کون سے مبارک ہاتھ ہیں جو یہاں تک پہنچ پائے ہیں۔ یا کون ہے وہ خوش نصیب جسے رجھانے کے لئے پرنسپل شگفتہ نے صحرا کی دہلیز پر پھول رکھا ہے۔

جب سے شگفتہ پرنسپل ہو کر کالج میں آئی تھی کسی نے اُسے ملین ریشمی یا سُوتی ساڑی، بغیر ایڑی کے چپل اور کس کر باندھے ہوئے خشک بالوں کے جوڑے کے سوا کسی اور لباس میں نہیں دیکھا تھا۔ بغیر آرائش کے خالی دیوار کا سا چہرہ جس پر دو بڑی بڑی سخت گیر آنکھیں ہمیشہ جھانکتی رہتیں۔ جن سے آنکھ ملانے کا حوصلہ کبھی کسی لیکچرر یا طالب کو نہ ہوتا تھا۔

جب سے وہ کالج میں آئی تھی کالج کی رنگین زندگی پر اوس پڑ گئی تھی۔ جدید تراش خراش کی دلدادہ سٹاف ممبروں کا رنگ و روغن اُس کے سامنے بیٹھے بیٹھے پسینے کی دھاروں میں بہہ جاتا تھا اور کلاسوں میں چہکتی کلیوں کے قہقہے [illegible] ہونٹوں ہی میں دبک کر رہ گئے تھے۔

جب اِس خزاں دیدہ فضا میں ایک صبح موتیے کی دو پتیاں اور ایک تازہ پھول نظر آیا تو نظروں ہی نظروں میں کئی سوال ایک سے دوسرے ذہن میں منتقل ہو گئے۔

کیا شگفتہ کی سگائی ہو گئی ہے؟

کیا شگفتہ نے کہیں دل لگا لیا ہے؟

کیا شگفتہ کو کوئی رشتہ مل گیا ہے؟

تھا بگی، جو دیدی۔ لیکن براہمن اور کھتری کی بحث میں اُلجھ کر اُس نے وہ پیشکش ٹھکرا دینے پر قوتی کی۔

رضیہ اور شانتا کے جانے کے بعد وہ دھیان سے پرچے نہ دیکھ سکی۔ بار بار توجہ ٹوٹ جاتا۔ اُس نے پرچے اُٹھا کر الماری میں پھینک رہنے دیئے اور خود پرنسپل کے کمرے میں آ گئی۔

شکنتلا کسی وزیٹر سے بات کر رہی تھی۔ پریم کرسی پر بیٹھی شکنتلا کے چہرے کا بغور رہ لیتی رہی۔ اُسے محسوس ہوا کہ واقعی شکنتلا کے چہرے پر نیا نکھار سی تازگی ہے۔ اُسے شکنتلا کے ہونٹ بھی رنگے ہوئے دکھائی دینے لگے اور وہ ملاقاتی کے جانے ہی بول اُٹھی۔

"تم کون سی لپ اسٹک استعمال کرتی ہو۔ بہت نیچرل کلر ہے اس کا بہت سج رہی ہے تمھارے چہرے پر!"

"کیا کہہ رہی ہو پریم۔ کہیں سے بھنگ پی کر تو نہیں آگئیں۔ یا یونہی سٹھیا گئی ہو؟" شکنتلا نے بڑے تعجب سے لیکن قدرے درشت لہجے میں کہا۔

"تمھارا کچھ قصور نہیں ہے دیدی! دریا میں ایک دن تو طغیانی آتی ہی ہے اور جب طغیانی آئے تو اُس کا کناروں سے چھلک جانا ہی اچھا ہے ورنہ طغیانی کو طغیانی تو کیا کوئی لہر تک نہ کہے گا۔"

"لیکن یہ کیا پہیلی ہے پریم! جلدی سے کہو اگر کوئی ایسی ویسی باتیں سن لے تو؟"

"سنتا ہے تو سن لے۔ جو آج نہ سنے گا اُسے کل معلوم ہو جائے گا۔"

"کچھ مُنہ سے پھوٹو گی بھی یا نکالوں تجھے یہاں سے؟" شکنتلا نے بناوٹی غصے میں کہا۔

"بات یہ ہے میری پرنسپل صاحبہ! کہ کالج میں بچے بچے کی زبان پر یہ افواہ ہے"۔ کسی دُشینت نے اگر شکنتلا کو تیرِ نظر سے بیندھ ڈالا ہے۔"

"کیا بکتی ہو؟"

"بکتی یہ ہوں کہ میری دیدی کی کشتی کو کنارا مل گیا ہے۔"

"کیوں جھوٹ کہتی ہو؟"

"جھوٹ یہ ہے کہ لوگ کہتے ہیں شکنتلا کی سگائی ہو گئی ہے۔"

"مگر تمھیں کیسے معلوم ہے؟" شکنتلا تھکاوٹ سی محسوس کرتے ہوئے واپس کرسی پر بیٹھ گئی۔

"چاند نکلے گا تو کس سے چھپا رہے گا۔ مشک ہوگا تو خوشبو کہاں دبی رہے گی۔"

"تم ماڈرن خیالات کی مالک ہو کر یہ کیا جھوٹ کہہ رہی ہو۔ سو فیصدی جھوٹ!"

"میں نہیں کہہ رہی ہوں سارا کالج کہہ رہا ہے۔ تین دن سے یہی افواہیں کالج کے ہر کمرے میں چکر لگا رہی ہیں اور تم ہو کہ دعوے تو دوستی کا کرتی ہو اور دایہ سے پیٹ چھپا!

جا رہا ہے۔"

"لیکن اِس بات کا کوئی ثبوت؟" شکنتلا نے جھنجھلا کر میز کو مٹھیوں سے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"اگر یہ سب غلط ہے تو تمھارے ہونٹوں پر یہ لپ اسٹک کیسی ہے؟"

"یہ تمھاری نظر کا دھوکا ہے!"

"اگر یہ نظر کا دھوکا ہے تو تمھارے بالوں میں یہ سبز پتیاں اور موتیے کا پھول کون لگا دیتا ہے؟"

شکنتلا جواب دینے کی بجائے کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ اُس کا چہرہ حیا کی سُرخی سے گلابی ہو گیا اور وہ کہنے لگی "سنو میری لاڈو! وہ تمھاری نظر کا دھوکا تھا تو یہ تمھاری عقل کا دھوکا ہے۔ ایک دن میں کنگھی کر رہی تھی کہ کوٹھی کی ملازمہ پیچھے سے آئی۔ اُس کے ہاتھ میں موتیے کی دو پتیاں اور ایک پھول تھا۔ میں نے جوڑا باندھا تو اُس نے پھول اُس میں اُڑس دیا۔ میں اُس کی اِس گستاخی پر تڑپ اُٹھی۔ میں چاہتی تھی کہ اُس کے منہ پر طمانچہ دے ماروں لیکن وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی "مالکن آپ کے بہت اچھا لگتا ہے۔ میرے لئے اسے آج کے دن لگائے رکھیئے" اُس کی آنکھوں میں ایک آبشار پیاس ایک انجانی سی تمنا دیکھ کر میں نے اُسے کچھ نہیں کہا۔ اور دن بھر پھول لگائے رکھا۔ پھول کی بھینی بھینی خوشبو کا ایک احساس سارا دن مجھ پر چھایا رہا اور دوسرے دن جب وہ پھول لائی تو میں نے اُسے لگانے سے انکار نہیں کیا۔ بس اِتنی سی بات تھی جسے تم نے دُشینت کا تیر اور نہ جانے کیا کچھ بنا ڈالا۔"

"اچھا جی! تو لگے ہاتھوں اِس نفیس جارجٹ کی ساڑی کی بھی وضاحت ہو جائے۔ یہ کون سا پرندہ کس سٹور سے اُٹھا کر لایا تھا؟"

"کتنی عجیب لڑکی ہو تم بھی ایک ایک چیز پر نگاہ رکھتی ہو۔ بات پھر اُسی ملازمہ کی ہے۔ میں نے اُس سے ساڑی مانگی وہ یہ نکال لائی۔ کہنے لگی سفید اور سبز شیڈ کی یہ ساڑی سفید پھولوں اور سبز پتیوں کے ساتھ خوب سجے گی۔ میں نے کہا بچے کالج جانا ہے، تو وہ بڑے التجا بھرے لہجے میں بولی۔ وہیں تو اِس کا رنگ نکھرے گا۔ اُس کے چہرے پر اُس کی دلی خواہشات کی جھلک تھی اور میں نے محض اُس کی تسکین کے لئے یہ ساڑی پہن لی۔"

"اور پلین چپل کی جگہ یہ اونچی ایڑی کے جوتے کس کی پسند ہیں؟"

شکنتلا کچھ جواب دینے کی بجائے ہنسنے لگی۔

"کہاں تک بچ کے جاؤ گی میری شکنتلا اب دو جواب۔ چلی تھی میرا فول بنانے"

"اوہو۔ میں کہتی ہوں اگر عقل کم ہو تو کسی سے اُدھار لے لینی چاہئے۔ لیکن تم تو لباس کے بارے میں ایک اتھارٹی ہو۔ اِتنا نہیں سمجھ سکتیں کہ جب ساڑی کا عرض زیادہ ہو تو ویسٹ لائن کو بھدے پن سے بچانے کے لئے اونچی ایڑی کا جوتا ضروری ہے۔ اب ہوئی تسلی!

افسانہ

نئی منزل نئی راہیں

عفت موہانی۔ ایم اے

۳-۴-۲۱-۱۱۳۴، غیرت خاں لین۔ حیدرآباد دکن

۳ دسمبر ۱۹۶۴ء

محترمی خوشتر گرامی صاحب! سلام ورحمت

... اپنی ایک کہانی "نئی منزل نئی راہیں" بصد فخرومسرت "بیسویں صدی" کی نذر کر رہی ہوں۔ اُمید ہے پسند آئے گی۔ اپنی گرانقدر رائے سے نوازکر ممنون فرمائیں۔ آپ کے خط کا انتظار رہے گا...

آپ کی بہن ــــــ عفت موہانی

وہ پورے دس سال بعد امریکہ سے لوٹ رہا تھا۔

امی اور ابا نے اُس کے استقبال کی نہایت شاندار تیاریاں کی تھیں۔ رُوبینہ بھی منتظر تھی۔ کون جانے وہی اُس کے تصوّرات کا پیکرِ جمیل نکلے! انتظار میں سر کھپانا بے سُود سمجھ کر وہ باہر برآمدے کی طرف نکل گئی۔ دھوپ سُنہری ہو چلی تھی۔ سائے طویل تھے۔ موسم خوشگوار تھا۔ پورچ میں بیلیں جھوم رہی تھیں۔

اُس نے اطمینان سے بھرپور لمبی سانس لی۔ اُسی وقت کوئی سامنے سے لپکتا ہوا چلا آرہا تھا۔

"معاف فرمائیے گا۔ کیا سر احسان کی کوٹھی یہی ہے؟" وہ ہانپتے ہوئے بولا۔

"کیا آپ نے گیٹ پر لگی ہوئی نیم پلیٹ نہیں ملاحظہ فرمائی؟"

"کون سے گیٹ پر؟"

"بدھو نمبر ایک!" وہ اُسے نظر انداز کر کے گنگنانے لگی۔

"اُن کی صاحبزادی ــــــ" جانے وہ کیا کہنے والا تھا۔ رُوبینہ جھلا گئی۔

"چلتے پھرتے نظر آیئے۔"

"بہت اچھا!" وہ تیر کی طرح ڈرائنگ روم میں گھس گیا۔

"انجم؟"

"آنٹی!"

اندر سے ملی جُلی خوشیوں بھری آوازیں سُن کر وہ اُدھر لپکی۔

اُس کی امی اُسے گلے لگائے ہوئے تھیں۔

"اُف! یہ انجم ہے؟" روبینہ ششدر رہ گئی۔

"یہ آپ کی نئی ما ما بڑی بدتمیز ہے۔" انجم نے رُوبی کو گھور کر دیکھا۔

اُس کی امی بے ساختہ ہنس پڑیں: "ارے۔ تم اسے پہچان نہ سکے۔ یہ رُوبی ہے۔"

"کون رُوبی؟"

"رُوبینہ احسان!" رُوبی نے خود اپنا تعارف کرایا۔

"معاف کیجئے۔ میں کسی کا احسان نہیں مانتا۔" اُس نے منہ بنا کر کہا۔

یہ ولایت سے پلٹے ہیں یا پاگل خانے سے؟ انتظار کی ساری اُمنگ ختم ہو رہی تھی۔ بھلا اِس گنوار بے ادب کے ساتھ رہ کر وہ کیا سمارٹ معلوم ہوگی۔

اپنے احساس کی تلخی کم کرنے کے لئے وہ خود کو پروفیسر شاہد کے تصوّر سے بہلانے لگی۔ اللہ۔ اُن کی کمپنی... پہلی بار اُنھوں نے روبینہ کو اپنی کار میں گھر تک کیلئے لفٹ دی تھی۔ وہ رُوبینہ کے لئے یادگار دن تھا۔ اُس کے دل میں پروفیسر کے لئے بہت گہرے جذبات تھے۔ احترام اور محبت سے لبریز!

کہاں یہ جنگلی اور کہاں وہ ہینڈسم پروفیسر!

چائے کی میز پر امی اُسے آوازیں دے رہی تھیں۔ وہ خاموش رہی۔ لیکن ابا کی گرجدار آواز پر اُسے اُٹھنا پڑا۔

اُسے دیکھتے ہی انجم نے سرو قد ہو کر اُسے سلام کیا۔

جواب میں اُسے بھی مسکراہٹ اُڑانی پڑی۔

اتّی ابّا کے چہرے پھولوں کی طرح کھلے ہوئے تھے۔ جن ننھے ننھے پیاسے کٹوروں سے

اُنڈ کر سب سے محبت سمیٹا تھا۔ اب وہی پھول آنا اور رخصت ہو کر اُن کے بڑھاپے

کی بیکسی تھا جس کی گھنی ٹھنڈی چھاؤں کے خیال ہی سے ان کی روحیں مطمئن و مسرور

ہو جاتیں۔

"ہماری رُوبی اس سال ہائی اسکول میں فرسٹ آئی" امّی نے کہا۔

"واہ واہ! واقعی؟" انجم نے بڑی حیرت سے کہا۔

"کیوں؟" رُوبی ذرا جھینپ کر بولی۔

"ارے لڑکیوں کو صرف خانہ داری اور بچے پالنا سیکھنا چاہیے جن کے گھر جائیں گی

وہاں سے تعریفیں سُننا رہیگا۔"

"آپ کو کسی نے لڑکیوں سے گفتگو کرنے کے آداب نہیں سکھائے؟" رُوبی بیحد

خفا ہو گئی۔

"آداب؟" وہ معصوم بن کر بولا "ابھی کیا تو تھا آپ کو جُھک کر۔"

اور پھر رات کو رُوبی امّی سے شکایتیں کرنے لگی۔

"یہ کب تک یہاں رہیں گے؟"

"وہ اب ہمیشہ یہیں رہے گا" امّی بے حد خوش تھیں۔

"نہ تو بات کرنے کی تمیز ہے۔ نہ کھانے پینے کی۔ آخر اُنھوں نے مجھے ملا کیوں بنا دیا؟"

امّی پھر ہنس دیں "برسوں بعد تمھیں دیکھا تھا۔ پہچان نہ سکا۔ اور وہ تو ہے ہی

سدا کا شریر۔"

"آپ لوگ اُن سے بہت محبت کرنے لگے ہیں؟"

"کیوں نہ کریں۔ کیا نکال دیں گھر سے باہر۔ اُس کے ماں باپ ہوتے تو وہ کیوں یہاں

آتا؟" امّی نے ٹکا سا جواب دیا اور اُٹھ کر کسی کام سے چل دیں۔

باہر کسی کے قدموں کی گمبھیر دھمک سُنائی دی۔ دوسرے لمحے انجم رُوبی کے

کمرے میں تھا۔

"پُوچھ کے آیا کیجئے" وہ پھر چڑ گئی۔

"میرا کمرہ کون سا ہے؟ یہیں رہنے لگوں تو کیا حرج ہے؟"

"خدا کی پناہ۔ آپ مجھے دیوانہ بنا دیں گے۔"

"سچ مچ!!" وہ چہکا۔

رُوبی خاموشی سے ٹیڑھی لکیریں کھینچنے لگی۔

"وہی محبت کا فرسودہ افسانہ!" وہ بولا "ہوتا ہی کیا ہے ان داستانوں میں۔

جہاں کسی کی اچھی شکل نظر آئی بس چاروں ہاتھ پاؤں سے مرنے لگے۔ ارے بھئی! دو آنکھوں

ایک ناک اور مُنہ میں محسن کہاں ہوتا ہے۔ ہم نے تو کہیں آنکھوں کے تیر، زلفوں کی چھاؤں اور

ہونٹوں کا یاقوتی پن نہیں دیکھا۔ جیسے دیکھا سب تمہاری شکل کے کانٹے نیا اچانک کے

خدا خانت کے ہے؟

"اور کچھ؟" وہ بڑی متانت اور استقلال سے مُنہ کا بگاڑ ختم کر گئی۔

"اور یہ کہ بیگمات کا لباس اُڑ اُڑ کر خوبصورت ہاس پہننا غضب خدا کا! آستین

صاف۔ بلاؤز میں تمھیں سردی نہیں لگتی۔ میری تو روح ہی کپکپی طاری ہو گئی ہے۔"

"بکواس بند کیجئے۔ میں ایسی خرافات نہیں سُن سکتی۔"

"بہت بہتر ——" وہ اترایا اُٹھا اور پردہ ہٹا کر باہر نکل گیا۔

اور پھر رُوبی گھر ہی سے بیزار رہنے لگی۔ جیسے در جنوں انجم گھر کے کونے کونے سے

پھوٹ نکلے ہوں! اُس کی امّی حد سے زیادہ سراہتیں۔ دن دن بھر بیٹھ انھیں امریکہ کی

کہانیاں سُنایا کرتا۔ ایسے ایسے لطیفے گھڑتا کہ وہ ہنسی ضبط نہ کر سکتیں۔

شام کو بن ٹھن کر وہ باہر نکلی۔

"کہاں؟" امّی نے استفہامیہ نظروں سے رُوبی کو دیکھا۔

"زینت بُلا رہی ہے۔ پکچر کے لئے۔"

"پکچر!" وہ بول پڑا "شام کو اکیلی لڑکی کا باہر جانا اچھا نہیں۔"

"مسٹر کروتُم کون ہوتے ہو؟" وہ شکایت کرنے لگی "یہ سہیلیاں ایسی سہیلی

لڑکیوں کو ورغلاتی ہیں۔ کوئی ضرورت نہیں جانے کی!"

رُوبی پاؤں پٹختی دندناتی اپنے کمرے میں آئی۔ پرس میز پر اُچھالا۔ چپلیں کہیں

پھینکیں اور تکیے پر اوندھی گر کر رونے لگی۔

آخر یہ شیطان اُس پر کیوں مسلط ہو گیا ہے۔

کتنے پروگرام اُس نے اپ سیٹ کر دئے تھے۔ ہر موقع پر روڑے اٹکاتے تھے۔

ہزار بار، لاکھ بار ڈانٹنے پر بھی وہ باز نہ آیا۔ رُوبینہ کو اُس سے نفرت تھی۔ گہری نفرت! جس نے

امّی ابّا کی ساری توجہ اپنی طرف کھینچ لی تھی۔ وہ خود کو اپنے ہی گھر میں پرائی محسوس کرنے لگی۔

اُسے انتظار تھا کب پروفیسر شاہد ابّا سے کہیں اور کب وہ ہمیشہ کے لئے اِس

گھر سے چلی جائے۔ پروفیسر نے تو اکثر اُس کی محبت کے گیت گائے تھے لیکن وہ اُن گیتوں کو

سہاگ کی شہنائی کا رُوپ دینا چاہتی تھی۔ جانے کب گُونجے۔

اکثر اُس نے انجم کو ڈانٹ دیا تھا۔ اب وہ بھی اُس سے کترانے لگا تھا۔ اپنے

دوسرے پروگرام بنا لئے تھے۔ کھانے کی میز پر بھی نہ آتا۔ اُس نے یُوں اُسے جھڑک کر اچھا کیا

تھا یا بُرا کیا تھا وہ تجزیہ نہ کر سکی ... اُس نے خود کو مطمئن کرنا چاہا۔ سکون ہی تو چاہتی تھی

اب سکون تھا۔ جہاں چاہے جائے، جدھر چاہے گھومے پھرے۔ کوئی انجم راستہ نہ کاٹتا! لیکن

دل میں یہ کھٹک کیسی تھی؟ وہ سمجھ نہ سکی ... جس چیز کو دل چاہے اور وہ مل جائے۔ پھر یہ

...شن اور اضطراب کیا!

دل کو بہلانے کے لئے وہ ذرا ذرا سی حرکت پر اُس نے سیکڑوں کوسنے دے ڈالے۔ انجم نے خوب قہقہے لگائے تھے۔ امّی نے سُنا تو وہ بھی اُسے ڈانٹنے بیٹھ گئیں "بھلا وہ کیا کہے گا؟ پڑھ لکھ کر کیسی زبان لئے پھرتی ہے۔"

اجانک صبح کو وہ ناشتہ پر آیا۔ خوب مسکرا رہا تھا۔

"آؤ بیٹے!" ابّا نے ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ بات چیت کے دوران میں اُسے دعائیں دیتے جا رہے تھے۔

"یہ دعائیں لگیں گی انکل!" انجم شرارت سے بولا۔

"ضرور لگیں گی بیٹے۔ جب تم نے میرا دل خوش کیا ہے ...!"

"پڑوس کی ماں مجھے بڑے برے کوسنے دے رہی تھی!" وہ بولا۔

"اس کی یہ مجال؟" رُوبی کے ابّو نے ناشتے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

"کہتی تھی کہ تمہاری صورت میرے شوہر سے ملتی جلتی کیوں ہے؟"

سب ہنس پڑے۔ رُوبی جل گئی۔ خواہ مخواہ بالواسطہ وہ اُسے کیوں چھیڑتا ہے!

ناشتے کے بعد وہ شکار کی تیاریوں میں لگ گیا۔

رُوبی کالج جا رہی تھی۔ ساڑی کی کلفدار لہروں کو ہوائی چپل سے پھٹکارتی وہ زینہ اُترنے لگی۔ کمپاؤنڈ میں وہ ملا۔

"شکار پر چلو رُوبی!" بہت پُرخلوص لہجے میں اُس نے دعوت دی۔

"شکریہ!" رُوبی کی نخوت برقرار رہی۔

"شکریہ کاہے کا؟" وہ سنجیدہ ہو گیا۔ "میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ اگر شکاری ماہر ہو تو شکار خود بخود پھنس جاتا ہے۔"

"ہُنہہ!" وہ پھنکارتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

کالج سے واپس آکر وہ شاہد کے ساتھ چل دی۔ پارک کے سُنسان گوشے میں دیر تک دونوں آئندہ زندگی کے خوشنما پلان بناتے رہے۔ دونوں نے نئی کوٹھی کے بے شمار نام سوچے۔ اس کے بعد کوٹھی کے سرسبز لان پر کھیلنے والے بچوں کے بارے میں سوچتے ہوئے روبینہ یکلخت شرما گئی۔

شام کی تاریکیاں اُمڈ آئی تھیں۔ بسیرا لینے والی چڑیوں نے درختوں میں شور مچا رکھا تھا۔ فضا بوجھل ہونے لگی تھی۔

رُوبینہ سے اپنی باتوں کا جواب مانگنے کے بعد شاہد نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"تم اس قدر ڈرتی کیوں ہو؟ جب ہمارے دل راضی ہیں تو پھر یہ جھجک کیسی؟ ہم بعد میں شادی کر لیں گے۔"

"بعد میں؟" رُوبینہ کا دل دھڑک اُٹھا۔ نظریں چار کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ جانے دھندلی روشنیوں کا عکس تھا یا اُس کے اندر کوئی لاوا پھوٹ رہا تھا۔ آنکھیں دھشت سے چمک سے روشن ہونے لگی تھیں۔

اور پھر یہ انتہائی مغرب پسند لڑکی دفعتاً مشرقی بزدل لڑکی ہو گئی۔

وہ جیسے ہی اُس کی طرف جھکا۔ رُوبینہ ہاتھ چھڑا کر تیزی سے بھاگ گئی۔

"سُنو تو۔ رُوبینہ۔ پوری بات تو سُنو" جانے کون سا کانٹا اُن کے پاؤں میں اُلجھ گیا کہ وہ بھاگ ہی نہ سکے۔

کمپاؤنڈ میں ڈاکٹر عزیزی کی کار دیکھ کر اُس کا دل دھڑکنے لگا۔ ابّا کہیں پھر تو نہیں پڑ گئے۔ وہ تیزی سے اوپر گئی۔

"کہاں تھیں اب تک؟" راہداری میں امّی کھڑی شعلہ بار نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھیں۔ "شریف لڑکیوں کے یہ لچھن نہیں ہوتے۔"

اُس کا دل دُکھا ہوا تھا۔ امّی کی بات گھونسہ بن کر لگی۔ دل دھڑک اُٹھا۔

"انجم اندر زخمی پڑا ہے۔ لیکن تم تو اُسے کوستی تھیں۔ اچھا ہی ہوا۔ تم اُس کی کون ہو؟" امّی کہتی رہیں۔ وہ اندھیرے میں چُپ چاپ کھمبے سے لگی کھڑی رہی۔

امّی اور ابّا ساری رات بیمار کے کمرے میں رہے۔ درد اور تکلیف کی شدت سے انجم سر تکیے پر رگڑتا رہا۔ رُوبینہ کی ہمت نہ پڑی کہ وہ اندر جا سکتی!

اُس کے ابّا اور امّی بہت پریشان تھے۔

"کیا سوچا ہوگا دل میں" امّی کہتی تھیں "گھر آئے مہمان کے نئے مرہم کرنا کانٹا!"

"نہیں نہیں!" رُوبی سجدے میں گر گئی "اے خدا! میری ساری بددعائیں واپس لوٹا لے۔" وہ روتی رہی۔ امّی اور ابّا آخر شب تھک ہار کر سو گئے۔

وہ دبے پاؤں اندر مُڑ گئی۔

"پانی۔ پانی!" انجم کراہ رہا تھا۔

"لیجئے پانی پی لیجئے!" اُس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔

"رُوبی۔ تم؟" انجم نے سُرخ سُرخ آنکھیں کھولیں۔

صُبح کے ہلکے نُور میں وہ کوئی اور ہی وجود معلوم ہو رہی تھی۔ دوپٹے سے سر ڈھانکے، کلائیوں تک آستینیں بند، جُھکی جُھکی پلکیں بار حیا سے لرز رہی تھیں۔

"پانی پی لیجئے" وہ رُکتی رُکتی بولی۔

"میری پیاس بُجھ گئی" انجم مسکرایا "مگر یہ تم۔ میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں؟"

"آپ کو وہ سب کچھ ناپسند تھا نا؟"

"اور اُلّو بنا رہی ہو؟"

"نہیں نہیں میں معافی مانگتی ہوں۔ آپ مجھے نوکری سے اب کبھی نکال نہیں سکیں گے۔ آج سے آپ کی تیمارداری میرے ذمہ ہے۔"

"اور تم غصے میں میرا گلا دبا یا تو میں کس سے فریاد کروں گا؟"

"پھر وہی۔ خدا کے لئے ایسی باتیں یاد نہ دلایئے۔ میں نے آپ کے ساتھ بہت بدتمیزیاں کی ہیں۔ کیا آپ مجھے معاف نہ کریں گے؟"

"کر دوں گا۔ مگر ایک شرط پر۔"

"نا۔ ہم شرط وط نہیں مانتے۔"

"ضرور؟"

"کیا؟"

"ایک بات کہوں؟"

"پھر کبھی۔ ابھی آتی ہوں۔"

اُس نے سرگوشی سی کی اور اندر بھاگ گئی!

غزل

جناب بیلی بھیونڈی۔ ایم کام

شبنمی شبنمی فضا ہو تم
یا برستی ہوئی گھٹا ہو تم

ناز ہو، غمزہ ہو، ادا ہو تم
اس سے بھی اور کچھ سوا ہو تم

میری آنکھوں سے تم اگر دیکھو
تم کو معلوم ہو کہ کیا ہو تم

عارضِ گل ہو، رنگِ گلشن ہو
ایک پیکر شباب کا ہو تم

دل سے پوچھو تو دل یہ کہتا ہے
دل نشیں اور دلربا ہو تم

میرے بکھرے ہوئے فسانوں کا
ایک رنگین سلسلہ ہو تم

میری غزلوں کی، میرے نغموں کی
جان ہو، روح ہو، صدا ہو تم

نشہ ہو، روپ ہو، جوانی ہو
کیا بتاؤں کہ اور کیا ہو تم

زندگی بھر کی آرزوؤں کا
ماحصل اور مدعا ہو تم

غزل

ذوقی رامپوری

بہار کا ہے تجھے انتظار، دیوانے
بہار پر تجھے کیا اختیار، دیوانے

جہاں کو رازِ جنوں کی خبر نہ ہو جائے
کسی کا نام نہ لے بار بار، دیوانے

خزاں میں تھا کسے آرائشِ چمن کا خیال
بہار میں نکل آئے ہزار دیوانے

یہ ہوش بھی نہ رہا جستجو میں پھولوں کی
اُلجھ گئے ترے دامن میں خار دیوانے

خرد پہ ناز تھا جن کو وہ سوچتے ہی رہے
پڑا جو وقت چلے سوئے دار دیوانے

جنابِ شیخ کی ایسے میں کون سنتا ہے
گھٹا اُٹھی تو ہوئے بادہ خوار دیوانے

بس اِک خفیف تبسم بس اِک لطیف نگاہ
کہ ہو نہ جائیں کہیں ہوشیار دیوانے

ہے اُن کی خاص نوازش مجھی پہ ورنہ وہ
جدھر نگاہ اُٹھائیں ہزار دیوانے

سکوں تلاش نہ کر زندگی میں اے ذوقی
کسے ملا ہے جہاں میں قرار دیوانے

افسانہ

رنگ اور روشنی

پروفیسر حامدی کاشمیری ایم اے

بہوری کدل، سری نگر ۲

۲۶ر دسمبر ۶۴ء

پیارے بھائی! آداب

شدید برفباری کی وجہ سے ہفتوں سے بجلی آف ہے۔ شمع کی مدھم سی، کانپتی ہوئی لَو میں یہ افسانہ مکمل کیا ہے۔ امید ہے آپ کو اور قارئین کو پسند آئے گا ——— میرے خطوط آپ کو مل گئے ہوں گے۔ آپ نے اس سلسلے میں مزید کچھ تحریر نہیں کیا۔ میں آپ کے خط کا انتظار کر رہا ہوں۔ کیا وہ بات کسی حد تک آگے بڑھ گئی ہے ——— برف نے راستے مسدود کر دئے تھے، اس لئے سالنامہ دیر سے ملا۔ کتنا خوبصورت نمبر نکالا ہے آپ نے۔ سالنامہ کے ورق الٹتا جا رہا ہوں، جیسے رنگ و نور کی دنیا میں گم ہو رہا ہوں۔ آپ کی کاوش کی داد نہیں دی جا سکتی! اس بار بھی آپ کی جدت پسندی، آپ کی رعنائی طبع اور ذوقِ جمال ہر صفحے پر جلوہ گر ہے!...

آپ کا ——— حامدی کاشمیری

آتش دان کی دہکتی لہراتی ہوئی آگ میں خطوط جل رہے تھے۔ تہہ کئے ہوئے رنگین اور معطر اوراق آگ کا لمس پاتے ہی لال، پیلے اور نیلے رنگ کے نرم شعلوں میں ڈھل رہے تھے۔ شعلے لپک رہے تھے، اور لفظوں کے اندر جاگتے ہوئے، سرسراتے ہوئے احساس کی نازک تھرتھراہٹوں کو چاٹ رہے تھے۔ دل کی دھڑکنیں بھسم ہو رہی تھیں، خواب جل رہے تھے، دھواں اٹھ رہا تھا۔

اس کی انگلیاں سردی سے سن ہو کر رہ گئی تھیں۔ کمرے میں داخل ہو کر اس نے جلدی سے اسٹیتھسکوپ ٹیبل پر گرا دیا جیسے اس کے ہاتھ برف سے شل ہو گئے ہوں۔ کمرے کی کھڑکیاں بند تھیں لیکن پردے ابھی تک گرائے نہیں گئے تھے۔ سرد ہوا کے جھونکے کمرے میں آزادی کے ساتھ آ رہے تھے۔ باہر تلسنہ کے ورق جیسی سڑکوں اور گلی کوچوں میں برفانی ہوا چہرے پر تھپڑ لگا رہی تھی۔ درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے نیچے آ گیا تھا۔ اس موسم میں کسی پیشنٹ کو گھر جا کر دیکھنا مصیبت ہے۔ وہ انگلیوں کی درد کرتی ہوئی پوروں کو سانس کی گرمی پہنچانے لگا۔ اس کا دستانہ دو دن سے غائب تھا۔ باہر زمستاں کی شام کے ویران، مرگ آلود اور یخ بستہ سائے اتر رہے تھے۔ وہ ویران برف آلود تنہائی میں سرد اور بے جان آتش دان کے سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اسے نوکر پر سخت غصہ آیا۔ گدھے کے سر کے سینگوں کی طرح غائب ہے، کم بخت! ابھی ہوتی بیماری اس کی جان کو رو رہی ہے لیکن وہ خاموش رہا۔ اس نے نوکر کو آواز نہیں دی۔ اس کی نگاہوں میں تھوڑی دیر پہلے مسز مہتا کی موت کا نقشہ گھوم گیا۔ کاش وہ اسے بچا سکتا! مشکل سے پچیس برس کی عمر تھی اس کی۔ اس کا خوبصورت جسم برف کی چادر کی طرح پھیلا ہوا تھا، اور اس کا چیختا ہوا نوزائیدہ بچہ ماں کی لاش سے الگ ٹھٹھر رہا تھا۔ وہ کانپ اٹھا یہ نظارہ دیکھ کر۔ اس کا دل مسوس ہو چکا تھا۔ اگر وہ مسز مہتا کی بین کرتی ہوئی بہن کی توجہ اس ننھی سی جان کی طرف نہ پھیرتا، تو وہ بھی برف ہو جاتا بیچارہ!

رنگین شعلوں کے آنچ دیتے ہوئے سنہرے سائے اس کے گمبھیر چہرے پر کانپ رہے تھے۔ وہ پلک جھپکائے بغیر شعلوں کے سرسراتے اور پھڑپھڑاتے ہوئے سوئے کے اوراق کو گھور رہا تھا۔ شعلوں کا انعکاس، باریک لووں کی صورت میں اس کی آنکھوں کی لامحدود گہرائیوں میں اتر کر تھرتھرا رہا تھا۔

جب وہ مسز مہتا کے گھر سے نکلا تو مایوسی کی برف کا پہاڑ اس کے سینے پر جم چکا تھا۔ شانتا بھی شادی کے ڈیڑھ ہی سال کے بعد بالکل اسی طرح زندگی اور موت کی کشمکش میں الجھ چکی تھی، اور اپنی انتہائی کوششوں کے باوجود وہ اسے موت کے ظالم ہاتھوں سے واپس نہ لا سکا تھا۔ اس کا تپتا ہوا جسم برف ہو گیا، اس کی رنگین آنکھوں چاند گہن ہو چکا تھا۔ اور اس کی دنیا تاریک ہو چکی تھی۔ اتنے بڑے صدمے کی تاب لا اس کے

اس کی بات بھی، اُس کے ہوش و حواس پر بجلی گر پڑی تھی۔

اُس نے کرسی پر اپنے اکڑے ہوئے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اُس کے ہاتھ مُرجھائے ہوئے پتوں کی طرح بند تھے، اور اُس نے لمبے لمبے بکھرے بالوں سے ڈھکی چھوٹی گردن کو کرسی کی پشت پر ٹکا دیا۔ اُس سے شکن آلود ماتھے پر سیاہ، بال خیلے ابرو ان تک جھک آئی تھی، وہ آتشدان کے سرد راکھ کو دیکھ رہا تھا، اُس کے چہرے پر تشنج کی سی کیفیت تھی، جیسے چہرے پر پڑی ہوئی سلوٹیں جم گئی ہوں، مایوسی کی ایسی ہی ذہنی کیفیت انسان کو کہیں کا نہیں رکھتی، انسان پاگل ہو جاتا ہے، وہ اپنے منصب سے گر جاتا ہے، اور ——— اور وہ دھرتی کے سینے پر ایک بوجھ بن کر رہ جاتا ہے۔

لیکن وہ اس دھرتی پر بوجھ بن کر زندہ رہنے کے لئے تیار نہیں، جس لمحے اُسے یقین ہو جائے گا کہ وہ ایک بے کار بوجھ بن کر رہ گیا ہے، وہ ——— وہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اپنے وجود کو ختم کر دے گا! یہ اُس کا آج کا فیصلہ نہیں ہے، برسوں پہلے کا فیصلہ ہے۔ یہ فیصلہ اُس نے شانتا کی موت کے بعد کیا تھا۔ تو کرنے آتشدان میں آگ جلائی تھی، آگ کے شعلوں کو زبان مل گئی۔ زبان بلنے لگی ——— تمہارے فیصلے ہم دیکھ چکے ہیں نیند آور گولیاں ان فیصلوں کو موت کی نیند سُلاتی ہیں!

شانتا کی موت نے اُس کی جسمانی اور ذہنی قوتوں کو مفلوج کر دیا تھا!

وہ شام ایسی ہی تاریک اور ویران تھی کہ اچانک ایک الہامی کیفیت اُس کے دل میں جاگ اُٹھی تھی۔ روشنی کی ایک کرن دل کی تاریکی میں تھرتھرائی تھی اور پھر اس کی نگاہوں میں شاداب روشنی کے بہت سے دریچے کُھل گئے تھے۔ وہ روشنی کے سمندر میں نہا گیا تھا ——— یہ شانتا کے خطوط تھے جنہیں وہ بھول چکا تھا اور جو اچانک آج شانتا کے سوٹ کیس میں اس کے ہاتھ لگ گئے تھے جیسے قارون کا خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو۔ شانتا کے محبت نامے، نسوانی تحریر کے آڑے ترچھے خطوط، ہر لفظ خلوص اور محبت کی ایک دنیا، ایک البیلی دنیا، پیار کے نازک جذبات کے مختلف رنگ، پڑھتے وقت رنگوں کی پھوار کاغذ کے ان رنگین اوراق میں ایک معصوم دل کی دھڑکنوں کا ارتعاش زندہ تھا۔ کون کہتا ہے شانتا اُس سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ چکی ہے، شانتا کی چمکتی ہوئی آنکھوں کے خواب، اُس کے شبنمی ہونٹوں کے سُلگتے ہوئے افسانے، اُس کی دھڑکنوں کا سنگیت، اُس کے خون کی حرارت، اُس کی رُوح کی تپش اُس کے خطوط میں محفوظ ہے۔

اُس کا جسم آگ کی تپش محسوس کرنے لگا۔ لکڑیاں تڑخ تڑخ کر جل رہی تھیں۔ آگ کے سُرخ شعلے نرم نیلی دھاریوں کے ساتھ پھیل رہے تھے، جھُول رہے تھے، اینٹھ رہے تھے اور سُوکھی لکڑی کو اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے۔

اُس کے چہرے کا تناؤ ڈھیلا پڑتا جا رہا تھا!

اُس کا چہرہ تانبے کی طرح دمک رہا تھا!

اُس کے ہونٹ مُسکرا رہے تھے!

یہ خطوط اب اُسے آنکھوں کی روشنی سے زیادہ عزیز تھے۔ شانتا کی حنائی انگلیوں کی خوشبو میں بسے ہوئے یہ خطوط اُس کی کُل کائنات تھے۔ اُس نے ان خطوط کو ایک مقدس امانت کی طرح اپنے کمرے میں شیشے کے دراز میں بہت احتیاط اور حفاظت کے ساتھ رکھا تھا۔ اور آج سولہ برسوں سے ان یادگار کو سینے سے لگائے بیٹھا تھا۔ ہسپتال سے لوٹ کر وہ اپنی سٹڈی میں شانتا کی میٹھی میٹھی، خواب آور اور پیار بھری باتوں سے آباد کر لیتا۔ اُس کے بھیگی دھیمی دھیمی گنگناہٹ اُس کے کانوں میں رس گھولتی۔ اُس کی پلکیں بوجھل ہونے لگتیں۔

نوکر نے کھڑکیوں کے پردے گرا دئے تھے اور شام کے گھٹے ہوئے سائے کمرے کی دیواروں، چھت، دروازوں سے بھری الماری اور شیلف میں بے ڈھنگے طور پر آویزاں گرد آلود سُولوں سے چمٹے ہوئے تھے۔

کچھ سوچ کر اُس نے آگ پر ایک لکڑی ڈالی۔ سوچ کے تاریک جالے اُس کے دل و دماغ کو سخت گرفت میں لے رہے تھے۔ وہ بے بس ہوا جا رہا تھا اُسے شدت سے محسوس ہوا کہ اُس کا سارا جسم زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ وہ ان زنجیروں کو جھٹک دینا چاہتا ہے، وہ آزاد ہونا چاہتا ہے اور یہ خط ——— یہ زنجیریں؟

اُس نے ریشم کے کیڑے کی طرح خود ہی اپنے گرد ایک سخت جال بُن رکھا ہے!

یہ خطوط محض ایک فریب ہیں، چھلاوہ!

شانتا مر چکی ہے ——— شعلے زور زور سے چیخ رہے تھے۔

یہ نئی سوچ اُس کے دل و دماغ پر بُری طرح مسلط ہو رہی تھی!

اُس کے سینے پر جمے ہوئے پہاڑ کے نیچے ایک تیز کھولتا ہوا لاوا حرکت میں آگیا!

خطوط سائے ہیں، سایوں کی کوئی حقیقت نہیں۔ وہ سولہ سترہ برسوں سے ان سایوں کی پوجا کرتا رہا ہے۔ یہ سائے اُس کے دل اور دماغ کو زنگ لگا چکے ہیں۔ اُس کی رُوح کی ویرانی بڑھتی گئی۔ ہر نیا لمحہ سینے کے بوجھ کو بڑھاتا رہا، اُس کی سانسیں بوجھل ہوتی گئیں۔ وہ مستقل طور پر اعصاب کی کمزوری کا شکار ہوتا گیا۔ وہ دلی سکون کے لئے ترستا رہا۔ بے خوابی کے جھلستے ہوئے انگاروں کو خواب آور گولیوں سے ٹھنڈا کرتا رہا۔ اُس کی ذہنی صلاحیتیں ماند پڑ گئیں، یادداشت کمزور ہو گئی۔ اُس کی شہرت روز بروز گھٹتی جا رہی تھی۔

اُس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور سگریٹ کا ایک لمبا کش لے لیا۔

آگ کے شعلے گنگنا رہے تھے!

اچانک وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے ادھ جلی سگریٹ آگ میں پھینک دی اور میز کی طرف آیا۔ دراز کھٹ سے کھول کر اُس نے تہہ در تہہ خطوط کی ڈھیری اپنے دونوں ہاتھوں سے سمیٹ لی۔ اور دراز کو کھُلا چھوڑ کر وہ پھر کرسی پر آبیٹھا اور آن واحد میں خطوط کی اس

وہ کوٹھی ہوئی آگ میں جھونک دیا۔

آگ چند لمحے دب سی گئی لیکن جلد ہی شعلے انگڑائیاں لینے لگے اور بل کھاتے شعلوں کے کناروں پر رینگنے لگے

وہ شانتا کی پہلی تحریر تھی۔ ڈیڑھ سال کے بعد جب شہر کے لئے اُس کا تبادلہ ہوا سامان وغیرہ ٹھوا کر بس کے کنارے کھڑا تھا تو شانتا نے جھکی ہوئی آنکھوں پر گھنی پلکوں کا پردہ ڈالے تمتماتے ہوئے رخساروں کے ساتھ ایک لفافہ اُس کی طرف بڑھایا۔

"ارے ـــــ یہ کیا؟ تمھارے کام کا بل تو نہیں چکانا ہے؟" وہ مذاق کے موڈ میں تھا۔

شانتا نے صرف اتنا کہا اور پلٹ کر سنبھلتی ہوئی سیڑھی سے غائب ہو گئی۔

"جہاں ہونٹ گونگے ہوتے ہیں، وہاں خط بات کہہ جاتے ہیں"

اور جب اُس نے بس میں دوسرے مسافروں کو اونگھتے ہوئے پاکر وہ خط ایک سانس میں پڑھا تو اُسے محسوس ہوا بے شک اِس خط نے شانتا کی بے زبانی کو زبان دے دی ہے۔

پیار کے ازلی حروف سے لکھا ہوا وہ خط اُس نے گھر پہنچ کر بار بار پڑھا۔ اور ہر بار ایک اجنبی لطافت اُس کی رگ و پے میں تحلیل ہو گئی۔ یہ خط نسوانی حُسن، احساس اور زندگی کا ایک جیتا جاگتا ثبوت تھا۔ زندگی کا یہ حسین اور لطیف پہلو آج تک نہ جانے کیوں اُس کی نظروں سے اوجھل رہا۔ میڈیکل ٹریننگ کے دوران کئی شوخ و شنگ لڑکیوں نے اُس سے محبت کی پینگیں بڑھائیں لیکن وہ اُنھیں ٹالتا رہا اور جب اُسے گھر سے پچاس میل دور اُس علاقے میں تعینات کیا گیا، تو شانتا اُسے بہت قریب ملی۔ وہ ڈیرے والے کی اکلوتی لڑکی تھی اور مقامی اسکول میں کام کرتی تھی۔ خاموش سی، پیاسی لڑکی، اُس کے چہرے پر چیچک کے چند مٹے مٹے سے داغ بھلے لگتے تھے۔ اُس کا صحت مند جسم ایک موزوں سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ فرصت میں، گھر کے کام کاج سے فراغت پاکر وہ، اُس کے پتا جی اور میں تینوں مختلف مسائل پر گفتگو کرتے، شانتا کی فطری ذہانت اُس کی کم گوئی چھپا نہ سکی۔ اُس کی دلآویز خوبصورتی سے وہ دل ہی دل میں متاثر تھا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ شانتا کے پاؤں میں زنجیر پڑ چکی ہے۔ اپنے ہی علاقے کے ایک دُکاندار سے اُس کی منگنی ہو چکی تھی۔

شانتا کے خطوط آتے رہے ـــــ!

خطوط جل رہے تھے!

جلتی ہوئی لکڑی کے شفاف شعلے کی روشنی میں اب یہ موٹا خط جل رہا ہے۔ اُس کے ایک کونے کو آگ چوم رہی ہے اور خط کی اوپری سطح جھلک رہی ہے۔

"میں پاؤں کی اِس زنجیر کو توڑ پھینکنا چاہتی ہوں"

اُس کے حوصلے جوان تھے۔ اُسے ایک اَن پڑھ، موٹی توند والا دُکاندار ایک آنکھ نہ بھایا تھا۔ کاغذ کے اوراق پر اُس نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا تھا

خط کی لپٹی ہوئی تہوں پر اب نیلی دھاری والا شعلہ سرسرا رہا تھا۔

ہر نیا خط شانتا کی شخصیت کی ایک نئی تہہ کھول دیتا۔ روشنی کی ایک نئی لہر اُس کے دل کو چھو لیتی۔

اُس کی زندگی کے راستے دُور دُور تک روشن ہو جاتے۔

اور پھر تین سال کی جد و جہد کے بعد وہ کامیاب ہو گئے۔ یہ تین سال تین صدیاں اُنھوں نے خطوط کے سہارے گزار دی تھیں۔ اُن کی گھریلو زندگی کا آغاز ہو چکا تھا۔ گھر جنت کا نمونہ تھا۔ ہر لمحہ حُسن، رنگ اور خوشبو میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ زندگی کی راحتوں کا لطف لے رہے تھے۔

سرد ہوا کے جھونکوں سے شعلے تیز ہو رہے تھے۔

بہت سے خطوط سُلگتی ہوئی راکھ میں بدل چکے تھے۔ راکھ کے ڈھیر پر رہ رہ کر کوئی چنگاری بھڑک اُٹھتی اور معدوم ہو جاتی۔ اب ایک خط باقی رہ گیا تھا۔

"یہ خط آپ کے پاس ..." آگ کی زہریلی زبان نے بقیہ جملے کو ڈس لیا۔ فوراً خط کا کاغذی پیرہن جلنے لگا۔ شعلہ یک بارگی بلند ہوا اور جلد ہی نیچے آرہا اور آہستہ آہستہ مدھم پڑ گیا۔

ایک لمحہ گزرا۔

شعلے خاموش ہو چکے تھے، لکڑیاں جل کر راکھ ہو چکی تھیں۔ دو ادھ جلی لکڑیاں سُلگ رہی تھیں۔ آتشدان کے بیچ میں جلے ہوئے خطوط کے سیاہ ورق ہوا کی ہلکی جنبش سے راکھ ہو رہے تھے۔

اُس کے چہرے پر شام کی سیاہی گھُل گئی تھی۔

معاً وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے کندھے جھٹک دئے۔ اُس کا جسم قدرے ہلکا ہو گیا تھا۔ وہ اپنے ماضی کے اوراقِ پریشاں کو آگ لگا چکا تھا۔ یادیں راکھ بن چکی تھیں۔ وہ ٹیبل کی سمت آیا اور ٹیبل لیمپ روشن کیا۔

"چائے لاؤں جناب؟" دروازے پر نوکر سہمی ہوئی آواز میں بولا۔

"لے آؤ" اُس نے ٹیبل پر بے ترتیبی سے رکھی ہوئی کتابوں کو قرینے سے رکھا اور تازہ آئے ہوئے لٹریچر کو دیکھنے لگا۔

چند لمحے گزرے۔

غیر شعوری طور پر اُس نے دیکھا کہ ٹیبل کا ڈرائیر کھلا پڑا ہے ـــــ خالی اور ویران!

گزشتہ پندرہ بیس برسوں سے ڈرائیر کی آغوش خوشبو میں لپٹے ہوئے انفاس سے آباد تھی، وہ آج لٹ چکے تھے۔ روز ٹیبل پر بیٹھ کر وہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ڈرائیر کو کھول دیتا اور محبت کے دفتر کھُل جاتے۔ اُس کے ویران لمحوں میں پھول ہی پھول کھل اُٹھتے!

لیکن آہ ــــــ!

اُسے اتنا معلوم ہوا کہ ایک ہُوک اُس کے دل و جگر کو چیرتی ہوئی اُٹھی۔ وہ تلملا اُٹھا اور اضطراب سے کانپا اور گھبراہٹ میں اُٹھ کھڑا ہوا اور آتش دان کی طرف گیا ایک پاگل کی طرح!

آتش دان کی آگ مدھم پڑ چکی تھی!

کمرہ نیم تاریک، نیم روشن تھا۔ دیواریں سایہ گیر تھیں۔ فرش ویران تھا اور باہر یخ آلود شام کے بھیانک چہرے کے نقش سرمئی ہوئی تاریکی میں پاگل ہو چکے تھے۔

جس کی زندگی کا آخری سہارا چھن چکا تھا۔ اُس کی جان سے کسی پیار کی متاع لُٹ چکی تھی!

اُس نے اپنے ہاتھوں زندگی کی بُنیاد دل کو ڈھا دیا تھا۔ وہ قاتل ہے قاتل! اُس کی روح کی شادابی کی آخری رمق بھی چھن گئی تھی۔ اب وہاں بھٹکتے ہوئے ویرانے تھے اور بس!

چہرے کے بگڑتے ہوئے خدوخال سے اُس نے بائیں ہاتھ سے پسینہ پونچھا اور واپس مڑا۔

”جناب چائے!“

”واپس لے جاؤ۔ میں پینا نہیں چاہتا ــــــ“ اُس کی اپنی آواز اُسے اجنبی معلوم ہوئی۔ نوکر چپکے سے باہر نکلا۔

وہ چند لمحوں تک خطوں کی سیاہ راکھ کو خالی خالی بے معنی نظروں سے گھورتا رہا۔

کچھ سوچ کر وہ پلٹا، وہ کہاں جائے؟ لمحوں کے پہاڑ جم چکے تھے۔ زمستان کی یخ بستہ اور طویل رات پھیلی ہوئی تھی اور کسی تارے کی چنگاری بھی نہ سلگتی تھی۔

وہ آگے بڑھا۔ اُس نے الماری کھول دی۔ باہر سیڑھی پر کسی چیز کے گرنے کی آواز سے وہ چونک اُٹھا لیکن دروازے کو بند دیکھ کر وہ مطمئن ہوا۔ اُس نے خواب آور گولیوں کی ایک نئی شیشی نکالی۔ سرد ہاتھ سے الماری بند کی۔

ارے ــــــ! الماری کے نیچے فرش پر ٹیبل لیمپ کی دھیمی سی سبز روشنی میں ایک خط ابھری ہوئی مہروں کے ساتھ پڑا تھا۔ یہ خط اُس کے ہاتھوں سے گر گیا۔ سارے کے سارے خطوط جل کر خاکستر ہو گئے لیکن یہ کم بخت ــــــ! وہ اسے بھی جلا کر راکھ کر دے گا جو کہانی ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکی ہے، اُس کا کوئی حصہ، کوئی تار بھی باقی نہیں بچنا چاہئے۔ یہ کہانی ختم ہونے کے لئے ہی شروع ہوئی تھی۔ وہ ٹیبل کی طرف آیا۔ اُس نے شیشی ٹیبل پر رکھ دی۔ اور خط کو دونوں ہاتھوں سے دو ٹکڑے کرنے کی نیت سے کھینچا ہی تھا کہ چرمراتے ہوئے خط کی تہوں سے تازہ خوشبو کی ایک شاداب لہر اُس کے نتھنوں کو چیر گئی۔

وہ حیران رہ گیا۔

وہ خط کو آنکھوں کے قریب لا کر حروف پڑھنے لگا۔ وہ اچھی طرح سے پڑھ نہ سکا۔

دل کی رانی!

تم نے میرے جیون کے ہر پل کو رنگ اور روشنی سے بھر دیا ہے۔ کل میرے کمل والے دن ملاقات ہوگی۔ تمہارے خط کا بے چینی سے انتظار کر رہا ہوں۔ یہی خط میری زندگی کا سہارا ہیں۔ ماما جی کا مال گھر شیلف کی الماری سے اُن کے لئے بکوزائم کی نئی شیشی بھجوا رہا ہوں...

ارے یہ خط کہاں سے آ گیا، یہ حروف؟ یہ شانتا کا خط تو نہیں ہے اور نہ اُس کی تحریر ہی ہے، پھر یہ خط ــــــ یہ ماجرا کیا ہے؟

اُس کی حیرت زدہ آنکھیں خط کے اوراق سے چپل چپل کر ناکام ڈھونڈنے لگیں۔ دوسرے لمحے جب اُس نے خط کے لفافے کو دیکھا تو خط اُس کے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے چھوٹ کر ٹیبل پر اوندھے منہ آن گرا ـــ اُس کا سارا بدن پسینے پسینے ہو چکا تھا۔ وہ ٹیبل پر کہنیاں ٹکائے اپنے ہاتھوں سے چہرے کو تھامے ہوئے تھا۔ ایک لمبی سانس لے کر اُس نے تھکے ہاتھ آنکھوں سے ذرا ہٹائے اور کنپٹیوں کے پیچھے رکھ لئے۔

معاً اُسے محسوس ہوا کہ نیچے ٹیبل پر محبت کے خطوں کے انبار لگے ہیں، رنگین اور معطر خط، اُس نے سر اوپر اُٹھایا۔ اُسے دکھائی دیا جیسے سارا کمرہ خطوں سے اٹ گیا اور ساری کائنات پر محبت نامے بکھرے ہوئے ازلی اور ابدی رشتوں کے اسرار کے دفتر کھول رہے ہیں۔ کہانی ختم نہیں ہوئی۔ یہ کبھی نہ ختم ہونے والی کہانی ہے جہاں یہ بظاہر ڈوبتی ہے، وہیں اس کا طلوع بھی ہوتا ہے۔ وہ اُٹھا۔ اُس نے شیشی واپس الماری میں رکھ دی۔ کچھ سوچ کر خط بھی الماری کے اندر رکھ دیا۔

وہ دروازے کی طرف آیا اور سوئچ آن کیا۔ کمرہ روشنی سے بھر گیا۔

”راگھو!“

”جناب!“

”دیکھو کیا ہے، فوراً آگ جلاؤ!“

آتش دان کی آگ پھر روشن ہو گئی۔

”راگھو!“

”جی!“

”چائے لے آؤ ــــ اور ہاں، بھوشن آجائے تو کہہ دو کہ ڈیڈی بُلاتے ہیں!“

عید مُبارک
عید کے موقعہ پر خوب
دیکھ بھال کر اپنے لیئے
جوتوں کا انتخاب کیجیے
اور یہ آپ کے لیئے بہتر
ہوگا کہ آپ اپنی نزدیک
ترین باٹا کی دوکان میں
تشریف لائیے۔
Bata

غزل

رفعت سلطان بی اے

...ں کی ہوا نہیں ملتی
...زندگی کی فضا نہیں ملتی

...ے عشق میں خبر اپنی
...منزلِ نقشِ پا نہیں ملتی

...تیرے کرم سے مجھے
...فرصتِ التجا نہیں ملتی

...جب تک عشق میں آئے
...زندگی کو بقا نہیں ملتی

...سے اُن گیسوؤں کو آئی ہے
...اب کسی سے صبا نہیں ملتی

عشق اگر ہو نہ قدرداں رفعت
حسن کو بھی ادا نہیں ملتی

غزل

ضامن ناگپوری

مقدر ہے حریفِ جلوۂ جانانہ برسوں سے
اسیرِ شامِ ہجراں ہے دلِ دیوانہ برسوں سے

ہزاروں انقلاب آئے ذرا جنبش نہ کی اس نے
خدا معلوم کس عالم میں ہے دیوانہ برسوں سے

خدارا اب تو دل آزاریوں سے باز آ جاؤ
چھلکنے کیلئے بیتاب ہے پیمانہ برسوں سے

جو اپنے چاکِ دامن کو رفو تک کر نہیں سکتے
وہ دیوانے سمجھتے ہیں مجھے دیوانہ برسوں سے

نہ قاصد ہی کوئی آیا نہ کچھ اُن کی خبر آئی
خدا جانے بھٹکتا ہے کہاں پروانہ برسوں سے

پرستش آج بھی کرتا ہوں میں ضامنؔ کسی بت کی
ہے میرے کعبۂ دل میں نہاں بتخانہ برسوں سے

غزل

جبریل صدیقی ایم اے

نظر سے کام غمِ عشق میں زباں کے لئے
کہ لفظ غیر ضروری ہیں داستاں کے لئے

یہ زندگی ہے کہاں زندگی تمہارے بغیر
کہ اتحاد ضروری ہے جسم و جاں کے لئے

تری نظر جو نہیں ہے تو کیا ہے قصۂ غم
کہاں سے لاؤں میں عنوان داستاں کے لئے

چمن میں آتشِ گل سے بھی آگ لگتی ہے
بہار و برق برابر ہیں آشیاں کے لئے

دلِ خراب کو خود نذرِ حسن کرتا ہوں
زمیں ابھار رہا ہوں میں آسماں کے لئے

گلوں کا رنگ بہت تیز ہو گیا جبریلؔ
چمن میں آگ لگی میرے آشیاں کے لئے

غزل

شمیم انصاری شکاروی

بادہ و ساغر و سبو ہے تو کیا
سامنے کوئی ماہرو بھی تو ہو

ڈھونڈنے سے خدا بھی ملتا ہے
جذبۂ شوقِ جستجو بھی تو ہو

اُن کا ملنا تو کوئی بات نہیں
اُن سے ملنے کی آرزو بھی تو ہو

عید مبارک
عید کے موقعہ پر خوب
دیکھ بھال کر اپنے لیئے
جوتوں کا انتخاب کیجئے
اور یہ آپ کے لیئے بہتر
ہوگا کہ آپ اپنی نزدیک
ترین باٹا کی دوکان میں
تشریف لایئے
Bata

غزل

رفعت سلطان بی اے

گیسوؤں کی ہوا نہیں ملتی
زندگی کی فضا نہیں ملتی

منزلِ عشق میں بجز اپنے
مقصدِ نقشِ پا نہیں ملتی

[illegible] کے کرم سے مجھے
فرصتِ التجا نہیں ملتی

موت جب تک عشق میں آئے
زندگی کو بقا نہیں ملتی

چھو کے اُن گیسوؤں کو آئی ہے
اب کسی سے صبا نہیں ملتی

عشق اگر ہو نہ قدرداں [illegible]
حسن کو بھی ادا نہیں ملتی

غزل

ضامن ناگپوری

مقدس ہے حریفِ جلوۂ جاناں بہاروں سے
اسیرِ شامِ ہجراں ہے دلِ دیوانہ بہاروں سے

ہزاروں انقلاب آئے ذرا جنبش نہ کی اُس نے
خدا معلوم کس عالم میں ہے بیگانہ بہاروں سے

غلط اب تو دل آزاریوں سے باز آ جاؤ
چھلکنے کیلئے بیتاب ہے پیمانہ بہاروں سے

جو اپنے چاکِ داماں کو رفو تک کر نہیں سکتے
وہ دیوانے سمجھتے ہیں مجھے دیوانہ بہاروں سے

نہ قاصد ہی کوئی آیا نہ کچھ اُن کی خبر آئی
خدا جانے بھٹکتا ہے کہاں پروانہ بہاروں سے

پرستش آج بھی کرتا ہوں میں ضامن کبھی بُت کی
ہے میرے کعبۂ دل میں نہاں بتخانہ بہاروں سے

غزل

جبریل صدیقی بی اے

نظر ہے کام غمِ عشق میں زباں کے لئے
کہ لفظ غیر ضروری ہیں داستاں کے لئے

یہ زندگی ہے کہاں زندگی تمہارے بغیر
کہ اتحاد ضروری ہے جسم و جاں کے لئے

تری نظر جو نہیں ہے تو کیا ہے قصۂ غم
کہاں سے لاؤں میں عنوان داستاں کے لئے

چمن میں آتشِ گُل سے بھی آگ لگتی ہے
بہار و برق برابر ہیں آشیاں کے لئے

دلِ خراب کو خود نذرِ حسن کرتا ہوں
زمیں بنا رہا ہوں میں آسماں کے لئے

گلوں کا رنگ بہت تیز ہو گیا جبریل
چمن میں آگ لگی میرے آشیاں کے لئے

غزل

قمر انصاری شکاروی

بادہ و ساغر و سبو ہے تو کیا — سامنے کوئی ماہرو بھی تو ہو
ڈھونڈنے سے خدا بھی ملتا ہے — جذبۂ شوقِ جستجو بھی تو ہو
اُن کا ملنا تو کوئی بات نہیں — اُن سے ملنے کی آرزو بھی تو ہو

آیئے آپ کو سادھنا کا ہمراز بنائیں

"میرے رنگ روپ کے لئے لکس لاجواب ہے!"

فلمی حسینہ سادھنا کہتی ہیں —

"لکس کتنا خالص ہے، کتنا ملائم . . . اِس کا نرم نرم جھاگ میرے رنگ روپ میں لاجواب رونق لے آتا ہے! اور اس کی خوشبو بھی کتنی دلفریب ہے! اپنی خوبصورتی کی دیکھ بھال میں سدا لکس سے شروع کرتی ہوں، آپ بھی لکس استعمال کیجئے —— میری طرح!"

لکس ٹائلیٹ صابن —— فلمی ستاروں کا حسن بخش صابن

سفید اور دھنک کے چار رنگوں میں

ہندوستان لیور کا تیار کردہ

LTS. 178-140-45 UD

مشہور اہلِ قلم کے

محبوب مشغلے

کھُلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
ناموں کے انتخاب نے رُسوا کیا مجھے

راجہ مہدی علی خاں ——————

۱۳۹۔ پالی روڈ، باندرہ۔ بمبئی ۵۰

۱۸ جنوری ۶۵ء　　　　برادرم مولانا "بیسویں صدی" آداب

جب سے آپ کوان گروپ کے دورے پہ گئے ہیں آپ کی خیریت معلوم نہیں ہوئی۔ اُمید ہے آپ اب تک نیپال سے واپس آگئے ہوں گے ——— فروری کا "بیسویں صدی" اب تک نہیں ملا۔ شاید چند روز تک مل جائے۔ میں نے "مشاغل" کی دوسری قسط جو روانہ کی تھی وہ سب کی سب چھپ گئی یا کچھ حصہ بچا ہے؟ ——— میں پچھلے دنوں بہت بیمار رہا۔ گُردے خراب ہو جانے کی وجہ سے منہ، آنکھیں، ہاتھ، پاؤں، پیٹ سب متورّم ہو گئے تھے۔ علاج جاری ہے۔ ہفتوں مُرغ و ماہی سے محروم رہا ——— دو تین دن تک "مشغلوں" کی آخری قسط گھسیٹ ڈالوں گا۔ اطلاع دیجیے کہ زیادہ سے زیادہ کس تاریخ تک آپ کو یہ قسط مل جانی چاہیے ——— برادرم مولانا بیسویں صدی! اگر آپ نے پھر کبھی مجھے کچھ بھیجا تو دہلی آکر آپ کی ٹانگیں توڑ دوں گا ——— اب معلوم ہوا کہ مجھے جو مرچیں، مربے، شامی کباب، اچار وغیرہ بھیجے گئے تھے وہ کسی مضمون کے معاوضے کے سلسلے میں تھے۔ میں سمجھا تھا کہ بھائی نے بھائی کو تحفہ بھیجا ہے۔ اب اس قسم کی کوئی چیز بھیجی تو بذریعہ ہوائی جہاز سب چیزیں خوشتر گرامی کے پیٹ پر دے ماروں گا ——— وزیر آغا صاحب کو "بیسویں صدی" کا جنوری نمبر جس میں میرا مضمون درج ہے، نہیں ملا۔ از راہِ کرم فوراً انھیں جنوری اور فروری کے پرچے بذریعہ رجسٹری بھجوائیے۔ ہندوستان میں جس طرح آپ میرے تنہا دوست ہیں، پاکستان میں وزیر آغا صاحب ہیں ——— اگر آپ کو "راجہ تیر دلشتر علی خاں" کہلا کہلا کر خوش ہونے، قوم کو گاجروں کے فوائد اور مرچوں کے نقصانات بتانے سے فرصت مل جائے تو اس خط کا جواب دیجیے۔ ورنہ نہیں۔

مخلص ——— راجہ مہدی علی خاں

جناب منیجر صاحب "بیسویں صدی" السلام مسنون

آپ جانتے ہیں حضرت خوشتر گرامی میرے انتہائی عزیز دوست ہیں۔ خدا نخواستہ کبھی اُن پر کوئی وقت پڑ جائے تو میں اپنی جان تک قربان کر سکتا ہوں۔ اُن کا ایک خط میرے نام آیا ہے جسے پڑھنے کے بعد میں بہ آسانی اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ وہ پاگل ہو گئے ہیں۔ میں اُن سے دُور ہوں۔ ایسے میں میری تمام اُمیدیں آپ ہی سے وابستہ ہیں۔ براہِ کرم جلد از جلد دُنیا کے مشہور ڈاکٹروں کو بذریعہ طیارہ دہلی بُلوا لیجیے اور اُن کا علاج ہندوستانی اور یورپین ڈاکٹروں کے بورڈ کے ذریعہ کروائیے، فیس اور دیگر اخراجات کی بالکل فکر نہ کیجیے۔ "بیسویں صدی" کے اکاؤنٹ میں میرے ہزاروں روپے جمع ہیں اور

مزید رقم میں ٹیلیفون کے ذریعے بھیج دوں گا اُن سے تمام بل ادا کر دیجئے شکریہ!)

خاکپائے نوفتر گرامی ——— ماہر مہدی علی خاں

سجاد ظہیر (دہلی)

سیاہ قلم سے سُرخ تحریریں لکھنا اور لکھوانا۔ ترقی کو پسند کرنا ——— ترقی پسندوں کو پسند کرنا اور ترقیاں دلوانا۔ کمیونزم اور "ترقی ازم" دونوں "ازموں" کو ملاکر تیسری "ازم" "موقع ازم" ایجاد کرنا۔

ترقی پسندوں کو سُرخ گلاب سُنگھا سُنگھا کر ہوش میں لانا اور کہنا۔

"دیوانو! بکارِ خویش ہمیشہ ہشیار رہو"

اپنی کوٹھی کے باغ میں ٹماٹر، چقندر، آلوچے، آلو بخارے اور سُرخ مرچوں کی کاشت کرنا۔ علی سردار جعفری کو اپنے گھر کی چھت پر کھڑے دیکھ کر یہ مصرع پڑھنا۔

سُرخ پوشے بہ لبِ بام نظر می آید

سردار جعفری کا جواب دینا ؎

نہ بزور و نہ بہ زاری نہ بہ زر می آید

آلِ احمد سرور (علی گڑھ)

آل احمد کی زبوں حالی دیکھ کر سرور حاصل کرنا۔ "انجمن ترقی اُردو" کے مقابلے میں "انجمن تنزلِ اُردو" کی حوصلہ افزائی کرنا۔ ادب کے ہسپتال میں مریضوں کے دلوں کا پہلے خوردبین سے پھر دُوربین سے معائنہ کرنا۔ آخر میں "سیر بین" لکھنا۔

مریضوں کا پوسٹ مارٹم کرکے پہلے انھیں سڑک پر پھینک دینا۔ بعد میں انھیں اٹھا کر گھر لے آنا۔ انھیں دیکھ دیکھ کر کبھی ہنسنا کبھی رونا۔ کفن اتار کر انھیں دریا میں پھینک دینا اور کہنا ؎

ہوئے مر کے ہم جو رُسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کہیں جنازہ اُٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

خلیل الرحمٰن اعظمی (علی گڑھ)

خلیل کے ساتھ لفظ "خاں" لگا کر شاعری کے چمن زاروں میں خوبصورت فاختائیں اُڑانا۔ جنگل میں مُصلّی بچھا کر "یا خلیلُ" "یا رحمٰنُ" "یا اعظمُ" کا وِرد کرنا۔ مجھے ملالت کی حالت میں سامنے سے گزرتے دیکھ کر وظیفے کے الفاظ یُوں بدل لینا۔

"یا علیلُ" "یا ذلیلُ" "یا رذیلُ" "یا کمینُ"

کالج میں پروفیسروں کی حاضری لگانا۔ اپنے آپ کو مقبول کر خلیل الرحمٰن اعظمی "غیر حاضر" لکھ دینا۔

راقم الحروف کو ہر روز دو لیک دعاؤں اور دس ہزار بددعاؤں کے ساتھ یاد کرکے اپنی عاقبت خراب کرنا۔

اشعار گنگنانے سے صاف انکار کر دینا اور کہنا کہ اشعار غنڈے گنگناتے ہیں۔ پھر یکایک کسی غنڈے کے مندرجہ ذیل اشعار گنگنانے لگنا ؎

کیوں بے تیلی اُونگھ رہا ہے؟
جب "وہ" آئے
کرکے ہائے
آنکھ تو اُس کو مار
تاش کے پتے پھینکو یارو
تاش کے پتے پھینکو یار

عبادت بریلوی (کراچی)

بندوں کے خدا کی خود عبادت کرنا اور خدا کے بندوں سے اپنی عبادت کرانا۔ تنقیدی مضامین پر تنقیدی مضامین لکھنا۔

ہر روز بریلی کے پاگل خانے کی سیر کرنا۔ پاگلوں سے تبادلۂ خیالات کرنا۔ انھیں اپنے تنقیدی مضامین سُنا سُنا کر خوش ہونا۔ اُن کی رائے لینا۔ اُن کی رائے سے لفظ بہ لفظ اتفاق کرنا۔ ہوشمندوں کی ایک نہ سُننا۔

پاگلوں کو اپنا رباعیات عمر خیام کا ترجمہ سُنانا۔ اُن کی رائے پوچھنا۔ کچھ پاگلوں کا چلا چلا کر کہنا "بھاگ جاؤ غلط ترجمہ ہے" کچھ پاگلوں کا کہنا "اماں جانے دو ؎

دیوانہ ہے دیوانہ، دیوانے کو کیا کہیے"

کچھ پاگلوں کا عبادت صاحب کے ہاتھ میں چاقو دے کر کہنا ؎

مِٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے
کہ دانہ خاک میں مل کر گُل و گلزار ہوتا ہے

عاشق بٹالوی (لندن)

لندن میں رہ کر لاہور سے محبت کرنا۔ انڈیا آفس لائبریری میں سے مشاہیر کی لاشیں

[illegible] دفتر بھیجنا۔

[illegible] کر تیار کرانا۔ غالب پڑھنا۔ انگریزی میں [illegible] کر [illegible] دوستوں سے [illegible] شکسپیئر کو [illegible] کہنا۔ [illegible] (accompanying Card) کی حیثیت سے [illegible] کی جالا [illegible] کام [illegible] کرنا۔

[illegible] ترجمہ کر کے انگریزی میں اذان دینا۔ بچے کھچے [illegible] پبلک کو مخاطب کر کے کہنا ؎

میں کھٹکتا ہوں دل میں [illegible] کی طرح
تہنیتاً انگریز ہو، انگریز ہو، انگریز ہو

شاہد احمد دہلوی (کراچی)

"دشمنوں کے آگے ہاتھ جوڑ جوڑ کر کہنا: میاں جانے دو پہلوان فقیر کو تنگ نہ کرو۔ خفتہ کو تنگ کرو ۔۔۔۔۔ سمجھانے بجھانے پر بھی جب دشمن باز نہ آئے تو نعرۂ تکبیر [illegible] کہہ کر دشمن پر پل پڑنا۔ پہلے اس کا گریبان پھاڑنا۔ پھر گھونسوں سے اس کے دانت توڑنا۔ پھر ٹھوکریں مار مار کر اس کی ہڈی پسلی ایک کر دینا اور کہنا:

"ہاتھ لا استاد کیوں کیسی رہی؟"

حسینۂ اردو کو چھ دار خوبصورت غرارہ پہنا کر دہلی کی ملاوروں کے زیوروں سے آراستہ کرنا۔ افشاں لگا کر عطرِ حنا کی خوشبو میں مہکا کر، اُسے حسن کی بلندیوں پر بٹھا دینا اور پھر کہنا: شعر عرض کرتا ہوں ...

ستار کے کان مروڑنا۔ طبلے کے پیٹ پر گھونسے لگانا۔ ستار کی زلفوں کا مضراب سے پیچ [illegible] کرنا [illegible] کہنا ؎

بے خوبی تا ہمہ کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

جینے والے مرغوں میں کُھلّی کرانا۔ نہ لڑنے والے مرغوں کو [illegible] کھانا۔

مصنفوں کو ان کی کتابوں کے حقوق مفت واپس کر کے اپنا دیوالہ نکالنا۔

کھانے کے [illegible] کر خوش ہونا۔

دلی کی طرف منہ کر کے دلی کو یاد کرنا۔ دلی والوں کو یاد کرنا۔ قطب مینار کی بلندی کو دعائیں دینا۔ جامع مسجد دلی کی یاد میں نہاری کھانا۔ بے حد مرچوں والی نہاری کھلا کر اپنے پنجابی دوستوں یا دشمنوں کی آنکھوں سے آنسو نکلوانا۔ خوش ہونا اور کہنا ؎

کچھ کے منہ میں نہاری رکھ دی
اِک ذرا آپ کو زحمت ہوگی

مرزا ادیب (لاہور)

[illegible] کو فکر دینا۔ ان کی خاطر بیگم سے نئی نئی کہانیاں [illegible] چہرے پہ ہوائیاں اڑانا۔ بدحواس رہنا۔

"صحرا نورد کے خطوط" پوسٹ کرنے کے لئے صحراؤں میں لیٹر بکس تلاش کرنا۔ ریگستان کے اونٹوں کو دوست بنانا۔ اونٹوں کی سواری کرنا۔ اونٹنیوں کا دودھ مشکوں میں منہ لگا کر پینا۔ اونٹوں کو صحافی بنا کر کہنا۔ اونٹوں سے پوچھنا: "اونٹ رے اونٹ! تمہاری کون سی کل سیدھی؟ (اونٹوں کا جواب دینا: مرزا لے میاں! تیری کون سی کل سیدھی؟) اونٹوں سے روٹھ جانا۔

اشکبار کے [illegible] آغا حشر کاشمیری کے مزار پر فاتحہ دلوانا۔ مزار میں آغا صاحب کو مخاطب کر کے ناقدریٔ عالم کی شکایت کرنا۔ پہلے تو فرطِ احترام سے آغا صاحب کے مزار پر گھٹنے ٹیک دینا۔ پھر مراقبہ میں چلا جانا۔ دو گھنٹے تک مراقبے میں رہنا۔ کچھ یاد آتے ہی یکایک کان چھوڑ کر گوشہ [illegible] پھر اپنے اونٹ پر سوار ہو کر سرپٹ صحرا کی طرف بھاگ جانا۔ آخر ایک گندی جگہ آکر رک جانا اور یہ شعر پڑھنا ؎

کس نے پھینکا سبو کو زرا کرٹ
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

شاد امرتسری (لاہور)

لاہور اور پشاور ریڈیو سے اپنے کلام کی بجائے دوسرے شعراء کا کلام براڈکاسٹ کروا کر کسرِ نفسی کرنا۔ اپنا کلام نہ سنا کر سننے والوں کی دعائیں لینا۔

شاد عظیم آبادی۔ شاد عارفی۔ نریش کمار شاد۔ مہاراجہ کشن پرشاد شاد اور شاد امرتسری کے نام لے لے کر دوسرے شاعروں کو تلقین کرنا کہ وہ بھی اپنا تخلص شاد رکھ کر قوم کے دل شاد کریں۔

شاد کے آگے "ی" بڑھا کر ملک کی آبادی میں اضافہ کرنے کی کوشش کرنا۔

اپنی کامیابی کے لئے نیازیں دلوانا۔ نیاز دینے سے پہلے کہنا: نیاز دیتا ہوں میں واسطے نیاز فتح پوری کے۔ منہ میرا فتح پور بدمعاش کی طرف۔

میری نظموں کی تعریف کرنا۔ میری طرف سے بھیجے ہوئے شکریے کے تاروں کو پھاڑ پھاڑ کر پھینکنا اور کہنا ؎

تا مرد سخن نگفتہ باشد
عیب و ہنرش نہفتہ باشد

...حسن مرحوم (لاہور)

...پال نکال نکال کر اپنے پیچھے نیرنگ خیال کی نسوں میں داخل کرنا۔ اب
...میں اپنا شعر حرف کرنے کی پوری پوری کوشش کرنا۔
...ایڈیٹر بننا۔ ایڈیٹر ہو لانا۔ ایڈیٹر شک بہ در کرنا۔ ایڈیٹر واپس بلانا۔
...ہومیو پیتھک اور یونانی طب میں معالجت کرانا۔ طرح طرح سکے تیار کرنا۔
اپنے سینے کی انگوٹھی آگ میں پھینکنے کے بعد گھبرا کر اُسے چھٹے جلدی سے
...اور یہ مصرعہ پڑھنا

تو اگر گشتہ شدی آہ چہ می کردم من

...عبد المتین (لاہور)

معرفت کی باتیں کرنا۔ عشق حقیقی کی تعلیم دے کر دنیا والوں کو دنیا سے بیزار کرنا۔
...انھیں عشق حقیقی کے خلاف لیکچر دے کر عشق مجازی کی طرف گھسیٹ لانا۔ قہقہے لگانا۔
بچوں کو پڑھانا۔ پڑھاتے پڑھاتے آرٹ کی دنیا میں چلے جانا۔ واپس آنے پر
...روم کو خالی پانا۔ چپراسی سے پوچھنا "بچے کہاں گئے؟" چپراسی کا کہنا "وہ تو جوان
...۔ اُن کی شادیاں بھی ہو گئیں۔ اب وہ خود پروفیسر ہو گئے ہیں۔" حیران ہو کر
...یوں کو پڑھانے کی کوشش کرنا۔ چپراسیوں کا چیخیں مار کر بھاگ جانا۔
آرٹ کی دنیا میں واپس چلے جانا۔ دس برس کے بعد واپس آکر پوچھنا میں کہاں
...؟" لوگوں کا اطلاع دینا کہ "یہ ایمپلائمنٹ ایکسچینج کا دفتر ہے۔" یہ سنتے ہی "انا الحق" کا
...لگا کر سڑک پر واپس بھاگ آنا۔
چڑیا گھروں کو پاگل خانے اور پاگل خانوں کو چڑیا گھر کہنا۔ آسمان کو رباعیات
...نا۔ گنتوں سے مختلف مصرعوں پر گرہیں لگوانا۔
ایک سانس میں ہزاروں باتیں کہہ جانے کے بعد ایک سال کے لئے بالکل خاموش
...بانا۔ کسی اونچے درخت کی ٹہنی پر آنکھیں بند کر کے بیٹھ جانا اور کہنا ؎

ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا
بلبل ہے کوئی اُداس بیٹھا
آنکھوں سے ٹپک رہے ہیں آنسو
اور کہتا ہے ہائے میں کروں کیا

...ختار صدیقی (لاہور)

سارنگی بجانا۔ تان پورے بیچنا۔ مور پنکھیوں کی مرمت کرنا۔ پائلیں پہن کر سارے

شہر میں گھومنا ناچنا اور ساتھ ساتھ یہ مصرعہ گانا ؎

پگ گھنگھرو باندھ میرا ناچی

سات سُر کھلنا، پیار شروع گنگنانا، اوڑھنا بچھانا اور محسوس کرنا۔ ...
نانوے مرتبہ "یا موسیقار" کا ورد کرنا۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ؎

۱۔ پنگھٹ پہ مُرلیا چھوڑ گیو شیام
۲۔ پائلیں بجتی ہیں گیند کی صدا آتی ہے
۳۔ تنا نا نا۔ ری دری ری ری

یوسف ظفر (لاہور)

قد چھوٹا کرنے کی دوائیں کھانا۔ چاکلیٹ کھانا۔ جیبوں میں کھلونے رکھ کر باہر
پھرنا۔ نپلز خریدنا اور چوسنا۔ ننھی ننھی نظمیں لکھنا۔ گلیورز ٹیلز پڑھنا۔
حسن میں اپنا مقابلہ حضرت یوسف سے اور بزدلی میں اپنا موازنہ بہادر شاہ ظفر
سے کرنا۔ حسینوں کا ذکر کرتے ہوئے دوستوں سے کہنا۔

میں کسی کی آنکھ کا نور ہوں۔ میں کسی کے دل کا قرار ہوں
نہ یہ جل کے مجھ سے کہا کرو کہ میں ایک مشت غبار ہوں

لارنس گارڈن (لاہور) میں دراز قد حسینوں کو مخاطب کر کر کے کہنا ؎

ظفر سے بچ کے جاؤ گی کہاں تم؟
تمھیں سیڑھی لگا کر چوم لوں گا

ثناء اللہ ایڈیٹر نیا دور (کراچی)

ہر ماہ اپنا نام بدل ڈالنا (آجکل اُن کا اسم گرامی انوار احمد ہے)۔ "نیا دور" نکالنے
کے بعد چھ ماہ کے لئے بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لینا۔ اُٹھتے ہی جلدی سے "نیا دور" کا اگلا
شمارہ مرتب کرنا۔ اُسے پوسٹ کر کے پھر چھ ماہ کے لئے سو جانا۔ غیر ملکی دوستوں اور مضمون نگاروں
سے پردہ کرنا، شرمانا، تصویر نہ بھیجنا۔ مندرجہ ذیل مصرعے گنگنانا ؎

قوم کے غم میں نیند اڑائی ہے
چھ مہینے کی نیند سوتا ہوں
قوم کے غم میں اُٹھ کے روتا ہوں

فارغ بخاری

وجہ تسمیہ — بچپن میں نام ڈاکو خاں تھا۔ بچہ ہر وقت بخار میں مبتلا رہتا تھا۔
ایک دن کسی فقیر نے اُن کے در پر دستک دی۔ فقیر کو بریانی اور زردہ کھلا کر خوش کیا گیا تو

[illegible] کہا ہے؟

[illegible] ابا کا لباس دہ

[illegible]

فقیر بات سن کر اندر گیا۔ بچے کی پیشانی پر ... ایک گنڈا باندھ کر ... تو فقیر نے کہا: اب بچے کے بدن پر ... سب ... کے جسم پر ... بخار آ چکا تھا۔

فقیر ایک ... کر چلا گیا اور جاتے جاتے کہہ گیا کہ اب اس بچے کا نام فارغ بخاری ... رکھ دو۔ آئندہ جب کبھی اسے بخار آئے گا، تیسرے دن خود بخود اتر جائے گا۔ چنانچہ بچے کا نام فارغ بخاری رکھ دیا گیا۔

بچپن کے مشغلے ——

بخار میں مبتلا ہونا۔ تیسرے دن فارغ ہو جانا۔ وزیر آغا صاحب سے سستے داموں پریس خرید کر مہنگے داموں بیچنا۔ پشاور کے قابلِ اعتراض بازاروں میں تہمد باندھ کر اور کانوں میں عطر کی پھریریاں رکھ کر وزیر آغا صاحب کے ساتھ گھومنا اور بینگ بیچنے والوں کے ساتھ شور مچا کر گھومنا اور بستر پر تڑپ تڑپ کر پہلو بدل بدل کر گریبان پھاڑ پھاڑ کر شعر پڑھنا۔

گئے دکھوں بخار آکر بخاری
بخارِ عاشقی جاتا نہیں ہے

مضمون نگار حضرات

سے درخواست ہے کہ وہ بیسویں صدی کے لئے مضامین لکھتے وقت ہمیشہ اختصار سے کام لیا کریں کیونکہ بغرضِ اشاعت وصول ہونے والے مضامین میں سے مختصر افسانوں کو طویل افسانوں پر ترجیح دی جاتی ہے۔ اور طویل افسانے مضمون نگاروں کو واپس کر دیئے جاتے ہیں۔ غیر مطبوعہ مضامین کی واپسی کے لئے مضمون کے ساتھ ٹکٹ بھیجنے کی بجائے اپنا پورا پتہ لکھا ہوا پوسٹ آفس کا لفافہ بھیجیں۔ ورنہ ہم مضمون کی واپسی سے قاصر رہیں گے۔ مطلع کرنا ہے کہ لفظ غیر مطبوعہ ضرور لکھیے۔

SUNLIGHT
نئے فارمولے والے
سنلائٹ
سے آپکے کپڑے چمک اُٹھتے ہیں!

تحفہ

واسودیو۔ ایم اے

۲۶۔ برانڈول روڈ، ویسٹ ڈریٹن، میڈل سیکس (انگلینڈ)

۱۰ اکتوبر ۱۹۶۴ء

مکرمی خوشتر صاحب آداب

ایک مدت کے بعد اپنے وطن سے پانچ ہزار میل کی دُوری سے "بیسویں صدی" کے لئے ایک افسانہ "تحفہ" ارسال کر رہا ہوں۔ اُمید ہے آپ کو اور قارئین "بیسویں صدی" کو پسند آئے گا ——— "بیسویں صدی" آپ کی عنایت سے باقاعدگی سے پہنچ رہا ہے اور اسے پا کر ایسا محسوس کرتا ہوں جیسے ہر ماہ اپنے وطنِ عزیز پہنچ جاتا ہوں ——— "تحفہ" کے بارے میں آپ کی اور قارئین "بیسویں صدی" کی رائے کا منتظر ہوں...

نیازمند ——— واسودیو

سُدھا نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ وہ بہت آرام سے بے فکری کی نیند سو رہا تھا۔
لیکن جب سے سُدھا نے سیڑھیوں میں وہ منظر دیکھا تھا، اُس کی آنکھوں کی نیند غائب ہو گئی تھی۔ اُسے اپنی دُنیا میں اندھیرا اُبھرتا ہوا دکھائی دے رہا تھا، اپنی جیون نیا بھنور میں گھِرتی دکھائی دے رہی تھی۔ یہ سب سوچ سوچ کر اُس کا دماغ بالکل ماؤف ہو گیا تھا۔ عورت کی دُنیا اُس کا شوہر ہی تو ہوتا ہے۔ وہ اُسی کے سہارے ہنستی، ناچتی، گاتی، اُچھلتی اور کودتی پھرتی ہے۔ جب وہی اُسے دغا دے جائے تو پھر عورت کا جینا کیسا؟ شوہر اگر ہنس کر بات کرے تو عورت کے لئے دُنیا روشن ورنہ ایک بھیانک کالی رات!

کچھ دیر پہلے سُدھا نے دیکھا تھا یہی اندھیرا اُس کے گھر سنسار کو نگل رہا تھا۔ وہ بازار گئی تھی۔ گھر پہنچتے پہنچتے اُسے بہت دیر ہو گئی۔ شام گہری ہو گئی تھی۔ اِس لئے وہ تیز تیز قدم بڑھاتی چلی رہی تھی۔ اُسے ڈر تھا کہ اُس کا شوہر ججّے دفتر سے لَوٹ آیا ہو گا اور اُسے گھر نہ پا کر پریشان ہو گا۔ ویسے وہ مسز سرلا سے کہہ تو آئی تھی۔ تالے کی ایک کُنجی ججّے کے پاس بھی تھی اِس لئے گھر کا دروازہ کھولنے میں ججّے کو کوئی تکلیف نہ ہو گی۔ پھر بھی وہ اُسے نہ پا کر پریشان تو ہو گا ہی۔ کتنا پیار کرتا ہے وہ اُسے۔ اُسے نہ پا کر وہ پریشان ہو جاتا ہے۔

اِسی طرح ایک دن جب وہ شاپنگ سے گھر دیر میں پہنچی تھی تو ججّے کو پریشان اور اُداس دیکھ کر اُس نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

"ججّے تم میرے ذرا سا لیٹ آنے پر اتنے بے چین کیوں ہو جاتے ہو؟"

"بازاروں میں، سڑکوں پر لوگوں کی بھیڑ بھاڑ اور موٹر گاڑیوں کا تانتا لگا رہتا ہے۔ اُس افراتفری میں میری بُلبل کہیں کھو گئی تو میں کہیں کا نہ رہوں گا۔ یہ سوچ کر میں اُداس ہو جاتا ہوں۔"

"ہماری شادی کو چار ہی سال تو ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے بھی میں اِسی شہر میں رہتی آئی ہوں۔"

"اُس وقت تم بہت محفوظ تھیں۔"

"وہ کیسے؟"

"اُس وقت تم میرے سپنوں میں جو قید تھیں۔"

ججّے کی یہ بات سُن کر سُدھا کا رُواں رُواں کھِل اُٹھا تھا۔ یہ سوچتی ہوئی وہ جلدی جلدی قدم بڑھا رہی تھی۔ اپنے فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ کسی کو باتیں کرتے ہوئے سُن کر ٹھٹک گئی۔ اُسے سُنائی دیا۔

"پکڑ لیا نا! اب تو اب کیسے بھاگو گی؟ نہ جانے کب سے مجھے دُور دُور سے ترسا رہی ہو۔ بڑی ظالم ہو!"

یہ آواز سُن کر سُدھا کانپ گئی۔ یہ تو ججّے ہے!! وہ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔ اندھیرے میں اُسے ججّے کی پرچھائیں سی دکھائی دی۔ وہ کسی کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔

"کیا کرتے ہو، کوئی آجائے گا؟"

اس آواز کو سن کر سدھا چونک اٹھی۔ یہ تو مسز سریواستوا کی نوجوان لڑکی ریتا ہے!

"کوئی نہیں آئے گا ریتو! تمھاری ممی اور بھابی کھانا بنا رہی ہیں۔"

"اور سدھا؟" ریتا جے کے نزدیک ہوتے ہوئے بولی۔

"بازار شاپنگ کے لئے گئی ہے۔ آج تو ان پنکھڑیوں کو چھو لینے دو۔" جے کی آواز سدھا کو سنائی دی۔

اس سے پہلے کہ وہ اور قریب آتے ریتا ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گئی اور جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ یہ دیکھ کر سدھا بھی ایک کونے میں دبک گئی۔

جے نے ادھر ادھر دیکھا اور بھاگتی ہوئی ریتا سے ہنس کر کہنے لگا۔

"کوئی نہیں تھا۔ وہ تو بلی تھی۔ بس یونہی ڈر گئی!"

لیکن ریتا نے مڑ کر نہ دیکھا اور بھاگ کر اپنے گھر میں گھس گئی۔ دروازہ زور سے بند ہونے کی آواز سدھا کو بھی سنائی دی۔ کچھ دیر تک جے وہیں کھڑا رہا اور جب سیٹی بجاتا ہوا سیڑھیوں سے نیچے اترا تو سدھا کونے سے نکلی۔

"کون؟ سدھا؟" جے نے پوچھا۔

"ہاں" سدھا نے جذبات پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے بہت جلد آنے کی کوشش کی لیکن دیر ہو ہی گئی۔" سدھا نے جے کے نزدیک آتے ہوئے کہا۔

جے نے اندھیرے ہی میں سدھا کے ہاتھوں کے بنڈل کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"میں تو پریشان ہو گیا تھا کہ اتنی دیر تمھیں کیوں ہو گئی؟"

"مجھے ڈھونڈنے چلے تھے شاید!"

"ہاں۔ اندھیرا چھا رہا تھا نا!"

وہ اس طرح باتیں کرتے ہوئے اوپر آگئے۔ سدھا ہی نے دروازہ کھولا۔ بجلی روشن کرتے ہوئے بولی۔

"پھر تو میں وقت ہی پر آگئی ہوں نا۔ زیادہ اندھیرا تو نہیں ہوا؟"

سدھا کے طنز کو جے نہ سمجھ سکا۔

لیکن کسی بھی انداز سے سدھا نے جے پر یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ اس نے ریتا اور اس کی رومان بھری باتیں سن لی ہیں۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ وہ حسب معمول اپنا کام کرتی رہی۔ لیکن اس کا دل رو رہا تھا۔ اس کے دل سے ہوک اٹھتی تھی لیکن وہ اسے دبا دیتی۔

سدھا اب اپنے پلنگ پر پڑی تھی۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اسے اپنے چاروں طرف بھیانک اندھیرے کے سوا کچھ نہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ کیا کرے؟ اس نے اپنے دل سے پوچھا۔ اگر مسز سریواستوا سے کہا تو وہ کبھی یہ ماننے کے لئے تیار نہ ہوں گی کہ اس کی چھوٹی موٹی اور شرم و حیا کی پتلی لڑکی ریتا ایسے عمل کیا سکتی ہے! وہ اپنی لڑکی کی شرافت اور پاکیزگی کے لئے وہ بڑی سے بڑی قسم کھانے کے لئے تیار ہو جائے گی۔

اگر وہ جے سے کچھ باز پرس کرتی ہے تو گھر میں لڑائی جھگڑے کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ جے کب کہتا ہے کہ اس نے چوری کی ہے۔ چاہے وہ رنگے ہاتھوں ہی کیوں نہ پکڑا جائے۔ پھر سے کیسے اپنا قصور مان لے گا۔ اس سے فائدہ کے بجائے تلخی اور رنجش ہی بڑھے گی۔ ریتا کا کچھ نہ بگڑے گا۔ جے کچھ پروا نہ کرے گا۔ بس اس کی اپنی ہی زندگی زہر بن جائے گی۔

ایسے ہی خیالات میں ساری رات گزر گئی۔

صبح اٹھ کر بھی سدھا اپنے دل کی بات زبان پر نہ لائی۔ دفتر جاتے ہوئے جے نے سدھا سے کہا: "سدھا آج میں تم میں ایک بہت بڑی تبدیلی دیکھ رہا ہوں۔"

جے کی بات سن کر سدھا کانپ گئی۔ وہ سوچنے لگی کیا اس کے من کا چور جے نے پکڑ لیا ہے؟

"جانتی ہو آج میرا جنم دن تھا۔ شادی کے بعد تم میرے ہر جنم دن پر صبح اٹھ کر سب سے پہلے ہیپی برتھ ڈے کہا کرتی تھیں۔ آج یہ بات تم بھول گئی ہو۔ کہیں شام کا پروگرام نہ بھول جانا۔ شام کی دعوت بہت مزیدار ہو۔"

جے نے اس کے ریشمیں بالوں سے کھیلتے ہوئے کہا۔

سدھا نے جے کی بات سن کر اطمینان کی سانس لی۔

"اوہ! یہ تو واقعی بہت بڑی بھول ہوئی۔ اس کی تو مجھے بہت بڑی سزا ملنی چاہیے۔ بطور جرمانہ آج شام کو دعوت کے ساتھ ساتھ میں آپ کو ایک شاندار تحفہ بھی دوں گی۔" سدھا نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"سچ! کاش شام ابھی آجائے!!" جے نے سدھا کے گالوں پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے ہنس کر کہا۔

"انتظار کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ انتظار کیجئے شام کا۔"

سدھا کی بات سن کر جے کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

شام کو جے گھر لوٹا تو اس نے دیکھا ریتا بھی سدھا کے ساتھ کام میں مشغول ہے۔ وہ اسے دیکھ کر حیران ہوا۔ شوہر کی حیرانگی کو بھانپ کر سدھا نے کہا۔

"آج آپ کا برتھ ڈے ہے نا؟ اس لئے بہت سے پکوان بنائے ہیں۔ مدد کے لئے ریتا کو بلا لیا تھا۔"

"کیا سارے شہر کو دعوت پر بلا رہی ہو؟" گھر کی سجاوٹ کو دیکھ کر جے بولا۔

"خیال تو یہی تھا۔ مسٹر اور مسز کپور کا آج سینما دیکھنے کا پروگرام تھا۔ چڈھا صاحب اور ان کی دھرم پتنی ایک رشتے دار کی شادی میں گئے ہوئے ہیں۔ مسز سریواستوا کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ اس لئے ہماری خوشی میں صرف بے چاری ریتا ہی شریک ہو رہی ہے۔"

گھر میں دھلی
سرف
سے دھلی
Surf
POWDER

افسانہ

تنہا تنہا

______ ایم کوٹھیاوی راہی

تاشی پور خورد۔ گورکھپور (یوپی)

۲۶ اکتوبر ۶۳ء　　　　برادرِ محترم خورشید صاحب آداب

... پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہوں۔ آپ کی خاموشی کتنی پیاری ہے۔ زیادہ سے زیادہ مشق اور محنت کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ دیکھئے یہ کہانی لایا ہوں "تنہا تنہا" ______ یہ ایک رومانی کہانی ہے جس میں متوسط طبقے کے ایک فرد کا نفسیاتی تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کہیں بے ساختہ ہنسی آتی ہے اور کہیں آنسو ______ اِس میں جذبات کا دھیما پن ہے۔ کسک ہے۔ دبی دبی چنگاریاں ہیں...

آپ کا بھائی ______ ایم کوٹھیاوی راہی

"ایک خوبصورت، خوب سیرت اور پڑھی لکھی لڑکی کے لئے رشتہ درکار ہے جس کی عمر اٹھارہ بیس سال کے لگ بھگ ہے۔ لڑکا خوبصورت، خوب سیرت اور پڑھا لکھا ہو۔ عمر پچیس چھبیس سال سے زیادہ نہ ہو۔ کام کرتا ہو یا نہ کرتا ہو۔ شادی کے بعد مستقل طور پر لڑکی والوں ہی کے گھر رہنا ہوگا۔ لڑکی والے متمول ہیں۔ سید ہیں۔ لڑکے کا بھی سید ہونا ضروری ہے۔"

میں یہ اشتہار کیل میں شیروانی ٹانگتے اور اُتارتے وقت روز ہی دیکھتا۔ میرے کمرے کی دیوار پرانی تھی جس کا پلستر جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا تھا۔ جب سے میں نے یہ کمرہ کرائے پر لیا تھا یہ ردی اخبار اور لوہے کی ایک کالی سی کیل دیوار پر لگی تھی تاکہ شکستہ پلستر میں سے جھانکتی اینٹیں جالے تھرے کپڑوں کا ستیاناس نہ کریں۔ شاید میری طرح پہلا کرایہ دار بھی نفاست پسند تھا۔ جب بھی تنہائی حد سے زیادہ پریشان کرتی تو میں اپنے دل کو اسی اشتہار میں گم کر دیتا۔ مسکراتا، ٹھنڈی آہیں بھرتا اور پھر جب یہ حسین طلسم ٹوٹتا تو میں خود کو صلواتیں سنانے لگتا۔

میں اُس دن شام کا دھندلکا گہرا ہوتے ہی کمرے میں چلا آیا اور شیروانی ٹانگ کر جونہی بستر پر دراز ہوا "وہ" اچانک اشتہار سے باہر نکل آئی اور زیرِ لب مسکرانے لگی۔ میں نے کہا جاؤ چائے لاؤ۔ وہ اُٹھی اور ایک کپ گرم گرم چائے بنا لائی۔ چسکی لیتے ہوئے میں نے پوچھا "کہو میری جان! دن کیسا گزرا؟"

وہ بولی۔

"آپ کی یاد میں؟"

اور پھر اُس نے شوخی سے پوچھا۔

"کیا آپ دفتر جانا بند نہیں کر سکتے؟"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

وہ مسکرانے لگی اور بولی۔

"میرے گھر کوئی کام دھام نہیں ہے۔ ملازمت کو لات مارئیے اور چلئے..."

میں ملازمت کو لات مار کر تیار ہو گیا اور یہ چھوٹا سا بوسیدہ کمرہ چھوڑ کر ایک شاندار حویلی میں آ گیا جہاں بہت سے نوکر چاکر تھے۔ ہر طرح کا عیش و آرام تھا۔ نہ کوئی کام نہ کاج۔ بس بیٹھے رہو۔ جی چاہے تو بندوق اُٹھاؤ اور شکار کھیلنے چل دو۔

ایک دن شیر کے شکار کی سوجھی۔ میں نے بندوق اُٹھائی اور دو نوکر ساتھ لے کر جنگل کی راہ لی۔ چلتے چلتے شام ہو گئی۔ لیکن شیر کیا کہیں گیدڑ تک نظر نہ آیا۔ ایک مچان بھی بنوایا گیا تھا اسی جنگل میں۔ رات کو مچان پر بیٹھا نیچے بندھے بھینسے کو دیکھتا رہا وہ کرنارہ جلاتا تو وہ جگالی کرتا نظر آتا۔ برسات کی رات تھی۔ جھینگروں اور مینڈکوں کی بے ہنگم آوازوں کے ساتھ کبھی کبھی کسی خوفناک درندے کی گرج بھی سنائی دے جاتی۔ سنتے سنتے جمائی آنے لگتی۔ دونوں نوکر مچان ہی پر میرے ساتھ بیٹھے تھے اور بیڑی پی رہے تھے۔ یکایک میں نے دیکھا تاریکی میں دو سرخ سی بتیاں چمک رہی ہیں۔

دونوں ٹوکر پڑا اُٹھے۔

"حضور! شیر آ رہا ہے۔"

میں سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ بندوق چھاتی سے لگا کر نشانہ درست کرنے لگا۔ وہ دو [illegible] آنکھیں تھیں۔ آنکھوں کے درمیان اندھیرا تھا۔ میں اسی اندھیرے پر نشانہ لگائے ہوئے تھا۔ اور جب شیر گرجتا ہوا سینے پر جھپٹا تو میں نے دھائیں سے فائر کر دیا۔ اور پھر ایک فائر اور۔ دوسرا فائر ایسا تھا کہ میں دھڑام سے چارپائی کے نیچے آ گیا۔ منہ کے بل! رات ابھی باقی تھی اور خواب ادھورا ـــــ میں لیمپ بجھانا بھول گیا تھا۔ اس کی زرد روشنی میں مجھے وہ اشتہار نظر آیا۔ شیروانی کے دامن کے پاس یہ عبارت صاف چمک رہی تھی: "ایک خوب صورت، خوب سیرت اور پڑھی لکھی لڑکی کے لئے رشتہ درکار ہے۔۔۔"

مجھے ایسے خواب عموماً مہینے کی بیس سے اکتیس تک برابر دکھائی دیتے۔ خوبصورت خواب! جن کی تعبیر نہایت گھناؤنی اور مزاج کو تلخ بنا دینے والی ہوتی، چارپائی کبھی مچان بن جاتی کبھی پل۔ کبھی کوئی اونچی عمارت جس پر سے میں اکثر بے تحاشہ گرتا۔

ایک دن سرِ شام ہی کمرے میں چلا آیا تھا۔ تنخواہ مل گئی تھی۔ جیب کی بیوگی دور ہو چکی تھی۔ جس دن ایسا ہوتا میں زیادہ تر آدھی رات کے بعد ہی کمرے میں قدم رکھتا۔ لیکن اس دن اس لئے خلافِ معمول سرِ شام ہی آنا پڑا کہ وہ میکے جانے والی تھی اور پہنچانا مجھی کو تھا۔

"تمہارے ابا کو تو اپنی دولت پر بڑا ناز تھا۔ اب ذرا پوچھو اُن سے کیا حال ہے؟"

"دیکھئے جناب! بار بار میرے ابا کو نہ کوسا کیجئے۔"

"کوسوں گا اور ضرور کوسوں گا!"

"دیکھئے اچھا نہ ہوگا!"

"کیا کرو گی؟"

"زہر کھا لوں گی!"

"اللہ کرے کھا لو۔۔۔"

"ہائے اللہ! میری قسمت پھوٹ گئی۔ کس سے پالا پڑا۔ میں کیا کروں؟"

"روؤ، اتنا روؤ، اتنا روؤ کہ گاڑی کا وقت نکل جائے۔"

"وہ تو میں جانتی ہی تھی کہ یہ رنگ بدل بدل کر باتیں کیوں ہو رہی ہیں۔ دیکھئے جناب ایمان سے کہتی ہوں۔ رو دیئے گا ہاتھ پر ہاتھ دھر کے۔ نہیں ملے گی کوئی دوسری مجھ جیسی!"

"خدا نہ کرے اب ملے کوئی تم جیسی!"

"آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟"

"یہی کہ ـــــ بند کرو یہ بکواس ـــــ ترک کرو خیال میکے جانے کا۔

پہلے میں تمہارے گھر والوں سے ڈرتا تھا۔ لیکن جب سے تم کو [illegible] ہوئی ہے سارا ڈر دل سے نکل چکا ہے۔ اب میں آزاد ہوں۔"

"شادی کیوں کی جب ایسا ہی تھا؟"

"کس نے کی تھی شادی تم سے ـــــ محترمہ! [illegible] نہیں کی تھی شادی میں نے۔ محض ایک فریب ـــــ اشتہار میں [illegible] مستقل طور پر لڑکی ہی والوں کے گھر رہنا ہوگا۔ بے کار ہو چاہے [illegible] ـــــ شادی کی تھی تم سے کہ بے عمر بھر بیکار رہ کر کسی دنیا اور [illegible] میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں تم سے کہ میں نے شادی کی تھی تمہارے ابا کی حویلی میں ٹھاٹ سے رہنے کے لئے۔ مجھے کیا خبر تھی کہ سر منڈاتے ہی اولے پڑیں گے۔ [illegible] کر کے تمہارے ابا جنت میں محل تعمیر کرانے کی تیاریاں شروع کر دیں گے۔ مجھے اور تمہیں دنیا بھر کی مصیبتوں میں گرفتار کر کے خود حج کرنے چلے جائیں گے اور پھر واپس [illegible] اور بوسیدہ مکان میں رہنے لگیں گے۔ اور۔۔۔"

"بس بس۔۔۔ کیا تم نہیں جانتے ہر کمال را زوال۔۔۔"

"رہنے دو یہ نصیحت۔ میں کچھ نہیں سنوں گا۔ آج تنخواہ کے جو ملے [illegible] ملے ہیں ان کے خرچ کا حساب سنو۔"

لیکن اس نے کچھ نہیں سنا۔ رونے لگی۔ مجھے مجبوراً خاموش ہو جانا پڑا۔ اس کو منانے میں لگ جانا پڑا۔ اور جب وہ من گئی تو لے کر اسٹیشن جانا پڑا۔ اور ٹکٹ کٹا کر تیسرے درجے کے ایک ڈبے میں سوار ہو جانا پڑا۔

ٹرین جب فراٹے بھرنے لگی تو میرے دل نے دعا مانگی۔ اللہ کرے کوئی حادثہ ہو جائے۔ یہ ٹرین کسی پہاڑ سے ٹکرا جائے۔۔۔ میں عاجز آ چکا تھا اس زندگی سے۔ اس غم کی ہری بھری زندگی سے۔ دعا قبول ہو گئی۔ اور گاڑی لڑ گئی اور لڑتے ہی میں دھم سے نیچے آ گرا۔ منہ کے بل زمین پر ـــــ کمرے میں اسی طرح سناٹا تھا۔ رات ابھی باقی تھی۔ میں لیمپ بجھانا بھول گیا تھا۔ بجھانے سے پہلے نظر اٹھ گئی۔ دیوار پر وہی [illegible] کا اشتہار منہ چڑاتا نظر آیا۔ تنخواہ کے سارے روپے تکیے کے نیچے محفوظ تھے۔

اور ایک دن اس سلسلہ میں ایک عجیب سا خواب دیکھا جو بیان نہیں کر سکتا۔ آنکھ کھلتے ہی جی میں آئی کہ اس کم بخت اشتہار کو پھاڑ دوں۔ پھاڑنے کے لئے لپکا بھی۔ لیکن جیسے مجھے کسی نے روک دیا ہو۔ نہ پھاڑ سکا۔ اتوار کا دن تھا۔ [illegible] تھی۔ دسمبر کا مہینہ تھا۔ جیب خالی تھی۔ گھر سے چھوٹے بھائی انیس اور حمیدہ آپا کے کئی خط آ چکے تھے کہ جلد آؤ۔ اماں بلاتی ہیں۔ ایک بہت ضروری کام ہے۔ میں خوب سمجھتا تھا۔ مجھے پھنسانے کی تیاریاں ہوں گی۔ پہلے بھی اس قسم کی تیاریاں ہوتی تھیں۔ کئی بار سے

ہمارے ماہر دستکار

ہزاروں برسوں سے
نسل بعد نسل،
ہمارے دستکار حیاتِ عزیز کو
اپنے فن کے لئے وقف کرتے آئے ہیں۔
اسی کے صدقے انہوں نے اپنے روایتی ہنر میں
بے مثال مہارت پائی ہے۔ اُن کی ہر تخلیق
حسین، جمیل، جاں نواز ہوتی ہے
دُنیا میں اُن کی مثال کم کم ملتی ہے
اُن کی صناع اُنگلیوں سے تخلیق کی وہ فیرمئی شعاعیں
پھوٹتی ہیں کہ ہر شے کو شاہکار بنا دیتی ہیں
دستکاری کے قدیم فن کو مزید سنوارنے،
اشیاء کی افادیت بڑھانے اور اُن کی
خوبصورتی میں چار چاند لگانے کے لئے
ہر روز ایک نیا ڈیزائن
ہر روز ایک نئی تکنیک۔

ہمارے جمالیاتی ذوق کو جلا دینے اور ثقافتی ورثے کو بھرپور بنانے کے
سلسلے میں انجام دی گئی خدمات کے پیشِ نظر ملک میں پہلی بار ممتاز
دستکاروں کو قومی انعام دیئے جا رہے ہیں۔

آل انڈیا ہینڈی کرافٹس بورڈ

DA 64/360

ڈاکٹر مس تنویر حیا کیم اے سری لنکا
(نذرِ میر)

کبھی دل پر سے چھا جاتے ہے گردِ ملال
اس نگر میں چاندنی برسائے ہے تیرا خیال
ملک کی نفرت سے اس طرح بھاگوں ہوں میں
شہر کی وحشت سرا سے جس طرح بھاگے غزال
...س سینے میں یک تلوار سے چل جائے ہے
اب تو فرقت میں ہوا ہے سانس بھی لینا محال
...پھڑ پھڑ کر گریباں مائلِ فریاد ہے
آج اُس بت پر بھی کھل جائے گا دیوانے کا حال
آج طبع حاضر ہے کچھ عشرت تفنن کے لئے
تیر کے انداز میں دو چار مصرعے [illegible]

امر چند قیس جالندھری

ہر نظر میں اگرچہ عیاں بھی نہیں
لاکھ پردوں میں وہ نہاں بھی نہیں
مے کدے میں بھی جا کے دیکھ لیا
چارۂ رنج و غم وہاں بھی نہیں
جلوۂ حسن گو نہیں ارزاں
جان کے مول کچھ گراں بھی نہیں
لامکاں میں بھی ڈھونڈ آئے ہم
کیا خبر تھی کہ تو وہاں بھی نہیں
مہرباں تو نہ تھا وہ پہلے بھی!
اب وہ اے قیس! بدگماں بھی نہیں

افق سبزواری

کل سرِ بزم کہا شمع نے پروانے سے
زیست ملتی ہے تپ عشق میں جل جانے سے
کھل نہ جائے کہیں پیچ و خمِ گیسو کا بھرم
آپ اُلجھے ہی نہیں ہیں کسی دیوانے سے
تھی کبھی گرمیِ ہنگامۂ محفل ہم سے
آج محفل میں ہمیں لگتے ہیں بیگانے سے
جب کسی دل کی طرف آتی ہیں کافر نظریں
حدیں مل جاتی ہیں کعبہ کی صنم خانے سے
اے افق تا بہ صبح مشفق کو کوئی سمجھائے
چھیڑ ہر وقت کی اچھی نہیں دیوانے سے

رشید جعفری

اُن کو غمخوار ہم نہ کر پائے
یعنی اظہارِ غم نہ کر پائے
زندگی کی مصیبتوں سے گریز
زندگی کی قسم نہ کر پائے
بھیک اُن سے ستم کی مانگیں گے
وہ اگر کچھ کرم نہ کر پائے
گو اُنھوں نے کمی ستم میں نہ کی
ہم ہی قدرِ ستم نہ کر پائے
عشق میں ہم نے جان تک دیدی
آپ آنکھیں بھی نم نہ کر پائے

مشہور ترقی پسند شاعر

سردار جعفری سے انٹرویو

زرینہ نگار شاد

۵۔ ایف۔ موتی باغ ۲۔ نئی دہلی

۳۰ دسمبر ۱۹۶۳ء

محترمی خوشتر صاحب!

... سردار جعفری کا نام اردو کے جدید ادب میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس حقیقت سے وہ لوگ بھی انکار نہیں کر سکتے جو جعفری کے نظریات اور اُن کی شاعری کی مقصدیت سے اتفاق نہیں کرتے۔ سالنامہ کے بعض مضامین سے اب تک لطف اندوز ہو رہا ہوں ...

آپ کا ———— زرینہ نگار شاد

شاد۔ کیوں حضرت! یہ سردار جعفری آپ کا نام ہے یا تخلص؟

جعفری۔ علی سردار میرا نام ہے۔ جعفری سیدوں کی ذات ہے یعنی میرے خاندانی نام کا حصہ ہے۔ تخلص کوئی نہیں ہے۔

شاد۔ آپ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

جعفری۔ ۲۹ نومبر ۱۹۱۳ء کو بلرام پور میں۔

شاد۔ تعلیم کہاں کہاں سے اور کہاں تک حاصل کی؟

جعفری۔ بلرام پور، علی گڑھ، دہلی اور لکھنؤ سے۔ ڈگری اگرچہ بی۔ اے کی ہے لیکن پڑھا ایم۔ اے تک ہوں۔ انگریزی لٹریچر میں ایم۔ اے فائنل کا امتحان نہیں دے سکا۔

شاد۔ شاعری کا آغاز کب ہوا۔

جعفری۔ بچپن ہی میں ہو گیا تھا کیونکہ انیس کی وجہ سے گھر میں شاعری کا ماحول تھا۔

شاد۔ کیا میں آپ کا سب سے پہلا شعر سن سکتا ہوں؟

جعفری۔ اب یاد نہیں۔ البتہ یہ ضرور یاد ہے کہ میری شاعری کا آغاز مرثیوں سے ہوا تھا۔ جن کی زبان، تشبیہ، استعارہ اور ترتیب ہر چیز انیس کی ہوتی تھی میرا اپنا کچھ نہیں ہوتا تھا۔

شاد۔ کسی ابتدائی مرثیہ کے کچھ شعر یاد ہوں تو فرمایئے۔

جعفری۔ پہلا مرثیہ جو کہا تھا وہ کچھ اس طرح شروع ہوتا تھا ؎

آتا ہے کون شمع امامت لئے ہوئے
اپنی جلو میں فوج صداقت لئے ہوئے

اللہ رے حُسن فاطمہ کے ماہتاب کا
ذرّوں میں چھپتا پھرتا ہے نُور آفتاب کا

اور آخری دو مصرعے تھے ؎

اکبر کو اپنے پہلوئے غم میں سُلاؤں گی
اصغر کو اپنی گود میں جھولا جھلاؤں گی

شاد۔ آپ نے ابتدائی شاعری پر اصلاح کس سے لی؟

جعفری۔ کسی سے بھی نہیں۔

شاد۔ شروع میں کس کس اردو شاعر سے آپ خاص طور پر متاثر ہوئے؟

جعفری۔ انیس۔ غالب۔ اقبال اور جوش سے۔

شاد۔ آپ کے نزدیک اِس صدی کا بہترین اردو شاعر کون ہے؟

جعفری۔ اقبال۔

شاد۔ آپ کے نزدیک بہترین شعر کی تعریف کیا ہے؟

جعفری۔ طالب علمانہ باتیں کہی جا سکتی ہیں کہ جس میں جذبے کی شدت ہو۔ بندش کی چستی ہو۔ تشبیہہ اور استعارے کا حُسن ہو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ حُسن کی طرح شعر کی بھی تعریف نہیں ہو سکتی۔

شاد۔ آپ کس طرح شعر کہتے ہیں؟

جعفری۔ یہ بتانا ممکن نہیں ہے۔

شاد۔ اپنے ہم عصر شاعروں میں کون کون سے شاعر آپ کو خاص طور پر پسند ہیں؟

جعفری۔ فیض۔ جذبی۔ مخدوم اور ن۔ م۔ راشد۔ لیکن "ماورا" کے بعد کا راشد پسند نہیں ہے۔ اگرچہ اُن کی نئی نظم "ایران میں اجنبی" کے بارے میں پطرس کا کہنا ہے کہ وہ ایشیا کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ لیکن یہ اُن کی ذاتی رائے ہے جس سے میں اتفاق نہیں کرتا۔

شاد۔ انگریزی شاعروں میں آپ کس کس سے متاثر ہوئے؟

جعفری۔ بہت طویل فہرست ہے بہتوں نے متاثر کیا۔ انتخاب بہت مشکل ہے۔

شاد۔ آپ کی زندگی کا کوئی ایسا اہم واقعہ جس نے آپ کی شاعری پر غیر معمولی اثر ڈالا ہو؟

جعفری۔ ایک آدھ نہیں۔ ایسے کئی واقعات ہوں گے لیکن اس وقت کوئی یاد نہیں آ رہا۔

شاد۔ کیا نئی نسل کے اُردو شاعروں میں کوئی قابلِ ذکر شاعر بھی ہے؟

جعفری۔ یہ نئی اور پرانی نسل کا سوال ہی غلط ہے۔ فراق حالانکہ جوش کی نسل سے ہیں لیکن نمائندگی ہماری نسل کی کرتے ہیں۔ اختر الایمان بہت دیر سے شعر کہہ رہے ہیں لیکن انھیں بالکل نئی نسل کا شاعر سمجھا جاتا ہے۔

شاد۔ شاعری کے علاوہ ادب کی دوسری کن کن اصناف سے آپ کو دلچسپی ہے؟

جعفری۔ لکھنے یا پڑھنے کی حد تک۔

شاد۔ دونوں کی حد تک۔

جعفری۔ پڑھنے کی حد تک تو ہر صنفِ ادب سے دلچسپی ہے اور لکھنے کی حد تک شاعری کے علاوہ تنقید اور کہانیاں بھی میں نے لکھی ہیں۔

شاد۔ سیاست سے آپ کب اور کس طرح وابستہ ہوئے؟

جعفری۔ طالب علمی کے زمانہ میں آزادی کی تحریک زوروں پر تھی۔ بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح میں بھی اُس تحریک میں شامل ہوگیا۔ خاص طور پر متاثر کرنے والا جواہر لال نہرو ہے۔

شاد۔ سیاست سے گہری وابستگی نے آپ کے ادب پر کیا اثر ڈالا؟

جعفری۔ کسی حد تک اچھا اثر ڈالا اور کسی حد تک بُرا بھی۔

شاد۔ کس طرح؟

جعفری۔ اچھا اس طرح کہ میں باشعور ادب پیش کر سکا اور بُرا اس طرح کہ اُس میں سیاست کا رنگ ضرورت سے زیادہ گہرا ہوگیا۔

شاد۔ رنگ گہرا ہونے سے آپ کی مراد غالباً خطابت کی فراوانی سے ہے۔

جعفری۔ نہیں۔ خطابت کو میں بُری چیز نہیں سمجھتا۔ آخر قرآن اور انجیل میں بھی تو خطابت ہے۔

شاد۔ تو پھر آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟

جعفری۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ میں نے اپنے آپ کو محدود کر لیا۔ اچھی شاعری کو زندگی کے زیادہ سے زیادہ پہلوؤں پر حاوی ہونا چاہئے۔ اس نقص کا احساس اب شدت سے محسوس کر رہا ہوں۔

شاد۔ آپ کے خیال میں کیا ہر ادیب کو آپ ہی کی طرح کسی سیاسی پارٹی سے مستقل طور پر وابستہ ہو جانا چاہئے۔

جعفری۔ ضروری نہیں۔

شاد۔ ادب اور سیاست کے علاوہ آپ کے کیا مشاغل ہیں؟

جعفری۔ فلموں میں بھی جھک مارتا ہوں لیکن سیاست میرا مشغلہ تو نہیں ہے۔ ہاں سیاست سے واقف ضرور ہوں اور اس سے دلچسپی بھی رکھتا ہوں۔ لیکن یہ میرا مشغلہ نہیں ہے۔

شاد۔ حب الوطنی اور بین الاقوامی اخوت میں آپ کسے ترجیح دیتے ہیں؟

جعفری۔ کسی ایک کو دوسری پر ترجیح دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حب الوطنی فاشزم بھی بن سکتی ہے اور بین الاقوامی اخوت حب الوطنی سے فرار کا باعث بھی ہو سکتی ہے۔ حب الوطنی تو انسانی خون میں ہوتی ہے۔ اُسے کوئی نہیں چھین سکتا۔ یہاں تک کہ وطن کا غدار بھی اُس سے پوری طور پر دامن نہیں چھڑا سکتا اور بین الاقوامی اخوت تربیت یافتہ ذہن کی چیز ہے۔ میرے خیال میں ان دونوں میں توازن ہونا چاہئے۔

شاد۔ کیا شعر و شراب لازم و ملزوم ہیں؟

جعفری۔ نہیں بھائی شعر تو پوری زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔

شاد۔ تو آپ شراب کیوں پیتے ہیں؟

جعفری۔ اچھی لگتی ہے اس لئے اُس کا سرور اچھا لگتا ہے۔ اُس سے لطف حاصل ہوتا ہے۔ صحیح حدود کے اندر پی جائے تو صحت کے لئے بھی مفید ثابت ہوتی ہے۔

شاد۔ آپ کے خیال میں کیا اچھا شاعر اچھا انسان بھی ہوتا ہے؟

جعفری۔ ضروری نہیں۔

شاد۔ کیا ادب ادیب کی شخصیت کا غماز ہوتا ہے؟

جعفری۔ بالکل ہوتا ہے۔

شاد۔ کیا آپ عروض سے واقف ہیں؟

جعفری۔ واقف ضرور ہوں لیکن اتنا نہیں جتنا اساتذہ۔

شاد۔ معاف کیجئے یہ بہت مبہم جواب ہے۔

جعفری۔ سچی بات یہ ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی میں جب میں اُردو کا طالب علم تھا تو مولانا احسن مارہروی میرے اُستاد تھے جنھوں نے باقاعدگی سے مجھے عروض پڑھایا ہے۔

طیب ورقی صدیقی دہلی

[illegible] کتنا بلند شاعر تھا لیکن اس
کے باوجود [illegible] میں ایسی بہت سی چیزیں ہوں گی جو عروض کے اعتبار سے
غلط ہوں گی۔

شاد۔ کیا عروض کا جاننا شاعر کے لئے لازمی ہے؟

جعفری۔ اچھے شاعر عروض سے ضرور واقف ہوتے ہیں۔

شاد۔ جا بجا بہت سے اچھے شاعر عروض سے ناواقف ہیں۔

جعفری۔ مثلاً؟

شاد۔ مثلاً اختر شیرانی۔

جعفری۔ اختر شیرانی اُن بڑے شاعروں کی صف میں نہیں آتے جن میں میر۔ غالب۔ اقبال اور جوش ہیں۔

شاد۔ لیکن جوش صاحب نے بھی مجھے خود بتایا ہے کہ وہ عروض نہیں جانتے۔

جعفری۔ جانتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ اُنھوں نے جھوٹ بولا ہے کہ نہیں جانتے۔ جب روسی حکومت یہ کہتی ہے کہ ہمارا پلان فیل ہو گیا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا ہے کہ سوویت یونین میں قحط پڑ گیا ہے۔ جوش صاحب جب یہ کہیں کہ میں عروض سے واقف نہیں تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ عروض سے ناواقف ہیں۔

شاد۔ بہت خوب! جواب نہیں جعفری صاحب آپ کا بھی۔ اُبدی شکست گواہ چست۔ شاید اسی موقعے کے لئے بولتے ہیں۔ خیر اب یہ بتائیے کہ کیا ہمارا موجودہ ادب بھی جمود کا شکار ہے؟

جعفری۔ جی نہیں جمود کا شکار تو نہیں البتہ حالات کا اثر ضرور پڑ رہا ہے۔ وہ اثر یہ ہے کہ علمی سرمایہ کم ہو رہا ہے۔

شاد۔ اُردو غزل کے مستقبل کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جعفری۔ غزل بطور صنفِ سخن کے باقی رہے گی لیکن رشید احمد صدیقی۔ فراق اور سرور کی اس بات کو مبالغہ پر محمول کرتا ہوں کہ غزل نظم پر حاوی ہے۔ میرے خیال میں اُردو شاعری کی عظمت اور اُس کا مستقبل نظم سے وابستہ ہے۔

شاد۔ غزل کے مستقبل کی بات چھوڑئیے۔ یہ فرمائیے کہ ہندوستان میں اُردو کا مستقبل کیا ہے؟

جعفری۔ اگر یہی صورتِ حال رہی تو اچھا نہیں۔ اور اگر اس میں کوئی خوشگوار تبدیلی پیدا ہو گئی تو پچھلے پندرہ سال میں اُردو نے جو کھویا ہے وہ حاصل ہو جائے گا۔ حالات بظاہر اچھے نظر نہیں آتے۔ قطعی جواب دینا بہت مشکل ہے۔

شاد۔ کیا آپ اس خیال سے متفق ہیں کہ ہندوستان میں اُردو کی بقا کی صرف یہی صورت ہے کہ دیوناگری رسم الخط کو اپنا لیا جائے؟

جعفری۔ پہلے اس سے متفق تھا لیکن اب نہیں ہوں۔

شاد۔ کیوں؟

جعفری۔ رسم الخط سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اُردو زبان کو تعلیم اور ایڈمنسٹریشن سے بے دخل کیا جا رہا ہے۔ ایسا ہونے سے رسم الخط کی تبدیلی کے باوجود اُردو زبان کو نقصان پہنچے گا۔ اُردو زبان خواہ کسی بھی رسم الخط میں ہو اُسی صورت میں زندہ رہ سکتی ہے جب نظم و نسق اور تعلیم میں بھی اُس کا استعمال ہو۔ ویسے اُردو والوں کو دونوں رسم الخطوں سے واقف ہونا چاہئے اور اگر اُردو ادیب ہندی سے اچھی طرح واقف ہو جائیں تو اور بھی اچھا ہے۔ اس سے اُردو بہتر ہو سکے گی۔

شاد۔ اچھا جناب اب ذرا ترقی پسند ادب کی تحریک کے متعلق کچھ فرمائیے۔ یہ تو آپ مانتے ہیں نا کہ ترقی پسند ادب کی تحریک اب ختم ہو چکی ہے۔

جعفری۔ جی ہاں۔ اب پھل آ گیا ہے۔ حالات تبدیل ہو گئے ہیں۔ ترقی پسند ادب کی تحریک اپنا رول ادا کر کے چلی گئی۔ قیامت تک تو کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔

شاد۔ یہ بھی بتانے کی زحمت فرمائیے کہ ترقی پسند ادب کی تحریک نے کیا رول ادا کیا ہے؟

جعفری۔ ادب کو نیا خیال اور نیا مواد بخشا ہے۔ آج اُردو ادب میں جو بڑے نام نظر آتے ہیں وہ اُسی تحریک کی دین ہیں۔ فیض۔ مخدوم اور فراق نے اپنی آواز اُسی تحریک کے زیرِ اثر پہچانی ہے۔ فراق کی غزلوں میں جو عظمت آئی ہے وہ اُسی تحریک کا نتیجہ ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ آج وہ اس کا اعتراف شاید اتنا کھل کر نہ کریں۔

شاد۔ کیا اس تحریک کی موجودہ حالات میں ضرورت نہیں ہے؟

جعفری۔ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں اب حالات بدل چکے ہیں۔ نئے شعور کی آج بھی ضرورت ہے لیکن تحریک کی شکل میں نہیں۔

شاد۔ اس موضوع کو بھی چھوڑئیے۔ یہ بتائیے کہ آپ کے اب تک کے کہے ہوئے کلام میں آپ کو اپنی کون کون سی نظمیں خاص طور پر پسند ہیں۔

جعفری۔ یہ کہنا بہت مشکل ہے۔ ویسے مجھے اپنی نظمیں "میرا سفر" "پتھر کی دیوار" اور "نیند" بہت پسند ہیں۔ اِدھر جو نئی نظمیں کہی ہیں ان میں "پیغمبر مسیحا دشت" اور "قتلِ آفتاب" مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔

شاد۔ کیا موجودہ مشاعرے آپ کے خیال میں اُردو کی ترویج و اشاعت کے لئے سود مند ہیں؟

جعفری۔ مشاعروں کی اس اعتبار سے اہمیت تو ہے کہ لوگوں تک کچھ چیزیں پہنچتی ہیں۔
لیکن سامعین کی زیادہ تر تعداد اُردو سے ناواقف ہے اس لئے مشاعروں
کا علمی اور ادبی معیار گر رہا ہے۔
شاد۔ آپ جس مشاعرے میں شرکت کرنے کے لئے دہلی تشریف لائے ہیں اُس کا وقت
ہو چکا ہے اس لئے اب میں تو اجازت چاہوں گا اور آپ مشاعرے کے
علمی اور ادبی معیار کو سنبھالا دیجئے۔ اچھا آداب عرض!!

اُردو ادب میں ایک گرانقدر اضافہ

نغمۂ سرمد شہید سرمد کی فارسی رباعیوں کا ترجمہ اُردو رباعیوں میں۔ از عرش ملسیانی۔ سرمد کے سوانح بھی کتاب میں درج ہیں۔ پہلے اصل رباعی ہے اس کے نیچے اُردو ترجمہ۔ اُردو اور فارسی ادب اور تصوف کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے نادر تحفہ۔ قیمت پانچ روپے۔

پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی۔ دریا گنج۔ دہلی نمبر ۶

منی آرڈر بھیجتے وقت کوپن منی آرڈر پر یہ ضرور تحریر فرمایئے کہ رقم کس سلسلے میں بھیجی گئی ہے تاکہ تعمیلِ ارشاد میں دیر نہ ہو۔ خط و کتابت کرنے اور منی آرڈر بھیجنے کے لئے پتہ "رسالہ بیسویں صدی دہلی نمبر ۶" لکھنا کافی ہے۔

افسانہ

سکوتِ پردۂ ساز

سعید احمد صدیقی

میمن منزل، بدر باغ۔ علی گڑھ

۱۱ دسمبر ۱۹۶۴ء

محترمی و مکرمی خوشتر صاحب، تسلیم

آپ کی خدمت میں ایک اچھوتا اور نیا تجربہ پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ میرا مضمون نفسیات ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ میری یہ پیش کش ادب کی دُنیا میں قبول کی جائے گی۔ اِس افسانے کا تعلق کچھ ایسے مشاہدات سے ہے جن سے اکثر عوام اور شاید خواص بھی آشنا نہیں ہیں۔ جہاں پر کہانی ختم ہوتی ہے عموماً وہاں سے لوگ افسانہ شروع کرتے ہیں —— صرف خیالات (Reflections) پر بہت سی کہانیاں لکھی گئی ہیں لیکن عام طور پر یہ کہانیاں فلیش بیک تکنیک یا کچھ خارجی اتفاقات اور واقعات کے سہارے آگے بڑھتی ہیں یا منزل تک پہنچتی ہیں۔

زیرِ نظر افسانے میں خیالات اپنی خالص شکل میں پیش کئے گئے ہیں۔ خارجی واقعات اور زیادتوں سے بچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو کچھ ہے وہ فوری تاثر سے متعلق ہے۔ ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اِس افسانے میں بیک وقت تین کرداروں کے خیالات پیش کئے گئے ہیں اور ہر کردار کے ساتھ پورا انصاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے —— یہ تینوں کردار ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہیں۔ صرف ایک اسٹیشن سے دوسرے اسٹیشن تک ہمسفر رہنے کے بعد مختلف منزلوں کی سمت چل دیتے ہیں۔ دورانِ سفر میں بھی اُن میں کوئی گفتگو نہیں ہوتی۔ نہ ایثار، قربانی اور بہادری کے اظہار کے لئے کوئی حادثہ پیش آتا ہے۔ لیکن پھر بھی اُن کے ذہن کے پردوں پر جو خیالات اُبھرتے ہیں وہ ایک ایسی کہانی کی تشکیل کرتے ہیں جو ہر لحاظ سے مکمل ہے۔

مخلص —— سعید احمد صدیقی

وہ ڈبے میں داخل ہوئے۔ اتفاقاً —— فرسٹ کلاس میں بھی غیر مہذب اور گندے انسانوں سے چھٹکارا نہیں ملتا، جنہیں یہ بھی تمیز نہیں کہ فوم کشنڈ سیٹس پر کیسے بیٹھنا چاہیئے اور سامان کس جگہ رکھنا چاہیئے۔ سامان؟ رَبش!! جنک! باہر کسی ملک میں پل بڑھ کر بھی اِتنا گھٹیا سامان خریدنا پسند نہیں کرتا۔ اُس نے اپنا قیمتی سُوٹ کیس اور ایئر انٹرنیشنل کا بیگ اوپر کی برتھ پر رکھتے ہوئے سوچا۔

گاڑی آہستہ آہستہ رینگنے لگی۔ وہ بے خیالی میں چوڑیوں کو کلائی سے اوپر نیچے اُتار کر دیکھنے لگی۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ روز ریل میں بیٹھ کر کالج اور کالج سے گھر۔ نہ کوئی ایڈونچر نہ تھرل۔ کسی دن کوئی "معقول" لڑکا مل گیا تو یہ سب پڑھائی لکھائی ختم اور —— ڈیڈی بیچارے اِسی فکر میں گھلے جاتے ہیں کہ کوئی "معقول" لڑکا —— ہونہہ! اُس نے مُنہ بناتے ہوئے سوچا۔ ڈیڈی ایک دن مذاق میں کہہ بھی تو رہے تھے کہ "مُنّی بیٹیا آجکل تو لڑکیاں خود ہی بَر ڈھونڈ لاتی ہیں —— لیکن اِس مذاق میں کچھ حقیقت بھی تھی۔ شاید دبی ہوئی خواہش! کسی دن میرے خوابوں کا شہزادہ حقیقت کی دُنیا میں نظر آگیا تو پکڑ کر اُسے ڈیڈی کے پاس لے جاؤں گی۔ یہ سوچ کر ہی اُس کے چہرے پر ہلکی سی سُرخی پھیل گئی۔ اُس نے اِدھر اُدھر مُڑ کر دیکھا کوئی اس کے خیالات بھانپ تو نہیں گیا۔ لیکن مجھے تو خود بھی نہیں معلوم کہ میری پسند کیا ہے۔ کالج کی لڑکیاں کیا بڑھ چڑھ کر اپنی محبت کے قصے سُناتی ہیں اور ہر روز بدلتے ہوئے فیشن کی طرح نیا محبوب ڈھونڈ لیتی ہیں۔ یہ بھی کوئی محبت ہوئی! اُس کی نظر خوبصورت نوجوان کے سگریٹ کیس پر سے

مستی و ناآشنائی، وحشت و بیگانگی
یا تری آنکھوں میں دیکھی یا ترے دیوانے میں ——— ذوق دہلوی

اُف، وہ نیند کے سائے، نیم باز آنکھوں پر
سحر رہا ہو جیسے کوئی آبگینوں میں ——— قتیل شفائی

بہت لطیف اشارے تھے چشم ساقی کے
نہ میں ہوا کبھی بے خود، نہ ہوشیار ہوا ——— اصغر گونڈوی

سُرخ ڈورے تری آنکھوں کے الٰہی توبہ
چاہئے تھا انہیں پیوستِ رگِ جاں ہونا ——— عزیز لکھنوی

چشم ساقی کہ تھی کبھی مخمور
خود ہی آخر شراب ہو کے رہی ——— فانی بدایونی

(مرسلہ: ایس، ایس جھنکاری، ایم اے۔ کلکتہ)

ہوتی ہوئی کھڑکی کے پاس بیٹھے ہوئے نیم دیہاتی نوجوان کی پتلون پر لگے ہوئے پیوند پر ٹھہر گئی۔

———◆———

لڑکی نے سامنے والی سیٹ پر رکھا ہوا اپنا بایاں پیر سمیٹ لیا۔ ایک بے تعلق سی نظر نئے آنے والے پر ڈالی جو اپنا سامان سلیقے سے رکھنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ وہ اپنی کلائی میں بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھ کر بیزاری سے گاڑی کے حرکت میں آنے کا انتظار کرنے لگی۔ کالج تو بس اب شروع ہونے ہی والا ہوگا۔ مسز شکلا کا پیریڈ تو اب ملنے سے رہا۔

———◆———

اُس نے سب خالی سیٹوں کو نظر انداز کر کے عین لڑکی کے سامنے والی سیٹ کو رومال سے صاف کر کے بیٹھنے کے قابل بنایا۔ جیب میں سے سنہرا سگریٹ کیس نکال کر میوزیکل لائٹر سے سگریٹ جلا کر ہلکے زرد شعلے کی لو میں سے لڑکی کے سراپا کا تفصیلی جائزہ لیا۔ اسپلینڈڈ انڈیڈ!! ——— بس اگر یہ ہندوستان نہ ہوتا اور یہ لڑکی پیرس کے کسی ریستوراں میں بیٹھی ہوتی تو وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے اُسے ہم رقص بننے کی دعوت دیتا۔ ریل کا ختم نہ ہونے والا مسلسل نغمہ ——— جیسے جاز کی طویل دُھن۔ اجنبی شہر میں میز پر تنہا بیٹھے ہوئے اسکاچ کے جام پہ جام خالی ہوتے جاتے ہیں اور پھر کوئی نیم عریاں اطالوی یا فرانسیسی حسینہ مسکراتی بل کھاتی ”ایکسکیوز می، مے آئی سِٹ ہیئر“ کہہ کر تنہائی کے جادو کو توڑ کر کسی دوسرے طلسم میں لے جاتی ہے جہاں جسم خوشبو بکھیرنے لگتا ہے اور رات فاکس ٹراٹ، والٹز یا ٹوئسٹ کے بہکے ہوئے قدموں میں ڈھل کر بیت جاتی ہے اور صبح کو کچھ یاد نہیں آتا کون ہم رقص تھا، کس نے لاسٹ آف کی موسیقی کب ختم کی۔ ایک گمنام خلش، ایک بے نام تھکن!

———◆———

اُس نے سوچا ٹکٹ خریدنے سے کچھ پیسے بچ جاتے تو آج شہر سے لوٹتے وقت چھوٹی بہن کے لئے چوڑیاں، نقلی موتی کے بُندے اور بالوں کی پنیں لے لیتا۔ تھرڈ کلاس کے کسی ڈبے میں صرف ٹکنے ہی کی جگہ مل گئی ہوتی تو فضول پیسے پھینکنے سے بچ جاتے۔ اور اگر دفتر پہنچنے میں بھی دیر ہو گئی تو؟ اُس نے گھبرا کر سر کھڑکی سے باہر نکال کر پلیٹ فارم پر لگی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھنے کی کوشش کی لیکن فاصلے کی وجہ سے نہ دیکھ سکا۔

———◆———

اُس نے کھڑکی کی سمت سے ایک لمحے کے لئے پلٹ کر دیکھا اور پھر اُسی طرح باہر دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ ہرے بھرے دُور تک پھیلے ہوئے کھیت، نیم دائرے کی شکل میں سجے ہوئے پیڑ، کھیتوں کی مُنڈیریں جو دُور سے نظر کے متوازی معلوم ہوتی ہیں اور پھر رفتہ رفتہ اپنا زاویہ بدلتی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ ریل کے قریب آنے پر یکلخت پیچھے کی جانب بھاگتے ہوئے پتھروں، جھاڑیوں اور ٹیلیفون کے کھمبوں کے ساتھ ساتھ ختم نہ ہونے والی دوڑ میں شریک ہو جاتی ہیں۔ بے خیالی میں اُس کا ہاتھ اپنے پتلون کے پیوند کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ معلوم نہیں کیوں ——— یہ ٹیلیفون کے کھمبے بھی عجیب ہیں!! اِن کے درمیان تنے ہوئے تار خود بخود کبھی نیچے کی طرف جُھکتے چلے جاتے ہیں اور پھر ایک مقررہ وقفے کے بعد اوپر اُٹھنے لگتے ہیں۔ اوپر.... نیچے .... اوپر.... نیچے وہ کسی بچے کی طرح انہماک سے دل ہی دل میں تاروں کو اپنے حکم پر چلتے دیکھ کر خوش ہوتا رہا۔ پھر خود ہی اُسے اپنی احمقانہ ”دلچسپی“ کا احساس ہوا اور اُس نے کھڑکی کی طرف سے مُنہ پھیر لیا۔

———◆———

لڑکی کے ہاتھ سے چُوڑی اُتر کر نیچے گر پڑی اور سائیکل کے پہیے کی طرح بل کھاتی ہوئی اُس کے پیروں کے قریب آخری بار تیزی سے گھوم کر فرش سے جا لگی۔ چُوڑی اُٹھانے کے لئے لڑکی نے اُٹھنا چاہا لیکن ——— ٹائٹ اسکرٹ میں جُھک کر کوئی چیز اُٹھانا مشکل بھی ہے اور بے تُکا بھی.... اور ایک ذرا سی چُوڑی کے لئے اسکرٹ کو شلوار کے گھیرے سے اوپر تک اُٹھا کر جُھکنا اور اِتنے مردوں کے سامنے؟ اِس خیال ہی سے اُس کے چہرے پر ایک جھینپی ہوئی سی مُسکراہٹ پھیل گئی۔ اُٹھنے کی کوشش کرنے کے بہانے اُس نے اسکرٹ میں پڑی ہوئی خیالی شکنوں کو دونوں ہاتھ کو لھوں

[illegible] کرکے واپس بیٹھ جانا ہی بہتر سمجھا۔

دل سے دُور تک پھیلے ہوئے ہرے بھرے کھیتوں کو دیکھ کر وہ سوچنے لگا کہ ایک دن جب بینک کا قرض ادا ہو جائے گا تو وہ اپنے گاؤں جاکر گھر کے ہر کھیت میں کام شروع کرے گا اور پھر جب کھیتیاں لہلہانے لگیں گی اور اُس کی پریشانی دور ہو جائے گی تو ایک دن وہ بھی کسی خوبصورت اور منتی لڑکی سے شادی کرے گا جو کھیتی باڑی میں اُس کا ہاتھ بٹا سکے۔ اُس کے لئے کھیت پر کھانا پکا کر لائے اور جب تک وہ کھانا کھائے سامنے بیٹھی مسکراتی رہے ——— اُس نے مُڑ کر دیکھا لڑکی کھڑکی کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی ——— تصوّر نے تھوڑی دیر کے لئے ہم سفر لڑکی کو اُس گوری کے روپ میں لاکر کھڑا کر دیا۔ اور وہ سوچنے لگا بھلا پڑھی لکھی اور امیر گھرانے کی لڑکی اُس کے ساتھ کیا خوش رہ سکے گی۔ اور پھر اُسے نہ جانے کیوں اپنے گاؤں کے زمیندار کا مقولہ یاد آگیا جو وہ وقت بے وقت اپنے کاشتکاروں اور مزدوروں سے کہتے اور طنز بھرے لہجے میں کہا کرتا تھا "رہیں جھونپڑوں میں اور خواب دیکھیں محلوں کے۔"

اُس نے مُڑ کر نیچے گری ہوئی چوڑی کو دیکھا۔ لیکن پھر اپنے بڑھے ہوئے شیو اور خستہ حال کپڑوں کے نمایاں ہونے کے خیال سے صرف پہلو بدل کر چوڑی اٹھانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور یوں بھی بلاوجہ اپنی ہنسی اُڑوانے سے کیا فائدہ؟ اِتنے لوگوں میں چوڑی اٹھانے کے لئے اُٹھوں گا تو لوگ سوچیں گے میں لڑکی کی توجہ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اب پہلی بار اُس نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ لڑکی واقعی بہت خوبصورت تھی... لیکن میرے اور اِس کے ماحول میں بہت فرق ہے اور اِس فرق کے ہوتے ہوئے اِس لڑکی کے متعلق سوچنا....

لڑکی نے اُس کے بڑھے ہوئے شیو کو دیکھا۔ کتنے گھنے بال ہیں!! ٹھوڑی سے لے کر گلے اور گردن سے سینے تک موٹے سیاہ بالوں کا سلسلہ سا چلا گیا ہے۔ کتنا مینلی (Manly) معلوم ہوتا ہے۔ جیسے بغیر تراشا ہوا ہیرا!! پھٹی ہوئی قمیص سے نظر آتی ہوئی مچھلیاں، چوڑے شانے اور کشادہ سینہ۔ جیسے کسی عظیم مصوّر نے مردانہ وجاہت کی تصویر کھینچ کر رکھ دی ہو۔ غریب ہے تو کیا ہوا۔ کتنا سیدھا اور شریف ہے۔ کاش یہ مجھ سے بات کرے.... وقت ہی پوچھ لے۔ اور پھر میں اِس سے پوچھوں گی آپ کیا کرتے ہیں؟ کیا نام ہے؟ اور.... اور.... آپ کی شادی ہو گئی ہے کیا؟ اور پھر جب جان پہچان ہو جائے گی اور یہ بھی اگلے اسٹیشن پر اُترا تو میں اِس سے کہوں گی وہ بھی میرے ساتھ اسکوٹر میں بیٹھ جائے اور پھر کسی ہوٹل میں چائے پئیں گے .... دوستی بڑھ جائے گی.... اور شاید.... اور وہ خوابوں اور خیالوں کی بستی میں سُنہرے محل تعمیر کرنے لگی۔

اُس نے چوڑی اُٹھا کر لڑکی کو دیتے ہوئے نہایت قاتل مُسکراہٹ سے دیکھا۔ مُسکراہٹ جو اُس نے برسوں کے تجربے اور محنت کے نتیجے میں اپنی مرضی کے طابع کی تھی۔ لیکن لڑکی نے شکریہ بھی تو نہیں کہا۔ خیر اب جلد ہی گفتگو کا کوئی موقع نکل آئے گا۔ لیکن خود سے کوئی گفتگو شروع کرے تو انڈین لڑکیاں اُسے "چیپ" سمجھنے لگتی ہیں۔ اور کون جانے خود بھی اِسی وجہ سے پہل نہیں کرتیں۔ زمانہ بدل گیا لیکن ہمارے مُلک کی لڑکیاں نہ بدلیں۔ خیر کچھ بھی ہو "شی اِز لے ڈِش"..... کیوپڈ اگر مہرباں ہو گیا تو سفر ختم ہونے سے پہلے ہی....

وہ اپنی پتلون کی نہ مٹنے والی کریز پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچ رہا تھا لڑکی اِس کی شخصیت سے کافی مرعوب ہو چکی ہے۔ بس دولت کا تھوڑا سا رعب اور پڑ گیا تو کامیابی یقینی ہے۔ اُس نے جیب سے پرس نکال کر کسی فرضی ضرورت کے خیال سے ٹکٹ نکالا اور اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا اور قصداً پرس اِس طرح گرا دیا کہ وہ لڑکی کے

حدیثِ دل

اُٹھ کر تو آ گئے ہیں، تری بزم سے مگر
کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے آئے ہیں ——— فیض احمد فیض

تم نے تو حکمِ ترکِ تمنا سُنا دیا
کس دل سے آہ ترکِ تمنا کرے کوئی ——— مجاز لکھنوی

عجب حال اپنا ہوتا، جو وصالِ یار ہوتا
کبھی جان صدقے ہوتی، کبھی دل نثار ہوتا ——— داغ دہلوی

تم زمانے کی راہ سے آئے
ورنہ سیدھا تھا راستہ دل کا ——— باقی صدیقی

پھر دل طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے ——— غالب

(مُرسلہ: کے۔ کے سود۔ ایم اے۔ دلی)

راُس میں بھرے ہوئے ہرے ہرے نوٹ اور نمایاں ہوگئے۔ اُس
مے ہیں، دیر لگاتی تاکہ لڑکی کو ازراہِ اخلاق شوا ٹھاکر اُسے دینے کا
ن اس سے پہلے کہ لڑکی اُٹھتی، دیہاتی نوجوان نے شوا اُس کے ہاتھ میں
ی کلچرڈ اور وحشی۔ ہے! اس نے کس نے کہا تھا آپ تکلیف فرمائیے!!
بعد اُس نے اُٹھ کر سُوٹ کیس میں سے کچھ رنگین امریکن رسالے نکال کر
ہوسکتا ہے اِن میں سے کسی رسالے کی قسمت جاگ اُٹھے!

یالات کے دھارے میں بہتی ہوئی بہت دُور آگئی تھی۔ جان پہچان سے
سے محبت کی سرحد کے قریب:

"آپ کیا کرتے ہیں؟"
"کھیتی...... اور آپ؟"
"میں کالج میں پڑھتی ہوں۔"
"آپ روز شاہدرہ سے غازی آباد کالج میں پڑھنے جاتی ہیں؟"
"جی ہاں۔ اور آپ کہاں جا رہے ہیں؟"
"میں کھیتوں کے لئے بیج خریدنے منڈی جا رہا ہوں۔"
"سُنئے آپ کے گھر میں کون کون ہے۔ میرا مطلب......"
"سب ہیں... ماتا ہیں۔ پتا ہیں۔ بہن ہے۔ بس ایک کمی ہے..."
"اور اگر وہ کمی میں پُوری کر دوں تو؟"
"نہیں تم وہ کمی نہیں پُوری کر سکتیں۔ تم کالج میں پڑھنے والی نرم اور نازک
ہو، کھیت پر میرا ہاتھ نہ بٹا سکو گی۔ میں تمھیں وہ دولت اور آرام نہ دے سکوں گا
جس کی تم عادی ہو۔"
"مجھے دولت اور سُکھ نہیں چاہئے۔ میں کھیت پر تمھارے ساتھ محنت کروں گی
...وں گی اور اُسی میں خوش رہوں گی۔"
"دیکھنے اور کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔"
گاڑی کی رفتار مدھم ہو رہی تھی۔ شاید اسٹیشن قریب آگیا تھا۔

گاڑی دھیرے دھیرے رُک رہی تھی۔ تھینک گاڈ! اِس ریچھ سے تو پیچھا چھوٹا۔
...اده سازگار ہو جائے گا۔ جب یہ دیہاتی اپنا ٹاٹ کا تھیلا اُٹھا کر یہاں
...جائے گا تب شاید یہ لڑکی اتنا حجاب نہ محسوس کرے۔ گاڑی بھی رُک گئی ہے۔
...کوئی بیرا آجاتے تو ــــــ لیکن یہ کیا؟ لڑکی بھی اِسی اسٹیشن پر اُتر رہی ہے۔
...خری وقت میں رسپونس دی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اسے پس تو وہ شروع ہی سے
ہوگئی تھی۔ بس اندازے کی ذرا سی غلطی ہوگئی۔ یہ کیا پتہ تھا کہ صرف ایک اسٹیشن کے لئے
ہم سفر تھی ورنہ بہت کچھ ہوسکتا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا یہ کتنی احمقانہ بات ہے کہ میں اِس لڑکی کے متعلق سوچ رہا ہوں۔
میری پتلون میں لگے ہوئے پیوند، پھٹی ہوئی قمیص، جوتوں کی شکستگی اور بڑھا ہوا شیو...
جنھیں میں لاکھ کوشش کے بعد بھی نہیں چھپا سکتا۔ ایسے مفلس اور وحشی آدمی سے
کون لڑکی محبت کرے گی۔ محبت تو خیر دُور کی بات ہے۔ بات کرنے میں بھی شاید توہین
محسوس کرے۔ لیکن معلوم نہیں کیوں، ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ لڑکی وہی ہے جس کی
مجھے ضرورت ہے۔ خوبصورت اور جسم بھی کسی گاؤں کی لڑکی سے کم نہیں۔ بس یہ جی چاہتا
ہے اِس سے کہہ دوں میرے ساتھ گاؤں چل۔ میں تجھے سونا چاندی اور نئے فیشن کے
کپڑے تو نہ دے سکوں گا لیکن تجھے رکھوں گا بڑے آرام سے اور ہنسی خوشی۔ لیکن بھلا وہ
کیوں عیش و عشرت کو چھوڑ کر ایک قلاش کا ہاتھ پکڑے گی۔ لے دے کر ایک عزت رہ گئی
ہے وہ بھی ہاتھ سے جائے گی اگر کہیں اُس نے بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا: "نا بابا نا ــــــ"
اُس نے اپنی خیالی حماقت پر لعنت بھیجی۔

اُس نے اپنا تھیلا اُٹھایا اور ٹٹول کر اُس کے اندر کی چیزوں کی سلامتی اور
موجودگی کا یقین کرنے کے بعد گاڑی رُکنے سے پہلے ہی دروازے کی طرف بڑھنا شروع
کر دیا۔ اُس نے مُڑ کر لڑکی کی طرف دیکھنے کی ضرورت بھی نہ سمجھی جو اُس سے کچھ کہنا چاہتی تھی۔
لڑکی کے ہلتے اور کانپتے ہوئے ہونٹوں اور سوالیہ آنکھوں کو وہ نہ دیکھ سکا۔ اپنے خیالات
کی بلند پروازی سے گھبرا کر اور اُن سے جلد سے جلد چھٹکارا پانے کے لئے وہ گاڑی
اچھی طرح رُکنے سے پہلے ہی پلیٹ فارم پر پھیلی ہوئی بھیڑ میں گم ہو گیا۔

اُس نے سوچا گاڑی رُکنے پر وہ اُسے چائے پینے کی دعوت دے گا۔ پہلے
وہ ہندوستانی لڑکیوں کے عام رواج کے مطابق تکلّف کرے گی۔ لیکن جب میں
قریب بیٹھے ہوئے سب لوگوں کے لئے چائے کا آرڈر دوں گا تو پھر اُسے زیادہ انکار کی
گنجائش نہ رہے گی۔ اِس لڑکی کی وجہ سے اِس بندر کو بھی چائے پیش کرنی پڑے گی۔
اُس نے حقارت سے نیم دیہاتی نوجوان کی طرف دیکھا اور پھر لڑکی کی طرف متوجہ ہو گیا۔
شاید اب محبت کا اثر اُدھر بھی رنگ لانے لگا ہے۔ کس ادا سے نظریں بچاگئی اور اِس
طرح دوسری طرف دیکھنے لگی جیسے اُس جنگل کو دیکھ رہی ہو۔ اور وہ سُرخی جو ایک لمحے
کے لئے اُس کے چہرے پر پھیل گئی تھی۔ مشرقی لڑکیاں اپنے جذبات کو چھپا لیتی ہیں
ریفلکسز (Reflexes) پر کنٹرول نہیں کر سکتیں۔ یہ سُرخی صرف اُس وقت پیدا

...ہرے کے علاوہ وہ لڑکی کے جذبات میں ارتعاش پیدا ہو۔ اور اس
...ے لڑکی دیکھتی رہی کہ اور آنسو بہتے ہوئے بڑھے!
...وہ چھوڑ آیا... اور وہ سگریٹ جلانے لگا۔

...ساتھ کی شب وہ مڑ کر دیکھے گا ایک بار... ایک لمحے کے لئے
...ہیں گے۔ ... بجلی پر اتر رہی ہوں؛ لیکن نہ اس نے مڑ کر
...دیکھ سکی۔ کاش اس نوجوان کو معلوم ہو جاتا کہ میرے دل میں اس کے
لئے — پھر ایک ایک آنسو نے کانوں میں چمکیں اور تیزی سے سوہانی کی طرف گری۔ گاڑی آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی۔ دور بھیڑ میں وہ وحشی سا انسان جا رہا تھا جس کے لئے ایک لڑکی کے دل میں ایک بے قرار دھڑکن پیدا ہوئی تھی۔ گاڑی رک گئی تھی لیکن وہ تک کرتے ہوئے نوجوان کی بھیڑ میں گم ہوتے دیکھتی رہی۔ تم دیکھتے تو یہی ہیں تمہارے ساتھ کھیتوں میں محنت بھی کر سکتی تھی تمہارے لئے میں سب کچھ کر سکتی تھی۔ بھیڑ میں اب اس نوجوان کی شکل پہچاننا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ لڑکی کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپک کر پلکوں کے پاسیداں میں جذب ہو گیا جو شاید کسی نے نہیں دیکھا۔

...ل

حفیظ مالیگانوی

...سب آزار کیوں ہے
زمانہ برسرِ پیکار کیوں ہے

...لیا عجز ہم جانتے ہیں
عنایت آپ کی سرکار کیوں ہے

...میں نے اظہارِ تمنا
تمہارے ہاتھ میں تلوار کیوں ہے

...اتی ہے دل میں خار بن کر
...ظر آمادہ آزار کیوں ہے

حفیظ اس بات پر برہم ہے دنیا
مرا دل مرکزِ انوار کیوں ہے

غزل

خلش دریری

جواں عزمِ سفر ہونے لگا ہے
جنوں پھر راہبر ہونے لگا ہے

کسی کی یاد دل میں بس رہی ہے
خزف ریزہ گہر ہونے لگا ہے

شبِ ظلمت بھیانک تھی کب اتنی
کہیں ذکرِ سحر ہونے لگا ہے

ترے جلوؤں کی رنگینی میں شامل!
مرا حسنِ نظر ہونے لگا ہے

کوئی آتا نہیں راہِ وفا میں
یہ رستہ پُر خطر ہونے لگا ہے

...ل

...سرہوانی

دل اگر اُن کے لب و عارض کا افسانہ کہے — وہ بھی دیوانہ کہیں، دنیا بھی دیوانہ کہے

خود مری بیتابیاں سب کچھ بتا دیں گی اُنھیں — کون اپنے منھ سے اپنے دل کا افسانہ کہے

ذرّے ذرّے سے نمایاں ہیں جنوں سامانیاں — جب یہ عالم ہو تو کس کو کون دیوانہ کہے

اب تو سناٹا ہے زنداں سے فصیلِ شہر تک — ایسی دنیا کو زمانہ کیوں نہ ویرانہ کہے

پاس جا کر گر پڑا اور اس میں بھرے ہوئے ہرے ہرے نوٹ اور نمایاں ہوگئے۔ اُس نے جان بوجھ کر اُٹھنے میں دیر لگائی تاکہ لڑکی کو از راہِ اخلاق بٹوا اٹھا کر اُسے دینے کا موقع مل سکے۔ لیکن اس سے پہلے کہ لڑکی اُٹھتی، دیہاتی نوجوان نے بٹوا اُس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ کتنا اَن کلچرڈ اور وحشی ہے! اس سے کس نے کہا تھا آپ تکلیف فرمائیے!! کچھ دیر سوچنے کے بعد اُس نے اپنے سوٹ کیس میں سے کچھ رنگین امریکن رسالے نکال کر بینچ پر ڈال دیئے۔ ہوسکتا ہے ان میں سے کسی رسالے کی قسمت جاگ اُٹھے!

وہ خیالات کے دھارے میں بہتی ہوئی بہت دُور آگئی تھی۔ جان پہچان سے دوستی اور دوستی سے محبت کی مرحلے کے قریب۔

"آپ کیا کرتے ہیں؟"

"کھیتی.... اور آپ؟"

"جی۔ میں کالج میں پڑھتی ہوں۔"

"آپ روز شاہدرہ سے غازی آباد کالج میں پڑھنے جاتی ہیں۔"

"جی ہاں۔ اور آپ کہاں جارہے ہیں؟"

"میں کھیتوں کے لئے بیج خریدنے منڈی جارہا ہوں۔"

"سُنیئے آپ کے گھر میں کون کون ہے۔ میرا مطلب....؟"

"سب ہیں.... ماتا ہیں۔ پتا ہیں۔ بہن ہے۔ بس ایک کمی ہے....؟"

"اور اگر وہ کمی میں پوری کردوں تو؟"

"نہیں تم وہ کمی نہیں پوری کرسکتیں۔ تم کالج میں پڑھنے والی نرم اور نازک لڑکی ہو۔ تم کھیت پر میرا ہاتھ نہ بٹا سکو گی۔ میں تمھیں وہ دولت اور آرام نہ دے سکوں گا جس کی تم عادی ہو۔"

"مجھے دولت اور سکھ نہیں چاہئے۔ میں کھیت پر تمھارے ساتھ محنت کروں گی تمھیں آرام دوں گی اور اسی میں خوش رہوں گی۔"

"کہنے اور کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔"

گاڑی کی رفتار مدھم ہو رہی تھی شاید اسٹیشن قریب آگیا تھا۔

گاڑی دھیرے دھیرے رُک رہی تھی۔ تھینک گاڈ! اس ریچھ سے تو پیچھا چھوٹا۔ اب ماحول زیادہ سازگار ہو جائے گا۔ جب یہ دیہاتی اپنا ٹاٹ کا تھیلا اُٹھا کر یہاں سے روانہ ہو جائے گا تب شاید یہ لڑکی اتنا حجاب نہ محسوس کرے۔ گاڑی بھی رک گئی ہے۔ ڈائننگ کار کا کوئی بیرا آجائے تو ــــــ لیکن یہ کیا؟ لڑکی بھی اسی اسٹیشن پر اُتر رہی ہے۔ کمبخت نے آخری وقت میں رسپونس دی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ امپریس تو وہ شروع ہی سے ہوگئی تھی۔ بس اندازے کی ذرا سی غلطی ہوگئی۔ یہ کیا پتہ تھا کہ صرف ایک اسٹیشن تک کے ہم سفر تھی ورنہ بہت کچھ ہوسکتا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا یہ کتنی احمقانہ بات ہے کہ میں اس لڑکی کے متعلق سوچ رہا ہوں۔ میری پتلون میں لگے ہوئے پیوند، پھٹی ہوئی قمیص، جوتوں کی شکستگی اور میلا پن ــــ جنھیں میں لاکھ کوشش کے بعد بھی نہیں چھپا سکتا۔ ایسے مفلس اور وحشی آدمی سے کون لڑکی محبت کرے گی۔ محبت تو خیر دُور کی بات ہے۔ بات کرنے میں بھی شاید توہین محسوس کرے۔ لیکن معلوم نہیں کیوں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ لڑکی وہی ہے جس کی مجھے ضرورت ہے۔ خوبصورت اور جسم بھی کسی گاؤں کی لڑکی سے کم نہیں۔ بس یہی جی چاہتا ہے اس سے کہہ دوں میرے ساتھ گاؤں چل۔ میں تجھے سونا چاندی اور نئے فیشن کے کپڑے تو نہ دے سکوں گا لیکن تجھے رکھوں گا بڑے آرام سے اور ہنسی خوشی۔ لیکن بھلا وہ کیوں عیش و عشرت کو چھوڑ کر ایک قلاش کا ہاتھ پکڑنے گی۔ لے دے کر ایک عزت رہ گئی ہے وہ بھی ہاتھ سے جائے گی اگر کہیں اُس نے بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا: نا نا نا ــــ اُس نے اپنی خیالی حماقت پر لعنت بھیجی۔

اُس نے اپنا تھیلا اُٹھایا اور ٹٹول کر اُس کے اندر کی چیزوں کی سلامتی اور موجودگی کا یقین کرنے کے بعد گاڑی رُکنے سے پہلے ہی دروازے کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ اُس نے مُڑ کر لڑکی کی طرف دیکھنے کی ضرورت بھی نہ سمجھی جو اُس سے کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لڑکی کے ملتے اور کانپتے ہوئے ہونٹوں اور سوالیہ آنکھوں کو وہ نہ دیکھ سکا اپنے خیالات کی بلند پروازی سے گھبرا کر اور اُن سے جلد سے جلد چھٹکارا پانے کے لئے وہ گاڑی اچھی طرح رُکنے سے پہلے ہی پلیٹ فارم پر پھیلی ہوئی بھیڑ میں گُم ہوگیا۔

اُس نے سوچا گاڑی رُکنے پر وہ اُسے چائے پینے کی دعوت دے گا۔ پہلے وہ ہندوستانی لڑکیوں کے عام رواج کے مطابق تکلف کرے گی۔ لیکن جب میں قریب بیٹھے ہوئے سب لوگوں کے لئے چائے کا آرڈر دوں گا تو پھر اُسے زیادہ انکار کی گنجائش نہ رہے گی۔ اس لڑکی کی وجہ سے اِس بندر کو بھی چائے پیش کرنی پڑے گی۔ اُس نے حقارت سے نیم دیہاتی نوجوان کی طرف دیکھا اور پھر لڑکی کی طرف متوجہ ہوگیا۔ شاید اب محبت کا اثر اُدھر بھی رنگ لانے لگا ہے۔ کس ادا سے نظریں بچا گئی اور اس طرح دوسری طرف دیکھنے لگی جیسے اُس جنگلی کو دیکھ رہی ہو۔ اور وہ سُرخی جو ایک لمحے کے لئے اُس کے چہرے پر پھیل گئی تھی۔ مشرقی لڑکیاں اپنے جذبات کو چھپا لیتی ہیں ریفلکسز (Reflexes) پر کنٹرول نہیں کرسکتیں۔ یہ سُرخی صرف اُس وقت پیدا

ہر کسی چہرے کو دیکھ کر خیال ہے لڑکی کے جذبات میں انقلاب پیدا ہو۔ اور اس
نے ان میں محبت کی لو ہو سکتا ہو۔ کیا وہ پھر ایسا انہیں پہچان سکتے تھے؟
... تو بس سگریٹ جلانے لگا۔

وہ سوچ رہی تھی کہ شاید وہ مُڑ کر دیکھے گا۔ ایک بار... ایک لمحے کے لیے
زمیں اس سے کہہ سکوں گی: میں بھی اسی اسٹیشن پر اتر رہی ہوں۔ لیکن نہ اُس نے مُڑ کر
دیکھا اور نہ وہ کچھ کہہ سکی۔ کاش اُس نوجوان کو معلوم ہو جاتا کہ میرے دل میں اُس کے
لیے ... پھر ایک بیک اُس نے کتابیں سمیٹیں اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔
گاڑی آہستہ آہستہ رک رہی تھی۔ دروازے میں وہ وحشی سا انسان سہارا دیا تھا جس کے لیے
ایک لڑکی کے دل میں ایک بے قرار دھڑکن پیدا ہوئی تھی۔ گاڑی رک چکی تھی لیکن وہ
تک کر جاتے ہوئے نوجوان کو جب تک گم ہوتے دیکھتی رہی۔ تم دیکھتے تو یہی ہیں تمہارے
ساتھ کھیتوں میں محنت بھی کر سکتی تھی تمہارے لیے سب کچھ کر سکتی تھی۔ بھیڑ میں اب
اُس نوجوان کی شکل پہچاننا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ لڑکی کی ہمت نے ایک آنسو ٹپکا دیا کے
پاسبانوں میں جذب ہو گیا جو شاید کسی نے نہیں دیکھا۔

غزل

حفیظ مالیگانوی

محبت باعث آزار کیوں ہے
زمانہ برسرِ پیکار کیوں ہے

کسی کو کیا خبر ہم جانتے ہیں
عنایت آپ کی سرکار کیوں ہے

کیا تھا میں نے اظہارِ تمنا
تمہارے ہاتھ میں تلوار کیوں ہے

چُبھی جاتی ہے دل میں خار بنکر
نظر آسا وہ آزار کیوں ہے

حفیظؔ اس بات پر برہم ہے دنیا
مرا دل مرکزِ انوار کیوں ہے

غزل

خلش وسادی

جواں عزمِ سفر ہونے لگا ہے
جنوں پھر راہبر ہونے لگا ہے

کسی کی یاد دل میں بس رہی ہے
خزف ریزہ گہر ہونے لگا ہے

شبِ ظلمت بھیانک تھی کب اتنی
کہیں ذکرِ سحر ہونے لگا ہے

ترے جلوؤں کی رنگینی میں شامل!
مرا حُسنِ نظر ہونے لگا ہے

کوئی آتا نہیں راہِ وفا میں
یہ رستہ پُر خطر ہونے لگا ہے

غزل

خورشید افسر بسوانی

دل اگر اُن کے لب و عارض کا افسانہ کہے
وہ بھی دیوانہ کہیں، دنیا بھی دیوانہ کہے

خود مری بیتابیاں سب کچھ بتادیں گی اُنھیں
کون اپنے منھ سے اپنے دل کا افسانہ کہے

ذرّے ذرّے سے عیاں ہیں جنوں سامانیاں
جب یہ عالم ہو تو کس کو کون دیوانہ کہے

اب تو سناٹا ہے زنداں سے فصیلِ شہر تک
ایسی دنیا کو زمانہ کیوں نہ ویرانہ کہے

دیگر کسی قوم کی طرح اہلِ ہند کا بھی یہ خصوصی حق ہے کہ وہ آزاد ہوں۔
اپنی محنت کے ثمر اور زندگی کی آسائشوں سے لطف اندوز ہوں تاکہ
اُنھیں نشوونما کے مکمل مواقع میسر آسکیں۔

جواہر لال نہرو

حلف آزادی
۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء

ہمارا راستہ صاف اور سیدھا ہے یعنی ہم داخلی طور پر آزادی و خوشحالی پر مبنی سوشلسٹ جمہوریت کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں اور خارجی طور پر امنِ عالم کی برقراری اور سبھی اقوام سے دوستانہ تعلقات رکھنے کے خواہش مند ہیں۔ اس سیدھے راستے پر گامزن ہونے اور ان درخشاں آدرشوں کے حصول کے لئے ہم آج خود کو ازسرِ نو وقف کرتے ہیں۔

لال بہادر شاستری
وزیر اعظم ہند

جملہ پنجابی آج

آزادی کو مستحکم بنانے کے لئے اپنے عزم کی ازسرِ نو توثیق کرتے ہیں۔

جاری کردہ:۔ محکمہ تعلقات عامہ پنجاب

NO. PRD/612

مشہور مصنفین کے مشہور ناول اور کتابیں

افسانہ لکھ رہی ہوں	خوش باش ایم اے	دو روپے
اندھیرے	اختر عادل رومی	دو روپے
آگ اور دھواں	م م راجندر ایم اے	دو روپے ۵۰ نئے پیسے
اندھیرے اجالے	عادل رشید	تین روپے
اندھیری راتیں	ریوتی سرن شرما	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
ایک پیار ایک دھوکا	رام سرن شرما	تین روپے ۲۵ نئے پیسے
بیگم صاحبہ	شوکت تھانوی	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
بلاوا	"	دو روپے ۵۰ نئے پیسے
پگلی	"	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
بے غیرت	مضطر ہاشمی	چار روپے ۴۵ "
بادن پتے	کرشن چندر ایم اے	پانچ روپے ۹۵ "
پہلی لڑکی	رازدان ایم اے	دو روپے ۹۵ نئے پیسے
انورہ	فیاض علی	آٹھ روپے ۵۰ "
برہن	کرشن گوپال عابد	چار روپے ۵۰ "
ستم	"	چار روپے ۵۰ "
گھائل	"	تین روپے ۹۵ "
ظالم	سعید امرت	دو روپے ۵۰ "
جانے والے	اختر عادل روپ	تین روپے ۵۰ "
جاتی ہوئی بہار	جوش محمود آبادی	چار روپے
چوٹ	دت بھارتی	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
گناہ	"	دو روپے ۹۵ نئے پیسے
حال دل	بیگم قمر ولایت حسین	تین روپے ۵۰ "
خاتون	انتصار حسین	تین روپے
حاجی مراد	قیس رامپوری	چار روپے
پاگل	رئیس احمد جعفری	چھ روپے
زخم ابرو (نظم)	عبدالحمید عدم	دو روپے ۵۰ نئے پیسے

دو پھول	عادل رشید	تین روپے ۹۵ "
دو سال پہلے دو سال بعد	زبیدہ خاتون	چھ روپے
زیب مسلسل	شفیق بانو	دو روپے
زہر	ذکی انور	چھ روپے
برجیس	قیس رامپوری	چار روپے
اچھی صورت بری نگاہ	ریاض ارشد	تین روپے
کانٹے	رضیہ سجاد ظہیر	تین روپے ۹۵ نئے پیسے
مجھے تم سے محبت ہے	نقی نور	تین روپے ۵۰ "
نئے قدم	ہاجرہ نازلی	چار روپے ۵۰ "
ننگی جوانی	سعید امرت	دو روپے
رہگذر	امیر مرزا	چار روپے ۵۰ نئے پیسے
خوفناک محبت	عبدالحلیم شرر	تین روپے
شاہدہ	انتصار حسین	تین روپے
کرشمہ	شفیق الرحمٰن	تین روپے
ناظر کی آپ بیتی	ایم اسلم	تین روپے
ایک دل ہزار غم	عزیز بدایونی	دو روپے ۵۰ نئے پیسے
زردینہ	رئیس احمد جعفری	چھ روپے ۵۰ نئے پیسے
ننگا شہر	احمد شجاع	پانچ روپے
دردانہ	نادرہ خاتون	پانچ روپے
چندرکلا	جمنا داس اختر	دو روپے ۵۰ نئے پیسے
جلن	"	تین روپے ۵۰ "
رادھا از بھگ	"	دو روپے ۵۰ "
پاپی	"	چار روپے
سوناگاچی	"	چار روپے ۵۰ "
طوفانوں کی کہانی	"	چار روپے ۵۰ "
جوار بھاٹا	"	چار روپے ۵۰ "

قیامت	نکہت	[illegible]
سازش	"	[illegible]
کانٹوں کی سیج	رشید اختر ندوی	پانچ روپے
گمراہ	قیس رامپوری	چار روپے ۵۰ نئے پیسے
ناگ دیوتا	محمود جالندھری	دو روپے ۵۰ "
خون کے چھینٹے	"	دو روپے ۵۰ "
تیر نگاہ میں	"	تین روپے ۵۰ "
داغ	نگہت بھارتی	تین روپے ۵۰ "
پیاسا	"	تین روپے ۵۰ "
[illegible]	"	دو روپے
پراسرار قافلہ	"	دو روپے
پیاس	[illegible]	تین روپے ۵۰ "
محبت روتی ہے	غلام عباس	دو روپے
مالوا	میکسم گورکی ترجمہ نرش کمار شاد	ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے
کھیت میں لہو	تاجور سامری	ایک روپیہ ۵۰ "
جی ہاں سچے ہیں	شوکت تھانوی	تین روپے ۱۰ "
پردے کے پیچھے	منٹو	دو روپے ۵۰ "
ملکۂ صحرا	اوم پرکاش شاہی	دو روپے ۵۰ "
خاموش نغمہ	"	چار روپے
آتش گل (مجموعہ کلام)	جگر مرادآبادی	پانچ روپے
باقیات اقبال "	ڈاکٹر اقبال	تین روپے
تلخیاں (کلاں) "	ساحر	چھ روپے
تلخیاں (خورد) "	ساحر	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
پرچھائیاں "	ساحر	ایک روپیہ ۲۵ نئے پیسے
انسانیت موت کے دروازے پر	مولانا آزاد	تین روپے ۵۰ "
زہرہ کا حسن	اشفاق احمد	دو روپے

پتہ:- رسالہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی نمبر ۶

بیسویں صدی دہلی

[illegible]

غزل

کیف [illegible] صدیقی

حسن کے دل میں چاہ پیدا کر
دل میں شکلِ ماہ پیدا کر

جلوۂ حسن دیکھنے والے
پہلے ذوقِ نگاہ پیدا کر

حرم و دیر چھوڑ کر میخانہ
ہر جگہ رسم و راہ پیدا کر

جس پہ جلوے ہوں خود بخود قرباں
کوئی ایسی نگاہ پیدا کر

کیف اب اپنی چشمِ گریاں سے
کچھ نئے مہر و ماہ پیدا کر

غزل

چندر پرکاش جوہر بجنوری

دے کر جمالِ دید مذاقِ نظر کو میں
جلووں کو دیکھتا ہوں کبھی جلوہ گر کو میں

پا جاؤں تابِ دید اگر عمر بھر کو میں
آئینۂ جمال بنا لوں نظر کو میں

پھر ہے جبینِ شوق کو سجدے کی آرزو
پھر ڈھونڈنے چلا ہوں ترے سنگِ در کو میں

اللہ رے احترامِ حریمِ جمالِ دوست
یہ تاب ہی نہیں کہ اٹھاؤں نظر کو میں

منزل مجھے ملے نہ ملے کچھ گلہ نہیں
جوہر نہ ساتھ لونگا مگر راہبر کو میں

غزل

ساحر کنجاہی

اک قافلہ خیال کا آیا گزر گیا
ہر چند ہم نے روکنا چاہا گزر گیا

برسوں کے بعد بھی وہ ملے ہیں تو اس طرح
سایہ سا میرے پاس سے گویا گزر گیا

آنکھوں کی پیاس بجھ نہ سکی تھی کہ دوستو
چہرہ دکھا کے ابر کا ٹکڑا گزر گیا

[illegible]
سر سے ہوا کے آگ کا دریا گزر گیا

افسانہ

ادھوری کہانی

پروفیسر ظفر احمد نظامی ایم اے

شعبہ سیاسیات، گورنمنٹ ڈگری کالج۔ دتیا (مدھیہ پردیش)

۲۳ دسمبر ۶۴ء   برادرِ محترم! تسلیمات

"۲ نومبر کو میرٹھ سے دلی پہنچا اور پھر اُسی شام وہاں سے دتیا کے لئے چل پڑا کیونکہ ۳ کو کالج کھل رہا تھا۔ اسی لئے دوبارہ حاضری سے قاصر رہا۔ ویسے میرٹھ روانگی سے پہلے میں نے ٹیلیفون پر دیوالی اور سالِ نو کی مبارکباد پیش کرنے کی کوشش ضرور کی تھی لیکن آپ کی عدم موجودگی کے باعث ناکام ہوئی ——— دلی کے مختصر دورانِ قیام میں آپ سے وہ لمحاتی ملاقات ذہن پر جاوداں اثر مرتسم کر گئی ہے جب آپ انتہائی مصروفیات کے عالم میں اپنی شفقت اور محبت کا اظہار فرما رہے تھے۔ کوکاکولا کی بوتل جتنی سیاہ و سرد تھی میرا دل اُتنی ہی شدت سے آپ کے خلوص اور گہرے خلوص کی گرمی کو محسوس کر رہا تھا۔ راجہ مہدی علی خاں کا خط پڑھ کر آپ کا دل بھر آیا تھا اور آپ جذبات کی رَو میں بہہ گئے تھے جسے میں کبھی نہیں بھلا سکتا۔ ملک ضرور تقسیم ہو گیا لیکن خلوص ایسی شے نہیں جو منقسم ہو جائے۔ آپ کے بلند خیالات قومی یکجہتی اور ہندو مسلم اتحاد کی کڑیوں کا سنگم ہیں ——— سپرو ہاؤس دلی میں میری مصروفیتیں بہت کارآمد ثابت ہوئیں اور آپ کو مسرت ہوگی کہ اپنی علالت کے باوجود اتنے کم وقت میں بھی میں نے اپنے لکچرس کے لئے کافی مواد فراہم کر لیا۔ یہاں پہنچ کر مجھے پھر اپنی مصروفیات میں گم ہو جانا پڑا۔ اگرچہ دلی کی گہماگہمی کے بعد فطرت کے وسیع دامن میں پھر خاموش اور پُرسکون زندگی مل گئی لیکن دریا گنج کی مصروف ترین شاہراہ کا وہ حصہ اب بھی ذہن و دل میں محفوظ ہے جس میں آپ کی نشست اور "بیسویں صدی" کا دفتر ہے۔۔۔

آپ کا بھائی ——— ظفر احمد نظامی

اُسے ڈاک کا انتظار کر رہا تھا۔ اُس کا معمول تھا صبح اخبار پڑھتا اور پھر ناشتے کے بعد ڈاک کا انتظار کرنے لگتا۔ وہ ایک ہفتہ وار اخبار کا ایڈیٹر تھا۔ وقت گزاری کے لئے وہ اپنے ہی اخبار کے تازہ شمارے کی ورق گردانی کرنے لگا۔ تجارتی امور کے سلسلے میں باہر رہنے کے باعث وہ اس شمارے کے بیشتر کو نہیں پڑھ سکا تھا۔ اس کی مکمل ترتیب اُس کے اسسٹنٹ کی مرہونِ منت تھی۔ اُس نے پرچے کا ٹائیٹل دیکھا، صفحات اُلٹے، اداریہ پڑھا۔ نظموں کے ابتدائی بند اور غزلوں پر اُچٹتی نظر ڈالتا ہوا وہ افسانوی حصہ کی جانب متوجہ ہوا۔ سبھی جانے پہچانے ادیب تھے۔ اکثر اُس کے دوست تھے اور بیشتر اُسی کے بنائے ہوئے جنہیں خود اُسی نے لفٹ دے کر ادبی دنیا میں مشہور کیا تھا۔ اسی سرسری جائزے کے دوران میں ایک افسانے پر اُس کی نگاہیں جم گئیں جو ڈائری کے اوراق پر مشتمل تھا اور اُسی کے ایک عزیز دوست کی جنبشِ قلم کا نتیجہ تھا۔

اُس کی دلچسپی بڑھنے لگی۔ یہ ایک لڑکی کی ڈائری تھی۔ وہ ایک اوسط درجے کے خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ ابتدائی تعلیم مدرسوں میں حاصل کرنے کے بعد وہ کالج کی رومانی فضاؤں میں گم ہو کر رہ گئی۔ آزادانہ ماحول اُسے راس آگیا۔ اُس کے خیالات کی رَو نئی تہذیب کی راہوں کی جانب بہنے لگی۔ زندگی کے رُخ سے پہلی بار پردہ اُٹھا تو دُنیا رنگین نظر آئی۔ سینے میں مچلتے ہوئے دل کی دھڑکنوں نے رومانی اشعار کی صحیح ترجمانی کی۔ مخلوط تعلیم نے اُس کے دل کی دُنیا کو اُمنگوں اور آرزوؤں سے بھر دیا تھا۔ لڑکے اُسے دیکھ کر فقرے کستے تو وہ لطف اندوز ہوتی، وہ اُن سے گہری دلچسپی کا اظہار کرتی۔ پڑھنے سے زیادہ وقت بناؤ سنگار میں گزارنے لگی۔ وہ کالج کے ایکٹنگ اور سوشل ہنگاموں کی روحِ رواں بن گئی۔ کوئی

ادھوری کہانی

پروفیسر ظفر احمد نظامی ایم اے

شعبہ سیاسیات، گورنمنٹ ڈگری کالج، دتیا (مدھیہ پردیش)

۲۲ دسمبر ۶۳ء　　　　برادرِ محترم! تسلیمات

۹ نومبر کو میرٹھ سے دلی پہنچا اور پھر اُسی شام ہمارے دتیا کے لئے چل پڑا کیونکہ ، سے کالج کھل رہا تھا۔ اسی لئے دوبارہ حاضری سے قاصر رہا۔ ویسے میرٹھ روانگی سے پہلے میں نے ٹیلیفون پر دہلی اور رسالہ نو کی مبارکباد پیش کرنے کی کوشش ضرور کی تھی لیکن آپ کی عدم موجودگی کے باعث ناکام ہوئی ——— دلی کے مختصر سے دورانِ قیام میں آپ سے وہ لمحاتی ملاقات ذہن پر جاوداں اثر مرتسم کر گئی ہے جب آپ انتہائی مصروفیات کے باوجود بھی اپنی شفقت اور محبت کا اظہار فرما رہے تھے گوکہ وہ رات جتنی سیاہ و سرد تھی میرا دل اتنی ہی شدت سے آپ کے منھ سے نکلتے خلوص کی گرمی کو محسوس کر رہا تھا۔ ڈاکٹر مہدی علی خاں کا خط پڑھ کر آپ کا دل بھر آیا تھا اور آپ جذبات کی رو میں بہہ گئے تھے جسے میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ ملک ضرور تقسیم ہو گیا لیکن خلوص ایسی شے نہیں جو منقسم ہو جائے۔ آپ کے بلند خیالات قومی یکجہتی اور ہندو مسلم اتحاد کی کڑیوں کا سنگم ہیں ——— بہرحال اس دتی میں میری مصروفیتیں بہت کارآمد ثابت ہوئیں اور آپ کو مسرت ہوگی کہ اپنی علالت کے باوجود اتنے کم وقت میں بھی میں نے اپنے تھیسس کے لئے کافی مواد فراہم کر لیا۔ یہاں پہنچ کر پھر اپنی مصروفیات میں گم ہو جانا پڑا۔ اگرچہ دتی کی گہما گہمی کے بعد فطرت کے وسیع دامن میں پھر خاموش اور پُرسکون زندگی مل گئی لیکن دریا گنج کی مصروف ترین شاہراہ کا وہ حصہ اب بھی ذہن و دل میں محفوظ ہے جس میں آپ کی نشست اور بیسویں صدی کا دفتر ہے...

آپ کا بھائی ——— ظفر احمد نظامی

[و]ہ ڈاک کا انتظار کر رہا تھا۔ اُس کا معمول تھا صبح اخبار پڑھتا اور پھر ناشتے [کے بعد ڈ]اک کا انتظار کرنے لگتا۔ وہ ایک ہفتہ وار اخبار کا ایڈیٹر تھا۔ وقت گزاری کے لئے [اپنے] اخبار کے تازہ شمارے کی ورق گردانی کرنے لگا۔ تجارتی امور کے سلسلے میں باہر [رہنے کے] باعث وہ اس شمارے کے بیشتر کو نہیں پڑھ سکا تھا۔ اس کی مکمل ترتیب اُس کے [دوس]ت کی مرہونِ منت تھی۔ اُس نے پرچے کا ٹائیٹل دیکھا، صفحات اُلٹے، اداریہ پڑھا۔ [...] ابتدائی بند اور غزلوں پر اچٹتی نظریں ڈالتا ہوا وہ افسانوی حصہ کی جانب [بڑھا۔ سب]ھی جانے پہچانے ادیب تھے۔ اکثر اُس کے دوست تھے اور بیشتر اُسی کے بنائے [ہوئے تھے] جن کو خود اُسی نے لفٹ دے کر ادبی دنیا میں مشہور کیا تھا۔ اسی سرسری جائزے [کے دوران] ایک افسانے پر اُس کی نگاہیں جم گئیں جو ڈائری کے اوراق پر مشتمل تھا اور اُسی کے ایک عزیز دوست کی جنبشِ قلم کا نتیجہ تھا۔

اُس کی دلچسپی بڑھنے لگی۔ یہ ایک لڑکی کی ڈائری تھی۔ وہ ایک اوسط درجے کے خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ ابتدائی تعلیم مدرسوں میں حاصل کرنے کے بعد وہ کالج کی رومانی فضاؤں میں گم ہو کر رہ گئی۔ آزادانہ ماحول اُسے راس آگیا۔ اُس کے خیالات کی رو نئی تہذیب کی راہوں کی جانب بہنے لگی۔ زندگی کے رُخ سے پہلی بار پردہ اٹھا تو دنیا رنگین نظر آئی۔ سینے میں مچلتے ہوئے دل کی دھڑکنوں نے رومانی اشعار کی صحیح ترجمانی کی۔ مخلوط تعلیم نے اُس کے دل کی دنیا کو اُمنگوں اور آرزوؤں سے بھر دیا تھا۔ لڑکے اُسے دیکھ کر فقرے کستے تو وہ لطف اندوز ہوتی، وہ اُن سے گہری دلچسپی کا اظہار کرتی۔ پڑھنے سے زیادہ وقت بناؤ سنگار میں گزارنے لگی۔ وہ کالج کے الیکشن اور سوشل ہنگاموں کی روحِ رواں بن گئی۔ کوئی

ادھوری کہانی

پروفیسر ظفر احمد نظامی ایم اے

شعبہ سیاسیات، گورنمنٹ ڈگری کالج۔ دتیا (مدھیہ پردیش)

برادرِ محترم! تسلیمات

۲۲ دسمبر ۶۳ء

۶ نومبر کو میرٹھ سے دلّی پہنچا اور پھر اسی شام وہاں سے دتیا کے لئے چل پڑا کیونکہ یہ کالج کھل رہا تھا۔ ابھی لئے دوبارہ حاضری سے قاصر رہا۔ ویسے میرٹھ روانگی سے پہلے میں نے ٹیلیفون پر دیوالی اور سال نو کی مبارکباد پیش کرنے کی کوشش ضرور کی تھی لیکن آپ کی عدم موجودگی کے باعث ناکام ہوئی ——— دلّی کے مختصر سے دورانِ قیام میں آپ سے وہ لمحاتی ملاقات ذہن پر جاوداں اثر مرتسم کر گئی ہے جب آپ اتفاقی مصروفیات کے باوجود مجھ سے اپنی شفقت اور محبت کا اظہار فرما رہے تھے۔ کوکا کولا کی بوتل جتنی سیاہ و سرد تھی میرا دل اتنی ہی شدت سے آپ کے جذبہ اور گہرے خلوص کی گرمی کو محسوس کر رہا تھا۔ راجہ مہدی علی خاں کا خط پڑھ کر آپ کا دل بھر آیا تھا اور آپ جذبات کی رو میں بہہ گئے تھے جسے میں کبھی نہیں بھلا سکتا۔ ملک ضرور تقسیم ہو گیا لیکن خلوص ایسی شے نہیں جو منقسم ہو جائے۔ آپ کے بلند خیالات قومی یک جہتی اور ہندو مسلم اتحاد کی کڑیوں کا سنگم ہیں ——— بہرحال دلّی میں میری مصروفیتیں بہت کارآمد ثابت ہوئیں اور آپ کو مسرت ہوگی کہ اپنی علالت کے باوجود اتنے کم وقت میں بھی میں نے اپنے تھیسس کے لئے کافی مواد فراہم کر لیا۔ یہاں پہنچ کر مجھے پھر اپنی مصروفیات میں گم ہو جانا پڑا۔ اگرچہ دلّی کی گہما گہمی کے بعد خلوت کے دبیز دامن میں پھر خاموش اور پُرسکون زندگی مل گئی لیکن دریا گنج کی مصروف ترین شاہراہ کا وہ حصّہ اب بھی ذہن و دل میں محفوظ ہے جس میں آپ کی نشست اور

آپ کا بھائی ——— ظفر احمد نظامی

بیسویں صدی کا دفتر ہے...

حسن ڈاک کا انتظار کر رہا تھا۔ اُس کا معمول تھا صبح اخبار پڑھتا اور پھر ناشتے کے بعد ڈاکیے کا انتظار کرنے لگتا۔ وہ ایک ہفتہ وار اخبار کا ایڈیٹر تھا۔ وقت گزاری کے لئے وہ اپنے ہی اخبار کے تازہ شمارے کی ورق گردانی کرنے لگا۔ تجارتی امور کے سلسلے میں باہر رہنے کے باعث وہ اس شمارے کے میٹر کو نہیں پڑھ سکا تھا۔ اس کی مکمل ترتیب اُس کے اسسٹنٹ کی مرہونِ منت تھی۔ اُس نے پرچے کا ٹائیٹل دیکھا، صفحات اُلٹے، اداریہ پڑھا۔ نظموں کے ابتدائی بند اور غزلوں پر اُچٹتی نظریں ڈالتا ہوا وہ افسانوی حصّہ کی جانب متوجہ ہوا۔ سبھی جانے پہچانے ادیب تھے۔ اکثر اُس کے دوست تھے اور بیشتر اُسی کے بنائے ہوئے جنھیں خود اُسی نے لفٹ دے کر ادبی دنیا میں مشہور کیا تھا۔ اسی سرسری جائزے کے دوران میں ایک افسانے پر اُس کی نگاہیں جم گئیں جو ڈائری کے اوراق پر مشتمل تھا اور اُسی کے ایک عزیز دوست کی جنبشِ قلم کا نتیجہ تھا۔

اُس کی دلچسپی بڑھنے لگی۔ یہ ایک لڑکی کی ڈائری تھی۔ وہ ایک اوسط درجے کے خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ ابتدائی تعلیم مدرسوں میں حاصل کرنے کے بعد وہ کالج کی رومانی فضاؤں میں گم ہو کر رہ گئی۔ آزادانہ ماحول اُسے راس آ گیا۔ اُس کے خیالات کی رو نئی تہذیب کی راہوں کی جانب بہنے لگی۔ زندگی کے رُخ سے پہلی بار پردہ اٹھا تو دنیا رنگین نظر آئی۔ سینے میں مچلتے ہوئے دل کی دھڑکنوں نے رومانی اشعار کی صحیح ترجمانی کی۔ مخلوط تعلیم نے اُس کے دل کی دنیا کو اُمنگوں اور آرزوؤں سے بھر دیا تھا۔ لڑکے اُسے دیکھ کر فقرے کستے تو وہ لطف اندوز ہوتی، وہ اُن سے گہری دلچسپی کا اظہار کرتی۔ پڑھنے سے زیادہ وقت بناؤ سنگار میں گزارنے لگی۔ وہ کالج کے الیکشن اور سوشل ہنگاموں کی روحِ رواں بن گئی۔ کوئی

[illegible] تھی، کوئی شام اُس کے بغیر رنگین نہیں تھی۔ [illegible] تھی۔ اُس نے بھی وقت کے تقاضوں کو [illegible] اپنے دل کے ولولوں کی حوصلہ افزائی کی اور جوانی کے جذبات کی قدر کرتے ہوئے اُن کی خوبصورت تکمیل کی کوشش میں مصروف ہو گئی۔

احسن کو لطف آنے لگا۔ وہ اطمینان سے بیٹھ گیا۔ سگریٹ کے کش لیتے ہوئے پھر ڈائری پڑھنے میں منہمک ہو گیا۔

۷ر دسمبر ———

زندگی کی ویران وادیوں میں بہار آگئی۔ اُس سے ایک پکنک میں ملاقات ہوئی اُس نے مجھے پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا اور میرے دل میں چُبھتا چلا گیا۔ وہ بہت دولتمند ہے۔ میں پہلی ہی ملاقات میں اُسے بہت قریب محسوس کرتی ہوں۔ نظروں سے کیا ہوا آغاز ہونٹوں کے تبسم پر اختتام پذیر ہوا۔

۹ر دسمبر ———

اُس سے ملاقاتیں ہوتی رہیں، گفتگو جاری رہی، اُس نے پہلی بار مجھے عمر خیام کی رباعیات کا قیمتی مجموعہ تحفۃً پیش کیا۔

۱۳ر دسمبر ———

تحفے آتے رہے اور ہم ملتے رہے۔ باغوں میں، سینماؤں میں، کلبوں میں، ہوٹلوں اور ناچ گھروں میں۔ زندگی شاید انھیں دلچسپیوں کا دوسرا نام ہے۔ شاید ہی کوئی لمحہ افسردگی کی نذر ہوا ہو۔

۱۹ر دسمبر ———

وہ بہت اُداس اُداس آیا۔ نظریں نیچی کئے۔ اُس کے والدین اُس کی شادی کہیں طے کر بیٹھے تھے لیکن ایک امیر باپ کا بیٹا ہوتے ہوئے بھی وہ میری محبت میں گم ہو گیا تھا۔ وہ مجھے بہت قدر کی نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ میں نے پہلی بار اُسے اُداس دیکھا، خود بھی افسردہ ہو گئی۔

۲۱ر دسمبر ———

میں نے اُس سے کہا ہم جیون ساتھی بن جائیں۔ وہ بے حد خوش ہوا۔ لیکن اُس کے والدین نے صاف انکار کر دیا۔

۲۲ر دسمبر ———

میں اُسے کھونا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے اپنی محبت کے واسطے دیئے اور سول میرج کا مشورہ دیا جسے وہ ٹھکرا نہ سکا۔

۲۶ر دسمبر ———

شادی بہت سادہ طریقے سے ہوئی۔ مجھے اُس سادگی سے کہیں زیادہ، اُس کے ساتھ عیش و عشرت کی زندگی پسند تھی لیکن وقت کا تقاضہ یہی تھا کہ ہم دونوں [illegible] کے رسم و رواج سے بے نیاز اور سماج کی بے بنیاد کھوکھلی پابندیوں سے ہٹ کر ایک دوسرے کے جیون ساتھی بن گئے۔

۳۰ر دسمبر ———

میں اُس سے علیحدگی چاہتی ہوں۔ چار ہی دن میں بیزار ہو جانا پڑا۔ [illegible] اولاد ہونے کے باوجود اُس کے والدین نے اِس شادی کی وجہ سے اُسے جائداد سے محروم کر دیا۔ میں پریشان ہو گئی ہوں۔ چاہتی ہوں کہ جلد ہی چھٹکارا پالوں۔ اب اُس کے ساتھ رہنے سے کچھ حاصل نہیں۔ میں نے اُسی کے ایک وکیل دوست سے رابطہ لی ہے جو جلد ہی مجھے آزاد کرا دے گا۔

یہاں تک پڑھنے کے بعد احسن نے دیکھا جگہ کی کمی کے باعث اخیر میں "باقی آئندہ" لکھ دیا گیا ہے۔

کہانی کی یہ پہلی قسط تھی۔ مطلب یہ تھا کہ قارئین بے چینی سے اگلی اشاعت کا انتظار کریں۔ اُس نے سوچا حقیقت سے دُور ہے یہ کہانی۔ کہیں ایسا بھی ہوا ہے۔ دفعتہً اُس کی نظریں قریب ہی رکھی ہوئی میز کی جانب اُٹھ گئیں جس پر کچھ خطوط رکھے ہوئے تھے۔ وہ پڑھنے میں اتنا منہمک تھا کہ اُسے خبر بھی نہ ہوئی کہ ملازم کب ڈاک رکھ گیا۔ ڈاک میں اخبارات اور رسائل کے علاوہ چند خطوط بھی تھے۔ اُس نے جلدی جلدی سارے خط پڑھ ڈالے۔ اُس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اُس نے ملک کے مختلف حصوں سے ایڈیٹر کے نام موصول ہونے والے اِن خطوط کے مضمون کی یکسانیت پر غور کیا۔ سب کا خلاصہ یہ تھا۔

"براہِ کرم افسانے کی دوسری قسط شائع نہ کرکے احسان فرمایئے۔ حیرت ہے کہ میرے دل کا راز افسانہ نگار پر کیوں کر ظاہر ہو گیا۔ یقین کیجئے اب میں اپنی قسمت پر اعتماد رکھ کر وہی کروں گی جو میرا فرض ہے۔"

[illegible] عام طور پر دفعہ ۱۴۴ لگی رہتی ہے۔ وزیر اعظم کی کوٹھی کے باہر بھوک ہڑتال کرنے آجائیں گے۔ گاؤں میں بھوکوں مر کر دہلی میں نوکری کرنے کے لئے آجائیں گے۔ بھیک مانگنے کے لئے آجائیں گے۔ کیونکہ یہاں کے گنا ہگار سے ریل کے ٹکٹ کی ہمیں پانچ دس پیسے ڈال کر احساس گناہ کم کرنے کے بہت شوقین ہیں۔ اگر آپ کے پاس دولت زیادہ ہے تو دہلی کے اشوکا ہوٹل میں چائے پینے کے لئے آجائیں گے۔ جہاں پانچ روپے کی کپ چائے ملتی ہے اور جہاں کے بیرے معزز شہری سے معلوم ہوتے ہیں ۔۔۔۔ اور اگر کوئی بہانہ نہیں ملتا تو آپ کوئی نہ کوئی چیز سمگل کر کے دہلی لے آئیں گے گھڑیاں، سونا، اناج، کپڑے، لڑکیاں وغیرہ، کیونکہ دہلی سمگلروں کی بہت بڑی منڈی ہے۔ جہاں گھڑی سے لے کر لڑکی تک ہر چیز پر پیسہ پیسہ کے منہ مانگے داموں بک جاتی ہے۔

غرض آپ کسی بھی بہانے سے آئیں گے، جلد یا بدیر دہلی میں آئیں گے اور یہیں کے ہو کر رہ جائیں گے۔ شادی کریں گے، بچے پیدا کریں گے اور پھر یہیں مٹی ہو جائیں گے یا [illegible] دونوں حالتوں میں دہلی آپ کو برداشت کرے گی۔

اجنبی باشندوں کی بستی ——————●

دہلی میں داخل ہونے کے کئی راستے ہیں اور ہر راستے سے ہر روز ہزاروں لوگ دہلی پر حملہ کرنے کے لئے داخل ہوتے ہیں اور پھر دہلی کے کوچہ و بازار میں یوں کھپ جاتے ہیں کہ وہ بھی دہلی ہی کے باشندے معلوم ہونے لگتے ہیں۔ ایک اجنبی حملہ آور اور دہلی کے مستقل باشندے میں تمیز کرنا انتہائی مشکل ہے۔ آپ یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ ایک پہاڑی چھوکرا جو دہلی کے ایک ہوٹل میں برتن مانجھ رہا ہے آٹھ سال سے دہلی میں مقیم ہے یا آج صبح ہی لاریوں کے اڈے پر اترا ہے۔ یا کافی ہاؤس میں جو سیاہ رنگ کا مدراسی جنٹلمین سیاہ رنگ کا سوٹ پہنے سیاہ رنگ کی کافی پی رہا ہے ۔ سنٹرل سیکرٹریٹ میں گذشتہ دس سال سے کلرکی کر رہا ہے یا آج ہی مدراس میل پر سوار ہو کر دہلی میں کلرکی کرنے آیا ہے ـــــ اور یا اجمیری گیٹ سے جس تانگہ بان کے تانگے پر آپ سوار ہوئے ہیں وہ ۱۹۴۷ء ہی میں یہاں تانگہ بانی کرنے آ گیا تھا یا سہارنپور میں اس کا چینی کا ڈپو تھا جو کسی وجہ سے چل نہ سکا اور یہ دہلی میں تانگہ چلانے کے لئے ایک ہی ہفتہ پہلے آیا ہے۔

دہلی کے باشندوں اور باہر سے آنے والوں میں امتیاز کرنا کیوں مشکل ہے؟ اس لئے کہ موجودہ دہلی کا نہ کوئی اپنا کلچر ہے نہ لباس ہے نہ زبان جس سے یہ پتہ چل سکے کہ یہ دہلی والا ہے وہ یہ کلکتے والا اور یہ لکھنؤ والا۔ دہلی کی کسی سڑک پر اگر دو آدمی چل رہے ہوں تو آپ یہ جان کر حیران ہو جائیں گے، کہ یہ دونوں ایک دوسرے کی زبان نہیں جانتے۔ ایک نے کوٹ پتلون پہن رکھا ہے تو دوسرا دھوتی کرتے میں ملبوس ہے۔ ایک نے کوٹ پتلون کے اوپر گاندھی ٹوپی پہنی ہوئی ہے تو دوسرے نے کھدر کی اچکن اور پاجامے کے اوپر ہیٹ لگا رکھی ہے۔ ایک ابھی ابھی ہوٹل سے مچھلی چاول کھا کر نکلا ہے تو دوسرے نے پراٹھا [illegible] اور ستم بالائے ستم یہ کہ دونوں ہی اپنے آپ کو دہلی کے باشندے کہتے ہیں۔

غرض دہلی میں ہر شخص دہلی کا باشندہ ہے اور ہر شخص اجنبی ہے ہر باشندہ ایک دوسرے کے لئے انجان! لیکن ہر اجنبی اپنے آپ کو دہلی کا باشندہ کہتا ہے کیونکہ دہلی کا کلچر اجنبی ہے، لباس اور زبان اجنبی ہے دہلی کے گرد پیش کے گھروں میں بھی اجنبیت کی ہوئی ہے۔ اجنبیت ہی دہلی کا کلچر ہے، لباس اور زبان ہے۔ اور یہ کلچر، لباس اور زبان دہلی میں آنے والے ہر راستے سے ہر روز داخل ہوتی رہتی ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد دہلی نے اپنا کلچر کھو دیا ہے اور اجنبیت پائی ہے۔

حدود اربعہ کہاں گیا؟ ——————●

دہلی کا حدود اربعہ معلوم کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ ریاضی اور جغرافیہ کا کوئی کلیہ دہلی پر لاگو نہیں ہوتا۔ دہلی ریاضی اور جغرافیہ کو پس پشت ڈال کر آگے نکل گئی ہے۔ کہتے ہیں کچھ قدرتی حدود ہوتی ہیں، جیسے دریا، پہاڑ، نہر جن سے کسی مقام کا حدود اربعہ معلوم کیا جا سکتا ہے۔ دہلی میں دریا بھی ہے، پہاڑ بھی اور نہر بھی۔ لیکن دہلی نے قدرت کی لگائی ہوئی ان بندشوں کی پرواہ نہیں کی اور تیز رفتار سیلاب کی طرح ان کے اوپر سے دندناتی ہوئی گذر گئی آج کل یہ دریا، پہاڑ اور نہریں دہلی شہر کے اندر آ گئی ہیں، یہ دہلی کو قید نہیں کر سکیں بلکہ دہلی نے انہیں قید کر لیا ہے۔ مثلاً ہماری جمنا دہلی شہر کے اندر یوں بہہ رہی ہے جیسے پولیس کے گھیرے میں کوئی سہما ہوا مجرم۔ دہلی کے کئی پہاڑ جو کبھی اپنے سر اٹھائے کھڑے رہتے تھے، اب دہلی کے باشندے ان پر سے موٹریں، لاریاں اور سائیکلیں گذار کر یوں لے جاتے ہیں جیسے یہ پہاڑ نہ ہوں بلکہ ان کے زر خرید غلام ہوں۔ سارے پہاڑ دہلی کے چھوٹے چھوٹے محلے بن گئے ہیں اور دہلی والوں نے ان کا نام پہاڑ گنج، پہاڑی دھیرج، بھوجلا پہاڑی، آنند پربت رکھ چھوڑا ہے اور یہ پہاڑ قدرتی پہاڑوں کی بجائے پہاڑی چھوکرے معلوم ہوتے ہیں جو برتن مانجھنے کے لئے دہلی میں آ گئے ہیں۔

در اصل جب سے دہلی آزاد ہندوستان کا دارالخلافہ بنی ہے آباد اور بے باک ہو گئی ہے اور کسی الھڑ دوشیزہ کی طرح چاروں کھونٹ اٹھکھیلیاں کرتی پھر رہی ہے۔ اس لئے اس کی حدود متعین کرنا قریب قریب ناممکن ہے ہر سال نہیں بلکہ ہر ہفتے اس کی حدود بدل جاتی ہیں۔ اگر ایک ہفتہ پہلے اس کی مغربی حد پٹیل نگر نامی کالونی میں تھی۔ تو ہفتہ کے ختم ہونے سے ایک گھنٹے پہلے پتہ چلتا ہے کہ اب پٹیل نگر سے آگے ایک اور کالونی نمودار ہو گئی ہے۔ جو اب دہلی کی مغربی حد کہلاتی ہے۔ مشرقی حد میں پہلے جمنا ندی تھی۔ اس کے بعد شاہدرہ بن گئی۔ اور اب شاہدرہ والے سرد آہ بھر کر کہتے ہیں کہ اب ہم مشرقی حد نہیں رہے کیونکہ ستاروں سے آگے ایک اور کالونی کا جہاں بس گیا ہے۔

اگر مظاہرہ کریں۔ جس کے لئے وزگر وعام طور پر دفعہ ۱۴۴ لگی رہتی ہے۔ وزیراعظم کی کوٹھی کے باہر بھوک ہڑتال کرنے کے لئے آجائیں گے، گاؤں میں بھوکوں مر کر دہلی میں نوکری کرنے کے لئے آجائیں گے، بھیک مانگنے کے لئے آجائیں گے۔ کیونکہ یہاں کے گناہگاروں بھکاریوں کے کشکول میں پانچ دس پیسے کے سکے ڈال کر احساس گناہ کم کرنے کے بہت شوقین ہیں اور اگر آپ کے پاس دولت زیادہ ہے تو آپ دہلی کے اشوکا ہوٹل میں چائے پینے کے لئے آجائیں گے جہاں پانچ روپے کی ایک چائے ملتی ہے اور جہاں کے بیرے ... معلوم ہوتے ہیں ——— اور اگر کوئی بہانہ نہ ملیگا تو آپ کوئی نہ کوئی چیز سمگل کرنے دہلی لے آئیں گے۔ گھڑیاں، سونا، اناج، کپڑے، لڑکیاں عورتیں، کیونکہ دہلی سمگلرس کی بہت بڑی منڈی ہے۔ جہاں گھڑی سے لے کر لڑکی تک ہر چیز بغیر رسید پر پوچھے منہ مانگے داموں بک جاتی ہے۔

غرض آپ کسی بھی بہانے سے آئیں گے، ... دہلی ضرور آئیں گے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ جائیں گے۔ شادی کریں گے۔ بچے پیدا کریں گے اور پھر نکھٹو ہو جائیں گے یا نکھٹو پن ... دونوں حالتوں میں، دہلی آپ کو برداشت کرے گی۔

اجنبی باشندوں کی بستی ——— •

دہلی میں داخل ہونے کے کئی راستے ہیں اور ہر راستے سے ہر روز ہزاروں لوگ دہلی پر حملہ کرنے کے لئے داخل ہوتے ہیں اور پھر دہلی کے کوچہ و بازار میں یوں پھیل جاتے ہیں کہ وہ بھی دہلی ہی کے باشندے معلوم ہونے لگتے ہیں۔ ایک اجنبی حملہ آور اور دہلی کے مستقل باشندے میں تمیز کرنا انتہائی مشکل ہے۔ آپ یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ ایک پہاڑی چھوکرا جو دہلی کے ایک ہوٹل میں برتن مانجھ رہا ہے آٹھ سال سے دہلی میں مقیم ہے یا آج صبح ہی لاریوں کے اڈے پر اترا ہے۔ یا کافی ہاؤس میں جو سیاہ رنگ کا مدراسی جنٹلمین سیاہ رنگ کا سوٹ پہنے، سیاہ رنگ کی کافی پی رہا ہے۔ سنٹرل سیکرٹریٹ میں گذشتہ دس سال سے کلرکی کر رہا ہے یا آج ہی مدراس میل پر سوار ہو کر دہلی میں کلرکی کرنے آیا ہے ——— اور یا اجمیری گیٹ سے جس تانگہ بان کے تانگے پر آپ سوار ہوئے ہیں وہ ۱۹۴۷ء ہی میں یہاں تانگہ بانی کرنے آ گیا تھا یا سہارن پور میں اس کا چینی کا ڈپو تھا جو کسی وجہ سے چل نہ سکا اور یہ دہلی میں تانگہ چلانے کے لئے ایک ہی ہفتہ پہلے آیا ہے۔

دہلی کے باشندوں اور باہر سے آنے والوں میں امتیاز کرنا کیوں مشکل ہے؟ اس لئے کہ موجودہ دہلی کا نہ کوئی اپنا کلچر ہے نہ لباس ہے نہ زبان جس سے یہ پتہ چل سکے کہ یہ دہلی والا ہے اور یہ کلکتے والا اور یہ لکھنؤ والا۔ دہلی کی کسی سڑک پر اگر دو آدمی چل رہے ہوں تو آپ یہ جان کر حیران ہو جائیں گے، کہ یہ دونوں ایک دوسرے کی زبان نہیں جانتے۔ ایک نے کوٹ پتلون پہن رکھا ہے تو دوسرا دھوتی کرتے میں ملبوس ہے۔ ایک نے کوٹ پتلون کے اوپر گاندھی ٹوپی پہنی ہوئی ہے تو دوسرے نے کھدر کی اچکن اور پاجامے کے اوپر ہیٹ لگا رکھی ہے۔ ایک

ابھی ابھی ہوٹل سے مچھلی چاول کھا کر نکلا ہے تو دوسرا ... اور ستم بالائے ستم یہ کہ دونوں ہی اپنے آپ کو دہلی کے باشندے سمجھتے ہیں۔

غرض دہلی میں ہر شخص دہلی کا باشندہ ہے اور ہر شخص اجنبی ہے اور ایک دوسرے کے لئے انجان! لیکن ہر اجنبی اپنے آپ کو دہلی کا باشندہ کہتا ہے کیونکہ دہلی کا کلچر اجنبی ہے، لباس اور زبان اجنبی ہے دہلی کے پچیس میل کے گھیرے میں ... ہوتی ہے۔ اجنبیت ہی دہلی کا کلچر ہے، لباس اور زبان ہے۔ اور یہ کلچر، لباس اور زبان دہلی میں آنے والے ہر راستے سے ہر روز داخل ہوتی رہتی ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد دہلی نے اپنا کلچر کھو دیا ہے اور اجنبیت پائی ہے۔

حدود اربعہ کہاں گیا؟ ——— •

دہلی کا حدود اربعہ معلوم کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ ریاضی اور جغرافیہ کا کوئی فارمولا دہلی پر لاگو نہیں ہوتا۔ دہلی نے ریاضی اور جغرافیہ کو پس پشت ڈال کر آگے قدم بڑھا دیا ہے۔ کہتے ہیں کچھ قدرتی حدود ہوتی ہیں، جیسے دریا، پہاڑ، نہر جن سے کسی مقام کا حدود اربعہ معلوم کیا جا سکتا ہے مگر دہلی میں دریا بھی ہے، پہاڑ بھی اور نہر بھی۔ لیکن دہلی نے قدرت کی لگائی ہوئی ان بندشوں کی پرواہ نہیں کی اور تیز رفتار سیلاب کی طرح ان کے اوپر سے دندناتی ہوئی گذر گئی۔ آج کل یہ دریا، پہاڑ اور نہریں دہلی شہر کے اندر آ گئی ہیں۔ یہ دہلی کو قید نہیں کر سکیں بلکہ دہلی نے انہیں قید کر لیا ہے۔ مثلاً بیچاری جمنا دہلی شہر کے اندر یوں بہہ رہی ہے جیسے پولیس کے گھیرے میں کوئی سہما ہوا مجرم۔ دہلی کے کئی پہاڑ جو کبھی اپنے سر اٹھائے کھڑے رہتے تھے، اب دہلی کے باشندے ان پر سے موٹریں، لاریاں اور سائیکلیں گذار کر یوں لے جاتے ہیں جیسے یہ پہاڑ نہ ہوں بلکہ ان کے زر خرید غلام ہوں۔ سارے پہاڑ دہلی کے چھوٹے چھوٹے محلے بن گئے ہیں اور دہلی والوں نے ان کا نام پہاڑ گنج، پہاڑی دھیرج، بھوجلہ پہاڑی، آنند پربت رکھ چھوڑا ہے اور یہ پہاڑ قدرتی پہاڑوں کی بجائے پہاڑی چھوکرے معلوم ہوتے ہیں جو برتن مانجھنے کے لئے دہلی میں آ گئے ہیں۔

در اصل جب سے دہلی آزاد ہندوستان کا دارالخلافہ بنی ہے۔ آزاد اور بے باک ہو گئی ہے اور کسی الھڑ دوشیزہ کی طرح چاروں کھونٹ اٹھکھیلیاں کرتی پھر رہی ہے۔ اس لئے اس کی حدود متعین کرنا قریب قریب ناممکن ہے ہر سال نہیں بلکہ ہر ہفتے اس کی حدود بدل جاتی ہیں۔ اگر ایک ہفتہ پہلے اس کی مغربی حد پٹیل نگر نامی کالونی میں تھی۔ تو ہفتہ کے ختم ہونے سے ایک گھنٹے پہلے پتہ چلتا ہے کہ اب پٹیل نگر سے آگے ایک اور کالونی نمودار ہو گئی ہے۔ جو اب دہلی کی مغربی حد کہلاتی ہے۔ مشرقی حد بھی پہلے جمنا ندی تھی۔ اس کے بعد شاہدرہ بن گئی۔ اور اب شاہدرہ والے سرد آہ بھر کر کہتے ہیں کہ اب ہم مشرقی حد نہیں رہے کیونکہ ستاروں سے آگے ایک اور کالونی کا جہاں بس گیا ہے۔

...کا شاعر

قارئین کرام! اس شگوفے کو نوش فرمانے سے پہلے یہ بھی سن لیں کہ اس کی تخلیق اس وقت ہوئی جب حضرت بہزاد لکھنوی نے انتقالِ وطن نہیں کیا تھا اور ہندوستان ہی میں موجود تھے۔

مجاز مرحوم، جوش صاحب اور فراق صاحب کسی مشاعرے میں شرکت کرنے کے بعد ٹرین میں ایک ساتھ واپس آ رہے تھے۔ اسی کمپارٹمنٹ میں ایک سیدھا سادہ نوجوان بھی موجود تھا اور ان حضرات کی گفتگو اور حلیے سے اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ حضرات بھی نوعِ انسان کے اس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جسے عرفِ عام میں "شاعر" کہا جاتا ہے۔

دفعتاً اس کے ذہن میں ایک سوال ابھرا اور اس نے ان حضرات کی طرف رخ کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"کیوں جی! ہندوستان میں حفیظ جالندھری کے مقابلے کا بھی کوئی شاعر ہے؟"

جوش اور فراق کچھ سوچنے لگے اور مجاز نے فوراً جواب دیا۔

"جی ہاں! بہزاد لکھنوی!!"

ترجمہ

درد و غم رنگ رنگ زندگی ۔۔۔۔۔۔

ایک بار مجاز مرحوم نے نہایت سنجیدگی سے سلام مچھلی شہری کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"سلام! میں سوچتا ہوں تمھاری نظموں کا روسی زبان میں ترجمہ کر ڈالوں۔"

"اور اگر وہ اس میں مقبول نہ ہو سکیں تو؟" سلام نے انتہائی معصومیت سے سوال کیا۔

"تو کیا!" مجاز نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔ "میں پھر انھیں اردو میں منتقل کر دوں گا!"

نئی نظم

کافی عرصے کے بعد مجاز سے ملاقات ہونے پر اُن کے ایک بے تکلف دوست نے دریافت کیا۔

"مجاز! ادھر تم نے کوئی نئی نظم نہیں کہی؟"

اور مجاز نے سر جھکا کر بہت دھیرے سے جواب دیا۔

"نئی نظم کیا کہوں! جو پرانی ہیں وہی لوگوں کو یاد نہیں۔"

شکر

مجاز مرحوم اور جذبی صاحب ایک ساتھ کسی دوست کے یہاں پہنچے۔

صاحبِ خانہ نے چائے سے ان حضرات کی تواضع کرنی چاہی۔

تھوڑی دیر بعد چائے آ گئی۔ مجاز، جذبی اور صاحبِ خانہ کے علاوہ اس وقت ایک اور صاحب بھی وہاں موجود تھے۔ انھوں نے چائے کے لوازمات پر ایک نظر ڈالی، وہ چونک پڑے اور حیرت آمیز انداز میں بولے۔

"کیوں صاحب! یہ کیسی شکر ہے؟"

(اطلاعاً یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ واقعہ اس زمانے کا ہے جب غالباً شکر پر کنٹرول نہیں تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ صاحبِ خانہ کے گھر میں اس وقت بھی کھانڈ سالی موجود تھی)

ان حضرت کا سوال سنتے ہی مجاز نے برجستگی سے جواب دیا۔

"یہ وہ شکر ہے جو آپ کے ہاں آتی ہو!"

(یہ لطیفہ ابھی ایک ماہ پہلے جذبی صاحب قبلہ نے مجھے اس وقت سنایا جب ایک مشاعرے سے واپسی کے بعد صبح کے تقریباً چار بجے اپنے کمرے میں چائے کے ساتھ میں نے ان کے سامنے یہی "شکر" پیش کی)

نقش فریادی

کسی مشاعرے میں مجاز مرحوم اپنا کلام سنا رہے تھے۔

دفعتاً سبھی چونک پڑے۔ خواتین کی گیلری سے کسی شیر خوار بچے کے رونے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔

مجاز نے ایک لمحے کے توقف کے بعد غالب کا یہ مصرعہ پڑھا ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا

صاحبو! شگوفوں کا یہ خوان میں نے آپ کی خدمت میں بیادِ مجاز نذر کیا ہے جنھوں نے اپنی زندگی کی تلخیاں خود اپنی ذات تک محدود رکھیں اور اپنے تبسم کی شیرینی دوسروں میں تقسیم کرتے رہے۔ جنھوں نے خود اپنے الفاظ میں ؎

سب کا تو مداوا کر ڈالا، اپنا ہی مداوا کر نہ سکے

سب کے تو گریباں سی ڈالے، اپنا ہی گریباں بھول گئے

کیا اُن کی زندگی ٹیگور (Tagore) کے ان الفاظ کی عملی تفسیر نہیں تھی؟

"The moon has all her light in the sky; her dark spots to herself!"

(چاند کی ساری روشنی آسمان کی بیکراں وسعتوں پر پھیل جاتی ہے، اس کے دھبے صرف اسی تک محدود ہوتے ہیں!)

اس سوال کا جواب کون دے گا؟

چراغِ آرزو

نعیم کوثر آکولوی

بالاپور، آکوٹ ضلع اکولہ (مہاراشٹر)

[illegible] اکتوبر [illegible]

محترم خوشتر صاحب تسلیمات

ایک کہانی "چراغِ آرزو" لے کر پہلی بار آپ کی بزم میں شریک ہو رہا ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ میری اس کوشش کو سراہیں گے۔ افسانہ کیسا ہے، اس میں کیا خوبی ہے اور کیا خامی؟ یہ آپ بہتر سمجھیں گے، آپ پرکھیں، اس لئے کہ آپ نقاد ہیں...

نیاز مند ——— نعیم کوثر

گوکیں پریشانی پہ بے لباس تھے۔ شکیل نے کھڑکی سے باہر جھانک کر ماحول کا جائزہ لیا۔ وہ حسین و رنگین ماحول ——— حدِ نظر تک حسن بکھرا چاندنی کی ردا بچھا رکھی تھی۔ خوبصورت پھولوں سے بھری کیاریاں۔ پھولوں سے ن کرتے ہوئے ہوا کے نرم رو جھونکے۔ کلیاں کھلنے کے لئے بے چین۔ شبنم کھلے پھولوں پر جیسے گلاب پاشی کر رہی تھی۔ اچانک شکیل کی نظریں آسمان کی طرف ا اور اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کی نگاہیں اُن شفاف بادل کے ٹکڑوں میں ن کر رہی ہوں۔ انگلیوں میں دبا سگار کب کا بجھ چکا تھا۔ نسرین نہ جانے کتنی بار ں آکر مایوس لوٹ گئی۔ رات اپنی پہلی منزل سے گزر کر دوسری منزل میں داخل ہوئی۔ نسرین نے ایک بار پھر کمرے میں جھانک کر دیکھا اور شکیل کو اُسی طرح کھویا ہوا پا کر وہ اندر داخل ہوئی۔ قریب آ کر کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہ سکی۔ اُس کا ہاتھ اُٹھا اور ے شکیل کے کاندھے پر ٹک گیا۔ ہوا کا تیز جھونکا کھڑکی سے اندر آیا اور میز پہ رکھے سارے کاغذات اپنے ساتھ اُڑاتا چلا گیا۔ شکیل چونک اُٹھا۔ اُس کی نگاہیں ن کے معصوم چہرے پر جم گئیں۔ نسرین نے مسکرا کر اُس کی طرف دیکھا اور کہا "یہ ہر روز اسی طرح گھنٹوں کمرے میں مقید رہنے لگے۔ نہ اپنی فکر ہے اور نہ دوسروں کا خیال۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے جب دیکھو کسی گہری سوچ میں ڈوبے نظر آتے ہیں" شکیل مسکرانے لگا۔ اُس کی نگاہوں میں بے پناہ محبت تھی۔ وہ عجیب نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ نسرین نے شرما کر سر جھکا لیا۔ شکیل پھر جہاں تھا وہیں آگیا۔ اُس کی نگاہیں ماحول پر جم گئیں جیسے کچھ تلاش کر رہی ہوں۔ نسرین نے بکھرے ہوئے کاغذات میز پر رکھ دیئے اور شکیل کی طرف مسرت بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔ اُس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور سیاہ پلکوں پر موتی جھلملانے لگے۔ شکیل نے چونک کر دیکھا۔ نسرین جا چکی تھی۔ اُس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

اور پھر شکیل کا قلم کاغذ پر تھرکنے لگا۔ شاید کوئی انوکھا خیال قلمبند کرنا چاہتا ہو۔ وہ دیر تک لکھتا رہا۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ شکیل نے انگڑائی لی اور وہیں میز پر سر ٹیکے آنکھیں بند کر لیں۔ نیند نے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

شکیل اور نسرین دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے بے حد محبت تھی۔ کالج ہی کے زمانے سے وہ ایک دوسرے کو چاہنے لگے تھے۔ شکیل نسرین کے حسن کا دلدادہ تھا اور نسرین شکیل کے افسانوں کی۔ نسرین کو شکیل کے افسانے بے حد پسند تھے۔ وہ اُس کے افسانوں میں کھو سی جاتی۔ جب کبھی شکیل کا کوئی افسانہ کسی پرچے میں شائع ہوتا، نسرین اُسے نہ جانے کتنی بار پڑھتی۔ اُسے شکیل کے افسانوں میں عجیب لطف محسوس ہوتا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ خود بھی اپنے آپ کو شکیل کے افسانوں کا ایک اہم کردار تصور کرنے لگی تھی۔ شکیل اُس کے سپنوں کا راجہ تھا۔ اُس کے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں شکیل ہی شکیل بسا ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ اُسی کے تصور میں کھوئی رہتی۔ شکیل یہ ساری باتیں جانتا تھا۔

ایک دن شکیل اپنے کالج کے احاطے میں ایک درخت سے ٹیک لگائے کچھ سوچ رہا تھا کہ نسرین اپنی سہیلی عذرا کے ساتھ وہاں سے گزری۔ شکیل پر

[illegible] گئے۔ عذرا نے اُس کی طرف دیکھا اور پھر شکیل کی طرف۔ [illegible] شکیل [illegible] کتاب میں کھویا ہوا تھا۔ عذرا نے شوخی سے مسکراتے ہوئے شکیل کی طرف دیکھا اور [illegible] "اُف! اِتنی محویت! خدا کی پناہ!!" نسرین نے گھبرا کر عذرا کی طرف دیکھا۔ عذرا مسکرا [illegible] شکیل نے کتاب بند کر دی اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ نسرین پر جیسے کپکپی طاری ہو گئی۔ شکیل قریب آیا تو اُس کے ہاتھ سے کتابیں چھوٹ گئیں۔ شکیل نے انھیں احتیاط سے اُٹھا کر نسرین کے ہاتھوں میں دے دیں اور مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ عذرا نے نسرین کی طرف دیکھا اور کہا "اری پگلی! یہ تجھے ہو کیا گیا۔ اِتنا اچھا موقع ہاتھ سے جانے دیا۔" نسرین کوشش کے باوجود کچھ نہ کہہ سکی۔

اور اِس کے بعد وہ رفتہ رفتہ ایک دوسرے کے قریب تر ہوتے گئے۔ نسرین کی دلی آرزو پوری ہو گئی۔ شکیل نے ہولے سے اُس کی زندگی میں قدم رکھا اور آگے

◆ ◆◆◆◆◆ ◆ ◆◆◆◆◆ ◆ ◆◆◆◆◆ ◆ ◆◆◆◆◆ ◆ ◆◆◆◆◆ ◆

- گناہ کا آغاز مکڑی کے تار کی مانند نازک ہوتا ہے، لیکن انجام جہاز کے رسّے کی مانند مضبوط اور ناقابلِ شکست ہوتا ہے۔ (عقبہ بن یوسف)
- انسانوں سے محبت کرنا ہی دراصل خدا سے محبت کرنا ہے اور انسانوں کی خدمت ہی دراصل خدا کی خدمت ہے۔ (حضرت ابوذر غفاریؓ)
- قناعت ہی سب سے بڑی دولت ہے۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ)
- دوسروں کے مال کا لالچ نہ کرنا بھی دراصل سخاوت ہے۔ (حضرت امام جعفر صادقؒ)
- عقل جس جگہ کامل ہوگی، حرص و شر ناقص ہوگا۔ (افلاطون)
- جو کوئی جتنا زیادہ بولتا ہے اُتنا ہی کم عقل ہوتا ہے۔ (خلیل جبران)
- دانا وہ ہے جو کم بولے اور زیادہ سُنے۔ (اقلیدس)

◆ ◆◆◆◆◆ ◆ ◆◆◆◆◆ ◆ ◆◆◆◆◆ ◆ ◆◆◆◆◆ ◆ ◆◆◆◆◆ ◆

بڑھتا گیا۔ نسرین جھوم جھوم اُٹھی۔ دل میں مسرت کے نغمے پھوٹنے لگے۔ دل کی بند کلیاں کھِل گئیں اور نسرین ایک نئی لَے، نئی ترنگ لئے ایک انوکھا نغمہ بن گئی۔ وہ اپنے دل میں عجیب سی گدگدی محسوس کرتی۔ ایک عجیب سا درد، ایک عجیب سی ٹیس اُس کے سینے میں ہر وقت رقصاں رہتی۔ اُس کے گلابی رخساروں پر ہر وقت مسکراہٹ رقص کرتی۔ شکیل نے ساز کو چھیڑ دیا۔ نغمے خود بخود بکھرنے لگے۔ نسرین راتوں کو عجیب عجیب سپنے دیکھنے لگی۔ اُس کے سپنوں کا راجہ شکیل مسکراتا آتا ـــــ نسرین اُس کی باہوں میں جھول جاتی اور کہتی "شکیل! اگر تم میری زندگی میں نہ آتے ہوتے تو میں اِن حسین نظاروں سے محروم رہ جاتی۔" اور شکیل کہتا "نسرین! ابھی یہ نظارے بے کیف ہیں، بے جان ہیں۔ اِن میں تو اُسی وقت جان آئے گی جب تم میری بن جاؤ گی۔ اُس وقت یہ کلیاں اپنا گھونگھٹ اُلٹ دیں گی، یہ پھول مسکرانے لگیں گے۔" اور پھر سپنے بکھر جاتے۔

نسرین سوچنے لگتی اِس کے یہ [illegible] سپنے پورے ہوں گے [illegible] کر پا بھی سکے گی یا نہیں۔ اور اگر اُسے شکیل نہ ملا تب کیا ہوگا؟ اُس کے [illegible] جواب دیتیں "شکیل تمھارا ہے! تمھاری محبت میں پاکیزگی ہے۔ [illegible] پھر تم سے شکیل کو کون چھین سکتا ہے۔" اور نسرین کو ایک اطمینان سا ہو جاتا۔

ـــــــــــــ ❦ ـــــــــــــ

دن اِسی طرح گزرتے گئے اور ... اور ایک دن نسرین کا یہ ادھورا سپنا پورا ہو گیا۔ شکیل نے نسرین سے شادی کر لی۔ نسرین نے شکیل کی شریکِ حیات بن کر اُس کی زندگی میں قدم رکھا۔ شکیل کے افسانوں نے ایک نیا موڑ اختیار کیا۔ اب اُن کے افسانوں میں مسکراہٹیں ہوتیں، قہقہے ہوتے۔ ہر افسانے کا ایک نیا انداز ہوتا ـــــ دونوں کی زندگی ایک مسکراہٹ بن گئی ـــــ ہنستے ہنستے دن گزرتے گئے۔

اور پھر اچانک حالات نے رُخ بدلا۔ نسرین کی مسکراہٹیں نہ جانے کہاں کھو گئیں۔ ایک ذرا سی بات افسانہ بن گئی ـــــ ایک روز شکیل کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ میز پر کاغذات بکھرے ہوئے تھے۔ اُسی وقت نسرین کمرے میں داخل ہوئی۔ شکیل کو اِس حالت میں پاکر حیران رہ گئی۔ وہ شکیل کے قریب آئی اور اُسے جھنجوڑ کر کہنے لگی "آخر آپ کو ہوا کیا ہے۔ میں کچھ دنوں سے دیکھ رہی ہوں آپ مجھ سے کچھ کھنچے کھنچے سے رہنے لگے ہیں اور اپنی طرف سے بھی بے پروا نظر آتے ہیں۔ اگر یہی حالت رہی تو ...." کہتے کہتے نسرین خاموش ہو گئی۔ شکیل نے اُس کی طرف عجیب نظروں سے دیکھا اور وہ سہم سی گئی۔ شکیل نے اُس کی طرف اُسی طرح دیکھتے ہوئے کہا "تمھیں ایسی باتیں کرنے کو ہمیشہ ایسا ہی وقت ملتا ہے جب میں کوئی کہانی یا افسانہ لکھتا ہوں یا کوئی نیا پلاٹ میرے ذہن میں اُبھرتا ہے۔" شکیل نے ڈانٹ پلائی۔ "تم مجھے درس دے رہی ہو؟ یہ کیوں نہیں کہتیں کہ اب تم خود بدل گئی ہو۔ کبھی تم میرے افسانوں اور کہانیوں کی تعریف میں زمین آسمان ایک کر دیا کرتی تھیں اور اب تمھیں یہ گراں گزرتا ہے کہ میں گھنٹوں بیٹھ کر کوئی کہانی یا افسانہ لکھتا ہوں۔ کیوں میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟ تم تو یہ چاہتی ہو کہ میں ہر وقت تمھیں دیکھتا رہوں، تمھاری تعریف کرتا رہوں۔ تمھاری اِن خوبصورت آنکھوں کی، اِن سیاہ ریشمیں بالوں اور اِن کے پیچ و خم کی تعریف کرتا رہوں۔ یہی سب تمھیں پسند ہے۔ اور میں یہ سب کر نہیں سکتا۔ ہاں تمھاری اِس آرزو کو اپنے افسانوں میں ضرور پوری کر سکتا ہوں لیکن شاید وہ سب کچھ تمھیں پسند نہیں۔ اِس لئے کہ تمھیں اِن باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔" شکیل نے بیزاری سے کہا اور کمرے سے اُٹھ کر چلا گیا۔ اُس نے نسرین کی طرف دیکھا تک نہیں۔ بس اِتنی سی بات سے دونوں کے دلوں میں تلخی پیدا ہو گئی۔ شکیل کو کیا معلوم کہ اُس کی اِتنی سی بات کا اُس کے نازک دل پر کیا اثر ہوا۔ اِن چند لفظوں نے نسرین کے دل سے

[illegible] ایک [illegible] نسرین کی
[illegible] ان [illegible] پیدا ہو گئی اور نسرین [illegible]
[illegible] ہو گئی ہوں۔ اس کے ہونٹوں پر [illegible] مسکراہٹ
[illegible] اپنے [illegible] ایک [illegible] کر
اس نے [illegible] جذبات کو ٹھیس پہنچائی۔ وہ سب اس نے شکیل سے کیوں کہا۔ کاش اس وقت
اس کی زبان اس کا ساتھ نہ دیتی لیکن اسے کیا معلوم کہ یہ سب کیوں اور کیوں کہے۔ اس نے چاہا کہ شکیل
کو منا لے، اس سے معافی مانگے۔ اس کے لئے اس نے بہت کوشش کی لیکن بے سود۔ شکیل نے اِس
طرح [illegible] نسرین [illegible] میں گھٹتی اور خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتی۔

ایک دن رات کے بارہ بجے تھے شکیل بے خبر سو رہا تھا۔ نسرین اس کے پاس آئی۔
مسہری کے قریب کھڑی شکیل کے مسکراتے چہرے کو دیکھنے لگی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس
کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات اٹھ رہے تھے۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے شکیل کے پیروں کو چھوا اور
بے اختیار اس کی پیشانی چوم لی۔ حسرت و یاس میں ڈوبی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے
لگی۔ اس کا دل بھر آیا۔ بھیگی پلکوں سے موتی گرنے لگے۔ گلابی رخساروں پر آنسو ایسے معلوم ہو رہے تھے
جیسے گلاب پر شبنم کے قطرے ہوں۔

نسرین آنسوؤں سے منہ دھوتی رہی۔ دن گزرتے گئے۔ لیکن شکیل کے رویے میں کوئی
تبدیلی نہ ہوئی۔ نسرین اس غم میں گھلتی رہی لیکن ایک ادیب، ایک فنکار اس کے جذبات و احساسات
کو نہ سمجھ سکا۔ نسرین کا شاداب و شگفتہ چہرہ مرجھا گیا۔ نسرین جو ایک مشرقی لڑکی تھی، اپنی زبان نہ کھولتی۔
سب کچھ خاموشی سے برداشت کرتی رہی۔ ایک شمع کی طرح جو رات کی تاریکی دور کرنے کے لئے خاموش
جلتی رہتی ہے اور اسے سحر کا انتظار ہوتا ہے، نسرین کو بھی شاید اسی کی طرح کسی صبح کا انتظار تھا۔

ایک دن نسرین سر جھکائے کسی کام میں مشغول تھی شکیل کمرے میں داخل ہوا۔ آج وہ
بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ نسرین نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور ششدر رہ گئی۔ آج اس
کے لئے پہلا اتفاق تھا جو شکیل کو اپنے سامنے ... دیکھ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ شکیل
کچھ کہتا دروازہ کھلا اور نسرین کی سہیلی عذرا کمرے میں داخل ہوئی۔ لیکن جیسے ہی اس کی نظر نسرین پر
پڑی وہ حیران رہ گئی۔ نسرین اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی اور آگے بڑھ کر عذرا سے لپٹ گئی۔ عذرا
نے نسرین کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیا اور حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر کہنے لگی: "کیا بات ہے
نسرین تمہاری یہ حالت۔ کیا تم ... کیا تم بیمار تھیں؟"

"نہیں تو۔ میں بھلا بیمار کیوں ہونے لگی" نسرین نے اپنے چہرے پر مسکراہٹ پیدا
کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ آج اچانک مجھ غریب کی یاد کیسے آ گئی؟"

عذرا بولی: "ارے ہاں نسرین! یہ تو میں بھول ہی گئی تھی۔ میں اصل میں اپنے دولہا بھائی
کو مبارکباد دینے آئی تھی۔"

"ہم ... مجھے ... مگر کہیں" شکیل ہکلا کر رہ گیا۔

عذرا نے اپنے بیگ سے ایک کتاب نکالی اور شکیل کی طرف بڑھا دی۔ نسرین حیرت سے
کبھی عذرا اور کبھی کتاب کی طرف دیکھتی۔ عذرا نے [illegible] کتاب کا سرورق [illegible]
شکیل کی تصویر تھی۔ عذرا تصویر کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگی: "چراغِ آرزو۔ جناب کی [illegible]
تخلیق! یہ خوبصورت ناول!!"

نسرین کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو جھلملانے لگے۔ اس نے شکیل کی طرف دیکھا۔ شکیل
نے سر جھکا لیا۔ عذرا کچھ دیکھتے ہوئے کہنے لگی: "کیا بات ہے بھائی جان آپ اور بھابی اِس طرح
خاموش کیوں ہیں؟" شکیل نے سر اٹھا کر عذرا کی طرف دیکھا۔ شکیل کی آنکھوں میں بھی آنسو بھر
رہے تھے۔ پھر اس نے مسکراتے ہوئے کہا: "کچھ نہیں عذرا! میں نے اپنے ناول کے لئے نسرین کے
ساتھ ایک خطرناک کھیل کھیلا۔" اِتنا کہہ کر شکیل آگے بڑھا اور پیار سے نسرین کے شانے پر ہاتھ

- خاموشی سے یہی کیا کم فائدہ ہے کہ بحث مباحثے سے نجات ملتی ہے۔ خاموش رہو یا ایسی بات کہو جو خاموشی کا نعم البدل ہو۔ (ایک مشرقی دانشور)
- خوش خلقی حصول مقصد میں کامیاب کرتی ہے اور خوش کلامی منزلِ مقصود سے قریب تر۔ (عربی ادب)
- میری فضیلت کا راز یہ ہے کہ میں نے اپنے جہل کو سمجھ لیا ہے۔ (حکیم بقراط)
- میں اچھے کردار کے دوست اور بہترین دماغ کے دشمن منتخب کرتا ہوں۔ (آسکر وائلڈ)
- اگر مجھ سے خدا کا تصور چھین لیا جائے تو میں پاگل ہو جاؤں۔ (ولسن)
- آزادی کا یہ مطلب نہیں کہ مذہب و اخلاق کی پابندی نہ کی جائے۔ (پوپ الگزانڈر)
- آرزو نصف زندگی ہے اور بے حسی نصف موت۔ (خلیل جبران)

رکھ کر کہنے لگا: "نسرین! میں بھی کتنا سنگدل انسان ہوں تمہیں کتنا پریشان کیا، کتنا دکھ پہنچایا۔
صرف اپنے ناول "چراغِ آرزو" میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے ——— لیکن میں
بہت خوش ہوں۔ مجھے ناز ہے تم پر کہ تم اِس امتحان میں کامیاب رہیں۔ میری اتنی بے پروائی
اور بے توجہی پر بھی تم نے اپنی زبان نہ کھولی۔ سچ ہے عورت زبان رکھتے ہوئے بھی اُف
نہیں کرتی۔ ہر ظلم سہہ سکتی ہے لیکن کچھ کہہ نہیں سکتی۔ کسی نے سچ کہا ہے ؎

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

میرا یہ ناول اِس حقیقت کا ثبوت ہے" ——— نسرین کے ہاتھ میں ناول تھا اور نظریں اس
کے نام پر۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر ناول میں جذب ہو گئے۔ اس نے ناول کو اپنے سینے
سے لگا لیا۔ شکیل نے جذباتی لہجے میں کہا: "یہ تو میری ایک ادنیٰ تخلیق ہے نسرین! ورنہ درحقیقت
میری آرزوؤں کا چراغ تم ہو!!"

نامور مصنفین کی مشہور کتابیں

شکست کے بعد	کرشن چندر	چار روپیہ پچاس پیسے
طوفان کی کلیاں	"	چار روپے
گرجن کی ایک شام	"	تین روپے
الٹا درخت	"	دو روپے پچھتر پیسے
دروازہ	"	دو روپے پچیس پیسے
سسرال	شوکت تھانوی	دو روپے
مسٹر ۵۰	"	تین روپے پچاس پیسے
بھرا گھر	"	دو روپے پچاس پیسے
جی ہاں چپ ہیں	"	تین روپے پچیس پیسے
جوڑ توڑ	"	پانچ روپے
داماد	"	دو روپیہ پچیس پیسے
گوشۂ عافیت	پریم چند	پانچ روپے
چوگان ہستی مکمل	"	گیارہ روپے
دودھ کی قیمت	"	تین روپے
خاک پروانہ	"	تین روپے
صبح زندگی	راشد الخیری	دو روپے
شب زندگی	"	ایک روپیہ پچیس پیسے
شام زندگی	"	ایک روپیہ پچاس پیسے
سیدہ کی بیٹی	رازق الخیری	تین روپے
سوز پرشش	مجنوں گورکھپوری	ایک روپیہ پچاس پیسے
اقبال	"	چار روپے
گرد کارواں	کنھیا لال کپور	تین روپے
سنگ و خشت	"	دو روپیہ پچاس پیسے
سونا گاچی	جمنا داس اختر	چار روپے پچاس پیسے
شعلۂ سنگ	کرشن چاندپوری	تین روپے پچاس پیسے
شمع	اے آر خاتون	پانچ روپے
چشمہ	"	دس روپے پچھتر پیسے
شکیلہ	مسعود اقبال	چار روپے پچیس پیسے

شکست ظلمت	محمود جالندھری	ایک روپیہ پچھتر پیسے
آندھی کی کلیاں	"	ایک روپیہ پچھتر پیسے
پہلی محبت	"	ایک روپیہ پچیس پیسے
خوابگاہیں	"	تین روپے پچاس پیسے
دنیا کے مشہور سائنسدان	"	دو روپے پچیس پیسے
شائستہ	نادرہ خاتون	چار روپے پچاس پیسے
ظالم	سید امرت	دو روپے پچاس پیسے
فتح خیبر	صادق حسین	چار روپے
مقابلہ	خان محبوب طرزی	تین روپے
نیلوفر	"	تین روپے
اکبری دروازہ	"	چار روپے
دوشیزۂ روم	"	تین روپے
دیوانہ	"	تین روپے
دو دیوانے	"	دو روپے پچاس پیسے
سیلاب	"	تین روپے
گناہ	دت بھارتی	دو روپے پچاس پیسے
اندھیرے اجالے	عادل رشید	تین روپے
بہار آنے تک	"	تین روپے پچاس پیسے
دو پھول	"	تین روپے پچانوے پیسے
مغرور	رئیس احمد جعفری	چار روپے پچاس پیسے
قیامت	ذکی انور	دو روپے پچاس پیسے
سازش	"	دو روپے پچاس پیسے
گورا	ٹیگور	چار روپے پچاس پیسے
لٹ گئی بہار	ضیا عظیم آبادی	تین روپے پچاس پیسے
دل ہی تو ہے	"	چار روپے پچیس پیسے
ممتاز	ایم اسلم	آٹھ روپے
آخری رات	"	پانچ روپے
ریحانہ	"	سات روپے

ودعہ	مہندر ناتھ	چار روپے پچھتر پیسے
گلی گلی	رام لعل	چار روپے
فردوس گوش	حضرت جوش ملسیانی	چھ روپے
کفر و ایمان	ہری چند اختر	چار روپے
وسکی کی بوتل	موہن یاور	دو روپے
لنکن نے کہا	منور لکھنوی	تین روپے
موٹر میکینک گائڈ	شیو ناتھ تسکین	چار روپے
موٹر ڈرائیونگ	کرشنا نند شوا	چار روپے پچاس پیسے
کیا خوب آدمی تھا		ایک روپیہ پچیس پیسے
عجیب لڑکی	اوم پرکاش ناہی	تین روپے
ہمارا نپیل (بچوں کیلئے)	خورشید گرامی	پچاس پیسے
ہمارا سبھاش	" ہندی "	پچاس پیسے
اجالے سے پہلے	ابراہیم جلیس	دو روپے پچاس پیسے
ابھرتے جوبن	اظہر اثر	دو روپے
آندھی میں چراغ	غلام الثقلین	سات روپے پچاس پیسے
اقوال زریں	مصطفےٰ احسن زیدی	پچاس پیسے
انارکلی	امتیاز علی تاج	دو روپے پچاس پیسے
آشا دیپ بجھے نا	ست پرکاش سنگر	دو روپیہ
ابراہیم لنکن	چندر موہن لانبہ	ایک روپیہ پچھتر پیسے
انسانیت موت کے دروازے پر	مولانا ابو الکلام آزاد	تین روپیہ پچاس پیسے
اصلی مکمل باورچی خانہ	جے سی داس ساجد	تین روپے پچاس پیسے
جینے کے لئے	ستیپال آنند	دو روپیہ پچاس پیسے
چھبیس سال بعد	امرتا پریتم	ایک روپیہ پچیس پیسے
حادثہ	قیس رامپوری	پانچ روپے پچاس پیسے
خون	شہزادہ تبسم	چار روپے
رضیہ کا شاہی دسترخوان	رضیہ سلطانہ	دو روپے پچاس پیسے
رسیلی	شہزادہ تبسم	دو روپے پچاس پیسے
زمین کے چھالے	آزاد ملیح آبادی	تین روپے پچاس پیسے

ملنے کا پتہ:- رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج پوسٹ بکس نمبر ۱۳۴۲، دہلی

نمک دان

اقبال سلیم

۱۵۸/ ۷ ڈی. کرشنا راجندرا اسٹریٹ. منڈیا (میسور اسٹیٹ)

۲۲ اکتوبر ۱۹۶۴ء　　　　مکرم و محترم جناب خوشتر صاحب! تسلیم

ادبی لطائف سے کچھ اپنی دلچسپی کچھ قارئین "بیسویں صدی" کے فرمائشی خطوط سے متاثر ہوکر ایک بار پھر "نمک دان" لےکر حاضر ہوا ہوں ــــــ ادبی لطائف بظاہر تفریحِ طبع کا سامان نظر آتے ہیں لیکن کسی شاعر یا ادیب کی شخصیت و کردار کا مطالعہ کرنے میں بڑی حد تک جامعہ مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ ان کی اہمیت کا اب ادبی حلقوں میں اعتراف کیا جانے لگا ہے۔

آپ کا ــــــ اقبال سلیم

شیطان کی آنت

پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھنؤ میڈیکل کالج میں زیرِ علاج تھے۔ اصغر گونڈوی مرحوم اُن دنوں الٰہ آباد میں تھے۔ اُن کا معمول تھا کہ الٰہ آباد سے ہر اتوار کو رشید صاحب سے ملنے ہسپتال آیا کرتے۔ انھی دنوں رشید صاحب کا مضمون "شیطان کی آنت" شائع ہوا تھا۔ ایک دن اُن سے نہ رہا گیا پوچھنے لگے: "اصغر صاحب! آپ ہر ہفتے اتنی دُور سے یہاں آنے کی کیوں ناحق زحمت فرماتے ہیں؟"

"شیطان کی آنت کھینچ لاتی ہے۔" اصغر صاحب نے جواب دیا۔

حاصلِ مشاعرہ غزل

علی گڑھ کے ایک مشاعرے میں جگر مرادآبادی شراب کے نشے میں دھت صدرِ مشاعرہ کے پہلو میں بیٹھے جھوم رہے تھے۔ جب کوئی اچھا شعر سُنتے تو داد دیتے ورنہ بے تکلف لاحول پڑھتے لیکن آواز اتنی مدھم اور نشے میں ڈوبی ہوئی تھی کہ دُور بیٹھے ہوئے سامعین یہ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ جگر صاحب داد دے رہے ہیں یا لاحول پڑھ رہے ہیں۔ ایک شریر طالب علم نے یہ بات نوٹ کرلی۔ وہ جب اپنی غزل سُنانے لگا تو اُس کی غزل کے ہر شعر پر جگر صاحب حسبِ عادت لاحول پڑھنے لگے اور وہ ستم ظریف طالب علم اُن کی ہر لاحول پر جُھک کر انھیں آداب بجالاتا۔ سامعین اِس غلط فہمی میں کہ جگر صاحب داد دے رہے ہیں خود بھی واہ واہ، سُبحان اللہ کا شور بلند کرنے لگتے۔ جب وہ طالب علم پڑھ چکا تو مُسکرا کر جگر صاحب سے کہنے لگا۔

"بس جناب! آپ کی لاحول دھری کی دھری رہ گئی اور میری غزل حاصلِ مشاعرہ ہوگئی۔"

حُسنِ طلب

علی گڑھ کالج کے ایک طالب علم جو خیر سے کالج میں کافی مشہور تھے، مولانا سلیمان اشرف کی کلاس سے متواتر غیر حاضر رہنے لگے۔ مولانا نے اُن کے متعلق دوسرے طلباء سے دریافت کیا تو پتہ چلا کہ حضرت آج کل بہت مصروف ہیں اور اپنے کمرے سے بہت کم نکلتے ہیں۔ ایک دوسرے طالب علم نے اُٹھ کر کہا: "فلاں فلاں کلاس میں تو دیکھے گئے تھے۔"

مولانا نے فرمایا: "آپ اُن سے کہہ دیجئے گا کہ آجایا کریں ؎

میرے غم خانے میں بھی ہوجائے دم بھر چاندنی

فی البدیہہ

مولانا ابوالکلام آزاد بارہ تیرہ برس کی عمر کے تھے کہ کلکتہ کے مشاعروں میں اکثر اپنا کلام سُنایا کرتے تھے۔ غالب کے ایک شاگرد نادر شاہ خاں شوخی رام پوری کو کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ مولانا جو غزلیں مشاعروں میں سُناتے ہیں وہ انھی کی ہوتی ہیں۔ ایک دن مولانا مسجد سے نماز پڑھ کر نکلے ہی تھے کہ شوخی صاحب نے روک لیا اور کہا۔

"میاں! ایک شاگرد نے غزل کے لئے تاک میں دم کر رکھا ہے اور میں بیمار ہوں

قابلِ مطالعہ منتخب شعری مجموعے

عنوان	شاعر	قیمت
	جگر مرادآبادی	پانچ روپے
	ڈاکٹر اقبال	چھ روپے
	جوش ملسیانی	چار روپے
	عرش ملسیانی	تین روپے
	،	ایک روپیہ
	ساحر ہوشیارپوری	تین روپے
	نرش کمار شاد	دو روپے ۲۵ پیسے
	،	دو روپے ۵۰ پیسے
	،	دو روپے ۲۵ پیسے
	،	تین روپے
	،	ایک روپیہ ۵۰ پیسے
	،	تین روپے
	تلوک چند محروم	تین روپے ۷۵ پیسے
	،	سات روپے ۵۰ پیسے
	فراق گورکھپوری	تین روپے ۵۰ پیسے
	،	تین روپے ۵۰ پیسے
	،	دو روپے ۷۵ پیسے
	جگن ناتھ آزاد	چار روپے ۵۰ پیسے
	،	دو روپے ۷۵ پیسے
(حصہ اول)	اکبر الٰہ آبادی	پانچ روپے
حصہ دوم	،	چھ روپے
	اختر شیرانی	آٹھ روپے
	شکیل بدایونی	تین روپے
	،	دو روپے ۲۵ پیسے
	جگی رضا	تین روپے ۵۰ پیسے
	کرشن موہن	پانچ روپے
	،	چھ روپے

عنوان	شاعر	قیمت
خرابات	عبدالحمید عدم	چار روپے
رم آہو	،	چار روپے
گلنار	،	دو روپے ۲۵ پیسے
قول و قرار	،	تین روپے ۵۰ پیسے
گردش جام	،	دو روپے ۲۵ پیسے
بطِ مے	،	دو روپے ۲۵ پیسے
تجر	قتیل شفائی	تین روپے
جھومر	،	تین روپے
روزن	،	تین روپے
جلترنگ	،	دو روپے ۲۵ پیسے
گفتنی	محمود سعیدی	دو روپے
نئی صبح	ضیا فتح آبادی	ایک روپیہ
طلوع	،	۷۵ نئے پیسے
نورِ مشرق	،	ایک روپیہ ۵۰ پیسے
آہنگِ غزل	پورن سنگھ ہنر	دو روپے ۵۰ پیسے
شہرِ دل	محسن زیدی	دو روپے
سفینہ و ساحل	عزیز وارثی	چار روپے

آئینۂ اصلاح ابوالفصاحت جوش ملسیانی کی اصلاحات شاگردوں کے کلام پر معہ توجیہہ اس کتاب میں درج ہیں۔ یہ کتاب مبتدی اور فن نہ جاننے والے شعراء کے لئے رہنما کا کام دے گی۔ قیمت تین روپے۔

جوش ملسیانی کے مکمل حالات زندگی، انتخاب کلام شاگردوں کے حالات اور کلام، تصویریوں کے ۸۴ صفحے۔ ضخامت ۵۰۰ صفحات۔ موجودہ دور کی بے مثل کتاب۔ قیمت دس روپے۔

مضراب شباب للت کے ایک ایک شعر میں اس کا اپنا دل دھڑکتا ہے اور ان دھڑکنوں میں اس نے سارے

جہان کے دکھ درد سمیٹ لئے ہیں۔ قیمت تین روپے۔

گلستانِ ہزار رنگ جس میں تقریباً چار ہزار شعراء کے اشعار عنوان وار ترتیب دئے گئے ہیں۔ اس یادگار کتاب کا مقدمہ مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا اور ہندی کتاب کا ڈاکٹر راجندر پرشاد نے۔ مولانا آزاد اور ڈاکٹر راجندر پرشاد کا نام نامی ہی اس بات کی ضمانت ہے کہ یہ کتاب کس پایہ کی ہوگی۔ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین، جناب رشید احمد صدیقی اور جناب نیاز فتحپوری نے اس کتاب کو اس صدی کی بہترین کتاب قرار دیا ہے۔ اُردو ایڈیشن دس روپے۔ ہندی ایڈیشن سات روپے ۷۵ پیسے۔

شاہنامۂ اسلام جناب حفیظ جالندھری کا شاہنامۂ اسلام۔ چار حصوں میں جن میں تیرہ سو سال اسلامی تاریخ کو منظوم کیا ہے۔ ہر حصہ قریباً تین سو صفحات کا ہے تازہ ایڈیشن اصلاح کے بعد چھپا ہے۔ قیمت سولہ روپے، اب صرف نو روپے میں پیش کیا جارہا ہے۔ محصولڈاک ایک روپیہ ۵۰ پیسے الگ ہوگا۔

تلامذۂ غالب غالبیات کے مشہور ماہر مالک رام صاحب کی گرانقدر تصنیف۔ اس کتاب میں غالب کے ۱۴۶ شاگردوں کی مکمل سوانح حیات اور کلام درج ہیں۔ پورے صفحہ کی تقریباً تیس تصاویر بھی شامل کتاب ہیں۔ ہندوستان بھر کے ادیبوں کا فیصلہ ہے کہ یہ کتاب بہترین ادبی تحفہ ہے۔ قیمت فی جلد سات روپے ۵۰ پیسے۔

کفرو ایمان پنڈت ہری چند اختر کا مجموعۂ کلام حضرت اختر کا نام نامی ہی اس کتاب کی اہمیت و افادیت کا ضامن ہے۔ کلام میں طنز کے نشتروں کے ساتھ درد مند دل کی گرمی بھی ہے۔ قیمت چار روپے۔

کلامِ بے لگام ابن انشا دہلوی کا نادر مجموعۂ کلام جس کے ہر شعر میں اکبر الٰہ آبادی کا رنگ جھلکتا ہے۔ طنز و مزاح کا رنگین گلدستہ، ۲۵۲ صفحات پر مشتمل دوسرا ایڈیشن شائع ہوگیا۔ قیمت مجلد چھ روپے۔

یہ شعر کس وقت کہا ہو گا ۔۔۔۔۔ انھوں نے زمین بتائی " یاد نہ ہو ۔۔۔۔ شاد ہو "

مولانا نے ایک کتب فروش کی دکان پر بیٹھے بیٹھے یہ شعر اسی وقت کہہ دیئے۔ لیکن انھوں نے مزید اطمینان کے لئے کہا: " اشعار کی تعداد طاق ہونی چاہئے " مولانا نے ایک لمحہ توقف کے بعد یا تال پڑھا شعر

وعدۂ وصل بھی اک طرفہ تماشے کی ہے بات
میں تو بھولوں نہ کبھی، ان کو کبھی یاد نہ ہو

پھبتی

مہاراجہ سخن غالب کی طرح حضرت شغل اکبرآبادی بھی بلا کے ظریف اور بذلہ سنج شاعر تھے۔ مہاراجہ بلوان سنگھ کے یہاں مشاعرہ تھا۔ مہاراجہ نے حاضر کے لئے حقے بھروا رکھے تھے اور خود بیٹھے سٹک پی رہے تھے۔ خوب موٹے تازے، گوری چٹی رنگت، گول چہرہ پر گھنی سیاہ داڑھی اور منہ میں حقے کی نے۔ شغل نے یہ رنگ ڈھنگ دیکھے تو منہ سے بے ساختہ نکل گیا ۔

دور سے تو مجھے بلور نظر آتا ہے

مہاراجہ نے سنا اور منہ سے سٹک نکالی ہی تھی کہ شغل نے دوسرا مصرعہ بھی کھینچ مارا ۔

دم چباتا ہوا لنگور نظر آتا ہے

ڈر

بابائے طنز اکبر مرحوم سے صہبا نام کے ایک درویش صفت مگر با مذاق شاعر اکثر ملنے آیا کرتے تھے۔ ایک دن اکبر نے فرمایا: " بھائی صاحب! آپ نماز عشا یہیں محلہ کی مسجد میں پڑھ لیا کیجئے۔ میں بھی آجایا کروں گا۔ اس کے بعد دونوں گھر چلے جائیں گے تو لطف صحبت رہے گا " ۔۔۔۔ انھوں نے منظور کر لیا۔ لیکن اگلی صبح آتے ہی کہنے لگے۔

" معاف کیجئے گا! شب کو حاضر نہ ہو سکا۔ بات یہ تھی کہ مسجد میں داخل ہوا تو لق و دق عمارت بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ وہ دہشت، وہ سناٹا، وہ ویرانی۔ توبہ توبہ! "

اکبر کی رگ طنز پھڑکی، مسکرا کر فی البدیہہ یہ شعر پڑھا ۔

شیخ جی رات کو مسجد میں نہیں جاتے ہیں
یعنی ڈرتے ہیں کہ بیٹھا کہیں اللہ نہ ہو

چوٹ

مولانا گرامی اور حضرت داغ کے درمیان جو نظام دکن کے استاد بھی تھے، معاصرانہ چشمک تھی۔ ایک دن داغ نے نظام کی خدمت میں بہ سبیل غیبت کہا: " حضور! یہ شخص شعر کیا خاک کہے گا۔ شاید کہیں سے قلمی دواوین ہاتھ آگئے ہیں اور اب اپنے نام سے چھپتا ہے "

مولانا عبدالحلیم شرر کے ذریعہ یہ بات مولانا گرامی تک پہنچی۔ بس پھر کیا تھا۔ گرامی نے نہ صرف داغ کی ہجو کہی بلکہ دوسرے دن سر دربار پڑھ بھی دی۔ داغ جل بھن کر خاک ہو گئے۔ نوبت درشت کلمات تک پہنچی۔ گرامی نے موقع پا کر کہا: " میں بھلا شعر کہنا کیا جانوں۔ یہ بھی کسی استاد کا غیر مطبوعہ کلام ہو گا "

شعر اور شیر

شاہد احمد دہلوی کے والد محترم مولانا بشیر الدین احمد کسی کام کے سلسلے میں حیدرآباد میں مقیم تھے۔ انھوں نے ایک چھیپی کو چند سادے دسترخوان دیئے کہ ان پر شعر چھاپ لاؤ۔ کچھ دنوں بعد وہ چھیپی دسترخوان لے کر حاضر ہوا تو دیکھنے والوں نے حیرت سے دیکھا کہ دسترخوان کے حاشیوں پر نیلے اور لال شیر چھپے ہوئے تھے۔ منہ پھاڑے ہوئے، دم اٹھائے ہوئے جیسے ابھی حملہ کر دیں گے۔ مولوی صاحب نے حیران و پریشان ہو کر پوچھا: " اے کمبخت! یہ تو نے کیا کیا؟ "

وہ معصومیت سے بولا: " سرکار ہی تو بولے تھے کہ ان پر شیران چھاپ لاؤ "

مضمون نگار حضرات سے

درخواست ہے کہ مضمون حاشیہ چھوڑ کر خوشخط لکھا کریں۔ اور سطور کے درمیان کافی جگہ چھوڑا کریں۔ بعض اچھے مضامین محض بدخط ہونے کی وجہ سے رہ جاتے ہیں۔ ہمیشہ غیر مطبوعہ مضامین بھیجیں اور ایڈیٹر کی اطلاع کے لئے مضمون کے خاتمے پر غیر مطبوعہ لکھیں۔ بعض مضمون نگار مطبوعہ مضامین بھیج دیتے ہیں۔ یہ نہایت نامناسب اور غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے۔ اپنے پاس اپنے مضامین کی نقل ضرور رکھیں۔ کیونکہ ناقابل اشاعت مضامین ضائع کر دیئے جاتے ہیں۔ مضمون کے خاتمے پر اپنا پورا پتہ لکھ دیا کریں۔ نوآموز حضرات مضامین بھیجنے سے پہلے کسی استاد سے مشورہ لے لیا کریں۔ اگر وہ چاہیں کہ مرسلہ مضامین ناقابل اشاعت ہونے کی صورت میں انھیں واپس کر دیئے جائیں تو مضمون کے ساتھ ٹکٹ بھیجنے کی بجائے اپنا پورا پتہ لکھا ہوا پوسٹ آفس کا لفافہ ارسال فرمائیں۔ ورنہ ہم مضمون کی واپسی سے قاصر رہیں گے۔ (ایڈیٹر)

سالنامہ دیکھا

اہلِ قلم حضرات کی رائیں

... جس طرح خوشتر گرامی اور بیسویں صدی لازم و ملزوم ہو چکے ہیں اسی طرح بیسویں صدی اور سالنامہ عظمت میں بھی چولی دامن کا ساتھ پیدا ہو چکا ہے۔ اس لئے جب بیسویں صدی کا تازہ سالنامہ ہمارے پاس برائے تبصرہ موصول ہوا تو ہمیں اس خاص نمبر کی عظمت، چکاچوند، وقار اور اعلیٰ ادبی معیار پر کوئی تعجب نہیں ہوا یہ سالنامہ نہیں بلکہ موجودہ اُردو ادب کے ارتقاء کی ایک سالہ خوبصورت تاریخ ہے۔ اس کے مطالعے سے آپ کے ذوقِ ادب کی ہی تسکین نہیں ہوتی بلکہ مستقبل کے اُردو ادب کی واضح جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے مسلّمہ اور نامور افسانہ نگاروں، ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ نئے اُبھرتے ہوئے فنکار بھی اپنی اچھوتی تخلیقات کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ اور ہم بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ یہ عظیم مرقع بیسویں صدی کے زندۂ جاوید ایڈیٹر خوشتر گرامی کا ناقابلِ فراموش کارنامہ ہے...

روزنامہ "ملاپ" (دہلی)

... یہ سالنامہ بھی سابقہ سالناموں کی طرح بہت شاندار اور قابلِ مطالعہ ہے۔ غزلوں اور افسانوں کا معیار بہت پاکیزہ، سبق آموز اور فکر انگیز ہے۔ لکھنے والوں میں ہندوستان کے وہ مشاہیر ہیں جن کے قلم پر ادب اور زبان فخر کرتی ہے۔ اس سالنامہ میں ۱۸ افسانے شریکِ اشاعت ہیں مگر ان میں کوئی افسانہ اخلاق سوز، سوقیانہ اور مبتذل نہیں۔ انہیں گھر کی لڑکیاں اور بڑی بوڑھیاں کسی تردد کے بغیر پڑھ سکتی ہیں۔ افسانوں کا کمال ہی یہ ہے کہ ہر شریف نظر اسے داد تحسین دے سکے۔ شاعروں میں ممتاز شعراء اور افسانہ نگاروں میں مشاہیر اہلِ قلم شامل ہیں۔ مجموعی حیثیت سے بیسویں صدی کو اس صدی کا افسانوی شاہکار سمجھنا چاہئے...

روزنامہ "الجمعیۃ" (دہلی)

... سالنامہ اس قدر حسین و جمیل ہے اور ایسے بیش قیمت اور رنگین پُر وقار مضامین نظم و نثر سے مالا مال کہ ماہِ مبارک میں جبکہ میرا زیادہ تر فرصت کا وقت تلاوتِ کلامِ پاک میں گزرتا ہے بیسویں صدی کے اس دلکش سالنامے کی نذر کرنا پڑا۔ یہ کوئی رسمی تعریف اور خوشامد نہیں بلکہ اظہارِ حقیقت ہے کہ آپ کا ہر خاص نمبر اپنے گذشتہ نمبر سے بہتر ہی ہوتا ہے...

پروفیسر حفیظ بنارسی (آرہ)

... سالنامہ کیا ہے ایک ایسا تعویذ ادب ہے جو افسانہ و شعر کے متوالوں کے لئے حرزِ جاں کی حیثیت رکھتا ہے۔ لباس و زیور میں لپٹی ہوئی اس عروس جمیل کا حسن دامنِ دل کو اپنی جانب کھینچنے میں بے حد کامیاب ہے۔ ہر ہر تخلیق اپنی اپنی جگہ ایک نگینہ کی طرح جڑی ہوئی ہے...

سید حسین رضوی (اعظم گڑھ)

... محترم خوشتر گرامی کے ہاتھوں مرتب کیا ہوا یہ پاکیزہ سالنامہ پڑھ کر جو مسرت حاصل ہوئی کہ لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ اپنے وطن عزیز سے بہت دور لندن میں بیٹھ کر سالنامہ کے مطالعے سے یہ محسوس کر رہا ہوں، جیسے میں آپ ہی کے پاس بیٹھا ہوں اور غریب الوطنی کا احساس زائل ہو گیا ہے۔ وطن کا اس سے بڑھ کر تحفہ میرے لئے اور کیا ہو سکتا تھا۔ ــــ تمام مضامینِ نظم و نثر اعلیٰ اور معیاری ہیں...

حافظ گلا سگو (لندن)

... یہ خوبصورت شمارہ خصوصی قصیدہ خوانی سے بالاتر ہے۔ آپ کی محنتوں اور کاوشوں کی تعریف کیسے کروں۔ حسبِ معمول یہ شمارہ بھی بہت خوب ہے ــــ بہت دنوں کے بعد محترمہ واجدہ تبسم کے ساتھ آپ کی تصویر دیکھی۔ وہی آب و تاب اور وقار ہے چہرے پر۔ آپ سے میری ملاقات کو بارہ سال گزر گئے اس عرصے میں جہاں حیرت انگیز تبدیلیاں نمودار ہوئیں وہاں زمانے کے سرد و گرم نے آپ پر ذرا بھی اثر نہ کیا۔ زندہ باد خوشتر گرامی...

یونس احمد (کراچی)

... چلتے پھرتے افسانوں کی حسین دنیا کے خوبصورت شہر لندن میں بیسویں صدی کا سالنامہ پڑھا۔ فن پارے بہت پسند آئے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر افسانہ دوسرے سے بڑھ کر ہے۔ سالنامہ کے ذریعہ جب اپنے محبوب دوست پروفیسر عاصی کرنالی اور صبا ای طاہرہ شباب سے ملاقات ہوئی تو خوشی کی انتہا نہ رہی...

ڈاکٹر بشیر قریشی (ایف آر سی ایس) (لندن)

... سب بولیات نمبر بھی شاہکار مضامین نظم و نثر کا حسین گلدستہ ہے اس کی ترتیب و تدوین پر آپ کو جس قدر بھی داد دی جائے کم ہے...

روشن گیلانی (ملتان)

... [illegible] سالنامہ اُردو ادب میں ایک سنگِ میل ہے۔ بے حد پسند [illegible] ہاتھوں ہاتھ لیا۔ لندن میں اس کی مقبولیت دیکھ کر بے پایان [illegible]

[illegible] سودیو، انگلینڈ)

... رنگ و نور کا پیکر، حسن و جمال کا مخزن، زبان و ادب کا نقرئی مینارہ سالنامہ بیسویں صدی نے اپنے حسین دامن میں تمام تر رعنائیوں اور رنگینیوں کے ساتھ ضیابار و نظر نواز جواہر میں نے افسانوی ادب کی اس تاریخی دستاویز کو محفوظ کر لیا ہے ...

اکرم فاروقی (امروہہ)

... "خاص نمبر" اور "سالنامے" نکالنا آپ کو آتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں آپ کے سلیقۂ حسنِ ترتیب اور نگاہِ فن شناس کی داد بھی بقدرِ معیار نہیں پیش کر سکتا۔ دراصل آپ کا کام داد سے بالاتر ہے ...

عنوان چشتی (جامعہ ملیہ دہلی)

... "بیسویں صدی" ہماری تہذیب کا علمبردار ہے اور اُردو ادب کا پیشوا۔ ۱۹۶۵ء کا سالنامہ ایک تاریخِ ادب ہے۔ اتنا حسین و جمیل با مقصد سالنامہ نکالنے پر میری مبارکباد قبول فرمائیے ...

رشید جعفری (آنولہ)

... اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کا نام اُردو ادب کے محسنوں میں لکھا جائیگا ہے۔ ایسے نازک وقت میں اور ناموافق حالات میں اُردو کی اتنی خدمت کرنا کوئی معمولی کام نہیں۔ اور وہ بھی ہندوستان کے دل میں بیٹھکر ...

پروفیسر مقبول احمد خان (نوشہرہ)

... سالنامہ کی جس قدر تعریف کروں کم ہے۔ اس نمبر نے نہ صرف "بیسویں صدی" کی شاندار روایات کو زندہ اور برقرار رکھا ہے بلکہ ان روایات کے سفر میں سنگِ میل کا کام کیا ہے ...

دھرم پال جرنلسٹ (دہلی)

... سالنامہ پاکر مجھے یہ محسوس ہوا جیسے کسی عروسِ لالہ کے معطر پیرہنِ منقش سے میرا ذہن و دماغ معطر ہو رہا ہے۔ اس ادبی شہپارہ کی ایک ایک سطر بادۂ جانفزا کی طرح اپنے جذبات و احساسات میں اُتار لی ...

ظہیر گیفی امروہوی (امروہہ)

اعلان

گلستان ہزار رنگ (مجموعۂ اشعار بعنوان مقدمہ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد) کی دوسری اشاعت کی تیاری کی جارہی ہے طبع اول کی ساری جلدیں ختم ہو گئیں۔ شعرائے کرام سے التماس ہے کہ اپنے کلام کا انتخاب مع مختصر سوانح مؤلف کے پاس مندرجہ ذیل پتہ پر جلد روانہ فرمائیں۔

سید بہاؤالدین احمد۔ ڈسٹرکٹ و سیشن جج، مظفرپور، بہار

قابلِ مطالعہ معیاری کتب

سیرت خاتم الانبیاء	مولانا محمد شفیع صاحب	ایک روپیہ پچیس پیسے
سوشلزم	پرنسپل چھبلداس	ایک روپیہ پچاس پیسے
معیک خوابوں	کشور زیدی	دو روپے
اردو	جگن ناتھ آزاد	پچاس پیسے
تعلیم دینے کا فن	ڈاکٹر منوہر سہائے انور	تین روپیہ پچاس پیسے
ذوقِ جنوں	آل احمد سرور	تین روپے پچاس پیسے
ریشم کی کشیدہ کاری		تین روپے پچاس پیسے
شبنم کشیدہ کاری		ایک روپیہ
شمع کشیدہ کاری		چار روپے پچاس پیسے
قدسیہ کشیدہ کاری		ایک روپیہ
دلہن کشیدہ کاری		دو روپیہ پچاس پیسے
بیگم کشیدہ کاری		ایک روپیہ پچاس پیسے
گلشن کشیدہ کاری	زینب انور	دو روپیہ

سوم و صبا	جوش ملیح آبادی	آٹھ روپے
شکوہ جواب شکوہ	ڈاکٹر اقبال	پچیس پیسے
بال جبریل	"	تین روپے پچاس پیسے
اکبینندن گرنتھ	جوش ملسیانی	دس روپے
نقشِ فریادی	فیض	دو روپے پچیس پیسے
آہنگِ حجاز	عرش ملسیانی	ایک روپیہ
ہفت رنگ	عرش ملسیانی	تین روپے
قول و قرار	عبدالحمید عدم	دو روپیہ پچاس پیسے
رنگ و آہنگ	"	ایک روپیہ
آہنگ	مجاز	تین روپے
شگفتہ	ساغر نظامی	بارہ روپے
گلستان ہزار رنگ	سید بہاؤالدین	دس روپے
سنگم	نرلش کمار شاد	تین روپے

سرگذاندو و اند	نرلش کمار شاد	دو روپے پچاس پیسے
پھوار	"	دو روپے پچاس پیسے
رنگ	"	دو روپے پچیس پیسے
ڈارلنگ	"	دو روپے پچاس پیسے
آتش گل	جگر مرادآبادی	پانچ روپے
صنم و حرم	شکیل بدایونی	ایک روپیہ
رعنائیاں	"	تین روپے پچاس پیسے
گفتنی	مخمور سعیدی	دو روپے
گلِ رعنا	ہنس لال رعنا جگی	تین روپے پچاس پیسے
دلِ ناداں	کرشن موہن ایم اے	چھ روپے
شبنم شبنم	"	پانچ روپے
تماشائی	"	ایک روپیہ
گردِ راہ	ضیا فتح آبادی ایم اے	تین روپے پچاس پیسے
ساز و نغمہ	بسمل کپور تھلوی	تین روپے
آہنگِ حیات	پروفیسر نشار الرحمان خاں نشا	ایک روپیہ ۵۰ پیسے

ملنے کا پتہ :- رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج پوسٹ بکس نمبر ۱۳۴۲، دہلی

زندگی بخش معلوماتی مقالات اور مفید کارآمد اشارات

۱۔ صحت کے لئے سبزیاں کیوں ضروری ہیں؟

دُنیا کے بڑے بڑے محققوں اور سائنس دانوں نے جدید ترین تحقیقات سے یہ ثابت کیا ہے کہ صحت کو برقرار رکھنے کے لئے سبزیوں کا استعمال بہت ضروری ہے۔ ڈاکٹر ایڈورڈ مسعود ایم۔بی۔ایف۔آر۔ایس کہتے ہیں کہ "جسم کی صحت، توانائی اور طاقت کے لئے جو معدنی اشیاء درکار ہیں وہ سب سبزیوں میں پائی جاتی ہیں۔ جسم کی طاقت قائم رکھنے کے لئے سبزیاں ضروری اور مفید ہیں"۔

ڈاکٹر سر ہنری ٹامسن کی تحقیق ہے کہ "انسانی جسم کی تمام طبعی ضروریات سبز ترکاریوں سے پوری ہو سکتی ہیں۔ حرارت، طاقت اور جسمانی نشو و نما کے لئے جتنی چیزیں درکار ہیں وہ سب سبز ترکاریوں سے مل سکتی ہیں"۔

سبز ترکاریوں میں وٹامنز کی مقدار دوسری غذاؤں سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ وٹامنز کی موجودگی نہ صرف جسمانی نشو و نما اور صحت کے لئے لازمی ہے بلکہ بہت سی بیماریوں کو روکنے میں مدد و معاون ہوتی ہے۔ سبزیوں کے بغیر ہماری خوراک مکمل نہیں ہو سکتی۔ سبز ترکاریاں تو طاقت بخش اجزا کی ایک کان ہے جس میں وٹامنز، فولاد، تانبا، چونا اور فاسفورس ہوتے ہیں۔ اور یہ تمام چیزیں ہمارے جسم کی نشو و نما اور پرورش کے لئے ضروری ہیں یہ چیزیں جسم کی قوت بڑھانے، اسے مضبوط بنانے، قوتِ ہاضمہ کو تیز کرنے اور جسم کو بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے لئے دیگر اجزاء سے کہیں زیادہ مفید ہیں۔

ساری غذاؤں کے ہضم میں تیزابی مادہ پیدا ہوتا ہے جو کئی طرح کی تکالیف پیدا کرتا ہے لیکن سبزیوں میں تیزابی مادے کو زائل کرنے کی قوت ہوتی ہے۔ اس لئے سبزیاں کافی مقدار میں کھانی چاہئیں۔

چونکہ سبزیوں میں نمکیات، معدنیات اور وٹامنز زیادہ مقدار میں ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کا استعمال جگر، گردے، مثانہ کی پتھری اور پرانے قبض کی شکایت میں بہت مفید ہے۔ سبزیاں زود ہضم اور قبض کشا ہوتی ہیں۔ انتڑیوں کو صاف کر کے انھیں طاقت بخشتی ہیں۔ اس لئے سبزیوں کا استعمال صحت اور زندگی کے لئے بہت ضروری اور بہت مفید ہے۔ سبزیوں میں شامل نمکیات سے خون معتدل اور صاف رہتا ہے۔ انسان خون اور جلد کے امراض سے بچا رہتا ہے اور قبض کی شکایت بھی نہیں ہوتی۔

ہماری غذا میں لوہا، چونا، فاسفورس، آیوڈین اور سلفر وغیرہ قدرتی کھار (نمکیات) ہونے چاہئیں۔ ورنہ ہمارا جسم مختلف امراض کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ تمام نمکیات جو انسانی صحت کے لئے ضروری ہیں سبز پتے والی ترکاریوں میں بکثرت موجود ہوتے ہیں۔ خصوصاً پالک، کاہو، قلفہ، بتھوا، پت گوبھی، سرسوں کا ساگ اور شلغم کے پتوں میں اتنی زیادہ مقدار میں ہوتے ہیں کہ سیب اور سنگترہ بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ بالفاظ دیگر پتوں میں جوہرِ حیات بھرا رہتا ہے۔

دودھ جسے ہم ایک اعلیٰ غذا کہتے ہیں انھیں ساگوں اور سبزیوں کا دوسرا روپ ہے۔ ساگ اور دودھ ایک دوسرے کا بدل ہیں۔ جہاں دودھ نہ ملے وہاں سبزیاں بکثرت کھانے سے اس کی تلافی ہو سکتی ہے۔ گائے، بھینس، بیل، بکری وغیرہ جانوروں کو ہری گھاس اور سبز پتے نہ ملیں تو ان کی نشو و نما ہی رک جاتے۔ دودھ میں تمام اناجوں کی بہ نسبت کیلشیم (چونا) کی مقدار زیادہ ہوتی ہے اور یہ جانوروں کے دودھ میں سبز چارہ ہی کی بدولت ہے۔ دودھ ہماری صحت اور زندگی کے لئے بہت ضروری ہے اور دودھ کو یہ وصف سبز چارے ہی سے حاصل ہوا ہے۔ گرانی کے موجودہ دور میں جبکہ خالص دودھ ایک روپیہ سیر بھی بمشکل دستیاب ہوتا ہے، ماہرین کی رائے ہے کہ جو لوگ دودھ حاصل نہیں کر سکتے وہ سبز پتے دار ساگ اور سبزیاں استعمال کر کے دودھ کے فوائد حاصل کر سکتے ہیں۔ سبز پتے دار ساگ دودھ کی کمی کو یقیناً پورا کرتے ہیں۔ دراصل یہ ہرے پتوں کا رس ہی ہے

[illegible] دودھ میں تبدیل کر دیتی ہیں۔

بچوں کی نشوونما اور پرورش کے لئے ساگ اور سبز ترکاریاں بہت ضروری ہیں۔ اگر ان میں بچپن ہی سے ساگ اور سبزیوں کی رغبت پیدا کی جائے تو یہ عادت زندگی بھر ان کی صحت کی حفاظت کرتی ہے۔ بچے جب دودھ سے ٹھوس غذا کی طرف آنے لگیں تو انھیں پالک وغیرہ نرم ساگ اور سبزیاں خوب اچھی طرح پکا کر دی جائیں۔

بیسویں صدی کے تجربات کے مطابق سبزیوں میں جو ہرا رنگ ہے وہ کھانے کے بعد جسم کے اندر خون میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ سبز پتوں والے ساگ نمک اور معدنیات کی کان ہیں۔ خون میں تیزابی مادہ بڑھ جانے سے انسان مختلف امراض میں گرفتار ہو جاتا ہے اور خون میں نمکیات کی مقدار بڑھنے سے امراض سے نجات مل جاتی ہے اس لئے ساگ سبزیاں کھانے سے انسان امراض سے بچا رہتا ہے۔ ان میں خون کی صفائی کرنے والے اجزاء بکثرت پائے جاتے ہیں۔ اس لئے خون کی خرابی سے پیدا شدہ امراض سبزیوں کے استعمال سے دور ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہرے پتے والے ساگ کھانے سے کوڑھ کو بھی فائدہ پہنچتا ہے۔ سبزیاں امراض جلد خارش، پھوڑے پھنسی کے لئے بھی مفید ہیں۔

ساگ اور سبز ترکاریوں میں ریشے زیادہ ہوتے ہیں۔ آنتوں میں ریشے پہنچنے سے آنتوں کی صفائی ہو جاتی ہے اور قبض سے بھی نجات مل جاتی ہے۔ قبض کے باعث آنتوں میں فضلہ کی سڑاند پیدا ہونے سے اکثر بیماریاں پیدا ہوتی ہیں اور سبز ترکاریاں کھانے سے انسان متعدد امراض سے محفوظ رہتا ہے۔

حاملہ عورتوں اور دودھ پلانے والی ماؤں کے لئے سبز ترکاریاں اور ساگ اکسیر کا حکم رکھتے ہیں۔ اس سے زچہ اور بچہ دونوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ ماں کا دودھ بڑھتا ہے اور بچے کو صحت مند دودھ حاصل ہوتا ہے۔

کچی سبزیاں کھانا زیادہ سود مند ہے۔ پکانے سے وٹامنز ضائع ہو جاتے ہیں۔ انھیں پانی کے بغیر یا نرم آنچ پر تھوڑے سے پانی میں پکانا چاہیے جو پکتے پکتے انھیں میں جذب ہو جائے۔ کچی سبزی کھانا بہت مفید ہے۔ گاجر، مولی، ٹماٹر، شلغم، کھیرا، پیاز اور سلاد وغیرہ کچے کھائے جا سکتے ہیں۔

سبزیاں وزن میں ہلکی اور حجم میں زیادہ ہوتی ہیں۔ اس لئے ہاضمہ میں مدد دیتی ہیں۔ اور قبض نہیں ہونے دیتیں۔

اروی، آلو، چقندر، شکر قندی اور کئی سبزیوں میں نشاستہ کی مقدار گندم اور چاول کی نسبت زیادہ ہوتی ہے۔

مٹر، فراش بین، باکلا، سیم وغیرہ میں پروٹین کافی ہوتی ہے۔ اس لئے انھیں غذا میں کافی استعمال کرنا چاہیے۔

سبزیاں قدرت کا گرانمایہ عطیہ ہیں۔ ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہیے۔

۲ـــــــ سگریٹ نوشی کی تباہ کاریاں

سگریٹ نوشی کے مہلک اثرات کے متعلق آپ بہت کچھ جانتے ہوں گے، بہت کچھ پڑھ چکے ہوں گے۔ لیکن اس بارے میں بہت کچھ جانتے ہوئے بھی لوگ اس مہلک عادت کو ترک نہیں کرتے، یا اس سے چھٹکارا نہیں پا سکتے۔ اس لئے بار بار خطرے کا الارم بجاتے رہنا ضروری ہے۔

ڈاکٹر کلارنس لیپ نے لکھا ہے ـــــ "صحت مند اور تندرست لوگوں کے لئے سگریٹ نوشی حد درجہ مضر ہے ہی، لیکن جن کی صحت اچھی نہ ہو، ان کے لئے میری رائے ہے وہ فوراً سگریٹ پینا چھوڑ دیں۔ صرف چار ہفتوں کے لئے۔ اور چار ہفتے کی بعد کی صحت کا پچھلی صحت سے مقابلہ کر کے دیکھیں کہ اس میں کتنی تبدیلی ہوئی ہے۔ طبیعت میں نئی جولانی پیدا ہوئی ہے، بھوک بڑھی ہے۔ اپنے تندرست ہونے کا احساس پیدا ہوا ہے، اگر آپ کو اپنے میں یہ تبدیلیاں محسوس ہوں تو سمجھ لیجئے کہ سگریٹ چھوڑنے سے پہلے آپ کی زندگی زہر آلود ہو گئی تھی۔"

ڈاکٹر اسٹیورٹ آر۔ رابرٹس نے لکھا ہے ـــــ "سگریٹ پینے والے کا دل کمزور ہو جاتا ہے ـــــ اور جب دل ڈوبا تو سب کچھ ڈوب گیا۔"

ڈاکٹر ہارٹ، ڈبلیو۔ ولی نے ایک موقع پر کہا تھا ـــــ "تمباکو موت کا ایک قریبی رشتہ دار ہے۔ اس کا خاص زہریلا جزو نکوٹین ہوتا ہے، جو سگریٹ پینے والے کی ہلاکت کا باعث بن سکتا ہے۔"

گذشتہ دنوں وزیر صحت نے لوک سبھا میں انکشاف کیا کہ "امریکن ڈاکٹروں نے سگریٹ پینے کے نقصانات کے متعلق جو رپورٹ مرتب کی ہے حکومت اس پر غور کر رہی ہے۔ حکومت سگریٹ کی تباہ کاریوں اور ایسے مہلک نتائج سے آگاہ ہے۔ جوں جوں سگریٹ پینے کی بدعت بڑھ رہی ہے لوگ پھیپھڑوں کے کینسر (سرطان) میں گرفتار ہو رہے ہیں۔ وزارت صحت نے عوام کو سگریٹ پینے کے نقصانات بتانے کے متعلق کئی طرح کے اقدامات کئے ہیں۔ سنیما گھروں، ریل کے ڈبوں اور بسوں میں سگریٹ نوشی کی ممانعت ہے۔

عوام سگریٹ نوشی کے مہلک نقصانات سے آگاہ ہونے کے باوجود اس مہلک عادت سے بچنے کی کوشش نہیں کرتے۔ سگریٹ کی نسبت حقہ اور پائپ کم نقصان دہ ہے۔ امریکی ڈاکٹروں کی رپورٹ کے مطابق ایک سگریٹ پینے سے انسان کی عمر چودہ منٹ کم ہو جاتی ہے۔

۳ـــــــ طویل عمر کا راز

اگر آپ صحت اور زندگی کے اصولوں پر نظر رکھیں اور ان پر کاربند رہیں تو یقیناً

زیادہ سے زیادہ دور کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر ہیڈرو اور دوسرے ڈاکٹروں نے مشورہ دیا ہے کہ اگر آپ زیادہ عرصے تک صحت مند رہنا چاہتے ہیں تو پریشان ہونا چھوڑ دیجئے۔ ذہنی انتشار اور پریشانیاں صحت کے لئے تو نقصان دہ ہیں ہی، بلکہ خطرناک جرائم!

دوپہر کے وقت لوگوں کو دن کا کھانا کھانے کے بعد تھوڑی دیر کچھ آرام کرنا چاہئے۔ اس سے کھانا ہضم کرنے میں معدہ کو مدد ملتی ہے۔

بحث و مباحثہ اور لوگوں سے تلخ و تُرش باتیں کرنے سے بچئے۔ لوگوں کو سمجھنے اور خود کو سمجھانے کی کوشش کیجئے۔ اس طرح آپ بہت سی ناخوشگواریوں اور پریشانیوں سے بچ سکتے ہیں۔

مشہور ماہر حیات ڈاکٹر فریلینک نے ایک موقع پر کہا تھا —— اگر ہم صحیح طریقے سے زندگی گزاریں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہر آدمی اپنی عمر میں دس سال کا اضافہ نہ کر سکے۔

کئی بیماریاں صرف ذہنی اضمحلال کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ افسردگی، پریشانی، بے چینی، بے کیفی، بے اطمینانی، نفرت ایسی بیماریاں ہیں جو زندگی کی توانائی اور اُس کی قوتوں کا شیرازہ بکھیر دیتی ہیں۔ نیز موت اور تباہی کو دعوت دیتی ہیں۔

۴ —— دروازہ بند کر دو!

مشہور مفکر ڈاکٹر بارڈن کے حکیمانہ مشوروں نے کتنی زندگیوں کو سنوار دیا ہے۔ جیسیں بیمار زندگی سے مایوس بے شمار لوگوں کو نئی زندگی بخش دی۔

ڈاکٹر موصوف نے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے —— جو باتیں تمہاری طبیعت کو کبیدہ خاطر کر دیتی ہیں، تمہارے دماغ کے توازن کو قائم نہیں رہنے دیتیں، انھیں بھول جاؤ —— تم اگر مایوس رہتے ہو تو مایوسی کو چھوڑ دو۔ رنج اور فکر کو دل سے اِس طرح نکال دو جس طرح چور کو باہر دھکیل دیا جاتا ہے۔ اپنی ساری کمزوریوں کے لئے دروازہ بند کر دو اور اُسے بند ہی رکھو۔ خوش دلی اور خوش باشی کے انتظار میں نہ رہو کہ وہ خود بخود آئے گی۔ اُس کے پیچھے جاؤ، اُس کا تعاقب کرو۔ اُسے دعوت دو اور اپنے پاس سے جانے ہی نہ دو۔

تکلیف دہ باتوں کے گزر جانے پر اُنھیں پھر یاد کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اگر تم اُنھیں یاد رکھو گے، بار بار دہراؤ گے تو نقصان ہی نقصان ہوگا۔ سکون اور اطمینان کی کئی گھڑیاں کھو بیٹھو گے۔ اِس لئے تکلیف دہ یادوں، تکلیف دہ باتوں کو بھول کر پھر نئے سرے سے کام شروع کر دو۔ نئے عزم کے ساتھ زندگی کے میدان میں کامیابی و کامرانی کی منزل کی طرف قدم بڑھاؤ —— ایسا کرو گے تو تم یہ دیکھ کر حیران رہ جاؤ گے کہ تمہاری زندگی میں جیسے ایک انقلاب آگیا ہے اور تمہارے گرد و پیش کے لوگ بھی تمھیں ایک نیا انسان، ایک بدلا ہوا انسان سمجھنے لگے ہیں۔

اِس لئے آج ہی مایوسی کو چھوڑ دو۔ رنج اور فکر کو دل سے اِس طرح نکال دو جس طرح چور کو باہر دھکیل دیا جاتا ہے۔ اپنی ساری کمزوریوں کے لئے دروازہ بند کر دو!

۵ —— صرف ہوائی قلعے نہ بنایئے

دُنیا میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو کچھ کرتے نہیں، صرف دن رات سوچتے رہتے ہیں۔ بڑی بڑی اسکیمیں بناتے ہیں، ہوائی قلعے تعمیر کرتے ہیں، سُنہرے خواب دیکھتے ہیں لیکن اُن کے خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتے۔ اُن کے خواب کبھی حقیقت نہیں بنتے۔

ایسے لوگوں کے لئے ڈاکٹر نپولین ہل نے لکھا ہے —— بہت سے انسان ایسے ہیں جو دن رات ہوائی قلعے بناتے رہتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کبھی نہ کبھی سب کے دن پھرتے ہیں۔ اس لئے وہ اپنے خوش قسمت کے گزرنے اور اچھا وقت آنے کا انتظار کرتے ہیں لیکن اچھا وقت ایسے لوگوں کی زندگی میں کبھی نہیں آتا۔ دولت کسی کے آنگن میں نہیں برستی۔ وہ ہمیشہ دولت کی آرزو میں جیتے ہیں۔ وہ یہ کبھی نہیں سوچتے کہ دولت صرف ہوائی قلعے بنانے سے نہیں آ سکتی۔ اُن کا یہ مقصد بغیر جدوجہد کے پورا نہیں ہو سکتا۔ ایسے لوگ ہمیشہ ناکامی اور نامرادی کی زندگی بسر کرتے رہتے ہیں۔

۶ —— ایک بڑا خزانہ، جس کے آپ مالک ہیں

ہر انسان کے پاس ایک بڑا خزانہ ہے جس کا وہ مالک ہے، لیکن بہت کم لوگ ایسے ہیں جنھیں اُس کا علم ہے یا جو اُس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

ڈاکٹر نپولین ہل نے ایک جگہ لکھا ہے —— دولت حاصل کرنے کی خواہش ایک عالمگیر خواہش ہے۔ لیکن بہت سے لوگ اپنی زندگی میں یہ خواہش پُوری کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ کیونکہ وہ اِس راز سے واقف نہیں کہ وہ ذخیرہ، وہ خزانہ اُن کے ذہن کی گہرائی میں دفن ہے۔ انھیں اِس بات کا علم نہیں کہ اُن کی دولت کا سرچشمہ خود اُن کا دماغ ہے۔

لوگ زندگی بھر دولت اور شہرت حاصل کرنے کے چکر میں پڑے رہتے ہیں۔ لیکن وہ اپنی تگ و دو، اپنی کوشش میں ناکام رہتے ہیں۔ اِس لئے کہ وہ اِس راز سے واقف نہیں کہ وہ دولت اُن کے ذہن کی گہرائیوں میں دفن ہے۔

وہ ذہن جو بیدار ہو۔ وہ دماغ جو منظم اور کسی مقصد کے حصول میں لگا ہو وہ ایسی زبردست طاقت بن جاتا ہے جس کے سامنے شکست کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ وہ شکست کو کے کر اُسے ایسا منظم کرتا ہے کہ وہ فتح میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور بڑی سے بڑی رکاوٹوں کو ہٹا دیتا ہے اور انسان کے ہر خواب کو حقیقت بنا دیتی ہے۔

صحت اور
مسرت
کے لئے
فیملی پلاننگ کیجئے

سرگوشیاں

اس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ فلمی، اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات شاملِ اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ "بیسویں صدی" کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھیے۔ ہر سوال کے بعد جواب لکھنے کی جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھیے کہ اس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے۔

(ایڈیٹر بیسویں صدی دہلی)

محمد نسیم اختر۔ کلکتہ

س۔ عورت کیا ہے؟

ج۔ شعلہ و شبنم کا حسین امتزاج!

س۔ بہت کوشش کرنے کے باوجود بھی اگر کامیابی حاصل نہ ہو سکے تو کیا کرنا چاہیے؟

ج۔ کوشش جاری رکھنی چاہیے۔ مایوس نہ ہونا چاہیے۔

محمد انعام الحق۔ چکردھرپور

س۔ زندگی خواب ہے یا شراب۔ حباب ہے یا عجاب؟

ج۔ زندگی شراب ہے نہ حباب، نہ حباب ہے نہ خواب۔ زندگی ایک درخشندہ و تابندہ حقیقت ہے!

س۔ لوگ کہتے ہیں علامہ اقبال شراب پیا کرتے تھے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

ج۔ لوگ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے

س۔ زندگی پر کوئی پسندیدہ شعر سنایئے۔

ج۔ سنیئے

زندگی بزمِ طرب بھی رسن و دار بھی ہے
زندگی پھول سے نازک بھی ہے تلوار بھی ہے

عبدالعزیز جنجوعہ۔ شیخوپورہ (پاکستان)

س۔ ایک ادیب کی زندگی کا نصب العین؟

ج۔ خدمتِ ادب۔ خدمتِ خلق!

س۔ عورت کا انتقام؟

ج۔ عورت جتنی نرم و نازک ہے، اس کا انتقام اتنا ہی شدید ہوتا ہے۔

س۔ کسی قوم پر خدا کا عذاب نازل ہوتا ہے تو کب نازل ہوتا ہے؟

ج۔ کوئی قوم جب زیادہ برائیوں میں مبتلا ہو جاتی ہے تو اس پر خدا کا عذاب نازل ہوتا ہے۔ اقوامِ عالم کی تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے۔

ایم زین الحق۔ ڈیلٹا گنج

س۔ زندگی ایک موڑ ہے۔ شادی ایک زنجیر ہے تو حسن ....؟

ج۔ حسن اس موڑ کو اور حسین بنا دیتا ہے۔

س۔ اگر ارمان بھرے دل میں آگ لگ جائے تو؟

ج۔ سمجھداری سے آگ بجھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

قیصر رعنا۔ ہزاری باغ

س۔ انسان کس وقت خودکشی پر آمادہ ہوتا ہے؟

ج۔ جب عزم و حوصلہ کا دامن چھوڑ دیتا ہے۔

س۔ آج کل انسان انسان سے دوستی نہیں کرتا دولت سے دوستی کرتا ہے۔ ایسا کیوں؟

ج۔ اس لئے کہ آج کل دولت ہی سب کچھ ہے۔

سید وصی حیدر۔ گیا

س۔ ادیب عموماً غریب دیکھے جاتے ہیں۔ ایسا کیوں؟

ج۔ ادیب اپنا دماغ، اپنا وقت، اپنا سب کچھ ادب پر قربان کر دیتے ہیں۔ پھر غریب نہ ہوں گے تو کیا امیر ہوں گے۔

س۔ پھول کو چھوڑ کر عورت کو کس چیز سے تشبیہ دیں گے؟

ج۔ چاندنی سے، کرن سے، کلی سے، خوشبو سے۔

س۔ اگر پھول نہ ہوتا تو ہار کس چیز کا بنتا؟

ج۔ آنسوؤں کے تاروں کا!

یوسف [illegible] کپور

س۔ [illegible] کے منتظر [illegible]

ج۔ [illegible] رہتے ہیں۔ جو تارے دل کی طرح اپنی منزل کی طرف گرم سفر رہتے ہیں۔

س۔ پھول اور چاندنی؟

ج۔ [illegible] کلیاں! یہ دونوں کسی افسانے کا حسین عنوان ہو سکتے ہیں۔

س۔ منزل سے بھٹکے ہوئے راہی کا انجام؟

ج۔ حسرت ناک ہوتا ہے۔

ایم کمال احمد جاجا

س۔ عورت مرد کی نظر سے کب گر جاتی ہے؟

ج۔ جب مرد کی نظر بصارت سے محروم ہو جاتی ہے!

س۔ شراب اور شباب دونوں میں کس کا نشہ برا اور نقصان دہ ہوتا ہے؟

ج۔ دونوں کا نشہ برا ہوتا ہے۔ ہر نشہ برا ہوتا ہے۔ تباہ کن ہوتا ہے۔

....

س۔ زندگی کیا ہے؟

ج۔ ؎ زندگی ہے غم و مسرت کا
مختصر اور طویل افسانہ

س۔ انسان کو اپنی زندگی میں کیا کرنا چاہیے؟

ج۔ ایسے کام جن سے زندگی قابلِ رشک بن جائے۔

س۔ تاریک دل میں جب نہ ہو امید کی کرن؟

ج۔ امید کی شمع پھر فروزاں کر لینی چاہیے۔

داؤد خاں۔ چن پٹن (بنگلور)

س۔ آج کل لڑکیاں، لڑکیوں کے کالج ہوتے ہوئے بھی لڑکوں کے کالج میں کیوں پڑھتی ہیں؟

ج۔ اس لئے کہ ان کے مغرب زدہ والدین یہی پسند کرتے ہیں۔

س۔ عورتوں کی سینما بینی سے پردہ دار عورتوں اور بے پردہ عورتوں پر کیا اثر ہوگا؟

ج۔ بہت برا۔ بے حد تباہ کن!

س۔ اگر بیسویں صدی، لڑکیاں پڑھیں تو بیسویں صدی کا مطالعہ ان پر کیا اثر چھوڑے گا؟

ج۔ اگر کبار مردوں کی طرح لڑکیاں بھی بیسویں صدی پڑھتی ہیں اور اس سے زندگی کے ہر موڑ سے گزرنے کے لئے روشنی پاتی ہیں۔

نذر النبی بوگرا۔ مشرقی پاکستان

س۔ غریب ہر وقت اپنی قسمت کو کیوں کوستا رہتا ہے؟

ج۔ اس لئے کہ وہ کم نظری سے سمجھتا ہے کہ اس کی غربت کا باعث اس کی حوصلہ کی پستی نہیں۔ اس کی قسمت ہے۔

س۔ ایک غریب کی آرزوئیں تڑپ کر کیوں رہ جاتی ہیں؟

ج۔ اس لئے کہ وہ امیروں سے اپنا حق لینے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔

س۔ ایک غریب محنت کرنے کے بعد بھی روٹی سے محتاج رہ جائے تو؟

ج۔ ہم اس سے کہیں گے ____

اے شکوہ سنج شوخیٔ تقدیر دیکھنا
ذوقِ عمل ہی تیرا کہیں خام تو نہیں

بجن پیاسا۔ پھر پا

س۔ اگر پھولوں کے بدلے کانٹوں سے پیار کریں تو؟

ج۔ بجن بھیا! یہ تو اور بڑی بات ہوگی پھولوں سے تو سبھی پیار کرتے ہیں۔

س۔ کہتے ہیں وقت پر گدھے کو بھی باپ بنانا پڑتا ہے۔ اگر گدھا باپ بننے سے انکار کرے تو؟

ج۔ یہ کرشن چندر سے پوچھئے جنہوں نے گدھے کی سرگزشت لکھی ہے۔

سید محمد علی کاظمی بشیش محل رجانسٹھ

س۔ بیسویں صدی کے عاشق کی معراج؟

ج۔ محبوبہ کے سینڈلوں سے مزاج پرسی!

س۔ جوش کے اس شعر کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

اوروں کو جو روزی سے لگانے پہ مصر ہے
چپ کرنے کی خاطر اُسے روزی سے لگا دو

ج۔ اس شعر میں حقیقت کی نہایت کامیاب عکاسی کی گئی ہے۔

باشو حنفی۔ کانپور

س۔ خوشتر بھائی! آپ کی ہر دلعزیزی کا راز؟

ج۔ حق گوئی، حق پسندی، خلوص و خدمت!

س۔ عورت کی سو فیصدی برائیوں میں ۹۹ فیصدی مردوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ آپ کی رائے؟

ج۔ آپ کا خیال سو فیصدی درست ہے۔

زکریا تاز۔ کلکتہ

س۔ زندگی خدا کی بخشی ہوئی ایک نعمت ہے تو موت کیا ہے؟

ج۔ ایک اٹل حقیقت!

س۔ جو اپنے علم اور عقل پر غرور کرتا ہو اُسے کیا کہنا چاہیے؟

ج۔ علم و عقل سے محروم و بے بہرہ!

س۔ زندگی کی راہیں اتنی خطرناک اور پُر درد کیوں ہوتی ہیں؟

ج۔ یہ تو اپنے اپنے عزم و عمل پر موقوف ہے۔ انسان زندگی کی راہوں کو خطرناک بنالے یا خوشگوار و خوش منظر، پُر درد بنالے یا پُر مسرت۔

[illegible] (ریاست)

س۔ [illegible] سے کی جاتی ہے؟

ج۔ [illegible] کے بعد [illegible] کی شادی کی جاتی ہے تو دل مسرت ہونے کے ساتھ ایک مصیبت ہو۔ بلکہ دل مسرت سے زیادہ [illegible]

س۔ [illegible] کب [illegible]؟

ج۔ جب [illegible] کا کوئی چپہ چپہ [illegible] پردہ فاش کر دیتا ہے۔

ایم۔ ایوب خاں فتحپوری۔ کانپور

س۔ محبت میں گام گام پر خاروں پر کیوں چلنا پڑتا ہے؟

ج۔ کانٹوں سے بھری راہ میں پھول کہاں سے آئیں گے۔

س۔ مجھے عشق کی منزل میں تاریکی کیوں نظر آتی ہے؟

ج۔ آپ تاریکی ہی کو روتے ہیں۔ اس منزل میں تاریکی کے بعد تباہی بھی آتی ہے۔

ایس۔ ایس علی۔ نظام آباد

س۔ بیسویں صدی کے خیالات کیا ہیں؟

ج۔ خالی پیالے!

س۔ کیا یہ غلط نہیں کہ زندگی اُمید سے وابستہ ہے؟

ج۔ یہ سو فیصدی صحیح ہے کہ زندگی اُمید سے وابستہ ہے۔ اُمید زندگی ہے۔

س۔ ہندوستان میں کس چیز پر مہنگائی کا اثر نہیں پڑا؟

ج۔ صرف انسان پر۔ جو پہلے بھی سستا تھا اور آج بھی سستا ہے۔

نذیر احمد منیر۔ یادگیر۔ گلبرگہ شریف

س۔ اس دور میں بے روزگار انسان کو روزی حاصل کرنے کے لئے کیا کرنا پڑے گا؟

ج۔ بڑی سفارش ــــــ اثر سے بڑی رشوت پیش کرنی پڑے گی!!

مشتاق صلاتی۔ مدراس

س۔ زندگی کو شاندار بنانے کے لئے کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ جن لوگوں کی زندگیاں مثالی تھیں یا شاندار ہیں اُن کے نقشِ قدم پر چل کر زندگی کو شاندار بنایا جا سکتا ہے۔

س۔ اگر بیسویں صدی کا چندہ وی پی منگا کر ادا کیا جائے تو کیا قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ وی۔ پی منگانے سے رعایت بھی ملتی ہے کہ نہیں؟

ج۔ وی پی منگانے پر زیادہ خرچ ہوتا ہے۔ منی آرڈر سے سالانہ قیمت بھیجنے میں کفایت ہوتی ہے۔ اس لئے ۹۵ فیصدی لوگ منی آرڈر ہی سے سالانہ قیمت بھیجتے ہیں۔

س۔ مجھے آپ کی شخصیت میں انسانیت کی معراج نظر آ رہی ہے۔ بتائیے آپ کے نقشِ قدم پر چلنے کے لئے مجھے کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ خدمت اور خلوص کو اپنا شیوہ و شعار اور حق گوئی و حق پرستی کو اپنا دین و ایمان بنا لیجئے۔ دوسروں کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھا اور دل سے کہئے ؎

وہ لوگ جن کو تمنا نہیں ہے جینے کی
میں جی رہا ہوں زمانے میں صرف ان کے لئے

سید احمد وحید الدین نزل۔ آندھرا

س۔ ہندوستان کا سب سے اچھا اور سب سے مشہور شاعر کون ہے؟

ج۔ ہندوستان میں بہت سے اچھے شاعر ہیں اور مشہور بھی۔

س۔ فلمی شاعر ساحر لدھیانوی اور شکیل بدایونی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج۔ دونوں اچھے شاعر ہیں۔

جوگندر شرما۔ بنارس

س۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ دنیا میں کتنی زبانیں بولی جاتی ہیں؟

ج۔ ۳۳ ہزار۔

س۔ اور ہندوستان میں کتنی زبانیں بولی جاتی ہیں؟

ج۔ ۱۴۴ زبانیں۔

[illegible] جعفری کراچی

س۔ [illegible] ؟

ج۔ [illegible]

س۔ غالب کے کلام میں زیادہ سوز ہے یا میر کے؟

ج۔ میر کے کلام میں زیادہ سوز ہے۔

عابد حسین گیاوی۔ پورنیہ

س۔ ہر مسلمان انگریزی ہندی کے بجائے اگر اردو میں پتہ وغیرہ لکھے تو قوم کو کہاں تک فائدہ ہو سکتا ہے؟

ج۔ ہر مسلمان ہی کو نہیں ہر اردو دوست کو اردو ہی میں پتہ وغیرہ لکھنا چاہیے۔

س۔ ہندوستانی مسلمانوں کا مستقبل؟

ج۔ حوصلہ کا دامن پکڑے رہیں تو روشن ہے حوصلہ کا دامن چھوڑ دیں تو تاریک ہے۔

س۔ سچی دوستی کس طرح قائم رہ سکتی ہے؟

ج۔ دو دوستوں کے درمیان کبھی غرض کو نہ آنے دیا جائے۔

ایم۔ کمال۔ چھاچھا

س۔ زندگی کا پھول کب کھلتا ہے اور کب مرجھاتا ہے؟

ج۔ اُمید کی نسیم سے کھلتا ہے اور مایوسی کے جھونکوں سے مرجھا جاتا ہے۔

س۔ عورت اور شرم میں کیا تعلق ہے؟

ج۔ چولی دامن کا۔ جان و تن کا۔

سیفی عباسی۔ برہانپور

س۔ ضمیر فروش کے نزدیک انسانیت کی اہمیت؟

ج۔ ضمیر فروش کو انسانیت سے کیا واسطہ؟

س۔ "سرگوشیاں" میں اگر ہم آپ سے کسی موضوع سے متعلق دونوں کو کیا دو سوال دوبارہ کر سکتے ہیں؟

ج۔ ہمارا خیال ہے یہ سلسلہ بیشتر لوگوں کی دلچسپی کا باعث نہ ہوگا۔

س۔ غریب مستقبل کے حسین سپنے کب تک دیکھتا رہے گا؟

ج۔ جب تک خواب کو حقیقت بنانے کے لئے ناقابلِ شکست عزم و عہد نہ کرے گا۔

محمد شبیر رشید اعظم مظفرپوری

س۔ ریاست جموں کی زندگی لافانی ہے اس میں رہنے والے لوگوں کی زندگی فانی ہے۔ کیوں؟

ج۔ آپ سے کس نے کہا کہ ریاست کی زندگی لافانی ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی ریاست کی زندگی اُس میں رہنے والوں سے ہوتی ہے۔

مدیر بیسویں صدی کے نام خطوط لکھتے وقت ہمیشہ اختصار سے کام لیا کریں تاکہ آپ کے ارشاد کی فوراً تعمیل ہو سکے۔ طویل خطوط مصروفیت کے باعث فوراً نہیں پڑھے جاتے۔

شاہکار ناول جو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو رہے ہیں

ڈاکٹر پونچھی کے لکھے ہوئے ناول

رات کے گھونگھٹ جس میں نئی تہذیب کے اُن فرشتوں کی کہانی ہے جنھیں ہندستان کی ایک رات نے جنم دیا مصنف نے آج کے سماج کے حسین چہروں سے پہلی بار رنگین گھونگھٹ اُلٹ دیئے ہیں۔ قیمت صرف دو روپے۔

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے اُن مردوں کی کہانی جو عورت کو الٹے عُریاں انداز میں دیکھنے کے تمنائی ہیں جس پر سے نظریں پھسل پھسل جائیں۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

زلف کے سر ہونے تک عشق و محبت اور حسن و شباب کی رعنائیوں اور زندگی کی مسرتوں اور حسرتوں کا سنگم تین معصوم بھولی بھالی لڑکیوں اور تین بے سہارا لڑکوں کی حسین ترین کہانی۔ قیمت فی جلد صرف تین روپے۔

چاندنی کے سائے اس میں شبنم کی ٹھنڈک بھی ہے اور شعلے کی حرارت بھی۔ کتاب کو ایک بار شروع کر کے ختم کئے بغیر آپ کو چین نہ آئے گا۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

پیاسے بادل ایک پہاڑی دوشیزہ کے پیار کی کہانی۔ دلآویز رومان کی ایک درد انگیز داستان۔ قیمت دو روپے۔ ۵۰ نئے پیسے۔

یادوں کے کھنڈر حیات کے نشیب و فراز کا آئینہ دار ناول جس میں جذبات اور آرزوؤں کا حسین طوفان مچل رہا ہے قابل مصنف نے دل کی دھڑکنوں کو ایسے رنگ و انداز سے ابھارا ہے کہ قلبی رفاقت اور خلوص پیار و محبت کی تصویر نگاہوں کے سامنے جھلکنے لگتی ہے۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

وادیاں اور ویرانے سوکھے سڑے میدانوں اور سرسبز و شاداب پہاڑوں کی حسین و جمیل کہانی۔ قیمت فی جلد چار روپے۔

زنجیر ایک گناہگار لڑکی کی حسین و جمیل داستان۔ عشق و محبت کی ایک ایسی پرپیچ رومان پرور داستان جسے پڑھ کر آپ عش عش کر اُٹھیں گے جسے زکی انور نے لکھا اور ادارہ "بیسویں صدی" نے شائع کیا ہے۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے

پگھلتے خواب اردو ادب کے جواں سال ادیب پروفیسر حامدی کاشمیری کا ایک دلچسپ رومانی ناول جس میں آپ کو کشمیر جنت نظیر کے حسین و دلفریب مناظر اور ان مناظر تلے ہلکی سسکتی کہانیوں کے خدوخال صاف دکھائی دیں گے۔ قیمت صرف دو روپے۔

نئے فرہاد پروفیسر شکیل الرحمن کا اچھوتا شاہکار ناول۔ ایک حسین و جمیل دوشیزہ کی المناک داستان۔ محنت و زر کی کشاکش کے اسٹیج پر لکھی ہوئی ایک انتہائی دلچسپ کہانی۔ قیمت صرف دو روپے۔

راہیں شباب کی فرانس کے عظیم ترین ناول نگار آبے پریوس کا غیر فانی شاہکار جس کا ترجمہ دُنیا کی تمام زبانوں میں ہو چکا ہے جس کی دس کروڑ جلدیں فروخت ہو چکی ہیں، جسے عشق و محبت کی بے نظیر داستان تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس ناول کی ہیروئن قلوپطرہ اور ہیلن سے بھی زیادہ حسین اور عظیم ہے۔ مترجم جناب مخمور جالندھری۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

طوفانِ بہار روس کے عدیم المثال ناول نگار تورگنیف کا رومانی شاہکار جس کا ترجمہ دُنیا کی بیالیس زبانوں میں ہو چکا ہے۔ جسے دُنیا کے مشہور نقادوں نے لافانی رومان قرار دیا ہے اور جسے اُردو میں پہلی مرتبہ ادارہ "بیسویں صدی" دہلی نے شائع کیا ہے۔ مترجم مخمور جالندھری۔ قیمت تین روپے۔

بھیگی راتیں فرانس کے عدیم المثال ناول نگار ایمل زولا کا مقبول ترین ناول انسان میں چھپے ہوئے حیوان کا افسانہ، اپنے محبوب کیلئے محبوبہ کی ناقابلِ فراموش قربانیوں کی کہانی۔ مترجم مخمور جالندھری۔ قیمت فی جلد تین روپے۔

فرنڈ موہنی حقیقت اور طنز سے بھرپور عورتوں کے اُس دیش کی کہانی جہاں مرد کا تصور بھی ایک جرم تھا۔ صدیوں بعد کی فضاؤں میں لکھی ہوئی ایک عجیب و غریب داستان جو اول سے آخر تک دلچسپیوں اور حیرت آفرینیوں سے لبریز ہے۔ جناب کوثر چاندپوری کا لکھا ہوا بے حد شوخ و دلچسپ ناول جو قاری کو کئی صدی آگے کی فضا میں پرواز کراتا ہے۔ قیمت فی جلد محض تین روپے۔

پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی۔ دہلی نمبر۶

[illegible] نظام آباد

س۔ [illegible] بیسویں صدی [illegible]

ج۔ وہ بیسویں صدی کی بلائی اور اپنی خورستانی کبھی چاہا [illegible] کہ بیسویں صدی کو ہر قسم ہر جگہ سے کسی جاتی ہے۔

س۔ [illegible] کہتے ہیں زندگی ایک بھیانک خواب ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟

ج۔ زندگی ایک حسین حقیقت ہے۔

شفیق الدین مجور۔ چنڈی گڑھ

س۔ کیا محبت کو آگ لگ جانے کے بعد کچھ کہا جاتا ہے؟

ج۔ جس نے کبھی یہ حماقت کی ہو اس سے پوچھئے۔

س۔ نوآفتر بھائی! بتائیے۔ میرے دوست کو خاموش رہنے کی کیوں عادت ہے؟

ج۔ اپنے دوست کی عادت آپ ہم سے زیادہ جانتے ہوں گے۔ ویسے خاموش رہنا بُرا تو نہیں۔ خاموش رہنا دیوتاؤں کی شان ہے۔

سیدہ ساجدہ بیگم۔ ہٹی گولڈ مائنز

س۔ آج کل کے لوگ حسن سیرت کے بجائے حسن صورت پر کیوں مرنے لگے ہیں؟

ج۔ اس لئے کہ اُن کے دل کی آنکھیں بصارت سے محروم ہو گئی ہیں۔

س۔ آج کل خلوص، ہمدردی اور محبت کا کوئی قدر داں نہیں ہے۔ ایسا کیوں ہے؟

ج۔ ان کی جگہ فریب کاری و ظاہر داری نے لے لی ہے۔

س۔ [illegible] پہ محبت اور سانسوں [illegible] کے سے منسوب ہے۔ لیکن آپ نے اپنی بیوی کا فوٹو "بیسویں صدی" میں کیوں شائع کیا؟

ج۔ ہم مناسب پردہ کو ضروری سمجھتے ہیں مگر عورت کو نہ ہنگامہ خیز بنانے کے حامی نہیں ہیں۔

سید امیر اللہ حسینی۔ کھم

س۔ ہماری حکومت کو اُردو زبان سے نفرت کیوں ہے؟

ج۔ حکومت کو اُردو زبان سے نفرت نہیں ہے۔ حکومت بھی اُردو کی دلکشی و رعنائی کی معترف ہے۔ ارباب حکومت اپنے گھروں میں اُردو ہی بولتے ہیں لیکن حکومت اسے اس کا جائز مقام نہیں دے رہی ہے۔

س۔ دُنیا میں سب سے بڑا نفسیات کا ماہر کون ہے؟

ج۔ جو اپنے بُرے بھلے کو سمجھ سکے۔

س۔ جو لوگ بغرض تعلیم ولایت جاتے ہیں، ان میں سے اکثر واپس نہیں آتے کیوں؟

ج۔ اکثر واپس آتے ہیں کچھ لوگ وہاں کی رنگینیوں میں کھو کر رہ جاتے ہیں۔

شاہین۔ چک منگلور

س۔ شریروں کی شرارت کو محبت سے جیت سکتے ہیں یا تلوار سے؟

ج۔ چین کی شرارت نے بتا دیا کہ تلوار سے۔

س۔ آپ اُردو کی خدمت کب سے انجام دے رہے ہیں؟

ج۔ جب سے ہوش سنبھالا ہے وہ۔
عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں!

س۔ آج کل انسان سچ کہنے سے کیوں ڈرتا ہے؟

ج۔ ہر دور میں بہادر انسان سچ کہنے سے کبھی نہیں ڈرتے۔ بزدلوں کی بات کہنے سے ہیں۔

ظفر امام زیدی۔ نظام آباد کراچی

س۔ جب کبھی ماضی کی یاد آتی ہے دل میں ایک ہوک اٹھتی ہے اور دفعتہً آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں۔ میں اپنے ماضی کو بھلا دینا چاہتا ہوں۔ کیا یہ ممکن ہے؟

ج۔ کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ بھلانے کی کوشش کیجئے۔ بارگاہ خداوندی میں خشوع و خضوع سے یہ دعا مانگا کیجئے ——

یاد ماضی عذاب ہے یارب!
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

ظ۔ ن۔ حیدرآباد دکن

س۔ برسوں سے بیسویں صدی کو پڑھتا دیکھتا ہوں۔ پچھلے دنوں چند شماروں کے ٹائیٹل بہت ہی حسین تھے۔ خدا کا شکر ہے اب پھر "بیسویں صدی" اپنی پرانی روایات کے مطابق سادہ، دلکش، گرس فل ٹائیٹل پیش کر رہا ہے۔ کیا آپ اس سلسلے کو قائم رکھیں گے؟

ج۔ ہماری کوشش برابر یہی رہتی ہے کہ ہم "بیسویں صدی" کو حسین سے حسین تر بنا کر پیش کریں۔ زیادہ سے زیادہ حسن بخشیں۔

محمد افتخار۔ لائل پور

س۔ افسانہ میں جب تک عورت کا کردار نہ پیش کیا جائے کیا وہ افسانہ نہیں کہلاتا؟

ج۔ کیوں نہیں۔

س۔ اگر کوئی افسانہ بھیجا جائے اور وہ آپ کے معیار کے مطابق نہ ہو تو آپ لکھنے والے کو جواب دیتے ہیں؟

ج۔ جواب کے لئے لفافہ ساتھ ہو تو ضرور جواب دیا جاتا ہے۔

پرنٹر پبلشر ایڈیٹر: خوشتر گرامی —— مطبوعہ: دلی پرنٹنگ ورکس بلمطبع اردو ٹائیٹل: سہارا اسٹوڈیو —— پتہ: دفتر رسالہ بیسویں صدی بلیماران دہلی

ع کچھ بھی ہو جائے جوانی مسکرائے گی ضرور

BISWIN SADI
29 TH YEARS OF PUBLICATION
Telephones: Office 271637 Residence: 619927

معریتا ـــــ تارا کی آنکھ کا تارا ـــــ خورشید گرامی کے نورِ نظر کی روشنی، وہ روشنی جس نے دونوں خاندانوں میں نور بکھیر دیا ہے

۸ مئی ۱۹۶۹ء کا دن ـــــ دہلی اور نئی دہلی کے ممتاز ادیبوں، سرکردہ شہریوں اور احباب کے لئے خوشیوں اور مسرتوں کا بھرپور پیغام لے کر آیا ـــــ یہ وہ دن تھا جس دن حضرت خوشتر گرامی کے لختِ جگر دائمی محبت کے اُن رشتوں کے اسیر ہو گئے جو زندگی کی بہار کا نکھار ہیں۔

اس ہجومِ رنگ و بو میں ہندوستان اور پاکستان کے ممتاز ترین شاعر اور ادیب حضرت خوشتر گرامی کو پُرخلوص مبارکباد پیش کر رہے تھے۔ یہ وہ اجتماع تھا جہاں مرکزی وزیر بھی تھے اور اہم ترین اہلِ فن بھی۔ جہاں وزیروں اور امیروں کے ساتھ ساتھ اقلیمِ سُخن کے تاجدار بھی جلوہ گر تھے ـــــ یہ اجتماع اُس شخصیت کی ہمہ گیر مقبولیت کا کامل اظہار تھا، جس کے زورِ قلم، زورِ ذہانت اور سب سے بڑھ کر زورِ خلوص نے اُردو کو ایک ایسا ادارہ دیا ہے جس پر تاریخِ ادب کو ہمیشہ ناز رہے گا۔

اور جو لوگ اِس جشنِ مبارکباد کے موقع پر نہ پہنچ سکے وہ اپنی پُرخلوص دُعائیں اور شبھ کامنائیں بھیجنے میں پیچھے نہیں رہے۔ اِن میں مرکزی حکومت کے کئی وزیر، صُوبوں کے وُزرائے اعلیٰ اور دوسرے بے شمار ارکانِ حکومت بھی شامل تھے ـــــ ہندوستان اور پاکستان کے سینکڑوں اہلِ قلم اور اہلِ فن بھی ـــــ اُردو کے جن خوش فکر، خوش نام اور خوش کلام شاعروں نے سہروں کے ہار شعروں میں پرو کر اس موقع پر اپنی نیک تمناؤں کا اظہار کیا اُن میں سلام مچھلی شہری، ضیا فتح آبادی، رشی پٹیالوی، نریش کمار شاد، شیخ نظام الدین نظام شیرکوٹی۔ آتی رام نگر، صادق قریشی (لاہور)، سید یزدانی جالندھری (لاہور) اور پنجابی کے راج کوی جناب اندرجیت سنگھ جی تُلسی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ـــــ پاکستان سے چیف آف دی ایگریکلچرل بیورو مغربی پاکستان گورنمنٹ، جناب صادق قریشی ایم اے کا اپنی اہلیہ محترمہ اور بال بچوں سمیت خصوصی طور پر اُڑان کر کے دہلی تشریف لانا اظہار ہے اِس حقیقت کا کہ مُلک تقسیم ہو سکتے ہیں، دل نہیں ؛
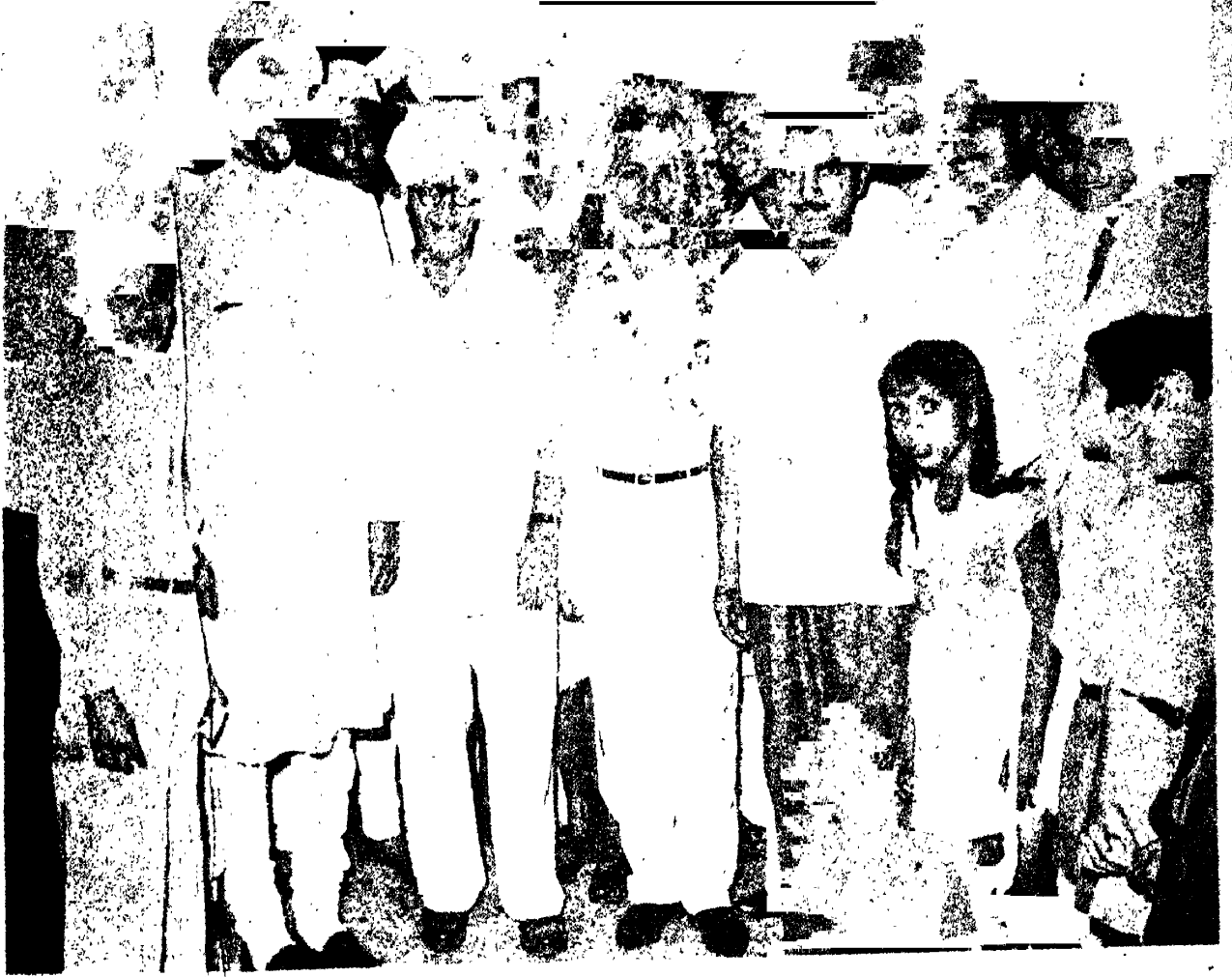
شادمانی اور شادکامی کی منزل پر روانہ ہونے سے پہلے دُولہا مرکزی وزیر ریلوے سردار سورن سنگھ جی۔ نامور ادیب سردار گُرنام سنگھ جی تیر ایم۔اے' پنجاب کے پُرانے قومی رہنما سیٹھ سُدرشن، اُردو کے خوش فکر شاعر رشی پٹیالوی اور دوسرے دوستوں اور ادیبوں کے ساتھ، اِن کے درمیان کی شخصیت آپ کی جانی پہچانی ہے ـــــ سردار سورن سنگھ جی دُولہامیاں کو بتا چکے ہیں کہ زندگی کی گاڑی بھی ریل کی پٹڑی کی طرح ہے۔ جس پر سیدھے چلنے والے ہی منزلِ مقصود پر پہنچتے ہیں ـــــ وزیر ریلوے کی آشیرواد یعنی سبز جھنڈی کے ساتھ برات منزلِ مُراد کی طرف روانہ ہوئی۔
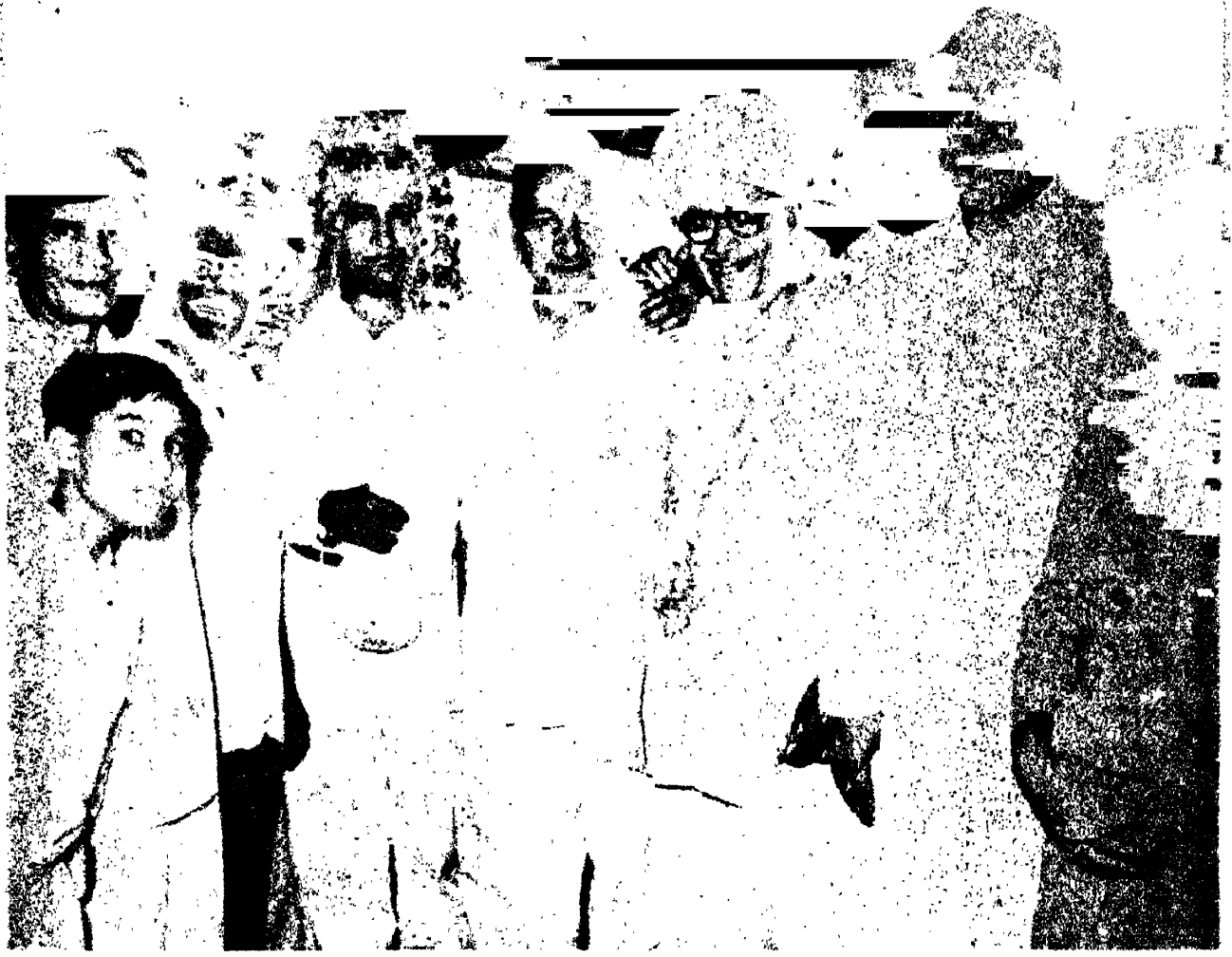
شہر کے سربراہ دہلی کارپوریشن کے میئر جناب میاں نورالدین احمد۔ بین الاقوامی شہرت یافتہ اخبار نویس رانا جنگ بہادر سنگھ۔ ہندی "مستانہ جوگی" کے ایڈیٹر شری چیتن کمار۔ نامور فرم میسرز اے۔ ایچ وھیلر اینڈ کمپنی الہ آباد کے نیک دل جنرل منیجر جناب ڈاکٹر ایس۔ ایچ۔ حیدر میاں صالح الدین صاحب (آئی۔آر۔ایس) روزانہ "ملاپ" کے شری رگھبیر داس چوپڑہ۔ خوش فکر و خوش شکل، جناب گلزار دہلوی کی موجودگی اظہار ہے اِس حقیقت کا کہ یہ اجتماع سیاست، ادب اور تجارت کا ایک حسین ترین امتزاج تھا۔

شادی کے دوسرے دن عصرانے کے دَوران میں جب دُولھا میاں نے اتّفاقاً اپنی نظریں ہٹا کر کسی دوسری طرف کیں تو نند کو موقعہ مل گیا کہ وہ بھی اپنی من چاہتی اور من موہنی بھابی سے کسی بہانے دو باتیں کرلیں۔ بہانہ تلاش کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ قریب ہی نادر ترین تحفوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ اِن میں سے کسی کو اُٹھایا اور بھابی جان سے باتوں کی گُل افشانی شروع کردی۔ پھول جلدی جلدی برسائے جا رہے ہیں تاکہ پیشتر اس کے کہ بھیا بھابی کی طرف دوبارہ متوجہ ہوں یہ اپنے من کی باتیں پوری کرے۔

برف میں آگ

فوٹو۔ ایس۔ نظام۔ دہلی

وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو مشہور شاعر ساغر نظامی کے بھائی شہریار پرواز کی تقریب شادی میں
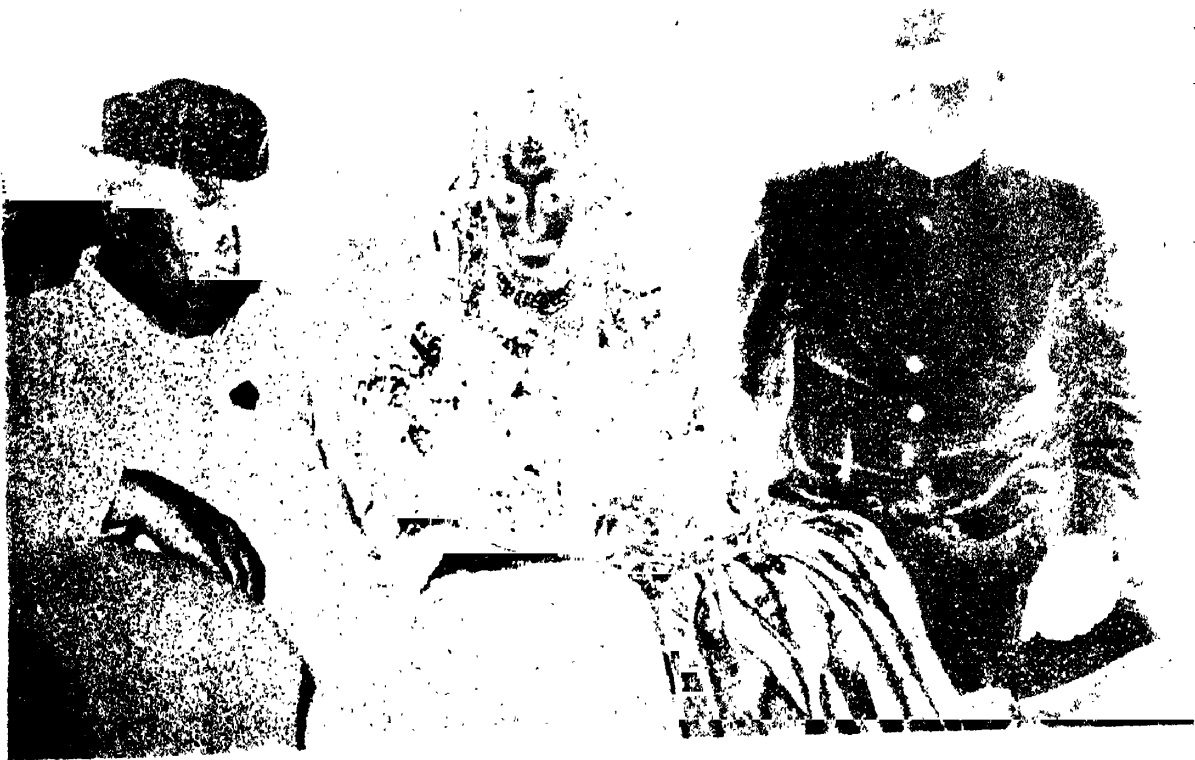
یہ شادی ادبی اور سماجی اجتماع کے لحاظ سے دہلی کی تاریخ میں یادگار رہے گی اور سدا بہار پھولوں کی یاد تازہ کرتی رہے گی۔

نواب غوثیہ سلطانہ اور شہریار پرواز

دُولہا نے دولہن کا ہاتھ پکڑا ــــــ زندگی بھر ساتھ رہنے کے لئے

ے یہ کہہ کرکے ہم دل کو بہلا رہے ہیں ؛ ذرا ٹھہر تو، دیکھ وہ آ رہے ہیں

فوٹو: سراج انور دہلی

ؔ زندگی بیت چلی ہے ترا رستہ تکتے ؛ تیری آہٹ بھی مگر راہ گزاروں میں نہیں

فوٹو: سراج الدین دہلی

حسین التجا

فوٹو: حافظ گلاسگو سکاٹلینڈ

درد بھری فریاد

فوٹو: حافظ گلاسگو سکاٹ لینڈ

ع میرے بھیا کو میری عُمر لگ جائے

فوٹو :- دیوی داس [illegible]

سہ جان آنکھوں میں، نظر در پہ، تمنا دل میں ؛ اب تو دم بھر کو خدا کے لئے آئے کوئی

فوٹو: سراج انور دہلی

نشانہ چُوک نہ جائے

فوٹو:۔ راج شرما نئی دہلی

شکار کی تاک

فوٹو: دیوی داس کوسیگر، بمبئی

افسانہ نمبر ۱۹۶۲ مفت حاصل کیجئے

مستقل خریداروں کی خدمت میں افسانہ نمبر مفت بھیجا جاتا ہے۔ ...

تیر و نشتر

”ہندوستان کی سماجی زندگی“ ایک مقالہ ——— سر پر کھدری ناٹ
کھدری ٹوپی۔ پیروں میں چپل، لاؤڈ اسپیکر پر تقریریں، ایٹ ہوم، ڈنر، ممبری
وزارت۔

”صرف آزادی حاصل کرلینا ہی کافی نہیں“۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن ———
بلکہ صدارت، وزارت، سفارت، گورنری، ممبری بھی ملنی چاہیے۔

”واجد علی شاہ کے زمانے کی جھانکیاں“ ایک عنوان ——— آجکل
بھی بعض وزیروں کے بنگلوں میں نظر آسکتی ہیں۔

خوشتر گرامی

”آپ کا روپیہ آپ کی دولت ہے“ ایک عنوان ——— ہماری
جیبوں میں ہے۔ اس کے گنہگار تو ہیں۔ لیکن اس پر کنٹرول مرارجی بھائی
کا ہے۔

”ہوم گارڈ کی نئی ذمہ داریاں“ ——— وزیر دوروں پر آئیں تو ان
کو سلامی دیں اور ان کے آگے پیچھے مارچ کریں۔
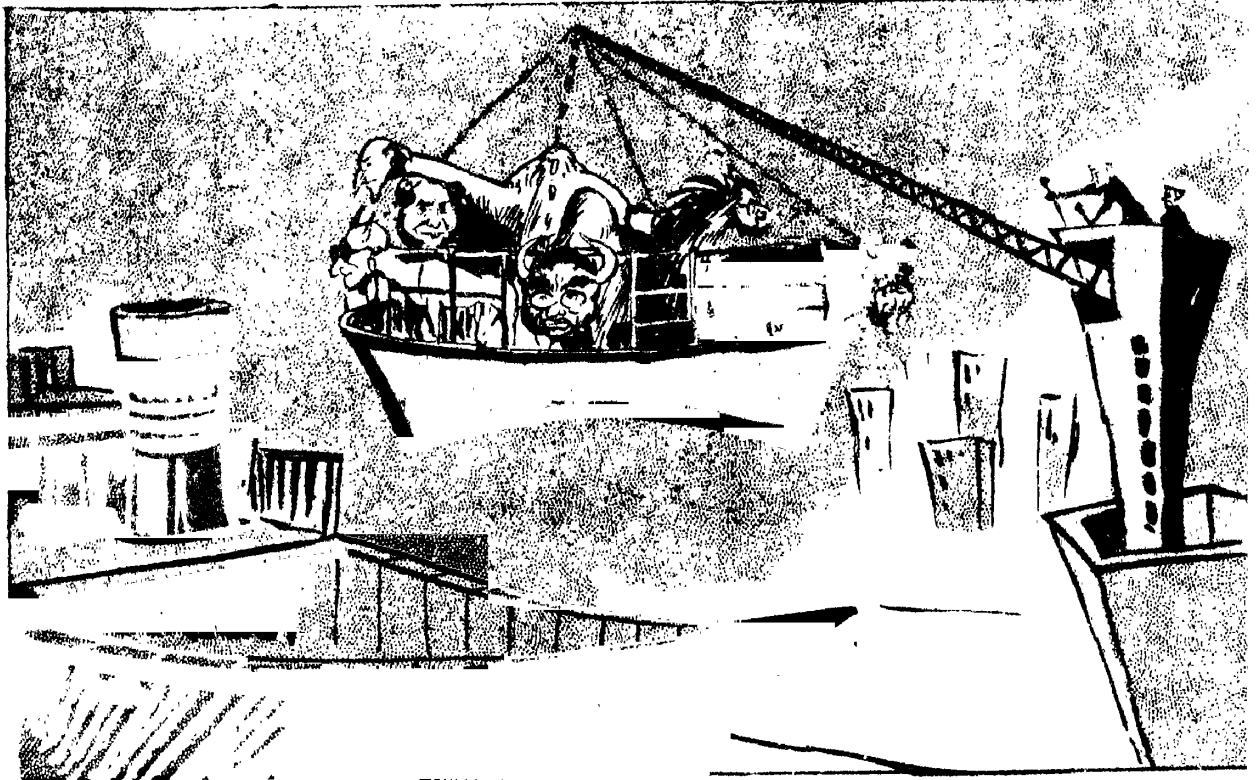
”ڈنمارک اور مغربی جرمنی کے مویشی ہندوستان لائے جائیں گے“ ایک خبر ——— اور ان کے بدلے ہندوستان سے سیاسی مویشی وہاں لے جائے جائیں گے۔

"تنظیم میں طاقت ہے اور طاقت میں ترقی"۔ ایک جنگی سلوگن ــــ کاش ہم کانگریسی بھی اس کا مفہوم سمجھ سکیں۔

ڈاکٹر لوہیا نے کہا۔ "پرجا سوشلسٹ پارٹی سرکار کے پیچھے چلنے والی پارٹی ہے" ــــ "کمیونسٹ پارٹی کانگریس کے اندر پاؤں ڈال کر چلتی ہے۔ جن سنگھ ایک اچھی اپوزیشن پارٹی ہے"ــــ اسی لئے ڈاکٹر لوہیا نے اسے اپنا نیا امام بنایا ہے۔

"خلائی پرواز میں روس آگے ہے"ــــ اور ہمارا بھارت ورش خالی باتوں میں سب سے آگے ہے۔

"پاکستان سے ہر سطح پر گفت و شنید کے لئے آمادگی"۔ لوک سبھا میں وزیرِ اعظم ہند کا اعلان ــــ یعنی میدانی سطح ہو، سمندری سطح ہو، پہاڑی سطح ہو۔ غرض کوئی سطح ہو۔

"حکومت جمہوریت کو نقصان پہنچا رہی ہے"۔ ایک جن سنگھی اخبار ــــ جن سنگھ اور ہندو مہا سبھا اسے تقویت پہنچا رہی ہیں۔

"سرحدی معاملے کو لٹکایا نہیں جا سکتا" ــــ بے شک! اسی لئے یہ مسئلہ اب تک کھڑا ہے۔

"ایشیا کو چینی کمیونزم سے بچائیے"ــــ لیکن یعنی روسی کمیونزم سے بعد کو نبٹ لیا جائے گا۔

"کانگریس کے مقامی کارکن کرپلانی کے لئے کام کر رہے تھے یا ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے"۔ ایک خبر۔ ایسے کہتے ہیں جس ہانڈی میں کھائیں اسی میں چھید کریں۔

افسانہ نمبر

"زرعی ترقی کے بغیر ہندوستان کی خوشحالی کا خواب پورا نہیں ہو سکتا۔ کھیتی کے جدید طریقے اختیار کرنے پر زور" مرارجی ڈیسائی کی تقریر ــــــ یعنی جیسے سناروں کو سونے سے محروم کیا گیا ہے ویسے ہی کسانوں کو ہل اور بیلوں سے محروم کر دیا جائے۔

"پہلوانوں کی ایک ٹیم کابل جائے گی" ــــــ اور اس میں بار بار کر جیتنے والے پہلوان لوہیا اور کرپلانی شامل ہوں گے۔

"پینے کے پانی میں کیچوے اور مچھلیاں" ــــــ کمیٹی کو وار ٹیکس کے ساتھ مچھلیوں کی قیمت اور طلب کرنی چاہیے۔

"فولاد سے بنے ہوئے بہترین قسم کے مصنوعی دانت" ــــــ یہ دکھانے کے ہیں یا کھانے کے؟

"امریکہ اور برطانیہ مسلم لیگ کو ختم کرنا چاہتے ہیں" پاکستانی اخبارات ــــــ کیا اس کے غلط کار لیڈروں کی سرگرمیاں اب امریکہ اور برطانیہ تک پہنچ گئی ہیں۔

"پنجاب کی وزارت میں توسیع نہیں ہوگی" سردار پرتاپ سنگھ کیروں کا بیان ــــــ نہ جانے کتنے دلوں پر مایوسی کی اوس پڑ گئی ہوگی۔

"نقلی مسالہ تیار کرنے والی فیکٹری" ــــــ اب نقلی لیڈر بھی تیار کرے گی۔

"مرکزی حکومت کے محکموں میں درجہ اوّل کے افسروں کی قلت" ــــــ افسر ہی نہیں وہاں درجہ اوّل کے وزیروں کی بھی قلت ہوگئی ہے۔
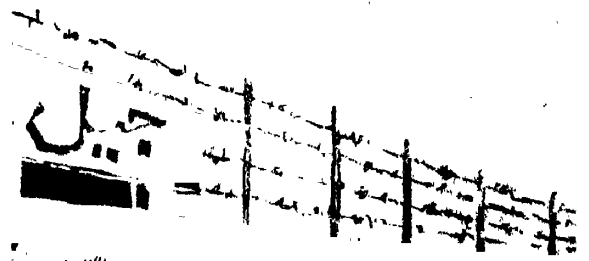
...ں کے لئے اچھی خوراک اور اچھے کپڑے"۔ ایک عنوان ــــــ بھوک اور ننگاپن دور کرنے کے لئے قید خانے پہنچنے کے کام کریں۔

"میں اور راجگوپال آچاریہ پنڈت جواہرلال نہرو کے دوست ہیں" اچاریہ کرپلانی کی تقریر
اور ایسے دوستوں کیلئے چچا غالب کہہ گئے ہیں ؏ ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں

"جمہوری ملکوں میں اختیارات چھوٹے چھوٹے حصّوں میں تقسیم ہونے چاہئیں" ایک مقالہ ——— یعنی ہر محلّے میں ایک آدمی کو وزیر اعظم اور ایک کو راشٹرپتی مقرر کیا جائے۔

"مجرموں کی سرپرستی کرنے والے سماج میں ناسور کی حیثیت رکھتے ہیں" ——— کیا کیا جائے سیاسی مجبوری ہے۔ اُن کی غنڈہ گردی سے ووٹ ملتے ہیں۔

"کراچی میں طلباء اور والدین دھرنا مار کر اسکول کے باہر بیٹھ گئے" ——— ایک ساتھ اسکول میں داخلہ چاہتے ہوں گے۔

"منصوبے کو عملی جامہ پہنانا عوام کا کام ہے" ایک لیڈر ——— اور لیڈروں کا کام منصوبے پر تقریریں کرنا ہے۔

"جنگِ آزادی کے دَوران میں جو وعدے کئے گئے تھے وہ شرمندۂ تعبیر نہیں ہوئے" ——— پُرانے وعدوں کو بھلاؤ۔ اب سوشلزم، مساوات، جمہوریت، شہری حقوق، خوشحالی کے نئے وعدوں پر دھیان دیجئے۔

"کراچی میونسپل کارپوریشن کا سیاہ کارنامہ" ——— غنیمت ہے دِلّی میونسپل کارپوریشن کا تو کوئی سفید کارنامہ بھی نہیں ہے۔

"خام لوہے کی مقدار میں اضافہ" ——— ڈاکٹر لوہیا کو مبارک ہو۔

"کراچی میں یومِ سیاہ منایا گیا" ——— ہر عمارت کے در و دیوار، ہر انسان کا چہرہ اور لباس اُس روز سیاہ تھے۔

"صدر ایوب کنونشن مسلم لیگ میں شامل ہو گئے" ایک خبر ــــــ کونسل مسلم لیگ کے صدر خواجہ ناظم الدین احتجاج کریں۔

"صدر ایوب نے مسٹر شعیب کی مزاج پرسی کی" ــــــ مزاج پرسی یعنی گوشمالی؟

مکان تعمیر کرنے کیلئے قرضے حاصل کرنے والے مستند انجینیروں کے تیار کردہ منصوبے ارسال کریں" ــــــ اور وزیروں کی سفارشیں بھی ساتھ ہونی ضروری ہیں۔

ملکہ انگلستان کے خیر مقدم کے لیے سرخ رنگ کا قالین دستیاب ہو سکا" ــــــ سیاہ قالین تلاش کر لیا ہوتا۔

"نیپال میں اردو کی گونج" ــــــ کمبخت وہاں بھی جا گھسی۔

"ناظم آباد کراچی کو کربلا بنایا جا رہا ہے" ــــــ خواجہ ناظم الدین کی سیاسی سرگرمیوں کا نتیجہ

"پانی کی قلت کے خلاف دہلی کارپوریشن کے باہر مظاہرہ" ــــــ غنیمت ہے ابھی قلت ہے۔ کہیں وہ پانی ملنا شروع ہو گیا جو یرقان پھیلاتا ہے تو کیا ہو گا۔

"حکومت نظم و نسق میں کوئی خلل اس وقت برداشت نہیں کرے گی" لال بہادر شاستری کا انتباہ ــــــ چلئے اس وقت نہیں، چند روز بعد سہی۔ مگر اس وقت بھی یہی فرمائیں گے۔

افسانہ

پیلا پھاٹک

بلونت سنگھ بی۔اے

امپیریل ہوٹل، چوک، الہ آباد

کرم گستر!

آپ کا اچانک الہ آباد نازل ہونا، قلندر کے ڈیرے پر صدا لگانا، اور پھر ایک سانس میں تین گلاس شربت پی جانا، یہ سب باتیں اس بات کی دلیل ہیں کہ آپ قلندروں کے قلندر ہیں۔ آپ سے مِل کر ایسی مسرت حاصل ہوئی کہ میں سوچتا رہ گیا کہ لوگ تفریح و تازگی کے لئے شربتِ روح افزا استعمال کرنے کے بجائے آپ کی زیارت کیوں نہیں کرتے . . ۔ چونکہ "بیسویں صدی" کے صفحات پر بھاری بھرکم افسانے جگہ نہیں پا سکتے۔ بلکہ یہاں تو ننھی جان، چھوٹی بائی وغیرہ کا طوطی بولتا ہے۔ لہٰذا "پیلا پھاٹک" حاضر ہے.....

آپ کا ——— بلونت سنگھ

پھر ایک بار پیلا پھاٹک میرے سامنے تھا۔

آج پینتس سال بعد پھر اُس سے ملاقات ہو رہی تھی۔

کوٹھی کے آگے دو بڑے بڑے پھاٹک تھے۔ جو دن میں کئی بار کھلتے اور بند ہوتے تھے۔ لیکن یہ چھوٹا سا پیلا پھاٹک کوٹھی کے پچھواڑے تھا۔ اور شاذ و نادر ہی کھولا جاتا تھا۔ اِتنی طویل مدت کے بعد بھی اُس کی شکل و صورت اور رنگ و روغن میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اُس پر گھنے بانسوں کی چھتر چھایا تھی۔ چاہے کیسی ہی موسلا دھار بارش ہو اُس پر بوندیں نہیں پڑتی تھیں۔ دھوپ کی تپش کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ شاید اِس کوٹھی کا ہر مالک اِس پر گہرے زرد رنگ کا وارنش کرا دیتا تھا۔ جبھی تو اُس میں انحطاط کے آثار تک دکھائی نہیں دیتے تھے۔

کبھی ہمارا خاندان اِس کوٹھی میں رہتا تھا۔ پھر ہمارے والد صاحب نے اُسے بیچ ڈالا اور ہم دوسرے شہر میں چلے گئے۔ مجھے میرا [illegible] انگلستان لے گیا۔ وہیں شادی کی۔ دو بچے ہوئے۔ ایک لڑکا بارہ برس کا اور بال بچے والا تھا وہ یورپ ہی میں رہتا تھا۔ لڑکی بڑی ہوئی تو اُس نے بھی وہیں شادی کر لی۔ میرے قریبی رشتے داروں میں سے بیشتر اِس دُنیا سے چل بسے تھے۔ بیوی کی زندگی نے بھی وفا نہیں کی تو مجھے اپنا وطن یاد آیا اور میں ہندوستان واپس چلا آیا۔ پھر اُسی کوٹھی میں پہنچا جہاں میرا بچپن گزرا تھا۔ یہ کوٹھی کئی مالک بدل چکی تھی۔ موجودہ مالک بھی اِسے بیچنے پر آمادہ تھا۔ میں نے جھٹ کوٹھی خرید لی میرے پاس روپے کی کمی نہ تھی۔ اِس پھاٹک کو دیکھ کر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بچپن کا کوئی پیارا ساتھی مِل گیا ہو۔

میں کوٹھی کی خاموش فضا میں چُپ چاپ کھڑا اِس پھاٹک کو گھورتا رہا۔ جیسے وہ ابھی مجھ سے بات کرنے لگے گا۔ میں پینتس سال پہلے چودہ سال کا بھولا بھالا لڑکا تھا۔ مجھے ایک لڑکی کا چہرہ یاد آیا جو مجھ سے پانچ چھ سال چھوٹی تھی۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے سے گہرا اُنس تھا۔ ہم سب سے

آنگ مچولی اِسی زرد پھاٹک کے پاس کھیلا کرتے تھے۔ میں آجکل کے لڑکوں کے بارے میں تو کہہ نہیں سکتا۔ البتہ میں اُس عمر میں بہت معصوم تھا۔ چنانچہ جب وہ لڑکی میری بیوی بنتی اور میں اُس کا شوہر تو مجھے بڑی عجیب محسوس ہوتی۔ میں جھوٹ موٹ دفتر جاتا۔ میرے لوٹنے تک میری بیوی جھوٹ موٹ کھانا پکاتی۔ اور مجھے کھلاتی۔ اِس طرح بیسیوں جھوٹ موٹ کے کھیل کھیلے جاتے جن میں وہ میری بیوی اور میں اُس کا شوہر بنتا۔ میرے خیال میں لڑکی کو بھی اِس کھیل میں مزا آتا تھا۔ یہ پھاٹک بھی ایک طرح سے ہمارا ساتھی تھا۔ کیونکہ اِس کے پاس ہی تو ہم یہ کھیل کھیلتے تھے یہ بھی ہمارے اُن کھیلوں سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ ہم دونوں جُدا ہو گئے اور پھر ایک دوسرے کی خبر نہیں ملی۔ میں تو اُسے یکسر بھول ہی گیا اور آج جب زرد پھاٹک کو دیکھتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں کہیں گیا ہی نہیں۔ جیسے میرے بچپن کی ساتھی ابھی بانسوں کے جھنڈ سے مسکراتی ہوئی نکل آئے گی۔ اور پھر ایک بار....

لیکن وہ لڑکی اب کہاں ہوگی؟

کچھ دنوں کے بعد آس پاس کے لوگوں سے میرے تعلقات پیدا ہو گئے۔ اِن میں سب سے اہم ایک خاتون تھی جو کسی کالج میں پڑھاتی تھی۔ میں ایک بار اُس کے کالج کے ایک جلسے میں مدعو کیا گیا۔ وہاں میں نے یورپ کے حالات پر مختصر سی تقریر کی۔ وہیں اِس خاتون کی صورت دکھائی دی۔ لیکن معاملہ یہاں تک نہیں رہا۔ دوسرے دن کیا دیکھتا ہوں کہ وہی خاتون ملاقات کے لئے آدھمکی۔ دھیمے لہجے میں بولی "میں آپ کے پچھواڑے رہتی ہوں، جدھر آپ کا پیلا پھاٹک ہے۔ میں آپ کی پڑوسن ہوں"

میں نے بڑے تپاک سے کرسی پیش کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے کالج کے جلسے میں شاید آپ ہی کو دیکھا تھا؟"

"جی ہاں! میں نے بھی آپ کی تقریر سُنی تھی۔ اُمید ہے آپ میری اچانک آمد...."

"جی نہیں، بالکل نہیں فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں" یہ کہتے کہتے میں نے نوکر کو چائے تیار کرنے کا حکم دیا۔

"بات یہ ہے کہ میں نے فرانسیسی زبان میں ڈپلوما لیا تھا۔ ہمارے کالج میں اِسی زبان کی کلاسیں شروع ہونے والی ہیں۔ اِسی لئے مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں طلباء کو فرنچ پڑھاؤں۔ میں بہت کچھ بھول چکی ہوں۔ آپ کی تقریر سے پتہ چلا کہ آپ فرانس میں بھی طویل عرصہ تک رہ چکے ہیں۔ اِسلئے سوچا، شاید آپ ہی میری مشکل کُشائی کر سکیں"

"کیوں نہیں، کیوں نہیں۔ میں ہر طرح سے آپ کی مدد کرنے کو تیار ہوں"

یہ تھی ہماری پہلی ملاقات!

تعلقات اور گہرے ہو گئے۔

میں نے پیلا پھاٹک استعمال کرنا شروع کیا ——

خاتون کی عمر چھتیس سال کی لگتی تھی لیکن اُس نے مجھے بتایا کہ اُس کی عمر تینتالیس سال کی ہے۔ عورتیں عمر کے معاملے میں سچ نہیں بولتیں لیکن وہ اِتنی سیدھی سادی تھی کہ اُس نے اصلی عمر بتادی۔ حالانکہ اُس کی صحت اِتنی اچھی تھی کہ اگر وہ دس سال کم بتاتی تو بھی یقین آجاتا۔ اُس کا بھی دُنیا میں کوئی نہیں تھا۔ اُس نے اپنی مرحومہ بہن کی بیٹی کو پالا پوسا تھا لیکن اب اُس کی شادی ہو چکی تھی۔ اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ کسی دوسرے شہر میں رہتی تھی۔

رفتہ رفتہ ہمارے تعلقات بڑھتے چلے گئے۔ وہ واپس جانے لگتی تو میں اُسے پیلے پھاٹک تک رخصت کرنے کے لئے جاتا۔ اگر میں اُس کے گھر جاتا تو وہ مجھے پیلے پھاٹک تک چھوڑنے آتی۔ ہم اکثر اِس پھاٹک پر ہاتھ رکھے اِدھر اُدھر کی باتیں کیا کرتے۔

اور پھر دن میں دو دو، تین تین مُلاقاتیں ہونے لگیں۔

پھر —— نہ جانے کیسے میرے دل میں یہ خیال جگہ پانے لگا کہ وہ خاتون دراصل وہی لڑکی تھی جو بچپن میں میرے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ ایسے موقعوں پر جب میں اُسے کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھنے

لگتا تو وہ میری یہ کیفیت دیکھ کر بُری طرح شرما جاتی۔

میں نے اکثر دل میں اِس بات کا تہیہ کیا کہ اُس سے دریافت کر لوں کہ وہ سچ مچ وہی لڑکی ہے یا نہیں؟ دھیرے دھیرے مجھے یقین ہونے لگا کہ وہ میری بچپن کی ساتھی ہے۔ اسی جذبے کے تحت میں کبھی کبھی اُس کا گورا نرم ہاتھ بھی چھو لیتا جس پر اُس کا چہرہ گلنار ہو جاتا۔

میں نے آخر ایک دن ہمت سے کام لے کر یہ سوال کر ہی ڈالا۔ کیونکہ میں اُسے بتا چکا تھا کہ مجھے اُس سے ایک دن بڑا ہی اہم سوال کرنا ہے۔ اس وقت ہم بانسوں کے سائے تلے کھڑے تھے۔ جیسے پھاٹک پر ہاتھ دھرے ہم ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے تھے وہ میرا سوال سُن کر بولی۔

"نہیں میں بچپن میں یہاں کبھی نہیں آئی۔ میرا بچپن اور جگہ بیتا۔ یہاں تو پچھلے چار ہی سال سے نوکری کے سلسلے میں قیام ہے۔"

یہ سُن کر میرے خواب برباد ہو گئے۔

شاید میرا چہرہ بھی لٹک گیا۔

وہ کچھ ہچکچا کر بولی۔

"اچھا آپ اپنے عرصے سے یہی سوال پوچھنے کے لئے بے قرار تھے"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اُس نے پھاٹک سے ہاتھ اٹھا لیا۔ اور مجھ کو کرسی تا یا غم کی مورت بنی اپنے مکان کی جانب چل دی۔

اُسے جاتے دیکھ کر مجھے یکایک تنہائی کا احساس ہوا۔ میں نے دفعتہً بے سُری آواز میں پکار کر کہا۔

"سُنیئے!"

اُس نے اُداس ہرنی کی طرح گھوم کر میری طرف دیکھا۔ پھر پھاٹک کے پاس پہنچی۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"میں سمجھتی تھی کہ آپ مجھ سے کچھ اور کہنا چاہتے تھے!"

اب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

فوراً بولا —— "حقیقت یہ ہے کہ میں آپ سے دریافت کرنا چاہتا تھا کہ کیا آپ ہمیشہ کے لئے میری بننا پسند کریں گی؟"

یہ سُن کر اُس کے چہرے پر پھول کھل اُٹھے۔ اور وہ کچھ کہے بغیر وہاں سے چل پڑی۔

جتنے سال پہلے کی طرح میری تمنائیں آج بھی اِس پیلے پھاٹک کے ارد گرد منڈلا رہی ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ پیلا پھاٹک میرے دل کی کیفیت خوب سمجھتا ہے۔ اور چپ چاپ مسکرا رہا ہے!!

پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری
ایم۔ اے

مستیوں کی جان ہے تیرا بدن | اِک خمارستان ہے تیرا بدن

جسم ہے یا جان ہے تیرا بدن | یا خدا کی شان ہے تیرا بدن

طابعِ ہر عضو ہے ہستی مری | حُسن کا فرمان ہے تیرا بدن

دیویت کی شان سر سے پاؤں تک | خوابِ ہندوستان ہے تیرا بدن

زندگانی ہے عبارت درد سے | درد کا درمان ہے تیرا بدن

سُنتے ہیں تکرار جلوے کو نہیں | اور کچھ ہر آن ہے تیرا بدن

دوستی اے دوست ہے جانِ جہاں | دوستی کی جان ہے تیرا بدن

سرمدی فن کا کوئی شہکار ہے | یا مرا دیوان ہے تیرا بدن

کاش اس کے ساتھ رہیے عمر بھر | دل کا ہر سامان ہے تیرا بدن

خود خبر اُس کو نہیں کیا چیز ہوں | کس قدر انجان ہے تیرا بدن

کافرِ عشقم کہ اے جانِ جہاں | جان ہے ایمان ہے تیرا بدن

ہاں دو عالم میں نہیں جس کا جواب | وہ سوالستان ہے تیرا بدن

راز اندر راز ہے یہ زندگی | اِس کی اِک پہچان ہے تیرا بدن

سو رہے ہیں جس میں فتنے بے شمار | حشر کا امکان ہے تیرا بدن

کسبِ فن کرتا رہا جس سے فراق
وہ نگارستان ہے تیرا بدن
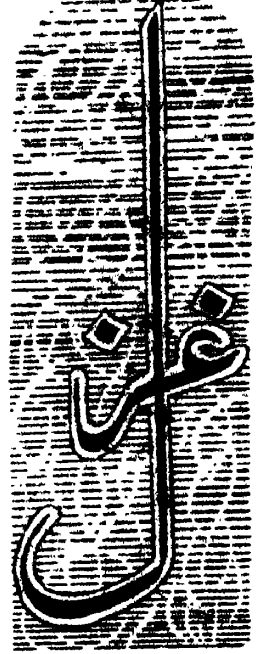
افسانہ

چاکِ دامن

پروفیسر حامدی کاشمیری ایم اے

بھوری کدل سرینگر کشمیر

۱۸ اپریل ۱۹۶۳ء

میرے عزیز بھائی!

.....اس افسانے کے کردار ہماری سوسائٹی کے ایک طبقے کے جانے پہچانے کردار ہیں۔ اور مدت سے چاک دامن کے رفو کو ترستے ہیں۔ اُمید ہے یہ افسانہ آپ کو اور قارئین کو پسند آئے گا.....آپ اپنے رفتہ رفتہ بھائی کو یاد کرتے ہیں تو رُوح پر عجب کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ..افسانہ نمبر کی کامیابی کے لئے دعا کر رہا ہوں....

آپ کا بھائی —— حامدی کاشمیری

پانچ بج چکے تھے۔

اُس کی بے چینی بڑھ رہی تھی۔

وہ کمرے کی برآئی۔ بہار کی معطر ہوا کے جھونکوں سے ریشمی پردے سرسرا رہے تھے۔ باہر خوشگوار دھوپ تھی اور نیچے لان میں شبنم بید کی نرم لچکیلی کرسی پر نیم دراز تھی۔ اُس کے ریشمی بالوں کی دو لٹیں شانوں کو ڈھکے ہوئے تھیں۔ اُس کی گود میں ہمنگوے کا "اولڈ مین اینڈ دی سی" تھا اور وہ ناول میں گم تھی۔ سفید ریشمی فراک اور شلوار میں وہ سنگِ مرمر کا کوئی حسین مجسمہ نظر آ رہی تھی۔

لمحہ بھر کے لئے وہ شبنم کو دیکھتی رہی۔ وہ کھو سی گئی۔ جیسے وہ شبنم نہیں، جمیلہ ہی ہے۔ ابھی چند سال پہلے کی بات ہے کہ وہ شبنم کی طرح کھلتی ہوئی کلی تھی۔ ویسا ہی مرمریں خوب صورت جسم، ویسی ہی خواب گوں آنکھیں ویسی ہی نزاکت، کالج میں وہ بیوٹی کوئین کہلاتی تھی۔ لیکن آج....؟

اُس کی آنکھیں لان سے آگے دُور تک سیب کے درختوں پر کھلے ہوئے شگوفوں میں اُلجھ گئیں۔ ہوا کے جھونکوں سے پتیاں بکھر رہی تھیں۔ وہ سوچنے لگی، ہوا کے یہ جھونکے کتنے ظالم ہوتے ہیں۔ کاش یہ پتیاں بکھر نہ جاتیں۔ درختوں کی شاخوں پر یہ کتنی بھلی، کس قدر پیاری معلوم ہوتی ہیں لیکن یہ پتیاں بکھر جاتی ہیں۔ بکھر جانا ہی ان کی تقدیر ہے۔

اُس کے خیالوں میں اُداسی کا کوئی سایہ نہیں لہرایا۔

وہ ہر لمحہ جوانی کے حسین آنچل کو حُسن اور محبت کے پھولوں سے بھرتی ہے۔ وہ رُوح کی خلوتوں کو خوشبو اور کیف سے آباد کرتی ہے۔ خوشبو اور کیف!

لیکن کیا آج اُس کی دل کشی تازگی اور حُسن میں کوئی کمی آگئی ہے؟ نہیں، وہ آج بھی بہاروں کی مانند شاداب اور جوان ہے۔ بہاریں ہمیشہ جواں رہتی ہیں۔ اُس کے پہلو میں ایک جوان دل دھڑکتا ہے۔ اُسکی نگاہیں آج بھی حسین لمحوں کی پرستار ہیں۔ وہ حسین لمحوں پر جان دیتی ہے۔ یہی زندگی ہے۔ زندگی کے حسین لمحوں کے نشے میں ڈوب جاؤ۔ اور کل کی بات کل پر چھوڑ دو۔ یہی زندگی کی مسرتوں کا راز ہے۔

وہ شگوفوں پر ایک بہکی ہوئی نظر ڈال کر کمرے کے اندر آئی۔ کمرے کی خوب صورتی کو آج چار چاند لگ گئے تھے۔ جو چیز جہاں بھی نہایت قرینے سے تھی

اور آئینے کی طرح جگمگا رہی تھی۔ اخروٹ کی لکڑی کی منقش الماری میں خوبصورت اور قیمتی کتابیں دیوار کے ساتھ چھوٹے سے ٹیبل پر سنگِ مرمر کے دو یونانی دیوتا۔ اور دیواروں پر بنائی ہوئی الماری پر فریم کئے ہوئے کئی گروپ فوٹو۔ نئے ڈیزائن کے چمکیلے سوفہ سیٹ۔ کرسیوں کے ساتھ ٹی پائی پر پھول دار شیشے کے ایش ٹرے۔ سامنے ٹیبل پر انگریزی رسالے۔ اُن کے سرورق پر نیم عریاں نسوانی تصویریں۔ فرش پر ایک نرم کشمیری قالین۔ اُس نے ایک گہری نظر سے ڈرائنگ روم کو دیکھا۔ اطمینان کی ایک ہلکی سی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں کے ایک کونے سے جاگی۔ اور وہ تیزی سے کمرے سے نکلی۔ جب وہ بیڈ روم میں قدِ آدم آئینے کے سامنے آئی تو اُس کے گلابی ہونٹوں کی مسکراہٹ اور شوخ ہو گئی۔

وہ تو آج بالکل شبنم کی طرح نظر آ رہی ہے، ایک کالج گرل! خوب! انوار صاحب پھڑک اٹھیں گے۔ پچھلے مہینے جب وہ اور مسز گپتا انوار احمد کے ساتھ پہاڑی کے دامن میں پکنک کو گئی تھیں اور اُس نے ماڈرن فیشن کی تنگ پائینچے کی سفید شلوار اور چست فراک پہنا تھا تو انوار صاحب اُسے دیکھ کر پاگل سے ہو گئے۔

"تم تو بالکل ایک کالج گرل معلوم ہوتی ہو!"

وہ کہتے رہے۔

اور اُس کے قہقہے جھرنوں کے شور میں ڈوب گئے۔ آج وہ پھر اُسے اسی لباس میں دیکھیں گے۔ تو ۔ ۔ ۔ اُسے خود بھی یہ لباس اچھا لگتا تھا۔

"تمہارے سڈول جسم کے خطوط میں جیسے کنول جل اٹھتے ہیں۔ خوب یاد آیا مسٹر برکت کا خیال تھا یہ! اُس نے مغل باغ میں ایک خوبصورت چاندنی رات میں ایک شگوفہ بار ٹہنی کے نیچے دیکھ کر یہ کہا تھا۔ اور وہ اُس کی وحشی نگاہوں سے ڈر گئی تھی۔ "مجھے تمہاری آنکھوں سے ڈر لگتا ہے"! اور وہ اُس کی چوڑی [illegible] تی سے لگ چکی تھی۔ وہ دھیرے سے مسکرائی۔ برکت کے بعد انوار احمد ہی ہیں جنھیں یہ لباس پسند آیا ہے۔ ستیش اور احمد تو اِس لباس کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ اپنے اپنے ٹیسٹ کی بات ہے۔ ایک بار جب وہ اِس لباس میں پارٹی پر گئی تو احمد نے عنایت اللہ سے اُس کا تعارف کراتے ہوئے کہا تھا۔ یہ جو آپ کو ٹیڈی گرل نظر آ رہی ہے، یہ ۔ ۔ ۔ ہلی فلیو۔ لیکن انوار ابھی خود جوان ہے، اُس کے سینے میں جوانی کی آگ ہے۔ وہ اُسے بھی جوان دیکھنا چاہتے ہیں۔

اُس نے اپنے جسم پر ایک ناقدانہ نظر ڈالی۔

ترشے ہوئے معطر بال، دو بڑی بڑی سُرمگیں آنکھیں، ستواں ناک، ملے ہوئے ابرو۔ چہرے کی صباحت، اُسے زیادہ پوڈر کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ وہ اب بھی پوڈر استعمال نہ کرتی اگر اُس کے گال کے نیچے دو ایک شکنیں نمودار نہ ہوتیں۔ اُس کے ہونٹ موٹے ہیں پھر بھی بُرے نہیں۔ اور دائیں طرف ٹھوڑی کے اُوپر ایک سیاہ تل۔ کاش یہ تل ذرا گال کے اُوپر ہوتا، گڈ گارڈ! پھر تو اُس کے چہرے پر کسی کی نظر نہ ٹھہرتی۔ لیکن ستیش کو یہ تل پھر بھی بہت پسند ہے اُسے تو اُس کے جسم میں قلوپطرہ کا حسن نظر آتا ہے۔ پاگل ۔ ۔ ۔ !

اُس کے جسم کے دوسرے خطوط؟ ۔ ۔ ۔ ۔ نہ جانے موٹاپے کی یہ تہہ کہاں سے چڑھ گئی۔ نہیں تو وہ بہت نازک تھی۔ پھول کی ایک ٹہنی کی طرح۔

وہ اب بھی جب شبنم کے ساتھ چلتی ہے تو دیکھنے والے سمجھتے ہیں کہ دو بہنیں جا رہی ہیں۔ یہ بات تو اُن کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتی کہ وہ ماں اور بیٹی ہیں۔ یہ تو محض اتفاق ہی ہے کہ شادی کے بعد ایک ہی سال میں وہ ایک بچی کی ماں بن گئی۔ ورنہ وہ آج بھی ایک کنواری لڑکی نظر آتی۔ کرنل اشفاق کے پچھلی جنگ میں لاپتہ ہونے کے بعد اُس نے شادی نہ کی۔ بڑے بڑے آدمیوں نے اُس سے شادی کی آرزو کی لیکن وہ اب اُس زنجیر کو اپنے پاؤں میں ڈالنا نہ چاہتی تھی۔ شادی کے بارے میں ہمیشہ اُس کا ایک انفرادی نظریہ رہا ہے۔ شادی عہدِ جاہلیت کی ایک اندھی رسم ہے۔ عورت کی غلامی، شخصیت کی موت۔ لیکن جب اُس کی شادی ہوئی تو وہ کوئی احتجاج نہ کر سکی۔ وہ جانتی تھی کہ اُس کا احتجاج بے سُود ثابت ہوگا۔ کرنل صاحب کی دُور تک پھیلی ہوئی جائداد کے چرچے کہاں کہاں نہ تھے۔ لیکن شادی کے ایک ہی سال میں اُن کی

عائلی زندگی کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ وہ کرنل صاحب کے تحکمانہ رویے کو
برداشت نہ کر سکی۔ کرنل صاحب ہوتے تو وہ گھر میں بھی لفٹ رائٹ اور
اٹینشن کرنے سے باز نہ آتے۔ اور وہ ہونٹ چبا کر رہ جاتی۔ اور جب کرنل صاحب
جنگ میں لاپتہ ہو گئے تو اُس نے دوسری شادی نہ کی۔ گھر میں شبنم کی تعلیم
و تربیت میں گم رہی۔ اور باہر دوستوں کی محبت اور رفاقت میں کھوئی
رہی۔ جس طرف اُس کی نظریں اُٹھیں، محبت سے دھڑکتے ہوئے کتنے
دل سجدہ ریز ہو گئے۔ اُسے اور کیا چاہئے تھا؟ زندگی کے ہر حسین لمحے
کی کیف اور مٹھاس چوس لیتی۔ وہ سرشار ارمانوں کے ہجوم میں جی رہی
تھی۔

کرنل صاحب کی ساری جائداد کی وہ تنہا مالک تھی!

اُسے اپنی خوش قسمتی پر ناز تھا۔

اُس نے جس چیز کی آرزو کی وہ اُسے ملی۔ ناامیدی کا سایہ بھی اُس سے
دُور رہتا!

اور جب ٹریڈنگ کمپنی کے مالک مسٹر انوار احمد کو اُس نے پہلی بار دیکھا تو اُس
کی پلکیں جھپک کر رہ گئیں۔ واپسی پر اُس کے دل پر ایک بھاری بوجھ تھا
نیند اُس رات دیر تک نہ آئی۔ یہ کیسی بے چینی تھی اُس کے خیالوں میں۔
رُوح کی گہرائی میں ایک اجنبی درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔

وہ حیران تھی۔

درد کا یہ کیسا جذبہ اُس کے دل میں جاگ اُٹھا ہے۔ اُس درد نے
اُس کے اندر کی سوئی ہوئی کتنی حسیات کو بیدار کر دیا تھا۔ کتنی لطیف کیفیتیں
اُس کے جسم کے رُوئیں رُوئیں میں کسمسا رہی تھیں۔ اُس رات کمرے
میں چاندنی میں نہائے ہوئے دریچے پر اُسے محسوس ہوا۔ چاند دہکتا ہوا
آگ کا گولہ ہے۔ جو اُس کے پہلو میں اُتر آیا ہے اور وہ جل رہی ہے۔
انوار احمد کی جگمگاتی ہوئی شخصیت کے جلووں نے اُس کی آنکھوں میں چکاچوند
پیدا کر دی تھی۔

وہ گھبرا گئی تھی!

"کیا مرد اس قدر خوب صورت ہو سکتا ہے؟!"

"کیا مرد اتنی تیزی سے رُوح کی خاموش خلوتوں کو ہنگاموں سے
بدل سکتا ہے؟"

اور جب اُس کی سُلگتی ہوئی پلکیں بھیگ گئیں تو اُسے احساس ہوا
کہ وہ انوار احمد کے بغیر جی نہیں سکتی۔ اور جب تک وہ اُس کے پیار کو حاصل
نہ کر سکی اُس کی اُداسی نہ گئی۔

لمحے زہر ٹپکا رہے تھے۔

اُس کے پیار اور اُس کے التفات کو حاصل کرنے میں اُسے کتنی
صبر آزما منزلوں سے گزرنا پڑا لیکن وہ کامیاب ہو گئی۔ ناکام وہ کبھی نہیں
ہوئی تھی۔ شکست اُس کی تقدیر نہ تھی۔

اُس کے دل نے دھڑک کر کہا۔

"وہ آتے ہی ہوں گے!"

اُس نے اپنی سڈول کلائی میں سونے کے رِسٹ میں بندھی ہوئی
رومر گھڑی دیکھی۔

ساڑھے پانچ بج چکے تھے!

بیقراری کی ایک تیز لہر اُس کے جذبات کو مشتعل کر گئی۔

ڈرائنگ رُوم میں واپس جانے کے بجائے وہ سیڑھیوں سے
نیچے اُترنے لگی۔ وہ فوراً ڈرائنگ رُوم ہی میں واپس آئے گی اور ان کا
انتظار کرے گی۔ شبنم تو اپنی دُنیا میں گم ہے۔

بے چینی کی تاب نہ لا کر وہ لان میں رنگارنگ پھولوں کی کیاری
کے قریب کرسی میں نیم دراز شبنم کی طرف جانے لگی۔

شبنم کتاب میں کھوئی ہوئی تھی۔

وہ قدموں کی مترنم آہٹ سے چونکی۔

اُس نے انگڑائی لی۔ فضا میں جیسے نشہ بکھر گیا۔ شگوفے مُسکرائے۔
دوسرے لمحے وہ ایک دوشیزہ ادا کے ساتھ اچانک اُٹھ کر کھڑی ہو گئی
اور مخمور لہجے میں بولی۔

"ممی! آ گئے آپ کے گیسٹ؟"

"ابھی نہیں آئے!"

"آگئی!" وہ گھڑی کو گھور رہی تھی۔

"بس آتے ہی ہوں گے!" جمیلہ کی نظریں جھک گئیں۔

"کون صاحب ہیں یہ؟"

"پھر وکیلوں کی طرح جرح کرنے لگیں تم، میں نے کہا تھا کہ بی۔اے کے بعد ایل ایل بی کر لو!"

اُس کے لہجے کی ترشی چھپ نہ سکی۔

شبنم خاموش ہوگئی۔

اتنے میں باہر کا گیٹ کھلا۔

دونوں کی نظریں اُٹھ گئیں۔

"آئیے انوار صاحب! بہت انتظار دکھایا!!" جمیلہ بے تابی پر قابو نہ پا سکی۔

"آئی ایم ویری سوری مسز جمیلہ!"

وہ اُن کے قریب آچکا تھا۔

جمیلہ نے کہا۔

"یہ شبنم ہیں، میری بچی، جن کا ذکر میں نے کیا تھا۔"

"ارے مس شبنم!..... آپ؟" اچانک انوار احمد و فورِ مسرت سے بولے۔

"اور آپ مسٹر انوار؟!"

شبنم کی خوابناک آنکھیں پھیل گئیں۔

اور جمیلہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کبھی شبنم اور کبھی انوار احمد کو دیکھتی رہی۔ اور جب شبنم نے انکشاف کیا کہ مسٹر انوار احمد اُس کی نئی سہیلی غزالہ کے چچازاد بھائی ہیں اور پچھلے مہینے اِن کی پہلی ملاقات ہوئی ہے۔ اور پھر وہ کئی بار غزالہ کے ہاں ملے ہیں۔ تو جمیلہ کی آنکھوں میں ایک تاریک سایہ لہرایا۔ اُس کے دل کی دھڑکن ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئی۔

وہ تینوں چائے پی رہے تھے۔

مختلف موضوع زیرِ بحث تھے۔

انوار احمد ہر موضوع پر روانی اور شگفتگی سے بول رہے تھے۔

دونوں کے چہرے کھلے ہوئے پھولوں کی طرح شاداب تھے لیکن رہ رہ کر جمیلہ کے دل میں کانٹے کی سی چبھن محسوس ہوتی۔ شبنم کی موجودگی اُسے کھٹک رہی تھی۔ اُس کے تصور میں انوار احمد سے اِس ملاقات میں کسی تیسرے انسان کی پرچھائیوں کا گزر بھی نہ تھا۔ وہ انوار احمد سے مکمل تنہائی میں باتیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ آج تنہائی کے لمحوں میں اپنا دل کھول کر دکھانا چاہتی تھی۔ وہ آج سارے حجابات کو آگ لگانے پر تلی ہوئی تھی۔

اُس نے ہر طرح کا اہتمام کر رکھا تھا لیکن.... ؟

لیکن شبنم.....؟

چائے کے گھونٹ اُسے زہر کے گھونٹ معلوم ہو رہے تھے۔

کاش یہاں شبنم نہ ہوتی۔

کاش اُس نے شبنم کو جنم نہ دیا ہوتا۔

کاش ——!

اچانک اُس نے شبنم کے سراپا پر ایک گہری نظر ڈالی۔ ایک عجیب سی نظر، جو نفرت اور جلن سے بھرپور تھی۔ چونکی ہوئی، خوفزدہ وہ گھبرا گئی۔

شبنم اُس کی زندگی کی مسرتوں میں زہر پھیلا رہی ہے۔ لیکن....

"مس شبنم!"

"جی!"

"اب کیا سوچا ہے آپ نے؟"

"کس بارے میں؟"

"مزید تعلیم کے سلسلے میں۔"

"آئی سی۔ آپ تعلیم کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔ ممی کہتی ہیں کہ میں وکالت پڑھوں۔ میرا خیال....."

"میں ٹھیک کہتی ہوں۔ جرح کرنا کوئی تم سے سیکھے۔"

"بھئی ایسا مشورہ نہ دیجئے انھیں۔ ڈگری لے کر تو بیچارے وکیلوں کا ناطقہ بند کر دیں گی۔"

شبنم کا شاداب کھنکتا قہقہہ گونج اُٹھا۔ اور جمیلہ تلملا رہی تھی کہ انوار

ی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرنے کی شعوری کوشش کے باوجود وہ بار بار شبنم کو والہانہ نظروں سے دیکھ لیتے اور براہِ راست اُس سے گفتگو کا کوئی نہ کوئی پہلو نکال لیتے۔

مایوسی اور شکست کے یہ لمحے اُس کی برداشت سے باہر تھے لیکن شکست اُس کی تقدیر نہیں، اُسے اپنی انفرادیت کے جادو پر اعتماد تھا۔

شام کے نرم دھندلکے سیب کے درختوں کی پھیلی ہوئی بانہوں سے اُتر رہے تھے۔ وہ کھڑکی پر تھی۔ اُداس، کھوئی ہوئی۔

اتنے میں باہر کا گیٹ کھلا۔

شبنم اندر آئی۔

اور گیٹ کے باہر انوار احمد تھے۔ وہ اندر نہیں آئے۔ دوسرے لمحے انھوں نے کار اسٹارٹ کی۔

"تم کہاں گئی تھیں آج شبنم؟"

"مسز الہ کے ہاں!"

وہ ... نس کو سنبھال نہ سکی۔

"یہ مسز الہ کون ہے؟"

"میری فرینڈ ہے۔" اُس کی سوالیہ نظر بیامی کے چہرے پر گڑ گئیں۔

"ہاں ہاں تم نے کہا تھا۔ وہاں مسٹر انوار احمد تو نہیں تھے؟"

"نہیں تو میں نے انھیں کئی روز سے دیکھا نہیں۔"

جمیلہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔

شام کے اندھیروں نے درختوں کی بانہوں کو چھپا لیا تھا۔

جب وہ اتوار کو شام کے بعد گھر آئی تو اُس کا سارا وجود دھونکنی کی طرح ... رہا تھا۔ وہ ایک زخم خوردہ ناگن کی طرح پھر اُٹھی تھی لیکن جمیلہ کے ... خود ... ریسٹ ہاؤس میں اُس نے انوار احمد کو دل کے اندر اُٹھتے ... گرجتے ہوئے طوفانوں سے بے خبر رکھا۔ اُس نے چہرے کی مسکراہٹ کو پھیکنے نہ دیا۔

وہ لمحہ جب اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کے پاگل جذبے کے تحت وہ شگوفوں کی مانند بکھر رہی تھی۔ تو انوار احمد کتنی بے نیازی سے دامن جھاڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور وہ ہونٹ چبا کر رہ گئی۔ یہ اُس کی نسائیت کی توہین تھی۔ اور وہ سوچتی رہی۔ کیا یہ وہی انوار احمد تھے جو اُس کی ایک نگاہِ غلط انداز کے لئے ترستے تھے۔ وہی انوار احمد جو اُس کی ایک مسکراہٹ پر نقدِ جان لٹانا چاہتے تھے!

لیکن آج ------ !؟

کیا اُس کے جسم میں پہلی سی کشش نہیں رہی ہے؟

کیا اُس کی محبت کی آگ سرد پڑ چکی ہے؟

نہیں، ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔

پھر یہ کیا ہو رہا ہے؟

شبنم نے اُن کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا تھا۔

اور جمیلہ تین روز سے بخار میں جل رہی تھی۔ وہ سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی۔ ورنہ بستر سے لگ گئی تھی۔ وہ بنگلے کے اندر آئی اور سیدھی اپنے کمرے کے اندر گئی۔ نوکر کو اُس نے کمرے میں آنے سے منع کر دیا۔

وہ دیر تک بستر پر یونہی پڑی رہی۔

شام کے لپکتے ہوئے اندھیروں میں۔

اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ لیکن اُس کے دماغ کی ایک ایک نس جاگ رہی تھی۔

اُس کے دل میں کتنے محشر کروٹیں بدل رہے تھے۔

شکست اُس کی تقدیر نہیں!

مایوسی اُس کی زندگی نہیں۔

وہ فتح اور کامرانی کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ وہ ہمیشہ کامران رہی ہے۔ جس چیز کی اُس نے چاہ کی، وہ چیز اُسے مل کر رہی۔

وہ کامران رہے گی یا مٹ کر فنا ہو جائے گی۔

وہ زندہ رہے گی۔

اُسے زندگی سے پیار ہے۔ بے پناہ پیار، اور اُس کی زندگی

ہموار راستہ ہے۔ وہ اب اُس کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اپنی راہ میں حائل ہونے والے ہر پتھر کو وہ پاش پاش کر دے گی۔ اُس کی انفرادیت میں طوفانوں کی قوت ہے۔ اُمڈے ہوئے طوفان کے آگے کون سی چیز ٹھہر سکتی ہے؟

معاً اُسے ایک نامعلوم اطمینان کا احساس ہوا۔

اُس نے آنکھیں کھولیں۔

وہ اُٹھی۔ سوئچ آن کیا۔ سارا کمرہ روشنی کے سیلاب میں ڈوب گیا

اتنی زیادہ روشنی سے وہ کانپ سی گئی۔

سب سے پہلے اُس نے کھڑکیوں کے پردے گرا دیئے۔

پھر اپنا لباس بدل دیا۔ کچھ سوچ کر وہ بیڈ پر بیٹھی۔ وہاں سے اُٹھی اور کنجیوں کا گچھا لے کر الماری کی طرف گئی۔ رُکی، ہڑک کر پلٹی اور دروازے کی طرف گئی۔ اور دہلیز کو پار کر کے شبنم کے کمرے کی طرف آئی۔ وہاں نوکر نکلا۔

"کیا حال ہے شبنم کا؟" اُس کی اپنی آواز اُسے اجنبی محسوس ہوئی۔

"اب ٹھیک ہے جی! ابھی ابھی آنکھ لگی ہے۔"

نوکر چلا گیا۔

وہ اندر آئی۔

خاموشی کانپ رہی تھی۔

شبنم بجلی کی سبز مدھم روشنی میں سو رہی تھی۔

"شبنم ——!" اُس کے ہونٹ ہلے۔

خاموشی اور گہری ہو گئی۔

وہ جلدی سے وہاں سے نکلی۔ اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنے کمرے میں آئی۔

ایک لمحہ بھی نہ گزرا تھا کہ وہ واپس دبے پاؤں شبنم کے کمرے میں پہنچی۔ اُس کا کانپتا ہوا جسم پسینے پسینے تھا۔ اُس کے دائیں ہاتھ میں رعشہ سا طاری تھا۔

وہ شبنم کے بیڈ کے قریب آئی۔

شبنم بے خبر سوئی تھی۔ اُس کی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں بند تھیں دراز پلکیں ہم آغوش تھیں۔ اُس کے نتھنے آہستہ سے ہل رہے تھے۔ اور ہونٹ قدرے کھلے تھے۔ اُس کی نگاہیں اُس کے نتھنوں اور ہونٹوں پر جمی رہیں

اچانک اُس کی نظریں اُس کے سارے چہرے پر پھیل گئیں۔ اُس کے چہرے پر معصومیت تھی۔ سوئی سوئی معصومیت، نکھری نکھری سی۔

اُف! یہ اُس کے پیلے سے چہرے پر کیسی معصومیت تھی۔ وہ بالکل دودھ پیتی بچی معلوم ہو رہی تھی۔ جو ابھی روتے روتے ماں کی گود میں سو گئی ہے۔ لمحہ بھر کے لئے وہ بھول ہی گئی کہ وہ وہاں کیا کرنے آئی ہے۔ وہ سوچنے لگی۔ وہ بارہا اسی طرح روتے روتے اُس کی گود میں سو گئی تھی!

اُس کے سینے میں ایک جھرجھری سی دوڑ گئی۔

وہ ایک عجیب وحشت کے عالم میں پیچھے مڑی۔

اور جب وہ کانپتے ہوئے جسم کے ساتھ اپنے کمرے میں واپس گئی تو بستر پر گرتے ہی اُس نے خواب آور گولیوں کی بڑی شیشی خالی کر دی!!

ابو الفصاحت پنڈت لبھو رام جوشؔ ملسیانی

کیوں تغزل کا نگہباں نہ رہے فن میرا
یہی پونجی ہے مری اور یہی دھن میرا

باغ میں کوئی ٹھکانا نہیں ملتا نہ سہی
بجلیاں خود ہی بنا دیں گی نشیمن میرا

دوستوں کی بھی کہیں قدر نہ مٹ کر رہ جائے
دشمنی ترک کئے جاتا ہے دشمن میرا

دے دیئے گریۂ خونیں نے مجھے پھول ہی پھول
تم تو کانٹوں ہی سے بھرتے رہے دامن میرا

چشمِ ظاہر میں تو اک خاک نشیں ہوں لیکن
عرشِ اعظم سے بھی اونچا ہے نشیمن میرا

کوئی نعمت جو ملی تھی تو سنبھالی نہ گئی
اس قدر چاک ہوا عشق میں دامن میرا

سر پٹکتی ہی رہیں، خاک اڑاتی ہی پھریں
آندھیوں کو نہ ملے گا کبھی گلشن میرا

گرم آہوں کو تو روکوں گا مگر خوف یہ ہے
گرم اشکوں سے نہ جل جائے نشیمن میرا

باغ ہو، دشت ہو، یا راہ گزر ہو کوئی
جس جگہ بیٹھ گیا، ہے وہی مسکن میرا

توبہ کرنے پہ بھی آیا ہے ریا کا الزام
تر ہوا اشکِ ندامت سے بھی دامن میرا

ترکِ الفت پہ بھروسا تھا بہت پہلے جوشؔ
بدنصیبی ہے کہ اب وہ بھی ہے دشمن میرا

جوشؔ ملسیانی

آئیے، آپ کو مالا سنہا کا ہمراز بنائیں...

"لکس سے میرا رنگ روپ دمک اُٹھتا ہے"

وہ کہتی ہیں۔

مالا سنہا کہتی ہیں: "آرائش جمال کا آغاز میں ہر روز لکس سے کرتی ہوں۔ اِس کا خالص، ملائم جھاگ کتنا دلربا ہے، کتنا حسن افزا! اپنی جلد کو خوشبودار لکس سے نکھرنے کا موقع دیجیے... آپ کا رنگ روپ بھی دمک اُٹھے گا۔"

لکس ٹائلیٹ صابن
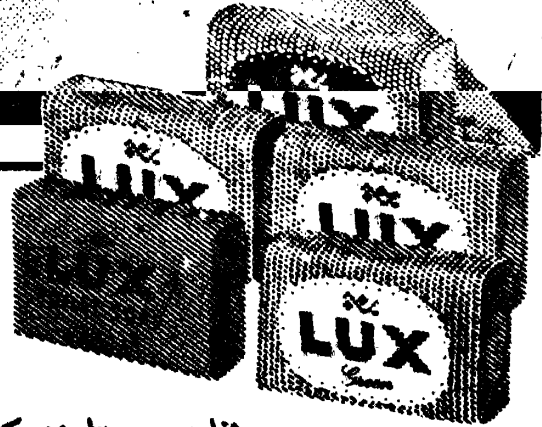
فلمی ستاروں کا خالص، ملائم، حسن بخش صابن

دھنک کے ۴ رنگوں میں اور سفید

ہندوستان لیور کا تیار کردہ

LTS. 145-140-45 UD

افسانہ

خطوط کا جال

مختار الرحمن راہی بی اے۔ ایل ایل بی

اکاؤنٹنٹ ڈسٹرکٹ جیل۔ ٹونڈ

۲۰ اپریل ۱۹۶۳ء　　　　محترمی و مکرمی حضرت خوشتر گرامی صاحب! آداب

"بیسویں صدی" کے بالغ نظر پرستار میری طویل خاموشی اور بزمِ "بیسویں صدی" سے غیر حاضری کی وجہ مجھ سے پوچھ رہے ہیں سو مجھی سے میری بات پوچھتی ہے ؟ یہ دُنیا اپنے لئے کتنی اجنبی ہے — خوشتر بھائی! ایک غمِ حیات اور غمِ روزگار کا مارا اور کیا کہہ سکتا ہے۔ آپ کے خلوص سے آخر ہجومِ غم میں گھرے ہونے پر بھی بہت ایک کہانی لکھوا ہی لی ہے "خطوط کا جال" حاضر ہے۔ آپ کی بصیرت افروز رائے کا منتظر ہوں۔۔

آپ کا اپنا ہی — مختار الرحمن راہی

"مس صاحبہ!" نجمی نے اُسے پکارا۔ "ذرا سُنیئے!"

"میرا نام اعجاز نسیم ہے مسٹر! مس صاحبہ نہیں۔" وہ زیرِ لب مسکرائی۔

"اور میرا نام بھی مسٹر نہیں نجمی ہے۔" نجمی نے بھی تُرکی بہ تُرکی جواب دیا۔

"خیر ہو گا۔ مجھے اِس سے سروکار نہیں!" وہ بڑبڑائی۔ "کیا سُنانا چاہتے ہیں آپ؟"

"آپ اُردو جانتی ہیں..؟" نجمی نے پوچھا۔

"آپ میرا امتحان لیں گے؟"

"میرے کس جملے سے یہ مطلب نکلتا ہے؟"

"ہونہہ!"

اُس نے اپنی گردن کو جھٹکا دیا اور آگے بڑھنے لگی۔

"بات بھی کوئی التبا کر کے!" نجمی کی یاس انگیز آواز نے اعجاز نسیم کا تعاقب کیا اور اُس کے قدم یک لخت رُک گئے۔

"آخر آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

اعجاز کی آواز میں جھلاہٹ اور بیزاری تھی۔ چہرہ پر رعونت تھی اور پیشانی پر غم و غصّہ کی لمبی لمبی لکیریں اُبھر آئی تھیں۔

"براہ کرم یہ خط پڑھ دیجئے۔ میں اُردو نہیں جانتا۔ شروع ہی سے ہندی پڑھی ہے نا۔ اِس لئے!"

اور نجمی نے ایک خط اعجاز کے ہاتھوں میں تھما دیا۔

پہلے اعجاز نے خط پر سرسری نظر ڈالی۔ اور پھر پڑھنے لگی۔

"نجمی صاحب! خلوص و احترام!

کل جب میں سرِ بازار کیلے کے چھلکے پر پیر پڑنے سے پھسل کر گر پڑی تھی تو جہاں سب راہگیر قہقہے لگا رہے تھے اور فقرے بازی کر رہے تھے آپ مجسّم خلوص اور شرافت بن کر آئے اور مجھے گھر تک پہنچایا۔ اُس پہلی

ہی ملاقات میں میں نے آپ میں کس قدر یگانگت اور اپنائیت کا جذبہ پایا۔ ممکن ہے آپ نے اسے محسوس کیا ہو کہ میرے مُنہ سے شکریہ کا لفظ بھی نہیں نکلا لیکن میں شکریہ ادا کر کے اُس احسان کا بدلہ نہیں اُتارنا چاہتی تھی جو آپ نے اُن اذیت ناک لمحات میں مجھ پر کیا تھا۔ اُس جھینپ اور شرمندگی کے عالم میں آپ سے آپ کے متعلق کچھ بھی تو نہ پوچھ سکی۔ آپ نے اپنی رہائش گاہ کا پتہ بتایا تھا۔ کچھ بھول گئی۔ کچھ یاد ہے۔ خدا کرے یہ خط آپ تک پہنچ جائے۔ آپ پڑھتے ہیں یا کہیں ملازم ہیں؟

نسرین"

اعجاز نجمی کو خط واپس کر کے جانے لگی تو نجمی نے کہا۔

"ایک گزارش اور ہے!"

"وہ بھی فرما دیجئے!" اعجاز کے لہجے سے بے زاری مترشح تھی۔

"اس خط کا جواب بھی لکھ دیجئے۔" نجمی کی آواز میں التجا تھی۔ "ارے آپ ابھی تک باہر ہی کھڑی ہیں۔ اندر تشریف لے آیئے نا!"

اعجاز نجمی کے کمرے میں آگئی۔

نجمی نے رائٹنگ پیڈ اور قلم اعجاز کو دیتے ہوئے کہا۔

"جواب میں لکھ دیجئے کہ مالی حالت خراب ہونے کی وجہ سے تعلیم کو خیرباد کہہ کر ملازمت کا سہارا لینا پڑا۔ فطرتاً تنہائی پسند واقع ہوا ہوں۔ اس لئے اب تک تنہا ہوں لیکن اب یہ کبھی نہ ختم ہونے والی تنہائی مجھے ڈستی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ یہ ابتہ آپ نے درست لکھا ہے۔ اب آپ سے کہاں اور کب ملاقات ہوگی؟"

"بس یا کچھ اور؟" اعجاز نے اُکتاتے ہوئے پوچھا۔

"آخیر میں لکھیئے۔ نگاہِ التفات کا منتظر۔ نجمی۔"

خط پورا کر کے اعجاز نے نجمی کے ہاتھوں میں اس طرح دیا جیسے اُس نے کوئی بہت بڑا بوجھ ہلکا کیا ہو۔

اور پھر وہ بغیر کچھ کہے چلی گئی۔

دو دن بعد اعجاز نسیم نے نجمی کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے پوچھا۔ اُس خط کا جواب آگیا؟" اُس وقت اعجاز کے لبوں پر معنی خیز تبسم تھا۔

"جی ہاں!" نجمی نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔ "مجھے آپ ہی کا انتظار تھا!"

"میں اُسے پڑھ سکتی ہوں؟"

"جی ہاں! اب تو آپ کو میں بار بار زحمت دیا کروں گا۔" نجمی نے جیب سے خط نکال کر اعجاز نسیم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

وہ پڑھنے لگی۔

"نجمی صاحب! عقیدتیں!

نوازش نامہ باصرہ نواز ہوا۔ آپ کی تنہائی پسند طبیعت نہ جانے کیوں انجمن کی خواہاں ہے۔ خیر حالات اور اسباب کچھ بھی ہوں لیکن ممکن ہے یہ نظریات کی تبدیلی کوئی زبردست انقلاب لے آئے۔ ابھی دو تین دن ملاقات نہ ہو سکے گی۔ موقع ملتے ہی میں خود آپ کو لکھ دوں گی۔ اس خط میں جواب طلب کوئی بات نہیں لیکن پھر بھی مجھے آپ کے خط کا انتظار رہے گا۔

نسرین"

خط پڑھ کر اعجاز نے نجمی کی طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا۔

"مبارک ہو!"

اور نجمی مسکرا کر رہ گیا۔

اعجاز جانے لگی تو نجمی نے کہا۔

"اس خط کا جواب نہیں لکھیں گی؟"

"اوہ!" اُس نے ایک سرد آہ بھری۔ "ہاں لکھوایئے۔" اُس کی آواز میں ہلکی ہلکی گھٹن تھی۔

"تنہائی اور انجمن کے متعلق مجھے اس وقت ایک شعر یاد آرہا ہے۔ جواب میں صرف وہی شعر لکھ دیجئے ؎

اِک تیری یاد نے ہی مجھے حوصلہ دیا
تنہائی میں بھی ساتھ مرے انجمن رہی"

اعجاز جانے کے لئے اُٹھی۔

"ایک منٹ رُکیئے!" نجمی نے کہا۔

"فرمائیے؟" اعجاز زیرِ لب مسکرائی۔ "کچھ اور لکھوانا ہے؟"

"ٹھیک زحمت اور دینی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"آپ تشریف تو رکھیے۔"

اور وہ بیٹھ گئی۔

نجمی نے رُوح افزا کے دو گلاس بنائے اور ایک اعجاز کی طرف بڑھا دیا۔ —————!

"کیا یہ خط لکھنے کا معاوضہ ہے؟" اعجاز کا ہاتھ کانپنے لگا۔

"جی نہیں!" نجمی نے سنجیدگی سے کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ آپ نے مجھے غلط سمجھا۔ کیا یہ وقت اور موسم کا تقاضا نہیں ہے؟"

"اوہ! آپ تو خفا ہو گئے!"

وہ مسکرائی۔

اُس کی آواز اور مسکراہٹ رُوح افزا سے بھی زیادہ رُوح پرور تھی۔

"اوہ! کافی دیر ہو گئی۔"

اعجاز نے خالی گلاس میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

اور چلی گئی۔

تین دن تک نسرین کا کوئی خط نہیں آیا۔ اعجاز روز نجمی سے خط کے بارے میں دریافت کرنے آتی۔ کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی اور چلی جاتی۔ اب وہ نجمی اور نسرین کے حالات میں دلچسپی لینے لگی تھی۔

ایک دن اعجاز نے نجمی سے پوچھا۔

"آپ کو نسرین کے مکان کا پتہ تو معلوم ہوگا؟ ———— آپ ہی اُس کے مکان پر چلے جائیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دشمنوں کی طبیعت ناساز ہو گئی ہو ————!"

"ایک دو دن اور انتظار کر لیں!" نجمی نے مایوسی کے لہجے میں کہا۔

"اگر پتہ بتائیں اور اجازت دیں تو میں وہاں چلی جاؤں؟"

"نہیں۔" وہ ایک دم بول پڑا۔ "ہو سکتا ہے اِس طرح بنی بنائی بات بگڑ جائے!!"

"اوہ ———!" اعجاز کی آواز میں احساسِ شکست تھا!

دوسرے دن نسرین کا خط آیا۔

اعجاز بے تابی سے پڑھنے لگی۔

"میرے نجمی!

میں تین دن کے لئے سورت چلی گئی تھی۔ ابا میرے ساتھ تھے۔ آپ کو میرے خط کا کسقدر انتظار ہوگا اِس کا مجھے احساس ہے۔ کل مجھے نئے پورے جانا ہے۔ کوشش کروں گی۔ شام کے وقت آپ کے کمرے کے سامنے سے گزروں۔ ملاقات ہو سکے گی یا نہیں، یہ ابھی نہیں کہہ سکتی۔ کیونکہ ہو سکتا ہے میرے ساتھ گھر کا کوئی آدمی ہو۔ لیکن یہ بھی کیا کم ہے کہ میں آپ کو دیکھ سکوں گی.....

آپ کی

نسرین"

"غالباً کل شام کو میرا یہاں موجود رہنا مناسب نہیں۔" اعجاز نے خط نجمی کو واپس کرتے ہوئے کہا۔

"ہو سکتا ہے آپ کو یہاں دیکھ کر نسرین مجھ سے بدظن ہو جائے۔" نجمی نے اندیشہ ظاہر کیا۔

"میرا اپنا بھی یہی خیال ہے۔"

اعجاز نے کہا اور مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

دوسرے دن اعجاز نے نجمی سے پُر اشتیاق لہجے میں کہا۔

"کہیئے کل شام کیا گزری؟"

"کچھ نہ پوچھیے خدا کرے کوئی!"

"اب آپ مجھ سے بھی کچھ چھپانے لگے۔ یا پھر شاید مجھے اِس قابل نہیں سمجھتے!" اعجاز کے چہرے پر حزن و ملال، یاس و نومیدی کی جھلک تھی!

"ایسا نہیں ہے اعجاز صاحبہ!" نجمی نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں بھلا آپ سے کیا چھپاؤں گا۔ وہ کل شام کو سامنے سے گزری۔ اُس کے ساتھ آٹھ دس سال کا ایک لڑکا تھا۔ جاتے جاتے وہ میری طرف دیکھ کر

زیر لب مسکرائی۔ اُس کے قدم رُکنے لگے۔ سامنے سے دو راہگیر آرہے تھے۔
اس لئے اُس نے لڑکے سے بلند آواز سے کہا۔

"آؤ جلدی چلو۔ ممکن ہے کل پھر آنا ہو"

یہ کہتے کہتے اُس کی نظریں پھر میری طرف اُٹھ گئیں۔

راہگیر گزر گئے۔

وہ رُک گئی۔

کچھ دیر کے لئے ہم ایک دوسرے کی آنکھوں کی گہرائیوں میں کھو گئے۔ ہم دونوں کو اس طرح دیکھ کر اُس لڑکے نے کہا۔

"باجی! چلئے نا، کیا دیکھنے لگیں؟"

اور پھر وہ چونک کر اُس کے ساتھ چلی گئی۔

"بہت پُر درد اور الم انگیز رُوداد ہے" اعجاز شرارت سے بولی۔

"آپ اس وقت میری بے بسی اور پامال تمناؤں کا مذاق اُڑا رہی ہیں"
نجمی کی آواز کے ساتھ دل کی سوزش کا دھواں نکلا۔ اور اعجاز کے رُخساروں پر پژمردگی کی گرد بن کر چھا گیا۔

"نجمی صاحب!" اعجاز نے کہا۔ "آپ کو میرے متعلق غلط فہمی ہو گئی ہے۔ لیکن آپ ہمیشہ مجھے اپنا ہمدرد اور رفیق پائیں گے۔"

نجمی نے دیکھا اعجاز کی آنکھیں آنسوؤں کے موتی رول رہی تھیں۔ اُس کی سانس پھُولی ہوئی تھی۔ اور وہ آنچل سے آنسو پونچھتی ہوئی باہر چلی گئی۔

دوسرے دن اعجاز نے نجمی کو غمگین اور متفکر دیکھ کر کہا۔

"اب مجھ سے آپ کی یہ حالت نہیں دیکھی جاتی"

"نہ دیکھئے!" نجمی نے جھلّا کر کہا۔

"کب سے بھرے بیٹھے ہیں؟" اعجاز نے معصومیت سے پوچھا۔
"اگر میرا آنا ناگوار گزرا ہو تو میں جاتی ہوں"

"اعجاز! میں آج بہت اُداس اور پریشان ہوں" نجمی کی یاس انگیز اور درد بھری آواز اُبھری اور پھر ڈوب گئی۔

"نسرین کا کوئی خط نہیں آیا کیا؟"

اعجاز قریب آکر بولی۔

نجمی نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"نجمی صاحب! ہجوم رنج والم میں گھر کر بھی مسکرانا سیکھئے۔ غمِ فراق ایک آزار سہی لیکن اسی میں وصالِ دوست کی اُمید افزا کرن بھی پوشیدہ ہوتی ہوتی ہے۔ پھر انسان کو کسی صورت میں مایوس اور قنوطی نہیں ہونا چاہئے"

اعجاز کی آواز میں ہمدردی، غم گساری اور خلوص کا جذبہ تھا۔

"کاش آپ بھی اس آزار میں مبتلا ہوتیں" نجمی نے جھلّا کر کہا۔

"اگر مجھے یہ آزار ہوتا تو میں یقیناً اُس میں بھی سکون خاطر کا پہلو تلاش کر لیتی"

"اب یہ وقت اور حالات ہی بتائیں گے۔ اپنی پریشانیاں اور دُکھ وہی سمجھتا ہے جس پر گزرتی ہے"

"اب چھوڑیئے بھی ان باتوں کو۔ آیئے کچھ دیر اُمید پارک میں گھوم آئیں آپ کا غم بھی غلط ہو جائے گا"

اور پھر وہ دونوں پارک کی طرف روانہ ہو گئے۔

نجمی نے اگلے دن اعجاز کے ہاتھوں میں نسرین کا خط تھما دیا۔ اعجاز نے بے تابی سے خط پڑھا۔

"میرے اپنے نجمی! یادیں اور تمنائیں!!

خدا جانے والدین کو میرے آپ کے تعلقات اور خط وکتابت کا کیسے علم ہو گیا۔ لیکن آج ابا امی سے کہہ رہے تھے۔ بہتر یہی ہے کہ اُس لڑکے نجمی کے بارے میں، اُس کے والدین کے متعلق جلد ہی معلومات فراہم کی جائیں اور پھر رشتہ طے کر دیا جائے۔ ورنہ رُسوائی اور بدنامی کا پورا پورا اندیشہ ہے۔ ہو سکتا ہے ابا یا کوئی اور آپ کے پاس آئیں۔ آپ جو سمجھیں اُن سے اپنے متعلق اور اپنے خیالات کے بارے میں بتائیں۔ میں پیش آنے والے حالات اور اپنے انجام کی منتظر ہوں۔ خدا کرے آپ بخیر و عافیت ہوں۔

آپ کی اپنی

نسرین"

"اب تو آپ کی دلی مُراد بر آئی نا مٹھائی کھلایئے" اعجاز نے خوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ لیکن اُس کی آواز میں دل کی جلن اور گھٹن تھی۔

"لیکن ... کیا ہوگا؟" نجمی کا لہجہ تشویش ناک تھا۔

"شہنائی بجے گی۔ گھوڑا آئے گا۔ بارات جائے گی اور پھر شادی ہو گی۔" اعجاز بجھے بجھے دل سے بولی۔

"لیکن اعجاز!" آواز نجمی کے حلق میں اٹک گئی۔

"ارے آپ اتنے گھبرا کیوں رہے ہیں، میں ہر طرح آپ کے ساتھ ہوں۔" اعجاز نے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

"لیکن کیا وہ لوگ مجھے پسند کریں گے؟"

"ارے آپ سے اچھا، شریف، پڑھا لکھا، اور برسرکار لڑکا انھیں اور کون ملے گا؟"

"کیا واقعی آپ سنجیدگی سے کہہ رہی ہیں؟"

"اس میں جو شک کرے وہ کافر!"

اعجاز شوخی سے بولی۔

"تو آپ میرا ساتھ دینے کے لئے تیار ہیں؟"

"بالکل دل و جان سے!"

"تو پھر اس سلسلہ میں آپ کے والدین سے گفت و شنید کی جائے؟" نجمی نے بے تابی سے پوچھا۔

"کس سلسلہ میں؟"

اعجاز نے حیرت سے پوچھا۔

"آپ کی اور میری شادی کے بارے میں" نجمی نے اعجاز کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ "ابھی آپ میرے متعلق اپنی پسندیدگی کا اظہار کر چکے ہیں۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

اعجاز کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"یہ حقیقت ہے اعجاز! جس کا اظہار میں نے بارہا کرنا چاہا لیکن نہ کر سکا!"

"میری تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا۔ پھر نسرین کا کیا ہوگا؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

"تو کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ نسرین کی زندگی سے کھیلتے رہے ہیں!!"

اعجاز کی پیشانی پر تشویشناک شکنیں پھیل گئیں۔

"جی یہ بھی نہیں" نجمی نے کہا۔ "جس لڑکی کا کوئی وجود ہی نہ ہو اُس سے بھلا شادی کس طرح ہوسکتی ہے۔ نسرین صرف ایک فرضی اور خیالی لڑکی تھی اور اُس کے خطوط آپ کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی غرض سے میں نے لکھے تھے...... اور آخر وہی ہوا جو میں نے سوچا تھا..... اور اب وہ ہوگا جو تم چاہو گی۔ یعنی میری حیات اور موت اب تمہارے فیصلے پر منحصر ہے" نجمی خاموش ہو گیا۔

"لیکن آپ بڑے شریر اور بڑے 'وہ' ہیں۔ آخر مجھے اپنے خطوط کے جال میں پھانس لیا نا!"

اعجاز نے اپنی دراز پلکوں کو اُٹھا کر نجمی کی طرف دیکھا۔ اُس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ اور آنکھوں میں التجا تھی!

"میں آپ کی رائے اور فیصلہ کا منتظر ہوں" نجمی کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"میں کسی معاملے میں دو رائے نہیں رکھتی۔ اور آپ کے بارے میں اپنی رائے پہلے ہی بتا چکی ہوں۔ لیکن جب آپ گھر ملنے آئیں تو مجھ سے ملنے کی غلطی نہ کیجئے۔ ورنہ..... باقی سب کام ٹھیک ہو جائے گا.....!"

◆ غصہ دیوانگی ہے، اسے قبضے میں رکھو۔ ورنہ یہ تم پر قبضہ کرلے گا: (ہوریس)

◆ میں اپنے حریفوں پر اس لئے غالب آتا ہوں کہ وہ چند لمحوں کو عموماً کچھ نہیں سمجھتے۔ اور میں اُن لمحوں کی قدر و قیمت کو خوب سمجھتا ہوں: (نپولین)

◆ انسان کا کردار اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس شے سے خوش ہوتا ہے: (ورڈز ورتھ)

یہ شعر کیوں کہا؟

علامہ اثر لکھنوی

"تلخیٔ زہر میں حلاوت ہے
ہجر میں ذوقِ وصل بھی ہے شریک"

○

شعرِ بالا سُنا جو کافر نے | یہ کہا ہنس کے از رہِ تضحیک
شاعری کیا اسی کو کہتے ہیں | جیسے کوئی فقیر مانگے بھیک
ایک مصرع کی ہے ڈگر پورب | تو ہے پچھم کو دوسرے کی لیک
کوئی بھنگی کوئی اگھوری ہے | اِس کی بہتی ہے رال اُس کی پیک
ایک ہے سیکمان، اِک روگی | دونوں کو آرہی ہے چھینک پہ چھینک[1]
اور اب اپنی زبان میں سُنیئے | تاکہ ثابت ہو کوئی کل نہیں ٹھیک
شاعری کے یُوں ہیں کُھلیں بندھن | جیسے جھاڑو کی بکھرے ایک اِک سیک
بندشیں سُست نادرست الفاظ | کہیں اہمال ہے کہیں تشکیک
بے مزہ نظم سر بسر آوُرد | عامیانہ خیال بلکہ رکیک
اِس پہ غرّہ کہ ہم ہیں اہلِ زباں | مالک اُردو کے بے سہیم و شریک
ایسی بکواس کا نتیجہ کیا

میں سمجھتا ہوں کیوں عتاب آیا | عرض کی میں نے ٹھیک بالکل ٹھیک
پردۂ نقد میں ہے کیا تحریک

"تلخیٔ زہر میں حلاوت کیوں
ہجر میں ذوقِ وصل کیوں ہے شریک"

اثر لکھنوی

[1] قافیہ کی بحث چھیڑنا خطرناک تھا۔ (اثر)

افسانہ

اجنبی دلہن

مہندر ناتھ بی۔ اے

۱۵۔چھیرہ بلڈنگ۔ سادھو داس پاشا روڈ۔ دادر بمبئی

۲۹ اپریل ۱۹۶۳ء

جناب خوشتر صاحب! آداب

.... افسانہ نمبر کے لئے افسانہ جلدی نہ بھیج سکا۔ میں اپنے نقل نویس کا انتظار کرتا رہا۔ دو چار روز کے بعد معلوم ہوا کہ وہ بیمار ہے۔ افسانہ خود ہی نقل کرنا پڑا! .....

آپ کا ———— مہندر ناتھ

جب سے چترویدی کلکتے سے اپنے گاؤں آیا تھا اُس کا دل بار بار یہی کہہ رہا تھا۔

'واپس کلکتے چلو۔ اس گاؤں میں کیا رکھا ہے؟'

کلکتے میں اُس کی زندگی کا سنہرا دور شروع ہوا تھا۔ اُسی شہر میں محبت نے پہلی بار اُس کے دل میں جنم لیا۔ پہلی بار اُس نے چاند کو اُبھرتے ہوئے دیکھا اُس نے پہلی بار ہوا کو سرسراتے ہوئے کنول کے پھولوں سے گزرتے ہوئے محسوس کیا۔ اور اسی عظیم جذبے کے زیر اثر اُس نے زندگی کے نشیب و فراز دیکھے۔ زندگی کی اَن گنت خوشیاں اُس شہر میں محسوس کیں۔ اور اُس شہر میں وہ محبت کی وجدانی کیفیت سے پہلی بار آگاہ ہوا۔

ہر دن جو اس گاؤں میں گزر رہا تھا وہ انگور بالا کی یاد میں بیت رہا تھا۔ چترویدی ایک پہلوان کی طرح ہٹا کٹا تھا۔ عمر بائیس برس کی تھی۔ چوڑا چکلا سینہ، لمبوترا چہرہ، بڑے بڑے جبڑے، دوہرا بدن، لانبی لانبی اور مضبوط ٹانگیں۔ ہاتھوں کی کلائیاں موٹی اور چوڑی، ہاتھ ملاؤ تو کسی کسان کے کھُردرے ہاتھ یاد آجائیں۔ آواز بھاری، گرجدار اور بارعب، تیز طرار باتیں، جھگڑنے میں سب سے آگے۔ جب غصہ آجاتا تو گردن کو آگے بڑھا کر اور آنکھوں کو سرخ کرتے ہوئے اس طرح مخاطب ہوتا جیسے سب کو کھا جائے گا۔

اُس کی شکل و صورت اور قد و قامت سے کبھی اِس بات کا اندازہ نہ ہوتا کہ چھ فٹ کے اِس گرانڈیل جوان کے سینے میں ایک محبت بھرا دل دھڑکتا ہے۔

تین برس ہوئے جب چترویدی گھر سے بھاگ کر کلکتے پہنچا تھا۔ جب فاقوں نے زور پکڑا تو اسٹیج پر کام کرنے لگا۔ یہیں انگور بالا سے ملاقات ہوئی۔ انگور بالا کو چترویدی کی کون سی ادا پسند آئی کہ دیکھتے ہی اُس پر ریجھ گئی۔ چترویدی تو جنگل کا پلا ہوا شیر تھا۔ اُسے سیدھی راہ پر لانا آسان نہ تھا۔ محبت بڑھتے بڑھتے بڑھی۔ اِس طوفان نے دونوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ انگور بالا نے اپنی محبت کا اظہار، خلوص، پیار اور خدمت سے کیا۔ چترویدی محبت کی زنجیروں کو دیکھ کر بدکا۔ لیکن کہاں جاتا، محبت کی پہلی چوٹ تھی۔ انگور بالا کی محبت میں ایسا بندھا کہ چند مہینوں میں وہ اپنے گاؤں کو بھول گیا۔ اپنے بھائیوں، اپنی بہنوں، اپنی ماں اور اپنے باپ کی یاد اُس کے ذہن سے مٹ گئی۔ دل جو گاؤں جانے کے لئے بیقرار رہتا تھا اب انگور بالا کے

اردگرد منڈلانے لگا۔ اس محبت میں کئی بار ایسے مواقع بھی آئے جب چترویدی نے اپنی شخصیت کا بھرپور اظہار کیا۔ اس نے خلوص اور محبت کا جواب کبھی نرمی سے نہ دیا۔ عورت کو ہمیشہ پاؤں کی جوتی سمجھا۔ غصہ آتا تو آپے سے باہر ہو جاتا انگور بالا کسی سے بات کر لیتی تو آنکھوں میں خون اتر آتا۔ اور اُسے رنڈی اور کم ذات کہہ کر پکارتا۔ انگور بالا جواب دینا ہی چاہتی کہ وہ پیٹنے لگتا منھ پر تھپڑ رسید کرتا۔ اس کی باہوں کو مروڑتا۔ اگر وہ چلاتی تو اُسے گھونسوں اور لاتوں سے نوازتا۔ ایک دوبار تو اس نے انگور بالا کو جان سے مارنے کی کوشش بھی کی۔ شاید دونوں کی قسمت اچھی تھی۔ ورنہ کب کے دونوں جنت میں پہنچ گئے ہوتے۔

انگور بالا بھی کوئی پڑھی لکھی ایکٹرس نہ تھی۔ اُسے بھی مار میں مزا آنے لگا جس سے چترویدی اُسے نہ پیٹتا وہ سمجھتی اب چترویدی کے دل میں اس کے لئے محبت نہیں رہی ہے۔ آخر مار پیٹ کی کوئی نہ کوئی راہ نکل ہی آتی اور اس طرح دونوں کے دلوں پر محبت اور وفا کی مُہر ثبت ہو جاتی۔ اس مار پیٹ کے علاوہ انگور بالا چترویدی کے لئے انگوروں کا رس تھی۔ ایک ایسی شراب تھی جسے پینے کی اُسے عادت پڑ چکی تھی۔ اس عرصہ میں چترویدی کو کئی بار گھر سے خطوط آئے کہ بیٹا! واپس چلے آؤ تم ایک بڑے زمیندار کے بیٹے ہو۔ یہاں سب کچھ ہے کسی بات کی کمی نہیں۔ رہنے کے لئے کافی زمین۔ کافی کھیت، دیکھ بھال کے لئے نوکر چاکر، مکھن، دودھ، گھی، سب کچھ تو ہے۔ بیٹا! یہیں آکر زندگی کے دن گزارو۔ پردیس میں رہ کر کیوں اپنی زندگی برباد کر رہے ہو؟

چترویدی انگور بالا کے پیار میں ایسا بندھ گیا تھا کہ اُس سے چھٹکارا پانا آسان نہ تھا۔ اس نے کئی بار گھر جانے کا ارادہ کیا لیکن ہر بار پیار نے اُس کی راہ روک لی۔ ایک بار تو اُس نے ٹرنک میں کپڑے بھی رکھ لئے پھر انگور بالا نے اِس انداز سے اپنی پیار بھری باہیں بڑھائیں کہ ٹرنک ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اور اُس نے انگور بالا کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

اچانک ایک دن چترویدی کو خط ملا کہ "تمھاری ماں بستر مرگ پر ہے اور آخری بار تمھیں دیکھنا چاہتی ہے۔ بیٹے! تیرے دل میں اپنی ماں کی ذرا سی بھی محبت ہے تو خط پڑھتے ہی چلے آؤ۔ دیر نہ کرنا۔

اب تو چترویدی کی نیند حرام ہو گئی۔ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے ماں کا چہرہ آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔ اسٹیج پر بولتے بولتے وہ خاموش سا ہو جاتا۔ تماشائی شور مچاتے، اور وہ پھر مکالمے بولنے لگتا۔ اب انگور بالا اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ چترویدی کا اپنی ماں سے ملنا بہت ضروری ہے۔ اس نے اپنے سینے پر پتھر رکھ کر چترویدی کو گھر جانے کی اجازت دے دی۔

چترویدی کلکتے سے سیدھا اپنے گاؤں پہنچا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ ماں بیمار نہ تھی۔ بیماری کا تو محض بہانہ تھا۔ ماں اس کی شادی کا سارا انتظام کر چکی تھی۔ چترویدی نے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ انکار سن کر ماں نے صاف صاف کہہ دیا۔ اگر تم نے شادی نہ کی تو تمھاری آنکھوں کے سامنے میرا مُردہ اِس گھر سے نکلے گا۔ چاروں طرف سے رشتے داروں نے گھیر لیا۔ آخر ماں کی محبت بیٹے کے پیار پر غالب آگئی۔ اور چترویدی کو آخر شادی کرنی پڑی۔ شادی کرنے کے بعد ڈھائی سال اس گاؤں میں کیسے گزرے کس دن اُس نے انگور بالا کو یاد نہ کیا۔ وہ کون سی رات تھی جب انگور بالا کو اس نے خواب میں نہ دیکھا۔ سرسوں کے لہراتے ہوئے کھیتوں میں اس نے انگور بالا کا چہرہ دیکھا۔ املی کے درختوں کے نیچے کھڑے ہو کر اس نے ٹھنڈی آہیں بھریں۔ اپنی بیوی سے باتیں کرتے ہوئے اس نے انگور بالا کو گھورتے ہوئے دیکھا۔ انگور بالا کا اِس میں کیا دوش تھا۔ وہ اِس گاؤں میں کیوں چلا آیا۔ اُس نے اپنے والدین کی بات کیوں مان لی۔ اگر اُس کی ماں اپنی بے وقوفی کی وجہ سے خودکشی کر رہی تھی تو کر لیتی۔ اُس نے بغاوت کا پرچم کیوں بلند کیا کسی کو اُس کی خوشیوں اور مسرتوں کو کچلنے کا کیا حق تھا۔ اب وہ اپنی دھرم پتنی سے کیسے کہے کہ وہ انگور بالا سے ملنے کے لئے بے تاب ہے۔ وہ لوگوں سے کیسے کہے کہ جتنی محبت اُسے انگور بالا سے ہے کسی اور عورت سے نہیں ہو سکتی۔ جس شدت سے انگور بالا نے چاہا تھا، وہ چاہت، وہ جذبۂ سپردگی وہ خدمت، خلوص، پیار کسی اور عورت سے نہ مل سکے گا۔ وہ انگور بالا کے خطوں کا کیا جواب دے۔ دو سال سے برابر خطوط آ رہے تھے۔ تم کب تک آ رہے ہو۔ میں تمھاری راہ دیکھ رہی ہوں۔ تمھارے بغیر اب کچھ اچھا نہیں لگتا۔ اب تو چلے آؤ! اُس نے خط کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کیا جواب دے

جو کچھ وہ کر چکا ہے۔ کیا وہ اُس کے متعلق جھوٹ بول دے؟ کیا وہ لکھ دے کہ اُس نے شادی کر لی۔ کیا وہ لکھ دے کہ اب اُسے انگور بالا سے محبت نہیں۔ اُسے انگور بالا سے کوئی محبت نہ ہوتی تو وہ ضرور یہ کہتا۔ دل تو اب بھی اُس سے ملنے کے لئے بے تاب تھا۔ آنکھیں آج بھی اُس کے لئے بھر آتی تھیں۔

چھ مہینے اور گزر گئے۔

اب خط آنے بند ہو گئے۔ وہ کب تک خط لکھتی!

اُس نے محبت کی شمع کو بجھنے نہ دیا۔ چتر ویدی کی اضطرابی کیفیت میں ہیجان بڑھ گیا تھا۔ اب ذرا ذرا سی بات میں وہ اپنی بیوی سے لڑنے لگتا۔ اپنی ماں کو کھری کھری سناتا۔ دونوں سے دور بھاگتا۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا اُس کے دل میں انگور بالا کو دیکھنے کی چاہت بڑھتی جا رہی تھی۔ اب اُسے کوئی چیز اچھی نہ لگتی۔ گاؤں کی ہر چیز کاٹنے کو دوڑتی۔ اور ایک دن اُس نے تہیہ کر لیا کہ وہ ہر حالت میں کلکتے جائے گا۔ انگور بالا سے مل کر اپنی کج ادائی کی معافی مانگ لے گا۔

وہ ایک دن اپنی بیوی سے کچھ کہے بغیر کلکتے کی طرف روانہ ہو گیا۔ گاڑی میں ہر چہرہ اجنبی تھا۔ اُسے صرف ایک چہرہ یاد تھا۔ اُس کے ذہن میں صرف انگور بالا کے خد و خال ابھر رہے تھے۔ زندگی کی تمام تمنائیں صرف ایک نکتہ پر آ کر مرکوز ہو گئی تھیں۔ اور وہ نکتہ تھا انگور بالا کا چہرہ، وہ بوٹا سا قد، بھرا بھرا جسم، پتلے پتلے ہونٹ اور دودھ کی طرح سفید رنگت۔ جلد ملائم اور بے حد نرم! چھوٹے چھوٹے موتیوں کی طرح چمکتے ہوئے دانت۔ ناک میں ہیرے کی کیل دمکتی ہوئی۔ بال گھنے گھنے اور سیاہ۔ انگور بالا کے صرف دو ہی موڈ تھے۔ ایک محبت کا موڈ جب وہ انگور کی بیل کی طرح اُس سے لپٹ جاتی اور دوسرا موڈ ہوتا نفرت کے اظہار کا۔ اُس وقت اُس کی آنکھوں سے شعلے برسنے لگتے۔ اور جو منہ میں آتا وہ کہہ دیتی۔ کبھی کبھی تو اُس کی زبان سے اتنے گندے اور برے فقرے سننے پڑتے کہ چتر ویدی حیران رہ جاتا۔ اور سوچتا رہتا کیا یہ وہی انگور بالا ہے جس کے منہ سے پھول جھڑتے تھے اس وقت انگاروں کی بارش کر رہی ہے۔

جوں جوں کلکتہ قریب آ رہا تھا اُس کے دل کی دھڑکن تیز تر ہو رہی تھی۔ گزرے ہوئے پیار کے دن فلم کی ریل کی طرح اُس کی آنکھوں کے سامنے آ رہے تھے۔ ماضی کا ہر لمحہ آتشیں تھا۔ جوان تھا۔ محبت یا نفرت سے بھرپور تھا۔

جب چتر ویدی کلکتے کے اسٹیشن پر اترا تو اُس نے سیدھا تھیٹریکل کمپنی کی طرف رخ کیا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ کمپنی ایک سال ہوا بند ہو گئی۔ اب نہ تھیٹر [illegible] اور نہ انگور بالا کا پتہ ہی کسی کو معلوم تھا۔ کافی دوڑ دھوپ کے بعد کمپنی کے ایک ملازم سے اچانک ملاقات ہو گئی۔ منشی نایاب [illegible] انگور بالا کا پتہ بتایا [illegible]

جو پتہ منشی نایاب نے بتایا تھا وہ واقعی نایاب تھا۔ بڑی بڑی عمارتوں اور کھلے راستوں سے وہ گزرتا رہا۔ اور وہاں سب کی نظروں سے اوجھل ہو جانے کے بعد وہ ایک ایسی بستی [illegible] جہاں جھونپڑے ہی جھونپڑے تھے۔ تنگ سڑکیں، قدم قدم پر ٹھوکریں کھانی پڑتیں۔ دبلے پتلے بچے ادھر ادھر کھیل رہے تھے۔ [illegible] بیمار کتے بے سدھ لیٹے ہوئے تھے۔ ایک جھونپڑے میں چند [illegible] زندگی کی آخری سانسیں لے رہی تھیں۔ ایک راہ گیر جو بہت مشکل سے قدم اٹھا رہا تھا اُس نے انگور بالا کا پتہ بتایا۔

چتر ویدی ایک جھونپڑے کے سامنے کھڑا تھا۔ یہی در تھا جس پر دستک دینے کے لئے وہ کلکتہ آیا تھا۔ دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت نہ پڑی۔ کیونکہ دروازہ کھلا تھا۔ دل کی دھڑکن لبوں پر تھی۔ آنکھیں دیدار کے لئے ترس رہی تھیں۔

اتنے میں ایک عورت دروازے میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ ہاں یہی انگور بالا تھی۔ اُس کی جانِ تمنا! ہائے وہ رنگ روپ کیا ہوا؟! چہرے کی شگفتگی، آنکھوں کی چمک، جسم کی کشش اب کہاں تھی؟!

"انگور بالا! —— میں —— چتر ویدی ——"

"اندر آئیے!" انگور بالا نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

گھر کیا تھا مفلسی کی دکان تھی۔ ایک کمرہ جس میں اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ ایک چھوٹا سا برآمدہ، ایک چارپائی، جس پر ایک میلی چادر بچھی ہوئی تھی

ساکت کھڑی رہ گئی تھیں۔ اور چند مُسلے ہوئے کپڑے ایک رسّی پر لٹک رہے تھے۔ ایک کونے میں ایک چھوٹا سا چولھا۔ آس پاس کی کچی دیواریں کالی سیاہ تھیں۔

اُس نے انگور بالا کی طرف دیکھا۔ وہ یاس و حسرت کا پیکر بنی ہوئی تھی جب انسان مفلس ہو جاتا ہے تو یاس و حسرت کا پیکر بننے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا۔ چترویدی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"یہ تم نے کیا کر لیا؟ تمھاری یہ حالت!"

"اب مجھ سے پوچھنے آئے ہو۔ ایک سال سے کمپنی بند ہے۔ جو زیور میرے پاس تھے وہ سب بک گئے۔"

"رُوپوں کے لئے مجھے لکھتی۔"

"تمھیں کیا لکھتی۔ تم نے خطوں کا جواب تک نہ دیا۔"

"میں بے بس تھا۔ تم سے بے حد شرمندہ ہوں۔ تم لکھتیں تو میں روپے ضرور بھیجتا۔"

"اِس دُنیا میں بے بس کون نہیں۔ تم مرد ہو کر اپنے آپ کو بے بس اور لاچار بتاتے ہو۔ میں تو ایک کمزور عورت ہوں۔"

"میرے قریب آؤ انگور!"

"اِتنی بے شرم نہیں ہوں میں!"

"مجھ سے شرم کس بات کی؟"

"جب اپنے پرائے ہو جائیں۔ جب زندگی کا آخری سہارا آنکھوں سے اوجھل ہو جائے۔ جب ہر طرف نا اُمیدی ہی نا اُمیدی نظر آنے لگے۔ اُس وقت ہر رشتہ بے معنی ہو جاتا ہے۔"

"کیا میں تمھارا کچھ نہیں لگتا؟"

"لگتے تھے، اب نہیں۔"

"انگور! میرے پاس آؤ۔ میں تم سے معافی مانگنے آیا ہوں۔"

وہ اپنی جگہ سے نہ ہلی۔

"میں کہتا ہوں میرے قریب آؤ۔"

وہ اپنی جگہ پر کھڑی رہی۔

"تم میرا غصہ جانتی ہو نا۔ اگر آپے سے باہر ہو گیا تو ..."

اُس نے پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھائے۔

وہ پیچھے سرک گئی۔ چترویدی اُٹھا۔ وہ تن کر کھڑی ہو گئی۔ اور لپک کر کہنے لگی۔ "مجھے نہ چھونا۔"

"کیا مطلب؟"

"میں نے شادی کر لی ہے۔ اب اِس جسم پر میرا کوئی اختیار نہیں۔"

"تم نے شادی کر لی انگور! مجھ سے اِتنی بے وفائی؟" چترویدی نے گرج کر کہا۔

"تم کہاں کے باوفا ہو۔ بے وفائی کا یہ سبق تم ہی نے پڑھایا ہے میں لگاتار دو سال تک تمھیں خط لکھتی رہی۔ تم نے کسی خط کا جواب نہیں دیا۔ دن رات تمھارا انتظار کرتی رہی۔ جب انتظار کرتے کرتے تھک گئی اور تمھارے قدموں کی آہٹ کو ترستے ترستے بہری ہو گئی اُس وقت مجھے معلوم ہوا کہ تم نے شادی کر لی۔"

"میں ——— میں اب بھی تمھیں چاہتا ہوں انگور!"

"لفظ چاہت کو بدنام نہ کرو۔ تمھارے انتظار میں میری محبت نفرت میں بدل گئی۔ چہرے کی رنگت اُڑ گئی۔ جسم دُبلا ہو گیا۔ میرے سارے زیور بک گئے لیکن تم نہ آئے۔ اور جب دت میری آنکھوں کے سامنے ناچنے لگی تو محض زندہ رہنے کے لئے میں نے اپنے آپ کو ایک آدمی کے حوالے کر دیا۔ دو وقت کے کھانے کے لئے، اِس گھر میں رہنے کے لئے۔ جب تک میں زندہ ہوں یا وہ زندہ ہے، یہ جسم اُس کا ہے۔ اگر تمھارے دل میں میرے لئے ذرا بھی عزت ہے تو یہاں سے فوراً چلے جاؤ۔ وہ آتے ہی ہوں گے۔ بازار گئے ہیں سودا لانے تمھیں دیکھ لیا تو اِس گھر سے نکال دیں گے۔ یہ کہہ کر انگور بالا نے اپنی پھٹی ہوئی ساڑی کے پلّو سے سر ڈھانپ لیا۔ چترویدی نے آخری بار انگور بالا کی طرف دیکھا۔ وہ چہرہ جو اُس نے کتنی بار دیکھا تھا جس پر اُسے پورا اختیار تھا، آج اُس پر اُس کا کوئی حق نہ تھا۔ وہ ہونٹ جن سے پھول جھڑتے تھے، وہ ملائم رُخسار، وہ بوٹا سا قد جن کے حُسن و جمال نے اُس کی نیندیں حرام کر دی تھیں، آج اُنھیں چھو بھی نہ سکتا تھا۔ آج انگور بالا ایک بے بس اور اجنبی دُلہن کی طرح اپنا جسم چھپائے جیسے اُس سے ہزاروں میل دُور کھڑی تھی!!

زیست غیرت دہِ ظلمات کہاں تھی پہلے
روزِ روشن میں مرے رات کہاں تھی پہلے

نالے تھے، اشکوں کی بہتات کہاں تھی پہلے
"تو" چلا کرتی تھی برسات کہاں تھی پہلے

جی نہیں سکتے مگر لوگ جیئے جاتے ہیں
زندگی میں یہ کرامات کہاں تھی پہلے

بارِ عشق آپ نے سونپا تھا ازل میں مجھکو
میری جانب سے شروعات کہاں تھی پہلے

گامزن سُوئے ترقی سہی دُنیا لیکن
زندگی اتنی پُر آفات کہاں تھی پہلے

عشق نے میرے اسے بخش دیا حُسنِ قبول
آپ کے حُسن میں یہ بات کہاں تھی پہلے

پڑ گیا نام محبت کا ہوس دُنیا میں
قسمتِ عشق میں یہ مات کہاں تھی پہلے

آ گیا رنگ کہا وعظ جو پی کر اے شیخ
بات یہ قبلۂ حاجات کہاں تھی پہلے

کام ساقی کا کوئی آنہ پڑا ہوا اے ابر
میکشوں کی یہ مدارات کہاں تھی پہلے
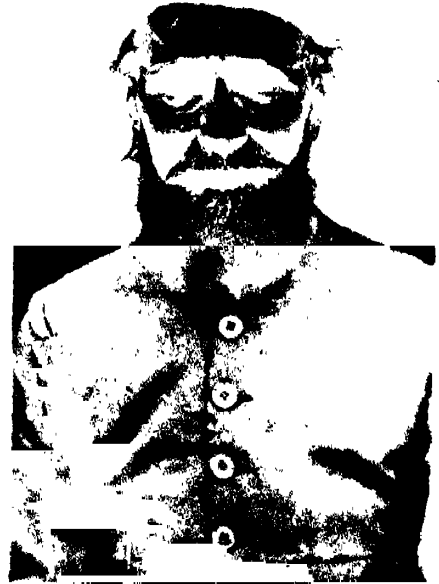
ابر احسنی

علامہ ابر احسنی گنوری

افسانہ

خوابِ پریشاں

کوثر چاندپوری

بھوپال ـــــ ۳۱ مارچ ۱۹۶۳ء

بھائی جان! مسکراہٹیں اور قہقہے!

...."خوشبو محبت کی" "نقش ڈائجسٹ" کراچی نے منتخب کیا ہے اور "الشجاع" کراچی نے بھی ہندوستان کی بہترین اردو تخلیقات کے ذیل میں "بیسویں صدی" سے نقل کیا ہے۔ افسانہ نمبر کے لئے خواب پریشاں بھیج رہا ہوں۔ آجکل طبیعت اچھی نہیں ہے۔ اور یوں بھی ست پرکاش سنگر نے پنڈی گڑھ ہجرت یا کوچ کر جانے سے اسیرِ تنہائی بن کر رہ گیا ہوں۔ شام کے قہقہے خواب و خیال ہو گئے ہیں۔ میری اِن محرومی کا انتقام سنگر سے اُن کے عزیز لے رہے ہیں۔ وہ بھی بڑے زور سے ہنسنے کے عادی تھے معلوم نہیں اب ہنستے ہیں یا ہنسنے کا مذاق اڑاتے ہیں....

مخلص آئین ـــــ کوثر چاندپوری

دھوپ پیلی پڑ چکی تھی۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور جھیل کی شفاف سطح پر لہروں کی پریاں ناچ رہی تھی۔ اُن میں کوئی لال یا سبز پری نہ تھی۔ سب سفید تھیں اور پارے کی طرح لرز رہی تھیں اور جن قادری کی نگاہیں جن پر اُداسی اور ویرانی جھلک رہی تھی بے چین موجوں کا دُور تک پیچھا کر رہی تھیں اور وہ مسلسل یہ شعر گنگناتے جا رہا تھا ؎

رہئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو

راز داں کوئی نہ ہو اور ہمزباں کوئی نہ ہو

پارک میں ہر طرف تتلیاں اُڑ رہی تھیں۔ اور دھنک سی کھلی ہوئی تھی۔ قادری چنگاریوں کی مانند اُڑتے ہوئے اُن رنگوں میں کوئی بھی دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ وہ مغرب کی سمت بڑھتے ہوئے سورج اور اس کی دم توڑتی ہوئی کرنوں کو دُودھیا رنگ کی پانی کی چادر پہ کھیلتے اور رقص کرتے دیکھ رہا تھا۔ جو کچھ ہی دیر بعد اُس عالم میں چلی جانے والی تھیں جہاں کوئی کسی کا پُرسانِ حال اور درد آشنا نہیں ہوتا۔ وہ حیران و تجسس نظروں سے ایک ہی جانب دیکھے جا رہا تھا۔ جیسے کوئی چیز تلاش کر رہا ہو۔ یا سیپوں، گھونگوں اور مونگے کی شاخوں کا تاج لگائے جھیل کے اندر سے کوئی دوشیزہ سر نکال کر کہنے والی ہو۔

"قادری! اپنا دل نہ توڑو۔ میں تمہاری شریکِ حیات بننے کے لئے تیار ہوں!"

قادری کا شمار اُن نوجوانوں میں تھا جنھیں سنگدل تو نہیں سنگین مزاج ضرور کہا جا سکتا ہے۔ وہ عشق و رومان پر کوئی یقین نہ رکھتا تھا۔ محبت کی گرمی نے کبھی اُس کے دل کے آبگینے کو نہ پگھلایا تھا۔ پھر بھی یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ اُس میں کوئی دل نہ پڑا تھا۔ سینکڑوں طرح کے تصورات جو غمِ دوراں کی تیز آنچ پر پکتے پکتے کھول جایا کرتے تھے۔ اُس کے دل و دماغ میں چرخ کھاتے رہتے تھے۔ اِدھر کچھ دنوں سے قادری کی زندگی تغیرات اور تبدیلیوں کی آماجگاہ

بنی ہوئی تھی۔ وہ تنہائی میں روتا اور غمناک اشعار گنگناتا تھا۔ اُس کی آواز میں بہت سوز اور درد تھا۔ اُس وقت بھی اُس کے غمناک نغموں نے بہت سے کانوں میں آگ سی بھر دی تھی۔ اُس کی نگاہیں کسی انجانی اور اَن دیکھی منزل کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں۔ غالباً وہ اپنی تنہائی سے اُکتا گیا تھا اور ہو سکتا ہے کسی ساتھی کو ڈھونڈ رہا ہو۔ اِتنی بڑی دُنیا میں کوئی ایسا رفیق نہیں مل رہا تھا جو کائنات کے ہر پیچ و خم پر اُسے سہارا دے۔ کہکشاں کی رنگینی اور خیالی دُنیا تک چاہے نہ لے جائے، مگر زمین کے نشیب و فراز پر قدم سے قدم ملا کر چلے۔ لیکن نہ جانے کیوں لڑکیاں اُس سے گھبراتی تھیں۔ جیسے وہ آدمی نہ ہو پُرانی داستانوں والی کوئی ایسی مخلوق ہو جو انس گند سونگھتی پھرتی ہو۔ وہ جوان تھا، خوب صورت تھا۔ مجموعی حیثیت سے چہرے میں ایک طرح کی کشش بھی تھی۔ لیکن یہ کشش بالکل بے جان ہو گئی تھی۔ کسی لڑکی پر اِس سوتے ہوئے جادو کا اثر نہ ہوتا تھا۔ قادری کسی جگہ جا کر بیٹھ جاتا تو آس پاس کی نشستیں خالی ہو جاتیں۔ ایک آدھ بار وہ بال رُوم میں بھی گیا۔ لیکن وہاں کوئی لڑکی اس کے ساتھ ڈانس کرنے کے لئے تیار نہ ہوئی۔ اور اُسے اپنی ذات سے نفرت کا شدید احساس ہوا جسے اُس نے آنسوؤں سے دھونے کی کوشش کی۔ وہ تعلیم یافتہ اور نوعمر ہونے کے باوجود یاس و حرماں کی تاریکیوں میں بھٹکتا جا رہا تھا۔ اُس کی فولادی طاقتیں پگھل کر پانی ہو گئی تھیں۔ اور کوہکنی یا تیشہ زنی کا حوصلہ سرد ہو گیا تھا۔ قادری احساس شکست کا ایک ہلکا سا بوجھ لئے سیمنٹ کی بنچ پر بیٹھ گیا۔ اُس کی کمر تکیہ کی سختی کو محسوس کرتی رہی جو اُس کا مقدر بن چکی تھی۔ اُس کے لئے نرم سے نرم چیز بھی سخت بن گئی تھی۔ کلیوں اور پھولوں سے لے کر باتوں اور اشاروں تک میں اُسے انھیں سختیوں سے دو چار ہونا پڑتا تھا۔ رات کو نرم و گرم بستر پر لیٹتا تو اُسے ایسا محسوس ہوتا جیسے فولاد کی ٹھنڈی چادر پر کروٹیں بدل رہا ہو۔ کبھی اُس کا جی چاہتا خوب روئے۔ اور چیخیں مارے۔ یہ ارادہ کرتے ہی اُس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آتے۔ اور پتلیاں سی پلکیں سیراب ہو جاتیں۔ آنسوؤں کی نمی سے اب تک کسی ساتھی کی تصویر نہ بنی تھی۔ نہ یہ اُسے بہا کر کہیں لے جا سکے تھے۔ سورج ڈوب گیا اور اُس کی سنہری دھوپ غائب ہو گئی۔ بجلی کے قمقمے روشن ہو گئے۔ وہ پارک کی چہل پہل سے اُکتا کر گیٹ کی طرف چلا۔ راستے میں کاوش سے اچانک ملاقات ہو گئی۔ وہ پارک میں داخل ہو رہا تھا اور قادری پارک کے آہنی پھاٹک کو جلد سے جلد عبور کر کے فٹ پاتھ پر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ ایک نے دوسرے کو غور سے دیکھا۔ کاوش کچھ دن پہلے باہر چلا گیا تھا۔ اُس وقت قادری کے سامنے ایک سرو قد خوب صورت نوجوان کھڑا مسکرائے جا رہا تھا۔ اُس کے سُرخ سفید رنگ میں صحت مند خون جھلک رہا تھا۔

"او و کاوش!"

"کیا حال ہے قادری! بہت غمگین صورت بنا رکھی ہے۔ خدا کی قسم سراپا سوز بنے ہوئے ہو۔ جیسے کوئی المیہ کہانی انسانی رُوپ میں ڈھل گئی ہو سُناؤ کیا حال ہے دوست؟"

"بہت بُرا۔ کبھی اپنی داستانِ الم سُنا سکا تو ضرور سُناؤں گا۔ کہاں ہو آجکل؟"

"سمندر کی لہروں پر بھاگتا پھرتا ہوں۔ نیوی میں نوکری کر لی ہے۔"

"کہاں کہاں گھوم آئے؟"

"امریکہ، جاپان، انگلینڈ، فرانس، جرمنی، غرض دُنیا کا کوئی ایسا ملک نہیں جہاں نہ گیا ہوں!"

"کسی کاکیشین یا اٹلین لڑکی کے زلف و رُخسار سے بھی کھیلنے کا موقع ملا؟"

"کیا پوچھتے ہو مبین! رومان میری زندگی ہے۔ یہ تو تم جانتے ہی ہو اور حُسن کو ہمیشہ میں ایک جاودانی مسرت سمجھتا رہا ہوں۔"

"اور شادی بھی ہوئی؟"

کیا مہمل سوال ...... کلیوں، پھولوں اور سنہری کی ڈبیوں کے گرد بھونرے اور مکھی کی مانند اُڑتا رہا ہوں لیکن شہد کے قریب کبھی نہیں گیا۔"

"خوب! غالب ہو اپنے وقت کے۔ کھاؤ، پیو اور اُڑ جاؤ والے فلسفہ حیات پر یقین رکھنے والے!"

"اور تم کیوں میر سوز بنے پھر رہے ہو؟ کیا تنہا ہو اب تک؟"

"اکیلا پیدا ہوا تھا اور غالباً اکیلا ہی مروں گا۔ زندگی میں ساتھ دینے والا کوئی ملتا ہی نہیں۔ موت کا ساتھی کیوں ملے گا؟ کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ پہاڑ کی چوٹی سے نیچے کی طرف دوڑتی ہوئی لاری یا جمنا کے طوفان میں گھری ہوئی کشتی میں بہت سے ساتھیوں کے ساتھ جان دوں!"

"خیال برا نہیں۔ بشرطیکہ اُس بس یا کشتی میں، میں موجود نہ ہوں!"

کاوش نے اپنے مخصوص انداز میں یہ جملہ کچھ اس طرح کہا کہ قادری اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا۔

"کہاں ٹھہرے ہو؟"

"ماموں کے یہاں۔ وہ کئی برس سے یہاں کاروبار کرتے ہیں۔ چھوٹی بہن بھی ساتھ ہے۔ اُسے عزیزوں سے ملانے لیتا آیا۔ ملو تمہیں کافی پلاؤں ماموں جان کا بنگلہ یہاں سے زیادہ دُور نہیں۔ وہ سامنے پہاڑ کی ڈھلوان پر برف کا تودہ سا چمک رہا ہے۔ بس وہی میری قیام گاہ ہے۔ امریکہ اور یورپ سے کئی طرح کی کافی لایا ہوں!"

کاوش کے ماموں سے قادری کی ملاقات نہ تھی۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ آفاق اینڈ کمپنی کا پروپرائٹر بہت بڑا تاجر اور دولت مند ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ جس کوٹھی میں وہ رہتا ہے وہ ایک طرح کا "بادل محل" ہے۔ سامنے جھیل پُشت پر اُونچا پہاڑ اور اندر پچکاریاں چھوڑتے ہوئے فوارے۔ بادلوں کی مانند دُودھ میں نہائے ہوئے درو دیوار۔ کوٹھی کی ہر چیز سفید ہے۔

کاوش اور قادری ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہر لحہ بلند ہوتی سڑک پر چلتے ہوئے اُس شاندار بلڈنگ تک جا پہنچے۔ جس کے ایک حصہ میں کاوش اپنی بہن کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی کاوش نے بجلی کی گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ ایک میٹھا رسیلا نغمہ کانوں کے پردوں سے ٹکرا کر اس طرح مرمریں فضا میں گھل گیا جیسے شکر کے ذرات دُودھ میں مل جاتے ہیں۔ اندر سے ایک نازک اور باریک آواز آئی۔

"آرہی ہوں بھائی جان!"

دروازے کے پردے کو خفیف سی حرکت ہوئی اور اُس کی اوٹ سے گلاب کے پھول ایسا چہرہ نمایاں ہوا۔ ہونٹوں پر خفیف مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں تاروں کی سی چمک۔

"قادری! یہ ہے میری چھوٹی بہن شاہینہ! بڑی شوخ اور نازک مزاج ذرا سی بات بلکہ اکثر بغیر بات ہی کے خفا ہو جاتی ہے۔ یوں سمجھو کہ چھوئی مُوئی کا پودا ہے۔ اور دیکھو مس شاہینہ! یہ ہیں میرے دوست مبین قادری۔ پہلے صرف مبین تھے اب قادری بھی بن گئے ہیں۔ میں انھیں کافی پلانے لایا ہوں!"

"بہت اچھا!"

شاہینہ کے ہونٹوں پر پھر وہی دلفریب مسکراہٹ پھیل گئی جو پردے سے جھانکتے وقت نظر آئی تھی۔ اُس کی آنکھوں کے کنول دمکنے لگے۔ اُس نے چٹکی بجا کر کہا۔

"ابھی پانچ منٹ میں کافی لاتی ہوں!"

شاہینہ صبح کی ہوا کے آہستہ خرام جھونکے کی طرح کمرے سے نکل گئی۔ اور مبین جیسے سر سے پاؤں تک شراب میں ڈوب گیا ہو۔ وہ شاہینہ کی آواز سے بھی متاثر ہوا اور چہرے کے فردوسی نقوش سے بھی۔ وہ نہایت سفید لباس پہنے ہوئے تھی جس کے درمیان اُس کا چہرہ ڈل جھیل میں کھلے ہوئے سُرخ کنول کی طرح جگمگا رہا تھا۔ قادری کا دل بالکل انوکھے انداز سے دھڑکنے لگا۔ یہ دھڑکنیں اُس کے لئے بالکل نئی تھیں۔ وہ سوچنے لگا۔

شاہینہ اُس کے دوست کی بہن ہے۔ اُسے دل کی بھرپور دھڑکنوں سے دُور ہی رہنا چاہئے۔ کاوش کی باتوں سے یہ اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ وہ شاہینہ کی شادی کرنے کی فکر میں ہے۔ ماں باپ دونوں مر چکے ہیں۔ شاہینہ اپنی خالہ کے پاس رہتی ہے۔ اور کاوش بڑی شد و مد سے اُس کے لئے جیون ساتھی تلاش کر رہا ہے۔ ہو سکتا ہے اُسی کا انتخاب ہو جائے۔

نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔

وہ شاہینہ کے قابل نہیں!

کہاں بادلوں کی رانی شاہینہ اور کہاں وہ ایک مصنوعی انسان! باہر سے اُجلا، اندر سے میلا۔

بیوی کی حیثیت سے وہ شاہینہ کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ چاند اور

پچھڑ کا کوئی جوڑ ہی نہ تھا۔

ذرا دیر بعد شاہینہ ٹرے اٹھائے آگئی۔ قادری ایک بار پھر چونک لیا۔ لمبا سرو جیسا قد، چھریرا بدن، شفق سے زیادہ رنگین رخسار اور آنکھوں سے میر و مومن کی غزلیں جھانکتی ہوئی۔ وہ قالین پر یوں چل رہی تھی جیسے جمنا تاج کے سائے میں محو خرام ہو۔ یا زبدا اربل راکس کے درمیان سے نہایت نزاکت کے ساتھ گزر رہی ہو۔

ٹرے میز پر رکھ کر وہ مڑی ہی تھی کہ کاوش بولا۔

"تم نہیں پیوگی؟"

"نہیں بھائی جان!"

"کیوں؟۔۔شاہینہ! میں تمھارا مہمان ہوں اور قادری میرا دوست ہے۔ تمھیں ہم دونوں کے ساتھ کافی پینی ہوگی۔ کیا تم میرا حکم نہیں مانوگی؟"

"آپ حکم دیتے ہی کب ہیں۔ درخواستیں کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔"

یہ کہہ کر شاہینہ اِس طرح قادری کے پہلو میں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی جیسے کسی ایسے مسافر کے شانے پر باز بیٹھ گیا ہو جو برسوں ریگستان میں سفر کرنے کے بعد سرِ شام ہی شہر میں داخل ہوا ہو۔ جہاں بادشاہ کا انتخاب کرنے کی غرض سے باز ہوا میں چھوڑا جا چکا ہو۔ اور وہ قادری کے ہاتھ پر آ بیٹھا ہو!

تینوں نیم دائرے میں پڑی کرسیوں پر بیٹھے کافی سِپ کر رہے تھے اور قادری کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کافی نہیں، روس کی ووڈکا پی رہا ہو۔ کاوش بار بار خاموشی توڑنے کی غرض سے کوئی دلچسپ سا فقرہ کہہ دیتا اور گفتگو کا سلسلہ جاری ہو جاتا۔ شاہینہ باتوں میں حصہ لے رہی تھی لیکن اُس کی بات چیت میں شوخی نہ تھی۔ ایک طرح کا شرمیلا پن تھا جو اُس کے لئے بھی نیا تھا اور کاوش کے لئے بھی۔ شرم کو شاہینہ ہمیشہ جہالت سمجھتی آئی تھی۔ مہمانوں کی موجودگی میں وہ اور زیادہ جھجکنے لگتی تھی۔ نہ جانے قادری کیسا مہمان تھا جس نے اُس پر شرم کا جادو کر دیا تھا۔

"کیا کر رہے ہو قادری؟" کاوش نے سوال کیا۔

"آئی، اے، ایس کی تیاری کر رہا تھا مگر۔۔۔"

"مگر کیا؟ پیار کر بیٹھے کہیں؟"

"کچھ ایسی الجھنیں پیش آگئیں کہ شریک نہ ہو سکا۔"

ابھی میں نے شاہینہ سے بھی کہا تھا کہ ہندوستان اور مغربی ممالک کے تعلقات پر اپنا تھیسس مکمل کر ڈالو لیکن انھیں ترقی پسند شاعروں کی نظمیں پڑھنے اور اُن پر تنقید کرنے ہی سے فرصت نہیں۔ لکھنے سے گھبراتی ہیں۔ انگلیاں قلم سنبھالنے کے تصور ہی سے فگار ہو جاتی ہیں۔"

"جب ہی تو دو سو صفحات کی ایک تنقیدی کتاب پریس بھیج چکی ہوں۔"

"وہ ٹائپ کی ہوگی تم نے!"

"قلم اور ٹائپ کے بٹن دونوں ہی انگلیوں سے مس ہو کر شعور کو جگاتے ہیں اور پھر مضامین کے ریلے بہنے لگتے ہیں۔ کسی زمانہ میں صریرِ خامہ کو نوائے سروش کہا جاتا تھا۔ اب ٹائپ رائٹر کی آوازیں دماغ میں سوئے ہوئے مضامین کو جھنجھوڑ ڈالتی ہیں۔ فیضی کی بانگِ قلم اور غالب کی صریرِ خامہ کا زمانہ گزر چکا۔ بھائی جان! سائنس کے عہد میں مشینوں کی باتیں ہی زیادہ مناسب ہیں!"

شاہینہ کی باتوں سے قادری بہت زیادہ مرعوب ہو چکا تھا، اُس کی قوتِ گفتار لڑکھڑانے لگی تھی۔ اور الفاظ زبان تک پہنچنے سے گریز کر رہے تھے۔ اُس کا خیال شاہینہ کی سیاہ لانبی پلکوں میں الجھا ہوا تھا۔ جن کے پیچھے دو ایسے قندیل فروزاں تھے جن میں بیکراں روشنی تھی۔ کبھی نگاہیں شاہینہ کے ہونٹوں پر جم جاتیں جو بلا مبالغہ سلیقے سے تراشے ہوئے یاقوت تھے۔ کافی ختم ہونے پر شاہینہ ٹرے لے کر چلی گئی۔ اور کاوش دیر تک قادری سے باتیں کرتا رہا۔ باتوں باتوں میں اُس نے یہ بھی کہہ دیا کہ اُسے شاہینہ کے لئے بَر کی ضرورت ہے اور وہ اُس کی شادی سے نمٹ کر ہی اپنی ملازمت پر جائے گا۔

قادری روز ہی کاوش سے ملتا رہا۔ کاوش کہیں سیر کو جاتا تو کار بھیجکر قادری کو بلا لیتا۔ اکثر شاہینہ بھی ساتھ ہوتی۔ ڈیڑھ مہینے بعد کاوش کسی ضروری کام سے بمبئی چلا گیا۔ شاہینہ اپنے ماموں کے یہاں ٹھہری رہی۔

قادری کو اُس کے اِتنی کافی اتنی پسند آئی کہ دوسرے تیسرے دن کافی پینے
آ جایا کرتا تھا۔ شاہینہ کبھی کبھی قادری کے ساتھ پارک بھی چلی جایا کرتی تھی۔ ایک
دن سڑک کے کنارے کنارے چلتے ہوئے قادری نے بہت دھیمی بلکہ کھوکھلی
آواز میں کہا۔

"مس شاہینہ!"

شاہینہ نے گھوم کر دیکھا۔ قادری کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ جیسے
سوکھے پتے خزاں کی ہوا سے کانپ رہے ہوں۔ اُن سے کوئی آواز نہیں نکل
رہی تھی۔ بس سانس نکل رہا تھا اور نتھنے خاموش تھے۔

"کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟"

"کچھ نہیں۔"

شاہینہ کھڑی ہو گئی اور تیکھے تیوروں سے قادری کو دیکھتے ہوئے بولی

"جھوٹ نہ بولیے۔ آپ ضرور کچھ کہنا چاہتے تھے!"

"آپ کا خیال ٹھیک ہے۔ مگر شاہینہ میرا منہ اس قابل نہیں کہ آپ سے
کچھ کہوں۔ پھر جذبات بھی الفاظ کی گرفت میں نہیں آ رہے۔"

"خیر نہ کہیے۔ میں بھی اکثر جذبات کو الفاظ کا جامہ نہیں پہنا سکتی۔ ہر بات
کہی نہیں جایا کرتی لیکن سُنی ضرور جاتی ہے۔"

قادری چونک گیا۔ اُس نے شاہینہ کی طرف دیکھا جو پہلے ہی اُسے
دیکھ رہی تھی۔ ذرا سی دیر میں ایک افسانہ ٹائپ ہو گیا جس کو واقعات کی فنکارانہ
ترتیب نے نقطۂ عروج پر پہنچا دیا۔

شاہینہ کی شادی ٹلتی رہی۔ ایک خواب کی اِتنی تعبیریں سامنے آگئی تھیں کہ وہ
پراگندہ ہوتا نظر آ رہا تھا۔ اِتنے پیام آ گئے تھے کہ کاوش کوئی تصفیہ ہی نہ
کر سکا تھا۔ وہ اُلجھ سا گیا تھا۔ آخر کاوش نے چار تصویریں منتخب کیں جن سے
اُس کے ماموں نے بھی اتفاق کیا۔ اُن تصاویر کو ایک خوب صورت البم میں
لگا دیا گیا۔ ایک تصویر پہلے سے لگی ہوئی تھی جس پر کاوش نے اپنے قلم سے
مبین قادری کا نام لکھا تھا۔ یہ البم شاہینہ کی میز پر رکھ دیا گیا۔ دوسرے
دن رضیہ آفاق، شاہینہ کی ماموں زاد بہن وہ البم اُٹھا لائی اور کاوش کو
دیتے ہوئے بولی "صرف مبین قادری پسند آئے۔" کاوش کے چہرے پر
مسرّت کی سُرخی نمودار ہو گئی۔ وہ دل ہی دل میں اُس کے انتخاب کو سراہنے
لگا۔۔۔۔

"کیا بات ہے تری نگہِ انتخاب کی!"

وہ ایک دم چونک گیا!

اُسے خیال آیا کہ یہ تو فانی کا مقولہ ہے جو غم و یاس کا شاعر ہے اور زندگی
کو گونگے کا خواب کہتا ہے۔

قادری کو بھی اِس فیصلہ کی اطلاع ہو گئی۔ وہ خوب ہنسا اور پھر رونے
لگا۔ اُس نے چند منٹ بعد کھونٹی میں لٹکا ہوا پورٹ فولیو اُتارا۔ اُس میں سے
اپنی ایک تصویر نکالی جو بہت بھیانک تھی۔ اُسے قادری کی شکل و صورت سے
کوئی مناسبت ہی نہ تھی۔ قادری نے اِس خط کے ساتھ وہ تصویر شاہینہ
کو بھیج دی۔

"مس شاہینہ! اِس سادہ لوحی بلکہ خود فریبی کا شکریہ! تم نے مجھے
اپنی غلط بختی کا نشانہ بنا لیا۔ شاہینہ! تم نے میرا اصل رُوپ نہیں دیکھا۔
تم مجھے ایک بہروپیئے کی شکل میں دیکھ کر مغالطے میں پڑ گئیں۔ میرا وجود سچ
مچ ایک حسین فریب ہے۔ جسے طبّی سائنس کا معجزہ بھی کہا جا سکتا ہے۔
میں اپنے پلاسٹک سرجن کی فنی مہارت کا صرف ایک اشتہار ہوں۔ میرے
اصل نقوش دیکھنے ہوں تو اِس تصویر کو دیکھو۔ جس میں ایک جبڑہ اور آدھے
دانت غائب ہیں۔ چہرے کی ہڈیاں ٹوٹی ہوئی ہیں۔ دو سال پہلے ایک حادثہ
نے مبین قادری کو اُس کے وجود سے الگ کر دیا ہے۔ میں ایک ساتھی
ضرور چاہتا ہوں اور تم سے بے پناہ محبت بھی کرتا ہوں۔ لیکن تمھیں اور
کاوش کو فریب نہیں دے سکتا۔ میں نے یہ راز اب تک کاوش کو نہیں
بتایا۔ خیال تھا کہ دوسرے لوگ بتا دیں گے۔ لیکن نہ جانے کیوں سب
کی زبان بند ہو گئی۔۔۔۔

شاید مجھ پر ترس آتا ہوگا ——

یا —— پھر تمھیں برباد کرنا چاہتے ہوں گے ——!

تمھارا خیر خواہ

قادری"

افسانہ نمبر

کبھی اِس مکاں سے گزر گیا کبھی اُس مکاں سے گزر گیا
ترے آستاں کی تلاش میں میں ہر آستاں سے گزر گیا

کبھی مہر و ماہ و نجوم سے کبھی کہکشاں سے گزر گیا
جو ترے خیال میں چل پڑا وہ کہاں کہاں سے گزر گیا

ابھی آدمی ہے فضاؤں میں ابھی اُڑ رہا ہے خلاؤں میں
یہ نہ جانے پہنچے گا کس جگہ اگر آسماں سے گزر گیا

یہ مرا کمال گُنہ سہی مگر اس کو دیکھ مرے خُدا
مجھے تُو نے روکا جہاں جہاں میں وہاں وہاں سے گزر گیا

جسے لوگ کہتے ہیں زندگی وہ تو حادثوں کا ہجوم ہے
وہ تو کہیے کہ میرا ہی کام تھا کہ میں درمیاں سے گزر گیا

میں مُرادِ شوق کو پا کے بھی نہ مُرادِ شوق کو پا سکا
درِ مہرباں پہ پہنچ کے بھی درِ مہرباں سے گزر گیا

چہک اب تو بلبلِ خوش نوا کوئی چھیڑ نغمہ اَلم رُبا
وہ جو ابرِ برق فروش تھا سرِ آشیاں سے گزر گیا

کیا برگ برگ کو مشک بُو، کیا شاخ شاخ کو عنبریں
تُو جو زلف کاندھے پہ ڈال کر کبھی گلستاں سے گزر گیا

چلو عرشؔ محفلِ دوست میں کہ پیام دوست بھی ہے یہی
وہ جو حادثہ تھا فراق کا سرِ دُشمناں سے گزر گیا
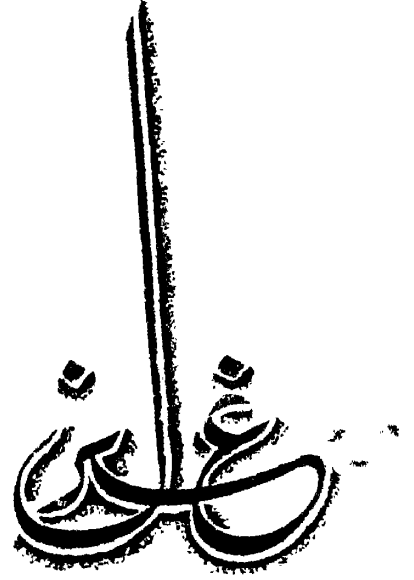
پنڈت بالمکند عرشؔ ملسیانی بی۔اے

افسانہ

رُت آئے رُت جائے

م۔ک۔ مہتاب ایم اے

ای۔ جی۔ ۹۸۴، پریم نگر۔ جالندھر

۵ر اپریل ۱۹۶۳ء — مکرمی و محترمی خوشتر صاحب آداب

... "جیا کی" کے لئے تحسین بھرے خطوط بھیجنے والے بہت سے بھائی بہنوں کا شکریہ۔ یہ عجیب بات ہے کہ میری کہانی "دست شناس" پڑھ کر لوگوں نے مجھے جیوتشی سمجھ لیا ہے اور اب تک ہاتھوں کے پرچے مل رہے ہیں۔ حالانکہ میرا افسانے کے ہیرو سے کوئی تعلق نہیں۔ افسانہ نمبر کی کامیابی کے لئے دعاؤں کے ساتھ!...

خیر اندیش ——— م۔ک۔ مہتاب

اُف! پانی کتنا گرم تھا!

تو میں نے ننگے ہاتھوں دیگچی کو اتارا ہی کیوں؟ اس میں پانی کا کیا قصور ہے اُبلنا اُس کی فطرت ہے اور جلا دینا گرمی کا خاصہ ہے۔

توبہ، توبہ! ہاتھ میں کتنی جلن ہو رہی ہے۔ جیسے کھولتا ہوا پانی جلد کے نیچے چلا گیا ہو۔ یہ میری ہی غلطی تھی۔ لیکن کلونت سنگھ اتنا تو کہہ سکتا تھا۔

"سردار جی! کام رہنے دو۔ یہ کام حلوائی خود کر لیں گے" لیکن اُسے آج فرصت ہی کہاں ہے۔ یہ وہی کلونت ہے جو ۲۳ برس پہلے ایک ایسے ہی دن یہاں ایک غلام کی طرح پھنسا ہوا تھا۔ کسی نہ کسی بہانے کھسک جانے کی کوشش میں تھا۔ اُس دن بھی تو کم بخت یہی ہاتھ جل گیا تھا لیکن وقت اور انسان انسان کا فرق ہے۔ جونہی سردار پورن سنگھ کو پتہ چلا بھاگے آئے۔

"سردار جی کاکا! چھوڑو یہ کام تمہارے بس کا نہیں۔ ذرا ہاتھ پر کالی سیاہی پوت لو تو آرام آجائے گا۔ اب آرام کرو تمھیں گھوڑیاں بھی تو اسٹیشن پر سے جانی ہیں!"

"نہیں باپو جی! کوئی زیادہ تکلیف نہیں۔ میں یہ کام صاف کر کے ہی جاؤں گا"

اور میں وہیں بیٹھا کام کرتا رہا۔

اف... ف... ف... کمبخت کتنی جلن ہو رہی ہے۔ اس وقت کہیں کوئی دوا بھی تو نہ ہوگی۔ ادھر صحن میں لڑکیوں نے وہ دھما چوکڑی مچا رکھی ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ کمرے میں ریڈیو نہ جانے کیا بولے جا رہا ہے۔ کہتے ہیں کہ گاؤں کی زندگی میں سکون ہوتا ہے۔ لیکن یہاں تو وہی ہنگامہ ہے جو کلکتہ کے بازاروں میں۔ ڈھولک کی آواز کانوں کے پردے پھاڑ رہی ہے۔ لڑکیوں کے بے محل اور بے موقع گیتوں کا شور کواڑوں کو چیرتا ہوا اندر چلا آتا ہے۔ وقت تھا۔ بیاہ شادیوں پر عورتوں کے بیبے اور مدھر راگ ہوتے تھے جن سے جذبات کی تسکین اور دماغ کو راحت ہوتی تھی۔ لیکن اب ہر جگہ فلمی نغموں کا راج ہے۔ جب پیار کیا تو ڈرنا کیا کی گردان جاری ہے۔

ایسے میں نیند خاک آئے گی؟ ایسا معلوم ہوتا ہے سب انگلیوں پہ چھالے اُبھر آئے ہیں۔ لیکن کلونت سے اتنا نہیں ہو سکا کہ حال پوچھنا تو کجا کوئی دوا ہی بھجوا دیتا۔

اور یہ وہی شخص ہے کہ جب ہاتھ میرا جلا تھا اور تکلیف اسے ہو رہی تھی۔

میں درد برداشت کر کے وہیں بیٹھ گیا۔ اور وہ مجھے وہاں سے اُٹھنے کے لئے مجبور کر رہا تھا۔

"اُٹھو مُراری! ہاتھ میں تکلیف بڑھ جائے گی۔ چلو چوبارے میں آرام کریں، وہاں بستر لگا دیئے گئے ہیں۔"

اور وہ مجھے لے کر چوبارے میں آگیا۔

نیچے اسی صحن میں لڑکیاں گا بجا رہی تھیں۔ اُن کے نغموں کی صدائیں سارے ماحول پر محیط تھیں۔ جن کے سحر میں ہم اپنے کالج کی لڑکیوں اور اُن سے وابستہ رُومانی داستانیں چھیڑ بیٹھے۔

پھر کلونت کہنے لگا۔

"آؤ نیچے چل کر لڑکیوں کا گانا سُنیں۔ اُن کا رقص دیکھیں۔"

"کیوں پٹنے کی نیت ہے کیا؟۔۔۔ اگر بے جی کو پتہ لگ گیا تو دماغ دُرست کر دیں گی!"

لیکن کلونت کو تو عجب بے کلی سی ہو رہی تھی۔ وہ کہنے لگا۔

"آؤ چارپائیاں برآمدے میں نکال لیں۔ اور باہر جھروکوں میں بیٹھ کر ان نغموں سے لطف اندوز ہوں۔"

اُس کی تجویز مجھے پسند آئی۔ لیکن ایک انجانے خوف کے تحت میں نے اُس سے کہا۔

"زینے کا دروازہ تو بند کر دو۔ اگر باپو جی آ نکلے تو زناٹے کا طمانچہ مُنہ پر جلتے ہوئے کہیں گے۔ کالجیٹ بدمعاش! لاہور سے یہاں مجرا سُننے کے لئے آئے ہو کیا؟"

کلونت دروازہ لگانے چلا گیا اور میں جھروکے میں آکر نظارے میں ایسا گم ہوا کہ نہ جانے کب کلونت آیا اور میرے قریب بیٹھ گیا۔ صحن میں گیس ٹنگے ہوئے تھے جن کی نیلگوں روشنی میں رنگ برنگے ریشمی لباسوں میں ملبوس لڑکیاں اور عورتیں حلقہ باندھے ڈھولک پر گیت گا رہی تھیں۔ جوان اور تنے ہوئے جسم، گوری رنگت، مسکراتے چہرے اور سُرخ ہونٹوں سے جھڑتے ہوئے نقرئی قہقہے سماں باندھ رہے تھے۔

دو لڑکیاں گلے میں ڈھولک ڈالے ایک دوسری کے مقابل کھڑی تھیں اور دو لڑکیاں جن میں سے ایک نے سُرخ اور دوسری نے سبز ریشمی لباس پہن رکھا تھا حلقے کے اندر ناچ رہی تھیں۔ حلقے میں کھڑی لڑکیاں لوک گیت کے بول چھیڑتیں اور ناچتی ہوئی لڑکیاں بول کی انترا کو لے کر گھوم جاتیں۔

ڈھولک گلے میں ڈالے کھڑی لڑکی نے ایک بول فضا میں بکھیرا۔

"کوٹھے تے پر کو ٹھڑا ماہی اُتے وچھائی لے ریت بھلا۔"

اور اُس کے مقابل کھڑی دوسری لڑکی بول اُٹھی۔

"اساں گندھایاں نی پنڈھیاں ماہی کیہے بہانے دیکھ بھلا۔"

اور حلقے میں آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دونوں لڑکیاں ٹپے کے بول لے کر محوِ رقص ہو گئیں۔

"دے چناں کتھے گزاری آ رات نے ساڈا جی دلیلاں دے داس دے۔"

حلقے میں کھڑی سب عورتوں نے اُن کی آواز میں آواز ملا دی۔ ڈھولک زور زور سے بجنے لگی۔ ناچنے والی لڑکیوں کے ساٹن کے لباسوں سے گیسوں کی روشنی یوں منعکس ہو رہی تھی جیسے حلقے میں سینکڑوں آئینے رقص کر رہے ہوں۔

کلونت میری گردن میں بازو ڈالے مبہوت بیٹھا تھا۔

چکر ختم ہونے کے بعد پنجابی کے اس لوک گیت کا دوسرا ٹپہ شروع ہوا۔

"کوٹھے تے پر کوٹھڑا اوے ماہی ہیٹھ وگے دریا بھلا۔"

اور بالمقابل کھڑی لڑکی بول اُٹھی۔

"میں بن جاواں مچھلی تُو بگلا بن کے آ بھلا۔"

اور سُرخ و سبز شعلے لپکتے ہوئے گویا ہوئے۔

"دے چناں کتھے گزاری آ رات دے میرا جی دلیلاں دے داس دے۔"

اور وہ دونوں اتنی تیزی سے چکر لگانے لگیں جیسے ایک ادری سُرخ اور سبز روشنی کے دو گولے ریشمی ڈوری سے باندھ کر اپنی اُنگلی کے گرد گھما رہا ہو۔

سبز پوش لڑکی چھوٹی لڑکی سے کہیں خوبصورت تھی۔ رقص کرتے

ہوئے اُس کا انگ انگ متحرک رہا تھا۔ وہ ایک شعلہ جوالا تھی جس کی نشیلی آنکھوں کے پیمانے چھلک چھلک کر نشہ بکھیر رہے تھے جس کی سیاہ ناگ پھنکار پھنکار کر تماشائیوں کو ڈس کر سُن کئے جا رہا تھا۔

میں بے اختیار بول اُٹھا۔

"کلدیپ! کون ہے یہ قیامت جو تین دن سے ۲۱ حویلی میں قلانچیں بھر رہی ہے؟"

"یہ میری بہن امرجیت کی سہیلی پرکاش ہے۔ امرت سر میں اُس کی ہم جماعت تھی۔ آجکل دہلی میں ہے۔ تم بڑے شاعر بنتے ہو، ذرا بتاؤ تو یہ کیسی ہے؟"

کلدیپ نے میری گردن کے گرد اپنے بازو کا حلقہ تنگ کرتے ہوئے کہا۔ ——

"کیا بتاؤں کلونت! جب جھوم جھوم کر چلتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کہکشاں میں کوئی ستارہ بدمست ہو گیا ہو۔"

"اور ناچتی کیسا ہے؟"

"جب آنکھیں مٹکاتی ہوئی پازیب جھنکاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ جھیل کے ساکن پانی میں چاند کے عکس کو کسی ابابیل نے چھو دیا ہو۔ اور پاس کھڑے کنول مسکرانے لگے ہوں!"

پائل پھر چھنکنے لگی تھیں۔ محفل پھر وجد میں آ گئی۔ لوک گیت کے بول بھی اشتعال انگیز ہو گئے تھے۔ کلونت میرے اور بھی قریب ہوتا گیا۔ اور میں ایک سرد آہ بھر کر دیکھنے لگا۔ کاش میرے بھی پر ہوتے اور میں سمندر کے نیلگوں پانی میں ہلورے لیتی اس سنہری مچھلی کو اُچک کر کہیں کیلاش پر جا بیٹھتا۔

اچانک کسی نے زینہ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ جیسے ایک حسین سپنا ٹوٹ گیا۔ آئینے میں دراڑیں پڑ گئی ہوں۔ کلونت چھلانگ لگا کر زینے میں، اور میں اپنی چارپائی پر تھا۔ گیت آہستہ آہستہ ختم ہو گیا۔ پھر اور گیت شروع ہوا۔ لیکن گھنگروؤں کی گنگنی دھمک اب بھی کان کے پردوں پر یوں محسوس ہو رہی تھی جیسے لطیف ہوا کا جھونکا ریشمی پردے کو سرسرا رہا ہو!

سنگیت ختم ہو گیا۔ لیکن کلونت نہیں لوٹا۔ مجھے تنہائی گراں گزرنے لگی تھی۔ پرکاش کی آواز اور رقص کے جادو نے میرے اندر ایک مقدس آگ سی سُلگا دی تھی۔ سونے کی کوشش کی لیکن آنکھوں سے نیند کوسوں دور اُڑ گیا تھا۔

"انگلیوں میں کتنا درد ہو رہا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے پانی جلد کے نیچے جا کر پھر کھولنے لگا ہے۔ دیکھو تو ہاتھ کی پشت پر کتنے آبلے اُبھر آئے ہیں۔" اور بالکل ویسی ہی بے چینی ہو رہی ہے جیسی اُس رات نیند نہ آنے سے ہو رہی تھی۔

میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔ رات بھیگ گئی۔ دھیرے دھیرے حویلی کی تمام آوازیں رات کے سناٹے میں دب کر رہ گئیں۔ صرف کبھی کبھی کسی کونے پر کوئی کتا رونے لگتا۔ سب روشنیاں گُل ہو چکی تھیں۔ اب صرف صحن میں ایک گیس روشن تھا جس کی کرنیں کھڑکیوں میں سے ہوتی ہوئی کمرے کے اندھیرے کو دھندلکے میں بدل رہی تھیں۔

کچھ دیر کے بعد دوسری منزل پر کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ پھر زینے میں کسی کے اُترنے کی آواز آئی۔ کوئی جلدی سے نیچے اُتر گیا۔ میں چوکنا ہو کر بیٹھ گیا کچھ دیر بعد پھر کسی کے سیڑھیوں سے اُترنے کی آواز آئی اور ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی زینے کے دروازے سے ٹکرا گیا ہو۔ میں نے گھور کر اُدھر دیکھنے کی کوشش کی۔ ایک سایہ حرکت کرتا ہوا نظر آیا۔ پھر ایک دھندلا سا عکس نظر آیا۔ ایک بھینی سی خوشبو آئی۔ وہ اٹھلاتی ہوئی قریب آ گئی۔ میں نے غور سے دیکھا۔

"پرکاش!"

میرے منھ سے بے اختیار سرگوشی کے انداز میں آواز نکل گئی۔

اُس نے دفعتہً منھ پھیر کر میری طرف حیران سے دیکھا۔ پھر ہاتھ کی پشت منھ پر رکھ کر جمائی لی۔ جیسے فضا میں دھنک لہرا رہی ہو۔ اور مسکراتے ہوئے بولی۔

"کیا نیچے جانے کے لئے سیڑھیاں اِدھر ہی سے ہیں؟"

"کیا نیچے آپ ہی ناچ رہی تھیں؟" میں نے اُس کی بات اَن سُنی کرتے ہوئے کہا۔

"کب ؟" اس نے اور حیرانی سے پوچھا۔

"رات کو نیچے ستاروں کے جھرمٹ میں !"

"کیا آپ اوپر بیٹھے دیکھ رہے تھے ؟ شریر کہیں کے۔ آپ کلونت کے دوست ہیں نا، ورنہ ...."

وہ خفگی کے لہجے میں بولی۔

"کیوں لڑکیوں کو دیکھنا جرم ہے ؟ ان کی آواز سننا گناہ ہے ؟ اگر ایسا ہوتا تو خدا انھیں ڈھانپ کر کیوں نہ پیدا کرتا ؟"

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی میری بات پر مسکرا دی۔

اور بولی۔

"نیچے سیڑھیاں ادھر ہی سے جاتی ہیں ؟"

"جاتی تو ادھر ہی سے تھیں۔ البتہ ایک راستہ ادھر سے بھی ہے !"

وہ جانے لگی تو میں نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

"پرکاش جی !"

"کیا بات ہے ؟" اس نے بھڑک کر کہا۔

"اوہو! آپ تو ناراض ہو رہی ہیں۔ دیکھئے آپ امرجیت کی سہیلی ہیں، میں کلونت کا دوست ہوں۔ اس میں گھبرانے یا ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔ مجھے آپ سے مشورہ کرنا ہے کچھ !"

"تو جلدی کیجئے، کہیں کوئی آ گیا تو ؟"

"آپ تو یوں ڈر رہی ہیں جیسے انارکلی چھپ کر سلیم سے ملنے آئی ہو !"

"آپ بڑے شوخ ہیں !"

"اس میں شوخی کی کوئی بات نہیں، میں تو آپ کے بے جا وہم کو دور کرنا چاہتا ہوں۔"

"تو کہئے مجھے نیند آ رہی ہے" اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر جمائی لیتے ہوئے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے آپ تھک گئی ہیں۔ آیئے پلنگ پر بیٹھ جایئے۔ اور اگر آپ کو کوئی جھجک ہو تو میں اٹھ جاتا ہوں۔"

"نہیں آپ مجھے جانے دیجئے۔"

لیکن میں نے اٹھ کر اس کے بازو پر رکھے ہوئے سبز ریشمی کپڑے تھام لئے۔ جن میں پائل کے گھنگھروؤں کی دبی دبی جھنجھناہٹ ہو رہی تھی۔ اور وہ کچھ کسمسائی ہوئی پلنگ کی پائینتی کے قریب بیٹھ گئی۔

"پرکاش جی ! میں نے آپ کو روکنے کی گستاخی اس لئے کی ہے کہ میں امرجیت کی شادی پر کوئی تحفہ دینا چاہتا ہوں۔ لاہور سے کچھ لا نہیں سکا۔ اب آپ بتایئے یہاں کون سی چیز موزوں رہے گی ؟"

"کوئی ساڑی وغیرہ دے دیجئے" اس نے ماحول سے اکتاہٹ کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"اوں ہوں !" میں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا "میرا خیال تھا آپ دہلی سے آئی ہیں ضرور کوئی اچھی چیز تجویز کریں گی۔ پھر گاؤں میں ساڑی کہاں مل سکتی ہے ؟"

"تو کوئی انگوٹھی بنوا دیجئے !"

اس نے کپڑے اٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن میں نے اپنا بھاری ہاتھ کپڑوں پر رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ دہلی نہیں گاؤں ہے اور صبح تو بارات آ رہی ہے !"

وہ زیرِ دام پرندے کی مانند پھڑپھڑا کر رہ گئی۔ اور لجاجت آمیز لہجے میں بولی۔

"ایشور کے لئے مجھے جانے دیجئے۔"

"کوئی اچھی سی تجویز بتایئے اور چلی جایئے۔"

وہ گال میں انگلی گڑائے ایک لمحہ سوچتی رہی۔ پھر بولی۔

"اچھا آپ یوں کیجئے، میں چاندی کا ایک جوڑی کنگن بنوا کر لائی ہوں آپ وہ لے لیجئے۔"

اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں چھوڑ آؤں ؟ ادھر اندھیرا ہے !"

"شکریہ ! مجھے دکھائی دیتا ہے۔"

اور وہ کپڑے اٹھا تیز تیز چلتی ہوئی برآمدے کی دوسری سمت یوں گم ہوئی جیسے آسمان سے کوئی ستارہ ٹوٹ کر روشنی کی لکیر چھوڑتا ہوا اندھیرے

میں کھو گیا ہوں۔ اور میں رات بھر اس اجنبی خوشبو کے ہالے میں کھویا رہا۔

صبح ہم گھوڑیاں لے کر اسٹیشن کی طرف جا رہے تھے۔ وہ مجھے کنوئیں کے قریب کھیت کی منڈیر پر کھڑی دکھائی دی جیسے گیہوں کی بالی پر اوس کا روشن قطرہ! اور میں گھوڑی کو پانی پلانے کے بہانے کنوئیں کی جانب نکل گیا۔ گھوڑی پانی پیتی رہی اور میں رات کی پیاسی آنکھوں کی تشنگی بجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ میرے قریب آگئی۔ میں اس سے کوئی بات پوچھنا چاہتا تھا، لیکن کوئی بات ہی نہ تھی، وہ خود ہی پوچھنے لگی۔

"برات کب آرہی ہے؟"

"ایک بجے کی گاڑی سے۔ لیکن وہ رات کا وعدہ یاد ہے نا؟ رات ختم ہونے کے ساتھ ختم تو نہیں ہوگیا؟"

"میں دینا تو نہیں چاہتی تھی۔ لیکن وعدہ چاہے جبر کے تحت کیا جائے وعدہ ہے۔ پھر کسی مرد کا وعدہ نہیں، لڑکی کا وعدہ ہے!" اور اس طنز کے ساتھ ہی وہ مسکرانے لگی۔

"بڑی شریر ہیں آپ!"

اُدھر سے گھوڑی کے ہنہنانے کی آواز نے طلسم توڑ دیا۔ میں نے دیکھا کلونت کھیتوں کے پار سڑک پر گھوڑی لئے کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا۔ اُسے دیکھ کر مجھے قدرے شرمندگی ہوئی اور میں جھٹ اس سے جا ملا۔

"کیوں پسند آئی تھیں؟"

کلونت نے میری پیٹھ پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"جوانی کے تپتے صحرا میں تو گدلے پانی کی بوند بھی آبِ حیات سے کم نہیں ہوتی۔ یہ تو خود آبِ حیات ہے دوست!"

اور ہم گھوڑیوں کو ایڑ لگا کر ہوا ہوگئے۔

شام کو میں چوبارے میں بیٹھا رات اور صبح کے حسین لمحات کی یاد میں محو تھا اور سوچ رہا تھا، پرکاش سے تحفہ کیسے حاصل کیا جائے؟ رات کو مجھے یہ تحفہ امرجیت کو دینا ہوگا۔ میں اُٹھ کر حجرے کے میں آگیا۔ صحن میں خوب چہل پہل تھی۔ پرکاش زری کا بھاری جوڑا پہنے، گوٹے کناری سے منقش اوڑھنی اوڑھے، ہتھیلی پر مہندی کا تھال اُٹھائے عورتوں کے ساتھ کہیں جانے کے لئے تیار کھڑی تھی۔ میں نے اُسے متوجہ کرنے کے لئے کھڑکی کا پٹ کھٹکھٹایا۔ اُس نے میری جانب دیکھا، کچھ جھینپی۔ لیکن جب میں نے کلائی دکھا کر جب اُسے وعدہ یاد دلایا تو وہ ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے مسکرا دی۔ میں کھڑکی سے ہٹ کر چوبارے میں آگیا۔ چند منٹ بعد سیڑھیوں میں کسی کے آنے کی آواز سُنائی دی۔ پرکاش مہندی کی تھالی اُٹھائے اُوپر آگئی۔

"فرمایئے! کیا حکم ہے کنیز کے لئے شہزادے صاحب!"

"واللہ خالص دہلوی زبان بھی بولتی ہو۔ میں نے صرف رات کے وعدے کے متعلق گستاخی کی ہے۔"

"تو لیجئے رات کو ادھر سے گزرنے کا جرمانہ!"

اور اُس نے سبز کاغذ میں لپٹے ہوئے کنگن نکال کر میری ہتھیلی پر رکھ دیئے۔

"اگر آپ ناراض نہ ہوں تو عوضانہ لے لیجئے۔"

"آپ بہت امیر ہیں کیا؟"

اُس نے آنکھیں مٹکا کر ہنستے ہوئے میری جانب دیکھا۔ میں نے اُس کی تھالی پکڑنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ میری گرفت سے بچ کر بھاگی۔ اور مہندی کا خوشبودار سبز غبار بکھیرتی ہوئی نیچے اُتر گئی۔

گاؤں میں قیام کے باقی دو دن پرکاش کا سرور میرے دل و دماغ پر چھایا رہا۔ اُس سے ملنے کے کتنے مواقع میں نے نکالے اور ہر موقع پر کتنی باتیں کیں۔ جن پر وہ ہنستی ہوئی کہہ دیتی۔

'آپ بڑے وہ ہیں!'

اور جب میں لاہور کے لئے روانہ ہوا تو میرا پتہ اُس کے پاس تھا اور اُس کا پتہ میری ڈائری میں۔

امتحان تک جو باقی مہینے رہ گئے تھے میرے لئے کانٹوں کی سیج بن گئے میں اپنے تصورات کی دُنیا کو پرکاش کی مُسکراہٹوں کے پھولوں سے سجاتا رہا۔ لیکن اس دوران میں کلونت نے اپنی حقیقی دُنیا پرکاش کی کرنوں سے آباد کر لی تھی!

امتحان کے بعد جب میں گھر لوٹا تو مجھے کلونت کا خط ملا۔

"مراری! تمھیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ میں نے تمھاری پسند کے مطابق پرکاش سے شادی کرنا منظور کر لیا ہے ..."

میں اِس سے آگے خط نہ پڑھ سکا۔

نوچ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

"دھوکے باز، کمینہ!"

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے خط کی سطریں سلائیاں بن کر میری آنکھوں میں بھر گئی ہوں۔ جیسے خط نے میرے دل کو داغ داغ کر ڈالا ہو۔ مجھے کلونت سے نفرت ہوگئی اور پرکاش سے بھی۔ کہ اگر اُس کا عہد اتنا بودا تھا تو اُس نے الفت کے کچے تار کا ایک سرا میرے ہاتھ میں تھمایا ہی کیوں تھا۔ میں ٹھہر کر پریکٹس شروع کرنی چاہتا تھا۔ لیکن وہیں تو کلونت پرکاش کو بیاہ کر لا رہا تھا۔

اور میں نے وہاں ٹھہرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

کلکتہ چلا گیا۔

کمروں میں کیسا بے ہنگم شور ہو رہا ہے۔ نہ کوئی سُر نہ تال۔ دھما چوکڑی بھی ہے۔ اور درد ہے کہ پھر لہریں مارنے لگا ہے۔ جیسے انگلیوں میں کوئی آری چلا رہا ہو۔ اُٹھ کر کہاں جاؤں؟ کہیں کوئی ڈاکٹر بھی تو نہ ہوگا۔ کاش کہیں سے کوئی تیز دھار چاقو ہی مل جائے۔ تو میں ان آبلوں کو چھیل ڈالوں۔ شاید درد کو کچھ سکون حاصل ہو۔

کلکتہ جا کر میں نے سب کچھ بھول جانے کی کوشش کی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ اُس کے بس کی بات نہ رہی ہو۔ اِس پر کلونت کے خطوط زخموں پر مسلسل نمک پاشی کرتے رہتے۔ میں نے کبھی اُس کے خطوں کا جواب نہ دیا۔ لیکن اُس کے خطوط برابر نشتر بن کر میرے زخموں کو ہرا کرتے رہتے۔ کچھ عرصہ بعد میں نے چاہا اُسے ڈانٹ دوں کہ مجھے خط نہ لکھا کرے۔ لیکن میں ایسا نہ کر سکا۔ کیونکہ اب زخموں پہ نمک لطف دینے لگا تھا۔

میں کلکتہ میں بہت آرام چین سے ہوں۔ خدا کا دیا سب کچھ ہے۔ وقت بہت اچھا گزرتا۔ لیکن یہ ظالم مجھے آرام بھی تو کرنے دے۔

گزشتہ سال کلونت کا خط آیا تھا کہ اُس کے لڑکے کی شادی ہے، میں بال بچوں کو لے کر آؤں۔ لیکن میں نے خط کا جواب نہیں دیا۔ البتہ بہو کیلئے ایک قیمتی ساڑی اور ایک جڑاؤ سیٹ بھیج دیا۔

اب پھر خط آیا۔ اُس کی لڑکی امرجیت کی شادی تھی۔ بچوں سمیت شرکت کی دعوت دی تھی۔ میں نے پھر خط کا جواب نہیں دیا۔ ایک قیمتی ساڑی اور سونے کے جوڑ پوری کنگن بطور تحفہ بھیج دیئے۔ میں نے سوچا تھا بلا ٹل گئی۔ لیکن چند دن بعد تحفہ واپس آگیا۔ ساتھ پرکاش کا خط تھا ... اِتنے برس بعد پہلا خط!

لکھا تھا۔

"ایشور آپ کو اور زیادہ دے۔ ہم پیار کے بھوکے ہیں۔ دولت کی نہیں۔ پھر لڑکیاں تو سب کی سانجھی ہوتی ہیں۔"

اور میرے پاس پرکاش کے خط کا صرف یہی جواب تھا کہ میں اِس ضعیف العمری میں، اِس کڑاکے کے جاڑے میں ہزاروں میل کی صعوبت برداشت کر کے یہاں آپہنچا ہوں۔

یہاں کلونت ملا۔ پرکاش ملی۔ وہ ویسی ہی ہے جیسی تیئیس برس پہلے تھی۔ زمانے کی گردش ماحول بدل دیتی ہے، انسان کے خدوخال میں تبدیلیاں کر دیتی ہے لیکن انسانی فطرت کو تبدیل نہیں کر سکتی۔ اُس کے مزاج میں وہی لاابالی پن ہے۔ وہی شوخی ہے۔ وہی بے باک اندازِ گفتگو ہے۔ بات بات پر ہنستی ہے اور قہقہے لگائے چلی جاتی ہے۔ مجھ سے باتیں کرتی ہے تو تھمنے کا نام نہیں لیتی۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کچھ کہتے کہتے رُک جاتی ہے۔ شاید نئے ماحول کی ذمہ داریاں راہ میں حائل ہو جاتی ہیں۔

اِن دو دنوں میں اُس نے میری خدمت کے لئے کون سا دقیقہ فروگزاشت کیا ہے؟ سیٹھ جی! سیٹھ جی! کی گردان سے اُس کی زبان تھک گئی ہوگی۔ وہ مجھ سے ضرور کچھ کہنا چاہتی ہے۔ اپنی بے وفائی کے لئے اظہارِ تاسف کرنا چاہتی ہے۔ ایسا نہیں تو اُس نے میرے ٹھہرنے کیلئے

یہاں الگ کیوں انتظام کر دیا ہے۔ کیا وہ یہاں مجھ سے تنہائی میں ملنا چاہتی ہے؟

اُف اوہ! میں بوڑھا ہو گیا ہوں مگر عقل نہیں آئی۔ کیا بچپن کی سی باتیں سوچ رہا ہوں۔ شاید میرے حواس بجا نہیں رہے۔ ہو سکتا ہے پرکاش نے میرے بارے میں کبھی سوچا بھی نہ ہو۔ اور اُس نے محض میرے مرتبے کے لحاظ سے یا میرے آرام کی خاطر میرے لئے الگ انتظام کیا ہو!

اوہ۔ ہو۔ ہو۔ ہو۔ ہاتھ کتنا درد کر رہا ہے۔ میں نے جان بوجھ کر یہ مصیبت مول لی ہے۔ مجھے یہاں آنا ہی نہیں چاہیئے تھا۔ اگر تیس برس پرکاش کو نہیں دیکھا تھا تو اب اُسے دیکھ کر کون سی عاقبت سنور گئی۔ پھر مجھے کیا ہوا کہ ایک ہزار میل کی مسافت طے کر کے دھکے کھاتا ہوا اس ویران گاؤں میں چلا آیا ہوں۔ یہ درد تو رات ہی رات میں مجھے ہلاک کر ڈالے گا۔ کوئی آئے تو اُس سے کہوں میری چارپائی ہی کہیں اور لے چلے۔ یہاں تو لڑکیوں کی دھما چوکڑی مجھے چین نہیں لینے دے گی۔

اتنے میں دروازے پر کھٹکا ہوا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی دروازے سے ٹکرا گیا ہو۔ پھر برآمدے میں جلتی ہوئی نیلی بتی کی روشنی میں ایک عورت ہولے ہولے قدم رکھتی ہوئی آتی دکھائی دی۔ جسم میں قدرے گداز تھا لیکن چال میں وہی مستی اور جانا پہچانا بانکپن تھا۔

میں تن کر بیٹھ گیا اور میرے منہ سے سرگوشی کے انداز میں آواز نکل گئی۔

"پرکاش!"

"ہاں!"

اور وہ پلک جھپکتے ہی دہلیز پار کر کے میرے پلنگ کے قریب آ گئی۔

"آؤ کیسے آئیں؟" میں نے پلنگ سے ایک طرف ہٹتے ہوئے کہا۔

"میں نے کاکے سے کہا تھا، جا کر سیٹھ جی کو دودھ دے آئے۔ لیکن وہ بولا۔ ماں جی! تم خود ہی چلی جاؤ۔ سُنا ہے آپ کی انگلیاں جل گئی ہیں۔ اب کیا حال ہے؟"

اُس نے دودھ کا کٹورا میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ اور خود قریب رکھی تپائی پر بیٹھ گئی۔

"انگلیوں کا کیا پوچھتی ہو پرکاش! انھیں تو جلنے کی عادت ہو گئی ہے۔ بلکہ اب تو جلنے میں کچھ لذت محسوس ہوتی ہے!"

"آپ اب بھی باتیں بہت دلچسپ کرتے ہیں سیٹھ جی!" وہ میری بات پر ہنسنے لگی۔

"اور آپ دودھ بہت اچھا ابالتی ہیں۔ ایک ایک گھونٹ میں شہد اور امرت ملا معلوم ہوتا ہے۔ اس میں شکر اپنی انگلی سے ملائی تھی کیا؟ کیا خوشبو ہے!!"

اُس نے میری بات پر قہقہہ لگایا لیکن منہ پہ ہاتھ رکھ کر کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ جیسے کہنا چاہتی ہو۔

"شریر کہیں کے! بڑے شوخ ہو تم!"

پھر ایک دم بات کا رخ بدل کر بولی۔

"آپ کو یہاں لڑکیوں کا گانا بجانا سنائی دے رہا ہے نا؟"

میں نے خالی کٹورہ اس کے حوالے کرتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اور اس کے ہونٹوں پر شرارت بھری مسکراہٹ تھی، جیسے وہ کسی پرانے واقعے کی یاد دلا کر طنز کر رہی ہو۔

"اب تو گاؤں میں بھی شہر کے گیتوں کا راج ہو گیا ہے۔" وہ کٹورے کو اپنی انگوٹھی سے کھنکھناتے ہوئے بولی۔

"اب گاؤں گاؤں کہاں ہے پرکاش؟" میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"نہ وہ پہلا سا خلوص، نہ پہلی سی فضا۔ نہ پہلی سی باتیں، نہ پہلے سے مدھر گیت، نہ وہ کنوؤں کی منڈیروں پر جگنوؤں کی طرح جگمگاتی لڑکیاں۔ اور نہ اُن میں اپنے محبوب سے چھپ چھپ کر ملنے کی وہ چاہ رہی ہے، جس کا اظہار وہ اپنے گیتوں میں کرتی تھیں۔ اب کوئی لڑکی پپیہا بن کر یہ نہیں چاہتی کہ اُس کا محبوب بگلا بن کر اُسے اچک کر لے جائے۔ اب تو شہروں کی بے حیائی دیہات میں بھی پھیل گئی۔ سن لو کیا ہنگامہ بپا ہے۔....

"جب پیار کیا تو ڈرنا کیا!"

وہ میری بات سن کر پھر ہنسنے لگی۔

"سیٹھ جی! آپ اب بھی وہی لڑکوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔"

"اور تم بھی تو ویسے ہی ہنستی ہو۔"

وہ میری بات پر لڑکیوں کی طرح شرما گئی۔ لیکن بات کا موضوع بدلتے ہوئے پھر بولی۔

"لیکن آپ کو یہ پسند کیوں نہیں؟"

"میں تو کلکتے کی مصنوعی زندگی کی گھٹن سے اُکتا کر یہاں آیا تھا کہ گاؤں میں پھر کوئی چاند کا ٹکڑا پاؤں میں پائل باندھے رقص کرتا ہوا آ رہا ہو گا۔

"چنان کتنے گزاری آرات دے!"

لیکن اب تو جیسے وہ خواب کی بات معلوم ہوتی ہے۔"

"تو کیا اتنے برسوں میں کوئی تبدیلی نہ آئی؟"

"تبدیلی کیا قیامت آگئی ہے۔"

"پھر بھی...."

"لیکن پھر بھی میری آنکھیں ایک بار وہی نظارہ دیکھنا چاہتی ہیں۔ کان وہی آواز سننا چاہتے ہیں۔ کیا تم ایک بار پھر...."

میں کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔

پرکاش نے شرما کر سر جھکا لیا اور بولی

"میں پھر کبھی نہیں ناچی۔ اُس شادی میں میری پائل گم ہو گئی تھی۔ میں نے اُسے بدشگونی سمجھ لیا۔ اور نہ انھوں نے مجھے کبھی اجازت ہی دی۔"

میں نے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا۔ اور پائل نکال کر اُس کی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ لو تمھاری امانت! اُس رات تم یہ میرے بستر ہی پر چھوڑ گئی تھیں۔ جب تک یہی میرے سکون کا سامان بنی رہی ہیں۔ میں انھیں تکیے کے نیچے رکھ کر سوتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے خواب میں کوئی محوِ رقص ہے۔ کوئی لہک لہک کر گا رہا ہے۔"

پرکاش نے سر نہیں اُٹھایا۔ پائل جھنکتی ہوئی اُس کی ہتھیلی سے پھسل کر اُس کے پاؤں میں جا گری۔

"کیا میں باندھ دوں؟"

میں نے گلوگیر آواز میں کہا۔

"اوں ہوں!"

اُس نے انکار میں سر کو زور سے جھٹکا۔ اور ایک آنسو اُس کی پلکوں سے میری اُنگلیوں پر آ گرا۔

درد کی لہریں یوں تھم گئیں جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ گئی ہو ——!

——وہ جانے کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

——لڑکیاں صحن میں گائے جا رہی تھیں

"——جب پیار کیا تو ڈرنا کیا ——!"

ساغر نظامی

کس رات مرے آپ کے پیماں نہیں ہوتے ‌ ‌ ‌ کب آنکھوں ہی آنکھوں میں چراغاں نہیں ہوتے

داماں نہیں جو نذرِ بہاراں نہیں ہوتے ‌ ‌ ‌ جو چاک نہ ہو جائیں گریباں نہیں ہوتے

ہم وہ ہیں ترے آئینہ خانے میں بھی اے دوست ‌ ‌ ‌ جلووں کو ترے دیکھ کے حیراں نہیں ہوتے

میرے نفسِ شوق سے آتا ہے تموّج ‌ ‌ ‌ گیسو یہ ہواؤں سے پریشاں نہیں ہوتے

ہے شرطِ اسیری کے لئے مستیٔ رندی ‌ ‌ ‌ ہشیار کبھی داخلِ زنداں نہیں ہوتے

ساقی یہ تری بزم کا اعجاز ہے ورنہ ‌ ‌ ‌ ہر بزم میں ہم مست و غزلخواں نہیں ہوتے

تھم جائیں جو آنسو انھیں آنسو نہیں کہتے ‌ ‌ ‌ جو آکے اتر جائیں وہ طوفاں نہیں ہوتے

عشاق پہ کرتے ہو قیاس اہلِ ہوس کا ‌ ‌ ‌ عشاق کبھی بندۂ ارماں نہیں ہوتے

ہوتے ہیں جو مایوس تو ہوتے ہیں خدا سے ‌ ‌ ‌ ہم شاکیٔ بے مہریٔ انساں نہیں ہوتے

کھلتا ہے یہ شیرازۂ شب گوں مرے دل پر ‌ ‌ ‌ گیسو ترے شانوں پہ پریشاں نہیں ہوتے

وہ عشق ہی کیا جس کی مہک عام نہیں ہے

وہ راز ہی کیا جو کبھی عریاں نہیں ہوتے

ساغر نظامی

افسانہ

روشنی کا پھن

رام لعل

ملٹی اسٹوری فلیٹ نمبر II / ۳۹ - آر - چار باغ - لکھنؤ

۱۲ اپریل ۱۹۶۳ء   برادرم خوشتر صاحب آداب

.... آپ کو "روشنی کا پھن" بھیجنے سے پہلے ایک میٹنگ میں پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ سید احتشام حسین نے اسے دلچسپ اور مکمل کہانی قرار دیا۔ حیات اللہ انصاری نے لفظ "بہیمانہ" سے لے کر عورت کی فطرت پر بحث کی جو ہمیشہ ایک جابر، بے رحم اور سنگ دل قسم کے مرد کی تمنا کرتی ہے۔ عابدہ سہیل اور ڈاکٹر محمد حسن   یہ کہانی اس عورت کی انتہائی مایوسی کا اظہار کرتی ہے جو اپنے مرد کے منھ سے "نہ" کا لفظ نہیں سننا چاہتی جس سے وہ شدید طور پر نفرت بھی کرتی رہی ہے۔ منظر سلیم، آفتاب اختر اور وارث کرمانی ایک دوسری ہی بحث میں الجھ گئے۔ کہ کوئی عورت اپنے شوہر سے پہلی ملاقات میں کسی صدمے سے دوچار ہو کر اسے ہمیشہ کے لئے چھوڑ بھی سکتی ہے یا نہیں؟ بیر راجہ جو کہانی کے حقیقی واقعات سے مجھ سے بھی زیادہ قریب رہ چکا ہے، حیران تھا کہ کہانی کو میں نے اپنی پسند کی شکل کیوں دے دی۔ فرید عشرتی اور ابراہیم علوی جو اردو ادب کے ابھی بالک ہی سمجھے جاتے ہیں، کہانی کے کسی اور پہلو پر بولنے کی بجائے بڑی معصومیت سے صرف تعریف ہی کر سکے۔ یہ مختصر سی روئداد اس کہانی کے بارے میں مختلف تاثرات پیش کرتی ہے جنھیں میں نے بڑی دلچسپی سے سنا۔ خود میرا اس کہانی کے بارے میں جو خیال ہے وہ اسی میں موجود ہے۔ اب میں بیسویں صدی کے قارئین کے تاثرات جاننا چاہوں گا....

آپ کا مخلص ——— رام لعل

ننو بس اسٹینڈ کی ریلنگ پر کتنی دیر سے جھکی بس کا انتظار کر رہی تھی۔ انتظار نے اس کے چہرے پر تھکن پیدا کر دی تھی۔ اس کا چہرہ بتاتا تھا کہ وہ یوں بھی بے زار اور مایوس ہے۔ اپنی سدھ بدھ کئی روز سے بھولی ہوئی ہے۔

سنٹرل جیل کا بس اسٹاپ بالکل سنسان تھا۔ وہاں ننو کے علاوہ صرف ایک ادھیڑ دیہاتی تھا۔ وہ اس کے ساتھ ہی جیل کے احاطے سے باہر آیا تھا ننو نے اسے اپنے بیٹے سے بغل گیر ہوتے اور آنسو بہاتے دیکھا تھا۔

جب وہ گوپال اور مدھوک کی باتیں سننے میں مصروف تھی۔ ملاقات کے تھوڑے سے وقت میں دونوں نے اس سے جلدی جلدی بہت کچھ کہہ ڈالنا چاہا تھا۔ اس کا ذہن ان ہی کی باتوں سے اب تک بھرا ہوا تھا۔ ادھیڑ دیہاتی کی طرف کتنی دیر سے وہ بے مطلب ہی دیکھے جا رہی تھی۔ جو سر جھکائے ایک پوٹلی میں سے گڑ اور شکر ملی روٹی کے ٹکڑے اٹھا اٹھا کر چبا رہا تھا۔ لیکن وہ اپنے خیالوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔

ایک ٹرک بہت تیزی سے اس کے پاس سے گزر گیا لیکن ڈرائیور

، آنکھیں اُسے بہت دُور تک گھورتی چلی گئیں۔ پھر ایک دوُدھ کے نتھنوں سے لدا پھندا اُس کے قریب آیا۔ وہ جس رفتار سے آرہا تھا اُسی رفتار سے چلا بھی گیا۔ اور نوجوان گوالے کا ماہیا کتنی دیر تک اُس کے کانوں سے ٹکراتا رہا۔ گانے کی آواز رِڑکے تار کی طرح ملیح اور مہین ہوتی چلی گئی۔ گوالا خوش شکل تو نہیں تھا۔ لیکن اُس کی آواز بہت اچھی تھی۔ کانوں میں رَس گھولنے والی۔ گوپال بھی ماہیا اور سرگانے والوں کے خطّے سے تعلق رکھتا تھا۔ اُس نے اپنی روپوشی کی مدت میں اُسے کئی بار ماہیا سُنایا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بول جنہیں سُنتے ہی اُس کی دھڑکن بڑھ جاتی تھی۔ کانوں کی لویں تک سُلگ اُٹھتی تھیں۔ اور ماتھے پر پسینے کی بُوندیں اُبھر آتی تھیں۔ وہ اُسکی آواز کی مدھرتا سے ہی لوک گیتوں کا مطلب سمجھ جاتی تھی۔ پھر بھی گوپال اصرار کر کے اُسے ایک ایک شبد کا مطلب بتانے لگتا تھا۔ 'رانجھنا' ہمارے علاقے میں عاشق کا ایک سمبل بن گیا ہے۔ جسے پیار سے ڈھولا بھی کہتے ہیں۔ ڈھول جانی بھی، مکھنا بھی اور سپہیا بھی۔ ابھی تک ہماری شاعری میں 'ماڈرن لور' کا کوئی تصور نہیں ملتا تھا جو بڑے خوبصورت سُوٹ بُوٹ میں ملبوس رہتا ہے۔ کتابیں پڑھتا اور پڑھاتا ہے۔ عینک لگاتا ہے اور دفتر، اور کارخانوں میں اپنی محنت بیچتا ہے۔ لیکن اب زندگی کی یہ سچائیاں بھی لوک گیتوں میں اپنا ٹھکانا ڈھونڈ رہی ہیں۔ اچھا سُن! تجھے ایک شہری بابو کی محبوبہ کا برہا سناؤں۔

ڈھیر ساری کتابوں میں رات دن کھویا کھویا رہنے والا گوپال اُسے دیکھتے ہی بچوں کی مانند مچل اُٹھتا تھا۔ اپنا کرڈواسگار فرش پر سل دیتا دونوں ہاتھوں سے ماتھے پر گرے ہوئے لمبے اور سُوکھے بال سمیٹ کر پیچھے کو لے جاتا۔ اور عینک کے موٹے شیشوں کے پیچھے سے شوخ چمکتی ہوئی آنکھوں سے مسکرا کر پوچھتا۔

"کیا کوئی گیت سُننے آئی ہے؟"

"نہیں!" وہ فوراً احتجاج کر کے کہتی "آج تم سے کوئی گیت نہیں سُنوں گی۔ صرف اُن دیوانوں کی کہانی سُنوں گی جو اپنے خوابوں کے پورا ہونے کے لئے زندگی بھر جیل میں پڑے سڑا کرتے ہیں۔ اُن کی بیویاں ماؤں اور بہنوں کی کہانی بھی سُناؤ جو اپنی ساری آرزوئیں اُن پر نچھاور کر کے زندگی کی ساری صعوبتیں سہتی رہتی ہیں۔"

یہ سُن کر گوپال بزرگوں کی سی گمبھیر ہنسی ہنستا تھا۔ حیران بھی ہوتا تھا کہ صرف انٹرمیڈیٹ تک پڑھی ہوئی لڑکی محض چند ہفتوں کی رفاقت سے اتنی باشعور کیسے بن گئی۔ لیکن وہ اُس کی حرکتوں، باتوں اور شرارتوں کو ایک بچّے کی معصومیت سے تعبیر کرتی تھی۔ بعض بچّے کتنے اچھے ہوتے ہیں۔ بغل میں ہمکتے ہیں سر ٹکرا ٹکرا کر لاڈ کرتے ہیں۔ کچھ طلب کرتے ہیں۔ لیکن اُن سے جی کبھی نہیں اُوبتا۔

وہ اُس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہتا۔

"مجھے بور کرنے کے لئے یہ کتابیں ہی کافی ہیں۔ اگر تو بھی اِن ہی کتابوں کی طرح میرا مغز چاٹنا شروع کر دے گی تو میں اِس بند کمرے میں رہتے رہتے پاگل ہو جاؤں گا۔ کہ تو کبھی کبھی آجاتی ہے۔ باتیں کرتی ہے مسکراتی ہے تو میرے تھکے ہوئے دماغ کو بہت کچھ سکون مل جاتا ہے۔ میں پھر سے تازہ دم ہو جاتا ہوں لیکن کیا تو جانتی بھی ہے کہ تو کتنی بڑی خدمت سرانجام دے رہی ہے؟"

گوپال دھوک اور ماں کے سامنے بھی اسی طرح کی باتیں کہہ دیا کرتا تھا۔ دھوک تو سُن کر مسکرا دیتا لیکن ماں اُسے ڈانٹ دیتی۔ "دیکھ بے ایک بیاہی ہوئی لڑکی سے ایسی باتیں کیوں کہتا ہے؟ تجھے شرم نہیں آتی؟"

اس کے بعد وہ منّو کو بھی ڈانٹ پلاتی۔

"چل بھاگ یہاں سے بے شرم! تیرے سُسرال والے جان گئے تو تجھے چیر کے رکھ دیں گے۔ سمجھی؟"

گوپال کو اُس کی ماں سر پھرا سمجھتی تھی۔ ماں کو دھوک کا ڈر نہ ہوتا تو وہ گوپال کو پہلے ہی دیس نکالا باہر کرتی۔ دھوک کو کارخانے سے بہت ہی کم تنخواہ ملتی تھی۔ ایک مزدور کو آخر ملتا ہی کتنا ہے۔ بڑی مشکلوں سے تین جیوں کی گزر بسر ہو رہی تھی۔ یہ چوتھی مصیبت اُس کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔ اُس کا پیٹ بھی دن میں دو بار کھانا مانگتا تھا۔ دن میں کئی کئی بار چائے، پانی اور سگریٹ وسگار بھی۔ لیکن چونکہ دھوک کا

علم خاص لئے لئے وہ مُنھ مانگی چیزیں مہیا کر دیا کرتی تھی۔

تھوڑی دور سے بس آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ چونک کر سیدھی کھڑی ہو گئی لیکن وہ دلّی بس نہ تھی۔ روہتک سے آ رہی تھی۔ وہاں اُس نے ایک سواری گاڑی بدلو کنڈکٹر نے اُسے لے چلنے کی پیش کش کر دی ——— وہ بھی کھڑے کھڑے تنگ آ چکی تھی۔ اسٹیشن تک جانے کے بعد اُسے پھر ایک اور بس پکڑنی ہوگی۔ جو شہر کے مختلف علاقوں میں گھماتی پھراتی ہوئی دفتر لے جائے گی۔ وہ کسی قسم کے تردّد کے بغیر اُسی بس میں سوار ہو گئی۔

بس کے اندر کوئی سیٹ خالی نہ تھی۔ عورتوں کی سیٹوں پر بھی مرد بیٹھے ہوئے تھے۔ کنڈکٹر کے کہنے سے دو مرد ایک سیٹ پر سے اُٹھ گئے۔ نمّو نے کنڈکٹر کو ساتھ آنے ادا کرتے وقت اُس کی طرف بڑی شکر گزار آنکھوں سے دیکھا۔ پھر اچانک اُن دو مردوں پر نگاہ پڑ گئی جو کنڈکٹر کے کہنے پر اُس کے لئے جگہ خالی کر کے پیچھے ایک ہی سیٹ پر بیٹھ گئے تھے۔ اُس نے استعجاب پر بڑی مشکل سے پردہ ڈالا۔ اور چہرے پر بظاہر بے پروائی سی لا کر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔ لیکن اُس کا سارا جسم نفرت اور غصّے سے دہک اُٹھا تھا۔ قے اور اُبکائی کی سی کیفیت سے بار بار حرکت کر رہا تھا۔ جن دو آدمیوں کو کنڈکٹر نے سیٹ پر سے اُٹھا لیا ہے اُنھیں نیچے کیوں نہیں اُتار دیا! بس بڑے زور سے چل رہی تھی۔ وہ پیچھے کی طرف تیزی سے سرکتی ہوئی سُرمئی سڑک پر نگاہ جمائے ہوئے تھی۔ جیسے کوئی پُرسکون سطحِ آب پر تیرتا پھسلتا ہوا چلا جا رہا ہو۔ نہ لہریں اُٹھ رہی ہوں، نہ چھینٹے۔ لیکن اُس کے اندر طوفان بپا تھا۔ پچھلے کئی گھنٹوں میں وہ ایک لمحہ کے لئے بھی پُرسکون نہیں ہو سکی تھی جب سے مدھوک اور گوپال جیل چلے گئے تھے سکون تو اُس سے اِس طرح بچھڑ گیا تھا جیسے کسی ماں سے بچہ! لیکن وہ سکون کی اِس قدر آرزو مند نہ تھی جس قدر سوچتے رہنے اور ڈوبی رہنے کی تھی۔ اِسی میں اُسے بڑی راحت مل رہی تھی۔

مدھوک نے سوسائٹی سے قرض لے کر اُس کا بیاہ کیا تھا۔ اُس کی ماں کو اپنے سارے زیور بیچ دینے پڑے تھے۔ اِس یگیہ میں مدھوک کے کئی دوستوں نے بھی اپنی اپنی حیثیت کے مطابق آہوتی دی تھی۔ نمّو کی نظروں کے سامنے میز، کرسی، لیمپ، اسٹوو، بجلی کی پریس، کراکری کا سامان کتنی ہی چیزیں گھومتی رہتی تھیں۔ بالکل اِس طرح جیسے خلا میں گردش کر رہی ہوں۔ لڑکی جب سُسرال جاتی ہے تو اُس کا دولہا یہ سب سوغاتیں خود ہی جمع کر کے اُس کا سواگت کیوں نہیں کرتا؟ یہ بات اُس نے ایک معصوم بچے کی طرح سوچی۔ جیسے اُس کی ماں نے دودھ پلانے کی بجائے جھڑک دیا ہو۔ اور وہ رو رو کر دودھ کے خواب دیکھ رہا ہو۔

دولہا کی یاد سے تو ہمیشہ اُس کے جسم کا ننّھا ننّھا ٹنک اُٹھتا تھا۔ اُسے اپنے بیاہ میں لڑکیوں اور عورتوں کے گائے ہوئے سارے گیت یاد تھے۔ وہ بیاہ کے سمے جس درد اور کرب میں مبتلا رہی تھی، وہی کیفیت اب بھی کبھی کبھی اپنے اوپر طاری کر لیتی تھی۔ شادی کا سُرخ جوڑا پہنے۔ سولہ سنگار کئے اور گھونگھٹ میں چہرہ چھپائے وہ اُس راجہ کے نواس میں داخل ہونے کا انتظار کر رہی تھی جو سجے ہوئے گھوڑے پر سوار ہو کر، زری کا چمکتا ہوا لباس پہن کر پھولوں سے ڈھکا ہوا چاندی کا مکٹ باندھ کر اور کمر میں تلوار لٹکا کر اُسے بیاہنے گیا تھا۔ لیکن اُسے گھر میں لے آنے کے بعد دن بھر کے لئے اِس طرح غائب ہو گیا تھا جیسے اُس سے کوئی واسطہ ہی نہ ہو۔ آدھی رات تک اُس کی نندیں اور جٹھانیاں اُس کے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہی تھیں۔ پھر وہ بھی تھک ہار کر اِدھر اُدھر اپنے کمروں میں جا کر سو گئی تھیں۔ صبح ہونے میں بہت زیادہ دیر نہیں رہ گئی تھی کہ اچانک وہ لڑکھڑاتا اور گنگناتا ہوا اُس کے کمرے میں داخل ہو گیا تھا۔ اُس نے گھونگھٹ کی آڑ میں سے اُس کی کلائیوں پر بندھے ہوئے پھولوں کے گجرے دیکھے تھے۔ اُس کے بے ترتیب بالوں اور کپڑوں کو دیکھا تھا۔ جب وہ قریب آیا تو اُس کے منھ سے شراب کی بدبو کے بھبکے نکل رہے تھے۔ اُس نے آتے ہی اس کا دوپٹہ چھین کر پرے پھینک دیا تھا اور بڑی سختی سے اُس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگا تھا۔ خوف اور صدمے کے کارن اُس کے منھ سے چیخ نکل گئی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ منھ پر رکھے اور دیوار کے ساتھ کمر لگائے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اپنے خوابوں کے دیوتا سے ملنے کے لئے اُس نے بیس سال انتظار کیا تھا۔ وہ بیس سال تک جس تصویر کو بنانے میں مصروف رہی تھی اُس کی ایک جھلک بھی اُس مرد کے چہرے میں دکھائی نہیں دی تھی۔ جو مرد

[illegible] خوابوں میں آکر اُس کے کانوں میں چپکے چپکے کچھ کہہ جاتا تھا وہ اِس مرد [illegible] مختلف تھا۔ بہت ہی مختلف۔ اِس کے پاس محبت کا نازک اور [illegible] تھا [illegible] دل کو موہ لینے والی مسکراہٹ کی ایک ہلکی [illegible] وہ [illegible] ایک وحشی بھوکا درندہ تھا۔ جو اُس کی عصمت [illegible] سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ چلاتی ہوئی کمرے [illegible]

[illegible] سے اُوپر پھیلا آسمان پڑی تھی۔ اُس کی نظر دُور [illegible] کے [illegible] اور ٹیلی فون کے تاروں کا ایک جال [illegible] ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے۔

[illegible] گھر پھر لوٹ کر نہیں گئی تھی۔ اُس کی ماں نے اُسے [illegible] کئی بار بلا بھیجا۔ اُن سے اپنی لڑکی کی حماقت کے لئے معافی [illegible] نمو کو ساتھ لے جانے کے لئے کہا۔ لیکن نمو نے ہمیشہ انکار کر [illegible] تھا۔ اُن کے سامنے تک آنے کے لئے بھی کبھی تیار نہ ہوئی۔ اُس نے [illegible] کو اپنا آخری فیصلہ کئی بار سُنایا تھا۔ اُس کی ماں دو ہتڑ مار مار کر ہمیشہ اپنا [illegible] سر پیٹ لیتی تھی۔ جب بیٹا، بیٹی اور گوپال تینوں دیوار بن کر کھڑے ہو [illegible] تے تو وہ کر ہی کیا سکتی تھی؟ اُسے گوپال تو بالکل اچھا نہیں لگتا تھا۔ [illegible] وہ اُسے ساری شرارت کی جڑ سمجھتی تھی۔ کیونکہ مدھوک اور نمو اُسی کے [illegible] کہنے پر چلتے تھے۔ ہر وقت اُس کے پاس گھسے رہتے تھے۔ پتہ نہیں کیا [illegible] کرتے رہتے تھے۔

ایک چوراہے پر سارا ٹریفک رُک گیا۔ کتنی ساری بسیں، موٹریں اور تانگے اور ٹرک تھے۔ نمو نے بڑی بے چینی سے پہلو بدلا۔ لیکن اُس نے سر نہیں گھمایا۔ اُن کی طرف کنکھیوں سے دیکھا۔ پھر اُسی طرح باہر دیکھتی رہی۔ دکانوں اور بسوں کی چھتوں پر سے اُس کی نگاہ پھسلتی رہی۔ پُرانے ناکارہ اشتہاروں کی کئی تہوں پر سے بھی جو فٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ دُور تک سجا کر لگائی گئی تھیں اُس کی نظر کے سامنے ماں کا وہ لال بھبھوکا چہرہ گھومنے لگا۔ جس دن اُسے گوپال اور اُس کے در پردہ تعلقات کا علم ہوا۔ اُس نے اپنے بال نوچ ڈالے۔ پیٹ پیٹ کر اپنے رُخسار سُوجا لئے۔ گوپال کو اُسی دم کمرہ کمرے سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ گوپال اور مدھوک دونوں اُسے سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ باہر گلی میں اُس کے بند دروازے کے سامنے کتنے ہی لوگ جمع ہو گئے تھے۔ گوپال اور مدھوک کسی لمحے گرفتار کئے جا سکتے تھے وہ اپنے کمرے میں پلنگ پر منہ چھپائے بلک بلک کر رو رہی تھی۔ اُس کی ماں کیوں نہیں سمجھتی کہ گوپال کا اِس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ اس میں کسی کا قصور نہیں ہے!

نمو نے اچانک دیکھا لوگ وہیں اُترنے لگے تھے۔ بہت سے اُتر بھی گئے تھے۔ آگے جلدی راستے کا کوئی امکان نہ تھا۔ اُس نے بھی اُترنے کا ارادہ کر لیا۔ یہاں سے وہ پیدل [illegible] تک پیدل چل سکتی تھی۔ صرف چند منٹ کا فاصلہ تھا۔ وہاں پہنچ کر [illegible] بس مل سکتی تھی۔ اُس نے بڑی بے چینی سے اُنھیں اِدھر اُدھر تلاش کیا۔ پھر یہ دیکھ کر اُسے اطمینان ہوا کہ وہ دونوں اُس سے پہلے ہی اُتر چکے تھے۔ بس سے اُتر کر اُس نے فٹ پاتھ تک پہنچنے کے لئے راستہ تلاش کیا۔ کاریں اور بسیں اور ٹرک ایک دوسرے کے پیچھے ایک لمبی دیوار کی طرح سجے ہوئے تھے۔ وہ اُن سب کے بیچ کی راہ سے فٹ پاتھ پر پہنچی تو وہ دونوں پھر دکھائی دے گئے۔ اُس کے قدم رُک گئے۔ حکم چند کے چہرے پر سیاہ چمکتی ہوئی مونچھیں بہت نمایاں تھیں۔ اِتنی نمایاں کہ اُس کا باقی چہرہ خود اپنی ہی مونچھوں سے ہراساں نظر آتا تھا۔ سر پر چمکتے ہوئے، سنورتے ہوئے سیاہ بال۔ جسم پر کالر والی کھُلی کھُلی سفید بوسکی کی قمیص۔ واسکٹ، اور لمبی ٹانگوں سے چپکا ہوا پاجامہ۔ لیکن ایک قصباتی دوکاندار کی مکمل شخصیت کی سی خود غرضی۔ سختی۔ مکاری اور متانت لئے ہوئے۔

اُس نے منہ پھیر کر اُس کے باپ کو دیکھا۔ بڑا سا پگڑ باندھے۔ سفید گھنی و بے ترتیب مونچھیں۔ اور بڑھی ہوئی حجامت۔ دونوں کا ناک نقشہ ایک سا تھا۔ رنگ، رُوپ، قد اور پہناوا تک!

اُسے راستہ پانے کے لئے صرف چند ہی لمحے رُکنا پڑا۔ اِسی دوران میں اُس کے کانوں میں وسنت نگر کا نام سُنائی پڑ گیا۔ وہ تانگے والے سے وہاں تک جانے کا بھاڑا طے کر رہے تھے۔

اُس کا خون پھر کھول اُٹھا۔ سمجھ گئی، اُنھیں ماں نے پھر بُلایا ہے۔

وہ مدھوک اور گوپال کی غیر موجودگی میں اُسے سسرال بھیجنا چاہتی ہے۔

اُس نے بڑی کوشش سے اپنے اندر کا طوفان روکا۔

بڑے ضبط اور توازن سے چلتی ہوئی اُن کے سامنے گئی۔

نہ سر جھکایا نہ سر ڈھانپا۔

رُک رُک کر مگر مضبوطی سے بولی۔

"آپ لوگ پھر آگئے۔ لیکن میں آپ کو بتا دوں، آپ میری ماں کے کہنے میں نہ آئیے میں آپ کے ساتھ کبھی نہیں جاؤں گی۔ کبھی نہیں۔ بہتر ہوگا آپ یہیں سے لوٹ جائیے۔"

یہ کہتے کہتے اُس کے اندر سے جو آنسو اُمڈ آئے تھے اُسنے اُنھیں پلکوں ہی پر روک لیا۔

لیکن وہ دونوں نمّو کی طرف بڑی حیرانی سے دیکھنے لگے۔ جیسے اُسے پہچان نہ رہے ہوں۔

پھر حکم چند کے باپ کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ آگئی۔

اُس نے اپنے بیٹے سے کہا،

"لے سُن پُتّر! راج کرنی کی بیٹی یہ سمجھ رہی ہے ہم اُس کی ماں کے بُلانے پر یہاں آتے ہیں۔ اِسے بتا دے ہم کسی دوسرے کے اِس لڑکی دیکھنے جا رہے ہیں!"

نمّو نے سُنا تو وہ پلکوں پر رُکے ہوئے آنسو نہ روک سکی لیکن اُس نے فوراً چہرہ گھما لیا۔

اور جلدی جلدی لڑکھڑاتی ہوئی ایک طرف چل پڑی۔

کیوپڈ

سلام مچھلی شہری

تم اپنے دور سے پہلے کے مہ پاروں سے یہ کہنا
"وہ شاعر کون تھا جس کے ترانے اب بھی زندہ ہیں

ہماری جلوہ گاہوں میں ہماری خوابگاہوں میں
یہ کس شہزادۂ دل کے فسانے اب بھی زندہ ہیں

بڑی حیرت ہے ہم تازہ نگارانِ گلستاں میں
اسی کے تیر کے رنگیں نشانے اب بھی زندہ ہیں

ارادہ ہے کسی سے مل کے اس کی زندگی پوچھیں
اسی سے ملتے جلتے کچھ دوانے اب بھی زندہ ہیں"

تمہارے کاروانِ رنگ و بو کی تیز رفتاری
مجھے معلوم ہے تم کو پریشاں کرتی رہتی ہے

تمہاری "صنعت کی تقدیس" تم کو نور دیتی ہے
مگر "تہذیب" منزل سے گریزاں کرتی رہتی ہے

تم آئینے پہ چھا جاتی ہو لیکن میں سمجھتا ہوں
نگاہِ آئینہ خود تم کو حیراں کرتی رہتی ہے

تمہاری ہر سجاوٹ، ہر نمائش، ہر طرب کوشی
تمہیں کچھ اور عریاں، اور عریاں کرتی رہتی ہے

میں تم سے دور اک بے نور میخانے میں بیٹھا ہوں
مگر تم مجھ کو اپنے آئینہ خانوں میں پاؤ گی

"مغرب" کے تیز برقی قمقمے جب مضمحل ہوں گے
تو میری لوریاں اپنے شبستانوں میں پاؤ گی

حقیقت سیم و زر کی جب تمہیں افسردہ کر دے گی
تو پیغامِ سکوں میرے ہی افسانوں میں پاؤ گی

تم اس سائنس کی دنیا کی چنچل برق پارہ ہو
مگر تسکیں بھی مجھ ایسے ہی دیوانوں میں پاؤ گی

شعورِ حسن، آدابِ لب و رخسار بخشا ہے
وہ میں ہوں، جس نے مہ پاروں کو اک معیار بخشا ہے

سلام مچھلی شہری

افسانہ

امباولی

پروفیسر ش اختر ایم۔اے

ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ آف اُردو، ڈورنڈا کالج۔ رانچی

۱۹ مارچ ۱۹۶۲ء

خوشتر بھائی!

بہت دنوں بعد آپ کی تحریر ملی تھی۔ آپ کی مصروفیت اپنی جگہ بجا اور درست ہے لیکن اِس مصروفیت پہ اُن تمام لوگوں کا حق ہے جنہیں آپ عزیز ہیں۔ دہلی میں رہ کر آپ سے نہ مل سکا۔ اِس کا قلق ہے۔ لمحہ بھر کی ہلکی سی فون کی گفتگو نے ملاقات کا اشتیاق بڑھا دیا تھا۔ لیکن مصروفیت ایسی تھی کہ دوسرے دن لوٹ جانا پڑا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے یہ بات آپ کو بُری لگی۔ اور آپ نے آج تک اپنے اِس دُکھی اور دُور اُفتادہ بھائی کو معاف نہیں کیا۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو تجدیدِ رسمِ وفا کے لئے میں حاضر ہوں۔ اور تنہا نہیں، بلکہ اپنی طویل غیر حاضری کی تلافی کے لئے ایک کہانی کے ساتھ .... آج سے بہت پہلے گوتم بُدھ ویشال آئے تھے اور ویشال کا تمام علاقہ انبہ پالی کے نام سے بھی موسوم ہے۔ ایک دیہاتی لڑکی کی وہاں اُن سے ملاقات ہوئی تھی۔ حقیقت کی جستجو میں کھوئے رہنے والے اُس عظیم انسان کے قدموں میں لغزش ہوئی اور وہ امباولی سے ایک ایسا وعدہ کر گیا جو ایفا نہ ہو سکا..... میری اِس کہانی امباولی کا پس منظر یہی ہے۔ لوک کتھا کو بنیاد بنا کر یہ کہانی لکھی گئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں قارئینِ "بیسویں صدی" اِسے پسند کریں گے آپ کے پاس "بیسویں صدی" کے پرانے فائل ضرور ہوں گے۔ میری کہانیوں کے تراشے بھجوا دیں تو عین نوازش ہوگی۔ مجھے اُن کی بہت ضرورت ہے۔ ویسے بھی آپ کی وساطت سے میرے پڑھنے والے بھیج دیں تو میں اُن کا ممنون رہوں گا....

آپ کا ــــــ ش

آم کے گھنے درختوں کے بیچوں بیچ ایک خوشنما سے تالاب کا پانی صندلی ہو گیا تھا۔ سارا گاؤں باغ میں سمٹ آیا تھا۔ کنواری لڑکیوں کی ایک ٹکڑی ہری ہری سایہ دار درختوں کے نیچے نیم دراز تھی۔ اور گاؤں کے بڑے بوڑھوں میں سرگوشیاں ہو رہی تھیں۔

"ہر سال کی طرح اِس سال بھی امباولی اپنے بڑوں کی عزت برقرار رکھے گی"

چاند کی روشنی پورے باغ میں پھیلی ہوئی تھی۔ ہلکی ہلکی موسیقی کی آواز اُبھر رہی تھی اور گاؤں والوں کی آنکھیں امباولی پر جمی تھیں جو اپنی صندل بدن سہیلیوں کے ساتھ تالاب کی سطح پر رقص کر رہی تھی۔ یوں تو ہر سال جب آم کی فصل ختم ہو جاتی اور انبہ پالی میں آموں کا میلہ لگتا تو گاؤں کے سب سے خوبصورت باغ میں تالاب کی صفائی ہوتی۔ اُس کے چاروں طرف شمعیں روشن کی جاتیں۔ بانسری سے پُر درد نغمہ نکلتا اور گیروا لباس

...ں نیم برہنہ نوجوان لڑکیاں [illegible] تالاب کے کنول کی طرح اپنی ...لیں کھول دیتیں اور پھر قدیم روایتوں کے مطابق تالاب کی سطح پر رقص ...روع ہو جاتا۔ کوئی دو ہزار برس سے اِس گاؤں میں لڑکیوں کی شادی اِسی ...مل کے بعد ہی ہوا کرتی تھی۔ جو لڑکی سورج کے طلوع اور غروب ہونے ...ے منظر کو رقص میں پیش کرتی اور آدھی رات تک بانسری کی اُبھرتی ہوئی ...واز کے ساتھ رقص کرتی رہتی، اُسے اپنی پسند سے شادی کرنے کی اجازت ...دی جاتی تھی۔

گزشتہ تین برسوں سے امباولی اِس مقابلے میں اوّل آ رہی تھی۔ ہر سال میلہ لگتا۔ باغ میں سارا گاؤں سمٹ آتا۔ پیڑ پودوں کی خاص جگہیں سجائی جاتیں۔ نیم برہنہ لڑکیاں گیلے لباس میں جل پری بن کر اُبھرتیں اور ساری چاندنی میں یہ چھوٹا سا گاؤں جسے انبہ پال کہتے ہیں ڈوب جاتا لیکن پچھلے تین برسوں سے اِس گاؤں میں کوئی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اِس لئے کہ امباولی نہ خود شادی کر رہی تھی اور نہ اِس مقابلے سے پیچھے ہٹ رہی تھی۔ بات صرف اِتنی تھی کہ اُس چھوٹے سے گاؤں میں اُس کے خوابوں کا کوئی شہزادہ نہ تھا۔ اکثر سہیلیاں اُسے طعنہ بھی دیا کرتیں۔ لیکن وہ مسکراتی ہوئی پانی کا گاگر اُٹھائے آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی۔ امباولی کا نام ایلی تھا۔ لیکن مقابلے میں اوّل آنے کے بعد اُسے حسبِ روایت امباولی کا خطاب مل گیا تھا۔ یہ سچ ہے کہ اُس کے جسم سے مالدہ آم کی خوشبو آتی تھی۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ انبہ پال میں اُس جیسی بہادر، بے باک اور صندل بدن کوئی اور رقاصہ نہ تھی۔ خوابوں اور خیالوں میں کھوئی رہنے والی اُس لڑکی کی ہر حرکت عجیب و غریب ہوتی۔ اُس نے زیادہ تعلیم حاصل نہ کی تھی۔ لیکن قصّے کہانیوں کی تمام کتابیں ختم کر چکی تھی۔ دُنیا کی سب مشہور لوک کتھاؤں کو یاد کر چکی تھی۔ دیوتاؤں سے اُس کی دلچسپی بہت زیادہ تھی۔ گرمیوں کی دوپہر میں اکثر اپنی جھونپڑی میں سینے کے بل لیٹی لیٹی وہ اُن لمحوں کو پکارا کرتی جو اب تک اُس کی زندگی میں نہیں آئے تھے۔ وہ لمحے جو اُس کی لانبی پلکوں پہ خاموشی سے آتے اور غائب ہو جاتے۔ پھر کوئی سہیلی دھیرے سے اُس کی کوٹھری میں داخل ہوتی اور اپنی نرم اُنگلیاں اُس کی پلکوں پر رکھ دیتی تو امباولی [illegible] جاتی اور بولتی۔

"ارے دیکھو! تُو اپنی شہزادی کو لینے اب تک کیوں نہیں آیا تھا؟"

اور پھر ایک بلند قہقہہ کوٹھری میں گونج اُٹھتا۔

امباولی کی ماں اُس سے پریشان تھی۔ اُس کی خواہش تھی کہ امباولی کی شادی جلد ہو جاتی۔ لیکن گاؤں کی پُرانی روایت کے خلاف قدم اُٹھانے کی اُس میں ہمت نہ تھی۔ لیکن اِس سال جب اُس کی ماں نے روتی ہوئی آواز میں سمجھایا تو امباولی صرف یہ کہہ کر خاموش ہو گئی۔

"آنے والی فصل کا انتظار کرو ماں! اگر اِس سال بھی مجھے کوئی پسند نہ آیا تو میں انبہ پال چھوڑ دوں گی اور جوگن بن جاؤں گی۔"

اور وہ سال آ گیا تھا۔

آموں کی فصل بھی آ گئی تھی۔

اور میلے میں اب صرف چند ہی دن باقی تھے۔ امباولی کی ماں بہت دُکھی تھی۔ اور وہ اپنی پگلی لڑکی کی منفرد طبیعت سے خوب اچھی طرح واقف تھی۔ اِس لئے وہ اُس کی تنہائی میں کبھی دخل انداز نہ ہوتی تھی۔ آج بھی امباولی اپنی چھوٹی سی کوٹھری میں چٹائی پر تکیے کے بل لیٹی ایک اَن دیکھی دُنیا میں غرق تھی کہ ایک ہلکی سی چاپ سُنائی دی۔ امباولی ویسے ہی لیٹی رہی۔ یہ وقت اُس کی سہیلی چمپا کے آنے کا تھا۔ چمپا بہت دھیرے پُراسرار لمحوں کی طرح آتی۔ اور اُس کی نیم خوابیدہ پلکوں پر اپنی زرد اُنگلیاں رکھ دیتی۔

اور امباولی حسبِ دستور پوچھتی۔

"ارے اجنبی! تُو اپنی شہزادی کو لینے اب تک کیوں نہیں آیا تھا؟"

لیکن آج امباولی نے کسی آنے والے کی بات نہ کی۔ کسی سپنے کے ہیرو کا بھی ذکر نہ کیا۔ بلکہ نہایت ہی غیر متوقع طور پر اُس کی زبان میں ہلکی سی لرزش ہوئی اور دھیرے سے بولی۔

"چمپا! اب یہ کھیل بند کر۔ میں اِس طرح کب تک اپنے آپ کو فریب دیتی رہوں گی۔ میں اِس دُنیا میں اکیلی آئی ہوں اور شاید اکیلی [illegible]

دھیرے دھیرے آہستہ تھم گئی تھی۔ امباولی نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اُس کے رُخساروں پر آنسوؤں کے دو موٹے قطرے ڈھلک آتے تھے۔

"گوتم مہاراج! اب کے میں امباولی نہیں ہوں گی۔ میں جل پری کا ناچ نہیں ناچوں گی۔"

جھوٹی سی اس کوٹھری میں ایک رُوح بول رہی تھی۔ اور دوسری خاموش تھی۔ وہ صرف حیرت سے ہاتھ باندھے سینے کے بل لیٹی ہوئی امباولی کو تک رہی تھی۔

جب کوئی جواب نہ ملا تو امباولی چونکی۔ اُس نے دھیرے سے اپنی گردن اوپر اٹھائی۔ اُس کی آنکھیں سُرخ تھیں، ایک لمحہ تک اُسکی آنکھوں میں آنسوؤں کا دھندلاپن چھایا رہا۔ پھر یکایک گھبرا کر وہ اُٹھ بیٹھی۔

"تم ——— !"

اُس کی لال آنکھوں میں تعجب اور غصہ تھا۔

"تم کون ہو؟"

چھریرے بدن کا لمبا خوش رُو اور اُلجھے اُلجھے بالوں والا ایک اجنبی ذرا بھی نہ گھبرایا۔ اُس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ اُبھری۔ اور وہ بہت سنجیدہ آواز میں بولا۔

"میں گوتم ہوں!"

"گوتم ——— ؟" امباولی بڑبڑائی۔

"ہاں! میں انبہ پالی آج پہلی بار آیا ہوں۔"

"غلط، بالکل غلط! تم پہلی بار نہیں آئے ہو۔ تم یہاں بہت پہلے بھی آئے تھے۔ تم نے کسی امباولی سے ایک وعدہ کیا تھا، لیکن وہ وعدہ آج تک پورا نہ ہوا اور وہ اب بھی تمھاری راہ دیکھ رہی ہے!" امباولی کا ذہن بہت پُرانی گپھاؤں میں اپنا ماضی تلاش کر رہا تھا۔

"کیا کہا ... تم نے ... میں پہلے بھی آیا تھا؟"

گوتم نے ششدر ہو کر پوچھا۔

امباولی چونکی۔ وہ خیالی دُنیا سے لوٹ چکی تھی۔

"اوں ہوں! " وہ سٹپٹا گئی۔ لیکن تھی بہت مغرور اور ضدی!

"لیکن تم یہاں آئے کیسے ... میری اجازت کے بغیر؟"

"دیوی اور دیوتاؤں کے یہاں جانے کے لئے اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی۔" وہ مُسکرایا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ مجھے ماں جی نے بتایا کہ اس کوٹھڑی میں ایک جوگن رہتی ہے۔ اور مجھے جن لوک گیتوں کی ضرورت ہے وہ اس جوگن کے سینے میں قید ہیں۔"

امباولی پریشان ہو گئی تھی۔ اب تک اس طرح کا کوئی واقعہ اُس کی زندگی میں پیش نہیں آیا تھا۔ اُس نے ایک بار اپنے آپ کا جائزہ لیا۔ وہ نیم برہنہ تھی اُس کی صندلی بانہیں کھلی تھیں۔ اور بدن پر صرف ایک ساڑی چپکی تھی ایک انجانے احساس کے تحت وہ کانپ گئی۔

"گھبراؤ نہیں! میں کل ہی چلا جاؤں گا۔ گاؤں گاؤں گیت جمع کرتا ہوا یہاں بھی نکلا، تمھارے گاؤں میں۔ لیکن اب میرا یہ کام کچھ دنوں کے لئے ادھورا رہے گا کیونکہ اس وقت میری دھرتی نے مجھے آواز دی ہے!"

"لیکن تم کون ہو؟"

"اہنسا کا پجاری گوتم!"

"گوتم؟" امباولی نے آنکھیں بند کر لیں۔

آنکھیں بند کرنے کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ وہ کچھ سوچنے لگی ہے۔

اُس کی یہ عادت بہت پُرانی تھی۔

پھر ایک لمحہ بعد اُس کے لبوں پر ایک نام اُبھرا۔

"گوتم ——— !"

"تم نے مجھے آواز دی؟" نوجوان گوتم نے چونک کر پوچھا۔

اب امباولی کا خواب ٹوٹ گیا تھا۔ اور وہ ہرن کی طرح دوڑتی ہوئی کوٹھری سے باہر نکل گئی۔

"تم گوتم ہو!؟ میرے خوابوں کے گوتم! جس نے پہلے بھی اس دھرتی کی مٹی کو چوما تھا۔ تم پہلے بھی ایک ویران زندگی میں بہار لائے تھے لیکن وہ عارضی تھی۔ تم راتوں رات آم کے باغ سے بھاگ نکلے تھے۔ تم نے

بیرشتوں میں ایک امباولی کو چھپا دیا تھا۔ لیکن اب تم نہیں جاسکتے۔
کا تالاب صاف ہوگیا ہے۔ درختوں میں جھولے پڑ گئے ہیں۔ شمعیں
روشن کی گئی ہیں۔ اور میں ناچوں گی۔ اپنی پلکوں پر تمھاری شکل کی پرچھائیں
لیے۔ اور پھر انبہ پالی میں بہار آجائے گی۔ تین برسوں سے انبہ پالی
ہوگیا تھا۔ کوئی شادی نہ ہوئی تھی۔ اب میں تمھارے ساتھ مل کر ایک
بساؤں گی۔ یہ دنیا میرے خوابوں سے زیادہ اچھی ہوگی۔"

امباولی کچھ دنوں سے یہی سب سوچ رہی تھی۔ گوتم بہت خوش
اس نے بہت سارے گاؤں دیکھے تھے۔ لیکن اس نے ایسی پگلی
دیکھی تھی۔ چلتی پھرتی خوابوں والی امباولی!

گوتم خلافِ توقع انبہ پالی میں ایک دو دن کے لئے آیا تھا لیکن
دس دن ہوگئے تھے۔ اس نے یہاں رہ کر کئی بہترین کہانیاں لکھی تھیں
کہانیاں جو وہ بہت دنوں سے نہیں لکھ پایا تھا۔ گوتم نے یہ کہانیاں
امباولی کو سنائی تھیں۔ اِن دس دنوں میں امباولی گوتم کے بہت قریب
تھی۔

ایک دن اس نے پوچھا۔
"گوتم! میں تمھیں کیسی لگتی ہوں!؟"
"اچھی...."
"بس صرف اچھی؟"
یہ سن کر گوتم ہنس پڑا تھا۔ گوتم نے سمجھا تھا مذاق کر رہی ہے۔
بڑھ گئی تھی۔
"گوتم ——!"
امباولی نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ایک لمحہ رک کر پھر بولی۔
"—— میں تم سے شادی کروں گی!"
"اوں —— !؟"
وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔
کئی منٹ تک اس پر سکتہ طاری رہا۔
"کیوں، تم چپ ہوگئے۔ کیا تمھاری شادی ہوگئی ہے؟"

"نہیں امباولی۔"
"پھر میں تمھیں اچھی نہیں لگتی؟"
"یہ بات بھی نہیں۔"
"تو پھر تمھیں کیا اعتراض ہے؟"

اِس کے بعد امباولی نے ناگاؤں کی ریت، اپنی محبت اور ویران زندگی کی کہانی سنائی۔ گوتم مجبور ہوگیا۔ اس کی باہوں میں انبہ پالی کی تمام روح چھپ گئی تھی۔ لیکن اِس کے بعد کے لمحے گوتم کے لئے پریشان کن تھے۔

آج شام ایک بار پھر سارا گاؤں باغ میں سمٹ آیا تھا۔ ہلکی ہلکی سی چاندنی میں تالاب کا پانی ہلکوریں لے رہا تھا۔ شمعیں روشن کی جا چکی تھیں۔ پروہت اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے تھے۔ نیم برہنہ لڑکیوں کی ٹولیاں درختوں میں جھولا جھول رہی تھیں۔ بانسری کا پُر درد نغمہ پھوٹ رہا تھا۔ اور چاند کی نرم روشنی میں درختوں کے بیچوں بیچ ایک خوب صورت سے تالاب کا پانی صندلی ہوگیا تھا۔

لیکن گوتم اداس تھا۔

وہ دیر تک امباولی کا رقص دیکھتا رہا۔ لیکن اس کی روح کانپ رہی تھی۔ پروہتوں کا خیال تھا کہ ہزاروں برسوں کے بعد کسی امباولی نے ایسا رقص کیا ہے۔ ایسا ناچ انبہ پالی میں صرف ایک بار اور ہوا تھا اور وہ اس وقت جب گوتم زندگی کا راز پانے اِس طرف آنکلے تھے اور اُن کی ملاقات ایک امباولی سے ہوئی تھی۔ جسے راتوں رات چھوڑ کر گوتم بھاگ نکلے تھے۔ اور امباولی تنہا رہ گئی تھی۔

گوتم نے گاؤں کی یہ کہانی سنی تھی۔ اِس لئے آج اُسے بھی اپنا وعدہ ٹوٹتا دکھائی دیا۔ بھاگ کر وہ امباولی کے کمرے میں آچھپا۔ آدھی رات کے بعد جب پروہتوں نے اپنا فیصلہ سنا دیا تو امباولی اپنی کامیابی کی خوشی میں دوڑتی ہوئی اپنی کوٹھری میں آگئی۔ گوتم اداس تھا۔ اس کی آنکھوں میں درد کے بے پناہ آنسو تھے۔ امباولی کی سانسیں پھول گئی تھیں۔ آتے ہی وہ گوتم کی گردن میں جھول گئی۔ گوتم کی آنکھیں امباولی کے بدن کی خوشبو

منہ ڈھکے تھیں۔

"تم بڑے بزدل ہو۔ مجھے اکیلا ہی چھوڑ کر بھاگ آئے!؟"

گوتم کچھ نہ بولا۔

وہ اپنا چہرہ امباولی کے سیاہ بالوں میں چھپائے تھا۔ امباولی اُس کے سینے سے لگی کھوئی کھوئی سی تھی۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

وہ دھیرے سے بولی۔

"کچھ نہیں" گوتم کی آواز میں درد تھا۔

"کل ہماری شادی ہوگی۔ پروہتوں نے اعلان کر دیا ہے" جانتے ہو تین برسوں کے بعد انبہ پال میں یہ شادی ہوگی۔ اگر تم میری زندگی میں نہ آتے تو مجھے اپنی یہ دھرتی چھوڑ دینی پڑتی گوتم! اور ہمالہ کی برفیلی وادیوں میں جیون بتانا پڑتا۔ لیکن آج میں بہت خوش ہوں!"

گوتم کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو قطرے نکلے اور امباولی کے رخساروں پر آگرے۔

"تم رو رہے ہو؟"

"ہاں امباولی! یہ شادی کل نہیں ہو پائے گی" گوتم کی آواز رندھی ہوئی تھی۔

وہ چونک پڑی۔

"گوتم ——!"

"ہاں امباولی! میں راتوں رات چلا جاؤں گا تمھاری نظروں سے بہت دُور"

"لیکن کیوں؟"

اُس کی آواز میں لرزش تھی۔

"میں نے تم سے کہا تھا کہ میری دھرتی نے مجھے آواز دی ہے۔ میں اہنسا کا پجاری ہوں۔ امباولی! اِس سمے میری ضرورت ہے۔ ایک بار پہلے بھی گوتم نے ہمارے سکھ کے لئے قربانی دی تھی، اپنی جان کی قربانی! میں بھی اُسی دھرتی کا ایک گوتم ہوں۔ امباولی! آج میرے دیش کی آنکھیں بھی میری طرف ہیں۔ میں بہت مجبور ہوں۔ میں برف کی آنچل اور خوب صورت وادیوں میں خون کے گلاب کھلنے نہیں دوں گا"

امباولی کی آنکھوں میں جمی ہوئی جھیل بہہ نکلی۔

"تم گھبراؤ نہیں امباولی! میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تو ایک مرتبہ انبہ پال تمھیں لینے ضرور آؤں گا!

آنکھیں

دکھا کے مد بھری آنکھیں کہا یہ ساقی نے
حرام کہتے ہیں جس کو وہ یہ شراب نہیں — حفیظ اللہ عزمی

خدا بچائے تری مست مست آنکھوں سے
فرشتہ ہو تو بہک جائے۔ آدمی کیا ہے — خمارؔ بارہ بنکوی

زمانہ آنکھ سے مجھ کو گرا کے بھول گیا
اک اشک تھا میں زمانے کی چشم تر کے لئے — بسمل سعیدی

میری آنکھیں بھی ہیں حیراں مرا دل بھی خالی
چند آنسو بھی نہیں خود پہ بہانے کے لئے — مخمور سعیدی

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا
جب آنکھ کھُلی دیکھا اپنا ہی گریباں تھا — اصغر گونڈوی

تم میرا انتظار کرنا" گوتم نے امباولی کو دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

امباولی اب چُپ ہو گئی تھی۔

اُس کی آنکھوں کے آنسو خشک ہو گئے تھے۔ اُن میں ایک پُرہول خاموشی اور ویرانی سما گئی تھی۔

وہ دھیرے دھیرے کوٹھری سے نکلی۔ اور باغ کی طرف چل پڑی گوتم بھی پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ اچانک ایک درخت کے پاس امباولی

"میں جا رہا ہوں امباولی! تم میرا انتظار کرنا۔"
امباولی نے زمین سے ایک مٹھی مٹی اٹھائی۔ اور گوتم کی پیشانی پر افشاں کی طرح لگا دی اور پُر وقار لہجے میں بولی۔
"بھگوان تمھاری رکشا پوری کریں۔"
ایک لمحہ بعد گوتم باغ سے سڑک پر آچکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ستارے جھلملا رہے تھے۔ وہ مڑ مڑ کر امباولی کو دیکھتا رہا۔ اور جب گوتم امباولی کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تو اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ اپنے خیالی اور خوابوں کے ہیرو کی تلاش میں دوڑتی ہوئی آج پھر خاموش خاموش، جھکی جھکی سی، اداس اور ایک ستارے کی طرح لرزاں ہے!

مضمون نگار حضرات سے

درخواست ہے کہ مضمون حاشیہ چھوڑ کر خوشخط لکھا کریں۔ اور سطور کے درمیان کافی جگہ چھوڑا کریں۔ بعض اچھے مضامین محض بدخط ہونے کی وجہ سے چھپنے رہ جاتے ہیں۔ ہمیشہ غیر مطبوعہ مضامین بھیجیں اور ایڈیٹر کی اطلاع کے لئے مضمون کے خاتمے پر غیر مطبوعہ لکھیں۔ بعض مضمون نگار مطبوعہ مضامین بھیج دیتے ہیں۔ یہ نہایت نامناسب اور غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے۔ اپنے پاس اپنے مضامین کی نقل ضرور رکھیں۔ کیونکہ ناقابلِ اشاعت مضامین ضائع کر دیئے جاتے ہیں۔ مضمون کے خاتمے پر اپنا پورا پتہ لکھ دیا کریں۔ نو آموز حضرات مضامین بھیجنے سے پہلے کسی اُستاد سے مشورہ لے لیا کریں۔ اگر وہ چاہیں کہ مرسلہ مضامین ناقابلِ اشاعت ہونے کی صورت میں انھیں واپس کر دیئے جائیں تو مضمون کے ساتھ ٹکٹ بھیجنے کی بجائے اپنا پورا پتہ لکھا ہوا پوسٹ آفس کا لفافہ ارسال فرمائیں۔ ورنہ ہم مضمون کی واپسی سے قاصر رہیں گے۔ (ایڈیٹر)

دو غزلیں

جگن ناتھ آزاد ایم اے

بہارِ گلشنِ افرنگ لاجواب سہی | جو پہلگام میں ہے اُس چمن کی بات نہیں
بہت حسیں ہے نظارا ترا مگر اے ٹیمز | ترے نظارے میں گنگ و جمن کی بات نہیں
پھرا ہوں مشرق و مغرب میں چار سُو لیکن | کسی دیار میں اپنے وطن کی بات نہیں
بُرا نہ مانے جو حسنِ فرنگ تو کہہ دوں | کہ اِس دیار میں حسنِ دکن کی بات نہیں

خود اپنے ذوقِ اسیری کی بات ہے آزادؔ
کسی کی زُلفِ شکن در شکن کی بات نہیں

خطا معاف جو بہکا ہوں میں کہ تیرے حضور | اگرچہ ہوش کا دعوے مجھے تھا ہوش نہ تھا
سمجھ لیا مرا دیوانہ پن جسے تم نے | کمالِ ضبط تھا میرا جنوں کا جوش نہ تھا
جو دل میں شور تھا آ کر زباں پہ نغمہ بنا | کہ میرا ذوق کبھی قائلِ خروش نہ تھا
ہزار رنگ سے اُس نے سُنائی دل کی حدیث | خموش رہ کے بھی میرا جنوں خموش نہ تھا

جو پوچھے تو بباطن فقیر تھا آزادؔ
یہ اور بات ہے ظاہر میں خرقہ پوش نہ تھا

افسانہ

ستی ساوتری

وہاب اشرفی ایم۔اے

پھلواڑی سبزی باغ۔ پٹنہ ۴

۲۰ مارچ ۱۹۶۳ء

مکرمی و محترمی! اسلام عقیدت

مزاجِ گرامی! میری کہانیاں "آخری لاش" اور "بیسویں قلوپطرہ" بے حد پسند کی گئیں۔ "آخری لاش" کے بارے میں مجھے بہت سے خطوط کویت سے ملے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ "بیسویں صدی" ایک بین الاقوامی رسالہ ہے اور اس کے پڑھنے والے دُنیا کے گوشے گوشے میں ہیں۔ یہ اُردو کے حق میں بہت حوصلہ افزا بات ہے۔ . . "ستی ساوتری" افسانہ نمبر میں آجائے تو مجھے مسرت ہوگی۔ ویسے میں بھی انتخابات کے معاملے میں "رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند" کے موقف کا قائل ہوں۔ یہ کہانی شاید الٹرا موڈرن عورتوں کو کچھ مکدر کر دے لیکن میرے احساسات حقیقی اور ایماندارانہ ہیں۔ خواہ مخواہ کا طنز مقصود نہیں۔ . . . "بیسویں صدی" مارچ ۱۹۶۳ء میں آمنہ ابوالحسن صاحبہ نے "بزدل" لکھ کر بہتوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔ آپ نے ایسی پیاری کہانی چھاپی ہے۔ اس لئے آپ بھی مبارک باد کے مستحق ہیں۔ . .

احقر ——— وہاب اشرفی

میرے سامنے ایک مختصر سا خط ہے، لیکن اس اختصار میں کیسا سیلاب ہے کہ مجھے بہائے لئے جاتا ہے۔ بہت تیز رفتار سے، بہت دُور۔ اس باڑھ کے پانی میں عجیب خوشبو ہے۔ محبت کی خوشبو ہے۔ خلوص کی گرمی ہے۔ سانسوں کی مدہوش کن آنچ ہے۔ تو یہ مختصر تحریر کیا نہیں ہے میرے لئے۔ یہ الفاظ جن میں شہد کی مٹھاس ہے، کبھی مجھے کڑوے لگتے تھے، بے حد کڑوے! لیکن یہ کیسا انقلاب ہے کہ تلخی شیرینی بن گئی ہے۔ وجہِ پریشانی باعثِ راحت ہے۔

"آپ چلے گئے، لیکن آپ کی یاد نہ جا سکی۔ وہ میرے لئے زندہ رہی دل میں مقفل رہی۔ بڑی قیمتی امانت کی طرح، بلکہ زندگی کی طرح! ہر خزاں بہار کا پیغام بن کر آئی۔ اور فریب دے کر چلی گئی۔ لیکن فریبِ مسلسل بھی اُمید کو گھائل نہ کر سکا۔ اور میں جیت گئی۔ زنے نہ میں مر جاؤں تو کیا کروں کہ آپ آ رہے ہیں۔ ایسی مسرت میں کیسے سنبھال سکوں گی میرے سرتاج!؟"

ہاں! یہ روحی انور لکھ رہی ہے۔ پہلے بھی بہت کچھ لکھ چکی ہے۔ آج میں کتنا بدل گیا ہوں، بالکل بدل گیا ہوں۔ پہلے ایسے خطوط بے حد عامیانہ معلوم ہوتے تھے۔ ایک دم بازاری جن سے دل کڑھ جاتا تھا اور اُداس ہو جاتا تھا۔ لیکن یکایک مجھے کیا ہو گیا ہے کہ میں اتنا جذباتی ہو گیا۔ رُوحی کے جملے مجھے سنبھالا دیتے معلوم ہو رہے ہیں۔ مجھے مسرور کر رہے ہیں۔ آج یہ الفاظ آنسوؤں کے موتی معلوم ہوتے ہیں۔ رُوحی کے آنسو، جن کی قیمت اب بہت معلوم ہوتی ہے۔ پہلے تو ایسی بات نہ تھی۔ پچھلے دنوں تک تو رُوحی ایسی نہ معلوم ہوتی تھی۔ پچھلے دنوں تک تو میں . . . میں . . . . .

اور کیا رُوحی کے ساتھ میرا رویہ غلط تھا کہ رُوحی زیبا نہ تھی۔ کیا مقابلہ ہو سکتا ہے دونوں میں؟ زیبا کی شرابی آنکھیں رُوحی کو میسر نہ تھیں۔ باب میرکی خوبیوں سے رُوحی واقف نہ تھی۔ اُسے لپ اسٹک کو استعمال معلوم نہ تھا۔ اُس پہ لباس کی تنگی کا حُسن آشکارا نہ تھا۔ وہ اپنی رفتار میں کوئی مصنوعی مگر قاتل انداز پیدا کرنے کی اہلیت نہ رکھتی تھی۔ اتنا ہی نہیں، زیبا کی جلد کی رنگت سے چاندنی شرماتی تھی۔ اور رُوحی..... اور رُوحی ... خیر جانے دیجئے۔

تو میرا رویہ رُوحی کے معاملے میں کیا غلط تھا؟ خلوص ہی تو سب کچھ نہیں ہے۔ ستی ساوتری بن جانا ہی تو سب کچھ نہیں ہے۔ میں کہ ایک شاعر حُسن کا دلدادہ آرائش کا پرستار، ترقی پسند..... تو رُوحی میری ذہنی سطح سے بہت نیچے تھی جو میری شاعرانہ صلاحیتوں کو گہنا تو سکتی تھی۔ جلا نہیں بخش سکتی تھی۔ میرے لئے مرنے کو تیار تھی لیکن میری زندگی نہیں بن سکتی تھی..... اور زیبا؟ تب میں فورتھ ایر میں اردو آنرز میں تھا۔ کلاس سے نکلتے ہی ایک مترنم سی آواز میرے کانوں سے ٹکرا گئی تھی۔

"مسٹر انور!" یہ تھرڈ ایر کی سائیکلوجی کی طالبہ زیبا تھی۔

"ہاں، ہاں!" میں ہکلایا تھا۔

"کل ہی ماہنامہ 'نوت' میں آپ کی نظم 'مجھے بھول جاؤ!' پڑھی تھی۔ بڑے امکانات ہیں آپ کے فن میں۔ ایسی قدرت جوان شعرا کو کم نصیب ہے۔ میری طرف سے مبارکباد قبول فرمائیے۔" زیبا نے ایک ہی سانس میں بہت سی باتیں کہہ دیں..... پھر ہم لوگ ملتے گئے تھے۔ زیبا کتنی پرگریسو تھی۔ جتنی حسین اتنی ہی کلچرڈ۔ اُس کی ماڈرن باتیں مجھے بہت اچھی لگتی تھیں۔ اُس کا ہنسنا بہت دل کش تھا۔ وہ لپ اسٹک لگانے کا آرٹ جانتی تھی۔ ہنسنے میں فن برتتی تھی۔ ڈریس کے حسن انتخاب اور استعمال کے گُر سے واقف تھی۔ وہ ہری ہری گھاس پر لیٹ کر میرے کیڈے کے لئے سین پوز کر سکتی تھی۔ یہاں تک کہ..... یہاں تک کہ میری شاعری کو آبرشیٹ کر سکتی تھی۔ ایسے میں رُوحی کے ساتھ میرا رویہ غلط تھا تو کیسے؟

آج تین سال کا عرصہ ہوتا ہے کہ مجھے پاپا نے ٹیلی گرام دے کر علی گڑھ سے بُلا لیا تھا۔ اور میرے احتجاج کے باوجود رُوحی سے میری شادی کر دی تھی۔ رُوحی سے پہلے میرا کوئی سابقہ نہ تھا۔ اُس کے شب و روز سے میں واقف نہ تھا۔ پھر بھی میں نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اُس کا گھونگٹ اُٹھا دیا تھا۔ میرے اردگرد تاریکی گہری ہو گئی تھی۔ میں اُس کے ساتھ پندرہ دنوں تک زہر کے گھونٹ پیتا رہا۔ اور اتنے ہی دنوں میں مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ ماڈرن زندگی سے آگاہ نہیں ہے۔ وہ شوہر کو سرتاج کہتی ہے۔ بھاری بھرکم لباس میں لپٹی رہتی ہے۔ نقرئی اور طلائی زیورات کے بوجھ تلے دبی رہتی ہے اُسے لباس کے وزوں ناموزوں ہونے کا حال معلوم نہیں۔ وہ اپنے لمبے بالوں کی آرائش تک نہیں کر سکتی۔ اُسے مذہبی کتابیں پڑھنے کا شوق ہے۔ وہ فرائڈ سے آگاہ نہیں ہے۔ وہ مجھے شاعر تو سمجھتی ہے لیکن اُسے میرے نماز نہ پڑھنے پر تعجب ہے۔

اور میں پھر زیبا کے پاس علی گڑھ واپس چلا گیا تھا۔ گھر پر میرے ساتھ جو ناٹک ہوا تھا اُس کی تفصیل اُسے بتا دی تھی۔ لیکن زیبا رُوحی تو نہ تھی کہ ایک زبردستی کے واقعے کو کوئی اہمیت دیتی۔ اُس کی ترقی پسندی سے مجھے سہارا ملا تھا۔ ڈھارس بندھی تھی۔ کچھ دن گزرتے گئے۔ رُوحی کے نقوش میرے ذہن و دماغ سے حرف غلط کی طرح مٹتے جا رہے تھے۔ کبھی کبھی بُری سی شبیہ اُبھر بھی آتی تھی۔ جب رُوحی کا کوئی ایسا خط ملتا تھا۔

"یہ درست ہے کہ میں آپ کے قابل نہیں لیکن قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔ اتنی بات تو شاید آپ مان لیں گے کہ میں شرعی طور آپ کی شریک حیات بن چکی ہوں۔ تو مجھے موقع دیجئے کہ میں اپنے کو تبدیل کر سکوں آپ کے قابل بنا سکوں۔ ایک بار میری جان کی قسم! آ جائیے...." [illegible] تحریریں مجھے بے حد گھناؤنی لگتی تھیں۔ بہت تلخ معلوم ہوتی تھیں [illegible] تو کلب کا رسیا تھا۔ رقص و سرود کی محفل کا عاشق تھا۔ نئی اُمنگ لئے [illegible] تھا۔ تو ان باتوں کے لئے زیبا ہی زیب دیتی تھی۔ جو جب گاتی تھی [illegible] عالم حیرت مجھ پر طاری کر لیتی تھی۔ میری باہوں میں جھول کر مجھے نئے [illegible] سے آگاہ کرتی تھی۔ جس کے لبوں کی شیرینی مجھے زندگی کی حلاوت بخشتی [illegible]

اور..... اور.....

تو میرا یہ اقدام کیسے غلط ہو سکتا تھا جب میں نے رُوحی کو [illegible]

رشتی پٹیالوی

تصور کے تاثر کو بھلا کر یاد آئے ہیں
بہ حالِ خود فراموشی وہ اکثر یاد آئے ہیں

وہ نظریں جو اتر کر دل میں اکثر کر گئیں گھائل
وہ نظریں یاد آئی ہیں تو نشتر یاد آئے ہیں

جنوں میں کیوں خلل انداز ہو وہمِ خود آگاہی
وہ عقل و ہوش سے غافل بنا کر یاد آئے ہیں

یہی منزل ہے شاید رہ سپارِ عشق کی منزل
یہاں آ کر وہ مجھ کو ہر قدم پر یاد آئے ہیں

جو رہبر ہوں مقام و وقت کی حدِ تعین تک
جنوں کی راہ میں کس کو وہ رہبر یاد آئے ہیں

نظر آئی نہ پھر پہلو بدلنے کی کوئی صورت
قرار آیا نہ پہروں جب وہ دم بھر یاد آئے ہیں

نہیں آئے تو جان و دل پہ تھی اک بے حسی طاری
جب آئے تو مجسم درد بن کر یاد آئے ہیں

بہر جلوہ ہوئے امکان روشن خود فریبی کے
بہر صورت ہمیں حیرت کے منظر یاد آئے ہیں

مری گم گشتگی کیا عافیت انجام ہے یارب!
نہ منزل یاد آئی ہے نہ رہبر یاد آئے ہیں

تصور میں ادھر دیکھا انھیں منہ پھیر کر جاتے
ادھر بیٹھے ہوئے دل کے برابر یاد آئے ہیں

بلا کی کیف ساماں ہیں وہ ان کی نشہ ریز آنکھیں
کبھی جب یاد آئی ہیں تو ساغر یاد آئے ہیں

چلا جب ذکرِ دل کش حضرتِ خوشتر گرامی کا
رشتی قلب و جگر کو تیر و نشتر یاد آئے ہیں

رشتی پٹیالوی

افسانہ

نیا کرائے دار

پروفیسر جگدیش مینی ایم۔اے

ایس۔ ڈی۔ کالج۔ پٹھان کوٹ

۱۳ر فروری ۱۹۶۳ء

محترمی خوشتر صاحب! تسلیم و آداب

..... بہت دنوں سے یہ سوچ رہا تھا کہ بزم "بیسویں صدی" میں شرکت کروں۔ اور ایک نیا افسانہ "نیا کرائے دار" بھیج کر یہ خواہش پوری کر رہا ہوں۔ یہ ایک خواہش تھی جو آج سے پہلے پوری نہیں کر سکا۔ وجہ صرف ایک سمجھ میں آئی کہ برسوں سے "بیسویں صدی" کا لگاتار مطالعہ کر رہا ہوں لیکن پھر بھی یہ اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ میرا افسانہ ادبی لحاظ سے آپ کے معیار کے مطابق ہوگا بھی یا نہیں۔ ؟ ہاں کہانی نئی ہے رنگ بھی نیا ہے...

نیاز مند ———— جگدیش مینی

نیا کرائے دار مجھے بالکل پسند نہیں آیا۔ شکل دیکھتے ہی میرا دل نفرت سے بھر گیا۔

بال لمبے لمبے، بالکل رُوکھے۔ جیسے مدّتوں سے سر پر تیل نہ لگایا ہو۔ چہرہ سُکڑا سُکڑا سا۔ داڑھی بہت دنوں کی تھی۔ چہرے پر میل اور پسینے کی تہہ چڑھی تھی۔ میلا کوٹ، جیسے سالوں سے اُسے نہ دھلوایا ہو۔ دن رات پہنے رہنے سے تیل کے دھبّے اور میل کے داغ اپنی چھاپ جماتے ہوئے تھے۔ پتلون کو دیکھ کر تو مجھے رحم آنے لگا۔ پتلون اونچی اور نیچے پائنچے شکنوں سے بھرے تھے۔ قمیص کے کالر پھٹے تھے۔ نکٹائی باندھی نہیں تھی۔ باندھی ہوتی تو ضرور کسی لیبل کا کام دیتی۔

نیا کرائے دار آیا تو میں کوٹھی کے آگے باغیچے میں پودوں کو پانی دے رہی تھی۔ اُس نے مجھ سے کوٹھی کا نمبر پوچھا۔ پھر کرائے کی بات کہہ کر کمرے دکھانے کے لئے کہا۔ جتنی دیر وہ باتیں کرتا رہا، کبھی تو میں اُس کی صورت اور کبھی اُس کے کپڑوں کو حیرانی سے دیکھتی رہی۔

میں نے کمرے دکھائے تو ادھر اُدھر دیکھ کر بولا۔

"کمرے اچھے ہیں۔"

اور باہر سامان لانے چلا گیا۔

سامان معمولی تھا۔ بستر تھا ایک بہت بڑا۔ پتہ نہیں اُس میں کیا کیا باندھ کر لایا ہوگا۔ ایک ٹرنک تھا۔ اُس پر نئی پالش تھی اور ایک تھا اٹیچی کیس میلا سا۔ اور بس! یہی اُس کا سامان تھا۔ چارپائی نہیں تھی۔ میز کرسی نہیں تھی اور کچھ سامان نہیں تھا۔

سامان رکھوا کر وہ سگریٹ سُلگانے لگا۔

میں بولی۔

"کمروں کی سفیدی کل تک ہو جائے گی۔"

"سفیدی؟" اُس نے کمروں کو دھیان سے دیکھا۔ اور دھیمی آواز سے کہنے لگا۔ "کمرے ٹھیک ہی ہیں۔ سفیدی کی ابھی کیا ضرورت ہے؟"

میں وہیں کھڑی رہی۔ اندر آنے کو اُس نے نہیں کہا۔ بیٹھنے کو بھی

نہیں کہا۔ ابھی تک کھڑی کیوں ہوں، کیا کہنا چاہتی ہوں؟ یہ بھی نہیں پوچھا چپ رہا۔ کچھ بھی نہیں پوچھا۔ کہا بھی کچھ نہیں۔ دیوار کا سہارا لئے سگریٹ پھونکتا رہا۔

آخر میں ہی بولی۔

"ڈیڈی کہہ گئے تھے، آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو کہہ دیجئے گا۔"

"جی شکریہ!"

اُس نے سگریٹ کی راکھ جھاڑی۔

وہ ابھی کھڑا تھا۔ میں وہیں کھڑی رہی۔ ابھی تک کیوں کھڑی تھی؟ اس لئے کہ ڈیڈی کی کہی ہوئی باتیں اُس سے کہہ سکوں۔ لیکن ڈیڈی نے یہ کام میرے سپرد کیوں کیا تھا؟ مجھے اب ڈیڈی پر غصہ آرہا تھا۔ ایسے آدمی سے باتیں کرنی پڑ رہی تھیں جو گندہ، گنوار اور جانے کیا کیا نظر آرہا تھا۔ جسے بات کرنے کی تمیز نہیں تھی۔ تہذیب کا جسے علم نہیں تھا۔ اور جسے کسی لڑکی کے ساتھ بات کرنے کا طور طریقہ نہیں آتا تھا۔

مجھے ایسے ہی جانور سے باتیں کرنی پڑ رہی تھیں۔

میں جل کر بولی۔

"ڈیڈی کہہ رہے تھے آج رات کا کھانا آپ یہیں کھا لیجئے گا۔ کل سے آپ اپنا انتظام کر لیں گے۔"

• عورت کے دل کا فیصلہ ایک ایسی عظیم الشان طاقت ہے جس کو سمندر کی قہّار موجیں، پہاڑوں کی سنگلاخ چٹانیں، زمین کے زبردست زلزلے اور جلیل القدر بہادر فوجوں کے حملے بھی نہیں توڑ سکتے۔ اُس کا دل ایک ایسا طلسم مخفی ہے جس کے بھید آج تک نامعلوم ہیں۔

(مولینا ابوالکلام آزاد)

• خوبصورت عورت آنکھوں کی مسرت ہوتی ہے اور خوب سیرت عورت رُوح و دل کی۔ (افلاطون)

میری اُونچی آواز اچانک ہی رُک گئی تھی۔ اُس نے مجھے دیکھا۔ دیکھتا رہا تھا۔ بہت بڑی بڑی آنکھیں تھیں اُس کی، لال سی۔ آنکھوں میں چمک نہیں تھی۔ بہت سا پانی تھا۔ جیسے سگریٹ کا بہت سا دھواں اُس کی آنکھوں میں گھس گیا ہو۔ یا وہ میری اُونچی اور بے ربط آواز پر سٹپٹا ہو۔ میں نیچے دیکھنے لگی۔

وہ نیا سگریٹ سُلگا کر بیٹھ گیا۔

دھیرے سے بولا۔

"اِس تکلیف کی ضرورت نہیں۔ کھانے کا انتظام میں نے کر لیا ہے!"

میں حیران تھی۔ خود بیٹھا۔ مجھے بیٹھنے کے لئے نہیں کہا۔ میں وہیں اُسی طرح کھڑی رہی۔

وہ یکایک اُٹھا اور کہنے لگا۔

"ذرا باتھ رُوم اور لیٹرین دکھا دیجئے۔"

لمحہ بھر کے لئے میں اُسے دیکھتی رہی۔ کیسا آدمی ہے یہ؟ کوئی غصہ نہیں۔ آواز میں کوئی تیزی نہیں۔ ٹھہری ہوئی صاف زبان۔۔۔۔ لیکن صُورت؟

"آئیے!"

میں نے کہا اور آگے آگے چل پڑی۔

صحن پار کر کے ایک کونے میں غسلخانہ تھا۔ دکھا کر بولی۔

"یہ باتھ ہے۔ ایک ہی ہے۔ اور یہ لیٹرین ہے۔ یہ بھی ایک ہی ہے۔"

دل میں آیا کہہ دوں آپ کو باتھ رُوم کی کیا ضرورت ہے۔ اوّل تو آپ نہائیں گے نہیں۔ اگر نہانا ضروری ہے تو باتھ رُوم کی آپ کو کیا ضرورت ہے؟ باتھ رُوم میں نہانا آپ کو آتا ہے کیا؟ صحن پڑا ہے۔ اور چھت خالی پڑی رہتی ہے۔ کوٹھی کے آگے بہت سی جگہ پڑی ہے، نہانے کے لئے کافی ہوگی۔ پھر لیٹرین میں فلش لگی ہے۔ آپ کو فلش کا کیا پتہ ہوگا۔ زنجیر بھی کھینچنا آئے گی یا نہیں؟ مکان کے باہر کتنے کھیت ہیں۔ کیا کافی نہ ہوں گے؟

سگریٹ کا آدھ جلا ٹکڑا باتھ رُوم میں پھینک کر کہنے لگا "میں

صبح آٹھ بجے نہا لیتا ہوں۔ آپ لوگوں کو کوئی خاص تکلیف نہ ہوگی؟"

"بھلا ہمیں کیا تکلیف ہو سکتی ہے؟"

میں نے تیزی سے کہا۔ تکلیف ہوگی یا نہیں، بتانا ضروری تھا کیا؟ اُس کا آنا ہی میرے لئے تکلیف کا باعث تھا۔ اُس کا سگریٹ پینا ہی میرے لئے تکلیف کا باعث تھا۔ اُس کی تو شکل ہی میرے لئے تکلیف دہ تھی۔ باتھ رُوم کو دیکھتے ہی سگریٹ کے ٹکڑے سے گندہ کر دینا میرے لئے تکلیف کا باعث تھا۔ نہاتے ہوئے معلوم نہیں کتنے سگریٹ پئے گا۔ کونسا فلمی گیت گائے گا۔ ایک جوان لڑکی کے گھر بے نے پر فلمی گیت گنگنانے سے بھلا کیا تکلیف ہو سکتی ہے؟

اتنی دیر میں اُس نے نیا سگریٹ سُلگا لیا اور پھر بولا۔

"اور لیٹرین کے بارے میں بھی آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہ ملے گا۔"

سگریٹ سُلگا کر جلتی تیلی کو بھی اُس نے باتھ رُوم میں پھینک دیا۔

نئے کرائے دار کی یہ کیا عادت تھی، سگریٹ پر سگریٹ پھونکے جانا ہر جگہ کو ایش ٹرے سمجھ لینا۔ کمروں کو گندہ کر دینا، صحن کو گندہ کر دیتا۔ باتھ رُوم کو گندہ کر دینا۔ اور چُپ چاپ کمرے میں چلا جانا۔ میرا وجود نفرت سے بھر گیا۔ نوکر کو بُلا کر میں نے سارے کمرے اور باتھ رُوم کو صاف کرنے کو کہا۔ اور تیزی سے باہر کوٹھی کے لان میں چلی گئی۔

ڈیڈی نے صبح بریک فاسٹ پر نئے کرائے دار کے آنے کی خبر دی تھی۔ انھوں نے کہا تھا۔

"وہ سی۔ او میں نیا آیا ہے۔ بے چارے کا کوئی رشتے دار یا ساتھی یہاں نہیں ہے۔ پانڈے صاحب نے اُس کی سفارش کی تھی۔ میں ہاں کر بیٹھا ہوں۔ آج شام کو وہ اپنا سامان لے کر آ جائے گا۔"

بریک فاسٹ پر اکثر بہت سی باتوں کا ذکر چل جاتا ہے۔ نئی مشکلوں کا حل سوچا جاتا ہے۔ دُودھ، ترکاری کی باتوں سے سیاست پر بحث ہونے لگتی ہے۔

ممی نئے کرائے دار کے آنے پر ناراض ہوگئیں۔ بولیں۔

آپ نے مکان کرائے پر تو دے دیا ہے۔ لیکن کچھ کرائے دار کا بھی کچھ پتہ ہے۔ کون ہے؟ کیسا ہے؟" وہ ڈیڈی کو دیکھنے لگیں۔ ڈیڈی اپنے لئے چائے بنا رہے تھے۔ سر اُٹھا کر ممی کو دیکھا۔ پھر سر نیچا کر کے کہنے لگے۔

"پانڈے صاحب نے سفارش کی ہے۔ وہ اپنا ہی ہوگا۔ پانڈے کیوں غلط آدمی کی سفارش کرتا؟"

ناشتے پر بحث ختم ہوگئی۔

ڈیڈی اُٹھ کر چلا گیا۔ جنتا بیٹھی رہ گئی۔

کانا پھوسی شروع ہوگئی۔ ممی نے کہا۔

"آدمی اچھا ہونا چاہئے۔"

"ضرور۔" میں کہنے لگی۔ "اگر یہ وقت ہی پر دے تو ٹھیک ہے!"

"باتھ رُوم کو وقت ہی پر استعمال کرے۔" ممی نے کہا۔

میں بولی۔

"گھر وقت ہی پر آئے۔"

"لائٹ زیادہ نہ جلایا کرے۔" ممی بولیں۔

میں نے کہا۔

"دوستوں کو گھر پر نہ لائے۔"

"لائے تو باہر کے دروازے سے!" ممی نے کہا۔

◆ تمھاری دولت میں غریبوں اور مسکینوں، معذوروں اور مجبوروں کا بھی حق ہے۔ (حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)

◆ اپنی حاجت پر دوسروں کی حاجت کو مقدم رکھنا ہی حقیقی کرم ہے۔ (حضرت مجدد الف ثانیؒ)

◆ پھول کی صحبت میں رہنے سے بے شک مٹی کے ریزوں سے بھی خوشبو آنے لگتی ہے۔ (سوامی سارشبد آنندجی)

◆ محنت ہی وہ سونے کی کنجی ہے جو دولت کے دروازے کھول دیتی ہے۔ (سمائلز)

"صحن میں کم آیا کرے!"

نوکر چائے کے برتن اُٹھانے لگا۔ کلاک نے نو بجائے۔ ڈیڈی نے جانے کا الارم دیا۔ ممّا پھوس بند ہو گئی۔ سیکنڈ لیڈر بھی اُٹھ گیا۔ رہ گئی تھی میں اکیلی۔ چائے کی نئی پیالی منگوا کر میں نئے کرائے دار کے بارے میں سوچنے لگی۔ خیال پرانے کرائے داروں کی طرف بھی چلا گیا۔

ایک کرائے دار بھاش کپور آئے تھے۔ کالج میں پروفیسر تھے میں اُن کے بارے میں سوچ کر مسکرا پڑی۔ دبلے پتلے، نہ گورے نہ کالے۔ قد نہ بڑا اتنا نہ چھوٹا۔ کندھے جھکا کر چلتے تھے۔ آنکھیں گڑھوں میں دھنسی تھیں۔ بات کرتے تو ماتھے پر بل پڑ جاتے۔

کپور صاحب آتے ہی کمروں میں نقص نکالنے لگے۔

"دیکھئے، کمروں کی دیواریں گندی ہو رہی ہیں۔ سفیدی نہیں ہے فرش دُھلا ہوا نہیں ہے۔ روشندان بند کر رکھے ہیں آپ نے۔ اِس کمرے میں کھڑکی تو صرف ایک ہی ہے۔ اور اِس روشندان کے تو شیشے ہی ٹوٹے ہوئے ہیں۔ سردیوں کے دن ہیں۔ ان کو ٹھنڈی ہوا آئے گی ....."

"سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

میں نے سارے اعتراض سُن کر کہا تھا۔

"کچن کہاں ہے؟"

"کچن تو ایک ہی ہے!"

"ارے، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ مجھے تو کچن بھی چاہیئے۔" پھر باہر کے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگے۔ "یہ تو میرا ڈرائنگ روم بنے گا۔ یہ کمرہ سونے کا بنے گا۔ چائے وغیرہ کہاں بنے گی؟ کچن تو بہت ضروری ہے۔"

وہ باہر نکل کر صحن، باتھ روم اور لیٹرین دیکھنے لگے۔

میرے مُنہ سے نکلا۔ "اُف!" پھر میں سوچنے لگی۔ چائے تو میں سمجھتی ہوں۔ لیکن یہ وغیرہ کیا ہوگا؟

صبح بریک فاسٹ پر بات ہونے لگی۔ فیصلہ ہوا کپور صاحب ہمارے ساتھ ہی بریک فاسٹ کر لیا کریں جب دوسرا کچن بن جائے گا تو وہ اپنا انتظام کر لیں گے۔

ڈیڈی اپنا فیصلہ سُنا کر چلے گئے۔ پیچھے رہ گئی میں اور ممّی۔ ممّی بھی کالج پڑھانے چلی جاتی ہیں۔ میری ممّی لڑکیوں کے کالج میں انگریزی کی ٹیچر ہیں۔ مصیبت میرے لئے تھی۔ گھر میں میں اکیلی رہ جاتی۔ اور جناب صبح آٹھ بجے اُٹھتے، شیو بناتے بناتے نو بج جاتے۔ اور مجھے بریک فاسٹ پیش کرنے کے لئے اُن کا انتظار کرتے رہنا پڑتا۔ پہلے دن تو وہ جھجکے۔ شرمائے بھی، لیکن مفت کی چیز پر کس کا دل نہیں آ جاتا۔ موج اُڑانے لگے۔ اُن کا سامان دھیرے دھیرے آنے لگا۔ پہلے ڈرائنگ روم کا سامان آیا بہت سی کُرسیاں، کافی میزیں۔ ایک اچھا خوبصورت سا ریڈیو۔ قالین پردے۔ اور جانے کیا کیا آیا تھا۔ مجھ سے پُوچھ پُوچھ کر سامان سجانے لگے۔ کمرہ سج گیا تو سامان لانے والے سے بولے "حساب میں دوکان پر آ کر دیکھ لوں گا۔"

کپور صاحب شروع شروع میں مجھے بہت اچھے لگے تھے۔ بہت چُپ رہتے تھے۔ جب بات کرتے ماتھے پر بل پڑتے لیکن آہستہ آہستہ میرا دل کپور صاحب کے لئے غصّے سے بھرتا گیا۔ میں زیادہ گھر پر رہا کرتی تھی۔ پڑھنا میری قسمت ہی میں نہیں تھا۔ ایف، اے کرکے ہی پڑھائی چھوڑ دی تھی۔ میگزین، کہانیاں پڑھنے اور سلائی کا کام کرنے میں دل لگا رہتا تھا۔ سردیوں میں صحن اور چھت دونوں جگہیں ہمارے بیٹھنے کو ہوا کرتی تھیں۔ صحن کی طرف کپور صاحب کے کمرے کی ایک کھڑکی پڑتی ہے بس! کپور صاحب اُسے کھول کر بیٹھنے لگے۔ سامنے کوئی کتاب کھلی ہوا کرتی اور نظر؟ میرے اُوپر۔ ایک دن، دو دن، تین دن، آخر کب تک برداشت کرتی۔ وہ ہر روز دیکھنے لگے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہنے کی کوشش کرنے لگے۔ میں صحن سے اُٹھ کر اُوپر چھت پر بیٹھنے لگی۔ مردوں کے پاس بہانے بہت ہوتے ہیں۔ وہ روز کوئی نہ کوئی بات لے کر اُوپر بھی آنے لگے۔ مجھے اُن کی کوئی بھی عادت اچھی نہیں لگتی تھی۔ لیکن کیا کرتی، کرائے دار تھے۔ چُپ رہتی۔

ایک دن وہ کہنے لگے۔

"سنیتا! تمہیں میگزین پڑھنے کا بہت شوق ہے۔"

"ہے... پھر...؟"

"ناول بھی پڑھتی ہو؟"

"کبھی کبھی!"

"کالج لائبریری میں بہت ہیں!"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"تمہارے لئے لے آؤں گا!"

"آپ کو تکلیف ہوگی۔"

"تکلیف کیسی؟" مسکرا کر کہنے لگے "تمہاری تو معمولی سے معمولی خواہش پوری کرنا بھی میں اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا۔"

وہ ہنس کر، کچھ مسکرا کر چلے گئے۔ جیسے اپنے طور پر انھوں نے مجھے جیت لیا ہو، میرے دل میں ہلچل پیدا کر دی ہو۔ کوئی طوفان بپا کر دیا ہو۔ لیکن مجھے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ اسی دن وہ ڈھیر سارے ناول لے آئے۔ نام کسی کا یاد نہیں رہا۔ لیکن لکھنے والوں کے نام ضرور یاد ہیں۔ کچھ گورو دت کے تھے، کچھ الا چند جوشی کے اور کچھ تھے شرت چندر کے۔ میں نے ناول بغیر پڑھے ہی لوٹا دیئے تھے۔

پھر ایک دن کہنے لگے۔

"آپ پکچر چلیں گی؟"

"نہیں!"

"کیوں؟"

"میں پکچر نہیں دیکھتی۔"

وہ کچھ اور کہنے لگے تھے میں بیچ ہی میں بول پڑی۔ "آپ کہیں اور کوشش کریں۔ یہاں آپ کا کچھ بھی بننے بنانے والا نہیں ہے۔"

"کیا؟"

میں نے اُن کی کوئی بات نہ سنی۔ اور اپنے کمرے میں چلی آئی۔ پھر معلوم نہیں کیوں اُنھوں نے مکان چھوڑ دیا۔ اور کسی دوسری جگہ چلے گئے۔

ایک دن میں نے اُن کے ساتھ سینما میں ایک لڑکی کو دیکھا۔ وہ میرے ساتھ کالج میں پڑھا کرتی تھی۔ انٹرول میں وہ اٹھ کر باہر چلے گئے۔ میں اٹھ کر لڑکی کے پاس [illegible] پوچھا۔

"سندھیا! تمہارے ساتھ یہ کون ہیں؟"

"وہ..." ہنس کر اور کچھ شرما کر کہنے لگی "کالج میں پروفیسر ہیں۔"

"اچھا!" میں نے حیرانی ظاہر کی۔ پھر پوچھا "یہ تو تمہیں پڑھاتے ہوں گے اپنے پروفیسر کے ساتھ تو..." میں نے بات بیچ ہی میں چھوڑ دی۔

ہنس کر بولی۔

"شادی کا پروگرام بن رہا ہے۔ ہمارے کرائے دار بھی ہیں۔"

"اوہو، تبھی!"

میں اپنی سیٹ پر آگئی اور سوچنے لگی۔ پروگرام اچھا ہے۔ پروفیسر، کرائے دار اور ہونے والا شوہر!

ایک اور کرائے دار آئے تھے۔ نام کچھ عجیب تھا اُن کا چھچھول پکوڑیا۔ چھچھول تو سمجھ میں آتا تھا لیکن پکوڑیا؟ سمجھ میں نہیں آیا میں نے پوچھا بھی تھا

"یہ پکوڑیا آپ کا تخلص ہے؟"

"تخلص ہی سمجھ لیجئے۔"

"جی، کیا مطلب؟"

"یار لوگ پریم سے پکوڑیا کہہ دیتے ہیں۔"

"کیوں؟"

"وہی بہتر جانتے ہوں گے۔"

"اوہو!"

چھچھول پکوڑیا نام نے اتنی سوچ میں نہیں ڈالا تھا جتنا اُن کی شکل نے عجیب چوکھٹا سا تھا چھوٹا۔ بال لمبے، کھچڑی۔ ہمیشہ گاندھی ٹوپی پہنے رہتے مونچھیں بڑی۔ ناک لمبی بگلے کی چونچ کی طرح۔ بات کرتے تو کبھی کبھی ہنس پڑتے اور پانوں سے سڑے دانتوں کی نمائش کر دیتے۔ آپ کانگریس کے سکریٹری تھے۔ جب تک مکان میں رہے خوب دھما چوکڑی مچا کرتی تھی۔ گھر سے باہر

کر نکلے جب جاتے تو آٹھ آٹھ دنوں تک غائب رہتے۔ اور جب آتے تو اپنے
ڈھیروں دوستوں کو ساتھ لاتے۔ ساری ساری رات اونچی آواز میں بحث کرتے
رہتے۔ اب کیا ہو رہا ہے؟ کیسے ہو رہا ہے؟ کیا ہوگا؟ آگے کیا ہوگا؟ فلاں
ملک نہرو کی پالیسی کو مانتا ہے۔ فلاں جگہ پر نہرو کا سواگت کیا جائے گا۔ وہاں
پنڈت جی کو ہاتھوں ہاتھ اٹھا لیا جاتا ہے گا۔
"اس فیلڈ میں محنت کرنی پڑے گی اس جگہ پر شریمتی اندرا گاندھی کو
ضرور ہی بلانا چاہئے۔ استری منڈل میں تو ان کی ہی چلتی ہے۔"
"پاکستان کی اس دھمکی نے کافی ہلچل پیدا کر دی ہے۔ کینیڈی کبھی اسکی
امداد نہیں کر سکتے۔ روس کی امداد تو ملتی ہی رہے گی۔ لیکن چین کی پالیسی کا
ہمیں سامنا کرنا پڑے گا۔"
"پنجاب کی سیاست زیادہ پیچیدہ ہوگئی ہے لیکن ...."
ان سیاست کی باتوں کو سن سن کر میں تنگ آگئی تھی۔ وہ نہ خود سوتے
تھے اور نہ دوسروں کو سونے دیتے۔ کروٹیں لیتے لیتے بیٹھ دکھنے لگتی۔ کتنی بار
باہر پانی پینے جانا پڑتا۔ اور غصہ آتا کہ ڈیڈی بھی کیسے کرائے دار پکڑ لا کر لے
آتے ہیں۔
صبح کو مجھے دیکھ کر وہ مسکرا پڑتے۔ جیسے کہہ رہے ہوں۔ رات آپ
لوگوں کو کشٹ ہوا ہوگا۔ کیا کیا جائے، ملک کا سارا بوجھ ہمارے ہی کندھوں پر
آپڑا ہے۔ اگر ہم لوگ رات کو جاگ جاگ کر ملک کی ترقی کے لئے نہیں سوچیں
گے تو اور کون سوچے گا۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ آگے سے .... لیکن ایسی
راتیں آتی رہیں اور سیاست پر بحث چلتی رہی۔ اور مجھے دکھ اس بات کا
ہونے لگا کہ ڈیڈی بھی بحث میں حصہ لینے لگے تھے۔ بحث میں کانگریس کا
نام ہوتا۔ جواہر لال نہرو کا نام ہوتا۔ امریکہ کا نام ہوتا۔ روس کا نام ہوتا۔
پاکستان کا نام ہوتا۔ چین کا نام ہوتا۔ اور ایک میرا نام ہوتا کہ میں سیاست
میں حصہ لینے والوں کو برا سمجھتی ہوں۔
ایک تکلیف ہو تو آدمی برداشت کر جائے لیکن پکوڑیا صاحب کے
شوق بھی بہت عجیب تھے۔ بیڑیاں بہت پیتے تھے۔ شاید کانگریس بیڑی
چلتی تھی۔ کیونکہ کانگریس بڑی سودیشی ہوتی ہے۔ اور اس پر ان کا لیبل بھی
لگا ہوتا ہے۔ آنے والے بھی سگریٹ پینے والے ہوتے۔ پان کھانے والے
ہوتے۔ اور کچھ حقہ پینے والے ہوتے۔ گھر بھر میں دھواں پھیلا رہتا۔
اور صبح ان کے کمروں کے سامنے سگریٹ بیڑیوں کے جلے ٹکڑوں کے ڈھیر
لگے رہتے۔ پانوں کی پیک سے فرش لال ہوتا۔ چلو یہ بھی برداشت کر
لیتے ہیں۔ ورنہ بھگت ہیں۔ ان کے لئے ہمارا بھی تو کوئی فرض ہے۔
انھیں عزت دینی ہی چاہئے۔ لیکن یہ کیا ہوا، صبح سبھی دوست غسلخانے
میں نہائیں گے۔ رومال، جرابیں، بنیان اور نہ جانے کیا کیا دھوئیں گے
کیا مجال جو انھوں نے کبھی یہ سوچا ہو کہ گھر میں دوسرے بھی رہتے ہیں۔
انھیں بھی نہانا ہوگا۔ باتھ روم کی انھیں بھی ضرورت ہوگی۔
میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ مکان خالی ہوگیا تو کسی کو نہیں دینے دوں
گی۔ لیڈر رہانے کو تو کبھی بھی نہیں۔ اور جب مچوّل پکوڑیا مکان چھوڑ کر
گئے تو میں نے پانچ روپے کا پرشاد بانٹا تھا۔ اور پرارتھنا کی تھی کہ ڈیڈی کو
بھگوان کچھ سمجھ بوجھ دے۔ لیکن کہاں؟ ڈیڈی ایک اور نیا کرائے دار لے آئے
تھے۔ مجھے تو ڈیڈی کے چناؤ پر حیرانی ہوتی ہے۔ وہ کرائے دار بھی ایسے
ہی لاتے ہیں جنھیں سیاست کا بخار ہوتا ہے اور جو بالکل گنوار ہوتے ہیں۔
نئے صاحب بھی باتھ روم اور لیٹرین پوچھ کر چلے گئے تھے۔ اپنا نام تک
نہیں بتایا۔ میں نے پوچھا بھی نہیں۔ میں پوچھنا بھی نہیں چاہتی تھی
ایسے آدمی سے بات ہی کون کرے۔ دیکھ کر ہی جی متلانے لگتا تھا۔ لیکن
یہ صاحب پہلے کرائے داروں سے کچھ الگ تھے۔ اس نے سفیدی کروانے
کے لئے بھی نہیں کہا تھا۔ کمروں میں نقص بھی نہیں نکالے تھے۔ کچن بھی
نہیں مانگا تھا۔ بریک فاسٹ خود ہی تیار کر لیا کرے گا۔ شاید بریک فاسٹ لینے
کی اس کی عادت ہی نہ ہو۔ اچھا ہی ہے۔ ڈیڈی کبھی اسے بریک فاسٹ کے
لئے نہیں کہیں گے۔ اور نہ کبھی وہ میرے سامنے میز پر آکر بیٹھے گا۔
باہر والی کھڑکی بند رکھے گا۔ صحن میں کم آئے گا اور چھت پر بالکل نہیں
جائے گا!
وہ تھوڑی دیر کمرے ہی میں رہا۔ پھر باہر آیا۔ وہی شکل، وہی
لباس، آنکھیں چڑھی ہوئی لال سرخ۔ ہاتھ میں شیو والا کپ پکڑے ہوئے

تھا۔ مجھے اپنی طرف دیکھتے پاکر بولا۔

"پانی پینا تھا!"

میرا دھیان شیو والے کپ کی طرف چلا گیا۔ کچھ محسوس کر کے اُس نے کہا۔ "اوہو! میرے پاس کوئی گلاس نہیں ہے۔ کل لے آؤں گا۔ آج اِسی میں پی لوں گا۔"

بے دیکھے، کچھ سُنے بغیر وہ باتھ رُوم میں گھس گیا۔ پانی پی کر اور کپ پانی سے بھر کر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ آتے ہوئے اُس نے میری طرف بالکل نہیں دیکھا تھا۔

مجھے بہت غصہ آیا۔ یہ کیسا آدمی گھر میں گھس آیا ہے۔ سوچا جا کر کہہ دوں مہاراج! ہم تہذیب یافتہ ہیں۔ ہم سے ملنے یہاں ہزاروں لوگ آتے ہیں۔ یہ شکل یہاں نہیں چلے گی۔ بوریا بستر سنبھالو اور کوئی دوسرا ٹھکانا تلاش کرلو۔ یہ جگہ آپ کے رہنے کے قابل نہیں ہے

دروازے ہی تک گئی تھی۔ وہیں ٹھہر گئی۔ وہ کیا سوچے گا؟ میں جو کچھ کہنے جا رہی تھی، وہ کیا مہذب آدمی کا سلیقہ ہوگا؟

میں وہیں کھڑی رہی۔

یکایک دروازہ کھُلا۔ مجھے سامنے کھڑی دیکھ کر دروازے کے کھُلے پاٹوں میں ہی رُک گیا۔ بولا۔

"یہاں کہیں نزدیک کوئی دوکان تو ہوگی؟"

"ہے!" میں دھیمے لہجے میں کہنے لگی۔ "باہر نکل کر دائیں طرف ہے۔ آپ کو کیا چاہیے؟"

"ماچس!"

وہ باہر نکل آیا اور دروازہ بند کرنے لگا۔

"ٹھہریے۔ میں ماچس لا دیتی ہوں۔" میں چلنے لگی۔

"نہیں ٹھہریے۔" وہ پیچھے سے بولا۔ "مجھے تو لانی ہی ہے، لے آؤں گا۔"

"پھر لے آئیے گا۔"

ماچس لاکر دی تو اُس نے شکریہ ادا نہیں کیا۔ اندر چلا گیا۔ مجھے پھر غصہ آگیا۔ دل میں تو آیا اُٹھا کر اُس کا سارا سامان باہر پھینک دوں۔ عجیب آدمی ہے۔ نام نہیں بتایا۔ لباس گندہ ہے۔ سلیقہ آتا نہیں ہے۔

میں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ پیٹھ دروازے کی طرف کئے سگریٹ پی رہا تھا۔ کمرے میں کتنا ہی سامان اِدھر اُدھر بکھرا پڑا تھا۔ کاغذ، کتابیں، پنسلیں، پُرانے اخبار، تصویریں، بستر کی چادریں، ہینگر، بُرش، شیونگ کا سامان! اور جانے کیا کیا پڑا تھا۔ سامان سارا قیمتی نظر آتا تھا۔

میری طرف مُڑا اور حیرانی سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں بولی۔

"میں نام پُوچھنے آئی تھی۔"

"اوہو!" مُسکرا اُٹھا۔ کہنے لگا۔ "میرا نام جگدیش مینی ہے!"

"جگدیش مینی؟"

مجھے محسوس ہوا میں نے یہ نام کہیں سُنا تھا۔ کہاں؟ کس سلسلے میں؟ کس جگہ؟ یاد نہیں آیا۔ وہیں کھڑی ہوئی اُسے عجیب نظروں سے دیکھتی رہی۔ اُس عجیب سے چہرے کے پیچھے کیا راز چھپا ہوا تھا۔ پُوچھ بیٹھی۔

"میں نے یہ نام کہیں سُنا ہے؟"

"ضرور سُنا ہوگا۔" کچھ ہنس کر وہ کہنے لگا۔ "یہ نام عام ہے۔"

"جی ——!"

کچھ کہتے کہتے میں رُک گئی۔

"جی —— !" سگریٹ کا ایک لمبا کش کھینچ کر وہ کہنے لگا۔ "ایک بار جگدیش مینی نے کسی لڑکی سے سائیکل ٹکرا دی تھی۔ شہر میں کافی بدنامی ہوئی۔ خبر اخبار میں چھپی تھی۔"

"جی ....." مجھے یقین نہیں آیا۔ کہہ اُٹھی۔ "نہیں پڑھی۔"

"اچھا!"

اُس نے اِس طرح کہا جیسے میری بات سُن کر اُسے بہت حیرت ہوئی ہو۔ کچھ سوچ کر وہ پھر کہنے لگا۔

"نہیں پڑھی ہوگی۔ لیکن ایک جگدیش مینی نے اپنی محبوبہ کی شادی پر دُکھی ہو کر خودکشی کرلی تھی۔ یہ خبر بھی اخباروں میں چھپی تھی۔"

روز پہننے کے کپڑے
سن لائٹ سے
کتنے سفید اور اُجلے!
SUNLIGHT SOAP
روز پہننے کے کپڑے—
تازہ تازہ، صاف صاف!
اور سفید اور اُجلے—کیونکہ یہ سن لائٹ سے
دُھلے ہیں۔ اپنے گھر کے سبھی کپڑے
سن لائٹ سے دھویئے۔
سن لائٹ—بڑھیا جھاگ والا خالص صابن
S.33-X52 I'D
ہندوستان لیور کا تیار کردہ

"وہ نہیں پڑھی!"

"میں نے بھی نہیں پڑھی؟" کچھ حیرانی میں ڈوبی آواز میں وہ بولا۔

"ایک جگدیش مینی تھرڈ کلاس ادیب بھی ہے۔ اس کی کہانیاں اکثر اخباروں میں آتی ہیں"

"جی......" میں کچھ سوچنے لگی تھی۔

"اور ایک جگدیش مینی میں ہوں۔ آپ کا کرائے دار!"

وہ ہنس پڑا۔

"میرا کرائے دار!؟" میں دھیرے سے بڑبڑائی۔ اور میری نگاہ اس کی طرف اٹھ گئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا میں اس جگدیش مینی کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ میں نے اس کے بارے میں پہلے کبھی سوچا ہے۔ کب سوچا ہے؟ کیوں سوچا ہے؟ یاد نہیں آرہا تھا۔ میری آنکھیں اس کے چہرے پر کچھ تھیں جیسے کچھ جاننے کی کوشش کر رہی ہوں۔ لیکن کیا، کیا وہی راز جو میرا کرائے دار کہہ رہا تھا، سائیکل ٹکرانے والا، خودکشی کرنے والا؟ یا ایک تھرڈ کلاس ادیب ہو گیا تھا؟ کہاں تھا؟ جہاں کوئی جگدیش مینی تھا کسی خاص واقعے میں تھا میں نے اس کے بارے میں پڑھا تھا۔ میں نے اس کے بارے میں سوچا تھا۔ بہت سوچا تھا اور ہمدردی ظاہر کی تھی۔ لیکن کہاں؟ یکایک وہ میری نظروں کے سامنے سے ہٹ گیا۔ اس نے مجھے ضرور پاگل سمجھ لیا ہوگا۔ دوسرے کمرے میں جا کر ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ٹہلتے ٹھہر گیا۔ اور دیوار کا سہارا لے کر سگریٹ پینے لگا۔ وہیں کھڑا رہا اور سگریٹ پیتا رہا۔ میری طرف نہیں دیکھا۔ میں وہیں خلا میں دیکھتے ہوئے اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

پھر مجھے سب کچھ یاد آگیا۔ وہ جگدیش مینی کون تھا۔ اس کے بارے میں میں نے کہاں پڑھا تھا، وہ راز کیا تھا، سب سمجھ میں آگیا تھا۔ تیزی سے میں اپنے کمرے کی طرف لپکی۔ اٹیچی کا سارا سامان باہر الٹ دیا۔ نیچے ایک لمبا چوڑا خط پڑا تھا۔ خط کھول کر پڑھنے لگی۔ بیچ میں کہیں لکھا ہوا تھا۔

"مدھو تم شادی پر نہیں آئیں، اچھا ہی کیا۔ ہماری بہت سی سہیلیاں بھی اس کی شادی پر نہیں گئیں۔ کیونکہ سب کو اُما کی پسند پر غصہ آرہا تھا۔ جس لڑکے کے ساتھ وہ شادی کر رہی ہے وہ مجھے بھی پسند نہیں۔ بہت چالاک ہے، بہت ماڈرن ہے۔ بہت شراب پیتا ہے۔ بہت آوارہ ہے لڑکیوں کا بہت پیچھا کرتا ہے۔ اُما کے پیچھے بھی وہ چند مہینوں سے تھا۔ کبھی کار اس کے سامنے روک دیتا اور کبھی بازاروں میں اس کے پیچھے پیچھے چلتا۔ کالج کے گیٹ پر کار لئے کھڑا رہتا۔ اور اُما یہی چاہتی تھی کہ اس کا شوہر لڑکی کے جذبوں کی قدر کر سکے۔ اس کے پاس اپنی ایک کار ہو، بنگلہ ہو۔ اُما اس کے دام فریب میں پھنس گئی۔ لیکن یہ لڑکا مجھے پسند نہیں آیا۔ اس کے ممی اور ڈیڈی کو بھی پسند نہیں آیا۔ دوسرے رشتہ داروں کو بھی پسند نہیں ہے۔

تم نے جگدیش مینی کو دیکھا نہیں۔ اگر اُما کی شادی پر آجاتیں تو ضرور دیکھ لیتیں۔ اس کے بارے میں میں نے پہلے بھی تمہیں کتنی بار لکھا ہے۔ شاید اُما نے بھی تمہیں لکھا ہو۔ وہ اُما کو چاہتا ہے۔ بہت چاہتا ہے۔ اُما بھی اُسے چاہتی تھی۔ لیکن اُما کی دوسری پسند میری سمجھ میں نہیں آئی۔

"جگدیش میں کیا نقص تھا؟ مجھے تو کوئی نقص اس میں نظر نہیں آیا خوب اچھا رنگ ہے۔ صحت اچھی ہے۔ نوکری پیشہ ہے اور ایک لڑکی کا اچھا خاوند بننے کی ساری خوبیاں اس میں تھیں۔ پھر اُما نے اُسے پسند کیوں نہیں کیا۔ وجہ ایک ہی میری سمجھ میں آتی ہے۔ وہ ماڈرن نہیں ہے شراب نہیں پیتا۔ بازاروں میں لڑکیوں کا پیچھا نہیں کرتا۔ اور کالج کے گیٹ پر کسی کا انتظار نہیں کرتا۔

"کیا محبت کی کسوٹی ہے؟ کیا آج ہر ایک لڑکی اپنے محبوب سے یہی چاہتی ہے کہ وہ آگے آگے چلتی جائے اور وہ اس کے پیچھے پیچھے ہاتھ باندھے چلتا جائے۔ اس کے ناز نخرے برداشت کرتا رہے۔ اس کی ہر ایک خواہش پوری کرتا رہے۔

سُنیتا! یہ سب کیا ہے؟ ہم مردوں ہی کو دوش کیوں دیتی ہیں کیوں کہتی ہیں کہ وہ پتھر ہوتے ہیں، بے وفا ہوتے ہیں۔ اُما کی بات لو۔ تم کس کو دوش دو گی؟ اُما کو یا جگدیش کو۔ جو اب بھی اُسے چاہتا ہے۔ اُما کی

شادی ہو چکی ہے۔ عرصہ ہو چکا ہے۔ لیکن وہ اب بھی اُما کو چاہتا ہے۔ کیوں چاہتا ہے وہ اُسے؟

وہ اُسے بھول کیوں نہیں جاتا؟

یہ وہ سوال ہیں جن کے جواب آج تک مجھے نہیں مل سکے۔

اُما کی شادی کے بعد میں جگدیش سے کتنی ہی بار ملی ہوں۔ لیکن اس نے کبھی بات نہیں کی۔ بہت بدل گیا ہے۔ وہ آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہی نہیں۔ چپ چاپ پاس سے نکل جاتا ہے۔

اور میں ——

میں اُس سے ہمدردی رکھنے لگی ہوں۔

اُس کے بارے میں اکثر سوچتی رہتی ہوں —— لیکن یہ پریم تو نہیں، ہمیشہ ایک ہی آدمی کے بارے میں سوچنا!؟

خط آگے جا کر ختم ہو گیا تھا۔

یہ وہی تھا —— میرا اپنا کرائے دار وہی تھا —— سارا راز جان کر میں اُس کے کمرے کی طرف بڑھی۔ وہ دروازہ بند کر رہا تھا۔ اُس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ نیلے سرج کا سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ کریز پوری تھی۔ ہونٹوں میں دبا سگریٹ کانپ رہا تھا۔ ہلکے ہلکے دھوئیں کے غبار اُٹھ رہے تھے۔

میں وہیں کھڑی ہو گئی۔

وہ مڑا۔

مجھے دیکھ کر کچھ ٹھہرا۔

پھر چلا گیا۔

اب وہ کتنا بدلا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ داڑھی صاف چہرہ صاف، خوب نکھرا ہوا۔ روکھے بال چکنے ہوئے تھے۔ اور مین گیٹ کے پاس پہنچ کر جب اُس نے یہ کہا تھا۔

"میں رات کو جلدی لوٹ آؤں گا!"

تو اُس کی آواز میں کتنا لوچ تھا، کتنا سلیقہ تھا۔

اُس نے کوٹھی کا مین گیٹ کھولا۔ باہر نکل کر گیٹ بند کیا، پھر سر جھکائے سڑک پر آگے بڑھ گیا۔

میں نے دل میں سوچا۔

"میں اس کرائے دار کو کبھی نہیں جانے دوں گی ——!!"

آزاد نظم

انشورنس ایجنٹ - میرا دوست

کرشن موہن ایم اے

مجھے یہ لگا ہے آج تک ہے میرے گھر جب بھی جی چاہے،
وہ میرا دوست بھی ہے اسلئے اس سے مروّت سے بھی اکثر پیش آتا ہوں
کبھی میں اپنے گھر ہوتے بھی اپنے گھر نہیں ہوتا
مگر اکثر یہ ہوتا ہے کہ گھر پکڑا ہی جاتا ہوں
تو اپنے آپ کو ایسے مواقع پر عجب حالت میں پاتا ہوں۔
ہمیشہ مجھ سے میرے فائدے کی بات کرتا ہے
وہ میری خیر خواہی میں مرے ہر آشنا کو مات کرتا ہے،
خیالِ دوستاں دن رات کرتا ہے
وہ میرا خیر خواہِ حال و مستقبل ہے، اُسکی گفتگو میں ایک تیور ہے
وہ کہتا ہے کہ بیمہ تو جوانی کا نشہ، پیری کا زیور ہے
مگر میں کیا کروں گھر کا بجٹ پورا نہیں ہوتا
مری تنخواہ پڑ جاتی ہے کم ہر ماہ جھجکے سے، کہوں کیسے

کبھی کافی نہیں ہوتے مجھے پیسے
کئی بار اس سے اپنی مفلسی کا ذکر کرتا ہوں
مگر وہ مجھ سے کہتا ہے
"تری آسودگی کی فکر کرتا ہوں"
مگر میں ایک شاعر کل کی خاطر آج کے دن فاقہ کش کیوں ہوں
بچانے کے لئے کچھ مال وقفِ کشمکش کیوں ہوں

یہ کس نے کھٹکھٹایا در، یہ کون آیا
کہو گھر میں نہیں صاحب ——
"کب آئیں گے"
"نہیں صاحب نے بتلایا ——

کرشن موہن

HAZELINE
TALCUM POWDER

HAZELINE
HAZELINE SNOW

افسانہ

پیار کی چاندنی

شفیق الرحمٰن ایم کام

دھریا بلاک۔ پوسٹ دھریا (بھاگلپور) بہار

۳۰ مارچ ۱۹۶۳ء محترم جناب خوشتر صاحب! ہدیۂ خلوص

..... لیجئے "پیار کی چاندنی" حاضر ہے۔ اگر اِس کہانی نے "بیسویں صدی" کے معیار کو چھو لیا تو سمجھوں گا کہ میری محنت اکارت نہیں گئی.....

نیاز مند ——— شفیق الرحمٰن

زینت نے آہستہ سے چائے کی ٹرے ٹیبل پر رکھ دی۔

مسہری پر ارشد بڑی بے ترتیبی سے لیٹا ہوا تھا۔ تکیہ سے اُس کا سر
طرف ڈھلک گیا تھا اور سینے سے بادامی رنگ کی اُونی چادر لپٹی ہوئی تھی
ینت نے مُسکرا کر اُس کے خوب صورت چہرے کی طرف دیکھا۔ اور اُس کے
رہانے بیٹھ گئی۔ وہ اُسے دیکھتی رہی اور دل ہی دل میں ایک بے پناہ مسرت
گدگدی محسوس کرتی رہی۔ اُس نے سوچا، جب وہ کنواری تھی تو ایک دن
ملے میں رجسٹرار صاحب کے یہاں شہنائی بجی تھی شیمونہ کی شادی تھی۔ اُس
ت کو اُس نے شیمونہ کے شوہر کو دیکھا تھا۔ بیلے کے پھولوں کے جال میں
دولہا جب عورتوں کے گیت سے بُری طرح شرما رہا تھا تو کتنا خوبصورت
لوم ہوتا تھا۔ فرحت نے کہا تھا "نوشہ بھائی! ذرا چہرہ تو اُوپر اُٹھائیے
پ تو ایسے شرما رہے ہیں جیسے آپ ہی میری باجی ہیں۔" ہائے کیسی مُنہ پھٹ
تی فرحت! لیکن اُنھوں نے بھی تو خوب جواب دیا تھا "شریر لڑکی! اگر
ں تمھاری باجی ہوں تو تمھارے نوشے بھائی ابھی گھوڑے کی پیٹھ سے
ہلانگ لگا کر کمرے میں کیوں چھپ گئے؟ انھیں بھی یہیں بُلا لو۔ اپنی
لہن کو آکر دیکھ جائیں۔" فرحت تو بچہ تھی۔ شرما کر بھاگ گئی۔ لیکن
شب تو یہ ہوا کہ بُوڑھی اور جوان عورتیں بھی اپنے مُنہ میں ساڑی
کے پلو دبا کر ہنسنے لگی تھیں۔ شاید اس لئے کہ بات شائستہ تھی۔ سب کو پسند آئی
ہو۔ اور اب اپنے دل کی بات اپنے ہی سے کیا چھپاؤں۔ سچ تو یہ ہے کہ
مجھے رشک ہونے لگا تھا کیونکہ وہ خوب صورت بھی تھے اور خوش گو بھی معلوم
ہوتے تھے۔ آخر میں بھی تو جوان تھی اور ہر جوان لڑکی کی تمنا یہ ہوتی ہے کہ
اُس کا شوہر بھی خوب صورت ہو۔ خوش گو ہو۔ جو اپنی پیاری پیاری باتوں سے
ہمیشہ اُسے ہنساتا رہے محبت بھری باتیں کرتا رہے۔ اور سچ مچ جیسے خدا
اُس وقت میرے دل کے دریچے میں جھانک کر دیکھ رہا تھا۔ مجھے وہ سب
کچھ مل گیا جو میں نے چاہا تھا۔ اُس نے ایک گہری نگاہ ارشد پر ڈالی۔ اُس کا
چہرہ مُسکرا رہا تھا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے اُس کی جنت اُس کے سامنے
مُسکرا رہی ہے۔ پھر وہ سوچنے لگی۔ یہ مجھے کتنا پیار کرتے ہیں کبھی کبھی
تو مجھے یہ خیال ہونے لگتا ہے۔ دُنیا میں کوئی اور شوہر اپنی بیوی کو
اتنا پیار نہ کرتا ہوگا۔ یہ مجھ سے کہا کرتے ہیں کہ میں ان کے دل کی دھڑکن ہوں۔
میں اُن کی رُوح سے زیادہ پیاری ہوں۔ میں چاند کی نورانی فضاؤں سے
زیادہ معصوم ہوں۔ میں اُن کی نبضوں کا لطیف ترنم ہوں۔ میں اُن کی سانسوں
کی ہلکی ہلکی خوشبو ہوں۔ اور جانے اِسی طرح مجھے یہ اور کیا کیا کہا کرتے ہیں
اور مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہی میری اِن بڑی بڑی آنکھوں کی

پنک ہے۔ یہی میری گھنیری زلفوں کی خوشبو ہیں۔ یہی میرے صبیح رخساروں کی رنگت ہیں۔ میرا سب کچھ ہیں۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ یہ مجھے بہت پیارے لگتے ہیں۔ دنیا کی ساری چیزوں سے زیادہ پیارے!

یہ سب کچھ سوچتے سوچتے وہ ذرا سا ارشد کے چہرے پر جھکی۔ دوسرے ہی لمحے اپنے گالوں پر اس کی سانسوں کی گرم گرم لطیف لہر محسوس کی تو وہ شرم سے دوہری ہوگئی۔

"کیوں! اب تک نیند پوری نہیں ہوئی آپ کی؟"

اس نے آہستہ سے اس کی پیشانی پر اپنی گداز ہتھیلی رکھتے ہوئے کہا۔ ارشد نے آنکھیں جھپکا کر ایک نظر زینت کو دیکھا۔ اور مسکرا کر کہنے لگا۔

"ڈارلنگ! آج مجھے سونے کی اوور ٹائم ڈیوٹی کرنی ہے!"

"لیکن میں نے آپ کے اوور ٹائم کی درخواست رد کر ڈالی ہے۔"

"وجہ تو سنوں آخر؟"

"سننے نہیں دیکھیے۔"

ارشد نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

سامنے زینت کے ہاتھ میں چائے کی گرم گرم پیالی کانپ رہی تھی۔ اور فضا میں اس کی خوشبو تیر رہی تھی۔ ارشد نے ایک گہری سانس لی اور اٹھتے ہوئے کہنے لگا۔

"اوہ زینت، یو آر گڈ!"

"یو ٹو، مائی لارڈ۔"

"وہ کیسے؟"

"وہ اس طرح کہ آپ نے میرے فیصلے کے خلاف پھر کوئی اپیل نہیں کی!"

"ارے میری زینو! تمھاری ہر خواہش میرے لئے ایک حکم کا درجہ رکھتی ہے اور پھر تم تو میرے لئے چائے لائی ہو! بھلا اس کے خلاف کون کافر اپیل کر سکتا ہے۔ اگر تم ایسے فیصلے دن بھر میں سو بار بھی کرو تو میرے سر آنکھوں پر!"

"اچھا اب گپ بند، چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔"

حکم کی فوراً تعمیل کی گئی۔

ارشد نے زینت کے ہاتھ ہی سے ایک چسکی لی اور اس کے بالوں سے کھیلنے لگا۔

"کیا یہ چائے تم نے بنائی ہے؟"

"نہیں، رحمت باجی نے۔ کیوں کیا بات ہے؟"

"شکر کچھ کم ہے۔"

"ٹھہریئے، میں لا کے دیتی ہوں۔"

"نہیں سنو! اپنی ان مخمور آنکھوں کی تھوڑی شراب ہی ڈھال دو نا۔۔۔۔!"

"بس آپ کو تو ہر وقت مذاق ہی چاہئے۔ رحمت باجی اگر سن لیں گی تو کیا کہیں گی؟"

"کہیں گی کیا، وہ جانتی نہیں کہ ہم دونوں جوان ہیں!"

"اوہ! آہستہ بھی نہیں بولتے۔ آپ کو تو جیسے ان کے جذبات کا کچھ خیال ہی نہیں ہے۔"

ارشد یکایک سنجیدہ ہو گیا۔

"مجھے خیال ہے زینت! شاید تم نہیں جانتیں کہ میں نے ان کے متعلق کئی بار بہت گہرائی سے سوچا ہے لیکن کیا بتاؤں قسمت ہی بے چاری کی پھوٹی ہے تو میں کیا کروں؟"

"خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کیجئے۔ آپ ہی سوچئے، آخر وہ بھی تو ایک لڑکی ہی ہیں نا! کوئی بھوت پریت تو نہیں۔"

"نہیں نہیں میں یہ کہاں سوچ رہا ہوں۔ تم تو خواہ مخواہ برا مان جاتی ہو۔ میں تو کوشش میں لگا ہی ہوا ہوں۔ جس دن کوئی مناسب لڑکا مل گیا ان کے ہاتھ پیلے کر کے ڈولی پر بٹھا دوں گا۔"

"بس خالی باتیں ہی تو کرنی آتی ہیں آپ کو۔"

"اتنے تلخ لہجے میں یہ نہ کہو میری زینو! میری دیانت داری اور سچائی کو چوٹ لگتی ہے!"

اور جواب میں وہ اُٹھ کر چلی گئی۔ فضا بدل گئی۔ کچھ ہی دیر پہلے جس ماحول میں خوشیاں ہی خوشیاں تھیں وہاں آگ برسنے لگی۔ فضا میں محبت کی خوشبو کے بجائے گرم گرم جھونکے چلنے لگے۔

ارشد سر تھام کر بیٹھ گیا۔

وہ سوچنے لگا۔

زینت نے اُس کی شادی کے ایک ہی ہفتہ بعد اُسے بتایا تھا کہ اُس کی ایک خالہ زاد بہن رحمت ہے۔ جسے وہ بہت چاہتی ہے اور رحمت بھی اُسے اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتی ہے کیونکہ بچپن ہی میں جب اُس کی ماں اُسے چھوڑ کر اُس دُنیا میں چلی گئی تھی جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا اُس وقت سے وہ اُسی کے ہاں رہتی ہے۔ اُس کے ابّا رتن پور میں ڈاکٹر ورما کے کلینک میں کمپاؤنڈر تھے۔ وہ رحمت کے لئے پھر کوئی ماں نہیں لائے۔ البتہ جب بھی کبھی وہ آتے تھے رحمت کے لئے کھلونے وغیرہ لاتے تھے۔ اور جب رحمت بڑی ہوگئی تو کپڑے، صابن وغیرہ لاتے تھے۔ جس کا نصف حصہ تو وہ برابر زینت ہی کو دے دیا کرتی تھی۔ جانے زینت سے اُسے کتنی محبت ہوگئی تھی۔ حالانکہ گھر میں زرینہ عصمت اور عشرت وغیرہ بھی تھیں۔ لیکن وہ سب سے زیادہ زینت ہی کو چاہتی تھی۔ دن اسی طرح ہنسی خوشی گزر رہے تھے کہ ایک دن غضب ہو گیا۔ رحمت کے ابّا ڈاکٹر ورما کے کمپاؤنڈر شرافت حسین رکولی ندی میں ڈوب کر مر گئے۔ معلوم ہوا۔ برسات کا موسم پورے شباب پر تھا اور وہ ڈاکٹر ورما کے ساتھ کسی تشویش ناک کیس کو دیکھنے جا رہے تھے۔ رتن پور میں وہ کلینک رکولی ندی کے کنارے تھا۔ ندی میں پانی کافی چڑھ آیا تھا۔ شرافت حسین نے ڈاکٹر ورما کو ندی میں جیپ اُتارنے سے منع کیا تھا لیکن وہ نہ مانے اور جب جیپ بیچ دھارے میں آئی تو کسی بڑے سے کھڈ میں اُلٹ گئی۔ ڈاکٹر ورما تو کسی طرح بچ گئے لیکن شرافت حسین نہ بچ سکے۔ ڈاکٹر ورما نے اِس حادثہ کی خبر زینت کے والد علی حیدر صاحب کو بھجوا دی۔ رحمت کو جب یہ خبر ملی تو چیخ مار کر جو گری تو اُسے دو دن تک ہوش نہ آیا۔ لیکن وقت انسان کا بہت بڑا رفیق ہے کتنا ہی بڑا حادثہ کیوں نہ ہو وقت اُس کے غم کو ہلکا کر ہی دیتا ہے۔ اور یہی رحمت کا بھی ہوا۔ گزرے لمحات نے اُس کے آنسو خشک کر دیئے۔ اُس کے دل سے غم والم کے منوں بوجھ دھیرے دھیرے اُترتے گئے۔ اور کچھ دن بعد زینت کے والدین کی شفقت پا کر وہ سب کچھ بھول گئی۔ رحمت بڑی تیزی سے جوان ہوتی گئی اور جب ایک دن زینت نے چپکے سے آ کر اُس کے کان میں کہا کہ اُس کے لئے ایک گورے چٹے خوبصورت دُولہا کی تلاش ہو رہی ہے تو وہ شرم سے یوں سمٹ گئی جیسے کسی نے چھوئی موئی کی پتیوں کو زور سے پھونک مار دی ہو۔ اور اُس کی پوری کی پوری شاخ سمٹ کر جھک گئی ہو۔ اُس کی شادی کی فکر علی حیدر صاحب کو تو تھی۔ زینت کی ماں کو زیادہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اُن کے بار بار ٹوکنے پر ہی حیدر صاحب نے ایک جگہ بات پکی کر لی۔ لڑکا اچھا تعلیم یافتہ تھا اور کسی بڑی فرم میں شعبۂ اشتہارات میں ایک ذمّہ دار منیجر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ لیکن اُس کی شرط یہ تھی کہ وہ امریکہ سے اعلیٰ ٹریننگ حاصل کر کے لوٹنے کے بعد ہی شادی کرے گا۔ اور اِدھر زینت کی ماں بضد تھیں کہ کم از کم عقد ہی ہو جاتے۔ اور امریکہ سے لوٹنے پر باقی رسمیں ادا کی جائیں۔ اُن کی یہ ضد پوری ہوگئی۔ رحمت کا عقد علی حیدر صاحب نے بڑی دھوم دھام کے ساتھ شمشاد سے کر دیا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ ایسی تقریب تزک و احتشام کے اعتبار سے شہر میں واحد تھی۔ علی حیدر صاحب نے ہائی کورٹ میں دس سال کی پریکٹس کی کمائی اس تقریب میں خرچ کر دی وہ لوگوں سے یہی کہا کرتے تھے کہ وہ اپنی لڑکی کی شادی کر رہے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ رحمت کو بے حد مانتے تھے۔ عقد کے وقت شمشاد نے جب قاضی صاحب کے پوچھنے پر کہا "جی ہاں میں نے قبول کیا" تو علی حیدر صاحب کے آنسو تھے کہ تھمتے ہی نہ تھے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اُن کے وہ آنسو خوشی کے تھے یا غم کے۔ خوشی تو اُنھیں اتنی تھی کہ شام کے وقت تک وہ سب سے ہنس ہنس کر یہی کہہ رہے تھے کہ بھئی یہ تو خدا کا فضل و کرم ہے۔ ورنہ وہ شرافت صاحب کی دی ہوئی اتنی بڑی ذمّہ داری کو کیسے نباہ سکتے تھے۔ لیکن اِس خوشی میں بھی اُنھیں غم تھا

ت کو اپنے کلیجے کا ٹکڑا سمجھتے تھے۔ اور وہ اُس دن اُن سے جُدا ہو
تھی۔

لیکن کون جانتا ہے کہ وقت کے سینے میں حادثات کے کتنے بڑے
ے جو الا مُکھی پوشیدہ ہیں جو کسی بھی وقت پھٹ کر کسی کی خوشیوں کو پلک
پکتے جھُلس سکتے۔ بھلا کوئی یہ جانتا تھا کہ عقد کے وقت رحمت کے جو مہندی
ائی گئی تھی۔ اُس کا سُرخ رنگ اِتنی جلدی سیاہ ہو جائے گا۔ اُسکی مانگ
ں جو سیندور گیتوں کی آواز میں بھر اگیا تھا۔ وہ اِتنی جلدی آنسوؤں
چھاؤں میں پونچھ دیا جائے گا۔ لیکن یہی ہوا اور عقد کے چوتھے ہی دن
ا۔ جب کہ شمشاد اپنے پروگرام کے مطابق امریکہ جا رہا تھا۔ اور راستے
ہیں طیارے میں آگ لگ جانے سے سارے مسافروں کے ساتھ شمشاد
ں پلک جھپکتے ہی ختم ہو گیا تھا۔ علی حیدر صاحب تو اپنے دروازے پر
نا کے تار کا انتظار کر رہے تھے کہ وہ امریکہ کیسے پہنچا۔ لیکن اُنھیں اِس
دثے کی خبر ملی۔ سارے گھر میں آگ لگ گئی۔ اُس آگ میں رحمت تو
کل جل کر خاک ہو گئی۔ اُس کی چوڑیاں پگھل گئیں۔ مانگ کا سیندور
ڑ گیا۔ بدن پر بیوگی کا کفن لپٹ گیا۔ اور وہ سب کچھ ہو گیا جو کبھی نہ
نا چاہیئے تھا۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہوئی کہ رحمت کو علی حیدر
حب کی شفقت کی بجائے نفرت ملنے لگی۔ زینت کی ماں اُس کے

سائے سے یوں بھاگنے لگیں جیسے رحمت دُنیا کی سب سے منحوس ترین
بیوہ ہے۔ محلّے کے لوگ اُسے حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے۔ اور رفتہ
رفتہ لوگوں سے اُسے کیا نہ ملا؟ مکروہ نگاہیں۔ زہر میں ڈوبی ہوئی نگاہیں
طعنے، تشنے، کوسنے، گالیاں، سب کچھ۔ لیکن زینت ایسی نہ تھی۔ اُس نے
سب کے دلوں میں رحمت کے لئے نفرت و حقارت کی آگ دہکتے دیکھی
تو اُس نے رحمت کو اپنے دل کی گہرائیوں میں ایسا چھُپا لیا جیسے سیپ
موتی کو۔ رحمت بھی اپنی زندگی کی خاردار پگڈنڈی پر چلتے چلتے اپنے پاؤں کو
لہو لہان کر چکی تھی۔ وہ زینت کے پیار کی چھاؤں میں آکر پناہ لینے لگی۔
پھر اُسی درمیان زینت کی شادی ہو گئی۔ اور جب زینت نے شادی کے
ایک ہی ہفتے بعد رحمت کی دُکھ بھری کہانی سُنا کر اُس سے کہا کہ اُسے وہ ہمیشہ
اپنے ساتھ رکھنے کی سوچ چکی ہے! تو زینت کے لئے اُس کے دل میں بے
پناہ محبت اُمڈ آئی۔ اور اب اِس شادی کو دو سال ہو گئے۔ اِس دوران میں
زینت نے ہزاروں بار ہاتھ جوڑ جوڑ کر، قسمیں دے دے کر کہا کہ وہ رحمت کے
لئے کوئی اچھا سا لڑکا تلاش کر دے۔ لیکن ....

اور آگے وہ کچھ نہ سوچ سکا۔

خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ زینت پھر کمرے میں واپس آگئی۔

"کیوں آپ نے ابھی تک چائے نہیں پی؟"

"پی لوں گا۔ لیکن تم ذرا ٹھہرو۔ مجھے کچھ کہنا ہے۔"

"بولئے!"

"بیٹھو تو سہی۔"

زینت ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

"وہاں نہیں، میرے پاس اِس سہری کا یہ!"

زینت اُس کی بغل میں آکر بیٹھ گئی۔

ارشد نے اُس کی بڑی بڑی آنکھوں میں جھانکا اور مُسکرا دیا۔ وہ
بھی مُسکرا دی۔

"اب بول بھی دیجیئے۔"

"اچھا اب تم ہی بتاؤ میں تم سے کیا کہنا چاہتا ہوں؟"

- کسی سے بگاڑ کر کے اُسے پھر دوست بنانا ایک بڑے دشمن کو پالنا ہے۔ (گریگوری)
- ہر شخص سچا دوست ڈھونڈتا ہے۔ لیکن سچا دوست بننے کی تکلیف کوئی گوارا نہیں کرتا۔ (بٹلر)
- اپنے دوست پر اُس کے عیب ظاہر کرنا سب سے اہم اور مشکل کام ہے۔ (بیچر)
- ایک دو گھنٹے فاضل کام کرنا گویا دولت کا ایک نیا حصّہ اپنی آمدنی میں بڑھانا ہے۔ (سر آرتھر ہلپس / ڈکنس)

"ویسے تو آپ کی مرضی۔ لیکن میں یہی چاہتی ہوں کہ آپ کہیں زینت!
تمھاری ہی محبت کی قسم تم مجھ سے رُوٹھا نہ کرو!"

"اچھا! تم کیا جواب دینے والی ہو؟"

"یہی کہ میرے سرکار! آپ کے ایک غمگین لمحے پر میری زندگی کی
ساری خوشیاں قربان ہیں۔ میں آپ سے رُوٹھ کر اپنی خوشی کا ایک لمحہ بھی
ضائع کرنا نہیں چاہتی۔"

"اوہ زینت! کتنی گہری ہے تمھاری محبت، کتنے بلند ہیں تمھارے
خیالات؟ میں تمھیں کیسے بتاؤں زینت کہ میں تمھاری ان ہی باتوں کو سننے
کے لئے بے چین رہتا ہوں۔ تمھیں پاکر تو جیسے میں نے دُنیا کی ساری خوشیاں
پالی ہیں!"

ارشد نے کہتے کہتے اُس کے کاندھے پر اپنا سر رکھ دیا۔ زینت نے
لپک کر اُس کی پیشانی کو چُوم لیا۔

اور پھر خود ہی شرم سے سُرخ ہوگئی۔

وہ پرے ہٹ گئی۔

ناشتہ کی میز پر ارشد نے زینت سے کہا۔

"میں اِس وقت ڈپٹی ظفیر صاحب کی طرف جا رہا ہوں۔ رحمت کی
نسبت کے متعلق باتیں کرنے۔ تم کھانے پر میرا انتظار نہ کرنا اور ہاں اپنی باجی
سے کہہ دیں کہ وہ مٹھائی وغیرہ منگا کر رکھیں۔"

اُسی وقت رحمت کسی کام سے کمرے کے سامنے سے گزر رہی
تھی۔ اُس کے کان میں جب ارشد کی یہ آواز گونجی تو اُسے ایسا محسوس ہوا
جیسے شبنم کے کسی قطرے نے کسی سُوکھے پتے پر گر کر اُسے تازگی بخشی ہو۔
اور پھر زمین پر ڈھلک کر روپوش ہوگیا ہو۔ اُس کے افسردہ ہونٹوں پر نہ
کوئی مسکراہٹ اُبھری اور نہ اُس کے جذبات کی پُرسکون جھیل میں کوئی تلاطم
ہی پیدا ہوا۔

تھوڑی دیر بعد ارشد چلا گیا۔

زینت نے اُسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"بس آپ جلدی سے خوش ہو جائیے باجی! جب وہ نکل کر گئے
ہیں تو کوئی اچھا سودا کر کے ہی لوٹیں گے۔"

"خاموش رہو زینت، مجھے پریشان نہ کرو۔"

"اچھا تو گویا میں آپ کو پریشان کر رہی ہوں۔ لیکن آپ کو میری قسم
بتائیے، یہ پریشانی کیسی لگ رہی ہے؟"

"مجھے زیادہ دق نہ کرو۔ پریشانی جیسی بھی ہو پریشانی ہے۔ اور پھر
تمھارا یہ مذاق میری گزشتہ زندگی پر ایک طنز ہے۔"

"باجی! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟"

"زینت! جس راہ پر میں گامزن آرہی ہوں، خدا کے لئے مجھے پلٹ کر دیکھنے
پر مجبور نہ کرو۔ منع کر دو انھیں کہ میرے لئے وہ کچھ نہ کریں۔ میں صرف زندگی
کی سخت دھوپ سے پریشان ہو کر تمھارے پیار کی چھاؤں میں سُستانے بیٹھ گئی
ہوں۔ میرے پاس خدا کی دی ہوئی ایک امانت ہے۔ جسے میں نے ایمانداری کے
ساتھ اُس کے پاس پہنچانے کی قسم کھالی ہے۔ اگر تم مجھے زیادہ پریشان کروگی
تو میں اُس امانت کو یہیں چھوڑ کر چلی جاؤں گی!"

"باجی خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کیجئے۔ لیکن آپ ہی ذرا سوچئے کہ زندگی
کا اتنا لمبا سفر آپ اکیلی کیسے طے کر سکیں گی؟"

"انھیں کسی مرد کی ضرورت ہوتی ہے جنھیں تنہا نہیں چلنا ہے لیکن
جس کی قسمت میں تنہا ہی چلنا ہے اُسے کسی مرد کی ضرورت کا احساس ہی نہیں ہوتا۔"

- جو لوگ ورزش کے لئے وقت نہیں نکال سکتے انھیں
بیماری کے لئے وقت دینا ہوگا۔ (آرل ڈربی)
- جو جلد بازی بوتا ہے وہ بدہضمی کاٹتا ہے۔
(آر۔ ایل۔ اسٹیونس)
- طبیب کو جھوٹا نہیں ہونا چاہئے کیونکہ جھوٹ خیانت ہے
اور طبیب میں خیانت نہ ہونی چاہئے۔ (حکیم ابوسہل)
- ہنسنا اور خوش رہنا صحت کے لئے اتنا ہی ضروری
ہے جتنا غذا کو چبا کر کھانا۔ (ڈاکٹر ہوریس فلیچر)

عشق است و ہزار بدگمانی

امرچند قیس جالندھری

یہ کیا لکھا ہے؟ محبت کا مجھکو پاس نہیں؟
تیرے خیال کو دل سے بھلا رہا ہوں میں؟
وفا سے دور، بہت دور جا رہا ہوں میں؟
ہوا ترے چمنِ دلکشی کی راس نہیں؟

نہیں نہیں یہ ترا وہم ہے یہ بات نہیں
یہ خواب میں بھی نہ لانا کہ تجھ سے بے خبر ہوں میں
گماں نہ کر کبھی کم ظرف اس قدر ہوں میں
دل ایک ہے مرے سینے میں پانچ سات نہیں

یہ کیا لکھا ہے! مرے دعوے سب دروغ و غلط؟
فریب تھے سبھی قول و قرار؟ محض فریب؟
تمام عہد تھے ناپائیدار؟ محض فریب؟
سفید جھوٹ مرے وعدے سب دروغ و غلط؟

تجھے بھلا کے کہیں کا میں رہ نہیں سکتا
کسی سے دل میں لگاؤں یہ غیر ممکن ہے
کسی کے فقروں میں آؤں یہ غیر ممکن ہے
ہوس کی رو میں مرا عشق بہہ نہیں سکتا

یہ کیا لکھا ہے! کسی سے میں دل لگا بیٹھا؟
کسی کی زلف کا اب میرے دل پہ سایا ہے؟
مری نگاہ میں اب اور کوئی جلوہ ہے؟
تجھے یقیں ہے تری یاد تک بھلا بیٹھا؟

مرے قدم میں کبھی لغزش آ نہیں سکتی
مری نظر نہ اٹھے گی کسی حسیں کی طرف
پری جمال، گل اندام، مہ جبیں کی طرف
وہ حور بھی ہو تو دل میں سما نہیں سکتی

امرچند قیس

سورج تنہا ہی ابھرتا ہے۔ اور سارا دن اپنی آگ میں جلتے جلتے شام کو مر جاتا ہے۔ "لیکن چاند کے ساتھ لاکھوں ستارے چلتے ہیں۔ کیونکہ اُسے ستاروں کی مدد کی ضرورت ہے۔ وہ اکیلا سفر کر ہی نہیں سکتا۔ میری زندگی بھی سورج کا ایک دہکتا ہوا گولہ ہے زینت! مجھے میری آگ کے سوا اور کچھ نہیں چاہئے۔ اور نہ خود کسی کو میرے نزدیک آنا چاہئے۔ میں نے زندگی کے آسمان پر اُبھرتے ہی سب سے پہلے اپنے قریب بیٹھی ہوئی ماں کو بھسم کر دیا۔ اُوپر چڑھتے چڑھتے اپنے باپ کو جلا کر راکھ کر دیا۔ اور ڈوبتے ڈوبتے شمشاد کو جھلس کر خاک کر دیا۔ میں خود اب ڈوب گئی۔ میری تو ساری دُنیا تاریک ہو گئی۔"

"لیکن باجی! چاند تو اب نکلنے والا ہے۔"

"چاند نہ کہو زینت! آسمان کے چہرے پر سورج کی نحوست کا ایک گہرا داغ ہے۔ جو کوڑھ کے داغ سے زیادہ کریہہ ہے۔ خدا کے لئے مجھے ان سب چیزوں کی یاد مت دلاؤ۔ مجھے ان سب چیزوں سے سخت نفرت ہو گئی ہے۔ جلتی راکھ کو بھلا شبنم کی خنکی کا کیا پتہ۔ البتہ شبنم کے قطرے آگ کے قریب آتے ہی بھاپ بن کر اُڑ جاتے ہیں۔ میرے احساس پر بجلی گر پڑی ہے۔ میرے دل میں نفرت کی آگ دہک رہی ہے۔ جہاں خوشیوں کی شبنم جل جائے گی زینت!"

اور دوپہر کے ٹھیک دو بجے۔

جب ارشد باہر سے لوٹ کر آیا تو اس کے چہرے پر ناکامیاں رو رہی تھیں۔ وہ جب بھاری بھاری قدموں سے چل کر اپنے کمرے میں آیا تو زینت بھی پیچھے پیچھے آ گئی۔ اس نے آہستہ سے پٹ بند کیا اور اس کے اُلجھے ہوئے بالوں میں اپنی پتلی پتلی انگلیوں سے

سی کرنے لگی۔

"کیا کہا ڈپٹی صاحب نے؟"

"وہ تیار نہیں ہوئے۔ کہنے لگے کہ ابھی
کے کو تھیسس جمع کرنا ہے۔ ہم اُس کے
اکٹریٹ کرنے کے بعد ہی بات چیت کریں
لے!

"کمرے میں ایک بھیانک سناٹا چھا
ا تھا!

قبرستان کا سا سناٹا۔

"لیکن زینت! میں رحمت کی شادی
کے ہی دم لوں گا۔ اُس کی زندگی کو برباد
نے سے بچاؤں گا۔"

زینت خاموش تھی۔ اُسے ارشد کے
ادے ایسے ہی معلوم ہو رہے تھے۔ جیسے
ی اپنی محبوبہ کی موت کے وقت اُس سے کہہ
ا ہو "میں بھی تمہارے لئے ایک تاج محل
اکر رہوں گا۔"

"ارے ہاں خوب یاد آیا۔ ایک لڑکا
در ہے۔"

طوفان تھم گیا۔

"وہ کون ہے؟"

"تم اُسے نہیں جانتی ہو۔ پوسٹ گریجویٹ
ہے اور تقریباً ڈھائی سو روپے ماہوار کما
رہا ہے۔ خوب صورت تو ایسا ہے کہ اگر تم
اُسے دیکھو تو مجھے پہچاننے سے انکار کردو۔" ارشد نے مسکرا کر کہا۔

"مذاق نہ کیجئے۔ اب بتا بھی دیجئے۔ کون ہے، کس کا لڑکا ہے؟"

"لیکن ٹھہرو۔ شاید اُس کی شادی ہوچکی ہے۔"

منظوم افسانہ

امیر کی بیوی

— بابو کرشن گوپال مغموم بی۔اے —

زمانہ ہوگیا، رہتک میں اک حسینہ تھی ۔ امیر باپ کی بیٹی بہ اسم لیلا تھی

غریب باپ کا بیٹا تھا ایک چندرپال ۔ جہانِ حُسن میں ڈھونڈے ملی نہ جس کی مثال

وفا کے قول محبت کے بھی قرار ہوئے ۔ تمام عمر رفاقت کے بھی قرار ہوئے

پھر ایک سلسلۂ نامہ و پیام چلا ۔ زیادہ دیر مگر اس طرح نہ کام چلا

جو راز فاش ہوا والدین پر اک دن ۔ تو برق گر ہی پڑی جانبین پر اک دن

امیر باپ نے لیلا کو خوب دھمکایا ۔ خط اُس کے ہاتھ سے چندر کے نام لکھوایا

لکھا تھا خط میں کہ ترکِ تعلقات کرو ۔ نہ بھول کر بھی کبھی مجھ سے کوئی بات کرو

امیر باپ کی بیٹی ہوں میں غریب ہو تم ۔ مرا نصیب چمکتا ہے، بدنصیب ہو تم

امیری اور غریبی کا ساتھ، ناممکن ۔ تمہارے ہاتھ میں ہو میرا ہاتھ، ناممکن

یہ خط ملا تو ہوا نیم مُردہ چندرپال ۔ لبوں پہ آہ تھی آنکھوں میں اشک رُوح نڈھال

ہجومِ یاس اُسے لے گیا سٹیشن تک ۔ وہاں پہنچ کے، ذرا دُور، ایک انجن تک

لہو کے چھینٹے تھے ٹکڑے تھی لاش اک غل تھا ۔ ہاں آہ! یہ اک نو جوان عاشق کا!

چھپتی اُس کی بنی گو امیر کی بیوی ۔ مگر ہے دل سے ابھی تک فقیر کی بیوی

کرشن گوپال مغموم

ارشد نے دماغ پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔

"تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ ایک بیوی کے مرنے کے بعد دوسری اور
اُس کے بعد تیسری مرد کرتے ہی ہیں۔"

"یہی تو مشکل ہے زینت کہ اُس کی بیوی زندہ ہے۔ اور اُسے وہ بے انتہا چاہتا بھی ہے!"

"اچھا تو پھر عجیب آدمی ہے وہ!"

"ہاں! ہے تو عجیب ضرور۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ اسلام نے تو چار شادیوں کی اجازت دے رکھی ہے۔ اِس لئے اگر وہ دُوسری شادی کرتا ہے تو کوئی گناہ نہیں کرتا۔"

"نہیں میں ایسی جگہ رحمت باجی کی شادی نہیں ہونے دوں گی۔ میں نہیں چاہتی کہ کسی کی زندگی کے آنگن میں جہاں پیار کی چاندنی بکھری ہو، وہاں سُورج کی جلتی ہوئی کوئی کرن پہنچے۔"

"لیکن زینت! رحمت تمھاری عزیز سہیلی ہی نہیں، بڑی بہن بھی ہیں کیا تم دونوں ایک ساتھ رہ کر ہمیشہ خوشی کی زندگی نہیں گزار سکتی ہو؟"

"کیا کہا ——— ؟؟؟"

زینت ایک دم چیخ اُٹھی۔

جیسے وہ کسی برقی تار سے ٹکرا گئی ہو۔ اُس کے دماغ میں تیز تیز آندھیاں چلنے لگیں۔

وہ بوکھلا گئی۔

جیسے کوئی بجلی گرنے والی ہو۔

جیسے سُورج کا گولا چاندنی میں اُترنے والا ہو۔

وہ رونے لگی۔ پھُوٹ پھُوٹ کر۔ ایک بچے کی طرح!

تھوڑی دیر بعد ارشد نے اُس کی ٹھوڑی پکڑ کر اُوپر اُٹھائی۔ تو زینت نے کہا۔

"کاش میرے چہرے کو اُوپر اُٹھانے کی بجائے آپ میرے دل کی گہرائی میں جھانک کر دیکھتے۔"

"میری زنّو! میں نے سب کچھ دیکھ لیا۔ تم تو میرے پیار کی چاندنی ہو!!"

زینت نے ارشد کو التجا بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ایسے میں کہیں سُورج نکل آئے تو؟"

"نہیں زینت ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ چاند اور سُورج بھی کہیں ساتھ نکلتے ہیں؟"

ارشد نے کہا۔

اور پیار سے زینت کی پیشانی چوم لی!!

ملک کے مایۂ ناز ادیبوں کے لکھے ہوئے دلچسپ شاہکار

آج کی بات آپ کے محبوب افسانہ نگار جناب جگدیش سہل کے دلچسپ بلند پایہ افسانوں کا حسین مجموعہ جن کے کرداروں کے قہقہوں اور آنسوؤں کو آپ اپنے قہقہے اور اپنے آنسو سمجھنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے

جو عورت ننگی ہے نامور فنکار ام سہل کی رُومان پرور اور تلخ کہانیوں کا حسین مجموعہ۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

میرے سپنے نامور افسانہ نگار خاتون پروفیسر کرشنا کماری ایم اے کے بہترین دلچسپ رُومانی افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت فی جلد صرف تین رُوپے۔

سنگھار کمرے میں پروفیسر کرشنا کماری ایم اے کے بہترین دلچسپ رُومانی افسانوں کے اس مجموعے کے ہر صفحے پر جذبات کا ایک حشر انگڑائیاں لے رہا ہے۔ قیمت دو روپے

دُکھتی رگیں ہر افسانے میں جوانی کا اضطراب ہے، حُسن کی بے کلی ہے، عشق کی بیقراری ہے۔ مصنف جناب شمس نظفر پوری۔ قیمت فی جلد دو رُوپے۔

ایک حمام میں تین ننگے زندگی کی عریاں تصویریں۔ وقت کی دُکھتی ہوئی رگ پر سعید امرت کی فنکارانہ ضرب۔ قیمت فی جلد صرف دو رُوپے۔

کالی راتیں سعید امرت کے افسانوں کا تازہ ترین مجموعہ۔ تشنہ جوانیوں کے اندھے جذبات کی ترجمان۔ بہکے ہوئے بڑھاپے کی ہوسناکیوں پر طنز ہیں اور کالی راتوں میں رینگنے والے گناہوں پر ضرب کاری ہیں۔ قیمت فی جلد تین رُوپے۔

یہ لڑکیاں رنگ رنگ کی شوخ و شنگ لڑکیوں کے جذبات و احساسات کی تصویریں۔ اختر ملیح آبادی کے افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت فی جلد تین روپے۔

عورت ایک پہیلی کیا عورت واقعی ایک پہیلی ہے؟ سمجھ میں نہ آنے والی پہیلی؟ اس کا جواب آپ راج کنول کے سولہ دلکش رُومانی افسانوں میں پائینگے قیمت فی جلد صرف تین رُوپے۔

پوسٹ مارٹم عرش ملسیانی کے مزاحیہ افسانوں اور مضامین کا حسین و جمیل مجموعہ جس میں مسکراہٹوں اور قہقہوں کی ایک دُنیا آباد ہے۔ قیمت سوا دو رُوپے۔

سیاہ تاج محل موہن یاور کے افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت تین روپے۔

فردوس اُردو ناول نگاری کی تاریخ میں ایک قابلِ قدر اضافہ۔ مصنفہ شکیل جمالی اس کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گیا اور اب دوسرا ایڈیشن قارئین کے اصرار پر نہایت آب و تاب سے شائع کیا گیا ہے۔ قیمت فی جلد دو رُوپے۔

۱۹۵۷ء کی دِلّی جناب مہیشور دیال نے اس میں تاریخی خاکوں کے واضح نقوش کو ایک پُر کیف داستان کے رُوپ میں پیش کیا ہے۔ جس میں آپ حُسن و شباب کی رنگینیوں ہی سے نہیں، جذبۂ حُبّ الوطنی، ایثار، اخوت و محبت اور رواداری کے چشموں سے بھی سیراب ہوں گے۔ دلّی کی ٹکسالی زبان، قلعۂ معلّے کی رسیلی، دل موہ لینے والی زبان کی حلاوت آپ کچھ جناب مہیشور دیال ہی کے زورِ قلم میں پائیں گے۔ کیونکہ یہ اُن کی اپنی مادری زبان ہے۔ قیمت فی جلد صرف تین روپے۔

ڈارلنگ جناب نریش کمار شاد کے منتخب طبع زاد افسانوں کا بے مثل اور حسین و جمیل مجموعہ۔ قیمت دو رُوپے ۵۰ نئے پیسے۔

سُرخ حاشیے اُردو کے مشاہیر ادیبوں کے دلچسپ لطیفے۔ قیمت دو روپے پچھتر نئے پیسے۔

راکھ تلے غیر ملکی افسانہ نگاروں کے شاہکار افسانے ہندستانی لباس میں۔ قیمت دو روپے۔

مالوا میکسم گورکی کے شہرۂ آفاق ناولٹ کا ترجمہ۔ قیمت ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے۔

سیاہ پوش خاتون یہ ایک دلچسپ اور ولولہ انگیز ناول ہے جو بیک وقت رومانی بھی ہے اور جاسوسی بھی۔ ایک پُراسرار سیاہ پوش خاتون کی کہانی حصہ اوّل دو روپے، دوم چار روپے۔

شہرِ دل جناب محسن زیدی کی غزلوں کا حسین انتخاب۔ محسن زیدی نے شہرِ دل کو آرزوؤں کی نوخیز کلیوں سے سجایا ہے۔ قیمت صرف دو رُوپے۔

سفینہ و ساحل جناب عزیز وارثی کا مجموعۂ کلام، ان کی شاعری میں اتنی توانائی، قوت اور دلآویزی ہے کہ نسلوں تک فراموش نہ کیا جا سکے گی۔ قیمت صرف چار روپے

گُلِ رعنا جناب برج لال جگی رعنا کا تازہ مجموعۂ کلام جو موجودہ دَور کی بہترین شعری خوبیوں سے مزین ہے جس کے مطالعہ کے بعد آپ یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ گُلِ رعنا واقعی بہترین شعری مجموعہ ہے۔ قیمت ساڑھے تین روپے۔

پتہ:- رسالہ بیسویں صدی دہلی نمبر ۶

رعنا جگی بی۔اے

وہ بھی کیا لوگ تھے جو بے سر و ساماں نکلے
ہائے گنتی کے بھی کمبخت نہ احساں نکلے

دل میں ڈوبے ہوئے نالے سرِ مژگاں نکلے
اشک بن بن کے مرے حسرت و ارماں نکلے

گل جو خاروں کو سمجھتے تھے حریفانِ چمن
وہی غارت گرِ تنظیمِ گلستاں نکلے

چیر کر سینۂ ذرات کو دیکھے جو کوئی
گرمِ خونِ دلِ خورشیدِ درخشاں نکلے

تھا کناروں ہی سے وابستہ سفینے کا ثبات
وقت پڑنے پہ وہی نوح کا طوفاں نکلے

ناز تھا جن کو تبسم پہ وہ غنچے آخر
چاکِ دل، چاکِ جگر، چاکِ گریباں نکلے

چند خوابوں کے سہارے پہ ہیں زندہ ہم لوگ
اور یہ خواب اگر خوابِ پریشاں نکلے

ذکر تک جن کا نہ تھا کل کسی افسانے میں
آج وہ لوگ ہر افسانے کا عنواں نکلے

یہ بھی اک معجزۂ خاکِ گلستاں ہے کہ خار
بڑھ کے پھولوں سے ہوا خواہِ گلستاں نکلے

ہائے وہ بھول کہ ہونا تھا جنھیں حسنِ چمن
داغِ رخسارِ چمن، زخمِ بہاراں نکلے

سرفروشانِ محبت کا جنوں کیا کہیئے
وادیٔ دار و رسن میں بھی غزل خواں نکلے

آہ یوں دل سے نکلتی ہے کبھی جیسے کوئی
رات کے پچھلے پہر توڑ کے زنداں نکلے

سائے کی طرح مرے ساتھ جو رہتے تھے کبھی
سانس کی طرح وہی مجھ سے گریزاں نکلے

زندگی خواب سے بیدار حقیقت ہو جائے
خود فریبی کے فسوں سے اگر انساں نکلے

صورتِ غنچہ جو آئے تھے تبسم بر لب
تیری محفل سے وہی اشک بداماں نکلے

شاخِ گل پہ جو بہاروں کا نشاں تھے رعنا
دستِ گلچیں میں وہی گل شرر افشاں نکلے

رعنا جگی

افسانہ

خول

بشیشر پردیپ ایم۔ ایس سی

نمبرا ۔ منگٹو نیا ایدی نیو ۔ بندریا باغ لکھنؤ

۳ اپریل ۱۹۶۳ء

محترم خوشتر صاحب تسلیم

.... یہ ایک ستم رسیدہ عورت کی کہانی ہے جسے قدرت نے زمانے کے جور و ستم سے بچانے کے لئے ایک "خول" عطا کر دیا ہے ۔ وہ ماضی کی وادیوں میں گم ہو گئی ہے ۔ دیکھئے امیرا اپنی اس دنیا سے کتنی مسرور، کتنی مطمئن ہے؟ اور اب ذہن کے دل میں اس کے لئے ابھرتی ہوئی چاہت یہ چاہتی ہے کہ اس کا یہ خول ٹوٹ جائے ۔ افسانہ قدرے طویل ضرور ہے لیکن دلچسپی آخر تک قائم رہتی ہے ۔ اس لئے امید ہے کہ طوالت قارئین کو بور نہ کرے گی .... افسانہ نمبر کی کامیابی کیلئے دعاؤں اور "بیسویں صدی" کے لئے نیک تمناؤں کے ساتھ ......

آپ کا ——— بشیشر پردیپ

ایک چھوٹا سا خوبصورت بنگلو ۔ بنگلے میں گھر کی مالک جدید فیشن کے زیور، کپڑے پہنے ، نوکروں پر حکم چلاتی ہوئی ۔ کبھی باہر باغیچے میں پھولوں کے گملوں میں شغل کے طور پر پانی ڈالتی ہوئی ۔ کبھی برآمدے میں دھوپ میں بیٹھی آرام کرسی پر بیٹھی کوئی کتاب یا اخبار پڑھتی ہوئی ۔ یا اون کے گولوں کو گود میں رکھے سلائیوں سے اپنے ان کا سویٹر بنتی ہوئی ۔ ان کا انتظار کرتی ہوئی ۔ باہر لان میں دو چھوٹے چھوٹے پیارے سے بچے کھیلتے ہوئے ۔ کلکاریاں بھرتے ہوئے .... یہ خواب تھے جو میرا نے اپنی شادی سے پہلے دیکھے تھے ۔ اور یہ خواب دیکھتے وقت وہ شرمائی تھی ۔ لجائی تھی اور اس نے گدگدی سی محسوس کی تھی ۔ کنوارپنے کی معصوم شرم اور ہلکی ہلکی ، میٹھی میٹھی گدگدی! اور اب شادی کے بعد بھی ان خوابوں کی پرچھائیاں اس کی یادداشت کے خانوں میں موجود تھیں لیکن یہ خواب پورے نہ ہوئے تھے ۔ بنگلہ ، زیور ، کپڑے اور نوکر چاکر تو مل گئے تھے ۔ لیکن پتی کا پیار نہ ملا ۔ پھول سے بچے نہ ملے ۔ اس لئے کچھ بھی نہ ملا ۔ خوابوں کی اس تصویر کا صرف فریم ہی ملا ۔ اس میں سے تصویر غائب تھی!

کالج کے دنوں میں وہ اتنی شوخ تھی کہ سہیلیوں کے ساتھ ہر وقت غلطی اور شادی کے بعد کی زندگی ہی کی باتیں کرتی رہتی ۔

"بھئی میں تو اپنا میچ دیکھنے کے بعد، پسند آنے کے بعد شادی کروں گی۔"

"ایسے بچوں کے بغیر بھی کوئی گھر ہوتا ہے ۔ عورت تو ماں بننے کے بعد ہی اپنی معراج کو پہنچتی ہے ۔ لیکن ایک بات تو طے شدہ ہے کہ ہم اتنی بڑی فیملی نہیں بنائیں گے ۔ بہت مختصر بس صرف دو بچے ۔ یا زیادہ سے زیادہ تین، ہاں!"

"میں ہر وقت گھر اور چولھے کی ہو کر نہیں رہ جاؤں گی ۔ کچھ سوشل لائف بھی تو ہونی چاہئے ۔ زندگی میں کوئی ایکٹیوٹی نہ ہو تو زندگی بوجھ بن کے رہ جاتی ہے!"

"ابھی اپنے ان کو تو یوں اپنا بناؤں گی کہ وہ کہیں بھی میرے بغیر نہیں جا سکیں گے ۔ بھئی یہ تو عورت کے اپنے ہاتھ کی بات ہے ۔ وہ چاہے تو مرد کو باندھ کر رکھ لے ۔ کلب ، سینما ، دوستوں کے ہاں جہاں بھی وہ جائیں گے

میں ساتھ رہوں گی۔"

اور شادی سے پہلے اس نے لڑکے کو دیکھ لیا تھا۔ جب اس کے لئے ایک جگہ رشتہ کی بات تقریباً طے ہو چکی تھی تو اس کے والدین نے لڑکے والوں کا اصرار نہ ہوتے ہوئے بھی انہیں لڑکے کے ساتھ آکر، لڑکی دیکھنے کے لئے بلا بھیجا تھا۔ دراصل وہ میرا کی، لڑکا دیکھنے کی خواہش کو پورا کر دینا چاہتے تھے۔ اور میرا ان لوگوں کے آنے پر بہت خوش تھی۔ لیکن صرف ایک ہی بار وہ لڑکے کو دیکھ سکی۔ اور وہ بھی جھکی جھکی نگاہوں سے۔ بس یہی کہ دنیش ایک تندرست و توانا نوجوان تھا۔ گورا چٹا رنگ، لمبا قد، گورے گورے بیچ چہرے کہرے سیاہ گھنگھریالے بال۔ اور خمار آلود آنکھیں۔ اور اسکے سوا وہ دیکھ ہی کیا سکتی تھی؟ آنکھیں تو ہمیشہ انسان کو دھوکا دیتی آئی ہیں؟ وہ بھی دھوکا کھا گئی۔ دنیش بالکل آوارہ اور نکما نوجوان تھا۔ اُس کے عیبوں ہی کی وجہ سے اُس کے امیر باپ نے میرا کے غریب باپ کے ہاں اپنے بیٹے کا رشتہ کرنا پسند کر لیا تھا۔ اور جہیز وغیرہ کی کوئی پروا نہ تھی۔ اُس نے اُس کی شادی اُس کے عیبوں کا علاج سمجھ کر کی تھی۔ اِس علاج کے لئے اگر اُس کو جیب سے بھی کچھ خرچ ہو جاتا تو وہ محسوس نہ کرتا۔ اور یہاں تو بہو بیٹی بھی کچھ نہ کچھ لائی ہی تھی۔

میرا نے سہاگ رات ہی کو اپنی قسمت میں آگ لگتے دیکھ لی۔ دنیش شراب کے نشے میں دھت کمرۂ عروسی میں داخل ہوا اور میرا سے ایسا برتاؤ کرنے لگا۔ جیسے وہ اُس کی دُلہن نہ ہو، کوئی بازاری عورت ہو۔ میرا سر جھکائے کمرے میں بیٹھی تھی۔ وہ لڑکھڑاتا، گنگناتا کمرے میں داخل ہوا۔

"زمانہ یہ سمجھا کہ ہم پی کے آئے ... ہم پی کے آئے ...."

اور جھومتا ہوا پلنگ کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

چند لمحے وہیں کھڑا رہا۔ اور پھر پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گیا۔

"گھونگھٹ کے پٹ کھول ری۔ تجھے پیا ملیں گے" اور وہ کانپتے ہاتھوں سے اُس کا گھونگھٹ ہٹانے لگا۔ ایک بدبودار ہچکی نے میرا کی بند آنکھیں کھول دیں۔ وہ حیرت اور دہشت بھری نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگی۔ کراہت آمیز آوارہ مسکراہٹ اور نشے سے بند ہوتی ہوئی سُرخ انگارہ سی آنکھیں۔ اور اُس نے ڈر کے مارے ہاتھوں میں اپنا منہ چھپا لیا۔ دنیش نے ایک اور ہچکی لی۔ بدبو کا ایک اور بھبکا چھوڑا اور پلنگ پر سے اُٹھ گیا۔ اور ساتھ والے پلنگ پر گر گیا۔ جب میرا ہوش میں آئی تو وہ بے ہوش پڑا تھا۔ میرا رات بھر سسکیاں بھرتی رہی۔ روتی رہی۔ یہ کیا ہو گیا؟ اُس نے کیا سوچا تھا اور اُسے کیا ملا؟

خواب کتنے حسین تھے!

لیکن تعبیر —— ؟!

وہ پہلی بار تین دن سسرال میں رہی اور وہ تینوں دن جیسے اُس نے انگاروں پر لوٹتے ہوئے کاٹے۔ اُس نے محسوس کیا دنیش کو اُس سے ذرا بھی دلچسپی نہیں ہے۔ ذرا بھی لگاؤ نہیں ہے۔ کبھی کبھی وقت وہ اُس سے مخاطب ضرور ہوتا۔ لیکن اِس طرح جیسے وہ اُس کی بیوی نہ ہو۔ گھر کی دوسری عورتوں کی طرح محض گھر کی ایک فرد ہو۔ نئی نویلی بیوی کے لئے جو چاہت جو محبت ایک شوہر کی باتوں سے پھوٹی پڑتی ہے وہ اُس کی باتوں میں بالکل نہ تھی۔ اُس نے یہ بھی دیکھا کہ گھر کے سب لوگ دنیش سے خوف کھاتے تھے۔ کوئی بھی اُس کی بات کو ٹوکنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ جہاں چاہے جاتے، جب چاہے گھر آتے۔ والدین کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا اور وہ بھی پانچ لڑکیوں کے بعد پیدا ہوا تھا۔ اِس لئے بچپن ہی سے سب کا لاڈلا رہا تھا بچپن کے لاڈ پیار کے سہارے اُس نے اپنے اندر بہت سارے عیب جمع کر لئے تھے۔ اور یہ عیب جوانی کے ساتھ جوان ہوئے تھے۔ جوانی نے اُسے کچھ خودسر اور تیز طبیعت بنا دیا تھا کسی کا ذرا سا کہنا سننا بھی اُس کی برداشت سے باہر تھا۔ والدین کو یہ ڈر بھی کھائے جاتا تھا کہ زیادہ کہنے سننے سے وہ کہیں کچھ کر نہ بیٹھے، ایک دوبار ٹوکنے پر اُس نے کوٹھی کے لان والے کنویں میں چھلانگ لگانے کی دھمکی بھی دی تھی۔ اور ایک اکلوتا بیٹا وہ اِس طرح سے نہیں گنوا دینا چاہتے تھے۔

پہلی رات کے بعد دوسری دو راتیں وہ اُس کے کمرے میں بھی نہ آیا اور میرا آنسوؤں سے اُبلتی رہی۔ اور تین دن کے بعد جب وہ میکے جانے کے لئے تیار ہوئی تو دنیش نے یہ بھی نہ پوچھا۔ کب آؤ گی میرا؟

اس کے لئے تو برابر تھا کہ میرا سسرال میں رہے یا میکے میں۔ اُسے شراب و طاؤس سے فرصت ہی کب ملتی تھی!

میرا جب میکے پہنچی تو ماں اُس کی اس اُڑی ہوئی رنگت کو دیکھ کر سہم گئی لیکن پوچھنے پر میرا یہی کہتی رہی۔

"وہ لوگ بہت اچھے ہیں!"

"وہ سب اچھے ہیں!!"

"وہ بھی بہت اچھے ہیں!!!"

ماں سمجھ گئی۔ یہ اُوپری دل سے کہہ رہی ہے۔ یہ وہاں خوش نہیں ہے۔ اس نے کرید کرید کر پوچھنا چاہا لیکن وہ چھپا گئی۔ مسکراتی رہی لیکن اُس کی مسکراہٹ صاف بتا رہی تھی کہ وہ دکھی ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہتی معلوم ہوتی تھی۔ تم سمجھ گئی ہو ماں تو پوچھتی کیوں ہو؟ میں زبان سے کچھ نہ کہوں گی۔ کچھ نہ بولوں گی۔

اُس کی سہیلیاں نرگس، تارا، پُشپا اُس سے ملنے آئیں تو اُس کے چہرے پر پژمردگی دیکھ کر اُس سے بات کرنا ہی بھول گئیں۔ انھیں اُس کی سہاگ رات سے متعلق سُننے کی، اُس کے پِی کا سبھاؤ جاننے کی بہت خواہش تھی۔ اور اُس کے مزاج کی شوخی کے پیشِ نظر وہ اُمید کرتی تھیں کہ وہ خود ہی لطف لے لے کر سب کچھ بتا دے گی۔ لیکن میرا تو جیسے ساری شوخی سسرال ہی میں بھول آئی تھی۔ بہت سنجیدہ مزاج ہو گئی تھی۔ بہت کم بات کرتی تھی۔ اور اُس کی یہ سنجیدگی دیکھ کر ان میں سے کسی کو ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ اُس سے کھل کر بات کرے۔

وہ یہی پوچھتی رہیں۔

"کیسے حال چال ہیں؟"

"سسرال والے کیسے ہیں؟"

"شہر کیسا ہے؟"

"کوٹھی کیسی ہے؟"

"اب تو ایک ماہ یہاں رہو گی نا؟"

اور وہ جواب دیتی رہی۔

"اچھی ہوں۔ تم سناؤ، تمھارے کیسے حال چال ہیں؟"

"وہ بہت اچھے لوگ ہیں!"

"ابھی شہر کہاں دیکھا ہے میں نے"

"ہاں کوٹھی بہت عالیشان ہے۔ بہت بڑے بڑے کمرے۔ وِل فرنشڈ!"

"ارے اتنے دن کہاں رہ سکتی ہوں۔ بس اگلی پہلی کے بعد چلی جاؤں گی۔"

اور ہر جواب کے بعد تکلف بڑھتا رہا۔ اپنائیت کم ہوتی رہی۔ کتنی سنجیدہ مزاج ہو گئی ہے میرا؟ کچھ بتاتی ہی نہیں۔ یہ تبدیلی کیسی؟ آنکھیں اور چہرہ صاف بتا رہے ہیں۔ کیا یہ ضروری ہے کہ زبان ہی سب کچھ بتائے؟؟

اور وہ چلی گئی۔

اُس کے ماں باپ ابھی اُسے سسرال بھیجنا نہیں چاہتے تھے لیکن پندرہ دن کے بعد سسر صاحب کا خط آنے پر وہ سسرال چلی گئی۔ اُس نے دنیش کو اپنی طرف مائل کرنے کا ہر طریقہ آزما ڈالا لیکن اُس کے دل میں اپنے لئے ذرا بھی دلچسپی پیدا نہ کر سکی۔ اُس نے اپنے آپ کو اور بھی پُرکشش، اور بھی حسین بنانے کی کوشش کی لیکن دنیش اُس کی طرف متوجہ نہ ہوا۔ مہینے دو مہینے کے بعد اگر وہ اُس کے پاس آتا بھی تو اُسے ایک عورت سمجھ کر آتا۔ بیوی سمجھ کر نہیں۔ اور ہر بار اُسے احساس دلایا جاتا کہ وہ محض ایک کھلونا ہے۔ جب اُس کا جی چاہے گا وہ اُس سے کھیلے گا۔ کھیلنے کے بعد چلا جائے گا اور جب اُس کا جی بھر جائے گا وہ اُسے پھینک دے گا۔ اور کچھ عرصہ بعد میرا سب کچھ بھول گئی۔ اُس کے چہرے کا سُرخ و سپید رنگ زرد اور پھیکا پڑ گیا۔ بڑی بڑی خوب صورت آنکھیں مسلسل سوچوں کی وجہ سے سکڑ کر چھوٹی ہو گئیں اور اُن کے ارد گرد سیاہی مائل حلقے پڑ گئے تھے۔ اُس کے ہمیشہ سے میچ کرتے ہوئے صاف ستھرے کپڑے بے ترتیب اور میلے ہو گئے۔ اُس کے سنہرے بال خشک اور پریشان ہو گئے۔ اور اب اُس کی سسرال کی عورتیں دنیش کے راہِ راست پر نہ آ سکنے کی وجہ میرا کی اپنے آپ سے بے توجہی جتانے لگیں۔ وہ دنیش کے چال چلن پر پردہ ڈالتیں اور میرا کو قصوروار ٹھہراتیں۔ سرگوشیوں میں، لیکن

میرا کہتی ہے کہ لندن میں ایک دوسرے سے کہتیں۔
"یعنی مرد تو جوتے ہی ایسے ہیں۔ ادھر اُدھر بھٹکتے پھرتے ہیں۔ شادی کے بعد تو یہ عورت ہی ہے جو مرد کو اپنے بس میں رکھتی ہے۔ لیکن ہماری بہو تو اتنی ہوشیار نہیں۔ قسمت کی بات ہے!"
اور میرا سوچتی۔
"عورت اگر چاہے تو مرد کو باندھ کے رکھ لے لیکن کس مرد کو، ایک شرابی کو، جو انھوں پر جان چھڑکنے والے کو؟"
پورے ایک سال کے بعد وہ میکے آئی۔ اور گھر والے اُس کی شکل دیکھ کر بُری طرح تڑپ اُٹھے۔ ماں باپ کو معلوم ہو چکا تھا۔ دنیش کے امیر والدین کیوں یہ رشتہ منظور کیا تھا۔ لیکن اب وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ پُوچھنے پر میرا اب بھی یہی کہتی۔
"وہ بہت اچھے لوگ ہیں!"
"وہ بھی بہت اچھے ہیں!"
"اور پھر یہ تو عورت کے اپنے ہاتھ کی بات ہے، عورت چاہے تو مرد کو باندھ کے رکھ لے۔"
دنیش کے والد نے بہو کو بھیجنے کے لئے لکھا تو میرا کے والد نے ٹال دیا۔ انھوں نے اُسے سمجھا دیا۔ کچھ دن اور رہ جاؤ۔ تمھاری صحت ٹھیک ہو جائے گی۔" اور میرا خاموش رہ گئی۔ پندرہ دن کے بعد اُس کے سسر کا دوسرا خط آیا تو انھوں نے پھر ٹال دیا۔ لکھ دیا کہ اُس کی صحت بہت گر گئی ہے۔ ٹھیک ہو جائے گی تو بھیج دیں گے۔ اور میرا اب بھی خاموش رہی۔ اُن کے اس قدم کے ردِّ عمل کے طور پر اُس کے سسرال والے بھی خاموش ہو گئے۔ اور اُس کے بعد انھوں نے خط ہی نہ لکھا۔ شوہر کو اُس کی ضرورت نہ تھی۔ گھر والوں کو کیا پڑی تھی کہ وہ زیادہ تقاضے کرتے۔ اور چھ مہینے گزر گئے۔
میرا سُسرال نہیں گئی۔
وہ سارے دن مکان کے پچھلے حصّے والے کمرے میں پڑی رہتی میلے کپڑے پہنے ہوئے۔ اُداس اور خاموش کبھی چارپائی پر لیٹی چھت کی طرف دیکھتی رہتی اور کبھی سامنے کھونٹی پر لٹکی ہوئی بُش شرٹ کو۔ یہ بُش شرٹ وہ اپنے ساتھ لے آئی تھی۔ اور اُسے اُس نے سامنے کھونٹی پر لٹکا دیا تھا۔ بُش شرٹ ریشمی کپڑے کی تھی اور اس پر کئی طرح کی چڑیوں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں خوب صورت اور رنگ برنگی تصویریں۔ اور وہ اُن تصویروں کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہتی۔
گھر والے اُس سے پُوچھتے۔
"یہ تم کیا دیکھتی رہتی ہو میرا؟"
اور وہ جواب دیتی۔
"کچھ نہیں بس ایسے ہی دیکھتی رہتی ہوں۔ بہت خوب صورت چڑیاں ہیں نا!"
اور گھر والے اُس کی یہ حالت دیکھ کر کُڑھتے رہتے۔
ایک دن وہ اپنے کمرے میں حسبِ معمول ٹکٹکی باندھے اُس بُش شرٹ کو دیکھ رہی تھی کہ اُس کی ماں کمرے میں داخل ہوئی۔ اُسے کچھ پتہ نہیں چلا کہ ماں کمرے میں آئی ہے یا نہیں۔ ماں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں اُس سے پُوچھا۔
"میرا! یہ تم کیا دیکھتی رہتی ہو بیٹی؟"
وہ ماں کی طرف ویران نگاہوں سے دیکھنے لگی۔
کچھ نہ بولی۔
اور اُس نے اپنی نظریں پھر تصویروں پر جما دیں۔
ماں کا دل کٹنے لگا۔
'ہائے کیا ہو گیا اِسے؟'
اور میرا اچانک کرخت لہجہ میں بولی۔
"تم دیکھ لینا ماں! میں اِن سب چڑیوں کو ایک ایک کر کے مار دوں گی!"
"ٹھُس! ــــ ٹھُس ــــ!!"
اُس نے ہاتھ کی اُنگلی سے پستول بنائی اور اُس طرف نشانہ باندھ کر منہ سے آواز نکالنے لگی۔

"ٹھُس! ۔۔۔ ٹھُس!! ۔۔۔ ٹھُس!!! ۔۔۔"

"ہیں ۔۔۔ ایک بھی نہیں مری ؟! ۔۔۔ ایک بھی نہیں اُڑی ۔۔۔ ؟

اچھا! ۔۔۔ یہ بات ہے ۔۔۔ !"

اور اُس نے جھپٹ کر کھونٹی پر سے بُش شرٹ اُتاری اور اُسے دانتوں سے کاٹ کاٹ کر تار تار کر دیا۔

اور پھر بے اختیار قہقہے لگانے لگی۔

"ہا ۔۔۔ ہا ہا! ۔۔۔ ہا، ہا ہا! ۔۔۔ سب اُڑ گئیں ۔۔۔ ! ۔۔۔ سب مر گئیں! ۔۔۔ ہا ہا ہا ۔۔۔ سب اُڑ گئیں! ۔۔۔ سب مر گئیں ۔۔۔ ! ۔۔۔ ہا ہا ہا ہا ۔۔۔ !"

اور اُسی شام لوگوں نے سُن لیا تمیرا کا دماغ چل گیا ہے!

تمیرا کو مینٹل ہسپتال میں داخل ہوئے پانچ سال ہو گئے ہیں۔ اُس کے سسرال والے اُس کے علاج کا خرچ برداشت کر رہے ہیں۔ جیسے ہی اُنھوں نے سُنا کہ تمیرا کا دماغ چل گیا ہے تو دوڑے ہوئے آئے تھے، اور اُنھوں نے اُسے ہسپتال کے اسپیشل وارڈ میں داخل کرا دیا تھا۔ اور جب لوگوں نے سُنا تھا تو وہ اُن کی تعریف کرنے لگے تھے۔

"کتنی محبت ہے انھیں اپنی بہو سے!"

"کتنی ہمدردی ہے انھیں اُس سے!!"

پانچ سال ہو چکے ہیں اُسے ہسپتال میں رہتے ہوئے۔ پہلے کچھ عرصہ تو وہ تشدد پر رہی تھی۔ ہر وقت بکتی رہتی۔ کبھی سسرال والوں کو اور کبھی میکے والوں کو گالیاں دیتی رہتی۔ لیکن کچھ عرصہ سے اب وہ پُرسکون ہو گئی تھی۔ سسرال کے متعلق تو اب کوئی بات ہی نہ کرتی تھی۔ کبھی کبھی اُسے دیکھنے کے لیے، اُس کا حال جاننے کے لئے کوئی نہ کوئی آتا رہتا۔ کبھی اُس کے ماں باپ کے ہاں سے اور کبھی اُس کی سسرال سے۔ دنیش پر اُس کے پاگل پن کا کوئی اثر نہ تھا۔ وہ بدستور شراب اور طوائفوں کا پُجاری تھا۔ لیکن اب کچھ عرصہ سے جانے کیا ہوا کہ وہ گھر پر ہی پڑا رہتا۔ یہ وقت کا تقاضا تھا یا عمر کا، جانے کیا بات تھی۔ لیکن یہ صحیح تھا کہ اچانک اُس کا دل اپنی اِس زندگی سے بھر گیا تھا۔ اب اُسے باہر سکون نہ ملتا تھا۔ وہ گھر ہی میں رہنے لگا تھا۔ شراب بھی اس نے بہت کم کر دی تھی۔ اور اب کچھ دنوں سے وہ تمیرا کے متعلق بھی سوچنے لگا تھا۔ شادی کے سات سال بعد اُسے اچانک اُس کا خیال آنے لگا۔ تمیرا پاگل ہے، ہسپتال میں داخل ہے۔ کیا وہ اچھی ہو جائے گی؟ کب تک اچھی ہو گی؟ کبھی یہ سوچیں اُسے بے چین کر دیتیں اور کبھی اُس کا دل چاہتا، وہ اِنھیں سوچوں میں ڈوبا رہے۔

ایک دن بیٹھے بٹھائے جو اُسے خیال آیا تو وہ گھر والوں کو بتائے بغیر تمیرا سے ملنے کے چل دیا۔ اتفاق کی بات جس دن وہ ہسپتال پہنچا تمیرا کی سہیلی نرگس بھی اپنے شوہر ڈاکٹر رضوی کے ساتھ اُسے دیکھنے کے لئے آ پہنچی۔ وہ ہسپتال کے انچارج ڈاکٹر جوشی کے کمرے میں بیٹھا تمیرا کے متعلق باتیں کر رہا تھا اور ڈاکٹر جوشی کے طنزیہ جملے ۔۔۔۔۔

"ارے آپ اُن کے شوہر ہیں!"

"آپ نے تو کبھی خبر ہی نہ لی اُن کی!"

کے جواب میں ۔۔۔

"بس یونہی خود نہ آیا۔ گھر والے جو آتے رہتے ہیں۔ اُن سے حال معلوم ہوتا ہی رہا ہے۔"

کہہ کر خاموش سا تأسف ظاہر کر چکا تھا کہ نرگس اور ڈاکٹر رضوی کمرے میں داخل ہوئے۔ ڈاکٹر جوشی نے ہاتھ ملایا۔ اور پھر اُس نے اُن سے اُس کا تعارف بھی کرایا۔ نرگس اپنی سہیلی کے پاگل ہو جانے کے بعد پہلی بار اُسے دیکھنے آئی تھی۔ وہ اِتنی دُور رہتی تھی کہ چاہتے ہوئے بھی اِس طرف آنے کا پروگرام نہ بنا سکی تھی۔ اُس نے دنیش کے سامنے تمیرا کے پاگل ہو جانے کا افسوس ظاہر کیا۔ اور چند منٹ کی گفتگو کے بعد وہ لوگ ڈاکٹر جوشی کے ساتھ تمیرا کو دیکھنے کے لئے چل پڑے۔ نرگس کے شوہر ڈاکٹر رضوی دماغی بیماریوں کے ماہر تھے۔ عورتوں کے اسپیشل وارڈ کی طرف چلتے چلتے وہ ڈاکٹر جوشی کے ساتھ پاگل پن کے نفسیاتی اسباب کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ نرگس اپنے شوہر کے پہلو میں چل رہی تھی۔ اور دنیش ڈاکٹر جوشی کی طرف تھا۔ نرگس کو یہ سب باتیں بہت دلچسپ معلوم

ہو رہی تھیں لیکن دنیش کو اِن باتوں سے اُلجھن سی ہو رہی تھی۔ دفتر پیچھے رہ گیا
تھا اور سامنے ہسپتال کے وارڈ نظر آ رہے تھے۔ بائیں طرف سڑک سے ذرا ہٹ کے
کیاریوں میں چاپایا بیچ مرد دھاری دار قمیص اور پاجامے پہنے پودوں کی گوڑائی
کر رہے تھے۔ وہ بہت انہماک اور دلچسپی سے اپنا کام کر رہے تھے۔ ڈاکٹر
رضوی اپنی بیوی سے مخاطب ہوا۔

"دیکھو نرگس! یہ سب مریض آکو پیشنل تھیریپی پر رکھے گئے ہیں۔ یہ
گارڈننگ کر رہے ہیں ــــ کیوں ڈاکٹر؟"

"جی ہاں!"

ڈاکٹر جوشی نے سر ہلا دیا۔

اُسی وقت سامنے سے ایک نوجوان لڑکا اور ایک ساٹھ پینسٹھ سالہ
آدمی آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ اُس شخص نے ایک ہاتھ میں اُس نوجوان کا ہاتھ
کس کر پکڑ رکھا تھا۔ اور دوسرے ہاتھ میں چمڑے کا ایک سوٹ کیس اور ایک
تھیلا پکڑے ہوئے تھا۔ تھیلا کپڑوں سے بھرا ہوا تھا۔ سوٹ کیس رسّی لپیٹ
کر باندھا ہوا تھا اور اُس میں سے بھی کپڑے باہر جھانک رہے تھے۔ لڑکا تیز تیز
قدم بڑھا رہا تھا جیسے چل نہ رہا ہو چھلانگیں لگا رہا ہو۔ اور اُس شخص کو اُسے
کھینچ کر آہستہ چلنے پر آمادہ کرنا پڑتا تھا۔ نوجوان نے اپنے جوتے اپنے دوسرے
ہاتھ میں پکڑ رکھے تھے۔ اور اُس کنکریلی سڑک پر ننگے پاؤں چل رہا تھا۔ اپنے
آپ میں مست، کچھ عجیب طرح سر ہلاتا ہوا۔

ڈاکٹر جوشی نے بتایا۔

"اس مریض کو گھر جانے کی اجازت دی گئی ہے۔ شروع شروع میں یہ
بہت وائلینٹ تھا۔ اور اسے الیکٹرک شاک لگائے جاتے رہے۔ اب کچھ
عرصہ سے پُرسکون ہو گیا ہے۔ دیکھنا ہے، گھر کا ماحول اب اس پر کیا اثر کرتا
ہے۔ یہ ایک مزدور لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن اس کا امیر باپ
نہ مانا۔ اور یہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا۔ اب یہ اچھے اور قیمتی کپڑے پھینک
دیتا ہے، اچھی اور قیمتی چیزیں توڑ دیتا ہے۔ مزدوروں کا سا حلیہ بنائے
رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ شاید سمجھتا ہے کہ اس طرح اس طرح اس کی محبوبہ
اسے مل سکتی ہے۔ لیکن اُس لڑکی کی تو شادی بھی ہو چکی ہے۔ بے چارا!"

نرگس اُس کی کہانی سے متاثر معلوم ہوتی تھی۔ دنیش کی آنکھوں
کی سُرخی بھی سوچوں کی وجہ سے کچھ ماندی سی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ چپ چاپ
اُن لوگوں کے ساتھ چل رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ پاؤں کے سامنے آتے ہوئے کسی
کنکر کو ایک ہلکی سی ٹھوکر مار دیتا۔ اور اُس کی یہ غیر شعوری حرکت اُس کے [illegible]
کی غمازی کرتی معلوم ہوتی۔

"لیجئے۔ یہی اُن کا کاٹیج ہے!"

ڈاکٹر جوشی ایک کوارٹر نما کمرے کے سامنے رُک گئے۔

اور وہ لوگ صحن میں داخل ہوئے۔ سامنے کرسی پر میرا بیٹھی تھی۔ گلابی
ساڑی میں ملبوس۔ گود میں اون کے گولے رکھے سویٹر بنتی ہوئی۔ اُس نے
جونہی نرگس کو دیکھا جھٹ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"ہیلو! ــــ نرگس ــــ!!؟"

اور وہ اُس سے بغل گیر ہو گئی۔

"ارے تم نے مجھے پہچان لیا؟"

اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے نرگس نے کہا۔ اُس کے چہرے پر بیک
وقت خوشی اور خوف کی ملی جلی پرچھائیاں ناچ رہی تھیں۔ ایک سہیلی سے ملنے
کی خوشی، ایک پاگل انسان سے نقصان پہنچنے کا خوف!

"لو اور سنو اپنی بچپن کی سہیلی کو نہ پہچانوں گی!"

اور اُس نے مسکراتے ہوئے ڈاکٹر جوشی اور اُن کے ساتھ کھڑے
ہوئے ڈاکٹر رضوی اور دنیش کی طرف دیکھا۔ دنیش کی طرف دیکھنے کا انداز
ویسا ہی تھا جیسے اُس نے ڈاکٹر رضوی کی طرف دیکھا تھا۔ ایک اجنبی
شخص کی طرف دیکھنے کا انداز۔ خالی خالی نظروں سے، بے پروائی سے۔
صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اُس نے دنیش کو نہیں پہچانا۔ اور یہ دیکھ کر دنیش
کو پہلے تو کچھ اطمینان سا ہوا لیکن پھر اُسے اپنی سہیلی سے باتیں کرتے
دیکھ کر اور اپنے نہ پہچانے جانے پر اُسے بے چینی سی محسوس ہوئی۔ نرگس
اُس کی اس بے چینی کو بھانپ گئی۔ اُسے کچھ حیرت بھی ہوئی کہ میرا نے
دنیش کو پہچانا نہیں!

نرگس نے ڈاکٹر رضوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

Robin Ultramarine

"یہ ہیں ۔ تو میرا! یہ تمھارے بہنوئی ہیں۔ ڈاکٹر رضوی!"
اور میرا نے ہاتھ جوڑ دیے۔
ڈاکٹر رضوی نے بھی ہاتھ جوڑ دیے۔
"اور انھیں جانتی ہو یہ کون ہیں؟" اُس نے دنیش کی طرف دیکھ کر
مُسکراتے ہوئے کہا۔
"بھیا ہیں"
میرا نے معصومیت سے سر ہلا دیا۔
نرگس نے افسوس اور ہمدردی کی نگاہوں سے دنیش کی طرف دیکھا۔
ڈاکٹر رضوی نے سرگوشی کی۔
"پاگل پن میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مریض کو صرف اپنا ماضی یاد رہتا
ہے۔ ایک خاص منزل کے بعد کی زندگی وہ بھول جاتا ہے"
"ارے بھئی یہاں کُرسیاں تو ہیں نہیں۔ کہاں بٹھاؤں تم لوگوں کو؟
ڈاکٹر صاحب نے ایک ہی کُرسی دے رکھی ہے!"
میرا نے شکایت آمیز نگاہوں سے ڈاکٹر جوشی کی طرف دیکھا
اور بولی۔
"آئیے بنچ پر ہی بیٹھ جائیے"
"آئیے بیٹھیے ڈاکٹر صاحب!" دنیش نے اُن لوگوں کو بیٹھنے کی پیش
کش کی اور خود کھڑا رہنے کے لئے اشارہ کیا۔
"نہیں نہیں آپ دونوں بیٹھ جائیے۔ ہم لوگ کھڑے ہیں" ڈاکٹر
رضوی بولے۔ اور پھر وہ ڈاکٹر جوشی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے پرے صحن کے
ایک کونے میں چلے گئے۔ اور تبادلۂ خیالات کرنے لگے۔ میرا کی کُرسی
کے سامنے چھوٹی سی بنچ پر ایک طرف نرگس بیٹھ گئی اور دوسری طرف دنیش
دنیش کے کان کبھی میرا اور نرگس کی باتوں کی طرف لگتے۔ اور کبھی ڈاکٹر
جوشی اور ڈاکٹر رضوی کی باتوں کی طرف۔ ڈاکٹر رضوی اور ڈاکٹر جوشی جانے
کیسے کیسے میڈیکل الفاظ کا استعمال کر رہے تھے۔
"مینک ڈپریشن!"
"انسولین شاک!"
"سائیکو تھریپی!" وغیرہ
اور یہ گفتگو اُسے عجیب و غریب معلوم ہو رہی تھی۔ اُدھر میرا نرگس سے
سہیلیوں کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ اور نرگس اُس کی باتوں کا جواب دے
رہی تھی۔ اور دنیش اُس کی یادداشت سے متاثر ہو رہا تھا۔ باتیں کرتے
کرتے میرا یکایک شوخ سی ہو جاتی۔ خاص طور پر جب وہ کسی سہیلی کے شوہر
کے بارے میں بات کرنے لگتی۔ اُس نے نرگس سے مذاق بھی کیا تھا۔ اُس
کے شوہر ڈاکٹر رضوی کے بارے میں کہنے لگی۔
"اری نرگس! تم سناؤ۔ تم تو انھیں دوسروں کی نظروں سے چھپائے
رکھتی ہوگی؟ ہے نا؟۔ ہی ہی ہی!" اور دنیش سوچنے لگا۔
"پہلے رہی ہوگی پاگل، اب تو پاگل نہیں معلوم ہوتی۔ کتنی خوبصورت
معلوم ہو رہی ہے۔ کتنی پیاری! اب تو اِس کی یادداشت لوٹ آئے شادی
کے بعد کی زندگی کی یادداشت! بس پھر ٹھیک ہے"
وہ یہی سوچ رہا تھا کہ ڈاکٹر جوشی اور ڈاکٹر رضوی اُن کی طرف
مُڑے۔ اور اُسی وقت میرا چلائی۔
"ڈاکٹر صاحب! ڈاکٹر صاحب! رات میرے بچہ ہوا ہے۔ لڑکا!
ہاں! بہت ہی سُندر ہے۔ آئیے، آپ کو دکھاؤں" ڈاکٹر جوشی نے مسکرا کر
پہلے نرگس کی طرف دیکھا۔ اور پھر دنیش کی طرف، جیسے کہنا چاہتے ہوں۔
"دیکھا آپ نے اِس کا پاگل پن؟"
نرگس اور دنیش حیرت سے کبھی میرا کی طرف دیکھنے لگے اور کبھی
ایک دوسرے کی طرف! ڈاکٹر رضوی اطمینان سے سگریٹ پی رہے تھے۔
اور میرا اُن سب سے بے پروا تھی!
وہ نرگس سے مخاطب ہوئی۔
"تم اپنے جیجا جی سے نہیں ملی ہونا؟ اِس وقت تو باہر گئے ہوئے ہیں۔
آئیں گے تو تمھیں ملاؤں گی۔ یہ سوئیٹر میں اُنہی کے لئے تو بُن رہی ہوں!
ڈاکٹر صاحب سے اُون منگوائی ہے"
نرگس اور دنیش نے اب پہلی بار دیکھا کہ اُس کی گود میں رکھا ہوا
سوئیٹر مردانے ڈیزائن کا تھا۔ نرگس کی نگاہوں میں اب بھی حیرت اور تاسف تھا۔

کیوں کہ خوشی کے مارے اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ ڈاکٹر جوشی ڈاکٹر دھنوی کی طرف تعجب خیز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اور حیرانی سے کے جذبات سے پھٹی پھٹی آنکھیں سکوڑ کر اپنے زانو پر پھیلا کر بہت پہلے سے اُن کی عادت ہے بچوں۔ پھر نرگس سے مخاطب ہوئی۔

"مجھے اچھی طرح یاد ہے جب یہ مجھے کالج میں ملا تھا۔ یاد ہے نا؟ اُن کو بچے بہت پسند ہیں ہر بار یہی ڈیڑھ درجن کی فرمائش کرتے ہیں۔ ہی ہی —— ہی ہی ہی ——!"

وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

بچوں کی سی معصوم ہنسی!

اور پھر فخر سے سویٹی کی طرف دیکھنے لگی۔ جیسے اپنی بنائی ہوئی چیز اپنے شوہر کے پسند کرنے پر خوش ہو رہی ہو ——! بہت خوش!!

"میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ جہاں جاتے ہیں ساتھ جاتی ہوں۔ اور بھی نرگس یہ تو عورت کے اپنے ہاتھ کی بات ہے۔ وہ چاہے تو مرد کو باندھ کے رکھ لے۔ ہاں!"

اُس کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا۔

ایسا اطمینان جو اپنے قول کو سچ ہوتا دیکھ کر پیدا ہوتا ہے۔ وہ سویٹی کا جائزہ لینے لگی۔ چند لمحوں کے بعد بولی۔

"اُن کے بچے بھی سب اُنہی پر گئے ہیں۔ بالکل سیدھے۔ ہاں نا!"

اُس نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ معصوم قہقہہ! جس میں تھوڑی سی حیا کی آمیزش بھی تھی۔

اور پھر وہ کرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور نرگس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔

"چلو آؤ! تمھیں دکھاؤں رات جو میرا لڑکا پیدا ہوا ہے۔ بالکل اُن کی شکل کا ہے۔ آؤ تو!"

اور وہ اُسے کمرے کی طرف لے جانے لگی۔

نرگس بوکھلاہٹ آمیز نگاہوں سے ڈاکٹر جوشی کی طرف دیکھنے لگی۔

دنیش بھی بینچ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

ڈاکٹر جوشی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں! جا کر دیکھ آئیے۔ بیوی کے بچے بہت خوب صورت ہیں!"

اور نرگس اور دنیش اُس کے پیچھے پیچھے اُس کے کمرے میں داخل ہوئے۔ دنیش نے ڈاکٹر دھنوی کو ڈاکٹر جوشی سے سرگوشی کرتے سنا۔

"اِس وقت اُسے وہ سب کچھ مل گیا ہے جو اُسے اپنی ازدواجی زندگی میں نہیں ملا تھا۔"

اور دنیش نے دیکھا سویٹی نہایت خوش خوش آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ عجیب بے چینی کے عالم میں نرگس کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوا۔ اندر پلنگ پر کپڑے کے کھلونوں سے بنے تین گڈے پڑے تھے۔ سویٹی تیر کی طرح اُس پلنگ کی طرف بڑھی اور اُس نے اُن میں سے ایک کو دونوں ہاتھوں میں اُٹھا لیا جیسے ماں کسی بچے کو اُٹھاتی ہے اور آہستہ سے نرگس کی طرف بڑھا دیا!

میرا فن میرا لہو

پریم وار برٹنی

میری تخیل کے ترشے ہوئے آئینے میں | کوئی پیکر، کوئی پرتو، کوئی تصویر نہیں
میرا فن ایک حقیقت نہ سہی خواب سہی | ہائے وہ خواب کہ جس کی کوئی تعبیر نہیں

کسی شیشے میں کسی جام میں بھی ڈھل نہ سکی | میرے مستی بھرے اشعار کی دہکی ہوئی آگ
ایک بے نام سی خوشبو کو ترستا ہی رہا | میری نظموں کا تقدس مری غزلوں کا سہاگ

پھر وہی میں ہوں وہی زہر بھرا سناٹا | پھر وہی رات کہ یوسف کا کفن ہو جیسے
پھر وہی چاند، وہی چاند کی پُرنور چتا | کوئی جلتا ہوا خوابوں کا وطن ہو جیسے

دُور سے پائلیں بجنے کی صدا آتی ہے | وحشتیں آئی ہیں زلفوں کے گھنے جال لئے
صبر و احساس کے سینے میں دھڑکتا ہے سکوت | گردشیں روتی ہیں زنجیرِ مہ و سال لئے

ہنس کے دیکھے گی نہ چلمن سے کوئی پردہ نشیں | نامہ آئے گا کسی کا نہ پیام آئے گا
دل کے خاکوں میں بھروں رنگِ وفا کس کے لئے | میرا فن، میرا لہو کون سے کام آئے گا

پریم وار برٹنی

خطرے کی زنجیر
کھینچنے سے پہلے
سوچئے!
خطرے کی زنجیر کا استعمال حفاظت کا
ایک ذریعہ ہے اور اسے صرف اشد ضروری
حالات میں ہی استعمال کرنا چاہئے۔
بغیر معقول وجہ خطرے کی زنجیر کھینچنے سے کسی
بیمار آدمی پر مصیبت نازل ہوسکتی ہے۔ سرکاری
کاموں کی سرانجام دہی میں رکاوٹ پڑ سکتی ہے۔
لوگ اپنی ڈیوٹی پر حاضر نہیں ہوسکتے اور گاڑی
میں سفر کرنے والے بوڑھے اور بیمار مسافروں کو
بےچینی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور مزید برآں مقررہ
نظام کے خلاف ایک گاڑی کو کھڑا کرنے سے اس
کا اثر سلسلہ وار دیگر کئی گاڑیوں پر پڑتا ہے۔ اور
تمام گاڑیاں لیٹ ہو جاتی ہیں۔
INDIAN RAILWAYS
جاری کردہ:۔ ناردرن ریلوے

طنزیہ

افواہیں

جہاں گرد کے قلم سے

جہاں گرد چاروں کھونٹ گھومتا ہے۔ افواہیں جمع کرتا ہے۔ اُسے افواہیں جمع کرنے کا جنون ہے۔ یہ جنون اِس لئے ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ جنون کے پیچھے ہوش مرتا ہے۔ افواہوں کے پیچھے تلخ حقیقتیں ہوتی ہیں۔

گھوڑی چڑھتے لگدا تھانیدار —— •

شمالی ہند میں شادی کے موقع پر ایک قدیم رسم چلی آتی ہے کہ دُولہا کو گھوڑی پر سوار کر کے دُولہن کے گھر تک لے جایا جاتا ہے۔ گھوڑی درحقیقت عہدِ قدیم کے ٹرانسپورٹ سسٹم کی یادگار ہے، جب بارات گھوڑوں اونٹوں اور بیلوں پر چلا کرتی تھی۔ لیکن عہدِ جدید میں مشین کی آمد سے سارے ٹرانسپورٹ سسٹم میں تبدیلی آ گئی ہے۔ اور اب براتیں ریل گاڑی، لاری اور کار وغیرہ میں جاتی ہیں۔ اگرچہ ٹرانسپورٹ کے باقی تمام ذرائع بدل کر مشینی ہو گئے ہیں لیکن دُولہا کو گھوڑی پر چڑھانے کی رسم بدستور جاری ہے۔

افواہ ہے کہ براتوں کی ٹرانسپورٹ کو مکمل طور پر جدید بنانے کے لئے ہند سرکار غور کر رہی ہے۔ اور شاید جلد ہی اِس سلسلے میں ایک بل پیش کیا جانے والا ہے کہ گھوڑی کو اب الوداع کہہ دیا جائے۔ اور دُولہا کو گھوڑی کی بجائے کھُلی کار یا جیپ میں بٹھا کر دُولہن کے گھر تک لے جایا جائے۔ جو لوگ کار مہیا نہ کر سکیں وہ موٹر سائیکل یا سکوٹر پر جا سکتے ہیں۔ انتہائی غریب لوگ اپنے دُولہا کو بائیسکل پر سوار کر کے دُولہن کے گھر تک لے جا سکتے ہیں۔ وہ بائیسکل کو گھوڑی کی طرح پھولوں اور گھنگھروؤں سے سجا سکتے ہیں۔

یہ بھی سُنا گیا ہے کہ اگر ایسا کوئی بل پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا تو ہندوستان کے مختلف حصوں سے کم از کم پانچ ہزار گھوڑیاں بطورِ احتجاج پارلیمنٹ کے باہر مظاہرہ کریں گی۔ اور نعرے لگائیں گی "ریکارڈ بل مُردہ باد! ہمیں مت اُجاڑو! ہم بیکار گھوڑیوں کے لئے کام مہیا کرو!" سُنا ہے اِس مظاہرے میں سوہن کار بھی گھوڑیوں کی حمایت میں حصہ لیں گے۔

موسم کی شرارت —— •

دہلی کے موسمی ماہرین میں یہ افواہ پھیلی ہوئی ہے کہ شاید اِس ساون اور بھادوں میں بارش بالکل نہ ہو۔ نہ گھٹائیں آسمان پر چھائیں نہ بادل گرجیں۔ اِس افواہ سے دہلی کے کئی حلقوں میں بڑا اضطراب پھیل گیا ہے۔ بالخصوص اُن سوشل خدمات انجام دینے والی انجمنوں میں جو سیلاب زدہ لوگوں میں کمبل، کپڑے اور کھانا تقسیم کیا کرتی ہیں۔ اور عوام کے دیئے ہوئے چندے کی بہت بڑی تعداد ہضم کر لیتی ہیں۔ اِس کے علاوہ اُن شعرا حضرات میں بھی بے چینی پائی جاتی ہے جو بادل اور گھٹا کو دیکھے بغیر شعر نہیں لکھ سکتے۔ اُن تاجر لوگوں کو بھی پریشانی ہے جو برسات کی آڑ میں اشیائے ضرورت کے دام بڑھانے کے نسلاً عادی ہو چکے ہیں۔

چنانچہ سُنا گیا ہے کہ یہ تمام حلقے سائنس دانوں کی مدد سے مصنوعی بارشوں اور مصنوعی سیلابوں کے امکانات پر غور کر رہے ہیں۔ اگر مصنوعی بارشوں کی اسکیم سرے چڑھ گئی تو مرارجی ڈیسائی وزیرِ خزانہ کی مدد سے ایک برسات ٹیکس لاگو کر دیا جائے گا۔ اور صرف وہاں بارش برسائی جائے گی جہاں کے لوگ

پڑ ٹیکس ادا کر چکے ہوں گے۔ شعراء پر لگائے گئے برسات ٹیکس کی شرح سب سے زیادہ ہو گی۔ موسمی ماہرین نے یہ پیش گوئی بھی کی ہے کہ اس بار دسمبر اور جنوری میں گرم گرم لُو چلے گی۔ اور سردیاں تو اس سال آئیں گی ہی نہیں۔ شاید اگلے سال مئی جون میں سردیوں کی باری آجائے۔

دَوڑ پیچھے کی طرف

یہ ایک عام شکایت پائی جاتی ہے کہ ہندوستان میں معیارِ تعلیم بُری طرح گر رہا ہے اور طالب علموں کی ایک نالائق ترین نسل پیدا ہو رہی ہے۔ ماہرین تعلیم نے اِس تشویشناک صورتِ حال کو تبدیل کرنے کے لئے ایک تعلیمی اسکیم یہ تیار کی ہے کہ تمام اسکول اور کالج بند کر دیئے جائیں تعلیمی کتابوں کی اشاعت قانوناً ممنوع قرار دے دی جائے۔ اور اساتذہ سے کہا جائے کہ وہ پُرانے زمانے کی طرح درختوں کے نیچے بیٹھ کر طلبار کو زبانی تعلیم دیا کریں۔ پچاس برس سے کم کا کوئی اُستاد تعلیم دینے کے لئے تعینات نہ کیا جائے۔ ڈگری سسٹم بند کر دیا جائے اور کوئی سند یا سرٹیفکیٹ نہ دیا جائے۔ ہر طالب علم کے لئے ضروری ہو کہ وہ تیس برس کی عمر تک تعلیم جاری رکھے۔

اِس اسکیم کے تحت ۱۹۶۵ء میں یہ نیا تعلیمی نظام جاری کیا جائے گا۔ اور اگر یہ بھی ناکام رہا تو آئندہ کے لئے ہندوستان میں تعلیم ہی ختم کر دی جائے گی۔ تاکہ نہ تعلیم ہو نہ اُس کا معیار گرے۔

ایک نیا تجربہ

پچھلے دنوں ایک ہندوستانی گاؤں میں کمیونزم کا تجربہ کیا گیا۔ تجربے کی بُنیاد کارل مارکس کی اِس تھیوری پر رکھی گئی کہ کمیونزم میں ہر آدمی سکا جتنا جی چاہے گا کام کرے گا۔ اور جتنا جی چاہے گا اشیائے ضرورت حاصل کر سکے گا۔ چنانچہ گاؤں میں منادی کرا دی گئی کہ ہر شخص جتنا جی چاہے کام کرے اور جتنی ضرورت ہو گاؤں کے مرکزی اسٹور سے اشیار لے جائے ہفتہ بھر تک یہ تجربہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ گاؤں کا سارا اسٹور سامان سے بالکل خالی ہو گیا۔ اور لوگوں نے ایک پیسے کی پیداوار بھی نہیں کی۔ یہ تجربہ "اخلاق واں اندولن" چلانے والی ایک انجمن کی طرف سے کیا گیا جس کا عقیدہ ہے کہ ملک کا اقتصادی نظام چاہے کچھ ہو، عوام کے اندر اخلاق کی بھاونا کو جگایا جا سکتا ہے۔ اِس تجربے کے فیل ہونے کے بعد انجمن کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ کمیونزم ہندوستان کی آب و ہوا کے موافق نہیں ہے۔ اِسلئے ملک میں اُس کا پروپیگنڈا کرنا خلافِ قانون اور خلافِ تہذیب قرار دیا جائے۔

بے وقوف سیٹھ

بمبئی کے کاروباری حلقوں میں یہ افواہ گشت لگا رہی ہے کہ وہاں کے ایک بہت بڑے سیٹھ نے ہند سرکار کے انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ کو پچھلے چھ برس کا انکم ٹیکس ادا کر دیا ہے۔ اور اُس چھ برس کے حساب و کتاب کے اصل رجسٹر انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ کو پیش کر کے ایک تحریری معافی نامہ بھی دے دیا ہے کہ وہ چھ برس سے جھوٹے حساب کتاب پیش کر کے انکم ٹیکس کی چوری کرتا رہا ہے۔

سُنا گیا ہے کہ ہند سرکار نے جہاں اُس سیٹھ کے دماغ کا کیمیکل تجزیہ کرنے کے لئے ایک ماہر ڈاکٹر مقرر کر دیا ہے۔ وہاں پارلیمنٹ کے باہر اُس کا ایک بُت نصب کرنے کا بھی فیصلہ کیا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ہندوستان کے چند سرکردہ سیٹھوں کا ایک ڈیپوٹیشن اُس سیٹھ کی خدمت میں بھیجا جا رہا ہے۔ جو اُسے سمجھا بجھا کر راہِ راست پر لانے کی کوشش کرے گا۔ اور اگر وہ سیدھے راستے پر نہ آیا تو اُس کا تجارتی بائیکاٹ کر دیا جائے گا۔

پربت وہ سب سے اُونچا

پیکنگ میں یہ افواہ پھیلی ہوئی ہے کہ چین اور ہندوستان کی سرحدوں کے درمیان جو کوہِ ہمالیہ پھیلا ہوا تھا وہ غائب ہو گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پچھلے دنوں جب کامریڈ ماؤ سی تنگ ہمالیائی سرحد کی چینی فوجوں کا اسپیشل معائنہ کرنے کے لئے لے جائے گئے تو معائنہ کرنے والی پارٹی یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہاں کوہِ ہمالیہ کا کہیں وجود ہی نہیں تھا۔ اور اُس کے بجائے سمندر ٹھاٹیں مار رہا تھا۔ نہ میکموہن لائن تھی نہ ماؤنٹ ایورسٹ اور نہ سرحدی چینی

ہیں کا کہیں وجود نہ تھا۔ پیکنگ میں یہ افواہ پھیلی ہوئی ہے کہ سارے کو ہمالہ پگھلا کر پانی بنا دیا گیا ہے۔ ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکا کہ یہ کس کی شرارت ہے لیکن عام خیال یہی ہے کہ یہ ہندوستان کے کسی جادوگر کا کرشمہ ہے جس نے کوہ ہمالیہ کو پگھلا کر چینی سرحد کو کئی ہزار میل پیچھے دھکیل دیا ہے۔ یہی سنا ہے کہ چینی سرکار اب ایسے نقشے تلاش کر رہی ہے جن سے وہ یہ ثابت کر سکے کہ ہمالیہ کا یہ سارا سمندر کبھی مملکتِ چین میں شامل تھا۔

درندے دہلی میں آئیں گے —— •

جُوں جُوں ہندوستان کی آبادی بڑھ رہی ہے تُوں تُوں مکانوں کی قلت کا مسئلہ پیچیدہ شکل اختیار کرتا جا رہا ہے۔ جتنے مکان بنائے جاتے ہیں، اُس سے دُگنے بچے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اِس مسئلے کو حل کرنے کے لئے ہند سرکار فیصلہ کر رہی ہے کہ بڑے بڑے وسیع اور گھنے جنگلات کو صاف کرایا جائے۔ اور وہاں انسانوں کو آباد کر دیا جائے جہاں شیر، ہاتھی بھیڑیے، ریچھ، اور چیتے وغیرہ خونخوار جانور رہتے ہیں۔ سنا ہے جُوں ہی یہ خبر خونخوار جانوروں تک پہنچی اُن میں بڑا اضطراب پھیل گیا، اگر جنگلات بھی اُن سے چھین لئے گئے تو وہ کہاں رہیں گے۔ چنانچہ اِن جانوروں نے ایک ریزولیشن ہند سرکار کو بھیجا ہے جس میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ ہم انسانوں کے ساتھ امن پسندانہ طریقے سے رہنے کو آمادہ ہیں۔ ہمیں جنگلوں سے نہ نکالا جائے بلکہ انسانوں کے ساتھ ساتھ ہمارے لئے بھی جنگلوں میں مکانات تعمیر کر دیئے جائیں۔ سُنا ہے ہند سرکار اس ریزولیشن پر انسانی ہمدردی کے نقطۂ نگاہ سے غور کر رہی ہے۔ اور ممکن ہے وہ جانوروں کی اِس پنچ شیل کی پالیسی سے اتفاق کر لے اور مکانوں اور خونخوار جانوروں کے مسائل ایک ساتھ حل ہو جائیں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو اس امر کا بھی امکان ہے کہ موجودہ آباد شہر دہلی میں بھی شیر، ریچھ، چیتے اور بھیڑیے وغیرہ آکر بس جائیں اور انسانوں اور جانوروں کے درمیان تعلقات کا ایک نیا دَور شروع ہو جائے۔

الٰہ دین کا چراغ —— •

دہلی کے کافی ہاؤسوں اور ریسٹورانوں میں اِس بات کا بڑا چرچا ہے کہ دہلی شہر کے ایک آدمی کو ایک کباڑ خانے سے الٰہ دین والا مشہور و معروف چراغ ملا ہے۔ جس کی مدد سے وہ عجیب و غریب کارنامے کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

سُنا گیا ہے کہ سب سے پہلے وہ چراغ کے دیو کی مدد سے آگرے کے تاج محل کو اُٹھا کر دہلی لے آئے گا۔ اور اُسے جمنا کے کنارے نصب کر دے گا۔ پہلے اُس کا پروگرام یہ تھا کہ پورے دہلی شہر کو اُٹھا کر کہیں مدھیہ پردیش کی طرف لے جائے۔ چنانچہ پچھلے دنوں دہلی شہر میں جو زلزلے کا ایک جھٹکا محسوس ہوا تھا وہ دہلی شہر کو یہاں سے اکھاڑنے کی کوشش کے سلسلے میں تھا۔ نہ جانے عین آخری موقع پر یہ پروگرام کیوں منسوخ کر دیا گیا؟ یہ بھی افواہ ہے کہ وہ دہلی کے مسلم ایریا میں رہنے والے تمام باشندوں کو راتوں رات اُٹھا کر بنگلوں اور کوٹھیوں میں پہنچا دے گا۔ اور کوٹھیوں اور بنگلوں کے باسیوں کو مسلم ایریا میں لے آئے گا تاکہ وہ بھی مسلم کی زندگی کی لذت سے آشنا ہو سکیں۔

افواہ ہے کہ دہلی پولیس اُس الٰہ دین کے چراغ کے مالک کو تلاش کرنے کی بے حد کوشش کر رہی ہے۔ لیکن وہ ابھی تک ہاتھ نہیں آیا بہرکیف دہلی شہر کے لئے آنے والے چند مہینے بڑے ہنگامہ خیز ہوں گے۔ سب کو انتظار کرنا اور تیار رہنا چاہیئے

ننھّی مُنّی افواہیں —— •

(۱) افواہ ہے کہ دہلی شہر میں ایک کنُواں دریافت ہوا ہے جس میں سے دن کو پانی اور رات کو دُودھ نکلتا ہے۔ لوگ جوق در جوق اُس کنُویں کی تلاش میں رات بھر گھُومتے رہتے ہیں۔

(۲) مدھیہ پردیش کے چالیس ڈاکوؤں کے دستخطوں سے سرکار کو ایک مراسلہ موصول ہوا ہے کہ ہمارے غار میں بہت سا خزانہ جمع ہو گیا ہے اس لئے آپ اپنے کسی علی بابا کو یہاں بھیجئے۔ جو ہم سے خزانہ لے جائے۔ معلوم ہوا ہے کہ ڈاکوؤں نے اِس سے پہلے بھی ایک ایسا ہی مُراسلہ

پر ٹیکس ادا کر چکے ہوں گے۔ شعراء پر لگائے گئے برسات ٹیکس کی شرح سب سے زیادہ ہوگی۔ موسمی ماہرین نے یہ پیش گوئی بھی کی ہے کہ اس بار دسمبر اور جنوری میں گرم گرم لو چلے گی۔ اور سردیاں تو اس سال آئیں گی ہی نہیں۔ شاید اگلے سال مئی جون میں سردیوں کی آمد ہو جائے۔

دوڑ پیچھے کی طرف •

یہ ایک عام شکایت پائی جاتی ہے کہ ہندوستان میں معیارِ تعلیم بُری طرح گر رہا ہے اور طالب علموں کی ایک نالائق ترین نسل پیدا ہو رہی ہے۔ ماہرینِ تعلیم نے اس تشویشناک صورتِ حال کو تبدیل کرنے کے لئے ایک تعلیمی اسکیم یہ تیار کی ہے کہ تمام اسکول اور کالج بند کر دیئے جائیں تعلیمی کتابوں کی اشاعت قانوناً ممنوع قرار دے دی جائے۔ اور اساتذہ سے کہا جائے کہ وہ پُرانے زمانے کی طرح درختوں کے نیچے بیٹھ کر طلبا کو زبانی تعلیم دیا کریں۔ پچاس برس سے کم کا کوئی اُستاد تعلیم دینے کے لئے تعینات نہ کیا جائے۔ ڈگری سسٹم بند کر دیا جائے اور کوئی سند یا سرٹیفکیٹ نہ دیا جائے۔ ہر طالب العلم کے لئے ضروری ہو کہ وہ تیس برس کی عمر تک تعلیم جاری رکھے۔

اس اسکیم کے تحت ۱۹۶۵ء میں یہ نیا تعلیمی نظام جاری کیا جائے گا۔ اور اگر یہ بھی ناکام رہا تو آئندہ کے لئے ہندوستان میں تعلیم ہی ختم کر دی جائے گی۔ تاکہ نہ تعلیم ہو نہ اُس کا معیار گرے۔

ایک نیا تجربہ •

پچھلے دنوں ایک ہندوستانی گاؤں میں کمیونزم کا تجربہ کیا گیا۔ تجربے کی بُنیاد کارل مارکس کی اس تھیوری پر رکھی گئی کہ کمیونزم میں ہر آدمی جتنا جی چاہے گا، کام کرے گا۔ اور جتنا جی چاہے گا اشیائے ضرورت حاصل کر سکے گا۔ چنانچہ گاؤں میں منادی کرا دی گئی کہ ہر شخص جتنا جی چاہے کام کرے اور جتنی ضرورت ہو گاؤں کے مرکزی اسٹور سے اشیاء لے جائے۔ ہفتہ بھر تک یہ تجربہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ گاؤں کا سارا اسٹور سامان سے بالکل خالی ہو گیا۔ اور لوگوں نے ایک پیسے کی پیداوار بھی نہیں کی۔ یہ تجربہ "اخلاق داں اندولن" چلانے والی ایک انجمن کی طرف سے کیا گیا۔ جن کا عقیدہ ہے کہ ملک کا اقتصادی نظام چاہے کچھ ہو، عوام کے اندر اخلاق کی بھاؤنا کو جگایا جا سکتا ہے۔ اِس تجربے کے فیل ہونے کے بعد انجمن کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ کمیونزم ہندوستان کی آب و ہوا کے موافق نہیں ہے۔ اس لئے ملک میں اُس کا پروپیگنڈا کرنا خلافِ قانون اور خلافِ تہذیب قرار دیا جائے۔

بے وقوف سیٹھ •

بمبئی کے کاروباری حلقوں میں یہ افواہ گشت لگا رہی ہے کہ وہاں کے ایک بہت بڑے سیٹھ نے ہند سرکار کے انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ کو پچھلے چھ برس کا انکم ٹیکس ادا کر دیا ہے۔ اور اُس چھ برس کے حساب و کتاب کے اصل رجسٹر انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ کو پیش کر کے ایک تحریری معافی نامہ بھی دے دیا ہے کہ وہ چھ برس سے جھوٹے حساب کتاب پیش کر کے انکم ٹیکس کی چوری کرتا رہا ہے۔

سُنا گیا ہے کہ ہند سرکار نے جہاں اُس سیٹھ کے دماغ کا کیمیکل تجزیہ کرنے کے لئے ایک ماہر ڈاکٹر مقرر کر دیا ہے۔ وہاں پارلیمنٹ کے باہر اُس کا ایک بُت نصب کرنے کا بھی فیصلہ کیا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ہندوستان کے چند سرکردہ سیٹھوں کا ایک ڈیپوٹیشن اُس سیٹھ کی خدمت میں بھیجا جا رہا ہے۔ جو اُسے سمجھا بُجھا کر راہِ راست پر لانے کی کوشش کرے گا۔ اور اگر وہ سیدھے راستے پر نہ آیا تو اُس کا تجارتی بائیکاٹ کر دیا جائے گا۔

پربت وہ سب سے اُونچا •

پیکنگ میں یہ افواہ پھیلی ہوئی ہے کہ چین اور ہندوستان کی سرحدوں کے درمیان جو کوہِ ہمالیہ پھیلا ہوا تھا وہ غائب ہو گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پچھلے دنوں جب کامریڈ یادسی تنگ ہمالیائی سرحد کی چینی فوجوں کا اسپیشل معائنہ کرنے کے لئے لے جائے گئے تو معائنہ کرنے والی پارٹی یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہاں کوہِ ہمالیہ کا کہیں وجود ہی نہیں تھا۔ اور اُس کے بجائے سمندر ٹھاٹیں مار رہا تھا۔ نہ میکموہن لائن تھی نہ ماؤنٹ ایورسٹ اور نہ سرحدی چینی

فوجوں کا نشان موجود نہ تھا۔ پیکنگ میں یہ افواہ پھیلی ہوئی ہے کہ سارے کوہ ہمالہ کو پگھلا کر پانی بنا دیا گیا ہے۔ ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکا کہ یہ کس کی شرارت ہے لیکن عام خیال یہی ہے کہ یہ ہندوستان کے کسی جادوگر کا کرشمہ ہے جس نے کوہ ہمالیہ کو پگھلا کر چینی سرحد کو کئی ہزار میل پیچھے دھکیل دیا ہے۔ یہ بھی سنا ہے کہ چینی سرکار اب ایسے نقشے تلاش کر رہی ہے جن سے وہ یہ ثابت کر سکے کہ ہمالیہ کا یہ سارا سمندر کبھی مملکت چین میں شامل تھا۔

درندے دلی میں آئیں گے ——— •

جوں جوں ہندوستان کی آبادی بڑھ رہی ہے توں توں مکانوں کی قلت کا مسئلہ پیچیدہ شکل اختیار کرتا جا رہا ہے۔ جتنے مکان بنائے جاتے ہیں، اُس سے دُگنے بچے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے ہند سرکار فیصلہ کر رہی ہے کہ بڑے بڑے وسیع اور گھنے جنگلات کو صاف کرا یا جائے۔ اور وہاں انسانوں کو آباد کر دیا جائے جہاں شیر، ہاتھی بھیڑیئے، ریچھ اور چیتے وغیرہ خونخوار جانور رہتے ہیں۔ سنا ہے جوں ہی یہ خبر خونخوار جانوروں تک پہنچی اُن میں بڑا اضطراب پھیل گیا کہ اگر جنگلات بھی اُن سے چھین لئے گئے تو وہ کہاں رہیں گے۔ چنانچہ ان جانوروں نے ایک ریزولیشن ہند سرکار کو بھیجا ہے جس میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ ہم انسانوں کے ساتھ امن پسندانہ طریقے سے رہنے کو آمادہ ہیں۔ ہمیں جنگلوں سے نہ نکالا جائے بلکہ انسانوں کے ساتھ ساتھ ہمارے لئے بھی جنگلوں میں مکانات تعمیر کر دیئے جائیں۔ سنا ہے ہند سرکار اس ریزولیشن پر انسانی ہمدردی کے نقطۂ نگاہ سے غور کر رہی ہے۔ اور ممکن ہے وہ جانوروں کی اس پنچ شیل کی پالیسی سے اتفاق کر جائے اور مکانوں اور خونخوار جانوروں کے مسائل ایک ساتھ حل ہو جائیں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو اس امر کا بھی امکان ہے کہ موجودہ شہروں میں بھی شیر، ریچھ، چیتے اور بھیڑیئے وغیرہ آکر بس جائیں اور انسانوں اور جانوروں کے درمیان تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہو جائے۔

الٰہ دین کا چراغ ——— •

دلی کے کافی ہاؤسوں اور ریسٹورانوں میں اس بات کا بڑا چرچا ہے کہ دلی شہر کے ایک آدمی کو ایک کباڑ خانے سے الٰہ دین والا مشہور و معروف چراغ ملا ہے۔ جس کی مدد سے وہ عجیب و غریب کارنامے کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

سنا گیا ہے کہ سب سے پہلے وہ چراغ کے دیو کی مدد سے آگرے کے تاج محل کو اُٹھا کر دلی لے آئے گا اور اُسے جمنا کے کنارے نصب کرے گا۔ پہلے اُس کا پروگرام یہ تھا کہ پورے دلی شہر کو اُٹھا کر کہیں مدھیہ پردیش کی طرف لے جائے۔ چنانچہ پچھلے دنوں دلی شہر میں جو زلزلے کا ایک جھٹکا محسوس ہوا تھا وہ دلی شہر کو یہاں سے اکھاڑنے کی کوشش کے سلسلے میں تھا۔ نہ جانے عین آخری موقع پر یہ پروگرام کیوں منسوخ کر دیا گیا؟ یہ بھی افواہ ہے کہ وہ دلی کے مسلم ایریا میں رہنے والے تمام باشندوں کو راتوں رات اُٹھا کر بنگلوں اور کوٹھیوں میں پہنچا دے گا۔ اور کوٹھیوں اور بنگلوں کے باسیوں کو مسلم ایریا میں لے آئے گا تاکہ وہ بھی مسلم کی زندگی کی لذت سے آشنا ہو سکیں۔

افواہ ہے کہ دلی پولیس اُس الٰہ دین کے چراغ کے مالک کو تلاش کرنے کی بے حد کوشش کر رہی ہے۔ لیکن وہ ابھی تک ہاتھ نہیں آیا بہرکیف دلی شہر کے لئے آنے والے چند مہینے بڑے ہنگامہ خیز ہوں گے۔ سب کو انتظار کرنا اور تیار رہنا چاہیئے

ننھی مُنّی افواہیں ——— •

(۱) افواہ ہے کہ دلی شہر میں ایک کنواں دریافت ہوا ہے جس میں سے دن کو پانی اور رات کو دودھ نکلتا ہے۔ لوگ جوق در جوق اُس کنوئیں کی تلاش میں رات بھر گھومتے رہتے ہیں۔

(۲) مدھیہ پردیش کے چالیس ڈاکوؤں کے دستخطوں سے سرکار کو ایک مراسلہ موصول ہوا ہے کہ ہمارے غار میں بہت سا خزانہ جمع ہو گیا ہے اس لئے آپ اپنے کسی علی بابا کو یہاں بھیجیئے۔ جو ہم سے خزانہ لے جائے۔ معلوم ہوا ہے کہ ڈاکوؤں نے اس سے پہلے بھی ایک ایسا ہی مراسلہ

بھیجا تھا لیکن ہندسرکار کو کوئی علی بابا نہیں مل سکا جسے وہ خزانہ لانے کے لئے بھیج سکتی۔

(۳) میرٹھ شہر کے ایک محلے میں پچھلے ہفتے دو فرقوں کے افراد میں بڑی بھیانک لڑائی ہوئی۔ جسے دیکھ کر محلے کے تمام کتوں نے آئندہ لڑنے اور بھونکنے سے توبہ کر لی ہے۔

(۴) امرت سر کے دو تھانے داروں کو اس جرم میں مار مار کر سخت زخمی کر دیا گیا کہ انھوں نے ایک آدمی سے رشوت لینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس پر اس آدمی کے حمایتیوں نے تھانیداروں کو پیٹ ڈالا۔

(۵) پچھلے دنوں جہاں گرد کی آستین میں ایک سانپ گھس گیا جس نے مطالبہ کیا کہ مجھے دودھ پلاؤ۔ جہاں گرد کے انکار کرنے پر سانپ نے اُسے ڈس لیا۔ جہاں گرد ہسپتال میں ہے۔ اُسے سانپ کے ڈسنے کا اتنا غم نہیں جتنا اس بات کا ہے کہ سانپ نے ایک قدیم ضرب المثل کو غلط ثابت کر دیا ہے۔

افسانچہ

سنہ ۱۹۴۲ء کی ایک رات

گوپی ناتھ امن بی۔اے

۴۰۔ دریا گنج۔ دہلی

۲۸ اپریل ۱۹۶۳ء محترم خوشتر صاحب، آداب و تسلیم

آپ نے مجھ سے افسانہ نمبر کے لئے کچھ لکھنے کی فرمائش کی ہے۔ میں افسانے نہیں لکھتا لیکن ایک انگریزی مقولے کے مطابق حقیقت افسانے سے عجیب تر ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ ۱۹۴۲ء کی ایک رات کی سرگزشت لکھ کر بھیج رہا ہوں۔ شاید افسانوں کی صف میں جگہ پانے کی مستحق ٹھہرے۔ نیازمند ــــ گوپی ناتھ امن

۱۹۴۲ء ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ۹ اگست کی صبح مہاتما گاندھی اور ملک کے بڑے بڑے لیڈر گرفتار کر لیے گئے۔ دوپہر تک ملک میں ہزاروں گرفتاریاں ہو چکی تھیں۔ دلی میں بھی گرفتاریاں ہوئیں۔ دوسرے دن پاربتی دیوی کی سرکردگی میں جلوس نکلا۔ اور اسی روز وہ گرفتار ہو گئیں۔ تیسرے دن خلیل الرحمٰن صاحب کی رہنمائی میں جلوس نکلا۔ اور چاندنی چوک میں گولی چل گئی۔ حکیم خلیل الرحمٰن صوبہ کانگریس کمیٹی کے ممبر تھے۔ ان کے اور ساتھی پہلے گرفتار ہو چکے تھے حکیم صاحب کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ تحریک کی رہنمائی بہن ستیہ وتی صاحبہ فرما رہی تھیں۔ وہ بھی ۱۲ اگست کو گرفتار ہو گئیں۔ اور تحریک کی رہنمائی مسز ارونا آصف علی اور مسٹر جگل کشور کھنہ کرنے لگے۔ ان دونوں کے بھی وارنٹ تھے۔ کھنہ جی تو پکڑ لیے گئے تھے لیکن ارونا جی آخر تک گرفتار نہیں ہوئیں۔ ہم سب ان کی رہنمائی میں کام کر رہے تھے۔ کانگریس خلافِ قانون جماعت قرار پا چکی تھی لیکن اس کی طرف سے نشر و اشاعت کا کام جاری تھا۔ اردو کی اشاعت شری رام لعل ورما کی گرفتاری کے بعد میرے سپرد تھی۔ اور میرٹھ سے والنٹیروں کا لانا بھی۔ میں اسی سلسلے میں غازی آباد گیا ہوا تھا جہاں کی ایک رات کا یہ واقعہ ہے۔ دسمبر کا مہینہ اور جاڑے کا زمانہ تھا۔ تحریک آزادی کی گرما گرمی اس سردی میں بھی جاری تھی۔ مجھے والنٹیروں کو لانے اور خلافِ قانون لٹریچر تقسیم کرنے کے لئے غازی آباد جانا پڑا۔ میں پہلے اپنے دوست چودھری گوپال سنگھ کے یہاں گیا۔ وہاں پولیس کا ایک ملازم بیٹھا تھا جو مجھے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ جب میں چودھری گوپال سنگھ کے مکان سے سٹر گنگا پرشاد کے مکان پر پہنچا تو وہ بھی جیل جانے کے لئے پابہ رکاب بیٹھے تھے۔ اوپر کی منزل پر بیٹھ کر ہم لوگ آپس میں باتیں کرنے لگے۔ میرے ساتھ ایک ایسے صاحب بھی تھے جو توڑ پھوڑ کے کام میں نشر و اشاعت سے زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ ہم لوگ دوسرے روز کا پروگرام بنا رہے تھے کہ آدھی رات کے وقت چودھری گوپال سنگھ کو یہ اطلاع ملی کہ ہم لوگوں کی گرفتاری کے انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔ اور پولیس کو یہ معلوم ہو گیا ہے کہ ہم دلی سے غازی آباد آئے ہوئے ہیں۔ چودھری صاحب سخت کشمکش میں تھے۔ انھیں مجھ سے محبت تھی۔ اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں اس حالت میں پولیس کے ہاتھ آؤں۔ چنانچہ انھوں نے رات کے دو بجے اپنے محرر ٹیکارام کو روانہ کیا کہ وہ ہمیں اطلاع دیدے

ٹیکارام ایک دھوتی اور ایک انگوچھا لے کر دلّی دروازے کی طرف روانہ ہوا کیونکہ کشن پرشاد عرف کے پرشاد صاحب کا مکان اُسی علاقہ میں تھا۔ چوراہے پر پولیس والے نے پوچھا تو کون ہے، کہاں جاتا ہے۔ ٹیکارام نے دیدہ و دانستہ گاندھی ٹوپی نہیں پہنی تھی۔ وہ کچھ ہچکچا کر بولا سینڈن میں نہانے جا رہا ہوں۔ پولیس والے نے کڑک کر پوچھا۔ ابے یہ نہانے کا کب وقت ہے، تو رات کے دو بجے نہانے چلا ہے؟ ساتھ ہی وہ پولیس والا کھڑا تھا جو ہم لوگوں کو گرفتاری سے بچانا چاہتا تھا۔ اُس نے کہا۔ میں اِسے جانتا ہوں، یہ باولا سا آدمی ہے، جس وقت آنکھ کھلتی ہے نہانے چل دیتا ہے۔ اِس جواب کے بعد پولیس افسر نے ٹیکارام کو جانے دیا۔ ٹیکارام پولیس کی نظر بچا کر گلیوں گلیوں اُس محلے میں پہنچا جہاں ہم لوگ ٹھہرے ہوئے تھے لیکن معلقاً اُس مکان پر نہیں آیا جہاں ہم تھے بلکہ پڑوس کے ایک مکان میں جا کر ڈپٹی صاحب کے نوکر کو آواز دی۔ ڈپٹی صاحب کا انتقال ہو چکا تھا۔ میں نے غازی آباد میں اُن کے اجلاس میں پریکٹس کی تھی۔ اُن کا اجلاس گھر ہی پر ہوتا تھا۔ اِس لئے اُن کے سب ملازم مجھے جانتے تھے۔ ٹیکارام نے دستک دی۔ ملازم باہر آیا۔ ٹیکارام نے اُسے الگ لے جا کر کہا۔ آسن صاحب اور اُن کے ملازموں کی گرفتاری ہونے والی ہے۔ ماسٹر کے پرشاد کے مکان پر جا کر اطلاع کر دو۔ یہ کہہ کر ٹیکارام چلا گیا اور ڈپٹی صاحب کے ملازم نے کے پرشاد صاحب کے مکان پر آ کر آواز دی۔ یہاں کیفیت یہ تھی ؏

جب کوئی بولا صدا کانوں میں آئی آپ کی

فوراً یہ خیال ہوا کہ پولیس آگئی ہے۔ لیکن کے پرشاد صاحب نے ملازم کی آواز پہچانی اور پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

ملازم بولا میرے گھر میں بڑے زور سے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔ آپ چورن کی گولیاں دیدیجئے۔" کے پرشاد صاحب کے یہاں چورن کی گولیاں تھی ہی نہیں۔ سمجھ گئے کہ کچھ دال میں کالا ہے۔ زینے سے اُتر کر نیچے گئے اور دروازہ کھولا۔ ملازم نے اندر آ کر کہا کہ آسن صاحب اور اُن کے ساتھیوں کو پکڑنے کے لئے پولیس آ رہی ہے۔ کے پرشاد صاحب نے فوراً واپس آ کر ہم لوگوں کو یہ خبر وحشت اثر سنائی۔ میرے لئے ہائی کمانڈ یعنی ارونا جی کا یہ حکم تھا کہ تمہیں گرفتار نہیں ہونا ہے۔ ترکیب کے ساتھ نشر و اشاعت کا کام کئے جاؤ۔ میں اور میرے ساتھی اُسی اندھیرے میں کے پرشاد صاحب کے مکان سے نکل کھڑے ہوئے البتہ اندھیرے میں جوتے ڈھونڈنے میں کچھ دیر لگی۔ کیونکہ گھبراہٹ میں کسی کا جوتا کسی نے پہن لیا۔ بہر حال ہم لوگ مکان سے باہر نکل آئے۔ ناجائز پمفلٹ میرے ہاتھ میں تھے۔ اور توڑ پھوڑ کا سامان میرے ساتھی کے ہاتھ میں تھا۔ دلّی دروازے سے باہر جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ ہمارے ایک ساتھی نے بتایا کہ فصیل میں ایک جگہ سے کچھ اینٹیں نکلی ہوئی ہیں۔ اُسی رخنہ سے نکل چلیں گے۔ یہ ترکیب پسند آئی اور ہم اُسی ٹوٹے ہوئے حصّے سے فصیل کے باہر آگئے۔ جہاں راستے میں جب موٹر کی روشنی نظر آتی ہم یہی سمجھتے کہ پولیس آ رہی ہے لیکن موٹریں بے پروائی سے گزرتی گئیں۔ ہم لوگوں نے اپنا سامان ایک کھیت کے اندر کہیں گاڑ دیا۔ اور باغ کے اندر بیٹھ رہے۔ وہاں اکثر شہر والے صبح ٹہلنے جاتے ہیں۔ کئی گھنٹے کے بعد ہم ایسی ہی ایک ٹولی میں غازی آباد کے اندر آئے۔ سویرا ہو چکا تھا۔ شہر میں آ کر معلوم ہوا کہ ہم لوگوں کے نکلنے کے ایک گھنٹے کے بعد پولیس نے ماسٹر کے پرشاد کے مکان پر چھاپہ مارا۔ اور اُن کو گرفتار کر کے لے گئی مگر اصل شکار ہاتھ نہیں لگا۔ ماسٹر صاحب تو گرفتاری کے لئے تیار ہی تھے۔ اِس لئے اُن کی گرفتاری پر ہم میں سے کسی کو افسوس نہیں ہوا۔ بلکہ اُن کا مذاق اُڑاتے ہم غازی آباد اسٹیشن پہنچے اور وہاں سے ٹکٹ لے کر دلّی آگئے۔

دو ہفتے بعد میں دلّی میں گرفتار کر لیا گیا۔ اور ڈیڑھ سال تک دلّی اور فیروز پور کی جیلوں میں نظر بند رہا۔ لیکن اِس گرفتاری کا اُس واقعے سے کوئی تعلق نہ تھا جس کا میں نے اُوپر ذکر کیا ہے۔ ہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ میری بیوی مجھ سے پہلے گرفتار ہو چکی تھیں۔ جیسے شری رام لال ورما کی اہلیہ اُن کی گرفتاری سے پہلے گرفتار ہو چکی تھیں!

غزلیں

منظور احمد منظور بی اے ایل ایل بی

درد یوں بھی کبھی فریادِ لب ہوتا ہے
شعر بن جاتا ہے، ورد او طلب ہوتا ہے

بے سبب آپ کھنچے جاتے ہیں کیوں آنکھوں میں
لوگ کہتے ہیں کہ ہر شے کا سبب ہوتا ہے

نگہِ ناز کا رخ ہے مرے دل کی جانب
حسن والوں کا یہی حسنِ طلب ہوتا ہے

نکلے کیا حوصلۂ تقریر کا اُس محفل میں
سانس لینا بھی جہاں سوءِ ادب ہوتا ہے

چارہ گر کوئی ملے دل کا تو اتنا پوچھوں
عشق کیا ہوتا ہے کیوں ہوتا ہے کب ہوتا ہے

طنز و طعنہ میں بھی ہے کوئی سلیقہ لازم
بات تو یہ ہے کہ ہر بات کا ڈھب ہوتا ہے

سم بھی ہے شہد بھی ہے اُن کی نظر کا افسوں
یہی مرنے یہی جینے کا سبب ہوتا ہے

عین وہ ہوتا ہے منظور کا وقتِ گریہ
بزمِ یاراں میں جو ہنگامِ طرب ہوتا ہے

منظور احمد منظور

شگفتہ طلعت ایم۔ اے

کبھی روتے روتے کبھی ہنستے ہنستے
کٹیں گے یونہی زندگانی کے رستے

اگر جانتے یوں ہی ہے زندگی بھر
ترے پیار میں ہم گھڑی بھر نہ ہنستے

سنور ہی گئی اُن کی زلفِ پریشاں
اُلجھتے گئے میری ہستی کے رستے

تری بے رخی نے کیا خاک ورنہ
نہ تھے ہم زمانے کی نظروں میں سستے

بالآخر دل اپنا بھی آباد ہوگا
یہ بستی بسے گی مگر بستے بستے

اگر دل تمھارے بھی پہلو میں ہوتا
کبھی میری مجبوریوں پر نہ ہنستے

بشر ہر زمانے میں بکتے رہے ہیں
کبھی وقت مہنگے کبھی وقت سستے

شباب اپنی خودداریاں رنگ لائیں
رہے عمر بھر ہجر میں ہم جھلستے

شگفتہ طلعت

سعادت نظیر ایم۔ اے

خیالِ حور و جنت کیا ہے؟ اک خوابِ پریشاں ہے
مرا موضوع دنیا ہے، مرا مقصود انساں ہے

چراغِ زندگی جوشِ محبت سے فروزاں ہے
ترے حسنِ جلوہ ساماں سے فروغِ بزمِ امکاں ہے

کچھ اس انداز سے چھیڑا تھا دل کا ساز مجنوں نے
کہ اب تک ہر بگولا نجد کے صحرا کا رقصاں ہے

کھلی تھیں گرم رفتاری سے جس پر بند راہیں بھی
وہی کوتاہیِ ذوقِ عمل سے پا بجولاں ہے

وہاں کے ذرے ذرے نے حیاتِ جاوداں پائی
جہاں کی سرزمیں آلودۂ خونِ شہیداں ہے

مذاقِ زندگی بدلے بقدرِ جذبِ الفت
دلِ درد آشنا! تیرا یہی کارِ نمایاں ہے

ترا جلوہ ستاروں میں، ترا جلوہ بہاروں میں
بقدرِ اعتباراتِ نظر کیا کیف ساماں ہے

سعادت! ہے بقولِ غالب اپنا بھی یہی مسلک
وفاداری بشرطِ استواری عینِ ایماں ہے

سعادت نظیر

شاکر سوپاروی

وہ حسن بھر دیا ہے تم نے مری نظر میں
کوئی نہیں سماتا اب چشمِ معتبر میں

اک آہ بن کے آیا لب پر غمِ محبت
افسانہ کہہ گئے ہم اک حرفِ مختصر میں

ٹھکرا دیا جو شاکر اُس جانِ انجمن نے
پرساں نہیں ہمارا اب کوئی شہر بھر میں

شاکر علی

گھر بھر کیلئے
ماں کی پسند
ڈالڈا
ڈالڈا
کھجور چھاپ
وناسپتی
اعلیٰ ترین وناسپتی تیلوں سے بنا ہے۔
صاف ستھرے، میل ملاوٹ سے محفوظ مُہر بند ڈبوں میں ملتا ہے۔
یاد رکھئے ڈالڈا کھُلا کبھی نہیں بکتا۔
بڑھتے بچوں کیلئے اِس میں وٹامن ہیں۔
— ایک بڑھیا، خالِص چکنائی

افسانہ

شہرِ تمنّا

ظفر پیامی ایم۔ اے

بی نظام الدین۔ ایسٹ۔ نئی دہلی

۱۱ اپریل ۱۹۶۲ء

محترمی خوشتر صاحب!

آپ کے ارشاد کی تعمیل میں افسانہ نمبر کے لئے الف لیلہ کی پیش کی کوئی نئی قسط تو پیش نہیں کر سکوں گا۔ اس لئے کہ اب یہ سب مضامین کتابی شکل میں جلد ہی بازار میں آجائیں گے۔ یہ الف لیلہ کے دیس کی کہانی ضرور پیشِ خدمت ہے۔ اُمید ہے کہ آپ کے قارئین اسے بھی دلچسپی سے پڑھیں گے۔ میں نے اس کہانی میں افسانہ در افسانہ کی الف لیلوی تکنیک کا تجربہ کیا ہے۔ دیکھئے کہاں تک کامیاب ہوا ہوں، لیکن مجھے اپنی یہ کہانی اس کی نسبتاً انوکھی تکنیک سے بھی زیادہ اس لئے پسند ہے کہ یہ ہم سب کی کہانی ہے۔ یہ کولھو کے اُن بیلوں کی کہانی ہے جو آنکھوں پر ڈپلومہ عزائم کی پٹیاں باندھے اپنے ہی مرکز کے گرد گھوم گھوم کر اپنی تگ و دو میں فنا ہو جاتے ہیں..... آپ کے نورِ نظر کی شادی پر تہہِ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ ایک ایسا اجتماع جس میں وزیرانِ حکومت سے لے کر حاکمانِ شہر، عالمانِ زمانہ اور دانایانِ راز بھی شامل ہوں کم دیکھنے میں آیا ہے۔ مجھے مسرت ہے کہ مصنفوں کے قلم اور وزیروں کے قلمدان سے بیک وقت آشیرواد حاصل کرنے کی سعادت آپ کے نورِ نظر کو ملی۔ "بیسویں صدی" کی عظمت جتنی شان سے نئی صدی میں جلوہ گر ہو رہی ہے یہ شادی اُس کی بہترین دلیل تھی۔ خدا کرے "بیسویں صدی" ہمیشہ "نئی صدی" ہی میں رہے....

آپ کا ——— ظفر پیامی

بغداد میں دن ڈھلنے کے ساتھ ہی شارع ابونواس پر جوانی کا نکھار آنا شروع ہو گیا۔ سورج کی تیز و تند شعاعیں شاید وہ بوڑھی اور رہبانہ خود را سہاتیں تھیں جن کی التہاب بھری نگرانی میں پلنے والی شہزادیاں اُمنگ آفریں عمر میں ہی اپنے محبوب کو دیکھنے کی تمنا نہ کر سکتی ہوں۔ لیکن اِن محتسب شعاعوں کے غائب ہوتے ہی شارع ابونواس دجلہ کے کنارے کا ہر ریستوران کچھ اس طرح سنور گیا جیسے الف لیلہ کی کوئی شہزادی اپنے خوابوں کے حسین شہزادے سے پہلی بار ملنے کے لئے بن سنور کر تیار ہو رہی ہو۔ یہاں کے ہر میخانے اور ہر مطعم پر یہ رات اِسی طرح آتی ہے جیسے یہ ملن کی پہلی اور آخری رات ہو۔ پھر ہر صبح یہ تمام راہ گزر وقت کی بے نام سی ویرانی میں کچھ ایسے کھو جاتی ہے جیسے یہ صبح قیامت کی ازلی اور آخری صبح ہو۔ اُس شام بھی جب بھُنی مچھلی کے تکّے گزک یعنی مسگوف کے ساتھ کھجور کی شراب "عرق" کے دور چلنے شروع ہوئے تو یوں لگا گویا زمانہ قیامت کی چال چل گیا ہے۔ وہ حُسن جو دن کو نہ جانے کونسی تاریکی کے پردے میں نہاں تھا شام کو کچھ ایسے نکھر آیا کہ چاند اور ستاروں نے شرما کر آنکھیں پھیر لیں۔ دجلہ میں چلنے والی کشتیوں کے مسافر

ں کی بے پناہ تاریکیوں میں گم ہو کر رہ گئے۔ اور سطح دجلہ پر فقط کشتیوں کی
۔۔ینگی روشنیاں تیرتی ہوئی یوں نظر آنے لگیں گویا جگنوؤں کا ایک ہجوم
ں سارے ماحول پر چھا گیا ہو۔ شارع ابونواس پر چلنے والے قدم رک رک
چلنے لگے۔ بھوکی نگاہیں پل پل سے گزرنے والی حسیناؤں کا طواف کرنے
بجائے ریستورانوں کے شیشے پر کسی انجانے حسن کے رازوں کو ٹٹولنے
رکھنگالنے میں مصروف ہو گئیں۔ نیخانوں سے موسیقی کی نشہ آور آوازیں
ر دو سیتاروں کے تھمنوں کی جھلکیاں کچھ اس طرح رس رس کر باہر آنے لگیں
جیسے آگ کے ذرات دبے ہوئے شیمپین بھری ہوئی بوتل سے باہر آنے
کے لئے ٹھاٹھیں مار رہی ہو۔ اور اس قیامت خیز ماحول میں بے بیاہتا
جوڑے نے سوچنا شروع کیا کہ ہنی مون کے بعد وہ زندگی کی ابتدا کیسے کریں
گے۔ ہندوستانی سفارت خانے کے فرسٹ سکریٹری ستیش لوتھڑا نے اپنی
نئی نویلی دلہن نشی بھرواس کی معصوم معصوم سی کمر کے گرد باہیں ڈالتے ہوئے
گویا اس کے سارے تبسم کو اپنی نگاہوں میں سمیٹ لیا۔ اور چپکے سے یہ وہ بات
اس کے کان میں کہہ دی جو ایسے وقت یہ کہی جاتی ہے۔ پھر وہ مسکرا دی اور شارع
ابو نواس کا ایک ایک قمقمہ اُن دونوں کے لئے زیادہ روشن اور زیادہ حیران ہو
اٹھا۔ پھر انھوں نے خوابستان کے محلوں کی بنیادیں اٹھانا شروع کیں۔
ان میں تمناؤں کے شبستاں سجائے اور آرزوؤں کے رنگین پردے
لٹکائے۔ ان دونوں نے بانہوں میں بانہیں ڈالے ہوئے گویا آسمان کے
تاروں کو چھو لیا۔ انھیں یقین تھا کہ ان کے گھر میں ہر شے ہوگی۔ بہت بڑا
سالان ہوگا۔ تین یا چار چاند سے بچے ہوں گے۔ بچوں کی اپنی خوابگاہیں
ہوں گی۔ اور نشی نے شرماتے شرماتے ہی وہ لباس تیار کر ڈالے جنھیں پہنا
کر اس کے بچے چاند کی نگری کے باسی دکھائی دیں گے۔ ستیش نے اس وقت
کا نقشہ کھینچ ڈالا جب وہ عمر کے اس دور تک پہنچ چکے ہوں گے جب آرام کام
بن جاتا ہے۔ پھر میاں بیوی میں کوئی حسین سی تکرار بھی ہوئی کہ کس پہاڑ
پر وہ ایک کوٹھی خریدیں گے۔ پھر فیصلہ ہوا کہ نینی تال اور مسوری دونوں
جگہ ایک ایک بنگلہ خریدیں گے۔ "نہیں بھئی، خریدنے سے کام نہیں چلے گا۔
ہم بنوائیں گے۔" دونوں نے ایک ساتھ کہا۔ اور پھر بچوں کا ذکر آ گیا۔
جوان بچے جو آہو کی طرح چہلیں کریں گے۔ اور مچلیں گے۔ اس پر نوجوان نے
اپنا سینہ عجیب شان سے پھلا لیا۔ اور اس کی دلہن کچھ اس طرح سمٹ گئی
جیسے کسی دوشیزہ نے پہلی بار اپنی شادی کا ذکر سنا ہو۔ آرزوؤں کی اسی
دنیا کو کھیتے ہوئے وہ اس ساحل تک جا پہنچے جسے اس رات ان کی امنگوں
کی معراج بننا تھا لیکن قلوپطرہ بار کے دروازے ہی پر بڑھ کر کسی نے
ان کا راستہ روک لیا۔ نوجوان نے ذرا گھور کر دیکھا تو یہ وہی فقیر تھا جو صبح
کے وقت کاظمین کی مسجد کے سامنے بھکاریوں کے ہجوم میں ملا تھا۔ یہ فقیر
انھیں اس وقت بھی منفرد اور سب سے عجیب نظر آیا تھا اور جب اس
نے ہاتھ بڑھا کر بڑی شستہ انگریزی میں بھیک مانگی تھی تو انھیں ایسا لگا
تھا جیسے وہ کوئی بادشاہ ہے جو نہایت متانت کے ساتھ اپنا نذرانہ طلب
کر رہا ہے۔ ستیش لوتھڑا نے نہ جانے کیوں مرعوب ہو کر اسے ایک چوتھائی
دینار کا نوٹ بھی دے ڈالا تھا۔ حالانکہ ان کا گائیڈ کہتا ہی رہا تھا کہ اسے کچھ
نہ دینا چاہئے۔ "یہ شخص فقیری کا نام بدنام کر رہا ہے صاحب!" ہندوستانی
گائیڈ نے بڑی نفرت سے اس فقیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ اس کے
بعد اس نے بتایا کہ یہ شخص کافی پڑھا لکھا آدمی ہے۔ کبھی سیاست میں حصہ
لیتے ہوئے اچھا خاصہ لیڈر بھی بن گیا تھا لیکن نہ جانے کیا ہوا کہ شہرت
کے عین آخری زینے پر پہنچ کر اس نے اپنی ایک ایک پائی شارع ابو نواس
کے ریستورانوں کی شراب اور مغنیاؤں پر لٹا دی۔ اب اس کا یہی معمول
ہے کہ وہ ہر صبح کاظمین کے مقدس اور پر جلال معبد کے سامنے آ جاتا
ہے۔ یہاں سے اسے جو کچھ ملتا ہے اسے شارع ابو نواس کے کسی ریستوران
میں جا کر لٹا دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ صبح کے پچھلے پہر تک ان کناروں
پر گھومتا ہوا شاعر شراب ابو نواس کے شعر گاتا پھرتا ہے۔ ایسا عجیب
غریب شخص بھلا بھیک کا مستحق ہو سکتا ہے؟" گائیڈ نے حقارت سے
اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ اور ستیش نے اس وقت جو اسے
راستے میں دیکھا تو اس کے رنگ برنگے لیکن تار تار لباس میلی سی
داڑھی، غاروں جیسی گہرائیوں سے جھانکتی ہوئی عقابی آنکھوں، اور
دھول سے اٹے بالوں پر اس کی نظر الجھ کر رہ گئی۔ صرف ایک چوتھائی

"دینار!" فقیر نے پہلے سے بھی زیادہ رعب کے ساتھ کہا۔

"کیوں؟"

"آج تک یہ سوال مجھ سے کسی نے نہیں پوچھا۔ لیکن تم اجنبی ہو تو لو سنو صرف اس لئے کہ آج میں شمپین پیوں گا۔ شمپین کی بوتل دو دینار میں ملے گی۔ اور میرے پاس اس وقت پونے دو ہی دینار ہیں۔"

"مگر ہم تمھیں شمپین پلانے کے موڈ میں نہ ہوں تو؟"

"لیکن میں تو ہوں اور یہی زیادہ اہم بات ہے۔"

اور نہ جانے کیسے شش اور اس کی دولہن کو اس الو کے فقیر سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اور ایک لمحہ کے تامل کے بعد اس نے فقیر سے کہا۔

"بہت اچھا تم شمپین ضرور پیو۔ لیکن ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ ہمارے پاس بیٹھ کر پیو۔ ہاں، مگر یہ لوگ تمھیں اندر گھسنے دیں گے؟"

"مجھے منظور ہے اور رہی اندر آنے کی اجازت، تو میرے ہاتھ میں دام ہیں جسم پر لباس نہیں تو کیا ہوا اور جب ہاتھ میں دام ہوں تو لباس کی وقعت ہی کیا ہے۔ کم از کم میرے لئے تو کوئی میخانہ کبھی بند نہیں ہو سکتا۔"

ریستوران میں بیٹھتے ہی بیرے کو آرڈر دینے کے بعد وہ بولا۔

"اب مجھے یقین ہے تم پوچھو گے کہ میں نے یہ انداز کیا اختیار کیا ہے کہ دن مسجد میں گزارتا ہوں تو رات شراب خانے میں، یہ سوال نہ جانے کتنے لوگ مجھ سے پوچھ چکے ہیں۔ لیکن میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔ اس لئے تمھارا ربع دینار بالکل بے کار جائے گا۔ بولو یہ سودا منظور ہے؟"

نوجوان ہندوستانی افسر نے جب شام کو یوں بے کار جاتے دیکھا تو اس الو کے چھان کی منت سماجت پر اتر آیا۔ اپنے غیر ملکی ہونے کا واسطہ دیا۔ اپنے اشتیاق کا اظہار کیا اور پھر اس کی دلہن نے شرمائی شرمائی نظروں سے التجا کی کہ وہ اپنی داستان انھیں ضرور سنائے۔

"میری داستان بے رنگ و بے جان ہے۔ تم سے بھی زیادہ۔ ہاں اگر سننا چاہتے ہو تو ایک اور داستان سنو جو الف لیلے کے اس دیش میں بھی اتنی ہی اچھوتی ہے جتنی شمپین کی وہ کنواری بوندیں۔ جن سے اب تک میرے سوا کسی کے ہونٹ آشنا نہیں ہوئے ہوں گے۔ یہ داستان دنیا کے مقدس ترین شہر یروشلم کی گلیوں میں کسی یتیم دوشیزہ کی طرح بھٹکتی پھرتی مل گئی تھی اور آج تک میرے سینے میں یوں محفوظ ہے جیسے کسی شہنشاہ کے حریم ناز کی ملکۂ خاص ہو۔ یروشلم تو تم گئے ہو نا؟"

اور جب نوجوان جوڑے نے مثبت میں سر ہلا دیا تو اس الو کے فقیر نے بغیر کسی تمہید کے کہنا شروع کیا۔

"تو تو سنو۔ تاکہ تمھیں بھی یہ حسرت نہ ہو کہ تمھارے آدھے دینار کے دام تمھیں وصول نہیں ہوئے۔ یہ دنیا ہی ایسی ہے جو شاہوں کو تو ملنے دے کر اس کا مطالبہ کبھی نہیں کرتی۔ لیکن فقیروں کو خیرات دے کر یہی چاہتی ہے کہ اس کا ثواب ملے۔ خیر تو سنو۔

یہ کہانی فلسطین کے ان جنگلوں کی ہے جہاں زیتون کے پیڑ اور سنگترے کے درخت ہر وقت ایک دوسرے سے یوں ہم آغوش رہتے ہیں جیسے کہ ایک دیو ہیکل شہزادے نے کلی جیسی نازک، کومل سی شہزادی کو اپنی باہوں میں سمیٹا ہوا ہو۔ فلسطین کے انہی جنگلوں میں ایک نوجوان لکڑ ہارا رہتا تھا۔ اس نوجوان کا نام کیا تھا۔ یہ تو مجھے یاد نہیں رہا لیکن ہم سہولت کی خاطر اسے ابو جمال کا نام دے دیتے ہیں۔ حالانکہ ابو کا مطلب باپ ہوتا ہے اور جمال کا حسن۔ اور وہ نوجوان نہ تو کسی کا باپ تھا اور نہ حسین۔ بہر حال صفت سے الٹے نام ہر ملک میں ہوتے آئے ہیں۔ تمھارے ہاں بھی ہوں گے۔ ہمارے ہاں تو عام ہوتے ہیں۔ ہاں تو ابو جمال ایک نوجوان لکڑ ہارا تھا۔ جو ہر کہانی کے اچھے ہیرو کی طرح ہوشیار بھی تھا۔ اور طاقتور بھی۔ لمبا چوڑا جسم بھی رکھتا تھا اور صاف ستھرا دماغ بھی۔ خوب مضبوط مچھلیوں والی سڈول سی باہیں بھی۔ اور باز کی طرح دور دور تک دیکھنے والی آنکھیں بھی۔ بہر حال میں آپ کو اس کے حلیے سے پریشان نہیں کروں گا۔ کیونکہ ہر عقلمند کہانی سننے والا یہ سمجھ سکتا ہے کہ کہانی کے ہیرو کی شکل کیسی ہونی چاہیے۔ خاص طور پر جب کہ وہ نوجوان بھی ہو۔ بس اتنا کہنا کافی ہو گا کہ وہ ہر لحاظ سے ایک محنتی اور جفاکش لکڑ ہارا لگتا تھا۔ مجھے پتہ نہیں کہ یہ لکڑ ہارا اس لق و دق جنگل میں کیوں اکیلا تھا

افسانہ نمبر

اور اُس نے اب تک صحت مند اور کماؤ ہونے کے باوجود شادی کیوں نہیں کی؟ بہر حال یہ نوجوان دن بھر جنگل میں گھوم کر لکڑیاں کاٹتا۔ زیتون کے پیڑوں سے بغل گیر ہوتے ہوئے سنگتروں کے بھاری بوجھل درختوں سے اُن کے پھل توڑ کر کھاتا غلیل لے کر کبوتروں، فاختاؤں اور اسی طرح کے دوسرے جانوروں کا شکار کرتا۔ اور پھر قریب کے گاؤں میں جا کر اپنی دن بھر کی کمائی کو ٹھکانے لگا آتا۔ یہ کمائی اُس کے لیے اتنی کافی ہوتی کہ وہ اپنے آپ کو خلیفہ یا سلطان سے کم نہ سمجھتا۔ اب آپ پوچھیں گے کہ اگر یہ سب کچھ موجود تھا تو یہ کہانی سُنانے کی کیا ضرورت تھی، کیونکہ کہانی کے لیے کسی بڑی مصیبت کا استعمال بہت ضروری ہے۔ ہمارے اِس نوجوان لکڑ ہارے کو بھی ایک دن ایک عجیب سی مصیبت سے دوچار ہونا پڑا۔

یہ مصیبت ایک اندھے اور بوڑھے بھکاری کی صورت میں نمودار ہوئی۔ جس کی صورت ابوجمال سے اتنی ملتی جلتی تھی کہ جی چاہتا تھا کہ ابوجمال کو ابنِ جمال کہیں۔ اور بوڑھے کو ابوجمال۔ خیر صورتوں کے ملنے سے کہیں نام اور ناموں کے ملنے سے کہیں نصیب بدلا کرتے ہیں؟ جب ابوجمال، اُس بوڑھے بھکاری سے ملا تو اُسے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ بوڑھا سینکڑوں ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر کے بغداد کے بڑے شہر سے یہاں پہنچا ہے۔ ابوجمال نے بوڑھے سے یہ تو نہیں پوچھا کہ بغداد وہ کس لئے گیا تھا اور وہاں سے کیوں واپس آ گیا؟ لیکن بغداد کی رنگ برنگی ہر ایک تفصیل اُس نے ضرور کُرید ڈالی۔ بوڑھے نے مزے لے لے کر بتایا کہ بغداد میں دجلہ کے کنارے رکس طرح رنگ رلیاں منائی جاتی ہیں۔ خلیفہ کے محل میں کس طرح جنّت کا سماں بندھ جاتا ہے۔ بازاروں میں کیسے سونے چاندی کی بارش ہوتی ہے۔ اور آر پار نظر آنے والے پتھر سے بنے شراب کے بڑے بڑے مٹکے کس طرح نرم و نازک کنیزیں اُٹھائے پھرتی ہیں کہ جنّت کی حُوریں بھی دیکھ لیں تو شرما جائیں۔ بوڑھے بھکاری کی اِن باتوں سے ابوجمال اسقدر خوش ہوا کہ اُس نے بوڑھے کو اپنی دن بھر کی کمائی دے ڈالی۔ یہی نہیں بلکہ اُس نے یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ ایک نہ ایک دن وہ بھی بغداد پہنچ کر رہے گا۔ بوڑھے نے یہ سُنا تو پہلے تو اُس نے کچھ اُداسی سی محسوس کی۔ لیکن بعد میں وہ اِس پر بھی تیار ہو گیا کہ ابوجمال کو بغداد پہنچنے کا راستہ بتا دے گا۔ ہر کہانی کے اچھے اور دلچسپ ہیرو کی طرح ہمارے ہیرو ابوجمال نے بھی یہ نہ سوچا کہ بھلا وہ بالکل پیدل بغداد کس طرح پہنچے گا؟ شاید اُس کے پاس اُونٹوں کے کاروبار میں شریک ہونے کے لئے پیسے بھی نہیں تھے۔ اور یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُن دنوں اُونٹوں کا کوئی کارواں اُدھر طرف آیا ہی نہ ہو۔ بہر حال ابوجمال نے بڑی لگن اور دلچسپی کے ساتھ بوڑھے بھکاری سے بغداد تک پہنچنے کا پورا راستہ دریافت کر لیا۔ یہ راستہ گھنے جنگلوں، اُونچی نیچی پہاڑیوں، تپتے اور جلتے صحراؤں اور ہفتوں لگاتار چلنے والے ریت کے طوفانوں سے اٹا پڑا تھا لیکن ابوجمال نے اِن دقتوں کی رتی برابر بھی پروا نہیں کی۔ وہ ہر قیمت پر بغداد پہنچنا چاہتا تھا تاکہ وہ بھی اُس عیش و عشرت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے جس پر یہ بوڑھا اپنی جوانی اور اپنی آنکھیں بھینٹ چڑھا آیا تھا۔ ابوجمال چونکہ اَن پڑھ تھا اِس لئے اُس نے بغداد کا راستہ یاد رکھنے کی ایک عجیب ترکیب نکالی۔ اُس نے اپنے پیٹ اور اپنی ٹانگوں پر وہ سارا راستہ کھدوا لیا جو بوڑھے بھکاری نے بغداد پہنچنے کے لئے اُسے بتایا تھا۔ اِس نقشے کو کھدوانے کے ساتھ ہی اُس نے عین چھاتی پر بغداد کی زندگی کے کچھ ایسے حسین اور دلکش نظارے بھی کھدوا لئے جنھیں وہ اُس بوڑھے بھکاری سے بار بار سُن چکا تھا۔ آپ حیران نہ ہوں۔ جوانی میں جذبات کی سُوجھ بوجھ ایسی ہی ہوتی ہے۔ نہ جانے آپ نے بھی اِس سے کتنی زیادہ مضحکہ خیز حرکتیں کی ہوں گی۔ جب وہ یہ کام کر چکا تو اُس نے کلہاڑی لی، چھوٹا بستر کندھے پر رکھا اور اپنے ٹوٹے پھوٹے گاؤں اور اپنے ہرے بھرے جنگل پر ایک نظر ڈالی اور بوڑھے بھکاری کی دعائیں لے کر بغداد کے راستے پر چل پڑا۔ اب یہ بات کہانی ہی نہیں حقیقت ہے کہ اُسے فلسطین سے بغداد تک پہنچنے کے لئے پندرہ سولہ سو میل کا راستہ طے کرنا پڑا۔ ایسا برا راستہ پا پیادہ طے کرنا یوں بھی آسان نہیں ہوتا۔ اور جب راستہ چلتے چلتے روٹی کما کر کھانے کی فکر بھی ہو تو یہ کام مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن ہمارے نوجوان لکڑ ہارے نے ہمت نہ ہاری۔ وہ برابر چلتا رہا۔ اُس کے پاؤں میں چھالے پڑ گئے۔ اُس نے راہ میں پڑے ببول کے کانٹوں سے انھیں پھوڑ لیا۔ جب گرمی ستانے لگی تو اُس نے توے کی مانند تپتی ہوئی ریت پر آرام کر لیا۔ اُسے

ٹھٹک گیا تو اُس نے اپنی تھکی ماندی آنکھیں دُور کسی سراب پر گاڑ دیں۔ پر جیسے حملہ کیا تو اُس نے چلنے کی رفتار اور بھی تیز کر دی۔ گویا وہ اُس سے نکلنا چاہتا ہو۔ غرضیکہ وہ چلتا رہا۔ دن رات ایسے چلتا رہا جیسے اُسے کسی کے پَر لگ گئے ہوں۔ یا اُس پر کوئی آسمانی پری مہربان ہو گئی ہو۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اپنے اس سفر کے دوران میں ابوجمال نے اپنی کلہاڑی سے کام لیا۔ جہاں اُسے لکڑیاں ملیں اُس نے کاٹ ڈالیں۔ اور بدوؤں کے قافلے کو بیچ کر روٹی کھری کر لی۔ جہاں اُسے کوئی جانور ملا اُسے غلیل سے مار کر کھا لیا۔ یہ اُس کی خوش نصیبی تھی کہ ان صحراؤں میں بڑے بڑے خونخوار جانور ہوتے ہی نہیں۔ اسی راستے پر چلتے ہوئے ابوجمال کو برسوں گزر گئے تھے اب یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ کب چلا تھا اور کہاں سے چلا تھا۔ لیکن بغداد کا نقشہ اب بھی اُس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اُس کی آنکھوں کی روشنی کچھ دھیمی ہو چکی تھی۔ اُس کے سینے پر بھی جھریاں پڑ چکی تھیں اُس کی ٹانگوں اور رانوں پر کھُدے بغداد کے نقشے کی لکیریں بھی مدھم پڑتی جا رہی تھیں لیکن بُوڑھے بھکاری کی ایک ایک بات اُس کے ذہن پر تازہ تھی۔ اُس نے سوچا اگر وہ سینے پر کھُدے رنگ رلیوں کے نقشے اچھی طرح نہیں دیکھ سکتا تو کیا ہوا۔ چند ہفتے یا زیادہ سے زیادہ چند مہینے بعد وہ خود بغداد کی اُن حسیناؤں کے ہاتھوں سے انگوروں کی لال لال شراب کے بلوریں جام تھامے گا۔ جو اب تک صرف اُس کے خوابوں میں آتی تھیں۔ اُس نے سوچا کہ پیٹ پر بنا بغداد کا نقشہ کس کام کا، کیونکہ اب وہ خود دجلہ کے رُوح افزا کناروں پر پہنچ کر کوئی محل صورت کشتی لے گا۔ اور اُسے سوتے سوتے ہی بغداد کے عین درمیان، خلیفہ کے محل "الحمرا" کے سامنے پہنچا دے گی۔ پھر کیا عجب کہ خلیفہ کی کوئی بیٹی اپنی سہیلیوں کے ساتھ سونے سے مڑھی کشتی میں سیر کرتی ہوئی وہیں آ نکلے۔ اور اُس پر عاشق ہو جائے۔ ایسا ہو جانا غیر یقینی تو تھا ہی۔ لیکن کم از کم اُس زمانے کے قصے کہانیوں میں تو ایسا ہوتا ہی تھا۔ اور وہ پھر اسی بہانے کسی خلیفہ کے محل، کسی وزیر کے قلعے یا کسی قاضی کی عدالت میں پہنچ جاتا۔ قاضی کی عدالت میں پہنچتے پہنچتے اُس کے خوابوں کا سلسلہ ٹوٹ جاتا اور وہ واپس اُسی صحرا میں آ جاتا جہاں سے پتہ نہیں بغداد کتنی دُور ہے لیکن گزرتے ہوئے قافلے والوں سے اُسے پتہ لگ جاتا کہ بغداد اب بہت دُور نہیں رہا۔ اور یہ سُن کر وہ ایک بار پھر اپنے قدموں کی رفتار تیز کر دیتا۔ اور پھر ایک بار وہ خلیفہ ہارون الرشید کی شان و شوکت اور اُس کے شہزادے ابوالحسین کی مہمان نوازی کی داستانوں میں کھو جاتا۔ کبھی کبھی اُسے خیال آتا کہ وہ بغداد کے دروازوں پر پہنچ چکا ہے لیکن رات ہو چکی ہے۔ اس کے بعد اگلی صبح ہوتی ہے دروازے کھلتے ہیں۔ وہ شہر کے اندر داخل ہوتا ہے تو اُس کی حیرانی کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ دل ہی دل میں وہ جانتا تھا کہ حیرانی کی وجہ کوئی نہیں ہو گی۔
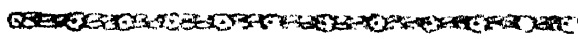
- خدا کے نزدیک حکماء کے اقوال کی جو قیمت ہے اُن کے زوال کی نہیں۔ (فیثا غورث)
- جاہل سے دوستی نہ کر کہ وہ یہ سمجھے کہ تجھے اُس کی جاہلانہ باتیں پسند ہیں۔ اور دانا کے غصے کو بے پروائی میں نہ ٹال کر کہیں وہ تجھ سے الگ نہ ہو جائے۔ (حضرت لقمانؑ)
- وقت اِس دُنیا کی رُوح ہے۔ (فیثا غورث)
- ساعتوں کو اہم سمجھنا چاہئے۔ ساعتیں گِننا اہم نہیں۔ (جیمز جے واک)
- سب سے بڑے چور وہ ہوتے ہیں جو آپ کا وقت ضائع کرتے ہیں۔

خلیفہ آناً فاناً مر گیا تھا اور امیر و وزیر اِس انتظار میں تھے کہ باہر سے آنے والے پہلے شخص کو خلیفہ یا بادشاہ بنا دیں۔ بُوڑھے بھکاری نے اُسے سب کچھ بتا دیا تھا کہ یہ صدیوں سے ہوتا چلا آیا ہے۔ اِس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں۔ آخر وہ اِسی طرح دن رات ایک کرتے ہوئے چلتے چلتے بغداد کے دروازوں کے قریب پہنچ گیا۔ لیکن اُسے پتہ بھی نہ چلا کہ وہ شہر پناہ میں گھوم رہا ہے۔ وہ شہر جس کے لئے اُس نے اپنی زندگی کے کتنے ہی بہترین برس چلتے چلتے گزار دیئے تھے۔ اُس نے اپنی ٹانگوں، اپنے پیٹ اور اپنے سینے کو بہت بار ٹٹولا مگر وہاں جھرّیوں، ہڈیوں کی اُونچی

بھی ڈوکوں کے سوا کچھ نہ ملا۔ بغداد پہنچتے پہنچتے رنگ رلیوں کی تمام تصویریں اور راستے کے تمام نقشے شاید اُس کے لہو میں بھوک اور پیاس بن کر گھل مل چکے تھے۔ اُسے ایک ڈھول سے بھوکے پیٹ کے علاوہ اور کچھ پتہ نہ چلتا تھا کہ کیا ہے۔

اور یہ تو آپ جان ہی چکے ہوں گے کہ اصلی بغداد کو دیکھنے سے پہلے ہی ابوجال کی آنکھیں راستے کی گرمی اور ریت کی نذر ہو چکی تھیں۔ اُس وقت اُس کی صورت اور اُس بوڑھے بھکاری کی صورت میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا جس نے اُسے بغداد کا راستہ بتایا تھا۔ یہ تو پتہ نہیں چلا کہ ابوجال بھی بغداد سے مایوس ہو کر واپس فلسطین کے جنگلوں میں پہنچا یا کہیں اور چلا گیا۔ لیکن اتنا ضرور کہتے ہیں کہ ابوجال کی شکل کے کئی بوڑھے بھکاری صدیوں تک بغداد کی گلیوں کی خاک چھاننے کے لئے شہر کے اندر داخل ہو کر اُسی طرح غائب ہوتے رہے جیسے ابوجال نہ جانے کہاں کھو گیا تھا۔"

اُس عجیب و غریب فقیر نے جب اپنی داستان ختم کی تو ریستوران میں آدمی کم اور کرسیاں زیادہ نظر آ رہی تھیں۔ وہ شیمپین کی بوتل کبھی کی خالی کر چکا تھا۔ اور اب اُس کی نگاہیں اُس عقاب کی طرح بے تاب ہو رہی تھیں جو شکار پر جھپٹنے کے بعد کہیں دُور اُڑ جانے کے لئے بے تاب ہو۔ اُس نے بے پروائی کے ساتھ نوجوان جوڑے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جب میں نے بیت المقدس میں یہ داستان سُنی تو میں بغداد کا ایک مشہور وکیل تھا۔ اور حیرت نہ ہوتی اگر اب تک اِس ملک کا کوئی حاکمِ اعلیٰ بنا ہوتا۔ لیکن اب تمھیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں رہی کہ میں نے کیوں وکالت کا گاؤن اور رہنمائی کی قبا کو اُتار پھینکا۔ اور دیوانگی کا تار تار جامہ پہن لیا۔ تو دوستو! میرا گناہ صرف یہی ہے کہ میں نے ابوجال کی طرح شہرِ تمنّا کے دروازے پر آنکھوں سے محروم ہو کر دستک نہیں دی۔ میں نے آس کی اندھی نگری پر اپنی روشن نگاہوں کو قربان کر دی اور لاکھ لاکھ شکر ہے اِس جامِ شیمپین کا کہ میں آج کے ابوجالوں کی طرح دُنیا کی اُن گلیوں میں نہیں بھٹکا جنھیں تم سب خوابوں کے شیش محل سمجھ کر تعمیر

غزل

نسیم عباسی امروہوی

دیکھ کے اِن آنکھوں کی مستی
لائے تاب یہ کِس کی ہستی

اُن کے جلوے صحرا صحرا
اُن کے چرچے بستی بستی

دل کی قیمت ایک نظر ہے!
جنسِ گراں اور اتنی سستی

اُن کے قدم پر سر ہے میرا
عینِ رفعت ہے یہ پستی

آج بھی نظروں میں ہے رقصاں
اِک تری مُورت بولتی ہنستی

تُو اے نسیم اور شعر کا میداں
تُو کیا ہے، کیا تیری ہستی

نسیم عباسی امروہوی

کرتے ہو اور پھر اُن میں طلسمِ ہوشربا کے مجبور بُتوں کی طرح اسیر ہو کر رہ جاتے ہو۔ خیر چھوڑو اِن باتوں کو۔ جاؤ تمھارے خواب ابوجال کے بغداد ہی کی طرح تمھارا انتظار کر رہے ہیں۔ جاؤ اُن میں کھو جاؤ۔ پیشتر اس کے کہ یہ خواب تمھیں کھا جائیں۔"

یہ کہہ کر وہ چپ چاپ اُٹھا اور شکریہ یا شب بخیر کہے بغیر ایک طرف چل دیا! ——

اور پھر ——

شارع ابونواس پر الف لیلہ کے کسی پُراسرار کردار کی طرح جانے کن پہنائیوں میں کھو گیا —— !!

نفیس سندیلوی

جب سے تم پر فدا ہے خدا کی قسم
حال دل کا بُرا ہے خدا کی قسم

حُسن پر اپنے تم کو بڑا ناز ہے
چار دن کی ہوا ہے خدا کی قسم

تم جفا کر کے کیوں ہو پشیماں اب
تم کو سب کچھ روا ہے خدا کی قسم

دیکھنا مُسکرا کر ترا ناز سے
دردِ دل کی دوا ہے خدا کی قسم

تم نفیسِ حزیں کو نہیں جانتے
وہ تو تم پر فدا ہے خدا کی قسم

نفیس

بیتاب بیلی بھیتی ایم۔ اے

ایک ادنیٰ سی آرزو کا مآل
میرے حالِ تباہ سے پوچھو

رنگ ساون کی بھیگی راتوں کا
اُن کی زلفِ سیاہ سے پوچھو

کیوں میں اُن کے قریب جاتا ہوں
کششِ بے پناہ سے پوچھو

عشق کی سجدہ ریزیوں کی بات
حُسن کی جلوہ گاہ سے پوچھو

کیوں ہے بیتاب خانماں برباد
اپنی نیچی نگاہ سے پوچھو

بیتاب بیلی بھیتی

عرش صہبائی

ہم جو رسوا ہوئے تھی خطا آپ کی
پھر بھی ہر بات ٹھہری بجا آپ کی

دوستی میں وفا ہی ضروری نہیں
آپ وہ کیجئے جو رضا آپ کی

آپ ہر اک مصیبت سے محفوظ ہوں
میرے سر آ پڑے ہر بلا آپ کی

ہم تو انجام سے باخبر تھے مگر
بھا گئی زندگی کو ادا آپ کی

اس کو قسمت کا اک معجزہ جانیے
میرے حصے میں آئی جفا آپ کی

عرش صہبائی

چندر پرکاش جوہر بجنوری

قربان جاؤں شوخِ تغافل شعار کے
دل سے بھلا دیے ہیں ستم روزگار کے

میں دیکھتا ہی رہ گیا حیرت سے چار سُو
پردے میں چھپ گیا مجھے کوئی پکار کے

جوہر نہ پوچھ مرحلۂ پیچ و تابِ عشق
اُلجھے ہم اور گیسوئے جاناں سنوار کے

چندر پرکاش جوہر بجنوری

شوکت تھانوی اور اُن کے لطائف

پروفیسر غلام احمد فرقت کاکوروی ایم۔اے

پہاڑی بھوجلہ۔ بالمقابل نذیریہ لائبریری۔ دہلی

۳۰ مارچ ۱۹۶۳ء

محترم خوشتر صاحب تسلیم

"شوکت تھانوی اور اُن کے لطائف" کے عنوان سے مطلوبہ مضمون بھیج رہا ہوں۔ اس میں اُن کے جو لطائف درج ہیں وہ آپ کو کہیں نہ ملیں گے۔ اور اُن کی زندگی سے متعلق جو واقعات لکھ رہا ہوں اُن کا بھی کسی کو علم نہیں ..... میں نے جو کچھ اُن کے بارے میں لکھا ہے وہ تمام تر حقیقت پر مبنی ہے ..... آخر میں وصیتاً عرض ہے کہ اس مضمون کی کوئی نقل حسب دستور قدیم میرے پاس موجود نہیں ہے۔ رسالے کے ایڈیٹر صاحبان میرے جو مضامین یا غیر واپس نہیں کرتے یا ڈاکخانے والے ضائع کر دیتے ہیں وہ سب کے سب میں داورِ محشر سے کہہ کر عالمِ بالا میں رکھواؤں گا ..... شوکت تھانوی کی بیماری کے بارے میں جو تفصیلات آئی ہیں اُن سے معلوم ہوا کہ وہ مرنے سے دو ماہ قبل جگر کے کینسر میں مبتلا ہو گئے تھے اور مرض نے اُن کو آخر میں اس قدر لاغر کر دیا تھا کہ وہ بستر پر جنبش بھی نہ کر سکتے تھے مگر دیکھئے تو کہ۔

جو اُٹھ نہ سکتا تھا بے سہارے وہ شورِ محشر اُٹھا کے اُٹھا ٭ ستم ظریفی تو کوئی دیکھے ہنسانے والا رُلا کے اُٹھا

مخلص ——— فرقت کاکوروی

یقین مانئے مجھے جعفر زٹلی سے لے کر اکبر الٰہ آبادی سے قبل تک جو مزاح نگار، ہجو نگار، ریختی گو شعراء اور ادباء مرے اُن کے مرنے کا چنداں غم اس وجہ سے نہیں ہوا کہ اُن سے نہ تو میرے مراسم تھے اور نہ میں نے انھیں دیکھا تھا البتہ اکبر الٰہ آبادی چونکہ میرے لڑکپن یعنی ۱۹۲۱ء میں مرے تھے اس لئے مجھے اُن کے مرنے پر صرف یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید ہمارے الٰہ آباد کے امرودوں کی شہرت جنّت والوں میں اس قدر ہوئی ہے کہ فردوس کے رہنے والوں نے بغیر چکھے اپنے ہونٹ اس بُری طرح چاٹنا شروع کر دیئے کہ رضوان کو مجبوراً حضرت عزرائیل علیہ السلام سے کہنا پڑا کہ وہ اکبر الٰہ آبادی کو فردوس بریں میں بلا کر الٰہ آبادی امرودوں کی قلمیں لگوائیں تاکہ جنّت کے رہنے والے ہندوستان کے اس جنّتی میوہ سے لطف اندوز ہو سکیں۔

حضرت ظریف لکھنوی کو دُنیا سے لے جانے میں ملک الموت کو میں یوں حق بجانب سمجھا کہ اودھ پنچ والے منشی سجاد حسین کی قیادت میں ایک وفد جو نواب سید محمد آزاد، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، تربھون ناتھ ہجر، احمد علی کسمنڈوی، احمد علی شوق، رتن ناتھ سرشار

اور ریاض خیرآبادی پر مشتمل ملک الموت سے اس بات کا مطالبہ کر چکا تھا کہ انھیں جنّت میں ایک ایسے مزاحیہ شاعر کی سخت ضرورت ہے جو خاص لکھنو کے رچے بسے انداز میں اُن کی محفل کو گُل و گلزار بنا دے۔ ۱۹۳۶ء میں جب مرزا فرحت اللہ بیگ مرے تو میں نے سوچا کہ چلو جنّت میں اِن کے پہنچنے پر مزے آئیں گے جب ڈپٹی نذیر احمد کے انگوروں میں یہ پہنچ کر برابر کا حصّہ بٹائیں گے اور اُن کے سود در سود کے حساب کو چکائیں گے۔

مگر پاکستان بننے کے بعد جب ملا رموزی مرے اور ملک الموت نے بغلیں بجانا شروع کیں کہ کیا گلابی اُردو لکھنے والے کو مارا ہے تو میں نے طنزاً کہا کہ ؎

کسی بیکس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا ٭ جو آپ ہی مر رہا ہو اُس کو گر مارا تو کیا مارا

میں نے کہا کہ قبلہ! خیر مارا تو سر آنکھوں پر مگر ایک مٹھی بھر ہڈیوں کے سوا ہاتھ کیا لگا؟ مار و لگلا پکھنا ہاتھ۔ زیادہ سے زیادہ گلابی لب و رخسار والی حوروں میں اُن کی گلابی اُردو مزا دے جائے گی اور اُس نحیف الجثہ کی تندرستی قدرے نکھر آئے گی۔ نمکدان والے

جنت کی سیٹ پہ بیٹھا کہ ملک الموت صاحب سے چلے تو میں نے کہا کہ چلو ہم لوگوں کی ایک سیٹ چار آدمیوں کی جگہ تو چار آدمی جنت میں گھیرے ہوئے ہوگا۔ گویا پہلے سے اپنی سیٹ بک ہو جائے گی۔ جگہ کی جگہ دلوائے گا اور قصائد خیر کی حم ظریفیوں پر شک پاشی کرے گا۔ فلک پیما مرے تو میں نے کہا چلو جنت فلک کی پیمائش میں کچھ نہیں تو فرشتوں کو پیمائش کراتے کراتے ہلکان ہی کرتے رہیں گے۔ احمق پھپھوندوی کے مرنے پر خیال آیا کہ جنت کی پرانی چیزوں پر پھپھوند لگا کر نئے فرنیچر کے آرڈر دلوائیں گے اور ہم لوگوں کے پیچھے پیچھے ہر طرف وہاں فرشتے کو دڑ تے نظر آئیں گے۔ مگر شوکت کی موت کا حقیقتاً مجھے اتنا غم نہیں جتنا اس بات کا غم ہے کہ اب تو گویا ملک الموت نے گھر ہی دیکھ لیا ہے کیونکہ شوکت کی موت درحقیقت ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے مزاح کی موت ہے۔ ان کے بعد یہاں سے پاکستان تک میدان ہی صاف ہو گیا اور ہمارا مزاحیہ ادب بھی کہ شوکت نے اپنی فقرے بازیوں سے مستقل چاشنی دے رکھی تھی وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ادبی فقرے بازیوں سے محروم ہو گیا اور اب ان کے مرنے کے بعد میرا یہ عالم ہے کہ

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو ✤ مدت ہوئی ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے

شوکت تھانوی سے میری ملاقات اُس وقت کی تھی جب نہ وہ شوکت تھے اور نہ میں عزت۔ وہ محمد عمر تھے اور میں غریب سا منو غلام احمد۔ وہ گورنمنٹ حسین آباد ہائی اسکول میں نویں جماعت میں پڑھتے تھے اور میں چوتھی جماعت کا طالب علم تھا اسی مناسبت سے ہم دونوں کی عمروں میں بھی فرق تھا یہ واقعہ ۲۲-۱۹۲۱ء کا ہے۔ اس وقت میں تو پچپنویں سال سے گذر رہا ہوں اور وہ ساٹھ سال کی عمر میں چل بسے۔

اُس زمانہ میں سید زین العباد صاحب گورنمنٹ حسین آباد ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے وہ نویں، دسویں جماعتوں کو انگریزی پڑھاتے تھے۔ مزاح نگاری کی خلافت شوکت (محمد عمر) کو قدرت کی طرف سے ودیعت ہوئی تھی اسلئے کلاس میں وہ ہر ماسٹر اور اُستاد کے پڑھانے کی نقلیں کر کے طلبہ اور اساتذہ میں بے حد ہر دلعزیز ہو گئے تھے۔ اُن کی نقل دیکھ کر خود اساتذہ بھی بے اختیار ہنس پڑتے۔ مجھے یاد ہے کہ اُس وقت اسکول میں کوئی سالانہ تقریب تھی جس میں مختلف کھیل کود کے علاوہ ایک آئی ٹم نقالوں کا بھی تھا۔ اس فنکشن میں انسپکٹر آف اسکولز اور باہر کے معززین کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ شوکت نے اپنے اسکول ماسٹر کی نقل کا پارٹ لیا تھا۔

[illegible] ماسٹر میں ایک عجیب عادت یہ تھی کہ وہ پان بہت کھاتے تھے اور جب کلاس میں انگریزی پڑھاتے تو کتاب کی ریڈنگ کرتے اور پڑھاتے وقت ہر دو تین سطریں پڑھانے اور معنی بتانے کے بعد پھر اپنا ہاتھ دانتوں تک لے جا کر انگلی سے پکڑ کر پان کی کسی ڈلی کو دانت سے اس طرح نکالتے جیسے کوئی دانتوں میں پھنسے ہوئے گوشت کے ریشہ کو نکالتا ہے اور اُسے نکال کر اور انگلی سے کلاس کے ایک طرف پھینک دیتے اور عبارت کی وضاحت میں لگ جاتے ان کی اس حرکت میں ظاہر ہے کہ دو چار سکنڈ ہر سطر کے بعد صرف ہو گئے۔ چنانچہ ہیڈ ماسٹر صاحب کی اس حرکت کی نقل شوکت نے ایسی ہو بہو اُتاری کہ خود زین العباد صاحب، انسپکٹر آف اسکولز اور حاضرین ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔

شوکت نے نویں جماعت پاس کر کے اسکول چھوڑ دیا مگر میری پڑھائی جاری رہی اور میں نے حسین آباد سے شیعہ اسکول کی پانچویں جماعت میں داخلہ لے لیا۔ اُس زمانہ میں شیعہ اسکول آصف الدولہ کے امام باڑہ میں تھا جو حسین آباد اسکول سے ملحق ہے۔ کئی سال تک مجھے نہیں معلوم کہ شوکت کیا کرتے رہے۔ لیکن جب سنہ ۲۷-۱۹۲۶ء میں میں دسویں جماعت میں تھا تو معلوم ہوا کہ وہ روزنامہ ہمدم لکھنؤ میں جو سید جالب دہلوی صاحب کی ادارت میں نکلتا تھا ٹائیپسٹ ہو گئے ہیں۔ چونکہ وہ ایک فطری انشا پرداز اور مزاح نگار تھے اس لئے ٹائیپسٹ کے فرائض کے ساتھ ساتھ مزاحیہ ٹکڑے لکھ لکھ کر سید جالب دہلوی صاحب کو دکھاتے رہے شروع شروع میں سید صاحب ان کی ساری عبارت کو سرخ روشنائی سے قلمزد کر کے لوِن غنہ میں کہتے[1] "مہ جائیں آپ ٹائیپ کیجئے یہیں کام آپ کیں بس کا نہیں ہے" مگر شوکت نے اُن کی اس ڈانٹ ڈپٹ کی پرواہ نہ کی اور برابر ان کی ڈانٹ ڈپٹ کے سایہ میں اُن سے اصلاح لیتے رہے بعد میں جب سید صاحب ہمدم سے مستعفی ہو کر لکھنؤ سے اپنا ذاتی روزنامہ ہمت نکالا تو ہمدم کا مزاحیہ کالم جس کا عنوان "دو دو باتیں" تھا شوکت اپنے نام سے لکھنے لگے اور رفتہ رفتہ اُس کالم کی اتنی شہرت ہوئی کہ اُس کے فقرے ادبی حلقوں میں لوگوں کی زبان پر آنے لگے اور محمد عمر کو بھول کر لوگ انھیں شوکت تھانوی سمجھنے لگے۔ تاریخ اُردو ادب کے مشہور و معروف مترجم مرزا احمد عسکری تو اُن کے فقروں کے عاشقوں میں تھے۔ غرض ادبی اور سیاسی

---

[1] سید جالب دہلوی افیون کھاتے تھے اس لئے اُن کی ساری گفتگو نون غنہ میں ہوتی تھی۔

قوں میں شوکت دیکھتے ہی دیکھتے سال میں بہت مشہور ہوئے اور انھوں نے بہت جلد
مزاحیہ مضامین کے ساتھ ساتھ مزاحیہ افسانے اور کہانیاں بھی لکھنا شروع کیں جس
سے ان کا شمار ملک کے مشہور مزاح نگاروں میں کیا جانے لگا۔ اسی درمیان میں وہ
[illegible] حضرت [illegible] آسی مرحوم کے شاگرد بھی ہو گئے اور مشاعروں میں
[illegible] شریک ہونے لگے چونکہ آواز خاصی پائدار پائی تھی اور شعر بھی اچھے
[illegible] اس لئے مزاح نگاری کے ساتھ ساتھ وہ بحیثیت شاعر بھی مشہور ہونا شروع
ہو گئے اور [illegible] مشاعروں میں بحیثیت شاعر بلائے جانے لگے۔

۱۹۳۰ء میں جب تسنیم امروہوی نے لکھنؤ سے اپنا مشہور مزاحیہ پرچہ ہفتہ وار
سرپنچ نکالا تو شوکت تھانوی اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اس کے لکھنے والوں میں ملک
کے بہت سے نوجوان ادیب اور شاعر شامل تھے۔ ان لکھنے والوں میں سید امین سلونوی
[illegible] احمد ادیب۔ خان محبوب طرزی مرحوم۔ ملا رموزی۔ ایم۔ اسلم۔ [illegible]
[illegible] اور راقم الحروف۔ اس اخبار کی ہردلعزیزی کا سہرا شوکت تھانوی
کے سر تھا۔ اس اخبار نے شوکت کے مزاح میں اور زیادہ جلا پیدا کر دی۔ اور ان کے
مزاحیہ افسانوں کے مجموعے شائع ہو کر عوام کے دلوں میں گدگدی پیدا کرنے لگے۔
[illegible] "سیلاب تبسم" "طوفان تبسم" "بحر تبسم" تھیں ان کے اسی دور کے مزاحیہ افسانے
شامل ہیں۔ ان مزاحیہ افسانوں میں سودیشی ریل کی شہرت اس قدر ہوئی کہ انگریزی میں
ترجمہ ہو کر وہ مضمون اسٹیٹسمین میں بھی شائع ہوا اور عوام میں وہ سودیشی ریل والے
شوکت کہلانے جانے لگے۔ ان کی ہردلعزیزی اور شہرت ۱۹۳۵ء تک اس منزل کو پہنچ
گئی کہ لکھنؤ کی جس محفل میں شوکت نہ ہوتے وہ محفل محفلوں کے زمرہ سے خارج سمجھی جاتی۔
میں اس زمانے میں روزنامہ "حقیقت" لکھنؤ میں جوائنٹ ایڈیٹر تھا۔ اور اس کا مزاحیہ کالم
[illegible] گلفشاں میرے سپرد تھا۔

۱۹۳۶ء میں جب یو۔پی کے زمینداروں نے کانگریس کے مقابلہ میں انگریزی کلچرسٹ
پارٹی کے نام سے ایک سیاسی جماعت کی تشکیل دی تو اس پارٹی کی اعانت سے شوکت نے
طوفان کے نام سے بڑے پیمانہ پر ایک روزنامہ نکالا اور وہ سرپنچ سے علیحدہ ہو گئے۔
یہ اخبار تقریباً ایک سال چل کر بند ہو گیا۔ چونکہ طوفان زمیندار پارٹی سے متعلق تھا، اور
اسے [illegible] انگریزوں کی اعانت حاصل تھی اور "حقیقت" کٹر قسم کا کانگریسی تھا اس لئے ان
سے اور راقم الحروف سے ایک موقع پر سیاسی چشمک پیدا ہو گئی اور کچھ عرصہ کے لئے میرے

اور شوکت کے درمیان کشیدگی اس منزل پر پہنچ گئی کہ ہم دونوں کے درمیان [illegible]
علیک سلیک تک کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ طوفان بند ہونے کے بعد شوکت آل انڈیا ریڈیو
لکھنؤ میں اسکرپٹ رائٹر ہو گئے اور لکھنؤ ریڈیو سے ان کے فیچر اس قدر مقبول ہوئے
کہ وہ آل انڈیا شہرت کے مالک ہو گئے۔ ۱۹۴۳ء میں جب ملک حبیب آل انڈیا ریڈیو
لکھنؤ کے اسٹیشن ڈائرکٹر ہو کر آئے تو اس زمانے میں نوابین لکھنؤ پر شوکت نے ریڈیو
فیچر کا ایک مزاحیہ سلسلہ شروع کیا جس میں ایک فیچر سے نوابین لکھنؤ کی تذلیل کا پہلو
نکلتا تھا اس پر راقم الحروف نے حقیقت میں ایک نوٹ لکھ کر ریڈیو کے ارباب حل
و عقد کو توجہ دلائی بالخصوص سر سلطان احمد کو جو اس زمانہ میں گورنمنٹ آف انڈیا میں
انفارمیشن اور براڈکاسٹنگ کے ممبر تھے۔ یہ چیز شوکت کو اس درجہ ناگوار گذری کہ
میرے اور ان کے درمیان دوبارہ تعلقات نے اس درجہ کشیدگی اختیار کر لی کہ ہم دونوں
میں بات چیت کا سلسلہ پھر منقطع ہو گیا۔ لکھنؤ ریڈیو کا چونکہ میں بھی ایک مستقل ٹاکر رہا تھا۔
اس لئے ملک حبیب نے بیچ میں پڑ کر آل انڈیا ریڈیو کے ایک ڈنر کے موقع پر جس میں
علامہ آرزو لکھنوی۔ جگر مرادآبادی۔ عبدالباری آسی اور ہندوستان کے دوسرے
شعراء اور ادبا شریک تھے ہم دونوں کے درمیان مصالحت کرا دی۔ چونکہ شوکت عمر میں
مجھ سے بڑے تھے اور ان کے تعلقات مولوی انیس احمد صاحب عباسی سے بھی تھے،
اس لئے باوجود اختلافات کے ہم دونوں کے درمیان رو برو کبھی کوئی سخت بات چیت
نہیں ہوئی۔ مگر چونکہ ان کا دل آئینہ سے زیادہ شفاف تھا اور وہ [illegible] واقع
ہوئے تھے۔ اس لئے وہ مجھ سے بھی اسی بے تکلفی سے ملتے تھے جس طرح وہ انیس احمد
صاحب سے بے تکلف تھے۔ اس کے بعد وہ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں
یو۔پی کے چیف [illegible] پبلسٹی افسر ہو گئے۔ وہاں سے وہ جیوتی آرٹ فلم کمپنی میں
بمبئی چلے گئے۔ اور کچھ عرصہ روزنامہ "حق" لکھنؤ میں مزاحیہ کالم لکھنے پر بھی ملازم
رہے۔ پاکستان بننے کے بعد وہ پاکستان کے ہو رہے۔ اور وہاں تین چار برس تک
ریڈیو پاکستان سے وابستہ رہے۔ آخر میں وہ پاکستان کے مشہور روزنامہ "جنگ" کے
راولپنڈی ایڈیشن کے ایڈیٹر ہو گئے۔ "قاضی جی" کے عنوان سے انھوں نے ریڈیو
پاکستان سے جو مزاحیہ فیچر کا سلسلہ شروع کیا تھا وہ آخر دم تک لکھ کر دنیا والوں کو
محظوظ کرتے رہے۔ مگر جب تک وہ لکھنؤ میں مقیم رہے شب میں ان کی نشست
مصطفےٰ منزل لکھنؤ میں ہوتی جو انیس احمد عباسی ایڈیٹر "حقیقت" کی سسرال ہے

شادی کے بعد میں چونکہ مصطفےٰ منزل ہی میں رہتا تھا۔ اِس لئے ڈاکٹر عظیم احمد صدیقی جو مصطفےٰ منزل ہی کے ایک حصّہ میں مقیم تھے اور مغرب کے بعد تفریحاً اپنے دوست احباب کے ساتھ رمی کھیلتے تھے۔ میں بہ حیثیتِ تماشائی دوسرے تیسرے دِن بھی پہنچ جاتا۔ چھٹیوں کے زمانے میں یہ نشستیں اکثر رات بھر رہتیں اور اُن نشستوں میں شوکت پابندی سے شریک رہتے۔ مجھے چونکہ تاش بازی سے کسی قسم کا فطری لگاؤ نہ تھا اور میرے فرصت کے بیشتر اوقات کتب بینی یا لکھنے پڑھنے ہی میں صرف ہوتے تھے اِس لئے تمام کھیلنے والے مجھے کچھ عجیب تحقیر آمیز نظروں سے دیکھتے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو اُن میں سے بیشتر حضرات جن میں شوکت بھی شامل تھے مجھے دُنیا کا منحوس ترین انسان اِن معنوں میں گردانتے تھے کہ میں کھیلنے والوں میں جس شخص کے قریب کبھی چند منٹ کے لئے بیٹھ جاتا وہ خواہ دُنیا کا بڑے سے بڑا رمی کا کھلاڑی کیوں نہ ہو ہارنا شروع ہو جاتا۔ اِس کا اِن کھیلنے والوں کو بارہا تجربہ بھی ہو چکا تھا۔ جس کا مجھے بھی اقرار ہے۔ ۱۹۴۸ء کا ذکر ہے کہ ایک دن شب میں گیارہ بجے ڈاکٹر صاحب کے یہاں رمی کی محفل پورے شباب پر تھی۔ اور ایک صاحب بُری طرح ایک گھنٹہ سے جیتتے چلے جا رہے تھے۔ کھیلنے والوں میں ہر کھلاڑی اُن کو نیچا دکھانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگائے تھا۔ مگر ہر داؤں خالی جا رہا تھا۔ اُس زمانے میں مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب غبارِ خاطر میرے زیرِ مطالعہ تھی۔ چنانچہ کوئی گیارہ بجے کا وقت ہو گا کہ میں دماغ کا بار ہلکا کرنے کی غرض سے اُس طرف، جدھر رمی ہو رہی تھی ہاتھ میں کتاب لئے چلا گیا۔ اِس مرتبہ خلافِ معمول میں نے دیکھا کہ مجھے اپنی طرف آتے دیکھ کر بجائے سبھوں کے چہرے کمھلانے کے جگمگا اُٹھے اور اُن کے چہروں پر مسرّت کی ایک لہر دَوڑ گئی بلکہ شوکت نے بآوازِ بلند فارسی کا یہ مصرع پڑھا ع اے آمدنت باعثِ آبادیِ ما دُوسرے نے کہا واللہ! خدا کی رحمتوں کا ایسے ہی موقعوں پر قائل ہونا پڑتا ہے۔ تیسرے نے کہا۔ اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔ آخر صاحب جو غالباً سب سے زیادہ چوٹ کھائے ہوئے تھے بولے۔ بھیّا! آج تم کہاں مر گئے تھے، آج تو ہماری آنکھیں تمھارے انتظار میں پتھرا گئیں۔ اِس پر وہ صاحب جو جیت رہے تھے اُنھوں نے ایک قہر آلود نظر مجھ پر ڈال کر

گُھمکالی۔ مگر اُن کی آنکھوں پر غالباً دو ڈھائی گھنٹے کی مسلسل کامیابی اور جیت کے پردے اِس طرح پڑے تھے کہ اُنھوں نے بہانگِ دہل کہنا شروع کیا۔ اب اِن کے والدِ معظم کو بھی بُلا کر میرے سر پر مسلط کر دو جب بھی مجھ پر کسی کا جادو نہیں چلے گا۔ اُن کے اِن متکبرانہ فقروں کو سُن کر سُننے والوں کے اور بھی آگ لگ گئی۔ اور شوکت نے کہا کہ بھیا فرقت! ذرا بیٹھ تو جاؤ اِن حضرت کی بغل میں جو تمھارے مُنہ پر اور ہم لوگوں کی موجودگی میں تمھاری جہاں آرا منحوسیت کی توہین کر رہے ہیں۔ چنانچہ اِن لوگوں کے بے حد اصرار پر میں اُن صاحب کی بغل میں بیٹھ گیا۔ اور ابھی بیٹھنے بھی نہیں پایا تھا کہ شوکت نے پتے کھول کر تقریباً تین سو پائنٹ کی رمی جیت لی۔ یہ دیکھ کر ایک زبردست قہقہہ لگا اور وہ صاحب جو ابھی تک جیت رہے تھے کسی قدر خفیف تو ضرور ہوئے مگر اپنی خفت مٹانے کے لئے بولے "آپ بیٹھے رہیئے"۔ چنانچہ دوسرا ہاتھ شروع ہوا۔ اور جب یہ لوگ کھیل میں مصروف تھے میں غبارِ خاطر جہاں تک پڑھ چکا تھا اُس سے اگلی سطریں اِس خیال سے پڑھنے لگا کہ اِس سے فرق ہی کیا پیدا ہوتا ہے۔ حُسنِ اتفاق سے اِس مرتبہ بھی شوکت کو تقریباً تین سو پائنٹ ملے۔ شوکت نے کہا۔ اُستاد! اب تو دل چاہتا ہے کہ ہم سب مِل کر مشترکہ طور پر تمھیں اپنا باپ بنا لیں۔ قسم قرآن کی۔ تمھاری نحوست کے اِس احسانِ عظیم سے ہم لوگ زندگی بھر سر نہیں اُٹھا پائیں گے۔ میں یہ سُن کر اُٹھنے لگا تو شوکت کو مخاطب کر کے ایک صاحب بولے۔ "یار شوکت! چار ہاتھ جیت چکے ہو اب تھوڑی دیر کے لئے اِنھیں اپنے پاس بُلا لو۔ ہم بھی تم سے کچھ کم زخم خوردہ نہیں ہیں"۔ اِس پر شوکت نے کہا کہ دو ہاتھ اور زخموں پر مرہم رگڑ لوں پھر میں آٹھ دس صفحے اُس ناول کے لکھنے اُٹھوں گا جس کا لاہور کے پبلشر سے وعدہ کیا ہے۔ تم ڈٹ کر مزے لوٹ لینا۔ چنانچہ میں حیران ہو کر رہ گیا جب بقیہ دو ہاتھ بھی شوکت ہی نے جیتے۔ اِس کے بعد شوکت اُٹھ کر دُور ایک کمرے میں چلے گئے۔ اور میں نے دیکھا کہ جب تک میں اُن صاحب کے پاس بیٹھا رہا وہ بُری طرح ہارتے ہی رہے۔ اور ہارنے والوں میں سب سے زیادہ پائنٹ وہی دیتے تھے۔ اِس کے بعد یہ عالم تھا کہ میری

شہر کے خاص و عام میں ضرب المثل بن گئی۔ چنانچہ ایک دفعہ
غالب مرحوم مشہور فارسی شاعر عرفی کے بڑے شیدا تھے اور جن کے
ان کی غزلیں حفظ تھیں انھوں نے میری موجودگی پر مشورہ دیتے
کہ قبلہ یہ علم، علم و فن بنا کر لے جائیے گا مرنے کے بعد ایک دم
جائیے گا تاکہ ہماری آئندہ نسلیں اُن سے مستفید ہوتی رہیں۔

اس سے قبل لاہور کے پبلشر کا جو ذکر میں نے کیا اُس کا واقعہ یوں ہے
ایک دفعہ شوکت مصطفیٰ منزل میں رمی کھیل رہے تھے کہ لاہور کے ایک بہت
بڑے پبلشر نے ایک خصوصی نمائندہ بھیج کر شوکت سے فرمائش کی کہ وہ تین
دن کے اندر اندر ایک ڈیڑھ سو صفحات کا ناول لکھ کر بھیج دیں۔ شوکت نے
اسی وقت ہی میں اُن سے وعدہ کر لیا کہ پرسوں شام کو روانگی سے قبل آپ کو
ناول مل جائے گا۔ جو لوگ کھیل رہے تھے انھوں نے کہا کیا کوئی ناول
لکھا ہوا رکھا ہے جو تم نے وعدہ کر لیا؟ بولے نہیں، ڈیڑھ سو صفحات کی تو بات
ہی کیا ہے، ابھی دو دن بھر پڑا ہے ہو جائیں گے۔ جب وہ صاحب چلے گئے تو
شوکت نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ یار! دوسرے کمرے میں ایک ٹیبل
رکھوا دو۔ آپ یقین مانئے کہ تیسرے روز جب وہ پبلشر کا نمائندہ جانے
لگا تو شوکت نے فل اسکیپ کے پچاس صفحے، دونوں طرف سے باریک لکھے
اُس کے حوالے کرتے ہوئے پانچ سو روپے کا چیک اُس سے لے لیا۔ یہ ایک
حقیقت ہے کہ وہ بلا کے ذہین اور طباع تھے کہ جب کوئی افسانہ یا مضمون
لکھنے بیٹھتے تو احساس ہوتا کہ اُن کا قلم تحریری آموختہ سناتا چلا جاتا ہے۔ پھر وہ
نہ اپنے لکھے پر نظر ثانی کرتے اور نہ اُس میں کسی قسم کی تبدیلی کرتے۔ اُن
کا خط بہت گٹھا ہوا باریک اور صاف ستھرا تھا جس میں دوبارہ کاٹ اور قلم
لگانے کی گنجائش بھی نہ ہوتی۔ رمی کھیلتے میں لطیفوں اور مزاحیہ فقروں
کے پھول جھڑتے ہوتے اُن کے منہ سے پھوٹتے رہتے تھے۔

میں جس زمانے میں "حقیقت" میں اور وہ "سرپنچ" میں تھے ہم دونوں
کے پاس ایک ریٹائرڈ ہندو پٹواری آتے تھے جن کے جسم سے کافور کی بو آتی
تھی۔ اُن بدنصیب کو چند ستم ظریفوں نے لگتے پر چڑھا کر شاعر بنا دیا تھا۔ اور
یہ بات اُن کی عاقبت خراب کی تھی کہ وہ مادرزاد شاعر پیدا ہوئے تھے۔
مگر حالات کی ستم ظریفی نے اُن کو پٹواری بنا دیا۔ موزوں اشعار کو ناموزوں
پڑھنے میں موصوف خود اپنا جواب تھے۔ دو دو ڈھائی ڈھائی سو اشعار کی غزلیں
اس انداز کے ساتھ کہتے کہ اگر کوئی ایک ناموزوں مصرع اُن کی غزل میں سے
نکال دے تو آپ بلاتکلف لیتے سے جا کر گن گنوا دیتے تھے۔ سب سے پہلے وہ میرے
پاس آئے۔ میں نے انھیں محض تفریح طبع کی خاطر آزاد صاحب کا شاگرد مشہور
کر دیا اور بعد میں حضرت آزاد نقشبندی سے بھی کہہ دیا کہ اگر کوئی اُن سے پوچھے
تو وہ اس کی تردید نہ کریں۔ اُن کا تخلص شوکت نے منطق تجویز کیا مگر سوال یہ تھا
کہ منطق کے بعد بھی ایک شہر کی ضرورت تھی جس سے اُنھیں منسوب کیا جاتا۔ لہذا
شوکت نے پوچھا کہ قبلہ! یہاں کس محلے میں مقیم ہیں؟ بولے گورگنج میں۔ اس
پر میں نے کہا کہ چونکہ یہ ترقی پسندی کا دور ہے۔ اس سے اب تک تو شعرا شہروں
سے منسوب کئے جاتے رہے ہیں لیکن آپ اپنے آپ کو محلے ہی سے منسوب کیجیے
اور اپنے کو منطق گورگنجوی لکھنا شروع کر دیں۔ اس پر بہت خوش ہوئے اور
اس کے بعد وہ منطق گورگنجوی ہی کہلائے۔ ایک دن شوکت کو لطیفہ سوجھا۔
اور جب منطق صاحب اُن سے ملنے آئے تو شوکت نے کہا کہ منطق صاحب آپ
بڑے موقع سے آ گئے۔ ابھی ابھی ایک اشتہار شائع ہوا ہے جس میں نظام
حیدرآباد نے شاعری سکھانے کا جو کالج کھولا ہے اُس کے لئے پرنسپل کی
ضرورت ہے۔ اتفاق سے جو خوبیاں اُمیدوار کے لئے ضروری بتائی گئی ہیں
وہ بدرجہ اتم آپ میں موجود ہیں۔ مقصد یہ کہ اُمیدوار ایک کہنہ مشق شاعر ہو
مرنے کے لئے پابہ رکاب ہو۔ جسم سے کافور کی بو آتی ہو۔ پٹواری گیری جانتا
ہو، نحیف الجثہ ہو۔ ہر موضوع پر فی البدیہہ شعر کہہ سکتا ہو۔ اور یہ سب وہ
خوبیاں ہیں جو شمالی ہندوستان کے شعراء میں اگر کسی میں بیک وقت موجود
ہیں تو وہ صرف جناب کی ذات ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک مصرع
ڈھائی سو اشعار کی ایک مختصر غزل کہنے کو دیا گیا ہے۔ جس میں یہ شرط ہے کہ
ایسے ایسے قافیے لائے جائیں جو آج تک کسی شاعر نے استعمال نہ کئے
ہوں۔ منطق صاحب نے پوچھا۔ اچھا اور وہ مصرع کیا ہے؟ شوکت نے
کہا کہ مصرع طرح ایسا بولتا ہوا ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ سنتے ہی آپ کے ذہن میں ایک دم
سے اشعار کا فوارہ پھوٹنا شروع ہو جائے گا۔ منطق صاحب بولے کہ پھر آپ مصرع

شادی کے بعد میں چونکہ مصطفےٰ منزل ہی میں رہتا تھا۔ اس لئے ڈاکٹر عظیم احمد صدیقی جو مصطفےٰ منزل ہی کے ایک حصّہ میں مقیم تھے اور مغرب کے بعد تفریحاً اپنے دوست احباب کے ساتھ رمی کھیلتے تھے۔ اُس میں بحیثیت تماشائی دوسرے تیسرے میں بھی پہنچ جاتا۔ چھٹیوں کے زمانے میں یہ نشستیں اکثر رات رات بھر ہوتیں اور اُن نشستوں میں شوکت پابندی سے شریک رہتے۔ مجھے چونکہ تاش بازی سے کسی قسم کا فطری لگاؤ نہ تھا اور میرے فرصت کے بیشتر اوقات کتب بینی یا لکھنے پڑھنے ہی میں صرف ہوتے تھے اس لئے تمام کھیلنے والے مجھے کچھ عجیب تحقیر آمیز نظروں سے دیکھتے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو اُن میں سے بیشتر حضرات جن میں شوکت بھی شامل تھے مجھے دُنیا کا منحوس ترین انسان ان معنوں میں گردانتے تھے کہ میں کھیلنے والوں میں جس شخص کے قریب کبھی چند منٹ کے لئے بیٹھ جاتا وہ خواہ دُنیا کا بڑے سے بڑا رمی کا کھلاڑی کیوں نہ ہو ہارنا شروع ہو جاتا۔ اس کا ان کھیلنے والوں کو بارہا تجربہ بھی ہو چکا تھا جس کا مجھے بھی اقرار ہے۔ ۱۹۴۸ء کا ذکر ہے کہ ایک دن شب میں گیارہ بجے ڈاکٹر صاحب کے یہاں رمی کی محفل پورے شباب پر تھی۔ اور ایک صاحب بُری طرح ایک گھنٹہ سے جیتتے چلے جا رہے تھے۔ کھیلنے والوں میں ہر کھلاڑی اُن کو نیچا دکھانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگائے تھا۔ مگر ہر داؤں خالی جا رہا تھا۔ اُس زمانے میں مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب غبارِ خاطر میرے زیرِ مطالعہ تھی۔ چنانچہ کوئی گیارہ بجے کا وقت ہوگا کہ میں دماغ کا بار ہلکا کرنے کی غرض سے اُس طرف، جدھر رمی ہو رہی تھی ہاتھ میں کتاب لئے چلا گیا۔ اس مرتبہ خلافِ معمول میں نے دیکھا کہ مجھے اپنی طرف آتے دیکھ کر بجائے سبھوں کے چہرے کمھلانے کے جگمگا اُٹھے اور اُن کے چہروں پر مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی بلکہ شوکت نے بآوازِ بلند فارسی کا یہ مصرع پڑھا ع اے آمدنت باعثِ آبادیِ ما دُوسرے نے کہا واللہ! خدا کی رحمتوں کا ایسے ہی موقعوں پر قائل ہونا پڑتا ہے۔ تیسرے نے کہا۔ اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔ اختر صاحب جو غالباً سب سے زیادہ چوٹ کھائے ہوئے تھے بولے۔ بھیا! آج تم کہاں مر گئے تھے، آج تو ہماری آنکھیں تمھارے انتظار میں پتھرا گئیں۔ اِس پر وہ صاحب جو جیت رہے تھے اُنھوں نے ایک قہر آلود نظر مجھ پر ڈالی مگر اُن کی آنکھوں پر غالباً دو ڈھائی گھنٹے کی مسلسل کامیابی اور جیت کے پردے اِس طرح پڑے تھے کہ اُنھوں نے بیانگِ دہل کہنا شروع کیا۔ اب اِن کے والدِ معظم کو بھی بُلا کر میرے سر پر مسلط کر دو جب بھی مجھ پر کسی کا جادو نہیں چلے گا۔ اُن کے اِن متکبرانہ فقروں کو سُن کر سُننے والوں کے اور بھی آگ لگ گئی۔ اور شوکت نے کہا کہ بھیا فرقت! ذرا بیٹھ تو جاؤ اِن حضرت کی بغل میں جو تمھارے مُنھ پر اور ہم لوگوں کی موجودگی میں تمھاری جہاں آرا منحوسیت کی توہین کر رہے ہیں۔ چنانچہ اِن لوگوں کے بے حد اصرار پر میں اُن صاحب کی بغل میں بیٹھ گیا۔ اور ابھی بیٹھنے بھی نہیں پایا تھا کہ شوکت نے پتے کھول کر تقریباً تین سو پائنٹ کی رمی جیت لی۔ یہ دیکھ کر ایک زبردست قہقہہ لگا اور وہ صاحب جو ابھی تک جیت رہے تھے کسی قدر خفیف تو ضرور ہوئے مگر اپنی خفت مٹانے کے لئے بولے۔ "آپ بیٹھے رہئے۔" چنانچہ دوسرا ہاتھ شروع ہوا۔ اور جب یہ لوگ کھیل میں مصروف تھے میں غبارِ خاطر جہاں تک پڑھ چکا تھا اُس سے اگلی سطریں اِس خیال سے پڑھنے لگا کہ اِس سے فرق ہی کیا پیدا ہوتا ہے۔ حُسنِ اتفاق سے اِس مرتبہ بھی شوکت کو تقریباً تین سو پائنٹ ملے۔ شوکت نے کہا۔ اُستاد! اب تو دل چاہتا ہے کہ ہم سب مِل کر مشترکہ طور پر تمھیں اپنا باپ بنا لیں۔ قسم قرآن کی۔ تمھاری نحوست کے اِس احسانِ عظیم سے ہم لوگ زندگی بھر سر نہیں اُٹھا پائیں گے۔ میں یہ سُن کر اُٹھنے لگا تو شوکت کو مخاطب کر کے ایک صاحب بولے۔ "یار شوکت! چار ہاتھ جیت چکے ہو اب تھوڑی دیر کے لئے اِنھیں اپنے پاس بُلا لو۔ ہم بھی تم سے کچھ کم زخم خوردہ نہیں ہیں۔" اِس پر شوکت نے کہا کہ دو ہاتھ اور زخموں پر مرہم رگڑ لوں پھر میں آٹھ دس صفحے اُس ناول کے لکھنے اُٹھوں گا جس کا لاہور کے پبلشر سے وعدہ کیا ہے۔ تم ڈٹ کر مزے لُوٹ لینا۔ چنانچہ میں حیران ہو کر رہ گیا جب بقیہ دو ہاتھ بھی شوکت ہی نے جیتے۔ اِس کے بعد شوکت اُٹھ کر دُور ایک کمرے میں چلے گئے۔ اور میں نے دیکھا کہ جب تک میں اُن صاحب کے پاس بیٹھا رہا وہ بُری طرح ہارتے ہی رہے۔ اور ہارنے والوں میں سب سے زیادہ پائنٹ وہی دیتے تھے۔ اِس کے بعد یہ عالم تھا کہ میری

نحوست شعر کے مختلف ادبی حلقوں میں ضرب المثل بن گئی۔ چنانچہ ایک دفعہ پنج ابصفلی مرحوم مشہور قانونی شاعر جو ان کی کے بڑے لتیا تھے اور جن کے مریض [illegible] کی تعطیلیں مچی تھیں انھوں نے میری نحوست پر مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ قبلہ! یہ علم ، علم دفینہ بنا کر نہ جانے جانا ، مرنے کے بعد ایک آدھ چھاپ جائیے گا۔ تاکہ ہماری آئندہ نسلیں اُن سے مستفید ہوتی رہیں۔

اس سے قبل لاہور کے پبلشر کا جو ذکر میں نے کیا اُس کا واقعہ یوں ہے کہ ایک دفعہ شوکت مصطفےٰ اسٹریٹ میں رمی کھیل رہے تھے کہ لاہور کے ایک بہت بڑے پبلشر نے ایک خصوصی نمائندہ بھیج کر شوکت سے فرمائش کی کہ وہ تین دن کے اندر اندر ایک ڈیڑھ سو صفحات کا ناول لکھ کر بھیج دیں۔ شوکت نے کھیلتے ہی میں اُن سے وعدہ کر لیا کہ پرسوں شام کو روانگی سے قبل آپ کو مسودہ مل جائے گا۔ جو لوگ کھیل رہے تھے انھوں نے کہا کہ کیا کوئی ناول لکھا رکھا ہے جو تم نے وعدہ کر لیا؟ بولے نہیں، ڈیڑھ سو صفحات کی تو بات ہے۔ کل دن بھر بیٹھا رہے ہو جائیں گے۔ جب وہ صاحب چلے گئے تو شوکت نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ یار! دوسرے کمرے میں ایک ٹیبل لیمپ رکھوا دو۔ آپ یقین مانئے کہ تیسرے روز جب وہ پبلشر کا نمائندہ جانے لگا تو شوکت نے فل اسکیپ کے پچاس صفحے، دونوں طرف سے باریک لکھے اُس کے حوالے کرتے ہوئے پانچسو روپے کا چیک اُس سے لے لیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ بلا کے ذہین اور طباع تھے کہ جب کوئی افسانہ یا مضمون لکھنے بیٹھتے تو احساس ہوتا کہ اُن کا قلم تحریری آموختہ سُناتا چلا جاتا ہے۔ پھر وہ اپنے لکھے پر نظرِ ثانی کرتے اور نہ اُس میں کسی قسم کی تبدیلی کرتے۔ اُن کا خط بہت گٹھا ہوا باریک اور صاف ستھرا تھا۔ جس میں دوبارہ کاٹ اور قلم اشاپ کی گنجائش بھی نہ ہوتی۔ رمی کھیلتے میں لطیفوں اور مزاحیہ فقروں کے سوتے اُن کے مُنہ سے پھوٹتے رہتے تھے۔

میں جس زمانے میں "حقیقت" میں اور وہ "سروش" میں تھے ہم دونوں کے پاس ایک ریٹائرڈ ہندو پٹواری آتے تھے جن کے جسم سے کافور کی بُو آنے لگی تھی۔ بدنصیب کو چند ستم ظریفوں نے لکھنے پر چڑھا کر شاعر بنا دیا تھا۔ اور کچھ کر دن کی عاقبت خراب کی تھی کہ وہ مادرزاد شاعر پیدا ہوئے تھے۔

مگر حالات کی ستم ظریفی نے اُن کو پٹواری بنا دیا۔ موزوں اشعار کو ناموزوں پڑھنے میں موصوف خود اپنا جواب تھے۔ دو دو، ڈھائی ڈھائی سو اشعار کی غزل اِس اِنا کے ساتھ کہتے کہ اگر کوئی ایک ناموزوں مصرع اُن کی غزل میں سے نکال دے تو آپ بلا تکلف اُسے سے دو رُگوں کِرا دیتے۔ سب سے پہلے وہ میرے پاس آئے۔ میں نے اُنھیں محض تفریحِ طبع کی خاطر آرزو صاحب کا شاگرد تجویز کر دیا اور بعد میں حضرت آرزو لکھنوی سے بھی کہہ دیا کہ اگر کوئی اُن سے پوچھے تو وہ اِس کی تردید نہ کریں۔ اُن کا تخلص شوکت نے منطق تجویز کیا مگر سوال یہ تھا کہ منطق کے بعد بھی ایک شہر کی ضرورت تھی جس سے اُنھیں منسوب کیا جاتا۔ لہٰذا شوکت نے پوچھا کہ قبلہ! یہاں کس محلے میں مقیم ہیں؟ بولے گولہ گنج میں۔ اِس پر میں نے کہا کہ چونکہ یہ ترقی پسندی کا دور ہے، اِس لئے اب تک تو شعرا شہروں سے منسوب کئے جاتے رہے ہیں لیکن آپ اپنے آپ کو محلے ہی سے منسوب کیجیے اور اپنے کو منطق گولہ گنجوی لکھنا شروع کر دیں۔ اِس پر بہت خوش ہوئے اور اِس کے بعد وہ منطق گولہ گنجوی ہی کہلاتے۔ ایک دن شوکت کو لطیفہ سوجھا۔ اور جب منطق صاحب اُن سے ملنے آئے تو شوکت نے کہا کہ منطق صاحب آپ بڑے موقع سے آ گئے۔ ابھی ابھی ایک اشتہار شائع ہوا ہے جس میں نظام حیدرآباد نے شاعری سکھانے کا جو کالج کھولا ہے اُس کے لئے پرنسپل کی ضرورت ہے۔ اتفاق سے جو خوبیاں اُمیدوار کے لئے ضروری بتائی گئی ہیں وہ بدرجۂ اتم آپ میں موجود ہیں۔ مقصد یہ کہ اُمیدوار ایک کہنہ مشق شاعر ہو، مرنے کے لئے پابہ رکاب ہو۔ جسم سے کافور کی بُو آتی ہو۔ پٹواری گیری جانتا ہو، نحیف الجثہ ہو۔ ہر موضوع پر فی البدیہہ شعر کہہ سکتا ہو۔ اور یہ سب وہ خوبیاں ہیں جو شمالی ہندوستان کے شعرا میں اگر کسی میں بیک وقت موجود ہیں تو وہ صرف جناب کی ذات ہے۔ اور اِس کے ساتھ ہی ساتھ ایک مصرع ڈھائی سو اشعار کی ایک مختصر غزل کہنے کو دیا گیا ہے۔ جس میں یہ شرط ہے کہ ایسے ایسے قافیے لائے جائیں جو آج تک کسی شاعر نے استعمال نہ کئے ہوں۔ منطق صاحب نے پوچھا۔ اچھا اور وہ مصرع کیا ہے؟ شوکت نے کہا کہ مصرع طرح ایسا بولتا ہوا ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ سُنتے ہی آپ کے ذہن سے اشعار کا فوارہ پھوٹنا شروع ہو جائے گا۔ منطق صاحب بولے کہ پھر آپ سنا

افسانہ نمبر

شادی کے بعد میں چونکہ مصطفےٰ منزل ہی میں رہتا تھا۔ اِس لئے ڈاکٹر عظیم احمد صدیقی جو مصطفےٰ منزل ہی کے ایک حصہ میں مقیم تھے اور مغرب کے بعد تقریباً اپنے دوست احباب کے ساتھ رمی کھیلتے تھے۔ اُس میں بحیثیتِ تماشائی دوسرے تیسرے میں بھی پہنچ جاتا۔ چھٹیوں کے زمانے میں یہ نشستیں اکثر رات بھر رہتیں اور اُن نشستوں میں شوکت پابندی سے شریک رہتے۔ مجھے چونکہ تاش بازی سے کسی قسم کا فطری لگاؤ نہ تھا اور میرے فرصت کے بیشتر اوقات کتب بینی یا لکھنے پڑھنے ہی میں صرف ہوتے تھے اِس لئے تمام کھیلنے والے مجھے کچھ عجیب تحقیر آمیز نظروں سے دیکھتے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو اُن میں سے بیشتر حضرات جن میں شوکت بھی شامل تھے مجھے دُنیا کا منحوس ترین انسان اِن معنوں میں گردانتے تھے کہ رمی کھیلنے والوں میں جس شخص کے قریب کبھی چند منٹ کے لئے بیٹھ جاتا وہ خواہ دُنیا کا بڑے سے بڑا رمی کا کھلاڑی کیوں نہ ہو ہارنا شروع ہو جاتا۔ اِس کا اِن کھیلنے والوں کو بارہا تجربہ بھی ہو چکا تھا۔ جس کا مجھے بھی اقرار ہے۔ سنہ ۴۸ء کا ذکر ہے کہ ایک دن شب میں گیارہ بجے ڈاکٹر صاحب کے یہاں رمی کی محفل پورے شباب پر تھی۔ اور ایک صاحب بُری طرح ایک گھنٹہ سے جیتے چلے جا رہے تھے۔ کھیلنے والوں میں ہر کھلاڑی اُن کو نیچا دکھلانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگائے تھا۔ مگر ہر داؤں خالی جا رہا تھا۔ اُس زمانے میں مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب غبارِ خاطر میرے زیرِ مطالعہ تھی۔ چنانچہ کوئی گیارہ بجے کا وقت ہوگا کہ میں دماغ کا بار ہلکا کرنے کی غرض سے اُس طرف، جدھر رمی ہو رہی تھی ہاتھ میں کتاب لئے چلا گیا۔ اِس مرتبہ خلافِ معمول میں نے دیکھا کہ مجھے اپنی طرف آتے دیکھ کر بجائے سبھوں کے چہرے کھلانے کے جگمگا اُٹھے اور اُن کے چہروں پر مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی بلکہ شوکت نے بآوازِ بلند فارسی کا یہ مصرع پڑھا ع اے آمدنت باعثِ آبادی ما دُوسرے نے کہا واللہ! خدا کی رحمتوں کا ایسے ہی موقعوں پر قائل ہونا پڑتا ہے۔ تیسرے نے کہا۔ اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔ آخر صاحب جو غالباً سب سے زیادہ چوٹ کھائے ہوئے تھے بولے۔ بھیّا! آج تم کہاں مر گئے تھے، آج تو ہماری آنکھیں تمھارے انتظار میں پتھرا گئیں۔ اِس پر وہ صاحب جو جیت رہے تھے اُنھوں نے ایک قہر آلود نظر مجھ پر ڈالی۔

جھکا لی۔ مگر اُن کی آنکھوں پر غالباً دو ڈھائی گھنٹے کی مسلسل کامیابی اور جیت کے پردے اس طرح پڑے تھے کہ اُنھوں نے بانگِ دہل کہنا شروع کیا۔ اب اِن کے والدِ معظم کو بھی بُلا کر میرے سر پر مسلّط کر دو جب بھی مجھ پر کسی کا جادو نہیں چلے گا۔ اُن کے اِن متکبرانہ فقروں کو سُن کر سُلگنے والوں کے اور بھی آگ لگ گئی۔ اور شوکت نے کہا کہ بھیا فرحت! ذرا بیٹھ تو جاؤ ان حضرت کی بغل میں جو تمھارے منہ پر اور ہم لوگوں کی موجودگی میں تمھاری جہاں آرا منحوسیت کی توہین کر رہے ہیں۔ چنانچہ اِن لوگوں کے بے حد اصرار پر میں اُن صاحب کی بغل میں بیٹھ گیا۔ اور ابھی بیٹھنے بھی نہیں پایا تھا کہ شوکت نے پتے کھول کر تقریباً تین سو پائنٹ کی رمی جیت لی۔ یہ دیکھ کر ایک زبردست قہقہہ لگا اور وہ صاحب جو ابھی تک جیت رہے تھے کسی قدر خفیف تو ضرور ہوئے مگر اپنی خفت مٹانے کے لئے بولے "آپ بیٹھے رہئے"۔ چنانچہ دوسرا ہاتھ شروع ہوا۔ اور جب یہ لوگ کھیل میں مصروف تھے میں غبارِ خاطر جہاں تک پڑھ چکا تھا اُس سے اگلی سطر اِس خیال سے پڑھنے لگا کہ اِس سے فرق ہی کیا پیدا ہوتا ہے۔ حُسنِ اتفاق سے اِس مرتبہ بھی شوکت کو تقریباً تین سو پائنٹ ملے۔ شوکت نے کہا۔ اُستاد! اب تو دل چاہتا ہے کہ ہم سب مِل کر مشترکہ طور پر تمھیں اپنا باپ بنا لیں۔ قسم قرآن کی۔ تمھاری نحوست کے اِس احسانِ عظیم سے ہم لوگ زندگی بھر سر نہیں اُٹھا پائیں گے۔ میں یہ سُن کر اُٹھنے لگا تو شوکت کو مخاطب کر کے ایک صاحب بولے "یار شوکت! یار! ہاتھ جیت چکے اب تھوڑی دیر کے لئے اِنھیں اپنے پاس بُلا لو۔ ہم بھی تم سے کچھ کم ز خوردہ نہیں ہیں"۔ اِس پر شوکت نے کہا کہ دو ہاتھ اور زخموں پر مرہم لوں پھر میں آٹھ دس صفحے اُس ناول کے لکھنے اُٹھوں گا جس کا لاہور پبلشر سے وعدہ کیا ہے۔ تم ڈٹ کر مزے لُوٹ لینا۔ چنانچہ میں حیرا کر رہ گیا جب بقیہ دو ہاتھ بھی شوکت ہی نے جیتے۔ اِس کے بعد شوکت اُ دُور ایک کمرے میں چلے گئے۔ اور میں نے دیکھا کہ جب تک میں صاحب کے پاس بیٹھا رہا وہ بُری طرح ہارتے ہی رہے۔ اور ہارنے والو سب سے زیادہ پائنٹ وہی دیتے تھے۔ اِس کے بعد یہ عالم تھا کہ م

یہ نحوست بھر کے حلقے کی باتوں میں ضرب المثل ہو گئی۔ چنانچہ ایک دفعہ شیخ احسان مرحوم مشہور فحاشی شاعر جو مری کے بڑے لتیا تھے اور جن کے گھر پر ظرافت کی محفلیں جمتی تھیں انھوں نے میری نحوست پر مبارک باد دیتے ہوئے کہا کہ قبلہ! یہ علم اعلم وغیرہ بنا کر نہ جائیے گا مرنے کے بعد ایک آدھ چھاپ جائیے گا تاکہ ہماری آئندہ نسلیں اُن سے مستفید ہوتی رہیں۔

اس سے قبل لاہور کے پبلشر کا جو ذکر میں نے کیا اُس کا واقعہ یوں ہے کہ ایک مرتبہ شوکت سلطنے عزیز میں رمی کھیل رہے تھے کہ لاہور کے ایک بہت بڑے پبلشر نے ایک خصوصی نمائندہ بھیج کر شوکت سے فرمائش کی کہ وہ تین روز کے اندر اندر ایک ڈیڑھ سو صفحات کا ناول لکھ کر بھیج دیں۔ شوکت نے کھیلتے ہی میں اُن سے وعدہ کر لیا کہ پرسوں شام کو روانگی سے قبل آپ کو مسودہ مل جائے گا۔ جو لوگ کھیل رہے تھے انھوں نے کہا کہ کیا کوئی ناول لکھا رکھا ہے جو تم نے وعدہ کر لیا؟ بولے نہیں۔ ڈیڑھ سو صفحات کی تو آ ہے۔ کل دن بھر پڑا ہے ہو جائیں گے۔ جب وہ صاحب چلے گئے تو شوکت نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ یار! دوسرے کمرے میں ایک ٹیبل لیمپ رکھوا دو۔ آپ یقین مانئے کہ تیسرے روز جب وہ پبلشر کا نمائندہ جانے لگا تو شوکت نے فل اسکیپ کے پچاس صفحے، دونوں طرف سے باریک لکھے اُس کے حوالے کرتے ہوئے پانچ سو روپے کا چیک اُس سے لے لیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ بلا کے ذہین اور طباع تھے کہ جب کوئی افسانہ یا مضمون لکھنے بیٹھتے تو احساس ہوتا کہ اُن کا قلم تحریری آموختہ سناتا چلا جاتا ہے۔ نہ تو وہ اپنے لکھے پر نظرثانی کرتے اور نہ اُس میں کسی قسم کی تبدیلی کرتے۔ اُن کا کاغذ بہت گٹھا ہوا باریک اور صاف ستھرا تھا۔ جس میں دوبارہ کاٹے اور قلم اشاپ کی گنجائش بھی نہ ہوتی۔ رمی کھیلتے میں لطیفوں اور مزاحیہ فقروں کے سوتے اُن کے منہ سے پھوٹتے رہتے تھے۔

میں جس زمانے میں "حقیقت" میں اور وہ "سرپنچ" میں تھے ہم دونوں کے پاس ایک ریٹائرڈ ہندو پٹواری آتے تھے جن کے جسم سے کافور کی بُو آنے لگی تھی۔ اُن بدنصیب کو چند ستم ظریفوں نے لکھے پر چڑھا کر شاعر بنا دیا تھا۔ اور یہ کہہ کر اُن کی عاقبت خراب کی تھی کہ وہ مادر زاد شاعر پیدا ہوئے تھے۔

مگر حالات کی ستم ظریفی نے اُن کو پٹواری بنا دیا۔ موزوں اشعار کہنے اور پڑھنے میں موصوف خود اپنا جواب تھے۔ روزانہ ڈھائی ڈھائی سو اشعار اس ناز کے ساتھ کہتے کہ اگر کوئی ایک ناموزوں مصرع اُن کی غزل میں نکال دے تو آپ بلا تکلف اُسے لے جائیے گا۔ [illegible] سب سے پہلے وہ پاس آئے تھے میں نے انھیں موصوف کی طبع کی خاطر آرزو صاحب کا شاگرد کر دیا اور بعد میں حضرت آرزو لکھنوی سے بھی [illegible] تو وہ اس کی تردید نہ کریں۔ اُن کا تخلص شوکت نے منطق تجویز کیا گیا کہ منطق کے بعد بھی ایک تمہ کی ضرورت تھی جو بہت انھیں منسوب کیا جاتا۔ شوکت نے پوچھا کہ قبلہ! یہ بتائیے کس محلے میں مقیم ہیں؟ بولے گور گنج میں۔ پر میں نے کہا کہ چونکہ یہ ترقی پسندی کا دور ہے، اس لئے اب تک تو شعراء سے منسوب کئے جاتے رہے ہیں لیکن آپ اپنے آپ کو محلے ہی سے منسوب اور اپنے کو منطق گورگنجوی لکھنا شروع کر دیں۔ اس پر بہت خوش ہوئے اس کے بعد وہ منطق گورگنجوی ہی کہلائے۔ ایک دن شوکت کو لطیفہ سُوجھا اور جب منطق صاحب اُن سے ملنے آئے تو شوکت نے کہا کہ منطق صاحب بڑے موقع سے آگئے۔ ابھی ابھی ایک اشتہار شائع ہوا ہے جس میں نظام حیدرآباد نے شاعری سکھانے کا جو کالج کھولا ہے اُس کے نئے پرنسپل کی ضرورت ہے۔ اتفاق سے جو خوبیاں اُمیدوار کے لئے ضروری بتائی وہ بدرجہ اتم آپ میں موجود ہیں۔ مقصد یہ کہ اُمیدوار ایک کہنہ مشق شاعر مرنے کے لئے پابہ رکاب ہو۔ جسم سے کافور کی بُو آتی ہو۔ پٹواری رہا ہو نحیف الجثہ ہو۔ ہر موضوع پر فی البدیہہ شعر کہہ سکتا ہو۔ اور یہ خوبیاں ہیں جو شمالی ہندوستان کے شعراء میں اگر کسی میں بیک وقت ہیں تو وہ صرف جناب کی ذات ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک ڈھائی سو اشعار کی ایک مختصر غزل کہنے کو دیا گیا ہے۔ جس میں یہ شرط ایسے ایسے قافیے لائے جائیں جو آج تک کسی شاعر نے استعمال نہ ہوں۔ منطق صاحب نے پوچھا۔ اچھا اور وہ مصرع کیا ہے؟ شوکت کہا کہ مصرع طرح ایسا بولتا ہوا ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ سنتے ہی آپ کے ذہن سے اشعار کا فوارہ چھوٹنا شروع ہو جائے گا۔ منطق صاحب بولے کہ پھر تو

سُننے میں کیوں نہیں آ رہے ہیں۔ شوکت نے کہا مصرعِ طرح یہ ہے ؎

درد دل درد دینے والے درد دل ہو جائے گا کی

شفیق صاحب یہ سن کر چونک گئے اور بولے کہ صاحب اِس زمین میں تو ہزار دو ہزار اشعار کی غزل پلک جھپکاتے ہو جائے گی۔ شوکت نے کہا۔ مگر وہ شرط بھی پیشِ نظر ہے کہ قافیے ایسے ہوں جو ابھی تک کسی شاعر نے استعمال نہ کئے ہوں۔ اور غالباً اِسی لئے دو ہزار روپے ماہوار تنخواہ رکھی گئی ہے۔ بولے۔ "دل" کے قافیے میں تجا تجل، ہجا ہجل، بٹا بٹل کے سے قافیے ہزاروں ہیں جو ابھی تک استعمال نہیں ہوئے۔ شوکت نے کہا۔ مگر "ہو جائے گا کی" کی ردیف کا خیال رہے۔ بولے اس کا چپاں ہونا کیا مشکل ہے میری دانست میں آپ "کی" کے مفہوم سے گھبرا کر یہ بات کہہ رہے ہیں۔ یہاں "کی" سے مراد ہے "کہ" یعنی درد دل درد دینے والے درد دل ہو جائے گا کہ نہیں۔ یہاں "کی" کا لفظ "کہ" کی جگہ پر ضرورتِ شعری کی خاطر استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ دوسرے روز شام ہی کو وہ ڈھائی سو اشعار کی ایک عجیب الطرفین ناموزوں غزل شوکت کے پاس لے کر پہنچ گئے۔ اُس غزل کو دو حصوں میں تقسیم کر کے نصف غزل پڑھیں اور نصف پر شوکت قسط وار تبصرہ کرتے رہے۔

پاکستان جانے کے بعد انھوں نے دوسری شادی کر لی۔ اور شادی کے دو سال بعد مع بیوی بچوں کے لکھنؤ آئے۔ میں اُس زمانے میں اتفاق سے چھٹیوں میں لکھنؤ گیا ہوا تھا۔ ایک دن دن بھر کے لئے وہ مع بیوی بچوں کے مصطفےٰ منزل بھی آئے۔ جہاں تھوڑی دیر کے لئے پھر پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔

شوکت سے میری آخری ملاقات ۱۹۶۲ء میں ہوئی جب وہ دلی کلاتھ مل کے مشاعرے میں یا گڈول مشن کے سلسلے میں ہندوستان آئے ہوئے تھے۔ مجھ سے وہ ڈیلی گیشن کے ممبروں کے ہمراہ بھی ملے اور پھر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ایک ادبی نشست میں بھی ملاقات ہوئی جس میں سید محمد جعفری، اقبال صفی پوری، فراق، نشور واحدی، حفیظ جالندھری وغیرہ شریک تھے۔ مشاعرہ شروع ہو چکا تھا۔ فراق درمیان میں بیٹھے تھے۔ دائیں جانب میں نشور اور سید محمد جعفری تھے اور بائیں جانب شوکت فراق صاحب کی پشت پر بیٹھے تھے

اتنے میں فراق صاحب نے مجھ سے کہا کہ اس [illegible] نہیں کیا بات ہے کہ شوکت کبھی میرے پاس آ کر نہیں بیٹھتا۔ خدا جانے کیوں اس قدر الگ رہتا ہے۔ اِس پر شوکت بولے کہ میں اپنی عزت کرواتا ہوں کہ کہیں جناب میرے بارے میں بھی یہ نہ مشہور کر دیں کہ یہ میرے سابق [illegible] اِس پر فراق صاحب اور ہم ہنستے ہنستے لوٹ ہو گئے۔ یوں تو جب بھی وہ پاکستان سے آتے تو مجھ سے ملاقات ضرور ہوتی۔ مگر اِس آخری بار وہ مجھ سے بے حد محبت اور اخلاص سے ملے اور میرے بعض مضامین کی بار بار تعریف کرتے رہے۔ اور بولے کہ صاحب! ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ضبطِ تولید کا سب سے زیادہ اثر مزاح نگاری نے قبول کیا ہے۔ کیونکہ مزاح نگار پیدا ہونے بند ہو گئے ہیں۔ اِس مرتبہ بہ نسبت پچھلی ملاقاتوں کے میرا اُن کا سب سے زیادہ ساتھ رہا۔ اور میں اور وہ ساتھ ہی ساتھ یونس دہلوی کی کوٹھی کھجنر یدڈ بھی گئے وہ راستے میں کہتے تھے کہ یوں تو پاکستان میں ہر قسم کا سکون ہے۔ لیکن وہاں میرا جی نہیں لگتا۔ اور یہاں کے دوست احباب کی صحبتیں ہر وقت دل کو ٹھوکے مارتی رہتی ہیں۔ جب میں اُن سے رخصت ہو کر گھر آنے لگا تو بولے۔ دیکھو بھائی! اب کب ملاقات ہوتی ہے۔ کیا معلوم تھا کہ یہ اُن سے آخری ملاقات ہے۔ اور اب یہ آنکھیں اُن کی صورت کو ہمیشہ کے لئے ترس جائیں گی ؎

صبح تک وہ بھی نہ چھوڑی تُو نے اے بادِ صبا
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

رسالہ نہ ملنے کی شکایت

دو مرتبہ چیک کرنے کے بعد بیسویں صدی ہر ماہ باقاعدہ [illegible] سے سپرد ڈاک کیا جاتا ہے۔ اِس کے باوجود شکایتی خطوط موصول ہونے پر دوبارہ بھیج دیا جاتا ہے۔ ۲۵ تاریخ کے بعد شکایتی خطوط موصول ہونے پر دوبارہ بھیجنے سے ہم معذور رہتے ہیں۔ رسالہ نہ ملنے کی شکایت [illegible] سے بھی کیجیے۔ (منیجر رسالہ بیسویں صدی۔ دریا گنج۔ دہلی ۲)

اُردو ادبی معمے [illegible]
[illegible] بہت زیادہ معاون ہوگی۔

شرائط اُردو ادبی معمے

۱۔ فیس داخلہ فی خاکہ ایک روپیہ۔ ایک نام سے ہر تین خاکوں کی فیس داخلہ دو روپے۔ تمام حل چھپے ہوئے یا سادہ کاغذ پر ہاتھ سے بنائے ہوئے خاکوں کی صورت میں بھیجے جا سکتے ہیں۔ خاکہ روشنائی سے پُر کرنا اور ہر خاکہ علیحدہ کاغذ پر ہونا ضروری ہیں۔ ہر خاکے کے نیچے بھیجنے والے کا پورا نام و پتہ روشنائی سے لکھا ہونا لازمی ہے۔ علاوہ روشنائی کے کسی چیز سے لکھے ہوئے یا لکھنے کے بعد مشکوک یا نامکمل حرف یا لفظ اور خالی خانے کی ایک غلطی تصور کی جائے گی چاہے وہ مستقل لفظ کیوں نہ ہوں حل بھیجنے کے بعد ان میں کوئی ترمیم نہیں کی جا سکتی۔

۲۔ ایک لفافے میں کئی اصحاب مل کر اپنے اپنے حل بھیج سکتے ہیں لیکن ہر خاکے پر ہر شخص کا نام و پتہ لکھا ہونا چاہیئے۔ ان تمام حلوں کی فیس کی منی آرڈر رسید، پوسٹل آرڈر یا نقد نامے حلوں کے ساتھ اسی لفافے میں وصول ہونا ضروری ہے۔ لفافہ کھلنے پر اندر سے نکلے ہوئے کاغذات کی تعداد اور نوعیت کے متعلق اُردو ادبی معمے کے کارکنان کا فیصلہ قطعی ہوگا۔

۳۔ تمام خاکے اُردو ادبی معمے کی مقررہ تاریخ و وقت کو یا اس سے قبل دفتر اُردو ادبی معمے میں پہنچ جانا لازمی ہیں۔ حلوں کے وصول نہ ہونے، دیر سے موصول ہونے یا راستے میں ضائع ہو جانے یا محکمہ ڈاک کی کسی لاپرواہی کی وجہ سے خاکہ پھٹ جانے یا خراب ہو جانے کی صورت میں دفتر اُردو ادبی معمے کوئی ذمہ داری قبول نہ کرے گا۔ وصولیابی کی مقررہ تاریخ اور وقت گذر جانے کے بعد وصول ہونے والے خاکوں کو اراکین اُردو ادبی معمے شامل مقابلہ نہیں کریں گے۔ لفافہ روانہ کرنے یا لفافے کے پہنچنے کا ثبوت خاکے یا متعلقہ کاغذات کے وصول ہو جانے کا ثبوت نہ ہوگا۔

۴۔ کسی بھی اُردو ادبی معمے کے تمام حل وصول ہونے کی آخری تاریخ اور وقت سے پہلے حلوں کی وصولیابی کی تاریخوں میں اضافہ کیا جا سکتا ہے یا بالکل ہی منسوخ بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کی منسوخی یا تاریخ میں اضافے کا اعلان کم از کم دو اُردو روزناموں میں کر دیا جائے گا۔ منسوخی کی صورت میں اس معمہ سے متعلق آئی فیس داخلہ واپس کر دی جائے گی۔ کوئی اشارہ غلط شائع ہو جانے کی صورت میں اس میں ترمیم کا اعلان کیا جا سکتا ہے یا اسے قطعاً منسوخ کیا جا سکتا ہے۔ اگر ایک ہی اشارہ دو مختلف کتابوں میں ہو اور دونوں کے جوابات الگ الگ ہیں تو صحیح حل کھلنے کے ۴۸ گھنٹے کے اندر اگر کتاب معہ دوسرے جواب کے اراکین اُردو ادبی معمے کو پیش کر دی جائے تو اشارہ منسوخ قرار دیا جائے گا۔ اشارہ منسوخ ہو جانے کی صورت میں اس اشارے کا جو بھی جواب کسی نے لکھا ہوگا اس کی غلطی شمار نہیں کی جائے گی۔

۵۔ ایک خانے میں صرف ایک حرف بھرنا ضروری ہے۔ بھ، تھ، ٹھ، پھ، چھ، کھ، گھ اور مھ ایک ایک حرف ہیں مگر وہ، ڈھ اور لا دو حرف تصور کئے جائیں گے۔ زیر، زبر، پیش وغیرہ اور مد کا کوئی خیال نہیں رکھا جائے گا۔ و اور ؤ، ن اور ں (نون غنہ) میں کوئی فرق نہیں۔ ی اور ے کا فرق صرف اس صورت میں [illegible] کسی لفظ کے آخر میں ہوں۔ ئی کی جگہ ی لکھا جائے [illegible] جائے گا۔ ترجیحاً (دو زیر، دو زبر اور دو پیش) کی بجائے [illegible] لکھا جائے گا جیسے عموماً کی جگہ عموماً لکھا جائے گا۔

۶۔ اُردو ادبی معمہ کا ایک اور صرف ایک ہی صحیح حل ہے جس کی کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ تمام حل وصول ہو جانے کی تاریخ گذر جانے کے بعد اُردو ادبی معمے [illegible] مستند حل ظاہر کرے گا۔ تمام حلوں کو مستند حل سے ملایا جائے گا۔ مستند حل سے ملتا جلتا حل بھیجنے والے حل کو درست حل سمجھا جائے گا۔ اور ملتے جلتے ہر لفظ کی ایک غلطی شمار کی جائے گی۔ بالکل درست حل بھیجنے والے شخص یا اشخاص کو پہلا انعام دیا جائے گا اور بقیہ انعامات بھی شخص یا اشخاص میں مساوی تقسیم کئے جائیں گے۔ صحیح حل موصول نہ ہونے کی صورت میں ترتیب کم غلطی والے حلوں پر انعامات کی تقسیم کی جائے گی۔

۷۔ اُردو ادبی معمے میں ایک شخص ایک انعام یا اس کا کوئی حصہ حاصل کر سکتا ہے گر بڑے انعام کو چھوٹے انعام پر ترجیح دی جائے گی۔ الگ الگ فیس داخلہ سے آئے ہوئے حل الگ الگ لوگوں کے سمجھے جائیں گے۔ حل کی فیس الگ الگ منی آرڈروں، پوسٹل آرڈروں یا نقد ناموں سے بھیجی گئی ہو۔ انعامات کی تقسیم کے اعلان کے بعد کسی وقت کسی انعام کا کوئی اور حقدار پایا گیا یا کسی انعام پانے والے کی غلطیاں زیادہ پائی گئیں تو اس کی روشنی میں انعامات کی تقسیم میں اسی حساب سے ترمیم کی جا سکے گی مگر انعامات کی رقم کی روانگی کے بعد کوئی تبدیلی نہیں ہو سکے گی۔ اور کوئی مطالبہ جائز تسلیم نہیں کیا جائے گا۔

۸۔ اُردو ادبی معمے سے متعلق کوئی رکن اُردو ادبی معمے میں حصہ نہیں لے سکتا۔

۹۔ کوئی خاکہ جو ان شرائط و ہدایات کی پابندی نہیں کرتا غیر مستحق قرار دیا جائے گا اور اس کی فیس داخلہ واپس نہیں کی جائے گی۔ اور کوئی زائد فیس بھی واپس نہیں کی جائے گی۔ اگر فیس داخلہ حلوں کے حساب سے کم موصول ہوئی یا بالکل نہ ہونے کی صورت میں تمام حل یا کوئی سے بھی حل شامل مقابلہ نہ کئے جائیں گے۔

۱۰۔ اُردو ادبی معمے میں شرکت کی ایک صاف اور اہم شرط یہ ہے کہ ترتیب کو اُردو ادبی معموں سے متعلق تمام متنازعہ امور میں کیا گیا اُردو ادبی معمے [illegible] کا ہر فیصلہ قابل قبول ہوگا۔ ہر فیصلہ قطعی اور آخری ہوگا اور حل بھیجنے والا قانونی طور پر اس فیصلے کا پابند ہوگا۔ اُردو ادبی معمے کی یہ شرائط کہ اگر اُردو ادبی معمے اور حل بھیجنے والے کے درمیان ایک ایسے معاہدے کی حیثیت رکھتی ہیں جو ہر حالت میں دہلی میں طے پایا ہے۔ اس سلسلے میں صرف دہلی کی عدالت کو حق سماعت حاصل ہے۔

۱۱۔ دوبارہ جانچ کرنے کی فیس ایک روپیہ ہے۔ غلطی ثابت ہونے کی صورت میں جانچ فیس واپس کر دی جائے گی۔ نتیجہ انعامات شائع ہونے کے دس دن کے اندر اندر رقم بھیجا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد انعامات کی روانگی شروع کر دی جائے گی۔

۱۲۔ ہر اُردو ادبی معمے کے انعامات کی روانگی کے بعد [illegible] تمام حل اور متعلقہ کاغذات ضائع کئے جا سکتے ہیں اور انعامات کی تقسیم کے بعد کوئی [illegible]

[illegible]

۱ ــــ صحت ہی زندگی ہے صحت ہی کامرانی ہے۔

مشہور مفکر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے۔ جو آدمی بہترین صحت کا مالک ہے وہی زندہ ہے کیونکہ اُس کے بدن کی ہر رگ میں اور اُس کے جسم کے ہر ریشے میں زندگی کی لہر دوڑتی ہے۔ وہی حقیقت میں کامیاب و کامران ہے۔ دُنیا کے بڑے بڑے انعامات اُس شخص کے نصیب میں ہیں جس کا بدن توانا جس کے پھیپھڑے قوی اور جس کی جسمانی قوت سالم ہو۔ اُس کے مقابلے میں نہ خاندانی وجاہت ٹھہر سکتی ہے نہ قابلیت نہ تعلیم و تربیت ذاتی طاقت اور زور کا مقابلہ کوئی چیز نہیں کر سکتی۔ اور ذاتی طاقت کا انحصار ہے زبردست اور قوی قوتِ حیات پر۔ جو چیز تمھاری تندرستی اور صحت میں اضافہ کر سکے وہ تمھاری ترقی کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔ اگر لوگ سمجھتے ہیں وہ عظیم الشان کارنامے صرف اُمنگ اور تمنا کے بل بوتے پر کر سکتے ہیں تو وہ غلطی پر ہیں۔ بڑے بڑے ارادوں کی تکمیل کے لئے قوی بدن اور توانا جسم ضروری ہے۔ جو شخص بہترین صحت کا مالک ہے کامیابی اُس کا حصہ ہے۔ اچھی صحت کامیابی و کامرانی کی ضامن ہے۔ اِس لئے صحت ہی زندگی ہے۔ صحت ہی کامرانی ہے۔

۲ ــــ زندگی میں کامیاب ہونے کے لئے۔

ڈاکٹر نپولین ہل نے لکھا ہے۔ زندگی میں کامیاب ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ہمارا ایک مقصدِ حیات ہو۔ لیکن ہم میں ۹۵ فیصدی ایسے لوگ ہیں جو بغیر کسی مقصدِ حیات کے لاابالی انداز سے زندگی بسر کرتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ کبھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ وہ دُنیا میں کونسا کام بہتر طریقے سے انجام دے سکتے ہیں یہاں تک کہ اُنھوں نے کبھی یہ سوچنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی کہ دُنیا میں زندگی گزارنے کے لئے کسی ایک واضح مقصدِ حیات کا ہونا ضروری بھی ہے یا نہیں؟ کامیابی کے لئے سب سے پہلے ضروری ہے کہ ہم اپنے ذہن کو ٹٹولیں۔ اپنے گردوپیش کا جائزہ لیں اپنی دلچسپی اور عدم دلچسپی پر غائر نظر ڈالیں اور سوچیں کہ ہماری ذہنی قوت سب سے بہتر کون سا کام کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ جب ہم اِس طرح اپنے حالات کا جائزہ لیں گے تو ہم خود بخود اپنی منزل کے قریب ہو جائیں گے۔ دُنیا میں آج تک کسی نے اُس وقت تک کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں کی جب تک اُس نے ایک بلند نصب العین کا تعین نہیں کیا۔ جو شخص اپنا تجزیہ کرتا ہے اور اپنے لئے ایک مقصدِ حیات متعین کر لیتا ہے اُس کی مثال اُس قافلے کی سی ہے جو اپنی منزل مقرر کر کے راہ کے خطروں سے بے نیاز ہو کر آگے بڑھتا چلا جاتا ہے اور بالآخر اُس کی منزل اُس کا استقبال کرتی ہے۔ ایسا انسان ہر موانع کو اپنی راہ سے ہٹا سکتا ہے اور پستی سے بلندی کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔

۳ ــــ آپ کا دماغ۔

دماغ جسم کا حاکمِ اعلیٰ ہے۔ وہ اعضا کو نہ صرف نقل و حرکت کے احکام صادر کرتا ہے بلکہ اُسی کے اشاروں سے ہم بات چیت کرتے ہیں۔ اُسی کی وجہ سے ہم میں چھونے، دیکھنے، سننے، سردی، گرمی، درد کی تکلیف بلکہ اچھے اور بُرے کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ دماغ ہی گئی گزری باتوں کی یاد ہمارے حافظے میں محفوظ کرتا اور تازہ کرتا ہے۔ وہی سوچتا، سمجھتا اور پرکھتا ہے۔ وہی ہمارے تمام خیالات و جذبات کا سرچشمہ و خزانہ ہے۔ اِس لئے ضروری ہے کہ جسم کے دوسرے حصوں کے ساتھ دماغ کو صحیح، صحت مند اور چاق و چوبند رکھنے کے لئے خاص احتیاط کریں۔ زیادہ سے زیادہ خیال رکھیں۔ ورنہ سارا نظامِ جسمانی درہم برہم ہو کر بدن کمزور اور بیمار ہو جائے گا۔ بدن کی تندرستی کے لئے دماغ کا صحت مند ہونا ضروری ہے۔ اِسی لئے ہمیں دماغ کی بہت زیادہ حفاظت کرنی چاہئے۔ اور اسے نہ صرف بیرونی چوٹوں سے بچانا چاہئے۔ بلکہ بُری باتوں اور نقصان دینے والی عادتوں سے بھی محفوظ رکھنا چاہئے

دماغ کو قوی کرنے کی ترکیب یہ ہے کہ ہم ہر وقت ہر بات چاہے کھیل ہو یا کام پوری توجہ سے کریں۔ اچھے خیالات رکھیں۔ ہر بات کے اچھے بُرے کو اچھی طرح سوچیں سمجھیں۔ اچھی بات اختیار کریں۔ بُری باتوں، جھوٹ، غیبت وغیرہ سے پرہیز کریں۔ خوش مزاجی کی عادت ڈالیں۔ ان باتوں کی مشق سے دماغ کو تربیت حاصل ہوتی ہے جس سے وہ قوی ہوتا ہے اور پھر اچھے کاموں کو بآسانی کر سکتا ہے۔ یاد رکھنا چاہئے اگر دماغوں کو اچھی باتوں کی تربیت نہ دی جائے تو وہ بہت جلد بُری عادتیں سیکھ لیتا ہے۔ اور پھر دماغ کی بُری عادتوں کا چھڑانا بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔ بے فکری سے دماغ کو نقصان پہنچتا ہے۔ اور وہ بے توجہی سے کام کرنے لگتا ہے۔ جھوٹ بھی دماغ پر بُرا اثر ڈالتا ہے۔ جس سے وہ غلط خیالی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ جسم کے دوسرے حصّوں کی طرح دماغ کو بھی نہ صرف ورزش و تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ بلکہ کافی غذا اور آرام کی بھی۔ بدن کا خون اُسے غذا پہنچاتا ہے اور آرام زیادہ تر اچھی اور پوری نیند سے حاصل ہوتا ہے۔ دن کے وقت تھکے ہوئے دماغ کو آرام دینے کے لئے ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اپنے کام کو بدل دیا جائے۔ مختلف کاموں کے لئے دماغ کے جُدا جُدا حصّے یا مرکز کام کرتے ہیں۔ اِس لئے کام بدل دینے سے اُس کے تھکے ہوئے حصّے کو آرام بھی مل جاتا ہے۔

۴ ــــــ بسیار خوری۔

یوں تو اب سے بہت پہلے تمام ڈاکٹروں کا یہ متفقہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ بسیار خوری مضر ترین عادت ہے۔ لیکن کچھ روز ہوئے ڈاکٹر جیمز مولیز نے اپنے تازہ ترین تجربات اور انکشافات کی روشنی میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ بسیار خوری سے انسان عمرِ طبعی تک نہیں پہنچ سکتا۔ اور وقت سے پہلے ہی دُنیا سے رخصت ہو جاتا ہے وہ کہتے ہیں زیادہ کھانے سے انسانی جسم کی مشینری پر زیادہ بوجھ پڑتا ہے مسلسل کام کرنے کے باعث سارے کل پُرزے ایک نیا کام شروع کر دیتے ہیں۔ یعنی پُرانے خلیوں کی جگہ نئے خلیے بننے لگتے ہیں۔ جس کی وجہ سے خون کی دیواریں کمزور پڑ جاتی ہیں۔ اور انسان یک لخت طبعی عمر کی نعمت سے محروم ہو کر پیامِ اجل کو لبیک کہتا ہے۔

۵ ــــــ غصّہ، صحت کا دشمن۔

کچھ دن ہوئے نارتھ ویسٹرن یونیورسٹی کے پروفیسر جی ایل فری مین اور اے ٹیلے نے بہت گہرے مشاہدات اور سخت امتحانات کے بعد یہ تجزیہ کیا کہ اُن لوگوں کو جو اعصابی تناؤ میں مبتلا ہوتے ہیں بمقابلہ اُن لوگوں کے جو ڈھیلے ڈھالے اور تفریح پسند طبیعت کے ہوتے ہیں بہت جلد اور زیادہ غصّہ آجاتا ہے اُنھوں نے دیکھا کہ بہت سی باتیں جو اوّل الذکر کو چراغ پا کر دیتی ہیں آخر الذکر کے چہرے پر ہلکی سی شکن بھی نہیں ڈال پاتیں۔ دوسرے تجربات سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے کہ اگر اعصابی تناؤ نہ ہو تو تلخ سے تلخ اور ناخوشگوار سے ناخوشگوار واقعہ اور جذبہ کا اثر بہت مشکل سے ہوتا ہے۔ اور ہوتا بھی ہے تو وقتی اور بہت ہلکا ہوتا ہے۔ انسانی جسم میں ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں اعصاب ہوتے ہیں اور جب اُن میں سے ایک کو بھی ہلکی سی تکلیف پہنچتی ہے تو اُس کا اثر دماغ پر ہوتا ہے۔ اور احساسِ درد پیدا ہوتا ہے۔ جبکہ اعصابی تناؤ کی کیفیت جاری رہتی ہے تو دماغ کے تاثرات میں مستقل تحریک کی وجہ سے قوتِ حس میں ذکاوت پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے ایسی حالت میں ہر ناگوار بات کا اثر زیادہ شدید ہوتا ہے۔ اِس کے برخلاف جب اعصابی تناؤ نہیں رہتا تو قوتِ حس اِتنی مستعد نہیں رہتی مستقل طور پر غصّہ دبانے کی وجہ سے باریک نسوں پر بہت بڑا اثر پڑتا ہے جس کی وجہ سے ہائی بلڈ پریشر کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ آدھے سر کے درد کی تکلیف دہ شکایت بھی اکثر اِسی عادت کی وجہ سے ہوتی ہے۔ فالج، اختلاج، دماغی کمزوری اور کینسر وغیرہ کے خطرات ہر وقت گھیرے رہتے ہیں۔ غصّہ سے خون خشک ہوتا ہے۔ اور دل و دماغ پر بھی اس کا مہلک اثر پڑتا ہے غصیلے آدمیوں کی صحت لازمی طور پر خراب رہتی ہے۔ اِن تمام مہلک عوارض سے بچنے کے لئے سب سے پہلے تو غصّہ ہونے سے گریز کیجئے جس بات پر یا جس جگہ غصّہ ہو جانے کے امکانات نظر آئیں اُسے نظر انداز کر دیجئے اور وہاں سے ہٹ جائیے لیکن جب آپ پر غصّہ کا بھوت سوار ہو ہی جائے تو ماہرین اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ زیادہ بہتر ہے کہ آپ کے غصّے کا اظہار کسی نہ کسی صورت میں ہو ہی جانا چاہئے۔ گو اکثر اُس کے نتائج تلخ ہو سکتے ہیں۔ پھر بھی غصّہ کے اظہار کی کوئی نہ کوئی صورت نکالنی ہی چاہئے۔ مثال کے طور پر دیوار، آئینہ یا تصویر کو بُرا بھلا کہہ کر دل کی بھڑاس نکال لیجئے۔ اپنے غصّہ کا نشانہ اپنے دل و دماغ کو بنانے کی بجائے عقلمندی یہی ہے کہ اِسی طرح کے بے ضرر طریقے اپنے غصّہ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے اختیار کئے جائیں تو بہتر ہے۔

۶ ـــــ آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں؟

ایک ماہر نفسیات کا خیال ہے کہ ہم اس لئے نہیں روتے کہ مغموم ہوتے ہیں بلکہ اس لئے مغموم ہوتے ہیں کہ روتے ہیں۔ آپ اس کا تجربہ آسانی سے کر سکتے ہیں۔ مصنوعی رونا رو کر دیکھئے آپ محسوس کریں گے کہ آپ پژمردہ و مغموم ہو چکے ہیں۔ اور اس کا تجربہ آپ یقیناً کر چکے ہوں گے کہ ایک مغموم آدمی کے سامنے ہنسنے ہنسانے کی باتیں کی گئیں۔ کچھ مزاحیہ جملے اور لطیفے سنائے گئے اور وہ ہنسنے لگا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا انداز بدل گیا۔ یہی حال پریشانیوں کا ہے۔ ہماری صلاحیتیں۔ اور توانائیاں معطل نہیں ہو جاتیں کہ ہم پریشان ہوتے ہیں۔ بلکہ جب صلاحیتوں کو معطل کر لیتے ہیں تو پریشان ہو جاتے ہیں۔ جو پریشانیاں آپ کے نزدیک بڑی اہمیت رکھتی ہیں وہ صرف آپ ہی کو لاحق نہیں ہیں دوسرے بھی ان سے دوچار ہوتے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ اگر دوسرے ان سے نکل آتے اور نکل رہے ہیں تو سوچئے آپ کیوں نہیں نکل سکتے؟

۷ ـــــ زندگی، پھولوں کی سیج یا کانٹوں کا بچھونا؟

زندگی پھولوں کی سیج نہیں ہے تو کانٹوں کا بچھونا بھی نہیں ہے۔ اس میں پھول اور کانٹے دونوں ہیں۔ کانٹے چن ڈالئے پھر پھول ہی پھول رہ جائیں گے یہ آپ پر منحصر ہے، آپ زندگی کو تلخ بنالیں یا شیریں۔ یہ آپ پر موقوف ہے کہ زندگی کو بھیانک رات بنالیں یا مسکراتی ہوئی صبح!!

۸ ـــــ مفید معلومات۔

- پلکوں کے بال اکھاڑنے یا کاٹنے سے نگاہ کمزور ہو جاتی ہے۔
- ہڑ معدے، دل اور دماغ کو تقویت دیتی ہے۔ بینائی کو تیز کرتی ہے۔ جگر اور تلی کے امراض میں مفید ہے۔
- انجیر کے دس دانے روز کھانے سے دبلا پتلا انسان فربہ اور تنومند ہو جاتا ہے۔ کالی گاجر گلے کے لئے اور سرخ گاجر سارے جسم کے لئے مفید ہے۔
- قوتِ حافظہ کو کمزور کرنے والی تین چیزیں:۔ خوراک کی زیادتی۔ (۲) ورزش کی زیادتی (۳) علم کی کمی زیادتی۔
- آلوؤں کو ہمیشہ پانی میں نمک ڈال کر ابالنا چاہیے۔

صرف ایک ہی ٹیوب کے فوائد
dermacare
Hair Remover
CREAM
SAHIB SINGH manufac
صاحب سنگھ
کا بلا شرط
پراڈکٹ

ASIAN/350

اِس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ فلمی، اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش وعریاں سوالات شاملِ اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ بیسویں صدی کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھیے۔ ہر سوال کے بعد جواب کے لئے جگہ چھوڑنی لازم ہے۔ ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھیے کہ اِس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے۔

(ایڈیٹر بیسویں صدی۔ دہلی)

مس پیاری سلطانہ۔ وجے واڑہ

س۔ بھائی جان! بہت سے مردوں کا کہنا ہے کہ عورت صرف ایک کھلونا ہے۔ اگر ایسا ہے تو مرد کیا ہے؟

ج۔ ایسے مردوں کی نظر میں مرد ایک بازی گر، ایک مداری ہوگا۔

س۔ انسان کے چاروں طرف مایوسیاں ہوں اور وہ فکر اور غم میں مبتلا ہو تو اُسے کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ یاس و نومیدی اور فکر و غم کے اندھیرے میں امید کی شمع روشن رکھنی چاہیئے تاکہ اندھیرا اور گہرا نہ ہو۔

امیر امان اللہ خاں۔ بھیری۔ گیا

س۔ زندگی کس طرح خوشگوار بنائی جائے؟

ج۔ اپنے فرائضِ منصبی کو بحسن وخوبی انجام دے کر!

س۔ دُنیا میں سب سے قیمتی شے کیا ہے؟

ج۔ یہ اپنی اپنی پسند اپنے اپنے خیال کی بات ہے۔ کسی کے نزدیک کوئی چیز قیمتی ہے کسی کے نزدیک کوئی چیز!

محمد سلیمان پرویز۔ خزانچی ہاٹ۔ پورنیہ

س۔ انگوٹھا لگانے والے منسٹر بنے بیٹھے ہیں اور ڈگریاں رکھنے والے نوکر رہے ہیں۔ کیا یہ صورتِ حال مضحکہ خیز نہیں؟

ج۔ کیوں نہیں۔ لیکن اس سے زیادہ مضحکہ خیز یہ ہے کہ تن آسانی و کاہلی کے باعث کچھ ڈگریاں رکھنے والے اپنے پیشے کے ناخدا خود نہیں بن سکتے۔

عبدالرؤف آمیر۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

س۔ اگر ایک انسان میں اخلاقی وجسمانی قوتوں کی کمی ہو تو وہ کیا کرے؟

ج۔ کمی دُور کرنے کی کوشش کرے۔ جدوجہد کرے۔

سیفی عباسی برہان پوری

س۔ ایک کامیاب مصنف کے نزدیک وقت کی اہمیت؟

ج۔ عام آدمیوں سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔

س۔ خوشتر بھائی! بحالتِ مجبوری دوستی نبھانی مشکل ہو جائے تو؟

ج۔ جب بھی نبھانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

س۔ مرنے والے کی قبر پر عقیدت کے پھول چڑھانے کا مطلب؟

ج۔ مرنے والے کی قبر پر عقیدت کے پھول چڑھانے کا مطلب اپنے جذبات کو تسکین دینا ہوتا ہے۔

آر۔ ایم۔ صدیقی۔ چاماگرام۔ مالدہ

س۔ بھائی جان! کسی ایسی کتاب کا نام بتائیے جس سے افسانہ لکھنا سیکھا جائے۔

ج۔ ایسی کوئی کتاب ہماری نظر سے نہیں گزری جو مبتدیوں کے لئے مفید ہو۔ ایک دو کتابیں ہیں۔ لیکن لکھنا سیکھنے کے بعد ان کا مطالعہ مفید ہو سکتا ہے۔ مبتدیوں کو کسی استاد سے استفادہ کرنا چاہیئے۔ کسی منزل آشنا رہنما کا دامن پکڑ کر منزل کی طرف بڑھنا چاہیئے۔

س۔ آپ کا پورا نام اور مذہب کیا ہے؟

ج۔ خاکسار کو لوگ خوشتر گرامی کہتے ہیں اور مذہب ادب اور انسانیت کی خدمت ہے۔

محمد شریف عالم اُدگانوی۔ مونگیر

س۔ انسان کب تک انسان رہتا ہے؟

ج۔ جب تک انسانیت کا دامن پکڑے رہتا ہے۔

س۔ سچ بات فوراً منھ سے کیوں نکل جاتی ہے؟

ج۔ اس لئے کہ سانچ کو آنچ نہیں۔

س۔ آجکل پڑھ لکھ کر لوگ ٹھوکریں کیوں کھاتے ہیں؟

ج۔ اس لئے کہ پڑھ لکھ کر جاہل ہو جاتے ہیں۔ حسین و خوش آئند خواب دیکھتے ہیں۔ لیکن اس کی تعبیر دیکھنے کے لئے، اُسے حقیقت بنانے کے لئے جد و جہد نہیں کرتے۔

طلعت بانو پروین۔ کلکتہ

س۔ بھائی جان! کیا میں آپ کی بزم میں شامل ہو سکتی ہوں؟

ج۔ بصد شوق! یہ ہماری بزم نہیں۔ ہم سب کی بزم ہے۔

س۔ کیا یہ صحیح ہے کہ اب پاکستان کی راجدھانی راولپنڈی ہو گئی ہے؟

ج۔ جی ہاں!

رؤف ادیب منصوری۔ کانپور

س۔ لگاتار کوشش کے باوجود گوہرِ مقصود نہ ملے تو کیا کرنا چاہیئے؟

ج۔ کوشش جاری رکھنی چاہیئے۔

س۔ اگر حالات موافق نہ ہوں تو کیا خود حالات کے موافق ہو جانا چاہیئے۔

ج۔ حوصلہ ہو تو حالات کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ ورنہ حالات سے سمجھوتہ کر لینا چاہیئے۔

سرفراز احمد ٹانڈہ فیض آباد

س۔ شکیل بدایونی کا کوئی اچھا سا شعر سنائیے۔

ج۔ گلوں کے رُخ پہ وہی تازگی کا عالم ہے
نہ جانے ان کو غمِ روزگار کیوں نہ ملا

س۔ اقبال کا کوئی نصیحت آمیز شعر سنائیے۔

ج۔ خودی کے زور سے دنیا پہ چھا جا
مقامِ رنگ و بو کا راز پا جا

برج لال کوشک۔ بھلار۔ کرنال

س۔ حوادث شخصیت پر کب غالب آتے ہیں؟

ج۔ جب انسان حوصلہ کا دامن چھوڑ دیتا ہے۔

س۔ خدا کا قاصد کون ہے جس کے ذریعے وہ اتنی نعمتیں اپنی مخلوق تک پہنچاتا ہے۔

ج۔ خدا کی قدرت کاملہ!

س۔ اختلاف دوستی کا مظہر ہے یا دشمنی کا؟

ج۔ دوستی میں بھی کسی بات پر پُرخلوص اختلاف ہوتا ہے لیکن بیشتر اختلاف دشمنی ہی کا مظہر ہوتا ہے۔

عبد السبحان پارولوی۔ پونا

س۔ انسان زندگی سے بیزار ہو جانے پر بھی مرنا نہیں چاہتا؟

بیسویں صدی

ستمبر ۱۹۶۳ء — مدیران: خوشتر گرامی — کرشن کمار

جلد — ۲۷ — طبیعت تعداد — ۲۷۱۹۳۷

نمبر — ۹ — مجموعی تعداد — ۲۳۹۲۷

"فلمساز اخلاق سوز فلمیں تیار کرتے ہیں": راج گوپال آچاریہ ——
ن انھیں کانگریس سوز فلمیں تیار کرنی چاہئیں۔

"دہلی اور کانپور کی گندی بستیاں دیکھ کر میرا دل جل جاتا ہے":
ت جواہر لال نہرو —— گندی بستیاں ہیں کہاں؟

"چین میں وسیع پیمانے پر ضبطِ تولید کی مہم شروع ہو گئی" ——
لئے کہ لوگوں کو لڑائیوں میں موت کے گھاٹ اتروانے کے بعد بھی
ی میں کمی نہ ہو سکی۔

"جاپان کے وزیر تعمیرات کا مکان پھونک دیا گیا" —— تاکہ وہ
وزیر وزارت میں ایک شاندار کوٹھی تعمیر کرا لیں۔

"شہر میں اژدھا آگیا" —— کس نیتا کی شان میں کہا
قصیدہ۔

"موجودہ کانگریس پارٹی دادا اور نانا کی تنظیم ہو کر رہ گئی ہے":
ل بہار —— اور پوتے اور نواسے اسے بہتی گنگا سمجھ کر
دھو رہے ہیں۔

"مسٹر بھیم سین سچر کی حق گوئی": ایک عنوان —— کہ وزارت
بھی گیا اور گورنری سے بھی۔

خوشتر گرامی

"ہمیں نئے دور کے تقاضوں کا ساتھ دینا ہے": پنڈت جواہر
لال نہرو —— جس دور نے مس کیلر پیدا کی۔

"میں اپوزیشن پارٹیوں کا متحدہ محاذ قائم کرنا چاہتا ہوں": آچاریہ
کرپلانی —— ضرور کیجئے کہ بیکار مباش کچھ کیا کر!

"لاہور میں انسدادِ ملیریا کی مہم" —— حالانکہ ملیریا سے زیادہ
ضروری سیاسی جراثیم کے انسداد کی مہم تھی۔

"ایک محکمہ جس نے آج تک ایک تنکا بھی ادھر سے ادھر نہیں
کیا": ایک عنوان —— دیانتداری کی شاندار مثال۔

"لاہور میں لیڈرشپ تربیتی کورس": ایک خبر —— مولانا مودودی،
خواجہ ناظم الدین، مسٹر سہروردی، چودھری محمد علی اور چودھری خلیق الزماں
جلدی کریں۔ کہیں داخلے سے محروم نہ رہ جائیں۔

"اساتذہ پر کام کا بوجھ کم کیا جائے": پنجاب یونیورسٹی کے وائس
چانسلر کی رائے —— یہ جو طلباء آئے دن ہڑتالیں اور اسٹرائک کرتے
رہتے ہیں کیا اس سے بوجھ ہلکا نہیں ہوتا؟

"جوانوں نے دیش کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائی اور آپ —"
ایک جنگی نعرہ —— اور آپ صرف تقریریں فرماتے رہے

نہرو کے بعد کون ـــــ؟

"آندھرا پردیش میں ڈاکٹروں کی قلت" ایک خبر ـــــ ڈاکٹر [illegible] کے انتقال اور ڈاکٹر گوپالا ریڈی کے مرکز میں چلے آنے کا نتیجہ۔

"قوم فردِ واحد کی ڈکٹیٹرشپ برداشت نہیں کرے گی" سردار [illegible]درخاں ـــــ جس میں آپ کو حصہ ملنا ضروری ہے!

"سردار پرتاپ سنگھ کیروں کے خلاف الزامات کو پنڈت جواہر [illegible] نہرو نے تسلیم نہیں کیا" ایک خبر ـــــ اس لئے کہ پنڈت جی [illegible] پر یقین نہیں کرتے۔

"[illegible] پارٹیاں کیسی [illegible]" [illegible]

پنڈت جواہر لال نہرو کی تقریر ـــــ تو کیا اس کے علاوہ کسی اور چیز کی توقع تھی؟

"چین کے ہر عمل سے بارود کی بو آتی ہے" ایک مقالہ ـــــ آپ سمجھے تھے کہ مشک اور عنبر کی خوشبو آئے گی۔

"ماسکو میں جو ہندوستانی نمائش ہو رہی ہے اس میں جب [illegible] تندوری مرغ کھلایا جائے گا تو کچھ اور لوگ ہندوستان کے دوست ہو جائیں گے" [illegible] ـــــ [illegible]

اصحاب [illegible] غلام [illegible] [illegible] [illegible]

"شاید عام چیزوں کی قلت نے ہمارے اخلاق کو تباہ کر دیا ہے۔" ایک مقالہ ___ اخلاق بھی کوئی ایسی چیز ہے جس کا ماتم کیا جائے اس تہذیب پر ترس کیجیے جس میں ہر چیز کی قلت ہو گئی۔

"پنجاب کے عزت دار کانگریسیوں کا وفد" ___ سردار پرتاپ سنگھ کیروں پر دباؤ ڈال کر کچھ حاصل نہ کرنے کے بعد مرکزی لیڈروں کے حضور میں۔

"چینیوں نے مصنوعی جلد تیار کر لی" ایک خبر ___ اس لئے کہ اصل جلد بے حیائی اور ڈھٹائی سے جلد کی بجائے گینڈے کی کھال بن گئی ہے۔

"چندہ جمع کرنے کا ناجائز طریقہ" ___ لوگ جائز طریقے سے جو چندہ نہیں دیتے۔

"برطانیہ کے کتوں کے لیے حفظان صحت کی اسکیم" ___ ایک وہ ہیں جنہیں کتوں کے لئے اسکیم بنانا آتی ہے۔ ایک ہم ہیں کہ انسان ہو کر بھی محروم ہیں اس سے۔

"مغربی تہذیب کے اثر سے بھارت کی روح سلب نہیں ہوئی" لال بہادر شاستری ___ بجا فرمایا۔ صرف جسم پر کوٹ پتلون نظر آنے لگے ہیں۔ جن کا روح سے کوئی تعلق نہیں۔

ایک خبر ___ قیمتوں میں ٹھہراؤ پیدا ہو گیا۔ دکانیں کھلیں گی تو کوئی چیز زیادہ قیمت پر فروخت ہوگی۔

"سگریٹ اور گیزٹ — دونوں لازم و ملزوم ہیں۔"

"کیلاشو بینک کے افلاطات مگر نوٹس ہوتے" ایک خبر — بنی حنیف کے ہوا خواہ ابھی تک زندہ ہوتے ہیں۔

"آپ کا نظم و ضبط قوم کی قوت" : ایک جنگی نعرہ — اور اکثریوں کا نظم و ضبط قوم کی عزت، جواب شکوہ میں رسوا ہوتی ہے۔

"عوام کی غالب اکثریت" ۔ ایک عنوان — اور نقلی اکثریت، اور مین اکثریت کونسی ہوتی ہے؟

"چین کا غم" ایک عنوان — شری خروشچیف نے بتانے سے انکار کر دیا۔

"جام نگر میں چارہ کی قلت، مویشی ہلاک ہو رہے ہیں" — کیوں ہلاک ہو رہے ہیں۔ جام نگر میں چارہ نہیں ملتا تو جام کھائیں۔

"ہم گپتا کا مقابلہ عدالت میں، اسمبلی میں اور گلیوں میں کریں گے"۔ اجیت پرشاد جین کا اعلان — حالانکہ ان میں سے کوئی جگہ اس مقصد کے لئے نہیں ہے۔ گپتا جی سے کہئے اکس ایس لنگر لنگوٹ اور آئیں اکھاڑے میں۔

"راولپنڈی کے ائیر وڈ شمن اسکول کے خلاف تحقیقات کا مطالبہ" — یعنی اس تمام میں ہندو اور پاکستان دونوں جگہوں کے اسکول ننگے ہیں۔

"صدر ایوب خود غرض عناصر سے پاکستان کو پاک کریں گے۔" ایک خبر

"کرپلانی اور لوہیا پنجاب کا دورہ کریں گے۔" ایک خبر —— پنجاب کو خدا محفوظ رکھے ہم تو بلا ہے۔

"شری سیمر کی چٹھی محض پروپیگنڈہ ہے۔" سردار پرتاپ سنگھ کیروں کا بیان —— جو بے کاری کے لمحات کو کام میں لانے کے لئے لکھی گئی۔

"راجستھان میں اردو سے بے انصافی۔" ایک عنوان —— وہ جگہ بتاؤ جہاں انصاف ہو رہا ہو۔

"دلی میں شراب کی فیکٹری پکڑی گئی" —— اور کیا ایک آدھ بوتل کا پکڑا جانا بھی کوئی عزت کی بات ہوتی۔

"باکسنگ کی جانچ پڑتال ہونی چاہیئے" ایک عنوان —— کہ گھونسا پڑنے کے بعد مزاج کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔

"پنجابی صوبے کے بارے میں بات چیت" —— خواب میں بھی ناکام رہی۔

"بے روزگاری پر خودکشی کر لی" —— چلو بے روزگاری سے چھوٹا!

ایجنٹ صاحبان [illegible]

[illegible] رہتے ہیں۔ (منیجر [illegible])

افسانہ

اپنا گھر، اپنی دُنیا

پروفیسر وقار بن الٰہی ایم۔اے

۲۶۔ چھوٹی روڈ۔ کیمبل پور۔ مغربی پاکستان

۶ مارچ ۱۹۶۳ء

خوشتر صاحب! آداب

کتنی مدت کے بعد آپ کو افسانہ بھیج رہا ہوں۔ اِس کا احساس مجھے خود بھی ہے۔ شرمسار بھی ہوں لیکن بھائی صاحب! کیا کیجئے، جب کہ ہم افسانہ نگار۔ پاگل لوگ کہانیاں لکھتے لکھتے خود کہانی بن جاتے ہیں۔ پھر لوگ ہماری طرح ہم سے کھیلتے ہیں۔ لطف یہ کہ تماشا بھی دیکھتے ہیں۔ یوں بھی گرے ہوئے کو تو کچلا ہی جاتا ہے۔ اُٹھایا کس نے ہے؟ اُٹھانا جانتا ہی کون ہے! ——— اِس مدت اور اِس طویل خاموشی میں بہت کچھ پایا اور سچ پوچھئے تو اُس سے کہیں زیادہ کھویا ہے۔ اب اِس کا حساب کیا کرنے بیٹھوں۔ ڈرتا ہوں کہیں اِسی فکر میں شام نہ گھر آئے ——— "اپنا گھر، اپنی دُنیا" میں ایک نمایاں تبدیلی آپ کو دکھائی دے گی۔ آپ کی رائے کا منتظر ہوں ..... آپ کا ——— وقار بن الٰہی

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ اور اِس وقت کون ہے جو گرم لحاف کو چھوڑ کے گاڑی میں سفر کرنے کو آجائے۔ پھر جو اسٹیشن اُس نے منتخب کیا تھا وہ تو دوپہر اور صبح کی گاڑیوں کے اوقات میں بھی ویران ہی رہتا تھا۔ رات کے اِس پہر میں تو انجن کی گھر رگھر رکے سوا اور کوئی آواز سُنائی نہ دے رہی تھی۔ آج سے ایک برس پہلے پسنجر کے سوا اور کوئی بھی گاڑی یہاں نہ رُکتی تھی۔ اب جو اچانک قریب ہی ایک ڈیم کی تعمیر شروع ہوئی تو اِس اسٹیشن کے جیسے بھاگ جاگ اُٹھے۔ اور اب وہاں سبھی گاڑیاں رُکنے لگی تھیں۔ اور یہ اسٹیشن اُس کے لئے یوں بھی اچھا تھا کہ اگلے اسٹاپ تک پہنچنے کے لئے گاڑی پورے دو گھنٹے لیتی تھی۔ اُس نے سوچا، دو گھنٹے میں بقول رُوس کے ساری دُنیا تباہ کی جا سکتی ہے۔ ایک مسافر کو لُوٹنا یا اُسے جان سے مار دینا تو معمولی کام تھا۔ کئی اسٹیشن پیچھے ہی وہ یہ اطمینان کر چکا تھا کہ جو ڈبہ اُس نے منتخب کیا ہے اُس میں صرف ایک ہی مسافر ہے اور وہ بھی عورت! اور مزید لطف یہ کہ اُس نے سونے سے پہلے دروازے کی چٹخنی بھی نہیں چڑھائی تھی۔ گاڑی جونہی سرکی، وہ بھی آہستگی سے لپک کر پائدان پر کھڑا ہو گیا۔ اور ڈنڈے کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑ کر اُس کے ساتھ لپٹ گیا۔

ریت میں نہ جانے کیا خاصیت ہے کہ پل میں یخ ہو جاتی ہے۔ اور گاڑی جس علاقے سے گزر رہی تھی اُس میں صرف ریت ہی نہ تھی، چھوٹے چھوٹے نالے، نہریں اور کھجوروں کے جُھنڈ دُور دُور تک پھیلے ہوئے تھے اُس نے اندازہ لگایا۔ پچھلے اسٹیشن سے گاڑی دس میل تو دُور آ ہی چکی ہوگی چادر سے مُنہ اور پیشانی اچھی طرح باندھ کے اُس نے ہینڈل گھمایا۔ اور ذرا سا دروازہ کھول کر اندر جھانک کے دیکھا۔ لیکن اِتنی ہی دیر میں غُبار کے بادل ڈبے میں جمع ہو گئے۔ اُس نے فوراً جسم کو اندر گھسیٹا اور دروازہ بند کر دیا۔ پھر چٹخنی بھی چڑھا دی اور پیشہ ور لوگوں کے بالکل برعکس چُپکے

ے دُوسری برتھ کے کونے پر بیٹھ گیا۔ پہلے ذرا اپنے شکار کا جائزہ تو لے
ہ۔ بے سُود ہاتھ ڈالنے سے کیا فائدہ؟ دیر تک وہ، اُسی اطمینان سے
بجارہا۔ گھبرانا بھی کیوں، کوئی پہلی بار تو نہ تھی جو وہ کسی مسافر کو لُوٹنے آیا تھا
ج تک نہ جانے کتنے بدقسمت شکار ہو چکے تھے۔ اور پھر ایک لڑکی کو دیکھ کے
اُس کا جی چاہا اُسے جگا دے اور اُس کے سامنے ہی اُس کے بکسوں کی
اشی لے۔ وہ اُس کا بھلا بگاڑ بھی کیا لے گی۔ ایک گھونسا بھی سہہ جائے
تو بڑی پہلوان ہو گی۔ چادر میں چھپی ہوئی اُس کی باچھیں کھل گئیں۔ تھیلوں
کے لال چھپٹے کوٹ میں اُس کا سینہ تن گیا اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں
جیسے بڑے بڑے دیپ جل اُٹھے۔ ایک لمحہ کے لئے اُس نے سوچا، نعرہ
کا قہقہہ لگائے۔ کتنی مدت ہو گئی ہے، وہ کسی عورت کو شکار نہیں کر سکا
اُس کے لئے یہ کتنی بڑی بات تھی۔ کتنی بُری بات!

کمرے کی ساری بتیاں روشن تھیں۔ اُس نے اُٹھ کے سوئچ بورڈ کو
دیکھا۔ اور پھر ایک ہلکی مریض روشنی کے سوا اور سب گُل کر دیں۔ اور پھر
بیٹھ کر اُس سوئی سوئی روشنی میں نیند میں ڈوبی ہوئی خاتون کو دیکھنے لگا۔
پہلے اُس کا رُخ باہر کو تھا۔ لیکن اب وہ چت لیٹی ہوئی تھی۔ خاصا لمبا قد
تھا اُس کا۔ گردن تک سارا جسم دو موٹے موٹے، دبیز کمبلوں میں چھپا
ہوا تھا۔ آنکھیں بند تھیں لیکن اُبھار بتا رہا تھا کہ خاصی موٹی ہوں گی۔ کاجل
کی لکیر باہر دُور تک گئی دکھائی دے رہی تھی۔ پیشانی کافی چوڑی تھی اور یوں
دکھائی دے رہی تھی جیسے سنگِ مرمر کی شفاف سطح پر بجلی کے موتیا رنگ کے
قمقمے کا عکس پڑ رہا ہو۔ اور اُس پر سیاہ گھنے بالوں کی مانگ یوں معلوم
ہو رہی تھی جیسے تاریک گھنے جنگلوں میں چھوٹا سا روشن راستہ! ناک
بے حد خوبصورت تھی۔ ہونٹوں پر پُرانی لپ اسٹک کی نہایت ہلکی تہہ
تھی۔ اُسے گال ایک ہی دکھائی دے رہا تھا۔ گلاب کے سفید پھول کی طرح
چند لمحے اطمینان سے سانس لیتی ہوئی اُس عورت کو وہ دیکھتا رہا۔ پھر ذرا
سی چادر نیچے کر کے جہاں اُس کے نتھنوں میں کمرے کی گرم، سوندھی
فضا آئی وہیں اُسے احساس ہوا کہ اِس فضا میں کسی کریم کی ہلکی ہلکی خوشبو
بھی رچی بسی ہے۔ طنز سے وہ دل ہی دل میں ہنس دیا۔

"عورت، لپ اسٹک، کریم اور کاجل کے سوا واقف بھی کس شے
سے ہے۔ اُس کے پاس لے دے کے یہی کچھ رہ گیا ہے۔ اِسے بھی من میں
نہ بسائے تو پھر کرے کیا؟"

پھر اُس نے سامان کا جائزہ لیا۔ برتھ کے نیچے دو بڑے بکس تھے۔
اور ایک چھوٹی اٹیچی جو کہ اُس نے سرہانے رکھ چھوڑی تھی۔ اِس کے علاوہ
ایک دو باسکٹ اور ایئر بیگ تھے۔ لیکن سب کے سب فضول۔ کسی میں
رسالے تھے اور کسی میں اُون۔ اُس کی نظریں چھوٹی اٹیچی پر جم کر رہ گئیں۔ شاید
یہ سوچ کے کہ اُس کے مطلب کی چیز اسی میں ہو گی۔

گرد تھی کہ بند کھڑکی اور گرے شیشے بیست اندر گھسی چلی ہی آ رہی
تھی۔ گاڑی تھی کہ پُوری رفتار سے بھاگی چلی جا رہی تھی۔ اور وہ خاتون گہری
نیند سو رہی تھی۔ ایک دم وہ اپنی جگہ سے اُٹھا۔ نیفے میں اُڑسے چاقو کو چھو
کے، اندازہ لگا کے اُس نے سوچا۔ اچانک اگر ضرورت پڑ گئی تو کہیں دیر
تو نہ ہو جائے گی۔ پھر اِس نے دوبارہ چادر کو اچھی طرح لپیٹا اور برتھ کے
پاس بیٹھنے ہی کو تھا کہ خاتون نے آہستگی کے ساتھ کروٹ بدلی۔ اور رُخ
دیوار کی طرف کر لیا۔ لیکن اُس کے جی میں جانے کیوں ہمیشہ کی طرح یہ خواہش
اُبھری۔ اگر وہ اُڑسا ہوا چاقو نکال کر اُس کے پہلو میں گھونپ دے اور پھر
عورت زندگی کی بھیک مانگتی ہوئی دم توڑ دے تو اُسے کتنا لطف آئے گا۔
آج تک وہ کتنی ہی عورتوں کو لُوٹ چکا تھا۔ لیکن کبھی تو اُس کے دل میں یہ
خیال نہ آیا تھا کہ وہ پل بھر کے لئے اُس عورت سے کھیل ہی لے۔ اور نہیں
تو اُس سے کچھ چھین ہی لے۔ لیکن ہمیشہ وہ تو ایک ہی بات سوچتا تھا۔ اِس
فتنے کو اگر ابھی ختم کر دوں تو کتنی اچھی بات ہو گی۔ دوسری کسی بات کا تو
وہ تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ برتھ کے پاس بیٹھ کر اُس نے بکس ہولے ہولے
باہر گھسیٹا۔ لیکن اُس کے قفل بند تھے۔ اُس کا جی چاہا کہ اُٹھے اور اُٹھ کر
اُس عورت کو جگا دے۔ اور اِسی کے ہاتھوں بکس کھلوائے۔ اِسی کے ہاتھوں۔
پھر مڑ کے وہ برتھ پر جا بیٹھا۔ اور چپ چاپ اُس سوئی
ہوئی خاتون کی پیٹھ دیکھنے لگا۔
اُس کے ذہن میں اپنے قصبہ کی ایک ایک بات اب بھی موجود

تھی۔ وہی قصبہ جہاں وہ کسی زمانے میں دسویں میں پڑھتا تھا اور دوست اُسے عاشقو کہہ کے پکارتے تھے اور جہاں کے اُستادوں کے لئے وہ ہمیشہ مکئی کی روٹی اور ساگ لے جایا کرتا تھا۔ وہی قصبہ جہاں اُس کی ماں رہتی تھی جو اُسے جنم دینے کے بعد بے برگ و ثمر چین بن گئی تھی۔ اور وہی قصبہ جہاں اُس کا بابو باپ مہینے کی دو تاریخ کو بلا ناغہ آتا تھا۔ اور بیٹے کو شہر کی کہانیاں سُناتا تھا۔ اور اُسے یہی کہتا کہ وہ دسویں کرے تو اُسے اپنے ساتھ لے جائے گا۔ پھر عاشق کالج میں پڑھے گا اور بابو بن جائے گا لیکن نہ اُس کا باپ پھر ملا۔ نہ وہ شہر ہی گیا۔ نہ اُس نے کالج میں داخلہ لیا اور نہ وہ بابو ہی بنا۔ کیسی کیسی باتیں تھیں جو اُس کے سینے میں گھٹ کے دل پر داغ چھوڑتی ہوئی وہیں گہرائیوں میں ڈوب گئی تھیں۔

کبھی کبھار دو ماسٹر اُسے دیکھ کے آپس میں سرگوشی کرتے یا طنزیہ ہنسی ہنستے تو دسویں میں پڑھنے کے باوجود عاشق کچھ بھی نہ سمجھ پایا۔ عاشق تو رہا ایک طرف، اُس کا باپ بھی اُن کے اشاروں کو نہ سمجھا۔ پھر لوگ اشاروں سے ہٹ کر باتوں پر آ گئے۔ اُس نے کچھ بھی کچھ نہ جانا۔ البتہ اُداس ضرور رہنے لگا۔ ہاں باپ نے یہ باتیں سُنیں تو سوچ میں پڑ گیا پھر اُس نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اور ایک دن عاشق اتنا ہی جان سکا کہ اُس کی ماں مر گئی ہے۔ لیکن گردن پر نیلے نیلے نشان تھے اور اُنہی نشانوں نے اُس کے باپ کو نہ جانے کہاں پہنچا دیا تھا۔ عاشق کو یاد تھا تو صرف اتنا کہ باپ نے چلتے ہوئے اُس کے گالوں پر پیار دیتے ہوئے صرف یہی بات کہی تھی۔

"بیٹے! عورت آستین کا سانپ ہے۔ اِس سے بچ کے رہنا۔ تم اسے پالو گے۔ لیکن یہ تمھیں ڈس لے گی۔"

پھر بھی وہ سمجھ نہ سکا۔ دو چار ماہ چچی کے گھر رہا۔ اُس نے اٹھتے بیٹھتے اُسے وہ وہ طعنے دیئے کہ اُس کے کان تک جل اُٹھے۔

"پتہ نہیں وہ کون سی گھڑی تھی جب ہم اُس منحوس کو بیاہ کر لائے تھے۔ خود تو منہ کالا کر ہی گئی۔ ساتھ ہی ہمارے بھائی کو بھی کھا گئی۔ اور یہ ہائے یہ مشٹنڈا، حرام کی نشانی ہمارے سینوں پر مونگ دلنے کے لئے چھوڑ گئی ہے۔" پھر دھپ، ایک جوتا اُس کے منہ، چھاتی یا پیٹھ پر آ پڑتا۔ اور وہ بلبلا کے باہر بھاگ جاتا۔ پھر ایک بار جو وہ بھاگا تو اُس نے لوٹ کے کبھی اُدھر کا رُخ نہ کیا۔ ہاں جُوں جُوں شعور جاگتا گیا ایک ایک بات اُس کے ذہن میں اُجاگر ہوتی چلی گئی۔ پہلے تو یہ حالت تھی کہ بازار میں یا سڑک کہیں عورت کو دیکھ کے اُس کا جی چاہتا کہیں اُسے کچا چبا جائے۔ لیکن اُس نے آہستہ آہستہ انتقام کی ایک نئی راہ سوچ لی۔ اب وہ بڑی دلیری سے اُن ڈبوں میں مسافروں کو لُوٹتا تھا جو اکیلے ہوں اور جن میں زیادہ تعداد عورتوں کی تھی۔

بر تھ سے وہ ایک دم ہی یوں ہڑ بڑا کے اُٹھا جیسے پولیس کے سپاہی کو اپنے سامنے دیکھ لیا ہو۔

دل نے سرگوشی کی۔

"او ئے یار او عاشقو! کیا سوچ میں پڑ گیا ہے۔ چھوڑ اِس لاکہانی کو پہلے جو اتنی مرتبہ سوچا ہے تو کیا پایا ہے تُو نے؟ جلدی کر نہیں تو باپ سے ملنے کا ارادہ ہے کیا؟"

آگے بڑھ کے اُس نے دوسرا بکس نکالا لیکن اُس کے قفل بھی بند تھے۔ گو وہ بکس تھے ضرور بڑے۔ لیکن ہلکے ہلکے معلوم ہو رہے تھے قفل دیکھ کے اُس نے سوچا۔ چابیاں ضرور اِس چھوٹی اٹیچی میں ہوں گی۔ اُٹھ کے اٹیچی اُٹھانے کے لئے وہ جھکا تو سارا جسم کانپ گیا۔ کتنی سیدھی مانگ ہے اِس کی۔ اور کیسی چمک رہی ہے۔ اور اِس کے بالوں سے یہ کیسی عجیب سی خوشبو اُٹھ رہی ہے۔ اور کتنے اطمینان سے سانس لے رہی ہے یہ۔ اگر جاگ جائے تو۔ ہائے کتنا بُرا ہوگا۔ لیکن جانے کون اندر سے فوراً بول اُٹھا۔

"تجھے کیا ہو رہا ہے اوئے عاشقے! جاگ گئی تو چاقو سے کام لے۔ ہاں، جاگ گئی تو چاقو کا ایک ہی وار!"

اُس نے ہاتھ بڑھا کے اٹیچی اُٹھائی اور آہستگی سے پیچھے ہٹ آیا۔ لیکن یہ دیکھ کر اُسے اور بھی غصہ آیا کہ اٹیچی بھی بند تھی۔ اُس نے مُڑ کے باتھ کا دروازہ کھولا اور اندر چلا گیا۔ دروازہ بند کیا تو وہاں کمرے سے زیادہ

درمیع رہا تھا۔ اُس نے زور دے کے جوڑ ڈھکنے کو اُٹھایا تو پُشت پر سے
زور سے چُرر کی آواز پیدا ہوئی۔ اور ڈھکنا الگ ہو گیا۔ لیکن اِس آواز کو
پہیوں کے شور نے فوراً ہی اپنے اندر جذب کر لیا۔ اٹیچی میں چند خط تھے
سامانِ آرائش کا سامان تھا۔ چند تصویریں اور سب سے نیچے دو تین ہلکے
ہلکے زیور پڑے تھے۔ دھت تیرے کی! ساری رات برباد کی اور ملا کیا؟
باہر سے اِتنی آن بان، سفر سیکنڈ کلاس میں، اور اندر سے کیا نکلا! یہ بھی
اندر سے کھوکھلی ہوتی ہیں، یہ عورتیں! ایک تصویر نکال کے دیکھی تو وہ
ایک خوبرو نوجوان کی تھی جو سُوٹ میں ملبوس تھا۔ ہوں! تو یہ لچھن ہیں
آپ کے! سبھی کے کرتوت ایک سے ہیں۔ زیور نکال کے اُس نے قمیص
کی جیب میں ڈالے۔ اور پھر چابیاں تلاش کرنے لگا۔ اُس نے ایک ایک
کونہ دیکھ لیا۔ ایک ایک لفافہ اُلٹ دیا۔ لیکن چابیاں ہوتیں تو ملتیں! اُسے
اٹیچی باہر نکال کے اُس نے ایک اور برتھ کے نیچے رکھ دی۔ اور پھر
اُس خاتون کے پاس جا کے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اُسے مطلب کی چیز
فوراً ہی نظر آ گئی۔ دیوار کے ساتھ ہی بڑا سا سیاہ رنگ کا پرس رکھا تھا جسے
اُس نے سونے سے پہلے یقیناً سرہانے کے نیچے دبا لیا ہوگا۔ لیکن اب وہ
کروٹیں بدلنے سے اپنی جگہ سے ہٹ گیا تھا۔ عاشق نے سانس روک
کے ایک ہاتھ بڑھایا اور سانس روک کے پرس اُٹھا لیا۔ ریزگاری اور چابیاں
ایک دم بج اُٹھیں۔ پر گاڑی کے شور میں یہ آواز ڈوب کے رہ گئی۔ پرس
کھول کے اُس نے چابیاں نکالیں اور اُسے بند کرنے لگا تو اچانک ہی
اُسے ایک اور خیال آیا۔ پھر پرس کھولا تو اُس میں ٹکٹ اور چند نوٹ پڑے
تھے۔ ٹکٹ اُس نے وہیں رکھ دیا۔ اور نوٹ نکال کے جیب میں
ڈال لئے۔ اور پرس ہینگر پر رکھ دیا۔

پہلا بکس کھولا تو اُس میں چند زنانہ قمیصوں اور شلواروں کے سوا
کچھ بھی نہ تھا۔ بکس بند کر کے اُس نے دُوسرا کھولا۔ اُوپر چند چادریں اور
کچھ غلاف تھے۔ اور نیچے نہایت عمدہ سُوٹ کا کپڑا رکھا تھا۔ اُس کے
ساتھ ریڈی میڈ قمیص تھی۔ ایک رُومال تھا جس پر سُرخ رنگ کے دو
پھول کاڑھے گئے تھے۔ اور اسی رُومال کے نیچے دو پھول رکھے
تھے۔ گلاب کے پھول! جو سُوکھ گئے تھے۔ اور جن کی پتیاں مُڑ تُڑ رہی تھیں۔
اِن بکسوں میں بھی کچھ نہیں۔ کتنی نکمی اور فضول عورت نکلی یہ بھی۔ اب وہ کیا
لے۔ سُوٹ ہی قیمتی دکھائی دیتا ہے لیکن وہ اِس سُوٹ کو کیا کرے گا!
وشع کرو جی! رُومال، نہیں۔ ساڑیاں، نہیں۔ چادریں، غلاف۔ نہیں،
نہیں اِن میں سے کچھ بھی نہیں لے گا وہ! دوسرا بکس بھی بند کر کے اُس
نے برتھ کے نیچے کر دیا۔ اور جب اُٹھا تو اچانک اُس کی نگاہیں چمکتے ہوئے
ہار پر جا پڑیں۔ جس کا ایک کونا ہی دکھائی دے رہا تھا۔ باقی ہار قمیص کے اندر
کہیں سینے ہی میں گُم ہو گیا تھا۔

ہار دیکھ کے اُسے بہت خوشی ہوئی۔ مال تو مال مل جائے گا اور
ہو سکتا ہے چاقو کی پیاس بھی بجھ جائے۔ لیکن پہلے اُس اٹیچی کو تو ایک بار
اور دیکھ لوں۔ ہو سکتا ہے اُس میں سے کچھ اور بھی نکل آئے۔ بعد میں تو ایک
پل بھی ٹھہرنا خطرناک ہوگا۔

پیچھے ہٹ کے اُس نے برتھ کے نیچے سے اٹیچی نکالی۔ اور سامنے
بیٹھ کے اُس میں رکھی ہوئی چیزوں کو اُلٹنے پلٹنے لگا۔ لیکن اب تو اُس میں
تین چار لفافے ہی رہ گئے تھے۔ اُس نے سوچا، اِن میں سے کسی لفافے میں
شاید نوٹ ووٹ نکل آئے۔ اور ایک لفافہ کھولا تو اُس میں ایک خط تھا۔
اُوپر کے دو ہی لفظ پڑھ کے اُس کے مُنہ سے ایک گالی نکلی۔ "بڑی عاشق
بنی پھرتی ہے۔ ہونہہ، بدکار!" دوسرا لفافہ کھولا۔ اُس میں سے چار تصویریں
نکلیں۔ ایک وہی جسے وہ پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ ایک اُس نوجوان اور
خاتون کی ساتھ لی گئی تصویر تھی جو کسی پارک میں لی گئی تھی —— ایک
ریلوے پلیٹ فارم پر۔ اور چوتھی تصویر کو دیکھ کے تو وہ چونک اُٹھا۔
تھے وہی دونوں۔ لیکن اِس میں خاتون دُلہن بنی ہوئی تھی۔ اور اُس
کے ذہن میں ایک دم کھلبلی مچ گئی۔ اُس نے جلدی سے خاتون کو دیکھا
پھر اُس تصویر کو۔ اچھا تو یہ اِس کا خاوند ہے۔ ہونہہ۔ یہ اِس کا خاوند
ہے۔ اچھا وہ قمیص، وہ سوٹ، رُومال اور پھول! کیا مطلب ہے
اِن پھولوں کا؟ ایک اور لفافہ کھولا تو وہ تار تھا۔ جس میں کراچی آنے
کی تاریخ اور گاڑی درج تھی۔ اُسے بند کر کے اُس نے آخری لفافہ کھولا۔
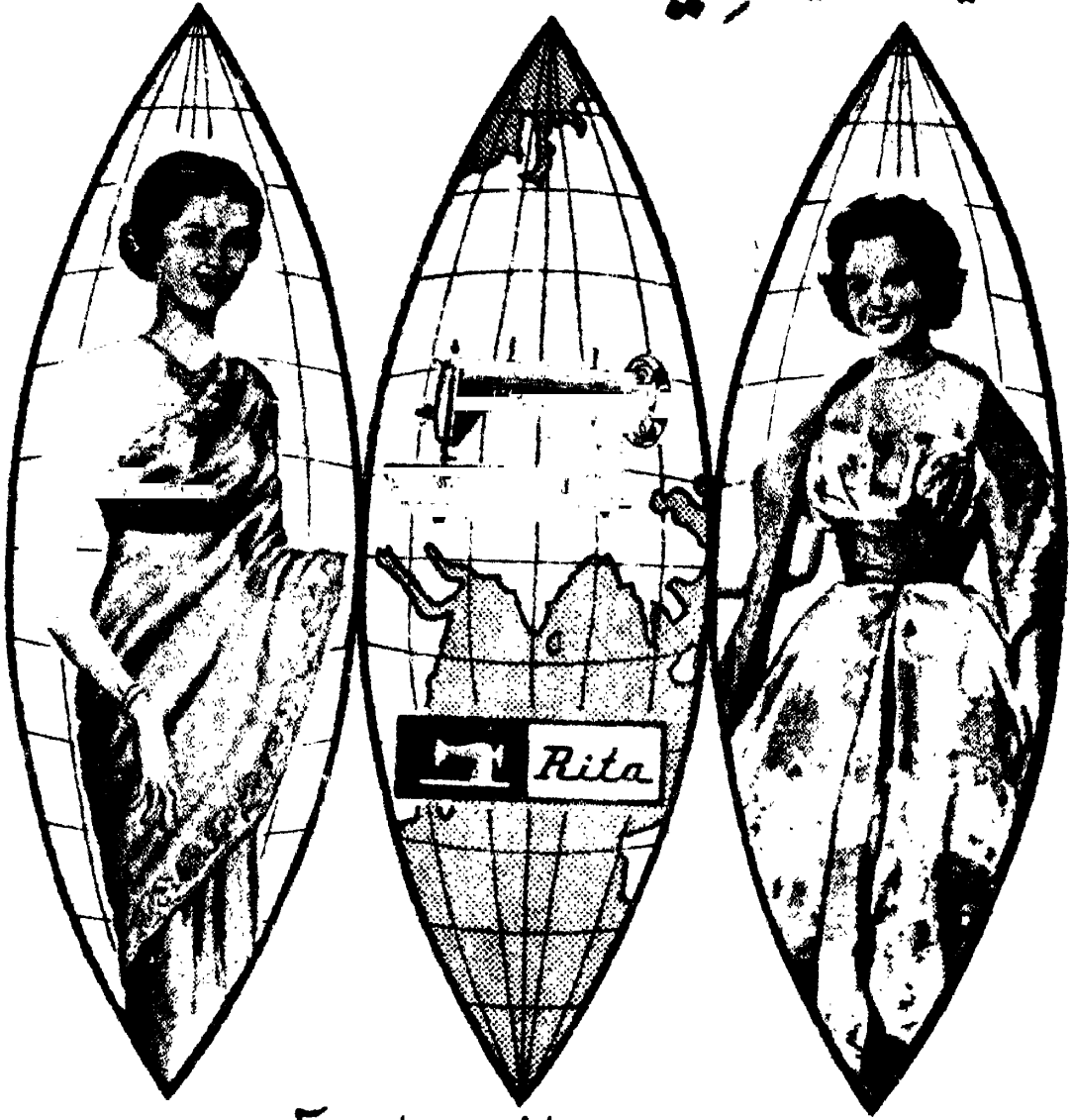
تو وہ بھی خط نکلا ــ اُس کا جی چاہا اسے پڑھ لے لیکن جیسے ڈبے ہی میں سے کوئی بول اُٹھا۔

"ارے عاشقو! کیا کر رہا ہے تو۔ ارے بدبخت! کیوں موت آئی ہے تیری بیٹا جی! اگلا پچھلا اُگلنا پڑے گا اور بڑے گھر کی سیر مفت میں۔ چھوڑ کس دھندے میں پڑ گیا ہے۔ چھوڑ۔ ارے لیکن نہیں۔ کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے وہ یہ خط ضرور پڑھے گا۔

خط دو ہی دن پہلے لکھا گیا تھا لیکن تار آجانے پر پوسٹ نہیں کیا گیا۔ عاشق کو یہی پتہ چلا کہ یہ اپنے شوہر سے ایک برس بعد ملنے جا رہی ہے۔ جب کہ وہ شادی کے ایک ہی ماہ بعد اس سے بچھڑ گیا تھا۔ اور اب وہ کراچی ہی میں گھر بسائیں گے۔ خط پڑھ لینے کے باوجود بار بار اُس کی نظریں اُن دو چار سطروں پر گئیں، جانے وہ کتنی بار انھیں پڑھ گیا۔ "ہم اب اپنا گھر بسائیں گے۔ اپنا گھر اپنی دُنیا ہوگی۔ اور ایک چاندنی ہوگی جس کا نور ہمیشہ ہم پر چھایا رہے گا۔ میں اپنے ساتھ وہ پھول بھی لا رہی ہوں، جو ایک بار تمہی نے توڑے تھے اور مجھ سے پُوچھا تھا۔ "بتاؤ تو میرا مطلب کیا ہے؟ انھیں میں نے آجتک رکھ چھوڑا ہے۔ بڑی حفاظت سے سنبھال کے! تمھارے لئے تحفہ بھی لا رہی ہوں۔ بوجھو تو کیا ہے بھلا؟"

ایک دم گاڑی کی رفتار آہستہ ہونے لگی۔ اُس نے سیٹ پر بیٹھے بیٹھے ڈر کر پہلے خاتون اور پھر دروازے کی طرف دیکھا۔ اور پھر باہر کی طرف کان لگا کر سُننے لگا۔ ابھی دو گھنٹے کہاں گزرے ہیں جو گاڑی رُکنے لگی ہے۔ لیکن گاڑی رُکی نہیں۔ کوئی اسٹیشن اُسے پاس تھر دکرنا تھا۔ لائنیں بدلنے سے جھٹکے سے لگے اور رفتار پھر تیز ہونے لگی۔ اطمینان کا سانس لے کے اُس نے سب خط بند کئے اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُسے یاد آیا ان بیتے برسوں میں ایک بار، صرف ایک بار اُس نے سوچا تھا۔ اگر یہ سب کچھ نہ ہو گیا ہوتا تو آج وہ بابو بن چکا ہوتا۔ اُس نے شادی کر لی ہوتی اور اُس کے بچے اور اُس کا گھر۔ اپنا گھر اور اُس کی بیوی۔ تو اُس نے فوراً ہی زمین پر تھوک دیا تھا۔ ماں نے باپ کو کیا دیا ہے جو میں بیوی کی سوچنے لگا ہوں؟ اب خراب ہو گیا ہے میرا دماغ بھی۔ لیکن اب جبکہ اٹیچی اُس کے ہاتھ میں تھی۔ خط اٹیچی کے اندر تھے۔ تو کوئی جیسے اُس سے سرگوشیاں کرنے لگا۔ تیرا گھر۔ تیرا گھر بھی ہوتا عاشقے! اور یہ اپنے خاوند کے پاس جا رہی ہے۔ اور اس کا گھر، اپنا گھر۔ اور وہ ہونٹ کاٹ کے بڑبڑا دیا۔ "ہٹاؤ جی۔ کیا بکواس ہے۔ جانے اُس بے چارے کو اس کے ہاتھوں کیسے کیسے دن دیکھنا پڑیں گے۔"

اٹیچی اُس نے سرہانے رکھ دی۔ کچھ نوٹ اور زیور اُس کی جیب میں تھے۔ ہنگر پر سے اُس نے پرس اُٹھا لیا۔ کھول کے پھر دیکھا۔ جیب سے چابیاں نکالیں۔ انھیں پرس میں رکھا۔ پرس بند کیا اور آہستگی سے خاتون کے پہلو میں رکھ دیا۔ اب صرف ہار لینا باقی رہ گیا تھا۔ پھر وہ دروازہ کھول کر پائیدان پر کھڑا ہو جائے گا۔ اور جونہی پلیٹ فارم آئے گا تو وہ چپکے سے دُوسری طرف اُتر جائے گا۔

اور وہ چاقو کو ایک بار پھر چھو کے جھک گیا۔ اتنا کہ عورت کی سانس اُسے اپنی آنکھوں اور آدھ کھلی پیشانی پر محسوس ہونے لگی لیکن ہار نکالے کس طرح۔ یوں تو بے حد مشکل ہے۔ اگر سینے سے جدا ہو بھی جائے تو سر سے کس طرح نکالے گا وہ۔ پھر ایک دم اُس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ کیوں نہ وہ چاقو نکال کے دونوں طرف سے پتلی رسّی کاٹ لے۔ سیدھا ہو کے اُس نے فوراً چاقو نکالا، کھولا اور تیز چمکتے پھل کو دیکھ کے اُسے بہت خوشی ہوئی۔ وہ پھر جُھکا اور جُوں ہی اُس کے ہاتھ عورت کے کندھے اور گردن کے درمیانی حصّے سے مَس ہوئے خاتون نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔ اور یک لخت اُس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ بڑی بڑی آنکھوں میں خوف، سراسیمگی اور ہراس سے بھری نگاہیں تڑپنے لگیں۔ اُس کے حلق سے ایک خوفناک چیخ نکلی اور پھر جب وہ اُٹھنے لگی تو عاشق نے جلدی سے آگے بڑھ کے اُس کے ہاتھ اور گردن کو دبا لیا۔ اور دُوسرا ہاتھ جس میں چمکتا ہوا چاقو تھا ہوا میں اُٹھ گیا۔ اُوپر، اور اوپر۔ عاشق کے اپنے اندر جیسے کوئی بول اُٹھا۔ جلدی کر عاشقے! جلدی کر عاشقے! ختم کر اس کھیل کو۔ ہار لے اور بھاگ۔ لیکن عاشق تھا کہ اُس کا اُٹھا ہوا ہاتھ نیچے آ ہی نہیں رہا تھا۔ جانے اُس نے خاتون کی

سا میں اور کیا کچھ دیکھ لیا تھا۔

اُسے صاف سُنائی دے رہا تھا کہ جیسے گاڑی کے پہیے چیخ رہے ہوں۔ ڈبے میں اور کبھی کبھی مسافر ایک ساتھ بول اُٹھے ہوں۔

"تیرا گھر۔ او پاگل تیرا اپنا گھر۔ یہی منذکر۔ دیکھ تو وہ کس ہمت سے بہے۔ اس نے کیسے کیسے خواب دیکھے ہوں گے۔ کوئی اُسے بیٹھ آئے گا ——

تحفہ ——!

زرماں ——!

پھول ——!

سوکھے ہوئے دو پھول —— تیرا گھر —— !!"

اور اندر والا پھر چیخا۔

"جلدی کر عاشقے! پہلے تو تُو نے کبھی اتنی دیر نہ لگائی تھی۔ کر دے ہاتھ ختم اس کی بات۔"

"نہیں عاشقے نہیں۔ اسے گھر بسانے دے۔ اِسے اپنے خوابوں بیر دیکھنے دے۔ اِسے چاندنی میں ڈوب جانے دے۔"

"جلدی کر نا عاشقے! آخر تُو وار کرتا کیوں نہیں؟"

"دو پھول —— اپنا گھر —— تیرا گھر ——"

سردیوں کی اُس رات میں بھی عاشق کی پگڑی سے پسینہ بہہ نکلا۔ اُس کی پیشانی کو بھگو گیا۔ ہاتھ اُسی طرح فضا میں اُبھرا رہا۔ اور نگاہیں دن کے چہرے پر یوں جم گئیں جیسے پتھرا گئی ہوں۔ گاڑی کی بریکیں چیخ ہیں۔

پھر اُٹھا ہوا ہاتھ ہولے ہولے نیچے اُس کے پہلو میں آ لگا گردن رکھے ہوئے ہاتھ کی سختی آہستہ آہستہ کم ہونے لگی۔ پھر وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔

چاقو پھینک کے اُس نے جلدی سے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ زیور نوٹ نکالے۔ اُنھیں پھٹی ہوئی اٹیچی میں ڈالا۔

اور —— گاڑی ایک دم رُک گئی ——"

اُس نے خوف سے کانپتی ہوئی خاتون کو دیکھا —— اپنے دونوں ہاتھ اُٹھائے۔ اُنھیں جوڑا۔ اور بولا۔

"معاف کر دینا جی —— !!"

پھر اُس نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ دروازہ کھولا اور باہر کود کر دور تک پھیلے ہوئے مہیب اندھیرے میں گم ہو گیا۔

بیسویں صدی کو ہم نے کبھی اشتہاروں کا پلندہ نہیں بنایا۔ اس میں ۲۲۰۰ اور بوگس قسم کے وہ اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے جن کا مقصد پڑھنے والوں کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالنا ہو۔

سلام مچھلی شہری

ساقی! ہو اگر چشمِ کرم اور پئیں گے
ہاں اور، ذرا اور، کہ ہم اور پئیں گے

اِن زُلفوں کی سوگند ابھی نشہ نہیں ہے
اِن مست نگاہوں کی قسم اور پئیں گے

یہ عہد ہے اے ساقیِ مخمور! کہ جب تک
سُلجھیں نہ تری زُلف کے خم اور پئیں گے

کہتے ہیں کہ یہ دَورِ محبت کا نہیں ہے
رکھنا ہے غمِ دِل کا بھرم اور پئیں گے

آئے تھے تری بزم میں جب غم کو بھلانے
کچھ اور زیادہ ہے وہ غم، اور پئیں گے

اِک شمعِ خرد ہے کہ فروزاں تھی، رہے گی
ہر چند بہکتے ہیں قدم اور پئیں گے

ہم زہر کے امرت سے کھلاتے ہیں شگوفے
پھولوں کی قسم ساغرِ سم اور پئیں گے

اربابِ زر و سیم کو ہر جام دکھا کر
خودداریِ رندی کی قسم، اور پئیں گے

جب تک سرِ افلاک خدا بن کے نہ اُبھریں
انساں کے تخیل کے صنم، اور پئیں گے

دُنیا! تری عظمت کی قسم زہر ہے صہبا
دُنیا! تری نفرت کی قسم، اور پئیں گے

ہر جام میں جب تک نہ ترا نُور ہو رقصاں
اے جلوہ گہہ دیر و حرم اور پئیں گے

اِن زُلفوں کی سوگند ابھی نشہ نہیں ہے
اِن مست نگاہوں کی قسم اور پئیں گے

مزدُور کے پیالوں کی تب و تاب سے جب تک
لرزندہ نہ ہو ساغرِ جم اور پئیں گے

احساس پہ گھنگھور گھٹا چھا تو چکی ہے
جب تک کہ یہ پلکیں ہوں نم اور پئیں گے

بجھتی ہوئی اِس شمع کی سوگند سلامؔ آج
جب تک کہ اِن آنکھوں میں دم اور پئیں گے

افسانہ

میر کی غزل

شعیب شمس ایم۔ اے

بھوانی پور۔ نراعت۔ موتیہاری (بہار)

۷ر مئی ۱۹۷۳ء مکرمی! احترام و عقیدت

.... لیجئے، اس بار "میر کی غزل" لے کر حاضر ہو رہا ہوں۔ کرشنا جیسی مظلوم لڑکیاں اور ورما جیسے کم ہمت نوجوان اب بھی ہمارے ملک میں بہت موجود ہیں۔ کیا اس سماج کی اصلاح کبھی ہو سکے گی؟ مجھے تو حالات اُمید افزا نہیں معلوم ہوتے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ .... آپ کا اپنا ــــــ شعیب شمس

جب میں نے اُسے پہلی بار دیکھا تو مجھے اُس کی آنکھوں کے چراغ دیکھ کر، بجھے ہوئے بے نور چراغ دیکھ کر جھیل کی وہ سطح یاد آ گئی تھی۔ جو کسی مفلس کے چہرہ کی طرح سنجیدہ اور سپاٹ نظر آتی ہے یا صنوبر کا وہ درخت جو کسی بوڑھے فلسفی کی طرح اُونگھ رہا ہو۔ پھر بھی میں اُس میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ نہ جانے کیوں۔ شاید اُس کی خاموشی مجھے بہت پسند آئی تھی۔ درحقیقت اُس کی خاموشی میں ایک خاص انداز تھا جسے دیکھ کر کوئی بھی حساس انسان اُس کی طرف کھنچنے لگتا تھا۔

پروفیسروں کے لئے اُس کی شخصیت ایک معمہ ہی نہیں تھی بلکہ اُس نے اُن کے لئے گفتگو کا ایک اچھا خاصا موضوع مہیا کر دیا تھا۔ اگر وہ صرف خاموش رہتی تو کوئی بات نہ تھی۔ اِس لئے کہ کالج کی اور بھی بہت سی لڑکیاں خاموشی پسند تھیں۔ گم سم رہنا کوئی آرٹ نہیں۔ نن نہیں! اور نہ یہ کوئی حسین انداز ہی ہے۔ جس سے نوجوان اُس کے لئے اپنے دلوں میں ہمدردی کا جذبہ رکھیں۔ وہ عدد رجہ حسین بھی تھی۔ یونانی شاعری کا ایک جیتا جاگتا نمونہ! سیفو کے قلم سے نکلی ہوئی بیساختہ سی ایک نظم۔ اُس کے مقناطیسی لبوں پہ غزلوں کی بے ساختگی تھی۔ اور

یہی وجہ تھی کہ پروفیسر سے لے کر طلبا تک اُس کے متعلق گفتگو کرنا فخر سمجھتے تھے۔ جیسے وہ کرشنا نہ ہو کشمیر کا مسئلہ ہو۔ عراق کی انقلابی انسان ہو جس پر اپنی رائے کا اظہار کرنا ہر ہوشمند اپنا حق سمجھتا ہو۔

مجھے اُس کالج میں جوائن کئے ہوئے محض تین دن ہوئے تھے لیکن کوئی بھی دن ایسا نہیں گزرا جب اسٹاف روم میں نوجوان پروفیسروں نے گفتگو کے دوران کرشنا کا تذکرہ نہ کیا ہو۔

آخر ایک دن پروفیسر ورما نے مجھ سے پوچھا۔

"آپ کی کیا رائے ہے شعیب صاحب؟"

"کس سلسلے میں؟"

میں نے انجان بن کر دریافت کیا۔

"کرشنا کے متعلق؟" اُن کی آنکھوں میں تجسس کی سینکڑوں لکیریں اُبھر آئی تھیں۔

"میں کیا رائے دے سکتا ہوں مجھے تو کچھ واقفیت بھی نہیں ہے۔"

"ادب کا طالب علم ہونے کی حیثیت سے آپ کی رائے مقدم سمجھی جائے گی۔"

"وہ کیوں ؟"

"ادب کا طالبِ علم عموماً حساس ہوتا ہے۔ لیکن ایک لڑکی کے متعلق ایک نوجوان اور حساس انسان صحیح رائے نہیں دے سکتا۔ اُس کے اظہار میں جذباتیت آجائے گی۔ اِس کے لئے آپ کسی ماہرِ نفسیات سے رجوع ہوں تو بہتر ہے۔"

اور میں اُٹھ کر لائبریری کی طرف چلا گیا۔

ریڈنگ رُوم میں کچھ لڑکے اپنی ٹائی کی گرہیں درست کرنے لگے۔ بعضے خود کو پڑھنے کے معاملے میں سیریس ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن کن انکھیوں سے وہ صدر دروازے کی طرف بھی دیکھ لیتے میں نے گھوم کر دیکھا۔ کرشنا داخل ہو رہی تھی۔ سفید ساری، ہلکے پیازی رنگ کا بلاؤز اور اُسی رنگ کا ربن۔ عام فیشن ایبل لڑکیوں کی طرح اُس کی چوٹی نہ تو پونی ٹیل کا نمونہ تھی۔ اور نہ ملکہ الزبتھ کے جُوڑے کی نقل ہی۔ اُس نے دو چوٹیاں بھی نہ کی تھیں۔ بالوں کو سنوار کر اُس نے شانوں پر بکھرا لیا تھا۔ اِس سادگی میں جو حُسن تھا وہ اُس کی سہیلی نرملا کے بھڑکیلے لباس میں بھی نہ تھا۔ جو اُس کے ساتھ ہی چلی آرہی تھی کرشنا کے آتے ہی ریڈنگ رُوم کی فضا بدل سی گئی۔ ہنگامے ختم ہوگئے میں مُسکراتا ہوا لائبریرین کے دفتر کی طرف بڑھ گیا۔ کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے کلرک نے بھی اپنے کپڑوں کی گرد جھاڑ کر اپنی خوش سلیقگی کا ثبوت دیا۔ لیکن کرشنا جس خاموشی سے آئی تھی اُسی خاموشی سے کتاب لے کر چلی گئی۔ لڑکوں کی سرگوشیاں تیز ہوتی گئیں۔ میں نے محسوس کیا اگر اِس ماحول کی آواز ریکارڈ کی جاتی تو اُس سے بس صرف ایک ہی آواز آتی۔

"کرشنا بے حد حسین ہے!"

"کرشنا دشمنِ ہوش و آگہی ہے۔"

"کرشنا کی زُلفوں میں ایران کی حسین شام کا عکس ہے!"

اور اِس طرح کرشنا کے حُسن کی مدح سرائی میں ایک حسین نظم تیار ہو چکی تھی۔ طلبا نے اُس کا ایک ایسا سراپا کھینچ کر رکھ دیا تھا۔ جس میں اگر رنگ آمیزی کر دی جاتی تو وہ خاکہ چغتائی کے تجریدی آرٹ اور جگر کی نظم سراپا سے بھی زیادہ حسین ہو جاتا۔

گھنٹہ بج چکا تھا۔

میں کلاس میں داخل ہوا۔ بورڈ پر نظر پڑتے ہی میں ٹھٹھک گیا۔ لکھا تھا۔

"خاموشی! تیرا نام حُسن ہے۔ تُو قلوپطرہ کے دیس کی حسین ترین شاہزادی ہے۔ تیری آنکھوں کے بُجھے ہوئے دیوں میں زندگی کی لاکھوں کہانیاں پوشیدہ ہیں۔ تیری چال میں بادہ خواروں جیسی لغزشِ مستانہ نہیں، پھر بھی تُو حُسن کی دیوی ہے۔ زندہ باد! اے حسین شاہزادی زندہ باد!!"

میں تھوڑی دیر اُسے دیکھتا رہا۔

طلبا باہم سرگوشیاں کرنے لگے۔

میں نے رجسٹر رکھ دیا اور اِس عبارت کے اُوپر عنوان کی جگہ پر لکھ دیا۔

"میر کی غزل!"

اُس دن سے کرشنا سارے کالج کے لئے کرشنا نہیں میر کی غزل ہو چکی تھی۔

ایک دن کانٹین میں کافی سے شغل کرتے ہوئے پروفیسر ورما نے کہا۔

"وہ لڑکی خواہ مخواہ پوز کرتی ہے!"

"کون؟"

"کرشنا!"

میں مُسکرا اُٹھا

"آپ اِس کالج میں کتنے دنوں سے لیکچرار ہیں ورما صاحب؟"

"چار سال ہو گئے۔"

"اور کرشنا اِس کالج میں کتنے دنوں سے ہے؟"

"اُس کا بھی یہ چوتھا سال ہے۔"

پروفیسر ورما بہت متفکر نظر آرہے تھے۔

"تعجب ہے۔ چار سال کے عرصہ میں آپ ایک لڑکی کا بھی مطالعہ نہیں کر پائے۔ جب کہ کسی انسان کو سمجھنے کے لئے صرف چند لمحے کافی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ آپ کو اُس کی قربت نہ نصیب ہوئی ہو۔ اور آپ کو اُس کا مطالعہ کرنے کا موقع نہ نصیب ہوا ہو۔ لیکن صرف اُس کے ظاہری رکھ رکھاؤ کی بنا پر آپ اُس کے متعلق کوئی نظریہ نہیں قائم کر سکتے اِس کے لئے ضرورت اِس بات کی ہے کہ آپ اُس کی نظروں میں جھانک کر اُس کے دل کا درد جاننے کی کوشش کریں۔"

"لیکن یہ بات آپ کس بنا پر کہتے ہیں کہ وہ مجھ کو پسند نہیں کرتی؟"

پروفیسر ورما کے لہجے میں جھنجلاہٹ کے آثار تھے۔

"مسٹر ورما! اگر کوئی خود کو پوز کرے گا۔ تو ایک دن، دو دن نہ کر بہ سوں۔ ظاہر ہے کہ اُس کی زندگی سے کچھ اذیت ناک منظر نہ یہ ایسے ضرور چپٹے ہوئے ہیں جنھوں نے اُس کی زندگی کو ایک المیہ گیت بنا دیا ہے۔ اور پھر آپ ٹھہرے معاشیات کے طالب علم۔ آپ بھلا زندگی کے ان نازک لمحات کو کیا خاک سمجھیں گے؟"

"لیکن میرے بھائی! وہ قربت کا موقع کسی کو دے تب تو اُس کا مطالعہ کوئی شخص کرے۔" ورما کے دل کی بات زبان پر آہی گئی۔

"ایسے آپ کا اعتراف شکست سمجھ لیا جائے نا؟" میں نے مسکراتے ہوئے کافی کی پیالی خالی کر دی اور کینٹین سے اُٹھ کر چلا گیا۔

پروفیسر ورما میں اب بہت زیادہ تبدیلیاں آ گئیں۔ نئے نئے اور نفیس قسم کے سُوٹ اب اُن کے جسم پر نظر آنے لگے تھے۔ پروفیسر ورما ویسے بھی کالج میں خوش پوش مشہور تھے۔ اور اُن کی یہ تبدیلی لوگوں کے لئے باعث حیرت نہ تھی۔ اِس کی وجہ صرف میں جانتا تھا پروفیسر ورما جنھوں نے اب نئی قسم کی خوشبو کا استعمال بھی شروع کر دیا تھا۔

طلبار کو اب پروفیسر ورما سے شکایت ہو چلی تھی۔ وہ پروفیسر جو کبھی طلبار میں اِس لئے ہر دلعزیز تھا کہ اپنے مضمون پر بہت زیادہ محنت کرتا تھا۔ طلبار کو محنت سے پڑھاتا تھا۔ بچی لگن سے سبق دیتا تھا۔ اب یہ شکایت سُننے میں آنے لگی کہ پروفیسر ورما کلاس میں صرف اپنے سُوٹ کی شکنیں درست کرنے اور اپنی ٹائی کی گرہ ٹھیک کرنے ہی میں وقت گزار دیتے ہیں۔ بعض لڑکوں نے تو مجھ سے یہاں تک کہہ دیا "سر! پروفیسر ورما اب زیادہ تر فورتھ ائیر ہی کا کلاس لیتے ہیں۔ دوسرے کلاسوں کا کچھ خیال نہیں کرتے۔ کبھی آتے ہیں اور کبھی نہیں آتے۔"

اور ان شکایتوں کے جواب میں میں صرف مُسکرا کر رہ جاتا۔ اب میں انھیں یہ کیسے بتا دیتا کہ اِس کی خاص وجہ یہ ہے کہ فورتھ ائیر میں کرشنا ہے۔ جسے ورما نے اپنے من مندر کی دیوی بنا رکھا ہے۔ اور کچھ یہ بھی خوف تھا کہ یہ کہہ دینے سے طلبار میں بے چینی کی ایک لہر دوڑ جاتی کیونکہ کرشنا صرف ورما ہی کی نہیں، سارے کالج کی ہیروئن تھی۔

اور پھر ——

کچھ دنوں کے بعد میں نے سُنا۔ پروفیسر ورما نے کرشنا کے والدین کے پاس شادی کا پیغام بھیجا ہے۔

پروفیسر ورما کی اِس تبدیلی کا راز اب سب کو معلوم ہو چکا تھا یہ خبر ملتے ہی پروفیسر ورما کو مبارک باد دینے اُس کے گھر گیا۔ لیکن اُس کا اُداس چہرہ دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔

"کیوں مسٹر ورما! آپ کی تو دلی مُراد بر آئی۔ اب آپ اتنے گُم سُم کیوں ہیں؟"

"شادی نہیں ہو سکتی مسٹر شعیب!"

ورما نے رُک رُک کر میری باتوں کا جواب دیا۔

"کیوں؟"

"کرشنا ودھوا ہے۔ بال ودھوا۔ اب وہ پھر شادی نہیں کرنا چاہتی اور میرے والدین بھی لکیر کے فقیر ہیں۔"

جواب طلب امور کے لئے ہمیشہ اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ یا پوسٹ کارڈ بھیجئے۔ ورنہ ہم جواب دینے سے قاصر رہیں گے۔ پاکستانی ٹکٹ ہندوستان میں کارآمد نہیں اِسلئے پاکستانی بھائی اور بہنیں اِس شرط سے مستثنیٰ ہیں۔ (منیجر بیسویں صدی دہلی)

امر چند قیس جالندھری

یہ وقتِ شام، یہ بادِ بہار کیا کہنا
یہ رُت، یہ سیر، لبِ جُو ئبار کیا کہنا

ہر ایک سمت جمال آشکار کیا کہنا
کمالِ صنعتِ پروردگار کیا کہنا

اِرم طرازیِ جوشِ بہار کیا کہنا
ہر ایک دشت و دمن لالہ زار کیا کہنا

نظر فروز چمن کا نکھار، کیا کہنا
فسوں طرازِ گُل و برگ و بار، کیا کہنا

یہ دھوپ چھاؤں کی فرحت اثر ہم آغوشی
یہ رنگِ قوسِ قزح کی بہار، کیا کہنا

یہ حُسن ریز مناظر یہ عطر بیز نسیم
ہر اک شجر، چمنِ پُر بہار، کیا کہنا

یہ آب و گِل کے کرشمے، یہ رنگ و بُو کا طلسم
نظر فریبیِ حُسنِ بہار، کیا کہنا

ادائے گُلّینِ رنگیں قبا، خدا کی پناہ
چہار سمت یہ نقش و نگار، کیا کہنا

شفق کا منظرِ مدہوش کُن تعالی اللہ
جمالِ غنچۂ گُل عذار، کیا کہنا

بہار اور بہارِ جمال، شانِ خدا
جمال اور جمالِ بہار، کیا کہنا

بُتانِ زہرہ جبیں اس طرح ہیں محوِ خرام
کہ مہر و ماہ کہیں بار بار، کیا کہنا

جبیں پہ نُور، نگاہوں میں کیف، رُخ پہ ضیا
خرامِ ناز میں ہر گُل عذار، کیا کہنا

خرامِ ناز کسی کا ہے رشکِ موجِ شراب
فضائے مست کُن و کیف بار، کیا کہنا

دل اپنا وقفِ غم و انتشار ہے اے قیس
مگر یہ کیفِ غمِ انتشار، کیا کہنا

افسانہ

سفارش

وفاؔ گنگوائی پٹھانوی

چیف انجینئرس آفس۔ این۔ ای۔ ریلوے۔ گورکھپور

۱۷ مارچ ۱۹۶۳ء — محترمی خوشتر صاحب! آداب

....افسانہ کیسا ہے، یہ تو آپ اور قارئین ہی بہتر جان سکیں گے۔ سرکاری اور غیر سرکاری حلقہ میں سفارش چلتی ہے۔ "بیسویں صدی" کی بزم میں بار پانے کے لئے میرے پاس کوئی سفارش نہیں ہے۔ پھر بھی اِس یقین کے ساتھ افسانہ بھیج رہا ہوں کہ "بیسویں صدی" اور آپ اِس پستی سے بہت بلند ہیں.....

عقیدت مند ——— وفاؔ

جب اُس کی آنکھ کھُلی تو دھوپ خوب نکل آئی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ آج اُسے ایک انٹرویو میں جانا تھا۔ وہ بی۔ کام کرنے کے بعد برابر اخبار کے "ضرورت ہے" کے کالم کو بہت غور سے پڑھتا۔ اور جب کوئی سروس اُس کی پسند کی نظر آتی تو اُس کی آنکھیں چمک اُٹھتیں۔ وہ خوشی سے جھوم اُٹھتا۔ درخواست وقت سے پہلے ٹائپ کراتا اور پھر اُسے سپردِ ڈاک کر کے اطمینان کی سانس لیتا۔ کال لیٹر کے لئے اُسی دن سے اُنگلیوں پر دن گننے لگتا۔ ہر بار وہ یہی سوچ کر درخواست دیتا کہ وہ ضرور منتخب کر لیا جائے گا۔ لیکن واہ رے قسمت! ہر بار اُسے مایوسی اور نا اُمیدی کا مُنھ دیکھنا پڑے گا۔ یہ اُسے معلوم نہ تھا۔ کبھی اُسے کال لیٹر تک نہ آیا۔ ہر بار وہ افسوس کر کے رہ جاتا۔ سوچتا، درخواست دیر میں پہنچی ہو یا پھر کوئی کمی رہ گئی ہو۔ ورنہ کال لیٹر ضرور آنا چاہیے وہ منتخب نہ کیا جاتا۔ اِس طرح وہ اپنے دل کو سمجھا لیتا۔

وہ ایک دن "ضرورت ہے" کے کالم کو بہ غور دیکھ رہا تھا۔ جبھی اُس کی نظریں اچانک چمک اُٹھیں۔ وہ خوشی سے پاگل ہو گیا۔ وہ چلا اٹھا ضرور درخواست بھیجوں گا۔ بی۔ کام تو اُس نے فرسٹ ڈویژن سے کیا ہی ہے۔ اکاؤنٹنسی میں بھی اُس نے ٹاپ کیا تھا۔ پبلیسٹی آفیسر کے لئے اُس نے فرم کا اشتہار دیکھتے ہی لکھنؤ کو درخواست بھیج دی۔ آج اُسی پبلیسٹی آفیسر کی پوسٹ کا انٹرویو تھا۔ اُس نے جلدی جلدی شیو کیا۔ نہایا، دھویا۔ نیا سوٹ نکالا جو اُس کے ڈیڈی نے اُس کی سالگرہ کے موقع پر سلوایا تھا۔ سوٹ دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ اُسے اپنے ڈیڈی کی بے اختیار یاد آگئی۔ اُس کے ڈیڈی اُسے کتنا پیار کرتے تھے۔ آج وہ زندہ ہوتے تو اُسے اپنی نوکری کی اتنی فکر نہ ہوتی۔ وہ بی۔ کام کرنے کے بعد ہی نوکری تلاش نہ کرنے لگتا۔ کم از کم وہ ایم۔ کام کرتا پھر ہائی ایجوکیشن کے لئے فارن جاتا۔ لیکن اُس کے ڈیڈی اچانک ہارٹ فیل ہو جانے سے چل بسے تھے۔ اب وہ اِتنی بڑی دُنیا میں ایک بیوہ بہن اور بوڑھی ماں کا اکیلا سہارا تھا۔ ساری فکریں اُس کے کندھوں پر آ چکی تھیں۔ اچانک گھڑی پر اُس کی نظر پڑی۔ ساڑھے نو بج چکے تھے۔ گیارہ بجے انٹرویو کے لئے پہنچنا تھا۔ وہ جلدی جلدی تیاری کرنے لگا اور ٹھیک دس بجے گھر سے چل پڑا۔

جب وہ انٹرویو ہال میں پہنچا۔ انٹرویو ہال امیدواروں سے بالکل بھر چکا تھا۔ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کیا یہ سارے آدمی اسی پوسٹ کے لئے آئے ہیں۔ اُس نے دل ہی دل میں سوچا۔ اُس کی سانسیں تیز ہو گئیں۔ اُمید کی کرن اُسے دُور جاتی ہوئی محسوس ہوئی۔ نا اُمیدی اور مایوسی کا سایہ نزدیک آتا ہوا محسوس ہوا۔ جب اُس سے نہ رہا گیا تو اُس نے ایک نوجوان کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

"جناب کیا آپ بھی انٹرویو ہی کے لئے تشریف لائے ہیں؟"

"جی ہاں! اور آپ؟"

"میں بھی اِسی غرض سے آیا ہوں۔ اور ۔ ۔ ۔"

بات ادھوری رہ گئی۔ کیونکہ چپراسی باہر آیا تھا۔

"آپ سبھی حضرات کرسیوں پر بیٹھ جائیے۔ صاحب آگئے ہیں۔ انٹرویو ابھی شروع ہو جائے گا۔"

یہ کہہ کر پھر اندر چلا گیا۔

اور چند منٹ کے بعد نکل کر اُس نے آواز لگائی۔

"جناب مُرلی دھر ورما صاحب!"

ایک لمبا تڑنگا گورا چٹا نوجوان ہاتھ میں چند کاغذات لئے کھڑا ہوا سب کی نظریں اُس کی طرف اُٹھ گئیں۔ چپراسی نے دروازے پر لہراتا ہوا ریشمی پردہ اُٹھا دیا، وہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ باہر ایک دم سنّاٹا چھا گیا۔ سبھی کے چہروں پر ہوائیاں سی اُڑ رہی تھیں۔ کبھی چہرے ہشّاش بشّاش نظر آتے اور کبھی ایک دم پژمردہ اور اُداس! عجیب سماں تھا۔ سبھی نوجوان اُمید اور نا اُمیدی کی کشتی میں سوار ہو کر ڈوب اور تَر رہے تھے۔

پانچ منٹ مشکل سے گزرے ہوں گے کہ مسٹر ورما پیشانی پر پھیلا ہوا پسینہ رُومال سے پونچھتے ہوئے باہر نکلے۔ اُن کے باہر نکلتے ہی سبھی لوگوں نے انھیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اور سوالوں کی بوچھار ہونے لگی۔

"ورما صاحب! کیا کیا پُوچھا گیا؟" ایک سوال

"کتنے آدمی ہیں کمیٹی میں؟" دُوسرے نے پُوچھا۔

"کبھی جنرل نالج میں کیا پُوچھا تھا؟" تیسرا بولا۔

"بزنس میتھیڈ کے بارے میں تو ضرور پُوچھا ہوگا؟" چوتھے نے ٹکڑا لگایا۔

ورما صاحب بےچارے سوالات سُنتے سُنتے ہی بوکھلا اُٹھے۔ وہ جواب کیا دے پاتے۔

جبھی چپراسی نے پھر آواز لگائی۔

"سید منظر الحق صاحب!"

ہال میں پھر ایک بار خاموشی چھا گئی۔

پردہ اُٹھا، منظر صاحب انٹرویو کمیٹی کے سامنے پہنچ گئے۔ لیکن تین ہی منٹ بعد وہ سر جھکائے لَوٹ آئے۔ انٹرویو جاری رہا۔ امیدوار انٹرویو کمیٹی کے سامنے آتے اور جاتے رہے۔ وہ ہال کے آخری حصّے میں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھا خیالی تانے بانے بُنتا رہا۔ آشا، نراشا کے ہنڈولے میں ہچکولے کھاتا رہا۔ اُس نے سوچا اگر وہ منتخب کر لیا گیا تو آٹھ سو روپے ماہوار ملے گی۔ بنگلہ کمپنی دے گی۔ چھ ماہ کے بعد ایک کار تو ضرور ہی خرید لوں گا۔ پھر تو حضرت گنج۔ امین آباد۔ قیصر باغ کا رہی پر گھوموں گا۔ کونسی کار اچھی رہے گی؟ وہ سوچنے لگا۔ پھر من ہی من میں بڑبڑایا۔ ابھی اتنی جلدی کیا ہے۔ جب خریدنی ہوگی دیکھا جائے گا۔ اُس نے محسوس کیا کہ اُس کا سلیکشن ہو گیا ہے۔ اُس نے امبیسڈر کار خرید لی ہے۔ وہ اُسی کار سے حضرت گنج جا رہا تھا کہ سامنے سے ایک نیلے رنگ کی کار آکر اُس کی کار سے ٹکرا گئی۔ اُس کی کار کا اگلا حصّہ خراب ہو گیا۔ وہ جُھنجھلا اُٹھا وہ غصّہ سے نیچے اُترنے ہی والا تھا کہ اُسی وقت چپراسی نے باہر آکر آواز لگائی۔

"جناب صغیر احمد قدوائی!"

وہ اپنا نام سُن کر چونک سا گیا۔ اُس کے خیالوں کا تانا بانا ٹوٹ گیا حواس درست کرتے ہوئے وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ دو منٹ بعد وہ انٹرویو کمیٹی کے سامنے کھڑا تھا۔

"آپ کا اسم شریف؟" پہلے نے پوچھا۔

"جناب مجھے صغیر احمد قدوائی کہتے ہیں۔"
"آپ کی تعلیم ؟"
دوسرے نے سوال کیا۔
"جناب میں نے بی کام فرسٹ ڈویژن سے کیا ہے اور ۔ ۔ ۔ ۔"
"بہت خوب ! کوئی سفارشی لیٹر بھی ہے ؟" تیسرے نے فوراً پوچھا۔
"جی ۔۔۔ جی نہیں !"
"تو پھر آپ جا سکتے ہیں۔ میں مجبور ہوں۔"

یہ آخری جملہ اُس کے کانوں میں سیسے کی طرح پگھلتا ہوا محسوس ہوا وہ کمرے سے باہر نکل آیا۔ اُس کی ساری اُمیدوں پر پانی پھر گیا تھا۔ اُس کی ساری آرزوئیں خاکستر ہو گئی تھیں۔ ساری محنت رائیگاں جا چکی تھی۔
بوجھل قدموں سے وہ گھر کی طرف چل پڑا۔

کیا زمانہ آ گیا ہے۔ ہر جگہ سفارش چلتی ہے تعلیم اور لیاقت کی کوئی اہمیت ہی نہیں رہی۔ تعلیم اور لیاقت رشوت اور سفارش کے بندھنوں میں اُلجھی ہوتی ہے۔ دیش غریب ہے۔ دیش کے نوّے فیصدی آدمی غریب ہیں۔ ہر آدمی رشوت کہاں دے سکتا ہے۔ غریب آدمی کی سفارش کون کرے گا وہ کس کی سفارش لا سکتا ہے؛ غریب آدمی چاہے جتنا تعلیمیافتہ ہو، قابل ہو، عقلمند ہو، اُسے اچھی نوکری نہیں مِل سکتی ۔ وہ اچھی نوکری کا مستحق نہیں ہوتا۔ جب تک اُس کے پاس سفارشی لیٹر نہ ہو۔ اُس نے سوچا اور وہ زمانے کی روش پر جھنجھلا اُٹھا ۔ اور تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔

"صغیر صاحب !"
پیچھے سے اچانک آواز آئی۔
اُس نے مُڑ کر دیکھا۔ کوئی نہیں تھا۔
پھر چلنے لگا۔
ذرا دیر بعد پھر آواز آئی۔
"صغیر صاحب !"
وہ چونک سا گیا۔ آواز بالکل جانی پہچانی سی معلوم ہو رہی تھی۔

لیکن آواز دینے والے کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اُس نے مُڑ مُڑ کر کئی بار آگے پیچھے دیکھا۔ اُسے کوئی دکھلائی نہ دیا۔ وہ بہت تذبذب میں پڑ گیا۔ دُور تک کوئی نظر نہ آیا۔ صرف ایک کار اُس کے برابر سڑک پر رینگ رہی تھی۔ کار سے آواز آ سکتی ہے۔ یہ بات اُس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ کیونکہ بڑے آدمیوں سے یا کسی ڈرائیور سے اُس کی کوئی جان پہچان نہ تھی۔ وہ تیزی سے چلنے لگا۔

"واہ مسٹر صغیر آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ آواز دینے پر رُکتے بھی تو نہیں۔"
تیسری بار پھر آواز آئی۔

اُس نے فوراً مُڑ کر کار کی طرف دیکھا مس ناہید علوی صاحبہ کار میں بیٹھی مُسکرا رہی تھیں۔ نظریں چار ہوئیں۔ آج سے دو سال پہلے کا زمانہ یاد آ گیا۔ کالج کی وہ زندگی یاد آ گئی جب وہ اور ناہید ساتھ پڑھتے تھے
ناہید نے مُسکرا کر کہا۔
"کیا آپ نے پہچانا نہیں ؟"
"مجھ میں بھلا اب اتنی ہمّت کہاں ہے کہ میں پہچاننے سے انکار کروں ؟"
"بہت دنوں بعد ملے۔ کہاں تشریف جا رہی ہے ؟" ناہید نے سرگوشی کی۔
"گھر جا رہا ہوں !"
"آئیے میں آپ کو گھر تک پہنچا دوں" ناہید نے کار کی کھڑکی کھولتے ہوئے کہا۔
"شکریہ !"
"کیا آپ کو میرے ساتھ چلنے میں کوئی اعتراض ہے ؟"
"ایسی تو کوئی بات نہیں"
"تو پھر آئیے۔ دیر کس لئے ؟"
ناہید نے اصرار کیا۔
اور وہ پھر انکار نہ کر سکا۔ جا کر ناہید کی بغل میں بیٹھ گیا۔ ناہید

اُس کی کلاس فیلو رہ چکی تھی۔ وہ ہمیشہ کار ہی سے کالج آتی تھی۔ وہ امیر باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ ماں بچپن ہی میں داغِ مفارقت دے گئی تھی۔ باپ نے بڑے لاڈ پیار سے پالا تھا۔ بیٹی کی ہر خواہش پوری کرتے۔ کالج میں ناہید کی دھاک تھی۔ وہ کالج یونین کی سکریٹری اور پریذیڈنٹ بھی رہ چکی تھی۔ ناہید ہر زاویئے سے حسین تھی۔ کالج کا ہر لڑکا یہی چاہتا کہ وہ مجھ سے ہنس کر دو بات کرے۔ لیکن وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتی۔ اُسے یاد آیا، جب پہلی بار ناہید نے کہا تھا۔

"صغیر صاحب! جانے کیا بات ہے جس دن آپ کالج نہیں آتے میرا دل بھی پڑھنے میں نہیں لگتا۔"

"سچ ؟!"

صغیر کو جیسے اُس کی بات پر یا پھر اپنے کانوں پر اعتبار نہ آ رہا ہو۔

"ہوں!"

اُس دن کے بعد ملاقاتوں میں اضافہ ہو گیا۔ ہر ہفتہ سینما کا پروگرام بنتا۔ خالی پریڈ کینٹین میں گزرتے۔ کالج کے دوسرے طلبا صغیر کے مقدر پر رشک کرنے لگے۔ اور کچھ حسد! وقت گزرتا رہا۔ اور وہ حسین خواب دیکھتا رہا۔ بی کام کرنے کے بعد وہ اپنی اسٹڈی جاری نہ رکھ سکا۔ ملاقاتوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ دو سال کے بعد آج یہ اتفاقیہ ملاقات ہوئی تھی۔

"صغیر صاحب! اِس وقت کہاں سے تشریف لا رہے ہیں؟" ناہید نے سلسلۂ کلام شروع کیا۔

"ایک انٹرویو میں گیا تھا۔"

صغیر نے بڑے مایوسانہ انداز میں بتایا۔

"کیا ہوا؟ سلیکٹ ہو گئے نا؟" ناہید نے پُر اُمید لہجے میں پُوچھا۔

"جی نہیں۔ بھلا آجکل کہیں سفارش کے بغیر نوکری مل سکتی ہے؟" صغیر نے مُنھ بنا کر کہا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"سُنیئے! آپ بھی تو ایک امیر باپ کی بیٹی ہیں۔ اپنے ڈیڈی سے کہہ کر سفارش کرا دیجئے نا!"

"دراصل آپ نوکری کرنا چاہتے ہیں؟" ناہید نے سرگوشی کرتے ہوئے پوچھا۔

"قطعی نہیں۔ نوکری نہیں کروں گا۔ جھک مارو[illegible]" ... چڑھاتے ہوئے کہا۔ ناہید نے کار کوٹھی کی طرف موڑ دی۔ اور اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا ـــ "سمجھی۔ آپ ناراض نہ ہوں میں فادر کو فون کرتی ہوں۔"

کوٹھی پر پہنچ کر اُس نے قدوائی کو ڈرائینگ رُوم میں بٹھایا اور [illegible] کرنے چلی گئی۔ فون اُٹھا کر کچھ نمبر ڈائل کئے۔

"ہلو... ہلو... میں ناہید بول رہی ہوں۔ فون ڈیڈی کو دیجئے"

"ہلو ڈیڈی! گڈ نون!"

"خوش رہو بیٹا! کیا بات ہے؟" دوسری طرف سے آواز آئی۔

"ڈیڈی آپ سے ایک کام ہے۔"

"کہو کہو۔ کون سا کام ہے؟"

"بات دراصل یہ ہے....."

"ہاں ہاں کہو۔ اِس میں ہچکچانے کی کیا بات ہے۔"

"ہمارے کلاس فیلو مسٹر قدوائی ہیں۔ بی کام فرسٹ ڈویژن کیا ہے۔ پرسنالٹی بھی خوب ہے۔ کئی جگہ انٹرویو میں گئے تھے۔ سفارش نہ تھی اِس لئے نہیں لئے گئے۔ میں نے اِن سے وعدہ کر لیا ہے کہ ڈیڈی سے کہہ کر ضرور نوکری دلا دوں گی۔ میرے اچھے ڈیڈی! آپ کے یہاں بھی تو ایک آدمی کی ضرورت ہے۔ مسٹر قدوائی کو رکھ لیجئے نا۔" ناہید نے ساری تفصیل بتائی۔

"بیٹا ناہید! آئی ایم سوری۔ میں نے ایک آدمی کو سلیکٹ کر [illegible] اب کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"ڈیڈی! میرے اچھے ڈیڈی! آپ کو مسٹر قدوائی کو رکھنا ہی ہوگا یہ میری عزت کا سوال ہے!" ناہید نے ضد بھری سفارش کی اور رُندھی ہوئی آواز میں بولی۔ "ڈیڈی! بولئے نا۔ کیا کہتے ہیں؟"

"اچھا جو تم چاہوگی وہی ہوگا۔ اِس میں رونے کی کیا بات ہے؟"

"مسٹر قدوائی کوٹھی پر موجود ہیں۔ تقرری نامہ چپراسی سے بھجوا دیجئے نا"

"اچھا، اچھا، جاؤ مسٹر قدوائی کو خوشخبری تو سناؤ"
ٹیلیفون ڈسکنیکٹ ہوگیا۔
ناہید نے باہر آکر کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
"معاف کیجئے گا مسٹر قدوائی! مجھے کچھ زیادہ دیر ہوگئی۔ بور تو نہیں ہوئے آپ؟"
"کوئی بات نہیں۔ کیا کہا ڈیڈی نے؟"
صغیر نے بہت بے چینی سے پوچھا۔
"مسٹر صغیر! مجھے بے حد شرمندگی ہے۔ ڈیڈی نے سفارش کرنے سے انکار کر دیا ہے۔" ناہید نے ہنستے ہوئے کہا۔
"اچھا کوئی بات نہیں۔ اب اجازت دیجئے" صغیر نے کہا اور چلنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔
"سنئے!"
"کہئے!"
"ڈیڈی نے کہا ہے کہ اگر مسٹر قدوائی چاہیں تو میں اپنے یہاں رکھ سکتا ہوں!"
"کون سی فرم ہے؟" صغیر کو امید کی جھلک نظر آئی۔
"ایک بالکل چھوٹی سی نوکری کرنی ہو تو بتاؤں"
"نوکری تو بہرحال کرنی ہے ــــ بتاؤ تو سہی"
"پھر بیٹھئے نا۔ کھڑے کیوں ہیں؟"
دونوں پھر بیٹھ گئے۔ نوکر نے فوراً چائے لاکر رکھ دی۔ ناہید نے چائے کا پیالہ صغیر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
"نوکری پانے کے بعد مجھے بھول تو نہ جائیے گا؟"
"کیا آپ نے مجھے اتنا احسان فراموش سمجھ لیا ہے۔ سچ کہتا ہوں میں زندگی بھر احسان مند رہوں گا۔"
"بس بس زیادہ نہ بنائیے۔ باتیں بنانا کوئی آپ سے سیکھے"
"اچھا ناہید صاحبہ! اب بتائیے کون سی فرم ہے۔ کیسی نوکری ہے، کیا تنخواہ ہے؟"

ابھی ناہید جواب بھی نہ دے پائی تھی کہ چپراسی اندر داخل ہوا۔ اور ناہید کو سلام کرکے ایک بند لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ ناہید نے وہ لفافہ صغیر کی طرف بڑھا دیا۔ اور بولی۔
"لیجئے صاحب! پڑھ لیجئے۔ کونسی فرم ہے اور کیسی نوکری ہے۔"
صغیر نے فوراً لفافہ چاک کیا۔ لیٹر دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ ڈرکیٹس انڈیا لمیٹڈ کے پبلسٹی آفیسر کا تقرری نامہ تھا۔ جس کا وہ انٹرویو دے گیا تھا اور سفارشی لیٹر نہ ہونے کی وجہ سے سلیکٹ نہ ہو سکا تھا۔ وہ فرط مسرت سے جھوم اٹھا۔ ناہید کو تشکر آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔
"ناہید صاحبہ! میں آپ کا کن الفاظ میں شکریہ ادا کروں۔ کاش میں دنیا کی ہر زبان جانتا ہوتا۔"
"صرف زبانی شکریے سے کام نہیں چلے گا مسٹر قدوائی صاحب!
"پھر کیا چاہیے؟"
"رشوت!"
"رشوت تو پہلے ہی دے چکا ہوں۔"
"کیا دیا ہے آپ نے رشوت میں؟"
"دل!"
دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔
جیسے سفارش اور رشوت میں رشتہ قائم ہوگیا ہو ــــ!

وقت کا نعرہ

زیادہ .... اپج
زیادہ .... بچت
زیادہ .... محنت
خریدو اسی وقت جب ہو ضرورت
بڑھے گی نہ اس سے کسی شے کی قیمت

نواب محمد صابر قلی خاں صابر

ہم سنائیں ہجر کی رُوداد کیا ۔ اُن کو پاسِ خاطرِ ناشاد کیا

برق سے جل ہی چکا جب آشیاں ۔ آسماں تجھ سے کریں فریاد کیا

ملتفت چشمِ کرم ہے آجکل ۔ پھر ستم ہوگا کوئی ایجاد کیا

آپ کیجے دشمنوں کی دل دہی ۔ دل ہمارا شاد کیا ناشاد کیا

جب غلامی اپنی فطرت بن چکی ۔ پھر ہوئے بھی تو ہوئے آزاد کیا

مجھکو محرومِ عنایت دیکھ کر ۔ غیر دل میں ہو رہا ہے شاد کیا

کیوں بچھایا دام ہم رنگِ زمیں ۔ ہم کو ناداں سمجھے ہے صیاد کیا

کون سا باقی رہا ہے اب ستم ۔ آسماں بھی اب کرے بیداد کیا

چھوڑ آئے راہ میں پیچھے کہیں ۔ سب ملے تھے قیس کیا فرہاد کیا

اُن کی محفل سے اُٹھا لایا ہمیں ۔ اب ارادہ ہے دلِ ناشاد کیا

ہم نے دیکھا ہے زوالِ حکم و عیش ۔ حکم کی اور عیش کی بُنیاد کیا

تُو ہے صابر صبر کی تکمیل کر

اہتمامِ نالہ و فریاد کیا

افسانہ

دلِ ریزہ ریزہ

ظفر ادگانوی

بعض راتیں کتنی بھیانک ہوتی ہیں!

اُن راتوں میں دِلوں کے زخموں کی ٹیس صاف طور پر سُنائی دیتی ہے پورا ماحول کرب کی سیاہ چادر میں ٹوٹے ہوئے دِلوں کو سمیٹ سمیٹ کے اور تھپک تھپک کے سُلانے کی ناکام کوشش میں مشغول رہتا ہے۔ لیکن ٹوٹے ہوئے دل شیشے نہیں، انہیں کون جوڑے، کون تسلی دے۔

پھر اصغر کا دل!

جو ابھی ابھی اچانک شیشے کی پیالی کی طرح کسی نازک سی بچی کے ہاتھوں سے پختہ فرش پر گر کر چکنا چُور ہو گیا تھا جس کے ریزے فضا میں پیوست ہو رہے تھے فضا سسک رہی تھی اصدات کسی گنہ گار دل کی طرح سیاہ اور بھیانک تھی۔ ایسی سِسکتی ہوئی سیاہ اور بھیانک فضا میں بالائی منزل سے چوڑیوں کے مانوس گیت کا نا کام تصور پگھلتے ہوئے سیسے کی طرح اُس کے کانوں میں رہ رہ کر ٹپکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ گیت جو کبھی اُس کے لئے علاجِ غمِ دل تھے۔ وہی گیت جو کبھی زیست کے ضامن تھے۔ دو سال پہلے جب وہ کرایہ دار کی حیثیت سے اِس مکان میں آیا تھا تو یہی گیت اُس کے دل کی دھڑکنوں کے ساتھ تیز ہو گئے تھے۔ اور پہلی بار اُس نے اِن جاگتی چوڑیوں کی من چاہی تعبیر میں ساری کی ساری رات کروٹیں بدلتے گزار دی تھی۔ اور دُوسرے دن جب وہ کالج سے واپس آیا تو چھجے پر کھڑا ہوا ایک بچہ اُسے دیکھ کر گھر کے سبھی لوگوں کو ایک ہی سانس میں آہستہ آہستہ پکارنے لگا۔

"نمو۔ نمو۔ آپا جان! جلدی آیئے"

اور پھر وہی مانوس چوڑیوں کے گیت معصوم قہقہوں کے ساز پر فضا میں بکھرتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اُس کی نگاہیں غیر ارادی طور پر اوپر اُٹھ گئیں۔ پچھلی رات کا چاند سرِ بام آ گیا تھا۔ پھر جیسے بدلی نے ڈھک دیا ہو کئی روز روپوش رہا لیکن چاند بدلی میں ہو پھر بھی چاندنی کا لطف تو ملتا ہی ہے۔

"مگر نظمی"

اُس کے دل نے سرگوشی کی۔

"یہ نظمی ہرگز نہیں ہو سکتی"۔ اُس کا ذہن بول پڑا۔

نظمی کے دِل کی دھڑکنیں جیسے اُس کی اپنی دھڑکنیں ہوں، جو چار سال کے اَن گنت لمحوں کو تصور کے ہار میں گوندھتی رہیں۔ جس کی لطیف خوشبو سے اُس کی سینکڑوں راتیں مہک اُٹھی تھیں۔ جس کے تصور کی گرمی سے یادوں کے رُخسار لہک اُٹھے تھے۔ لیکن وہی نظمی اُس کی زندگی سے جاگتے میں دیکھے ہوئے خواب کی طرح شرمندۂ تعبیر ہوئے بغیر نکال دی گئی۔ اُس کی معصوم راتوں سے ایک انجینئر کے مستقبل کا زرد پیلا سورج جگمگا اُٹھا۔

دُوسری طرف اصغر خود کو کتابوں میں اُلجھا لینے میں کامیاب ہو گیا۔ اُس نے ایم۔ اے میں داخلہ لے لیا تھا۔ کلاسز بہت آگے نکل چکے تھے۔ وہ غموں کے سیاہ بادلوں پر تیرتا ہوا شہر پہنچا۔ یہاں جب اُسے ہوسٹل میں جگہ نہیں مِل سکی تو اُس نے شہر میں کمرے کی تلاش شروع کر دی۔ اتفاق کی بات شہر میں راشد صاحب کے مکان میں اُسے جگہ مِل گئی۔ مکان دو منزلہ تھا۔ نیچے کی منزل میں اُسے ایک کمرہ مل گیا۔ بالائی منزل پر راشد صاحب خود رہتے تھے۔ اُوپر والی منزل کی چہار دیواری اتنی پست اور کھلی ہوئی تھی کہ اُوپر کے حصّے کے رہنے والوں کو نچلی منزل کے لوگ بآسانی دیکھ سکتے تھے۔ اُوپر کی آواز نیچے اور نیچے کی آواز اُوپر زیادہ زور سے نہ بولنے پر بھی کم و بیش سُنی جا سکتی تھی۔ بظاہر ماحول بہت پُرسکون تھا۔ اصغر نے سوچا، چلو

اطمینان سے پڑھنا لکھنا ہو سکے گا۔ لیکن یہاں کی پہلی ہی رات کنواری چوڑیوں کا تصور حقیقت بن کر اُس کے ذہنی سکون کو درہم و برہم کر رہا تھا۔

چوتھے دن جب اُس کا ایک دوست حامد اُس کے ساتھ نیا مکان دیکھنے آیا اُس نے اُس مکان کی قدیم طرز کی دیواروں کو دیکھ کر بہت زور سے قہقہہ لگایا۔ اُس نے اصغر کو مشورہ دیا کہ میاں کیوں اِس مکان میں رہ کر جانِ عزیز کو گنوانا چاہتے ہو۔ کوئی دوسرا کمرہ تلاش کر لو یہی نا کہ کرایہ کچھ زیادہ دینا ہوگا۔ اُس نے یہ سب کچھ اتنی اُونچی آواز سے کہا کہ اُوپر سے آتے ہوئے راشد صاحب نے سُن لیا۔ اُس وقت تو وہ کچھ نہ بولے اور حامد کو دیکھتے ہوئے باہر چلے گئے۔ لیکن شام کو اُنھوں نے اصغر کو بُلا کر پوچھا کہ وہ صاحب کون تھے اور آپ کو کیا مشورہ دے رہے تھے قہقہہ لگانے کا یہ انداز انھیں کس نے سکھایا؟ اصغر نے حامد کے متعلق سب کچھ بتا دیا۔ لیکن جب اُس نے یہ کہا کہ وہ بہت زندہ دل ہے اور اِس کی صرف ایک وجہ ہے کہ اُس نے اب تک شادی نہیں کی ہے۔ اس نئی اطلاع پر وہ ایک دم نرم پڑ گئے جیسے کوئی حادثہ گزر گیا ہو۔ اُن کی نگاہیں نیچے گر گئیں۔ اُنھوں نے اپنے سب سے چھوٹے لڑکے کو پکارا۔

"نمو! او نمو! ذرا چائے تو لے آؤ!"

اور چائے کے دَوران میں راشد صاحب نے اصغر کو یقین دلایا کہ یہاں اُسے کسی طرح کی تکلیف نہ ہوگی۔ نچلے حصے میں وہائٹ واشنگ کرا دی جائے گی۔ نیز یہ کہ آنگن میں برابر صفائی کرائی جائے گی۔ اور اُنھوں نے یہ سب کر کے دکھایا۔ اصغر کی پڑھائی کے لئے اُنھوں نے اپنا خوبصورت سا ٹیبل لیمپ اور کتابیں رکھنے کے لئے ریک بھجوا دیا۔ پھر رفتہ رفتہ ایسا ہونے لگا کہ جب بھی اصغر گھر میں شام کے وقت موجود ہوتا اُسے اپنی بیٹھک میں بُلا لیتے۔ چائے آتی۔ اصغر کے ذاتی حالات دریافت کرتے۔ ہمدردی کے پھول نچھاور کئے جاتے۔ خوش کُن مستقبل پانے کے لئے حالات سے لڑنے کی ہمت پیدا کرتے۔ یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ وہ موقع پر اپنے حالات سے بھی اصغر کو آہستہ آہستہ باخبر کرنے لگے۔ نجمہ کی نسبت کے سلسلے میں اپنی پریشانیاں اور ایسی ہی بے شمار باتیں۔ پھر وہ کچھ سیدھے ہو کر بیٹھے۔ اچانک انھیں جیسے کچھ یاد آ گیا۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ دروازے کے پاس جا کر اُنھوں نے باہر جھانکا۔ دروازے اور کھڑکیوں کے پردے برابر کئے۔ اور بہت ہی سنجیدگی کے ساتھ پھر کرسی پر آ کر بیٹھ گئے۔ اِس کے بعد اُنھوں نے بہت ہی رازدارانہ لہجے میں کہنا شروع کیا۔

" اصغر صاحب! اگر آپ چاہیں تو میری پریشانیاں ختم کر سکتے ہیں۔"

اصغر راشد صاحب کی بات سُن کر چونک پڑا۔ اُس کی پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمکنے لگے۔ اور بہت ہی مشکل سے اُس نے اپنا جملہ پُورا کیا۔

" مگر میں۔ مگر میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟" راشد صاحب کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک پیدا ہو گئی۔ اور اُنھوں نے بہت زور سے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

" مجھے معلوم ہے کہ آپ میری مدد نہیں کر سکتے۔ لیکن آپ کے دوست حامد..."

اصغر نے رُومال سے پسینہ خشک کیا۔ اطمینان کی ایک ٹھنڈی سانس لی۔ جیسے اُسے منوں مٹی کے نیچے سے خلاف توقع نکال لیا گیا ہو۔

" اوہ تو آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا میں آج ہی اُس سے تذکرہ کروں گا۔"

دفعتہً دروازے کے باہر کسی نے راشد صاحب کو پکارا۔ وہ اُٹھ کر باہر چلے گئے۔ اور اصغر پچھلے دروازے سے اپنے کمرے کی طرف جانے لگا تو اُسے سیڑھیوں کے قریب سے چوڑیوں کی آواز سُنائی دی۔ اُس کی نظریں آواز کا تعاقب کرتے ہوئے اُوپر اُٹھ گئیں۔ وہ چہرہ نہیں دیکھ سکا۔ لیکن اُس کی آنکھوں میں لمبی اور گھنیری زُلفوں کے باریک تار چبھ گئے۔

اُس نے کمرے میں داخل ہوتے ہوتے خود سے پُوچھا۔

"آخر یہ لڑکی کیا چاہتی ہے؟"

" لیکن میں اُس کے بارے میں ایسا کیوں سوچ رہا ہوں؟"

رات گئے تک وہ ذہنی کشمکش کے تاریک لمحات میں جانے کب
تک بھٹکتا رہا۔ اور شاید وہ پوری ہی رات سوچتے ہوئے گزار دیتا۔ لیکن
بالائی منزل پر اُسے چوڑیوں کی کھنک محسوس ہوئی۔ اُس کا بھٹکتا ہوا ذہن ایک
محور پر آگیا۔ چوڑیوں کی کھنک اب واضح ہوگئی۔ پھر ایک لمحہ بعد فضا میں ایک
نسوانی مدھم آواز اُبھری۔

"اصغر صاحب! سو گئے کیا؟"

اُس کے کانوں کو یقین نہیں آرہا تھا کہ اس وقت آدھی رات کے
سناٹے میں اُسے اِس طرح ایک لڑکی مخاطب کرسکتی ہے۔ وہ کچھ جھجکا، کچھ
گھبرایا۔ جواب کے لئے خود کو آمادہ کرنے لگا۔

اتنے میں فضا پھر مرتعش ہوگئی۔

"میں آپ ہی سے پوچھ رہی ہوں اصغر صاحب! سو گئے کیا؟"

اصغر اپنے حواس پر قابو پاچکا تھا۔ بہت ہی دھیمے لہجے میں اُس
نے جواب دیا۔

"کہیئے اِس وقت میں آپ کی کیا مدد کرسکتا ہوں؟"

"تکلیف تو ہوگی۔ اُوپر پانی ختم ہوگیا ہے۔ مجھے پیاس لگی ہے۔ اگر
آپ کے پاس پانی ہو تو ایک گلاس میں بھر کر زینے پر رکھ جائیے۔"

وہ پانی کا گلاس رکھ کر واپس آیا تو خود اُس کے حلق میں کانٹے چبھنے
لگے۔ سینے میں انگارے دہک اُٹھے۔ ایک گھنٹے کے اندر ہی پوری صُراحی
ختم کردی۔ پھر بھی دہکی ہوئی آگ سرد ہونے میں نہیں آرہی تھی۔ سینے کی
آگ بھڑکتی رہی۔ اور بھڑکتی رہی۔

یہ شعلے خود بخود کب ٹھنڈے پڑ گئے
نہ جانے اُسے کس وقت نیند آگئی۔

اِس طرح قربت کے بہانے ہاتھ آئے۔ تکلفات کی دیواریں
گرتی چلی گئیں۔ یہاں تک کہ وہ اب اصغر کے کمرے میں چلی آتی۔ بہت
اطمینان کے ساتھ باتیں ہوتیں۔ اُس نے اصغر کو بتایا کہ اُس کی ماں کو
مرے ہوئے زمانہ گزر گیا۔ وہ تنہا خالہ کے ساتھ رہتی ہے۔ دونوں بھائی
اسکول چلے جاتے ہیں۔ اور خالہ نے اُسے ہر طرح کی آزادی دے رکھی ہے

اُس نے مسکرا کر کہا تھا کہ خالہ اُس کی شکایت کسی سے بھی نہیں کرسکتی ہیں۔
وہ بہت سیدھی اور معصوم ہیں۔ مجھے بے حد چاہتی ہیں۔ میری ہر خواہش
اُن کی اپنی خواہش ہوتی ہے۔ وہ جانتی ہیں کہ نجمہ اِس وقت بیٹھی ہوئی اصغر
سے باتیں کررہی ہے۔ اُس نے ایک بار یہ بھی کہا تھا کہ آج تک اِس مکان
میں جتنے بھی کرائے دار آئے نہ جانے اُن سے مجھے کیوں نفرت سی ہوگئی۔
اُن میں سے ایک کی نگاہیں ہر وقت چھت پر لگی رہتیں۔ ایک نے نہ جانے
مجھے کیا سمجھ کر اپنے دوستوں میں گفتگو کا موضوع بنایا۔ اُس کے دوست آتے
تو آنگن میں زرافوں کی طرح گردن اُونچی کرکے فضا میں نہ جانے کیا تلاش
کرتے رہتے۔ مگر آپ .... اور یہ کہتے کہتے اُس کی آنکھوں میں حیا کے
سُرخ ڈورے نمایاں ہوجاتے۔ لیکن آپ کتنے سیدھے ہیں۔ ہاں آپ کے
وہ دوست ایسے زور زور سے قہقہے لگاتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے
پاگل گررہے ہوں۔ کچھ زیادہ عقلمند نظر نہیں آتے۔

اصغر کے ہونٹوں پر بھی ہنسی آجاتی۔

"اور اگر کہیں تمھاری شادی اُسی احمق کے ساتھ ہوگئی تو کیسا
رہے گا؟"

"لیکن میں تو شادی کرنا ہی نہیں چاہتی۔"

"تمھارے چاہنے اور نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟"

"لیکن وہ تو انجینئر ہیں۔ ہمیشہ پیسوں کی بات کرتے رہیں گے۔"

"کتنا اچھا ہوگا کہ نطشی کی طرح تم بھی آرام سے زندگی گزارو گی"

نطشی کا نام آتے ہی اصغر کا ذہن ڈوبنے لگتا۔ وہ غیر شعوری طو
پر کبھی کبھی یادوں کے کھنڈروں میں پہنچ کے کچھ تلاش کرنے لگتا۔ وہ نہ
سمجھ پارہا تھا کہ ابھی ابھی پھر نطشی کو وہ کیوں گفتگو میں لے آیا۔ اُس۔
کئی بار فیصلہ کیا کہ اب اُسے بھول جانا ہی بہتر ہے۔ لیکن اُس کا یہ فی
کسی شرابی کی توبہ کی طرح ہمیشہ ٹوٹتا رہا اور بدلتا رہا۔ نجمہ نے بھی اصغر
اِس دُکھ کو سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ وہ بھی چاہتی تھی کہ اصغر ایک
نئی زندگی شروع کرے۔ جس میں سب ہی کچھ ہو۔ لیکن تلخ یادیں نہ ہ
اِسی لئے اُس نے ایک بار پھر اصغر سے کہا تھا۔ "آپ ناحق اپنا مت

کیوں برباد کرنے کے درپے ہیں۔ آپ کیوں نہیں اُسے بھول جاتے ؟"

"نجمہ! میں نغلشی کو معاف نہیں کر سکتا۔ لیکن اُسے بھلا بھی نہیں سکتا میرے زخم بہت گہرے ہیں۔"

"آپ کے زخموں کا علاج ناممکن نہیں ہے۔"

"صرف ایک صورت میں۔"

"میں بھی تو سنوں۔"

"نغلشی کی جگہ جس لڑکی نے لے رکھی ہے وہ مل جائے تو میرے زخم بھر سکتے ہیں۔"

"تو اس کے لئے کونسی نہریں نکالنی پڑیں گی۔ اپنا لیجئے اُسے جسے آپ چاہتے ہیں اور جو آپ کو چاہتی ہے۔"

اصغر نے محسوس کیا کہ نجمہ نے بھی اُس کے سامنے اپنا دل نکال کر رکھ دیا ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ نجمہ نے مسکراتے ہوئے ایک دوسری بات چھیڑ دی۔

"ان دنوں آپ کا وہ احمق دوست نہیں آتا؟ کیا اُسے اپنی شادی میں دعوت نہیں دیجئے گا؟"

"اگر تم کہوگی تو اُسے ضرور بلاؤں گا۔ وہ تو میرا سب سے قریبی دوست ہے۔"

پھر وہ حامد کے متعلق ہر بار ایک نہ ایک بات پوچھ ہی ڈالتی لیکن دوسرے ہی لمحہ اُس کا لہجہ بہت محتاط ہو جاتا۔ اُس کی پیشانی پر شکنوں کی مانند میں پسینے کے قطرے سمٹ جاتے۔ اور وہ اِدھر اُدھر کی باتیں پوچھنے لگتی۔ مثلاً یہ کہ اُس نے کالج جانا کیوں چھوڑ رکھا ہے۔ امتحانات قریب آ گئے ہیں پھر بھی کتابوں کی گرد اب تک جھاڑی نہیں گئی ہے۔ اُس نے ایک دن صاف صاف کہہ دیا تھا۔

"اب اگر آپ نہیں پڑھیں گے تو میں آپ سے نہیں بولوں گی!"

وہ مرجھا گیا۔

"لیکن میں کتابوں کو اپنا رقیب بنانا نہیں چاہتا ہوں۔"

وہ مسکرا اٹھی تھی۔

"آپ جسے رقیب سمجھ رہے ہیں وہ تو دراصل میں ہوں۔ آپ مجھ سے نفرت کریں گے ؟"

جھینپتے ہوئے انداز میں وہ بولا۔

"تم تو بحث کرنے کے موڈ میں ہو بھئی! اچھا آج سے میں ان کتابوں سے بھی پیار کروں گا۔"

لیکن پھر بھی وہ کتابوں سے پیار نہ کر سکا۔ اُس کا پیار اور سوچیں صرف نجمہ کے لئے وقف ہو چکی تھیں۔ اُس کی یہ سوچیں ماضی کی لہروں سے نکل کر مستقبل کے ساحل سے ٹکراتی رہیں۔ لمحے گزرتے رہے۔ وقت کی طنابیں کھنچتی رہیں۔ اور ایک دن ایم۔ اے کا نتیجہ آ گیا۔ اصغر کو فیل ہونے کا غم نہیں ہونا چاہئے تھا۔ لیکن اُسے مایوسیوں کے سانپ چاروں طرف سے ڈسنے کے لئے دوڑ رہے تھے۔ نجمہ کو بھی اصغر کی ناکامی کا دلی دکھ ہوا۔ لیکن اُس نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ اُس نے بہت عقلمندی کیساتھ اُس کے تازہ زخم پر پھاہا رکھ دیا تھا۔

"اصغر! دیکھو۔ میری طرف دیکھو۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میرا بابا فیل ہو جائے اور میں مر جاؤں ؟"

ہارے ہوئے جواری کی طرح اُس نے گردن اُٹھائی تھی۔

"نہیں نجمہ۔ میں کسی طرح تمھاری ذراسی تکلیف بھی گوارا نہیں کر سکوں گا۔"

"تو پھر تمھیں میرے لئے اس غم کو بھولنا پڑے گا۔ بھول جاؤ کہ تم امتحان میں شریک ہوئے تھے۔"

نجمہ نے جاتے جاتے کہا تھا کہ زندگی میں اپنے دوست حامد کی طرح بھرپور قہقہے لگانا سیکھو۔ اور یہ محض اتفاق تھا کہ کچھ دیر کے بعد ہی حامد دہاڑتا چیختا آ پہنچا۔

"ابے تو فیل ہو گیا؟ کم بخت کہیں کا!"

اُس کے قہقہوں سے ماحول گونج اٹھا۔

"ابے اُٹھ! بچوں کی طرح روتا کیوں ہے۔ چل کپڑے بدل لے ــــ!"

"کہاں سے جاؤ گے! چھوڑ دو۔ میں آج تمہارا رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے بھوندہ کرو!"

"اچھا ہے یا لگاؤں ایک..."

زبردستی حامد نے اصغر کے کپڑے تبدیل کرائے اور کمرے سے باہر کھینچ لایا۔ اور جیب میں سے ایک ڈبہ نکال کر اُسے دیتے ہوئے بولا۔

"تیری بھابی تجھے دیکھنے کو بلا رہی ہیں۔ یہ لاکٹ اُسے پریزنٹ کر دینا۔"

ٹھیک اُسی لمحہ بالائی منزل پر سے شیشے کا گلاس کسی کے ہاتھ سے چھوٹ کر آنگن میں آگرا۔

گلاس چکنا چور ہو گیا تھا۔

شیشے کے ٹکڑے آنگن میں اس طرح بکھرے پڑے تھے جیسے دل کے ریزے ہوں۔

اُس دن کے بعد اصغر کے کان چوڑیوں کی کھنک سُننے کے لئے ترس گئے ——!!

مضمون نگار حضرات سے

درخواست ہے کہ مضمون حاشیہ چھوڑ کر خوشخط لکھا کریں۔ اور سطروں کے درمیان کافی جگہ چھوڑا کریں۔ بعض اچھے مضامین محض بدخط ہونے کی وجہ سے چھپنے رہ جاتے ہیں۔ ہمیشہ غیر مطبوعہ مضامین بھیجیں اور ایڈیٹر کی اطلاع کے لئے مضمون کے ماتحت پر غیر مطبوعہ لکھیں۔ بعض مضمون نگار مطبوعہ مضامین بھیج دیتے ہیں۔ یہ نہایت نامناسب اور غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے۔ اپنے پاس اپنے مضامین کی نقل ضرور رکھیں۔ کیونکہ ناقابلِ اشاعت مضامین ضائع کر دیئے جاتے ہیں۔ مضمون کے خاتمے پر اپنا پورا پتہ لکھ دیا کریں۔ نو آموز حضرات مضامین بھیجنے سے پہلے کسی اُستاد سے مشورہ لے لیا کریں۔ اگر چاہیں کہ مرسلہ مضامین ناقابلِ اشاعت ہونے کی صورت میں انھیں واپس کر دیئے جائیں تو مضمون کے ساتھ ٹکٹ بھیجنے کی بجائے اپنا پورا پتہ لکھا ہوا پوسٹ آفس کا لفافہ ارسال فرمائیں۔ ورنہ ہم مضمون کی واپسی سے قاصر رہیں گے۔ (ایڈیٹر)

اُودے سنگھ مصوّر

مُنہ پہ کہنا کوئی مذاق نہیں
چُپ بھی رہنا کوئی مذاق نہیں

بحرِ آلام بے کنارا ہے
اِس میں بہنا کوئی مذاق نہیں

پی کے تلخابۂ غمِ دُنیا
مست رہنا کوئی مذاق نہیں

سوزِ غم کا بیان مشکل ہے
مُنہ سے کہنا کوئی مذاق نہیں

تیرے نزدیک رہ کے دیکھا ہے
یُوں بھی رہنا کوئی مذاق نہیں

عمر بھر زندگی کے جور و ستم
ہنس کے سہنا کوئی مذاق نہیں

امتحاں کا مقام ہے دُنیا
اِس میں رہنا کوئی مذاق نہیں

مدعا دل کا گفتنی ہے مگر
اُن سے کہنا کوئی مذاق نہیں

زندگی کی گرفت میں آکر
زندہ رہنا، کوئی مذاق نہیں

اے مصوّر حدِ تغزّل میں
شعر کہنا کوئی مذاق نہیں

گوری
یعنی لازوال حُسن

افسانہ

نئے خواب

کلدیپ سنگھ بی اے

دی پنجاب نیشنل بنک لمیٹڈ گرونانک ٹی، پٹیالہ

۵ مارچ ۱۹۶۳ء

محترم نوشتر صاحب آداب

.... آپ بھی کیا سوچتے ہوں گے کہ ایک افسانہ لکھتا ہوں اور پھر سال چھ مہینے کے لئے خاموش ہو جاتا ہوں۔ لیکن ایک بات کا یقین کیجئے آپ کی پر خلوص شخصیت کی یاد سے کبھی غافل نہیں رہتا ہوں.... میرے پچھلے افسانے "جو جگر کے پار ہو" کے متعلق مجھے دور دراز سے بے شمار خطوط موصول ہوئے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ بیسویں صدی لوگوں کے دلوں کے کتنا قریب ہے۔ ایک عجیب بات بتاؤں۔ آپ کی دلی ہی سے ایک محترمہ نے مجھے لکھا ہے کہ یہ میں نے جو نقاش اُنھوں نے پچھلے کئی سال سے اپنے سینے کی گہرائیوں میں چھپا رکھی تھی اُس کا احساس مجھے کیسے ہو گیا؟ گویا اس بات کا ثبوت نہیں کہ بیسویں صدی میں آنے والی تحریریں لوگ کتنا گہرا اثر لیتے ہیں..... باقی رہی اس افسانے کی بات، تو اس کے متعلق مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ یہ افسانہ میں نے دل کی گہرائیوں سے لکھا ہے۔ ورنہ دیکھئے میں کس حد تک کامیاب بھی ہو گیا ہوں جو میرا دل کہنا چاہتا تھا۔ افسانے کے متعلق آپ کی اور قارئین کی رائے کا بے صبری سے انتظار کروں گا......

آپ کا ——— کلدیپ سنگھ

بوڑھے پادری کی منجھلی لڑکی کا نام تمی تھا۔ سانولے سے رنگ کی تمی جس کا رنگ اگر تھوڑا سا اور سانولا ہوتا تو وہ بھی شاید اپنی ہی طرح کی کئی دوسری لڑکیوں میں سے ایک شمار کی جاتی۔ اس تھوڑے سے کم سانولے رنگ ہی نے اُس کی شخصیت کو عام لڑکیوں سے کچھ مختلف بنا دیا تھا۔ میرا تو خیال ہے اُس کی شکل کے مقابلے میں اس کی آواز زیادہ خوبصورت تھی۔ اور وہ بہت اچھا بولتی تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ دو تین سال تک لکھنؤ کے کسی کالج میں پڑھتی رہی۔ اس لئے اُسکے بولنے کے انداز میں ایک جاذبیت پیدا ہو گئی تھی۔ بات کرتی تو گرد و پیش کے لوگ چونک کر اُس کی طرف دیکھنے لگتے۔ اور پھر اُس کی آواز بھی بے حد میٹھی تھی۔ اُس کے ہنسنے کا انداز اکثر مصنوعی ہوتا لیکن دلکش اور پیارا۔ دل تو کرتا ہر وقت اُس کے ہنسنے کی آواز سنتے ہی رہیں۔ ہر اتوار کی شام کو وہ گرجا آیا کرتی تھی۔ مجھے یاد ہے کرسمس کے موقع پر میں نے حضرت مسیح پر ایک مضمون لکھا تھا۔ جسے میرے ایک عیسائی دوست نے گرجا گھر میں پڑھ کر سنانے کے لئے مجھے مجبور کیا تھا۔ میں نے بہت سمجھایا کہ یہ سب مجھ سے نہ ہو سکے گا لیکن وہ نہ مانا۔ مجبوراً مجھے ہاں کرنی پڑی۔ اور وہیں تمی سے میری پہلی ملاقات

ہوتی۔ پادری نیوٹن گرجے میں آنے والے ہر آدمی سے ہاتھ ملاتا۔ اور اُسے دُعا دیتا تھا۔ سمی اُس کے پاس کھڑی رہتی۔ پتہ نہیں یہ سمی کی شخصیت کا اثر تھا یا پادری نیوٹن کا کہ اُس کے پاس جاتے ہی لوگوں کے سر عقیدت سے جھک جاتے تھے۔

"خدا تم پر اپنی بخششیں نازل کرے!"

بوڑھا پادری لمبا سا چغہ پہنے سب کو دعا دیتا۔

"خدا تمھیں ہر وقت خوش رکھے!!"

اُس کے ہاتھ کانپتے رہتے۔

"مقدس مسیح تم پر ہمیشہ مہربان رہے!!!"

نیوٹن بہت بُوڑھا تھا۔ اِس لئے دعا کا بہت سا حصّہ اُس کی بیٹی سمی ہی ادا کرتی تھی۔ سفید لباس پہنے جب وہ دعا کے الفاظ اونچی آواز میں پڑھتی تو گرجے کا ماحول کچھ عجیب سا ہو جاتا۔

اُس دن جب وہ دعا کے الفاظ پڑھ چکی تو مضمون پڑھنے کے لئے میرا نام پکارا گیا۔ ہاتھوں میں اپنی نوٹ بک سنبھالے میں آہستہ آہستہ ڈائس تک پہنچا۔ مضمون پڑھتے وقت سمی بالکل میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھی رہی پتہ نہیں میں نے مضمون کیسے پڑھا۔ معلوم نہیں اچھی طرح سے پڑھ بھی سکا یا نہیں۔ اِس لئے کہ میرے ذہن اور نظر کا محور سمی تھی۔ خاموش بیٹھی ہوئی سمی۔ حیرانی بھری نظروں سے دیکھتی ہوئی سمی۔ خوشی سے تالیاں پیٹتی ہوئی سمی۔ میرا دماغ اُس وقت پلٹا جب تالیوں سے سارا ہال گونج اُٹھا۔ مضمون بہت پسند کیا گیا تھا۔ میں ایک مسرت آمیز اطمینان کا سانس لیتے ہوئے خوشی کا احساس لے کر نیچے اُتر آیا۔

جب میں تقریب کے خاتمے پر گرجے کے صدر پھاٹک سے باہر نکل رہا تھا تو سمی نے بہت ہی پیاری مسکراہٹ کے ساتھ مجھے مبارک باد دی۔ پادری نیوٹن مجھے باہر تک چھوڑنے آئے تھے۔ شاید میرے دوست نے انھیں میرے افسانہ نگار ہونے کے بارے میں بتا دیا تھا۔ انھوں نے بہت محبت سے مجھے اگلے دن کھانے پر مدعو کر لیا تھا۔ اگلے دن شام کو میں اپنا بہترین سوٹ پہنے اُن کے گھر جا پہنچا۔ نیوٹن صاحب ڈرائنگ رُوم میں بیٹھے ایک موٹی سی مقدس کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر انھوں نے کھڑکی میں سے باہر باغ کی طرف اشارہ کر دیا۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ سمی باہر باغیچے میں خاموش بیٹھی نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ نیوٹن صاحب کا اشارہ پا کر میں اُسی جانب بڑھ گیا۔

"سمی ـــــ!"

میں نے اُس کے پاس پہنچ کر پکارا۔

وہ چونک پڑی۔

"کیا سوچ رہی ہو؟"

"کچھ نہیں!" ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اُس نے جواب دیا۔ "یونہی ذرا جی اُداس تھا۔ باہر چلی آئی۔ آپ آ گئے۔ آیئے آپ کو پاپا سے ملاؤں!"

"اُن سے تو میں مِل چکا ہوں" میں نے اُس کی اُداس سی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "لیکن تمھاری یہ اُداسی کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اِس عمر میں تو ہنگاموں سے لپٹ پٹ جانے کو جی چاہتا ہے"

سمی کچھ نہ بولی پھیکی پھیکی ہنسی ہنس دی۔

کچھ لمحے یونہی خاموش رہنے کے بعد وہ بولی۔

- انسان اُسی وقت اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتا ہے جب اُس کے ارادوں میں مضبوطی اور بلند ہمتی ہو ÷
  (حکیم ابو علی حسین نسوی)
- آپ سیکھنا چاہیں تو آپ کی ہر غلطی آپ کو کوئی نہ کوئی سبق دے سکتی ہے ÷ (ڈکنس)
- وقت کا ہاتھ بڑی بڑی عمارتوں کو خاک میں ملا دیتا ہے لیکن کوئی طاقت ایک اچھی کتاب کا وجود ناپید نہیں کر سکتی۔
  (زوٹو ہیا)

"آیئے میرے کمرے میں چلئے۔ وہاں بیٹھ کر کیٹس کی کوئی رومانی نظم پڑھیں گے۔ وقت کتنا اداس سا ہو رہا ہے۔" کہتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ اس کی ریشم جیسی انگلیوں کے لمس نے میرے اندر ایک عجیب سے احساس کو جگا دیا۔ ایک پاکیزہ سا احساس جیسے کسی پھول کو چھوتے وقت باغ کے کسی گوشے میں جاگتا ہے۔ میں کمرے میں آ کر چپ چاپ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ سمی اداس سا چہرہ لئے کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ اس کی اداس صورت نے شام کی اداسی میں اور اضافہ کر دیا تھا۔

"تم نے بتایا نہیں؟"

"کیا؟" اس نے پوچھا۔

"یہی کہ تمہاری ان خوبصورت آنکھوں کے پیچھے کون سی مایوسیاں چھپی کھڑی ہیں؟"

جواب میں وہ کچھ نہ بولی۔

چپ چاپ باہر کی طرف دیکھتی رہی۔

چند لمحے یونہی گزر گئے۔

میں نے اپنا سوال پھر دہرایا۔

جواب میں اس کے لب ہلے۔ آہستہ سے بولی۔

"آپ کو شاید معلوم نہیں کہ میری شادی ہو چکی ہے۔"

"ہوں!" میں نے دھیرے سے کہا۔

لیکن اس بات کا کچھ عجیب سا اثر میرے ذہن پر پڑا۔ ہو سکتا ہے اس کی اداسیوں کا سبب اس کی ناکام ازدواجی زندگی ہو۔ میں نے اپنے دل میں سوچا۔

"تمہارا شوہر تمہیں پیار نہیں کرتا؟" میں پوچھ ہی بیٹھا۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔"

"تمہیں وہ پسند نہیں؟"

"بہت پسند ہے وہ مجھے۔ دراصل یہی تو ساری پریشانیوں کی وجہ ہے!" اس نے عجیب انکشاف کیا۔

"تم اپنی زندگی سے مطمئن نہیں ہو؟" کہتا ہوا میں اٹھ کر اس کے قریب چلا آیا۔ جواب میں وہ کچھ نہ بولی۔ چپ چاپ ٹکٹکی لگائے کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔ میں کچھ دیر تک یونہی کھڑا رہا۔ اور پھر ہاتھ بڑھا کر اس کا چہرہ اپنی طرف کر لیا۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھیں بند تھیں اور گالوں پر شبنم کے قطروں جیسے دو آنسو لرز رہے تھے۔ میں کچھ لمحوں تک ان آنسوؤں کو بہتے دیکھتا رہا۔ غروب ہوتے ہوئے سورج کی کرنوں کا اداس سا عکس ان میں جھلملا رہا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے میرا جی چاہا ان آنسوؤں کو چوم لوں۔ اس کی اداسیوں کو اپنے اندر جذب کر لوں۔ لیکن یہ مناسب نہ تھا۔ جیب سے رومال نکال کر میں نے اس کے آنسو صاف کر دیئے۔ اتنے میں باہر برآمدے میں پادری صاحب کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ میں سمی سے ذرا پیچھے ہٹ کر باہر پھیلنے والے دھندلکوں کو دیکھنے لگا۔

کسی نے میٹھی آواز سے پکارا۔

"سمی بیٹا! اپنے مہمان کو چائے تو پلاؤ۔"

"اوہ!" اس نے اپنے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا "معاف کیجئے۔ مجھے یاد ہی نہیں رہا۔" کہتے ہوئے وہ ایک دم باہر چلی گئی۔ لیکن جہاں تک میرا خیال ہے وہ پادری صاحب سے اپنے آنسو چھپانا چاہتی تھی۔ اسی لئے فوراً چائے کے بہانے باہر چلی گئی۔

- غصہ ہمیشہ حماقت سے شروع ہو کر ندامت پہ ختم ہوتا ہے۔ (ارسطو)
- جو ایک لمحہ کے لئے غصہ کو دبا لیتا ہے وہ گویا غمناک دن سے اپنے آپ کو بچا لیتا ہے۔ (ایڈورڈ)
- شادمانی اور مسرت قدرتی دواؤں کا ایک سمندر ہے۔ انسان کو چاہئے کہ اس میں خوب دل بھر کر نہائے۔ (آئیجر)
- مصیبتیں اور بیماریاں اتنی خوفناک نہیں ہوتیں جتنی کہ وہ بزدلی اور کم ہمتی کی وجہ سے ہمیں نظر آتی ہیں۔ (سقراط)

"تم دونوں یقیناً کسی رنگین موضوع پر گفتگو کر رہے ہوں گے؟" پادری صاحب صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولے۔ "بڑھاپا بھی زندگی کی ساری خوبصورتی پر ایک بدنما دھبہ ہے! لیکن کیا کروں میرا جی چائے کا ایک گرم گرم پیالہ پینے کو چاہ رہا تھا۔ اس لئے چلا آیا۔"

"سمی کچھ اُداس دکھائی دیتی ہے۔" میں نے بوڑھے پادری کی بات سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے کہا۔

بوڑھا پادری میری بات سُن کر کچھ اُداس ہو گیا۔ بولا۔

"ہاں! لیکن شادی سے پہلے یہ بہت خوش رہنے والی لڑکی تھی۔ یہ سب اُداسیاں شادی کے بعد اس کے حصے میں آئی ہیں۔ لڑکا بھی اس کی اپنی پسند کا تھا۔ پھر پتہ نہیں کیا بات ہوئی۔"

"شادی ہوئے کتنا عرصہ ہوا؟"

میں نے پوچھا۔

"تقریباً پانچ سال ہو گئے!"

اتنے میں سمی چائے بنا کر لے آئی۔ اس لئے میں خاموش ہو گیا۔ ہم خاموشی سے چائے پیتے رہے۔

اُس دن کے بعد ہم اکثر ملتے رہے۔ اس دوران اُس کی اُداسیاں روز بروز بڑھتی رہیں۔ میں نے اُسے کریدنے کی کافی کوشش کی۔ لیکن ناکام رہا۔ باتیں کرتے کرتے وہ یکایک خاموش ہو جاتی۔ ہنستے ہنستے وہ یکایک رو پڑتی۔

ایک دن شام کو وہ مجھ سے ملنے آئی۔ دیر تک میں اُسے اپنی بہترین کہانیاں سُناتا رہا۔ جن میں عورتوں کے اکثر نفسیاتی پہلوؤں کی عکاسی نہایت خوبی سے کی گئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ شاید اس طرح وہ اپنا راز مجھے بتا دے۔ پھر میں اُسے اپنے پڑھنے کے کمرے میں لے گیا۔ وہاں دیوار پر ایک بچے کی ایک خوبصورت تصویر آویزاں تھی۔ وہ کئی لمحے تک اُسے دیکھتی رہی پھر بولی۔

"آپ جانتے ہیں عورت کی سب سے بڑی خواہش کیا ہوتی ہے؟"

میں خاموش رہا۔ لیکن میرا دل کہہ رہا تھا، راز اُس کے ہونٹوں پر آ گیا ہے۔ اُس کی زبان سے سُننے کی غرض سے میں نے کہا۔

"حُسن اور محبت!"

"نہیں!" اُس کی آواز میں بے پناہ اُداسی تھی۔ "حُسن اور محبت کے ملاپ سے بنی ہوئی تصویر، ایک خوبصورت سا بچہ!"

"اوہ! تو یہ بات ہے!!"

عورت کی نفسیات کے ہر پہلو پر میں نے سوچا تھا، لکھا تھا، لیکن اس پہلو کو آج تک میرا ذہن نظر انداز کرتا آیا تھا۔ بات میری سمجھ میں آ گئی تھی۔

"تو تم اس لئے اُداس رہتی ہو؟ بھلا اس میں اُداس ہونے کی کیا بات ہے؟" میں نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "ابھی تمھاری عمر ہی کیا ہے۔ بچہ بھی ہو جائے گا!"

میرا خیال تھا کہ میری بات اُس پر اچھا اثر کرے گی لیکن وہ اس سے اور اُداس ہو گئی۔

"سمی!" میں نے اُسے بہلانا چاہا۔

وہ بالکل خاموش تھی۔

میں اُس کے بالکل قریب چلا آیا۔

"سمی! خدا پر بھروسہ رکھو وہ ضرور تمھاری آرزو پوری کرے گا۔"

اُس نے اپنا سر میرے کاندھے پر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جیسے اُس کے ضبط کا باندھ ٹوٹ گیا ہو۔

"کاش ایسا ہو سکتا۔" وہ روتے ہوئے بولی۔ "دلیپ صاحب! کاش یہ ہو سکتا۔ آپ نہیں جانتے میں ولیم کو کتنا چاہتی ہوں۔ دُنیا میں خدا کے بعد اگر مجھے کوئی عزیز ہے تو وہ ولیم ہے۔ اُس کے بغیر میں کسی اور کا تصور بھی ذہن میں نہیں لا سکتی۔ لیکن کاش وہ اس قابل ہوتا۔ جسمانی لحاظ سے ہر طرح وہ ایک اچھا ذہین ہے۔ لیکن وہ میری یہ آرزو پوری نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر کہتے ہیں اُس کے خون میں وہ جراثیم ہی نہیں جن سے قدرت ایک نئی زندگی کی تخلیق کرتی ہے!"

یہ جان کر میرا دماغ سُن رہ گیا۔ مجھے اپنا تمام فلسفہ اور عورت کو سمجھنے

شاہکار ناول جو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو رہے ہیں

ٹھاکر پونچھی کے لکھے ہوئے ناول

رات کے گھونگھٹ جس میں نئی تہذیب کے اُن فرشتوں کی کہانی ہے جنہیں نئے نظام کی تاریک راتوں نے جنم دیا ہے۔ مصنف نے آج کے سماج کے حسین چہروں سے پارسائی کے رنگین گھونگھٹ اُلٹ دیئے ہیں۔ قیمت صرف دو روپے۔

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے اُن مردوں کی کہانی جو عورت کو ایسے عریاں انداز میں دیکھنے کے تمنائی ہیں جس پر سے نظریں پھسل پھسل جائیں۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

زلف کے سر ہونے تک عشق، محبت اور حسن و شباب کی رعنائیوں اور زندگی کی مسرتوں اور حسرتوں کا سنگم۔ تین معصوم بھولی بھالی لڑکیوں اور تین بے سہارا لڑکوں کی حسین ترین کہانی۔ قیمت فی جلد صرف تین روپے۔

چاندنی کے سائے اس میں شبنم کی ٹھنڈک بھی ہے اور شعلے کی حرارت بھی۔ کتاب کو ایک بار شروع کرکے ختم کئے بغیر آپ کو چین نہ آئے گا۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

پیاسے بادل ایک پہاڑی دوشیزہ کے پیار کی کہانی۔ دلآویز رومان کی ایک دردانگیز داستان۔ قیمت دو روپے ۵۰ نئے پیسے۔

یادوں کے کھنڈر حیات کے نشیب و فراز کا آئینہ دار ناول جس میں جذبات اور آرزوؤں کا حسین طوفان مچل رہا ہے۔ قابل مصنف نے دل کی دھڑکنوں کو ایسے رنگ و انداز سے اُبھارا ہے کہ قلبی رفاقت اور خلوص پرور محبت کی تصویر نگاہوں کے سامنے جھکنے لگتی ہے۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

وادیاں اور ویرانے سوکھے سڑے میدانوں اور سرسبز و شاداب پہاڑوں کی حسین و جمیل کہانی۔ قیمت فی جلد چار روپے۔

زنجیر ایک گناہگار لڑکی کی حسین و جمیل داستان۔ عشق و محبت کی ایک ایسی پُرپیچ رومان پرور داستان جسے پڑھ کر آپ عش عش کر اُٹھیں گے۔ جسے زکی انور نے لکھا اور ادارہ "بیسویں صدی" نے شائع کیا ہے۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے

پگھلتے خواب اردو ادب کے جواں سال ادیب پروفیسر جلدی کاشمیری کا ایک دلچسپ رومانی ناول جس میں آپ کو کشمیر جنت نظیر کے حسین و دلفریب مناظر اور اُن مناظر تلے بہتی سسکتی کہانیوں کے خد و خال صاف دکھائی دیں گے۔ قیمت صرف دو روپے۔

نئے فرہاد پروفیسر شکیل الرحمٰن کا اچھوتا شاہکار ناول۔ ایک حسین و جمیل دوشیزہ کی المناک داستان۔ محنت و زر کی کشاکش کے پس منظر پر لکھی ہوئی ایک انتہائی دلچسپ کہانی۔ قیمت صرف دو روپے۔

راہیں شباب کی فرانس کے عظیم ترین ناول نگار آبے پریوس کا غیر فانی شاہکار جس کا ترجمہ دُنیا کی تمام زبانوں میں ہو چکا ہے جس کی دس کروڑ جلدیں فروخت ہو چکی ہیں، جسے عشق و محبت کی بے نظیر داستان تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس ناول کی ہیروئن قلوپطرہ اور ہیلن سے بھی زیادہ حسین اور عظیم ہے۔ مترجمہ جناب مخمور جالندھری۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

طوفانِ بہار روس کے عدیم المثال ناول نگار تورگنیف کا رومانی شاہکار جس کا ترجمہ دُنیا کی بیالیس زبانوں میں ہو چکا ہے۔ جسے دُنیا کے مشہور نقادوں نے لافانی رومان قرار دیا ہے اور جسے اردو میں پہلی مرتبہ ادارہ "بیسویں صدی" دہلی نے شائع کیا ہے۔ مترجمہ مخمور جالندھری۔ قیمت تین روپے۔

بھیگی راتیں فرانس کے عدیم المثال ناول نگار ایمل زولا کا مقبول ترین ناول انسان میں چھپے ہوئے حیوان کا افسانہ۔ اپنے محبوب کیلئے محبوبہ کی ناقابلِ فراموش قربانیوں کی کہانی۔ مترجمہ مخمور جالندھری قیمت فی جلد تین روپے۔

فریڈ مونی حقیقت اور طنز سے بھرپور عورتوں کے اُس دیش کی کہانی جہاں مرد کا تصور بھی ایک جرم تھا۔ صدیوں بعد کی فضاؤں میں لکھی ہوئی ایک عجیب غریب داستان جو اوّل سے آخر تک دلچسپیوں اور حیرت آفرینیوں سے لبریز ہے۔ جناب کوثر چاندپوری کا لکھا ہوا بے حد شوخ و دلچسپ ناول جو قاری کو کئی صدی آگے کی فضا میں پرواز کراتا ہے۔ قیمت فی جلد محض تین روپے۔

پتہ :- رسالہ بیسویں صدی - دہلی نمبر ۶

کے تمام وعدے جھوٹے نظر آنے لگے۔

"اوہ!" میں صرف اتنا ہی کہہ سکا۔ مجھے بہت افسوس ہے سمی! قسمت کبھی کبھی تو انسان سے بہت بڑا مذاق کرتی ہے۔ مجھے واقعی تم سے بہت ہمدردی ہے۔"

جواب میں وہ کچھ نہ بولی۔

دیر تک میرے کاندھے پر سر رکھے روتی رہی۔ میں اُسے تسلّی دینے کے لئے اُس کے بالوں کو آہستہ آہستہ سہلاتا رہا۔ وقت بے حد اُداس ہو گیا تھا۔

اس کے بعد وہ مجھے بہت دنوں تک نہ ملی۔ پھر ایک دن یونہی بیٹھے بیٹھے مجھے اُس سے ملنے کا خیال آگیا۔ طبیعت بہت اُداس تھی۔ رہ رہ کر نہ جانے کیوں سینے میں ایک ٹیس سی اُٹھتی تھی۔ موسم کی اُداسی کا اثر تھا شاید۔ ہوا میں ایک عجیب طرح کی خنکی تھی۔ آسمان پر گھٹائیں برسنے کے لئے بے تاب تھیں۔ میں سمی سے ملنے اُس کے گھر کی طرف چل پڑا۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی۔ پادری صاحب گھر پر نہیں تھے۔ مجھے دیکھ کر سمی ایک پھیکی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر لے آئی۔

"آپ!" وہ بولی۔ "آیئے!"

میں اُس کے قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ اُسی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "آپ بیٹھیے میں چائے کے لئے کہہ آؤں۔ میں سوچ ہی رہی تھی کہ آپ آ گئے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کی آغوش میں بیٹھ کر چائے پینا کیسا رہے گا؟" میں جواب میں صرف مسکرا دیا۔

دیر تک ہم باہر برآمدے میں بیٹھے چائے پیتے رہے۔ پھر پانی برسنے لگا۔ ہم اُٹھ کر اندر چلے گئے۔ اندر اندھیرا سا ہو رہا تھا۔ سمی نے شمعدان روشن کر دیا۔ کچھ عجیب طرح سے روشنی اور اندھیرے باہم مدغم ہو گئے۔ سمی بولی "تیز روشنی

غزل

کرشن موہن ایم اے

میں رہا ہمیشہ مٹا مٹا، وہ رہے ہمیشہ خفا خفا
میں تھا ان زدہ وہ تھے دلربا، وہ رہے ہمیشہ خفا خفا

مرے دل کو حسن کا تھا آسرا، وہ رہے ہمیشہ خفا خفا
اسی واسطے ہے مجھے گلا، وہ رہے ہمیشہ خفا خفا

شب و روز مجھ پہ ستم کیا، مرے دل کو رہن الم کیا
مرے حال پر نہ کرم کیا، وہ رہے ہمیشہ خفا خفا

نہ جنوں میں اب وہ فسوں رہا، نہ وفا میں کیف دروں رہا
مرے دل کو رنج فزوں رہا، وہ رہے ہمیشہ خفا خفا

یہ ہے میری قسمت نارسا، ہے درد کو نہ ملی دوا
میں کبھی نہیں انھیں پا سکا، وہ رہے ہمیشہ خفا خفا

مجھے ناز عجز و نیاز پر، انھیں فخر عشوہ و ناز پر
کہ وفا و فا ہے جفا جفا، وہ رہے ہمیشہ خفا خفا

مری زیست غم کا ہے سلسلا، مجھے اپنے بخت سے ہے گلا
نہ کبھی وفا کا صلا ملا، وہ رہے ہمیشہ خفا خفا!

مجھے اچھی نہیں لگتی۔ دھندلکوں میں کھوئے رہنا پسند کرتی ہوں۔"

باہر بارش کچھ تیز ہو گئی تھی۔

ہم خاموشی سے دیواروں پر تھرکتے ہوئے سایوں کو دیکھتے رہے۔ اس دوران میں وہ مجھ سے کچھ پوچھنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کرتی رہی۔

"سنیئے!"

خاموشیاں تھرتھرائیں۔

"ہوں!"

"آپ نے وہ انگریزی ناول 'لیڈی چیٹرلیز لَور' تو پڑھا ہوگا؟"

"ہاں!"

"کیسا لگا وہ آپ کو؟"

اُس کی آواز ایسی تھی جیسے کسی ویران کھنڈر میں کوئی سسک رہا ہو۔ اور ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز فضا میں لرز رہی ہو۔

باہر ہوا بہت تیزی سے چل رہی تھی۔ ہوا کی وجہ سے شمعدان میں جلتی ہوئی موم بتیوں کی لَویں کانپ رہی تھیں۔ دیواروں پر پڑتے ہوئے سائے تیزی سے دھڑک رہے تھے۔ اور دلوں پر پڑتی ہوئی پرچھائیاں گہری اور گہری ہوتی جا رہی تھیں۔

"سمی تم کیا کہتی ہو..... کیا کہنا چاہتی ہو؟" میں نے گناہ کے احساس سے تقریباً کانپتے ہوئے کہا۔

وہ سسک پڑی۔

"آپ یہ بھی نہیں جانتے میں کیا کہنا چاہتی ہوں۔ کیسے ماہرِ نفسیات ہیں آپ؟"

"لیکن سنو سمی! یہ ایک پاپ ہے! ایک گناہ!!"

میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

اُس کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک پڑے۔ بولی۔

"کیا پاپ ہے اور کیا پُن۔ یہ میں نہیں جانتی۔ میں تو صرف اُس آگ کو ٹھنڈا کرنا چاہتی ہوں۔ جو مجھے جلا کر خاک کئے دے رہی ہے۔ جو کسی محبت نہیں لینے دیتی۔ عورت ایک ماں ہے۔ تمام کائنات کی خالق!!

میں صرف اپنا وہ حق لینا چاہتی ہوں جو قدرت نے مجھے دیا ہے۔ کیا یہ گناہ ہے؟ اور اگر یہ گناہ ہے تو پھر ثواب کیا ہے؟"

"نہیں سمی!" میں نے نہایت پُرسکون آواز میں کہا۔ "یہ گناہ نہیں گناہ تو وہ ڈھنگ ہے جو اس کے لئے تم اپنانا چاہتی ہو۔ سوچو تو سہی اگر ایسا ہو بھی جائے تو کیا تمھیں یقین ہے کہ تمھاری یہ جلن ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی؟ کیا تم چاہو گی کہ جب تم زندگی کے حسین لمحوں میں ہنسنا چاہو تو زندگی کے حسین لمحے تمھارے لئے اذیت ناک ہو جائیں۔ گناہ کی پرچھائیں تمھارے اندر ایک جھلسا دینے والی جلن کو بیدار کئے رکھیں۔ اور پھر وہ خوشی بھی کیا خوشی جس پر چاروں طرف سے گناہوں کی پرچھائیاں پڑ رہی ہوں۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"تو پھر میں کیا کروں، کہاں جاؤں؟"

"سمی!" میں نے اُس کے قریب آتے ہوئے کہا۔ "کیا تم نے کبھی سوچا ہے، اس دنیا میں کتنی ایسی ننھی ننھی روحیں آتی ہیں جن کے سر پر کوئی سایہ نہیں ہوتا اور وہ وقت کی آگ میں مسکرانے سے پہلے ہی جھلس جاتی ہیں۔ تمھارے پاس ممتا کا ذخیرہ ہے تو کیوں نہ اُس کے سائے میں تم کم از کم ایک پھول کو جھلس جانے سے بچا لو۔ اپنے چاروں طرف نظریں دوڑا کر دیکھو۔ تمھیں نہ جانے کتنے پھول یتیم خانوں، انا تھالیوں میں مرجھاتے ہوئے نظر آئیں گے۔ کسی ایک کو اٹھا لو۔ اُس کی خوشبو تمھاری تمام اداسیوں میں مسکراہٹیں بکھیر دے گی!"

اپنی بات کہنے کے بعد ایک تانیئے کے لئے میں نے اُس کی طرف دیکھا طوفان تھم گیا تھا۔ اُس کی پلکوں پر لرزتے ہوئے آنسوؤں میں نئے خواب جھلملا رہے تھے۔ میں اپنے دل میں مچلتی ہوئی ایک دیرینہ خواہش کو دبا نہ سکا۔ آگے بڑھ کر میں نے اُن لرزتے ہوئے آنسوؤں کو چوم لیا۔

باہر بارش تھم گئی تھی۔

ایک پاکیزہ سا احساس لئے میں وہاں سے چلا آیا۔

اس بات کے کافی دنوں بعد وہ مجھ سے ملنے آئی۔ اُس کے ساتھ

ایک خوبرو نوجوان تھا۔ جس کے بازوؤں میں ایک خوبصورت سا بچہ تھا۔
اُن دونوں کے چہروں پر ایک نورانی مسکراہٹ تھی۔ جس کی جھلک آپ موسم بہار میں کھلتی ہوئی کلیوں کے لبوں پر دیکھ سکتے ہیں۔ ولیم نے نہایت گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ میں نے دیکھا اُس کی آنکھوں میں میرے لئے عقیدت کے آنسو جھلک رہے تھے۔

سمی میرے پاؤں چھونے کے لئے آگے بڑھی۔

"پگلی.....!"

میں نے کہا۔

اور نہ جانے کس جذبے کے تحت میں نے اُسے سینے سے لگا لیا۔

فضا خوشی کے احساس سے جیسے مُسکرانے لگی!

ان چند منصور

نگاہوں میں جو پھرتے تھے ہمیشہ
تصور بھی اب اُن کا بارسا ہے

نفس میں ہے فقط مطلب فغاں سے
غرض کیا؟ نارسا ہے یارسا ہے

گلہ اُن سے انھیں کی بے رُخی کا
عبث، بے فائدہ، بے کار سا ہے

کبھی آرام جاں تھا عشق اُن کا
مگر اب جان کا آزار سا ہے

اثر کیا ہو کسی کے دل پہ منصور
تری فریاد ہی جب نارسا ہے

شاھد کبیر

اجنبی تھے بھی خوشی گھبرا گئے
ہنستے ہی آنکھوں میں آنسو آ گئے

ذکر تھا میری وفاؤں کا فقط
بندہ پرور آپ کیوں شرما گئے

کٹ ہی جاتا زندگانی کا سفر
آپ میری راہ میں کیوں آ گئے

زندگی اِک آنسوؤں کا جام تھا
پی گئے کچھ اور کچھ چھلکا گئے

شعریت جاتی رہی اشعار سے
بزم سے شاہد وہ اُٹھ کر کیا گئے

کیف احمد صدیقی

ہر خوشی غم کے سانچے میں ڈھلتی رہی
زندگی روز پہلو بدلتی رہی

ٹھوکریں ہم محبت میں کھاتے رہے
زندگی رفتہ رفتہ سنبھلتی رہی

اصل میں زندگی زندگی ہے وہی
جو حوادث کے پہلو میں پلتی رہی

اُس طرف وہ نگاہیں بدلتے رہے
اِس طرف دل کی دُنیا بدلتی رہی

کیف امواجِ غم کا سہارا لیے
کشتیٔ عشق طوفاں میں چلتی رہی

عشرت دہلوی

ساتھ باطل ہی کا دیتا ہے زمانہ پیہم
ہے جو حق بات اُسے لوگ کہاں کہتے ہیں

لذتِ دردِ محبت کا کریں کیا اظہار
اِک خلش ہے جسے ہم راحت جاں کہتے ہیں
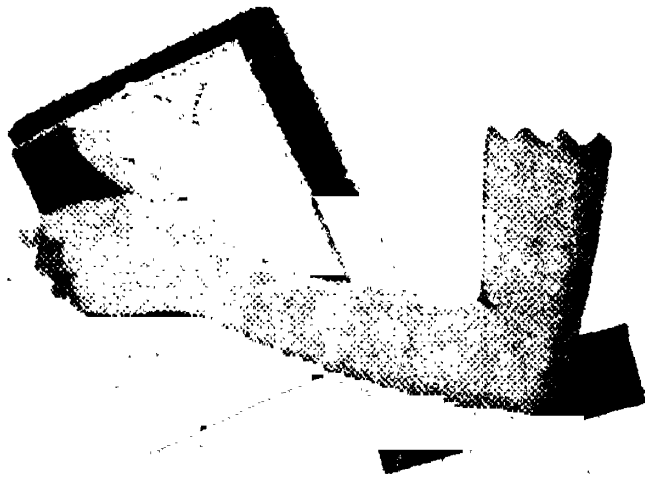
آزادی خطرے میں ہے۔
اپنی پوری طاقت سے اس کی حفاظت کیجئے۔
— جواہر لال نہرو
وسائل سوچ سمجھ کر صرف کریں
بھارت کے وسائل بہت قیمتی ہیں۔ یہ سارے کے سارے ملک کو مضبوط بنانے کے لیے صرف کئے جانے چاہئیں۔ یہی ان کا صحیح مصرف ہے یہی ایک طریقہ ہے جس سے ہم اپنی آزادی کو درپیش خطرے کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکتے ہیں۔ آزادی کی بھی ایک قیمت ہوتی ہے
کرنی ہے۔
آزادی کی حفاظت جی جان سے کریں

برما خلیفہ

جمیل الرحمٰن

[illegible]

[illegible]

برادرِ محترم! اسلام و خلوص

..... میں نے اس میں مزاح اور حزن کو ایک دوسرے میں ضم ہونے کی کوشش کی ہے۔ اُمید ہے کہ آپ کو افسانے کے پلاٹ اور تکنیک میں تنوع اور جدت کا احساس ہوگا.....

نیازمند ——— جمیل الرحمٰن

ورما ہوتے تو ایک بات بھی تھی، لیکن خلیفہ جی مسلمان تھے۔ اس لئے اُن کے ورما ہونے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ لوگ اُنھیں برما خلیفہ کہہ کر پکارتے تھے معلوم نہیں اُن کے نام کے ساتھ 'برما' کا کیا تعلق تھا۔ یوں خلیفہ جی خود کہا کرتے تھے کہ اُن کے آباو اجداد شاہانِ مغلیہ کے خاندانی درزی تھے۔ اور سارے شاہی ملبوسات انھیں کی نگرانی میں تیار کئے جاتے تھے۔ غدر کے بعد اُن کے جدِ امجد حضرت بہادر شاہ کے ہمراہ رنگون چلے گئے تھے۔ جہاں اُنھوں نے اچکنوں کے نئے نئے ڈیزائن تیار کئے تھے جو سارے برما میں بہت مقبول ہوئیں۔ بہادر شاہ کے انتقال کے بہت عرصہ بعد خلیفہ جی اپنے چچا کے ساتھ برما سے ہندوستان لوٹ آئے اور اسی شہر میں آ بسے۔ اُس وقت خلیفہ جی بہت کم عمر تھے۔ سلائی کٹائی ہنوز نہیں سیکھی تھی کہ چچا کا انتقال ہوگیا۔ اور سب سے پہلی چیز جو خلیفہ جی کے ہاتھوں سلی وہ اُن کے چچا کا کفن تھا۔ اُس دن سے آج تک خلیفہ جی نے سوائے کفن کے کوئی دوسری چیز کاٹی نہ سی۔ چار کوس کے اندر کوئی موت ہوتی تو برما خلیفہ کو بُلایا جاتا۔ خلیفہ جی اپنی بھاری بھرکم خاندانی قینچی

سنبھالے وہاں پہنچ جاتے۔ اور منٹوں میں کفن تیار ہو جاتا۔ یہی نہیں بلکہ تکفین سے لے کر تدفین تک سارے مراحل خلیفہ جی کی نگرانی میں انجام غسلِ میت کے وقت پڑھی جانے والی دُعائیں اُنھیں ازبر تھیں۔ جنازہ سلسلے میں کیا کیا چیزیں درکار ہوتی ہیں کہاں دستیاب ہوتی ہیں۔ اُن کو مقدار اور قیمت، گورکنوں کے پتے، جنازے کی نماز پڑھنے والوں کے الغرض اِن ساری باتوں کے وہ ماہر تھے۔ اور اُن کی مدد کے بغیر بیچارہ دار [illegible] تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ خلیفہ کا چھوٹا سا خاندان [illegible] [illegible] ایک بیوی اور ایک لڑکے احمد بخش پر مشتمل تھا۔ شروع شروع [illegible] [illegible] تھے تو ایک بیوہ کے کچے مکان میں کرایہ دار کی حیثیت سے رہتے تھے۔ لیکن بعد میں ایک سال ہیضہ کی وبا پھوٹ پڑی۔ شہر اور مضافات میں دھڑا دھڑ موتیں ہونے لگیں۔ خلیفہ جی کو دم مارنے کی فرصت نہ تھی۔ ہر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد کوئی نہ کوئی لقمۂ اجل ہو جاتا۔ اور [illegible] کی طلبی ہوتی۔ خلیفہ جی اپنی بھاری بھرکم قینچی اور بٹوہ سنبھالے روانہ ہو جاتے وہاں سے لوٹتے تو بٹوہ بھرا ہوا ہوتا۔ قینچی طاق پر رکھتے اور بیوی کے سا

بٹوہ کھول کر اُلٹ دیتے۔ رات کے بارہ بارہ بجے تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ بٹوہ اُنھی پیسے خرید کر لائے تھے۔ اُس کے آتے ہی یکایک آمدنی میں اِس قدر اضافہ ہوا کہ دو ماہ کے قلیل عرصے میں وہ کچا مکان اُنھوں نے بیوہ سے خرید لیا۔ اور مکان کے سامنے والی زمین بھی خرید لی۔ اُس پر اُنھوں نے امرود کے چند درخت بھی لگائے۔ الغرض یہ مکان اور امرودوں کا باغیچہ اُسی وبا کی یادگار تھے۔ بٹوے سے خوش اعتقادی کا یہ عالم تھا کہ خلیفہ جی ایک لمحہ کے لئے بھی اُسے خود سے جُدا نہ کرتے تھے۔ جب بھی کسی کی موت پر جاتے تو قینچی کے ساتھ بٹوہ بھی اُن کی جیب میں ہوتا۔ واپس آکر قینچی طاق پر رکھی جاتی۔ اور بٹوہ کھول کر اپنی بیوی کے سامنے اُلٹ دیتے۔ اُنھیں یقین تھا کہ اس بٹوہ کی برکت سے کبھی نہ کبھی پھر کوئی وبا ضرور آئے گی۔ اور اُن کے دن پھر پلٹیں گے۔

خلیفہ جی کو اپنی بچی امینہ سے بہت محبت تھی۔ بہت سی دُعائیں، خصوصاً جنازے کی نماز کے وقت پڑھی جانے والی دُعا اُنھوں نے اُسے بہت محبت سے یاد کرائی تھی۔ بچی بڑی ہوئی تو بڑا خلیفہ نے اپنے امرودوں کا باغیچہ رہن رکھ کر اُس کے ہاتھ پیلے کئے۔ اور امینہ اُسی شہر کے ایک دوسرے محلّے میں اپنا گھر بسانے چلی گئی۔ احمد البتہ بڑا نالائق نکلا۔ دن بھر محلّے کے لڑکوں کے ساتھ مارا مارا پھرنا۔ نہ پڑھتا، نہ لکھتا، نہ کوئی کام کاج ہی سیکھتا۔ خلیفہ جی کو اُس کی بہت فکر تھی۔ اکثر کہا کرتے

"بھیا! اس نالائق سے تو میں عاجز آگیا۔ سمجھاتے سمجھاتے تھک گیا۔ کہ کم از کم کفن تیار کرنا اور تجہیز و تکفین کے مسئلے تو سیکھ لے۔ کچھ تو روزی کا سلسلہ ہو جائے لیکن وہ تو سُنتا ہی نہیں۔ بارہا سمجھایا کہ آخر یہی تو ایک کاروبار ہے جو کبھی بند نہ ہوگا۔ حضرت آدم کے وقت سے لوگ مرتے آئے ہیں اور اللہ نے چاہا تو مرتے رہیں گے۔ بھیا! مجھے تو اب یہ فکر دامنگیر ہے کہ میں تو اب بوڑھا ہو چلا ہوں۔ کل کو اگر یہ سانس رُک گئی تو میرا یہ کفن کون تیار کرے گا۔ چار کوس کے اندر تو کوئی دوسرا شخص ایسا نہیں۔ اور پھر یہ بھی تو سوچئے کہ اگر مولا کی مرضی ہوئی اور کوئی وبا پھوٹ پڑی تو اکیلا میں کس کس کو ٹھکانے لگاؤں گا؟ ہائے کتنے روپوں کا نقصان ہوگا!"

"ہم لوگ تو دراصل پہلے کے تصوّر ہی سے کانپ اُٹھتے تھے لیکن خلیفہ جی تو فرشتۂ موت کے اہلکار تھے۔ اُنھیں ان باتوں سے بھلا کیا وحشت ہوتی فرشتۂ اجل کا کام جہاں پر ختم ہوتا وہاں سے خلیفہ جی کا کام شروع ہوتا۔ اور حضرت عزرائیل کے ہاتھوں شروع ہوا کارِ خیر خلیفہ جی کے ہاتھوں پایۂ تکمیل تک پہنچتا۔

لوگ کہتے ہیں کہ اب شرحِ اموات میں کمی آگئی ہے۔ لوگ کم مرتے ہیں۔ اب نہ طاعون کی گرم بازاری ہے نہ ہیضہ کی ہلاکت آفرینی! ملیریا کے خلاف حکومت نے محاذ قائم کر رکھا ہے۔ چیچک کے ڈر سے لوگ ٹیکے لگواتے پھرتے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ شرحِ اموات کے ساتھ خلیفہ جی کی آمدنی میں بھی بڑی کمی آگئی۔ امرود کے باغیچے کو رہن سے چھڑانے کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا نظر نہیں آتا تھا۔ بڑی شکلوں سے گزارہ ہو رہا تھا۔ بنیے کا قرضا سر چڑھ آیا تھا۔ جلد کوئی اُدھار دینے کو رضامند نہ تھا۔

ایک دن سویرے سویرے خلیفہ جی شکور میاں کی دُکان پر دھمکے۔ شکور نے ابھی ابھی دُکان کھولی تھی۔ سویرے سویرے خلیفہ جی پر نظر پڑی تو جی دھک سے رہ گیا۔ الٰہی خیر! آج صبح ہی صبح بڑا خلیفہ پر نظر پڑی ہے! بڑا خلیفہ کا موت، میّت، کفن اور جنازے کے ساتھ کچھ ایسا چولی دامن کا ساتھ تھا کہ سویرے سویرے لوگ اُنھیں دیکھنا بُرا شگون سمجھتے تھے۔ بے چارہ شکور خاموشی سے اُنھیں دیکھتا رہا۔ خلیفہ جی غصّے سے بھُوت ہو رہے تھے۔

"ذرا دیکھنا شکور میاں! اس عبدل میاں کی حرکت، جارا نے سوا آنا اور آدھ سیر آلو اُدھار دینے کو تیار نہیں۔ سمجھتا ہے جیسے اُسے موت نہیں آنی ہے۔ تُف ہے مجھ پر اور میری اوقات پہ اگر میں اُس کا کفن تیار کردوں۔ منگا لیگا کفن جاپان سے غسّال کا بل سے!"

پھر شکور کی دُکان پر رکھے ہوئے اسٹول پر بیٹھ گئے۔

اور بولے۔

"کوئی تندرست اور جوان ہے تو بلا سے۔ موت آتی ہے تو کمزور، تندرست، بوڑھا اور جوان کب دیکھتی ہے۔ اب دیکھو شکور میاں!

تم تو عمر میں مجھ سے بہت چھوٹے ہو اور تندرست بھی ہو لیکن اس کا بھلا کیا ٹھکانا کہ تم کب چل بسو۔ اور تمھاری مٹی منزل میرے ہی ہاتھوں . . . "

شکور کانپ گیا۔

"خدا کے لئے خلیفہ جی سویرے سویرے یہ بد دعا تو نہ دو۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں!"

خلیفہ جی نے شکور کو حیرت سے دیکھا۔ جیسے ان کی سمجھ میں بات نہ آئی۔ بولے۔

"بھئی اس میں بد دعا کی کیا بات ہے۔ موت کا جو دن اور وقت مقرر ہے وہ تو ٹلنے سے رہا۔ دعا یا بد دعا سے اس میں کوئی کمی بیشی تھوڑی ہو سکتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہونے سے کیا ہوتا ہے! کیا خبر کہ تم سے پہلے انھیں کا بلاوا آجائے!"

شکور میاں نے اپنی جان کا چھٹکارا اسی میں سمجھا کہ جلد از جلد آدھ سیر آٹا اور آدھ سیر آلو خلیفہ جی کے حوالے کرکے انھیں رخصت کیا جائے۔ اس نے فوراً وہ چیزیں تول دیں اور پیسے ادھار کھاتے میں خلیفہ جی کے نام لکھ لئے۔

ایک عرصہ تک جب شکور کو پیسے نہ ملے تو آخر اس نے ایک دن خلیفہ کو ٹوک ہی دیا۔

"خلیفہ جی! تمھارے نام سات روپے دس آنے بقایا کے نکلتے ہیں میں ایک چھوٹی پونجی کا دوکاندار ہوں۔ ذرا تم یہ رقم ادا کر دیتے تو بہت اچھا ہوتا۔"

خلیفہ جی بولے۔

ارے یار! کیوں بے صبر ہوا جاتا ہے۔ پیسے ہاتھ میں آگئے تو سب سے پہلے تیرا بقایا ادا کروں گا۔ اور ہاں اگر اس درمیان میں تو مر گیا تو آکر مفت کفن سلوا لینا۔ تیرا بقایا ہے نا میرے ذمے۔ تجھ سے پیسے نہ لوں گا۔ آکر مفت کفن سلوا لینا۔ گویا مرنے کے بعد مردے خود آکر کفن سلوایا کرتے ہیں۔

شکور کو غصہ آگیا۔ یہ کیا ہر وقت مرنے کی دعائیں مانگا کرتے ہو خلیفہ! نہ وقت دیکھتے ہو نہ موقع۔ مجھے میرے پیسے چاہئیں۔ جلد ادا کر دو ورنہ پھر ادھار نہ دوں گا۔

خلیفہ جی کو بھی غصہ آگیا۔

اکڑ کر بولے۔

"لے جا جا۔ ادھار نہ دے گا۔ میں بھی دیکھوں گا کہ تیرا کفن کون

آنکھیں

بھر دو انھیں جلووں سے یا آگ لگا دو تم	
آنکھیں بھی تمہاری ہیں سینہ بھی تمہارا ہے	جگر
بھری محفل میں ہر اک سے بچا کر	
تری آنکھوں نے مجھ سے بات کر لی	فراق
کہانی ہے تو اتنی ہے فریبِ خوابِ ہستی کی	
کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے	سیماب
محروم ہے اب تک ترے دیدار سے حسرت	
آنکھوں کی یہ پابندیِ آداب کہاں تک	حسرت موہانی
آنکھ سے آنکھ لڑی پر مجھے ڈر ہے دل کا	
کہیں یہ جائے نہ اس جنگ و جدل میں مارا	ذوق

تیار کرے گا۔ کیا تو آبِ حیات پی کر آیا ہے یا تیرے گھر میں کوئی اور . . ."

"کیا بک بک لگا رکھی ہے تم نے!" شکور بگڑ گیا۔

خلیفہ بولے۔

"بک بک کی کیا بات ہے یار! آخر سب کو مرنا ہی ہے۔ انسان وہی ہے جو ہمیشہ اپنی موت کو اپنی نظر کے سامنے رکھے۔ مجھے تو حیرت ہوتی ہے کہ لوگ اپنے مرنے کے تصور سے خوف زدہ کیوں ہو جاتے ہیں

ملک کے مایۂ ناز ادیبوں کے لکھے ہوئے دلچسپ شاہکار

آج کی بات آپ کے محبوب افسانہ نگار جناب جگدیش بل کے دلچسپ بلند پایہ افسانوں کا حسین مجموعہ جن کے کرداروں کے قہقہوں اور آنسوؤں کو آپ اپنے قہقہے اور اپنے آنسو سمجھنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے

جو عورت ننگی ہے نامور فنکار رام لعل کی رومان پرور اور تلخ کہانیوں کا حسین مجموعہ۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

میرے سپنے نامور افسانہ نگار خاتون پروفیسر کرشنا کماری ایم اے کے بہترین دلچسپ رومانی افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت فی جلد صرف تین روپے۔

سنگھار کمرے میں پروفیسر کرشنا کماری ایم اے کے بہترین دلچسپ رومانی افسانوں کے اس مجموعے کے ہر صفحے پر جذبات کا ایک محشر انگڑائیاں لے رہا ہے۔ قیمت دو روپے

دُکھتی رگیں یہ افسانے نہیں جوانی کا اضطراب ہے، حسن کی بیکلی ہے، عشق کی بیقراری ہے مصنف جناب شیخ مظفر زیدی۔ قیمت فی جلد دو روپے۔

ایک حمام میں تین ننگے زندگی کی عریاں تصویریں۔ وقت کی دُکھتی ہوئی رگ پر سعید امرت کی فنکارانہ ضرب۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

کالی راتیں سعید امرت کے افسانوں کا تازہ ترین مجموعہ۔ تشنہ جوانیوں کے اندھے جذبات کی ترجمان۔ بہکے ہوئے بڑھاپے کی ہوسناکیوں پر طنز ہیں اور کالی راتوں میں رینگنے والے گناہوں پر ضرب کاری ہیں۔ قیمت فی جلد تین روپے۔

یہ لڑکیاں رنگ رنگ کی شوخ و شنگ لڑکیوں کے جذبات و احساسات کی تصویریں۔ اختر بلیح آبادی کے افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت فی جلد تین روپے۔

عورت ایک پہیلی کیا عورت واقعی ایک پہیلی ہے؟ سمجھ میں نہ آنے والی پہیلی؟ اس کا جواب آپ راج کنول کے سولہ دلکش رومانی افسانوں میں پائینگے قیمت فی جلد صرف تین روپے۔

پوسٹ مارٹم عرش ملسیانی کے مزاحیہ افسانوں اور مضامین کا حسین ذیلی مجموعہ جس میں مسکراہٹوں اور قہقہوں کی ایک دنیا آباد ہے۔ قیمت سوا دو روپے۔

سیاہ تاج محل موہن یادو کے افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت تین روپے۔

فردوس اردو ناول نگاری کی تاریخ میں ایک کامیاب قدم اضافہ مصنف ... اس کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گیا اور اب دوسرا ایڈیشن قارئین کے اصرار پر نہایت آب و تاب سے شائع کیا گیا ہے۔ قیمت فی جلد دو روپے۔

۱۸۵۷ء کی دلی جناب بھیشور دیال نے اس میں تاریخی ناکوں کے واضح نقوش کو ایک پُر کیف داستان کے روپ میں پیش کیا ہے۔ جس میں آپ حسن و شباب کی رنگینیوں ہی سے نہیں، جذبۂ حب الوطنی، ایثار، اخوت و محبت اور رواداری کے چشموں سے بھی سیراب ہونگے۔ دلی کی ٹکسالی زبان، محاورے کی رسیلی دل موہ لینے والی زبان کی حلاوت آپ کچھ جناب بھیشور دیال ہی کے زورِ قلم میں پائیں گے کیونکہ یہ ان کی اپنی مادری زبان ہے۔ قیمت فی جلد صرف تین روپے۔

ڈارلنگ جناب نریش کمار شاد کے منتخب طبع زاد افسانوں کا بے مثل اور حسین و جمیل مجموعہ۔ قیمت دو روپے ۵۰ نئے پیسے۔

سرخ حاشیے اردو کے مشاہیر ادیبوں کے دلچسپ لطیفے۔ قیمت دو روپے پچھتر نئے پیسے۔

راکھ تلے غیر ملکی افسانہ نگاروں کے شاہکار افسانے ہندستانی لباس میں قیمت دو روپے۔

مالوا میکسم گورکی کے شہرۂ آفاق ناولٹ کا ترجمہ۔ قیمت ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے۔

سیاہ پوش خاتون یہ ایک دلچسپ اور ولولہ انگیز ناول ہے جو بیک وقت رومانی بھی ہے اور جاسوسی بھی۔ ایک پُراسرار سیاہ پوش خاتون کی کہانی حصہ اول دو روپے، دوم چار روپے۔

شہرِ دل جناب محسن زیدی کی غزلوں کا حسین انتخاب۔ محسن زیدی نے شہرِ دل کو آرزوؤں کی نوخیز کلیوں سے سجایا ہے۔ قیمت صرف دو روپے۔

سفینۂ و ساحل جناب عزیز وارثی کا مجموعۂ کلام، ان کی شاعری میں اتنی توانائی، قوت اور دلآویزی ہے کہ نسلوں تک فراموش نہ کیا جا سکے گی۔ قیمت صرف چار روپے

گلِ رعنا جناب برج لال جگی رعنا کا تازہ مجموعۂ کلام جو موجودہ دور کی بہترین شعری خوبیوں سے مزین ہے جس کے مطالعہ کے بعد آپ یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ گلِ رعنا واقعی بہترین شعری مجموعہ ہے۔ قیمت ساڑھے تین روپے۔

پتہ:- رسالہ بیسویں صدی دہلی نمبر ۶

اور اپنے عزیزوں کی موت پر روتے کیوں ہیں۔ مجھے تو کسی کی موت پر کبھی رونا نہ آیا۔ کسی کے مرنے پر روئے وہ جسے خود مرنا نہ ہو۔"

اور یہ حقیقت تھی کہ کسی کی موت پر خلیفہ جی کی آنکھوں سے کبھی ایک قطرہ بھی آنسو کا نہ ٹپک سکا تھا۔ بچے کی لاش پر بین کرتی ہوئی سوگ وار ماں کی دلدوز چیخیں، شوہر کی میت کے سرہانے در و دیوار سے سر ٹکرانے والی نوجوان بیوہ کی آہ و بکا، مُردہ باپ سے لپٹے ہوئے چھوٹے چھوٹے بچوں کی گریہ وزاری، خلیفہ جی کے سینے میں کبھی کوئی ہُوک نہ اُٹھا سکی۔ موت کی خبر اُن کے کانوں میں بینکر پیسوں کی جھنکار بن جاتی۔ ایسی خبر اُن کی آنکھوں میں ایک چمک، اُن کے چہرے پر ایک کرختگی، اور اُن کے ہونٹوں کے دونوں کناروں پر ایک موہوم سے تبسم کا انداز پیدا کر دیتی۔ ایک مشین کی طرح اُن کا ہاتھ طاق پر رکھی ہوئی قینچی کی طرف بڑھ جاتا۔ اور دوسرے ہاتھ کی گرفت جیب میں پڑے ہوئے بٹوے پر مضبوط ہو جاتی!

برما خلیفہ جمعہ کی نماز پڑھ کر مسجد سے باہر نکل ہی رہے تھے کہ شکور میاں سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ چھوٹتے ہی شکور میاں پیسوں کا تقاضا کر بیٹھے۔ شکور کا اس طرح سینکڑوں لوگوں کے سامنے تقاضا کرنا برما خلیفہ کو بہت بُرا لگا۔ اُس روز رات گئے تک وہ اپنی بیوی سے اپنے مالی حالات کے متعلق باتیں کرتے رہے۔

"کیا شب و روز آن لگے ہیں۔ لوگ مرنے میں بھی کنجوسی کرنے لگے۔ کوئی بھوکا رہے یا بھاڑ میں جائے، دوکانداروں کے تقاضے سہے لیکن لوگوں کو تو اپنے جینے سے مطلب۔ ہائے کیا خدا کی شان ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے موت بھی کہیں جا مری۔ اگر دو ایک دن اور آمدنی کی کوئی صورت نہ نکلی تو شکور سے آنکھیں ملانے میں جھجک محسوس ہوگی۔"

بیوی نے جمائی لی۔

اُسے نیند آ رہی تھی۔ بولی۔

"تو جی ایسا کام جو دوسروں کی موت کا محتاج ہو۔ میں کہتی ہوں تم کوئی اور کام شروع کیوں نہیں کرتے؟"

خلیفہ کو بیوی کی بات سُن کر تاؤ آگیا۔

"دوسرا کام ڈھونڈوں؟ اور اب عمر میں کوئی دوسری بیوی ہی کیوں نہ تلاش کر لوں؟ اری نیک بخت! اس بڑھاپے میں مجھ سے دوسرا کام کیا ہو سکے گا۔ لیکن تو اللہ کی رحمت سے کیوں مایوس ہوئی جاتی ہے۔ اگر اُس کی مرضی ہو تو ہوا کے ایک جھونکے کے ساتھ شہر کی آدھی آبادی تباہ ہو جائے۔ ہمارا یہ مکان دومنزلہ عمارت بن جائے۔ اور دکان کا باغیچہ ہرا بھرا ہو جائے۔ اور شکور... شکور کو بس..."

"توبہ توبہ!"

بیوی نے کانوں پر ہاتھ دھر لیا۔

پھر انھیں خوش آئند تصورات میں کھوئے خلیفہ جی نیند کی آغوش میں چلے گئے۔

صبح ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی کہ خلیفہ جی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے۔ کوئی زور زور سے دروازے کی کُنڈی کھٹکھٹا رہا تھا۔ ایسے وقت تو کوئی شخص کسی دوسری غرض سے نہیں آ سکتا۔ یقیناً اللہ تعالیٰ کو اُن کی بے بسی پر رحم آگیا ہے۔ اُن کی نگاہ طاق کی طرف گئی۔ جہاں لالٹین کی دھیمی روشنی میں قینچی پڑی جیسے مسکرا رہی تھی۔

جلدی سے اُٹھ کر اُنھوں نے دروازہ کھول دیا۔

سامنے امینہ کا بڑا لڑکا کھڑا تھا۔

اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ وہ خلیفہ کو دیکھتے ہی لپٹ گیا۔

"نانا جی! اماں رات چل بسیں!"

خلیفہ پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔

اُن کی سمجھ میں شاید کچھ نہ آیا۔ آنکھوں میں وہی جانی پہچانی چمک پیدا ہوئی۔ چہرے پر وہی کرختگی طاری ہو گئی۔ اور ہونٹوں کے دونوں کنارے پھڑپھڑا کر ایک بھیانک تبسم کا انداز پیدا کرنے لگے۔ نیم شعوری طور پر اُن کا ہاتھ طاق کی طرف بڑھ گیا۔

دن بہت چڑھ آیا تھا جب خلیفہ گھر لوٹے۔ اُن کی آنکھوں سے

سو کا کوئی قطرہ نہ ٹپکا۔ گھر میں داخل ہوتے ہوئے اُن کی نظر بیوی پر پڑی
غم سے نڈھال زمین پر پڑی سسک رہی تھی۔ انھوں نے قینچی طاق پر
لدی اور بیوی کے نزدیک کھٹولے پر بیٹھ کر اُسے کھوئے کھوئے سے
راز سے تکنے لگے۔ اُن کا بایاں ہاتھ جیب میں پڑے ہوئے بٹوے کو ٹٹولنے
لگا۔ غیر شعوری طور پر انھوں نے جیب سے بٹوہ نکالا۔ اُسے کھولا اور
وی کے سامنے اُسے اُلٹ دیا۔ ہمیشہ وہ ایسا ہی کرتے آئے تھے۔
لیکن آج بٹوے سے کوئی پیسہ نہ گرا۔

وہ حیرت سے خالی بٹوے کو گھورتے رہے۔ اور پھر یکایک جیسے
ان کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا ہو۔ جیسے انھیں کچھ یاد آگیا تھا۔ مرنے
والی اُن کی اپنی بچی تھی۔ اُن کی اپنی امینہ! چھوٹی چھوٹی سی۔ بھولی بھالی
معصوم بچی! جو بچپن میں اپنی توتلی زبان سے انھیں بابا! بابا! کہہ کر پکارتی
تھی، جسے وہ بہت پیار کرتے تھے۔ جسے وہ اپنے کندھوں پر بٹھا کے
بازار کی سیر کرایا کرتے جو اتنی ذہین تھی کہ اُن کی یاد کرائی ہوئی ساری
دُعائیں بہت کم سنی میں ازبر کر گئی تھی۔ جو بڑی ہو کر اُن کی روٹیاں
سینکتی تھی۔ جس کے ہاتھ پیلے کرنے میں انھوں نے اپنا امرودوں
کا باغیچہ رہن رکھ دیا تھا۔

جو سسرال جاتے ہوئے اُن کے سینے پر سر رکھ کر بلک بلک کر
روئی تھی۔ .... آج وہ اپنی اُس پیاری بچی کو، اپنے لختِ جگر کو قبر
کے اندھیرے میں چھوڑ آئے تھے۔

ماضی کے سارے واقعات یکایک اُن کی نظروں کے سامنے
سے گزر گئے۔

پھر یکایک اُن کے چہرے کی کرختگی پگھل گئی۔ آنکھوں کی چمک
سیال قطروں میں تبدیل ہونے لگی۔

ہونٹوں کی پھڑپھڑاہٹ ہچکیوں میں بدل گئی۔

برماخلیفہ نے اپنا خالی بٹوہ زمین پر پھینک دیا۔ اور اپنا چہرہ
دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ مامتا
کا وہ اتھاہ سمندر جس کے کناروں سے کبھی ایک قطرہ بھی نہ رِستا
تھا، آج کناروں کو توڑ کر اُن کی آنکھوں سے بہہ نکلا تھا۔ امینہ کی موت
کے صدمے نے جیسے اُس دھارے کا بند توڑ دیا تھا اور برماخلیفہ جو کبھی
کسی کی موت پر ایک آنسو بھی نہ گرا سکے تھے آج اُس دھارے پر ایک تنکے
کی طرح بہے جا رہے تھے ---!!

منی آرڈر بھیجتے وقت کوپن منی آرڈر پر ضرور تحریر فرمائیے کہ رقم کس سلسلے میں بھیجی گئی ہے۔ تاکہ تعمیلِ ارشاد میں دیر نہ ہو۔ خط و کتابت کرنے اور منی آرڈر بھیجنے کے لئے پتہ "رسالہ بیسویں صدی دہلی نمبر ۶" لکھنا کافی ہے۔ (مینیجر)

غزلیں

مسعود عالم بستوی بی کام

جب ترا عارضِ تاباں دیکھا
ایک مہتابِ درخشاں دیکھا

اِک شگفتہ گُلِ تر ہو جیسے
آج اُن ہونٹوں کو خنداں دیکھا

جُرأتِ عرضِ شکایت نہ ہوئی
جب اُنھیں خود ہی پشیماں دیکھا

خونِ مفلس ہے وہ روغن جس سے
رنگ محلوں میں چراغاں دیکھا

اُن کا اندازِ تبسم اکثر
غنچہ و گُل میں نمایاں دیکھا

بچ گئے جو غمِ دوراں سے اُنھیں
مبتلائے غمِ جاناں دیکھا

اخلاق سمراقی

ماہ و انجم ہیں لرزہ بر اندام
کون یہ آ گیا ہے برسرِ بام

غمِ دوراں سے انتقام لیا
تیرے غم کو بنا کے کیفِ دوام

اے شبِ ہجر کیا ارادہ ہے
ہر نفس لے رہا ہے اُن کا نام

اُن کی آنکھوں سے پی رہا ہوں مَیں
یہ مری مے کشی نہیں ہے حرام

ذرّے ذرّے میں ہیں وہ جلوہ نما
ہو نہ جائے مری نظر بدنام

فیض یہ رازِ احسنی کا ہے
ورنہ اخلاق اور زورِ کلام

قطعہ

ضیا مضطرب

ذوقِ نظر کو خوابِ زلیخا نہ کیجئے
مہنگا پڑے گا پیار کا سودا نہ کیجئے
ہر آرزو حریفِ سکوں ہے یہاں ضیا
مر جائیے کسی کی تمنا نہ کیجئے

ہندی نئی صدی

اپنے شہر کے جن ایجنٹ اخبارات سے آپ "بیسویں صدی" حاصل کرتے ہیں، اُنہی ایجنٹوں سے آپ ہندی رسالہ "نئی صدی" ۵۰ نئے پیسے فی کاپی کے حساب سے خرید سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ تمام ویلر بک اسٹال، ایچ گلاب سنگھ اینڈ سنز ریلوے بک اسٹال اور مدراس کے تمام ریلوے بک اسٹال اسے فروخت کرتے ہیں۔ اس میں پاکیزہ افسانوں، سماجی اصلاحی کہانیوں کے علاوہ دلچسپ رنگین کارٹون اور روزمرہ گھریلو زندگی میں کام آنے والے مفید مضامین شائع ہوتے ہیں۔ آپ یقیناً "نئی صدی" کو ایک بار خرید کر اس کے مفید گھریلو مضامین سے مستفید ہوں گے۔ اور اسے دوسرے ہندی رسالوں پر ہمیشہ ترجیح دیں گے اور اس کی کاپیاں سنبھال کر رکھیں گے۔ مستقل خریداروں کے لئے خاص رعایت "نئی صدی" کی قیمت فی کاپی ۵۰ نئے پیسے اور سالانہ قیمت مبلغ سات روپے مقرر ہے آج ہی سالانہ قیمت بذریعہ منی آرڈر بھیجکر یا رسالہ بذریعہ وی۔ پی بھیجنے کی اجازت دے کر اس کے مستقل خریدار بن جائیں مستقل خریداروں سے قیمتی خاص نمبر کی قیمت جدا نہیں لی جاتی۔ بلکہ سات روپے کی قلیل رقم میں قیمتی خاص نمبر بھی دیئے جائیں گے۔ سالانہ قیمت بذریعہ منی آرڈر بھیجنے میں آپ کو ۵۶ نئے پیسے کا فائدہ ہے۔

مینیجر نئی صدی - دریا گنج - پوسٹ بکس نمبر ۱۳۴۳- دہلی

رام لعل کے دو قابلِ قدر افسانوی مجموعے جنہیں نہ صرف پڑھنے والوں اور نقادوں نے سراہا بلکہ حکومت اتر پردیش نے بھی انہیں بہترین تخلیقی کارنامے تسلیم کرتے ہوئے بالترتیب پانچ سو اور اڑھائی سو کے گرانقدر انعامات سے سرفراز کیا۔

(۱) گلی گلی ــــ قیمت چار روپے (۲) نئی دھرتی پرانے گیت ــــ قیمت اڑھائی روپے

ٹین فون کی کہانی	۲/-	گردِ کارواں (کنھیالال کپور)	۳/-
مصنوعی سیارے	۱/-	نظر بند	۱/۲۵
لقمان نے کہا	۳/-	دھرتی کے دیو	۲/-
ہمارے زمانے کیلئے کارآمد فلسفہ	۵۰/-	سوشلزم	۲/-

ملنے کا پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی - دہلی نمبر ۶

دلچسپ نئی کتابیں

سنگ و خشت اُردو ادب میں طنز نگاری کے میر کارواں پروفیسر کنھیالال کپور کے طنزیہ مضامین کا مجموعہ۔ قیمت صرف دو روپے ۵۰ نئے پیسے۔

چنگ و رباب پروفیسر کنھیالال کپور کے مزاحیہ اور طنزیہ مضامین کا دوسرا مجموعہ قیمت صرف دو روپے ۵۰ نئے پیسے۔

ابراہیم لنکن امریکہ کے محبوب ترین صدر کی سوانح عمری جس نے غلامی کا خاتمہ کیا اور مساوات اور آزادی کو انسان کا پیدائشی حق قرار دیا قیمت ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے

رُدی بہرو جسمانی معذوریوں پر قوت عمل کی فتحیابی کی کہانی۔ ایک نابینا بچے کی کتابی کوششوں کا نتیجہ۔ قیمت تین روپے ۲۵ نئے پیسے۔

نُور ایک قاصد کو اپنے اندر جاذبیت اور دلکشی پیدا کرنے کے لئے کیا کیا امثال قربانیاں دینی پڑیں۔ قیمت صرف دو روپے ۵۰ نئے پیسے۔

آرزو کی کلیاں امریکہ کے شہرہ آفاق ناول نگار جان ہلٹن بیگ کے دو مختصر ناولوں کا حسین ترجمہ قیمت ایک روپیہ پچھتر نئے پیسے۔

دُنیا کے مشہور سائنس داں یہ کتاب آپ کو ان سائنس دانوں کی زندگیوں سے روشناس کرائے گی جنہوں نے نسل آدم کو ترقی کے موجودہ زینے پر پہنچایا۔ قیمت صرف دو روپے پچیس نئے پیسے۔

اپنی منزل اپنی راہیں رحیم سرویاں کا بہترین ناول جس کی فلم بنی تو ساری دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ انسان کے دُکھ سُکھ کی کہانی۔ قیمت صرف دو روپے ۵۰ نئے پیسے۔

شکستِ ظلمت یہ ایک اندھی عورت ہیلن کیلر کا افسانۂ زندگی ہے جس نے اپنی انگلیوں سے آنکھوں کا کام لیا اور دُنیا سے اپنی ذہانت کا لوہا منوایا۔ قیمت ایک روپیہ ۷۵ نئے پیسے۔

مابی ڈک ہرمن میلول کا مایۂ ناز شاہکار۔ آسمانِ ادب کا جگمگاتا تارا قیمت چار روپے

سائنس کی دُنیا یہ کتاب آپ کو سائنس کی ہر پیچیدگی کو سمجھنے میں مدد دے گی۔ آج دنیا میں کوئی بھی انسان سائنس سے بے بہرہ نہیں رہ سکتا مصنف ولیم اتھ کر وزر مترجم ایم ایم بیگ۔ قیمت فی جلد صرف تین روپے۔

ملنے کا پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی دہلی نمبر ۶

افواہیں

جہاں گرد کے قلم سے

جہاں گرد چاروں کھونٹ گھومتا ہے۔ افواہیں جمع کرتا ہے۔ اُسے افواہیں جمع کرنے کا جنون ہے۔ جنون اس لیے ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ جنون کے پیچھے ہوش ہوتا ہے۔ افواہوں کے پیچھے تلخ حقیقتیں ہوتی ہیں۔

کُتّا کرپٹ ہوگیا

بمبئی کی خفیہ پولیس کے اعلیٰ حلقوں میں ایک سراغ رساں کتّے کے متعلق یہ افواہ پھیلی ہوئی ہے کہ وہ کرپٹ ہو گیا ہے۔ اور اب ایمانداری سے کام نہیں کرتا۔ کہا جاتا ہے کہ ٹونی (یہ اس سراغ رساں کتّے کا نام ہے) بمبئی سی آئی ڈی کا ایک پرانا، ماہر اور قابلِ اعتماد کتّا تھا۔ اور اُس نے اپنی ناک کی بے پناہ طاقت سے بڑی بڑی پیچیدہ چوریوں کا سراغ لگایا تھا۔ لیکن پچھلے دنوں ایک فلم ایکٹر کے ہاں جب لاکھوں روپے کی چوری ہوئی تو ٹونی نے اس کیس میں مدد دینے سے انکار کر دیا۔ پھر جب اُس پر زیادہ دباؤ ڈالا گیا تو وہ چور کے قدموں کے نشانات سونگھنے پر آمادہ تو ہو گیا لیکن وہ پولیس افسروں کو بار بار غلط مقامات کی طرف لے گیا۔ اور اُس نے جان بوجھ کر انھیں دھوکا دینے کی کوشش کی۔ افواہ ہے کہ چوروں کی طرف سے ٹونی کو رشوت دی گئی ہے۔ چنانچہ ایک دن وہ نہایت اعلیٰ اور نفیس پکا ہوا گوشت چوری چھپے کھاتے ہوئے دیکھا گیا۔ شبہ کیا جا رہا ہے کہ یہ گوشت اُسے چوروں کی طرف سے بطورِ رشوت دیا جا رہا ہے۔ کتّے کا انسان کی طرح کرپٹ ہو جانا حیرت ناک ضرور ہے۔ لیکن ماہرین کا خیال ہے کہ صحبت کا اثر ضرور پڑتا ہے۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ کتّے کو کرپٹ کرنے میں ایک معزز کانگریسی کا ہاتھ ہے۔ جو چوری کے سال کا رہا گیا ہے۔ کرپٹ ٹونی کو دوسرے کتّوں سے الگ رکھا جا رہا ہے۔ تاکہ دوسرے کتّے اس کے اثرات سے محفوظ رہیں۔

مکھی نے گرفتار کرادیا

شہد کی ایک مکھی نے پولیس میں رپورٹ درج کرائی جس کے نتیجے میں ایک بہت بڑے سیٹھ کو حوالات کی ہوا کھانی پڑی۔ شہد کی اس مکھی کی شکایت یہ نہ تھی کہ اُس نے ملزم کی گردن پر کاٹا اور ملزم سیٹھ نے مُکا مار کر اُسے نیم جاں کر دیا۔ اور نہ اُس نے یہ رپورٹ لکھوائی کہ سیٹھ جی اُس کی امانت میں خیانت کر گئے۔ نہیں، رپورٹ اس سے بالکل مختلف تھی۔ یہ سیٹھ شہد کا بہت بڑا سوداگر تھا۔ اور کئی سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کو شہد سپلائی کیا کرتا تھا۔ اچانک ایک دن شہد کی یہ مکھی اُس سیٹھ کے گودام میں داخل ہوئی جہاں شہد کا بہت بڑا اسٹاک تھا۔ مکھی نے ہر ٹین کا شہد چکھا تو اُسے معلوم ہوا اس شہد میں ملاوٹ ہے۔ کیونکہ شہد کی مکھی خالص شہد کو پہچاننے میں یدِ طولیٰ رکھتی ہے۔ چنانچہ اُس مکھی نے تھانے میں رپورٹ لکھوائی اور سیٹھ جی گرفتار کر لیے گئے۔

بیچارا کارل مارکس

پچھلے دنوں رُوس اور چین کے درمیان ماسکو میں نظریاتی اختلافات

دور کرنے کے لئے جو ہفتہ بھر میٹنگ ہوتی رہی اُس میں ایک عجیب انکشاف ہوا۔ جب ایک رُوسی نمائندہ چینی ڈیلی گیشنوں کو کارل مارکس کی کتاب داس کیپٹل میں سے کچھ اقتباسات سُنا رہا تھا۔ تو ایک چینی ڈیلی گیٹ نے حیرت سے منہ کھول کر کہا۔

"کامریڈ! یہ آپ کیا سُنا رہے ہیں۔ یہ اقتباسات تو کارل مارکس کی کتاب میں ہیں ہی نہیں۔"

رُوسی نمائندے نے داس کیپٹل کھول کر اُس میں سے وہ اقتباسات دکھا دیے۔ جس پر چینی ڈیلی گیٹ کی حیرت اور بڑھ گئی۔ اُس نے بتایا کہ ہمارے ہاں چینی میں کارل مارکس کی کتاب کا جو ترجمہ موجود ہے اُس میں یہ اقتباسات کہیں نہیں ہیں۔ چنانچہ چینی زبان میں ترجمہ شدہ کتاب جب دیکھی گئی تو روسی نمائندہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ترجمہ داس کیپٹل کا نہیں بلکہ کسی اور کتاب کا ہے جسے چینی داس کیپٹل سمجھ کر پڑھتے رہے ہیں۔ افواہ ہے کہ جب روسی نمائندے نے اِس فاش غلطی کی طرف چینی کامریڈوں کو توجہ دلائی تو انھوں نے بضد ہو کر کہا کہ ہم اسی کتاب کو داس کیپٹل سمجھتے رہیں گے۔ اور دنیا کی کوئی طاقت ہمیں یہ سمجھنے سے نہیں روک سکتی کہ یہی داس کیپٹل ہے۔

لوئر ڈویژن بندر

جاپان سرکار کے محکمہ کامرس میں ایک بندر کو بطورِ کلرک بھرتی کیا گیا ہے اِس محکمہ کے متعلق پبلک میں عام شکایت تھی کہ یہاں کے ادھیکاری نہایت حرام خور ہیں یعنی کام بالکل نہیں کرتے۔ دن بھر گپ شپ کرتے ہیں اور رشوت لے کر ہی کام کرتے ہیں۔ ورنہ حرکت ہی میں نہیں آتے۔

چنانچہ جاپان سرکار نے اِس صورتِ حالات سے پریشان ہو کر بطورِ تجربہ ایک بندر کو سدھایا۔ اُسے ماڈرن طریقے سے تعلیم دلائی۔ اور ٹائپ کرنا سکھایا۔ کچھ عرصہ ٹریننگ دینے کے بعد بطورِ کلرک ایک دفتر میں ملازم کے طور پر تعینات کر دیا۔ سُنا ہے کہ یہ تجربہ بے حد کامیاب رہا۔ بندر بڑی دلچسپی اور ایمانداری سے کام کر رہا ہے۔ پبلک اُس کی کارکردگی اور حسنِ سلوک سے بے حد متاثر ہوئی ہے۔ اگر کوئی آدمی اُسے رشوت پیش کرتا ہے تو وہ اُسے بڑی خوفناک گھُڑکی دیتا ہے اور دانت اور پنجہ مار کر اُسے واپس بھگا دیتا ہے۔ افواہ ہے کہ جاپان سرکار کچھ مزید بندروں کو ٹریننگ دینے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اور اُس نے فی الحال ہندوستان سے ایک ہزار بندروں کی کھیپ منگوانے کا فیصلہ کیا ہے۔ جس کی وجہ سے ہندوستان میں بندروں کے بھاؤ تیزی سے بڑھتے جا رہے ہیں۔

لیڈروں کے تبادلے

یو۔پی کے کانگرسی لیڈروں کی آئے دن کی چپقلش سے پریشان ہو کر کانگرس ہائی کمانڈ نے تین ماہرینِ نفسیات کی ایک خفیہ کمیٹی مقرر کی تھی تاکہ وہ اِس باہمی چپقلش کے نفسیاتی اسباب معلوم کرے۔ چنانچہ کمیٹی نے اپنی رپورٹ دے دی ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ یو۔پی کی ہوا اور پانی کی تاثیر ہی ایسی ہے۔ جس سے انسان چھوٹے موٹے جھگڑوں میں اُلجھا رہتا ہے۔ افواہ ہے کہ کانگرس ہائی کمانڈ یو۔پی کے تمام کانگرسی لیڈروں کو یو۔پی سے باہر بھیج رہی ہے۔ انھیں مختلف صوبوں میں دو دو چار چار کر کے بانٹ دیا جائے گا۔ تاکہ ایک تو وہ ایک دُوسرے سے نہ مل سکیں۔ اور دوسرے آب و ہوا تبدیل کر کے اپنی تنگ نظری کو وسیع النظری میں بدل سکیں۔ سُنا ہے کہ یہ ہجرت فی الحال عارضی ہو گی۔ اور اسے بالکل بارٹر سسٹم یعنی اشیا کے باہمی تبادلے کے اصول کی بنا پر عمل میں لایا جائے گا۔ جتنے اُتر پردیش کے کانگرسی لیڈر کسی صوبے کو الاٹ کئے جائیں گے، اُتنے ہی کانگرسی لیڈر اُس صوبہ سے بطورِ تبادلہ یو۔پی میں لا کر بسائے جائیں گے۔ اگر یہ تجربہ کامیاب رہا تو آئندہ جس صوبہ کے کانگرسی آپس میں لڑیں گے اُن کو وہاں سے نکال کر مختلف صوبوں کو الاٹ کر دیا جائے گا۔

انجینئر کو سزا

راجدھانی میں اچانک بجلی فیل ہونے کے واقعات عام ہوتے رہتے ہیں۔ جس سے دہلی کے باشندوں کو بے حد پریشانی رہتی ہے۔ لیکن یہ

پریشانی اب عادت میں ڈھل گئی ہے۔ اِس لئے اِس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاتا۔ گزشتہ ہفتہ ایک عجیب بات ہوئی کہ پورے ہفتہ ایک منٹ کے لئے بھی بجلی فیل نہیں ہوئی۔ اس سے پبلک کو سخت شکایت پیدا ہو گئی کہ اُن کی عادت بگڑ گئی ہے۔ چنانچہ سُنا ہے دہلی کارپوریشن میں اس قسم کی عام شکایتیں پہنچنے لگیں اور دہلی کارپوریشن نے حکم دیا کہ اُس انجینیئر کو معطل کر دیا جائے جس کی وجہ سے بجلی فیل ہونی بند ہو گئی۔ کیونکہ دہلی کارپوریشن نے بڑی مشکل سے پبلک میں پریشانی کی عادت ڈالی تھی۔ لیکن اس انجینیئر نے برسوں کی محنت پر پانی پھیر دیا۔ یہ بھی افواہ ہے کہ انجینیئر مذکور کو جب کارپوریشن کے حکم کی خبر ملی تو وہ سر لے ڈمدکر دہلی سے بھاگ گیا۔ اور تادمِ تحریر حکام کے ہاتھ نہیں آیا۔

پھر شادی کرالو ———•

ہند پارلیمنٹ کے قریبی حلقوں میں یہ افواہ گشت لگا رہی ہے کہ اس مرتبہ پارلیمنٹ کے نئے سیشن میں ایک ممبر پارلیمنٹ شادیوں کے متعلق ایک مسوّدہ قانون پیش کرنے والے ہیں۔ جس کا مقصد یہ ہوگا کہ آئندہ ہندوستان کے ہر باشندے کے لئے لازمی قرار دیا جائے کہ وہ اپنی زندگی میں دوبارہ شادی کرے۔ ایک پچیس برس کی عمر میں اور دوسری پینتالیس برس کی عمر میں۔ اِس قانون کے پیچھے یہ فلاسفی کام کر رہی ہے کہ عام طور پر پینتالیس برس کی عمر تک پہنچ کر دونوں میاں بیوی ایک دوسرے سے بور ہو کر عمر کا آخری حصہ باہمی تلخی میں گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ دو شادی سسٹم سے یہ فائدہ ہوگا کہ میاں اور بیوی اِس بوریت سے بچ جائیں گے اور ماں باپ کی بجائے اپنی مرضی سے دوسری شادی کر کے آخری عمر بھی محبت اور مسرّت سے گزار سکیں گے۔ اگر یہ قانون پاس ہوگیا تو پینتالیس برس کے بعد ہر مرد کے گھر ایک نئی دُلہن آجائے گی۔ البتہ جو شادی شدہ جوڑا پینتالیس برس کے بعد بھی ایک دوسرے سے بور نہ ہوگا اُس پر یہ قانون لاگو نہیں ہوگا!

امن کے دو متوالے ———•

افواہ ہے کہ روسی وزیرِ اعظم مسٹر خروشچیف اور امریکی صدر مسٹر کینیڈی دونوں مل کر دُنیا کے مختلف ملکوں کا دَورہ کرنے والے ہیں اور وہ دُنیا کے ہر ملک میں جا کر تقریریں کریں گے اور مشترکہ حلف لیں گے کہ وہ تیسری عالمگیر جنگ نہیں چھیڑیں گے۔ پہلے خیال تھا کہ اِس دَورے میں برطانیہ کے وزیرِ اعظم مسٹر میکملن کو بھی شامل کیا جائے گا۔ لیکن چونکہ مس کیلر کے سکینڈل کی وجہ سے مسٹر میکملن کا اپنا مستقبل خطرے میں ہے اس لئے اُن کی شمولیت کی تجویز رد کر دی گئی۔

ٹرٹراہٹ بند ———•

اب کے برسات میں مینڈک نہیں ٹرّائیں گے۔ اِس کی وجہ یہ نہیں کہ مینڈک ٹرّانا بھول گئے۔ بلکہ اس کی وجہ وہ کرائسس ہے جو پچھلے دنوں اچانک پیدا ہو گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اپریل کے پہلے ہفتہ میں مینڈکوں کا ایک وفد وزیرِ تعلیم ڈاکٹر شریمالی سے ملا۔ اور یہ مطالبہ کیا کہ ڈکشنری میں سے لفظ ٹرّانا خارج کر دیا جائے۔ کیونکہ یہ لفظ صرف مینڈکوں کے ساتھ مخصوص ہو کر رہ گیا ہے۔ اور اِس سے مینڈکوں کی توہین کا پہلو نکلتا ہے۔ وفد کا کہنا تھا کہ مینڈک اِس ملک کے موسیقار ہیں۔ اور موسیقاروں کے ساتھ ٹرّانے کا لفظ وابستہ کرنا علمِ موسیقی کی اہانت ہے۔ جب انسان موسیقاروں کے لئے ٹرّانا کا لفظ استعمال نہیں کیا جاتا تو مینڈکوں کے ساتھ کیوں کیا جانے؟ اگرچہ وفد کی باتیں کافی مدلّل تھیں لیکن ڈاکٹر شریمالی نے معذوری ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ ایک لاکھ سال پرانے اور مشہور و مقبول لفظ کو ڈکشنری اور دوسری بے شمار کتابوں سے نکالنا ممکن نہیں۔ چنانچہ مینڈکوں کے وفد نے چیلنج دیا کہ اگر یکم جولائی تک اُن کا مطالبہ نہ مانا گیا تو ہندوستان بھر کے مینڈک کوئی سخت قدم اٹھانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ چنانچہ افواہ ہے کہ چیلنج کی میعاد گزر جانے کے بعد

مینڈکوں کی ایکشن کونسل نے اعلیٰ سطح پر بحث کی اور فیصلہ کیا کہ اِس برسات میں سارے ہندوستان کے مینڈک ٹرٹرانا بند کر دیں گے معلوم ہوا ہے کہ مینڈکوں کے اِس فیصلے سے اعلیٰ سرکاری حلقوں میں ہیجان پھیل گیا ہے۔ کیونکہ اگر مینڈک نہ ٹرٹرائیں تو برسات کا آدھا لطف ختم ہو جائے گا۔ اور مینڈکوں کے ٹرٹرانے سے جو نشاط انگیز کیفیت پیدا ہوجاتی ہے انسان اُس سے محروم ہو جائیں گے۔ سُنا گیا ہے کہ گورنمنٹ مینڈکوں کے اِس جارحانہ رویّے کے سامنے جھکنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اور وہ اِس کرائسس کا ڈٹ کر مقابلہ کرے گی ایک اعلیٰ سرکاری افسر نے جہاں گرد کو بتایا کہ ہمارے ہاں ایسے انسانوں کی کمی نہیں جو مینڈکوں کے مقابلے زیادہ بہتر طریقے سے ٹرٹرا سکتے ہیں اور بارش کے وقت اور بعد میں ٹرٹرانے کے لئے انسانوں کی ڈیوٹیاں لگا دی جائیں گی۔ اِس سلسلہ میں بھاری معاوضے پر کچھ شاعر حضرات کی خدمات بھی حاصل کی جارہی ہیں۔

ننھی مُنّی افواہیں ———— •

(۱) افواہ ہے کہ ہندوستان اور یورپ کے سرد ممالک کے درمیان دُھوپ سپلائی کرنے کا معاہدہ طے ہو گیا ہے کہ ہندوستان ہر سال اپنے مُلک کی تین چوتھائی دُھوپ کی پیداوار اِن ممالک کو برآمد کرے گا اور وہاں سے تبادلے میں سردی درآمد کرے گا۔ یہ معاہدہ "بیّو اور جینے دو" کے اصول پر کیا گیا ہے۔

(۲) نیتاجی سبھاش چندر بوس کے ایک بھگت نے انکشاف کیا ہے کہ چین کی طرف سے جنگ بندی کا اعلان نیتاجی کے مشورے پر کیا گیا ہے۔

(۳) کامریڈ ماؤزے تنگ کو پچھلے دنوں جب ایک ہندوستانی آم پیش کیا گیا تو اُنھوں نے یہ کہہ کر اُسے کھانے سے انکار کر دیا کہ یہ سامراجی آم ہے مجھے ہضم نہیں ہو گا۔

(۴) بمبئی کے ایک کارخانہ دار نے اعلان کیا ہے کہ وہ اپنا کارخانہ مزدوروں کے حوالے کرنے والا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب اِس خبر کی تصدیق اُس کارخانہ دار سے کی گئی تو اُسے خود اعتبار نہیں آیا کہ اُس نے ایسا اعلان کیا ہے۔

(۵) دہلی کے کھانڈ بیوپاریوں نے منسٹر خوراک کو ایک میمورنڈم بھیجا ہے کہ اُنھیں کھانڈ کی بلیک میلنگ کرنے کی اجازت دے دی جا[ئے]

(۶) پنجاب کے ایک پُرانے کانگریسی نے جہاں گرد کو بتلایا کہ چونکہ اب اُن کے پاس ایک کروڑ روپیہ جمع ہو گیا ہے اِس لئے اب وہ سوتنتر پارٹی میں شامل ہو رہا ہے۔

(۷) لکھنؤ کے قریب ایک سادھو مہاتما کی کٹیا سے پانچ تولہ سونا برآمد ہوا ہے۔ اُنھوں نے بیان دیا ہے کہ یہ سونا یوگ سے تیار کیا گیا ہے۔

افسانہ

پاگل

پروفیسر آفاق احمد ایم اے

کشمیر گورنمنٹ پولی ٹیکنک۔ سری نگر

۲۰ر اپریل ۱۹۶۳ء محترم خوشتر بھائی! آداب

.... میرا پاگل ایک روایتی پاگل نہیں، بلکہ ایسے لطیف پاگل پن کا انسکا ہے جس کے گیت ہم ازل سے گاتے آئے ہیں۔ یہ وہ وبا ہے جب حضرت آدمؑ عرش سے لے کر فرش پر اترے تھے۔ اور آج جس کے کم و بیش ہم سب ہی شکار ہیں۔ عشرت کی بے فرش واقعیت پسندی سے آپ بھی متفق ہوں گے......

آپ کا ——— آفاق احمد

"کیا بھئی گن چکے؟"

وہ اسی طرح خاموش بیٹھا آسمان کو تکتا رہا۔

"میں نے کہا حضور! سرد آہیں بھریئے۔ گنگنایئے۔ صرف اس طرح آسمان کو تکنے سے کام نہیں چلے گا۔"

وہ اب بھی خاموش تھا!

"جناب عشرت صاحب! کچھ منھ سے بولئے، سر سے کھیلئے، ایسا بھی کیا چپ کا روزہ؟"

عشرت کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ ابھری، اور اس نے کنکھیوں سے جاوید کی طرف دیکھا۔

"شکر ہے، کفر ٹوٹ رہا ہے۔ کیا قبلہ و کعبہ کو موقع کا شعر نہیں یاد آرہا۔ اگر اجازت ہو تو میں کچھ عرض کروں۔ ہاہا۔ کیا خوب کہا ہے کسی شاعر نے ؎

تاروں کا گو شمار میں آنا محال ہے
لیکن کسی کو نیند نہ آئے تو کیا کرے

کچھ تو بولئے حضور! یہ کیا یوداسیت طاری ہوئی ہے آپ پر، صرف تین سیکنڈ کی مہلت دیتا ہوں۔ اگر اب بھی آپ نغمہ سرا نہ ہوئے تو بندہ نو دو گیارہ ہو جائے گا۔"

"بیٹھو یار! ایسے خوب صورت موسم میں یہ بد مذاقی!" عشرت نے جاوید کی کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"خاک بیٹھو۔ ہم بیٹھے ہیں اور آپ آسمان کی طرف تکے جا رہے ہیں۔ ارے بھئی یہ اینچ دور ہے۔ اگر پیار ہی کرنا ہے تو سلیقے سے کرو۔ اس زمانے میں اس طرح کی فضول حرکتوں کا کوئی مقام نہیں ہے۔"

"کیسی فضول حرکتیں؟"

"یہی کہ ستاروں کو گنا جا رہا ہے۔ آہیں سیدھی برف خانے سے آرہی ہیں۔ چاہے سُر تال کا پتہ نہ ہو لیکن اشعار ضرور گنگنائے جائیں گے۔"

"میں نے اب تک ان میں سے کونسی حرکت کی؟"

"اجی آپ تو ان موڈرن مجنوؤں سے بھی دو جوتے آگے ہیں۔ اونٹ کی طرح منھ آسمان کی طرف اٹھا لیا اور چپ سادھ لی۔"

"میں اپنی قسمت دیکھ رہا تھا۔"
"قسمت ؟ تمھاری قسمت آسمان پر لکھی ہے ؟"
"سُنا ہے کاتب قسمت آسمان ہی پر رہتا ہے۔"
"اب بتاؤ بھی یہ کیا چکر ہے ؟"
"چکر کچھ نہیں، بس ستاروں کے کھیل ہیں !"
"ستاروں کے یا ستارہ کا ؟ کیا اُس کا نام ستارہ ہے ؟"
"نہیں۔"
"اختر ؟"
"تارا !"
"انجم ؟"
"اُوں ہُوں !"
"ثریا ؟"
"نہیں نہیں !"
"تو پھر کیا ہے ؟ زحل، مشتری، کوکب، عطارد، شہاب ثاقب ؟"
"ماشاءاللہ ! کیا آج کل لُغت رَٹ رہے ہو ؟"
"عشرت ! تم کافی ذہین ہو اور حقیقت کا اعتراف تم جتنی بار بھی چاہو میں کر سکتا ہوں۔ لیکن مجھے اتنا عقل کا دشمن بھی نہ سمجھو کہ تم بہت خاموشی سے موضوع کو بدل دو گے اور مجھے احساس بھی نہ ہوگا !"
"حضور ! آپ کی قوتِ فکر و احساس کا کیا کہنا ہے۔ خادم سے قصور ہوا معافی چاہتا ہوں۔ فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں ؟"
"میرے چند سوالوں کا جواب دو !"
"ارشاد ہو !"
"کون وہ غارت گرِ ضبط و ہوش ہے جس نے تمھاری آنکھوں سے نیندیں چُرا کر اُنھیں خلاؤں میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا ہے۔ تمھیں آدمی سے بندر بنا دیا ہے۔"
"نئے خطاب کا شکریہ عالم پناہ ! وہ ایک لڑکی ہے !"
"اتنا تو ہم بھی سمجھتے ہیں۔ لیکن اُس کا نام کیا ہے ؟"
"نام کچھ بھی ہو اس سے کیا ہوتا ہے ؟"
"میرا مطلب ہے اُس کے نام کا کیا اس فلک ناہنجار سے بھی کچھ تعلق ہے ؟"
"اس فلک ناہنجار کا رشتہ تو مجھ سے ہے۔ ہاں اُس کا تعلق ستاروں سے ہے !"
"ستاروں سے ؟ ہاں اب آئے مطلب پر۔ فرمائیے کیا تعلق ہے ؟"
"یہی کہ وہ بھی ان ستاروں کی طرح میری پہنچ سے بہت دُور ہے۔"
"تو قریب ہونے کے لئے آپ کسی اسپتنک سے اُڑنے والے ہیں یا پھر اپنے کچے دھاگوں کے سہارے ستاروں کو زمین پر لانے والے ہیں ؟"
"نہ میں اُڑ سکتا ہوں نہ ستارے ہی زمین پر آ سکتے ہیں۔ یہ فاصلہ تو ابدی ہے !"
"کچھ ستارے ٹوٹ بھی جایا کرتے ہیں۔"
"پھر وہ ستارے نہیں رہتے۔"
"ہاں وہ تمھارا سر بن جاتے ہیں۔ دیکھو عشرت ! مجھے شاعری سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ بس سیدھی سادی نثر میں بتاؤ یہ کیا فراڈ ہے۔ میں نے اُڑتی ہوئی خبر سُنی ہے کہ تم خودکشی کے امکانات پر غور کر رہے ہو۔"
"خودکشی ؟"
"ہاں ! راشدہ کہہ رہی تھی کہ تم نے شعر کہنا بھی شروع کر دیا ہے۔ اور اس سے پہلے کہ تم اپنے اشعار سنا کر مجھے مار ڈالو، میں تمھارا گلا گھونٹ دوں گا۔"
"تو پھر یہ تو قتل ہوگا !"
"قتل نہیں، خودکشی ! میں تمھارا ہمزاد ہوں۔"
"نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی۔"
"اگر تم نے سچ مچ پورا شعر پڑھنے کی کوشش کی تو میں تمھارا گلا گھونٹ دوں گا۔"
"مگر یہ شعر میرا نہیں بلکہ انشاء اللہ خاں انشا کا ہے !"

"انشاء اللہ تب بھی میرا ارادہ نہ بدلے گا۔"

"چلو اچھا ہوگا۔ ایک اہم مسئلہ تو حل ہو جائے گا۔"

"پھر وہی مسئلہ۔ خدا کے لئے اب ان معنوں میں گفتگو نہ کرو میں شنت سے بور ہو چکا ہوں!"

"تو پھر کیا کروں؟"

"میرے چند سوال اور باقی ہیں، اُن کا اور جواب دو۔"

"سرتسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے!"

"تمھارا نام؟"

"عشرت!"

"تعلیم؟"

"ایم۔ اے۔"

"پیشہ؟"

"لیکچرار!"

"شوق؟"

"شاعری!"

"دیگر مشاغل؟"

"کتابیں پڑھنا۔ کرکٹ اور بیڈمنٹن کھیلنا۔ اور جب ان میں سے کوئی کام نہ ہو تو آسمان کی طرف تکنا۔"

"دل کی کیا حالت ہے؟"

"دھڑکنے کا شغل جاری ہے۔"

"ان دھڑکنوں میں کوئی خاص آواز سنائی دیتی ہے؟"

"ہاں! کسی کے قدموں کی چاپ، جو کبھی رگِ جاں سے قریب سُنائی دیتی ہے تو کبھی دُور ستاروں کے پاس!"

"پھر وہی ستارے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تمھارے ستارے ہی گردش میں ہیں۔ بھوک کا کیا حال ہے؟"

"ایک وقت کھاتا ہوں۔"

"یہ حالت کب سے ہے؟"

"پچھلے بیس دنوں سے!"

"بیس دنوں سے؟"

"ہاں کیونکہ ابھی ماہِ رمضان کی اکیسویں تاریخ ہے اور روزے کل بیس ہوئے ہیں۔"

جاوید کے لبوں پر ایک بے اختیار مسکراہٹ اُبھری لیکن سوالات جاری رہے۔

"یار عشرت سچ بتا کہ یہ سب مذاق ہی ہے یا واقعی کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے؟"

"گڑبڑ تو کچھ نہیں ہر چیز نارمل ہے!"

"کیا کوئی نیا معاملہ ہے؟"

"نہیں تو کوئی پانچ چھ سال پُرانا۔"

"اچھا! لیکن تم نے تو کبھی مجھ سے ذکر نہیں کیا۔"

"ذکر کس طرح کرتا۔ مجھے خود بھی ٹھیک سے احساس نہیں تھا کہ میں غیر شعوری طور پر کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہوں۔ دراصل یہ داستان شروع ہونے سے بہت پہلے ہی شروع ہو چکی تھی۔"

"تم نے کہیں پہنچنے کا ذکر کیا تھا۔ ہاں تو تم کہاں پہنچ چکے ہو؟"

"جہاں سے اب لوٹ کر واپس نہیں آسکتا۔"

"تو پھر تم کیا کرو گے؟"

"چھٹیاں گزار کر پھر اپنی نوکری پر سری نگر چلا جاؤں گا۔"

"اور وہ؟"

"وہ کچھ دن تو اپنے ماں باپ کے پاس رہے گی۔ اور پھر اُس کے بعد غالباً اُس کی شادی ہو جائے گی۔"

"ہوں!! کیا وہ تم سے پیار کرتی ہے؟"

"معلوم نہیں!"

"عشرت! پھر اُس سراب کے پیچھے دوڑنے سے حاصل؟"

"یہ دل کا معاملہ ہے۔ تجارت نہیں۔ جو میں فائدے اور نقصان کی بات سوچوں۔"

"تو پھر تم اِن باتوں میں وقت کیوں ضائع کرتے ہو، اُس سے شادی کیوں نہیں کر لیتے ہو؟"

"شادی کوئی یک طرفہ فیصلہ نہیں ہے۔"

"آئی سی۔ تمھیں دوسری طرف سے انکار کا اندیشہ ہے؟"

"بہت ممکن ہے۔"

"لڑکی یا اُس کے متعلقین کو؟"

"کسی کو بھی ہو، انکار بہر حال انکار ہے۔"

"کیا تم نے اِس سلسلے میں کوشش کی ہے؟"

"نہیں!"

"ارادہ ہے؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"میں انکار برداشت نہیں کر سکتا۔"

"تو پھر اس خیال کو دل سے نکال دو۔"

"اِس کی جڑیں اب بہت گہری ہو چکی ہیں۔ اسے نکالنے کی کوشش میں کلیجہ نکل آئے گا۔"

- تم جس کام کو کرو استقلال کے ساتھ کرو۔ ذرا سی مشکل پیش آتے ہی اُسے چھوڑ کر بیٹھ جانا بزدلی کی علامت ہے اور ناکامی کا راستہ ہے۔ (ولیم کابیٹ)
- اپنے آپ کو اُس وقت تک انسان نہ سمجھو جب تک تمھاری رائے تمھارے غصّے کے زیرِ اثر ہے۔ (بطلیموس)
- نسل، رنگ اور اتفاقات کے باعث کوئی انسان ممتاز نہیں بن جاتا۔ بلکہ ممتاز وہ ہوتے ہیں جن کے دل و دماغ ممتاز ہوں۔ (انگرسن)
- حکمتِ عملی قوتِ بازو سے زیادہ کام کرتی ہے۔ (بطلیموس)

"عجیب مشکل ہے۔ مگر تم میں خرابی کیا ہے؟"

"اگر تم مجھ سے میرے متعلق میری رائے پوچھتے ہو تو یقین کرو بارہا سوچنے پر بھی مجھے اپنے اندر کوئی خاص خوبی نظر نہیں آئی۔ اگر ایک آدھ خوبیاں ہوں بھی تو بُرائیاں بے شمار!"

"خیر آپ اِس کسرِ نفسی کو تو جانے دیں۔ اگر صنفِ نازک کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہونے کا وعدہ کریں تو عرض کروں کہ آپ اتنی خوبیوں کے مالک ہیں کہ اُن کا شمار میں آنا محال ہے۔ گویا آسمان کے تارے ہیں۔"

"یہ عشرت کے عزیز ترین دوست جاوید کی فراست ہے یا شیخی بگھارنا تو نہیں۔"

"مگر دُنیا نے تمھیں اس قدر قریب سے کب دیکھا ہے جتنا کہ میں نے!"

"یہ چھوڑو۔ بات دراصل یہ ہے کہ وہ متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی ہے اور یہ طبقہ پنجوں کے بل کھڑے ہو کر اکثر آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھائے رہتا ہے۔ لیکن ہر وقت یہ خوف دامن گیر کہ کہیں وہ پھر اُن پستیوں میں نہ آ پڑے جہاں سے اُبھرنے کی کوشش میں اُس کی ہڈیاں سُلگ کر راکھ ہو چکی ہیں۔"

"اب میں سمجھا ..... وہ لوگ کسی بہت اونچی جگہ کی تلاش میں ہیں۔ کیا اُس کی منگنی ہو گئی؟"

"ابھی تو نہیں۔"

"ویسے شادی کی بات چل رہی ہے کہیں؟"

"اچھی لڑکی ہے، رشتے آتے ہی ہوں گے۔"

"کیا وہ بہت خوب صورت ہے؟"

"میری نظر میں!"

"اُس کی خاص خاص خوبیاں گناؤ۔"

"اُس میں کوئی عیب نہیں ہے!"

"خاموش، بے ادب! بے عیب صرف خدا کی ذات ہے۔ کوئی نہ کوئی عیب تو ہوگا۔"

"ہوگا، لیکن مجھے اُس میں کوئی عیب نظر نہیں آتا۔"

"حضور! میں دُنیا کی نظر سے پُوچھ رہا ہوں!"

"تم جانتے ہو کہ میں دُنیا دار نہیں ہوں!"

"اُف توہ! تم نے تو میرا ناک میں دم کر دیا۔"

"میں تو حکم کی تعمیل کر رہا ہوں۔ ورنہ میں بہت ممنون ہوں گا اگر آپ بھی خاموش بیٹھیں۔"

"جناب کو خاموشی سے اتنا پیار کیوں ہو گیا؟"

"وہ بھی فطرتاً خاموش طبع ہے۔"

"اللہ رے محبت! کیا اُس کے مُرید ہو گئے ہو؟"

"ہاں کچھ ایسا ہی ہے۔"

"جاؤ یار! تم نے تو پڑھ لکھ کر ڈبو دیا۔ ذرا آمادگی تو ظاہر کرو، اُس سے بہتر لڑکی تلاش کر کے نہ لے آؤں تو جاوید نام نہیں۔"

"میں سودا خریدنے نہیں نکلا ہوں جو بہتر لڑکی تلاش کروں۔"

"تمھارے دماغ میں گوبر بھرا ہے۔ میں دعویٰ کرتا ہوں کہ تمھیں اُس سے بہتر لڑکی مل سکتی ہے۔"

"لیکن وہ نہیں!"

"پھر آ گئے وہیں پہ چلے تھے جہاں سے ہم! جناب اِس قدر دیوانے ہیں اور اُسے بھول کر بھی تمھارا خیال نہ آتا ہوگا۔"

"تو اِس سے کیا ہوتا ہے؟"

"اچھا ایک بات بتاؤ۔ اگر اُس کی شادی ہو جائے تو افسوس تو نہ ہوگا تمھیں؟"

"یہ تو شادی کی نوعیت پر منحصر ہے۔"

"یعنی؟"

"اگر شوہر قدر دان ہے۔ اچھا ہے اور وہ بھی خوش ہے تو مجھے کوئی رنج نہ ہوگا اور اگر خدانخواستہ...."

"ارے بھیا! اِن الف لیلوی باتوں کو جانے دو۔ اِن میں کچھ نہیں رکھا ہے۔ پورا مستقبل تمھارے سامنے ہے۔ اُسے کیوں دیمک لگاتے ہو۔ ہنسو، کھیلو اور کچھ کام کرو۔"

"تو میں نے یہ کب کہا کہ میں زندگی کی تمام مشغولیتوں سے کنارہ کش ہو چکا ہوں!"

"آثار تو کچھ ایسے ہی نظر آتے ہیں۔"

"یہ تمھارا خیال ہے۔"

"تو پھر مُنہ اُٹھائے آسمان کی طرف کیا دیکھ رہے تھے؟"

"ستاروں کو!"

"پھر وہی ستارے!"

"ہاں اب اِنھیں ستاروں کے ساتھ میری زندگی وابستہ ہے!"

"اللہ رے وابستگی!"

اور ایک لمبی سی "ہُوں" کے بعد جاوید کا مُنہ آسمان کی طرف اُٹھ گیا۔

عشرت نے چند لمحے اُس کی طرف دیکھا اور کہا۔

"جاوید!"

وہ خاموش بیٹھا رہا۔

"میں نے کہا حضور! سرد آہیں بھریئے، گنگنایئے، صرف اِس

- یقیناً بھلائیاں بُرائیوں کو زائل کر دیتی ہیں۔ (قرآن پاک)
- فتنہ انگیزی قتل سے بڑھ کر ہے۔ (قرآن پاک)
- وہ سب سے اچھا انسان ہے جس سے انسانوں کو فائدہ پہنچے۔ (حضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- سب سے اچھی زندگی اُس شخص کی ہے جس کی زندگی میں دوسرے شریک ہوں۔ اور بُری ہے وہ زندگی جس کے ساتھ دوسرے بسر نہ کر سکیں۔ (حضرت امام حسنؓ)
- تندرستی بجائے خود اعلیٰ نعمت ہے۔ قناعت ایک بڑا خزانہ ہے سکون اچھی پونجی اور جمعیتِ خاطر بہترین رفیق ہے۔ (گوتم بدھ)

طرح آسمان کو تکنے سے کام نہیں چلے گا۔"

"یہ کون گستاخ ہے جو ہمارے خلوت کدے میں چلا آیا۔ اس وقت ہم ستاروں کی سرگوشیاں سن رہے ہیں۔"

"اچھا جی! کیا کہہ رہے ہیں وہ؟"

"کچھ تمہارا ہی ذکر ہے۔"

"میرا؟ خیر تو ہے؟"

"ہاں! لیکن اِن ستاروں میں ایک ستاری بھی ہے۔"

"ستاری؟"

ایک بے اختیار قہقہہ عشرت کے لبوں سے پھوٹ پڑا۔

"ہاں مِس ستاری! وہ کہہ رہی ہے کہ عشرت پاگل ہے۔ چلو اب اٹھو، ٹہلنے چلتے ہیں۔"

"مجھے اپنے پاگل پن پر ناز ہے۔ تم بیٹھو میں تیار ہو کر ابھی آتا ہوں ——!"
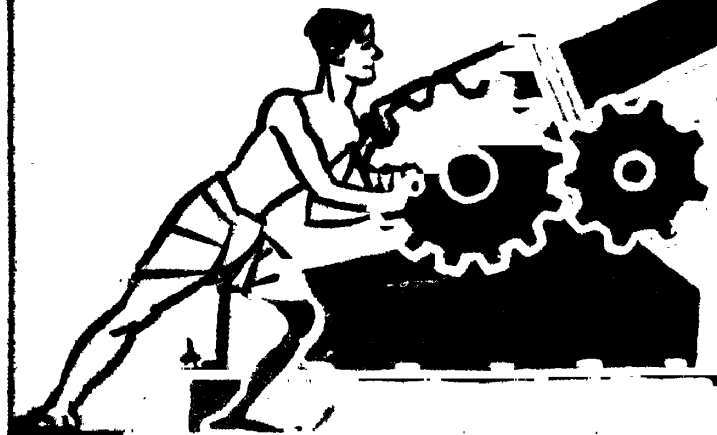
خاموش غازیپوری

ہمیں یاد ہے وہ کلیم تھے سرِ طُور جن کے قدم گئے
یہ تو وقت وقت کی بات ہے کبھی وہ گئے کبھی ہم گئے

مرے آنسوؤں پہ نہ طنز کر، تجھے کچھ خبر بھی ہے بے خبر
لگی ٹھیس دل کو تو بہہ گئے، جو مِلا سکون تو تھم گئے

ہے اُسی مقام پر آج بھی غمِ عشق اور برشتگی
نہ ہماری وحشتِ دل گئی، نہ کسی کی زلف کے خم گئے

وہ جنھیں شعورِ سفر نہ تھا اُنھیں میں نے عزمِ سفر دیا
وہی منزلوں پہ پہنچ سکے جو مرے قدم بہ قدم گئے

یہ خموش راز کی بات ہے میں یہ راز کیسے عیاں کروں
کہ حرم کا دَر کھُلا چھوڑ کر کہاں آج شیخِ حرم گئے

بِن بُلائے کبھی نہ جائیں گے
آپ کی بزم رشکِ طُور سہی
دِل کی دُنیا ہنوز ہے تاریک
لاکھ دیر و حرم میں نُور سہی
اُن کی باتوں میں آ ہی جاتا ہے
دل یہ مانا کہ باشعور سہی
غیر اُن کے قریب ہیں کشور
نہ سہی ہم قریب، دُور سہی

کشور کیلاش پوری

میرے احساس کی تھکن کی طرح
زندگی ہے اُجاڑ بن کی طرح
دِل کی ناکام حسرتوں کی قسم
میں ہوں اِک لاشِ بے کفن کی طرح
میری قسمت سنور نہیں سکتی
آپ کی زُلفِ پُرشکن کی طرح
مجھ کو کیا علم، لوگ کہتے ہیں
زندگی ہے حسیں دُلہن کی طرح

حبیب مخمور

نفسیاتی، جنسی، معلوماتی مقالات اور مفید گھریلو اشارات

۱ — موسم گرما کا مفید پھل تربوز

تربوز گرمی کے موسم کا مشہور پھل ہے۔ اس کا مزاج سرد تر ہے۔ یہ گرمی، خشکی اور پیاس کو تسکین دیتا ہے۔ اگرچہ اس میں غذائیت بھی ہے لیکن غذائیت کے مقابلہ میں اس کی ادویاتی افادیت زیادہ ہے۔ موسم کی گرمی یا گرم چیزیں کھانے پینے سے بدن میں گرمی بڑھی ہوئی ہو یا صفرا کا غلبہ ہو تو اس کے کھانے سے تسکین ہو جاتی ہے۔ صفرائی بخاروں اور تپ محرقہ میں جب بدن میں گرمی بڑھی ہوئی ہو اور بخار کی گرمی سے پیدا ہونے والی سوزش اور پیاس سے مریض بے چین ہو، بار بار پانی پینے سے تسکین نہ ہوتی ہو تو تربوز کا پانی معمولی برف سے ٹھنڈا کیا ہوا اس کے لئے آب حیات سے کم نہیں ہوتا۔ بدن میں بڑھی ہوئی گرمی کم ہو جاتی ہے۔ سِل، دق اور خشک کھانسی میں بھی تربوز کا استعمال مفید ہے۔ صفرا کے غلبے سے دست آتے ہوں تو اس کے استعمال سے فائدہ پہنچتا ہے۔ اس صورت میں یہ بدن کو غذائیت بھی دیتا ہے۔ اور صفرا کو کم کر کے دستوں کو روکتا ہے۔ تربوز، بوڑھے بلغمی مزاج کے آدمیوں کے لئے مناسب نہیں ہے۔ بلغم پیدا کرتا ہے۔ دیر ہضم ہے۔ تربوز نہار منھ ہرگز نہیں کھانا چاہیے اور کھانا کھانے کے فوراً بعد بھی کھانا مناسب نہیں ہے۔ اس سے نظام ہضم پر برا اثر پڑتا ہے۔ اس کے کھانے کا سب سے اچھا وقت دونوں کھانوں کے درمیان یعنی سہ پہر کا وقت ہے۔

۲ — آنسو صحت و تندرستی کے ضامن

ہو سکتا ہے یہ عنوان دیکھ کر بہت سے لوگوں کو حیرت ہو۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ آنسو صحت و تندرستی کے ضامن ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص کبھی نہ کبھی ضرور رویا ہوگا لیکن بہت کم لوگ آنسوؤں کی غیر شاعرانہ تشریح سے آگاہ ہیں۔ سینیکا مشہور رومی فلسفی لکھتا ہے "آنسو گرتے ہی ہیں خواہ ہم انھیں کتنا ہی روکیں۔ اور جب طفلِ اشک گر جاتے تو اُٹھتا نہیں چل جاتا ہے۔ لیکن گرنے کے بعد دیکھو تو روح کیسی فرحت پاتی ہے۔" اس میں شک نہیں، جسمانی طور پر بھی ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اگر رنج و غم کی شدت کی وجہ سے ہم خوب روئیں تو جی ہلکا ہو جاتا ہے۔ بے شک بیساختہ قہقہوں کی وجہ سے بھی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ اور یہ بھی صحت کے لئے اچھے ہیں۔ قدرت کا کوئی کام بے حکمت نہیں۔ جب رنج و غم کی شدت سے ہمارا دل بھر آتا ہے تو ہمیں آنسو بہانے ہی چاہئیں۔ انھیں روکنا درست نہیں۔ سائنس اس کے بارے میں یہ کہنے کی جرأت کرتی ہے اور اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ جب رنج و غم سے انسان کا جسم ناتوانی اور نقاہت محسوس کرتا ہے تو دل کے زخم کو دھونے کے لئے ایک طرح کا تیزابی مادہ جسم سے نکلتا ہے۔ اور وہ صحت کو برقرار رکھنے کے لئے، جسم کی توانائی کو بحال کرنے کے لئے بے حد ضروری ہے۔

وہ شخصیت سے بہتر ہوگی۔ یہی موازنہ ہمیں احساس کمتری میں مبتلا کر دیتا ہے۔ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ دوسرے لوگ خواہ وہ حقیقت کامل شخصیت کے مالک ہوں دنیا کا ہر کام نہیں کر سکتے۔ کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور ہے جو صرف ہم کر سکتے ہیں جو اُن کی پہنچ سے باہر ہے۔ اگر انسانی حلقے میں اُن کی اہمیت ہے تو ہماری بھی اہمیت ہے اور ہم بہت سی باتوں میں اُن کے برابر ہیں۔ مثلاً وہ خوب صورتی سے متاثر ہوتے ہیں تو ہم بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اگر وہ سچائی کے متوالے ہیں تو ہم بھی برائیوں کو گلے لگانے کے متمنی نہیں۔ یہ اور اس طرح کی تمام باتوں میں ہم اُن کے برابر ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ کچھ اوصاف ایسے ہیں جو ہمارے لئے مخصوص ہو کر رہ گئے ہیں۔

۷ ـــــ انسان کے کردار کی سب سے بڑی کمزوری

قوتِ ارادی کی کمزوری انسان کے کردار کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ ہم برائیوں کا علاج کر سکتے ہیں۔ کاہلی کو دور کرنے کا طریقہ ہمیں آتا ہے۔ اپنے جاہل پن سے چھٹکارا حاصل ہو سکتا ہے۔ بزدلی سے نجات مل سکتی ہے۔ لیکن قوتِ ارادی کی کمزوری ایک ایسی کمی ہے جسے خود قوتِ ارادی ہی دُور کر سکتی ہے۔ آپ تہیہ کر لیں کہ چاہے آپ کے کردار میں کتنی ہی خامیاں کیوں نہ ہوں لیکن اُن سب میں سے زیادہ خطرناک کو آپ نمایاں ہونے کا موقع نہ دیں گے۔ اگر آپ نے ارادہ کر لیا ہے تو سمجھئے آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

۸ ـــــ مسرت کا راز

مشہور مفکر ڈیل کارنیگی نے لکھا ہے۔ دُنیا میں ہر شخص مسرت کا خواہاں ہے اور اُسے حاصل کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے اپنے خیالات پر قابو پانا۔ خوشی خارجی حالات پر ہرگز مبنی نہیں بلکہ آپ کے احساسات اور خیالات پر منحصر ہے۔ آپ کی خوشی یا ناخوشی کا انحصار اس بات پر نہیں کہ آپ کے پاس کیا کچھ ہے؟ یا آپ کون ہیں؟ یا آپ کہاں ہیں؟ یا آپ کیا کر رہے ہیں؟ بلکہ اس بات پر ہے کہ آپ کیا سوچ رہے ہیں؟ مثال کے طور پر اگر دو آدمی ایک مقام پر ہوں، اُن کا کام بھی ایک ہو۔ دونوں کے پاس برابر کا سرمایہ ہو اور دونوں کی عزت اور وقار بھی برابر ہو پھر بھی اُن میں سے ایک غمگین، اور ایک شادماں ہو سکتا ہے۔ کیوں؟ صرف اپنے الگ الگ ذہنی رجحان کے باعث۔ میں نے قلیوں میں جو سات سینٹ یومیہ اُجرت پر چلچلاتی دھوپ میں لہو پسینہ ایک کرتے ہیں اتنے ہی ہشاش بشاش چہرے دیکھے ہیں

[illegible] کی خوشحال ترین آبادی ہیں "
[illegible] کا قول ہے۔
کوئی چیز بذات خود اچھی یا بُری نہیں ہوتی، یہ صرف ہماری سوچ پر
ہے۔ ہمارا خیال اُسے اچھا یا بُرا بنا دیتا ہے "
[illegible] نے کہا تھا۔
"اکثر لوگ اُتنے ہی خوش ہوتے ہیں جس حد تک خوش ہونے کا
ارادہ ہوتا ہے "
آپ خوش رہنا چاہیں تو کوئی آپ کو غمگین و اندوہگیں نہیں بنا سکتا۔
مسرت کا راز ہے۔

۹ ــــ فکر و پریشانی سے بچئے

ہر اچھے کام کو پسندیدگی کے رُجحان کے ساتھ کیجئے۔ اس سے نہ
[illegible] آپ زندگی میں کامیاب ہی ہوں گے بلکہ اس کے ساتھ آپ کی جانی
[illegible] بھی بہتر ہو جائے گی۔ فکر و پریشانی صحت کے لئے ہلاک ترین زہر
[illegible] جب آپ فکر چھوڑ کر ہر چیز کو دلچسپی اور خوشی کے ساتھ کرنے لگیں
تو تفکرات آپ سے دُور بھاگیں گے۔ اور قدرتی طور پر آپ کی صحت
[illegible] ہو جائے گی۔

پریشانی اور ناپسندیدگی کے رُجحان اور احساس کے وقت آپ کو مشکل
[illegible] چھٹکارا پانے کا کوئی مناسب طریقہ، کوئی مناسب راہ نظر نہیں آتی۔ فکر
[illegible] پریشانی دماغی قوتوں کو ماؤف کر دیتے ہیں۔ آپ کا دماغ جب ہی کام
[illegible] ہے جب وہ ناپسندیدگی کے رُجحان و فکر سے بالکل آزاد ہو۔ اُس وقت
آپ اپنا کام سوچ سمجھ کر کامیابی سے کر سکتے ہیں۔

۱۰ ــــ جذبات کا اثر معدے پر

جذبات کا اثر معدے پر بہت زیادہ پڑتا ہے۔ جب حالات سازگار
[illegible] گوار ہوتے ہیں تو بھوک خوب کھُل کر لگتی ہے۔ لیکن جب حالات موافق
[illegible] نہیں ہوتے تو بھوک مر جاتی ہے اور جب حالات پھر سُدھر جاتے ہیں تو

پھر بھوک لگنے لگتی ہے۔ جب [illegible] کے [illegible]
تناؤ پیدا ہو جاتا ہے تو پیٹ کے [illegible]
جیسے کسی زخم میں ہوتی ہے۔ [illegible]
زخم میں نہیں ہوتی بلکہ زخم کے اندر گرد [illegible]
سی پیدا ہو جاتی ہے۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ [illegible]
مبتلا ہوتے ہیں، اُن میں سے [illegible]
ہیں۔ فکر اور پریشانی کے علاوہ غصہ بھی انسان کے [illegible]
چھوڑتا ہے اور [illegible] تناؤ کی شکایت پیدا کرتا ہے۔

خاوند بیوی کا رہنما

پریم شاستر
کام شاستر
گربھ شاستر
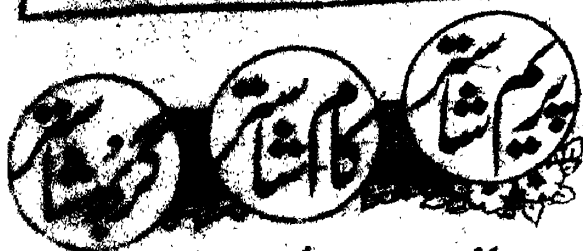
ان کتابوں میں ایسے ایسے راز اور نکتے بیان کئے گئے ہیں جن کا جاننا ہر
جوڑوں کے لئے بہت ضروری اور بہت مفید ہے۔ ایسے ایسے کار آمد نکتے ہیں کہ تجربہ
کار تجربہ کار خاوندوں کو بھی معلوم نہیں ہیں اور جنہیں جاننے کے بعد آپ کو شادی کی اصلی
مسرتیں حاصل ہوں گی۔ گھر کو بہشت بنانے کی تدابیر تفصیل سے لکھی گئی ہیں۔ خاوند
اور بیوی کے لئے ان کتب کا مطالعہ اتنا ہی ضروری ہے جتنی ایک انسان کے لئے ہوا اور
غذا ضروری ہے۔ ان کتب کی خوبیوں کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ
ہندوستان جیسے غریب ملک میں ان کتب کی [illegible] سے زائد جلدیں فروخت ہو چکی
ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ کوئی چیز کسی خاص خوبی کے بغیر اتنی بھاری تعداد میں
فروخت نہیں ہو سکتی۔

پریم شاستر باتصویر ــــــــ قیمت [illegible]
کام شاستر باتصویر ــــــــ قیمت [illegible]
گربھ شاستر باتصویر ــــــــ قیمت [illegible]

پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی دہلی [illegible]

مدیر "بیسویں صدی" کے نام

خطوط لکھتے وقت ہمیشہ اختصار سے کام لیا کریں تاکہ آپ کے ارشاد کی فوراً تعمیل ہو سکے۔ طویل خطوط مصروفیت کے باعث فوراً نہیں پڑھے جاتے۔

(منیجر رسالہ بیسویں صدی دہلی)

تلخ اور شیریں ، ماضی قریب اور ماضی بعید کی

یادیں

اختر الایمان کے کلام کا مکمل مجموعہ۔ جس پر ساہتیہ اکاڈمی کی طرف سے ۱۹۶۲ء کی بہترین اردو تصنیف" کا اعزاز اور پانچ ہزار روپے نقد کا گرانقدر انعام عطا کیا گیا۔ اب نئی آب و تاب کے ساتھ چھپ گئی ہے۔ کتابت و طباعت نہایت عمدہ نفیس گیٹ اپ۔ قیمت فی جلد صرف چھ روپے۔

پتہ :- رسالہ بیسویں صدی۔ دہلی نمبر ۶

مضمون نگار حضرات

سے درخواست ہے کہ "بیسویں صدی" کے لئے مضامین لکھتے وقت ہمیشہ اختصار سے کام لیا کریں بغرض اشاعت موصول ہونے والے مضامین میں سے مختصر افسانوں کو طویل افسانوں پر ترجیح دی جاتی ہے۔ اور طویل افسانے مضمون نگاروں کو واپس کر دیئے جاتے ہیں۔ غیر طلبیدہ مضامین کی واپسی کے لئے مضمون کے ساتھ ٹکٹ لگا ہوا اپنا پورا پتہ لکھا ہوا پوسٹ آفس کا لفافہ بھیجیں۔ ورنہ ہم مضمون کی واپسی سے قاصر رہیں گے۔ مضمون کے لفافے پر لفظ "غیر مطبوعہ" ضرور لکھئے۔

رسالہ نہ ملنے کی شکایت

دو مرتبہ پتے چیک کرنے کے بعد "بیسویں صدی" ہر ماہ باقاعدگی سے سپرد ڈاک کیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود شکایتی خطوط موصول ہونے پر دوبارہ بھیج دیا جاتا ہے۔ ۲۵ تاریخ کے بعد شکایتی خطوط موصول ہونے پر دوبارہ پرچہ بھیجنے سے ہم معذور رہتے ہیں۔ رسالہ نہ ملنے کی شکایت محکمہ ڈاک سے بھی کیجئے۔

(منیجر رسالہ بیسویں صدی۔ دریا گنج۔ دہلی نمبر ۶)

ستمبر ۱۹۶۳

افسانہ نمبر دیکھا

اہلِ قلم حضرات کی رائیں

.... افسانہ نمبر بیسویں صدی کی گزشتہ روایات کا آئینہ دار ہے۔ دلکش تصاویر اور گراں مایہ منظومات نظم و نثر جو حضرت خوشتر گرامی کے حسنِ ادارت کے غماز ہیں، اس شمارے کو ایک حیات افروز مرقع کا روپ دیتے ہیں.... حصہ نظم میں فراق، جوش ملیانی، عرش ملسیانی، ساغر نظامی، سلام مچھلی شہری اور پریم وار برٹنی کی تخلیقات خاص طور پر پسند آئیں....

کرشن موہن (کوٹہ، راجستھان)

.... افسانہ نمبر بہت خوب، بے حد کامیاب ہے۔ اس میں وہ سب کچھ ہے جو بیسویں صدی جیسے عظیم صحیفے کے خاص نمبر میں دیکھنے کی توقع ہوتی ہے.....

آسی رام نگری (مغلسرائے)

.... آپ اتنے اچھے نمبر شائع کرتے ہیں کہ اب تعریف کرنے کے لئے الفاظ بھی نہیں ملتے۔ اور پھر آپ کی مدیرانہ صلاحیتوں کا کون قائل نہیں....

نور شاد (سرینگر)

...گوناگوں جدتوں اور دل کش ندرتوں سے معمور افسانہ نمبر کی خوبیاں کیا بیان کروں، سورج کو چراغ کیونکر دکھاؤں؟.... اور دنیا نے ایک بار پھر دیکھ لیا کہ اس کے ناخداؤں میں حضرت خوشتر گرامی سب سے پیش پیش ہیں۔ اُن کے بازوؤں کی ساری توانائی اسی پر صرف ہو رہی ہے۔ اس

شاندار، اچھوتے اور معیاری افسانہ نمبر کی کامیابی پر دلی مبارکباد قبول فرمایئے....

ایم۔ کو ضیا دی راہی (قاضی پور خورد، گورکھپور)

.... میں اس حسین اور یادگار افسانہ نمبر میں شریک نہ ہو سکا، اس کا بے حد افسوس ہے۔ "افسانہ نمبر" بلند پایہ ادب کا ایسا حسین اور دلکش گلدستہ ہے جس نے اپنے حسن و خوبی سے قارئین کو بے خود کر دیا ہے۔ اتنا شاندار، اور معیاری افسانہ نمبر پیش کرنے پر دلی مبارکباد قبول فرمایئے...

عابد ضمیر (اسلام پور، آسنسول)

.... یوں تو بیسویں صدی کا ہر شمارہ ادبی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر تازہ افسانہ نمبر سابقہ نمبروں سے بھی آگے ہے۔ کون کافر ہے جو اسے دیکھ کر آپ کی خوش سلیقگی، ادبی خلوص، بے پناہ اور بہترین مدیرانہ صلاحیتوں کا اعتراف نہیں کرے گا......

کیف احمد صدیقی (سیتاپور)

...... یہ افسانہ نمبر آپ کی ہر دلعزیزی، شہرت، مقبولیت اور بلند پایہ فنِ ادارت کا شاہکار ہے۔ جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے..... یہ ایک ایسا سدا بہار گلدستہ ادب ہے جس کی خوشبو مدتوں روح کو معطر کرتی رہے گی....

دھرم پال (راجوری گارڈن۔ نئی دہلی)

.... حیران ہوں کہ اِس زمانے میں اِتنا بڑا پرچہ آپ کیسے نکال لیتے ہیں۔ آپ لوگوں کی محنت اور خلوص کی بدولت زندہ ہے....

(پروفیسر، کندن لال (ایم۔اے) نئی دہلی

.... افسانہ نمبر اتنا عظیم ہے کہ اِس کی تعریف کے لئے کوئی بھی زبان اسب الفاظ مہیا نہیں کرسکتی۔ ہر چھ ماہ کے بعد اتنی عظیم ادبی محفل سجالینا، آپ کا کام ہے۔ یقین جانئے جب اُردو ادب کی بقا کے لئے کوشش کرنے والے اُردو نواز حضرات کی فہرست ترتیب کی جائے گی تو اس میں آپ کا نام سرِ فہرست ہوگا....

کلدیپ سنگھ (پٹیالہ)

.... ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی مشاق مصوّر نے کینواس پر جابجا دلکش رنگ بکھیر دیئے ہوں اور ان بولتے ہوئے رنگوں نے کسی حسین سی تصویر کا روپ دھار لیا ہو.... (منیر کاظمی دہلی)

.... یہ افسانہ نمبر سابقہ نمبروں کی طرح کامیاب ہے۔ لکھنے والوں میں ملک کے مشہور ادیب اور یگانہ قلم افسانہ نویس شامل ہیں۔ شاعری کا حصہ بھی بہت بلند ہے۔ اِس افسانہ نمبر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اسے ہر شریف گھر میں ہر شریف خاتون اطمینان کے ساتھ پڑھ سکتی ہے کیونکہ یہ ابتذال، عُریانی اور معیار کی پستی سے بالکل پاک ہے۔ تصاویر اور شاعری سے ... درجنوں افسانوں تک کل مضامین کی تعداد ... ہے جس میں مشہور اہلِ قلم اور شعراء شامل ہیں۔ مثال کے طور پر ... فراق، علامہ آثر لکھنوی، ساغر نظامی، عرش ملسیانی، جگن ناتھ ... جگر تونسوی، گوپی ناتھ امن، ظفر پیامی، عرش صہبائی، علامہ ... وغیرہ کے نام لینا کافی ہوں گے۔ کتابت نہایت لاجواب اور معیاری طباعت بے نظیر ہے.... (روزنامہ الجمعیت۔ دہلی)

اس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ فلمی، اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و ذاتی سوالات شامل اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ بیسویں صدی کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کے لئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے۔ ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھیئے کہ اس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے۔

(ایڈیٹر بیسویں صدی۔ دہلی)

افتخار بلگرامی۔ بمبئی

س۔ ماں کی خدمت کا صلہ؟

ج۔ جنت!

س۔ "عزت کی موت ذلت کی زندگی سے بہتر ہے" یہ کس کا قول ہے؟

ج۔ کسی غیور و خوددار کا۔ ٹیپو سلطان نے کہا تھا "شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے اچھی ہے"

س۔ خودداری اور فرض کی جنگ میں کس کی فتح ہوتی ہے؟

ج۔ فرض کی فتح ہونی چاہئے۔

عبدالجلیل عادل۔ کشن گنج

س۔ امیر انسان میں ایسی کون سی خوبی ہوتی ہے جو غریب انسان میں نہیں ہوتی؟

ج۔ امیر انسان کے پاس دولت ہوتی ہے جو آجکل ساری خوبیوں سے بڑی سمجھی جاتی ہے۔

س۔ انسان کی ناکامی کی وجہ؟

ج۔ حوصلہ کی پستی۔

س۔ اگر انسان عزت و شہرت چاہے تو کیا کرے؟

ج۔ عزت و شہرت حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرے۔

آفتاب۔ کراچی

س۔ انسان کی عالمگیر زبان؟

ج۔ پیار۔ محبت۔ اخوت!

س۔ ادب کے نام پر جو لوگ فحاشی کرتے ہیں اُن کا انجام کیا ہوگا؟

ج۔ نیک نہ ہوگا۔

س۔ جس گھر میں "بیسویں صدی" نہ ہو؟

ج۔ آپ کا خیال ہوگا ہم کہیں گے جس گھر میں "بیسویں صدی" نہ ہو، اُس گھر کے لوگوں کا ادبی ذوق پست ہوگا۔ لیکن ہم یہ نہ کہیں گے۔ خود ستائی ہمارا شیوہ نہیں۔

نسرین بانو ۔ کلکتہ

س۔ بھائی جان! مجھے ایک لڑکے سے محبت ہے۔ وہ بھی مجھے دل و جان سے چاہتا ہے۔ ہم دونوں کے پیار میں خلوص، سچائی اور پاکیزگی ہے۔ ہم ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ لیکن ہم دونوں کی شادی ہونے کی کوئی اُمید نہیں! اس لئے کہ وہ لڑکا دوسرے خاندان کا ہے اور غریب بھی ہے۔ جب کہ ہمارے پاپا کو اللہ نے کافی دے رکھا ہے۔ بتائیے میں کیا کروں؟

ج۔ حالات سے سمجھوتہ کر لیجئے۔ آپ کے پاپا آپ سے زیادہ تجربہ کار و جہاندیدہ ہیں آپ کی بھلائی کو آپ سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ اُن پر بھروسا کیجئے۔

اے غنی احمر ۔ کلکتہ

س۔ جب انسان نیک کام اختیار کرتے ہیں تو اُن پر مصیبت آجاتی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟

ج۔ وہ بظاہر مصیبت ہوتی ہے لیکن درحقیقت رحمت ہوتی ہے۔

س۔ بھیا! شادی کرنے کے بعد آزادی ختم ہو جاتی ہے؟

ج۔ جی ہاں! لیکن شادی کا بندھن کتنا پیارا ہوتا ہے۔

س۔ زندگی پھول ہے یا کانٹا؟

ج۔ کبھی پھول، کبھی کانٹا۔ یہ آپ پر موقوف ہے کہ آپ اپنی زندگی کو پھول بنائیں یا کانٹا!

صغیر احمد عثمانی ۔ اعظم گڑھ

س۔ ایک مدت سے میں افسانے لکھا کرتا ہوں اور اصلاح بھی کرائی لیکن اُنھیں شائع کرانے پر طبیعت آمادہ نہیں ہوتی۔ کیوں؟

ج۔ احساس کمتری ترقی کی راہ کا سب سے بڑا پتھر ہے۔ حوصلہ سے کام لیجئے۔ ہر چنگاری شعلہ بن سکتی ہے۔

س۔ انسان پر مذاہب کی بندش کیوں لگائی گئی ہے؟

ج۔ تاکہ انسان بے راہ نہ ہو جائے۔ مذہب سے بہتر کوئی نظامِ حیات نہیں۔

ایم ۔ اے احسن ۔ پٹنہ

س۔ میرے کچھ رشتہ دار ہیں، جو مجھ سے کسی سلسلے میں زبردستی کرتے ہیں۔ کہ تمہیں یہ کام انجام دینا ہوگا لیکن اُس کام کو انجام دینے میں میرا بہت بڑا خسارہ ہوگا۔ آپ بتائیے میں کیا کروں؟ کام انجام نہ دوں تو بُرا کہلاتا ہوں۔ اگر انجام دوں تو خسارہ اُٹھاؤں گا۔ مشورہ دیں کہ کیا کروں؟

ج۔ کسی کا دل جارحانہ طور پر نہیں جیتنا چاہیے کسی کا دل پیار سے فتح کرنا چاہیے۔

س۔ اس دُنیا میں کیا اپنا کوئی نہیں ہوتا ہے۔ ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے خدارا نیک مشورہ سے میری رہنمائی فرمائیے۔

ج۔ اپنا سہارا آپ بنئے۔ جب آپ اپنے جینے کا ڈھنگ درست کر لیں گے تو دُنیا میں زندہ رہنے کے لئے طرح طرح کی تکلیفیں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔

س۔ اگر حالات ساتھ نہ دیں تو حالات سے سمجھوتہ کر لینا چاہیے؟ کیا یہ صحیح ہے؟

ج۔ جی ہاں!

محمد نذیر الحسن ۔ پورنیہ

س۔ بھیا! کیا مفلسی چھپائی بھی جا سکتی ہے؟

ج۔ ہاں! سلیقہ مند اپنی مفلسی کو چھپائے رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ اس کے اظہار سے

کوئی فائدہ نہیں ہوتا مفلس انسان لوگوں کی
نظروں میں تنکہ ہو جاتا ہے۔

س۔ نادار طبقے کی عید؟

ج۔ کسی نے کہا ہے ؎

دس پندرہ کا خرچ یہاں اک رقم نہیں
اُف! مفلسی میں عید محرم سے کم نہیں

مشکور احمد قریشی۔ پالن پور۔ گجرات

س۔ خوشتر بھیا! جوش ملیح آبادی کا نام کیا ہے؟

ج۔ شبیر حسین!

س۔ شوکت تھانوی کا مکمل پتہ اور عمر کیا ہے؟

ج۔ شوکت صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے۔

رُوحی فاطمہ۔ سیدن پور

س۔ امیر لوگ غریبوں کو انسان کیوں نہیں سمجھتے؟

ج۔ اُن کی نظر میں دولت ہی معیارِ انسانیت ہے

س۔ بھیا! کیا آج کل کی دنیا میں غریب ہونا بھی ظلم ہے؟

ج۔ ظلم نہیں، گناہ ہے!

س۔ بھیا! اپنی پسند کا کوئی شعر سنائیے۔

ج۔ سُنیئے ؎

کہاں کے مطرب غزل کہاں کے شاہد و چمن
کہ زندگی تمام تر بساط کارزار ہے

محمد غضنفر حسین۔ اجڑولی

س۔ آج کل اُردو کا مایۂ ناز شاعر کون ہے؟

ج۔ بہت سے ہیں۔ نام کس کس کا لیا جائے؟

س۔ جوانی؟

ج۔ جوانی دیوانی ہوتی ہے۔

علی احمد جلیس۔ برہان پور

س۔ اس فانی زندگی میں درد، غم، پریشانی اور انسانیت کا نام نہ ہو تو؟

ج۔ پھر زندگی زندگی نہ ہوگی۔

س۔ خوشتر بھیا! میں ماضی، حال، مستقبل سے ڈر رہا ہوں مجھے مقابلے کی راہ بتایئے۔

ج۔ ڈرنے کی کیا بات ہے؟ حوصلے سے کام لیجئے۔ بلند حوصلہ انسان کسی سے نہیں ڈرتے۔

نجم الہدیٰ قریشی۔ کانپور

س۔ حضرت ساغر نظامی کا نام کیا ہے؟

ج۔ صمد یار خاں!

عبدالحمید خاں۔ برہان پور

س۔ خوشتر بھیا! حقیقی خوشی کا راز؟

ج۔ دوسروں کو خوشی دینا!

س۔ محبت اور انسانیت کی کشمکش میں کس کا ساتھ دینا چاہیے؟

ج۔ انسانیت کا!

ایس۔ ایس۔ سمیع اللہ۔ رانچی

س۔ خستہ حال، گم کردہ منزل اور تاریک راہ! ایسی حالت میں کوئی کیا کرے؟

ج۔ جب بھی حوصلہ نہ چھوڑے۔ ورنہ منزل دُور اور دُور ہو جائے گی۔ تاریکی اور گہری ہو جائے گی۔

س۔ یہ کس کا شعر ہے اور اس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ ؎

اُٹھا کر پھینک دو باہر گلی کے
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

س۔ کسی حقیقت آشنا شاعر کا شعر ہے اور اچھا شعر ہے۔

س۔ کامیابی کا راز؟

ج۔ ناکامی سے کبھی بددل نہ ہونا۔

نور جہاں۔ بلہاری۔ مونگیر

س۔ تعلیم نسواں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج۔ عورتوں کو ضروری تعلیم سے بہرہ ور رکھنا چاہیے۔

الطاف احمد شہیدی۔ آکولہ

س۔ کوئی ایسا شعر سنائیے جو آپ کو پسند ہو۔

ج۔ سُنیئے۔

جو صرف عشرتِ منزل کی دُھن میں چلتا ہے
حرام عشرتِ منزل ہے ایسے راہی کو

س۔ اُردو کا سب سے پہلا شاعر؟

ج۔ "گلستانِ ہزار رنگ" کے مرتب کے بیان کے مطابق اردو کے پہلے شاعر حضرت امیر

[illegible]

س۔ موجودہ شعراء میں قابلِ ذکر خاص شعراء؟

ج۔ بہت سے شاعر ہیں، کتنے نام بتائے جائیں!

محمد سعید اختر

س۔ آج کی دنیا میں وفا کی قیمت؟

ج۔ کوئی قیمت نہیں۔

س۔ دوست اگر دشمن بن جائے تو کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ اُس سے ہوشیار رہنا چاہئے۔

س۔ وکالت کے پیشے اور سچائی میں کیا رشتہ ہے؟

ج۔ بہت نازک!

سلیمان بلخی۔ شیر گھاٹی۔ گیا

س۔ دُنیا کو بہت سے لوگ جہنم کہتے ہیں۔ لیکن یہاں سے کوچ کرنا کوئی نہیں چاہتا۔ کیوں؟

ج۔ آپ اپنی کہئے۔ آپ یہاں سے کوچ کرنا چاہتے ہیں؟

رفیق اکرم۔ بھساول

س۔ انسان اپنے ہی سائے سے کب ڈرنے لگتا ہے؟

ج۔ جب اپنے بیگانے بن جاتے ہیں۔

س۔ آپ نے دیش کے لئے کیا دیا۔ تن، من، دھن؟

ج۔ بقدرِ ہمت کسی نہ کسی مقدار میں سب کچھ۔

احمد حسن۔ عادل آباد

س۔ یہ شعر کس کا ہے؟

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

ج۔ مجروح سلطان پوری کا۔

س۔ چین سے دوستی کرکے ہندوستان کو کیا فائدہ پہنچا؟

ج۔ جو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

شیخ ابوبکر صدیقی۔ ہٹی گولڈ مائنس

س۔ قدرت کی انوکھی تخلیق؟

ج۔ ہماری رائے میں وہ لوگ قدرت کی انوکھی تخلیق ہیں جو بے بنیاد طور پر کسی سے بدگمان ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ کوئی ایسا مصرعہ سنائیے کہ غصہ آجائے۔

س۔ کوئی ایسا مصرع سُنائیے کہ غصہ آجائے۔

ج۔ سُنیئے ؎

آپ سے احمق بھی دُنیا میں ابھی موجود ہیں

شفیع احمد نئی بستی، جھریا

س۔ انسان اگر ہر طرف سے مجبور ہو جائے تو کیا کرے؟

ج۔ اپنے عزم و حوصلہ پر بھروسا کرے۔

س۔ آنسو کیا ہے؟

ج۔ اشک رخسار پہ ڈھلکے تو ہے اک قطرۂ آب
اور پلکوں پہ جو چمکے تو گہر ہوتا ہے

عمر خطاب خاں جمشید پوری

س۔ رات کو نیند نہ آسکے تو کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ شاعری کرنی چاہئے یا [illegible]

س۔ اپنے گھر کا بجٹ بڑھتا ہی جا رہا ہے کیسے گزارہ کر سکتے ہیں یا خرچ کم کیا جائے؟

ج۔ جو خرچ کم کرنا ضروری ہو۔ ایک دانشور کا قول ہے۔ اپنی آمدنی بڑھانا اپنے اختیار میں نہیں ہے۔ لیکن اپنا خرچ کم کر دینا اپنے بس میں ہے۔

عبد الصبور۔ گلبرگہ

س۔ انسان بُری صحبتوں کی طرف کب رُخ کرتا ہے؟

ج۔ جب اچھی راہوں سے بھٹک جاتا ہے۔

س۔ علامہ اقبال کا کوئی اچھا سا شعر سنائیے۔

ج۔ سُنیئے ؎

خودی کے زور سے دُنیا پہ چھا جا
مقامِ رنگ و بو کا راز پا جا

س۔ انسان اپنی زندگی سے گھبرا جائے تو اُسے کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ زندگی کو ایسا بنانا چاہئے کہ اُسے پیار کرنے کو جی چاہے۔

الطاف حسین۔ مبارکپور

س۔ ملکِ عدم کا کتنا کرایہ ہے؟

ج۔ آپ چاہیں تو بغیر کرائے بھی جا سکتے ہیں۔

س۔ سچے دوست کی کیا پہچان ہے؟

ج۔ دوست کبھی بدگمان نہیں ہوتا۔

سید احمد حسین کاکوڑگیا

س۔ ادب کیا ہے؟

ج۔ جو آپ ادبی کتابوں اور ادبی رسائل میں پڑھتے ہیں۔

س۔ ایک اچھا ادیب بننے کے لئے کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ ادبی کتابوں اور ادبی رسائل کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ کسی اچھے ادیب سے استفادہ کرنا چاہئے۔

نور الدین پرویز۔ اورنگ آباد

س۔ شمع اور پروانے دونوں جلتے ہیں۔ آپ دونوں میں قابلِ رحم کسے سمجھتے ہیں؟

ج۔ دونوں اپنی اپنی آگ میں جلتے ہیں ؎
پرائی آگ میں جلتا ہے کون دنیا میں
پتنگے آگ میں اپنی بنام شمع جلے

محمد مظہر الہدیٰ۔ آرہ

س۔ اردو کے حامیوں کو اب کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ مایوس نہ ہونا چاہئے۔ اردو کی بقا کے لئے عزم و استقلال سے کام کرنا چاہئے۔

س۔ زندگی میں کامیابی کے طریقے؟

ج۔ کامیاب انسانوں کی زندگی سے روشنی حاصل کرنی چاہئے۔ زندگی آموز اور حیات افروز تحریریں پڑھنی چاہئیں۔

س۔ تندرستی کا راز کیا ہے؟

ج۔ کھانے پینے، رہنے سہنے میں صحت کے اصولوں کی پابندی کرنی چاہئے۔ مفصل معلومات کے لئے صحت کے موضوع پر کتابیں پڑھنی چاہئیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اس موضوع کی مشہور کتاب "صحت و زندگی" مطبوعہ ادارہ بیسویں صدی دہلی کے مطالعہ سے آپ کو بہت کافی روشنی ملے گی۔

محمد ہاشم ایوبی۔ شاہ آباد

س۔ افسانہ لکھنے کا کیا مقصد ہونا چاہئے؟

ج۔ افسانہ لکھنے کا مقصد تعمیر ہونا چاہئے تخریب نہیں۔

س۔ افسانہ مردہ ہوتا ہے یا زندہ؟

ج۔ جیسا افسانہ ہو۔ کچھ افسانے لافانی ہوتے ہیں۔

س۔ افسانہ کا اثر اخلاق پر؟

ج۔ اچھے افسانے کا اچھا اثر پڑتا ہے بُرے افسانے کا بُرا۔

سید صابر یسین علی۔ برمل

س۔ پیٹھ پیچھے بُرائیاں کرنا۔ دوسروں کی غیبت کرنے کا جذبہ ہمارے سماج سے کب دور ہوگا؟

ج۔ جب تک ہمارے معاشرے کا ہر فرد کوشش نہ کرے سماج سے یہ برائی دور نہیں ہو سکتی۔

مختار احمد صدیقی۔ ہزاری باغ

س۔ کیا اردو زبان میں کوئی ایسا شاعر گذرا ہے جو بنگالی شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کے مقابل ہو؟

ج۔ علامہ اقبال!

س۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اردو، انگریزی اور چینی کے بعد دنیا میں سب سے زیادہ بولی جاتی ہے لیکن مجھے یقین نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ ہندی بولنے والوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ براہ کرم آپ اپنی رائے ظاہر کریں۔

ج۔ دنیا کی ساری زبانوں میں انگریزی اور چینی کے بعد اردو سب سے زیادہ بولی جاتی ہے۔ یہ کچھ لوگوں کا خیال نہیں ہے۔ یہ اعداد و شمار اقوام متحدہ نے اکٹھے کئے ہیں۔

س۔ شادی کرنا فرض ہے مگر کب اور کس عمر میں کرنی چاہئے؟

ج۔ پختہ عمر ہو جانے کے بعد شادی کرنی چاہئے۔

ایس۔ ایم۔ یوسف۔ سلطان پور

س۔ دل کب روتا ہے؟

ج۔ جب دل کو ٹھیس لگتی ہے۔

س۔ دل سے نکلنے والی خاموش فریاد؟

ج۔ اثر سے خالی نہیں ہوتی ؏
بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے!

…ہ ہزار روپے کے انعامات کی شاندار تقسیم

… ۴۹ خوش نصیبوں نے صحیح حل بھیج کر آٹھ ہزار روپے کے انعام میں سے بقدر ایک سو … روپے ستائیس نئے پیسے فی کس حاصل کیا۔

… ۲۰۰۴ حل موصول ہوئے جن پر دوسرا انعام تین ہزار روپے بحساب سات روپے چالیس نئے پیسے فی کس تقسیم ہوا۔

… ۵۰۰ حل موصول ہوئے جن پر تیسرا انعام دو ہزار پانچ سو روپے بحساب دو روپے انچاس نئے پیسے فی کس تقسیم ہوا۔

… ۱۳۸۲ حل موصول ہوئے جن پر چوتھا انعام ایک ہزار پانچ سو روپے بحساب ایک روپیہ ستو نئے پیسے فی کس تقسیم ہوا۔

انعامات کی روانگی ۲۲ اگست ۱۹۶۳ء سے شروع ہو جائے گی

…س کے بعد!
اردو ادبی معمہ نمبر ۲ کے ذریعہ حاصل کیجئے

Rs. 18,555.55
اٹھارہ ہزار روپے …

اور اب!

Rs. 21,000.00
اکیس ہزار روپے …

اردو ادبی معمہ نمبر ۳ کے ذریعہ پیش کئے جا رہے ہیں۔

اردو ادبی معمے کے حل ہاتھ سے بنائے ہوئے یا چھپے ہوئے خاکوں میں بھیجئے۔ خاکے مفت طلب کریں۔

معمے سے متعلق تمام خط و کتابت صرف اس پتہ پر کیجئے۔ اردو ادبی معمے، اردو بازار، دہلی ۶

"چمبل گھاٹی کے ڈاکوؤں میں خفیہ معاہدہ۔ متحدہ محاذ بنالیا" ——— سرکار کے خلاف ؟ تو پھر باقی اپوزیشن پارٹیاں بھی اُسمیں شامل ہو جائیں ———

اس لئے یو۔ پی سرکار وزیروں کا بوجھ گھٹانے پر غور کر رہی ہے۔

"دنیا کا سب سے بڑا چڑیا گھر" ——— اس میں دنیا کے بڑے بڑے سیاسی رہنماؤں کے لئے خاص انتظامات کئے جائیں گے۔

"بھارت کو جنگ سے بدتر حالات درپیش ہیں" شری لال بہادر شاستری ——— اور بیرونی جنگ کی وجہ سے نہیں بلکہ کانگریسیوں کی اندرونی جنگ کی وجہ سے۔

"آبادی پھٹ رہی ہے" ——— بھاگ کر وہ بندوق کی طرح کا کوئی بند بناؤ۔

"معمّا مجلتی ہے۔ ایک عنوان ——— وزارتوں اور عہدوں کے سامنے۔

"یو۔ پی اسمبلی میں گورنمنٹ کے خلاف شرم شرم کے نعرے" ———
شرم تو اسی دن اُٹھ جاتی ہے جب آدمی لیڈر بن جاتا ہے اور رہی سہی وزارت کی قربان گاہ پر چڑھ جاتی ہے۔

"دلّی سرکار مہنگائی روکنے میں بالکل ناکام رہی" ——— ایک سرکار ہے کیا کیا کرے۔ مہنگائی روکے۔ چینی تقسیم کرائے۔ کوئلے کا انتظام کرے۔ غلہ منگوائے۔ گڑ کی بلیک روکے۔ ایک انار سو بیمار ہیں یہاں تو۔

"برلن کی دیوار ختم" ——— اب دیوارِ چین کی باری ہے۔

"پاکستان کو اسلامی جمہوریہ قرار دینے کی تجویز" ——— [illegible]

[illegible]

"گندم کی [illegible] ۔ [illegible] پنجاب کے [illegible] —— [illegible]

[illegible]

"حکومت منصوبہ بندی کی سرپرستی قبول کرے" ایک عنوان —— اور [illegible] ملک کی [illegible] میں شامل ہو جائے۔

"نادار طلباء کے لئے وظائف" —— اور نادار لیڈروں کے لئے وزارتیں۔

"آریہ سماج قوم کا کیرکٹر بنانے کے لئے میدان میں اُترے" ایک عنوان —— اور سب سے پہلے اُن آریہ سماجی اخباروں کا کیرکٹر درست کرے جنہوں نے کیچڑ اچھالنا زندگی کا مقصد بنا لیا ہے۔

"تعلیم کا مقصد صرف روپیہ کمانا نہیں ہوتا" مرارجی ڈیسائی —— تو پھر لیڈری کرنا بھی نہیں ہوتا۔ وہ تو ہندوستان میں بغیر تعلیم کے بھی ہو جاتی ہے۔

"چاول اسمگل کرنے کی کوشش ناکام بنا دی گئی" ایک خبر —— اور دلّی میں گڑ کی بلیک کی کوشش کامیاب رہی۔

"مشرقی پاکستان میں مشینی آلات بنائے جائیں گے" —— اور انہیں سیاسی مشینری میں فٹ کر کے سیاستدانوں کو درست کیا جائے گا۔

"الیکشنوں میں پیسہ خرچ کرنے کی کھلی چھٹی دے دی جائے گی" ایک خبر —— برلاؤں، ٹاٹاؤں اور ڈالمیاؤں کے اُمیدواروں کے لئے زبردست سہولت۔

"سیمنٹ کی قلت دور کرنے کے اقدامات" ایک خبر —— غالباً اُس میں

"چو۔ این۔ لائی کی پھر وہی پرانی رٹ" —— یعنی مرغے کی ایک ٹانگ۔

صدر ایوب کنونشن مسلم لیگ کے صدر منتخب کر لیے گئے۔

"ہندی ملک کی تمام زبانوں کی بڑی بہن ہے" : ایک مقالہ ——— اور آج کل کے بڑے چھوٹوں کے حقوق غصب کرنا جائز سمجھتے ہیں۔

"سائنسی قابلیت کی تلاش" : ایک عنوان ——— فضا میں، خلا میں، زمین کے نیچے کہاں؟

"پنجاب میں کانگرس کا جنازہ نکل کے رہے گا" : شری رام پیارے کا بیان۔
——— مولوی عبدالغنی اور پنڈت سری رام شرما قسمت آزمائی کر چکے اب آپ کی باری ہے۔

"ریلوے حادثوں پر قابو پانے کے لئے بورڈ کا قیام" : ایک خبر
بورڈ کے دفتر میں ایک سوئچ لگا دیا جائے گا جسے دبانے سے بورڈ حادثے روک دیا کرے گا۔

"چین اپنے نقطۂ نظر پر قائم" : ایک عنوان ——— بارہ برس کے بعد کتے کی دم نلی سے نکالنے پر ٹیڑھی ہی نکلے گی۔

"کابینہ میں کانٹ چھانٹ مشکل" : مہاراشٹر کے وزیر اعلیٰ کا خیال ——— جب تک کوئی کامراج آ کر پھر پلان پیش نہ کرے۔

"عورت کون ہے؟" : ایک عنوان ——— اُن ہی سے پوچھیے۔

"دلی کو ملاوٹ خور تاجروں سے بچانے کی مہم" ——— غیروں سے بچایا جا سکتا ہے۔ گر اپنوں سے تو خدا ہی بچائے۔

"طوفان اُٹھ رہا ہے" : ایک عنوان ——— اور ہم ہیں کہ بنسی بجا رہے ہیں۔

افسانہ

تیسری لڑکی

یونس رمزی ایم۔ اے

۳۰۳ پاکستان کوارٹرز۔ لارنس روڈ کراچی

۲۶ر اکتوبر ۱۹۶۳ء — محترمی خوشتر بھائی! تسلیمات

لیجیے حسبِ وعدہ ایک افسانہ "تیسری لڑکی" سالنامہ کیلئے حاضرِ خدمت ہے۔ اپنی پسند اور رسید سے مطلع فرمائیے۔ خدا کرے سالنامہ خوب سے خوب تر ہو۔ آپ کے سفر کا حال ادیبوں کے خطوط سے معلوم ہوتا رہتا ہے۔ کیا ایسا ممکن نہیں کہ آپ کبھی سرحد پار کا بھی سفر کر سکیں! کبھی ادھر بھی آئیے۔ یقین جانئے آپ بہت سے لوگوں کو چشم براہ پائیں گے....

یونس رمزی

تیسری لڑکی اندر دھنش کے سے ابروؤں، چمکدار آنکھوں، اور خمدار پلکوں کی وجہ سے بہت خوبصورت نظر آ رہی تھی۔ سنولائی تھی۔ پہلی بار اُس سے ملنے کے بعد سونی کو ایک عجیب سی ٹھنڈک کا احساس ہوا تھا۔ اُس شبنم کا جو جلتی ہوئی آگ سے ٹپک کر اپنے وجود کو فنا کر دے۔ تیسری لڑکی سیتا سین تھی جو ستار کے تاروں پر مضراب لگاتے وقت دلوں کو آہستہ سے چھو لیتی تھی۔ ساز کا حجاب اور نغمہ کا غیر مرئی پردہ ہٹ سا جاتا تھا۔ اور مضراب کی چوٹیں دلوں پر محسوس ہوتی تھیں۔

پہلی بار وہ اُسے پیراڈائز پوائنٹ پر ملی تھی۔ لہراتے ہوئے سیاہ بالوں، بھیگے بھیگے سے سرخ متبسم لبوں اور نیلگوں آنکھوں کی گہرائیوں کے ساتھ یوں کھڑی تھی جیسے کوئی یونانی مجسمہ ہو۔ اُس کے نازک نازک سے چنبیلی کی رنگت والے پیروں کے نیچے بیچ کی نرم نرم ریت کا دامن خیال کا وہ نقش ابھار رہی تھی جس پر سونی کی نگاہیں جم کر رہ گئی تھیں۔ اور اُسے کچھ ایسا محسوس ہوا تھا جیسے ریت پر دو کنول کے پھول نرم سُروں میں سرگوشی کرتے ہوئے بہت آہستہ آہستہ متحرک ہوں، وہ دلچسپی سے مبہوت کھڑا دیکھتا رہا۔ اُس نے اُسے کئی زاویے سے دیکھا اور کئی زاویے سے وہ اُسے حسین نظر آئی۔ اُس کے نازک نازک سے پھڑکتے نتھنے، سرخ سرخ ہونٹوں پر سورج کی روشنی کے آخری پرتو کو نگاہوں کی ترازو میں تولا۔ اور پھر گگن کی لالی کو سمندر کی لہروں میں تحلیل ہوتے دیکھنے لگا۔

سمندر کی بیکراں لہریں ساحل سے ٹکرا رہی تھیں، وہ لہروں سے قریب ہوتا گیا اور پھر اُس نے سوچا۔ یہ لڑکی بھی سمندر کی ایک بیکراں لہر کی طرح ہے۔ شام دھیرے دھیرے گہری ہو گئی کسی رنگین خواب کی طرح۔ لڑکی آہستہ آہستہ لہروں کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ بھی اُس کے پیچھے پیچھے بڑھتا گیا۔ اچانک سمندر کی لہروں کی دیوار نے لڑکی کو چھپا لیا۔ اور وہ چیخ پڑی۔

سونی کی آنکھوں کے سامنے پانی کی دیوار تھی لیکن پھر بھی اُس نے لڑکی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ لہر آئی اور گزر گئی۔

اور یہی سیتا تیسری لڑکی تھی جو اُس کی زندگی میں اچانک آ گئی تھی۔ پہلی لڑکی سعدیہ تھی جو اُسے یونیورسٹی میں ملی تھی۔ اور جو ٹیسٹ ٹیوب اور جار کے شیشے کی دیوار سے اُس کی طرف بہت گہری آنکھوں سے دیکھا کرتی تھی۔ اور جب وہ اُس کی طرف نگاہیں اٹھا کر دیکھتا تو شیشے کی دیوار کے اُس پار اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی لکیر گہری ہو جاتی۔ اُسے محسوس ہوتا جیسے یہ لڑکی روزانہ اُس کے دل کی دیوار پر مسکراہٹ کی منہدیاں پھینکتی رہتی ہے۔ اُسنے بہت چاہا کہ کیمیکلز سولیوشن اور ٹیسٹ ٹیوب میں کھو کر اُسے بھول جائے۔ لیکن وہ بہت ضدی لڑکی تھی۔ اُس نے مسکرانا نہ چھوڑا اور آخر وہ اُسے گھسیٹ کر باہر کامن روم میں لے آئی۔ کینٹین میں لے آئی۔ پارک میں لے آئی۔ سینما ہال اور میوزیم ہال میں لے آئی، اپنی کار میں لے آئی جسے وہ ساٹھ میل کی رفتار سے چلا کر بچوں کی طرح قہقہے لگاتی تھی۔

اور پہلی بار جب وہ اُسے اپنے گھر لایا تو اُس کی ماں شانتی دیوی کو کتنی مسرت ہوئی تھی، قدم قدم پر بچھی جاتی تھی۔ اُس کے خشک و ویران ہونٹوں پر پہلی بار مسکراہٹ اپنی پوری زندگی کے ساتھ پھیل گئی تھی۔ اُس مسکراہٹ میں کچی کلیوں کی سی تازگی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے لہو کا ایک قطرہ ہونٹوں پر پھیل گیا ہو۔

ماں کی یہ مسکراہٹ سونی کو بہت اجنبی معلوم ہو رہی تھی۔ پہلی بار جب اُس نے میٹرک پاس کیا تھا تو بھی وہ اس انداز سے نہ مسکرائی تھی۔ جب اُس نے بی اے کیا تھا اُس وقت بھی ایسی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر نہ آئی تھی۔ یہ مسکراہٹ تو ایسی تھی جیسے کالے بادلوں سے اچانک سورج کی کرنیں چھن کر نکل آئی ہوں۔ اور تب اُس نے بھی مسکرانے کی کوشش

کا جھی ... سے اُس کے دل تک ایک راستہ بن گیا تھا جو منور تھا، روشن تھا اور اس میں ... خوشبو تھی۔ دھنک کے سات رنگ تھے۔ اس کنارے سے اُس کنارے تک ... اور اُس کو سمدرا اُسے دنیا کی سب سے قیمتی شے معلوم ہوئی۔ وہ ماں کے لئے تو ... ہوئے ناسور کا نشتر بن گئی تھی۔

... سمدرا کو وہ اپنے ہاتھوں سے کھلانے لگیں۔ بالکل سمدرا جیسے اُس کی نئی نویلی بہو ہو۔ اور ہنستے ہنستے شانتی دیوی کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے اور سمدرا ایسے ہی خوا... رہی تھی جیسے اسی وہ سونی کی دلہن ہو۔ وہ بار بار کہتا رہا۔ ماں جی! سمدرا اب روز آئے گی۔

لیکن دوسرے دن جب وہ سمدرا سے ملنے اُس کی کوٹھی پر پہنچا تو سمدرا نے اُسے اپنے پتاجی رائے صاحب سے ملایا اور باتوں باتوں میں اُنہیں بتایا کہ وہ ہری پور کے زمیندار اتم سنگھ کا لڑکا ہے تو وہ اچانک چونک پڑے جیسے کسی بچھو نے اُن کے ڈنک مار دیا ہو۔

"تو پھر تم شانتی دیوی کے لڑکے ہو؟"

"جی ہاں! پتاجی کے مرنے کے بعد وہ مجھے شہر لے آئی تھیں اور انہوں نے ہی میری پرورش کی ہے۔"

"مگر شانتی دیوی اتم سنگھ کی بیاہتا بیوی نہیں تھیں۔" رائے صاحب نے بہت سنجیدگی سے کہا۔

"جی؟!" سونی کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

"ہاں! شانتی دیوی اُن کی داشتہ تھیں۔" اور سونی کو محسوس ہوا جیسے رائے صاحب نے اسے دلدل میں دھکا دے دیا ہے۔ اور وہ دھیرے دھیرے ڈوبتا جا رہا ہے۔ اُس کا دم گھٹنے لگا ہے۔ وہ پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ ماں کی اُداسی کا راز آج اُس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔

"میں چلتا ہوں۔" اُس نے دھیرے سے کہا۔ سمدرا اُسے گیٹ تک چھوڑنے آئی۔ اور ایسے پلٹ گئی جیسے ہوا نے اچانک اپنا رُخ بدل دیا ہو۔

اور جب وہ مشکل بھون میں داخل ہوا تو مہندی کی باڑھ کے پاس ہی اُسے شانتی دیوی مل گئیں جو مندر سے واپس آ رہی تھیں۔

"آج سمدرا نہیں آئی بیٹے؟" انہوں نے بہت نرمی سے پوچھا۔

"اب وہ کبھی نہیں آئے گی ماں۔ کبھی نہیں!"

"کیوں جھگڑا ہو گیا ہے تمہارا؟"

"ہاں، وہ بڑے باپ کی بیٹی ہے، اُس کی تین ملیں ہیں، سات کاریں ہیں۔ شہر میں چھ دفاتر ہیں۔ اور اُس کی خوبصورت ساریاں خود اُس کی ملیں بناتی ہیں۔"

"لیکن سمدرا تو بہت اچھی لڑکی ہے۔ میں نے تو اُس کے من میں جھانک کر دیکھا تھا۔"

"تم نے غلط دیکھا تھا ماں! آکاش دھرتی کو چھوتے ہیں یہ صرف نظر کا دھوکا ہے۔"

جسونت مہکری دہلی

"نہیں نہیں کچھ ایسی بات ... تم ... ہو..."

"کچھ ایسی بات ہے، ہاں کچھ ایسا ... تمہارے پتاجی ... کے دوستوں میں تھے۔"

"دوستوں میں تھے!" ... کی خالی ... کے ہاتھ سے گر گئی۔ ... جسم کانپنے لگا۔ طوفان میں ... درخت کی طرح۔ اُن کی آنکھیں ... سے ڈبڈبا آئیں۔ سونی نے بڑھ کر انہیں سنبھالا ... اور کرسی پر بٹھا دیا۔

اس دن کے بعد سمدرا نے اُس سے ملنا جلنا ... اور وہ ... مجرم کی طرح خود کو اُس کی نظروں سے چھپاتا پھرتا۔ ... اُسے ایسا محسوس ہوتا کہ ایک پل میں یہ لڑکی سمدرا اُسے سپنوں کا ... ان کا ... کے لئے بیوپار معلوم ہوا تھا۔ لیکن اُس نے سوچا، اس دھرتی پر ... انسان کی ماں صرف ایک ہوتی ہے۔ اور ماں، ماں ہے۔ ... اس کا پیار رُک گیا تھا۔ ایک ... خاموشی ... کھلنے لگتی ... خاموشی اُس کے لئے سولی بن جاتی۔ اور وہ انہیں جھنجھوڑ کر کہتا۔ "بولو ماں! بولو۔ دیکھو میں تمہارا ... بیٹا ہوں۔" یہاں تک کہ سمدرا کے آنچل کو چھوڑ دینے کے غم کو بھی اُس نے بہت ... سے بھلا دیا تھا۔ ایک حادثہ زندگی کے دوسرے حادثہ کو کمزور بنا دیتا ہے۔ کچھ ایسا ہی ... ساتھ ہوا تھا۔

پھر سونی نے ایم۔ ایس سی کیا۔ لیکچرار بنا۔ دوسرے شہر میں منتقل ہو گیا۔ لیکن شانتی دیوی کے لبوں پر وہ مسکراہٹ واپس نہ لا سکا جسے پہلی بار سمدرا کے ملنے پر اُس نے دیکھا تھا۔ وہ زیادہ تر خاموش رہتیں۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے ... ہوں۔ اور ماں کی اس مسکراہٹ کے لئے اُس نے دوسری سمدرا ایک دن ڈھونڈ ہی نکالی۔ دوسری سمدرا اجونتی تھی جو حال ہی میں سوشیولوجی میں ڈگری لے کر امریکہ سے واپس ہوئی تھی اور کلکتہ سے دہلی کے ہوائی سفر میں اُس سے ملاقات ہو گئی تھی۔ تمام راستے وہ نہایت بے تکلفی سے اُس سے باتیں کرتی رہی۔ یہاں تک کہ ازدواجی زندگی پر بھی اُس نے کھُل کر باتیں کی تھیں اور اُس نے ہنستے ہنستے اُس سے پوچھ بھی لیا کہ خود اپنی شادی کے بارے میں اُس کا کیا خیال ہے؟ اور جواباً اُس نے بتایا کہ اس بارے میں سوچنے کی اُسے فرصت ہی نہیں ملی۔ اور ڈم ڈم ایئرپورٹ پر اُس نے چلتے چلتے اُس سے کہا۔ "دیکھئے اس بارے میں کبھی سوچنے کی مہلت ملے تو ضرور بتائیے گا۔"

"اچھی بات ہے۔" وہ زیرِ لب مسکرائی اور ایک طرف کو چل دی۔

اور یہ محض اتفاق کی بات ہے کہ اجونتی ٹھیک ایک ہفتہ بعد اُس کے مکان پر دستک دے رہی تھی۔

"اوہ! آپ؟" وہ چونک پڑا۔

ماں۔ جسے بیٹے پر
ناز ہے۔
باپ۔ جسے اپنے آپ
پر شرم آتی ہے
ان کے لڑکے نے میٹرک کے امتحان میں ۷۰ فیصدی نمبرات حاصل کیے۔
زندگی بیمہ

آمدِ حُسن

پرنسپل شارق ایم اے

شاخیں لچکیں سبزہ جھوما اور لہکی پُروائی
بادل نے اپنے خم خانے سے مستی برسائی
دور کہیں باغوں کے پیچھے بجلی سی لہرائی
آئی وہ مستی میں ڈوبی اور لہراتی آئی
آئی وہ ہر دے کی رانی جیون کا سکھ لائی

ماتھے کی نورانی بندی سورج کو شرمائے
اُس کے ہونٹوں کی رنگینی سو جلوے برسائے
اُس کے بچھوؤں کی جھنکاروں سے دھرتی لہرائے
دیپک راگ سنانے کو وہ دیپک بن کر آئی
آئی وہ ہر دے کی رانی جیون کا سکھ لائی

رم جھم رم جھم میگھا برسے اور امرت برسائے
جس سے فطرت اور فطرت کی ہر شے جھوم جائے
ایسے میں وہ گاگر لے کر جل بھرنے کو آئے
جل بھرنے کو آئی وہ دیکھو جل بھرنے کو آئی
آئی وہ ہر دے کی رانی جل بھرنے کو آئی

غزل

سیّد حجاب ترمذی

تسلیاں نگہِ عشوہ کار رہنے دے
مجھے خدا کے لیے بیقرار رہنے دے

اک خندۂ گل پژمردہ حال غنچوں سے
یہ چھیڑ چھاڑ نسیمِ بہار رہنے دے

ترا عتاب ہے اِس التفات سے بہتر
خطا معاف یہ دو دن کا پیار رہنے دے

ابھی گھٹا نہ مرا اشتیاقِ بے پایاں
نگاہِ لطف کا اُمیدوار رہنے دے

خزاں نصیب خزاں ہی میں مطمئن ہیں اب
نسیمِ صبح، سلامِ بہار رہنے دے

نہیں اہم یہ موضوعِ گفتگو اے دوست!
نہ پوچھ مجھ سے مرا حالِ زار رہنے دے

ملا کے خاک میں مجھ کو اڑا نہ خاک تری
خلوصِ دل کی کوئی یادگار رہنے دے

ابھی مناظرِ فطرت کی آنکھ پُرنم ہے
ابھی ہنسا نہ مجھے اشکبار رہنے دے

قفس میں چھین لے صیاد ہر خوشی میری
بس ایک تصورِ باغ و بہار رہنے دے

اس التفات سے لطف نہ غرض آتی ہے

یہ التفات تغافل شعار رہنے دے

افسانہ
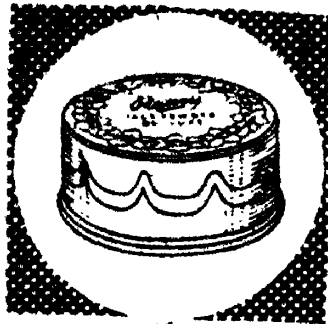
ڈیڈ لیٹر

مختار الرحمن راہی بی اے ایل ایل بی

اکاؤنٹینٹ ڈسٹرکٹ جیل کوٹہ (راجستھان)

۲۶ اکتوبر ۱۹۶۲ء محترمی و مکرمی حضرت خوشتر گرامی صاحب آداب و نیاز

.... زیرِ نظر کہانی کے متعلق صرف اتنا عرض کرونگا کہ اس کے کردار شاد شمع اور ناز ہمارے معاشرے اور سرزمین ہند کے حقیقی کردار ہیں جنہیں نہ غم سازگار رہے نہ خوشی سے

غم تو اک بارِ گراں اِس دلِ نازک پہ سہی — بارِ احساسِ مسرت بھی تو مشکل سے اُٹھا

میں اپنے اِس شعر کی ترجمانی "ڈیڈ لیٹر" میں کامیابی کے ساتھ کر سکا ہوں یا نہیں۔ یہ آپکی فن شناس نظریں ہی پرکھ سکینگی۔ بیسویں صدی کے بلند معیار اور اہلِ ذوق قارئین حضرات نے ہمیشہ میری کہانیوں کو سراہا ہے۔ اس بار بھی میں نے یہی کوشش کی ہے کہ اُنہیں "ڈیڈ لیٹر" پڑھ کر مایوسی نہ ہو۔ وہ فن کے آئینے میں اپنے فنکار کا عکس ضرور دیکھ لیں گے....

ہمیشہ کی طرح آپکی نوازشات کا خواہاں ——— مختار الرحمن راہی

کوٹہ

۷ جون ۶۲ء ناز! پیاری ناز

جے پور سے کوٹہ آنے کے بعد میں نے ایک خط تمہیں پونہ کالج کے پتہ پر لکھا تھا جس کا تم نے حوصلہ افزا جواب دیا تھا۔ لیکن میں تمہیں جلد جواب نہ دے سکا۔ یہاں کام بے حد زیادہ ہے۔ دفتری مصروفیات اور پریشانیوں میں گھرے رہنے کے باعث میں سب کچھ بھول گیا تھا۔ دو ماہ بعد آج جب ذاتی فائل میری نظر سے گذری تو اُس میں تمہارا خط ملا اور اب میں یہ خط اپنی پی۔ اے کو ڈکٹیٹ کروا رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تم اِس تاخیر کا مطلب بداخلاقی یا بدگمانی نہ سمجھو گی۔ ناز! تمہارے امتحانات کب شروع ہو رہے ہیں اور تم جے پور کب واپس جا رہی ہو؟ میں بھی اُن دنوں جے پور پہنچنے کی کوشش کرونگا۔ اطمینان رکھو ناز! بس اب انتظار کی یہ گھڑیاں ختم ہونے والی ہیں اور ہمارے پیار کی ریشمی ڈوری کے دونوں سرے مل کر لازوال خلوص اور محبت کا ایک ایسا دائرہ بنائیں گے جس میں ہماری رقصاں اور شادماں زندگی سازِ اُلفت سے اُبھرا ہوا ایک ایسا حسین اور دلکش نغمہ ہوگی جس کی ہر دُھن کیف و سرور اور جاودانی کا پیغام دیگی۔ یہاں میں نے شادی کے قریب قریب سب انتظامات مکمل کر لئے ہیں۔ بس ناز! تم جلد اپنی انگلی کا ناپ یا کوئی نمونہ بھیجدو تاکہ میں تمہارے لئے حسین سی انگشتری بنوا سکوں۔

تمہارا اپنا ——— شاد

پونہ

۱۲ جون ۶۲ء

میرے اپنے شاد! خدا تمہیں شاد رکھے۔

خلوص نامہ ملا۔ آپ نے عدیم الفرصت ہونے کے باوجود مجھے یاد کیا اس کا شکریہ! لیکن اتنی بھی کیا مصروفیت کہ اپنی پی۔ اے سے خط کا جواب لکھوایا۔ دیکھئے یہ رسم ہو جانے دوسرے سے خط لکھوانا کہاں تک مناسب ہے؟ میرا خیال ہے اِس طرح آپ یا تو کھل کر دل کی بات نہیں کہہ سکتے۔ یا پھر ہماری بہت سی باتیں جو ہم تک ہی محدود رہنا چاہئیں اُن سے ایک اجنبی اور غیر واقف ہو جائیگا۔ یوں آپ بہتر سمجھتے ہیں۔ مجھے آپ پر اعتماد ہے۔ میرے امتحانات ایک ماہ بعد شروع ہوں گے آج کل Activities چل رہی ہیں۔ ٹریننگ ہی کے سلسلہ میں بچوں کی پوری نفسیات اُنکی تعلیم و تربیت وغیرہ بھی شامل ہے.... ہاں انگشتری کا نمونہ جلد ہی بھیجدوں گی۔

[illegible] سا کیوں ہے؟

شمع واقعی قابلِ اعتبار ہے۔ وہ دن بھر مشین کی طرح کام کرتی رہتی ہے یہ خط
[illegible] کو ڈسٹرب کر رہا ہوں اور وہ اس طرح گم صم رہی ہے جیسے کسی موم بتی کا تذکرہ
[illegible] کا حق۔ میں نے اُس کے چہرے پر ہر وقت فکر اور پریشانی کی لکیریں دیکھی ہیں
جو اب سے عاری چہرے پر غموں کے نقوش اُس کی سادگی اور کشش حسن میں اضافہ
کر دیتے ہیں۔ میں نے بارہا چاہا کہ اُس کے مغموم رہنے کی وجہ پوچھوں لیکن پھر کچھ سوچ کر
خاموش رہا۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں شمع کب تک بہائیگی آنسو۔ بات عنوان ہے کہانی کا آخر
چھوڑئیے بھی شمع یا موم بتی کی باتوں کو۔

تمہیں جان نے تب کو پوچھا ہے....؟

بیکو تمہیں بھی جان ہیں و تقریباً چھ ماہ پہلے آپکی چچی اس دارِ فانی سے رحلت فرما
چکی ہیں....

ناز آج ختم ہے صدا آ رہی ہو۔ کیا تمہیں بھی شاد یاد آ رہا ہوں۔؟

تمہارا ——— خرم

پونہ ——— ۱۲ر جولائی ۶۳ء

پیارے شاد!

قریبِ رگِ جاں۔

آپنے میری محبت کو بے خودی کا عالم کہکر پکارا ہے۔ سُنئے ضرور

کھوئی کھوئی ہوں میں جو کسی کے خیال میں
[illegible] ہے مجھے نیند آگئی!

[illegible] نے کیا ہو گیا ہے.... جب کبھی کتابیں
[illegible] ہیں اور جب آپ میرے تصورات
[illegible] بظاہر کتنی چپ چاپ بیٹھ جاتی ہوں لیکن
[illegible] اگر ذہن پر زور ڈالکر کچھ یاد کرنے کی کوشش کرتی ہوں
[illegible] یاد نہیں آتا۔ اب آپ ہی بتلائیے میں کیا کروں؟
[illegible] چھوڑ کر واپس آجاؤں لیکن مجبوراً یہاں رُکنا پڑ رہا ہے۔
[illegible] صاحب! سُنئے شمع کی لو سے ذرا بچتے رہئے کہیں... پروانہ وار
[illegible] کوئی غلط خیال نہ کیجئے..... مجھے آپ پر پورا پورا اعتماد ہے۔ رہا سوال
شمع کا تو کون جانے وہ کس کے لئے جل رہی ہے؟ کس نے اُس کا سوز جانا ہے ؎

زندگی شمع بن کے پگھلے گی
اِس میں شامل ہے سوزِ پروانہ

چچی جان دہلی میں ایک رشتہ کی چچی رہتی ہیں اُنھی نے مجھے یاد فرمایا ہے لیکن
میں وہاں نہیں جاؤں گی۔ مطمئن رہئیے۔ آجکل آپ کی مصروفیات کا کیا حال ہے؟
کب تک آپ شمع کے ہاتھ سے لکھے ہوئے خطوط بھیجتے رہیں گے۔ اب تو آپکی
تحریر کو بھی ترس گئی.....

صرف آپکی ——— ناز

کوئٹہ ——— ۲۵ر جولائی ۱۹۶۳ء

میرے احساس کی رگ رگ میں سمائی ہوئی ناز!

دھڑکتے دل کا سلام لو۔

گزشتہ ایک ہفتے سے علیل ہوں۔ دفتر بھی نہیں جاسکا۔ صرف ضروری
کاغذات پر گھر ہی دستخط کئے۔ شمع نے میری بہت دیکھ ریکھ کی۔ اب قدرے
تندرست ہوں۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ تمہارے امتحانات شروع ہو گئے ہونگے
دست بدعا ہوں کہ خدا تمہیں کامیابی عطا فرمائے۔ میں نے تمہارے لئے ایک
خوبصورت سی انگوٹھی بنوائی ہے تم اسے یقیناً پسند کرو گی۔ جے پور جانے کی تاریخ سے
جلد اطلاع دو۔

جانِ ناز ——— شاد

پونہ ——— ۱۰ر اگست ۶۳ء

شاد! روحِ زندگی

برسات کی رنگین راتیں [illegible]
میں کون سی آگ میں جل جاؤں [illegible]

امتحانات آج ہی ختم ہوئے ہیں اور میں ایسا محسوس کر رہی ہوں جیسے
میرے دوش سے کوئی بارِ گراں ہلکا ہو گیا ہو۔ میں کل صبح کی گاڑی سے جے پور
جا رہی ہوں۔ انتظار کے لمحے طویل ہوتے جا رہے ہیں۔ میں اُس دن کا بہت شدت
سے انتظار کر رہی ہوں جب آپ میرے سامنے ہوں گے اور میں آپ کو پلکیں
جھپکے بغیر دیکھتی رہوں گی اور اس طرح یا تو آپ کو اپنی آنکھوں میں سمو لونگی یا پھر خود آپکی
آنکھوں کی گہرائی میں غرق ہو جاؤں گی۔ میری زبان نجانے کتنی باتیں آپ کو سُنانے
کے لئے بے چین ہے۔ یہ پڑھ کر بے حد فکر ہوئی کہ آپ علیل ہو گئے تھے۔ خدا کا شکر
ہے کہ اب آپ روبصحت ہیں۔ خدارا اپنی صحت کا خاص طور پر خیال رکھئے........
شادی کے بعد تو یہ ذمہ داری بھی میں لے لونگی۔ شمع کا میری طرف سے شکریہ ادا کر دیجئے
لکھئے کہ آپ جے پور کب تشریف لا رہے ہیں۔ مجھے بڑا انتظار ہے۔

[illegible] آپکی صحت پر اس کا بُرا اثر پڑے گا۔
[illegible] اور خشک کتابوں کے ساتھ دماغ سوزی کے
بعد جب آپکی تصویر دیکھتی ہوں تو دل اور دماغ کو راحت سی ملتی ہے اور پھر میری
چشمِ تمنا مستقبل کے [illegible] خلوص محبت اور ایثار کے ابدی نقوش اُبھارتی ہے
[illegible] کے کبھی نہ [illegible] والے رنگوں کی آمیزش کرتی ہے۔ اب صرف
تمہاری تصویر ہی تو میری تنہائیوں کی رفیق اور انیس ہے۔

آپ کی دُور افتادہ ——— ناز

کوئٹہ ——— ۱۰ جون ۶۳ء

اِک دن مری حیات کا عنوان ہو گے تم!
اِک ایسی اُمید پہ جی رہا ہوں میں

میری اپنی ناز!

حرکتِ نبضِ حیات

یعنی میری کائنات

میرا خیال تھا کہ تم میری دو ماہ کی مسلسل خاموشی سے بے حد برہم اور خفا ہو گی
اور بہت سے الزام مجھ پہ عاید کرو گی لیکن تمہارا پُر خلوص اور محبت بھرا خط پا کر میں تمہارے
بے پناہ جذبۂ اُلفت اور وسیع القلبی کا قائل ہو گیا۔ تمہارے اِسی انداز اور طرزِ عمل
کی وجہ سے میرے دل میں تمہارے لئے جو جگہ ہے وہ کسی اور کے لئے نہیں مجھے تم
جیسی شریکِ حیات ملنے کا تصور ہی حیات افروز اور باعثِ فخر ہے۔

شمع میری [illegible] کم گو۔ بجھی بجھی سی۔ بنا ہر اپنی دنیا میں گمن اور مطمئن
لیکن حقیقتاً نا مساعد حالات کا شکار ہے۔۔۔۔ یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی قابلِ اعتبار
لڑکی ہے۔ میں نے بارہا اُسے سرکاری معاملات میں آزمایا ہے اور مجھے کبھی اُس سے کوئی شکایت
نہیں ہوئی۔ اس لئے تم بھی اِس طرف سے مطمئن رہو۔

میری تصویر؟ میں نے تو تمہیں کوئی تصویر نہیں دی پھر تمہارے پاس
[illegible] تصویر کیسی؟ میری صحت اچھی ہے بلکہ پہلے سے زیادہ تندرست اور تندرست ہوں
تم [illegible] یکسوئی کے ساتھ کرو۔ امتحانات قریب ہیں نا۔ انگوٹھی کا نمونہ جلد
بھیجو۔

تمہارا اپنا ——— مظفر

[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]

مرکزِ خیال اور ماحصلِ حیات مظفر!
آرزوئیں۔ تمنائیں۔
حسبِ حکم انگوٹھی کا نمونہ بذریعہ پارسل بھیج رہی ہوں۔
جی ہاں آپکی تصویر میرے پاس ہے۔۔۔ میرے مظفر۔۔۔ ہر وقت ہی تو
آپکی صورت میرے تصور کی آنکھ میں سمائی رہتی ہے۔ کس لمحہ میری نظروں سے اوجھل
نہیں ہوتی۔ اُس کے نقوش اتنے گہرے اور واضح ہیں کہ اکثر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے
کہ آپ میرے سامنے محوِ کلام ہیں اور آپ کے اِس تخیلی پیکر سے گفتگو اور اس کی پرستش
کرتے کرتے راتیں گذر جاتی ہیں اور وقت کی رفتار کا اندازہ نہیں ہوتا۔ اب آپ
ہی بتائیے کاغذی تصویر سے میرے تصور کی تراشی ہوئی تصویر بہتر ہے یا نہیں؟

وہ دلکشی کہاں سے لائے گا ہر مصور
جیسی مرا تصور تصویر کھینچتا ہے

یوں اگر آپ اپنی تازہ تصویر بھیج دیں تو مزید نوازش ہو گی۔ بار ہا اصرار کے
باوجود آپنے ابتک میری خواہش پوری نہیں کی۔ خیر آپ کو شمع پر اعتبار ہے اور مجھے
آپ پر۔۔۔۔ لیکن شمع اور بجھی بجھی سی؟ کونسا ایسا غم ہے بے چاری کو؟ کبھی آپنے اُس سے
پوچھنے کی زحمت گوارا کی؟ سُن رہے ہیں مظفر صاحب! کالج اور ہوسٹل کی سب ہی
لڑکیاں مجھے آپکا نام لے کر پکارتی ہیں اور بہت سی، ہماری شادی سے پہلے ہی پارٹی کا
پروگرام ترتیب دے رہی ہیں۔۔۔ تہنا یونہی تو خوش ہوں ؎

میرا جرچا ہوا دنیا میں تمہارے نام کے ساتھ!

آج ہی ممی جان کا خط آیا ہے کہ میں امتحان ختم ہوتے ہی اُن کے پاس جاؤں وہ
مجھ سے ملنے کے لئے بے چین ہیں۔ دیکھئے کیا ہو۔

آپکی ——— ناز

کوئٹہ ——— ۱۲ جولائی ۶۳ء

میری ناز!
دل کی دھڑکنیں
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

آپکی اور صرف آپکی ——— طالبِ دیدار ناز

کوٹہ ——— ۱۸ اگست ...

حاصلِ حیات ناز!

مضطرب دل کی دھڑکنیں

آج میں تمہیں ایسا خط لکھ رہا ہوں جسے پڑھ کر تم پہلے تو فکرمند اور افسردہ ہوکر غم کے گہرے ساگر میں ڈوب جاؤ گی لیکن بعد میں تمہارے لبوں پر تبسم کی کرنیں رقص کرنے لگیں گی۔ اطمینان رکھو ناز اب ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔۔ ہاں تو سنو میرے کوشش الخیر پہنچے کے خط کے جواب میں جب تمہارا خط مجھے ملا تو اسی دن میرے ساتھ ایک حادثہ ہوگیا۔۔۔ ہوا یوں کہ میں تمہارے خیال کی رنگینیوں میں کھویا ہوا صحن میں کھڑا تھا۔ دفعتہ کچھ سوچ کر مجھے چکر آگیا اور فرش پر بے ساختہ گر گیا۔ آنکھوں کے سامنے ایک تیز شعلہ لپکا اور پھر میری بصارت جاتی رہی۔ دنیا میرے لئے تاریک ہوگئی۔ قدرت نے میری زندگی کے ساتھ کتنا بڑا مذاق کیا تھا۔ فوری طور پر ڈاکٹروں کا مشورہ لیا گیا اور میں (Eye Specialist) کے زیرِ علاج رہا۔ کافی غور سے تشخیص کے بعد مجھے بتایا گیا تھا اور یہی مجھے یقین دلایا تھا کہ بہت جلد یہ عارضی اندھاپن دور ہو جائے گا اور میں پھر دیکھنے لگوں گا۔ اس حادثہ کی اطلاع میں نے تمہیں اس لئے نہیں دی کیونکہ اس کا تمہارے دل پر بُرا اثر پڑتا اور اس طرح تمہاری تعلیم بھی ادھوری رہ جاتی۔۔۔ اور پھر مجھے اندیشہ تھا کہ جب تمہارے والدین کو اسکا علم ہوگا تو بہت ممکن ہے وہ اپنی لڑکی کو ایک نابینا کے ساتھ بیاہ کر اس کی زندگی تباہ کرنا نہ چاہیں۔۔۔۔ مجھے ڈاکٹروں کے مشورہ کے مطابق اطمینان تھا کہ میں جلد دیکھنے کے قابل ہو جاؤں گا۔۔۔۔ اور یہی وجہ تھی کہ تمہیں جواب دینے میں دو ماہ کا طویل وقفہ ہوگیا۔ اور پھر مجبوراً تمہیں شمع کے ذریعہ خط لکھوانے لگا اور وہ ہی مجھے تمہارے خطوط پڑھ کر سُناتی رہی۔ ان تین مہینوں میں شمع نے میرا جو ساتھ دیا، میری قسمت کی تاریکی میں اپنے خلوص اور ہمدردی کی شمعیں روشن کیں اگر اس کا شکریہ ادا نہ کروں تو یہ احسان فراموشی ہوگی۔۔۔۔ اور اب میں بالکل تندرست ہوں۔۔۔۔ بخوبی دیکھ سکتا ہوں پڑھ سکتا ہوں۔۔۔۔ یہ خط میں خود اپنے ہاتھ سے تحریر کر رہا ہوں۔

میں تمہارے انتظار کے لمحات کو مختصر ترین کرنے کی غرض سے ایک ہفتہ بعد جے پور آ رہا ہوں اور پھر تم۔۔۔۔ اور میں۔۔۔۔ ایک۔۔۔۔۔

تمہارا

شاد

جے پور ——— ۲۲ اگست

شاد صاحب!

آپ کا خط ایک مدت کے بعد غیر متوقع طور پر ملا۔ پڑھ کر شدید حیرت بھی ہوا آپکی ذہنیت پر۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میری شادی ہونے والی ہے آپ نے جس غلط اور غیر مہذب انداز میں خط لکھا ہے وہ نہایت ہی پست ذہنیت کا ثبوت ہے۔ آپکا خط پڑھ کر میں یہ نہ سمجھ سکی کہ آپ اندھے ہو گئے تھے یا پاگل۔ معاف کیجئے آپکا دماغی توازن درست نظر نہیں آتا۔ آپ ایک بار میرا خط پھر غور سے پڑھیں جو آپ کے تحریر کردہ پہلے خط کے جواب میں میں نے لکھا تھا۔ اس میں میں نے واضح الفاظ میں تحریر کیا تھا کہ آپکی دو ماہ کی مسلسل خاموشی کی وجہ سے والدین نے میری شادی دوسری جگہ طے کر دی ہے اور اب میں بہت جلد رئیس صاحب سے بیاہی جانے والی ہوں۔۔۔۔ اس لئے اب آپ مجھ سے خط و کتابت بند کر دیں۔ قطعی طور پر۔ پھر بھی آپ نے یہ بے سر و پا خط تحریر کیا۔ خدا کی خیر ہوئی جس دن آپکا خط ملا اُس دن میں گھر آئی ہوئی تھی۔ اور اگر امی اُس خط کو پہلے سے کھول دیتیں اور ان کے ہاتھ پڑ جاتا تو۔۔۔۔ میرا خیال ہے کہ آپ آئندہ ایسی حرکت نہ کریں گے۔

میں آپکا خط بھی اس خط کے ساتھ واپس کر رہی ہوں ——— ناز

کوٹہ ———

واجب الاحترام باس! آداب

اِس خط کے ساتھ میں اپنا استعفیٰ بھی منسلک کر رہی ہوں۔ کیوں؟ وجہ میں بھی جانتی ہوں اور آپ بھی۔ مجھے آپ سے صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ میں نے آپ کو دھوکا ہرگز نہیں دیا اور نہ میں نے آپ کو تاریکی میں رکھا۔ آپکی بینائی جانے کے چوتھے دن ناز صاحبہ کا ایک خط آیا تھا جس میں انہوں نے دل شکن الفاظ میں کسی رئیس صاحب سے اپنی شادی کی اطلاع دی تھی اور اگر وہ خط میں آپ کو سُنا دیتی تو یقیناً آپ کے دل پر، آپ کی آنکھوں پر اس کا بُرا اثر پڑتا جبکہ ڈاکٹروں کے مشورے کے مطابق آپ کو مکمل سکون اور آرام کی بے حد ضرورت تھی اور صحیح حالات سے آپ کو آگاہ کر دینے سے ممکن تھا کہ آپ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی بینائی کھو بیٹھتے۔۔۔۔ اِس لئے میں نے اپنی طرف سے جو جعلی افسانہ خط لکھ کر آپ کو سُنا دیا اور پھر آپ خط مجھے ڈکٹیٹ کرواتے رہے اور میں ناز صاحبہ کی طرف سے جواب دیتی رہی۔ آپ کو سُناتی رہی۔ لیکن ساتھ ساتھ میں اِس تصور سے کانپ بھی اٹھتی تھی کہ اِس کا انجام کیا ہوگا؟ میں نے صرف آپکی صحت، آپکی بینائی اور آپکی حیات کی خاطر ایسا کیا تھا۔ حالات اُلجھتے گئے۔ آپ ناز صاحبہ کی اُلفت میں بے انتہا کھوتے گئے اور وہ آپ کے اعصاب پر مکمل طور پر چھا گئی تھیں۔ اس لئے میں نے اس نازک عالم میں آپ کو حقیقت سے آگاہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اور اب جبکہ آپکی بصارت واپس

اٹھی ہے اور آپ نے جو دوسرا بھر کر خط لکھا تھا جس کا جواب ابھی ابھی آیا ہے وہ آپ نے مجھے پڑھنے کے لیے اس لئے دیا ہے کہ میں حالات پر روشنی ڈالوں.... بہت ممکن ہے میرا کردار آپکی نظروں میں گر گیا ہو.... شمع کا کام جلنا اور دوسروں کو روشنی پہنچانا ہے.... میں دھواں اس طرح جلتی رہونگی، آنسو بہاتی رہونگی اور ایک دن میلی ہوئی وجود پگھل جائیگا یا فضا میں دھواں بنکر تحلیل ہو جائیگا.... اس سے پہلے کہ آپ مجھے ملازمت سے برطرف کریں میں خود اپنا استعفیٰ پیش کر رہی ہوں مگر اس وقت میری نظروں میں میری بوڑھی والدہ کا جھریوں بھرا چہرہ اور مجھ سے چھوٹے بہن بھائیوں کا مستقبل نظر آرہا ہے.... لیکن آپ سے درخواست ہے کہ میرا استعفیٰ منظور فرمایا جائے۔ میں گھر جارہی ہوں۔

آپکی فرمانبردار پی۔ اے ——— شمع

کوئٹہ ——— ۴ ستمبر ۶۲

بنام محترمہ شمع صاحبہ۔ پی۔ اے ٹو ڈائرکٹر سوشیل ویلفیئر ڈپارٹمنٹ

سروس رولز کے مطابق آپکا استعفیٰ اسی حالت میں منظور کیا جاسکتا ہے کہ آپ ایک ماہ کی نوٹس پے جمع کرائیں ورنہ آپ کے خلاف ضروری کارروائی کی جائیگی۔

شاد ——— ڈائرکٹر

تقریباً ایک ماہ بعد ....

شمع جب ان سب خطوط کو سلسلہ وار یکجا کر چکی اور اُس کا خاوند ظفر ملک انہیں پڑھ چکا تو اُس نے شمع سے دریافت کیا ——— "تم نے اس آخری خط کا کیا جواب دیا؟" ———

"اُسی دن میں نے اپنے پیارے اور بچپن کے ساتھی ظفر ملک میں مخلص اور جاں نثار پروانے کا رُوپ سنجیدگی اور غور سے دیکھا پھر اُس پروانے نے شمع کو گل ہونے سے بچا لیا اور میں نے شاد صاحب کے دفتر میں ایک ماہ کی نوٹس پے بذریعہ منی آرڈر بھیجدی اور منی آرڈر کوپن پر یہ لکھدیا ——— اِس نوازش کا شکریہ! شمع جل بجھے گی لیکن عزت و عظمت پر حرف نہ آنے دیگی۔ نوٹس پے ارسال کی جارہی ہے۔"

"شاد صاحب نے آپکی ہمدردی اور خلوص کا بدلہ اچھا دیا۔" ظفر ملک مسکرایا۔

"مجھے خود اُن کے اس طرز عمل پر حیرت ہوتی ہے کیونکہ چند ماہ اُن کے ساتھ پی۔ اے کا کام کرنے کے بعد میں نے اندازہ کیا تھا کہ وہ ایسے ہرگز نہیں تھے۔ لیکن۔"

"صاحب خط لے جائیے" دفعتہً ڈاکیے کی آواز پر وہ چونک پڑے۔

ظفر ملک نے دیکھا وہ خط شمع کے نام تھا۔ شمع نے لفافہ چاک کیا اور باآواز بلند پڑھنے لگی۔

کوئٹہ ——— ۳ ستمبر ۶۲ء

محترمہ شمع صاحبہ!

عقیدت کے پھول خلوص کی کلیاں

سرکاری طور پر تمہیں ایک مراسلہ آج ہی روانہ کر چکا ہوں۔ محکمانہ قوانین اور سروس رولز کے مطابق ایک ماہ کی نوٹس پے تمہیں جمع کرانی ضروری ہے کیونکہ میں اپنے ذاتی معاملہ میں کوئی کام ایسا کرنا نہیں چاہتا جس پر لوگوں کو انگشت نمائی کا موقع ملے۔ آپ مطمئن رہیں نوٹس پے جمع کرانے کا میں نے انتظام کر لیا ہے۔ یوں اب میں آپکا آپکی والدہ صاحبہ اور چھوٹے بہن بھائی کا بار اپنے شانوں پر سمجھ کر مسرت محسوس کر رہا ہوں۔ درحقیقت آپ ہی نے میرے ظلمت کدۂ حیات میں خلوص اور پیار کی شمع روشن کی ہے ورنہ کون جانے میرا کیا حشر ہوتا۔ آپ کے احسان کا بدلہ میں کبھی نہیں ادا کر سکتا۔ پھر بھی آپ کو تاحیات خوش رکھنے کی کوشش ضرور کروں گا۔ کیا آپ ہمیشہ کے لئے میری زندگی میں اپنے جمال کی روشنی بکھیرتی رہینگی؟ مجھے آپ کے فیصلے کا انتظار رہیگا۔ آپکی خاموشی کا مطلب میں یہ سمجھونگا کہ شمع کی روشنی میری ظلمتوں میں اُجالا نہ کر سکیگی۔

آپکا صرف ——— شاد

ظفر نے لفافہ دیکھا اُس پر کوئٹہ، ڈیڈ لیٹر آفس اور کوئٹہ کے ڈاک خانوں کی بہت سی مُہریں ثبت تھیں۔ وہ خط کوئٹہ کی بجائے غلطی سے کوسٹہ چلا گیا تھا اور ایک ماہ بعد آج اُنہیں ملا تھا۔ خط پڑھ کر کمرے کے پُرسکون ماحول میں بوجھل سکوت چھا گیا۔ شمع کی آنکھوں میں دو شبنمی قطرے اُمڈ آئے جنہیں اُس نے فوراً صاف کر ڈالا مگر وہ اپنے چہرے کے غم کو کس طرح چھپا سکتی تھی جو تبسم میں بھی نمایاں تھا۔ اور ظفر ملک نے ان خطوط کے سلسلہ کی آخری کڑی خط کے اختتام پر منسلک کرنے کے بعد خطوط کی فائل پر جلی قلم سے لکھدیا ——— "ڈیڈ لیٹر"

اُوور لوڈگاڑی

(رُوحِ مجازؔ سے معذرت کے ساتھ)

عشق ہو قیدِ شریعت میں تو کیا ایسا کروں
آٹھویں اولاد پر بھی شُکر کا سجدا کروں
پیار سے ہر ایک برخوردار کو دیکھا کروں
یا کہ بیگم صاحبہ کو باپ کے چلتا کروں

اَے غمِ دل کیا کروں اَے وحشتِ دل کیا کروں!

یہ گرانی اور یہ بیروزگاری ہائے ہائے
اُس پہ یہ بڑھتی ہوئی مردم شماری ہائے ہائے
آٹھویں کے بعد بھی اور اک کی باری ہائے ہائے
شکر بھیجوں یا خدا کی دین کا شکوا کروں

اَے غمِ دل کیا کروں اَے وحشتِ دل کیا کروں

کارخانوں میں کہیں پر اب نہیں ملتی جگہ
دفتروں میں جاؤ تو ہے نو ویکنسی کی صدا
سچ تو یہ ہے حد سے بڑھنا نعمتوں کا بھی بُرا
لختِ دل فاقے سے سُوکھیں اور میں دیکھا کروں

اَے غمِ دل کیا کروں اَے وحشتِ دل کیا کروں

ایک بیوی آٹھ بچے ایک باپ اور ایک ماں
دونوں وقتوں میں یہ کھانے والے بائیس الاماں
سب توانا خیر سے ہیں ایک میں ہی ناتواں
ہے کلرکی ساٹھ کی کس کس کی میں سیوا کروں

اَے غمِ دل کیا کروں اَے وحشتِ دل کیا کروں

قرض خواہی روز و شب کی کیوں نہ اُلجھن ڈال دے
دیکھ کر مجھ کو مہاجن کیوں نہ چلمن ڈال دے
ہو اگر میری جگہ بھینسا تو گردن ڈال دے
کب تک اُوور لوڈ گاڑی رات دن کھینچا کروں

اَے غمِ دل کیا کروں اَے وحشتِ دل کیا کروں

ہلالؔ رضوی رامپوری

منزلوں کے شیدائی

جے پال

معرفت رئیس نجمی امروہوی آشیانہ سرائے کہنہ۔ امروہہ یو۔پی

۲۰ اکتوبر ۱۹۶۲ء

محترم بھائی! تسلیم

سالنامہ کے لئے "منزلوں کے شیدائی" ارسال خدمت کر رہا ہوں طویل خاموشی کی وجہ! میری زندگی کے روشن اور تاریک پہلو آپ خود اپنی نظروں سے دیکھ چکے ہیں۔۔۔ بھائی میرے میں آپ کے اس بے پایاں خلوص کو کبھی نہیں بھلا سکتا کہ آپ یہاں تشریف لائے تھے اور مجھے نہ پاکر مجھ سے ملنے کے لئے مرادآباد میرے دفتر تشریف لے گئے اور مجھے ملاقات کا شرف بخشا۔ اگرچہ قلم اور کہانی کا رشتہ میں تقریباً چھوڑ چکا تھا اور اس ادبی دنیا سے رحلت کر چکا تھا لیکن آپ کی پُرعظمت شخصیت نے ایک بار پھر مجھے زندہ کر دیا ہے۔ خدا نے چاہا تو اب میں زندہ ہی رہوں گا! ....

مخلص ——— جے پال

آج فیصلے کا دن تھا ——— !

چاروں طرف ایک گہری اور پُراسرار خاموشی چھائی تھی۔ خاموشی جو کسی طوفان کا پیش خیمہ ہوا کرتی ہے لیکن یہاں طوفان ابھی تک نہیں آیا تھا صرف اضطرابی لہروں کا پُرسکوت مد و جزر تھا اور اُس کی تہہ میں چھپا ہوا وہ طوفان تھا جو رُندھاں کی زندگی بخش بلندیوں کو سرنگوں ...... کر دیتا ہے۔ جو کوہ بے ستون کے جگر سے دودھ کی شیریں نہر نکالنے والے کو موت کا انعام اور کچے گھڑے پر اپنے محبوب سے ملنے کے سبب سیٹ کر دل کی راہوں پر سفر کرنے والے کو دریا کی بیکراں پنہائیاں بخشتا ہے ——— وہ طوفان ابھی نہیں آیا تھا مگر جسے کل ہی آجانا چاہئے تھا۔ خوابوں کی دلکش رعنائیاں اور محبت کی جواں بخت صحت مند کہانیوں کو کل ہی ختم ہو جانا چاہئے تھا شاید کالج کی رومانی فضاؤں پر خزاں کا کربناک تسلط کبھی کا ہو چکا ہوتا اگر کل ہی رضیہ کالج آجاتی ——— !

"خدا کرے رضیہ آج بھی کالج نہ آئے!" فیس کاؤنٹر پر کھڑے ہوئے چند طلباء نے سرگوشیاں کیں۔

"ایک دن تو اُسے آنا ہی ہے!" انجم نے پُریقین لہجے میں کہا۔

"خدا کرے آج نہ آئے!" سہیل نے دعا مانگی۔

کاریڈور میں کھڑے ہوئے لڑکے اضطرابی کیفیت سے کامن روم کے دروازے پر [illegible] جو گھبرا رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ [illegible] کہ اس چلمن کو ایک [illegible] کامن روم کے اندر داخل ہو گئی [illegible]

چپراسی آئے گا اور چلمن کو پھر جنبش ہوگی۔ رضیہ کامن روم سے باہر نکلے گی ایک فاتحانہ انداز سے ماحول کی اضطرابی کیفیت کا جائزہ لیگی اور پرنسپل روم میں داخل ہو جائے گی اور پھر ——— پھر تو سب کچھ مٹ جائے گا، ختم ہو جائے گا فنا ہو جائے گا۔

ایک صرف اختر ہی کے وجود سے تو کالج کے حسین ہنگامے زندہ ہیں۔

"اختر صاحب!"

ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ کے آخری خالی کمرے کے دروازہ پر دستک دی گئی۔

"مسٹر اختر ...!" جواب میں موت جیسا سکوت ملا۔

صبح ہی سے اختر نے خود کو مقید کر رکھا تھا۔ دروازہ پر کئی بار دستک دی جا چکی تھی۔ صرف طلباء ہی نہیں کئی پروفیسر صاحبان بھی اُسے پکار چکے تھے لیکن نجانے کون سے ارادہ کے تحت وہ خاموش تھا اور اب اُس کی یہ طویل خاموشی کسی پُراسرار واقعہ کے اختتام کی طرح بن گئی تھی۔

"اُف اب کیا کیا جائے ——— یہ کمبخت اختر کا کام نہیں لیتا اور رضیہ کے آنے میں زیادہ دیر نہیں!"

[illegible]

[illegible]

مجھے مطلب اختر سے ہے اور ہم لوگ رضیہ کو مجبور کریں گے کہ وہ ... [illegible] پیش کی۔

"میں بھی اُس سے مل چکا ہوں" نجمی نے بتایا۔

"کیا جواب ملا" ؟ اضطراب اپنی معراج کو پہنچ چکا تھا۔

"اُس کا یہ اصرار ہے کہ اختر اُس سے تحریری معافی مانگے ....؟"

"مگر یہ بات ممکن تو نہیں" دوسری نے پریشان ہو کر کہا۔

"آپ کو کوئی بات بھی ممکن نہیں" آوازوں میں مایوسی اور بیزاری تھی۔

کتنی معمولی بات ہنگامہ بن گئی تھی۔

بات واقعی معمولی تھی جو ایک مہیب طوفان کی بنیاد بن گئی جس نے کالج کے سارے ماحول کو ایک کپکپاہٹ میں منتقل کر دیا۔ بات صرف دن پہلے کی ہے۔ مگر نہیں یہ بات چند ماہ پہلے کی ہے جب لڑکوں نے اپنے خیالات کی کنیں چھیڑنا شروع کیں۔ اُس دن کالج میں "کالج ویک" کے سلسلے میں ایک مباحثہ تھا۔ تیرس ہال کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ شہر کے تمام معززین اور کالج کے بہت سے پڑھنے والے طلبا اُس فنکشن میں مدعو کئے گئے تھے۔ کالج کے لئے مباحثہ کا موضوع بھی بالکل ہی نیا اور انوکھا تھا "عورت اور پردہ"۔ مشنری کالجوں میں آج سے پہلے کبھی ایسے اچھوتے اور کیف آگیں موضوع پر مباحثہ نہیں ہوا تھا اس لئے طلبا کے ساتھ ساتھ کالج میں برقعہ پہن کر آنے والی طالبات کا بھی جم غفیر موجود تھا۔ اُس وقت تک کالج میں ایک صرف رضیہ ہی بہت اچھا بولتی تھی۔ وہ ہمیشہ ڈائس پر ایک فاتحہ کی طرح قدم رکھتی اور فاتح کی طرح واپس ہوتی۔ رضیہ پردہ کی مخالفت میں بولی۔ اُس کی نظر میں پردہ عورت کو گہری نیند سُلانے والی گولیوں کی طرح تھا جو عورت کی زندگی کے ہر روشن پہلو کو تاریکیوں میں جذب کر دیتا ہے۔ رضیہ کی تقریر ختم ہوئی سارا ہال تالیوں کے شور سے گونج اُٹھا جبھی سکریٹری کی آواز کے بعد ایک صحت مند جسم کا خوبصورت لڑکا اسٹیج پر آیا۔ ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ اور آنکھوں میں فتح کا یقین لے کر ...... ہال میں سرگوشیاں جاگ اُٹھیں معلوم ہوتا ہے "نیا نیا وارد ہوا ہے۔ وہ کچھ دیر تک سٹیج پر کھڑا ہوا شرماتا رہا۔ شاید کانپ بھی رہا تھا۔ پھر ذرا سنبھل کر اُس نے رضیہ کی تقریر کی وہ مخالفت کی، کچھ ایسے عجیب اور کچھ انوکھے نکتے کچھ ایسے نئے زاویئے اپنی تقریر میں اُجاگر کئے کہ سب حیران رہ گئے اور نہ صرف لڑکوں کو بلکہ خوبان کالج اور دوسری مدعو کی گئی خواتین کو بھی رضیہ کی تقریر بے معنی محسوس ہوئی۔ پھر معلوم ہوا کہ ججوں نے بھی پہلے انعام کا حقدار اختر کو قرار دیا ہے۔ ہجوم میں ایک ہیجان پھیل گیا۔ آج گزشتہ کئی سالوں کے بعد پہلی بار رضیہ کو ایک شرمیلے اور نو وارد لڑکے نے شکست دی تھی۔

لیکن شاید رضیہ کی مغرور طبیعت نے اس شکست کو قبول نہیں کیا تھا اُس دن اگر اپنی شکست قبول کر لیتی تو آج یہ ہنگامہ ہرگز ہرگز نہ ہوتا۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ خوبصورت زندگی کی اُس تتلی جیسی افسردگیوں میں گم ہو جاتا۔۔۔ اُس واقعہ کے بعد رضیہ [illegible] مغرور اور گمبھیر ہو گئی۔ اُس کے یاقوتی لبوں کی مسکراہٹیں ختم ہو گئیں۔ جذبات کی جگہ [illegible] ایک عجیب حوصلہ شکن کرختگی پیدا ہو گئی۔ لیکن صرف ایک اختر تھا جس نے رضیہ کی بے تصنع عظمت کا احساس نہیں کیا۔ رضیہ کالج کی حسین ترین لڑکی تھی۔ ماں کی ذہین لڑکی تھی۔ امیر باپ کی اکیلی تنہا اولاد تھی اس لئے ورثہ میں وہ سب کچھ ملا تھا جس کی ضرورت [illegible] اور آرزوؤں کی شکست کے لئے ہوا کرتی ہے۔ ہاں اُس رات کے بعد اختر کالج کا ہیرو بن گیا۔ لڑکوں اور اُستادوں میں ہر دلعزیز بن گیا اور جلد ہی وہ کالج کا سب سے [illegible] ذہین اور خوش باش طالب علم سمجھا جانے لگا۔

اسی دوران نہ جانے کہاں سے کالج کی فضاؤں نے اپنے اندر کسی [illegible] ہوا کے جھونکے محسوس کئے۔ نہ جانے کس نے یہ خبر اُڑا دی کہ رضیہ اکثر اختر کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتی ہے۔ آہستہ آہستہ نوزائیدہ افواہ ایک شہرت بن گئی۔ حقیقت اور خواب کی بھیڑ پر کسی کو یقین نہ آتا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ افواہ خود اختر نے اُڑائی تھی۔ پھر کیا۔ اب کالج کے تمام گوشوں میں اس بے یقینی داستان پر تبصرے ہونے لگے۔ ہر نظر رضیہ کو پُر معنی انداز میں گھورنے لگی۔ لڑکوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں جنم لیتیں اور رضیہ تلملا کر رہ جاتی۔ وہ جانتی تھی کہ اُس کی روح کی بیکراں وسعتوں میں محبت نام کی کوئی ہلکی سی پیاس نہیں ہے۔ پھر یہ افواہ کیوں؟ وہ عہد کئے ہوئے تھی کہ شکست نہیں قبول کرے گی اور اختر کے حلقے کے طلبا اس حقیقت سے آشنا تھے کہ اختر ایک دن رضیہ کو سرنگوں کر کے رہیگا۔

حسن اور عشق کے تصادم میں دن یونہی بیت رہے تھے ۔۔۔!

اُس دن پورے چاند کی رات تھی۔ کچھ طلبا اور طالبات نے کالج سے دور شہر سے باہر قلعہ کی نہر کے کنارے پکنک کا پروگرام بنایا۔ لڑکوں کے ساتھ رضیہ بھی شامل ہوئی تھی۔ ایک خوبصورت سُہانی رات تھی۔ سُہانی پُرسحر فضاؤں کے خوش بخت لمحے تھے۔ خیال تھا کہ ہر کوئی چاندنی رات کا سیمیں آنچل تھام کر خوابوں کی بستیوں میں پہنچ جائیگا۔ اختر کا شدت سے انتظار تھا لیکن وعدہ کے باوجود وہ نہ آیا تو چاندنی رات اُداس ہونے لگی۔ بہت دیر بیت گئی۔ گوری کے دو گیت بھی ختم ہو گئے۔ بشیر نے وائلن پر کتنے ہی فلمی نغموں کی دُھنیں سنا ڈالیں۔ پھر چاندنی رات اُداس ہونے لگی۔ آخر کار نجمی نے اپنی غزل شروع کی اور جب غزل اختتام پر آئی تو اختر کے ملازم نے طلبا کو اختر کا ایک خط لا کر دیا جو سگریٹ لائٹر کی روشنی میں [illegible]

"ساتھیو! معاف کرنا میں نہ آ سکا۔ کیا کروں بات [illegible]
مجبوریوں کی ہے۔ اب خود ہی فیصلہ کر لو کہ [illegible]
ڈھانپ لے اور اپنی مسکراہٹوں پر پھر سے [illegible]

منزلوں کے شیدائی

جے پال

بمعرفت رئیس مجی امروہوی "آشیانہ" سرائے کہنہ۔ امروہہ۔ یو پی

۳۰ اکتوبر ۱۹۶۳ء

محترم بھائی! تسلیم

سالنامہ کے لئے "منزلوں کے شیدائی" ارسال خدمت کر رہا ہوں۔ طویل خاموشی کی وجہ؛ میری زندگی کے روشن اور تاریک پہلو آپ خود اپنی نظروں سے دیکھ چکے ہیں...۔ بھائی میرے میں آپ کے اس بے پایاں خلوص کو کبھی نہیں بھلا سکتا کہ آپ یہاں تشریف لے آئے اور مجھے نہ پاکر مجھ سے ملنے کے لئے مرادآباد میرے دفتر تشریف لے گئے اور مجھے ملاقات کا شرف بخشا۔ اگرچہ قلم اور کہانی کا رشتہ میں تقریباً پہلے چھوڑ چکا تھا اور اس ادبی دنیا سے رحلت کر چکا تھا لیکن آپ کی پُرعظمت شخصیت نے ایک بار پھر مجھے زندہ کر دیا ہے۔ خدا نے چاہا تو اب تک زندہ ہی رہوں گا! ....

مخلص ——— جے پال

آج فیصلے کا دن تھا ——— !

چاروں طرف ایک گہری اور پُراسرار خاموشی محیط تھی۔ خاموشی جو کسی طوفان کا پیش خیمہ ہوتی ہے لیکن یہاں طوفان ابھی تک نہیں آیا تھا۔ صرف اضطرابی لہروں کا پُرسکوت مدو جزر تھا اور اُس کی تہہ میں چھپا ہوا وہ طوفان تھا جو نوجوان کی زندگی بخش بلندیوں کو سرنگوں کر دیتا ہے۔ جو کوہ بے ستون کے جگر سے دودھ کی شیریں نہر نکالنے والے کو موت کا ہاتھ دے کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے اور دل کی راہوں پہ سفر کرنے والے کو صبا کی ٹھنڈی ہوائیاں بخشتا ہے ——— وہ طوفان ابھی نہیں آیا تھا اگرچہ اُسے کل ہی آجانا چاہئے تھا۔ کالج کی دلکش رعنائیاں اور محبت کی جوان بخت صحت مند کہانیوں کو کل ہی ختم ہو جانا چاہئے تھا۔ کالج کی رُومانی فضاؤں پر خزاں کا کربناک تسلط کبھی کا ہو چکا ہوتا اگر کل ہی رضیہ آجاتی ——— !

"خدا کرے رضیہ آج بھی کالج نہ آئے!" فیس کاؤنٹر پر کھڑے ہوئے چند نے سرگوشیاں کیں۔

"ایک دن تو اُسے آنا ہی ہے!" انجم نے پُریقین لہجے میں کہا۔

"خدا کرے آج نہ آئے!" سہیل نے دعا مانگی۔

کاریڈور میں کھڑے ہوئے لڑکے اضطرابی کیفیت سے "کامن روم" کے دروازہ پر لگی چلمن کو گھور رہے تھے اور سوچ رہے تھے کچھ دیر اور گذر گئی کہ اس چلمن کو ایک جنبش ہوگی اور رضیہ "کامن روم" کے اندر داخل ہوگی پھر "پرنسپل روم" میں گھنٹی بجے گی۔ چپراسی آئے گا اور چلمن کو پھر جنبش ہوگی۔ رضیہ "کامن روم" سے باہر نکلے گی۔ ایک فاتحانہ انداز سے ماحول کی اضطرابی کیفیت کا جائزہ لے گی اور "پرنسپل روم" میں داخل ہو جائے گی اور پھر ——— پھر تو سب کچھ مٹ جائے گا، ختم ہو جائے گا، فنا ہو جائے گا

ایک صرف اختر ہی کے وجود سے تو کالج کے حسین ہنگامے زندہ ہیں۔

"اختر صاحب!"

"ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ" کے آخری خالی کمرے کے دروازہ پر تھپکی دی گئی۔

"مسٹر اختر...!" جواب میں موت جیسا سکوت ملا۔

صبح ہی سے اختر نے خود کو مقید کر رکھا تھا۔ دروازہ پر کئی بار دستک دی جا چکی تھی۔ صرف طلباء ہی نہیں کئی پروفیسر صاحبان بھی اُسے پکار چکے تھے لیکن نجانے کون سے ارادہ کے تحت وہ خاموش تھا اور اب اُس کی یہ طویل خاموشی کسی پُراسرار واقعہ کے اختتام کی طرح بن گئی تھی۔

"اُف اب کیا کیا جائے ——— ! یہ کمبخت باہر آنے کا نام نہیں لیتا اور رضیہ کے آنے میں زیادہ دیر نہیں!"

"بیشک اُس کے آنے سے پہلے اِسے اپنی خطرناک ضد سے ہٹانا ضروری ہے"

"یہ دروازہ کھولے تب نا!"

اختر دروازہ نہیں کھول رہا تھا اور رضیہ کے آنے میں مزید دیر نہیں تھی۔ کالج یونین کے تمام ممبران اور دوسرے طلباء اپنی ہر کوشش میں ناکام ہو چکے تھے۔

"کیوں جناب آخری بار ہم لوگ رضیہ کو مجبور کریں۔" اکرم نے ایک تجویز سامنے پیش کی۔
"میں صبح اُس سے مل چکا ہوں۔" کلیم نے بتایا۔
"کیا جواب ملا؟" اضطراب اپنی معراج کو پہنچ چکا تھا۔
"اُس کا یہ آخری فیصلہ ہے کہ اختر اُس سے تقریری معافی مانگے....؟"
"مگر یہ بات ممکن تو نہیں۔" مظہر نے پُریقین ہو کر کہا۔
"اب تو کوئی بات بھی ممکن نہیں۔" آوازوں میں مایوسی اور بیزاری تھی۔
کتنی معمولی بات ہنگامہ بن گئی تھی۔

بات واقعی معمولی تھی جو ایک مہیب طوفان کی بنیاد بن گئی جس نے کالج کے سارے ماحول کو ایک کپکپاہٹ میں منتقل کر دیا۔ بات دو دن پہلے کی ہے۔ مگر نہیں یہ بات چند ماہ پہلے کی ہے۔ لڑکوں نے اپنے خیالات کی کندیں پھینکنا شروع کیں۔ اُس دن کالج میں۔ کالج ویک کے سلسلے میں ایک مباحثہ تھا۔ تمیرین ہال کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ شہر کے تمام معزز لوگ اور کالج کے پرسوز پڑھنے والے طلبا اُس فنکشن میں مدعو کئے گئے تھے۔ کالج کے لئے مباحثہ کا موضوع بھی بالکل ہی نیا اور انوکھا تھا "عورت اور پردہ" ٹریننگ کالج میں آج سے پہلے کبھی ایسا اچھوتا اور کیف آگیں موضوع پر مباحثہ نہیں ہوا تھا اس لئے طلباء کے ساتھ ساتھ کالج میں پڑھنے والی طالبات کا بھی جم غفیر موجود تھا۔ اُس وقت تک کالج میں ایک صرف رضیہ ہی بہت اچھا بولتی تھی۔ وہ ہمیشہ ڈائس پر ایک فاتح کی طرح قدم رکھتی اور فاتح کی طرح واپس ہوتی۔ رضیہ پردہ کی مخالفت میں بولی۔ اُس کی نظر میں پردہ عورت کو گہری نیند سُلانے والی گولیوں کی طرح تھا جو عورت کی زندگی کے ہر روشن پہلو کو تاریکیوں میں جذب کر دیتا ہے۔ رضیہ کی تقریر ختم ہوئی سارا ہال تالیوں کے شور سے گونج اُٹھا جبھی سکریٹری کی آواز کے بعد ایک صحت مند جسم کا خوبصورت لڑکا اسٹیج پر آیا۔ ہونٹوں پر ایک عجیب سی مُسکراہٹ اور آنکھوں میں فتح کا یقین لے کر..... ہال میں سرگوشیاں جاگ اُٹھیں معلوم ہوا "نیو ایڈ" میں نیا نیا وارد ہوا ہے۔ وہ کچھ دیر تک اسٹیج پر کھڑا ہوا شرماتا رہا۔ شاید کانپ بھی رہا تھا۔ پھر ذرا سنبھل کر اُس نے رضیہ کی تقریر کی وہ مخالفت کی، کچھ ایسے عجیب اور کچھ انوکھے نکتے، کچھ ایسے نئے زاویئے اپنی تقریر میں اُجاگر کئے کہ سب حیران رہ گئے اور نہ صرف لڑکوں کو بلکہ خوبانِ کالج اور دوسری مدعو کی گئی خواتین کو بھی رضیہ کی تقریر بے معنی محسوس ہوئی۔ پھر معلوم ہوا کہ ججوں نے بھی پہلے انعام کا حقدار اختر کو قرار دیا ہے۔ ہجوم میں ایک ہیجان پھیل گیا۔ آج گزشتہ کئی سالوں کے بعد پہلی بار رضیہ کو ایک شرمیلے اور نو وارد لڑکے نے شکست دیدی تھی۔

لیکن شاید رضیہ کی مغرور طبیعت نے اِس شکست کو قبول نہیں کیا تھا۔ اُس دن اگر وہ اپنی شکست قبول کر لیتی تو آج یہ ہنگامہ ہرگز ہرگز نہ ہوتا۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ خوبصورت زندگی کا مستانی بھرا افسردگیوں میں گم ہو جاتا.... اُس واقعہ کے بعد سے رضیہ [illegible] سنجیدہ اور گمبھیر ہو گئی۔ اُس کے یاقوتی لبوں کی مُسکراہٹیں ختم ہو گئیں۔ یہ بات [illegible] پر ایک عجیب حوصلہ شکن کرختگی پیدا ہو گئی۔ لیکن صرف ایک اختر تھا جس نے رضیہ کی پُر تصنع عظمت کا احساس نہیں کیا۔ رضیہ کالج کی حسین ترین لڑکی تھی۔ ساتھ ہی ذہین بھی تھی۔ امیر باپ کی اکیلی تنہا اولاد تھی اس لئے وہ خریدتی وہ سب کچھ رہا تھا جس کی فرصت خواہشوں اور آرزوؤں کی شکست کے لئے ہوا کرتی ہے۔ ہاں اُس رات کے بعد اختر کالج کا ہیرو بن گیا لڑکوں، اُستادوں میں ہر دلعزیز بن گیا اور جلد ہی وہ کالج کا سب سے زیادہ ذہین اور خوش پوشاک طالب علم سمجھا جانے لگا۔

اس دوران نہ جانے کہاں سے کالج کی فضاؤں نے اپنے اندر دھیمی دھیمی شتیل ہوا کے جھونکے محسوس کئے۔ نہ جانے کس نے یہ خبر اُڑا دی کہ رضیہ اکثر اختر کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتی ہے۔ آہستہ آہستہ تو زاً یہ افواہ ایک شہرت بن گئی۔ حقیقت اور خواب کی چادر پر کسی کو یقین نہ آتا تھا بعد میں معلوم ہوا کہ یہ افواہ خود اختر نے اُڑائی تھی پھر کیف اب کالج کے تمام گوشوں میں اِس بے یقینی رومان پر تبصرے ہونے لگے۔ ہر نظر رضیہ کو پُر معنی انداز میں گھورنے لگی۔ لڑکوں کے ہونٹوں پر مُسکراہٹیں جنم لیتیں اور رضیہ تلملا کر رہ جاتی۔ وہ جانتی تھی کہ اُس کی روح کی بیکراں وسعتوں میں محبت نام کی کوئی جھلک پیدا نہیں ہوئی پھر یہ افواہ کیوں؟ وہ طے کئے ہوئے تھی کہ شکست نہیں قبول کرے گی اور اختر کے ملنے کے طلباء اس حقیقت سے آشنا تھے کہ اختر ایک دن رضیہ کو سرنگوں کر کے رہیگا۔

حسن اور عشق کے تصادم میں دن یونہی بیت رہے تھے ——!

اُس دن پورے چاند کی رات تھی۔ کچھ طلباء اور طالبات نے کالج سے دور شہر سے باہر قلعہ کی نہر کے کنارے پکنک کا پروگرام بنایا۔ لڑکوں کے ساتھ رضیہ بھی شامل ہوئی تھی۔ ایک خوبصورت سُہانی رات تھی۔ رومان پرور فضاؤں کے خوش بخت لمحے تھے۔ خیال تھا کہ ہر کوئی چاندنی رات کا سیمیں آنچل تھام کر خوابوں کی بستیوں میں پہنچ جائیگا۔ اختر کا شدت سے انتظار تھا لیکن وعدہ کے باوجود نہ آیا اور چاندنی رات اُداس ہونے لگی۔ بہت دیر بیت گئی۔ گوری کے دو گیت بھی ختم ہو گئے، بشیر نے وائلن پر کتنے ہی فلمی نغموں کی دُھنیں سنا ڈالیں، پھر چاندنی رات اُداس ہونے لگی۔ آخر کار نجمی نے اپنی غزل شروع کی اور جب غزل اختتام پر آئی تو اختر کے ملازم نے طلباء کو اختر کا ایک خط لا کر دیا جو سگریٹ لائٹر کی روشنی میں با آواز بلند پڑھا گیا

"ساتھیو! معاف کرنا کہ میں نہ آسکا۔ کیا کروں بات میرے دل اور میری مجبوریوں کی ہے۔ اب خود ہی فیصلہ کر لو کہ جس محفل کی روح خود پر غرور دولت کا لبادہ ڈھانپ لے اور اپنی مُسکراہٹوں پر پہرے لگا دے وہاں پر کوئی کیوں آئے —؟

اف کر دو کہ میں نہ آسکا محفل کی بے رونق روح کو میرا آداب کہو۔

نیازکار ——— اختر

اشارہ صاف رضیہ کی طرف تھا۔ طلباء نے چور نظروں سے رضیہ کی طرف دیکھا
س کا چہرہ اُس وقت ہر طرح کے جذبات اور تاثرات سے خالی تھا لیکن جس کے دل میں
ب ہولناک تلاطم پھیل چکا تھا۔ جس کے دماغ کی رگوں سے "بے رونق روح" نام کا زہر
را چمٹ گیا تھا۔ پھر بھی اس کے ہونٹ خاموش تھے۔

چاندنی رات کی معطر تازگی اور شبنمی طراوت بغیر کسی دلچسپی کے ختم ہو گئی۔

ایک ہفتہ بیت گیا، اور ہونٹ خاموش رہے۔

لیکن اس درمیانی وقفہ میں کبھی کبھی عجیب سی نظروں سے اختر رضیہ کو گھورتا رہا
ور چھیڑتا رہا۔

ایک مہینہ بیت گیا اور ہونٹ خاموش رہے۔ لیکن دل کے سمندر میں جوار بھاٹا
تا رہا۔ لہریں آسمان کی وسعتوں کو چھوتی رہیں، دماغ کی رگوں سے زہریلا کیڑا چمٹا رہا لیکن
ب ہونٹ وا ہوئے تو ایک بھیانک طوفان آگیا اور ماحول میں چاروں طرف زہر پھیل
یا۔

سائیکلوجی کا پیریڈ تھا کلاس کو پروفیسر انصاری لے رہے تھے۔ چاروں طرف
ہری خاموشی تھی۔ اچانک گلاب کا ایک پھول فضا میں کیا لہرایا کہ چاروں طرف زہر پھیل گیا۔

"سر کہیں سے یہ پھول ...." یہ رضیہ کی آواز تھی۔

"کس بدتمیز نے یہ حرکت کی ہے۔۔؟"

جواب میں قبرستانوں جیسا سناٹا تھا۔

"اس طرح کوئی نہ بولے گا!" پروفیسر انصاری کی آواز میں غضب کا غصہ سمٹ آیا
تھا "آپ کو کس پر شک ہے؟"

رضیہ ایک سرعت کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

"سر! میرا شک یقین کی صورت میں اختر صاحب کی طرف ہے؟" نجانے کیوں
اس بار اُس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

"اختر صاحب!"

وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ اُس کے چہرے پر عجیب سی سیاہی پھیل گئی۔

"تمہاری اس حرکت پر ہم یقین کر لیں؟" پروفیسر انصاری نے اُس سے پورے
کلاس کے سامنے ضمانت لے لی۔

اختر کا سر نیچے جھک گیا۔ اُس کی نگاہیں کلاس کے فرش پر گڑ گئیں۔

"میں پرنسپل صاحب کو رپورٹ کروں گی!" یہ کہتے ہوئے رضیہ کلاس سے باہر
نکل گئی۔

"ٹھیک ہے ...." نجانے کیا کہتے ہوئے انصاری صاحب کلاس سے باہر چلے گئے
سارے طلباء نے اختر کو گھیر لیا۔ سینکڑوں سوال دریافت کئے۔ سب کو تعجب
تھا کہ پھول کب اُچھالا اور کب رضیہ کی میز پر جا کر گرا۔ مگر اختر چپ تھا۔ اُس کا سر بیک
نیچے جھک رہا تھا۔ شاید ندامت کا بار اُس سے سنبھل نہیں رہا تھا۔

سوچوں کے ساتھ ساتھ شاید لب بھی ساکت ہو گئے تھے۔

اور طلباء سوچ رہے تھے اگر رپورٹ ہو گئی تو یقیناً اُس کی کالج کی زندگی ہمیشہ کے
لیکر ختم ہو جائے گی۔

گھنٹہ ختم ہونے تک یہ خبر پورے کالج میں پھیل گئی اور پرنسپل ... لودھی
نے چند لڑکوں کو بلا لیا۔

"تمہارے کلاس میں یہ سب کیا ہو گیا بھئی؟"

"انصاری صاحب نے آپ کو کچھ نہیں بتایا؟" جاوید نے سوال کا جواب دیا۔

"انہوں نے اپنی رپورٹ میں کیا لکھا ہے؟" امیر بہت بیتاب ہو گیا تھا۔

میرے پاس ابھی کوئی رپورٹ نہیں پہنچی ہے۔ میں نے آپ لڑکوں کو اسی لئے
بلایا ہے کہ آپ انصاری صاحب کو رپورٹ نہ کرنے دیں۔ ورنہ میں مجبور ہو جاؤں گا ....
کہتے کہتے لودھی صاحب رُک گئے۔

لڑکے باہر نکل آئے اختر کو تلاش کیا گیا لیکن وہ ایکدم نہ جانے کہاں غائب ہو گیا
آخری پیریڈ میں لیکچر تھیٹر میں میٹنگ کی گئی یونین کے ممبران نے سب سے سینئر
اسٹوڈینٹ نہال کو انصاری صاحب سے بات کرنے کے لئے مقرر کیا۔ اُنہیں یقین تھا
کہ پروفیسر انصاری نہال کی التجا ٹھکرائیں گے نہیں۔

اور جب دوسرے دن کالج کھلا تو لڑکوں کے چہرے گلنار تھے۔ نہال نے
خبر دی تھی کہ انصاری صاحب نے رپورٹ نہ کرنے کا وعدہ کر لیا ہے۔ پھر اختر کو ...
جاتی۔ اُسے اطمینان دلایا جاتا لیکن اختر آج بھی غائب تھا۔ وہ کوششوں کے باوجود کسی کو
گھر پر بھی نہیں مل سکا تھا۔

وقت پُرسکون انداز سے گزرنے لگا۔ ایک صرف اختر کا انتظار تھا جو کچھ بے
چین کر رہا تھا۔ یکلخت تیسرے پیریڈ میں سکون کو آگ لگ گئی خبر ملی کہ رپورٹ ہو چکی ہے
خود رضیہ نے کی ہے اور اپنا گواہ انصاری صاحب کو بنا لیا ہے۔

اب کیا ہوگا ——؟ کیا ہونا چاہئے تھا —— کوئی کیا کہہ سکتا تھا۔

پانچویں پیریڈ میں پرنسپل لودھی نے یونین کے ممبران کو پھر بلا لیا۔

"رضیہ نے رپورٹ کر دی ہے" لودھی صاحب نے گمبھیر آواز میں بات
شروع کی۔

لڑکے سوالیہ نشان بنے کھڑے تھے

"میرے لئے ایکشن لینا ضروری ہے۔ اختر کالج کا ذہین طالب علم ہے مجھے اُس سے ایسی اُمید نہیں تھی۔ اُس کا یہ آخری سال ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اُس کا مستقبل تباہ ہو جائے رپورٹ کی نوعیت ایسی ہے کہ میں اُسے معاف بھی نہیں کر سکتا" کچھ دیر اور سوچنے کے بعد وہ پھر بولے "کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ سب لوگ رضیہ کو مجبور کریں اور وہ کسی طرح اپنی رپورٹ واپس لے لے؟"

کوئی کیا کہہ سکتا تھا۔

"اختر کالج آیا ہے؟" پرنسپل لودھی امیر سے مخاطب تھے۔

"جی ابھی تک نہیں آیا۔"

"اختر کی یہ غیر حاضری کالج کے پُورے اسٹاف کو مشکوک کر رہی ہے۔"

آخری پیریڈ میں طلبار نے رضیہ کو گھیر لیا۔

رضیہ آج بالکل بدلی ہوئی تھی۔ ہمیشہ زیادہ بولنے والی آج اُس کی آواز کی وہ کیف آگیں متانت ختم ہو چکی تھی۔ وہ نسوانی کھنک ٹوٹ چکی تھی جس سے کبھی بات کرنے والے کے پسینے چھوٹ جاتے تھے۔ اُس کی آنکھیں آج بے پناہ شوخ اور چنچل بن گئی تھیں اور وہ ایک عجیب سے خشگیں لہجے میں بات کر رہی تھی۔

"اب کوئی صورت ایسی نہیں کہ آپ اختر کو معاف کر دیں؟" لڑکوں نے مایوس ہو کر حوصلے توڑ ڈالے۔

رضیہ فتنہ بیانداز میں کچھ دیر مُسکراتی رہی۔ پھر اُس نے چاروں طرف چور نگاہوں سے شاید اختر کو تلاش کیا۔

"اگر وہ مجھ سے تحریری معافی مانگے" رضیہ نے مغرورانہ انداز سے بات ختم کر دی۔

بات ختم ہو گئی۔

طلبار کو یقین تھا کہ اختر کسی صورت معافی نہ مانگے گا۔ اب تو وہ شاید بات کرنا بھی گوارہ نہ کریگا۔ پھر کیا ہوگا؟ انجام ظاہر تھا کہ زندگی روشنیوں اور کامرانیوں سے پہلو بچا کر رُسوائیوں اور تاریکیوں کی سیاہ عمیق وادیوں کی طرف رواں ہو گی۔

اختر ابھی تک کالج نہیں آیا تھا۔

اب کیا ہوگا، اب کیا ہونا چاہیے تھا؟ پھر وہی سوال پلٹ آئے تھے! فضا انتہائی کربناک حد تک کربناک بن چکی تھی۔ کوئی کیا کر سکتا تھا؟ پرنسپل لودھی نے رضیہ کو بُلا لیا جب سے رضیہ نے رپورٹ کی تھی وہ شاید خود بھی پریشان تھے۔ اصولی طور پر اور کالج کے قانون کے مطابق اختر کا کالج سے نکال دیا جانا ضروری تھا اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ آخری دنوں میں اُن کے ایک ہونہار طالب علم کا مستقبل جہاں ارمانوں کی بہاریں اور خوابوں کی رنگین تعبیریں تھیں خود اُن کے ہاتھوں غمناک رنگ میں بدل جائے۔ منزل کے قریب پہنچ کر روشنی اور اُجالوں کا اعتبار اپنے دامن میں زندگی کی ویرانیاں سمیٹ کر رُسوائیوں کے اندھیرے میں غرق ہو جائے۔ انہوں نے شاید رضیہ کو خود آخری بار سمجھانے کی کوشش کی تھی ــــــ لڑکوں کو ایک بار پھر مایوسی کے اندھیرے میں اُمید کی ننھی سی کرن نظر آئی۔

لیکن رضیہ کے پرنسپل روم سے باہر آتے ہی یہ کرن بھی بجھ گئی۔ رضیہ نے پرنسپل صاحب کو بھی مایوس کر دیا تھا۔ وہ بہر حال اختر سے تحریری معافی چاہتی ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ وہ کالج نہ آ کر اپنے گھر پر ہی رزلٹ پر اختر کا انتظار کر سکتی ہے۔

پھر ایک بار شاید آخری بار طلبار نے "ملیکچر تھیٹر" میں میٹنگ کی۔ اِس بار خوبان کالج کو بھی شریک کیا گیا۔ طے پایا کہ اس بار جیسے بھی ہو اختر کو تلاش کیا جائے گا اور اُسے مجبور کیا جائیگا کہ وہ ..... لیکن اختر کو مجبور کیسے کیا جاتا؟ وہ نجانے کہاں پوشیدہ تھا؟

آخری دن بیت گیا۔ ہر اُمید ختم ہو گئی!!

نہ اختر نظر آیا اور نہ رضیہ راضی ہوئی ــــــ اور آج فیصلہ کا دن تھا۔

کالج میں چاروں طرف ایک پُر اسرار خاموشی پھیل ہوئی تھی اور غم سے بھیگی ہوئی ہر آنکھ رضیہ کی منتظر تھی۔ پروفیسر نجیب نے نجانے کیوں آج پہلا پیریڈ ہی نہ لیا۔ آج کتنے ہی لڑکے پروفیسر جناب کے پیریڈ میں نہ گئے اور اُدھر کلاس روم کی فضا پر بھی ایک عجیب بوجھل پن چھایا رہا۔ خیال تھا کہ اختر آج بھی کالج نہ آئے گا۔ خدا سے دعائیں مانگی جا رہی تھیں کہ وہ آج بھی کالج نہ آئے لیکن خلافِ اُمید اختر کالج آ چکا تھا۔ اپنے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ لئے، جیسے اُسے معلوم تھا کہ کچھ نہ ہوگا ــــــ کچھ بھی تو نہ ہوگا ــــــ لڑکوں نے اُس سے بات کرنے کی کوشش کی۔ جواب میں وہ صرف مُسکراتا رہا ــــــ پھر اُسے پرنسپل صاحب نے بُلا لیا لیکن پرنسپل روم کی طرف جانے کی بجائے اُس نے خود کو ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ کے آخری خالی پڑے کمرے میں مقید کر لیا۔ نجانے وہ کون سے لمحے کا منتظر تھا۔ اگرچہ اب کچھ بھی باقی نہ رہا تھا۔ ہاں صرف رضیہ ابھی تک نہ آئی تھی۔

چوتھا پیریڈ گزر گیا ــــــ ہولناک سکوت قائم رہا لیکن پانچویں پیریڈ کے ختم ہونے تک سکوت ٹوٹ گیا۔ ماحول میں چاروں طرف سرگوشیوں کا شور مچ گیا ــــــ رضیہ بھی کالج آ گئی تھی۔

پرنسپل لودھی شاید خود انتظار اور کشمکش کے اذیت ناک لمحوں سے گھبرا گئے تھے اور گھبرا گئے تھے۔

آخر کار انہوں نے دونوں کو ہی بُلا لیا۔

مختصر لمحے ساکت ہو گئے۔ پھر ایک طویل مسافت کے بعد چھٹا پیریڈ شروع ہوا تو چاروں طرف مضطرب لرزشیں پھیل گئیں۔ چپراسی نے اختر کے کمرے پر دستک دی اور پرنسپل صاحب میں آنے کا پیغام دیکر لوٹ گیا۔ اُسی وقت اختر نے ایک سُرعت کے ساتھ دروازہ کھولا جیسے وہ نہایت شدت سے اِس لمحے کا منتظر تھا۔ اُس کے چہرے پر اب بھی ایک عجیب سا اطمینان تھا اور ہونٹوں پر عجیب سی مُسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ طلبار کے ہجوم کے ساتھ آہستہ قدم

دہ گئے۔ بڑھاپے سے اتفاق کہیں یا رضیہ کا اے سشو پروگرام گیلری میں دونوں ایک ساتھ
ہو گئے۔ مختصری ساعت کے لئے دونوں کے قدم ٹھہر گئے۔ رضیہ کے ہونٹوں میں سارے
ہاں کا خفہ سمٹ آیا تھا اور تیور یا کے تیکھے ہو گئے تھے۔ اختر کی مسکراہٹ قدرے
دیاں ہو گئی پھر نجانے کیا ہوا کہ رضیہ کے بیضوی چہرہ پر ایک گھبراہٹ ابھر آئی۔ اُس کی
رفتار اختر سے تیز ہو گئی اور وہ اختر سے پہلے پرنسپل روم میں داخل ہو گئی پروفیسر
انصاری پہلے سے وہاں موجود تھے۔

سارے جسم ہولے ہولے کانپ رہے تھے۔ اگرچہ اب کچھ باقی نہیں رہ گیا تھا، پھر بھی
سب انتظار تھا ایک پراسرار خاموشی تھی جو طلبا کی روح کو اپنی گرفت میں پکڑے ہوئے تھی
لیکن نہیں! شاید ابھی سب کچھ باقی تھا، دھرتی اب بھی گھوم رہی تھی۔ ہر چیز حرکت میں تھی دیواریں
لیکن میں تھیں غرض حرکت میں تھا، کامن روم کی حسین چلمن حرکت میں تھی بلکہ ایک صرف وہ
راز ہی نہ تھی ایک صرف وہ سانس ہی نہ تھی جو زندگی اور حرکت کا احساس دلاتی ہے ——
بہت دیر بیت گئی —— کوئی باہر نہ نکلا —— اور دل دھڑکتے رہے۔

اور جب وہ باہر نکلے تو سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ اختر کے چہرہ پر ایک خفیف سی سیاہی
تھی لیکن آنکھوں میں ہلکی سی چمک تھی اور ہونٹوں پر دبی مسکراہٹ تھی۔ رضیہ کے خوبصورت
بیضوی چہرہ پر آسودگی اور سکون کے سائے تھے۔ اُس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں
میں فتح کی چمک تھی۔ پروفیسر انصاری نے بتایا اختر نے کوئی بحث نہیں کی، اپنا جرم
قبول کر لیا۔ مگر رضیہ سے اُس نے ——

"اور کیا....؟" کتنے ہی منہ حیرت سے ایک ساتھ کھل گئے۔
"وہ کالج سے نکال دیا گیا ہے۔"
دل ایکدم تیزی کے ساتھ دھڑکنے لگے خاموشیاں گہری ہو گئیں اور بات
ختم ہو گئی۔

کسی کو حیرت نہ ہوئی۔ فضا میں کوئی تغیر نہ ہوا۔ کوئی ہنگامہ بھی نہ ہوا صرف طویل لمحے
ساکت رہ گئے۔ صرف ایک کمند ٹوٹ گئی۔ تعجب اگر تھا تو اتنا تھا کہ رضیہ کامن روم
سے پھر باہر نہ نکلی۔ چھٹا پیریڈ ختم ہو گیا وہ باہر نہ نکلی، ساتواں پیریڈ ختم ہو گیا، وہ نظر نہ آئی
معلوم ہوا کہ وہ کامن روم سے غائب ہے۔ وہ کہاں گئی؟ اور کب گئی؟ کسی کو کچھ خبر نہ تھی
اور جب آخری پیریڈ ختم ہونے کا وقت ہوا تب —— وہ کامن روم ہی سے باہر
آئی۔ اُس کا سر جھکا ہوا تھا اُس کی گلابی رنگت پر نجانے کہاں سے سفیدی یکجا ہو گئی تھی
اور کیوں؟ اُس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ کسی کو کچھ نہیں معلوم تھا کہ اب وہ پرنسپل روم
کی طرف کیوں جا رہی ہے؟ لیکن طلبا یہ سوچ رہے تھے کہ ابھی کچھ اور باقی رہ گیا ہے ——
—— ؟!

یکلخت یہ خبر پھیل گئی کہ رضیہ رو رہی ہے۔ یکلخت یہ بھی پتہ چلا کہ رضیہ پرنسپل شوکت

اور ان کے قدم حقیقتاً جھک گئی —— بلکہ ایک سوال لگ رہی ہے —— حیرت سے طلبا
ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ اُن کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آ رہا تھا معلوم ہو کہ بھلا رضیہ
نے اُچھالا تھا اور ..... ! حیرت سے طلبا ایک دوسرے کو تکتے تھے —— تھک گئے تھے
اُن کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آ رہا تھا یہ کیسا طوفان تھا وہ کیسی نفرت تھی وہ کیسا انتقام تھا؟
نفرت کی محبت کی یہ کیسی آمیزش تھی کوئی کچھ بھی تو نہ سمجھ سکا اور شاید کبھی کوئی سمجھ بھی نہ سکتا
اگر سائیکلوجی کے پروفیسر انصاری یہ نہ بتاتے۔

"ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی کو چاہتے ہوئے بھی ہم اُسے اپنی روح کی گہرائیوں
میں چھپائے رہتے ہیں۔ گماں ہوتا ہے۔ خبر نہیں ہوتی۔ کوئی حادثہ کوئی ٹکراؤ ہوتا ہے ہمارا
شعور زخمی ہوتا ہے، تب وہ چاہ، وہ لگاؤ، وہ ہمک روح کا ایک اہم ترین حصّہ بن جاتی ہے"

"اب کیا ہو گا؟" طلبا نے دُور مستقبل کی روشنیوں کا جائزہ لیا۔
معذرت گوئی اور محبت کی نازک لکیروں کے جڑ کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا
لیکن دوسرے دن لڑکوں کے لئے یہ بات معمہ بن گئی کہ پردہ کی مخالفت میں چند
تقریر کرنے والی لڑکی رضیہ کالج کی کئی اور طالبات کی طرح برقعہ پہن کر کالج آنے لگی ہے ——
یا تو اس وجہ سے کہ اختر پردہ کی مخالفت میں بولا تھا یا پھر اب وہ منہ دکھانے کے قابل نہ
رہ گئی تھی !!

امر چند قیس جالندھری

ہر سُو شبابِ حُسن و جمال آشکار ہے
غنچوں پہ رنگ دھوپ، گُلوں پر نکھار ہے
دامانِ کوہسار ہے رشکِ فضائے خُلد
موجِ صبا ہے غیرتِ موجِ ہوائے خُلد
نظروں پہ چھا رہی ہے ردا سبزہ زار کی
دِل میں سما رہی ہے ادا شاخسار کی
ہر سُو فضا میں جلوۂ طوفانِ رنگ و بُو
حدِ نگاہ تک سروسامانِ رنگ و بُو

(۲)

شہرِ خموش سے ہے سوا رہ گزار کیوں؟
دوزخ نما ہے آج لبِ جوئبار کیوں؟
تاریک تر ہے کس لئے نُورِ بہارِ صبح؟
کیا بعدِ شام اِسی لئے تھا انتظارِ صبح؟
کیا اب بھی پانی بھر نے وہ گُل رُخ نہ آئے گی؟
کیا صبح بھی مجھے وُہی تارے دکھائے گی؟

ساجن بھارتی

مقدر اُن کے، اُن کی قسمتیں ہیں
جنہیں حاصل تمہاری قُربتیں ہیں!
ہمیں اُن سے محبت، اور اُن کو
زہے تقدیر، ہم سے نفرتیں ہیں
کسی کی "نیلگوں مخمور نظریں"؟
مقرر "میکشی کی دعوتیں" ہیں
تصدق آپ کی "شانِ کرم" کے
گُناہوں سے زیادہ رحمتیں ہیں
کہیں پر گونجتے ہیں شادیانے
کہیں ماتم بپا ہے، ظلمتیں ہیں
"وفا کی راہ" میں اِک اِک قدم پر
سراسر زحمتیں ہی زحمتیں ہیں
ترے اشعار سے ساجن نمایاں
تری "فکر و نظر" کی وسعتیں ہیں

چندر پرکاش جوہر بجنوری

نہ آئے جام مُجھ تک غم نہیں ہے — نظرِ ساقی سے ملنا کم نہیں ہے
سنبھل کر میرے دِل پہ ہاتھ رکھیئے — یہ شعلہ ہے کوئی شبنم نہیں ہے
غمِ محبُوب سے بڑھ کر جہاں میں — نشاط انگیز کوئی غم نہیں ہے
غمِ دوراں کو کیا اپناؤں جوہر — غمِ جاناں کی لذت کم نہیں ہے

افسانہ

انتقام

رئیس نجمی امروہوی

"آشیانہ" سرائے کہنہ امروہہ (یو۔پی)

۱۴ر ستمبر ۱۹۶۳ء محترم بھائی! آداب

.....اس بار آپ جتنے مختصر وقفہ کے لئے امروہہ تشریف لائے تھے، اُس سے میں بے حد دُکھی ہوں۔ آپ سے ناراض اسلئے نہیں ہو سکا کہ مجھے آپ کے چلے جانے کے بعد بہت اچھی طرح یہ معلوم ہو گیا تھا کہ آپ کی دفتری پریشانیاں صرف دفتر تک ہی محدود نہیں رہیں بلکہ انہوں نے دہلی سے چل کر آپ کا امروہہ تک پیچھا کیا۔ خوشتر بھائی! مجھے بے حد حیرت اور تعجب ہے کہ اتنی اُلجھنیں اور دقتیں ہونے کے باوجود آپ بیسویں صدی اور نئی صدی کو کس طرح اپنے محور پر قائم کئے ہوئے ہیں۔ رامپور اور مراد آباد کا وہ طویل سفر جو ہم لوگوں نے بہت ہی مختصر سے وقفہ میں طے کر لیا تھا اور جسے آپ نے رام گنگا کا پُل پیدل پار کرتے ہوئے ایک پلک سے تعبیر کیا تھا بھلائے نہ بھولے گا۔ رامپور میں خاص طور پر آپ کے دوست پروفیسر مقبول گورنمنٹ کالج نوشہرہ (پاکستان) کی پُرخلوص اور سادہ طبیعت کو کبھی فراموش نہ کر سکوں گا۔ جن سے آپ ہی کے ذریعہ شرفِ نیاز حاصل ہوا۔ یہ آپکی کوئی کم بلندی نہیں کہ وہ ہندوستان تشریف لاتے لیکن اُن کے پاس دہلی کا ویزا نہیں تھا۔ لیکن آپ اُن سے ملنے کے لئے موسلا دھار بارش میں امروہہ سے رامپور اُن کے گھر پہنچے۔ میں سمجھتا ہوں آپ جیسی پُرخلوص اور عظیم ہستیوں کا قُرب اگر کسی انسان کو مِل جائے تو پھر اُسے دنیا میں کس چیز کی آرزو رہ جائے گی!.....ایک تازہ تخلیق جو بے حد مختصر اور چند خطوط پر مشتمل ہے ارسال خدمت کر رہا ہوں۔ آپ ایسی ہی کہانیاں پسند کرتے ہیں.....کار لائق

خلوص کار ——— رئیس نجمی امروہوی

"اختر مقام" پیرس روڈ۔ علیگڈھ

۱۱ر مئی ۱۹۶۳ء محترمی انجم صاحب! خلوص بیکراں

میں بہت دنوں سے آپکی کہانیاں مختلف رسائل میں پڑھتی رہی ہوں۔ آپکی کہانیوں کے بے حد چونکا دینے والے اختتام مجھے بے حد پسند آتے ہیں۔ میری اِس اجنبی تحریر کو دیکھ کر آپ کس قدر چونکیں گے، لیکن چونکئیے گا نہیں میں آپ کے لئے اجنبی نہیں ہوں اِس لئے آپ کو پہلے اپنے آپ سے متعارف کرا دوں میں آپ کے ہی محلّہ میں رہنے والی وہ لڑکی ہوں جو ایک دن غیر ارادی طور پر آپ سے ٹکرا گئی تھی اور میرے ہاتھوں سے کتابیں گر گئی تھیں۔ میں نے اُس وقت آپکی اُس بدتمیزی پر آپ کو بہت بُرا بھلا کہا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں آپ نے اُس کا بالکل بُرا نہیں مانا اور ہنستے ہوئے اپنے گھر میں داخل ہو گئے تھے جس کی وجہ شاید یہی تھی کہ اُن دنوں ہمارے شعور لتنے جوان نہ تھے۔ یہ اب سے چار سال پہلے کی بات ہے۔ اِس عرصہ میں میں نے کتنی ہی بار آپ کو گلی میں آتے جاتے دیکھا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ مجھے بہت تیز نگاہوں سے گھورتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔ اِسے آپ قُربت کہیئے یا پھر دشمنی لیکن میرے لئے یہ اپنائیت کا احساس ہے، جس نے مجھے آپ کو خط لکھنے پر مجبور کر دیا ہے۔ مجھے اِن دنوں آپ سے ایک بہت بڑی شکایت پیدا ہو گئی ہے کاش! آپ اُس پر سنجیدگی سے غور کر سکیں۔ میں نے پرسوں آپکی تازہ کہانی "حنائی پتیاں" پڑھی ہے جو "تشکیل" کے ماہِ رواں کے شمارہ میں بہت آب و تاب کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ اُس کہانی میں آپ نے ہیروئن کی جگہ میرا اصلی نام لکھ دیا اور ہیرو آپ خود بن گئے۔ پتہ نہیں میرا اصل نام آپ کو کیسے معلوم ہو گیا؟ کہانی کے اندر محلّے کی گلی میں آپ سے ٹکرانے کا واقعہ تو خیر حقیقی تھا لیکن میں نے کب آپ سے محبت کے سُنہرے عہد و پیمان کئے؟ اور کب طویل طویل خط لکھے؟ میں کب آپ سے "ہانسدیو پارک" میں ملی اور زندگی بھر

تو نیہا نے کی قسم کھائی ہ واللہ کہ یہ رسالہ ابو یا بھائی جان کے ہاتھ لگ جائے
پھر ایک قیامت آجائے گی۔ آپ کو کیا پتہ کہ میری سہیلیوں نے وہ کہانی پڑھ کر آپ کے
اور میرے نام کے ساتھ جوڑ جوڑ کر کتنے نئے نئے قصے جوڑ لئے ہیں اور مجھے پرسوں سے
یہ چھیڑ رہی ہیں اور یہ سلمی کی بچی تو آپ کا نام ہی نہیں لیتی بلکہ آپ کو دولہا بھائی،
دولہا بھائی کے نام سے یاد کرتی ہے اور جان بوجھ کر آپ کے تذکرے میرے سامنے
کرتی ہے۔ آپ اگر سڑک پر نظر آجائیں اور میں اُس کے ساتھ ہوں تو پھر اُس کی باتیں سُنو
ایک بار بھی سُن لو گے تو کہانیاں لکھنا چھوڑ دو گے۔ میں چاہوں تو اس حرکت کی آپکو
سزا دے سکتی ہوں کہ آپ عمر بھر یاد کرتے رہیں کہ کسی رئیس سے پالا پڑا تھا۔ جائیے معاف
کئے دیتی ہوں خدا کے لئے آئندہ پھر ایسی کوئی حرکت نہ کیجئے ورنہ میں آپ سے ناراض ہو
جاؤں گی۔ اور پھر آپ مجھے منا بھی نہ سکیں گے۔ آپ سے ایک عرض ہے اگر آپ مان جائیں
میرے لئے بڑا لیکن آپ کے لئے ایک معمولی سا کام ہے۔ میں اور میری سہیلی زندگی بھر
آپکا یہ احسان نہ بھول سکیں گی۔ یہ ایک چھوٹا سا واقعہ ہے جو خط کے ساتھ دو صفحات پر
لکھا ہوا ہے اسے آپ کہانی کا رُوپ دیکر جلد سے جلد ماہنامہ "تشکیل" کے کسی قریبی شمارہ
میں اپنے ہی نام سے شائع کرا دیجئے۔ دراصل یہ واقعہ میری ایک سہیلی افروز اور کالج کے
ایک پروفیسر نواب کے مابین پیش آیا تھا کہانی لکھتے وقت یہ خیال رکھیئے کہ واقعات کرداروں
کے نام اور اُس کا اختتام اِسی صورت میں ہو۔ اگر یہ واقعہ ایک اچھی کہانی کا رُوپ دھار گیا
تو میری سہیلی کی شادی اس کی من پسند جگہ یعنی پروفیسر نواب کے ساتھ ہو جائے گی۔
یہ اُس کی زندگی کا سوال ہے۔ دراصل اُس نے آپکی یہ کہانی پڑھ کر یہ اندازہ لگایا کہ آپ مجھ سے
بڑی دلچسپی رکھتے ہیں تب اُس نے یہ واقعہ میرے سامنے بیان کیا اور اصرار کیا کہ میں ایک
خط اور یہ پُورا واقعہ آپ کو لکھوں اور آپ اسے کہانی کا رُوپ دیکر شائع کرا دیں۔ اِن
دنوں افروز اور پروفیسر نواب کے درمیان ایک گہری خلیج پیدا ہو گئی ہے۔ آپکی کہانی افروز
کی فریاد کے رُوپ میں بہت آسانی کے ساتھ نہ صرف اُن تک پہنچ جائیگی بلکہ افروز کے
روکش ہونے میں مدد دیگی۔ پھر تو پرانی باتوں کے پھول مرجھا جائیں گے نئی باتوں
کی کلیاں کھِل اٹھینگی۔ اِس محنت کا انعام میرے پاس دعاؤں کے سوا اور کچھ نہیں ہے
میں دوسرا خط آپ کو جب ہی لکھوں گی جب آپ یہ کہانی شائع کرا دیں گے۔ اس
درمیان آپ مجھے کوئی خط نہ لکھیئے گا کیونکہ ہمارے ابو جان بہت سخت مزاج کے آدمی
ہیں۔ خدانخواستہ خط پکڑا گیا تو؟ ——— میں دوسرے خط میں آپ کو خط بھیجنے اور ملنے
کی تمام تر آسان ترکیبیں لکھونگی۔ میرے اور آپ کے درمیان خط و کتابت میں کوئی
بھی پریشانی حائل نہ ہوگی۔ اگر میرے وہ تمام پلان پُورے ہو گئے جو میں نے سوچ رکھے
ہیں۔ جب تک انتظار کیجئے گا۔ اچھا اب اجازت دیجئے۔ رات کافی بیت گئی ہے۔
لیکن ہاں ایک بات تو بھول ہی گئی۔ میرا یہ خط پڑھ کر پھاڑ دیجئے اور اس راز کو راز ہی
رکھیئے ——— آپکو میری قسم!

آپ کی ایک نئی پرستار ——— فائزہ

سونگرہ ہاؤس۔ میرس روڈ۔ علیگڑھ
۱۴ مئی ۶۳ء

محترمی بھائی سہیل راہی! تسلیم

اس سے پہلے میری ایک کہانی آپ کو ملی ہوگی "تشکیل" کے لئے ایک اور کہانی "تخلیق محل کے دریچے" ارسال خدمت کر رہا ہوں۔ یہ کہانی نہیں ایک حقیقت ہے جسے کہانی کا رُوپ دیدیا گیا ہے۔ آپ میری پہلی کہانی "یاد بھرا دل" ابھی شائع نہ کریں اُس کے بجائے یہ کہانی شریک اشاعت کر لیں۔ اِس کہانی کی جلد سے جلد اشاعت میرے لئے بڑی خوشی کا باعث بنے گی کیونکہ اس میں کچھ واقعات ایسے بھی ہیں جو اس دنیا کے جیتے جاگتے کرداروں کے دلوں کی امانت ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ کہانی آپ کی پسند کے معیار کے عین مطابق ہوگی۔ کوئی وجہ نہیں کہ کہانی آپ کو پسند نہ آئے کیونکہ میں نے اپنا پورا فن اور کئی دن کی لگاتار محنت اس میں صرف کی ہے۔ اگر کسی وجہ سے کہانی آپ کو پسند نہ آئے جب بھی کوشش کیجئے کہ یہ شائع ہو جائے ——— کہانی کی رسید اور آپکی بیش قیمت رائے جاننے کا شدت سے منتظر رہوں گا۔

خلوص کیش ——— انجم شمالی

دفتر ماہنامہ "تشکیل" ۹۳۱/II ۔ چاندنی چوک دہلی
۱۵ جولائی ۱۹۶۳ء

انجم شمالی صاحب! آداب

مجھے آپکی کہانی ۱۷ مئی کو مل گئی تھی۔ میں نے اُسی وقت اُسے دیکھ لیا تھا کہانی کی رسید فوراً نہ بھیجنے کی وجہ میرا وہ پروگرام تھا جس کی بناء پر میں اُن دنوں کشمیر جا رہا تھا آپکی خواہش کے مطابق میں نے دفتر میں اُس کی فوری اشاعت کے لئے ہدایت کر دی تھی۔ میں پچھلے دنوں کشمیر ہی میں تھا اور "تشکیل" کا جولائی کا شمارہ مجھے وہیں پر ملا۔ کل واپس آیا ہوں تو دفتری اور ڈاک کے ساتھ ساتھ یہ بارونق خطوط بھی آتے ہوئے ملے ہیں ان خطوط کا تعلق صرف آپکی ذات شریف اور آپکی اُس کہانی سے ہے جو "تخلیق محل کے دریچے" کے عنوان سے "تشکیل" کے حالیہ شمارہ میں شائع ہوئی ہے۔ آپکی تحریر کے مطابق آپکی یہ کہانی ہے جس پر آپ نے اپنا پُورا فن صرف کیا ہے۔ یہی وہ کہانی ہے جس پر آپ نے سب سے زیادہ محنت کی ہے۔ یہ جان کر مجھے بے حد افسوس ہے کہ آپ جیسا نامور افسانہ نگار بھی ایسی چوری کر سکتا ہے۔ ہاں تو آپ نے سرقہ کر ہی لیا لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ آپ نے

ہیرو ہیروئن کے نام تک بدلنا گوارہ نہیں کئے۔ آپکی اس کہانی نے جہاں آپکی عزت اور شہرت پر سیاہی پھیر دی وہاں میرے مقبول عام ڈائجسٹ کو تجارتی نقطۂ نگاہ سے بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ رسالہ کی اس گرتی ہوئی شہرت کا بدلہ تو میں بہت آسانی کے ساتھ آپ سے لے لونگا اور آئندہ شمارہ میں اس کہانی کار کا نام جس کی یہ اصل کہانی ہے اور کہانی شائع کرونگا۔ ساتھ ساتھ آپ کے بارے میں بھی بہت کچھ لکھوں گا۔ بلکہ خاص طور پر یہ وضاحت کر دوں گا کہ آج کی دنیا کے آپ جیسے ادیب کیا ہیں؟

ادارہ "تشکیل" جب ہر تخلیق پر معقول معاوضہ دیتا ہے تو اس بات کا خاص خیال رکھتا ہے کہ اس میں شائع ہونے والی ہر تخلیق اچھوتی ہو۔ ہم آپ کے وقار سے متاثر تھے اور یہ یقین رکھتے تھے کہ آپ ہمارے اس یقین کو کبھی نہ ٹوٹنے دینگے لیکن مدتوں بعد آپ ہی نے اِس یقین کو مجروح کر دیا اور وہ بھی صرف پچیس روپوں کے لئے

ماہنامہ "جھلک" کا وہ خاص نمبر جس میں ہند و پاک کی مشہور افسانہ نگار خاتون "بشریٰ جبیں" کی یہ کہانی شائع ہوئی ہے ارسالِ خدمت کر رہا ہوں تاکہ آپ کے لئے ایک آئینے کا کام دے اور آپ اِس میں اپنی صورت دیکھ سکیں اور اپنی صفائی میں کچھ نہ کہہ سکیں

ماہنامہ "جھلک" کی دو کہانیاں آپ ہی کے شہر کی رہنے والی مس شاہینہ نے مجھے بھیجی ہیں اُن کا خط اور آپکی پہلی کہانی اُنہیں باون خطوط کے ساتھ منسلک ہیں اور وہ خط بطور خاص آپ کے دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

کہانی کے معاوضہ کے پچیس روپے پہلی فرصت میں بذریعہ منی آرڈر واپس کر دیں اور آئندہ کوئی بھی کہانی "تشکیل" کے لئے ارسال نہ کریں۔ ہمیں ایسی کہانیوں کی کوئی ضرورت نہیں۔

منی آرڈر کا منتظر
سُہیل راہی

اختر مقام میرس روڈ۔ علی گڑھ
۲۹ اگست ۱۹۶۳ء

محترم انجم صاحب! گلہائے عقیدت

اُمید ہے آپکا مزاج ہمکنار عافیت ہوگا۔ "تشکیل" کے جولائی کے شمارہ میں آپکی کہانی "محل کے دریچے" نظروں سے گذری۔ اِس کہانی کی اشاعت کے بعد آپکی شہرت کو چار چاند لگ گئے ہوں گے! کیا منی اگست کا شمارہ آپکی نظر سے نہ گذرا ہو۔ یہ وہی شمارہ ہے جس میں سُہیل راہی ایڈیٹر "تشکیل" نے آپ کو بڑے اچھے اچھے خطابات سے نوازا ہے آپ ابھی بھولے نہ ہوں گے۔ اپنی وہ کہانی جس میں آپ نے میرا نام لکھ کر میری عزت سے مذاق کیا تھا اُس سے مجھے کتنی تکلیف پہنچی تھی، یہ صرف میں جانتی ہوں۔ میں نے آپ سے اپنی اُس بے عزتی کا انتقام کتنی آسانی سے لے لیا۔ اب آپ مجھے کیا خط لکھیں گے اور اپنی اس بے عزتی کا کیا انتقام لیں گے۔ میں سمجھتی ہوں اتنا کچھ بدنام ہو جانے کے بعد آپ کے اندر طاقت ہی ختم ہو چکی ہوگی —— اور پھر آپ جیسا ہارا ہوا انسان کسی سے کیا انتقام لے سکتا ہے؟

آپکی ناصح —— شاہینہ

نیاز احمد آسی خانپوری

کہہ لی جو کبھی ہم نے غزل شدتِ غم سے
بہہ نکلی وہیں نہر سی اِک دیدۂ نم سے

جو دیدۂ مخمور سے پینے کے ہیں عادی
کچھ اُن کو سروکار نہیں ساغرِ جم سے

دم میری رفاقت کا جو بھرتے تھے ہمیشہ
بیگانے ہوئے جاتے ہیں اندازِ کرم سے

روتا ہوں مگر اشک نہیں آنکھ میں کوئی
یہ حال ہوا ہے مرا اب شدتِ غم سے

مشتاق مرے سجدوں کے تھے دیر و حرم بھی
اُٹھی نہ جبیں جھک کے ترے نقشِ قدم سے

فرقت میں خیال آتا ہے جب اُن کا تو آسیؔ
آتے ہیں مری بزمِ تصور میں وہ چھم سے

راسخ عرفانی

فکرِ زہد و ثواب کون کرے
دل کو وقفِ عذاب کون کرے

جرم میرے ہیں تیری بخشش ہے
اب حساب و کتاب کون کرے

آگ غم کی جلا کے سینے میں
اپنے دل کو کباب کون کرے

حسن والوں کے عشق میں کھو کر
زندگانی خراب کون کرے

پیار اُن کو بھی مجھ سے ہے لیکن
دور اُن کا حجاب کون کرے

چشمِ ساقی سے پی کے اے راسخؔ
آرزوئے شراب کون کرے

محمد عبدالقیوم صدیقی مست تھری

منور ہوئی چاند تاروں کی دُنیا
بدلنے لگی غم کے ماروں کی دُنیا

کسی طرح رو کے رُکیں گے نہ آنسو
اگر دیکھ لو بے قراروں کی دُنیا

وہیں ملتے ہیں عابد و پارسا بھی
جسے کہتے ہیں میگساروں کی دُنیا

مری چشمِ گریاں کا عالم ہی دیکھو
جو دیکھی نہ ہو آبشاروں کی دُنیا

ہیں پلکوں پہ تابندہ آنسو کے قطرے
اُتر آئی آنکھوں میں تاروں کی دُنیا

بہت دن رہے مستؔ دیر و حرم میں
چلو دیکھ لو میگساروں کی دُنیا

اُلجھن

ظفر احمد نظامی ایم اے

۲۵ نیو ہوسٹل کوارٹرس ہولکر کالج اندور مدھیہ پردیش

۵ اکتوبر ۱۹۶۳ء
برادر محترم! تسلیمات

.... یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ بے حد مصروف ہیں۔ اب سالنامہ کے لئے ایک اور افسانہ بھیج رہا ہوں جسے گزشتہ سالنامے کے "آٹوگراف" ہی کی ایک کڑی کہا جا سکتا ہے....

آپ کا ـــــ ظفر احمد نظامی

پہلی جنوری کی رات بھیگ چلی تھی۔ چاند ستاروں کے جھرمٹ میں گھرا ہوا تھا اور اپنی نقرئی کرنوں سے فضا کے سکوت کو پُراسرار بنا رہا تھا۔ درختوں کی سرد شاخیں خاموش تھیں۔ ہوائیں بھی پُرسکون تھیں۔ فضائیں یکسر رومان میں ڈھل گئی تھیں اور میں اپنی مضطرب سوچوں میں مصروف تھا۔ نئے سال کی آمد کا مشاعرہ بہت کامیاب رہا تھا اور میری نظمیں بہت پسند کی گئی تھیں۔ رومان اور سیاست کے خوبصورت ملاپ نے میری تخلیقات میں چار چاند لگا دئے تھے۔ آج ٹاؤن ہال کے اس شاندار مشاعرے میں کامیابی کا سہرا میرے ہی سر رہا تھا۔ قوم پروری اور رومان نوازی کے اس مشاعرے میں نظم کو ایک نیا اور عجوب صورت موڑ میری ہی بدولت ملا تھا۔ میرے ہر بند کو بار بار پڑھوایا گیا اور سبھی نے واہ وا کے فلک شگاف نعرے بلند کرکے میرے کلام کو والہانہ انداز سے سراہا تھا۔ مشاعرے کے اختتام پر بے شمار افراد نے مجھے گھیر لیا تاکہ آٹوگراف حاصل کئے جا سکیں۔ انہیں میں کئی لڑکیاں بھی تھیں جنہیں میں نے نہایت اچھے اشعار لکھ کر آٹوگراف دئے تھے۔ یہ حسین سلسلہ ختم ہوتے ہی میں گھبرا اٹھا۔ منتظمین اور شعراء کے علاوہ سب لوگ جا چکے تھے اور میرے ہاتھوں میں ایک انتہائی نفیس لیڈیز پارکر پین جگمگا رہا تھا۔ شاید کوئی لڑکی آٹوگراف لینے کے بعد یہ قلم میرے ہی پاس بھول گئی تھی۔ قلم بہت قیمتی تھا۔ جس سے بھینی بھینی خوشبوئیں اڑ کر اس کی مالکہ کے حُسن کی غمازی کر رہی تھیں۔ سیاہ پین پر کسی "شمیم" کا خوبصورت نام جھلک رہا تھا۔ جیسے سیاہ بادلوں میں سے چاند جھانک رہا ہو۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ اف! کیسی ہوگی وہ جس کا نام اتنا حسین ہے! وہ آٹوگراف لے چکی تھی یقیناً میری ادبی کاوشوں کی مداح رہی ہوگی، مجھ سے مل بھی چکی ہے مگر جسے میں بھول رہا تھا۔

ارباب ذوق مجھے مبارکباد دینے لگے اور میں نے گھبرا کر وہ قلم جیب میں رکھ لیا تاکہ کسی کی نظر نہ پڑ جائے۔

"آپ کی نظم 'سہاگ' تو خوب رہی!" ایک صاحب نے کہا۔

"جی! پسندیدگی کا شکریہ!"

"آپ کا مجموعہ کب آرہا ہے؟"

"فی الحال اس کا کوئی امکان نہیں" میں نے جواب دیا۔

"نہیں جناب! یہ تو زیادتی کر رہے ہیں آپ!"

"ہاں صاحب مجموعہ تو چھپوا ڈالئے!" ایک اور صاحب نے اصرار کیا۔

"دیکھئے سوچوں گا" میں نے کہا۔

"نہیں، جناب سوچنے سے کام نہیں چلیگا!" اُن کا جواب تھا۔

اُن کے اصرار پر مجھے چائے بھی پینی پڑی اور نجانے کیا کیا باتیں ہوئیں لیکن میرا ذہن اُسی قلم اور اُس کی مالکہ میں اُلجھا رہا اس کے بعد میں رخصت ہو کر اپنے مکان کی طرف چلدیا۔ خیالوں میں ڈوبا ڈوبا۔ جتنے خوب صورت چہرے میرے ذہن میں محفوظ رہ گئے تھے وہ سب باری باری حافظہ میں رقص کرتے رہے۔ لیکن کچھ یاد نہ آیا میں یہ امانت فوراً واپس کر دینا چاہتا تھا۔ یہ خیال بھی تھا کہ شاید کسی نے تحفۃً مجھے پیش کر دیا ہو لیکن اس زمانے میں اتنا قیمتی قلم تحفے میں بھول کر چھوڑ جانا سراسر حماقت تھی۔

مجھے وہ شمیم یاد آگئی جو کالج میں معاشیات پڑھ رہی تھی۔ وہ بہت خاموش لڑکی تھی۔ بہت غور سے شعر سنتی۔ داد کو بیداد بنا دینا شعر کی توہین اور شاعری کی تذلیل سمجھتی تھی۔ بار ہا اُس کی آنکھیں نیچے کو جھکی زمین کے ذرات میں شاید کسی اہم مسئلہ کی تحقیق میں مصروف نظر آتی تھیں۔ وہ ایک ریسرچ اسکالر تھی۔ اگر کبھی شعر پر داد دے اُٹھتی تو فکر و خیال کی قیمت وصول ہو جاتی تھی۔ اُس کے نرم و نازک ہونٹوں سے نکلی ہوئی باریک اور نقرئی صدائے تحسین "واہ" جواہرات سے زیادہ بیش قیمت ہوتی تھی لیکن وہ تو مشاعرے کے بعد نظر ہی نہ آئی تھی۔ سامعین میں موجود ضرور تھی لیکن اُس سے ملاقات نہ ہو سکی تھی۔

پھر مجھے وہ خوبصورت شمیم یاد آگئی جو مقامی گرلز کالج میں اُردو کی لکچرار تھی۔ اُس کی اُلجھی ہوئی زلفوں میں گلاب کا شاداب اور حسین پھول ہمیشہ منزل رنگ و نور تک پہنچنے میں امداد کرتا تھا۔ اُس کی تحریر میں نثر کم اور نظم زیادہ ہوتی تھی۔ اُس کی نگاہیں بہت تیز تھیں۔ باریک سے باریک نکتہ کو سمجھتیں اور دوسروں کو سمجھا سکتی تھیں وہ خود بھی شاعر تھی لیکن بہت کم لوگوں کو اس کا علم تھا۔ کبھی کبھی میرے بیحد اصرار پر مجھے شعر سناتی لیکن وہ تو عرصہ ہوا کہیں باہر گئی ہوئی تھی۔ مشاعرے میں اُس کی موجودگی کا کوئی سوال ہی نہ تھا اور اگر بالفرض وہ ہوتی بھی تو آٹوگراف کیوں لیتی جبکہ اکثر و بیشتر اُس سے میری ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ اِن دو کے علاوہ میں کسی اور ایسی شمیم سے واقف نہ تھا جو ادبی ذوق کی حامل ہو۔

میں پھر خیالوں میں کھو کر ادبی اجتماع کے خوبصورت ہال میں پہنچ گیا جہاں شاعر کے بعد لڑکیوں کے ہجوم نے مجھے گھیر لیا تھا۔ مجھے یاد آیا، ایک لڑکی بہت دیر تک ٹکٹکی باندھے مجھے دور سے دیکھتی رہی تھی اور اُس کی یہ ادا مجھے بہت بھائی تھی۔ پھر وہ آہستہ آہستہ چل کر میرے پاس آ پہنچی تھی۔ اُس کے قریب آتے ہی خوشبوؤں کی لہریں مچل گئی تھیں ہر طرف فضاؤں میں رنگت و نکہت کی تتلیاں اُڑنے لگی تھیں اور میں نے اُس کی ڈائری کے سادہ ورق پر کوئی بہت ہی رومانی شعر لکھ دیا تھا۔ ہو سکتا ہے یہ قلم اُس کا رہا ہو لیکن اُس کے بعد تو مسلسل آٹوگراف دینے پڑے تھے۔ اگر یہ قلم اُس کا تھا تو پھر یہ تسلسل قائم نہیں رہ سکتا تھا۔

پھر مجھے یاد آیا۔ ایک شوخ اور چنچل سی لڑکی نے آداب کے بعد مجھے میری کامیاب نظموں پر مُبارکباد دی تھی اور مجھ سے "زلف" پر میرے ہی کسی شعر کی فرمائش کی تھی۔ میں نے اُس کا نام پوچھا تھا اور اُس نے مُسکرا کر کہدیا تھا "ناز" ——— اور میں نے زلف اور ناز کی مناسبت سے ایک شعر اُس کی ڈائری پر لکھ دیا تھا۔ وہ شکریہ کہکر چلی گئی تھی۔ اسی طرح کتنی یادیں آئیں اور خوشبوئیں اُڑا کر چلی گئیں لیکن دل نہ مانا۔ میری ذہنی کشمکش میں اضافہ ہو گیا۔ اہمیت اور اعلیٰ کے احساس نے ایک حسین پیکر پا لیا۔ تجسس کے لطف کی کسک دل نے عجب طرح محسوس کی۔ دل کی دھڑکنیں تسلسل و بلندی کے سہارے تیز ہوتی رہیں۔ نگاہیں عالم خیال میں کسی کو تلاش کرتی رہیں، ذہن تھک گیا اور دماغ ماؤف ہو گیا۔ زندگی میں جستجو کی اہمیت کا پہلی بار اتنا شدید احساس پیدا ہوا جسے دل نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔

رات بیت رہی تھی۔ میں گھر پہنچا۔ سر میں سخت درد تھا۔ دل کی دھڑکنیں تیز تر تھیں۔ خیالات اُلجھے ہوئے تھے۔ چاہتا تھا کہ جلد سے جلد بستر پر لیٹ کر سو جاؤں شاید کچھ سکون ملے۔ لیٹا تو خیالات نے پھر آگھیرا۔ سونے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ نیند کی دیوی شاید میری بیتابی سے آنکھوں سے روٹھ گئی تھی۔ سر کا درد بڑھتا جا رہا تھا اُٹھا اور قریب رکھی ہوئی کتاب کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اِس مشغلے میں دل نہ بہلا سر کا درد چین نہ لینے دیتا تھا۔ تنہائی بُری طرح ڈس رہی تھی۔ میری بیوی میکے گئی ہوئی تھی۔ وہ ہوتی تو کچھ آرام ملتا، اُس سے باتیں کر کے ہمیشہ ہی مجھے سکون ملا کرتا تھا۔ سوچا اُسی کو خط لکھ ڈالوں شاید کچھ تسکین ہو جائے۔

لیٹر پیڈ کھولا، وہی بیش قیمت قلم جیب سے نکالا کہ میری شمی لکھتے ہی چونک پڑا۔ آنکھوں کے سامنے سے تمام چہرے معدوم ہو گئے۔ ستاروں کی جھنکار گھٹ گئی مشاعرے کا اختتام نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ دل کی دھڑکنوں کا انداز بدل گیا۔ سامنے دیوار پر آویزاں اُس کی تصویر مُسکرا کر میری بے چینی کا مذاق اُڑا رہی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ یہ قلم تو میری بیوی کا تھا جو میں نے کچھ روز پہلے ہی اُس کی سالگرہ پر اُسے تحفتاً پیش کیا تھا اور جسے شاید عجلت میں وہ اپنے ساتھ لیجانا بھول گئی تھی۔

میں نے شمی کی تصویر کی طرف دیکھا، جیسے وہ اب بھی مُسکرا رہی تھی!

کرشن موہن ایم۔ اے

عشرت ہی تو چاہت کا ارمان نہیں ہوتی

دولت ہی تو راحت کا سامان نہیں ہوتی

ہنسنے سے بہلتا ہے کچھ دیر تو دل آخر

رونے سے کوئی مشکل آسان نہیں ہوتی

پھولوں کی ہنسی سے دلِ تسکین نہیں پاتا

پھولوں کی ہنسی، تیری مسکان نہیں ہوتی

حسرت ہے کہ مدت سے مہماں ہے مرے گھر میں

عشرت ہے کہ دو دن بھی مہمان نہیں ہوتی

جان اپنی تو کر دیں ہم قربان ترے غم پر

آن اپنی مگر ہم سے قربان نہیں ہوتی

کنول میرٹھی

آپ کرتے ہیں ہمیشہ مجھ کو تڑپانے کی بات

آ کے بیٹھے بھی نہیں اور چھیڑ دی جانے کی بات

چھوڑیئے وہ بات جس سے بات بڑھتی ہو عبث

کیجئے کچھ خندہ پرور بات بن جانے کی بات

اپنے دل کی بات ہم اُن سے نہیں کہتے کہ وہ

بات سے کرتے ہیں پیدا بات کٹ جانے کی بات

پھر کیا ذکرِ وفائے غیر مجھ سے آپ نے

دیکھئے پھر آپ نے کی مجھ کو تڑپانے کی بات

بات ہی اوّل تو مجھ سے وہ نہیں کرتے کنولؔ

اور اگر کرتے بھی ہیں تو دل کو تڑپانے کی بات

حبیب الرحمٰن راہیؔ

حالتِ دل کہی نہیں جاتی

ہم سے فریاد کی نہیں جاتی

یاد ان کی جو دل میں آتی ہے

وہ خلش پھر کبھی نہیں جاتی

نکہتِ زلفِ یار کے صدقے!

عمر بھر بے خودی نہیں جاتی

چارہ گر زہر ہی مجھے دے دے

گر دوا تجھ سے دی نہیں جاتی

رہنما ہو نہ عشق اگر راہیؔ

منزل آسان کی نہیں جاتی

جیت

کریم رضا

انجینئرنگ ریسرچ ڈیپارٹمنٹ حال ٹیکری، حیدرآباد (آندھرا پردیش)

۲۰ اکتوبر ۱۹۹۳ء

گرامی قدر! تسلیم

"جیت" آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ اس زیر نگاہ افسانہ کی تکنیک میں نیا پن محسوس کریں گے یہ ایک تجربہ ہے اس میں ہمارے شعور کے خوش آئند مستقبل کی ایک جھلک دکھائی دے رہی ہے۔ امید ہے کہ آپ کی طبع نازک پر یہ جدت طرازی گراں نہیں گزرے گی۔

——— کریم رضا

کالج کا وسیع ہال طلبا اور طالبات سے بھرا ہوا تھا۔

طلبا اپنی یونین کے صدارتی امیدواروں اور اُن کے حامیوں کی تقریریں سننے کے لئے بے چین تھے۔ جلسہ شروع ہونے میں چند لمحے باقی تھے۔ ہال میں شور وغل اور ہنگامے جیسے اس بات کی علامت تھے کہ یہ انتخابات کالج کی زندگی میں ایک نئے باب کا اضافہ کرنے والے ہیں۔

انتخابات میں صرف دو ہی اُمیدوار کھڑے تھے ——— ایک پُشپاوتی اور دوسرا ودیا ساگر۔

پُشپاوتی بی۔اے کے پہلے سال کی طالبہ تھی۔ امیر گھرانے کی لڑکی تھی۔ ناک نقشہ سے خاندانی وقار جھلکتا تھا اور چال ڈھال بھی امیرانہ تھی ہی ہر روز وہ ایک نئے لباس میں قیامت ڈھاتی بہت کم مواقع ایسے آئے جب کسی نے اُسے ایک ہی لباس دوبارہ زیب تن کئے دیکھا ہو دُبلی پتلی، چھریرے بدن والی پُشپاوتی کالج کے لڑکوں میں اکثر موضوعِ گفتگو رہا کرتی۔ کچھ لڑکے جو طبعاً رومان پسند تھے۔ پُشپاوتی کو دیکھ کر اپنی اپنی پسندیدہ فلمی ہیروئن کی ادائیں اپنے ذہنوں میں تازہ کرتے۔ جو لڑکے حسن پرست ہوتے ہوئے بھی ضبط کا یارا رکھتے تھے وہ ہر روز آتے جاتے راستے بدل بدل کر ایک طائرانہ نظر پُشپاوتی پر ضرور ڈال لیا کرتے تھے تاکہ ان کے ذوقِ جمال کی تسکین ہو سکے۔ کالج کی ساری لڑکیاں بدصورت تو نہیں تھیں لیکن ان کا حسن پُشپاوتی کے آگے آفتاب کو چراغ دکھانے کے برابر تھا۔ اس لئے سب پُشپاوتی کو دیکھ کر احساسِ کمتری کا شکار ہوتیں اور اسی احساسِ کمتری نے انہیں پُشپاوتی سے مرعوب کر رکھا تھا لیکچررس کا یہ عالم تھا کہ وہ کلاس میں لیکچر دیتے ہوئے ایک نگاہِ غلط انداز پُشپاوتی پر ڈالنے کا جذبہ اپنے دل میں کروٹیں لیتا ہوا ضرور محسوس کرتے لیکن لڑکوں کے خوف سے ایسے جرأتمندانہ اقدام کی اپنے میں ہمت نہ پاتے۔

ودیا ساگر بی۔اے کے دوسرے سال کا طالب علم تھا۔ وہ خوبصورت تھا اور نہ دولتمند گھرانے کا چشم و چراغ ہی۔ البتہ تعلیمی حالت اچھی تھی۔ ذہین تھا اس لئے کلاس میں کبھی کبھی ایسے سوالات پوچھ بیٹھتا جس کے باعث کبھی تو لکچرار خوش ہوتے اور کبھی سوالات کے فوری تشفی بخش جوابات نہ دے پا کر اُسے جھڑک دیا کرتے لیکن ودیا ساگر اس سے بُرا نہ مانتا اور خاموش ہو جایا کرتا اور اُس وقت تک اُس لکچرر سے کوئی سوال نہ کرتا جب تک کہ وہ لکچرر خود اُسے سوالات کی اجازت نہ دے ——— وہ طلبا میں زیادہ مقبول بھی نہ تھا۔ تنہا پسندی کا عنصر اُس کی طبیعت پر غالب تھا۔ ودیا ساگر اس کے لئے آمادہ نہ تھا کہ وہ صدارتی انتخابات میں ایک اُمیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہو لیکن اپنے کچھ خاص ساتھیوں کے اصرار پر اُس نے اپنے آپ کو مجبور پایا۔ وہ انتخابات کے نتائج اور اپنے انجام سے پُوری طرح واقف تھا اور اپنی اِس حرکت کو ایک حماقت سے زیادہ نہ سمجھتا تھا۔ اگر اُسے کوئی خوشی تھی تو وہ اس بات کی کہ اُس نے اپنے قریبی ساتھیوں کا دل نہیں دُکھایا تھا۔ اِسی مسرت نے اُس میں اپنی متوقع شکست کے تاسف کو کم کر دیا تھا۔

ہال میں شور وغل ہر لحظہ بڑھتا جا رہا تھا۔ جیسے ہی اناؤنسر مائیک کے قریب آیا، سب لوگ یک لخت خاموش ہو گئے۔ ایسا معلوم ہونے لگا جیسے ایک طویل عرصہ سے اِس ہال کے در و دیوار نے کوئی آہٹ تک نہ سُنی ہو۔

"حاضرین! جیسا کہ آپ واقف ہیں یہ انتخابی جلسہ کی دوسری نشست ہے

کل آپ نے دونوں اُمیدواروں کے حامیوں کی تقریریں سُنی ہیں۔ وقت کافی ہو جانے کے باعث جلسہ آج کے لئے ملتوی کیا گیا تھا۔ آج صرف دو تین ہی مقررین ہیں۔ اس کے علاوہ آپ صدارت کے دونوں اُمیدواروں کو بھی سُن سکیں گے۔" ایڈوائزر نے جلسہ کی کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

ڈائیس پر مقررین بھی اپنی کرسیوں پر بیٹھ چکے تھے۔ وزیا ساگر بھی ڈائیس پر نظر آ رہا تھا لیکن اُس کے بازو والی کرسی خالی تھی۔ لڑکے باہم اشارے کر رہے تھے جس میں پُشپا وتی کی عدم موجودگی پر تشویش کا اظہار تھا۔ یہ بے چینی کی کیفیت کم بھی نہ ختم ہو گئی جب لال ساڑی اور لال بلاؤز میں ملبوس پُشپا وتی اپنی ساڑی کا آنچل سنبھالتے ہوئے ڈائیس پر دکھائی دی۔ وہ شرماتی، لجاتی، مسکراتی وزیا ساگر کے بازو والی کرسی پر آ بیٹھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ ایک شعلہ ہے جو بھڑک کر سارے ہال کو اپنی لپیٹ میں لے لینا چاہتا ہو۔ لوگوں کے چہروں پر مسرت اس طرح نمایاں ہوئی جیسے خزاں رسیدہ چمن میں بہار کی آمد نے ڈالی ڈالی کو پیامِ حیات سنا دیا ہو۔ وہ لڑکے جو پُشپا وتی کے لباس کا مطالعہ بہت دلچسپی سے کیا کرتے تھے، اپنی نشستوں سے اُٹھ اُٹھ کر پُشپا وتی کو بغور دیکھنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ وہ طلبا جن کی نظریں اکثر سینڈلوں پر ہوا کرتی تھیں، اُنہوں نے دیکھا کہ سینڈل کا رنگ بھی لال ہے۔ کسی کی زلفوں کے اسیر بننے یا پھر گیسوئے عنبریں کے سائے میں زندگی گزارنے کا حسین تصور رکھنے والے طلبا نے دیکھا کہ پُشپا وتی کی شانوں پر بکھری ہوئی زلفیں لال ربن کی بندش کو کمزور بنانے کے لئے مضطرب ہیں۔ اپنے بالوں کو پھولوں سے سجانے والی لڑکیاں بھی پُشپا وتی کے ذوق پر رشک کرنے لگیں جب اُنہوں نے دیکھا کہ ایک گہرے سُرخ رنگ کا گلاب اُس کی زلفوں کے حُسن کو دوبالا کر رہا ہے۔

"اب جناب مرتضیٰ کلیمی صاحب آپ کو مخاطب کریں گے:" ایڈوائزر نے اعلان کیا۔

"عزیز بھائیو اور بہنو!

میں آج اپنے آپ کو بہت خوش نصیب محسوس کر رہا ہوں کہ ایک ایسی شخصیت کے تعلق سے لب کُشائی کا مجھے شرف حاصل ہوا ہے جس سے نہ صرف آپ تمام واقف ہیں بلکہ آپ تمام اُس شخصیت کے مدّاح ہیں۔ میرا اشارہ ہمارے کالج کی مقبول ترین طالبہ پُشپا وتی کی جانب ہے۔ کل کی تقاریر میں آپ نے پُشپا وتی کے اوصافِ حمیدہ کا کافی تذکرہ سماعت فرمایا ہے۔ میں آپ کا زیادہ وقت لئے بغیر صرف ایک نکتہ کی جانب آپ سب کی توجہ مبذول کروانا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ ہمارے کالج کا مالیہ کافی کمزور ہے۔ جب تک ہمیں ایسی شخصیت نہ ملے جو صرف یہ کہ درد کو محسوس کرے بلکہ درد کا علاج بھی بن سکے اُس وقت تک یہ ممکن نہیں ہے کہ ہمارا کالج ترقی کر سکے۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر غریب اور نادار طلبا صرف اس وجہ سے فری شپ حاصل نہیں کر سکتے کہ کالج کے مالیہ میں اس کی گنجائش نہیں رہتی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ طلبا کے حصولِ تعلیم کی راہ میں مالی مشکلات ایک چٹان بن کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ کالج کی لائبریری میں بیش قیمت کتابوں کا اضافہ کریں لیکن ہماری یہ خواہش صرف اس لئے پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچتی کہ ہمارے کالج کا مالیہ اس کا متحمل نہیں ہے۔ اس دشواری پر فتح پانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایک ایسی شخصیت ہمیں ملے جو صرف ایک گراں قدر عطیہ سے ہماری اس دشواری کو حل کر سکے۔ ایک عرصہ سے ہماری یہ تمنا رہی ہے کہ ہم کالج ڈے کے موقع پر ایک کُل ہند مشاعرہ کا اہتمام کریں اور مشہور و معروف شعرا کو دعوت دیں۔ ظاہر ہے یہ کام صرف باتوں سے انجام نہیں پا سکتا۔ اس کے لئے ایک ایسی شخصیت کی ضرورت ہے جو شہر کے معززین (میری مُراد دولتمند اصحاب سے ہے) سے اس خصوص میں مالی تعاون حاصل کر سکے۔

اگر ہم وہ تمام چیزیں چاہتے ہیں جن کا تذکرہ میں نے ابھی آپ کے سامنے کیا ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم اپنی یونین کی صدارت کے لئے ایک ایسی شخصیت کا انتخاب نہ کریں جو اِن تمام دشواریوں کو بآسانی ختم کر سکتی ہو۔ میری رائے میں پُشپا وتی کو صدارت کے لئے منتخب کرنا جہاں ہماری اپنی دُوراندیشی کی دلیل ہو گی وہیں پُشپا وتی کے ساتھ

آنکھیں

تُو اگر آپ کو دیکھے تو میری آنکھ سے دیکھ
اپنا آئینہ میرا دیدۂ پُر آب بنا ——— ذوق

دمِ رخصت وہ چپ رہے عابد
آنکھ میں پھیلتا گیا کاجل ——— عابد علی عابد

آنکھوں کو انتظار سے گردیدہ کر چلے
تم یہ تو خوب کارِ پسندیدہ کر چلے ——— حسرت

میرا رشتہ ہے میخانے سے اتنا
تری مدہوش آنکھوں کا گدا ہوں ——— عدم

گھٹا کے ساتھ آنکھیں اُٹھ رہی ہیں
ہماری توبہ ٹوٹے گی یہیں سے ——— اختر شیرانی

مُرسلہ: سید کلیم اختر بہاولپور (پاکستان)

خدمت پرخلوص عقیدت

میں اپنی تقریر کی طوالت پر معذرت خواہ ہوں اور آخر میں آپ کے آگے ایک قطعہ نذر کرتے ہوئے رخصت ہوتا ہوں ؎

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ جانے وہ نظر کیا

"ابھی آپ جناب نوشی کلیمی صاحب کے خیالات سُن رہے تھے۔ اب کلاس اور تا جہاں آپ کو مخاطب کریں گی" اناؤنسر نے جیسے ہی اعلان کیا اور تا جہاں زیرِ لب تبسم کے ساتھ مائیک کے قریب آگئیں۔

"میرے اچھے بھائیو اور میری پیاری بہنو!

ابھی میرے پیش رو مقرر نے اُن تمام خوبیوں کا تذکرہ کیا ہے جن سے ہم اور ہمارا کالج دو چار ہے۔ میں اُن تمام باتوں کو دوبارہ اظہار نہیں کروں گی اس لئے کہ مجھے آپ کے قیمتی وقت کا پورا پورا احساس ہے۔ میں صرف اُن دھڑکنوں کو آپ کے سامنے رکھوں گی جو ایک تربیت یافتہ کی حیثیت سے میں نے پُشپا رانی کے دل میں محسوس کی ہیں۔

پُشپا رانی ایک دھڑکتے دل اور ایک فکرِ عالم آشوب کی مالک ہیں۔ اُن کے دل کی دھڑکنیں جہاں انسانیت کی سسکیوں پر زیادہ تیز ہو جاتی ہیں، اُن کی فکر فلک نشیں انسانیت کے مسائل کو حل کرنے کے لئے راہیں تلاش کرتی ہے۔ پُشپا رانی جہاں کالج کی فلاح و ترقی کے لئے ایک ماہرِ تعلیم کی حیثیت سے سوچتی رہی ہیں وہیں ایک دردمند انسان کی حیثیت سے ہر ایک طالب علم کی مشکلات کو دور کرنے کے جذبۂ بلند سے سرشار ہیں۔

میں اس عظیم شخصیت کو سامنے رکھتے ہوئے جو خوش قسمتی سے ہماری ساتھی ہے اُن تمام اصحاب سے سوال کرتی ہوں جو صرف بلند بانگ دعوے کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اُن کے نعرے انہیں شہرت و عزت عطا کریں گے۔ ؎

اے صاحبانِ نظر تمہاری نظر میں ذوقِ نظر کہاں ہے
جگر پہ رکھتے ہو ہاتھ لیکن بتاؤ سوزِ جگر کہاں ہے

"یہ تھیں کلاس اور تا جہاں ——— اب جناب وحید مرزا صاحب اپنے خیالات پیش کریں گے" اناؤنسر کی آواز ہال میں گونجی۔

"شمعِ علم کے جاں نثار پروانو! ——— ابھی آپ نے زبان کی لطافت اور زورِ خطابت کے شاندار مظاہرے دیکھے۔ میں مقرر ہوں اور نہ شاعر، اس لئے میں خطابت کے جوہر دکھا سکتا ہوں اور نہ مقفّٰی عبارتوں ہی میں اپنا مافی الضمیر ادا کر سکتا ہوں۔ ہاں اتنا ضرور کر سکتا ہوں کہ وہ باتیں آپ کے سامنے بلا کسی مبالغہ کے رکھوں جنہیں میں حقیقت سمجھتا ہوں۔ آپ کی حق شناسی پر مجھے کامل بھروسہ ہے اس لئے آپ کے آگے لب کشائی کی جرأت کرتے ہوئے میں فخر محسوس کرتا ہوں۔

جلوہ فگن ہو، اگر آفتابِ عالمتاب اپنی تمام تر تابناکیوں کے ساتھ ضو فگن ہو کر اُس کی حیات بخش کرنوں سے زمین کا ذرہ ذرہ روشن ہو اور میں کہوں کہ یہ دن کی جلوہ فرمائیاں نہیں رات کی ہیں تو کیا آپ حقیقت میں دن کی روشنی کو رات کی ظلمت سمجھ لیں گے؟ اگر بہار بداماں گلستاں میں کلیاں چٹک رہی ہوں، عندلیبانِ چمن نغمہ سرائی کر رہے ہوں اور میں کہوں کہ یہ بہار کی حیات آفرینیاں نہیں، خزاں کی دامانِ گیاں ہیں تو کیا آپ حقیقت میں بہار کی کارفرمائی کو خزاں کی کارگزاری سمجھ لیں گے؟ مجھے یقین ہے کہ آپ کبھی ایسا نہیں سمجھیں گے۔ آپ کی حقیقت آشنا نظریں کبھی دن کو رات اور بہار کو خزاں سمجھنے کے لئے آمادہ نہ ہوں گی۔

وہ دیا سا گر ہمارے کالج کا ایک ہونہار طالب علم ہے جس کی علمی قابلیت

آج تو دردِ ہجر بھی کم ہے
آج تو کوئی آیا ہوتا ——— فراق گورکھپوری

نہ کوئی وعدہ نہ کوئی یقیں، نہ کوئی اُمید
مگر ہمیں تو ترا انتظار کرنا تھا ——— فراق گورکھپوری

ابھی کہوں تو کریں لوگ شرمسار مجھے
کہ کس کے وعدے پہ ہے اتنا انتظار مجھے ——— [illegible]

تمہیں یہ بھی کبھی خیال آیا
کہ کوئی راہ دیکھتا ہوگا ——— نظام رامپوری

کچھ بعد یہ بھی رنگ رہا انتظار کا
آنکھ اُٹھ گئی جدھر بس اُدھر دیکھتے رہے ——— اثر لکھنوی

اور انتظامی صلاحیتوں کا ایک شاندار ریکارڈ موجود ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ آج اُس ریکارڈ کو چیلنج وہ کر رہے ہیں جن کا اپنا خود کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔ غمگساری کے لئے وہ آگے بڑھ رہے ہیں جنہیں یہ نہیں معلوم کہ غم کیا ہے؟ غم اور غمگساری کے رشتے اگر اتنے ارزاں ہو گئے ہیں تو پھر ہمیں شعورِ غم کا مفہوم بدلنا ہوگا۔ درد کا درماں کرنے کے لئے وہ بھی فراہم ہو رہے ہیں جن کی پاپوشی کا شرف ایک کانٹے کو تک نہیں مل سکا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری آپ کی نظروں کو خیرہ نہیں کر سکے گی،

آپ جانتے ہیں ـــ

حقیقت چھپ نہیں سکتی بناوٹ کے اصولوں سے

کہ خوشبو آ نہیں سکتی کبھی کاغذ کے پھولوں سے

ابھی جناب وید مرزا صاحب آپ سے تخاطب کر رہے تھے۔ جلسہ کی کاروائی اپنے اختتامی مراحل طے کر رہی ہے۔ اب صرف اُمیدواروں کی تقریریں باقی ہیں۔ پہلے میں عزیزہ پُشپا وتی سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ آپ کو مخاطب فرمائیں۔" اناؤنسر نے جوں ہی اعلان کیا ہال تالیوں کی آواز سے گونج اٹھا۔ پُشپا وتی نے کرسی سے اٹھتے ہوئے دونوں ہاتھ جوڑ کر اپنے استقبال پر شکریہ ادا کیا۔ ایک مُسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر بکھیر کر شوخ اور چنچل زلفوں کو شانے سے ہٹایا اور پھر آنچل لہراتی ہوئی مسلسل تالیوں کی گونج میں مؤدبانہ انداز سے مائیک تک آ گئی۔

"راہ اور منزل کے رفیقو!

میں آپ کے جذبات سے بے حد متاثر ہوں اور آپ کے جذبات کا دِلی احترام کرتی ہوں۔ آپ لوگوں نے جو نیک توقعات مجھ سے وابستہ کی ہیں، میں اُنہیں پورا کرنے کی حتی الامکان کوشش کا آپ کو یقین دلاتی ہوں۔ شکریہ۔"

پھر پورے تالیوں کی گونج میں پشپا وتی اپنی کرسی پر جا بیٹھی۔

"اب اس جلسہ کے آخری مقرر جناب ودیا ساگر ـــــ آپ کو مخاطب کریں گے" اناؤنسر نے آخری اعلان کیا۔

"میرے عزیز ساتھیو!

میں اِس وقت آپ کے سامنے اپنی صلاحیتوں اور قابلیتوں کو منوانے کے لئے نہیں کھڑا ہوا ہوں بلکہ ایک خادم کی حیثیت سے آپ کے سامنے ہوں۔ مجھے اپنی علمی کم مائیگی کا پُورا احساس ہے اور میں اپنی کمزوریوں اور خامیوں کا خود معترف ہوں میں اپنے میں اتنی جُرأت نہیں پاتا کہ بہ صد ہزار خامیاں آپ کا ووٹ حاصل کرنے کے لئے دروغ بیانی سے کام لوں اور بڑے بڑے وعدے کروں البتہ اپنی حقیر سی خدمات کو پیش کرنے کا وعدہ کرتا ہوں۔ خدمت لینا آپ کا کام ہے اور خدمت کرنا میرا۔ صدارت میری نظر میں صرف اعزاز ہی نہیں بلکہ خدمت کرنے کی ایک بڑی ذمّہ داری ہے۔ اگر آپ مجھ میں اِس ذمّہ داری کو سنبھالنے کی صلاحیت نہیں محسوس کرتے تو میری یہ پُرخلوص درخواست ہے کہ خدارا آپ مجھے ووٹ نہ دیجئے۔ میں آپ کی صحیح رائے پر اپنی شکست کو شکست نہیں بلکہ اپنی فتح تصور کرتا ہوں۔

بھگوان ہم سب کی مدد کرے۔"

آج انتخابات کا دِن تھا۔ رائے دہی شروع ہو چکی تھی۔ کالج میں ہر طرف ہما ہمی تھی۔ کالج کی دیواروں پر [illegible] [illegible] پوسٹر [illegible] [illegible] ہزاروں کی تعداد میں مختلف مضامین و رنگ کے رقعے پُشپا وتی کی [illegible] گیٹ پر تقسیم کئے جا رہے تھے۔ کینٹین آباد تھی۔ [illegible] [illegible] [illegible] بھی کینٹین کے ایک گوشہ میں اپنی سہیلیوں اور اپنے مددگاروں کے ساتھ [illegible] میں مصروف تھی۔ لڑکے اور لڑکیاں کینٹین میں [illegible] پُشپا وتی کو [illegible] [illegible] تھے اور پُشپا وتی مُسکرا کر ہر آنے والے کا شکریہ [illegible] [illegible] ودیا ساگر کے چند ساتھی کالج میں ہر آنے جانے کی طرف [illegible] تھے۔ اُن سے منت و سماجت کر رہے تھے۔ ودیا ساگر اپنے ساتھیوں کی پُرخلوص سعی و کاوش سے بے حد متاثر تھا۔ وہ کچھ دیر اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد چائے پینے کے لئے کینٹین میں گیا۔ جہاں پہلے ہی سے پُشپا وتی کا قبضہ تھا۔ ودیا ساگر کو دیکھ کر کینٹین میں بیٹھے ہوئے طلباء اور طالبات نے اُسی کے متعلق گفتگو کرنی شروع کی۔ کینٹین میں ایک کرسی بھی خالی نہ تھی۔ وہ کاؤنٹر کے پاس ہی کھڑا چائے پیتے ہوئے کینٹین کا جائزہ لیتا رہا۔ جب اُس نے کاؤنٹر پر اپنی چائے کا بل ادا کرنا چاہا تب منیجر نے کہا،

"یہ رہنے دیجئے جناب" اور اُس نے پیسے لوٹانے چاہے۔

"کیوں؟" ودیا ساگر نے تشویش ظاہر کی۔

"آج کینٹین کے تمام بلوں کا پے منٹ پُشپا وتی دیوی کر رہی ہیں اور انہوں نے اڈوانس بھی دیدیا ہے" منیجر نے وضاحت کی۔

"لیکن آرڈر میں نے دیا ہے اِسی لئے میں پے کروں گا" ودیا ساگر نے اصرار کیا۔

اتنے میں پُشپا وتی ودیا ساگر کے قریب آئی۔ کہنے کیا۔

"آج مجھے یہ موقع عطا فرمائیے کہ بل میں ادا کروں!" پُشپا وتی نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

"مگر کیوں؟" ودیا ساگر نے پوچھا۔

"یہ میری خواہش ہے اور مجھے اُمید ہے کہ آپ مایوس نہ کریں گے" پُشپا وتی نے نہایت لجاجت سے درخواست کی۔

"شکریہ!" ودیا ساگر نے کینٹین سے نکلتے ہوئے کہا۔

کچھ ہی دیر میں پُشپا وتی کے اِس مظاہرہ کا تذکرہ کالج میں ہر طرف ہونے لگا۔ ودیا ساگر دِل ہی دِل میں شرمندہ تھا اور سوچ رہا تھا کہ کاش وہ نہ کھڑا ہوتا اور اِس طرح پُشپا وتی کی دولت پانی کی طرح نہ بہتی۔ وہ دولت کے اِس بہاؤ کا ذمہ دار اپنے آپ کو واحد ذمّہ دار سمجھ رہا تھا۔ اُسے اپنی کامیابی کی پہلے ہی سے اُمید نہ تھی اور اب اُسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ بُری طرح شکست کھانے والا ہے۔ اِس احساس کا اعادہ [illegible]

اپنے جوان بہت اور قربِ پرستش ساتھیوں کے آگے مناسب نہیں سمجھا اور سر کے شدید درد کا بہانہ کر کے اُس نے اپنے ساتھیوں سے گھر جانے کی اجازت مانگ لی۔

شام کو نتیجہ کا اعلان کیا گیا۔

پشپا وتی اپنی کار کی جانب جاتی ہوئی نظر آئی۔ چند لڑکوں اور لڑکیوں نے اُسے راستے میں روکا اور اُس سے گفتگو کرنی چاہی۔

"میں ایسے کالج میں پڑھنا نہیں چاہتی!" پشپا وتی اپنا فیصلہ سنانے کے بعد مغرورِ حسن کار میں بیٹھ گئی اور کالی چمکدار بیوک کالج کے گیٹ سے باہر نکل گئی۔

میں نے سوچا تھا یونہی وقت کے ہاتھوں اے دوست
بھر ہی جائے گا مرا زخمِ تمنا اک دن
دور ہو جائے گی احساس کے ماتھے کی شکن
مٹ ہی جائے گا غمِ دل کا سدا داغ اک دن

یونہی مٹ جائیں گے سب دل سے نقوشِ ماضی
یاد آئیں گے نہ اب بیتے دنوں کے لمحات
وقت کے ہاتھوں سے ہو جائے گی خود بخیہ گری
سل ہی جائے گا مرا چاک گریبانِ حیات

لیکن افسوس کہ خلوت گہِ دل میں اب تک
رقص کرتے ہیں اُمیدوں کے حسیں تاج محل
وہی رخشندہ تخیل، وہی بزمِ انجم
وہی مخمور نگاہیں، وہی حافظ کی غزل
وہی مہتاب کی پھیلی ہوئی سیمیں چادر
وہی ہنستی سی بہاریں، وہی شاداب چمن
لالہ و گل کے دریچوں سے جھلکتا ہوا نور
چاندنی راتوں کے ملبوس میں تاروں کی دلہن

زینتِ دیدہ و دل ہیں جو نقوشِ ماضی!
لوحِ حسرت سے ہے کیا اُن کا مٹانا ممکن؟
ہو چکے کب کے جو پیوست رگِ جاں اے دوست
مجھ سے ممکن ہے، نہ اب تجھ سے بھلانا ممکن

دفاع کے لئے زراعت اتنی ہی اہم ہے
جتنی کہ بندوقیں۔
وزیراعظم ہند

اُس کے اعجاز میں بینڈ باجے نہیں بجتے، کوئی ہجوم تالیوں سے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا، نہ ہی تمغے اس کے سینے کی زینت بنتے ہیں۔ بہادر پنجابی کسان جوان جملہ امور سے غافل ہے، اپنے ہموطنوں کے لئے خوراک پیدا کرنے کی خاطر اپنے کھیت میں مکمل طور پر مصروف کار ہے۔ ایک بلند ہمت جوان کی طرح جو اپنی سرحدوں پر چوکس رہتا ہے۔ پنجابی کسان گھریلو محاذ پہ ایک ثابت قدم سپاہی ہے جو قوم کی سپلائی لائن کو برقرار رکھنے کا عزم رکھتا ہے۔

چوں کہ اصلاح شدہ بیجوں کی قسمیں، زراعت کے نئے طریقے، زرعی آلات کیمیائی کھادوں کا استعمال اور کیڑے مارنے والی ادویات کا چھڑکاؤ وغیرہ سب اُس کے علم اور رسائی میں ہے۔ لہٰذا وہ زرعی پیداوار کو دوگنا کرنے کا یقین واثق رکھتا ہے۔ چنانچہ وہ صبح سویرے سے لے کر گہری شام تک اپنے کھیتوں میں سرگرم رہتا ہے۔ اُس کا ارادہ، اُس کی انتھک لگن اور استقلال یقیناً اُس کی عظمت کو چار چاند لگا دیں گے۔

آؤ ہم خریدتے، کھاتے اور پکاتے ہوئے خوردنی اشیا کو ضائع ہونے سے بچائیں تاکہ خوراک کی پیداوار کو دوگنا کرنے کی کوششوں میں کسانوں کی حوصلہ افزائی ہو سکے۔

جاری کردہ:-
محکمہ تعلقاتِ عامہ پنجاب

نیا بہروپ

عبدالرحمٰن خالد

1812/D جی۔ایم۔آباد، لائل پور

۹ر ستمبر ۱۹۶۳ء

محترمی خوشتر صاحب! آداب
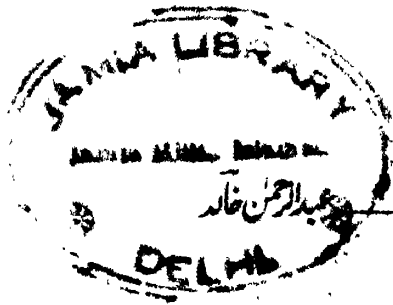
ایک عرصے سے بیسویں صدی کا مطالعہ کر رہا ہوں "بزم بیسویں صدی" میں شریک ہونے کو بہت دنوں سے دل چاہتا تھا۔ آج ایک افسانہ "نیا بہروپ" بھیج رہا ہوں۔ افسانہ کے متعلق میں کچھ نہ کہوں گا۔ اگر اس نے بیسویں صدی کے صفحات پر جگہ پالی تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔ افسانہ کیسا ہے! اسے آپ کی نکتہ رس نگاہ اور قارئین کا ذوق ہی پرکھ سکتا ہے۔

خلوص کار ——— عبدالرحمٰن خالد

روحی ڈارلنگ!

تسلیمات۔ خط ملا۔ پڑھ کر خوشی ہوئی۔ آپ مجھے خط لکھنے والی تیسری لڑکی ہیں۔ آپ سے پہلے دو بہنوں نے خطوط لکھے تھے جن کے جواب بھی میں نے دے دیئے تھے۔ لیکن اس کے بعد انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ "پاکستان ٹائمز" میں اڈریس چھپنے کے بعد تقریباً بارہ لڑکوں نے خطوط لکھے۔ آج کل چھ لڑکوں سے قلمی دوستی جاری ہے (بقیہ چھ لڑکے قلمی دوستی کی حدود کو چھوڑ کر آگے بڑھ گئے تھے)

آپ نے شک ظاہر کیا ہے کہ کہیں میں لڑکی کے روپ میں کوئی مرد تو نہیں! تو عرض ہے کہ چور کے دل میں چور ہوتا ہے جس طرح آپ مجھے مرد سمجھ رہی ہیں اسی طرح میں بھی آپ کو مرد سمجھ سکتی ہوں۔ بہرحال لڑکا، لڑکی، کا پرابلم صرف ملاقات کے ذریعے ہی طے ہو سکتا ہے اور مجھے امید ہے کہ یہ موقع بھی جلد ہی لائل پور میں ہی میسر آجائے گا۔ اچھا آداب۔

آپ کی دُور افتادہ

روبینہ

اچھی روحی!

آداب! خط ملا۔ میں تصویر کا انتظار کر رہی ہوں۔ آپ کے انداز بیان ہی سے پتہ چلا کہ آپ کی تصویر بہت ہی . . . . . ہوگی۔ دروازے پر نظریں گڑی ہوئی ہیں۔ جلد تصویر بھیج دیں۔ دیکھئے انتظار موت سے بھی شدید ہوتا ہے۔ زیادہ انتظار نہ کروایئے۔ آپ کو معلوم ہے کہ انتظار کی گھڑیاں کتنی لمبی اور کٹھن ہوتی ہیں۔ بہرحال آداب۔

جواب کی منتظر ——— روبینہ

روحی ڈارلنگ!

ابھی ابھی میں نے آپ کو شکوے سے بھر پور خط پوسٹ کیا ہی تھا کہ آپ کا خط ملا۔ تصویر بھی ملی۔ تصویر دیکھ کر میں تو بالکل دنگ ہی تو رہ گئی۔ اتنا خوبصورت ——— اتنا پیارا ——— اتنا سُندر ——— مجھے . . . میری اُمید سے زیادہ ہی خوبصورت تھی۔ اب آپ نے لکھا ہے کہ میں بھی اپنی تصویر بھیجوں۔ چند دنوں تک بھیجنا تو مشکل بات ہے۔ آپ نے پہلے کیوں نہ لکھا۔ اچھا آج تصویر کھنچوا رہی ہوں۔ چار۔ چھ دنوں تک بھیج دوں گی۔ سالگرہ کی دعوت پا کر خوشی ہوئی۔ میں بہت مشکل میں پھنسی ہوئی ہوں۔ "ہوم ایگزامنیشن" ہو رہے ہیں۔ میرے لئے سرگودھا سے لائل پور آنا بہت ہی مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ البتہ سالگرہ کا تحفہ نئے سال کی ڈائری حاضر خدمت ہے۔ قبول فرمائیں۔ خدا ایسے ہزاروں دن دیکھنا نصیب کرے۔ اچھا اجازت۔

ناچیز ——— روبینہ

روبی ڈیر!

سلام! نوشتہ باصرہ نواز ہوا۔ آپ نے مجھے بہت غلط سمجھا ہے۔ میں نے وہ الفاظ محض جذبات میں لکھ دیئے تھے۔ آپ کو محسوس نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ دراصل اسی قلمی دوستی کے چکر میں ایک بار پہلے دھوکا کھا چکی ہوں۔ ایک لاہوری لڑکے نے ایک لڑکی کے رُوپ میں مجھے دھوکا دیا تھا۔ اچھا اجازت۔ اگلے خط میں تصویر بھیجوں گی۔

گناہگار ——— روحی

روبینہ ڈارلنگ !

مسکراہٹیں !۔! تحفہ ملا . . . شکریہ! اب آپ نے مجھے اور بیقرار کر دیا ہے۔ تصویر جلد بھیجئے۔ میں منتظر ہوں۔ بقول آپ کے "انتظار کی گھڑیاں بہت لمبی اور کٹھن ہوتی ہیں" اس لئے پریشان نہ کیجئے۔ میں منتظر ہوں انتظر ہوں! منتظر ہوں !!! اشنی بات ! خط کا جواب اور تصویر جلد بھیجو۔ ورنہ حسرت رہے گی وصال یار کی نہ کبھی جیسے کچھ دیتی ہوں ہاں! آداب

وہی جو آپ کو سمجھ نہ سکی ——— روحی

روحی جانِ من !

سلام !! خط ملا۔ تصویر اگلے خط میں بھیجوں گی۔ وعدہ رہا۔ اب میں کہنے یہ والی تھی کہ یہ زندگی کی راہیں بھی کتنی عجیب و غریب ہوتی ہیں۔ ہزاروں لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے۔ راستے ایک لیکن منزلیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ راستے جدا ہو جاتے ہیں۔ راہی ملتے ہیں۔ لیکن بچھڑ جانے کے لئے۔ کیا ہماری فرینڈ شپ کا یہی حال ہوگا؟ میں اکثر دن کی روشنیوں اور رات کی تاریکیوں میں بیٹھ کر سوچا کرتی ہوں۔ مجھے جواب چاہیئے۔ جواب دو جلدی۔ کیا دوستی کو لات تو نہ مار دو گی؟ کہیں بعد میں بدل تو نہ جاؤ گی؟

منتظر ——— روبینہ

مس روبینہ !

کیا پاگل ہو گئی ہو؟ افسانہ نگاری کب سے شروع کر دی ہے میں اور آپ کی دوستی کو لات مار دوں؟ یہ ناممکن ہے۔ میں عہد سے نہیں پھرا کرتی۔ ہاں تمہیں اختیار ہے۔ میں وعدہ کر رہی ہوں شہنشاہی وعدہ ! اس کے علاوہ میرے خطوط دوستی کی پائداری کی علامت نہیں ہیں؟ اچھا نیک دعاؤں کے ساتھ۔ مگر تصویر جلد بھیجنا۔

مظلوم ——— روحی

مس روحی !

لو سنو تم آج ایک حقیقت سنو گی۔ یہ تصویر دیکھو وہی تصویر جو تم نے لائل پور میں میرے ساتھ کھنچوائی تھی وہی ہے نا! دیکھو غور سے ! انسان زندگی کی راہوں پر اکیلا نہیں چل سکتا۔ اس زندگی کی راہ کو طے کرنے کے لئے ایک نہ ایک سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ ایک وقت آتا ہے جب دکھی دل کچھ کہنا اور کچھ سننا چاہتا ہے۔ اس وقت رفیق حیات کے سوا کوئی ساتھ نہیں دے سکتا۔ مجھے آپ کے سہارے کی ضرورت ہے۔ مجھے آپ سے محبت ہے۔ میں آپ کی خاموش آنکھوں، خاموش دل اور خاموش روح کو اپنی محبت کی حرارت سے زندہ کرنا چاہتا ہوں۔ میرے دل کی بےتابی اس درجہ بڑھ چکی ہے کہ چھلک کر ساکت ہو چکا ہے۔ میں مظلوم ہوں میں محتاج ہوں۔ اور تمہارے جلوے کا طلبگار ہوں۔ میرا مقصد حیات اور سرمایۂ زندگی تمہیں ہو۔ اس دل جلے کی درخواست ٹھکرا نہ دینا۔ ابھی تک میں آپ کو دھوکا دیتا رہا اور صرف آپ ہی کو نہیں۔ بہت سے اوروں کو بھی۔ مگر کیا کروں میں محبت کا بھوکا ہوں محبت کا بھوکا۔ اس دل کو جوڑنے اور توڑنے کا اب صرف تمہیں اختیار ہے۔ لیکن یہ نہ سمجھنا ——— کہ میں تمہاری منتیں سماجتیں ہی کرتا رہوں گا۔ میرے پاس تمہارا گروپ فوٹو ہے۔ تمہاری بداخلاقی کا ثبوت تمہارے وہ محبت بھرے خطوط ہیں جو تم نے وقتاً فوقتاً مجھے لکھے تھے۔ بہرحال میں بیک وقت تمہیں دھمکی بھی دیتا ہوں اور منت بھی کرتا ہوں کہ تم سیدھے راستے پر آجاؤ ورنہ میں تمہیں تمہارے گھر بھر میں نکو بنا دوں گا! اچھا رخصت بہت جلد لائل پور آرہا ہوں۔ ارم ہوٹل پر سترہ دسمبر بوقت چھ بجے شام ملو۔ انتظار کروں گا ——— ورنہ . . . . . . تم خود سمجھدار ہو۔

تمہارا نادیدہ دیوانہ ——— ناصر

ناصر میاں !

ہاہا۔ قہقہے !! ناصر میاں قہقہے لگاؤ۔ اتنے قہقہے لگاؤ کہ تمہارے جدامجد کی روح بھی قبر سے نکلنے کے لئے بےتاب ہو جائے۔ اتنا ہنسو کہ لوگ تمہیں دیوانہ سمجھنے پر مجبور ہو جائیں۔ مگر کیوں؟ لو سنو اتنا نے کو دل تو نہیں چاہتا مگر اپنے عاشق صادق کو زیادہ دیر دھوکے میں رکھنا نہیں چاہتی۔ سنو تمہاری محبوبہ ——— کیا نام تھا اس کا؟ . . . . غالباً روحی . . ہاں روحی کی جنس تبدیل ہو گئی "روحی" اب "روحی" کے بجائے "منیر" کے روپ میں مخاطب ہے۔ ہاہاہا ہی ہی ہی!

تم نے کہا تھا نا کہ زندگی کی راہیں بھی عجیب و غریب ہوتی ہیں تم نے ٹھیک کہا تھا۔ واقعی زندگی کی راہیں عجیب ہونے کے ساتھ ساتھ غریب بھی ہوتی ہیں۔ ہوں۔ ٹھیک تھی تمہاری بات ہم نے ایک دوسرے کو [illegible] کی کوشش کی۔ مگر . . . . . افسوس!! کہو اب بھی مجھ سے قلمی دوستی پسند کرو گے؟ تصویر تم بھی دیکھ لو جس طرح تم نے اپنے من کی مراد پوری کرنے کے لئے میرے جیل بہن کے فوٹو کے ساتھ اپنا فوٹو فٹ کروا کر مجھے پھنسانے کی کوشش کی اسی طرح میں اپنی روح کو ہوا دینے کے لئے تمہارے فوٹو کے ساتھ اپنا فوٹو فٹ کروا کر تمہیں بھیج رہا ہوں۔

اور منیر مسکرا رہا تھا۔ نہ جانے یادوں کے یہ ذخیرے دماغ کے کن نامعلوم گوشوں سے ٹپک رہے تھے اور تھوڑی دیر بعد وہ نیند کی وادیوں کی سیر کر رہا تھا!!۔

نظر برنی

پامالیِ اربابِ وفا دیکھ رہا ہوں
بدلی ہے زمانہ کی ہوا دیکھ رہا ہوں

غنچے نہیں کانٹے بھی ہیں مائل بہ تبسم
یہ معجزۂ دستِ صبا دیکھ رہا ہوں

"اندازِ کرم" اُن کا نہیں تازہ شگوفہ
اک عمر سے یہ کرب و بلا دیکھ رہا ہوں

آئی ہے مجھے یاد کسی ماہ لقا کی
برسات میں پھر زخم ہرا دیکھ رہا ہوں

غافل ہیں ابھی تک وہ نظر مری وفا سے
یہ اپنی محبت کا صلہ دیکھ رہا ہوں

ذاکر حسین حیدر نقوی

نہ مل سکے گا دکانوں سے ٹوٹ جانے پر
یہ جامِ دل ہے کوئی ساغرِ سفال نہیں

قدم قدم پہ مصیبت کے ہیں پہاڑ مگر
رہِ وفا کا مسافر کہیں نڈھال نہیں

ہر ایک اپنے خیالات کا ہے شیدائی
یہاں کسی کو کسی کا کوئی خیال نہیں

یہ کہہ رہا ہے مرا شوقِ آبلہ پائی
کسی جگہ بھی ٹھہرنے کا اب سوال نہیں

تصورات کی دنیا حسین ہے حیدر
خیالِ یار سے بہتر کوئی خیال نہیں

حفیظ مالیگانوی

ہم تو یہ سمجھتے ہیں ہم کو چھوڑ کر تنہا
انجمن بنا لیتا حسن خود نگر تنہا

پا رہا ہوں میں خود کو ہائے کس قدر تنہا
ہمسفر نہیں کوئی اور رہگذر تنہا

تو ہی اک سہارا ہے بجھ نہ لے چراغِ دل
دور منزلِ غم ہے اور ہے سفر تنہا

رنگ و بو کے طوفاں میں دل تو کھو گیا لیکن
اس ہجومِ رنگیں میں رہ گئی نظر تنہا

اُن کی یاد میں گم ہیں روز و شب حفیظ اپنے
پھر بھی لوگ کہتے ہیں ہم کو بے خبر تنہا

دلچسپ نئے رُومانی ناول

شہیدِ محبت بوٹا سنگھ اپنی محبوبہ کی خاطر جانِ عزیز تک قربان کر دینے والے عاشقِ جانباز کی پُرسوز داستان۔ بوٹا سنگھ عرف جمیل احمد کی محبت کی خونچکاں روداد شہزادہ خوشباش بی۔اے کا لکھا ہوا معرکہ خیز ناول۔ قیمت تین روپے پچاس نئے پیسے۔

ناتوں کی سیج رشید اختر ندوی کا عبرت آموز اور دل گداز رُومانی ناول جسے اگر آپ نے نہیں پڑھا تو زندگی کے بہت سے پہلو آپ سے پوشیدہ رہ جائیں گے۔ قیمت پانچ روپے

[…]گھرانہ قیسی رامپوری کا ایک سماجی اور اصلاحی رومانی ناول جس میں ایک مسلم گھرانے کے کرداروں کو پیش کیا گیا ہے۔ قیمت چار روپے پچیس نئے پیسے۔

[…]یامت نامور فن کار جناب زکی انور کا سوز و گداز اور محیرّ العقل واقعات سے بھرپور جاسوسی رُومانی ناول۔ قیمت دو روپے پچاس نئے پیسے۔

[…]ارش جناب زکی انور کا ایک لاجواب جاسوسی رُومانی ناول جس میں ایک لڑکے کے کردار کو پیش کیا گیا ہے۔ قیمت دو روپے پچاس نئے پیسے۔

[…]پی پلپ کی دنیا میں پلے ہوئے انسانوں کی زندگی کا ایک نیا رُخ۔ جسے نڈر ناول نویس جناب جمنا داس اختر نے انوکھے اور سبق آموز انداز میں پیش کیا ہے۔ قیمت ۲ روپے ۵۰ نئے پیسے

[…]بش محل جناب شوکت تھانوی کے قلم سے اُن شاعروں کی داستان، جن کے چہروں پر سنجیدگی، متانت اور عظمت کے نقاب پڑے رہتے ہیں۔ قیمت تین روپے

[…]اب گاہ میں جاسوسی اور سراغرسانی سے متعلق ایک ناول ہی نہیں، بلکہ اصلاحی اور سماجی داستان بھی ہے۔ ایک ایسی لڑکی کی داستان جو […]ت کے چسکے میں اپنی چھوٹی بہن کی زندگی تباہ کر دیتی ہے، جھوٹی شہرت کیلئے قتل [او]ر خونریزی سے بھی گریز نہیں کرتی۔ مصنفہ مخمور جالندھری۔ قیمت ۳ روپے ۵۰ نئے پیسے

[…]ہ ایثار منشی پریم چند کا رُوحانی پریم سے بھرپور ایک اخلاقی ناول جسے منشی صاحب کے ناولوں میں ممتاز درجہ حاصل ہے۔ قیمت تین روپے۔

[…]ہاں پٹے ہیں مشہور مزاح نگار جناب شوکت تھانوی کے تازہ ترین مزاحیہ افسانوں کا مجموعہ جنہیں پڑھ کر آپ لوٹن کبوتر ہو جائیں گے۔ تین روپے ۲۵ نئے پیسے

پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی۔ دہلی

جواب طلب اُمور کے لئے ہمیشہ اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ یا پوسٹ کارڈ [بھیجیں] ورنہ ہم جواب دینے سے قاصر رہیں گے۔ پاکستانی ٹکٹ ہندوستان میں کارآمد نہیں [اس] لئے پاکستانی بھائی اور بہنیں اس شرط سے مستثنےٰ ہیں۔ (منیجر بیسویں صدی دہلی)

افسانہ

عشرتِ قطرہ

ایس۔ این سوز

پتہ نہیں لکھا۔

محترم خوشتر بھائی۔ تسلیم

... میں نے بساط بھر کوشش کی ہے کہ محسن کا کردار ایک باپند انسان کا کردار ہو۔ معلوم نہیں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں۔
آپ کی پسند اور قارئین کرام کی رائے کا منتظر ہوں۔ مجھے اپنی خامیاں جان کر بے حد مسرت ہوگی... مخلص ـــ ایس این سوز

"عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا" ـــ قطرہ کی معراج یہ ہے کہ وہ دریا سے ملے اور آغوشِ صدف میں پہنچ کر گوہرِ تابدار بن جائے یا دریا کی وسعتوں میں جذب ہو جائے ـــ ایک ذرۂ حقیر کی انتہا یہ ہے کہ سورج کی کرنوں میں فنا ہو کر اپنے وجود کو گم کر دے۔ انسانیت کے پودے کو اپنے خون سے سینچ کر پروان چڑھانا انسانیت کی معراج ہے" ـــ پروفیسر محسن عشرتِ قطرہ سمجھا رہے تھے اور طلباء کو احساس ہو رہا تھا کہ پروفیسر آج انتہائی اچھے موڈ میں ہیں۔ جب تک لکچر ہوتا رہا، ایک سکوت طاری رہا۔ پیریڈ ختم ہوتے ہی گھنٹہ کی آواز نے سکوت کو توڑا اور پروفیسر محسن کمرے سے نکل کر اسٹاف روم میں جا رہے تھے کہ پوسٹ مین نے ایک تار دیا۔

تار محسن کی باجی جنت کا تھا جس نے اسے اولین فرصت میں دہلی بلایا تھا۔ اس لئے کہ وہ امریکہ جانے سے پہلے محسن سے ملنا چاہتی تھی۔ خان بہادر عظمت اللہ کی اکلوتی لڑکی جنت امریکہ سے آرٹس کی اعلیٰ سند حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اور اب ایک نادر موقع تھا جبکہ سراج ـــ جنت کا ماموں زاد بھائی اور رئیس اعظم کھونڈ کا اکلوتا لڑکا ـــ ایم ای کرنے کے بعد انجینئرنگ کی اعلیٰ ڈگری کے لئے امریکہ جا رہا تھا۔ عظمت اللہ نے یہ سوچا کہ لڑکا ہونہار ہے، امریکہ سے آنے کے بعد دو تین ہزار روپیہ مہینہ کما لے گا۔ لیکن جنت نے ایسا نہیں سوچا تھا۔ وہ تو بس محسن ہی کے لئے ایسا سوچ سکتی تھی، کسی دوسرے کے لئے نہیں! وہ ایسی بات کیوں سوچے۔ امریکہ کے سفر کی بس اس کی آرزو تھی۔ بہ یک کرشمہ دو کار کے تحت وہ آرٹس میں ڈگری لینا چاہتی تھی۔ ورنہ اُسے محسن سے دور رہنا کسی صورت گوارہ نہ تھا۔ محسن جنت کا خالہ زاد بھائی تھا۔ بچپن ہی میں ماں باپ کے سایۂ عافیت سے محروم ہو گیا۔ اُس کا کوئی سہارا نہ تھا۔ خان بہادر عظمت اللہ ہی نے اُس کی پرورش کی اور تربیت کا ذمہ اپنے سر لیا۔ لڑکا ہونہار تھا۔ ادب سے ایم۔ اے کر کے گورنمنٹ کالج الہ آباد میں اُردو کا پروفیسر ہو گیا۔ جنت کے متعلق اُس نے بہت سے حسین خواب دیکھے تھے اور یہ ایک فطری بات تھی ـــ دونوں ساتھ رہتے رہتے اب جوانی سے ہم آغوش ہوئے تھے۔ ایک دوسرے کی خواہشات، ایک دوسرے کے محسوسات، عادات و اطوار سے پوری طرح واقف تھے۔ اور محسن میں کس بات کی کمی تھی، خوبرو جوان تھا، تعلیم یافتہ تھا، سنجیدہ اور مفکر ذہن پایا تھا۔ طبیعت سپاہیانہ تھی۔ کھیل کے میدان میں ہمیشہ لوگوں کی نظریں اس پر جمی رہتی تھیں۔ شاعر طبعی زبان نہیں تھا لیکن دوستوں کے اصرار سے کسی مشاعرے میں کچھ کہا تو مستقبل پر نظر رکھنے والے کہنہ مشقوں نے ضرور یہ سمجھا کہ شاعری کے افق پر ایک تابناک ستارہ نمودار ہوا چاہتا ہے۔

محسن کی انسانیت دوست شخصیت پر خالو جان کے احسانات نے گہرے نقوش چھوڑے۔ اُسے ہمیشہ یہی احساس رہا کہ میں اور میرا سب کچھ انہیں کا مرہونِ منت ہے اور میری زندگی اس خاندان کے کسی کام آ جائے تو مقصدِ زندگی حاصل ہو جائے۔ اُس نے غیر شعوری طور پر خان بہادر کے گھر سے اپنی زندگی کو اس پنچھی کی طرح وابستہ کر لیا تھا جس کے دل میں در قفس وا ہونے کے باوجود باہر جانے کی تمنا نہ ہو۔ جنت کے برتاؤ اور خان بہادر کی عنایات سے اُس نے یہ باور کر لیا تھا کہ اُس کی زندگی اور اس کی کل کائنات بس یہی گھر ہے! جنت کی تعلیم پر محسن نے بساط بھر محنت کی اور جب جنت امتیازی نمبروں سے بی۔ اے پاس ہوئی تو اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے ایک بڑا بوجھ اُس کے سر سے اتر گیا ہو جیسے وہ سکندرِ اعظم بن گیا ہو۔ اُسے جنت سے محبت ہو چلی تھی اس قدر خاموش اور سنجیدہ محبت کہ جنت بھی جس کے احساسات کو محسوس نہ کر سکے اور کبھی خود اپنے ہی خیال میں کسی بات سے اُسے یہ احساس ہو جائے کہ ایسا نہ جنت نے کچھ غلط مطلب نہ لے لیا ہو تو اس قدر آب آب رہے کہ گھنٹوں جنت سے آنکھیں ملا کر بات نہ کر پائے۔ یہ آنکھیں ہی تو ہیں نا! جو کچھ نہ کہنے کے باوجود سب

دیکھ دیتی ہیں ظالم ــــــ اچھا آپ اس محبت کو کیا کہیں گے جو صرف دل میں پرورش
ہے ۔ میٹھا میٹھا درد پیدا کرتی ہے اور ہزار بے چینیوں کے بعد بھی لب تک آ نہیں
۔ بس کچھ ایسی ہی محسن کی محبت تھی ۔ اُسے اس بات سے سخت وحشت ہوتی تھی کہ
ت سے وہ کہے "جنت مجھے تم سے محبت ہے !" "جنت ! میں تمہارے بغیر زندہ کیسے
سکوں گا" لیکن انسان چاہے جس بلندی پر بیٹھے ، چاہے جتنی احتیاط برتے اُسے
ھوں کی عکاسی اور دل کی بے صدا آواز پر کبھی اختیار نہ ہوا ۔

محسن اور جنت زبان سے کچھ نہ کہنے کے باوجود ضرور یہ سمجھ گئے تھے کہ "تیرے
میں تیرے ہی میں ہوں کوئی دوسرا نہیں ہے" ــــــ اور پھر دلوں کو یہ احساس
جانے کے بعد زبان سے چند رسمی جملے ادا کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی ۔ یہ ایک
یسا مقام ہوتا ہے جہاں ایک کا دُکھ دوسرے کا غم اور ایک کی ہنسی دوسرے کی خوشی
ن جاتی ہے اور یہی معراج محبت ہے ۔

تار ملنے کے بعد محسن نے ایک ہفتہ اتفاقی رخصت کی درخواست دی اور
دوسرے دن صبح پٹھان کوٹ سے دہلی کے لئے روانہ ہوگیا ۔

محسن دل سے یہ چاہتا تھا کہ جنت امریکہ نہ جائے ۔ اس لئے کہ اس کے خیال
سے ایک عورت کے لئے تعلیم اتنی ہی ضروری ہے کہ وہ ہر حالت میں امورِ خانہ داری
سے بے نیاز نہ ہو جائے ۔ ایک اچھی بیوی اور ایک اچھی ماں بن سکے ۔ اور یہیں محسن
اور جنت کے خیالات میں تضاد تھا جنت کہتی ــــــ تعلیم چاہے جتنی زیادہ اور وسیع ہو
وہ کہاں ایک عورت کو اچھی بیوی اور اچھی ماں بننے سے روکتی ہے یہ تو اپنا اپنا ظرف ہے
زندگی ابتدا تا انتہا کچھ نہ کچھ سیکھنے کے لئے ہے ۔ ہمہ دانی کا کوئی انسان دعویٰ نہیں
کر سکتا ۔ زندگی کی آخری گھڑیوں تک ایک انسان کسی نہ کسی بات کا طالب رہتا ہے
اور کچھ نہ کچھ سیکھتا رہتا ہے ۔ محسن کے لئے یہ بات ایسی تو نہیں تھی کہ اس کا کوئی ٹھوس
جواب نہ دے پاتا ۔ لیکن وہ خیال خاطرِ محبوب رکھتے ہوئے خاموش ہو جاتا ۔ یہ بھی تو
اپنے اپنے ظرف کی بات ہے ۔

محسن کو جنت پر کامل اعتماد تھا ایسا اعتماد جو خود ہو جاتا ہے پیدا نہیں کیا جاتا اور پھر
جنت کا مستقبل کتنا شاندار ہوگا ، کتنا روشن ہوگا ۔ یقیناً وہ ایک کامیاب ادیبہ ہوگی ۔
شہرت اس کے قدم چومے گی اور اسی خیال سے اُسے اپنے آپ ہی فخر محسوس ہونے
لگا ۔ گو جُدائی کا خیال افسردہ کن ضرور تھا لیکن اس خیال سے اُسے جو مسرت حاصل
ہوئی وہ افسردگی سے کہیں زیادہ تھی اور جنت اُسے برسات کی کسی ابرآلود شام گھرے
سیاہ بادلوں کے درمیان یک بیک جگمگاتے ہوئے روشن اور درخشاں ستارے کی
طرح نظر آنے لگی ۔

محسن دہلی پہنچا تو جنت اور سراج کے امریکہ جانے کی تیاری تقریباً مکمل
ہو چکی تھی ۔ معلوم ہوا کہ سراج ایک ہفتے سے یہیں مقیم ہے ۔ محسن سراج سے بڑے تپاک
سے ملا لیکن سراج نے جواب میں اتنی ہی سرد مہری دکھائی ۔

Oh ! I see you are Mr. Mohsin for you
she is waiting till now !

کچھ اس طرح ادا کیا گیا جس کی تلخی محسن اور جنت دونوں محسوس کئے بغیر نہ رہ سکے
لیکن یہ وقت سوال و جواب میں تلخی پیدا کرنے کا نہ تھا محسن مسکراتے ہوئے Thanks
کہہ کر خاموش ہو گیا ۔ سراج پہ سرتاپا مغربیت چھائی ہوئی تھی ۔ ہر بات تصنع سے پُر اور
ہر ادا مغرب کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ــــــ امیر باپ کا بیٹا تھا ۔ اس کی پرورش بھی
اُسی انداز سے ہوئی تھی ۔

محسن کے دہلی آنے کے دو دن بعد جنت اور سراج امریکہ روانہ ہو گئے ۔
روانگی سے پہلے ضبط کے باوجود محسن بُجھا بُجھا اور افسردہ تھا ۔ آنکھیں شبنمی ہو چلی تھیں ۔
بہر حال اپنی اس کیفیت کو وہ جنت سے چھپانا چاہتا تھا لیکن جنت کی حالت بھی کچھ
اس سے بہتر نہ تھی ۔ آخر وہ بات جو برسوں رازہائے سربستہ کی طرح سینوں میں دبی رہی تھی
جدائی کے بے چین لمحات اُسے زبان پر لے آئے ۔ جنت نے انتہائی خود اعتمادی اور
سنجیدگی سے کہا ۔

محسن افسردہ کیوں ہوتے ہو ۔ اتنے طویل سفر پہ جاتے ہوئے مجھے بھی اضطراب
ہے لیکن جانے سے پہلے میں تمہیں یقین دلانا چاہتی ہوں کہ میں تمہیں کبھی بھول نہ سکوں گی ۔
مجھ پر اعتماد رکھو ۔ میرے خیال میں اتنا کافی ہے کہ تم مجھے خوشی خوشی خدا حافظ کہو ۔ میں بھی
یہی کوشش کر رہی ہوں خدا کامیاب کرے ۔"

"جنت ! یہ بات اتنی آسان نہیں ہے جیسا تمہارا خیال ہے ۔ قربت اور
دوری میں بہت فرق ہوتا ہے ۔" محسن نے اپنے سارے ہوش و حواس کو مجتمع کر کے کہا !
"پھر بھی میرے لئے یہ الفاظ سرمایۂ حیات ہیں اور ان کے سہارے میں ساری زندگی
گذار سکتا ہوں ۔ ربّ العزت مجھے طاقت دے" . . . .

ہوائی جہاز سراج اور جنت کو لے کر اُڑ گیا ۔ محسن کی نگاہیں آسمان پر اُس
وقت تک مرکوز رہیں جب تک امریکن ایر لائنس کا جیٹ طیارہ ایک پائنٹ بن کر
نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا ۔

ہجر و جُدائی کی وارداتیں یہ کچھ نئی نہیں ہیں ۔ ازل سے ابد تک برقرار
ہیں اور ہر چاہنے والے کو اس منزل سے گذرنا پڑتا ہے ــــــ محسن پر بھی ایک ایک لمحہ
ایک ایک سال بن کر گذرنے لگا تو یہ کوئی عجیب بات یا نئی واردات نہیں تھی بلکہ
عجیب بات تو وہ ہوئی کہ چھ ماہ بعد جنت کے خطوط میں یک دم نیا پن آگیا ۔ ایسے

جیسے کسی اتفاقی حادثہ کا شکار ہو جاتا ہے۔ محبوب کو نہیں اُس حسن کے جذبات و حسیات کو یہ بات چونکا دینے کے لئے کافی تھی پھر بھی انسان کا دل اور وہ بھی پیار بھرا دل عافیت کے ہزار پہلو ڈھونڈ کر نکل جاتا ہے اور ایک عارضی اطمینان کے لئے اتنا ہی بہت ہوتا ہے۔

کچھ دنوں بعد ایک آدھ خط کا جواب وصول ہونے لگا۔ وہ بھی اجنبیت لئے ہوئے جیسے کسی قید کے ملاقاتی کو رکھا جائے۔ محسن کے حساس دل پر یہ چوٹیں ضرب پر بجلی گرنے سے کم نہ تھیں۔ یہ وہ اذیت ناک و کرب انگیز واقعات تھے جن کے لئے وہ بالکل تیار نہ تھا۔ اُسے گمان بھی نہ تھا کہ حالات یوں پلٹ سکتے ہیں۔ وہ تو ایک مطمئن اور خوش قسمت آدمی کی طرح پر سکون ماحول میں اپنی زندگی کی کشتی کو چلا رہا تھا۔ اچانک ہی تیز ہوائیں چلنے لگیں گی اور سمندر میں طوفان آ جائے گا۔ اس کا اُسے مطلق خیال نہ تھا اور پھر وہ اتنا آسان پسند رہا تھا اور یوں کہ کسے لئے حادثاتِ زندگی کے لئے خود کو تیار نہ کر پاسکا تو اُس کی حالت یقیناً قابل رحم ہو جاتی ہے ——— یہی حالت محسن کی ہوئی وہ بکھر بکھر گیا اور پریشان رہنے لگا۔ وقت ہر زخم کا بہترین مرہم ہے جو وقت گزرتا ہے وہ ہمیشہ غم کی کا ایک ورق پلٹ دیتا ہے۔ دُکھ انسان کو نڈھال کرتا ہے لیکن جو اُسے صبر و ضبط کے ساتھ پی گیا اس کے دل و دماغ پر جلا ہو جاتی ہے۔ کچھ دنوں دنیا سے اپنے ماحول سے بیگانہ زندگی گزارنے کے بعد اس میں اچانک ایک تبدیلی ہو گئی۔ ایک نیا جذبہ اُبھرا جیسے کسی بے حد اندھیرے غار میں جگنو چمکتا ہوا کہیں سے روشنی کی کرن پھوٹ پڑی ہو۔ اس نے حالات پر غور کیا، خود کی زندگی پر غور کیا اور اس نے محسوس کیا کہ جنت سے محبت ہو جانا ایک فطری بات ہے۔ محبت جنت کی امانت ضرور ہے اور وہ ایک انفرادی بات ہے لیکن انفرادی بات کے لئے انسان اجتماعی مفاد کو کچل دے یہ انسانیت سے بعید ہے۔ وہ اس بھری ساری دنیا میں تنہا خود کے مفاد کیلئے خود کو آرام چین کیلئے نہیں پیدا کیا گیا اور بھی فرائض ہیں اور بھی ذمہ داریاں ہیں اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ اور اگر اُن سے منہ موڑ لیا جائے تو انسانیت کا سہاگ اُجڑ جائے گا۔ وہ ایک پروفیسر ہے۔ طلبا کی بے شمار قیمتی زندگیوں کی ہدایت و راہ نمائی اس کے ہاتھ میں ہے۔ ایک انسان ہونے کے ناطے بہت سے فرائض ہیں۔ جنت کی امانت میں خیانت نہ ہو۔ اُس کی محبت بدنام نہ ہو اور تمام فرائض سے سبکدوشی حاصل کر سکوں یہی زندگی کا مقصد ہونا چاہئے اور انہیں خیالات نے اُسے بے پناہ طاقت دی۔ وہ پھر دوستوں کا ہمدم اور طلبا کا قابل احترام پروفیسر بن گیا۔

زندگی کے کچھ اور سال گذر گئے۔ سراج ایکزیکیٹیو انجینیر بن کر ہندوستان آیا۔ اسے اب کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ پی ڈبلیو ڈی کے ایک اعلیٰ افسر کے لئے کس چیز کی کمی ہو سکتی ہے۔ جنت کو وہ اس عرصہ میں اپنے ماحول کے مطابق ڈھال چکا تھا۔ مغرب کی چکتی دمکتی زندگی نے جنت کے معصوم دل و دماغ کو جیت لیا تھا۔ انگلستان کی دولت بھی جانے کے بعد ایک آزاد اور وسیع نگاہوں کو خیرہ کر دینے والے ماحول میں رہ کر آئی تھی۔ جہاں رہ کر اُسے یہ یاد رہ جاتا تھا کہ زندگی کا عیش اور پیسے کا تناسب کس قدر اہم اور سخت ہے۔ سراج تو سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ جنت کی کل کائنات پر چھا گیا۔ اور محسن کا خیال دُور ہوتے ہوتے۔ دُھندلا ہوتے ہوتے ایک دبیز کُہر کے اوٹ میں دب گیا۔

خان بہادر عظمت اللہ کو اسی دن کا انتظار تھا۔ بڑی دھوم دھام سے سراج اور جنت کی شادی ہو گئی اور شادی کے ہنگاموں میں غریب محسن سے کسی نے یہ بھی نہ پوچھا کہ بیچارے پہ کیا گذری!!

سراج کے پاس کوٹھی تھی۔ کار تھی۔ دولت اور حکومت تھی۔ ایک نشہ تھا اور جنت تھی۔ محسن کے پاس صرف بیتے دنوں کی یاد تھی اور زندہ انسان کی طرح زندگی گذارنے کا ایک موہوم نیکی کا ایک خیال۔ ایک سہارا۔ وہ ترقی پاکر پروفیسر سے پرنسپل بن گیا۔ سراج کا نشہ جو اُسے دولت اور حکومت نے دیا تھا چڑھتا رہا۔ دن بیتتے رہے اور جنت ایک خوبصورت بچی کی ماں بن گئی۔ سراج میں دولت کا نشہ اور اس نشہ سے پیدا ہونے والی چیزیں ایک ایک کر کے پیدا ہوتی گئیں یعنی شراب اور طوائفوں کے بالاخانے کے چکر لازم و ملزوم بن گئے۔ دولت غیر فطری ہو تو یہی ہوتی ہے۔ جب کم ہونے لگا تو رشوت سے اس کی پوری کی جانے لگی اور اُس کی انتہا یہ ہوئی کہ ایک دن انٹی کرپشن انسپکٹر نے رنگے ہاتھوں دھر لیا! نوکری گئی۔ رہی سہی پونجی لے کر ایک لٹے ہوئے مسافر کی طرح وطن واپس آئے لیکن یہاں آنے پر پتہ چلا کہ والد صاحب نے سراج میاں کو ایگزیکیٹیو انجینیر بنانے میں تمام جائداد کو گروی کرا دیا ہے۔

خان بہادر عظمت اللہ نے جذبات کے جھٹکے میں کچھ ایسا نقصان اٹھایا کہ ان کی کمر ٹوٹ گئی! جب انہیں داماد کے حالات کی خبر ہوئی تو حرکت قلب بند کر بیٹھے۔ سراج کے چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی تھی اور کچھ نہیں۔

سراج جیسا عیش و عشرت میں پلا ہوا انسان جسے کبھی حادثات سے دوچار ہونا نہ پڑا ہو وہ بزدل ہی ہو سکتا ہے اور اس بزدل انسان نے معصوم بچی کا خیال کیا نہ جنت کا اور خودکشی کر لی۔

جنت نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کبھی بھولے سے اُسے خیال بھی نہ ہوا تھا کہ حالات اپنا رُخ یوں بھی بدل سکتے ہیں۔ رہے سہے اثاثے کو سمیٹ کر وہ اسی جگہ آ گئی جہاں سے وہ محبت کو ٹھکرا کر دولت کے پیچھے گئی تھی۔ اور وہ جگمگاتی ہوئی روشن جگہ اب ایک ویران کوٹھی میں تبدیل ہو چکی تھی۔

جنت اور جنت کی ماں کی رہائش کے بعد زندگی گزرنے لگی۔ محسن کو
اس بات کا علم تھا۔ وہ جنت کی بیکلی دیکھتی زندگی بھی برکت بن جاتی اور اب اس روشنی
پھیلے ہوئے کالے بادل بھی اس کی نظر سے پوشیدہ نہ تھے۔

سروس کو تقریباً پندرہ سال ہو گئے تھے اور وہ جنت کے وقت رخصت
الفاظ کے سہارے تمام زندگی گزارنے کا عہد پورا کر رہا تھا۔ پندرہ سال کی
اس کی تقریباً چالیس ہزار روپیہ بنک میں جمع تھا۔

ایک دن صبح بینک کا اکاونٹ کیا اور پھر جنت کے نام ایک خط لکھا:۔

جنت ــــــــ!

گو مجھے تم سے خطاب کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ پھر بھی اس جنت
تعلق سے لکھ رہا ہوں جس کے الفاظ کے سہارے اب تک زندگی گزاری ہے
مجھے علم ہے کہ تم کن حالات سے گزر رہی ہو اور میں یہ لکھنے کی ضرورت نہیں
سمجھتا کہ میں کن حالات سے گزرا ہوں۔ بہرحال ایک آخری غرض جو میں لکھتا ہوں
یہ صدقہ باقی تمہارا ہے جس کے لئے شکر ہے میری زندگی نے وفا کی ہے۔ وہ پورا
کر رہا ہوں۔ عمر بھر کی کمائی چالیس ہزار روپیہ میں دس ہزار بقایا رکھ کر تیس ہزار
ان کے نام منتقل کر دیا ہے اور بینک کی پاس بک بھی رجسٹری سے بھیج رہا ہوں۔
دل افسردہ ہے عزیز و شفیق!

میرا خیال ہے ریحانہ کی تعلیمی زندگی مکمل کرنے اور تمہیں دنیا کے تفکرات
نکالنے کے لئے یہ کافی ہو گا۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔ میں دس ہزار روپیہ لے کر
جا رہا ہوں معلوم نہیں کہاں ــــ! بس اب زندگی دائمی سکون چاہتی ہے۔
قطرہ کی خواہش یہی ہے کہ وہ دریا میں فنا ہو جائے ــــــــ

خدا حافظ!

نا اہل ـــــــ محسن

یہ خط جس وقت جنت کے ہاتھ میں پہنچا آنسوؤں کی لڑیاں اس کے
رخسار پر رواں تھیں۔ عمر بھر کا رونا ایک لمحہ ہنسی کے لئے ــــــ!

ایم۔ نثار احمد نثار

جب صبا شانہ کشِ زلف رسا ہوتی ہے
اِک بلا اور بھی بالائے بلا ہوتی ہے

تم جو بھولے سے اِدھر دیکھ لیا کرتے ہو
وہ نگاہِ غلط انداز بلا ہوتی ہے

لاکھ وہ لاکھ میں شمشیرِ نگاہِ قاتل
چھانٹ لیتی ہے اُسے جس کی قضا ہوتی ہے

قیصر عثمانی

اگر مجھ کو تم سے محبت نہ ہوتی!
یہ سودا نہ ہوتا یہ وحشت نہ ہوتی

جو حُسنِ نظر کارفرما نہ ہوتا
جہاں میں کوئی اچھی صُورت نہ ہوتی

جو ہوتا نہ میں کشتۂ عشق قیصر
یہ صُورت نہ ہوتی یہ حالت نہ ہوتی

ا۔ س۔ نادان

خوشیوں کے ساتھ غم بھی ملے ہیں تو کیا ہوا
شبنم کے اشک بھی تو ہیں گُل کی ہنسی کے ساتھ

میں بھی ہوں ایک رند مجھے بھی تو جام دے
ساقی نہ کر مذاق مری تشنگی کے ساتھ

نادان ہے خوش نصیب جسے اُن سے فیض ہے
ورنہ بتوں نے کی ہے وفا کب کسی کے ساتھ

کیف احمد صدیقی

ابھی صرف دیوانہ کہتی ہے دُنیا
خدا جانے کیا کیا غمِ دل بنائے

ترے ہی تصور میں کھویا ہوا ہوں
غمِ معتبر کو بھی باطل بنائے

مجھے کیف اُن کی شرابِ محبت
غمِ دو جہاں سے ہے غافل بنائے

سب ٹھیک ہو جائے گا

پرکاش پنڈت

۳/۱۰۸ ۵۲۵ نوین شاہدرہ دہلی ۳۲

۲۰ جولائی ۷۳ء

برادرم خوشتر گرامی صاحب! تسلیم

طویل مدت کے بعد ایک طنزیہ خاکے کے ساتھ "بیسویں صدی" کی محفل میں حاضر ہو رہا ہوں۔ پسند نہ آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بس پڑھیے اور داد دیجیے۔ چھاپیے اور داد دلوائیے بس۔

مخلص ـــــ پرکاش پنڈت

میر میاں نے اپنے نکاح کے موقعے پر جب بوکھلا کر "ناں" کہا اور مولوی صاحب نے اُسے "ہاں" قرار دیتے ہوئے فوراً نکاح پڑھا دیا تو ماتا کی ماری میر کی ماں نے چھاتی کوٹ لی اور بلک بلک کر مولوی صاحب سے شکایت کی، کہ حضرت آپ نے یہ کیا قہر کر دیا؟ تو حضرت یعنی سفید ریش مولوی صاحب نے، جن کی ریش ظاہر ہے دھوپ میں سفید نہ ہوئی ہوگی، اپنی ریش مبارک پر دستِ مبارک پھیرتے ہوئے فرمایا "آپ فکر نہ کیجیے، سب ٹھیک ہو جائے گا" ـــــ اور یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ نکاح کے بعد نہ تو میر کو کوئی فکر کرنے کی ضرورت رہی تھی نہ میر کی ماں کو۔ یہاں تک کہ خود راقم نے مطمئن اور بے فکر ہو کر کان چھدوا لئے تھے۔ بدن پر بھبوت مل لی تھی اور گیروا رنگ کر ہاتھ کا پیالہ بن کر الکھ نرنجن کا نعرہ بلند کرنے لگا تھا۔

"آپ فکر نہ کیجیے، سب ٹھیک ہو جائے گا" ـــــ قرنوں اور صدیوں سے چلا آرہا یہ جملہ ایک دو بار نہیں، آپ نے سینکڑوں بار سنا ہوگا اور مجھے یقین ہے جتنی بار آپ نے یہ جملہ سنا ہوگا، اس سے کچھ زیادہ بار ہی سب ٹھیک ہو گیا ہوگا۔

میں نے ذاتی طور پر یہ جملہ سب سے پہلے چھ برس کی عمر میں سنا تھا۔ جب میرے والد بزرگوار نے میرے اسکول آکر میرے ماسٹر سے شکایت کی تھی کہ میں کسی کا کہنا نہیں مانتا۔ دن بھر آوارہ لڑکوں کے ساتھ گھومتا رہتا ہوں اور کبھی پڑھنے لکھنے پر توجہ نہیں دیتا ـــــ اور میرے ماسٹر صاحب نے کمال شفقت سے انہیں اطمینان دلاتے ہوئے کہا تھا "آپ فکر نہ کیجیے، سب ٹھیک ہو جائے گا" میرے والد تو مطمئن ہو کر گھر چلے گئے اور میرے ماسٹر صاحب نے بھری کلاس میں مجھے بنچ پر کھڑا کر کے بڑے مشفق تھپڑوں اور گھونسوں سے مجھے ٹھیک کرنا شروع کر دیا۔

میں نے دوسری بار یہ جملہ اُس کے دوسرے دن پھر سنا۔ جب میں نے اسکول جانے سے انکار کر دیا اور سڑکوں پر طلسمی انگوٹھیاں اور منتر پھونکے گنڈے تعویز عطا کرنے والے ایک پہنچے ہوئے بزرگ کی شاگردی اختیار کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اور میرے شفیق ماموں نے مجھے اپنی تحویل میں لیتے ہوئے میری والدہ سے کہا "آپ فکر نہ کیجیے، سب ٹھیک ہو جائے گا" اور انھوں نے میری ٹانگوں میں لکڑی کا ڈنڈا دے کر اور مجھے مرغا بنا کر مجھ سے دریافت فرمایا کہ تم اپنے نیک ارادے سے باز آؤ گے یا میں تمہیں ٹھیک کروں؟

وہ دن اور آج کا دن اس جملے نے زندگی کی راہ میں قدم قدم پہ نہ صرف مجھے ٹھیک کیا ہے بلکہ بے فکری کی ایسی گراں بہا دولت بخشی ہے کہ خدا دے اور ناچیز بندہ لے۔

اپنے دل کے مرض کی وجہ سے ہر وقت جہنم کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے رہتا ہے لیکن ڈاکٹر صاحبان کے منہ سے یہ جملہ سن کر ہمیشہ میری باچھیں کھل

سب ٹھیک ہو جائے گا

پرکاش پنڈت

۳۸/۵۲ زون شاہدرہ دہلی ۳۲

۳۰ جولائی ۱۹۹۳ء

برادرم خوشتر گرامی صاحب تسلیم

طویل مدت کے بعد ایک طنزیہ خاکے کے ساتھ "بیسویں صدی" کی محفل میں حاضر ہو رہا ہوں۔ پسند نہ آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بس پڑھیے اور داد دیجیے۔ چھاپیے اور داد دلوایئے۔

مخلص ــــــ پرکاش پنڈت

ہیر سیال نے اپنے نکاح کے موقعے پر جب بوکھلا کر "ہاں" کہا اور مولوی صاحب نے اُسے "ہاں" قرار دیتے ہوئے فوراً نکاح پڑھا دیا تو ماتا کی ماری ہیر کی ماں نے چھاتی کوٹ لی اور بلک بلک کر مولوی صاحب سے شکایت کی کہ حضرت آپ نے یہ کیا قہر کر دیا؟ تو حضرت یعنی سفید ریش مولوی صاحب نے، جن کی ریش ظاہر ہے دوپہر میں سفید نہ ہوئی ہوگی، اپنی ریش مبارک پر دستِ مبارک پھیرتے ہوئے فرمایا "آپ فکر نہ کیجیے، سب ٹھیک ہو جائے گا" ـــــ اور یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ نکاح کے بعد نہ تو ہیر کو کوئی فکر کرنے کی ضرورت رہی تھی نہ ہیر کی ماں کو۔ یہاں تک کہ خود رانجھے نے مطمئن اور بے فکر ہو کر کان چھدوا لیے تھے۔ بدن پر بھبھوت مل لی تھی اور گورکھ ناتھ کا چیلا بن کر الکھ نرنجن کا نعرہ بلند کرنے لگا تھا۔

"آپ فکر نہ کیجیے، سب ٹھیک ہو جائے گا" ـــــ قرنوں اور صدیوں سے چلا آ رہا یہ جملہ ایک دو بار نہیں، آپ نے سینکڑوں بار سنا ہوگا اور مجھے یقین ہے جتنی بار آپ نے یہ جملہ سنا ہوگا، اس سے کچھ زیادہ بار ہی سب ٹھیک ہو گیا ہوگا۔

میں نے ذاتی طور پر یہ جملہ سب سے پہلے چھ برس کی عمر میں سنا تھا۔ جب میرے والد بزرگوار نے میرے اسکول آ کر میرے ماسٹر سے شکایت کی تھی کہ میں کسی کا کہنا نہیں مانتا۔ دن بھر آوارہ لڑکوں کے ساتھ گھومتا رہتا ہوں اور کبھی پڑھنے لکھنے پر توجہ نہیں دیتا ـــــ اور میرے ماسٹر صاحب نے کمال بےفکری سے انھیں اطمینان دلاتے ہوئے کہا تھا "آپ فکر نہ کیجیے، سب ٹھیک ہو جائیگا"

میرے والد تو مطمئن ہو کر گھر چلے گئے اور میرے ماسٹر صاحب نے بھری کلاس میں مجھے بنچ پر کھڑا کر کے بڑے مشفق تھپڑوں اور گھونسوں سے مجھے ٹھیک کرنا شروع کر دیا۔

میں نے دوسری بار یہ جملہ اُس کے دوسرے دن پھر سنا، جب میں نے اسکول جانے سے انکار کر دیا اور سڑکوں پر طلسمی انگوٹھیاں اور منتر پھونکے ہوئے گنڈے تعویز عطا کرنے والے ایک پہنچے ہوئے بزرگ کی شاگردی اختیار کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اور میرے شفیق ماموں نے مجھے اپنی تحویل میں لیتے ہوئے میری والدہ سے کہا "آپ فکر نہ کیجیے، سب ٹھیک ہو جائے گا" اور انھوں نے میری ٹانگوں میں لکڑی کا ڈنڈا ڈال کر اور مجھے مرغا بنا کر مجھ سے دریافت فرمایا کہ تم اپنے نیک ارادے سے باز آؤ گے یا میں تمھیں ٹھیک کروں؟

وہ دن اور آج کا دن اِس جملے نے زندگی کی راہ میں قدم قدم پر نہ صرف مجھے ٹھیک کیا ہے بلکہ بے فکری کی ایسی گراں بہا دولت بخشی ہے کہ خدا دے اور ناچیز بندہ لے۔

اپنے دل کے مرض کی وجہ سے ہر وقت جہنم کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے رہتا ہے لیکن ڈاکٹر صاحبان کے منہ سے یہ جملہ سن کر ہمیشہ میری باچھیں کھل

لازمیِ ڈپازٹ

(مُلازمین) اسکیم

۱۹۶۳ء

لازمی ڈپازٹ (ملازمین) اسکیم ۱۹۶۳ء، ۲۲ ستمبر ۱۹۶۳ء سے ختم کر دی گئی ہے۔ اِس اسکیم کے تحت اب ملازموں سے مزید رقم وصول نہیں کی جائے گی۔

رقموں کی واپسی

اس اسکیم کے تحت جو روپیہ جمع کرایا جا چکا ہے، وہ لوٹا دیا جائے گا اور ساتھ ہی اس پر ۴ فی صد سالانہ سود اتنے ہر ایک پورے کیلنڈر ماہ کے لئے ملے گا کہ جتنے ماہ کے لئے رقم سرکار کے پاس رہی ہے۔ ملازموں کو چاہیئے کہ وہ مالکان سے اپنی پاس بکیں حاصل کر لیں اور جمع رقم کی واپسی کے لئے اس دفتر میں درخواست دیں، جس میں کھاتا کھولا گیا ہے۔ اگر ملازم کی درخواست کے بغیر ہی مالک نے کھاتا کھولا تھا، تو رقم کی واپسی مالک کے ذریعے ہی ہو سکتی ہے۔

ایسے مالکان، جنہوں نے اپنے ملازموں کے کھاتے اپنے پاس کھول رکھے ہیں، وہ اپنے ملازموں کو براہِ راست رقم لوٹا دیں گے۔ ایسے مالکان اِس طرح لوٹائی گئی رقم ڈپازٹ قبول کرنے والے اس دفتر سے حاصل کر سکتے ہیں، جس میں انہوں نے اپنا کھاتا کھول رکھا ہے۔

وزارتِ خزانہ

بھارت سرکار

ملک کے مایۂ ناز ادیبوں کے لکھے ہوئے دلچسپ شاہکار

آج کی بات آپ کے محبوب افسانہ نگار جناب جگدیش بل کے دلچسپ بلند پایہ افسانوں کا حسین مجموعہ جس کو پڑھ کر دلربا قہقہوں اور آنسوؤں کو آپ اپنے قہقہوں اور اپنے آنسو سمجھنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے

جو عورت ننگی ہے نامور فنکار رام لعل کی رومان پرور اور تلخ کہانیوں کا حسین مجموعہ۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

میرے سپنے نامور افسانہ نگار فاتون پروفیسر کرشنا کماری ایم اے کے بہترین دلچسپ رومانی افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت فی جلد صرف تین روپے۔

سنگھار کمرے میں پروفیسر کرشنا کماری ایم اے کے بہترین دلچسپ رومانی افسانوں کے اس مجموعے کے ہر صفحے پر جذبات کا ایک محشر انگڑائیاں لے رہا ہے۔ قیمت دو روپے

دہکتی رگیں ہر افسانے میں جوانی کا اضطراب ہے، حسن کی بجلی ہے عشق کی بیقراری ہے مصنفہ جناب شمس مظفر پوری۔ قیمت فی جلد دو روپے۔

ایک حمام میں تین ننگے زندگی کی عریاں تصویریں۔ وقت کی دہکتی ہوئی رگ پر سعید امرت کی فنکارانہ ضرب۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

کالی راتیں سعید امرت کے افسانوں کا تازہ ترین مجموعہ۔ تشنہ جوانیوں کے اندھے جذبات کی ترجمان۔ بہکے ہوئے بڑھاپے کی ہوسناکیوں پر طنز ہیں اور کالی راتوں میں رینگنے والے گناہوں پر ضرب کاری ہیں۔ قیمت فی جلد تین روپے۔

یہ لڑکیاں رنگ رنگ کی شوخ و شنگ لڑکیوں کے جذبات و احساسات کی تصویریں۔ اختر ملیح آبادی کے افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت فی جلد تین روپے۔

عورت ایک پہیلی کیا عورت واقعی ایک پہیلی ہے؟ سمجھ میں نہ آنے والی پہیلی؟ اس کا جواب آپ راج کنول کے سولہ دلکش رومانی افسانوں میں پائیں گے قیمت فی جلد صرف تین روپے۔

پوسٹ مارٹم عرش ملسیانی کے مزاحیہ افسانوں اور مضامین کا حسین و جمیل مجموعہ جس میں مسکراہٹوں اور قہقہوں کی ایک دنیا آباد ہے۔ قیمت سوا دو روپے۔

سیاہ تاج محل موہن یادو کے افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت تین روپے۔

فردوس اردو ناول نگاری کی تاریخ میں ایک قابل قدر اضافہ [illegible] اس کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گیا اور اب دوسرا ایڈیشن [illegible] کے اہتمام سے نہایت آب و تاب سے شائع کیا گیا ہے۔ قیمت فی جلد [illegible]

۱۹۵۷ء کی دلی جناب ہیش سیال نے اس ہی تاریخی [illegible] کو ایک پر کیف داستان کے روپ میں پیش کیا ہے۔ جس میں کہانی [illegible] رنگینیوں ہی سے نہیں، جذبۂ حب الوطنی، ایثار، اخوت و محبت اور [illegible] کے چشموں سے بھی سیراب ہوں گے۔ دلی کی ٹکسالی زبان [illegible] لینے والی زبان کی حلاوت آپ کو جناب ہیش سیال ہی کے [illegible] گے۔ کیونکہ یہ ان کی اپنی مادری زبان ہے۔ قیمت فی جلد صرف تین روپے۔

ڈارلنگ جناب نریش کمار شاد کے منتخب [illegible] افسانوں کا بے مثل و حسین و جمیل مجموعہ۔ قیمت دو روپے۔ ۵۰ نئے پیسے۔

سرخ حاشیے اردو کے مشاہیر ادیبوں کے دلچسپ لطیفے۔ قیمت دو روپے پچھتر نئے پیسے۔

راکھ تلے غیر ملکی افسانہ نگاروں کے [illegible] افسانے ہندوستانی لباس میں۔ قیمت دو روپے۔

ماں میکسم گورکی کے شہرۂ آفاق ناولٹ کا ترجمہ۔ قیمت ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے۔

سیاہ پوش خاتون یہ ایک دلچسپ اور ولولہ انگیز ناول ہے جو بیک وقت رومانی بھی ہے اور جاسوسی بھی۔ ایک پُراسرار سیاہ پوش خاتون کی کہانی [illegible]

شہر دل جناب محسن زیدی کی غزلوں کا حسین انتخاب۔ محسن زیدی نے [illegible] کو آرزوؤں کی نوخیز کلیوں سے سجایا ہے۔ قیمت صرف دو روپے۔

سفینہ و ساحل جناب عزیز وارثی کا مجموعۂ کلام ان کی شاعری میں [illegible] قوت اور دلآویزی ہے کہ نسلوں تک فراموش نہ کیا جا سکے گی۔ قیمت صرف [illegible]

گل رعنا جناب برج لال جگی رعنا کا تازہ مجموعۂ کلام جو موجودہ دور کی بہترین خوبیوں سے مزین ہے جس کے مطالعہ کے بعد آپ یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ گل رعنا واقعی بہترین شعری مجموعہ ہے۔ قیمت [illegible]

پتہ:- رسالہ بیسویں صدی دہلی نمبر ۲

انسان!

انور علیگی

نور منزل، رسل گنج، علی گڑھ

۵ نومبر ۱۹۶۲ء

محترمی! تسلیم

جب آپ افسانہ پڑھتے پڑھتے آخری سطروں پر آئیں گے تو چونک اٹھیں گے ——— ارے یہ کیا، یہ تو میرا آٹوگراف ہے ——! جی ہاں یہ آپ ہی کا آٹوگراف ہے۔ جو آپ نے میرے دوست تنویر خیر کو دیا تھا۔ آپ کے آٹوگراف سے متاثر ہو کر میں نے یہ افسانہ لکھا ہے۔ دیکھئے کیسا ہے۔

آپ کا ——— انور علیگی

اُڑتے ہوئے کوّے کے منہ سے چُرائی ہوئی روٹی کا ٹکڑا گر پڑا۔

اور وہ ٹکڑا چار ہاتھ پاؤں والے جسم کے سینے پر گرا جو برہنگی کے وسط میں لیٹا ہوا تھا۔

کوّے نے جب دیکھا کہ میری لذیذ غذا انسان کے سینے پر جا پڑی ہے تو وہ پریشان ہو گیا۔

لگا کائیں کائیں کرنے۔

"اے میری قوم کے لوگو! ——— آؤ ——— آؤ ——— دیکھو میری روٹی ایک انسان کے سینے پر جا پڑی ——— ہائے! اب میں کیا کروں، روٹی کیسے حاصل کروں؟"

کوّے کی کائیں کائیں سُن کر دو چار کوّے فوراً اُس کی مدد کو آ گئے۔

"کیا بات ہے رے؟"

"میری روٹی ——— میری روٹی ——— بھیا!"

وہ تقریباً روتا ہوا بولا۔

"کہاں ہے تیری روٹی ——— ارے روتا کیوں ہے، تیری روٹی ملے گی، ضرور ملے گی! ——— بتا کہاں ہے؟"

ایک جوان کوّے نے اُس کی ہمت بندھائی۔

"وہ دیکھو ——— اُس انسان کے سینے پر!"

"یہاں گری کیسے؟"

"کچھ نہ پوچھو۔ قسمت خراب تھی۔ اتنی مشکلوں سے تو چُرا لایا تھا سو وہ بھی جا پڑی۔ اگر مجھے یہ روٹی نہ ملی تو میں مر جاؤں گا بھیا! ——— مجھے بہت زور کی بھوک لگی ہے ———!"

کوّا پھر رونے لگا۔ دوسرے کوّے اُسے روتا چھوڑ کر پیچھے اُس انسان کے قریب پہنچ گئے۔ جو برہنہ چاروں خانے چت پڑا تھا۔

اور لگے ترکیب سوچنے۔

اچانک ایک بوڑھے کوّے کی سمجھ میں ایک ترکیب آ گئی۔

وہ اُچک کر بولا۔

"آؤ ——— ہم ایک ساتھ مل کر شور مچائیں"

"کیوں؟"

"جب یہ ہماری آواز سُنے گا تو برداشت نہ کر سکے گا اور ہمیں مارنے دوڑے گا۔ جب یہ ہمیں مارنے دوڑے گا تو روٹی کا ٹکڑا اُس کے سینے سے گر جائے گا اور ہم روٹی کا ٹکڑا لے کر چمپت ہو جائیں گے!"

سب نے دل کھول کر اس ترکیب کی داد دی۔

اور وہ بوڑھا کوّا بھول کر کیا ہو گیا۔

وہ لگا کائیں کائیں کرنے۔

اُس کی دیکھا دیکھی دوسرے کوّوں نے بھی کائیں کائیں شروع کر دی

اور اشارے سے اُس کوّے کو بلا کر اُسی کائیں کائیں میں شامل کر لیا جو بیچارہ

بیٹھا تھا۔
کوّے کائیں کائیں کرتے رہے۔
لیکن اُس انسانی جسم میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔
کوّوں نے اور زور لگایا۔
اُس انسان نے آنکھ تک نہ کھولی۔
کوّے پیچھے ہٹ گئے۔
لیکن وہ بے جان لاش کی طرح پڑا رہا۔
"یہ کیا بدتمیزی ہے —— یہ تو اُٹھتا ہی نہیں؟"
بڑے کوّے نے ہانپتے ہوئے کہا۔
"شاید نیند گہری ہے۔"
"نہیں، نہیں یہ بہانہ کر رہا ہے۔"

- عورتوں سے حسنِ معاشرت سے گزران کرو۔ (قرآنِ پاک)
- عورتوں کا بھی تم پر ایسا ہی حق ہے جیسا تمہارا حق مردوں پر ہے۔ (قرآنِ پاک)
- عورت کی عزت شریف طبیعتیں ہی کرتی ہیں اور اُس کی اہانت کمینے لوگوں کے سوا کوئی نہیں کرتا۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- عورتوں میں سب سے اچھی عورت وہ ہے کہ اُس کا شوہر اُسے دیکھے تو خوش ہو جائے۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- دین خزانہ ہے اور علم اُس کا راستہ ہے۔ (حضرت مولا علی کرم اللہ وجہہٗ)
- خوش خو ہونا تمام حکمتوں کا خلاصہ ہے۔ اِس سے امن و سلامتی حاصل ہوتی ہے اور دلوں میں محبت نشو و نما پاتی ہے۔ (حکیم بقراط)
- قوانینِ قدرت سے بغاوت کرنے والے، انتقامِ قدرت سے اپنے کو محفوظ نہ سمجھیں۔ (یحییٰ برمکی)

"تو پھر کیا کیا جائے؟"
"اِس کے پاؤں سر پر ٹھونگیں ماری جائیں۔"
"لیکن ٹھونگیں مارے گا کون؟"
"میں ماروں گا!"

ایک نوجوان کوّے نے ہمت کر لی اور آہستہ آہستہ پھدکتا ہوا اُس کی طرف بڑھا۔
وہ بڑھتا جاتا اور گردن اُچکا اُچکا کر اُس کی آنکھوں کو دیکھتا جاتا تھا۔
آنکھیں بالکل بند تھیں۔
ہمت کر کے کوّے نے اُس کے سر پر ایک ٹھونگ ماری اور اُڑ کر جا بیٹھا۔
دوسری ٹھونگ ماری —— وہ قدم پیچھے ہٹ گیا۔
کوئی حرکت نہ ہوئی۔
تیسری ٹھونگ ماری اور وہیں بیٹھا رہا۔
کوئی حرکت نہ ہوئی۔
پھر اُس نے لگاتار کئی ٹھونگیں ماریں اور گردن اُچکا کر دیکھا۔
خاموشی تھی!
اُس کی ہمت بڑھی۔ وہ اُچھل کر ٹانگوں پر، رانوں پر آیا، پیٹ پر آیا، پھر فوراً سینے پر آ گیا، روٹی منہ میں دبائی اور دو تین بار خوشی میں اُس کے سینے پر اُچھلا اور پھر اُڑ گیا۔
اُس کے ساتھ ہی سب کوّے اُڑ گئے اور دیوار پر جا بیٹھے۔ نوجوان کوّے نے روٹی کا ٹکڑا اُس بھوکے کوّے کے منہ میں دے دیا۔
اور سب کائیں کائیں کرتے اُڑ گئے۔

کالو نے جب ایک انسان کو اِس طرح گلی میں برہنہ پڑا دیکھا تو اُسے بہت تعجب ہوا۔
اُس نے چاروں طرف گھوم کر اُسے دیکھا۔
اُس کے پاؤں چاٹے، اُس کی رانوں پر زبان پھیری، پیٹ پر تھوتھنی رگڑی اور جب اُس کے دماغ میں اُس کے یہاں لیٹنے کا مقصد سمجھ میں نہ آیا تو اُس نے ٹانگ اُٹھا کر اُس کے منہ پر آبِ حیات کی بارش شروع کر دی۔

گلی میں وہ برہنہ جسم اب بھی پڑا تھا۔
گلی سنسان تھی، خاموش تھی۔
برہنہ جسم سے کچھ دُور گلی کے نکڑ پر، سہ منزلہ عمارت کے دروازے پر کوئی دستک دے رہا تھا۔
کچھ منٹ بعد دروازہ کھلا۔
کسی نے گردن باہر نکالی، اُس کے پھٹے پُرانے کپڑے دیکھ کر اُس نے ناک بھوں نکالیں۔

"کیا ہے؟"

"مجھے سیٹھ جی سے ملنا ہے۔"

اُس کے لہجے میں ملائمت تھی۔

"تمہارا نام؟"

"سیٹھ جی سے کہنا محلّے کا ایک غریب آدمی آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

"مجھے نام بتاؤ۔"

"نام بتانے سے فائدہ؟"

"میں مالک سے کیا کہوں گا کہ کون آیا ہے۔"

"وہ مجھے نہیں جانتے ـــــ غریب آدمی کو کوئی نہیں جانتا۔"

"تو پھر میں اُن سے کیا کہوں؟"

"یہی کہ محلّے کا ایک آدمی آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

"اچھا ـــــ بیٹھ جاؤ۔"

وہ پلٹ کر اندر چلا گیا۔

اور وہ سوچنے لگا کہاں بیٹھوں، آس پاس زمین کے سوا بیٹھنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔

وہ کھڑا ہی رہا۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا۔

"سیٹھ جی نے پوچھا ہے کیا کام ہے؟"

"کام میں اُنہیں کو بتاؤں گا۔"

دروازہ پھر بند ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد ایک دوسرا دروازہ کھلا۔

"آؤ ـــــ بیٹھو، مالک ابھی آتے ہیں۔"

وہ ایک کونے میں کرسی پر بیٹھ گیا۔

سیٹھ جی نمودار ہوئے۔

وہ کھڑا ہو گیا۔

"کیا بات ہے؟"

"وہ مر گیا!"

"کون؟"

"روڈ انسپکٹر!"

"کون روڈ انسپکٹر؟"

"ایک نیم پاگل فقیر، جسے لوگ روڈ انسپکٹر کہتے تھے۔"

"تو پھر ـــــ؟"

"اُس کی لاش آپ کی عمارت کے قریب پڑی ہے۔"

"تو میں کیا کروں؟"

"اُس کے کریا کرم کا انتظام۔"

"وہ مسلمان تھا؟"

"نہیں۔"

"وہ ہندو تھا؟"

"نہیں۔"

"پھر کون تھا؟"

"انسان!"

"تم جھوٹ بولتے ہو۔ وہ مسلمان تھا!"

"نہیں، نہیں، وہ صرف انسان تھا۔"

"نہیں وہ مسلمان تھا، یہ بات اُس کا جسم دیکھ کر ثابت ہو جاتی ہے۔"

"میری مانئے ـــــ وہ صرف انسان تھا۔"

"بکواس بند کرو، وہ مسلمان تھا، ہم اُس کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔ ہم اُن مسلمانوں کے لئے کچھ نہیں کر سکتے، جنہوں نے اِس دیش کو دو حصوں میں بانٹ دیا ـــ جاؤ ـــ نکل جاؤ

- ہم دولت سے ہم نشیں حاصل کر سکتے ہیں دوست نہیں۔
- ہم دولت سے نرم بستر حاصل کر سکتے ہیں نیند نہیں۔
- ہم دولت سے غذا حاصل کر سکتے ہیں اشتہا نہیں۔
- ہم دولت سے کتابیں حاصل کر سکتے ہیں علم نہیں۔

(بقراط)

- اپنی ضرورتوں کو محدود کر لینا ہی بڑی مالداری ہے۔

(بطلیموس)

- نیکی کا آغاز مشکل اور انجام خوشگوار ہے بدی کی ابتدا لذیذ اور انجام تلخ ہے۔ (فرینکلن)
- بُرے کام صرف اِس لئے بُرے نہیں کہ وہ ممنوع ہیں بلکہ اِس لئے کہ وہ مُضر بھی ہیں۔ (فرینکلن)
- دولت مند بننے کا راز یہ ہے کہ انسان جتنا کمائے اُس سے کم خرچ کرے۔ (فرینکلن)
- دل آزاری سب سے بڑی معصیت ہے (حکیم بو علی سینا)

"میاں سے! —— اُس کی لاش چیل کوّوں کے آگے ڈال دو!"
وہ سر جھکائے باہر نکل آیا۔

برہنہ لاش پر ایک اُچٹتی سی نظر ڈال کر وہ آگے بڑھ گیا۔ گلی میں اُس کے قدموں کی آواز گونج رہی تھی۔

وہ آہستہ آہستہ بڑھتا رہا۔

جس بلڈنگ کے آگے وہ رُکا وہ عارف محل تھا —— برآمدے میں لگے ہوئے گھنٹی کے بٹن پر اُس نے دھیرے سے ہاتھ رکھ دیا۔

دور کہیں گھنٹی کی آواز سنائی دی۔

پورے دو منٹ بعد کوئی دروازے پر آیا۔

"مجھے صاحب سے ملنا ہے"

اُس نے اُس کے پوچھنے سے پہلے ہی کہہ دیا۔

"کارڈ کہاں ہے؟"

"میرے پاس کوئی کارڈ نہیں —— صاحب سے کہنا کہ محلے کا ایک غریب آپ سے ملنے آیا ہے۔"

"اچھا ٹھہرو۔"

وہ اندر چلا گیا۔

کچھ دیر بعد آیا تو بولا۔

"اس وقت صاحب سے ملاقات نہیں ہو سکتی پھر آنا۔"

"کیوں؟"

"یہاں کیوں کا جواب نہیں دیا جاتا۔"

"لیکن مجھے اسی وقت ملنا ہے۔"

"کیوں؟"

"مجھے کام ہے۔"

"بہت ضروری کام ہے۔"

"ہاں بہت ضروری!"

"اچھا ٹھہرو۔"

وہ اندر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد نکلا تو بولا۔

"صاحب آتے ہیں، تم ڈرائنگ روم میں بیٹھو۔"

وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا۔

صاحب آئے تو وہ کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھو۔"

"آپ کی گلی میں ایک ننگی لاش پڑی ہے۔"

"کون مر گیا؟"

"روڈ انسپکٹر۔"

"کون روڈ انسپکٹر؟"

"ایک نیم پاگل فقیر۔"

"ہم —— تم کون ہو؟"

"ایک ادیب —— ایک غریب آدمی۔"

"کیا چاہتے ہو؟"

"کفن کے لئے پیسے۔"

"کس سے؟ —— مجھ سے؟"

"ج —— جی!"

وہ کانپ گیا۔

"قاسم!"

صاحب زور سے چیخے۔

ایک مسٹنڈا آدمی آواز پر دوڑا آیا۔

"جی سرکار!"

"صاحب کو باہر پھینک دو —— یہ کفن کے لئے روپے لینے آئے ہیں —— یہ اُس آدمی کے لئے کفن چاہتے ہیں، جو ہندو تھا۔"

"نہیں، نہیں وہ مسلمان تھا!"

"بکواس! وہ ہندو تھا! اُس کی کلائی پر گُدے ہوئے وہ الفاظ دیکھو، جن سے ہندو مذہب کی بُو آتی ہے۔"

"اگر وہ ہندو تھا بھی تو کیا ہوا؟"

"اچھا ——؟ کچھ نہیں ہوا ——؟ تم چاہتے ہو میں اُس ہندو کے کفن کے لئے پیسے دوں، جس کی قوم ہمیں غدار کہتی ہے۔ ہمیں یہاں سے نکال دینا چاہتی ہے۔ ہمیں تباہ و برباد کر دینا چاہتی ہے! ایسی قوم کے فرد کے لئے ہم سے کچھ نہ ہوگا۔"

"قاسم صاحب کو باہر پھینک دو!"

غریب ادیب کو باہر پھینک دیا گیا۔

وہ لنگڑا ہوا لاش کے قریب آیا۔
اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا
اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے
لاش کو اُس نے کندھے پر لادا اور ایک طرف چل دیا۔
وہ چلتا رہا، چلتا رہا
لیکن مندر سے، بہت دور سے
ایک آواز آ رہی تھی، جیسے کوئی گا رہا ہو۔
آہستہ آہستہ ——— ایک عجیب سا گیت
"ہندو بہت ہیں، مسلمان بہت ہیں، مگر انسانوں کی کمی ہے۔"

مضمون نگار حضرات

سے درخواست ہے کہ "بیسویں صدی" کے لئے مضامین لکھتے وقت ہمیشہ اختصار سے کام لیا کریں۔ بغرضِ اشاعت موصول ہونے والے مضامین میں سے مختصر افسانوں کو طویل افسانوں پر ترجیح دی جاتی ہے۔ اور طویل افسانے مضمون نگاروں کو واپس کر دیئے جاتے ہیں۔ غیر مطبوعہ مضامین کی واپسی کے لئے مضمون کے ساتھ ٹکٹ بھیجنے کی بجائے اپنا پورا پتہ لکھا ہوا پوسٹ آفس کا لفافہ بھیجیں۔ ورنہ ہم مضمون کی واپسی سے قاصر رہیں گے۔ مضمون کے خاتمے پر لفظ "غیر مطبوعہ" ضرور لکھیئے۔

آزاد نظم

مستقبل

——— نازش انصاری (علیگ) ———

اک بھیانک سیاہ رات کو
ایک معصوم بچے کا منہ چوم کر
زندگی نے کہا
میں کہ تیرے لئے غم کا پیغام ہوں
غم بھی وہ غم کہ جس کے کئی نام ہیں
اک غمِ زندگی
اک غمِ ملک و قوم
اک غمِ ہندوستاں
لیکن ان سب پہ حاوی ہے غم پیار کا
جو مقدر ہے انسان کا
اک مقدس امانت یہ فطرت کی ہے
اس کا پانا کبھی غم، اس کو کھونا بھی غم
لیکن احساسِ مستقبلِ زندگی، تیرے معصوم دل کو نہیں۔
کاش تو جانتا! تیرے دامن میں تیرے لئے کوئی راحت نہیں، کاش تو جانتا!!
کہتے کہتے یہ سب زندگی رو پڑی
خلافِ توقع وہ کمزور پھول
مسکرانے لگا۔

●●

افواہیں

جہاں گرد کے قلم سے

جہاں گرد چاروں کھونٹ گھومتا ہے۔ افواہیں جمع کرتا ہے۔ اُسے افواہیں جمع کرنے کا جنون ہے۔۔ یہ جنون اِس لئے ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ جنون کے پیچھے ہوش ہوتا ہے۔ افواہوں کے پیچھے تلخ حقیقتیں ہوتی ہیں۔

ایک نمکین افواہ

افواہ ہے کہ ہند سرکار اس امر پر سنجیدگی سے غور کر رہی ہے کہ چینی کے کرائسیس کا کوئی مستقل حل تلاش کیا جائے۔ چنانچہ ایک تجویز ہے کہ ملک بھر میں چینی کے استعمال کو ممنوع قرار دے دیا جائے اور اس کی بجائے نمک کے استعمال کو فروغ دیا جائے۔

سرکار کی خفیہ تجاویز کسی نہ کسی طریقے سے اکثر فاش ہو جاتی ہیں۔ یہ تجویز بھی فاش ہو گئی اور کھانڈ کے کارخانہ داروں تک پہنچ گئی۔ اُنہوں نے فیصلہ کیا ہے کہ چینی کے کارخانے چونکہ بند کرنے پڑیں گے اس لئے وہ چینی کی بجائے نمک کا کاروبار شروع کر دیں گے۔

یعنی لوگوں کو چینی کے بعد اب نمک کے کرائسیس کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے۔

خوفناک سرکلر

صدر کانگرس شری کامراج نے تمام ماتحت کانگرس کمیٹیوں کو ایک سرکلر ارسال کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ بیشتر کانگرسی چونکہ نالائق ہیں اور انہیں کانگرس کے آدرشوں کا ذرا بھی علم نہیں ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ کانگرس کے ہر ممبر کا ایک ٹیسٹ پیپر لیا جائے۔ جو کانگرسی اس امتحان میں پاس ہو جائے اسے کانگرس کی ممبری کے اہل سمجھا جائے۔

سرکلر کے ہمراہ ٹیسٹ پیپر بھی بھیجا گیا ہے۔ جس میں مندرجہ ذیل سوالات حل کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

۱۔ سوشلزم کی مندرجہ ذیل اقسام پر الگ الگ مختصر نوٹ لکھو۔

مارکسی سوشلزم۔ ہندو سوشلزم۔ سردارے سوشلزم۔ بھارتیہ سوشلزم۔ گاندھیائی سوشلزم۔ پرجا سوشلسٹوں کا سوشلزم۔ مرارجی ڈیسائی سوشلزم۔ جمہوری سوشلزم سوشلسٹ پیٹرن آف سوسائٹی۔ سرمایہ دارانہ سوشلزم۔ بھرشٹاچاری سوشلزم۔ آدرش وادی سوشلزم۔ اور صرف سوشلزم۔

۲۔ آپ کی تعلیم کتنی ہے۔ جنم کے بعد آپ نے کوئی کتاب پڑھی ہے یا پچھلے جنم کے مطالعہ پر ہی گزارا کر رہے ہیں۔

۳۔ اگر آج کانگرس پارٹی سے حکومت چھن جائے تو کیا پھر بھی آپ کانگرس کے ممبر رہنا پسند کریں گے؟

۴۔ کیا وجہ ہے کہ باوجود کانگرس کے سوشلسٹ پروگرام کے سرمایہ دار زیادہ امیر ہو رہے ہیں اور غریب بدستور غریب ہیں۔

۵۔ اگر ۱۹۴۲ میں ایک روٹی ایک پیسے میں ملتی تھی تو ۱۹۶۲ میں وہ آنے میں کیوں بکنے لگی ہے۔ اور دس برس بعد کتنے میں ملا کرے گی۔ روٹی کی یہ مہنگائی خوشحالی کی علامت ہے یا بدحالی کی۔

۶۔ ریشم کا کپڑا کھدر کے کپڑے کے مقابلہ پر سستا کیوں مل رہا ہے۔ گاندھی جی کی کسی کتاب کے حوالے سے ثابت کرو کہ کھدر افلاس کی علامت ہے۔

۷۔ آپ کے علاقہ میں کتنے فی صدی کانگرسی کرپٹ ہیں؟ پورے نام اور پتے لکھئے۔ اور اگر کوئی بھی کرپٹ موجود نہیں ہے تو کانگرس پارٹی کی مقبولیت کم کیوں ہو رہی ہے۔

نوٹ:۔ ۱۔ پرچہ حل کرتے وقت نقل نہ کی جائے تو بہتر ہے۔ کیونکہ ایک دوسرے کی نقل کرنے سے کانگرس میں کرپشن بڑھی ہے۔

۲۔ پاس ہونے کے لئے کسی کی سفارش نہیں مانی جائے گی۔ سفارش پہنچانے والا چاہے امتحان میں پاس ہی کیوں نہ ہو اُسے فیل سمجھا جائے گا۔

بھرشٹاچار یونین

نئی دہلی کے سرکردہ حلقوں میں یہ افواہ پھیلی ہوئی ہے کہ ۲۶ جنوری کو دہلی میں ایک

سمینار کیا جا رہا ہے۔ جس کا نام آل انڈیا بھرشٹاچار ایکسپرٹس سیمینار ہوگا۔ اس سمینار میں ہندوستان بھر کے قرپٹ اور ماہر بھرشٹاچاری نمائندے شرکت کریں گے۔ اور بھرشٹاچار کے متعلق اپنے کارناموں پر روشنی ڈالیں گے۔ غیر ممالک سے بھی کچھ کرپٹ ڈیلی گیٹ اس سمینار میں شرکت کریں گے جو بتائیں گے کہ دوسرے ممالک کے مقابلہ پر ہندوستان کے کرپٹوں کی کیا پوزیشن ہے اور انہیں مزید ترقی کے لئے کونسے اقدامات کرنے چاہئیں۔

یہ سیمینار خفیہ ہوگا کیونکہ اس میں بڑے بڑے کرپٹ سرکاری افسر بھی شرکت کریں گے اور اُن کے بیانات کو خفیہ رکھا جائے گا تاکہ کرپشن کے اعترافات کے بعد اُن کی سرکاری نوکری خطرہ میں نہ پڑ جائے۔

اِس سیمینار میں یہ فیصلہ بھی کیا جائے گا کہ ملک کے ہر صوبہ میں ایک ایک بھرشٹاچار ایکسپرٹ کمیٹی قائم کی جائے جو صوبہ کے کرپٹ ممبروں کی رہنمائی کرتی رہے اور کرپشن کے نئے نئے طریقے بھاتی رہے۔

سُنا ہے ملک کے بہت سے کانگریسیوں نے اِس سیمینار میں شرکت کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اُمید کی جاتی ہے کہ سیمینار میں ان کی اکثریت ہو جائے گی اور آل انڈیا بھرشٹاچار کمیٹی میں وہ برسرِ اقتدار آ جائیں گے۔

مہنگائی ختم

قریب قریب سرکاری حلقوں میں یہ افواہ بڑے چسکے لے لے کر اُڑائی جا رہی ہے کہ ہند سرکار نے مہنگائی کا ایک تیر بہدف علاج تلاش کر لیا ہے۔

اِس علاج کی رو سے سرکاری ملازموں کی تنخواہوں میں ہر مہینے دس فیصدی کا اضافہ کر دیا جائے گا۔ چنانچہ فروری ۱۹۶۴ سے ہر ملازم کو دس فیصدی زیادہ تنخواہ ملے گی۔ گورنمنٹ اشیائے ضرورت مہنگا کرنے والے تاجروں کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لے گی بلکہ مارکیٹ میں اُن کے ساتھ کھلا مقابلہ کریگی اور دیکھے گی کہ وہ کس حد تک اشیاء کو مہنگا کر سکتے ہیں۔ سرکار کو یقین ہے کہ مہنگائی اِس رفتار سے ہرگز نہیں بڑھ سکتی جس رفتار سے وہ تنخواہیں بڑھائے گی۔ اور آخر کار مہنگائی میں اضافہ کرنے والے شکست کھا جائیں گے۔

چنانچہ اس افواہ سے سرکاری ملازموں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے کہ اب مہنگائی کے مستقل خوف سے نجات پا جائیں گے اور ممکن ہے اِس طرح ان کا کیریکٹر بھی بلند ہو جائے۔ اور وہ رشوت اور ہیرا پھیری سے بھی خلاصی حاصل کر سکیں۔

ایک لاکھ کے شہر

دہلی میں افواہ پھیلی ہوئی ہے کہ بڑے بڑے شہروں کی آبادی کم کرنے پر غور کیا جا رہا ہے۔

تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ بڑے شہروں میں انسان کی مسرت اور تسکین کا سامان مہیا کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ بجلی، پانی، ہسپتال، خوراک، ٹریفک، مکان، تعلیم غرض ہر معاملہ میں بے چینی پیدا ہو گئی ہے۔ اِس لئے کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی کہ شہروں کی آبادی کو بڑھایا جائے۔ شہروں کی آبادی بڑھتی ہے تو دکھ بھی بڑھتے ہیں اس لئے شہروں کی آبادی کم کر دینی چاہیئے۔

چنانچہ تجویز ہے کہ ہر بڑے شہر کی آبادی ایک لاکھ سے زیادہ نہیں ہونی چاہیئے باقی آبادی کے لئے الگ الگ شہر بنائے جائیں۔ چنانچہ دہلی کی چوبیس لاکھ آبادی کے لئے چوبیس شہر بنائے جائیں گے۔ اِسی طرح بمبئی، مدراس، کلکتہ، لکھنؤ وغیرہ۔ بڑے شہروں کی آبادی کو بھی نکال دیا جائے گا۔ اور ان کے لئے قرب و جوار کے گاؤں اور قصبوں میں ایک ایک لاکھ کے نئے شہر بسائے جائیں گے۔

خیال کیا جاتا ہے کہ اس طرح بہت سے دیہات اور قصبے بھی ختم ہو کر بڑے بڑے شہر بن جائیں گے۔ نظم و نسق بہتر ہو جائے گا اور بڑے شہر کے باشندوں کو دیہاتیوں پر جو برتری حاصل ہے وہ ختم ہو جائے گی۔

قیاس ہے کہ ۱۹۶۵ء تک ہندوستان میں ایک ایک لاکھ کی آبادی کے ہزاروں شہر پیدا ہو جائیں گے۔ دیہات اور قصبوں کا نام و نشان مٹ جائے گا اور یہ ملک ایک ایک لاکھ والے شہروں کا ملک بن جائے گا۔

انسان کی بولی

جلد ہی یو۔این۔او میں پانچ بڑی طاقتوں کی طرف سے ایک ہنگامہ خیز ریزولیوشن پیش ہونے والا ہے کہ ساری دنیا کی ایک ہی زبان بنا دی جائے۔

اِس ریزولیوشن کا مقصد یہ بیان کیا جاتا ہے کہ آج ساری دنیا ایک دوسرے کے قریب آ چکی ہے۔ ایک ملک کا باشندہ دوسرے ملک میں یوں بلا تکلف چلا جاتا ہے۔ جیسے اُس کی سسرال ہو۔ ساری دنیا امن و امان سے رہنا چاہتی ہے۔ روس اور امریکہ جیسے پرانے دشمن تک ایک ساتھ مل کر چاند تک جانا چاہتے ہیں۔ اِس لئے اس بڑھتے ہوئے میل ملاپ میں جو سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ وہ زبان ہے۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ دنیا کا ہر انسان ایک دوسرے سے بولتے وقت ایک ہی زبان استعمال نہ کرے۔ تاکہ اس سے یگانگت اور بھائی چارہ کو تقویت مل سکے۔

لہٰذا فیصلہ کیا جانے والا ہے کہ دنیا میں صرف ایک ہی زبان کو رائج کیا جائے وہ کونسی زبان ہو اس کا فیصلہ "ٹاس" سے کیا جائے گا۔ یعنی اگر تمام ممالک اس خیال پر

حق ہوگئے کہ ایک مشترکہ زبان ہونی چاہیئے۔ یو۔ این۔ او کے کھلے اجلاس میں ایک صندوق رکھا جائے گا۔ اس صندوق میں دنیا میں بولی جانے والی ہر زبان کی پرچی ڈال دی جائے گی اور کسی ننھے سے معصوم بچے سے کہا جائے گا کہ ان میں سے ایک پرچی نکال لے دنیا کے نصیب میں جو زبان لکھی ہو گی اُسی زبان کی پرچی نکل آئے گی۔

عین ممکن ہے یہ زبان اُردو ہو یہ بھی ہو سکتا ہے پنجابی زبان ہو۔ اگر ایسا ہوا تو دنیا کا ہر انسان پنجابی بولتا ہوا نظر آئے گا۔ اور ماسٹر تارا سنگھ کو پنجابی صوبہ کی بجائے پنجابی دنیا مل جائے گی۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ پنجابی زبان کی پرچی نہ نکلے بلکہ عربی زبان کی پرچی نکل آئے، تو ہر پنجابی باشندہ عربی بولتا ہوا نظر آئے گا۔

دُودھ کی نہریں

چائے اور کافی کی صنعت کو جلد ہی نیشنلائز کیا جانے والا ہے۔

مگر اس نیشنلائزیشن کے پیچھے ایک عظیم تبدیلی وجود میں آنے والی ہے۔ اور وہ یہ کہ چائے اور کافی کی تمام پیداوار غیر ممالک کو بھیج دی جائے گی۔ اور اُس سے جو روپیہ حاصل ہوگا۔ اُس سے ہندوستانیوں کو مفت دودھ پلایا جائے گا۔

تجویز ہے کہ انڈیپنڈنٹ ہندوستان کے تمام چائے خانوں اور کافی ہاؤسوں میں چائے اور کافی پلانا ممنوع قرار دے دیا جائے اور چائے کے پیالے کی بجائے دودھ کے پیالے پلائے جائیں۔ اور دودھ کے ہر پیالے کا نرخ چائے کے پیالے کے نرخ کے برابر وصول کیا جائے۔ اس سے چائے خانوں کو جو گھاٹا ہوگا وہ گورنمنٹ خود ادا کرے گی ——

دراصل گورنمنٹ ہندوستان کے باشندوں میں چائے کی عادت دور کرا کر دودھ کی عادت ڈالنا چاہتی ہے تاکہ وہ اس روایت کو صحیح ثابت کر سکے کہ کسی زمانہ میں ہندوستان میں دودھ کی نہریں بہا کرتی تھیں۔

اگر یہ تجویز کامیاب ہو گئی تو اسے شراب خانوں پر بھی لاگو کر دیا جائے گا یعنی شراب کی بوتلوں کی بجائے دودھ کی بوتلیں فروخت ہوا کریں گی۔ اور اس طرح امتناع شراب کی سکیم کو جو اب تک ناکام رہی ہے، کامیاب بنایا جائے گا۔

جنگل میں امن

فری تھنکرز اور مشہور سماجی سیوک ... کی سرکردگی میں جو امن جتھہ چین کی یاترا پر روانہ ہوا تھا وہ کہیں گم ہو گیا ہے اور کئی ماہ سے اس کا پتہ نہیں چل رہا کہ اُس جتھے کے ساتھ کیا معاملہ پیش آیا۔ ایک آخری اطلاع کے مطابق چین سرکار نے اسے داخلہ کی اجازت نہیں دی تھی۔ اُس کے بعد جتھے کے ممبروں پر کیا بیتی؟ اس کے متعلق کچھ علم نہیں۔ سنا ہے کچھ ہوائی جہازوں نے اڑان کر کے اُن کی کھوج لگانے کی ... ناکام رہے ...

افواہ یہ بھی ہے کہ چین کے انکار کے بعد امن جتھے کے ممبروں کا انسان پر سے اعتماد اُٹھ گیا اور وہ انسان کی بجائے جنگلی جانوروں کے ساتھ بود و باش اختیار کر چکے ہیں۔ دوسری افواہ یہ ہے کہ وہ کوہ ہمالیہ کی کسی گپھا میں تپسیا میں مصروف ہو گئے ہیں تاکہ وہ دوسروں کی آتما کو آگرشت نہیں کر سکے تو اپنی آتما ہی کو مزید شُدھ کر سکیں۔

مختصر افواہیں

۱۔ دلائی لامہ کے سونے جواہرات کے تمام صندوق چوری ہو گئے ہیں۔ افواہ ہے کہ یہ کسی چینی کی کارروائی ہے۔

۲۔ شری جے پرکاش نارائن نے کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ شری جے پرکاش نارائن نے اپنے اس فیصلہ پر حیرت کا اظہار کیا ہے۔

۳۔ ماسٹر تارا سنگھ پانچ سال کے لئے اگیات واس پر جا رہے ہیں۔

۴۔ سردار پرتاپ سنگھ کیروں چیف منسٹر پنجاب نے اپنے لڑکوں کو ہدایت کی ہے کہ وہ اپنی تمام جائداد نیشنل ڈیفنس فنڈ میں دے دیں۔

۵۔ صدر کانگرس شری کامراج نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ ہندوستان کی ساری موجودہ زبانیں سیکھیں گے۔ سب سے پہلے تو وہ ہندی سیکھ رہے ہیں۔

۶۔ جن سنگھ پارٹی ملک میں فرقہ پرستی کے خلاف تحریک جاری کر رہی ہے نتیجے کے طور پر سو فیصدی جن سنگھی پارٹی سے نکال دئے جائیں گے۔

شاہکار ناول جو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو رہے ہیں

ٹھاکر پونچھی کے لکھے ہوئے ناول

رات کے گھونگھٹ جس میں نئی تہذیب کے اُن فرشتوں کی کہانی ہے جنہیں نئے نظام کی تاریک راتوں نے جنم دیا۔ مصنف نے آج کے سماج کے حسین چہروں سے پارسائی کے رنگین گھونگھٹ اُلٹ دیئے ہیں۔ قیمت صرف دو روپے۔

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے اُن مردوں کی کہانی جو عورت کو ایسے عریاں انداز میں دیکھنے کے تمنائی ہیں جس پر سے نظریں پھسل پھسل جائیں۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

زلف کے سر ہونے تک عشق و محبت اور حُسن و شباب کی رعنائیوں اور زندگی کی مسرتوں اور حسرتوں کا سنگم۔ تین معصوم بھولی بھالی لڑکیوں اور تین بے سہارا لڑکوں کی حسین ترین کہانی۔ قیمت فی جلد صرف تین روپے۔

چاندنی کے سائے اس میں شبنم کی ٹھنڈک بھی ہے اور شعلے کی حرارت بھی۔ کتاب کو ایک بار شروع کر کے ختم کئے بغیر آپ کو چین نہ آئے گا۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

پیاسے بادل ایک پہاڑی دوشیزہ کے پیار کی کہانی۔ دلآویز رومان کی ایک درد انگیز داستان۔ قیمت دو روپے۔ ۵ نئے پیسے۔

یادوں کے کھنڈر حیات کے نشیب و فراز کا آئینہ دار ناول جس میں جذبات اور آرزوؤں کا حسین طوفان مچل رہا ہے۔ قابل مصنف نے دل کی دھڑکنوں کو ایسے رنگ و انداز سے اُبھارا ہے کہ قلبی رفاقت اور خلوص پر محبت کی تصویر نگاہوں کے سامنے جھلکنے لگتی ہے۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

وادیاں اور ویرانے سوکھے سڑے میدانوں اور سرسبز و شاداب پہاڑوں کی حسین و جمیل کہانی۔ قیمت فی جلد چار روپے۔

زنجیر ایک گناہگار لڑکی کی حسین و جمیل داستان۔ عشق و محبت کی ایک ایسی پُر پیچ رومان پرور داستان جسے پڑھ کر آپ عش عش کر اُٹھیں گے۔ جسے ذکی انور نے لکھا اور ادارہ بیسویں صدی نے شائع کیا ہے۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے

پگھلتے خواب اردو ادب کے جواں سال ادیب پروفیسر علمدی کاشمیری کا ایک دلچسپ رومانی ناول جس میں آپ کو کشمیر جنت نظیر کے حسین و دلفریب مناظر اور ان مناظر تلے ہچکی سسکتی کہانیوں کے خدوخال صاف دکھائی دیں گے۔ قیمت صرف دو روپے۔

نئے فرہاد پروفیسر شکیل الرحمٰن کا اچھوتا شاہکار ناول۔ ایک حسین و جمیل دوشیزہ کی المناک داستان۔ محنت و زر کی کشاکش کے اسٹیج پر لکھی ہوئی ایک انتہائی دلچسپ کہانی۔ قیمت صرف دو روپے۔

راہیں شباب کی فرانس کے عظیم ترین ناول نگار آبے پریوس کا غیر فانی شاہکار جس کا ترجمہ دُنیا کی تمام زبانوں میں ہو چکا ہے جس کی دس کروڑ جلدیں فروخت ہو چکی ہیں، جسے عشق و محبت کی سب سے عظیم داستان تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس ناول کی ہیروئن قلوپطرہ اور ہیلین سے بھی زیادہ حسین اور عظیم ہے۔ مترجمہ جناب مخمور جالندھری۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

طوفانِ بہار روس کے عدیم المثال ناول نگار تورگنیف کا رومانی شاہکار جس کا ترجمہ دُنیا کی بیالیس زبانوں میں ہو چکا ہے۔ جسے دُنیا کے مشہور نقادوں نے لافانی رومان قرار دیا ہے اور جسے اردو میں پہلی مرتبہ ادارہ بیسویں صدی دہلی نے شائع کیا ہے۔ مترجمہ مخمور جالندھری۔ قیمت تین روپے۔

بھیگی راتیں فرانس کے عدیم المثال ناول نگار ایمیل زولا کا مقبول ترین ناول۔ انسان میں چھپے ہوئے حیوان کا افسانہ، اپنے محبوب کیلئے محبوبہ کی ناقابلِ فراموش قربانیوں کی کہانی۔ مترجمہ مخمور جالندھری۔ قیمت فی جلد تین روپے

فرنڈموسی حقیقت اور طنز سے بھرپور عورتوں کے اس دیش کی کہانی جہاں مرد کا تصور بھی ایک جُرم تھا۔ صدیوں بعد کی فضاؤں میں پیش ہوئی ایک عجیب و غریب داستان جو اول سے آخر تک دلچسپیوں اور حیرت آفرینیوں سے لبریز ہے۔ جناب کوثر چاندپوری کا لکھا ہوا بے حد شوخ و دلچسپ ناول جو قاری کو کئی صدی آگے کی فضاؤں میں پرواز کراتا ہے۔ قیمت فی جلد محض تین روپے۔

پتہ:- رسالہ بیسویں صدی - دہلی نمبر ۶

شکر پارے

شمیم حنفی۔ ایم۔ اے

۶۸۔ ایم۔ بی۔ ہاؤس۔ الہ آباد یونیورسٹی

۲۸ مئی ۱۹۶۳ء

محترمی!

سُنا ہے اگلے وقتوں میں لوگ جب کسی بزرگ کے حلقۂ ارادت میں شریک ہوتے تھے تو اپنے ساتھ شیرینی کا ایک خوان لے جایا کرتے تھے۔ "بیسویں صدی" کے کارواں میں شامل ہوتے وقت میں بھی شکر پارے لے کر قافلہ سالار کے پاس پہونچا۔ آپ نے جس محبت سے اُنہیں شرف قبولیت بخشا اور حصہ داروں نے جس اشتیاق سے خطوط لکھے اُس کا تقاضہ ہے کہ شکر کے اس محط کے باوجود یہ روایت برقرار رکھوں۔ دوسری قسط حاضر ہے۔ ملاحظہ کیجیے! اِس بار چاشنی کچھ اور "گاڑھی" ہے۔

آپ کا ———— شمیم حنفی

لوافیر

جوش ملیح آبادی الہ آباد آئے اور فراق کے ساتھ قیام کیا۔

دو چار روز کے قیام کے بعد اچانک اُنہیں خیال آگیا کہ جلد از جلد دہلی پہونچنا ہے فراق ابھی اُنہیں اور روکنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اصرار کیا ———— "جلدی کیا ہے دو ایک روز بعد چلے جانا"

"نہیں!" جوش نے فیصلہ کُن انداز میں کہا۔

"آخر بات کیا ہے؟" فراق نے ٹٹولنے والی نظروں سے اُن کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"معشوق انتظار کر رہا ہوگا" جوش بہت سادگی سے بولے۔ "میں نے وعدہ کیا تھا کہ کل تک ضرور پہونچ جاؤں گا"

معاملہ نازک تھا اس لئے فراق نے بھی مزید اصرار کرنا مناسب نہ سمجھا اور اُنہیں رخصت کرنے کے لئے ان کے ساتھ اسٹیشن تک گئے۔ لیکن ابھی یہ پلیٹ فارم تک پہونچے ہی تھے کہ ٹرین رینگنے لگی۔

جوش بہت تیزی سے لپکے اور ٹرین کا آخری ڈبہ جو عموماً کھلا ہوا ہوتا ہے اور جسے پبلک استعمال نہیں کر سکتی اُس پر بہ دقت تمام چڑھنے میں کامیاب ہوگئے۔

گارڈ نے حیرت سے اُن کی طرف دیکھا اور چلایا ———— "ارے صاحب یہ کیا ہے! اگر ایکسی ڈنٹ ہو گیا تو کیا ہوگا؟"

جوش نے اُسی انداز میں چیخ کر ہاتھ ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "کوئی بات نہیں۔ لوافیر!"

غریب الوطنی

۱۹۴۷ء کے بعد الہ آباد یونیورسٹی کے کچھ "جن سنگھی" ذہنیت رکھنے والے مسلمان طلبا شکست خوردگی کے عالم میں ایک سایہ دار جگہ الگ تھلگ بیٹھے آپس میں اُن دنوں کی باتیں کر رہے تھے جب اپنے خیال میں وہ آزاد تھے۔

"یار سچ پوچھو تو اپنا ملک پاکستان ہے یہاں اب ہم لوگوں کا مستقبل ہی کیا رہ گیا ہے؟"

ٹھیک اُسی وقت فراق صاحب ایک صاحب کے ساتھ اُن کے قریب سے گذرے اور یہ جملہ اُن کے کانوں سے ٹکرایا۔ اُن صاحب نے لڑکوں پر ایک نظر ڈالی اور مُسکرا کر سوالیہ نظروں سے فراق کی طرف دیکھنے لگے۔

فراق نے کوئی اور جواب دینے کے بجائے حسرت سے حفیظ جونپوری کا یہ شعر پڑھا ؎

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

واپسی کا ٹکٹ

حصولِ آزادی سے کچھ دنوں پہلے کا ذکر ہے۔

سفید فام آقاؤں نے اپنا بستر سمیٹنا شروع کر دیا تھا لیکن کالے آدمیوں کے مقابلے میں برتری کے مریضانہ احساس کو اُسی طرح سینے سے لگائے ہوئے تھے۔

چنانچہ ایک سیدھے سادے ہندوستانی کو فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں دیکھ کر اُس کمپارٹمنٹ میں سفر کرتا ہوا ایک انگریز نفرت سے ہونٹ سکوڑے بغیر نہ رہ سکا۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟" سیدھے سادے ہندوستانی نے بہت شستہ انگریزی میں سوال کیا۔

انگریز جلا بھنا بیٹھا تھا اُس نے جواب دینے کے بجائے مُنہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"میں نے پوچھا آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟" یہ حضرت بھی اُس سے "تعارف" کروانے پر تلے ہوئے تھے۔

"میں جہنم کو جا رہا ہوں!" اُس نے کرخت لہجے میں جواب دیا۔

سیدھے سادے ہندوستانی نے جنہیں ہم آپ پروفیسر رشید احمد صدیقی کی حیثیت سے جانتے ہیں، حیرت سے اُس پر ایک نظر ڈالی اور اطمینان سے بولے ——— "ویری گڈ! میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا لیکن میرے پاس واپسی کا ٹکٹ بھی ہے۔"

اِس جواب پر وہ بھی کھلکھلائے بغیر نہ رہ سکا اور معذرت طلب کرنے کے بعد بہت تپاک سے تعارف کی درخواست کی۔

حُسنِ شکایت

آنند نرائن مُلّا کے علاوہ اردو کے جانے پہچانے شعرا میں جن حضرت کو اُن کے ترنم نے خاصا بدنام کیا ہے وہ حضرت مانی جائسی ہیں۔

دہلی کے کسی مشاعرے میں وہ اپنے اُسی مخصوص جگر خراش ترنم کے ساتھ ایک لمبی چوڑی غزل ..... "معصوم پہ رحم آتا ہے ..... معلوم پہ رحم آتا ہے" پڑھ رہے تھے۔

خدا خدا کر کے غزل ختم ہوئی اور سامعین نے سکون و اطمینان کی ایک ٹھنڈی سانس لی۔

لتے ہیں کسی منچلے نے آتی ہے منت کرنے کے بعد اُسی ردیف و قافیہ میں اُنہیں کے ترنم کے ساتھ یہ شعر پڑھا ——

سُننے والوں پہ تجھے رحم نہ آیا مانی
لوگ کہتے ہیں کہ مظلوم پہ رحم آتا ہے

اور اِس حاضر دماغی کی داد اُس نے سارے مجمع کے علاوہ خود حضرت جائسی سے بھی وصول کی۔

خراج

"انگارے" والی رشیدہ آپا اور مرحوم ڈاکٹر رشید جہاں کے یہاں ایک صاحب پہونچے جو خیر سے شاعر تھے۔

"کہئیے! خیریت تو ہے، بیٹھئے؟" مرحومہ نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں۔ عنایت! ایک نظم ہو گئی تھی۔ لے کر حاضر ہو گیا۔ شاید کسی ... ہو!" شاعر نے بڑے انکسار کے ساتھ کہا۔

"سُنائیے!"

شاعر نے جب دیکھا کہ شکار پھنس گیا ہے تو اُس نے اپنی ڈیڑھ سو شعر کی نظم شروع کر دی۔

بیس پچیس اشعار تک تو انہوں نے صبر کیا، پھر چند شعر اور برداشت کر گئیں لیکن بالآخر اُن کی سیمابی فطرت نے ضبط کے بندھن توڑ دیئے اور انہوں نے ایک نویں درجے کے طالب علم کو آواز دی ——— "بیٹے! ذرا اِدھر آؤ!"

شاعر نے رُک کر خاموشی سے اُن کی طرف دیکھا۔

"آپ پڑھتے رہئیے۔" انہوں نے متانت سے کہا۔ پھر اُس بچے سے مخاطب ہوئیں "دیکھو! تم اِن کی نظم سُنو جب تک میں ایک ضروری کام سے باہر ہو آؤں" مرحومہ اُٹھ کر چلی گئیں لیکن آپ کو حیرت ہو گی کہ ہمارے شاعر نے اِس خراجِ تحسین کو بخوشی قبول کر لیا اور اُسی زور و شور کے ساتھ بچے کو پوری نظم سُنا ڈالی۔

پتہ

"حضرت! اپنا پتہ تو بتا دیجئے تاکہ جب کبھی دہلی آؤں تو ملاقات ہو" ایک ... شاعر نے پہلی بار پنڈت ہری چند اختر مرحوم سے کسی مشاعرے میں متعارف ہوا، اُن کی طرف ... ہوئے درخواست کی ——— "نوٹ کر لیجئے" ——— پنڈت جی بہت سنجیدگی سے بولے ——— شاعر نے اپنی ڈائری کھولی ——— "شاعر نمبر تین ہزار سات سو ستر ... اردو بازار دہلی۔"

افسانہ

لوفر

تنویر نسیر

ارشاد منزل، گولا بازار۔ لکھنؤ

۲۰ مئی ۱۹۶۳ء　　　　محترم خوشتر بھائی! آداب

...... رام لعل صاحب نے اِس کہانی کی بہت تعریف کی۔ میں نے اِس کہانی کا عنوان "لوفر" رکھا تھا۔ لیکن انہیں سنانے کے بعد فیصلہ اُن کو خبر ہونے تک پر آکر ٹھہر گیا۔ لیکن مجھے یہ عنوان پسند نہیں۔ اب آپ پر فیصلہ ہے۔ اچھا سا کوئی اور عنوان رکھ دیجئے۔ ورنہ "لوفر" ہی مناسب رہے گا ...

نیاز مند ——— تنویر نسیر

رشیاں کو لفافہ گلی کے کسی بچے ہی نے دیا تھا۔ لفافے پر کچھ نہیں لکھا تھا۔ وہ جلدی سے کھول کر پڑھنے لگی۔

"بیس روپے نذر ہیں، اپنے لئے کپڑے خرید لینا۔ تمہارا جمپر پھٹ چکا ہے"

"لوفر! ——— آوارہ! ——— بدتمیز! ——— کمینہ!"

رشیاں کو جتنی بھی گالیاں یاد تھیں اُسے دے ڈالیں، اور ایک ہی جھٹکے میں نوٹوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ غصّہ سے اُس کی آنکھیں لال انگارہ ہو گئیں اُس نے سامنے والی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ خاموشی سے، سکون سے کھلی ہوئی کھڑکی کے اُس پار کسی کتاب کے مطالعے میں غرق تھا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

اِس گلی میں اُسے آئے ہوئے چار مہینے ہو چکے تھے۔ رشیاں کو معلوم ہو چکا تھا کہ ہوسٹل میں لیٹ اڈمیشن ہونے کی وجہ سے اُسے کمرہ نہ مل سکا تھا۔ اِسی لئے مجبور ہو کر وہ یہاں آگیا تھا۔ اُس کے کمرے کی ایک کھڑکی ٹھیک رشیاں کے مکان کی طرف کھلتی تھی۔ جہاں سے رشیاں کے گھر کی ہر چیز صاف دکھائی دیتی تھی۔ اُس سے پہلے جو کرایہ دار رہتا تھا وہ کھڑکی بند رکھتا تھا۔ اِس لئے رشیاں وغیرہ کو تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ لیکن اُس کے آنے کے بعد کھڑکی کھلی رہنے لگی کھڑکی کھلی رہنے لگی تو رشیاں اور گھر کے دوسرے لوگوں کو بہت تکلیف ہو گئی۔ اور پھر یہ تکلیف آہستہ آہستہ عادت میں بدل کر کہیں غائب ہو گئی لیکن اب وہ کرایہ دار رشیاں کے لئے بہت تکلیف دہ ہوتا جا رہا تھا۔ رشیاں کو ایک اور حادثہ یاد آیا۔ ایک دن وہ لائبریری میں کوئی کتاب تلاش کر رہی تھی کہ اچانک کسی نے پوچھا "کس کتاب کی تلاش ہے؟" وہ چونک کر مڑی تو وہی کھڑا تھا۔ رشیاں کو اُس کی یہ مسکراہٹ بہت بُری لگی۔ وہ چڑ کر بولی۔

"آپ سے مطلب؟!"

"بہت بد دماغ معلوم ہوتی ہیں آپ!"

اُس نے ناک سکوڑی۔

"جی ہاں! ——— پھر ———؟" رشیاں تلخ لہجے میں بولی۔

"میں نے تو آپ کے بھلے ہی کے لئے پوچھا تھا۔ شاید میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا۔"

"شکریہ! مجھے اِس کی ضرورت نہیں۔"

وہ اُسے وہیں چھوڑ کر چلی گئی۔ کاؤنٹر کے پاس جا کر اُس نے کلرک سے اُس کی شکایت کی تو وہ چونک پڑا اور مسکرا کر بولا۔

"وہ سلیم صاحب ہیں۔ ایم۔ اے میں پڑھتے ہیں۔ بہت شریف آدمی ہیں آپ کو شاید غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"اُونہہ ——— !!"

وہ پیر پٹختی ہوئی وہاں سے چلی آئی۔

اُسی دن شام کو اُسے ایک پیکٹ ملا۔ لانے والی اُس کی چھوٹی بہن تھی۔ اُس نے پوچھا۔

"کس نے دیا ہے؟"

"معلوم نہیں" چھوٹی بہن بولی "کوئی صاحب دے گئے ہیں۔"

رشیاں نے پیکٹ کھولا۔ اُس میں ایک کتاب اور خط رکھا تھا۔

مجھے معلوم ہوا کہ آپ کو وہ کتاب نہیں ملی۔ کتاب حاضر ہے!"

"لوفر ——— !"

"کمینہ ——— !"

"بدمعاش ——— !!!"

ریشماں پھٹ پڑی۔ اُسے معلوم تھا کہ یہی لوگ تو سماج کے دشمن ہوتے ہیں۔ کرپشن تو ان ہی سے پھیلتا ہے۔ آج کتاب دی ہے۔ کل کپڑے پیش کریں گے۔ پرسوں فلم کی دعوت دی جائے گی اور ترسوں . . . .

وہ سوچتی رہی اور غصہ میں جلتی رہی۔

پھر اُس نے کتاب کے ٹکڑے ٹکڑے اُڑا دیئے۔

"لوفر ——— !"

"آوارہ ——— !!"

"سُور ——— !!!"

اُس نے دماغ کو جھٹک دیا۔

"کیا ہوا بیٹی؟" ماں نے پکارا: "کسے گالیاں دے رہی ہو؟"

"کچھ نہیں امی!" ریشماں نوٹوں کے پھٹے ہوئے ٹکڑوں کو دیکھتی ہوئی بولی۔ "کتاب پڑھ رہی ہوں۔"

ماں خاموش ہوگئی۔ اور ریشماں اپنی غربت کے بارے میں سوچنے لگی وہ غریب تھی، یتیم تھی، اُس کے پاس اچھا گھر نہیں تھا۔ کپڑے نہیں تھے۔ مطالعہ کے لیے کتابیں نہیں تھیں۔ اور دولت نہیں تھی۔ ورنہ کیا آج اِس لوفر کی یہ ہمت ہوتی کہ اُس کے پھٹے کپڑے دیکھ کر روپے بھیجتا۔ اُس کی توہین کرتا۔ اُس کی اَنا کو ٹھیس پہنچاتا۔

"لوفر ——— !"

"آوارہ ——— !!"

وہ پھر بڑبڑائی اور اپنے جسم کے حصّوں کو پھٹے جمپر سے چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن جب وہ اُس میں کسی طرح کامیاب نہ ہو سکی تو کمرے کے اندر جا کر اپنا وہ جوڑا نکالنے لگی جو اُس نے کسی آڑے وقت کے لیے رکھ چھوڑا تھا۔ پھر اُسے خیال آیا کہ دوسرے دن اُسے انٹرویو میں جانا ہے۔ اِس لئے اُس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ اور ایک گندی سی چادر اوڑھ کر آنگن میں نکل آئی۔ اُس نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ لیکن کھڑکی اب بند ہو چکی تھی۔ وہ چارپائی پر بیٹھ گئی اور اپنی مختصر سی زندگی کے بارے میں سوچنے لگی۔ وہ غریب تھی۔ یتیم تھی۔ اُس کے پاس اپنا گھر نہیں تھا۔ کوئی ایسا ذریعۂ معاش نہیں تھا جس سے زندگی اطمینان بخش طور پر گزر سکتی۔ جب وہ ہائی اسکول ہی میں تھی تو اُس کا باپ ایک کے حادثے میں چل بسا تھا۔ ماں صدمہ کر کے پاگل ہوگئی تھی۔ باپ کے مرنے کے بعد گھر کا سارا بوجھ اُس کے نازک کندھوں پر آ پڑا تھا۔ اُس بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے ٹیوشن کرنا پڑا۔ محلّے والوں کے کپڑے سینے پڑے۔ لوگوں کی باتیں سننی پڑیں اور سڑکوں پر لوگوں نے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ کر گندے اور بازاری جملے بھی کسے۔ وہ اِن ساری مشکلات کا سامنا نہایت بہادری سے کرتی رہی۔ لیکن وہ اپنی خوش مزاجی کو مرنے سے کسی طرح بھی نہ روک سکی۔ وہ کچھ چڑچڑی ہو گئی تھی۔ اب وہ بی۔ اے فائنل میں تھی۔ گھر کے کاموں کے بعد اُس کا کام نوکری کی تلاش رہ گیا تھا۔ کئی بار وہ انٹرویو میں بھی جا چکی تھی۔ لیکن اُس کے پاس کوئی سفارش اور نہ رشوت دینے کے لئے کوئی بڑی رقم تھی۔ اِس لئے آج تک وہ کامیاب نہ ہو سکی۔ گھر کی حالت بہت ابتر تھی۔ اِس لئے نوکری کی تلاش ضروری تھی۔ وہ ابھی یہی سب سوچ رہی تھی کہ دھڑ سے کھڑکی کھلی۔ اُس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اُس نے جلدی سے اپنی پیٹھ اُس طرف کر لی۔

اُس دن دھوپ بہت تیز تھی۔ لُو چل رہی تھی۔ وہ جلدی جلدی قدم بڑھاتی ہوئی گھر کی طرف جا رہی تھی۔ پسینے سے بھیگ کر اُس کا جمپر اُس کے جسم سے چپک گیا تھا۔ اُسے کچھ شرم بھی لگ رہی تھی۔ لیکن اُس کی کوشش یہی تھی کہ وہ جلد سے جلد گھر پہنچ جائے۔ اچانک ایک رکشا اُس کے قریب آ کر رُک گیا۔

"آیئے میم صاحب!"

رکشا والے نے کہا۔

وہ چونک پڑی۔ پھر اُس نے اپنے پرس کو دیکھا جس میں صرف دو آنے پڑے ہوئے اُس کی بے بسی اور مفلسی کا مذاق اُڑا رہے تھے۔

"نہیں!" وہ آہستہ سے بولی۔ "ضرورت نہیں۔"

"لیکن بیگم صاب! اب تو آپ کو بیٹھنا ہی پڑے گا۔"

"کیوں؟" اُس کی تیوری چڑھ گئی۔

"کیونکہ اُن صاب نے آپ کا کرایہ دے دیا ہے۔" رکشا والے نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ریشماں نے دیکھا وہی سائیکل پر چلا جا رہا تھا۔

"لوفر ——— !"

اُس نے اپنی مخصوص گالی دی۔ پھر رکشا والے سے بولی۔

"کرایہ اُنھیں لوٹا دو میں پیدل ہی چلی جاؤں گی!"

"ریشم!" ——— ماں نے آواز دی۔

"ممی امّی! وہ چونک پڑی۔
وہ خیالوں کی دُنیا سے نکل آئی۔
اُس کی ماں نے کہا۔
"بیٹی رات زیادہ ہو رہی ہے۔ کل صبح تمہیں انٹرویو میں بھی جانا ہے۔
اب سو جاؤ!"
وہ وہیں چارپائی پر لیٹ گئی۔
وہ اب بھی بیٹھا پڑھ رہا تھا۔
ریشماں نے چادر مُنہ تک کھینچ لی۔ رات بھر خواب میں اُسے نوفر، کتابیں رکشا والا اور رُوپے دکھائی دیتے رہے۔

دُوسری صبح وہ جلدی ہی اُٹھ گئی۔ اُسے ٹھیک آٹھ بجے انٹرویو کے لئے پہنچنا تھا۔ جلدی جلدی سب کام ختم کر لینے کے بعد وہ روانہ ہو گئی۔

انٹرویو شروع ہونے میں زیادہ دیر نہیں تھی۔ بہت سارے نوجوان لڑکے لڑکیاں کرسیوں پر بیٹھے وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ سارے اُمیدواروں کے چہرے مختلف جذبات سے رنگین ہو رہے تھے۔ کسی کی آنکھیں اُمید سے روشن تھیں تو کوئی بہت ہی نااُمید دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اِن حالات سے بے خبر ماحول سے قطعی بے نیاز ہو کر خاموشی سے ایک بنچ پر بیٹھ گئی۔

تھوڑی دیر بعد انٹرویو شروع ہو گیا۔ انٹرویو کے پرچے سب میں تقسیم کر دیئے گئے۔ لیکن پرچہ پڑھتے ہی ریشماں بوکھلا گئی۔ پرچہ اتنا سخت تھا کہ اُس کا سمجھنا بھی اُس کے لئے مشکل تھا۔ حساب اور جنرل نولج میں تو وہ صفر ہی تھی۔ وہ اُداس ہو گئی۔ اُس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اُس کی مایوسی بڑھ گئی پھر وہ پرچہ چھوڑ کر اُٹھ ہی رہی تھی کہ اُس کی نظر سلیم پر پڑ گئی۔ وہ اُس سے صرف تین کرسیاں آگے بیٹھا تیزی سے لکھ رہا تھا۔ پہلے تو اُس نے نفرت سے مُنہ پھیر لیا پھر اُسے اچانک ایک خیال آیا۔ مدد کی بھیک مانگنے کا نہیں، بلکہ انتقام کا خیال۔ اپنی توہین کا خیال۔ وہ مسکرائی اور پھر اپنی سادہ کاپی پر اُس کا نام لکھ کر اندر اُلٹی سیدھی تصویر بنا ڈالی۔

دوسرے دن انٹرویو کا نتیجہ نکلنے والا تھا۔ اُسے اپنا انجام تو معلوم ہی تھا لیکن وہ سلیم کی بوکھلاہٹ دیکھنے کی متمنی تھی۔ سب سے پہلے سلیم ہی کا نام پکارا گیا لیکن وہ غیر حاضر تھا۔ ریشماں کو مایوسی ہوئی۔ دفتر کے باس نے تمام اُمیدوار لڑکے اور لڑکیوں کو کاپی میں بنی تصویر دکھائی۔ ایک فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا۔ لیکن ریشماں بالکل نہ ہنسی وہ جس مقصد سے آئی تھی وہ پورا نہ ہوا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ سلیم نے اپنی کاپی میں شاندار جوابات دیئے ہونگے

وہ مایوس ہو کر اُٹھی۔ لیکن اچانک جیسے اُس پر بجلی گر پڑی۔ دفتر کا باس اُس کا نام پکار رہا تھا۔ پہلے تو وہ حیرت سے بُت بنی کھڑی رہی کہ شاید کوئی دوسری ریشماں حاضر ہو۔ لیکن جب اُسے یقین ہو گیا تو وہ تیر کی طرح میز کی طرف بڑھی۔ اُس کے ہاتھ میں کاپی تھی۔ دفتر کا باس اُس کی تعریفوں کے پُل باندھ رہا تھا۔ وہ سارے اُمیدواروں میں فرسٹ آئی تھی اور سلیم کی ہینڈ رائٹنگ اُس کی نگاہوں کے سامنے ناچ رہی تھی۔

"لوفر! —— آوارہ!!"

وہ رندھی ہوئی آواز میں بڑبڑائی لیکن اِس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ یہ گالیاں تو اُس نے اضطراری طور پر عادت کے مطابق دے ڈالی تھیں لیکن اُس کے سامنے تو اُس کی ماں کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ جو شاید اب کبھی بھوکی نہ رہے گی۔ اُس کے بھائی بہن اب ہرگز جاہل نہیں رہیں گے۔ وہ بھی اب جھونپڑوں میں نہیں رہے گی۔ اب تو اُس کے پاس ایک خوبصورت سا گھر ہو گا۔

اور پھر جب وہ چونکی تو اُسے بے ساختہ لوفر یاد آ گیا۔ وہ تڑپ گئی نہیں وہ لوفر نہیں تھا۔ وہ تو ایک فرشتہ ہے۔ اُس کا خیال بالکل غلط تھا۔ ہر جگہ اُس نے اُس کی مدد کی تھی۔ بے غرض مدد۔ بے لوث مدد! وہ تو انسانیت کا علمبردار تھا۔ وہ تو دوسروں کا دُکھ درد جاننے والا تھا۔

ریشماں کا چہرہ شرم سے سُرخ ہو گیا۔ اور پلکوں پر کئی آنسو آ کر رُک گئے اُس نے اُس کے بارے میں کتنا غلط سوچ لیا تھا۔ پھر دوسرے ہی لمحہ وہ گھر کی طرف بھاگ رہی تھی۔ اِس بات کا خیال کئے بغیر ہی کہ لوگ کیا سوچیں گے گھر زیادہ دُور نہیں تھا۔ تیز تیز قدموں سے وہ گھر پہنچی۔ اور سیدھی سلیم کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ ارے وہاں تو ایک تالا جھول رہا تھا۔ وہ مایوس ہو کر گھر لوٹ آئی۔ وہ سوچ رہی تھی جب وہ آئے گا تو وہ اُس سے ضرور معافی مانگ لے گی۔ اُس کا خوب خوب شکریہ ادا کرے گی۔ اور اُس کے احسانات کا بدلہ اُتارنے کی کوشش کرے گی۔ یہی سوچتے سوچتے وہ گھر پہنچی۔ اُسے ہمیشہ کی طرح مغموم دیکھ کر اُس کی ماں سمجھ گئی کہ وہ آج بھی ہمیشہ کی طرح ناکام رہی تھی۔ اِس لئے وہ کچھ نہ بولی اور خاموشی سے اُس کی طرف ایک لفافہ بڑھا دیا۔ "یہ کوئی دے گیا ہے!"

ریشماں چونک پڑی۔ اُس کے ہونٹوں پر تازگی دوڑ گئی۔ چہرہ خوشی سے سُرخ ہو گیا۔ اُس نے جلدی جلدی لفافہ کھولا۔ لیکن اچانک پھر اُس کا چہرہ زرد ہو گیا۔ لکھا تھا "میں آپ کی ناراضگی کی وجہ اب تک نہ سمجھ سکا لیکن میں جا رہا ہوں میں نے آپ کو بہت پریشان کیا۔ مجھے معاف کر دیجئے گا۔"

اُس کی آنکھوں سے ایک ساتھ کئی موتی گر پڑے اور لوفر دُھند میں ڈوب گیا!!

ایک افسانچہ — ایک تصحیح

سلیم جہانگیر

"علیم منزل" دروہ (ضلع جالنہ)
۶ راگست ۱۹۶۳ء

برادرِ مکرم جناب خوشتر گرامی صاحب! تسلیم

موقر "بیسویں صدی" کی ایک گزشتہ اشاعت میں میرا ایک افسانہ بعنوان "کہانی" شائع ہوا تھا اور اُس نے پرستارانِ ادب سے بے انتہا داد و تحسین حاصل کی تھی۔ اُس افسانہ کی اشاعت کے بعد کچھ ایسے حالات سے دوچار رہا کہ بزمِ "بیسویں صدی" میں شریک نہ ہو سکا۔ آج ایک "ایک افسانچہ ایک تصحیح" پیشِ خدمت ہے۔ اگر قبول افتد زہے عزّ و شرف۔

نیازمند ——— سلیم جہانگیر

موقر "بیسویں صدی" کی اشاعت ماہ مئی ۱۹۶۳ء میں "لطائفِ سخن" کے عنوان سے محترم م۔ رشس، عالی، بی۔ اے کے کچھ افسانچے شائع ہوئے ہیں "قبلہ قبلی اور شبلی" کے عنوان سے جو افسانچہ صاحب موصوف نے قلمبند فرمایا ہے اُس میں آپ رقمطراز ہیں:۔

"ایک مرتبہ مولانا وحید الدین سلیم کے ہاں علامہ شبلی مہمان تھے۔ علامہ شبلی دوست احباب کے مجمع میں بیٹھے علمی بحث میں مصروف تھے۔ دوپہر کے کھانے کا وقت بھی گذر گیا۔ ایک آدھ بار مولانا نے اشارۃً شبلی کو کھانے کے لئے کہا بھی۔ لیکن جب بہت دیر ہوگئی اور شبلی نے پروا نہ کی تو سلیم نے تنگ آ کر فی البدیہہ کہا ؎

میں نہیں جانوں قبلہ قبلی
روٹی کھائے بھائی شبلی

یہ سُننا تھا کہ شبلی بحث چھوڑ چھاڑ واہ وا کرتے اُٹھ کھڑے ہوئے۔"

مجھے افسوس ہے کہ فاضل مضمون نگار واقعہ مذکورہ بالا کی صحیح صورت ناظرینِ "بیسویں صدی" کی ضیافتِ طبع کے لئے پیش کرنے سے قاصر رہے۔ آج کتاب "کائناتِ ادب" میرے پیشِ نظر نہیں ہے لیکن اپنے حافظہ کی مدد سے اُس واقعہ کی صحیح صورت پیش کرتا ہوں جو حسبِ ذیل ہے:۔

ایک مرتبہ مولانا وحید الدین سلیم نے علامہ شبلی نعمانی کو اپنے گھر مدعو کیا اور ایک منظوم دعوت نامہ لکھا:۔

آتی نہیں مجھ کو قبلہ قبلی
بس صاف یہ ہے کہ بھائی شبلی!
تکلیف اُٹھاؤ آج کی رات
کھانا یہیں کھاؤ آج کی رات

اتفاق سے ان دنوں علامہ شبلی پیر کے زخم کی وجہ سے بڑی تکلیف میں مبتلا تھے۔ اُنہوں نے فی البدیہہ منظوم جواب لکھا:۔

وہ گئے دن کہ زمانے میں پھرا کرتا تھا
اب تو اللہ کے افضال سے تیمور ہوں میں
مجھ کو دعوت میں نہ آنے کا ہے افسوس بہت
جیتے جی مُردہ ہوں مرحوم ہوں معذور ہوں میں

مئی آرڈر بھیجتے وقت کوپن میں آرڈر پر یہ ضرور تحریر فرمائیے کہ رقم کس سلسلے میں بھیجی گئی ہے تاکہ تعمیلِ ارشاد میں دیر نہ ہو [illegible] کرنے ہو تو [illegible] کے لئے پتہ رسالہ بیسویں صدی دہلی نمبر ۶ لکھنا کافی ہے [illegible]

زندگی بخش معلوماتی مقالات اور مفید کارآمد اشارات

۱ ـــــ اپنے لئے بھی ایماندار رہئے!

ڈاکٹر مارڈن نے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے ـــــ دنیا میں ایسے تو بہت سے لوگ ہیں جو دوسروں کے لئے بھلے ہیں، لیکن اپنے لئے بھلے نہیں ہیں۔ وہ اپنے جسم کی صحت کا خیال نہیں رکھتے، اپنی قوتوں کو جمع نہیں کرتے، دوسروں کے خادم ہیں، لیکن اپنے لئے ظالم ہیں۔ دوسروں کے لئے ایماندار ہونا بہت بڑا وصف ہے، لیکن اپنے لئے ایماندار ہونا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ اپنی بھلائی نہ چاہنا، اپنی بھلائی کی فکر نہ کرنا اُتنا ہی بڑا گناہ ہے جتنا کہ دوسروں کی بھلائی نہ چاہنا۔ انسان کا یہ فرض ہے کہ وہ جسمانی اور ذہنی اعتبار سے اپنے آپ کو بلند سے بلند سطح پر رکھے، نہیں تو وہ دنیا کو وہ پیغام نہ دے پائے گا جس کے لئے وہ دنیا میں آیا ہے۔ ہر انسان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے آپ کو بہتر حالت میں رکھے۔ یہ بہت بڑا گناہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو گری ہوئی حالت میں رکھے۔ ایسا کرنے سے وہ وقت کی مانگ پوری کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ وہ مشکل در پیش آنے پر ہمت کے ساتھ اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

دُنیا میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جو اعلیٰ درجہ کی قابلیت و صلاحیت رکھتے ہوئے بھی زندگی میں معمولی ہی کام کرتے ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے جسم اور دماغ کو بہتر حالت میں نہیں رکھتے۔ دوسرے لفظوں میں وہ اپنے لئے ایماندار نہیں ہوتے۔

۲ ـــــ انڈا ـــــ بہترین مقوّی غذا

انڈا ہمارے جسم کی پرورش کرنے اور اسے طاقت دینے کے اعتبار سے اعلیٰ درجہ کی غذا ہے۔ انڈے کا کیمیاوی تجزیہ کیا جائے تو اِس میں ۱۲ فیصدی پروٹینز پائے جاتے ہیں، جو ہمارے جسم میں قوت و حرارت پیدا کرنے کے کام آتے ہیں۔ ۷۵ فیصدی پانی ہوتا ہے، جو ہمارے جسم کے لئے ایک نہایت ضروری چیز ہے۔ ان کے علاوہ اُس میں مختلف نمکیات ہوتے ہیں۔ جو ہمارے جسم کے لئے بے حد ضروری ہیں۔ مثلاً کیلیشیم، فولاد، فاسفورس۔

انڈے کی یہ اہمیت کوئی نئی دریافت نہیں ہے۔ اطبّاء قدیم نے بھی اس کی افادیت و اہمیت کو سراہا ہے۔ شیخ الرئیس کے نزدیک انڈا مقوی قلب بھی ہے۔

بینائی بڑھانے کے لئے بھی انڈا بہترین غذا ہے۔ عام جسم کو طاقت دینے کے ساتھ دماغ اور آنکھوں کو طاقت دیتا ہے۔ ایک محقق کا بیان ہے کہ مرض رتوندی کی ابتدا میں (جس میں آنکھوں کی بینائی زائل ہو جاتی ہے) انڈوں کے استعمال سے زائل شدہ بینائی واپس آ جاتی ہے۔

انڈے ہر عمر اور ہر موسم میں استعمال کئے جا سکتے ہیں اور اُن سے بچے جوان اور بوڑھے سب یکساں طور پر فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ گرمیوں کے مقابلے میں سردیوں میں ان کا استعمال زیادہ فائدہ مند ہے۔ بعض لوگ سردیوں میں انڈوں کا حلوہ بنا کر کھاتے ہیں۔ لیکن بہتر طریقہ یہ ہے کہ انڈوں کو نیم برشت کر کے دودھ کے ساتھ کھایا جائے یا دو انڈوں کی زردی، سفیدی پیالے میں نکال کر خوب پھینٹیں اُس کے بعد جوش کھایا ہوا دودھ ڈال کر شہد یا چینی سے میٹھا کر کے پئیں۔ اُبلے ہوئے انڈے کے مقابلے میں آدھا اُبلا ہوا انڈا زیادہ مفید اور طاقت بخش ہے۔ انڈے میں وہ سب کچھ ہے جو انسانی جسم اور اُس کی نشو و نما کے لئے ضروری ہے، یہ تپ دق کے مریضوں، خون کی کمی، مردانہ کمزوری، دل و دماغ کی کمزوری دور کرنے کے لئے بے نظیر دوا اور غذا ہے۔ خون پیدا کرتا ہے۔ بدن کو موٹا کرتا ہے۔ دودھ سے زیادہ طاقت بخش غذا ہے۔

۳ — بہترین دماغی غذا

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ بعض اقسام کی مچھلیاں خاص طور پر کیکڑے اور جھینگے دماغ کے لئے بہترین غذا ہیں، کیونکہ ان میں فاسفورس زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن جدید تحقیقات اس کی تائید نہیں کرتی۔ کیونکہ مچھلی میں ایسے اجزا نہیں ہیں، جن کی بنا پر وہ دماغ اور مخصوص طور پر دماغی محنت کرنے والوں کے لئے زیادہ قوت بخش ثابت ہو سکے۔

اٹالیہ کے ایک ڈاکٹر الفانسو بیاسی کرنشی نے لکھا ہے۔ پنیر دماغی کام کرنے والوں کے لئے بہت اچھی غذا ہے۔ اس سے عقل و فراست بڑھتی ہے۔ ڈاکٹر موصوف اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ پنیر میں پانچ فی صد فاسفورس ہے جو مچھلی کے فاسفورس سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کے بعد انڈوں کی زردی، خشک نباتات، گوشت اور پھول گوبھی کا نمبر ہے۔ ڈاکٹر بیاسی کرنشی کہتے ہیں، دماغی کام کرنے والوں کو چاول، ڈبل روٹی، ثقیل، قابض، دیر ہضم غذائیں، نشاستہ یا اور زیادہ نہ کھانا چاہئے۔

پنیر تاثیر کے لحاظ سے سرد تر ہے۔ خون پیدا کرتا ہے اور بدن کو موٹا کرتا ہے۔ آنتوں کو طاقت بخشتا ہے۔ پنیر میں پروٹین زیادہ ہوتا ہے جو جسم اور دماغ کے لئے بہت مفید ہے۔ مدیر "بیسویں صدی" کی رائے میں مچھلی بھی دماغ کو تقویت بخشتی ہے۔ اس میں فاسفورک ایسڈ بہت پایا جاتا ہے جو دماغ کو خصوصیت سے طاقت بخشتا ہے۔

۴ — دل کی حفاظت کیجئے

قدرت نے دل کو سینہ کے اندر پھیپھڑوں کی گود میں بہت حفاظت سے رکھ دیا ہے، کیونکہ اسی پر انسان کے جسم کی پرورش بلکہ زندگی کا دارومدار ہے۔ جب بے احتیاطی سے دل کی کل بگڑ جاتی ہے یا بڑھاپے کی وجہ سے دل کمزور ہو کر بیٹھ جاتا ہے تو موت واقع ہو جاتی ہے۔ دل مضبوط اور تندرست نہ ہو تو سارا جسم کمزور اور بیمار ہو جاتا ہے۔

بڑوں سے زیادہ بچوں کے دل کی حفاظت کرنی چاہئے۔ اچھی غذا اور مناسب ورزش سے اُس کی نشوونما اور طاقت بڑھانی چاہئے۔ خاص طور پر تمباکو کی زیادتی سے دل میں بہت خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ یاد رکھنا چاہئے کہ بچوں کے ننھے سے دل پر تمباکو کا بہت بُرا اثر پڑتا ہے، اس لئے بچوں کو تمباکو کے استعمال کی عادت سے خاص طور پر بچانا چاہئے اسی طرح دوسری نشہ آور چیزوں، مثلاً شراب اور نشہ کی چیزوں سے بھی، جو دماغ اور خون کو زہریلا کر دیتی ہیں۔

دل کے متعلق ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ عام طور پر یہ پرانا خیال چلا آ رہا ہے کہ دل خیالات و جذبات، سمجھ بوجھ، سوچ بچار، عقل و شعور، تمام قلبی واردات و نازک احساسات کا آلہ، سرچشمہ، یا گزرگاہ ہے۔ شاعری اور ادب میں دل کی لگی، بے چینی، تڑپ اور تکلیف کی داستانیں بھری پڑی ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے تمام خیالات و جذبات کی پیدائش کا مقام دماغ ہے، دل نہیں۔ دل خون کی گردش کا ایک اہم آلہ ہے، اس لئے دل کی حفاظت بہت ضروری ہے۔

۵ — مستقبل کے اندیشے — ماضی کا ماتم

مستقبل کے اندیشے انسان کے ذہنی سکون پر چھاپہ مارتے ہیں۔ لیکن اُن میں سے اکثر محض موہوم ہوتے ہیں اور حقیقت بن کر سامنے نہیں آتے — اس مہینے خرچ آمدنی سے زیادہ ہو گیا ہے۔ مہمان بھی آ رہے ہیں، بڑی مشکل پیش آئے گی۔ موسم تبدیل ہو رہا ہے زکام اور کھانسی کی شکایات نہ ہو جائے۔ چھٹی ختم ہو گئی، گاڑی پر سوار نہ ہو سکے۔ غیر حاضری نہ لگ جائے، جواب طلبی نہ ہو جائے کہیں تبادلہ نہ ہو جائے، اجنبی جگہ ہو گی، خدا جانے کیا کیا مشکلات پیش آئیں گی! — اس طرح کے غیر ضروری اندیشے ہمارے ذہنی سکون، اطمینان پر بُرا اثر ڈالتے ہیں اور خود اعتمادی اور قوتِ عمل کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ اوّل تو ضروری نہیں کہ ہم نے جس مشکل کا تصور کیا ہو، وہ درحقیقت آ پہنچے۔ لیکن اگر آ ہی پہنچے تو اُسے محسوس کرنے کا صحیح وقت بھی وہی ہے، جب ہم اُس سے دوچار ہوں۔ وقت سے پہلے ہی پریشان ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی تکلیف کی عمر میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔

مستقبل کے اندیشوں کی طرح ماضی کی ناگوار یادیں بھی ذہنی اذیت کا باعث ہوتی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ماضی میں ہمیں کوئی نقصان پہنچا تھا لیکن اب اُس کی یاد سے کیا حاصل؟ کیا اس طرح اُس نقصان کی تلافی ہو سکتی ہے؟ ہم بچپن کی نادانی یا جوانی کی ناتجربہ کاری سے کوئی حماقت کر بیٹھے تھے، کوئی بے انصافی یا دل آزاری کی ہوگی، کسی کو ناحق نقصان پہنچایا ہوگا، کوئی غیر اخلاقی حرکت کی ہوگی اب اُس پر متاسف ہونے سے فائدہ؟ مگر تلافی کا موقع باقی ہے تو اُس سے انکار نہ ہونا چاہئے۔ ورنہ بہتر یہی ہے کہ ہم اپنی غلطی سے درگزر کریں۔ بہت سے لوگ اپنے آپ کو معاف نہیں کرتے اور مسلسل سزا بھگتے رہتے ہیں۔

۶ — ایک بڑی غلط فہمی

لوگ عام طور پر ایک بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں سگریٹ یا دوسری صورتوں سے تمباکو پینے سے دماغی تھکن دُور ہو جاتی ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ تمباکو نوشی تھکن اُتارنے اور مستعد بنانے کی بجائے دماغی حس کم کر دیتی ہے اور خلیات مُردہ ہو جاتے ہیں، جس کی وجہ سے ذرا دیر کے لئے تھکن سے بے خبری ہو جاتی ہے۔ بہت سے لوگ فخریہ کہا کرتے ہیں کہ جب ہم سگریٹ کے دو تین کش لگا لیتے ہیں تو ہمارا دماغ کام کے لئے پوری طرح تیار ہو جاتا ہے۔ اُن لوگوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ جس وقت تمباکو کا اثر دُور ہو جاتا ہے تو وہ تازہ دماغ ہونے کی جگہ اور سست ہو جاتے ہیں اور مزید کام کرنے کے لئے

انھیں سگریٹ کے اور کش لگانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس طلب اور تھکن کا سلسلہ جاری رہتا ہے آخر کار وہ سگریٹ کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتے۔ اس سے خوف کی کیفیت، چڑچڑاپن، بدمزاجی، بے خوابی، سر درد وغیرہ کے علاوہ حافظہ بھی خراب ہو جاتا ہے۔ اگر آپ حافظہ کو تیز اور قوی رکھنا چاہتے ہیں تو تمباکو اور سگریٹ سے قطعی پرہیز کیجئے۔ کام کی کثرت سے جو دماغی ضعف ہوتا ہے وہ تازہ ہوا، آرام اور عمدہ غذا سے دور ہو سکتا ہے۔ سگریٹ یا تمباکو سے نہیں۔ لوگ اس بارے میں ایک بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

۷ — طاقت سب سے بڑی دولت ہے

ایک مغربی مفکر نے لکھا ہے — انسان کی صلاحیت اور اس کی طاقت دونوں کامیابی کے لئے سب سے بڑا سرمایہ ہیں۔ کافی صلاحیت ہو لیکن طاقت نہ ہو تو انسان کسی مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس لئے آپ چاہے اور کچھ بھی کریں، اپنی قوت و طاقت کو مزید تقویت دیں۔ طاقت کی حفاظت ضرور کریں۔ جس کے جسم کی طاقت قائم ہے، وہ اس انسان سے زیادہ دولتمند ہے۔ جس کے پاس دولت تو کافی ہے، لیکن اس نے جسمانی طاقت کو کھو دیا ہے۔ قوتِ حیات کے مقابلے میں سونا تو کوڑا ہے، ہیرا دھول ہے، اور زمین یا مکان حقیر چیزیں ہیں۔

اگر آپ اپنی قابلیت و صلاحیت سے کام لینے کی طاقت نہیں رکھتے تو اُس صلاحیت کا فائدہ ہی کیا ہے۔ اگر آپ جسمانی طور پر کمزور ہیں تو اچھے دماغ اور بلند خیالات کا فائدہ ہی کیا۔ کمزور جسم کے سامنے جب کوئی بڑا موقع آئے گا تو آپ کی تھکی ہاری قوت سار کر دیگی۔ اُس کا فائدہ نہ اُٹھا سکے گی۔ اگر آپ نے جسم کی طاقت کو فضول ضائع ہو جانے دیا ہے، تو جب کوئی بڑا موقع آئے گا تب آپ کانپتے ڈرتے آگے بڑھیں گے۔ اُس وقت آپ میں خود اعتمادی کے بجائے شک ہو گا۔ آپ میں اپنی طاقت کا احساس پیدا نہ ہو گا۔ اور آپ جانتے ہیں، زندگی میں سنہرا موقع کھونے سے کتنا افسوس ہوتا ہے۔

۸ — کیا انسان جو بننا چاہے بن سکتا ہے؟

دراصل یہ فقرہ نامکمل ہے اور غلط فہمی پیدا کر سکتا ہے، کیونکہ اس میں اُن بنیادی شرائط کو حذف کر دیا گیا ہے جو خواہشات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ضروری ہیں۔ یعنی کوئی شخص ہر چیز حاصل کر سکتا ہے بشرطیکہ اُسے اُس کی لگن ہو۔ اُس کے حصول کا صحیح منصوبہ بنائے، قانونِ فطرت کے خلاف نہ ہو، اور اُس کے حصول کے لئے وہ خدمات انجام دے سکے، جو اُس کے برابر وزن رکھتی ہوں۔ اِس لئے کوئی شخص وہ نہیں ہو سکتا۔ جس کے لئے اُس کی موجودہ ذہانت سے زیادہ کی ضرورت ہوتی ہے

اُس کی کوشش بھی قانونِ فطرت کے خلاف ہوگی اور کتنی ہی خواہش کیوں نہ کی جائے لیکن اُس کا حاصل کرنا ممکن نہ ہوگا۔ عملی فلسفہ کی یہ تعلیم ہے کہ ہم اپنی زندگی قانونِ فطرت کے مطابق گزاریں، وگرنہ اُس کے خلاف معمولی ذہانت کا آدمی اُس حد کی انتہا تک پہنچ سکتا ہے جو اُس کی صلاحیت و قابلیت سے دور نہ ہو۔ انسانیت کے گلستان میں بہت سے درخت ہیں کوئی بڑا اور کوئی چھوٹا۔ ایسا کون آدمی ہو گا جو ایک کے مقابلے میں دوسرے کو کم اہم قرار دے سکے!

سالنامہ دیکھا

اہلِ قلم حضرات کی رائیں

....نیا سال شروع ہونے سے پہلے ہمیشہ آپ کی طرف سے ایک نہایت قیمتی اور حسین وجمیل تحفہ وصول ہوتا ہے اور دسمبر کے وسط میں جب یہ تحفہ سالنامہ بیسویں صدی کی صورت میں مجھے ملتا ہے تو میں مسرت وانبساط اور تشکر وممنونیت کے جذبات کے درمیان سوچنے لگتا ہوں کہ یہ تحفہ پہلے سب تحائف سے بڑھ گیا ہے۔ اس مرتبہ بھی یہی ہوا۔ آپ کی جدتِ طبع کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ اِس مرتبہ آپ نے ادیبوں کی گھریلو زندگی سے قارئین بیسویں صدی کو روشناس کرایا ہے۔ آپ کی اِس کوشش سے قارئین اپنے محبوب ادیبوں کے اور قریب آ گئے ہیں....

ظفر واسطی (لاہور)

....سالنامہ واقعیٔ ایک حیات آموز اور نشاط افروز مرقع ہے۔ قارئین کے محبوب قلمکاروں اور اُن کے متعلقین کی تصاویر اور مختصر حالات بہت دلچسپ اور لُطف آمیز ہیں۔ یہ فیچر آپ کے خلاق ذہن کی ایک نئی اُپج ہے۔ جس نے سالنامہ کو ایک انوکھی دھج عطا کر دی ہے۔ اِس فیچر نے متعدد فنکاروں کی زندگی کے تخلیقی گوشے اُجاگر کر دیئے ہیں۔ بیسویں صدی کا یہ نمبر آپ کے نکھرے ہوئے ذوقِ ادب کی ایک یادگارِ جمیل ثابت ہوگا ؎

دیکھ کے تیرا حُسنِ ایماں ۔۔ منکر بھی ایمان لائے ہیں ....

کرشن موہن (کوٹہ راجستھان)

....سالنامہ دیکھ کر بے پایاں مسرت کے ساتھ بے اندازہ حیرت بھی ہو رہی ہے۔ اتنے نامساعد حالات میں بھی آپ نے سالنامہ اُسی روایتی شان سے پیش کیا ہے، جو دوسروں کے لئے قابلِ رشک ہے۔ سالنامہ کے تابندہ ودرخشندہ دامن پر آپ کے بلند عزم کی جبیں پر پڑنے والی کسی ہلکی سی بھی شکن کی جھلک نظر نہیں آتی۔ آپ نے اِس بار فنکاروں کو جس انوکھے انداز سے متعارف کرایا ہے۔ ادبی دنیا میں یہ نئی روایت ہے، اور بہت خوب ہے بلکہ خوب تر ہے....

آسی رام نگری (مغل سرائے)

....سالنامہ اِس دفعہ بھی اپنی عالی شان صالح وتوانا روایت کا حامل ہے۔ حالانکہ آپ کا دستِ راست جسے آپ اپنا کاتبِ تقدیر کہتے ہیں پاکستان میں اپنی نرگسِ بیمار کی تیمارداری میں مصروف تھا اور بیشتر اہم مضامین اُس کی تحویل میں تھے اِن میں حالات ایسے حسین ودلکش سالنامہ کو معجزہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا....

نرلش کمار شاد (نئی دہلی)

....اس مرتبہ ابتدائی حصہ میں آپ نے جو تبدیلیاں کی ہیں وہ حسین بھی ہیں دلچسپ بھی، افسانے اچھے ہیں۔ اتفاق ہے کہ جس موضوع کو اچھوتا سمجھ کر میں نے افسانہ لکھا اُسی موضوع پر آپ کے یہاں ایک اور کہانی چھپ گئی، فرق یہ ہے کہ میں نے قلاّش کا لفظ کہیں استعمال نہیں کیا اور اِس کہانی کا عنوان ہی یہ ہے۔ بہرحال....

ناوک نے ترے صید نہ چھوڑا زمانے میں ۔۔ تڑپے ہے مرغِ قبلہ نما آشیانے میں

کوثر چاند پوری (بھوپال)

....حضرت خوشتر گرامی علم وادب کے بیکراں سمندر میں غوطہ زن ہوتے ہیں اور دُنیائے فکر ونظر کے لئے جو لاجواب "جوہر" دریافت کرتے ہیں وہ "بیسویں صدی" کا "سالنامہ" ہوتا ہے۔ ادبی حلقوں کے لئے حضرت خوشتر کی یہ عظیم پیش کش صحت مند ادب کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اہلِ فن جس خلوص اور رغبت سے اِس "جوہرِ بے مثال" کا خیر مقدم کرتے ہیں وہ سب پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ معیاری مضامینِ نظم ونثر کا انتخاب اور اشاعت میں ترتیب کا سلیقہ جنابِ خوشتر گرامی کی خوبیٔ صحافت کی ہمہ گیر صلاحیت کو اُجاگر کرتا ہے....

رشی پٹیالوی (چندی گڑھ)

SUNL GHT
SOAP
SUNLIGHT
SOAP

.... ماشاءاللہ ہر لحاظ سے اپنا جواب آپ ہے۔ تصویریں، شعر اور ادب کے خطوط، مقالات نظم و نثر ہر چیز مجھے بہت پسند آئی۔ آپ اُردو زبان اور ادب کی اِس اُردو کشی کے دور میں جو گرانقدر خدمات انجام دے رہے ہیں وہ لائق صد تحسین و آفریں ہے۔ خدا اُردو کے لئے آپ کو اور بیسویں صدی کو زندہ و پائندہ رکھے۔ آمین....

(پروفیسر) ایم اے حفیظ بنارسی

....سالنامہ بیسویں صدی ہر سال کی طرح اپنی تمام تر رعنائیوں اور تابانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوا اور نظریں ہمیشہ کی طرح منور ہو گئیں۔ اس مرتبہ آپ نے جو نیا انداز اُردو فنکاروں کو پیش کرنے کا اختیار کیا ہے اور اُس کے لئے جن خصوصی فنکاروں کا انتخاب فرمایا ہے اُس کی داد جس قدر دی جائے کم ہے ....

ضیا فتح آبادی (نئی دہلی)

.... آپ کی ترتیب اور صحافت کے سلیقہ کی جس قدر بھی داد دی جائے کم ہے۔ ماضی کی طرح یہ سالنامہ بھی ایک ادبی دستاویز بن کر رہ گیا۔ میں تو بہت قریب سے دیکھ چکا ہوں کہ آپ پرچے کے نہ صرف مضامین بلکہ اُن کی کتابت طباعت اور گیٹ اپ پر جن باریک اور ناقدانہ نظروں سے کام لیتے ہیں اور اُسے آخری منزلوں تک پہنچاتے ہیں وہ مجھے کسی اور ادارہ میں نہیں ملتیں ....

رئیس نجمی امروہوی (امروہہ)

.... شیخ صاحب نے سالنامہ کے سلسلہ میں آپ پر جو ستم کیا وہ بڑا ہولناک تھا۔ اِس پر بھی سالنامہ بہت بہتر بہت خوب۔ بہت وقت پر شائع کر کے آپ نے اپنا معیار اور پابندیٔ وقت کا نام خوشتر گرامی ہے ....

سعید انصرت (کراچی)

.... خوبصورتیوں کا شیدائی ہوں۔ دیکھتا ہوں تو تشنگی سا ہو جاتا ہوں ..... اِس بار سالنامہ دیکھا تو مجھے اپنی خبر نہ رہی ....

جے پال ٹیڑھا (امروہہ)

.... اب کے سالنامہ گزشتہ سالناموں سے بازی لے گیا۔ آپ جادوگر تو نہیں۔ خدارا یہ سحر ہمیں بھی سکھا دیجئے۔ ڈاکٹر شکیل الرحمان، رام لعل، ہیندر ناتھ، انور شلہ اور کرشن چندر کے افسانے خوب ہیں، خوشتر بھائی۔ مبارک ہیں آپ جن کے دم خم سے ایسے شاہکار دیکھنے نصیب ہوتے ہیں ....

موہن یاور (جموں)

.... آپ کے انتخاب اور دقتِ نظر کا جواب نہیں ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ آپ تیر و نشتر میں بڑے کام کی باتیں لکھتے ہیں۔ پھر اتنے اختصار کے ساتھ آپ جو کچھ کہہ جاتے ہیں۔ وہ آپ ہی کا حصہ ہے ....

منظر صدیقی (کراچی)

.... آپ کی بے لوث ادبی خدمت نے بیسویں صدی کے سالنامے کو ایک نئی زندگی اور نئی روشنی بخشی ہے اور یہ روشنی ہمیشہ آفتابِ ادب بن کر چمکتی رہیگی۔ اس مرتبہ آپ نے سالنامے کی انفرادیت اور رنگینی میں گوناگوں اضافہ کر دیا ہے ....

چندر پرکاش جوہر بجنوری (الٰہ آباد)

.... آپ نے قارئین بیسویں صدی کو نئے سال کا جو تحفہ سالنامے کی صورت میں پیش کیا ہے اُس کے لئے آپ کو یقیناً بیشمار مبارکبادیں مل رہی ہوں گی۔ میرے پاس خطوط آنے شروع ہو گئے ہیں۔ ان سب میں آپ کی اُردو نوازی کا اعتراف کیا گیا ہے۔ آپ بجا طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں ....

رام لعل (لکھنؤ)

.... بیسویں صدی کا سالنامہ دیکھ کر طبیعت باغ باغ ہو گئی۔ اگر ایمان کی پوچھئے تو زیرِ نظر سالنامہ بیسویں صدی پچھلے تمام نمبروں سے سبقت لے گیا۔ پاکستان میں اِس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ کراچی کے کسی ایجنٹ کے یہاں اِس کی کوئی کاپی نظر نہیں آتی۔ آپ نے اِس کی قیمت ڈیڑھ روپیہ رکھ کر واقعی بہت بڑا ایثار کیا۔ اگر آپ اس کی قیمت تین روپیہ بھی رکھتے تو بھی یہ ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ....

حباب ترمذی (کراچی)

.... تیر و نشتر جیسے گہرے، اور لامحدود موضوع پر آپ جس ثقاہت اور انفرادیت پسند اسلوب سے طنزیات کا اختصار پیش فرماتے ہیں، یقیناً ہند و پاک میں کوئی صحافی اِس سے بہتر نہیں پیش کر سکتا ——— اِس میں مبالغہ نہیں ملک کے بڑے بڑے دانشوروں کی آپ کے بارے میں یہی رائے ہے! ... اِس بار پھر آپ نے افسانوی، اور صحافتی دنیا کو چونکا دیا ہے۔ آپ اس میدان کے شہسوار ہی نہیں، بیرکار بھی ہیں، افسانوی حصہ اسقدر دلچسپ، اور معیاری، پاکیزہ و ارفع ہے۔ کہ اِس کی یاد عرصہ تک لوگوں کے دلوں سے محو نہیں ہو سکتی ....

ظہیر کیفی (امروہہ)

Just 2 tablets

سُعالین

سعالین کی صرف دو ٹکیاں گلے کی خراش کو دُور کرنے اور تسکین پہنچانے کے لیے کافی ہیں۔ یہ سانس کی نالیوں کو صاف کرتی ہیں۔ کھانسی ، زکام اور گلے کی خرابیوں کو دور کرتی ہیں اور خراش کو پیدا ہونے سے روکتی ہیں۔

سُعالین

آپ کے سانس کو بھی خوش گوار بناتی ہے

ہمدرد

دہلی ، کانپور ، پٹنہ

کہ مسئلہ کیا ہے ؟

حق اور دِفاع کا ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے۔
آپ کھیتوں اور کارخانوں میں پیداوار
جتنی زیادہ بڑھائیں گے،
قوم کے ہاتھ اتنے ہی زیادہ مضبُوط ہوں گے۔

مضبُوط دِفاع کے لئے جی توڑ محنت کریں

اس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ غیر اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات شامل اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ بیسویں صدی کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھیے۔ ہر سوال کے بعد جواب کیلئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھیے کہ اس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے —— ایڈیٹر بیسویں صدی دہلی

شکیلہ بانو ۔ علیگڑھ

س ۔ میں جناب آسی رام نگری کو اپنے افسانے اصلاح کے لئے بھیجنا چاہتی ہوں۔ کیا آپ اُن کا مکمل پتہ بتا سکتے ہیں ؟

ج ۔ جناب آسی رام نگری مغل سرائے (بنارس)

س ۔ میری تعلیم گھریلو ہے۔ کیا افسانہ نگار بننے کے لئے کالج کی اعلیٰ تعلیم ضروری ہے ؟

ج ۔ جی نہیں۔ کالج کی اعلیٰ تعلیم سے زیادہ مطالعہ اور احساس و مشاہدہ ضروری ہے۔

سلیم انصاری ۔ خاندیس

س ۔ یہ کس کا شعر ہے ؎

شکارِ غم کو سہارا جو نہ ملے دنیا کی آنکھ کو
در حقیقت وہ انسان انسان ہے ہر قدم پر جو گر کر سنبھل جائے

ج ۔ کسی کا شعر ہو۔ بہت اچھا شعر ہے۔

فطرت قاسمی بنگلور

س ۔ انسان وقت کا غلام کیوں ہے ؟

ج ۔ ہر انسان وقت کا غلام نہیں ہوتا۔ کاہل اور بے عمل انسان وقت کا غلام ہوتا ہے۔

س ۔ حسرت ؟

ج ۔ حسرت کا دامن حد سے زیادہ دراز کرنے والوں کی حسرت کبھی پوری نہیں ہوتی۔

س ۔ ہونٹوں کی مسکراہٹ کس بات کی غمازی کرتی ہے ؟

ج ۔ ہونٹوں کی مسکراہٹ سچی بھی ہوتی ہے، جھوٹی بھی۔ کبھی کبھی دل افسردہ ہوتا ہے۔ پھر بھی ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوتی ہے۔ پھر بھی مسکرانا پڑتا ہے۔

مسرت شہناز ۔ کلکتہ

س ۔ میرے ایک بھائی کا خیال ہے، خلوص ہر حال میں برا ہے۔ جب تک تھوڑا ہے ٹھیک ہے اور بڑھ جائے تو مہلک۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے ؟

ج ۔ آپ کے بھائی کا خیال صحیح نہیں ہے خلوص ہر صورت میں اچھا ہوتا ہے۔

س ۔ زندگی کا دوسرا نام حادثات یا محبت ——

ج ۔ یہ اپنے اپنے خیال کی بات ہے۔ زندگی کے بہت سے نام ہیں۔ زندگی کی بہت سی تعریفیں ہیں —— زندگی بزمِ طرب بھی رسن و دار بھی ہے —— زندگی سنگِ گراں بھی ہے گلِ تر بھی ہے !

س ۔ زندگی یوں تو ہمیشہ سے پریشاں سی تھی
اب تو ہر سانس گرانبار ہوئی جاتی ہے

ج ۔ بانو! حالات سے ہراساں نہ ہونا چاہیئے حوصلہ نہ چھوڑنا چاہیئے ——

حیات کیا ہے اگر تلخیٔ حیات نہیں
وہ زندگی ہی نہیں جس میں حادثات نہیں

عبدالواحد ۔ سنگا ریڈی

س ۔ انسان کو اپنی موت کا دن معلوم ہو جائے تو ؟

ج ۔ موت سے پہلے ہی مر جائے۔

س ۔ رات کے بعد دن ۔ دن کے بعد رات آتی ہے۔ جوانی کے بعد بڑھاپا، بڑھاپے کے بعد جوانی کیوں نہیں آتی ؟

ج ۔ اس لئے کہ انسان کی زندگی دن اور رات نہیں ہوتی۔

محمد خلیل خان۔ جلا

س۔ خوشتر بھائی! ہندوستان میں اردو زبان کی کیا اہمیت ہے۔

ج۔ وہی اہمیت ہے۔ اردو بولنے اور لکھنے پر کوئی پابندی نہیں!

س۔ مذہب؟

ج۔ مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا۔ ہر مذہب اچھا نظام حیات ہے۔

س۔ یہ شعر کس کا ہے ؂
پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

ج۔ علامہ اقبال کا۔

حنیفہ بیگم۔ علیگڑھ

س۔ مسکراہٹ؟

ج۔ جئے تو رنج و الم میں بھی مسکرا کے جئے
دگرنہ زندگی مشکل سے ہے آدمی کے لئے

سید اصغر علی زیدی اصغر۔ میرٹھ

س۔ دل اور ساز؟

ج۔ دل ایسا ساز ہے جس کے تار ٹوٹتے ہیں تو آواز نہیں ہوتی۔

س۔ "محبت مستقل آزار بھی ہے" یہ کہاں تک سچ ہے۔

ج۔ سو فیصدی!

س۔ انسان کیریکٹر سے عظیم ہوتا ہے یا عظیم ہو کر اپنے کیریکٹر کو بناتا ہے۔ جواب شاید خوش تر کر دے۔

ج۔ انسان کیریکٹر سے عظیم ہوتا ہے۔

. . . .

س۔ خوشتر بھیا! اردو کو آخر اس کا صحیح مقام ملے گا؟

ج۔ اردو کی جان بخشی کیا کم کرم ہے۔ جو آپ اس کا صحیح مقام ملنے کے مشتاق ہیں۔

جاوید شمسی۔ راولپنڈی

س۔ عمدہ شعر کی پہچان کیا ہے؟

ج۔ آپ خود شاعر ہیں۔ یہ آپ دوسروں سے زیادہ جانتے ہوں گے۔

س۔ انسان کو کس طرح زندگی بسر کرنی چاہئے؟

ج۔ جس طرح اچھے لوگوں نے زندگی بسر کی۔ جس طرح اچھے لوگ زندگی بسر کرتے ہیں۔

لبی خاں سہسرامی۔ کلکتہ

س۔ آج کل کی لڑکیاں اتنی عریانیت پسند کیوں ہو گئی ہیں۔

ج۔ لڑکیاں عریانیت پسند نہیں ہو گئی ہیں۔ مرد عریانیت پسند ہو گئے ہیں۔

س۔ انسان زندگی سے تنگ آ کر موت کو کیوں تلاش کرتا ہے؟

ج۔ اپنی خام خیالی کی بنا پر وہ سمجھتا ہے کہ زندگی کے مارے کو موت کے دامن میں پناہ ملے گی۔

شمس۔ ورنگل

س۔ اگر کوئی لڑکی کسی مرد کو دیکھ کر مسکرائے تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟

ج۔ کوئی لڑکی مرد کو دیکھ کر نہیں مسکراتی۔

س۔ ہر فنکار عورت کی ننگی تصویر بنانے کی کوشش کیوں کرتا ہے؟

ج۔ آپ کا خیال غلط ہے۔ حقیقی فنکار ایسا نہیں کرتا۔

محمد سلیم۔ ٹبلہ

س۔ خوشتر بھائی! کیا سب سے بڑی خود اعتمادی اور قوت ارادی مجھ میں بدرجہ اتم مفقود ہے

ج۔ آپ احساس کمتری میں مبتلا ہوں گے۔ حیات عظیمہ اور زندگی افروز تحریروں اور کتابوں کے مطالعہ سے آپ میں خود اعتمادی پیدا ہو جائے گی اور قوت ارادی بھی۔

س۔ کیا مغرب کی تقلید ہماری اصلاح و فلاح کی ضامن ہے؟

ج۔ ہرگز نہیں۔

محمد اکرم۔ گریڈیہ ہزاری باغ

س۔ ایک اچھے غزل گو شاعر میں کیا خصوصیت پائی جاتی ہے۔

ج۔ شنیدہ کے بود مانند دیدہ! کسی اچھے غزل گو شاعر کا کلام پڑھ کر خود دیکھ لیں۔

مس پیاری سلطانہ۔ وجے واڑہ

س۔ بھائی جان! عورت کی سب سے بڑی خواہش اور سب سے بڑا ارمان کیا ہے؟

ج۔ عورت کی سب سے بڑی خواہش ہمیشہ جوان رہنا اور سب سے بڑا ارمان ہے ماں بننا۔

س۔ زندگی کے لئے سب سے بڑی اور ضروری چیز کیا ہے؟

ج۔ زندگی سے پیار کرنا۔

سید لیاقت حسین۔ برکنگ (اسکیس)

س۔ خوبصورتی کا معیار کب بلند ہوتا ہے اور کیسے؟

ج۔ اپنی صحت کا خیال رکھنے سے۔

س۔ مرد اپنے جذبات پر زیادہ قابو رکھ سکتا ہے یا عورت؟

ج۔ عورت۔

شہزاد محمد خاں۔ حیدرآباد سندھ

س۔ آج انسانیت کا معیار اتنا پست کیوں ہو گیا ہے؟

ج۔ اس لیے کہ انسان انسان نہیں رہا۔

س۔ جب انسانیت اپنی حدود سے تجاوز کر جائے تو؟

ج۔ حیوانیت ہی حیوانیت ـــ زندگی ہی زندگی رہ جاتی ہے۔

س۔ کب انسانیت پر حیوانیت غالب آجاتی ہے؟

ج۔ جب انسان انسانیت کا دامن چھوڑ دیتا ہے۔ جب انسان حیوان بن جاتا ہے۔

طاہر قاسم۔ بچہر دکھی۔ سارن

س۔ انسانیت کب تک سسکتی رہے گی۔؟

ج۔ جب تک دشمن انسانیت چنگیز اور ہلاکو کے جانشین چیاؤ ماؤ جیسے انسان دنیا میں زندہ رہیں گے۔

س۔ خوب انداز ہے چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں
یہ شعر کس طرح صحیح ہے۔ میری ایک سہیلی سے شرط لگی ہے۔ وہ "انداز" کی جگہ "پردہ" کہتی ہیں۔

ج۔ انداز نہیں، پردہ صحیح ہے۔

س۔ بھیا عورت کی بے بسی اور مظلومی کب ختم ہوگی؟

ج۔ جب عورت ظلم کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو جائے گی۔

اطہر بھائی۔ سیونی۔ ایم۔ پی

س۔ میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن ڈرتا ہوں شریک حیات مرضی کے مطابق نہ ہوئی تو زندگی اجیرن نہ ہو جائے۔

ج۔ سمجھ پرکھ کر شریک حیات چنیے۔ پھر بھی اس میں کوئی کمی ہو تو اس سے تعاون کرنے کی کوشش کیجیے حالات سے سمجھوتہ کرنے کی کوشش کیجیے۔ پھر زندگی اجیرن نہ ہوگی۔

س۔ بتائیے مرد عورت کا کیا رشتہ ہے؟

ج۔ قرآن پاک میں مرد اور عورت کو ایک دوسرے کا لباس کہا گیا ہے۔

ایم۔ ڈی۔ ای۔ رانچی

س۔ بھائی جان! میری ایک مشکل کا حل بتائیے۔ ایک طرف ماں، دوسری طرف بیوی۔ دونوں کی اپنی الگ الگ۔ کچھ غلطیاں ادھر سے کچھ غلطیاں ادھر سے۔ لیکن کچھ زیادہ ایک طرف سے۔ بتائیے میں کیا کروں؟

ج۔ بیوی سے کہیے ساس کا ادب و احترام کرے ماں سے کہیے بہو سے پیار کا برتاؤ کریں جب ساس بہو کو بیٹی سمجھتی ہے تو بہو بھی ساس کو ماں سمجھتی ہے۔

س۔ غم کو کس طرح زندگی سے الگ کیا جائے۔ کیا اس کی کوئی تدبیر ہے؟

ج۔ کیوں نہیں، غم کو خوشی بنا لیجیے۔ غالب نے کہا ہے ؎
رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج

عبدالولی۔ بھاگل پور

س۔ "بیسویں صدی" میں جو تصویریں چھپتی ہیں کیا آپ ان کا معاوضہ دیتے ہیں؟ تصویریں کس سائز کی ہونی چاہئیں؟

ج۔ اچھی تصویروں کا معاوضہ دیا جاتا ہے جس سائز کی تصویریں آپ "بیسویں صدی" میں دیکھتے ہیں اُسی سائز کی تصویریں ہونی چاہئیں۔

اظہار حسین رہبر رامپوری۔ کیسریا

س۔ انتظار؟

ج۔ موت سے بھی شدید ہوتا ہے
الانتظار اشد من الموت

س۔ بے پناہ محبت کا انجام؟

ج۔ بے پناہ تباہی!

س۔ بھائی جان! کیا محض نظارۂ حسن سے انسان گناہ کا مرتکب ہو سکتا ہے جب کہ اس کا دل پاک ہو۔

ج۔ محض نظارۂ حسن کو بھی اس لیے گناہ قرار دیا گیا ہے کہ یہی گناہ کی تمہید بنتا ہے۔

اعجاز احمد۔ دہلی

س۔ آپ افسانہ نگاروں کے پتے افسانوں کے ساتھ شائع کرتے ہیں۔ شاعروں کے پتے کیوں نہیں شائع کرتے۔ اگر افسانہ نگار کو اس کی تخلیق کے لیے حوصلہ افزا پیغام کی قارئین سے طلب ہے، تو شاعروں کو بھی ہوتی ہوگی۔ اگر شاعر .... کو بھی اس کی تخلیق کے بارے میں لکھنا ہو تو آپ شعرا کے پتے شائع کیا کریں۔

ج۔ افسانہ نگاروں کے صرف پتے تو نہیں شائع کئے جاتے، افسانوں کے ساتھ افسانوں کے متعلق خطوط بھی پیش کر دیے جاتے ہیں۔

س۔ پست ہمت وہ ہیں راہ شوق میں جو رہ گئے
حوصلہ والوں کے آگے دور کچھ منزل نہیں
آپ کا اس شعر کے بارے میں کیا خیال ہے؟

ج۔ اچھا شعر ہے۔

سراج الدین ابراہیم ۔ بھیونڈی

س ۔ بھائی جان! کیا دولت کی طرح کامیابی بھی انسان کو مغرور بنا دیتی ہے؟

ج ۔ ہاں، کم ظرف لوگوں کو مغرور بنا دیتی ہے۔

س ۔ اردو کی سب سے پہلی غزل کس نے کہی۔

ج ۔ حضرت امیر خسرو نے۔

س ۔ بھیا! آپ کی نظر میں آج کا سب سے بڑا غزل گو شاعر کون ہے؟

ج ۔ جو مشاعروں میں سب سے اچھا گا کر پڑھے!

عبدالقیوم نظامی ۔ لاہور

س ۔ عام طور پر یہ شعر غالب کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے لیکن دیوانِ غالب میں ڈھونڈنے سے نہیں ملا کیا واقعی یہ غالب کا شعر ہے۔

جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں
ایسی جنت کو کیا کرے کوئی

ج ۔ دیوانِ غالب میں یہ شعر نہیں ہے تو اسے غالب سے منسوب کرنا مناسب نہیں۔

س ۔ آپ کے خیال میں اگر کوئی ایسی کتاب ہے جس میں ایک ہی مفہوم کے بہت سے اشعار جمع کئے گئے ہوں تو اُس کا نام بتایئے، اور وہ کہاں سے مل سکتی ہے؟

ج ۔ ایسی کتاب "گلستان ہزار رنگ" ہے، ادارہ بیسویں صدی سے مل سکتی ہے۔

س ۔ کیا غالب قنوطی شاعر تھے؟ آپ کا کیا خیال ہے؟

ج ۔ غالب کو قنوطی کہنا صحیح نہیں ہے کیا ایسے اشعار کہنے والا قنوطی شاعر ہے۔

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

واعظ تاج الدین راہی بیڑیا

س ۔ کوئی ایسا وقت بھی آتا ہے جب گناہ ثواب میں بدل جاتا ہے؟

ج ۔ قبلہ! آپ واعظ ہیں، یہ ہم سے زیادہ آپ جانتے ہوں گے۔

س ۔ انسان کو راحت کس طرح مل سکتی ہے؟

ج ۔ دوسروں کو راحت دینے سے۔ کسی کو تکلیف نہ پہنچانے سے۔

س ۔ دُنیا میں عورت نہ ہوتی تو؟

ج ۔ دُنیا سنسان ویران ہوتی۔ علامہ اقبال نے فرمایا ہے۔

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

سید اختر حسین ۔ مرشد آباد

س ۔ خمار آلود اور نمناک آنکھوں میں کیا فرق ہے؟

ج ۔ کوئی ایسی آنکھ دیکھ لیجئے ——— شنیدہ کے بود مانند دیدہ ———

س ۔ حسین خوابوں کی دنیا میں کیا یادِ ماضی کا نقش بھی مل سکتا ہے؟

ج ۔ ماضی حسین رہا ہوگا تو ضرور ملے گا۔

س ۔ آج کس کی مانگ زیادہ ہے؟

ج ۔ جس سے سب کو بڑی نفرت ہے! یعنی "چینی" کی۔

عبدالحمید غافل ۔ سرینگر

س ۔ موجودہ زمانہ میں عورتوں کی نیم عریانیت کفایت شعاری ہے یا فیشن پرستی؟

ج ۔ فیشن پرستی ۔ مردوں کی ذہنیت کی پستی؟

س ۔ ہماری تہذیب کو بگاڑنے میں آج کل کی بے ہودہ فلموں کا کہاں تک ہاتھ ہے۔ اُن سے بچنے کی کوئی صورت؟

ج ۔ فلموں نے ہماری تہذیب کو کافی تباہ کیا ہے ۔ اس تباہی سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ ایسی فلمیں نہ دیکھی جائیں ۔ ایسی فلموں کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے۔

س ۔ اگر سائنس خدا سے انکار کرتی ہے تو مسلمان کیوں سائنس پر یقین کرتے ہیں۔ اگر یقین نہیں کرتے تو سائنس پڑھنا کیوں نہیں چھوڑتے۔

ج ۔ صرف خدا سے انکار ہی تو سائنس نہیں ہے سائنس اور بہت کچھ ہے۔

سعیدہ نیاز ۔ الہ آباد

س ۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں ساری دنیا میں کتنے روزانہ اخبارات نکلتے ہیں؟

ج ۔ ساری دنیا میں ۲۰۰۰، روزانہ اخبارات نکلتے ہیں؟

س ۔ بھائی جان! یہ بھی بتائیں ساری دُنیا میں کتنی زبانیں بولی جاتی ہیں اور اُن میں سے زیادہ کون سی زبان بولی جاتی ہے؟

ج ۔ ساری دنیا میں ۳۳ ہزار زبانیں بولی جاتی ہیں اُن میں سب سے زیادہ انگریزی بولی جاتی ہے۔

س ۔ انڈونیشیا میں مسلمانوں کی آبادی کتنی ہے۔

ج ۔ ۹۰ فی صدی۔

محمد کلیم بھنڈارا مدینہ ۔ ہزاری باغ

س۔ اس دنیا میں تعلیم کی زیادہ اہمیت ہے یا دولت کی؟

ج۔ دونوں کی۔

س۔ قیامت کی تعریف؟

ج۔ قیامت کی تعریف بہت طویل ہے جو سرگوشیوں میں ممکن نہیں۔ عشق و محبت کی حماقت کرنے والے دوری و مجبوری کی رات کو قیامت کہتے ہیں۔ لیڈری پیشہ لوگوں کے لئے وہ دن قیامت ہوتا ہے جس دن وہ الیکشن ہوتا ہے جس میں وہ خود کسی کے مقابلہ میں کھڑے ہوتے ہیں۔

س۔ اس دنیا میں ہمیشہ قائم رہنے والی شے؟

ج۔ نیک اعمال ——— نیک افعال!

عطا ہاشمی گھائل ۔ دربھنگہ

س۔ ادب کیا ہے؟

ج۔ جو آپ ادبی رسائل اور ادبی کتابوں میں دیکھتے ہیں۔

س۔ آسی رام نگری ایک افسانہ کی اصلاح کا کیا معاوضہ لیتے ہیں؟

ج۔ آپ یہ جاننے کے لئے انھیں سے دریافت فرمائیں۔

قمر کلیم انصاری۔ درگاپورا۔ بردوان

س۔ سب سے زیادہ کس پھول میں خوشبو ہوتی ہے؟

ج۔ چمپا میں۔

ایم اے منظور آرزو۔ بوگرا (مشرقی پاکستان)

س۔ ایک غریب آدمی اپنے وطن کے لئے کیا کر سکتا ہے؟

ج۔ بہت کچھ کر سکتا ہے۔ امیروں سے زیادہ غریبوں کے دل میں وطن کی خدمت کا جذبہ ہوتا ہے۔

س۔ ایک انسان کی محبت نفرت میں بدل جائے تو ...؟

ج۔ وجہ دریافت کر کے اُسے دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اور اگر ایسا کرنے والا "جاوؔ" ہو تو پھر اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہیے۔

س۔ قومی مفاد کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہیے۔

ج۔ وہ سب کچھ جس کی ضرورت ہو۔

جمال احمد ہاشمی ۔ دربھنگہ

س۔ دورِ جدید میں کوئی ایسا شاعر ہے جس نے اقبال کے نظریہ کو اپنایا ہو؟

ج۔ کوشش تو کتنوں نے کی۔ لیکن کامیاب کوئی نہ ہوا۔

س۔ آپ کے یہاں فن کی قدر ہوتی ہے یا فنکار کی؟

ج۔ دونوں کی۔ لیکن ہم پہلے فن کو دیکھتے ہیں، اس کے بعد فنکار کو۔

قدسیہ خانم ۔ دربھنگہ

س۔ کسی لڑکی سے شادی کرتے وقت لوگ حسن اور دولت کو ترجیح دیتے ہیں، کیوں!

ج۔ اس لئے کہ یہ چیزیں نظر آتی ہیں، باطن کا حسن آنکھوں سے اوجھل ہوتا ہے۔

س۔ س۔ غزل ۔ ایوت محل

س۔ مجھے اردو ادب سے بے حد دلچسپی ہے۔ بتائیے کہ کن کتابوں کا مطالعہ میرے لئے مفید ثابت ہو سکتا ہے؟

ج۔ ہر ادبی کتاب کا مطالعہ مفید ہوگا۔

س۔ غالب کو شاعرِ اعظم کہا جاتا ہے تو پھر اقبال کو کیا کہیں؟

ج۔ شاعرِ مشرق ——— شاعرِ حیات!

س۔ فلمی دنیا کے مشہور شاعر حسرت جے پوری اور ساحر لدھیانوی کیا ادبی دنیا کے بھی مایہ ناز شاعر کہے جا سکتے ہیں؟

ج۔ ساحر لدھیانوی کو ادبی دنیا میں بھی ممتاز مقام حاصل ہے۔

اے قدوس بانک ۔ ہگلی

س۔ غم کے بعد خوشی کا مقدر نہ کرے تو انسان کیا کرے؟

ج۔ مایوس و بددل نہ ہو۔ اپنے دل میں اُمید کی شمع روشن رکھے۔

س۔ سکونِ خاطر کب ملتا ہے؟

ج۔ جب انسان اچھے کام کرتا ہے۔

صاحب الزماں ۔ الٰہ آباد

س۔ انسان کا اوّلین مقصد کیا ہے؟

ج۔ ہر انسان کا ایک مقصد نہیں ہوتا۔ کسی کا مقصد تعمیر ہوتا ہے۔ کسی کا تخریب۔ کسی کا مقصد امن اور شانتی ہوتا ہے، کسی کا مقصد امن دشمنی اور امن سوزی ہوتا ہے۔

س۔ کیا عورتیں احساسِ کمتری کا شکار ہوتی ہیں؟

ج۔ کیوں نہیں۔ لیکن مردوں سے کم۔

[illegible] ——— [illegible] ——— [illegible]
بیسویں صدی دہلی

پتہ:- ریڈیم کیمیکل ورکس پرائیویٹ لمیٹڈ پوسٹ بکس نمبر ۱۳۵۱ دہلی نمبر ۶

27TH YEAR OF PUBLICATION
طاقت کی سب سے مشہور دوا
جو
فوراً اثر دکھاتی ہے
ریڈیم ٹانک پلز
پتہ۔ ریڈیم کیمیکل ورکس (پرائیویٹ) لمیٹیڈ پوسٹ بکس نمبر ۱۳۵۱ دہلی

"چنڈی گڑھ میں کٹھ پتلیوں کا شو"۔ ایک خبر —— جس میں ماسٹر تارا سنگھ، چودھری دیوی لال، پنڈت سری رام شرما، اور مولوی عبدالغنی نے حصہ لیا۔

"جنوں اور بھوتوں نے سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا"۔ ایک خبر —— انہوں نے دیکھا کہ انسان ان جیسی بیہودگیاں کر رہا ہے تو وہ کیوں دور بیٹھے تماشہ دیکھتے رہیں۔

"وزیر کی نیند حرام ہو گئی"۔ ایک عنوان —— اُس نے وزارت کو پھولوں کی سیج سمجھا تھا۔

"چمڑا گھر کی آمدنی"۔ ایک عنوان —— سیاسی جانوروں کی پرورش پر خرچ ہو گی۔

"پنجاب سرکار نے پانچ بڑے بڑے شہروں میں سائیکل رکشا ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا"۔ —— وہاں کے بیکار ہونے والے رکشا ڈرائیوروں کو چاہئے کہ سیاست کے میدان میں آ جائیں۔

"زیادہ نمبروں والے امیدواروں کو نظر انداز کر دیا گیا"۔ ایک خبر —— اُن کی سفارش کرنے والے لیڈر نہ ہوں گے۔

"چینی میں پھر بلیک"۔ ایک خبر —— کیسے ممکن ہے چینی تو سفید ہوتی ہے۔

"آٹے میں ملاوٹ کی روک تھام کے لئے انسپکٹر مقرر کئے گئے" —— اور اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ انسپکٹر خالص ہیں اُن میں ملاوٹ نہیں ہے؟

"کرنال میں اناج کی کمی نہیں" —— تو کیا لیڈروں کی کمی ہے؟ امرتسر، چنڈی گڑھ، رہتک سے منگوا لیں۔

"افسروں کی کانفرنس کی اہم سفارشات" —— ڈالی سسٹم [illegible]

[illegible] دہلی

"بہت سے سرکردہ پرجا سوشلسٹ لیڈروں نے کانگرس میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا" ایک خبر ـــــ صدر کانگرس کو اُن کے لئے ایسے عہدے تلاش کرنے چاہئیں جیسا اشوک مہتہ کو دیا گیا ہے۔

قرار دیا جائے۔ چار پہیوں کا لاری کے گروپ کا کام کرنے کی ہدایت کی جائے۔ دورے میں بیوی کو ساتھ لے جانے اور بیت چارج کرنے کی اجازت ہو۔

"پنجاب اسمبلی کے بجٹ سیشن کے پہلے روز ہی اپوزیشن نے گڑبڑ شروع کر دی" ـــــ اس لئے اب اپوزیشن کا نام گڑبڑ گروپ رکھ دیا جائے۔

"جھنگ (پاکستان) کے بازارِ حسن میں پولیس کا چھاپہ" ایک خبر ـــــ درجنوں حشیش کی ذخیرہ اندوزی کرنے والے گرفتار۔ ہزاروں من حشیش برآمد۔

"کلیدی صنعتوں کو فروغ دینے کے لئے ایک نیا بنک قائم کیا جائے گا" مرکزی وزیر خزانہ نے بل پیش کر دیا ـــــ ـــــ بھلا ٹاٹا اور ٹالیا اینڈ کمپنی جلد امداد حاصل کرنے کے لئے درخواستیں بھیجیں۔

"اُتر پردیش میں خوراک کرائسس حل کرنے کے لئے اقدامات" ایک خبر ـــــ پہلے وزارت کرائسس تو حل کر لیجئے۔ خوراک کا کیا ہے۔ وہ تو مل ہی جائے گی۔ وزارت ہاتھ سے نکل گئی تو پھر نہ ملے گی۔

"عوام کو تنگ نظری، صوبہ پرستی اور ذات پات وغیرہ سے دور رکھنا چاہیئے" نائب وزیر تعلیم ـــــ اس کے لئے ضروری ہے کہ عوام کو لیڈروں سے محفوظ رکھا جائے اور سب لیڈروں کو کالے پانی بھیج دیا جائے۔

"یو۔ پی کی دستکاریاں" ایک عنوان ـــــ جن میں کانگرسیوں کی باہمی رسہ کشی کی قدیم دستکاری بھی شامل ہے۔

"دہلی میں آٹا غائب" ـــــ چلو لوگ کھانا کھانے کی زحمت سے بچ گئے۔

"پنجاب کی پرجا سوشلسٹ پارٹی کا شیرازہ بکھرنے لگا" ایک خبر ـــــ کیا شیرازہ لگا کر بھی جوڑا نہیں جا سکتا۔

"آج لیڈر سرمایہ داروں کو ناراض کرنا نہیں چاہتے" ایک عنوان ـــــ

"چین کا کردار۔ ایک عنوان ——— دوست بن کر پیٹھ میں چھرا گھونپتا ہے۔

——— اس لئے کہ الیکشن میں ان سے چندہ جو ملتا ہے۔

"بونے بچے قدآور ہو سکیں گے۔" سڈنی کے ڈاکٹروں کا اعلان ——— اور
یہ قطب مینار کی ہمسری کر سکیں گے۔

"رات کو پڑھنا بیکار ہوتا ہے۔" جرمن ڈاکٹروں کا دعویٰ ———
یسنداں اگر دن کے متعلق بھی ایسا ہی فتویٰ دیدیں تو دنیا کے کروڑوں طالب علم
کی مصیبت سے چھوٹ جائیں اور ان کے شکر گزار ہوں۔

"پہاڑوں کی چھاتی میں پرانی بستی۔" ایک عنوان ——— اب تک تو چھاتی
دودھ سنتے آئے تھے مگر اب معلوم ہوا کہ بستی بھی ہوتی ہے۔

"لاہور پولیس نے چڑیا گھر کی پہاڑی سے تین لڑکوں کو ایک پردہ دار خاتون
مذاق کرتے ہوئے گرفتار کر لیا۔" ایک خبر ——— اب انہیں ایک پنجرے
میں بند کر کے چڑیا گھر میں رکھ دیا جائے تاکہ لوگ دیکھیں اور عبرت حاصل کریں۔

"پنجاب سرکار سرکاری نوکریوں میں کھلاڑیوں کو زیادہ ترجیح دے گی۔" ایک
خبر ——— اس لئے ماسٹر تارا سنگھ ملازمتوں میں ناانصافیوں کو دور کرانا چاہتے
ہیں تو کالی دال کی بجائے کرکٹ۔ فٹ بال اور ہاکی وغیرہ کی کلبیں چلائیں۔

"ناجائز شراب کی بوتلیں پکڑی گئیں۔" ایک خبر ——— اچھا ہوا بوتلیں ہی
تھیں شراب نہ تھی۔

"ایک ایک انچ زمین خالی کرائے بغیر چین سے گفت و شنید نہ کی جائے۔"
آچاریہ کرپلانی ——— آچاریہ جی آپ سیٹھی میٹر کی بات کیجئے۔ انچوں اور فٹوں سے
ناپ تول خلاف قانون ہے۔

"دیش سے کرپشن دور کرنے کے لئے سب پارٹیوں سے شری گلزاری لال نندہ

کی ہدایت ایک خبر ——— اس لئے کہ کرکٹ کے حمام میں سب پارٹیاں ننگی ہیں۔

میں حد رکھنے کا نتیجہ۔

"ہوائی جہاز جھیل میں گر گیا" ایک خبر ——— مسافروں نے فضائی غسل کیا

"ملک میں بے حساب اور خفیہ رقم کی صحیح مقدار کا پتہ چلانا مشکل" کرشنم اچاری ——— اس لئے کہ ایسی رقم جمع کرنے والوں کو وزیروں کی سرپرستی حاصل ہے اور وہ بے حساب اور خفیہ طور پر اُس رقم میں سے حصہ لیتے رہتے ہیں۔

"پاکستان میں ہسپتال بند۔ ڈاکٹر غائب۔ وارڈ خالی" ایک اخباری عنوان ——— پاکستانی عوام کی عمدہ صحت کا ثبوت۔

"اُردو بین اقوامی زبان بن سکتی ہے" ایک عنوان ——— خواہ مخواہ بن سکتی ہے۔ ہندو کمشنا اتنی والے مورچہ لگا کر روک دیں گے۔

"کرایہ کی دیگیں فروخت کر دیں" لاہور میں ایک گوالے کی گرفتاری ——— شادی کے اخراجات جو پورے کرنے تھے۔ اب بھینس بیچ کر دیگیں خریدے گا۔

"ملتان (پاکستان) کے قریب ایک ہزار من روئی جل کر خاکستر ہوگئی" ایک خبر ——— نئی فصل کے اسٹاک کے لئے گودام خالی ہوگیا۔

"سستی دکانوں پر آٹے کی مقدار آدھی رہ گئی" ایک خبر ——— ملاوٹ کر لیجئے پوری ہو جائے گی۔

"امریکن لائف انشورنس کے صدر لاہور آرہے ہیں" ایک خبر ——— تاکہ نااہل اور بیکار سیاستدانوں کی زندگی کا بیمہ کر سکیں۔

"فوجی حوالدار کا صندوق غائب" ایک خبر ——— صندوق کو حوالات

"کھلونوں کا پندرھواں بین الاقوامی میلہ" ایک خبر ——— اس بار صرف سیاسی کھلاڑیوں کے لئے کھلونے پیش کریگا۔

افسانہ

شبنم کا پیاسا

شکرناتھ وی۔ آئے

وہ جو اُس کونے والی میز کے پاس جدید ترین ڈیزائن کی شلوار اور قمیص پہنے ہوئے کھڑی ہے۔ وہ جس کے بال مِس ڈے نیل کے بیوٹی پارلر کے سجائے ہوئے ہیں، ساتی رنگ کا ڈبل نٹنگ کا سوئیٹر پہنے ہوئے ہے ـــــــ یہ لڑکی مجھ سے محبت کرتی تھی۔ یہ محض میری خوش فہمی نہیں ہے، یہ ایک حقیقت ہے ـــــــ ایک بہت بڑی حقیقت!

کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ محبت کا دیوتا اندھا ہے۔ اور یہ کتنی اچھی بات ہے کہ یہ اندھا ہے۔ ورنہ ایک ڈسپوزل کے امریکی سوٹ کا، جسے میں نے ایک کباڑیئے سے بائیس روپے میں خریدا ہے اور جسے اپنے بدن پر فٹ کرانے کے لئے میں نے اپنے درزی کو دو روپے اور دیتے ہیں، یعنی جس کی کُل قیمت چھتیس رُوپے ہے ـــــــ اور ایک ڈھائی روپے والے سوئیٹر کا میل کیا معنی ـــــــ؟

اِس امریکہ کے ڈسپوزل مال نے تو ہمارے شہر کے متوسط طبقے کو ایک نئی سماجی زندگی دی ہے۔ ہائے! کیسے عمدہ عمدہ سوٹ ہیں، جیسٹر ہیں، اوور کوٹ ہیں۔ چند منچلوں نے ان کوٹوں کو ایک نیا نام دیا ہے۔ آنرن اوور کوٹ!

آج کل کی زندگی کو سائن بورڈوں کی کتنی ضرورت پڑتی ہے۔ اور متوسط طبقے کے لئے سائن بورڈوں کی کمی کو اِن آنرن اوور کوٹوں نے پُورا کر دیا ہے۔

بہرحال بات اُس ڈل کی مچھلی کی مانند سڈول جسم والی لڑکی کی ہو رہی ہے، جسے مجھ سے محبت ہو گئی تھی۔ یہ لڑکی ہر منگل کی شام کو روز الینڈ میں تامبولا کھیلنے آتی تھی اور میں تو ہر شام ہی یہاں ہوتا تھا، کیونکہ ایک پچاس فیصدی امریکی سوٹ پہنکر آدمی کا دماغ پچاس فی صدی ہندوستانیوں سے قدرے زیادہ امریکن ہو جاتا ہے، اور وہ عام جگہوں کو چھوڑ کر ایک ماڈرن ریسٹوران میں آتا ہے، جیسا کہ یہ اپنا روز الینڈ ہے۔

اب جبکہ بات چلی ہے، تو میں آپ کو یہ بتانا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ میں کہاں سے اور کیونکر وہ پیسے فراہم کرتا ہوں، جس سے روز الینڈ کے بھاری بھرکم بِل ادا ہوتے ہیں ـــــــ ورنہ آپ ضرور سوچنے لگیں گے کہ یہ دو سو رُوپے کا ملازم اور روز الینڈ جائے؟ اور میں نہیں چاہتا کہ اِس ابتدائی ہی منزل میں آپکی سوچوں کا دھارا کسی دوسری طرف مُڑ جائے اور آپ پولیس وغیرہ کے معنوں میں سوچنے لگیں۔

جی نہیں! میں رشوت ہرگز نہیں لیتا۔ میرا تعلق ہی اُس محکمے سے ہے جہاں اُوپر کی آمدنی کا سلسلہ نہیں چلتا۔ بات یہ ہے کہ میں ایک دوہری شخصیت کا مالک ہوں یعنی ایک دو سو روپے کا ملازم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک آرٹسٹ بھی ہوں۔ دفتری اوقات کے بعد اور چھٹی کے دنوں میں، میں اپنے دماغ کی گتھیاں برش اور رنگوں سے سُلجھاتا رہتا ہوں۔ لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں آرٹ اور اس طرح کی چیزیں روپے پیسے کے معاملے میں بہت منحوس ہوتی ہیں۔ چند برس پہلے جب میں نے تنگ آکر اپنی اِس ذہنی ورزش کو ترک کرنے کا فیصلہ کیا تھا، تو میرے ایک مخلص اور مہربان دوست نے

مجھے سوجھا تھا کہ کیوں نہ میں کچھ کمرشل قسم کی چیزیں پینٹ کیا کروں تاکہ کم از کم اپنے پرشوق رنگوں اور کینواس کے لئے ہی پیسے کماؤں۔ مشورہ بہت اچھا تھا اور میں نے صابن کے اشتہار، ہیر آئل بوتلوں کے لیبل، رسالوں اور میگزینوں کے سرورق وغیرہ بنانے کا دھندہ شروع کیا تھا۔

دھندہ چل نکلا ہے۔ اب رنگ بھی خریدے جاتے ہیں، برش بھی منگوائے جاتے ہیں اور کینواس بھی بکتا ہے۔ ساتھ ساتھ روزالینڈ کی سیر بھی ہو جاتی ہے۔

اور میرے لئے روزالینڈ کی سیر اتنی مہنگی بھی نہیں پڑتی، جتنا یہاں کے لوگوں سے ظاہر ہوتا ہے کیونکہ منگل کے دن تامبولا میں بھی کھیلتا تھا اور ہفتہ بھر کا خرچ نکل آتا تھا۔

کیا کھیل بنایا ہے بنانے والے نے یہ بھی۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ یہ ایک امریکن کھیل ہے جوئے کی طرح۔ ضرور ہوگا۔ وہ کھیل جس میں نقد روپے پیسے کا لین دین ہو، امریکہ کا نہیں تو کیا پھر زلینڈ کا ہو سکتا ہے ـــــ سوچنے والی بات ہے۔

ہاں تو بات اُس ابابیل جیسی نرم اور نازک لڑکی کی ہو رہی ہے، جو ہر منگل کی شام کو روزالینڈ میں تامبولا کھیلنے آتی تھی۔ یہ لڑکی اتنی خوبصورت ہے کہ پہلی ہی نظر میں آدمی پیار ہو جاتا ہے۔ اس لئے یہاں روزالینڈ میں بہت سے لڑکے اِس لڑکی سے بات کرنے کو ترستے تھے۔ وہ لڑکے جو قیمتی کاروں میں بیٹھ کر آتے ہیں۔ وہ لڑکے جو عورتوں کی طرح میک اپ کرتے ہیں اور عوام سراؤں کی طرح گفتگو کرتے ہیں۔ وہ لڑکے جو تنگ پتلونوں کی بیلو بیاٹمز اور نوکدار جوتے پہنتے ہیں۔ وہ لڑکے جو بلیک کافی پیتے ہیں اور انگریزی گانے گنگناتے ہیں۔ ــ یہ سب لڑکے اِس کانچ کی نازک مورتی جیسی لڑکی سے ایک بات کرنے کو ترستے تھے۔ میں اِس گروپ کا فرد نہ تھا اس لئے میں کسی شمار و قطار میں بھی نہیں۔

اُس دن منگل تھا اور روزالینڈ کا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ سب لوگ اپنے اپنے ٹکٹوں پر جھکے ہوئے نمبر تلاش کر رہے تھے۔ میں بھی جھکا ہوا تھا۔ کان نمبر بولنے والے کی طرف تھے۔ آنکھیں ٹکٹ کے نمبروں پر لگی ہوئی تھیں۔ اُنگلیاں پنسل تھامے کانپ رہی تھیں کیونکہ ٹکٹ دو سو روپے کا تھا اور انعام اڑھائی سو روپے کی تھی۔

ٹک۔ ٹک۔ ٹک۔

میرے ٹکٹ پر نمبر کٹتے رہے ـــ اور یکلخت میں چیخ اٹھا ـــ یس!

سارے لوگوں نے تالیاں بجائیں۔ میں نے فاتحانہ انداز میں چاروں طرف دیکھا۔ لیکن تالیوں کا رُخ میری طرف نہ تھا۔ دوسرے کونے سے ایک اور آواز آئی تھی اور تالیاں دراصل اُس آواز پر بج رہی تھیں۔ اور وہ شعلہ بدن لڑکی اپنی جگہ کھڑی ہو کر انعام وصول کر رہی تھی۔ اُس نے ایک سرسری نظر مجھ پر ڈالی۔ میں نے بھی ایک بے معنی سی نظر اُس پر ڈالی، اور پھر ہم دونوں کاؤنٹر پر چلے ـــ اپنے اپنے ٹکٹ لئے اور اپنے اپنے حصے کے پیسے وصول کئے۔ اب قریب کھڑے ہو کر میں نے اُس کی طرف پھر ایک نظر دیکھا اور جواب میں اُس کے ہونٹ ایک مہین سی مسکراہٹ تلے کانپ اُٹھے۔

بس اتنی سی بات ہو گئی۔ اس کے بعد میں بھی آ کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا اور وہ بھی جا کر اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔

لیکن جانے کیا ہوا کہ اس کے بعد میرے ہر ٹکٹ کے نمبر غلط نکلے اور میرا خیال ہے کہ آج تک غلط ہی نکل رہے ہیں کیونکہ اب کوئی انعام مجھے نہیں مل رہا ہے اسی لئے میں نے اپنے کمرشل آرٹ کا کام تیز کر دیا۔ اب میں سنیما کے پوسٹر بھی بنانے لگا اور کبھی کبھی کسی مانند ملوائی یا تو ندیل بزاز کا پورٹریٹ بھی بنا لیتا۔

لیکن بات تو اُس یاسمن کی کلی کی ہو رہی ہے ـــ ایک دن میں حسبِ معمول ایک ٹیبل پر اکیلا بیٹھا تھا۔ تقریباً سب لوگوں نے ٹکٹ خرید لئے تھے۔ اتنے میں وہ آ گئی۔ اندر آ کر اُس نے چاروں طرف ایک نظر ڈالی اور پھر میرے ٹیبل کے پاس آ کر رک گئی۔

"میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں۔؟"

"جی ہاں! تشریف رکھئے ـــ" میں نے جواب دیا۔

"آول ڈگر" کیبن سے آواز آئی۔ لیکن اتنے میں نمبر بولے جانے لگے اور چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔ میں بھی اپنے ٹکٹ پر جھک گیا۔

"میں آپ کے ساتھ کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں ـــ" اُس نے نہایت دھیمے لہجے میں کہا۔

"ابھی ـــ؟"

"ہاں اس گیم کے بعد ـــ"

میں چاہتے ہوئے بھی اپنے ٹکٹ پر سے نظر اُٹھا کر اُس کی طرف نہ دیکھ سکا۔ نہ جانے یہ لڑکی کونسی باتیں مجھ سے کہنا چاہتی ہے۔ میرے دل میں بہت سی باتوں کا جلوس نکل آیا۔ میرے ٹکٹ کے نمبر غلط ملط ہونے لگے۔ گھبرا کر میں نے ٹکٹ ہاتھ میں لیکر مسل دیا اور اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ لیکن وہ میز کی سطح پر کسی غیر مرئی شے کو دیکھ رہی تھی۔ راؤنڈ ختم ہونے کے بعد وہ اپنی جگہ سے اُٹھی اور مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے روزالینڈ سے باہر آ گئی۔

باہر آ کر ہم ساتھ ساتھ بہت دُور تک چلتے رہے۔ گم ثم سے خاموش خاموش سے۔

"میرا نام نیلم ہے۔"

"میرا نام نیل کنٹھ ہے۔"

"میں ہسپتال میں نرس ہوں۔"

"میں امپورٹ ایکسپورٹ کا کام کرتا ہوں۔"

"میں کوئی امیر لڑکی نہیں ہوں۔ صرف پوز کرتی ہوں۔ میری ماں اسکول میں ٹیچر ہے ہمارا مکان معمولی سا ہے، جس میں کوئی پیانو نہیں ہے۔"

"مکانات تو بہر حال سبھی کے ہوتے ہیں جیسے کبھی ہوا۔ ہر مکان، مکان ہوتا ہے۔ دیکھئے میں زیادہ تر کام کے سلسلے میں انڈیا کے باہر ہی ہوتا ہوں۔ پھر بھی دو تین بڑے ہوٹلوں میں مکان ہیں، جہاں میں کبھی کبھی رہتا ہوں۔ ورنہ نوکر وغیرہ ہی رہتے ہیں۔"

"میں کئی دنوں سے چاہتی تھی کہ ہم دوست بن جائیں۔"

"شوق سے۔ شوق سے! بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

اُس نے چُپ چاپ دایاں ہاتھ آگے بڑھایا۔ میں نے بھی خاموشی سے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا۔ اور ایک لمحے کے لئے رُک کر ہم نے ہاتھ ملایا۔ اُوپر کیبنی کے لگے ہوئے مرکری لیمپ کی روشنی ہو رہی تھی۔

"اچھا تو اب میں چلتی ہوں۔" اُس نے کہا اور میری طرف دیکھے بغیر چلی گئی۔ اُس کے جانے کے بعد میں دیر تک اُسی جگہ پہ کھڑا اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اُس نے ایک بار بھی پیچھے مُڑ کر نہیں دیکھا۔ میں بھی پلٹ کر جانے ہی والا تھا کہ میری نظر اُس بہت بڑے سائن بورڈ پر پڑی، جس پر موٹے موٹے حروف میں "ابلا ہونگ" لکھا ہوا تھا اور نیچے ایک بوڑھے راہب کی تصویر بنی تھی۔ جس کے ہاتھ میں جلتا ہوا چراغ تھا۔

یہ سائن بورڈ میرے ہی ہاتھوں کا بنا ہوا تھا۔

ایک لمحہ دوسرے لمحے سے کتنا مختلف ہوتا ہے۔ ابھی ایک لمحہ پہلے اگر کوئی مجھ سے یہ کہتا کہ یہ لڑکی کسی ہائی کمشنر کی بیٹی ہے، تو میں یقین کر لیتا لیکن۔ اب ۔۔۔

اب تو نیلم اور میں دوست بن گئے تھے۔ اور شام کو روز النیڈ کے ایک تنہا گوشے میں بیٹھ کر باتیں کرتے رہتے تھے۔ وہ مجھ سے مرعوب نظر آ رہی تھی، کیونکہ اُس کی نظروں میں میں ایک بہت بڑا بزنس مین تھا۔ جس کا گھر اُس جگہ ہے جہاں حسن اور رعنائی ہے اور سسرال امریکہ، کنیڈا اور گریٹ برٹن ہے ۔۔۔۔ یعنی برطانیہ کلاں اور یہ واقعہ بھی ہے کہ اُس سے باتیں کرتے وقت میں اپنے آپ کو برطانیہ کلاں ہی کا آدمی محسوس کر رہا تھا۔ اُف! وہ مقام کہ جہاں آدمی خود اپنے آپ ہی کو دھوکا دیتا ہے۔

رفتہ رفتہ یہ دوستی پگھلتی رہی پگھلتی رہی اور محبت کے سانچے میں ڈھل گئی۔ میں نے اتنی احتیاط سے ضرور کام لیا کہ اُسے کبھی اپنے گھر نہیں بلایا۔ اور نہ اُس کے ساتھ بات چیت ہی کو اُس راہ پر بڑھنے دیا، جس سے گزر کر وہ میری حقیقت تک پہنچ پاتی۔

ایک دن جبکہ میں روز النیڈ میں بیٹھا نیلم کا انتظار کر رہا تھا تو بیرے نے آ کر اطلاع دی کہ میرا فون آیا ہوا ہے۔ میں اُس کونے والی تپائی کی طرف بڑھا جس پر ٹیلی فون رکھا تھا اور ریسیور ہاتھ میں لیا۔

"ہیلو ۔۔۔۔" نیلم کی آواز آئی۔

"کیا بات ہے ہنی ۔۔۔۔؟"

"میں ہوسپٹل سے بول رہی ہوں۔ ابھی ایک کیس آیا ہے اور میری ڈیوٹی لگا دی گئی ہے۔ میں شاید نہ آ سکوں۔"

"او۔کے ڈیر! کل تو آؤ گی نا۔؟"

"اوہ شیور شیور ۔۔۔۔ بائی ۔۔۔۔"

میں نے ریسیور کریڈل میں ڈال دیا اور آ کر اپنی جگہ پہ بیٹھ گیا۔

مگر ۔۔۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میرے ٹیبل پر اس دوران میں ایک خوش پوش خوش شکل نوجوان آ کر بیٹھ گیا ہے۔

"ہیلو مسٹر نیل کنٹھ ۔۔۔۔" اُس نے مجھے اپنی طرف دیکھتے ہوئے کہا کم بخت: جانے کہاں سے میرا نام جان گیا تھا۔

"ہیلو ۔۔۔۔" میں نے بے رُخی سے جواب دیا۔

"میں بہت دنوں سے اس موقعہ کی تلاش میں تھا کہ تنہائی میں آپ سے چند باتیں کر سکوں۔"

"فرمایئے ۔۔۔"

"میں ۔۔۔ میں مس نیلم کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"وہاٹ!؟"

"بات یہ ہے کہ ۔۔۔ میں مس نیلم سے پیار کرتا ہوں۔"

"آپ نے اس وقت کہیں زیادہ تو نہیں پی ہے ۔۔۔؟"

"جی نہیں، میں پیتا نہیں ہوں۔ مجھے اور کوئی راہ نہیں سوجھی، سوچا آپ سے اپنے پیار کی بھیک مانگوں ۔۔۔"

"آپ کو شرم آنی چاہیئے ۔۔۔ مسٹر ۔۔۔!"

"مدھوکر ۔۔۔۔ مدھوکر شرما ۔۔۔ میں شرمندہ ہوں، نادم ہوں ۔۔۔۔ ۔۔۔۔ مجھے چاہیئے تھا کہ پہلے ہی اپنا تعارف کراتا۔ میں مدھوکر شرما ہوں۔ یہاں انجینئرنگ انسٹی ٹیوٹ میں پڑھاتا ہوں۔ میرے باپ سری رام نگر کے چیف انجینئر ہیں ۔۔۔ اور ۔۔۔"

"مسٹر مدھوکر! پیار کی بھیک مردوں سے نہیں عورتوں سے مانگی جائے تو اچھا ہے ۔۔۔ آپ کی اطلاع کے لئے عرض کروں کہ نیلم اور میں بہت جلد شادی کرنے والے ہیں۔"

"اوہ! تب تو بہت بُرا ہوا۔ بہر حال مسٹر نیل کنٹھ! قصور کسی کا نہیں ہے۔ میرا اپنا ہے۔ مجھے بہت پہلے مس نیلم کے سامنے شادی کی درخواست رکھنی چاہیئے تھی۔ لیکن اُس

وقت مجھے اپنے دل پر اتنا بھروسہ نہیں تھا جتنا اب ہے ——— خیر ———

مجھے اُس کی باتوں سے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ اندر ہی اندر بجھ گیا ہو۔ جیسے اُس کے اندر کی روشنی بجھ گئی ہو اور اب اُس کے اندر اندھیرا ہی اندھیرا ہو۔ جس میں اُسے کچھ بھی دکھائی نہ دے رہا تھا۔

اُس رات جب میں اپنے گھر میں داخل ہوا تو میرا دل بہت بے چین تھا۔ بے قرار تھا ——— دروازہ کھولتے ہی سامنے دیوار پر لگے ہوئے آئینے نے میرا منہ چڑایا۔

"مسٹر کنٹھو! کیا عمر ہے تمہاری؟"

"چالیس سال ———"

"تمہارا باپ چیف انجینئر ہے؟"

"نہیں ———"

"تمہاری حیثیت کیا ہے۔؟"

"کچھ بھی نہیں"

"تو اتنے سارے خوبصورت لڑکوں کے سامنے تمہاری کیا وقعت ہے۔؟

——— تم کیوں مس نیلم سے فوراً شادی نہیں کر لیتے۔ کیا تم اُس وقت کا انتظار کر رہے ہو جب کوئی منچلا اُس کی بانہہ پکڑ کے اُسے تم سے دُور لے جائے ———؟"

"نہیں"

"تو پھر ———؟"

"میں اپنا بھرم کیسے قائم رکھوں۔؟"

"کیسے قائم رکھوں۔؟"

یہ سوال اُس دن بھی میرے ذہن کو کُرید رہا تھا۔ جب میں نے نیلم کے سامنے شادی کی تجویز رکھی۔ مدھم مدھم سی چاندنی تھی۔ ہم دونوں گنگری ہل میں بیدرنگ بوٹ کے چھت پر بیٹھے تھے۔ دُور دُور تک چاندی کی ننھی ننھی لہریں متحرک رہی تھیں۔ سامنے ہوٹل کی روشنیاں ستاروں کی طرح ٹمٹما رہی تھیں۔ میں نے نیلم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر آ کھڑی تھی اور وہ ایک لمحے، صرف ایک لمحے کے لئے میری طرف دیکھنے کے بعد جیسے بھیگ گئی تھی۔ اب ایک سیال شے میرے سامنے تھی۔ جس کے انگ انگ پر چاندی کے تار بکھر گئے تھے۔ اُس نے نہایت پیار سے، نہایت خاموشی سے میری طرف پھر دیکھا ——— اور پھر نظریں جھکا کر کہنے لگی۔

"دو دن کی مہلت دو گے مجھے؟"

"دو دن کی مہلت؟ ——— کیوں آخر ———"

"بس! آج ہی کل میں کچھ ہونے والا ہے"

اس نے زیر لب کہا اور پھر وہ گزر گیا۔

پھر کئی لمحے گزر گئے۔ دن گزر گئے۔ ہفتے گزر گئے۔ لیکن نیلم میری راہ سے کبھی نہ گزری۔

ایک دن [illegible] میں مدھو کر ملا۔ میری طرف دیکھ کر وہ مسکرایا۔ ایک عجیب سی مسکراہٹ [illegible] کے بعد کچھ کہنے کے لئے کچھ [illegible] اور پھر میں نے اچانک [illegible] چھوڑ دیا۔ بیئر آئل بوتلوں کے لیبل بنانا چھوڑ دئے۔ سالوں کے [illegible] بنانا چھوڑ دئے۔ ماڈرن دوائیوں اور موٹے بنوں کے پوٹریٹ بنانا چھوڑ دئے۔

جب [illegible] ایک امریکی [illegible] خرید کر رہا تھا تو راستے میں اچانک نیلم مل گئی۔ [illegible] نے اُسے نہیں پہچانا۔ اس لئے نہیں [illegible] بدل گئی تھی۔ [illegible] لیکن وہ مجھے فوراً پہچان گئی۔

"ہیلو مسٹر کنٹھو ———"

"او ——— ہیلو ———"

"بہت [illegible] ہو ——— آؤ ———"

اور میرے انکار کے باوجود وہ مجھے [illegible] لے آئی۔ ہم دونوں ایک کونے [illegible] کے پاس بیٹھ گئے۔ دونوں خاموش تھے۔ میرے دل میں کوئی غصہ نہیں تھا، کوئی شکوہ نہیں تھا [illegible] کوئی جذبہ تک نہیں تھا۔

"ایک دن تم نے دوستی کے لئے بڑھایا ہوا میرا ہاتھ پکڑا تھا۔ یاد ہے؟ [illegible]" دفعتاً وہ بول پڑی۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"[illegible] تمہاری دوستی نے مجھے کتنا فائدہ پہنچایا ——— میں مدھو کر کو اپنے میں کامیاب ہو گئی۔ [illegible]"

"مدھو کر؟ [illegible]" میرے منہ سے اچانک نکل پڑا۔

"[illegible] مدھو کر کو شروع سے چاہتی تھی۔ میں اُس سے شادی کرنا چاہتی تھی [illegible] کل کی زندگی ہی ہے ——— اُس کے پاس وہ سب کچھ تھا اس کے خواب میں دیکھتی تھی۔ [illegible] پاس کچھ بھی نہ تھا۔ میں تمہاری ہی طرح بہت سے پریمگار راج ہنسوں میں گھومتی تھی ———"

"[illegible] ——— [illegible]"

"[illegible] طرح۔ تم بھی اپنے ایک خول چڑھائے اپنی جھوٹی امارت کا [illegible] کئے ہوئے تھے۔ لڑکیاں مردوں کے بارے میں سب کچھ جانتی ہیں [illegible] عورتوں کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔ ہماری جنس بہت محتاط ہے۔ اور [illegible] مردوں کا شیوہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مدھو کر نے میرے بارے میں کبھی کچھ

جاننے کی کبھی ضرورت محسوس نہ کی ——— لیکن وہ مجھ سے محبت کرنے کے باوجود شادی کا لفظ زبان پر نہ لاتا تھا۔

میں نے سبھی ہتھیار آزمائے اور ناکام ہوئی۔ آخرکار میری نظر تم پر پڑی۔ تم میری ہی طرح منسوب تھے۔ تمہاری عمر میں پختگی تھی۔ تم سے مجھے کوئی خطرہ نہ تھا۔ تو جوانوں کی بات اور ہے۔ میں نے ایک ناٹک کھیلا۔ صرف مدھوکر کے لئے۔ اُس کے دل میں رشک و رقابت کا جذبہ ابھارنے کے لئے ——— میں تمہارے ساتھ گھومنے لگی ——— اور آخرکار میں کامیاب ہوگئی ———"

"کیا کامیابی حاصل ہوئی ہے تمہیں ؟"

"میں نے اور مدھوکر نے دو ماہ پہلے کورٹ میں شادی کرلی ہے۔ یاد ہے جس دن تم نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھ سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی ——— اُس کے دوسرے ہی دن وہ مجھے ریزالیشن میں بلا اور میرے سامنے گھٹنے ٹیک کر شادی کی درخواست کی۔ اور یہ بھی وعدہ لیا کہ اب میں کبھی تم سے نہ ملوں گی ——"

ایک طویل خاموشی چھاگئی۔ ہمارے سامنے رکھے ہوئے کافی کے پیالے سرد ہوگئے جیسے ان میں کسی نے برف کی ڈلیاں ڈال دی ہوں۔

"میں اب بھی تمہاری دوست ہوں۔ اور ہمیشہ رہوں گی ———" اُس نے کہا اور بغیر کچھ سُنے اُٹھ کے چلی گئی۔

اُس رات میں نے خواب میں وہ بڑا سائن بورڈ دیکھا، جس پر موٹے موٹے حروف میں "اولڈ مونک" لکھا ہوا تھا اور نیچے ایک بوڑھے راہب کی تصویر بنی تھی، جس کے ہاتھ میں جلتا ہوا چراغ تھا۔ ایک لمحے کے لئے اُس بوڑھے راہب نے چراغ اُوپر اُٹھایا، اور ایک کمزور سی، بجھی بجھی سی روشنی میں میں نے دیکھا کہ بوڑھا راہب میں خود ہوں، جو دوسروں کو روشنی دکھاتا ہے اور خود ہمیشہ اندھیرے میں رہتا ہے ——— دوسرے دن سے میں پھر سائن بورڈ پینٹ کرنے لگا۔

تلخ اور شیریں، ماضی قریب اور ماضی بعید کی

اختر الایمان کے کلام کا مکمل مجموعہ جس پر ساہتیہ اکاڈمی کی طرف سے ۱۹۶۲ء کی بہترین اُردو تصنیف" کا اعزاز اور پانچ ہزار روپے نقد کا گرانقدر انعام عطا کیا گیا۔ اب نئی آب و تاب کے ساتھ چھپ گئی ہے۔ کتابت و طباعت نہایت عمدہ نفیس گیٹ اپ۔ قیمت فی جلد صرف چھ روپے۔

پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی دہلی ۶

منظر صدیقی اکبرآبادی

کون سمجھے کہ دل ہے کیوں مغموم ‎ ‎ ‎ درد میرا کسی کو کیا معلوم

دیکھ کر رنگ بزمِ ہستی کا ‎ ‎ ‎ محوِ حیرت ہیں مہر و ماہ و نجوم

شدتِ غم کی انتہا یہ ہے ‎ ‎ ‎ زندگی کا بدل گیا مفہوم

التفاتِ نگاہِ دوست نہ پوچھ ‎ ‎ ‎ اِک نظر سے بدل دئے مقسوم

کہہ گئے وہ کچھ آنکھوں آنکھوں میں ‎ ‎ ‎ ڈھونڈتے رہئے معنی و مفہوم

کردیا ہے تسلسلِ غم نے ‎ ‎ ‎ ہر خوشی سے حیات کی محروم

ہم رہے ہیں خرابِ ذوقِ نظر ‎ ‎ ‎ ہم سے پوچھو نگاہ کا مفہوم

آؤ کچھ آشیاں کی فکر کریں ‎ ‎ ‎ چل رہی ہے چمن میں بادِ سموم

آ گئے ہم فریبِ ہستی میں ‎ ‎ ‎ ورنہ انجامِ زندگی معلوم

کر گیا منظرِ حزیں کو تباہ
ہائے وہ ایک جلوۂ معصوم

افسانہ

مِس سروجہ

مدثر حسین رضوی۔ بی۔ اے، بی ایڈ (علیگ)

دانش کدہ۔ امروہہ۔ (یو۔پی)

۲۸ر جنوری ۱۹۶۴ء

محترم القام خوشتر بھائی! آداب و تسلیم

مزاج اقدس، بعد عرصہ دراز کے بعد ایک کہانی "مس سروجہ" ارسال خدمت کر رہا ہوں۔ اس کے کردار میری اپنی بستی کے چلتے پھرتے انسان ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ اس مختصر کہانی میں عام روش سے بالکل الگ ہو کر محبت کا ایک اعلیٰ معیار پیش کیا گیا ہے۔ آپ نے جدت طرازی کو ہمیشہ سراہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کہانی آپ کو ضرور پسند آئے گی۔ میں "مس سروجہ" اور "مسز سانیال" کے کرداروں کے ساتھ کہاں تک انصاف کر سکا ہوں اس کا اندازہ آپ ہی کی باریک بیں نگاہیں کر سکتی ہیں۔ مجھے بیسویں صدی کے ذہین قارئین کی رائے کا بھی انتظار رہے گا....

نیاز کیش:۔ مدثر حسین رضوی

آج آخرکار اُس ہنگامے نے اپنی معراج پا ہی لی جس سے لڑکیاں کل ہی سے خوف زدہ تھیں۔ بات کا اختتام بھی آخر میں وہی ہوا جس کا کالج کی ساری لڑکیوں کو خدشہ تھا اور یہ خدشہ ایک طرح سے اپنی جگہ پر درست بھی تھا کیونکہ مسز سانیال کے ساتھ پرنسپل مس سروجہ کا کل کا رویہ کسی حد تک بھی مناسب نہ تھا۔ بات بہت معمولی تھی، بہت چھوٹی سی تھی۔ اگر وہ مسز سانیال کو آٹھ دن کی رخصت دے دیتیں تو شاید یہ معمولی سا واقعہ اتنا غیر معمولی ہرگز نہ بنتا اور وہ اُن کے آفس کی دیوار، دل ہی سے باہر نکلتا اور نوبت مسز سانیال کے استعفے تک نہ آتی وہ کل ہی دس دن کی چھٹی کے بعد واپس آئی تھیں اور انہوں نے صبح ہی اپنی کالج ڈیوٹی جوائن کی تھی لیکن اُن کے شوہر کے اچانک حادثے کے تار نے اُنہیں پھر چھٹی لینے پر مجبور کر دیا تھا اور اُن کے دل میں دہلی پہنچنے کی بہت بےچینی پیدا کر دی تھی۔

یہ کل کے چوتھے پیریڈ کا ہو تو ہے کہ اُنہیں ایک ٹیلیگرام ملا تھا جس میں اُنہیں اطلاع دی گئی تھی کہ مسٹر سانیال اچانک ایک کار سے ٹکرا گئے۔ اُن کی حالت اچھی نہیں ہے اور وہ دہلی کے ولنگٹن ہاسپٹل میں داخل کر دیئے گئے ہیں۔ وہ اُس وقت فورتھ ایئر انگلش لٹریچر کا کلاس لے رہی تھیں۔ ساری لڑکیوں نے دیکھا تھا کہ مسز سانیال اس غیر متوقع اور غم انگیز تار کو پاکر نیم پاگل سی ہو گئی تھیں اور انہوں نے اُسی لمحہ آٹھ دن کی چھٹی کی درخواست مس سروجہ کے نام لکھی تھی۔ وہ تار بھی انہوں نے اپنی درخواست کے ساتھ منسلک کر دیا تھا ——— اور پھر وہ کلاس انہوں نے چھوڑ دیا۔

جب وہ اس درخواست اور تار کو لے کر پرنسپل مس سروجہ کے آفس میں داخل ہوئیں تو انہوں نے ہمیشہ کی طرح مسکراتے ہوئے ہونٹوں سے مسز سانیال سے کرسی پر بیٹھنے کو کہا لیکن دوسرے ہی لمحے مس سروجہ کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اُن کے غمزدہ چہرے کو دیکھ ایک دم سمٹ گئی۔ انہوں نے گھبراتے ہوئے لہجہ میں مسز سانیال سے پوچھا ——— "اس وقت تم اتنی پریشان کیوں ہو؟"

مسز سانیال نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے چھٹی کی درخواست اور وہ تار اُن کی میز پر رکھ دیا اور پھر خود بھی ہچکیوں کے درمیان اس المناک حادثے کے بارے میں اُنھیں سب کچھ بتا دیا۔ مس سروجہ نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ وہ دیر تک ٹیلیگرام کو گھورتی رہیں اور کسی نئی گہری سوچ میں ڈوبی رہیں۔

سوچوں کے اس بیکراں سمندر سے نکلنے کے کچھ دیر بعد انہوں نے مسز سانیال کے چہرہ پر ایک معنی خیز نگاہ ڈالی اور بولیں۔

"تم کل ہی دس دن کی چھٹی کے بعد اُن کے پاس سے واپس آئی ہو اور تار کے مطابق کل ہی ایکسیڈنٹ بھی ہو گیا۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟"

"مسز سانیال اُن کے منہ سے ہمدردانہ الفاظ کے بجائے یہ غیر متوقع جملے سنکر حیرت سے اُن کی طرف دیکھنے لگیں ——— اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولیں وہ مجھے اسٹیشن تک پہنچانے آئے تھے، ہو سکتا ہے واپسی میں حادثہ ہو گیا ہو۔"

"میرے خیال میں یہ تار فرضی معلوم ہوتا ہے" ـــــــ مس سروجہ نے دُور اندیشی اور ہمیشہ کی روایتی صاف گوئی سے کام لے کر کہا۔

"لیکن مجھے ہر حالت میں وہاں پہنچنا ہے۔ میرے ساتھ کوئی ایسا مذاق نہیں کر سکتا۔ اگر یہ تار بھیجنے والے کا نام بسنت ہے اور اس نام کا میرا کوئی رشتہ دار وہاں نہیں ہے"

"جذباتی نہ بنو۔ میرے خیال کے مطابق پہلے تم خود ایک جوابی ٹیلیگرام یہاں سے کے آفس کے پتہ پر کر دو۔ پوری طرح معلوم ہو جائے تو چلی جانا۔ تمہیں معلوم ہے کہ پچھلے لڑکیوں کی پڑھائی کا کس قدر نقصان ہوا ہے۔ اب تم پھر چھٹی لینا چاہتی ہو!"

"اِس کی ذمہ داری میرے اوپر ہے۔ میں صحیح وقت پر اُن کا کورس ختم کرا دوں گی بے فکر رہئے۔"

"تمہارے اتنا کہنے سے کچھ نہ ہوگا۔ کالج کی پرنسپل ہونے کی حیثیت سے رزلٹ کی ذمہ داری میرے اوپر بھی ہے۔"

"لیکن میرا کیس سیریس ہے میڈم ـــــــ میں ہر حالت میں جاؤں گی چاہے چند ہی دن کے لئے جاؤں۔"

"تم اگر جاؤ گی تو اس میں میری مرضی ہرگز شامل نہ ہوگی۔ میں موجودہ حالت میں ہرگز چھٹی نہیں دے سکتی۔ ہاں اگر تم ایک جوابی تار دہلی بھیج دو اور اُس کے جواب میں بھی یہی لکھا ہو تو میں ضرور چھٹی دے دوں گی۔ تم آج ٹیلیگرام دے کر کل تک کا انتظار کر سکتی ہو۔"

"لیکن میڈم! میرا سُہاگ!" یہ کہتے کہتے وہ ایکدم خاموش ہو گئیں۔ جیسے کہ ناک میں کھو گئی ہوں۔

مس سروجہ نے چہرہ پر بناوٹی غصہ لاتے ہوئے کہا "میرا دل اتنا کمزور نہیں کہ تمہارے آنسوؤں میں بہہ جائے۔ مجھے تم سے زیادہ لڑکیوں کی پڑھائی کا خیال ہے۔ تم لوگوں کو اپنے شوہر اتنے پیارے ہوتے ہیں تو پھر نوکری کرنے کیوں آتی ہو؟ ہمیں دیکھو ہم نے شادی اس لئے نہیں کی کہ میں اپنی پوری زندگی تعلیم کی راہوں پر قربان کر دینا چاہتی ہوں۔"

مسز سانیال خاموشی سے سب کچھ سُنتی رہیں اور سوچتی رہیں کہ آخر آج مس سروجہ ایک معمولی بات پر کیوں اَڑ گئی ہیں۔ انہوں نے تو اس سے پہلے کبھی اِن کی کسی بات پر انکار نہیں کیا۔ ہو سکتا ہے اِس وقت اِن کا موڈ خراب ہو.... لیکن .... لیکن ..... اور روتی ہوئی اُن کے کمرے سے باہر آ گئیں۔

ایک گھنٹہ اور گزر گیا تھا ـــــــ دہلی جانے والی گاڑی کا وقت بھی گزر گیا تھا۔ جب اُن کی پرنسپل مس سروجہ اُنہیں چھٹی دینے کے لئے راضی نہ ہوئی تھیں، مسز سانیال نے اسٹاف روم میں رو رو کر بُرا حال کر لیا تھا اور اس کے بعد کوئی کلاس بھی نہیں لیا تھا۔ اس اداس اور مضمحل چہرہ پر آنسوؤں کے بیشمار شبنمی قطرے تار پا کر موتیوں کی طرح گرنے لگے تھے۔ وقت جوں جوں گزر رہا تھا اُن کو تسلی دینے کے لئے ہر شخص آتا جاتا رہا۔ کالج کی ہر دلعزیز اور پُر وقار پروفیسر مسز ملک جن کی بات مس سروجہ نے کبھی نہ ٹالی تھی وہ بھی مسز سانیال کی سفارش میں بہت کچھ کہہ کر تھک چکی تھیں لیکن مس سروجہ اس معاملہ میں نہ جانے کیوں پتھر کی نہ ہلنے والی چٹان بنکر رہ گئی تھیں جس میں جذبات نام کی کوئی چیز جنم ہی لے سکتی تھی۔ یہ دیکھ کر اسٹاف روم میں بھی اُداسی چھا گئی تھی۔ ہر کوئی اُن کی طرف سے مایوس ہو چکا تھا اور ہر پروفیسر کو اپنے مستقبل میں لینے والی ضروری چھٹیوں کے لئے یاد آ گئے تھے۔ غم اور اُداسی کی لہریں جب اسٹاف روم سے نکل کر کامن روم میں پہنچیں تو اُن لہروں سے سب سے زیادہ متاثر فورتھ ایئر کی لڑکیاں تھیں کیونکہ مسز سانیال کا سب سے زیادہ تعلق اُسی کلاس سے تھا۔ یہی وہ کلاس تھا جس کا ہر روز ایک پیریڈ وہ لیا کرتی تھیں۔ اُس کلاس کی ہر لڑکی اُنہیں پروفیسر سے زیادہ اپنی بڑی بہن سمجھتی تھی۔ اُن کی چھٹی کی نامنظوری ہر ایک کے لئے حیران کُن بات تھی کیونکہ ہر لڑکی جانتی تھی کہ اب سے دو سال پہلے مسز سانیال کو خود مس سروجہ نے کوشش کر کے کانپور سے اپنے کالج میں ٹرانسفر کرایا تھا۔ وہ اپنے ڈیپارٹمنٹ میں ایک اسمارٹ اور محنتی پروفیسر کی حیثیت سے مشہور تھیں۔ اُن کی سروس زیادہ پُرانی نہ تھی پھر بھی وہ اتنی تجربہ کار مانی جاتی تھیں کہ وہ جس کالج میں بھی جاتیں وہاں کا انگلش لٹریچر کا رزلٹ مثالی حیثیت کا بن جاتا۔ اِس لئے اب اُن کے استعفیٰ کی خبر ایک بھاری مسئلہ بنکر لڑکیوں کے سامنے کھڑی ہو گئی تھی۔

ایسے نازک موقع پر جب اُن کے شوہر مسٹر سانیال کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہو اُن کی آٹھ دن کی چھٹی کی درخواست مس سروجہ اتنی بیرحمی سے نامنظور کر دیں گی یہ کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ اگرچہ مس سروجہ کالج بھر میں اپنی اصول پسندی اور سخت گیری کے لئے مشہور تھیں پھر بھی لڑکیاں اُن کی نرم دلی کے بارے میں یہ بھی جانتی تھیں کہ انہوں نے ایک بار اپنی نئی اور قیمتی جرسی صرف اِس بات پر اپنی ملازمہ کو دے دی تھی کہ اُس بیچاری نے سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے اُن سے اُس کی قیمت پوچھ لی تھی۔ وہ نفسیاتی طور پر اُس کا مقصد سمجھ گئی تھیں اور اپنی ستر روپے کی جرسی زبردستی اپنی اُس ملازمہ کو پہنا دی تھی۔ مسز سانیال سے اُن کے اچھے تعلقات تھے۔ وہ لڑکیوں میں بھی کافی گھُلی ملی رہتی تھیں یہاں تک کہ لڑکیوں کی ضد پر کسی بھی پروگرام میں وہ کئی کئی گیت یا اپنے پسندیدہ شاعر غالب کی غزلیں سُنا دیتی تھیں اور آفس میں وہ ہمیشہ ایک گریٹیڈ آفیسر کی طرح پیش آتی تھیں لیکن آج تک کسی لڑکی نے تصور میں بھی یہ نہ سوچا تھا کہ وہ اتنی سخت بھی ہو جائیں گی کہ بیچاری مسز سانیال کے آنسوؤں سے بھی اُن کا دل نہ پسیجے گا۔

جب پانچویں پیریڈ کے بعد بہت سی لڑکیوں نے مسز سانیال کو اسٹاف روم میں روتے ہوئے دیکھ لیا تو اُن ساری لڑکیوں کے دل اُن کے لئے تیز تیز دھڑکنے لگے اور سب کی آنکھوں سے اُن کا غم چھلکنے لگا۔ رنگ برنگے دوپٹے فکر آمیز انداز میں سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔

"چلو نا ہم سب پرنسپل صاحب کے پاس چلیں" ہر وقت مُسکرانے والی صبیحہ نے کہا۔
ثمرہ نے بتایا کہ وہ مسز نگ تک سے انکار کر چکی ہیں اور اب اُن سے کچھ کہنا بیکار ہی ہے۔

رابعہ نے اپنی رائے پیش کی "جانے میں حرج ہی کیا ہے؟"
"اگر مسز سانیال نے استعفیٰ دے دیا تو ہم سب کی پڑھائی کا کیا ہوگا؟" ثمرہ نے اپنی فکر کا اظہار کیا۔

"اتنی معمولی بات پر وہ ہرگز استعفیٰ نہیں دے سکتیں" الزبتھ نے پُریقین لہجہ میں کہا۔ "تمہیں شاید یاد نہیں جب ہم پکنک منانے کالا گڑھ گئے تھے تو انہوں نے اپنی زندگی کے حالات بتاتے ہوئے ہم سے کیا کہا تھا" سب لڑکیوں نے اشتیاق بھری نظروں سے سوشیلا کی طرف دیکھا۔

ناہید ایکدم بولی "کیا کہا تھا؟"

"وہ صرف شوق کی خاطر یہ نوکری کر رہی ہیں ورنہ ان کے شوہر ہرگز اس نوکری کے حق میں نہیں ہیں" سوشیلا کے بجائے پالو ملا کمشتی نے جواب دیا۔

"تو.... تو.... وہ ضرور استعفیٰ دے سکتی ہیں" ——— سب لڑکیوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

آخر کار یہی طے ہوا کہ پرنسپل صاحبہ کے پاس جانا ہی چاہئیے۔ وہ سب آفس کی طرف چل پڑیں۔ کسی کو اُمید نہ تھی کہ مس سروجہ اُن کی بات مان لیں گی۔ اُن کی ضدی طبیعت سے سب واقف تھیں لیکن پھر بھی وہ اُن کے پاس اس طرح جا رہی تھیں جیسے کسی نرم رو ندی کی لہریں آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی ہوں اور سامنے کسی منہ زور چٹان سے ٹکرانے والی ہوں۔ ——— یہ لہریں اس چٹان سے تو کیا ٹکراتیں پہلے آفس کے دروازہ پر پڑے ہوئے نیلے پردے سے ٹکرائیں۔ قمر جو اسٹوڈنٹ یونین کی صدر تھی اور جو دن میں کئی بار مس سروجہ کے پاس بلائی جاتی تھی، لڑکیوں کے ہر معاملہ میں پیش پیش رہتی تھی اور اُن سے بے تکلف طور پر گفتگو کر لیتی تھی اُسی نے پردہ کو ہلکی سی جنبش دی۔ لیکن یہ دیکھ کر لڑکیوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ مس سروجہ کی جگہ اُنہیں مسز ناگ کا موٹے نقوش والا بھیانک چہرہ اُنکی کرسی پر نظر آ رہا تھا۔ سب لڑکیاں ٹھٹک کر رہ گئیں۔ مس سروجہ آفس سے کیوں غائب ہو گئیں؟ اور اُن کی جگہ عارضی طور پر کالج کی وائس پرنسپل مسز ناگر کیوں کام کر رہی ہیں؟ مسز ناگر کے بتانے پر معلوم ہوا کہ مس سروجہ کی طبیعت خراب ہو گئی ہے اور اس وقت وہ اپنے کمرہ میں آرام کر رہی ہیں۔ ——— کالج بلڈنگ سے چند قدم کے فاصلہ پر پرنسپل صاحبہ کا بنگلہ تھا۔ سب لڑکیوں نے وہاں تک جست بھری۔ لیکن وہاں اُن کے چپراسی سے یہ سُن کر ساری لڑکیوں کے دل ڈوب گئے کہ پرنسپل صاحبہ نے کسی سے بھی ملاقات کرنے کے لئے منع کر دیا تھا۔ اس کے بعد یہ بات ایک پہیلی بن چکی تھی اور مسز سانیال کے ایک سنجیدہ مسئلہ کے لئے اُن کا یہ رویّہ کالج کے ہر فرد کے لئے گہری نفرت کا باعث بن گیا تھا ———

اس طرح چوتھا گھنٹہ بھی بیت گیا۔
پھر چھٹی بھی ہو گئی۔
اور بات کل کے لئے ٹل گئی تھی۔

اور یہ آج کی بات ہے کہ پہلا پیریڈ ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ ریحانہ نے نہ جانے کہاں سے یہ خبر لاکر سُنائی کہ پرنسپل صاحبہ گزشتہ شب کی کسی گاڑی سے کہیں چلی گئی ہیں۔ چوکیدار کے کہنے کے مطابق انہوں نے اس سے پہلے کبھی اس گاڑی سے سفر نہیں کیا تھا۔ رات جب وہ تنہا گئی ہیں تو اُن کی آواز بھاری تھی۔ وہ اچھی طرح بول بھی نہیں پا رہی تھیں۔ اُنہیں رکشہ بہاری ہی نے لاکر دیا تھا لیکن وہ اُسے اپنے ساتھ اسٹیشن تک بھی نہیں لے گئی تھیں۔ یہ بات ہوا کی طرح سارے کالج میں پھیل گئی اور پہلے ہی پیریڈ سے کلاسز میں بھیوں کی سی بھنبھناہٹ شروع ہو گئی۔ دوسرا پیریڈ کس قدر بے چینی کے عالم میں گزرا۔ کالج کی پوری فضا کل کے واقعہ کے اثر سے خاصی سوگوار تو تھی ہی لیکن اس سوگواری میں مزید اضافہ اُس وقت ہوا جب یہ بات پُوری طرح یقین کی حد کو پہنچ گئی کہ واقعی پرنسپل صاحبہ کالج نہیں آئی ہیں اور اُن کی جگہ وائس پرنسپل مسز ناگر کام کر رہی ہیں۔ تیسرے پیریڈ کو شروع ہوئے ابھی کچھ ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ رابعہ نے آکر یہ اطلاع بھی دے دی کہ ابھی ابھی جب وہ پانی پینے کے لئے باہر گئی تھی تو جہری نے اُسے پورے یقین کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ مسز سانیال نے اپنا استعفیٰ لکھ کر مسز ناگر کو پیش کر دیا ہے۔

یہ سُنتے ہی سب لڑکیوں کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے!
"اب کیا ہوگا؟" سلمیٰ کی بھاری آواز اُداس ماحول میں اُبھری۔

"ہمیں اس کلاس میں ابھی پورے ایک سال پڑھنا ہے" ہر شائستہ نے دور مستقبل کی طرف دھیان دوڑایا۔

"احتجاج ہونا چاہئیے" قدسیہ نے کہا۔

پیریڈ خالی تھا۔ ساری لڑکیاں اسٹاف روم کی جانب چلیں ——— ابھی اُن سب نے گیلری میں چند ہی قدم طے کئے ہوں گے کہ اسٹاف روم کے قریب مسز مبینی نے اُنہیں بتایا کہ وہ سب بیکار جا رہی ہیں۔ اسٹاف کی سب ہی ممبر مسز سانیال کو سمجھا چکی ہیں۔ وہ کسی حالت میں بھی استعفیٰ واپس لینے کے لئے تیار نہیں ہیں ——— اُنکی باریک آواز نے لڑکیوں کے دلوں کے حوصلے توڑ دیئے۔ جب لڑکیاں مسز مبینی کی بات کو نظر انداز کر کے کچھ اور آگے بڑھیں تو فلاسفی کی پروفیسر مسز نقوی سے ٹکرائیں۔ انہوں نے اسٹاف روم سے نکلتے ہوئے حسب عادت لڑکیوں سے وقت ضائع نہ کرنے کے لئے کہا اور تنبیہ کی کہ وہ اپنی اپنی کلاسز میں چلی جائیں ——— لیکن لڑکیاں پھر بھی اسٹاف روم میں داخل ہو گئیں۔ مسز سانیال وہاں تنہا تھیں۔ کئی لڑکیوں نے رو رو کر اپنا بُرا حال کر لیا۔ سلمیٰ نے تو اُن کے پاؤں تک پکڑ لئے تھے وہ پھر بھی اپنا استعفیٰ واپس لینے پر راضی نہ ہوئی تھیں۔

...میں ایک بار سب لڑکیوں نے پھر اُن کی خوشامد کی ـــــ لیکن اُن کے اپنے خیال کے مطابق ایسی نوکری بیکار تھی کہ اُن کے شوہر موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہوں اور اُنہیں چھٹی نہ ملے۔ اُن کی پرنسپل اُن کے لئے اتنے اہم معاملے سے یوں منہ موڑ کر غائب ہو جائے یہ کہاں کی بات ہے یہ کوئی انسانیت نہیں!

مسٹر سانیال سے اُنہیں بے پناہ محبت تھی۔ دس دن کی چھٹی اُن کے ساتھ گزارنے کے بعد وہ پرسوں رات ہی تو واپس آئی تھیں۔ وہ دہلی کی کسی پرائیویٹ فرم میں ملازم ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ گزشتہ رات وہ ایک لمحہ کو بھی نہیں سو سکی ہیں اور اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کے اَن گنت ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر اُن کے دامن میں گرتے رہے ہیں اور جبھی انہوں نے اپنی زندگی کا یہ اہم فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے پیارے سانیال کی خاطر نوکری چھوڑ دیں گی اور کالج کی پرانی اور محبت بھری فضاؤں کو چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اُن کے پاس چلی جائیں گی۔ اُنہیں نوکری سے زیادہ اپنے شوہر کی زندگی عزیز ہے۔ انہوں نے انگریزی تعلیم ضرور حاصل کی لیکن وہ مشرقی عورت ہیں۔ وہ عورت جو اپنے شوہر کے لئے سب کچھ قربان کر دیتی ہے۔ جو اُس کی خاطر اپنی زندگی کی بھی بازی لگا سکتی ہے۔ وہ زندگی بھر اُبلی ہوئی دال کھا کر اپنا گزارہ کر سکتی ہیں لیکن ایسی نوکری ہرگز نہیں کر سکتیں جس میں اُنہیں حلوہ کھانے کو ملے لیکن اُن کے وجود پہ دوسروں کا حق ہو ـــــ اُن کے پاؤں حکم کی زنجیروں سے بندھے ہوں ـــــ اب اُن کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ اِن زنجیروں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے توڑ دیں۔ اور یہ زنجیریں اِسی صورت میں ٹوٹ سکتی تھیں کہ وہ اِس نوکری سے مستعفی ہو جائیں۔ اور وہ یہ استعفیٰ لکھ کر کالج کی وائس پرنسپل کو دے بھی چکی ہیں۔

"اگر آپ ایک دن اور یہ استعفیٰ نہ دیں اور پرنسپل صاحبہ کی واپسی کا انتظار کر لیں تو۔" لوتھکا نے اپنی رائے دی۔

"ایک دن کی بات تو دُور رہی مجھے ایک ایک لمحہ بھاری ہے!" مسز سانیال نے پریشان کُن لہجہ میں جواب دیا۔

"میڈم جو قدم جلدی میں اُٹھایا جاتا ہے معاف کیجئے گا وہ اکثر غلط ہوتا ہے۔" ترنے پھر ایک بار اندھیرے میں روشنی کی کرن دیکھنے کی کوشش کی۔

"میں تم سب لوگوں سے کافی پہلے دنیا میں آئی ہوں۔ میری اپنی سمجھ کے مطابق میرا یہ قدم مجھے روشنیوں کی طرف لے جائے گا۔ جہاں میرے اوپر کسی کی غلامی کے اندھیرے سایہ نہ کر سکیں گے۔ میں آج تک نہ سمجھی تھی کہ نوکری کیا چیز ہوتی ہے ولیکن کل مجھے اچھی طرح احساس ہوا ہے کہ نوکری نوکری ہی ہے چاہے وہ کسی بادشاہ کی ہو یا فقیر کی!"

"آپ استعفیٰ نہ دیکر کالج کی وائس پرنسپل مسز ناگ سے چھٹی بھی لے سکتی ہیں۔" طاہرہ نے اُنہیں ایک نئی راہ دکھائی۔

"مجھے اب نوکری نہیں کرنی ہے۔ یہ میرا اٹل فیصلہ ہے!"

"لیکن ہمارا پورا سال اور اِس سال کی پڑھائی ـــ" بجھتے بجھتے سسکی آواز خاموشیوں میں ڈوب گئی۔

مسعودہ کا یہ جملہ سنتے ہی کئی لڑکیوں کے چہروں پہ ہوائیاں اڑ گئیں جیسے اچانک اُنہیں اخبار میں اپنا رول نمبر ہی نظر نہ آیا ہو اور وہ فیل ہو گئی ہوں۔

سب ہی لڑکیاں خاموش تھیں۔ کوئی کسی سے کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔ سب لڑکیاں ایک دوسرے کو سوالیہ نگاہوں سے گھور رہی تھیں۔ جیسے اُن میں سے ہر ایک اِس سانحے کی ذمہ دار ہے۔ آخرکار اِس خاموشی کو توڑتے ہوئے گلوگیر آواز میں خود ہی مسز سانیال نے کہا۔

"تمہارے اِس پورے سال کی پڑھائی کی ذمہ داری میرے اوپر نہیں پرنسپل مس سروجہ کی ذات شریف پر ہے۔ کاش وہ مس نہ ہوتیں اور اُن کا بھی کوئی شوہر ہوتا تو شاید یہ اندازہ کر سکتیں کہ ایک ہندوستانی بیوی کے لئے اُس کا شوہر کیا ہوتا ہے۔ انہوں نے مجھے ایسا کرنے پر مجبور کیا ہے۔ میں مجبور ہوں۔ اگر مجبور نہ ہوتی تو کیوں تمہارا محبت بھرا ماحول چھوڑ کر جانے کے لئے قدم اُٹھاتی۔ میں آج بارہ بجے کی گاڑی سے دہلی جا رہی ہوں۔ تم سب سے جدا ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے" ـــــ کئی لڑکیاں آنکھوں میں آنسو بھر لائیں۔ کتنی ہی لڑکیوں نے آنسوؤں کی لڑیوں کو اپنے دوپٹوں میں چھپا لیا۔ مسز سانیال کی آنکھیں بھی کسی قدر نم ہو گئیں لیکن اِس وقت اُن میں آنسوؤں کے قطرے نہیں آئے۔ شاید مسلسل روتے روتے اُن کے آنسو اب ختم ہو چکے تھے۔

گیارہ ہی بجے سے اُن کے جانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ کالج میں ایسا ماتمی دن کبھی اِس سے پہلے نہیں آیا تھا۔ سب ہی ملول اور افسردہ تھے۔ سب ہی آنکھیں نمناک تھیں کوئی کسی سے اپنی غمگین دھڑکنوں کا حال نہیں کہہ رہا تھا لیکن دل ہی دل میں کئی لڑکیاں خدا سے گڑگڑا کر دعا مانگ رہی تھیں کہ خدا کرے اِسی لمحہ مس سروجہ آ جائیں اور انہیں اپنے فیصلہ پر عمل کرنے سے روک دیں ـــــ لیکن مس سروجہ تو جیسے برسوں کے لئے چلی گئی تھیں۔ اُنہیں مسز سانیال کے جانے کے وقت تک واپس آنا تھا نہ آئیں۔ اگر وہ آنیوالی ہوتیں تو پھر اِس طرح جاتی ہی کیوں؟ ـــــ چند لڑکیوں میں سرگوشیاں ہوئیں۔ اور آخرکار وہ ساعت بھی آئی جب مسز سانیال اسٹیشن کے لئے روانہ ہوئیں۔ ـــــ اور وہ کالج سے کچھ اِس طرح چلی گئیں جیسے کسی ارمانوں بھرے دل سے حسرت ہی نکل گئی ہو۔ نہ کوئی الوداعی پارٹی ہوئی۔ نہ کوئی فوٹوگروپ ہوا اور نہ اُن کے کاموں کی تعریف ہی کی گئی ـــــ نہ اُن کی خدمات کے سلسلہ میں رسمی تقریریں ہوئیں۔ صرف غم کا سوگوار ماحول ساری فضا پر چھایا رہا۔ چند لڑکیوں اور کچھ ٹیچروں نے اسٹیشن تک اُن کا ساتھ دیا۔ گاڑی آئی۔ وہ اُس میں سوار ہوئیں اور اپنی پُرنم آنکھوں میں یادوں کے سوگوار چراغ جلائے ہوئے اپنی زندگی کے ہمسفر کے پاس دہلی پہنچنے کے لئے روانہ ہو گئیں۔

اور اِس طرح پرنسپل مس سروجہ کی ضد کے سامنے کتنی ہی لڑکیوں کا مستقبل اور مسز سانیال کی ملازمت اندھیروں میں گم ہو گئی۔

راستے بھر مسز سانیال نے بہت کچھ سوچ ڈالا اور جب گاڑی دہلی اسٹیشن پر پہنچی تو وہ [illegible] باہر نکلیں اور تانگے میں بیٹھ کر [illegible] ہسپتال کے لئے روانہ ہو گئیں۔ ہسپتال کے انکوائری آفس میں معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ مسٹر سانیال پرائیویٹ وارڈ کے روم نمبر چھبیس میں ہیں۔ [illegible] روم نمبر چھبیس کی جانب چل پڑیں۔ گیلری میں چلتے ہوئے جیسے جیسے مختلف نمبروں کے کمرے اُن کی آنکھوں کے سامنے سے گزرتے تھے اُن کے دل کی دھڑکن بڑھتی جاتی تھی۔ روم نمبر [illegible] انہوں نے اپنی داہنی جانب دیکھ کر دل ہی دل میں دہرایا۔

روم نمبر چوبیس، پچیس [illegible] اس سے آگے چھبیس ہی ہونا چاہیئے۔

اور دوسرے لمحہ وہ روم نمبر چھبیس کے دروازہ پر تھیں۔ لیکن یہ کیا ۔۔۔!! اُف میرے بھگوان میری آنکھیں کہیں دھوکہ تو نہیں کھا رہی ہیں؟ انہوں نے دل ہی دل میں کہا۔ انہوں نے ایک بار پھر روم نمبر پر نگاہ ڈالی ۔۔۔ اُنہیں ایسا محسوس ہوا جیسے اُن کا دل ڈوبا جا رہا ہے پھر بھی انہوں نے ہمت سے کام لیا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھیں۔ مسٹر سانیال کے پلنگ کے قریب واقعی ایک بھاری بھرکم عورت ہری ساڑی پہنے بیٹھی تھی۔ وہ انہیں دوا پلا رہی تھی۔ [illegible] پھر رُک گئیں کیونکہ اُن کے دل میں یکلخت سینکڑوں خدشات جنم لینے لگے تھے۔ مسٹر سانیال کا کردار تو ہمیشہ اُن کے سامنے ایک شفاف آئینہ کی طرح رہا تھا۔ پھر یہ عورت لیکن دوسرے ہی لمحہ انہوں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ وہ کچھ اور آگے بڑھیں۔ نہ جانے کیوں انہیں اپنے قدم کئی کئی من وزنی معلوم ہو رہے تھے۔ انہوں نے سوچا کہیں انکوائری آفس سے تو غلط اطلاع نہیں مل گئی لیکن دوسرے ہی لمحہ اُن کے دل نے تردید کی ۔۔۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ چند قدم اور ۔۔۔ وہ اپنا ہر قدم اس طرح اُٹھا رہی تھیں جیسے موت و حیات کا فاصلہ طے کر رہی ہوں ۔۔۔ بیڈ نمبر دو ۔۔۔ اُن کی جانب اُس عورت کی پشت تھی۔ انہوں نے سوچا ہو سکتا ہے مسٹر سانیال کی کوئی رشتہ دار [illegible] اُن کے پاس آ گئی ہو ۔۔۔ لیکن نہیں ۔۔۔ اب وہ [illegible] بے تاب ہو گئیں ۔۔۔ انہوں نے تیزی کے ساتھ اپنا اگلا قدم اُٹھایا ۔۔۔ اور پھر ۔۔۔ وہ حیرت کے اتھاہ سمندر میں ڈوب گئیں۔ وہ ۔۔۔ وہ ۔۔۔ وہ تو پرنسپل مس سروجہ تھیں۔ مسز سانیال کے ذہن میں ایک ثانیہ کے لئے خیال اُبھرا ۔۔۔ شاید میرے پاس آتے ہوئے اُس تار کا انہیں یقین نہیں آیا اور خود مجھ سے پہلے رات کی گاڑی سے یہاں تک آ گئیں ۔۔۔ دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں لیکن نہ جانے کیوں مس سروجہ کی نظریں شرم و حیا کے بوجھ سے جُھک گئیں۔ وہ بالکل خاموش تھیں۔ مسٹر سانیال نیم بیہوشی کے عالم میں سفید چادروں سے لپٹے پڑے تھے۔ مس سروجہ نے دوا کا آخری چمچہ مسٹر سانیال کے حلق میں ڈال کر اُن کے سر کو آہستہ سے تکیہ پر رکھ دیا اور اُن کے آدھے منہ پر چادر ڈال دی۔ مسز سانیال خاموش کھڑی تھیں۔ مس سروجہ کرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئیں اور اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے رندھی ہوئی آواز میں بولیں۔

"مسز سانیال تم آ گئیں اور تم نے مجھے دیکھ بھی لیا اب میں تم سے کچھ چھپانا بھی نہیں چاہتی۔ تم نے تو شاید یہ سمجھا ہوگا کہ مسٹر سانیال میرے لئے اجنبی ہوں گے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ [illegible] مسٹر سانیال کئی سال تک میرے کلاس فیلو رہے تھے۔ میں نے [illegible] زندگی کی اُمنگ [illegible] اُن کے ساتھ چلنے کی [illegible] لیکن میری قسمت [illegible] حالات کے [illegible] تمہارے سہاگ کی [illegible] چلے گئے [illegible] میں نے اُن سے ایک وعدہ کیا تھا کہ شادی کروں گی تو صرف تمہارے ساتھ، ورنہ اپنی زندگی یونہی گزار دوں گی ۔۔۔ اور میں آج تک اپنا وہ وعدہ نبھا رہی ہوں۔ اب میری خوشیوں کی دھوپ غم کے سائے میں بدل چکی ہے ۔۔۔ میں نے آج تک تمہیں یہ راز نہیں بتایا کہ تمہارا تقرر میں نے صرف اس لئے اپنے کالج میں کرایا تھا کہ تم میرے یہاں رہو گی تو اس بہانہ کبھی نہ کبھی مسٹر سانیال کو میں بھی دیکھ کر اپنے من کے دیوتا کی پوجا کر لیا کروں گی ۔۔۔ اتنا کہتے کہتے وہ خاموش ہو گئیں۔ شاید کچھ اور سوچنے لگی تھیں۔ مسز سانیال کو خاموش دیکھ کر انہوں نے پھر بات آگے بڑھائی ۔۔۔ کل میں نے تمہاری چھٹی کی درخواست نامنظور کر کے اپنے دل پر بڑا جبر کیا تھا لیکن میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھی کیونکہ ٹیلیگرام دیکھنے کے بعد کئی گھنٹوں تک میری آنکھیں آنسو بہاتی رہی تھیں۔ میں چاہتی تھی کہ تم سے پہلے اس موقع پر مسٹر سانیال کے پاس پہنچوں۔ میرے اس عمل سے تمہارے دل میں بہت سی بدگمانیاں پیدا ہو گئی ہوں گی لیکن تم اپنے دل میں انہیں جگہ نہ دینا کیونکہ بات دل کے رشتوں کی ہے ہر کوئی دل کے ہاتھوں مجبور ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم ہمیشہ ان سب باتوں کو ایک راز کی طرح اپنے دل میں رکھو گی۔ مسٹر سانیال کی حالت اب خطرے سے باہر ہے تم بے فکر رہو اور جب تک جی چاہے یہاں اُن کے پاس رہ سکتی ہو۔ میں اب واپس جا رہی ہوں ۔۔۔" اور پھر وہ کمرے سے تیزی سے باہر نکل گئیں لیکن مسز سانیال خاموشی کے ساتھ کھڑی ششدر سی یہی سوچتی رہیں کہ کیا مس سروجہ اُن کی خوشگوار زندگی کی راہوں میں پڑا ہوا پتھر تھیں؟ ۔۔۔ یا پھر انجانے میں اُن کی ذات مس سروجہ کی زندگی کے لئے تاریکیوں کا پیکر بن گئی ہے۔

گھر بھر کی دُھلائی جگمگاتی سفید! بیداغ صاف! اسلئے کہ ڈھیروں جھاگ دینے والے سرف میں دُھلائی کی زائد قوت ہے! ساڑھیاں، شلواریں، قمیضیں، بچوں کے لباس... ہر کپڑا سفید ترین دُھلتا ہے اور صاف ترین! ساری دُھلائی گھر میں سرف سے کیجئے۔

سرف سے کپڑے سفید ترین دُھلتے ہیں

سید حجاب ترمذی

اُدھر نقاب میں جنبش سی پائی جاتی ہے
ادھر نظر میں تجلی سمائی جاتی ہے

بجھا رہے ہو لگا کر تم آگ کیوں دل میں
کہیں یہ آگ لگا کر بجھائی جاتی ہے

گلوں کو ہو نہیں سکتی تمام عمر نصیب
جو بات اُن کے تبسم میں پائی جاتی ہے

نقاب رُخ سے اُلٹ دیجئے خُدا کے لئے
کہ رُوح کھنچ کے اب آنکھوں میں آئی جاتی ہے

یہ لطفِ خاص، یہ اصرار، یہ خلوصِ تمام
میں پی چکا ہوں مگر پھر پلائی جاتی ہے

کلیم و طور سبھی ہیں جس کی تاب سے معذور
وہ برق خرمنِ دل پر گرائی جاتی ہے

یہ نازِ حسن، یہ بے باکیاں ارے توبہ
میں رو رہا ہوں ہنسی اُن کو آئی جاتی ہے

ہوش باش کہ ہے اعتراف عشق گناہ
کہیں یہ بات زباں پر بھی لائی جاتی ہے

حجاب کشتیِ عمرِ رواں کی خیر نہیں
سنبھالتا ہوں مگر ڈگمگائی جاتی ہے

رشی پٹیالوی

تمہارے آتے ہی زندگی کے چمن میں کیا کیا بہار چھائی
ترستی آنکھوں کے بھاگ جاگے تڑپتے دل کی کلی کھل آئی

میں تم کو دیکھوں کہ دیکھوں ہر سو بہار ساماں خوشی کا عالم
اُدھر اُدھر ہے سلونا منظر جدھر جدھر بھی نظر اُٹھائی

ذرا سا تم سے جُدا ہوئے تھے عجب عجب حادثوں سے گذرے
کسی خوشی نے ہمیں نہ پوچھا کہیں بھی راحت نظر نہ آئی

جہاں جہاں بھی قدم تمہارے جمال ارزانیاں کریں گے
وہاں وہاں رنگ و نور بن کر بہار ہوگی سبھی سجائی

ہزار جاں سوز ہے جُدائی ہوا ہے محسوس لیکن ایسا
صبا تمہارا سلام لائی سحر تمہارا پیام لائی

عطائے صہبائے بے خودی ہے تمام گم گشتگی کا عالم
طریقِ منزل میں آگہی بھی فریبِ حیرت سے کم نہ پائی

مشاہدہ بھی ہے تجربہ بھی نصیب اپنا مقام اپنا
ہماری نظروں میں ایک تم ہو تمہاری نظروں میں سب خُدائی

اُجڑ نہ دیکھے کوئی ہمارا شعور و خود آگہی کے ہاتھوں
نہ پھر ہمیں اپنی یاد آئی تمہاری یاد اس ادا سے آئی

رشی سے پوچھو تو یہ حقیقت کھلی حقیقت سے کم نہیں ہے
تمہارا دیدار زندگی ہے قضا کا پیغام ہے جُدائی

آواز کا جادو

راز یوسفی

۱/۴۵ دھرم پورہ۔ لاہور نمبر ۱۵
۲۰ جنوری ۱۹۶۴ء

خورشید بھائی!

سلامِ عقیدت۔ سالنامہ باصرہ نواز ہوا۔ "آفتاب آمد دلیلِ آفتاب" کے مصداق "بیسویں صدی" کا سالنامہ "بیسویں صدی" کا سالنامہ ہے۔ اور مدح و ستائش سے مستغنی! ہر اعتبار سے اسے جانِ ادب کہا جا سکتا ہے۔ یہ وہ مہکتا ہوا گلدستۂ ادب ہے جس سے مدتوں مشامِ جاں معطر رہے گا۔ اس بار تصاویر کا انداز آپ کی طبع جدت پسند کا آئینہ دار ہے۔ آپ نے بے حد حسین پیرایہ میں قلمکاروں کی گھریلو زندگی کو دامنِ قرطاس پر پیش کیا ہے۔ "ملاآ" کی تعریف کے خطوط کی بھرمار نے ایک "حسین پریشانی" میں مبتلا کر دیا ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ایک ہی مرکزی خیال کی دو کہانیاں سالنامہ میں ساتھ ہی شائع ہوئیں۔ اور یہ آپ کی مدیرانہ دانشمندی کی دلیل ہے۔ ورنہ مختلف شماروں میں شائع ہونے سے ایک دوسرے پر سرقہ کا الزام وارد ہو سکتا تھا۔ حالانکہ یہ سراسر حسنِ توارد ہے ——— "آواز کا جادو" حاضرِ خدمت ہے۔ اس جادو سے آپ اور قارئین کس حد تک مسحور ہوتے ہیں۔ اِس کا فیصلہ تو اشاعت کے بعد ہی ہوگا۔ بہرنوع اِس کا مرکزی نقطۂ خیال آپ سے ضرور داد طلب ہے...

نیاز کیش ——— راز یوسفی
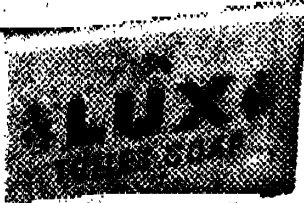
آفتاب پر رومانی موڈ طاری تھا۔

"اُس کی آواز میں شعلے کی لپک اور ہر تان میں دیپک راگ کا سوز و گداز ہے۔"
آفتاب چینیز لنچ ہوم میں کافی کی تلخ چسکیوں کے دوران میں بُری طرح بہک رہا تھا۔

"مگر وہ محترمہ ہیں کون؟" میں نے کریدنے کی کوشش کی۔

"یہ تو میں خود بھی نہیں جانتا۔ بس یوں سمجھ لو کہ اُن کا نادیدہ شیدائی ہوں۔"

"تو اِس کا یہ مطلب ہوا کہ تم صرف آواز پر فریفتہ ہو؟"

"کتنے بد ذوق ہو۔ تم بھی ندیم! آواز کا شخصیت سے بہت گہرا تعلق ہے۔ حسین آواز پیکرِ حسین ہی سے نکل رہی ہے۔ اگر اُس رسیلی آواز کا شہد ایک بار تمہارے کانوں میں ٹپک جائے تو مجھے یقین ہے کہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھو گے۔"

"مجھے تو خدا اِس افتاد سے محفوظ ہی رکھے۔ ابھی دنیا میں بہت کچھ کرنا ہے مجھے۔ اور پھر ایسی حسین وارداتوں کے لئے تم ہی کیا کم ہو؟"

"اور ہو۔ جبھی تو کہتا ہوں۔ قانون کی خشک کتابیں پڑھتے پڑھتے فلاسفر بن کر رہ گئے ہو۔ نہ کوئی اُمنگ نہ ترنگ ؎

جوانی اور ہنگاموں سے خالی
یہ جینا ہے یہ کوئی زندگی ہے؟

"تمہارے قول کے مطابق یہ جینا بھی کوئی جینا نہ سہی۔ لیکن میں یہ جینا بھی کیا جینا ہے کہ ہر وقت سایوں کے پیچھے بھاگتے رہو۔ بھلے آدمی ؎

راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا

"ندیم! بس مجھے تمہاری یہ مشفقانہ نصیحتیں ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔ تمہارے سینے میں دل کی جگہ کوئی برف کی سِل رکھی ہوئی ہے۔ جس نے پگھلنا

آنکھیں

بات کیا کرتے مجھے مست دکھا کر چل دیئے
کہہ گئے آنکھوں ہی آنکھوں میں وہ کیا کیا بات ــــــ یاسؔ لڈکی

بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا!
تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی ــــــ ڈاکٹر اقبالؔ

لڑتی نہ جائے آنکھ جو ساقی سے شیفتہؔ
ہم کو تو خاک لطف نہ آئے شراب میں ــــــ شیفتہؔ

دید لیلیٰ کے لئے دیدۂ مجنوں ہے ضرور
میری آنکھوں سے کوئی دیکھے تماشا تیرا ــــــ رندؔ لکھنوی

وہ آنکھ اپنے کام سے غافل نہیں فراقؔ
کچھ دیر رہ لے ہوش ہر اک ہوشیار کا ــــــ فراقؔ گورکھپوری

مرسلہ: ست نام سنگھ جھنکاری ایم۔اے (کلکتہ)

نہیں۔ میری مانو تو قانون پڑھنے کی بجائے اسلامیات کے ریسرچ اسکالر بن جاؤ۔ پھر یہ باتیں تمہیں اچھی طرح زیب دیں گی۔"

آفتاب کے منہ کا ذائقہ خراب ہو گیا تھا۔ وہ لڑنے کے موڈ میں آ گیا تھا۔

"ارے۔ میرے پیارے رومیو! تم تو خفا ہو گئے۔ اچھا۔ ذرا کھل کر بتاؤ۔ وہ کون ہے۔ کیا ہے۔ اور تم نے اُس کا دیپک راگ کب اور کہاں سُنا ہے؟"

اُس کا غصہ فوراً ہی رفع ہو گیا۔ اور وہ پھر چہک کر بولا۔

"بات یہ ہے کہ وہ ایک پرائیویٹ فرم میں ٹیلیفون آپریٹر ہے۔ اُسے ریڈیو پر بولنے کا بڑا شوق ہے۔ ایک روز اُس نے ٹیلیفون کیا۔ تو اتفاق سے مجھے ہی اُس سے بات چیت کرنے کا موقع ملا۔ بس پھر کیا تھا۔ بات بن گئی۔ میں نے اُس سے وعدہ کر لیا کہ وہ کسی روز دفتر میں چلی آئے۔ میں آڈیشن کے موقع پر اُس کی پوری مدد کروں گا۔ اور اُسے ریڈیو پر بطور اناؤنسر ملازم کرانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھوں گا۔"

"مگر اُس کی آواز میں غنائیت کا جو جادو ہے۔ اُس کا تمہیں کیسے علم ہوا؟"

"تو تم یہ سمجھتے ہو کہ میں نے اُس سے صرف ایک ہی بار بات کر کے اُس کے بارے میں اتنی اونچی رائے قائم کر لی۔ بھلے آدمی! وہ پچھلے دو ہفتوں سے ہر روز ٹیلیفون پر میرے ساتھ باتیں کرتی ہے اور کئی مرتبہ ٹیلیفون ہی پر اُس نے مجھے گا کر سُنایا ہے۔ میں اپنے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے ریڈیو اسٹیشن پر ایک لڑکی بھی اُس تک ہم پلّہ نہیں ہے۔ جس روز پہلی بار اُس کی آواز ریڈیو سے نشر ہوگی تو سارا ملک جھوم اُٹھے گا۔"

"اور اس نئی دریافت کا سہرا تمہارے سر بندھے گا۔" میں نے ہلکی سی چٹکی لی اور دل ہی دل میں اُس کی سادگی پر مسکرا دیا۔ اور دیر تک یہ سوچتا رہا اگر وہ آج کل کے عام نوجوانوں کی طرح اتنا دل پھینک اور لاابالی نہ ہوتا۔ تو کتنا عظیم آرٹسٹ ہوتا۔

آفتاب ریڈیائی ڈراموں کی روحِ رواں تھا۔ اُس کی آواز میں غضب کا سوز و گداز تھا۔ کوئی ڈرامہ اُس کے بغیر کامیاب نہ ہوتا تھا۔ ایک عظیم آرٹسٹ کی تمام خصوصیات اُس میں بدرجۂ اتم موجود تھیں لیکن ایک کمزوری اُس کی تمام خوبیوں پر غالب تھی اور وہ تھی صنفِ نازک! شوخ و رنگین سایوں کے پیچھے بھاگنا اُس کی فطرتِ ثانیہ تھی۔ اور اپنی اسی کمزوری کے باعث وہ خاصا بدنام اور پست ہو کر رہ گیا تھا۔ ایک مخلص دوست کی حیثیت سے اکثر اوقات دبے الفاظ میں تنقید کر کے میں اُس کی انا کو جھنجھوڑتا رہتا تھا لیکن وہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ اور میری معمولی سی چھیڑ چھاڑ سے بھی وہ شعلے کی طرح بھڑک اٹھتا تھا۔

کچھ دیر ہر طرف خاموشی طاری رہی۔ پھر اچانک جیسے اُسے کچھ یاد آ گیا۔ اور اپنی سیمابی فطرت کے تقاضے سے مجبور ہو کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا بھئی۔ میں چلتا ہوں۔ آج نغمہ ناہید تین بجے آڈیشن کے لئے آ رہی ہے۔ فرصت ملے تو چلے آنا۔ ذرا تفریح رہے گی۔"

اور وہ ہاتھ ملا کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا لنچ روم سے باہر نکل گیا۔

میں بھی تین بجے ریڈیو اسٹیشن پر موجود تھا۔

آفتاب بے حد خوش تھا۔ اُس وقت وہ اپنے بہترین سوٹ میں ملبوس تھا۔ اور اپنی میز کے پاس یوں جم کر بیٹھا تھا۔ جیسے اُس کا جسم کرسی کے ساتھ سِل گیا ہو۔ اور ایک لمحہ کے لئے کرسی سے علیحدگی اُس کی جان پر بنا دے گی۔ اُس کی نگاہیں بیرونی دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ اور وہ ہیجان و اضطراب کا ایک جیتا جاگتا نمونہ بنا ہوا تھا۔ اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میں نے اُچک کر ریسیور اٹھا لیا۔ ایک بہت میٹھی اور رسیلی آواز میرے کانوں کے ساتھ ٹکرائی۔

"آفتاب صاحب تشریف رکھتے ہیں؟"

"جی۔ آپ کی تعریف؟" میں نے بات کو آگے بڑھانے کی غرض سے پوچھا۔

"مجھے نغمہ ناہید کہتے ہیں۔"

"کی۔ جی لیجیے۔ بات کیجیے" میں نے کہا۔ وہ اُٹھتے ہوئے بولا اور ریسیور آفتاب کی طرف بڑھا دیا۔

بے شک اتنی مِس مرینی آواز میں نے آج تک نہیں سُنی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں اعتراف کیا کہ آفتاب نے اس آواز کے بارے میں جو رائے قائم کی تھی، اُسے آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور ایسی حسین آواز کسی حسین ہی سراپا سے نکل سکتی ہے۔ مجھ پر ایک نشہ سا طاری ہو گیا۔ اور میں دیر تک اُس کے کیف و سرور میں ڈوبا رہا۔

آفتاب بول رہا تھا۔

"میں آپ ہی کا منتظر ہوں۔ فوراً چلی آئیے۔ آڈیشن میں کچھ زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ اور پھر یہ تو صرف ضابطے کی کارروائی ہے۔ آپ جیسی ملکوتی آوازیں قدرت کی خاص ودیعت ہوتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی آواز "آواز کی دنیا" میں تہلکہ مچا دے گی۔"

"آفتاب صاحب۔ یہ تو آپ کی بڑائی کی بات ہے۔ ورنہ میں کس قابل ہوں۔ ہاں! آپ کی توجہ سے کسی قابل ہو جاؤں گی۔ حالات نے آواز فروشی پر مجبور کر دیا ہے۔" دوسری طرف سے آواز آ رہی تھی۔

"آپ بے حد دکھی معلوم ہوتی ہیں۔ خیر۔ اب باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔ فی الحال تو آپ تشریف لے آئیے۔"

آفتاب ذرّے کو ذرّہ بنانے کے لئے بے چین تھا۔ اس لئے وہ باتوں میں وقت ضائع نہ کرنا چاہتا تھا۔

"ابھی حاضر ہو رہی ہوں۔"

ٹیلیفون بند ہو گیا۔

آفتاب کے لئے یہ لمحات بہت نازک تھے۔ وہ اس طرح دم سادھے بیٹھا تھا۔ جیسے قتل کا کوئی ملزم عدالت میں مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا جج کی زبان سے اپنی قسمت کا آخری فیصلہ سننے کے لئے زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہو۔ اور آدھ گھنٹے کے بعد آفتاب کی قسمت کا فیصلہ اُس وقت ہوا۔ جب ایک مہیب، زردہ چہرے والی ادھیڑ عمر کی عورت نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"اگر میں پہچاننے میں غلطی نہیں کرتی، تو آفتاب صاحب آپ ہی ہیں۔" اُس کا اشارہ ٹھیک آفتاب کی طرف تھا۔ "میرا نام نغمہ ناہید ہے۔" وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

اور آفتاب کا چہرہ فرطِ غم سے یوں سنولا گیا تھا۔ جیسے برسات کے موسم میں کسی گہری سیاہ بدلی نے آفتاب کو اپنے دامن میں چھپا لیا ہو۔

"بیسویں صدی" کو ہم نے کبھی اشتہارات کا پلندہ نہیں بنایا۔ اِس میں ۴۲۰ اور بوگس قسم کے وہ اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے جن کا مقصد خریداروں کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالنا ہوتا ہے

یاد

کوئی بجلی سی کلیجے میں لئے جاتا ہے
ہم تری یاد سے غافل نہیں ہونے پاتے ——— فانی

میرے قابو میں نہ پہروں دلِ ناشاد آیا!
وہ مرا بھولنے والا، جو مجھے یاد آیا ——— داغ

پکارتی ہے نہ دروازہ کھٹکھٹاتی ہے
بڑے گھمنڈ سے یاد اُن کی دل میں آتی ہے ——— آرزو لکھنوی

اُن کو میں کس طرح بھلاؤں نظام
یاد کس بات پہ نہیں آتے ——— نظام رامپوری

ہم تجھے بھول گئے، ہائے تری سادہ دلی
کوئی طائر کبھی بھولا ہے نشیمن اپنا ——— عندلیب شادانی

آپ بھارت کی
کسی بھی زبان
میں
تار بھیج سکتے ہیں
بشرطیکہ
پیغام
دیوناگری رسم الخط
میں ہو

منظور الحسن منشا، ایم۔ اے

بہارِ سینۂ افگار کو نظر نہ لگے
عنایتِ نگہِ یار کو نظر نہ لگے

کسی چمن میں کہاں یہ نشاطِ سامانی
جمالِ زخمِ دلِ زار کو نظر نہ لگے

ہم اُن کے غم کو چھپاتے ہیں اپنے دل میں
کہ ایسی دولتِ بیدار کو نظر نہ لگے

زمانہ دیکھ رہا ہے حریص نظروں سے
کہیں ہمارے مسیحا کو نظر نہ لگے

یہ دھوپ یہ لب و رخسار کی شفق تابی
یہی ہے ڈر کہیں سرکار کو نظر نہ لگے

جو فتنہ خیز بھی ہو اور حیا سلمان بھی
کیوں ایسے حسن طرحدار کو نظر نہ لگے

جگر کے خون سے منشاؔ ہوئی ہے انکی نمود
خدا کرے ترے اشعار کو نظر نہ لگے

نسیم شاہجہاں پوری

مجھ کو اوراقِ پریشاں پہ ہنسی آتی ہے
جانے کیوں ہر گلِ خنداں پہ ہنسی آتی ہے

تم نگاہِ غلط انداز سے دیکھا نہ کرو
مجھ کو اس لطفِ گریزاں پہ ہنسی آتی ہے

ہم سے جانبازِ محبت پہ ہے آمادۂ جور
جرأتِ گردشِ دوراں پہ ہنسی آتی ہے

ہو کے مختار نظر آتا ہے کتنا مجبور
دورِ جمہور کے انساں پہ ہنسی آتی ہے

کچھ میں پلکوں پہ ضیابار تو کچھ دامن پر
مجھ کو اشکوں کے چراغاں پہ ہنسی آتی ہے

کوئی گریاں کوئی خنداں کہیں شبنم کہیں پھول
مجھ کو تنظیمِ گلستاں پہ ہنسی آتی ہے

دینے والے نے مجھے اتنا دیا ہے کہ نسیمؔ
اپنی کوتاہیِ داماں پہ ہنسی آتی ہے

اُودے سنگھ مصوّر

کیوں پشیماں ہوں کہ اظہارِ تمنا کر دیا
میں نے جو موزوں مناسب ٹھیک سمجھا کر دیا

اُن کی چپ پر ہم نے تھوڑا سا تقاضا کر دیا
عرضِ مطلب کے لئے یہ لازمی تھا کر دیا

آپ کے ظلم و ستم کا جب کوئی چارہ نہیں!
ہم نے شکوا کر دیا تو نارو کیا کر دیا

عشق کا انجام کیا ہے یوں کہیں کیسے کہیں
عشق کے آغاز نے جب ہم کو رسوا کر دیا

اللہ اللہ بارگاہِ حسن ہے وہ بارگاہ
کافر و مومن جہاں دونوں نے سجدا کر دیا

کوششِ ضبطِ الم کی دیکھئے بے چارگی
چشمِ تر نے میرے دل کا راز افشا کر دیا

کیا بتائیں کس طرح گزری مصوّرؔ کی حیات
رات دن غم کھا کر اُس نے وقت پورا کر دیا

افسانہ

ایک خموشی لاکھ سکوں

رئیس نجمی امروہوی

آشیانہ، سرائے کہنہ، امروہہ (یوپی) ضلع مراد آباد

۲۰ دسمبر ۱۹۶۳ محترم جنگ! آداب و نیاز

ایک نئی کہانی "ایک خموشی لاکھ سکوں" میری ڈائری کے چند اوراق پر مشتمل ہے ارسال خدمت ہے۔ میرے خیال میں کہانی آپ کو پسند آئے گی کیونکہ میں نے ڈائری کے صفحات کو کہانی کے روپ میں ایک نئے انداز سے مرتب کیا ہے۔ پہلی بار تجربہ کیا ہے۔ پڑھنے والے اس نامعلوم ہستی کی کہانی ہے جس کے لئے شکیل شفائی نے اپنا ایک شعر یوں کہا ہے ؎

شمع جس آگ میں جلتی ہے نمائش کے لئے ہم اسی آگ میں گمنام جلے جاتے ہیں

اپنی کہانی کے اس کردار سے جس کی یہ ڈائری میں نے بغیر اجازت پڑھی تھی اور اب تک اسے چھپانے کا گناہ کر رہا ہوں معذرت چاہوں گا ——— کراچی پاکستان سے میری کہانی "غم کے بادل برسے" پر مجھے ایک صاحب کا بہت ہی دلچسپ خط ملا ہے جس میں انہوں نے میری زندگی کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی ہے اور معلوم کیا ہے کہ میری بیشتر کہانیوں کا اختتام المیہ کیوں ہوتا ہے؟ انہوں نے اپنا پتہ نہیں لکھا ہے اسی لئے میں "بیسویں صدی" کے توسط سے اُن سے صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ میں اس رنگا رنگ زندگی میں جو کچھ دیکھتا اور محسوس کرتا ہوں وہ میری کہانیوں کے روپ میں ڈھل جاتا ہے .... نیاز کار ——— رئیس نجمی امروہوی

---

۸ جولائی ۱۹۶۳ء

میں کالج سے بہت پہلے گھر آگئی تھی۔ کھانے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد میں نے تنہائی کو مٹانے کے لئے ریک سے ایک کتاب نکال لی اور یوں ہی وقت گزاری کے لئے پڑھنے لگی۔ اسی وقت کسی نے اچانک دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے جیسے ہی کیواڑ کھولے میرا دل دھک سے رہ گیا۔ خلاف توقع میرے سامنے ایک خوبرو نوجوان کھڑا تھا جو میرے لئے اجنبی تھا۔ جیسے ہی میری نگاہیں اس کی نگاہوں سے ٹکرائیں وہ گھبرا گیا۔ میں نے محسوس کیا وہ کوئی لفظ کہتے کہتے رُک گیا ہے اور آواز اس کے حلق میں اٹک کر رہ گئی ہے۔ وہ ہلکے زرد رنگ کی بشرٹ اور نیلی پینٹ پہنے تھا۔ اس کی اٹیچی اس کے ہاتھ میں جھول رہی تھی۔ شاید وہ کوئی پردیسی تھا۔ چند ثانیوں تک وہ مجھے یوں ہی دیکھتا رہا اور میں بھی نظریں نیچی کئے اس کے ہونٹوں سے نکلنے والے الفاظ کا انتظار کرتی رہی۔ بھائی جان اپنے آفس گئے ہوئے تھے۔ وہ اُن کا دوست بھی نہیں ہو سکتا جو کبھی پہلے اُن کے ساتھ ہمارے گھر آیا ہوتا اور میں اُسے پہلی ہی نظر میں پہچان لیتی۔ اس سکوت کو توڑتے ہوئے اُس نے مجھ سے پوچھا "عذرا باجی کہاں ہیں؟" تب میں نے اُسے بتایا کہ وہ غلطی سے ہمارے گھر آ گیا ہے۔ عذرا باجی تو اس مکان کو دو ماہ پہلے چھوڑ چکی ہیں اور اب سامنے والے مکان کی پشت پر جو نیا مکان بنا ہوا ہے اُس میں رہنے لگی ہیں۔ اُس نے اپنی اس انجانی غلطی کا احساس کرتے ہوئے مجھ سے معذرت طلب کی اور مجھ سے عذرا باجی کے مکان تک پہنچنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں ازراہ ہمدردی اُن کا گھر بتانے کے لئے اُن کے دروازے تک چلی گئی لیکن یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ خلاف توقع اُن کے دروازے پر اُس وقت تالا لگا ہوا تھا۔ یہ تالا میرے ہی لئے نہیں اُس کے لئے بھی تعجب کا مرکز بن گیا۔ ایک دم اُس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا اور بے پناہ تھکن کے آثار اُس کے چہرے پر نمایاں ہو گئے۔ عذرا باجی اور اُن کے شوہر سے ہمارے گھریلو تعلقات بہت اچھے تھے۔ جب سے میں اور بھائی جان اس محلے میں آئے ہیں، ایک صرف انہی کا گھر ایسا ہے جن سے ہماری پہلے ہی دن سے بڑی بے تکلفی ہو گئی ہے۔ میرے سامنے کھڑا ہوا پردیسی

۱۴ رجولائی ۱۹۶۳ء

آج کا دن بہت مشکل سے گزرا ہے۔ میری زندگی میں اتنا طویل دن
نہیں آیا۔ میرے دل میں طرح طرح کے خیالات بے مقصد آتے رہے۔ تنہائی کا
حصہ صرف اس سوچ میں گزرا کہ نہ جانے انہوں نے میرے خط کو سطر کی کون سی
انہوں نے پڑھا ہوگا اور پڑھنے کے بعد میرے بارے میں کیا کیا سوچا ہوگا؟ اور میرے
بارے قائم کی ہوگی؟ میں نے اس خط میں اُن سے اُس دن کی خاموشی کی ساری
تان بیان کی ہے۔ اپنی ساری مجبوریاں لکھی ہیں۔ اپنی انجانی بد اخلاقی کی
چاہی ہے۔ اجنبیت کی اُن دیواروں کا ذکر کیا ہے جو اُس دن اُن کے اور
میرے درمیان حائل تھیں۔ اور اس کے بعد اُن کے سامنے اپنے دل کے سارے
جذبات کھولتے ہوئے اُن سے والہانہ محبت کا اظہار کیا ہے۔ اُن کے قدموں میں
بقیہ زندگی کے دن گزارنے کی خواہش کی ہے۔ کتنا اچھا ہو میرے لئے کہ تصور
سا ہمیشہ کے لئے اُن کی ہو جاؤں۔ ایک چھوٹا سا گھر ہو۔ جس کا ایک آنگن ہو۔
میں اور اُن کا انتظار ہو۔ لیکن سنا ہے کہ مردوں کے دل پتھر کے ہوتے ہیں پتہ نہیں
خیالات اُن کے لئے اپنے دل میں رکھتی ہوں وہی جذبات وہ بھی میرے اپنے دل
رکھتے ہیں یا نہیں۔ مجھے امید ہے وہ مجھ سے ضرور انسیت رکھتے ہوں گے۔ وہ تو
خیالوں سے بلند ہیں۔ وہ ایک کہانی کار ہیں اور کہانی کار کے دل میں تو سارے
جہان کا درد ہوتا ہے۔ اُن کے دل میں اتنی جگہ اور نہ ہوگی کہ اس میں میرا درد بھی
سما سکے۔ پندرہ تاریخ کو اُن کی واپسی کی امید ہے۔ نہ جانے وہ میرے خط کا جواب
دیں گے یا کیا لکھیں گے۔ اب میں کیسے اُن کے سامنے جاؤں گی؟ کیسے بیچ کے دن گذریں گے!

تھک گئے ہم کرتے کرتے انتظار ۔۔۔ اک قیامت اُن کا آنا ہو گیا

۱۵ رجولائی ۱۹۶۳ء

آج اُن کے آنے کی پوری امید تھی لیکن سارا دن انتظار میں بیت گیا۔ میں
تھوڑی تھوڑی دیر بعد باجی کے گھر کے چکر لگاتی رہی۔ خدا کرے باجی نے میرے اس
زیادہ آنے جانے سے کچھ سمجھ نہ لیا ہو

کبھی نغمہ، کبھی نالہ، کبھی خاموشی پیہم
تری یادوں کے صدقے دل کا اک عالم نہیں ہوتا

۱۶ رجولائی ۱۹۶۳ء

انتظار کی طویل کشمکش کے بعد وہ آج آ گئے تھے۔ میں چاہتی تھی کہ کسی طرح
مجھے تنہائی مل جائے اور میں اُن سے کچھ باتیں کروں۔ ایسی باتیں جن کی ابتدا تو ہو
لیکن انتہا کوئی نہ ہو۔ گزشتہ دنوں کی طرح مجھے آج بھی کوئی موقع نہیں مل رہا تھا۔
جب بھی گئی کوئی نہ کوئی اُن کے پاس بیٹھا ہوا ملا۔ آج تو اُن کی شخصیت مندا باجی کے
پورے گھر کے لئے بہت دلچسپ بنی ہوئی تھی۔ انہیں باجی کے گاؤں سے
آج ہی واپس چلا جانا تھا۔ اس لئے میں اپنے خط کا جواب پانے کے لئے بے چین
تھی جب میری ساری کوششیں ناکام ہو گئیں تو میں باجی کے ڈرائنگ روم کے دروازے
پر پڑے ہوئے جالی دار پردہ کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے پردہ کے اس پار
ڈالی تو میں نے دیکھا وہ اور مندا باجی ڈرائنگ روم میں چائے پی رہے تھے۔ میری طرف ان
کی پشت تھی اور وہ باجی کے بالکل سامنے تھے چند لمحوں بعد انہوں نے مجھے دیکھ لیا
تھا اور مسکرائے بھی تھے۔ پھر تو جواب میں میں بھی مسکرا دی۔ اچانک انہوں نے باجی کو
مخاطب کر کے مجھے اندر بلانے اور چائے پلانے کی دعوت دی۔ میں بغیر کچھ کہے خاموش
کے اندر چلی گئی اور اُن کے دائیں طرف والی کرسی پر جا کر بیٹھ گئی۔ باجی نے چائے کا
ایک کپ میرے لئے بھی بنایا اور اُن سے میرا تعارف کرایا۔ تعارف کے
دوران باجی نے میری تعریف کے میری صفات کے وہ پل باندھے کہ میں خود شرما
گئی۔ بھلا بیچاری کو کیا معلوم تھا کہ میں اُن سے بہت پہلے سے متعارف ہوں۔ اُن کے
اور میرے ناموں کی یکسانیت نے جو باجی ہی نے میرے سامنے کافی دنوں پہلے میری
توجہ کا مرکز بنا دی تھی۔ میرے دل میں ایک ہلچل پیدا کر دی تھی اور اب یہ ہلچل کیسی ہو گئی
ہے؟ اور یہ تعارف کتنا طویل ہو گیا ہے؟ چائے پیتے ہوئے انہوں نے باجی سے کہا
"دودھ ٹھنڈا ہو چکا ہے"۔ باجی جیسے ہی "ملک پوٹ" لے کر باورچی خانہ کی طرف گئیں۔
میں نے موقع مناسب جان کر اُن سے اپنے خط کا جواب چاہا۔ پہلے وہ جھجکے جیسے انہیں
باجی کے آنے کا ڈر ہو۔ پھر انہوں نے پردے کے پار ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور
مسکراتے ہوئے کہنے لگے "تم نے اپنے خط کا جواب دینے کی قسم دی تھی اس لئے جواب
حاضر ہے"۔ جلدی جلدی انہوں نے اپنی پینٹ کی جیب سے ایک مڑا ہوا بند لفافہ نکالا
اور میری طرف پھینک دیا ــــ خط کا جواب پا کر میری خوشیوں کی انتہا نہ رہی۔ یا اللہ
عشق میں میرا میری محبت قبول ہو چکی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ جواب کیوں دیتے؟ اس دوران
میں باجی آ گئیں اور چائے دوبارہ بنائی گئی لیکن میں نے اس بار چائے پینے سے انکار
کر دیا۔ اسی طرح کتنی ہی دیر بیت گئی۔ پھر اُن کے جانے کا وقت قریب آ گیا۔ رکشا آیا
وہ اُس میں بیٹھے۔ سب لوگوں کو الوداعی سلام کیا۔ میری طرف بھی ایک اچٹتی نگاہ ڈالی اور
چلے گئے اور میں تھکی تھکی اُداس اُداس گھر آ گئی۔ گھر آئی تو خلاف توقع بھائی جان آئے
ہوئے ملے۔ اُن کی طبیعت اچانک دفتر میں خراب ہو گئی تھی۔ اس لئے وہ وقت
سے پہلے گھر آ گئے تھے۔ مجھے اُس وقت سے اب تک وہ خط پڑھنے کا موقع نہ مل
سکا ہے نہ جانے انہوں نے اپنے خط میں کیا کیا لکھا ہوگا؟ مجھے کس لقب سے مخاطب
کیا ہوگا؟ میں بے تاب ہوں کہ جلد سے جلد کسی طرح یہ خط پڑھ لوں لیکن مجھے اب بھی
اس خط کو پڑھنے کا موقع نہیں مل رہا ہے۔ یہاں تک کہ اب رات ہو گئی ہے ــــ

بھائی جان بھی اب تک جاگ رہے ہیں! نہ جانے اب میں کس طرح پڑھوں! مجھے نہ جانے کیوں بھائی جان کے جاگنے سے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے انہیں اس خط کا علم ہو چکا ہے اور وہ اس موقع کی تلاش میں ہیں کہ میں کب وہ خط پڑھوں کی اور وہ ایک دم آ جائیں گے۔ معلوم ہوتا ہے آج کی رات اور راتوں سے زیادہ پریشان کن ہوگی اور نیندیا میری پلکوں سے لپٹتی رہیں گی اور بھاگتی رہیں گی۔

مجھ کو حاصل کسی کی خوشی ہو گئی اب میری زندگی، زندگی ہو گئی

۱۶ر جولائی ۱۹۶۳ء

آج اتوار تھا۔ کالج کی چھٹی تھی۔ بھائی جان کا بھی آج چھٹی کا دن تھا۔

صبح سے دس بجے تک کا وقت میرے لئے سخت بے چینی کا گزرا۔ ہر وقت وہ لفافہ میرے ذہن میں گردش کرتا رہا جسے میں کل سے چاہتے ہوئے بھی نہ پڑھ سکی تھی۔ اُسے پڑھنے کے لئے میں مکمل تنہائی چاہتی تھی اور تنہائی مجھ سے نہ جانے کیوں روٹھ گئی تھی۔ آخر کار بھائی جان اپنے ایک دوست سے ملنے کے لئے سول ہاسپٹل گئے تب میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ وہ لفافہ نکالا اور بڑی آرزوؤں کے ساتھ اُسے چاک کر کے اس میں رکھا ہوا وہ خط نکالا جس میں میری زندگی کے ایک حسین خواب کی ایک حسین تعبیر ملنے والی تھی۔ لیکن میری قسمت جس نے مجھے ہمیشہ اجالوں کی بجائے اندھیرے دیئے۔ میں نے جیسے ہی اُس کی تہوں کو کھولا میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا کیونکہ وہاں میرے خوابوں کی حسین تعبیروں کے بجائے ایک سادہ کاغذ تھا جو اُن کی طرف سے میری تمام باتوں کا کورا جواب تھا۔

گو کہ میں نے بہت دنوں پہلے اپنے خیالوں میں اُن سے اس مذاق کی آرزو کی تھی لیکن جب اس آرزو نے تکمیل کی حدوں کو چھو لیا تو نہ جانے کیوں میں یہ سوچنے لگی ہوں کہ باجی تو اپنے خط کے جواب میں ایسا سادہ کاغذ پا کر بے تحاشا ہنسنے لگی تھیں اور اُس وقت میں نے اُن کی اُس ہنسی کو ایک پاگل پن سے تعبیر کیا تھا لیکن وہی سادہ کاغذ دیکھ کر میری آنکھوں میں یہ آنسو کیوں آ گئے ہیں۔ میں تو اب تک صرف اتنا جانتی تھی کہ تحریریں ہی اپنے اندر زبان رکھتی ہیں لیکن آج مجھے احساس ہوا کہ سادے کاغذ بھی کبھی کبھی اپنے اندر آنسوؤں کے بہت بڑے طوفان چھپائے ہوتے ہیں جو مجھ جیسی جذباتی لڑکی کے وجود کو بہا سکتے ہیں۔ میں ہمیشہ کی طرح آج بھی ڈائری لکھنے بیٹھی ہوں لیکن نہ جانے میں اپنی ڈائری کے ان اوراق کو کبھی پڑھ سکوں گی یا نہیں کیونکہ مجھے اپنے ان بے اختیار بہنے والے آنسوؤں سے ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے یہ قطرے میری ڈائری کے ہر ہر لفظ پر گر کر ان کا وجود ختم کر دیں گے اور ان غمناک لمحوں کو مجھے شاید پھر کبھی یاد نہ آنے دیں گے اور میں اپنی ڈائری دیکھ کر ہمیشہ یہی سمجھتی رہوں گی کہ میرا ماضی بھی ایک سادے کاغذ کی طرح گزرا ہے جہاں کسی کو نہ پانے کی خوشی ہے نہ کھونے کا غم ہے۔ ◆

دلچسپ نئی کتابیں

سنگ و خشت اُردو ادب میں طنز نگاری کے میر کارواں پروفیسر کنھیا لال کپور کے طنزیہ مضامین کا مجموعہ۔ قیمت صرف دو رُوپے ۵۰ نئے پیسے۔

چنگ و رباب پروفیسر کنھیا لال کپور کے مزاحیہ اور طنزیہ مضامین کا دوسرا مجموعہ قیمت صرف دو رُوپے ۵۰ نئے پیسے۔

ابراہیم لنکن امریکہ کے محبوب ترین صدر کی سوانح عمری جس نے غلامی کا قلع قمع کیا اور مساوات اور آزادی کو انسان کا پیدائشی حق قرار دیا۔ قیمت ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے

رُوبرو جسمانی معذوریوں پر قوتِ عمل کی فتحیابی کی کہانی۔ ایک نابینا بچے کی قابلِ ستائش کوششوں کا مرقع۔ قیمت تین رُوپے ۲۵ نئے پیسے۔

نورا ایک ناصرہ کو اپنے اندر جاذبیت اور دلکشی پیدا کرنے کے لئے کیا کیا لا مثال قربانیاں دینی پڑیں۔ قیمت صرف دو رُوپے ۵۰ نئے پیسے۔

آرزو کی کلیاں امریکہ کے شہرۂ آفاق ناول نگار جان سٹین بیک کے دو مختصر ناولوں کا حسین ترجمہ۔ قیمت ایک روپیہ پچھتر نئے پیسے۔

دُنیا کے مشہور سائنس داں یہ کتاب آپ کو اُن سائنس دانوں کی زندگیوں سے رُوشناس کرائے گی جنھوں نے نسلِ آدم کو ترقی کے موجودہ زینے پر پہنچایا۔ قیمت صرف دو رُوپے پچیس نئے پیسے۔

اپنی منزل اپنی راہیں ولیم سرویان کا بیسٹ سیلر ناول جس کی فلم بنی تو ساری دُنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ انسان کے دُکھ سُکھ کی کہانی۔ قیمت صرف دو رُوپے ۵۰ نئے پیسے۔

شکستِ ظلمت یہ ایک اندھی عورت ہیلن کیلر کا افسانۂ زندگی ہے جس نے اپنی انگلیوں سے آنکھوں کا کام لیا اور دُنیا سے اپنی ذہانت کا لوہا منوایا۔ قیمت ایک رُوپیہ ۵۰ نئے پیسے۔

مابی ڈِک ہرمن میلول کا لافانی شاہکار۔ آسمانِ ادب کا جگمگاتا تارا۔ قیمت چار رُوپے

سائنس کی دُنیا یہ کتاب آپ کو سائنس کی ہر پیچیدگی کو سمجھنے میں مدد دے گی۔ آج دُنیا میں کوئی بھی انسان سائنس سے بے بہرہ نہیں رہ سکتا۔ مصنف ولیم اتھکر۔ مترجم ایم ایم بیگ۔ قیمت فی جلد صرف تین رُوپے۔

ملنے کا پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی دہلی نمبر ۱

شاہد کبیر

خوں کے گھونٹ پینے کو میکشی سمجھتے ہیں
بادہ کش اِسی کو اب زندگی سمجھتے ہیں

دل سے ہار کر چپ ہیں ورنہ اُن کی باتوں کو
کل بھی ہم سمجھتے تھے آج بھی سمجھتے ہیں

لوگ بھی سمجھتے ہیں اب تو ہم کو دیوانہ
ہم تو یہ سمجھتے تھے آپ ہی سمجھتے ہیں

تیرہ بخت راتوں کے آنسوؤں کا سایہ ہے
لوگ جس کو تاروں کی روشنی سمجھتے ہیں

اُن کی بدگمانی کو کوئی کیا کہے شاہد
میں جو کرتا ہوں سجدہ سرکشی سمجھتے ہیں

محمد عبدالقیوم صدیقی مست فتحپوری

موسمِ گُل ہے جام و بادہ ہے
دل کا کچھ اور ہی ارادہ ہے

چشمِ مخمور ہے کہ ئے خانہ
جو نظر ہے وہ روحِ بادہ ہے

پھر ستم گار کو نئی سوجھی!
لطفِ پیشیں کا پھر اعادہ ہے

ہے توجہ کی اِک حسیں صورت
وہ تغافل جو بالارادہ ہے

مست سے مِل کے آپ خوش ہوں گے
طبع رنگیں، مزاج سادہ ہے

سلطان احمد خان بی ستاب بلی ٹی ایم کام

یوں گذر تے ہ پر خطر سے
جیسے نکلے سفینہ بھنور سے

شدتِ انتظار اب نہ پوچھو
خوں ٹپکنے لگا چشمِ تر سے

مجھ کو پیغامِ اُلفت ملا ہے
سرمگیں، سرمگیں اِک نظر سے

کہہ رہی ہے فضائے معطّر
کوئی گذرا ہے اِس رہ گذر سے

جس سے چھلکے شرابِ محبت
آپ دیکھیں مجھے اُس نظر سے

ٹیس اُٹھتی ہے بیتاب اکثر
زخمِ دل اور زخمِ جگر سے
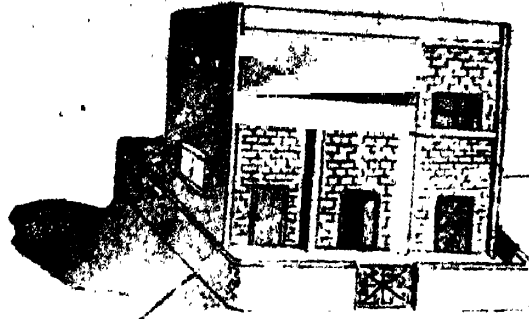
آپ کے کنبہ کی خوشحالی کا راز
آپ کی بچتوں میں مضمر ہے
جن بچتوں کے ذریعہ سے حل ہوتے ہیں۔
جس سال تک حل ہوتے ہیں
کیومیولیٹو ٹائم ڈیپازٹ سکیموں میں
۱۰۰ روپے ماہانہ لگانے سے
سال ۱۹۷۴ء تک ۱۲۵۰۰ روپے حاصل ہوتے ہیں جن سے شاندار مکان تعمیر کیا جا سکتا ہے۔
۱۲ سالہ نیشنل ڈیفنس سرٹیفیکٹوں میں
روپیہ لگانے سے
۶.۲۵ فیصدی سالانہ سادہ سود کے حساب سے ۱۹۷۶ء تک بچے کی شادی کے لئے یکمشت روپیہ حاصل ہوتا ہے۔
۱۵ سالہ اینوئٹی سرٹیفیکٹوں میں
۲۲۲۵ روپے لگانے سے
بچے کی ابتدائی تعلیم سے کالج تک کی تعلیم کے لئے ۲۵ روپے ماہوار حاصل ہوتے ہیں۔
چھوٹی بچتوں کی مختلف سکیموں میں
لگایا گیا روپیہ
معقول تحفظ کا ضامن ہے۔
وقت کا بہترین تحفہ
۵، ۱۰، ۵۰، ۱۰۰ اور ۱۰۰۰ روپے کی مالیت کے چھوٹی بچتوں کے تحفہ کوپن
جو
ہر ڈاکخانے سے ملتے ہیں
محکمہ تعلقاتِ عامہ، پنجاب
ڈائرکٹر سمال سیونگز، پنجاب
PRD/710

افسانہ

ایک خواب بے خواب سا

نور شاہ

دفتر ڈائریکٹر ایجوکیشن جموں (توی)

۲۴ جنوری ۱۹۶۴ء   برادرِ محترم خوشتر صاحب ! تسلیم

. . . اُردو افسانہ نے اب وہ ڈگر اپنالی ہے جہاں اظہار کی نئی راہیں تلاش کرنا ناگزیر بن گیا ہے۔ اس سلسلے میں جو نئے تجربے کئے گئے ہیں وہ بہت حد تک کامیاب رہے۔ آپ نے ہمیشہ نئے تجربوں اور نئی راہوں کا خیر مقدم کیا ہے۔ میں نے بھی اس کہانی "ایک خواب بے خواب سا" میں ایک نیا تجربہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک ہی کہانی میں دو کہانیاں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ بظاہر دونوں کا ایک دوسرے کوئی تعلق نظر نہیں آتا لیکن دونوں کا ایک دوسرے کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ دو کہانیاں دو طبقوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ایک طبقے میں پیار محض دل بہلانے کی چیز ہے اور دوسرے طبقے میں پیار نام کی چیز پر جان دینے سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا۔ پستیوں اور بلندیوں کے درمیان جو ایک خلا ہے "ایک خواب بے خواب سا" اسی خلا کی کہانی ہے۔ میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں یہ آپ ہی بتاسکیں گے ——— "مونا لزا" بے حد پسند کی گئی۔ یہ سب آپ کا خلوص ہے اور اُن لوگوں کی محبت ہے جو بیسویں صدی پڑھتے ہیں اور اپنی رائے سے نوازتے ہیں ——— تازہ شمارہ میں عبدالرحمٰن فاؔلد کا افسانہ "نیا سویرا" پڑھ کر مجھے بے ساختہ اپنا افسانہ "نلنی" یاد آگیا ———

آپ کا بھائی ——— نور شاہ

جب رات کی خاموشیاں جاگ اٹھتی ہیں اور آنگن میں کھلے پھول مستی میں جھومتے خواب کی وادیوں میں کھو جاتے ہیں تو میں گھر لوٹتا ہوں۔ اپنے کمرے کا دروازہ کھولنے پر میری نظریں بے ساختہ گلی والی کھڑکی سے جا ٹکراتی ہیں اور میں اُس کے پٹ ایسے کھول دیتا ہوں جیسے رات کی حسینہ اپنی گہری سیاہ زلفوں کی مانگ میں یادوں بھری کہانیوں کی کہکشاں سنوار رہی ہو!

یادوں بھری کہانیاں !!

یوں تو میرے کمرے کی تین کھڑکیاں ہیں لیکن جو کھڑکی گلی کی طرف کھلتی ہے مجھے اُس سے بے حد محبت ہے یہ کھڑکی میری ہمراز ہے اور اس پر لٹکے ہوئے فاختائی رنگ کے پردے کی سرسراہٹ میں میرے دل کی دھڑکنوں کی دھیمی دھیمی سی آواز بھی شامل ہے۔ لیکن آج میں یہ کھڑکی نہیں کھولنا چاہتا۔ میں تاروں بھری رات کی اس تاریکی میں اپنے دل کی دھڑکنوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سُلانا چاہتا ہوں تاکہ سامنے والے مکان سے اُبھرنے والی یہ نیم سُریلی آوازیں اُن یادوں بھری کہانیوں کو میرے سامنے نہ دُہرائیں جنہیں میں بھول جانا چاہتا ہوں۔

دودھ ہرَرو پہ تنے ملبہ
مینہ چیاؤ کل گنے بم
ژندن دانہ برن چھکہ
لالو کلبہ آلہ وے

(میں اپنا یہ سیمیں بدن دودھ میں نہلاؤں گی مجھے تیری محبت یاد آنے لگی۔ میں صندل کا پانی اپنے آپ پر چھڑکوں گی۔ اے محبوب آ، میں اپنا سر تجھ پر قربان کروں)

میں کبھی اِن گیتوں پر جان دیتا تھا اب انھیں سننا نہیں چاہتا۔ اب مجھے ان نیم سُریلی آوازوں سے نفرت ہے۔

یہ کھڑکی مجھ سے بار بار کیا پوچھ رہی ہے۔

"کھول دے یہ پٹ!"

"نہیں نہیں، آج مجھے ٹھنڈی تازہ ہوا کی ضرورت نہیں۔ آج میں اپنے بند کمرے میں گھٹ گھٹ کر مرنا چاہتا ہوں۔ میں اپنی ان ساری کہانیوں کو اپنے کمرے کی گھٹن میں دفن کرنا چاہتا ہوں تاکہ صبح کوئی نئی کہانی نہ جاگے۔ کسی نئی کہانی کا جنم نہ ہو۔ میں نئی صبح کی دلہن کو اندھیروں میں بیدار ہوتے نہیں دیکھنا چاہتا۔

اے میری ہمراز کھڑکی اُس لڑکی پر رحم کر جس کی زندگی کی ساری تمنائیں، لڑکپن کی ساری اُمنگیں، ان نیم سُریلی آوازوں میں مچل رہی ہیں لیکن جو خود نہیں جانتی اُسے کون پالکی میں بٹھا کر دور اجنبی وادیوں میں لے جا رہا ہے!

کھول دے کھڑکی، اور دیکھ اُس پار سامنے والے مکان میں شادی کے کتنے ہنگامے ہیں —— وہ دُلہن بنی بیٹھی ہے۔ سُرخ سُرخ سنہرے لبادے میں لپٹی ہوئی چھوٹی موٹی سی بنی دلہن اپنی آنکھوں میں انجانے محبوب کا تصوّر لئے اپنے دولہے کی منتظر، خوابوں کے شہزادے کے انتظار میں دودھ سے نہایا ہوا سیمیں بدن، سُرخ پھولوں اور گجروں سے سنوارا ہوا سراپا انتظار۔ شبِ عروسی کے سُرخ جوڑے کے دامن میں جوہی اور ریحاں کے کھلے ہوئے پھولوں کو پھیلائے ہوئے تصورِ جاناں کئے . . . . . !

لیکن یہ سب ایک خواب ہے۔ خواب! جو کبھی حقیقت کا رُوپ نہیں اپنا لیتے۔ کھڑکی پر لٹکے ہوئے فاختائی رنگ کے پردے میں ہلکی سی جُنبش ہوئی اور مجھے محسوس ہوا جیسے میری ساری عمر کسی اَن دیکھے خوابوں کے جزیرے میں ایک اجنبی سا خواب دیکھتے دیکھتے بیت چکی ہے۔

ایک اجنبی سا خواب!

"میں تمہارے خواب کی تعبیر ہوں پھول کی خوشبو ہوں، نغمگیت کی لے ہوں۔"

میں آواز کی مٹھاس میں کھو گیا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اپنے دل کے بجھے بجھے سے چراغ کی ٹمٹماتی لَو کو بچانے کے لئے اپنا ہی خونِ دل جلانے لگا۔

اور وہ لمحہ جب میں نے اپنے خوابوں کو صنوبر کا رُوپ اپناتے دیکھا گذر چکا ہے خواب صرف خواب ہیں اور صنوبر ایک حقیقت۔ خواب جو کبھی حقیقت نہیں بنتے صرف ایک لمحہ آتا ہے اور گذر جاتا ہے اور اُس لمحے کی یادیں ساری عمر کا روگ بن جاتی ہیں میں بھی ایک روگی ہوں اور سامنے وہ چھوٹی موٹی سی بنی دُلہن بھی ایک روگی ہے!

اُس نے سوچا تھا۔

اُس کا اپنا سجے کنوارے خوابوں کا شہزادہ بن کر آئے گا اور اس کے بہار بھرے چمن میں پھولوں کی خوشبوئیں سونگھے گا۔ اُس کے چاندی سے بدن سے کھیلے گا۔ چاندنی بن کر چھائے گا۔ اس کے دودھ میں نہائے ہوئے جسم کا لمس اُسے کندن بنا دیگا لاج اور شرم سے جُھکا ہوا سر اوپر اُٹھائے گا اور پھر . . . . !

ہر لڑکی اپنے محبوب کے بارے میں ایسا ہی سوچتی ہوگی!!

"نہیں نہیں۔"

ہر لڑکی اپنے محبوب کے بارے میں ایسا سوچتی تو کیا . . . . تو صنوبر نے میرے بارے میں ایسا کیوں نہ سوچا!!

اور اُس شام میں جھیل کے کنارے ایک انجان سی جگہ وائلن بجا رہا تھا میں بے حد اُداس تھا اور ایک ایسی دھن کی تلاش میں تھا جس میں اپنی ساری اداسیوں کو سمو سکوں، اچانک وائلن کے تار ٹوٹ گئے اور اس کے ساتھ ہی کسی کے قدموں کی چاپ جاگی۔

"آپ وائلن بہت اچھا بجاتے ہیں!"

میں نے اپنی پلکیں اُٹھا کر دیکھا۔ صندلی رنگ کا مرمریں جسم لئے ایک لڑکی تھی اور اُسے دیکھ کر مجھے محسوس ہوا جیسے میں ایک روح ہوں جو ازل سے ایسی ہی خوبصورتی کی تلاش میں اُداس ہو گئی تھی۔ وہ واپس مُڑ گئی۔ ایک ہری بھری پُشت پر پیچھے چلتے چلتے سپید رنگ کا ریشمی فراک بے حد چُست ہو گیا تھا اور اُس پر سنہرے بالوں کے دو لمبے لمبے لٹ لہرا رہے تھے۔ مجھے اپنا سارا وجود بالوں کی گھٹاؤں میں گھرا محسوس ہوا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میرا سارا وجود گھٹاؤں میں تحلیل ہو کر اب پانی بن کر جھیل کی تہہ میں گم ہو جائے گا۔

میں نے اپنی پلکیں جھکا لیں!

وہ اپنی سیاہ رنگ کی فیٹ کار میں بیٹھ کر چلی گئی لیکن درمیان میں ایک ایسی لکیر اُبھر آئی کہ میں رات گئے تک سوچتا رہا کیا یہ لکیر کبھی مٹے گی۔

گھر آیا اور وائلن کے تار ٹھیک کرنے لگا۔ مجھے وقت کا کوئی احساس نہ رہا۔ ذہن میں ایک ہی جملہ بار بار گونج رہا تھا۔ آپ وائلن بہت اچھا بجاتے ہیں۔ دل کے کسی گوشے میں ایک ہی سراپا گدگدی کر رہا تھا . . . . صندلی رنگ کا مرمریں جسم، دفعتاً مجھے محسوس ہوا کہ کمرے کی کھڑکی بند ہے۔ میں نے اُٹھ کر کھڑکی کے پٹ آہستہ سے کھول دیئے اور سامنے گلی میں حسبِ معمول دو سائے دیکھے۔ مجھے پہچاننے میں کوئی دیر نہ لگی۔

ایک سایہ فتحے کا تھا۔

دوسرا سایہ سلمیٰ کا تھا۔

پھر دیکھتے دیکھتے ایک تیسرا سایہ نمودار ہوا۔ اس نے سلمیٰ کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا اور اُسے گھسیٹ کر لے گیا جیسے سلمیٰ لڑکی نہ ہو چاول کی بوری ہو۔

یہ تیسرا سایہ جو ابھی ابھی نمودار ہوا تھا احمد الدین کا تھا۔ احمد الدین جو سلمیٰ کا باپ ہے۔

ولائیمانے پوشے مدنو

(میرے پھولوں کے متوالے ساجن آجا)

"اب تو کھڑکی کھول دے۔"

"نہیں۔ نہیں۔"

"دیکھو تو ابھی گھر لوٹا ہے تمہارے آتے ہی پھولوں کو خواب آنے لگے ہیں اور یہ پھول تمہاری زندگی ہیں۔ یہ تمہیں سکون بخشتے ہیں ان کی خوشبو سے تمہارے تھکے ماندے لمحے معطر ہوتے ہیں۔"

سکون . . . . کتنا خوبصورت لفظ ہے جب زندگی میں سکون ہی نہ ہو تو یہ خوبصورت لفظ دہرانے سے کیا فائدہ، جب ساری زندگی تھکے ماندے لمحوں سے بھرپور ہو تو یہ خوشبو کس کام کی . . . . . یہ رنگ برنگے پھول اور ان سے آنے والی خوشبو بھی دراصل ہمارے لئے وہ خواب ہیں جو بڑی بڑی کوٹھیوں میں تیجے سنورے کیاریوں میں اگتے ہیں اور ایک ایسی ہی کوٹھی میں صنوبر بھی رہتی ہے۔

"میں نے اس لڑکی کو کئی بار دیکھا ہے"، میرے ایک دوست نے مجھ سے کہا ــــ "ہاں ہاں وہی بقول تمہارے صندلی رنگ کی مرمریں بم والی لڑکی، جانتے ہو کس کی بیٹی ہے کہاں رہتی ہے کہاں جاتی ہے۔"

"جانتا تو تم سے کیوں پوچھتا۔"

"اس کا نام صنوبر ہے۔ وہ اے۔ آر۔ خان کی بیٹی ہے اور جھیل ہی کے کنارے سرکاری کوٹھی میں رہتی ہے۔"

"اے۔ آر۔ خان، وہ آئی۔ سی۔ ایس۔ جو . . . . !"

"جی ہاں ــــ بڑی ماڈرن قسم کی لڑکی ہے خالص ترقی پسند، ہر شام کو ہوٹل کیپری آتی ہے۔"

دیکھتے دیکھتے وہ تیسرا سایہ بھی غائب ہو گیا۔ اس رات میں نے ایک سپنا دیکھا، بس وہی سپنا ــــ میں جھیل کے کنارے وائلن بجا رہا ہوں اور صنوبر مست ہرنی کی طرح وائلن کی دھنوں پر تھرک رہی ہے۔

"یہ تمہیں دیر تک سونے کی کیا عادت پڑ گئی ہے۔"

سپنا ٹوٹ گیا۔ بھابی کی آواز تھی۔

"تم کیا جانو بھابی، میں تو ساری عمر سوتے سوتے گذارنا چاہتا ہوں تاکہ ایک شپنا دیکھ سکوں۔"

بات ہونٹوں سے باہر نہ آسکی۔ بھابی میرے قریب آئی اور رازدارانہ لہجے میں کہا۔

"تم نے کچھ سنا بابر۔"

"کیا ــ؟"

"یہ جو سلمیٰ ہے نا، سامنے والے مکان کی، کل وہ پکڑی گئی۔"

"کیا مطلب؟"

"شمیم کے ساتھ گلی میں نہ جانے کیا کر رہی تھی، باپ کو شک تھا ہی وہ جاگتا رہا اور پکڑ لیا۔"

"میں جانتا ہوں۔"

"تم کیسے جانتے ہو۔ تمہارے بھیا کہہ رہے تھے کہ احمد الدین نے سلمیٰ کو اتنا پیٹا ہے کہ اس کے سارے جسم پر داغ پڑ گئے ہیں بیچارے احمد الدین کی عزت مٹی میں مل گئی۔"

"کیسے؟"

"تم کیوں ناسمجھ بن رہے ہو بابر۔ رات کا وقت، لڑکے لڑکی کا ملنا اور وہ بھی گلی میں، تم . . . .!"

"بھابی" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "بھابی یہ سب جھوٹ ہے وہ ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔ پیار کرنا جرم نہیں۔ میں تمہاری قسم کھا کر کہتا ہوں بھابی۔ ان کی محبت پاک ہے۔"

"تم کیسے جانتے ہو؟"

"میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ کئی بار دیکھا ہے ان کی باتیں بھی سنی ہیں۔ شمیم اچھا لڑکا ہے، تم بھیا سے کہو کہ وہ احمد الدین سے شمیم اور سلمیٰ کی شادی کی بات کریں۔"

کیسی عجیب بات ہے، کیسی عجیب دنیا ہے، کیسے عجیب لوگ ہیں۔ یہاں گلی میں ملنے والے دو پریمیوں کا مقدس اور پاکیزہ پیار رسوا ہو جاتا ہے اور وہاں فرش مرمر پر ملنے والوں کے گناہ اور ثواب کی حدیں ختم ہو جاتی ہیں۔

"ویٹر"

"سر"

"ایک بلیک اینڈ وائٹ۔"

"ایک جم خانہ بیئر"

"دو بلیک کافی۔"

میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اچانک زندگی کے آثار ایک ساتھ جاگ پڑے۔ آرکسٹرا پر کوئی سہانی دھن چھڑ گئی تھی اور فرش مرمر پر جواں جسم ناچ رہے تھے۔

"تم کہاں ہو، تمہاری وہ آواز کس ساز میں ڈوب گئی جس کے سہارے

[illegible] سمجھنا چاہتا تھا۔"

کوئی آرڈر نہیں!

میں نے ایک سگریٹ سلگایا اور پھر شراب کے جام میں بہتی دُنیا کو دیکھا ——— دروازے سے ابھی ابھی داخل ہونے والی صنوبر گوشے والی میز پر ایسی بیٹھی تھی جیسے سنگ مرمر کے حوض میں گل دوپہرکا پھول کھلا ہو — بے داغ پھول!!

"ویٹر"

"مادام"

"کافی لے آؤ"

اور مجھے جناب بلیک اینڈ وائٹ چاہیئے، نہ جم خانہ بیئر۔ میرے دل کی نواب بُجھ چکی ہے۔ ہوسکے تو میرے خواب لوٹا دو۔

یہاں کی دنیا جاگ رہی ہے اور باہر کی دنیا سو رہی ہے ایک ہے جو سنگ مرمر کے محل میں موتیوں کی مالا پرو رہی ہے۔ ایک وہ ہے جو آنسوؤں کی مالا پرو رہی ہوگی۔

صنوبر — !

سلمیٰ — !!

کنول کا پھول پانی میں اُگتا ہے اور پانی میں رہتا ہے۔ صنوبر سلمیٰ کی بات کیا جانے!

"صاحب، وہ میم صاحبہ آپ کو یاد کرتی ہیں"

"مجھے!"

"جی ہاں"

میں نے بے ساختہ صنوبر کی طرف دیکھا۔ وہ مُسکرا رہی تھی۔

"معاف کیجئے میں نے آپ کو پہلے نہیں دیکھا"

میں خاموش رہا۔

"ویٹر، ایک اور کافی"

کافی آئی اس نے پھر وہی پُرانی بات چھیڑی۔

"وائلن آپ بہت اچھا بجاتے ہیں"

"کوشش کرتا ہوں"

"جی نہیں ——— میں تو اُس شام بے ہوش ہوتے ہوتے رہ گئی"

"شکر ہے کہ وائلن کے تار ٹوٹ گئے تھے ورنہ آپ شاید واقعی . . . . !"

وہ مُسکرا دی اور میں نے جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیا۔

کافی پینے کے بعد وہ چلنے لگی۔

"آپ ابھی ٹھیریں گے کیا"

"جی نہیں میں بھی جانا چاہتا ہوں"

ہم باہر آگئے۔ وہی سیاہ رنگ کی کار اُس کی منتظر تھی۔

"آپ کو کہاں جانا ہے؟"

"جھیل کے کنارے"

"وائلن بجانے؟"

"نہیں اُسی کے کنارے رہتا ہوں"

"تو آئیے وہاں تک میں آپ کا ساتھ دوں گی"

"اور اس کے بعد ——" بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

وہ مُسکرا دی اور پھر میری طرف ایسے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو ——— تیرا میرا تو جنم جنم کا ساتھ ہے، میں تو ازل سے تمہاری تلاش میں بھٹک رہی ہوں۔ میں تو تمہارے سنگیت کی لے ہوں، ساز کی آواز ہوں، تمہارے وائلن کا نغمہ ہوں، میں . . . . . !

اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

من میں کچھ ایسی بے قراری تھی کہ میں ساری رات سو نہ سکا

زعفران اور کستوری سے نہلائے ہوئے جسم کا بھی کہیں سودا ہو سکتا ہے۔ اس جسم کی تو پوجا کی جاتی ہے۔ من کے مندر، لیکن من ہو تو؟

"کس کا"

"سلمیٰ کے باپ کا"

"جس نے سلمیٰ جیسی لڑکی کو جنم دیا کیا اُس کا کوئی من نہیں"

"نہیں"

"تم کیسے جانتے ہو"

"اُس کا من ہوتا تو وہ اپنی بیٹی کا سودا نہ کرتا"

"سودا! یہ تم کیا کہہ رہے ہو بابر؟"

"بھیا میں ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں۔ من نام ہے ضمیر کا، محبت کا، شرافت کا، اور احمد الدین کے پاس ان میں سے کوئی شے نہیں۔ وہ بھوکا ہے"

"ضمیر، شرافت اور محبت کا؟"

"نہیں"

"پھر —؟"

"وہ پیٹ کا بھوکا ہے اور یہ بھوک سلمیٰ کی شادی کرنے سے مٹ سکتی ہے۔

مقصد جانتا ہے کہ اس کی سلمیٰ شبنم کے قطروں کی طرح پاک ہے اور شفیق اُسے
دل کی گہرائی سے پیار کرتا ہے۔ لیکن . . . . !"
"لیکن کیا ۔۔ ؟"
"شفیق غریب ہے اور احمد الدین کو روپیوں کی ضرورت ہے تاکہ وہ اپنی
گنی گندی سا کھ پھر حاصل کر سکے اور اس کے لئے وہ سلمیٰ . . . . !"
"بابو ۔"
"ہاں بھیا در اصل اس کا بھی کوئی قصور نہیں، ہم سب کو اچھے مکان،
اچھے کپڑوں اور اچھے کھانے کی ضرورت ہے اور اپنی ایک ضرورت کے لئے ہم دوسروں
کی آتماؤں کو فروخت کرتے ہیں۔ دلوں اور خیالوں کو بیچ ڈالتے ہیں۔"

لمحے تستے ہیں اور گذر جاتے ہیں !
"کل ہمارے ہاں نئے سال کی پارٹی ہے۔ آپ بھی آئیے گا" صنوبر
نے بلیک کافی کا ایک گھونٹ پینے کے بعد کہا۔
"میں ۔۔؟"
"ہاں ہاں آپ تو ایسے کھوئے رہتے ہیں جیسے جاگتے میں بھی سو رہے ہوں۔"
"آج کل میں صرف سونا چاہتا ہوں۔"
"کیوں ۔۔۔۔ ؟"
"سوتے سوتے ایک خواب دیکھنا چاہتا ہوں کہ میں جھیل کے کنارے . . .!"
اُس نے میری بات کاٹ دی
"اپنا وائلن بھی ساتھ لیتے آنا !"
سنگ مرمر کا ہوٹل ہو یا گلابی رنگ کا ڈرائنگ روم، ایک جیسی دنیا ہے۔
ایک جیسا ماحول ہے، ایک جیسی باتیں ہیں اور ایک جیسے لوگ ہیں۔ وہاں بھی
شراب کے جام میں دنیا بنتی ہے اور یہاں بھی ۔۔۔۔۔ بس فرق اتنا ہے کہ وہاں
بڑے لوگ نقلی چہرے لگا کر آتے ہیں اور کلچر کی باتیں کرتے ہیں۔ یہاں نقلی چہرے
اُتر جاتے ہیں اور اصلی کلچر وجود میں آتا ہے۔ عجیب سی دنیا تھی، بہکے بہکے لوگ،
ان لوگوں کی بہکی بہکی بیویاں، اور ایسی ہی دنیا میں صنوبر بھی تھی۔ اس کی آنکھوں
میں عجیب سی مستی تھی، عجیب سی بے قراری تھی۔
ٹِک ٹِک ٹِک ۔۔ گھڑی نے بارہ بجا دیئے !

Happy new year to you

Happy new year to you

ملی جلی آوازیں ایک ساتھ فضا میں گونجیں اور اس کے ساتھ ہی ساری
روشنیاں بجھ گئیں۔ صرف سانسوں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے اسی تاریکی میں
سانسوں کے اسی مدوجزر میں اپنا وائلن اٹھایا اور ایک دھن چھیڑ دی۔

جب جواں دل دھڑکتے ہیں۔
تارے لرزتے ہیں۔
رات نکھر جاتی ہے
محبت کا دیوتا ہنستا ہے
اور فرشتے دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں
کاش معصوم فرشتے بھی محبت کر سکتے ۔۔!

دفعتاً بجلی کے قمقموں میں روشنی لوٹ آئی اور میں نے صنوبر کو ایک نوجوان
کی آغوش میں دیکھا۔ میرے وائلن کے تار ٹوٹ گئے۔ میرا ہاتھ بُری طرح زخمی ہو گیا
میری انگلیوں سے خون بہنے لگا۔
بستر پر لیٹے لیٹے میں نے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا اور سوچا ۔۔۔۔۔ وائلن
کے تار ٹوٹ جاتے ہیں تو انہیں پھر جوڑا جا سکتا ہے۔ دل کے تار ٹوٹ جاتے ہیں
تو انہیں کیوں جوڑا نہیں جا سکتا ؟ !
کچھ دن بعد میرا ہاتھ ٹھیک ہو گیا لیکن ڈاکٹر نے کہا اب یہ انگلیاں کبھی وائلن
کے تاروں کو نہ چھیڑ سکیں گی۔ وہ نغمہ تو ڈوب چکا تھا جو دلوں کو ملاتا ہے !

یہ ابھی ابھی میرے گھر آنے سے پہلے کی بات ہے۔ صنوبر کے ہاں آج بھی
پارٹی تھی۔ اس کے باپ لے۔ آر۔ خان آئی۔ اے۔ ایس نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"آج کی یہ پارٹی صنوبر اور شفیق کی شادی کے سلسلے کی ابتداء ہے۔ میں
اب ریٹائرڈ ہو چکا ہوں۔ شفیق کو آپ جانتے ہی ہیں خواجہ عبدالصمد کے اکلوتے
بیٹے ہیں لاکھوں کی جائداد ہے لاکھوں کے کاروبار ہیں اور مجھے اس ملاپ پر مسرت
ہو رہی ہے۔"
"آپ کا وائلن کہاں ہے ؟" صنوبر نے میرے قریب آکر کہا۔
"میرے وائلن کے تار ٹوٹ چکے ہیں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔"
"وہ وائلن مجھے دیجئے نا۔"
"آپ کو دیدوں تو میرے پاس کیا رہے گا ؟"
"عجیب فلسفہ ہے" شفیق نے کہا "آؤ ڈارلنگ اب ہم مل کر اپنے دل کے
وائلن پر ایک نئے نغمے کی تخلیق کریں گے۔"
"نہیں شفیق مجھے وائلن چاہیے۔"
"بس وائلن ہی چاہیئے نا کل ایک درجن لے آؤں گا۔"

"مجھے صرف بابر کا وائلن چاہیئے"

"تو لو نا اُس کی قیمت دیں گے"

مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے صنوبر کی طرف دیکھا اور کہا۔

"شفیق صاحب، آپ ہر چیز پیسے سے خریدنے کے عادی ہیں۔ پیسوں سے بڑھ کر بھی کوئی چیز ہوتی ہے"

"کوئی چیز نہیں۔ میں تمہارا وائلن خریدنا چاہتا ہوں، کتنی قیمت چاہتے ہو؟ ہزار ___ دو ہزار ___ چار ہزار ___ دس ہزار . . . . !!"

اور وہ صنوبر کی باہوں میں باہیں ڈال کر چلا گیا

وَلو میانے یوشئے مَدنو

(میرے پھولوں کے متوالے ساجن آجا)

اور سلمیٰ بک گئی!

تصدیق کی جاتی ہے کہ محمد مشتاق نے جس کی شادی سلمیٰ دختر احمدالدین کے ساتھ طے ہوئی ہے مبلغ چھ ہزار روپے نقد اپنے سسر کو دیئے ہیں اور ہر مہینے مبلغ یک صد روپیہ دیتا رہے گا۔

یہ تحریر مجھ سے سُنی جاتی ہے۔

"محمد مشتاق آپ کو منظور ہے؟"

"منظور!"

"اور سلمیٰ بی بی ___؟"

"کوئی آواز نہیں ___!"

"اور سلمیٰ بی بی یہ شادی تمہیں منظور ہے۔؟"

"نہیں ___"

ایک دھیمی سی آواز آئی پردے میں ایک ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی اور اُس کے ساتھ ہی ایک ہنگامہ ہوا۔

میں جب احمدالدین کے مکان میں پہنچا تو وہاں ایک خاصا ہنگامہ تھا۔ سلمیٰ بے تحاشا رو رہی تھی۔ احمدالدین غصہ سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔

"یہ شادی نہیں رُک سکتی! لڑکی ہاں کرے یا نا، میں اُن سے روپے لے چکا ہوں۔ چھ ہزار ___ چھ ہزار ___ شادی ہوگی اور ابھی ہوگی! سلمیٰ کی شادی صرف مشتاق کے ساتھ ہوگی! شیمے کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ بے وقوف لڑکی ہے محبت کرتی ہے سمجھ جائے گی۔"

"ٹھیرو ___!" میں چلا اُٹھا، ایک لمحے کے لئے سارے مکان میں سکوت چھا گیا!

"سلمیٰ کی شادی مشتاق سے نہیں ہو سکتی۔ سلمیٰ کی شادی شیمے سے ہوگی اور احمدالدین تم روپیہ لوٹا دو اگر تم روپیہ لینا ہی چاہتے ہو میں تمہیں شیمے کی طرف سے چھ ہزار روپیہ دینے کے لئے تیار ہوں ___!"

"تم یہ روپیہ کہاں سے لے آؤ گے بابر ___؟" میری بھابی کی آواز تھی!

"میں اپنا وائلن بیچ ڈالوں گا ___ مجھے صرف ایک رات کی مہلت چاہیئے؟"

میں نے اب اپنے کمرے کی کھڑکی کھول دی ہے۔ احمدالدین کے مکان میں اب کوئی ہنگامہ نہیں۔ صرف دو نیلی آنکھیں گلی میں جھانکتی نظر آ رہی ہیں۔ سلمیٰ کی آنکھیں ہیں جنہیں شیمے کا انتظار ہے۔

وَلو میانے یوشئے مَدنو

(میرے پھولوں کے متوالے ساجن آجا)

عابد مناوری

یوں تو ہونے کو ہر اِک شب کی سحر ہوتی ہے
اِک شبِ ہجر ہی مشکل سے بسر ہوتی ہے

آتے آتے دلِ مضطر کو قرار آتا ہے
ہوتے ہوتے ہی شبِ غم کی سحر ہوتی ہے

یہ الگ بات ہے وہ کچھ بھی زباں سے نہ کہیں!
آنکھوں آنکھوں میں ہر اِک بات مگر ہوتی ہے

اور بڑھ جاتی ہے بےتابیٔ دل اے عابد
اُن کی تحریر جو فردوسِ نظر ہوتی ہے

نند لال پروانہ بی۔ اے

ہم ہیں غم سے نڈھال اے ساقی
جام و مینا سنبھال اے ساقی

ہم بھی پیاسے ہیں ایک مدت سے
اِس طرف بھی خیال اے ساقی

تیرے ہر جام میں جھلکتا ہے
میرا رنگِ خیال اے ساقی

ڈگمگانے لگا ہے پروانہ
جلد اِس کو سنبھال اے ساقی

آزاد گورداسپوری بی۔ اے

دل میں جتنے چاک تھے چاکِ گریباں ہو گئے
اے جنوں خوش ہو مرے جینے کے ساماں ہو گئے

میری بربادی تو شاید اقتضائے وقت تھی
بندہ پرور آپ کیوں ناحق پریشاں ہو گئے

کام آئے کس حسیں انداز سے آنسو مرے
زینتِ مژگاں بنے یا زیبِ داماں ہو گئے

بزمِ عشرت کی تمنا خوش دلی کچھ آرزو
زندگی کے خواب جتنے تھے پریشاں ہو گئے

اختر نظمی

زندگی شمعِ آرزو دل میں
خود جلاتی ہے، خود بجھاتی ہے

جس پہ انساں کا اختیار نہیں
وہ زمانے کی بے ثباتی ہے

نااُمیدی کے خارزاروں میں
زندگی راستہ بناتی ہے

گوری مرسرائزڈ ویکس
چہرے کی خوبصورتی کے لئے

جیکم کاسمٹکس

ہر جگہ ملتی ہے

ANTI CONCEPTO

FOR BIRTH CONTROL

اولاد کی پیدائش آپ کے اختیار میں۔ جب چاہیں روک لیں

اینٹی کینسپٹو کے استعمال سے اولاد کی پیدائش آپ کے اختیار میں ہو جائے گی۔ اور جب چاہیں گے اولاد پیدا ہو گی اور جب چاہیں گے اولاد نہ ہو گی۔ کمزور عورتوں کے لئے ہر سال بچے کی پیدائش بہت خطرناک ہوتی ہے اور ویسے بھی کثرتِ اولاد موجودہ زمانے میں ایک بہت مصیبت ہے۔ اینٹی کینسپٹو کے استعمال سے صحت پر بُرا اثر نہیں پڑتا۔ نہایت بے ضرر اور مُفید دوا ہے۔ کسی قسم کے نقصان کا اندیشہ نہیں۔ ہزارہا معززین معقولانہ استعمال کرتے ہیں۔ یہ دوا بیش قیمت اجزائے سائنٹیفک اُصولوں پر تیار کی گئی ہے۔ بہت بھروسے کی چیز ہے قیمت فی شیشی صرف پانچ روپے

ریڈیم کیمیکل ورکس پرائیویٹ لمیٹڈ۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۳۵۱ دہلی نمبر ۶

افسانہ

نہ ستائش کی تمنّا نہ صلے کی پروا

ڈاکٹر ایش کمار ایم۔ اے

شعبہ انگریزی، پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ

۹ جنوری ۱۹۶۴ء

مکرمی تسلیم

ایک افسانہ "نہ ستائش کی تمنّا نہ صلے کی پروا" ارسالِ خدمت ہے جو ایک فنکار کے آخری افسانے کی کہانی ہے۔ یہ سُریندر ہی کے آخری افسانے کی کہانی نہیں ہے۔ ایسے بہت سے فنکاروں کی کہانی ہے، جو شخصیت پرستی کے باعث قبولِ عام کی سند نہیں پا سکے۔ جن کی تخلیقات کا بھی انجام ہوتا ہے، جو سُریندر کے آخری افسانے کا ہوا۔ اور جو اپنی کاوش کا یہی انجام دیکھ کر یہ احساس کی تلخی کم کرنے کے لئے سُریندر کی طرح گنگنانے لگتے ہیں "نہ ستائش کی تمنّا نہ صلے کی پروا"....

مخلص ——— ایش کمار

گاڑی کانپور سنٹرل سے چل پڑی، لیکن شور و غل اُسی طرح جاری تھا۔ کسی کا تھیلا گم تھا۔ کسی کا بستر گم تھا۔ کسی کے چوٹ آئی تھی۔ جون کا مہینہ دوپہر کا وقت۔ جس ڈبے میں چالیس کی گنجائش تھی۔ وہاں اسّی سے زیادہ مسافر بھر چکے تھے۔ کچھ باہر کھڑکیوں سے لٹکے ہوئے تھے۔ سریش ایک کونے میں بیٹھا یہ نظارہ دیکھ رہا تھا۔

سریش اُردو کا ایک افسانہ نگار تھا۔ اور اُردو افسانہ نگاروں کی طرح غریب۔ افسانے پڑھے تو بہت جاتے ہیں۔ خریدے نہیں جاتے۔ اُدھار یا کرایہ پر ہی لئے جاتے ہیں۔ دکاندار کماتا ہے۔ مصنف کے پلّے کچھ نہیں پڑتا۔ نظمیں پڑھی یا بھی تو کم جاتی ہیں۔ لیکن خریدی بہت جاتی ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ سریش اکثر سوچا کرتا وہ کیوں نہ شعر کہنا شروع کر دے۔ حال ہی میں اُس نے ٹیگور کی دو ایک نظموں کا ترجمہ کیا تھا۔ جنہیں بہت پسند کیا گیا۔ آج اُسے خیال آ رہا تھا کہ وہ ایک نئی قسم کا شاعر، ایک نیا ورڈز ورتھ بنے گا۔ جو اُردو شاعری کو دقیانوسی تشبیہوں اور پُرانی اصطلاحوں کی زنجیروں سے آزاد کر دے گا۔ اُردو نما فارسی کے بجائے وہ عام لوگوں کی زبان میں، عام لوگوں کے خیالات۔ جذبات اور احساسات کی ترجمانی کرے گا۔

سریش مسافروں کی طرف متوجہ ہوا تاکہ اپنی آئندہ نظموں کے لئے مواد ڈھونڈے۔ اُس کے قریب ہی ایک سادھو مہاتما براجمان تھے۔ جٹا دھاری، جسم ننگا، اور بھسم لگی ہوئی۔ چہرے پر داڑھی کی تین تہیں اور ماتھے پر تین لکیروں کا تلک۔ آنکھیں لال سُرخ، مگر تیز۔ باہر سے معلوم ہوتا تھا کہ بے خبر ہیں۔ اور اپنے ماحول سے بے پروا کہیں دور اپنے خیالات میں کھوئے ہیں۔

لیکن پھر بھی گرد و پیش کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ کمر میں صرف لنگوٹ، ہاتھ میں لوٹا، چمٹا۔ سریش کو سادھوؤں سے ویسے ہی اُنس تھا، شاعرانہ اُنس۔ فنکارانہ اُنس۔ کبھی کبھی ایک چائے کی پیالی دے کر گھنٹوں اُن سے باتیں کیا کرتا۔ پانچ چھ سال ہوئے، بدری ناتھ کی یاترا پر جاتے ہوئے اُس نے رشی کیش سے موہن چٹی تک سارا دن ایک ہی سادھو کے ساتھ گزارا اور موہن چٹی پہنچ کر جب اُس نے آٹا دال کے لئے سادھو کو ایک روپیہ دیا اور سادھو کھانا بنانے میں مشغول ہو گیا تو اُس نے بیٹھ کر ایک افسانہ لکھا "سادھو کی جھولی!" اُسے خوب یاد تھا، وہ سفر۔ جون ہی کا مہینہ تھا۔ آج وہ افسانہ نہیں لکھے گا۔ آج وہ اپنی پہلی نظم لکھے گا، جس کا عنوان ہوگا، "جٹا دھاری سادھو" وہ اُسے غور سے دیکھنے لگا۔

ساتھ بیٹھے ہوئے ایک مسافر نے پوچھا "مہاراج آپ کہاں سے آ رہے ہیں کدھر جائیں گے؟ کہاں استھان ہے آپ کا؟"

سوچا کہ اِن سوالوں کی بوچھاڑ کا کیا جواب دے۔ کلکتہ سے سریش کے ساتھ ہی سوار ہوا تھا۔ سارا راستہ کچھ نہیں بولا۔ دو ایک اسٹیشنوں پہ گاڑی سے اُترا، لیکن اصرار کے باوجود کسی بھگت نے چائے نہیں پلائی خیال آیا، شاید اسی طرح چائے مل جائے۔ بولا، "استھان کہاں ہے بھگت جی۔ جہاں پڑ رہے، استھان ہو گیا ——— سادھوؤں کا کوئی گھر نہیں ہوتا۔ سنسار مایا ہے۔ جگت متھیا۔"

...ہو گیا۔

... اور ایک بھگت جی۔ آٹھ دس دن اُن کے ہاں ٹھہریں ... دس بارہ بار بدری ناتھ ہو آئے ہیں مگر جی نہیں بھرتا ... میری ... بھیا!"

... میں سادھو مہاتما نے اپنا تھیلا کھولا تاکہ چلم سُلگائے۔ چلم بھرتے وقت انسان ... نکلی۔ بھگت جی کا بچہ سہم کر چیخ اُٹھا۔ ساتھ بیٹھے مسافر بھی سہم گئے۔ جب پوچھا ... بھیا، "یہی تو ہمارے پاس ہے۔ اور رہ ہی کیا؟ اس طرح کی تین کھوپڑیاں ہمارے تھیلے میں ہیں۔ ان کھوپڑیوں پر ہی دھیان کے لئے ہم اپنا آسن جماتے ہیں۔ شیو کے ... ۔ موت کا ہر وقت خیال رہتا ہے۔ دھیان خوب لگتا ہے۔ جگت بھیا!"

بھگت جی کے بچے نے کھانا مانگا اور جب اُس کی ماں نے گٹھری کھولی تو ... نے سادھو سے رسمی طور پر پوچھا

"مہاراج آپ بھی کھائیں گے؟"

اِسی کا تو انتظار تھا۔ بولے "ہاں، دو چار روٹی ... گے۔ راستے کچھ نہیں کھایا۔"

بھگت جی نے اپنا اور اپنی بیوی کا حصہ اُن کے ... کر دیا۔ پاس سے ایک من چلا نوجوان بول اُٹھا، ... بھیا!"

سب ہنس پڑے۔

سریش یہ نظارہ دیکھتا رہا۔ اُس کے دل میں ہیجان تھا۔ ... اُس کے شاعر بننے کا یہ پہلا موقع نہ ہوتا تو غالباً فی البدیہہ ہی ... نظم ٹپک پڑتی۔

سریش نے دوسرے مسافروں کی طرف نظر دوڑائی۔ سامنے ... لائے ہوئے ایک سیٹھ جی بیٹھے تھے، جنہوں نے مغل سرائے کے اسٹیشن پر ... التجا کی تھی، "او بھیا، رام کے واسطے مجھے اندر لے لو۔ مجھے یہیں الہ آباد تک ... ہے" اور جب اُنہیں دو ایک شریف مسافروں کے کہنے پر بہت مشکل سے ... جگہ مل گیا تو پوچھنے لگے، "گاڑی دہلی کس وقت پہنچے گی؟" سارے مسافر ہنس پڑے ... دوسری نظم کا عنوان ہوگا۔ "سیٹھ جی۔"

سریش نے پھر دیکھا۔ ایک کونے میں ایک خان جسے اپنے سے زیادہ اپنی ... کے لئے جگہ درکار تھی، دبکا کھڑا تھا۔ وہ بھی وقت تھا کہ پٹھان کو دیکھتے ہی اکثر ... چھوڑ کر چلے جاتے تھے، لیکن آج اُس نے اپنی جگہ اس لئے چھوڑ دی تھی کہ ... اپنے بچے کو سُلا سکے۔ اُس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں ... ہمدردی۔

تلی۔ اِسی تاک میں رہتا کہ کسی نہ کسی طرح لوگوں کی مدد کرے۔ کسی کا ٹرنک اوپر سامان رکھنے والے تختے پر رکھتا۔ کسی کو اندر آنے میں مدد دیتا۔ کسی کے لئے خوانچے والے کو بلاتا۔ سریش کی تیسری نظم ہو گئی۔ "کابلی والا۔"

اُس نے سوچا، شاعر ہمیشہ پہاڑ اور سمندر، حسن اور عشق، پھول اور وصال ہی پر کیوں نظمیں لکھتے ہیں؟ کیا وہ تیسرے درجے کے ڈبے میں سفر نہیں کرتے؟ غالب بیچارے کے وقتوں میں ریل گاڑی تو نہیں تھی۔ لیکن کن مشکلات سے بہلی کے لئے دہلی سے کلکتہ تک سفر طے کیا۔ اور ویسے بھی اُس کے لئے "قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں۔" شاعری افلاس و ناداری ہی میں تو پرورش پاتی ہے۔ مایوسی اور محرومی کے تھپیڑے ہی اسے جگاتے ہیں۔ سیلِ حوادث اس کے لئے مکتب ہے۔ وہی ہونٹ گاتے ہیں۔ جو چومنے سے محروم رہتے ہیں۔ "مُرغی ہے میری طبع تو ہوتی ہے رواں اور!" سریش کے دل میں طرح طرح کے خیالات موجزن تھے۔ کیا ہوا وہ غریب ہے؟ غالب بھی تو غریب تھا۔ لیکن بدقسمتی سے غالب کے بعد اردو کے شعرا یا تو "سر" بن گئے، یا خان بہادر ہو گئے، یا رسالوں کے ایڈیٹر!

سریش پھر دیکھنے لگا۔ کھڑکی کے پاس ایک نوجوان بیٹھا تھا، جو وردی میں تو نہیں تھا لیکن بول چال وضع قطع سے پولیس کا سپاہی معلوم ہوتا تھا اور شاید چھٹی پر گھر جا رہا تھا۔ ساری رات وہ صرف اِس لئے نہیں سویا تھا کہ کہیں زیادہ مسافر اندر نہ گھس آئیں۔ بار بار ہجوم کھڑکی تک آتا اور بار بار وہ اپنے بازو یا زبان کی قوت سے اُسے پیچھے دھکیل دیتا۔ کچھ من چلے اُس کا مقابلہ کرتے اور کچھ ریل پیل کے بعد اندر گھسنے میں کامیاب ہو جاتے۔ دونوں طرف سے کچھ گرما گرمی ہوتی۔ پُر تپاک فقرے کسے جاتے اور جونہی ہر نیا مسافر اپنا بستر کسی کے سر کے اوپر یا پاؤں کے نیچے دھکیل دیتا۔ اُس کانسٹبل کا مددگار بن جاتا۔ ہر اسٹیشن پر وہ کھانے کے لئے کچھ دے دیتا۔ شربت کا گلاس چکھ کر لوٹا دیتا کہ اس میں سکرین ہے۔ وہ نہیں پیئے گا۔ سگریٹ کی ڈبیا لے کر کہہ دیتا، پیسے اس نے دے دئے ہیں۔ کچھ کسر رہتی تو گالیوں سے پوری کر لیتا۔ سریش نے سوچا اس کی بہترین نظم ہوگی۔ "ایک کانسٹبل کا سفر۔"

گاڑی چالیس پینتالیس میل کی رفتار سے جا رہی تھی، لیکن سریش کا دماغ اس سے کئی گنا زیادہ تیز۔ بے ساختہ اُس کے منہ سے ایک مصرع نکلا:

"وہ آدمی ہی کیا جو مصیبت نہ سہہ سکے!"

- ہمت سے زندگی بنتی ہے اور بے دلی سے موت (ٹیگور)
- خدایا آنکھ تجھے نہیں دیکھ سکتی حالاں کہ تو ہر آنکھ کی پتلی ہے۔ (ٹیگور)
- سب سے خوبصورت چیز انسان کا ارادہ ہے۔ (طلائی ادب)
- غصے کے غلبے میں انسان حق بجانب نہیں رہ سکتا۔ (چینی دانشور)
- جسے ایک بار سانپ نے ڈسا وہ برسوں رسی سے ڈرتا ہے۔ (چینی مفکر)
- اُس خوشی سے بھاگو جو غم کا کانٹا بن کر بلائے جان ہو جائے (ہربرٹ اسپنسر)

کتنا سادہ مصرعہ تھا لیکن کتنا رنگین۔ عام لوگوں کا خیال ہے کہ اُردو شعر کہنا ہی کیا؟ غزل کہنی ہو یا نظم، اُردو تو اب ایک بازاری زبان ہے۔ مصرعہ بے ساختہ نکلا لیکن تھا تیسرے درجے کا۔ ایک ہی مصرعہ سے غزل شروع کرنے کے لئے مصرعہ تو آ ہی گیا۔ لیکن اُردو زبان کا شاعر بننا کیا آسان بات ہے۔ سب سے پہلی مشکل تو تخلص ڈھونڈنا ہے۔ پچھلے کئی دنوں سے سریش تخلص کی تلاش میں سرگرداں رہا تھا۔ صدہا تخلص ذہن میں آئے اور رد کئے گئے۔ کوئل سے لے کر چاند تک اور خار سے لے کر شیطان تک سب نورانی تخلص ختم ہو چکے تھے۔ جس ملک میں ہر شخص پاس نوجوان شاعر ہو اور ہر گھر میں شعر لکھا جاتا ہو یا نہیں، تخلص ضرور اُردو والے رکھ لیں۔ اُس ملک میں تخلص بیچارے ختم نہ ہو جائیں تو کیا کریں۔ کتنا خوش قسمت تھا وہ دور جب کوئی تخلص تلاش نہیں کرتا تھا۔ سریش اپنے مصرعہ کو پھر سوچنے لگا۔

مصرعہ تو سادہ تھا مگر قافیہ مشکل۔ سہہ، رہ، بہہ، کہہ۔ بس یہی تو قافیے تھے گویا اُس کی پہلی غزل کے صرف چار ہی شعر ہوں گے۔ آخر غزل شروع ہوئی۔ کچھ ادل بدل کے بعد دوسرا مصرعہ مکمل ہوا

"شاعر کہا ہو غم کے بھنور میں دہ بہہ گئے" غم کا بھنور تشبیہ تو پرانی تھی لیکن کتنی سادہ زبان۔ اقبال نے اسے مروج غم میں بدل دیا تھا اور غالب نے طوفان حوادث میں۔ سریش اُردو کو فارسی کی غلامی سے بھی آزاد کرے گا۔

گاڑی ٹنڈلا جنکشن پر پہنچی۔ پھر وہی نظارہ، پھر وہی کہرام۔ وہی پولیس کانسٹبل اور وہی تکیہ کلام۔ اُس طوفان بد تمیزی میں سریش کی نظر ایک نوجوان مسافر پر پڑی جو پٹھان کے نزدیک بیٹھا تھا۔ ننگے سر، کھلا سندھی قسم کا پاجامہ، اور سفید وائل کا کرتا۔ بال سنوارے ہوئے وہ طالب علم معلوم ہوتا تھا۔ اور شور و غل سے بے خبر کتاب پڑھنے میں مصروف تھا۔ مسافر لڑتے۔ بچے چیختے۔ کانسٹبل ہر طرح کے آوازے کستا لیکن وہ نوجوان اِس تمام ہنگامے سے الگ، لغویات اور گالی گلوچ سے دُور اپنی رُومانی دنیا میں کھویا تھا۔ کبھی کبھی اُس کے لبوں پر مسکراہٹ آ جاتی۔ کبھی وہ چونک سا پڑتا۔ اچانک اوپر کے ایک بستر گرا اور اُس کی کتاب نیچے جا پڑی۔ اُس کے گھٹنے پر چوٹ بھی آئی۔ پٹھان نے بستر اُٹھا کر فوراً اوپر رکھ دیا اور اُس کا گٹھنا دبانا چاہا۔ لیکن اُس نے ہاتھ سے منع کر دیا اور کتاب اُٹھا کر پڑھنے میں پھر مشغول ہو گیا۔ سریش دیر تک اُسے دیکھتا رہا۔ کبھی اُس نوجوان پر رشک کرتا کبھی اُس مصنف پر جو اُس کی توجہ اور مسکراہٹ کا باعث تھا۔ رشک کے ساتھ ساتھ اُس کا اشتیاق بھی بڑھتا گیا۔ اُس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ اُس نوجوان اور اُس مصنف دونوں سے تعارف پیدا کرے۔ لیکن اُس کے اور اُس نوجوان کے درمیان کوئی

● میرے لئے زندگی موم بتی نہیں، ایک بہت بڑی قندیل ہے جو ایک لمحہ کے لئے میرے ہاتھ لگ گئی ہے۔ (برنارڈ شا)

● ——— مسرت دوسروں کے باغوں اور تفریح گاہوں میں نہیں، ہمارے اپنے ہی گھروں میں رہتی ہے۔ (آسکر وائلڈ)

● ——— پیروں کی لغزش کے بعد تو سنبھلا جا سکتا ہے، لیکن زبان کی لغزش کے بعد سنبھلنا مشکل ہے۔ (فرینکلن)

● ——— تجربہ ہمارا ایک اچھا اُستاد ہے۔ (فرینکلن)

● ——— اچھی اور نیک عادت، نرم اور شیریں گفتار، بہت سی مشکلیں آسان کر دیتی ہے۔ (ڈاکٹر ہیگو)

پانچ گز کا فاصلہ تھا اور اِس فاصلہ میں دو درجن کے قریب مسافر اور نصف درجن بستر حائل تھے۔ سریش اپنے ذوقِ جستجو کو ضبط نہ کر سکا اور سرکتے سرکتے اُس کے قریب پہنچ گیا۔

"معاف کیجئے، آپ اتنی توجہ سے کیا پڑھ رہے ہیں؟ کتنی گرمی ہے اور کتنی بھیڑ لیکن آپ ایسے مشغول ہیں کیا امتحان نزدیک ہے؟"

نوجوان مسکرایا اور کہنے لگا "نہیں صاحب! امتحان نزدیک نہیں۔ یہ افسانوی مجموعہ ہے۔"

سریش کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ بھی تو افسانے لکھتا تھا۔ پوچھا "کون سی کتاب ہے؟"

"منزلِ خار، سریندر سکسینہ کے تازہ ترین افسانوں کا مجموعہ"

دفعتاً سریش کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ ایک لہر گزری اور اُس کا سارا جسم لرز گیا۔ مسکرا کر بولا "کیا آپ اِس کے مصنف سے تعارف پسند کریں گے؟"

"یقیناً! میں اُس کا مداح ہوں۔ اُس کا ہر افسانہ کسی اچھے خیال کا حامل ہے۔ زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کا عکس ہے۔ سدا بہت تعمق خیال، پُر لطف طنز، سب میں لاثانی۔ علی گڑھ پہنچ کر میں پہلا مضمون اِسی افسانہ نگار پر لکھوں گا۔"

سریش کچھ ضبط کے بعد بولا "کوان سی ڈمنس سمجھئے یا چانس وہ فنکار آپ کے سامنے کھڑا ہے۔"

نوجوان کچھ گھبرایا، کچھ متحیر ہوا۔ ایک منٹ تک اسے کچھ نہ سوجھا کہ وہ کیا کرے۔ آخر وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور اپنے برابر دے تشریف رکھنے کی التجا کی۔ ایک ہی جگہ دونوں دھنس گئے۔

نوجوان بولا "مجھے نہایت خوشی اور فخر ہے کہ میرا آپ سے تعارف ہوا!"

"میں بھی نہایت خوش ہوں کہ میں نے اپنی آنکھوں سے اپنے افسانوں کی اتنی قدر دیکھی۔ یہاں تو دم لینے کو جگہ نہیں اور آپ اتنی توجہ سے پڑھ رہے ہیں۔"

"ہاں، میں آپ کا افسانہ "رزمگاہ خیر و شر" پڑھ رہا تھا۔ آپ نے علی گڑھ کے ایک طالب علم کا ذکر کیا ہے جسے ایک روسی لڑکی سے محبت تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں چار سال سے علی گڑھ میں پڑھ رہا ہوں۔ میں نے تو گرد و نواح میں میلوں تک کسی روسی لڑکی کی شکل نہیں دیکھی۔ معلوم نہیں، افسانوں میں یہ لڑکیاں کہاں سے آ جاتی ہیں۔"

دونوں ہنس پڑے۔

سریش کا ماتھا ٹھنکا۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ افسانوں کا قصہ یہی چھڑ جائے گا۔ [illegible] سنبھل کر بولا "یہاں پہلی [illegible] گزشتہ ہوئی تھی [illegible]

مگر یہ کتاب [illegible] ہے۔ آپ کی [illegible] کا مجموعہ"

[illegible] کہانیاں لکھتا ہوں۔ کتنی [illegible] [illegible] چھپ چکا ہے۔ "تماب زندگی"۔ [illegible] ورنہ ضرور آپ کو تحفتاً پیش کرتا۔

[illegible]

[illegible] نے ایک دوسرے کے پتے لکھ لئے۔ یکایک اشوک نے پوچھا، "یہی [illegible] کا نام تھا۔ بھلا آپ نے نیمہ کو مار کیوں دیا؟ کون سی ہے وہ کہانی؟ ہاں، [illegible] کتنی نیک، خوبصورت اور معصوم لڑکی ہے۔ کیا کیریکٹر پیدا کیا ہے آپ نے۔ اس کی موت نہایت دردناک چوٹ تھی میرے لئے۔ آخر کس لئے؟ کیا قصور تھا اُس کا؟"

سریش گھبرا گیا۔ "زہرہ وسیم" اُس کی کوئی کہانی نہیں تھی، اور نہ نیمہ اُس کا کوئی کردار۔ سنبھل کر بولا، "شیکسپیئر نے بھی تو کارڈیلیا کو۔۔۔" یہی دیا تھا کیا زندگی میں معصومیت کا خون نہیں ہوتا؟ جان بچ گئی۔

ایک مداح کے لئے بس اتنا ہی کافی تھا۔ سریش نے موضوع بدل دیا۔ اب وہ ایک نئی دنیا میں تھا۔ گرد و پیش، گاڑی کا گھمسان، پولیس کانسٹیبل کی کشمکش، وہ سب بھول چکا تھا۔ اس نئی حیثیت میں اُس کے لئے دنیا کا رنگ ہی نیا تھا۔ وہ ایک بلند ترین افسانہ نگار تھا اور دنیا اُس کی مداح۔ لوگ اُس کے افسانے خریدتے تھے اور گاڑی کے کھچاکھچ ہجوم میں پڑھتے تھے۔ وہ بار بار اُس طالب علم کے چہرے کی طرف دیکھتا۔ جس پر تحسین و عقیدت کے تاثرات نمایاں تھے۔ آج اُسے پچھلے دس سال کی محنت کا صلہ مل گیا۔ وہ خوشی کے ساتویں آسمان تک پہنچ چکا تھا۔

کچھ دیر دونوں خاموش رہے۔ دونوں احساسات سے پُر تھے۔ طالب علم نے کسی اور افسانے کی طرف اشارہ کرنا چاہا لیکن سریش نے ٹوک کر علی گڑھ کی نسبت سوالوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ دیر تک گفتگو جاری رہی۔ دونوں ایک خیالی دنیا میں تھے۔ جس میں نہ جٹا دھاری سادھو اور نہ سیٹھ جی کا دخل تھا۔ اتنے میں علی گڑھ کا اسٹیشن آ گیا۔ اشوک نے اجازت چاہی۔ پُرتپاک الوداع ہوئی اور ہیرو اور مداح ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔

سریش اپنے سامان کے پاس واپس آ گیا۔ واپس آتے ہی اُس کی خیالی دنیا یکدم معدوم ہو گئی۔ وہ دنیا جس کا دار و مدار ایک طالب علم کے چند الفاظ پر تھا۔ وہ طالب علم اپنے کالج یا گھر کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ اُس ڈبے میں بہت سے مسافر کھڑے یا بیٹھے تھے۔ اُن میں سے ایک بھی اُسے نہیں جانتا تھا۔ سریش کو کچھ رنج سا ہوا۔

گاڑی خورجہ پہنچ گئی۔ سریش کے ڈبے میں دال سیویوں کا دور شروع ہوا۔ ایک نے خریدیں، پھر دوسرے نے اور پھر سب نے باری باری۔ سادھو مہاراج اُتر رہے تھے۔ بھگت جی نے انہیں بھی الوداعی تحفہ پیش کیا۔ سریش بھی کچھ ہچکچاہٹ کے بعد اس صلائے عام میں شریک ہوا۔ آہستہ آہستہ دال سیویاں کھا رہا تھا اور دنیا جہان کی باتیں سوچ رہا

تھا۔ دفعتاً اُس کی نگاہ ہاتھ میں لئے دال سیویوں والے کاغذ پر پڑی۔ [illegible] اُس [illegible] ٹھٹک کر ماند اور اُچھل گیا۔ یہ تو اُس کی آخری کتاب میں پہلی کہانی کا عنوان تھا، جو اُس نے پچھلے سال بہت محنت سے پہلگام میں لکھی تھی۔ آج اُس کہانی کے بخیے اُدھڑ چکے تھے اور اُس کے پُرزے گاڑی کے مسافروں کے ہاتھ میں تھے۔ کسی ایک مسافر [illegible] کاغذ پر کیا لکھا ہے اور اس کا مصنف کون اور کہاں ہے۔ گاڑی کے اندر اور باہر [illegible] کے اوراق بکھرے پڑے تھے اور پاؤں کے نیچے روندے جا رہے تھے۔ خوانچے والا پھر وہاں سے گزرا۔ سریش نے چاہا کہ باقی ماندہ کتاب اُس سے خرید لے۔ خوانچے والے کے پاس ردی کاغذ کے طور پر وہی ایک کتاب تھی۔ جب سریش نے اصرار کیا تو اُسے کچھ شک سا ہو گیا۔ اُس نے چار آنے مانگے۔ کتاب کی ڈیڑھ روپیہ قیمت میں چار آنے تو اُس کا اپنا حصہ بھی نہیں تھا۔ اُسے کچھ گھاٹے کا سودا نظر آیا اور صبر کر کے احساسات کو ٹھکرا دیا۔ خاموش بیٹھا اپنے تازہ ترین افسانوں کے افسوسناک حشر کو دیکھتا رہا۔ جن کے اوراق [illegible] مسافروں کے ہاتھوں میں تھے۔ لیکن اُن میں سے کوئی بھی اشوک نہ تھا، جو اُسے پڑھتا اور لکھنے والے سے متعارف ہونا چاہتا ——— پھر احساس کی تلخی کم کرنے کے لئے آہستہ آہستہ گنگنانے لگا ——— نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا ———

اُس نے قسم تو نہیں کھائی، لیکن آج اُس نے افسانہ نہ لکھنے کا عہد کر لیا۔

شاعرِ جمال حضرت فراقؔ گورکھپوری سے انٹرویو

نریش کمار شاد

۱۵ ایف. موتی باغ ۲ نئی دہلی

۳ رفروری ۱۹۶۴ء مکرمی خوشترؔ صاحب!

آئندہ پرچہ کے لئے "فراقؔ گورکھپوری سے انٹرویو" بھیج رہا ہوں فروری کے شمارے میں ایک افسانچہ ——— ایک تصحیح کے تحت سلیم جہانگیر صاحب نے بیسویں صدی میں جو کچھ تحریر کیا ہے۔ اس پر افسانچے کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ تصحیح کا۔ انھوں نے علامہ شبلی نعمانی کا جو واقعہ مولانا حمیدالدین حلیم سے منسوب کیا ہے اس کا تعلق دراصل اکبرؔ الہ آبادی سے ہے اور منظوم دعوت نامہ بھی وہ نہیں بلکہ ان تین اشعار پر مشتمل تھا۔ یہ اشعار کلیاتِ اکبرؔ میں بھی موجود ہیں ؎

آتا نہیں مجھ کو قبلہ قبلی بس صاف یہ ہے کہ بھائی شبلی
تکلیف اُٹھاؤ آج کی رات کھانا یہیں کھاؤ آج کی رات
حاضر جو کچھ ہو دال دلیا سمجھو اِس کو پُلاؤ قلیہ

اُس زمانے میں شبلیؔ کا ایک پاؤں بندوق کے حادثے سے بے کار ہو چکا تھا۔ انہوں نے اس کے جواب میں جو منظوم دعوت نامہ بھیجا تھا اُس میں بھی دو نہیں بلکہ حسبِ ذیل چار شعر تھے ؎

آج دعوت میں نہ آنے کا مجھے بھی ہے ملال لیکن اسباب کچھ ایسے ہیں کہ مجبور ہوں میں
آپ کے لطف و کرم سے مجھے انکار نہیں حلقہ در گوش ہوں ممنون ہوں مشکور ہوں میں
لیکن اب وہ نہیں ہوں میں کہ پڑا پھرتا تھا اب تو اللہ کے افضال سے تیمور ہوں میں
دل کے بہلانے کی باتیں ہیں وگرنہ شبلی جیتے جی مُردہ ہوں مرحوم ہوں مغفور ہوں میں

نریش کمار شاد

فراقؔ صاحب اُس شام بجھے بجھے سے بیٹھے تھے۔ میں نے آداب بجالانے کے بعد جب صحت کے متعلق دریافت کیا تو اور بھی بجھ گئے اور بہت بے دلی سے کہنے لگے "اب صحت کیا ٹھیک ہوگی، گرتی ہوئی دیوار ہوں، دونوں ہاتھوں میں ہر وقت درد رہتا ہے اور بعض اوقات تو ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے۔" اتنا کہنے کے بعد سے کراہنے لگے۔ اس کے بعد کچھ ہی بات چیت ہوئی تھی کہ مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس گھر میں ان کا خیال کم ہی کیا جاتا ہے۔ تاہم بہت ممکن ہے بہر حال میں نے اس ملال کو کم کرنے کے لئے خواہ مخواہ جوشؔ ملیح آبادی کا ذکر چھیڑتے ہوئے کہا۔

"جوشؔ صاحب کے متعلق پاکستان کے [illegible] لکھا ہے کہ جوشؔ نے بہت سے ناخوشگوار [illegible] ہیں کیا؟"

[illegible]

"[illegible] بلکہ میرے گھر میں کئی ایک دن رہ چکے ہیں۔ میں اُن کی شخصیت سے بہت متاثر ہوں۔ لیکن اُن کی شخصیت کے کچھ ناخوشگوار اثرات بھی مجھ پر ہیں۔ انہوں نے ایک خیالی خواب دیکھ کر ہندوستان کو چھوڑا جس کی وجہ

[illegible] سالوں میں بہت زیادہ غم پیدا ہوا میرا ماتھا اگرچہ اُس وقت بھی [illegible] لیکن اُن سے قدرے ناآسودگی اور بیزاری کے میرے جذبے کا اُن کے [illegible] چلے جانے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یوں تو کئی سال پہلے میری اُن سے اَن بن بھی ہو گئی تھی۔ بعد میں اپنی رباعیات کے مجموعے 'رُوپ' کا اُن کے نام انتساب کرتے ہوئے میں نے اِس اَن بن کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔ لیکن مجھے یہ اعتراف ہے کہ جوشؔ صاحب کا دل بھی میرے دل کی طرح صاف ہے۔ وہ میرے لئے بدی کا لفظ بھی نہیں بولے اور نہایت خلوص سے میری شاعری کے معتقد ہیں"۔ فراقؔ صاحب جذبات کی رو میں بہے جا رہے تھے۔ میں نے انہیں چونکاتے ہوئے کہا "یہ تو سب ٹھیک ہے حضرت! لیکن میں تو اُن ناخوشگوار اثرات کی بات کر رہا تھا۔"

"ہاں ناخوشگوار اثرات ———" فراقؔ صاحب واقعی چونکتے ہوئے بولے "ارے کچھ ایسے ناخوشگوار بھی نہیں میرے یہ ڈیڑھ دو لفظ جنہیں آپ مہمل بھی کہہ سکتے ہیں محض اُس احساس کی پیداوار ہیں کہ جوشؔ صاحب صرف مخدوم ہو کر رہ گئے ہیں۔ وہ خراجِ عقیدت لیتے تو ہیں مگر دیتے نہیں۔ یوں تو میرے اپنے کردار میں بھی بہت سی خرابیاں ہیں۔ جنسی زندگی جو ایک انسان کی پرائیویٹ ملکیت ہوتی ہے میرے یہاں کچھ زیادہ خوشگوار نہیں ہے لیکن جوشؔ صاحب کی ناآسودہ کرنے والی باتیں ——" اور اس کے بعد مسکراتے ہوئے کہنے لگے ——"اب جوشؔ صاحب اگر 'آپ' بولنے کب تک رہیں سن سکتے اور اُنہیں بولنے سے 'کب' کی بجائے بولنے سے 'کب' بالکل ایسا ہی معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی گھوڑا کی 'دم' کہے تو جوشؔ صاحب کی ایسی باتوں پر غصہ نہیں پیار آنا چاہیئے یہ تو اُن کے حسین نخرے ہیں ———"

میں نے فراقؔ صاحب کی توجہ پھر اصل سوال پر مبذول کراتے ہوئے کہا "اُن ناخوشگوار اثرات کی وضاحت کیجئے۔"

فراقؔ صاحب کے چہرے پر ہلکی سی برہمی کی پرچھائیں پڑی اور انہوں نے کہا "مثلاً بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ جوشؔ، نہرو، آزاد اور شنکرلال سے اپنے اثر سے کچھ کام کرا لیتے تھے اس میں اُن کا رویہ ایسا ہوتا تھا کہ دوسروں کا فائدہ کراتے کراتے اپنا بھی فائدہ کر لیتے تھے۔"

"تو اس میں کسی کا کیا نقصان ہوتا ہے؟"

"جی ہاں ———" فراقؔ صاحب نے میری تائید کی اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ذرا جھنجھلا کر بولے "جوشؔ سے میری ناآسودگی محبت کی ناآسودگی ہے۔ جوشؔ صاحب کی عظمت کو دیکھتے ہوئے اُن کے بارے میں ایسی باتیں سننا بھی اچھا نہیں لگتا۔ ایک بات اور کہہ دوں کہ میں پروفیسر آدمی ہوں۔ معاملے کا آدمی نہیں۔ اس لئے ایسے معاملات میں اپنی رائے پر اعتماد بھی نہیں کرتا۔" اور پھر بہت ہمدردانہ لہجے میں کہنے لگے "جوشؔ کے ساتھ کچھ میاں بیوی [illegible] لائق نہیں ہوا۔ داماد بھی جب تک یہاں تھے تو اعلیٰ تعلیم پانے کے باوجود کچھ نہیں کرتے تھے۔ جوشؔ پر متعلقین کا بوجھ بہت زیادہ ہے۔ ایسے عالم میں [illegible] تو کر ختم ہو جاتی جناب!" 'جناب' کا لفظ فراقؔ صاحب نے اپنے خاص انداز میں لمبا کر کے ادا کیا۔

میں ناخوشگوار اثرات کے سلسلے میں تو فراقؔ کے جواب سے مطمئن نہ ہو سکا لیکن یہ امر میرے لئے تسلی بخش تھا کہ جوشؔ صاحب کے ذکرِ خیر نے فراقؔ کی رگِ کرم کو چھیڑ دیا ہے۔

"فراقؔ صاحب! پچھلے دنوں جب جوشؔ صاحب یہاں تشریف لائے تھے تو ———" میں نے ارادتاً جوشؔ صاحب کے ذکر کو طول دیتے ہوئے کہا "میں نے اُن سے پوچھا تھا کہ اردو کے جدید ترین شاعروں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے اس کے جواب میں انہوں نے کہا تھا کہ میری رائے کچھ زیادہ اچھی نہیں ہے۔ کیا آپ بھی اُن شاعروں کے بارے میں ایسی ہی رائے رکھتے ہیں؟"

"نہیں بھائی! میں ایک ڈنڈے سے سب کو نہیں ہانکوں گا!" فراقؔ صاحب کی طبعی شگفتگی عود کر آئی "میں محسوس کرتا ہوں کہ یورپ کے ادیبوں میں مطالعے کی روایات ہم سے زیادہ مضبوط ہے۔ آج کل کے اردو شاعروں کو خالص اردو کتابوں کا مطالعہ اتنا فائدہ نہیں پہنچا سکتا جتنا انگریزی کتابوں کا لیکن ہمارے یہاں سماجی اور اقتصادی حالات کچھ ایسے ناہموار ہیں کہ ہمارا نیا شاعر ذاتی مطالعے کو مطالعے سے زرخیز نہیں بنا سکتا اور پھر یہ زمانہ بھی انتشار کا زمانہ ہے جو شاعری کے لئے زمین سازگار نہیں۔ آج شاعری پوری دنیا میں ایک بحرانی دور سے گذر رہی ہے۔ ہمارے وہ شاعر جن کی عمر پچاس سال سے کم اور تیس سال سے زیادہ ہے اُن میں بعض کی شاعری اچھی خاصی تو ہے لیکن پُرعظمت نہیں۔ جدید شاعری میں کچھ حسین آوازیں تو بے شک سنائی دیتی ہیں لیکن کوئی بڑی آواز سنائی نہیں دیتی لیکن نئے شاعروں کی طرف سے جو تجربے کئے جا رہے ہیں وہ سب کے سب ایسے نہیں ہیں کہ انہیں لغو قرار دے دیا جائے۔"

"ہم جدید شاعروں کے کماں دار فیض احمد فیضؔ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

فراقؔ صاحب کچھ سوچتے ہوئے رک رک کر بولنے لگے "دستِ صبا" میں اور اُس کے بعد سے فیضؔ نہ جانے کیوں زبان کی صحت سے بے پروا ہو گئے ہیں۔ پھر بھی وہ کبھی کبھی مجھے بہت اچھے لگتے ہیں لیکن اُن کے کلام کی اشاریت میرے لئے ناقابلِ فہم ہے۔"

میں نے محسوس کیا طبیعت کی ناسازی کے باوجود فراق صاحب اپنی شاعری کے متعلق گفتگو کرنے کے موڈ میں آگئے ہیں۔

"فراق صاحب کیوں نہ اس بے ربط گفتگو کو باقاعدہ انٹرویو کی شکل دے دی جائے؟" اور ان کے جواب کا انتظار کئے بغیر میں نے سوال کر دیا "آپ عالم وجود میں کب تشریف لائے؟"

"۲۸ اگست ۱۸۹۶ء بروز جمعہ۔ بوقت دوپہر"

"خوب ــــــ اور شاعری کا آغاز کب ہوا؟"

"والد محترم حضرت عبرت بھی شاعر تھے۔ بچپن میں ان سے شعر سن کر متاثر ہوتا تھا۔ ۱۹۲۱-۲۲ء میں ڈرتے ڈرتے خود بھی کچھ شعر موزوں کئے۔"

"ابتدائی کلام پر اصلاح کس سے لی؟"

"والد کو کچھ اشعار ضرور دکھائے لیکن ان کے انتقال کے بعد کسی سے اصلاح نہیں لی۔ ویسے میرے چند مصرعوں میں پروفیسر مہدی حسن ناصری اور امیر مینائی کے شاگرد وسیم خیرآبادی نے بھی ترمیم کی۔ ریاض خیرآبادی نے بھی دو ایک مصرعے دیکھے تھے لیکن حقیقت میں میرا مطالعہ ہی میرا استاد ثابت ہوا۔"

"کس کس شاعر سے آپ غیر معمولی طور پر متاثر ہیں؟"

"۲۳، ۱۹۲۴ء میں امیر مینائی کی شگفتہ بیانی سے بہت متاثر تھا لیکن جلد ہی میں اردو شاعری سے ناآسودہ ہونے لگا۔ اس میں لفاظی اور سطحیت کی بہتات اور حرارت کی کمی محسوس ہونے لگی۔ اس وقت اپنے آپ کو مطمئن کرنے میں میر نے میری بہت مدد کی۔ میر کے علاوہ اردو میں غالب اور آتش، انگریزی میں ورڈز ورتھ اور کیٹس اور ہندی میں تلسی داس سے بھی متاثر ہوں۔"

"کیا آپ اس کلیے سے اتفاق کرتے ہیں کہ اچھا شاعر اچھا انسان بھی ہوتا ہے؟"

فراق صاحب نے سگریٹ کا ایک طویل کش لگاتے ہوئے جواب دیا "ایک آدمی کے کردار کی ساخت میں مختلف قوتیں کارفرما رہتی ہیں جیسے والدین کا خون۔ گھریلو زندگی۔ سماجی روایات جس زمانے میں وہ پیدا ہوا۔ اس زمانے کے حالات۔ اور تعلیم و تربیت اور پھر اچھے آدمی کا معیار بھی ہر ماحول میں علیحدہ ہوتا ہے لیکن یہ بات ضرور ہے کہ جو اچھا شاعر ہوگا وہ کسی ماحول میں بھی بری زندگی کا معاون نہیں ہو سکتا۔ وہ ظلم اور سیاہ دلی کی کبھی حمایت نہیں کر سکتا۔ بولتے بولتے فراق صاحب کھو سے گئے اور چند لمحوں تک چپ چاپ کچھ سوچتے رہنے کے بعد بولے "ایک اچھے شاعر میں شخصی کمزوریاں ہو سکتی ہیں اس کی جنسی زندگی غیر متوازن ہو سکتی ہے۔ وہ شراب کا عادی ہو سکتا ہے۔ نیک نیتی کے باوجود اس سے کسی وقت کسی غلطی کا ارتکاب ہو سکتا ہے۔ یعنی وہ خلوص کے ساتھ کسی مسئلے میں غلطی کر سکتا ہے۔ لیکن شاعری اور دیگر فنون لطیفہ کا مقصد ہی نیکی کی قوتوں کو مدد پہنچانا ہے اس لئے سماج کی بہبودی کے لئے ایک اچھا شاعر بہر صورت معاون ثابت ہوگا۔"

فراق صاحب کی زبان سے شراب کا ذکر سن کر میں نے اگلا سوال شراب ہی کے متعلق کیا "کیا شعر و شراب لازم و ملزوم ہیں؟"

فراق صاحب نے ایک دم تردید کرتے ہوئے کہنا شروع کیا "جوش، مجاز اور میں اپنے اپنے طور پر الگ الگ شراب کے سلسلے میں اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ شعر کا کوئی تعلق شراب سے نہیں ہے کسی نشہ باز فنکار نے کبھی نشے کے زیر اثر کوئی اپنا شاہکار نہیں لکھا۔ ٹیگور کو دیکھیے وہ کبھی شراب نہیں پیتے تھے۔ اقبال نے بھی جوانی میں ضرور پی لیکن بعد ازاں اسے مطلقاً منہ نہیں لگایا۔ داغ نے اتنی چلبلی اور رنگین شاعری کرنے کے باوجود شراب کو کبھی چھوا تک نہیں۔ حکیمت انیس اور نظیر کے بارے میں بھی کسی سے نہیں سنا کہ وہ پیتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ ایک آدھ پیگ پی لینے کے بعد شاعر باتیں بہت اچھی کر سکتا ہے لیکن شعر نہیں کہہ سکتا اور زیادہ پینے کے بعد تو ظاہر ہے وہ سو ہی جائے گا اور شراب کا نشہ اترنے کے بعد بھی اس سے کسی اچھی تخلیق کی توقع لاحاصل ہے۔"

"تو پھر یہ فرمائیے کہ آپ کیوں پیتے ہیں؟"

فراق صاحب کچھ غمگین ہو کر کہنے لگے "میری ازدواجی زندگی جہنم کی طرح اذیت ناک رہی ہے۔ میری شادی غلط ہو گئی تھی۔ گھر کی برکتوں کو کھو کر دولت اور شہرت حاصل کرنے کے باوجود میرے دل کی ہائے ہائے نہیں مٹ سکتی تھی حالانکہ میں بڑا چغم آدمی ہوں۔"

"چغم ــــــ؟" میں سوالیہ نظروں سے فراق صاحب کی طرف دیکھنے لگا ـــ "جی ہاں چغم۔ یہ ہمارے علاقے کی بولی ہے۔ غالباً آپ کے پنجاب میں یہ لفظ نہیں بولا جاتا۔ چغم یعنی چہ غم" اور پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے فراق صاحب نے کہنا شروع کیا "ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ گھریلو زندگی کی تلخی نے مجھے شراب کی تلخی کا عادی بنا دیا۔ ۴۲ سال کی عمر کے بعد سے اسے روزانہ پی رہا ہوں۔ اب تو دوسرے عادی شراب نوشوں کی طرح نیند کے لئے بھی اس کا پینا میرے لئے ضروری ہو گیا ہے لیکن میں یہ مانتا ہوں کہ بہ حیثیت مجموعی کردار پر شراب کا اثر کچھ زیادہ اچھا ثابت نہیں ہوتا۔"

"پھر تو اس کا مطلب ہے کہ ــــــ" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "آپ حکومت کی امتناع شراب کی پالیسی کے بھی حامی ہوں گے؟"

"بڑے شریر ہیں آپ!" فراق صاحب بہت سنجیدگی سے کہنے لگے "قانون بنا کر شراب نوشی کی ممانعت نہیں کرنی چاہیے۔ سماج کو ایسی فضا پیدا کرنی

چاہیے کہ ———

"سماج کو ایسی فضا کیسے پیدا کرنی چاہیے؟" میں نے فراق صاحب کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"یہ سوال آپ نے بہت اہم کیا ہے" فراق صاحب اپنی آنکھیں مٹکاتے ہوئے بولے "غالباً روایتوں کے اثر سے مزاج ہی ایسا بنا دینا چاہیے کہ انسان شراب سے متنفر ہے جیسے ہندو گائے کا یا مسلمان سور کا گوشت نہیں کھاتا لیکن ایسا کرنے کی راہ میں دقتیں بہت ہیں ——— بہرکیف دنیا بھر کے ملکوں کے لیے مسئلہ خاصا پریشان کن ہے بلکہ اب تو روس کے لیے بھی یہ ایک اہم مسئلہ بن گیا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ شراب نوشی سے اگر ایک فیصدی یا نصف فیصدی لوگ بھی برباد ہو جاتے ہیں تو یہ بہت بڑے سماجی نقصان کا باعث ہے۔"

"فراق صاحب ایک نہایت عام سا سوال پوچھنے کی اجازت چاہتا ہوں۔" میں نے بہت انکسار سے کہا "وہ یہ کہ آپ کیونکر شعر کہتے ہیں؟"

"شعر کیونکر کہتا ہوں ———؟" فراق صاحب نے آہستہ سے کہا جیسے خود اپنے آپ سے یہ پوچھ رہے ہوں اور پھر کہنے لگے "ہوتا یہ ہے کہ کوئی ایک مصرع اچانک گونجتا ہوا تحت الشعور سے شعور میں آجاتا ہے اور پھر یہی مصرع بعد میں یکسوئی کے ساتھ پوری غزل کہلانے کا محرک بنتا ہے۔ لیکن یہاں اس بات کا خیال رکھیے کہ مختلف شاعروں کے ذہن میں اُن کی وجدانی شخصیت کے مطابق مصرعے ذہن میں آتے ہیں۔ مثلاً داغ کے ذہن میں ہمیشہ چھیڑ چھاڑ کے مصرعے آتے ہوں گے۔ لیکن میرے یہاں مصرعے۔ کیفیت۔ اثر۔ نرمی اور گھلاوٹ لے کر آتے ہیں۔

"گستاخی معاف آپ اتنی لمبی لمبی غزلیں کیوں کہتے ہیں؟"

"اس کی دو وجہیں ہیں" فراق صاحب نے بلا تامل بہت تحمل کے ساتھ جواب دیا۔

"میں نے جوانی میں لکھنؤ کے شاعروں کے دیوان پہلے دیکھے اور دہلی شاعروں کے بعد میں۔ امیر اور وزیر وغیرہ اکثر سہ غزلہ چہار غزلہ تک کہتے تھے۔ اُنہیں کی تقلید میں لمبی لمبی غزلیں کہنے کا میں بھی عادی ہو گیا اور دوسری وجہ جو اس سے زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ میں جب فکرِ سخن کرتا ہوں تو روایتی انداز میں شعر نہیں کہتا ہوں۔ میرے ذہن پر ایک موڈ طاری ہو جاتا ہے۔ کائناتِ حُسن و عشق اور زندگی کی معنویت مجھ پر چھا جاتی ہے۔ میرا ہر شعر حُسن عشق اور زندگی کی کسی خاص کیفیت کا ایک ترجمان ہوا لبریز پیالہ ہوتا ہے۔ میرے دوست مجنوں گورکھپوری نے میرے متعلق بہت اچھی بات کہی ہے کہ میں مزاجاً نظم گو تھا لیکن طبیعت میں انتشار کی وجہ سے غزل کہنے لگا میں منطقی تسلسل سے شعر نہیں کہتا۔ ایک خاص عالم میں ڈوب کر اُس کی مختلف کیفیتوں کو نظم کرنے پر مجبور ہوتا ہوں۔ میں شعر پر مسلط نہیں ہوتا شعر مجھ پر مسلط ہوتا ہے۔ اِس اعتبار سے میں قادر الکلام نہیں بلکہ عاجز الکلام ہوں۔ عام شاعر موزوں کلام میں نثر کہتے ہیں لیکن میں جمالیاتی حقائق پر شعر کہتا ہوں۔"

"بے شک۔ بے شک!" بے اختیار میری زبان سے نکل گیا۔

"اور سُنیے ———" فراق صاحب نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میں بیدل کی طرز میں بھی شاعری نہیں کرتا جو غریب غالب تک کے لئے بھی مصیبت کا موجب تھی ؎

طرزِ بیدل میں شاعری کرنا اسد اللہ خاں قیامت ہے

میرے اچھے اشعار اسرارِ حیات کے مظہر ہونے کے باوجود ایک بہت پڑھے لکھے آدمی اور ایک معمولی پڑھے لکھے آدمی کو یکساں طور پر متاثر کرتے ہیں جیسے میرا یہ شعر سُن کر ؎

زندگی کیا ہے آج سے اے دوست!
سوچ لیں اور اُداس ہو جائیں

ایک عام آدمی بھی اُسی طرح اُداس ہو جاتا ہے جس طرح کوئی خاص باذوق آدمی۔"

اور اتنا کہتے کہتے فراق صاحب پھر اپنے ہاتھوں میں تکلیف محسوس کرنے لگے اور اس کے ساتھ ہی سردی بھی۔ اور انھوں نے اپنے آپ کو ایک کمبل میں لپیٹ لیا۔

"فراق صاحب! اب آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔"

"ہاں بھائی ———!" فراق صاحب نے بہت حسرت ناک لہجے میں میری تائید کرتے ہوئے غالب کا یہ مصرع پڑھ دیا ؎

"اب عناصر میں اعتدال کہاں"

"پوچھنا تو آپ سے بہت کچھ چاہتا تھا لیکن اس انٹرویو کے سلسلے کو ختم کرنے سے پہلے اتنا بتا دینے کی ضرور تکلیف فرمایئے کہ آپ کے نزدیک ہندوستان میں اردو کا مستقبل کیا ہے؟"

فراق صاحب نے کسی تمہید کے بغیر بلکہ بہت جذباتی انداز میں کہنا شروع کیا۔

"جو ہندی ادب بنایا جا رہا ہے کروڑوں آدمیوں کی بول چال سے اُس کا کوئی تعلق نہیں ہے اور اِس ادب کے جس حصے کا ہماری بول چال سے

پھر غلط ہے کہ وہ ہماری بولی کے نہایت گھریلو لہجے سے وابستہ ہے ... سکتی ہے۔ ہماری بولی کبھی بھی وہ ہندی نہیں بن سکے گی ... کا ہندی ادب پڑھ کر سمجھ نہیں سکتے۔ حسین شکل میں جو بولی آج مستعمل ہے وہ صرف اردو ہے۔"

" لیکن فراق صاحب! ہماری نئی نسل تو اردو سے قطعی ناواقف ہے۔ اردو کا مستقبل تو آخر اسی سے وابستہ ہے۔" میں نے کہا۔

فراق صاحب پُر اعتماد لہجے میں بولے "اس کے باوجود میں اردو کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں۔ یہ درست ہے کہ اردو کے ادبی ارتقا کی رفتار کم ہو جائے گی لیکن ہماری بولی ہندی کے موجودہ ادب کے مطابق تو کبھی نہ ہوگی۔ اردو کے ساتھ یہ بے انصافی دیر تک نہیں ہو سکتی۔ سات آٹھ برس کے بعد یا زیادہ سے زیادہ دس پندرہ سال کے بعد اردو سے انصاف ضرور ہوگا۔"

"ع تری آواز مکے اور مدینے" میں نے ہنستے ہوئے یہ مصرع پڑھا اور فراق صاحب کو 'خدا حافظ' کہنے کے بعد وہاں سے چلا آیا۔ ✣

مضمون نگار حضرات سے

درخواست ہے کہ مضمون حاشیہ چھوڑ کر خوشخط لکھا کریں۔ اور سطور کے درمیان کافی جگہ چھوڑا کریں۔ بعض اچھے مضامین محض بدخط ہونے کی وجہ سے چھپنے رہ جاتے ہیں۔ ہمیشہ غیر مطبوعہ مضامین بھیجیں اور ایڈیٹر کی اطلاع کے لئے مضمون کے خاتمے پر غیر مطبوعہ لکھیں۔ بعض مضمون نگار مطبوعہ مضامین بھیج دیتے ہیں۔ یہ نہایت نامناسب اور غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے۔ اپنے پاس اپنے مضامین کی نقل ضرور رکھیں۔ کیونکہ ناقابلِ اشاعت مضامین ضائع کر دیئے جاتے ہیں۔ مضمون کے خاتمے پر اپنا پورا پتہ لکھ دیا کریں۔ نوآموز حضرات مضامین بھیجنے سے پہلے کسی اُستاد سے مشورہ لیا کریں۔ اگر وہ چاہیں کہ مرسلہ مضامین ناقابلِ اشاعت ہونے کی صورت میں انھیں واپس کر دیئے جائیں تو مضمون کے ساتھ ٹکٹ بھیجنے کی بجائے اپنا پورا پتہ لکھا ہوا پوسٹ آفس کا لفافہ ارسال فرمائیں۔ ورنہ ہم مضمون کی واپسی سے قاصر رہیں گے۔ (ایڈیٹر)

SUNLIGHT
SOAP
نئے فارمولے والے
سنلائٹ
سے آپکے کپڑے چمک اُٹھتے ہیں!
نئے فارمولے والے سنلائٹ کی شان دیکھئے۔ نیا خوشنما سرورق، نئی خوبصورت ٹکیہ اور زیادہ اُجلی دُھلائی کی قوت! اس قوت کی بدولت آپ کے کپڑے ہر بار زیادہ چمکدار دُھلتے ہیں — جی ہاں زیادہ سفید، زیادہ چمکدار!
ہندوستان لیور کا تیار کردہ
S. 52-140 UD

ایک ستارۂ ظلمت

ایم کوٹھیاوی راہی

قاضی پورہ نور دگر، فتح پور (یو۔ پی)

۱۹ ستمبر ۱۹۶۳ء

برادر محترم خوشتر صاحب! آداب

... "ایک ستارۂ ظلمت" موجودہ شعری ماحول پر ایک چوٹ ہے۔ اس میں ایسے لوگوں کی سخنوری اور سخن فہمی اور شاعر نوازی کا حال دکھایا گیا ہے جو ہم خستہ نصیبوں کے لئے اپنے دامن میں رنگا رنگ پھول لئے زیر لب گنگنایا کرتے ہیں۔ "کیا تم آؤ گے؟"

آپ کا بھائی ——— ایم کوٹھیاوی راہی

"شاعر بھائی رات لطف آگیا!"

"تمہاری قوالی خوب جمی؟"

"ہاں خوب، بہت خوب! کہئے آپکی کیا خاطر کروں؟"

"خاطر کی کیا ضرورت ہے" نشاط نے ہنستے ہوئے چار مینار سلگایا۔

آتش قوال پھر بولا۔

"میری آمدنی میں آپکا بھی حق ہے۔ آخر آپ بیکار ہی تو ہیں۔ خون پسینہ ایک کرکے شعر کہتے ہیں۔ رات آپ ہی کی غزلوں نے میرے حریفوں کو ہرایا" اور پانچ کا ایک نوٹ بڑھاتے ہوئے بولا۔

"اسے میرا دل رکھنے کے لئے رکھ لیجئے"

"تو پھر غزل نہیں ملے گی" نشاط اُسی طرح ہنستے ہوئے بولا۔

آتش نے ہاتھ کھینچتے ہوئے پوچھا "کیوں؟"

"میں شعر بیچنے کے لئے نہیں کہتا" نشاط کے لہجے میں درد تھا۔ آتش تاڑ گیا۔ خودداری کو ٹھیس لگ رہی ہے۔ نوٹ جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔

"ایک بات اور بھی ہے شاعر بھائی!"

"کہو؟"

"چلمن میں سے بار بار آپ کے کلام کی فرمائش ہوتی رہی"

"اچھا!"

"جی ہاں۔ اور جب محفل برخاست ہوئی تو ایک چھوٹا سا لڑکا میرے پاس آیا۔ آپ کا پتہ پوچھنے کے لئے"

"بتادیا تم نے؟"

"آپ نے مجھے بتایا کب تھا۔ شاید کسی چلمن والی کا دل آپ پر آگیا ہے شاعر بھائی"

"میں ایسے خواب دیکھنے کا عادی نہیں ہوں" یہ کہہ کر نشاط آگے بڑھ گیا۔ آتش لپک کر بولا۔

"مگر شاعر بھائی! نئی غزلیں کب دے رہے ہیں؟"

"ہوٹل میں آکر لے جانا"

"کس ہوٹل میں؟"

"بخشی پور والے ہوٹل میں۔ جو پاور ہاؤس کے پاس ہے۔ جہاں چائے ایک آنے کپ ملتی ہے"

باہر بارش ہو رہی تھی۔ ٹین کی چھت والے ہوٹل میں بیٹھا نشاط چائے پی رہا تھا۔ آتش قوال بھیگتا بھاگتا آیا۔ اور بولا۔

"کہاں کہاں ڈھونڈا آپ کو اردو بازار سے نخاس تک، نخاس سے بخشی پور تک اور بخشی پور سے ..."

"یونائیٹڈ ٹاکیز تک!" نشاط نے بات پوری کردی۔ آتش ہنسنے لگا۔ کافی بھیگ چکا تھا۔ چائے والے خاں صاحب سے ایک کپ چائے مانگتے ہوئے بولا۔

آپ صرف شادی شدہ نوجوان کیوں ملازم رکھتے ہیں۔ کیا وہ کنواروں سے بہتر کام کرتے ہیں؟
اصل میں شادی شدہ مردوں کو گالیاں برداشت کرنے کی عادت ہوتی ہے اور وہ حکم عدولی نہیں کرتے۔

"کہاں رہے مہینوں شاعر بھائی؟"
"لکھنؤ چلا گیا تھا۔"
"خیریت تو ہے؟"
"ہاں خیریت ہی سمجھو۔ ریڈیو والوں نے یاد کیا تھا....."
"خوب خوب! تو کیا آپ بھی آ گئے ریڈیو پر؟"
"نہیں"
"تو کیا کرنے گئے تھے؟"
"یہ مت پوچھو" نشاط نے چائے ختم کرتے ہوئے کہا۔
ایک منٹ دونوں چُپ رہے۔
پھر آتش سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔
"اس محلے میں تو آپ کی بڑی دھاک جم گئی ہے شاعر بھائی!"
"کیا ہوا؟"
"ادھر کئی محفلیں ہوئیں جب دیکھیے فرمائش پر فرمائش۔ بس آپ ہی کے کلام کی فرمائش"

"کس کی طرف سے؟"
"ایک چلمن والی کی طرف سے!"
"کوئی اور بات کرو" اُکتاہٹ محسوس کرتے ہوئے نشاط بولا "میں ایسی باتوں میں دلچسپی لینے کا عادی نہیں ہوں۔"
"ارے چانس مل رہا ہے آپ کو شاعر بھائی۔ گولڈن چانس! یار لوگ چکر پر چکر لگاتے ہیں پھر بھی دیدار نصیب نہیں ہوتا۔ اور آپ کے لئے تو..... وہ کیا بھلا سا ایک شعر ہے آپ کا اِس سلسلے کا....."
"یاد نہیں" نشاط نے چار مینار سُلگاتے ہوئے بات کاٹی "اور سب خیریت ہے نا؟"
"خیریت کہاں ہے۔ ابھی کل ہی کی بات ہے۔ محفل ختم ہوتے ہی زوروں کی بارش ہونے لگی۔ مجھے وہیں کمرے میں ٹِک جانا پڑا۔ کوئی دو بجے ہوں گے کہ اندر کا دروازہ کھلا۔ اور شاعر بھائی! مجھے محسوس ہوا خواب دیکھ رہا ہوں۔ ہاتھ میں لیمپ لئے ایک حسینہ آئی۔ شرماتی ہوئی اور مجھ سے میری نوٹ بک مانگ کر بولی۔ ذرا نشاط صاحب کی ایک غزل نوٹ کرنی ہے اور یہ دیکھیے ....."
یہ کہتے ہوئے آتش نے اپنی بھیگی ہوئی سیاہ صدری کی جیب سے رومال میں لپٹی ہوئی نوٹ بک نکالی۔
ایک سادہ ورق پر لکھا تھا "قوال صاحب! آپ کی مہربانی ہوگی۔ اِس اعلے درجے کی شاعری کے لئے نشاط صاحب کو میری دلی مبارکباد پہنچا دیں اور اُن کے پتے سے نوازیں۔"
"فریب .... فریب .... حسین فریب!" قہقہہ لگاتے ہوئے نشاط نے نوٹ بک آتش کو واپس کر دی۔ وہ بھونچکا سا رہ گیا۔
بارش ٹین کی چھت پر جل ترنگ بجا رہی تھی۔

محرم کی ساتویں کو بہت چہل پہل تھی۔ نشاط اپنے چند شاعر ساتھیوں کے ساتھ لال ڈگی پارک میں بیٹھا ہوا کھا رہا تھا۔ مہندی کا جلوس دیکھنے والے مرد اور عورتیں پارک میں بھرے تھے۔ وہ جلوس اِسی طرف سے گذرنے والا تھا۔ اتنے میں آتش اپنے چند شاگردوں کے ساتھ نظر آیا۔ نشاط کو دیکھ کر لپکا۔
"شاعر بھائی السلام علیکم"
"علیکم السلام"
"ذرا اِدھر آنے کی زحمت کریں۔"

وہ اُٹھ کر آتش کے قریب گیا۔ تو وہ اُسے تالاب کی طرف لے گیا۔

"وہ لوگ اس پارک میں موجود ہیں؟"

"تو بکو یار! اسی لئے بُلایا تھا؟"

"آپ سُنئے تو سہی"

"خیر! کہو"

"میں کئی دنوں سے آپ کی تلاش میں تھا۔"

"اور غزلیں درکار ہیں؟"

"جی نہیں۔ ایک خط آپ کا، میرے پاس پڑا ہے۔"

"کس نے دیا ہے؟"

"سائرہ نے!"

"یہ سائرہ کیا اُس لڑکی کا نام ہے؟"

"جی ہاں"

"پڑھ کر جواب تم ہی لکھ دینا۔"

"میں کیا لکھوں گا؟"

"جو جی میں آئے!"

"مگر آپ سُنیئے تو سہی"

"بولو فوراً"

"تفصیل سے کہوں گا تو آپ نہیں سنیں گے۔ آپ کے عشق میں وہ دیوانی ہوتی جا رہی ہے۔ قسم خدا کی شاعر بھائی! چاند کا ٹکڑا ہے۔ چاند کا ٹکڑا! چار چاند لگ جائیں گے آپ کی شاعری میں اُس سے محبت کر کے۔ بُری طرح فریفتہ ہے آپ پر!"

"اچھا لاؤ۔ دیکھوں کیا لکھا ہے!"

خط جیب سے نکال کر آتش نے نشاط کے حوالے کر دیا۔

نشاط پڑھنے لگا۔

"نشاط صاحب! ایک غیر شخص کے توسط سے یہ خط آپ کو لکھ رہی ہوں۔ یقین جانیئے نشاط صاحب! آپ کی غزلوں کے ایک ایک شعر نے میرے دل پر تیر و نشتر کا سا کام کیا ہے۔ ایک کنواری لڑکی ہو کر بھی صاف صاف لکھنے پر مجبور ہوں کہ مجھے آپ کی ذات سے ایک اُنسیت ہو گئی ہے۔ خدا کے لئے موقع نکال کر شرفِ ملاقات بخشیئے۔"

اِس شعلائی تحریر سے نشاط کا دل پگھل سا گیا۔ وہ زیرِ لب مُسکرانے لگا۔ چند لمحوں تک مُسکراتا رہا۔ پھر بولا۔

"بہت نادان معلوم ہوتی ہے؟"

"ارے یہ محبت ہے شاعر بھائی۔ محبت ..... پتھر کو بھی پانی کر دیتی ہے۔ میری مانیئے تو جواب لکھ مارئیے۔ میں اسی وقت کسی نہ کسی طرح پہونچا دوں گا۔"

سامنے پڑے ہوئے سگرٹ کا ایک خالی پیکٹ اٹھا کر نشاط نے لکھ دیا۔

"مجھے آپ کی اُنسیت سے ہمدردی ہے۔ آپ مجھ سے جب چاہیں مِل سکتی ہیں۔ کل رات کو اسی پارک میں لائبریری کے پاس انتظار کروں گا۔"

لال ڈگی پارک کل کی طرح بارونق تھا۔ آج اُدھر سے کوئی جلوس گذرنے والا تھا۔ نشاط لائبریری کے پاس بجلی کے ایک کھمبے کے نیچے بنچ پر بیٹھا چار مینار پی رہا تھا۔ دس بج رہے تھے۔ اتنے میں سامنے سے اُسے ایک بُرقعہ پوش لڑکی آتی ہوئی نظر آئی۔ اُس کا دل دھڑکنے لگا۔ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ قریب آ کر لڑکی بولی۔

"تسلیمات!"

"تسلیمات!"

اور پھر نشاط نے دیکھا نقاب اُٹھتے ہی چاند نکل آیا ہے۔

"آپکا نام سائرہ ہے؟"

کیا واقعی تم شادی شدہ نہیں ــ ؟ ــ پھر یہ مار پیٹ کے نشان کیسے ــ ؟

"کہاں؟"

"آپ مجھے نشاط کہتے ہیں؟"

"میرے انتظار کا شکریہ!" وہ شرماتی ہوئی بولی۔

"اس کی کیا ضرورت ہے۔" نشاط نے اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے کہا "شکریہ تو مجھے ادا کرنا چاہیے جو آپ نے یہاں تک زحمت کی۔ کیا اکیلی ہی آئی ہیں؟"

"جی نہیں۔ گھر سے باجی وغیرہ کے ساتھ نکلی تھی میاں صاحب کے امام باڑے میں جانے کے لئے لیکن وہاں سے موقع نکال کر آپ کے پاس چلی آئی۔ آپ کی شاعری کھینچ لائی۔"

"وہ آپ کو امام باڑے میں نہ پاکر پریشان نہ ہوں گی؟"

"جی نہیں۔ میں نے کہہ دیا تھا مجھے اپنی ٹیچر صاحب کے گھر جانا ہے۔ اُن کا گھر امام باڑے کے پاس ہی ہے۔"

"آپ پڑھتی بھی ہیں؟"

"جی ہاں"

"کس کلاس میں؟"

"گیارہویں میں!"

"آپ کا مکان جعفر بازار میں ہے؟"

"جی"

اور اب پوچھنے کے لئے نشاط کے پاس کوئی سوال نہ تھا۔ وہ چُپ ہو گیا تھا۔ سائرہ نے سکوت توڑا۔

"کیا آپ اِسی شہر کے رہنے والے ہیں؟"

"جی"

"کیا کرتے ہیں؟"

"شعر و شاعری"

"اتنی اچھی غزلیں آپ کہہ لیتے ہیں کہ جواب نہیں۔ سچ کہتی ہوں خوب کہتے ہیں۔ بہت خوب نشاط صاحب!"

"اِس نشاط نوازی کا شکریہ!" وہ ہنس کر بولا۔

سائرہ شرما سی گئی۔

کئی لمحوں تک دونوں چُپ رہے۔

اِس بار یہ سکوت نشاط کو توڑنا پڑا۔

"میرے لئے کوئی حکم ہو تو کہیے!"

"میں التجا کروں گی" اُس کی پلکیں جھک گئیں۔ نشاط کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ واقعی پیار کرنے کے قابل لڑکی تھی بہت حسین، بہت جمیل۔ بہت پُرکشش۔ نشاط کی شاعرانہ زندگی کا پہلا حسین حادثہ تھا۔ پہلا افسانہ، پہلا خواب۔ اپنے فن پر اس کی یہ بات اُسے بہت اچھی لگی۔

"میں التجا کروں گی" لڑکی کی لرزتی آواز فضا میں گونجی "ایک کوئی محبوب غزل سُنائیے۔ کوئی تازہ غزل نشاط صاحب...."

نشاط نے دیکھا۔ وہ اپنی لانبی لانبی پلکیں اُٹھائے اُسے دیکھ رہی تھی کچھ عجیب طرح سے۔ عجیب انداز سے نشاط کا جی چاہا۔ فی البدیہہ شعر کہنا شروع کر دے برجستہ کہنے لگے۔

اور پھر ایک تازہ غزل سُنانے لگا۔

رُک رُک کر، ٹھہر ٹھہر کر۔

سائرہ مورتی بنی سنتی رہی۔

اور سُنتے سُنتے بول پڑی۔

"ایسے نہیں نشاط صاحب۔ ایسے نہیں۔ ویسے ہی سُنائیے۔ ویسے ہی...."

"ویسے ہی؟" وہ حیرت سے تکنے لگا "کیا مطلب۔"

"جیسے آتش سُناتا ہے۔ آتش..." سائرہ نے معصومیت سے کہا۔

اور نشاط کو محسوس ہوا جیسے کسی آل انڈیا مشاعرے کے ڈائس پر ہُوٹ ہوا "تحت اللفظ سُنانے کے جرم میں۔"

"سُنائیے نا نشاط صاحب!" سائرہ پھر بول پڑی "آتش کے مُنہ سے سُن کر سوچتی تھی کہ وہ اتنا اچھا گاتا ہے تو آپ کتنا اچھا گاتے ہوں گے۔ جب غزل بھی آپ کی اپنی ہے۔"

اور چاند کا یہ ٹکڑا، سورج کا گولا بن کر نشاط کی رُوح کو پھونکنے لگا۔ اُسے خاموش دیکھ کر سائرہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ اور اُٹھ کر بُرقعہ اوڑھتی ہوئی بولی۔

"معاف کیجیے گا نشاط صاحب! میں آپ کو غلط سمجھی۔"

"اور میں بھی!" یہ کہہ کر وہ بنچ پر اوندھے مُنہ لیٹ گیا۔ وصل کا چاند غروب ہو گیا۔ نشاط کا تخیل پھر ہجر کی ظلمتوں میں کھو گیا۔ نئے فن پاروں کی جستجو میں پلکیں بھیگنے لگیں۔ دھڑکنیں ڈوبنے لگیں۔

طنزیہ

افواہیں

جہاں گرد کے قلم سے

جہاں گرد چاروں کھونٹ گھومتا ہے۔ افواہیں جمع کرتا ہے۔ اُسے افواہیں جمع کرنے کا جنون ہے۔ یہ جنون اس لئے ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ جنون کے پیچھے ہوش ہوتا ہے۔ افواہوں کے پیچھے تلخ حقیقتیں ہوتی ہیں۔

ہند سرکار اس تجویز پر بڑی سنجیدگی سے غور کر رہی ہے کہ ملک بھر کے شاعروں کو راست پر لیا جائے تاکہ انہیں بھی سماج میں کوئی واضح مقام مل سکے۔

ہند سرکار کے پاس اس قسم کی نئی شکایات پہنچی ہیں کہ بے روزگاری، شاعروں کا سب سے بڑا پرابلم ہے۔ بلکہ بہت سے بے روزگار جب روزی نہیں کما سکتے تو شاعر بن جاتے ہیں۔ اعداد و شمار کے مطابق ملک کو جتنی شاعری کی ضرورت ہے، شاعروں کی تعداد اس ضرورت سے سو گنا زیادہ ہے۔ اور یہ صورت حالات انتہائی خوفناک ہے۔ اس قسم کے نقصانات ہو رہے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان پڑھ لوگ بھی شاعر بن رہے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ جوں جوں شاعر بڑھ رہے ہیں، شاعری کی قدر و قیمت کم ہوتی جا رہی ہے۔ اور اس صورت حالات کی واحد وجہ یہ ہے کہ شاعروں کا کوئی سماجی مرتبہ نہیں ہے۔ ایک بڑھئی، ایک ٹائپسٹ، ایک لوہار، حتیٰ کہ ایک نائی کا بھی سماجی مقام ہے، لیکن شاعر کی روزی کا کوئی باقاعدہ انتظام نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ کئی شاعر بھوک سے تنگ آکر کلرک بن جاتے ہیں۔ منیم بن جاتے ہیں، بڑھئی بن جاتے ہیں، حتیٰ کہ ایک شاعر کو تو کپڑے کی ایک دکان پر "سیل انچارج" کے طور پر کام کرتے دیکھا گیا ہے۔

لہٰذا شاعروں کو سماجی مقام دلانے اور شاعری کی لاج رکھنے کے لئے سرکار مندرجہ ذیل انتظامات پر غور کر رہی ہے۔

۱۔ ٹیسٹ لے کر شاعروں کو شاعری کے پرمٹ دئے جائیں۔ صرف پرمٹ بردار شاعر ہی شاعری کر سکیں گے ایرے غیرے نہیں۔

۲۔ صرف اُسی شاعر کو شاعری کا پرمٹ جاری کیا جائے گا جو نہ صرف ٹیسٹ میں پاس ہو جائے بلکہ شاعری کے علاوہ کسی نہ کسی صنعت میں بھی کام کرنے کے قابل ہو۔

۳۔ تمام پرمٹ یافتہ شاعروں کو سرکار کی طرف سے پانچ پانچ ہزار روپے بطور قرضہ دئے جائیں۔ تاکہ وہ اُس روپے کی مدد سے کوئی کاروبار یا سمال سکیل انڈسٹری جاری کر سکیں۔

۴۔ ریڈیو پر، مشاعروں میں، رسائل میں اور جلسوں میں اور فلموں میں صرف پرمٹ یافتہ شاعروں کو مدعو کیا جائے اور ان کے زمروں کے مطابق انہیں معاوضہ دیا جائے۔

۵۔ آئندہ پانسالہ پلان میں نئے شاعروں کی حوصلہ شکنی کی جائے تاکہ شاعری کی وبا کو زیادہ پھیلنے سے روکا جا سکے۔ اور آنے والے کم سے کم پندرہ برس تک موجودہ شاعروں کی کھپت سے ہی گذارا کیا جائے۔

سُنا ہے اس انقلابی تجویز کی روشنی میں پرمٹ جاری کرنے والی جو مشینری مقرر کی جائے گی وہ بلند کردار کے لوگوں پر مشتمل ہوگی تاکہ پرمٹ دیتے وقت کرپشن کا سلسلہ شروع نہ ہو جائے کیوں کہ آج تک ہند سرکار کا ہر اچھا منصوبہ کرپشن کا شکار ہو جاتا رہا ہے۔

واشنگٹن میں افواہ پھیلی ہوئی ہے کہ یہاں ایک ڈاکٹر نے بے حد حیرت انگیز تجربہ کیا۔ کہ اپریشن کے ذریعہ ایک کلرک کا دماغ نکال کر ایک بزنس مین کے سر میں فٹ کر دیا اور بزنس مین کا دماغ کلرک کے سر میں منتقل کر دیا۔ نتیجہ بڑا دلچسپ مگر دردناک نکلا۔ کہ اب وہ بزنس مین تیزی سے اپنا بزنس تباہ کرتا جا رہا ہے اور ممکن ہے کہ چند ماہ تک کلرک بن کر رہ جائے اور دوسری طرف کلرک کا جھکاؤ تیزی سے بزنس کی طرف ہو رہا ہے اور وہ دولت مند ہوتا جا رہا ہے۔ اور کلرکی کو ترک کرنے کے متعلق سوچ رہا ہے۔

جب یہ افواہ ہندوستان میں پہنچی۔ تو سنا ہے، یہاں کئی حضرات کے دل تک پہنچی ہے چنانچہ سوشلسٹ لیڈر ڈاکٹر رام منوہر لوہیا اپنے احباب کی محفل میں کہتے

سُنے گئے ہیں۔ کہ اگر پردھان منتری نہرو دماغوں کے اِس دوستانہ تبادلہ پر رضامند ہو جائیں۔ تو وہ اپریشن کراکر اپنا دماغ پردھان منتری کو دینے کے لئے تیار ہیں۔ اسی طرح ماسٹر تارا سنگھ جی اکالی لیڈر اپنا دماغ سردار پرتاب سنگھ کیروں کے ساتھ بدلنے کے متعلق سوچ رہے ہیں۔ اگرچہ جہاں گرد نے جب شری مرارجی ڈیسائی سے اِس سلسلے میں استفسار کیا۔ تو انہوں نے مُسکراتے ہوئے فرمایا۔ "ہندوستان بھر میں کونسا ایسا آدمی ہے۔ جس میں میرے دماغ سے زیادہ صلاحیتیں ہوں۔ اِس لئے میں اپنا دماغ تبدیل کرانا اپنی ہتک سمجھتا ہوں۔" البتہ شری پاٹل نے تمنا ظاہر کی۔ کہ میں اپنا دماغ کسی کمیونسٹ لیڈر سے بدلنے پر تیار ہوں۔ تاکہ میں یہ دیکھ سکوں۔ کہ انسان میں کمیونسٹ دماغ پاکر کونسی تبدیلی آجاتی ہے۔ لیکن یہ تبدیلی صرف عارضی ہوگی۔ کیونکہ میں مستقل طور پر کمیونسٹ دماغ پاکر عذاب میں مبتلا رہنا نہیں چاہتا۔"

بہرکیف "انتقال دماغ" کا یہ اپریشن اگر ہندوستان میں انتہائی سستے داموں ہوتا شروع ہوگیا۔ تو خطرہ ہے کہ ہر ہندوستانی ایک دوسرے سے اپنا دماغ تبدیل کرالیگا۔ اور یہاں ایک دلچسپ صورتحالات پیدا ہو جائے گی۔ اگرچہ جہاں گرد کا خیال ہے۔ کہ اِس سے ہندوستانی معاشرے میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوگی۔ کیونکہ دماغ تو بدستور وہی کے وہی اور اتنی ہی تعداد میں رہیں گے۔ صرف ایک کا دماغ دوسرے کے دماغ میں چلا جائیگا۔ اِس سے نہ کوالٹی بڑھے گی نہ تعداد۔

●————————

دہلی کے مرد سماج میں یہ افواہ بڑی بُری طرح گشت لگا رہی ہے کہ پچھلے دنوں دہلی کے قریب ایک گھنے جنگل میں دہلی کی تمام حسین ترین عورتوں کی ایک خوفناک میٹنگ منعقد ہوئی اور اِس خوفناک میٹنگ میں نہایت افسوسناک فیصلے کئے گئے۔ جو قریب قریب سبھی مردوں کے خلاف تھے۔

مثلاً سب سے پہلا فیصلہ یہ کیا گیا۔ کہ مردوں سے سگرٹ نوشی کی عادت قطعاً چھڑا دی جائے۔ پہلے اُنہیں ایک مہینے کا نوٹس دیا جائے اور اگر وہ سگرٹ ترک نہ کریں تو اُن کا بائیکاٹ کر دیا جائے۔ یعنی کوئی حسین عورت اُن سے محبت نہ کرے۔ اُنہیں کنکھیوں سے نہ دیکھے، اُن کی طرف دیکھ کر مسکرائے نہیں، شرمائے نہیں۔ کوئی ناز و ادا دکھائے نہیں (اِس میں شادی شدہ محبت اور کنواری محبت دونوں شامل ہیں۔)

اِس فیصلے سے دہلی کے مردوں میں کھلبلی مچی ہُوئی ہے۔ سنا ہے کچھ خاوندوں کو اپنی حسین بیویوں کے تحریری نوٹس موصول بھی ہو چکے ہیں۔ کنواری حسیناؤں کے ترکِ محبت کے نوٹس جاری کرائے گئے ہیں یا نہیں، اس کے متعلق جہاں گرد کو ابھی اطلاع نہیں ملی۔ کیونکہ یہ نوٹس خفیہ طور پر اور زبانی دئے جا رہے ہونگے۔ بہرکیف محبت کے ماحول میں تناؤ کی سی ایک کیفیت پیدا ہوگئی ہے اور مرد حضرات سوچ رہے ہیں کہ کے اِس بائیکاٹ کا مردانہ شان سے ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے۔ اور حسیناؤں کی بجا بدشکل عورتوں کے ساتھ محبت شروع کر دی جائے۔ اِس میں خطرہ صرف یہ ہے۔ کہ عورتیں کہیں صورت حالات سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائیں۔ اور اپنی محبت کا ریٹ کا اونچا نہ کر دیں۔

اگر حسیناؤں نے اپنے بائیکاٹ سے دہلی کے مردوں کو چاروں خانے چت گرا دیا۔ تو اس تجربہ کو ہندوستان بھر میں آزمایا جائے گا۔ غرض محبت کی دنیا میں ایک شدید کرائسیس آنے والا ہے

دیکھیں کیا بنتی ہے قطرے پر گہر ہونے تک

●————————

پاکستان سرکار نے اخباروں کو نیشلائز کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ لیکن ہندوستان اِس سے بھی آگے جانے پر غور کر رہی ہے، افواہ ہے۔ کہ ہند سرکار تمام اخباروں کو قطعی طور پر بند کر رہی ہے۔ کیوں کہ ماہرین کی رائے ہے کہ اخبارات ہی ملک میں انتشار بدنظمی، بغاوت اور بے چینی پھیلاتے رہتے ہیں اور ہر صبح گھر گھر میں پہنچ کر عوام کو بیوقوف بنا رہے ہیں۔ اگر اخبارات بند کر دئے جائیں۔ تو ممکن ہے قوم سکھ اور چین کی زندگی گزارنے لگے۔

چنانچہ تجویز کیا گیا ہے، کہ اخبارات روزانہ کی بجائے ماہانہ شائع ہوا کریں، جن میں مہینہ بھر کی خبروں کا خلاصہ شائع کیا کریں۔ ریڈیو پر سے بھی مہینہ میں صرف ایک بار خبریں نشر کی جایا کریں۔ ان خبروں میں لیڈروں کے بیانات بالکل شائع نہ کئے جائیں۔ اِس سے مقصد یہ ہے۔ کہ لوگ باگ اخباروں سے نجات پاکر کچھ تعمیری کاموں کی طرف وقت اور توجہ دے سکیں گے۔

اگر اِس تجویز پر عمل شروع ہوگیا تو خیال کیا جاتا ہے کہ پچانوے فیصدی لیڈر اپنی لیڈری ترک کر دیں گے اور صرف پانچ فی صدی لیڈر بچ جائیں گے۔ جو صحیح معنوں میں عوام کی خدمت کیا کریں گے۔ اور پچانوے فی صدی لیڈر اخبارات کی چھلنی میں سے "چھن کر باہر نکل جائیں گے۔

●————————

دہلی کی جنتر منتر روڈ پر ایک دردناک افواہ اُڑ رہی ہے۔

جنتر منتر روڈ پر صدر کانگرس شری کامراج کا ہیڈکوارٹر ہے۔ سنا ہے، شری کامراج نے کانگرس کے تمام وزیروں، ممبرانِ پارلیمنٹ، ممبرانِ اسمبلی اور دوسرے

اسے کانگرسی لیڈروں کو ایک خطرناک سرکلر بھیجا ہے۔ کہ آیئے، ہم ایک بار پھر اُس
یادگار کو تازہ کریں، جب انگریز سرکار کے خلاف آزادی کی جدوجہد میں بدیشی
مال کا بائیکاٹ کیا جاتا تھا اور انگریزی لباس اور اس کی ہولیاں جلائی جاتی تھیں۔ تمام
لیڈر اپنے گھروں، یعنی بنگلوں اور کوٹھیوں کے باہر اس ہولی کا انتظام کریں لہٰذا
گھروں میں معمولی ضرورت سے زیادہ جتنے بھی کپڑے ہیں۔ چاہے وہ دیسی ہیں یا
بدیسی، مردوں کے ہیں یا اُن کی بیگمات کے۔ سب کپڑے باہر نکال کر ایک ڈھیر
بنا دیا جائے۔ اور اُن کی ہولی جلا دی جائے۔ تاکہ اس سے عوام پر ایک بار پھر واضح
ہو جائے۔ کہ کانگرسی لیڈر آج بھی قربانی کر سکتے ہیں۔

سنا ہے یہ ہولی سسٹم، دراصل کامراج پلان کا ایک حصہ ہے۔ پہلا حصہ
وزیروں کے استعفیٰ کے متعلق تھا، دوسرا کپڑوں کی ہولی کا۔ اور کہا جاتا ہے کہ کامراج
کے تھیلے میں ابھی "قربانیوں" کے اور کئی حصے بھی موجود ہیں۔ جو آہستہ آہستہ باہر آتے
جائیں گے جو کانگرسی لیڈروں کو آہستہ آہستہ بالکل "عوام" بنا کر رکھ دیں گے۔

آچاریہ شنکر راؤ دیو جو اپنی رہنمائی میں ایک "امن جتھہ" لے کر چین کی طرف گئے تھے
آج کل بڑے پریشان ہیں۔ کیونکہ چین نے اُن کے جتھہ کو داخلہ کی اجازت نہیں دی۔ اُس کے
بعد انہوں نے پاکستان جانا چاہا۔ مگر وہاں بھی داخلہ کی اجازت سے انکار کر دیا گیا۔
لہٰذا اب وہ پریشان ہیں۔ کہ امن کا پیغام کس ملک میں لے کر جائیں۔ کیونکہ وہ ہندوستان
واپس آکر شرمندہ نہیں ہونا چاہتے۔ لہٰذا ایک افواہ کے مطابق انہوں نے فیصلہ کیا ہے
کہ چاند کی سرزمین پر جا کر وہاں کے عوام کو امن اور اہنسا کا پیغام دیں۔ چنانچہ
انہوں نے امریکہ اور روس کی سرکاروں کو ایک درخواست بھیجی ہے۔ کہ ہمیں ایک خلائی
جہاز عنایت کر دیا جائے۔ تاکہ ہم چاند پر پہنچ کر اپنے مشن کی تکمیل کر سکیں۔ کیونکہ
زمین پر تو ہمیں کوئی داخلہ کی اجازت نہیں دیتا۔ اور ہم عدم تشدد کے حامی تشدد کے
ذریعے کسی ملک میں اندر گھسنا نہیں چاہتے۔

جہاں گرد نے آچاریہ جی سے جب ایک انٹرویو کیا تو انہوں نے آنکھوں سے
آنسو بہاتے ہوئے کہا۔ "اگر ہمیں راکٹ بھی نہ ملے۔ تو ہم بھگوان سے پرارتھنا کریں گے
کہ ہمیں اس دُنیا سے اٹھا لے۔ کیونکہ اُس کے بعد ہمارے زندہ رہنے کا کوئی مقصد
باقی نہیں رہ جاتا۔"

پچھلے دنوں ایک ہاتھی نے سپریم کورٹ میں درخواست دائر کی جس میں مطالبہ
کیا تھا کہ ہند سرکار نے اُس کی آبائی جگہ پر ناجائز قبضہ کر رکھا ہے۔ وہ اُسے واپس
دلایا جائے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک بہت بڑے وکیل کی شہہ پر ہاتھی نے یہ دعویٰ دائر
کیا ہے۔ دعویٰ کی رو سے جہاں آجکل ہند پارلیمنٹ بنی ہوئی ہے کسی زمانہ میں یہاں
ایک گھنا جنگل تھا اور اُس جنگل میں ایک پہاڑی کی کھوہ میں مُدعی ہاتھی کے آباؤ اجداد
رہا کرتے تھے۔ اور اگر آج بھی پارلیمنٹ کی بلڈنگ کے نیچے کھدائی کی جائے۔ تو وہ کھوہ
نظر آ جائے گی اور ہاتھیوں کی رہائش کے آثار بھی مل جائیں گے۔ ہاتھی کے وکیل کو
یقین ہے کہ قانون اور انصاف کی رو سے ہاتھی کے مقدمے جیتنے کے امکانات بہت
روشن ہیں۔ جہاں گرد کو معلوم ہوا ہے کہ وکیل مذکور اور ہاتھی میں شاید ایک خفیہ معاہدہ
ہو چکا ہے۔ کہ اگر ہاتھی مقدمہ جیت گیا۔ تو پارلیمنٹ کی آدھی زمین وکیل صاحب کو لیز
پر دے دیگا۔

سنا ہے کہ ایک سابق مغل شہزادہ جو آج کل ایک لانڈری میں کام کرتا ہے
اس مقدمہ کے نتائج کا بڑی بے صبری سے انتظار کر رہا ہے۔ کہ اگر ہاتھی کو آبائی جائیداد
مل گئی۔ تو وہ مغل شہزادہ بھی ہند سرکار پر یہ دعویٰ کر دیگا۔ کہ ساری دہلی کی زمین اُس کی
آبائی جائداد ہے، کیونکہ یہ اُس کے مغل اجداد کی راجدھانی تھی۔ اور انہوں نے ساری دہلی جو
جو کبھی جنگل تھی، ہاتھیوں، بھیڑیوں، چیتوں، شیروں اور بلاؤ بگڑوں کو باقاعدہ معاوضہ ادا کر کے
حاصل کی تھی۔

ننھی منی افواہیں

۱۔ سابق وزیر خزانہ شری مُرار جی ڈیسائی نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ وہ بھی پنڈت نہرو
کی طرح اپنے کوٹ پر گلاب کا پھول لگایا کریں گے۔

۲۔ سوشلسٹ لیڈر ڈاکٹر لوہیا نے صدر کانگرس شری کامراج کو انگریزی میں ایک
خط لکھا ہے۔ کہ اگر چھ ماہ کے اندر اندر آپ نے ہندی زبان نہ سیکھی تو میں آپ کے
گھر کے باہر بھوک ہڑتال کر دوں گا۔

۳۔ سیٹھ ڈالمیا اپنے تمام دھن دولت پر لات مار کر جنگلوں میں تپسیا کے لئے جا رہے
ہیں کہ ساری جائداد نیشنل ڈیفنس فنڈ میں دے دیں گے۔

۴۔ ممبر پارلیمنٹ سوامی رامیشورا نند جی گذشتہ دنوں ایک دُکان سے انگریزی
کا قاعدہ خریدتے ہوئے دیکھے گئے۔

۵۔ ہوم منسٹر شری گلزاری لال نندہ نے سرکاری ایڈمنسٹریشن میں سے کرپشن ختم
کرنے کی جو میعاد دو سال رکھی تھی۔ اب وہ پانچ سال کر دی گئی ہے۔ اور پانچ
سال کے بعد اگر ضرورت محسوس کی گئی تو پانچ سال اور بڑھا دی جائے گی۔

آنکھوں کی تندرستی اور دلکشی کے لئے
بھیم سینی
کاجل
ہر جگہ
بکتا ہے
رس کیلا نگر دہلی ۶
ڈسٹری بیوٹرز:۔ میسرز منوہر ٹریڈنگ کمپنی
امرت مارکیٹ۔ صدر بازار دہلی

افسانہ

شاہکار

صفدر محمود بی۔ اے

نیو ہوسٹل گورنمنٹ کالج کمرہ نمبر ۱۹۳ لاہور (مغربی پاکستان)

۱۹ر جنوری ۱۹۶۴ء مدیر محترم! خوشنوشتہ گرامی! سلام مسنون

ایک عرصے سے بیسویں صدی کی محفل میں شریک ہونے کا شوق رہا ہے۔ اسی کی تکمیل کے لئے شاہکار بھیج رہا ہوں۔ میری پہلی تخلیق اور شاہکار! کتنی عجیب بات ہے! پھر بھی یہ شاہکار ہے! . . . .

مخلص ——— صفدر محمود

شیریں ابھی دوکان کے سامنے پہنچی ہی تھی کہ اندر سے آواز آئی "اندر تشریف لے آئیے" اور وہ جھجکتی ہوئی اندر داخل ہو گئی

"تشریف رکھئے!"

وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ اور خالی خالی نگاہوں سے دیواروں پر لٹکی ہوئی تصویروں کو دیکھنے لگی۔

چند لمحوں کے بعد فوٹوگرافر نے رجسٹر سے نگاہ اوپر اٹھاتے ہوئے پوچھا "آپ فوٹو کھنچوائیں گی نا؟"

"جی ہاں" اس کے ہونٹ تھرتھرائے

"کونسا سائز؟"

"پاسپورٹ سائز"

"بہت اچھا" کہہ کر فوٹوگرافر دائیں طرف والے کمرے کا پردہ اٹھا کر اندر داخل ہو گیا۔

چند لمحوں کے بعد اس نے پردہ سرکاتے ہوئے کہا "آئیے کیمرہ تیار ہے"

اور وہ کیمرے والے کمرے میں آ گئی۔ سامنے دیوار پر ایک نہایت خوبصورت پردہ آویزاں تھا اور ساتھ ہی ایک چھوٹا سا اسٹول رکھا تھا۔ وہ اسٹول پر ذرا ایک طرف مڑ کر بیٹھ گئی۔

فوٹوگرافر نے جھٹ سے سارے بلبوں کا رخ اس کے چہرے کی طرف کر دیا اور قریب آ کر شیریں کا پوز ذرا ٹھیک کیا۔ اور پھر کیمرے کے پیچھے جھک کر سیاہ پلیٹ پر پڑتا ہوا شیریں کا عکس غور سے دیکھنے لگا۔ اور پھر قریب آ کر کہنے لگا۔

"اِف یو ڈونٹ مائنڈ پلیز ایک بات کہوں؟"

"جی ضرور کہئے"

"میرا خیال ہے کہ آپ کی تصویر بہت شاندار آئے گی اور مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے اسے میرا شاہکار قرار دیا جائے گا" شیریں کے چہرے پر تعجب آمیز حیرت کے نقوش ابھر آئے اور لاشعوری طور پر اس کے منہ سے نکل گیا "کیوں؟"

"آپ کے خدوخال نہایت متناسب اور حسین ہیں۔ پھر آپ کے چہرے پر معصومیت کی ہلکی سی جھلک ہے۔ ایسے چہرے کی تصویر اکثر بہت حسین اترتی ہے"

شیریں یوں اپنے حسن کا قصیدہ سن کر شرما گئی اور اس کے رخساروں پر حیا کی سرخی پھیل گئی اور پھر اس کا چہرہ انتہائی مسرت سے کھل اٹھا دوسرے لمحے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے اندر کی عورت انگڑائی لے کر جاگ اٹھی ہو اور اس میں بے پناہ خود اعتمادی آ گئی۔ اس کے ہونٹ مسرت سے پھول کی پنکھڑیوں کی مانند پھڑپھڑائے اور غیر ارادی طور پر اس کے منہ سے نکل گیا "اچھا؟" اور جیسے فوٹوگرافر کو مزید کچھ کہنے کا موقع مل گیا "ہاں!" اس نے شیریں کی ——— ٹھوڑی کو ذرا اوپر اٹھاتے ہوئے کہا "یہ لانبی لانبی سیاہ پلکیں جو ان چمکدار آنکھوں پر سیاہ جال تن رہی ہیں یہ خوبصورت سی ناک یہ گلاب سے رخسار تصویر کو جاندار بنا دیں گے۔ اور ہاں! اگر یہ لٹ پیشانی پہ بکھر جائے تو قیامت آ جائے!" اور اس نے آگے بڑھ کر آوارہ بالوں کی ایک لٹ

پیشانی پر بکھری ہوئی لٹیں سیاہ بدلیوں کے آنچل ہیں۔ اور شیریں کے چہرے پر مسکراہٹ اور بھی گہری ہو گئی۔

فوٹو گرافر نے جھٹ سے ریڈی کہا اور کیمرے کا بٹن دبا دیا۔

"فکر نہ کیجئے اگلی ہی وقت آکر لے جائیے گا۔ مجھے یقین ہے یہ تصویر میرا شاہکار رہے گی!"

شیریں وہاں سے اٹھی اور دوپٹے کا پلو انگلی پر لپیٹتی ہوئی باہر نکلی اور گھر کی جانب قدم بڑھانے لگی۔ چلتے ہوئے اُسے ایسا احساس ہو رہا تھا جیسے وہ فلک پر چل رہی ہے اور اس کے قدموں کے نیچے کہکشاں بچھی ہوئی ہے۔ وہ فاتحانہ نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھتی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ گھر پہنچ کر وہ اپنے کمرہ میں چلی گئی اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ قدآدم آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر وہ اپنی شخصیت اور چہرے کے حسین نقوش کا جائزہ لینے لگی اور پھر فوٹو گرافر کے شہد بھرے الفاظ اُس کے ذہن کے لوح پر اُبھرنے لگے اور وہ آپ ہی آپ شرما گئی۔

ستواں ناک، زرد رخسار اور کھلتا ہوا رنگ ـــــ وہ قبول صورت تو ضرور تھی لیکن اتنی غیر معمولی حسین نہیں جتنا وہ آج محسوس کر رہی تھی۔ یوں تو ہر انسان اپنی تعریف سن کر خوش ہوتا ہے لیکن جوانی کی حدود میں قدم رکھتی ہوئی عورت اِس طرح کسی مرد سے اپنی تعریف سن کر تو ستاروں کو چھونے لگتی ہے اور آج شیریں قدآدم آئینے کے سامنے کھڑی نہ جانے کن بلندیوں پر پرواز کر رہی تھی اور اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ آج تک تاریکی میں رہی ہے جیسے اُسے آج تک اپنی چھپی خوبیوں کا علم ہی نہ تھا۔ جیسے اُسے اپنی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ ہی نہ تھا۔ سوچ کے اس دھارے میں بہتے ہوئے وہ اتھاہ گہرائیوں میں کھو گئی اور فوٹو گرافر کے کہے ہوئے فقروں کی بازگشت اُس کے کانوں میں گونجنے لگی اور اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی بہت میٹھی چیز کانوں کے راستے دل و دماغ اور اس کی روح میں دھیرے دھیرے اُتر رہی ہے "شاید آپ کی تصویر میرا شاہکار قرار دی جائے!" وہ آپ ہی آپ مسکرا دی۔

اچانک سوچتے سوچتے اُس کے ذہن کے اُفق پر کئی ستارے چمکنے لگے۔ پھر کئی ستارے آسمان سے ٹوٹ کر فضا میں بکھر گئے۔ لیکن ایک درخشاں ستارہ بڑی آب و تاب سے چمکتا رہا۔ اور اُس کی روشنی باقی فضا پر چھا گئی۔ لمحہ بہ لمحہ روشنی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ ستارہ بڑھتے بڑھتے شکیل کا مسکراتا چہرہ بن گیا۔ خوابیدہ یادیں انگڑائی لے کر بیدار ہو گئیں اور شکیل کا سنجیدہ سا چہرہ اس کی نظروں کے سامنے لہرانے لگا۔ شکیل ـــــ اُس کا محبوب! اور وہ سوچنے لگی وہی شکیل جسے وہ دل کی پوری گہرائی سے چاہتی ہے جو اس کے من کا راجہ ہے۔ جس کی صورت اُس نے اکثر ستاروں کی روشنی اور پھولوں کی مہک میں جھلکتی دیکھی ہے۔ جس کے حسین خیالوں سے اُس نے اپنے خوابوں کی دنیا سجائی ہے۔ جو میری روح کی گہرائی میں اُتر گیا ہے۔ اور وہ بھی تو مجھے دل کے مندر میں بٹھا کر پوجا کرتا ہے اُس کے دل کی دھڑکنوں کو اکثر میں نے اپنا نام پکارتے سنا ہے۔ شکیل اُس کے بچپن کا ساتھی جسے اُس نے اپنے جیون کا ساتھی بنانے کا پورا ارادہ کر لیا ہے۔ اُسے اپنی محبت کا کتنا دعویٰ ہے لیکن اُس نے کبھی میری ان خوبیوں کا اعتراف نہیں کیا۔ بہت کم باتیں کرتا ہے ہر وقت سنجیدہ رہتا ہے۔ اُس نے کبھی یہ بھی نہیں کہا کہ "تم بہت حسین ہو"۔ جب بھی آئے گا کوئی نہ کوئی نصیحت یا تجویز پیش کرے گا "شیریں یہ لباس اچھا نہیں۔ یہ رنگ زیادہ شوخ ہے۔ بالوں کو اس طرح پیشانی پر مت بکھیرا کرو . . . . ."

یہ احساسات کچھ باغیانہ ثابت ہوئے اور اس کا ذہن ایک بار پھر خیالات میں ڈوب گیا ـــــ نہ جانے اُسے مجھ سے الفت ہے بھی یا نہیں۔ بڑا بنا پھرتا ہے۔ نہ جانے خود کو کیا سمجھتا ہے۔ ہر وقت بے حد سنجیدہ موڈ میں ہوتا ہے۔ ان مردوں کو سمجھنا بہت مشکل ہے دل میں کچھ ہوتا ہے اور ظاہر میں کچھ اور ـــــ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور اُس محبت کے دیئے جھلملانے لگے۔ نئی نئی بدگمانیوں نے جنم لیا اور وہ دل ہی دل میں کہنے لگی شاید اُسے مجھ سے محبت ہی نہیں۔ وہ باجی سے محبت کرتا ہوگا اِسی لئے جب بھی آتا ہے بس باجی سے دیر دیر تک باتیں کرتا رہتا ہے کبھی اُن کے انتخاب کی داد دیتا ہے۔

اتنے میں اُس کے کانوں میں باہر سے شکیل کی آواز آئی اور اُس کے خیالات کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ شکیل باجی سے کہہ رہا تھا ـــــ "باجی آج تو بہت سمارٹ نظر آ رہی ہیں کہیں نظر نہ لگ جائے!" اور شیریں جھلا کر رہ گئی۔

چند لمحوں کے بعد اُس نے شکیل کے قدموں کی چاپ سنی۔ شاید وہ اُس کے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اور شیشے سے ایک دم ہٹ کر بستر پر آن گری۔ شکیل نے آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔

"شیریں سیر کے لیے چلو گی؟"

وہ تو پہلے ہی بھری بیٹھی تھی اور ایک دم جیسے لاوا پھٹ پڑا "جی نہیں . . . . . . مجھے کالج کا کام کرنا ہے!" اور شکیل تیور بدلے ہوئے دیکھ کر واپس چلا گیا۔

دوسرے دن شیریں نے بہت اہتمام سے میک اپ کیا۔ ہلکے سے رنگ کی ساڑی پہنی اور قدآدم آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر بال سنوارنے لگی۔ آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ کر وہ خود ہی کہہ اٹھی "اُف۔ قیامت!" تیار ہو کر وہ تصویر لینے فوٹو گرافر کی دوکان کی طرف چل دی۔ راہ چلتے ہوئے اُسے بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ آج وہ اس کے حُسن سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

تصویریں کل سے کہیں زیادہ حسین نظر آرہی ہوں۔ آج وہ مجھے دل کھول کر داد دے گا شاید وہ بیچارہ میری محبت کے دام میں اسیر ہو گیا ہے۔ وہ اپنے شاہکار کو دیکھ کر نہ جانے کتنی دیر خیالات میں ڈوبا رہے گا۔

جب وہ دوکان پہنچی تو فوٹوگرافر وہاں موجود نہ تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھ کر بیٹھ گئی۔ اتنے میں فوٹوگرافر کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ شاید وہ کسی کی تصویر اتار رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا "دیکھئے میڈم! آپ کی تصویر کتنی خوبصورت ہو گئی۔ مجھے یقین ہے یہ تصویر میرا شاہکار ہوگی!"

شیریں کی توجہ اس کی طرف مبذول ہو گئی۔ پردہ سرکا اور ایک موٹی بھدی بدصورت سی عورت مسکراتی ہوئی برآمد ہوئی۔ شیریں کو ایسا محسوس ہوا جیسے اسے آسمان سے زمین پر پھینک دیا گیا ہو۔ اور وہ فوٹو لئے بغیر تیزی سے باہر نکل آئی۔

جواب طلب امور کے لئے ہمیشہ اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ یا پوسٹ کارڈ بھیجئے۔ ورنہ ہم جواب دینے سے قاصر رہیں گے۔ پاکستانی ٹکٹ ہندوستان میں کار آمد نہیں ہیں اسلئے پاکستانی بھائی اور بہنیں اس شرط سے مستثنیٰ ہیں (منیجر بیسویں صدی دہلی)

قابلِ مطالعہ منتخب شعری مجموعے

کتاب	شاعر	قیمت
آتش گل	جگر مراد آبادی	پانچ روپے
تحسین چمن	ذاکر اقبال	چھ روپے
جستہ جستہ	حفیظ ملیانی	چار روپے
ہفت رنگ	عرش ملیانی	تین روپے
آہنگِ مجاز	"	ایک روپیہ
سحرِ غزل	ساحر ہوشیارپوری	تین روپے
دستک	نریش کمار شاد	سوا دو روپے
پھوار	"	اڑھائی روپے
للکار	"	سوا دو روپے
قاشیں	"	تین روپے
آیاتِ جنوں	"	ڈیڑھ روپیہ
سنگم	"	تین روپے
رباعیاتِ محروم	تلوک چند محروم	پونے چار روپے
گنجِ معانی	"	ساڑھے سات روپے
شعب	فراق گورکھپوری	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
رمز و کنایات	"	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
مشعل	"	دو روپے ۷۵ نئے پیسے
بیکراں	جگن ناتھ آزاد	چار روپے ۵۰ نئے پیسے
ستاروں سے ذروں تک	"	دو روپے ۷۵ نئے پیسے
کلیاتِ اکبر الٰہ آبادی	اکبر الٰہ آبادی (اوّل)	پانچ روپے
" حصہ دوم	"	چھ روپے
کلیاتِ اختر شیرانی	اختر شیرانی	آٹھ روپے
رعنائیاں	شکیل بدایونی	تین روپے
صنم و حرم	"	دو روپے ۷۵ نئے پیسے
گلِ رعنا	جگی رعنا	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
شبنم شبنم	کرشن موہن	پانچ روپے
دلِ ناداں	"	چھ روپے

کتاب	شاعر	قیمت
خرابات	عبد الحمید عدم	چار روپے
رمِ آہو	"	چار روپے
گلنار	"	دو روپے ۷۵ نئے پیسے
قول و قرار	"	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
گردشِ جام	"	دو روپے ۷۵ نئے پیسے
بطِ مے	"	دو روپے ۷۵ نئے پیسے
گجر	قتیل شفائی	تین روپے
جھومر	"	تین روپے
روزن	"	تین روپے
جلترنگ	"	دو روپے ۶۲ نئے پیسے
گفتنی	مخمور سعیدی	دو روپے
نئی صبح	ضیا فتح آبادی	ایک روپیہ
طلوع	"	۷۵ نئے پیسے
نورِ مشرق	"	ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے
آہنگِ غزل	پورن سنگھ ہنر	دو روپے ۵۰ نئے پیسے
شہرِ دل	محسن زیدی	دو روپے
سفینۂ وصال	عزیز وارثی	چار روپے

آئینۂ اصلاح ابو الفصاحت جوش ملسیانی کی اصلاحات شاگردوں کے کلام پر مع توجیہ اس کتاب میں درج ہیں۔ یہ کتاب مبتدی اور فن نہ جاننے والے شعراء کے لئے رہنما کا کام دے گی قیمت تین روپے

جوش ملسیانی کے مکمل حالاتِ زندگی، انتخابِ کلام شاگردوں کے حالات اور کلام، تصویروں کے ۸۴۰ صفحے ضخامت، ۲۰ صفحات موجودہ دور کی بے مثل کتاب قیمت دس روپے

مضراب قبلہ ملت کے ایک ایک شعر میں اس کا اپنا دل دھڑکتا ہے [illegible]

سارے جہاں کے شاعر دو روپے ۵۰ نئے پیسے قیمت

گلستانِ ہزار رنگ جس میں تقریباً چار ہزار اشعار عنوان وار ترتیب دیئے گئے۔ اس یادگار کتاب کا مقدمہ مولانا ابو الکلام آزاد نے، ہندی کتاب کا ڈاکٹر راجندر پرشاد نے۔ مولانا آزاد اور ڈاکٹر راجندر پرشاد کا نامِ نامی ہی اس امر کی ضمانت ہے کہ یہ کتاب کس پایہ کی ہوگی۔ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین، رشید احمد صدیقی، اور جناب نیاز فتحپوری نے اس کو اس صدی کی بہترین کتاب قرار دیا ہے۔ اردو ایڈیشن دس روپے۔ ہندی ایڈیشن سات روپے ۵۰ نئے پیسے

شاہنامۂ اسلام جناب حفیظ جالندھری کا شاہنامہ چار حصوں میں جس میں تیرہ سو سالہ اسلام کو منظوم کیا ہے۔ ہر حصہ قریباً تین سو صفحات کا ہے۔ تازہ اصلاح کے بعد چھپا ہے۔ قیمتی سولہ روپے اب صرف [illegible] کیا جا رہا ہے۔ محصولڈاک ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے الگ ہوگا

تلامذۂ غالب غالبیات کے شہرہ آفاق ماہر مالک رام صاحب کی گرانقدر تصنیف۔ اس کتاب میں غالب کے ۱۴۶ شاگردوں کی سوانح حیات اور کلام درج ہیں۔ پورے صفحہ کی تقریباً بتیس تصاویر بھی شاملِ کتاب ہیں۔ ہندوستان بھر کے ادیبوں کا فیصلہ ہے کہ کتاب بہترین ادبی تحفہ ہے۔ قیمت فی جلد صرف سات روپے ۵۰ نئے پیسے۔

کفر و ایمان پنڈت ہری چند اختر کا مجموعۂ کلام حضرت اختر کا نامِ نامی ہی اس کتاب کی اہمیت و مقبولیت کا ضامن ہے [illegible] میں طنز کے نشتروں کے ساتھ [illegible] ہے قیمت چار روپے

کلامِ بے لگام [illegible] کا مجموعۂ کلام جس کو [illegible] میں اکبر الٰہ آبادی کا رنگ جھلکتا ہے [illegible] ۲۲۴ صفحات پر مشتمل دوسرا ایڈیشن ختم ہو گیا قیمت [illegible]

پتہ:- رسالہ بیسویں صدی دہلی نمبر ۶

آفسانچہ

شکر پارے

شمیم حنفی ایم۔ اے

۷۴۔ ایم جی۔ ہاؤس الہ آباد یونیورسٹی الہ آباد

۲۲ ر جنوری ۱۹۶۴ء

خوشتر بھائی! تسلیم

"شکر پاروں" کی یہ تیسری قسط اپریل ۱۹۶۴ء کے بیسویں صدی کے لئے ہے۔ ۱۹۶۳ء کی ۴ رمئی کو ۱/۲ ۸ بجے صبح مسکراہٹوں کے اُس سفیر نے سفرِ حیات کی آخری منزل طے کی تھی جس کی یادیں بیسویں صدی کے ہزاروں قارئین کے ذہن میں ان واقعات سے تازہ ہوں گی۔ شوکت تھانوی مرحوم نے قلموں کی ساری دنیا کو قہقہوں کی دولت دی تھی۔ یہ دولت کسی ایک فرد یا ایک قوم یا ایک ملک ہی نہیں ہر اُس شخص کے لئے ہے جو زندگی کے لئے مسرتوں کو لازمی سمجھتا ہے۔

آپ کا ——— شمیم حنفی

مشورہ

ایک بار محرم الحرام کے موقع پر لکھنؤ کی ایک بزم عزا میں شوکت تھانوی کے ایک شیعہ دوست اُنہیں بھی اپنے ساتھ لیتے گئے۔

ذاکر نے جب مصائب اہلِ بیت کا بیان شروع کیا تو حاضرینِ مجلس میں ہر شخص متاثر ہو اُٹھا۔ کتنی ہی آنکھیں اشکبار ہو گئیں اور گلے رندھ گئے۔

شوکت مرحوم کے دوست پر بھی رقت طاری تھی۔ انہوں نے بیقرار ہو کر بلند آواز میں کہا۔

"بخدا اب سُنا نہیں جاتا! کیا کروں؟"

شوکت تھانوی نے اِدھر اُدھر نظر ڈالی پھر چپکے سے اُن کے کان میں بولے۔

"سُنی ہو جاؤ!"

تحفہ

اُس وقت امتیاز علی تاج اور حجاب امتیاز علی کے ساتھ شوکت تھانوی کے علاوہ ایک اور دوست بھی تھے جن کے بال ضرورت سے زیادہ لمبے تھے۔ وہ حضرت اس خوش فہمی کے شکار نظر آتے تھے کہ یہ بال اُن کے حُسن میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ اُن کی شاعرانہ شخصیت کے بھی ضامن ہیں۔

"کیوں صاحب! آپ کی سالگرہ کس تاریخ کو ہوگی؟" شوکت مرحوم نے اچانک اُن سے پوچھا۔

انہوں نے سر کو ایک خفیف سی جنبش دی مسکرائے، پھر ایک خاص اندازِ دلربائی سے سوال کیا۔

"۱۸ راگست کو! لیکن آپ یہ کیوں دریافت کر رہے ہیں؟"

شوکت تھانوی نے بہت سادگی سے کہا ——— "اُس موقع پر میں آپ کو بالوں میں لگانے کا فیتہ اور ربن تحفے میں دینا چاہتا ہوں!"

پیروڈی

خواجہ عزیز الحسن مجذوب بڑی وارفتگی کے عالم میں یہ شعر جھوم جھوم کر پڑھ رہے تھے ؎

کیا سے کیا تُو نے یہ اے شوقِ فراواں کر دیا
پہلے جاں، پھر جانِ جاں، پھر جانِ جاناں کر دیا

شوکت تھانوی سے ضبط نہ ہو سکا۔ جلدی سے بولے۔

"خواجہ صاحب! پہلے میرا مطلع سُن لیجئے!"

"پڑھیئے!" خواجہ صاحب نے ایکبارگی رُک کر غور سے اُن کی طرف دیکھا۔
"عرض کرتا ہوں ؎

کیا سے کیا بیرم کو اکبر تُو نے ہاں ہاں کر دیا
پہلے خاں پھر خانِ خاں، پھر خان خاناں کر دیا

تصویر

یہ ذکر جن مشہور شاعر کا ہے وہ خیر سے بہت گندے رہنے کے عادی ہیں۔

حلیہ ــــ میلے کپڑے، چیکٹ بال، جلد پر میل جمی ہوئی!

بقیہ حالات ــــ منہ اور لباس سے ناگوار بُو کے بھبکے نکلتے ہوئے!

ایک مشاعرے میں جب یہ حضرت مائیک پر آئے تو کسی فوٹو گرافر نے اپنا کیمرہ سنبھالا۔

"کیوں صاحب! میری تصویر لے کر کیا کیجیئے گا؟" انہوں نے مُسکراتے ہوئے سوال کیا۔

فوٹو گرافر سے پہلے شوکت مرحوم بول پڑے ــــ "تصویر اس لئے اُتار رہے ہیں کہ ایک آدمیوں کو ڈرائیں گے۔ دوسرے جو لوگ صفائی کا خیال نہیں رکھتے اُنہیں دکھا کر عبرت دلائیں گے"

ابا کے نام

اُس وقت شوکت تھانوی محمد عمر نام کے ایک نوعمر طالب علم تھے۔

ایک دن انہوں نے اپنے والد کو اپنی تعلیم کے سلسلے میں ایک خط لکھا ساری باتیں لکھنے کے بعد انہوں نے اختتامیہ کے طور پر شعر بھی لکھا تھا ؎

"مانو نہ مانو جانِ جہاں اختیار ہے
ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں"

نزلہ

۲۳ مارچ ۱۹۶۳ء کو ایک سرکاری تقریب میں شوکت تھانوی کی ادبی خدمات کے اعتراف میں اُنہیں حکومتِ پاکستان کی جانب سے تمغۂ امتیاز عطا کیا گیا۔

تمغہ دیتے وقت صدرِ پاکستان نے نہایت محبت سے ہنستے ہوئے کہا۔

"شوکت! تو ہمیں اپنے سفید بالوں سے ڈراتا ہے!"

"جی نہیں! نزلہ گرا ہے" شوکت مرحوم نے مسکرا کر فوراً جواب دیا۔

لیکن سفید بالوں کا وہ ڈر سچ نکلا

اور اس واقعے کے ایک ہی ماہ گیارہ دن بعد ۴ مئی کی صبح "سودیشی ریل" کے

مصنف کو پیامِ موت ملا اور وہ اپنے پیچھے بہت سی یادیں چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے اُس جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آیا۔ ۱۱

روشن پٹیالوی

اجل ہی کے دم سے حیات کو دوام ہے
فنا کے اختیار میں بقا کا انتظام ہے

مصیبتوں کے دم سے ہے مسرتوں کی دلکشی
اگر نہ ہو غمِ حیات زندگی حرام ہے

بر آئے گی نہ آرزو، رہیں گی دل میں حسرتیں
یہ کاروانِ زندگی بہت ہی تیز گام ہے

ہزار بار کہہ دیا کہ عشق شاہِ حسن کا
غلام ہے، غلام ہے، غلام ہے غلام ہے

پلک سے رُک سکے گی کیا، حیا سے دب سکے گی کیا
نگاہِ ناز کے لئے عبث یہ روک تھام ہے

صنم کدے کا کعبے سے بھلا مقابلہ ہی کیا
اِدھر بتوں کی دید ہے، اُدھر خدا کا نام ہے

ہے روشن ایک ایک شعر تیرا دلکش و حسیں
زبان و فن کی خوبیوں کا آئینہ کلام ہے

گیان چند منصور نیمی

کیا کہوں طور ہم نشینوں کے؟
اُن کے دِل میں مزار کینوں کے

لاکھ جاں بخش ہو جمال اُن کا
دل شکن دِل ہیں نازنینوں کے

ظلم سہتا ہوں، ناز اُٹھاتا ہوں
نازنینوں کے، مہ جبینوں کے

موڑ دیتے ہیں رُخ جو طوفاں کا
کب وہ محتاج ہیں سفینوں کے

دورِ حاضر میں اقربا، احباب
سانپ ہیں وہ بھی آستینوں کے

کیوں نہ مہکائیں رُوح کو منصور
شعر، پھر ایسی گُل زمینوں کے

کیفؔ بنارسی (کراچی)

پریشانی بری ننگ محبت ہے دلِ مضطر!
کہیں اہلِ وفا کو بے خلش آرام آتا ہے

فضاؤں پر بہاریں جھومتی محسوس ہوتی ہیں
تصور میں جب اُن کا عارضِ گلفام آتا ہے

کسی کے حسنِ دلکش کو تو کوئی کچھ نہیں کہتا
محبت ہی کے سر ہر طرح کا الزام آتا ہے

کہانی مرگئی

فراز عابدی

۱۴/۸ سی۔ قلعہ پورہ وارانسی

۱۰ ر فروری ۱۹۶۳ء

محترم خوشتر بھائی! آداب

ایک افسانہ "کہانی مرگئی" لے کر "بیسویں صدی" کی بزم میں شریک ہونے کی جرأت کر رہا ہوں۔ اُمید ہے آپ اسے شرفِ قبولیت بخشیں گے۔ اگر آپ اظہارِ حقیقت کو سفارش نہ سمجھیں تو عرض کردوں کہ میرے بزرگ محترم جناب ستی صاحب رام نگری کو یہ افسانہ بہت پسند آیا... اپنی گراں قدر رائے سے نوازیئے گا۔

آپ کا ——— فراز عابدی

آفتاب مغربی گوشے میں لرز رہا تھا۔ اُس کی شعاعیں بلند مکانوں کی سب سے اونچی منزلوں سے لپٹی ہوئی تھیں۔ شعاعوں میں ہلکی سی زردی تحلیل ہو چکی تھی۔ اور سبز و شاداب درختوں کی ہری پتیاں اُن کے سُنہرے عکس میں بہت بھلی معلوم ہو رہی تھیں۔ زمین ہموار تھی اور اُس کی آغوش میں ننھے مُنّے پودے دُور تک پھیلی ہوئی ہری گھاس کے ساتھ ہاتھ ہلا ہلا کر آفتاب کو وداع کر رہے تھے۔ اِن کے حلقے میں زمین کا ایک وسیع اُبھار تھا، جو بلند ہوتا چلا گیا تھا۔ یہاں زمین سخت تھی۔ جگہ جگہ نوکیلے پتھر اُبھرے ہوئے تھے۔ اور کچھ چھوٹے چھوٹے پودے سوکھ کر کانٹا ہو رہے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اِس ہرے بھرے میدان سے اِن کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور یہاں خزاں کا راج ہے۔ ٹیلے کی چوٹی پر قدیم طرز کی ایک گول عمارت نظر آ رہی تھی۔

قافلہ ٹیلے کے دامن میں آکر رُک گیا۔ یہ قافلہ پانچ آدمیوں پر مشتمل تھا۔ اُن میں ایک ہندوستانی تھا اور چار انگریز تھے۔ انگریزوں میں دو جوان مرد تھے۔ ایک بوڑھا تھا، جس کی سفید داڑھی سینے تک لٹک رہی تھی، اور ایک خوبصورت جوان لڑکی تھی۔

"او اوہ! نائس.... ونڈر فل.... بیوٹی فل!!"

لڑکی اپنے چاروں طرف بہار دیکھ کر تقریباً ناچتی ہوئی چیخی۔

"تھینک یو پاپا! ہاؤ ڈو یو ڈو!" وہ فرطِ مسرت سے بوڑھے سے لپٹ گئی۔ بوڑھا مُسکرایا۔

"تمہیں کیسا محسوس ہو رہا ہے راجر———" لڑکی نے پاپا سے الگ ہوتے ہوئے راہبر کو مخاطب کیا۔

"بہت بھلا!" راجر نے مختصر سا جواب دیا۔

لڑکی نے آنکھوں سے دُوربین لگا کر اُس عمارت کو دیکھا۔ اور پھر اپنے کیمرے میں اُس کا عکس اُتار لیا۔ ہندوستانی گائڈ اِن انگریزوں کو اُس عمارت کے متعلق کچھ بتا رہا تھا۔

قافلہ ٹیلے کی سنگلاخ زمین پر آگے بڑھنے لگا۔ ایک پتلی سی پگڈنڈی چکر کاٹتی ہوئی اوپر کو جاتی تھی——— اور دس منٹ بعد یہ لوگ اُس عمارت کو چھو سکتے تھے۔

عمارت کے وسط میں ایک گہرا کنواں تھا۔ اندر مہیب تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اُس کے دہانے کے چاروں طرف لوہے کی موٹی موٹی سلاخوں کا حصار تھا۔ عمارت ایک منزلہ تھی۔ اور اوپر جانے کے لئے ایک طرف زینہ تھا۔ راجر زینے کی طرف بڑھ گیا۔ اُس کے پیچھے پیچھے ریٹی بھی تھی۔ دونوں کھلی ہوئی چھت پر نکل آئے۔ ہوا کے خنک جھونکوں نے اُن کا استقبال کیا۔

دُور دُور تک منظر حسین تھا۔ ریٹی بہت خوش تھی۔ لیکن راجر کچھ آشفتہ تھا۔ اُس کے حزیں چہرے پر آفتاب کی روشنی اور زیادہ زرد معلوم ہو رہی تھی۔ ریٹی نے

زلف

تیری زلفِ سیہ کی یاد میں آنسو چھلکتے ہیں
اندھیری رات ہے، برسات ہے جگنو چمکتے ہیں ——— میر

بیخودی کی پریشاں خیالیاں معلوم
کچھ الجھنوں میں مگر گیسوئے ایاز بھی ہے ——— فراق گورکھپوری

کتنی دلفریب ہے، کتنے بے مثال ہے
زندگی بھی آپ کے گیسوؤں کا جال ہے ——— قدم

بھٹک رہے ہے دھند لکوں میں کاروانِ خیال
بس اب خدا کے لئے کاکلیں سنوار و بھی ——— احمد ندیم قاسمی

رات چھائی تو روئے عالم پر
تیری زلفوں کی آبشار گری ——— فیض

(مرسلہ۔ روشن پٹیالوی بی۔ اے چنڈی گڑھ)

قدرتی مناظر کی کئی تصویریں لیں۔ لیکن راجر کھویا سا اُفق کی سرخیوں میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔

"بہت اُداس ہو!"

رینی نے راجر کے قریب آکر اس کے سلجھے بالوں کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

"کیا یہ مناظر تمہیں مسرت نہیں بخشتے ———؟"

"یہ مناظر مجھے آشفتگی بخشتے ہیں رینی!"

"اور میں ———؟"

رینی راجر کے اور قریب آگئی۔

"کیوں!" اُس نے راجر کے بالوں کو چھیڑا۔ وہ اُس کے بالکل قریب آگئی۔ اتنے قریب کہ......

"نو پلیز!"

"پلیز!" رینی نے چنبیلی کی بیل کی طرح اپنی نازک باہیں اُس کی گردن میں حائل کر دیں۔

"نو!" راجر نے سخت لہجے میں کہا۔ اور اُس نے آہستہ سے گرفت کھول دی۔

رینی خفیف سی ہو کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

منظر ایک لمحے کے لئے حزیں ہو گیا۔

"رینی!"

رینی کچھ نہ بولی۔ اُس کے چہرے پر خفگی اور بیزاری کے آثار صاف عیاں تھے۔

"مجھے معاف کر دو!" راجر نے اس سے قریب ہو کر کہا۔

"آؤ چلیں!" اُس نے رینی کی پتلی کمر کو اپنے مضبوط بازو کے حلقے میں لے لیا اور دونوں زینے کی طرف بڑھ گئے۔

گائیڈ کہہ رہا تھا

اس عمارت کے متعلق بہت سی کہانیاں مشہور ہیں۔ لیکن ایک بوڑھا، جس کی جھونپڑی یہاں سے تقریباً بیس گز کے فاصلے پر ہے ایک پُرلطف کہانی سناتا ہے"

"کیا وہ بوڑھا یہاں تک نہیں آسکتا"، رینی نے پُر اشتیاق لہجے میں پوچھا۔

"فرمایئے!" کسی نے نہایت شائستہ انگریزی میں کہا۔

وہ ایک چونکا دینے والا لمحہ تھا۔ ایک ساتھ دس آنکھیں ایک اسی سال کے سفید ریش بوڑھے کو گھور رہی تھیں۔

"کیا آپ حضرات وہ واقعہ سننا پسند کریں گے جو آج سے نو سو سال پہلے یہاں پیش آیا تھا ———؟"

پُراسرار بوڑھا بولا۔

"ضرور!" رینی کے پاپا نے کہا۔

"تو سنئے!" بوڑھا اُن کے قریب آتے ہوئے بولا

"آج سے نو سو سال پہلے یہاں ایک خوبصورت چرواہی بھیڑیں چرایا کرتی تھی۔ اُس وقت یہاں یہ ٹیلہ نہ تھا، یہ عمارت نہ تھی۔ یہ جگہ ایک چھوٹی سی چراگاہ تھی یہ چراگاہ ایک بہت بڑے دولت مند کی ملک تھی۔ اُس کا اخلاق اچھا نہ تھا۔ وہ بہت ظالم اور بدشعار تھا۔ اُس کا بیٹا اُس سے دو قدم آگے نکلا۔ جب باپ مرگیا تو بیٹے نے وہ حرکتیں کیں کہ یہاں کے باشندوں کی زندگی اجیرن ہو گئی۔ وہ اپنے وقت کا مشہور غنڈہ ہوا۔ اُس نے اپنا نام رانگا رکھا۔"

"چرواہی کا کیا ہوا؟"

راجر نے سوال کیا۔ وہ اس کہانی سے بہت متاثر معلوم ہو رہا تھا جیسے اُس کے ماضی کی گرہیں کھل رہی ہوں۔

"چرواہی بہت خوبصورت تھی۔ اُسے ایک اعلیٰ خاندان کے ایک خوبرو نوجوان سے محبت ہو گئی۔ وہ خوبرو نوجوان بھی اُسے چاہتا تھا۔ دونوں کی محبت رات کی رانی کی دو شاخوں کی طرح آپس میں لپٹتی بڑھتی چلی گئی لیکن ایک دن یہ بیل لوگوں کی نظر میں چڑھ گئی اور دونوں کے بیچ میں خاندان اور دولت کی اونچی دیوار حائل ہو گئی۔ اسی دوران رانگا نے خوبصورت چرواہی کو دیکھ لیا۔ وہ اُسے حاصل کرنے کی

کوشش کرنے لگا ٹھیک اِس ٹیلے کے پیچھے ایک مکان تھا۔ راجا نے خوبصورت چرواہی کو اس میں قید کر دیا اور ایک شام جب راجا اُس کی عصمت کا دامن چاک کر دینا چاہتا تھا، وہ اونچے مکان پر سے کود پڑی اور اس کا جسم اُس غار میں سما گیا جو اُس مکان کے پیچھے تھا۔ پھر کسی کو پتہ معلوم ہو سکا کہ اُس خوفناک غار میں اُس کے جسم کی کیا حالت ہوئی۔ اُس کا محبوب اُس کے غم میں پاگل ہو کر نہ جانے کہاں چلا گیا۔

وقت کے خوفناک تھپیڑوں کو وہ مکان برداشت نہ کر سکا۔ ایک دن مسمار ہو گیا لیکن وہ غار پُر نہ ہو سکا۔ لوگوں کا عقیدہ تھا کہ اُس غار میں خوبصورت چرواہی کی روح بھٹکتی ہے اور وہ غار جبھی پُر ہوگا جب خوبصورت چرواہی کا محبوب اس میں اُتر جائے گا۔

لمحے صدیوں میں جذب ہو گئے۔ اور وہ کہانی مر گئی۔

جب وہ کہانی مر گئی تو کچھ انجان ہاتھوں نے یہاں کنواں کھودنا شروع کیا لیکن کافی گہرائی میں بھی انہیں پانی نہ ملا۔ ایک بار پھر وہ کہانی زندہ ہو گئی۔ ایک ایسا وقت آیا جب وہ کہانی پھر مر گئی۔ پیاسا کنواں برقرار رہا۔ یہاں پیلر کیسے بن گیا اور یہ عمارت کس نے بنوائی؟ یہ ایک الگ سوال ہے۔ لیکن اب تک مجھ سے کئی آدمیوں نے یہ کہا ہے کہ انہوں نے اِس کنویں میں ایک خوبصورت عورت کا وجود محسوس کیا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ وہ ایک بے قرار روح ہے اُس کی آنکھوں میں انتظار کی شمعیں جھلملاتی ہیں۔ اس خوبصورت چرواہی کی بے قرار روح شاید آج تک بے قرار ہے اُس کا محبوب جو ہر شام اس سے پھر ملنے کا وعدہ کر کے جدا ہوتا تھا، شاید اب نہیں آتا۔ اور شاید وہ غار اب تک پُر نہ ہو سکا ہے۔"

پُراسرار بڈھا خاموش ہو گیا۔

لمحے اُداس ہو گئے۔

یکایک اُس چھوٹی سی عمارت میں ایک چیخ گونجنے لگی۔

"مورنا! مورنا! میں آ رہا ہوں۔ تمہارا انتظار ختم ہو گیا مورنا! میں آگیا!!"

راجر دیوانگی کے عالم میں کنویں کے حصار کو پھلانگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ کوئی اُسے روکتا، وہ کنویں میں چھلانگ لگا چکا تھا۔

"میری مورنا!!"

ایک آواز تیزی سے دور ہوتی جا رہی تھی۔

"راجر! راجر!"

رینی کی جگر خراش چیخ اُبھری۔ لیکن راجر بہت دور جا چکا تھا۔

"پاپا"!

رینی اپنے پاپا سے لپٹ کر رونے لگی۔ اور پاپا کی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر رینی کی بھوری زلفوں میں جذب ہو گئے۔

آفتاب غروب ہو چکا تھا ---- کہانی پھر مر گئی!

زلف

ہم جانتے تھے پہلے سے دونو ہیں کج ادا
وہ دن کبھی زلفِ یار سے دل کی بنی نہیں ---- ریاض خیرآبادی

صبحدم زلفیں نہ یوں بکھرائیے
لوگ دھوکا کھا رہے ہیں شام کا ---- قمر جلالوی

سب ہمارے لئے زنجیر لئے پھرتے ہیں
ہم سرِ زلف گرہ گیر لئے پھرتے ہیں ---- ناسخ

مہک مہک سی گئی ہے فضا دو عالم کی
جو تیری زلفِ معنبر ہوا میں لہرائی ---- مظہر نسیم

زلف کو چھیڑا صبا نے ہے ہماری کیا خطا
ہم گرفتارِ بلا ہیں بے خطا پکڑے گئے ---- بہادر شاہ ظفر

مرسلہ: سی۔ کے۔ حفیظ اللہ شریف چک بالاپور

مضمون نگار حضرات سے درخواست ہے کہ وہ بیسویں صدی کے لئے مضامین لکھتے وقت ہمیشہ اختصار سے کام لیا کریں۔ بغرضِ اشاعت موصول ہونے والے مضامین میں سے مختصر افسانوں کو طویل افسانوں پر ترجیح دی جاتی ہے۔ اور طویل افسانے مضمون نگاروں کو واپس کر دیئے جاتے ہیں۔ غیر طلبیدہ مضامین کی واپسی کے لئے مضمون کے ساتھ ٹکٹ بھیجنے کی بجائے اپنا پورا پتہ لکھا ہوا پوسٹ آفس کا لفافہ بھیجیں۔ ورنہ ہم مضمون کی واپسی سے قاصر رہیں گے۔ مضمون کے خاتمہ پر لفظ "غیر مطبوعہ" ضرور لکھیے۔

دلچسپ نئے ناول

طوفانِ بہار رُوس کے عدیم المثال ناول نگار ترگنیف کا رومانی شاہکار ہے جسے حضرت مخمور جالندھری نے اُردو کا لباس پہنایا۔ جس کا ترجمہ دُنیا کی بیالیس زبانوں میں ہو چکا ہے۔ جس کا شمار دُنیا کے دس عظیم رومانی ناولوں میں ہوتا ہے۔ جس کی ایک کروڑ سے زائد جلدیں فروخت ہو چکی ہیں۔ جسے دُنیا کے مشہور نقادوں نے لافانی رومان قرار دیا ہے۔ اور جسے اُردو میں پہلی مرتبہ ادارۂ "بیسویں صدی دہلی" نے شائع کیا ہے۔ یہ ناول پاکیزہ اور دلآویز رومان کی ایک دردانگیز داستان ہے۔ جاذبِ نظر کتابت و طباعت، عمدہ کاغذ، پختہ جلد۔ قیمت فی جلد صرف تین روپے۔

زنجیر ایک گناہ گار لڑکی کی حسین و جمیل داستان، جس کے گناہ یہ تھے کہ وہ غریب تھی۔ وہ حُسن و جمال کا مجسمہ تھی۔ وہ رقص کے ایک اسکول میں کام کرتی تھی وہ تنہا تھی اُس کا دُنیا میں کوئی نہ تھا۔ وہ ایک شریف گھر کے لڑکے سے محبت کرتی تھی چنانچہ وہ ایک شریف وکیل صاحب کو گناہوں کی زنجیر میں جکڑی ہوئی نظر آئی اور وکیل صاحب نے اُسے اپنی بہو بنانے سے انکار کر دیا۔ عشق و محبت کی ایک ایسی پُرپیچ رومان پرور داستان، جسے پڑھ کر آپ عش عش کر اُٹھیں گے، جسے زکی انور نے لکھا اور ادارۂ "بیسویں صدی" نے شائع کیا ہے۔ قیمت فی جلد دو روپے۔

آج کی بات آپ کے محبوب افسانہ نگار جناب جگدیش بل کے دلچسپ، بلند پایہ، رومان پرور افسانوں کا حسین مجموعہ۔ جس کے افسانے آج کے سماج، آج کے معاشرے اور آج کے ماحول کی رنگینیوں، مسرت کوشیوں اور الجھنوں کی ایک ایسی تصویر ہیں جس کے خد و خال کو حقیقت کی لکیروں سے ترتیب دیا گیا ہے آپ ان میں بھرے ہوئے قہقہوں کو اپنے قہقہے۔ ان میں سسکتی ہوئی آہوں کو اپنی آہیں اور ان کے کرداروں کی پلکوں پر لرزتے ہوئے آنسوؤں کو اپنے آنسو سمجھنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

پوسٹ مارٹم جنابِ عرش ملسیانی کے مزاحیہ افسانوں اور مزاحیہ مضامین کا حسین و جمیل مجموعہ۔ جس میں طنز و مزاح، مسکراہٹوں اور قہقہوں کی ایک دُنیا آباد ہے۔ قیمت دو روپے پچیس نئے پیسے۔

پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی دہلی نمبر ۶

دلچسپ نئی کتابیں

سنگ و خشت اُردو ادب میں طنز نگاری کے میرِ کارواں پروفیسر کنہیا لال کپور کے طنزیہ مضامین کا مجموعہ۔ قیمت صرف دو روپے پچاس نئے پیسے۔

چنگ و رباب پروفیسر کنہیا لال کپور کے مزاحیہ اور طنزیہ مضامین کا دوسرا مجموعہ۔ قیمت صرف دو روپے پچاس نئے پیسے۔

ابراہیم لنکن امریکہ کے محبوب ترین صدر کی سوانحعمری —— جس نے غلامی کا قلع قمع کیا اور مساوات اور آزادی کو انسان کا پیدائشی حق قرار دیا۔ قیمت ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے

روبرو جسمانی معذوریوں پر قوتِ عمل کی فتحیابی کی ولولہ انگیز کہانی۔ ایک نابینا کے پیہم تدبر شتاش کوششوں کا مرقع اور اُس کی بلند ہمتی کی دلکش داستان جس کا مفہوم تذکرہ ہے۔ قیمت تین روپے پچیس نئے پیسے۔

نورا ایک قاصد کو اپنے اندر نئی جاذبیت پیدا کرنے کے لئے کیا کیا لامثال قربانیاں دینی پڑیں۔ قیمت صرف دو روپے پچاس نئے پیسے۔

آرزو کی کلیاں امریکہ کے شہرۂ آفاق ناول نگار جان سٹین بیک کے دو مختصر ناولوں کا ترجمہ۔ یہ دونوں ناول انسان کی اُمیدوں، آرزوؤں اور بے کسی و مایوسی کے حسین امتزاج کی داستان ہیں۔ قیمت ایک روپیہ پچھتر نئے پیسے۔

دُنیا کے مشہور سائنس داں یہ کتاب آپ کو اُن سائنس دانوں کی زندگیوں سے رُوشناس کرتی ہے جنہوں نے اپنی ساری عمر تحقیق و تجسس کی نذر کر کے نسلِ آدم کو ترقی کے موجودہ زینے پر پہنچایا۔ اور اُس کی راتوں کو دن بنایا۔ قیمت صرف دو روپے پچیس نئے پیسے۔

اپنی منزل اپنی راہیں ولیم سرویان کا بےنظیر ناول جس کی فلم تیار ہوئی تو ساری دُنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ انسان کے دُکھ سُکھ کی کہانی۔ قیمت صرف دو روپے پچاس نئے پیسے

شکستِ ظلمت یہ ایک اندھی عورت ہیلن کیلر کا افسانۂ زندگی ہے جس نے اپنی اُنگلیوں سے آنکھوں کا کام لیا اور دُنیا سے اپنی ذہانت کا لوہا منوایا۔ قیمت ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے

مابی ڈِک دُنیا کے کلاسیکی آسمانِ ادب کا جگمگاتا تارا۔ ہرمن میلوِل کا مایۂ ناز شاہکار ناول۔ قیمت چار روپے۔

ملنے کا پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی۔ دہلی نمبر ۶

دوستوں کی محفل سے

اختر بستوی

وشنو محل۔ گاندھی نگر۔ بستی (یو۔پی)

۱۸ جنوری ۱۹۶۴ء گرامی قدر! آداب و تسلیمات

دوستوں کی محفل کی کوئی بات دوسروں تک پہنچانا شریعت احباب میں گناہ ہے لیکن کچھ دن ہوئے مجھ سے یہ گناہ دیدہ و دانستہ سرزد ہوا تھا اور میں نے بزمِ احباب کے چند لطائف آپ کی نذر کر دیئے تھے جنہیں آپ نے شرفِ قبولیت بخش کر قارئین تک پہنچا دیا تھا۔ لیجئے آج پھر اسی گناہ کا مرتکب ہو رہا ہوں کیونکہ اس سے لاکھوں لوگوں کی دلبستگی کا سامان مہیا ہو جائے گا ـــــ امید ہے ان لطیفوں کو بھی "بیسویں صدی" کے کسی شمارے میں جگہ مل جائے گی۔ آپ کا سالنامہ اس بار بھی "بیسویں صدی" کی گذشتہ روایات کے مطابق نہایت شاندار ہے . . . .

احقر ـــــ اختر بستوی

سائیکل ہوائی جہاز سے ٹکرا گئی ـــــ ●

ایک کل ہند مشاعرے میں ایک نوجوان شاعر فراق گورکھپوری کی ایک غزل کی زمین میں غزل پڑھ رہا تھا۔ درمیان میں وہ فراق صاحب کی غزل کا ایک شعر بھی پڑھ گیا جس پر سامعین نے بہت داد دی۔ فراق صاحب خود بھی اس مشاعرے میں موجود تھے۔ ان سے یہ چوری برداشت نہ ہو سکی۔ جب وہ نوجوان شاعر اپنی غزل ختم کر چکا تو انہوں نے اُسے اشارے سے اپنے پاس بلایا اور پوچھا "کیوں بھئی یہ تم نے میرا شعر اپنی غزل میں کیوں شامل کر لیا؟"

نوجوان شاعر نے جواب دیا "حضرت یہ شعر میں نے کہا ہے"

فراق صاحب نے فرمایا "یہ ناممکن ہے!"

نوجوان شاعر بولا "ناممکن کیوں ہے؟ کیا ایسا ہو نہیں سکتا کہ میرا خیال آپ کے خیال سے ٹکرا گیا ہو؟"

فراق صاحب نے برافروختہ ہو کر کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سائیکل ہوائی جہاز سے ٹکرا جائے"

دعوت اور دال ـــــ ●

لکھنؤ کے ایک رئیس نے کچھ مشہور شاعروں اور ادیبوں کو اپنی کوٹھی پر دعوت [illegible] چُنا جانے لگا تو طرح طرح کی مرغن غذاؤں کے ساتھ ساتھ کچھ پلیٹوں میں دال بھی آئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ صاحبِ خانہ کو دال بہت مرغوب تھی۔ عثمان غنی صاحب کو یہ بات معلوم نہیں تھی۔ اس لئے انہوں نے احمد جمال پاشا کے کان میں آہستہ سے کہا "اتنی عظیم الشان دعوت میں دال کی آمد کیا معنی رکھتی ہے! بھلا کہیں دعوت میں بھی دال آیا کرتی ہے؟" پاشا صاحب نے جواب دیا "کیوں نہیں حضرت! لفظ "دعوت" میں سب سے پہلے حرف "دال" ہی آتا ہے۔

پیروڈی اور پھبتی ـــــ ●

املو خاص (اعظم گڈھ) کے سالانہ مشاعرے میں شرکت کرنے کے لئے بہت سے شعراء تشریف فرما تھے۔ شام کے وقت میرے کمرے میں نازش پرتاب گڈھی، انور مرزاپوری، ملک زادہ منظور اور خاموش غازیپوری بھی آ گئے اور کسی موضوع پر دھواں دھار بحث چل نکلی۔ ہم سب کے سامنے الگ الگ قسم کے سگریٹوں کی ڈبیاں رکھی ہوئی تھیں اور ہر شخص بے تحاشا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ کچھ دیر بعد میرے سامنے رکھی ہوئی "سیزرس" کی ڈبیہ خالی ہو گئی تو میں نے دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلایا لیکن معلوم ہوا کہ سب اپنی اپنی [illegible] میرے بغل میں ایک مقامی شاعر حضرت رفیق اعظمی [illegible] [illegible]

[illegible] ان کے ہم وطنوں کا خیال ہے کہ وہ گالی بکنے میں اپنا ثانی [illegible] رکھتے۔ میں نے ان کی طرف مڑ کر کہا "حضرت اگر برا نہ مانیں تو ایک بیڑی ہی عطا فرمائیں۔" انہوں نے خندہ پیشانی سے ایک بیڑی میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا "جناب میں نے اپنے ایک ڈرامے کے مزاحیہ سین میں ایک شعر لکھا تھا؂

کوٹھے پہ رہنے والے زینے پہ آ گئے ہیں
رانیہ نواب جو تھے سینے پہ آ گئے ہیں

اس وقت مجھے اس شعر کی پیروڈی سوجھ گئی ہے اگر اجازت ہو تو عرض کروں۔"
ہم سب ان کی طرف متوجہ ہو کر بولے "ارشاد!" انہوں نے فرمایا؂

کوٹھے پہ رہنے والے سیڑھی پہ آ گئے ہیں
"سیزرس" پینے والے بیڑی پہ آ گئے ہیں

خلل اندازی

محمود احمد ہنر کو ایک دن اختر سندیلوی اور ساحر الحمیدی وغیرہ زبردستی پکڑ کر ایک فلم دکھلانے لے گئے۔ سینما ہال میں جب تک روشنی رہی ہنر صاحب خوب چہکتے رہے لیکن جب بتی گل ہو گئی اور فلم شروع ہو گئی تو وہ دو چار جملے بولنے کے بعد بالکل خاموش ہو گئے۔ ان کے احباب اس وقت فلم دیکھنے میں مشغول تھے اس لئے انہوں نے ہنر صاحب کی خاموشی پر کوئی توجہ نہیں کی۔ تھوڑی دیر بعد اختر صاحب کے سامنے والی سیٹ پر جو صاحب بیٹھے تھے وہ خراٹے لینے لگے اور ہال میں فلمی موسیقی کے ساتھ ساتھ ان کی ناک کا "نغمہ" بھی گونجنے لگا۔ اختر صاحب کو یہ "بے سُرا نغمہ" بہت کھل رہا تھا لیکن وہ صاحب بالکل اجنبی تھے۔ اس لئے انہوں نے کچھ دیر تک ضبط کیا لیکن جب ان کی قوتِ ضبط جواب دے گئی تو انہوں نے ان کا کندھا ہلاتے ہوئے کہا "جناب یہ سینما ہال ہے آپ کی خواب گاہ نہیں ہے۔"

وہ نیند سے چونکنے کے بعد حضرت اختر صاحب پر بگڑتے ہوئے بولے "میں چاہے سوؤں یا جاگوں آپ کو کیا؟ آپ میری نیند میں خلل انداز کیوں ہوئے؟"

ہنر صاحب ان دونوں کی گفتگو میں دخل دیتے ہوئے بولے "یہ سچ ہے جناب انہیں آپ کی نیند میں خلل انداز ہونے کا حق نہیں تھا لیکن آپ کی ناک بہ بانگِ دہل بول رہی تھی اس کی وجہ سے میری نیند میں بھی خلل پڑ رہا تھا۔ آخر میں بھی تو آپ کی طرح سو رہا تھا۔"

دعائے نکاح

ایک بار انور صدیقی صاحب اپنے دوست محمد علی صدیقی کی بہن کی شادی میں شرکت کرنے کے لئے بستی تشریف لائے۔ نکاح سے کچھ دیر پہلے ان کی بغل میں تارا شنکر ناشاد صاحب آ کر بیٹھ گئے اور بہت ہی گھل مل کر باتیں کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد قاضی صاحب نے نکاح پڑھانا شروع کیا۔ آخر میں جب سب لوگ دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو غیر ارادی طور پر تارا شنکر صاحب کے ہاتھ بھی اٹھ گئے لیکن اس دعا کا مقصد ان کی سمجھ میں نہ آیا۔ اس لئے نکاح کے اختتام پر انہوں نے انور صاحب سے پوچھا "بھئی یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ شادی کے موقع پر حاضرینِ بزم کس چیز کے لئے دعا مانگتے ہیں؟" انور صاحب نے انتہائی سنجیدہ چہرہ بنا کر جواب دیا "جو لوگ کنوارے ہوتے ہیں وہ یہ دعا مانگتے ہیں کہ انہیں جلد از جلد بیوی مل جائے اور جو شادی شدہ ہوتے ہیں وہ اس بات کے لئے دعا مانگتے ہیں کہ جس قدر جلد ہو سکے بیوی سے چھٹکارا مل جائے۔"

زندگی بخش معلوماتی مقالات اور مفید کارآمد اشارات

۱ ـــــ انڈا ـــــ بہترین غذا اور دوا

انڈے کی غذائی افادیت مشہور ہے لیکن بطور دوا بھی انڈا بہت مفید ہے۔ انڈے کی نیم برشت زردی اعضائے ہضم کی مشینری کے عمل سے ہضم ہو کر پورے طور پر خون بن جاتی ہے۔ اس سے فضلہ بہت کم بنتا ہے۔ خون پیدا کرنے اور عام جسمانی کمزوری دور کرنے کے لئے انڈا بہترین غذا ہونے کے ساتھ بہترین دوا بھی ہے۔

طب جدید کے تجربات سے ثابت ہو چکا ہے کہ انڈا ایک بے مثل مقوی غذا اور بہترین ٹانک ہے اسے بجا طور پر غذا نما دوا کہا جا سکتا ہے۔ بلا شبہ غذا کے ذریعے یہ جسم کو دوا کا فائدہ پہنچاتا ہے۔ یہ تپ دق کے مریضوں، خون کی کمی اور مردانہ طاقت کی کمزوری کے لئے نہایت موثر اور زود اثر دوا ہے اور دل و دماغ اور جسم کی کمزوری دور کرنے کے لئے بے نظیر غذا بھی ہے۔ اگر اسے باقاعدگی سے استعمال کیا جائے تو بڑھاپے تک مردانہ کمزوری کی شکایت پیدا نہیں ہوتی اور انسان اولاد پیدا کرنے کے قابل رہتا ہے۔ موسم سرما میں انڈوں کا حلوہ مقوی باہ دوا اور بہترین غذا تسلیم کیا گیا ہے۔

جلی ہوئی جگہ پر انڈے کی سفیدی لگانے سے فوراً جلن دور ہو کر ٹھنڈک پڑ جاتی ہے

انڈے کی زردی کا لیپ دردِ گردہ کے لئے مفید ہے۔ ایک انڈے کی زردی نکال کر اُسے تانبے کی طشتری میں ڈال کر آگ پر رکھیں اور ہلدی تین چار ماشہ ملا کر دونوں کو گرم کر ایک کپڑے پر لگا کر گردے کے مقام پر لگائیں۔

انڈے کی سفیدی کا پانی (البومن واٹر) بچوں کے اسہال و پیچش میں بہت مفید ہے۔ یہ بہت جلد ہضم ہو کر غذائیت بھی دیتا ہے اور اُن کے مرض میں بھی مفید ثابت ہوتا ہے۔ ایک کچے انڈے کی سفیدی لے کر اُسے خوب پھینٹیں۔ اس کے بعد ڈیڑھ پاؤ ٹھنڈا پانی (جو پہلے سے اُبال کر ٹھنڈا کر لیا گیا ہو) ایک بوتل میں ڈالیں اور اس میں انڈے کی سفیدی ملا کر خوب ہلائیں۔ دونوں چیزیں اچھی طرح مل جائیں گی۔ ذائقہ کے لئے قدرے نمک یا شکر ملائیں اور تھوڑا تھوڑا بچے کو پلائیں۔ داخس (انگل بیڑہ) جس میں انگلی کے پوروں میں ورم ہو جاتا ہے اور درد کی شدت سے مریض ہر وقت بے چین رہتا ہے، اس حالت میں انڈا نہایت مفید ثابت ہوتا ہے۔ ایک انڈا لے کر اُسے توڑ کر سفیدی نکال دیں صرف زردی رہنے دیں۔ اب اس انڈے میں سوجی ہوئی انگلی داخل کر کے باندھ لیں۔ صبح و شام یہی عمل کریں۔ چند بار کے باندھنے سے ورم تحلیل ہو جائے گا۔ یا پک کر پھوٹ جائے گا۔ انڈے کی زردی کو بھون کر شہد میں ملا کر لگانے سے چہرے کی چھائیاں اور داغ دھبے دور ہو جاتے ہیں۔ انڈے کی زردی سفیدی سمیت جلا کر باریک پیس کر ناک میں نفوخ کریں۔ جو نکسیر کی دوا سے بند نہ ہو اس کے استعمال سے بند ہو جائے گی۔

اگر قے اور پیشاب میں خون آتا ہو تو کچا انڈا پینے سے رک جاتا ہے۔

۲ ـــــ داڑھی بینائی کے لئے مفید ہے

عام طور پر لوگ داڑھی کو قدامت پسندی کی نشانی سمجھتے ہیں۔ اور کچھ لوگ جو اپنے آپ کو زیادہ روشن خیال سمجھتے ہیں، داڑھی کو تقدس کی نشانی سمجھتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ داڑھی طبی نقطۂ نظر سے بہت مفید ہے۔ جدید طبی سائنس بھی اس حقیقت کی تائید کرتی ہے۔

امریکہ کے مشہور ماہر چشم ڈاکٹر ایم پائنک کے بیان کے مطابق جو لوگ داڑھی رکھتے ہیں ان میں سے شاید ہی کسی کی بینائی کمزور ہوتی ہے۔ ڈاکٹر پائنک نے اپنے طویل تجربات و مشاہدات کی روشنی میں ایک مقالہ لکھا ہے جس میں دعویٰ کیا ہے کہ داڑھی رکھنے والوں کی بصارت اُن لوگوں کے مقابلے میں زیادہ اچھی ہوتی ہے جو

ایسی ہوگی نہیں رکھتے۔ ڈاکٹر یوسف نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ اگر کوئی شخص کبھی ٹھنڈے پانی سے آنکھیں دھولیا کرے تو اُسے زندگی میں شاید ہی کبھی عینک کی ضرورت پیش آئے۔ آنکھیں اور دماغ میں ٹھنڈک پہنچانے سے چہرے کی اُن باریک باریک نسوں پر اثر پڑتا ہے جن کا تعلق بصارت اور بینائی سے ہوتا ہے۔

۳ —— ہلدی —— ایک صحت بخش مصالحہ

ہلدی ہماری غذاؤں اور دوسرے مصالحوں کے ساتھ ڈالی جاتی ہے۔ اِس سے سبزی بھاجی اور سالن وغیرہ خوش ذائقہ اور خوش رنگ ہی نہیں ہو جاتا بلکہ ہلدی دوسرے مصالحوں کی طرح صحت کے لئے بھی بہت مفید ہے۔ ہلدی مصالحے کا ایک ضروری جزو ہے اِس کے استعمال سے غذائیں بادی نہیں کرتیں۔ اِس عام فائدے کے علاوہ ہلدی میں بے شمار فائدے پوشیدہ ہیں۔ جس سالن میں ہلدی نہ ڈالی جائے نہ خوش شکل اور خوش رنگ نہ ہونے کے باعث رغبت سے نہیں کھایا جاتا۔

ہلدی مزاج کے لحاظ سے گرم اور خشک ہے۔ جگر اور سینے کو صاف کرتی ہے۔ اِس کے استعمال سے بلغم دور ہوتا ہے اور خون صاف ہوتا ہے۔ ہلدی گرم اور خشک ہونے کے باعث جریان اور احتلام میں بہت مفید ہے اور طاقت بڑھ جاتی ہے یہاں تک کہ جگر کی بیماریوں میں بھی استعمال ہوتی ہے۔

ہلدی کو آنکھوں میں سرمے کے طور پر لگانے سے بینائی کی کمزوری دور ہو جاتی ہے ایک تولہ ہلدی سالم کو لیموں کے تولہ بھر رس میں بہت باریک کھرل کر کے خشک ہونے کے بعد شیشی میں بھر لیں اور رات کو سوتے وقت آنکھوں میں سرمہ کی طرح لگانے سے بینائی کی کمزوری دور ہوتی ہے اور دور کی چیزیں صاف دکھائی دینے لگتی ہیں۔ ہلدی کا یہ سرمہ جالا اور پھولا کو کاٹتا ہے۔ آنکھ دکھنے کے لئے بھی مفید ہے۔ ہلدی کو باریک پیس کر پانی میں خوب جوش دے کر چھان لیں اور یہ پانی دو دو چار چار قطرے آنکھ میں ٹپکائیں درد اور سرخی دور ہو جاتی ہے۔

ہلدی باریک پیس کر کپڑے میں چھان کر… صبح و شام تازہ پانی سے چار چار ماشہ کھانے سے پہلے ہو جیسا مہلک مرض دور ہو جاتا ہے۔ تجربہ پانی سے گھس کر دن میں دو تین بار لگانا بھی مفید ہے —— پُرانی سے پُرانی بلغمی کھانسی کو تین تین ماشہ ہلدی دن میں دو تین بار پانی کے ساتھ کھانے سے آرام آ جاتا ہے —— ہلدی باریک پسی ہوئی چھ ماشہ گائے یا بکری کے دہی کی چھاچھ کے ساتھ صبح و شام کھانے سے دائمی سوزاک سے نجات مل جاتی ہے —— سوزاک خواہ دس سال سے ہو اور دوائیں کرتے کرتے مریض عاجز اور مایوس ہو چکا ہو، چھ چھ ماشہ باریک ہلدی صبح و شام بکری کے دودھ کی لسی یا تازہ پانی کے ساتھ کھانے سے اِس موذی مرض سے نجات مل جاتی ہے —— الیونا یا کسی زہریلے زنبور کے ڈنک مارنے کی جگہ چار تولہ ہلدی کو پانی میں رگڑ کر تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد لگانے سے زہر اُتر جاتا ہے۔ علاج کے استعمال سے پہلے کسی اور دوا سے کُلّیاں کرنا زیادہ مفید ہوگا —— کاٹنے پر دو دو تولے ہلدی کو پانی میں ملانا بہت مفید ہے۔ کاٹی ہوئی جگہ پر ہلدی کا لیپ بھی ضروری ہے —— ہلدی چوٹ کے درد اور ورم کو دور کرتی ہے۔ چوٹ اندرونی ہو یا بیرونی۔ ایک ماشہ ہلدی کو پیس کر نیم گرم دودھ کے ساتھ کھلائیں اور ہلدی کا اور پان میں کھانے والا چونا ہم وزن چوٹ اور سوجن کی جگہ لگانا بہت مفید اور کارگر دوا ہے۔ درد اور سوجن کو دور کرتی ہے —— ہلدی پیٹ کے کیڑوں کو ہلاک کرتی ہے۔ اِس مرض کے لئے ہلدی کو پانی میں جوش دے کر پلایا جاتا ہے یا اِس کا سفوف بنا کر نیم گرم پانی کے ساتھ کھلایا جاتا ہے —— جونکیں لگانے کے بعد جونکوں کے ڈنگوں پر ہلدی باریک پیس کر لگانے سے خون کا بہنا رُک جاتا ہے اور ڈنک نہیں پکتے —— ہلدی عام زخموں کے لئے بھی مفید ہے۔ اِس کو باریک پیس کر چھڑکنے سے زخموں کی سڑاند بھی دور ہو جاتی ہے۔

۴ —— کچھ حافظہ کے متعلق

تجربہ بتاتا ہے کہ مردوں سے عورتوں کا حافظہ زیادہ قوی ہوتا ہے۔ اسکولوں اور کالجوں میں لڑکوں پر لڑکیوں کو فوقیت ہوتی ہے۔ وہ لڑکوں سے زیادہ آسانی سے یاد کر لیتی ہیں۔ عورتیں مردوں کے مقابلے میں مناظر، آوازیں اور ذائقے وغیرہ بہتر طور پر یاد رکھ سکتی ہیں۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے، عمر کے ساتھ حافظہ گھٹ جاتا ہے۔ اگر واقعی عمر کے بڑھنے کے ساتھ حافظہ کمزور ہو جائے تو اُس کا الزام عمر پر نہیں، آپ پر عائد ہوتا ہے ایک متوسط آدمی کی سیکھنے کی قابلیت ۲۰ سال کی عمر میں انتہا کو پہنچ جاتی ہے اور ۴۵ سال کی عمر میں اُس میں ۱۵ فیصدی کمی ہو جاتی ہے، اُس کے بعد اُس میں کمی ہونا ہونا دونوں ممکن ہیں، اِس کی وجہ یہ ہے کہ عموماً درمیانی عمر میں نئی باتیں سیکھنے کا شوق نہیں رہتا اور آدمی پُرانے مروجہ ہی خیالات سے وابستہ رہنا پسند کرتا ہے۔ درحقیقت یہ ہے کہ سن رسیدہ دماغ بہتر کام اِس لئے کر سکتا ہے کہ اُس کے پاس پہلے سے خیالات کا وسیع ذخیرہ ہوتا ہے جن سے وہ نئے خیالات کو وابستہ کر سکتا ہے۔

۵ —— دَوَا خوری کی عادت

کسی بیماری کا شکار ہو جانے پر اُس سے چھٹکارا پانے کے لئے دوا کھانا ضروری ہے۔ لیکن کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جنہیں دوا کھانے بلکہ دوا کھاتے رہنے کی عادت ہوتی ہے

...ہوائے جاریت کا علاج کرنا ضروری ہے، لیکن پہلے سب سے ضروری [illegible]
...یٹ کو حرکت دینے والا بنا لینا اچھا نہیں۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو قبض میں
...مبتلا ہیں طبی مشورہ نہیں لیتے اور خود ہی مسہل اور قبض کشا دوائیں روزانہ کھاتے
...ہیں اور اس طرح عادی بن جاتے ہیں کہ ایک دن بھی ناغہ نہیں کرتے۔ انہیں معلوم
...ہے کہ ہر مسہل، ہر دوا، چاہے وہ کتنی ہی بے ضرر کیوں ہو اپنا عمل کرنے کے لئے
...میں ایک طرح کا ہیجان پیدا کرتی ہے۔ اس لئے طبی مشورہ لازم ہے تاکہ طبیب اس
...دور کرنے کے لئے دوسری ترکیبیں اختیار کرے۔ اکثر لوگ سخت اور تیز مسہل دوائیں
...زیادہ استعمال کر کے اپنی آنتوں کے استر کو سخت ترین نقصان پہنچاتے رہتے ہیں۔

بہت سی مقوی دوائیں جو بازاری دوا فروش بیش از بیش فوائد بتا کر فروخت
...کرتے ہیں مضر اور غیر سائنٹیفک اجزا کی حامل ہوتی ہیں۔ جو لوگ دوا خوری کے عادی
...ہو گئے ہیں۔ وہ ان دواؤں کو بلا ضرورت کثرت سے استعمال کرتے ہیں اور بلا فائدہ
...نقصان اٹھاتے ہیں۔

۶ ـــــ غصہ مفید بھی ہو سکتا ہے

عام طور سے غصہ اور مزاج کی برہمی کو صحت کے لئے مضر سمجھا جاتا ہے۔ لیکن کچھ ہی
...پہلے طب عقلی کے ماہرین نے غصہ پر جو تحقیقات کی ہے، اُس سے اس نتیجہ پر
...پہنچے کہ غصہ بعض اوقات بے ضرر اور صحت کے لئے مفید بھی ہو سکتا ہے۔

نہ جانے ایسے کتنے مریض ملیں گے جو معدہ کی مزمن شکایات میں محض اس لئے
مبتلا ہیں کہ انہوں نے اپنی فوری برہمی یا طیش کو لگاتار روکنے یا دبانے کی کوشش کی تھی۔

حال ہی میں جو تحلیلی تحقیقات ہوئی ہے اس کے مطابق طیش اور غصہ کے جذبات
دوسرے جذبات کے مقابلہ میں بے ضرر، بلکہ بعض اوقات صحت مندانہ سمجھا جاتا ہے
...فرائڈ نے ایک موقع پر کہا ہے۔ تہذیب کے ارتقاء میں ہمارے بُرے جذبات اور
...ناپسندیدہ اعمال کا بھی حصہ ہے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ بعض اوقات غیظ و غضب اور
ناپسندیدہ افعال میں بھی کچھ بھلائی کے پہلو مضمر ہوتے ہیں۔

ایسا طوفانی غصہ جو قابو سے باہر ہو اور کراہت و نفرت سے اس کا لازمی تعلق ہو،
...ایک بات اور ہے۔ اس طرح کے جذباتی ہیجانات کردار کی کمزوریوں کا رُخ ظاہر کرتے ہیں،
...ان سے کوئی تقویت بخش یا مفید اثر مرتب نہیں ہوتا۔ تحقیقات سے واضح ہوتا ہے کہ جو لوگ
...بچپن یا لڑکپن میں خطرناک علامتوں میں مبتلا رہ چکے ہیں وہ طیش دلانے میں جلد آجاتے ہیں۔
...ان میں کوئی نہ کوئی ایسی کمزوری رہ جاتی ہے۔ جو آگے چل کر اس نوع کی اثر پذیری میں
تبدیل ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر مارج ایم ماشرائن معلم نفسیات کیلیفورنیا یونیورسٹی نے ایسے لوگوں
...کے حالات کی تحقیقات کرتے ہوئے بے جان تند مزاجی کی حقیقت پر روشنی ڈالی ہے
...لکھتی ہیں ـــــ جو لوگ اس عادت میں مبتلا ہیں بسبب اپنے [illegible] کے [illegible]
...میں شدید [illegible]

[illegible] بہت سالوں سے [illegible] ذاتی [illegible] جو کہ [illegible] نہیں جانتے کہ ایسا
کیوں ہوتا ہے، ایسا کیوں ہوتا ہے۔ ان کا اس حالت کو سمجھنا ان کے ہمسروں کو
فکر میں ڈال دیتا ہے۔

بہت سے لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ جب وہ اپنے دل کی بھڑاس نکالتے
ہیں تو ان کا مزاج ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ بھڑاس نکالنے کی افادیت ہم سب کے نزدیک
مسلم ہے۔ آدمی غصے میں بھرا بیٹھا ہو، کسی وجہ سے اندر ہی اندر گھٹ رہا ہو اور
اپنی برہمی کے اظہار کا موقع نہ پاتا ہو، تو اُسے اس حالت سے سخت نقصان پہنچ
جانے کا اندیشہ ہے۔

۷ ـــــ آپ کا دل

دل بھی جسم کے دوسرے حصوں کی طرح کام کرتا ہے اور اُسے بھی آرام کی ضرورت
ہے۔ جو گھوڑا تیز رفتاری سے دوڑتا ہے وہ بہت مدت تک نہیں دوڑ سکتا۔ اس لئے
کام کے ساتھ ہر روز خاصا آرام بھی کیجئے۔

اپنے دل پر سے بوجھ اُتار پھینکئے۔ ہر روز تھوڑی سی ورزش کرنا بہت مفید
ہے۔ لیکن سُست ہونا بھی مناسب نہیں۔

جب آرام کر رہے ہوں تو غموں اور اُلجھنوں کو بھول جائیے۔ ایسا کرنے سے
آپ کا دل آپ کا بہترین مددگار ثابت ہوگا۔

تھکاوٹ سے بھی آپ کا دل کانپنے اور تیزی سے دھڑکنے لگتا ہے۔ اکثر حالات
میں دل کا تیزی سے دھڑکنا تھکاوٹ کی وجہ سے ہوتا ہے۔ چودہ گھنٹے کام نہ کیجئے۔ آٹھ
گھنٹے محنت سے کام کرنا۔ تھوڑا سا کھیل یا تفریح اور مناسب نیند آپ کی صحت کو بہتر رکھ
سکتا ہے۔ آپ کے دل کو سیر و تفریح کی ضرورت ہے۔ دل کی تفریح کے لئے کبھی کبھی
چھٹی لے کر سیر کیجئے۔ اکثر وہ لوگ جنہیں دل کا عارضہ ہوتا ہے اپنے کاروبار کبھی بند نہیں
کرتے اور بہت مصروف رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قبر ہی میں پہنچ کر آرام کرتے ہیں
اگر زندگی پیاری ہے، آپ زیادہ دنوں تک زندہ رہنا چاہتے ہیں تو اپنے دل کا خیال
رکھئے۔ دل کی طرف سے بے پروائی نہ برتئے۔

شاہکار ناول جو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو رہے ہیں

زکی انور کے لکھے ہوئے ناول

رات کے گھونگھٹ جس میں نئی تہذیب کے اُن فرشتوں کی کہانی ہے جنہیں نئے نظام کی تاریک راتوں نے جنم دیا۔ مصنف نے آج کے سماج کے حسین چہروں سے پارسائی کے رنگین گھونگھٹ اُلٹ دیئے ہیں۔ قیمت صرف دو روپے۔

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے اُن مردوں کی کہانی جو عورت کو ایسے عریاں انداز میں دیکھنے کے تمنائی ہیں جس پر سے نظریں پھسل پھسل جائیں۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

زلف کے سر ہونے تک عشق و محبت اور حسن و شباب کی رعنائیوں اور زندگی کی مسرتوں اور حسرتوں کا سنگم۔ تین معصوم بھولی بھالی لڑکیوں اور تین بے سہارا لڑکوں کی حسین ترین کہانی۔ قیمت فی جلد صرف تین روپے۔

چاندنی کے سائے اس میں شبنم کی ٹھنڈک بھی ہے اور شعلے کی حرارت بھی۔ کتاب کو ایک بار شروع کرکے ختم کئے بغیر آپ کو چین نہ آئے گا۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

پیاسے بادل ایک پہاڑی دوشیزہ کے پیار کی کہانی۔ دلآویز رومان کی ایک درد انگیز داستان۔ قیمت دو روپے۔ ۵۰ نئے پیسے۔

یادوں کے کھنڈر حیات کے نشیب و فراز کا آئینہ دار ناول جس میں جذبات اور آرزوؤں کا حسین طوفان مچل رہا ہے۔ قابل مصنف نے دل کی دھڑکنوں کو ایسے رنگ و انداز سے اُبھارا ہے کہ قلبی رفاقت اور خلوص پر در محبت کی تصویر نگاہوں کے سامنے تھرکنے لگتی ہے۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

وادیاں اور ویرانے سوکھے سڑے میدانوں اور سر سبز و شاداب پہاڑوں کی حسین و جمیل کہانی۔ قیمت فی جلد چار روپے۔

زنجیر ایک گناہگار لڑکی کی حسین و جمیل داستان۔ عشق و محبت کی ایک ایسی پُر پیچ رومان پرور داستان جسے پڑھ کر آپ عش عش کر اُٹھیں گے جسے زکی انور نے لکھا اور ادارہ "بیسویں صدی" نے شائع کیا ہے۔ قیمت فی جلد صرف ۵ روپے

پگھلتے خواب اُردو ادب کے جواں سال ادیب پروفیسر [illegible] کا ایک دلچسپ رومانی ناول جس میں آپ کو کشمیر [illegible] کے حسین و دلفریب مناظر اور اُن مناظر کے پیچھے سسکتی کہانیوں کے [illegible] صاف دکھائی دیں گے۔ قیمت صرف دو روپے۔

نئے فرہاد پروفیسر شکیل الرحمٰن کا اچھوتا شاہکار ناول۔ ایک [illegible] دوشیزہ کی المناک داستان۔ محنت و زر کی کشاکش کے [illegible] پر لکھی ہوئی ایک انتہائی دلچسپ کہانی۔ قیمت صرف دو روپے۔

راہیں شباب کی فرانس کے عظیم ترین ناول نگار [illegible] کا شاہکار جس کا ترجمہ دُنیا کی تمام زبانوں میں ہو چکا ہے جس کی دس کروڑ جلدیں فروخت ہو چکی ہیں، جسے عشق و محبت کی بے مثل داستان تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس ناول کی ہیروئن قلوپطرہ اور ہیلن سے بھی زیادہ حسین اور عظیم ہے۔ مترجم جناب مخمور جالندھری۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

طوفانِ بہار روس کے عدیم المثال ناول نگار تورگنیف کا شاہکار جس کا ترجمہ دُنیا کی بیالیس زبانوں میں ہو چکا ہے۔ جسے دُنیا کے مشہور نقادوں نے لافانی رومان قرار دیا ہے اور جسے اُردو میں پہلی مرتبہ ادارہ "بیسویں صدی" دہلی نے شائع کیا ہے۔ مترجم مخمور جالندھری۔ قیمت تین روپے۔

بھیگی راتیں فرانس کے عدیم المثال ناول نگار ایمیل زولا کا مقبول ترین ناول انسان میں چھپے ہوئے حیوان کا افسانہ، اپنے محبوب کیلئے محبوبہ کی ناقابلِ فراموش قربانیوں کی کہانی۔ مترجم مخمور جالندھری۔ قیمت فی جلد تین روپے۔

فرینڈ موہنی حقیقت اور طنز سے بھرپور عورتوں کے اُس دیش کی کہانی جہاں مرد کا تصور بھی ایک جرم تھا۔ صدیوں بعد کی فضاؤں میں کھوئی ہوئی ایک عجیب و غریب داستان جو اوّل سے آخر تک دلچسپیوں اور حیرت آفرینیوں سے لبریز ہے۔ جناب کوثر چاندپوری کا لکھا ہوا بے حد شوخ و دلچسپ ناول جو قاری کو کئی صدی آگے کی فضا میں پرواز کراتا ہے۔ قیمت فی جلد محض تین روپے۔

پتہ :- رسالہ بیسویں صدی - دہلی نمبر ۶

اس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، علمی و ادبی سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ غلطی اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات شامل اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ "بیسویں صدی" کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کے لئے جگہ چھوڑنا لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھیئے کہ اس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے۔ —— ایڈیٹر بیسویں صدی دہلی

محمد شمس الدین۔ رائچور (دکن)

س۔ حقیقی معنوں میں شمع آزادی کا پہلا پروانہ کون تھا؟

ج۔ کچھ لوگوں کے خیال میں ٹیپو سلطان، کچھ لوگوں کی رائے میں بہادر شاہ ظفر۔

س۔ "فسانۂ آزاد" کس کی تصنیف ہے اور کہاں سے مل سکتی ہے

ج۔ مولانا محمد حسین آزاد کی تصنیف ہے۔ اردو کتابوں کے قدیم اداروں میں ملنی چاہئے۔

س۔ چین کا مستقبل؟

ج۔ اس کے اسلاف چنگیز اور ہلاکو کا انجام!

وشن بیدل۔ بیٹریا مونگیر

س۔ عورت کو ہر قدم پر کس چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔

ج۔ بھوکے مردوں سے بچنے کی

س۔ مرنے کے بعد آسمان پر چلے جائیں گے تو زمین سے "بیسویں صدی" حاصل کرنے کا کیا ذریعہ ہوگا؟

ج۔ آپ کو آسمان پر لے جانے والے کے قبضۂ قدرت میں سب کچھ ہے۔ اچھے اعمال کر کے اُسے خوش کرنے کی کوشش کیجئے پھر آسمان پر بھی "بیسویں صدی" پانا کچھ مشکل نہ ہوگا۔

ذاکر پاشا۔ کرنول۔ آندھرا

س۔ مسلسل جدوجہد کے بعد بھی اگر انسان ناکام رہے تو ......؟

ج۔ اس یقین کے ساتھ جدوجہد جاری رکھنی چاہئے کہ۔۔ یقین محکم عمل مسلسل میں راز ہستی ہے۔

س۔ عورت کا حسن پھول ہے یا کانٹا؟

ج۔ کسی کے لئے پھول کسی کے لئے کانٹا!

نسیم محی الدین محی الدین نگر۔ دربھنگہ

س۔ جدوجہد کے بعد بھی قسمت ساتھ نہ دے تو...؟

ج۔ جدوجہد جاری رکھنی چاہیے۔ منزل کی طرف بڑھتے رہنے سے منزل قریب آتی جاتی ہے۔

س۔ کوشش کے باوجود حالات سازگار نہ ہوں تو؟

ج۔ کوشش جاری رکھنی چاہئے۔ کوشش رائیگاں نہیں جاتی۔

س۔ تگ و دو کی حد کمال تک پہنچ کر بھی ناکامی ہی ملے تو ....؟

ج۔ جب بھی مایوس نہ ہونا چاہئے۔ کامیابی کے لئے تگ و دو کرنا بھی کامیابی کا ایک حصہ ہے

محمد اکرام الحق۔ کلکتہ

س۔ کیا افلاس تمام جرائم کا ذمہ دار ہے؟

ج۔ جی ہاں۔ لیکن مفلس مجرم نہیں۔

س۔ افلاس اور انسان کا رشتہ؟

ج۔ بلند حوصلہ انسان سے افلاس کا کوئی رشتہ نہیں۔ پست حوصلہ انسان سے افلاس کا دائمی رشتہ ہوتا ہے۔

اندر بہادر لعل۔ بہرائچ

س۔ فراق کا کوئی شعر سنائیے۔

ج۔ شام ہی سے گوش بر آواز ہے بزم سخن
کچھ فراق اپنی سناؤ کچھ زمانے کی کہو

س۔ ٹیگور نے کہا عورت ایک خوشبو ہے۔

خلیل جبران نے لکھا عورت زہر ہے۔
آپ کا کیا خیال ہے؟

ج۔ ہماری رائے میں عورت ایسا آبِ حیات ہے
جسے مرد کبھی کبھی زہر بنا دیتا ہے۔

س۔ کرشن چندر کا طرزِ نگارش کہیں کہیں منٹو سے
ملتا ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

ج۔ خیال اپنا اپنا نظر اپنی اپنی --- کرشن چندر
کا اندازِ نگارش کبھی کبھی منٹو سے ملتا ہے،
اور منٹو کا اندازِ نگارش کہیں کہیں کرشن چندر
سے ملتا ہے۔

غلام ربانی۔ گیا

س۔ زندگی کیا ہے؟

ج۔ زندگی نام ہے طوفانِ حوادث کا روش
ننگِ ساحل ہے وہ جس کو کوئی طوفاں نہ ملا

س۔ اچھا طالب علم بننے کے لئے کیا کرنا چاہیے۔

ج۔ تعلیم کی تکمیل سے پہلے تعلیم کو اپنی زندگی
بنا لینا چاہیے۔

پیاری سلطانہ۔ وجے واڑہ

س۔ بھائی جان! میں ہمیشہ فکر و غم میں رہتی ہوں
دل کو بہلاتی ہوں لیکن بہلتا ہی نہیں۔
ایسی حالت میں میں کیا کروں؟

ج۔ حالات سے سمجھوتہ کر لیجیے۔ غم کو خوشی بنا لیجیے۔

س۔ دل . . .

ج۔ دلِ برباد کو بھی کہنے والے دل ہی کہتے ہیں
خزاں دیدہ چمن کو بھی چمن کہنا ہی پڑتا ہے

س۔ اگر زندگی میں طوفان اٹھنے لگیں تو کیا کرنا
چاہیے؟

ج۔ ہراساں نہ ہونا چاہیے۔ حوصلہ کا دامن
نہ چھوڑنا چاہیے

زورِ طوفاں دیکھ کر موجوں سے جو کترا گیا
اُس زبوں ہمت کی قسمت میں کنارا ہی نہیں
موجِ غم کناروں سے ہم کنار کرتی ہے
کشتیِ حیات اکثر ڈوب کر ابھرتی ہے

سید واعظ احمد۔ ڈیسر گڑھ

س۔ انسان کا سب سے اچھا دوست کون ہے؟

ج۔ اس کا اچھا اخلاق و کردار۔

س۔ دنیا میں سب سے زیادہ جھوٹ بولنے والا
ملک کون ہے؟

ج۔ چین! جس نے ہندوستان کے خلاف
غلط بیانی کو اپنا شیوہ بنا لیا ہے

س۔ جذبی کا کوئی شعر سنائیے۔

ج۔ اب کیا بتائیں کیسے بنی، کیوں اُجڑ گئی
اپنے خیال میں تھے جو ہم انجمن لئے

بالکرشن ولین۔ نئی بستی۔ ریواڑی

س۔ "بیسویں صدی" کی سرگوشیاں میں اب بہنیں
بھی کافی حصہ لینے لگی ہیں۔ "بیسویں صدی"
کی اس ہر دلعزیزی کا کیا راز ہے؟

ج۔ "بیسویں صدی" کی پاکیزگی اور اس کے معیار
کی بلندی کوئی راز نہیں کھلی ہوئی حقیقت ہے

محمد تمیز اختر بی اے۔ پورنیہ

س۔ اگر امید دنیا سے اٹھ جائے تو کیا ہوگا؟

ج۔ اندھیرا ہی اندھیرا ہوگا

س۔ چینیوں کے جنگ چھیڑنے کا اصل مقصد کیا ہے؟

ج۔ ملک گیری کی ہوس کو آسودہ کرنا

س۔ عاشق کے ساتھ معشوق کی محبت کیسی ہوتی ہے؟

ج۔ بہت پیاری! جس کا اظہار وہ کبھی چپل سے
[illegible] کبھی سینڈل سے کرتا ہے۔

ضیاء الحق ضیاء۔ مال بازار۔ بنگال

س۔ جب اپنا اپنا نہ رہے تو کیا کرنا چاہیے؟

ج۔ سمجھ لیجیے کہ وہ اپنا نہیں ہے۔ اپنا اپنا ہی ہے

س۔ اچھی بیوی کی پہچان کیا ہے؟

ج۔ اچھی بیوی بُرے وقتوں میں مرد کو سہارا
دیتی ہے۔ مرد کا سہارا نہیں بنتی ہے۔

محمد شمس الدین خاں کاتبی۔ ارریہ پورنیہ

س۔ انسان کی منزلِ مقصود کب ختم ہوگی؟

ج۔ انسان کی منزلِ مقصود کبھی ختم نہیں ہوتی۔
وہ ایک منزل کو پا لینے کے بعد دوسری منزل
کی طرف بڑھتا ہے۔ ساری زندگی یہ سلسلہ
جاری رہتا ہے۔

س۔ زیادہ گہری دوستی مفید ہے یا نقصان دہ؟

ج۔ پر خلوص ہو تو مفید ہوتی ہے۔ دکھاوے کی
ہو تو نقصان دہ ہوتی ہے۔

اقبال احمد۔ کھڑوہ

س۔ تدبیر سے تقدیر بدل جاتی ہے؟

ج۔ جی ہاں تدبیر کے نتیجے کا تقدیر نام ہے

س۔ غالب کا کوئی اچھا سا شعر سنائیے

ج۔ آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

س۔ عورت کا حقیقی حسن کیا ہے؟

ج۔ شرم و حیا

سید رفیع الدین۔ گیا

س۔ خورشید بھیا۔ کیا لڑکیوں کو اسکول یا کالج میں
پڑھانا چاہیے؟

ج۔ لڑکیوں کو لڑکیوں کے اسکول یا کالج میں
پڑھانا چاہیے ہم مخلوط تعلیم کے حامی نہیں ہیں
تنہا تعلیم کیا مکمل اخلاق سے بہتر نہیں ہے

س۔ بہت لڑکیاں محبت کا جھوٹا سوال کرتی ہیں کیا انہیں شرم نہیں آتی؟

ج۔ ہم سے ایسے سوالات کرنے والی لڑکیاں نہیں ہوتیں۔ لڑکے لڑکیاں بن کر ایسے سوالات کرتے ہیں — شرم اُن کو مگر نہیں آتی!

محمد احسن ارشد۔ حیدرآباد دکن

س۔ کیا اردو ادب میں بھی انگریزی اور فرانسیسی ادب کے سے شاہکار ہیں؟

ج۔ یقیناً! جو لوگ احساسِ کمتری میں مبتلا ہیں پرانی چیزوں کے پرستار ہیں وہی اس حقیقت کے منکر ہیں۔

س۔ اردو کے کسی ایسے شاعر کا نام بتلائیے جسے شہرتِ دوام حاصل ہوئی ہو۔

ج۔ علامہ اقبالؒ

س۔ ہندوستان میں اردو دشمن تحریکوں کا سدِّباب کرنے کے لئے اردو دوست کیا اقدامات کر رہے ہیں؟

ج۔ انگریزی فلمیں دیکھتے ہیں۔ دوستوں سے باتیں کرتے ہیں تو بلا ضرورت بھی انگریزی الفاظ برتتے ہیں۔ اردو کے اچھے رسائل کو نظر انداز کر کے انگریزی پرچے خریدتے ہیں ایسے ہی اور بہت سے اقدامات کر رہے ہیں۔

م۔ اے۔ ابراہیم سلاڈی۔ ہزاری باغ

س۔ غالب کا ایک اچھا سا شعر سنائیے۔

ج۔ زندگی اپنی اسی طرح جو گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

س۔ کیا محبت فرض کی راہ میں رکاوٹ ہوتی ہے؟

ج۔ جی ہاں۔

زکریا ناز۔ کلکتہ

س۔ غریبوں سے دنیا خفا کیوں ہے؟

ج۔ دوسروں کی فکر چھوڑیئے۔ آپ تو غریبوں سے خفا نہیں؟ آپ غریبوں سے خفا نہ ہوا کریں۔ آپ غریبوں سے خفا نہ ہوا کریں۔

س۔ ایک خوبصورت اور سبق آموز مقولہ ملاحظہ فرمائیں کہ آپ کو اس سے کہاں تک اتفاق ہے۔ مقولہ ہے — بیوقوف کا دل اُس کی زبان میں ہوتا ہے لیکن عقلمند کی زبان اُس کے دل میں ہوتی ہے۔

ج۔ ہم اس مقولے سے سو فیصدی متفق ہیں۔

خلش احمد عادل۔ کھام گاؤں

س۔ مشہور ترقی پسند ادیب خواجہ احمد عباس اور علامہ حالی مرحوم میں کیا رشتہ ہے؟

ج۔ خواجہ صاحب علامہ حالی مرحوم کے نواسے ہیں۔

س۔ کیا علامہ حالی کو اردو ادب میں وہی مقام حاصل ہے جو بنگالی ادب میں ٹیگور کو؟

ج۔ جی نہیں، ان دونوں عظیم شاعروں کا اندازِ فکر جداگانہ تھا۔

س۔ کیا علامہ حالی کی مسدس کو مذہبی نظم کہا جا سکتا ہے؟

ج۔ جی ہاں۔ مذہبی اور قومی

محمد علاؤالدین رحمانی۔ مونگیر

س۔ خوشتر بھائی میرے ایک پڑوسی ہیں جو "بیسویں صدی" پڑھنے سے گریز کرتے ہیں بتائیے "بیسویں صدی" پڑھنے کی طرف کس طرح رجوع کروں؟

ج۔ اُن میں بلند ادبی ذوق پیدا کیجئے۔ "بیسویں صدی" کے لاکھوں پرستاروں کی طرح وہ بھی "بیسویں صدی" کے پرستار بن جائیں گے

س۔ میرے ایک دوست ہیں جو آج کل مجھ سے ناراض ہیں۔ بتائیے انہیں خوش کرنے کے لئے کیا کروں؟

ج۔ اگر واقعی آپ کی غلطی ہو تو اُسے تسلیم کر لیجئے اگر آپ کی غلطی نہ ہو تو ایسے دوست کو خوش کرنے کے لئے کوئی غلط کام نہ کیجئے۔

عظیم۔ کامٹی

س۔ بھیا! ایک اچھا سا شعر سنائیے جو دل کی گہرائیوں کو چھو لے۔

ج۔ اپنے دل کی گہرائی کا اندازہ تو آپ کو ہوگا۔ ہم سے ہماری پسند کا ایک شعر سنئے ؎

منجدھار میں کشتی چھوڑ چکے، ساحل سے تعلق توڑ چکے
اندازۂ طوفاں کیا معنی، ہم شورشِ طوفاں دیکھ چکے

س۔ میں نے محسوس کیا ہے شاعری روح کی غذا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟
آپ کا خیال صحیح ہے

ج۔ بھیا میرے خیال میں دنیا کے سامنے ایک مذہب ہے اور وہ ہے انسانیت! دنیا کے سامنے ایک مذہب نہیں ہے ایک مذہب ہونا چاہیے — مذہب انسانیت!

خلیل جبران نے لکھا عورت زہر ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

ج۔ ہماری رائے میں عورت ایسا آبِ حیات ہے جسے مرد کبھی کبھی زہر بنا دیتا ہے

س۔ کرشن چندر کا طرزِ نگارش کہیں کہیں منٹو سے ملتا ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

ج۔ خیال اپنا اپنا نظر اپنی اپنی ——— کرشن چندر کا اندازِ نگارش کبھی منٹو سے ملتا ہے، اور منٹو کا اندازِ نگارش کبھی کبھی کرشن چندر سے ملتا ہے۔

غلام ربانی۔ گیا

س۔ زندگی کیا ہے؟

ج۔ زندگی نام ہے طوفانِ حوادث کا روش
ننگِ ساحل ہے وہ جس کو کوئی طوفاں نہ ملا

س۔ اچھا طالب علم بننے کے لئے کیا کرنا چاہیے۔

ج۔ تعلیم کی تکمیل سے پہلے تعلیم کو اپنی زندگی بنا لینا چاہیے۔

پیاری سلطانہ۔ وجے واڑہ

س۔ بھائی جان! میں ہمیشہ فکر و غم میں رہتی ہوں دل کو بہلاتی ہوں لیکن بہلتا ہی نہیں۔ ایسی حالت میں میں کیا کروں؟

ج۔ حالات سے سمجھوتہ کر لیجئے، غم کو خوشی بنا لیجئے۔

س۔ دل . . .

ج۔ دلِ برباد کو بھی کہنے والے دل ہی کہتے ہیں
خزاں دیدہ چمن کو بھی چمن کہنا ہی پڑتا ہے

س۔ اگر زندگی میں طوفان اٹھنے لگیں تو کیا کرنا چاہیے؟

ج۔ ہراساں نہ ہونا چاہیے۔ حوصلہ کا دامن نہ چھوڑنا چاہیے

زورِ طوفاں دیکھ کر موجوں سے جو کترا گیا
اُس زبوں ہمت کی قسمت میں کنارا ہی نہیں
موجِ غم کناروں سے ہم کنار کرتی ہے
کشتیٔ حیات اکثر ڈوب کر اُبھرتی ہے

سید واعظ احمد۔ ڈیسر گڑھ

س۔ انسان کا سب سے اچھا دوست کون ہے؟

ج۔ اس کا اچھا اخلاق و کردار۔

س۔ دنیا میں سب سے زیادہ جھوٹ بولنے والا ملک کون ہے؟

ج۔ چین! جس نے ہندوستان کے خلاف غلط بیانی کو اپنا شیوہ بنا لیا ہے

س۔ جذبی کا کوئی شعر سنائیے۔

ج۔ اب کیا بتائیں کیسے بنی کیوں اُجڑ گئی
اپنے خیال میں تھے جو ہم انجمن لئے

بالکرشن وملن۔ نئی بستی۔ ریواڑی

س۔ "بیسویں صدی" کی سرگوشیاں میں اب بہنیں بھی کافی حصہ لینے لگی ہیں۔ "بیسویں صدی" کی اس ہر دلعزیزی کا کیا راز ہے؟

ج۔ "بیسویں صدی" کی پاکیزگی اور اس کے معیار کی بلندی کوئی راز نہیں کھلی ہوئی حقیقت ہے

محمد تمیز اختر بی اے۔ پورنیہ

س۔ اگر امید دنیا سے اُٹھ جائے تو کیا ہوگا؟

ج۔ اندھیرا ہی اندھیرا ہوگا

س۔ چینیوں کے جنگ چھیڑنے کا اصل مقصد کیا ہے؟

ج۔ ملک گیری کی ہوس کو آسودہ کرنا

س۔ عاشق کے ساتھ معشوق کی محبت کیسی ہوتی ہے؟

ج۔ بہت پیاری! جس کا اظہار وہ کبھی چہل سے [illegible] سے کرتا ہے

ضیاء الحق ضیا۔ مال بازار بنگال

س۔ جب اپنا اپنا نہ ہو تو کیا کرنا چاہیے؟

ج۔ سمجھ لیجئے کہ وہ اپنا نہیں ہے اپنا سمجھتے تھے

س۔ اچھی بیوی کی پہچان کیا ہے؟

ج۔ اچھی بیوی بُرے وقتوں میں مرد کا سہارا دیتی ہے۔ مرد کا سہارا نہیں بنتی ہے۔

محمد شمس الدین خاں کاظمی۔ ارریہ پورنیہ

س۔ انسان کی منزلِ مقصود کب ختم ہوگی؟

ج۔ انسان کی منزلِ مقصود کبھی ختم نہیں ہوتی۔ وہ ایک منزل کو پا لینے کے بعد دوسری منزل کی طرف بڑھتا ہے۔ ساری زندگی یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔

س۔ زیادہ گہری دوستی مفید ہے یا نقصان دہ؟

ج۔ پرخلوص ہو تو مفید ہوتی ہے۔ دکھاوے کی ہو تو نقصان دہ ہوتی ہے۔

اقبال احمد۔ کھڑوہ

س۔ تدبیر سے تقدیر بدل جاتی ہے؟

ج۔ جی ہاں تدبیر کے نتیجے کا تقدیر نام ہے

س۔ غالبؔ کا کوئی اچھا سا شعر سنائیے

ج۔ آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

س۔ عورت کا حقیقی حسن کیا ہے؟

ج۔ شرم و حیا

سید رفیع الدین۔ گیا

س۔ خورشید بجیا۔ کیا لڑکیوں کو اسکول یا کالج میں پڑھانا چاہیے؟

ج۔ لڑکیوں کو لڑکیوں کے اسکول یا کالج میں پڑھانا چاہیے ہم مخلوط تعلیم کے حامی نہیں ہیں رہا تعلیم کا تعلق ہے [illegible]

س۔ ... بہت ... سوال کرتی ہیں
کیا انہیں شرم نہیں آتی؟
ج۔ گر ... سوالات ... لڑکیاں
... لڑکے لڑکیاں بن کر ایسے سوالات
کرتے ہیں ـــــ پھر اُن کو شرم نہیں آتی!

محمد احسن ارشد حیدرآباد دکن

س۔ کیا اُردو ادب میں بھی انگریزی اور فرانسیسی ادب کے سے شاہکار ہیں؟

ج۔ یقیناً! جو لوگ احساسِ کمتری میں مبتلا ہیں پرانی چیزوں کے پرستار ہیں وہی اس حقیقت کے منکر ہیں۔

س۔ اردو کے کسی ایسے شاعر کا نام بتلایئے جسے شہرت دوام حاصل ہوئی ہو۔

ج۔ علامہ اقبالؒ

س۔ ہندوستان میں اردو دشمن تحریکوں کا سدِّباب کرنے کے لئے اردو دوست کیا اقدامات کر رہے ہیں؟

ج۔ انگریزی فلمیں دیکھتے ہیں۔ دوستوں سے باتیں کرتے ہیں تو بلا ضرورت بھی انگریزی الفاظ بولتے ہیں۔ اردو کے اچھے رسائل کو نظر انداز کر کے انگریزی پرچے خریدتے ہیں ایسے ہی اور بہت سے اقدامات کر رہے ہیں۔

م۔ اے۔ سابر ابراہیم سلاوی۔ ہزاری باغ

س۔ غالب کا ایک اچھا سا شعر سنایئے۔

ج۔ زندگی اپنی اسی طرح جو گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

س۔ کیا محبت فرض کی راہ میں رکاوٹ ہوتی ہے؟

ج۔ جی ہاں۔

زکریا تاز۔ کلکتہ

س۔ غریبوں سے دنیا خفا کیوں ہے؟

ج۔ دوسروں کی فکر چھوڑیئے۔ آپ تو غریبوں سے خفا نہیں؟ آپ غریبوں سے خفا نہ ہوا کریں۔ آپ غریبوں سے خفا نہ ہوا کریں۔

س۔ ایک خوبصورت اور سبق آموز مقولہ ملاحظہ فرمائیں کہ آپ کو اس سے کہاں تک اتفاق ہے۔ مقولہ ہے ـــــ بیوقوف کا دل اُس کی زبان میں ہوتا ہے لیکن عقلمند کی زبان اُس کے دل میں ہوتی ہے۔

ج۔ ہم اس مقولے سے سو فیصدی متفق ہیں۔

خلش احمد عادل کھام گاؤں

س۔ مشہور ترقی پسند ادیب خواجہ احمد عباس اور علامہ حالی مرحوم میں کیا رشتہ ہے؟

ج۔ خواجہ صاحب علامہ حالی مرحوم کے نواسے ہیں

س۔ کیا علامہ حالی کو اردو ادب میں وہی مقام حاصل ہے جو بنگالی ادب میں ٹیگور کو؟

ج۔ جی نہیں، ان دونوں عظیم شاعروں کا اندازِ فکر جداگانہ تھا۔

س۔ کیا علامہ حالی کی مسدس کو مذہبی نظم کہا جا سکتا ہے؟

ج۔ جی ہاں۔ مذہبی اور قومی

محمد علاؤالدین رحمانی۔ مونگیر

س۔ خوشتر بھائی میرے ایک پڑوسی ہیں جو "بیسویں صدی" پڑھنے سے گریز کرتے ہیں بتایئے "بیسویں صدی" پڑھنے کی طرف کس طرح رجوع کروں؟

ج۔ اُن میں بلند ادبی ذوق پیدا کیجئے "بیسویں صدی" کے لاکھوں پرستاروں کی طرح وہ بھی "بیسویں صدی" کے پرستار بن جائیں گے

س۔ میرے ایک دوست ہیں جو آج کل مجھ سے ناراض ہیں۔ بتایئے انہیں خوش کرنے کے لئے کیا کروں؟

ج۔ اگر واقعی آپ کی غلطی ہو تو اُسے تسلیم کر لیجئے اگر آپ کی غلطی نہ ہو تو ایسے دوست کو خوش کرنے کے لئے کوئی غلط کام نہ کیجئے۔

عظیم۔ کامٹی

س۔ بھیا! ایک اچھا سا شعر سنایئے جو دل کی گہرائیوں کو چھو لے۔

ج۔ اپنے دل کی گہرائی کا اندازہ تو آپ کو ہو گا۔ ہم سے ہماری پسند کا ایک شعر سنئے ؎

منجدھار میں کشتی چھوڑ چکے ساحل سے تعلق توڑ چکے
اندازۂ طوفاں کیا معنی، ہم شورشِ طوفاں دیکھ چکے

س۔ میں نے محسوس کیا ہے شاعری روح کی غذا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟
آپ کا خیال صحیح ہے

ج۔ بھیا میرے خیال میں دُنیا کے سامنے ایک مذہب ہے اور وہ ہے انسانیت!
دنیا کے سامنے ایک مذہب نہیں ہے ایک مذہب ہونا چاہیے ـــــ مذہب انسانیت!

خلیل احمد فاروقی۔ مونگیر بہار

س۔ کسی کتاب کے مضامین اگر ترجمہ کرنے ہوں یا کسی کتاب کا ترجمہ کرنا ہو تو کس سے اجازت لینی پڑتی ہے۔ صاحب مضمون سے یا صاحب کتاب سے یا اُن کے پبلشرز سے؟ خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ مصنف یا پبلشرز ممالک غیر سے تعلق رکھتے ہوں۔

ج۔ مصنف اور پبلشر دونوں سے اجازت لینی چاہیئے۔ اگر مصنف نے جملہ حقوق پبلشر کو دے دیئے ہوں تو صرف پبلشر ہی سے اجازت لینی چاہیئے۔

س۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم نے ایک انگلش اردو ڈکشنری مرتب کی تھی جو آج کل دستیاب نہیں ہو رہی ہے۔ براہ کرم کسی اسٹاکسٹ کا پتہ دیں عنایت ہوگی۔
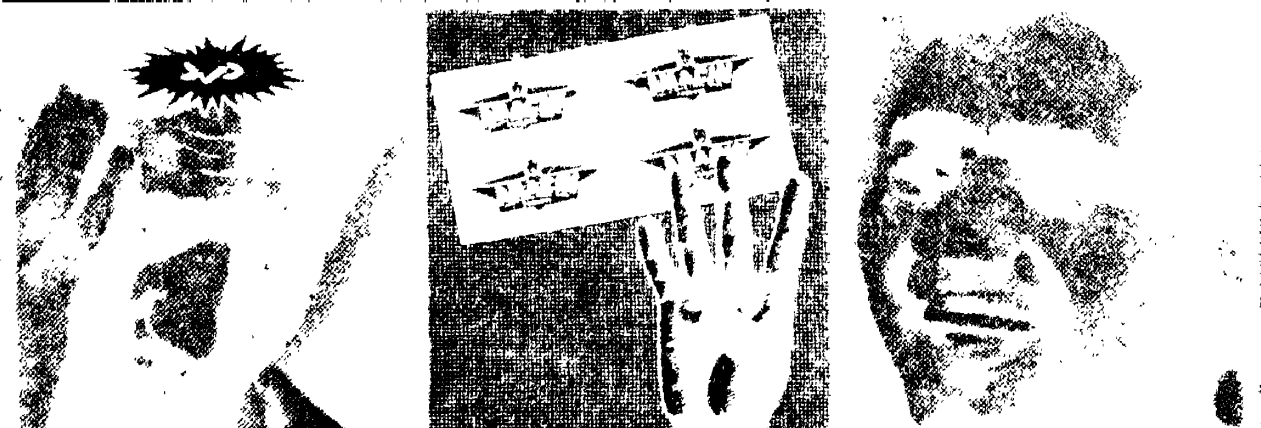
ج۔ مکتبہ اردو لاہور اور مکتبہ جدید لاہور کو لکھئے۔ ہند میں مکتبہ اردو یا مکتبہ جدید لاہور کا کوئی اسٹاکسٹ نہیں ہے۔

محمد یوسف الدین نظام آباد۔ آندھرا

س۔ کیا یہ صحیح ہے کہ شرافت کا دوسرا نام بزدلی ہے۔

ج۔ ہرگز نہیں۔ لیکن چین کی شرافت دشمنی نے یہ بتا دیا کہ کمینے کے ساتھ شرافت حماقت بن جاتی ہے۔

س۔ خود غرض دوستوں سے کس طرح چھٹکارا پایا جائے۔

ج۔ خود غرض بن کر۔

عبدالرشید بانکی۔ پٹنہ

س۔ عورتوں کو چڑیوں کی طرح گھر کے پنجرے میں بند رکھنے سے اُن کی صحت تباہ ہوتی ہے۔ انہیں تازہ ہوا نہیں ملتی۔ پردہ ہی قومی ہلاکت کا سبب بنا ہوا ہے۔ آپ اپنی رائے سے نوازیئے۔

ج۔ ہم عورتوں کو چڑیوں کی طرح گھر کے پنجرے میں بند رکھنے کے حامی نہیں لیکن مناسب پردہ کو اچھا سمجھتے ہیں۔

س۔ پردہ میں رہنے سے عورتیں اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کر سکتیں۔ آپ کا کیا خیال ہے۔

ج۔ ہر عورت کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا اتنا ضروری نہیں، جتنا ضروری ہے گھر کو جنت کا نمونہ بنانے کے لئے گھر گرہستی کی تعلیم و تربیت حاصل کرنا۔ ہماری رائے میں عورت اور مرد کے فرائض الگ الگ ہیں۔ عورت کی حقیقی دنیا گھر اور گھر کا آنگن ہے۔

محمد [illegible]

س۔ ڈاکٹر صاحب! [illegible] اگر [illegible] ہوتی تو زندگی کا ہونا [illegible]؟ آپ کے خیال میں کون سا لفظ موزوں ہے؟

ج۔ یہ اپنے اپنے ذوق کی بات ہے۔

س۔ کیا بیماری موت کا پیغام ہے؟

ج۔ بیماری موت کا پیغام نہیں ہوتی صحت کی طرف سے مایوسی موت کا پیغام ہوتی ہے۔

س۔ بیوی اپنے شوہر کو کس وقت دھوکا دیتی ہے؟

ج۔ بیوی اپنے شوہر کو دھوکا نہیں دیتی، شوہر سے دھوکا کھاتی ہے، اور زندگی میں بہت بار کھاتی ہے۔

کوثر پروین ستایار، بورگرا

س۔ جب آشیاں جل جائے تو آسمان سے فریاد کرنا حماقت ہے یا شرافت؟

ج۔ حماقت۔

س۔ غلامی کی زنجیر میں جکڑا ہوا انسان؟

ج۔ انسان کہلانے کا مستحق نہیں۔

اے۔ کے۔ محمد سلیم۔ کرنول

س۔ جو لڑکی آنکھ مارنے پر غصے میں سُرخ ہو کر سینڈل کی طرف اشارہ کرے تو اُسے دیکھ کر کیا کرنا چاہیے؟

ج۔ سر پہ پاؤں رکھ کر بیک بینی و دو گوش بھاگ کھڑا ہونا چاہیے۔

اے بیگم۔ جائیاسہ

س۔ بھائی جان! کسی کو اگر ملکِ عدم جانے کا شوق ہو تو اُسے ٹکٹ کہاں سے لینا پڑے گا؟

ج۔ ہم زندگی کے نشیب میں ہم سے حیات آباد کی [illegible]

[illegible]

س۔ پردے کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

ج۔ ہم مناسب پردے کو مفید سمجھتے ہیں۔

س۔ بھائی جان! کوئی حیات افروز شعر سنائیے۔

ج۔ مسکراتا ہے غم کو سہتا ہے جو نہ گھبرائے دنیا کی آفات سے
درحقیقت انسان انسان ہے ہر قدم پر جو گر کر سنبھلتا ہے

ذکریا ناز۔ کلکتہ

س۔ موت کے وقت انسان کی آنکھوں سے آنسو کیوں نکلتے ہیں؟

ج۔ اس حقیقت کے اظہار و اعتراف کے لئے کہ انسان جس زندگی کا زندگی بھر شاکی رہتا ہے وہ بے حد پیاری ہے۔

س۔ آج کل کی دوستی ——— آپ کی نظروں میں؟

ج۔ حسین فریب ہے۔ یقین نہ آئے تو رنگِ دوستی چین کو دیکھ لیجئے۔

س۔ دنیا اتنی سنگدل کیوں ہو گئی ہے؟

ج۔ دنیا ہمیشہ سنگدل رہی ہے۔

جمیلہ پروین۔ اورنگ آباد

س۔ انسان شیطان کب بنتا ہے؟

ج۔ جب انسانیت سے دُور ہو جاتا ہے۔

س۔ انسان وطن پرست کب کہلاتا ہے؟

ج۔ جب اپنا تن من دھن وطن کے لئے قربان کر دینے سے دریغ نہ کرے۔

رضی مجیدی بگھونوی۔ بھوپال

س۔ کامراج پلان کا مستقبل؟

ج۔ حال کے آئینہ میں آپ خود ہی مستقبل دیکھ لیں۔

س۔ اگر آپ کو وزیر تعلیم ہند کا عہدہ مل جائے تو آپ اُردو کے لئے کیا کریں گے؟

ج۔ [illegible] دیں گے!

س۔ خوشتر بھائی! بیسویں صدی کی اشاعت کتنی ہے؟

ج۔ آپ کے قیاس و گمان سے کہیں زیادہ!

کیفی بھارتی۔ کرہٹی

س۔ کیا بیسویں صدی کے افسانہ نگاروں کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اُن کے افسانے پڑھنے والے انہیں ضرور خط لکھیں؟

ج۔ اُن کی یہ خواہش نہیں ہوتی کہ ضرور خط لکھیں، ہاں یہ خواہش ہوتی ہے کہ اُن کے افسانے پڑھنے والے انہیں خط لکھیں تاکہ وہ اُن کے خطوط کے آئینہ میں اپنی تخلیقات کی خوبیاں اور خامیاں کو دیکھ سکیں۔

محمد مشتاق احمد۔ جگدل۔ ۲۴ پرگنہ

س۔ مجھ میں اور میرے دوست میں بحث ہوئی، آخر کار اس بحث کا فیصلہ آپ پر ہے۔ میں کہتا ہوں غالب شاعر اعظم ہیں اور میرا دوست کہتا ہے ڈاکٹر اقبال شاعر اعظم ہیں۔

ج۔ علامہ اقبال نے بھی غالب کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔

س۔ دُنیا کا سب سے بڑا سیاستداں کون ہے؟

ج۔ جو الیکشن جیتنے اور کرسی حاصل کرنے کے لئے ناروا کو بھی روا سمجھے۔

شہزادی بیگم۔ لورنا۔ دھنباد

س۔ عورت کا حقیقی زیور کیا ہے؟

ج۔ شرم و حیا!

Rs 3,00,000.00

تین لاکھ روپے نقد انعامات

لاکھوں روپے کے انعامات تقسیم ہو چکے ہیں!

اکثر تشہیری پرچوں کا اُردو اَدبی معمے کے بارے میں رویہ افسوسناک ہے چند کو اشتہارات نہیں دیئے گئے ہیں اس لئے وہ ہمارے استحکام اور دیانت پر نہایت غیر ذمہ دارانہ اور رکیک حرف رکھ رہے ہیں۔ ادب نواز اس پُر کینہ نکتہ چینی کی حقیقت کو سمجھیں اور ان بلیک میلروں کے بیانات پر کان نہ دھریں۔ اوچھے ہتھکنڈوں سے ہماری کامیابی اور ترقی کو روکا نہیں جاسکتا ہے۔ ادب نوازوں سے گذارش ہے کہ سستی اور اشتہاری نکتہ چینی سے اثر پذیر نہ ہوں بلکہ ہر معاملہ میں ہم سے تحقیق اور تصدیق فرمائیں۔ اور بازاری نقادوں کے لئے آگاہی کہ بلیک میلنگ جرم ہے۔ وہ قانونی گرفت سے نہ بچ سکیں گے!

آپ بھی

اُردو اَدبی معمہ

کے ذریعہ

بے پناہ مسرت اور دولت حاصل کیجئے

اُردو اَدبی معمہ نمبر ۶ کے انعامات کی روانگی شروع کر دی گئی ہے!

ماہ بماہ ہمارے ارادے مستحکم اور ہماری کامیابی روشن تر ہو رہی ہے

صحیح حل اُردو اَدبی معمہ نمبر ۷

نوٹ: اشارہ نمبر ۶ اور اشارہ نمبر ۱۸ مختلف کتابوں میں ہونے کی وجہ سے دونوں اشارے کینسل کردئے گئے

مشاہد ہر ماہ

* پُر اثر کہانیاں و افسانے
* دلچسپ علمی ادبی مضامین اور معیاری نظمیں و غزلوں کے علاوہ اُردو اَدبی معمے دہلی کے انعام یافتگان کی فہرست بھی شائع ہوتی ہے

قیمت سالانہ: ۴ روپے — فی پرچہ: ۴۰ نئے پیسے

جاری کردہ، اُردو اَدبی معمے اُردو بازار دہلی ۶

ن اور خلوت

ینٹ، پتھر اور چونے سے بنا ہوا گھر میرا نہیں، سرکاری کوارٹر ہے، لیکن اِس گھر کے اندر جو دوسرا گھر ہے وہ میرا ہے، بالکل اپنا۔ میری اور میری رفیقۂ حیات کی مجموعی شخصیت کا وہ جلالی اور جمالی
گرمی میں صبح چار اور پانچ کے درمیان اُٹھ جاتا ہوں۔ عصمت کے ہاتھ کی بنائی ہوئی گرم چائے مل جاتی ہے۔ چائے کے بعد پان کھاتا ہوں اور لکھنے پڑھنے میں لگ جاتا ہوں۔ میرے
وقت یہی ہے۔ پہلے لکچرس تیار کرتا ہوں، اُس کے بعد کوئی دوسرا کام سوجھتا ہے۔ آٹھ بجے تک دو چار پان ضرور کھاتا ہوں۔ اِس کے بغیر اب کوئی کام نہیں ہوتا، اسی وقت ضرور
ہوں۔ دس بجے کھانا کھا کر یونیورسٹی جاتا ہوں اور چار بجے واپس آتا ہوں۔ بچے لپٹ جاتے ہیں، اور ان کی پیاری پیاری باتیں مجھے وادیٔ خیال سے باہر لے آتی ہیں۔
چائے پیتے ہوئے خوب باتیں کرتا ہوں، آج کا تازہ لطیفہ سُناتا ہوں اور اخبار پڑھتا ہوں، عزیزوں اور دوستوں کے خط آجاتے ہیں اور میں اُن کی محبت بھری باتیں سُنتا ہوں۔
کھیلنا میرے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا فلسفہ، الٰہیات، مذہبیات، تاریخ و اقتصادیات اور لسانیات کا مطالعہ کرنا۔ خصوصاً چھٹی کے دن ہم زیادہ ہنستے اور کھیلتے ہیں۔ باغ کے
پودوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ شام کی چائے کے بعد بچے پڑھنے چلے جاتے ہیں اور میں اپنی لائبریری میں آجاتا ہوں۔ میری نگرانی میں پی۔ ایچ ڈی کے کئی مقالے لکھے جا رہے ہیں
ان کے لئے میں خود بھی پڑھتا ہوں تاکہ ایمانداری سے طلبا کی رہنمائی کر سکوں۔ شام کو تحقیقی مقالے اور یونیورسٹی کے سیمینار اور ٹیٹوریل کے پرچے دیکھتا ہوں۔ رات کے کھانے
ہلکی پھلکی کتابیں اور کہانیاں پڑھتا ہوں۔ جاسوسی ناول بھی اور روحوں کی کہانیاں بھی۔ گھر ہی گھر ہے جہاں آدمی "خود کلامی" کے عذاب سے نکل آئے، جب تک باہر رہتا ہوں اس
میں مبتلا رہتا ہوں۔ اپنی انجمن میں آیا، اور اس عذاب سے نجات ملی —— لکھتے پڑھتے ہوئے مجھ پر بچوں کے شور و غل کا کوئی اثر نہیں ہوتا، کبھی کبھی اثر ہوتا ہے تو
چھوڑ کر اُٹھ جاتا ہوں، بچے سمجھتے ہیں میں بہت ناراض ہو گیا۔ سب ایک ایک کر کے سامنے آتے ہیں اور میں اُنہیں سینے سے لگا لیتا ہوں۔ غمِ دوراں اور ایک پیارے سے
کے لئے ڈوب جاتا اگر یہ انجمن نہ ہوتی۔ داخلی زندگی جب تک مرتب نہ ہو زندگی کرنا دوبھر ہو جائے، اپنا گھر انجمن بھی ہے اور خلوت بھی۔ اِس انجمن میں بھی خلوت میسر ہے
بھی ایک گھر ہے ——

گھر کا ماحول، محفل کی محفل

ساحر ہوشیار پوری (دہلی)

فن کار بھی آخر انسان ہے۔ اور اس کا بھی اپنا ایک گھر ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ فن کار کا دل، دماغ، اور اُس کی ذہنی کیفیات عام انسان سے مختلف ہوتی ہیں اور اُس کے پرکھنے اور سوچنے کا ڈھنگ بھی الگ ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ جھونپڑی میں بھی محلوں کی آسائش کا لطف حاصل کر لیتا ہے۔ —— صبح کے وقت بے حد مصروفیت ہوتی ہے۔ اخبار کی ورق گردانی کا بھی وقت نہیں ملتا۔ بس جھٹ پٹ تیار ہوئے اور "کان پر رکھ کر قلم نکلے" والا معاملہ ہوتا ہے۔ حالاں کہ یہ قلم شعر و شاعری کے لئے نہیں بلکہ دفتری امور کے لئے وقف ہوتا ہے۔ شام کو گھر پہنچے، ہاتھ منہ دھو کر خدائے دو جہاں کی بارگاہ میں سجدہ ادا کیا، اُس دن کی ڈاک سے آئے ہوئے خطوط پڑھے، دختر رز سے سرگوشیاں اور اٹھکھیلیاں ہوئیں، اور پھر بیوی بچوں کے ساتھ کچھ وقت کے لئے اپنی اور ان کی دن بھر کی کارگزاری پر گفتگو کا سلسلہ چلا۔ کبھی کبھار کسی نیم سیاسی، نیم ادبی اور سماجی موضوعات پر بھی گفتگو ہو جاتی ہے۔ لیکن گھر کے انتظامی معاملات میں دخل دینا مجھے قطعی پسند نہیں، میری بیوی ہی تنہا گھر کا انتظام کرتی ہے۔ اس تصویر میں مالتی اپنے کسی سوال پر میرے شاعرانہ تبصرے کو غور سے سن رہی ہے۔ میری بیوی اور سندیپ بھی ہمہ تن گوش ہیں۔ اور سب سے چھوٹا لڑکا مہیش بڑی بے زاری کے عالم میں اپنی ماں کو جھنجھوڑ رہا ہے۔ اُسے شاید کوئی نئی شرارت سوجھ رہی ہے۔

میرے لئے سونے سے پہلے شغلِ مطالعہ نہایت ضروری ہے اور یہ مطالعہ خواب آور گولیوں کا کام بھی دیتا ہے۔ کبھی موڈ ہوا تو مطالعے کی جگہ شعر گوئی کا دور چلتا ہے۔ شعر کہنے کے لئے مجھے کسی خاص ماحول اور تحریک کا سہارا درکار نہیں۔ بس موڈ آیا اور تخلیق کے سوتے بہ نکلے۔ ایسے عالم میں نیند کوسوں دور بھاگ جاتی ہے اور رات کی سیاہی بقعۂ نور بن جاتی ہے۔ پھر دوسری صبح کو معمولات میں بے قاعدگی پیدا ہونا لازمی ہے۔ لیکن شام کے پروگرام میں شاید ہی کبھی رخنہ اندازی ہوتی ہو، سوائے ایسی شام کے جو مشاعرے میں گزرے یا ہم مشرب و ہم ذوق احباب کی محفل میں ——

ساحر (دستخط)

میرا کمرہ

کوثر چاندپوری

لکھنا ہر روز کا نہیں ہر وقت کا شغل ہے۔ بس یوں سمجھئے کہ مشغلۂ حیات ہے اور یہ کمرہ میری دنیا ہے، دیکھنے میں چھوٹا سا ہے لیکن کونین کی وسعتیں اپنے اندر لئے ہے۔ جہاں
ہوتی ہے وہاں ساری دنیا موجود رہتی ہے۔ ۱۲ بجے پریکٹس سے فارغ ہو کر کھانا کھاتا ہوں، پھر آدھ گھنٹے کے لئے لیٹ جاتا ہوں، اس کے بعد ایک پیالی چائے پیتا ہوں۔ سگر
بالکل استعمال نہیں کرتا۔ تمباکو بھی نہیں کھاتا، پان دن میں دو چار ہی کھاتا ہوں، تحریک کا کام چائے سے لیتا ہوں، چائے بالکل اسی اہتمام سے پیتا ہوں جس سے غالب شراب پیا کرتے تھے، م
اچھی ہونی چاہئے، اور برتن صاف ستھرے، پھر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سچ مچ بادۂ ناب چڑھا لی ہو —— کمرے کے باہر شور و شغب رہتا ہے، خیالات اس سے بالکل منتش
ہوتے۔ البتہ کوئی باتیں شروع کر دیتا ہے تو طوفان سا آجاتا ہے، تخیلات میں برہمی سی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس وقت قلم رکھ دیتا ہوں اور اندر ہی اندر کھولتا رہتا ہوں۔ کبھی پردہ اٹھا کر ا
معصوم سا ننھا چہرہ جھانک کر کہتا ہے —— "ابا جی؟ ہم آئس کریم کھا سکتے ہیں؟"

یہ چہرہ انجم کا ہوتا ہے۔ بیک گراؤنڈ میں وسیم میاں اور ناہید صاحبہ ہوتی ہیں، یہی دونوں انھیں آلۂ کار بناتے ہیں اور ٹھیک چار بجے پائپ میں پانی آنے کی آواز آتی ہے، "تش
سامان رکھ دیا گیا!" —— یہ آواز صالحہ کوثر کی ہوتی ہے جو ایم۔ اے کی طالب علم ہیں۔ ادھر پھر چائے کا چکر چل پڑتا ہے اور اتوار کے دن بڑا ہنگامہ ہوتا ہے، جا
ہے اجمل، حمیرا، ارشد اور امجد آجاتے ہیں، یہ —— دن بھر گھر کو سر پر اٹھائے رہتے ہیں ۹ بجے چلے جاتے ہیں ——
رات کو اسی کمرے میں پڑھتا ہوں اور سوچتا ہوں ——

میری گھریلو زندگی

واجدہ تبسم

میری گھریلو زندگی میں کوئی بہت خاص یا غیر معمولی بات نہیں ہے ———— میں اپنے بیٹوں (شجاع الدولہ اور ٹیپو سلطان) کی ماں بھی ہوں اور آپا بھی۔ بیٹوں کے نام اپنے باپ نے رکھے ہیں۔ بڑے کو دولہا اور چھوٹے کو نی ٹو کہتی ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ اُس نے زندگی میں اتنی حسین مصروفیات دے دی ہیں۔ کھانا کبھی خود ہی پکاتی ہوں۔ سلائی بھی کرتی ہوں۔ ملنے والے آجائیں تو اُن کی تواضع بھی میں ہی کرتی ہوں۔ پھر پانچوں وقت کی نمازیں اور قرآن شریف بھی پابندی سے پڑھتی ہوں۔ بڑے صاحبزادے کو روزانہ شام کے وقت سیر کرانے بھی لے جاتی ہوں۔ جہاں تک بن پڑتا ہے، ہر کام خود ہی کرتی ہوں لیکن کہیں آنا جانا ہو اور بچوں کو تیار کرنا ہو تو اشفاق کی مدد ضروری ہو جاتی ہے۔ اُن کا کام بچوں کو موزے اور جوتے پہنانا ہوتا ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ دنیا کا سب سے مشکل کام بچوں کو جوتے پہنانا ہے۔ ایک پہنائیے، وہ دوسرا پہنانے تک پہلا نکال پھینکتے ہیں۔ پھر پہلا پہنائیے تو .... بس یہ سلسلہ جاری ہی رہتا ہے۔

ان پیاری پیاری مصروفیات سے وقت مل جائے تو لکھ بھی لیتی ہوں۔ ویسے پڑھنے کا تو یہ ہے کہ بغیر پڑھے زندہ نہیں رہ سکتی۔ کسی نہ کسی طرح ایک دو گھنٹہ روزانہ کچھ نہ کچھ پڑھ لیتی ہوں۔ اِنہی مصروفیات کی وجہ سے میں نے ابتک فلم انڈسٹری میں قدم نہیں رکھا ہے (رائٹر کی حیثیت سے) حالانکہ دو تین آفر آچکے ہیں۔

اِدھر اشفاق نے بہت سے بکھیڑے پھیلا رکھے ہیں۔ جُوہو پر زمین خریدی ہے۔ آجکل اُنھیں وہاں بنگلہ بنوانے کی ایسی دُھن سوار ہے کہ پوچھئے نہیں۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ میری عدم موجودگی میں آئے ہوئے خطوں کے جواب وہ خود ہی دے لیا کرتے تھے۔ لیکن اب وہ بڑے آدمی بنتے جا رہے ہیں ————"

گھر کی دہلیز پر

[illegible]

دن بھر کا تھکا ماندہ جب میں گھر کی دہلیز پر قدم رکھتا ہوں تو میری رفیقۂ حیات اپنی دلآویز مسکراہٹ سے میرا خیر مقدم کرتی ہے۔ اور میں اپنی پہلی شاہکار تخلیق "منو" کو دیکھ کر دُنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو جاتا ہوں۔

ابھی صوفے پر بیٹھ کر اپنی "دُنیا" سے باتیں کرنے میں محو ہوا تھا۔ پاس ہی "بنٹو" "بیسویں صدی" کے سالنامہ میں تصویریں دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا کہ بِن بُلائے مہمان کی طرح ٹیلی فون کی گھنٹی بھی نازل ہو گئی۔ ٹیلی فون کا جواب نہیں۔ کیوں؟ دیکھئے کہ اب دن بھر کے تھکے ماندے کو موقع ملا ہے کہ کچھ پیار کی، کچھ زندگی کی باتیں کروں۔ لیکن یہ ٹیلیفون ..... خُدا بچائے اِس مصیبت سے!

میری افسانہ نگاری کی صبح ہر روز رات کے گیارہ بجے کے بعد شروع ہوتی ہے۔ پڑھتا ہوں۔ تازہ ترین رسائل، اور نئی شائع ہونے والی کتابیں۔ پھر لکھتا ہوں۔ افسانے، تنقیدی مضامین، یا طربیہ خاکے، فرمائش پوری کرنے کے لئے، کبھی رسائل کی کبھی ریڈیو کی، افسانے کا تانا بانا تیار ہو تو قلم خود بخود چلنے لگتا ہے۔ بہت رات گئے تک لکھنا میرا معمول ہے۔ پھر سو جاتا ہوں اور صبح ہو جاتی ہے، پھر وہی چکر، اخبار کا دفتر اور گھر کی دہلیز۔ فاصلہ دو فرلانگ، یہی فاصلہ کبھی دو سو میل کا بن جاتا ہے اور کبھی بس دو ہاتھ ——

محوِ مطالعہ　　　　فوٹو: سراج انور، دہلی

جوان ہمت

فوٹو: ایچ۔ایل سیٹھ، دہلی

نڈھال

جنتِ ارضی

فوٹو: حافظ گلاسگو
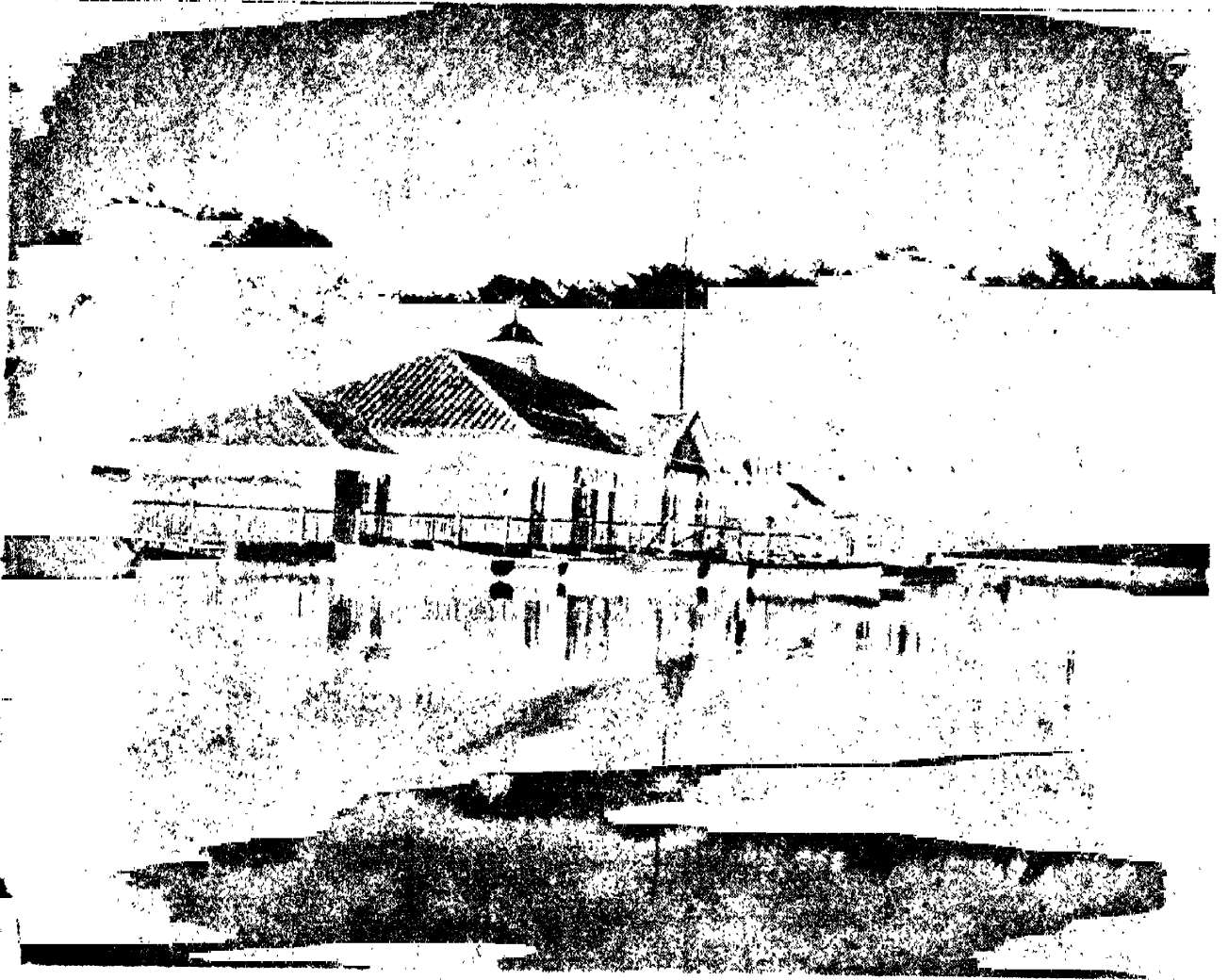
تاریخ عالم کا وہ عظیم انسان جو نصف صدی تک نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دُنیا میں امن و آزادی کی رُوح پھونکتا رہا، خود ابدی نیند سو گیا۔

آنجہانی پنڈت جواہرلال نہرو اپنے آخری سفر پر ——— وہ ستارا جو اپنے پیچھے روشنی کی ایک تابناک لکیر چھوڑ گیا۔

بیسویں صدی

ایڈیٹر — خوشتر گرامی

جلد — ۲۸ ٹیلیفون دفتر — ۲۷۱۳۷

نمبر — ۷ ٹیلیفون رہائش — ۲۳۹۲۷

فی پرچہ Rs. 1-50

تیر و نشتر

خوشتر گرامی

"بددیانتی کی روک تھام"۔ ایک عنوان ——— اور صرف تقریروں کے ذریعہ۔

"کرپشن اور جمہوریت ساتھ ساتھ نہیں رہ سکتے"۔ گلزاری لال نندہ ——— دونوں الگ الگ ہیں۔ جمہوریت زبان پر ہے اور کرپشن دلوں میں۔

"مگرمچھ زندہ پکڑا گیا"۔ ایک خبر ——— سیاسی ہے یا غیر سیاسی۔

"تیس سال میں پنجاب کی آبادی دگنی ہو گئی" ——— اور لیڈروں کی تعداد دس گنی۔

"کانگرسیوں میں جوتے چل گئے" ——— جوتے چلنے ہی کے لئے ہوتے ہیں۔

"عوام کو تاریکی میں نہ رکھئے"۔ ایک عنوان ——— اور ہر آدمی کو ایک ایک ٹارچ سپلائی کیجئے۔

"پنجاب میں شادی ٹیکس لگے گا"۔ ایک خبر ——— اس لئے کنواروں کی انجمن "اینٹی شادی ٹیکس" ایجی ٹیشن شروع کرے۔

"ہند اور پاکستان کے درمیان جنگ نہیں ہو گی"۔ ایک عنوان ——— جن سنگھیوں کی جانب سے پُرزور احتجاج۔

"پاکستان کے پرائیویٹ کالجوں کے اساتذہ کے حالات معلوم کرنے کے لئے کمیشن مقرر کرنے کا مطالبہ"۔ پاکستانی اخبارات ——— اس میں نصابی کتابوں کے علاوہ درسِ محبت کے معاملات کی چھان بین بھی شامل ہو گی۔
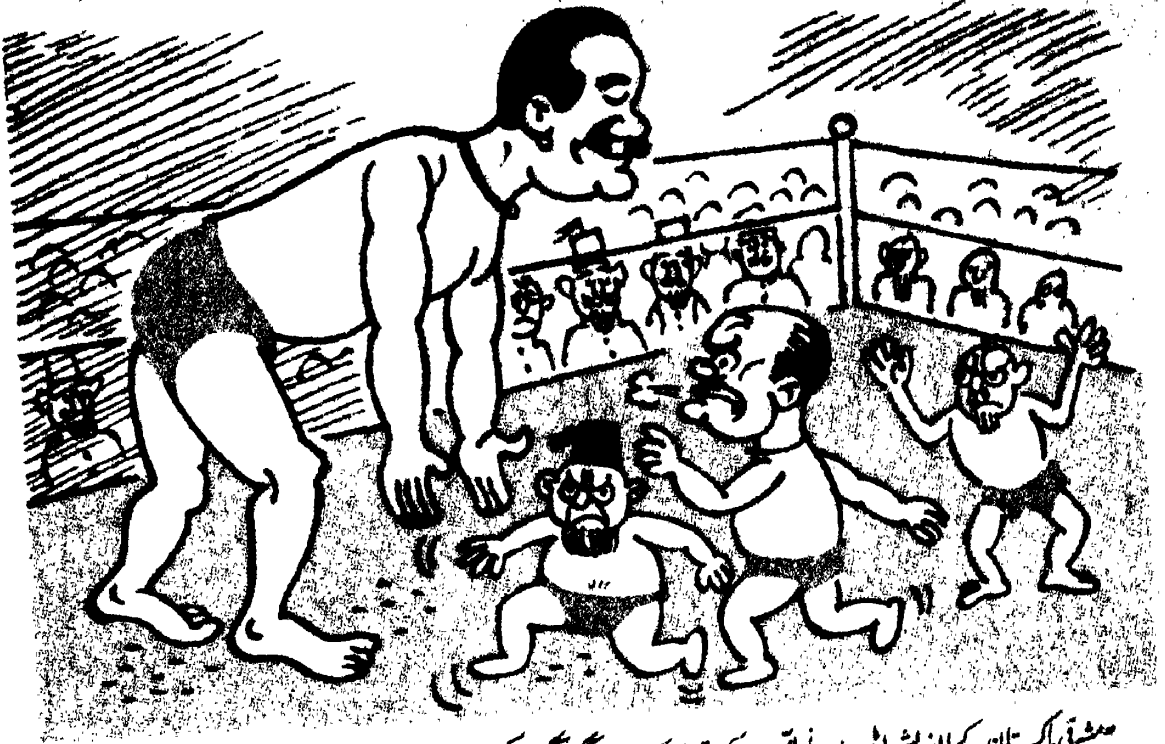
"مشرقی پاکستان کے اپوزیشن لیڈروں نے ایوب کے مقابلہ کے لئے لنگر لنگوٹ کس لئے ہیں" ——— ایک خبر۔

"لڑکیوں کے لئے بھی لازمی تعلیم" ۔ وزیر تعلیم پنجاب کا اعلان ——— ...کی لیڈروں کے لئے اختیاری ہے چاہے پڑھیں چاہے نہ پڑھیں۔

"کرپشن کیسے دور ہو" ۔ ایک عنوان ——— اسے جائز قرار دے کر۔

"کانگرس کے اصول اچھے ہیں ۔ کام کرنے والے غلط ہیں" ۔ ایک عنوان ——— ...نے والوں کی پرواہ نہ کیجئے ۔ اصولوں کو چاٹتے رہئے۔

"اپنے مقصد پر نظر رکھو" ۔ لال بہادر شاستری کا مشورہ ——— اس ...مقصد پر کانگرس پہلے ہی عمل کر رہا ہے۔

"جمہوریت خطرے میں" ۔ ایک عنوان ——— "اسلام اور ہندو دھرم ...خطرے میں" کے پرانے نعروں کے بعد نیا نعرہ۔

"کاہلی سے احتراز کیجئے" ۔ گلزاری لال نندہ کی تلقین ——— ورنہ وزارت سے محروم رہ جائیں گے۔

"فیروز پور میں لوگ ایک ماہ میں سات لاکھ روپے کی شراب پی گئے" ۔ ایک خبر ——— بھارت رتن کی طرح فیروز پور کو نشہ رتن کا خطاب دیا جانا چاہئے۔

"پرمٹ مارکہ سیاسی لیڈروں سے خبردار" ۔ ایک عنوان ——— یہ کھدر کے کرتے اور دھوتیاں پہن پہن کر اور گاندھی ٹوپیاں اوڑھ اوڑھ کے چلتے ہیں۔

"کانگرس کو گدی سے اتارنے کے لئے متحد ہو جاؤ" چیرمین سوشلسٹ پارٹی کی اپیل ——— مگر بعد میں گدی پر قبضہ کے لئے پیدا ہونے والی پھوٹ کا بندوبست بھی پہلے ہی کر لیں۔

"وزارت کی پیشکش" ——— نیکی اور پوچھ پوچھ۔

"ہندوستان کے ڈاکوؤں اور پولیس میں خفیہ گٹھ جوڑ" ایک عنوان ——— کہ ہم تم سب آپس میں بھائی بھائی جو سلے گا بانٹ کر کھائیں گے۔

"پاکستان سے مفاہمت ضروری ہے" ایک عنوان ——— جن سنگھ اور ہندو مہا سبھا کی سیاسی دوکانوں کا دیوالہ نکل جائے گا۔

"جموں و کشمیر کے سابق وزراء اب تک سرکاری بنگلوں میں مقیم ہیں" ——— دوبارہ ملنے کی اُمید میں۔

"امریکہ روئی مہیا کرےگا" ایک خبر ——— روئی سے پیٹ نہیں بھرے گا۔ روٹی مہیا کرو۔

"ڈانگے گروپ کانگریس کا پٹھو ہے": رام مورتی کا سرٹیفکیٹ ——— اور گوپالن گروپ چو۔ این۔ لائی کا؟

"پیداوار بڑھانے والوں کا مالیہ معاف": سردار پرتاپ سنگھ کیروں کا اعلان ——— ہر قسم کی پیداوار بڑھانے والے اس موقعہ سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

"جنگی سطح پر کام کرو" سردار پرتاب سنگھ کیروں کی ہدایت ——— یعنی ہر کام پر آپس میں لڑیں مریں۔

حادثۂ غم فزا

گئے عدم کو صد افسوس آج نہرو بھی
قضا نے کھینچ دیا اُن پہ بھی خطِ تنسیخ
کیا خیال جو سالِ وفات کا لے جوشؔ
'شدید حادثۂ غم فزا' ہوئی تاریخ
١٩٦٤

جوش ملسیانی

"آوارہ کتے دلّی کارپوریشن کے لیے دردِ سر بنے ہوئے ——— اور آوارہ سیاستدان کونسے باعثِ راحت ہیں۔

"یو۔پی میں انگور کی کاشت کی جائے گی" ایک خبر ——— مگر کھٹے انگوروں کی نہ ہو ورنہ کچھ سیاسی لومڑیاں محروم رہ جائیں گی۔

آفتاب غروب ہوگیا

خوشتر گرامی

آنکھوں سے آنسو رواں ہیں، دل سے دھواں اٹھ رہا ہے۔ آنکھیں ہی نہیں دل بھی خون کے آنسو رو رہا ہے۔ قلم یہ لکھتے ہوئے کانپ رہا ہے کہ ۲۷ مئی کو بیسویں صدی کے امن و آشتی کا آفتاب ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا ——— بقا و فنا اور حیات و ممات لازم و ملزوم ہیں۔ انسانی زندگی کا انجام موت ہے۔ اوتار، پیغمبر اور رشی منی بھی موت کی زد سے نہ بچ سکے، ہر شے کو فنا ہے۔ بقا صرف اللہ کے لئے ہے۔ مرنے کو تو سبھی مرتے ہیں۔ لیکن بعض مرنے والے تا ابد فراموش نہیں ہو سکتے۔

پنڈت جواہر لال جی نہرو ہم سے رخصت ہو چکے ہیں۔ لیکن جب تک کرۂ ارض پر نسلِ انسانی موجود ہے وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے اور ان کا نام اور کام ہمیشہ غیر فانی رہیگا۔ وہ کردار و عمل کے اعتبار سے بیسویں صدی کی ایک ایسی عظیم شخصیت تھے جو کسی قوم میں صدیوں کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ انھیں دنیا کی کوئی طاقت راہِ حق سے منحرف نہ کر سکی۔ وہ سیکولرازم کے بہت بڑے ستون تھے۔ انہوں نے ملک کو غیر فرقہ وارانہ بنیادوں پر کھڑا کیا اور اس کے سماجی اور سیاسی اداروں میں ایک نئی قوت، نئی سپرٹ اور نئی روح پیدا کر دی۔ وہ جمہوریت کے عظیم ترین علمبردار، عالمی امن اور اتحاد کے بے نظیر حامی اور فلاحِ انسانی کے حقیقی بہی خواہ تھے ——— انہوں نے ملک اور قوم کو خالص جمہوری اصولوں پر چلایا اور بین الاقوامی دنیا کے دل پہ ہندوستان کی عظمت کا سکہ جما کر اس کو عظیم الشان ممالک کی صفِ اول میں لا کھڑا کیا۔ بالفاظِ دیگر انھوں نے ہمارے ملک کو اس بلند درجے پر پہنچایا جسے دوسری قومیں صدیوں تک حاصل نہ کر سکیں ——— پنڈت جی کی دائمی مفارقت ملک کے لئے ایک ناقابلِ برداشت سانحہ، ایک قومی المیہ اور ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ آج ہندوستان ہی نہیں ساری دنیا میں صفِ ماتم بچھی ہوئی ہے۔ آج ہندوستان ہی نہیں ساری دنیا اس عظیم رہنما اور روشنی کے عظیم مینار سے محروم ہو گئی ہے، وہ ہم سے عین اس وقت جدا ہوئے جب ہمیں ان کی اشد ضرورت تھی اور ساری دنیا کی نظریں ان پر لگی ہوئی تھیں۔ ان کی المناک موت نے سارے جہان کو اندوہناک کر دیا ہے۔ آج ساری دنیا سوگوار اور پوری سطحِ زمین ماتم کدہ ہے ——— ان کی بے وقت موت سے بیسویں صدی کی وہ عظیم ترین شخصیت رخصت ہو گئی جو آدرش انسانیت کا صحیح نمونہ تھی۔ وہ ایک فرد نہیں بلکہ ایک انسٹی ٹیوشن تھے۔ ان کے ساتھ ایک دور، ایک یگ جسے نہرو یگ کہتے ہیں ختم ہو گیا۔ وہ ہندوستان کے وزیرِ اعظم ہی نہیں تھے بلکہ ۴۴ کروڑ انسانوں کے دلوں کے مالک اور ان کے محبوب بھی تھے۔ ہمارے ملک میں پنڈت جواہر لال نہرو کا بدل موجود نہیں اور نہ اس عظیم رہنما کا جانشین صدیوں تک پیدا ہو سکتا ہے۔ ہاں کام چلانے اور وزارتِ عظمیٰ کی کرسی سنبھالنے کے لئے شری لال بہادر شاستری کو عزت عطا کی گئی ہے جس کے وہ بجا طور پر مستحق اور موزوں ہیں۔ وہ عقل و دانش اور تدبر و حکمت کے پتلے ہیں۔ ہمیں یقین کرنا چاہئے کہ ان کی رہنمائی میں وہ سب کام پورے ہو جائیں گے جنہیں نہرو جی ادھورا چھوڑ گئے ہیں اور یہی نہرو جی کی بہترین یادگار ہوگی کہ ہم ان کے نیک مشن کو پورا کریں اور ان کی دکھائی ہوئی راہ پر چلیں ———

خورشید

ہجومِ غم

طاری ہے دیارِ ہند پر عالمِ یاس
گریاں گنگ و جمن، ہمالہ ہے اُداس
قسمت میں وطن کی کیا لکھا تھا یا رب
نہرو بھی گیا گاندھی و آزاد کے پاس

محروم

تاریخِ وفاتِ نہرو

پروفیسر ڈاکٹر منوہر سہائے انور ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی

چل بسے پنڈت جواہرلال نہرو ہائے ہائے! ۔۔۔ مُلک کو اِس وقت تھی اُن کی نہایت احتیاج

اُن کو صحت مند خاطر خواہ حد تک دیکھ کر ۔۔۔ دیکھنے والوں کے دِل میں جوش زن تھا اِبتہاج

کیا خبر تھی دُوسرے دن کُوچ کر جائیں گے وہ ۔۔۔ گر پڑے گا مادرِ ہندوستاں کے سر سے تاج

کی طبیبوں نے بچانے کی بہت کوشش مگر ۔۔۔ بے اثر ثابت ہُوا سارا مُداوا سب علاج

ہو گئی ہے کانگرس اُن کے نہ ہونے سے یتیم ۔۔۔ دیکھئے اب کس طرح چلتا ہے اُس کا کام کاج

حیف اُن سا حامِلِ کردارِ عالی اب کہاں ۔۔۔ رو رہے ہیں اُن کے غم میں نسلِ آدم کے سماج

ہمنوارانِ وطن کی کج روی کے باوجُود ۔۔۔ عینیت ہی کی طرف مائل رہا اُن کا مزاج

وہ مُسلّم جانشیں تھے گاندھی حق کوش کے ۔۔۔ اُن کے ہوتے غیرِ حق کا غیر ممکن تھا رواج

ہو رہے ہیں پے بہ پے اطرافِ عالم سے وُصُول ۔۔۔ رہنمایانِ سیاست کی عقیدت کے خراج

حضرت انور نے رحلت کی خبر سُن کر کہا

"ہو گیا گُل ہند کا روشن چراغ اے وائے آج"

۱۹۶۴ عیسوی

سلہ آدرش واٹا

منوہر سہائے انور
۲۷ مئی ۱۹۶۴ء

۳/۲۸ ایسٹ پٹیل نگر، نیو دہلی

افسانہ

گڑھا

کرشن چندر ایم اے

گروفراس فضیلتہ روڈ کھار، بمبئی ۵۲

۱۴ مئی ۱۹۶۳ء

برادرم خوشتر صاحب! آداب

ایک افسانہ بعنوان "گڑھا" بھیج رہا ہوں۔ یہ اُس ماحول پر طنز ہے، جس میں ہم سب جی رہے ہیں۔ خدا کرے وقت پر مل جائے۔ فوٹو اسی ہفتے بھیجنے کی کوشش کروں گا۔ چار پانچ سال سے کوئی تصویر نہیں کھنچوائی۔ دوسروں کی تصویریں کھینچنے میں لگا رہا ———— اُمید ہے "افسانہ نمبر" ہمیشہ کی طرح اس بار بھی آپ کی محنت اور کاوشوں کا آئینہ دار ہوگا۔ بمبئی کب آئیے گا ———؟

آپ کا ————

ایک آدمی گڑھے میں گر گیا۔ اور شور مچانے لگا۔ "مجھے بچاؤ، بچاؤ۔ میں گڑھے میں گر گیا ہوں۔ مجھے باہر نکالو۔"

گڑھا سڑک کے عین بیچ میں تھا۔ اور ہر ایک کو دکھائی دیتا تھا۔ اور بہت پرانا تھا۔ گڑھا جتنا چوڑا تھا جتنا گہرا تھا۔ اُس پر سے موٹریں بہت آسانی سے گزر جاتی تھیں اور جس طرح موٹریں بہ آسانی کسی گڑھے پر سے گزرتی رہتی ہیں اُس کی مرمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

شور سن کر دو آدمی آئے۔ ایک آدمی پتلون پہنے ہوئے تھا۔ دوسرا خاکی نیکر۔ پتلون والا آدمی گڑھے کے کنارے کھڑا ہو گیا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی کاپی اور پنسل تھی۔ خاکی نیکر والا آدمی گڑھے کے کنارے اکڑوں بیٹھ گیا اور اطمینان سے بیڑی پینے لگا۔ اور بیڑی کی خاک گڑھے میں جھاڑتا رہا۔

"مجھے بچاؤ۔ مجھے بچاؤ۔ میں گڑھے میں گر گیا ہوں۔" گرے ہوئے آدمی نے گڑھے میں سے ہاتھ نکال کر زور سے چلانا شروع کیا۔

خاکی نیکر والے آدمی نے اپنی جیب سے چمڑے کا ایک گول ڈبہ سا نکالا۔ اُس ڈبے کے اوپر پیتل کا ایک بٹن لگا ہوا تھا۔ خاکی نیکر والے نے بیڑی ختم کر کے پیتل کے بٹن کو گھمایا۔ چمڑے کے ڈبے میں سے چمکتے ہوئے فولاد کا ایک فیتہ نکلا۔ جو گراری کی طرح باہر نکلتا گیا۔

پتلون والے نے دانتوں میں پنسل دبا کر کہا۔ "بولو۔" خاکی نیکر والے نے فیتے کو گڑھے کے اوپر رکھ کر جواب دیا۔ "لمبائی پندرہ فٹ۔" پھر اُس نے فیتے کا رُخ بدل کر پیمائش کی۔ بولا۔ "چوڑائی آٹھ فٹ۔" پھر اُس نے گڑھے کی گہرائی کو جانچا۔ بولا "گہرائی بائیس فٹ۔"

"چ... چ..." پتلون والا صاحب بولا۔ "بہت گہرا ہے۔"

"یہی تو میں بھی کہتا ہوں!" گرا ہوا آدمی چلایا۔

"گڑھا بہت گہرا ہے۔ میں خود نہیں نکل سکتا۔ مجھے دوسروں کی مدد درکار ہے۔ مہربانی کر کے بچائیو۔ مجھے اِس گڑھے سے نکالو۔ نہیں تو میں اِس میں پڑا پڑا بھوکا پیاسا مر جاؤں گا۔"

"چُپ رہو۔" پتلون والا آدمی نہایت سختی سے بولا۔ "ہمارا کام گڑھے کی پیمائش کرنا ہے۔ گرے ہوؤں کو نکالنا نہیں ہے۔"

اِتنا کہہ کر پتلون والے نے خاکی نیکر والے کو اِشارہ کیا۔ "چلو، ہمیں ابھی اس سڑک کے بہت سے گڑھے دیکھنے ہیں۔"

خاکی نیکر والا اپنی جلی ہوئی بیڑی گڑھے میں پھینک کر پتلون والے کے ساتھ چلا گیا۔

گرا ہوا آدمی پھر چلانے لگا۔ "میں گڑھے میں گر گیا ہوں۔ مجھے باہر نکالو۔"

ہر نکالو کسی طرح ....."

اُس کا شور سُن کر تین آدمی آئے۔ اور گڈھے کے تینوں طرف کھڑے ہو گئے۔ دو آدمی سفید اچکن اور دھوتی پہنے ہوئے تھے۔ تیسرے نے ٹیری لین کی عمدہ پتلون پہن رکھی تھی۔ اُس کے جُوتے بہت چمکدار تھے۔

وہ لوگ بہت غور سے گڈھے میں گِرے ہُوئے آدمی کو دیکھنے لگے۔

"گڈھے میں گِر گیا ہے؟" ایک بولا۔

"ہاں!" دُوسرے نے تائید کی۔

"گڈھا ہی معلوم ہوتا ہے!"

"ہر سڑک پر گڈھے ہوتے ہیں" تیسرا بولا "اگر چلنے والا احتیاط کرے تو ہرگز گڈھے میں نہیں گِر سکتا"

"بے شک کبھی نہیں گِر سکتا" پہلا بولا "ہماری میونسپلٹی ہر سڑک پر اتنے بڑے بڑے گڈھے بناتی ہے کہ آنکھ کھول کر چلنے والا اُن میں کبھی گِر ہی نہیں سکتا۔ یہ سب اِس کا اپنا قصُور ہے!"

"میرا کوئی قصُور نہیں ہے" گِرا ہوا آدمی بھرّائی ہوئی آواز میں بولا۔

"میں کل رات سے اِس گڈھے میں گِرا ہُوا ہوں۔ سڑک پر اندھیرا تھا۔ اِس سڑک پر بجلی کے کھمبے بہت دُور دُور ہیں۔ اور اِس گڈھے کے بالکل سامنے بجلی کا جو کھمبا ہے۔ اس کا بلب ٹوٹا ہوا ہے۔ یقین نہ آئے تو خود دیکھ لو۔ رات بہت اندھیرا تھا۔ میں جلدی جلدی قدم اُٹھاتا ہُوا گھر جا رہا تھا کہ اِس گڈھے میں گِر گیا۔ مجھے اِس گڈھے سے نکالو۔ میرے حال پر رحم کرو۔ میری بیوی گھر پر میرا اِنتظار کر رہی ہے"

"جلدی چلو" دُوسرے آدمی نے سڑک کے ایک طرف اشارہ کرکے باقی دو ساتھیوں سے کہا۔ "وہ سٹاک ایکسچینج کو جانے والی بس آ گئی۔ اِس کم بخت کو نکالنے میں لگ جاؤ گے۔ تو ہزاروں کا نُقصان ہو جائے گا"

وہ لوگ تیزی سے سٹاک ایکسچینج کو جانے والی بس کی طرف دوڑے۔

اب کے گڈھے میں گِرا ہُوا آدمی اِتنے زور سے گلا پھاڑ پھاڑ کر چلّایا کہ گڈھے کے گرد بہُت سے آدمی جمع ہو گئے۔ سب لوگ حیرت سے اُس گِرے ہُوئے آدمی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ لیکن کسی کو ہمت نہ ہوتی تھی۔ کہ اِس گِرے ہوئے آدمی کو گڈھے سے نکالے۔

"گڈھا بہُت گہرا ہے" ایک آدمی نے اظہارِ افسوس کیا۔

"اور اِس میں کیچڑ بھی ہے" دُوسرا بولا۔

"اسے بچانے والا خود بھی گڈھے میں گِر سکتا ہے" تیسرا بولا۔

"کپڑے بھی خراب ہوں گے" چوتھا بولا۔

"مگر کسی نہ کسی کو تو اِس بے چارے کو نکالنا ہی چاہیئے" ایک ادھیڑ عورت اپنے بچّے کو سنبھالتے ہوئے بولی۔

بہت سے لوگوں کو سڑک کے بیچ میں اکٹھا ہوتے دیکھ کر ایک سنتری تیزی سے بھاگا بھاگا آیا۔ اُس نے غُصّے میں آ کر مجمع کو تتر بتر کرنا شرُوع کیا۔

"کیا ہُوا؟ ــــــ بھاگو ــــــ بھاگو ــــــ راستہ دو۔ راستے سے ہٹ جاؤ۔ یہ خِلاف قانُون مجمع ہے۔ باؤلے ہُوئے ہو۔ احمق ہو تم سب! کیا تُم نے آج تک کسی کو گڈھے میں گِرا ہُوا نہیں دیکھا؟ کوئی عجوبہ ہے یہ۔ جو اتنی بھیڑ لگا رکھی ہے۔

ہٹو۔ بھاگو یہاں سے۔ ورنہ ابھی لاٹھی چارج کرتا ہُوں"

پولیس کی وردی دیکھ کر لوگ اِدھر اُدھر بھاگ گئے۔ پولیس مین گڈھے کے کنارے کھڑا رہا۔ اُس نے اپنی نوٹ بک نکالی اور غرّا کر بولا۔

"بدمعاش، جان بُوجھ کر گڈھے میں گِرا ہے۔ اور یہ مجمع لگا کر لوگوں سے پیسے بٹورنے کا نیا ڈھنگ نکالا ہے"

"دُہائی ہے سنتری صاحب! میں بدمعاش نہیں ہُوں۔ میں گڈھے میں گِر گیا ہُوں۔ مجھے باہر نکالو"

سنتری نے غور سے گڈھے کے اندر دیکھا۔ نیچے گڈھے کے اندر پانی کا پائپ نظر آ رہا تھا۔ اور اُس میں سے پانی رِس رِس کے باہر نکل رہا تھا۔ اور گڈھے میں جمع ہو رہا تھا۔

"تم پائپ کو نقصان پہنچانے کے اِرادے سے گڈھے میں داخل ہُوئے ہو" سنتری غُصّے سے چلّایا "تاکہ شہر میں ہیضہ پھیل جائے تم کوئی خطرناک غیر مُلکی ایجنٹ معلُوم ہوتے ہو"

"میں کوئی غیر مُلکی ایجنٹ نہیں ہُوں۔ دُہائی ہے سنتری صاحب میں ایک غریب شہری ہوں۔ نئی تعمیر ہونے والی بلڈنگوں پر اینٹیں ڈھو ڈھو کر اپنا پیٹ پالتا ہُوں"

"سب معلُوم ہو جائے گا۔ پولیس کو سب معلُوم رہتا ہے۔ اپنا نام بتاؤ" سنتری نے گرج کر پُوچھا۔

گِرے ہُوئے آدمی نے اپنا نام بتایا۔

"کہاں رہتے ہو؟"

گِرے ہوئے آدمی نے اپنے رہنے کی جگہ بتائی۔

"اپنی عمر بتاؤ"

گِرے ہُوئے آدمی نے اپنی عمر بتائی۔ پولیس مین نے گِرے ہُوئے آدمی کو

ڈیوٹی کر اس ہولناک نقشہ اپنے ذہن میں مرتب کر کے ڈائری میں لکھ لیا۔ بولا۔
"تمہارا چالان ہو گا۔"
"بے شک چالان ہو جائے۔ مگر مجھے اس گڑھے سے تو نکالو۔"
گڑھے میں گرے ہوئے آدمی نے دانت پیس کر کہا۔
"میں تمہیں اس گڑھے سے نہیں نکال سکتا۔" پولیس مین نے اپنی نوٹ بک اور پنسل جیب میں رکھنے سے پہلے اس میں سے ایک پرچہ پھاڑا اور اُسے گڑھے میں گرے ہوئے آدمی کی طرف پھینک کر بولا۔ "یہ تمہارا چالان ہے۔ کل صبح دس بجے سے پہلے چوک کے تھانے میں حاضر ہو۔"

سنتری چلا گیا۔ گرا ہوا آدمی دیر تک حیرت اور ڈر سے چُپ رہا۔ پھر آہستہ آہستہ چلانے لگا۔ دیر تک چلاتا رہا۔ چلاتے چلاتے اُس کی آواز بیٹھ گئی۔ اور اس کے جسم کے ہر مسام سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ اُسے بہت زور کی پیاس محسوس ہونے لگی۔ بالآخر اُس نے رستے ہوئے پائپ کے جائنٹ کو ذرا سا کھولا اُس میں سے پانی کی دھار زور سے نکلی۔ گرے ہوئے آدمی نے اپنا منہ پائپ کے جائنٹ سے لگا دیا اور جی بھر کر پانی پیا۔ پھر اُس نے زور لگا کر پائپ کا جائنٹ بند کر دیا۔ اب پائپ سے پانی ٹپکنا بند ہو گیا تھا۔

پانی پی کر وہ چند لمحوں کے لئے تو چُپ رہا۔ پھر جب اُس نے نگاہ اُوپر اٹھائی تو بہت سی آنکھوں کو اپنے اُوپر تاکتے ہوئے پایا۔
"ایک آدمی ہے جو گڑھے میں گر کر پائپ کھول کر اپنی پیاس بجھا رہا ہے۔" ایک آدمی بولا۔
"حالانکہ اپنے گھر بھی بجھا سکتا تھا۔" دوسرا بولا۔ "بہت عجیب آدمی ہے۔"
"مجھے تو کوئی فقیر معلوم ہوتا ہے۔" تیسرا بولا۔
"بابا کیلا کھاؤ گے؟" چوتھے آدمی نے جو بہت سے کیلے لئے ہوئے تھا ایک کیلا پھینکتے ہوئے کہا۔
گڑھے میں گرے ہوئے آدمی نے جلدی سے کیلا دبوچ لیا۔ کیونکہ اُسے بہت بھوک لگی ہوئی تھی۔ چھلکا اتار کر اُس نے ایک ہی منہ میں سارا کیلا نگل لیا۔ گرے ہوئے آدمی کی آنکھیں پھٹی پھٹی تھیں اور اس کا حلق کیلے کو نگلتے ہوئے عجیب طرح سے چل رہا تھا۔ کیلا پھینکنے والے نے اُس کے حلق کی اِس حرکت کو دوبارہ دیکھنے کے لئے دوسرا کیلا اُس کی طرف پھینکا۔ گڑھے میں گرا ہوا آدمی دوسرے کیلے کو بھی فوراً نگل گیا۔
"اب نمبر بتاؤ؟"
"گھر کا نمبر؟" گرے ہوئے آدمی نے پوچھا۔
"گھر کا نمبر نہیں۔ سٹے کا نمبر... بابا...!"

"میں کوئی بابا نہیں ہوں۔" گڑھے میں گرا ہوا آدمی زور سے چلایا۔
"میں ایک غریب شہری ہوں۔ اینٹ ڈھونے والا۔ کل رات کے گیارہ بجے سے اس گڑھے میں گرا ہوا ہوں۔ اور کوئی آدمی میری مدد کو نہیں آتا۔ ارے کیسے ہو تم ظالم لوگ؟"
"سالا دو کیلے کھا گیا ہمارے۔ اور ہمیں کو ظالم بتا رہا ہے۔" کیلے والا بولا۔
"اور اُوپر سے نمبر بھی نہیں بتاتا۔" دوسرے آدمی نے گڑھے کے کنارے سے مٹی کا ایک ڈھیلا اُٹھا لیا۔ "ماروں سالے کے سر پر۔ پھوڑ دوں اس کا سر۔"
"تیسرا بولا۔ "احمق ہوا ہے۔ سمجھتا نہیں۔ بابا جی نے نمبر بتا دیا ہے۔"
"کیا؟"
"گیارہ..."
"گیارہ؟"
"ہاں گیارہ... یعنی ایک سے ایک!"
"بلپ رے... ارے بھاگ۔ نمبر لگانے کا ٹائم نکلا جا رہا ہے!"
"ارے کوئی مجھے اس گڑھے سے نکالو۔" گرا ہوا آدمی چلایا۔ لیکن نمبر لگانے والے بھاگ گئے تھے اُسے گڑھے میں چھوڑ کر....
تھوڑی دیر کے بعد ایک شاندار موٹر اُس گڑھے کے قریب آکر رکی اور اُس میں سے ایک لمبا تڑنگا گورا چٹا آدمی نکلا۔ جس نے بہت قیمتی مغربی طرز کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اُس کی آنکھوں پر بہت قیمتی چشمہ تھا۔ جب وہ گڑھے میں گرے ہوئے آدمی کو دیکھ کر مسکرایا تو گرے ہوئے آدمی کو اُس کے دانتوں میں دو دانت سونے کے دکھائی دئے۔ شکل و صورت سے وہ کوئی غیر ملکی معلوم ہوتا تھا۔
"ہیلو!" غیر ملکی بولا۔ "میرا نام بارنس ریگ ہے۔"
"صاحب!" گرا ہوا آدمی نہایت لجاجت سے بولا۔ "مجھے اس گڑھے سے باہر نکالو۔"
صاحب اپنی کلائی پر بندھی ہوئی بیش قیمت گھڑی کی طرف دیکھ کر بولا۔
"میں صرف آدھ گھنٹہ لوں گا۔"
"آدھ گھنٹہ کیا ایک گھنٹہ لے لیجئے۔ دو گھنٹے لے لیجئے۔ مگر کسی طرح مجھے اس گڑھے سے باہر نکال دیجئے۔"
"میں تم سے کچھ سوالات کا جواب چاہتا ہوں۔" گورے آدمی نے کالی جلد والی ایک موٹی سی نوٹ بک اور ایک بیش قیمت فونٹین پن نکالا۔
"پوچھئے۔" گرے ہوئے آدمی نے بے صبری سے کہا۔
"تم کب سے اس گڑھے میں ہو؟"

"کل رات سے۔"

"کل رات سے تو ہو لیکن کیا لگتا ہے تم کیا محسوس کرتے ہو کہ یہاں کب سے ہو؟"

"ایسا لگتا ہے جیسے سیکڑوں سال گزر گئے۔"

گورے آدمی نے جلدی جلدی لکھتے ہوئے کہا۔ "میں یہی جواب چاہتا تھا...... اچھا! اب یہ بتاؤ۔ جب تم گڈھے میں گرے اُس وقت تم نے کیا محسوس کیا؟"

"کیا محسوس کیا؟ کیا مطلب؟"

"مطلب یہ ہے کہ اُس وقت تمہارے لاشعور کے اضطراب بے شعور کی حرکت منفی کیا تھی؟"

"مجھے معلوم نہیں!"

"کیا تم اِس گڈھے میں خوش نہیں ہو؟"

"ہرگز نہیں۔"

"نہیں؟"

"بہت ناشکرے ہو۔ یہ نہیں سوچتے۔ کہ اگر تمہیں اِس سے بھی گہرا گڈھا ملا جاتا تو تمہاری ہڈی پسلی ٹوٹ جاتی۔"

"اے صاحب۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔" گرا ہوا آدمی ہاتھ جوڑ کر منت کرنے لگا۔ "ایسے اَندھے سیدھے سوال مجھ سے مت کرو۔ میں ایک غریب بے یار و مددگار انسان ہوں۔ مجھے کسی طرح اِس گڈھے سے نکالو۔"

"جرمن پرابلم کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"جرمن بلم؟ ——— اَے صاحب۔ میں نے آج تک کوئی بلم استعمال نہیں کیا۔ قسم لے لو۔ میں تو ساری عمر اینٹیں ڈھوتا رہا ہوں۔"

"امریکہ یا رُوس؟ ——— اِن دونوں میں سے تم کسے بہتر سمجھتے ہو؟"

"جو مجھے گڈھے سے نکالے......!" گرے ہوئے آدمی نے آنکھیں میچ کے بالکل زچ ہو کر کہا۔

گورے آدمی نے اپنی نوٹ بک بند کی اور مسکرا کر کہا۔

"تھینک یُو۔ تم نے اِس مصیبت کے باوجود میرے سوالات کا جواب دیا۔ اس کے لئے تہ دل سے تمہارا شکر گزار ہوں۔ اب میں جاتا ہوں۔"

"مگر مجھے گڈھے سے تو نکالتے جاؤ۔" گڈھے میں گرا ہوا آدمی منت سماجت کرنے لگا۔

"ساری!" گورا صاحب بولا۔ "یہ میرا کام نہیں ہے۔ میں دراصل ٹیکنیکل آرگنائزیشن کا فارن ایکسپرٹ ہوں۔ میں اپنے ترقی یافتہ ملک سے تمہارے پچھڑے ہوئے ملک کی مدد کرنے کے لئے بھیجا گیا ہوں۔"

"تو میری بھی مدد کرو۔ گورے صاحب!"

"ساری۔ یہ میرا کام نہیں ہے۔ میرا کام سڑک کے گڈھوں کے اعداد و شمار جمع کرنا ہے۔ اور گڈھے میں گرے ہوئے لوگوں کا نفسیاتی مطالعہ پیش کرنا ہے۔ میں اِس کام کے لئے دو سال تک تمہارے ملک کا دَورہ کروں گا۔ ہر سڑک کے ایک ایک گڈھے کو دیکھوں گا۔ پھر اپنے ملک میں جا کر اِس کی رپورٹ کروں گا۔ اِس کام میں ایک سال لگ جائے گا۔ پھر اِس رپورٹ پہ غور و خوض ہوگا۔ ممکن ہے دو سال اُس میں لگ جائیں۔ اُس کے بعد یہ رپورٹ مُناسب مشوروں کے ساتھ تمہارے ملک کی حکومت کو پیش کر دی جائے گی۔ گڈ بائی....!"

گڈھے میں گرا ہوا آدمی نا اُمیدی سے کراہنے لگا۔ اب دُھوپ تیز ہو چلی تھی۔ سُورج سر پر آ گیا تھا۔ اُس کے سارے بدن میں سُوئیاں سی چبھ رہی تھیں۔ اور چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں اور کہیں کوئی سایہ نہ تھا۔ ایسا لگتا تھا۔ جیسے اُس کی کھوپڑی چٹخ جائے گی۔ گڈھے میں گرے ہوئے آدمی نے اپنی کنپٹیوں کو دونوں ہاتھوں سے داب لیا اور زور زور سے کراہنے لگا۔

ایک آواز آئی۔ "کیوں روتے ہو بچہ؟"

گرے ہوئے آدمی نے کراہنا بند کر کے اُوپر دیکھا۔ اُوپر ایک جٹا دھاری سادھو کا چہرہ نظر آیا۔

"سادھو مہاراج!" وہ رو کر بولا۔ "میں گڈھے میں گر گیا ہوں۔ کسی طرح مجھے اِس گڈھے سے باہر نکالیے۔"

"بھولے بچے!" سادھو مہاراج ہنس کر بولے۔ "کتنے نادان ہو تم [illegible] چھوٹے سے گڈھے سے نکل کر باہر کے بڑے گڈھے میں گرنا چاہتے ہو [illegible]! یہ ساری دُنیا ہی ایک بہت بڑا گڈھا ہے۔ اور ہر شخص ایک گڈھے میں ہے۔ کوئی چھوٹے میں۔ کوئی بڑے میں۔ اِس گڈھے سے رہائی کسی منش کے بس میں نہیں۔ اِن گڈھے سے رہائی تجھے صرف بھگوان دلا سکتے ہیں۔"

"بس ذرا اپنے ہاتھ کا سہارا دیدو۔" وہ گڑگڑا کر بولا۔ "میں تمہارا سہارا پا کر اُوپر سڑک پر آ جاؤں گا۔"

"کیا سڑک کیا گڈھا۔ کیا موری، کیا کھمبا، سب برابر ہیں۔ یہ سارا جگت متھیا ہے مایا جال ہے۔" سادھو مہاراج دونوں ہاتھ پھیلا کر بولے۔ "ہم تو جلتے ہیں سیدھے ہر دوار کو تمہیں گڈھے سے نکالنا ہمارے بس میں نہیں۔ اتنا آشیرباد ضرور دیتے ہیں کہ بیٹا جہاں رہو سُکھی رہو۔"

سادھو مہاراج کے جانے کے بعد دو آدمی اور آئے۔ ایک نے کہا۔ "یہ کون وہ

ٹھیک ہے لیکن یہ تو دوسرا بولا۔ "مگر یہ تو چھوٹا سا ہے۔"

"اور اس میں ایک آدمی بھی گرا ہوا ہے۔" پہلا بولا۔

دوسرا بولا: "اور اس وقت تک اس گڑھے کو نہیں بھرا جا سکتا جب تک اس [آدمی] کو گڑھے سے نہ نکالا جائے۔"

"اور جب تک نہ نکالا جائے۔ گڑھا بھرا نہیں جا سکتا۔" پہلا بولا۔

"مگر ہمارے پاس اس آدمی کو باہر نکالنے کا ٹائم نہیں ہے۔" دوسرا [بولا]۔

"اور گڑھے کو بھرنے کا ٹائم بھی نہیں ہے۔"

"اور منسٹر صاحب کی سواری دس منٹ بعد ادھر سے گزرنے والی ہے۔"

"تو اب کیا کریں؟"

"مجھے گڑھے سے باہر نکالو۔" گڑھے میں گرا ہوا آدمی کمزور آواز میں چلایا۔

"چپ بے! بکواس بند کر!" پہلا بولا۔ "جلد ہی وزیر صاحب کی گاڑی ادھر [سے گزر]نے والی ہے۔ اس لئے جہاں پڑا ہے۔ وہیں دم سادھے پڑا رہ۔ ایک لفظ [بھی] بولا تو کھوپڑی توڑ دوں گا۔"

گڑھے میں گرا ہوا آدمی سہم کر چپ ہو گیا۔ وہ دونوں آدمی گڑھے کے ادھر ادھر [دیکھ]نے لگے۔ آخر ایک بولا: "وہ ادھر نئی بلڈنگ کے نیچے لکڑی کے تختے زمین پر پڑے [ہوئے] نظر آ رہے ہیں۔ انہیں لاکر اس گڑھے پر بچھائے دیتے ہیں۔ جب وزیر صاحب کی [سوا]ری گزر جائے گی۔ اٹھا کر وہیں رکھ دیں گے۔"

چنانچہ یوں کیا گیا۔ گڑھے میں گرے ہوئے آدمی کے سر پر لکڑی کے تختے رکھ دیئے [گئے]۔ جب وزیر صاحب کی سواری گزر گئی۔ تو لکڑی کے تختے اٹھا کر واپس پہنچا دیئے [گئے]۔

(بعد میں وزیر صاحب نے بیان دیا۔ سڑک پر کوئی گڑھا نہیں تھا۔ میں نے [کسی جگہ] کوئی گڑھا نہیں دیکھا۔ سڑک بہت صاف ستھری ہے۔ شکایت کرنے والے سرکار [کو بدن]ام کرنے کے لئے ایسا کہتے ہیں)

سہ پہر ڈھلنے لگی۔ سائے لمبے ہونے لگے۔ ہوا میں ایک خوشگوار خنکی آ گئی۔ [لوگ] عمدہ کپڑے پہنے چہل قدمی کے لئے نکلنے لگے۔ اتنے میں ایک نوجوان چار پانچ دن [کی] داڑھی بڑھائے، تنگ مہری کی پتلون پہنے شانوں تک بال بکھرائے گڑھے کے قریب [آ]یا جھک کر دیکھنے لگا۔ دیکھ کر ہنس دیا۔ پھر وہ نوجوان بہت اطمینان سے گڑھے [کے ک]نارے بیٹھ گیا اور اس نے اپنے دونوں پاؤں نیچے گڑھے میں لٹکا دیئے۔

گڑھے میں گرے ہوئے آدمی کے دل میں امید کی ایک جھلک پیدا ہوئی۔ اس نے آہستہ سے کہا: "اے نوجوان! مجھے گڑھے سے نکال۔"

"میں ایسا نہیں کر سکتا۔" وہ نوجوان انکار میں سر ہلا کر بولا۔ "اگر ایسا کروں گا۔ تو میرے ادب میں جذباتیت پیدا ہو جائے گی۔ اور ممکن ہے مقصدیت بھی پیدا ہو جائے اور مجھے ان دونوں سے نفرت ہے۔"

"تو کون ہے اے نوجوان؟" گرے ہوئے آدمی نے اسے حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں؟ ۔۔۔ میں نظم جدید کا شاعر ہوں! ۔۔۔ میں وہ شاعری کرتا ہوں جو آج سے ایک سو برس بعد آنے والی ہے۔ میرا مجموعہ کلام آج ہی چھپا ہے۔ "اندھیرے کا سویرا" کیسا نام ہے؟ تجھے اپنے مجموعہ کلام کی ایک جلد دیئے جاتا ہوں۔ گڑھے میں بیٹھ کر اسے جی لگا کے پڑھنا۔"

اتنا کہہ کر شاعر نے اپنے تازہ مجموعہ کلام کی ایک جلد گڑھے میں پھینک دی اور کافی ہاؤس چلا گیا۔

دن ڈھل گیا۔ شام بھی ڈھل گئی۔ رات آ گئی۔ گڑھے میں گرے ہوئے آدمی کو وہ گڑھا بہت بھیانک اور تاریک معلوم ہونے لگا۔ دور کہیں کہیں مدھم سی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ کبھی کبھی کسی موٹر کے گزرنے کی آواز آتی۔ موٹر اس کے سر سے گزر جاتی اور وہ کانپتا ہوا رہ جاتا۔ اب سردی سے اس کا سارا بدن ٹھٹھر رہا تھا۔ اور گھٹنوں تک کیچڑ میں کیڑے سے کلبلاتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اس کا ذہن ماؤف ہوا جا رہا ہے۔ ہوش و حواس جواب دے رہے ہیں۔ یکایک اس نے اپنے سر کے اوپر ایک سایہ سا دیکھا۔

ایک عورت پھٹی ساڑی پہنے۔ بال بکھرائے، وحشت کے عالم میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کے قدموں میں پڑا تھا۔ اور وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے قدموں میں کیسا خطرناک گڑھا ہے۔

یکایک اس نے اپنی بیوی کو پہچان لیا اور پہچانتے ہی اس کے منہ سے ایک دلدوز چیخ نکلی۔ اس نے اپنی بیوی کو نام لے کر پکارا۔

وہ عورت چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ جیسے جاننا چاہتی ہو یہ آواز کدھر سے آ رہی تھی۔

"میں یہاں ہوں۔" وہ زور سے چلایا۔ "یہاں نیچے گڑھے میں!"

وہ عورت گڑھے پر جھک گئی۔

وہ خوشی سے کانپتے ہوئے لہجے میں اپنی بیوی کا نام لے کر بولا۔ "ذرا ہاتھ نیچے کرو۔ جھک کر ہاتھ نیچے کرو۔ میں تمہارے ہاتھ کا سہارا لے کر اوپر آ جاؤں گا۔"

عورت نے خوشی کے آنسو پونچھ کر اپنا ہاتھ نیچے جھکا دیا۔ گڑھے میں گرے

جب مسٹگی نے اپنی بیوی کا ہاتھ تھام کر اوپر آنے کے لئے زور لگایا۔ تو اُس کی بیوی بھی پھسل کر گڈھے میں جاگری۔

دس سال بعد میرا اُس سڑک سے گزر ہوا۔ سڑک کی حالت پہلے سے بدتر ہو چکی تھی۔ اور وہ گڈھا بھی ابھی تک وہیں موجود تھا۔ ہم لوگ ایک جلوس کی صورت میں چل رہے تھے۔ ہمارے ہاتھوں میں اونچے اونچے جھنڈے تھے۔ جن پر لکھا تھا۔ "ہمیں روٹی دو۔ کپڑا دو۔ محنت کا پھل دو۔ ایسی شاعری دو جو سمجھ میں آتی ہو۔ ایسا نظام زندگی دو جس میں محبت ہو اور ہمدردی ہو۔ ایسے حاکم دو جو ہمارے ساتھ بس کے کیو میں کھڑے ہو سکیں"

ہم لوگ جھنڈے اٹھائے آہستہ آہستہ چل رہے تھے کہ سڑک کے بیچ میں وہ گڈھا آگیا۔ اور ہم اُس کے کنارے رُک گئے اور حیرت سے گڈھے کے اندر دیکھنے لگے۔

گڈھے میں گرا ہوا آدمی اب تک وہیں تھا۔ اُس کی بیوی بھی وہیں تھی۔ اس عرصے میں اُن کے ہاں دو بچے بھی پیدا ہو گئے تھے۔ اور وہ اِس کیچڑ۔ بدبو اور گندگی میں انسان نہیں معلوم ہوتے تھے۔ خوفناک قسم کے مینڈک یا کچھوے سے معلوم ہوتے تھے۔

یکایک بہت سے ہاتھ نیچے گڈھے کی طرف بڑھ گئے۔

"آؤ۔ آؤ۔ اوپر آؤ۔ گڈھے سے نکل آؤ۔ ہمارے ساتھ چلو۔" میں نے کہا۔

مرد کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اُس نے ایک بچے کو اپنے ہاتھوں میں چھپا لیا۔ دوسرا بچہ عورت نے اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ سہم کر بولی۔

"نہیں نہیں"

میں نے گڈھے میں گرے ہوئے آدمی سے کہا۔ "ہم تمہیں گڈھے سے باہر نکالنے کے لئے آئے ہیں۔ ہمارے ساتھ چلو۔ دیکھو۔ اوپر ہوا کتنی تازہ ہے۔ زندگی کتنی وسیع ہے۔ آسمان کس قدر کھلا ہے۔ آؤ ہمارے ساتھ مل کر ایک بہتر زندگی کے لئے جدو جہد کرو۔"

اُسے سہارا دینے کے لئے ہمارے ہاتھ اور نیچے گئے۔ وہ، اُس کی عورت اور اُس کے بچے گڈھے کے فرش پر سکڑ کر بیٹھ گئے۔

یکایک اُس گڈھے میں گرے ہوئے آدمی نے مڑ کر کہا۔

"تم جاؤ۔ میرے لئے یہی گڈھا کافی ہے۔ اب میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ گڈھے میں اس سڑک کے مجھے آرام بہت ہے۔"

نیند کی آرزو

شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

اب تو کالی گھٹا جب آتی ہے
دل میں یوں کانپتے ہیں کچھ کھٹکے
کون سمجھے کہ بوندیں نہیں سے
ہائے کیا ہو گیا مرے دل کو
اکثر آتی ہے، شب کو اِک آواز
وا ورا! اِک نفس کی رنگینی

دل میں ہر رات جاگ جاتی ہے
شمع جس طرح جھلملاتی ہے
کیا مرے دل پہ بیت جاتی ہے
کم کم اُن کی بھی یاد آتی ہے
اور مرا نام پوچھ جاتی ہے
زندگی بھر لہو رُلاتی ہے

ایک اِک کرکے بجھ چکے ہیں چراغ
نیند اب دیکھئے کب آتی ہے!

غزل

پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری ایم اے

جب تک کہ غمِ عشق کا ساماں نہ ہوا تھا
یہ دل بھی سراپردۂ امکاں نہ ہوا تھا

کب وہ دلِ پُرشوق میں مہماں نہ ہوا تھا
کب پہلوئے مضطر سے گریزاں نہ ہوا تھا

تخلیقِ جہاں کا ابھی ساماں نہ ہوا تھا
ہاں! عشق ابھی سلسلہ جنباں نہ ہوا تھا

یہ میری نوا ہے کہ کمندِ مہ و خورشید
ایسا کوئی اب تک تو غزل خواں نہ ہوا تھا

سنتے ہیں کہ خود اپنے لئے بن گیا خطرہ
انسان ابھی خیر سے انساں نہ ہوا تھا

شوخیِ تبسم سے بنا روکشِ گلزار
وہ غنچۂ نورس جو گلستاں نہ ہوا تھا

یہ نیم نگاہی کی ادا چشمِ کرم میں!
اب تک تو مری موت کا ساماں نہ ہوا تھا

اُس مطلعِ رُخ پر ابھی نظریں نہ پڑی تھیں
وہ چہرہ ابھی اِک شفقستاں نہ ہوا تھا

اِک منکرِ مخلص کی کرامات نہ پوچھو
انکار ابھی روکشِ ایماں نہ ہوا تھا

جب تک وہ تماشائے گلستاں کو نہ آئے
گلزار غبارِ سرِ داماں نہ ہوا تھا

کھلتے چلے پہلے ہی سے اسرارِ مظاہر
وہ جسم نگاہوں میں ابھی جاں نہ ہوا تھا

وہ کاکلِ برہستہ بھی بکھری نہ تھی جب تک
شیرازۂ ہستی بھی پریشاں نہ ہوا تھا

آزادیِ انساں فقط اِک خواب تھی جب تک
وحشی ترا شائستۂ زنداں نہ ہوا تھا

آفاق اڑا مثلِ غبارِ سرِ منزل
اِس دل میں ابھی عزمِ بیاباں نہ ہوا تھا

جب تک دمِ نظارہ وہ پلکیں نہ اُٹھی تھیں
دل پر عملِ شعبدہ بازاں نہ ہوا تھا

پھولوں میں چھری بن کے نسیمِ سحر اُتری
ایسا تو کبھی خونِ گلستاں نہ ہوا تھا

اے دوستو میں کون ہے فراقِ سخن آرا!
کب رنگِ سخن رشکِ بہاراں نہ ہوا تھا

چڑیل

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن، ایم۔ اے (ڈی۔ لٹ)

۱۵۔ جواہر نگر، سری نگر، کشمیر

محترمی خوشتر بھائی! تسلیم

حکم نامہ بشکریہ۔ افسانہ اور تصویر بھیج رہا ہوں۔ "لینڈ سلائیڈ" جتنا مقبول ہوا اتنا میرا کوئی افسانہ مقبول نہیں ہوا تھا، دنیا کے کس کس ملک میں سالنامہ گیا ہے! ابھی تک خطوط کا سلسلہ جاری ہے اور جب وقت ملتا ہے جواب لکھنے بیٹھ جاتا ہوں۔ "بیسویں صدی" اُردو کا سب سے مقبول پرچہ ہے، خدا آپ جیسے لوگوں کو سلامت رکھے، نئے شمارے میں شمیم نقوی صاحب (یا صاحبہ) نے "سرگوشیاں" میں جس محبت سے یاد کیا ہے اُس کا شکریہ کس طرح ادا کروں۔ یہ افسانہ اُن کے نام اور اُن تمام لوگوں کے نام معنون کرتا ہوں جو میرے افسانے شوق سے پڑھتے ہیں اور مجھے یاد کرتے ہیں۔۔۔

شکیل الرحمٰن

یہ اُس زمانے کی بات ہے جب میں گڑھی کے قریب ایک چھوٹے سے خوبصورت "دیوی تال" میں رہتا تھا۔ گڑھی کا علاقہ کچھ زیادہ دُور نہ تھا اور شہر بھی قریب ہی صبح اپنی کار سے شہر جاتا، دن بھر کے کام کے بعد شام کو "دیوی تال" واپس ہوتا۔ شہر میں ابھی تک مجھے کوارٹر نہیں ملا تھا، اس لئے شہر سے دس میل دُور دیوی تال میں ایک پُرانی کوٹھی کرایہ پر لے لی تھی۔ مجھے اُس گاؤں کا ماحول پسند تھا۔ چھوٹا سا گاؤں تھا، آبادی بھی بہت کم تھی، چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر لوگ آباد تھے، پہاڑیوں کا علاقہ تھا، وہ اِدھر اُدھر چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں میں رہتے تھے۔

جب یورپ میں تین سال رہ کر واپس آیا تو مجھے ایک فیکٹری میں ملازمت ملی، اُس زمانے میں انجینروں کی کمی تھی اس لئے ملازمت ملنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ یورپ کی ہنگامہ خیز زندگی سے نکل کر آیا تھا اور تنہا رہنا چاہتا تھا، مجھے زندگی کی تنہائی زیادہ پریشان نہیں کرتی اس لئے کہ میں نے گریز کا راستہ نکال لیا ہے۔ روحوں کے قصے شروع سے پسند تھے، تنہائی اور ہنگامی زندگی میں یہ قصے مجھے سہارا دیتے رہے ہیں، روحوں کے قصوں اور ناولوں سے میری الماریاں بھی ہوئی ہیں، ان پُراسرار کہانیوں میں کھو جاتا اور روحوں کے ساتھ معلوم نہیں کہاں کہاں

انگلینڈ میں مجھے روحوں کی کہانیوں سے اور زیادہ دلچسپی ہو گئی اِس لئے کہ وہاں ہزاروں قصے سننے کو ملے اور معلوم نہیں کتنے ناول ہاتھ آئے، میرے کئی انگریز دوستوں نے ایسے ایسے پُراسرار قصے سنائے کہ توبہ بھلی۔ ہندوستان آکر اُن کہانیوں میں اور کھو جانے کا موقع ملا، دیوی تال کا خاموش ماحول، ہر طرف پھیلی ہوئی تنہائی اور پھر اپنی پُرانی کوٹھی، یکسوئی تھی، آرام تھا، مزے میں زندگی گزر رہی تھی۔

راگھو میرا ملازم تھا، چالیس اور پچاس کے درمیان چھوٹے قد کا آدمی، اُس کی گول گول پُراسرار سبز آنکھوں اور چہرے کی جھرّیوں کو دیکھ کر میں اکثر سوچتا، راگھو بھی اُن قصوں کا کوئی دلچسپ کردار ہے، اُس کے چہرے کی جھرّیوں میں معلوم نہیں کتنی پُراسرار کہانیاں چھپی ہوتی تھیں، ایک بات پہلے بتا دوں، مجھے روحوں کے قصوں سے دلچسپی ضرور تھی لیکن نئی تعلیم نے مجھے کسی لمحہ یہ سوچنے نہیں دیا کہ واقعی روحیں اِس مادّی دنیا میں آتی ہیں اور اِس بھری دنیا میں اُن کی حرکتیں اتنی دلچسپ اور پُراسرار ہوتی ہیں، نہیں بھائی نہیں، مجھے ایسی باتوں پر کبھی یقین نہیں آیا، اُدھر کوئی پُراسرار ناول ختم ہوا اور میں اِس مادّی اور ہنگامی زندگی میں آ گیا، یہ محض گریز کا ایک راستہ تھا، پڑھنے کا شوق تھا اور تنہائی میں میرے ساتھی یہی پُراسرار قصے تھے۔

میں ایک دن فیکٹری سے واپس آکر ایک نئے ناول میں کھویا ہوا تھا، کافی

ہو رہی تھی، آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے، رات اندھیری تھی، شام کے بعد دیوی تال میں بالکل خاموشی چھا جاتی تھی، کبھی کبھی آدی باسیوں کے پُراسرار نغمے سنائی دیتے لیکن اُس رات ہر طرف خاموشی تھی، سکوت تھا، دس بجے ناول تھا۔ اِس درمیان راگھو دو بار میرے کمرے میں آیا اور مجھے مصروف دیکھ کر خاموشی سے واپس چلا گیا، تیسری بار آیا تو ناول ختم ہو چکا تھا، میں نے اُس کی پُراسرار آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "ہاں راگھو، دیر تو ہو گئی، لیکن ناول دلچسپ تھا، آج تو میں نے کوئی کام بھی نہیں کیا، یہ ناول پڑھتا رہا، ایک روح کی کہانی راگھو، رات بھر مجسٹریٹ کو پریشان کرتی ہے اور دن بھر اپنی قبر میں آرام کرتی ہے۔"

راگھو کی آنکھیں مجھے گھورنے لگیں، اُس کی آنکھوں میں اور زیادہ چمک آگئی آہستہ سے بولا "روح کی کہانی؟" میں نے اُس کی سبز آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ہاں راگھو، روح کی کہانی، بہت دلچسپ کہانی ہے، لیکن تم اِس طرح کیوں پوچھ رہے ہو۔ ڈر گئے کیا؟" پھر اُس سے کہا "راگھو، یہ کہانی ہے، حقیقت نہیں ہے، کھانا لگاؤ، میں ابھی آیا۔" اور راگھو خاموشی سے واپس چلا گیا۔ میں نے سوچا وہ کتنا بھولا بھالا آدمی ہے، بھلا اِس زندگی میں روح قبر سے نکل کر کیوں آنے لگی اور پھر ایسی خوبصورت اور حسین روح ——— صدیوں کی پیاسی رُوح!" اُسی وقت بادل زور سے گرجے، بارش تھم چکی تھی۔ میں ناول بند کرکے اُٹھا ہی تھا کہ دریچے میں ایک سایہ نظر آیا، کسی عورت کا سایہ۔ میں نے غور سے دیکھا، واقعی کسی عورت کی پرچھائیں تھی۔ اس اندھیری رات میں اِس دریچے کے قریب کون ہے؟ یہ سوچتے ہوئے میں نے بڑھ کر دریچہ کھول دیا، وہاں کوئی بھی نہ تھا، مجھے اپنی حماقت پر ہنسی بھی آئی، پُراسرار ناول پڑھ کر ذہن کی حالت ایسی ہو جاتی ہے، میں تھوڑی دیر باہر دیکھتا رہا، ہر طرف خاموشی تھی، سناٹا تھا، ہوا سرد تھی، دور کسی پہاڑی پر آدی باسیوں نے اپنا گیت شروع کیا، اور خاموشی کے جال ٹوٹنے لگے، میں نے دریچہ بند کر دیا، بہت بھوک لگی تھی، میں ابھی مڑا ہی تھا کہ دوسرے دریچے پر نظر گئی اور وہاں بھی وہی سایہ تھا، اِس بار تو یقین ہو گیا کہ یہ ناول کا اثر نہیں ہے! ضرور کوئی باہر کھڑا ہے، میں نے لپک کر دوسرا دریچہ کھول دیا لیکن وہاں بھی سناٹا تھا، تیز ہوا تھی، آدی باسیوں کا گیت فضا میں پھیل رہا تھا اور دیوی تال میں بس اُسی کی گونج تھی۔

"یہاں بھی کوئی نہیں ہے ——— لیکن میں نے تو ——— میں نے تو ابھی ابھی ایک سایہ دیکھا ہے۔" میں بڑبڑایا، اُسی وقت راگھو آگیا "سرکار کھانا لگا چکا ہوں ———" میں اُس کی آواز سے قدرے چونک گیا۔ اُس کی آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں، میری آنکھوں میں کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ اُس کی دونوں سبز آنکھیں دو سوالیہ نشان بن گئی تھیں۔ میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"کون راگھو، ابھی آیا۔ میں دریچہ کھول کر دیکھ رہا تھا کہ موسم کیسا ہے" مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے راگھو کی آنکھیں یہ کہہ رہی ہیں، اِس جھوٹ کا فائدہ کیا ہے؟ راگھو نے کہا "موسم بہت خراب ہے سرکار، بہت اندھیرا ہے، ہر طرف اندھیرا ہے" اُس کی آواز انتہائی پُراسرار تھی، میں مسکراتا ہوا کھانے کے کمرے میں چلا آیا اور ٹیبل پر بیٹھتے ہوئے راگھو سے کہا ——— "راگھو، ابھی ایک روح آئی تھی، مجھ سے ملنے۔ تم آگئے تو وہ بھاگ گئی۔" راگھو کانپ کر رہ گیا، اُس نے کانپتے ہوئے کہا ———

"نہیں سرکار! نہیں، ایسا نہ کہیے، روحوں کا مذاق نہیں اُڑاتے سرکار، بھگوان نہ کرے اس گھر میں کوئی روح یا پریت آئے۔" اور پھر جلدی جلدی کھانا ٹیبل پر رکھنے لگا۔ میں نے کھاتے ہوئے پوچھا "راگھو، تم روحوں اور بھوتوں سے شاید بہت گھبراتے ہو؟" راگھو نے کوئی جواب نہ دیا۔

راگھو نے اُس رات چنے کی دال بہت اچھی بنائی تھی، میں نے تعریف کرتے ہوئے کہا "آج تو دال خوب بنائی ہے، بہت لذیذ ہے، جب سے تم آئے ہو بھوت ——— توبہ بھوت نہیں، میرا مطلب ہے بھوک بہت لگتی ہے اور تم ہر چیز اچھی پکا لیتے ہو، سالن، روٹی، گوشت، دال، یہاں آنے سے پہلے تم کہاں کام کرتے تھے راگھو؟" ——— راگھو نے جواب دیا۔

"سرکار، اِس سے پہلے میں ایک انگریز کے ساتھ تھا، سچ پوچھیے تو سب کچھ اُسی کے ساتھ رہ کر میں نے سیکھا ہے۔ اسے ہندوستانی کھانے بہت پسند تھے، میرا بہت خیال رکھتا تھا سرکار، بہت خیال رکھتا تھا۔" راگھو نے ایک ٹھنڈی سانس لی، اُس ایک سانس میں اُس کی زندگی کا ایک خوبصورت دَور پوشیدہ تھا۔

"وہ انگریز ولایت چلا گیا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں سرکار" راگھو نے بات ٹالتے ہوئے کہا "اور دال ...؟"

"نہیں جی، بس کافی ہے، ہاں تو میں پوچھ رہا تھا کہ تم نے اُس کی ملازمت کیوں چھوڑ دی، کیا اُس نے کسی بات سے ناراض ہو کر تمہیں الگ کر دیا؟" میں نے اُسے چھیڑنے کی کوشش کی۔

"نہیں سرکار۔ وہ قدرے خاموشی کے بعد بولا "وہ مر گیا" اُس کی سبز آنکھوں میں عجیب پُراسرار روشنی تھی اُسی وقت بادل کڑکے اور شاید کہیں دور بجلی گری میں نے اچھی طرح محسوس کیا کہ راگھو کانپ کر رہ گیا ہے۔

"وہ مر گیا؟" میں نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر اُسے تسلی دی۔ "راگھو، یہی دنیا ہے یہی زندگی ہے، آنا جانا لگا ہوا ہے، آج ہم ہیں کل نہ ہوں گے۔"

"نہیں سرکار، ایسی بات نہیں، اُس انگریز کو موت نہیں لے گئی بلکہ ...."

ہمیں میں کہانی سُنانے کے لئے کہہ رہا ہوں اور تم میری شادی رچا رہے ہو، شادی ضروری بھی کیا ہے؟"

میں نے دیکھا راگھو عجیب نگاہوں سے گھور رہا تھا، اُس نے کہا "سرکار، میں آج کہانی ضرور سُناؤں گا لیکن میری بات مان لیجئے، جلد شادی کر لیجئے۔"

"کس حکیم صاحب نے تم سے کہا ہے کہ مجھے شادی جلد کر لینی چاہئے؟" میں نے طنزیہ پوچھا۔

"سرکار میرے گاؤں میں ایک بہت بڑے سادھو آئے تھے، وہ کہتے تھے کہ جو شادی نہیں کرتا اُس کے گھر میں....."

"اُس کے گھر میں روح آتی ہے، بھوتنی آتی ہے، چڑیل آتی ہے یہی نا؟" میں نے اُس کی بات پوری کر دی۔ "وہی گڑھی کے بنگلے کی چڑیل جو اُس انگریز کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔" چند لمحے کی خاموشی رہی، میں نے خاموشی کو توڑتے ہوئے پوچھا۔

"راگھو، تم نے شادی کی ہے؟"

"بیوی مر چکی ہے سرکار!" راگھو نے بہت سادگی سے جواب دیا۔

"دوسری کر لو ورنہ وہی خطرہ تمہیں بھی ہے۔" میں نے قدرے چڑچڑے پن سے کہا۔

"میں بہت بوڑھا ہوں سرکار۔" راگھو نے قائل کرنے کی کوشش کی۔ میں نے کہا "وہ انگریز بھی تو بوڑھا تھا۔"

راگھو نے مجھے گھورتے ہوئے کہا "ہاں سرکار میں نہیں جانتا کہ اُس کے پاس روح کیوں آئی تھی لیکن کئی دنوں سے آپ کی کوٹھی کے پاس ایک سایہ منڈلا رہا ہے، ہر رات وہ سایہ آپ کی کھڑکی....." میں اِس انکشاف سے گھبرا گیا۔ میں نے غور کیا کہ اُس سایہ کو صرف میں نے ہی نہیں راگھو نے بھی دیکھا ہے۔

"وہ ضرور گڑھی سے آئی ہے۔" راگھو کا سلسلہ جاری تھا "میری بات مان لیجئے، جلدی شادی کر لیجئے، مجھے وشواس ہے کہ پھر یہ روح اِس کوٹھی کی طرف نہ آسکے گی۔" اُسی وقت دُور ایک کتا رونے لگا اور ماحول اور زیادہ پُراسرار بن گیا۔

"اگر میں اُس چڑیل یعنی اُس روح سے شادی کر لوں؟" میں نے راگھو کو چھیڑا۔

"باپ رے!" وہ زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا "دیکھو، مجھے نیند آ رہی ہے، اب کل کہانی سُنانا، جاؤ آرام کرو۔" اور پھر اُسے سمجھایا کہ جو تم نے راتوں کو کسی کا سایہ دیکھا ہے وہ کسی درخت کا سایہ ہے، میں نے خود دیکھا ہے، جاؤ اب آرام کرو۔" میں نے کمبل سر سے پاؤں تک اوڑھ لیا۔

"درخت کا سایہ ہے.... کسی درخت کا سایہ ہے۔" راگھو کی آواز دُور سے سُنائی دے رہی تھی، وہ اپنے کمرے میں جا چکا تھا۔

اِس طرح کئی دن بیت گئے میں نے اپنے دریچوں پر پھر کوئی سایہ نہیں دیکھا۔ اب مجھے یقین آ گیا کہ وہ محض فریبِ نظر تھا۔ اتوار کا دن تھا دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ دیوی تال کا علاقہ بہت ہی خوبصورت نظر آ رہا تھا۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا کچھ کام کر رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی، میں نے راگھو کو آواز دے کر پوچھا "راگھو کون آیا ہے؟" چند لمحے خاموشی رہی، میں نے راگھو کو پھر آواز دی، راگھو بڑبڑاتا ہوا آیا۔

"آ گئی ــ! وہ آ گئی ــــ آج وہ آ ہی گئی ــــ! میں کہتا تھا نا ــــ آخر ــــ آخر وہ آ گئی !!"

"ارے راگھو، کیا ہو گیا ہے تمہیں، کون ہے وہاں؟" میں نے پوچھا۔

"سرکار.... وہ...... وہ آ گئی....!" اُس کی آواز کانپ رہی تھی، اُس کی آنکھیں اور زیادہ پُراسرار نظر آ رہی تھیں۔

"کون وہی؟ کچھ بتاؤ گے بھی؟" میں نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے پوچھا۔

"وہی سرکار، بالکل وہی، ہو بہو وہی!!" راگھو کی مشین چل رہی تھی۔

"کیا بک رہے ہو، کون ہو بہو وہی؟" میں نے ناراضگی کا اظہار کیا۔

"وہی سرکار.... وہ ..... راتوں کی پرچھائیں .... رات کا سایہ!"

"راتوں کی پرچھائیں، کیا فضول بات ہے، کیا نام بتایا ہے اُس نے؟" میں نے پوچھا۔

"سرکار، میں نے پوچھا نہیں، اُس کا کوئی نام نہیں ہوتا سرکار! اُس کا نام تو شریر کے ساتھ مِٹ جاتا ہے.... اب تو دن میں بھی آنے لگی، دن میں!"

"نام نہیں ہوتا؟ کس کا نام نہیں ہوتا؟ تمہارا دماغ کچھ چل گیا ہے راگھو، ارے، رُوپ تو نہیں آ گئی؟"

راگھو بڑبڑا رہا تھا "رُوپ، ہاں رُوپ، رُوپ بدل بدل کر آتی ہے۔" میں واقعی ناراض ہو گیا، بھلا آدمی بھی ایسا پایا جاتا ہے، کتنا احمق ہے راگھو! "کیا بکتے ہو، دیکھو رُوپ آئی ہو گی، تم اُسے ڈرائنگ روم میں لے جاؤ، میں کپڑے تبدیل کر کے ابھی آیا۔" راگھو اسی طرح کھڑا تھا "کچھ سنا تم نے" میں نے ڈپٹ کر کہا۔ "ہاں سرکار سب کچھ سُن رہا ہوں، سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔" راگھو اسی طرح کھڑا رہا۔

"کمال کے آدمی ہو! رات بھر روحوں اور چڑیلوں کے بارے میں سوچتے رہتے ہو اور صبح جو لڑکی نظر آ جاتی ہے اُسے روح سمجھ لیتے ہو، راگھو مہاراج،

تھی یہ فیکٹری میں کام کرتی ہے، میرے ساتھ کام کرتی ہے، ابھی چند دن ہوئے
اُسے یہاں ملازمت ملی ہے۔ آج میں نے اُسے کھانے پر بلایا ہے۔ اب بھی!
جاؤ کھانا جلدی تیار کرو، میں ابھی آیا۔"
راگھو بڑبڑاتا ہوا دروازے کی طرف جانے لگا۔ "دفتر میں کام کرتی ہے
ابھی ابھی ملازمت ملی ہے ——— وہ آگئی ——— آخر وہ آگئی ——— میں
جانتا تھا ——— وہ ضرور آئے گی!"

میں کپڑے تبدیل کر کے ڈرائنگ روم میں آیا۔ میں نے محسوس کیا راگھو مسلسل رُوپ کو گھور گھور کر دیکھ رہا ہے اور رُوپ قدرے پریشان ہے۔ میں نے راگھو کو بازار بھیج دیا تاکہ کھانا جلد تیار ہو جائے۔ راگھو چلا گیا۔ رُوپ کا رنگ چمپئی تھا پہلی نظر میں وہ خلوتِ دل میں آ بسی تھی۔ اس شاخ کے قریب آ کر مجھے جو بھینی بھینی خوشبو ملی تھی میں اُسے بتا نہیں سکتا۔ اُسے دیکھ کر ایک آگ سی رگوں میں بہنے لگی تھی، ایک نامعلوم سی آگ! رُوپ ابھی ابھی فیکٹری کے دفتر میں ملازم ہوئی تھی اور چند دنوں میں ہم دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے تھے۔ جب راگھو چلا گیا تو رُوپ کہنے لگی "راج! مجھے دیکھ کر تمہارے اس بوڑھے ملازم کی آنکھیں کھلی رہ گئیں، وہ پلکیں جھپکنا بھی بھول گیا۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا "خوب کہا! تم نے راگھو کو وہ کسی (COMPLEX) کا شکار ہے۔" ہم نے چائے بنائی اور پینے لگے۔ رُوپ نے کہا "میں تو تمہارے گھر راگھو کو دیکھ کر سہم سی گئی تھی، ایسا معلوم ہوتا ہے اِسے کہیں دیکھا ہے۔"

"کہاں دیکھا ہے تم نے؟" میں نے پوچھا،

"شاید گڑھی میں" رُوپ نے کہا۔ گڑھی کے نام سے میں کچھ چونک گیا، رُوپ نے فوراً کہا "جانتے ہو اُس نے مجھے دیکھ کر کیا کہا؟"

"کیا کہا؟" میرا اشتیاق بڑھا۔

رُوپ کہنے لگی "پہلے تو دروازہ کھول کر وہ کانپ گیا، جیسے اُس نے مجھے نہیں کسی بھوت، چڑیل یا روح کو دیکھ لیا ہو" پھر مجھے دیر تک گھورتا رہا، پھر کہا "تم آگئیں، تم آگئیں!" میں تو اُس کی آواز سے کانپ گئی، وہ اندر گیا اور پھر آیا، کہنے لگا "اندر آجاؤ" مجھے اس پر بہت غصہ آیا، میں نے پوچھا تم میری طرف اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو، غلطی سے کہو میں آگئی ہوں، کہنے لگا "تم آگئی ہو ——— میں جانتا ہوں۔"

میں ہنسنے لگا "تم نے تو رُوپ کمال ہی کر دیا، ہو بہو اُس کی نقل اتار دی۔ میں نے ناحق راگھو کو (Ghost Complex) ہے وہ تو مجھے بھی شاید بھوت یا روح سمجھتا ہے" میں نے پھر بات بدلتے ہوئے کہا "چھوڑو ان باتوں کو، یہ تو بتاؤ شہر میں کہاں رہتی ہو، آخر تم نے اب تک اسے راز کیوں رکھا، چلو، میں تمہارے گھر کہیں آؤں گا، کہ تم کم سے کم اپنے گھر کا پتہ تو بتاؤ۔"

"نہیں بتا سکتی" رُوپ نے بہت سادگی سے جواب دیا۔

"کیوں؟ وجہ پوچھ سکتا ہوں؟"

"وہاں تم نہیں آسکتے۔" رُوپ نے اعتماد کے ساتھ کہا۔

"مگر کیوں؟" میں مچل گیا۔

"بتاؤں؟" رُوپ نے پوچھا۔ اُس کے ہونٹوں پر شرارت کھیل رہی تھی۔

"ہوں ہوں" میں نے کہا۔

"وہاں بھوت رہتے ہیں" اور وہ ہنسنے لگی۔

"دیکھو رُوپ، یہ مذاق اچھا نہیں، مجھے تو تمہارے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں، تم کہاں رہتی ہو۔ شہر میں وہ کون خوش نصیب بنگلہ ہے جہاں تمہارے جلوے بکھرے ہیں؟"

"یہ جاننا ضروری ہے؟ بالکل نہیں، میں تمہارے آفس میں ہوں، اب تمہاری کوٹھی پر ہوں اور تمہارے قریب ہوں، بھلا اس سے زیادہ جاننے کی ضرورت کیا ہے؟"

میں نے جھینپتے ہوئے کہا "میں نے بس یونہی پوچھ لیا تھا، یہ ٹھیک ہے جب تم قریب ہو تو پھر ایسے سوالات بیکار ہیں۔ میں جانتا ہوں تم کسی وجہ سے اپنے ماضی کو بھولنا چاہتی ہو اور کسی کو بتانا نہیں چاہتیں۔"

"ایسا ہی سمجھ لو" رُوپ نے ٹھنڈی سانس لی۔ چائے پی کر ہم دونوں اندر آئے، میں نے رُوپ کو اپنا کمرہ دکھایا جہاں الماریوں میں رُوحوں اور بھوتوں کے قصے قدیم مصری لاشوں کی طرح خاموش کھڑے تھے، میں نے رُوپ کو بتایا کہ مجھے رُوحوں کے قصوں سے بہت دلچسپی ہے، اور یہی تنہائی کے ساتھی ہیں۔ رُوپ نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اُس دن اُسے کچھ کہانیاں سنائیں روح کی خودکشی کی کہانی۔ صدیوں پُرانی لاش کی آنکھوں میں زندگی آجاتی ہے اور اُس کی نیلی نیلی آنکھیں اپنے محبوب کا تعاقب کرتی ہیں۔

اُس وقت تک راگھو بازار سے آچکا تھا، کھانا تیار ہوا اور ہم کھانے لگے۔ رُوپ نے طنزیہ کہا "تمہارا گھر رُوحوں کا بسیرا معلوم ہوتا ہے۔" وہ بار بار ایسے جملوں سے پریشان کرتی رہی اور میں ہنستا رہا۔

کھانے کے بعد ہم ڈرائنگ روم میں آگئے۔ سامنے گڑھی کی پہاڑیاں نظر آرہی تھیں۔ میں نے رُوپ سے کہا "دیکھو وہاں، گڑھی کی پہاڑیاں کتنی خوبصورت ہیں!"

"میں اُن پہاڑیوں کو جانتی ہوں" رُوپ کا لہجہ پُراسرار تھا۔

اُسی وقت راگھو آیا۔ اُس کے ہاتھ میں چاندی کی ایک لمبی اور عجیب و غریب کنجی تھی۔ اس نے کہا "سرکار یہ چابی کھانے کے ٹیبل پر تھی" رُوپ چونک سی گئی۔ اُس نے فوراً کہا "یہ میری کنجی ہے۔ میں نے ہنستے ہوئے کنجی اُسے دیدی اور کہا ـــــــ "اِسے تو کسی تالے میں رکھنا چاہئے، اپنے کمرے میں صرف جواہرات رکھتی ہو"

"کیسی باتیں کرتے ہو، کنجی میری سہیلی کی ہے، غلطی سے میرے پاس آگئی ہے"

"اچھا اچھا! میں نے سمجھا شاید تمہیں کسی جن نے لاکھ پتی بنا دیا ہے اور چاندی کی یہ لمبی اور انوکھی کنجی دی ہے کہ اپنے جواہرات حفاظت سے رکھنا"

"باتیں خوب بناتے ہو، دوسری باتیں کرو" میں نے محسوس کیا جیسے رُوپ بات کا رُخ بدلنا چاہتی ہے۔

"دوسری باتیں! اچھا سنو، وہ سامنے جو پہاڑیاں ہیں وہ گردھی کی ہیں" میں نے کہنا شروع کیا۔

"میں جانتی ہوں"

"لیکن تم یہ نہیں جانتیں کہ انہی پہاڑیوں میں ایک ایسی پہاڑی بھی ہے جہاں ایک بنگلہ ہے اور بنگلے میں کبھی ایک انگریز رہتا تھا اور اُس انگریز کو ایک عورت کی روح نے اپنی گرفت میں لے لیا تھا، اور وہ انگریز اُس روح کے ساتھ معلوم نہیں کہاں چلا گیا"

"سچ؟" رُوپ نے حیرت سے کہا۔

"ہاں سچ، یہ روحیں بہت پریشان کرتی ہیں، سوچتا ہوں رُوپ کوئی خوبصورت روح میرے پاس بھی آتے اور مجھے اپنی روحانی دنیا میں لے جائے، کھو جاؤں اُس دنیا میں اور پھر واپس نہ آؤں"

رُوپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی، جیسے وہ خود روح کا کردار ادا کرنا چاہتی ہو، چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اُس نے کہا "دیکھو یہ سڑی گلی کتابیں پڑھ کر اپنا دماغ خراب کر رہے ہو، جب شہر میں کوارٹر مل جائے تو فوراً چلے جاؤ، اِس پوری کوٹھی میں کوئی بات ضرور ہے"

"تم آجاؤ تو سب ٹھیک ہو جائے گا، جس دن ہم دونوں کی شادی ہوگی یقین کرو راگھو بھیرویں گائے گا اور میں ملہار!" رُوپ کی آنکھیں شرم سے بوجھل ہو گئیں، گھنی پلکیں جھک گئیں۔

ہم کچھ دیر اسی طرح باتیں کرتے رہے، رُوپ نے کئی بار پوچھا کہ میں روحوں کے وجود کا قائل تو نہیں ہوں؟ اور میں نے ہر بار کہا کہ مجھے ایسی باتوں پر کبھی اعتقاد نہیں رہا۔ اِس کے بعد رُوپ نے میرا ہاتھ دیکھا، لکیروں کو پڑھنے لگی اور کچھ سوچ کر کہا

"غلط بالکل غلط تمہیں روحوں پر یقین ہے اور تمہارے [illegible] ہے وہی روح تمہیں اپنی گرفت میں لے لے گی" میں [illegible] بالکل چونک گیا۔ رُوپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی [illegible] نہ چاہتا تھا کہ اُس نے سہیلی سے ملنے کا ذکر کیا اور چلی گئی۔ میرے ذہن میں ساری باتیں گھوم رہی تھیں۔

دوسرے دن راگھو باغ کی صفائی کر رہا تھا، میں دھوپ میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا، فیکٹری میں چھٹی تھی، فیکٹری کے کسی ڈائرکٹر کا کوئی رشتہ دار مر گیا تھا، راگھو صفائی کرتے کرتے یک بیک میرے پاس دوڑا آیا، اُس کے ہاتھ میں کنجی تھی جو ایک بار کھانے کے ٹیبل پر ملی تھی اور رُوپ نے یہ کہہ کر لے لیا تھا کہ سہیلی کی کنجی ہے۔ ہو بہو وہی کنجی! چاندی کی لمبی اور عجیب و غریب کنجی، میں سوچا کنجی تو رُوپ اپنے ساتھ لے گئی تھی، پھر کہاں سے آگئی۔ راگھو نے بتایا اُسے میرے دریچے کے قریب ملی ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے وہ سایہ ناچ گیا جو اُس رات دریچے پر نظر آیا تھا۔ پھر رُوپ کی طرف دھیان گیا رُوپ کی کنجی اور [illegible] میں کچھ سوچ نہ سکا۔ راگھو کی گھورتی ہوئی آنکھوں سے بچنا میرے لئے مشکل تھا۔ کنجی اپنے پاس رکھ لی اور اُٹھ کر اندر آگیا۔ راگھو بڑبڑا رہا تھا "سمجھا، سب کچھ سمجھا وہ ــــــ وہی تھی ــــــ بالکل وہی!"

"ہو سکتا ہے رُوپ کوئی روح ہو؟" راگھو اُسے پہچانتا ہے۔ رُوپ راگھو کو دیکھ کر گھبرا گئی تھی، اُس نے کہا تھا۔ میں نے راگھو کو کہیں دیکھا ہے ــــــ اور پھر، پھر کنجی ــــــ!" فلم کے منظر کی طرح یہ باتیں آکر چلی گئیں، میں نے ذہن سے ہر بات کو جھٹک دیا۔

اُسی دن رات کو دروازے پر دستک ہوئی، ہر طرف خاموشی تھی۔ دور ایک کتا رو رہا تھا، سناٹے میں اُس کی آواز بہت بھیانک معلوم ہو رہی تھی، میں نے دروازہ کھولا، میرے سامنے رُوپ تھی، میں گھبرا سا گیا۔ اتنی رات کو رُوپ دیوی تال پر، کیوں آئی ہے، رُوپ نے بھانپ لیا، اُس نے کہا۔

"کیوں، اِس وقت میرا آنا تمہیں ناگوار معلوم ہوا؟" میں نے اپنی الجھن کو چھپانے کی کوشش کی اور اُسے اندر لے آیا۔ آتش دان گرم تھا، ہم آتش دان کے قریب بیٹھ گئے۔

"اِس وقت کہاں سے آرہی ہو، میرا مطلب ہے ...."

"گردھی سے" میں قدرے لرز گیا۔ راگھو کافی لے کر آیا، ہم دونوں کافی پینے لگے۔

[illegible] کے ساتھ رہتی ہوں۔ چلو آؤ، تمہیں بتا کر [illegible] اُس [illegible] میں نے تمہیں [illegible]

"تم گڑھی میں رہتی ہو؟" میں نے ایک احمق کی طرح پوچھا۔

"ہاں، گڑھی میں۔ تمہیں اعتراض ہے؟"

"نہیں تو، بالکل نہیں" میں گھبرا گیا۔

"کتنی خوبصورت پہاڑیاں ہیں گڑھی کی! کتنی خاموشی ہے وہاں، جنگلی [illegible] کا حسن ہے، میں صبح بس سے شہر جاتی ہوں اور شام کو واپس گڑھی آ جاتی ہوں۔"

"اس اندھیری رات میں تم گڑھی واپس جاؤ گی؟" میں نے کافی ختم کر لی تھی،

"ہاں، اندھیری رات سے تو مجھے محبت ہے" ٹھنڈی سانس لے کر اُس نے [illegible] لیا۔

"اندھیرے کا حسن تم نے نہیں دیکھا آج! میرا خیال ہے کہ اندھیرے میں صدیاں [illegible] روشنی میں رہنے والوں کو اس کی خبر نہیں ہوتی۔ جب چاند ڈوب جاتا ہے، اندھیرا پھیل جاتا ہے تو میں تلاش میں نکلتی ہوں، مجھے کس کی تلاش ہے نہیں جانتی۔"

[illegible] کا لہجہ نہایت ہی پُراسرار تھا۔

"اچھا آؤ اب چلو اپنی کار سے مجھے گڑھی چھوڑ آؤ۔ جی چاہتا ہے اس اندھیری [illegible] تمہارے ساتھ سفر کروں" وہ اُٹھ گئی۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں" میں بھی اُٹھا اور کپڑے تبدیل کر کے رُوپ کے ساتھ [illegible] گڑھی کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں وہ بالکل خاموش رہی۔ گڑھی کے سنسان علاقے میں ایک جگہ اُس نے کہا گاڑی روک لو، وہ اُتر گئی اور اندھیروں [illegible] ہو گئی۔ میں دیکھتا رہ گیا۔ میں بہت زیادہ پریشان ہو گیا۔ گڑھی کی پہاڑیوں میں [illegible] روحوں کی کہانیاں سن چکا تھا، رُوپ کے بارے میں اب اتنے ثبوت [illegible] کہ یقین آ گیا کہ رُوپ ایک روح ہے، ایک چڑیل ہے۔ پھر اُس کا پیچھا [illegible] کہیں نظر نہ آئی۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر رُومال نکالنا چاہا تو رومال کے [illegible] کنجی بھی نکل آئی جو لاکھو کو میرے دریچے کے قریب ملی تھی، میں نے سوچا تھا [illegible] اُس کنجی کے بارے میں رُوپ سے باتیں کروں گا لیکن اُس کی پراسرار خاموشی [illegible] اُلجھنوں کی وجہ سے کچھ نہ کہہ سکا۔ میں رُوپ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے اندھیرے [illegible] تاریک اور ٹوٹے ہوئے بنگلے کے قریب آ گیا، ہر طرف لکڑی کی جالیاں تھیں، [illegible] آنکھوں سے گھور رہے تھے۔ چمگادڑیں جسم سے لپٹ رہی تھیں۔ میں نے [illegible] بنگلے کا جائزہ لیا۔ ویران اور سنسان بنگلہ، تمام دروازے ٹوٹے [illegible] صرف ایک دروازہ بند تھا اور اُس میں ایک عجیب و غریب تالا لگا تھا۔

اُس تالے کو دیکھتے ہی مجھے فوراً رُوپ کی انوکھی کنجی کا خیال آیا۔ میرا خیال درست نکلا، اُسی کنجی سے وہ تالا کھل گیا۔ اندر اندھیرا تھا، مجھ پر عجیب خوف طاری تھا۔ وہاں پرانے صندوق پڑے تھے، ٹوٹی پھوٹی چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ ٹارچ سے میں نے دیواروں کا جائزہ لیا، یک بیک سناٹے میں آ گیا، دیوار پر ایک طرف ایک تصویر لگی تھی، ایک بڈھی عورت کی، بوڑھی رُوپ کی ——! "پچھلے جنم کی تصویر ہے" میرے ہمزاد نے مجھ سے سرگوشی کی۔ دیواروں سے آواز آتی محسوس ہوئی "پچھلے جنم کی تصویر ہے" میں نے اطمینان سے تالا بند کیا، رومال سے پسینہ پونچھا۔ اور اپنی کار کی طرف آیا۔ اُسی وقت گڑھی کی آخری بس شہر کے لئے جا رہی تھی۔ پھر ہر طرف سناٹا تھا، میں دیوی تال واپس آ گیا۔

میں نے دفتر سے تین دن کی چھٹی لے لی۔ طبیعت بہت بوجھل تھی، اُن تین دنوں میں رُوپ سے ملاقات نہیں ہوئی۔ چوتھے دن صبح رُوپ آئی تو میں اُسے خاموش دیکھتا ہی رہا۔ اُس کا چمپئی چہرہ نکھرا ہوا تھا، اُس کے گلابی ہونٹوں پر وہی پُراسرار مسکراہٹ تھی، اُس کے جسم سے وہی بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔ میری رگوں میں وہی نامعلوم سی آگ بہنے لگی۔ وہ میرے قریب بیٹھ گئی اور کہنے لگی "طبیعت تو اچھی ہے؟ تین دن فیکٹری کیوں نہیں آتے؟ بہت انتظار کیا تمہارا۔ موسی نے تمہیں بلایا ہے، وہ شادی کی بات پکی کرنا چاہتی ہیں۔"

"روح سے شادی کرنا چاہتی ہیں، چڑیل سے" میں کانپنے لگا "تم چلی جاؤ یہاں سے، تم مجھے خواہ مخواہ پریشان کر رہی ہو، کون ہے تمہاری موسی، کہاں رہتی ہے یہ سب جھوٹ ہے، گڑھی کے ویران بنگلے میں ایک روح رہتی ہے اور وہ تم ہو، وہاں اور کوئی نہیں رہتا، وہاں تمہارے پچھلے جنم کی ایک تصویر بھی لگی ہوئی ہے، چڑیل کی تصویر، بوڑھی کھوسٹ رُوپ کی تصویر" میں بُری طرح کانپ رہا تھا۔

رُوپ نے کچھ دیر ضبط کیا اور پھر بے اختیار ہنسنے لگی، میں گھبرا گیا۔ وہ کہنے لگی

"بھولے راجہ! میں اُس ویران بنگلے میں نہیں رہتی، تمہارے دیوی تال میں رہتی ہوں۔"

"دیوی تال میں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں ہاں، دیوی تال میں! گڑھی میں میرے دادا کا بنگلہ ضرور ہے، وہ اب برباد ہو چکا ہے۔ اُس بنگلے میں جو تصویر تم نے دیکھی ہے وہ میری ماں کی ہے" اب وہاں کوئی نہیں رہتا، میرے پتاجی اور میری ماتاجی ایک ہوائی حادثے کا شکار ہو گئے، میری دنیا ویران ہو گئی، میں اپنی موسی کے ساتھ تمہارے قریب ہی رہتی ہوں۔" اُس کی

اُسی وقت راگھو آیا، اُس کے ہاتھ میں چاندی کی ایک لمبی اور عجیب و غریب کنجی تھی۔ اُس نے کہا "سرکار یہ چابی کھانے کے ٹیبل پر تھی۔" رُوپ چونک سی گئی۔ اُس نے فوراً کہا "یہ میری کنجی ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کنجی اُسے دیدی اور کہا "—— اسے تو کسی نمائش میں رکھنا چاہئے، اپنے کمرے میں صرف جواہرات رکھتی ہو؟"

"کیسی باتیں کرتے ہو، کنجی میری سہیلی کی ہے، غلطی سے میرے پاس آگئی ہے۔"

"اچھا اچھا! میں نے سمجھا شاید تمہیں کسی جن نے لاکھوں کی جواہرات بنا دیا ہے اور چاندی کی یہ لمبی اور انوکھی کنجی دی ہے کہ اپنے جواہرات حفاظت سے رکھنا۔"

"باتیں خوب بناتے ہو، دوسری باتیں کرو۔" میں نے محسوس کیا جیسے رُوپ بات کا رُخ بدلنا چاہتی ہے۔

"دوسری باتیں! اچھا سنو، وہ سامنے جو پہاڑیاں ہیں وہ گردش کی ہیں۔" میں نے کہنا شروع کیا۔

"میں جانتی ہوں۔"

"لیکن تم یہ نہیں جانتیں کہ انہی پہاڑیوں میں ایک ایسی پہاڑی بھی ہے جہاں ایک بنگلہ ہے اور بنگلے میں کبھی ایک انگریز رہتا تھا اور اُس انگریز کو ایک عورت کی روح نے اپنی گرفت میں لے لیا تھا، اور وہ انگریز اُس روح کے ساتھ معلوم نہیں کہاں چلا گیا۔"

"سچ؟" رُوپ نے حیرت سے کہا۔

"ہاں سچ، یہ روحیں بہت پریشان کرتی ہیں، سوچتا ہوں رُوپ کوئی خوبصورت روح میرے پاس بھی آتے اور مجھے اپنی روحانی دنیا میں لے جائے، کھو جاؤں اُس دنیا میں اور پھر واپس نہ آؤں۔"

رُوپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی، جیسے وہ خود روح کا کردار ادا کرنا چاہتی ہو، چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اُس نے کہا "دیکھو یہ سڑی گلی کہانیاں پڑھ کر اپنا دماغ خراب کر رہے ہو، جب شہر میں کوارٹر بن جائے تو فوراً چلے جانا، اس پوری کوٹھی میں کوئی بات ضرور ہے۔"

"تم آجاؤ تو سب ٹھیک ہو جائے گا، جس دن ہم دونوں کی شادی ہوگی یقین کرو راگھو پھر دیپک گائے گا اور میں ملہار!" رُوپ کی آنکھیں شرم سے بوجھل ہوگئیں اور پلکیں جھک گئیں۔

ہم کچھ دیر اسی طرح باتیں کرتے رہے، رُوپ نے کئی بار پوچھا کہ میں روحوں کے وجود کا قائل تو نہیں ہوں؟ اور میں نے ہر بار کہا کہ مجھے ایسی باتوں پر کبھی اعتقاد نہیں ہوا۔ اس کے بعد رُوپ نے میرا ہاتھ دیکھا، لکیروں کو پڑھنے لگی اور کچھ سوچ کر کہا

"غلط، بالکل غلط، تمہیں روحوں پر یقین ہے اور تم [illegible] ہے وہی روح تمہیں اپنی گرفت میں لے لے۔" میں [illegible] بالکل چونک گیا۔ رُوپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی [illegible] ہی چاہتا تھا کہ اُس نے سہیلی سے ملنے کا ذکر کیا اور چلی گئی۔ میرے ذہن میں اُلجھی ساری باتیں گھوم رہی تھیں۔

دوسرے دن راگھو باغ کی صفائی کر رہا تھا، میں دھوپ میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا، فیکٹری میں چھٹی تھی، فیکٹری کے کسی ڈائرکٹر کا کوئی رشتہ دار مرگیا تھا۔ راگھو صفائی کرتے کرتے یک بیک میرے پاس دوڑا آیا۔ اُس کے ہاتھ میں وہی کنجی تھی جو ایک بار کھانے کے ٹیبل پر ملی تھی اور رُوپ نے یہ کہہ کر لے لیا تھا کہ اُس کی سہیلی کی کنجی ہے۔ ہو بہو وہی کنجی، چاندی کی لمبی اور عجیب و غریب کنجی۔ میں نے سوچا کنجی تو رُوپ اپنے ساتھ لے گئی تھی، پھر کہاں سے آگئی۔ راگھو نے بتایا یہ کنجی اُسے میرے دریچے کے قریب ملی ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے وہ سایہ ناچنے لگا جو اُس رات دریچے پر نظر آیا تھا۔ پھر رُوپ کی طرف دھیان گیا۔ رُوپ کی کنجی اور پھر میں کچھ سوچ نہ سکا۔ راگھو کی گھورتی ہوئی آنکھوں سے بچنا میرے لئے مشکل تھا۔ میں نے کنجی اپنے پاس رکھ لی اور اُٹھ کر اندر آگیا۔ راگھو بڑبڑا رہا تھا "سمجھا، سب کچھ سمجھا۔ وہ —— وہی تھی —— بالکل وہی!"

"ہو سکتا ہے رُوپ کوئی روح ہو؟" راگھو نے پہچانا ہے۔ رُوپ بھی فوراً راگھو کو دیکھ کر گھبرا گئی تھی، اُس نے کہا تھا۔ میں نے راگھو کو کہیں دیکھا ہے —— اور پھر پھر کنجی ——!" فلم کے منظر کی طرح یہ باتیں آکر چلی گئیں، میں نے ذہن سے ہر بات کو جھٹک دیا۔

اُسی دن رات کو دروازے پر دستک ہوئی، ہر طرف خاموشی تھی۔ دُور ایک کتا رو رہا تھا، سنّاٹے میں اُس کی آواز بہت بھیانک معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا، میرے سامنے رُوپ تھی۔ میں گھبرا سا گیا۔ اتنی رات کو رُوپ دیوی تال پر کیوں آئی ہے، رُوپ نے بھانپ لیا، اُس نے کہا۔

"کیوں، اس وقت میرا آنا تمہیں ناگوار معلوم ہوا؟" میں نے اپنی اُلجھن کو چھپانے کی کوشش کی اور اُسے اندر لے آیا۔ آتش دان گرم تھا، ہم آتش دان کے قریب بیٹھ گئے۔

"اس وقت کہاں سے آرہی ہو، میرا مطلب ہے ....."

"گردش سے۔" میں قدرے لرز گیا۔ راگھو کافی لے کر آیا، ہم دونوں کافی پینے لگے۔

[illegible] چلا آ رہا ہے، تمہیں پتا ہے کہ یکدم اُس نے [illegible] کہ اس نے تمہیں کچھ پتہ نہیں بتایا۔"

"تم گڑھی میں [illegible] ہو؟" میں نے ایک احمق کی طرح پوچھا۔

"ہاں، گڑھی میں، تمہیں اعتراض ہے؟"

"نہیں تو، بالکل نہیں۔" میں گھبرا گیا۔

"کتنی خوبصورت پہاڑیاں ہیں گڑھی کی، کتنی خاموشی ہے وہاں، جنگلی پھولوں کا حسن ہے۔ صبح بس سے شہر جاتی ہوں اور شام کو واپس گڑھی آ جاتی ہوں۔"

"اس اندھیری رات میں تم گڑھی واپس جاؤ گی؟" میں نے کافی ختم کر لی تھی۔

"ہاں، اندھیری رات سے تو مجھے محبت ہے۔" ٹھنڈی سانس لے کر اُس نے کہنا شروع کیا۔

"اندھیرے کا حسن تم نے نہیں دیکھا راج! میرا خیال ہے کہ اندھیرے میں ہی مسرت گزرتی ہے، روشنی میں رہنے والوں کو اس کی خبر نہیں ہوتی۔ جب چاند ڈوب جاتا ہے، اندھیرا پھیل جاتا ہے تو میں تلاش میں نکلتی ہوں، مجھے کس کی تلاش ہے نہیں جانتی۔"

رُوپ کا لہجہ نہایت ہی پُراسرار تھا۔

"اچھا اب چلو، اپنی کار سے مجھے گڑھی چھوڑ آؤ۔ جی چاہتا ہے اس اندھیری رات میں تمہارے ساتھ سفر کروں۔" وہ اُٹھ گئی۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔" میں بھی اُٹھا اور کپڑے تبدیل کر کے رُوپ کے ساتھ اپنی کار میں گڑھی کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں وہ بالکل خاموش رہی۔ گڑھی کے سنسان علاقے میں ایک جگہ اُس نے کہا گاڑی روک لو۔ وہ اُتر گئی اور اندھیروں میں گم ہو گئی۔ میں دیکھتا رہ گیا۔ میں بہت زیادہ پریشان ہو گیا۔ گڑھی کی پہاڑیوں میں بھٹکنے والی روحوں کی کہانیاں سن چکا تھا، رُوپ کے بارے میں اب سارے ثبوت مل گئے تھے کہ یقیناً رُوپ ایک روح ہے، ایک چڑیل ہے۔ پھر اسکا پیچھا کیا۔ وہ کہیں نظر نہ آئی۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر رومال نکالنا چاہا تو رومال کے ساتھ [illegible] جو اُس کو میرے دروازے کے قریب ملی تھی، میں نے سوچا تھا راستے میں اس [illegible] کے بارے میں رُوپ سے باتیں کروں گا لیکن اُس کی پُراسرار خاموشی اور اپنی الجھن کی وجہ سے کچھ نہ کہہ سکا۔ میں رُوپ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے اندھیرے میں ایک تاریک اور ٹوٹے ہوئے بنگلے کے قریب آ گیا، ہر طرف لکڑی کی جالیاں تھیں، الو بیٹھے آنکھوں سے گھور رہے تھے، چمگادڑیں جسم سے لپٹ رہی تھیں۔ میں نے ٹارچ سے پورے بنگلے کا جائزہ لیا۔ ویران اور سنسان بنگلہ، تمام دروازے ٹوٹے ہوئے تھے صرف ایک دروازہ بند تھا اور اُس میں ایک عجیب و غریب تالا لگا تھا۔

اُس تالے کو دیکھتے ہی مجھے فوراً رُوپ کی انگوٹھی کا خیال آیا۔ میرا خیال درست نکلا، کنجی سے وہ تالا کھل گیا۔ اندر اندھیرا تھا، مجھ پر عجیب خوف طاری تھا۔ وہاں پرانے صندوق پڑے تھے، ٹوٹی پھوٹی چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ ٹارچ سے میں نے دیواروں کا جائزہ لیا۔ یک بیک سناٹے میں آ گیا، دیوار پر ایک طرف ایک تصویر لگی تھی، ایک بوڑھی عورت کی، بوڑھی رُوپ کی۔۔۔۔ "پچھلے جنم کی تصویر ہے" میرے ہمزاد نے مجھ سے سرگوشی کی۔ دیواروں سے آواز آتی محسوس ہوئی "پچھلے جنم کی تصویر ہے" میں نے گھبرا کر تالا بند کیا، رومال سے پسینہ پونچھا، اور اپنی کار کی طرف آیا۔ اسی وقت گڑھی کی آخری بس شہر کے لئے جا رہی تھی۔ پھر ہر طرف سناٹا تھا۔ میں دیوی تال واپس آ گیا۔

میں نے دفتر سے تین دن کی چھٹی لے لی۔ طبیعت بہت بوجھل تھی، اُن تین دنوں میں رُوپ سے ملاقات نہیں ہوئی۔ چوتھے دن صبح رُوپ آئی تو میں اُسے خاموش دیکھتا ہی رہا۔ اُس کا تیکھا چہرہ نکھرا ہوا تھا، اُس کے گلابی ہونٹوں پر وہی پُراسرار مسکراہٹ تھی، اُس کے جسم سے وہی بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی، میری رگوں میں نہ جانے نامعلوم سی آگ بہنے لگی۔ وہ میرے قریب بیٹھ گئی اور کہنے لگی "طبیعت تو اچھی ہے؟ تین دن فیکٹری کیوں نہیں آئے؟ بہت انتظار کیا تمہارا۔ موسی نے تمہیں بلایا ہے، وہ شادی کی بات پکی کرنا چاہتی ہیں۔"

"روح سے شادی کرنا چاہتی ہیں، چڑیل سے۔" میں کانپنے لگا "تم چلی جاؤ یہاں سے، تم مجھے خواہ مخواہ پریشان کر رہی ہو، کون ہے تمہاری موسی، کہاں رہتی ہے؟ یہ سب جھوٹ ہے۔ گڑھی کے ویران بنگلے میں ایک روح رہتی ہے اور وہ تم ہو۔ وہاں اور کوئی نہیں رہتا، وہاں تمہارے پچھلے جنم کی ایک تصویر بھی لگی ہوئی ہے، چڑیل کی تصویر، بوڑھی کھوسٹ رُوپ کی تصویر۔" میں بُری طرح کانپ رہا تھا۔

رُوپ نے کچھ دیر ضبط کیا اور پھر بے اختیار ہنسنے لگی، میں گھبرا گیا۔ وہ کہنے لگی

"بھولے راجہ! میں اُس ویران بنگلے میں نہیں رہتی، تمہارے دیوی تال میں رہتی ہوں۔"

"دیوی تال میں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں ہاں، دیوی تال میں! گڑھی میں میرے دادا کا بنگلہ ضرور ہے، وہ اب برباد ہو چکا ہے۔ اُس بنگلے میں جو تصویر تم نے دیکھی ہے وہ میری ماں کی ہے۔ اب وہاں کوئی نہیں رہتا۔ میرے پتا جی اور میری ماتا جی ایک ہوائی حادثے کا شکار ہو گئے، میری دنیا ویران ہو گئی، میں اپنی موسی کے ساتھ تمہارے قریب ہی رہتی ہوں۔" اُس کی

افسانہ نمبر

آنکھیں مسکرا رہی تھیں، اس کی پلکیں مسکرا رہی تھیں، اُس کے ہونٹوں پر کوئی جادو کھیل رہا تھا۔ ”جس دن تمہیں دیکھا اُسی دن سے مجھے تم میں کشش سی محسوس ہونے لگی۔ میں تمہیں چھپ چھپ کر دیکھتی رہی، ایک رات سکنڈ شو دیکھ کر شہر سے آئی تو تمہارے کمرے میں روشنی دیکھی، رات اندھیری تھی، میں اِس باغ میں آئی اور تمہیں دریچے سے دیکھنے لگی جب تم نے دریچے کھول دئے تو میں چھپ گئی۔ مجھے یاد ہے دو بار اِن دریچوں پر آئی ہوں۔ جب فیکٹری میں مجھے ملازمت مل گئی تو میں نے تمہیں قریب محسوس کیا۔ میں نے دیکھا تم بھی مجھ میں دلچسپی لے رہے ہو۔ میں نے اپنی خوش قسمتی پر ناز کیا، میں بہت جلد تمہاری بن جانا چاہتی تھی، اُس بنگلے میں جو تالا لگا ہوا ہے وہ کسی مہاراج نے میرے دادا کو دیا تھا۔ جاگیر کے ساتھ یہ تالا بھی ملا تھا۔ اُس کی دو کنجیاں میرے پاس تھیں، ایک تو کہیں گر گئی، غالباً تمہارے دریچے کے قریب اور دوسری میرے پاس ہے۔“

”رُوپ!“ میرا خواب ٹوٹ گیا تھا، بھیانک خواب، پُراسرار خواب!! ”لیکن تم نے مجھے پریشان کیوں کیا، اتنی پُراسرار کیوں بنی رہیں؟“

”بس مجھے شرارت سوجھی، میں نے یہ دیکھ کر تمہیں پریشان کرنا چاہا، تمہاری کوٹھی کا ماحول بھی پُراسرار تھا، تب اگر جن پراسرار تھا تم بھوتوں اور روحوں کی کہانیاں پڑھتے سو چا تمہیں پریشان کروں۔ محض تمہیں اُلجھن میں گرفتار کرنے کے لئے اُس رات گئی تھی، جب تم مجھے تلاش کر رہے تھے تو میں بس اسٹینڈ پر تھی، بس کے آتے ہی چلی آگئی، میں جانتی تھی کہ تمہارے پاس دوسری کنجی ہے اور تم مجھے تلاش کرتے کرتے اس بنگلے کے قریب ضرور جاؤ گے۔ اور میری ماں کی تصویر دیکھ کر اور اُلجھن میں پڑ جاؤ گے۔ میں ایسی شرارتیں بہت کرتی ہوں۔ میں بچپن ہی سے شریر ہوں۔“

پھر ہم دونوں بے اختیار ہنسنے لگے، میں تو اتنا ہنسا اتنا ہنسا کہ راگھو کی بنر آنکھیں ناچنے لگیں۔ میں نے راگھو سے کہا ”راگھو! یہ دیکھو، میں چڑیل سے شادی کر رہا ہوں!“ —— میں اُسی وقت رُوپ کے ساتھ اُس کی موسی کے ہاں چلا گیا۔

وہ چڑیل میری بیوی ہے، اور راگھو شاید اب بھی یہ سمجھتا ہے کہ میں کسی خوبصورت رُوح کی گرفت میں ہوں —— یہ چڑیل مجھے پسند ہے۔ راگھو کچھ بھی سمجھے۔

ابوالفصاحت حضرت جوش ملسیانی

جو بلا جان سے لپٹتی ہے
وہ لپٹتی نہیں چمٹتی ہے

عمر کی یہ دورنگیاں دیکھو
جتنی بڑھتی ہے، اتنی گھٹتی ہے

اُن کا غصہ ہے یا کوئی مقراض
بات کرتے زبان کٹتی ہے

میری منزل بھی مجھ سے ہے بیزار
دیکھ کر مجھ کو دور ہٹتی ہے

زندگی کو عدم تو راس نہ تھا
اب اُسی سمت کیوں پلٹتی ہے

موت کی روک تھام کر، یارب!
یہ تو ہر ایک پر جھپٹتی ہے

کتنی فاتح ہے اُن کی چشمِ کرم
رنج و غم کی صفیں اُلٹتی ہے

اُن سے جھگڑا تو کر ہی بیٹھے ہیں
دیکھئے کس طرح نبٹتی ہے

کیا کروں اِس گھٹا بڑھی کا علاج
درد بڑھتا ہے جان گھٹتی ہے

تارے گننے سے جوش کیا ہوگا
کٹتے کٹتے ہی رات کٹتی ہے

جوش ملسیانی

افسانہ

آگ

پروفیسر عاصی کرنالی ایم۔ اے

۲۶۷۔ ممتاز آباد۔ ملتان

حضرتِ خوشتر! تسلیمات

"تین لڑکیاں" اور "سزا" کے بعد "تسکین" کی اشاعت پر شکریہ۔ آخری افسانے پر تو خط اس کثرت سے آئے اور آ رہے ہیں کہ اجتماعی شکریہ ادا کرنے کیلئے "بیسویں صدی" کے سوا کوئی اور ذریعہ نہیں۔ چھ مختلف افراد نے اسے ہندی میں منتقل کرنے کی اجازت مانگی ہے۔ اُن حضرات کو چاہئے کہ اس بارے میں آپ سے رجوع کریں۔ آج ایک افسانہ "آگ" حاضر ہے۔ یہ ایک ذہنی اُلجھن اور نفسیاتی کشمکش ہے جو آگ بن کر ہیرو کے دماغ و دل کو جلاتی رہتی ہے۔ آگ پر کس کا زور ہے۔ یہ ظالم کس کا کہنا مانتی ہے۔ یہ وہ شے ہے جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے ـــــ افسانے میں جذباتیت کے بہاؤ کے باوجود مقصدیت کا خیال رکھا گیا ہے۔ اُمید ہے پسند خاطر ہوگا اور افسانہ نمبر کے دامن میں زینت پائے گا۔

نیاز کیش

کانتا نے گھر کے آنگن میں قدم رکھا اور چپکے سے میرے دل میں داخل ہوگئی۔ میں نہیں سمجھ سکا اُس کے لئے میرے دل کے پٹ آپ ہی آپ کیوں کھل گئے۔ اُس میں کیا بات تھی۔ کچھ بھی تو نہیں۔ ایک بالکل عام سی لڑکی، سانولا سا رنگ، چھوٹا سا قد، گول مول سا بدن ـــــ وہ ایک نوکرانی کی حیثیت سے میرے گھر میں داخل ہوئی لیکن نہیں معلوم کیوں؟ جیسے میں نے آہستہ سے اُس کا ہاتھ تھام کر کہا ہو۔ 'یہاں آنگن میں نہ کھڑی رہو۔ اُدھر دل کا دروازہ کھلا ہے، وہاں اندر چل کر بیٹھو'۔

میری بیوی بہت خوبصورت ہے۔ چمپا ہے اُس کا نام۔ سچ مچ وہ چمپا کا پھول ہے۔ میں نے بیاہ سے پہلے اُسے چاہا۔ اُس کی خوشبو سے اپنے من کو مہکایا۔ اُس کے رنگ سے اپنی آنکھوں کو شگفتگی بخشی۔ میں نے اُس سے ٹوٹ کر محبت کی ـــــ بے تحاشا پیار کیا۔ میں اتنا جذباتی ہو چلا تھا کہ اُسے دنیا کی حسین ترین لڑکی کہتا تھا۔ اور میرے لئے وہ سچ مچ ایسی ہی لڑکی تھی۔ پھر چمپا کو میں نے اپنے آنگن کی کیاری میں اُگا دیا۔ اس سے میرا بیاہ ہوگیا۔ میری چاہت بڑھتی گئی، بڑھتی گئی۔ اور آج بھی یہ چاہت سدا بہار پھول کی طرح شگفتہ ہے۔ آج دس سال گزرنے کے بعد بھی آج جب ہمارے گھر میں چار بچے اُس چمپا کی کوکھ سے خوشبو اور رنگ کی طرح مہکتے اور کھلتے ہوئے بچے! آج بھی چمپا میری نظروں میں اتنی ہی حسین ہے جتنی اسوقت تھی جب اُس نے میرے گھر کے آنگن میں قدم رکھا تھا۔ اگرچہ دس سال بیت جانے کا اثر اُس کی عمر پر بھی ہے اور میری عمر پر بھی۔ اُس کے چہرے میں وہ پہلی سی تازگی اب نہیں کیونکہ اِسی تازگی، اِسی رعنائی اور اِسی حُسن کی کوکھ سے چار بچوں نے جنم لیا ہے۔ اُس کی بہار ننھے ننھے پھولوں کی تخلیق میں صرف ہوتی رہی ہے۔ پھر بھی چمپا چمپا ہے اس لئے کہ میں اُسے اپنی آنکھ سے دیکھتا ہوں۔ پھر بھی جب کانتا نے میرے گھر کے آنگن میں قدم رکھا تو وہ چپکے سے میرے دل میں داخل ہوگئی۔

میں نے اس جذبے کو بہت دیانتداری سے کھرچنا چاہا۔ میں بڑی قوت سے اِس جذبے سے ٹکرایا۔ میں اسے پاش پاش کرنا چاہتا تھا۔ اِس لئے کہ جب میں نے آج سے دس سال پہلے چمپا کو اپنے دل میں داخل کیا تھا تو میں نے اندر سے دروازہ مقفل کر لیا تھا اور اُس کی چابی میں نے چمپا کے ہاتھ میں تھما دی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کانتا نے یہ بند دروازہ کیسے کھول دیا۔ شاید کوئی چور راستہ، کوئی رخنہ، کوئی شگاف کہیں پیدا ہوگیا ہو اور وہ وہاں سے داخل ہوگئی ہو، یا شاید وہ کوئی اونچی، بہت اونچی سیڑھی اپنے ساتھ لائی ہو اور اُس پر چڑھ کر اندر کی طرف کود گئی ہو۔

افسانہ نمبر

میرا ذہن دو جذبوں کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ کبھی میں سوچتا، اِس کانتا میں کیا ہے؟ عام سی گنوار، کون سی بڑی ——— اُدھر چمپا اب بھی خوبصورت ہے اور پھر وہ میری بیوی ہے، میرے بچوں کی ماں ہے، میری سب کچھ ہے۔ میں اُسے اپنے دل میں تنہا رہنے دوں گا۔ ایسے ہی ملکہ کی طرح جس کی مملکت میں کسی اور کو سنگھاسن پر بیٹھنے کا حق نہیں ——— کبھی میرے ذہن کا دوسرا رُخ دوسرا روپ اختیار کر لیتا ——— چمپا میرے ورثے اور احترام کی مستحق ہے لیکن محبت کا ایک جذبہ ہی دور ہوتا ہے۔ ایک اونچی لہر کی طرح محبت بڑھتی اور بلند ہوتی رہتی ہے لیکن جذبے کی دوسری اونچی لہر کی آخر کوئی نہ کوئی حد تو مقرر ہوتی ہے ——— مجھے چمپا سے آج بھی محبت ہے۔ لیکن آج محبت پر احترام کا جذبہ غالب ہے اور شادی کے دس سال بعد ایسا ہونا بالکل قدرتی ہے۔ لیکن ایک محبوبہ کی حیثیت سے کانتا دوبارہ آ سکتی ہے وہی اونچی لہر

- حقیقتاً وہ نیک ہے جو اپنی ذات کو اُن لوگوں سے الگ نہیں کرتا جنہیں "دُنیا" بد سمجھتی ہے۔ (خلیل جبران)
- شرم و حیا کے ساتھ پسپائی بے شرمی کے ساتھ کامیابی سے بدرجہا بہتر ہے۔ (خلیل جبران)
- جس قوم کے جاہل لوگ سردار بن جائیں تو سمجھ لو اُن کا کوئی سردار نہیں، جب کام بننے والے ہوتے ہیں تو اہلِ عقل کے ہاتھوں بن جاتے ہیں اور جب بگڑنا ہوتے ہیں وہ شریروں کے ہاتھوں بگڑ جاتے ہیں۔ (عربی ادب)
- جو خلق کو چھوڑ کر خالق تک رسائی پانا چاہتے ہیں خلق اور خالق دونوں سے محروم رہتے ہیں۔ (مولانا رومی)

والی بات ہے۔ میں چمپا کو اُس کے تخت سے نہیں اٹھاتا۔ لیکن اگر وہ ذرا سرک جائے، ذرا دامن سمیٹ لے، تخت پر بس ذرا سی جگہ چھوڑ دے تو میں کانتا کو بھی ایک گوشے میں بٹھا لوں! ——— لیکن سوچ کا یہ دھارا کتنا خطرناک تھا۔ میں اپنے ذہن سے اِس جذبے کو جھٹک دیتا اور یہ میری بدنصیبی ہے کہ جھٹکے جانے پر بھی یہ جذبہ چمگادڑ کی طرح میرے ذہن کے جھروکے میں پنجے گاڑے رہتا۔ میں نے اِس خوفناک جذبے کی مدافعت میں اپنی پوری عقل، پوری تدبیر صرف کر دی۔ کئی راتیں میں نے جاگ کر گزاریں لیکن اُف! کالی گھٹا کی طرح پھیلتا، جمتا اور گہرا ہوتا ہوا یہ جذبہ! ——— میں نے چمپا اور کانتا کی خوبیوں کا مقابلہ بڑے شعور اور دیانتداری سے کیا۔ میں نے ایک کاغذ پہ ممکن خوبیوں کے نام لکھ لئے۔ میں نے سو نمبر مقرر کئے۔ جب میں نے الگ الگ ٹوٹل کیا تو کانتا نے سو میں سے بارہ نمبر لئے اور چمپا نے اکانوے۔ پھر بھی کانتا ہوا کی طرح ہر روزن، ہر جھروکے سے گھستی چلی گئی ——— ایک نوکرانی، گاؤں کی اُجڈ لڑکی، اَن پڑھ، سانولی، پستہ قد، گول مول سی، بس صرف نوجوان۔ اسی نوجوانی اور گول مٹول پن کی وجہ سے اُس نے بارہ نمبر لے لئے تھے۔ امتحان کے نتیجے میں وہ بُری طرح فیل تھی۔ پھر بھی اُس کی جوانی کے ملکے ملکے بخارات کی نمی سے میں اپنے دماغ اور روح کو نہ بچا سکا!

آخر میں نے دونوں جذبوں سے سمجھوتہ کر لیا۔ میں چمپا کو چاہوں گا۔ چمپا کا احترام کروں گا لیکن کانتا کو بھی اپنے دل سے دُور نہ کروں گا۔ وہ آخر اچھی ہے، سچ پوچھو تو مجھے اچھی لگتی ہے۔ کسی دوسرے کو چاہنے کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ ہم نے پہلی چاہت کو ترک کر دیا ہے۔ ہم باغ میں جاتے ہیں، ایک پھول کو پسند کرتے ہیں، پھر دوسرے کو، پھر تیسرے کو بھی ——— ہم اپنی چاہت ایک پھول تک محدود نہیں رکھتے اور یہ بھی ہے کہ ہم نرگس اور بنفشہ اور کنول کے پھول کو گلاب کے مقابلے پر نہیں لاتے لیکن ہم اُن تمام پھولوں کو پسند کرنے کی جرأت نہیں کرتے گلاب کی توہین تو نہیں کرتے! ——— شاید بلکہ یقیناً ساری دنیا میں ایک آدمی بھی ایسا نہ ہوگا جس نے ایک پھول، بس ایک پھول چُن لیا ہو اور پھر باغ کی طرف جانا چھوڑ دیا ہو۔ چمپا میرے نزدیک گلاب کا پھول ہے لیکن اگر کنول یا نرگس کا ایک پھول میرے دامن میں آگرا ہو تو مجھے اُسے باہر نہیں پھینک دینا چاہیے۔ اِس فیصلے اس سمجھوتے کے باوجود میں چمپا کی دل شکنی نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے اس نئے پیار کو اُس سے چھپانا تھا۔ کیسی عجیب بات ہے کہ چمپا سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کانتا بھی میرے دل میں خود بخود آگئی ہے۔ شاید وہ دونوں ٹکرا جائیں۔ حالانکہ پھول زیادہ فراخ دل ہوتے ہیں وہ ایک ہی ٹہنی پر ایک ساتھ رہ کر مسکراتے رہتے ہیں!

میں نے دونوں کے پیار کا حساب کتاب الگ الگ خانے میں رکھا اور اس لئے کہ چمپا کسی مقام پر کھٹک نہ جائے میں بڑی ذہانت سے چمپا سے زیادہ پیار جتانے لگا اور اُس کے سامنے کانتا کی بُرائی کا ناگوار فرض ادا کرنے لگا۔ اُف! انسان کی بے بسی اُسے کتنا حیلہ ساز بنا دیتی ہے!

کانتا کو میرے گھر نوکرانی لگے مہینے سے اوپر ہو چکا تھا۔ میرا یہ تمام وقت اِس اندرونی آگ میں سُلگتے گزرا۔ جب میرا ذہن ایک مناسب فیصلے پر پہنچ گیا تو میں نے میدان میں قدم بڑھایا۔

"چمپا! ایک بات کہوں، بُرا تو نہ مانو گی؟"

"کہو۔ میں بُرا کیوں ماننے لگی۔"

"اِس کانتا میں تم نے ایسی کیا بات دیکھی جو اسے نوکر رکھا؟"

"ضرورت جو تھی گھر میں۔ پھر یہ بے چاری مصیبت کی ماری ہے۔ باپ سر پر

نہیں ۔ بس بیمار ۔ کوئی سہارا نہیں ۔ میں گاؤں گئی کچھ اس کا خیال کرنے ۔ کچھ اپنی ضرورت کا ۔ اسے ساتھ لے آئی کیوں ؟ بات کیا ہے ؟ " چمپا نے مجھے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا ۔

" پھوہڑ ہے بالکل نہایت اُجڈ ۔ برتن دھوتی ہے تو میل صاف نہیں ہوتا ۔ کمرہ جھاڑتی ہے تو گرد باقی رہ جاتی ہے "

" بس اتنی سی بات ! " چمپا کھلکھلا کر ہنس پڑی ۔ " آخر گاؤں میں رہتی تھی ۔۔۔ ڈھنگ سیکھ جائے گی ۔ ہمیں غریبوں کا خیال رکھنا چاہیئے ۔ "

" کمال کرتی ہو چمپا ! ایسے گھر بڑے بڑے لوگ آتے ہیں ۔ سوٹڈ بوٹڈ اپ ٹو ڈیٹ رہنے والے ۔ پرکاش اور سریندر جیسے دوست ہو ۔ کل ما دراہ تہی ، پرکاش تو کل ہی کہہ رہا تھا ۔ بھیا ! ڈرائنگ روم اتنا سجا ہوا ہے پر صفائی نہیں ۔ چمپا ! تم اسے جواب دے دو ۔ کوئی اور سرونٹ ڈھونڈتے ہیں جو سلیقہ مند ہو ۔ یہ گنوارن کہاں سے آمری ؟ "

چمپا پھر ہنس پڑی ۔ " ارے راجن بابو ! تم تو بڑے سینٹی مینٹل ہو گئے ہو ۔ میں اب سے خود اس کے کام کی دیکھ بھال رکھا کروں گی ۔ چھوڑو یہ قصہ ۔ کوئی اور بات کرو ۔ "

میں نے چمپا کا ہاتھ چوم لیا ۔۔۔۔ " تم کتنی سُندر ہو چمپا ! کتنی من موہنی ۔۔۔ ! "

اور وہ میرا رخسار تھپتھپا کر ہنستی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی ۔

میرے دل نے کہا ۔ ۔ ۔ کانتا معاف کرنا ۔ میں نے تمہاری بُرائی کی ۔ تمہیں بُری کہا ۔ تم کتنی اچھی ہو کانتا ۔ گول مول سی ! میں تمہیں اپنے پیار کی حرارت دوں گا اور اُس کے صلے میں تمہارے لمس کی بھیک مانگوں گا ۔ میری گول مول سی گُڑیا سی کانتا !

اِنہی خیالات میں میری آنکھ لگ گئی !

دو دن کے بعد صبح ناشتے کی میز پر میں اور چمپا اور بچے بیٹھے تھے ۔ کانتا سروس کر رہی تھی ۔ میرا دل چاہتا تھا وہ میرے برابر کی کرسی پر بیٹھے ۔ میرے ساتھ چمپا ہی کی طرح چائے پئے ۔ سینڈوچ میرے منہ میں ٹھونس دے ۔ میرے آگے سے آملیٹ کی پلیٹ اُٹھا کر خود کھانے لگے ۔ لیکن وہ تو اس گھر کی نوکرانی تھی ۔۔۔۔ ! ایک بار ٹرے سے ٹی سیٹ ٹیبل پر رکھتے ہوئے ملک پاٹ اُس کے ہاتھ سے پھسل گیا ۔ دودھ ٹیبل کلاتھ پر بہنے لگا ۔ میں نے کانتا کی طرف گھورتے ہوئے کہا ۔

" اندھی ہو تم ۔ سلیقہ بالکل نہیں تم میں ! "

وہ کانپ اُٹھی ۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے ایک نازک تتلی کے خوبصورت پروں کو مسل دیا ہو ! میں اُسے کیسے کہتا ۔ یہ غصہ جھوٹا ہے کانتا ! یہ محض بناوٹ ہے ۔ دودھ گر گیا تو کیا ہوا ۔ تم چائے بھی اُنڈیل دو ۔ سارا ٹی سیٹ توڑ ڈالو ۔ میں اور لے آؤں گا ۔ تم سے اچھا تھوڑا ہی ہے !

وہ سر جھکائے کھڑی تھی ! چمپا نے اُسے دلاسا دیتے ہوئے کہا " کوئی بات نہیں کانتا ! جاؤ کچن میں جاؤ ۔ "

وہ چلی گئی ۔ چمپا نے ہنس کر کہا ۔

" تم نے تو خوامخواہ ہی بچاری کو ڈانٹ دیا ۔ غریبوں کے دل بہت نازک ہوتے ہیں ۔ "

" جانے بھی دو ! "

" اب تھوڑا سا دو منٹ ۔ یہ لو ۔ یہ انڈا کھاؤ ۔ کھاؤ بھی ! "

میں نے منہ کھول دیا ۔ چمپا نے انڈے کا ایک پیس میرے منہ میں ٹھونس دیا ۔ اُس وقت نہ جانے کیوں میری نگاہیں کچن کی طرف اُٹھ گئیں !!

تین مہینے ہو گئے ۔ اس مدت میں میں نے چمپا کے حُسن اور دلکشی خلوص اور

- میری نظر میں مرد اور عورت برابر ہیں ۔ دُنیا کی ترقیوں میں عورت کا بھی اُتنا ہی حصہ ہے جتنا مرد کا ۔ (قاضی نذرالاسلام)
- خوبصورت عورت کے دیکھنے سے آنکھیں خوش ہوتی ہیں اور خوش سیرت کے دیکھنے سے دل مسرور ہوتا ہے ۔ (سموئیل)
- تاریخ یہ تو بتاتی ہے کہ فلاں جنگ میں مردوں نے اتنا خون بہایا ۔ یہ کون بتائے کہ عورتوں نے کس طرح اپنے سہاگ اُجاڑے ۔ (قاضی نذرالاسلام)
- آدمی کا حصہ وہی ہوتا ہے جو اُس کے کانوں میں محفوظ ہو اور جو زبان پر آجائے وہ دوسروں کا ہو جاتا ہے ۔ (عربی ادب)
- خدا کی کائنات میں سب سے قابلِ قدر نیک عورت ہے ۔ (اناطول فرانس)

بے پناہ چاہت کے اتنے قصیدے پڑھے کہ میرا خیال ہے چمپا یہ محسوس کرنے لگی جیسے راجن بابو نے دس سال کے طویل عرصے کو ایک رسّی کی طرح لپیٹ دیا ہو اور جیسے ابھی دن آگئے ہوں جب چمپا سے پیار شروع ہوا تھا ۔۔۔۔ لیکن اس تمام وقت میں مجھے کانتا سے پیار ظاہر کرنے کا موقعہ نہ ملا تھا ۔ وہ میری بار بار کی ڈانٹ ڈپٹ سے اُداس سی رہنے لگی تھی ۔ میں اس صورت حال کو ختم کرنا چاہتا تھا ۔ میں کسی موقعہ کی تلاش میں تھا تاکہ میں اپنا دل کھول کر کانتا کے سامنے رکھ سکوں ۔ اور کہہ سکوں مجھے تم سے اتنا پیار ہے جتنا سمندر کی گہرائی اور آکاش کی بلندی ! آؤ میرے بازوؤں میں آجاؤ کانتا ! ایک پھول کی طرح میری گرفت میں آجاؤ تاکہ میں تمہارے رنگ اور تمہاری مہک کو نچوڑ کر من کی آگ بُجھا سکوں ۔ میں یہ سب کچھ کرنا چاہتا تھا ۔ مجھے اس کا حق تھا ۔ یہ انسان کی فطرت ہے ۔ وہ باغ میں جا کر دو تین چار پھولوں کو نوچ سکتا ہے ۔

افسانہ نمبر

بھی حق میں دُنیا کے تمام انسانوں کو دینا چاہتا ہوں۔ چاہے کوئی بھی ہو۔ چاہے چمپا ہی کیوں نہ ہو۔ . . . لیکن میں تو کانتا کی بات کر رہا تھا۔ میں کانتا اور تنہائی !!

میرے کئی دوست میرے یہاں آتے رہتے تھے گھنٹوں بیٹھتے گپیں لڑتیں تاش کے کئی کئی ہاتھ ہوتے۔ سب کچھ ہوتا لیکن میں کھویا کھویا سا رہتا۔ ایک ذہنی اُلجھن، ایک کرب ——! پرکاش بہت ذہین تھا تاڑ گیا۔ ایک روز اُس نے کہا۔

"راجن! میں کسی ہیرا پھیری کے بغیر یہ سُننا چاہتا ہوں کہ تم کس سے پریم کرنے لگے ہو؟"

میں ہنسا۔ میں نے بات بنائی: "کچھ کاروباری چکر ہیں پرکاش! اور کوئی بات نہیں۔"

"بکواس بند کرو" پرکاش نے ڈانٹتے ہوئے کہا "ایک نباض ایک ماہر فن طبیب سے مریض اپنا مرض نہیں چھپا سکتا۔"

تب میں نے تنگ آکر کانتا والی بات بتا دی۔

"کیا بھائی تو بیصورت نہیں رہیں۔ دونوں میں کتنا فرق ہے۔ چمپا کتنی بھولی شکل ہے کتنی چارمنگ! بیوقوف آتی کو چھوڑ کر منڈی کے پیچھے بھٹکتے ہو!"

"تم بدھو ہو پرکاش۔ کاش تم کانتا کو میری آنکھوں سے دیکھتے۔"

وہ سنجیدہ ہوگیا۔ "اس طرح تو سارا نظام تو پٹ ہو جائے گا۔ مالک اتنے خبیث ہو گئے تو کسی نوکرانی کی آبرو محفوظ نہ رہے گی۔ کوئی کسی پر کیسے بھروسہ کرے گا؟"

"فلسفی نہ بن سالے! من کی آگ کو فلسفے کی عینک سے نہیں دیکھا جاسکتا۔"

پرکاش نے مجھ پر لعنت بھیجی اور یہ کہتے ہوئے چلا گیا۔

"سالے! تیرے دماغ کا کوئی نٹ ڈھیلا ہوگیا ہے۔ بڑا فنٹوش ہے۔ مجھے کیا اعتراض ہے۔ سوہن حلوے کی بجائے گڑ پر منہ مار۔ گدھا کہیں کا!"

اور جلد ایک موقعہ ہاتھ آگیا! چمپا کی ایک سہیلی کا بیاہ تھا دوسرے محلے میں۔ چمپا نے کہا۔

"میں جا رہی ہوں۔ تارا کا بیاہ ہے۔ شام تک لوٹ آؤں گی۔ گھر میں کانتا کو چھوڑے جا رہی ہوں کسی بات کی تکلیف نہ ہو تمہیں۔"

"جلدی آنا چمپا! تمہارے بغیر میرا جی کیسے لگے گا۔ آنکھیں دروازے ہی پر لگی رہیں گی۔"

چمپا نے مجھے دیکھا۔ اُس کی نگاہوں میں محبت کے جذبے کی چمک تھی۔ وہ مجھ سے چمٹ گئی۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس لئے کہ ایک پیار ہم آغوش تھا اور دوسرے کا آغاز ہونے والا تھا! —— چمپا چلی گئی۔ کانتا برابر والے کمرے میں فرنیچر جھاڑنے لگی۔ میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی نس نس میں جیسے بجلیاں کوندری ہوں۔

دل کی دھڑکن تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے آواز دی۔

"کانتا!"

"جی آئی بابو جی۔"

اور وہ آگئی۔ اُس کے ہاتھ میں جھاڑن تھا۔ گھبراہٹ کے عالم میں دوپٹہ سر سے سرک گیا تھا۔ سر کے بال پنکھے کی ہوا میں لہرانے لگے۔ وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ شاید دو قدم کے فاصلے پر۔ اور میں جانتا تھا کہ کچھ دیر میں یہ فاصلہ مختصر سا فاصلہ بھی مٹ جائے گا اور یہ تتلی میرے دامن میں ہوگی۔

"جی بابو جی پھرمائیے؟"

میں نے چاہا کچھ نہ فرماؤں کھینچ کر اپنے آغوش میں لے لوں —— کہ کال بل کی آواز سنائی دی۔ میں نے جھلا کر کانتا سے کہا: "دیکھو کون پاجی ہے۔" وہ گئی اور ڈاک لے کر آگئی۔

"ڈاکیہ تھا۔ ڈاک ہے بابو جی۔"

"ہونہہ۔ اچھا ذرا پانی لاؤ۔ جلدی آنا!"

وہ جا چکی۔ میری نظر کے سامنے ایک نیلا لفافہ تھا مسٹر راجن کے نام۔ کسی نیلادتی کی طرف سے یہ چمپا کا لفافہ ہے لیکن کون ہے یہ نیلادتی۔ کوئی سہیلی ہوگی لیکن چمپا نے کبھی اس کا نام نہیں لیا۔ لاؤ پڑھ کر دیکھیں۔ شاید کوئی مزیدار لڑکی ہو۔ میں نے لفافہ چاک کیا۔ لکھا تھا:

ڈارلنگ چمپا!

میں پرکاش ہوں نیلادتی نہیں۔ یہ سوانگ اس لئے بھرا کہ راجن نہ کھٹکیں۔ میں تمہیں چاہنے لگا ہوں۔ دل کے ہاتھوں بے بس ہوں۔ کیا میرے پیار کو سہارا دوگی تم۔ تم کتنی سوہنی ہو اور میں بھی سُندر ہوں! آؤ ہم پیار کریں۔ خاموشی سے راجن کو پتہ نہ چلے۔ چمپا! اس میں حرج بھی کیا ہے۔ کیا ایک پھول کے بعد دوسرے پھول کو . . .

میں اس سے آگے نہ پڑھ سکا۔ میں نے کاغذ کے ٹکڑے کر دئیے۔ میں غصے میں پاگل ہوگیا۔

"کیا چمپا میرے ہوتے ہوئے پرکاش کو چاہنے گی؟ اُس کے گلے میں باہیں ڈالے گی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ چمپا کو میں یہ حق نہیں دے سکتا۔ وہ آگے بڑھے گی تو میں اسے اور پرکاش کو قتل کر دوں گا! ایک پھول دوسرا پھول یہ بکواس ہے محض بکواس! حرام زادہ پھولوں کا ذکر کرتا ہے۔ ضرور چاہو، پچاس پھولوں کو چاہو میں نہیں روکتا۔ اپنے دامن میں سارا باغ اُلٹ لو۔ لیکن چمپا دوسرا پھول نہیں بن سکتی! میں اسے برداشت نہ کروں گا۔ لیکن . . . . لیکن پھر مجھے کانتا کو آغوش میں لینے کا کیا حق ہے؟ کانتا، کانتا، نہیں صرف چمپا . . . .!

"پانی لو بابو جی۔ میں کب سے کھڑی ہوں۔"

"ہاں لاؤ۔ اب تم چلی جاؤ۔ دوسرے کمرے میں کام کرو!!"

یہی حق میں دُنیا کے تمام انسانوں کو دینا چاہتا ہوں۔ چاہے کوئی بھی ہو چاہے چمپا ہی کیوں نہ ہو...... لیکن میں تو کانتا کی بات کر رہا تھا۔ میں کانتا اور تنہائی !!

میرے کئی دوست میرے یہاں آتے رہتے تھے گھنٹوں بیٹھتے گپیں لڑتیں تاش کے کئی کئی ہاتھ ہوتے۔ سب کچھ ہوتا۔ لیکن میں کھویا کھویا سا رہتا۔ ایک ذہنی اُلجھن ، ایک کرب ——۔ ! پرکاش بہت ذہین تھا۔ تاڑ گیا۔ ایک روز اُس نے کہا۔

" راجن ! میں کسی ہیرا پھیری کے بغیر یہ سُننا چاہتا ہوں کہ تم کس سے پریم کرنے لگے ہو ؟"

میں ہنسا۔ میں نے بات بنائی۔ " کچھ کاروباری چکر ہیں پرکاش ! اور کوئی بات نہیں ۔"

" بکواس بند کرو۔" پرکاش نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ " ایک نباض ایک ماہر فن طبیب سے مریض اپنا مرض نہیں چھپا سکتا ۔"

میں نے تنگ آ کر کانتا والی بات بتا دی۔

" کیا بھائی تو اصورت نہیں رہیں۔ دونوں میں کتنا فرق ہے۔ چمپا کتنی بیوٹی فل ہیں ! کتنی چارمنگ ! بیوقوف ! تتلی کو چھوڑ کر بندی کے پیچھے لپکتے ہو !"

" تم بدھو ہو پرکاش ! کاش تم کانتا کو میری آنکھ سے دیکھتے ۔"

وہ سنجیدہ ہو گیا " اس طرح تو سارا انظام چوپٹ ہو جائے گا۔ مالک اتنے خبیث ہو گئے تو کسی نوکرانی کی آبرو محفوظ نہ رہے گی۔ کوئی کسی پر کیسے بھروسہ کرے گا ؟"

" فلسفی نہ بن سالے ! من کی آگ کو فلسفے کی عینک سے نہیں دیکھا جا سکتا ۔"

پرکاش نے مجھ پر لعنت بھیجی اور یہ کہتے ہوئے چلا گیا۔

" سالے ! تیرے دماغ کا کوئی نٹ ڈھیلا ہو گیا ہے۔ لٹرا منوٹش۔ مجھے کیا اعتراض ہے۔ سوہن حلوے کی بجائے گڑ پر منہ مار۔ گدھا کہیں کا !"

اور جلد ایک موقعہ ہاتھ آ گیا ! چمپا کی ایک سہیلی کا بیاہ تھا دوسرے محلے میں۔ چمپا نے کہا۔

" میں جا رہی ہوں۔ انا کا بیاہ ہے۔ شام تک لوٹ آؤں گی۔ گھر میں کانتا کو چھوڑے جا رہی ہوں کسی بات کی تکلیف نہ ہو تمہیں ۔"

" جلدی آنا چمپا ! تمہارے بغیر میرا جی کیسے لگے گا۔ آنکھیں دروازے ہی پر لگی رہیں گی ۔"

چمپا نے مجھے دیکھا۔ اُس کی نگاہوں میں محبت کے جذبے کی چمک تھی۔ وہ مجھ سے چمٹ گئی۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اِس لئے کہ ایک پیار ہم آغوش تھا اور دوسرے کا آغاز ہونے والا تھا ! —— چمپا چلی گئی۔ کانتا برابر والے کمرے میں فرنیچر جھاڑنے لگی۔ میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی نس نس میں جیسے بجلیاں کوندری ہوں۔

دل کی دھڑکن تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے آواز دی۔

" کانتا !"

" جی آئی بابو جی ۔"

اور وہ آ گئی۔ اُس کے ہاتھ میں جھاڑن تھا۔ گھبراہٹ کے عالم میں دوپٹہ سر سے سرک گیا تھا۔ سر کے بال پنکھے کی ہوا میں لہرانے لگے۔ وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ شاید دو قدم کے فاصلے پر۔ اور میں جانتا تھا کہ کچھ دیر میں یہ فاصلہ مختصر سا فاصلہ بھی مٹ جائے گا اور یہ تتلی میرے دامن میں ہو گی۔

" جی بابو جی پھر بایئے ؟"

میں نے چاہا کچھ نہ فرماؤں کھینچ کر اپنے آغوش میں لے لوں —— کہ کال بل کی آواز سُنائی دی۔ میں نے جھلا کر کانتا سے کہا۔ " دیکھو کون پاپی ہے۔" وہ گئی اور ڈاک لے کر آ گئی

" ڈاکیہ تھا۔ ڈاک ہے بابو جی ۔"

" ہونہہ۔ اچھا ذرا پانی لاؤ۔ جلدی آنا !"

وہ باہر گئی۔ میری نظر کے سامنے ایک نیلا لفافہ تھا۔ مسز راجن کے نام کسی لیلا وتی کی طرف سے یہ چمپا کا لفافہ ہے لیکن کون ہے یہ لیلا وتی۔ کوئی سہیلی ہو گی۔ لیکن چمپا نے کبھی اس کا نام نہیں لیا۔ لاؤ پڑھ کر دیکھیں۔ شاید کوئی فرسٹ لڑکی ہو۔ میں نے لفافہ چاک کیا لکھا تھا۔

ڈارلنگ چمپا !

میں پرکاش ہوں لیلا وتی نہیں۔ یہ سوانگ اس لئے بھرا کہ راجن نہ کھٹکیں۔ میں تمہیں چاہنے لگا ہوں۔ دل کے ہاتھوں بے بس ہوں۔ کیا میرے پیار کو سہارا دو گی تم۔ تم کتنی سویٹ ہو اور میں بھی سُندر ہوں ! آؤ ہم پیار کریں۔ خاموشی سے راجن کو پتہ نہ چلے۔

چمپا ! اس میں حرج بھی کیا ہے۔ کیا ایک پھول کے بعد دوسرے پھول کو......۔

میں اس سے آگے نہ پڑھ سکا۔ میں نے کاغذ کے ٹکڑے کر دئیے۔ میں غصے میں پاگل ہو گیا۔

' کیا چمپا میرے ہوتے ہوئے پرکاش کو چاہے گی ' اُس کے گلے میں باہیں ڈالے گی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ چمپا کو میں یہ حق نہیں دے سکتا۔" وہ آگے بڑھے گی تو میں اُسے اور پرکاش کو قتل کر دوں گا ! ایک پھول ' دوسرا پھول ' یہ بکواس ہے محض بکواس ! حرام زادہ پھولوں کا ذکر کرتا ہے۔ ضرور چاہو ' پچاس پھولوں کو چاہو میں نہیں روکتا۔ اپنے دامن میں سارا باغ اُلٹ لو۔ لیکن چمپا دوسرا پھول نہیں بن سکتی ! میں اِسے برداشت نہ کروں گا۔ لیکن...... لیکن پھر مجھے کانتا کو آغوش میں لینے کا کیا حق ہے ؟ کانتا ' کانتا ' نہیں صرف چمپا......!

" پانی لو بابو جی۔ میں کب سے کھڑی ہوں ۔"

" ہاں لاؤ۔ اب تم چلی جاؤ۔ دوسرے کمرے میں کام کرو !"

Dr. W. H. A. Shadani,
M. A., Ph. D. (London)
Professor & Head of the Department

Department of Urdu and Persian
University of Dacca
Dacca—2

The 9th May 1967

۳۱ - نیل کھیت روڈ - ڈھاکا - ۲ - پاکستان

پیارے خوشتر! ایک لمبے عرصے کے بعد تمہارے دو خط ملے۔ تمہاری فرمائش کے مطابق افسانہ نمبر کے لئے چند شعر بھیج رہا ہوں۔ ان میں سے ہر شعر ایک سچی کہانی ہے یا کم سے کم کسی سچی کہانی کا ایک ٹکڑا۔ یہ کہانیاں بیک وقت آپ بیتی بھی ہیں اور جگ بیتی بھی۔ اب لوگوں کو ان میں سے اپنی اپنی کہانیاں ڈھونڈ لینے دو۔

بہت سا پیار۔ تمہارا عندلیب

غزل

پروفیسر ڈاکٹر عندلیب شادانی ایم اے پی ایچ ڈی

دیکھتا ہوں رات کو جب دو ستارے پاس پاس ٭ جانے کیوں اس وقت ہو جاتا ہے میرا دل اداس

اب نہ آئیں گے اتر کے وہ لمحے لوٹ کر ٭ رائگاں ہے اب نگاہِ آرزو کا التماس

آج میں اُس آرزو کے سامنے شرمندہ ہوں ٭ جس کو سمجھا تھا کسی کی آرزو کا انعکاس

لاکھ امیدیں مسکرائیں اب نہ کھاؤں گا فریب ٭ لب تک آتے آتے کتنی بار چھلکا ہے گلاس

بدگماں ہوں تجھ سے میں، سچ، مگر اتنا تو سوچ ٭ کیوں مری امید کے دل میں گھسی آتی ہے یاس

بے نیازی آرزومندی کی فطرت میں نہیں ٭ تم سے کیا شکوہ کہ ہم نے ہی غلط باندھی تھی آس

تیرے استغنا کے قرباں! دل کا عالم کیا کہوں ٭ جیسے کوئی چھوڑ دے پتھر پہ شیشے کا گلاس

گردشِ ایام تو نے وہ محل بھی ڈھا دیا ٭ ہم نے رکھی تھی محبت پر محبت کی اساس

تم نے اپنا نام کیوں لکھا نہیں تصویر پر
میں نے اس پر لکھ دیا "حسنِ ازل کا اقتباس"

عندلیب شادانی
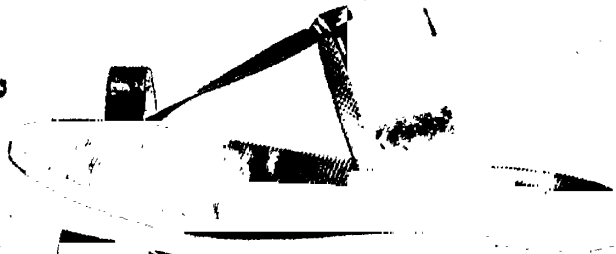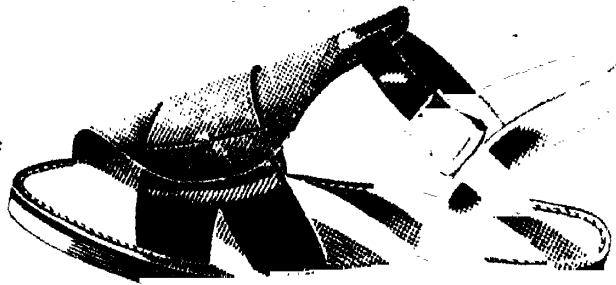
ندا ۹۵،۹
ستارہ ۹۵،۹
ڈپلی ۴۸ ۳۵،۸
اسپرنگ ۹۵،۱۳
ہولیڈے ۹۵،۱۷

مرزا لطیفہ

پرنسپل کنھیا لال کپور ایم۔ اے

ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ آف انگلش۔ ڈی۔ ایم کالج، موگا (پنجاب)

۲۷ اپریل ۱۹۶۴ء

ڈیئر مولانا خوشتر گرامی صاحب!

سے میری صدری ۔۔۔۔۔ آپ نے لکھا ہے "افسانہ نمبر سر پہ آگیا ہے" مولانا! خدا آپ کا سر سلامت رکھا ایسے توئی حادثے آئے دن اس پر نازل ہوتے رہتے ہیں۔ آپ نے پہلے کبھی پروا کی ہے جو اب کریں گے؟ ہم نے سوچا تھا آپ سالنامہ نکالنے کے بعد صبر یا آرام کریں گے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی طرح پھر آپ کو دیوتر یاد آیا۔ کامیاب سالنامہ نکالنے پر اس لئے مبارکباد نہیں دی کہ مبادا آپ کی پیاری پیاری صورت کو میری نظر لگ جائے ورنہ مبارکباد کا کیا ہے۔ یہ تو اُن لوگوں کو بھی دیتا ہوں جو سالنامہ کی بجائے دیوالہ نکالتے ہیں۔ مبارکباد کی بات چلی ہے تو آپ بڑے شوق سے مجھے مبارکباد دے سکتے ہیں کہ ۲۶ اپریل سے اپنے کالج کا پرنسپل بنا دیا گیا ہوں۔ کیوں مولانا کیسی رہی ہوئی نا دہی بات ۔۔۔۔۔ اسی دُنیا میں لے لیتی ہے قدرت انتقام آخر ۔۔۔۔۔

اب مصروفیت کا یہ عالم ہے کہ اپنے آپ پر خوشتر گرامی کا گمان ہوتا ہے۔ اگر اس حالت میں مضمون یا افسانہ کی بجائے اُس کا عنوان ہی لکھ سکوں تو غنیمت سمجھنا چاہئے۔ بہرحال ایک مزاحیہ افسانہ بعنوان "مرزا لطیفہ" بھجوا رہا ہوں۔ ممکن ہے آپ کو پسند آئے کیوں کہ آپ خود بڑے لطیفہ باز ہیں۔ آپ نے "فنکار اپنے گھر میں" کا جو تصویری سلسلہ شروع کیا ہے۔ اُس کے بارے میں یہ عرض ہے کہ تصاویر کا حقیقت سے دُور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔ ورنہ جیسا کہ آپ بھی جانتے ہیں اپنے اپنے گھر میں تمام فنکاروں کی ایک جیسی آؤ بھگت ہوتی ہے۔ یعنی بھاگوان ہاتھ میں بیلن لئے کھڑی ہیں اور فن کار صاحب فرار ہے ہیں۔ سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے (یار کی بجائے آپ نار بھی پڑھ سکتے ہیں) مولانا! فن کار کو گھر میں (کم از کم اپنے گھر میں) کبھی سکون نصیب نہیں ہوتا۔ ... کہیں آپ مولانا کی تکرار سے گھبرا تو نہیں گئے۔ یقین فرمایئے اگر آپ کی ڈاڑھی ہوتی تو آپ واقعی مولانا لگتے اور کہلاتے ۔۔۔۔۔

آپ کا (پرنسپل) کنھیا لال کپور ۔۔۔۔۔

ہم نے مرزا لطیفہ سے زیادہ سادہ لوح شخص آج تک نہیں دیکھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ وُہ سادہ لوحوں کے بادشاہ ہیں تو رتی بھر مبالغہ نہ ہوگا۔ یہ جب اسکول میں پڑھتے تھے تو اُنہیں کسی دوست نے بتایا کہ دیئے کی روشنی میں مطالعہ کیا جائے تو آنکھیں خراب نہیں ہوتیں۔ چنانچہ متواتر تین سال دیئے کی مدھم روشنی میں مطالعہ کرتے رہے نتیجہ یہ ہوا کہ بینائی کمزور ہوگئی اور اُنہیں کتے پر بکری اور بکری پر بارہ سنگھے کا دھوکا ہونے لگا۔ آخر عینک لگوائی اور آئے دن کے مغالطوں سے ہمیشہ کے لئے نجات پائی۔ اُنہی دنوں کا ذکر ہے کسی مسخرے نے اُنہیں مشورہ دیا کہ اگر اخروٹ دانتوں سے توڑے جائیں تو دانت مضبوط ہو جاتے ہیں۔ ایک دن ایک سخت سا اخروٹ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اخروٹ تو ٹوٹا نہیں البتہ اِن کے دو دانت ضرور ٹوٹ گئے۔ جب کالج میں پہنچے تو اُنہوں نے ایک کتاب میں پڑھا جو خواب آدھی رات کے بعد آتے ہیں

بالکل صحیح ہوتے ہیں۔ ایک رات انہوں نے خواب میں دیکھا کہ اُن کے عزیز دوست میاں جگنو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اُسی وقت اُٹھ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگے روتے تھے اور ہر دس منٹ کے بعد غالب کا شعر تھوڑے سے تصرف کے ساتھ رقت انگیز لہجے میں پڑھتے تھے۔

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی جگنو
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

جب صبح ہوئی اپنے ہم جماعتوں کو مرحوم کی باتیں سُنا کر آٹھ آٹھ آنسو روئے "اجی صاحب کیا بات تھی میاں جگنو کی۔ کتنی چھوٹی سی پیاری پیاری ناک تھی اس پر مکھی تو کجا مچھر تک نہیں بیٹھنے دیتے تھے اور آنکھیں! آنکھیں اتنی خوبصورت تھیں کہ انہیں ایک بار دیکھنے کے بعد اپنی آنکھیں نوچ لینے کو جی چاہتا تھا۔ وہ تو صاحب مہر و وفا کے پُتلے تھے ایک بار میری عینک گم ہو گئی۔ انہوں نے مجھے اپنی عینک دیتے ہوئے کہا اس کا نمبر آپ کی عینک سے دُگنا ہے۔ تاہم جب تک آپ کی عینک بن کر نہیں آتی اس سے کام چلائیے۔"

حُسنِ اتفاق سے اُسی شام میاں جگنو آگرہ سے اُنہیں ملنے کے لئے آ گئے۔ انہیں دیکھ کر مرزا لطیف کی آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں۔ بار بار عینک سے گھور کر دیکھتے کہ یہ واقعی میاں جگنو ہیں یا اُن کا بھوت ہے۔ جب تین چار دفعہ اُن کے چہرے پر ہاتھ پھیرنے کے بعد اُنہیں یقین ہو گیا کہ وہ گوشت پوست کے انسان ہیں تو گلے سے لگا کر بولے "جگنو بھائی۔ خدا نے تمہیں دوبارہ زندگی بخشی۔ اس خوشی میں تمہیں فلم "آدھی گون" دکھائی جائیگی۔"

کالج چھوڑنے کے بعد جب مرزا ایک کمپنی میں کلرک ہو گئے تو انہوں نے ایک دن کسی اخبار میں پڑھا کہ بیس جون کو دنیا ختم ہو جائے گی۔ آپ اس بے بنیاد خبر پر ایمان لے آئے۔ اور گھر کی تمام چیزیں پادنے پونے بیچنے لگے۔ ہم نے پوچھا "آپ یہ کیا کر رہے ہیں" آبدیدہ ہو کر فرمایا "صاحب دنیا ہی ختم ہو رہی ہے تو فرنیچر۔ کتابوں اور برتنوں کا کیا فائدہ۔ جو تھوڑی بہت رقم مل جائے غنیمت ہے" ہم نے جواب میں کہا "جب دنیا ہی نہ رہی تو آپ رقم لے کر کیا کیجیے گا"۔ کہنے لگے "اس مسئلہ پر تو ہم نے ابھی غور نہیں کیا۔"

خیر اس قسم کے شگوفے تو مرزا آئے دن چھوڑتے رہتے ہیں۔ چند دن ہوئے ایک ایسا عجیب و غریب واقعہ ہوا کہ وہ موت کے منہ میں جانے سے بال بال بچے — ہوا یہ کہ انہوں نے اپنا زائچہ جوتشی کو دکھایا۔ جوتشی نے بتایا کہ ان کے چوتھے گھر میں سینچر ہے۔ مرزا نے حیران ہو کر کہا "پنڈت جی۔ میرا تو صرف ایک گھر ہے اور دراصل وہ بھی میرا نہیں۔ کرائے پر لے رکھا ہے۔ میرے چوتھے گھر میں سینچر کیسے داخل ہو گیا؟"

پنڈت جی نے انہیں مطلع کیا چوتھا گھر جوتش کی ایک اصطلاح ہے۔

"خیر ہو گی لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"فرق یہ پڑتا ہے کہ آپ جو بھی کام کریں گے اس میں رخنہ پڑے گا۔"

"بخدا یہ تو آپ صحیح فرماتے ہیں۔ اب اس کو ہی لیجئے کہ میری سگائی [illegible] کی لڑکی سے ہونے والی تھی۔ میں اُن کے گھر جا رہا تھا کہ راستے میں پھوپی جان مل گئیں۔ وہ مجھے اپنے گھر گھسیٹ کر لے گئیں اور زبردستی میرا نکاح اپنی لڑکی نکہت کے ساتھ پڑھوا دیا۔ اور سُنیئے۔ جب مجھے سڑک کے پار جانا ہوتا ہے۔ بسوں یا موٹروں کا قافلہ میرے راستے میں حائل ہو جاتا ہے اور بسا اوقات سڑک پار کئے بغیر گھر واپس آ جاتا ہوں"

"گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اس کا تدارک کیا جا سکتا ہے۔"

"وہ کیسے"

"سینچر کے دن کالے ناگ کو دودھ پلا دیجئے۔ سینچر ٹل جائے گا"

مرزا لطیف نے جوتشی کی بات پلے باندھ لی۔ ایک تھرموس میں دودھ بھر کر کالے ناگ کی تلاش کرنے لگے۔ اگر اکیلے تلاش کرتے تو چنداں مضائقہ نہ تھا لیکن وہ اصرار کرنے لگے کہ ہم بھی اُن کے ساتھ چلیں۔ کیونکہ دوست وہی ہوتا ہے جو مصیبت کے علاوہ کالے ناگ کی تلاش میں بھی دوست کا ساتھ دیتا ہے۔

ہم نے اُن کی معیت میں جنگلوں۔ بیابانوں اور اُن تمام جگہوں کی خاک چھانی جنہیں کالے ناگوں کا مسکن بتلایا جاتا ہے لیکن بدقسمتی سے ناگ تو کہاں چھپکلی تک نظر نہ آئی۔ ایک دن مرزا اُداس ہو کر کہنے لگے "معلوم ہوتا ہے تمام کالے ناگ یہاں سے ہجرت کر گئے ہیں۔"

ہم نے پوچھا کیوں اور کہاں؟

"ممکن ہے وہ ایک جگہ رہتے رہتے اُکتا گئے ہوں یا آب و ہوا کی تبدیلی کے لئے افریقہ چلے گئے ہوں" مرزا نے جواب دیا۔

"پھر تو اُن کی تلاش بے سود ہے۔"

اب جب کبھی مرزا کو کسی معمولی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا اُس کی ذمہ داری سینچر کے سر تھوپ دیتے۔ ایک بار جب رقموں کی غلط میزان لگانے پر اُنہیں سخت سست کہا گیا تو فرمانے لگے "یہ سب سینچر کا قصور ہے کہ ہر بار اٹھارہ جمع نو ستائیس کی بجائے میں تینتالیس لکھتا رہا"

آخر جب مرزا کا وہم جنون کی حدود کو چھونے لگا تو ہم نے اُنہیں اس سے نجات دلانے کی ایک ترکیب سوچی۔ ایک سینچر وار ہم ایک سپیرے کو جس کے پاس کالا ناگ تھا مرزا کے گھر لے گئے۔ مرزا سے کہا گیا کہ تھرموس میں دودھ بھر کر ایک کرسی پر بیٹھ جائیں اور جونہی ناگ پھن پھیلا کر اُن کے سامنے آئے بڑی عقیدت سے اُسے دودھ پیش کر دیں۔ سپیرے نے ناگ کو پٹاری میں سے نکال کر فرش پر رکھا۔ اور بین بجانی شروع کی۔ ناگ نے یک لخت پھن ہوا میں لہرایا اور مرزا کی طرف لپکا۔ شاید اُس نے اپنی زبان سے مرزا کے ہاتھ کو چھو بھی لیا۔ ایک دلدوز چیخ مار کر مرزا کرسی سے نیچے گر پڑے اور اُس

عالم میں چاہیے۔ جس کے متعلق کہا گیا ہے۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی!

اُنہیں اسپتال پہنچایا گیا۔ اُن کے دماغ پہ اتنا اثر ہوا کہ تین دن بھر بکتے رہے۔ اکثر عرلب میں چیختے "مار ڈالا ناگ نے۔ بچاؤ بچاؤ"

جب چوتھے دن اسپتال سے گھر لوٹے۔ تو اُنہوں نے سب سے پہلا سوال یہ کیا "ناگ کو دودھ پلا دیا تھا؟"

ہم نے جھوٹ بولتے ہوئے جواب دیا "جی ہاں۔ معلوم ہوتا ہے بڑا لذیذ دودھ تھا۔ ناگ غٹاغٹ پی گیا"

"اجی پیتا کیسے نہ ڈیری کا خالص دودھ تھا" مرزا نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"چلیے۔ سینچو تو ٹل گیا"

"ہاں اِس میں تو کوئی شک نہیں"

"اور خدا کا شکر ہے کہ آپ کی جان بچ گئی"

"اونہہ" مرزا لطیف نے منہ بنا کر کہا "ایسی کونسی بات تھی۔ یونہی ذرا چکر آگیا تھا"

پنڈت بالمکند عرش ملسیانی بی۔ اے

شیخ لاکھوں وعظ گو فرمائے گا
ایک ہی جنت کے نغمے گائے گا
میکدے کی سرحدیں چھُولے اگر
جانے کتنی جنتیں بتلائے گا

•

شورِ ہو حق بھی بڑی شے ہے مگر
شورِ نوشا نوش بھی کچھ کم نہیں
فرق اتنا ہے کہ اس میں غم ہی غم
اور اِس دنیا میں کوئی غم نہیں

•

میکدے سے آج رندانِ عظام
شیخ صاحب کا نکالیں گے جلوس
اس تپاکِ باہمی سے درس لیں
کس لئے لڑتے ہیں امریکہ و روس

•

قدر دانِ سخن نہیں کوئی
قدر ہوتی ہے اب تو سُرّے کی
شیخ صاحب کی دعوتوں میں بھی
دھوم ہوتی ہے ساغرورے کی

•

بادۂ ارغواں سے اتنا عذر
یہ تو ہے خود کو رُوسیہ کرنا
شیخ صاحب! سنا بھی ہے تم نے
عین ایمان ہے گنہ کرنا

عرش ملسیانی

پشکر ناتھ بی، اے

معرفت ہیڈ کیشئر اسٹیٹ بنک آف انڈیا جموں (توی)

۲۵ مارچ ۱۹۶۳ء

برادر محترم! آداب و نیاز

"بیسویں صدی" کا خاص نمبر پھر زیر ترتیب ہے۔ اس کے لئے ایک افسانہ بعنوان "بے نام خط" ارسال خدمت کر رہا ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ کو اور "بیسویں صدی" کے قارئین کو خاص طور سے پسند آئے گا۔ نہ جانے ہمارے اندر ــــــ بہت اندر وہ کونسی چیز ہے جو ہمارے احساسات و جذبات میں توازن پیدا کر کے ہم سے بعض نیک کام کراتی ہے۔ ہمارے سیپیوں میں یہ موتی نہ ہوتے تو ہمیں انسان کون کہتا ۔؟ میں اُن پاکستانی قارئین کا شکر گزار ہوں جو مجھے وقتاً فوقتاً اپنی آراء سے نوازتے رہتے ہیں۔ اُن کی خدمت میں گزارش ہے کہ بعض مجبوریوں کے پیش نظر فرداً فرداً اُن کے خطوط کے جواب نہیں دے سکتا۔ "بیسویں صدی" کا یہ خاص نمبر حسب روایت اُردو ادب میں ایک سنگ میل کی حیثیت لئے منظر عام پر آئے گا، اس کا مجھے یقین ہے ــــــ کیونکہ خوشتر گرامی ہمیشہ سے بہترین اور نفیس ترین چیزوں کے قائل ہیں ــــــ اور یہ نام اُردو صحافت و ادب میں معیار، حسن ترتیب دل کشی اور وقار کا ضامن ہے ....

خیر اندیش ــــــ پشکر ناتھ

یہ خط ایک کبوتر کی طرح پھڑ پھڑاتا ہوا، اُس سامنے والے خوبصورت چوبارے سے اُڑ کر میرے سامنے آ گرا ہے۔ لفافے پر کوئی نام نہیں ہے۔ پھر بھی میں جانتا ہوں کہ یہ خط میرے لئے ہے۔ اس میں وہ پیغام ہے جو صرف میں ہی پڑھ سکتا ہوں ــــــ دوسرا کوئی پڑھ بھی لے تو کیا کرے گا، یہی نا کر اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کسی گندی موری میں پھینک دے گا ورنہ منہ میں کچھ بڑبڑاتا ہوا اپنے راستے پر ہولے گا؟ میں بھی شاید ایسا ہی کروں گا۔ لیکن پہلے اس سامنے والے چوبارے سے اُس سائے کو وہاں سے ہٹنے تو دیجئے۔ یوں دیکھتے بھالتے کسی کا دل دکھانا اچھی بات نہیں۔

اس لئے فی الحال اِس خط کو پڑا رہنے دیجئے۔ کیا معلوم یہ کوئی راز عیاں کر دے!

اُس چوبارے میں بھی ایک راز پنہاں ہے، جو نہ جانے کس طلسم کشا کا انتظار کر رہا ہے۔ ویسے یہ چوبارہ اِس گلی کا سب سے اُونچا اور سب سے خوبصورت چوبارہ ہے۔ ارد گرد سفید رنگ کا آر۔سی۔سی کا تین فٹ اُونچا جنگلہ ہے۔ اِس جنگلے کی حدود کے اندر، کھلے آسمان کے نیچے چاندنی رات کا منظر کتنا حسین دکھائی دیتا ہوگا، اِس کا صرف احساس ہی کیا جا سکتا ہے۔ رات کو کبھی اِس چوبارے پر سے چوڑیوں کی مدھم سی کھنک ایسے سنائی دیتی ہے جیسے غلطی سے قلم ستار کے تاروں سے چھو گیا ہو اور مجھ جیسا کوئی

آزاد منش اِس چوبارے سے کئی فٹ نیچے اپنے چھت پر سویا ہوا، یہ موہوم سا ارتعاش سُن کر خواب میں بڑبڑانے لگتا ہے۔

لیکن میں یہ ارتعاش محسوس کر کے کبھی نہیں بڑبڑاتا، کیونکہ میں حقیقت جانتا ہوں۔ میں نے اُس لڑکی کو دیکھا ہے جس کی کلائیاں یہ نغمہ بکھیرتی ہیں ــــــ آیئے آپ کو تھوڑا سا پس منظر بھی بتا دوں۔

یہ چوبارہ اُس کوٹھی کی سب سے اُونچی چھت ہے، جس میں ایک ریٹائرڈ جج رہتا ہے۔ اور یہ لڑکی اِس جج کی اکلوتی بیٹی مونا ہے اِس کوٹھی میں اور بھی لوگ رہتے ہیں، یعنی مونا کی ماں ہے، ایک بیوہ موسی ہے جو یہیں رہتی ہے، تین نوکر ہیں دو ایلسیشن کُتے ہیں، ایک موٹر ہے، ایک سکوٹر ہے جس پر بیٹھ کر مونا سیر کو جاتی ہے۔ اور ہاں! ایک سادھو مہاراج بھی ہیں، جنہوں نے کوٹھی ہی میں ایک کمرے کو آشرم بنایا ہے اور پچھلے گیارہ برسوں سے یہیں براجمان ہیں۔

اِن تمام آدمیوں، جانوروں اور چیزوں کا اِس کہانی سے کوئی تعلق نہیں ہے، اِس لئے انہیں کوٹھی کے اندر ہی رہنے دیجئے۔

اِن جج صاحب سے پہلی بار گلی میں ملاقات ہوئی تھی۔ جبکہ انہوں نے

"آپ سائیکالوجی پڑھاتے ہیں یا فزیالوجی۔"

"میں [illegible] ویسے تو سائیکالوجی ہی پڑھاتا ہوں۔ آپ ــــ آپ کو اعتراض [illegible]"

[illegible]

[illegible] کچھ [illegible]

[illegible]

[illegible] ایک [illegible]

[illegible]

[illegible] بولا کیا

باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ جج صاحب تفکرات [illegible] کے چکر میں پڑے ہیں [illegible] تاکہ میرے ساتھ گھڑی دو گھڑی بیٹھ کر تبادلۂ خیالات کیا کریں۔ لیکن اس پہلی ملاقات میں، میں نے اُنھیں یہ نہیں بتایا کہ عمر اور اُس کے تقاضے، بھی ایک موضوع ہے جو ایسے تبادلۂ خیالات کے وقت، بلکہ اِس سے پہلے مدِنظر رکھا جانا چاہئیے۔ کیا پتہ جس چیز کو ایک ساٹھ برس کا آدمی فکر سمجھ رہا ہو، اور اندر ہی اندر گل سڑ رہا ہو، اُسی چیز کو ایک چھبیس برس کا آدمی سرے سے کوئی آفت ہی نہ مانتا ہو۔

بہرحال! اِس بات سے ہمیں بحث نہیں ہونی چاہئیے۔ کیونکہ میرے سامنے یہ خط اُسی طرح پڑا ہے، اور وہ سایہ بھی اُس چوبارے پر اُسی طرح لرز رہا ہے۔

کاش! میں نے اِس سائے کو کبھی نہ دیکھا ہوتا تو اِس وقت اِس کی یہ ادا میرے دل میں کیا کیا فتنے نہ جگاتی۔ اِس خط کی اہمیت کتنی بڑھ جاتی اور میں کس طرح اِسے دھیرے سے اُٹھاتا، آنکھوں سے لگاتا، ہونٹوں سے مس کرتا، اور اِس کی ایک ایک سطر کو اپنی نگاہوں سے چومتا۔ اِسے پڑھتے پڑھتے شرما جاتا۔ میرے کانوں کی لویں سرخ ہو جاتیں اور میں اکیلے میں یونہی بیٹھا خواہ مخواہ مسکرانے لگتا۔

لیکن کیا کروں؟ میں نے موناکو دیکھا ہے نا۔ اِس کے ساتھ دو ایک باتیں بھی کی ہیں۔ اِس کے چند اشارے بھی دیکھ سمجھ لئے ہیں۔ اِس لئے اِس خط کو ہاتھ میں اٹھانے کو جی نہیں چاہتا۔

بات یہ ہے کہ جتنا خوبصورت یہ چوبارہ ہے، جہاں سے اُڑ کر یہ خط میرے پاس آیا ہے۔ اور جتنی خوبصورت یہ کوٹھی ہے، جہاں مونا رہتی ہے۔ اور جتنے خوبصورت کپڑے پہنتی ہے اور جتنی خوبصورت اِس کی آواز ہے اُس سے کہیں زیادہ وہ بدصورت ہے۔

قدرت نے اُسے ایک خوبصورت مکان، ایک خوبصورت کار، خوبصورت کپڑے۔ خوبصورت آواز اور خوبصورت جسم دے کر ایک نہایت ہی بدصورت چہرہ دیا ہے۔ اُس کے ساتھ کتنا بڑا مذاق کیا ہے۔ اور اِس سے بھی بڑا مذاق یہ ہے کہ مونا کو اِن خوبصورتیوں کا احساس بھی ہے اور اپنے بدصورت چہرے کا بھی شدید احساس ہے۔ اسی لئے اُسے بہت کم چھت پر یا کھڑکی کے پاس یا لان میں یا برآمدے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ بہت کم گھر سے نکلتی ہے۔ بہت کم باہر جاتی ہے۔ یہ بہت کم کسی کے سامنے آتی ہے۔ [illegible] کبھی کبھی مجھے اُس کی حالت پہ کتنا ترس آتا ہے۔ تب مجھے [illegible] کوئی باتصویر تصور میں اِس کے آ [illegible] مجھے [illegible] کا ماحول مخوابیدہ ہوتا ہے اور رستے [illegible] بیٹھ گئے ہیں۔ جب مائیں اپنے بچوں کے منہ میں [illegible] سہیلیاں اپنی ساتھیوں کے گلے میں [illegible] اُنہیں رات بے خبر پڑی ہوتی ہیں۔ جب کنواریاں اپنے سینوں کی بہا سجائے ہونٹوں پر [illegible] لئے محوِ خواب ہوتی ہیں ــــــ تو دو آنکھوں سے خاموش آنسو بہنے لگتے ہیں۔ اور چاندنی میں نہا کر ایک ایک کر کے دامن میں جذب ہوتے رہتے ہیں۔

پہلی بار میں نے اُسے برآمدے میں دیکھا تھا جب میں جج صاحب کے منہ سے تفکرات کی نئی تفسیریں سُن کر باہر آ رہا تھا۔ اچانک اُس کا اور میرا سامنا ہوا اور ایک لمحے کے لئے مجھے محسوس ہوا جیسے میرے [illegible] کی سانس اندر اور باہر کی باہر ہی رک گئی ہے ــــ اور میں بیچ میں ہاتھ پاؤں مارتا ہوا لٹک گیا ہوں۔ میرے سامنے ایک حسین پیکر کھڑا [illegible] نفیس لباس میں لپٹا ہوا۔ ہاتھ پاؤں اتنے خوبصورت کہ دو لمحے دیکھو تو جان نکل جائے۔ گردن کا خم اتنا خوبصورت کہ زبان خشک ہو کر تالو سے لگ جائے۔ بال [illegible] گھنے اور ملائم کہ سارا بنگال گھنا نظر آئے ــــــ اور چہرہ اتنا بدصورت کہ [illegible] ہو جائے اور آنکھوں کے آگے [illegible]

[illegible] وہ ایک پردے کی اوٹ میں غائب ہو گئی اور اپنے پیچھے خوشبوؤں کا ایک سیلاب چھوڑ گئی۔ اپنے بدصورت چہرے کا دائمی نقش بھی ساتھ ہی ساتھ نہ چھوڑتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ اِس پہلی ملاقات کے بعد ہاتھ دُعا میں اُٹھ گئے کہ میرے معبود! پھر کبھی یہ جلوہ نہ دکھانا ــــ!

اُس رات میں نے تصور کی نگاہ سے کئی چہرے دیکھے جو اِسی گلی میں پروان چڑھ رہے تھے۔ خوبصورت چہرے، قبول صورت چہرے، سانولے چہرے، بالائی کی طرح سفید اور بے داغ چہرے، معصوم چہرے، مغموم چہرے، موٹے چہرے، پتلے چہرے ــــ لیکن کوئی چہرہ ایسا نہ دیکھا۔ اور دوسرے دن صبح ہی صبح میں نے اِس چہرے کو کھرچ کھرچ کر اپنے ذہن کے پردے سے مٹا دیا۔ نہ جانے مجھ سے پہلے کتنے

افسانہ

بے نام خط

پشکر ناتھ بی، اے

معرفت ہیڈ کیشئر اسٹیٹ بنک آف انڈیا جموں (توی)

۲۵ مارچ ۱۹۶۳ء   بلادر محترم! آداب و نیاز

"بیسویں صدی" کا خاص نمبر پھر زیر ترتیب ہے۔ اس کے لئے ایک افسانہ بعنوان "بے نام خط" ارسال خدمت کر رہا ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ کو اور "بیسویں صدی" کے قارئین کو خاص طور سے پسند آئے گا۔ نہ جانے ہمارے اندر ...... بہت اندر وہ کونسی چیز ہے جو ہمارے احساسات و جذبات میں توازن پیدا کر کے ہم سے بعض نیک کام کراتی ہے۔ ہمارے سیپیوں میں یہ موتی نہ ہوتے تو ہمیں انسان کون کہتا۔؟ میں اُن پاکستانی قارئین کا شکر گزار ہوں جو مجھے وقتاً فوقتاً اپنی آراء سے نوازتے رہتے ہیں۔ اُن کی خدمت میں گزارش ہے کہ بعض مجبوریوں کے پیش نظر فرداً فرداً اُن کے خطوط کے جواب نہیں دے سکتا۔ "بیسویں صدی" کا یہ خاص نمبر حسب روایت اُردو ادب میں ایک سنگ میل کی حیثیت لئے منظر عام پر آئے گا، اس کا مجھے یقین ہے ...... کیونکہ خوشتر گرامی ہمیشہ سے بہترین اور نفیس ترین چیزوں کے قائل ہیں ...... اور یہ نام اُردو صحافت و ادب میں معیار، حسن ترتیب دل کشی اور وقار کا ضامن ہے ....

خیر اندیش ...... پشکر ناتھ

یہ خط ایک کبوتر کی طرح پھڑ پھڑاتا ہوا، اُس سامنے والے خوبصورت چوبارے سے اُڑ کر میرے سامنے آ گرا ہے۔ لفافے پر کوئی نام نہیں ہے۔ پھر بھی میں جانتا ہوں کہ یہ خط میرے لئے ہے۔ اس میں وہ پیغام ہے جو صرف میں ہی پڑھ سکتا ہوں ...... دوسرا کوئی پڑھ بھی لے تو کیا کرے گا، یہی نا کہ اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کسی گندی موری میں پھینک دے گا اور منہ میں کچھ بڑبڑاتا ہوا اپنے راستے پر ہولے گا؟ میں بھی شاید ایسا ہی کروں گا۔ لیکن پہلے اُس سامنے والے چوبارے سے اُس سائے کو وہاں سے ہٹنے تو دیجئے۔ یوں دیکھتے دکھاتے کسی کا دل دکھانا اچھی بات نہیں۔

اس لئے فی الحال اس خط کو پڑا رہنے دیجئے۔ کیا معلوم یہ کوئی راز عیاں کر دے! اُس چوبارے میں بھی ایک راز پنہاں ہے، جو نہ جانے کس طلسم کشا کا انتظار کر رہا ہے۔ ویسے یہ چوبارہ اس گلی کا سب سے اُونچا اور سب سے خوبصورت چوبارہ ہے۔ ارد گرد سفید رنگ کا آر۔ سی۔ سی کا تین فٹ اُونچا جنگلہ ہے۔ اس جنگلے کی حدود کے اندر، کھلے آسمان کے نیچے چاندنی رات کا منظر کتنا حسین دکھائی دیتا ہو گا، اس کا صرف احساس ہی کیا جا سکتا ہے۔ رات کو کبھی اس چوبارے پر سے چوڑیوں کی مدھم سی کھنک ایسے سنائی دیتی ہے جیسے غلطی سے قلم ستار کے تاروں سے چھو گیا ہو اور مجھ جیسا کوئی آزاد منش اس چوبارے سے کئی فٹ نیچے اپنے چھت پر سویا ہوا، یہ موہوم سا ارتعاش سُن کر خواب میں بڑبڑانے لگتا ہے۔

لیکن میں یہ ارتعاش محسوس کر کے کبھی نہیں بڑبڑاتا، کیونکہ میں حقیقت جانتا ہوں۔ میں نے اُس لڑکی کو دیکھا ہے جس کی کلائیاں یہ نغمہ بکھیرتی ہیں ...... آئیے آپ کو تھوڑا سا پس منظر بھی بتا دوں۔

یہ چوبارہ اُس کوٹھی کی سب سے اُونچی چھت ہے، جس میں ایک ریٹائرڈ جج رہتا ہے۔ اور یہ لڑکی اِس جج کی اکلوتی بیٹی مونا ہے اِس کوٹھی میں اور بھی لوگ رہتے ہیں، یعنی مونا کی ماں ہے، ایک بیوہ موسی ہے جو یہیں رہتی ہے، تین نوکر ہیں دو ایلسیشن کتے ہیں، ایک موٹر ہے، ایک سکوٹر ہے جس پر بیٹھ کر مونا باہر کو جاتی ہے اور ہاں! ایک سادھو مہاراج بھی ہیں، جنہوں نے کوٹھی ہی میں ایک کمرے کو آشرم بنایا ہے اور پچھلے گیارہ برسوں سے یہیں براجمان ہیں۔

اِن تمام آدمیوں، جانوروں اور چیزوں کا اِس کہانی سے کوئی تعلق نہیں ہے، اِس لئے انہیں کوٹھی کے اندر ہی رہنے دیجئے۔

اِن جج صاحب سے پہلی بار گلی میں ملاقات ہوئی تھی۔ جبکہ انہوں نے

آنکھیں

دیوانہ وار دوڑ کے کوئی لپٹ نہ جائے
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا نہ کیجیے ——— مرزا یگانہ لکھنوی

دیکھو تو چشمِ یار کی جادو نگاہیاں
ہر اک کو ہے گماں کہ مخاطب ہمیں رہے ——— حسرت موہانی

وہ عالم ہے اب خشک آنکھوں میں اپنی
کہ طوفاں ہے برپا۔ روانی نہیں ہے ——— جگر مرادآبادی

میں اپنی جان تو قربان کر چکوں تجھ پر
یہ چشمِ مست ابھی نیم باز رہنے دے ——— جگر مرادآبادی

ہے چشمِ نیم باز عجب خواب ناز ہے
فتنہ تو سو رہا ہے در فتنہ باز ہے ——— وزیر

مرسلہ: ست نام سنگھ بھنڈاری ایم۔ اے (کلکتہ)

۔۔۔نے یہ جان سوز کام کیا ہوگا۔ خدایا! ہم سب کو معاف کر دینا۔

بہت سے دن بیت گئے۔ اس دوران میں، میں نے مونا کو دو ایک بار ضرور دیکھا ۔۔۔ اس انداز سے جیسے میرا دل اُس کے خالق کی طرف سے بالکل صاف ہے اور ۔۔۔بات سے سمجھوتہ کر چکا ہوں کہ خوبصورتی اور بدصورتی دو ایسی چیزیں ہیں جو ۔۔۔ والا دیتا ہے۔ اور ہمیں اِس معاملے میں بولنے کا کوئی حق نہیں ہے ——— ایک دن جبکہ ۔۔۔ہی اچھے موڈ میں گھر آ رہا تھا تو مجھ سے ان جانے میں ایک گناہ سرزد ہو گیا۔ ۔۔۔ات تھی۔ شاید دھوپ پیاری تھی اور دن کسی بچے کی آنکھ کی طرح شفاف تھا۔ ۔۔۔حسین صورت، بہت پہلے دیکھی ہوئی، اچانک آنکھوں میں کوند گئی تھی یا شاید ۔۔۔ کی کوئی البیلی ادا یکایک یاد آ کر دل کو گدگدا گئی تھی ——— میں کھلنڈرے ۔۔۔ہونٹوں پر مسکراہٹ کی خوشبو لئے گھر آ رہا تھا۔ گلی کے موڑ پر پہنچا تو سامنے ۔۔۔لیاں نکل رہی تھیں۔

۔۔۔ہا ہے مونا۔ یہ لڑکی کتنا سمارٹ ہے!"

۔۔۔ان میں سے ایک نے شرارت کی اور میں مسکرا کر ان تینوں کو دیر تک جاتے ۔۔۔دیکھتا رہا۔ جب میں واپس مڑا تو سامنے مونا کھڑی تھی۔ لٹی لٹی سی، شرمندہ سی

پشیمان سی۔ جیسے اپنے چہرے کو بدصورت بنانے کی ذمہ دار وہ خود ہو۔

مجھے اُس پر بے حد ترس آیا۔ بے حد ترس آیا۔

"جانے یہ دلنواز صورت کسے قتل کرنے جا رہی ہے؟"

میرے منہ سے اچانک نکل گیا۔ یا شاید اچانک نہ نکلا ہو بلکہ میں نے قصداً ایسا کہا ہو۔ بہرحال میرا یہ جملہ سن کر وہ ٹھٹھک گئی، جیسے بجلی کا تار چھو لیا ہو۔ پھر ایک ہی لمحے میں اُس کے چہرے پر یکے بعد دیگرے کئی رنگ آ کر غلط ملط ہو گئے۔ کچھ شرم تھی، کچھ غصہ تھا، کچھ غرور تھا، کچھ جھجک تھی ——— دوسرے لمحے اُس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ اُبھر آئی اور وہ چلی گئی۔

میں جب گھر میں داخل ہوا تو اس واقعہ کو بھول چکا تھا۔ لیکن وہ آج تک اِس واقعہ کو نہیں بھلا سکی۔ آہستہ آہستہ میں نے دیکھا کہ انڈے میں پہلے شگاف ہوا، پھر ایک چھوٹا سا چھید ہوا، پھر ایک چونچ باہر آئی۔ پھر انڈا دو حصوں میں بٹ گیا اور ایک گل گوتھنا سا چوزہ باہر آیا۔

پہلے اُس خوبصورت چوبارے سے چوڑیوں کی کھنک اُبھری، پھر ایک سایہ لہرانے لگا، پھر ایک آنچل پھیل گیا، پھر ایک چہرہ نمودار ہوا۔

کاش! یہ چہرہ اتنا بدصورت نہ ہوتا تو اِس آنکھ مچولی میں بڑا اچھا مزہ آتا۔ اب ہر شام اُس خوبصورت چوبارے پر ایک چہرہ آنکھیں بچھائے منتظر ہوتا۔ ہلکے ہلکے ترنم میں کسی گیت کی صدا بلند ہوتی۔ دبے دبے انداز میں کوئی سرگوشی اُبھرتی۔

پہلے میں نے اِس طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ پھر میں نے دلچسپی کا اظہار کیا۔ پھر کچھ چڑ سی ہونے لگی اور آخر کار مجھے بے حد غصہ آیا اور میں نے چھت پر جانا ہی چھوڑ دیا۔ جج صاحب کی کوٹھی پر جانا بھی چھوڑ دیا۔ اُس طرف والی اپنے کمرے کی کھڑکی بھی بند کر دی۔ گناہ میں نے کیا تھا اور اب اُس کی سزا بھی مجھے ہی ملنی چاہئیے۔ میں نے اپنے آپ کو سزا دی اور کمرے میں بند ہو گیا۔ کئی دن بلکہ ہفتے گزر گئے۔ لیکن میرے دل کا چین واپس نہ آیا۔ کبھی بیٹھے بیٹھے ایسا محسوس ہوتا جیسے کوئی ان دیکھی صورت ٹکٹکی لگائے مجھے دیکھ رہی ہے۔ کچھ پڑھنے بیٹھ جاتا تو محسوس ہوتا کوئی میرے بالکل قریب بیٹھ کر آہیں بھرنے لگا ہے۔ یکایک ہوا سے کھڑکی کھل جاتی تو کہیں دور سے دو گھورتی ہوئی آنکھیں نظر آتیں۔ آسمان پر بادل چھا جاتے تو ہلکے ہلکے ترنم میں کسی گیت کی صدا بلند ہوتی۔

مالک! یہ کیسا عذاب بخشا ہے مجھے۔ کیا اُس ایک لمحے کو کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا؟

اور ایک دن مجھے واقعی محسوس ہوا کہ یہ لڑکی میرے حواس پر چھا گئی ہے۔ اُس دن میں ہفتوں کے بعد جج صاحب کے پاس چلا گیا۔ اور ان سے مشکلات اور اُنہیں کیسے دور کیا جائے، کے موضوع پر ایک دن بہت ... شام کو جب

تکلفات کا ایک بہت ہی بوجھ اپنے دل پر لئے میں گھر آیا تو مجھے فوراً خیال آیا کہ تکلفات کے اس بوجھ کو ہلکا کرنے کا ایک ہی راستہ ہے۔ یعنی یہ مکان چھوڑ دیا جائے۔ یہ گلی چھوڑ دی جائے بلکہ شہر ہی تو چھوڑ دیا جائے۔

اگلے کئی دن اسی پریشانی میں گزر گئے۔ لیکن مکان نہ ملا۔ اور اسی دوران میں چھٹی کا دن آیا۔ صبح ہی صبح آنکھ کھلی تو دھوپ بہت پیاری معلوم ہو رہی تھی۔ سوچا چھت پر جاکر تھوڑی دیر دھوپ میں بیٹھا جائے۔ اور اسی شدید خواہش کے زیر اثر میں بھول ہی گیا کہ میں نے مدت سے چھت پر جانا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اور یہ خیال مجھے اس وقت آیا جب میں اخبار لے کر چھت پر بچھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ ڈرتے جھجکتے میں نے ایک نظر اس سامنے والے خوبصورت چوبارے پر ڈالی اور میرا دل دھک سے رہ گیا۔ سفید رنگ کے جنگلے کے اندر ایک سایہ رینگ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس سائے نے ایک خوبصورت ہاتھ بڑھایا۔ دودھیا رنگ کی کلائی میں پڑی ہوئی چوڑیوں میں چھنک پیدا ہوئی اور پھر یہ خط ایک کبوتر کی طرح پھڑپھڑاتا ہوا آیا اور میرے سامنے گر کر جامد ہو گیا——

میرا خیال ہے کہ میں اب اس خط کو اٹھالوں گا کیونکہ وہ سایہ اس چوبارے سے اٹھ گیا ہے۔ اور مجھے کوٹھی کے اندر کہیں سے اس کی مترنم آواز آرہی ہے۔

کوئی تخاطب نہیں ہے۔ کوئی القاب نہیں۔ کوئی تاریخ نہیں—— لکھا ہے——

مجھے یہ خط نہیں لکھنا چاہئے تھا کیونکہ وہ مسرت مجھے نہیں سونپی گئی ہے جو کسی اجنبی کو پیار پتر لکھنے سے حاصل ہوتی ہے
میں ایک بدصورت اور بدنصیب لڑکی ہوں—— لیکن اس دن گلی میں جو آپ نے مذاق میں ایک جملہ کہا اُسے سُن کر میں ایک پل کے لئے اپنا المیہ بھول گئی۔ ہائے! وہ خود فریبی کا لمحہ!
کیا آپ صرف ایکبار پھر کبھی وہ جملہ نہیں کہہ سکیں گے۔ اس کے بدلے میں آپ کو اپنے دل میں چھپایا ہوا خون کا ایک قطرہ دینے کو تیار ہوں——

اُف! ہم سب کتنے ڈھونگی ہیں۔ میرے ہاتھوں نے خط کو پھاڑنے کی کوشش کی لیکن خط اب بھی میرے ہاتھوں میں اسی طرح کانپ رہا ہے۔ سانس لے رہا ہے۔ دن ڈھلا۔ شام ہو گئی۔ میں ہزار کوشش کے باوجود اس کرسی سے نہیں اُٹھ سکتا میں اس خط کو کیسے پھاڑوں گا؟ اس میں کوئی نازیبا بات نہیں ہے۔ اس میں کوئی پیار کی آگ نہیں ہے۔ اس میں کوئی ملنے کا وعدہ نہیں ہے۔ اس میں کوئی بات تک کرنے کی خواہش نہیں ہے۔ اس میں کوئی پیار کی حلاوت نہیں ہے۔

افسانۂ دل

دل کی بساط کیا تھی نگاہِ جمال میں
اِک آئینہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں —— سیماب اکبرآبادی

دل کی مفارقت کو کہاں تک نہ رو دیئے
اللہ ایک عمر کا ساتھی بچھڑ گیا —— نریش کمار شاد

قتیلؔ اب دل کی دھڑکن بن گئی ہے چاپ قدموں کی
کوئی مری طرف آتا ہوا محسوس ہوتا ہے —— قتیل شفائی

دل کو برباد کرکے بیٹھا ہوں!
کچھ خوشی بھی ہے کچھ ملال بھی ہے —— جگر مرادآبادی

شادؔ یہ دل کا فسانہ بھی فسانہ ہے عجب
جو بیاں ہو کے بھی محتاجِ بیاں رہتا ہے —— نریش کمار شاد

اِس میں تو صرف ایک دُعا ہے۔ یارب! زندگی تو دی ہے اب تھوڑا سا عذاب بھی تو دے——

ابھی ابھی راہول پُرانے کاغذوں سے یہ خط نکال لایا ہے۔ بڑا شریر ہو گیا ہے یہ بچہ۔ ابھی سال ہی بھر کا ہے اور ایسی حرکتیں کرنے لگا ہے۔ جب یہ مجھے ڈیڈی اور مونا کو ممی کہنا سیکھے گا، تب کیا ہوگا۔

سرف سے گھر میں کپڑے دھوئیے اور دیکھئے دُھلائی کا کمال ... سفید ترین، صاف ترین اور آسان ترین! اِس لئے کہ سرف میں دُھلائی کی زائد قوت ہے۔ اپنی ساری دُھلائی سرف سے کیجئے ... بچوں کے لباس، قمیضیں، ساڑھیاں، سبھی کپڑے سرف سے دھوئیے۔

سرف سے کپڑے سفید ترین دُھلتے ہیں!

ہندوستان لیور کا تیار کردہ

SU 44-140 UD

افسانہ

سوکھا طوفان

کوثر چاندپوری

بھوپال

۱۰ اپریل ۱۹۶۳ء

بھائی جان!

.... دلی میں رہتے رہتے آپ بھی غالب بن گئے۔ یعنی کہ آم پسند۔ بھوپال آموں کے لئے نہیں جھیلوں، پیتا
پھلوں اور قدرتی مناظر کے لئے مشہور ہے۔ آپ یہاں آئیں تو آموں کی تمنا لے کر نہیں، ان تینوں چیزوں کے حسن کا اشتیاق
لے کر آئیں۔ آم کھانے ہوں تو چاند پور چلے جائیے وہاں بڑے بھائی حکیم علی اکبر صاحب اتنے آم کھلائیں گے کہ آپ مجھے
بھول جائیں گے۔ میرا حصہ بھی آپ کی نذر ہو جائے گا۔ آپ کا کہانی نمبر سرنگا آ کر قلم تک پہنچ گیا لیکن افسانہ "سوکھا طوفان"
بھیج رہا ہوں۔ سالنامے میں آنے والی کہانی کی تعداد بہت ہے خطوط میرے پاس آئے کہ اب تک کبھی نہ آئے تھے۔ ان میں
لڑکیوں کے خطوط زیادہ تھے۔ افسانہ انہیں بہت پسند آیا۔ اسی سماج سے اس کا تعلق بھی تھا۔ مس روشنی ملک (اندور) کو
شکایت ہے کہ میرا قلم کہیں کہیں بیباک اور گستاخ ہو گیا ہے۔ بیباکی ادب کا وصف ہے گستاخی کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔
آپ بتائیے۔ میرے افسانوں کا مجموعہ "شعلۂ سنگ" آ گیا ہے۔ اسی مہینے میں آپ تک پہنچ جائے گا ....

آپ کا، آپ سے دور ——— کوثر چاندپوری

مجیب اور رخسانہ چائے کی میز پر آمنے سامنے بالکل حیران اور خاموش بیٹھے ایک
دوسرے کو تک رہے تھے، جیسے خود اپنی تقدیر پڑھ رہے ہوں۔ ویسے دونوں کا
خیال تھا کہ قسمت لکھی نہیں جاتی ہے۔ پیالیوں سے بھاپ اٹھنا بند ہو گئی تھی۔ چائے
یقیناً ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ پیالیوں کے آس پاس چند تصویریں بکھری پڑی تھیں۔ مجیب کا منھ
اترا ہوا تھا اور مسکراہٹ نہیں تھی اور رخساروں کی وہ سرخی اور تازگی بھی غائب تھی جس کو
بناوٹ مجیب روز "مشہور" ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں کہر سا چھایا جا رہا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا
گویا بے تحریک گئی ہے پیالی اتنی کم برس سکے کہ خدا بھی طرح جانا نہیں۔ رخسانہ حد سے زیادہ
سنجیدہ تھی۔ اس کی سنجیدگی اور جھلاہٹ سردی کی اس چڑیا کی مانند لگ رہی تھی جو بدن کی بجلی
گرمی میں کونل کی آواز سنتے ہی پر پھڑپھڑانے لگتی ہے۔ آنکھوں کا خمار ہلکا ہو گیا تھا حالانکہ
وہ حیران خاموش تھیں وہ جھکی جھکی سی تھیں۔ اس نے سرخ لباس پہن رکھا تھا اور سر سے
پاؤں تک دلہن کا لباس اور درخت معلوم ہو رہی تھی جس کے پتے جھڑ گئے ہوں اور پھول
انگاروں کی طرح دہک رہے ہوں۔

"چائے ٹھنڈی ہو گئی۔" رخسانہ دھیمی آواز میں بولی۔
"یہ تصویریں کیوں بکھیر دیں تم نے میز پر؟"
"معاف کرو مجیب! میں انہیں سمیٹے لیتی ہوں۔" رخسانہ کے لہجہ میں ہلکی سی
جھنجلاہٹ اور بیزاری تھی۔ مجیب نہ جانے کیوں رو پڑا۔ بڑے بڑے آنسو جیسے ہی بہ نکلے
رخسانہ چونک گئی جیسے کیتلی میں بھری گرم چائے اس کے بدن پر گر گئی ہو۔ اس نے جلدی جلدی
تصویریں سمیٹ کر لفافہ میں ڈال دیں اور گھٹی ہوئی آواز میں بولی۔
"مجیب جذباتی نہ بنو۔ اس طرح تلخ حقیقتوں پر فتح نہیں پائی جا سکتی اور
اور جذبات کس کے پاس نہیں ہوتے لیکن سب اس طرح روتے نہیں پھرا کرتے۔"
"رو کہاں رہا ہوں، میں رویا نہیں کرتا، رلایا کرتا ہوں۔ میری آنکھوں سے
چنگاریاں جھڑ سکتی ہیں پانی نہیں برس سکتا۔"
"ہو سکتا ہے یہ پانی نہ ہو، پگھلے ہوئے شعلے ہوں۔"
"یہ ہو سکتا ہے!" مجیب نے رومال سے آنکھیں پونچھ لیں۔

"میں کام نہیں چلے گا منسود جلدی لاؤ۔
پانی ٹھنڈا نہیں گرم ہونا چاہیئے۔"

مجیب منسود ھو کر آیا اور رخسانہ دوسری چائے بنا چکی تھی اُس نے آتے ہی پیالی اُٹھائی اور چسکیاں لینے لگا دوسری رخسانہ نے اپنی لمبی اور پتلی انگلیوں میں تھام کر پتلے سرخ ہونٹوں سے لگالی اُسی وقت بالوں کی ایک لٹ پنکھے کی ہوا سے آوارہ ہوگئی۔ کبھی چہرے پر کالی گھٹا کے مانند جھومنے لگتی، کبھی شانے پر جا پڑتی یا پیشانی کی طرف آکر آنکھوں کی نقاب بن جاتی تب وہ جھنجلا کر اُسے ہٹا دیتی۔ دونوں چُپ تھے نگاہوں کے تار ریشمی دھاگوں کی طرح اُلجھ رہے تھے، سُرخ، نیلے اور سبز ڈورے آپس میں گتھ کر کچھ پھول بنانے جو فوراً ہی بگڑ جاتے۔

رخسانہ اور مجیب ایک دوسرے کے لیئے نئے نہ تھے وہ پانچ سال سے محبت کی حسین وادیوں میں بھٹک رہے تھے اور اتنے قریب آ چکے تھے کہ ہر لمحہ دونوں کے ایک ہو جانے کا خیال رہتا تھا لیکن وہ اب تک الگ ہی الگ رہے، فاصلے جس قدر کم ہوتے منزل اُتنی ہی دور ہوگئی۔ بات یہ نہیں تھی کہ جذباتی یکسانیت مفقود ہو گئی اور اختلاف ہو۔ وہ دونوں شروع ہی سے بالکل ہم آہنگ اور ہموار رہے تھے، پسندیدگی کا جذبہ گھٹا نہیں تھا بڑھتا ہی گیا تھا، مجیب کو ایک اچھی نوکری مل گئی تھی۔ اُس نے ایک خوشنما بنگلہ بھی حاصل کر لیا تھا جو بے حد پُر فضا جگہ واقع تھا ——ایک اونچے ٹیلے پر سمندر کے بالکل سامنے، دُور پانی پر جہاز اس طرح تیرتے دکھائی دیتے جیسے احساس میں حسین اُمنگیں مچل رہی ہوں اُس نے بڑی تگ و دو کے بعد یہ بنگلہ اپنے نام الاٹ کرایا تھا اور یہاں آکر اُسے تنہائی میں بڑی گھٹن اور اُلجھن محسوس ہوتی تھی رات کو مسہری پر لیٹے لیٹے ایسا معلوم ہوتا جیسے ایک دم سارے قمقمے بجھ گئے ہوں۔ بنگلہ کا کونہ کونہ تاریک ہو گیا ہو اور سمندر میں تیرتے ہوئے جہاز بر ساعت کے ستاروں کی طرح چمک رہے ہوں۔ وہ گھبرا کر آنکھیں بند کر لیتا اُس وقت ایسا معلوم ہوتا جیسے رخسانہ دبے پاؤں آ رہی ہو، اس کی شلوار کی سرسراہٹ صاف سُنائی دیتی۔ بجھے ہوئے بلب ایک کے بعد دوسرے روشن ہونے لگتے۔ بنگلہ جگمگا اُٹھتا۔ مجیب آنکھیں کھول دیتا پھر جلد ہی احساس ہوتا کہ جو کچھ دیکھ رہا تھا اُس کی حقیقت خواب سے زیادہ نہ تھی خواب بھی ایسا جس کی تعبیر نہ ہو، تاریکی پھیلتی رہتی ویرانی اور سوگواری چپے چپے پر سانس لیتی رہتی گویا اژدھے پھنکار رہے ہوں وہ دیوانہ وار باہر نکل جاتا۔ اُس کا جی چاہتا رخسانہ کو پکار کر کہے "اب آتی کیوں نہیں ہو رخسانہ! تمہارے نہ ہونے سے نہ صرف اس گھر کا ماحول ویران اور سُنسان ہے بلکہ میری زندگی اور میرا مستقبل اُداس ہے، اس میں کوئی بہار نہیں، اُمید کی ساری کلیاں [illegible] —— قرار دیا تھی کہ رخسانہ اسی کی ہوگی ایک روز وہ بہار یاسمین کی طرح آ جائے گی اور ہمیشہ دونوں مل کر مُسکراتے رہیں گے، لیکن آہستہ آہستہ چمن پر خزاں چھا گئی، کلیاں سوکھ کر جھڑ گئیں، دل گرتے گئے ہر رخسانہ بالکل سرد ہوگئی اُس میں کوئی گرمی اور کوئی اُمنگ باقی نہ رہی۔ اُس کے ہونٹ ہنسی سے محروم ہو گئے۔ دل میں جذبات کی آندھیاں چلنی بند ہو گئیں، مجیب ہفتہ میں دو چار بار ضرور اُس کے یہاں جاتا تھا۔ وہ گھنٹوں ساتھ رہتے لیکن وہ رومانی باتیں نہ ہوتیں، وہ فقرے قہقہے نہ گونجتے لبوں پر مسکراہٹوں کی بے چین تتلیاں نہ اُڑتیں، جیسے اُن میں کوئی عہد و پیمان ہی نہ ہوا ہو۔ ایک نے دوسرے سے دیوانہ وار محبت ہی نہ کی ہو، راتوں کو جاگ کر تصورات کی جنتیں نہ بنائی ہوں، ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ساحل سمندر پر کبھی چہل قدمی ہی نہ کی ہو۔ ایک زمانہ تھا جب رخسانہ مجیب کے منہ سے کوئی دلچسپ شاعرانہ بات سُنتی تو بے اختیار ہنس دیتی۔ اُس کی آنکھوں سے شراب سی چھلک پڑتی، رخسار تمتما اُٹھتے لیکن آج جب رخسانہ ہری ساڑی پہنے بہار کے سبک رو جھونکے کی مانند کمرے سے باہر آئی، اور اس طرح برآمدے کو عبور کیا جیسے شراب کی موج ساغر کے ایک کنارے سے مچل کر دوسرے کنارے کی جانب بڑھ گئی ہو مجیب اس منظر سے شدید طور پر متاثر ہوا اُس نے بے اختیار کہا۔

(NOW HEAVEN MAKES ON EARTH)

رخسانہ کے لبوں پر صرف ایک مری سی مُسکراہٹ ہی آ کر رہ گئی اُس کے چہرے پر گلاب کی پتیاں نہ لرزیں۔ نگاہوں سے شعلے نہ لپکے۔ مجیب روز یہ سوچ کر آتا کہ آج رخسانہ سے ضرور کہیگا۔

"رخسانہ اب کس بات کا انتظار ہے۔ تمہاری تعلیم ختم ہوگئی، تم ایک مشہور ایڈوکیٹ کی پرائیویٹ سکریٹری ہو گئیں، مجھے بھی ملازمت مل گئی، مکان بھی مل گیا، بہت ہی شاندار کوٹھی ہے، دیکھو گی تو چھوڑنے کا نام نہ لوگی۔ یہی مکان ہمارے سفر کی منزل ہے ہمارا چھوٹا سا تھکا ہوا قافلہ یہیں ٹھہر جائیگا پھر کبھی صدائے جرس بلند نہ ہوگی زندگی حرکت سہی لیکن سکون کے بغیر اُس کا کوئی تصور نہیں، سکون نہ ہو تو حرکت کیا ہو۔" لیکن جس وقت وہ رخسانہ کے سامنے جاتا اُس کی طاقت گفتار جواب دے جاتی۔ اُسے جرات ہی نہ ہوتی کہ رخسانہ کو اس نئے مکان میں آنے کی دعوت دے۔ ہو سکتا ہے وہ انکار کر دے اور اس طرح وہ سارے قصور والیوان منہدم ہو جائیں جو اُمید عمل اور آرزو کی آمیزش سے برسوں میں بن کر اس قابل ہوئے تھے کہ اُن میں مسرتوں کی شمع روشن ہو مجیب کے نزدیک زندگی نام تھا صرف رخسانہ کے اُس اقرار اور اعتراف کا جس سے محبت کی پیاس بجھا کرتی تھی اور دل میں گرمی پیدا ہو جاتی تھی وہ انکار اور انحراف کا اُس نے کبھی تصور تک نہ کیا تھا، رخسانہ بظاہر کسی انقلاب سے [illegible]
ایڈوکیٹ نے اُسے ملازم رکھا تھا وہ بہت [illegible]

لیکن کتنی مسرت اور زندگی ہوتی ہے یہ بات اُسے اب یاد بھی نہ تھی، کسی اور جہاں کے ساتھ وہ کبھی کی بیٹھ گئی تھی۔ ایک بار اُس نے اتنا مزید کہا تھا کہ اسحٰق بھائی اس مہینے یہاں سے فارم چلے جائیں گے، یہ بات اتنی پُرانی ہو چکی تھی کہ بہت سوچنے پر یاد آئی تھی۔ دو سو روپے کا ڈرافٹ سروس پانے کی تاریخ ہی سے اسحٰق کو بھیج رہی تھی، اُس میں انقلاب کا کوئی شائبہ تک نہ تھا۔ کیونکہ مجیب جانتا تھا کہ اسحٰق کے پاس آمدنی کا کوئی ذریعہ باقی نہیں رہا ہے وہ دیوالیہ ہو کر سب کاروبار ختم کر چکا ہے۔ رخسانہ نے مدت سے اسحٰق کا ذکر تک نہ کیا تھا، مہینہ بھر پہلے وہ ہاسٹل چھوڑ کر کرائے کے فلیٹ میں آ گئی تھی اِس سلسلے میں اُس نے صرف اتنا ہی کہا تھا

"ہاسٹل چھوڑنا ہی تھا۔

کئی نوٹس مل چکے تھے۔

وہ صرف پڑھنے والوں کے لئے ہے۔

میں تعلیم پوری کر کے ملازمت بھی کر چکی تھی۔"

آخر میں دبی زبان سے یہ بھی کہا تھا۔

"بھائی جان آنے والے ہیں، بچے بھی ساتھ ہوں گے۔"

یہ سب باتیں اُس نے نہایت پھیکے، خشک اور فلسفیانہ انداز میں کی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا زبان اور دماغ کے درمیان سارے رابطے منقطع ہو چکے ہیں۔ وہ سوچے بغیر بولے جا رہی ہے۔ اُس وقت مجیب یہ پوچھنا ہی بھول گیا تھا۔ اسحاق بھی تو ہوں گے بھائی جان کے ساتھ؟

پھر اُس نے سوچا تھا یہ تو بڑا مہمل سوال ہے۔ اُن کے ساتھ نہ ہونے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے، کہیں بچوں سے باپ بھی جدا ہوا کرتی ہے۔

مجیب بہت اُلجھن میں پڑ گیا تھا وہ رخسانہ کی طرف مشکوک نہ ہوتے ہوئے بھی اُس کے اندر تبدیلیاں محسوس کر رہا تھا بعض اوقات وہ پتھر کا ایسا مجسمہ نظر آتی جس میں حُسن ہو احساس اور نطق نہ ہو وہ آرٹسٹ کی چابکدستی کا ایسا حسین و جمیل مجسمہ بن جاتی جسے کسی کی پرستاری کی خبر ہی نہ ہو، مجیب جس وقت بھی رخسانہ کے یہاں جاتا وہ ڈرائنگ روم میں بالکل اُسی انداز سے ملتی جیسے قطعی مطمئن ہو، زندگی میں کوئی طوفان ہی نہ آیا ہو احساس میں کوئی ہلچل ہی نہ ہوئی ہو۔ اُس شام اُسے ایک نئی ترکیب سوجھی، اُس نے بالکل نئے انداز سے بجھتے ہوئے چراغ کی لو اُبھارنی چاہی وہ چند لڑکیوں کی تصویریں لفافہ میں بند کر کے لے گیا اور رخسانہ کو لفافہ دیتے ہوئے بولا۔

"ذرا انھیں دیکھ لینا رخسانہ کسی وقت!"

[illegible] ـــــــ خطوط ۹۹

"چند تصویریں ہیں دیکھ لینا کسی وقت۔"

"ابھی کیوں نہیں، بُتوں کی تصویریں اور حسینوں کے خطوط دیکھنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے!" مجیب ہنس پڑا، بہت دن کے بعد رخسانہ نے ایک دلچسپ بات کہی تھی اور رخسانہ ایک ایک تصویر کو دیکھ کر بڑی برجستگی سے اظہارِ خیال کرنے لگی۔

"یہ بہت بھدی ہے گال بیر جیسے تو ہیں!"

"اور یہ بیماری ان سومنیا (INSOMANIA) کا شکار معلوم ہوتی ہے نہ جانے کس کے لئے راتوں کو جاگتی ہے اِس کی آنکھوں میں کوئی ایسا ہولناک ہو سکتا ہے پیغام ہی قبول نہ کرے۔"

"یہ ٹھیک رہے گی قد ذرا سا چھوٹا ہوتا تو اچھا تھا۔ ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے ناقہ پر سوار کسی مجنوں کے پیچھے بھاگ رہی ہو ـــــــ مجنوں تمہارے سوا کون ہو سکتا ہے، بہرحال تمہارے لئے اسپین کی یہ کھجور بری نہیں، تم نے عربی پڑھی ہے عربی اور کھجور میں وہاں نتی اور ہتھوڑے کی سی نسبت ہے۔"

رخسانہ تصویریں برابر برابر رکھ کر ایک بار اور اُنھیں دیکھنے لگی۔

"نگاہ اِسی پر ٹھہرتی ہے، میں تو اِسی پر ہیڈ ملک لگائے دیتی ہوں۔"

مجیب اُس کی صورت تکتا رہا۔ ذرا دیر تو اُس نے پلک تک نہ جھپکائی اور رخسانہ نگاہیں نیچی کرنے پر مجبور ہو گئی وہ مجیب کی اِس دل شکن اور جانسوز نگاہ کو برداشت نہ کر سکی جو اُس کے چہرے پر رات کے اندھیرے کی مانند پھیلی ہوئی تھی اور جس میں لپٹا ہوا اُس کا چہرہ اُس لاوارث مزار کی طرح دکھائی دے رہا تھا جس کا سنہ وفات بھی کسی نے کھرچ ڈالا ہو۔ اُسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اُس کے مستقبل کا ایوان ایک ہی پل میں دھڑام سے زمین پر آ رہا ہو اور وہ خود بھی اُس کے ملبہ میں دب گئی ہو۔ مجیب دیر تک کچھ نہ بولا۔ اُس کی زبان جاتے نہ بلی ذرا سی دیر بعد جانے آ گئی اور پھر اُن تصویروں کی بات چل نکلی۔ چار پانچ دن بعد مجیب پھر رخسانہ کے یہاں گیا اور ہنستے ہوئے بولا۔

"رخسانہ وہی لڑکی سب کو پسند آئی جس پر تم نے نشان لگایا تھا سچ کہتا ہوں تم حسین ہی نہیں ہو حُسن شناس بھی ہو۔"

"مبارک ہو!"

"شکریہ!"

"کب ہو رہی ہے شادی؟"

"پرسوں۔ آج اقبال آ جائیں گے۔ وہ پولیس میں انسپکٹر ہیں۔ صرف چھ دن کی چھٹی مل سکی ہے۔ آپا جان بہت دنوں سے کہہ رہی تھیں کہ پہلے......

"لیکن میں اپنے چھوٹے بھائی اقبال کا بیاہ کر رہا ہوں اس لڑکی سے۔"

رخسانہ کے احساس کو زبردست جھٹکا لگا، وہ سر سے پاؤں تک لرز گئی۔

"میں نے آپ کے لئے پسند کیا تھا اُسے۔"

"میرے لئے؟" ——— وہ اتنا کہہ کر چپ ہو گیا۔ اُس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ اُسے پہلی بار رخسانہ کی عہد شکنی کا یقین آیا۔ اُس وقت رخسانہ اُسے مجسم فریب نظر آ رہی تھی وہ اُس سراب کی طرح تھی جو کبھی ہاتھ نہیں آیا کرتا ہمیشہ دور دور ہی رہتا ہے وہ غصہ میں بھر گیا اور تلملا کر اُٹھا۔

"تم جا نہیں سکو گے!"

"کیوں؟"

"کچھ کہنا ہے مجھے۔"

"میں کوئی بات نہیں سنوں گا، رخسانہ تم غلاف میں لپٹی وہ تلوار ہو جس کی دھار فولاد کو بھی دو ٹکڑے کر سکتی ہے۔"

"ضرور ہوں لیکن اب غلاف سے نکل آنا چاہتی ہوں، ذرا بیٹھ جاؤ۔"

مجیب پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کہئے!" اس نے ترچھی نگاہوں سے رخسانہ کو دیکھتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا۔

"بھابی جان آگئی ہیں؟"

"کب؟"

"تین مہینے ہونے کو آئے۔"

"اور اسحٰق؟"

"اُنھیں سینی ٹوریم کی ٹھنڈی فضا بھا گئی وہ وہیں سو گئے۔"

رخسانہ رونا چاہتی تھی روئی بھی نہیں، آنکھیں بالکل نہ بھیگیں، لیکن ہچکی بند گئی اور گرم ریت کے اُس سوکھے طوفان میں اُس کی آوازیں دب گئیں جیسے اونٹوں کے کارواں تپتے ہوئے ریگستان میں دفن ہو جاتے ہیں اور حُدی کی سریلی تانیں خاموش ہو جاتی ہیں۔

"اور تم نے ذکر تک نہیں کیا، مجھے غیر سمجھا۔"

رخسانہ چپ بیٹھی رہی، اُس کی آنکھیں پتھرانے لگیں جیسے حیات کی رعنائیاں رخصت ہو رہی ہوں۔

"رخسانہ! ——— رخسانہ!!" مجیب نے اُس کا شانہ جھنجھوڑتے ہوئے کہا، خدا کے لئے رونے لگو، تمہارا رونا اِس وقت بہت ضروری ہے۔"

"کیوں ہنسوں ——— رونے کی کیا بات ہے مجھے بڑی خوشی ہے کہ ایک اہم ذمہ داری میرے سر آپڑی ہے۔ میں ایک اُمید پرست عورت کی طرح [illegible] گزرتے [illegible] کروں گی۔"

مجیب ڈر گیا اُسے خیال ہوا کہ رخسانہ کے دماغ پر بہت گہرا اثر ہوا ہے شاید وہ پاگل ہو جائیگی۔ مجیب دیر تک بیٹھا رہا رخسانہ نے پھر کوئی بات نہ کی، اُس کی آنکھیں چمکتی رہیں اور ہونٹ لرزتے رہے۔ اُسی وقت اندر سے بچے کے رونے کی آواز آئی۔ رخسانہ فوراً اندر چلی گئی اور پھر باہر نہ آئی مجیب مایوس ہو کر چلا گیا۔ شام کو وہ پھر رخسانہ کے یہاں گیا۔ وہ ڈرائنگ روم میں تنہا بیٹھی تھی مجیب کو دیکھتے ہی کھڑی ہو گئی۔

"آؤ مجیب، تم بھاگ کیوں گئے تھے، مجھے خیال تھا کہ جاؤ گے نہیں بس بیٹھے رہو گے۔ ——— میں جانتی تھی کہ تم اس وقت ضرور آؤ گے۔"

مجیب اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ بہت خوبصورت بش شرٹ اور جینز پہنے ہوئے تھی سر پر فلیٹ کیپ لگا رکھا تھا، مجیب سمجھ گیا کہ اُس کا دماغ چل گیا ہے وہ سنک گئی ہے۔ ——— افسوس رخسانہ پاگل ہو گئی۔

"بہت حیران ہو مجیب، تم نہیں جانتے یہ اسحٰق بھائی کا بہت پسندیدہ ڈریس ہے، میں اِس وقت اسحٰق بن گئی ہوں، جو مرا نہیں زندہ ہے اور دنیا میں ایک اسحٰق ہمیشہ موجود رہیگا ——— مجیب عورت صرف ماں نہیں وہ باپ بھی بن سکتی ہے۔"

ابھی وہ اور کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اندر سے ایک خوبصورت، معصوم اور چلبلا بچہ بھاگتا ہوا آیا اُس کے سر پر ریشمی سنہری بال فرشتوں کے پروں کی مانند لہرا رہے تھے اور پھولے ہوئے گال سیب کی طرح سُرخ تھے۔

"ڈیڈی!" وہ چیخی۔

"بیٹا! ——— پپّو!" رخسانہ نے اُسے بازوؤں میں لے لیا اور مجیب کو دیکھتے ہوئے بولی ——— "مجیب یہ ہمارا بیٹا ہے ہم اِس کے ڈیڈی ہیں، اِس کی ممی ہماری بیوی ہے کیوں پپّو؟"

"ہاں، ہاں تم ہمارے ڈیڈی ہو، تمہارے مونچھیں بھی نہیں ہیں۔"

"تمہارا نام؟" ——— مجیب نے اُس کے گال پر انگلی مارتے ہوئے پوچھا۔

"بی-او-وائی - بوائے، معنی ننھا سا (لڑکا)" اُس نے شوخی سے ہنستے ہوئے کہا۔

"صرف لڑکا نہیں پپّو! تم ایک زمانہ، ایک مستقبل اور ایک نسل ہو! مجیب بتاؤ اِسے بہلانے کے لئے سوٹ پہن کر باپ بنا کیا یہ پاگل پن ہے؟ میں ڈیڈی نہ بنوں تو اِس کا دل کانچ کی مانند ٹوٹ نہ جائے۔"

انہوں نے بڑھ کر چہرے کو اپنے بازوؤں میں دبا لیا اور رخسار سے رخسار ملا کر —— بنا سکتیں۔

پھر کہا —— "آپ بننے کے لئے تم زیادہ موزوں ہو۔" "آپ کا کردار میں تم سے بہتر طور پر ادا کر سکتا ہوں!"

رخسانہ تم یہ ڈرامہ کھیل سکتی ہو اسے حقیقی اور فطری نہیں

رشی پٹیالوی

محبت غرض کے لئے رہ گئی ہے، محبت برائے محبت نہیں ہے
مرے دل کو دیکھو کر یہ دیکھ کر بھی کسی سے کسی کی شکایت نہیں ہے

اگر میں یہ کہہ دوں کہ تم بے وفا ہو تو بدلیں تمہاری نگاہوں کے تیور
چلو جو بھی ہو تم، بہت خوب ہو تم مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے

کہاں تک نیاز آفریں ہو گئی ہے یہ عجزِ محبت کی بے چارگی بھی
جہاں آنکھ بے تاب ہے دیکھنے کو وہاں سر اٹھانے کی جرأت نہیں ہے

اسے ہر کوئی تو نہیں جانتا ہے جدائی تمہاری ہے طرفہ قیامت
یہ مانا اسے ہر کوئی مانتا ہے قیامت سے پہلے قیامت نہیں ہے

یہ احساسِ بے چارگی بھی سلامت یہ ماحولِ صبر آزما بھی غنیمت
وہاں آنکھ بھرنے پہ مجبور ہوں میں جہاں شرحِ غم کی اجازت نہیں ہے

یہ رودوں کے میلے یہ نظروں کے جادو حسیں داستانوں کے عنوان سے ہیں
فقط اپنے مطلب کو اپنی ہے دنیا کسی کو کسی کی ضرورت نہیں ہے

تاثر ہے نظارۂ یک نظر کا نگاہیں بھی ہیں دل کے ہمراہ بے خود
مگر انہیں دیکھ کر دیکھتا کیا مجھے محویت ہی سے فرصت نہیں ہے

بچھائے ہیں وہ جال اب آگہی نے حقیقت ہے گم ہوش کے دائروں میں
اگر اب جنوں ساتھ اپنا نہ دیگا کہیں بچ نکلنے کی صورت نہیں ہے

وہ ماحول ہے سو بلاؤں کا مسکن وہاں رقص کرتے ہیں وحشت کے سائے
رشی روشنی بھی وہاں تیرگی ہے جہاں دل میں نورِ محبت نہیں ہے
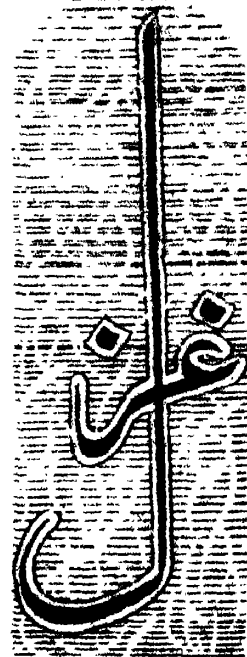
رشی پٹیالوی

کھانسی سے نجات پانے کے لئے
واٹربریز کمپاؤنڈ لیجیے

لال لیبل

واٹربریز کمپاؤنڈ میں موجود کریوسوٹ
اور گائیکول سانس کے نظام کو جراثیم سے پاک
رکھتے ہیں اور بلغم خارج کرتے ہیں، پھیپھڑے
صاف رکھتے ہیں، کھانسی، زکام، سانس کی
تکلیف اور دمہ جیسی کیفیت کا مقابلہ کرنے میں
مدد کرتے ہیں اور جراثیم کو دوبارہ پھیلنے
سے روکتے ہیں۔
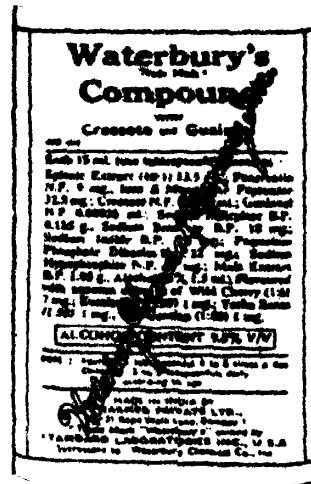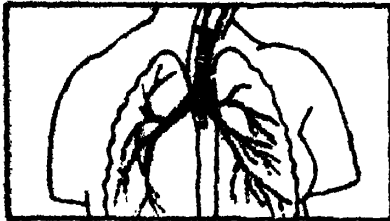
انسی مستقل وجہ سے گھر کر جاتی ہے اور بیماری
مقابلہ کرنے والی توانائی کم ہو جاتی ہے۔ واٹربریز
پاؤنڈ بیک وقت تین طرح سے اثر کرتا ہے:
ام پہنچاتا ہے، طاقت بحال کرتا ہے، اور بیماریوں
مقابلہ کرتا ہے۔ اس کے موثر اجزاء کریوسوٹ
گائیکول کھانسی میں آرام پہنچاتے ہیں، لوہا اور
وٹی اجزاء نیز جو اور مالٹ کے ست بھوک
ھاتے ہیں، طاقت بحال کرتے ہیں اور جراثیم
مقابلہ کرنے والی توانائی پیدا کرتے ہیں جس سے
وں کے پلٹنے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔
بارہ جیسی بیماریوں کا مقابلہ کرنے والی
انائی برقرار رکھنے کے لئے لال لیبل
لا واٹربریز کمپاؤنڈ پیجئے۔

واٹربریز
کمپاؤنڈ

کھانسی، زکام، سانس کی تکلیف
اور دمہ جیسی کیفیت کا مقابلہ کرنے کی توانائی پیدا کرتا ہے

وارنر لیمبرٹ فارماسیوٹیکل کمپنی

مس حیرت

زکی انور بی۔ اے (آنرز)

لونگنا، ہزاری باغ
یکم جنوری ۱۹۶۳ء

بھائی جان!

.... پچھلے دنوں "بیسویں صدی" میں میرے دو ایسے افسانے شائع ہوئے ہیں جن کے بارے میں کچھ لوگوں کو نہ جانے کیوں یہ یقین ہو گیا ہے کہ وہ افسانے افسانہ نہیں حقیقت ہیں! اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہ گیا کہ میں کوئی مبارک دن اور تاریخ دیکھ کر قسم کھاؤں کہ وہ افسانے بس افسانے ہی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہماری روزمرّہ کی زندگی میں اُن افسانوں کے کردار کچھ اس قدر بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں کہ کوئی بھی اُس قماش کا مرد اپنے بالوں میں یا کوئی بھی اُس قماش کی لڑکی اپنی چوٹیوں میں تنکا تلاش کرنے میں حق بجانب ہے۔

اُن افسانوں سے متعلق میرے پاس بہت زیادہ خطوط آئے، اُن میں بعض اتنے دلچسپ تھے کہ اُن کی مدد سے ایک افسانہ تو مرتب کر کے میں آپ کو بھیج چکا ہوں دوسرا یہ "مس حیرت" ارسال خدمت ہے۔

مراد آباد کے ایک صاحب نے مجھے غیرت دلائی ہے کہ میں نے ایک ہندو مُدیر کو خوش کرنے کے لئے اپنی ایک مُسلمان بہن کو عریاں کر دیا ہے۔ بھائی مراد آبادی صاحب کے غیرت دلانے پر بھی میں شرم سے پانی پانی تو نہ ہو سکا البتہ اپنی بہن کے لئے کپڑے لے کر حاضر ہوا ہوں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ موجودہ سماج کی نازک اندام، میری بہن کپڑوں کا بوجھ نہیں برداشت کر سکے گی۔ اور میری طرف اور میرے پیش کئے ہوئے موٹے جھوٹے کپڑوں کی طرف حقارت سے دیکھتے ہوئے اپنے عریاں جسم پر باریک ترین پرانگوں کا ایک غلاف ڈال لے گی! ایک غلاف ــــ ایک حسین ترین کفن!

لاحول بھیجیے مجھ پر کہ اس "ترقی یافتہ" دَور میں ایسی دقیانوسی باتیں سوچتا ہوں۔ یقیناً مجھے "بیسویں صدی" سے پہلے پیدا ہونا چاہئے تھا....

آپ کا
[دستخط]

چشتی منزل، بردوان: ۲۷ مارچ ۶۳ء

محترمہ! تسلیم

آپ کا کرم نامہ ملا۔ بہت بہت شکریہ!

مجھے سخت افسوس ہے کہ آپ دو بار آئیں اور آپ نے کئی بار فون بھی کیا لیکن آپ سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ یقین کیجیے مجھے سخت ملال ہے۔ میں کیا عرض کروں سرچشتی کی طویل علالت نے مجھے بہت پریشان کر رکھا ہے یہاں تک کہ [illegible] رہا ہوں لیکن آپ کا طویل خط پڑھ کر مجھے نہ صرف

آپ کے کیس سے دلچسپی ہو گئی ہے بلکہ مجھے سخت غصہ آ رہا ہے۔ کاش میں اُس بدتمیز افسانہ نگار کو مناسب سزا دلوا سکوں۔ افسوس کی بات ہے کہ ایک طرف تو وہ کمبخت اپنے آپ کو ترقی پسند کہتا ہے، اپنی اکثر تحریروں سے مادہ پرست ظاہر ہوتا ہے اور میں جانتا ہوں کہ وہ پکا کمیونسٹ تو ہے ہی پھر بھی ایک معمولی سی بات کے لئے ہنگامہ کر رہا ہے جو بات آج ایک مذاق ہے جبکہ ہم کافی مہذب اور ترقی یافتہ ہو چکے ہیں۔

ایسا تو نہیں کہ اُس نے آپ سے محبت کی ہو اور آپ نے [illegible] کی ہو

(یہ بات میں نے مذاقاً کہدی بُرا نہ مان جائیے!)

بہرحال سردست آپ کے لئے سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ وہ کسی کسی طرح تحریری طور پر یہ اقرار کرے کہ اُس نے آپ ہی کی کہانیاں لکھی ہیں اور یہ کہ اُن کہانیوں کی مستحق وہ نہیں اصل آپ ہیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو بہت آسانی کے ساتھ اُس پر مقدمہ چلایا جا سکتا ہے اور آپ جتنا چاہیں ہرجانہ وصول کر سکتی ہیں۔

"سُنیئے ——— افسانہ نگار" ایک نوجوان افسانہ نگار ہے مجھے یقین ہے اس کا ذہن کافی پختہ ہوگا اور دل میں محبت کا جذبہ بھی ہوگا آپ کسی اور لڑکی کے ذریعہ اُس سے خط و کتابت شروع کیجئے بہت ممکن ہے وہ کام کی بات لکھ مارے۔

یہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ اُسے غیرت دلائی جائے کہ ایک مسلمان ہوتے ہوئے اس نے اپنی کہانی کی "فاطمہ" کو ایک ہندو طوائف کے ساتھ منہ کالا کرتے دکھایا ہے! کل مذہب کے کندھے پر بندوق رکھ کر بڑے سے بڑا شیر مارا جا سکتا ہے..... ممکن ہے اُس کی رگوں کا اسلامی خون جوش مارے گا اور وہ اگل دے گا کہ اس کی کہانیاں اور نہیں حقیقت تھیں۔

کوشش کیجئے یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ خدا آپ کو کامیاب کرے۔

آپ کا مخلص۔ ابو فضل چشتی پلیڈر

۔۳۰ اپریل ۶۳ء

محترمی!

یہ تحریر آپ کے لئے نئی تو ضرور ہوگی لیکن ادبی دنیا میں آپ نئے نہیں ہیں۔ اس لئے آپ کو اچھی طرح جانتی ہوں ——— اور آپ مجھے بس کوئی "مس حسینہ" سمجھئے۔

آپ کی کہانی "کھوٹا پیار" پڑھنے کے بعد میں آپ کو کچھ لکھنے پر مجبور ہو گئی ہوں۔ امید ہے کہ آپ توجہ فرمائی کی زحمت گوارا کرلیں گے۔

جمشید پور میں ایک عرصے سے ہوں۔ آپ کی کہانی پڑھنے کے بعد آپ کے شہر کی ایک بدنام "فاطمہ" کی تصویر نظر کے سامنے آگئی جس نے اپنی تعلیم جمشید پور میں مکمل کی ہے۔

خدا کرے آپ کی کہانی خالص آپ کے دماغ کی اُپج ہو ورنہ مجھے آپ سے شکایت ہوگی کہ آپ نے اپنی کہانی کی فاطمہ میں حقیقت کی رابعہ کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے ——— رابعہ کی بے راہ روی کے لئے اُس کی ماں کو بہت حد تک ذمہ دار قرار دیا جا سکتا ہے جبکہ آپ نے اس کی ماں کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں

دی ہے۔

آج کل میں پٹنہ آئی ہوئی ہوں اگر آپ جواب دینا چاہیں تو ذیل کے پتہ پر ۳ ہفتوں کے بعد لکھیں۔

مخلص
[illegible]

میرا پتہ: مس [illegible] [illegible] ایم [illegible] جمشید پور

برودان۔ ۹ اپریل ۶۳ء

محترمہ! تسلیم

آپ کا کرم نامہ ملا کسی عنوان سے ہی سہی آپ نے میری طرف توجہ فرمانے کی زحمت گوارا کی جس کے لئے میں بے حد شکر گزار ہوں۔

کام کی بات سے پہلے ایک بے کار بات عرض کرتا ہوں آپ بُرا تو نہ مانیں گی، اور وہ بے کار بات یہ ہے کہ مجھے اپنی کہانیوں میں حیرت، استعجاب اور سسپنس بہت اچھے لگتے ہیں۔ اپنی زندگی میں بھی اور اُن زندگیوں میں بھی جو میری زندگی سے وابستہ ہیں یقین کیجئے اگر کوئی لڑکی مجھ سے محبت کرتی رہے اور محبت کی منزل خود سپردگی کی حد میں داخل ہو جائے اور تب اگر مجھے پتہ چلے کہ کالج کا کوئی خوبصورت سا لونڈا مجھے بیوقوف بنا رہا تھا تو میں خوشی سے پاگل ہو جاؤں۔ یا پھر میری بیوی جو مجھ سے بے پناہ محبت کرتی ہے ایک دن اعلان کر دے کہ اسے مجھ سے سخت نفرت ہے تو میں اُسے گود میں اٹھا کر ناچنے لگ جاؤں گا۔ ہاں تو کہنے کی بات یہ ہے کہ مجھے آپ کا نام "مس حیرت" بہت پسند آیا اور میں آپ کو اسی نام سے مخاطب کروں گا یہاں تک کہ آپ کے پتے میں بھی یہی نام لکھ کر معرفت میں آپ کا اصلی نام دے دیا کروں گا۔

اب کام کی بات، مس حیرت! اس بات کو بس اتفاق ہی سمجھئے کہ میری کہانی "کھوٹا پیار" کی فاطمہ آپ کی جانی پہچانی سی نظر آتی ہے ویسے کہانی خالصاً میرے ذہن کی پیداوار ہے۔ ویسے ہمارے اس مہذب سماج میں فاطماؤں کی کمی نہیں اس لئے کسی بھی اُس قماش کی لڑکی کو اُس کہانی کے آئینے میں خود اپنی تصویر نظر آ سکتی ہے۔ یہی بات آپ کے ساتھ ہوئی ہے.... معاف کیجئے گا میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کو اپنی سہیلی کی تصویر نظر آگئی ہے۔

کیا میں امید کروں کہ آپ پھر کبھی خیریت کے ایک آدھ جملے سے نوازنے کی زحمت گوارا کریں گی؟

خیر اندیش
محسن برودانی

مرشدآباد۔ ۱۰ اپریل ۶۳ء

محترم جناب محسن بردوانی صاحب! آداب و نیاز

آپ کا ایک افسانہ "اپنا زمانہ" کے دسمبر کے شمارے میں بعنوان "[illegible]" پڑھا بہت پسند آیا۔

خاص طور پر ایک مسلمان لڑکی فاطمہ کا کردار جو آپ نے پیش کیا ہے بہت خراب ہے۔ آپ کا یہ افسانہ پڑھ کر میں ہی نہیں ہر عقیدت مند مسلمان شرم سے پانی پانی ہو گیا ہوگا۔ لیکن مجھے تعجب ہے کہ یہ افسانہ لکھتے وقت آپ کی غیرت اور شرافت کہاں چلی گئی تھی؟

بہت افسوس اور شرم کی بات ہے کہ "اپنا زمانہ" کے ہندو مدیر رام بھروسے صاحب کی حمایت حاصل کرنے کے لئے اور رسالہ "اپنا زمانہ" میں ایک افسانہ نگار کی حیثیت پانے کے لئے آپ نے خود اپنی بہن کو عریاں کر دیا۔ امید ہے آپ کو اپنے لکھے پر شرم آئے گی۔

خیر اندیش

ذوالفقار علی خاں

بردوان۔ ۱۶ اپریل ۶۳ء

برادرِ محترم! تسلیم

آپ کا کرم نامہ ملا، شکریہ!

"اپنا زمانہ" اور بعض دوسرے کثیر الاشاعت ماہ ناموں میں کہانی کی اشاعت پر اتنے خطوط آتے ہیں کہ مقدرت نہ ہوتے ہوئے بھی مجھے ایک پارٹ ٹائم اسسٹنٹ رکھ لینا پڑا ہے کیونکہ کسی کے خط کا جواب نہ دینا مجھے بہت بُرا لگتا ہے۔ ان دنوں میرا وہ اسسٹنٹ چھٹی پر ہے اس لئے میں اپنے کسی بھی قدردان کو خط نہیں لکھ سکا ہوں۔ میرا مطلب ہے خط نہیں لکھوا سکا ہوں۔ لیکن آپ کا خط اتنا دلچسپ ہے کہ جلد سے جلد جواب دینے کے لئے منہ میں پانی آگیا! (یعنی قلم کی نب کی نوک پر اٹک گئی) اور میں خود ــــ لکھنے بیٹھ گیا ہوں۔

میرے بھائی! کوئی گمراہ، بدچلن یا بدکردار مرد یا عورت اگر اپنے آپ کو کسی مذہب سے منسلک سمجھے تو یہ اُس کی خوش فہمی ہے۔ اور جو لوگ ویسے مرد یا عورت کو کسی مذہب کا فرد سمجھتے ہیں وہ حماقت کرتے ہیں ــــ کوئی بھی مذہب فحاشی یا بدچلنی کی اجازت نہیں دیتا۔

میری کہانی کی فاطمہ موجودہ حالت میں نہ ہندو ہے نہ مسلمان نہ سکھ نہ عیسائی وہ صرف ایک اوباش لڑکی ہے جسے کوئی بھی مذہب برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ پہلے اُس کا کسی مذہب سے تعلق رہا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اپنی اوباش زندگی سے تھک یا اکتا کر وہ آئندہ زندگی گزارنے کا کوئی اچھا اصول اپنے لئے پسند کرے۔

لیکن اگر مجھے اس وجہ سے شرم سے پانی پانی ہو جانا چاہئے تھا کہ میں نے فاطمہ نام کی ایک لڑکی کو بلونت نام کے ایک مرد کے ساتھ گندی راہوں پر گامزن دکھا دیا ہے... تو پھر میرے بھائی! طوائفوں کے محلوں میں صرف پانی پانی ہی نظر آنا چاہئے ــــ ہندوؤں کا پانی، مسلمانوں کا پانی، سکھوں کا پانی اور عیسائیوں کا پانی، جہاں فاطمائیں بلونتوں کے ساتھ، رادھائیں علی بخشوں کے ساتھ، روبیاں کسی اور غیر مذہب کے نام کے مرد کے ساتھ اور بسنت کوریں بھی غیر مذہب کے نام کے مردوں کے ساتھ نظر آتی رہتی ہیں! ــــ بھائی صاحب! یہ سب کچھ ہمارے مہذب سماج کا غلاظت اپ ہے اور وہ تہذیب ہے جو ہم بدن سے برآمد کرتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ نہ تو طوائفوں پر پابندی عائد کرنے سے ختم ہو سکتا ہے نہ آپ کے شرم دلانے سے نہ میرے شرم سے پانی پانی ہونے سے ــــ یہ انحطاط ایک انقلاب کا پیش خیمہ ہے جس کا ہمیں انتظار ہے۔

آپ نے میرے بارے میں رائے قائم کرنے میں کسی قدر جلد بازی سے کام لیا ہے۔ آپ جیسے قدردانوں کی دعا سے میں اُس مقام پر ہوں جہاں پہنچ کر مدیروں کو خوش کرنے یا کسی خاص پرچے میں جگہ پانے کے لئے کوئی بھی زحمت گوارا کرنا نہیں پڑتی بلکہ مدیروں کے تقاضوں سے گھبرا کر جھوٹ بولنا پڑتا ہے..... لیکن جہاں تک رام بھروسے صاحب کو خوش کرنے کے لئے اپنی بہن کو عریاں کرنے کی بات آپ نے کہی ہے میں نہایت ہی خلوص اور ایمانداری سے عرض کرتا ہوں ــــ

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند
مشکل ہے کہ اک بندۂ حق بین و حق اندیش
خاشاک کے تودے کو کہے کوہ دماوند

اگر میرے خط سے آپ کا اسلامی خون اور بھی زیادہ جوش میں آگیا ہے تو آج رات نرگس اور راج کپور کی یا مدھوبالا اور کشور کمار کی کوئی فلم دیکھ لیجئے انشاء اللہ ضرور افاقہ ہوگا۔

اور اگر آپ مطمئن ہیں تو شکرانے کی دو رکعت نماز پڑھئے مزید اطمینان نصیب ہوگا!

خدا کرے آپ بخیر ہوں۔ والسلام

آپ کا اپنا

محسن بردوانی

چشتی منزل، بردوان، ۱۳ر مئی ۶۳ء

ڈیر رابعہ!

تم نے ٹھیک ہی سوچا ہے حقیقت چاہے کچھ بھی ہو لیکن میں بھی شہر کا ایک بدنام لونڈا اور اب خلاف پڑ گئی، جیسا کہ میں نے سنا ہے ہوشیار ہو گئی ہے اور محسن میاں کے دوست احباب کیمرے لے کر گھومتے ہیں تاکہ کہیں اور کبھی کسی بدنام شخص کے ساتھ تمہیں دیکھ کر تصویر اتار لیں تاکہ عدالت میں ثابت کیا جاسکے کہ تم ایک کال گرل ہو!

بہرحال ۔۔۔ مس حیرت کے نام اور ذوالفقار علی خاں کے نام محسن صاحب نے جو خط لکھے ہیں، تم نے صرف اُن کی نقل بھیج دی ہے لیکن مجھے کیس بنانے کے لئے اوریجنل خطوں کی ضرورت ہوگی جلد بھیج دیجئے۔

بیچارہ مس حیرت کے نام خط میں بالکل صاف بچ نکلا ہے (لیکن مس حیرت کو اُس سے بدستور خط و کتابت جاری رکھنا چاہئے بلکہ عشق شروع کر دینا چاہئے) لیکن ذوالفقار علی خاں کو جو خط محسن صاحب نے لکھا ہے اُس میں اقبال کے اشعار لکھ کر کسی قدر پھنس گئے ہیں، حضرت!

بھئی رابعہ! وہ میری فیس کا معاملہ کیا ہوا؟

امید ہے تم بخیر ہوگی۔

تمہارا

ابو فضل چشتی، پلیڈر

بردوان، ۲۰ر جون ۶۳ء

مائی ڈیر چشتی صاحب! تسلیم

حد ہو گئی، بخدا آپ بالکل تاجرانہ ذہنیت رکھتے ہیں۔ ہر خط میں بس فیس کی بات اور کمال تو یہ ہے کہ ایک طرف تو آپ مجھ سے محبت کا دبے دبے انداز میں اظہار کرنے لگے ہیں اور دوسری طرف وہی، مرغی کی ایک ٹانگ! ۔۔۔ فیس ... فیس ... فیس!

خیر سنئے، میں نے امی جان سے روپے منگوائے ہیں آتے ہی بھیج دوں گی۔

لیکن یہ تو بتائیے حضرت کہ مقدمہ آخر دائر کب ہوگا؟ میں نے سنا ہے کہ محسن صاحب اب پورے طور پر کوئی ناولٹ ہی لکھنے والے ہیں جس کے سرورق پر وہ کسی تقریباً عریاں لڑکی کی تصویر دیں گے جس کی شکل میری شکل سے ملتی جلتی ہوگی۔ اگر سچ مچ یہ سب کچھ ہو گیا اور آپ کچھ نہیں کر سکے تو میں زہر کھا لوں گی اور میری موت کے ذمہ دار آپ ہوں گے۔

یقین کیجئے چشتی صاحب میں آپ کی اتنی خوشامد ہرگز نہ کرتی لیکن مجھے سب سے زیادہ پریشان کن بات یہ ہے کہ اُس محسن کے بچے کی ملاقات صرف یہاں کے بیشتر وکیلوں ہی

سے نہیں ہے شہر کے فرشتے کمبخت بھی اُس کے خلاف کچھ نہیں کرنا چاہتے۔

خدا کے لئے آپ میری عزت بچائیے۔

آپ کی

رابعہ

چشتی منزل، بردوان، ۱۷ر جون ۶۳ء

ڈیر رابعہ!

آج رات تمہارے کیس کا مسودہ تیار کروں گا۔ "اپنا زمانہ" کے شمارے اور دوسرے کاغذات جو تمہارے پاس ہیں لے کر آجاؤ۔

چشتی

چشتی منزل، بردوان، ۱۹ر جون ۶۳ء

میری روحی! خوش رہو

ہاں تمہارے دونوں خط مل گئے۔ کمال کرتی ہو، تم اپنے ابا جان کے ساتھ شملے جانا چاہتی ہو پھر بھی مجھ سے اجازت لینے کی ضرورت محسوس ہوئی تمہیں؟ اری نیک پروین! یہ وہ زمانہ ہے کہ اگر تم کسی پرستار (اگر ہو!) کے ساتھ بھی کہیں جانا چاہو تو مجھ سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں! ..... خیر تم شوق سے جاؤ لیکن ایک شرط پر کہ ہر روز خط لکھنے والا عہد بھلانا نہ ہوگا!

رابعہ کے بارے میں معلوم کرنے کے لئے سخت بے قراری ہے تمہیں! بات کیا ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ محسن صاحب کی کہانیوں کے آئینے میں تمہیں بھی اپنی کوئی سہیلی نظر آرہی ہے؟

بہرحال، پرسوں کی رات وہ کیس ختم ہو گیا۔ لیکن چونکہ مت، ضروری نہیں کہ اگر کوئی معاملہ رات کی تاریکی میں ختم ہو تو وہ تاریکی ہی پر ہی ختم ہو۔

پرسوں رات میں نے رابعہ کو اُس کے کیس کا مسودہ تیار کرنے کیلئے ضروری کاغذات کے ساتھ بلایا تھا اور وہ تقریباً رات کے دس بجے نہ صرف ضروری کاغذات کے ساتھ بلکہ نہایت ہی غیر ضروری بناؤ سنگار اور میک اپ کے ساتھ آگئی۔ یہ تو میں تمہیں پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ میں اُس سے بے تحاشہ عشق کرنے لگا تھا۔ آتے ہی اُس نے ایک روایتی محبوبہ کی طرح فراق کی تپش بیان کرنا شروع کر دی اور پھر خواہ مخواہ میری بے وفائی کا رونا رونے لگی لیکن میں سمجھ گیا کہ یہ سب کچھ صرف اس لئے ہے کہ میں پھر اپنی فیس کا مطالبہ نہ کروں۔ اور بے شک اُس وقت میں نے فیس کی بات نہیں کی۔ اور میں اُسے یہ سمجھانے لگا کہ اُس کے کیس میں کوئی جان نہیں [illegible] بردوانی سے صلح کر لے۔ پہلے تو میں کیا بیان کروں وہ کس طرح [illegible]

نے بڑی نفاست کے ساتھ کہا ۔ تو اُس نے بہت بے بسی کے ساتھ کہا کیسے لیکن [illegible] مجھ سے وہ بیٹی کی طرح کرتی رہی ہے اُس کی آواز میں اپنے آپ کا زوال ہے ۔ پتہ نہیں کیوں وہ یہ کہتی تھی کہ [illegible] ایک شو ہو گا ! اس لئے میں نے اُسے کہا اگر یہ کچھ ہو سکتا ہے کہ وہ [illegible] کرنا چاہ رہا ہو اور کچھ پیسے سے اُس کا تم خرید لیا جائے گا ۔ [illegible] کہا ۔

"نہیں چشتی صاحب آپ کا خیال غلط ہے میں جانتی ہوں اُس کمبخت کو پیسوں کی ضرورت نہیں ۔ کافی اچھی ملازمت کرتا ہے اور لوٹ پٹانگ افسانے اور ناول لکھ کر کافی پیسہ کماتا ہے ۔ فرض کیجئے کہ اُس نے پیسے لینا منظور بھی کر لیا تو میں دوں گی کہاں سے ؟ پیسے ہوتے تو آپ کی فیس اب تک ادا نہ کرتی ! ۔۔۔۔ اس کے علاوہ جو کچھ میرے پاس ہے وہ میرا حسن ہے لیکن اُس حیوان کے لئے نہیں !"

مجھے شرارت سوجھی اور میں نے کہا ۔

"رابعہ ! ڈاکٹروں سے جسمانی مرض کا حال اور وکیلوں سے مقدمے کی تفصیل چھپایا نہیں کرتے ۔ تو پھر بتاؤ کیا یہ بات غلط ہے کہ اب تمہاری حیثیت ایک بکنے والی اور خریدی جانے والی چیز کی سی ہے ۔ تمہیں کوئی بھی گلے لگا سکتا ہے کوئی بھی تمہارا ہمراہی بن سکتا ہے ۔۔۔۔۔ اگر وہ خوش نصیب محسن بھی ہو تو کیا حرج ہے ؟"

رابعہ نہایت ہی کرب ناک انداز میں خاموش ہو گئی ۔ اس کی صورت پر کچھ ایسی کیفیت طاری تھی کہ مجھے بہت رحم آ رہا تھا ۔

ٹھیک اسی وقت کتابوں کی الماری کے پیچھے سے محسن نکل آیا جسے میں نے پہلے ہی وہاں چھپا رکھا تھا اور نکلتے ہی اپنے مخصوص بے تکے انداز میں چیخا ۔

"ہیلو مس عیرت ۔۔۔۔۔ ہاؤ ڈو یو ڈو !"

میں کیا بتاؤں اُس وقت رابعہ کی کیا حالت ہوئی اگر اُس کے پاس ریوالور ہوتا تو ہم دونوں ہی کو قتل کئے بغیر نہ رہتی ۔ اُس کے چہرے پر یہ کیفیت کافی دیر تک طاری رہی اور کمرے میں موت کا سا سکوت طاری رہا ۔

لیکن یکایک وہ بہت بے بسی سے بولی ۔

"مسٹر محسن ! مجھے یاد ہے یونیورسٹی کے ایک فنکشن میں میں نے آپ کو غنڈہ کہہ دیا تھا ۔ یقیناً آپ کی کہانیاں میری اُس غلطی کا رد عمل ہیں ۔ میں آپ سے معافی مانگتی ہوں ۔"

"مجھے افسوس ہے مس عیرت ۔" محسن نے کہا ۔ "کہ محض معافی مانگ لینے سے بات نہیں بنے گی ۔"

"یقین کیجئے محسن صاحب ۔" رابعہ تقریباً رو پڑی ۔ "میرے پاس پیسے نہیں ۔"

"نہیں عیرت !" محسن نے کہا ۔ "تمہاری دعا سے مجھے پیسوں کی ضرورت بھی نہیں ۔ قرآن صاحب تو تمہاری ذات پر ساٹھ ستر روپے ماہوار خرچ کر کے دوستوں میں گھومتے پھرتے ہیں ۔ اگر وقت آجائے تو یہ خاکسار کم سے کم ایک اوٹ پٹانگ ناولٹ کا معاوضہ چار پانچ سو تو تم پر نثار کر ہی سکتا ہے ۔ کوئی اور ہی صورت نکالو ۔"

رابعہ کا چہرہ ایک بار پھر سرخ ہو گیا اور دیر تک سُرخی قائم رہی اور جب سُرخی ختم ہوئی تو شفق پھول اُٹھی اور وہ نہایت ہی دلبرانہ انداز میں مسکرانے لگی ۔

"نو نو ۔" محسن پھر چیخا ۔ "اس مسکراہٹ سے کام نہیں چلے گا ۔ مسکراہٹ تو مس عیرت ! نہایت سستے داموں میں ملتی ہے ۔ آج کی ہماری تہذیب میں بھی ایسی ہزاروں بے ہودہ مسکراہٹیں سڑکوں پر خوانچے والے بیچتے پھرتے ہیں ۔۔۔۔ یہاں سارے بچے آئے ۔۔۔۔ مجھے کچھ اور چاہئے ' کچھ اور ۔ میرے پاس نہیں مسکراہٹ تو تم سے زیادہ پیاری میری بیوی کی ہے ' جو میری اپنی مسکراہٹ ہے ' جسے میں نے خریدا نہیں بلکہ مجھے خدا کی طرف سے بخشی گئی ہے ۔۔۔۔"

"خدا کے لئے مجھے پاگل نہ بنایئے محسن صاحب !" وہ تقریباً کراہ اُٹھی ۔ "کیا چاہتے آپ کو ؟"

اور تب ردی میں کیا بتاؤں ۔۔۔۔ وہ محسن جسے تم اور رابعہ اور پتہ نہیں کتنے لوگ زمانہ بھر کا غنڈہ کہتے ہیں کیا بولا ؟ ۔۔۔۔ وہ کچھ نہیں بولا ۔۔۔۔ وہ چپ ہو گیا اور اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں ' یہاں تک کہ اُس کی پلکوں میں آنسو جھلملانے لگے ۔ یقیناً اسے اپنی مرحوم بہنیں یاد آنے لگی تھیں ۔۔۔۔۔ وہ بہت دیر تک گم سُم بیٹھا رابعہ کو گھورتا رہا ۔

پھر ردی ۔۔۔ جیسے جھپٹ کر اُس نے رابعہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پھر تھم تھم کر کہنے لگا ۔

"رابعہ یہ الزام ہے کہ میں نے تمہیں عریاں کر دیا ہے لیکن سچ یہ ہے کہ جب تو ننگی تھی میں نے تیری تصویر اُتاری ہے ۔۔۔۔ اور اب میں تجھے کپڑے پہنانا چاہتا ہوں ۔۔۔۔ میں تجھے اس طرح مستور کر دینا چاہتا ہوں کہ خود بھی تجھے دیکھنے کو ترس جاؤں ۔۔۔۔ ہاں رابعہ میں یہی چاہتا ہوں ۔ رابعہ مجھے نہ تیرے پیسے چاہئیں نہ تیری مسکراہٹ ۔ مجھے صرف وہ تڑپ دے دے رابعہ ' وہ کسک دے دے ' وہ بے قراری [illegible] جو ایک بھائی کے دل میں اُس کی بہن کی سسرال جانے کے بعد ہوتی ہے ۔"

ردی میں کیا بتاؤں کس والہانہ انداز میں رابعہ محسن کے سینے سے لگ گئی ۔ اور تم یقین نہیں کرو گی کہ اُس وقت رابعہ کے چہرے پر کیسا تقدس چھا گیا تھا !

اور محسن بے ہودہ کہانیوں کے ہیروں کی طرح بیٹھ کر تم چونک اُٹھو گی کہ رابعہ اب برقعے میں نظر آتی ہے اور محسن بڑی شدت سے اپنی بہن کا رشتہ تلاش کر رہا ہے ۔

ایک غنڈے کی کہانی ختم ہو گئی ۔

ایک اوباش لڑکی کی کہانی ختم ہو گئی ۔

اور اب میں یہ خط ختم کرتا ہوں ۔ ایک ضروری کیس کا مسودہ تیار کرنا ہے ۔

گھر کے بزرگوں کو آداب ۔ بے بی کو پیار ۔

تمہارا

چشتی

از دہلی
[illegible]

جناب خوش‌نظر گرامی صاحب - تسلیم

نوازش نامہ لکھنے کا ملا۔ حالت یہ ہے کہ

گمانِ زیست بود بر منت ز بیدردی
بد است مرگ و لے بدتر از گمانِ تو نیست

لیکن بجز تعمیلِ ارشاد چارہ بھی نہیں۔ جو کچھ ہے قبول فرمائیے

میری زندگی کا افسانہ

پہلا داغ - ایک گمنام سے محلہ میں گھر میں ہوئے وجودِ حقیر
مادرِ مہرباں کی رحلت تھی۔ دورِ طفلی میں شومیِ تقدیر

دوسرا داغ - ختمِ تعلیم نوکری پائی۔ نوکری پر نثار قلب و ضمیر
بیوی بچہ کی موت کیا کہئے۔ اک جواں مر گیا اور چھٹا پیر

تیسرا داغ - بعدِ شش سال دوسری شادی۔ یعنی پھر قیدِ خانداں میں اسیر
نوکری ترک کر کے مختاری - کی یہ اپنے فلاح کی تدبیر

چوتھا داغ - رہے ہم قیدِ فرنگ میں دو بار - گو نہ تھی پاؤں میں کوئی زنجیر
اٹھ گیا سایہ پدر سر سے - شہر میں جن کی تھی بہت توقیر

پانچواں داغ - اور اک بار قیدِ افرنگی - ملک آزاد کوششِ تعمیر
تھے صحافی تو اب ہوئے افسر۔ بانکے تھے جریدوں کی تحریر

چھٹا داغ - انتخابات میں ملی نصرت - کہیں افسر سے بن گئے تھے وزیر
چھن گیا عہدہ وہ سماں لوٹی۔ تھے وزیر اور اب بنے ہیں مشیر

اور ساتواں داغ تو ابھی [illegible] —

سائے

مختار شکیب ایم۔ اے

اے۔ ۲۲۷۔ حسرت موہانی کالونی۔ منگھوپیر روڈ۔ کراچی نمبر ۱۴

۱۳ مارچ ۶۴ء خوشتر بھائی اخوص بکیراں

کے۔ ایل۔ ایم میں ملازمت اختیار کرنے کے بعد سے لکھنا بہت کم ہو گیا ہے۔ اپریل ۶۴ء کے بیسویں صدی میں میرا ایک افسانہ شائع ہوا تھا۔ اُس کے بعد پھر آپ کو کچھ ارسال نہ کر سکا۔ اب ایک افسانہ "سائے" حاضرِ خدمت ہے۔ امید ہے اسے افسانہ نمبر کی آغوش میں جگہ مل جائے گی.....

نیاز آگیں مختار شکیب

وہ صبح آٹھ بجے دفتر پہنچ گئی۔

باتھ روم کے آئینہ میں بال ٹھیک کئے۔ لبوں پر سُرخی کی ایک ہلکی سی تہہ جمائی اور اپنے کمرہ میں جا بیٹھی۔ اُسے کتنی صبح دفتر جانا پڑتا تھا۔ دوسرے اور لوگوں کی ڈیوٹی تو نو بجے سے شروع ہوتی تھی اور اُسے آٹھ بجے جانا پڑتا تھا۔ وہ پاک ایرویز کے ریزرویشن ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتی تھی۔ اور دفتر میں سب سے پہلے صرف اُسی کو اسپیشل ڈیوٹی پر جانا پڑتا تھا۔

اُس نے کچھ لکھنے کے لئے پیڈ اُٹھایا تو ایک دم چونک گئی۔ پیڈ کے نیچے ایک چھوٹی سی پرچی رکھی تھی جس پر لکھا تھا۔

کتنی آسانی سے طے ہو جائے راہِ زندگی
تیرا نازک ہاتھ آ جائے جو میرے ہاتھ میں
پھر ہزاروں حادثاتِ ناگہاں آئیں مگر
مسکرا کر میں گذر جاؤں گا تیرے ساتھ میں

وہ ایک دم میز پر جھک گئی۔

یہ کس کی تحریر ہے؟ کون گستاخ ہے یہ؟

چار سال سے میں یہاں ملازم ہوں لیکن اس عرصہ میں یہ پہلا واقعہ ہے۔ ایسی حرکت کرنے کی کسے جرأت ہوئی!!

اس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا — جیسے اُسے کوئی دیکھ رہا ہو۔ اُس نے پرچی چھپا دی۔

ایسا کون کر سکتا ہے بھلا؟

وہ سوچنے لگی۔

یہ یقیناً اُسی کی حرکت ہے — وہی — جو اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتا ہے۔ کیا نام ہے اُس کا؟ — ہاں ہاں! یاد آیا — وہ محب! کمبخت جب بھی میرے کمرہ کے سامنے سے گذرتا ہے۔ مجھے گھورتا ہوا ہی جاتا ہے۔

میرا کمرہ بھی عجیب ہے۔ تینوں طرف شیشے کی دیواریں ہیں۔ ہر کوئی مجھے گھورتا ہے۔ دفتر کے اور دوسرے ڈیپارٹمنٹ میں بھی تو لڑکیاں ہیں۔ سب مجھے ہی کیوں گھورتے ہیں — اور وہ محب! وہ تو اپنی صورت اس طرح بنا کر مجھے دیکھتا ہے جیسے میرے ہی عشق میں گھُل رہا ہو۔

ہائے اللہ! یہ میں کیا سوچ رہی ہوں — توبہ....

اُس نے گھبرا کر وہ پرچی اپنے پرس میں رکھ لی۔

اچھا آنے دو اس محب کے بچے کو مزہ چکھاؤں گی! — لیکن ہو سکتا ہے یہ حرکت کسی اور نے کی ہو — اُس نے ایسا نہ کیا ہو گا۔ وہ بس مجھے دیکھتا ہی رہا ہے۔ آج تک اُس نے مجھ سے کسی بہانے بات نہیں کی۔ جبکہ اکثر لڑکے کسی نہ کسی بہانے مجھ سے بات کر لیتے ہیں۔ وہ ایسا نہیں کر سکتا۔

لیکن مجھے اُس سے ہمدردی کیوں ہو رہی ہے؟

وہ اگر خوبصورت شخصیت کا مالک ہے تو کیا۔ مجھے اُس کی سیاہ چمک دار مونچھیں اچھی لگتی ہیں تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ مجھے اُس سے ہمدردی ہونے لگے۔

یہ حرکت اُسی کی ہو گی!

ٹرنگ — ٹرنگ — ٹرنگ —

ٹیلیفون کی گھنٹی نے اُس کے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔ اس نے ریسیور اُٹھایا۔

ٹنٹارنگ — پاک ایرویز — ریزرویشن؟

دوسری طرف ایک اجنبی لیکن پُرخلوص آواز تھی۔

"کتنی آسانی سے طے ہو جائے راہِ زندگی

تیرا نازک ہاتھ آ جائے جو میرے ہاتھ میں"

اُس نے رسیور فوراً رکھ دیا۔

"اُف میرے خدا! آج یہ کیا ہو رہا ہے؟"

گھبراہٹ اور اضطراب کی پرچھائیاں اُس کے چہرے پر اُتر آئیں۔

یہ محب کی آواز تو نہیں معلوم ہوتی ——— لیکن شرارت [illegible]ہے۔ شاید آواز بدل لی ہو۔

نو بجے تھے ———

محب اُس کے کمرے کے سامنے سے اُسے محبت بھری نظروں سے دیکھتا ہوا چلا گیا۔ اُسے دیکھتے ہی لبنیٰ کا غصہ کافور ہو گیا۔

"ہائے اللہ! آدمی تو بھلا معلوم ہوتا ہے ——— یہ ایسا کس طرح کر سکتا ہے؟"

اس آواز میں بھی کتنا خلوص تھا ——— کتنی چاہت تھی!!

"کتنی آسانی سے طے ہو جائے راہِ زندگی"

پھر اس خلوص ——— اور اس چاہت سے ایسا معلوم ہوتا کہ یہ حرکت محب ہی نے کی تھی۔

وہ رات کو بھی بستر پر کروٹیں بدلتی رہی۔

مجھے اس آواز ——— اس تحریر سے اتنا اُنس کیوں ہو رہا ہے؟ ——— اُف! میں کیا کروں؟

دوسرے دن صبح وہ دفتر پہنچی تو پیڈ کے نیچے ایک پرچی اور رکھی تھی لیکن اس دفعہ اُس پر انگریزی میں لکھا تھا ———

"YOU ARE IN MY THOUGHTS
EVERY MINUTE OF THE DAY,
IN MY DREAMS EVERY
HOUR OF THE NIGHT-H"

(تم ہر لمحہ میرے خیالوں پر چھائی رہتی ہو اور میرا ہر خواب تمہارے خیالوں سے سجا رہتا ہے ———!!)

اس نے پرچی نکال کر فوراً پرس میں رکھ لی۔ جیسے اُسے بھی وہ تحریر بہت پسند تھی۔ لیکن وہ منہ ہی میں بڑبڑانے لگی۔
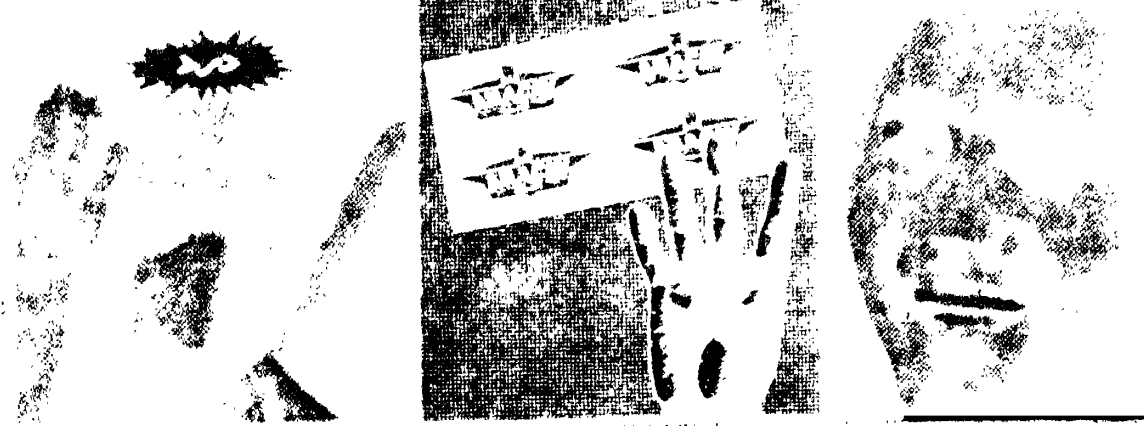
"یہ کون گستاخ ہے؟"

لیکن میں اُسے گستاخ کیوں کہہ رہی ہوں۔ اُسے بات کرنے کا موقع ہی نہ ملتا۔ یا وہ میری بدنامی کی وجہ سے دفتر میں مجھ سے بات نہیں کرتا۔ اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتا ہے۔ وہ روزانہ لیٹ بیٹھتا ہے۔ اور اُس وقت جاتا ہے جب سب لوگ چلے جاتے ہیں۔ شاید یہ پرچی وہ جاتے وقت رکھتا ہو کہ اُسے کوئی دیکھ ہی نہیں پاتا۔ اس طریقے کے سوا وہ بیچارہ کر ہی کیا سکتا ——— اور میں بھی تو بہت دنوں سے اس سے بات کرنے کا بہانہ تلاش کر رہی تھی۔ ہائے ——— میں اُس سے کس طرح بات کروں ———! میں اُس کی نیلی جھیل سی آنکھوں کو دیکھوں گی یا اُس سے بات کروں گی۔ مجھ سے تو یہ دونوں کام ایک وقت میں نہ ہو سکیں گے۔

ٹرنگ ——— ٹرنگ ——— ٹرنگ۔

ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

اُس کے چہرے پر خوشی کی روشنی پھیل گئی۔

وہی آواز معلوم ہوتی ہے ——— سویٹ!!

اُس نے رسیور اُٹھا لیا۔

لیکن دوسری طرف کسی مسافر کی آواز تھی جو اُسی روز کی پرواز کا وقت معلوم کر رہا تھا۔

وقت بتا کر اُس نے مایوسی سے رسیور رکھ دیا ——— شام تک ٹیلیفون آتے رہے۔ اور ہر فون پر یہی گمان ہوتا رہا کہ یہ محب ہے۔ لیکن ہر بار اُسے مایوسی ہوئی۔ محب کئی بار اُس کے کمرہ کی طرف سے آیا اور گیا۔ لیکن وہ اُس سے نگاہ نہ ملا سکی۔

تیسرے دن پیڈ کے نیچے ایک پرچی ——— ایک نئی تحریر کے ساتھ ملی اُس پر لکھا تھا۔

"میری زندگی ایک ریگستان کی مانند ہے۔ جس میں آج تک محبت کا کوئی گلاب نہیں مہکا ———!؟"

پرچی کو دیکھتے ہی وہ تڑپ اُٹھی۔

ظالم شاعری کرتا ہے!

پھر وہ اپنے دل میں کہنے لگی ———

"محب! میری زندگی ایک گلاب کی مانند ہے جس پر بھونرے تو بہت منڈلاتے ہیں لیکن آج تک کوئی شہزادہ ایسا نہیں آیا جو اپنا دامن اس گلاب سے سجا لے!!"

تین روز سے اُس کی عجب حالت ہو گئی تھی۔ کام میں کئی غلطیاں ہو گئیں ہر بار

دلچسپی۔ کئی بار اُس نے ٹیلیفون پر غلط جواب دئے ——— اور کتنے ہی مسافروں سے باتیں سنیں۔ اُس نے کئی بار کوشش کی کہ وہ اپنے ذہن سے ان خیالات کو جھٹک دے۔ لیکن وہ ہر بار اس کوشش میں ناکام رہی۔ تین روز سے وہ سو بھی نہیں سکی تھی۔ کام تو وہ چار سال سے کر رہی تھی۔ اور جب بھی اُسے بہت دنوں سے پسند تھا۔ دل ہی دل میں وہ اُسے چاہتی بھی تھی۔ لیکن اُس کی ایسی حالت پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔

اُسے چوتھے دن دفتر میں ایک پرچی اور ملی

"تمہاری آواز کا سحر میرے مقدر کا نوشتہ ہے!"

اور پھر تقریباً ایک ہفتہ کے لئے یہ سلسلہ بند ہوگیا۔ اس عرصہ میں وہ بہت مضطرب رہی۔ اُسے کسی طرح قرار نہ ملا۔ وہ بہت سویرے بیدار ہو جاتی۔ الٹا سیدھا ناشتہ کرتی اور دفتر کی طرف نکل پڑتی۔ اس امید پر کہ شاید آج کوئی پیغام ملے۔ لیکن اُسے ناکامی ہوتی رہی۔ سات دن اُسے سات برسوں سے زیادہ معلوم ہوئے۔

آٹھویں دن ایک پرچی ملی۔ اُس پر لکھا تھا

"تمہاری قربت میری زندگی ہے اور تمہارا

فراق ——— میری موت!!"

پرچی دیکھ کر اُس کی آنکھیں خوشی سے بھر آئیں ——— اُسی روز دوپہر بعد اُسے فون پر پھر وہی آواز سنائی دی جو پہلے روز اُس نے سُنی تھی۔

"دور تک کوئی مسافر بھی نظر آتا نہیں

سوچتا ہوں کس طرح تنہا کٹے گا یہ سفر"

وہ ریسیور کان سے لگائے بیٹھی رہی۔ اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس کے کانوں میں اسی آواز کا جلترنگ بجتا رہے اور وہ یونہی بیٹھی سُنتی رہے لیکن اُدھر ایک شعر کے بعد ہی بغیر کسی بات کے ٹیلیفون کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔

وہ اُداس ہوگئی۔

اور پھر ایک دن صبح ایک پرچی اور ملی۔ اُس پر لکھا تھا۔

"زندگی ———!

آج شام ———

چھ بجے ———

شیزان کے فیملی روم نمبر ۸ میں ———

ایک کپ چائے ———!!

انتظار کروں گا ———

شدید انتظار ———!!!"

اُف میرے اللہ!

میں اُس کے سامنے کیونکر جاؤں گی۔ اُس سے کیا بات کروں گی ——— اُس سے کس طرح نگاہیں ملاؤں گی؟

نہیں ——— نہیں ——— میں ہرگز نہیں جاؤں گی!

اُف! کس قدر مشکل مقام ہے یہ! میرے دل کی حالت کیا ہوگئی ہے۔ یہ اتنی زور سے کیوں دھڑک رہا ہے ——— کہیں دھڑکتے دھڑکتے بند تو نہ ہو جائے گا!

چھ بجے ———

شیزان میں ———

بڑی ہمت سے، تیز تیز دل کی دھڑکنوں کے ساتھ جب لبنیٰ نے فیملی روم نمبر ۸ کا پردہ اُٹھایا تو اُس کی ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

فیملی روم میں پاک ایر ویز کے ریزرویشن ڈیپارٹمنٹ ہی کا ایک پچاس سالہ کلرک رشید بیٹھا تھا۔ جو اُس کے پرانے چاہنے والوں میں سے ایک تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر بڑی بڑی مونچھوں تلے ایک مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی اور آنکھوں کے ستارے آنسوؤں میں ڈوب گئے تھے۔

"مجھے معاف کر دیجئے مس لبنیٰ! میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوگیا تھا ——— میری زندگی واقعی ایک ریگستان کی مانند ہے۔ جس پر کوئی گلاب کبھی نہ مہک سکے گا!!"

اُس کی آواز حلق ہی میں پھنس کر رہ گئی ———!

اور لبنیٰ کی آنکھوں میں اندھیرے اُتر آئے ———!!!

افسانہ نمبر

۸۸۹۲۸ - نیا محلہ - بل بلڈنگ
دہلی - یکم مئی ۶۶ء

برادرِ گرامی، خوشتر گرامی صاحب

عرض و نیاز!

آپ کا بہت ہی پیارا خط ملا ۔ افسانہ نمبر کے لئے آپ نے جس دلفریب و دلنشین انداز میں غزل کی فرمائش کی ہے وہ آپ کی محبت اور خلوص کا آئینہ دار ہے ۔ لیجئے خاص نمبر کے لئے ایک خاص ہی غزل حاضر کر رہا ہوں ۔ پڑھئے، بار بار پڑھئے اور داد دیجئے!

زندگی ہم سے خفا ہو جیسے ۔ اب دوا ہو نہ دعا ہو جیسے

تیری فرقت میں ہوا یوں محسوس ۔ زندگی ایک سزا ہو جیسے

اس طرح کرتا ہوں پوجا تیری ۔ تو محبت کا خدا ہو جیسے

ایسا ارمان ملاقات کا ہی کیا ۔ دل میں طوفان اٹھا ہو جیسے

میرے ہونٹوں پہ ترا ذکر جمیل ۔ ہر نفس موج صبا ہو جیسے

تیری آنکھوں سے ٹپکتی مستی ۔ ایک مے خانہ کھلا ہو جیسے

غم سے ملتی ہے مسرت دل کو ۔ غم بھی تیری ہی ادا ہو جیسے

وہ پشیماں ہیں جفا ہی پہ مری ۔ یہ بھی میری ہی خطا ہو جیسے

افسانہ

چھنال

مہندر ناتھ۔ بی۔ اے

۱۵، چھپرا بلڈنگ، مادھوداس پاستا روڈ، دادر، بمبئی ۱۴

۲۴ر اپریل ۱۹۶۴ء

محترم خوشتر صاحب! تسلیم

.... افسانے کا مرکزی خیال یہ ہے کہ ہم لوگوں کے متعلق بہت جلدی اپنی رائے قائم کرتے ہیں۔ یہ کہاں تک درست ہے۔ اسی خیال کے متعلق یہ افسانہ لکھا گیا ہے۔ اُمید ہے افسانہ آپ کو پسند آئے گا۔ اپنی رائے سے مطلع کیجئے گا۔ ——— بمبئی میں گرمی برابر بڑھتی جا رہی ہے۔ دلی میں تو خوب گرمی ہوگی یعنی ناقابلِ برداشت! اُمید ہے افسانہ نمبر نکالنے کے بعد بمبئی آیئے گا....

آپ کا

[illegible]

یوں تو مجھے امرت درما کی بیوی سے مل کر بے حد مسرّت ہوئی، ملاقات تو پہلی تھی، لیکن یہ چھوٹی سی ملاقات ذہن پر اَن مِٹ نشان چھوڑ گئی۔ دیکھنے میں اوشا ورما بے حد حسین تھی۔ سرو قد، کالے سیاہ بال کندھوں پر لٹکے ہوئے جیسے کالی سیاہ رات کسی جگمگاتے ہوئے جزیرے پر اُتر آئے۔ آنکھیں روشن اور بڑی بڑی۔ ناک سُتواں۔ ہونٹ پتلے اور یاقوت کی طرح سُرخ۔ اور اُن کے کسنے لرزتے ہوئے چہرے اور بانہوں کی جِلد بے حد شفاف اور صاف۔ جسم کے خطوط پُرکشش اور جاذبِ نظر، جس پر ایک بار نگاہ ڈالے تو سارا جسم لرز لرز جائے۔

یوں تو دوست کی بیوی کی اتنی تعریف نہیں کرنی چاہئے۔ لوگ غیروں کی تعریف زیادہ کرتے ہیں اپنوں کی کم۔ میں تو انگریزی زبان کے ایک مقولے کے مطابق اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ "خیرات گھر سے شروع کیجئے، چاہے وہ سکّوں کی خیرات ہو، یا تعریفی جملوں کی۔"

اوشا ورما میرے گھر میں کیا وارد ہوئی کہ چند ہی دنوں میں ساری بلڈنگ میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ میں غیروں کی پروا کم کرتا ہوں، اپنوں کی زیادہ۔ مجھے اپنی بیوی پر پورا بھروسہ تھا کہ وہ ایک خوش شکل اور حسین صورت کو دیکھ کر کتنی خوش ہوگی۔ میں اپنی بیوی کی عادت سے بخوبی واقف ہوں کہ جب کبھی کوئی بدصورت عورت اُس سے ملنے آئی، اُس نے ہمیشہ میرا تعارف کرا دیا۔ اور بدقسمتی سے کوئی حسین لڑکی یا عورت نے اس گھر کی طرف رُخ کیا تو اُس نے ہمیشہ میرے گھر کا دروازہ بند پایا۔

اوشا ورما صرف آئی ہی نہیں تھی بلکہ دو ماہ اُسے اس گھر میں ٹھہرنا تھا۔ آج کل اُس کا شوہر لندن میں بحیثیت انجینئر کام کرتا تھا۔ اوشا ورما کے پاس پاسپورٹ نہ تھا۔ پاسپورٹ حاصل کرنے کے لئے جتنی دوڑ دھوپ کرنی پڑتی ہے اُس کا علم میری بیوی کو نہ تھا۔ جنّت کا پاسپورٹ بہت آسانی سے مل سکتا ہے۔ لیکن لندن کا پاسپورٹ حاصل کرنا، جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

اوشا ورما صرف حسین ہوتی تو شاید یہاں کے لوگ اُسے نظر انداز کر دیتے۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی اور تھا۔ ایک خوبصورت چہرے اور جسم کے علاوہ وہ فیشن کی بے حد دلدادہ تھی۔ بس سونے پر سہاگے والی بات تھی۔ نت نئے فیشن بھی موسموں کی طرح بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی کالی گھٹا کی طرح تیز اور تند۔ کبھی موسمِ بہار کی طرح دلفریب۔ شوخ و شنگ۔ کبھی رنگ مدّھم مدّھم سا ہے تو کبھی نگاہوں کو خیرہ کرنے والا۔

آج محبت [illegible]

زلف

ناصحِ نے مرا حاصلِ ایماں نہیں دیکھا
شانے پہ تری زلفوں کو پریشاں نہیں دیکھا — اصغر گونڈوی

وہ زلفیں دوش پہ بکھری ہوئی ہیں
جہانِ آرزو تھرّا رہا ہے — جگر مرادآبادی

زلفیں بکھیر تاکہ زمانے کو علم ہو
ظلمت حسین تر ہے شبِ ماہتاب سے — عبدالحمید عدم

تری زلفِ پریشاں سے عقیدت ہو گئی جب سے
ہمیں اپنی پریشانی حسیں معلوم ہوتی ہے — نرش کمار شاد

اجازت ہو تو میں تصدیق کر لوں تیری زلفوں سے
سُنا ہے زندگی اِک خوبصورت دام ہے ساقی — عبدالحمید عدم

لگے یا پیچے کا۔ اگر آج ہونٹوں پر یاقوت کی طرح لپ اسٹک لگی ہوئی ہے تو کل ہلکی نیم گلابی سی لپ اسٹک لگائی جائے گی جس سے شاید موسمِ بہار کا اندازہ نہ ہو سکے بلکہ خزاں کی آمد کا پتہ چلے۔

اوشا ورما چُست پینٹ بھی پہنتی تھی۔ جب کبھی کبھار تنگ بلاؤز اور پینٹ پہن لیتی تو بلڈنگ میں قیامت سی برپا ہو جاتی۔ اُس بلڈنگ کے رہنے والے پُرانی روش پر زیادہ چلتے تھے۔ نئی راہوں پر چلنا اُنہوں نے سیکھا نہیں تھا۔ انھیں دسید ھی سادی لڑکیاں پسند تھیں، اسی لئے اوشا ورما کو وہ پسند نہ کر سکے بڑی جلدی وہ اُس کی چلت پھرت۔ اُس کے اندازِ گفتگو اور دوسری عادتوں سے نالاں ہو گئے۔

اوشا ورما بیویوں کو چھوڑ کر بچّوں اور بیویوں کے شوہروں سے بہت جلدی بے تکلف ہو جاتی۔ کسی کے بچّے کو اُٹھا کر چوم لیتی۔ کسی کو لالی پاپ دیتی۔ کسی کے شوہر کو ہیلو کہتی۔ کسی کو نمستے، کسی کو سلام۔

مجھ سے وہ بہت جلدی گھُل مِل گئی۔ آٹھ دس دنوں کے اندر اندر وہ مجھ سے اس طرح باتیں کرنے لگی، جیسے وہ مجھے برسوں سے جانتی ہو۔ یوں تو میں چوڑیوں کا بیوپار کرتا ہوں۔ کلیان میں ایک چھوٹی سی فیکٹری ہے۔ وہیں چوڑیاں بنتی ہیں۔ نت نئے ڈیزائن تراشتا ہوں اور اپنی جمالیاتی حِس کو چوڑیوں میں ڈھالتا ہوں۔ شاعرانہ مزاج رکھتا ہوں۔ رنگ رُوپ [illegible] ہوں اور حسن کا پجاری ہوں۔ اس لئے میری بیوی میرے بارے میں [illegible] کرتی ہیں دل پھینک ہوں۔ حالانکہ میں اتنا بدمذاق نہیں کہ دل کو ہر [illegible] کسی کی نذر کر دوں۔ دل کو بڑی انمول چیز سمجھتا ہوں۔ سوچ سمجھ کر کسی کو دیتا ہوں تاکہ دلِ ناداں بے توقیر نہ ہو۔

اگر اوشا ورما نہ آتی تو میں مصیبتوں سے دوچار نہ ہوتا۔ شاید آپ نے سُنی ہوگی کہ ایک میان میں دو تلواریں نہیں سما سکتیں۔ بالکل اسی طرح دو عورتیں ایک چھت کے نیچے نہیں رہ سکتیں۔ میری بدقسمتی کا آغاز اُس وقت سے ہوا جب میں اوشا ورما کے ساتھ باہر جانے لگا۔ پاسپورٹ بنوانے میں دوڑ دھوپ کرنی پڑتی ہے۔ میں اپنی بیوی سے کیا کہتا کہاں جانا پڑے گا؟ کس کس سے ملنا ہوگا!

چند دنوں تک تو میری بیوی نے اس صدمے کو برداشت کر لیا لیکن ایک دن اُس کی قوتِ برداشت نے جواب دے دیا اور میری ڈارلنگ مجھ پر برس پڑی۔

"تم ہر روز اُس کے ساتھ باہر گھومنے چلے جاتے ہو۔ شرم نہیں آتی؟"

"وہ میرے دوست کی بیوی ہے۔ شرم تمہیں آنی چاہئے جو مجھ جیسے باوقار آدمی پر تہمت لگا رہی ہو!"

"ہاں ہاں میں جانتی ہوں تم کتنے پاکباز ہو۔ ابھی پچھلے ہی سال تم نے اُس لڑکی کو . . . ."

"ارے آہستہ بات کرو! کوئی سُن لے گا تو کیا کہے گا!؟"

"جیسے لوگوں کی آنکھیں نہیں! کان نہیں!! سب میری طرح بُدھو ہیں نا؟ کل سے تم اُس کے ساتھ نہیں جا سکتے!"

"تو اُس کا پاسپورٹ کیسے بنے گا؟"

"خود بنوا لے!"

"لوگوں سے ملنا پڑتا ہے۔ ذرا سوچ سمجھ کر بات کرو۔ اکیلی جان اتنا سب کچھ کیسے کرے گی؟"

"جی ہاں وہ تو بچّی ہے۔ ابھی اُس نے چلنا پھرنا کہاں سیکھا ہے؟ دیکھتے نہیں محلّے کے سارے مردوں سے نہایت آزادی سے باتیں کرتی ہے۔ غریب مولندہ میں مارا مارا پھرتا ہے۔ یہ لونڈیا یہاں رومان لڑاتی ہے ـــــ ابھی جس کا مرد لندن میں رہے اُس کا کھانا ہضم نہ ہونا چاہئے۔ یہ دن رات گلچھرّے اُڑاتی ہے۔ بہترین کپڑے پہنے۔ چہرے پر پوڈر اور ہونٹوں پر لپ اسٹک لگا کر دندناتی پھرے۔ کل سے تم . . . ."

"بات تو سُنو!"

"بات کیا سنوں؟ محلے کی ساری عورتیں باتیں کرتی ہیں کہ تم جیسی معصوم اور بھولی عورت کوئی نہیں۔ ضرورت کے تقاضے پر مرد کو جانے کی اجازت دے رکھی ہے۔ تم تو نرکھی ہو گئی! ایسے بڑی عورتوں سے بچ کر رہنا چاہئے۔ مرد کا کوئی اعتبار ہوتا ہے! مرد ایک جوتی اُتارتا ہے دوسری پہنتا ہے۔ کل وہ تمہیں کوسے اُسے تو میں کیا کروں گی؟"

"کیسی اُلٹی سیدھی باتیں کر رہی ہو! تم ساوتری ہو کر ایسے جملے منہ سے نہیں نکالنے چاہئیں۔ ہندو استری کے لئے پتی پرماتما کے سمان ہوتا ہے اور تم اپنے پتی پر بھروسہ بھی نہیں کرتیں؟"

"بھروسہ گیا بھاڑ میں۔ میں اپنے شوہر کو دوسروں کے حوالے کر دوں؟ اپنے ہی پیروں پر خود کلہاڑی مار لوں؟ میں اتنی بھولی اور معصوم نہیں ہوں جی!"

"دیکھو رکمنی! پرماتما کے لئے یہ بات کر کے اپنے شوہر کی توہین نہ کرو۔ میں پرماتما کی قسم کھا کر کہتا ہوں، میرے دل میں کوئی پاپ نہیں۔ وہ بچاری پاسپورٹ بنوا لے، پھر دیکھ لینا، میں اُسی دن اُسے ہوائی جہاز پر سوار کرا دوں گا۔ ذرا دھیرج اور صبر سے کام لے۔"

"میں تو چھاتی پر پتھر رکھ لوں گی لیکن اس بلڈنگ کے لوگ اس عورت سے بے حد تنگ ہیں۔"

بیویوں کو سمجھانا ایک احمقانہ فعل ہے۔ میں خاموش ہو گیا۔ اُس شام جب اوشا ورما گھر میں داخل ہوئی تو وہ بے حد خوش تھی۔ دائیں ہاتھ میں ایک ٹوکری تھی جس میں آم تھے اور بائیں ہاتھ میں ایک لفافہ تھا، جس میں رکمنی کیلئے ساڑھی تھی۔

"بھابی تیرے لئے ساڑھی لائی ہوں۔"

رکمنی کچھ نہ بولی۔

"دیکھ تو سہی۔ پہنے گی تو پری لگے گی!"

"مجھے رام کرنے کا اچھا طریقہ ہے لیکن میں اس کے جھانسے میں ہرگز نہیں آؤں گی۔" رکمنی نے سوچا۔

"پہلے کھانا کھا لو پھر ساڑی دیکھ لوں گی۔" رکمنی ذرا کرخت لہجے میں بولی۔ رکمنی نے کچھ اس انداز سے کھانا پروسا، جیسے وہ کھانا نہیں بلکہ زہر دے رہی تھی۔ صاف ظاہر ہے کہ ہم دونوں نے زہر کھا لیا اور ایک دوسرے سے بات کئے بغیر سو گئے۔

جب میری بیوی صبح ہوتے ہی رسوئی میں جا کر چائے بنانے لگی تو اوشا ورما میرے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

"حضور آپ اُس کرسی پر تشریف رکھئے۔ ذرا مجھ سے دور۔"

انتظار

لاکھ آفتاب پاس سے ہو کر گزر گئے
ہم بیٹھے انتظارِ سحر دیکھتے رہے — جگر مرادآبادی

اے دلِ مرگ آشنا! خط کا جواب سُن لیا
اور تو بے قرار ہو اور تو انتظار کر — جوش ملسیانی

حد بھی کوئی انتظار کی ہے
اب چاندنی دھوپ ہو چلی ہے — بسمل سعیدی

اللہ ری بے خودی کہ ترے پاس بیٹھ کر
تیرا ہی انتظار کیا ہے کبھی کبھی — نریش کمار شاد

کس وسیلے سے رات گزرے گی
اب ترا انتظار بھی تو نہیں — نامعلوم

"کیوں جی؟ کیا بات ہے!؟" اُس نے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اس فلیٹ میں رہنا چاہتی ہو؟"

"کیوں نہیں؟"

"پاسپورٹ بنوانا چاہتی ہو؟"

"اسی کام کے لئے آئی ہوں۔"

"لندن جانا چاہتی ہو؟"

"WHY NOT"

"جانتی ہو لوگ تمہیں کیا کہتے ہیں؟"

"کیا کہتے ہیں؟"

"کہتے ہیں تم بُری عورت ہو۔ بد اخلاق ہو۔ مجھ سے پیار کرتی ہو۔"

"یہ بلڈنگ ہے یا پاگلوں کا ہسپتال؟" اور پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"تمہارے ہنسنے سے بات نہ بنے گی۔ اوشا لوگوں کو تمہارا چلن پسند نہیں۔ تمہاری لپ اسٹک سے نفرت ہے۔ تمہارے بلاؤز، تمہاری پینٹ سے نفرت ہے۔ تم جو دوسروں سے ہنس کر اور مسکرا کر بات کرتی ہو، اُس سے عورتیں جلتی ہیں۔ اُن کی نیندیں حرام ہو گئی ہیں۔ دن رات میری بیوی کو بھڑکاتی ہیں۔"

"تو پھر میں کیا کروں؟"

"تم اپنے آپ کو بدلو۔"

"یہ نہ ہوگا رمیش! میں اپنے آپ کو بدلنے پر تیار ہوں اگر میں غلطی پر

میں اوشا درما سے کیا کہتا، جس کی میں عزت کرتا تھا مجھے تو اس میں کوئی غلطی نظر نہ آتی تھی جس کی طرف اشارہ کر سکتا۔ میں بھی وقت کا انتظار کرنے لگا۔ اپنی قسمت کو وقت کے حوالے کر دیا۔ واقعات اور حالات جس طرف لے جانا چاہیں گے لے جائیں گے۔ میرے بس میں کچھ نہیں۔

دو دن کے بعد ہماری بلڈنگ کی سامنے والی سڑک سے میونسپل کمیٹی کے کارکنوں نے ایک کتے کو پکڑ کر لاری میں رکھ لیا۔ بچوں نے شور مچایا۔ محلے کی عورتیں باہر نکل آئیں۔ کمیٹی کے کارکنوں کے سامنے گڑگڑائیں۔ اُن کی منتیں کیں۔ کارکنوں نے صرف یہ کہا۔

"ہمیں آوارہ کتوں کو گولی مارنے کا حکم ہے۔ اگر یہ پالتو کتا ہے تو اس کا پٹہ کہاں ہے؟"

عورتیں اور بچے میونسپل ورکروں کے پیچھے پڑے ہوئے تھے کہ ہمارے محلے کا کتا ہے اسے چھوڑ دو۔

"اس کا پٹہ کہاں ہے؟" ایک کارکن چلایا۔ پٹہ تو کتے کے گلے میں نہ تھا۔

"اس کتے کے مالک کو تھانے بھیج دو! وہیں فیصلہ ہوگا۔"

سب لوگ کام کاج پر گئے ہوئے تھے۔ عورتوں میں اتنی ہمت نہ تھی کہ سرکاری تھانے میں بیٹھ کر کتے کو واپس لے آئیں۔ اُس وقت اوشا ورما نے ہمت کی اور وہ تھانے گئی اور ایک گھنٹے بعد کتے سمیت واپس لوٹی اور کتے کو مالکن کے حوالے کیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کتے کا پٹہ دیا اور ایک رسید۔

بچے تو بے حد خوش ہوئے لیکن عورتوں نے ناک بھنویں سکیڑ لیں۔ ایسی عورت جو مردوں کا مقابلہ کرے انہیں قطعی پسند نہ تھی۔ وہ اس محلے کو ناپاک نہ کر دے گی۔ بھلا اس کی موجودگی سے بچوں پر کیا اثر پڑے گا۔ دو دن کے لئے کیا آئی، ڈیڑھ مہینے سے یہیں پڑی ہوئی ہے۔ جانے کا نام نہیں لیتی۔ محلے میں انہیں عورتوں نے سب کو بلا کر میٹنگ کی اور رکمنی کو آڑے ہاتھوں لے لیا۔

"اری تو سمجھ دار ہوتی تو نوبت یہاں تک نہ آتی۔"

"بہن میں کیا کروں؟"

"اسے اس کی چوٹی پکڑ کر گھر سے باہر کر دے۔"

"اسے کس بات پر گھر سے باہر کر دوں راج کی ماں۔"

"اب باتیں بھی ہمیں بتائیں؟ کیا تیری آنکھوں پر پٹی بندھی ہے۔ جب سر سے پلو ڈھلک جائے گا تب تمہیں ہوش آئے گا! تمہاری نند کی وجہ سے ہمارے شوہروں کے منہ میں پانی آنے لگا ہے۔"

"تم نہیں جانتیں۔ جدھر وہ جاتی ہے سب کی نگاہیں اسی طرف جاتی ہیں۔"

"کل میرا پتی مجھ سے کہہ رہا تھا تم بھی پینٹ پہنا کرو۔"

"سن لو رکمنی! جب وہ دوکان سے آئے تو آتے ہی کہنے لگے، سوہن کی ماں بازار کپڑوں سے بھرا پڑا ہے۔ اچھے سے کپڑے خرید لا۔ کسی اچھے سے درزی سے سلا اور انہیں سلیقے سے پہن۔ دیکھتی نہیں رکمنی کے گھر میں جو عورت آئی ہے۔ کیا جل پری سی بنی رہتی ہے۔"

"اور میرے شوہر رات کو مجھ سے کہہ رہے تھے بال کٹوا لے اور ناگن کی طرح بل کھا کر میری طرف دیکھ! دیکھتی نہیں رکمنی کے گھر جو عورت . . . ."

"اس عورت نے تو ہمارا جینا حرام کر دیا ہے۔ یہ عورت نہ آتی تو مزے سے گذر رہی تھی۔ ایک تو مردوں کے لئے کھانا پکاؤ۔ دن رات محنت کرو۔ اُن کے بچوں کو پالو۔ بن ٹھن کر اُن کا انتظار کرو۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک لگاؤ، مٹک مٹک کر چلو۔ پینٹ پہنو۔ ہنس کر بات کرو۔ ہم گھر کی عورتیں ہیں کہ بازاری عورتیں ہو دیکھ بہن! اب بھی وقت ہے۔ ذرا سنبھل کر چل۔ ورنہ بنا بنایا گھر اُجڑ جائے گا۔ گھر آباد کرنے میں بڑا وقت لگتا ہے لیکن برباد ہونے میں دیر نہیں لگتی۔"

بس جتنے منہ اتنی باتیں۔ سب کا غم و غصہ اوشا ورما پر نکلا۔ کمیٹی میں بیٹھ کر سب عورتوں نے اوشا کو وہ صلواتیں سنائیں کہ خدا بھی سنتا تو پناہ مانگتا۔ ابھی باتیں ہو رہی تھیں کہ اچانک ایک لڑکی دوڑتی ہوئی آئی۔

"ہائے رام! کندن لعل تو بے ہوش ہو گیا ماں جی!"

سب عورتیں لڑکی کے پیچھے بھاگیں۔ کمرے میں جا کر دیکھا تو کندن بے ہوش پڑا تھا۔ آنکھیں چڑھی ہوئیں اور سانس بڑی مشکل سے آ رہی تھی۔ لب بھینچے ہوئے تھے اور ہاتھ پاؤں میں تشنج تھا۔ دن کے تین بج چکے تھے۔ مرد اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ اُس وقت اوشا ورما کو کسی نے آ کر اطلاع دی کہ ایک لڑکا بے ہوش ہو گیا ہے۔ وہ لڑکے کو دیکھنے کے لئے داخل ہوئی۔ پہلے تو سب نے ناک منہ چڑھایا۔ جب دیکھا کہ یہ کام اُن کے بس کا نہیں تو سب خاموش ہو گئیں۔

اوشا نے ایک لڑکی سے پوچھا "یہاں قریب ہی کوئی ڈاکٹر ہے؟"

"ہے دیدی۔"

"مجھے اُن کے پاس لے چلو۔"

اوشا ورما اور وہ چھوٹی لڑکی ڈاکٹر کے پاس پہنچیں۔ ڈاکٹر کو جگایا۔ ٹیکسی لی اور کندن کو دکھایا۔ ڈاکٹر نے دوا دی، اوشا نے پھر ٹیکسی کی۔ دوا لائی اور

کندن کو دوا پلائی۔ دوا سے کندن کو کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اوشا پھر ڈاکٹر کے پاس گئی۔ ڈاکٹر نے پھر دوسری دوا دی۔ اوشا دوپہر کے دو بجے سے صبح چار بجے تک اُس لڑکے کے سرہانے بیٹھی رہی۔ عورتیں آتیں۔ لڑکے کے متعلق پوچھتیں اور چلی جاتیں۔ صرف ایک اوشا ہی تھی جس نے ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق اُس لڑکے کی دیکھ بھال کی۔ اور اُس کی جان بچالی۔ کندن نے پانچ بجے کے قریب آنکھیں کھولیں اور کہنے لگا "ماں!"

کندن کی ماں دوڑتی ہوئی آئی اور بیٹے کے سرہانے بیٹھ گئی۔ اوشا اٹھنے لگی

"تمہیں بہن تو بیٹھ۔ اصل میں تو ہی اس کی ماں ہے!"

"نہیں ماں جی ایسی بھی کیا بات ہے۔ سیوا کرنا تو انسان کا فرض ہوتا ہے۔"

"لیکن بیٹی ہمارا بھی کچھ فرض ہے۔ ہم نے تمہارے متعلق نہ جانے . . ."

وہ خاموش ہوگئی اور منہ پھیر لیا۔ کندن کی ماں نے محلے کی ہر عورت سے یہ بات کہی۔ کندن کی بیماری کی بات بڑھا چڑھا کر سنائی۔ اوشا کی بے لوث خدمت کا ذکر کیا۔ دو ہفتے کے بعد اوشا کو پاسپورٹ مل گیا۔ اور جب وہ ٹیکسی میں بیٹھنے لگی تو ٹیکسی کے چاروں طرف عورتیں کھڑی تھیں۔ سب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ پیار اور ندامت کے آنسو۔۔۔ "بہن! ہم سے بھول ہوئی۔ معاف کرنا۔ ہم نے تمہیں جھنان سمجھا تھا لیکن تم تو دیوی نکلیں۔"

غزل

پروفیسر جمیل مظہری ایم۔ اے

کبھی ابھی صبح، ابھی شام ہوئی جاتی ہے
زندگی گردشِ ایام ہوئی جاتی ہے

تھا محبت کے لئے موت کا ارماں مخصوص
مگر اب تو یہ ہوس عام ہوئی جاتی ہے

اے دعا مانگنے والے تری ہر دم کی دعا
اب خدا کے لئے دشنام ہوئی جاتی ہے

کارواں آ ہی گیا تا بہ سوادِ تشکیک
منزل اب زحمتِ یک گام ہوئی جاتی ہے

جس پہ تہذیب نے رکھی تھی حیا کی تہمت
وہ ادا اور بھی بدنام ہوئی جاتی ہے

مژدہ اے ذوقِ سخن جنبشِ لب ہائے جمیل
جنبشِ پردۂ الہام ہوئی جاتی ہے

جمیل مظہری

غزل

نسیم عباسی امروہوی

ہائے یہ کیا ستم ہوا آنکھ تری چھلک گئی
کیا مرے اشکِ غم کی بات خلوتِ ناز تک گئی

اُن کو چلے تھے ڈھونڈنے اُنکا نشاں نہ مل سکا
بجھ گئے فکر کے چراغ، چشمِ خیال تھک گئی

پا کے نگاہِ التفات ہوگئے تازہ دل کے زخم
کِھل گئے گلستاں میں پھول، بادِ صبا لہک گئی

یہ تو خبر ہے محو تھا رات میں تیری یاد میں
یہ نہیں کچھ خبر کہ کب آنکھ مری جھپک گئی

یوں بھی کیا کہ بارہا پھونک دیے دل و جگر
یوں بھی ہوا کہ غم کی آگ اشک بنی ٹپک گئی

حادثۂ نگاہ کو ہوگئیں مدتیں نسیم
زخم نہ مندمل ہوئے دل کے نہ وہ کسک گئی

افسانہ

آخری خواہش

ظفر اوگانوی ایم۔ اے

نشیمن۔ رمنہ روڈ۔ پٹنہ۔ ۴

۸ر اپریل ۶۴ء

گرامی قدر اخلوص و عقیدت

آپ نے افسانہ نمبر کی تیاریاں شروع کردی ہوں گی۔ اور ہم سب ابھی سے جون کے مہینے کا انتظار کر رہے ہیں اس یقین کے ساتھ کہ "بیسویں صدی" کا یہ نمبر بھی اپنے اندر نئے جلوے لئے آئے گا ـــــ افسانہ نمبر کے لئے خطوں پر مشتمل ایک کہانی "آخری خواہش" ارسال ہے۔ خطوں کے فارم پر جو قدرت محترمی جناب زکی انور کو ہے وہ کم ہی لکھنے والوں کے حصے میں آئی ہے۔ انھوں نے اس ٹیکنک پر "بیسویں صدی" میں جو کہانیاں لکھی ہیں وہ قابلِ ستائش ہیں۔ لیکن میں نے کہاں تک کامیابی حاصل کی ہے یہ تو آپ ہی بتائیں گے یا پھر "بیسویں صدی" کے ذہین قارئین ـــــ اس کہانی پر مجھے صرف اتنا ہی کہنا ہے کہ بڑا بننے کا خواب ہر ذہن میں ہوتا ہے۔ اس کی پہلی منزل ذہانت اور فکری انفرادیت ہے مگر کتنے پڑھے لکھے لوگ اس منزلِ فکر و آگہی پر پہنچ پاتے ہیں اور ان میں سے کتنے ہیں جو ذہن و فکر کی اس انفرادیت کا مفہوم جانتے ہیں؟ ـــــ میں بتانا چاہتا ہوں کہ دوسروں کا مذاق اڑانا (جو ان دنوں ذہانت کا معیار سمجھا جانے لگا ہے) کوئی بڑی بات نہیں۔ یہ بہت ہی چھوٹے ذہن و دماغ والوں کی خاصیت ہے جو محض معمولی سی مشق سے حاصل ہو جاتی ہے۔ ایسے لوگ بزدل ہوتے ہیں اور اپنے کمتری کے احساس پر پردہ ڈالے رکھنے کے لئے وِٹ کو مسلط کر لیتے ہیں تاکہ انھیں ذہین کہا جائے لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ بڑائی اور حقیقی عظمت یہ ہے کہ خود مذاق بنا جائے تاکہ کچھ ہی دیر کے لئے سہی دوسروں کو اس طرح یہ تو احساس ہو سکے گا کہ وہ بھی "کچھ" ہیں۔ عظیم شخصیتیں حقیقت میں وہ ہوا کرتی ہیں جو دوسروں کو عظیم بننے کے لئے موقع دیتی ہیں اور اپنا مذاق خود اڑانے کا سامان بہم کرتی رہتی ہیں اور اس کے لئے وہ اپنے بعض پوشیدہ پہلوؤں کو بھی منظرِ عام پر لاتے ہوئے کسی طرح کی جھجک نہیں محسوس کرتیں۔ حالانکہ ایسا کرنے میں کبھی کبھی بہت بڑا خطرہ بھی اپنے سر لینا پڑتا ہے۔ برطانیہ کے عظیم مفکر اور فلسفی رابرٹ لینڈنے اپنے پیپر آن سیکنڈ [illegible] میں اس موضوع پر بہت واضح اور مدلل بحث کی ہے ـــــ میں نے بھی "آخری خواہش" میں اسی لطیف موضوع پر ایک لطیف پیرایہ میں قلم اٹھایا ہے۔ ضرورت ہے کہ اسے غور سے پڑھا جائے اور خطوں پر دی گئیں تاریخیں یاد رکھی جائیں۔ ورنہ ظاہری نگاہ میں یہ ایک بہت معمولی اور سیدھی سادی کہانی ثابت ہو سکتی ہے۔ اسی لئے میں نے کہا کہ مجھے آپ اور آپ کے ذہین (میری مراد اُن ذہین حضرات سے نہیں ہے جن کا تذکرہ میں نے اوپر کے جملوں میں کیا ہے) قارئین سے یہ توقع ہے کہ مجھے اپنے "ردِ عمل" سے مطلع کریں گے ....

مخلص کار ظفر اوگانوی

پاٹن پٹنہ ۳

محترمہ بیگم رضا جلالی اخلاص بیگماں

مجھے اس کا بھی احساس ہے کہ آپ ایک سال میں کم از کم [illegible]

میں آپ نے میری کہانیوں کو سراہا ہے۔ دل کھول کر تعریفیں کی ہیں [illegible]

[illegible]

ایسا کیوں کیا۔ یہ میں نہیں جانتا لیکن غیر شعوری طور پر میں نے اپنے خطوں کو سب کی نظروں سے پوشیدہ رکھنے کی خواہش اپنے اندر محسوس کی ہے۔ پھر ایسا ہوا کہ آپ نے تین ماہ سے میری تصویر کا تقاضا شروع کر دیا۔ آپ کی اس خواہش پر میرے دل کی دھڑکنیں کچھ تیز ہو گئیں۔ ایسے میں فیصلہ بھلا کس طرح ہو سکتا تھا کہ پہلے آپ کے تمام خطوں کا جواب دیا جائے یا پہلے تصویر بھیجی جائے۔ لیکن دوسرے خط میں آپ کی یہ خواہش اور شدید ہو گئی پھر تیسرے خط میں آپ نے میری خاموشی پر مجھے کیا کچھ نہیں لکھا۔ یہ میرا ہی دل جانتا ہے۔ آپ کے تمام خطابات شکریے کے ساتھ میں قبول کرنے کو تیار ہوں لیکن میں اس بات کو کبھی گوارا نہیں کر سکتا کہ کوئی مجھے مغرور کہہ دے۔ آپ مجھے مغرور کہتی ہیں تو شاید میں آپ کو جواب دینے کو وقت کبھی نہ نکال پاتا۔ ایک تو آفس کے کام سے فرصت ہی کم ملتی ہے۔ [illegible] کے رجسٹروں میں۔ سیلز اور سپلائی کے کاغذوں کے ہجوم میں اور دوکانوں کے چکر میں خود کو بھی بھول جاتا ہوں کبھی اگر وقت ملا بھی تو سب کچھ چاہتا ہے پڑھوں یا لکھوں ـــــ لیکن آپ نے صرف ایک لفظ سے میری انا کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور میں مجبور ہو گیا کہ آپ کو خط لکھوں۔ میں پھر کہتا ہوں کہ کوئی بھی ادیب مغرور نہیں ہوتا۔ بڑے لوگوں کو (میری مراد [illegible] سے ہے) عام لوگوں نے غلط سمجھا ہے۔ کبھی کبھی یہ غلط فہمی اس حد تک مہلک ہو جاتی ہے کہ اس سے بعض بڑے اور حساس ذہن متاثر ہو کر تباہ ہو جاتے ہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے نہ میں بڑا ہوں اور نہ مغرور۔ آپ کا شکوہ بجا کہ میں نے آپ کو کسی خط کا جواب نہیں دیا لیکن اس کا مطلب یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ میں حُسن کی اداؤں کو بل کھاتا ہوا دیکھنا چاہتا تھا۔ آپ کی ناراضگی سر آنکھوں پر کہ میں نے اپنی تصویر نہیں بھیجی لیکن اس کا سبب یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ خوبصورت کہانیاں لکھنے والا بذات خود خوبصورت نہ ہو۔ اسی لئے میں نے آپ سے کہا تھا کہ جذبات اہم ہوتے ہیں تصویروں کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ جو لوگ تصورات کی افادیت کے قائل ہوں گے وہ ظاہری خد و خال کو یقیناً ثانوی حیثیت دیں گے۔ اسی بنا پر میں نے آج تک تمام ایڈیٹروں اور پڑھنے والوں کے شدید اصرار کے باوجود اپنی تصویر کسی کو نہیں بھیجی۔ یہ میرا فیصلہ تھا کہ میں اپنی تصویر کسی کو نہ دوں گا ـــــ لیکن آپ کی ضد کی وجہ سے مجھے اپنا فیصلہ بدلنا پڑ رہا ہے۔ نہ جانے کیوں پہلی بار تمہاری ـــــ اوہ! معاف کیجئے گا آپ کی ضد مجھے بہت پیاری معلوم ہوتی ہے۔ لیجئے تصویر حاضر ہے۔ کوئی خاص بات؟

خلوص کیش ـــــ اشرف ممتاز

کمل، بمبئی ۱۸

۱۴ جنوری [illegible]

میرے پیارے اشرف!

[illegible] مجھے اس طرح کے بے تکلف تخاطب میں کتنا سکون مل رہا [illegible] مجھے ایسی مسرت ہوئی جیسے مجھے کوئی لازوال دولت مل گئی ہو۔ یہ اس لئے کہ اس سے پہلے تمہارے خط کے لئے میں کتنے صبر آزما لمحوں سے دوچار ہوئی ہوں۔ پوسٹ مین کو کتنی بار ناحق جھڑکا ہے کہ وہ میرے خط ادھر اُدھر ڈال آتا ہے۔ پھر کتنی ہی بار حسرت بھری نگاہوں سے جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ آج میرا صبر کھل گیا ہے اور دنیا میری نظروں میں جنت بن گئی ہے...... تم شاید یقین نہ کرو گے کہ آج سے پہلے میرے گھر والوں نے اتنا زیادہ خوش مجھے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ آج سبھی کو حیرت تھی، ممی میری [illegible]۔ باجی بات کی تہہ تک نہیں پہنچ سکیں۔ یہ سب صرف اسی حد تک سوچ سکیں کہ [illegible] بی۔ اے میں فرسٹ پوزیشن حاصل کر لی ہے۔ ہو سکتا ہے تمہیں بھی میری اس کامیابی میں خوشی کا کوئی شاندار پہلو نظر آ جائے اور یہ کہ تم بھی اوروں کی طرح مجھے پرخلوص مبارکباد کی روایات میں جکڑ دو۔ اگر واقعی تم نے ایسا کر ڈالا تو یقین مانو میں سمجھوں گی کہ تم بھی دوسروں کے ذہن سے سوچنے کے عادی ہوتے جا رہے ہو۔ میرا خیال ہے کہ ذہن و دماغ ایک عظیم نعمت ہے جس کا بہترین مصرف یہ ہے کہ اس سے سوچا جائے اور دوسروں کی سوچ پست ہی جائے۔ ورنہ ذہن مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے اور مفلوج ذہن انسان کے لئے سب سے بڑی لعنت ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے کہہ رہی ہوں کہ ڈیڈی جو شہر کے بڑے تاجر ہیں۔ جن کا مقصد صرف روپیہ کمانا اور خوشی سے خزانے جمع کرنا ہے وہ بھی صحیح یا غلط اپنا ایک انداز فکر رکھتے ہیں۔ تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ میری اس کامیابی پر انہوں نے صرف اتنا ہی کہا کہ میری بیٹی ہندوستان کی ہزاروں اچھی ذہین اور محنتی لڑکیوں میں ایک ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ انہوں نے انتہائی پیار سے مسکراتے ہوئے تمہارا خط مجھے بڑھا دیا۔ ڈیڈی نے خط بھی پڑھ لیا تھا۔ اس بات کو میں نے محسوس کرتے ہوئے بھی اپنے چہرے پر جب کوئی تاثر نہ آنے دیا تو انہوں نے مجھے گلے سے لگا لیا اور کہا کہ میری رعنا بھارت کی لاکھوں لڑکیوں میں ایک ہے۔

میرے پیارے! میں تم پر یہ سب کچھ اپنی صلاحیت کا رعب جمانے کے لئے نہیں لکھ رہی ہوں۔ میں نے تفصیل کے ساتھ یہ باتیں اس لئے لکھی ہیں کہ تمہیں میرے ماحول کا تجزیہ کرنے میں کوئی دشواری نہ پیش آئے۔ ہاں تو۔ ڈیڈی نے خط پڑھ لیا ہے وہ سب کچھ سمجھ گئے ہیں۔ اور اب ان سے کچھ کہنے سننے کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی ہے۔

ارے ہاں! ڈیڈی کو بھی تمہاری تصویر پسند آئی ہے۔ لیکن برا نہ مانو تو ایک بات کہوں کہ اتنی اچھی خاصی شکل اتنی جاذب نظر شخصیت اور اس پر یہ داڑھی، یہ گوگلس اور پھر یہ [illegible] کیپ۔ مجھے کچھ جچا نہیں۔ میرے اچھے اشرف! تم نے لکھا ہے کہ میری ضد تمہیں اچھی لگی ہے اگر ایسا ہے تو پھر میری ایک چھوٹی سی ضد اور ہے وہ یہ کہ تم داڑھی...... بھئی صاف بات یہ ہے کہ میں تمہیں یوں دیکھنا نہیں چاہتی۔ سمجھ گئے نا! تم داڑھی رکھ کر [illegible]

تمہاری اپنی ـــــ رعنا کمل

ن بمبئی ۱۵

۱۰ جنوری ۶۳ء   میرے اشرف!

تمہاری تازہ ترین کہانی "گلشن نا آفریدہ" پڑھنے کے بعد تمہاری فنکارانہ عظمت کا احساس تو کبھی کو ہوا ہوگا لیکن تم نے میرے لئے جو قربانی کی ہے اس کی بنا پر میں یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ تم صرف ایک عظیم فنکار ہی نہیں ہو ایک عظیم انسان بھی ہو ـــــ تم مجھے کتنا چاہتے ہو۔ اس کا اندازہ مجھے تمہاری اِس تصویر سے ہو گیا۔ تازہ تصویر جو تمہاری عظیم قربانی کی تصویر ہے۔ ونڈرفل! اِس میں تم کتنے وجیہہ نظر آتے ہو۔ کوئی اِس وقت میری آنکھوں سے دیکھے۔ ویسے ڈیڈی بھی اب اپنی اکلوتی بیٹی ہی کی آنکھوں سے تمہیں دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ اُن سے تو خدا سمجھے۔ یہ بھی کوئی بات ہے کہ جب بھی میں اُن کے پاس گئی انھوں نے بس تمہارا تذکرہ چھیڑ دیا۔ مستقبل کے لئے جیسے اُن کے پاس کوئی اور موضوع ہی باقی نہ رہ گیا ہو۔ صرف تمہارا ذکر۔ تمہاری شخصیت اور تمہارے افسانوں کی تعریف۔ میں کتنی ہی ماڈرن سہی لیکن ہوں تو ایک لڑکی۔ وہ بھی کنواری۔ ویسے میں شرم کے مارے پسینے پسینے ہو جاتی ہوں۔ پھر بھی جی یہی چاہتا ہے کہ کوئی تمہاری تعریف کرتا رہے اور میں سنتی رہوں۔ سنتی رہوں اور زندگی بیت جائے ـــــ دیکھو نا! میں آج ہی ڈیڈی سے کہہ رہی تھی کہ میری کار اب پرانی ہو چکی ہے۔ کوئی نیا ماڈل منگا دیجئے۔ سُنو گے انھوں نے کیا جواب دیا۔ کہنے لگے اب بیک وقت مجھے دو کاریں خریدنی پڑیں گی۔ مجھے بے حد حیرت ہوئی آخر ڈیڈی صرف میرے لئے دو کاریں کیوں خرید رہے ہیں۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے صاف لفظوں کہہ دیا کہ تمہارے اشرف کے لئے بھی تو ایک کار چاہئے ـــــ میں کیا بتاؤں اس وقت میری کیا حالت ہوئی ـــ پھر جب ڈیڈی نے کہا کہ "تمہارے اشرف" اُس وقت میرا دل بلیوں اچھلنے لگا تھا۔ اور اسی لمحہ میرے اشرف کی قسمت پر مجھے رشک آیا تھا شخصیت کا جادو اب ڈیڈی کے سر پر چڑھ کر بولنے لگا ہے۔

بھئی ہاں! یہ تم نے کیا کیا؟ تم سیاہ چشمہ اس تصویر میں بھی لگائے ہوئے ہو۔ دیکھو اب کی بار تصویر کھنچوانے سے پہلے ذرا یاد کر کے چشمہ اُتار دینا۔ سیاہ چشمے میں تم سی۔ آئی۔ ڈی نظر آتے ہو۔ اور پیارے! سچ مانو مجھے سی۔ آئی۔ ڈی والوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ کیا میری اس چھوٹی سی خواہش کا احترام کر سکو گے؟

صرف تمہاری ـــــ رعنا

ن بمبئی ۱۵

۱۰ جنوری ۶۳ء

میں جانتی ہوں کہ میں کیا ہوں (خود کو کتنے کم لوگ پہچانتے ہیں۔ اکثر خود کو کبھی سوا کبھی زیادہ اور کبھی کم) یا پھر میرا آئینہ گواہ ہے۔ اور اگر واقعی میں تمہیں اچھی لگی ہوں تو اِس سے زیادہ میری اور کیا خوش قسمتی ہو سکتی ہے..... اِن دنوں تم مجھے ہر لمحہ آ آ کر ستانے لگے ہو۔ میری سانس پھول جاتی ہے اور نشہ ہی نشہ رگ و پے میں سماتا لگتا ہے۔ ایسے میں تم میرے پاس ہوتے ہو اور تمہارا لمس مجھے پاگل کر دیتا ہے۔ لیکن کیا بتاؤں کہ اب مجھ میں انتظار کی گھڑیاں گننے کی بھی طاقت ختم ہوتی جا رہی ہے۔ کاش!..... ستم بالائے ستم یہ کہ ڈیڈی کو اِس ماہ میں کہیں جانے کی فرصت ہی نہیں ہے۔ انھوں نے کہہ رکھا ہے کہ آئندہ ماہ کے شروع میں وہ پٹنہ جا کر تمہاری ممی سے بات کریں گے۔

اِس بار بھی تمہارا خط ڈیڈی ہی کے ہاتھوں میں پڑ گیا۔ انھوں نے لفافہ کھولا۔ خط پڑھا اور تمہاری تصویر بہت غور سے دیکھتے رہے ـــــ اور میں تو تمہاری تازہ تصویر دیکھ کر کیا کہوں کہ کیسے کیسے ہچکولے کھانے لگی تھی۔ اُف! یہ بڑی بڑی مخمور آنکھیں۔ اِن میں تمہاری شخصیت کے سبھی اسرار مجھے نظر آ گئے۔ تمہاری اِن آنکھوں میں بلا کی ذہانت ہے۔ اِنہیں آنکھوں میں مجھے عزم و بلند حوصلگی کا عکس بھی نظر آ رہا ہے۔

میرے اشرف! تم رہ رہ کر مجھے کیوں ستانے لگے ہو۔ اب دیکھو نا! اِس بار تم نے چشمہ تو اُتار دیا لیکن سُوٹ اور کشتی کیپ کا کیا کمبینیشن ہے۔ میری سمجھ میں خاک نہیں آیا۔ تم اِنکم ٹیکس کے ایک آفیسر ہو۔ تمہیں ٹوپی کسی طرح بھی زیب نہیں دیتی۔ ہائے اللہ! میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ تمہاری شخصیت کو پُر وقار بنانے میں تمہارے گھنگریالے سیاہ اور چمک دار بال کتنے معاون ثابت ہوں گے ـــــ یہ سب کچھ میں اِس یقین کے ساتھ کہہ رہی ہوں کہ میری آخری بات مان لینے میں تمہیں کوئی ہچکچاہٹ نہ ہوگی۔

تمہاری اور صرف تمہاری ـــــ رعنا

ن بمبئی ۱۸

۸ فروری ۶۳ء   میرے محبوب! مجتبیٰ

تم تو بے ناحق کانٹوں میں گھسیٹنے لگے۔ میں تمہیں اپنی تصویر بھیجنے سے گریز کر رہی تھی۔ میری تصویر میں جو کچھ بھی تم نے دیکھا ہے میں اُسے تمہارا حُسنِ نظر ہی کہہ سکتی ہوں۔ اِس لئے کہ

جمن، بمبئی ۱۵

۱۵ فروری ۶۳ء   مکرمی جناب اشرف صاحب! آداب و عقیدت

یہ میری بدقسمتی ہے کہ میں اپنی آخری خواہش کی وجہ سے آپ کو کھو بیٹھی اور ڈیڈی بھی ناراض ہو گئے۔ جب وقت سے انھوں نے یہ تصویر دیکھی ہے وہ میرے خون کے پیاسے ہو گئے ہیں۔ اگر میں آپ سے یہ نہ کہتی تو آپ کا بھانڈا سر دیکھنے سے بچ جاتی.....

خدارا آپ مجھے معاف کر دیجئے۔   والسلام

مس رعنا جمال

دفتر اِنکم ٹیکس سپرنٹنڈنٹ بہار رینج پٹنہ

۱۵ فروری ۶۳ء   شری جمال گدڑی والا بمبئی کلاتھ سپلائر۔ بمبئی

آپ کو نوٹس دیا جاتا ہے کہ پٹنہ کلاتھ اسٹور اینڈ جنرل سپلائر جو آپ کا برانچ زیر چپ ہے۔ اس میں ہمارے محکمہ کے نئے آفیسر شری اشرف جمال نے چند شکوک کی بنا پر سیلز اور سپلائی کے رجسٹروں کی جانچ کی اور پتہ چلایا کہ تقریباً دو لاکھ روپے انکم ٹیکس کے اب تک ادا نہیں کئے گئے ہیں۔ نیز یہ کہ ہمارے اس لائق اور ہونہار آفیسر نے آپ کے زیر چپ کچھ جعلی رجسٹر بھی برآمد کر لئے ہیں۔

لہٰذا انکم ٹیکس کی عدم ادائیگی اور حکومت کو دھوکہ دینے کے الزام میں آپ کے برانچ زیر چپ پر پولیس کا سربمہر تالا ڈال دیا گیا ہے، منیجر کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اور آپ کے خلاف پٹنہ کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا گیا ہے۔ مقدمہ کی تاریخ کی اطلاع عدالت کے ذریعہ بعد میں دی جائے گی۔

دستخط اور مہر
انکم ٹیکس سپرنٹنڈنٹ
بہار ونگ پٹنہ
نوٹس ۵۶۱۷/۶۲ I.T.

غزل

سردار پورن سنگھ ہنر ــــــ

جو بلا کبھی نہ جائے اُسے آپ کیا کہیں گے
جو پلٹ پلٹ کے آئے اُسے آپ کیا کہیں گے

یہ بجا کہ حسن اُس کا ہے ہمیشہ جلوہ آرا
جو کبھی نظر نہ آئے اُسے آپ کیا کہیں گے

وہی زور برق و باراں وہی شورِ دل فگاراں
جو سماں لہو رلائے اُسے آپ کیا کہیں گے

یہ نظر تو آرہا ہے کہ جہاں مقام غم ہے
جو یہاں بھی مسکرائے اُسے آپ کیا کہیں گے

یہ سہی کہ سعی بے جا ہے فریب زندگی کا
جو نصیب آزمائے اُسے آپ کیا کہیں گے

جو رلا کے پھر ہنسائے وہ تو دل نواز ٹھہرا
جو ہنسا کے پھر رلائے اُسے آپ کیا کہیں گے

کسی بے وفا سے بھی ہو جسے آرزو وفا کی
جو اُسی کے گیت گائے اُسے آپ کیا کہیں گے

پورن سنگھ ہنر

غزل

محمد عبدالقیوم صدیقی مست فتحپوری ــــــ

کیوں کسی کی نگاہ سے پوچھو
خستگی دل کی، آہ سے پوچھو

کس سہارے پہ جی رہا ہوں میں
کرم بے پناہ سے پوچھو

اپنے حُسن و جمال کی تابش
پرتوِ مہر و ماہ سے پوچھو

دل کے کیسی اُتر گئی دل میں
یہ خود اپنی نگاہ سے پوچھو

کس لئے میں گناہ کرتا ہوں
رحمتِ بے پناہ سے پوچھو

زخم کتنے ہیں میرے پہلو میں
اپنے تیرِ نگاہ سے پوچھو

شوق منزل میں کتنی لذت ہے
کسی گم کردہ راہ سے پوچھو

محمد عبدالقیوم صدیقی مست

افسانہ

فریب

پروفیسر حامدی کاشمیری ایم۔اے

انت ناگ کشمیر
۷رمئی ۱۹۶۴ء

پیارے بھائی! تسلیم

ایک تازہ افسانہ بعنوان "فریب" بھیج رہا ہوں، افسانہ قدرے تاخیر سے ملے گا۔ لیکن مجھے اُمید ہے افسانہ نمبر میں جگہ پائے گا ۔۔۔ انت ناگ کی شاداب بہاروں میں اکثر آپ کو یاد کرتا ہوں ! کیا ان گرمیوں میں آپ اِدھر کا پروگرام نہیں بنا سکتے؟ ہم سب آپ کے لئے چشم براہ ہیں۔ اُمید ہے، اس بار بھی افسانہ نمبر ایک یادگار ادبی صحیفہ بن کر سامنے آئے گا ۔۔۔

آپ کا بھائی ــــ حامدی کاشمیری

میں نے آج بھی کامنی سے کچھ نہ کہا، بس اُس کی باتیں سنتی رہی۔ وہ مدھم سے لہجے میں میٹھی میٹھی باتیں کرتی ہے، اور میں خواب دیکھتی ہوں، میری پلکیں بوجھل ہونے لگتی ہیں۔ میں اُس کے چہرے کو دیکھتی ہوں، اُس کے چہرے کی ذہانت اور پیار کی روشنی میری آنکھوں کو بھاتی ہے۔ میں اپنی نظریں اُس کے چہرے سے ہٹانا نہیں چاہتی۔ جب وہ مسکراتی ہے تو کتنے پھول کھل اُٹھتے ہیں، میں پھولوں کی وادی میں نکل جاتی ہوں، اور کامنی کہتی ہے، شیلا تم سپنوں کی رانی ہو۔ تمہاری آنکھوں میں کتنے خواب بسے ہوتے ہیں۔ اِن بڑی بڑی آنکھوں میں دیکھتی ہوں، تو مجھے اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے، جیسے میں ان آنکھوں میں ڈوب جاتی ہوں۔ جھیل کی طرح شاداب اور خاموش آنکھیں مجھے بے چین کر دیتی ہیں، شیلا، بھگوان کے لئے اِن لانبی لانبی گھنی پلکوں میں کاجل نہ لگایا کرو، میرا جینا دوبھر ہو جائے گا۔ میں مسکراتی ہوں، کامنی بالکل شاعروں کی سی باتیں کرتی ہے، جیسے وہ کا تج مجھ سے پیار کرتی ہے۔

پگلی، کسی کا سکون لوٹ کر تمہاری ظالم آنکھیں اب خود سکون کے لئے ترستی ہیں سپنوں کے سنسار میں بھٹکتی رہتی ہیں۔ کامنی نے ایک دن بھولے پن سے کہا تھا اور میں نے اپنے آنسو پلکوں کی اوٹ میں چھپا لئے تھے!۔

راستہ لمبا ہوتا جا رہا ہے، کاش یہ جلدی طے ہو، سامنے دور تک کوئی تانگا نظر نہیں آتا۔ راستے پر گہری چپ چھائی ہوئی ہے اور میں تنہا چل رہی ہوں۔ درختوں کی گھنی چھاؤں میں ہوا ہلکی سرسراہٹ کے ساتھ گزرتی ہے۔ یہ چھاؤں نہ ہو تو دھوپ میں چلنا دوبھر ہو جائے، لیکن میں جب بھی کامنی کے گھر سے پیدل آئی، میں نے تھکاوٹ کا نام نہ لیا۔ میں آج بھی تھکی نہیں ہوں، لیکن یہ راستہ ــــ؟ ابھی تو مین چوک بھی نہیں آیا۔ کاش میں آج گھر سے نہ نکلی ہوتی!، لیکن کامنی سے ملنا ضروری تھا۔ پرسوں پروگرام بن چکا تھا اور کل چھٹی تھی۔ گھر میں تمام دن بیٹھ کر کیا کرتی؟ سارا دن کاٹنا مشکل تھا، رہ رہ کے میرا دل ڈوبنے لگتا۔ آج یہ حالت برسوں کے بعد ہو رہی تھی۔ اب بھی وہی حالت ہے۔ کامنی باتیں کرتی رہی، میں توجہ سے اس کی باتیں سنتی رہی، بہت مسرور تھی وہ، اور آج اُس نے گھر کو آئینہ خانے کی طرح سجا رکھا تھا۔ اُسے کل شام پتاجی نے بتایا تھا کہ اب جلدی منگنی کی تاریخ طے ہو جائے گی۔ اور آج وہ کتنی بنی سنوری تھی، جیسے آج ہی اُس کا ان دیکھا محبوب آ رہا ہو!

میں جلد گھر لوٹنا چاہتی تھی۔

مجھے کل ہی سے محسوس ہو رہا تھا کہ میری سوئی ہوئی دھڑکنیں جاگ اُٹھی ہیں، مدت کے بعد دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ آنے والی گھڑیوں کے تصور سے میرا انگ انگ کانپنے لگتا ہے، سارا جسم پسینے میں ڈوب جاتا ہے۔ وہ کیسی گھڑیاں ہوں گی، قیامت کی گھڑیاں! کیا میں

اپنے آپ کو سنبھال سکوں گی؟ اگر میرے دل کی دھڑکن رُک گئی تو ـــــ
چنگی چوک پر پہاڑ جانے والی بس کھڑی ہے۔ سورج کی گرمی سے سڑک کا تارکول جگہ جگہ سے پگھل چکا ہے۔ کتنی بھولی تھی ان دنوں! مجھے ہنسی آرہی ہے مجھے اپنی بے وقوفی پر۔ پتا جی آگے آگے چل رہے تھے۔ وہ ٹکٹ گھر سے ٹکٹ خریدنے جا رہے تھے ایسی ہی گرمی تھی، سورج آگ برسا رہا تھا۔
میں گلابی رنگ کی ریشمی قمیص اور شلوار پہنے ہوئے تھی۔ میرے گلے میں نیلون کا دوپٹہ تھا اور پاؤں میں نئی سفید چپل۔ اُمیش اور کمو میرے ساتھ چل رہے تھے۔ امیش دو روز پہلے آیا تھا اور دس روز کے بعد واپس جا رہا تھا اس لئے پتا جی نے پروگرام بنایا کہ تین چار دن پہاڑ پر گزارے جائیں۔ امیش خوشی سے اُچھل پڑا لیکن اُس نے شرط رکھی کہ اس ٹرپ میں شیلا بھی ساتھ رہے۔ میں نے انکار کیا اور اُس کا چہرہ بجھ گیا۔ پتا جی نے دیکھا تو وہ مجھے ساتھ آنے پر اصرار کرتے رہے۔ پتا جی امیش کو بہت چاہتے تھے۔ کیوں کہ اس کی پرورش میں پتا جی کا بڑا ہاتھ تھا۔ جب وہ پریم نگر میں ملازمت کے سلسلے میں مقیم تھے تو امیش کے گھر ہی قیام کا انتظام تھا۔ اُمیش کے پتا نے اور کہیں نہ جانے دیا، اور پتا جی نے بھی پرائے گھر کے بجائے ایک رشتہ دار کے ہاں ٹھہرنا مناسب سمجھا۔ وہ دس سال تک وہاں رہے، اور انہیں گھر کا سا آرام ملا۔
میں خاموشی سے چل رہی تھی اور امیش کمو کا ہاتھ تھامے میرے بازو میں چل رہا تھا، اچانک میرا پاؤں پگھلتے ہوئے تارکول پر پڑا اور دوسرے ہی لمحے امیش کا شرارت آمیز قہقہہ گونج اٹھا۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ تارکول میں پھنسے میرے چپل کی درگت دیکھ کر ہنس رہا تھا عجیب آدمی ہے جب سے آیا ہے میری ہر بات کا مذاق اُڑا رہا ہے، میرے چپل کا ستیا ناس ہوا، اور یہ دانت کھولے ہنس رہا ہے۔
میں جھنجھلائی ہوئی آگے بڑھی اور ہاتھ پر چپل درست کرنے لگی۔
"آپ کیوں تکلیف کر رہی ہیں؟ میں ٹھیک کر دوں گا اسے۔"
"رہنے دیجئے، یہ مذاق مجھے اچھا نہیں لگتا۔"
"آہا باجی بگڑ گئیں ـــــ آہا ـــــ" کمو تالی بجانے لگی۔
"کمو شرم نہیں آتی تمہیں ـــــ"
میں سچ مچ پریشان سی ہو گئی اپنے غصے کو چھپا نہ سکی، کمو کو زور سے ڈانٹا۔ وہ خاموش ہو گئی، اور منہ لٹکا کر امیش کی طرف شکایتی نظروں سے دیکھنے لگی۔

امیش کی ہنسی رُک گئی۔
وہ اچانک سنجیدہ ہو گیا۔
پتا جی بس کے قریب کھڑے مسکراتے ہوئے ہماری طرف ہاتھ ہلا رہے تھے۔
صبح وہ دیر سے جاگی۔ ہوا کے جھونکوں سے کھڑکی کا میلا سا پردہ پھڑپھڑا رہا تھا۔ اُجلی اُجلی دھوپ کھڑکی اور ساتھ والی دیوار پر پھیلی تھی۔ میں اُٹھی، اور کھڑکی میں آئی، سر سبز درختوں اور پھولوں سے بھری ہوئی یہ چھوٹی سی جگہ روپہلی دھوپ میں انگڑائی لے کر جاگ رہی تھی۔ دور کے گھنے جنگل کے پرے پہاڑ کی برف پوش چوٹیاں مسکرا رہی تھیں۔
"دیکھئے تو، باجی کب کی جاگی ہیں۔ آپ جھوٹ کہتے تھے کہ وہ گیارہ بجے تک سورہی ہیں" کمو کمرے کے اندر آئی۔ اس کے پیچھے پیچھے امیش تھا، نائٹ سوٹ پہنے ہوئے، شانوں پر تولیہ ڈالے، وہ ابھی ابھی نیند سے جاگا تھا، اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ بال اُلجھے اُلجھے سے تھے۔
"اچھا بابا، تم ہی جیت گئیں، تمہاری باجی جلدی اٹھنے کی عادی ہیں، ٹھیک ہے؟"
"میں آج ذرا دیر سے جاگی ہوں، دن کافی چڑھ آیا ہے ـــــ" میں نے شرمندگی کے احساس کو مٹانا چاہا۔
"آپ بھی دیر ہی سے اٹھے ہیں؟"
"جی ـــــ جی ہاں، بات یہ ہے کہ رات دیر تک میری آنکھ نہ لگی، دن کے واقعات آنکھوں میں گھومتے رہے۔ نیند نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی کم بخت ادھر مچھروں کی پوری بٹالین حملہ آور ہوئی ـــــ"
"پھر تو واقعی رات بھر جسم میں سوئیاں سی چبھوتے رہے اور ـــــ"
"آپ بھی شاید سوئی نہیں ہیں، آپ کی آنکھیں بھی سوجی ہوئی ہیں!"
"نہیں تو ـــــ" "میں خوب سوئی" میں نے جلدی سے کہا اور امیش کی خمار آلود شرارت سے بھری ہوئی آنکھوں سے اپنی نظریں ہٹالیں نہ جانے امیش کے لہجے میں کیا بات تھی کہ مجھے گھبراہٹ محسوس ہوئی اور میں ٹوتھ پیسٹ لے کر کمرے سے باہر نکل گئی۔
ہم پہاڑ سے واپس آرہے تھے۔ دائیں بائیں دیودار کے گھنے درختوں میں ہوا شائیں شائیں کرتی ہوئی چل رہی تھی، بادل تیزی سے بھاگ رہے تھے میرے ساتھ امیش نے سنیری کے کئی فوٹو لئے تھے، اس نے ہمارا گروپ فوٹو بھی لیا۔

"میرا ہاتھ چھوڑ کے کر آپ کیا کریں گے؟"

"آپ کی ان خوابناک آنکھوں کو تکتا رہوں گا۔"

"رہنے بھی دیجئے آپ باتیں خوب بناتے ہیں۔"

"یہ تو زیادتی ہے میرے ساتھ، میں ایک صاف دل انسان ہوں، دل کی ہر بات میری زبان پر آجاتی ہے۔"

میں چپ ہو گئی۔ امیش کے بہکے ہوئے لہجے سے سہم سی گئی، اس نے فوراً ہی، زور سے کر اس کے چہرے پر مسرت کی بہار چھا گئی۔

کالے بادل جھکتے چلے آرہے تھے اور پہاڑ سرمئی دھندلکوں کے بادے میں چھپ گئے تھے۔ اب ہمارے سامنے پتھریلا راستہ تھا، میں پوری توجہ اور احتیاط سے چھوٹے بڑے پتھروں پر قدم رکھ رہی تھی، نیچے ایک پہاڑی نالہ تھا جس کا پاٹ زیادہ نہ تھا، اور جو زیادہ گہرا بھی نہ تھا۔ لیکن اس کا پانی شور مچاتا ہوا تیزی سے بہہ رہا تھا۔ اسے پار کرنے کے لئے بیچ میں رکھے ہوئے پتھروں کا ایک پل تھا۔ معاً میرے جسم کا توازن قائم نہ رہا، اور دوسرے ہی لمحے میرا بایاں پاؤں بہتے ہوئے پانی میں تھا، رمیش نے، جو میرے پیچھے تھا، فوراً مجھے کندھے سے پکڑ کر سہارا دینا چاہا لیکن وہ بھی دھم سے میرے ساتھ ہی پانی میں آرہا۔ ہم دونوں گھٹنوں تک پانی میں ڈوبے رہے۔ رمیش نے اپنے بھیگے ہوئے جوتے اور پینٹ سے بے پروا ہو کر، مجھے اٹھا دیا تھا، اس کی گرفت بہت سخت تھی، لیکن میں کچھ نہ کہہ سکی۔ وہ قہقہے لگا رہا تھا اور میں بھی ہنسی پر قابو نہ پا رہی تھی، لیکن جب اس نے کندھے پر میری پیروں سے چپکی ہوئی شلوار اور قمیص کے بھیگے ہوئے دامن کی ہنسی اڑائی، تو مجھے بہت کوفت ہوئی، اپنی حالت کو دیکھئے مسٹر جب کہیں دوسروں کا مذاق اڑائیے، لیکن میں نے کچھ نہ کہا۔

ہم چند قدم ہی چلے تھے کہ بارش پھر آگئی۔

اس رات مجھے بخار آیا، دوسرے دن شام تک بخار نہ ٹوٹا۔ امیش دو بار ڈاکٹر کو بلا کر لایا، اور خود ہی بازار سے انجکشن اور دوا بھی لایا۔

پاپا شام کے ساتھ گھر سے باہر رہے تھے۔

پتا جی آ گئے، انہوں نے سوئچ آن کیا اور بازار کسی کام سے چلے گئے

امیش میرے سرہانے بیٹھا تھا۔

"کہئے کیسی طبیعت ہے اب؟"

"اب ٹھیک ہوں —"

"ذرا نبض دیکھوں آپ کی" یہ کہہ کر اس نے میرے دائیں ہاتھ کی کلائی اپنی انگلیوں میں تھام لی۔

میں کیسے اپنی کلائی کو اس کے ہاتھ سے جھٹک دیتی؟ میں خاموش رہی

"نارمل ہو رہا ہے ——— اور اب بخار نام کو نہیں —"

امیش چہک رہا تھا۔

"اگر آپ نے میری بات مانی ہوتی، تو یوں بارش میں بھیگنے کی نوبت نہ آتی!"

"کون سی بات؟" میں نے یاد کرنے کی کوشش کی۔

"بارش تیز ہونے پر میں نے آپ کو اپنا کوٹ دیا تھا۔"

میں نے سنی ان سنی ایک کر دی۔

امیش کی شرارت بھری آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ اس نے کٹو کو بازوؤں میں اٹھا کر کہا۔

"بتاؤ کٹو، اگر تمہاری باجی کل بارش میں میرا کوٹ پہن لیتیں تو؟"

"آپ کا کوٹ؟"

"ہاں، ہاں میرا کوٹ!"

"لیکن آپ تو مرد ہیں ——" کٹو نے بھولے پن سے کہا۔

"اچھا یہ بات ہے، اور تمہاری باجی؟"

"وہ ——— وہ تو میری باجی ہیں ———"

امیش نے قہقہہ لگایا، اور کٹو کو بازوؤں سے پکڑ کر ہوا میں اچھالا سورج کی سنہری کرنیں امیش کے چہرے پر پڑ رہی تھیں اور وہ کہہ رہا تھا!

"مجھے ایسا لگتا ہے آپ اس دنیا کی انسان نہیں ہیں!"

"جی ———؟"

"آپ خوابوں میں رہتی ہیں؟"

"آپ سے کس نے کہا؟"

"آپ کی آنکھوں نے ——— ایسی خواب ناک آنکھیں میں نے کبھی نہیں دیکھیں، ان میں ڈوب کر انسان خوابوں میں ڈوب جاتا ہے ———!"

امیش کیا کہنا چاہتا تھا، میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے وہ میرا مذاق اڑاتا ہے!

آج گھر میں رونق ہے۔ زندگی ہے، کٹو اور لتا دونوں متحرک رہی ہیں۔ مہمان جو آرہا ہے۔ میرا ہر لمحہ قیامت ہے۔ میں نے یہ بات تم سے نہیں کہی۔ کامنی، دل کی دھڑکنوں کا راز تم سے کیا کہتی؟ یہ تو خوابوں کی باتیں ہیں اور

تم حقیقت کی دنیا میں رہنے والی خوابوں کے جادو کو کیا سمجھو گی۔ تم خوابوں سے نکل کر حقیقت کا سامنا کرو منیبا۔ میں دھوکے اور جھوٹ سے گھبراتی ہوں حقیقت دھوکا ہے۔ اور خواب بھی دھوکا ہی دیتے ہیں!

کامنی! جب سے یہاں ٹرانسفر ہوا ہے، مجھے ایک سچے دوست کی کمی کا احساس جاتا رہا ہے۔ انسان کا چہرہ اس کے دل کا آئینہ ہوتا ہے۔ کامنی کی بھولی سی معصوم صورت، اس کے لہجے کا درد، اس کی آنکھوں سے شفقت کی پھوٹتی ہوئی روشنی ——— اس کی پیاری پیاری باتیں! وہ بھی برسوں سلگتی رہی ہے۔ محبت اس نے نہیں کی لیکن اس کی شادی کا مسئلہ برسوں سے اٹکا ہوا ہے۔ پریم نگر میں ڈھنگ کا لڑکا ملنا مشکل ہو گیا ہے۔ "جن دنوں میری شادی ہوتی، ان دنوں میں پڑھائی کے چکر میں تھی۔ تین برسوں غم میں گھلنے کے بعد اب ممی اور ڈیڈی کی فکر دور ہو رہی ہے۔ اب میری شادی ہونے والی ہے، لڑکا مل گیا ہے، بات تقریب قریب طے ہو چکی ہے ———" کامنی کے لہجے میں جذبات کی کپکپی چھپ نہ سکی۔

اور میں سوچتی رہی، میری منزل کہاں ہے؟
میں ایک عمر سے بھٹکتی رہی ہوں، کب تک بھٹکتی رہوں گی؟
میں تھک گئی ہوں ———!
میرے اعضا شل ہو گئے ہیں ———!!
میں ان آنکھوں کے خوابوں کی شمعوں کو بجھانا چاہتی ہوں تاکہ اندھیرا ہو جائے ——— مکمل اندھیرا!

ایک ہفتہ گذر چکا تھا۔
میں امیش کو بھول چکی تھی!

پتاجی نے اس دن رات کا کھانا کھاتے ہوئے ٹرپ کا ذکر کیا، ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد جب انہوں نے امیش کی بہت سی تعریفیں شروع کیں، تو میں بور ہونے لگی۔ بات یہیں پر آ کر نہیں رکی۔ پتاجی ایک صاف گو آدمی تھے۔ انہوں نے صاف صاف کہا کہ رمیش کے گھر والوں کی طرف سے شادی کا پیغام آیا ہے۔ یہ سننا تھا کہ میرا سر چکرا سا گیا۔ میرے دماغ کی نسیں جھنجھنا اٹھیں، میں گھبراہٹ اور غصّے میں وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آئی، اور کچھ کھائے پیئے بغیر بستر پر گر گئی۔ پتاجی کے اصرار کے باوجود میں نے کچھ نہ کھایا۔

رات طویل ہو گئی۔

اور جب میری آنکھ لگی، میں نے کیسے کیسے ڈراؤنے خواب دیکھے ——— میں تنہا ایک پھیلے ہوئے ویرانے سے گذر رہی ہوں، ننگے سر اور ننگے پاؤں اور میرے پیچھے، امیش کے قہقہے میرا تعاقب کر رہے ہیں۔

اور صبح پتاجی نے اعلان کیا کہ یہ شادی نہیں ہوگی۔

ایک سال گذر گیا۔ پتاجی پرموشن پر پریم نگر گئے اور وہاں امیش ہی کے گھر ٹھہرے۔ امیش کے والد انہیں بس اڈے پر لینے کے لئے آئے تھے، وہ نہایت محبت اور شفقت سے پیش آئے۔ پتاجی اس خلوص اور محبت سے پگھل گئے۔ جب انہوں نے مجھے یہ سب حالات لکھے تو مجھے سکون کا احساس ہوا۔

گھر میں اب کمو تھی، اور میں ——— کتنا سُونا سُونا لگتا تھا گھر، جب سے پتاجی چلے گئے تھے۔ مجھے تنہائی بہت محسوس ہونے لگی تھی، امی تو ہم سے بہت پہلے بچھڑ چکی تھیں، کمو اور لتا کو ان کی صورت بھی یاد نہ تھی، لیکن میری آنکھوں میں ان کی تصویر کھنچی ہوئی تھی۔ وہ جب سے سورگباش ہوئیں، کمو اور لتا کی پرورش کا سارا بوجھ پتاجی اور میرے کندھوں پر تھا۔ تم ان بچیوں کی بڑی بہن بھی ہو، اور ماں بھی ہو، کوئی میرے دل کے اندر آواز دے رہا تھا!۔

ایک دن تار ملا کہ پتاجی کی طبیعت خراب ہے۔
ہم تینوں دوسرے دن پریم نگر پہنچے۔
پتاجی پر اچانک دل کا دورہ پڑا تھا۔ لیکن بروقت ڈاکٹری امداد سے خطرہ ٹل گیا اور اب انہیں آرام تھا۔

میں نے ان کی تیمارداری میں رات دن ایک کر دیا۔ ان کی حالت بہتر ہونے لگی، اب وہ کمو اور لتا سے خوب باتیں کرتے، انہیں پیار کرتے لطیفے سناتے۔ ہم سب قہقہے لگاتے!۔

پندرہ دن ہو گئے پتاجی اب رو بصحت ہو رہے تھے، لیکن امیش نہ آیا، معلوم ہوا کہ اس کی چھٹی منظور نہیں ہوئی، رمیش کی چھوٹی بہن پاروتی نے کئی دلچسپ باتیں بتائیں ..... ایک دن وہ مجھے امیش کے کمرے میں لے گئی اور کہنے لگی: جب آپ کے پتاجی نے شادی کا پیغام ٹھکرا دیا تو بھیا کو بہت دکھ ہوا وہ کئی دن تک پریشان سے رہے، انہیں کھانے پینے تک کا ہوش نہ رہا۔ جب بھیا کی حالت بگڑنے لگی تو ڈیڈی بہت گھبرائے، انہوں نے بہت سمجھایا، لیکن بھیا جیسے بہرے ہو گئے تھے۔ پتاجی کئی اچھے گھرانوں کے پیغام لائے، لیکن بھیا پتھر بن گئے تھے، اس دن کے بعد وہ کچھ کھے سے

جگر سے غائب ہو گئے — پارو کی چھپی ہوئی ہیرے جیسی آنکھوں سے آنسو چھلکنے لگے۔

وہ نوکری میں بھرتی ہو گئے۔ اور اب ایک اچھے عہدے پر فائز ہیں۔

ایش کے کمرے میں بلا کی ویرانی تھی۔ دیواروں سے وحشت ٹپک رہی تھی، ٹیبل گرد آلود تھا، جس پر چند کتابیں بے ترتیبی سے پڑی تھیں، دیوار پر دو تین خالی ہینگر ٹنگے ہوئے تھے، فرش پر بچھی ہوئی دری گرد سے اٹی ہوئی تھی — اتنی ویرانی، اتنی وحشت —!

میرے دل کو نہ جانے کیا ہو گیا۔ جیسے یہ ساری ویرانی کسی اجنبی راستے سے میرے دل میں داخل ہو گئی —!

پارو نتا کے ساتھ کمرے سے باہر گئی تھی اور میں اپنی بھیگی بھیگی پلکوں سے ٹیبل پر گرد آلود کتابوں کو دیکھ رہی تھی!

یہ آنسو — ؟

نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا؟

میں نے دل میں ایک انجانے محشر کو اٹھتے ہوئے محسوس کیا۔

اُف یہ دل کا محشر —!

میں نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے ٹیبل پر پڑی ہوئی کتاب اٹھائی، یہ کیٹس کے خطوط تھے، فینی براؤن کے نام!

میں نے پہلا ورق اُلٹا، ایک خوبصورت کاغذ کے چند اوراق ملے،

میری نظریں رُک گئیں —!

میرا دل زور سے دھڑک اٹھا۔

"یہ تین دن اتنے لمبے ہو گئے، جیسے تین ہزار سال، میں اس ویران کمرے میں مایوسی کی آگ میں جل رہا ہوں —!"

میں نے کانپتے ہاتھوں سے دوسرا ورق اُلٹا۔

"تم نے مجھے ٹھکرا کے کہیں کا نہیں رکھا، شیلا، تمہیں بھولنا میرے بس میں نہیں، تمہاری خواب ناک آنکھوں نے پاگل بنا دیا ہے!"

اگلا ورق ——————

"اُف یہ دیواریں مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتی ہیں، میں یہاں سے بھاگ جانا چاہتا ہوں، میں کہاں جاؤں، کہاں جاؤں؟"

اور جب میں کتو اور نتا کے ساتھ واپس گھر آئی تو ہماری تقدیر لٹ چکی تھی، پتاجی اچھے بھلے جاتے چلتے ہوئے دل کے دورے میں سرگباش ہو چکے تھے۔

ایش نے اچانک میری کائنات میں آگ لگا دی تھی، ہر طرف شعلے ہی شعلے تھے، اور میں رات دن جل رہی تھی!

میں نے کتو اور نتا کے معصوم خیالوں پر غم کی پرچھائیاں بھی نہ پڑنے دیں۔ میں نے ان کی تربیت اور تعلیم کو اپنا مقصدِ حیات بنا لیا۔ اور انہیں ماں کی ممتا، بہن کا پیار اور باپ کی محبت دی، وہ دونوں خوش تھیں!

اور ایش کے لگائے ہوئے روگ میں میرا جسم، میری روح گھل رہی تھی۔

تم کتنی دُبلی ہوتی جا رہی ہو شیلا —!

تمہارے چہرے کا رنگ اُڑ گیا ہے۔

کیا کرے بے چاری، گھر کا سارا بوجھ اس کے ذمہ ہے!

کتنی چپ چاپ رہتی ہے شیلا!۔

ہمسائے کی عورتیں، رشتے دار، اپنے پرائے باتیں کرتے رہے، لیکن میں خاموش رہی! مجھے خاموشی سے پیار ہو گیا تھا!

رات کو میں بہت کم سوتی، اور دن بھر کام میں مصروف رہتی!

میری صحت تباہ ہو چکی تو شادی کے پیغام بھی آنے بند ہو گئے۔

میں نے اطمینان کی سانس لی، کتنا پریشان کرتے ہیں یہ لوگ!

ڈاکٹر چوپڑا تو میرے عشق میں دیوانے ہو رہے تھے، پاگل کہیں کے!

اور جوگندر کو میری آنکھیں بہت پسند تھیں، اس نے لکھا تھا کہ وہ میری خواب ناک آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر خوب صورت نظمیں لکھتا رہے گا۔ بے چارہ شاعر!

لیکن جب میں ہڈیوں کا پنجر بن گئی، تو دونوں نے آنکھیں پھیر لیں۔

سات سال گزر گئے!

یہ پہاڑ جیسے سال کیونکر گزرے، طویل، ویران، سرد اور تاریک سال!

اور کل شام مجھے تار ملا کہ ایش آ رہا ہے!

ایش آ رہا ہے!

ایش آ رہا ہے!

ایش آ رہا ہے!!

کائنات کا ہر ذرہ پکار رہا تھا، ایش آ رہا ہے!

...یا مسکراہٹوں کے پھول بکھیرتا ہوا، اس نے کہا ہوا
...عجب مسکراتے ہوئے اس نے مجھے ہاتھ جوڑ کر آداب
...میں گر گئی۔
...انگ کانپ اٹھا!
...کا قد کتنا نکلا ہوا تھا، اس کے بھرے بھرے مضبوط جسم
...کتنی خوب صورت لگ رہی تھی۔ آج اس کے چہرے
...میز ہنسی نہ تھی۔
...نے کیا صورت بنا رکھی ہے شیلا؟"
...کچھ نہ کہہ سکی۔

میں نے اپنے کانپتے ہوئے نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبا لیا۔
چائے پیتے ہوئے امیش نے کہا۔
"میں ایک ضروری کام سے آیا ہوں شیلا"
میں سراپا گوش تھی، اور میرا سینہ زور زور سے دھڑک رہا تھا!
"ڈیڈی اب کافی بوڑھے ہو چکے ہیں، ان کی خواہش ہے کہ میں شادی کر لوں، میں آج تک ٹالتا رہا۔ لیکن ——— اب ڈیڈی زیادہ دن رکنے والے نہیں ———"

میرے خواب مجھے پستیوں سے اٹھا کر ایک بار پھر آکاش کی بلندیوں میں لے گئے!

میرے جی میں آیا کہ امیش کے قدموں میں گر کر اس کے پاؤں اپنے آنسوؤں سے دھوؤں، تاکہ میرے ماضی کے دھبے دُھل جائیں ———!
اتنے میں امیش نے پاکٹ ڈائری نکالی، اور کہا
"ڈیڈی نے بات طے کی ہے میں انکار نہ کر سکا۔ لڑکی کا فوٹو یہ ہے۔ میں اس کے بارے میں آپ کی رائے جاننا چاہتا ہوں، وہ آپ کے ساتھ ہی کام کرتی ہے ———"

میں نے فوٹو پکڑ لیا۔ میرے ہاتھ کانپ رہے تھے!
میری آنکھیں اندھی ہو گئی تھیں!
شمعیں بجھ چکی تھیں!
میرے کانپتے ہاتھ میں کامنی کا خوب صورت چہرہ مسکرا رہا تھا۔

نوجوانیں صدی کے نام خطوط لکھتے وقت ہمیشہ اختصار سے کام لیا کریں تاکہ آپ کے ارشادات کی فوراً تعمیل ہو سکے۔ طویل خطوط مصروفیت کے باعث فوراً نہیں پڑھے جاتے ——— منیجر

یہ ترا شہر!

محمود سعدی

یہ ترا شہر، یہ فردوسِ طرب، خُلدِ نشاط
آج اک غم کا جہنم نظر آتا ہے مجھے
اِس کی ہر شام ہے، اِک شامِ بلا میرے لئے
اِس کا ہر روز، محرم نظر آتا ہے مجھے

●

یہ در و بام کہ گہوارۂ راحت تھے کبھی
آج دیتے ہیں یہ ہر لحظہ اذیت مجھ کو
گوشہ گوشہ، مرا مقتل نظر آتا ہے مجھے
ذرّے ذرّے سے یہاں ہوتی ہے وحشت مجھ کو

●

کہکشاں تھیں ترے قدموں سے کبھی جو راہیں
آج ڈسنے کو لپکتی ہیں وہ ناگن بن کر
یہ فضائیں کہ مجھے پیار ہے جن سے
تیر برساتی ہیں مجھ پر مری دشمن بن کر

●

یہ ترا شہر، یہی ریت ہے اِس شہر کی کیا؟
کسی انجان کو خود اپنا بنانا اے دوست
اور پھر خوگرِ الطاف و عنایت کر کے
اِس سلوکِ ستم آگیں سے مٹانا اے دوست

محمود سعدی

افسانہ

ایک نئی تصویر

رام لعل

آر۔ ۳۹ ملٹی اسٹوری فلیٹ، چار باغ، لکھنؤ۔ ۴

۱۵ / اپریل ۱۹۶۴ء   برادرم خوشتر صاحب! آداب

یہ کہانی میں نے بنگلے کے ویٹنگ روم میں بے حد تنہائی کے عالم میں لکھی۔ جب بنگال، مدراس اور غیر ممالک سے آئے ہوئے کئی ٹورسٹ جوڑے نہا دھوکر اور کپڑے بدل کر موٹروں اور بسوں کے ذریعے اجنتا کے غار دیکھنے کے لئے جا چکے تھے اُس وقت میرا ہمدم ویٹنگ روم کا وہ لنگڑا بیرا ہی رہ گیا تھا جو ہر پندرہ منٹ کے بعد پانی اور چائے پوچھنے کے لئے آجاتا تھا۔ . .

آپ کا مخلص

بینا پنڈت اپنے پاپا کے لئے ناشتہ لگوا رہی تھی۔ وہ ابھی باتھ روم میں تھے۔ اُن کے گنگنانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ایک خوش مزاج مطمئن اور مسرور انسان اسی طرح سے گنگنا سکتا ہے۔

بہادر اُبلے ہوئے انڈے لے کر آیا تو اُس نے مسکرا کر یہ خبر بھی سُنائی "بی بی جی، باہر کوئی صاحب آئے ہیں۔ ڈرائنگ روم میں ہیں۔"

بینا چونک گئی۔ کون ہو سکتا ہے وہ؟ جیسے اپنے آپ سے پوچھا۔ میدانوں سے ہزاروں میل دور، ہزاروں فٹ کی اونچائی پر کون ملنے آئے گا؟

وہاں عام طور پر باہر سے کوئی نہیں آتا تھا۔ کبھی کبھار ہی آس پاس کے جھونپڑی نما بنگلوں کے رہنے والوں کے بال بچے (چھٹیوں میں) آجایا کرتے تھے۔ اب تو سکول کھل چکے تھے۔ جو لوگ آئے تھے وہ جا چکے تھے۔ اُنہی کے آنے پر تھوڑی سی گہما گہمی پیدا ہو جاتی تھی اُس خاموش سے پہاڑ پر۔ کچھ شوخ چہرے، کچھ دلچسپ لباس، کچھ من کو لبھانے والی باتیں! بس اُنہی دنوں یہ سب کچھ میسر آتا تھا۔

بینا نے ڈرائنگ روم کا پردہ اُٹھایا تو اُس پر جیسے سکتہ سا طاری ہو گیا۔ لیکن وہ جلدی ہی سنبھل گئی اور مسکرا کر بولی "آپ! آپ کب آئے؟ کیا ابھی؟"

چالیس برس کا ایک صحت مند اور شکیل مرد اُسے دیکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اپنے سر کو ایک عجیب سے مردانہ شکوہ کے ساتھ جنبش دے کر بولا ــــ "آج ہی۔ ابھی ابھی چلا آرہا ہوں لیکن تم! آپ کیسی ہیں؟ اچھی ہیں نا!"

کچھ لمحوں تک وہ بینا کی طرف اشتیاق بھری نظروں سے دیکھتا رہ گیا پھر دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ آمنے سامنے۔

اُس نے اپنی جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی۔ سگریٹ ہونٹوں میں پھنسا کر ادھر اُدھر کچھ ٹنگی ہوئی کچھ رکھی ہوئی اور کچھ بکھری ہوئی پینٹنگز کی طرف دیکھا۔

"یہ سب کون کرتا ہے؟ آپ؟ نہیں شاید پاپا! کیوں؟"

"جی پاپا ہی۔ میں تو بس اب کچھ نہیں کرتی!" وہ مسکرا دی۔

جب وہ سگریٹ سلگا چکا تو اس نے پوچھا۔

"پاپا اب کیسے ہیں؟ بڑھاپے کا شدید احساس تو نہیں ہوتا اُنہیں؟"

"نہیں بالکل نہیں۔ بہت ہی خوش رہتے ہیں پینٹنگ، شکار، کتابیں، رسالے اور لمبی لمبی سیریں اور گپ لڑانے کے لئے ساتھی یہ سب انہیں بے حد مصروف رکھتے ہیں۔"

اُسی وقت بہادر نے پردہ اُٹھا کر کہا "صاحب ناشتے پر انتظار کر رہے ہیں۔"

"آئیے آپ بھی۔"

وہ بینا کے پیچھے پیچھے دوسرے کمرے میں گیا۔ اُس کی نظریں بینا کی پشت پر ٹکی رہیں۔ اُس کی شاہانہ چال پر۔

ڈرائنگ روم میں ساٹھ برس کا سُرخ و سفید اور تنومند بوڑھا اُسے دیکھتے ہی چہک اُٹھا "ہیلو ہیلو! او دھر! کہو؟ تم کیسے ہو؟"

اُس نے او دھر کو گلے سے لگا لیا۔ دونوں ایک جیسے طویل قامت کے تھے۔ بوڑھا ایک

پرانے محل کی طرح مضبوط اور اودھو ایک جدید طرز کے دو منزلہ مکان کی طرح دلکش۔

"تم دس سال کے بعد مل رہے ہو نا!" بوڑھے نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ آپ کو آخری بار کلکتہ پورٹ پر دیکھا تھا جب آپ انڈونیشیا جا رہے تھے۔ اپنی تصویروں کی نمائش کے سلسلے میں۔"

اس پر کیشورائے شرما نے ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا اور کہا "جانتے ہو جاکرتا میں میری نمائش کتنی کامیاب رہی تھی۔"

"مجھے سب معلوم ہے۔ اخبارات میں بھی پڑھا تھا اور آگیا پنڈت نے بھی بتایا تھا اور ـــــ انہی دنوں ایک آسٹریلین خاتون جو ساؤتھ ایسٹ ایشیا کا دورہ کرتی پھرتی تھیں کچھ روز کے لئے بمبئی میں میرے یہاں ٹھہری تھیں۔ انہوں نے اتفاق سے آپ کی تصویریں جاکرتا میں دیکھی تھیں وہ بھی تعریف کر رہی تھیں۔ اور جب انہیں معلوم ہوا میں آپ کو بہت قریب سے جانتا ہوں تو وہ اور بھی خوش ہوئیں۔"

"اچھا اچھا!" بوڑھے نے خوش ہو کر مچھلی کے کبابوں کی پلیٹ اس کے سامنے کر دی "یہ کھاؤ۔ کل ہی سُندربن جھیل سے شکار کر کے لایا ہوں۔ یہاں مچھلی کا شکار بہت اچھا ہوتا ہے۔ اتنی بڑی بڑی مچھلیاں ملتی ہیں۔"

اس کی پھیلی ہوئی باہیں دیکھ کر اودھو اور بینا دونوں ہنس پڑے۔

"لے چلوں گا تمہیں۔ آج ہی لے چلوں گا۔"

بینا بالکل انڈے کو چمچہ سے ڈبو ڈبو کر کھاتی رہی اور ان کی باتیں سُنتی رہی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے جان پہچان کے لوگوں کی خیریت اور دوسرے حالات دریافت کرتے رہے۔

"وہ شکھیشور میرا بھانجہ نا! وہ آج کل ماسکو میں ہے۔ سوویت حکومت کا مہمان سکالر۔ جانتے ہو اُس نے کتنی ساری کتابیں لکھ ماری ہیں۔"

"اچھا وہ گنگولی کہاں ہے آج کل؟ جو نوی میں تھا آپ کے بڑے بھائی کا داماد۔"

"وہ ساؤتھ میں ہے۔ کوچین میں۔ وکرانت پر ہی ہے ایک عرصے سے۔"

اودھو نے اُسے اپنے بزنس کے بارے میں بھی بتایا۔ وہ اب ایکسپورٹ امپورٹ نہیں کرتا تھا۔ خود ہی مشینری مینوفیکچر کرنے لگا تھا۔ اُس کی فرم کی خاص چیزیں بلوئر اور ایگزہاسٹر تھیں۔

کیشورائے شرما نے اُسے اپنے سگار بھی پینے کے لئے دئے۔ دونوں ہی بہت اونچی اور شگفتہ گفتگو کرنے والوں میں سے تھے۔ اس دوران میں بینا کو بہت کم بات کرنے کا موقع ملا۔ بلکہ بالکل ہی نہ ملا۔ اگر اُس نے ایک آدھ بار ناشتے اور چائے کے بارے میں ان سے کچھ پوچھ لیا تو اُسے بات چیت تھوڑے ہی کہا جائے گا! لیکن یہ کہنا بھی غلط ہوگا کہ وہ اودھو نارائن کی باتوں کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ یا وہ اُس کی بعض باتیں سُن سُن کر اپنے ذہن میں ایک پس منظر بھی بناتی نہیں چلی گئی تھی۔ نہیں وہ ایسی خود پسند نہیں تھی کہ کسی کو دیکھ کر اپنے اندر ہی گم ہو جانے والی۔ ہرگز نہیں! وہ اُسے بہت پہلے سے جانتی تھی جب اُس کے پتی آتی زندہ تھے اور اودھو نے جتنے لوگوں کا ذکر اُس کے باپ کے سامنے کیا اُن میں سے بیشتر کو وہ جانتی تھی۔ شوہر کے انتقال سے پہلے وہ اس طرح خاموش اور تنہا زندگی بسر کرنے کی عادی نہیں تھی۔ وہ اُس کے ساتھ اور اُس کے دوستوں کے ساتھ ہوا اور خوشبو کی مانند گھومتی رہی تھی۔ صرف پانچ ہی سال پہلے کی بات تھی کہ وہ کتنی دلچسپ عورت سمجھی جاتی تھی۔ اپنی سوسائٹی کی روحِ رواں! جو نہ صرف دعوتیں دینے اور دھول کرنے کے لئے مشہور تھی بلکہ اپنی خوش اخلاقی اور خوش پوشی کے لئے بھی مشہور تھی۔

پانچ سال کے مختصر طویل عرصے نے اُس کے چہرے پر مایوسی اور تنہائی کے بہت گہرے نشانات نہیں چھوڑے تھے۔ وہ اب بھی دلکش نظر آ رہی تھی۔ اودھو کی آمد نے اُس کے چہرے پر اطمینان اور مسرت کی جو ہلکی ہلکی کیفیت پیدا کر دی تھی وہ بھی اُس دلکشی میں اضافہ کا موجب بنی تھی۔

ناشتے کے بعد وہ ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ پھر تھوڑی دیر تک باتیں کرنے قہقہہ لگانے کے بعد سُندربن جھیل کی طرف چل دئے۔ لیکن جس وقت وہ وہاں سے روانہ ہوئے آرٹ ہی پر گفتگو کر رہے تھے۔ کیشورائے ایسے آدمی کو بے حد پسند کرتے تھے جو مصوری کو سمجھتا ہو۔ اُس کی چھپی ہوئی اشاریت کی وضاحت کر سکتا ہو اور ناقدانہ نگاہ بھی رکھتا ہو۔

اُن کے جلدی لوٹنے کی امید نہیں تھی۔ رات کے کھانے کے وقت ہی واپس آ سکتے تھے۔ جب تک بینا نے پاپا کا جو سوئٹر شروع کر رکھا تھا اُس کا بہت سا حصہ بُن ڈالا۔ دو گھنٹے سو بھی لی۔ دو گھنٹے شام کے اپنی ایک پڑوسن مسز گنڈو دیا کے ساتھ بھی گزارے۔ اور کچھ وقت اپنے سورگیہ پتی کی چند یادگاروں کو پھر سے نکال کر دیکھنے میں بھی گزارا۔

اُس کی یادگاروں میں اُس کا ایک پورٹریٹ تھا۔ ایک دوربین، دو ایک کتابیں جو اُس نے بینا کو تحفتاً دی تھیں۔ اور ایک خط۔ آخری خط! اس خط کو اُس نے کئی بار پڑھا اور پھر وہ سب چیزیں اُسی طرح حفاظت کے ساتھ بند کر دیں۔ وہ سب بند ہی رہتی تھیں۔

رات کے کھانے کے لئے اُس نے خاص اہتمام کیا۔ کئی طرح کے کھانے بنائے۔ اور جب وہ دونوں مچھلیوں سے بھرے ہوئے بیگ لے کر لوٹے اور اُن کے نتھنوں میں کھانوں کی خوشبو پہنچی تو وہ بے قرار ہو گئے۔ اُس کے پاپا نے حسبِ معمول میز پر مُکّے مار مار کر بہادر کو جلدی سے جلدی کھانا لانے کا حکم دیا۔ لیکن اودھو بہت ہی سنجیدگی سے مسکراتا رہا۔ نہایت سنجیدگی سے کھانے کا انتظار کرتا رہا۔

بینا اُس کی یہ سنجیدگی دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ پہلے وہ ایسا نہیں تھا۔ وقت نے اُس کے وقار میں یہ اضافہ کر دیا تھا۔

اُنہیں کھانا کھلا کر وہ اپنی کاٹج کے سامنے ذرا فاصلے پر ایک پہاڑی نالے پر بنی ہوئی پُلیا پر جا بیٹھی۔ وہ ابھی تک باتیں کر رہے تھے۔ اُسے اس بات کی کوئی شکایت نہیں تھی کہ اُس کے پاپا اودھو کو اتنا مصروف کیوں رکھے ہوئے تھے لیکن وہ اتنے خوش بھی تو تھے! وہ چاہتی تھی وہ اودھو سے اِسی طرح خوش اور مطمئن رہیں۔

اچانک اُسے اپنے قریب قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ اس نے سر اُٹھا کر دیکھا اودھو اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ بہت ہی قریب۔

وہ کچھ گھبرا گئی لیکن وہ وہیں بیٹھ گیا۔ اُس کے پاس پلیا پر۔ کچھ دیر تک خاموش رہا۔ نیچی پہاڑیوں پر بنے ہوئے بنگلوں میں سے چھن چھن کر آنے والی روشنیوں کو دیکھتا رہا اور پھر جیسے الفاظ کے لئے جد و جہد کرتے ہوئے بولا۔

"اُمّی نے مرنے سے کچھ عرصہ پہلے مجھے ایک خط لکھا تھا۔ شاید آپ کو بھی لکھا تھا۔ اُس نے مجھ پر ایک خوشگوار ذمہ داری ڈالی تھی۔ مجھے اُس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ مجھے یقین تھا ہم دونوں خوش رہ سکیں گے لیکن بدقسمتی سے میں نے ایک دوسری عورت سے شادی کر لی۔ اُنہی دنوں جب اُمّی مرے تھے۔ اُس کے بعد میں آپ سے مل بھی نہ سکا۔ لیکن اتنے دنوں میں ڈرتا رہا تم میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ وہی ہوا بھی۔ میں کتنا نادم ہوں! میں بتا نہیں سکتا۔ آپ کو یہ بتانا بھی فضول ہوگا کہ میں اُس عورت سے مطمئن نہیں ہوں۔ میں صرف یہ بتانے کے لئے یہاں تک آیا ہوں کہ آپ میرا انتظار نہ کریں۔ میں سخت نادم ہوں۔"

یہ سُن کر بینا سناٹے میں آگئی۔

اُسے ہرگز یہ توقع نہ تھی۔ اگرچہ یہ بات بالکل غیر متوقع بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن اُس نے ہمیشہ انتظار ہی کیا تھا۔

اودھو نے اُسے خاموش دیکھ کر پھر کہا ——— "آج دوپہر کے وقت جب ہم شکار کو جا رہے تھے میں نے پاپا سے سب کہہ دیا۔ وہ بھی اُمّی کے اُس خط کے بارے میں جانتے تھے لیکن میری بات سُن کر اُنہیں ذرا سی بھی مایوسی نہ ہوئی۔ میں اُن کے چہرے پر اُس کیفیت کی ایک لہر بھی نہ دیکھ سکا اور بہت حیران ہوا۔ وہ شخص کتنا عجیب ہے! کتنا بڑا ہے! زندگی کی ساری تلخیوں کو اپنے قہقہے میں اُڑا دیتا ہے! بتاؤں اُس نے کیا کہا تھا؟ کہا تھا تمہاری بات سُن کر میرے ذہن میں ایک نئی تصویر اُبھر آئی ہے۔ ایک شاہکار تصویر! موقعہ ملا تو آج کل میں اُسے پینٹ کر ڈالوں گا تم دیکھو گے ——— کل ہی!"

بینا پنڈت اپنی جگہ سے اُٹھی۔ اُسے جاتے دیکھ کر اودھو بھی اُٹھا۔ اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ اندھیرے میں وہ دونوں سائے سے معلوم ہو رہے تھے۔

ڈرائنگ روم میں روشنی تھی۔ وہ دونوں اندر چلے گئے۔ کیشو لال شرما دیوار کی طرف منہ کئے ایک تصویر کے سامنے بیٹھے تھے۔ اپنے کمرے میں وہ ہمیشہ اسی طرح بیٹھ کر تصویریں بناتے تھے۔ لیکن وہ بالکل خاموش تھے۔ ساکت! ٹکٹکی باندھے تصویر کو دیکھے جا رہے تھے۔

دونوں نے اُس تصویر کو چونک کر دیکھا۔ بینا ہی کی تصویر تھی بہت ہی مکمل! بہت ہی حقیقی! لیکن جتنی مایوسی اور بے بسی تصویر میں تھی اُتنی بینا کے اپنے چہرے پر بھی نہیں تھی۔ پُلیا سے اُٹھ کر یہاں تک آتے آتے اُس نے خود کو بہت کافی متوازن کر لیا تھا۔ اب وہ مسکرا سکتی تھی۔ اُسی طرح سر اُٹھا کر اودھو سے یا اور کسی سے بھی مل سکتی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ جو کچھ ہو چکا تھا وہ پانچ سال پہلے کا تھا۔

ان کے آنے کی آہٹ پا کر بوڑھے نے سر گھمایا۔ ان کی طرف دیکھا لیکن وہ مُسکرا نہ سکا۔ پہلے وہ اپنی ہر تصویر کو مکمل کر کے خوشی کا اظہار کرتا تھا۔ لیکن اب وہ مُسکرانے کی ساری قوت کھو چکا تھا۔ اپنے چہرے کی وہ ساری بشاشت بھی جو اُس کی شخصیت کا ایک خاص حصہ تھی۔ شاید یہ نئی تصویر کا ردِ عمل تھا!!

جواب طلب اُمور کے لئے ہمیشہ اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ یا پوسٹ کارڈ بھیجئے۔ ورنہ ہم جواب دینے سے قاصر رہیں گے۔ پاکستانی ٹکٹ ہندوستان میں کار آمد نہیں ہیں اسلئے پاکستانی بھائی اور بہنیں اِس شرط سے مستثنٰی ہیں۔ (منیجر بیسویں صدی دہلی)

افسانہ نمبر

غزل

الطاف مشہدی

ایڈیٹر خلوص (پندرہ روزہ) بلاک نمبر ۱۹ - سرگودھا (پاکستان)

۱۸ اپریل ۱۹۶۴ء

پیارے بھائی جان!

سلام خلوص و محبت

گرامی نامہ باصرہ نواز ہوا۔ کتنی پیاری ہے آپ کی تحریر، لفظ لفظ سے خلوص قلبی کے چشمے پھوٹ رہے ہیں۔ آپ یقین مانیں کہ ایسے لوگ اب دنیا میں بالکل نایاب ہیں۔ خط پڑھتا رہا اور آنکھوں سے رم جھم لگی رہی۔ مگر

اب کون آئے گا تیری رم جھم کو دیکھنے
اے چشم اشکبار بہت رات ڈھل گئی!

ایک مدت کے بعد "بیسویں صدی" دیکھنے کو ملا۔ حیران ہوں کہ عمر کا آپ کے حسن کار پہ کوئی اثر نہیں۔ بیسویں صدی کے معیار کو اب تو فلک بوسی کا اعتماد دینا ہی پڑتا ہے۔ اللہ آپ کو ہمیشہ زندہ و سلامت اور شاد و خرم رکھے۔ گزشتہ سال مجھے یہ سن کر بے حد دکھ ہوا کہ جگن ناتھ آزاد سرگودھا سے گزر کر جوہر آباد کالج میں مشاعرہ پڑھنے گئے اور انہیں اپنے دیرینہ ہمجولی کا خیال تک نہ آیا۔ حالانکہ قیام پاکستان کے بعد ڈھاکہ کے ایک مشاعرہ میں خلد آشیانی پنڈت ہری چند اختر اور آزاد مجھ سے ملے۔ اور بغلگیر ہو کر ہم اتنا روئے کہ لوگ ہمارے ارد گرد جمع ہو گئے۔ میرا ہی ایک شعر ہے کہ

غم دے کے غمگسار بھی پہچانتے نہیں
ہم بیکسوں کو یار بھی پہچانتے نہیں

کتنی حسین بستیاں ویران ہو گئیں
نظریں اٹھیں تو دیکھ کے حیران ہو گئیں

جلوے کسی کے حاملِ صد طور ہو گئے
کرنیں فلک سے ٹوٹ کے انسان ہو گئیں

تم کیا گئے کہ درد فضا میں بکھر گیا
گلیاں ہمارے شہر کی سنسان ہو گئیں

بربط کے تار ہو گئے جب نذرِ احتساب
چیخیں کتابِ زیست کا عنوان ہو گئیں

سر رکھ دیا خدا کی روایت کے سامنے
تجھ سے عجیب لغزشیں نادان ہو گئیں

انسان سیم و زر کے مزاروں میں کھو گیا
کروٹ بدل کے طاقتیں یزدان ہو گئیں

الطاف میکدہ بھی ہے اک حسن اتفاق
سب مشکلیں حیات کی آسان ہو گئیں

ایک غیر مطبوعہ و تازہ غزل ارسال خدمت ہے۔ خدارا کبھی کبھی ضرور یاد فرماتے رہا کریں۔ زندگی کا کیا بھروسہ۔ "بیسویں صدی" میں میری غزل پڑھ کر میرے تین دوستوں نے مدت کے بعد مجھے نہایت پیار بھرے الفاظ میں یاد کیا ہے۔ جناب ضیا فتح آبادی، جناب دیس راج یکتا اور جناب دلگیر شیرانی کی خدمت میں میرا سلام عرض کر دیجیے۔

بندۂ محبت

الطاف مشہدی

مشہور مصنفین کے مشہور ناول اور کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
افسانہ لکھو رہے ہو	خوش باش ایم اے	دو روپے
اندھیرے	اختر عادل روپ	دو روپے
آگ اور دھواں	م م راجندر ایم اے	دو روپے ۷۵ نئے پیسے
اندھیرے اجالے	عادل رشید	تین روپے
اندھیری راتیں	ریوتی سرن شرما	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
ایک پیالی ایک دھوکا	رام سرن شرما	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
بیگم صاحبہ	شوکت تھانوی	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
داماد	"	دو روپے ۵۰ نئے پیسے
پگلی	"	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
بےغیرت	مضطر ہاشمی	چار روپے ۲۵ "
باون پتے	کرشن چندر ایم اے	پانچ روپے ۹۵ "
کالی لڑکی	رتن لال ایم اے	دو روپے ۹۵ نئے پیسے
افشو	فیاض علی	آٹھ روپے ۵۰ "
برہمن	کرشن گوپال عابد	چار روپے ۵۰ "
ستم	"	چار روپے ۷۵ "
گھائل	"	تین روپے ۹۵ "
ظالم	سعید نصرت	دو روپے ۵۰ "
جانے والے	اختر عادل روپ	تین روپے ۵۰ "
جاگتی ہوئی بہار	وحشی محمود آبادی	چار روپے
چوٹ	دت بھارتی	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
گناہ	"	دو روپے ۹۵ نئے پیسے
حالِ دل	بیگم توقیر ولایت حسین	تین روپے ۵۰ "
خاتون	انتصار حسین	تین روپے
حاجی مراد	قیسی رامپوری	چار روپے
پاگل	رئیس احمد جعفری	چھ روپے
خم ابرو (نظم)	عبدالحمید عدم	دو روپے ۵۰ نئے پیسے

کتاب	مصنف	قیمت
دو پھول	عادل رشید	تین روپے ۹۵ "
دو سال پہلے دو سال بعد	زبیدہ خاتون	چھ روپے
فریب مسلسل	شفیق بانو	دو روپے
زہر	زکی انور	چھ روپے
برجیس	قیسی رامپوری	چار روپے
اچھی صورت بری نگاہ	ریاض ارشد	تین روپے
سناٹے	رضیہ سجاد ظہیر	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
مجھے تم سے محبت ہے	تقی نور	تین روپے ۵۰ "
نئے قدم	ہاجرہ نازلی	چار روپے ۵۰ "
ننگی جوانی	سعید نصرت	دو روپے
رہ گذر	انیس مرزا	چار روپے ۵۰ نئے پیسے
خوفناک محبت	عبدالحلیم شرر	تین روپے
شعلہ	انتصار حسین	تین روپے
کرنیں	شفیق الرحمٰن	تین روپے
ناظر کی آپ بیتی	ایم اسلم	تین روپے
ایک دل ہزار غم	عزیز بدایونی	دو روپے ۵۰ نئے پیسے
زرینہ	رئیس احمد جعفری	چھ روپے ۵۰ نئے پیسے
ننگا شہر	احمد شجاع	پانچ روپے
دردانہ	نادرہ خاتون	پانچ روپے
چندر کلا	جمنا داس اختر	دو روپے ۵۰ نئے پیسے
جلن	"	دو روپے ۵۰ "
رادھا الزبتھ	"	دو روپے ۵۰ "
پاپی	"	چار روپے
سونا گاچھی	"	چار روپے ۵۰ "
طوفانوں کی کہانی	"	چار روپے ۵۰ "
جوار بھاٹا	"	چار روپے ۵۰ "

کتاب	مصنف	قیمت
قیامت	زکی انور	دو روپے
سازش	"	دو روپے
کانٹوں کی سیج	رشید اختر ندوی	پانچ روپے
گھرانہ	قیسی رامپوری	چار روپے
ناگ دیوتا	محمود جالندھری	دو روپے
خون کے چھینٹے	"	دو روپے
خوابگاہ میں	"	تین روپے
فراق	رنگین بھارتی	تین روپے
پیاسا	"	تین روپے
پراسرار رقاصہ	"	دو روپے
پراسرار قاتل	"	دو روپے
پیاس	کے ایل نارنگ ایم اے	تین روپے ۵۰
محبت روتی ہے	غلام عباس	دو روپے
ماں	میکسم گورکی ترجمہ نرش کمار شاد	ایک روپیہ ۵۰
کھیت میں لہو	تاجور سامری	ایک روپیہ ۵۰
جی ہاں سچ ہے	شوکت تھانوی	تین روپے ۲۵
پردے کے پیچھے	منٹو	دو روپے ۵۰ "
ملکۂ صحرا	اوم پرکاش نامی	دو روپے ۵۰ "
خاموش نغمہ	"	چار روپے
آتش گل (مجموعہ کلام)	جگر مرادآبادی	پانچ روپے
باقیات اقبال " ذکر اقبال		تین روپے
تلخیاں (کلاں) "	ساحر	چھ روپے
تلخیاں (خورد) "	ساحر	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
پرچھائیاں "	ساحر	ایک روپیہ ۲۵ نئے پیسے
انسانیت موت کے دروازے پر	مولانا آزاد	تین روپے ۵۰ "
زہریلا حسن	اشفاق احمد	دو روپے

پتہ:- رسالہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی نمبر ۶

افسانہ

شیشۂ دل

واجدہ تبسم۔ ایم۔ اے

پلاٹ نمبر ۱، ریلوے بلاک نمبر ۱۳، سانتا کروز (ویسٹ) بمبئی ۵۴

یکم مئی ۱۹۶۴ء

اچھے بھیا!

پچھلے دنوں میں آپ سے بے حد خفا تھی۔ اور ساتھ ہی بدظن بھی۔ آپ نے اپنے لخت جگر کی شادی میں مجھے نہ بلا کر بہت دکھ دیا تھا۔ ایک وسوسہ یہ بھی تھا کہ کہیں آپ خود ہی مجھ سے خفا نہ ہوں یا یوں ہی بھلا رکھا ہے۔ لیکن پچھلے دنوں آپ کے مسلسل اور بہت سے خطوں نے پھر یہ احساس کرا دیا ہے کہ آپ بھولے نہیں ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کے خطوں کا جواب نہ جا سکا۔ میں منگلور گئی ہوئی تھی ——— ایک کہانی "شیشۂ دل" بھیج رہی ہوں۔ اس یقین کے ساتھ کہ وہ لیٹ ہو جائے گی۔ اگر لیٹ ہو جائے تو آپ اسے کسی اور شمارے میں چھاپ دیں۔ جب آپ کے پرچے میں چھپنا ہی ٹھہرا تو خاص نمبر یا عام نمبر کی کوئی تخصیص نہیں۔

آپ کی بہن واجدہ تبسم

آج کی رات دل پہ کس قدر بھاری ہے ———!!

باہر زوردار بارش ہو رہی ہے ——— سرد اور نکیلی ہوائیں میری کوٹھی کے در و دیوار سے ٹکرا رہی ہیں ——— میں نے شیشے کے دریچے سے اپنی ناک لگا کر ابھی ماحول کی ٹھنڈک محسوس کی ہے ——— بارش لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جا رہی ہے جیسے آج برس کر پھر کبھی نہ برسے گی ——— آج میں یوں محسوس کر رہی ہوں کہ یہ بوندیں آسمان کے آنسو ہیں۔ شاید اسے بھی میرے غم پر رونا آ رہا ہے۔ سائیں سائیں کرتی ہوا جب کمرے میں چکر لگاتی ہے تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے ہوا میرے حال تباہ پر سسکیاں بھر رہی ہے۔ آسمانی بجلیاں بھی نہیں چمکتیں کہ زندگی کی تاریکی میں ذرا سی روشنی کا احساس ہی دل کو خوش کر دے۔ آج تو ہر طرف تاریکی ہے۔ ہر سو اندھیرا ہے۔ ستاروں کی طرح روشنی بکھیرنے والے لمحات تو کب کے گزر چکے۔ آج تو صرف آنسو ہیں اور کراہیں ——— آج کی رات!!

آج سے پہلے میں کس قدر خوش تھی؟ کس درجہ مطمئن؟؟ دل کے نہاں خانوں میں چھپے غم کون دیکھ سکتا ہے بھلا ———؟ میں نے اپنے غموں پر خوشیوں اور مسکراہٹوں کا رنگین پردہ ڈال رکھا تھا، جو اتنا دبیز تھا کہ غم کی کرنیں کبھی اس کے آر پار نہ چمک سکیں اور دیکھنے والوں نے یہی سمجھا کہ مجھ سا خوش بخت اس دنیا میں کوئی نہیں ——— میں نے خود اپنے آپ کو اس قدر بھرپور دھوکا دیا تو دوسروں کو دھوکے میں رکھنا کون سی مشکل بات تھی ———؟ لیکن آج سارے بھرم کھل گئے ہیں۔ آج دل کا ہر داغ نمایاں ہو گیا ہے ——— اور میں بے حد حیرت کے ساتھ سوچ رہی ہوں کیا کسی کے منہ سے نکلا ایک ننھا سا جملہ میری خوشیوں کو یوں پامال کر سکتا ہے ———؟

میں نے ابھی نگاہیں اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا ہے۔ آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ سیاہ بادلوں کے اس پردے کے پیچھے ستارے بھی ہوں گے، بجلیاں بھی، لیکن سیاہی نے روشنی کو نگل لیا ہے۔ اب صرف رات کا بے پناہ اندھیرا ہے۔ بارش اسی شدت سے ہو رہی ہے۔ میں چاہتی ہوں آج اتنی بارش ہو، اتنی بارش ہو کہ اس پانی میں سب کچھ بہہ جائے ——— سب کچھ ڈوب جائے ——— میں اپنے غم، اپنی حسرتیں، اپنے دکھ، اپنا وجود تک بھول جاؤں۔ لیکن میں جانتی ہوں ایسا نہیں ہوگا۔ بارش بھی تھم جائے گی، چاند بھی چمک اٹھے گا، ستارے بھی نکل آئیں گے، لیکن میں اپنے سدا بہار غم کو لئے یادوں کے کھنڈر میں پھرتی رہوں گی۔ گل لالہ کے داغ کی طرح محبت کے اس داغ کو بھی ہمیشگی حاصل ہو گئی ہے۔

رات میرے ارمانوں کی طرح تاریک ہے۔

آج دوپہر ہی کی بات ہے خالد نے ایک پارٹی ارینج کی تھی بہت سے مہمانوں کے ساتھ ساتھ اس نے آفتاب کو بھی انوائٹ کیا تھا۔ خالد نے آج میرے لئے خاص طور سے ایک ساڑی خریدی تھی ——— ننھے ننھے گلاب کے بے شمار سرخ سرخ

پھولوں اور ہری ہری کومل پتیوں والی سلکن ساری۔ اور یہ ساری پہن کر بقول خالد میں "جانِ بہار" نظر آرہی تھی۔ واقعی خالد نے شادی کی پہلی سالگرہ کے عین مطابق بہاروں سے بھرا تحفہ دیا تھا۔ میں کس قدر خوش تھی!! اور خوش کیسے نہ رہتی۔ ایک عورت کی زندگی کی معراج اور کیا ہوتی ہے ——؟ محبت کرنے والا شوہر گڑیا جیسی ننھی مُنی بچی۔ اور پھر جس کا ماضی غربت اور افلاس میں کٹا ہو اُس کے لئے ذاتی بڑی سی، سجی سجائی کوٹھی —— کار —— فون —— یہ سب چیزیں بہت معنی رکھتی ہیں ——! مہمان ایک ایک کرکے آرہے تھے۔ چھیڑ چھاڑ بھی ساتھ ہی ساتھ چل رہی تھی۔

ذکیہ نے خالد پر وار کیا —— "بھئی شادی کی پہلی سالگرہ کی تصویر تو عموماً میاں بیوی پر مشتمل ہوتی ہے، مگر یہاں تو تیسرا ممبر بھی شامل ہوگیا —— بھئی بہت جلد باز ہو تم لوگ ——"

خالد بے شرمی سے ہنس دیا "بھئی اپنا بس نہیں چلا ورنہ پروگرام میں تو یہ شامل تھا کہ بابا بےبی ساتھ ساتھ ہی آجاتے ——" سب قہقہے لگانے لگے اور میں جھینپ کر رہ گئی۔

مہمان آتے گئے —— تحفوں سے میز لدتی گئی —— سب سے آخر میں آفتاب آیا —— روایتی شہزادوں کی طرح خوبصورت، وجیہہ اور بے پناہ گریس کا مالک —— اُس کے آتے ہی رشیں نے چوٹ کی ؎

وہ آئے بزم میں اتنا تو میرؔ نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

خالد ہنس کر بولا —— "آفتاب کے سامنے چراغ جل بھی کہاں سکتے ہیں یار" پھر اُس کی پیٹھ تھپک کر بولا —— "کیوں طبیعت ٹھیک نہیں ہے ——؟ بڑے بجھے بجھے سے نظر آرہے ہو ——؟"

آفتاب ہنس دیا —— اوپری دل والی ہنسی —— "نہیں یار ایسی کوئی بات نہیں —— کام —— کام —— کام —— انسان مشین تو ہے نہیں کہ تھک نہ جائے ——"

"پھر ضرورت اس بات کی ہے کہ فوراً شادی کرلی جائے ——" اسلم چہکا "کیونکہ ہر مرض کی دوا ہے بیوی ——"

ہنسی کا ایک فوارہ چھوٹا مگر آفتاب اس میں حصہ نہ لے سکا —— میں نے سہم کر اُس کی طرف دیکھا —— اُس کے روشن اور خوبصورت چہرے پر تاریکی اور غم کا یہ کیسا سایہ لپکا ——؟ خدا خیر کرے —— تھوڑی دیر بعد جب وہ میز پر اپنا تحفہ رکھ رہا تھا تو میں نے دھیرے سے کہا۔

"واقعی اب آپ کو شادی کرلینی چاہئے"

اُس نے میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا کہ میرا وجود ڈگمگا اُٹھا —— "شادی کیوں ——؟" ہلکی سی درد بھری مسکراہٹ!

"دل بہلنے کے لئے —— اور کیوں —— کیا لوگ شادیاں نہیں کیا کرتے؟"

"لیکن میں بار بار شادی کرنے کا قائل نہیں ہوں"

میں اُس کے دئے ہوئے شیشے کے گلدان کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی، اُس کی بات سُن کر چونکی —— "بار بار شادی ——؟ تو کیا آپ نے شادی کی ہوئی ہے!"

وہ ہنسا اور پھر اعتماد سے بھرپور لہجے میں بولا۔

"سُنو سحر —— میں نے زندگی میں صرف تم سے محبت کی، تمہیں چاہا اور تم سے ہی شادی کا خواب دیکھا۔ لیکن جب تم نے کسی اور کا دامن تھام لیا تو میں نے سوچا مجھ میں کوئی خامی رہی ہوگی جو تم نے مجھے نظر انداز کر دیا!"

چھن —— میرے ہاتھوں سے شیشے کا گلدان گرا۔ اور کرچی کرچی ہوگیا۔ اور ہر کرچی جیسے میرے دل میں چُبھ گئی۔ وہ کہے جارہا تھا ——

"میں نے جب دیکھا کہ تمہارے دل میں میرے لئے کوئی جذبہ نہیں تو تمہارے راستے سے ہٹ گیا۔ میں محبت میں زبردستی کا قائل نہیں ہوں، میں کیوں تمہیں محبت کرنے پر مجبور کرتا؟ لیکن یہ پھانس میرے دل میں کئی دنوں سے اٹک کر رہ گئی ہے کہ پوچھ تو لوں کہ کیا میں اتنا بُرا تھا ——؟؟"

میں نے گھبرا کر اُسے دیکھا —— اِدھر اُدھر دیکھا —— سب باتوں میں مشغول تھے، قہقہے، مذاق، لطیفے —— ہر طرف خوشیوں کی بارش ہو رہی تھی۔ مگر میں ایسے میں کہاں تھی ——! وہ سہم سا گیا —— معافی مانگنے کے انداز میں بولا۔

"خدا کے لئے سحر مجھے غلط نہ سمجھنا —— اور —— اور ——" وہ رک کر بولا —— "اب سے خدا کے لئے کبھی مجھے شادی کے لئے نہ کہنا —— میں بڑی تباہ زندگی گذار رہا ہوں ——" وہ یونہی کھڑے کھڑے میز کی سطح پر انگلی سے شعر لکھنے لگا ؎

بدل گئیں وہ نگاہیں یہ سانحہ تھا امیرؔ
پھر اس کے بعد کوئی انقلاب ہو نہ سکا

میں بُت بنی کھڑی تھی —— میری محویت کو سلمیٰ کی آواز نے توڑا۔

"بھئی خالد صاحب —— آپ نے سحر کے لئے ساڑی تو خوب پسند کی لیکن کچھ نامکمل سی ہے ——"

"کیا مطلب ——؟" خالد پریشان ہو کر پوچھ رہا تھا۔

"مطلب یہ کہ آپ کی پسند کردہ اِس ساڑی میں پتیاں ہیں، ڈنڈیاں ہیں، پھول

یاسمین صمدی، دہلی

تو یہ سب کچھ ہے مگر کانٹے نہیں ہیں ـــــ حالانکہ پھول کے ساتھ کانٹے تو ہونے ہی چاہئیں ـــــ"

میں نے بڑے کرب سے سر اُٹھا کر سلمیٰ کی طرف دیکھا ـــ کانٹے؟ ساری پھولوں سے لدی ہے تو کیا ہوا ـــــ کیا میری زندگی میں کانٹے نظر نہیں آرہے تھیں ـــــ" لیکن یہ آواز میرے دل سے نکلی تھی، ہونٹ تو بے صدا ہی تھے۔

مجھے یوں کھڑے کھڑے کتنے زمانے گذر رہے مجھے پتہ نہیں ـــــ جب میں نے چلنے کے لئے قدم اُٹھایا تو آفتاب کہہ رہا تھا۔

"سنبھل کے سحر ـــــ راہوں میں شیشے کی کرچیاں ہیں۔ کہیں پاؤں میں نہ چُبھ جائیں"

میں نے بے بس ہو کر اُسے دیکھا ـــــ "تم پاؤں کی بات کرتے ہو اور یہاں تو دل لہولہان ہے ـــــ" میں پھر بھی خاموش ہی تھی۔

اندر "فش پونڈ" والا مخصوص گیم شروع ہو چکا تھا۔ چلانے اور دھم مچانے کی آوازیں کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھیں، کسی نے ہمیں آواز دی ـــ "بھئی دو مچھلیاں غائب ہیں انہیں پکڑ لاؤ نا ـــــ"

لیکن میں اندر جانے کی بجائے بیڈ روم میں چلی آئی ـــــ زور سے آنکھیں میچ کر سونے کی کوشش کی، لیکن خوشیوں کی طرح نیند بھی جا چکی تھی۔ ذہن کے آسمان پر یادوں کے ستارے ایک ایک کرکے ٹوٹتے رہے۔ ہر جانا پہچانا چہرہ چاند بن کر اُبھرتا ڈوبتا رہا۔ سب سے آخیر میں صرف ایک ہی چہرہ چمکتا رہ گیا ـــــ یہ آفتاب تھا!!

وہ لمحہ جب میں نے پہلی بار دل کے سارے جذبوں کے ساتھ آفتاب سے محبت محسوس کی ـــــ!

شبنم باجی کی شادی تھی۔ ہمارا گھر بیحد چھوٹا اور شکستہ سا تھا اس لئے اُن کی شادی پھوپھی اماں کی شاندار کوٹھی میں ہونی طے پائی۔ پہلی بات تو بہن کی جدائی کا احساس اور دوسری بات اپنی غریبی کا احساس۔ یوں لگ رہا تھا کہ دل کا شیشہ کرچیاں کرچیاں ہوا جا رہا ہے۔ اے کاش ابو زندہ ہوتے، ہم بھی صاحبِ حیثیت ہوتے۔ لاکھ سگی پھوپھی ہیں، پھر بھی باجی کی شادی کسی اور کے ہاں نہ ہو کر اپنے بنگلے میں ہوتی۔ زندگی نے کس قدر خوبصورت اور پُر بہار دن دیکھے تھے اور آج کس قدر بے بسی کا سامنا تھا ـــــ؟ امی کس قدر تباہ ہو رہی تھیں ـــــ؟ میرا دل اندر ہی اندر رونے لگا ـــــ شام کے سات آٹھ بجے کا وقت تھا۔ اندر باجی کی رخصتی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ کئی لڑکیوں نے مل کر باجی کو سنوارنا شروع کر دیا تھا ـــــ باجی کی سسکیاں تھیں کہ رُکنے کا نام ہی نہ لیتی تھیں ـــــ کئی برسوں سے جو بندھن بندھا تھا وہ اب ٹوٹنے جا رہا تھا۔ نئی زندگی میں قدم رکھتے ہوئے انہیں کس قدر نصیحتیں ستا رہی ہوں گے۔ جانے اس راہ میں کیسے کیسے ساتھی ملیں۔ وہ پیچھے مڑ کر دیکھیں گی بھی تو سوائے آنسوؤں اور کراہوں کے کیا ملے گا ـــــ؟ کیا ایک لڑکی کا مقدر یہی ہوتا ہے خدایا کہ ہر گام پر ہر موڑ پر سہم سہم کر یہ سوچے کہ زندگی میں جس اجنبی ساتھی کا ہاتھ تھاما ہے، وہ اُسے خوش بھی رکھے گا یا نہیں۔ کیا محرومیاں ہی اُس کا نصیبہ ہیں یا پلکوں سے ٹوٹ کر گرنے والے ہر آنسو، ہر موتی کو اُس کا پردیسی ساتھی اپنی آنکھوں میں سمیٹ لینے کا حوصلہ بھی رکھتا ہے ـــــ! میرے ٹوٹے دل نے دعا دی ـــــ

"خداوندا ـــــ باجی نے بڑے بُرے دن گذارے ہیں۔ اُن کی راہ کا ہر کانٹا پھول بن جائے۔ اُن کی ہر کراہ، ہر آنسو، ہر غم کا بدلہ اب یوں دینا کہ وہ پھولوں، خوشیوں اور بہاروں میں کھو کر رہ جائیں"

باجی وداع ہو رہی تھیں۔ اُس وقت مجھے اُن کے پاس ہونا چاہئے تھا مگر میں وہاں باغ کے ایک کونے میں سنگِ مرمر کی بنچ کے ایک کونے پر سر نیہوڑائے یوں بیٹھی تھی جیسے کوئی مجسمہ۔ آنسو میری آنکھوں سے رواں تھے۔ اندر سے سسکیوں اور چیخوں کی آوازیں بلند ہوتی سُنائی دے رہی تھیں۔ مجھے خود پر قابو رکھنا دشوار ہو گیا۔ اُسی لمحہ میں نے اپنے سر پر کسی بیحد شفیق، مہربان اور محبت بھرے ہاتھوں کا دباؤ محسوس کیا۔ میں نے چونک کر سر اُٹھایا۔ "اس وقت تنہا بیٹھی یہاں کیا کر رہی ہو ـــــ؟ ارے تم تو رو رہی ہو ـــــ خدا خیر کرے ـــــ کیا ہوا ـــــ؟"

یہ آفتاب تھا ـــــ میں نے کوئی جواب نہیں دیا ـــــ بس سسکیاں اور تیز ہو گئیں۔

"اوہو ـــــ یہ لڑکیاں بھی رونے میں خوب ماہر ہوتی ہیں۔ بھئی ہوا کیا یہی نا کہ باجی کی شادی ہو گئی۔ انہیں دولہا مل گیا اور تمہیں نہیں ملا ـــــ تو یہ ایسی کوئی رونے کی بات نہیں۔ اگلے سال تمہاری باری سہی ـــــ" مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے سر اُٹھا کر دیکھا ـــ آفتاب نے بھی مجھے ایک لمحے کو دیکھا اور مسکرا کر کہا۔ "بھئی بُرا نہ ماننا سحر اس وقت تمہاری آنکھوں میں آنسو اور ساتھ ہی ہونٹوں پر ہنسی دیکھ کر اچانک ایک شعر یاد آگیا ؎

آتے ہی اُن کے اشک ہمارے نکل پڑے
لو ساتھ ساتھ چاند ستارے نکل پڑے

میں نے آفتاب کی اس انتہائی بے باکی پر بڑی حیرت سے اُسے دیکھا۔ وہ مسکرایا ـــــ "بھئی میں نے یہ اپنے لئے نہیں کہا ـــــ میں چاند واند نہیں ہوں۔ بس معمولی سا آفتاب ہوں ـــــ"

"معمولی سا آفتاب ـــــ؟" دل نے سوچا ـــــ "یہ معمولی سا آفتاب اگر میرے اندھیرے آسمان پر چمک اُٹھے تو ـــــ؟" میں سہم گئی۔ دل نے مجھے چونکایا۔

...ہوئی خواہش نہیں کیا کرتے ـــــ" غم کے سیاہ بادل نے پھر مجھے اپنے ...نے میں کھینچ لیا۔ میرا شکستہ چہرہ جو ابھی ابھی نئے نئے پھول کی طرح کھل رہا تھا، کھینچ ...یا ـــــ ایکدم بہت سارے آنسو میری آنکھوں سے اُبل پڑے۔ ساتھ ہی ایک ہلکی چیخ بھی میرے منہ سے نکل گئی۔ آفتاب نے تڑپ کر آگے بڑھ کر میرا آنسوؤں سے بھرا ...چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور بھاری آواز میں کہنے لگا۔

"سحر میں تمہارے غم کو سمجھتا ہوں۔ اس وقت تمہیں شبنم کی جدائی کا اتنا خیال ...ہے جتنا اس بات کا کہ اس نے، اور ساتھ ہی تم نے بھی، کس قدر دکھی زندگی ...ری ہے، تمہارے دل میں یہ غم پل رہا ہے کہ ساری زندگی کٹھنائیوں میں گذارنے ...بعد آج جس کا ہاتھ تھاما ہے پتہ نہیں وہ کس انداز سے پیش آئے ـــــ اور ...گی اب اپنے آپ کو کس روپ میں پیش کرے۔ مگر ہر سب سے ٹُرا کر لے جانے ...اتنا بے رحم نہیں ہوتا، دراصل اتنی ایک ہستی کے سہارے تو لڑکی اتنی ساری ...دن کو قبول کر لیتی ہے ـــــ رضوان میرا دوست ہے، میں اُسے جانتا ہوں۔ ...نے بھی دیکھا ہے کہ وہ شبنم کو کس قدر چاہت سے بیاہ کر لے جا رہا ہے۔ ایسے بے بنیاد ...دن کو اپنے دل میں جگہ نہ دو ـــــ" اس نے دھیرے سے میرا چہرہ چھوڑ دیا۔ ...اری پیاری آنکھیں رونے کے لئے نہیں بنی ہیں ـــــ"

میرا دل ڈگمگا گیا ـــــ آفتاب کی تسلی میں کس قدر اعتماد بھرا ہوا تھا۔ جی چاہا ...تاہ کر بیٹھوں کہ آفتاب کے آگے سر جھکا دوں ـــــ جی چاہا اُس کے پاؤں ...کی دھول اپنی مانگ میں بھر لوں۔ جی چاہا کہ شکایت کر بیٹھوں کہ سورج کا ایک ...ہونے کے باوجود بھی اب تک تم نے میری دنیا کو کیوں اندھیرا رکھا۔ لیکن میں کچھ ...میں نے اپنا بوجھل سر اٹھایا۔ وہ مجھ سے کس قدر بلند تھا۔ جیسے وہ آسمان تھا، ...زمین ـــــ مگر محبت جو کہ ان وسوسوں سے بالاتر ہوتی ہے میرے دل ...مر کر چکی تھی۔

محبت میں سوچنے سمجھنے کی گنجائش ہوا کرتی تو میں آفتاب کو چاہنے سے قبل یہ سوچ لیتی کہ وہ ایک بڑے باپ کا بیٹا ہے۔ اُس کے ڈیڈی لاکھوں میں کھیلتے ...وہ بڑی سی کوٹھی میں رہتا ہے۔ لمبی سی کار میں گھومتا ہے اور میں ـــــ؟ مگر ...واقعی اندھی ہوتی ہے ـــــ!! اُس رات کی چھوٹی سی واردات کے بعد ...نے محبت کو اپنا جیون بنا لیا۔ میں آفتاب کے لئے جینے لگی۔ ایک لمحے کو بھی یہ نہ ...کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ کیا وہ بھی مجھے چاہتا ہے ـــــ؟ میں ...سوچتی۔ میرا مذہب محبت کئے جانا تھا۔ یہ سوچنے کی مجھے ضرورت نہ تھی کہ وہ مجھے ...ہے یا نہیں ـــــ چاہے گا یا نہیں ـــــ میں محبت میں سودے بازی کو

کیوں جگہ دیتی۔ دل جو دینے کی چیز تھی دے دی۔ لینے کے بارے میں میں نے کبھی نہ سوچا۔

لیکن زندگی ـــــ! زندگی نے مجھے بتا دیا کہ میں نے آفتاب کے ہاتھوں میں اپنا دل صرف جلنے کے لئے دیا تھا۔ اُس نے میری محبت کو کبھی محبت نہ سمجھا ـــــ؟؟ کیا وہ یہ سمجھتا رہا کہ یہ سب کچھ کھیل ہے ـــــ؟! بھول شاید میری ہی تھی کہ اس کی تسلی اور دلاسے کو محبت کا روپ دے بیٹھی۔ یہ تو سوچا ہوتا کہ غم اور دکھ میں لوگ زخمی دل پر وقتی پیار کا پھاہا تو رکھ ہی دیتے ہیں ـــــ مگر پھر اِس چاہت کے نرالے ڈھنگ؟

مجھے اچھی طرح یاد ہے عید پر پھوپھی اماں نے ہم سبھوں کو اپنے گھر بلایا تھا۔ عید کے ہنگامے کے بعد جب دوسرے دن ہم لوگ جانے لگے تھے تو پھوپھی اماں نے امی سے کہا تھا۔

"ثریا ـــــ آفتاب نے کہا تھا سحر کو چند دنوں کے لئے روک لینا۔"

امی نے ہڑبڑا کر مجھے دیکھا۔ میں نے پھوپھی اماں کو ـــــ وہ ہنس کر بولیں۔

"وہ کہتا تھا شبنم کی جدائی سے سحر بہت نڈھال ہے اور خود کو تنہا تنہا محسوس کرتی ہے یہاں رہ کر اُس کا دل بہل جائے گا۔"

میرا من کھل اُٹھا ـــــ آفتاب کو میرا کس قدر خیال ہے۔ کیا... کیا... میں نے رک رک کر، ڈر ڈر کر، سہم سہم کر سوچا ـــــ "کیا وہ بھی مجھ سے محبت کرنے لگا ہے ـــــ؟!" مگر پھر وہی نامراد دولت دیوار بن کر کھڑی ہو گئی اور میں نے خود کو تسلی دی ـــــ "وہ نہیں چاہتا تو کیا ہوا ـــــ کیا یہ کافی نہیں ہے کہ میں ہی اُسے چاہتی رہوں!"

پھوپھی اماں کے ہاں زندگی کا بالکل وہی ڈھب تھا، جو ناولوں، افسانوں یا پکچروں میں ہوتا ہے۔ غم زندگی سے دور دور یہ لوگ خوشیوں میں اس طرح ڈوبے رہتے تھے کہ پتہ چلتا ہی نہ تھا کہ اس کوٹھی سے باہر دنیا میں فکریں، اُلجھنیں، غم اور آنسو بھی ہوتے ہیں ـــــ پھوپھی اماں کی ایک ہی لڑکی تھی۔ رعنا باجی ـــــ ایک ہی لڑکا آفتاب ـــــ مگر اُن دونوں کے دوست احباب، ملنے جلنے والے اِسقدر بے حساب تھے کہ بلا مبالغہ کوٹھی پر کسی ہوٹل کا گمان ہوتا تھا ـــــ لوگ آ رہے ہیں جا رہے ہیں۔ کافی چل رہی ہے۔ چائے بن رہی ہے۔ کھانے پک رہے ہیں۔ کھلائے جا رہے ہیں۔ ریڈیو چیخ رہا ہے۔ پیانو کی خبر لی جا رہی ہے، پنگ پانگ، بیڈمنٹن، کرکٹ چل رہا ہے، کیرم کی شامت آ رہی ہے۔ ساتھ ساتھ برف میں لگے ٹھنڈے ٹھنڈے پھل کھائے جا رہے ہیں۔ ریڈیوگرام پر مغربی موسیقی کے ایک ساتھ کئی کئی ریکارڈ چڑھا دئے گئے ہیں۔ فلش بلب چمک رہے ہیں۔ دھڑا دھڑ

...جا رہی ہیں۔ مجھے یہ سب کچھ بڑا عجیب عجیب سا لگتا جیسے میں
...اب دیکھ رہی ہوں یا پریوں کے قصوں والے دیس میں آ گئی ہوں۔ جہاں
...خوبصورت خوشیاں ہیں۔ بہاریں ہیں۔ رنگین ریشمی چمکیلے بھڑکیلے ملبوسات ہیں۔ سب
...پہ ہے مگر دل نہیں۔ محبت کی قدریں نہیں۔ وہ چوٹ میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ اُس
...ن لمبی سی کار میں لد کر سب سینما جا رہے تھے۔ حسب معمول میں اکیلی باغ کے کونے
...ں بیٹھی ہوئی تھی۔ اکیلے پن میں خیالات میں کھوئے رہنا میرا سب سے بڑا عیش
...رہا ہے۔ میں خیالات سے تب چونکی جب کسی نے میرے متعلق بات کی۔

"اسے بھئی جب بھی جا رہے ہیں تو اسے کیوں چھوڑ رہے ہو ـــ!"

رعنا باجی کی آواز آئی ـــ "بھئی اُس کے کپڑے وغیرہ تو دیکھو۔ اور پھر
بال بنانے کا تو اُسے ذرا سلیقہ نہیں ـــ چڑیے کا گھونسلہ بنے رہتے ہیں
اُس کے بال ـــ"

رعنا باجی کی گہری سہیلی شیلا کی آواز آئی ـــ "مگر سچ پوچھو تو رعنا
...ن حلیے میں بھی وہ پری جیسی لگتی ہے ـــ کیا بے پناہ حسن پایا ہے کم بخت نے۔"

"اونہہ ـــ بھئی چلئے نا بہت دیر ہو جائے گی ـــ" میں نے
دونوں ہاتھوں سے بالوں کو سمیٹا۔ قدرے سامنے جھک کر کار کی طرف دیکھا۔
اسٹیرنگ پر آفتاب جھکا ہوا تھا۔ رعنا باجی کا حکم پا کر وہ مستعد ہو گیا اور زوں کی آواز
کے ساتھ کار یہ جا وہ جا۔

مجھے آنسو روکنا دوبھر ہو گیا۔ امی مجھے یہاں کس لئے چھوڑ گئی ہیں ـــ؟ یوں
...ہیں دل بہلا کرتا ہے ـــ؟ میں اس قدر روئی ہوں اس قدر روئی ہوں کہ
میری آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ اُسی لمحہ مجھے اپنے سر پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔
...ہاتھ! اسے تو میں جنم جنم سے جانتی ہوں ـــ اسی ہاتھ کو تھام کر تو میں
نے زندگی کے خواب زاروں میں قدم رکھا تھا۔ اسی ہاتھ کے سہارے تو چل کر
میں نے بہاروں کے دروازے پر دستک دی تھی ـــ آفتاب یہ تمہارا ہی
ہاتھ ہے نا میرے آفتاب ـــ!

میں گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوئی ـــ آفتاب نے مجھے شرارت سے دیکھا۔
"تم تو بس اس موقعے کی تاک ہی میں رہتی ہو کہ آنسو بہا سکو! چہرہ دیکھو ذرا،
سرخ گلاب ہو رہا ہے ـــ"

میں نے بات ٹالنے کی کوشش کی ـــ "آپ کیوں پلٹ آئے؟"
میں نے نگاہوں سے سوال کیا ـــ میرے خاموش سوال کا اُس نے
شائستگی سے جواب دیا ـــ "ٹکٹ نہیں ملی ـــ" وہ ہنسا ـــ میں نے
بے یقینی انداز سے اُسے دیکھا ـــ وہ مسکرائے جا رہا تھا۔

میرے خدا ـــ میں کدھر جا رہی ہوں ـــ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔
کہیں محبت دھیرے دھیرے ہم دونوں کے دلوں میں اپنے قدم تو نہیں جما رہی ہے
آفتاب! خدا کے لئے آفتاب اس قدر قریب نہ آؤ ـــ تمہاری قربت کا تصور
ہی مجھے جلا کر راکھ کر دے گا۔ تم سورج ہو۔ سورج کی تمنا خوبصورت سہی مگر زندگی
مجھ پر اتنی مہربان نہیں کہ اُجالے میرا مقدر بن جائیں ـــ!!

آفتاب نے کبھی بھولے سے بھی اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا۔ میں کبھی یہ
جان ہی نہ پائی کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے یا محض ہمدردی ہے۔ بالکل ویسی ہی
ہمدردی جیسی غریبوں کے ساتھ امیروں کو، پیسہ والوں کو ہوتی ہے۔ کبھی کبھار اُس
کے رویے سے مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ مجھ پر نچھاور ہونے سے بھی دریغ
نہ کرے گا لیکن جب میں اس جذبے کا تجزیہ کرنے بیٹھتی تو مجھے لگتا کہ وہ سب کچھ
خدا ترسی اور ہمدردی ہے۔ وہی دل پر مرہم رکھنے کا پرانا انداز ـــ جس سے
میں کبھی اُس کی محبت کا ثبوت نہ پا سکی۔

پھوپھی اماں کے ہاں ایک دن سب لوگ "میوزیکل چیرز" کھیل رہے تھے۔
یہ گیم یوں کھیلا جاتا تھا کہ اس میں بارہ کھلاڑی ہوتے تھے اور گیارہ کرسیاں، یہ
گیارہ کرسیاں ایک قطار میں یوں رکھ دی جاتیں کہ ان کی سمتیں مخالف ہوتیں۔ ادھر
کوئی بھی ہارمونیم بجاتا رہتا اور بارہ کھلاڑی دھیرے دھیرے گیارہ کرسیوں کے
ارد گرد گھومتے بھاگتے رہتے۔ جب ہارمونیم رک جاتا تو اکدم سب کرسیوں کی
طرف لپکتے۔ جو ایک بچ جاتا وہ آؤٹ قرار دیا جاتا۔ اس طرح ایک کرسی اور ہٹا دی
جاتی اور یوں آخر میں کرسی پا لینے والا جیت جاتا اور انعام کا مستحق ٹھہرتا ـــ اُس
دن میں بھی اس گیم میں شامل کی گئی ـــ کرسیاں گھٹتے گھٹتے اور ساتھی آؤٹ ہوتے
ہوتے آخیر میں صرف میں اور آفتاب ہی رہ گئے۔ میرا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ ہارمونیم
رکا تو حالانکہ آفتاب کرسی کے سامنے تھا ـــ وہ ہٹ گیا اور مجبوراً مجھے بیٹھنا اور
جیتنا پڑا ـــ سب لوگ تالیاں بجانے اور شور مچانے لگے۔ لیکن رعنا باجی آگے
بڑھیں اور زناٹے کے ساتھ بولیں۔

"ایسی چھچھوری حرکتوں سے تم کیا سمجھتی ہو کہ پیار کی بازی بھی جیت لو گی ـــ؟
اس بھرّے میں نہ رہو۔ زمین بن کر آسمان کو چھونے کی کوشش مت کرو ـــ بھیا
تمہارے مقابل بہت عظیم ہیں اور یہ سوچ لو کہ وہ منگنی شدہ بھی ہیں ـــ"

میں کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ سوچ بھی نہ سکی۔ ہوا کیا تھا؟ رعنا باجی مجھ سے کیوں
بگڑ بیٹھیں۔ میں نے کب اُن کے بھیا کو اُن سے چھیننے کی کوشش کی ہے۔ میں کب
اس گھر میں۔ اس محل میں۔ اس کوٹھی میں بہو بن کر آنا چاہتی ہوں۔ میں تو کچھ بھی نہیں
چاہتی۔ کچھ بھی نہیں چاہا۔ ہاں ایک چھوٹی سی بھول ہو گئی ہے کہ میں نے تمہیں چاہا ہے

نظمت سکندر (ہم کولوبلی)

آفتاب ــــ اور میں!

امی شام میں اپنے گھر چلی آئی اس تہیے کے ساتھ کہ اب زندگی باقی رہی تو پھر کبھی اس کوٹھی میں قدم نہ رکھوں گی جہاں چراغوں کی بجائے دل جلائے جاتے ہیں۔ جہاں کے باغوں کے پھولوں میں خونِ دل کی لالی مسکراتی ہے۔ میں کبھی نہ جاؤں گی۔ مگر میرے سارے عہد دھرے کے دھرے رہ گئے جب ایک شام بیحد لمبی خوبصورت اور چمکتی سی کار لے کر آفتاب آیا اور امی سے کہا کہ سحر کو امی نے فوراً بلایا ہے ــــ امی بے چاری کو کیا معلوم تھا کہ تمہیں کیا بات ہے۔ انہوں نے مجھے سوار کرا دیا۔ کار کے چلتے ہی میرے آنسو بھی شروع ہو گئے۔ آفتاب نے ذرا دور چل کر کار روک دی۔

"اُف ــــ پھر وہی ابرِ باراں!!" وہ جیسے گھٹ گھٹ کے جلنے والے لہجے میں بولا "یہاں سامنے تشریف لے آئیے آپ ــــ" میں جھجکی تو وہ چڑ کر بولا ــــ "میں کہتا ہوں کہ سامنے آ کر بیٹھو نا ــــ" میں دھیرے سے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا اور بولا ــــ "امی وی نے نہیں بلایا۔ میں خود ہی لینے آیا ہوں" میں نے بوکھلا کر اُسے دیکھا تو وہ ہنسا ــــ "چلو ایک لمبی ڈرائیو پر چلتے ہیں ــــ تمہاری ساری تھکن دور ہو جائے گی۔ تم بھی اُٹھو گی ــــ"

آفتاب ــــ تمہاری قربت میں اگر میں ہوں تو مجھے کون سی تھکن زیر کر سکتی ہے ــــ؟ میں تو تمہیں دیکھتے ہی جی اُٹھتی ہوں۔ مجھے کسی سیر کی کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ شے جو خون بن کر میری رگوں میں دوڑ رہی ہے وہ تمہاری محبت ہے۔ بس اس دولت کو مجھے بخش دو پھر میں کبھی خدا سے اپنے بخت کی نارسائی کا گلہ نہ کروں گی۔ مجھے صرف تمہارا پیار تمہارا ساتھ چاہئے میرے آفتاب! یہ سب کچھ میرے دل کی زبان نے کہا ــــ میرے ہونٹ ساکت وصامت تھے اور آنکھیں ــــ؟ (ان آنکھوں نے ہی تو مجھے تباہ کیا ــــ نہ یہ ہوتیں نہ میں آفتاب کا جلوہ دیکھتی اور تباہ ہوتی ــــ!) وہ آفتاب کو یوں دیکھے جا رہی تھیں کہ بس چلے تو سدا کے لئے وہیں چھپا کر رکھ لیں۔

وہ رات ــــ زندگی کی یادگار رات ــــ رعنا باجی اور آفتاب کے بہت سے دوست، احباب اور لکھنؤ والی ممانی جان کے سارے بچے مل کر باغ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ بات یوں نکلی کہ مردوں کو کس قسم کی بیویاں پسند کرنی چاہئیں اور بیویاں کس قسم کے مردوں کو پسند کریں ــــ ایک صاحب بولے ــــ "کیوں یار آفتاب تمہارا کیا نظریہ ہے اس کے متعلق ــــ" آفتاب نے بے پناہ سنجیدگی سے جواب دیا ــــ "یار بیوی کے تعلق سے اپنا ایک ہی نظریہ ہے کہ بیوی اُلجھے اُلجھے بالوں والی ہو اور بیحد صاف ستھری نہ ہو ــــ اس سے یہ ہوتا ہے کہ شام کو جب تھک تھکا کر گھر آؤ تو یہ احساس بڑا سکون دیتا ہے کہ بیوی بڑی بگھڑ اور ضد دار قسم کی ہے۔ دن بھر کے کام سے بال اُلجھ گئے ہیں ــــ رنگ سنولایا ہے کپڑے ذرا میلے ہو گئے ہیں ــــ وہ ہنس کر ذرا رکا اور رعنا باجی کی طرف دیکھ کر بولا۔ "ہر دم ہی بی بی ہاہا کرنے، بن ٹھن کر سدا ٹیپ ٹاپ رہنے والی خواتین کو میں اکثر ناپسند کرتا ہوں ــــ"

یوں جیسے سارا قصور میرا ہی تھا، رعنا باجی نے مجھے بیحد گھور کر دیکھا اور جل کر آفتاب سے مخاطب ہوئیں ــــ "مگر بھیا صاحب آپ کو مبارک ہو کہ آپ کی ہونے والی دلہن ان تمام صفات سے مبرا ہیں جو آپ کو پسند نہیں ــــ شاہینہ بیحد صاف ستھری رہتی ہے، بال بڑے بنے سنورے رہتے ہیں اور خدا کے کرم سے اُس کے ہاں اتنے نوکر ہیں کہ اسے بیل کی طرح کام میں جُت کر کپڑے میلے کرنے کی کبھی ضرورت نہیں پیش آتی ــــ"

میں نے پہلی بار آفتاب کو اتنے غصے میں دیکھا ــــ "رعنا خاموش رہو ورنہ زبان کھینچ لوں گا ــــ نالائق کہیں کی ــــ" ماحول اچانک بڑا ٹینس ہو گیا۔ کچھ سوچ کر آفتاب نے خاموشی اختیار کر لی ــــ رعنا باجی اپنی انسلٹ بُری طرح فیل کر کے بالکل بچوں کی طرح روتی ہوئی اُٹھ گئیں ــــ "بڑے آئے مجھے ڈانٹنے والے ــــ سب کچھ ڈیڈی سے نہ کہہ دیا تو نام نہیں بڑے آئے شادی کرنے والے ــــ" انہوں نے مجھے گھور کر دیکھا اور اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

پھر سب اُٹھ گئے۔ میں اکیلی بیٹھی رہ گئی ــــ خزاں رسیدہ پتے ایک ایک کر کے ٹوٹتے اور میرے قدموں میں آ آ کر ڈھیر ہوتے رہے۔ اس ڈھیر میں بیٹھے بیٹھے اچانک میں نے یوں محسوس کیا کہ میں خود بھی ایک خزاں رسیدہ پتہ ہوں جو خزاں کے بے رحم ہاتھوں یہاں ٹوٹ کر آ گرا ہے ــــ بڑی رات گئے میں ڈھیر سے اُٹھی ــــ باغ میں موسم اور بے موسم کے جتنے بھی زرد رنگ کے پھول تھے سب کو جمع کیا اور ایک گلدستے کی شکل میں جمع کر کے آفتاب کی میز پر رکھ آئی۔

دوسرے دن ایک عجیب وغریب حادثہ ہو گیا ــــ رعنا باجی کو دیکھنے کے لئے کچھ مہمان آنے والے تھے ــــ ویسے تو بڑے باپ کی بیٹی ہونے کے باعث اُنہیں کئی پیغام آ چکے تھے ــــ ان میں ایسے بھی تھے جو مالا مال تھے۔ ایسے بھی تھے جنہیں امیر گھرانے کی بیٹی کے ساتھ ساتھ ہزاروں روپے کے جہیز کی بھی آس تھی۔ مگر یہ جو مہمان آ رہے تھے یہ اِسقدر رئیس تھے کہ ان کے بارے میں سُنا گیا کہ وہ کہتے تھے کہ "آسمان خدا کا زمین میری ــــ" یعنی چاند سورج ستارے اور آسمان ہی ایسی چیزیں ہیں جنہیں میں حاصل نہیں کر سکتا، ورنہ زمین پر شاید ہی کوئی شے ایسی ہو جسے میں چاہوں اور خرید نہ لوں ــــ!

پھوپا صاحب ایسے کوئی پرانے خیال کے آدمی نہ تھے۔ رعنا آپی بھی پردہ نہیں کرتی تھیں، خود ہی کار ڈرائیو کرتی تھیں۔ شاپنگ کو کھلی کار میں جاتی تھیں ـــــ اُن پر کسی قسم کی پابندی نہیں تھی۔ اکلوتی تھیں۔ ماں باپ کے بے حد لاڈوں کی تھیں۔ خالد صاحب اپنا پیغام خود ہی لے کر آ رہے تھے کیونکہ اُن کے ماں باپ عرصہ ہوئے انتقال کر چکے تھے۔ ٹی پارٹی کا بے حد بڑے پیمانے پر انتظام ہوا تھا، اُس کی کرتا دھرتا رعنا باجی ہی تھیں۔

شام پڑے خالد صاحب آ گئے۔ پارٹی اُنھوں نے خوب انجوائے کی اور سب میں بے حد گھل مل گئے۔ جاتے جاتے وہ بے حد خوش تھے۔ پھوپا صاحب سے اُنھوں نے بالکل فرینک ہو کر کہا ـــــ "آپ کے گھر کا ماحول مجھے بہت پسند آیا، سب لوگ بھی۔ سحر کو میں نے ہر لحاظ سے بہترین پایا ـــــ مجھے بار بار فارن آنا جانا پڑتا ہے۔ جلد ہی پھر جانا ہے۔ بہت بہتر ہو جو آپ اِس نیک کام کو جلد سے جلد نپٹا دیں۔"

پھوپا صاحب نے بے حد اطمینان سے جواب دیا: "جیسی آپ کی مرضی۔"

اُس رات جب میں نیند کے لئے تڑپ رہی تھی اور نیند مجھ سے بھاگی جا رہی تھی، آنسوؤں کی سوغات دے کر ـــــ کہ پھوپا صاحب کمرے میں داخل ہوئے اور بڑے پیار سے بولے۔

"بیٹی سحر آج کل کا زمانہ ایسا نہیں ہے کہ شادی بیاہ جیسے مسئلے میں لڑکیوں کی رائے نہ پوچھی جائے ـــــ خالد نے رعنا کی بجائے تمہیں پسند کیا ہے ـــــ ٹھیک ہے۔ تم بھی میری ہی بیٹی ہو۔ اور اس لحاظ سے زیادہ توجہ اور محبت کی مستحق کہ تمہارے سر پر باپ کا سایہ نہیں۔ بیٹی خالد کو میں رعنا کے لئے ہر لحاظ سے پسند کر چکا تھا صرف خالد کی اپنی پسند باقی رہ گئی تھی سو اُس نے آج تمہیں پسند کر لیا ـــــ ظاہر ہے مجھے یہ رشتہ دل سے پسند ہے۔ تمہاری ماں کو بھی ہوگا ہی۔ تم اپنی رائے بتلا دو۔ مگر میں اپنے طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ اس سے اچھا رشتہ تمہیں پھر کبھی نہ آئے گا۔ سوچ لو اور مجھے جواب دو۔ وقت بڑا قاتل ہے وہ کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ ایسا نہ ہو کہ بعد کو تم پچھتاتی رہو ـــــ"

"لیکن پھوپا صاحب میں آفتاب کو چاہتی ہوں۔ میں اس کے بغیر زندگی کا تصور تک نہیں کر سکتی۔ پوچھنا کیا ضرور ہے کیا آپ کو محسوس نہیں ہوتا کہ میرا انگ انگ اس کا دیوانہ ہے ـــــ خدا کے لئے پھوپا صاحب رعنا باجی کو خالد صاحب سے بیاہ دیجئے اور مجھے بہو بنا کر اپنے قدموں میں جگہ دے دیجئے ـــــ"

میں نے بے صدا آواز سے چلا چلا کر یہ سب کچھ کہا مگر پھوپا صاحب کچھ نہ سُن سکے ـــــ میں چکرا کر اُن کے پیروں میں گر پڑی اور وہ میری خاموشی کو میری رضا سمجھ بیٹھے۔

پھوپا صاحب نے باپ بن کر میری شادی کا سارا بار اُٹھا لیا۔ دن رات میں یہی سوچتی رہتی اِس محبت کے بوجھ کو میں کس طرح سہار پاؤں گی ـــــ؟ کہیں خالد پر یہ راز افشا ہو گیا تو ـــــ؟ آفتاب تم تو مرد تھے۔ تم نے یہ بزدلی کیسے دکھائی۔ کیوں نہ اپنی امی اور ڈیڈی سے صاف کہہ پائے میں سحر سے شادی کرنا چاہتا ہوں ـــــ! سوچتے سوچتے مجھے ہنسی آ جاتی ـــــ مگر سحر بی بی ـــــ آفتاب نے تم سے محبت کا اقرار ہی کب کیا ہے جو تم اِن زاویوں سے سوچتی ہو ـــــ اگر محبت ہوتی تو ضرور کہتا مگر کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ تمہیں چاہتا بھی ہے ـــــ؟ یہی ایک غم تھا جس نے جان ہی لے لی ـــــ اور یہی ایک سہارا تھا جس نے جینے کا حوصلہ بخشا کہ جب اُس نے مجھے چاہا ہی نہیں تو میں کیوں اپنی محبت سے خالد کو محروم کروں ـــــ؟ یہ سوچ کر میرا جی جل اُٹھتا کہ میرے ہی لئے آفتاب کے دل میں ہمدردی اور خدا ترسی کا جذبہ کیوں اُبھرا جسے میں نادان، محبت سمجھ بیٹھی۔ اب کبھی آفتاب سے سامنا ہونے کی نوبت آتی تو میں نگاہیں چرا لیتی۔ عورت سب کچھ برداشت کر جاتی ہے، محبت کی تذلیل نہیں سہہ سکتی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ آفتاب پر اپنی بے لوث محبت کا راز کھول دوں اور وہ یہ سمجھنے لگے کہ میں اُسے شاید اِس لئے چاہتی ہوں کہ اُس کے پاس دولت ہے۔ کوٹھی ہے۔ کار ہے۔ نہیں میری محبت اتنی سستی نہیں ہے ـــــ اے خدا مجھے صبر کی طاقت دے۔ میں نے خود کو حالات کے ہاتھوں سونپ دیا۔

خالد کے یہاں بیاہ کر آئی تو مجھ پر زندگی کے نئے دروازے کھل گئے۔ خالد نے دُنیاوی عیش کے ساتھ ساتھ مجھے اِس قدر بھرپور محبت دی کہ میں اپنے نصیب پر آپ نازاں ہو گئی۔ زندگی میں کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ کبھی بھولے سے میرا دل نہ دُکھایا۔ جو بات میرے منہ سے نکل گئی گویا پتھر کی لکیر ہو گئی اور اُسے پورا کرنا خالد پر فرض ہو گیا۔ میرا دل جو آفتاب کی محبت میں جل کر راکھ ہو چکا تھا، خالد کی محبت سے جی اُٹھا۔ میں اپنا ماضی بھول گئی۔ سب کچھ بھول گئی، صرف یہ یاد رہ گیا کہ میں خالد کی ہوں اور خالد میرا ـــــ زندگی میں جتنی محرومیاں تھیں، کھونے کا جو کچھ احساس تھا سب مٹ گیا۔ میں خوشیوں میں مگن ہو گئی۔ ہر بات بھول گئی۔ ہر یاد کو بھلا دیا۔ ہر یاد کو فراموش کر دیا۔

زندگی کا تقاضا ہی یہ تھا کہ خالد کی بے پناہ محبت کا جواب محبت سے دے سکوں۔ آج آفتاب آ گیا اور اپنے ساتھ یادوں کی بے شمار کرچیاں بھی لے آیا، جو میرے دل میں چبھ کر رہ گئی ہیں ـــــ اور اب جس سے زندگی بھر قطرہ قطرہ خون نچڑتا رہے گا اور میں ویران راتوں میں آنسوؤں کے چراغ جلائے یہ سوچتی رہا کروں گی

کہ یہ سب کیا ہو گیا ـــــ کیا ہو گیا ـــــ آفتاب نے پوچھا ہے ـــــ "مجھ میں کیا تہی تھی۔ کیا میں اتنا بُرا تھا کہ تم اپنا نہ سکیں؟ میں محبت میں زبردستی کا قائل نہیں ہوں۔ میں کیوں تمہیں محبت کرنے پر مجبور کرتا ـــــ تمہارے دل میں میرے لئے کوئی جذبہ ہی نہ تھا تو میں بھی تمہارے راستے سے ہٹ گیا ـــــ!

وہ میرا بے پناہ احساسِ کمتری تھا خدایا ـــــ جس سے سدا میرے لب بند ہی رہے۔ کسی لمحے بھی میں آفتاب کے سامنے زبان نہ کھول سکی۔ ہر بار آنسوؤں سے بات کا جواب دیا۔ یا کبھی مسکرا کر رہ گئی۔ یہ سوچا ہی نہیں کہ ہر بار کی خاموشی اُسے غلط فہمی میں بھی مبتلا کر سکتی ہے۔ میری خاموشی نے اُسے غلط فہمی میں ڈالا کہ میں اُسے نہیں چاہتی۔ اور اُس کے یوں محتاط رہنے سے میں یہ سمجھی کہ وہ مجھ سے صرف ہمدردی جتا رہا ہے۔ یہ کیسی بھول ہو گئی خدایا ـــــ لیکن اگر یہ غلط فہمیاں پیدا نہ ہوتیں تو بھی کیا میں آفتاب کو حاصل کر سکتی تھی ـــــ؟ آفتاب اتنی بڑی مکر لے سکتا تھا کہ اپنی منگنی توڑ کر مجھ سے شادی کر لے ـــــ پیسے کی طاقت بہت بڑی ہوتی ہے آفتاب ـــــ چلو یہی سوچ کر تم خوش رہو زندہ رہو کہ میں نے ہی تمہیں ٹھکرا دیا ہے۔ اگر میں تمہاری ہو جاتی، تب بھی ایسے اذیت ناک ماحول میں شاید ہی جی پاتی، جہاں رعنا باجی کے دل چیرنے والے طعنے سدا کانٹوں کی طرح دل کو چھیدتے رہتے۔ اب سوچتی ہوں کہ اُن کی مجھ سے بے پناہ نفرت بھی ٹھیک ہی تو تھی آفتاب ـــــ بھلا کون بہن چاہے گی کہ اُس کا بھائی ہیرے جواہرات کو چھوڑ کر کنکر دل کو گلے لگا لے۔ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند کب سجا ہے ـــــ؟ تمہاری کوٹھی میں رہ کر میں سدا احساسِ کمتری کے بوجھ تلے دبی رہی۔ شاید ہی کبھی سر اُٹھا کر چل پاتی۔ میری خودی اور انا کی شکست کے کچوکے میرے دل کو گھائل کر چھوڑتے ـــــ تم سوچو گے کہ دل کے بہلانے کو کیسی کیسی انوکھی باتیں بنا رہی ہوں، سوچو گے خالد کیا کم امیر ہے، پھر کیا اُس کے ساتھ رہ کر مجھے احساسِ کمتری نہیں ہوا ـــــ؟ نہیں آفتاب ـــــ خالد کی بات اور ہے۔ میرے بچپن سے لے کر میری جوانی تک کا ہر لمحہ تم لوگوں کے سامنے رہا اور میں نے اور تم نے، اچھی طرح جانا ہے کہ تم لوگ ستارے ہو آسمان پر چمکنے والے ـــــ میں دھول ہوں پیروں سے مٹ جانے والی۔ تم لوگ مجھے کبھی عزت کی نگاہ سے نہ دیکھ پاتے۔ خالد غیر تھا۔ اور پھر بے پناہ دولت نے اُس کے پاس دولت کی ویلیو ہی کھو دی ہے۔ بعد میں خالد نے مجھے بتایا کہ اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ پھوپا صاحب کی ایک ہی لڑکی ہے، یہ جانے بغیر کہ میں کون تھی، اِس نے پیام پیش کر دیا۔ یہ تو قسمت کے کھیل ہیں۔ بچپن سے لے کر جوانی تک جس دولت نے سدا میرا دل دُکھایا، وہ میرے قدموں میں آئی بھی تو کب اور کیسے ـــــ کہ میں نے زندگی سے جیسے ناطہ توڑ لیا۔

میں زندگی کے کیسے کٹھن دوراہے پر کھڑی ہوں خدایا کہ نہ موت کی دعا مانگ سکتی ہوں نہ زندگی کی آرزو کر سکتی ہوں۔ موت کے بارے میں سوچوں تو میری ننھی سی گڑیا کی موہنی شکل میرے بڑھتے قدم روک لیتی ہے۔ اُس نے کیا قصور کیا ہے کہ ماں کی محبت سے اتنی کومل عمر میں محروم ہو جائے اور جینے کے بارے میں سوچوں تو کیسے جیوں ـــــ؟ ایک ایسی آگ سینے میں لگی ہے جو نظر تو نہیں آتی مگر میرا وجود بھسم کئے دے رہی ہے۔ میں زندگی بھر سلگتی رہوں گی۔ یہ آگ کبھی نہ بجھے گی۔ جھوٹے دلاسوں اور تسلیوں سے بھی نہیں ـــــ!!

بارش کے ننھے منے قطرو! ـــــ میری جلتی ہوئی زندگی میں ٹھنڈک بھر دو۔ ہیروں کی طرح چمکنے والی بوندو! ـــــ میں اپنا آنچل پھیلا کر تم سے بھیک مانگتی ہوں کہ اس لمحہ بہ لمحہ بھسم کر دینے والی آگ کو ٹھنڈا کر دو ـــــ رات کی اِس بے پناہ تاریکی کو اپنے جھل مل کرتے حُسن سے اُجالے بخش دو ـــــ!

مگر میں کس قدر نادان ہوں ـــــ کیا یہ آگ پانی کے قطروں سے بُجھ پائے گی ـــــ! اس آگ کو کوئی پانی نہیں بجھا سکتا ـــــ اس تاریکی کو کوئی آفتاب بھی منور نہیں کر سکتا ـــــ اس سیاہ رات کی کوئی سحر نہیں ـــــ دل کا شیشہ چُور چُور ہو چکا ہے ـــــ کتنی ساری کرچیاں میری روح میں پیوست ہو گئی ہیں ـــــ خدایا!

میں نے دریچے سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لی ہیں۔ باہر بارش ہو رہی ہے۔ تاریکی نے ہر چیز کو ڈھانک رکھا ہے ـــــ آج کی رات کس قدر تاریک ہے۔ آج کے بعد سے تو ہر رات ہی تاریک ہے ـــــ میرا لہولہان دل ڈوبا جا رہا ہے۔ اور میں ڈوبتے دل کو تھام کر تاریکی سے پوچھ رہی ہوں ـــــ "کیا سچ مچ اب کبھی سحر نہ ہوگی ـــــ؟"

مضمون نگار حضرات سے درخواست ہے کہ وہ بیویں صدی کے لئے مضامین لکھتے وقت ہمیشہ اختصار سے کام لیا کریں بغرض اشاعت موصول ہونے والے مضامین میں سے مختصر افسانوں کو طویل افسانوں پر ترجیح دی جاتی ہے۔ اور طویل افسانے مضمون نگاروں کو واپس کر دیئے جاتے ہیں۔ غیر مطبوعہ مضامین کی واپسی کے لئے مضمون کے ساتھ ٹکٹ بھیجنے کی بجائے اپنا پورا پتہ لکھا ہوا پوسٹ آفس کا لفافہ بھیجیں۔ ورنہ ہم مضمون کی واپسی سے قاصر رہیں گے مضمون کے لفافے پر لفظ "غیر مطبوعہ" ضرور لکھیے۔

مہر لال سونی ضیا ایم۔ اے

خامشی داستاں نہ بن جائے
بے زبانی زباں نہ بن جائے

دل کی روداد کیا کہوں، جب تک
تو مرا رازداں نہ بن جائے

کر تو لوں درد کی دوا لیکن
چارہ گر رازداں نہ بن جائے

جو ترا غم سمجھ کے میں نے لیا
وہ غم دوجہاں نہ بن جائے

یہ تغافل، یہ بے رُخی، یہ حجاب
عشق وہم و گماں نہ بن جائے

آنکھ سے گر کے اشک، دامن پر
دل کا افسانہ خواں نہ بن جائے

تم چراغاں اگر کرو تو کیوں
رہ گزر کہکشاں نہ بن جائے

ضیا فتح آبادی

پروفیسر اختر نظمی

آج یادوں کی محفل سجی ہے
خواب ہے، خواب کی روشنی ہے

ایک تاریک وادی ہے دُنیا
تم جہاں ہو وہیں روشنی ہے

اس کا پیکر ہے وہ ساز جس کی
خامشی میں بھی اِک نغمگی ہے

جس جگہ ساتھ چھوڑا ہے تم نے
بس وہیں زندگی رُک گئی ہے

زندگی کے اندھیروں کا غم کیا
آرزو کی کرن جاگتی ہے

کیا مِلائے گی مجھ سے نگاہیں
زندگی مجھ کو پہچانتی ہے

گھل گیا رُوح میں ایک نغمہ
دُور سے کس نے آواز دی ہے

پروفیسر اختر نظمی

پروفیسر صدیق شاہد ایم۔ اے

نگاہِ یار نے کیا کیا مجھے دیئے دھوکے
میں کتنا دور رہا اُس سے آشنا ہو کے

وہ جس کے غم میں تڑپتی ہے زندگی شاہد
کبھی ملے تو میں اُس کے پاؤں دھو دھو کے

پروفیسر صدیق شاہد

ایک خاکہ

سرگذشت ایک شاعر کی

ظفر پیامی ایم۔ اے

۔ ۸ سی نظام الدین ایسٹ نئی دہلی

مکرم و محترم خوشتر صاحب!

آپ کے زیر ترتیب افسانہ نمبر کے افسانے زبان زد خاص و عام ہیں۔ چار چار کاتب کتابت میں مصروف ہیں ڈھیروں مسودے چھاننے پھٹکنے اور "حشو" کاٹتے چھانٹتے ہیں۔ بلاک پر بلاک بن رہے ہیں۔ پریس والوں کی جان پر بنی ہے۔ کاغذ والوں میں بھگدڑ مچی ہے کہ کیوں کر "سرگذشت ایک شاعر کی" ساتھ پریشان ہیں کہ افسانہ نمبر کا حسن لیے ان لمبا بنایا جائے اور قبلہ خوشتر صاحب حسب عادت مرغ بسمل کا قلیان کرتے ہوئے دن رات معروف ہیں، غرضیکہ اگر بقول غالبؔ "قطرے کے گہر ہونے تک" کے مرحلوں کا رنگ دیکھنا ہو تو اس کا نظارہ "بیسویں صدی" کے دفتر ہی میں جا کر کرنا چاہیئے۔ کہیئے میں نے غیب کی آنکھ سے دیکھ کر خلق کی زبان سے سن کر افسانہ نمبر کی تیاریوں کا اندازہ کیا ہے یا نہیں! اس قدر محنت کے بعد اس میں کسے شک رہ جاتا ہے کہ افسانہ نمبر اُردو زبان کی ادبی روایات میں ایک نئے سنگ میل کا اضافہ کرے گا اس میں تو خیر شبہ ہی نہیں کہ آپ کے خلوص اور لگن نے "بیسویں صدی" کو اُردو کے افسانوی ادب کی سب سے بڑی حقیقت بنا دیا ہے۔ "سرگذشت ایک شاعر کی" حاضر ہے یہ ایک فرضی خاکہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ شہر شہر اور محلے محلے میں لیے "شعر فنکاروں" کا کوئی عکس اِس میں نظر آجائے۔ اگر یہ پسند آیا تو میرا ارادہ کچھ دوسرے نیک بختوں، مثلاً نقادوں ایڈیٹروں، لیڈروں اور سماج سیوکوں کے خاکے "اڑانے" کا بھی ہے اِس کے لئے مجھے آپ اور حلقۂ بیسویں صدی کی رائے کا انتظار رہے گا۔

نیاز کیش :۔ ظفر پیامی

ہر انسان پر ایک نہ ایک وقت ایسا ضرور آتا ہے جب اُسے دنیا کے سبھی کام دھندے چھوڑ کر آخرت کی جانب کوچ کرنا پڑتا ہے۔ اُردو بولنے والے ہر نوجوان پر زندگی میں دو پہر ایسے ضرور آتے ہیں جب کہ اُس کے دل میں شاعر بننے کی تمنا انگڑائیاں لینے لگتی ہے ایسا لگتا ہے جیسے زندگی کا تمام کاروبار قافیہ اور ردیف کا پابند ہو کر رہ گیا ہو یہ اور بات ہے کہ اس شوق میں اکثر انجام ہی کیا جاتا ہے کہ زندگی کا تمام رنگ ... ہو کر رہ جاتا ہے۔ بہر حال [illegible] کہ اگر ہم یہاں شعر کے شہسوار کہلائے تو آنے والی نسلیں [illegible] جائیں گی۔

[illegible]

تصور کے علاوہ غم دوراں کے تقاضے بھی کچھ کم نہ تھے۔ پڑھائی لکھائی سے کبھی کوئی خاص رغبت رہی ہی نہیں۔ طبیعت کی پیدائشی آرام طلبی اور عاشق مزاجی کے باعث کھیل کود کے میدان دور ہی سے کاٹنے کو دوڑتے تھے۔ لے دے کر بس شاعری ہی کا راستہ ایسا تھا جسے اختیار کر کے شہرت عام اور بقائے دوام کا تاج پہننا مشکل نظر آتا تھا اور نہ مہنگا۔ آج کے زمانے کا یہی دستور ہے کہ کوئی چیز جتنی زیادہ مشکل ہوگی اتنی ہی مہنگی بھی پڑے گی۔ جو شے سب سے سستی ہے وہ سب سے آسان بھی ہے۔ اب یہ اُردو ادب کی خوش نصیبی ہے کہ شاعری سستی بھی ہے اور آسان بھی۔

[illegible] آرام طلبی کو [illegible]

بکنے لگا مالی بھی ہے۔ دلچسپی سے ماشتنہ مزاج رکھنے کی بدولت دل کسی کام پہ زیادہ دیر تک نہیں لگتا۔ شاعری کا جب عزم کیا تو پتہ چلا کہ تھوڑی بہت محنت تو اس میں بھی کرنا ہی پڑے گی۔ کم از کم عروض سے واقفیت تو بے حد ضروری ہے۔ شہرت عام کی بلند چوٹی پر چڑھنے کی جلدی میں یہ ممکن نہ تھا کہ عروض تو کیا بجوں املا اور تلفظ کی بھول بھلیوں میں بھی اپنا وقت ضائع کروں۔ لیکن بھلا ہو اس دوست کا جو وقت پہ کام آیا اُس نے اِس مُشکل کے مقت کچھ ایسی رہنمائی کی کہ خضر و سکندر کی روایتیں تازہ ہو گئیں۔ اُس نیک بخت نے ہمیں بتایا کہ اللہ میاں نے دنیا کی ہر چیز میں ایک تناسب قائم کیا ہے۔ عین اُسی طرح ایک تناسب شعر و ادب میں بھی ہے۔ توازن اور تناسب کچھ اس طرح سے ہے کہ شعر کہنے والوں کو عموماً سد بھیکا اور روپے والوں کو اکثر شعروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ سُنا تو اُس مالک کی سوچ بوجھ کی داد دی جس نے مشکل اور مشکل کشا میں لاجواب تعلق پیدا کیا ہے۔ ہم نے اسی مرد دانا کے راز کو مرشد بنا لیا جس نے کارِ خدا کا یہ راز خاص ہم پر افشا کیا تھا اُس مہربان سے ہمیں یہ بھی پتہ چلا کہ اس معاملے میں وہ بذاتِ خود ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ یہ نیک بخت بھی ہماری ہی طرح قسمت کا ستایا ہوا تھا جو تعلیم کی کمی طبیعت کی کاہلی، عادات کی خرابی اور گلے کی خوبی کی بدولت شاعر کہلانے پر مجبور تھا اُس نے ایک بزرگ صورت اور خضر صفت ماہرِ ادب کو اپنا مرشد بنا رکھا تھا۔ جو صفِ اوّل کے اُستاد تو نہیں مانے جاتے تھے لیکن ایک مشہور و معروف مرحوم شاعر کے علاقائی جانشین ضرور کہلاتے تھے۔ اُنہوں نے ایک بہت ہی معمولی اور حقیر رقم کے بدلے مجھے بھی اپنے حلقۂ فیض کا ممبر بنا لیا۔ انھوں نے مجھے ایک چاق چوبند سا تخلص بھی عطا فرمایا۔ اِس کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ وہ ہر اُلٹے سیدھے مصرعے اور اوٹ پٹانگ بحر میں انگوٹھی کے نگینے کی طرح فٹ ہو جاتا تھا۔ اب میں بھی ہر ایسے مشاعرے میں جانے لگا جہاں شاعروں کی تعداد سامعین سے کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے۔ اُلٹی سیدھی فلمی دھنوں کی نقل اُتارنے کا شوق بچپن ہی سے تھا اس لئے غزل پڑھنے کا ایک مخصوص ڈھنگ ایجاد کرنے میں کوئی خاص دقت پیش نہیں آئی۔ چونکہ اکثر و بیشتر اشعار کچھ اسی طرح کے ہوتے تھے۔ اس لئے میرا پلڑا بھاری رہتا تھا کیوں کہ میری آواز میں شیرینی تھی۔

دھیرے دھیرے مجھے احساس ہوا کہ شاعر کہلانے کے لئے شعر خریدنا ہی کافی نہیں بلکہ شاعر صورت بننا بھی ضروری ہے۔ یہ ضرورت اس لئے بھی شدت اختیار کر گئی کہ چند بڑے مشاعرے قریب تھے جہاں سامعین اور شعراء میں تمیز کرنے کے لئے لازمی تھا کہ شاعر ایک شکل خاص کا مالک ہو۔

مشفق اُستاد نے خضر مہربان کی طرح اس شکل کو اختیار کرنے میں بھی بڑی مدد فرمائی۔ سب سے پہلے تو انھوں نے لباس درست کرایا۔ اُنھوں نے معمولی لباس کو

ایسے کپڑوں کو خیرباد کہلا کر اپنے دادا جان مرحوم کی ایک عدد شیروانی عطا فرمائی جو دیمک کی طرح جا بجا دھبوں اور زخموں سے داغدار تھی۔ یہ علامت بچتے ہوئے انھوں نے نصیحت بھی کر دی کہ دل کی طرح اس کے رفو کا چارہ بھی کبھی نہ کیا جائے۔ میں نے یہ نصیحت بھی تحمل سے قبول کر لی کیونکہ اُستادِ مشفق نے شیروانی کی قیمت بھی کوئی بہت زیادہ وصول نہیں کی تھی۔ جب ایک شیروانی ایک غزل کے بھاؤ مل جائے تو کس کا جی نہیں چاہتا کہ اُسے خالص شاعرانہ ڈھنگ سے پہنے۔ اُسترے سے بھی کافی دیر تک پرہیز کیا گیا۔ مگر خارش کا زیادہ ہی حملہ ہوتا تو حجام کا سہارا لینا ہی پڑتا۔ لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ کہیں کوئی بڑا مشاعرہ تو قریب نہیں۔ شاعر شکل بننے میں رہی سہی کسر غسل سے مسلسل اجتناب برتنے اور چند شعر آور اشیاء کے مسلسل استعمال نے پوری کر دی۔ اگر کبھی کبھار یہ اشیاء میسر نہ ہوتیں تو بھی ان کے استعمال میں بے تحاشا بے پروائی کی تشہیر ضرور کی جاتی۔ تجربے نے بتایا تھا کہ شاعر کی مکمل شخصیت کے لئے یہ سب کچھ بہت ضروری ہے۔

بڑے مشاعروں میں پڑھنے سے گھریلو محاذ پر ایک فائدہ یہ ہوا کہ غسلخانے میں ایک بڑا سا قدِ آدم شیشہ آ گیا۔ اس سے میں نے اس بات کی پوری مشق کر لی کہ کس طرح ایک بنی بنائی شکل کو بگاڑا جاتا ہے۔ میں نے شعر پڑھتے وقت بالوں کو آگے پیچھے پھینکنے میں اتنی مہارت حاصل کر لی کہ ٹینس کے ماہر کھلاڑی بھی میرے اسٹائل پر رشک کرنے لگے۔ اب تو مجھے مشاعرے میں جانے سے پہلے ریہرسل میں بھی زیادہ وقت نہیں لگتا تھا۔

میں مسلسل مشق کی بدولت چھ سات گھنٹے کا کام بیس پچیس منٹ میں کر لیا کرتا۔ بعض وقت تو ریہرسل کے بغیر ہی مشاعرے میں پہنچ جاتا۔ لیکن سوائے خاص لوگوں کے اور کوئی شخص فرق محسوس نہ کر سکتا۔

جس طرح لگاتار روتے رہنے سے نقوش خود بخود روتے دکھائی دیتے ہیں اسی طرح چاروں پہر شاعر کہلاتے کہلاتے آدمی خود بخود شاعر نظر آنے لگتا ہے۔ زندگی مزے سے بسر ہو رہی تھی اور قریب تھا کہ میں بقائے دوام کی چوٹی کے قریب پہنچ جاؤں۔

لیکن ایک خاص واقع نے یہ تمام منصوبے تہس نہس کر دیئے۔ ایک بہت بڑے مشاعرے میں مجھے پڑھنے کا بلاوا آیا۔ اُستاد کی اتفاقیہ عدم موجودگی کی وجہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے ان کی بیاض خاص سے ایک تازہ غزل نکال لی جو انہوں نے خود اپنے پڑھنے کے لئے مخصوص کر رکھی تھی۔ غزل اتنی اچھی تھی کہ کوئی ظالم اُستاد بھی سُنتا تو جھوم جاتا۔

جب مشاعرے میں میرے پڑھنے کی باری آئی تو میں نے جھوم جھوم کر غزل

قابلِ مطالعہ منتخب شعری مجموعے

کتاب	شاعر	قیمت
آتشِ گل	جگر مراد آبادی	پانچ روپے
کلیاتِ اقبال	ڈاکٹر اقبال	چھ روپے
جنون و ہوش	جوش ملسیانی	چار روپے
ہفت رنگ	جوش ملسیانی	تین روپے
آہنگِ حجاز	″	ایک روپیہ
سحرِ غزل	ساحر ہوشیارپوری	تین روپے
دھنک	نریش کمار شاد	سوا دو روپے
پھوار	″	اڑھائی روپے
فنکار	″	سوا دو روپے
قاشیں	″	تین روپے
آیاتِ جنوں	″	ڈیڑھ روپیہ
سنگم	″	تین روپے
رباعیاتِ محروم	تلوک چند محروم	پورے چار روپے
گنجِ معانی	″	ساڑھے سات روپے
رمز و کنایات	فراق گورکھپوری	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
[illegible]	″	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
مشعل	″	دو روپے ۷۵ نئے پیسے
بیکراں	جگن ناتھ آزاد	چار روپے ۵۰ نئے پیسے
ستاروں سے ذروں تک	″	دو روپے ۷۵ نئے پیسے
کلیاتِ اکبر الٰہ آبادی	اکبر الٰہ آبادی (اوّل)	پانچ روپے
″ حصہ دوم	″	چھ روپے
کلیاتِ اختر شیرانی	اختر شیرانی	آٹھ روپے
رعنائیاں	شکیل بدایونی	تین روپے
صنم و حرم	″	دو روپے ۲۵ نئے پیسے
گلِ رعنا	جگی رعنا	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
شبنم شبنم	کرشن موہن	پانچ روپے
دلِ ناداں	″	چھ روپے
خرابات	عبدالحمید عدم	چار روپے
رمِ آہو	″	چار روپے
گلنار	″	دو روپے ۲۵ نئے پیسے
قول و قرار	″	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
گردشِ جام	″	دو روپے ۲۵ نئے پیسے
بطِ مے	″	دو روپے ۲۵ نئے پیسے
گجر	قتیل شفائی	تین روپے
جھومر	″	تین روپے
روزن	″	تین روپے
جلترنگ	″	دو روپے ۲۵ نئے پیسے
گفتنی	محمود سعیدی	دو روپے
نئی صبح	ضیا فتح آبادی	ایک روپیہ
طلوع	″	۷۵ نئے پیسے
نورِ مشرق	″	ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے
آہنگِ غزل	پورن سنگھ ہنر	دو روپے ۵۰ نئے پیسے
شہرِ دل	محسن زیدی	دو روپے
سفید و سیاہ	عزیز وارثی	چار روپے

آئینۂ اصلاح ابوالفصاحت جوش ملسیانی کی اصلاحات شاگردوں کے کلام پر مع توجیہ اس کتاب میں درج ہیں۔ یہ کتاب مبتدی اور فن نہ جاننے والے شعراء کے لئے رہنما کا کام دے گی۔ قیمت تین روپے

جوش ملسیانی کے مکمل حالاتِ زندگی، انتخاب کلام، شاگردوں کے حالات اور کلام، تصویروں کے ۴۸ صفحے۔ ضخامت ۵۰۰ صفحات موجودہ دور کی بے مثل کتاب۔ قیمت دس روپے

مضراب شباب للت کا ایک ایک شعر میں احساس کا اپنا دل دھڑکتا ہے اور ان دھڑکنوں میں اس نے

سارے جہاں کے دکھ درد سمیٹ لئے ہیں۔ قیمت [illegible]

گلستانِ ہزار رنگ جس میں تقریباً چار ہزار اشعار کا انتخاب عنوان وار ترتیب دیئے گئے ہیں۔ اس یادگار کتاب کا مقدمہ مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا اور ہندی کتاب کا ڈاکٹر راجندر پرشاد نے۔ مولانا آزاد اور ڈاکٹر راجندر پرشاد کا نام نامی ہی اس امر کی ضمانت ہے کہ یہ کتاب کس پایہ کی ہوگی۔ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین، جناب رشید احمد صدیقی، اور جناب نیاز فتحپوری نے اس کتاب کو اس صدی کی بہترین کتاب قرار دیا ہے۔ اردو ایڈیشن دس روپے۔ ہندی ایڈیشن سات روپے ۵۰ نئے پیسے۔

شاہنامۂ اسلام جناب حفیظ جالندھری کا شاہنامۂ اسلام چار حصوں میں [illegible] اسلامی تاریخ کو منظوم کیا ہے۔ ہر حصہ تقریباً تین سو صفحات کا ہے۔ تازہ ایڈیشن اصلاح کے بعد چھپا ہے۔ قیمتیں [illegible] کیا جا رہا ہے۔ محصولڈاک ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے [illegible]

تلامذۂ غالب [illegible] گرانقدر تصنیف۔ اس کتاب میں غالب کے [illegible] سوانح حیات اور کلام درج ہیں۔ پانسو صفحوں کی تقریباً [illegible] تصاویر بھی شامل کتاب ہیں۔ ہندوستان بھر کے ادیبوں کا فیصلہ ہے کہ یہ کتاب بہترین ادبی تحفہ ہے۔ قیمت فی جلد صرف سات روپے ۵۰ نئے پیسے۔

کفر و ایمان [illegible] کا مجموعۂ کلام حضرت [illegible] نام نامی ہی اس کتاب کی اہمیت و افادیت کا ضامن ہے [illegible] ہیں ننھے نشتروں کے ساتھ [illegible] قیمت [illegible]

کلامِ بے لگام ابن انشاد دہلوی کا نادر مجموعۂ کلام جس کے ہر شعر میں اکبر الٰہ آبادی کا رنگ جھلکتا ہے۔ طنز و مزاح کا رنگین گلدستہ ۲۵۲ صفحات پر مشتمل دوسرا ایڈیشن شائع ہو گیا قیمت مجلد [illegible]

پتہ:- رسالہ بیسویں صدی دہلی نمبر ۶

افسانہ

مسز کیپٹن

کشمیری لال ذاکر ایم۔ اے، بی۔ ٹی

۷۹۔ ڈی۔ ایل۔ ایف کالونی۔ روہتک (پنجاب)

برادرِ گرامی! تسلیم

معلوم نہیں کس کا شعر ہے۔ لیکن یاد آگیا ہے تو سُن لیجیے۔

ہم اپنے دوستوں کی بے وفائی سہہ تو لیتے ہیں
مگر ہم جانتے ہیں، دل ہمارا ٹوٹ جاتے ہیں

ایک مُدت تک "بیسویں صدی" سے غیر حاضر رہا اور جب حاضر ہوا تو ایک ساتھ دو تین کہانیاں لے کر۔ اور اب دوستوں کو شکوہ ہے کہ میں نے "بیسویں صدی" کے لئے اتنی تیزی سے کیوں لکھنا شروع کر دیا ہے۔ آپ بھی دوست نواز ہیں اور میں بھی کنور مہندر سنگھ بیدی کی برادری سے تعلق رکھتا ہوں، جو دوست کے لئے سب کچھ کر گزرتے ہیں۔ اِس لئے دوستوں کا ذکر ایسے الفاظ میں کرنا چاہتا ہوں جس سے اُن کیلئے احترام کے جذبات کا اظہار ہو، بہرحال میں نے اپنا ایکس پلینیشن دے دیا ہے۔ اگر آپ کو کچھ کہنا ہو تو کہہ لیجیے۔ افسانہ نمبر کے لئے "مسز کیپٹن" حاضر ہے۔ یہ ہریانہ کا ایک کردار ہے جسے میں اس افسانہ میں پیش کر رہا ہوں۔ چونکہ آجکل ہریانوی ہو چکا ہوں اس لئے میرے افسانوں پر اس ماحول کی چھاپ ہونا ضروری ہے .... نیاز کیش

کشمیری لال ذاکر

[illegible] سال کے دوران میں اُس نے یہ آٹھواں گھر تبدیل کیا تھا۔ وہ جب سے [illegible] مسئلہ حل نہ ہوا تھا۔ حل ہونا تھا بھی مشکل۔ دراصل وہ ایک جگہ [illegible] نہ سکتا تھا۔ اُس کی خانہ بدوشی کی حسرت اِسی طرح [illegible] خانہ بدوشوں کے کسی ٹولے کو کہیں ڈیرہ ڈالے ہوئے دیکھتا [illegible] کا احساس ہوتا۔ کتنا پیارا ڈھنگ تھا زندگی گزارنے [illegible] تو ذرا سستانے کو، پڑاؤ کو منزل بنا بیٹھنے کے جذبے [illegible] ماہ رہ چکتا تو اُس میں اُسے بہت سے نقائص [illegible] کھڑکیاں بے ڈھنگی نظر آتیں۔ چھت ناہموار اور [illegible] دکھائی دیتے۔ پڑوسی جو اب تک اُسے بھلے آدمی نظر آتے تھے [illegible] لگنے لگتے۔ اور وہ تہیہ کر لیتا کہ اب اس مکان میں نہیں [illegible] سے کچھ کہے مالک مکان کی ایک پائی چکا کر چلتا بنتا۔

سامان ٹرک یا تانگے پر نہیں لے جاتا تھا بلکہ چھکڑے پر جیسے خانہ بدوش اپنا سامان لادتے ہیں۔ چارپائیاں اُلٹی پڑی ہیں، بالٹیاں ایک طرف لٹک رہی ہیں۔ کرسیاں اوندھی ہو کر ڈول رہی ہیں۔ بس کمی یہ رہ جاتی تھی کہ وہ خود کسی خانہ بدوش کی طرح چھکڑے پر سوار نہ ہوتا تھا۔ ایسے لوگ لاج کچھ لو یا کچھ اور ورنہ اُسے تو اِس بات سے بھی گریز نہ تھا۔ پھر چھکڑا نئے مکان کے سامنے آکر رُکتا اور سامان اُترتا اور ایک دو دن وہ اس طرح رہتا جیسے واقعی خانہ بدوش ہو۔

یہ آٹھواں مکان بھی اُس نے اپنی اسی عادت کے مطابق حاصل کیا تھا۔ یہ مکان اُسے بہت پسند آیا۔ ایک الگ کوٹھی تھی جس کا مالک ایک ریٹائرڈ فوجی کپتان تھا۔ اُس نے اپنے لئے تین کمرے الگ بنوا رکھے تھے اور وہ انہیں میں رہتا تھا۔ یہ چھوٹی سی کوٹھی اُس نے کرائے پر دے رکھی تھی۔ راکیش کو یہ کوٹھی اس لئے مل گئی تھی کہ اُس کا ایک مجسٹریٹ دوست، جو اس میں رہتا تھا تبدیل ہو گیا تھا۔ اور جاتے وقت اِس کی

...ہے۔ لڑکپن سے عاشقانہ مزاج رکھنے کی بدولت دل کسی کام پر زیادہ ...نہیں لگتا۔ شاعری کا جب عزم کیا تو پتہ چلا کہ سنتے ہیں بہت محنت تو اس میں بھی کرنا ہی ...گی۔ کم از کم عروض سے واقفیت تو بے حد ضروری ہے۔ شہرتِ عام کی بلندی پر ...میں یہ ممکن نہ تھا کہ عروض تو کیا بحور، املا اور تلفظ کی بھول بھلیوں میں بھی ...وقت ضائع کروں۔ لیکن بھلا ہو اس دوست کا جو وقت پر کام آیا اُس نے اس مشکل کے ...جیسی کی کہ خضر و سکندر کی روایتیں تازہ ہو گئیں۔ اُس نیک بخت نے ہمیں بتلایا ...نے دنیا کی ہر چیز میں ایک تناسب قائم کیا ہے۔ عین اُسی طرح ایک تناسب ...ہے۔ توازن اور تناسب کچھ اس طرح سے ہے کہ شعر کہنے والوں کو عموماً ...اور پڑھنے والوں کو اکثر شعروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ سُنا تو اُس مالک کی ...کی داد دی جس نے مشکل اور مشکل کشا میں لاجواب تعلق پیدا کیا ہے۔ ہم نے ...اُسے راز کو درست بنایا جس نے کارِ خدا کا یہ رازِ خاص ہم پر افشا کیا تھا ...سے ہمیں یہ بھی پتہ چلا کہ اِس معاملے میں وہ بذاتِ خود ہماری کوئی مدد نہیں ...۔ یہ نیک بخت بھی ہماری ہی طرح قسمت کا ستایا ہوا تھا جو تعلیم کی کمی طبیعت ...عادات کی خرابی اور گلے کی خوبی کی بدولت شاعر کہلانے پر مجبور تھا۔ اُس نے ...بزرگ صورت اور خضر صفت ماہرِ ادب کو اپنا مرشد بنا رکھا تھا۔ جو صفِ اوّل ...استاد تو نہیں مانے جاتے تھے لیکن ایک مشہور و معروف مرحوم شاعر کے علاقائی ...ضرور کہلاتے تھے۔ اُنہوں نے ایک بہت ہی معمولی اور حقیر رقم کے بدلے ...بھی اپنے حلقۂ فیض کا ممبر بنا لیا۔ انہوں نے مجھے ایک چاق چوبند سا تخلص عطا فرمایا۔ اِس کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ وہ ہر اُلٹے سیدھے مصرعے اور اوٹ ...بحر میں انگوٹھی کے نگینے کی طرح فٹ ہو جاتا تھا۔ اب میں بھی ہر ایسے مشاعرے ...جانے لگا جہاں شاعروں کی تعداد سامعین سے کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے۔ اُلٹی سیدھی دھنوں کی نقل اُتارنے کا شوق بچپن ہی سے تھا اس لئے غزل پڑھنے کا ایک مخصوص ...ایجاد کرنے میں کوئی خاص دقت پیش نہیں آئی۔ چونکہ اکثر و بیشتر اشعار ایک ہی ...کے ہوتے تھے۔ اس لئے میرا پلڑا بھاری رہتا تھا کیوں کہ میری آواز میں شیرینی

دھیرے دھیرے مجھے احساس ہوا کہ شاعر کہلانے کے لئے شعر خریدنا ...نہیں بلکہ شاعر صورت بننا بھی ضروری ہے۔ یہ ضرورت اس لئے بھی شدت ...کیونکہ چند بڑے مشاعرے قریب تھے جہاں سامعین اور شعراء میں تمیز کرنے ...لازمی تھا کہ شاعر ایک شکلِ خاص کا مالک ہو۔

مشفق اُستاد نے خضرِ مہربان کی طرح اس شکل کو اختیار کرنے میں بھی بڑی ...۔ سب سے پہلے تو انہوں نے لباس درست کرایا۔ اُنہوں نے معمولی لباس والے

ایسے کپڑوں کو خیرباد کہلا کر اپنے دادا جان مرحوم کی ایک خستہ شیروانی عنایت کی جو ...کی طرح جا بجا چھیدوں اور زخموں سے داغدار تھی۔ یہ خلعت بخشتے ہوئے انہوں نے نصیحت بھی کر دی کہ دل کی طرح اس کے رفو کا چارہ بھی کبھی نہ کیا جائے۔ میں نے یہ نصیحت سچے دل سے قبول کر لی کیونکہ اُستادِ مشفق نے شیروانی کی قیمت بھی کوئی بہت زیادہ وصول نہیں کی تھی۔ جب ایک شیروانی ایک غزل کے بھاؤ پڑ جائے تو کس کافر کا جی نہیں چاہتا کہ اُسے خالص شاعرانہ ڈھنگ سے پہنے۔ اُستروں سے بھی کافی دیر تک پرہیز کیا گیا مگر خارش کا زیادہ ہی حملہ ہوتا تو حجام کا سہارا لینا ہی پڑتا۔ لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ کوئی بڑا مشاعرہ تو قریب نہیں۔ شاعر شکل بننے میں مددگار بھی کسر غسل سے مسلسل اجتناب برتنے اور چند شعر آور اشیاء کے مسلسل استعمال نے پوری کر دی۔ مگر کبھی کبھار یہ اشیاء میسر نہ ہوتیں تو بھی ان کے استعمال میں بے تحاشا بے سلیقگی کی تشہیر ضرور کی جاتی۔ تجربے نے بتایا تھا کہ شاعر کی مکمل شخصیت کے لئے یہ سب کچھ بہت ضروری ہے۔

بڑے مشاعروں میں پڑھنے سے گھریلو محاذ پر ایک فائدہ یہ ہوا کہ غسلخانے میں ایک بڑا سا قدِ آدم شیشہ آ گیا۔ اس سے میں نے اس بات کی پوری مشق کر لی کہ کس طرح ایک بنی بنائی شکل کو بگاڑا جاتا ہے۔ میں نے شعر پڑھتے وقت بالوں کو آگے پیچھے پھینکنے میں اتنی مہارت حاصل کر لی کہ ٹینس کے ماہر کھلاڑی بھی میرے اسٹائل پر رشک کرنے لگے۔ اب تو مجھے مشاعرے میں جانے سے پہلے ریہرسل میں کچھ زیادہ وقت نہیں لگتا تھا۔

میں مسلسل مشق کی بدولت چھ سات گھنٹے کا کام بیس پچیس منٹ میں کر لیا کرتا۔ بعض وقت تو ریہرسل کے بغیر ہی مشاعرے میں پہنچ جاتا۔ لیکن سوائے خاص لوگوں کے اور کوئی شخص فرق محسوس نہ کر سکتا۔

جس طرح لگاتار روتے رہنے سے نقوش خود بخود روتے دکھائی دیتے ہیں اسی طرح چاروں پہر شاعر کہلاتے کہلاتے آدمی خود بخود شاعر نظر آنے لگتا ہے۔ زندگی مزے سے بسر ہو رہی تھی، اور قریب تھا کہ میں بقائے دوام کی چوٹی کے قریب پہنچ جاؤں۔

لیکن ایک خاص واقع نے یہ تمام منصوبے تحس نحس کر دیئے۔ ایک بہت بڑے مشاعرے میں مجھے پڑھنے کو بلا لیا۔ استاد کی اتفاقیہ عدم موجودگی کی وجہ سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے میں نے ان کی بیاضِ خاص سے ایک تازہ غزل نکال لی جو انہوں نے خود اپنے پڑھنے کے لئے مخصوص کر رکھی تھی۔ غزل اتنی اچھی تھی کہ کوئی ظالم اُستاد بھی سُنتا تو جھوم جاتا۔

جب مشاعرے میں میرے پڑھنے کی باری آئی تو میں نے جھوم جھوم کر غزل

کچھ زیادہ مائل رہی ہے۔ لڑکپن سے عاشقانہ مزاج رکھنے کی بدولت دل کسی کام پر زیادہ دیر تک نہیں لگتا۔ شاعری کا جب عزم کیا تو پتہ چلا کہ تھوڑی بہت محنت تو اس میں بھی کرنا ہی پڑے گی۔ کم از کم عروض سے واقفیت تو بے حد ضروری ہے۔ شہرت عام کی بلند چوٹی پر پہنچنے کی جلدی میں یہ ممکن نہ تھا کہ عروض تو کیا ہجوں، املا اور تلفظ کی بھول بھلیوں میں بھی الجھ کر وقت ضائع کروں۔ لیکن بھلا ہو اس دوست کا جو وقت پر کام آیا اُس نے اس مشکل کے وقت کچھ ایسی رہنمائی کی کہ خضر یا سکندر کی روایتیں تازہ ہو گئیں۔ اُس نیک بخت نے ہمیں بتایا کہ اللہ میاں نے دنیا کی ہر چیز میں ایک تناسب قائم کیا ہے۔ عین اُسی طرح ایک تناسب شعر و ادب میں بھی ہے۔ توازن اور تناسب کچھ اس طرح سے ہے کہ شعر کہنے والوں کو عموماً روپے پیسے کی اور روپے والوں کو اکثر شعروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ سُنا تو اُس مالک کی سوجھ بوجھ کی داد دی جس نے مشکل اور مشکل کشا میں لاجواب تعلق پیدا کیا ہے۔ ہم نے اسی مردِ دانائے راز کو مرشد بنایا جس نے کارِ خدا کا یہ رازِ خاص ہم پر افشا کیا تھا اس مہربان سے ہمیں یہ بھی پتہ چلا کہ اس معاملے میں وہ بذاتِ خود ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ یہ نیک بخت بھی ہماری ہی طرح قسمت کا ستایا ہوا تھا جو تعلیم کی کمی طبیعت کی کاہلی، عادات کی خرابی اور گلے کی خوبی کی بدولت شاعر کہلانے پر مجبور تھا۔ اُس نے ایک بزرگ صورت اور خضر صفت ماہرِ ادب کو اپنا مرشد بنا رکھا تھا۔ جو صفِ اوّل کے اُستاد تو نہیں مانے جاتے تھے لیکن ایک مشہور و معروف مرحوم شاعر کے علاقائی جانشین ضرور کہلاتے تھے۔ اُنہوں نے ایک بہت ہی معمولی اور حقیر رقم کے بدلے مجھے بھی اپنے حلقۂ فیض کا ممبر بنا لیا۔ انھوں نے مجھے ایک چاق چوبند سا تخلص بھی عطا فرمایا۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ وہ ہر الٹے سیدھے مصرعے اور اوٹ پٹانگ بحر میں انگوٹھی کے نگینے کی طرح فٹ ہو جاتا تھا۔ اب میں بھی ہر ایسے مشاعرے میں جانے لگا جہاں شاعروں کی تعداد سامعین سے کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے۔ اُلٹی سیدھی دھنوں کی نقل اتارنے کا شوق بچپن ہی سے تھا اس لئے غزل پڑھنے کا ایک مخصوص ڈھنگ ایجاد کرنے میں کوئی خاص دقت پیش نہیں آئی۔ چونکہ اکثر و بیشتر اشعار ایک ہی طرح کے ہوتے تھے۔ اس لئے پلڑا بھاری رہتا تھا کیوں کہ میری آواز میں شیرینی تھی۔

دھیرے دھیرے مجھے احساس ہوا کہ شاعر کہلانے کے لئے شعر خریدنا ہی کافی نہیں بلکہ شاعر صورت بننا بھی ضروری ہے۔ یہ ضرورت اس لئے بھی شدت اختیار کر گئی کہ چند بڑے مشاعرے قریب تھے جہاں سامعین اور شعراء میں تمیز کرنے کے لئے لازمی تھا کہ شاعر ایک شکل خاص کا مالک ہو۔

مشفق اُستاد نے خضر مہربان کی طرح اس شکل کو اختیار کرنے میں بھی بڑی رہنمائی کی۔ سب سے پہلے تو انھوں نے لباس درست کرایا اُنھوں نے معمولی انداز کے [illegible] ایسے کپڑوں کو خیرباد کہلا کر اپنے لالہ جان مرحوم کی ایک عدد شیروانی عنایت کی جو ہیئت میں حاتم کی طرح جا بجا داغ دھبوں اور زخموں سے داغ دار تھی۔ یہ عطیہ بخشتے ہوئے انھوں نے نصیحت بھی کر دی کہ دل کی طرح اس کے رفو کا چارہ بھی کبھی نہ کیا جائے۔ میں نے نصیحت بھی دل سے قبول کر لی کیونکہ اُستاد مشفق نے شیروانی کی قیمت بھی کوئی بہت زیادہ وصول نہیں کی تھی۔ جب ایک شیروانی ایک غزل کے بھاؤ پڑ جائے تو کس کافر کا جی نہیں چاہے گا کہ اُسے خالص شاعرانہ ڈھنگ سے پہنے۔ اُستروں سے بھی کافی دیر تک سر ہرا کیا گیا مگر خارش کا زیادہ ہی حملہ ہوتا تو حجام کا سہارا لینا ہی پڑتا۔ لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ کہیں کوئی بڑا شاعر قریب نہیں۔ شاعر شکل بننے میں دیر ہی کیا تھی کہ غسل سے مسلسل اجتناب برتنے اور چند شعراء و اشیاء کے مسلسل استعمال نے پوری کر دی۔ اگر کبھی کبھار یہ اشیاء میسر نہ ہوتیں تو بھی ان کے استعمال میں بے تحاشہ بے پروائی کی تشہیر ضرور کی جاتی۔ تجربے نے بتایا تھا کہ شاعر کی مکمل شخصیت کے لئے یہ سب کچھ بہت ضروری ہے۔

بڑے مشاعروں میں پڑھنے سے گھریلو محاذ پر ایک فائدہ یہ ہوا کہ غسل خانے میں ایک بڑا سا قدِ آدم شیشہ آ گیا۔ اس سے میں نے اس بات کی پوری مشق کر لی کہ کس طرح ایک بنی بنائی شکل کو بگاڑا جاتا ہے۔ میں نے شعر پڑھتے وقت بالوں کو آگے پیچھے جھٹکنے میں اتنی مہارت حاصل کر لی کہ ٹینس کے ماہر کھلاڑی بھی میرے اسٹائل پر رشک کرنے لگے۔ اب تو مجھے مشاعرے میں جانے سے پہلے ریہرسل میں بھی زیادہ وقت نہیں لگتا تھا۔

میں مسلسل مشق کی بدولت چھ سات گھنٹے کا کام بیس پچیس منٹ میں کر لیا کرتا۔ بعض وقت تو ریہرسل کے بغیر ہی مشاعرے میں پہنچ جاتا۔ لیکن سوائے خاص لوگوں کے اور کوئی شخص فرق محسوس نہ کر سکتا۔

جس طرح لگاتار روتے رہنے سے نقوش خود بخود روتے دکھائی دیتے ہیں اسی طرح چاروں پہر شاعر کہلاتے کہلاتے آدمی خود بخود شاعر نظر آنے لگتا ہے۔ زندگی مزے سے بسر ہو رہی تھی، اور قریب تھا کہ میں بقائے دوام کی چوٹی کے قریب پہنچ جاؤں۔

لیکن ایک خاص واقعے نے یہ تمام منصوبے تہس نہس کر دیئے۔ ایک بہت بڑے مشاعرے میں مجھے پڑھنے کا بلاوا ملا۔ اُستاد کی اتفاقیہ عدم موجودگی کی وجہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے ان کی بیاضِ خاص سے ایک تازہ غزل نکال لی جو انہوں نے خود اپنے پڑھنے کے لئے مخصوص کر رکھی تھی۔ غزل اتنی اچھی تھی کہ کوئی ظالم اسے سُنتا تو جھوم جاتا۔

جب مشاعرے میں میرے پڑھنے کی باری آئی تو میں نے جھوم جھوم کر غزل

افسانہ

مسز کیپٹن

کشمیری لال ذاکر ایم۔اے، بی۔ٹی

۷۹۔ڈی۔ایل۔ایف کالونی۔روہتک (پنجاب)

برادرِ گرامی! تسلیم

معلوم نہیں کس کا شعر ہے۔لیکن یاد آگیا ہے تو سن لیجئے۔

ہم اپنے دوستوں کی بے وفائی سہہ تو لیتے ہیں
مگر ہم جانتے ہیں، دل ہمارا ٹوٹ جاتے ہیں

ایک مُدت تک "بیسویں صدی" سے غیر حاضر رہا اور جب حاضر ہوا تو ایک ساتھ دو تین کہانیاں لے کر۔ اور اب دوستوں کو شکوہ ہے کہ میں نے "بیسویں صدی" کے لئے اتنی تیزی سے کیوں لکھنا شروع کر دیا ہے۔ آپ بھی دوست نواز ہیں اور میں بھی کنور مہندر سنگھ بیدی کی برادری سے تعلق رکھتا ہوں، جو دوست کے لئے سب کچھ کر گزرتے ہیں۔ اس لئے دوستوں کا ذکر ایسے الفاظ میں کرنا چاہیے جن سے اُن کیلئے احترام کے جذبات کا اظہار ہو، بہرحال میں نے اپنا اکسپلینیشن دے دیا ہے۔ اگر آپ کو کچھ کہنا ہے تو کہہ لیجئے۔ افسانہ نمبر کے لئے "مسز کیپٹن" حاضر ہے۔ یہ ہریانہ کا ایک کردار ہے جسے میں اس افسانہ میں پیش کر رہا ہوں۔ چونکہ آجکل ہریانوی ہو چکا ہوں اس لئے میرے افسانوں پر اس ماحول کی چھاپ ہونا ضروری ہے.... نیاز کیش

کشمیری لال ذاکر

دو سال کے دَوران میں اُس نے یہ آٹھواں گھر تبدیل کیا تھا۔ وہ جب سے یہاں آیا تھا مکان کا مسئلہ حل نہ ہوا تھا۔ حل ہونا تھا بھی مشکل۔ دراصل وہ ایک جگہ تین چار ماہ سے زیادہ ٹھہر بھی نہ سکتا تھا۔ اُس کی خانہ بدوشی کی حسرت اِسی طرح پوری ہوتی تھی۔ وہ جب خانہ بدوشوں کے کسی ٹولے کو کہیں ڈیرہ ڈالے ہوئے دیکھتا تو اسے ایک عجیب سی مسرت کا احساس ہوتا۔ کتنا پیارا ڈھنگ تھا زندگی گزارنے کا۔ بس بہے جاؤ، کہیں رکو مت۔ رکو تو ذرا سستانے کو، پڑاؤ کو منزل بنا لینے کے جذبہ سے نہیں۔ وہ جب کسی مکان میں تین ماہ رہ چکتا تو اُس میں اُسے بہت سے نقائص نظر آنے لگتے۔ صحن تنگ معلوم ہوتا، کھڑکیاں بے ڈھنگی نظر آتیں۔ چھت ناہموار اور لپ سٹک اور نم آلود دکھائی دیتے۔ پڑوسی جو اب تک اُسے بھلے آدمی نظر آتے تھے اسے کمینے ذلیل اور غیر مہذب لگنے لگتے۔ اور وہ تہیہ کر لیتا کہ اب اس مکان میں نہیں رہے گا۔ چنانچہ وہ بغیر کسی سے کچھ کہے مالک مکان کی ایک ایک پائی چکا کر چلتا بنتا۔

سامان ٹرک یا تانگے پر نہیں لے جاتا تھا بلکہ چھکڑے پر جیسے خانہ بدوش اپنا سامان لادتے ہیں۔ چار پائیاں اُلٹی پڑی ہیں، بالٹیاں ایک طرف لٹک رہی ہیں۔ کرسیاں اوندھی ہو کر ڈول رہی ہیں۔ بس کمی یہ رہ جاتی تھی کہ وہ خود کسی خانہ بدوش کی طرح چھکڑے پر سوار نہ ہوتا تھا۔ اسے لوک لاج کچھ لو یا کچھ اور ورنہ اُسے تو اِس بات سے بھی گریز نہ تھا۔ پھر چھکڑا نئے مکان کے سامنے آکر رکتا اور سامان اُترتا اور ایک دو دن وہ اس طرح رہتا جیسے واقعی خانہ بدوش ہو۔

یہ آٹھواں مکان بھی اُس نے اپنی اِسی عادت کے مطابق حاصل کیا تھا۔ یہ مکان اُسے بہت پسند آیا۔ ایک الگ کوٹھی تھی جس کا مالک ایک ریٹائرڈ فوجی کپتان تھا۔ اُس نے اپنے لئے تین کمرے الگ بنوا رکھے تھے اور وہ اُنہیں میں رہتا تھا۔ یہ چھوٹی سی کوٹھی اُس نے کرائے پر دے رکھی تھی۔ راکیش کو یہ کوٹھی اس لئے مل گئی تھی کہ اُس کا ایک مجسٹریٹ دوست، جو اُس میں رہتا تھا تبدیل ہو گیا تھا۔ اور جاتے وقت اِس کی

...ے گیا تھا کپتان کو یہاں تاگوار ضرور گزری تھی لیکن اُس نے مداخلت ... جس دن راکیش نے مکان پر قبضہ کیا کپتان اپنے گاؤں گیا ہوا تھا۔ اُس کا ...ہاں سے تقریباً بارہ میل دور تھا اور وہاں اُس کی زمینیں تھیں۔ کوٹھی میں داخل ...جس نے سب سے پہلے راکیش کا سواگت کیا تھا وہ کپتان کا السیشین کتا تھا جس ...نے قد اور خوفناک شکل سے اُسے بُری طرح ڈرا دیا تھا اور جس کی آواز سُن کر کپتان ... باہر آگئی تھی۔

"سیزر! ادھر آؤ۔"

کُتا دُم ہلاتا اپنی مالکن کی طرف چلا گیا اور راکیش نے اُس کی طرف شکر گزار ...سے دیکھ کر کہا۔

"بہت بہت شکریہ۔"

"شکریہ کس بات کا؟" وہ اور قریب آگئی اور سیزر اُس کے آگے پیچھے پھرتا ...سُونگھنے لگا۔

"آپ نے میری جان بچائی ہے۔"

جواب میں وہ ہنسی۔ لیکن اس ہنسی میں ترنم نہیں تھا، تُنگی تھی۔ وہ اتنی جاندار ...تھی جتنی اُسے ہونا چاہیے تھا، اُسے حیرت ہوئی۔

راکیش اپنے ذہن میں اس جوان لڑکی کے متعلق کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ آتی کسن اور ...لیکن دبی ہوئی سی، جیسے اُس کے ارتقاء پر کوئی وزنی چٹان رکھ دی گئی ہو اور وہ اُس ...کی طرح ہو جو برسات میں کسی پتھر کے نیچے سے سر نکال رہی ہو، جس کی کونپلیں مُرجھا ...گئی ہوں اور رنگ ایکدم پیلا ہو گیا ہو۔

"آپ ——؟" راکیش اپنا سوال مکمل نہ کر سکا۔ اُس کے ذہن میں تذبذب ...بن تھی۔

"کہیے۔" وہ مُسکرا دی۔

"میرا مطلب ہے؟"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" اُس نے پوچھا۔

"آپ؟"

"وہ نرس ہوں جو پیکنگ دن کی کمی ہوا کرتی کی نرس ہو۔"

"میں کپتان صاحب کی بیٹی ہوں۔"

"مسز کپتان؟"

"جی میرا نام کتاب کور ہے۔" وہ مُسکرائی اور اُس نے اپنے سر سے ڈھلکتا ہوا آنچل سنبھالا۔ اُس کی انگلیاں بہت خوبصورت تھیں۔

وہ اور قریب آگئی تھی اور سیزر اور زیادہ مچلنے لگا تھا۔

آدمی سامان اُتار رہے تھے۔ اب اُس کا وہ بکس اُتر رہا تھا جو اُس کا واحد سرمایہ تھا۔ بکس بہت بھاری تھا۔ اُتارنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ راکیش کو خدشہ تھا جیسے بکس زمین پر گر جائے گا اور اُس کی تمام دولت بکھر جائے گی۔ اُس کا دماغ جھنجھنا اُٹھا۔

"اس میں اینٹیں بھری ہیں کیا؟"

"کتابیں ہیں مسز کپتان۔" راکیش نے بہت نرمی سے جواب دیا۔ اور اُس کی نظریں بھر کے لئے اپنے سامنے کھڑی جوان عورت کی طرف اُٹھی۔ اُس کے گورے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ وہ سہم گیا اور نظریں بچا کر کتابوں سے بھرے ہوئے بکس کی طرف دیکھنے لگا جو زمین پر رکھ دیا گیا تھا۔ جب اُس نے نظر اُٹھائی تو کتاب کور اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی چھوٹے قد کی تیلی سی عورت۔ راکیش کو ایسا لگا جیسے اُس کے لئے اپنی حدوں سے باہر نکلنے کی مہلت ختم ہو گئی تھی اور اب اُس کی حدیں اُسے دوبارہ واپس بلا رہی تھیں۔ راکیش کو محسوس ہوا جیسے ایک خوبصورت کتاب اچانک الماری سے باہر گر گئی تھی۔ ایسی کتاب جس کے صفحوں پر کسی کی انگلیوں کے نشان نہیں تھے۔ جو صرف خریدی گئی تھی پڑھی نہیں گئی تھی اور اب وہ کتاب دوبارہ الماری میں رکھی جا رہی تھی اور باہر تالا لگایا جا رہا تھا۔

راکیش نے اس رات کھانا نہیں کھایا۔ تھرموس میں کافی تھی، بسکٹ کا ڈبہ ساتھ تھا۔ اُس نے اُسی پر گزارا کر لیا۔ نوکر سامان سنبھالنے میں لگا رہا اور جب تھک گیا تو راکیش سے اجازت لے کر باہر چلا گیا۔ راکیش بکس میں سے کتاب نکال کر الماری میں سجا رہا تھا اور سگریٹ کا دھواں کمرے کی فضا میں بکھیر رہا تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔

"تشریف لائیے۔" راکیش نے کہا۔

وہ آدمی جو اندر داخل ہوا کپتان ہی ہو سکتا تھا۔ راکیش نے دیکھتے ہی اندازہ کر لیا۔

"کیپٹن چودھری۔"

"سوندھی۔"

- اُٹھو، جاگو، اور جب تک منزل نہیں پا لیتے چین سے نہ بیٹھو۔ (سوامی وویکانند)
- ماضی کی یادوں یا مستقبل کے خوابوں میں کھوئے رہنے سے کہیں بہتر ہے کہ اپنے حال کو تعمیر کرو۔ (سوامی وویکانند)
- جب کسی کام کا ارادہ کرو تو یہ سمجھو تم سب کچھ کر سکتے ہو۔ (سیل مین)
- میں نے کبھی کسی ایسے کام کو ہاتھ نہیں لگایا جس میں اپنی تمام طاقتوں کو صرف نہ کر سکا۔ (چارلس ڈکنس)

"So you are my new tenant?"

"جی"

"لیکن جشر پٹیل نے یہ اچھا نہیں کیا۔ اُس نے یہ مکان میری مرضی کے خلاف دیا ہے"

"I am Sorry for that"

"تمہیں شرمندہ نہیں ہونا چاہئے۔"

"آپ چاہیں تو میں مکان خالی کر سکتا ہوں۔"

"نو۔ نو۔ وٹ نون سینس"

راکیش ڈر گیا۔ یہ تو بہت اکھڑ قسم کا آدمی تھا۔

"تھینک یو کیپٹن"

"میری مسز نے کہا، دیکھ آئیے نیا کرایہ دار کیسا ہے" کپتان یہ کہہ کر مسکرا دیا۔

تو کتاب کور نے مجھ سے اپنی ملاقات کا ذکر کپتان سے نہیں کیا ــــــ؟ راکیش خوش ہو گیا۔

"شکریہ"

"اتنی ساری کتابیں تمہاری ہیں؟"

کپتان کا اندازِ گفتگو اُسے پسند نہ آیا لیکن وہ برداشت کر گیا۔

"جی"

"کس لئے؟"

"پڑھنے کے لئے"

"ینگ مین کیوں اپنی زندگی برباد کر رہے ہو۔ کتابیں پڑھنے والے زندگی میں کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ they are utter failures ــــــ"

"یہی میری ہابی ہے"

"بکواس ہے۔ بیچ دو ان کتابوں کو۔ ورنہ انھیں الماری میں رکھ کر اوپر سے پردہ ڈال دو"

"کیوں؟"

اِس سے پہلے کہ کپتان اس سوال کا جواب دیتا سیزر کے زور سے بھونکنے کی آواز آئی اور وہ فوراً کمرے سے باہر نکل گیا۔

کتا راکیش کے نوکر کو بھونک رہا تھا۔

"رات کو باہر مت رہا کرو، کتا پھاڑ ڈالے گا" کپتان کی آواز گیٹ کے قریب گونج رہی تھی۔

راکیش کا نوکر جب اندر داخل ہوا تو بے چارہ بُری طرح کانپ رہا تھا۔

"یہ فوجیوں کا گھر ہے ملک صاحب ذرا سنبھل کر رہنا" راکیش نے مسکراتے ہوئے اپنے نوکر کو مخاطب کیا اور خود کتابیں سجانے میں لگ گیا۔

کوئی گیارہ بجے کے قریب راکیش بستر میں لیٹا تو اُس نے کپتان کے گھر سے بہت اونچے لہجے میں بولنے کی آواز سُنی جیسے کپتان کسی کو دھمکا رہا ہو۔ اور اُس کے ساتھ سیزر کی آواز بھی شامل تھی۔ کرخت اور زوردار۔

دوسرے دن راکیش آفس نہیں گیا۔ اُس نے دو دن کی چھٹی لے لی بستر میں لیٹے ہوئے اُس نے سُنا۔

"بشسوندھی کیا کر رہے ہیں؟" کپتان نوکر سے پوچھ رہا تھا۔

"لیٹے ہیں، بیمار ہیں"

"ہماری طرف سے بول دینا"

"جی اچھا"

راکیش بیمار تو خیر کیا تھا، اُس کا ذہن ضرور پریشان تھا۔ یہ نیا گھر شاید اُسے راس نہ آئے۔ وہ گھر میں رہ کر کپتان کی حرکات اور اُس کے سارے دن کے پروگرام کا اندازہ کرنا چاہتا تھا اور یہ تبھی ممکن تھا جب وہ بیمار بن جائے اور کہیں باہر نہ جائے۔ اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ کپتان صبح پانچ بجے اُٹھ کر کتے کو ساتھ لئے سیر کو نکل جاتا تھا اور اپنے گھر کے مین دروازے میں تالا ڈال جاتا تھا۔ سات ساڑھے سات بجے کے قریب آ کر تالا کھولتا اور گیٹ کے سامنے گزرتے ہوئے نالے کا پانی جو شہر کے واٹر ورکس میں جا کر سارے شہر کو سپلائی ہوتا تھا، ایک لوہے کی نالی کے ذریعے لان میں کھول دیتا پھر لان میں لگے ہوئے ایک ایک درخت اور پودے کو غور سے دیکھتا۔ اُس کے بعد غسل کرتا اور پھر ناشتہ کر کے آرام کرتا۔ چونکہ آبادی کا یہ حصہ شہر سے دو میل دور تھا، اِس لئے دوسرے تیسرے روز سائیکل پر شہر جاتا، ضرورت کی چیزیں خریدنے کے لئے۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر سو جاتا اور پھر اپنی پُرانی موٹر کار کو جو گیرج میں بند رہتی تھی، اِدھر اُدھر سے دیکھتا اور بونٹ کو زور سے بند کرتا اور سیزر کو گالیاں دیتا ہوا چائے پینے کے لئے چھت پر چڑھ جاتا۔ وہ چائے چھت ہی پر پینا پسند کرتا تھا۔ رات کو ریڈیو

- جو مرد عورت کی ادنیٰ کمزوریوں کو معاف نہیں کرتا، وہ اُس کی اعلیٰ خوبیوں سے کبھی واقف نہیں ہو سکتا۔ (خلیل جبران)
- عورت تقدیس و تعظیم کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ (جے برڈ)
- عورت زندگی کی کٹھن راہوں کے لئے رہبرِ کامل ہے۔ (ہیلن)
- عورت مرد کا نصف ایمان ہے۔ (موتی)
- جس میں بلند حوصلگی نہیں وہ حرماں نصیب ہے۔ (گوئٹے)

یہاں آئے ہوئے گئے تھے۔ کپتان کو ریلیف ملا اور ضرور گزری تھی لیکن اُس نے مداخلت نہیں کی۔ جس دن راکیش نے مکان چھوڑا، کپتان اپنے گاؤں گیا ہوا تھا۔ اُس کا گاؤں یہاں سے تقریباً بارہ میل دور تھا اور وہاں اُس کی زمینیں تھیں۔ کوٹھی میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے راکیش کا سواگت کیا تھا، وہ کپتان کا السیشین کتا تھا جس نے اپنے قد اور خوفناک شکل سے اُسے بُری طرح ڈرا دیا تھا اور جس کی آواز سُن کر کپتان کی بیوی باہر آگئی تھی۔

"سیزر! ادھر آؤ۔"

کتا دُم ہلاتا اپنی مالکن کی طرف چلا گیا اور راکیش نے اُس کی طرف شکر گزار نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"بہت بہت شکریہ۔"

"شکریہ کس بات کا؟" وہ اور قریب آگئی اور سیزر اُس کے آگے پیچھے پھرتا ہوا سونگھنے لگا۔

"آپ نے میری جان بچائی ہے۔"

جواب میں وہ ہنسی۔ لیکن اس ہنسی میں ترنم نہیں تھا، تلخی تھی۔ وہ اتنی جاندار نہیں تھی جتنی اُسے ہونا چاہیے تھا، اُسے حیرت ہوئی۔

راکیش اپنے ذہن میں اس جوان لڑکی کے متعلق کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ اتنی کمسن اور جوان لیکن دبی ہوئی سی جیسے اُس کے ارتقاء پر کوئی وزنی چٹان رکھ دی گئی ہو اور وہ اُس گھاس کی طرح ہو جو برسات میں کسی پتھر کے نیچے سے سر نکال رہی ہو جس کی کونپلیں مُڑی تُڑی ہوں اور رنگ ایکدم پیلا ہو گیا ہو۔

"آپ ــــــ؟" راکیش اپنا سوال مکمل نہ کر سکا۔ اُس کے ذہن میں تذبذب اور اُلجھن تھی۔

"کہیے۔" وہ مُسکرا دی۔

"میرا مطلب ہے؟"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" اُس نے پوچھا۔

"آپ؟"

"وہ ہنس دی جیسے کسی دن کی کھلی ہوئی کلی کی ہنسی ہو۔"

"میں کپتان صاحب کی بیوی ہوں۔"

"مسز کپتان؟"

"جی میرا نام کتاب کور ہے۔" وہ مُسکرائی اور اُس نے اپنے سر سے ڈھلکا آنچل سنبھالا۔ اُس کی اُنگلیاں بہت خوبصورت تھیں۔

وہ اور قریب آگئی تھی اور سیزر اور زیادہ مچلنے لگا تھا۔

آدمی سامان اُتار رہے تھے۔ اب اُن کا وہ بکس اُتر رہا تھا جو اُس کا دماغ تھا۔ بکس بہت بھاری تھا۔ اُتارنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ راکیش کو خدشہ تھا یہ زمین پر گر جائے گا اور اُس کی تمام دولت بکھر جائے گی۔ اُس کا دماغ جھنجھنا اُٹھا۔

"اس میں اینٹیں بھری ہیں کیا؟"

"کتابیں ہیں مسز کپتان۔" راکیش نے بہت نرمی سے جواب دیا۔ اور اُس کی نظر پل بھر کے لئے اپنے سامنے کھڑی جوان عورت کی طرف اُٹھی۔ اُس کے گورے پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ وہ سہم گیا اور نظر بچا کر کتابوں سے بھرے ہوئے بکس کی طرف دیکھنے لگا جو زمین پر رکھ دیا گیا تھا۔ جب اُس نے نظر اُٹھائی تو کتاب کور اندر کی طرف جا رہی تھی، چھوٹے قد کی تیلی سی عورت۔ راکیش کو ایسا لگا جیسے اُس کے حدوں سے باہر نکلنے کی مہلت ختم ہو گئی تھی اور اب اُس کی حدیں اُسے دوبارہ بُلا رہی تھیں۔ راکیش کو محسوس ہوا جیسے ایک خوبصورت کتاب اچانک الماری سے گر گئی تھی۔ ایسی کتاب جس کے صفحوں پر کسی کی اُنگلیوں کے نشان نہیں تھے۔ جو صرف گئی تھی پڑھی نہیں گئی تھی اور اب وہ کتاب دوبارہ الماری میں رکھی جا رہی تھی اور تالا لگایا جا رہا تھا۔

راکیش نے اس رات کھانا نہیں کھایا۔ تھرموس میں کافی تھی، بسکٹ کا ڈبہ تھا۔ اُس نے اُسی پر گزارا کر لیا۔ نوکر سامان سنبھالنے میں لگا رہا اور جب تھک گیا تو راکیش سے اجازت لے کر باہر چلا گیا۔ راکیش بکس میں سے کتاب نکال کر الماری میں رکھ رہا تھا اور سگریٹ کا دُھواں کمرے کی فضا میں بکھیر رہا تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔

"تشریف لائیے۔" راکیش نے کہا۔

وہ آدمی جو اندر داخل ہوا کپتان ہی ہو سکتا تھا۔ راکیش نے دیکھتے ہی پہچان کر لیا۔

"کیپٹن چودھری۔"

"سوندھی۔"

- اُٹھو، جاگو، اور جب تک منزل نہیں پا لیتے چین سے نہ بیٹھو۔ (سوامی وویکانند)
- ماضی کی یادوں یا مستقبل کے خوابوں میں کھوئے رہنے سے کہیں بہتر ہے کہ اپنے حال کو تعمیر کرو۔ (سوامی وویکانند)
- جب کسی کام کا ارادہ کرو تو یہ سمجھو کہ تم سب کچھ کر سکتے ہو۔ (سیل مین)
- میں نے کبھی کسی ایسے کام کو ہاتھ نہیں لگایا جس میں اپنی تمام طاقتوں کو صرف نہ کر سکا۔ (چارلس ڈکنس)

"So you are my new tenant?"

"جی۔"

"لیکن مسٹر سنہا نے یہ اچھا نہیں کیا۔ اُس نے یہ مکان میری مرضی کے خلاف دیا ہے۔"

"I am sorry for that"

"تمہیں شرمندہ نہیں ہونا چاہیے۔"

"آپ چاہیں تو میں مکان خالی کر سکتا ہوں۔"

"نو۔ نو۔ وٹ نون سینس۔"

راکیش ڈر گیا۔ یہ تو بہت اکھڑ قسم کا آدمی تھا۔

"تھینک یو کیپٹن۔"

"میری مسز نے کہا' دیکھو آپ نے نیا کرایہ دار کیسا ہے۔" کپتان یہ کہہ کر مسکرا دیا۔

تو کتاب کور نے مجھ سے اپنی ملاقات کا ذکر کپتان سے نہیں کیا ——— وہ راکیش سمجھ گیا۔

"شکریہ۔"

"اتنی ساری کتابیں تمہاری ہیں؟"

کپتان کا انداز گفتگو اُسے پسند نہ آیا۔ لیکن وہ برداشت کر گیا۔

"جی۔"

"کس لئے؟"

"پڑھنے کے لئے۔"

"ینگ مین کیوں اپنی زندگی برباد کر رہے ہو۔ کتابیں پڑھنے والے زندگی میں کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ ——— they are utter failures"

"یہی میری ہابی ہے۔"

"بکواس ہے۔ بیچ دو ان کتابوں کو۔ ورنہ انھیں الماری میں رکھ کر اوپر سے پردہ ڈال دو۔"

"کیوں؟"

اس سے پہلے کہ کپتان اس سوال کا جواب دیتا سیزر کے زور سے بھونکنے کی آواز آئی اور وہ فوراً کمرے سے باہر نکل گیا۔

کُتا راکیش کے نوکر کو بھونک رہا تھا۔

"رات کو باہر مت رہا کرو' کُتا پھاڑ ڈالے گا۔" کپتان کی آواز گیٹ کے قریب گونج رہی تھی۔

راکیش کا نوکر جب اندر داخل ہوا تو بے چارہ بُری طرح کانپ رہا تھا۔

"یہ فوجیوں کا گھر ہے ٹھیک صاحب ذرا سنبھل کر رہنا۔" راکیش نے مُنہ ... ہوئے اپنے نوکر کو مخاطب کیا اور خود کتابیں سجانے میں لگ گیا۔

کوئی گیارہ بجے کے قریب راکیش بستر میں لیٹا تو اُس نے کپتان کے گھر سے اونچے لہجے میں بولنے کی آواز سُنی جیسے کپتان کسی کو دھمکا رہا ہو۔ اور اُس کے کتے کی آواز بھی شامل تھی۔ کرخت اور زوردار۔

دوسرے دن راکیش آفس نہیں گیا۔ اُس نے دو دن کی چھٹی لے لی۔ لیٹے ہوئے اُس نے سُنا۔

"مسٹر سوندھی کیا کر رہے ہیں؟" کپتان نوکر سے پوچھ رہا تھا۔

"لیٹے ہیں' بیمار ہیں۔"

"ہماری طرف سے بول دینا۔"

"جی اچھا۔"

راکیش بیمار تو خیر کیا تھا' اُس کا ذہن ضرور پریشان تھا۔ یہ نیا گھر شاید راس نہ آئے۔ وہ گھر میں رہ کر کپتان کی حرکات اور اُس کے سارے دن کے پروگرام کا مطالعہ کرنا چاہتا تھا اور یہ بھی ممکن تھا جب وہ بیمار بن جائے اور کہیں باہر نہ جائے۔ معلوم ہو گیا تھا کہ کپتان صبح پانچ بجے اُٹھ کر گُتے کو ساتھ لئے سیر کو نکل جاتا تھا۔ اپنے گھر کے مین دروازے میں تالا ڈال جاتا تھا۔ سات ساڑھے سات بجے کے آکر تالا کھولتا اور گیٹ کے سامنے گزرتے ہوئے نالے کا پانی جو شہر کے واٹر ورکس سے سارے شہر کو سپلائی ہوتا تھا' ایک لوہے کی نالی کے ذریعے لان میں کھول دیتا پھر لگے ہوئے ایک ایک درخت اور پودے کو غور سے دیکھتا۔ اُس کے بعد غسل کرتا اور ناشتہ کر کے آرام کرتا۔ چونکہ آبادی کا یہ حصہ شہر سے دو میل دور تھا' اس لئے دو تیسرے روز سائیکل پر شہر جاتا۔ ضرورت کی چیزیں خریدنے کے لئے۔ دوپہر کا کھانے کے بعد کچھ دیر سو جاتا اور پھر اپنی پُرانی موٹر کار کو جو گیرج میں بند رہتی تھی' اُدھر سے دیکھتا اور بونٹ کو زور سے بند کرتا اور سیزر کو گالیاں دیتا ہوا چائے کے لئے چھت پر چڑھ جاتا۔ وہ چائے چھت ہی پر پینا پسند کرتا تھا۔ رات کو

- جو مرد عورت کی ادنیٰ کمزوریوں کو معاف نہیں کرتا' وہ اُس کی اعلیٰ خوبیوں سے کبھی واقف نہیں ہو سکتا۔ (خلیل جبران)
- عورت تقدیس و تعظیم کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ (سجے برڈ)
- عورت زندگی کی کٹھن راہوں کے لئے رہبر کامل ہے۔ (ہیلن)
- عورت مرد کا نصف ایمان ہے۔ (موتی)
- جس میں بلند حوصلگی نہیں وہ حرماں نصیب ہے۔ (گوئٹے)

[illegible] سنتا اور پھر سرہانے [illegible] کا انتظام کیا۔ تنہائی میں گھوم کر اور گیٹ کو دیکھ کر
[illegible] ساتھ لے اندر چلا جاتا جہاں کچھ دیر تک اس کی زور زور سے بولنے کی آواز
[illegible] پھر بتیاں گل ہو جاتیں اور سناٹا چھا جاتا کبھی کبھی سیزر کے بھونکنے کی
آواز [illegible] پر بند کر دیتا یا پھر الماری میں بند وہ خوبصورت کتاب جس
[illegible] آنکھوں کے نشان تک نہ تھے ایک مقید پنچھی کی طرح اپنے پر پھڑپھڑاتی،
[illegible] سے سر پٹختی اور تھک کر رہ جاتی۔ ایسے لمحوں میں راکیش اپنے سرہانے جلتے
لیمپ کی روشنی میں چپ چاپ ان دونوں کے بارے میں سوچتا جو جنم جنم کی
پیاس ہونٹوں پہ لئے کائنات کے گرد دھکا کھاتی رہتی ہیں۔

اس نے دو دن میں کتاب کور کو ایک بار بھی نہ دیکھا۔ وہ اپنی مخصوص حدوں میں
قید تھی۔ البتہ کپتان دوسرے دن شام کو اس کا حال پوچھنے آیا اور سرہانے رکھی ہوئی
کتاب کور دیکھ کر ڈانٹتے ہوئے بولا۔

"بیماری میں پڑھتے ہو؟ پاگل ہو جاؤ گے۔"

"بغیر پڑھے میرے پاگل ہونے کے زیادہ امکانات ہیں کپتان صاحب۔" راکیش
نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور کافی کا پیالہ پیش کیا جو اس کا نوکر بنا کر لایا تھا۔

کپتان نے کافی کا پیالہ لے لیا۔

"تمہارے ساتھ عورت کوئی نہیں؟"

راکیش کپتان کے اس طرز تخاطب کا عادی ہو گیا تھا۔

"میری ماں اور بہن ہے۔"

"بس!"

"جی بس۔"

"بیوی نہیں ہے؟"

"شادی نہیں کی۔"

"بہت اچھا کیا۔ عورت سے چاہے جو بھی رشتہ رکھو اسے بیوی کبھی مت
بناؤ۔"

"کیوں؟"

"سوال کم پوچھا کرو۔ زیادہ سوال پوچھنا گستاخی ہے۔"

راکیش مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

"کب آ رہے ہیں تمہارے گھر والے؟"

"ہفتہ بھر میں آ جائیں گے، کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔"

"سیر کرنے!"

"جی نہیں ایک شادی اٹینڈ کرنے۔"

"بکواس۔"

راکیش خاموش ہو گیا۔ کپتان نے کافی ختم کر لی اور چلنے کو اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا گڈ نائٹ۔"

"گڈ نائٹ۔" راکیش نے جواب دیا۔

کپتان کتے کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف چلا گیا اور جاتے وقت سرہانے
رکھی ہوئی آدھی کھلی کتاب بند کر کے میز پر پٹک گیا۔ کتاب کو میز پر پٹکنے سے زور کی
آواز پیدا ہوئی جس سے روشن دان کے پاس پردوں میں چونچ دئے رات گزارنے والی چڑیا
پھڑپھڑا اٹھی اور سیزر بھونکنے لگا۔

راکیش تین چار دن دفتر میں زیادہ مصروف رہا۔ وہ دیر سے گھر لوٹتا اور پھر
فائل ورک کرتا رہتا۔ آدھی رات تک اسے کسی دوسری طرف توجہ دینے کی فرصت ہی
نہ ملتی۔ چونکہ صبح کو وہ دیر سے اٹھنے کا عادی تھا اس لئے بمشکل تیار ہو کر آفس پہنچ
پاتا۔ چنانچہ کئی دن تک کپتان سے ملاقات نہ ہوئی۔ ایک شام جب وہ دفتر سے
ٹھیک وقت پر گھر پہنچا تو اس نے دیکھا کتاب کور لان میں کھڑی اس کے نوکر سے
باتیں کر رہی تھی۔ گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی نوکر اس کی طرف پلٹا اور کتاب کور
نے اپنا آنچل سر پہ لے لیا جو جوڑے پر آ کر اٹک گیا تھا اور آگے نہ پھسلا تھا۔

"نمستے مسز کپتان۔"

"نمستے۔" وہ راکیش کی طرف مڑی اور مسکرائی۔

"بہت دنوں میں درشن ہوئے آپ کے؟"

"آپ کو بیماری اور کتابوں سے اور دفتر کے فائلوں سے فرصت ملے تو کسی
دوسری طرف دھیان دیں۔"

"اچھا تو یہی پوچھ رہی تھیں آپ میرے نوکر سے۔"

"جی۔"

"پہلے دن کے بعد تو آپ نے خبر تک نہ لی کہ آپ کے کرایہ دار کیسے ہیں۔"

"کرایہ دار آپ میرے نہیں، کپتان صاحب کے ہیں۔"

"ایک ہی بات ہے۔"

"ایک نہیں ہے۔"

"کپتان صاحب کہیں باہر تشریف لے گئے ہیں کیا؟"

"جی ہاں، ورنہ میری جگہ یہاں نہیں وہاں ہے۔" اس نے اپنے کمرے کی طرف
اشارہ کیا۔ چھت کی منڈیر پر ایک آہنی پنجرہ تھا جس میں ہرے رنگ اور سرخ چونچ والا
طوطا پنجرے سے ٹکریں مار رہا تھا۔

"کہاں گئے ہیں وہ؟"

"تو وہ تھوڑی دیر میں واپس آجائیں گے۔"

"آپ کی شادی کو کتنا عرصہ ہوا؟"

"تقریباً ایک صدی۔"

راکیش یہ جواب سن کر سکتے میں آگیا۔ اس مختصر سے جواب میں ایک نوجوان عورت کی بے پناہ آزردگی کی پوری داستان تھی۔ ایک پوری کتاب تھی اِس ایک فقرے میں۔ اُس نے نظریں اُٹھائیں۔ دو پتلے پتلے نازک ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔ جیسے آدمی کا زبردست ریلا گلاب کے پھولوں کو روند کر چلا گیا ہو۔

"آپ کی ماتاجی اور بہن کب آرہی ہیں؟" اُس نے فوراً اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

"بس دو ایک دن میں آنے والی ہیں۔"

"تو شاید میری نظر بندی میں کچھ فرق پڑے۔ ہماری پہلی کرایہ دار مسز متل سے تو کپتان صاحب کو چڑ تھی۔ وہ بہت اچھی لڑکی تھی لیکن نئے ڈھنگ سے رہنے اور سوچنے والی۔"

"تو اس میں کیا برائی تھی؟"

"برائی یہ تھی کہ کپتان صاحب کو یہ انداز پسند نہیں تھا۔ جب تک وہ لوگ یہاں رہے میں اُن سے صرف دو بار ملی۔"

"ایک بار آنے پر اور دوسری بار جانے پر۔ معلوم ہوتا ہے یہی سلوک میرے ساتھ بھی ہوگا۔"

"یہ تو آپ کی ماتاجی کے آنے ہی پر سوچا جائے گا۔"

"سوائے آپ کے اور کپتان صاحب کے یہاں اور کوئی نہیں رہتا کیا؟"

"سیزر ہے اور پنجرے میں بند طوطا ہے۔"

کتاب کور نے جب یہ الفاظ کہے تو اُسی وقت کتے کے بھونکنے کی آواز آئی اور وہ بغیر کچھ کہے تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی اپنے گھر کی طرف چلی گئی۔ راکیش اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ کتنی متوازن چال تھی اُس کی اور کتنا غیر متوازن تھا اُس کا ماحول۔ اور پھر اُس نے دروازے پر رُک کر ایک بار راکیش کی طرف دیکھا اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ راکیش نے برآمدے میں قدم رکھا اور سگرٹ سُلگا لیا۔ نوکر اندر چائے لگا رہا تھا۔ وہ پردہ اُٹھا کر اندر داخل ہوا ہی تھا کہ کیپٹن چودھری نے گیٹ کھولا۔

دوسرے دن شام کو راکیش کی ماں اور اُس کی بہن مالتی آگئیں۔ راکیش کے اِس کوٹھی کے انتخاب پر دونوں خوش ہوئیں۔

"اِس بار تم نے اچھا مکان لیا ہے" ماں نے کہا۔

"لیکن یہ سب کتاب نا۔ کون جانے کب سنک سوار ہو جائے اور یہ بھاگ کھڑے ہوں۔" مالتی نے جواب دیا اور لان میں اُگی ہوئی گھاس کی ہریالی اُس کی آنکھوں میں لہرا گئی۔

"یہاں میرا بھی کچھ دن رہنے کو دل چاہتا ہے" مالتی۔

"تمہاری روایات کے خلاف ہوگی یہ بات۔"

"یہ ترقی پسندی کا ٹیگ ہے" اِس میں روایات بنتی بگڑتی رہتی ہیں۔"

دونوں بہن بھائی بحث کرتے رہے اور ماں اندر چلی گئی۔ یہ بحث دو بیدار دماغوں کے ایک دوسرے کو پرکھنے اور جانچنے کی کوشش تھی۔

رات کو غیر متوقع طور پر کپتان نے دستک دی۔ کپتان بعد میں آتا تھا اُس کا کتا پہلے آ پہنچا تھا۔

"تو تمہارے گھر والے آگئے؟"

"جی ہاں شام کو پہنچے ہیں۔"

اس کے بعد راکیش نے کپتان سے اپنی ماں اور مالتی کا تعارف کرایا۔ کپتان انھیں اس طرح جانچ رہا تھا جیسے انٹرویو لے رہا ہو۔ اور پھر وہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے بولا۔

"I like your people"

"تھینکس۔"

"مجھے متل فیملی بالکل پسند نہ تھی۔ مسز متل تو بس ڈیکوریشن پیس تھی۔"

کپتان کے اس ریمارک پر مالتی ہنس پڑی۔

"عورت ڈیکوریشن پیس بھی تو ہے کپتان صاحب۔"

"نہیں۔ تمہارے خیالات سے مجھے بغاوت کی بُو آتی ہے۔ فوجی بغاوت کو کچلتے ہیں اس کا ساتھ نہیں دیتے۔" کپتان بولا۔

"ٹھیک ہے کپتان صاحب۔" مالتی نے جواب دیا۔

ماں یہ سب باتیں سن رہی تھی اور خاموش بیٹھی تھی۔

"Sabotage (سیبوٹیج) کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

"Un pardonable (اَن پارڈنیبل)" کپتان جیسے چیخ اُٹھا تھا۔

لمحہ بھر کو سناٹا چھا گیا۔

ماں انگریزی نہیں جانتی تھی لیکن اُسے کپتان کا یہ انداز اچھا نہیں لگا۔

کچھ دیر بعد کپتان چلا گیا۔

کتاب کور کو راکیش کے گھر آنے جانے کی اجازت مل گئی تھی۔

دھیرے دھیرے راکیش کو محسوس ہونے لگا جیسے وہ چٹان جو اب تک برسات میں اُگی ہوئی گھاس پر پڑی اُسے کچل رہی تھی، کسی نے ایک طرف دھکیل دی ہے۔ کونپلوں کا رنگ بدلنے لگا تھا اور اُن میں توانائی آنے لگی تھی۔ کتاب کور کی شخصیت نمایاں ہو رہی تھی، سنور رہی تھی، نکھر رہی تھی۔ اُس کا لباس، اُس کی آواز، اُس کی ہنسی سبھی کچھ بدل رہا تھا۔ اُسے کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ وہ راکیش سے کوئی نہ کوئی کتاب لے جاتی لیکن پڑھتی کپتان سے چھپ کر کیونکہ کپتان کو کتابیں پڑھنا اچھا نہ لگتا تھا۔ راکیش کو محسوس ہوا جیسے کتاب کور بذات خود ایک کتاب تھی، الماری میں بند جس میں گھٹی ہوئی، جسے الماری کا تالا کھول کر کسی نے کبھی پڑھنا تو درکنار کھول کر دیکھا تک نہ تھا اور اب وہ کتاب باہر میز پر رکھ دی گئی تھی۔ اُس کے اوراق کھلے پڑے تھے اور ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں میں پھڑپھڑا رہے تھے اور اُس لمحے کا انتظار کر رہے تھے جب کوئی اُنھیں چھوئے اور اُن میں اپنی اُنگلیوں کی زندگی بخش حرارت بھر دے۔

اب جب کبھی اُس کا راکیش سے سامنا ہوتا تو وہ پہلے کی طرح اپنا ڈھلکا ہوا آنچل سنبھالنے کی کوشش نہ کرتی۔ راکیش نے دیکھا، اُس کے بال لمبے اور کالے تھے۔ اُس کی گردن پر ایک خوبصورت تل تھا اور کھلے گلے کا بلاوز اُسے اور بھی پُرکشش بنا دیتا تھا۔ اُس کے ہونٹ پتلے اور ترشے ہوئے تھے، اُس کے دانت سفید اور ہموار تھے۔ اُس کی باتیں اچھی تھیں۔ اور وہ بڑی صاف اور شستہ زبان بولتی تھی۔ کیونکہ وہ اُتر پردیش کی رہنے والی تھی۔ اُس کے جنم سے تین ماہ پہلے اُس کے باپ کا انتقال ہو گیا تھا اور اُس کی ماں نے اُسے بڑے جتن سے پالا تھا۔ وہ اُسے کتابو کہہ کر پکارتی تھی کیونکہ اُسے کتابوں سے بہت لگاؤ تھا۔ اور پھر کیپٹن چودھری نے اپنی آخری پوسٹنگ کے دوران کتابو کو حاصل کرنے کے لئے کئی حربے استعمال کئے تھے۔ وہ اپنی پہلی بیوی کو چھوڑ چکا تھا۔ اُس کا اُس بیوی سے ایک لڑکا تھا جسے وہ خرچ دے کر گاؤں کے اسکول میں پڑھا رہا تھا۔ اور جو اپنی ماں سے جھگڑتا رہتا تھا اور باپ کی طرفداری کرتا تھا۔ اور اسی میں کپتان کی جیت تھی۔ اور اب اُس کا لڑکا مہندر چودھری دو سال ہوئے گھر سے چلا گیا تھا اور اُس کا کچھ پتہ نہ تھا۔ کپتان نے اس کے بارے میں کبھی دُکھ یا افسوس کا اظہار نہ کیا تھا۔ پچھلے دو برس سے کتاب کور یہاں تھی اور ان چوبیس مہینوں میں اُس نے ایک آدھ بار ہی گیٹ سے باہر قدم رکھا تھا۔ اخبار کے علاوہ اُس نے اور کوئی چیز نہ پڑھی تھی۔ اُسے ریڈیو کا شوق تھا لیکن کپتان انگریزی گانے سُنتا تھا، کیونکہ فلمی گانے اُسے پسند نہ تھے۔ کتاب کور کی زندگی میں کہیں کوئی رنگ، کوئی اتھل پتھل، کوئی چمک، کوئی [illegible] تھا۔ ایک سپاٹ اور سیدھا راستہ تھا جس میں کہیں کوئی موڑ نہ تھا، اور اب [illegible] کے آجانے سے اُس کے جیون میں ایک رنگ آگیا تھا۔ وہ ایک موڑ پر کھڑی تھی اور نہیں جانتی تھی کہ آگے کیا ہے۔ لیکن اُسے اِس بات کی خوشی تھی کہ [illegible] راستے میں کہیں کوئی موڑ تو آیا۔ اس موڑ کے آگے کیا ہے؟ شاید اُس نے اپنے دل میں اس کا کوئی تصور بھی کیا ہو لیکن یہ تصور واضح نہیں تھا۔ اور جو منظر اُسے دیکھنے کو ملا [illegible] اُس کی اُسے کبھی اُمید نہ تھی۔ اُس نے جیون میں اُس کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ [illegible] نے اور چاہے کتنی ہی باتیں سوچی ہوں لیکن یہ جو کچھ ہوا وہ کبھی اُس کے دھیان میں [illegible] آیا تھا۔ اس معاملے میں وہ بالکل بے دوش تھی۔

ایک شام جب راکیش لان میں بیٹھا مالتی سے باتیں کر رہا تھا، اُس نے دیکھا کہ کوئی چوبیس پچیس برس کا ایک نوجوان اٹیچی کیس اُٹھائے گیٹ کے اندر داخل ہوا اور [illegible] بھر کو رُکا۔

"کیپٹن چودھری کوٹھی کے کس حصے میں رہتے ہیں؟"

"سامنے والے حصے میں۔" راکیش نے اشارے سے بتایا اور وہ نوجوان سیدھا اُس حصے کی طرف چل دیا۔ کپتان باہر جانے کے لئے گھر سے نکل ہی رہا تھا کہ اُسے دیکھ کر رُک گیا۔

"تم کہاں سے آ ٹپکے ہو؟ مجھے ایسے لوگ پسند نہیں۔"

سیزر اندر بندھا بھونک رہا تھا۔

نوجوان جانے کے لئے واپس مُڑا۔

"رُک جاؤ۔" کپتان کی آواز گونجی۔

نوجوان رُک گیا اور پھر کپتان کے ساتھ اندر چلا گیا۔ دوسری صبح معلوم ہوا کہ اُس نوجوان کا نام مہندر چودھری تھا اور وہ کپتان کا لڑکا تھا۔

"سوندھی، تم اسے کوئی نوکری دلا سکتے ہو؟ یہ میرا لڑکا ہے۔ مجھے صرف اِس لئے اچھا لگتا ہے کہ یہ اپنی ماں کے خلاف ہے، جسے میں چھوڑ چکا ہوں۔" ایک دن [illegible] بعد کپتان نے کہا۔

"میں کوشش کروں گا، کپتان صاحب۔"

"پلیز۔"

راکیش نے جان لیا کہ مہندر میں جوان جسم کے سوا اور کوئی خصوصیت نہ [illegible] کتاب کور کے ساتھ اُس نے بھی راکیش کے گھر آنا جانا شروع کیا۔ صرف اُس [illegible] وہاں مالتی تھی۔ کچھ دن یہ سلسلہ چلتا رہا۔ راکیش نے [illegible] پکچر دیکھنے گئے۔ اُس دن کتاب کور [illegible] تھا، مالتی تھی اور وہ خود تھا۔

سیٹوں کی طرف بڑھنے سے پہلے مالتی [illegible]

[illegible] گی۔ مالتی مہندر [illegible] تھی۔ اُسے پہچان کر خوشی ہوئی۔ پہلے کتاب کور پھر مہندر پھر راکیش اور سب سے آخر میں مالتی نے اپنی سیٹ لی۔ پکچر کے دوران میں راکیش نے دیکھا کہ مہندر کا سارا دھیان کتاب کور پر مرکوز تھا۔ کتاب کور نے کئی بار ٹوکا بھی۔ وہ پکچر کا پورا پورا لطف لینا چاہتی تھی لیکن مہندر تھا کہ بس اپنی کہے جا رہا تھا۔ راکیش بور ہوتا رہا، مالتی تمام وقت پکچر دیکھتی رہی۔

چونکہ پکچر کی تجویز مالتی کی طرف سے تھی اس لئے کپتان نے اعتراض نہ کیا تھا۔ لیکن اُن کے چلے جانے کے بعد وہ تاؤ کھاتا رہا بلکہ سائیکل پر سنیما ہال تک بھی پہنچا۔ لیکن پکچر شروع ہو چکی تھی۔ وہ واپس آ گیا۔ گھنٹہ بھر کے بعد وہ پھر وہاں آیا۔ اُسی وقت انٹرول ہوا تھا۔ اُس نے دیکھا اُس کا لڑکا مہندر چودھری پنواڑی کی دکان سے پان لے رہا تھا اور سگریٹ سلگا رہا تھا۔ کپتان نے سوچا سنیما ہال میں جا کر کتاب کور کا ہاتھ پکڑ کر اُسے باہر کھینچ لائے لیکن کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو روک لیا۔

پکچر ختم ہوئی تو راکیش نے گھر جانے کے لئے دو رکشا کئے۔ ایک رکشے میں کتاب کور اور مالتی اور دوسری میں وہ اور مہندر بیٹھیں گے' اُس نے سوچا تھا۔ حالانکہ اُسے مہندر کے ساتھ بیٹھنا پسند نہ تھا۔ کتاب کور جب رکشا میں بیٹھی تو مہندر ایکدم اُچک کر اُس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ مالتی اور راکیش دوسرے رکشا میں سوار ہوئے۔

مالتی نے راستے میں ایک آدھ بار بات کرنے کی کوشش کی لیکن راکیش نہیں بولا۔ وہ صرف سگریٹ سلگاتا رہا اور انھیں پئے بغیر پھینکتا رہا۔

گھر پہنچے تو گیٹ پر کپتان کھڑا تھا۔ اُس نے مہندر اور کتاب کور کو ایک ہی رکشے سے اترتے دیکھا تو اُس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔

کتاب کور اپنا آنچل سنبھالتی ہوئی سہمی ہوئی سی اندر داخل ہوئی۔ اُس کے بعد مالتی، پھر راکیش اور سب کے بعد مہندر۔ کپتان کچھ دیر وہیں کھڑا رہا اور پھر اپنے کمرے کی طرف لوٹ گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد کپتان کے گرجنے اور کتاب کور کے رونے کی آواز آنے لگی۔ صرف مہندر کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ کافی دیر یہ ہنگامہ ہوتا رہا اور پھر سب خاموش ہو گئے۔ صرف سیزر بھونکتا رہا۔

اگلے دن کتاب کور راکیش کے گھر نہ آئی۔ اُس سے اگلے دن بھی نہ آئی اور پھر اُس سے اگلے دن بھی نہیں۔ ہار کر مالتی خود گئی لیکن دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ واپس آ گئی۔ کپتان کا روزمرہ کا پروگرام بھی بدل گیا تھا۔ وہ صبح کی سیر لان کی دیکھ بھال اور [illegible] سب ختم ہو گئی تھی۔ وہ کئی دن سے نظر بھی نہ آیا تھا۔ ایک [illegible] بوڑھا سا نظر آیا۔ اُسے دھکا لگا۔ اُس کے [illegible]

”کپتان صاحب طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟“

”حالات ٹھیک نہیں۔“

”کیا ہو گیا ہے آپ کو؟“

”سیبوٹاژ (Sabotage)“

کپتان اس پر ایک تفصیلی نظر ڈال کر گیٹ کی طرف بڑھ گیا اور دیر تک اپنی پرانی کار سے الجھتا رہا۔ پھر بونٹ کو درست بند کیا اور اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

راکیش اُس کے جواب کے متعلق سوچتا ہی رہ گیا۔ وہ کپتان کی نقل و حرکت کا بہت غور سے جائزہ لے رہا تھا۔ لان میں گھومتے ہوئے اُس نے دیکھا کپتان فوجی وردی پہنے چھت پر بیٹھا پیالی کی بجائے مگ میں چائے پی رہا تھا۔ تپائی پر ایک بوتل بھی رکھی تھی۔ شاید شراب تھی اُس میں۔ پھر اندھیرا ہو گیا اور چھت کی بتی تھوڑی دیر جل کر بجھ گئی۔

کپتان شاید اندھیرے میں بیٹھ کر شراب پی رہا تھا۔

رات کے گیارہ بجے تھے۔ راکیش کی ماں سو گئی تھی۔ مالتی کچھ پڑھ رہی تھی۔ راکیش اپنے بستر میں لیٹا سگریٹ پھونکے جا رہا تھا۔

کپتان کے گھر پھر جھگڑا شروع ہو گیا۔

راکیش اور مالتی کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ گئے۔

کپتان گالیاں بک رہا تھا اور کتاب کور رو رہی تھی۔

مہندر سخت آواز میں کہہ رہا تھا۔

”تم ذلیل ہو۔ تم نے میری ماں کی زندگی برباد کی ہے۔ میں اس کا بدلہ لوں گا۔“

یہ مہندر کے الفاظ تھے۔ آگ اگلتے ہوئے الفاظ۔

اور پھر آگ اگلتی ہوئی گولی کی چیخ گونجی۔ تڑپتی اور تلملاتی ہوئی۔

سیزر گلا پھاڑ کر بھونکنے لگا اور درختوں پر بیٹھے پرندے رات کے اندھیرے میں چیخ چیخ کر پھڑپھڑانے لگے

اور پھر ایک گھائل سناٹا کراہنے لگا۔

اُس سے اگلی شام۔

کوٹھی کے گیٹ کے سامنے ایک چھکڑا سامان سے لدا کھڑا تھا اور راکیش گیٹ بند کر چکنے کے بعد اپنے نام کی تختی اتار رہا تھا۔ کتاب کور چھت پر کھڑی تھی اور جانے والے قافلے کو دیکھ رہی تھی۔ راکیش کو محسوس ہوا جیسے اُس کی کتابوں کا [illegible] پھٹ گیا ہو اور ایک نئی کتاب جو اُس نے [illegible]

...انے والے دو کوڑیوں کی چھینا جھپٹی میں ورق ورق ہو گئی تھی۔ اس کی جلد اکھڑ
...ی تھی، ٹانکے ٹوٹ گئے تھے اور اس کا ایک ایک اُجلا اور بے داغ ورق ایک
...وسرے سے الگ ہو کر ہواؤں میں اُڑ رہا تھا۔ سڑک پر ان گنت اوراق بکھرے پڑے
...تھے، جنہیں لوگ اپنے پاؤں سے روندتے ہوئے بے پروائی سے چلے جا رہے تھے۔

اور وہ ایک طرف کھڑا حیرت زدہ یہ سب دیکھ رہا تھا اور خاموش تھا۔ اس کی
آنکھوں میں آنسو تھے۔ اور کاغذ کے ٹکڑے بگولے بن کر مضطرب اور بے قرار بندگان
کی طرح ہواؤں میں چکر کاٹ رہے تھے۔

غزل

ابر احسنی گنوری

خلدِ مقصود چمن ہو جیسے ہو بہو میرا وطن ہو جیسے

یوں وفا ڈھونڈ رہا ہوں اس میں عصرِ نو، عہدِ کہن ہو جیسے

سادہ کارانِ وفا کا کردار کسی زاہد کا چلن ہو جیسے

بدگماں حسن ہے کچھ اس سے یوں عشق بھی وعدہ شکن ہو جیسے

آدمیت کا یہ اِس دور میں حال لاش بے گور و کفن ہو جیسے

یوں ستم کرتی ہے مجھ پر دنیا یہ بھی دنیا کا چلن ہو جیسے

ابروئے دوست پہ بل کا عالم زُلفِ قسمت کی شکن ہو جیسے

موجِ کوثر کی یہ دل آویزی روکشِ گنگ و جمن ہو جیسے

اِس ترنم سے چٹکتی ہے کلی اُن کا اندازِ سخن ہو جیسے

ابتو یوں عمر بسر ہوتی ہے زندہ رہنا کوئی فن ہو جیسے

میرا یہ حال وطن میں اے دوست کوئی محرومِ وطن ہو جیسے

یوں محبت ہے اندھیرے کا چراغ
ضو فشاں شمعِ لگن ہو جیسے

ابر احسنی گنوری

غزل

رعنا جگی بی۔ اے

وہ کعبہ اب نہیں ملتا وہ بت خانے نہیں ملتے حقیقت پر جو مبنی تھے وہ افسانے نہیں ملتے

محبت کی روایت جن کی قربانی سے زندہ تھی وہ شمعیں رو گئیں بجھ کر وہ پروانے نہیں ملتے

چراغِ راہِ ہستی تھا ہر اک نقشِ قدم جن کا جو ہر منزل سے واقف تھے وہ دیوانے نہیں ملتے

جو اپنی آگ میں چپ چاپ جل جاتے تھے محفل میں ہماری انجمن میں اب وہ پروانے نہیں ملتے

جہاں انسانیت جام و سبو ہی کے ڈھلتی تھی جہاں تہذیب پلتی تھی وہ میخانے نہیں ملتے

نہ تھی کم دوستی سے دشمنی جن کی زمانے میں جو اپنوں سے زیادہ تھے وہ بیگانے نہیں ملتے

جہاں اہلِ جنوں بھی جشنِ آزادی مناتے تھے چمن زارِ جہاں میں اب وہ ویرانے نہیں ملتے

ہماری زندگی تھی جن کے دم سے زندگی رعنا
وہ اپنے اب نہیں ملتے وہ بیگانے نہیں ملتے

رعنا جگی

افسانہ

دلِ بے تاب ٹھہر!

موہن یادر

راج تلک روڈ جموں توی

۱۴ اپریل ۱۹۶۴ء   برادرم خورشید صاحب! تسلیم

آپ کا حکم سر آنکھوں پر، افسانہ نمبر کے لئے "دلِ بے تاب ٹھہر" حاضر ہے۔ مجھے امید ہے کہ بیسویں صدی کا یہ افسانہ نمبر بھی ایک سنگ میل ہوگا۔ سالنامہ کا صوری و معنوی حسن اب تک ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اب افسانہ نمبر ایک انوکھی سج دھج کے ساتھ منظرِ عام پر آئے گا۔

میرے افسانوں کا پانچواں مجموعہ "اپنا گھر" عنقریب چھپ رہا ہے۔ اس کے بعد ہی میں اپنے ناول "پتھروں کا شہر" کی طرف توجہ دوں گا....

مخلص

یادر

پریمیئر میں بینڈ بج رہا تھا۔ حسین جوڑے چکنے فرش پر محوِ رقص تھے۔ ایک
پال ایک خاص ادا کے ساتھ بیٹھا، تھری نائن تھری کے سگریٹ کا
گنوار رہا تھا۔ اور اُس کے سامنے تھری نائن تھری کا ٹن تھا اور ساتھ ہی
پیالی۔

ہر بار اُس کی نگاہیں دروازے کی طرف جاتیں اور ناکام لوٹ آتیں۔ یہ
سے کی آواز بھی عجیب ہے، جو اُس کے دل کے تاروں کو چھیڑ رہی تھی۔

اب جب کہ دروازہ کھلا تو اُس کی نگاہیں ناکام نہیں پلٹ سکیں۔ باہر
سفید رنگ کی کار تھی۔ اور وہی جوان حسین لڑکی اور دوسری ادھیڑ عمر کی
اُسی طرح سفید ساڑیوں میں ملبوس، سفید شال اوڑھے ہوئے ہال
تھیں۔

کافی رش تھا۔ زندگی تھرک رہی تھی۔ مستی مچل رہی تھی اور حسن
لڑکی نے ہال کا جائزہ لیا۔ سب ٹیبل پُر تھے صرف پال کے
کرسیاں خالی تھیں۔ وہ دونوں اُسی طرف بڑھ گئیں۔

عورت نے پال سے پوچھا۔

"کیا ہم یہاں بیٹھ سکتے ہیں؟"

پال ذرا کھوگیا۔ اور بولا۔

"جی ہاں۔ بیٹھئے۔"

اور وہ دونوں بیٹھ گئیں۔

پال کو اس جنت میں آئے ہوئے پانچ سات دن ہوگئے تھے۔ اور جبھی سے وہ پریمیئر میں آرہا تھا۔ اُسے کافی اور رقص سے بہت لگاؤ تھا۔

سارے کشمیر میں اُسے ایک ہی لڑکی نظر آئی تھی، جو اُداس تھی، خاموش تھی، ساکن تھی، جھیل ڈل کی طرح۔ جھیل ڈل بھی خاموش ہے اور اُس کے سینے پر کتنے رومان پروان چڑھے۔ کتنے پیارے پیارے اور معصوم دلوں نے ایک دوسرے کی دھڑکنیں سنیں۔ لیکن ڈل کی قسمت میں صرف اُداسی، خاموشی اور سکون! اور اُسی طرح یہ لڑکی اُداس تھی، اتنی خوبصورت کہ اپسرائیں بھی آجائیں تو راستہ بھول جائیں، کہ آکاش کدھر ہے۔

پال سوچ رہا تھا۔ لڑکی اور عورت میں کتنی مشابہت ہے۔ دونوں سگی بہنیں معلوم ہوتی تھیں، لیکن بات چیت سے پتہ چلا کہ ماں اور بیٹی تھیں۔

ماں نے اپنی اکلوتی بیٹی کے چہرے پر ایک مدت کے بعد مسکراہٹ دیکھی تھی۔

اب بینڈ پر والز کی دھن بج رہی تھی۔ رقص جاری تھا۔ چکنے فرش پر زندگی تھرک رہی تھی۔

پال نے لڑکی سے کہا۔

"مادام۔ آپ میرے ساتھ رقص . . ."

"جی ــــــ"

لڑکی اُس کی طرف گھور گھور کر دیکھنے لگی۔

"بیٹی۔ کوئی بات نہیں۔ جاؤ۔ ڈانس کرو۔ ذرا دل بہل جائے گا۔"

"اچھا ممی۔"

اور اچھی ممی کی اچھی بیٹی پال کے ساتھ فرش پر پھیلنے لگی۔

پال نے پوچھا۔

"آپ اس قدر کھوئی کھوئی سی کیوں ہیں! جب سے میں آپ کو دیکھ رہا ہوں۔ آپ اسی طرح پریشان ہیں۔"

اُس نے پھیکی سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ "نہیں تو۔"

"آپ کا نام!" پال نے پوچھا۔

"میرا نام شیلی ہے۔"

"ــــــ اور میرا نام پال ہے۔ میں لاہور رہتا ہوں۔ گریجویٹ ہوں۔ میرے فادر ایکسپورٹ امپورٹ کا کاروبار کرتے ہیں۔ یعنی کہ اِدھر کا مال اُدھر اور اُدھر کا مال اِدھر ــــــ"

پال کے تعارف کرانے کے انداز پر شیلی ہنسنے لگی۔

"اور آپ ــــــ"

پال نے کہا۔ "میں اپنے فادر کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یعنی کہ ہم سب چور ہیں۔"

شیلی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"آپ کافی دلچسپ ہیں۔"

"شکریہ ــــــ" پال نے کہا۔ "اور آپ کہاں رہتی ہیں، کیا کرتی ہیں اور . . ."

شیلی نے پال کی بات کاٹ دی۔

"میری کہانی سُن کر آپ کو دُکھ ہوگا۔"

پال نے کہا۔

"مادام۔ تب رہنے دیجئے۔ میں آپ کو اُداس نہیں دیکھنا چاہتا۔"

اور شیلی کی ماں شیلی کو خوش دیکھ کر بہت مسرور نظر آ رہی تھی۔

اب شیلی کی ماں پریمیئر میں بہت کم آتی۔ کبھی دردِ سر کا بہانہ اور کبھی داڑھ کے درد کا۔ اس طرح وہ چاہتی کہ شیلی کی راہ میں رکاوٹ نہ بنے، اور وہ اکیلی پریمیئر جائے۔ شیلی ہو، پال ہو، اور دونوں رقص کرتے ہوئے سب بھول جائیں۔

شیلی اور پال پریمیئر کی دنیا سے باہر نکلے، اور کشمیر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ گئے۔ کبھی گلمرگ، کبھی ٹنگمرگ، کبھی چشمہ شاہی، کبھی نشاط، کبھی شالامار، کبھی نگین۔

"یہ نگین بھی خوب ہے۔" پال نے کہا۔

"اور مجھے تیرتی ہوئی لڑکیاں بہت پسند ہیں۔ کتنی خوبصورت نظر آتی ہیں تیرتے ہوئے جیسے مچھلیاں۔"

پال نے پیار سے کہا۔

"پھر بھی تم سے کم خوبصورت۔"

"خوشامدی کہیں کے . . ." اور شیلی کا چہرہ اُتر گیا۔ وہ پریشان ہو گئی۔ "پال۔ واپس چلو۔ یہ نگین کا ماحول مجھے برباد کر دے گا۔ واپس چلو۔"

اور پال شیلی کے ساتھ اس کے بنگلے پر چلا گیا۔

جب صبح پال شیلی کے بنگلے پر پہنچا تو شیلی اپنی آیا کے ساتھ کار میں کہیں گھومنے چلی گئی تھی۔ اُسے حیرت بھی ہوئی کہ شیلی نے پہلی بار اُس کا انتظار کیوں نہیں کیا۔ اور اکیلی کیسے چلی گئی۔

شیلی کی ماں نے پال سے کہا۔

"پال بیٹا۔ شیلی رات بھر پریشان رہی۔ اُسے رہ رہ کر گئے گزرے دنوں کی یاد ستاتی رہی۔"

"کون سے دن ممی۔ بچپن کے یا سہیلیوں سے کھیلنے کے دن۔" پال نے پوچھا۔

"نہیں بیٹا۔ وہ رات بھر بڑبڑاتی رہی۔ اور بار بار کشور کا نام لیتی رہی۔" ممی یہ کہہ کر چپ ہو گئی۔

"یہ کشور کون ہے؟" پال نے پوچھا۔

شیلی کی ماں نے کہا۔

"تمہیں شیلی نے کشور کے بارے میں نہیں بتایا۔"

"نہیں ــــــ" پال نے حیرانی سے کہا۔

"بیٹا۔ نہیں جانتے تو جان لو۔ کشور میرا داماد تھا۔ شیلی کا پتی۔ فوج میں میجر تھا۔ بالکل تمہاری طرح خوبصورت، جوان اور تمہاری ہی شکل ــــــ اور ــــــ برما کے محاذ پر ایسا گیا کہ اب تک واپس نہ آیا۔ کوئی کہتا ہے مارا گیا ہے، کوئی کہتا ہے وہ بموں کے دھماکوں سے پاگل ہو گیا ہے، کوئی کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ ــــــ بیٹا۔ افواہوں پر کون یقین کرے۔ دو برس ہو گئے ہیں۔ کچھ پتہ نہیں چلا۔ اور اس کے اس طرح اچانک بچھڑ جانے پر میری بیٹی کی خوشیاں چھن گئیں۔ میں اپنی بیٹی کو اداس نہیں دیکھ سکتی۔ کشمیر وہ ہر سیزن میں آتے تھے۔ میری بیٹی کو کشمیر بہت پیارا ہے۔ کشمیر کے پہاڑ، دریا، چیڑ، چنار

اور [illegible] بہت سے رنگی ہوئی چوٹیاں، شالاطے اور [illegible] بہت
[illegible] نوجوان جوڑے لڑکیاں۔ پیشادو برس میں پہلی بار اس کے چہرے
پر [illegible] سنگم دیکھا ہے۔ کیمیوب بھی سینوں میں آ کستے۔ وہی کار
ہے [illegible] وہی شیلی ہے لیکن کشور نہیں ہے ـــــــ اور پھر تم
مل گئے پیا۔"

پال سوچ رہا تھا ـــــــ ایک بار شیلی نے کہا تھا۔ میری کہانی سُن کر آپ کو
دکھ ہوگا۔ اور واقعی اُسے دکھ ہوا۔

اور یہ ماں کتنی عظیم تھی۔ جس کے سینے میں دکھ کے کتنے لاوے اُبل رہے تھے۔
جو بظاہر خوش نظر آتی تھی تاکہ اس کی جوان بیٹی کو غم کی پرچھائیاں نہ گھیر لیں۔

جب بارہ بجے تک شیلی لوٹ کر نہ آئی تو پال اجازت لے کر چلا آیا۔
ادھر شیلی پریشان تھی کہ اُس نے خواہ مخواہ ایک شریف آدمی کے دل کو دکھایا
اور اُدھر پال گم سم تھا۔

دوسری صبح جب پال شیلی سے ملنے نہ آیا تو شیلی کی ماں نے شیلی سے کہا۔
"شیلی۔ جاؤ ذرا پیر پیٹرک گھوم آؤ شاید پال وہیں مل جائے۔"
اور جب شیلی پیر پر پہنچی تو اُس نے دیکھا۔ واقعی پال بیٹھا اُسی انداز میں سگریٹ
پھونک رہا تھا۔

"ہیلو شیلی! ہیلو پال!" کے ساتھ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے
بیٹھ گئے۔

شیلی نے کہا۔
"تم کل صبح گھر پر آئے تھے۔ آج کیوں نہیں آئے؟"
پال نے کہا۔ "اس لئے کہ شاید آج بھی تم اکیلی نکل گئی ہوں گی۔"
شیلی نے پوچھا۔
"تم مجھ سے ناراض ہو گیا؟"
"نہیں تو ـــــــ"

اب شیلی اُس کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اُس کے سگریٹ پینے کا انداز،
اُس کا بات کرنے کا ڈھنگ، اس کا چہرہ، اُس کے سر کے بالوں کا اسٹائل۔ سب کچھ کشور
سے ملتا جلتا تھا۔ فرق صرف ایک تھا دونوں میں، وہ میجر تھا۔ اور یہ بزنس مین۔

"شیلی۔ تم میرے چہرے کو کیا پڑھ سکو گی۔ یہ چہرہ بہت پُراسرار ہے۔" پال نے کہا۔
شیلی فطرتاً ہنسی ہنستے ہوئے بولی۔
"یہ تو میں بھی جانتی ہوں یہ چہرہ ایک معصوم نوجوان کا ہے۔ اور پھر میں نے اس
چہرے سے سب کچھ پڑھ لیا ہے۔"

پال بھی ہنسا۔
"بھلا بتاؤ تو سہی کہ تم نے کیا پڑھ لیا ہے؟"
"نہیں پال۔ بھگوان کے لئے مت پوچھو۔"
"کیوں؟" پال نے پوچھا۔
شیلی کی آواز بھرّا گئی۔ بولی۔
"تمہیں یاد ہے۔ ایک روز تم نے پوچھا تھا کہ میں کون ہوں۔ کہاں رہتی ہوں؟
اداس کیوں ہوں، اگلے روز دن آگیا ہے کہ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں۔"
پال نے ان سُنی کرتے ہوئے کہا۔
"شیلی۔ یہ والز کی دھن کتنی پیاری ہے۔ کتنی پُرکشش، مقناطیس کی مانند۔ اور یہ
تھرکتے ہوئے حسین جسم۔ آؤ ہم بھی رقص کریں؟"
شیلی نے اداس لہجے میں کہا۔
"نہیں۔ ڈانس تو زندگی بھر ہوتا رہے گا۔ یہ کہانی سنانے کا موڈ پھر بنے یا
نہ بنے۔ اس لئے۔۔۔"
"سہانی بہار چھوڑو ماضی کی باتیں۔ بھول جاؤ کل کیا تھیں تم، آج دیکھو تم کیا ہو۔"
پال نے کسی ہیرو کی طرح کہا۔
"لیکن تم نہیں جانتے میں شادی۔۔۔"
پال نے شیلی کی بات کاٹ کر کہا۔
"شیلی۔ میں تمہاری کہانی سُن چکا ہوں۔ اب تم کوئی نئی کہانی سناؤ جس سے تمہاری
زندگی میں کلیاں مہکیں، پھول کھلیں اور بہار مستی میں جھومے۔"
"پال ـــــــ!" شیلی مستی میں جھومنے لگی ـــــــ "آؤ۔ ڈانس چلیں۔"
"اس وقت! یہ شام پیر پر ہی گزرے گی۔ کل دوپہر کو چلیں گے۔" پال نے
کہا۔ "یہ رقص، یہ زندگی، یہ تھرکتی چلتی زندگی ـــــــ آج میں اور تم اسی میں ڈوب
ڈوب جائیں گے۔"

شیلی کی ماں نے یک لخت شیلی میں تبدیلی دیکھ کر اپنے من ہی من میں بھگوان
کا شکریہ ادا کیا کہ اس کے بھگوان نے اُس کی سُن لی تھی۔

اُدھر دونوں میں شادی کے عہد و پیمان بھی ہو چکے تھے۔

ایک شام پال شیلی کے ساتھ کار میں گھوم رہا تھا ـــــــ خوش آئند خواب میں
مگن، اور شیلی خاص ادا کے ساتھ ڈرائیونگ کر رہی تھی۔ اس نے سفید ساڑی زیب تن
کر رکھی تھی۔ وہ آکاش کی اپسرا معلوم ہو رہی تھی جو ایک شہزادے کو سیر کے لئے لے
جا رہی تھی۔

"پال یہ راستہ کبھی ختم نہ ہوگا؟" شیلی نے پوچھا۔

"نہیں۔ یہ راستے بھولے بھٹکے مسافروں کو منزلوں کا پتہ دیتے ہیں" پال نے کہا۔

شیلی نے مستی بھرے انداز میں پوچھا۔

"لیکن ہماری منزل کب آئے گی؟"

پال نے بھی شیلی کے سے انداز میں جواب دیا۔

"اگر لگن سچی ہو تو منزل خود بخود قدم چومتی ہے۔"

"پال ـــــ اب میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی!" شیلی نے کہا۔

"میں بھی ایسی ہی حالت سے گزر رہا ہوں" پال بولا۔

"اس کا حل ـــــ" شیلی نے پوچھا۔

"فوراً شادی!" پال نے بتایا "میں تو تاریخ بھی طے کر چکا ہوں"

اور شیلی کو ایسا محسوس ہوا کہ اُس کی ہاری ہوئی دنیا پھر لوٹ آئی۔ وہ اپنی زندگی کے پھر پانچ سال پیچھے چلی گئی۔ جب کوئی اُس کی زندگی میں پہلا پیار کا گیت بن کر آیا تھا۔ اور اب اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اُس کی زندگی کی کتاب کا پہلا باب شروع ہوا ہے۔

جب رات کو شیلی اپنے بنگلے پر پہنچی تو حد سے زیادہ خوش نظر آ رہی تھی۔ شیلی کی ماں نے اُسے اس حد تک خوش پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

ماں نے پوچھا۔

"آج تم بہت خوش نظر آ رہی ہو۔ کیا بات ہے بیٹی!"

"ماں۔ آج میں بہت خوش ہوں۔ بہت خوش! یہ ساری دنیا میری ہے۔ یہ ساری خوشیاں میری ہیں! اب مجھ سے میری خوشیاں کوئی نہیں چھین سکتا۔ کوئی نہیں!" شیلی بولتی ہی چلی جا رہی تھی "یہ حسین دنیا میری ہے۔ یہ محبت۔۔۔"

ماں نے بیٹی کی بات کاٹ دی۔

"بیٹی۔ میں بھی تو جانوں، تمہاری خوشی کا بھید؟"

"ممی۔ ہم اگلے مہینے شادی کریں گے۔ بس کو ـــــ" شیلی خوشی میں پھولی نہیں سما رہی تھی۔

ایک ہفتہ کے بعد شیلی، اُس کی ممی وغیرہ ڈیرہ دون چلے گئے۔ اور پال لاہور، اپنے گھر۔

شادی کی تاریخ نزدیک آ رہی تھی۔

شیلی کو پال کے بغیر ایک ایک گھڑی ایک ایک برس کی ہو رہی تھی۔ اور وہ دن میں کئی کئی بار اپنے دل کی دھڑکنوں کو سمیٹ کر محبت ناموں کی صورت میں پال کو بھیج دیتی۔ اُدھر پال بھی خط پر خط لکھ رہا تھا کہ اُس کے بغیر اُس کی زندگی زندگی نہیں ہے۔

انتظار کی گھڑیاں ختم ہو رہی تھیں۔

اور ایک نئی صبح جنم لے رہی تھی۔

پھر وہ دن بھی آ گیا جب پال دولہا بن کر ڈیرہ دون پہنچ گیا۔

شیلی کی کوٹھی دلہن کی طرح سجی ہوئی تھی۔ گیس کے غبارے، کاغذ کی رنگین جھنڈیاں، بیلیں، اس بات کی شاہد تھیں کہ یہاں کوئی آئے گا اور شیلی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بنا کر لے جائے گا۔

شیلی دلہن بن کر کمرے میں بیٹھی تھی کہ کیا دیکھتی ہے کہ سامنے کوئی کھڑا مسکرا رہا۔ اُس کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو آ گئے۔

جب پال شیلی کو یہ اطلاع دینے کے لئے کہ ہم آ گئے ہیں، اُن کی کوٹھی میں پہنچے سب سے پہلے اُس نے شیلی کے قہقہوں کی آواز سنی۔ اتنے بلند قہقہے۔ وہ حیران بھی ہوا اور خوش بھی کہ کہیں شیلی خوشی میں پاگل نہ ہو جائے۔

پھر پال نے دیکھا کہ سجے سجائے کمرے میں شیلی اور ایک نوجوان مرد چائے پی رہے تھے۔ اور ساتھ ساتھ باتیں بھی کر رہے تھے۔ ہنس بھی رہے تھے اور قہقہے بھی لگا رہے تھے۔

پال نے سوچا۔

"شیلی آج کتنی خوش نظر آ رہی ہے۔ دلہن بن کر وہ اور بھی نکھر گئی ہے"

جب شیلی کی نظر پال پر پڑی تو اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"پال صاحب! آیئے۔ اِن سے ملئے۔ میرے ہسبینڈ میجر کشور۔ اور آپ ہیں مسٹر پال"

پال لمحہ بھر کے لئے چکرا سا گیا۔ پھر سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"آپ تو۔۔۔۔"

شیلی نے پال کی بات کاٹتے ہوئے جواب دیا۔

"وہ سب افواہیں تھیں جب میجر صاحب برما کے محاذ پر تھے نا۔ ان کی فوج ہار گئی تھی۔ تب سے میجر جاپانیوں کی قید میں تھے۔ اب جبکہ جاپانی ہار گئے ہیں اور جنگ بھی ختم ہو گئی ہے، تمام فوجی قیدی رہا کر دئے گئے تو میجر بھی گھر آ گئے ـــــ"

پال نے کہا۔

"میجر کشور۔ نئی زندگی مبارک!"

عزیز وارثی

میں اگر صورتِ پروانہ فدا ہو جاتا
اُن کو اندازۂ آئینِ وفا ہو جاتا

اپنی قدرت سے لیا کام الٰہی تُو نے
ورنہ اِس دَور کا ہر شخص خدا ہو جاتا

تم اگر دیکھنے والے کو نظر آجاتے
حشر سے پہلے ہی اِک حشر بپا ہو جاتا

تُو نے پہچان لیا عشق کی قدروں کا مزاج
یہ نہ پوچھ آج تری بزم میں کیا ہو جاتا

خود پرستی سے بچائے رہا اپنے کو عزیزؔ
ورنہ احباب کے ہاتھوں ہی فنا ہو جاتا

آزاد گورداسپوری بی۔اے

حیاتِ عشق ہم کو جاوداں معلوم ہوتی ہے
یہ دُنیا مختصر سی داستاں معلوم ہوتی ہے

ابھی کچھ بوالہوس آئیں گے توڑیں گے مسل دیں گے
گلوں کی مُسکراہٹ رائیگاں معلوم ہوتی ہے

بجا ہے یہ کہ صدہا کلفتیں ہیں راہِ اُلفت میں
مگر یہ راہ پھر بھی بے زیاں معلوم ہوتی ہے

سُناتا ہے کوئی جب واقعاتِ عشق محفل میں
مجھے اپنی مکمل داستاں معلوم ہوتی ہے

جبیں ساقی کی شاید ہے یہی معراج اے ہمدم
جبیں اب بے نیازِ آستاں معلوم ہوتی ہے

آزاد گورداسپوری

غزل

حامد بیکاوی

ترک کردیں خیال ہی تیرا
اب تو یہ بات بھی نہیں ہوتی

تم سے مل کر بھی ہم نے دیکھا ہے
دل کو اکثر خوشی نہیں ہوتی

شورشِ آرزو نہ ہو جب تک
زندگی، زندگی نہیں ہوتی

جو طبیعت کو سازگار نہ ہو
ہم سے وہ بندگی نہیں ہوتی

بے سبب دُشمنی تو ہوتی ہے
بے غرض دوستی نہیں ہوتی

حامد

افسانہ

سوکھے ہوئے پھول

بشریٰ رشید ایم اے

دار العرفان۔ بہاولپور (مغربی پاکستان)

یکم مارچ ۱۹۶۷ء محترم خوشتر صاحب! تسلیمات

"کہسار کا چاند" کے سلسلے میں مجھے کویت اور پاک و ہند سے اتنے خطوط موصول ہوئے کہ سب کا فرداً فرداً جواب نہ دے سکی۔ اب شکریے کے طور پر "سوکھے ہوئے پھول" بھیج رہی ہوں۔ اگر یہ قبول ہو جائیں تو اپنی قسمت پر ناز کریں گے....

راقمہ ——— بشریٰ رشید

"سارہ! تم نے جنید کے ساتھ شادی نہ کر کے بڑی حماقت کی"

میری بہن مجھ سے کہتی ہے میں آنکھیں اٹھا کر اپنی بہن کی طرف دیکھتی ہوں اور پھر سر جھکا لیتی ہوں۔

"تمہیں بہر حال شادی کر لینی چاہئے تھی" وہ پھر کہتی ہے "مجھے تو اب احساس ہوتا ہے، شادی عورت کے لئے کتنی ضروری ہے اور پھر شادی اُسے اُسی مرد سے کرنی چاہئے جو اس کا سب سے زیادہ خواہش مند ہو"

اب کے میں سر اٹھا کر اپنی بہن کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتی ہوں اور وہ میری نظروں کے طنز کو نظر انداز کر کے کہے جاتی ہے۔

"درحقیقت عورت کی زندگی کی تکمیل ننھے منے بچوں سے ہوتی ہے سچ کہتی ہوں سارہ جب عورت چند ننھے منے بچوں کی ماں بن جاتی ہے تو وہ ایک نئی دنیا میں پہنچ جاتی ہے۔ اُسے اپنے غم، اپنی حسرتیں اور اپنی محرومیاں بھول جاتی ہیں۔ اس کا وجود چھوٹے چھوٹے وجودوں میں منقسم ہو جاتا ہے۔ وہ اُنہی کے لئے جیتی ہے اور اُنہی کے لئے مرتی ہے ور اُنہی کے لئے وہ ساری دنیا سے بے نیاز ہو جاتی ہے ....." میں چپ چاپ اپنی بہن کا منہ تکے جاتی ہوں۔ وہ پھر کہتی ہے۔

"اب دیکھو میرا اتو نو سال کا ہو گیا ہے۔ شانی چھ سال کی ہے۔ اور آنو تین سال کا ہے۔ میں دنیا سے اتنی آگے نکل آئی ہوں۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کبھی مجھے ماضی کا غم نہیں ستاتا۔ میں سمجھتی ہوں یہی میری دنیا ہے۔ یہی کچھ میں نے چاہا تھا۔ بچوں کے بغیر ایک عورت ادھوری ہے نامکمل ہے۔ اپاہج ہے۔ وہ پھر میری طرف ہمدردی سے دیکھتی ہے۔

"تم جو پوری زندگی تنہا بسر کرنے کا تہیہ کئے بیٹھی ہو، تمہیں دیکھ کر میرا کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ مجھے بتاؤ سارہ! تم نے یہ دس طویل سال کیونکر بسر کئے۔ میں تمہاری جگہ ہوتی تو مر چکی ہوتی"

میں اب ایک ٹھنڈی سانس بھر کر نظریں جھکا لیتی ہوں۔

"سارہ! میں سچ کہتی ہوں اب بھی وقت نہیں گیا ہے۔ تم بھی شادی کر لو۔ اور اگر تم جنید ہی سے شادی کرنا چاہتی ہو تو اب ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟"

اب ضبط کی قوت جواب دے جاتی ہے اور میرے اندر الاؤ سلگ اُٹھتے ہیں۔ میرا دل چاہتا ہے میں اپنی بہن کو کوئی زہر بھرا فقرہ کہوں۔ لیکن میں آنسو پی جاتی ہوں، اور زہر خند مسکراہٹ سے اپنی بہن کی طرف دیکھتی ہوں۔

"اب تمہارا بچہ بھی آنو کے لگ بھگ ہوتا۔ پگلی تم نے ایک ہی ضد پر اپنی زندگی قربان کر دی۔ اور وہ جنید کا بچہ پھر نہ جانے کہاں غائب ہو گیا ——"

اور میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنی بہن کے منہ پر ہاتھ رکھ دوں اور کہوں اس خود غرض زبان سے جنید کا نام بار بار مت لو۔ لیکن پھر میرے اندر ہزاروں درد انگڑائیاں لینے لگتے ہیں اور میں اس موضوع پر بولنا سراسر حماقت سمجھتی ہوں۔ ان کے پچھتاؤوں میں میں اضافہ کرنے کے لئے مکمل خاموشی سادھ لیتی ہوں اور میز پر پڑے ہوئے پیپر الٹ پلٹ کر کے دیکھنے لگتی ہوں۔

"تو تم تو اصل میں بن گئی ہو۔ پتھر کا پتھر ——— تنہائی کی زندگی نے تم سے سارے جذبات چھین لئے ہیں۔۔۔ تم ذرا سی کوشش کرو تو جنید کا پتہ لگ سکتا ہے" اب میں بہت تیز نظروں سے بہن کی طرف دیکھتی ہوں میرے ہونٹ پھڑپھڑا رہے ہیں۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے میری بہن میرے تیور جان جاتی ہے اور اٹھ کر باہر جانے لگتی ہے

"ہم تو تیرے ہی بھلے کو کہتے ہیں۔ ہم سے تیری ویران سنسان زندگی نہیں دیکھی جاتی ———" اور وہ باہر نکل جاتی ہے۔ میں ان بھلا چاہنے والوں کی منطق پر غور کرنے لگتی ہوں۔ میری بہن باہر جا کر میری امی کو نجانے کیا کچھ کہنے لگتی ہے۔ کہ میری بوڑھی ماں رونے لگتی ہے اور رات کو جب میں اپنے کام کاج سے فارغ ہو کر تاروں بھری چھت تلے بیٹھتی ہوں تو میری ماں اپنا جھریوں سے بھرا چہرہ اٹھا کر میری طرف دیکھتی ہے اور پھر لرزتی ہوئی آواز میں کہتی ہے۔

"تیری بربادی کی ذمہ دار میں ہوں سارہ! میں خدا کو کیا جواب دوں گی۔"

اُن آنسوؤں کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اور میں سپاٹ سے لہجے میں کہتی ہوں "کسی کی تباہی کا کوئی ذمہ دار نہیں ہوتا، میری ماں! یہ سب نصیبوں کا لکھا ہوتا ہے۔" "مجھے کیا معلوم تھا تو اتنی ضدی ثابت ہوگی۔ اس وقت میں سائرہ کی باتوں میں آ گئی ———" اور میرے ہونٹوں پر زہر پھیل جاتا ہے اور میں اپنے ذہن میں ماں کے فقرے دہراتی ہوں ——— ہاں ماں تو کر بھی کیا سکتی تھی۔ معاشرے کی چکی میں پسی ہوئی مائیں رسم و رواج کے خلاف قدم اٹھانے کی جرأت نہیں کر سکتیں لیکن بیٹیوں کی بہاسا تجزاتی رکھ لیتی ہیں۔ لیکن میں کچھ بھی نہیں کہتی۔ اب کچھ کہنا بعد از وقت اور بے معنی ہے ——— میں نے تو اُس وقت بھی کچھ نہیں کہا تھا جب کہنے کا وقت تھا۔ اور اب کچھ کہہ کر ان پشیمان دلوں کو اور دکھ نہیں دینا چاہتی "بیٹی تو کسی طرح جنید کا پتہ لگا لے۔ اور اُسی سے شادی کر لے لیکن خدا کے لئے اپنی زندگی یوں نہ اجاڑ ———" میری ماں پھر کہتی ہے۔

لیکن میں چاند کی سمت نظریں جمائے رکھتی ہوں۔ میرا دل خون ہو جاتا ہے۔ میرے اعصاب میں چنگاریاں دہک اٹھتی ہیں۔ اور میرا دل چاہتا ہے میں کہوں۔ میری ماں! وقت تیرے فیصلے کے انتظار میں رُک نہیں سکتا تھا۔ یہ وقت مجھے کلیوں سے پھولوں کے دیس میں لایا۔ اور پھول مرجھانے لگے۔ اب میں ننگی شاخوں کے جھنڈ میں آن پہنچی ہوں۔ ان پر کوئی پھول نہ کھلے گا۔ میں باغباں کو پکاروں بھی تو کس طرح ——— ؟

لیکن میں پھر بھی چپ رہتی ہوں، ایسا نہ ہو میری ماں کو اور صدمہ پہنچے حالانکہ میں جانتی ہوں۔ ستر سال کی اس بوڑھی عورت کی جان مجھ ہی میں اٹکی ہوئی ہے اور اس کا پچھتاوا ایک مسلسل عذاب ہے اُس کے لئے ——— پر میں کیا کروں۔۔۔۔ ایک قطرے کو سمندر کی لہروں کے سپرد کر کے تلاش کرنا دیوانگی ہے۔ حماقت ہے ——— اُس قطرے کو کون تلاش کر کے لائے جو گہر ہونے کے لئے سمندر کی عمیق گہرائیوں میں کود گیا اور پھر اُس وقت کو کون منا کر لائے جو زندگی کا نقیب تھا۔ جو کلیوں، پھولوں کا امین تھا ——— جو محبت کا ضامن تھا ——— اب تو وقت بھی مفلوج ہو کر لنگڑا رہا ہے اور میں چاند کی سمت تکے جاتی ہوں۔ جیسے میرا گھر بھی چاند میں آباد ہو گیا ہے اور میں اُس گھر کو چاند کی آنکھوں میں تلاش کرتی ہوں۔ اور یہ چاند میرے سامنے آ جاتا ہے اور میری پلکوں پر جھک کر کہتا ہے۔

"میں وہ نہیں جس کی کھوج میں تو مجھے دیکھے جاتی ہے۔ میں تو گم گشتہ خیالات اور تھکی ماندی آنکھوں کی آخری پناہ گاہ ہوں۔ میں خود بھی ان متجسس نگاہوں کی گرمی، درکراہتے ہونٹوں کے سوز سے تھک گیا ہوں۔ لیکن میں کیا کر سکتا ہوں۔ انسان اپنی آرزوؤں، امیدوں کو کھو کر جب بے آسرا ہو جاتے ہیں ——— اور اُن چہروں کو تلاش کرتے کرتے تھک جاتے ہیں جو چہرے کبھی حاصل زندگی تھے تو ——— اپنی فریب خوردہ نظریں میرے چہرے پر گاڑ دیتے ہیں۔ میں بیک وقت اُن سب کو ان کا محبوب نظر آتا ہوں اُن کے پراگندہ خیالات کی آخری منزل بن جاتا ہوں ——— اُن کی خوشیوں اور محبتوں کا آئینہ بن جاتا ہوں۔

میں کیا کروں ——— میں خود بھی صدیوں سے یہ کھیل رچاتا رچاتا تھک گیا ہوں۔ اور اب تیری تلاش کرتی ہوئی نظریں مجھ پر کیوں رُک گئی ہیں۔۔۔۔"

"نہیں ———" میں ایک سوگوار تبسم سے اپنا سر اپنے رنگین تکیوں میں چھپا لیتی ہوں "میں اُسے تلاش کرنے کے لئے تیرے داغدار جگر تک نہیں اُتری۔ پگلے! وہ تجھ سے بھی کہیں بلند تھا۔ تجھ سے بھی کہیں روشن تھا۔ میں نے اُسے کبھی چاند نہیں کہا تھا۔ میں تو اُس کے لئے چاند سے بھی بلند کوئی نام ڈھونڈتی رہی" ——— اور وہ قطرہ بن کر سمندر کی گہرائیوں میں کود گیا وہ گہر بننا چاہتا تھا یہ اُس کی بھول تھی۔ ورنہ وہ تو ایسا گوہر آبدار تھا جسے اپنے اندر چھپانے کے لئے سمندروں کے سینے مدت سے اُچھل رہے تھے۔

اور اے چاند!

تو میرے خیالات کی اُڑان نہیں ہے۔ تو ایک حد ہو سکتا ہے۔ اس طرح اُداس نہ ہو کہ میری آنکھوں نے تیری اُداسی اور بلندی ایک پیکر میں سموئی تھی۔ اور زندگی منزل بننے کی بجائے طویل راہ گذر بن گئی تھی — ہاں سچ اُس روز جب سب سے آخر میں وہ کمرے میں داخل ہوا ہے تو میں اُسے دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی۔ وہ اپنے کالے سوٹ میں، اُداس سی صورت اور پژمردہ آنکھوں کے ساتھ —— مجھے عرش سے اترا ہوا کوئی خاکی معلوم ہوا۔

اور جب وہ کمرے کے وسط میں آکر کھڑا ہو گیا تو میں اُسے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ وہ کوئی یوسف ثانی نہیں تھا۔ لیکن مردانہ وجاہت کا ایک دلنواز نمونہ تھا۔ اُس کے چہرے پر سوز تھا —— ایسا سوز جو چاند کے داغ میں ہوتا ہے۔ چاند کا داغ نظر آجاتا ہے اُس کا داغ اس کے دل میں تھا۔ میں اس کے داغ کو نہ دیکھ سکی۔ لیکن اس کے چہرے پر بکھرے ہوئے سوز کو میں نے ضرور پا لیا اور اس کی طرف دیکھ کر میرا دل اُداس ہو گیا ———— میں نے اُس کا غم آپ ہی آپ اپنے دل میں منتقل کر لیا۔ اور جب سال گرہ کا کیک کٹ چکا تو میں اپنی پلیٹ اُٹھا کر دور۔ دریچے میں جا کھڑی ہوئی، جہاں مجھے کوئی نہ دیکھے لیکن میں سب کو دیکھ سکوں۔ مسز ارشد کی اس پر نظر پڑی اور وہ پیشوائی کو اس کی طرف بڑھیں —— اُس نے ایک سپاٹ سی مسکراہٹ کے ساتھ مسز ارشد کے سلام کا جواب دیا اور پھر چاروں کونوں میں متلاشی نظروں سے دیکھنے لگا۔ میری ہی طرح شاید وہ بھی کسی کنج عزلت کا تمنائی تھا۔ میں نے اُس کی طرف سے منہ پھیر لیا اور باہر سڑک کی طرف دیکھنے لگی۔ سالگرہ کا شور و ہنگامہ اپنے عروج پر پہنچتا جا رہا تھا۔ لیکن میں الگ تھلگ کھڑی مسرور ہو رہی تھی۔ اُس شب میری روح مطمئن تھی —— جیسے اُس کا کوئی بچھڑا ہوا حصہ اُس سے آن ملا ہو۔ جیسے آج شب اُس کی تشنگی مٹ گئی ہو۔

اللہ —— رُوح کا اطمینان بھی کیسا کیف آگیں ہوتا ہے۔

میں ابھی اپنے اندر سرور و کیف کے شادیانے بجتے سن رہی تھی کہ رابعہ میرے قریب آگئی۔

"یہاں کیوں چھپی کھڑی ہو؟"

"نہیں تو ——"

"کیا اپنے بہنوئی کا سامنا کرنا نہیں چاہتیں؟"

کون سا بہنوئی ——؟" میرے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

"بھئی وہی جنید ترمذی!"

"تو کیا جنید اس محفل میں آیا ہوا ہے؟"

"ہاں —— تو نے نہیں دیکھا ——" میں نے اپنا چہرہ محفل کی طرف گھما لیا۔

"وہ دیکھو —— سیاہ کوٹ میں وہ سب سے الگ متموم، کھڑا ہے۔"

"اوہ! میں نے اب پہچانا ہے ——" میں پینار سے نیچے چھپنے لگی۔ میری رُوح کے سارے تقاضے رونے لگے۔ کتنی بے وقوف ہوں میں نے جنید کو پہچانا ہی نہیں۔ ہاں اور پہچانتی بھی کیسے ——؟ میں نے تو اُسے ایک ہی بار دیکھا تھا۔ اس کی تصویر میرے ذہن سے اتر چکی تھی اور اب یہ کتنا بدل گیا ہے۔

مجھے آج سے پانچ سال پہلے کا واقعہ یاد آگیا۔

ہم دونوں بہنوں کی پرورش ماں نے بڑے شاہانہ انداز میں کی تھی۔ بیوہ ہونے کے باوجود ہمیں شہزادیاں بنائے رکھا۔ اور ہم دونوں بہنیں لاشعوری طور پر یہ سمجھنے لگ گئی تھیں کہ دنیا میں کوئی شخص اس قابل نہیں جو ہمیں اپنا بنا سکے، اس لئے ہمارے لئے عرش سے خاص طور پر کوئی خاکی اُترے گا۔ اور یہ خیال عمر کے ساتھ ساتھ پختہ ہونے لگا۔

اُن دنوں میں الیف۔ ایس۔ سی کر رہی تھی جس کے لئے مجھے لاہور کے ایک کالج میں داخلہ لینا پڑ گیا۔ اور سائرہ میری بڑی بہن بی۔ اے میں پڑھ رہی تھی۔ وہ ماں کے ساتھ بتوں میں رہتی تھی۔ مجھے سائنس میں خاصی محنت درکار تھی۔ اُدھر ایک دم سائرہ باجی کا خط آیا کہ اُسے وہ عرش سے اُترا ہوا خاکی زمین پر نظر آگیا ہے اور وہ اس سے شادی کر رہی ہے شادی کی تیاری اِس طرح آناً فاناً ہوئی کہ میں کچھ سوچ ہی نہ سکی۔ شادی کی جو تاریخ رکھی گئی تھی اُس سے دوسرے دن میرے فائنل امتحان تھے۔ امّی نے مجھے لکھا تھا کہ میں چاہے ایک دن کے لئے آؤں لیکن ضرور آؤں —— سو میں ایک دن پہلے چلی گئی۔ شادی کے روز میں نے بھیڑ میں جنید کو دیکھا۔ نہ جانے مجھے کیسا لگا۔ کیوں کہ میرے اعصاب پر تو امتحان کا بھوت سوار تھا۔ بارات رخصت ہو گئی۔ اور اُسی رات میں لاہور کے لئے روانہ ہو گئی۔ میرا ذہن پریشان رہا۔ میرے امتحان شروع ہو گئے اور ایک دن سائرہ باجی میرے ہوسٹل آگئیں۔ میں حیران رہ گئی۔

"سارہ! میں اور جنید ہنی مون کے لئے سوئٹزرلینڈ جا رہے ہیں ——"

"جی ——؟"

"ہاں ——"

"کہاں ہیں جنید بھائی ——؟" اُن سے ملنے کا اشتیاق جاگ اٹھا۔

"وہ ایک ضروری کام سے گئے ہیں۔ کیونکہ پرسوں ہم روانہ ہو رہے ہیں" باجی شام تک میرے پاس بیٹھی رہیں۔ لیکن جنید بھائی نہ آسکے اُن کا ٹیلی فون آگیا۔ کچھ پاسپورٹ کا جھگڑا تھا۔ باجی مجھ سے یہ وعدہ کرکے چلی گئیں کہ سوئزرلینڈ جانے سے پہلے وہ جنید کو مجھ سے ضرور ملائیں گی۔ لیکن پھر کتنے ہی دن گذر گئے۔ نہ باجی آئیں نہ جنید بھائی۔ ایک مہینے بعد مجھے سوئزرلینڈ سے باجی کا خط آیا۔ اُس نے نہ ملنے پر معذرت کی تھی۔ اور بھی بہت کچھ لکھا تھا جس سے صاف معلوم ہو رہا تھا باجی بے حد خوش ہے۔ میں نے اطمینان کی سانس لی۔ وقت گذرتا رہا —— میرا رزلٹ آؤٹ ہوا۔ میں ایف۔ ایس۔ سی میں فیل ہوگئی۔ دُکھ تو مجھے بہت ہوا لیکن میں نے اندازہ لگا لیا کہ میں سائنس میں نہ چل سکوں گی۔ اگلے سال میں نے آرٹس لے لیا۔ باجی کو سوئیزرلینڈ گئے ایک سال ہوگیا تھا۔ جنید بھائی نے وہاں نوکری کرلی تھی اور دونوں بہت خوش تھے۔ پھر اُنہوں نے اپنی آمد کے متعلق لکھا۔ ان دنوں بھی میرے امتحان ہو رہے تھے۔ میں اُنہیں لینے کراچی نہ جا سکی۔ صرف امی گئیں اور انھیں لے آئیں۔ جنید بھائی نے مکان وغیرہ کا انتظام کرلیا تو باجی بھی کراچی چلی گئیں پھر کچھ عرصے بعد میں نے ایک اور خبر سُنی —— سائرہ باجی نے جنید بھائی سے طلاق لے لی۔ کیوں ——؟ کس لئے ——؟ کس طرح ——؟

کسی نے ان باتوں کا جواب نہیں دیا۔ بس سائرہ باجی ہمیشہ کے لئے امی کے پاس آگئیں۔ کبھی کبھی مجھے باجی کا دُکھ بھرا خط مل جاتا اور مجھے لاشعوری طور پر ہی جنید سے نفرت محسوس ہونے لگتی۔ یہ مرد جس عورت کو اتنے پیار محبت سے اپناتے ہیں اس کے لئے کوئی قربانی نہیں کرسکتے۔ وقت آگے کو سرکتا رہا۔۔۔ میں نے بی۔ اے کرلیا۔ ایم۔ اے کیا۔ لیکن ابھی تک مجھے وہ عرش سے اترا ہوا خاکی نظر نہ آیا، میں نے مقامی کالج میں جاب قبول کرلی۔ ابھی مجھے ایک مہینہ ہوا تھا کالج جاتے ہوئے مسز ارشد میرے ساتھ ہی پڑھاتی تھی۔ آج اُن کی لڑکی طیبہ کی سالگرہ تھی اور میں تقریب میں آئی تھی۔

اور اچانک کالے سوٹ میں ملبوس عرش سے اُترا ہوا ایک خاکی مجمع کے وسط میں نمودار ہوا۔ جسے دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے اسے کہیں دیکھا ہے۔ میں اسے پہچانتی ہوں —— نہیں میں تو اسے جنم جنم سے جانتی ہوں۔

اور اب رابعہ نے مجھے بتایا یہ جنید ہے۔

میرا خون کھول اٹھا۔ تو اس نے میری بہن کو طلاق دی ہے! اور وہ ساری عقیدت ایک نفرت میں بدل گئی۔

"تو وہ اسی طرف آرہا ہے" رابعہ نے مجھے بتایا۔

"میرا اس سے تعارف مت کرانا رابعہ —— میرا خیال ہے وہ مجھے نہیں پہچانے گا"

"اچھا ——"

میں بے نیازی بن کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ رابعہ وہاں سے ٹل گئی اور وہ میرے سامنے والی کرسی پر آکر بیٹھ گیا اور میری طرف غور سے دیکھنے لگا۔ پھر اُس کے چہرے کا سوز کچھ اور پُرنور ہوگیا۔ اور وہ اپنی گہری دلکش آواز میں بولا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے میں آپ کو جانتا ہوں۔ پہچانتا ہوں۔ آپ کون ہیں؟"

مجھے ایک دم طیش آگیا۔

"جی نہیں —— میں آپ کو نہ جانتی ہوں —— نہ پہچانتی ہوں —— اور آپ کون ہیں؟ اس سے مجھے کوئی غرض نہیں"

"یہ آپ کے دل کی زبان نہیں آپ کی اپنی زبان ہے ——"

اس نے ایک سوگوار تبسم کے ساتھ کرسی پر ٹیک لگالی۔

"کیا مطلب ——؟"

"آپ نے پہچانا تو مجھے اسی وقت تھا جب میں کمرے میں داخل ہوا تھا۔"

میرا دل دھڑکنے لگا —— "جی نہیں آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے میں نے تو آپ کو اب تک نہیں پہچانا۔ یہاں تک کہ میں آپ کا نام بھی نہیں جانتی"

اُس نے کہا "نام اور حسب ونسب سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اصل چیز رُوح کی پہچان ہے۔ کیا آپ کی رُوح مجھے دیکھ کر مطمئن نہیں ہوگئی تھی؟" میرا دل کانپ گیا۔

"آپ کو اس کا کیا اندازہ ہوسکتا ہے"

"میں نے آپ کا چہرہ پڑھ لیا تھا"

"بالکل غلط ——— !"

میرے دل نے مجھے اس کی آگاہی دی تھی "

"کیسے ——— ؟"

"آپ کو دیکھ کر میری روح یوں ٹھٹھک گئی تھی جیسے ایک بھٹکے ہوئے پرندے کو اچانک نیا نشیمن نظر آجائے "

"یہ کون ہے ——— یہ کون ہے ——— یہ کون ہے ———" میرا کلیجہ منہ کو آنے لگا، لیکن پھر نفرت کا ایک طوفان میرے ہونٹوں تک آگیا —

ایسی ہی مکاری کی باتیں کر کے اس نے سائرہ کا دل موہ لیا تھا اور اب —

میں اسے کچھ کہنے والی تھی کہ مسز ارشد قریب آگئیں۔

"یہ سارہ زبیری ہے جنید! تم شاید اسے جانتے ہوگے۔ ابھی ابھی کالج میں آئی ہے۔ بہت اچھی بچی ہے" مسز ارشد کے اس بزرگانہ انداز پر مجھے ہنسی آگئی۔

"کیا آپ سائرہ زبیری کی بہن ہیں؟" اچانک جنید نے اپنی بھاری گمبھیر آواز میں کہا اور میرے سامنے نفرتوں کے پہاڑ کھڑے ہو گئے۔

"جی ہاں ———" میں نے بڑی تندی سے کہا۔

"اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ ایک ہی گھر میں ابراہیم اور آذر بھی جنم لے سکتے ہیں۔ بہر حال آپ وہ ہیں جن کی ذرا سی جھلک میں نے سائرہ میں پائی اور ——— بھٹک گیا "

"لیکن میں سائرہ جیسی سادہ لوح اور عاقبت نا اندیش نہیں ہوں آپ کو معلوم ہونا چاہئے!" یہ کہہ کر میں وہاں سے اٹھ کر آگئی۔ گھر آکر میں سارا وقت سلگتی رہی۔ میرا دل کہتا تھا پگلی نہ بن ——— یہ وہی شخص ہے بالکل وہی ——— جسے تو بائیس سال سے تلاش کرتی پھر رہی ہے۔ لیکن عقل کہہ رہی تھی۔ اس نے تیری بہن کی زندگی برباد کی ہے۔ یہ وہ شخص ہے جو ایک عورت کو طلاق دے چکا ہے۔ اور ہمارا سماج جہاں طلاق شدہ عورت کو اس کا اصلی مقام نہیں دے سکتا۔ طلاق دینے والے مرد کی طرف سے بھی بدگمان ہو جاتا ہے۔ اس لئے میری بدگمانی حق بجانب تھی۔ لیکن اس رات ——— جب بھی میں آنکھیں بند کرتی مجھے جنید اپنے سامنے کھڑا دکھائی دیتا۔ کالے سوٹ میں ملبوس ——— ایک مغموم ——— اداس ——— پرسوز چہرے اور پرنم آنکھوں والا نوجوان! اس کی سرگوشیاں مجھے اپنے کانوں میں سنائی دیتیں ——— "تم میری روح کی پہچان ہو ——— تم میری روح کی پہچان ہو ——— لیکن تم جو کچھ بھی ہو میری بہن کو طلاق دے چکے ہو۔ اب تم میرے لئے کچھ بھی نہیں ہو ——— اب میں کسی اور خاکی کو اعتماد دوں گی ——— اور خاکی کو ڈھونڈوں گی ——— پھر کئی دن یوں ہی بیت گئے۔

میرا خیال تھا میں اسے بھول جاؤں گی۔ لیکن اس سے ملنے کی طلب شدید پیاس کی مانند بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر ایک دن میری دوبارہ اس سے ملاقات ہو گئی وہ ——— رنگ کا سوٹ پہنے بے جان بے جان قدم اٹھاتا آ رہا تھا۔ میں بھی ——— رنگ کا سوٹ پہنے تھکی تھکی سی جا رہی تھی۔ اس دن صبح بہت چمکیلی تھی۔ ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر بت بن گئے۔ ہم نے ایک دوسرے کے کپڑوں کو دیکھا اور حیرانی سے مسکرا دئے۔

"میں جس وقت سے چلا ہوں آپ کے متعلق سوچ رہا ہوں"

میں بھی تو اسی کے متعلق سوچ رہی تھی، مگر میں خاموش رہی۔

"اس وقت ہمارا ملاپ یوں ہوا ہے جیسے نیلے آسمان پر سرمئی بادل مخالف سمتوں سے آکر مل جائیں "

"اچھی تشبیہ ہے" میں ہنس پڑی۔

"میں آپ کے ساتھ چل سکتا ہوں؟" اس کی آواز میں التجا تھی۔

"زندگی بھر کے لئے!" میرا دل پکارا ——— لیکن میں نے صرف نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"شکریہ ———" وہ میرے ساتھ چل پڑا۔

"لیکن میں نے آپ کو اجازت نہیں دی" میں نے شوخی سے کہا۔

"آپ کی نظریں کہہ رہی تھیں کہ آپ زندگی بھر کے لئے میرے ساتھ چل سکتی ہیں!"

میرا دل سجدہ ریز ہو گیا۔ اسی کو روح کی پہچان کہتے ہیں۔ اور میں خاموش ہو گئی۔

"تو کیا میں نے غلط سمجھا تھا؟" اس نے پوچھا

"اس کا جواب دینا مشکل ہے "

"کیوں؟"

"مجھے ہمیشہ سے سچ بولنے کی عادت ہے"

"میں سچ کی تلخی سہنے کا عادی ہوں "

"لیکن کبھی کبھی سچ اتنا میٹھا بن جاتا ہے کہ زندگی تلخ ہو جاتی ہے"

"ایسی مٹھاس سے اب تک میں محروم رہا ہوں۔ اس کی آواز میں محرومیوں کی لرزش تھی۔ میرا دل خون ہونے لگا۔

"آپ نے بالکل صحیح سمجھا تھا۔"
"جو آپ کی نظروں نے کہا تھا؟"
"جی ——"
"سارہ ——!"
"ہاں جنید ——" میں بالکل بے بس ہوگئی۔ اُس میں میرا کوئی تصور نہ تھا۔ یہ کوئی رُوح کے تقاضے تھے۔ یہ کوئی آسمانی ملن تھا۔ جو آپ ہی آپ ہوگیا تھا پھر ہم دونوں سڑک پر خاموش چلتے رہے —— اُس سنسان اور ویران سڑک پر ہمارے لئے زندگی کی تمام تر بہاریں جاگ اٹھی تھیں۔ پھر میرے کالج کا گیٹ آگیا۔ میں نے جنید کی طرف دیکھا
"میں کل آپ سے پھر ملوں گا۔"
"کہاں ——؟"
"اسی سڑک پر جس نے ہمیں منزل کا پتہ بتایا ہے۔"
"اچھا ——" ہم دونوں جُدا ہوگئے
اگلے دن میں نے ہلکے نیلے رنگ کا سوٹ پہنا۔ قرینے سے دوپٹہ اوڑھا اور اپنا کالا بیگ لے کر باہر نکل آئی۔ سڑک پر جنید آرہا تھا اُس نے بھی ہلکے نیلے رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اور کالی ٹائی باندھے ہوئے تھا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کے لباسوں کو دیکھا اور خاموشی سے چل دیئے۔
اُس سے اگلے دن میں نے کریم کلر سوٹ پہنا اور سُرخ دوپٹہ اوڑھا اور باہر نکل آئی۔ دوسری طرف سے جنید کریم کلر سوٹ کے ساتھ سُرخ ٹائی لگائے آرہا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنس دیئے۔
"تم کب تک اس آزمائش میں پڑی رہوگی سارہ!" اُس نے ہنس کر کہا۔
"مجھے آزمائش کی ضرورت نہیں ہے جنید۔ یہ سب تو اپنے آپ ہورہا ہے۔ قدرت کے کام بھی کیسے عجیب ہوتے ہیں۔"
"اور کتنے پیارے بھی ——!"
"جب میں نے پہلے پہل تمہیں دیکھا تو مجھے محسوس ہوا تم مجھ سے نفرت کروگی۔"
"ہاں میں نے تم سے نفرت کرنے کی پوری کوشش کی۔"
"لیکن میرا دل کہتا رہا تم مجھ سے ضرور محبت کروگی۔"
"میں ایسا کرنے پر مجبور سی ہوگئی۔"
"اور تم جانتی ہو، میں نے تمہاری بہن کو طلاق دی۔"
"یا اُس نے خود طلاق لی؟"
"لوگ تو یہی کہتے ہیں کہ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔"
"تالی بجانے کی ابتدا تو ایک ہاتھ ہی کرتا ہے۔"
"میں تمہاری نظر میں نہ سہی —— دنیا کی نظر میں مجرم ہوں!"
"مجھے دنیا سے کیا لینا۔"
"زمانہ تمہیں ستائے گا سارہ۔"
"میں زمانے سے مشورہ لینے نہیں جاؤں گی۔"
"تم ابھی سماج کے اصولوں کو نہیں جانتی ہو۔"
"جنید تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"
"یہی کہ میں نے شادی نہ کرنے کا تہیہ کیا ہوا ہے۔"
"اچھا ——؟" میرے دل پر منوں برف گر پڑی۔
"محبت نہ کرنے کا تہیہ تو نہیں کیا نا!"
"نہیں میں محبت کروں گا۔ یہاں تک کہ مرجاؤں گا۔"
"پھر ایسی باتیں نہ کیا کرو۔"
"کیا تم نے گھر میں میرے متعلق بتایا ہے؟"
"نہیں —— اس کی ضرورت فی الحال نہیں۔"
"تم نے کبھی مجھ سے طلاق کی وجہ نہیں پوچھی؟"
"یہ کیا ضروری ہے۔ جو بندھن ٹوٹنا ہو ٹوٹ جاتا ہے۔"
"تم نے اپنی بہن کی وکالت نہیں کی ——"
"میں جانتی ہوں وہ بڑی خود پرست اور خود پسند ہے۔"
"اور سارہ میں آخر وقت تک اُس کے ساتھ نباہ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن وہ ایک دم فیصلے صادر کردیا کرتی تھی۔ اُس نے ایک رات ہی میں طلاق لینے کا فیصلہ کرلیا۔ اور پھر عدالت کے ذریعے زبردستی طلاق لے لی۔"
"آج سے پانچ سال پہلے میں بھی ایسی تھی۔ خود پرست اور خود پسند ——"
"پھر ——"
"پھر میں نے خود کو بدلنے کی کوشش کی۔ جب سرتاپا بدل گئی تو تم مجھے مل گئے۔"
"میرا دل چاہتا ہے اب زندگی ٹھہر جائے بس!"

ضیاء الحق خان

کروں گی تو اُن کے سر پر آسمان آن گرے گا — انہیں دنیا اور خاندان کی ناک کٹتی ہوئی محسوس ہوئی — انہیں میرا یہ فعل گردن زدنی معلوم ہوا۔ اور جب سائرہ باجی کو معلوم ہوا تو انہوں نے مجھے بے غیرت — بدقماش عاقبت نااندیش اور ڈائن کے خطابات سے نوازا — اور یہ بھی کہا اگر میں نے جنید سے شادی کرلی تو وہ زہر کھالیں گی!۔ میری ماں نے مجھ سے بول چال بند کردی — میری سوچ کے سارے دروازے مقفل ہوگئے۔ زمانہ پھر درمیان میں حائل ہوگیا اور میں تن تنہا — بھٹکے ہوئے جنید کا سہارا نہ بن سکی۔

"جنید . . . "

"ہاں! میں یہ سب کچھ جانتا تھا سارہ!"

"مگر یہ سب نامناسب ہے جنید! اس میں گناہ کیا ہے"

"گناہ یہ ہے کہ میں تمہاری بہن سے نباہ نہ کرسکا"

"اب کیا ہوگا؟"

"شادی ہی کرنی ہو تو اس کے کئی راستے ہیں سارہ! ہم کورٹ میں جاکر بیاہ کرسکتے ہیں۔ میں تمہیں اپنے ساتھ کہیں لے جاسکتا ہوں۔ تم گستاخ بن کر اپنی ماں کی نافرمانی کرسکتی ہو۔ لیکن میں ان میں سے کوئی بات نہیں چاہتا۔ میں تمہیں تمہاری نظر میں نہ گراؤں گا۔ اپنی بلندیوں سے گر کر تم کبھی سکون نہ پاسکوگی۔ مجھے تو زندگی بھر بے چین رہنا ہی ہے"

"جنید . . . . جنید . . . ." میرا دل رونے لگا۔ "مجھے ترغیب دلاؤ۔ خدا کے لئے مجھے ترغیب دلاؤ — تاکہ میں ساری دنیا کو ٹھکرا کر تمہاری بن جاؤں۔ یہ تم مجھے کون سا راستہ دکھا رہے ہو؟" میں روتی رہی۔

"اور پھر میں تمہاری اماں کا اور دل دکھانا نہیں چاہتا۔ سارہ یہ وہ بالکل نہیں جانتیں کہ طلاق میں سراسر اُن کی لڑکی کا قصور ہے لیکن اُن کی نظروں میں میں مجرم ہوں"

"پھر اب میں کیا کروں جنید؟"

"تم مجھ سے ایک وعدہ کرو"

"کیا؟"

"کہ تم ضرور کسی اور سے شادی کرلوگی"

"نہیں نہیں نہیں!! — میں ہرگز ایسا وعدہ نہیں کرسکتی!"

"تمہیں میری خاطر ایسا کرنا پڑے گا"

"میں ایسا وعدہ نہ کرسکوں گی"

"بڑے خود غرض ہو دوسروں کو بھٹکنے کے لئے تنہا چھوڑ دینا چاہتے ہو"

"یہ جوان دنوں میری کیفیت ہے — اسی میں موت آجائے تو شاید اُن دکھوں کا کفارہ ادا ہوجائے جو تقدیر نے اب تک مجھے دیئے ہیں"

"پاگل نہ بنو! اب زندگی کوئی کروٹ لے گی"

اور وہ عرش سے اُترا ہوا خاکی میری روح میں سماتا ہوا چلا گیا دو سال اور بیت گئے۔ پھر اچانک سائرہ باجی کی زندگی میں کہیں سے احمد بھائی آگئے۔ سائرہ باجی نے اُن سے شادی کرلی۔ میری راہ کا ایک بوجھ ہٹ گیا۔

اُس شام میں کشتی چلا رہی تھی اور جنید سفید کپڑے پہنے میرے سامنے بیٹھا تھا۔

"جنید میں نے فیصلہ کرلیا ہے"

"کیا —"

"کہ میں شادی کروں گی"

"اچھا!"

"اور تم اپنا فیصلہ بدل دوگے۔ میرے لئے — صرف میرے لئے!"

"سارہ . . . ." میں نے دیکھا جنید کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے — خوشی کے آنسو — غم کے آنسو — تشکر کے آنسو —

"جنید —!" میں نے اُس کے رخساروں پر انگلی رکھی۔

"یہ بہت مقدس آنسو ہیں انہیں بہنے نہ دینا" اُس نے کمال ضبط سے آنسو پی لئے۔

اور اُسی وقت میری پلکیں جھک گئیں۔

"نظریں اُٹھاؤ سارہ!" جنید نے کہا۔

"اب میری آنکھوں میں تمہارے آنسو آگئے ہیں"

"میری طرف دیکھو —" میں نے نظریں اُٹھائیں۔ اب میرے ہونٹوں پر تھے۔ اور ہم دونوں کھلکھلا کر ہنس دیئے ... میں شہنائیاں بجنے لگیں اور میرا دل سہاگ کے ... [illegible]

"تم وعدہ نہ کروگی تو میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"کہاں ؟"

"بہت دُور ـــــ تاکہ تم میری پرچھائیں بھی نہ دیکھ سکو۔"

"ایسا نہ کرنا جنید!"

"کیوں ؟"

"مجھے یقین ہے میں ایک دن اپنی ماں اور سنگ دل بہن کو منالوں گی۔"

"ایسا کبھی نہ ہو سکے گا سارہ! اور جب تک میں تمہارے پاس رہوں گا تم اپنے مستقبل کے متعلق صحیح فیصلہ نہ کر سکو گی۔"

"جنید خدا کے لئے کہیں جانے کی نہ سوچنا۔"

"میرے ماتھے پر جو داغ لگا ہے وہ کیسے دھو سکوں گا سارہ!"

"میں اُسے اپنے آنسوؤں سے دھولوں گی جنید!"

"میں اس کا وعدہ نہیں کرتا۔"

"تم مجھے اب کب ملوگے ....؟" میں نے ہزاروں تمناؤں کے ساتھ پوچھا۔

"اب کے بچھڑے ہوئے شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں"

جنید خاموشی سے باہر نکل گیا۔ پھر میرے آنسو کب تھمے ـــــ آنکھیں خشک ہوگئیں ـــــ تھک گئیں ـــــ دل میں سُرخ قطرے گرتے رہے۔ لیکن اب زندگی اس مقام پر آگئی ہے جہاں حصول و ناکامی میں کوئی فرق نہیں رہا۔ وہ لوگ جو دل کے قریب رہتے ہوں، جن کی خوشبو سانسوں میں رچی ہو، وہ اس دنیا کے سمندر میں قطرہ بن کر کھو بھی جائیں تو کہاں آنکھ سے اوجھل ہوتے ہیں۔ بس من و تو کا فرق سٹ جاتا ہے۔ خواب و خیال ایک ہو جاتے ہیں ـــــ اور پھر نگری نگری صدا لگانے والا جب ایک در پر بیٹھ جائے تو حرص و ہوس سے بلند و بے نیاز ہو جاتا ہے۔ دل ایک گداگر تھا ـــــ اس کا کاسہ بھر کر کبھی خالی نہ ہوا۔

اور میری تو اب بھی یہی عادت ہے کہ کہیں کوئی خوشنما پھول دیکھ لیتی ہوں تو توڑ کر کتاب میں رکھ لیتی ہوں۔

اسے! لوگ سوکھے پھولوں کو ناکارہ کیوں کہتے ہیں؟ وہ پھول مرجھا ضرور گئے ـــــ پامال نہیں ہوئے ـــــ گلے کی زینت نہیں بنے ـــــ جن کی کنواری خوشبو ہاتھوں کے لمس سے نہیں گہنائی ـــــ وہ تو بہت مقدس پھول ہیں ـــــ پاک اور آبگینے.... کیا اُن پھولوں کے سہارے حیات کے ویران دن بسر نہ ہو سکیں گے۔

غزل

شباب ملت ایم۔ اے

تبسم کی گھٹا جی کھول کر غیروں پہ برسائی
ذرا سی بھی توجہ آپ نے ہم پر نہ فرمائی

اشارے دے گئی اہلِ نظر کو ڈوب جانے کا
سرِ محفل تمہاری نیلگوں آنکھوں کی گہرائی

یہ کس کا پھول سا مکھڑا ابھر آیا تصور میں
کہ خوشبو سے مہک اٹھی یکایک میری تنہائی

کہاں میری حزیں دنیا، کہاں تیری حسیں دُنیا
یہاں ہوتا ہے ماتم تو وہاں بجتی ہے شہنائی

حیاتِ عشق کا صدقہ چلے آؤ چلے آؤ
کہ ناگن بن کے اب ڈسنے لگی ہے شامِ تنہائی

بچالے ڈوبنے والے کو، یہ جذبہ کہاں لائیں
شباب اس دور کا انساں ہے ساحل کا تماشائی

شباب ملت ایم۔ اے

غزل

کیف احمد صدیقی

غم ہی غم ہے خوشی کے پردے میں
موت ہے زندگی کے پردے میں

کتنی کلیوں کی مسکراہٹ ہے
اُن لبوں کی ہنسی کے پردے میں

تجھکو معلوم ہی نہیں اے دل
ہے دوا درد ہی کے پردے میں

ہوش ہی ہوش ہے خرد والو
میری دیوانگی کے پردے میں

کروٹیں لے رہا ہے نورِ سحر
رات کی تیرگی کے پردے میں

کتنی رنگینیاں مچلتی ہیں
حُسن کی سادگی کے پردے میں

درد ہی درد ہے جلن ہی جلن!
کیف کی شاعری کے پردے میں

کیف احمد صدیقی

غزل

کرشن موہن ایم۔ اے

کیا اعتبارِ جنوں کا شور مری خموشیِ راز نے
مرے خفتہ غم کو جگا دیا تری یادِ زمزمہ ساز نے

کئے کتنے فتنے بپا یہاں ترے حُسنِ فتنہ طراز نے
دیئے چھوڑ باہمی رابطے ترے غم میں اہلِ نیاز نے

ترا حُسن دلکش و دلکشا ترے آگے چاند بھی ماند ہے
کیا رام سارے جہان کو ترے لطف و عشوہ و ناز نے

مرے دل پہ جبر مبیں کیا، لئے اپنے زیرِ نگیں کیا
مجھے اپنے غم کا یقین دیا ترے حسنِ ذرہ نواز نے

مرے حالِ زار کو دیکھ کر تری آنکھ نم ہے مجھے یہ غم
ترے دل کو مائلِ غم کیا مرے دل کے سوز و گداز نے

ترا حُسن مظہرِ نورِ حق، ترا وصل کیفیتِ شورِ حق
مجھے کر دیا ہے حق آشنا ترے جلوہ ہائے مجاز نے

کرشن موہن

طنز و مزاح

میں، راجندر سنگھ بیدی اور خلق خدا

راجہ مہدی علی خاں

۱۳۹ - پالی روڈ - باندرہ بمبئی ۵۰

۱۷ر اپریل ۱۹۷۳ء

مائی ڈیر خوشتر گرامی صاحب، تسلیم

میں نے تیتیس ہزار بار آپ کو سمجھایا ہے کہ بیتی صاحب والے قصے میں میرا کوئی ہاتھ نہیں مگر آپ کسی طرح نہیں مانتے۔ جو دوست تیتیس ہزار بار سمجھانے سے بھی نہ سمجھے اُسے تیتیس ہزار گالیاں دے کر فارغ ہو جانا چاہیئے۔ اب میں انصاف "ناظرین" بیسویں صدی پر چھوڑتا ہوں وہی فیصلہ کریں گے کہ قصور میرا تھا، بیدی صاحب کا، اُن کے پٹھان نوکر کا یا حالات کا! خیریت اسی میں ہے کہ آپ ان "واقعات" کی رپورٹ جو میں نے بڑی محنت سے ترتیب دی ہے "بیسویں صدی" کے افسانہ نمبر میں شائع کر دیں ورنہ حشر کے دن قادر مطلق کو کیا منہ دکھائیں گے۔ ناراض ہونے سے پہلے آپ نے مجھ سے میری "گھریلو زندگی" کی تصویر اشاعت کے لئے مانگی تھی اول تو میرے پاس گھر ہی نہیں ہے گھریلو زندگی کہاں سے آئے گی۔ دن ٹیکسیوں میں گھومتے بسر ہو جاتا ہے۔ رات کو سمندر کے ساحل پر جا کر سو جاتا ہوں جہاں وقتاً فوقتاً مگر مچھ آ آ کر مجھ سے آپ کے بارے میں تفصیلات معلوم کرتے رہتے ہیں۔ میں یہ کہہ کر ٹال دیتا ہوں کہ میری خوشتر صاحب سے جنگ ہے۔ اگر آپ مجھے کسی نظم یا مضمون کا دو لاکھ روپیہ معاوضہ دے دیں تو ٹوٹا پھوٹا ایک مکان بنوا لوں۔ اور گھریلو زندگی شروع ہو جائے۔ بیگم راجہ مہدی علی خاں سال میں تین سو چونسٹھ دن میکے میں رہتی ہیں۔ صرف ایک مرتبہ مجھے ٹیکسی یونین کے پتے پر ٹیلی گرام دے کر ریلوے پلیٹ فارم پر بلا لیتی ہیں۔ دو تین گھنٹے پلیٹ فارم پر یا ویٹنگ روم میں بسر کر کے اُسی دن رات کو لڑ جھگڑ کر واپس چلی جاتی ہیں۔ روپے پیسے کی ضرورت ہو تو خواب میں آ کر تبادلۂ خیالات کر جاتی ہیں۔ جتنے روپے انہیں درکار ہوں میں ایک آدھ روپیہ زیادہ ہی اُنہیں بھیج دیتا ہوں۔ بھلا درویشوں فقیروں کی بھی کوئی گھریلو زندگی ہوتی ہے۔ کمال کرتے ہیں آپ! مجھ سے میری گھریلو تصویریں مانگتے ہیں۔ ازراہ کرم مطلع فرمایئے کہ کالے پانی میں آپ کی کسی سے جان پہچان ہے؟ وہاں زمین کس بھاؤ ملتی ہے؟ میں وہاں آباد ہونا چاہتا ہوں۔ وہاں کے مسلمان شیعہ ہیں یا سُنی؟ ہندو کانگریسی ہیں یا مہا سبھائی؟ اور وہاں سکھوں کی بھرمار کے ساتھ رشوت ستانی اور گرانی کی یہ قیامت تو نہیں بالتفصیل سے مطلع فرما کر ممنون فرمائیں۔

آپ کا مخلص ——— راجہ مہدی علی خاں

ایک دن میں اور راجندر سنگھ بیدی فلسفۂ روحانیات پر بحث کر رہے تھے۔ نہ روحانیات سے وہ واقف تھے نہ میں۔ وہ مجھ پر اپنی قابلیت کا رُعب جمائے جا رہے تھے اور میں ان پر بے ہودہ جوابات پھینک رہا تھا۔ اس سلسلے میں نہ اُنہیں کچھ آتا جاتا تھا نہ مجھے۔ اتنے میں ان کے گھر کے دروازے کی گھنٹی بجی۔ نوکر نے آ کر اطلاع دی "کوئی صاحب ملنا چاہتے ہیں۔" بیدی صاحب نے جواب دیا "اندر بھیج دو۔"

تھوڑی دیر بعد ایک خوش پوش حضرت تشریف لائے اور "آداب" کہنے کے بعد قریب ہی ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ بیدی صاحب نے آنے کی غرض و غایت پوچھی تو اُنہوں نے اپنی غریبی اور مفلوک الحالی کی ایسی ایسی دردناک داستانیں سُنائیں کہ میں بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

بیدی صاحب اُٹھ کر جلدی سے اندر گئے اور تھوڑی دیر بعد مسز بیدی سے

حدیثِ لب و رُخسار

عارضِ گلگوں پہ اُن کے رنگ سا اِک آگیا
اِن گُلوں کو چھیڑ کر میں نے گلستاں کر دیا
— اصغر گونڈوی

پھول ڈوبا ہوا گلاب میں تھا
اُف وہ چہرہ حجاب آلودہ
— آثر لکھنوی

کچھ تو ہے ویسے ہی رنگیں لب و رخسار کی بات
اور کچھ خونِ جگر ہم بھی ملا دیتے ہیں
— آل احمد سرور

جانے کس رنگ میں تشریح کریں اہلِ ہوس
شرحِ زلف و لب و رخسار کروں یا نہ کروں
— فیض احمد فیض

اُن لبوں کی جاں نوازی دیکھنا
منہ سے بول اٹھنے کو ہے جامِ شراب
— جگر

سو روپے کا ایک نوٹ نے کر آگئے۔ چند ہمدردانہ جملوں کے بعد اُنہوں نے سو روپے کا یہ نوٹ اُن سفید پوش حضرت کی جیب میں ڈال دیا۔ میرے پاس اُس وقت صرف پچیس روپے تھے۔ میں نے بھی ہچکچاتے ہوئے یہ کہہ کر یہ رقم، اُن کی جیب میں ڈال دی کہ "معاف کیجئے اِس وقت میرے پاس یہی حقیر رقم موجود تھی"۔

اُن صاحب نے بڑے احترام اور خلوص سے بہت پُرجوش انداز میں پہلے بیدی صاحب سے ہاتھ ملایا اُن کا شکریہ ادا کیا اور نسبتاً کم پُرجوش انداز میں میرا بھی شکریہ ادا کیا اور ہم دونوں سے ہاتھ ملا کر رُخصت ہو گئے۔

اُنھیں گئے ہوئے کوئی دس منٹ گزرے ہوں گے کہ دروازے کی گھنٹی پھر بجی۔ نوکر نے آکر بتایا کہ "کوئی میم صاحب آپ سے ملنے آئی ہیں"۔

بیدی صاحب نے بظاہر شرما کر اور بہ باطن "خوش" ہو کر جھینپتے ہوئے انداز میں نوکر سے کہا "اندر بھیج دو"۔

ایک نوجوان خوبصورت خاتون گھبرائی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔ بہت سُلجھے ہوئے انداز میں اُنھوں نے اپنا نازک ساحنائی ہاتھ پیشانی کی طرف اُٹھا کر بیدی صاحب کو آداب کہا۔

"تشریف رکھئے" بیدی صاحب نے کہا اور وہ بیدی صاحب کے سامنے ایک کرسی پر جلوہ افروز ہو گئیں۔

"آپ کیسے تشریف لائیں؟" بیدی صاحب نے کچھ ہچکچا کر پوچھا ۔۔۔

خاتون گھبرائے ہوئے انداز میں بولیں۔ "بیدی صاحب! میں نے تھوڑی دیر پہلے اِس حُلیے کے ایک آدمی کو آپ کے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہیں آپ نے اِس کی کوئی مالی امداد تو نہیں کی؟"

"بیدی صاحب نے متعجب ہو کر پوچھا "کیوں! کیا بات ہے؟"

وہ بولیں "اگر آپ نے اِس آدمی کو روپیہ دیا ہے تو آپ نے ایک شرابی کو چند روز کی شراب کے لئے پیسے مہیا کئے ہیں۔ کیا دیا ہے آپ نے اُسے؟"

میں نے گھبرا کر کہا۔ "وہ اپنے دردناک حالات سُنا کر بیدی صاحب سے تقریباً سوا سو روپے لے گیا ہے"۔

یہ سُن کر اِن خاتون نے افسوس سے اپنا سر پیٹ لیا اور کہنے لگی "بیدی صاحب آپ بہت سیدھے آدمی ہیں۔ یہ بمبئی ہے۔ آپ کو معلوم نہیں یہاں فرشتوں کے بھیس میں شیطان پھرتے ہیں؟ توبہ! توبہ! توبہ! یہ آپ نے کیا کیا بیدی صاحب؟"

"لیکن آپ اُس آدمی کو کیسے جانتی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

اِس سوال پر وہ خاتون پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ مسز بیدی نے اُن کے رونے کی آواز سُنی۔ تو وہ بھی گھبرا کر ڈرائنگ روم میں آگئیں۔ ہم دونوں نے اور مسز بیدی نے اُنھیں چُپ کرانے کی بہت کوششیں کیں۔ اُن سے پُوچھا، آخر بات کیا ہے؟ اُنھیں تسلیاں بھی دیں۔ لیکن اُن کے آنسو نہ تھمے آخر روتے روتے وہ بے ہوش ہو گئیں۔

مسز بیدی جلدی سے اندر گئیں۔ ٹھنڈے پانی میں گلوکوز حل کر کے اُس خاتون کے مُنہ میں ٹپکایا۔ پھر اپنے آنچل میں عطرِ خس لگا کر اُس خاتون کے خوبصورت چہرے کو ہوا دینے لگیں۔ مُشکل سے وہ ہوش میں آئیں۔ اُنھیں گرم گرم کافی پلائی گئی۔ تو اُنھوں نے اپنی داستانِ غم سنانی شروع کی۔ کہنے لگیں "جو آدمی آپ کو دھوکا دیکر سوا سو روپے لے گیا ہے وہ میرا شوہر ہے۔ اُس نے آپ کے مکان سے کچھ فاصلے پر ایک ٹیکسی کھڑی کر رکھی تھی۔ آپ سے رُوپے لے کر وہ تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا ٹیکسی کی طرف لپکا اور بیٹھتے ہی یہ جا وہ جا۔ کل وہ کہہ رہا تھا کہ "ماٹونگا کالج کے پاس ایک مشہور افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی رہتے ہیں۔ اُنھیں بہت سے لوگ اُلّو بنا کر پیسے لے آتے ہیں۔ میں بھی ایک دن اُن کی حجامت کر آؤں گا"۔ میں نے اُس سے کہا "تم کب تک خلقِ خدا کو بے وقوف بنا کر اپنی عاقبت برباد کرتے رہو گے۔ تمہارے ہاتھ پیر سلامت ہیں، شراب ہی پینی ہے تو خود کما کر پیو۔ ایک تو ہم لوگوں کو بھوکا رکھ کر شراب پیتے ہو دوسرے شرفا کو دھوکا دے کر پیسے حاصل کر کے شراب پینا تو جہنم کی آگ کو پیٹ میں ڈالنا ہے۔ تمہیں شرم نہیں آتی؟

پھر کہا اُس نے بیلن اُٹھالیا بھاری مار کر لہولہان اور اَدھ موا کر دیا۔ یہ دیکھئے میرا بدن۔ یہاں کھول کر آپ کو دکھاتی ہوں۔"

یہ نشانات دکھا کر وہ پھر زار و قطار رونے لگیں اور بولیں بیدی صاحب میرا شوہر آپ سے بھی بڑا افسانہ نگار ہے۔ آپ کو تو ایک افسانے کے پچاس روپے بھی ملتے ہوں گے اور آپ کے افسانوں کو تو لوگ جھوٹی داستانیں سمجھتے ہوں گے لیکن اُس کے جھوٹے افسانے اور اُس کی جھوٹی داستانیں سُن کر آپ جیسے سمجھدار اور ذہین لوگ سے سچا سمجھ لیتے ہیں اور اُس پر روپیوں کی بارش کر دیتے ہیں۔ سب سے بڑا افسانہ نگار تو وہ ہے۔ سچ میں آپ سب اُس کے سامنے!"

اُس عورت نے اپنی شادی اور اپنی ازدواجی زندگی کے بہت سے دردناک واقعات بھی سنائے۔ اور یہ بھی بتایا کہ کس طرح اُس کا شوہر شراب پیتا رہا۔ اور اُس کا پانچ سالہ بچہ طبی امداد نہ ملنے کی وجہ سے تڑپ تڑپ کر مرگیا۔

ہم سب نے اُس خاتون کو بہت تسلی دی اور ہر ماہ اُسے کچھ نہ کچھ مالی امداد دینے کا وعدہ کیا۔ مسز بیدی کے پاس اِس وقت سَو روپے اور تھے بیدی صاحب نے مانگے تو اُنہوں نے خوشی سے دے دیئے۔ خاتون نے رُوپے لینے سے انکار کر دیا اور کہا، "میں روپے لینے نہیں آئی۔ اِس لئے آئی ہوں کہ آپ اُس آدمی کے ہتھکنڈوں سے بچیں۔"

ہم تینوں نے منتیں کر کے بڑی مشکل سے اُسے سو روپے دیئے۔ بڑی ردّو کد کے بعد اُس نے روپے لے لئے اور وعدہ کیا کہ اگر زندگی میں کبھی خُدا نے اُسے رُوپیہ دیا تو وہ ضرور بیدی صاحب کو وہ رقم جو اُس کا شوہر لے گیا ہے اور یہ سَو روپیہ لوٹا دیگی۔ اِس کے بعد بیدی صاحب نے ایک ٹیکسی منگوائی اور اُس خاتون کو مجھ سے لے کر چھ روپے جو میں نے واپس جانے کے لئے بچالئے تھے دے تاکہ وہ ٹیکسی کا کرایہ ادا کر سکے اور سو روپے کا نوٹ بھنانا نہ پڑے۔

دوسرے دن میں کسی کام میں مصروف تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ریسیور اٹھایا تو بیدی صاحب بولے "یار اُس عورت کے متعلق تُم سے کچھ مشورہ کرنا ہے فوراً چلے آؤ۔"

میں اپنا ایک بہت ضروری کام چھوڑ کر بیدی صاحب کے یہاں پہنچ گیا۔ اُنھوں نے مجھ سے کہا: "راجہ صاحب میرے پیر میں موچ آگئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اُس خاتون سے جاکر مل آئیں۔ بہت غیور خاتون ہیں۔ پھر نہ آئیں گی۔ اُن سے اتنا کہہ آیئے کہ جب روپے کی ضرورت ہو آکر بلا تکلف لے جائیں۔ یہ بھی پوچھ آیئے کہ ہمارے دئے ہوئے سو روپے اُس کے شوہر نے تو نہیں چھین لئے؟"

مجھے بیدی صاحب کے گھر آئے ہوئے پانچ منٹ بھی نہیں گذرے تھے کہ پھر دروازے کی گھنٹی بجی۔ نوکر نے آکر بتایا کہ "اسماعیل نامی کوئی صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔"

فسانۂ ہجر

ترے فراق کی راتیں کبھی نہ بھولیں گی مزے ملے اُنھیں راتوں میں عمر بھر کے مجھے	ناصر کاظمی
کیا سناتے ہو کہ ہے ہجر میں جینا مشکل تم سے بے رحم پہ مرنے سے تو آساں ہوگا	مومن
فانی اُمیدِ مرگ نے بھی دے دیا جواب جینے کی ہجر میں کوئی صورت نہیں رہی	فانی
اب دورِ آسماں ہے نہ دورِ حیات ہے اے دردِ ہجر! تو ہی بتا، کتنی رات ہے	فراق گورکھپوری
ہجر کی رات کاٹنے والے کیا کرے گا اگر سحر نہ ہوئی	عزیز لکھنوی

بیدی صاحب حسبِ معمول بولے "اندر بھیج دو۔"

وہ آدمی آیا اور سہما سہما کرسی کے سرے پر بیٹھ گیا۔ بیدی صاحب نے ایک منٹ کے توقف کے بعد اُس سے پوچھا "میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

وہ بولا "بیدی صاحب! کل کیا کوئی میاں بیوی آپ سے سوا دو سَو روپے اُڑا لے گئے تھے؟"

یہ سُنتے ہی مجھ پر بجلی سی گر گئی۔ اور بیدی صاحب بھی اپنی صورت اُلوؤں کی طرح بنا کر کھسیانے ہو کر دیکھنے لگے۔

میں نے پوچھا "وہ لوگ کون تھے؟"

اسماعیل بولا ہمارے محلّے کا مشہور غنڈہ سلیم کل پان کی دکان پر اپنے ایک دوست کو بتا رہا تھا کہ کل میں نے اور میری بیوی خورشید نے فلم والے راجندر سنگھ بیدی کی خوب حجامت کی۔ اپنی دکھ بھری جھوٹی داستانیں سنا کر اُن سے سوا دو سَو روپے اینٹھ لائے سوا دو سَو روپے نقد! اور ساتھ ہی ٹیکسی کا کرایہ! سلیم ہمارے محلّے کا مشہور غنڈہ ہے اور خورشید اُس کی مشہور فیشن ایبل بیوی ہے جو جیبیں کترتی ہے۔

ہم دونوں کو اِس طرح اپنے لُٹنے اور بے وقوف بننے کا افسوس ہی نہیں بلکہ صدمہ بھی ہوا۔ میں نے بیدی صاحب سے کہا "بیدی صاحب ہم دونوں کو خودکشی کرلینی

چاہتے ہو۔ وہ بولے "ہاں یار!"

یہ سُن کر وہ آدمی کہنے لگا "اگر آپ لوگ خودکشی کرلیں گے تو ہم غریبوں محتاجوں کا کیا انجام ہوگا؟" غریب اور محتاج! کہہ کر ہم دونوں ہنس پڑے۔

اِس کے بعد اسماعیل ایک گھنٹے تک بک بک کر کے ہمیں بور کرتا رہا۔

جب کسی طرح اسماعیل نہ اُٹھا تو بیدی صاحب نے کہا "اچھا اسماعیل صاحب آپ کی تشریف آوری کا بہت بہت شکریہ! مجھے راجہ صاحب سے کچھ پرائیویٹ باتیں کرنی ہیں۔"

وہ آدمی بولا "بیدی صاحب مجھے بھی آپ سے کچھ پرائیویٹ باتیں کرنی ہیں۔ کہوں تو جاؤں۔"

میں اُٹھ کر اندر چلا گیا۔

مجھے اندر گئے ابھی دو منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ باہر سے بیدی صاحب کی چیخ سُنائی دی۔ "راجہ صاحب! بچائیے۔ بچائیے! خدا کے لئے جلد آئیے!!"

گھبرا کر مسز بیدی اور بیدی صاحب کے تین نوکر چاقو لے کر کمرے میں آ گئے۔

بیدی صاحب اور اسماعیل کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

بیدی صاحب گھبرائی ہوئی آواز میں مجھ سے بولے "یہ آدمی مجھ سے رُوپے مانگتا ہے"

یہ سنتے ہی میں نے اسماعیل کو بازو سے پکڑا اور اُسے گھسیٹ کر باہر دھکیل دیا۔

واپس آ کر میں نے بیدی صاحب سے پوچھا کہ "یہ نیسر اُلٹیرا کیا کہتا تھا؟"

وہ کہنے لگے "مجھ سے کہتا تھا بیدی صاحب پانچوں اُنگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ میں واقعی آپ کی مدد کا مستحق ہوں۔ ہمارے گھر میں تین دن سے فاقہ ہے اور مکان کے مالک کا نوٹس آیا ہے مکان خالی کردو میں پانچ مہینے سے مکان کا کرایہ ادا نہیں کر سکا۔"

میں یہ سُن کر ہنس پڑا۔ مسز بیدی اور نوکر اندر چلے گئے۔ بیدی صاحب سوچ میں ڈوب گئے۔ تھوڑی دیر بعد کہنے لگے "یار کہیں یہ آدمی سچا تو نہیں تھا؟"

میں غضب ناک ہو گیا "مسٹر!" میں نے بیدی صاحب کو جھنجھوڑ کر کہا "آپ نشے میں ہیں" وہ جھینپ گئے۔ پھر بولے۔

"یار میرا دل کہہ رہا ہے کہیں یہ آدمی سچا نہ ہو۔ آپ نے اِسے گھسیٹ کر زبردستی گھر سے باہر نکال دیا۔ مجھے خدا سے ڈر لگ رہا ہے۔"

پھر اسی سلسلے میں اور باتیں ہونے لگیں۔ اتنے میں مسز بیدی کسی کام سے ڈرائنگ روم میں آ گئیں۔ دروازے کے پاس ایک گرا ہوا وزیٹنگ کارڈ بیدی صاحب کے ہاتھ میں دے کر بولیں "یہ کس کا کارڈ ہے؟"

میں نے اُن کے ہاتھ سے کارڈ لے کر پڑھا۔ اُس میں اِسماعیل کا نام اور اُس کے گھر کا پتہ درج تھا۔

بیدی صاحب کو تو اُس آدمی پر ترس آ ہی رہا تھا میرا بھی ضمیر ملامت کرنے لگا کہ شاید میں نے ایک مصیبت زدہ کی بے عزتی کر کے اُسے گھر سے نکالا۔ بہت بُری بات ہوئی۔

کچھ دیر بعد طے پایا کہ میں کارڈ پر لکھے ہوئے پتے سے اِسماعیل کا سراغ لگا کر اصل حالات معلوم کروں۔

دوسرے دن شام کو میں نے ٹیکسی لی۔ اور پوری محلہ اُس آدمی کی تلاش میں پہنچ گیا۔ منزلِ مقصود پر پہنچ کر میں نے اُس آدمی کے گھر کا پتہ پوچھا۔ چند غنڈے اور آوارہ لوگوں نے مجھے دیکھ کر آپس میں کچھ کھسر پھسر کی۔ ایک آدمی سے اِسماعیل کا پتہ پوچھا تو اُس نے ایک چھوٹے سے مکان کی بالائی منزل کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے نظریں اُٹھائیں تو دیکھا اُس مکان کی کھڑکی کی چق ہل رہی ہے۔ جیسے کوئی خاتون مجھے جھانک رہی ہو۔ جب میں نے گھر کے دروازے پر دستک دی اور اسماعیل صاحب کے متعلق دریافت کیا تو اُس خاتون نے مجھے اندر بُلا لیا۔ کرسی پر بٹھایا اور کہنے لگیں "جس ہستی کے متعلق آپ دریافت فرما رہے ہیں وہ ہستی کل اللہ کو پیاری ہو گئی۔"

مجھ پر ایک بجلی سی گر گئی۔ میں نے پوچھا "کیوں کیا ہو گیا؟" وہ خاتون بولیں "اِسماعیل صاحب میرے اور اپنے بال بچوں کے فاقے نہ دیکھ سکے۔ پرسوں صبح اُنھوں نے ایک کنوئیں میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی۔"

یہ سُن کر میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ تھوڑی دیر میں خاموش بیٹھا رہا اُس کے بعد میں نے اُسے تسلّی دی اور کہا "قسمت کے لکھے کو کوئی نہیں مٹا سکتا جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ آپ صبر سے کام لیجئے۔ میں اپنے دوست راجندر سنگھ بیدی صاحب سے مشورہ کرنے کے بعد کل آپ سے ملوں گا۔"

اب میں ٹیکسی لے کر سیدھا بیدی صاحب کے گھر پہنچا۔ وہ میرے منتظر تھے۔ میں نے سر جھکا کر مری ہوئی آواز میں کہا "یار وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔"

وہ گھبرا کر بولے "کیا وہ سچا تھا؟"

میں نے سر جھکا کر جواب دیا "ہاں وہ سچا تھا۔ اُس نے پرسوں کنوئیں میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی۔"

یہ سُن کر بیدی صاحب پتھر سے بن گئے۔ اور میری حالت یہ تھی کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔

بیدی صاحب نے مجھے بہت لعنت ملامت کی۔ اور میں نے بھی اپنے آپ پر ہزار لعنتیں بھیجیں۔

دوسرے دن یہ طے پایا کہ ہم مرحوم کے بال بچوں اور بیوہ کو بیدی صاحب کے گھر لے آئیں۔ بیدی صاحب کا خیال تھا، مہمان اُن کے گھر سے ناکام لوٹا تھا۔ اِس لئے

بیدی صاحب کا فرض ہے کہ وہ اُن کے بال بچوں کی کفالت کریں۔

دوسرے دن جب ہم اُن کے گھر پہنچے تو وہ خاتون نہایت تپاک سے ہم سے ملیں۔ ہمیں شربت پلایا، چائے پلائی۔ بیدی صاحب نے اُن کے بچوں کو پالنے کی پیشکش کی تو وہ کہنے لگیں: "بیدی صاحب آپ جیسا نیک دل خدا ترس آدمی دنیا میں ڈھونڈے سے نہیں ملے گا۔ خدا آپ کو اس نیکی کا صلہ دیگا۔ بچے ماں کے جگر کے ٹکڑے ہوتے ہیں۔ اور وہ کیسے ہی بُرے حالات میں بھی اُن سے جُدا رہنا پسند نہیں کر سکتی۔ لیکن میں محض اپنے بچوں کا مستقبل سنوارنے کے لئے انھیں آپ کے حوالے کرتی ہوں۔ میری ساس بڑی ظالم ہے۔ وہ انھیں رکھنے کے لئے کسی طرح تیار نہ ہوگی۔ رہی میری ماں تو اُن لوگوں کے بھی حالات اچھے نہیں ہیں۔ میرا بھائی بھی بہت غریب کلرک ہے۔ وہ ہمارا بوجھ برداشت نہ کرسکتا۔ اس لئے میں نے یہی سوچا ہے کہ بچوں کو آپ کے حوالے کرکے اپنی بہن کے پاس چلی جاؤں۔ بچوں کے والد کی تمنا تھی کہ وہ بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائیں۔ وہ اپنی زندگی میں اپنی تمنا پوری نہ کرسکے۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ آپ کے ذریعے مرحوم کی آخری خواہش پوری کرا دے۔ آپ میرے چاروں بچوں کو لے جائیے۔ اور اگر ہو سکے تو انھیں اپنے ہی بچوں کی طرح لکھا پڑھا دیجئے۔"

ہم نے دو ٹیکسیاں لیں اور چاروں بچوں کو بٹھا کر بیدی صاحب کے گھر لے آئے۔ ایک بچے کی عمر تقریباً چودہ سال تھی۔ دوسرے کی تیرہ سال، تیسرے کی دس سال اور چوتھے کی آٹھ برس۔

دوسرے دن میں پھر بیدی صاحب کے گھر پہنچا۔ چاروں بچے ریڈی میڈ خوبصورت پوشاکیں پہنے اُچھل کود رہے تھے۔

اس طرح تقریباً دو ماہ گزر گئے۔ بیدی صاحب بچوں سے محبت کرتے تھے اور بچے بیدی صاحب سے۔ بیدی صاحب نے انھیں اسکول میں داخل کرا دیا تھا۔

تین ماہ بعد بچوں کی ماں بھی بچوں سے ملنے آئی۔ بیدی صاحب نے اُسے بھی نئے کپڑے سلوا دئے اور دس پندرہ روز کے لئے روک لیا۔

بیدی صاحب کو مدراس فلم انڈسٹری سے ایک آفر آئی اور وہ ایک نوکر کے ساتھ مدراس چلے گئے۔

مسز بیدی اپنے سگے بچوں اور ایک نوکر کو ساتھ لے کر اپنے ایک قریبی عزیز کی شادی میں دہلی چلی گئیں۔ اب گھر پر اُس خاتون اور اُس کے بچوں کا راج تھا یا اُس نوکر کا جو کھانا پکاتا تھا۔

پندرہ دن بعد جب بیدی صاحب آئے تو گھر سے نوکر بھی غائب تھا، خوبصورت خاتون بھی اور بچے بھی۔

گھر کا جائزہ لیا گیا تو سب قیمتی چیزیں غائب تھیں۔

محلے کے ایک واقف کار نے بتایا کہ وہ خوبصورت خاتون اپنے بچوں کو لے کر ایک ٹیکسی میں چلی گئی تھیں اور پھر واپس نہیں آئیں۔ اور نوکر قریب کے ایک گھر میں کام کرنے والی خادمہ کے ساتھ بچا کھچا سامان لے کر بھاگ گیا ہے۔

بعد میں محلے میں جاکر تحقیقات کرنے سے معلوم ہوا کہ اسماعیل صاحب نے خودکشی نہیں کی تھی وہ اپنے بال بچے ساتھ لے کر اپنے وطن چلے گئے ہیں۔

میں اور بیدی صاحب اُن کے ڈرائنگ روم میں لگے ہوئے ایک بورڈ کے سامنے مبہوت کھڑے تھے۔ اس بورڈ پر لکھا تھا۔۔۔

سرائے سردار راجندر سنگھ بیدی

"یہاں اجنبیوں کی مستقل رہائش، اُن کے کھانے پینے، علاج معالجے اور کفن دفن کا پورا انتظام ہے۔ ہر طرح کے مہمان بلا اجازت آکر ٹھہر سکتے ہیں۔"

میں نے بیدی صاحب سے کہا: "اِس بورڈ کو باہر پھینک دوں؟"

وہ ذرا ہچکچا کر بولے "ابھی رہنے دو یار۔ میں کچھ دن سوچ لوں۔"

پھر بیدی صاحب اسٹول پر کھڑے ہو کر اُس رومال سے اِس بورڈ کی گرد صاف کرنے لگے جو وہ خاتون غلطی سے میز پر چھوڑ گئی تھی۔

بورڈ صاف کرکے وہ اِسٹول پر سے اُترے ہی تھے کہ دروازے کی گھنٹی پھر بجی۔

اب کی بیدی صاحب کے اُس پٹھان نوکر نے دروازہ کھولا جو اُن کے ساتھ مدراس گیا تھا اور جو بیدی صاحب کے لُٹنے کی ساری کہانیاں سُن چکا تھا۔

وہ آکر ہم سے کہنے لگا "جی چار غنڈے اور آئے ہیں روپے پیسے کی مدد چاہتے ہیں۔"

میں نے اور بیدی صاحب نے بیک آواز کہا "بھگا دو سالوں کو مار مار کر۔"

اِس پٹھان نوکر نے اِن چاروں "غنڈوں" کے ساتھ کیا سلوک کیا یہ ایک الگ داستان ہے۔

وہ چار غنڈے کون تھے؟ کرشن چندر۔ خواجہ احمد عباس۔ خوشتر گرامی ایڈیٹر "بیسویں صدی" اور مدراس کا ایک کروڑپتی پروڈیوسر!

ان لوگوں نے جب بیدی صاحب کے لُٹنے کی خبر سُنی تو وہ انھیں "مبارکباد" دینے آئے تھے۔ اُن کی جو شامت آئی بیدی صاحب کے نئے پٹھان نوکر سے ازراہِ مذاق کہہ دیا کہ "خو ہم تمہارے صاحب سے مالی امداد لینے آیا ہے اور لے کے جائیگا۔"

نوکر نے ان شرفاء سے کیا سلوک کیا مت پوچھئے۔ اُن کے ہاتھوں طبیعت صاف کرانے کے بعد یہ شرفاء وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ نکلے [illegible] ایک نہ [illegible] لگ جاتا تھا۔

پروڈیوسر تو مارے غصّے کے ۲۵ ہزار کا کانٹریکٹ کینسل کرکے واپس مدراس چلا گیا۔ باقی تینوں دوست اب تک ہم سے ناراض ہیں۔

جب بھی ہم خواجہ احمد عباس یا کرشن چندر صاحب سے ملنے جاتے ہیں تو وہ باہر کہلا بھیجتے ہیں "صاحب گھر پر نہیں ہیں"۔

سب سے زیادہ تو قہر گرامی صاحب وہ کچھ [illegible] کرسکے تو انھوں نے رسالہ "بیسویں صدی" ہمارے نام بند کر دیا ہے اور قسم کھالی ہے کہ کبھی ہماری نظم یا نثر شائع نہیں کریں گے!

عصمت بہن نے یہ خبر سنی تو بے حد [illegible] ہوئیں۔ وہ ہم سب کا [illegible] کرانے کی کوشش کر رہی ہیں۔

افسانہ

محبت کے رنگ

جگدیش بمل

۸/۷ سی، بھارت نگر۔ ۸۴۲ گرانٹ روڈ، بمبئی ۷

۶ رمئی ۱۹۶۴ء

محترم بھائی! آداب

"محبت کے رنگ" لے کر حاضرِ خدمت ہو رہا ہوں ـــــ ان رنگوں کو پہچاننے کے لئے آپ کے کردار کی پختگی اور شخصیت کی رنگینی کی ضرورت ہوتی ہے لیکن انسان کو یہ روشنی اتنی جلدی کہاں نصیب ہوتی ہے؟ مجھے ان رنگوں کو کینوس پر لانے میں غیر معمولی تاخیر ہو گئی ہے لیکن یہ سوچ کر کہ دیر سے پہنچنا نہ پہنچنے سے بہتر ہے، بھیجنے کی جرأت کر رہا ہوں....

آپ کا ـــــ بمل

آرکسٹرا پر کل والی میٹھی دھن بج اٹھی۔

وہی میٹھی دھن جسے سن کر کانت کو کل پہلی بار ایسا محسوس ہوا تھا جیسے اس کے دل کے اندھیروں میں اُجالے کا کوئی پیکر انگڑائی لے کر بیدار ہو رہا ہے۔

کل پھر وہی دھن بج رہی تھی۔ وہی ریسٹورنٹ تھا، وہی دھوئیں سے بھرا ہوا نیم گرم ماحول، لیکن آشا ـــــ آشا آج اس کے ساتھ نہ تھی۔

کانت نے سگریٹ سلگا کر گھڑی کی طرف دیکھا۔

"خدا نے انسان کے دل میں اُمید کا چراغ روشن کر کے اُسے کتنا بڑا دھوکا دیا ہے۔"

وہ اپنی سوچ پر خود ہی مسکرا دیا۔

آرکسٹرا پر ہلکی سی دھن اس کے دل کے تاروں کو چھو رہی تھی۔ وہ اردگرد سے بے نیاز اس میٹھی دھن میں کھو کر رہ گیا تھا۔

کل ریسٹورنٹ سے باہر نکل کر اس نے آشا کے لئے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے پوچھا تھا۔

"آپ ـــــ آپ کل مجھ سے ملنے آسکیں گی؟"

"نہیں!" آشا نے ایک لمحہ کے لئے بھی نہ سوچا جیسے وہ جانتی تھی کہ کانت اس سے یہ سوال کرے گا اور اسے اس سوال کا نفی میں جواب دینا ہے۔ جیسے وہ یہ بات گھر ہی سے سوچ کر آئی ہو۔

کوئی اور ہوتا تو کانت کو غصہ آجاتا لیکن آشا کے انکار سے اُسے غصہ نہیں آیا نہ ہی کوئی حیرت ہوئی۔ اس نے کار کا دروازہ بند کرتے ہوئے آشا سے کہا "ٹھیک ہے!"

آشا کو اس کے گھر کے دروازے پر چھوڑ کر جب کانت نے کار سٹارٹ کی تو آشا نے پوچھا "اندر نہیں آیئے گا؟"

کانت نے اُداس اُداس آنکھوں سے آشا کی طرف دیکھا اور اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے رک رک کر بولا "دیکھئے اگر ـــــ اگر آپ کو اپنے انکار پر غور کرنے کی فرصت مل جائے اور ـــــ اور میری خوش قسمتی سے آپ کا ارادہ بدل جائے تو کل ـــــ کل اسی ریسٹورنٹ میں آپ مجھے اپنا منتظر پایئے گا۔"

لیکن آشا نہ آئی ـــــ

آرکسٹرا پر وہ میٹھی دھن بند ہو گئی تھی۔ اب کلارنٹ پر مدھم مدھم سُروں میں بہت ہی پُرسوز دھن بج رہی تھی۔

اُسے یاد آیا کل اس نے آشا سے پوچھا تھا۔

"آپ نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی؟"

آشا کا چہرہ سُرخ ہو گیا تھا۔ پھر نہ جانے کون سے جذبے سے اس کی آنکھیں روشن ہو گئیں

"محبت کرنے کے لئے آدمی کو جس اہلیت کی ضرورت ہوتی ہے وہ مجھ میں کہاں ہے

L. H. KHAN

ہر کیا ایسا کون ہے جو گھر میں، اپنے کنبے میں، اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کے ساتھ رہتے ہوئے پیار کی امرتا کو محسوس نہیں کرتا؟"

کانت کتنی ہی دیر آشا کو حیرت سے دیکھتا رہا۔ آشا کے چہرے کی سرخی گہری ہو گئی۔

"کیا دیکھ رہے ہیں؟"

کانت چونک پڑا۔ اپنے آپ کو سنبھال کر بولا۔

"میں اپنے معمولی سے سوال کے جواب میں اتنی گہری اور پُر معنی بات سنوں گا یہ اس کا اندازہ نہ تھا ـــــ میں تو دراصل آپ سے ـــــ آپ سے یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ ـــــ"

کانت اپنی بات مکمل نہ کر سکا۔ آشا مسکرا دی۔

- آج کا دن سستی میں نہ کھوؤ۔ کل پھر یہی حال ہوگا اور پرسوں اس سے بھی زیادہ کاہلی، آؤ ہم لمحہ کو مضبوط پکڑ لیں۔ (شکسپیر)
- اہلِ ہمت کے پاس مقاصد ہوتے ہیں اور عام لوگوں کے پاس خواہشیں۔ (ایک مغربی دانشور)
- کس قدر اندھا ہے وہ شخص جو اپنی جیب سے تیرا دل خریدنا چاہتا ہے۔ (خلیل جبران)
- مقدمہ بازی میں جیت گئے تو گویا جل گئے اور ہار گئے تو راکھ ہو گئے۔ (ملایائی ادب)
- جو زیادہ بولتے ہیں وہ جانتے نہیں اور جو جانتے ہیں وہ زیادہ بولتے نہیں۔ (چینی ادب)
- زمانہ سب سے بڑا استاد ہے۔ (ہندی ادب)
- جو دنیا کے طالب ہیں اگر وہ زمانہ کی کڑی سختیاں نہ جھیل سکیں تو ناکامی کا شکوہ نہ کریں۔ (یحییٰ برمکی)

"محبت تو محبت ہی ہے۔ وہ ہر روپ سے آدمی کی زندگی میں داخل ہوتی ہے لیکن میں نے کہا نا، محبت کو سمجھنے کے لئے جس پہچان اور علم کا ہونا ضروری ہے وہ مجھ میں کہاں؟ میں تو آج تک اپنے آپ کو بھی نہیں جان سکی۔"

"اپنے آپ کو کون جان سکا ہے؟ ـــــ یہ تو ـــــ یہ تو بہت بڑی بات ہے۔"

"اور محبت کہاں کوئی چھوٹی بات ہے؟ یہ تو ـــــ یہ تو ہماری زندگی کی سب سے بڑی اور اہم بات ہے۔"

"لیکن آشا جی! ـــــ یہ ـــــ یہ محبت کا جذبہ ہی تو ہے جو ہمیں اپنے آپ کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ ہم اُن راستوں پر چلنے کے لئے اگر کسی پہچان کے منتظر رہیں گے تو زندگی بھر اس کے رنگوں سے محروم رہیں گے۔"

آشا نے ایک پل کچھ نہ سوچا، فوراً بولی۔

"ہم دونوں کے نقطۂ نظر میں فرق ہے۔ آپ اس بات کو مانتے ہیں کہ محبت ہم سے باہر ہے۔ ہمارے دل و دماغ سے باہر یہ کہیں غیب سے آتی ہے لیکن میں نے کبھی ایسا خیال نہیں کیا۔ میں نے تو ہمیشہ یہی سمجھا ہے کہ محبت ہر انسان کے اندر پنہاں ہے ـــــ محبت ہی ہمیں زندگی بخشتی ہے۔ یہی ہمارے جیون کا کارن ہے اور یہی ہماری زندگی کی خالق ہے۔"

کانت سر جھکائے کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔

"لیکن ابھی ابھی آپ نے کہا تھا محبت ہر روپ سے انسان کی زندگی میں داخل ہوتی ہے۔ اگر محبت باہر سے نہیں آتی تو یہ الفاظ ـــــ"

"لیکن میں نے یہ کب کہا کہ یہ ہم سے باہر ہے ـــــ کیا ہمارے اندر کی گہرائیوں سے کوئی جذبہ ہماری زندگی، ہمارے دل کی زمین پر نہیں پھوٹ سکتا؟ اگر ایسا ہی ہوتا تو دھرتی کی کوکھ سے کوئی بھی شے جنم نہ لے سکتی۔ یہ درخت، پھل پھول، یہ پودے سب زمین سے باہر ہوا میں معلق ہوتے۔"

آشا کے ساتھ تین چار گھنٹے پل جھپکتے ہی گزر گئے۔ کل پہلی بار کانت نے آشا کی باتیں سن کر اس کی گہری اور سنجیدہ آنکھوں میں کھو کر اس کے چہرے کی روشنی دیکھ کر اور اس کے قرب کی ہلکی ہلکی آنچ محسوس کر کے یہ جانا کہ وہ اب تک زندگی کی اتنی بڑی حقیقت سے بے بہرہ تھا۔ اُسے پہلی بار یہ محسوس ہوا کہ ہر انسان کے دل میں جستجو کی ایک عجیب سی پیاس سمائی ہوئی ہے۔

اس نے آشا سے پوچھا۔

"آپ زندگی کے بارے میں اتنا کچھ جانتی ہیں پھر بھی اپنے اندر علم اور اکملیت کی کمی محسوس کرتی ہیں۔ پھر ـــــ پھر مجھ جیسا آدمی! ـــــ مجھ جیسے آدمی کے بارے میں آپ کیا کہیں گی جسے آج سے پہلے اس دنیا کی پہچان اور حقیقت کا بالکل پتہ نہ تھا۔"

اپنی کم علمی کا اعتراف کرتے ہوئے کانت کے اندر خوشی کی ایک عجیب سی لہر اُبھری۔ سچائی کو ماننا کتنا مشکل ہے۔ لیکن اس مشکل پر عبور پا کر اسے تسلیم کرنے کے بعد کتنی بڑی مسرت کا احساس ہوتا ہے۔ کانت کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے دل کے اندر کوئی بند کھڑکی کھل گئی ہے اور فرحت بخش ہوا کے ایک جھونکے نے اس کی ساری ہستی کو تر و تازہ کر دیا ہے۔ اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور ایک عجیب نشے سے اس کی آنکھیں بند ہو گئیں ـــــ آشا کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تو وہ اپنے اندر کی طلسمی وادیوں سے باہر نکل آیا۔ آشا کہہ رہی تھی۔

"یہ آپ کی بڑائی ہے کہ آپ نے ایسا محسوس کیا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ میں اب تک صرف اتنا جان سکی ہوں کہ میں کچھ بھی نہیں جانتی۔"

آہستہ آہستہ انگلیوں کے نزدیک آتی محسوس کی تو اپنے غصب اللہ سے چھلے سگریٹ جس کی آنچ اس کی انگلیوں کے قریب دم توڑ رہی تھی۔ اس نے ایش ٹرے میں مسل کر بجھا دی اور نشست کی طرف اپنی نگاہیں اٹھائیں۔

وہ پل بھر کے لئے کار میں بیٹھا۔ کار اسٹارٹ کر کے کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے آشا کے گھر کی طرف کار کا رُخ موڑ دیا۔

آشا کوٹھی کے پائیں باغ میں ایزل کے سامنے کھڑی ہاتھ میں برش لئے ایک تصویر بنا رہی تھی۔ کانت اس کے پیچھے آکر کھڑا ہو گیا —— آشا نے پلٹ کر کانت کی طرف دیکھا تو کانت نے کہا۔

"آج آپ نے بہت انتظار کرایا؟"

"لیکن میں نے تو ——"

"ہاں! پھر بھی نہ جانے کیوں اُمید تھی کہ آپ ضرور آئیں گی؟"

آشا نے کانت کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ ایزل پر جھکے ہوئے اطمینان کا ایک لمبا سانس لیا۔

کانت نے پوچھا "یہ —— یہ کیسی تصویر ہے؟ جس میں صرف لکیریں اور رنگ ہی ہیں؟"

"لکیروں اور رنگوں کے بغیر بھی کوئی تصویر بنتی ہے؟" آشا نے کانت کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ تصویر کو ایک خاص زاویے سے دیکھتی رہی۔

"میرا یہ مطلب نہ تھا —— وہ ترتیب جو رنگوں اور لکیروں کو ایک سانچے میں ڈھال کر تصویر کے نقوش ابھارتی ہے۔ مجھے دراصل اُسی ترتیب کا ——"

آشا نے ایک پل کے لئے کانت کی طرف دیکھا پھر مسکرا کر بولی۔

"دیکھئے یہ دو ندیاں ہیں۔ یہ کالے رنگ کی ندی جو چمکتی ہوئی ابرق کے رنگ کی تی کے کناروں میں قید ہے، دُکھ کی ندی ہے اور اس طرف کالی مٹی کے کناروں میں چمکتے ہوئے سفید رنگ کی ندی جسے آپ دیکھ رہے ہیں، سُکھ کی ندی ہے —— یہاں پر ان دونوں کا سنگم ہے اور —— اور یہ سورج —— پیار کا سورج ہے جو ان سے پرے آسمان کے خلاؤں میں روشن ہے۔ ان کے خطوط ایسے ہیں جو میرے اندر کی آنکھیں دیکھتی ہیں۔"

کانت کچھ دیر سوچتا رہا۔

"اور یہ —— اس سنگم پر گرتی ہوئی سورج کی کرنیں! —— یہ کیسے رنگ چھوڑ رہی ہیں؟"

"جیسے سورج کے ایک رنگ میں سات رنگ چھپے ہوتے ہیں اسی طرح محبت کے آفتاب کی روشنی کا رنگ ایک ہوتے ہوئے بھی کتنے ہی رنگوں کے امتزاج سے بنتا ہے۔"

"لیکن آشا جو محبت تو ہمارے اندر ہے، اس کی روشنی باہر سے نہیں آتی پھر —— پھر وہ سورج اتنی دور آسمانی خلاؤں میں کیوں چمک رہا ہے؟"

"کیونکہ ہمارے عمل پیدا کرتے ہیں اور عمل ہمارے ارادے سے جنم لیتے ہیں —— ہر انسان کے اندر ایک کائنات ہے۔ ایک ایسی بڑی دُنیا ہے جس میں انسان کی شخصیت کے چاند ستارے بھی موجود ہیں اور آتما کا سورج بھی۔"

کچھ دیر آشا خاموش رہی، پھر بولی۔

"کل کی باتوں ہی سے مجھے محبت کے نُور کو لکیروں اور رنگوں کے ذریعہ کینوس پر اتارنے کی بات سوجھی تھی۔ نہ جانے میں اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوں یا نہیں؟"

آشا نے مُڑ کر کانت کی طرف دیکھا۔ وہ اُسے عجیب سی نظروں سے ایک ٹک

- مُسکراہٹ زندگی کی علامت ہے۔ (ٹیگور)
- اگر تم اپنا بھلا چاہتے ہو تو دوسروں کی خدمت کرو۔ (ابن یمین)
- جس نے آج کا کام کل پر اُٹھا رکھا وہ مقصد سے دور رہا۔ (ابن یمین)
- تجربات اور معلومات بڑھانے کے لئے ہمیشہ کوشاں رہو تاکہ تمہاری کشتیٔ حیات ساحلِ مُراد سے ہمکنار ہو۔ (ہربرٹ اسپنسر)
- حق اور باطل میں کوئی رشتہ نہیں۔ (مامون رشید)
- خوبصورت عورت کو دیکھنے سے آنکھیں خوش ہوتی ہیں اور خوش سیرت عورت کو دیکھنے سے دل مسرور ہوتا ہے۔ (سموئیل)
- ہماری زندگی اپنے تجربوں کی قرض دار ہے۔ (آسکر وائلڈ)

دیکھے جا رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا اُجالا تھا۔ جیسے شبنم پھولوں کو اُجلا اور روشن کر دیتی ہے۔

جیسے کسی نے آشا کا دل ایک لمحہ کے لئے گیند کی طرح اُچھال کر ہوا میں اوپر پھینک دیا۔ اُس نے اپنی نظریں جُھکالیں۔

"کیا دیکھ رہے ہیں؟"

"آپ کو —— میں —— میں سوچ رہا تھا کہ آپ کتنی عظیم ہیں۔ اگر —— اگر آپ سے میری ملاقات نہ ہوتی تو —— تو میں کتنا بدقسمت ہوتا۔"

بات کرتے کرتے کانت کا لہجہ کپکپانے لگا۔ آشا نے دیکھا کانت کی روشن آنکھیں نم سی ہو گئی ہیں۔ یہ کیسے آنسو تھے جنھوں نے آشا کے سینے میں پہلی بار ممتا کی میٹھی دھڑکنیں جگا دیں۔

Z.H.RAH

کچھ دیر بعد دونوں آمنے سامنے بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ آشا نے پوچھا۔

"[illegible] آپ ۔۔۔ آپ کس سوچ میں گم ہیں؟"

کانت نے چونک کر آشا کی طرف دیکھا۔ اور آشا نے اُس کی آنکھوں میں مسکراہٹ [illegible] ۔۔۔ کانت نے کہا۔

"اگر آپ [illegible] اندھیروں [illegible] اندر اتنے روشن جذبے کہاں چھپ سکتے ہیں۔ نور کا سیلاب تو اب میرے سارے دکھ بہائے لئے جا رہا ہے۔ لیکن ۔۔۔"

کانت چپ ہو گیا۔ آشا نے سر اُٹھا کر کانت کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر غم کے گہرے بادل چھا گئے تھے اور اُس نے اپنا سر جھکا لیا تھا۔

"آشا ۔۔۔" جب کچھ دیر بعد کانت نے سر اُٹھا کر کہا تو اُس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ "آشا ۔۔۔ تم مجھ سے بہت بڑی ہو۔ بہت عظیم ہو۔ میں تمہارے قابل ہی کہاں ہوں۔ لیکن اگر تم نے مجھے کچھ مہلت دی تو میں ۔۔۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اپنے آپ کو تمہارے قابل بنانے کی کوشش کروں گا۔"

کانت کی آنکھوں سے آنسو باہر نکل آئے تھے۔ اُس نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔ آشا کی قوتِ گفتار جیسے کسی نے چھین لی ہو۔ وہ ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی۔

اُسی شام کانت جب گھر پہنچا تو ماں نے پوچھا۔

"کانت، تم نے مجھے آشا کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ اگر تمہیں لڑکی پسند ہے تو شادی کی بات پکی کر دوں۔"

"نہیں ماں ۔۔۔ میں ۔۔۔ میں ۔۔۔"

"لیکن اُس لڑکی کی تو میں نے بہت تعریف سنی ہے۔ کیا نقص ہے اُس میں؟"

"تم نے جو سُنا تھا، وہ لڑکی اُس سے کہیں بڑھ کر ہے ماں۔ لیکن تم یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ میں ۔۔۔ میں بھی اُس کے قابل ہوں یا نہیں؟"

کانت کے لہجے میں عجیب سی بے بسی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں کانپتے ہوئے آنسو دیکھ کر ماں تڑپ اُٹھی۔

"کانت ۔۔۔ کانت بیٹے ۔۔۔ کیا بات ہے؟ کیا اُس لڑکی نے تمہیں کچھ کہہ دیا ہے؟"

کانت سنبھل گیا۔

"نہیں ماں! اُس نے [illegible] ۔۔۔ ماں ۔۔۔ [illegible]

[illegible]

"تو مجھے معلوم ہوا [illegible]

[illegible]

نے تو مجھے اتنا [illegible] آخر [illegible]

[illegible]

[illegible]

حیران رہ گیا۔

اُس دن بھی کانت نے اُن سے یہی کہا۔

"آشا کی بڑائی نے، اُس کے علم کی روشنی نے مجھے اپنے بہت چھوٹے پن کا احساس دلا دیا ہے۔ میں اُس کے قابل نہیں ہوں۔"

ناتھ بابو ایک لمحہ کانت کی آنکھوں میں دیکھتے رہے۔

"کانت بیٹے! سچائی کو اپنے اندر اتنا پیچیدہ نہ کرو۔ یہ تو بہت ہی آسان اور سادہ سی شے ہے۔ محبت کی گہرائیاں تو انسان کی سوچ کو بہت ہی سادہ اور آسان بنا دیتی ہیں۔ تم ۔۔۔ تم اتنے اُلجھ کر کیوں رہ گئے ہو؟ اور آشا تو بالکل سیدھی سادی سی لڑکی ہے۔ اُس نے بہت کچھ سیکھ کر، بہت کچھ جان کر بس یہی جانا ہے کہ زندگی، محبت اور سچائی کے رنگوں سے مل کر بے حد سادہ اور آسان ہو جاتی ہے۔ وہ تمہیں اِس لئے بڑی لگتی ہے کہ اُس کے ذہن اور دل میں کوئی اُلجھن نہیں۔"

وہ خاموش ہو گئے۔ کانت نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ دیر تک ناتھ بابو کی طرف دیکھتا رہا۔ ناتھ بابو ہنس کر بولے۔

"اور دیکھو یہ بھی کتنی عجیب بات ہے کہ میں ایک مجبوری کے تحت تمہارے پاس آیا ہوں۔"

"مجبوری؟" کانت کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"ہاں! تم لوگوں کی طرف سے آشا کے رشتے کے متعلق جب کوئی جواب نہ ملا تو میں نے ایک دوسرے لڑکے کی بابت آشا سے بات کی۔ آشا نے بغیر کسی اُلجھن اور جھجک کے مجھے اپنا فیصلہ سنا دیا۔"

اتنا کہہ کر ناتھ بابو خاموش ہو گئے۔ کانت کے چہرے پر اور اُس کی آنکھوں میں سہمے ہوئے [illegible] کی لکیریں دیکھ کر وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

کانت ضبط نہ کر سکا: "آشا نے کیا ۔۔۔ کیا فیصلہ سُنایا؟"

"اُس نے مجھ سے کہا کہ وہ کانت کے علاوہ کسی اور سے شادی کی بات سوچ بھی نہیں سکتی۔"

سلاخوں کے پیچھے

رامپال۔ بی اے آنرز

آپ کا خط!

ایک جیلر کو بات بات پر گالیاں دینے کی عادت تھی۔ اگر کوئی قیدی سامنے نہ ہوتا تو دوات۔ قلم۔ بلاٹنگ پیپر پر غصہ نکالتے اور اس بات کے لئے وہ سارے محکمے میں مشہور تھے۔ ایک دن اُن کا پڑھا لکھا اردلی اُن کا ایک خط اُن کے پاس لایا۔

"حضور۔ آپ کا خط!"

تھمی اُن مُٹھی ایک کر کے گرج کر بولے۔

"کس اُلّو کے پٹھے کا خط ہے؟"

اردلی نے ادب سے سر جھکا کے کہا۔

"حضور۔ آپ کا!"

کھسیانے سے ہو کر لیکن جلی ہوئی رسّی کی طرح بل کھا کر بولے۔

"کس حرامزادے نے بھیجا ہے؟"

اردلی نے دبی زبان سے عرض کی۔

"حضور کے باپ نے!"

اردلی اُلٹے پاؤں دروازے سے کھسک گیا۔

خاوند کا نام

جیلر صاحب اپنے رعب اور دبدبے کے لئے مشہور تھے۔ اُنکا قول تھا کہ بڑے سے بڑا اور ضدی سے ضدی قیدی بھی اُن کے سامنے ہار مانتا ہے۔ اور یہ تھا بھی سچ۔ اُن کا ڈنڈا اور جاہ و جلال دونوں مشہور تھے۔

ایک دن ایک طوائف کسی الزام میں جیل میں آ گئی۔ خانہ پُری شروع ہوئی۔ جیلر صاحب نے بار بار پوچھا۔

"نسیرہ بائی۔"

"خاوند کا نام؟"

خاموشی۔

جیلر صاحب کا پارہ چڑھ گیا۔

"میں کیا بکتا ہوں سُنتی نہیں؟" پھر میز پر مکا مار کے زور سے پوچھا "گھر والے کا نام؟ میں فارسی نہیں بول رہا۔"

طوائف نے ٹھیٹ طوائفانہ انداز میں کہا۔

"سمجھتی ہوں حضور۔ لیکن کیا عرض کروں۔ حضور اپنا ہی نام لکھ لیں۔ مجھے تو اعتراض نہیں ہاگر آپ گستاخی نہ سمجھیں تو۔"

جیلر صاحب خلا میں گھورنے لگے۔

کام نکل گیا

پھانسی کی کوٹھری میں ایک سزائے موت کے قیدی سے زیادہ بھگوان کا نام لینے والا کوئی نہ تھا۔ جب بھی جیلر گشت پر آتا۔ یہ بھگوان کی یاد میں گم ہوتا۔ ہر وقت پاٹھ پوجا میں لگا رہتا۔ اگر کوئی بات بھی ہوتی تو جواب یا تو اشاروں میں دیتا یا چند لفظوں میں۔ اور اس کے بعد پھر بھگتی میں لگ جاتا۔ رات کو ایک دو بجے جب بھی جیلر گشت پر آیا اُسے پوجا ہی کرتے پایا۔

ایک دن دوپہر کے وقت جیلر راؤنڈ پر آیا تو یہ قیدی بے خبر سویا ہوا تھا۔ جیلر نے جگایا اور پوچھا۔

"کیوں۔ آج پوجا پاٹھ بند ہے؟"

جواب دیا۔

"جناب! گھر والوں نے اطلاع دی ہے۔ سزائے موت میں تخفیف ہو کر سزا صرف سات سال رہ گئی ہے۔ بھگوان سے جتنا کام لینا تھا لے چکا۔ اب اُسے زیادہ تکلیف دینے کو دل نہیں چاہتا۔"

اور جیلر خاموش کھڑا اس سودے بازی پر غور کرنے لگا۔

دھندا

ایک جیلر اور اس کی بیوی بازار جا رہے تھے، تو ایک آدمی نے جھک کے سلام کیا۔ جیلر صاحب نے بے اعتنائی سے ہاتھ اُٹھایا۔ اور سرسری طور پر پوچھا۔

"کہو۔ جگو۔ کیا کر رہے تھے؟"

اُس نے مسکرا کے کہا۔

"حضور۔ وہی بٹوے کا دھندا۔"

بیوی نے سوچا۔ شاید لیڈیز پرس بناتا ہے۔ اُس نے فوراً خاوند کو ٹھوکا دیا تا اس سے پوچھے۔ اس کا بٹوے بنانے کا کارخانہ کہاں ہے؟ شاید بٹوہ سستا مل جائے۔ جیب کترا ہوشیار تھا۔ تاڑ گیا۔ فوراً بات بنا کر بولا۔

"بی بی جی! تھوک کا مال بناتے ہیں۔ چرمی بٹوے۔ لیڈیز پرس۔ پلاسٹک کے بٹوے۔ بہت سی قسم کے۔ جیسا گاہک مل جائے۔"

جیلر اور جیب کترے کی آنکھیں ملیں۔ دونوں مسکرائے۔

جیلر نے بیوی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"چلو بیگم! کہیں یہ تمہارا بٹوہ نمونے کے طور پہ نہ لے جائے!"

اور جیب کترا سلام کر کے بھیڑ میں غائب ہو گیا۔

حسرتِ ناتمام

مغربی پاکستان میں ایک قبیلہ ہے۔ جس میں یہ دستور تھا کہ جب تک اُن کا جوان کوئی کامیاب چوری نہ کرے۔ کوئی ڈاچی (اونٹنی) نہ چُرائے۔ کوئی گھوڑی کھول کر نہ لے جائے۔ اس وقت تک اُس کی دستار بندی نہ ہوتی تھی، نہ اُس کی سگائی یا شادی ہی ہوتی تھی۔

اتفاق سے اس قبیلے کے ایک آدمی نے قتل کر دیا۔ اسے سزائے موت ہوئی۔ اُس کی اپیلیں خارج ہو گئیں۔ اور آخر کار اُس کی پھانسی کا دن مقرر ہو گیا۔ یوم مقررہ پر اُس کے رشتہ دار اُس کی لاش لینے کے لئے آئے، تو اُس کی ماں نے زور زور سے بین کیا۔

"او شیرا! جوانی کی موت مرا۔ نہ تو نے کوئی اچھی سی چوری کی۔ نہ کوئی گھوڑی چُرائی۔ نہ کسی زمیندار کے نقب لگائی۔ نہ کوئی ڈاچی ہی بھگائی۔ تیری تمام حسرتیں دل کی دل میں رہ گئیں۔ تو نے زندگی میں دیکھا ہی کیا۔ اب تو آگے جا کے کیا منہ دکھائے گا!"

موت سے پہلے

ایک آدمی کو سزائے موت ہوئی۔ اس کا جرم تھا کہ اُس نے ایک چھ سالہ بچی کو اغوا کر کے قتل کر ڈالا۔ جرم سنگین تھا۔ ایک معصوم بچے کا قتل جسے ابھی نیکی بدی کا علم ہی نہ تھا۔

ایک دن اُس آدمی کی بیوی اور بچی اُس سے ملاقات کرنے آئی — ملاقات اور بات ہوتی رہی۔ اور بچی ایک کونے میں بے نیاز بیٹھی رہی۔ جب ملاقات ختم ہونے کا وقت آیا، تو اُس آدمی نے کوٹھڑی میں سے ہاتھ نکال کر بچی کو پکارا۔

"آ مُنّی! پیار لے لے۔"

اور مُنّی سہم کے ایک طرف ہو گئی۔

"آ جا بیٹے! اب تیرے باپ کے پاس پیار کے سوا ہے ہی کیا۔"

مُنّی نے آہستہ سے کہا۔

"نہ باپو! میں پیار نہیں لیتی۔ سُنا ہے تم نے اِن ہاتھوں سے ایک میرے جتنی بچی کا گلا گھونٹ دیا!"

اور کوٹھڑی سے نکلا ہوا ہاتھ لرزنے لگا۔

کیا میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں؟

مجسٹریٹ نے تیوری چڑھا کر نخوت سے پوچھا۔

"تم پھر آ گئے؟"

ملزم چپ رہا۔

"اب کے پھر جوا کھیلا؟"

ملزم مُسکرا دیا۔

"تمہیں معلوم ہے جوا کھیلنا جرم ہے" مجسٹریٹ نے چڑ کر کہا

"حضور مجھے معلوم ہے" ملزم نے آہستہ سے کہا۔

"تو پھر جوا کیوں کھیلا؟"

"کیا عرض کروں حضور۔ رات جب میں حضور کو ٹیکسی میں بٹھا کے گھر چھوڑنے گیا۔ تو حضور نشے میں چور تھے۔ اور نشے کی حالت میں رہ رہ کر چار ہزار روپے کا ذکر کر رہے تھے۔ جو سرکار نے کلب میں جوئے میں ہارے تھے۔ جب میں حضور کو گھر پہنچا کے لوٹنے لگا۔ تو حضور نے دس روپے بخشش میں دیئے۔ راستے میں چند ساتھی مل گئے جن کے دس روپے میں بھی جوئے میں ہار گیا" منصف نے حکم دیا "بری۔"

طنز و مزاح

ریٹائر ہونے کے بعد

پروفیسر غلام احمد فرقت کاکوروی ایم اے

۵-۱۷۰۱ پہاڑی بھوجلہ - دہلی

۸ مئی ۶۴ء

خوشتر صاحب!

کچھ معلوم ہے کہ ہمارے انتقال کا زمانہ آگیا ہے اور ہم چھٹیوں کے بعد ہی لکھنؤ جانے کے لئے زین دین کسے بیٹھے ہیں۔ مگر

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

ہم نے تم سے دوستی کیا کی اچھا بھلا اپنے سر پہ تیغ ستم کو سوار کرلیا ہے۔ اسی کو کہتے ہیں "آ بیل تو مجھے مار" اگر تمہارے یوں ہی نمبر نکلتے رہے تو ایک دن ہمارا نمبر بھی نکال دوگے۔

کیسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری

سبحان اللہ! ایک مضمون جو "بیسویں صدی" کے لئے بیسویں صدی میں بھیجا تھا وہ ابھی تک لا پتہ ہے۔ کیا اُس کی اشاعت کے انتظار میں مجھے حضرت خضر سے عمر کی بھیک منگواؤ گے اور مجھے اکیسویں صدی تک زندہ رکھو گے۔ اگر نہیں چھاپتے تو واپس کر دو یا کہہ دو کہ "قبلہ وہ تو کھو گیا" ہاں۔ ہاں اس سے سستا نسخہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ ہم چھاتی پیٹ کر رہ جائیں اور تم مسکرا کر وار خالی دو ——— خدا کرے تم کو بھی حضرت نوح اور خضر کی عمر میسر ہو اور ہم جیسے "بے گناہوں" کو زندگی بھر تڑپاتے رہو ——— یہ مضمون رات آٹھ بیٹھ کر لکھا ہے۔ تم کو بھی قسم ہے میری بداعمالیوں اور عجلت پسندیوں کی جو تم اسے نہ چھاپو۔ اور جب میں تمہارا افسانہ نمبر کھول کر دیکھوں تو اپنا نام ٹٹول کر رہ جاؤں۔ چونکہ کسی مضمون کے مسودہ کی کاپی اپنے پاس نہیں رکھتا اس لئے جو مضمون زندہ درگور ہو جاتا ہے یا ردّی کی ٹوکری کی نذر ہو جاتا ہے اُس کا تیجا کرکے الائچی دانے بچوں میں تقسیم کر دیتا ہوں ——— اُس روز دفتر گیا تو جناب کو کرسی سے مہمان اُٹھانے گئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بے گور و کفن گھر واپس آیا۔ زبان پر نہ پوچھو کیا کیا تعریفی کلمات تھے۔ دھوپ اس بلا کی پڑ رہی ہے کہ گھر سے نکلنے کو دل نہیں چاہتا ورنہ تھوڑی دیر کے لئے ضرور آتا۔ ۱۶ ار ۱۷ تک لکھنؤ جا رہا ہوں۔ اب تمہارے بچے ماشاء اللہ اتنے بڑے ہو گئے ہیں کہ انہیں پیار بھی نہیں لکھ سکتا۔ مگر تم پر لعنت نہ بھیجوں تو تم بھر پور لعنتیں بھیجتے ہو اُس سے محروم ہو جاؤں۔ اللہ تمہیں "ریش یاب" کرے۔

مخلص غلام [illegible]

مالک ۔ دیکھ بے۔ کہتا ہے تو مجھے باپ سمجھ اور میں جو حکم دوں اُسے بجالا۔ اپنی ماں سے بھی کہہ دینا ورنہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ اب تو جان اور تیرا کام۔

نوکر ۔ مگر میری ماں اس پر کیسے راجی (راضی) ہوگی۔ سرکار!

مالک ۔ ابے سرکار کے بچے۔ ماں کے راضی ہونے نہ ہونے کا سوال نہیں سوال تیرے راضی ہونے کا ہے۔

نوکر ۔ ملا سرکار میرا باپ تو جندہ (زندہ) ہے۔

مالک ۔ ابے۔ یہ تو مجھے بھی معلوم ہے۔ باپ کے زندہ ہونے نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آخر میں جو تجھ سے کہہ رہا ہوں اس پر [illegible]

بہار آئی ہے ویرانے میں

بہار آئی ہے ویرانے میں،

فوٹو: ایس شاہ علی (حیدرآباد)

ع- ترے قرباں! اِس بھبھاکت کا کیا نام ہے ساقی؟

فوٹو: ایس، شاہ علی (حیدرآباد)

مدیر خوشتر گرامی

اگست ۱۹۶۲ء

ٹیلیفون دفتر ـــــــ ۲۷۱۹۴۷

ٹیلیفون رہائش ـــــــ ۶۱۹۹۲۷

قیمت فی پرچہ

۷۵ نئے پیسے

تیر و نشتر

خوشتر گرامی

آمرانہ راج کو ختم کرنے کے لئے ملک بھر میں متحدہ محاذ بناؤ — ایک عنوان۔

"مغربی بنگال سرکار نے چاول کی سرکاری تجارت کا فیصلہ کر لیا" ایک خبر —— تاکہ وزارتوں اور دوسرے عہدوں سے محروم رہنے والے ایک ایک دوکان کا لائسنس پا سکیں۔

"پنجاب کی زرعی پیداوار میں بھاری کمی" ایک خبر —— اور کرپشن کی پیداوار میں بھاری اضافہ۔

"کرپشن کے خاتمے کے لئے آل پارٹی سرکار قائم کی جائے" ایک عنوان —— تاکہ صرف کانگرسی ہی نہ کھائیں بلکہ سب مل جل کر کھائیں۔

"پنجاب میں مہمانوں کی تعداد پر پابندی" ایک خبر —— مگر وزیروں کی تعداد پر کوئی پابندی نہیں۔

"تجارت پیشہ افراد سے سیاسی خدمت کرنے کی اپیل" ایک عنوان —— یعنی اپنا پیشہ تجارت چھوڑ کر لیڈری کریں۔

"ہندوستان کا غذائی مسئلہ" ایک عنوان —— جو تقریروں اور کانفرنسوں سے حل کیا جائے گا۔

"پنجاب میں کرپشن کی ذمہ داری کانگرس پر" مولوی عبد الغنی اور دیوی لال کا الزام —— اور اپوزیشن کے فرشتے پنجاب سے باہر رہتے ہیں۔

"عورتوں کی تعلیم پر مردوں سے زیادہ توجہ کی ضرورت" وزیر تعلیم شری چھاگلہ —— اس لئے کہ اس طرح عورتیں تیزی سے کلرک بھرتی ہو کر مردوں کی

"فرقہ وارانہ جماعتوں پر کوئی پابندی نہیں لگے گی"۔ ——— ایک خبر

"...کی گرانی کا سبب"۔ ایک عنوان ——— یہ ہے کہ لوگ غلہ کھاتے ہیں۔ چھوڑ
متا ہو جائے۔ پھل کھائیں۔ انڈا مرغی اڑائیں۔

"بیویوں کو ہل میں جوت دیا"۔ ایک خبر ——— تاکہ بچوں کی بجائے اناج پیدا کریں۔

"دلی کے لئے اسمبلی قائم کی جائے"۔ ایک عنوان ——— اس لئے کہ
دانوں کے لئے کارپوریشن کا میدان تنگ ہے۔

"تحفظ ... میں رشوت"۔ ایک عنوان ——— روک تھام ہونے پر نیا
[illegible]

"... کمیشن کا خرچہ کس پر پڑے گا؟" ایک سوال ——— سرکار پر اور سرکار
...ن سے کھائے گی۔

"مدھیہ پردیش کانگریس کے حساب میں گول مال"۔ ایک خبر ——— وہ پردیش
بناؤ جہاں کانگریس میں گول مال نہ ہو اور سب کانگرسی فرشتے ہوں۔

"ہمیں سرمایہ دارانہ سماج ختم کرنا ہے"۔ ایک عنوان ——— اور غریب
سماج بنانا ہے۔

"گوڑگاؤں میں ٹرک پکڑا گیا"۔ ایک خبر ——— ابھی تک حوالات میں ہے
یا جیل بھیج دیا؟

"پنجاب میں کوٹوں اور پرمٹوں کا اسکینڈل"۔ ایک عنوان ——— داس کمیشن
کو ایک بار پھر زحمت دی جائے۔

"ٹرین بغیر گارڈ کے چل پڑی"۔ ایک خبر ——— سیاسی گاڑی ہوگی۔

"فیل ہونے پر گھر سے بھاگ گئی": ایک خبر ـــــ تاکہ عشق کے امتحان میں فیل نہ ہو۔

"ملک کی سلامتی": ایک عنوان ـــــ اور ناشکروں، احسان ناشناسوں کی غارت۔

"پاکستان میں اُردو": ایک خبر ـــــ شریمان ماسٹر تارا سنگھ پنجابی کے لئے مر رہے ہیں۔

"محکمہ انسداد رشوت ستانی کی بدولت ملک میں رشوت ستانی وسیع پیمانے پر پھیل گئی ہے": پاکستان کی قومی اسمبلی میں تقریریں ـــــ یعنی

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

"پاکستان کے صدارتی انتخاب کے لئے ابھی اپوزیشن نے کسی اُمیدوار کے نام پر غور نہیں کیا": خواجہ ناظم الدین کا بیان ـــــ "آپ خود اپنے ہی نام پر غور فرمالیجئے تو کافی ہے۔"

"گرانی روکنے کے لئے سرکاری اخراجات میں کمی کرو": کرشنما چاری کی اپیل ـــــ اور وزیروں میں کمی کرنا اس میں شامل نہیں۔

"جلسہ میں دال کے چھلکے": ایک عنوان ـــــ یعنی ایک میوہ دو مزے۔

"مسجد میں چوری۔ خدا کا خوف نہ آیا": ایک عنوان ـــــ یا وہ جگہ بتا کہ جہاں خدا نہیں۔

"چاول اور گیہوں کی زیادہ سے زیادہ قیمتیں مقرر کی جائیں": ایک عنوان ـــــ اس لئے کہ اس وقت کی بڑھی ہوئی قیمتیں بھی کم اور بہت کم ہیں۔

"یو۔پی میں چینی کا قحط": ایک خبر ـــــ اور سیاسی دھڑے بندیوں کی افراط۔

"شری لال بہادر شاستری کی اپنے بیٹوں کو ہدایت": ایک خبر ـــــ مجھے داس کمیشن سے بچانا۔

"اگر کرپشن جاری رہی تو سوشلزم قائم نہ ہو سکے گا": ـــــ گلزاری لال نندہ کی وارننگ۔

موتمنر پارٹی نے آئندہ انتخابات کے لئے مہم شروع کردی۔

"ٹیلی فون پر بات کرنے والے ایک دوسرے کو دیکھ بھی سکیں گے": ایک خبر ــــ عشق کے ماروں کو خوشخبری۔ لطفِ سماعت کے ساتھ ساتھ لذتِ دیدار [illegible]ص ہوگی۔

"ملک میں جدید طرز کی چاول ملیں قائم کی جائیں گی" وزیر تجارت کا اعلان ــــ تاکہ اُن کا چاول کھا کر جدید علوم و فنون اور ٹیکنالوجی ہمارے پیٹ میں پہنچ جائے۔

"بدعنوانی ملک کے لئے غیر ملکی حملے سے زیادہ خطرناک ہے": شری گلزاری لال ــــ اسی لئے اکثر کانگرسیوں نے زیادہ خطرناک چیز کو اپنے شایانِ شان [illegible]کر اپنایا ہے۔

"نکیروں کے دعوے دھرے کے دھرے رہ گئے": ایک عنوان ــــ [illegible]تاروں نے کبھی کبھی دھوکا دے جاتے ہیں اور جیوتش غلط ہو جایا کرتا ہے۔

"سابق فوجی پاکستان کا گرانقدر اثاثہ ہیں": صدر ایوب ــــ اور سابق سیاستدان گرانڈیل بوجھ ہیں۔

"ڈاکہ زنی کی دس وارداتیں": ایک عنوان ــــ نمبر دس کے بدمعاش نے کی ہوں گی۔

"بہترین دماغوں کا بین الاقوامی کلب": ایک عنوان ــــ سرکاٹ کا مشکر بنایا جائے گا۔

"آٹا ملوں پر چھاپے": ایک عنوان ــــ پولیس کے یا عوام کے؟

"برف والوں کی لوٹ": ایک خبر ــــ آج کل تو لوٹ ہی لوٹ ہے اور جلتا پھر بھی اُلوٹ ہے۔

"[illegible] پیدا ہوگیا" ایک خبر —— زچہ کی بے بسی۔

"قصور وار افسروں کے خلاف تحقیقات" ایک خبر —— اور قصور وار [illegible] آبرو۔

"سیمہ پالیسی لوگوں کی زندگیوں سے نہیں کھیلنے دیا جائے گا" شری لال بہادر شاستری —— وہ اُن کی جیبوں سے بے شک کھیلتے رہیں۔

"سیمہ پالیسی کا چیلنج قبول کر رہے" ایک عنوان —— کروہ لوگوں کو بھوکوں مار سکتے ہیں۔

"یو پی اسمبلی کے ارکان کی تعداد کم کر دی گئی" ایک خبر —— شاید اس لئے کہ مدبروں کی تعداد کافی ہے۔

"اردو تعلیم کی مشکلات" ایک عنوان —— پڑھنا چھوڑ دیجئے مشکل حل ہو گئی۔

"پاکستان کے بڑے شہروں میں تیز رفتاری پر کنٹرول کرنے کا فیصلہ" ایک خبر —— وہاں تیز گفتاری پر بھی کنٹرول کی ضرورت ہے۔ بے لگام سیاستداں انھیں بہت پیدا ہوتے ہیں۔

"فرقہ پرست پارٹیوں پر پابندی کا معاملہ کھٹائی میں" ایک خبر —— کسی سنار کے سپرد کر دیا ہوگا۔

"منافع خوری، بلیک مارکٹ اور ذخیرہ اندوزی کی سرکوبی ہوگی" شری لال بہادر شاستری —— بشرطیکہ ہمارا سر سلامت رہا۔

"زندگی میں کبھی کبھی چھینٹے پڑیں گے" ایک عنوان —— چھینٹوں سے ڈرنے والے ایک طرف ہو جائیں۔

"دیہاتی عورتوں نے بسکٹ بنانا سیکھا" ایک خبر —— تاکہ اگر روٹی نہ ملے تو بسکٹ بنا کر کھا سکیں۔

وسیطوں کے براہِ راست انتخاب کا مطالبہ

دکھ کے سپنے

تحریر: وقار بن الٰہی

محل روڈ کیمبل پور (مغربی پاکستان)

محترمی ————— خوش رہیں ۔ آداب

آپ کا خط بہت دن پہلے مل گیا تھا لیکن میں کچھ اس طرح مصروف رہا ہوں کہ آپ کو نہ جلد جواب دے سکا اور نہ کہانی بھیج سکا۔ حالاں کہ ایک مدت سے میری یہ خواہش تھی کہ آپ کو کہانی بھیجوں پتہ نہیں کیوں آپ کے لئے لکھ کر ہمیشہ سکون ملا ہے ۔ میں اسے افسانہ نمبر میں چھپا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں مگر دیر ہو گئی ہے اب آپ جس طرح بھی ہو اس کو شریک اشاعت کر لیں ۔ مجھے امید ہے کہانی آپ کو پسند آئیگی ۔

آپ کا اپنا ————— وقار بن الٰہی

آج بہت دنوں بعد اس ہوٹل میں آئی ہوں تو کتنا عجیب عجیب سا لگ رہا ہے وہی پرانا گوشہ، وہی ماحول وہی لوگ اور وہی بیرہ جو آج بھی اپنی عادت سے مجبور ہنس پڑا ہے ۔ مجھے جھک کر سلام کیا ہے اور پھر آرڈر لے کے اندر چلا گیا ہے ۔ میں نے کس قدر اطمینان سے میز کے نیچے اپنی ٹانگیں پھیلا دی ہیں جیسے لیٹ جانے کا ارادہ ہو اور نگاہیں حسب معمول قریب کے لیمپ پر جما دی ہیں جس کی دھیمی دھیمی روشنی ہمیشہ اس طرح لگتی ہے جیسے کوئی گداز گداز سا ہاتھ کندھے پر آجائے ۔ پھر میں نے بڑے سکون سے آنکھیں بند کر لی ہیں، چند منٹ سوچا ہے، چند لمحے آنکھیں نیم وا کر کے سوئے سوئے ماحول کا جائزہ لیا ہے اور پھر اچانک ہی آنکھیں کھول کے سارے ہال کا جائزہ لے ڈالا ہے کہ کہیں کسی نے مجھے دیکھ تو نہیں لیا، کہیں کوئی میری اس حالت کو تاڑ تو نہیں گیا، کہیں کوئی مجھے پہچان کے بیٹھ تو نہیں سوچ رہا کہ اس لڑکی کے سینے میں آج یہ سکون کہاں سے آگیا ہے بات بھی ٹھیک ہے ۔ آخر یہ اتنا سکون میرے اندر کہاں سے گیا ہے ۔ آخر میں وہی شبنم ہوں پھر اتنی بدل کیوں گئی ہوں، آخر یہ مجھے ہو کیا گیا ہے — کیا — آخر کیا ؟

بہت مدت کی بات ہے، میں نے ان دنوں تعلیم مکمل کی تھی اور کسی اچھی سی نوکری کی تلاش کر رہی تھی کہ ایک شام اسی پرانے گوشے میں آبیٹھی۔ پتہ نہیں، اس روز میں کیوں بہت اداس ہو رہی تھی میری آنکھیں کوئی اتنی اچھی نہیں ہیں لیکن بڑی مغرور ہیں اور لوگ کہتے ہیں کہ اداسی کے عالم میں وہ بہت ہی زیادہ اداس اور پیاری لگنے لگتی ہیں اور یہ کوئی بھی مرعوب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ۔ پیالے میں شکر ملاتے ہوئے میں کچھ اور ہی سوچ رہی تھی اور اسی بے خیالی میں چمچہ میری انگلیوں میں سے پھسلا اور چھن سے فرش پر گر گیا لیکن قبل اس کے کہ میں اسے اٹھاؤں، کوئی اپنے آپ جھکا، چمچہ اٹھایا، میز پر رکھا، مجھے دیکھ کے تھوڑا سا مسکرایا اور پھر لبوں سے پھسلتے ہوئے بولا ۔

"میں بہت دیر سے آپ کو اداس اداس دیکھ رہا ہوں، کیا بات ہے ۔ ؟"

پل بھر کے لئے میں نے اس شخص کو غور سے دیکھا، لمبا تڑنگا اور سپید چہرہ، اس کے علاوہ اس میں کوئی خصوصیت نہیں تھی ۔ مجھے ایک دم غصہ بھی سخت آیا، میں کیسی ہی کیوں نہ ہوں، یہ پوچھنے والا کون ہوتا ہے ۔ لیکن آخر عورت ہوں نا ۔ پھر جانے کیسے میں نے اسے بیٹھنے کی دعوت دی ۔ آج بھی سوچتی ہوں تو میری سمجھ میں قطعاً نہیں آتا کہ کیسے اور کیوں کر یہ الفاظ میرے لبوں سے پھسل گئے تھے ۔ وہ بڑی بے نیازی سے میرے سامنے آبیٹھا فوراً ہی سگریٹ سلگایا اور پھر متواتر کبھی راکھ جھاڑتا اور کبھی میری طرف دیکھتا اور مسکرا دیتا مجھے اس کا یہ انداز بے حد پیارا لگا ۔ کوئی اتنی چاہت اور اتنی محبت سے آپ کی طرف دیکھے تو اس پہ پیار نہ آئے تو کیا ہو ۔ میں نے اور چائے منگوائی، اس کے لئے تیار کی اور پیالہ اس کی طرف سرکایا تو اس نے بڑی شریر نگاہوں سے دیکھتے ہوئے شکریہ کہا اور دیر تک پیالہ سامنے رکھے ٹھنڈی ہوتی ہوئی چائے کو دیکھتا رہا ۔ اچانک میں نے کہا "چائے پیجئے نا، ٹھنڈی ہو رہی ہے "

"[illegible] سامنے ہوں تو یہاں سے اٹھنے کو بھی خواہش نہیں ہوتی، چائے کا دور چلتا رہے [illegible]"

لہجے اور لفظوں کے اعتبار سے مجھے سخت غصہ آنا چاہیے تھا لیکن جانے کیسی کشش تھی اُس کے لہجے میں شرمائی، بس تھوڑا سا مسکرائی اور مسکرا کے سوچ کے رہ گئی ——

"اُسے کتنا سویٹ لگتا ہے یہ۔"

ہوٹل سے نکلتے نکلتے بہت دیر ہو گئی۔ گھر اتنا نزدیک بھی نہیں تھا۔ لیکن میں پہلے ہی لیٹ ہو گئی تھی۔ اس وقت تک ہم دونوں ایک دوسرے کے بارے میں سب کچھ جان چکے تھے۔ اور ـــــ آپ کسی بچے کو پہلی مرتبہ کوئی کھلونا دلا دیں تو جس طرح پہروں وہ اسی طرف متوجہ رہتا ہے یہی صورت میری بھی ہو رہی تھی۔ میں پہروں نہیں ہوتو اُس شخص کے بارے سوچنا چاہتی تھی۔ آنکھیں بند کر کے جاگتے میں بھی اچھے اچھے سپنے دیکھنا چاہتی تھی۔ ہائے اس پگلی عورت کو سپنوں سے بھی کتنا پیار ہوتا ہے۔ اُسے کچھ حاصل ہو یا نہ ہو، وہ تو اسی میں خوش ہو کر سپنے تو دیکھ رہی ہے۔

مجھے چند ہی دنوں میں نہ جانے کیا ہو گیا کہ میں اپنا آپ بھی بھول گئی۔ یاد تھا تو صرف اتنا کہ کوئی پیارا سا ساتھی میرا اپنا ہے اور اس جیون کی پگڈنڈیوں پر میں اکیلی نہیں ہوں، کوئی اور بھی ساتھ چلنے والا ہے۔ ایسا جس کے پاس دنیا کا سب کچھ ہے۔ دولت عزت، شہرت، سلیقے کی سمجھ۔ آخر کیا نہیں ہے۔ اور یہی وہ چیزیں ہیں جن پر ایک عورت پاگل ہو جاتی ہے۔ پتہ نہیں یہ کچھ اور تھا یا پاگل پن ہی کہ میں نے اُس کے لئے ایک ایک لمحہ گننا شروع کیا، پھر بے تاب ہونا شروع کیا اور آخر یہ بے تابی جھنجھلاہٹ میں بدلنی شروع ہو گئی۔ کیا مصیبت ہے کہ کسی سے ملنے کے لئے آپ کو دن دن بھر انتظار کرنا پڑے۔

اُن دنوں جیسے میں نے اپنے آپ کو بھلا دیا تھا۔ جب بھی شام گھرتی تو میں گھر سے نکل کے سیدھی ہوٹل پہنچتی، اس کا انتظار کرتی اور جب وہ آ جاتا تو پہروں سارے جہان کے قصے منہ ہی منہ گھولا جاتا۔ وہ بھی تو بڑا ظالم تھا۔ کس اہتمام اور سلیقے سے کپڑے پہنتا تھا اور کس چاؤ سے باتیں کرتا تھا اور اُس کی باتوں میں شوخی و شرارت بھی کتنی زیادہ ہوتی تھی۔ چائے پی کے ہم بہت دیر تک باتیں کرتے رہتے اور باہر جوں جوں اندھیرا ہوتا جاتا میرے دل کی روشنیاں بھی گل ہوتی جاتیں۔ میرا دل بچوں کی طرح مچل اٹھتا۔ یہ شخص میرے ساتھ کیوں نہیں چلتا۔ یہ مجھے اپنے ساتھ کیوں نہیں لے جاتا ـــــ آخر کب تک ہم ایک دوسرے سے علیحدہ علیحدہ بھٹکتے رہیں گے ـــــ پھر ـــــ وہ اس ہوٹل سے رات بھر کے لئے میں جدا ہوتی تو لگتا پہاڑ سی رات [illegible] کٹے گی۔

لیکن یہ راتیں بھی کٹ ہی جایا کرتی تھیں کہ میں جانے تصور میں کیا کچھ بُن لیتی اور اب تو جیسے میں نے سب کچھ سوچ لیا تھا۔ سب کچھ دیکھ کے اُس کے سامنے اپنا سر جھکا دیا تھا۔

اُس شام میں آ کے بیٹھی ہی تھی کہ نیاز کی گاڑی باہر رکی۔ آج وہ آ گیا اور میرے دل میں جو اُس کے خلاف غصہ اُبل رہا تھا کہ کل وہ کیوں اتنے سارے دوستوں کو ساتھ لے آیا تھا، اُسے دیکھ کے جانے کہاں غائب ہو گیا۔ اپنی مخصوص چال سے میرے قریب آیا، تھوڑا سا جھکا اور پھر جیسے سرگوشی کی ـــــ "کیوں جی ـــ آج اتنے سخت قاتلانہ موڈ اور روپ میں کیوں بیٹھی ہیں آپ؟"

میں نے پہلے کی طرح اب بھی اُسے جواب نہیں دیا۔ ہاں تھوڑا سا شرما ضرور گئی اور دل میں سوچا ہائے! یہ شخص مجھ سے اتنا پیار کرتا ہے۔ چائے پی چکے تو نیاز کہنے لگا۔

"کل ویک اینڈ ہے شبنم! باہر چلیں۔"

میں نے پلکیں جھپکائیں، خمار آلودہ ذہن کو تھوڑا سا جھٹکا۔

"کہاں ـــ!"

"یہاں سے کوئی پچاس میل پر ایک بڑا ہی اچھا ریسٹ ہاؤس ہے۔ چلتے ہیں۔ رات ٹھہریں گے۔ انجوائے کریں گے۔"

میں نے یقین نہیں کیا کہ یہ شخص کیا کہہ رہا ہے۔ اپنے آپ کو سنبھال کے میں نے اُس کے چہرے کو دیکھا، اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔ پر چہرہ اتنا سپاٹ اور نگاہیں اتنی سیدھی تھیں کہ میں کچھ بھی نہیں سمجھ سکی۔ پھر سوچا نیاز کو تم ایک مدت سے جانتی ہو، وہ اتنا بُرا تو نہیں۔ تم اُس پہ اعتماد کیوں نہیں کرتیں۔ کیوں نہیں، میں نے اُسے دیکھا اور کہا۔

"چلیں گے۔ ایک مرتبہ نہیں، سو مرتبہ۔ لیکن جب ہم دو نہیں رہیں گے۔"

عورت مر جاتی ہے لیکن یہ جملہ نہیں کہتی۔ لیکن پتہ نہیں میرے منہ سے یہ بات کیسے نکل گئی۔ شاید اس لئے کہ میں اُس سے سارے سپنے کہہ دینا چاہتی تھی۔ اُس نے میری بات سنی۔ اُس کا چہرہ اچانک بدلا۔ تھوڑا سا کھلکھلا کے ہنسا، میز سے اٹھا، کرسی کھسکائی اور کہنے لگا۔

"کیا سوچ بیٹھی ہو تم بھی۔ عورت بدقسمت اسی لئے ہے کہ اُسے خوشی دینا چاہو تو وہ گلے کا ہار بن جاتی ہے۔" اور پھر میری طرف دیکھے بغیر ایک آن میں اس نے کاؤنٹر پہ پیسے لوٹائے اور باہر نکل گیا۔

میں نے اُس کے بعد اُسے اس ہوٹل میں بہت کم دیکھا ہے۔ وہ آتا بھی نہیں، وہ آئے بھی تو کبھی آنکھ اُٹھا کے بھی میری طرف نہیں دیکھتا۔ [illegible]

چھنتا اپنے آپ کو خوب اذیت دی۔ باتیں یاد کر کے بُری طرح تڑپی اور
دھیرے اس خیال کو دل میں بٹھا لیا کہ اچھا ہی ہے جو ٹھوکر کھانے سے پہلے
ن ہوں۔ پر اتنی سی بات سے بھی کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا تھا جیسے مجھ سے میرا
چھن گیا ہے۔

میں نے آہستہ آہستہ سروس میں پھر دلچسپی لینی شروع کر دی کہ گھر کی چار
یں اکیلی ہوں گی تو ماضی کی باتیں بُری ہی کیوں نہ ہوں، مجھے کھا جائیں گی ۔
بانی گئی تو واقعی مجھ میں تبدیلی آ گئی۔ نیاز جیسے بالکل بھول گیا۔ اعتماد آہستہ آہستہ
دل میں سرایت کرنے لگا اور میں نے محسوس کیا جیسے میں بھی کچھ ہوں، جیسے میں
بکتی رہوں یا اب کوئی مجھ سے ایسی بات کرے گا تو میں اس کا منہ توڑ جواب
ہا ہوں۔

میں دفتر کے جس کمرے میں بیٹھتی تھی وہاں تین شخص اور بھی کام کرتے تھے۔
سے عمر تھے ایک کی کوئی تیس پینتیس کے لگ بھگ عمر تھی لیکن سب کے دلوں
دوسرے کے لئے بڑا انس تھا۔ کوئی ایک دن نہ آتا تو باقی سب اسی شام
مزاج پُرسی کو جا پہنچتے۔ کمرے میں بیٹھ کے میں نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ میں
ہوں اور یہ سب مرد ہیں۔ بلکہ ہم سب کا احساس یہی ہوتا تھا کہ ہم سب یہاں
ہیں اور بس۔ اور شاید اسی لئے سب کی بڑے مزے میں کٹ رہی تھی۔

ایک دن میں آفس میں معمول سے کچھ زیادہ ہی مصروف تھی۔ کام اتنا زیادہ اور
تھا کہ شام تک نبٹانا بہت مشکل دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے اس کا قطعاً ہوش
تھا کہ میرے لباس کو کیا ہو رہا ہے یا میرے بال کیسے چڑیلوں کی طرح بکھر رہے ہیں
اور یاد ہے کہ شام جب میں تھک کے کمر سیدھی کرنے کرسی پہ بیٹھی تو اچانک محسوس
نوجوان ساتھی ابھی تک دفتر میں ہے اور ــــ باہر شام کے سائے بہت
دراز ہو چکے ہیں۔ میں زیادہ نہیں چونکی، بات مجھے عجیب سی لگی۔ پرس اور بیگ
، پپڑی جمے ہونٹوں پہ زبان پھیر کے جب میں باہر نکلی تو وہ بھی میرے ساتھ ہی
لیکن اس کے قدموں کی چاپ بتا رہی تھی کہ وہ جھجک رہا ہے۔

"آپ بہت زیادہ تھک گئی ہیں، محسوس نہ کریں تو ــــ ایک پیالہ چائے ــــ"
"اوہ ــــ شیور ــــ وائی ناٹ ــــ پر اتنی دیر تک آپ کیوں بیٹھے رہے؟"
بڑی خوشی سے اس کی دعوت قبول کر لی کہ ہم دونوں کام کرنے والے ہی تو تھے۔
نہیں جانے اس نے کیا کہا، میں نے نہیں سنا، ٹیکسی لینے کا خیال دل سے
کے اس کے ساتھ پیدل ہی چل پڑی اور ہم اسی ہوٹل کے اسی گوشے میں
بیٹھے۔

اس نے پیالہ اٹھا کے چائے بنائی تو پتہ نہیں کیسے ایک بڑی مدت کے
بعد اچانک ہی نیاز مجھے یاد آ گیا۔ اس کی نگاہوں میں کتنی شوخی ہوتی تھی ــــ پھر
میں نے فوراً ہی اسے ذہن سے جھٹک دیا۔ اپنے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کو دیکھا اس
کی نگاہوں میں شوخی نہیں ــــ لیکن ایک لہر ضرور تھی جس سے میں نا آشنا نہیں تھی۔
لہر ــــ اپنایت کی لہر ــــ جیسے کوئی سکون اور ٹھنڈک سے اپنی گرفت میں کر دے
میں نے پلکیں جھپکا کے جھکا لیں، چائے پی اور ہلکے پھلکے موڈ میں اٹھ کے اس کے
ساتھ باہر چلی آئی۔

میں نے اگلے دو چار دنوں میں بھی دیکھا کہ وہ دفتر کے بند ہونے کے
بعد بھی بیٹھا رہتا ہے اور میں اٹھتی ہوں تو میرے پیچھے پیچھے ضرور آتا ہے اور بغیر کسی جھجک
کے چائے کی دعوت دے ڈالتا ہے۔ ہم یہیں آ بیٹھتے ہیں، چائے پیتے ہیں اور پھر اٹھ
کے اپنے اپنے گھروں کو چل پڑتے ہیں۔ ہم میں دوستی ہے، ہم ایک دوسرے کے
پارٹنر ہیں اور بس ــــ

لیکن ایک شام عجیب سی بات ہوئی۔ میرا اپنا ذہن ہی بھٹک گیا۔ جھٹکنے کے
باوجود مجھے یوں لگا جیسے میں نے بڑی ہی پیاری بات سوچی ہے۔ اس روز مجھے دیر نہیں ہوئی
تھی۔ عین وقت پر دفتر سے نکلی تھی لیکن چلتے چلتے پتہ نہیں، کیسے میں نے اسے دعوت
دے ڈالی تھی۔ یہاں لیمپ کی مدھم سی روشنی میں چائے بنا کے اس کے آگے سرکاتے
ہوئے اچانک ہی میری نگاہیں اس کے چہرے پر جم گئیں۔ وہ سر جھکائے سگریٹ پی رہا
تھا۔ پیالے کو دیکھ کے اس نے فوراً ہی سگریٹ مسل دی اور پوروں پر جمی راکھ صاف
کر کے پیالہ تھام کے جو اس نے شکریہ کہا تو ــــ میرا دل جیسے کانپ گیا۔ اس کا
یہ انداز مجھے بے حد پیارا لگا اور دو چار گھونٹ لے کے میں نے سوچا ــــ
میں نے سوچا ہے ــــ یہ شخص اس سفر میں میرا ساتھی بن جائے تو ــــ تو کیسا
رہے۔ سرگوشی میں نے اپنے دل سے کی تھی لیکن شرمائی یوں جیسے وہ سرگوشی سارے
جگ میں پھیل گئی ہو۔ وہ میری سوچ سے بے خبر چائے گھونٹ گھونٹ پیتا رہا۔ چائے ختم
کی تو دفتر کی پرانی باتیں لے بیٹھا جن سے اب مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

میں نے اس رات اور اس کے بعد آنے والی چند راتوں میں بھی پہلے کم اور
پھر زیادہ اسی کے بارے میں سوچا اور ہر بار میرے ذہن نے مجھے سمجھایا، اچھا آدمی ہے۔
تیرا ساتھ دے گا۔ یہ جذبات سے کورے رہنے والے آدمی بڑے باحوصلہ ہوتے ہیں۔ ہر
ایک کو دیتے ہی ہیں، کسی سے کچھ لیتے نہیں ــــ تو بڑھ کے خود ہی اس کا دامن کیوں
نہیں تھام لیتی ــــ سیدھی بات ہے۔ چند ہی راتوں کی سوچوں نے مجھے بے بس کر کے
رکھ دیا۔ میں نے سنجیدگی سے جنگ لڑی اور آخر تھک کے اپنے جذبات کے سامنے
سر جھکا دیا۔

وہ اگلی شام مجھے اور بھی پیارا دکھائی دیا۔ دن بھر کے کام کے باعث اس

مجھے بہت برا لگا ... لیکن اس کی شکل سے اُس کے چہرے کا عجیب سا تاثر دیا تھا
جی چاہا تھا اس کے سامنے سب کچھ اُگل ڈالوں لیکن پھر جیسے میں نے خود ہی اپنی
آنکھ کا گھونٹ پیا ——— نہیں یہ بری بات ہے۔ بہت بری ——— اُس شام
بہت ہی بیٹھا گیا اور رات بھی تو قیامت کی تھی۔ لگتا تھا۔ اس شخص کے دل میں
پھر کوئی جذبات کا سمندر ہے اور میں بدقسمت ہوں جو کسی حادثے کی منتظر ہوں جو مجھے اُس
سے قطرہ سے پھوٹ رہی تھی جب میں اپنے دل میں ایک فیصلہ لئے کسی وجہ اور بے چین
نظروں سے سو گئی۔

اس روز دفتر دیر سے پہنچی تو شام کو دیر تک بیٹھنا پڑا اور اُٹھی تو وہ پہلی مرتبہ مجھ
سے پہلے ہی اُٹھ کے باہر برآمدے میں آ چکا تھا۔ باہر نکل کے مجھے احساس ہوا کہ آج
دیر بہت ہو گئی ہے اور کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے آج ہوٹل نہیں جاؤں گی کہ رات
کے اندھیرے گھر آئے تھے۔ کاریڈور میں سے گزری اور جہاں موڑ پر روشنی ذرا کم تھی
اچانک ہی کسی نے بازو بڑھا کر مجھے سمیٹ لیا اور کچھ یوں سینے سے چمٹا لیا جیسے سکول
جاتے ہوئے کتابیں سینے سے چمٹائی جاتی ہیں۔ مجھے سنبھلنے اور ساری بات سمجھنے میں
دو چار لمحے گزر گئے اور جب اپنے آپ کو چھڑانے کے لئے میں نے ہاتھ پاؤں مارے
تو اس نے سرگوشی کی۔

"پاگل ——— ترساتی کیوں ہے۔ ارے یہاں کوئی نہیں دیکھ رہا۔ چل ———
——— اُس ہوٹل میں ———" ساتھ ہی دو ہونٹ میری گردن کے قریب ہوتے ہوئے
ہولے ہولے میرے لبوں کی طرف بڑھنے لگے۔ جانے کہاں سے مجھ میں اتنی طاقت
آگئی کہ میں نے زور کا ایک چانٹا چٹاخ سے اُس کے منہ پر جڑ دیا۔ بازوؤں کی گرفت
آپ ہی آپ ڈھیلی پڑ گئی اور میں ایسی بھاگی ہوں کہ گھر تک پیچھے پلٹ کے نہیں دیکھا۔

میں نے دفتر سے دس روز کی رخصت لے لی۔ کبھی سوچا کرتی تھی کہ میں نے
زندگی میں کوئی ٹھوکر نہیں کھائی لیکن اس روز مجھے شدت سے احساس ہوا کہ میں دوسری
مرتبہ ٹھوکر کھا چکی ہوں اور قصور صرف اتنا تھا کہ میں نے اپنی اس خواہش پر قابو نہیں پایا
کہ ——— میرا بھی کوئی ساتھی ہو ——— دس روز مجھے نہیں معلوم کس طرح گزر گئے۔
لگتا تھا زندہ ہوں لیکن جیسے کسی پتھر کے نیچے۔ سوچ ضرور رہی ہوں لیکن ذہن گنگ
ہو گیا ہے۔ دیکھ ضرور رہی ہوں لیکن آنکھیں دھندلا گئی ہیں اور نبض ضرور چل رہی ہوں لیکن
مجھے اپنا ہی ماتم کر رہی ہوں۔

دفتر گئی تو پتہ چلا وہ حضرت استعفیٰ دے کر جا چکے تھے۔ میں نے چند دنوں تک
اُس کے میز کو کھوئی کھوئی نظروں سے ضرور دیکھا لیکن انسان ہوں نا۔ جو اپنی ایسی
غلطیوں کو جلد ہی فراموش کر دیتا ہے جن میں سوائے پچھتاوے کے اور کچھ نہ ہو۔
میں نے ... کام میں دل لگایا اور چند ہی دنوں میں پھر سے
پرانی شبنم ہو گئی۔ چند روز کے لئے میں نے یہاں بھی آنا جانا چھوڑ دیا تھا لیکن وہ کہا
میں نے، کہ یہاں بیٹھ کے ہمیشہ یوں لگتا ہے جیسے کوئی کندھے پر گداز گداز سا ہاتھ رکھ دے
میں اسے نہیں چھوڑ سکی اور پھر سے یہاں آنے لگی اور اکثر شامیں یہیں تنہا ہی
گزرنے لگیں۔

پھر ایک دن میں دفتر سے آئی تو امی نے بڑی ماتا سے مجھے گھیر لیا۔
"ہائے، تیرا یہ نگوڑا دفتر۔ تجھے بس کھا ہی جائے گا۔ بگلی ——— کبھی گھر کا بھی
سوچا کر، یہاں سُن تو، کیا کچھ ہو جاتا ہے۔ آج تیرے حامد بھائی آ رہے ہیں۔"
تھکی ہوئی تو تھی ہی، امی کی باتوں پر بہت جھنجھلائی، پر جب انھوں نے حامد
کا نام لیا تو میرا جی چاہا، بچوں کی طرح تالیاں بجاؤں اور خوشی سے اس بڑے آنگن کو
ایک ہی چھلانگ میں پار کر جاؤں۔ حامد اور میں بچپن میں برسوں ایک ساتھ رہے تھے۔
ان دنوں وہ بڑا شریر اور ضدی تھا۔ کتنا کتنا پیٹا ہے اُس نے مجھے اور کس قدر دق کیا
ہے میں نے اُسے۔ لیکن اِدھر چار پانچ برس سے اُن کی کوئی اطلاع نہیں تھی سوائے
اس کے کہ جناب اس عرصہ میں انٹرنیشنل فرم کے آدمی ہو گئے ہیں۔ اُن کی باتیں سنتی
اخباروں میں پڑھتی تو ملنے کو جی مچل مچل جاتا، پر پھر جانے کیا سوچ کے چپ ہو جاتی۔
حامد آئے تو مجھے جیسے اپنا آپ بھول گیا۔ ارے! یہ تو ویسا ہی شریر تھا
ہاں ضدی نہیں تھا۔ اُف کتنی ساری باتیں آتی تھیں اُسے۔ رات گئے تک میں اُس کی
منتیں کرتی رہی کہ مجھے دوسرے بڑے شہروں کی باتیں سنائے لیکن وہ بچپن کی کھٹی
میٹھی باتیں کچھ اس انداز میں لے بیٹھا تھا کہ میں بھی مدہوش ہو کے رہ گئی اور اُس کے
ساتھ ساتھ ماضی کے چمن زاروں میں گھومتی رہی اور آنکھیں بند کئے اُن دنوں کو دیکھتی
رہی جو ہم نے ایک ساتھ گزارے تھے اور جن میں چاندنی اور جھرنوں کے گیتوں کے سوا
کچھ بھی نہیں تھا۔ مجھے لگتا تھا جیسے پچھلے دو تین برس میری زندگی کا حصہ تھے ہی نہیں۔
اب تو حامد میرے سامنے تھا اور جس کی مچلتی ہوئی آنکھیں گداز گداز سی گفتگو مجھے صاف
بتا رہی تھی جیسے کسی نے مجھے اپنا لیا ہے یا جیسے اُن میں میری تصویر اور میری چاہت
کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔
دوسرے ہی دن حامد کو لے میں اس گوشے میں آن بیٹھی۔ مجھے آج یہ گوشہ
عجیب عجیب سا لگ رہا تھا اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سارے ہال میں بیٹھے لوگ
مجھی کو مسکرا مسکرا کر دیکھ رہے ہیں۔ مبارک باد دے رہے ہیں کہ جس کے ساتھ اتنا
اچھا ساتھی ہے۔ یہاں بیٹھ کے نہ تو نیاز یاد آیا اور نہ ہی میرا پارٹنر۔ انھیں یاد کرنے
کی فرصت ہی کس کو تھی۔ حامد کا سینہ تو جیسے تالاب تھا کہ جس میں میں پتھر کی طرح گر گئی
تھی اور اب چاہتی بھی تو نہیں نکل سکتی تھی۔
میں نے اُس روز چاہا نہیں اُس کے ... بہت ساری ... شامیں ... کے

[illegible] یہاں بیٹھ کر اُس کے چہرے کو دیکھا کبھی ہلکے [illegible] باتیں، پتہ نہیں کیوں، عورت سپنے دیکھنے کی [illegible] گھر کا ہی کیوں نہ ہو، اُسے بہت حسین سمجھنے [illegible] سے پہلے وہ سپنے دیکھ چکا تھا جن میں سوائے دُکھ اور ندامت کے [illegible] حامد کے ساتھ چلے گئے، میرا دل کیوں نہیں دھڑکتا تھا۔

[illegible] اس دن روز [illegible] دفتر میں مجھے لگا جیسے برسوں سے وہ [illegible] گھر جاتا [illegible] آگے بڑھ کے میرا استقبال کرتا، یا مجھے گھر سے [illegible] تو کبھی میری امّی سے بھی نہیں کہا تھا۔ گھر میں ہوتی تو ایک کپڑا، ایک [illegible] کے میری تلاش میں سارے گھر کو چھان مارتا۔ جی میں آتی تو مجھے سامنے بٹھا کے [illegible] فلمی گیت اُسے یاد تھے، سناڈالتا۔ آواز بھی تو اُس کی بہت اچھی تھی۔ پھر کبھی اکتا جاتا تو ہم سنیما چلے جاتے اور میں نے ہمیشہ دیکھا کہ گھر سے باہر نکل کے تو اُس کی عزت اور احترام میں اور اضافہ ہو جاتا ہے اور میں اپنے آپ کو بلند، بہت بلند سمجھنے لگ جاتی تھی۔

اُس نے خود کبھی اپنی زبان سے کسی بات کا اقرار نہیں کیا۔ لیکن بزرگ کہہ گئے ہیں کہ چہرہ دل کا آئینہ ہوتا ہے۔ میں نے ہمیشہ اپنے لئے اُس کے جذبات اُس کے چہرے سے پڑھ لئے۔ میں تو رہی ایک طرف، امّی کی بجھی بجھی آنکھوں میں بھی ان دنوں اک چمک آگئی تھی۔ جب بھی ہم دونوں اکٹھے باہر نکلے یا گھر واپس آئے ہیں تو ہمیشہ ہی مسکرائی ہیں اور میں تو اُس کے علاوہ اور کچھ جانتی ہی نہیں تھی کہ دن بھر حامد کو یاد کروں یا اُس کے پاس بیٹھوں اور رات بھر اُس کے خواب دیکھوں یا اُس کے تصوّر سے دل بہلاؤں۔

وہ شام ہمارے گھر میں حامد کی بیسویں شام تھی۔ میں نے اُسے کہہ دیا تھا کہ دفتر دیر ہو جائے گی وہ سیدھا ہی ہوٹل چلا آئے۔ دفتر سے نکل کے ہوٹل پہنچ کے میں نے پہلی مرتبہ اس گوشے کو چھوڑا اور ستون کی آڑ میں بیٹھ گئی کہ حامد آ کے تلاش میں پریشان ہوگا تو میں اچانک سامنے آ کے اُسے حیران کر دوں گی۔ مجھے وہاں بیٹھے آدھا ہی گھنٹہ گذرا ہوگا کہ حامد داخل ہوا۔ پر آج اُس کے ساتھ تین چار دوست اور بھی تھے۔ وہ سبھی ستون کی دوسری طرف آرام سے بیٹھ گئے، میں نے دم سادھ لیا۔

وہ پہلے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے، پھر اچانک ہی ایک غیر مانوس سی آواز آئی۔

" حامد یار ـــــ لڑکی کا کیا بھروسہ ـــــ ابھی تک تو آئی نہیں۔ اب کیا آئے گی۔"

" ارے نہیں! وہ صرف لڑکی ہی نہیں، میری بہت کچھ ہے اور میں شکاری کو جال ایسا پھینکنا چاہیئے کہ شکار لاکھ پھڑپھڑائے، پر نکل نہ پائے۔ کیا سمجھے آئے گی نہیں تو ـــــ"

اُف! یہ تو حامد کی آواز تھی۔ مجھے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ لگا جیسے ہوٹل کی چھت میرے سر پر آ رہی ہے۔ آخر حامد بھی ان دونوں ہی کا بھائی نکلا نا ـــــ یہ بھی تو ایک مرد ہی ہے نا ـــــ اس نے برسوں کی رفاقت کو یوں مسل دیا۔

" لیکن یار ـــــ ہمارے حصّے کا بھی خیال رکھنا ـــــ" یہ کسی تیسرے شخص کی آواز تھی۔

" ہم تو صرف چکھنے کے قائل ہیں دوست۔ حصّے بخرے تم کر لینا ـــــ"

یہ پھر حامد کی، نہیں نیاز کی، نہیں میرے پارٹنر کی آواز تھی۔ مجھ سے اور برداشت نہیں ہو سکا۔ چپ چاپ اٹھی، ستون کی دوسری طرف آئی، جہاں حامد بیٹھا تھا، ایک لمحے کے لئے اس کے سامنے رُکی اور پھر باہر نکل گئی۔

آج بہت مدت بعد یہاں آئی ہوں تو ماضی کا سب کچھ یاد آ گیا ہے۔ سوچتی ہوں، دُنیا میں کون سی ایسی خوبی ہے جو ان تینوں میں نہیں تھی۔ سب کے سب حسین تھے، بلا کے حسین ـــــ ہر ایک کے پاس دولت تھی اور اُس پہ انفرادی خصوصیات الگ ـــــ پر جانے کیوں کبھی میرا یہ جی نہیں چاہا کہ اُٹھوں اور اُن میں سے کسی کی بھی گود میں سر رکھ دوں ـــــ آج میرے سامنے ایک اور آدمی بیٹھا ہے جس میں کوئی صفت نہیں ہے، کالا بھجنگ سا، کوئی فن کوئی بڑائی کوئی ہنر اس میں نہیں۔ دولت اس کے پاس نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں ہے کہ جس پر فخر کر سکوں لیکن اتنا ضرور ہے کہ ـــــ میرا جی پہلی بار چاہ رہا ہے کہ اُٹھوں اور اُٹھ کے اُس کی گود میں سر رکھ دوں کہ یہ میرا جیون ساتھی ـــــ تو ہے ـــــ مجھے دُھتکار تو نہیں دے گا؟ میرے لئے نیاز، پارٹنر اور حامد تو نہیں ہوگا ـــــ؟

پروفیسر منوہر سہائے انور، ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی

کرم اُن کا بجائے خود ستم سے کم نہیں ہوتا
وہ جو غم بخشتے ہیں "غم برائے غم" نہیں ہوتا

بُرا کیا ہے غمِ بے حد اگر کچھ کم نہیں ہوتا
دُفورِ غم کے ریلے میں شعورِ غم نہیں ہوتا

کبھی لگتی ہے دِل کو ٹھیس تو غم کم نہیں ہوتا
کبھی صدمے گزر جاتے ہیں لیکن غم نہیں ہوتا

وہاں ہوتا ہے اِک بے نام کرب انگیز سا عالم
جہاں وہ فتنہ غارت گرِ عالم نہیں ہوتا

چُھری سے نقش کر دو نام اپنا میرے سینے پر
بہت تکلیف ہے، دِل کا دھڑکنا کم نہیں ہوتا

غمِ جاں سوزِ جاناں میں مزے کی بات یہ دیکھی
مزہ دیتا ہے جب کوئی شریکِ غم نہیں ہوتا

وہاں سے ہم خود اپنے آپ کو آواز دیتے ہیں
جہاں آواز میں آواز کا عالم نہیں ہوتا

غریبوں کے گھروں میں گھپ اندھیرا "جگمگاتا" ہے
سحر ہو یا نہ ہو، اُس کا اُجالا کم نہیں ہوتا

خُدا نے بانٹ دی "میراثِ آدم" نسلِ آدم کو
نہیں ہوتے وہ "آدم زاد" جن کو غم نہیں ہوتا

تجھے کہتے ہیں عالم دوست تیرے چاہنے والے
کوئی "بدنام" یوں اے دُشمنِ عالم نہیں ہوتا

ہوا کرتا ہے حُسن و عشق کا انجام غم ہی کی
وہ کم ہو کر نہیں بڑھتا، یہ بڑھ کر کم نہیں ہوتا

نہ کر غم بھول جانے کی عبث تلقین اے ناصح
ارے نادان اپنا غم پرایا غم نہیں ہوتا

بہارِ حُسن ڈھل جاتی ہے لیکن تھا انور
گر جوشِ جنونِ عشق ہمیشہ کم نہیں ہوتا

۳۶ ے، ایسٹ پٹیل نگر دہلی

بھٹکتی روحیں

م۔ک۔ مہتاب ایم۔اے

ای۔جی ۹۸۴۔ پریم نگر۔ جالندھر

۴ اپریل ۱۹۹۳ء
مکرمی و محترمی خوشتر صاحب! آداب

.... افسانہ نمبر کے لئے ایک افسانہ ”بھٹکتی روحیں“ ارسال ہے۔ امید ہے قارئین اسے پسند فرمائیں گے اور مجھے اپنی دعاؤں سے نوازیں گے کیونکہ بیسویں صدی کے بلند معیار کی طرح اس کے قارئین کی ناقدانہ نگاہ بھی بہت بلند ہوتی ہے ....

نیاز کیش ——— م۔ک۔ مہتاب

"جب کوئی خوبصورت دوشیزہ غسل کے بعد چھت پر کھڑی ہو تو رنگین جوانوں کی پیاسی روحیں اس کے بالوں سے ٹپکتے امرت کے قطروں سے پیاس بجھانے کے لئے اُس کے گرد منڈلانے لگتی ہیں۔" اقبال نے بات کے آخری الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

رشی کا چپو پانی کی بجائے کشتی کے پیندے میں لگنے سے جھیل کے سکوت میں ایک عجیب سی آواز پیدا ہوئی۔ آسمان سے ایک ستارہ ٹوٹتا ہوا جھیل کے پانی میں بجھ گیا۔ مچھلی اچھلی اور دوسرے ہی لمحے پانی میں ڈوب گئی۔ جھیل کے عقبی جنگل سے کسی پرندے کی آواز ایک کونے سے دوسرے کونے تک گونجتی چلی گئی۔

منوہن نے روپا کی طرف دیکھا اُس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ آنکھیں جیسے اندر اُتری ہوئی، حیرت سے منہ کھلا اور بے ترتیب بال۔

"رشی چپو الٹا چلاؤ، کشتی مشکل میں پھنس جائے گی۔" منوہن ایک درخت کو نزدیک دیکھ کر چیخا اور کشتی درخت سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔

رشی کے ہاتھوں میں چپو چل نہیں رہے تھے۔ چہرہ پسینے سے تر اور خشک پریشان بال بکھرے تھے۔

"اقبال تم نے یہ کیا بے وقت کا موضوع چھیڑ دیا ہے۔ یہ رات کا سناٹا اور ... سہمی ہوئی ڈر گئی ہے۔" منوہن نے اقبال کی طرف جھکتے

"یہ اُن کے لئے کوئی نئی بات تھوڑے ہی ہے۔" اقبال نے بازوؤں کے پورے زور سے چپو چلاتے ہوئے کہا۔

"کیا بکواس کرتے ہو۔ تم شاید آج کوشش سے یہی ٹھان کر آئے ہو۔ کتنی حسین رات تھی لیکن تم تو بور کرنے پر تُلے ہوئے ہو۔ رشی! تم کوئی گیت ہی سناؤ!"

رشی نے پتلون کی جیب سے ماؤتھ آرگن نکالا اور ایک رومانی نغمہ فضا میں بکھیرنے لگا۔

یہ رات یہ چاندنی پھر کہاں
سُن جا دل کی داستاں

نغمے کی دُھن نے فضا کو مسحور کر دیا۔ جیسے پورنماشی کے ابھرتے چاند کی کشتی نیلے آسمان میں دم بھر کے لئے رُک گئی ہو۔ ستاروں نے آنکھ جھپکنی بند کر دی ہو۔

اقبال اور منوہن نے روپا کی طرف دیکھا۔ وہ سہمی ہوئی کبوتری کی طرح کشتی کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اُس کا رنگ زرد، پلکوں کے پردے جھکے ہوئے اور پریشان زلفیں ہوا کی لہروں سے رخساروں پر کھیل رہی تھیں۔ لیکن خوفزدہ ہونے کے باوجود وہ اپنا بھرم بنائے رکھنے کے لئے اپنی بھری لمبی چوٹی کے آخری سرے کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر مارتے ہوئے تال دے رہی تھی۔ چوٹی میں جگہ جگہ آویزاں چاندی کی گھنگھریاں جھنک کر ایک حسین ردھم

رہی تھیں۔
کیونکہ دشمن ختم ہوتے ہی کشتی کنارے سے آلگی۔ ایک طلسم ٹوٹ گیا۔
روپا کی طبیعت ابھی نہیں سنبھلی تھی۔ اقبال اور منوہن جھیل کے کنارے سیر کرنا
چاہتے۔ رمیش باغیچے میں بیٹھ کر سستا لینا چاہتا تھا۔
"لیکن میں تو ہوسٹل جانا چاہتی ہوں اقبال!" خوفزدہ روپا ساڑی کی
سلوٹیں درست کرتے ہوئے بولی۔
"رمیش تم روپا کو ہوسٹل چھوڑنے جاؤ۔ میں اور اقبال کچھ دیر سستا کر آئیں
گے۔ ہم تو شل ہو گئے ہیں کشتی چلاتے چلاتے" منوہن نے اقبال کے بازو میں
بازو ڈالتے ہوئے کہا۔
رکشا روپا اور رمیش کو لے کر چل دیا۔ اقبال اور منوہن باغیچے میں جا کر خاموش
بیٹھ گئے۔
"کیوں دوست ناراض ہو گیا؟" اقبال نے کہنیوں کے بل اوندھے لیٹتے
ہوئے کہا۔
"میں آج تمہیں پیٹنا چاہتا ہوں۔ تم نے ہماری بے عزتی کی ہے۔ اعتماد کو
ٹھیس لگائی ہے۔ کیا روپا اس واقعہ کے بعد کبھی ہمارے ساتھ بوٹنگ کے لئے آئے گی۔
امید نہیں تھی تم اتنی جلدی بہک جاؤ گے۔ اتنا کیا کم ہے کہ وہ ہمارے اتنا نزدیک
ہے۔ تمہیں آج کیا سوجھی تھی کہ اس حسین شام کے رومان کو غمناک رات میں بدل ڈالا۔
وہ بہت آزاد خیال لڑکی ہے۔ لیکن کوئی لڑکی ایک خاص حد سے آگے بڑھنا پسند
نہیں کرتی۔"
"مجھے کیا علم تھا کہ وہ یوں ڈر جائے گی۔ میں نے تو پُراسرار ماحول کی مطابقت
سے مافوق الفطرت باتوں کا ذکر چھیڑ دیا۔ میرا خیال تھا وہ ایسی باتوں میں دلچسپی
لیتی ہے۔"
"تمہیں کیسے معلوم ہے؟"
"ایک دن کی بات ہے منوہن! روپا پروفیسر امرت لال کے پاس لیبارٹری میں
بیٹھی ان کی باتوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ میں دبے پاؤں اندر چلا گیا اور یہی وہ فقرہ تھا جو میں
نے دروازے پر کھڑے کھڑے سنا۔"
"کیا کہہ رہے ہو اقبال! یہ بگلا بھگت بڈھا روپا کو لئے بیٹھا تھا۔ وہ دہلی
جیسی جگہ سے یہاں چندی گڑھ تعلیم کے لئے آئی ہے۔ کتنے اعلیٰ خاندان کی لڑکی ہے۔ کیوں اُسے
بدنام کرتے ہو اقبال" منوہن اُٹھ کھڑا ہوا۔
"میں اسے بدنام نہیں کرنا چاہتا۔ میں نے اور بھی بہت کچھ سنا ہے۔ میں کسی
پر اعتبار نہیں کر سکتا لیکن جو کچھ میں نے اپنے کانوں سے سنا اس کی تصدیق کیلئے
میں نے آج وہ فقرے دوہرائے۔ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میرے کان دھوکا نہیں
کھا رہے تھے۔ اسی طرح اور جو کچھ میں نے سنا ہے وہ بھی درست ہو گا منوہن۔"
"میں نے تو ہمیشہ امرت لال کو ایک بزرگ صورت سیدھا سادہ انسان سمجھا
ہے جو اپنے حال میں مست ہے جسے طلبا پریشان کیا کرتے ہیں تو وہ بُرا نہیں مانتا۔
جلد کہو اور کیا سنا ہے تم نے؟"
"میں نے اُس دن کے بعد امرت لال اور روپا کے تعلقات کے بارے میں
سراغ لگانے کی کوشش شروع کر دی۔ لیبارٹری اسسٹنٹ کرتار سنگھ نے مجھے
بتایا کہ ہم جس شخص کو سادہ لوح سمجھ کر پریشان کیا کرتے ہیں وہ ایسا نہیں ہے۔ وہ روپا
پر ڈورے ڈال رہا ہے۔ کچھ دن ہوئے روپا اُس کے کمرے میں آئی۔ وہ کھانا کھانے
کے لئے ٹفن کیریر میز پر رکھ کر پروفیسر کرجی سے بات کرنے اُس کے کمرے میں گیا تھا۔
روپا کہنے لگی مجھے بہت بھوک لگی ہے میں دروازہ بند کر کے کچھ کھا لوں تم امرت سے
کہنا نہیں۔
لیکن چند منٹ بعد ہی کمرے سے زور کی چیخ بلند ہوئی۔ میں کھڑکی کی راہ
سے اندر لپکا۔ لیکن خوف سے میرا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ ٹفن کیریر کھلا رکھا
تھا۔ روپا سنگِ مرمر کی مورتی کی مانند فرش پہ بے ہوش پڑی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں
شور کرتا امرت لال آ گیا۔ اُس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ٹفن کیریر کے ایک ڈبے
میں رکھی انسانی کھوپڑی جھٹ سے دراز میں چھپا دی۔ مجھے کمرے سے باہر نکال دیا
اور کچھ دیر بعد میں نے دیکھا روپا امرت لال کے سامنے بیٹھی اُس کے ساتھ کھانا کھا رہی
تھی۔ اب بھی وہ دن میں کم از کم ایک بار روز اُس سے ملتی ہے" اقبال نے بڑے
رازدارانہ لہجہ میں کہا۔
"لیکن اُس نے ہمیں کبھی کوئی بات نہیں بتائی" منوہن کی حیرانی بڑھتی
جا رہی تھی۔
"میں نے آج بوٹنگ کا لطف ضرور کرکرا کر دیا ہے لیکن میں مجبور تھا میں
کئی دن سے اُس سے یہ بات کہنا چاہتا تھا۔"
"مطلب؟" منوہن نے حیرانی سے پوچھا۔
"مطلب یہ کہ میں دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ میں آج یہ اعتراف کرتا ہوں کہ
مجھے اُس سے محبت ہے۔ میں نے بیشک آپ لوگوں سے یہ بات چھپائے رکھی لیکن اس
میں میرا کچھ اختیار نہیں تھا۔ خود روپا بھی میری طرف جھکتی چلی گئی اور اگر آپ ناراض نہ
ہوں تو میں کہوں گا کہ اگر ہم دن میں ایک دو بار مل نہ لیں تو ہمیں چین نہیں آتا۔ لیکن
اُس نے میرے لبوں پر مہرِ خاموشی لگا رکھی ہے اور مجھ سے وعدہ لے رکھا ہے کہ میں اس
برس کے آخر تک یہ راز کسی پر افشا نہ ہونے دوں گا۔ لیکن امرت کے ساتھ اس کے

[illegible] ہوتے اندر ایک آگ جل رہی ہے۔ ایک نادیدہ آنک سے جو
مجھ کو [illegible] لیے رہتی ہے۔ لیکن وہ جب مجھے ملتی ہے اُس کے پیار کی گرمی میں
پہلے سی تپش نہیں ہوتی اور میں ہزار کوشش کے باوجود اُس سے دل کی
بات نہیں کہہ سکتا۔ مجھے [illegible] کے لئے معاف کرنا منوہن! لیکن میں اس عذاب
سے نکلنے کے لئے کوئی راستہ نہیں پا رہا تھا۔" اقبال کی بات سن کر منوہن نے سر
جھکا لیا۔ پھر اقبال کے کاندھے پر بازو ڈالتے ہوئے قدرے بلند آواز میں بولا جیسے
اُس نے اقبال کا جرم معاف کر دیا ہو۔

"آؤ اب ہوسٹل چلیں۔ صبح رشی کو بُلا کر بات کریں گے۔"

لیکن صبح رشی خود ہی اُن کے کمرے میں چلا آیا۔ اُس کے بال پریشان تھے۔ آنکھیں رات بھر جاگتے رہنے کی غماز تھیں۔ وہ بے دم سا ہو کر آرام کرسی پر لیٹ گیا اور پھر اقبال کو مخاطب کر کے بولا۔ "اقبال! تم نے رات رُوپا سے کیا کہہ دیا تھا کہ میرے لئے تو ایک مصیبت کھڑی ہو گئی۔ میں نے راستے میں اُسے بہلانے کی بہت کوشش کی لیکن اُس کی حالت دِگرگوں ہوتی گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ یادوں کے گہرے غار میں اُترتی چلی جا رہی ہو۔ یہاں تک کہ اُس نے میری باتوں کا جواب دینا بند کر دیا۔ میں گھبرا گیا۔ اُس کے جسم کو چھوا تو وہ محض گوشت اور ہڈیوں کا ڈھیر تھا جس سے روح پرواز کر چکی تھی۔ میں نے ایک نل سے اُس کے منہ میں پانی ڈالا لیکن پتھر کب پانی پیتے ہیں۔ میں اُسے اِس حالت میں ہوسٹل نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ کسی ڈاکٹر کو ملنے سے ڈرتا تھا۔ آخر بیس سیکٹر میں گورودت کے مکان کی جانب رکشا موڑا۔ میں نے رُوپا کو دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا۔ جب ہم ٹیگور تھیٹر کے قریب سے گزر رہے تھے تو رُوپا نے سر کو زور سے جھٹکا اور اُس کے پریشان بال میرے چہرے پر پھیل گئے اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اُس کی روح جسم میں واپس آ گئی ہے جیسے مداری کے خالی تھیلے میں پھر گولہ لوٹ آیا ہو۔ میں نے ڈر کر اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔ اُس نے مجھے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور پوچھنے لگی میں کہاں ہوں۔ یہ شہنائیاں کیسی ہیں۔ تم کہاں تھے۔ یہ چاندنی پھر کہاں۔ وہ چاند کہاں ہے۔ مجھے ہوسٹل پہنچا دو مجھے پریکٹیکل کی تیاری کرنی ہے۔"

میں اُسے اُس کے کمرے میں چھوڑ آیا لیکن خود سو نہ سکا۔ رُوپا ضرور کسی جن کے سائے میں ہے۔ اِس سے زیادہ میری عقل کام نہیں کرتی۔ میں رات رُوپا کو جس ملازمہ کے سپرد کر کے آیا تھا وہ ابھی ابھی مجھے ملی تھی۔ کہتی تھی رات وہ آرام سے سوئی۔ ورنہ پہلے کئی بار ایسا ہوا ہے کہ آدھی رات کو میں نے اُس کے کمرے کی بتی جلتی ہوئی دیکھی ہے۔ [illegible] مطالعہ کے لئے اُٹھتی ہے لیکن یہی آدھ پون گھنٹے بعد بتی گل ہو جاتی۔ [illegible] دروازے کے شور [illegible] سے جھانکا تو اُس کا لباس نیچے گرا پڑا تھا اور وہ زانو پر سر رکھے بے سُدھ بیٹھی تھی۔ تھوڑی دیر بعد بتی بجھ گئی۔ میں کچھ نہ سمجھ سکی اِس کا کیا مطلب ہے اور روز ایسا کیوں ہوتا ہے؟"

معاملہ زیادہ پُراسرار اور پیچیدہ ہو گیا۔ چائے [illegible] رکھی سرد ہو گئی اور وہ تینوں خاموش بیٹھے واقعات کی کڑیاں ملاتے رہے۔

"اقبال! مجھے رُوپا کا مرض نفسیاتی نوعیت کا معلوم ہوتا ہے۔ کیوں نہ سائیکالوجی کے پروفیسر ڈاکٹر ناگ سے مشورہ کیا جائے" رشی نے تجویز پیش کی۔

"لیکن جب تک مریض خود اپنے مرض کا ذکر نہ کرے ہم اُسے کیسے لے جا سکتے ہیں۔ بظاہر اُس میں کوئی نقص نظر نہیں آتا۔ کالج آتی ہے۔ بیڈمنٹن کھیلتی ہے۔ کل میرے ساتھ میٹنی شو میں گئی تھی۔ خود ہی راستے میں یہ انگوٹھی پسند کی اُس پر میرا نام لکھوایا۔ مجھے کسی قسم کے مرض کا شک نہیں۔"

"لیکن تم نے اُس سے کسی بات کا ذکر وہاں بھی کیا تھا؟" منوہن نے پوچھا۔

"میں یہ نادانی کیوں کرتا۔ کیوں خواہ مخواہ اُس میں ایک شک پیدا کر دیتا۔ آج تو رشی نے جنگل میں پریوں کا ذکر کیا اور میں نے دل کی بات کہہ دی۔"

"رشی! تمہاری تجویز درست ہے لیکن ڈاکٹر ناگ سے ملنے سے پہلے میں امرت لال سے بات کر کے معاملے کی تہہ تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ نہ جانے رُوپا کس اُلجھن میں گرفتار ہے۔"

اور جب منوہن پروفیسر امرت لال سے ملنے اُس کے کمرے میں گیا تو رُوپا وہاں سے نکل رہی تھی۔ وہ سخت گھبرائی ہوئی تھی۔ سفید چُست لباس میں وہ سنگ مرمر کی کسی شاعر کا خواب معلوم ہو رہی تھی۔

"رُوپا تم کہاں؟" منوہن نے حیرت سے پوچھا۔

"پریکٹیکل کا کچھ سامان تھا واپس کرنے آئی تھی۔" اور اِس سے پہلے کہ وہ کوئی اور بات کرتا وہ برآمدہ پار کر چکی تھی۔ منوہن کو اقبال کی باتیں وزنی معلوم ہونے لگیں۔

جب منوہن کمرے میں داخل ہوا تو پروفیسر امرت پنسل سے رُوپا کی ایک نیم عریاں تصویر بنا رہا تھا جو اُس نے جھٹ اُلٹ دی۔ دونوں کچھ لمحات گومگو کی حالت میں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے رہے۔

"فرمایئے آپ کو کیا چاہیئے؟" پروفیسر امرت نے اپنے حواس پر قابو پا کر کاغذ تہہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں لیبارٹری کے کام سے نہیں آیا۔ میں صرف یہ پوچھنے آیا ہوں کہ رُوپا کا آپ سے کیا تعلق ہے؟" منوہن نے بات مختصر کرتے ہوئے کہا۔ امرت لال کا چہرہ ایک دم سُرخ ہو گیا اور وہ بولا۔

- جب تک کام جب تک شخصیت کے کم بولنا ہے۔ (حکیم ارسطاطالیس)
- بہت زیادہ گوئی خواہ وہ اچھی باتیں ہوں ضعفِ عقل کی دلیل ہے۔
(حکیم ارسطاطالیس)
- محض بڑا ہونے سے کیا ہوتا ہے جب تک فیض نہ ہو۔ تاڑ کو دیکھو مسافر کو سایہ
نہ پھل اور پھل بہت دور! (ہندی ادب)
- جو واقعی بڑے ہیں وہ بڑا بول نہیں بولتے۔ ہیرا کب اپنے منہ سے کہتا
ہے کہ میں بڑا ہوں۔ (ہندی ادب)

"اگر جواب دینے کی بجائے میں آپ سے پوچھوں کہ آپ کا اُس سے کیا
تعلق ہے تو؟"

"وہ میرے دوست کی ہونے والی بیوی ہے۔"

"کون سے دوست کی؟ اقبال سنگھ؟ دنیش یا خود تمہاری؟ شاید یہاں کی
بتوں کے غیر ملکی ڈیزائنوں کی مانند من کا مندر بھی فرانسیسی فنِ تعمیر کے نمونے پر ڈھل
چکا ہے جس میں تقدس کی ایک مورتی کی بجائے چہار اطراف سے ناپاکیزگی کی خاک
اُڑتی ہے!" امرت کے قہقہے میں گہرا طنز پنہاں تھا۔

"یہ جھوٹ ہے، تہمت ہے، سراسر بہتان ہے پروفیسر صاحب! آپ کو اپنی
معصوم طالبہ کے بارے میں ایسا کہتے ہوئے شرم آنی چاہئے۔ آپ اُسے کیوں روز اپنے
کمرے میں بلاتے ہیں اور اپنی تصویروں کا ماڈل بناتے ہیں۔ پھر پُراسرار باتوں سے اُسے
پریشان کرنے کا مطلب؟ ذرا آئینہ دیکھئے اور سوچئے کہ کون سے عاشقوں کی پیاسی
روحیں دوشیزاؤں کے گرد منڈلایا کرتی ہیں۔ اُس کے والد نے یہاں اُس کی
حفاظت اور آرام کی ذمہ داری مجھے سونپ رکھی ہے اور میں آپ سے پوچھنے کا حق رکھتا
ہوں کہ آپ کو اُس سے یہ سلوک کرنے کا کیا حق ہے۔ آپ کا اُس سے کیا تعلق ہے؟"
منوہن نے خشمگیں لہجے میں کہا۔

"دیکھو مسٹر! تمھیں میرے رُوپا سے تعلقات کے بارے میں پوچھنے کا کوئی حق
نہیں، پھر بھی میں تمھیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ رُوپا میری بیوی ہے۔ اگر اعتبار نہ ہو تو تم
آج رات نو بجے میرے مکان پر آکر دیکھ سکتے ہو۔" کہتے ہوئے امرت لال کمرے
سے نکل گیا اور منوہن ایک مارگزیدہ مُسافر کی مانند وہیں سر پکڑے بیٹھا رہا۔

رات کو نو بجے ہوا میں خنکی کا عنصر بڑھ گیا تھا۔ راجدھانی کے سکوت کو کہیں
کہیں کوئی موٹر رکشا توڑ دیتا تھا۔

پروفیسر امرت برآمدے میں کھڑا ٹہل رہا تھا۔ اُس نے ایک لمبا سیاہ کوٹ اور
سیاہ پگڑی پہن رکھی تھی۔

"اندر چلے آیئے منوہن بابو۔"

منوہن پہلے تو اُسے پہچان نہ سکا، پھر جھجکتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ دروازوں
اور کھڑکیوں کے شیشوں پر سیاہ رنگ کیا گیا تھا۔ کمرے کے اندر بھی کوئی زیادہ
روشنی نہیں تھی۔ منوہن ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"آپ کیا پئیں گے۔ چائے یا دودھ؟" پروفیسر امرت نے پوچھا۔

"میں چائے پینے نہیں آیا۔ صرف آپ کے قول کی تصدیق کرنے آیا ہوں۔ اگر یہ
صحیح ہے تو رُوپا کہاں ہے؟"

"اطمینان رکھو نوجوان میں تمھیں سب کچھ دکھا دوں گا لیکن مجھے مہمان نوازی کا
فرض تو ادا کرنے دو۔ لو یہ بسکٹ تو کھاؤ۔" پروفیسر نے الماری سے طشتری اُٹھا کر
تپائی پر رکھ دی۔

"آپ مجھے بے ہوش تو نہیں کرنا چاہتے؟" منوہن نے کمرے کا جائزہ لیتے
ہوئے کہا۔

"دھوکہ بازی میری عادت نہیں۔ تم لوگوں نے میری سادگی کا ناجائز فائدہ
اُٹھایا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ رُوپا میرے اتنا قریب ہے اُسے پھسلانے کی کوشش
کی ہے۔"

"یہ جھوٹ ہے! اِس کا ثبوت؟" منوہن نے بلند آواز میں کہا۔

"ثبوت تم دیکھ نہیں سکو گے۔" اور وہ دیوار سے لٹکی ہوئی رسّی کو کھینچنے لگا۔ کمرے
میں یوں آواز گونجی جیسے کانسی کا تھال پتھر کے فرش پر گرا ہو۔ دیوار سے سیاہ پردہ
ہٹ گیا۔ منوہن پر منظر کی ہیبت طاری ہو گئی۔ دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی سفید میز پر
نیلی آنکھوں والی ایک سیاہ بلی بیٹھی تھی۔ اس کے قریب ہی ایک چوکھٹے پر ایک کھوپڑی
رکھی تھی جس کی آنکھوں کے گڑھے بہت سیاہ تھے۔ اِن دونوں کے سامنے ایک ڈبے پر
شمعدان رکھا تھا۔ بلی ٹکٹکی باندھے منوہن کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"ڈرو نہیں مسٹر! یہ تمھیں پہچاننے کی کوشش کر رہی ہے۔" یہ کہتے ہوئے امرت لال
نے ڈبے میں سے سُرخ رنگ کا پاؤڈر اپنے چہرے پر مل لیا اور پھر ایک سلائی سے کھوپڑی
کی آنکھوں میں سے سُرمہ اپنی آنکھوں میں ڈال لیا۔

"پروفیسر! یہ کیا ہے؟" منوہن نے ایک سحر زدہ شخص کی مانند حیرت سے پوچھا۔

"اگر تم بھی جو کچھ تم دیکھنا چاہتے ہو دیکھنے آئے ہو تو تمھیں بھی یہی کچھ کرنا ہو گا۔
اِدھر آؤ۔"

منوہن سخت گھبراہٹ کی حالت میں اُٹھا اور آنکھوں میں اَنجن لگا کر واپس کرسی
پر آ گیا۔ وہ اپنے آپ کو پروفیسر کے شکنجے میں محسوس کر رہا تھا۔

پروفیسر امرت نے میز کی دراز میں سے شیشے کی ایک چھڑی نکالی جس کے اندر چینے

تھی کہ ایک کریہہ شکل کی شمع دان جیسا کھوپڑی کو اس پر رکھ دیا۔ اُس کے سامنے
کئی کنول سے رکھ دیا۔ اور خود چھڑی کو کھوپڑی کے گرد گھماتا ہوا منتر پڑھنے
لگا۔ پھر منتر پڑھتے ہوئے کچھ بڑبڑانے لگا۔

"بم بھولا شوب بم بھولا۔ بم بھولا شوب بم بھولا!
بھیجو موہنی کو بھیجو!!"

پروفیسر کی آواز اونچی ہوتی جا رہی تھی۔ منوہن نے دیکھا کھوپڑی کی آنکھوں کے گڑھوں میں منتروں کی آواز کے ساتھ ساتھ سُرخ روشنی ہونے لگی۔ جو زرد ہو کر نیلی ہو گئی۔ اب امرت منتر پڑھتے ہوئے پوڈر کھوپڑی پر چھڑکنے لگا اور کھوپڑی میز سے اُٹھنے لگی۔ گندھک کی آگ کا سا نیلا دھواں کھوپڑی میں سے نکل کر پھیلنے لگا۔ امرت کانسی کے تھال پر چھڑی کی ضرب لگا رہا تھا۔ یکایک بلی چیخنے لگی۔ منوہن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ہاتھ پاؤں کانپنے لگے اور اس نے دیکھا کہ نیلے دھوئیں میں ایک عورت کی تصویر صاف دکھائی دے رہی تھی جس نے سفید چادر سے جسم ڈھانپ رکھا تھا اور جس کے لمبے بال چاروں طرف پریشان تھے۔

"موہنی... بشکنتلا کو بلاؤ!" پروفیسر امرت نے اونچی آواز میں حکم دیا۔ تصویر غائب ہو گئی۔ اور دو ہی لمحے بعد دھوئیں میں ایک اور تصویر انسانی پیکر میں دکھائی دینے لگی۔ بلی زور زور سے چیخنے لگی۔ منوہن کو اپنی آنکھوں پر دھوکہ ہونے لگا۔ جس میز پر کھوپڑی رکھی تھی اب وہاں روپا اپنے جمال کی پوری رعنائیوں کے ساتھ کھڑی اپنی لمبی چوٹی کو بل دے رہی تھی۔ شب خوابی کے سفید لباس میں وہ چاند دیش کی کوئی دیوی معلوم ہوتی تھی۔

"کہو کیسی ہو؟" پروفیسر امرت نے چھڑی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
روپا نے ہاتھ اٹھا کر ایک توبہ شکن انگڑائی لی جیسے نسیم سحری کے ریشمی لمس سے کوئی کلی چٹک رہی ہو اور بولی: "اچھی ہوں۔"
"میں نے تمھیں کہا تھا مجھے گلاب کے پھول پسند ہیں۔"
"یاد رکھو کسی اور کے پیچھے مت جانا، بس کہے!" روپا نے بالوں کی پُشت سے گلاب کا پھول نکال کر انگلیوں میں پکڑ لیا اور مسکرانے لگی۔
"تم آج جلد سو گئیں؟"
"میں کچھ تھکی تھکی سی ہوں۔ لیکن آج یہاں یہ اجنبی آنکھیں کس کی ہیں؟"
"یہ میرے ایک دوست ہیں جو پوچھنا چاہتے ہیں میرا تم سے کیا تعلق ہے؟"
"تم کیسی باتیں کرتے ہو۔ وہی جو مالک اور خادم کا ہوتا ہے۔ تم کب تک میرا امتحان لیتے رہو گے۔ مجھے اپنی ذات میں جذب ہونے کی اجازت دو۔ مجھے دور کر دو۔ امرت تم مجھے امرت کا یہ پیالہ ہونٹوں سے لگا لینے دو۔ میں تمہاری ہوں اور

- بہادر کا بڑا درجہ ہے خواہ وہ غازی ہو یا شہید، فاتح ہو یا مفتوح۔ بس دشمن کو پیٹھ نہ دکھائی ہو۔ (گرونانک جی)
- جو لوگ اچھے کام کرتے ہیں وہی شریف و افضل ہیں جو بدکردار ہیں وہی کمینے اور رذیل ہیں۔ (گرونانک جی)
- دیکھنے میں چاہے پچاس کروڑ میل کے دور دراز سفر کو کرنا پڑتا ہو گی سے پورا کرتی ہے اور اس میں مقررہ وقت سے ایک سکنڈ تو کیا ایک سکنڈ کے دسویں حصہ کی کمی بیشی نہیں ہوتی۔ (ایڈورڈ ایورٹ)

ہمیشہ تمہاری رہوں گی!" لڑکی نے یہ کہتے ہوئے پلکیں جھکا لیں اور بازو ڈھیلے چھوڑ دیے۔

"تمہیں نیند آ رہی ہے شاید۔ جاؤ سو جاؤ۔" اور امرت پھر منتر پڑھتے ہوئے شیشے کی چھڑی گھمانے لگا۔ کانسی کا تھال فرش پر گرنے سے ڈراؤنی آواز پیدا ہوئی۔ بلی پھر چیخنے لگی۔ نیلا دھواں کھوپڑی کی آنکھوں میں واپس داخل ہونے لگا اور میز پر کھڑی روپا کا جسم دھوئیں میں تحلیل ہونے لگا۔ کھوپڑی کی آنکھیں پھر سیاہ ہو گئیں اور سارے منظر پر سیاہی چھا گئی۔

منوہن پسینے میں تر نیم جاں کرسی میں دھنسا رہا۔
"پروفیسر! یہ کیا تھا؟ مجھے پانی کا ایک گلاس دو۔ میرا دل ڈوب رہا ہے۔"
"گھبراؤ نہیں! آؤ منہ ہاتھ دھو لو میں تمھیں سب بتاؤں گا۔"
تھوڑی دیر بعد منوہن امرت لال کے سامنے میز پر بیٹھا واقعات کی کڑیاں ملا رہا تھا۔

"تم روپا کو شکنتلا کے نام سے کیوں پکارتے رہے۔ یہ کہاں سے آئی اور کہاں چلی گئی۔ صاف صاف کہو۔ میں تمہاری ہر بات قبول کرنے کو تیار ہوں۔"
"اگر سچ جاننا چاہتے ہو تو سُنو! اس لڑکی کا اصلی نام شکنتلا ہے۔ یہ لو اُس کی دستخط شدہ تصویر۔ لو یہ اس کے میرے نام خطوط۔ ہم دونوں کی اکٹھی تصویر! کیا اب بھی تمھیں میرے اور اُس کے تعلقات کے بارے میں کوئی شک ہے؟ ہم دونوں ملنے کے لئے بے قرار ہیں لیکن کسی غیبی طاقت نے ہمیں جُدا کر رکھا ہے۔" امرت نے کئی خطوط اور تصویریں میز پر بکھیرتے ہوئے کہا۔
منوہن کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ گلے سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔
"لیکن پروفیسر! ان پر ۱۹۴۳ء کی تاریخ ہے۔ خدا کے لئے یہ بھید بتاؤ میں پاگل ہو جاؤں گا۔" منوہن نے ہتھیار ڈال دیے۔

"منوہر یہ ایک لڑکی شکنتلا کی روح تھی جو اپنے موجودہ خاکی لباس میں ہے"

"لیکن یہ شکنتلا کون ہے؟"

"منوہر تو شکنتلا اسی طرح میری ہم جماعت تھی جس طرح رُوپا تمہاری۔ ہمارا جسمانی بندشوں سے بلند اُٹھ کر روحانی محبت میں تبدیل ہو گیا تھا۔ جدائی پل بھر کی تھی لیکن شکنتلا کے باپ کو مجھ سے نفرت تھی۔ وہ مجھے ہلاک کر دینا چاہتا تھا شکنتلا میری شعاع بنی ہوئی تھی۔ ایک دن میں لیبارٹری میں کام کر رہا تھا شکنتلا ہوئی تھی۔ وہ بے حد اُداس تھی۔ باتوں باتوں میں اس نے ایک مہلک زہر نکال لیا اور چند لمحے بعد ایک بے جان سرد نیلا ہاتھ میرے ہاتھ میں رہ گیا۔ جیسے پھر ملیں گے خدا حافظ!

"منوہر!" بات کرتے کرتے پروفیسر امرت کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ "اگر میرے بس میں ہوتا تو میں اس کی لاش کو محفوظ کر کے رکھ لیتا۔ میں اسے سپردِ آتش نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں لاش لے کر روپوش ہو گیا۔ اور کسی گمنام مقام پر اُسے دفنا دیا۔ گھر چھوڑ دیا۔ نام بدل لیا اور در در کی خاک چھانتا رہا۔ میز پر رکھی یہ کھوپڑی شکنتلا کی ہے۔"

"لیکن اس کھوپڑی کا رُوپا سے کیا تعلق ہے؟" منوہر نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔

"مجھے یقین تھا شکنتلا پھر آئے گی۔ اس کی پیاسی روح کبھی قرار نہ پا سکے گی۔ اسلئے میں روحوں کو بلانے کا فن سیکھنے لگا۔ لوگ مجھے جاہل وحشی اور نہ جانے کیا کیا کہتے رہے۔ لیکن بالآخر مجھے ایک سنیاسی سے روحیں بلانے کا عمل آ گیا اور اس دن سے یہ کھوپڑی میری حیات ہے۔ اس کے ذریعے مجھے پتہ چلا شکنتلا کہاں ہے۔ میں گڑگاؤں کے اس مکان میں لینے گیا تھا۔ بالکل وہی ناک نقشہ۔ ہو بہو شکنتلا! میں نے بے اختیار اُسے گلے سے لگا لینا چاہا لیکن وہ جھجک کر ایک طرف ہٹ گئی۔ میری ہی امداد اور مشورے سے اس نے چنڈی گڑھ میں داخلہ لیا۔ رُوپا میری راحتِ جاں۔ میرا سکونِ قلب ہے۔ میں دن بھر اسے دیکھ کر زندہ رہتا ہوں۔ رات کو جب تنہائی ستم ڈھاتی ہے تو اس کی روح کو بلا کر خانہ آباد کر لیتا ہوں۔ کیا آپ لوگ میرا سکون چھیننا چاہتے ہیں۔ کیا آپ چاہتے ہیں میں پھر خاک بسر گلی گلی گھومتا رہوں؟" امرت نے پگڑی اُتار دی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

منوہر میز کی چمکدار سطح میں اپنے چہرے کو بغور دیکھ رہا تھا جس پر گھبراہٹ اور پریشانی کے نشانات عیاں تھے۔ وہ جانفشانی پر زور دیتے ہوئے بولا "مجھے آپ سے ہمدردی ہے پروفیسر صاحب لیکن کیا آپ اس طرح رُوپا کو حاصل کر لیں گے؟"

"کیوں نہیں۔ آپ نے دیکھا نہیں وہ میرے کتنا قریب ہے۔ ایک دن وہ اور میں ایک ہو جائیں گے۔ شکنتلا کی بے چین روح کو سکون حاصل ہوگا وہ امرت کے پیالے میں اپنے پیاسے ہونٹ رکھ دے گی۔"

"لیکن ایک نوخیز کلی کو ایک بوسیدہ گلدان میں سجانے سے فائدہ؟" منوہر نے جرأت کا اظہار کیا۔

"مسٹر منوہر! یہ محبت ہے اور محبت میں عمر کا فرق کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ روح امر ہے۔ جب محبت جسمانی بندشوں سے آزاد ہو جاتی ہے تو تمام غیر حقیقی پردے سامنے سے ہٹ جاتے ہیں۔"

"لیکن اگر ایسا نہ ہو سکا تو؟" منوہر نے پروفیسر امرت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔

"کیسے! کیوں!!" امرت لال مٹھیاں بھینچتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا "اب اگر کسی نے میری راہ میں حائل ہونے کی کوشش کی تو میں دنیا سے ٹکرا جاؤں گا۔ اب میں اُسے اپنے سے جُدا نہ ہونے دوں گا۔ اگر پھر کسی نے میرے دل پر وار کیا تو میں اس پر زندگی حرام کر دوں گا! میں عین اس وقت رُوپا کی روح قبض کر لوں گا جب وہ اس غاصب کی گود میں ہو۔ اِس سے پہلے کہ کسی کے آتشیں سانس رُوپا کے ہونٹوں کی پنکھڑیوں کو جھلسنے کے لئے آگے بڑھیں اس کے بازوؤں میں گلاب کی ڈالی رُوپا نہیں اس کی لاش ہوگی!! میرے ارمانوں کی قبر پر کوئی اپنی عشرتوں کے چراغ نہیں جلا سکے گا" اور امرت لال اُداسی اور بے چینی کے عالم میں کمرے میں ٹہلنے لگا۔

منوہر پروفیسر امرت کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا پھر میز پر رکھی ہوئی تصویروں کو اُلٹتے ہوئے بولا "پروفیسر صاحب! آپ پریشان نہ ہوں۔ مجھے تو صرف یہی عرض کرنا تھا کہ میرے دوست کو رُوپا سے جنون کی حد تک محبت ہے۔ وہ رُوپا کے بغیر زندہ نہیں رہ سکے گا۔ لیکن آپ نے جو کچھ مجھے دکھایا اور بتایا اُسے دیکھتے ہوئے میں آپ کے جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا۔ میں اقبال کی محبت کے لئے آپ کی حسرتوں کا خون نہیں دیکھ سکتا۔ اقبال یہ زخم برداشت کر سکتا ہے لیکن عمر کے اس حصے میں شاید یہ چوٹ آپ کے لئے ناقابلِ برداشت ہو۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ رُوپا اگر آپ کے اتنا نزدیک ہے تو وہ اقبال کو روک کیوں نہیں دیتی اُسے بے وقوف کیوں بنا رہی ہے۔ میں آپ کا حامی ہوں مجھے خوشی ہوگی اگر دو بھٹکی ہوئی روحیں پھر مل جائیں۔ آپ رُوپا سے کہیں کہ وہ اقبال کو اس راہ سے ہٹا دے۔"

"لیکن منوہر آپ جیسوں میں بات کا علم ہے۔ تم ہی اپنے دوست سے کہہ دو کہ وہ میرے راستے میں کانٹے نہ بکھیرے۔ مجھے بھٹکا راہ نہ دکھائے۔ مجھے میرا گوہرِ مقصود حاصل کر لینے دے۔ وہ میرے بچوں کے برابر ہے۔ اُسے کہو مجھ پر رحم کرے۔" پروفیسر امرت نے التجا سا

...[illegible] آنکھوں سے ٹپک پڑے۔

[illegible] کی حالت دیکھ کر مفوس کا دل پسیج گیا۔ وہ کرسی کی پشت پر جھکا [illegible] صاحب میں اپنی شکست قبول کرتا ہوں۔ آپ اطمینان رکھیں۔ اقبال [illegible] ہو گا۔ رُوپا آپ کی تھی آپ کی ہے اور آپ ہی کی رہے گی اور [illegible] ہے گا۔"

[illegible] ٹھنڈی سانس لی۔ اور اپنے لمبے چغے کی جیب سے پستول [illegible] "یہ کام اور بھی کردو میرے محسن!"

[illegible] سے کانپتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔

"مجھے گولی مار دو۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ رُوپا کو مجھ سے نفرت ہے۔ وہ کل شام یہ پستول لے کر مجھے ہلاک کرنے آئی تھی۔ میں نے اُس کے مرمریں ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تو وہ یوں تڑپ کر الگ ہو گئی جیسے کسی بچے کو کسی بوڑھے ناگ نے کاٹ کھایا ہو۔ اور وہ چیختی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔"

"مجھ سے میری زندگی نہ چھینو پروفیسر!"

پروفیسر لمرت پر مجنونانہ حالت طاری ہو گئی۔ اُس نے خود ہی پستول اُٹھا لیا اور سیاہ چغے پر اندھا دھند گولیاں چلاتا ہوا بولا۔ "مجھے اُس کی روح پر اختیار ہے دل پر نہیں۔ بلقان [illegible] دو کہ میرا پیار دو نوجوان دلوں کے پیار میں حائل نہ ہوگا۔" اور پروفیسر نیم مُردہ حالت میں میز پر سر رکھ کر بیٹھ گیا۔

پردے کے پیچھے سے رُوپا کی دلدوز چیخ سنائی دی اور خون کی لکیر فرش پر آہستہ آہستہ رینگنے لگی۔

غزل

[illegible] منشاء الرحمٰن خاں منشاؔ ایم۔ اے

پیار کی تم سے اِلتجا کی ہے
دل نے کتنی حسین خطا کی ہے

ظلم جن دوستوں نے ڈھائے ہیں
ہم نے اُن کے لئے دعا کی ہے

اُن نگاہوں کو کیا کہیں قاتل
جن میں معصومیت بلا کی ہے

کوئی ایسے وفا بھی کیا کرتا
آپ نے جس طرح جفا کی ہے

زُلفِ ہستی سنوارنے کے لئے
ہم نے کوشش تو بارہا کی ہے

زندگانی سے ہاتھ دھو کر بھی
کرنے والوں نے یاں وفا کی ہے

اِس زمانے میں ہر کوئی منشاؔ
جانے کیوں زندگی کا شاکی ہے

غزل

حق حزیںؔ ایم۔ اے

اِسلئے عزیز اپنی مجھ کو زندگانی ہے
اُن کی بے وفائی کی اِک یہی نشانی ہے

تیرے دم قدم سے تو جانے حال کیا ہوگا
جب ترے تصور سے شامِ غم سُہانی ہے

دل کے زخمِ کہنہ کی تازگی نہیں جاتی
ٹیس آج کی سی ہے چوٹ گو پُرانی ہے

جیسے دولتِ کونین آگئی ہو دامن میں
دل کو اُن کا غم پاکر کتنی شادمانی ہے

عالمِ تغیّر میں کس کو معتبر کہیے
عشق بھی فسانہ ہے حُسن بھی کہانی ہے

دن خدا خدا کر کے کٹ گیا اگر تو کیا
خیر سے ابھی اے دل ابھی رات بھی تو آنی ہے

کیف مے بجا لیکن یہ بتا مجھے ساقی
آتی سرخوشی کب تھی جتنی سرگرانی ہے

سر ہوئیں سلامت ہے دوش پر حزیںؔ اب تک
کس کے آستاں پر اب قسمت آزمانی ہے

زکام کا مقابلہ کرنے کے لئے

واٹربیریز کمپاؤنڈ
لال لیبل
لیجئے

Waterbury's
Trade Mark
Compound
with
Creosote and Guaiacol

Splenic Extract (10:1) 13.5 ... Pancreatin N.F. 9 mg.; Iron & M... Peptonate 32.5 mg.; Creosote N.F. ... ml.; Guaiacol N.F. ... Sodium Benzoate B.P. 18 mg.; Sodium Iodide B.P. ... Potassium ... Malt Extract B.P. 1.65 g.; Alcohol ... 1.5 ml.; Flavoured with aqueous ... of Wild Cherry (1:6) 7 mg.; ... Yerba Santa (1:30) 1 mg.; ... Gentian (1:30) 1 mg.

ALCOHOL CONTENT 9.5% V/V

MADE IN INDIA BY
... PRIVATE LTD.,
... Rope Walk Lane, Bombay 1
Trade Mark "Waterbury's" owned by
STANDARD LABORATORIES INC., U.S.A.
Successors to Waterbury Chemical Co., Inc.

واٹربیریز کمپاؤنڈ میں موجود کریوسوٹ اور گیاشیک سانس کے نظام کو جراثیم سے پاک رکھتے ہیں اور بلغم خارج کر دیں، پھیپھڑے صاف رکھتے ہیں۔ کھانسی، زکام، سانس تکلیف و دمہ جیسی کیفیت کا مقابلہ کرنے میں مدد کرتے ہیں جراثیم کو دوبارہ پھیلنے سے روکتے ہیں۔
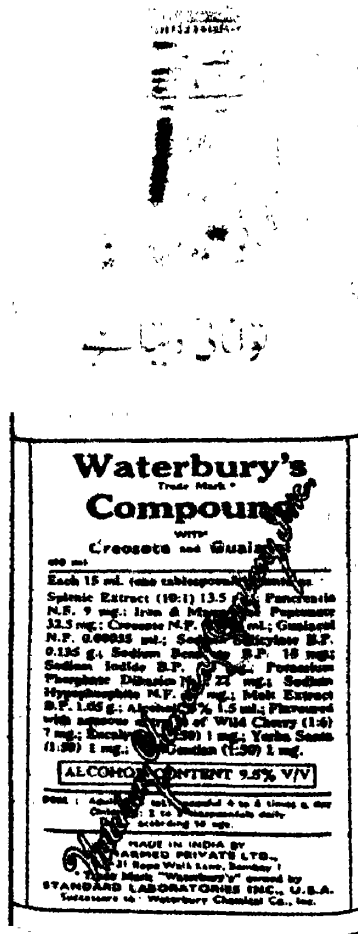
طور سے زکام کو معمولی بات سمجھا جاتا ہے لیکن اس سے سل کمزوری آجاتی ہے اور بیماری کا مقابلہ کرنے کی توانائی کم جاتی ہے۔ واٹربیریز کمپاؤنڈ بیک وقت تین طرح اثر کرتا ہے: آرام پہنچاتا ہے، طاقت بحال کرتا ہے اور ریوں کا مقابلہ کرتا ہے۔ اس کے موثر اجزاء کریوسوٹ اور یکول زکام میں آرام پہنچاتے ہیں، لوہا اور مقوی اجزاء نیز جو اور ل کے ست بھوک بڑھاتے ہیں، طاقت بحال کرتے ہیں راثیم کا مقابلہ کرنے والی توانائی پیدا کرتے ہیں جس سے ے کے پلٹنے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔

ہمیشہ بیماریوں کا مقابلہ کرنے والی توانائی برقرار رکھنے کے لئے لال لیبل والا واٹربیریز کمپاؤنڈ لیجئے۔

واٹربیریز کمپاؤنڈ
کھانسی، زکام، سانس کی تکلیف
دمہ جیسی کیفیت کا مقابلہ کرنے کی توانائی پیدا کرتا ہے

وارنر لیمبرٹ فارماسیوٹیکل کمپنی (محدود ذمہ داری کے ساتھ یو۔ایس۔اے میں تشکیل شدہ)

افسانہ

حنا کی خوشبو

ایم کوٹھیاوی راہی

قاضی پور خورد گورکھپور (یوپی)

۸ نومبر ۱۹۶۳ء

برادر محترم خوشتر صاحب! آداب

... یہ ایک تازہ ترین کہانی ہے۔ اُن زہرہ جبینوں کے لئے جن سے زندگی کو زخم ملے۔ درد ملا۔ رات اور اُمس کی خاموشں کراہیں ملیں۔ لیکن آپ دیکھیے اِس سے رات کی کنواری فضاؤں سے مہک اُٹھنے کا امکان ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو ایک تیرہ بخت کی طرف سے اُن زہرہ جبینوں کی نذر کر دیجیے جن کا ذکر اوپر کر چکا ہوں ...

آپ کا بھائی ـــــــ ایم کوٹھیاوی راہی

"شفق ڈوب رہی ہے"

"دیکھ رہی ہوں"

"سائے عنابی ہونے لگے ہیں"

"دیکھ رہی ہوں"

"اب کیسی ہو؟"

"اچھی ہوں"

"میں بھی اچھا ہوں"

"دیکھ رہی ہوں"

"ناراض ہو؟"

"نہیں"

"تو کچھ بات کیوں نہیں کرتیں؟"

"مرنا چاہتی ہوں"

"یہ تو کئی بار سن چکا ہوں"

"اور تم زندہ رہنا چاہتے ہو؟"

"ہاں"

"کس کے لئے؟"

"تمہارے لئے"

"میں تو مر جانا چاہتی ہوں"

"نہیں مرنے دوں گا"

"میں نے طے کر لیا ہے"

یہ کہہ کر رُوپ رو پڑی۔ سورج کا دل کانپ گیا۔

"کیا ہوا رُوپ؟"

"کل لوگ آنے والے ہیں"

"کون لوگ؟"

"پتاجی۔ ماں جی۔ دیدی، جیجا... مجھے یہاں سے لے جانے کے لئے ـــــ لے جا کر دوسروں کے حوالے کرنے کے لئے۔ روؤ تم بھی سورج! میں اِس لئے اچھی ہوئی ہوں کہ اپنے آپ سے چھین لی جاؤں؟ تم سے چھین لی جاؤں۔ چُپ کیوں ہو؟"

"اوں"

"بولتے کیوں نہیں؟"

"آں؟"

"کیا خیال ہے اب؟"

"کچھ نہیں"

"مر رہے ہو اب تم بھی نا؟"

"کیا کہوں؟"

آنکھیں

تیری پلکوں سے تھیں وابستہ امیدیں دل کی
آنکھ کیا تیری پھری پھر گئی جھاڑو دل میں ______ جلیل

محو ہیں اپنی جگہ آسودگانِ کوئے دوست
آرزو دل میں ہے دل آنکھوں میں آنکھیں محوِ دوست ______ شاد عظیم آبادی

کیا مصیبت ہے کھلے آنکھ تو رونا آئے
اور جھپکے تو وہی خواب پریشاں دیکھوں ______ مصحفی

پڑے ہم دیکھتے ہیں چپکے چپکے اپنی آنکھوں سے
نکلنا دم کا روزِ انتظار آہستہ آہستہ ______ جلال لکھنوی

مزا برسات کا چاہو تو ان آنکھوں میں آبیٹھو
سیاہی ہے سفیدی ہے شفق ہے ابرباراں ہے ______ نامعلوم

مرسلہ: نجمی رائے پوری۔ نیا ننگل

"سہارا دو۔ سہارا..."

رُوپ نے سر اُس کے شانے پر رکھ دیا۔

دونوں سسکنے لگے۔

شفق ڈوب گئی۔

فضا کے عناب سیاہ ہو گئے۔

ندی چپ چاپ بہتی رہی۔

سویرا اُداس تھا۔ آسمان اُداس۔ فضا اُداس۔ سینی ٹوریم اُداس۔ رُوپ کو پھر بخار آگیا تھا۔ اور مُنہ سے خون۔ ڈاکٹر نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

"آپ لوگ مایوس نہ ہوں۔ جلد ہی پھر ٹھیک ہو جائیں گی۔ ہفتے دو ہفتے میں تار دیا جائے گا۔"

"ہم ہفتہ دو ہفتہ یہیں رہ جائیں تو؟"

"کوئی حرج نہیں لیکن اس بستی میں کوئی اچھا ہوٹل نہیں ہے...!"

"کیا خیال ہے رُوپ کی ماں؟"

"جو آپ کی مرضی!"

گرجا کا یہ منظور نہ تھا۔ چھوٹا سا یہ کارواں رُوپ کو چھوڑ کر پھر واپس ہو گیا۔

کھنڈر میں موم بتی کی پیلی روشنی چمک رہی تھی۔ تارے آسمان پر چھائے ہوئے کہرے میں کانپ رہے تھے۔ سورج بے دم سا بیٹھا کینوس پر ایک یاس انگیز تصویر بنانے میں منہمک تھا۔ بملا کو نیند آگئی تھی۔

"میں آگئی سورج!"

"کون؟ رُوپ؟"

"ہاں۔"

"تم گئیں نہیں؟"

"نہیں تو۔"

"اس گھڑی تو خوب کھیل رہی ہو!"

"بخار جو پھر سے چڑھ آیا ہے!؟"

"اور گھر والے؟"

"آئے بھی گئے بھی۔ تم آج دن بھر سینی ٹوریم کی طرف نہیں آئے۔ چوکیدار کو پھر دو روپے رشوت دینی پڑی یہاں آنے کے لئے۔"

"چلو اچھا ہوا۔ اب کیا خیال ہے؟"

"اپنی کہو!"

"زندہ رہوں گا!"

"کس کے لئے؟"

"تمہارے لئے!"

"اور میں مر گئی تو؟"

"اب نہ تم مرو گی۔ نہ میں..."

دونوں ایک دوسرے میں کھو گئے۔

موم بتی جلتی رہی۔ روشنی کے پیلے پن پر سُرخی سی چھا گئی۔ کھنڈر کی ٹھنڈ دل کے نرم شعلوں میں دب گئی۔ رات کا غمناک پہلو بدل گیا۔ دونوں روحیں پیار کی معصوم فضا میں تحلیل ہونے لگیں۔

"لیکن یہ کب تک رُوپ؟"

"جب تک میں بیمار ہوں۔"

"اور تم اچھی ہو گئیں تو؟"

"میں اچھی نہیں ہوں گی۔ تمہارے لئے سورج تمہارے لئے [illegible]"

[illegible] جا گی ہوں۔ اپنے بس کی بات ہے ...؟

"مگر روپ!"

"کیا؟"

"میں نہیں چاہتا!"

"کیا؟"

"کہ تم جلو!"

"چھوڑو یہ بات۔"

"نہیں نہیں۔"

"کیا؟"

"تم اچھی ہو جاؤ۔ تم اپنے گھر جاؤ۔ تم شہنائیوں کے سہانے شور میں کھو جاؤ۔ [illegible] ناچو۔ گیت گاؤ۔ رقص میں آؤ۔ آج میں نے سوچا ہے۔ اپنی خوشی کے لئے تمھیں [illegible] خود غرضی ہے۔ میں خود غرض نہیں ہوں روپ ..."

سورج کی آنکھ نم ہو گئی۔

روپ دیکھتی رہی۔

ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔

روپ کا دل کانپ گیا۔

"یہ کیا۔ تم لڑکی بن گئے۔ پاگل ... آخر بیمار ایک میں ہی تو نہیں! تم بھی تو بیمار ہو۔"

"میں کہاں بیمار ہوں۔ بیمار ہوتا تو وہاں نہ ہوتا؟"

"تمہارے پاس پیسہ جو نہیں ہے۔ تم غریب جو ہو۔ نہیں تو نہیں تو تمہاری [illegible] میں وہاں ضرور لے جاتی۔ مجھے تمہاری غریبی کا پورا پورا احساس ہے ..."

"خیر چھوڑو یہ۔ چھوڑو۔ اب جاؤ۔"

"کیوں جاؤں؟"

"تمھیں اچھی ہونا ہے۔ مجھے چھوڑو۔ پاگل نہ بنو۔"

اس نے روپ کی کلائی چھوڑ دی۔ اور پنسل اٹھا کر کینوس پر لکیریں کھینچنے [illegible] قدرتی لکیروں اور دائروں کو ابھارنے لگا۔ موم بتی کی روشنی پھر پیلی ہو گئی۔ کھنڈر [illegible] پھر چمک اٹھی۔ افسردگی اور یاسیت پھر چاروں طرف پھیل گئی۔ روپ رونے [illegible] پھوٹ کر سسک سسک کر۔ لیکن سورج نے سوچا۔ یہ آنسو اس کے بیمار [illegible] بجھا دیں گے۔ میری بے مروتی اسے ضرور اچھا کر دے گی۔ وہ دیر تک سورج کے [illegible] لیکن وہ لکیریں کھینچتا رہا۔

یاد

یاد اُس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ
نادان! پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا ——— میرؔ

مانوس ہو چلا تھا تسلی سے حالِ دل
پھر تم نے یاد آ کے بدستور کر دیا ——— حسرت موہانی

کر رہا تھا غمِ جہاں کا حساب
آج تم یاد بے حساب آئے ——— فیض

اک ایک نفس میں روشنی ہے
یادوں کے چراغ جل رہے ہیں ——— شاعر لکھنوی

کچھ نقش تیری یاد کے باقی ہیں ابھی تک
دل بے سر و ساماں سہی ویراں تو نہیں ہے ——— عظیم مرتضیٰ

سویرا غم انگیز تھا۔ شعاعیں کھنڈر میں کانپ رہی تھیں۔ سورج کی بہن کملا وید جی کے ہاں سے لائی ہوئی دوا ابال رہی تھی۔ سورج کو نیند آ گئی تھی۔ جب دوا گلاس میں انڈیل کر وہ اس کے پاس گئی اور کمبل ہٹا کر ماتھے پر ہاتھ رکھا تو بخار تیز تھا۔ سامنے کینوس پر لکیریں چمک رہی تھیں۔ کچھ واضح کچھ غیر واضح لکیریں۔ ایک ادھورا پودا، ایک ادھوری دوشیزہ۔ ایک ادھوری دیوار۔ ایک ادھورا آنگن ...

"بھیا اٹھو دوا پی لو۔"

"رہنے دے کملا۔" وہ کراہتا ہوا بولا۔

"رہنے کیوں دوں۔ وید جی نے کہا ہے جلدی اچھے ہو جاؤ گے۔"

"ان سے جا کر کہہ دے۔ میرا بھیا مرنا چاہتا ہے۔"

یہ سن کر کملا رو پڑی۔

بیچاری کملا!

"تیرا بھیا غریب ہے۔ تیرا بھیا سنکی ہے۔ تیرا بھیا چترکار ہے۔ یہ دنیا اس کے لئے بہت چھوٹی ہے کملا ..." وہ آنکھ موندے کہتا رہا۔

کملا سسکتی رہی۔

صبح کی مردہ شعاعیں کھنڈر میں کانپتی رہیں۔

ڈوبتی شفق کے اُداس سائے سینی ٹوریم پر چھا رہے تھے۔ دور ندی آہستہ آہستہ بہہ رہی تھی۔ رُوپ سورج کے کھنڈر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اتنے میں وہ ...ن کی طرف جاتا ہوا دکھائی دیا۔

رُوپ نے پکارا۔ اور لپکی۔

وہ ٹھہرا اور بولا۔

"کہو؟"

"کہاں جاتے ہو؟"

"گھومنے۔"

"کیسے ہو؟"

"اچھا ہوں۔"

رُوپ نے دیکھا۔ آج واقعی وہ اچھا معلوم ہو رہا تھا۔ بہت اچھا۔ گلاب ...ح شگفتہ! چند ہی روز میں یہ بہار...

"تم نے تو کہا تھا سورج، ساتھ ہی اچھے ہوں گے۔ دیکھو! میں ابھی تک ...ہوں۔"

"دھنوان جو ہو۔ دھنوان کبھی اچھے نہیں ہو سکتے۔ وہ ہمیشہ سے بیمار رہے ہیں، ہمیشہ بیمار رہیں گے۔ ہم چترکار لوگ جو اُن کا رُوپ اُتارتے ہیں سدا سے اچھے ہیں، اچھے رہیں گے۔"

"یہ آج کیا بک رہے ہو؟"

"وہی جو نہ سمجھو گی۔"

"اب میں بھی اچھی ہو جاؤں گی۔"

"کس کے لئے؟"

"تمہارے لئے۔"

"مگر میں اب پرایا ہوں رُوپ!"

"کیا؟"

"ہاں۔ پرایا۔ بیگانہ!"

"اچھے ہوتے ہی بدل گئے؟"

"اب جو چاہے کہو۔"

"کون ہے وہ؟"

"ایک دُنیا سے بھی اچھی، دنیا سے بھی سُندر، دنیا سے بھی بڑھ کر حسین ... ہوا اُس کے آگے۔ کچھ بھی تو نہیں۔ اُس نے میرے لئے رُوپ اپنا نہیں کیا۔ کہوں تو ...رنجیدہ ہو جاؤ گی۔ اُس نے میرے لئے گیت گائے ستاروں کے۔ ساز بجاتے۔ ناچی تھرکی اور... اور... شرمائی لجائی مہندی رچائی..."

"کون ہے وہ...؟"

"ہے کوئی تمھیں کیا۔ اُس سے جلن کی نہ سوچو۔ وہ کسی دھنوان کی بیٹی نہیں ہے۔ وہ ایک مانجھی کی بیٹی ہے۔ اُس مانجھی کی بیٹی جو... اب کیا کہوں۔ تم جاؤ مجھے جانے دو۔ دیکھنا ہے تو جا کر میرے کھنڈر میں دیکھ لو۔ اُس کی تصویر چھوڑ آیا ہوں..."

"لیکن سورج۔ تم پاگل ہو گئے ہو... نرے پاگل... ٹھہرو... کہاں جاتے ہو... آج ہوا چل رہی ہے... برف گرنے والی ہے... تم سے ایک بات کہنے والی ہوں..."

"کیا... یہی نا... کہ اب تم بالکل اچھی ہو چکی ہو؟"

"ایک بات اور بھی ہے۔"

"یہی نا... کہ تمہارے گھر والے آنے والے ہیں؟"

"ایک بات اور بھی ہے۔"

"یہی نا... کہ تمہاری شادی ہونے والی ہے؟"

"ایک بات اور بھی ہے۔"

"یہی نا..."

"ہاں۔ ذرا بوجھو...!"

"اب تم ہی کہو۔"

"خط میں پتا جی کو صاف صاف لکھ دیا ہے میں تم سے سگائی کرنا چاہتی ہوں۔"

"جواب میں وہ لکھ دیں گے پاگل نہ بنو!"

"اُن کا جواب بھی آ گیا ہے۔"

"کیا؟"

"انھیں منظور ہے۔ میری پسند اُن کی پسند۔ سورج اُن کی پسند! مگر یہ کیا! تم خوش نہیں ہوئے؟"

"مجبور ہوں۔"

"کاہے کی مجبوری؟"

"میری زندگی، میری شہنائی، میری مہندی۔ مجھے مل چکی ہے۔ تم کب آ جاتیں رُوپ...!"

اور فضا میں ایک قہقہہ سا گونج کر معدوم ہو گیا۔

ڈوبتی شفق کے اُداس سائے رات کی سنگین تاریکیوں سے ہم آغوش ہو چکے تھے۔ اکیلی کھڑی رُوپ کا سر بُری طرح چکرا رہا تھا۔ ندی دھیمے دھیمے بہہ رہی تھی۔

کھنڈر میں موم بتی کی پیلی روشنی چمک رہی تھی۔

رئوپ کو تلاش کرتے ہوئے اُس کے پتا، ڈاکٹر اور چوکیدار کے ساتھ
قبرستان میں پہنچے تھے۔ سامنے کیپسوں پر ایک آنگن تھا۔ ایک دیوار تھی۔
بیت کا اُجالا تھا۔ اور وہیں سر جھکائے رئوپ کھڑی تھی۔ اِس یاس انگیز
کے پاس وہ ننھی جوتی تیاگ پر کلائے موم بتی روشن کر دی گئی تھی۔ لوگوں کے بار بار
پوچھنے پر بھی بولی۔

"میں نہیں جانتی رئوپ کون ہے۔ لیکن سورج بھیا مرتے دم ہی کہہ گئے
تھے کہ رئوپ آئے تو یہ تصویر اُسے دے دینا۔"

رئوپ کے پتا کا دل بھر آیا۔

"اُس کے مرنے کی خبر رئوپ کو ہے کہ نہیں؟"

"میں نہیں جانتی۔ لیکن اُن کی موت پر یہاں کوئی لڑکی نہیں آئی . . ."

"چلئے صاحب! اندر کی طرف چلیں۔" ڈاکٹر اُکتا کر بولا۔

اور کملا کو تسلی دیتے ہوئے وہ باہر نکل آئے۔

رات کے ٹھٹھرتے اندھیرے میں ایک سایہ سینی ٹوریم کی طرف بڑھتا ہوا نظر
رئوپ کے پتا اُس سائے کو پہچان گئے۔ رئوپ کا سایہ تھا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے
اور شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"کہاں چلی گئی تھیں بیٹی؟"

"کہیں نہیں۔"

"اب کیسی ہو؟"

"اچھی ہوں۔"

"گھر چلوگی نا؟"

"ہاں۔"

"اور وہ چترکار، جس کے بارے میں تم نے لکھا تھا . . ."

"وہ . . . وہ پتا جی . . . سنکی ہے . . . پاگل ہے . . . مجھے معاف کر دیجئے . . . اُس
کی بات . . . اُس کی بات نہ کیجئے پتا جی!"

اور باپ سے لپٹ کر رئوپ سسکنے لگی۔ لیکن یہ بات اُسے اُس کے پتا نے
کبھی نہیں بتائی کہ سورج کو مرے کئی دن ہو چکے ہیں۔ اور اُس کی رُوح رات کی کنواری
فضاؤں میں ہوا کی خوشبو بن کر بس گئی ہے!

مدیر بیسویں صدی کے نام خط لکھتے وقت ہمیشہ اختصار سے کام لیا کریں
تاکہ آپکے ارشاد کی فوراً تعمیل ہو سکے طویل خط مصروفیت کے باعث فوراً نہیں پڑھے جاتے۔

(منیجر رسالہ بیسویں صدی دہلی)

غزل

زخمی پٹیالوی

دل وفورِ درد سے دل بن گیا دل ہو گیا
تیرے قدموں پر فدا کرنے کے قابل ہو گیا

کچھ تو پہلے ہی سے تھے انوار کے پردوں میں وہ
ایک پردہ چشمِ حیراں کا بھی حائل ہو گیا

دُور تک پہنچے مری دُشواریوں کے سلسلے
جو قدم اُٹھا رہِ اُلفت میں منزل ہو گیا

گُم رہی تھی عافیت انجام تیری راہ میں
ڈھونڈنے والا تجھے خود خضرِ منزل ہو گیا

پردہ داری کس بلا کا نام ہے اے ضبطِ راز
تو سمجھ نا بھی مجھے دشوار و مشکل ہو گیا

معجزہ سا کر گئی تیری توجہ کی نظر
تھا کبھی جو بارِ محفل جانِ محفل ہو گیا

دیکھنا ہے اور ابھی کیا کچھ مری تقدیر میں
آرزوئے شوق میں جینا تو مشکل ہو گیا

دُور تھا جب تک کوئی منزل نئے منزل تھی عزیز
آ گیا منزل پہ جو بے زارِ منزل ہو گیا

اور کوئی روز جینے کی تمنا ہو گئی
جب سے تیرا غم مری مشکل میں شامل ہو گیا

وائے قسمت! مرحلہ راہِ محبت کا زخمیؔ
جتنا آسان ہو گیا اُتنا ہی مشکل ہو گیا

ڈوبتی شفق کے اُداس سائے سیمیں توریم پر چھا رہے تھے۔ دور ندی آہستہ آہستہ بہہ رہی تھی۔ رُوپ سورج کے کھنڈر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اتنے میں وہ ندی کی طرف جاتا ہوا دکھائی دیا۔

رُوپ نے پکارا۔ اور لپکی۔

وہ ٹھہرا اور بولا۔

"کہو؟"

"کہاں جاتے ہو؟"

"گھومنے۔"

"کیسے ہو؟"

"اچھا ہوں۔"

رُوپ نے دیکھا۔ آج واقعی وہ اچھا معلوم ہو رہا تھا بہت اچھا! گلاب کی طرح شگفتہ! چند ہی روز میں یہ بہار . . .

"تم نے تو کہا تھا سورج، ساتھ ہی اچھے ہوں گے۔ دیکھو! میں ابھی تک بیمار ہوں۔"

"دھنوان جو ہو۔ دھنوان کبھی اچھے نہیں ہو سکتے۔ وہ ہمیشہ سے بیمار رہے ہیں۔ ہمیشہ بیمار رہیں گے۔ ہم چترکار لوگ جو اُن کا رُوپ اُتارتے ہیں سدا سے اچھے ہیں۔ سدا اچھے رہیں گے۔"

"یہ آج کیا بک رہے ہو؟"

"وہی جو نہ سمجھو گی۔"

"اب میں بھی اچھی ہو جاؤں گی۔"

"کس کے لئے؟"

"تمہارے لئے۔"

"مگر میں اب پرایا ہوں رُوپ!"

"کیا؟"

"ہاں۔ پرایا۔ بیگانہ!"

"اچھے ہوتے ہی بدل گئے؟"

"اب جو چاہے کہو۔"

"کون ہے وہ؟"

"ایک دُنیا سے بھی اچھی، دنیا سے بھی سُندر، دنیا سے بھی بڑھ کر حسین ـــــ تم کیا ہو اُس کے آگے۔ کچھ بھی تو نہیں۔ اُس نے میرے لئے روپ اُکیا نہیں کیا۔ کہوں تو جل کر بھسم ہو جاؤ گی۔ اُس نے میرے لئے گیت گائے ستاروں کے۔ ساز بجائے۔ ناچی تھرکی اور . . . اور . . . شرمائی لجائی مہندی رچائی . . ."

"کون ہے وہ . . . ؟"

"ہے کوئی تمھیں کیا۔ اُس سے جلن کی نہ ہو چو۔ وہ کسی دھنوان کی [illegible] ہے۔ وہ ایک ماجھی کی بیٹی ہے۔ اُس ماجھی کی بیٹی جو . . . اب کیا کہوں تم جانے دو۔ دیکھنا ہے تو جا کر میرے کھنڈر میں دیکھ لو۔ اُس کی تصویر چھوڑ آیا ہوں . . ."

"لیکن سورج۔ تم پاگل ہو گئے ہو . . . نرے پاگل ۔ ٹھہرو . . . کہاں ہو . . . آج ہوا چل رہی ہے . . . بھت گرنے والی ہے . . . تم سے ایک بات کہنے والی [illegible]"

"کیا . . . یہی نا . . . کہ اب تم بھی اچھی ہو رہی ہو؟"

"ایک بات اور بھی ہے۔"

"یہی نا . . . کہ تمہارے گھر والے آنے والے ہیں؟"

"ایک بات اور بھی ہے۔"

"یہی نا . . . کہ تمہاری شادی ہونے والی ہے؟"

"ایک بات اور بھی ہے۔"

"یہی نا . . ."

"ہاں۔ ذرا بوجھو . . . ؟"

"اب تم ہی کہو۔"

"خط میں پتاجی کو صاف صاف لکھ دیا ہے میں تم سے سگائی کرنا چاہ[تی ہوں]"

"جواب میں وہ لکھ دیں گے پاگل نہ بنو!"

"اُن کا جواب بھی آگیا ہے۔"

"کیا؟"

"انھیں منظور ہے۔ میری پسند اُن کی پسند۔ سورج اُن کی پسند! مگر تم خوش نہیں ہوئے؟"

"مجبور ہوں۔"

"کاہے کی مجبوری؟"

"میری زندگی، میری شہنائی میری مہندی۔ مجھے مل چکی ہے۔ تم رُوپ . . . !"

اور فضا میں ایک قہقہہ سا گونج کر معدوم ہو گیا۔

ڈوبتی شفق کے اُداس سائے رات کی رنگین تاریکیوں میں گم ہو رہے تھے۔ اکیلی کھڑی رُوپ کا سر کسی طرح جھکا ہوا تھا۔ ندی ویسے ہی بہہ رہی تھی۔

کھنڈر میں موم بتی کی پیلی روشنی جھلملا رہی تھی۔

رُوپ کو تلاش کرتے ہوئے اُس کے پتا، ڈاکٹر اور چوکیدار کے ساتھ اُس کمرے میں چلے آئے تھے۔ سامنے کینوس پر ایک آنگن تھا۔ ایک دیوار تھی۔ ایک مہندی کا پودا تھا۔ اور وہیں سر جھکائے رُوپ کھڑی تھی۔ اس یاس انگیز تصویر کے پاس ہی ٹوٹی ہوئی تپائی پر کملا نے موم بتی روشن کر رکھی تھی۔ لوگوں کے بار بار پوچھنے پر آنسو پیتی ہوئی بولی۔

"میں نہیں جانتی رُوپ کہاں ہے۔ لیکن سورج بھیا مرتے دم یہی کہہ گئے تھے کہ رُوپ آئے تو تصویر اُسے دے دینا۔"

رُوپ کے پتا کا دل بھر آیا۔

"اُس کے مرنے کی خبر رُوپ کو ہے کہ نہیں؟"

"میں نہیں جانتی۔ لیکن اُن کی موت پر یہاں کوئی لڑکی نہیں آئی۔۔۔"

"چلئے صاحب! ندی کی طرف چلیں۔" ڈاکٹر اُکتا کر بولا۔

اور کملا کو تسلی دیتے ہوئے وہ باہر نکل آئے۔

رات کے ٹھٹھرتے اندھیرے میں ایک سایہ سینی ٹوریم کی طرف بڑھتا ہوا نظر آیا۔ رُوپ کے پتا اُس سائے کو پہچان گئے۔ رُوپ کا سایہ تھا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے بڑھے اور شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"کہاں چلی گئی تھیں بیٹی؟"

"کہیں نہیں۔"

"اب کیسی ہو؟"

"اچھی ہوں۔"

"گھر چلو گی نا؟"

"ہاں۔"

"اور وہ چترکار، جس کے بارے میں تم نے لکھا تھا۔۔۔"

"وہ۔۔۔ وہ پتا جی۔۔۔ سنکی ہے۔۔۔ پاگل ہے۔۔۔ مجھے معاف کر دیجئے۔۔۔ اُس کی بات۔۔۔ اُس کی بات نہ کیجئے پتا جی!"

اور باپ سے لپٹ کر رُوپ سسکنے لگی۔ لیکن یہ بات اُسے اُس کے پتا نے بھی نہیں بتائی کہ سورج کو مرے کئی دن ہو چکے ہیں۔ اور اُس کی رُوح رات کی کنواری فضاؤں میں حنا کی خوشبو بن کر بس گئی ہے!

مدیر بیسویں صدی کے نام خط لکھتے وقت ہمیشہ اختصار سے کام لیا کریں تاکہ آپکے ارشاد کی فوراً تعمیل ہوسکے طویل خط مصروفیت کے باعث فوراً نہیں پڑھے جاتے۔

(مینیجر رسالہ بیسویں صدی دہلی)

رِشی پٹیالوی

دل دُورِ درد سے دل بن گیا دل ہو گیا
تیرے قدموں پر فدا کرنے کے قابل ہو گیا

کچھ تو پہلے ہی سے تھے انوار کے پردوں میں وہ
ایک پردہ چشمِ حیراں کا بھی حائل ہو گیا

دُور تک پہنچے مری دُشواریوں کے سلسلے
جو قدم اُٹھا رہِ اُلفت میں منزل ہو گیا

گُم رہی تھی عافیت انجام تیری راہ میں
ڈھونڈنے والا تجھے خود خضرِ منزل ہو گیا

پردہ داری کس بلا کا نام ہے اے ضبطِ راز
آہ بھرنا بھی مجھے دشوار و مشکل ہو گیا

معجزہ سا کر گئی تیری توجہ کی نظر
تھا کبھی جو بارِ محفل جانِ محفل ہو گیا

دیکھنا ہے اور ابھی کیا کچھ مری تقدیر میں
آرزوئے شوق میں جینا تو مشکل ہو گیا

دُور تھا جب تک کوئی منزل نئے منزل تھی عزیز
آ گیا منزل پہ تو بیزارِ منزل ہو گیا

اور کوئی روز جینے کی تمنا ہو گئی
جب سے تیرا غم مری مشکل میں شامل ہو گیا

وائے قسمت! مرحلہ راہِ محبت کا رشیؔ
جتنا آسان ہو گیا اُتنا ہی مشکل ہو گیا

افسانہ

ہم سفر

پروفیسر ظفر احمد نظامی ایم۔ اے

شعبۂ سیاسیات، گورنمنٹ ڈگری کالج دتیا (مدھیہ پردیش)

۱۵ر فروری ۱۹۶۴ء　　　مدیر محترم! تسلیمات

پچھلے دنوں کئی ذہنی الجھنوں کا شکار رہا۔ نومبر میں ایک حادثۂ عظیم والد محترم کی وفات کی شکل میں رونما ہوا تھا پھر دسمبر میں "بیسویں صدی" کے دل نواز سالنامے میں "منزل سے آگے" کی اشاعت کے ساتھ ہی میرا تبادلہ اندور سے دتیا ہو گیا جو گوالیار اور جھانسی کے درمیان ریلوے لائن پر واقع ہے۔ خوب صورت پہاڑیوں کے دامن میں یہ چھوٹا سا تاریخی شہر اپنے سینے میں سنہانے کتنی داستانیں سمیٹے ہوئے ایک سمت عظیم اتر پردیش اور دوسری جانب قدیم مدھیہ بھارت کی وسیع سرحدوں کو چھو کر کئی تہذیبوں کا سنگم بنا ہوا ہے۔ اندور کی مصروف ترین مشینی زندگی گزارنے کے بعد یہاں فطرت کے قرب کے باعث دل قدرے پرسکون ہے لیکن اندور پھر بھی نہیں بھولتا۔ بے تکلف دوستوں کے درمیان پرخلوص قہقہے اب بھی تخیل کے خاموش پردوں پر ابھر آتے ہیں۔ یہاں ادبی فضا بھی خاصی ہے۔ شعر گوئی اور سخن فہمی کا ذوق بہت غنیمت ہے۔ "منزل سے آگے" اور "الجھن" پر قارئین کے خطوط ابتک موصول ہو رہے ہیں۔ بہت سے دوستوں نے تو ان کہانیوں کو آپ بیتی سمجھ کر مجھ سے اظہار ہمدردی بھی کیا ہے لیکن یہ بات کسی حد تک سچ ہے کہ یہ کہانیاں مشاہدے پر مبنی ہیں۔ بہرکیف دونوں کہانیوں کو مجموعی طور سے بہت پسند کیا گیا ہے اور فرمائش کی گئی ہے کہ میں اپریل فول سے متعلق کوئی نئی کہانی لکھوں۔ وقت نہ ملنے کے باعث اس حکم کی تعمیل تو نہ ہو سکی لیکن سرزمین دتیا کے دئے ہوئے ایک پلاٹ پر یہ کہانی مکمل ہو گئی ہے۔ دیکھیں آپ اور قارئین کہاں تک پسند کرتے ہیں؟ جھانسی نمائش کے مشاعرے میں جناب ساحر ہوشیارپوری سے بہت دیر آپ کی باوقار و پرخلوص شخصیت ہی موضوع گفتگو بنی رہی اور کسی کو یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہ ہوا کہ آپ بذات خود ایک انجمن ہیں....

آپ کا ــــــ ظفر احمد نظامی

شام ہو چلی تھی، سہ پہر کا سورج اپنی نرم کرنوں سے فضا پر سونا چڑھا رہا تھا۔ سی رنگین ماحول میں ٹرین آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ مسافر وقت گزاری کے لئے اپنے اپنے مشغلوں میں محو تھے۔ ایک صاحب سگریٹ پر سگریٹ پھونک کر سینما کے کسی اداکار کی طرح دھوئیں کے مرغولے ہوا میں چھوڑ کر خود ہی اپنے فن کی داد دے رہے تھے۔ کچھ لوگ اخباروں اور رسالوں کی ورق گردانی میں مصروف تھے اور کچھ اس دورِ جمہوریت میں [illegible] کے بادشاہ اور بیگم سے دل بہلا رہے تھے۔ وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا [illegible] اپنے ڈبے کے مسافروں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور تاش کے پتوں کے کھیل کی جانب متوجہ ہو گیا۔

وہ ایک خوش ترنم شاعر تھا اور ہر جگہ مقبول۔ لوگ محض اسے سننے کا اشتیاق لئے مشاعروں میں جمع ہوتے۔ اس کی نظمیں معیاری رسائل میں شائع ہوتی تھیں۔ اکثر و بیشتر اس کے نام خطوط میں یا تو مشاعروں کے دعوت نامے ہوتے یا کسی رسالے کے ایڈیٹر کی کوئی فرمائش ہوتی، یا اس کے مداحوں کے قصیدے۔ وہ [illegible] شرکت کرتا تھا وہاں اس کی تعریف اور سب [illegible] کر دی تھی۔ وہ تاش [illegible]

رہتا چاہتا تھا اور شاداں ہی کو عشق کا حاصل سمجھتا تھا۔ اُس وقت بھی وہ ایک مشاعرے میں شرکت کے لئے جا رہا تھا۔ صبح سویرے ہی وہ اپنے شہر سے روانہ ہو گیا تھا۔
اگلے کسی اسٹیشن پر اُسے گاڑی تبدیل کر کے اپنی منزل پر نو یا دس بجے تک پہنچنا تھا۔ اُسے مشاعرے میں شرکت کا بہت معقول معاوضہ ملنے والا تھا اگلے کسی اسٹیشن پر اُسے منزل کے لئے آخری گاڑی بالکل تیار ملنے والی تھی۔ اس کے بعد وہاں پہنچنا ممکن نہیں تھا اور اسی لئے وہ بہت احتیاط سے اپنے سفر کا پروگرام ترتیب دے کر چلا تھا۔ اس طرح وہ وقت پر مشاعرے میں پہنچ سکتا تھا۔ اُس نے اپنی ہی غزل کے اشعار دل ہی دل میں گنگناتے ہوئے تاش کے کھیل کی بازی ہارنے والے شخص کی جانب مسکرا کر دیکھا اور دل ہی دل میں اُس سے اظہار ہمدردی کرنے لگا۔ تاش کی بازی پھر جمنے لگی تھی۔

اسٹیشن آگیا، وہ پلیٹ فارم پر اُترا اور سامنے ہی ٹی اسٹال پر چائے پی کر یان چباتا ہوا چہل قدمی کرنے لگا۔ یہ کوئی جنکشن تھا اسی لئے کافی دیر گاڑی ٹھہرتی تھی۔ وہ پلیٹ فارم کی ایک بنچ پر بیٹھ گیا اور سگریٹ کے کش لینے لگا کہ اُس کی نگاہ بے خیالی میں سامنے والے ایک ڈبّے میں بیٹھی ہوئی خوب صورت لڑکی سے جا ٹکرائی۔ وہ اُس کی طرف دیکھ کر مسکرا دی اور پھر نظر پھیر کر دوسری سمت دیکھنے لگی۔ اُس کے تبسم میں ایک عجیب کشش اور شوخی تھی بلکہ ایک خاموش دعوت تھی اور سلام کا ایک اچھوتا انداز تھا۔ وہ جھینپ گیا، اُس کے دل کی دھڑکنیں تیز تر ہو گئیں، جذبات مچل اُٹھے اور چہرے پر ایک سوہنی لہر دوڑ گئی اُسے خیال آیا کہ ہو سکتا ہے یہ لڑکی بھی اُس کی مدّاح رہی ہو کیوں کہ اُسے اُس کے اکثر مدّاح ریل میں مل جایا کرتے تھے۔ اُس نے پھر نظریں اُدھر اُٹھائیں تو دیکھا کہ لڑکی پھر اُسی انداز سے مسکرا رہی ہے۔ اُس کے تبسم میں معصومیت تھی اور ایک عجیب چنچل پن۔ ہٹرین نے سیٹی دے دی اور وہ اپنے کمپارٹمنٹ کی جانب چل پڑا۔ چلتے چلتے اُس نے دیکھا، لڑکی اُسے دیکھنے کی کوشش کر رہی ہے۔

اُسے پسینہ آگیا، پہلی بار اتنی بیباکی سے کسی لڑکی نے اُس کی جانب اِس چاہ سے دیکھا تھا۔ وہ اپنی قسمت پر ناز کرنے لگا، اُسے خود پر رشک ہونے لگا۔ شاعری ہی کی بدولت لوگ اُسے اتنی عزت دیتے تھے اُس کے پاس بہت لوگوں کے خطوط آتے لیکن اسٹیشن پر اس طرح کسی اجنبی لڑکی کا خاموش اظہارِ شوق اُس کے لئے ایک نیا تجربہ تھا وہ سوچنے لگا کاش وہ بہت پہلے مِل گئی ہوتی۔ صبح سے شام تک کا سفر اُس نے کبھی کتاب پڑھ کر، کبھی سگریٹ جلا کر اور کبھی سو کر کاٹا تھا۔ وقت پہاڑ کی مانند تھا اور وہ اپنے خیالات کے تیشے سے اُسے کاٹ رہا تھا اور آخر اب اُسے اچانک "شیریں" کی جھلک دکھائی دی تھی۔ اُس نے سوچا وہ ضرور اس سے مخاطب ہو گی، شگفتہ باتیں کرے گی جن سے پھول جھڑیں گے۔
اُسے جس اسٹیشن پر گاڑی تبدیل کرنی تھی اُس کے آنے میں ابھی کچھ دیر تھی اُس نے طے کر لیا کہ اگلے اسٹیشن پر وہ اپنا سامان اُسی کمپارٹمنٹ میں منتقل کر لے گا جس میں وہ بیٹھی ہوئی تھی حالانکہ وہ خود سیکنڈ کلاس میں تھا۔

ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر گاڑی رُکی لیکن اُسے کوئی قلی دکھائی نہ دیا۔ وہ اپنے ڈبّے سے نیچے اُترا۔ جھانک کر دیکھا تو لڑکی سے اُس کی نگاہیں چار ہوئیں لیکن اِس مرتبہ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی جھلک نہیں تھی، اُس نے نظریں پھیر لیں لیکن اُسے محسوس ہوا جیسے وہ اُسے چھپ چھپ کر دیکھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ ریل چل پڑی وہ کوئی فیصلہ کئے بغیر اپنے ڈبّے میں واپس آگیا اُس نے سوچا ضرور وہ اُسے اپنے ڈبّے میں بلانا چاہتی ہو گی جبھی تو اِس مرتبہ اتنی بے رُخی اور شکایت آمیز نگاہوں سے دیکھ رہی تھی اُس کی نگاہوں میں ایک شکوہ تھا، گلہ تھا، بے کسی اور بے بسی تھی۔ اُسے اُس کی حالت پر ترس آگیا۔ اُس نے اگلے اسٹیشن پر اُس کے کمپارٹمنٹ میں پہنچ جانے کا تہیّہ کر لیا اور اُسی کے خیالات میں گُم ہو گیا۔ اُس نے سوچا معلوم نہیں لڑکی کی منزل کون سی ہے؟ وہ تنہا سفر کر رہی یا اُس کے ساتھ کوئی اور ہے؟؟ ممکن ہے اُس نے اِس کی نظمیں کسی مشاعرے میں سُنی ہوں یا رسائل میں پڑھی ہوں اور شاید تصویر بھی دیکھی ہو۔

اسٹیشن آتے ہی وہ پلیٹ فارم کی دوسری طرف ریل سے نیچے اُتر پڑا اپنا سامان اُسی کمپارٹمنٹ میں چھوڑ کر اُس ڈبّے میں جس میں وہ لڑکی بیٹھی ہوئی تھی پہنچ گیا۔ تیسرے درجے کے اُس ڈبّے میں بہت رش تھا۔ وہ بمشکل اوپر چڑھ سکا۔ کھڑے رہنے کی گنجائش بھی دشواری ہی سے نکل سکی۔ اُس نے سوچا واپس اپنے کمپارٹمنٹ میں چلے لیکن قربتِ حسن کے احساس نے اُس کے پاؤں میں زنجیریں ڈال دیں۔ وہ اُس سے ذرا فاصلہ پر بیٹھی تھی لیکن وہ اُسے بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ وہ خلاؤں میں گھور رہی ہے اور اُسے خیال آیا کہ وہ اُسی کی متلاشی ہو گی اچھے کپڑوں میں ملبوس تھی۔ اُس کے شانوں پر ہلکا سا سادہ دوپٹہ پڑا ہوا تھا۔ بال پریشان تھے۔ ممکن ہے سفر اور تھکان کے باعث بکھر کر رہ گئے ہوں۔ وہ جوان اور خوب صورت تھی۔ اُس کے ہاتھوں میں چوڑیاں نہیں تھیں۔ آج کل یہی فیشن ہے وہ بھی اُس سے نہ بچ سکی ہو گی۔ وہ مہذب معلوم ہوتی تھی۔ اُس کی پیشانی پر اُسے دور سے کچھ خراشیں سی محسوس ہوئیں۔ آج کل فیشن کی چیزیں بھی بہت نقصان دہ ہیں ہو سکتا ہے بیماری کی وجہ سے رہی ہوں۔ اُس کی آنکھوں میں اُسے کوئی چمک نظر نہ آئی۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اُس کے قریب ایک معمّر آدمی اور ایک لڑکا بیٹھا تھا دوسری جانب ایک عورت بھی بیٹھی تھی۔ ہو سکتا ہے یہ سب اُس کے عزیز ہوں یا ماں باپ اور بھائی ہوں، ساس سسر کے ساتھ تو وہ اس بیباکی سے نہیں بیٹھ سکتی تھی۔

وہ تھوڑی ہی دیر میں جماہیاں لینے لگی اور پھر اچانک اُٹھ کھڑی ہوئی لیکن اُس کے ساتھ والی عورت نے اُس سے کچھ کہا اور وہ بیٹھ گئی۔ اُس نے دیکھا وہ بُڑبُڑا رہی تھی، اُس سے کچھ کہہ رہا تھا اور وہ اِس طرح سُن رہی تھی جیسے اُسے اُس کی باتوں پر بہت غصّہ

...ں تھا اس طرح وہ لڑکی آج تک نہیں دیکھی تھی جو چنچل ہونے کے ساتھ ساتھ سنجیدہ بھی ہو۔ اس نے موقع غنیمت جانا اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لئے آگے بڑھنے لگا۔ اب دیر کرنا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ وہ اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ وقت بھی بہت ہو چکا تھا اور اس کا سامان بھی دوسرے کمپارٹمنٹ میں رکھا ہوا تھا۔ اس نے گفتگو میں پہل کرنے کے لئے دل ہی دل میں کچھ مکالمے دہرائے جن سے وہ اپنا تعارف پیش کر سکتا تھا تو اس کے بارے میں تفصیل سے معلومات حاصل کر سکتا تھا۔ اس نے وہ تمام جملے ذہن نشین کر لئے جو دوران گفتگو میں استعمال کئے جانے والے تھے۔ اس نے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرا رومال سے منہ صاف کیا اور ان لوگوں کے قریب پہنچ کر کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک لڑکی اسے دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اس کا منہ چڑا دیا۔ بوڑھے نے غصے میں لڑکی کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور پھر نظریں ہٹا کر اس سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

معاف کیجئے جناب، میں بہت شرمندہ ہوں، کچھ عرصے سے اس کے دماغ میں خلل ہے اور اب مجبور ہو کر میں اسے روحانی علاج کے لئے میراں داتار لئے جا رہا ہوں۔

اس پر بجلی سی گر پڑی، نظر اٹھا کر دیکھا تو گاڑی وہ پلیٹ فارم چھوڑ رہی تھی جہاں اسے گاڑی تبدیل کرنی تھی

ایم۔ اے۔ ناز قادری (مظفر پوری)

اشک بن بن کے حسرت نکلتی رہی
دل کی حالت بگڑتی سنبھلتی رہی

اشک بہتے رہے رات ڈھلتی رہی
دل میں یادوں کی اک شمع جلتی رہی

تیر غم کھا کے دل خون روتا رہا
مسکراہٹ لبوں پر مچلتی رہی

عالم فرقت یار کیا پوچھئے
دل دھڑکتا رہا، جاں مچلتی رہی

شعلۂ عشق دل میں فروزاں رہا
زندگی شمع کی طرح جلتی رہی

راہی قریشی ایم اے

پاس تنظیم گلستاں ہے نہ توقیر بہار
ہو گئے اہل چمن ہر قید سے آزاد کیا

ہم ہی اپنے لب سئے لیتے ہیں جانے دیجئے
آپ کے جور و ستم کی داد کیا، فریاد کیا

عرض غم کی اک تمنا تھی، سو پوری ہو گئی
اپنے حق میں دیکھئے ہوتا ہے اب ارشاد کیا

اب محبت کا وہ عالم ہے نہ اپنا وہ مزاج
اب صبا کے دوش پر آئے کسی کی یاد کیا

چشم ساقی میں نہیں تشنہ لبی کی آبرو
پھر سر میخانہ آخر حاصل فریاد کیا

قیس رامپوری

جہاں کہیں مرے دیوانہ پن کی بات چلے
چھڑیں بہار کے قصے چمن کی بات چلے

بہار آئی، گریباں بدست ہوں لیکن
یہ چاہتا ہوں ترے پیرہن کی بات چلے

آزادی خطرے میں ہے ۔ اپنی پوری طاقت سے اِس کی حفاظت کیجیے

جواہر لال نہرو

افسانہ

زندگی عذاب ہے یا رب

تبسّم شفائی

نگینہ پٹرول پمپ۔ اورنگ آباد گیا (بہار)

محترم خوشتر صاحب! تسلیمات

... اِس کہانی کے ساتھ میں پہلی بار بزمِ "بیسویں صدی" میں شریک ہو رہا ہوں۔ اُمید ہے میری اِس کوشش کو آپ سراہیں گے۔ یہ میرا بالکل نیا تجربہ ہے۔ ذرا آپ اندازہ لگایئے میں عورت کی نفسیاتی کیفیت کا تجزیہ کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں۔ سُنا ہے ایک کشمیری پروفیسر بھی اِس سلسلے میں تجربات کر رہے ہیں...

آپ کا مخلص ــــــ تبسّم شفائی

میں نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ ساحرہ اپنے وارڈ میں کھانس اُٹھی۔ اُس کی آواز دیر تک فضا میں گونجتی رہی۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور لیٹے ہی لیٹے سوچنے لگی۔ نیند نہیں آرہی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے اُٹھ کر کانچ کی صراحی سے پانی پیا تھا۔ گھڑی میں چابی دی تھی۔

معلوم نہیں کیوں؟ ــــــ رات ہوتی ہے تو میرا دم گھُٹنے لگتا ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے سینی ٹوریم کی دیواریں سرگوشیاں کر رہی ہیں۔ یہاں کی ہر چیز بولتی ہے نہ جانے کیا کیا۔ رہ رہ کر انجانے سائے باہر میدان میں اُبھرتے ہیں۔ کبھی کبھی کھوکھلے سینے سے نکلی ہوئی کھانسی کی آواز آتی ہے۔ کبھی رونے کی صدائیں اُبھرتی ہیں اور سسکیوں اور آہوں کے درمیان رات کے سنّاٹے میں گم ہو جاتی ہیں۔ رات کا سنّاٹا، پُرہول سنّاٹا جاگ اُٹھتا ہے۔ کبھی صحن کے سامنے کوئی سایہ اُبھرتا اور اُبھر کر گزر جاتا ہے۔ ایک انجانے خیال سے میرا سارا جسم کانپ اُٹھتا ہے۔ سانس آپ ہی آپ پھول جاتی ہے اور ایک ویران سی خوشبو [illegible] سی محسوس ہوتی ہے۔ دواؤں کی تیز بُو ہواؤں کے جھونکوں کے ساتھ آتی ہے تو میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو جاتے ہیں اور پسینے کی ننھی ننھی بوندیں چہرے پر اُبھر آتی ہیں۔ کئی بار راشد باجی کہہ چکی ہیں کہ اگر طبیعت گھبراتی ہو تو نصیبن بُوا کو بُلا لو۔ ایک [illegible] تیمار دار رہنے کی تو اجازت ہے لیکن میں نے ہر بار یہ کہہ کر ٹال دیا کہ [illegible] کی میری طبیعت اب اتنی خراب [illegible] اپنا [illegible] کہ نصیبن بیچاری [illegible] کے

جنجال میں پھنس نہ جائیں ــــــ بیماریاں یوں تو غریبوں کے پاس کم آتی ہیں لیکن جب آتی ہیں تو جان لے کر ہی جاتی ہیں۔ اُن کے پاس اتنا پیسہ کہاں جو معقول علاج کرا سکیں۔

سینی ٹوریم کے اِس حصّے میں ہر طرح کے لوگ بھانت بھانت کے پنچھی کی طرح رہتے ہیں۔ ہر حالت میں اور ہر موسم میں۔ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کروٹ لی۔ نیم کی ڈالیاں لہرائیں جس کے متحرک سائے کھڑکیوں کے شیشے پر لمحہ بھر کے لئے ناچے اور تاریکیوں میں گم ہو گئے۔ چاند بدلی میں جا چھُپا جیسے کسی نے نئی نویلی دلہن کے مکھڑے پر گھونگھٹ کھینچ دیا ہو تاکہ کسی کی نظر نہ لگ جائے۔

میں بھی ایک رات اِسی طرح دلہن بنی تھی۔ کتنی خوبصورت تھی وہ رات پونم کی مدھر چمکیلی رات ــــــ مجھے رات کی اُس تنہائی میں آفاق بہت یاد آرہا تھا میں اُسے بھُلانے کی جتنی کوشش کرتی بیتی باتیں اتنی ہی زیادہ یاد آتیں اور میرے دل کو کچوکے لگاتیں۔ پھر یہ کچوکے میری روح میں اُتر گئے۔ ساری فضا مکدر ہو گئی۔ سارے ستارے ٹوٹ گئے اور کمرے کی کھڑکیوں کے سارے شیشے چکنا چور ہو کر دل میں اُترنے لگے میں زخمی ہو گئی، مجروح ہو گئی۔ نیم مُردہ سی سہاگ کے پلنگ پر پڑی سسکنے لگی۔ آفاق [illegible] تصویر ایک ابھر [illegible] گم [illegible] ــــــ ایک [illegible] شوہر میری زندگی کا مالک اور ایک عورت کے [illegible] مسکرا رہا تھا۔ اُس کی [illegible]

[illegible] مسکراہٹ [illegible] لیکن ایسا نہ کر سکی۔ زمانے نے اُسے میرا مالک بنایا [illegible] کمزور ناتوان ایک لڑکی جو اب کسی کی بیوی بن چکی تھی، بھلا کیا بغاوت پر آمادہ ہوتی۔ دل مسوس کر رہ گئی اور وہ مسکراتا ہوا میرے قریب آ گیا۔ چارپائی پر بیٹھا میرے [illegible] ایک ٹیس اٹھی۔ نہ جانے وہ کیا کیا مجھ سے پوچھتا رہا لیکن مجھ میں اتنی سکت کہاں [illegible] جواب دیتی۔ تجربہ کار ہاتھ اندھیرے میں سرکنے لگے۔ میرے جسم میں جھرجھری سی ہوئی۔ پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا اور رات بھر اسی عالم میں رہی۔

تین سال سے میری زندگی سے لپٹا ہوا یہ میرا شوہر نہ میرا جیون ساتھی ہے [illegible] معصوم بچے کا باپ جو پیدائش کے دوسرے ہفتے ہی اِس جہانِ فانی سے چل بسا اور [illegible] کے لئے اچھا ہی ہوا ورنہ وہ بھی بڑا ہو کر ہمیشہ کڑھتا ہی رہتا۔ میں تو بس ایک [illegible] جسم ہوں۔ جس کے یہاں ہر صبح ایک ہے، ہر شام کا مقصد ایک ہے ــــــ تاریکی اور صرف تاریکی ــــــ جذبات و احساسات سے بیگانہ، روح کی آواز سے ناآشنا، میں نہ کوئی بیوی ہوں نہ ماں نہ جیون ساتھی نہ روح کا پیار نہ بہار کا نغمہ۔ میں تو بس ایک جسم ہوں۔ ایک عورت کا گوشت کے لوتھڑوں سے بنا ہوا مشینی جسم جسے نہ پھولوں کی ضرورت ہے، نہ آنسوؤں کی مالا گوندھنی آتی ہے۔

میں آہستہ آہستہ اپنے شوہر کے متعلق جاننے لگی۔ یہ فلم پروڈیوسر تھے۔ اِنکی کئی [illegible] بنا چکی تھیں۔ رات میں دیر سے گھر لوٹنا اُن کے معمول میں داخل تھا۔ میں [illegible] اُن کے انتظار میں کھانا لئے بیٹھی جاگتی رہتی۔ ایک دن سر میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا اور آنکھوں میں جلن اُمڈ آئی تھی ـــ دل چاہ رہا تھا کہ اُس روز بھی پچھلی کئی راتوں کی طرح رو رو کر گزار دوں۔ وہ آئے لیکن دل کی حسرت دل ہی میں گھٹ کر رہ گئی۔ میری اُس جلن پر کسی نے نرم ہاتھ کبھی نہیں رکھا۔ کسی نے آنکھ سے ڈھلے ہوئے آنسوؤں کو رخسار سے نہ پونچھا بلکہ دیر سے آنے کا سبب پوچھنے پر گرم گرم کھولتا کڑھاؤ میرے سر پر اُنڈیل دیا گیا۔ میرے شوہر نے کھانے کی میز کے سارے چینی کے برتن توڑنے میں کانچ اور شیشے کے ٹکڑوں کی شدید چبھن سے تڑپتی رہی۔ زندگی بھر کے لئے یہ درد مجھے ملا تھا۔

سوچتے سوچتے آنسوؤں کے چند قطرے پلکوں سے ڈھلک آئے اور تکئے میں جذب ہو گئے۔ میں بے جان سرد لاش کی طرح بستر پر پڑی ہوں۔ نیند آنکھوں میں ہے نہ کوئی خواب۔ نہ کوئی خواہش ہے نہ کوئی آرزو۔ میری زندگی میں اب بچا ہی کیا ہے۔ سب کچھ ہار گئی ہوں۔ میں محبت کی تلاش میں نکلی تھی اور ہوس دامن سے لپٹ گئی۔ چاند ستاروں سے ٹھنڈک مانگتے مانگتے دہکتے ہوئے شعلوں کو اپنے دامن میں اٹھا لیا۔ شبنم کی جستجو میں زہر کو ہونٹوں سے لگا لیا اور پھولوں کی لگن میں اپنے نازک سے ہاتھوں کو زخمی کر لیا۔ یہ خار کتنے بے رحم ہوتے ہیں، کتنے ظالم ہوتے ہیں۔ کاش یہ کسی کے جذبات کو سمجھ سکتے۔ کاش ــــــ اکاش ــــــ!!

میں بستر پر پڑی سسک رہی ہوں۔ سسکیاں بھر رہی ہوں۔ دل کے [illegible] چھپے گوشوں میں ہچکیاں گھٹ کر رہ گئی ہیں ــــــ آہ ــــــ کتنا بھیانک ماحول ہے اور میری نگاہ میں ایک بار پھر آفاق کا چہرہ گھوم گیا۔

شادی کے ڈیڑھ سال بعد فلم ایکٹریس مینا [illegible] کی سالگرہ پر آفاق سے ملاقات ہوئی تھی۔ بچوں کی طرح معصوم چہرہ رکھنے والا آفاق آنکھوں کی چمک اور چہرے کا حسن کھو چکا تھا۔ اُس کے جسم پر اَن مٹ تھکن چھائی ہوئی تھی اور ایک حسین سی غمگین مسکراہٹ لبوں پر کھیل رہی تھی۔ سگریٹ اُس کے لبوں کے درمیان پھنسا ہوا تھا جب وہ مسکراتا تو سگریٹ ہلکا سا کپکپا جاتا۔ حسین کہانیوں کو جنم دینے والے آفاق کی مسکراہٹ اور دکھ بھری ہو جاتی۔ اُس کا غم زہر بن کر آنکھوں اور لبوں سے چھلک [illegible] دھیمے دھیمے اُمڈتے ہوئے آنسوؤں کی نمی اور دل کی گھٹن کا احساس شدید ہوتے [illegible] وہ تخیلات کی وادیوں میں کھو جاتا لیکن جیسے ہی مجھ پر نظر پڑی وہ ہڑبڑا کر اپنی سیٹ [illegible] اٹھا۔ میرے شوہر نے بڑی گرمجوشی سے آفاق سے ہاتھ ملایا اور میرا تعارف کرایا۔ انہیں کیا معلوم کہ ہم دونوں زندگی کے کسی دَور میں ایک دوسرے سے پہلے ہی مل چکے ہیں۔ خاموش نظریں جھکائے سب کچھ سنتی رہی۔ آفاق سے نظر ملانے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔ اُس کی یہ حالت دیکھ کر میری طبیعت مضمحل ہو گئی تھی۔ میں دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کاش آفاق بھی اب شادی کر لے تاکہ اُس کی زندگی کی تلخی کچھ کم ہو۔ مجھ سے اُس کی یہ حالت دیکھی نہ جا رہی تھی ــــــ اُف ــــــ اگر میں مسلمان کے گھر پیدا ہوتی یا آفاق کسی ہندو گھرانے سے تعلق رکھتا تو ہماری زندگی یوں مجبوریوں اور نامرادی کا مزار نہ ہوتی۔

"کہو شہل اچھے تو ہو نا" ــــــ اُس نے کھلکھلاتے ہوئے پوچھا۔
"بھئی بہت دن کے بعد نظر آئی ہو ــــــ آؤ کچھ باتیں کریں"
میرے دل کی دھڑکن ایک دم بڑھ گئی جیسے دل سینے سے نکل کر حلق میں آ [illegible] اور پنڈلیاں تھرتھرانے لگیں۔

"آؤ" ــــــ میرے شوہر نے مجھے مخاطب کیا۔
میں دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتی آگے بڑھتی گئی۔ [illegible]
[illegible] میرے شوہر اور سب سے پیچھے میں۔ [illegible] مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے [illegible] سارے لوگوں کی نظریں میرا تعاقب کر رہی ہیں لیکن درحقیقت یہ میرا احساس [illegible] سب اپنی اپنی دنیا میں مگن تھے۔ سب اپنی اپنی دُھن میں لگے تھے کسی کو [illegible] تھی جو دوسرے کا جائزہ لیتا۔

آفاق کی میز پر جگہ کافی تھی ہم وہیں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد مینا [illegible] اٹھلاتی ہوئی آئی اور آتے ہی میرے شوہر کو مخاطب کیا۔
"ہیلو مسٹر سہگل! ــــــ آپ آگئے میں ابھی فون کرنے ہی والی تھی"

[illegible] دہلی

میں نے ایک نظر مینا پر ڈالی۔ وہ مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔ نظروں کے ملتے ہی اس نے اپنی نظر جھکا لی۔ توبہ توبہ۔ چھی چھی ــــــ سارا سینہ بلاوز سے جھانک رہا تھا۔

"اچھا ہوا جو تم شہلا کو بھی لے آئے ورنہ میں تو آج ناراض ہی ہو جاتی۔"

مینا چکرورتی کے اس جملے پر میرے دل میں ایک ہوک سی اٹھی اور پھر میری نگاہ نہ جانے کیسے آفاق کی طرف چلی گئی۔ وہ خاموش حسرت بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ کچھ گھبرا سا گیا۔

"جانتی ہو شہلا۔ میں نے شادی کر لی۔"

"ایں ــــــ!" غیر ارادی طور پر میرے منہ سے نکلا۔

"ہاں ــــــ ہاں! ــــــ سچ مچ" اس کے ہونٹوں پہ تبسم کی لکیریں بکھر گئیں۔

"تم دیکھو گی تو خوشی سے جھوم اٹھو گی۔ بڑی خوبصورت ہے۔ بالکل چینی کی مورتی!"

"چینی کی مورتی ــــــ چینی کی مورتی ــــــ" میرے ذہن میں گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔ یہی وہ الفاظ تھے جو کبھی میرے لئے استعمال ہوتے تھے۔ اب ان الفاظ کا حق دار کوئی اور ہو گیا تھا۔ ان الفاظ سے کتنی حسین شامیں وابستہ ہیں، ماضی کی کتنی داستانیں پنہاں ہیں جنھیں سطح سمندر پر بکھرے ہوئے لاتعداد ریت کے ذرّے جانتے ہیں۔

آفاق کے منہ سے شادی کا لفظ سن کر واقعی میرے دل میں اطمینان کی ایک لہر دوڑ گئی اور میرا سارا جسم عجیب جذبات کی ایک عجیب کیفیت سے سرشار ہو اٹھا۔

"تم نے ہمیں بلایا نہیں" ــــــ میرے شوہر نے گلہ کیا۔

"ہاں" ــــــ آفاق اسی طرح ہنستا رہا۔

"بات یہ ہوئی کہ یہ شادی بہت ہی جلدی میں ہوئی۔ ابا جان نے رشتہ طے کیا [illegible] گاؤں جا کر میں نے شادی کر لی۔"

میں نے آفاق کی طرف دیکھا۔ وہ یوں تو بات میرے شوہر سے کر رہا تھا لیکن [illegible] جملے میرے ہی لئے تھے اور میں کان لگائے ایک ایک لفظ سن رہی تھی۔ یہ جان کر [illegible] خوشی ہوئی کہ اس شادی سے آفاق خوش ہے۔

پھر سالگرہ کے پروگرام شروع ہو گئے۔ سب سے پہلے کیک کاٹا گیا پھر ہیلن کا رقص ہوا پھر ٹی پارٹی اور پھر سب رخصت ہونے لگے۔ باہر گیٹ تک ہمارے ساتھ مینا چکرورتی بھی آئی۔ آفاق بھی ساتھ تھا۔ رخصت ہوتے ہوئے اس نے ہمیں اپنے گھر آنے کی دعوت دے ڈالی۔

نہ جانے چند مہینوں کے بعد میرے شوہر کو کیسے آفاق کا وہ جملہ یاد آ گیا۔ مجھے تیار ہونے کے لئے کہا۔ شوہر نے کار نکالی اور ہم آفاق کے بنگلے کی طرف روانہ ہو گئے۔ میرے شوہر نے مجھے آفاق کے بنگلے کے سامنے اتار دیا اور خود یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے کہ میں ایک گھنٹہ بعد آ جاؤں گا۔ ذرا آفس میں ایک ضروری کام ہے۔ تم آفاق سے کہہ دینا۔

میں دُور تک انھیں جاتے دیکھتی رہی۔ مجھے سوچنے کی کچھ مہلت بھی نہیں ملی تھی۔ یہ سب کچھ بہت جلدی میں ہوا تھا ــــــ میں آہستہ آہستہ قدم بڑھاتی ہوئے آفاق کے بنگلے میں داخل ہو رہی تھی۔ میرا ذہن میرے شوہر کے رویّے میں اُلجھا ہوا تھا۔ اور آفاق کے بنگلے میں تنہا داخل ہوتے ہوئے میری دلی کیفیت عجیب سی ہو رہی تھی۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ برآمدے میں پہنچتے ہی میری نظر ایک کھڑکی سے گزرتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔ ایک مرد کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے لبوں میں ایک جلتا ہوا سگریٹ دبا تھا۔ میں نے بجھے ہوئے دل سے آفاق کو پہچان لیا۔

"آپ کس سے ملنا چاہتی ہیں؟" ــــــ ایک آواز نے مجھے مخاطب کیا۔ میں نے سوچا شاید یہ اس کی بیوی ہو گی۔ لیکن ــــــ آواز! ــــــ آواز تو مرد کی تھی۔

"آپ کس سے ملنا چاہتی ہیں؟" ــــــ سوال پھر دہرایا گیا۔

"جی! ــــــ آفاق صاحب کی بیوی سے۔"

وہ ایک بے تکی ہنسی ہنسنے لگا۔

"شاید آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"آفاق صاحب کا یہی گھر ہے نا؟"

"جی ہاں! لیکن آفاق صاحب نے ابھی تک شادی [illegible] خادم ہوں۔"

"کیا تم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہو؟"

"جی ہاں بیگم صاحب! انھیں کسی لڑکی سے محبت ہو گئی ہے۔ ہمیشہ اُسی کے خیال میں کھوئے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی کہانیاں لکھتے لکھتے تصویریں بنانے لگتے ہیں اور کبھی کبھی صرف شہلا شہلا لکھ کر کاپی کا سارا صفحہ بھر دیتے ہیں۔ ایک دن کسی فلم ایکٹریس کی سالگرہ سے لوٹ کر آئے تو شراب کے نشے میں چُور تھے۔ ایک عورت بھی اُن کے ساتھ آئی تھی۔ پھر جب ذرا ہوش آیا تو ڈانٹ کر اُسے بھگا دیا۔"

میں نے ایک بار پھر چپکے چپکے آفاق کے کمرے کی طرف دیکھا وہ سگریٹ پی رہا تھا۔ اپنی ساری محبتوں، زندگی کی ساری کڑواہٹوں، سارے دُکھوں کو سگریٹ کے تلخ ذائقے میں مدغم کر رہا تھا۔ وہ مسلسل سگریٹ کے کش لگاتا رہا ــــــ شاید کچھ لکھ رہا تھا۔

میں پریشان ہو گئی اور اُسی طرح پریشان تیز تیز قدم اٹھاتی باہر چلی آئی۔ ایک ٹیکسی لی اور مکان پہنچ گئی۔ جا کر بستر پر لیٹ گئی ہلکا ہلکا پیٹ میں درد ہو رہا تھا بعد میں سینے میں درد ہونے لگا پھر ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی چیز پیٹ سے اُچھل کر حلق

[illegible] پھر مجھے ہوش نہ رہا۔ غنودگی چھاتی گئی۔

اور جب ہوش آیا تو اپنے آپ کو سینی ٹوریم میں پایا۔ راحیلہ باجی سامنے کھڑی تھیں۔ اور وہ ایک کرسی پر اُن کے پاس بیٹھے کسی سوچ میں گم تھے۔ اور ابا جی ڈاکٹر سے گفتگو کرتے ہوئے کمرے سے باہر چلے گئے تھے پھر ہلکی ہلکی چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ اور مجھے اس بات کا احساس ہو گیا کہ اُس رات میرے مُنہ ناک سے خون نکلا تھا۔

میں ایک مہینے سے سینی ٹوریم کے اس کمرے میں پڑی ہوں ٹی بی کی مریضہ بن کر۔ وہ ہر اتوار کو آجاتے ہیں۔

آج میں تنہا ہوں۔ بالکل تنہا! اور ایک ایسی تنہائی محسوس کر رہی ہوں جو میرے وجود کو ختم کرنے کے لئے کافی ہے۔ نیم کے پتوں کے درمیان سے چاند کے جھانکنے پر صحن کے ایک کونے میں پھر چاندنی نے کروٹ لی اور وارڈ میں ہلکی سی روشنی پھیل گئی۔ اندھیرے پر اُجالے غالب آگئے۔ دُھندلے دُھندلے سے اُجالے لیکن میری زندگی کی تاریکی تو سدا کی ہے بھلا وہ کیوں مٹنے لگی۔

میں نے کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کی تو سرہانے رکھا ہوا اخبار نیچے گر گیا۔ اُسے میں نے جھک کر اُٹھا لیا۔ لائٹ ابھی تک جل رہی تھی میری نظر ایک اشتہار پر جم کر رہ گئی ــــــــ

ــــــــ ادارہ نئی دُنیا فخر کے ساتھ پیش کرتا ہے

عظیم فنکار آفاق نور کی عظیم تخلیق

"زندگی عذاب ہے یارب"

جس پر انہیں سالِ رواں کا سب سے بڑا ادبی انعام ملا ہے۔

اور دائیں طرف ایک خبر چھپی تھی ــــــــ

"زندگی عذاب ہے یارب" کے نامور مصنف آفاق نور

اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے ہیں۔"

پھر آگے میں کچھ نہ پڑھ سکی۔ رفتہ رفتہ میری آنکھیں جھکنے لگیں۔ سر ایک طرف ڈھلک گیا اور آنسو رخسار سے پھسلتے ہوئے تکئے میں جذب ہونے لگے۔

شہزادی

ــــــــ پریم وار برٹنوی

تاروں کا سُنہرا سپنا ہو
پھولوں کی مہکتی وادی ہو
تم رنگ برنگے موسم کی ارمان بھری شہزادی ہو

جب زُلف تمہاری کُھلتی ہے
موسم کا دھڑکتا ہے سینہ
یہ پھول تمہارے زیور ہیں
اور چاند تمہارا آئینہ
یہ آئینہ مت ٹھکراؤ تم ہار سنگھار کی عادی ہو
تم رنگ برنگے موسم کی ارمان بھری شہزادی ہو

سجتے ہیں خواب بہاروں کے
ہر رات تمہاری آنکھوں میں
تصویر جو میں نے دیکھی ہے
کلیوں کی کنواری آنکھوں میں
شاید کہ کسی نے تم کو بھی تصویر وہی دکھلا دی ہو
تم رنگ برنگے موسم کی ارمان بھری شہزادی ہو

جب چاروں طرف خاموشی ہے
جب چاروں طرف تنہائی ہے
پھر مجھ سے تمہاری شوخ نظر
کیوں شرمائی شرمائی ہے
جیسے کہ کسی نے آج تمہیں زنجیرِ وفا پہنا دی ہو
تم رنگ برنگے موسم کی ارمان بھری شہزادی ہو

افسانہ

گھر میں اجنبی

نور شاہ

ہسپتال روڈ ۔ درگہ مین ۔ سرینگر (کشمیر)

۲۶ / اپریل ۱۹۶۴ء برادرِ محترم! آداب

"گھر میں اجنبی" اُن دلوں کی کہانی ہے جو محبت کی سیڑھی سے پھسل کر ایک بار گرتے ہیں تو ہمیشہ کیلئے اپنی جان کو روگ لگا لیتے ہیں۔ اپنی پہلی محبت کی خاطر اپنے "گھر" کی ویرانی نہیں مٹا سکتے اور انھیں اپنے گھر میں بھی اجنبیت کا احساس ہونے لگتا ہے! ـــــ یقین ہے کہ "افسانہ نمبر" اب کی بار بھی اپنی شاندار روایتوں، جدتوں اور رنگینیوں کے ساتھ شائع ہوگا۔

آپکا بھائی ـــــ نور شاہ

یہ آنکھیں بھی کبھی کبھی ساون کی ندیاں بن جاتی ہیں!

میرے اِن آنسوؤں کی کہانی جانے کب شروع ہوئی۔ وہ ایک لوک کتھا ہے نا ـــــ ایک تھا چڑا، بھولا بھالا سا، اُس نے تنکے تنکے جوڑے اور ایک ربنایا، گھر بنا تو اُسے اپنی تنہائی کا احساس ہوا اور پھر ایک چڑیا....!

اُس رات جب میں دیر سے گھر لوٹا تو اپنی خواب گاہ میں ایک چڑا دیکھ کر ران نہیں ہوا۔ سوچا راہ بھولا ہوگا پو پھٹتے ہی اُڑ جائے گا، فضاؤں میں تیرتا ہوا دور، ہت دور۔ میں سوگیا۔ صبح جب میری آنکھ کھلی تو وہ واقعی کمرے سے چلا گیا تھا لیکن ات کو پھر اُسے اپنی خواب گاہ میں پایا۔ اُس نے چند تنکے بھی جمع کئے تھے اور انہیں ایک وسرے کے ساتھ جوڑنے میں منہمک تھا۔ بڑی محنت، محبت اور سلیقے سے ایک یک تنکا سنوار رہا تھا۔ کچھ تنکے فرش پر بکھر گئے تھے۔ میں نے فرش پر سے وہ تنکے جمع کئے اور کھڑکی سے باہر پھینک دئے اور وہ تنکے بھی جنہیں وہ محنت اور محبت سے جوڑنے یں مصروف تھا۔ چڑے نے میری طرف دیکھا۔ خاموش رہا۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں یں نہ جانے کیا تھا۔ آرزوؤں کی ایک دُنیا تھی، ایک گھر کا خواب تھا۔ رات کو کئی بار میری آنکھ کھلی، ہر بار اُسے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا۔ خاموش خاموش سا اپنی ننھی پلکوں کو جھپکاتے ہوئے!

وہ شاید اپنا گھر لٹ جانے سے اُداس ہوگیا تھا!!

گھر لٹ گیا۔ جب میرا گھر لٹ گیا تھا تو میں بھی اُداس ہوگیا تھا۔ اُس وقت کس نے میری آرزوؤں کی دنیا کی پروا کی تھی؟ کس نے میرے گھر کے خواب کی تعبیر تلاش کرنے میں مدد کی تھی؟ نیلی نے بھی نہیں۔ نیلی جو میری اپنی تھی۔ جس نے عمر بھر ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا۔ ایک ساتھ جینے اور مرنے کی سوگند کھائی تھی ـــــ میں نے بھی ایک گھر بنانے کا تصور کیا تھا۔ ایک خوبصورت گھر بنانے کا خواب دیکھا تھا۔ میرے دل کی دھڑکنوں میں یادوں کی گنگناہٹ تھی اور تصور میں زندگی کی متنوع وسعتیں تھیں۔ میں نے بھی سوچا تھا اپنی زندگی کے بارے میں، اپنی ایک چھوٹی سی دنیا کے بارے میں، اپنی ماں کی آخری حسرت، آخری تمنا کے بارے میں۔ لیکن نیلی تو بڑے گھرانے کی بیٹی تھی اور میں ایک درمیانہ گھرانے کا بیٹا۔ اُس وقت میں نے سوچا تھا۔ محبت میں کوئی فرق حائل نہیں ہوتا۔ محبت بلندیاں اور پستیاں نہیں دیکھتی۔ بلندیاں اُس کی جانب جھکتی ہیں اور پستیاں اُبھر کر اُسے اپنا لیتی ہیں۔ برسوں سے جلتے ہوئے خیالوں کے دلوں کو نیلی نے ایک ہی پھونک سے بجھا دیا تھا۔ ایک گھر لٹ گیا تھا۔ ایک دل اُداس ہوگیا تھا۔ ایک خواب اپنی تعبیر کی تلاش میں کھو گیا تھا۔

چڑا اپنا گھر لٹ جانے سے اُداس ہوگیا تو کیا ہوا، اب کوئی گھر نہیں بسے گا۔ اب کسی خواب کی تکمیل نہ ہوگی۔ لٹ جانے دو آرزوؤں کی دنیا کو....!

کئی دن ایک ساتھ گزرے۔ مجھے گھر سے باہر رہنا پڑا۔ جب لوٹا تو گھر بن چکا تھا۔ تنکے جوڑے جا چکے تھے۔ اور چڑا اپنے گھر میں چہچہا رہا تھا۔ ایک بار میرے ہاتھ اُس کی طرف بڑھے۔ اس سے پہلے کہ میں اُس گھر کے تنکے تنکے بکھیر دیتا میں نے اُسکی

آنکھوں میں جھانکا۔ وہی چھوٹی چھوٹی معصوم سی آنکھیں تمناؤں کی جھیل لئے ـــــ میرے ہاتھ رُک گئے۔ میں اپنی اس حرکت پر خود ہی حیران رہ گیا۔

آنسوؤں کی بات تو پھر رہ گئی!

چڑا دولہا بنا اور اپنے لئے ایک چھوٹی سی چڑیا دولہن بنا کر لے آیا۔ دولہا خوش تھا دولہن خوش تھی۔ دونوں خوشی سے چہچہا رہے تھے۔

گھر بس چکا تھا!

اور اُس لمحے مجھے اپنے گھر کے اندھیرے کا احساس ہوا۔ دل میں ایک آہٹ سی ہوئی۔ دل کا یہ صحرا تو صدیوں سے جل رہا تھا۔ میں نے اپنی پلکوں کو جنبش دی۔ اپنے گھر کے ایک ایک گوشے میں گیا۔ ایک ایک شے کو دیکھا اور چھوا۔ ہر سمت ویرانی سی چھائی

- نیک خو ہونا تمام حکمتوں کا خلاصہ ہے۔ (سقراط)
- سب سے بڑی خوبی جو آدمی میں ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ ہر روز نیکی کے بارے میں گفتگو کرے اور اپنا اور دوسروں کا پوری دیانتداری اور انصاف سے محاسبہ کرتا رہے۔ (سقراط)
- تم کسی سے وہ برتاؤ نہ کرو جو تم اپنے لئے پسند نہیں کرتے۔ (حکیم کنفوشیس)
- آدمی کسی کے ساتھ نیکی نہ کر سکے تو اتنا تو کرے کہ اُس کو بُرائیوں سے آگاہ کرتا رہے۔ (بقراط)
- خدا کی نعمتوں میں عورت سب سے زیادہ قابلِ قدر ہے۔ جب میں مصائب کے طوفان میں گھرا ہوتا ہوں تو وہی میری دلجوئی کرتی ہے۔ وہ میری نگران ہے۔ اُس کی محبت کے بھروسے پر میں کہہ سکتا ہوں کہ میں کوئی بُرا کام نہ کروں گا۔ (کرک)

ہوئی تھی۔ ہر چیز سے اجنبیت کا احساس ہو رہا تھا۔ میں تو اپنے ہی گھر میں اجنبی تھا۔

پانی کے بغیر کنول مُرجھا جاتا ہے' مر جاتا ہے!

چاندنی کے بغیر چاند بے کیف ہے' بے رنگ ہے!!

چڑیا کے بغیر چڑے کی زندگی ادھوری ہے!!!

اور میں ....؟

میں رو پڑا۔ میری آنکھیں ساون کی ندیاں بن گئیں۔ میں نے نیلی کو تلاش کیا۔ نیلی نہ ملی۔ اُس کی یادیں اُبھر آئیں۔

نیلی تو کہاں ہے!

کاش نیلی نے وہ کشمیری لوک کتھا سُنی ہوتی۔ وہی ایک تھا چڑا بھولا بھالا سا۔ لیکن وہ کہتا تو ابھی ادھوری ہے۔ سُنو نیلی! پھر دولہا نے دولہن سے کہا۔

"تمہارے کانوں میں یہ بالیاں کیا خوب سجتی ہیں۔ ان کے اندر میرے ہزاروں تمناؤں نے اپنا نشیمن بنا رکھا ہے۔ تمہیں کس چیز کی تمنا ہے۔ تمہارے تو سات سنگار ہو چکے ہیں۔ آؤ میں تمہارے نازک بدن کو سُرخ جامہ پہناؤں۔"

چڑیا مُسکرائی اور پھر خود ہی اپنی مُسکراہٹ پر شرمائی۔

میں خواب گاہ سے باہر بالکونی میں نکل آیا۔ مجھے اپنا کمرہ' اپنا گھر جہاں میں تنہائی کی بے شمار راتیں اور دن گزارے تھے' بیگانہ معلوم ہو رہا تھا۔ یہاں بھی اندھیرا ہے۔ میرے دل کی طرح۔ ساری بالکونی اندھیرے میں ڈوب گئی ہے۔ اِس بالکونی کا میری زندگی اور میری تنہائیوں سے گہرا تعلق رہا ہے۔ اِس نے کئی چاندنی راتوں میں زندگی بخشی ہے۔ کئی طوفانی اور تاریک راتوں میں پناہ دی ہے جیسے آج کی رات .... آج کی رات بھی تاریک ہے۔ آج کی رات بھی میں تنہا ہوں۔ نیلی نہ جانے کہاں ہے؟ سامنے سارے مکانوں کی روشنیاں بُجھ چکی ہیں۔ کہیں کوئی آواز نہیں۔ .. ہاں گلی کے اُس پار والے مکان کی بالائی کھڑکی ابھی بند نہیں ہوئی ہے۔ بجلی کی دھیمی دھیمی سی روشنی اب بھی کھڑکی سے باہر آ رہی ہے۔

آنسو اب تھم چکے ہیں!

پریتی کا آدھا چہرہ نظر آ رہا ہے۔ یہ پریتی بھی عجیب لڑکی ہے۔ ساری ساری رات نہ جانے کیا پڑھتی رہتی ہے۔ میں نے تو اُسے کہیں آتے جاتے نہیں دیکھا۔ گلی سے گزرتے نہیں دیکھا پھر بھی نہ جانے کون سی موٹی موٹی کتابیں پڑھتی رہتی ہے۔ ہے بہت سُندر۔ اِس کا سراپا ہی رومان انگیز ہے۔ آنکھیں تو آبِ حیات کا چشمہ ہیں۔ ایسی ہیں کہ اِن میں اُلجھنے کو جی چاہتا ہے۔ اور اِس تاریکی میں جو سیب کے شگوفوں کی سی خوشبو آ رہی ہے ضرور اُس کی سانسوں کی خوشبو ہوگی!

پھر بھی نہ جانے میرے گھر کا اندھیرا!

یہ نیلی کہاں چلی گئی۔ اُس سے ملے مُدتیں گزر گئیں۔ پریتی سامنے ہے۔ اُس کا چہرہ نظر آ رہا ہے۔ لیکن یہ چہرہ دیکھتے دیکھتے تو میں اب اُکتا چکا ہوں۔ بھلا صرف دیکھنے ہی سے من کی پیاس بُجھ سکتی ہے۔

اگر میں بھی ایک چڑا ہوتا!

اگر واقعی میں ایک چڑا ہوتا تو کس جانفشانی سے تنکے جمع کرتا۔ تنکوں کے آشیانے کا ارمان ہوتا ہے ـــــ میں بھی اُس دن یہی ارمان لئے چلا جا رہا تھا اکیلا اکیلا' تنہا تنہا' حیران حیران ـــــ اور مجھے نیلی ملی۔ اب یقین نہیں آتا کہ ملی تھی وہ۔ اُس پگڈنڈی کے نشان دُھندلا گئے ہیں جس پر سے گزر کر وہ آئی تھی میرے دل کے آشیانے میں دونوں پر پھیلا کر صرف ایک لمحے کیلئے بیٹھ گئی تھی۔

یہ چڑیا بھی اس وقت بالکل ایسے ہی بیٹھی ہے۔ لو رچڑیا! اِس بیچارے
کے بارے میں کوئی علم نہیں۔ مجھے بھی کوئی علم نہیں کہ یہ آواز جو دن ڈھلے
ندھیروں سے اُبھرتی ہے اور ایک سائے کی طرح میرے سارے وجود پر
تی ہے کہاں سے آتی ہے اور کہاں چلی جاتی ہے؟ آس پاس کی چیزوں سے
ں کو پکارتی کسی کو تلاش کرتی ہوئی یہ آواز ــــــ اسے کیا معلوم اِس
س ارمان کا اور اِس گھونسلے کا جس میں اِسوقت یہ چڑیا بیٹھی ہے کون سا
اں ہے۔ یہ آواز آتی ہے تو محسوس ہوتا ہے جیسے پگھلی ہوئی چاندی بہہ رہی
آواز میں تو گیسوں کی گلپوشش جھیل کا سا سکون ہے۔ یہ آواز کانوں سے ٹکراتی
یس ہوتا ہے جیسے کوئی کانوں میں شہد ٹپکا رہا ہے!

لون؟!
نیلی ہوگی۔ لیکن نیلی تو یہاں نہیں ہے۔ نیلی کا وجود نہ سہی اُس کی یادیں تو ہیں۔
سہارے ہی کیا عمر کے خواب کی تعبیر مل سکتی ہے؟ خواب کی تعبیر کیلئے تو تنکے
نے پڑتے ہیں۔ جیسے چڑے نے کئے اور پرتی.... کھڑکی بند ہو چکی ہے۔ چہرہ
ے اوجھل ہو چکا ہے۔ نیلی نہیں ہے۔ پری نہیں ہے۔ وہ آواز بھی نہیں۔
وں؟ کہاں جاؤں؟ رات کا وقت ہے اور اِس تاریکی میں اگر وہ آواز سنائی
ں اُسی کے سہارے اُس مقام کی تلاش میں جا نکلتا جہاں مجھے نیلی ملی تھی۔
نیلی سے پہلی ملاقات کی وہ بھینی بھینی سی مہک اب بھی میری سانسوں میں
ہے۔ سامنے ہی تو رہتے تھے وہ لوگ۔ لیکن یہ یہاں کی بات نہیں ہے۔ تب
ماں کے ساتھ رہتا تھا۔ ہمارے چھوٹے سے مکان کے ساتھ ہی ایک اچھی
ی تھی۔ جانے کب سے خالی پڑی تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اِس میں بھوت
ہتے ہیں۔ کچھ مُدت کے بعد معلوم ہوا کوٹھی فروخت ہو چکی ہے۔ کسی مسٹر کپور
ی تھی۔ میں نے مسٹر کپور کو کبھی نہیں دیکھا۔ وہ جرمنی میں تھے۔ اُن کی بیوی اپنی
کے ساتھ اِس کوٹھی میں رہنے کے لئے چلی آئی تھی۔ میں نے کوئی بھوت پریت
ں دیکھا۔ البتہ ایک پری دیکھی۔ ایک خوبصورت پری! جیسے برفیلے پہاڑوں کی
تی ہے۔ اُجلی اُجلی دُھلی دُھلی سی۔ چاندنی رات تھی۔ کھڑکی کھلی تھی۔ وہ اپنے
لیٹی تھی۔ چاند کی نرم نرم کومل کومل اور ٹھنڈی ٹھنڈی کرنیں اُسکے نیم خوابیدہ
ہ پڑ رہی تھیں۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ بس دیکھتا ہی رہا۔ اچانک وہ
ی جیسے کوئی سپنا دیکھ کر جاگ پڑتا ہے۔ وہ کھڑکی کے قریب آئی۔ میری
یکھا۔
پھر کھڑکی بند ہو گئی!
چاند پہلی بار چمکا تھا۔ چاندنی پہلی بار بکھری تھی۔ ایک پری چاندنی بن کر آئی اور

پہلی ہی جھلک میں میرے دل کی دھڑکنیں سمیٹ لیں۔
میری ماں بیمار ہو گئی۔ رات کا وقت تھا۔ وہ بخار سے تپ رہی تھی۔
میں اکیلا تھا۔ ڈاکٹر کو بلانے جاتا تو ماں کے پاس کون رہتا۔ عجیب سی پریشانی میں
مُبتلا تھا۔ ماں نے نیم بے ہوشی کے عالم میں کہا۔
"بیٹا سامنے والی کوٹھی میں ڈاکٹر نینا رہتی ہے۔"
میں ننگے پاؤں دوڑتا ہوا کوٹھی پہنچا۔ لان میں نوکر سو رہا تھا۔ اُسے جگایا
اور ساری بات سمجھا دی۔ وہ اندر چلا گیا۔
"یہ نینا کون ہے؟" میں نے سوچا۔
دروازہ کھلا اور ڈاکٹر نینا باہر آئی۔ برفیلے پہاڑوں کی اُجلی اُجلی دُھلی

- نیکی کی ترغیب دینے والا نیکی کرنے والے کے برابر ہے۔
(حضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- نیکی سے عمر بڑھتی ہے۔ (حضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- نیک وہ ہے جو دوسروں سے نصیحت پکڑے۔
(حضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- اپنے ماں باپ سے نیکی کرو تمہاری اولاد تم سے نیکی کرے گی۔
(حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ)
- کرم یہ ہے کہ سوال سے پہلے دیا جائے۔ (حضرت حسن رضی اللہ عنہٗ)
- دولت کا بہتر مصرف یہ ہے کہ اِس سے عزت و آبرو کو برقرار رکھا جائے۔
(حضرت حسین رضی اللہ عنہٗ)
- مصیبت پڑنے پر گھبرانا بجائے خود مصیبت ہے۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ)

دُھلی سی پری نے ڈاکٹر کا رُوپ دھار لیا تھا۔
"میری ماں بیمار ہے۔"
"چلئے میں دیکھتی ہوں۔" جیسے پگھلی ہوئی چاندی بہہ گئی۔
اُس نے ماں کو دیکھا۔
"بخار بہت تیز ہے۔ اِن کے ماتھے پر ٹھنڈے پھاہے رکھ دیجئے۔ میں ابھی
دوا بھجواتی ہوں۔"
"میں آپ کے ساتھ چلوں؟"
"جی نہیں نوکر کے ہاتھ بھجوا دوں گی۔"
"آپ تنہا....!"

"میں ڈرتی نہیں ہوں۔"

میں ساری رات جاگتا رہا۔ صبح وہ خود ہی آئی۔ ماں کا بغور معائنہ کیا۔

"آپ کی ماں اب خطرے سے باہر ہے۔"

"شکریہ" میرے منہ سے نکل گیا۔

"آپ اپنا خیال رکھئے اب۔ کچھ دیر سو لیجیے۔" اس کے ہونٹ مسکرائے۔

اس کے بعد وہ کئی بار ہمارے ہاں آئی۔ میں اس کے ہاں گیا۔ ادب، نفسیات، سیاست اور دوسرے مسائل پر باتیں کیں۔ ایک دوسرے کو پہچانا اور قریب آئے۔ پہچان، پہچان، ملاقاتیں اور قربت ایک دوسرے میں تحلیل ہو گئیں اور محبت کا ایک چراغ جلا۔ پیار کا ایک ساگر وجود میں آیا۔ ہم دونوں نے مل کر چراغ کی لو کو امر رکھنے کی سوگند کھائی۔

رات بھیگ چکی ہے۔ اب سو جانا چاہئے۔ یہ نیند کی دیوی کہاں چلی گئی ہے۔ ساری ساری رات جاگتا رہتا ہوں۔

مجھے تیرے بغیر نیند نہیں آتی۔

اس بات کا میرے دل کو بہت دکھ ہے۔

کبھی اس جلتی ہوئی چھاتی کو ٹھنڈک تو پہنچا۔

وقت گزرتا رہا!

محبت کا چراغ جلتا رہا!!

"نیلی! ماں بیمار ہے۔ چند دنوں کی مہمان ہے۔ اس کی آخری حسرت، آخری تمنا ہے کہ وہ....!"

"کیا چاہتی ہے؟"

"اپنی بہو کا منہ دیکھنا چاہتی ہے۔"

"تو کر لو نا شادی۔"

"میں جانتا تھا کہ نیلی تم....!"

اس نے میری بات کاٹ دی۔ "کوئی لڑکی دیکھ رکھی ہے؟"

"ہاں ایک لڑکی ہے۔ اُجلی اُجلی سی۔ سیب کی ڈالیوں کی طرح جھکی جھکی سی۔"

نیلی کی آنکھیں مسکرائیں۔ پھر آہستہ آہستہ یہ مسکراہٹ دب گئی۔ ایک ہی پھونک سے محبت کا چراغ بجھ گیا۔ ایک ہی سانس میں ساری غلط فہمیاں دور ہو گئیں۔

"میں نے ابھی شادی کے بارے میں سوچا تک نہیں۔"

"لیکن محبت، وعدے اور....؟"

"محبت اپنی جگہ ہے لیکن شادی میں اسی کے ساتھ کروں گی جس کے پاس ایک خوبصورت گھر ہو۔"

"گھر تو میرے پاس بھی ہے۔"

"یہ گھر وہ گھر نہیں جس کی میں تلاش میں ہوں۔ گھر سے میرا مطلب ایک شاندار کوٹھی سے ہے۔ ایک خوبصورت کار سے ہے۔ ایک....؟"

ماں اپنی آخری حسرت آخری تمنا لے کر چلی گئی۔

میں نے گھر چھوڑا۔ شہر چھوڑا۔

چڑے نے تنکے تنکے جوڑ کے گھر بنایا۔ میں نے روپیہ روپیہ جوڑا اور ایک کوٹھی بنائی۔ ایک کار خریدی۔ بستی بستی نگر نگر گھوما پر نیلی نہ ملی!

میرا گھر لٹ گیا۔ میرے خواب بکھر گئے۔

میں اب نیلی کو بھولنے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ چڑا اپنی چڑیا کو لے کر آیا اور میرے ماضی کے دھندلکوں سے اس کی یادیں ابھر آئیں۔ پریتی کا چہرہ دیکھتا ہوں تو نیلی کی صورت آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ ایسی ہی ایک کھڑکی میں، میں نے نیلی کو پہلی بار دیکھا تھا۔ دن ڈھلے گلی کے نیم اندھیروں سے آواز آتی ہے تو مجھے نگین کی گلپوش جھیل کا سکون یاد آتا ہے۔

نیلی کی آواز میں بھی ایسا سکون تھا۔

نیلی ——!

نیلی ——!!

میرا نشیمن اداس ہے۔ میں اکیلا ہوں۔ اپنے ہی بنائے ہوئے گھر میں گھبرا اٹھتا ہوں۔ اور وہ آواز گلی میں سے ایک سائے کی طرح تیرتی ہوئی ابھرتی ہے —— لیکن میں اس آواز کی حقیقت جان چکا ہوں۔ کسے معلوم تھا کہ پریتی جو صبح کی پہلی کرن کی طرح خوبصورت ہے ایسی سحر انگیز آواز بھی رکھتی ہے۔ ابھی ابھی یہاں آئی تھی زندگی میں پہلی بار۔

"دیکھیے آپ کے گھر میں ہماری ایلیشیشن تو نہیں گھس آئی ہے۔" اس نے صحن میں آ کر پکارا۔

"ایلیشیشن —— ایلیشیشن یہاں کیا لینے آئے گی۔ ہاں ایک پری ضرور اتر آئی ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

پریتی شرما گئی!

"ضرور نہیں آؤ گی ——" میں نے پوچھا۔ اور وہ اُداس ہوگئی۔
"... پریتی کو دیکھو گا۔ کیسے نئے نویلے بچے ایک نئی نظر سے۔ اور اپنے گھونسلے
میں بیٹھی ہوئی چڑیا انہماک سے دیکھنے لگی۔ "لاؤ اِسے گھر میں۔ پھر یہ خود ہی تمہارا گھونسلہ
بن جائے گی۔ تم سے تمہاری تنہائیاں چھین لے گی۔ اپنے دونوں پر پھیلا کر تمہارے گھونسلے میں
سہاگ کی گرمی بھر دے گی۔ نیلی کیا اس سے زیادہ خوبصورت تھی۔ اس کی آنکھوں میں جھانکو۔
تم سے محبت کرتی ہے۔ خاموش محبت۔ اس کے مکان کی کھڑکی تمہارے لئے کھلی
رہتی ہے۔"

"پریتی —— میں .... میں تم سے !"

دفعتاً نہ جانے کیا ہوا؟ میرے اندر ایک زور کا طوفان اُٹھا۔
"نکل جاؤ یہاں سے۔ یہ گھر نیلی کا ہے۔ اور اس کے آنے تک یہ
ویران رہے گا!"

پریتی بھونچکا رہ گئی۔ حیران و پریشان دیکھتی رہی۔ اس نے میرے سارے
وجود پر ایک غلط انداز نظر ڈالی۔ اور کمرے سے نکل گئی!

اوپر گھونسلے میں بیٹھی ہوئی چڑیا اپنے چڑے کے اور قریب سرک آئی ہے۔
دونوں مل کر اتنا شور مچانے لگے ہیں کہ جی چاہتا ہے ان کا گھونسلہ ہی اُجاڑ دوں!!

ہربھگوان شاد

امتحاں کا وقت ہے اے دل سنبھل فرقت کی رات
دیکھ لیں گے کل جو پڑ جائے گی کل فرقت کی رات

اے دلِ ناداں! عبث ہے اب کسی کا انتظار
ڈھل گیا پچھلا پہر۔ دو کا عمل فرقت کی رات

وہ نہ آئے تھے تو یہ کم بخت آ مرتی کہیں
مر گئی ہے کس جگہ جا کر اجل فرقت کی رات

ڈوبتی نبضیں اشارہ کر رہی ہیں ہم نفس!
رہ گئی ہے اب فقط دو چار پل فرقت کی رات

بحرِ غم میں تہہ نشیں ہو کر جناب شاد نے
کتنی درد انگیز لکھی ہے غزل فرقت کی رات

مجیب اسلم

تُو ہی قلب و نظر میں ہے جلوہ فگن
پردۂ ذہن پر تُو ہی جلوہ نما

بھولتا ہی نہیں وہ سماں دوستو!
جس گھڑی کوئی ملتے ہی رخصت ہوا

تیرے دم ہی سے جیسے فروزاں تھا وہ
یُوں ترے بعد مہتاب گہنا گیا

جو سرِ شاخ کھلتے ہی مرجھا گئے
کیجئے اُن شگوفوں کا بھی تذکرا

جس کو لے کر تجھے ڈھونڈتے تھے کبھی
وہ چراغِ تمنا بھی گُل ہوگیا

کون گزرا تھا اس راہگذر سے مجیب
ڈھونڈتا ہے کسے آج تک راستا

مجاہد اجل گانوی

جفائیں تم کو مبارک، وفائیں ہم کو عزیز
ہم اپنا کام کریں گے، تم اپنا کام کرو

محبتوں کی لطافت ہے اہلِ دل کیلئے
یہ کیف خاص ہے یارو! اسے نہ عام کرو

"میں ڈرتی نہیں ہوں۔"

میں ساری رات جاگتا رہا۔ صبح وہ خود ہی آئی۔ ماں کا بغور معائنہ کیا۔

"آپ کی ماں اب خطرے سے باہر ہے۔"

"شکریہ" میرے منہ سے نکل گیا۔

"آپ اپنا خیال رکھئے اب۔ کچھ دیر سو لیجئے۔" اس کے ہونٹ کپکپائے۔

اس کے بعد وہ کئی بار ہمارے ہاں آئی۔ میں اس کے ہاں گیا۔ ادب، نفسیات، سیاست اور دوسرے مسائل پر باتیں کیں۔ ایک دوسرے کو پہچانا اور قریب آئے۔ یہ جان پہچان، ملاقاتیں اور قربت ایک دوسرے میں تحلیل ہو گئیں اور محبت کا ایک چراغ جلا۔ پیار کا ایک ساگر وجود میں آیا۔ ہم دونوں نے مل کر چراغ کی لو کو امر رکھنے کی سوگند کھائی۔

رات بھیگ چکی ہے۔ اب سو جانا چاہئے۔ یہ نیند کی دیوی کہاں چلی گئی ہے۔ ساری ساری رات جاگتا رہتا ہوں۔

مجھے تیرے بغیر نیند نہیں آتی۔

اس بات کا میرے دل کو بہت دکھ ہے۔

کبھی اس جلتی ہوئی چھاتی کو ٹھنڈک تو پہنچا۔

وقت گزرتا رہا!

محبت کا چراغ جلتا رہا!!

"نیلی! ماں بیمار ہے۔ چند دنوں کی مہمان ہے۔ اس کی آخری حسرت، آخری تمنا ہے کہ وہ . . . . !"

"کیا چاہتی ہے؟"

"اپنی بہو کا منہ دیکھنا چاہتی ہے۔"

"تو کر لو نا شادی۔"

"میں جانتا تھا کہ نیلی تم . . . . !"

اس نے میری بات کاٹ دی۔ "کوئی لڑکی دیکھ رکھی ہے؟"

"ہاں ایک لڑکی ہے۔ اجلی اجلی سی۔ سیب کی ڈالیوں کی طرح جھکی جھکی سی۔"

نیلی کی آنکھیں مسکرائیں۔ پھر آہستہ آہستہ یہ مسکراہٹ دب گئی۔ ایک ہی پھونک سے محبت کا چراغ بجھ گیا۔ ایک ہی سانس میں ساری غلط فہمیاں دور ہو گئیں۔

"میں نے ابھی شادی کے بارے میں سوچا تک نہیں۔"

"لیکن محبت، وعدے اور . . . . !"

"محبت اپنی جگہ ہے لیکن شادی میں اسی کے ساتھ کروں گی جس کے پاس ایک خوبصورت گھر ہو۔"

"گھر تو میرے پاس بھی ہے۔"

"یہ گھر وہ گھر نہیں جس کی میں تلاش میں ہوں۔ گھر سے میرا مطلب ایک شاندار کوٹھی سے ہے۔ ایک خوبصورت کار سے ہے۔ ایک . . . . !"

ماں اپنی آخری حسرت آخری تمنا لے کر چلی گئی۔

میں نے گھر چھوڑا۔ شہر چھوڑا۔

چڑے نے تنکے تنکے جوڑ کے گھر بنایا۔ میں نے روپیہ روپیہ جوڑا اور ایک کوٹھی بنائی۔ ایک کار خریدی۔ بستی بستی نگر نگر گھوما پر نیلی نہ ملی!

میرا گھر لٹ گیا۔ میرے خواب بکھر گئے۔

میں اب نیلی کو بھولنے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ چڑا اپنی چڑیا کو لے کر آیا اور میرے ماضی کے دھندلکوں سے اس کی یادیں ابھر آئیں۔ پریتی کا چہرہ دیکھتا ہوں تو نیلی کی صورت آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ ایسی ہی ایک کھڑکی میں، میں نے نیلی کو پہلی بار دیکھا تھا۔ دن ڈھلے گلی کے نیم اندھیروں سے آواز آتی ہے تو مجھے نگین کی گلپوش جھیل کا سکون یاد آتا ہے۔

نیلی کی آواز میں بھی ایسا سکون تھا۔

نیلی ——— !

نیلی ——— !!

میرا نشیمن اداس ہے۔ میں اکیلا ہوں۔ اپنے ہی بنائے ہوئے گھر میں گھبرا اٹھتا ہوں۔ اور وہ آواز گلی میں سے ایک سائے کی طرح تیرتی ہوئی ابھرتی ہے ——— لیکن میں اس آواز کی حقیقت جان چکا ہوں۔ کسے معلوم تھا کہ یہ پریتی جو صبح کی پہلی کرن کی طرح خوبصورت ہے ایسی سحر انگیز آواز بھی رکھتی ہے۔ ابھی ابھی یہاں آئی تھی زندگی میں پہلی بار۔

"دیکھئے آپ کے گھر میں ہماری ایلشیشن تو نہیں گھس آئی ہے۔" اس نے صحن میں آ کر پکارا۔

"ایلشیشن ——— ایلشیشن یہاں کیا لینے آئے گی۔ ہاں ایک پری ضرور اتر آئی ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

پریتی شرما گئی!

"اندر نہیں آؤ گی ـــــ؟" میں نے یونہی کہا۔ اور وہ اندر آ گئی۔

میں پریتی کو دیکھنے لگا۔ ایک نئے زاویے سے ایک نئی نظر سے۔ اوپر اپنے گھونسلے میں بیٹھی ہوئی چڑیا انہماک سے دیکھنے لگی۔ لاؤ اپنے گھر میں۔ پھر یہ خود ہی تمہارا گھونسلہ بنانے گی۔ تم سے تمہاری تنہائیاں چھینے گی۔ اپنے دونوں پر پھیلا کر تمہارے گھونسلے میں سہاگ کی گرمی بھرے گی۔ نیلی کیا اس سے زیادہ خوبصورت تھی۔ اس کی آنکھوں میں جھانکو۔ یہ تم سے محبت کرتی ہے۔ خاموش محبت۔ اس نے مکان کی کھڑکی تمہارے لئے کھلی رکھی ہے۔

"پریتی ـــــ میں ... میں تم سے؟"

دفعتاً نہ جانے کیا ہوا؟ میرے اندر ایک زور کا طوفان اٹھا۔

"نکل جاؤ یہاں سے۔ یہ گھر نیلی کا ہے۔ اور اس کے آنے تک ویران رہے گا!"

پریتی بھونچکا رہ گئی۔ حیران و پریشان دیکھتی رہی۔ اس نے میرے سارے وجود پر ایک غلط انداز نظر ڈالی۔ اور کمرے سے نکل گئی!

اوپر گھونسلے میں بیٹھی ہوئی چڑیا اپنے چڑے کے قریب سرک آئی ہے۔ دونوں مل کر اتنا شور مچانے لگی ہیں کہ جی چاہتا ہے ان کا گھونسلہ بھی اجاڑ دوں!!

غزل

ہر بھگوان شاد

امتحاں کا وقت ہے اے دل سنبھل فرقت کی رات
دیکھ لیں گے کل جو پڑ جائے گی کل فرقت کی رات

اے دلِ ناداں! عبث ہے اب کسی کا انتظار
ڈھل گیا پچھلا پہر۔ دو کا عمل فرقت کی رات

وہ نہ آئے تھے تو یہ کم بخت آ مرتی کہیں
مر گئی ہے کس جگہ جا کر اجل فرقت کی رات

ڈوبتی نبضیں اشارہ کر رہی ہیں ہم نفس!
رہ گئی ہے اب فقط دو چار پل فرقت کی رات

بحرِ غم میں تہہ نشیں ہو کر جناب شاد نے
کتنی درد انگیز لکھی ہے غزل فرقت کی رات

غزل

مجیب اسلم

تُو ہی قلب و نظر میں ہے جلوہ فگن
پردۂ ذہن پر تُو ہی جلوہ نما

بھولتا ہی نہیں وہ سماں دوستو!
جس گھڑی کوئی ملتے ہی رخصت ہوا

تیرے دم ہی سے جیسے فروزاں تھا وہ
یوں ترے بعد مہتاب گہنا گیا

جو سرِ شاخ کھلتے ہی مرجھا گئے
کیجئے اُن شگوفوں کا بھی تذکرہ

جس کو لے کر تجھے ڈھونڈتے تھے کبھی
وہ چراغِ تمنا بھی گُل ہو گیا

کون گزرا تھا اس رہگزر سے مجیب
ڈھونڈتا ہے کسے آج تک راستا

جفائیں تم کو مبارک، وفائیں ہم کو عزیز — ہم اپنا کام کریں گے، تم اپنا کام کرو
محبتوں کی لطافت ہے اہلِ دل کیلئے — یہ کیفِ خاص ہے یارو! اسے نہ عام کرو

مجاہد جلگانوی

It's love at first sip!

گولڈ کائین

سیبوں کا

اصلی رَس

عمدہ ترین سیبوں سے تیار شُدہ
گولڈ کوئین خوش ذائقہ اور صحتمند
ڈرنک ہے ۔ جو ہمیشہ آپ کو
پُرسکون اور تازہ رکھتا ہے
ایک بار کا ذائقہ آپ کو ہمیشہ
کے لئے گرویدہ بنا دے گا ۔

موہنز

جِنجر ٹانک

ایک حیرت انگیز پینے کی چیز ۔ جس سے
آپ کی بھوک بڑھتی ہے ۔
قوتِ ہاضمہ مضبوط ہوتی ہے ۔
اور کھانے کی رغبت بڑھتی ہے ۔
معدہ کے جملہ امراض میں اس کا
استعمال ایک یقینی علاج ہے ۔

ڈائر میکن بریوریز لمٹیڈ

قائم شدہ ۱۸۵۵

موہن نگر ۔ غازی آباد (یوپی)

افسانہ

خالِ رُخ

پروفیسر انور سیوانی ایم اے

شیخ محلہ نئی گلی سیوان (سارن)

۱۳ نومبر ۱۹۶۳ء

محترمی خوشتر صاحب! تسلیمات

آپ بیسویں صدی کا افسانہ نمبر شائع کر رہے ہیں۔ بیسویں صدی کے عام شمارے تو کیا کم ہوتے ہیں۔ سال میں دو خاص نمبر شائع کر کے اردو افسانوی ادب کے شائقین کے ذوق کو آسودگی بخش کر آپ اُن پر بڑا کرم کرتے ہیں۔ اُمید ہے یہ افسانہ نمبر بھی افسانوی ادب میں مشعلِ راہ بن کر جلوہ گر ہوگا۔ لیجئے ایک نئی تخلیق "خالِ رُخ" حاضر ہے۔ افسانہ رومانی اور جذباتی ہے۔ میں آپ کی اور بیسویں صدی کے قارئین کرام کی رائیں جاننے کا متمنی ہوں۔ بیسویں صدی کے قارئین کے لئے میں اجنبی نہیں ہوں۔ میرے کئی افسانے بیسویں صدی کے خاص نمبروں اور عام شماروں میں آ چکے ہیں۔ "ڈارلنگ" اور "ماڈرن لیلیٰ" کی اشاعت پر مجھے بہت سے تعریفی خطوط ملے تھے۔ اِدھر سات آٹھ سالوں سے میں نے لکھنا چھوڑ دیا تھا لیکن اب پھر میرے افسانے رسائل میں آنے لگے ہیں۔ افسانہ کی رسید اور اپنی رائے سے مطلع فرمائیے....

نیاز مند ——— انور سیوانی

جہاز کی ریلنگ کا سہارا لئے میں نہ جانے کب تک ڈوبتے سورج کے حسین نظارے میں کھویا رہا۔ جہاز کنارے کو چھوڑ کر بیچ دریا میں آ چکا تھا، حدِ نظر تک پانی ہی پانی دکھائی دیتا تھا۔

دریا کے پانی پر ڈوبتے سورج کا منظر ہمیشہ مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری کر دیتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سورج دنیا کے ایک حصے سے رخصت ہوتے وقت، اُس خطہ کے لوگوں سے جدائی کے غم میں نڈھال ہو جاتا ہے اور اُس کے جگر کے خون کی لالی اُفق پر پھیل جاتی ہے۔ دریا کے پانی پر اُس لالی کا عکس کسی بُڑھیا کی مانگ میں پھیلے ہوئے اُداس سیندور کی طرح معلوم ہوتا ہے اُس جھریوں بھرے چہرے کی طرح جس کا سُہاگ تو قائم ہے لیکن اب جس میں آب و تاب نہیں۔

دریا کے پانی پر ڈوبتے سورج کا منظر ہمیشہ میرے دل میں عجیب اُداسی اور پژمردگی کے احساسات بھر دیتا ہے۔ میں نے اکثر اپنے دل سے سوال کیا ہے، ایسے وقت میں اُسے کیا ہو جاتا ہے! میرا ذہن اس کا جواب دینے سے قاصر رہتا ہے سارا دن مشغولیتوں میں گذرا تھا۔ کئی دفتروں کے چکر لگانے کے بعد شام کے جہاز سے پٹنہ سے روانہ ہو کر مظفر پور جا رہا تھا۔ دن بھر کی دَوڑ دھوپ نے مجھے تھکا دیا تھا۔ جہاز جیٹی کو چھوڑ کر دریا کے اندر داخل ہوا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی خوشگوار ہوا کے جھونکے آنے لگے۔ دوسرے مسافروں کی طرح میں بھی ریلنگ کا سہارا لے کر شام کے پُر سکون منظر سے دل بہلانے کی کوشش کرنے لگا۔ پانی پر ڈوبتے سورج کے منظر نے مجھ پر کیف طاری کر دیا، پانی کی سطح پر اُفق کی لالی کے عکس کو دیکھ کر میرے دل میں اُداسی اور پژمردگی کے جذبات بیدار ہونے لگے لیکن آج کی شام میں اپنے دل میں ایک نامعلوم سی خلش پاتا تھا ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ذہن کسی بھولی بسری بات کو یاد کرنے کی اذیت ناک کشمکش میں مبتلا ہو۔

نہ جانے کب تک میں شام کے منظر سے اُبھرنے والے خیالوں میں اپنے کو کھوئے رکھتا۔ اچانک میری محویت کے تار بکھر گئے۔ جہاز کا سائرن بجا اور ایسا معلوم ہوا جیسے میرے کان جھنجھنا اُٹھے ہوں۔ اُن غم انگیز خیالوں کا طلسم جن میں میں کھویا ہوا تھا ٹوٹ گیا۔ اور تب مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ میں دیر تک کھڑا رہا تھا۔ میرے پاؤں تھک گئے تھے۔ کیبن کی سیٹ پر بیٹھ کر میں نے تازہ اخبار کی سرخیاں پڑھ کر وقت گذارنا چاہا۔ لیکن طبیعت اِس طرف مائل نہ ہوئی خالی الذہن ہو کر میں تھوڑی دیر بیٹھا رہا، پھر کیبن کے مسافروں کا جائزہ لینے لگا۔ کئی چہروں سے ہو کر گذرتی ہوئی نظر سامنے کی برتھ پر بیٹھی ہوئی جوان لڑکی کے چہرہ پر رُک گئی۔ معاً مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میں نے کوئی گم شدہ چیز پالی ہو ——— میرے خدا اِس قدر مشابہت! ایک لمحہ تک تو مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا لیکن جو چیز زندہ حقیقت کی طرح سامنے موجود ہو اُس سے اِنکار کیسے کیا جا سکتا ہے؟ آج میرے اِس خیال کو شکست ہوئی کہ اُس جیسا کوئی دوسرا چہرہ صانعِ قدرت نے نہ بنایا ہوگا۔ اُس لڑکی کا چہرہ تو ہو بہو اُسی جیسا تھا۔ اگر یہ پندرہ برس پہلے کی بات نہ ہوتی اور ایسا سانحۂ عظیم واقع نہ ہوا ہوتا جس نے میری جذباتی زندگی کی دنیا ہی بدل ڈالی تو میں سمجھتا کہ سامنے کی برتھ پر بیٹھی ہوئی لڑکی سلمٰی کے سوا کوئی دوسری نہیں ہو سکتی!

میرے سامنے اس قدر مشابہ، وہی خدوخال، وہی رنگ رُوپ اور سب سے
بڑھ کر بھنووں ابروؤں کے درمیانی حصے سے کچھ اوپر پیشانی پر ویسا ہی تل!

میں اُسے دیکھ کر مبہوت سا رہ گیا۔ پندرہ برس پہلے بیتے ہوئے دنوں کی یاد تصور کے پردوں پر رقص کرنے لگی۔ یادوں کے دریچے جو پندرہ سال سے بند کر دیئے گئے تھے، اچانک کھل گئے ——— لڑکی اپنے بازو میں بیٹھی ہوئی عورت سے باتیں کر رہی تھی۔ میں نے غور سے اُس کی طرف دیکھا، باتیں کرتے وقت اُس کے رخساروں پر ویسے ہی گہرے نشان بن جاتے جیسے پندرہ سال پہلے میری آنکھوں نے طلعی کے رخساروں پر دیکھے تھے۔ لڑکی مسکرائی اور اُس کے نازک ہونٹوں کی تازگی نے مجھ پر نشہ سا طاری کر دیا۔ میں بھول گیا کہ بس کے کیبن میں بیٹھا ہوا ہوں، میرے تصور کو پنکھ لگ گئے اور میرے خیالات پندرہ سال پہلے بیتے ہوئے دنوں کی اُن حسین وادیوں میں آ گئے جو اب بھولے بسرے خواب بن کر رہ گئے ہیں۔ لیکن اس وقت خوابوں سے زیادہ حسین، ماضی کے پردوں پر گم شدہ حقیقت کا رُوپ لئے ہوئے تھے۔

شاید آپ مجھے نہ جانتے ہوں، میں ایک آرٹسٹ ہوں۔ شاید اس لئے کہ میرے نام کے آگے کچھ شہرت کا کوئی لیبل نہیں لگا ہوا ہے۔ آرٹسٹ! میں نے یونہی کہہ دیا، ورنہ میں کیا اور میرا آرٹ کیا! یہ تو میں خود بھی نہیں بتا سکتا کہ میں اپنے کو آرٹسٹ کیوں سمجھتا ہوں۔ کینوس کے پردہ پر برش کی مدد سے رنگوں کے امتزاج سے نقش و نگار بنا لینا اگر آرٹ ہے تو یقیناً میں آرٹسٹ کہے جانے کا مستحق ہوں۔

یہ پندرہ برس پہلے کی بات ہے، اُس وقت تصویریں بنانے کا شوق مجھ پر جنون کی طرح طاری تھا۔ اپنا چھوٹا سا اسٹوڈیو میرے خوابوں کی جنت تھا۔ ایزل کے سامنے جب برش اور روغن لے کر بیٹھتا تو ایسا محسوس ہوتا جیسے میں زندگی کا سب سے ضروری فریضہ ادا کر رہا ہوں۔ کینوس کے پردوں پر پھیلے ہوئے رنگوں میں میرے خواب پرورش پاتے۔ ایسے دن بھی آتے جب میں کئی کئی دن تک اپنے اسٹوڈیو سے باہر نہ نکلتا ——— تصویریں بنانا ہی میرا کام ہوتا۔ تصویریں بنانے کا محبوب مشغلہ میرے تمام مشاغل پر حاوی ہو گیا تھا۔ کئی مقامی نمائشوں میں میری بنائی ہوئی تصویریں پسند کی گئیں۔ کچھ تصویروں پر انعام بھی ملے۔ مقامی آرٹسٹوں میں میرا نام صفِ اول میں لیا جانے لگا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اگر میں نے محنت اور ذہانت سے کام لیا تو جلد ہی میرا شمار مشہور آرٹسٹوں میں ہونے لگے گا۔

لیجئے میں کہاں سے کہاں بھٹک آیا! آج کا دن ہی ایسا ہے۔ پندرہ سال پہلے کے بیتے دن جو مجھ سے روٹھ کر نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتے رہے ہوں گے، آج ذہن کے دریچوں سے بھاگ بھاگ کر آ رہے ہیں اور مجھ سے لپٹ رہے ہیں۔ ساتھ ہی اُن کی غمناک آنکھیں میرے خلا میں آنسوؤں سے ڈبڈبا رہی ہیں، کیا پھر طوفان اُٹھ گیا؟ کشتی بھٹک گئی؟ لیکن مجھ بدنصیب کے لئے ساحل کہاں؟ [illegible] انکا عہد تو پندرہ سال پہلے ختم ہو گیا!

جذبات کی رو میں بہہ رہا ہوں ——— ابروؤں کے درمیانی حصے سے کچھ اوپر پیشانی کا وہ تل! اس نے تو مجھے ہمیشہ جذباتی بنایا ہے۔ آج سے پندرہ سال پہلے بھی تو اسی اِس تل نے میرے جذبات کی دنیا میں ایک روشنی پیدا کی تھی [illegible] میرے تصورات کو پرواز کرنا سکھایا تھا۔

یہ پندرہ سال پہلے کی بات ہے۔ ایک شام جب سورج ڈھل رہا تھا [illegible] ندی کے کنارے میں نے پہلی بار اُسے دیکھا تھا ——— میں اپنے ننھیال کے گاؤں میں دو ہفتے ہوئے آیا تھا۔ شہر کی مصروفیات اور شور و غل سے بھری زندگی سے عارضی طور پر ہٹ کر دیہات کا ماحول مجھے بہت پسند آیا۔ ہر شام میں کھیتوں میں سے ہوتا ہوا ندی کے کنارے [illegible] کی مچلتی سرحد سے ہو کر گزرتی ہے ٹہلنے کے لئے چلا جاتا ——— دریا کے پانی کی سطح پر ڈوبتے ہوئے سورج کا منظر میرے دل میں نہ جانے کیسی رومانی کیفیت پیدا کر دیتا۔ اُس شام بھی میں دریا کی اٹھتی، گرتی لہروں پر ڈوبتے سورج کی کرنیں دیکھنے میں محو تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دریا کی سطح پر پگھلا ہوا سونا لہریں لے رہا ہو۔ وہ شام میری زندگی کی یادگار شام بن گئی۔ دریا کی لہروں سے گزرتی ہوئی میری نظر کنارے کھڑے بگلے پر پڑی، سفید براق پروں والا بگلا نہ جانے کس دھیان میں ڈوبا ایک ٹانگ پر کھڑا تھا۔ بگلے کی اس ہیئت پر لحظہ بھر توجہ بھی نہ دے پایا تھا کہ میری نگاہیں اُس کے چہرے پر پڑیں، اِس رومان پرور ساعت میں اُس کا وجود ایسا معلوم ہوا جیسے وہ گوشت پوست کا انسانی وجود نہ ہو بلکہ اُن حسین مناظر کا ایک حصہ ہو ——— وہ مجھ سے تھوڑی دُور پر دریا کے کنارے کھڑی تھی، ساتھ ہی اُس کا دس برس کا چھوٹا بھائی اُس کی اُنگلی پکڑے کھڑا تھا۔ میں اُسے دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ اُس کا حسین و جمیل چہرہ اور دونوں ابروؤں کے درمیانی حصے سے کچھ اوپر پیشانی پر تل، مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ کسی آرٹسٹ کا شاہکار ہو۔

لڑکی اپنے گرد و پیش سے بے نیاز ڈوبتے ہوئے سورج کا منظر دیکھنے میں منہمک تھی وہ اپنے بھائی کی کسی بات پر مسکرائی تو اُس کے رخساروں پر لکیروں کے گہرے نشانوں نے اُس کے حسن کو میری نگاہوں میں اور زیادہ پُرکشش بنا دیا۔

نہ جانے کب تک میں اُس لڑکی کو دیکھتا رہتا۔ اچانک اُس کی نگاہیں اٹھیں اور وہ میری طرف دیکھ کر شرما سی گئی، حیا سے اُس نے نگاہیں نیچی کر لیں۔ سر پر سے گرے ہوئے دوپٹے کو درست کیا اور کنکھیوں سے میری طرف دیکھتی ہوئی گاؤں کی طرف چلی گئی۔

اُس رات مجھے دیر تک نیند نہ آئی۔ اُس لڑکی کا حسین چہرہ رہ رہ کر میرے تصور میں آتا اور مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ اپنی طالب علمی کے زمانے میں میں نے سیکڑوں حسین چہرے دیکھے ہوں گے لیکن ایسی کیفیت میرے دل پر کبھی طاری نہ ہوئی تھی۔ نہ جانے کب مجھے نیند آئی ہو گی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آنکھیں بند ہو جانے پر بھی اُس لڑکی کا تصور [illegible] چھا رہا۔

[illegible]

یونیورسٹی کے امتحان سے فرصت ملی۔ تو گھر پہنچنے کے بعد ہی میں کافی تھکاوٹ محسوس کرنے لگا۔ تھکے ہوئے دماغ کو آرام اور تفریح کی ضرورت تھی۔ انہیں دنوں ملیح آباد جانے کے بجائے والدہ کی تاکید پر میں اپنے ننھیال چلا آیا۔ کچھ کتابیں اور تصویریں بنانے کا سامان ساتھ تھا۔ صبح و شام کی سیر و تفریح اور ماموں زاد بھائی بہنوں سے گپیں لڑانے کے بعد بھی فرصت کا کافی وقت بچ جاتا۔ فرصت کے ان لمحوں میں گاؤں کے مناظر کی تصویریں بنانا میرا سب سے زیادہ دلچسپ مشغلہ تھا۔ ایزل کے سامنے بیٹھا ہاتھ میں برش لئے مختلف رنگوں کی مدد سے میں اُس شام تصویر بنانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اُس دن جب میں سیر کرنے کے لئے ندی کے کنارے گیا تو جانے کیسے یہ بات میرے دل میں آ گئی کہ کوئی ایسی تصویر بنانے کی کوشش کروں جو میری اب تک کی بنائی ہوئی ساری تصویروں میں شاہکار ہو۔ ہاتھ میں برش لئے میں تصویر کے لئے موضوع کی فکر کر رہا تھا لیکن کوئی مناسب موضوع سوجھ نہیں رہا تھا۔ بے خیالی میں میرا ہاتھ برش کو تھامے ہوئے کینوس کی طرف اٹھا ہی تھا کہ ایک ذرا سی آہٹ پر میری نگاہیں بائیں طرف اٹھیں ——— سلمیٰ دبے پاؤں کمرے میں آ گئی تھی۔ سلمیٰ پر نظر پڑتے ہی معاً دل میں خیال آیا کہ اگر میں سلمیٰ کی شبیہ کینوس پر اتار سکوں تو یقیناً یہ میری شاہکار تصویر ہو گی۔

میں نے غور سے سلمیٰ کی طرف دیکھا۔ اُس کا حُسن پہلے سے زیادہ نکھر گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُس کے حُسن میں پہلے سے زیادہ دلکشی آ گئی ہو ——— سلمیٰ اور میں اور زیادہ قریب آ گئے تھے۔ سلمیٰ سے میری ملاقاتیں بڑھتی گئیں۔ محبت کے پُرکیف پردوں میں مستقبل سے بے نیاز ہم نے تصورات کے نہ جانے کتنے شیش محل تیار کئے تھے۔ سماج اور سماج کے رواجی بندھنوں کو بھول کر رُومان کے کیف آگیں لمحوں میں کھو کر اپنے نامعلوم مستقبل کے لئے ہم نے عہد و پیمان کر ڈالے۔ زندگی اپنی تمام تلخیوں سے پاک ہمارے لئے ایک کیف انگیز نغمہ بن گئی تھی۔ میں سلمیٰ کے حُسن سے مسحور ہو کر رہ گیا۔ میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ سلمیٰ کے حسین خد و خال کو برش اور رنگوں کی مدد سے کینوس پر اُجاگر کر کے اپنے فن کو اپنے محبوب کی نذر کروں ——— ایک پُرکیف جذبے کے تحت میں کینوس پر سلمیٰ کے حسین خد و خال کو خاکوں میں سمونے لگا۔ جب کبھی برش کو کینوس پر پھیرتا میری خوشی کی انتہا نہ رہتی، یہ سوچ کر کہ اپنے محبوب کی شبیہ کو رنگ و روغن سے آراستہ کر رہا ہوں، ایک ایسے محبوب کی شبیہ کو جس کے ایسا حسین میری نظروں میں کوئی دوسرا نہیں ———

ایسے وقت میں اپنے ماحول سے بے نیاز ہو کر ہمہ تن تصویر بنانے میں منہمک ہو جاتا۔ ایک دن اسی طرح جب میں ایزل کے سامنے بیٹھا اپنے شاہکار کو رنگ و روغن میں سموتے میں منہمک تھا، سلمیٰ دبے پاؤں میرے پاس آئی۔ مجھے یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کب سے کھڑی ہے۔ مجھے تو اُس کی موجودگی کا احساس اُس وقت ہوا جب اُس نے میری پیشانی پر ہاتھ رکھا اور پوچھا "یہ کس کی تصویر بنائی جا رہی ہے؟" میری محویت ٹوٹی۔ اُس کی سوالیہ

اور تب مجھے معلوم ہوا کہ اُس کا نام سلمیٰ ہے۔ اس واقفیت نے میرے ذہن کے بند دریچے کھول دیے۔ مجھے یاد آیا، بچپن میں جب کبھی میں اپنے ننھیال آتا سلمیٰ میرے ساتھ کھیل کود میں شریک ہوتی۔ اور چھ سات سال سے میں اپنے ننھیال نہ آ سکا تھا اس عرصے میں اُس دبلی پتلی لڑکی کی جسمانی ساخت میں کتنی تبدیلی آ گئی تھی۔

بچپن اور جوانی ——— ان کے درمیان چھ سات ہی سال کا تو فاصلہ تھا لیکن ان چھ سات ہی سالوں کے عرصے میں سلمیٰ کے رنگ رُوپ میں کتنی تبدیلی آ گئی تھی۔ یہ سلمیٰ جو دبلی پتلی ہڑبڑی سی چڑچڑی لڑکی تھی جس کا گڑیوں اور کھلونوں کو توڑنا پھوڑنا ہی سب سے بچپن کا محبوب مشغلہ تھا جو بات بات پر خفا ہو کر بسورنے لگتی تھی آج کتنی بدل گئی تھی! حُسن و شباب کا مجسمہ، شاداب گلاب کی طرح کھلا ہوا چہرہ جس پر نسوانیت کا وقار آ گیا تھا۔

سلمیٰ کے گھر والوں سے میرے ننھیال والوں کے گہرے مراسم تھے۔ سلمیٰ اکثر میرے نانا کے گھر آتی اور میں اُس کے گھر جاتا۔ ہم دونوں قریب آتے گئے۔ سلمیٰ کی موجودگی میں میرے دل کو ایک عجیب سے کیف کا احساس ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے میرے جذبات کو قوت پرواز مل گئی ہو۔

چھٹیوں کے دن ختم ہو گئے، یونیورسٹی کا نیا سیشن شروع ہونے والا تھا میں اپنے گھر سے ہوتا ہوا یونیورسٹی کے ہوسٹل میں آ گیا۔ یہاں آنے پر میرا دل کچھ عجیب اضطراب میں مبتلا رہا۔ مجھے خود یہ بات معلوم نہ ہوتی تھی کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ سلمیٰ کی موجودگی میں میرا دل مسرور ضرور رہتا تھا لیکن اُس وقت میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ اُس کی جدائی میرے دل کو اس طرح مضطرب کر دے گی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میرے وجود میں کسی چیز کی کمی آ گئی ہو۔ میں نے کوئی بہت عزیز شے کھو دی ہو۔ اکثر میں خالی الذہن ہو جاتا، جب کبھی مجھے اپنا ننھیال یاد آتا، سلمیٰ کا حسین چہرہ میرے تصور کی آنکھوں کے سامنے آ جاتا۔ ایسا معلوم ہوتا، میرے کان اُس کے نازک لبوں سے نکلی ہوئی شیریں آواز کو سننے کے لئے ترسنے لگے ہیں۔

ہفتوں میری یہی کیفیت رہی۔ دل بیقرار ہو جاتا۔ ایسا جی چاہتا اُڑ کر سلمیٰ کے پاس پہنچ جاؤں۔ ایک ناپختہ دماغ جذبات کا مطیع بن کر رہ جاتا ہے۔ حُسن کی کشش دل کے لئے کیف انگیز مدہوشی کا سامان بن جاتی ہے۔ تصورات حُسن کی رنگین وادیوں میں پرواز کرنا ہی زندگی کا ماحصل سمجھنے لگتے ہیں لیکن روزمرہ کی زندگی کی حقیقتیں ان حسین وادیوں سے نکال کر ہمیں زندگی کے پٹے پٹائے راستے پر ڈال دیتی ہیں۔

رفتہ رفتہ زندگی کے معاملات میرے تصورات پر حاوی ہوتے گئے۔ امتحان کے لئے کتابوں کے مطالعہ کی مشغولیت اور ساتھیوں کی صحبت نے میری زندگی کو اسی پرانے ڈھرے پر ڈال دیا۔ جیسے جیسے امتحان کے دن قریب آتے گئے کتابوں کا مطالعہ مجھے ایسا مشغول رکھنے لگا کہ میرے ذہن کو پڑھے ہوئے مضامین پر غور و فکر کرنے کے سوا اور کسی خیال کو آنے کی فرصت نہ دیتا۔ کبھی کبھی سلمیٰ کا خیال آ کر رہ جاتا لیکن اب اُس کا خیال لمحاتی ہوتا۔

[illegible] آنکھیں [illegible] میں نے سرور کے عالم میں کہا "پہچان لو یہ میری اُس تمنا کی شبیہ ہے جو میرے دل میں بستی ہے اور جو ہر لمحہ میری آنکھوں کے سامنے رہتی ہے"۔ ایک اُداس سی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر آئی اور وہ خاموش اور پیار بھری نظروں سے تصویر کی طرف دیکھتی رہی۔

تصویر قریب قریب مکمل ہو چکی تھی۔ سلمیٰ کی شبیہ اپنے حُسن و شادابی کے ساتھ کینوس کے پردوں پر اُتر آئی تھی۔ سلمیٰ کے خد و خال نے رنگوں کا رُوپ اختیار کر لیا تھا۔ صرف ایک کمی رہ گئی تھی، ابروؤں کے درمیانی حصے سے کچھ اوپر پیشانی کا تِل جو اُس کے حسین چہرہ کے حُسن کو دوبالا کرتا تھا، ابھی بنانا باقی تھا۔ میں چاہتا تھا کہ سلمیٰ کو پاس بٹھا کر اُسے بناؤں، تاکہ اُسے مناسب مقام پر دکھانے میں غلطی نہ کروں۔

دو دن سے سلمیٰ سے ملاقات نہ ہو سکی تھی حالانکہ میں نے اُسے یہ بات بتا دی تھی۔ اُس رات میرا دل بے حد پریشان تھا، میرا ذہن سلمیٰ کی تصویر میں لگا ہوا تھا، جب تک پیشانی کا تِل نہیں بن جاتا، تصویر مکمل نہ ہوتی۔ "سلمیٰ نہ آئی، سلمیٰ نہ آئی!" میرا دل بار بار کہہ رہا تھا۔ اپنے دل کو بہلا کر میں ایزل کے سامنے بیٹھ گیا۔ تصویر کو کئی بار تنقیدی نظر سے دیکھا۔ تصویر ہر طرح مکمل تھی، صرف پیشانی کا تِل بنانا باقی تھا۔ میرے تصور کی آنکھوں کے سامنے آگیا سلمیٰ کا حسین چہرہ اور اُس کی پیشانی کا تِل —— تِل کے تصور نے میرے دل پر ایک عجیب سا کیف طاری کر دیا جیسے سلمیٰ کے چہرے کا سارا حُسن اُس تِل میں سما گیا ہو۔ نہ جانے کب تک مجھ پر محویت طاری رہی۔

قدموں کی چاپ سے میری محویت ٹوٹی —— سلمیٰ! یہ سلمیٰ تھی "آ گئیں سلمیٰ؟ تم نے تو بہت انتظار کرایا۔ آؤ بیٹھو۔ آج تمہاری تصویر مکمل کر لوں" —— میرے مُنہ سے نکلا۔ نیچی نگاہیں کیے سلمیٰ خاموش بیٹھ گئی۔

"ہیں یہ کیا! سلمیٰ، تم خاموش کیوں ہو؟ دو دن سے ملاقات بھی نہ ہوئی اور آج آئی ہو تو ایسی خاموش! لو خوش ہو جاؤ آج تمہاری تصویر —— ارے! یہ چہرہ اُداسی کیوں؟ یہ بال بکھرے ہوئے کیوں؟ اور ہاں تم آج اپنی پیشانی کو اِس طرح چھپا کیوں رہی ہو؟ ارے بھئی تمہاری پیشانی کا تِل، یہی تو ہے جو ہمیشہ کے لئے میرے دل پر نقش ہو گیا ہے۔ آؤ، اور قریب آؤ، آج تمہاری تصویر —— ہیں، یہ کیا، یہ کیا! آنسو؟ خدا کے لئے کچھ بولو تو، آج تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ خدا کے لئے کچھ بولو، کچھ بولو —— ہائے اللہ میں پاگل ہو جاؤں گا!!"

میرے ہاتھ جو اُس کی پیشانی اور رخساروں کو تھامے ہوئے تھے، آنسوؤں سے بھیگ گئے۔

"میرے اللہ! بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی" —— خاموش سر جھکائے سلمیٰ آنسو بہائے جا رہی تھی۔

"خدا کے لئے کچھ کہو —— سلمیٰ تمہیں میری قسم ——"

بیتاب ہو کر میں نے سلمیٰ کی پیشانی سے ساڑھی کا پلو ہٹا دیا۔ میرے خدا! اُس کی پیشانی کے حسین تِل کی جگہ ایک ننھا سا زخم تھا —— میرا کلیجہ دھک سے ہو کر رہ گیا —— غم و اندوہ سے میں بُت سا بن کر رہ گیا۔

سلمیٰ کا جُھکا ہوا سر اور بھی جُھک گیا۔

ہچکیوں کے درمیان، سلمیٰ رُک رُک کر کہنے لگی "اچھے رشید مجھے بھول جاؤ ..... کل میں نے اپنی پیشانی سے یہ نیلا نشان کھرچ ڈالا، تم جسے تِل سمجھتے تھے، وہ تِل نہیں تھا۔ بچپن میں میری ماں نے مجھے نظرِ بد سے بچانے کے لئے گودنے والی سے یہ نیلا نشان بنوا دیا تھا۔ میرے چار بہن بھائی کم سنی ہی میں انتقال کر گئے تھے۔ گاؤں کی عورتوں کی صلاح پر ماں نے ایسا کیا تھا تاکہ مجھے کسی کی نظر نہ لگے، لیکن پرسوں، پرسوں"۔

ہچکیوں کے درمیان اُس کی آواز بند ہو گئی۔

میرے حواس جاتے رہے، "یہ کیا ہوا؟ یہ کیا ہوا؟ سلمیٰ کو آج کیا ہو گیا ہے؟" میرے دل نے مجھ سے سوال کیا لیکن زبان پر ایک لفظ نہ آیا۔

آنسوؤں اور ہچکیوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے سلمیٰ نے کہا "اچھے رشید مجھے بھول جاؤ ——!" یہ کہہ کر وہ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

جب ذرا آنسو تھمے تو کہنے لگی —— "پرسوں مجھے نظر لگ گئی، میری پیشانی کی بِندیا میری حفاظت نہ کر سکی، کل میں نے اُسے کھرچ ڈالا، اس نشان کو جسے تِل سمجھ کر تمہاری نگاہوں نے محبت کی نہ جانے کتنی مہریں ثبت کی ہوں گی —— اب میری شادی ——"

وہ صرف اتنا کہہ سکی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میں پاگل ہو گیا، میرے دماغ پر جیسے کسی بھاری ہتھوڑے کی ضرب لگی ہو —— میں غم و اندوہ سے کانپنے لگا، میری زبان کو جیسے قفل لگ گیا ہو۔

نہ جانے کب تک ہم دونوں غم و اندوہ کے سمندر میں ڈوبے رہے۔ میری نظر سلمیٰ کی پیشانی پر پڑی، اُس کی پیشانی پر تِل کی جگہ گہرے زخم کا نشان تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے سلمیٰ کے چہرہ کا سارا حُسن زخمی ہو کر اُس گہرائی میں تڑپ رہا ہو —— میرے دل میں ہیجان سا اُٹھا، میں چیخ اُٹھا،

"سلمیٰ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، دنیا کی کوئی طاقت تمہیں مجھ سے چھین نہیں سکتی —— میں، میں ——"

سلمیٰ نے اپنا ہاتھ میرے مُنہ پر رکھ دیا۔ وہ اپنے آنسو جیسے پی گئی، اور پھر اُس کے چہرہ پر گہری سنجیدگی چھا گئی تھی۔ دھیمی آواز میں اُس نے کہا "میرے اچھے رشید، اب یہ نہیں ہو سکتا۔ ہمارے خوابوں کے سارے شیش محل بے حقیقت تھے، ہمارے عہد و پیمان بہت کمزور ثابت ہوئے۔ سماج کے بندھنوں کو توڑنے کی ہم میں طاقت نہیں —— رشید میرے اچھے رشید، مجھے بھول جاؤ۔"

میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن سلمیٰ نے اپنا ہاتھ رکھ کر میرا منہ بند کر دیا۔ وہ صرف اتنا کہہ سکی "صبر، پیارے رشید، صبر!"

نہ جانے کب سلمیٰ میرے پاس سے اُٹھ کر چلی گئی ——— نیم بیہوشی کے عالم میں میں نہ جانے کتنی دیر تک پڑا رہا ——— جب مجھے ہوش آیا، میری نظر سب سے پہلے ٹیبل پر لگی ہوئی سلمیٰ کی تصویر پر پڑی ——— نہ جانے کب میری آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے گر کر تصویر کے اُس حصّہ پر جا پڑے جہاں پیشانی پر تِل بنانے کی جگہ تھی ———

مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے آنسوؤں کے اِن چند قطروں نے تندرستہ اختیار کر لی ہو جن میں میری آرزوؤں اور تمناؤں کے شیش محل ڈھ گئے ہوں۔ میں پاگل ہو گیا۔ "میری نامکمل تصویر!" میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ میں دیوانوں کی طرح رات کی تاریکی میں چل کھڑا ہوا ———

یہ رات میری جذباتی زندگی کی موت کی آخری رات تھی۔ یہ آخری رات تھی جب میں اُس حسین چہرے کی دید سے، جس کی میرے دل نے پرستش کی تھی، محروم کر دیا گیا۔ یہ آخری رات تھی جب میں نے اپنی نظروں کی بصارت کھو دی جس سے میرا دل منوّر رہتا تھا۔

پندرہ برس کا عرصہ کتنا لمبا عرصہ ہوتا ہے۔ اِس لمبے عرصے میں میری زندگی نے جانے کتنے نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ نہ جانے کتنی بار میں نے اپنے وجود کو مٹتے ہوئے دیکھا ہے، نہ جانے کتنی بار میرے ہوش کے کندھوں پر میری زندگی کی لاش ڈھوئی گئی ہوگی ——— زندگی کی حقیقتیں نہ جانے کتنی سنگینیاں اُنھوں نے اپنے ساتھ اکٹھا کر لی ہے۔ مٹی ہوئی قبروں میں بھی یہ زندگی کی بو سونگھتی پھرتی ہیں ——— صدیوں کی دفن کی ہوئی سڑی گلی لاشوں کو بھی زندہ ہونے پر مجبور کر دیتی ہیں ——— میرا وجود، پندرہ سال ہوئے پیشانی کے اُس حیات بخش تِل کے معدوم ہونے کے ساتھ ہی ختم ہو گیا ——— یہ پندرہ سال میرے لئے پندرہ صدیاں بن گئیں۔ میں یاس، پژمردگی اور مایوسیوں کے سمندر میں ڈوبتا اُبھرتا رہا۔ میں زندہ کہاں رہا! لیکن پھر بھی زندگی کی لاش مجھ سے چمٹی ہوئی مجھے روزمرہ کے معمولات کی ادائیگی کے لئے مجبور کرتی رہی۔ ایک اذیت ناک مجبوری! جب انسان ایک چلتی پھرتی لاش بن کر جینے کے لئے مجبور ہو۔

زندگی کی حقیقتوں کے جبر سے سہمے ہوئے انسان کی طرح میں نے اپنے کو حالات کے سپرد کر دیا ہے۔ آپ اسے عزم و عمل کا جذبہ سمجھیں، آپ اسے زندگی کی کامرانی کہیں، پندرہ برس سے ہر لمحہ میں نے زندگی کو ایک مجبوری سمجھ کر اُس کا ساتھ دیا ہے۔ جب کبھی کامیابی میری زندگی کے دامن میں آگئی ہے، ایک بے جان سی ہنسی میرے ہونٹوں پر ضرور رینگ گئی ہے لیکن یہ اُس کرب کو کہاں مٹا سکتی ہے، جس نے میرے سارے وجود کو اپنی چادر میں لپیٹ رکھا ہے۔ غم و یاس کی اس دبیز چادر میں کبھی کبھی سوراخ سا دکھائی دینے لگتا ہے جس سے میرا ماضی جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ ماضی کے روشن حصّہ پر سلمیٰ کے حسین چہرے کی جھلک ہوتی ہے، اُس کے شاداب حُسن کی جھلک جو اُس کی پیشانی کے تِل سے منوّر ہو کر میرے خیالوں کے خواب کے حسین جزیروں میں لے جاتی ہے۔ سلمیٰ کی پیشانی کا تِل، اُس کا تصوّر ہی تو زندگی کا سہارا بنتا ہے اور پھر جب اُس تِل کے مِٹ جانے کی بات یاد آتی ہے، تو مجھے اِس تلخ حقیقت کا علم ہوتا ہے کہ اُن کے ساتھ ہی میرا وجود مجھ سے رخصت ہو گیا۔ میری زندگی مجھ سے روٹھ گئی۔

میرے سامنے پتھر پر بیٹھی ہوئی لڑکی بھی کسی خیال میں کھوئی تھی ——— کتنی مشابہت تھی اُس میں اور سلمیٰ میں!

غزل

——— محمد عبد القیوم صدیقی مست فتحپوری

نکہتِ زُلفِ یار کیا کہیے
رشکِ مُشکِ تتار کیا کہیے

دِل باشاد، چشمِ ماروشن
آمدِ نوبہار کیا کہیے

تشنگی اور بڑھ گئی دل کی
بارشِ حُسنِ یار کیا کہیے

وہ گئے، دل گیا، بہار گئی
داغ ہیں یادگار کیا کہیے

دِل میں جنّت کی آرزو نہ رہی
عشرتِ کُوئے یار کیا کہیے

عشق خوددار، حُسن بے پروا
مُدّعا بار بار کیا کہیے

مُلتفت ہو گئی نگاہِ کرم
مستؔ اپنا وقار کیا کہیے

SUNLIGHT

افسانہ

پونم کا چاند

رئیس نجمی امروہوی

"آشیانہ" سرائے کہنہ امروہہ

۷، جولائی ۱۹۶۴ء

میر کاروانِ ادب! آداب و احترام

.... میری اس کہانی سے پہلے تین خاتون افسانہ نگاروں کے "چاند" یعنی واجدہ تبسم کا "زرد چاند" میری بہن اعجاز نسرین کا "پیاسا چاند" اور بشریٰ رشید کا "گہن کا چاند" بیسویں صدی کے ادبی خلاؤں میں گردش کر چکے ہیں اور قارئین کی نگاہوں سے گذر چکے ہیں۔ اپنے پڑھنے والوں کی فرمائش پر میں بھی ایک "پونم کا چاند" بیسویں صدی کی ادبی فضا میں گردش کرنے کے لئے آپ کو سونپ رہا ہوں۔ میرا مقصد اُن سے مقابلہ کرنا ہرگز نہیں ہے کیونکہ وہ چاند اپنی اپنی جگہ بہت روشن اور تابناک تھے میں اپنے پڑھنے والوں سے صرف اِس بات کا خواہشمند ہوں کہ وہ مجھے یہ بتائیں کہ میرا چاند اُن کے دل کی وسعتوں میں کہاں تک پہنچا ——— اب رہ جاتی ہے شوبی تو اِس بیچاری کے لئے اتنا ہی بہت ہے کہ ہم سب لوگ اسے حقارت کی نظروں کی بجائے اچھی نظروں سے دیکھیں کیونکہ وہ بے قصور ہے اور اُس کی زندگی کے ساتھ تو سب کچھ بالکل اسی طرح ہوا ہے کہ ؎

ساحل پہ لائے اور سفینے ڈبو دیئے ـــــ یوں زندگی نے ہم کو ہنسایا کہ رُلا دیئے

خیر سگال ——— رئیس نجمی امروہوی

میری سوچیں بھی عجیب سی ہیں جو میری زندگی کے غموں کے ساتھ ساتھ میری تنہائیوں کے لئے کسی شدید درد کا احساس بنکر رہ گئی ہیں چار برس کی طویل خاموشی کے بعد آج اچانک مجھے رازی کا ایک خط ملا ہے اور وہ خط میری میز پر رکھا ہے ——— میں اپنے کمرے میں ہمیشہ کی طرح آج بھی تنہا ہوں۔ پونم کا چاند پوری آب و تاب کے ساتھ آسمان پر جگمگا رہا ہے اور میرے آنگن میں اُس کی نورانی کرنیں اُجالا پھیلا رہی ہیں لیکن میرا دل اُداس ہے اور یہ کرنیں میرے دل میں نوک نشتر کی طرح اُتر رہی ہیں۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی میرے ارمان لہو بنکر میری آنکھوں سے چھلک اٹھنا چاہتے ہیں اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے میرے وجود میں رازی کی یادوں کے شعلے میرے ناکردہ گناہوں کی سزا دینے کے لئے پھر بھڑک اٹھے ہیں۔

میں دیر سے اُسی خط کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔

میں تو ہمیشہ سے یہ سوچتی رہی ہوں کہ وقت ماضی کی یادوں پر بادل بنکر چھا جاتا ہے لیکن ان یادوں کو میرے دل میں دھڑکتے ہوئے کئی سال بیت چکے ہیں پھر یہ اب بھی اُسی طرح جوان کیوں ہیں؟ میرے احساس کے تاریک غم خانوں میں ابھی کوئی قندیل روشن نہیں ہوئی میرے سپنوں کی یہ گلیاں آج تک اندھیری کیوں ہیں؟ میں نہیں سمجھ پاتی کہ میری رُوح کی گہرائیوں میں یہ کیسی انجانی آرزوؤں کی آنچ دفن ہے جو میرے وجود کو پگھلا دینا چاہتی ہے؟ نہ جانے میرے حسین خوابوں کے یہ کونسے دریچے ہیں؟ جن میں غم کے ویرانوں کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ یہ فیصلہ تو خود میں نے ہی کیا تھا پھر اُس فیصلے نے مجھے کیوں اب تک سکون کی راہ نہ دکھائی ——؟

رازی میرے بچپن کا ساتھی تھا ......!

میں نے آج سے پہلے بھی اکثر یہ سوچا ہے کہ یہ ضروری تو نہیں کہ کچی عمر کے

[illegible] ساتھ گذرنے کے بعد ایک دلچسپ واقعہ ہوا۔

ہم سب لوگوں کو بڑے ماموں جان کے یہاں کسی تقریب میں لکھنؤ جانا پڑا اور وہیں میری نظروں نے رازی کو دیکھا۔ یہ وہی رازی تھا میں پہلی ہی نظر میں اُسے پہچان گئی اور اُس نے بھی مجھے ایک لمحے میں پہچان لیا۔ نہ جانے کیوں نگاہوں کے اُس پہلے تصادم کے بعد نہ تو وہی مجھ سے کچھ بولا اور نہ میں نے ہی اُس سے کوئی بات کرنی مناسب سمجھی۔ اُسی دن دوپہر میں سلمیٰ بھابی نے اُس کا ذکر کرتے ہوئے جب مجھے اُس کے بارے میں یہ بتایا کہ اُس نے بی۔ اے کا امتحان فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا ہے تو نہ جانے کیوں میرے دل میں اُس کے لئے بڑا احترام پیدا ہو گیا۔ میں اُن دنوں انٹر میڈیٹ کا امتحان دے چکی تھی ——— شام کو ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے جب میں نے گہری نظروں سے اُس کا جائزہ لیا تو مجھے اس کے وجود میں بہت کشش محسوس ہوئی۔ بچپن کی حد کو چھوڑ کر اُس کی شخصیت اب بڑی پُر وقار بن چکی تھی۔ اُس میں اب وہ چنچل پن نہ تھا بلکہ ایک مرعوب کُن سنجیدگی تھی اور اُسی سنجیدگی کی وجہ سے اُس میں خاندان کی کئی لڑکیاں دلچسپی لینے لگیں۔ راشدہ اور افروز تو ہر وقت اُس کے تذکرے کرنے لگی تھیں اور یہاں تک کہ اُن کی تنہائیوں میں اُسے پانے کے منصوبے بھی بننے لگے تھے۔ اُن منصوبوں کا ذکر سن کر میں سوچا کرتی کہ کیوں؟ آخر کیوں؟ یہ راشدہ اور افروز رازی کے چرچے کرتی ہیں، اس ذکر اس خیال پر تو میرا حق ہے۔ کیونکہ جو خلش جو چبھن میرے دل میں ہے وہ اِن کے دل میں تو نہیں ——— رازی نے تو اِنھیں کوئی خلش نہیں بخشی۔ میرے معبود میں کیا کروں؟ یہ جذبہ، یہ جلن یہ رقابت!! میرے خدا مجھے اِن سے بچا، کہیں میں اپنے خیال، اپنی سوچوں کی وسعت نہ کھو دوں۔ اور شاید کچھ کھو بھی دیتی اگر اُس شام رازی مجھے راشدہ، شاہینہ اور افروز پر فتح نہ بخشتا!۔

اُس دن اکرام چچا نے کیرم کے کھیل کا پروگرام بنایا تھا ——— راشدہ اور افروز دونوں شدت سے رازی کی پارٹنر بننا چاہتی تھیں اور میں چپ تھی۔ میں تو ہمیشہ ہی چپ رہی ہوں۔ لیکن میرے لئے ایک وہی لمحہ تو تھا کہ مجھے دنیا بھر کی مسرتوں کے خزانے مل گئے۔ ہاں رازی نے مجھے اپنا پارٹنر بنانے کا اعلان کیا تھا۔ اور پھر وہ دونوں نہ جانے کس جذبہ کے تحت وہاں سے اٹھ کر چلی گئی تھیں اور ہم لوگوں نے چچا کے ساتھ دیر تک کیرم کھیلی تھی۔ مجھے زندگی میں پہلی بار اپنی نظروں میں کیرم جیسے خشک کھیل میں بڑی لطافت محسوس ہوئی تھی۔ کھیل کے درمیان رازی کے دلچسپ لطیفوں نے سب لوگوں کو اور خاص طور پر مجھے ہنساتے ہنساتے بیتاب کر دیا تھا۔ اور پھر کھانے کا وقت ہو گیا تھا اور سب ہی لوگ کھانے کے لئے اٹھ کر چلے گئے تھے۔ میں نے دیکھا تھا، کھانے کی میز پر راشدہ اور افروز کے مُنہ بُری طرح پھولے ہوئے تھے۔ لیکن مجھے اِس کی بالکل پرواہ تھی۔ میں جانتی تھی کہ رازی پر میرا حق ہے۔ اُسے مجھے ملنا چاہیئے۔ اُسی حق نے اب رازی کی قربت پا کر میرے دل میں ایک آگ بھر دی تھی اور میں دل ہی دل میں خاندان کی روایات سے مُنہ موڑ کر اُسے پانے کے خواب دیکھنے لگی اور یہ بالکل بھول گئی کہ اگر یہ راز کسی بھی بزرگ کے کانوں تک پہنچ گیا تو مجھے سب کچھ مل جائے گا لیکن رازی نہ ملے گا!۔

[illegible] کئی بار میں نے چاہا کہ رازی سے تنہائی میں بات کروں۔ اُس سے کہوں کہ میں نے اپنی تلاش میں مجھے بہت تھکا دیا ہے اور اب میں اُسے کھو کر جینا نہیں چاہتی اور یہ سب کچھ کہنے کے بعد پھر اُس سے وعدہ لوں کہ اُس کی زندگی پر صرف میرا حق ہوگا لیکن میرے سامنے نہ جانے وہ کون سی حیا کے پردے تھے جو آگے بڑھنے نہیں دیتے تھے۔ جب ہمارے گھر لوٹنے کے دن بہت ہی قریب آ گئے اور میں ہار کر سوچنے لگی کہ اب وہ کبھی مجھے نہ پا سکے گا تو اُداس ہونے لگی ——— لیکن وہ رات ——— !!

اُف! وہ رات کیسی تو بہت حسین رات تھی۔ پونم کا چاند سارے آسمان پر چاندنی کی بارش کر رہا تھا جب میں نہ چاہتے ہوئے بھی رازی کے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ ماحول میرے خیالوں کی طرح حسین اور کیف آگیں تھا اور میں سوچ نہ جانے خیالوں کی کون سی وادی میں بھٹک گئی تھی کہ میں نے کسی کے قدموں کی آواز سنی۔ میرے خیالات کی لڑیاں بکھر گئیں میں کانپ گئی۔ پلٹ کر دیکھا رازی تھا۔ میرے مُنہ سے غیر اختیاری طور پر نکل گیا۔

"کیا میری طرح تمہیں بھی چاندنی راتیں پسند ہیں؟"

"اپنی پسند کے ساتھی مل جاتے ہیں تو زندگی کی تاریک راہیں چاہے وہ دن کے وقت طے ہوں یا تاریک راتوں میں چاندنی راتوں سے کم نہیں ہوتیں ویسے مجھے چاندنی راتیں بہت پسند ہیں"

وہ جذباتی سا ہو گیا تھا۔ اچانک وہ سنبھل گیا۔

"تم بُرا تو نہیں مان گئیں؟"

میں خاموش تھی۔ وہ میری خاموشی سے گھبرا گیا یا پھر کسی دوسرے خوف کے تحت وہاں سے چلا گیا اور میں اُسے نہ روک سکی۔ میں تنہا رہ گئی لیکن مجھے اُس کے ایک ہی جملے کی بازگشت سے ایسا ضرور محسوس ہوا جیسے بچپن سے میرے دل میں ہونے والی وہ چبھن ختم ہو گئی ہے۔ اگلے دن میں نے شام کے وقت اپنی تمام قوتیں مجتمع کر کے اُسے پھر ایک بار لان میں ملنے کی دعوت دی جسے اُس نے خوشی قبول کر لیا۔ ایک عجیب کشمکش ایک عجیب انتظار کے بعد وہ لمحہ آیا جب رازی میرے قریب آیا۔ میں نے گفتگو کا آغاز اِس طرح کیا۔

"رازی! میں کئی دن سے تم سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔ کیا تم یہ گوارا کر سکو گے کہ اپنے چند لمحے میرے ساتھ گذار سکو؟"

اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس نے کہا "کہو کیا کہنا چاہتی ہو۔ یہ لمحے اپنے ہیں!"

میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے اپنے دل کی پہلی اور آخری آرزو کا اظہار اِن الفاظ میں کر دیا۔

"رازی تمہیں یاد ہے کہ بچپن میں تم اور میں ایک ہی مقصد کے لئے لڑتے تھے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ بچپن کے وہ لمحے ایک بار پھر ہم واپس بُلا لیں اور اپنی زندگی کی راہ پر ایک ساتھ

مقصد پانے کے لئے کوشاں ہو جاتے۔ یعنی ہماری منزل ایک ہو! "وہ خاموشی سے میری بات کو غور سے سنتا رہا۔ مسکراتا رہا۔ پھر کچھ دیر تک خاموش رہ کر اپنی مسکراہٹوں کو سمیٹتے ہوئے کہنے لگا۔

"شوبی! مجھے بہت خوشی ہوئی ہے یہ جان کر کہ تم بھی میرے اُس خواب کی تعبیر ہو جو اب تک نہیں ہو سکی ہے۔ اپنی خود کی زبان سے تم سے یہ بات کہنے کے لئے سوچ رہا تھا جو تم نے اس وقت ظاہر کی۔ آؤ عہد کریں، اس چاند اور اس کی پاکیزہ کرنوں کو شاہد بنائیں کہ ہم زندگی کی آخری دھڑکنوں تک ایک دوسرے کا ساتھ نبھائیں گے۔ ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے!"

میں نے کہا "تم نے جو بھی کہا ہے یہ میرے دل کی آواز ہے۔ تمہارے الفاظ میرے الفاظ ہیں۔ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں جدا نہیں کر سکتی!" لیکن شاید اس کی نظر میں عورت کے وعدے کچے دھاگوں سے بھی کمزور تھے، اس لئے اس نے مجھ سے قسم لی۔ میں نے قسم کھائی کہ اُس سے وعدہ کیا کہ "رازی! میں تمہاری ہوں اور صرف تمہاری رہوں گی!" بات کو بڑھانے کے لئے میں نے کہا۔

"میں آسمان پر رہنے والے چاند کو شاہد نہیں بناؤں گی رازی! میری زندگی کے چاند تو تم ہو! تم ہی میری محبت کے امین ہو اور اس عہد و پیمان کے شاہد بھی!!"

"شوبی! اگر میں تمہاری نظر میں چاند ہوں تو پھر تم کیا ہو؟"

میں اُس کے اس جملے پر شرما گئی۔ میری پلکیں حیا کے بوجھ سے جھک گئیں۔ بھلا میں اُس کی اس بات کا کیا جواب دیتی، میں کسی کیف آگیں خیال میں ڈوب گئی پھر وہ خود ہی بولا۔

"اور تم اس چاند کی چاندنی ہو!"

"چاند کے بغیر چاندنی کا کوئی وجود نہیں ہوتا" میں نے برجستہ کہا۔

"چاندنی کے بغیر بھی تو کوئی چاند نہیں ہوتا!" اُس نے دُور خلاؤں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"ہوتا ہے؟" اُس نے میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

میں نے مُسکراتے ہوئے کہا "روسی چاند!"

وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

اگلے دن میں اپنے ابّو اور امّی کے ساتھ اپنے گھر لوٹ آئی۔ میری پلکوں پر میرے اشکوں کا کوئی بادل تیری کی جدائی کا پیغام دینے کے لئے مچلا یا، اس لئے کہ اب وہ میرا ہو گیا تھا۔ میرا بن گیا تھا۔ آنسوؤں کے ہار تو جدائی کے جنازوں کے لئے ہوتے ہیں اور میں نے تو اُس دن رازی کو ہمیشہ کے لئے پانے کی بنیاد رکھی تھی۔ وہ بنیاد جس پر میری آرزوؤں کا حسین شیش محل تعمیر ہوتا تھا۔ جس میں ہمارے حسین خوابوں کی حسین تعبیریں ہمارا انتظار کر رہی تھیں۔

اپنے اپنے گھروں کو لوٹنے کے بعد اُس نے مجھے خط لکھے، میں نے اُسے خط لکھے۔ اُس نے مجھے جواب دیئے، میں نے اُسے جواب دیئے اور اس طرح ہم پہاڑی ندیوں کی سی تیزی کے ساتھ ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔

دن اور رات جیسے جیسے گھٹتے گئے ہماری آرزوؤں کا دامن پھیلتا گیا ــــ میرے خلوص اور سچی چاہت کی تکمیل کے لئے میری نہ جانے کتنی سسکتی راتیں میری آنکھوں میں کٹیں، کتنے ہی کربناک دن بے چینی کے عالم میں گزرے۔ میری آرزوؤں سے قریب تر ہوتے گئے اور میں دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے خوابوں میں اپنی ہی منزل پر گامزن رہی۔ خاندان کی تقریبوں میں رازی سے ایک دو بار ملاقات ہوئی لیکن ہم نے اپنے منصوبوں کی خبر کسی کو کانوں کان نہ ہونے دی کیونکہ ہو سکتا تھا ہمارے قدم اس منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی ساکت کر دیئے جاتے۔

ہمارے خاندان کی یہ روایت رہی ہے کہ کوئی بھی لڑکا یا لڑکی باہم ایسا کوئی رشتہ استوار نہیں کر سکتے جسے پیار یا محبت کہا جاتا ہے۔ یہ حق صرف بزرگوں کے لئے مخصوص و محفوظ ہے کہ کون کس کے لئے مناسب ہے اور کون کس کے لئے موزوں! اپنے حق کی یہ دیوار بزرگوں نے اتنی اونچی بنائی تھی کہ آج تک خاندان کے کسی لڑکے یا لڑکی نے اُسے پھلانگنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کسی لڑکے اور لڑکی کی تنہائی کو ہمیشہ مشکوک نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ رازی میری دُور کی خالہ کا لڑکا تھا پھر بھی خاندان ایک تھا اور مجھے اپنے جذبوں پر اور گھر والوں پر پورا بھروسہ تھا اگرچہ خاندان کی نظر میں یہ راستے سیدھے نہ تھے۔

لیکن اسے میں اپنی قسمت کا مذاق کہوں یا حالات کی ستم ظریفی کہ جاوید بھائی کے بچے کی سالگرہ پر جب لان میں میں اور رازی زندگی کی نئی اُڑانوں کے لئے آسمان پر کمندیں ڈال رہے تھے اور سب لوگ خالہ جان کی کوٹھی کے بڑے ہال میں سالگرہ کی تقریب میں مشغول تھے کہ میرے ابّو اور امّی سے کسی نے وہ بات کہہ دی جسے سُن کر اُن کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ جہاں تک میرا خیال ہے یہ بات میری ماموں زاد بہن شاہینہ نے کہی ہوگی، کیونکہ اُس کی باتوں سے میں نے ایک بار یہ اندازہ لگایا تھا کہ وہ رازی کو بڑی شدت سے چاہتی ہے۔ پچھلی روایات کی روشنی میں اس تاریک خبر کو خاندان بھر میں اتنی بُری نظر سے دیکھا گیا کہ رازی کے ابّو اور میرے ابّو میں اپنی بیٹی اور اپنے بیٹے کے کردار کو بلند ثابت کرنے کے لئے ایسی لڑائی ہوئی کہ خدا کی پناہ ــــــ!

رازی کو میرے ابّو نے ایسے بُرے بُرے خطابات سے نوازا کہ میرا دل تک ہل گیا اور پھر تو جیسے سب کچھ ہل گیا۔ پھر اگلے دن صبح کو ابّو امّی مجھے گھر لے آئے اور ڈانٹ پھٹکار کے بعد میرے اوپر کڑی پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ اُس کے بعد تو رازی کا خط ہی آیا اور نہ مجھے ہی کوئی ایسا موقع ملا جو میں رازی سے مل سکتی۔ میری ہمتیں خود میری شکست کی آواز بن کر رہ گئیں اور میں اس راہ میں اپنا خلوص، اپنی چاہت اپنی آرزو سب کچھ ہی ہار گئی۔ میرے دامن میں سکھوں کے پھول آنے کے بجائے دُکھوں کے انگارے آ گئے اور یہ میری حسرت ہی رہی کہ کاش میرے آنسوؤں کے ساتھ رازی کی آنکھ کا ایک آنسو بھی دامن کے اِن انگاروں پر گر جاتا تو شاید یہ انگارے ہمیشہ کے لئے سرد ہو جاتے۔ لیکن ایسا ہوتا کہاں ہے۔ ہم اپنی زندگی کے لئے جو کچھ چاہتے ہیں وہ ہمیں کبھی نہیں ملتا اور جو کچھ ہمیں ملتا ہے اُس کی امید ہمیں خواب و خیال میں بھی نہیں ہوتی۔

حال جیسے جیسے ماضی بنتا رہا میرے ابّو اور رازی کے گھر والوں میں دشمنی کی خلیج تو

گھر میں دھلی
سرف
سے دھلی
Surf

ایک شام
شکریہ ابا جان!
آپ نے موموکو کھوج
کر نکال لیا

اُردو کے مشہور و مقبول شاعر

ساحر لدھیانوی سے انٹرویو

نریش کمار شاد

۱۵۔ ایف ۔ موتی باغ ۲ ۔ نئی دہلی

۱۶ رجون ۶۴ء

مکرمی خوشتر صاحب!

"افسانہ دل" نظر نواز ہوا۔ ادیبوں کی گھریلو زندگی کی تصویروں، خطوط اور پرچے کی ظاہری سج دھج اور آب و تاب سے مسرور ہونے کے بعد جب مضامین نظم و نثر کو بھی حسب توقع وسیع اور پُر وقار پایا تو بے اختیار آپ کی بلند نظری اور خوش مذاقی کا معترف ہونا پڑا۔ ابھی تک صرف حصۂ نظم ہی کا مطالعہ کر سکا ہوں۔ مجھے عندلیب شادانی کی مرصع غزل اس حصے کی جان معلوم ہوئی۔ فراق، جوش ملسیانی، جمیل مظہری اور الطاف مشہدی کے بعض اشعار بھی ان باکمال حضرات کے رنگ سخن کے نہایت کامیاب ترجمان اور اُردو کی غزلیہ شاعری میں ایک خوش گوار اضافے کا باعث ہیں لیکن جناب من! اس خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لیجیے، وہ یہ کہ بعض موضوعات پر مختلف شعراء کے منتخب اشعار بلاشبہ نہایت عمدہ ہیں لیکن "افسانہ دل" کے زیر عنوان آپ نے فانی بدایونی کے اس مشہور شعر کو مجھ سے منسوب کر دیا ہے۔

دل کی مفارقت کو کہاں تک نہ روئیے
اللہ ایک عمر کا ساتھی بچھڑ گیا

کشمیری لال ذاکر کے افسانے کے ساتھ آپ کے نام اُن کا جو خط تحریر ہے اُس میں ایک شعر بھی ہے اور وہ بالکل ناموزوں ہے۔ ایسی غلطیاں دوسرے نام نہاد ادبی پرچوں میں تو بالعموم ہوتی رہتی ہیں لیکن "بیسویں صدی" میں ان کا ہونا باعث حیرت بھی ہے اور افسوسناک بھی۔

نریش کمار شاد

(یہ دونوں غلطیاں کتابت اور پروف ریڈنگ کی ہیں کشمیری لال صاحب ذاکر کے خط میں جو شعر ہے وہ اس طرح ہے۔

ہم اپنے دوستوں کی بے وفائی سہہ تو لیتے ہیں
مگر ہم جانتے ہیں دل ہمارے ٹوٹ جاتے ہیں

ادارہ ان غلطیوں پر توجہ دلانے کے لئے شاد صاحب کا شکر گزار ہے اور قارئین سے معذرت خواہ ہے ۔ ایڈیٹر)

"میں کب اور کہاں پیدا ہوا؟"

میرے اس سوال کو زیر لب دُہرا کر ساحر نے ہنستے ہوئے کہا "اے جدت پسند نوجوان یہ تو بڑا ہی روایتی سوال ہے۔ اس روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے اس میں اتنا اضافہ اور کر لو: اور کیوں پیدا ہوا؟"

میں نے جان بوجھ کر اپنے اوپر بے چارگی طاری کرتے ہوئے کہا "آپ کی خوش مذاقی مسلّم لیکن ساحر صاحب ان کا سہارا لے کر آپ ہم غریبوں کے انٹرویو لینے کے شوق کا مذاق کیوں اڑا رہے ہیں؟"

ساحر نے ذرا سا جھینپتے ہوئے قہقہہ لگایا اور سگریٹ کا پیکٹ میری طرف

ہاتے ہوئے کہا "۱۹۲۱ء میں لدھیانہ میں "
میں نے اطمینان کی سانس لی اور پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر سلگاتے
ہوئے پوچھا "تعلیم کہاں سے اور کہاں تک حاصل کی ؟"
"بی اے نہیں کر سکا ہوں ۔ گورنمنٹ کالج لدھیانہ اور دیال سنگھ
لج لاہور دونوں کالجوں سے نکالا ہوا ہوں ـــــــــ " اور اتنا کہنے کے بعد ساحر
کے لہجہ میں جیسے فخر و اعتماد کی لہر دوڑ گئی "لیکن اب اِن دونوں کالجوں کو ناز ہے کہ
ں وہاں پڑھتا رہا ہوں اور اب اس حادثے کا کہ میں وہاں سے نکالا ہوا ہوں یقیناً
نہیں صدمہ ہے "
اور مجھے اس وقت بے اختیار ساحر کی نظم "نذرِ کالج" کا آخری شعر یاد آگیا ؎

لیکن ہم اُن فضاؤں کے پالے ہوئے تو ہیں
گر یاں نہیں تو یاں کے نکالے ہوئے تو ہیں

"اچھا یہ فرمایئے مسٹر عبد الحئی سے آپ حضرت ساحر لدھیانوی کب بنے ؟"
"۱۹۳۷ء میں میٹرک کا امتحان دینے کے بعد اور امتحان کا نتیجہ نکلنے سے پہلے
جب مجھے بالکل فراغت تھی "
"سب سے پہلا شعر کیا تھا ؟"
"یاد نہیں ۔ شاید یاد رکھنے کے قابل بھی نہ ہو "
"ابتدائی شاعری پر اصلاح کس سے لی ؟"
"کسی سے نہیں " اور پھر یکایک جیسے ساحر صاحب کو کچھ یاد آگیا اور
وہ کہنے لگے "ہاں یہ ضرور ہوا کہ میں نے اپنی سب سے پہلی نظم ایک دوست کے ذریعہ
اپنے اسکول کے ٹیچر فیاض ہریانوی کو اُن کی رائے دریافت کرنے کے لئے بھیجی "
"تو انھوں نے کیا رائے دی ؟"
"یہی کہ اشعار موزوں ہیں لیکن مجموعی حیثیت سے نظم بہت معمولی ہے "
اتنا کہہ کر ساحر نے اپنے مخصوص لیکن بڑے محبوب اور دل کش انداز میں کہا "ظاہر ہے
میرے لئے اُسوقت یہی بہت تھا کہ اشعار موزوں تو ہیں "
"اپنا تخلص آپ نے ساحر ہی کیوں تجویز کیا ؟"
کرسی سے اُٹھ کر ساحر کمرے میں ٹہلنے لگے اور ٹہلتے ٹہلتے کہنے لگے "چونکہ کوئی نہ
کوئی تخلص رکھنا مُروج تھا اور اس رواج کا احترام کرنے کی نیت سے میں اپنے کورس
کی کتابوں کی ورق گردانی کر رہا تھا تاکہ تخلص کے لئے کوئی اچھا سا لفظ مل جائے کہ
اقبال نے داغ کا جو مرثیہ لکھا ہے اُس میں اِس شعر پر نظر پڑی ؎

اِس چمن میں ہوں گے پیدا بلبلِ شیراز بھی
سینکڑوں ساحر بھی ہوں گے صاحبِ اعجاز بھی

اپنی شاعری کے متعلق مجھے کوئی خوش فہمی یا غلط فہمی نہیں تھی اور چونکہ میں بھی اپنے آپ کو
سینکڑوں میں ایک شمار کرتا تھا اس لئے اپنے تخلص کے لئے مجھے ساحر مناسب
معلوم ہوا "
"شروع میں آپ اُردو کے کس کس شاعر سے خاص طور پر متاثر تھے ؟"
"اقبال اور جوش ملیح آبادی سے "
"اور اب اگر میں یہ دریافت کروں کہ آپ شعر کہتے کیوں ہیں ؟"
ساحر نے حیرت زدہ ہو کر میری طرف دیکھا تو نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس
ہونے لگا جیسے وہ دیکھ نہیں رہے ہیں بلکہ مجھے اپنی لمبی نوکیلی ناک سے سونگھ رہے ہیں بعد
ایک بار پھر کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے "میری رائے میں ہر آدمی کا جو پیشہ ہے اس میں اُس
کا شوق اور ضرورت دونوں شامل ہوتے ہیں ۔ کبھی شوق پہلے اور کبھی ضرورت ۔ سماجی اور
سیاسی نظریے کی تبلیغ کا سوال اس کے بعد پیدا ہوتا ہے ۔ تقسیمِ وطن کے بعد ضروریات
زندگی کی تکمیل کے لئے اپنے وقت کا ایک حصہ مجھے فلمی شاعری کی نذر کرنا پڑا ۔ اس کے
علاوہ اپنی زندگی کے بعض سانحات کی یاد کو محفوظ رکھنے کے لئے بھی میرا ذہن تخلیقِ شعر پر
مجبور تھا "
یہ سن کر مجھے پھر اُن کا یہ شعر یاد آگیا ؎

دُنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

"اور آپ شعر کہتے کیوں کر ہیں ؟"
اِس کے جواب میں ساحر اپنے چیچک زدہ چہرے کو سہلاتے ہوئے بتانے لگے ۔
"بعض اوقات کوئی ذاتی واقعہ یا اجتماعی مسئلہ ذہن پر اِس طرح طاری ہو جاتا ہے کہ
اشعار کے بغیر اُس کا تجزیہ کرنا ممکن ہی نہیں ہوتا ۔ اُس وقت کسی خاص ماحول کی بھی ضرورت
نہیں ہوتی ۔ ایسے عالم میں کوئی چیز مخل ہوتی بھی ہے تو مخل ہوتی ہوئی محسوس نہیں ہوتی البتہ
فلمی گانا لکھنے کے لئے دروازہ بند کر کے کمرے میں ٹہل ٹہل کر اور شعوری طور پر اپنے آپ کو
گیت سے متعلق ماحول اور کردار کی نفسیات کے سانچے میں ڈھال کر اشعار کہتا ہوں ۔ یا
گیت لکھتا ہوں "
"اچھے شعر کی آپ کے خیال میں مختصر ترین تعریف کیا ہے ؟"
"خوبصورت ہو سچا ہو اور مفید ہو "
"کیا آپ عروض سے واقف ہیں اور کیا عروض کا جاننا شاعر کے لئے ضروری
سمجھتے ہیں ؟"
"میں خود عروض سے قطعاً ناواقف ہوں ۔ اِس صورت میں عروض کا جاننا
شاعر کے لئے ضروری کیونکر کہہ سکتا ہوں ۔ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ اگر ایک اچھا شاعر

روش سے واقف ہو تو اُس کے حق میں زیادہ اچھا ہے۔"

"آپ کی زندگی کا کوئی ایسا واقعہ جس نے آپ کی شاعری پر غیر معمولی اثر ڈالا ہو؟"

"کتنے چھوٹے اور بڑے واقعات ہیں۔ کسی خاص واقعے کا انتخاب ناممکن ہے۔"

"آپ اس عہد کا سب سے بڑا شاعر کسے تسلیم کرتے ہیں؟"

"نظریاتی اختلاف کے باوجود اقبال کو۔"

"اُردو کے موجودہ شاعروں میں آپ کو خاص طور پر کون سا شاعر پسند ہے؟"

"مشکل یہ ہے کہ ہم عصر شاعروں کے بارے میں ذاتی پسند کا انحصار فن کار کے علاوہ اُس کی شخصیت پر بھی ہوتا ہے۔ تاہم فیض احمد فیض مجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔"

"اور اُردو کے جدید ترین شاعروں میں کوئی قابلِ ذکر شاعر بھی آپ کی نظر میں ہے؟"

"نریش کمار شاد۔" ساحر نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا: "حوصلہ افزائی کا شکریہ لیکن ذرا اور سنجیدگی سے بتلائیے۔ میرا مطلب ہے حق گوئی سے کام لیجئے تاکہ کسی کی حق تلفی نہ ہو۔"

"حوصلہ افزائی یا تمہیں خوش کرنے کا سوال نہیں ——" ساحر نے اپنی لمبی لمبی انگلیوں کو لہراتے ہوئے کہا —— "اپنی اس رائے کا اظہار میں پہلے بھی کر چکا ہوں۔ تصدیق درکار ہو تو کنور مہندر سنگھ بیدی سے پوچھ لینا۔"

اپنے ذکر کے سلسلے کو ارادتاً منقطع کرتے ہوئے میں نے دوسرا سوال کیا۔

"آپ کی نظر میں اب تک آپ کی بہترین نظم کون سی ہے؟"

ساحر نے سگریٹ کا ایک لمبا سا کش لگاتے ہوئے کہا: "مختلف اوقات میں مختلف نظمیں بہترین معلوم ہوتی رہی ہیں۔"

"مثلاً اسوقت کون سی نظم؟"

"پرچھائیاں۔" ساحر نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا شعر و شراب لازم و ملزوم ہیں؟"

"ہرگز نہیں۔ شعر کہنے کے لئے نشے کی مطلقاً ضرورت نہیں ہے۔ نشے کی حالت میں عام طور پر اچھا شعر کہا ہی نہیں جا سکتا۔"

"تو پھر آپ شراب کیوں پیتے ہیں؟"

"میں تو بُشرٹ بھی پہنتا ہوں حالانکہ بُشرٹ پہننا شاعر کے لئے ضروری نہیں ہے۔"

"شاعری سے قطع نظر ویسے آپ کے شراب پینے کی وجہ کیا ہے؟"

"میں شراب نہیں پیتا تھا۔ جب بمبئی میں شراب بندی ہوئی تھی اُس وقت بھی شراب نہیں پیتا تھا۔ بعد میں لو بلڈ پریشر کی وجہ سے طبّی طور پر میں نے تین چار سال تک شراب کا استعمال کیا اور اُس سے کافی افاقہ ہوا۔ اب البتہ اس کا عادی ہو گیا ہوں۔ رات کو شراب پئے بغیر اچھی طرح نیند نہیں آتی۔"

"شاعری کے علاوہ آپ کو ادب کی دوسری اصناف سے کس حد تک دلچسپی ہے؟"

"پڑھنے کی حد تک ہر صنف سے دلچسپی ہے لیکن ——" ساحر نے انگلیوں کو اپنے بالوں میں اُلجھاتے ہوئے کہا —— "شروع شروع میں کچھ کہانیاں بھی میں نے لکھی ہیں اور بعد میں چند تنقیدی مضامین بھی۔"

"کیا ہمارا موجودہ ادب واقعی جمود کا شکار ہے؟"

"جمود حرکت کی ضد ہے۔ ادب میں حرکت تو ہے۔ لکھا بھی بہت کچھ جا رہا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ بہت زیادہ بلند پایہ نہ ہو۔"

"آپ کا سیاسی نظریہ کیا ہے؟"

"میں کبھی کسی سیاسی پارٹی کا ممبر نہیں رہا۔ غلام ہندوستان میں آزادی کے مثبت پہلو ڈھونڈنا اور ان کا پرچار کرنا میرا نصب العین ضرور رہا ہے۔ اور اب ذہنی طور پر اقتصادی آزادی کا حامی ہوں جس کی واضح شکل میرے نزدیک سوشلزم ہے۔"

"آپ کے خیال میں ہندوستان میں اُردو کا مستقبل کیا ہے؟"

ساحر نے ڈپلومیٹک انداز اختیار کرتے ہوئے جواب دیا۔ "اُردو زبان کے مستقبل کو ہندوستان کے مستقبل سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان ایک ترقی پسند ملک ہے۔ اور اُردو ایک ترقی یافتہ زبان۔ اس لئے ہندوستان میں اُردو کا وہی مستقبل ہے جو خود ہندوستان کا ہے۔ یعنی جس رفتار سے تعصب اور تنگ نظری میں کمی پیدا ہوگی اُسی رفتار سے ملک اور اُردو دونوں آگے بڑھیں گے۔"

"اب ذرا ترقی پسند ادب کی تحریک کے متعلق کچھ فرمائیے؟"

"میں سمجھتا ہوں ترقی پسند تحریک نے ادب اور مُلک کی بڑی خدمت کی ہے۔ اگرچہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُس سے کچھ غلطیاں بھی ضرور سرزد ہوئی ہیں، لیکن جو لوگ صرف اُس کی خامیاں ہی گنتے ہیں میں اُن سے مطمئن نہیں ہوں۔"

"لیکن یہ تو آپ مانتے ہیں کہ اُس کا شیرازہ اب بکھر چکا ہے۔"

"جی ہاں منظم صورت اب باقی نہیں ہے۔"

"اور کچھ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ یہ تحریک محض چند افراد کے حصولِ شہرت اور باہمی ستائش کی تحریک تھی۔ اِس سے اُنھوں نے اپنا اُلّو سیدھا کیا اور تحریک کا بول و رام ہو گیا۔ اُس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

حسن میں نکھار کے لئے
للی جیولری
(گولڈ پلیٹڈ)
تجارتی معلومات کے لئے :-
مینوفیکچررز :-
شوم پراڈکٹس
پرائیویٹ لمیٹڈ
کلکتہ ۹
ایم۔ ایس۔ شرما اینڈ سنز۔ ۲۴۰ پوسٹ آفس سٹریٹ صدر بازار۔ دہلی ۶

"لوگ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔"

مجھے توقع تھی کہ میری بات کے جواب میں ساحر اپنا یہ مصرعہ پڑھ کر پیچھا چھڑانے کی کوشش کریں گے لیکن انھوں نے خلافِ توقع بہت تحمل سے کہنا شروع کیا۔

"نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ اس تحریک کے افراد نے کافی قربانیاں کی ہیں۔ صعوبتیں جھیلی ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ ایک دوسرے کی شہرت میں اضافے کا باعث ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ سماج اور ادب کے منفی میلانات کے خلاف اُن کی نظریاتی یکسانی تھی۔ اب اگر تحریک میں کرائسس پیدا ہوا تو اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارے ذہنوں میں سرمایہ داری کے توڑ کے لئے اشتراکی نظام کا جو خوش آئند تصور تھا اُس میں بھی شخصی آزادی اور کچھ دوسرے معاملات کے متعلق بعض عملی خرابیاں محسوس ہوئیں۔"

میں نے موضوعِ گفتگو بدلتے ہوئے کہا "فلمی شاعری اور خاص طور پر اپنی فلمی شاعری کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟"

"ادبی شاعری کے نئے کبھی شروع میں روایتی شاعری کرنی پڑتی ہے۔ اس کے بعد شاعر اپنے دل پسند اسٹائل سے کام لیتا ہے۔ میں نے بھی ابتدا میں فلمی دنیا کی روایت سے ملتی جلتی شاعری کی اور بعد میں اپنی جگہ بنانے پر میں اس قابل ہوا کہ بہت سی فلموں میں اپنی پسند کی فلمیں انتخاب کر سکوں۔ اس طرح میں بآسانی اور خوبی اپنے خیالات و جذبات کا پرچار کر سکا ۔۔۔" اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے ساحر نے کہا ۔۔۔ "فلم کے اس پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اپنے خیالات و جذبات کا پرچار کرنے کے لئے یہ ایک پاور فل میڈیم ہے۔"

"یہ بتائیے کہ پرانے فلمی شاعروں میں کون سا شاعر آپ کو پسند ہے؟"

"آرزو لکھنوی۔"

"اور ہم عصر فلمی شاعروں میں؟"

ساحر کے سہمے ہوئے چہرے پر ہلکی سی پریشانی کا رنگ دوڑا لیکن جلد ہی انھوں نے متوازن ہوتے ہوئے مسکرا کر کہا "بات یہ ہے کہ میں فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کا صدر رہوں اسلئے اس سوال کا جواب دینا مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ اب سب فلمی شاعروں کو ایک آنکھ سے دیکھنا میرا فرض ہے۔"

دفعتاً مجھے ساحر کی کسی پرانی نظم کا ایک شعر یاد آگیا ؎

تم میں ہمت ہے تو دُنیا سے بغاوت کر دو
ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کر لو

"اس کا جواب دینا تو غالباً آپ نامناسب خیال نہیں کریں گے ۔۔۔" میں نے کچھ جھجکتے ہوئے پوچھا ۔۔۔ "کہ آپ نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟"

ساحر جیسے اس غیر متوقع سوال کو سن کر چونک سے گئے اور پھر حسبِ عادت اس سوال کو ہنسی میں اُڑاتے ہوئے جواب دیا "کیونکہ کچھ لڑکیاں مجھ تک پہنچ نہیں اور کچھ لڑکیوں تک میں دیر سے پہنچا۔"

مختصر کہ قہقہے کے بعد میں نے کہا "اچھا ساحر صاحب مجھے اب اجازت دیجئے کیونکہ میں بمبئی میں اپنی قیام گاہ تک بروقت پہنچنا چاہتا ہوں۔"

ناردرن ریلوے

نوٹس

خطرے کی زنجیر کا ناجائز استعمال ـــــــ ایسے اشخاص جو گاڑی سے ایسے مقامات پر جو شیڈیولڈ سٹاپ سے برعکس ہیں اُتریں گے یا چڑھیں گے، کے خلاف زیر رول 16_A آف جنرل رولز آف انڈین ریلویز پارٹ II قانونی کارروائی کی جائے گی۔

ایسا پایا گیا ہے کہ ناپسندیدہ اشخاص خصوصاً طلباء خطرے کی زنجیر کو جو کہ محض ہنگامی ضرورت کے وقت ہی استعمال کی جانی چاہئے۔ اپنے گھروں کے نزدیک اُترنے کے لئے یا ان سٹیشنوں سے بچنے کے لئے جہاں انہیں ٹکٹ دکھانے پڑیں گے کھینچ کر گاڑیوں کو روک لیتے ہیں۔

چونکہ ایسے واقعات ان راستوں پر عام ہو رہے ہیں جہاں طلباء زیادہ سفر کرتے ہیں اور وہ اچھی طرح جانے ہوئے ہیں، یہ مناسب سمجھا گیا ہے کہ ایسے لوگوں کو بھارتی ریلویز کے عام قواعد حصہ دوئم کے لئے قاعدہ 16_A کی دفعات کے تحت پکڑنے اور سزا دلوانے کے لئے خاص چھاپوں کا اہتمام کیا جائے۔ ان قواعد کے تحت علاوہ ڈیوٹی پر موجود کسی ریلوے ملازم کے کسی بھی دیگر شخص کو خواہ اس کے پاس جائز ٹکٹ ہو یا نہ ہو اس امر کی قطعی ممانعت ہے کہ وہ ریل گاڑی سے سوائے باضابطہ ٹھہراؤ کے اور کہیں نہ اُتر سکتا ہے نہ گاڑی کو چھوڑ سکتا ہے۔ ماسوا ان حالات کے جب ریلوے حکام کی جانب سے اس بارے میں باقاعدہ اختیار یافتہ کسی ملازم ریلوے کی ایماء و اجازت سے ایسا کیا جائے۔ قاعدہ 16_A کی نقل مندرجہ ذیل ہے۔

"کوئی بھی شخص (سوائے ڈیوٹی پر موجود ملازم ریلوے کے) خواہ اس کے پاس جائز ٹکٹ ہو یا نہ ہو سوائے باضابطہ ٹھہراؤ کے کہیں اور نہ تو ریل گاڑی سے اُتر سکے گا نہ گاڑی کو چھوڑ سکے گا ماسوا اس حالت کے جبکہ ریلوے حکام کی جانب سے اس بارے میں باقاعدہ اختیار یافتہ کسی ملازم ریلوے کی اجازت و ایماء سے وہ ایسا کرے۔"

افسانہ

تری آرزو بھی گلاب ہے

محمود واجد ایم۔ اے

۲۲/۱ دیوان بگان، کلکتہ۔ ۴۶

۲۱ اپریل ۶۴ء

بھائی! آداب

"تری آرزو بھی گلاب ہے" پڑھیے اور داد دیجیے۔ اپنے قارئین کی رائے کا بھی انتظار کروں گا۔ ویسے آپ وہ منزل ہیں جہاں سے سرخرو گزرنا شرطِ اوّل ہے۔ پچھلے دنوں ذہنی طور سے بے حد منتشر رہا۔ میری بیٹی جس کی عمر پندرہ سال تھی اچانک مر گئی اور ان حالات میں کہ میرا نام اُس کی زبان پر تھا اور میں محض پچاس میل دُور بیٹھا بے خبر رہا۔ میری مراد میری بھتیجی سے ہے جسے میں بیٹی کی طرح مانتا رہا تھا۔ اس حادثے نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ ذرا طوفان تھم لے تو تاثرات کو فنی شکل دوں۔ کاش الفاظ ہمارے جذبات کا ساتھ دے سکتے! میری زندگی کا رُخ بدل گیا ہے! میں اپنے آپ کو بھولنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہ کچھ اپنی پسند بھی ہے کچھ مجبوری بھی...

نیاز آگیں ——— محمود واجد

میرے مِس انجنا چکرورتی سے یونہی سے مراسم تھے۔ میرے آفس میں کلرک کی آسامیوں کا انٹرویو ہو رہا تھا۔ وہ بھی امیدوار تھی۔ میں اُدھر سے گزر رہا تھا۔ نہ جانے اُسے کیسے شک ہوا کہ میں بنگالی ہوں۔ دو چار باتیں ہوئیں۔ بنگلہ کلچر کا میں کمزوری کی حد تک دلدادہ رہا ہوں لیکن یہ مسئلہ خالص نوکری کا تھا چونکہ ہندی کم جانتی تھی اس لئے وہ نروس ہو رہی تھی۔ میں نے دلاسا دیا۔ ڈویژنل منیجر کے پاس میرے نام فون آیا تھا۔ وہاں بورڈ کے ممبر بیٹھے تھے۔ عجیب اتفاق تھا اُسی وقت انجنا چکرورتی کا نام پکارا گیا۔ میں نکل رہا تھا اور وہ داخل ہو رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی۔ انٹرویو ختم ہوا تو اُس سے ملاقات نہ ہو سکی۔ میں پہلے ہی نکل گیا تھا۔ پھر میں چھٹی میں گھر چلا گیا۔ چند ہفتوں کے بعد لوٹ کر آیا۔ معلوم ہوا انجنا جوائن کر چکی ہے۔ اُس دن وہ آفس نہیں آئی تھی۔ دوسرے دن آئی۔ میں برآمدے میں کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔

"اشرف صاحب!" ایک مترنم آواز پیچھے سے آئی۔

"اوہ آپ!" میں چونک پڑا۔

"آپ تو اُس دن چلے گئے۔ میں برابر ڈھونڈتی رہی۔ آپ کا شکریہ ادا کرنا بھی بھول گئی ———!" وہ شگفتہ اُردو بول رہی تھی جیسے اُس نے سُن لیا ہو کہ میں اُردو داں ہوں۔

"اِس میں شکریے کی بات کیا۔ آپ نے محنت کی اُس کا پھل ملا۔"

"محنت کا پھل بھی ہمیشہ کہاں ملتا ہے صاحب! یہ گیارھواں انٹرویو تھا۔"

"دینے والے کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔"

اِس اثناء میں کتنے لوگ میرے پاس سے گزر گئے۔ کسی نے مسکرا کر دیکھا۔ کسی نے معنی خیز سلام کیا۔ کسی نے عجیب انداز سے خیریت پوچھی۔ ہل کلرک ٹھاکر تو صرف سر جھکا کر گزر گیا۔ جیسے اُسے کچھ غرض ہی نہ ہو۔ پھر ہم اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔ میں ایک ضروری فائل سے اُلجھا رہا۔ کئی دنوں تک اُس سے بات چیت نہ ہو سکی۔

ایک دن وہ فائل لئے خود میرے ٹیبل پر آگئی۔ ایک چٹھی اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں نے اُسے سمجھا دیا اور ضروری ڈرافٹ کرا دئے۔ اِس درمیان آفس کے کلرکوں میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں اُن کا اظہار نہ کیا جائے تو اچھا ہے۔ آئینہ کا وجود نہ ہوتا تو خوش فہمیوں کا اِمکان تھا۔ لیکن خوش فہمیوں کے اُڑتے پرندوں کو کون کاٹ

سکا ہے۔ بقصد فطرت ہر کوئی خوش فہم ہوتا ہے۔ اگر یہ فریب باہم نہ ہو تو آدمی کا دم نکل جائے۔ لیکن یہاں تو بیٹھے بیٹھے دم نکل رہا تھا۔ پینٹ کی کریز، قمیص کے کالر اور بالوں کی بکھری ہوئی لٹ سے لے کر باتوں کی شائستگی، اٹھنے بیٹھنے کے انداز اور اپنے خیالات کے اظہار تک ہر بات میں تنظیم آگئی تھی۔ کوئی اپنے آپ کو بہت مشغول ظاہر کرتا۔ کسی کی گہری خاموشی حقیقتِ حال کا نقشہ کھینچتی۔ کہیں میٹھی میٹھی نظر اٹھتی۔ کسی کے لبوں پر پُراسرار مسکان ہوتی —— تصنع کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ پھر آپ ہی آپ بہت سی باتیں معمول پر آنے لگیں۔ اس درمیان لوگوں کے خیالات انجنا کے متعلق بنتے بگڑتے رہے۔ انجنا میں ایک ہی کمزوری تھی۔ وہ اپنے کام سے متعلق مشکلات پر قابو پانے میں کسی سے بھی مدد لینے میں ہچکچاتی نہ تھی۔ اس سلسلے میں بہت سے قصے مشہور ہو گئے تھے۔ خصوصاً مسٹر ٹھاکر کا قصہ بہت دلچسپ تھا۔ اچانک ایک بار اُسے اپنے سامنے دیکھ کر اُن کی ایسی حالت ہو گئی کہ اُن کی زبان تتلانے لگی تھی۔ مسٹر جسونت تو پسینے پسینے ہو گئے جب وہ اُن کے ٹیبل پر جھک کر ایک ڈرافٹ دکھانے لگی۔ انصاری تو اُسے دیکھ کر یتیم کی سی صورت بنا لیتا۔ بوڑھے بلانے صاحب کی آنکھوں میں بھی چمک آجاتی۔ یہ باتیں میری غیر حاضری میں ہوا کیں ورنہ میری موجودگی میں وہ کہیں اور جانے کی ہمت ہی خود میں نہ پاتی تھی۔ ہو سکتا ہے مجھے غلط فہمی ہو لیکن ایک دن اُس نے مجھ سے کہا تھا۔

"اشرف صاحب! میں آپ کے بغیر تو بے بس ہو جاتی ہوں۔"

"اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھئے۔ شطرنج کی طرح کب تک چلے گا!"

میں نے دیکھا اچانک اُس کا چہرہ مُرجھا گیا۔ معاً مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا لیکن اُس وقت تک اُس کی پلکوں تک آنسو آچکے تھے۔ بہت مشکل سے اُسے سنبھال سکا۔ مجھے خدشہ تھا کہ کوئی ایسی ویسی بات نہ پھیل جائے! لیکن اچھائی تو محدود ہوتی ہے۔ جس کا ڈر تھا وہ ہو کر رہا۔ کئی دنوں تک انجنا کا موڈ آف رہا اور اُس کی ذمہ داری مجھ پر تھوپی گئی۔ بعضوں کا خیال تھا کہ وہ میری کمزوری بن چکی ہے اسی لئے میں لوگوں کو دکھانے کو ایسا کرتا ہوں۔ بعض اُس کے کیریکٹر پر شک کر رہے تھے۔ چند ہی دنوں میں میں نے دیکھا کہ بڑی بڑی باتیں مشہور ہو گئیں۔ پھبتیاں کسی جانے لگیں۔ لوگ انجنا کے رومان کے بارے میں بہت کچھ سُنانے لگے۔

ایک اتوار کو میں انجنا کے یہاں چلا گیا۔ اپنی ملاقات کے ابتدائی دنوں میں اُس نے مجھے جو پتہ دیا تھا، اُس کی روشنی میں وہاں پہنچنا مشکل نہ تھا۔ وہ کہیں باہر گئی ہوئی تھی۔ اُس کی ماں سے میں نے اپنا تعارف کرایا تو وہ بستر سے اُٹھ بیٹھی حالانکہ بہت کمزور تھی۔ ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اُس نے آخر ساری باتیں کہہ دیں۔ کس طرح انجنا کے باپو کی بے وقت موت سے سارا بوجھ اُس غریب کے کندھوں پر آپڑا تھا۔ گھر میں ماں کے علاوہ ایک بیوہ بہن تھی اور کئی چھوٹے بچے تھے۔ اتوار کو وہ دستکاری کے ایک اسکول میں پارٹ ٹائم کام کرنے جاتی ہے۔ میں اُٹھ ہی رہا تھا کہ انجنا آگئی۔ اُس کی ماں نے بہت روکا لیکن میں چلا آیا۔ ایک لفظ نہ بولی جیسے اُسے یقین ہو کہ میں ہی اُسے مناؤں گا۔ پھیلنے والی بات کو کون پکڑ سکا ہے۔ مجھ سے استفسار ہونے لگے۔

"کہئے اشرف صاحب! اچھی گزر رہی ہے نا!"

ایک صاحب نے پوچھا۔

"انجنا آجکل بہت کھوئی کھوئی سی رہتی ہے!"

کسی گوشے سے آواز آئی۔

"قسمت ہو تو اشرف صاحب جیسی —— کیوں ٹھاکر ہے نا!"

سب سے سیدھے سادے شخص کو بھی لوگ گواہ بنانا چاہتے تھے لیکن میری ایک چپ سو باتوں کا جواب تھی!

میں باتوں کو ہوا دینے کا عادی نہیں۔ میں سمجھتا ہوں الجھن انسانی ہے۔ ساری باتیں اِس حقیقت پر انحصار کرتی ہیں کہ آپ کس چیز سے کس قدر متاثر ہوتے ہیں!

ایک ہفتہ تک انجنا آفس نہیں آئی۔ لوگوں کو تشویش ہونے لگی۔

کسی نے کہا —— "کوئی نیا پارٹنر پھنسا ہوگا!"

"میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ بہت سستی لڑکی ہے!" ایک صاحب نے انکشاف کیا۔

اور یہ ساری باتیں محض مجھے سُنانے کے لئے کہی گئی تھیں۔ ایک بزرگ نے مجھ سے بہت ہمدردی ظاہر کی۔

"آخر آپ کو کیا دلچسپی ہے چھوڑیئے اُسے۔"

میں دل کی طاقتوں پر اتنا بھروسہ کرتا ہوں کہ مجھے اُن سارے ہنگاموں کے پیچھے کوئی تشویشناک پہلو نظر نہیں آرہا تھا۔ کچھ طبیعت ناساز تھی جس کے باعث وہ آفس نہیں آرہی تھی۔ اِس درمیان مہینہ ختم ہو گیا۔ اُس کا پے بِل نہیں بن رہا تھا۔ ٹھاکر کو شاید میری کمزوری کا احساس تھا۔ اُس نے اطلاع دی تھی۔ میں نے ذرا سی کوشش کر دی اُسے پیسے مل گئے۔ وہ اُسی دن آئی تھی۔ بہت زرد زرد سی ہو رہی تھی جیسے کسی نے رگوں کا سارا خون چوس لیا ہو۔ اِس بات کی بھی غلط تاویل ہونے لگی۔ کبھی کبھی میں کام کرتے کرتے نظر اُٹھاتا کر دیکھتا تو ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ ایک ٹک مجھے دیکھ رہی تھی۔ جیسے اُسے یقین ہو کہ کوئی آ

...جاؤں گا! میں خود کو کمزور کمزور سا محسوس کر رہا تھا۔ یہ چند راتیں میں نے بہت کرب سے گزاری ہیں۔ دکھوں کا علاج تو ممکن ہے لیکن دکھ سے پیدا ہونے والی الجھنوں کا علاج قطعی ممکن نہیں! اور میں اسی طرح خود کو الجھنیں محسوس کر رہا تھا۔

آج آفس گیا تو یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ انجنا سے ساری باتیں کہہ دوں گا۔ آفس پہنچا تو سارا ماحول بدلا ہوا تھا —— میں جدھر سے گزرتا تھا خوشی تھی۔ جیسے سب کو انتظار ہو کہ میرا ردِعمل کیا ہوگا۔ میں ابھی اپنی سیٹ پر بیٹھا ہی تھا کہ چپراسی نے ایک لفافہ لا کر دیا —— خط نکال کر میں پڑھنے لگا۔

"اشرف صاحب! مجھ پر آپ کے بے حساب احسانات ہیں لیکن اتنا حق تو مجھے آپ دیں گے ہی کہ میں اپنی زندگی کا مناسب ساتھی چن سکوں۔ اُمید ہے کہ آپ مجھے معاف کر دیں گے۔ میں نے رات مسٹر شاکر سے شادی کر لی ہے!!"

مضمون نگار حضرات سے درخواست ہے کہ وہ بیسویں صدی کے لئے مضامین لکھتے وقت ہمیشہ اختصار سے کام لیا کریں بغرضِ اشاعت موصول ہونے والے مضامین میں سے مختصر افسانوں کو طویل افسانوں پر ترجیح دی جاتی ہے۔ اور طویل افسانے مضمون نگاروں کو واپس کر دیئے جاتے ہیں۔ غیر طلب شدہ مضامین کی واپسی کے لئے مضمون کے ساتھ ٹکٹ بھیجنے کی بجائے اپنا پورا پتہ لکھا ہوا پوسٹ آفس کا لفافہ بھیجیں۔ ورنہ ہم مضمون کی واپسی سے قاصر رہیں گے۔ مضمون کے لفافے پر لفظ غیر مطبوعہ ضرور لکھیئے۔

غزل

قمر اقبال اورنگ آباد

فصلِ گُل ہے تو یہ آثارِ خزاں کیسے ہیں؟
باغباں! غنچہ و گُل نوحہ کناں کیسے ہیں؟

ہم تو میکش ہیں ہمارا تو ٹھکانا ہے یہی
شیخ جی آج مگر آپ یہاں کیسے ہیں؟

جس سے وابستہ ہیں ماضی کی سُلگتی یادیں
"اُس گلی میں مرے قدموں کے نشاں کیسے ہیں؟"

میری رُودادِ اَلم ایک فسانہ ہی سہی!
تیری آنکھوں سے مگر اشک رواں کیسے ہیں؟

جو ستاروں سے پرے تھے وہ جہاں دیکھ چکے
جو ستاروں سے ہیں آگے وہ جہاں کیسے ہیں؟

غزل

سید حباب ترمذی

یہ ممکن نہیں عشق کی آن جائے
بلا سے اگر جاتی ہے جان جائے

مجھے اس ادا سے نہ دیکھا کرو تم
مبادا زمانہ بُرا مان جائے

کنارے کنارے چلا ہے سفینہ
مزہ جب ہے طوفان طوفان جائے

نگاہوں کو جب دعوتِ شوق دیں وہ
بصد شوق دل کیوں نہ قربان جائے

اِن آنکھوں سے شاید یہی دیکھنا تھا
بُتوں کی خدائی میں ایمان جائے

حباب ایسی رنگین غزلیں کہو تم
حسینوں کے ہاتھوں میں دیوان جائے

غزل
قمر اقبال اورنگ آباد

طنزیہ

جہاں گرد چاروں کھونٹ گھومتا ہے۔ افواہیں جمع کرتا ہے اُسے افواہیں جمع کرنے کا جنون ہے۔ یہ جنون اِسلئے ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ جنون کے پیچھے ہوش ہوتا ہے۔ افواہوں کے پیچھے تلخ حقیقتیں ہوتی ہیں ـــــــ!

جہاں گرد کے قلم سے

افواہ ـــــــ ●

ڈاکٹر رام منوہر لوہیا کے متعلق آج کل دو عجیب و غریب افواہیں پھیلی

۔

پہلی افواہ یہ ہے کہ مرحوم پنڈت نہرو کی جو وصیت شائع کی گئی ہے اُس
لب حصہ شائع کیا گیا ہے۔ دوسرا حصہ جان بوجھ کر شائع نہیں کیا گیا۔ کیونکہ
ڈاکٹر رام منوہر لوہیا کو پنڈت نہرو نے اپنا جانشین منتخب کیا تھا۔ افواہ میں یہ
یلہ ہے کہ ڈاکٹر لوہیا کے پاس وصیت کے اُس دوسرے غیر مطبوعہ حصے کی
وجود ہے جسے وہ موزوں وقت پر شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

دوسری افواہ یہ پھیلی ہوئی ہے کہ آنے والے جنرل الیکشن میں ڈاکٹر لوہیا
ت پندرہ نشستوں پر بطور اُمیدوار کھڑے ہوں گے۔ یہ پندرہ نشستیں وہ
ں پر مرکزی سرکار کے وزیر بطور اُمیدوار کھڑے ہوں گے۔ اور ڈاکٹر لوہیا ہر وزیر کا
ابلہ کریں گے۔ انھیں اُمید ہے کہ وہ پندرہ کے پندرہ وزیروں کو چاروں
ت گرا دیں گے۔

اِس سلسلہ میں ایک تیسری ضمنی افواہ یہ پھیلی ہوئی ہے کہ متذکرہ بالا دونوں
ڈاکٹر لوہیا نے خود پھیلائی ہیں۔

ری افواہ ـــــــ ●

جون کے پہلے ہفتہ میں سرکردہ چینی لیڈروں کی ایک ہنگامی میٹنگ ہوئی۔
ا یہ تھا کہ پنڈت نہرو کے انتقال پر چین بھر میں ایک "جشن مسرت" کا اہتمام کیا
۔ یہ ایجنڈا چو۔ این۔ لائی نے پیش کیا۔ اور دلیل یہ دی کہ پنڈت نہرو کی موت سے

یہ سوال خود بخود حل ہو گیا ہے کہ اب ایشیا کا واحد لیڈر کون ہے؟

کامریڈ چو۔ این۔ لائی نے میٹنگ کو بتایا کہ پنڈت نہرو میرے راستہ کی سب سے بڑی چٹان تھے۔ کیونکہ تمام ایشیائی ممالک پنڈت نہرو ہی کو ایشیا کا لیڈر سمجھتے تھے اور مجھے دوسری پوزیشن دیتے تھے۔ لیکن اب سارا ایشیا میری طرف دیکھ رہا ہے، کہ میں ہی ایشیائی عوام کی رہنمائی کر سکتا ہوں۔ اِس لئے یہ امر چین کے لئے باعثِ فخر ہے، کہ پنڈت نہرو کی موت ہو گئی اور چین کے سر پر ایشیا کی رہنمائی کا تاج رکھا جا رہا ہے۔

"لہٰذا ... " کامریڈ چو۔ این۔ لائی نے فیصلہ کُن لہجہ میں کہا " اِس انتقال کو چین بھر کے لئے جشنِ مسرت میں منتقل کر دیا جائے۔ اور ہفتہ بھر تک چین میں یہ جشن منایا جائے۔"

افواہ ہے کہ اِس موقع پر کامریڈ چو۔ این۔ لائی اور کامریڈ ماؤ سی تنگ میں ایک زبردست جھڑپ ہو گئی کیونکہ کامریڈ ماؤ نے کہا کہ "پنڈت نہرو کے بعد ایشیا کا واحد لیڈر میں ہی بن سکتا ہوں۔ کیونکہ کامریڈ چاؤ مجھ سے جونیئر ہیں۔"

اِس جھڑپ کے بعد میٹنگ میں زبردست ہنگامہ ہوا۔ مُکّے دکھائے گئے، ایک دوسرے پر کُرسیاں پھینکی گئیں۔ اور ایشیا کے یہ دونوں متوقع لیڈر ایک دوسرے کے ہاتھوں زخمی ہو کر ہسپتال میں پہنچ گئے۔ اور جشنِ مسرت جشنِ ماتم میں بدل گیا۔

تادمِ تحریر دونوں حضرات کے ماتھے اور گھٹنے زخمی ہیں اور اِن پر پٹیاں بندھی ہوئی ہیں۔ دونوں نے بیان دیا ہے کہ اب زخم مُندمل ہونے کے بعد ہی ایشیا کی لیڈری کا فیصلہ کیا جائے گا۔

تیسری افواہ ـــــــ ●

ہندوستان کے نئے پردھان منتری شری لال بہادر شاستری کے متعلق

بہت سی افواہیں ایک وقت پھیلی ہوئی ہیں ——— اُن افواہوں کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ بہت سے لوگ شاستری جی کے ساتھ کسی نہ کسی پُرانے سمبندھ کا قصہ گھڑ کر پیش کر رہے ہیں۔

مثلاً ——— جہاں گرد کو کانپور کے ایک نائی نے بتایا کہ ایک بار شاستری جی جب آٹھ برس کے تھے تو اُس سے بال کٹوایا کرتے تھے۔

کلکتہ کے ایک کروڑپتی بزنس مین نے بتایا کہ شاستری جی اور میں پہلوانوں کے ایک اکھاڑے میں ساتھ بیٹھ کر مالش کیا کرتے تھے اور ڈنڑ پیلا کرتے تھے۔ شاستری جی مجھ سے پانچ ڈنڑ کم پیلا کرتے تھے۔

ناگپور کے ایک جیوتشی نے جو آج کل زمین پر جنتری بچھا کر لوگوں کی قسمت دیکھتا ہے ——— بتایا کہ جب شاستری جی تیرہ برس کے تھے تو میں نے اُن کے ہاتھ کی ریکھائیں دیکھ کر انھیں یہ بتانا چاہا تھا کہ تم ہندوستان کے راہبر ہو گے۔ لیکن شاستری جی کے پاس میری فیس کے پانچ آنے نہیں تھے۔ اس لئے میں نے بغیر فیس کے کچھ بتانے سے انکار کر دیا تھا۔

بنارس کے ایک پنواڑی نے بتایا کہ شاستری جی مجھے ہندی پڑھایا کرتے تھے۔ اور میں اُس کے بدلے میں انھیں سپیشل پان بنا کر کھلایا کرتا تھا۔

دلی کے ایک ریٹائرڈ پنشنر بڈھے نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا ——— "آہ اب شاستری جی مجھے کہاں پہچانیں گے۔ ایک بار وہ مجھ سے ایک کتاب مانگ کر لے گئے تھے جو انھوں نے آج تک واپس نہیں کی۔"

جہاں گرد کا خیال تھا کہ وہ اِن افواہوں کے متعلق شاستری جی سے رائے طلب کرے۔ لیکن اُس نے یہ سوچ کر ارادہ ترک کر دیا کہ شاستری جی مرنجاں مرنج انسان ہیں مسکرا کر اِن تمام افواہوں کی تصدیق کر دیں گے۔

چوتھی افواہ ———— ●

راجدھانی دہلی کے سیاسی حلقوں میں اس افواہ پر بڑی لے دے ہو رہی ہے کہ شیخ محمد عبداللہ نے پالیٹکس سے ریٹائر ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اور جلد ہی سنیاس دھارن کرنے والے ہیں۔

جہاں گرد نے اِس سلسلہ میں شیخ صاحب کے وفادار ساتھی مرزا افضل بیگ سے استفسار کیا۔ تو وہ ٹھنڈی آہ بھر کر بولے "اُس شخص کا کوئی اعتبار نہیں کیونکہ بنیادی طور پر وہ جذباتی آدمی ہے۔ وہ کبھی ایک اچھا ڈپلومیٹ نہیں رہا۔ میں تو بور ہو چکا ہوں اُس شخص سے۔ اور دعا کرتا ہوں کہ وہ جتنی جلدی سنیاس دھارن کرے اُتنا ہی اچھا ہے۔ کم از کم میرے لئے راستہ تو صاف ہو جائے گا۔"

اُس کے بعد جہاں گرد شیخ صاحب سے ملا تو شیخ صاحب بولے "میں کشمیر کا اچاریہ ونوبا بھاوے بننا چاہتا ہوں۔ اور مرزا صاحب کا یہ خیال غلط ہے کہ اکیلے ہی کشمیر میں بھودان تحریک شروع کروں گا۔ بلکہ میں مرزا صاحب کو بھی اُس میں شامل کروں گا۔"

"آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟" جہاں گرد نے پھر پوچھا۔

"پنڈت نہرو کے بعد اب پالیٹکس میں کوئی لطف نہیں رہا۔" انھوں نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بات ختم کی۔ "اُن کے انتقال سے میرے سارے منصوبے خاک میں مل گئے ہیں۔ اور اب ہند اور پاک کے لیڈروں کے ساتھ چند ملاقاتوں کے بعد میں "سروودیا" ہو جاؤں گا۔"

پانچویں افواہ ———— ●

"کامراج زدہ" سابق مرکزی وزیر شری مرارجی ڈیسائی نے اپنے متعلق یہ افواہ پھیلا رکھی ہے کہ وہ ملک بھر میں دورہ کر کے کانگریسی ورکروں میں مقبول ہونے کا کام کریں گے۔ اور کانگریس کے اگلے سالانہ سیشن میں صدر کانگریس مسٹر کامراج کو عہدہ سے ہٹا کر خود کانگریس کے صدر بن جائیں گے۔

جہاں گرد نے جب اُن سے پوچھا "اُس کے بعد آپ کیا کریں گے؟"

تو وہ ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے بولے "میں کامراج پلان کے مقابلہ پر ڈیسائی پلان پیش کروں گا، جس کے تحت خود وزیر اعظم بن جاؤں گا۔ اور اُن وزراء کو کیبنٹ سے نکال دوں گا، جنھوں نے مجھے کیبنٹ سے نکلوا دیا تھا۔"

جہاں گرد نے پھر سوال کیا "آپ ایسا کیوں کرنا چاہتے ہیں؟"

شری ڈیسائی نے مسکرا کر جواب دیا "کیونکہ میرے محبوب سورگیہ پردھان منتری شری جواہر لال نہرو کی یہی اِچھا تھی۔"

چھٹی افواہ ———— ●

گذشتہ دنوں جب پنڈت نہرو کے انتقال کی خبر ملی تو کلکتہ کے سبھا وادی حلقوں میں زور شور سے یہ افواہ پھیل گئی یا پھیلا دی گئی کہ شولسری آشرم کے سادھو بابا اچانک اپنے آشرم سے غائب ہو گئے ہیں۔ اور اپنے ایک خاص چیلے سے کہہ گئے ہیں کہ دراصل وہ ہی نیتا جی سبھاش چندر بوس ہیں۔ اور اب اُن کے نمودار ہونے کا صحیح وقت آگیا ہے۔

اِس افواہ کے مطابق وہ جلد ہی دہلی کے لال قلعہ پر نمودار ہوں گے وہاں سے اعلان کریں گے کہ اب وہ ملک کی باگ ڈور سنبھال رہے ہیں [illegible]

سبھاش وادی لیڈر نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ وہ جون کے آخری ہفتے دہلی میں ظاہر ہوں گے۔ اس افواہ کی تصدیق کے لئے جب کچھ لوگ مذکورہ آشرم گئے تو وہاں معلوم ہوا کہ باباجی نے ایک مہینے تک کسی سے ملنے جلنے کی ممانعت کر رکھی ہے۔ اس سے اس افواہ کو اور بھی تقویت پہنچ گئی۔

تادمِ تحریر یعنی جولائی کے پہلے ہفتہ تک باباجی دہلی میں آ کر نمودار نہیں ہوئے۔ لیکن سُنا ہے سبھاش وادی گروپ نے اب سابقہ افواہ میں ایک چھوٹی سی ترمیم کر دی ہے اور کہا ہے، کہ سبھاش بابو کے نمودار ہونے کا صحیح وقت ۱۵ اگست ہے۔ جبکہ وہ مرحوم پنڈت نہرو کی بجائے لال قلعہ پر قومی جھنڈا لہرائیں گے۔

نوٹ :- بالکل ایسی ہی ایک اور افواہ جرمنی میں بھی پھیلی ہوئی ہے کہ وہاں ۱۵ اگست کو ہٹلر نمودار ہونے والے ہیں۔

ساتویں افواہ

گزشتہ دنوں دریائے گنگا کے کنارے ایک جنگل میں ہندوستان بھر کے تمام کرپٹ کانگریسیوں (جن میں کئی کانگریسی وزرا بھی شامل تھے) کی ایک خفیہ میٹنگ ہوئی۔ جس میں ہر کرپٹ کانگریسی نے گنگا جل ہاتھ میں لے کر قسم کھائی کہ وہ پنڈت نہرو کے انتقالِ پُرملال کے پیشِ نظر آئندہ ایک سال کیلئے بھرشٹا چار سے توبہ کرتے ہیں۔ اور جوں ہی حالات نارمل ہو جائیں گے۔ یعنی انھیں پنڈت نہرو کا غم بھول جائے گا۔ تو وہ اُس کے بعد ہی بھرشٹاچار شروع کریں گے، اُس سے پہلے نہیں۔

معلوم ہوا ہے کہ اُس میٹنگ کے فیصلہ کی ایک نقل پرائم منسٹر شاستری اور صدر کانگریس شری کامراج کو بھجوا دی گئی ہے۔ کرپٹ کانگریسیوں نے عوام اور سرکار دونوں سے درخواست کی ہے کہ اُن کے اس فیصلہ کو ذاتی تصور نہ کیا جائے بلکہ اسے نہایت سنجیدگی سے لیا جائے۔ کرپٹ کانگریسیوں نے اِس سلسلہ میں اپنا ایک ہنگامی دفتر دہلی میں کھول دیا ہے اور عوام سے کہا ہے کہ جس کانگریسی کے متعلق انھیں شک ہو کہ وہ اِس فیصلہ کی خلاف ورزی کر رہا ہے یعنی بھرشٹاچار کر رہا ہے، اُس کی اطلاع فوراً اِس دفتر کو بھیجی جائے۔

راجدھانی دہلی کے سیاسی حلقوں میں کرپٹ کانگریسیوں کی اِس ایک سالہ قربانی کو بے حد سراہا جا رہا ہے۔

ننھی مُنّی افواہیں

۱۔ افواہ ہے کہ سابق وزیرِ خزانہ شری ڈیسائی نے اِس بنا پر وزیر بننے سے انکار کر دیا کہ تمام مرکزی وزیر چائے پیتے ہیں۔ اگر وہ چائے پینا بند کر دیں تو میں وزیر بننے کے لئے تیار ہوں۔

۲۔ صدر کانگریس شری کامراج ۱۵ اگست کو رام لیلا گراونڈ میں خالص ہندی زبان میں تقریر کریں گے۔

۳۔ انجمنِ خواتین پاکستان نے مطالبہ کیا ہے کہ پاکستان سرکار میں پچاس فیصدی وزیر عورتوں میں سے لئے جائیں۔ ورنہ وہ آنے والے الیکشن کا بائیکاٹ کریں گی۔

۴۔ شری جے پرکاش نارائن نے شری جے پرکاش نارائن کو دھمکی دی ہے، کہ جب تم مجھے ہندوستان کا وزیرِ اعظم نہیں بنا سکتے تھے، تو تم نے اتنے برس تک مجھے دھوکے میں کیوں رکھا۔

۵۔ لنکا سرکار نے ہند سرکار سے مطالبہ کیا ہے، کہ ہندوستان میں اِس محاورے کو ڈکشنری میں سے نکال دیا جائے کہ "لنکا سے جو بھی نکلا باون گز کا"۔ کیونکہ لنکا میں اِسوقت ایک بھی آدمی باون گز کا نہیں ہے۔

۶۔ چینی کمیونسٹ پارٹی نے اپنے پرانے کاغذات میں سے ایک ریزولیوشن کی کاپی پاکستان سرکار کو ارسال کی ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ چینی کمیونسٹ پارٹی نے پاکستان کے قیام کی حمایت کی تھی۔

۷۔ ہند سرکار اس بات کی کھوج کر رہی ہے کہ ہنومان جی جس جہاز پر سوار ہو کر سنجیونی بوٹی لینے گئے تھے، وہ کس نے بنایا تھا۔

مشہور مصنفین کے مشہور ناول اور کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
افسانے نگر رہے	خوش باش ایم اے	دو روپے
اندھیرے	اختر عادل روپ	دو روپے
آگ اور دھواں	م۔ م۔ راجندر ایم اے	دو روپے ۵۰ نئے پیسے
اندھیرے اجالے	عادل رشید	تین روپے
اندھیری راتیں	ریوتی سرن شرما	تین روپے ۹۵ نئے پیسے
ایک پیار ایک دھوکا	رام سرن شرما	تین روپے ۲۵ نئے پیسے
بیگم صاحبہ	شوکت تھانوی	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
[illegible]	〃	دو روپے ۵۰ نئے پیسے
پگلی	〃	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
بے غیرت	مضطر ہاشمی	چار روپے ۲۵ 〃
باون پتے	کرشن چندر ایم اے	پانچ روپے ۹۵ 〃
پہلی لڑکی	راز داں ایم اے	دو روپے ۹۵ نئے پیسے
انور	فیاض علی	آٹھ روپے ۵۰ 〃
برہن	کرشن گوپال عابد	چار روپے ۵۰ 〃
ستم	〃	چار روپے ۷۵ 〃
گھائل	〃	تین روپے ۹۵ 〃
ظالم	سعید امرت	دو روپے ۵۰ 〃
جانے والے	اختر عادل روپ	تین روپے ۷۵ 〃
جاتی ہوئی بہار	وحشی محمود آبادی	چار روپے
چوٹ	دت بھارتی	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
گناہ	〃	دو روپے ۹۵ نئے پیسے
حالِ دل	بیگم توقیر ولایت حسین	تین روپے ۵۰ 〃
طوفان	انتصار حسین	تین روپے
ماہی مراد	قیسی رامپوری	چار روپے
پاگل	رئیس احمد جعفری	چھ روپے
[illegible] (نظم)	عبد الحمید عدم	دو روپے ۵۰ نئے پیسے

کتاب	مصنف	قیمت
دو پھول	عادل رشید	تین روپے ۹۵ 〃
دو سال پہلے دو سال بعد	زبیدہ خاتون	چھ روپے
فریبِ مسلسل	شفیق بانو	دو روپے
زہر	زکی انور	چھ روپے
برجیس	قیسی رامپوری	چار روپے
اچھی صورت بری نگاہ	ریاض ارشد	تین روپے
سناٹے	رضیہ سجاد ظہیر	تین روپے ۹۵ نئے پیسے
مجھے تم سے محبت ہے	نقی نور	تین روپے ۵۰ 〃
نئے قدم	ہاجرہ نازلی	چار روپے ۵۰ 〃
ننگی جوانی	سعید امرت	دو روپے
رہگذر	انیس مرزا	چار روپے ۵ نئے پیسے
خوفناک محبت	عبد الحلیم شرر	تین روپے
شاہد	انتصار حسین	تین روپے
کرنیں	شفیق الرحمٰن	تین روپے
ناظمہ کی آپ بیتی	ایم اسلم	تین روپے
ایک دل ہزار غم	عزیز بدایونی	دو روپے ۵ نئے پیسے
زرینہ	رئیس احمد جعفری	چھ روپے ۵۰ نئے پیسے
ننگا شہر	احمد شجاع	پانچ روپے
دردانہ	نادرہ خاتون	پانچ روپے
چندر کلا	جمنا داس اختر	دو روپے ۵۰ نئے پیسے
جلن	〃	دو روپے ۵۰ 〃
رادھا الزبتھ	〃	دو روپے ۵۰ 〃
پاپی	〃	چار روپے
سونا گاچی	〃	چار روپے ۵۰ 〃
طوفانوں کی کہانی	〃	چار روپے ۵۰ 〃
جوار بھاٹا	〃	چار روپے ۵۰ 〃

کتاب	مصنف	قیمت
قیامت	زکی انور	دو روپے [illegible]
سازش	〃	دو روپے ۵۰ 〃
کانٹوں کی سیج	رشید اختر ندوی	پانچ روپے
گمراہ	قیسی رامپوری	چار روپے [illegible] نئے پیسے
ناگ دیوتا	محمود جالندھری	دو روپے ۵۰ 〃
خون کے چھینٹے	〃	دو روپے ۵۰ 〃
خوابگاہ میں	〃	تین روپے ۵۰ 〃
فراق	رنگین بھارتی	تین روپے ۵۰ 〃
پیاسا	〃	تین روپے ۵۰ 〃
پراسرار رقاصہ	〃	دو روپے
پراسرار قاتل	〃	دو روپے
پیاس	کے۔ ایل نرائن بی اے	تین روپے ۵۰ 〃
محبت روتی ہے	غلام عباس	دو روپے
مالوا	میکسم گورکی ترجمہ: نریش کمار شاد	ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے
کھیت میں لہو	تاجور سامری	ایک روپیہ ۲۵ 〃
جی ہاں پٹے ہیں	شوکت تھانوی	تین روپے ۲۵ 〃
پردے کے پیچھے	منٹو	دو روپے ۵۰ 〃
ملکۂ صحرا	اوم پرکاش نامی	دو روپے ۵۰ 〃
خاموش نغمہ	〃	چار روپے
آتش گل (مجموعہ کلام)	جگر مرادآبادی	پانچ روپے
باقیات اقبال 〃	ڈاکٹر اقبال	تین روپے
تلخیاں (کلاں) 〃	ساحر	چھ روپے
تلخیاں (خورد) 〃	ساحر	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
پرچھائیاں 〃	ساحر	ایک روپیہ [illegible] نئے پیسے
انسانیت موت کے دروازے پر (مولانا آزاد)		تین روپے ۵۰ 〃
زہریلا حسن	اشفاق احمد	دو روپے

پتہ — رسالہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی نمبر ۶

شمیم حنفی ۔ ایم ۔ اے

"کاشانہ"، ۱۴۵ ۔ سول لائن سلطانپور ۔ یوپی

۴ اپریل ۶۴ء

خوشتر بھائی! تسلیم

.... اپریل کے شمارے میں "نرش کار" شاد کا فراق صاحب سے ایک انٹرویو شائع ہوا ہے ۔ اُس انٹرویو میں فراق صاحب سے جو سوالات پوچھے گئے ہیں اُن کا جواب قاری کے ذہن میں فراق صاحب کی وہ تصویر پیش کرتا ہے جو اداسیوں، مایوسیوں اور تنہائیوں کے احساس سے مرتب نظر آتی ہے ۔ یہ حقیقت ہے کہ زندگی کے بعض المیوں نے فراق صاحب کو انھیں کے الفاظ میں "سوزِ مکمل، دردِ مجسم" بنا دیا ہے ۔ لیکن جن لوگوں نے فراق صاحب کو قریب سے دیکھا ہے وہ اُن کی شخصیت پر چھائے ہوئے افسردگی کے غبار میں ایک ایسی تابناکی اور زندہ دلی بھی پاتے ہیں جو فراق صاحب کی شخصیت کا ایک اہم پہلو ہے ۔ انھیں دیکھ کر مجھے اکثر بائرن کا یہ جملہ یاد آجاتا ہے ——

"The people whose hearts are always aching are the ones who joke most."

ان "شکر پاروں" میں فراق صاحب کے کچھ لطیفے پیش کر رہا ہوں ۔ ان لطائف میں محض ہنسی کے لئے ہنسی" کا سامان ہی نہیں بلکہ فراق صاحب کی ذہانت، طباعی اور حاضر جوابی کی تصویریں بھی نظر آتی ہیں ۔

آپ کا ——— شمیم حنفی

پنشن یافتہ

گذشتہ موسمِ سرما کی بات ہے :

امرتسر کے ایک ہوٹل میں فراق صاحب چند شاعر دوستوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے ۔ اُن حضرات کا قیام بھی اُسی ہوٹل میں تھا ۔

اُسی وقت ہوٹل کا منیجر ایک رجسٹر لے کر آیا اور ساحر ہوشیارپوری کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا ۔

"آپ لوگ ذرا اس کی خانہ پُری کر دیں ۔"

ساحر نے اپنا نام اور مستقل پتہ تو لکھ دیا لیکن جب "پیشے" کے خانے پر نظر پڑی تو اُلجھ گئے اور فراق صاحب سے پوچھنے لگے ۔

"کہیئے صاحب! میں اپنا پیشہ کیا لکھوں ؟"

"معشوق لکھ دو !" فراق صاحب بولے ۔

"ارے صاحب! اب اس عمر میں !" ساحر نے مسکراتے ہوئے کہا ۔

"آگے پنشن یافتہ بھی لکھ دینا !" فراق صاحب نے بہت سادگی سے مشورہ دیا ۔

بھنبھناہٹ

فراق صاحب کے ایک دوست نے ہندی مضامین کے کسی مجموعے کے ایک صفحے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ۔

"دیکھیے صاحب! ان حضرت نے ایک ہی صفحے پر بیس جگہ لفظ بھن بھن (भिन-भिन) کا استعمال کیا ہے ۔"

فراق صاحب نے پُر خیال انداز میں اُس صفحے پر ایک نظر ڈالی پھر مسکراتے ہوئے بولے ۔

"بھئی تو پورے صفحے پر مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں !"

تعارف

فراق صاحب کسی مشاعرے میں شرکت کرنے کے بعد الہ آباد واپس آ رہے تھے۔
دورانِ سفر قریب ہی بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے جو فراق صاحب کی گفتگو
سے کافی متاثر ہو رہے تھے نہایت سعادت مندانہ انداز میں پوچھا۔
"صاحب! میں آپ کا نام جان سکتا ہوں!"
"اوہ!" فراق صاحب کے ایک ہم سفر دوست جلدی سے بولے۔ "آپ ان سے
واقف نہیں! یہ پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری ہیں!"
فراق صاحب کے چہرے پر کچھ اُلجھن کے آثار نمایاں ہوتے پھر انھوں نے اپنے
مخصوص انداز میں قدرے جھلاہٹ کے ساتھ کہا۔
"کیوں صاحب! تعارف کرانے کا یہ کون سا طریقہ ہے۔ آخر آپ صرف فراق گورکھپوری
نہیں کہہ سکتے تھے؟ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ آپ ہیں مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی،
آپ ہیں حضرت علی سکندر جگر مراد آبادی، پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری!!!"

ایک خط

میں ایک دن علی الصبح فراق صاحب کے یہاں پہنچا تو فراق صاحب نے منہ
بناتے ہوئے ہاتھ میں دبے ہوئے ایک خط کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"دیکھو بھئی! یہ ایک صاحب کا خط ہے لکھتے ہیں ــــ "مجھے بے حد افسوس ہے
کہ ڈیڑھ دو سو غزلیں سینکڑوں افسانے اور پچاس ساٹھ نظمیں کہنے کے بعد بھی میں آپ کی توجہ سے
محروم رہا۔ آپ نے اپنے حالیہ مضمون میں جو "السٹریٹڈ ویکلی" میں شائع ہوا ہے پچاسوں اہلِ قلم
حضرات کے نام گنائے ہیں لیکن مجھے نظر انداز کر دیا ہے!"
اتنا کہہ کر انھوں نے ایک سادہ پوسٹ کارڈ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
"انھیں جواب لکھ دو!"
پھر انھوں نے خط لکھانا شروع کیا۔
"مکرمی! واقعی افسوسناک بات ہے کہ آپ جیسے ہزاروں لوگ جو چپ چاپ ادب کی
خدمت کر رہے ہیں اُن کا نام جب کبھی ادبی تاریخ کا جائزہ لیا جاتا ہے تو میرے ہی نہیں ہر ایک
کے ذہن سے نکل جاتا ہے!"

ایک مباحثہ

ایک کھدر پوش بزرگ بڑے گرما گرم انداز میں کسی موضوع پر فراق صاحب سے
بحث فرما رہے تھے۔ انھوں نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔
"فراق صاحب! آپ میری پوری بات تو سن لیجئے! تب آپ سمجھ سکیں گے!"
فراق صاحب نے اُسی انداز میں جواب دیا۔
"دیکھئے صاحب! آپ اپنی بات کہئے! میں سن لوں گا! لیکن آپ یہ کیسے کہہ سکتے
ہیں کہ آپ کی بات میری سمجھ میں بھی آجائے گی؟"

انتہائے محبت

الہ آباد کی مشہور ادبی انجمن "تھرسڈے کلب" کی ایک نشست میں فراق صاحب
"ادب اور ثقافتی انتشار" کے موضوع پر تقریر کر رہے تھے۔ اپنی تقریر کے دوران میں انھوں نے
اُردو کا انگریزی ادب سے موازنہ کرتے ہوئے اس شکایت کا اظہار کیا کہ ہمارے یہاں
ثقافت کی وہ پرچھائیاں نظر نہیں آتیں جو انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں کے ادب
میں ملتی ہیں۔
تقریر کے بعد تبصروں کا دور شروع ہوا تو ایک صاحب نے کہا۔
"انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں کے مقابلے میں اُردو ابھی بہت کم سِن
ہے! پھر ہم اس کم سِن بچے سے وہ مطالبات بھلا کیسے کر سکتے ہیں؟"
فراق صاحب نے برجستہ جواب دیا۔
"دیکھئے صاحب! یہ تو محبت کی انتہا ہو گئی۔ آخر آپ کب تک اُردو کو بچہ سمجھتے
رہیں گے!"

حماقت

ایک بار فراق صاحب مطالعے کے طریقوں پر اظہارِ خیال فرما رہے تھے۔
اس دوران میں انگریزی کے ایک پروفیسر کا ذکر آگیا جن کے بارے میں یہ مشہور تھا
کہ انھوں نے بعض کتابیں بقول خود سو سو بار پڑھ ڈالی ہیں۔
فراق صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں آنکھیں پھیلا کر کہا۔
"صاحب! حماقت کی انتہا ہو گئی! میں کہتا ہوں جس کی سمجھ میں کوئی کتاب
ایک بار کے مطالعے کے بعد نہیں آئی وہ سو بار پڑھ ڈالے پھر بھی کچھ حاصل نہ ہوگا!"

یہ "مشتے نمونہ از خروارے" اُس شاعر کی زندگی کے چند لمحات کا خاکہ ہے جس کی
زندگی خود اُس کے الفاظ میں یہ ہے۔

یہ اُداس اُداس بجھی بجھی کوئی زندگی ہے فراق کی
مگر آج کشتِ سخنوری ہے اُسی کے دم سے چمن چمن

افسانہ نمبر دیکھا

اہلِ قلم حضرات کی رائیں

....افسانہ نمبر بہت پسند آیا، پچھلے تمام نمبروں سے آگے ہے۔ اچھے اور خوبصورت افسانے شریکِ اشاعت ہیں۔ آپ کی انفرادیت ہر جگہ محسوس ہوتی ہے ایسے تاریخی شمارے کو نوبل میں رکھنا ضروری ہے ـــــ آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی (یونیورسٹی میں) بہ تقریب ... کی حیثیت سے ہوگیا ہے .... (ڈاکٹر) شکیل الرحمان (سری نگر)

....کتنے حسین جلوؤں کو آپ نے اس کے دامنِ رنگیں میں سمیٹ لیا ہے! آپ واقعی جلوؤں کی تخلیق کرتے ہیں! جب سے افسانہ نمبر ملا ہے، ہم جلوؤں میں کھو گئے ہیں! سرورق کی جدت اور تازہ کاری لاجواب ہے! اللہ کرے آپ کے ہنر کار ہاتھوں "بیسویں صدی" کے بے شمار ایسے حسین و جمیل نمبر سنورتے رہیں! .... (پروفیسر) حامدی کاشمیری (سری نگر)

....افسانہ نمبر بہت شاندار ہے، تخلیقات کے اعتبار سے بھی اور تصاویر کے لحاظ سے بھی، ادیبوں کی گھریلو زندگی کو سامنے لاکر آپ نے بہت سے پردے اٹھا دیئے ہیں، اکثر چہرے بے نقاب نظر آرہے ہیں۔ آپ قابلِ مبارکباد ہیں کہ ندرت اور جدت کا کوئی نہ کوئی پہلو نکال ہی لیتے ہیں، ادب کے لئے جدت اور ندرت ہی کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ میری جانب سے اس بہترین اور خوبصورت ادبی پیشکش پر مبارکباد قبول فرمائیے .... کوثر چاند پوری (بھوپال)

.... دیکھ کر غرقِ حیرت ہوں! اِن ناساعد حالات میں ایسا عظیم نمبر پیش کرنا کسی عظیم انسان ہی کا عظیم کارنامہ ہو سکتا ہے!! .... آنند رام نگری (مغلسرائے)

....اتنا خوبصورت افسانہ نمبر بس آپ ہی نکال سکتے ہیں۔ صرف اُردو کی نہیں، ساری ہندوستانی زبانوں کی بات کر رہا ہوں اور اس وقت اُن ساری زبانوں میں، جنہیں میں جانتا ہوں، کوئی ایسا لفظ نہیں مل رہا ہے جو اُس بے پایاں مسرت کا اظہار کرسکے جو اسے دیکھ کر ہوئی ہے ....
ظفر احمد (رانچی)

....سرورق دیکھ کر ہی طبیعت پھڑک اٹھی۔ سبحان اللہ۔ اب مجھے سو فیصدی یقین ہوگیا ہے کہ آپ واقعی جادوگر ہیں، فنکاروں نے گھر میں تصویریں خوب ہیں۔ ڈاکٹر شکیل الرحمن کا افسانہ "چڑیاں" افسانہ نمبر کی جان ہے۔ کرشن چندر، مہندر ناتھ، رام لال، واجدہ تبسم، پشکر ناتھ، کے افسانے اچھے ہیں۔ راجہ مہدی علی خاں کا مزاحیہ خوب ہے .... موہن یاور (جموں توی)

.... دیکھ کر مسرت ہوئی جس ڈھنگ سے آپ اُردو ادب کی خدمت کر رہے ہیں اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُردو نہ صرف جاندار ہے بلکہ اُس میں زندہ و پائندہ رہنے کی تمام علامتیں موجود ہیں۔ آپ ایسی ہستیوں ہی کے لئے علامہ سیماب اکبرآبادی نے فرمایا تھا کہ "غنیمت ہے جو صدیوں میں کوئی دیوانہ مل جائے" اور مولانا موصوف کا ایک اور مصرع آپ کے طریقۂ کار پر صادق آتا ہے "صلہ ملنا کوئی یہ صلا ملا کر نہیں" اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ آپ کی وجہ سے "بیسویں صدی" اِس وقت ہندوستان میں اردو ادب کا صحیح نمائندہ ہے۔ فنکاروں کی تخلیقات کے ساتھ خطوط شائع کرنے کا رواج آپ کی جدت ہے، صحت مند اور مفید ہے .... ضیا فتح آبادی (نئی دہلی)

... جدت طرازی اور حسنِ انفرادیت آپ ہی کا حصہ ہے۔ اس مرتبہ ادباء و شعراء کے گھریلو ماحول کی دلکش تصاویر کی شمولیت نے اردو زبان کی ادبی روایات میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ افسانہ نمبر کا ہر صفحہ آپ کے خلوص اور لگن کا آئینہ دار ہے۔ آپ نے اردو زبان کے "افسانوی ادب" کو نہایت بلند مقام تک پہونچا دیا ہے۔ اِس منزل تک پہونچنے کے لئے آپ کو کن منزلوں سے گزرنا پڑا ہوگا اس کا اندازہ کم ہی لوگوں کو ہوگا۔ اردو اور بیسویں صدی کے ساتھ ہی آپ کا نام بھی امر رہے گا .... مہدی پرتاپگڑھی (پرتاپ گڑھ)

....افسانہ نمبر دیکھ کر خوشی ہوئی۔ مبارکباد۔ افسوس ہوا کہ اس محفل میں میں ہی نہیں ہوں۔ انشاء اللہ آئندہ نمبر میں ضرور شامل ہوں گا .... سہیل عظیم آبادی (پٹنہ)

....اتنا خوبصورت افسانہ نمبر نکالنے پر دلی مبارکباد قبول کیجئے۔ یہ بلاشبہ ۶۴ء کا ایک خوبصورت تحفہ ہو سکتا ہے .... آمنہ ابوالحسن (حیدرآباد)

......میں نے بیسویں صدی کے سالنامے کے بارے میں لکھا تھا کہ آپ نے معنوی اور صوری خوبیوں کی انتہا کو چھو لیا ہے۔ لیکن اب افسانہ نمبر دیکھ کر مجھے کہنا پڑتا ہے کہ آپ کی [illegible] کی کوئی انتہا نہیں ہے اور بیسویں صدی کا ہر نمبر اپنے قارئین کے لئے پہلے سے کہیں [illegible] افسانہ نمبر [illegible] کا ایک حسین گلدستہ ہے جو آپ کی جدت طبع کا آئینہ دار ہے ....

م۔ک۔ مہتاب (جالندھر)

......اس بار افسانہ نمبر پہلے سے کہیں زیادہ دلکش اور معیاری ہے۔ اس بحرانی دور میں ادب کا مقصد [illegible] راہوں پر بھرپور قدم رکھنا کوئی آپ سے سیکھے ....

جے پال (ڈیڑھا) امروہہ

سیدھا

....میں سوچتا ہوں کہ اس کی خوبصورتی پر آپ کو مبارکباد دینا مناسب نہیں اور نہ ہی میرے پاس ایسے الفاظ ہیں کہ اس کی خصوصیات کا احاطہ کر سکیں۔ اس لئے چپ چاپ آپ کے حسن ادارت اور افسانہ نمبر کی عظمتوں کا اعتراف کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ واقعی جب تک آپ جیسے مدیر ہماری زبان وادب کا علم بلند کئے ہوئے ہیں ہم اپنی زبان کے مستقبل سے مایوس نہیں....

شمیم حنفی (سلطان پور)

......یہ دیکھ کر بے پایاں مسرت حاصل ہوئی کہ آپ کا ذوقِ جمیل پورے نمبر پر چھایا ہوا ہے۔ تمام مندرجات اعلیٰ اور معیاری ادب کا نمونہ ہیں۔ بلاشبہ انھیں دوسری زبانوں کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ پڑھ کر میں تو حیرت میں مبتلا ہو گیا۔ واقعی "بیسویں صدی" کے فنکار خونِ جگر سے لکھتے ہیں۔ ایک کہانی بھی گھٹیا نہیں....

حفیظ مالیگانوی (مالیگاؤں ناسک)

......بیسویں صدی کا افسانہ نمبر دیکھا۔ بھئی آپ کی جدت طرازی کا جواب نہیں ــــ آپ نے تو ادیبوں کی گھریلو زندگی کی عکاس تصویریں "فنکار اپنے گھر میں" کے عنوان سے چھاپ کر رسالے کو اور بھی دلچسپ بنا دیا۔ شکیل الرحمن، مہندر ناتھ، کرشن چندر، کوثر چاندپوری، واجدہ تبسم اور بشریٰ رشید نے بہت ہی خوبصورت کہانیاں لکھی ہیں۔ اور راجہ بھائی کا طنزیہ مزاحیہ فیچر، میلا راجندر سنگھ بیدی اور خلیق خدا بھی کافی پسند کیا گیا....

تبسم شفائی (نگینہ)

...مشہور شاعر اور مفکر گیٹس نے لکھا ہے کہ "اچھا لکھنا، اچھا ہونے کی نشانی ہے"

بیسویں صدی کا یہ افسانہ نمبر آپ کی [illegible] اور [illegible] کا [illegible] ملک کے ممتاز افسانہ نگاروں کی شرکت اس بات کی گواہ ہے کہ [illegible] محبت آپ کے قلم اور آپ کے خلوص کا مرہون منت ہے [illegible] بیسویں صدی (دہلی) ــــ آپ کے خلوص کا [illegible] ...

[illegible]

....افسانہ نمبر دیکھ کر بے ساختہ، واہ واہ، نکل گئی۔ [illegible] ادیبوں کی اتنی ساری پیاری پیاری تخلیقات کو ایک ہی شمارے میں اکٹھا کر دینا آپ ہی کا کام ہے....

ہربنس دوست [illegible]

....آپ نے ہر بار نئے نئے "ستم ایجاد" کر کے "دنیائے عشق" کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ خدا کی قسم آپ "جانِ ادب" ہیں۔ اللہ کرے اسی طرح برسوں آپ کے ہاتھوں "گیسوئے ادب" سنورتے اور نکھرتے رہیں....

شاد عزیزی (بھوپال)

....جس طرح شراب کی بہت سی قسمیں ہیں اور ہر قسم اپنے اندر ایک نشہ، ایک کیف اور ایک ولولہ رکھتی ہے۔ مگر اچھی شراب تو وہ ہے۔ جو "شرابی" کو مدہوش کر دے۔ دنیا و مافیہا سے بےگانہ کر دے۔ اسی طرح ادب کی بھی بہت سی قسمیں ہیں۔ جاسوسی ادب، رومانی ادب اور جنسی ادب۔ مگر بلند ترین ادب تو وہ ہوتا ہے۔ جو قاری کی روح کی گہرائیوں میں اتر جائے اور ایسا ادب مجھے "بیسویں صدی" کے افسانہ نمبر میں ملا۔ افسانہ نمبر ایک ایسا گلدستہ ہے۔ جس میں جوہی، گلاب، چمپا کلی، یوکپٹس، اور موگرے کے پھولوں کے ساتھ ساتھ دوسری قسم کے دوسرے پھول بھی مسکرا رہے ہیں۔ جن ہاتھوں نے ایسا خوبصورت گلدستہ سجایا ہے۔ ان ہاتھوں کو چوم لینا چاہئے....

حنیف چودھری (ملتان [illegible])

....آپ نے اس نامساعد اور اقتصادی بحران کے زمانے میں بہت ہمت سے کام لے کر اتنا ضخیم، حسین وخوبصورت، دلچسپ اور کامیاب نمبر شائع کیا جبکہ نیوز پرنٹ کی گرانی ناقابل برداشت ہوتی جا رہی ہے۔ تخلیقات کا انتخاب خوب ہے۔ اور پھر ترتیب نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا ہے۔ کاش! میں بھی اس عظیم شمارے میں شریک ہو سکتی....

ذکیہ خانم (بہار شریف، پٹنہ)

زندگی بخش معلوماتی مقالات اور مفید کارآمد اشارات
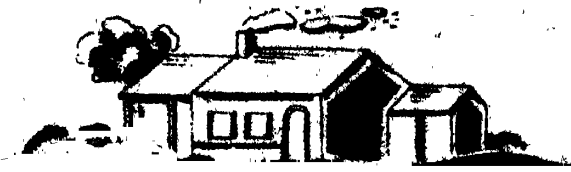
ا۔ آم ۔ صحت اور طاقت کا سرچشمہ

اگر آم کو افضل الاثمار (پھلوں میں سب سے افضل) کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ غالب نے اپنی مشہور نظم "آم کی تعریف" میں اس پھل کو باغِ جنت کے سربہ مہر گلاس سے تعبیر کیا تھا۔ یہ محض شاعری نہیں ہے حقیقت کا شاعرانہ اظہار ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آم قدرت کی ایک ایسی نعمت ہے جس پر ہم ہندوستانی بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ لذیذ اور خوش ذائقہ ہونے کے علاوہ آم اس لحاظ سے بھی دوسرے تمام پھلوں سے ممتاز ہے کہ یہ ہر اعلیٰ و ادنیٰ کو بافراط میسر آتا ہے۔ اور کثرت سے کھایا جاتا ہے۔

آموں کی درجنوں قسمیں ہیں۔ شیریں بھی، ترش بھی، رسیلا بھی اور گاڑھے رس کا بھی۔ ہر قسم کا ذائقہ جدا اور لذت جدا ہوتی ہے۔ تاثیر کے لحاظ سے پکا ہوا آم گرم تر ہے۔ آم میں جتنی زیادہ ترشی ہوگی اتنا ہی کم گرم ہوگا اور جتنا زیادہ شیریں ہوگا اتنی ہی اس میں گرمی زیادہ ہوگی۔

کھٹا آم مُضرِ صحت ہے۔ نزلہ اور زکام کی شکایت پیدا کرتا ہے۔ گلے اور دانتوں کو نقصان پہنچاتا ہے اور خرابیٔ خون کا باعث ہوتا ہے۔ قلمی آم ثقیل اور دیر ہضم ہوتا ہے۔ پختہ شیریں اور بے ریشہ آم مفید ہوتا ہے۔ جدید تر تحقیقات کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ آم دوسرے تمام پھلوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ غذائیت بخش ہے۔ آم میں وٹامن اے اور سی کثیر مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ اس میں وٹامن سی سنگترے کے مقابلہ میں چالیس گنا اور سیب کے مقابلہ میں چھ گنا ہوتا ہے۔ امریکہ کے نامور ڈاکٹر ولسن نے اپنے تجربات سے ثابت کیا ہے کہ آم میں مکھن سے زیادہ طاقت موجود ہے۔ اس کے استعمال سے جسم میں نروس سسٹم کی خرابی سے پیدا شدہ نقائص دور ہو جاتے ہیں اور بدن میں غیر معمولی طاقت آتی ہے۔ ایمپائر مارکٹنگ بورڈ آف لندن نے اپنے بلیٹن میں لکھا ہے کہ آم میں وٹامن اے، سی اور ڈی دوسرے تمام پھلوں سے زیادہ مقدار میں پائے جاتے ہیں۔

اکثر مقوی غذائیں دیر ہضم اور ثقیل ہوتی ہیں لیکن آم کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ مقوی بھی ہے اور زود ہضم بھی۔ یہ اعضائے رئیسہ کو حیرت انگیز طور پر طاقت بخشتا ہے۔ قوتِ باہ میں اضافہ کرتا ہے۔ معدہ، مثانہ اور گردوں کو طاقت بخشتا ہے۔ جسم کو موٹا کرتا ہے۔ دافعِ قبض اور پیشاب آور ہے۔ خون بکثرت پیدا کرتا ہے اور مصفّیٔ خون بھی ہے۔

آم کھانا کھا کر یا دوپہر کے بعد کھانے چاہئیں۔ نہار منہ کھانا مُضرِ صحت ہے۔ خلوئے معدہ کی حالت میں ان کا استعمال ضعفِ ہضم کا سبب بنتا ہے۔ اور معدے میں گرمی پیدا کر دیتا ہے جس سے کئی طرح کی شکایات پیدا ہو سکتی ہیں۔

آم کھانے کے بعد دودھ پینے سے جسم میں طاقت پیدا ہوتی ہے اور دودھ کی لسی پینے سے اس کی گرمی کا اثر زائل ہوتا ہے۔ جامن اور دودھ کو آم کا مُصلح کہا جاتا ہے۔ اگر آم کھانے کے بعد چند جامنیں کھائی جائیں تو آم بہت جلد ہضم ہو جاتے ہیں۔ اور پیٹ میں گرانی نہیں محسوس ہوتی۔ کم خوابی یا بے خوابی کے مریضوں کے لئے آم سے زیادہ کوئی چیز سودمند نہیں۔ رات کو سونے سے پہلے اگر آم کھا کر دودھ پی لیا جائے تو بہت گہری اور پُرسکون نیند آتی ہے۔

دورانِ حمل میں خواتین کے لئے آم بہترین پھل ہے۔ اس سے نہ صرف اُن کی صحت ہی قائم رہتی ہے بلکہ بچہ بھی خوبصورت اور صحت مند پیدا ہوتا ہے۔ تازہ اور

سے آم تھوڑی مقدار میں کھائے جائیں۔ ضعف اعصاب میں آم خصوصیت کے ساتھ مفید ہیں۔ ایسے اشخاص جو عام جسمانی کمزوری اور ضعف باہ کے شاکی ہیں متواتر آم کا استعمال کریں۔ کچھ ہی دنوں میں محسوس کریں گے کہ اُن کی صحت بحال ہو رہی ہے۔ جوانوں اور بوڑھوں کے علاوہ بچوں کے لئے بھی آم ایک مفید پھل ہے۔ اس سے اُن کے بدن کی نشو و نما میں مدد ملتی ہے۔

آم کو برف میں یا سرد پانی میں ٹھنڈا کر کے کھانا چاہئے۔ اس طرح اس کی گرمی اور مضرت دور ہو جاتی ہے۔ آم اگر تخمی ہوں تو انھیں ہاتھ سے پلپلا کر کے اُن کا رس چوسا جائے اور اگر قلمی ہوں تو انھیں تراش کر قاشوں کی شکل میں اُن کا گودا استعمال کیا جائے لیکن دونوں حالتوں میں آم مناسب مقدار میں کھائے جائیں۔ زیادہ کھانے سے فائدے کی بجائے نقصان پہنچتا ہے۔ اپھارہ، پیچش، بد ہضمی اور اسہال وغیرہ کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ قلمی آم کی بہ نسبت تخمی آم زیادہ مفید ہوتا ہے۔ یہ نسبتاً جلد ہضم ہو جاتا ہے لیکن اس کا رسیلا اور شیریں ہونا شرط ہے۔ تخمی آم نفاخ اور دیر ہضم ہوتا ہے۔ جن لوگوں کا معدہ کمزور ہو انھیں تخمی آم بہت احتیاط کے ساتھ کم مقدار میں استعمال کرنے چاہئیں۔ زیادہ آم کھانے سے اگر طبیعت میں گرانی محسوس ہو تو تھوڑا سا نمک چاٹ لیں یا تھوڑی سی سونٹھ باریک کر کے پھانک لیں فوراً گرانی دور ہو جائے گی۔ آم کے بعد تھوڑی سی جامنیں کھا لینے سے اس کی گرمی کا اثر کم ہو جاتا ہے اور آم جلد ہضم ہو جاتے ہیں۔ آم بواسیر، سنگرہنی اور قولنج میں مفید ہیں اور جگر کے لئے مفر ہیں لیکن ترش آم جگر کے لئے زیادہ مفر نہیں۔ ان کا مربہ دل اور معدے کو قوت دیتا ہے اور بواسیر کو نافع ہے۔ فرحت بخش اور قبض کُشا ہوتا ہے۔ دل و دماغ اور پھیپھڑوں کو طاقت بخشتا ہے۔ آم کا اچار کھانسی، زکام اور نزلے کی شکایت پیدا کرتا ہے۔ صحت کی حالت میں کبھی کبھی کھا لینے میں کوئی حرج نہیں۔ آم ایک ایسی نعمت ہے جس سے امیر و غریب اور اعلیٰ و ادنیٰ سبھی مستفید ہوتے ہیں اور یہ اس موسم کا بہترین تحفہ ہے۔

۲۔ آلو کے فائدے اور نقصان

سبزیوں میں آلو کا استعمال سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ آلو ہندوستان اور پاکستان میں ہر موسم میں دستیاب ہوتا ہے اور کم و بیش سارا سال کھایا جاتا ہے۔ دُنیا بھر میں شاید ہی کوئی سبزی اس کثرت سے استعمال کی جاتی ہے۔ یہ لذیذ اور جسم کو پرورش کرنے والی غذا ہے۔ اس کا مزاج سرد و خشک ہے۔ کوئی بھی غذا کھانے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ صحت کے نقطۂ نظر سے کیا فوائد اور نقصانات رکھتی ہے اور ہمارے جسم پر اس کے کیا اثرات ہوتے ہیں۔ تبھی یہ ممکن ہے کہ ہم اپنی خوراک کے ذریعہ بہتر نتائج حاصل کر سکیں اور اُن نقصانات سے بچ سکیں جو غذا سے متعلق بے پروائی اور لاعلمی کے باعث پیدا ہوتے ہیں۔ کون سی غذا کب اور کس طریقے سے کھائی جانی چاہئے؟ یہ سوال بہت اہم ہے اور اسے نظر انداز کرنے کا مطلب ہے کہ ہم اپنی صحت اور تندرستی سے غافل ہیں۔

آپ اکثر آلو کھاتے ہیں۔ لیکن کیا آپ کو معلوم ہے کہ جسمانی طور پر اس خوراک کا آپ پر کیا اثر ہوتا ہے؟

آلو میں دوسری ترکاریوں کی بہ نسبت وٹامن اور معدنی اجزا بہت زیادہ ہیں۔ نیز لوہا اور کیلشیم بھی اس میں کافی مقدار میں پایا جاتا ہے۔ پروٹین کی موجودگی اس کی غذائی قدر و قیمت اور زیادہ بڑھا دیتی ہے۔ فاسفورس، پوٹاشیم، میگنیشیا اور سوڈیم جیسے معدنی اجزاء آلو کے چھلکے میں خصوصیت کے ساتھ موجود ہوتے ہیں اس لئے آلو کو چھیلے بغیر استعمال کرنا چاہئے۔ چھلکا اتار دینے سے آلو کے اکثر مفید اجزا ضائع ہو جاتے ہیں۔ آلو کو تنور یا بھاپ میں دم پخت کرنا چاہئے۔ پانی میں اُبال کر اس پانی کو ضائع کر دینا آلو کے مفید و صحت بخش اجزاء کو ضائع کر دینے کے مترادف ہے۔ اگر آلو کو اُبالنا ہی ضروری ہو تو پانی اتنی کم مقدار میں رکھیں کہ وہ سب ان میں جذب ہو جائے اور اگر کچھ باقی رہ جائے تو اُسے بھی ضائع نہ کریں بلکہ کام میں لائیں۔

آلو میں وٹامن اے، بی اور سی کافی مقدار میں ہوتے ہیں۔ ایک آلو میں وٹامن بی اتنی ہی مقدار میں ہوتا ہے جتنی گیہوں کی ایک روٹی میں۔ اس میں گندھک، کلورین، آیوڈین اور تانبا بھی پائے جاتے ہیں۔ اس لئے غذا کے طور پر آلو بہت مفید چیز ہے۔

ڈنمارک کے چیف ہیلتھ آفیسر ڈاکٹر ہنڈ ہیڈ نے آلو کے بیشمار تجربات کئے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ دوسری تمام غذاؤں کے مقابلہ میں آلو ہی ایک ایسی غذا ہے جس سے ہمارے جسم کو مکمل غذائیت حاصل ہو سکتی ہے اور یہ دیگر تمام غذاؤں کا بہترین بدل بن سکتی ہے۔ ڈاکٹر مذکور نے تجربات سے یہ ثابت کیا ہے کہ صرف آلو کھا کر ہی انسان صحت مند و توانا رہ سکتا ہے اور اُن تمام لوگوں کے مقابلہ میں جو عمدہ سے عمدہ غذائیں استعمال کرتے ہیں اُس کی صحت و توانائی میں کسی قسم کی کمی واقع نہ ہو گی۔ گذشتہ جنگِ عظیم کے دوران میں ڈاکٹر ہنڈ ہیڈ نے اپنے تجرباتی حلقے کے تمام افراد پر گوشت کھانے کی پابندی عاید کر دی تھی اور انھیں صرف آلو کی خوراک پر زندہ رکھا۔ تجربے نے ثابت کیا کہ اُن میں سے کسی کی صحت اور طاقت میں کوئی خلل واقع نہیں ہوا۔ وہ سب اُتنے ہی طاقت ور اور تندرست رہے جتنے دوسرے بہتر غذائیں کھانے والے۔ اُس وقت سے ڈاکٹر ہنڈ ہیڈ کو "ڈاکٹر پوٹیٹو" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنے طویل تجربات کی روئداد شائع کی ہے اور لکھا ہے کہ بعض لوگ آلو کے متعلق کہتے

خاص آپ کے
نیا
لائف بوا
LIFEBUOY
for health
خوشنما
نیا سرورق
نئی
پکڑنے میں آسان
ٹکیہ
لائف بوائے ہے جہاں، تندرستی ہے وہاں

دلکش نفیس ایمبرائیڈری
چکن اور ایمبرائیڈ
کپڑے
نینی کارپوریشن لمیٹیڈ

۵ — آپ کیوں بیمار ہوتے ہیں؟

مشہور سائنسداں تھامس ایڈیسن نے لکھا ہے — "میں اپنی طبیعت کے مطابق پرہیزی کھانا کھا کر اپنی صحت برقرار رکھتا ہوں۔ لوگ مرغن کھانے کھا کر اپنی صحت تباہ کر لیتے ہیں۔ اپنا ہاضمہ خراب کر بیٹھتے ہیں۔ اگر کھانے میں احتیاط برتی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ کوئی شخص بیمار پڑے۔ بیشتر لوگ اپنے کھانے کی غیر معتدل عادات کے باعث بیمار پڑتے ہیں۔ میں معتدل اور اپنی محتاط طبیعت کے مطابق کھاتا پیتا ہوں۔ یہی میری صحت کا راز ہے۔"

۶ — بیوی — منزلِ حیات کا ساتھی

ڈاکٹر نپولین ہل نے لکھا ہے — دنیا میں کوئی انسان دوسروں کے تعاون کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ تعلقات واقعی بڑی معرکۃ الآرا چیز ہیں — اگر کوئی شخص اپنے احباب کا دائرہ وسیع کرنے کا عادی ہے تو ایک وقت آئے گا جب یہ تمام دوست اس کی معاونت اور مدد کے لئے تیار ہو جائیں گے بشرطیکہ وہ اس کے لئے تیار ہو سکے کہ اپنے آپ کو ان کی خدمات و تعاون حاصل کرنے کا اہل بنا سکے۔

دنیا میں سب سے اچھا اشتراک بیوی اور شوہر کے درمیان قائم ہو سکتا ہے۔ عورت اگر چاہے تو انسان پہاڑ کو کاٹ کر رکھ سکتا ہے۔ عورت ہمیشہ سے انسان کو آگے بڑھانے کا ایک بہت بڑا ذریعہ رہی ہے۔ خوش نصیب ہے وہ شخص جس کی بیوی اس کے کاموں میں اس کی برابر کی شریک ہے کیونکہ اس کی کامیابی میں کوئی شک و شبہ نہیں کر سکتا۔

اگر آپ ہنری فورڈ، ایڈیسن یا نپولین کی زندگی کا مطالعہ کریں تو آپ یہ جان کر حیران رہ جائیں گے کہ ان کی کامیابی کا راز وہ ذہنی آسودگی تھی جو بیوی اور شوہر کے خوشگوار تعلقات سے پیدا ہوتی ہے۔ اور "شوہر اور بیوی" کا دماغی اشتراک تھا۔ بیوی شوہر کے کاموں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی تھی اور ہر وقت اس کا حوصلہ بڑھاتی تھی — اور یہی قوت تھی جو ان لوگوں کو زمین سے آسمان پر لے گئی۔

۷ — بے خوابی

آجکل بے خوابی کی شکایت عام ہے۔ رات کو بہت دیر سے سونے اور دن چڑھے تک بستر پر پڑے رہنے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ سگریٹ نوشی، چائے، شور و غل، کشمکشِ حیات، غمِ روزگار، ہوسِ زر اور اسی طرح کے دوسرے کتنے ہی اسباب نے نیند کو ہم سے بڑی حد تک دور کر دیا ہے۔

بے خوابی کا تعلق ہاضمے سے بھی ہے۔ بسیار خوری اور بدہضمی بھی بے خوابی کا سبب بن جاتی ہے۔ رات کا کھانا زیادہ بھاری نہ ہونا چاہئے۔ بریاح بسا اوقات اچھے بُرے خوابوں کا باعث ہوتی ہیں اور جب ہم صبح کو بیدار ہوتے ہیں تو ساری رات سونے کے باوجود ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سوئے ہی نہیں۔

بعض حالات میں دن بھر محنت کرنے کے بعد ہمارے خون میں شکر کی مقدار کم ہو جاتی ہے اس سے اعصاب پر بُرا اثر پڑتا ہے اور نیند مشکل سے آتی ہے۔ اگر ایسے لوگ سونے سے پہلے شکر کی بنی ہوئی کوئی چیز تھوڑی سی مقدار میں کھا لیا کریں تو یہ شکایت دور ہو سکتی ہے۔ اگر اس طرح بھی اعصاب پر اچھا اثر نہ پڑے تو بستر تک پہنچنے کے بعد نیم گرم پانی سے بھیگے ہوئے تولیے پیٹ پر رکھنے سے نیند آ سکتی ہے۔

گندے کپڑے، میلا بستر، گندہ کمرہ اکثر اوقات بے خوابی کا باعث ہوتے ہیں۔ کمرے سے لے کر چارپائی تک ہر چیز درست ہونی چاہئے۔ اس پر کچھ زیادہ خرچ نہیں ہوتا۔ اگر ہم اپنے ہاتھوں سے اپنا بستر صاف کر لیا کریں، چارپائی کسی ہوئی رکھیں تو اس میں کیا دشواری ہے؟

گہرے سانس لینے سے نظامِ جسم پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ عام طور سے موسیقار دوسرے لوگوں کی بہ نسبت اچھی نیند آتی ہے۔ سوتے وقت ہماری سانس آہستہ لیکن گہری ہو جاتی ہے اس لئے جاگتے میں بھی لمبے سانس لینے کی عادت ڈالئے۔

گھڑی پر بار بار نظر نہ ڈالئے۔ وقت گزرنے کا احساس آپ کو نیند سے دور لیتا جائے گا۔ سوتے وقت ڈھیلا لباس پہنئے۔

سونے سے پہلے کافی چائے، سگریٹ اور دوسری نشہ آور چیزوں سے گریز کیجئے یہ تمباکو حرکتِ قلب کو تیز کر دیتا ہے جس سے نیند خراب ہو جاتی ہے۔

نیشنل اینڈ گرینڈلیز

نیشنل اینڈ گرینڈلیز میں سیونگز بینک اکاؤنٹ کھولنا بالکل ہی آسان ہے۔ اس مقصد کے لئے صرف پانچ روپے کی ضرورت ہوگی اور آپ سالانہ ۳ فیصدی سود حاصل کرسکیں گے۔

پوری تفصیلات کے لئے آج ہی اپنی قریبی شاخ میں تشریف لائیں۔ آپ کے بنکنگ کے ہر قسم کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے ہماری فوری اور بروقت خدمات حاضر ہیں۔

نیشنل اینڈ گرینڈلیز بینک لمیٹڈ

برطانیہ میں قائم شدہ کمپنی جس کے ممبروں کی ذمہ داریاں محدود

[illegible]

۵ — آپ کیوں بیمار ہوتے ہیں؟

مشہور سائنس داں تھامس ایڈیسن نے لکھا ہے ——— "میں اپنی طبیعت کے مطابق چیزیں کھاتا ہوں اگر اپنی صحت برقرار رکھنا چاہتا ہوں۔ لوگ مرغن کھانے کھا کر اپنی صحت تباہ کر لیتے ہیں۔ اپنا ہاضمہ خراب کر بیٹھتے ہیں۔ اگر کھانے میں احتیاط برتی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ کوئی شخص بیمار پڑے۔ بیشتر لوگ اپنے کھانے کی غیر معتدل عادات کے باعث بیمار پڑتے ہیں۔ میں معتدل اور اپنی محتاط طبیعت کے مطابق کھاتا پیتا ہوں، یہی میری صحت کا راز ہے۔"

۶ — بیوی — منزلِ حیات کا ساتھی

ڈاکٹر نپولین ہل نے لکھا ہے ——— دنیا میں کوئی انسان دوسروں کے تعاون کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ تعلقات واقعی بڑی معرکۃ الآراء ہیں ——— اگر کوئی شخص اپنے احباب کا دائرہ وسیع کرنے کا عادی ہے تو ایک وقت آئے گا جب یہ تمام دوست اس کی معاونت اور مدد کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ بشرطیکہ وہ اس کے لئے تیار ہو سکے کہ اپنے آپ کو ان کی خدمات و تعاون حاصل کرنے کا اہل بنا سکے۔

دنیا میں سب سے اچھا اشتراک بیوی اور شوہر کے درمیان قائم ہو سکتا ہے۔ عورت اگر چاہے تو انسان پہاڑ کو کاٹ کر رکھ سکتا ہے۔ عورت ہمیشہ سے انسان کو آگے بڑھانے کا ایک بہت بڑا ذریعہ رہی ہے۔ خوش نصیب ہے وہ شخص جس کی بیوی اس کے کاموں میں اس کی برابر کی شریک ہے کیونکہ اس کی کامیابی میں کوئی شک و شبہ نہیں کر سکتا۔

اگر آپ ہنری فورڈ، ایڈیسن یا نپولین کی زندگی کا مطالعہ کریں تو آپ یہ جان کر حیران رہ جائیں گے کہ ان کی کامیابی کا راز وہ ذہنی آسودگی تھی جو بیوی اور شوہر کے خوشگوار تعلقات سے پیدا ہوتی ہے۔ ان "شوہر اور بیوی" کا دماغی اشتراک تھا، بیوی شوہر کے کاموں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی تھی اور ہر وقت اس کا حوصلہ بڑھاتی تھی ——— اور یہی قوت تھی جو ان لوگوں کو زمین سے آسمان پر لے گئی۔

۷ — بے خوابی

آجکل بے خوابی کی شکایت عام ہے۔ رات کو بہت دیر سے سونے اور دن چڑھے تک بستر پر پڑے رہنے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ سگریٹ نوشی، چائے، شور و غل، کشمکش حیات، غم روزگار، ہوس زر اور اسی طرح کے دوسرے کتنے ہی اسباب نے نیند کو ہم سے بڑی حد تک دور کر دیا ہے۔

بے خوابی کا تعلق ہمارے ہاضمے سے بھی ہے۔ بسیار خوری اور بد ہضمی بھی بے خوابی کا سبب بن جاتی ہے۔ رات کا کھانا زیادہ بھاری نہ ہونا چاہئے۔ ریاح بسا اوقات اچھے بُرے خوابوں کا باعث ہوتی ہیں اور جب ہم صبح کو بیدار ہوتے ہیں تو ساری رات سونے کے باوجود ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سوئے ہی نہیں۔

بعض حالات میں دن بھر محنت کرنے کے بعد ہمارے خون میں شکر کی مقدار کم ہو جاتی ہے اس سے اعصاب پر بُرا اثر پڑتا ہے اور نیند مشکل سے آتی ہے۔ اگر ایسے لوگ سونے سے پہلے شکر کی بنی ہوئی کوئی چیز تھوڑی سی مقدار میں کھا لیا کریں تو یہ شکایت دور ہو سکتی ہے۔ اگر اس طرح بھی اعصاب پر اچھا اثر نہ پڑے تو بستر تک پہنچنے کے بعد نیم گرم پانی سے بھیگے ہوئے تولیے پیٹ پر رکھنے سے نیند آ سکتی ہے۔

گندے کپڑے، میلا بستر، گندہ کمرہ اکثر اوقات بے خوابی کا باعث ہوتے ہیں۔ کمرے سے لے کر چارپائی تک ہر چیز درست ہونی چاہئے۔ اس پر کچھ زیادہ خرچ نہیں ہوتا۔ اگر ہم اپنے ہاتھوں سے اپنا بستر صاف کر لیا کریں، چارپائی کسی ہوئی رکھیں تو اس میں کیا دشواری ہے؟

گہرے سانس لینے سے نظام جسم پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ عام طور سے موسیقاروں کو دوسرے لوگوں کی بہ نسبت اچھی نیند آتی ہے۔ سوتے وقت ہماری سانس آہستہ لیکن گہری ہو جاتی ہے اس لئے جاگتے میں بھی لمبے سانس لینے کی عادت ڈالئے۔

گھڑی پر بار بار نظر نہ ڈالئے۔ وقت گزرنے کا احساس آپ کو نیند سے دور لیتا جائے گا۔ سوتے وقت ڈھیلا لباس پہنئے۔

سونے سے پہلے کافی، چائے، سگریٹ اور دوسری نشہ آور چیزوں سے گریز کیجئے۔ یہ تمباکو حرکت قلب کو تیز کر دیتا ہے جس سے نیند خراب ہو جاتی ہے۔

سرگوشیاں

اِس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ فلمی، اخلاقی، تہذیبی سوالات [illegible] گھٹیا، فحش، بیہودہ سوالات قابلِ اشاعت نہیں سمجھے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ "بیسویں صدی" کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کے لئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھئے کہ اس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے۔

ایڈیٹر "بیسویں صدی" دہلی

سوال و جواب

محمد عطاء الرحمن صوفی ملکاپور۔ بلڈانہ

س۔ عورت اور دولت میں کیا فرق ہے؟

ج۔ عورت کے ایثار اور عظمت سے دولت کا کیا مقابلہ کیا موازنہ۔ عورت اپنا خونِ جگر پلا کر اُس وقت انسان کی پرورش کرتی ہے جب اُسے پروان چڑھاتی ہے جب دولت اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھتی بھی نہیں۔

س۔ بھائی صاحب! اگر زمانے کے غم ساتھ نہ چھوڑیں تو کیا کروں؟

ج۔ آپ خود اُن کا ساتھ چھوڑ دیں۔

س۔ زندگی کیا ہے؟

ج۔ سنگِ گراں بھی اور گلِ تر بھی۔

سراج الدین ایم ابراہیم بھیونڈی

س۔ بھیا! زندگی غم و مسرت کا دوسرا نام ہے۔ یہ کہاں تک درست ہے؟

ج۔ سو فیصدی

س۔ مرزا محمد رفیع سودا نے اُردو شاعری کو کیا دیا؟

ج۔ [illegible] ایک اچھے جواہر پارے۔ گرانقدر گہر ریزے!

س۔ آپ جعلسازِ اعظم خضر دہلوی کے سیاہ کارنامے کب منظرِ عام پر لائیں گے؟

ج۔ اِس جعلسازِ اعظم کے سیاہ کارناموں کی روداد بہت ہی شرمناک ہے۔ اس تنگ اور نیت کے سیاہ کارنامے پیش کر کے "بیسویں صدی" کو دامن آلودہ کرنا ہم "بیسویں صدی" کی عظمت کی توہین سمجھتے ہیں لیکن ہمیں "بیسویں صدی" کے ہزاروں قارئین کے اصرار و اشتیاق کا احترام کرنا ہی پڑے گا۔

ارشد جمال جگدل ۲۴ پرگنہ

س۔ بھیا! آپ کی نظر میں آج کا سب سے بڑا ادیب کون ہے؟

ج۔ جو دوسروں کی تخلیقات کو توڑ موڑ کر اپنا لینے کا فن جانتا ہو۔

س۔ بھائی جان! دہلی سے کتنے ادبی رسالے شائع ہوتے ہیں اور اُن میں سب سے بلند مقام کسے حاصل ہے؟

ج۔ دہلی سے کئی ادبی رسائل نکلتے ہیں۔ اُن میں سب سے بلند مقام کسے حاصل ہے؟ یہ اپنی اپنی نظر، اپنی اپنی پسند کی بات ہے۔ خودستائی کبھی ہمارا شیوہ نہیں رہا۔

س۔ بھائی جان! "بیسویں صدی" نئے لکھنے والوں کو موقع کیوں نہیں دیتا؟

ج۔ "بیسویں صدی" نے ادب کے ایوان میں جتنے نئے چراغ جلائے شاید ہی کسی صحیفے نے جلائے ہوں۔ یہ خودستائی نہیں اظہارِ حقیقت ہے۔

اعجاز اصغر [illegible]

س۔ کیا [illegible] دیکھنا جرم ہے؟

ج۔ قانون کی نظر میں جرم نہیں لیکن اخلاق کی نظر میں تباہ کن ہے۔

س۔ آپکا سب سے پیارا مشغلہ کون سا ہے؟

ج۔ زبان و ادب کی خدمت!

کمر کے درد سے پرکاش کا بُرا حال تھا۔۔

سیریڈون درد اور ٹیس میں جلد اور بے ضرر طریقہ پر پورا آرام پہنچاتی ہے۔ کمر کے درد، سر کے درد، دانت کے درد، حرارت اور سردی زکام کے لئے دُنیا بھر میں مشہور سیریڈون لیجئے۔ بڑوں کے لئے ایک ٹکیہ، بچوں کے لئے ½ سے ½ ٹکیہ تک۔

ایک ہی سیریڈون ’روش‘

احمد اقبال۔ کاروادی

س۔ بھائی جان! بیسویں صدی میں کرشن چندر کا سب سے پہلا افسانہ کون سے سال کے کس مہینے میں شائع ہوا تھا؟

ج۔ کرشن چندر "بیسویں صدی" میں اتنی طویل مدت سے لکھ رہے ہیں کہ یہ بتانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔

س۔ کرشن چندر کے بھائی مہندر ناتھ کے علاوہ اور کوئی بھائی یا بہن ہے جو ادیب یا ادیبہ ہے؟

ج۔ ان کی بہن سرلا دیوی مشہور و ممتاز ادیبہ تھیں۔

س۔ مشہور افسانہ نگار آسی رام نگری کا افسانہ "بیسویں صدی" میں بہت دنوں سے نظر نہیں آیا۔ وہ کیا اب نہیں لکھتے؟

ج۔ اب وہ ایسی شمع بن گئے ہیں جو خود جل کر دوسروں کو روشنی بخشتی ہے۔

پھونک کر اپنے آشیانے کو
روشنی بخش دی زمانے کو

لیکن روحانی طور پر آسی صاحب "بیسویں صدی" کے کارواں سے الگ نہیں ہیں۔ ہر منزل ہر موڑ پر "بیسویں صدی" کے ساتھ ہیں۔ "بیسویں صدی" سے اتنے ہی قریب ہیں جتنے قریب ہم ہیں۔

سید عابد حسین قزلباغ۔ دہلی

س۔ انسان اور جانور میں کیا فرق ہے؟

ج۔ انسان گر کر جانور ہو سکتا ہے۔ لیکن جانور گر کر انسان نہیں ہو سکتا!

س۔ بھائی جان! امیر تقی کا کوئی شعر سنائیے۔

ج۔ [illegible]

س۔ [illegible]

ج۔ [illegible]

چھوڑ دینے والے مایوس ہوتے ہیں۔

نسرین نیلوفر۔ ہزاری باغ

س۔ عورت کے لیے سب سے گراں مایہ شے کیا ہوتی ہے؟

ج۔ عصمت و عفت۔

س۔ کوئی شخص خواہ وہ اس کا بھائی ہی کیوں نہ ہو، اگر عورت کی عزت و عصمت پر دھبہ لگائے تو ایسے شخص سے محبت کرنی چاہیے یا نفرت؟

ج۔ بانو! آپ بھی کیا سادگی۔ آپ بھی کیا معصومیت کہ آپ یہ بات بھی نہ سمجھ سکیں۔ ایسے برے آدمی کے سائے سے بھی دور رہنا چاہیے۔

عادل کہلگانوی مغربی۔ ونا چپور

س۔ رسالہ "خاتونِ مشرق" کا پتہ معلوم ہو تو مطلع فرمائیں۔

ج۔ دفتر رسالہ "خاتونِ مشرق" اردو بازار۔ دہلی۔

س۔ آج کے انسان کی سب سے بڑی کمزوری کیا ہے؟

ج۔ حوصلے کی پستی ہمیشہ انسان کی سب سے بڑی کمزوری رہی ہے۔

فتح چند۔ الور

س۔ آج کل کے زمانے میں غریب کو جینے کا حق کیوں نہیں ہے؟

ج۔ غریب سے جینے کا حق کوئی نہیں چھین سکتا۔ حوصلہ ہو تو غریب امیروں سے اپنا حق چھین سکتے ہیں۔

تیرگی اپنے مقدر کی مٹانے کے لئے
چھین کر چاند ستاروں سے اجالا لے لیں

س۔ رفتار، گفتار، دستار۔۔۔؟

ج۔ سب میں افراط و تفریط سے بچنا چاہیے۔

طلعت پروین۔ پٹنہ

س۔ بھائی جان! کوئی حسین شعر سنائیے۔

ج۔ شب کی آغوش میں بل کھاتی ہوئی کاہکشاں
کیسی مانگ کی بکھری ہوئی افشاں تو نہیں

عبدالحمید خاں۔ برہان پور

س۔ تقدیر کا تکیہ؟

ج۔ صرف تقدیر پر تکیہ کرنے والے تقدیر کے صحیح مفہوم سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ —— تدبیر کے نتیجے کا تقدیر نام ہے۔

س۔ تدبیر کی تلوار؟

ج۔ عزم و یقین کے ہاتھ میں ہو تو بہت تیز ہوتی ہے۔

محمد صدیق۔ سری نگر

س۔ انسان کا پہلا فرض؟

ج۔ انسانیت کی خدمت۔

س۔ طالب علم کی کامیابی کا راز؟

ج۔ تعلیم کی تکمیل سے پہلے اپنی ساری توجہ تعلیم پر مرکوز رکھنا۔

س۔ خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف
یہ کس کا شعر ہے؟

ج۔ علامہ اقبال کا۔

منیر احمد منہاجی بسی سہنجن۔ اعظم گڈھ

س۔ ... سوالات کس تاریخ تک بھیجے جائیں؟

ج۔ کسی تاریخ کی پابندی ضروری نہیں۔

س۔ غالب اور ذوق کے درمیان کیسے تعلقات رہتے تھے۔ دوستانہ یا حریفانہ؟

ج۔ ان کے تعلقات دوستانہ ہی تھے۔ معاندانہ و حریفانہ نہ تھے۔

س۔ موجودہ دور میں ہندوستان کی سب سے مشہور ادیبہ کون ہیں؟

ج۔ بندہ نواز! یہ شرف مردوں کے لئے مخصوص رہنے دیجئے۔ آنٹی بھی کیا فراخدلی!

سید امام الدین اطہر ہوی لکچرر گورنمنٹ ہائی اسکول الدھیا

س۔ اگر ہو عزم محکم کا سہارا
نظر آئے گا طوفاں میں کنارا

یہ شعر کس کا ہے؟ میں کہتا ہوں ڈاکٹر راج بہادر ... کا ہے اور میری سہیلی سرور کہتی ہے علامہ اقبال کا ہے۔ ہم دونوں میں یہ شرط ہے جو ہارے وہ دونوں کیلئے بیسویں صدی کا سال بھر کا چندہ جمع کرے۔ اب فیصلہ آپ پر ہے۔

ج۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے یہ شعر کس کا ہے لیکن یہ یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ شعر علامہ اقبال کا نہیں ہے۔ اس شعر کا مضمون بہت اچھا ہے۔ لیکن بندش بتاتی ہے کہ یہ شعر علامہ اقبال کا نہیں ہے۔

س۔ میں گیارہ خط لکھ چکی ہوں چچا جان آپ ہمارے سوالوں کا جواب کیوں نہیں دیتے جبکہ میں نے اردو صرف بیسویں صدی کے شوق میں پڑھی ہے۔ پہلے سرور ہی بیسویں صدی پڑھ کر مجھے سنایا کرتی تھی۔

ج۔ حیرت ہے کہ آپ کے اتنے سارے خطوط کیا ہوئے خطوط ملتے تو ضرور جواب دیا جاتا۔ آپ شوق سے سوالات بھیج سکتی ہیں۔ ہم ضرور جواب دیں گے۔

انوار حسین انصاری بی۔ اے۔ سہسرام

س۔ پنڈت نہرو کی "میری کہانی" پہلے کس زبان میں منظر عام پر آئی؟

ج۔ انگریزی میں۔

س۔ خوشتر صاحب! جب اخلاق اور انسانیت کا بدلہ برائی، دھوکا اور فریب سے ملے تو؟

ج۔ چین کی انسانیت دشمنی و فریب کاری نے یہ بتا دیا ہے کہ ہرگز فریب نہ کھانا چاہئے۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہئے۔

نسیم آرا نسیم بی۔ اے۔ اندور

س۔ یہ شعر کس کا ہے اور اس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

کشتی کے بھنور میں موجوں سے کھیلیں گے
مل جائے گا ہمیں بھی طوفان میں کنارا

ج۔ یہ نہیں معلوم یہ شعر کس کا ہے۔ شعر کا مضمون اچھا ہے لیکن شعر بطور شعر اچھا نہیں ہے مصرعہ اولی بحر سے خارج اور وزن سے عاری ہے۔

سراج الدین بریلوی۔ بریلی

س۔ خوشتر بھیا! میری شادی قریب ہے میں اس وقت زیر تعلیم ہوں۔ بتائیے کیا کروں؟

ج۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد شادی ہونی چاہئے۔

س۔ مجھے کسی سے عشق ہوگیا ہے۔ مگر میں بچنا چاہتا ہوں۔ بچنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟

ج۔ اس پاگل پن کی تباہ کاریوں کی المناک داستانیں پڑھئے۔ اپنے سامنے اپنے گرد پیش ہونے والے عبرتناک واقعات دیکھئے۔

محمد حلیم انصاری۔ ...

س۔ علم عمل اور صحت ... اعلیٰ درجہ بلند ہے؟

ج۔ علم با عمل کا۔

س۔ علم کے لئے عمل ضروری ہے یا عمل کیلئے ...

ج۔ دونوں ضروری ہیں۔ عمل کے بغیر علم حاصل نہیں۔

کمال الدین اجمیری۔ نندی پر ...

س۔ چند ماہ پہلے "بیسویں صدی" کے سرورق کا پر جو تصویر چھپی ہے اس کا عنوان ہے "چھلکے ہی پڑے شراب شباب آنکھوں ..." وہ تصویر حقیقی ہے یا فرضی ہے؟

ج۔ "بیسویں صدی" کی ساری تصویریں حقیقی ...

زیڈ احمد۔ سیوگہ۔ میسور

س۔ دلی کی سیر کرنے کیلئے کون سا موسم خوشگوار ...

ج۔ فروری یا نومبر!

س۔ اردو ادب میں شکسپیر کون ہو سکتا ہے

ج۔ آغا حشر کاشمیری کو اردو کا شکسپیر کہا جاتا ہے۔

خالق اختر راہی۔ ناگر کرنول

س۔ خوشتر بھیا! مجھے لیڈر بننے کا شوق ... کیا کروں؟

ج۔ یہ کیا مشکل ہے۔ پہلے ... مقابلوں میں شکست کھا کر ... کیجئے۔ بس آپ لیڈر بن گئے!

آنکھوں کی حفاظت زندگی کی حفاظت ہے

"غنچہ پھر لگا کھلنے ...." فوٹو: محفوظ شاہد لاہور

بیسویں صدی

ایڈیٹر : خوشتر گرامی

ستمبر ۱۹۶۴ء

جلد —— ۲۹
شمارہ —— ۹

ٹیلیفون دفتر —— ۲۷۳۳۷
ٹیلیفون رہائش —— ۷۱۹۹۲۷

قیمت فی پرچہ

۷۵ پیسے

"سوا کھرب ڈالر [illegible] گے": ایک خبر — مشکل [illegible] سے [illegible] جائے گا۔

"کانگریس [illegible] کی بے توجہی پر اظہار افسوس": ایک خبر — [illegible] والے [illegible]

"میلہ ساغر مجنوں کے نام": ایک عنوان — پیارے اب کھانے کو نہیں عشق بھول جاؤ۔

"بھارت میں انقلابی زرعی اصلاحات": ایک عنوان — پیداوار کا سلسلہ بالکل ختم کیا جائے گا تاکہ لوگ کھانے کی تکلیف سے بچیں۔

"نقلی سرکاری تجارت مضر ثابت ہو سکتی ہے": ایک عنوان — اُسے معتبر بنانا ہے تو اس میں بنیوں کو شامل کیجئے۔

"دلی میں فیملی پلاننگ کا کام کرنے والے ایک ورکر نے اپنے دسویں بچے کی سالگرہ منائی": ایک خبر — فیملی پلاننگ کی شاندار کامیابی۔

"پنجاب میں بارش سے تباہی": ایک خبر — وزارت کی تباہی سے نجات ملی تو بارش نے تاکا۔

"کرپشن قانون اور سزا سے ختم نہیں ہوگی": جسٹس داس کی رائے — بلکہ اس کے لئے بار بار اور ہر جگہ داس کمیشن مقرر کرا کر داس رپورٹیں تیار کرانی ہوں گی۔

"کتنے نالائق ہیں ہم": ایک جن سنگھی اخبار کی سرخی — اب پتہ چلا ہے آپ کو۔ خیر غنیمت ہے۔

"ٹیچروں کی بہبودی کا پروگرام": ایک سرخی — اسکول کے بعد بچوں کو کھلائیں اور آیا گیری کریں۔

"مہنگائی کا مسئلہ حل کرنے کے لئے سماج دشمن اور خود غرض لوگوں کا صفایا کیا جائے گا" — شری گلزاری لال نندہ کا اعلان۔

[illegible] گلاس لے لیں گے۔"

مسٹر ورما نے وہسکی کے گلاس میں سے ایک چھوٹا سا گھونٹ لیا جو [illegible] کرنے کے لیے تھوڑا سا مقدار تھا۔ پھر بولے: "اچھا ڈارلنگ! ایکسکیوز می! تم مسٹر لوتھرا [illegible] تھکا ہوا تو میں بھی ہوں۔"

مسٹر لوتھرا نے مسکرا کر اپنی بیوی کی جانب دیکھا۔ بیوی نے اسی مسکراہٹ سے جواب دیا: "ہاں ہاں، لے لو، ہم دونوں ذرا ریسٹ لیں گے۔"

مسٹر لوتھرا اور مسز ورما فلور پر چلے گئے تو مسز لوتھرا کسی قدر تلخ مسکراہٹ میں بولیں: "تمھارا پارٹنر بھی میرے پارٹنر کی طرح اناڑی ہے۔ لوگ ہاٹ ڈانس کی بات کر رہے ہیں اور وہ ٹوئسٹ کی فرمائش کر رہی۔ کوئی تُک ہے اس بھونڈے مذاق کی؟"

مسٹر ورما نے دانت دکھا دئے جس کا مطلب تھا کہ وہ مسکرا رہے ہیں اور بولے۔

"میں نے بڑی ترکیب سے دونوں کو ہٹا دیا تاکہ ہمیں تنہائی ملے۔"

مسز لوتھرا نہایت رومانی انداز سے ہنسیں اور بولیں: "تم کیا ہٹاتے۔ وہ تو میں نے تمھیں نیچے سے پیر مار کر اشارہ دیا تھا۔"

"اوہ! وہ اشارہ تھا؟ سچ مانو میں تو سمجھا تھا کہ تم نے غلطی سے ایسا کیا۔ ترکیب میری ہی تھی۔"

مسز لوتھرا بولیں: "غلطی سے پیر مارتی تو معافی مانگ لی ہوتی۔"

ورما کھلکھلا کر ہنس پڑے اور کہا: "مجھے یاد آرہا ہے ایک بار تم نے کالج میں بھی یوں ہی اشارہ دیا تھا۔"

"تم جب بھی نہیں سمجھ پائے تھے۔ بدھو کی طرح اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔"

"نہیں یہ بات نہیں تھی مسز لوتھرا۔"

"ہش!" مسز لوتھرا نے ہونٹوں پر انگلی رکھی اور بولی: "تمھاری مسز اور میرے [illegible] سے دُور رہ کر ہم آلکا اور دیوندر ہیں۔ مسز لوتھرا اور مسٹر ورما نہیں۔"

"آلکا!" دیوندر نے پکارا۔

"ہوں" جیسے دُور سے آواز آئی۔

"میں سمجھ رہا تھا کہ میں نے تمھیں کھو دیا ہے۔"

"مجھے ایسا احساس کبھی نہیں ہوا۔ شادی سماجی رسم ہے اور محبت دل کی [illegible] میں جلنے والا ایسا چراغ جو پھونکوں سے نہیں بجھایا جا سکتا!"

"میں نے تم سے شادی کرنے کی بہت کوشش کی۔"

"تم [illegible] ہو۔"

"نہیں [illegible] نہیں۔ میں [illegible] پتا جی کے پاس گیا تھا۔ لیکن اُنھوں نے مجھ سے کہا کہ میں اپنا اور اپنے پتا جی کا بینک سرٹیفکیٹ بتاؤں۔ کہاں سے بتاتا۔ کیا کرتا۔ یہ تو میرے سسر صاحب تھے جنھوں نے اپنا پیسہ لگا کر مجھے آگے پڑھنے کے لئے امریکہ بھیجا تاکہ وہاں سے لوٹوں تو اُن کی لڑکی سے مجھے شادی کرنی پڑے۔ اُنھی کے رسوخ تھے کہ مجھے خارجی امور کی منسٹری میں یہ بڑی جگہ ملی۔"

"مسٹر لوتھرا سے بھی پتا جی نے اُن کی مالی حالت کا ثبوت چاہا تھا۔ جانتے ہو مسٹر لوتھرا نے کیا کیا؟"

"نہیں جانتا۔"

"اُنھوں نے ایک اور بینک کا کھاتہ کھولا۔ اُس میں اوور ڈرافٹ لے کر اُسے پہلے کھاتے میں منتقل کروا دیا جس کے باعث اُن کا بینک بیلنس بڑھ گیا تب سرٹیفکیٹ نکلوایا۔"

دیوندر ہنسنے لگا: "میں ایسی ترکیب نہیں سوچ سکا۔"

"پھر شادی کے بعد پتا جی ہی کے پیسوں سے اُنھوں نے پیسہ بنایا۔"

"کیا کام کرتے ہیں وہ؟"

آلکا جھوم کر بولی: "امپورٹ ایکسپورٹ موٹروں کا۔"

"خوب خوب! اچھا بزنس ہے۔"

"موٹروں کے ساتھ ساتھ ہم لوگ ہاٹ ڈرنک بھی منگواتے ہیں میرا مطلب ہے فارن برانڈی، رم، اسکاچ وغیرہ۔"

"ہاؤ سویٹ!" دیوندر نے جیسے ترس کر کہا: "تم لوگ بڑے عیش کی زندگی گزار رہے ہو!"

"نہیں" آلکا نے دُکھ بھری آواز میں کہا: "وہ صرف پیسے بنانا جانتے ہیں۔ دیوندر! میں تمھیں اکثر یاد کرتی ہوں۔"

"میں بھی آلکا! میں بھی۔"

"اِسکاچ پیو گے؟ میرے بیگ میں ہے۔ اسے اسکاٹ لینڈ سے ہم نے ذاتی اِستعمال کے لئے منگوایا ہے۔"

"آج کی رات پُرکیف ہو جائے گی۔ میں انکار نہیں کروں گا آلکا! میں انکار نہیں کروں گا۔ وائٹ ہارس اِسکاچ ہوگی؟"

"نہیں" آلکا نے جواب دیا: "میں صرف 'اولڈ سمگلر' پیتی ہوں یا کبھی کبھی جانی واکر۔ ہمارے مسٹر رم پسند کرتے ہیں۔ اُن کے ساتھ ہوتی ہوں تو میں بھی رم پیتی ہوں لیکن تمھارے ساتھ 'اولڈ سمگلر' پیوں گی۔"

"اولڈ سمگلر!" دیوندر نے جھوم کر دُہرایا اور کہا: "کمبخت بہت دنوں بعد منہ سے لگ رہی ہے۔"

مسٹر لوتھرا نے اپنی بیوی کی طرف بہت پیاسے انداز میں دیکھ کر پوچھا۔
"ڈارلنگ! تم کہہ رہی تھیں کہ ایک اسکاچ کی بوتل رکھنا تم نہیں بھولو گی۔"

"نہیں رم کی۔" آنکا نے بھولپن کا اظہار کیا اور ہینڈ بیگ میں سے رم کی بوتل نکال کر ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولی۔ "اوہ توبہ! وہ تو میرے بیگ ہی میں پڑی ہوئی ہے۔ مجھے بالکل دھیان نہ رہا۔"

مسٹر لوتھرا نے چار گلاسوں میں کوکا کولا ڈالی آدھی سے ذرا کچھ اوپر تک۔ تب ہر ایک کے اوپر رم کی بوتل جھکی۔ مسٹر لوتھرا انکھیوں سے مسز ورما کی طرف بھی دیکھ رہے تھے۔ پھر ٹھنک ٹھنک کر بولے۔

"کوکا کولا اور رم کی آمیزش بھی کیا چیز ہے۔ بڑی دلفریب ہوتی ہے۔ آپ خوب رقص کرتی ہیں!"

مسز ورما نے مسکرا کر دیکھا۔ جیسے اس جملے کا مطلب اُن کی سمجھ میں آگیا ہو۔
مسز لوتھرا دونوں کو نظر انداز کرنے کے خیال سے گلاسوں میں آئس کیوب ڈالنے لگیں۔
مسٹر لوتھرا سگریٹ کے مرغولے بنا بنا کر چھت کی طرف پھینک رہے تھے۔

سیکنڈ راؤنڈ شروع ہو چکا تھا۔ ہارٹ ڈانس کا سیکنڈ راؤنڈ۔ قمقمے پھر مدھم ہونے لگے۔ بینڈ کی تانیں آہستہ آہستہ اُٹھنے لگیں۔

مسٹر لوتھرا نے ایک گلاس مسز ورما کی طرف بڑھایا اور کہا۔
"آپ تھک گئی ہیں۔ لیجئے تازہ دم ہو جائیں گی۔"
"اوہ شکریہ!"

آنکا بھی مسز ورما کی طرف دیکھ کر مسکرائیں۔ اب اُنھیں مسز ورما سے کوئی رنجش نہیں تھی۔ چالیس ہزار کے کاغذات پر دستخط کردہ اپنے سارے احساسات کو بلند کر چکی تھیں۔ یقیناً مسز ورما اب اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ اِن کاغذوں سے اب اُنھیں کم از کم دس ہزار روپے کا منافع ہوگا۔

مسٹر لوتھرا نے ایک گلاس مسٹر ورما کے آگے بڑھایا اور ایک آنکا کے سامنے رکھا۔

"آج کی خوبصورت رات کے نام" مسٹر لوتھرا نے گلاس اوپر اُٹھایا۔
"کیا! مسٹر ورما بولے۔ "کیا رم ہے؟"
"ہاں!"
"تو معاف کیجئے میں قطرہ بھی نہیں پی سکتا۔ میں اسپرٹ میں نشہ بندی کا ... احترام کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن مجھے آپ لوگوں سے کوئی شکایت نہ ہوگی یقیناً

نہیں۔ آئی ڈونٹ مائنڈ!"

اپنے شوہر کا یہ انداز مسز ورما کو نہیں بھایا۔ ایک گھونٹ لے کر بولی۔
"کیوں مس کر رہے ہو ڈیر! اُٹھاؤ اور پی جاؤ۔ ہم سب ایک ہی طور کے رقص کرنے والے نہیں ایک ہی تھالی کے چٹے بٹے بھی ہیں۔"

آنکا کو مسز ورما کے کہنے کا انداز بے ساختگی اور جملہ سب کچھ بہت اچھا لگا۔ اس لئے مسز ورما کے ساتھ شریک ہو کر وہ بہت فراخدلی کے ساتھ قہقہے بکھیرنے لگیں۔ دونوں کے شوہر کسی قدر کھسیانے ہو کر ایک دوسرے کو تک رہے تھے جیسے اُن کی بیویوں نے اُن کا پول کھول دیا ہو۔ پھر آنکا نے دیکھا کہ مسز ورما اندھیرے کا سہارا لے رہی ہیں۔ کاغذوں کا چھوٹا سا پلندہ اُنھوں نے بلاؤز کے اندر سے نکالا اور سب کی نظروں سے بچاتی بچاتی اپنے ہینڈ بیگ میں ڈالنے لگیں۔ آنکا کے سینے پر جیسے سانپ سا لوٹ

- بدخلق، بدخو اور سخت گو آدمی جنت میں نہ داخل ہوگا۔
  (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- نہ دولت خواہش کرنے سے ملتی ہے نہ جوانی خضاب لگانے سے اور نہ صحت دوا سے۔
  (حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ)
- عالم وہ ہے جس کا کردار اُس کی گفتار کی گواہی دے۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہ)
- علم مال سے بہتر ہے اس لئے کہ علم انسان کی حفاظت کرتا ہے اس کے برعکس انسان کو مال کی حفاظت کرنی پڑتی ہے۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہ)
- صلح اور سلام میں خوبی ہی خوبی ہے۔ (قرآن پاک)
- نیکی سے عمر بڑھتی ہے۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)

گیا۔ کیا مسز ورما نے بھی اس کے مسٹر کے دستخط لئے۔ کاہے کے لئے؟ کوئی معاہدہ؟ کوئی وعدہ؟ کیا ہے یہ! آخر کیا ہے۔ وہ بھی منافع کمائے گی کیا۔ دس ہزار سے کم یا زیادہ؟

احساسِ شکست نے پھر سر اُٹھایا۔
مسز لوتھرا کا دل چاہا وہ میز پر رکھے ہوئے برف کے ٹکڑوں سے مسز ورما کا سر پھوڑ دے کیونکہ اُنھیں وہ بہت خطرناک معلوم ہو رہی تھی لیکن مسز لوتھرا کچھ بھی نہ کر سکیں۔ ... مسز ورما کا ...

دو غزلیں

پروفیسر ڈاکٹر منوہر سہائے انور، ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی

(۱)

یہ تواضع، یہ مدارات کہاں تھی پہلے
آج کیا بات ہے، یہ بات کہاں تھی پہلے

ہو گیا چرخِ ستمگار مخالف ورنہ
اس قدر بارشِ آفات کہاں تھی پہلے

لوگ کس منہ سے کریں عہدِ رواں کی تعریف
اب ہے جو تلخیٔ اوقات کہاں تھی پہلے

آج اعلانِ حقیقت پہ زباں کٹتی ہے
اس عمل کی یہ مکافات کہاں تھی پہلے

آپ رسوا نہ کریں مفت میں اُن کو انورؔ
آپ سے اُن کی ملاقات کہاں تھی پہلے

(۲)

جب ہمیں اُن کی یاد آئی ہے
آنسوؤں نے جھڑی لگائی ہے

تیرے قربان جاؤں اے ساقی
بے پلائے بہت پلائی ہے

راحت و رنج کا کسے ادراک
کیا خبر وصل یا جدائی ہے

غلط انداز تھا وہ تیرِ نگاہ
پھر بھی دل پر خراش آئی ہے

دوستوں سے بچے رہو انورؔ
دوستی کس کو راس آئی ہے

۳/۱ اسٹیشن [illegible]

تبسم کی لکیر

وہاب اشرفی ایم۔ اے

بہار لودجنگ، سبزی باغ، پٹنہ۔۴

۱۴/ مئی ۶۳ء محترم خوشتر صاحب! تسلیم

... تبسم کی لکیر بہت مدت سے نظر ثانی ایک ایسا افسانہ ہے جو یقیناً آپ کو پسند آئے گا۔ اگر یہ خاص نمبر میں چھپ سکے تو کیا کہنا لیکن اس کے لئے تو شاید اب بہت دیر ہو گئی ہے ——— میں بیسویں صدی کے صفحات سے کچھ دن غیر حاضر رہتا ہوں تو لوگ سمجھتے ہیں کہ میں نے لکھنا چھوڑ دیا ہے۔ تبسم کی لکیر بتائے گی کہ چھٹی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی...

——— کمترین وہاب اشرفی

مسٹر ایم۔ وسیم تقریباً پندرہ سال بعد مجھے آج پھر گاندھی میدان میں مل گئے۔

مسٹر ایم۔ وسیم ہم سب پر حاوی تھے، عجب ذہن پایا تھا انھوں نے۔ جیسے چوبیس پچیس کی ادھ کچی عمر میں مغرب کے تمام علوم و فنون پر قادر ہو گئے ہوں۔ ڈیلی شیو بناتے۔ مناسب لباس زیب تن کرنے کے بعد ٹھیک وقت پر کالج پہنچ جاتے۔ نصاب کی کتابوں کے علاوہ اُن کے پاس ہر وقت مغربی زبان و ادب کی موٹی موٹی کتابیں ہوتیں۔ جب وہ ہم سے بحث کرتے تو چلتے پھرتے عالم فاضل نظر آتے۔ انگریزی لب و لہجہ پر پوری طرح قادر تھے۔ تنقیدی کتابیں پڑھ پڑھ کے ہم لوگوں کا ناطقہ بند کئے رہتے۔ ہم جب کبھی اپنی زبان کی بات کرتے تو وہ برس پڑتے۔ اُن کا خیال تھا کہ اُردو میں شاعری ابھی ابتدائی منزل میں ہے۔ ڈرامے تو مفقود ہیں۔ اچھے افسانوں اور ناولوں کا بھی کال ہے۔ فلسفہ، عمرانیات اور معاشیات کے علوم ہمارے ملک کے دائرۂ عمل سے باہر ہیں۔ ہمارا کلچرل سرمایہ برائے نام ہے۔ تہذیب و تمدن کے الفاظ مبہم ہیں۔ ہمارے ہاں اُن کی کوئی حقیقت نہیں۔ عام طور سے ہمارے ملک کی عورتیں جاہل ہیں۔ انھیں نہ اپنا مقام ہے نہ اپنے شوہروں کا۔ وہ مردوں کے کندھوں پر بوجھ ہیں" اور یہ بوجھ احمق شوہر خواہ مخواہ ڈھونے پر مجبور ہیں۔ ہمارے ہاں نفاست نام کی کوئی چیز نہیں۔ ہم اپنے ساتھ میلے کچیلے بچوں کی ایک بٹالین لئے پھرتے ہیں جنھیں کھلانے کے لئے نہ ہمارے پاس پیسے ہوتے ہیں۔ نہ اُن کی تربیت و تعلیم کے لئے مناسب ذرائع۔ ہماری تہذیب ایک سڑی ہوئی لاش ہے جس سے ہم کیڑوں کی طرح لپٹے ہوئے ہیں۔

غرض مسٹر ایم۔ وسیم ہم سب پر حاوی تھے۔ انھوں نے عجب سرکش اور انقلابی ذہن پایا تھا۔ اُن کے سامنے اُن کے بہت سے ساتھیوں کی کور دبتی تھی۔ اُن سے ڈرنے والوں میں میرا نام سرفہرست تھا۔ وہ مجھے احمق سمجھتے تھے اور اُن کا یہ خیال بے بنیاد نہیں تھا۔ میری تعمیر میں واقعی ایک صورت خرابی کی مضمر تھی کہ میں اپنے قومی و تہذیبی سرمایہ کو ایک قدامت پسند کی طرح عزیز رکھتا تھا۔ مجھ میں کسی لڑکی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی جرأت نہ تھی۔ ہم دونوں انگریزی ادب میں ایم اے کر رہے تھے لیکن ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی شہرۂ آفاق نظم مجھے آج تک پوری یاد نہ ہو سکی، جبکہ غالب تو غالب مجھے کئی مقامی شاعروں کی غزلیں اور نظمیں از بر تھیں جنھیں میں کبھی تحت اللفظ اور کبھی ترنم سے غسل خانے کی تنہائی میں یا دوستوں کی محفل میں جہاں مسٹر ایم۔ وسیم نہ ہوتے بے تکلفی سے پڑھتا۔ مسٹر ایم۔ وسیم آفتِ ناگہانی کی طرح مجھ پر مسلط تھے۔ بی۔ اے اور ایم۔ اے میں اُن کے اور میرے مضامین ایک تھے۔ انگریزی آنرز کے علاوہ فلسفہ اور تاریخ کی کلاسیں بھی ہم ساتھ ہی لیتے۔ وہ انگریزوں کی طرح چُست اور موزوں لباس پہنے ہوئے جب مجھ پر گہری تنقیدی نظر ڈالتے تو میری جان نکل جاتی۔ احساسِ کمتری مجھ پر یلغار کرتا اور میں بے بس ہو کر اپنے بوٹ کے فیتے کسنے لگتا جو نہ معلوم کیوں ایسے مواقع پر ڈھیلے ہو جاتے۔ میں سوچتا مسٹر ایم۔ وسیم آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہے ہیں۔ "تم کب تک جاہل رہو گے؟ اعلیٰ تعلیم کا تم پر کب اثر ہو گا؟ اور ——— اور تمھیں یہ انگریزی پڑھنے کا کیا شوق تھا!!؟"

ایک ایسے ہی کمزور لمحے میں ڈاکیہ نے مجھے ایک پوسٹ کارڈ دیا تھا، اُس وقت

مسٹر ایم۔ وسیم میرے ساتھ تھے۔ اتفاق کہئے کہ خط پڑھتے ہی میرے لبوں پر تبسم کی ایک لکیر کھنچ گئی۔ یہ ہنسی میرے لئے قیامت خیز ثابت ہوئی کیونکہ مسٹر ایم۔ وسیم نے فوراً سوال کیا "کیا لکھا ہے اس خط میں!؟" ـــــ ہم ہندوستانی بہت جذباتی ہوتے ہیں خوش ہوتے ہیں تو جی بھر کے اور غم مناتے ہیں تو سینہ کوٹ کوٹ کر ـــــ اسوقت جو خوشی مجھے حاصل ہوئی تھی میں اسے چھپا نہ سکا۔ میں نے مسکرا کر کہا ـــــ "گرمیوں کی تعطیل میں میرا عقد ہو رہا ہے۔"

"لیکن کس سے؟"

"اماں نے رشتہ طے کیا ہے، مجھے تفصیل معلوم نہیں۔"

مسٹر ایم۔ وسیم کے جدید ذہن کو جیسے ایک تازیانہ لگا۔ وہ مجھ پر انگریزی میں اور انگریزوں کے سے انداز میں برس پڑے۔ جو کچھ انھوں نے کہا اُس کا اردو ترجمہ یہ ہے۔
ـــــ "شرم، شرم، تم اتنے گنوار، دیہاتی اور بوڑھے ہو کہ اپنی بیوی تک خود نہیں چن سکتے۔ احمق! اپنی زندگی کو کیوں جہنم بناتے ہو اور گھسی پٹی بوسیدہ روایتوں کا ساتھ دے کر کیوں ملک کی ترقی کی راہ میں روڑا بنتے ہو، تم نہیں جانتے کہ تمھاری شریک حیات کتنی پڑھی لکھی ہے؟ سوشل ہے یا نہیں، خوبصورت ہے یا نہیں۔ اور تم پھر بھی خوش ہو، لعنت ہے تم پر۔ شرم، شرم۔"

اور واقعی شرم سے میری گردن جھک گئی۔ گردن جھکاتے ہوئے میں نے پھر اماں کے خط پر غور کیا۔ اور تبسم کی ایک لکیر پھر لبوں پر پھیل گئی جسے مسٹر ایم۔ وسیم کی نظروں سے بچانے کے لئے میں اپنے بوٹ کے فیتے باندھنے لگا جو پتہ نہیں کیسے کھل گئے تھے؟

اور اُس دن گاندھی میدان میں 'رام لیلا' کے باعث بہت بھیڑ تھی۔ میری شامت اعمال کہئے کہ میں نے اس کا تذکرہ مسٹر ایم۔ وسیم سے کر دیا۔ اب کیا تھا اُن کے مغربی انداز کے جدید ذہن کو ایک زبردست جھٹکا لگا، تلملا گئے اور تلملا کر اپنے خاص انداز میں کہنے لگے ـــــ "پٹنہ میں کب سے 'انٹونی اینڈ کلوپٹرا' ہے کچھ سیکھنا چاہو، کچھ جاننا چاہو، محبت کے فلسفہ کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہو تو اُسے دیکھو، کیوں فول فول چیزوں میں اپنا وقت برباد کرتے ہو ـــــ آخر کیوں!؟" اور میں ایک بار پھر شرمسار ہوا اور شرمسار ہو کر اور ایک طرف منہ اُٹھا کر غور کرنے لگا کہ 'رام لیلا' اور 'انٹونی اینڈ کلوپٹرا' ـــــ یعنی، یعنی ـــــ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا، کچھ بھی نہ آیا۔

ہم دونوں نے ایم۔ اے کر لیا تھا، مسٹر ایم۔ وسیم کا نتیجہ شاندار تھا، بہت ہی شاندار۔ انھوں نے ٹاپ کیا تھا، فرسٹ کلاس فرسٹ آئے تھے۔

پھر ہم ایک مدت کے لئے ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ میں ان دنوں مالی دشواریوں میں مبتلا تھا، میری شادی ہو چکی تھی اور ہم دونوں میں ایک کا اضافہ بھی ہو گیا تھا۔ میری نگاہ اپنی ماں پر گئی تھی۔ اُن کی آنکھیں ان کی طرح صاف شفاف اور آنکھیں بڑی بڑی، روشن اور ذہین۔ کبھی کبھی جب میں اپنے ان [illegible] کو دیکھتا، نگار کی ناک صاف کرتا تو مسٹر ایم۔ وسیم میرے ذہن کے افق پر ابھر آتے۔

"شرم، شرم، تم اتنے گنوار، دیہاتی اور بوڑھے ہو کہ اپنی بیوی تک نہیں چن سکتے۔" اور مجھے اپنی ماں کا وہ خط یاد آجاتا ـــــ اور میں سوچا کرتا میں شہر سے بہت اچھی لڑکی ڈھونڈ سکتا تھا، جس کی غلافی آنکھیں مجھ سے کبھی کچھ نہیں مانگتیں، قربانی اور ایثار کا ایسا مجسمہ میں کہاں تلاش کرتا۔ یہ ہنستا ہوا چہرہ اور میری قلیل آمدنی اور میرے بڑھتے ہوئے اخراجات! مانا کہ شبینہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہے، لیکن زیادہ پڑھی لکھی لڑکیاں زیادہ کر بھی کیا سکتی ہوں گی!؟ یہ دیہاتی عورت جو ہر دکھ ہنس کر جھیل لیتی ہے، مسائل کو اپنے دلکش تبسم میں گھول کر پی جاتی ہے۔ میری بوڑھی اور بیمار ماں کی خدمت کرتی ہے۔ اس سے زیادہ کیا چاہئے، کیا چاہئے اس سے زیادہ مجھے؟

پھر مجھے معلوم ہوا کہ مسٹر ایم۔ وسیم لندن جا کر پی ایچ ڈی کر چکے ہیں اور وہیں انھوں نے اپنی پسند کی ایک شادی بھی کر لی ہے۔ شاباش! میری زبان سے بےساختہ نکل گیا۔ اس لئے کہ مسٹر ایم۔ وسیم سے مجھے یہی توقع تھی، اُن کا ذہن مغربی تھا اور جدت پسند بھی، وہ بہت پڑھے لکھے تھے۔ مغربی ادب کو تو وہ گھول کر پی گئے تھے۔

ادھر میری حالت بھی قدرے سدھر گئی تھی، مقامی کالج میں لکچرر شپ کے علاوہ کہانیوں سے بھی آمدنی ہو جاتی تھی، لیکن ساتھ ساتھ خاندانی ترقی بھی جاری تھی۔ میری بٹالین دو لڑکیوں اور دو لڑکوں پر مشتمل ہر وقت میرے گھر میں پریڈ کرتی رہتی۔ اماں سے نبٹنے کے بعد شبینہ ان کے لفٹ رائٹ میں لگی رہتی۔ اُن کے کپڑے دھوتی، انھیں وقت پر کھلاتی پلاتی اسکول بھیجتی اور جو وقت بچتا مجھے بہلانے میں گزارتی۔ اپنی محبتوں سے میرے دکھ درد کا علاج کرتی، ایسے میں کبھی کبھی مجھے مسٹر ایم۔ وسیم یاد آجاتے اور اُن کے جملے بھی ـــــ "ہمارے ہاں نفاست نام کی کوئی چیز نہیں ہے، ہم اپنے ساتھ اپنے میلے کچیلے بچوں کی ایک بٹالین لئے پھرتے ہیں ـــــ" ایسے میں میرا دل مجھ سے سوال کرتا ـــــ "ان میلے کچیلے بچوں کے بغیر تیری زندگی کا کیا تصور ہوگا ـــــ!؟" اور میں جلدی سے اپنی فوج میں سے کسی ایک کو پکڑ کر بے تحاشہ چومنے لگتا اور مجھے احساس تک نہ ہوتا کہ اس کی ناک کی ریزش میرے منہ میں چلی آئی ہے۔ میں بھی عجیب گنوار تھا، کہ مسٹر ایم۔ وسیم کی صحبت کا کوئی اثر نہیں لیا تھا۔

"توبہ توبہ آپ مجھے کیا بنانا چاہتے ہیں" ـــــ یہ تھا میری بیوی کا جواب، جب میں نے کہا تھا کہ ایک امریکی رقاصہ ہے، یا کسی بڑے کلب میں اپنا خاص رقص پیش کرے گی

...ں رہی تھی تو مجھے چھوڑ گیا تھا، اُداسی کے احساس کے ساتھ۔ اُس وقت مجھے مسٹر ایم۔ وسیم یاد آئے تھے جنھوں نے کہا تھا ——— "تمھاری بیوی سوشل ہے یا نہیں؟" آج کی بات نے مجھے ایک دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔ شبینہ کلب نہیں جا سکتی، وہ سوشل نہیں ہے! میں ایک ذہنی اُلجھن لئے کلب آ گیا تھا ——— امریکی رقاصہ نے واقعی اپنا کمال دکھایا تھا' میری گردن کئی بار جھکی اور کئی بار میں نے اپنے جوتے کے فیتے درست کئے اور کئی بار رومال سے اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھا۔ مجھے شبینہ یکایک یاد آ گئی تھی ——— "توبہ توبہ آپ بھی مجھے کیا بنانا چاہتے ہیں؟" ——— "اِس میں آپ کیا بنانا چاہتا ہوں! میرے دماغ نے مجھ سے پوچھا۔ میرا ذہن میرا ساتھ دیتا تو شاید کوئی جواب ڈھونڈ پاتا۔ اِس وقت مسٹر ایم۔ وسیم ہوتے تو ضرور میری مدد کرتے کیونکہ ان کا ذہن انقلابی تھا اور ہم سب پر بھاری تھا۔

اور آج تقریباً پندرہ سال بعد مجھے مسٹر ایم۔ وسیم گاندھی میدان میں مل گئے ہیں جہاں بھیڑ رام لیلا ہے۔ اِن کے پیچھے سات بچوں کی ایک بٹالین ہے ایک سکڑی سمٹی سی خاتون ہیں۔ مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آتا ہے۔ لیکن مسٹر ایم۔ وسیم ذہین ہیں اور ہم سب پر بھاری ہیں' اس لئے میری حیرت کو سمجھ لیتے ہیں ——— "میں نے لندن میں تین شادیاں کیں' تینوں ناکام رہیں' اور یہ تمھاری بھابی کلثوم ہیں' یہ میری تمام تر بدعنوانیوں کے باوجود میرا انتظار کرتی رہیں۔ اِن کی بچپن میں مجھ سے منگنی ہو چکی تھی۔ زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہیں' لیکن اِن کی بدولت میری زندگی سنبھل گئی ہے سنور گئی ہے؟" ——— اتنا کہہ کے وہ اپنے ایک بچے کی ناک صاف کرنے لگے۔ میں نے جھٹ اُن کے ایک بچے کو اُٹھا لیا اور اُسے چومنے لگا۔ اسی اثناء میں میں نے محسوس کیا کہ مسٹر ایم۔ وسیم کے لبوں پر تبسم کی ایک لکیر کھنچ گئی ہے جسے شاید وہ مجھ سے چھپانے کے لئے جھک گئے اور جھک کر اپنے جوتے کے فیتے باندھنے لگے جو نہ جانے کیسے کھلے رہ گئے تھے۔

حسنِ جواں

شہاب ملیح آبادی

شہابؔ، اُس کا بدن ہے کہ بادۂ گلنار — نفس نفس ہے شرابی، رواں رواں سرشار
زفرق تا بہ قدم، اِک تبسّمِ موہوم — اور اُس پہ زُلفِ رسا تا کمر، غضب آثار
کِھلی کِھلی سی جوانی، دُھلے دُھلے انداز — ٹپک ٹپک سے بدن پر ٹپک ٹپک رفتار
قدم قدم پہ، روانی، نسیمِ صبحِ چمن! — روش روش پہ جوانی، خرامِ ابرِ بہار
سکوتِ لب جو عطا عشق کو کرے آہنگ — خرامِ ناز جو غمزوں کو سونپ دے تلوار
وہ زُلف و رُخ کا تاثر، سماں ہو وہ جیسے — زمیں تمام سیاہی، فلک تمام انوار
کبھی نظر میں پریشاں ہے نغمۂ بے صوت — کبھی ہے زُلف خموشی بہ شانۂ گفتار
کبھی بہ جبر تمنّائے قُرب، دامن کش — کبھی بہ لطفِ تقاضائے دِل تمام ایثار
کمر میں لوچ کچھ ایسا کہ خود بدن بولے — متاعِ بُردۂ آدم ہے کائنات کا بار
وہ منہکی سی ادائیں، جگہ جگہ مصروف — وہ بے دھڑک سی نگاہیں، پلک پلک ہُشیار
جھپک وہ جنبشِ مژگاں میں عالمِ نوکی — جبینِ سادہ پہ نقشِ قدامتِ افکار
وہ جس پہ غیض میں برسے، اُسی کا بیڑا غرق — وہ جس کو لطف سے دیکھے اُسی کا بیڑا پار
ملے جو خاکِ کفِ پا تو خاک بھی اکسیر — نہیں تو شمس و قمر ہیچ، زندگی بے کار
زباں میں لوچ ہے ایسا کہ ہم چُرا لائے — سکوت ساز تکلّم، یہ نطق بے گفتار

بُتوں کی چاہ میں شیخی بگھارتے تھے شہابؔ
چلا نہ زور تو شرما کے بن گئے دیں دار

افسانہ

دل کے معاملے

جگدیش بمل

۸/۷ سی، بھارت نگر، ۳۴۲ گرانٹ روڈ، بمبئی۔ ۷

۱۲ر جون ۶۴ء

محترم بھائی!

... آپ نے میرے پچھلے خط کا جواب نہیں دیا، نہ افسانے کی رسید ہی سے مطلع فرمایا۔ شاید آپ بے حد مصروف ہیں۔ میں آپ کی اتنی مصروفیات میں 'دل کے معاملے' لے کر حاضرِ خدمت ہو رہا ہوں۔ کچھ لمحات نکال کر اِس طرف توجہ فرمائیں اور اسے قارئین کی خدمت میں پیش کر کے شکریہ کا موقع دیں ...

آپ کا ـــــ بمل

شوکت فردوس کے پیچھے آکر کھڑا ہو گیا۔

"کس کی تلاش ہے؟"

فردوس نے چونک کر دیکھا اور شوکت کو دیکھتے ہی اُس کا چہرہ کنول کی طرح کھل گیا۔

"اِتنی دیر کر دی۔"

شوکت نے فردوس کا ہاتھ پکڑ لیا: "چلو ڈانس کریں۔"

آرکسٹرا پر چیری بلوزم کی دُھن بج رہی تھی اور مسز گپتا کی کوٹھی کے ایرکنڈیشن ہال میں جوان جوڑے ایک دوسرے کی باہنوں میں اُلجھے موسیقی کی تان پر اِس طرح جھوم جھوم کر رقص کر رہے تھے جیسے بادلوں کی دُھندلی وادیوں میں دُنیا کے بہترین جوڑوں کو خدا نے اپنے حضور میں طلب کر کے اُن کی جھولیاں خوشیوں کی مُرادوں سے بھر دی ہوں ـــــ مدھم مدھم سی روشنی اِس طرح جھلملا رہی تھی جیسے تابشِ حُسن سے روشنی بھی شرما رہی ہو۔

"شوکی؟" فردوس نے کہا۔

"ہوں!"

"اِتنی دیر کیوں لگا دی؟"

"لیٹ سیلف ہوں نا۔"

"ہاہا ـــــ وہ تو ہو ہی!"

فردوس نے شوکت کے سینے پہ اپنا سر ٹکا دیا۔ اُس کی آنکھیں بند سی ہو گئیں۔

"شوکی؟"

"آں؟"

"تم کب تک لیٹ سیلف بنے رہو گے؟"

"جب تک خدا نے مجھے بنائے رکھا ـــــ ہاہا ـــــ" شوکت ہنس دیا۔

"تم خدا کو درمیان میں کیوں لے آئے ـــــ اِس وقت تو ہمارے درمیان ذرا سا بھی فاصلہ نہیں اور ـــــ اور خدا تو وقت اور فاصلوں ہی میں رہتا ہے ـــــ تم ـــــ تم ـــــ"

آرکسٹرا پر چیری بلوزم کا میوزک بجنا بند ہو گیا اور ہال کی ساری بتیاں روشن ہو گئیں۔ شوکت فردوس کا ہاتھ پکڑے مسٹر اور مسز گپتا کے پاس آ گیا۔

"ہلو شوکی!" مسز گپتا نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

"مبارک!" شوکت نے مسٹر اور مسز گپتا کو باری باری دیکھتے ہوئے کہا۔

"خدا کرے ایسے ہزاروں دن آپ کی زندگی میں آئیں۔"

"اوہ نو ـــــ" مسز گپتا کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔

"میں اِتنی بوڑھی ہو کر زندہ نہیں رہنا چاہتی۔"

"آپ کے نزدیک بڑھاپا آنے کی ہمت کیسے کر سکتا ہے مسز گپتا؟"

"کیوں؟" مسز گپتا کے چہرے کی سُرخی گہری ہو گئی۔

"بڑھاپا نڈر ہے اور مسٹر گپتا کسی دوسرے مرد کو آپ کے نزدیک کیسے آنے دیں گے؟"

مسٹر گپتا قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

"ہاں" ـــــ مسز گپتا نے بیدے شوکت کی طرف دیکھا۔

جب شوکت اور فردوس کرسیوں پر آکر بیٹھ گئے اور ان کے سامنے کافی سرو کردی گئی تو شوکت نے فردوس سے پوچھا۔

"تم مسز گپتا کی بہت اچھی سہیلی ہو ان کی شادی ہوئے آج ایک سال ہو گیا؟ کیسی تھی ہوں دونوں کی؟"

"کیا مطلب؟"

"بہت سے لوگ کہتے ہیں لو میرج کامیاب نہیں ہوتی اسی لئے پوچھ رہا تھا۔"

"اوہ سنو ـــــ تم اتنے پڑھے لکھے ہو کر اور برسوں یورپ رہنے کے بعد بھی ایسی بات کہتے ہو؟"

شوکت مسکرا دیا ـــــ "وہ اس لئے کہ مجھے آج تک شادی کا تجربہ نہیں ہوا۔"

"تو پھر ـــــ تو پھر کیوں لیٹ لطیف بنے ہوئے ہو؟"

فردوس کا چہرہ بات کرتے کرتے کانوں تک سرخ ہو گیا۔

"اللہ کی مرضی میں کسی کا دخل نہیں۔" شوکت اس موضوع پر بڑا سنجیدگی سے بات کرتا تھا۔ فردوس کو اس کی یہ ادا اچھی لگتی تھی۔

ایک لمحہ خاموشی رہی۔ شوکت پیانو کی کرسی پر بیٹھی ہوئی لڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔ فردوس کی آنکھوں میں چنگاریاں سُلگ پڑیں۔

"شوکت؟"

"ہوں؟" اس نے بغیر دیکھے ہی کہا۔

"کیا تم ـــــ کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتے؟"

شوکت نے چونک کر فردوس کی طرف دیکھا۔ آج فردوس نے کھل کر اس سے یہ بات پوچھ لی تھی۔ شوکت کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔

"دیکھو فردوس! میں ایک سیدھا سادہ سا انسان ہوں۔ محبت میرے لئے اتنی بلند اور گہری شے ہے کہ میرا چھوٹا سا ذہن اس کی وسعتوں کو سمو سکتا ہے اور نہ میرے دل کا شانہ اتنا بڑا ہے کہ محبت کے عظیم جذبے اس میں اپنا گھر بنا سکیں ـــــ یوں سمجھ لو کہ محبت مجھ سے بالاتر ہے۔"

شوکت ہنسنے لگا۔ فردوس نے اپنی نگاہیں جھکا لیں۔ شوکت کی ہنسی پر وہ حیران [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

لیکن شوکت نے کار کی طرف جانے کے لئے جب فردوس کا ہاتھ [illegible] چپ چاپ شوکت کے ساتھ کار میں بیٹھ گئی۔

شوکت نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا: "فردوس ـــــ کیا ناراض ہو گئیں؟"

"ناراض ہونے کا مجھے حق ہی کہاں ہے؟"

شوکت اپنی ہنسی نہ دبا سکا۔ فردوس کو غصہ آگیا۔

"یہ کیا بے وقوفوں کی طرح ہنسے جا رہے ہو؟"

پھر بھی شوکت کی ہنسی نہ رک سکی۔

"بے وقوف میں نہیں تم ہو ـــــ ہا ہا ـــــ میں نے ـــــ میں نے ـــــ" ہنسی کی وجہ سے وہ بات پوری نہ کر سکا۔ فردوس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ وہ منہ پھیر کر کار سے باہر دیکھنے لگی۔

شوکت سنجیدہ ہو گیا۔

"فردوس! میں نے یہ کب کہا کہ میرا شادی کرنے کا خیال نہیں ـــــ تم نے مجھ سے محبت کے بارے میں پوچھا، میں نے اپنا خیال ظاہر کر دیا ـــــ عورت اور مرد کا تعلق گھر گرہستی، محبت سے کہیں زیادہ بڑی ذمے داری ہے۔ لیکن ایسا نہیں کہ ان باتوں کو میں سمجھتا نہیں۔ اگر یہی محبت ہے تو اس محبت کو میں خوب سمجھتا ہوں۔ لیکن فردوس! مجھے یہ سبھی کچھ محبت کا ایک روپ معلوم ہوتا ہے۔ اصل محبت کچھ اور ہی ہے جو خدا کی طرح میری سمجھ میں نہیں آتی، ہاں میں اسے مانتا ضرور ہوں۔"

فردوس یہ سب سننے کے بعد بھی چپ رہی۔ شوکت نے ایک موڑ کی طرف کار گھماتے ہوئے کہا۔

"تم یہ نہ سمجھنا کہ مجھے تمہارے جذبات کا علم نہیں ـــــ تمہاری طرح ایک اچھی زندگی گزارنے کا میں بھی خواہشمند ہوں اور شادی کے لئے تم سے زیادہ موزوں اور کون لڑکی مل سکتی ہے؟ لیکن تم یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ کوئی ایسی بات بھی ہو گی جس کی وجہ سے میں لیٹ لطیف بنتا جا رہا ہوں۔"

فردوس نے پلٹ کر شوکت کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی دیکھ کر اس نے پوچھا۔

"کیا بات ہے شوکت ـــــ کون سی ایسی بات ہے جو تم نے مجھ سے چھپا رکھی ہے؟"

شوکت کی ہنسی کو بریک لگ گئے۔

"تم ہی تو کہتی ہو [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ہو سکتی تھی۔ [illegible] ہے تو میں اُن کے
حالات کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

شوکت نے فردوس کی طرف دیکھا۔ وہ ہمہ تن گوش تھی۔

"اُن سے کرنے والوں میں فریدہ کے رشتے کے ایک چچا بھی تھے ـــــ یہ دلچسپ [illegible] کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اُن کے انتقال کے بعد اُن کی ایک بچی بے سہارا ہو کر کسی رشتہ دار کے یہاں کسمپرسی کی حالت میں اپنے دن کاٹ رہی ہے۔ یہ جان کر مجھے بہت دکھ ہوا۔ میں اُس بچی کو یہاں لے آیا۔ وہ دیہات میں رہنے والی ایک سیدھی سادی سی لڑکی ہے۔ وہیں پلی بڑھی اور جوان ہوئی اور تھوڑی بہت تعلیم حاصل کی۔ میں اُسے آج کی دنیا کے مطابق ڈھال کر کسی اچھی جگہ اُس کی شادی کر دینا چاہتا ہوں۔ اس معاملے میں مجھے کتنا مشرقی سمجھ لو اور لیکن یہ سچ ہے کہ ایک جوان لڑکی کو گھر بٹھا کر میں اپنی شادی رچانا اچھا نہیں سمجھتا۔"

فردوس کا گھر آگیا۔ شوکت نے کار کھڑی کر دی۔ فردوس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ کر اُس نے کہا۔

"فردوس تم مجھ سے اب بھی ناراض ہو؟"

فردوس کا چہرہ خوشی سے چمک اُٹھا۔

"نہیں شوکی تم زندگی کے کسی موڑ پر مجھے اَن ریزنیبل (unreasonable) نہیں پاؤ گے ـــــ لیکن ـــــ لیکن تم اُس لڑکی ـــــ کیا نام ہے اُس لڑکی کا؟"

"عارفہ!"

"ہاں تو تم عارفہ کی شادی کیوں نہیں کر دیتے؟"

"میں نے کہا نا' میں اُسے آج کی دنیا کے مطابق بنا دینا چاہ رہا ہوں۔ اُس نے پچھلے چار مہینوں میں اتنا کچھ جان لیا ہے' اتنا کچھ سیکھ لیا ہے کہ گمان بھی نہیں ہوتا کہ وہ چار پانچ مہینے پہلے دیہات کی اکھڑ اور گنوار لڑکی تھی۔"

فردوس نے سوچتے ہوئے کہا۔

"ہمارے دور کے رشتے کے ایک بھائی ہیں' تم کہو تو اُن کی طرف سے پیغام بھجواؤں۔"

"اگر لڑکا اچھا ہے تو تم سمجھو کہ یہ نیک کام کرنے میں تم میری برابر کی حصہ دار ہو گی۔"

فردوس نے آنکھوں میں شوخی بھر کر کہا "بس اسی نیک کام میں یا ـــــ"

پھر وہ کار کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

شوکت نے لڑکے کو گھر بلا کر عارفہ سے اُس کا تعارف کرایا اور دونوں کو تنہا [illegible] ـــــ ایک گھنٹے کے بعد جب یوسف چلا گیا تو عارفہ کو اپنے کمرے میں بلا کر شوکت نے پوچھا۔

"کیوں عارفہ تمہیں لڑکا پسند آیا؟"

عارفہ کا چہرہ حیا سے سرخ ہو گیا اور اُس کا سارا جسم چھوئی موئی کی طرح سمٹ گیا۔ شوکت نے کہا۔

"اس میں شرمانے کی کیا بات ہے تم اپنی پسند نا پسند بتا دو۔"

عارفہ پیٹھ موڑ کر کھڑی ہو گئی ـــــ شوکت عارفہ کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔

"تو تمہاری خاموشی کو میں ہاں سمجھ لوں۔"

عارفہ نے پلٹ کر نہیں دیکھا بس اپنا سر نفی میں ہلا دیا۔

"کیا لڑکا پسند نہیں آیا؟"

عارفہ نے پھر نفی میں اپنا سر ہلا دیا۔

"کوئی بات نہیں کوئی اور لڑکا تلاش کریں گے۔ اب تم اپنے کمرے میں جاؤ۔"

لیکن ایک دو نہیں کتنے ہی اچھے لڑکے آئے' لیکن عارفہ اس طرح منہ بنا لیتی جیسے اُسے گندگی کے ڈھیر کے پاس کھڑا کر دیا گیا ہو ـــــ شوکت کبھی غصے میں نہ آیا تھا لیکن عارفہ سے تنگ آکر اُس نے ایک دن اُسے ڈانٹ دیا۔

"نہ جانے تم اپنے آپ کو کیا سمجھنے لگی ہو کوئی لڑکا تمہاری نظر میں نہیں جچتا۔ اب میں تمہارے لئے یوسف کہاں سے ڈھونڈ کر لاؤں؟"

عارفہ کی آنکھیں بھر آئیں لیکن اُس نے کچھ کہا نہیں چپ چاپ آکر بستر پر لیٹ گئی۔

اور جب شوکت نے یوسف کو دیکھا تو پہلی ہی نظر میں اُسے عارفہ کے لئے پسند کر لیا۔ وہ فلموں کے ہیرو کی طرح مضبوط اور دراز قامت نوجوان تھا۔ گورا رنگ' اور سنہرے گھنے بالوں میں ہلکی ہلکی لہریں ـــــ وہ ایسا نوجوان تھا جس پر پہلی ہی ملاقات میں کوئی بھی لڑکی اپنا دل نچھاور کر سکتی تھی۔ ظاہری حسن کے علاوہ اُس میں باطنی خوبیاں بھی تھیں۔ وہ پڑھا لکھا شریف نوجوان تھا۔ کھاتے پیتے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔

اُس نے گھر آکر عارفہ کو یوسف کے بارے میں بتایا ـــــ ابھی ایک دن پہلے وہ عارفہ کو غصے میں نہ جانے کیا کیا کہہ چکا تھا۔ سمجھانے کے لہجے میں بولا۔

"کل میں نے جھنجھلاہٹ میں نہ جانے تمہیں کیا کچھ کہہ دیا تم اُن باتوں کا کچھ خیال نہ کرنا۔ تم میری جگہ پر کھڑی ہو کر سوچو تو تمہیں محسوس ہو گا کہ میری اپنی بھی کچھ پرابلم ہیں۔ میں چاہتا ہوں جلد سے جلد تمہاری شادی کے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں۔ اسی لئے ـــــ"

عارفہ نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

"ناراض ہونے کی بات ہی کیا تھی ـــــ آپ مجھ سے بڑے ہیں' آپ کو غصہ ہونے کا حق بھی تو ہے۔"

[illegible]

کمرے سے نکل گیا ـــــــ عارفہ نہ آئی۔ خادمہ نے آکر بتایا۔

"عارفہ بی بی کہہ رہی ہیں انھیں لڑکا پسند ہے۔"

شوکت نے اطمینان کی سانس لی ـــــــ وہ کمرے کی کھڑکی کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

اب شام کے سائے لمبے ہو گئے تھے اور درختوں کے پیچھے آفتاب کی سُرخ کرنیں مغربی اُفق کی طرف بکھر رہی تھیں۔ شوکت نے ایک لمحہ یوسف کے بارے میں سوچا اور نہ جانے اسکے بعد میں اُس کا دل کیوں پھڑپھڑا کر رہ گیا۔ اطمینان کے بعد دُکھ کی ایک تیز دھار اُس کے دل کو چیرتی چلی گئی ـــــــ شوکت گھبرا گیا۔ اُس کے لئے یہ دُکھ بالکل انوکھا اور نیا تھا۔ فوراً ہی وہ اپنے کمرے سے باہر نکل گیا۔ خادمہ کچن کی طرف جا رہی تھی۔ اُس نے پوچھا۔

"عارفہ کہاں ہے؟"

"اپنے کمرے میں ہے حضور!"

شوکت عارفہ کے کمرے کی دہلیز پر آکر کھڑا ہو گیا۔ کمرے کے اندر اندھیرا تھا۔ عارفہ کا پیکر اُسے پلنگ پر آہستہ آہستہ ہلتا ہوا محسوس ہوا۔ پھر سسکیوں کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔

کمرے میں داخل ہو کر وہ عارفہ کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔

"عارفہ!"

عارفہ کو جیسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ وہ ہڑبڑا کر پلنگ سے اُٹھی اور شوکت کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اُس کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے آنسو شوکت کو اندھیرے میں بھی دکھائی دے گئے۔

"عارفہ تم ـــــــ تم رو کیوں رہی ہو؟"

"نہیں تو ـــــــ نہیں تو۔" عارفہ کی آواز گلوگیر تھی۔ اُس نے دوپٹے کے پلو سے اپنی آنکھیں صاف کیں۔ شوکت کو جیسے کچھ ہوش ہی نہ رہا ہو۔ اُس کا سارا وجود عارفہ کے آنسوؤں میں بہہ گیا۔ آگے بڑھ کر اُس نے عارفہ کے کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔

"عارفہ تم ـــــــ تم کیا ـــــــ کیا مجھ سے ـــــــ"

شوکت کو ایسا محسوس ہوا جیسے اندر ہی اندر کسی نے اُس کی آواز کا گلا گھونٹ دیا ہو۔ اُس کا سارا جسم لرز اُٹھا۔ وہ عارفہ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولا۔

"عارفہ ـــــــ عارفہ تمھیں کیا یوسف پسند آگیا؟"

اُس کی آواز کانپ رہی تھی اور اپنی نادانی کی باتوں پر اُسے خود حیرت ہو رہی تھی۔

چھوئی موئی بن کر عارفہ نے اپنا سر شوکت کے سینے پر ٹیک دیا اور پھر دو دلوں کی دھڑکنیں ہم آہنگ ہو گئیں ـــــــ!

غزل

رشی پٹیالوی

دل کشی ہے نغموں کی ساز ٹوٹ جانے سے
زندگی نِبھتی ہے دل پہ چوٹ کھانے سے

یوں بھی جس کا جی چاہے کر لے اپنی رسوائی
غم خوشی نہیں بنتا حالِ غم سنانے سے

یہ بھی اِک نوازش ہے آپ کے تغافل کی
رہ کے ہم زمانے میں کٹ گئے زمانے سے

گُل کھلائے غنچوں نے ذوقِ لب کُشائی میں
حادثے ہوئے کیا کیا لب پہ بات آنے سے

قید و بندِ ہستی کی انتہا نہیں کوئی!
ابتدا تو دیکھی ہے موت کے بہانے سے

شمع لاکھ روشن ہو روشنی نہیں ہوتی
روشنی تو ہوتی ہے شمعِ دل جلانے سے

گھر کی آگ دیتی ہے آگ آشیانے کو
آشیاں نہیں جلتے برق کے جلانے سے

اب جنوں کرے شاید ہوش کی دوا کوئی
آپ میں نہیں آتا دل کسی پر آنے سے

بال و پر نکالے گی لذّتِ اسیری جب
ہم قفس میں آئیں گے اُڑ کر آشیانے سے

پردہ دار ہیں جلوے خود نمائیاں کیسی
پردے اُٹھ نہیں سکتے دیکھنے دکھانے سے

منظرِ حقیقت بھی ڈھل گیا فسانے میں
کچھ نظر میں آنے سے کچھ نظر نہ آنے سے

جو سُنے وہی سمجھے اپنی داستاں اس کو
ہر کسی کو نسبت ہے عشق کے فسانے سے

اے رشی خدا حافظ کاروانِ اُلفت کا
راہ بھول جاتا ہے راہ کے دکھانے سے

سر کا درد
کمر کا درد
دانت کا درد
تکلیف کے دنوں کا درد
سردی زکام
درد، ٹیس اور سردی زکام میں
آرام کے لئے
ایک ہی سیریڈون، روش، کافی ہے!
درد دور کرتی ہے، آرام پہنچاتی ہے، تازگی دیتی ہے

افسانہ

درد کی آواز

اختر عابد لوگانوی

گمیر منات۔ امروہہ۔ یوپی

۱۴ مارچ ۱۹۶۴ء

محترم! تسلیم

...امروہہ میں جو وقت آپ کے ساتھ گزرا کتنا روح افزا تھا۔ یہ میں ہی جانتا ہوں۔ آپ نے مجھے جتنا سراہا میری شخصیت اس قابل نہ تھی۔ میں آپ کا بے حد ممنون ہوں۔ آپ کی محبت نے جو نقش میرے دل پر چھوڑے ہیں وہ کبھی نہیں مٹ سکتے۔ جس افسانے کا میں نے آپ سے ذکر کیا تھا وہ "درد کی آواز" کے عنوان سے ارسال خدمت کر رہا ہوں۔ کہہ نہیں سکتا کہ یہ افسانہ نمبر کے معیار پر پورا اترے گا یا نہیں ——— میں آپ کی گرانقدر رائے کا منتظر ہوں...

آپ کا ——— عابد

رات بہت بھیانک ہے طوفان سا ماحول پیدا ہو رہا ہے، بادل چیخ رہے ہیں جیسے آسمان سے فریاد کر رہے ہوں، ہوا کے جھونکے کمرے کی کھڑکیوں سے ٹکرا رہے ہیں جیسے معصوم کھڑکیوں سے انتقام لینا چاہتے ہوں۔ کمرے میں جلتی ہوئی شمع کی لَو تھرتھرا رہی ہے۔ لیکن میں اُسے ان آوارہ جھونکوں کی شرارت سے محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ نہ جانے میرا دل کیوں چاہ رہا ہے کہ یہ شمع ہمیشہ جلتی رہے۔

ایک بار کھڑکیوں کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ جیسے کوئی اُن کے راستے سے کمرے میں آ رہا ہو۔

"کون ہے؟"

کوئی نہ تھا۔ میں تھا اور تنہائی تھی۔

[illegible]

جیسے پیارے ساتھی کی محبت [illegible]

چاہتا ہوں۔ پھر میں [illegible]

چھپائے ہوئے تھا۔

وہ سردی کی [illegible]

[illegible]

امی جان نے کہا تھا: "نسیم آج رات کو لکھنؤ سے آنے والی ٹرین سے تمہارے ماموں جان اپنی لڑکی نسرین کے ساتھ آ رہے ہیں۔"

"جی ہاں! وہ تو کل اُن کے ٹیلیگرام سے معلوم ہو چکا ہے۔" میں نے اُن کی تائید کی تھی۔ اور حسب حکم اسٹیشن چلا آیا تھا۔ مجھے یاد آ گیا تھا کہ ہمارے گھر سے کچھ فاصلے پر ایک پختہ مکان تھا جس میں چند افراد رہتے تھے اور اُن کا شمار ہمارے قریبی رشتہ داروں میں ہوتا تھا۔ میں بچپن میں اکثر اُن کے یہاں جایا کرتا تھا۔ میری عمر اُس وقت تقریباً سات سال ہوگی۔ اُس گھر میں رہنے والوں کو میں ماموں جان اور ممانی جان کہا کرتا تھا۔ اُن کی ایک چھوٹی سی بچی تھی جسے وہ پیار سے [illegible] کہہ کر پکارتے۔ بالکل چینی کی گڑیا معلوم ہوتی۔ اُس گھر کی نفاست اُن لوگوں کی بلند معاشرت اور خاص معیار زندگی کی غماز تھی۔

[illegible]

[illegible]

وہاں پہنچ کر مجھے یہ تو یاد رہا کہ ہندوستان میرا وطن ہے جہاں میں نے ایک
مسلم ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں لیکن یہ بھول گیا تھا جہاں مجھے شعور ملا۔ جوان ہوا لیکن
[illegible] گیا تھا مجھے کبھی یہ خیال نہ ہوا تھا کہ پچی اب نسرین بن گئی ہے۔

آسٹریلیا کے نئے ماحول نے میرے احساس کو بدل دیا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں
سکتا تھا کہ اس مشینی ملک میں پہنچنے کے بعد بھی مجھے وہ رعنائیاں نصیب ہو سکتی ہیں جو انسان
مشینی زندگی سے دور حسن و محبت کی وادیوں میں ملتی ہیں۔ وہاں میرے کان نغموں کی لے
کے عاشق ہو جائیں گے۔ میری آنکھوں میں حسین نظارے بس جائیں گے۔

سب سے بڑی مسرت اور شادمانی جو میری زندگی سے وابستہ ہوئی تھی اس کی
وجہ لینو مارک تھی۔ لینو مارک میری زندگی کی تنہا راہ میں ماہِ تمام بن کر چلی آئی تھی۔

وہ پہلا دن تھا جب میں ایک اجنبی اور جوان لڑکی کے قریب بیٹھا تھا۔ اس کی

- جہالت کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ علم کے آستانے پر اپنی پیشانی جھکا دے۔ (جمال الدین افغانی)
- دل اور زبان اگر پاک ہوں تو ان سے بہتر کوئی چیز نہیں اور اگر پاک نہ ہوں تو ان سے بدتر کوئی چیز نہیں۔ (حکیم لقمان)
- جو شخص ایمانداروں کے وجود پر یقین نہیں رکھتا وہ خود بے ایمان ہے۔ (ایک مشرقی دانشور)
- مذاق کے اچھا یا برے ہونے کا فیصلہ اس شخص کے کان کرتے ہیں جس سے وہ مذاق کیا گیا ہو نہ کہ اس شخص کی زبان جو مذاق کر رہا ہے۔ (شیکسپیئر)
- عورت کا بہترین زیور اس کی شرم اور خاموشی ہے۔ (ایمرسن)

متبسم سی نگاہوں نے مجھ پر جادو سا کر دیا تھا۔ اس دن میں نے محسوس کیا تھا کہ آج تک
میں اپنے فطری تقاضوں کا گلا گھونٹتا رہا ہوں۔

"تم انڈین ہے؟" اس نے پہلی ملاقات میں مجھ سے پوچھا تھا۔

میں حیران تھا کہ وہ ہندوستانی بھی جانتی ہے۔ پھر میں نے اس کے سوال کا جواب
دیتے ہوئے پُر اشتیاق لہجے میں پوچھا تھا۔

"تم نے ہندوستانی زبان کب سیکھی؟"

"ہم کافی عرصے تک ہندوستان رہی ہے۔" اس نے اپنی دلکش مسکراہٹیں نچھاور
کرتے ہوئے جواب دیا تھا۔

یہ بات بھی باعثِ مسرت تھی کہ وہ ہندوستان میں رہ چکی تھی۔ وہاں کے رہن سہن سے
واقفیت رکھتی تھی۔ اور ایک خاص بات یہ کہ اُسے ہندوستانی ادب سے بھی بہت حد تک دلچسپی تھی۔

ہندوستان کے شاعروں اور ادیبوں کے بارے میں [illegible]
پریم چند وغیرہ اُس کے پسندیدہ شاعر اور ادیب تھے۔ ہندوستان کے بارے میں [illegible]
ایسی باتیں بھی کہی تھیں جن کو مجھے ہندوستانی ہونے کے باوجود احساس [illegible]
وجہ تھی کہ لینو مارک میرے احساسات پر چھاتی چلی گئی۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ آسٹریلیا [illegible]
ملک نہیں ہے بلکہ میرا اپنا دیس ہے۔ لینو کی قربتوں نے مجھے [illegible]
کے بحرِ بیکراں میں ڈبو دیا تھا۔ وہ ادب اور آرٹ پر فلسفیانہ انداز میں [illegible]
آنکھوں کی وسعتوں میں محبت کی پرچھائیاں تلاش کرتے کرتے آنکھوں میں ڈوب جاتا۔ اس کے [illegible]
اردو کے شاعروں اور ادیبوں کی بہت سی ایسی تصنیفات کے نام تھیں جنہیں میں ہندوستان میں رہ کر بھی
قریب سے نہ دیکھ سکا تھا جتنا مجھے لینو مارک کے قریب رہ کر دیکھنے کا موقع ملا۔ اس طرح مشرقی اور
مغربی ادب کا لاوا میرے ذہن میں اُبلتا رہا۔ اور دل میں لینو مارک کی محبت کا دریا بہتا رہا۔ میں یہ
بھول گیا تھا کہ سائنس میرا سبجکٹ ہے۔

لینو مارک نے میرے ان خفتہ جذبات کو بہت سراہا اور مجھے نہ جانے کتنا بڑا [illegible]
سمجھنے لگی۔

ایک دن اس نے کہا تھا ——— "ڈیر نسیم! زندگی کی راہوں پر اجنبی ملتے ہیں [illegible]
کرتے ہیں لیکن بہت جلد بچھڑ جاتے ہیں۔ لیکن ہم محسوس کرتی ہے کہ تم ہم سے نہیں بچھڑ سکے گا [illegible]
یہ خیال ٹھیک ہے؟"

"یس ڈیر لینو، ہم تم سے دل کی گہرائی سے [illegible] کرتا ہے۔"

اس جواب پر لینو نے فرطِ محبت سے میرے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں [illegible]
تھا۔ اور میں زندگی کے آغاز اور انجام سے بے خبر ہو کر اُسے اپنی سمجھنے لگا تھا۔

لیکن وہ رات کتنی اُداس تھی۔

جب لینو مارک بالکل کسی ہندوستانی لڑکی کی طرح مجھ سے چمٹ کر سسک رہی تھی۔ اور
والد صاحب کا خط میرے سامنے پڑا تھا جس میں انہوں نے لکھا تھا۔

نسیم! ——— میں تمہیں جیسا انسان دیکھنا چاہتا تھا ویسا
تم نہ بن سکو گے۔ تمہارے دو بار فیل ہونے سے مجھے اندازہ لگانا پڑا ہے کہ تم اپنی
منزل کو چھوڑ کر کسی طوفان کی جانب قدم اٹھا رہے ہو۔ اس لئے میرا فیصلہ ہے
کہ تم فوراً چلے آؤ تاکہ تمہیں معلوم ہو کہ زندگی کا اصل مقصد کیا ہوتا ہے۔

ابا جان کا فیصلہ کسی پہاڑ کی طرح اٹل تھا۔ جب یہ فیصلہ لینو کو میں نے [illegible]
سنایا تھا کہ میں ایک ہی ہفتہ میں ہندوستان چلا جاؤں گا تو اس کا چہرہ مرجھا گیا تھا۔ [illegible]
اس نے کہا تھا۔

"مسٹر نسیم! ہم نے آسٹریلیا میں [illegible] کے ایک نوجوان سے [illegible]
وہ دھوکا دے کر انڈیا چلا گیا۔ ہم اس کے لئے انڈیا بھی گیا [illegible]

[illegible] کر چلا جائے گی۔ سب نے مجھے دھکا دیا۔ ہم دھوکہ کھاتی رہی۔ [illegible] ساتھ کی قسمت بگڑ گئی تھی۔ ہم دل کے ہاتھوں مجبور تھی تمہیں دل دیا۔ [illegible] دیا مانگتے ہو۔ ہماری قسمت کا کیا ہوگا لیکن ہم وہیں Promise کرتی [illegible] نہیں کرے گی۔ ہم نے قبول کیا تھا کہ تم ہمارے بغیر نہیں Love کا فیصلہ [illegible] ہے۔ تم چلا جائے گا لیکن ہم تمہیں کبھی نہیں بھولے گی ـــ نہیں بھولے گی ...... [illegible] نام کبھی نہیں بھولے گی !!"

لینو مارک کہتی رہی اور روتی رہی۔ جیسے وہ اپنے آنسوؤں میں ڈوب جانا چاہتی ہو۔

ــــــ وہ رات بھی کم طوفانی نہ تھی جب میں لینن سے دور اُس کے دیس سے دور جا رہا تھا اور مجھے اچانک معلوم ہوا تھا کہ لینن ایئرپورٹ سے واپس چلی گئی۔ ــــ اب میرے چند آنسوؤں کے سوا کوئی نذرانہ نہ تھا۔ لیکن مجھے محسوس ہوتا تھا کہ جیسے لینن میرے ساتھ کھڑی ہے اور کہہ رہی ہے۔ مسٹر نسیم! ہم تم کو مرتے دم تک کبھی نہیں بھولے گی۔

باہر اب بھی طوفانی کیفیت سارے ماحول پر طاری ہے۔ کمرے کی کھڑکیاں بھی زور زور سے ٹکرا رہی ہیں اور ٹیبل پر رکھی ہوئی شمع کی لو بھی تھرتھرانے لگی ہے لیکن میں نے اپنے ہاتھوں کے سائے پھیلا رکھے ہیں۔

معلوم ہوا ٹرین ایک گھنٹہ لیٹ ہے۔ انتظار کے لمحات گراں گزرنے لگے تو میں ویٹنگ روم سے باہر نکل آیا۔ ایک جگہ کچھ قلی دہکتی ہوئی آگ کے پاس بیٹھے اپنے سرد جسموں کو گرمی پہنچا رہے تھے۔ میں بھی اپنی شخصیت کا خیال کیے بغیر اُن کے قریب جا کر کھڑا ہوگیا۔ اور نہ جانے کیوں سوچنے لگا کہ زندگی ایک دہکتی ہوئی انگیٹھی بھی ہے اور برف کی طرح منجمد بھی۔ لیکن میری زندگی؟

ــــــ جب سے میں آسٹریلیا سے لوٹا تھا مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ میری زندگی برف کی طرح منجمد ہو کر رہ گئی ہے۔ میں نے تقریباً چار سال اپنے دیس سے دور رہ کر کیا حاصل کیا تھا؟ کیا لے کر لوٹا تھا؟ ـــــ نہیں کہہ سکتا کہ میرے پاس کیا تھا۔ لیکن ہاں جب میں نے خود سے سوال کیا تھا تو مجھے معلوم ہوا کہ میرے ہاتھ خالی تھے۔ میرا دامن سُونا تھا۔ اور جو کچھ میں لایا تھا وہ چند لمحات کی چند یادیں تھیں، چند جملے تھے جو لینن نے کہے تھے۔ کچھ آنسو تھے جو لینن نے بہائے تھے، اور ایک داغ تھا جو بہت گہرا تھا۔ لیکن یہ سب کسی کے کام کی چیزیں نہ تھیں نہ آپا جان کی آرزوؤں کی تکمیل ہو سکتی تھیں۔ میرے مستقبل کی روشنی نہ بن سکتی تھیں مجھے زندگی کی روش کو بدلنا تھا۔ وقت اور حالات کا یہی تقاضا تھا کہ سب کچھ بھلا دوں ــــ نہیں کہہ سکتا کہ میں لینن کو بھول گیا تھا یا اُس کی یاد خود ہی مجھ سے رُوٹھ کر چلی گئی تھی ــــ آسٹریلیا سے آنے کے کچھ دن بعد آپا جان نے مجھے ایک خط دیا تھا۔ وہ خط ماموں جان کا تھا جو لکھنؤ سے آپا جان کے نام آیا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا۔

بھائی صاحب! آپ کی خواہش کو میں کیسے ٹھکرا سکتا ہوں میری تو خود یہی آرزو تھی کہ نسیم اور نسرین زندگی کی شاہراہ پر شانہ بشانہ قدم اُٹھاتے آگے بڑھیں۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ نے مجھے میرا فرض یاد دلا کر شرف بخشا۔ نسرین ایم۔ اے کر چکی ہے اُس کے لیے نسیم سے بہتر لڑکا اور کون ہو سکتا ہے۔ میں بصد خلوص اس نیک کام کے لیے راضی ہوں جب آپ کہیں میں نسرین کو لے کر حاضر ہو جاؤں گا۔ کاش! اُس کی ماں بھی زندہ ہوتی۔

میں خط پڑھ کر خاموش ہو گیا تھا۔ اور آپا جان نے ممتا کے سارے خزانے مجھ پر نچھاور کرتے ہوئے کہا تھا: اچھا ہوا کہ میرا بیٹا دور دیس سے چلا آیا۔ اب گھر میں چاند سی بہو آ جائے گی۔ [illegible] آپا جان کا بھی اب دوسرا فیصلہ یہی تھا کہ جلد از جلد میری شادی کر دی جائے تاکہ میں زندگی کے اصل مقصد کو سمجھ سکوں۔ مجھے بھی غم نہ تھا کہ اب ایسی زنجیر میں قید

- جس نے اپنی حماقت کو پہچان لیا سمجھ لو اُس کے دُکھ اور مصیبت ختم ہو گئی۔ (میتھیو آرنلڈ)
- وہ انسان جو اپنی خوشیاں چھپا سکتا ہے اُس انسان کی نسبت زیادہ عظیم ہے جو اپنے غموں کو چھپا لیتا ہے۔ (لیوٹیر)
- انسان کے بنائے ہوئے قانون کے سامنے انسان کا دماغ جھک جاتا ہے اُس کی روح نہیں۔ (خلیل جبران)
- جو شخص اپنی زندگی عمدگی اور باقاعدگی سے بسر کرتا ہے اُس کی مثال پھل دار درخت کی ہے ورنہ وہ گویا خاردار جھاڑی ہے۔ (فرینکلن)
- عورت کا محبت بھرا دل دنیا میں سب سے بڑی شے ہے۔ (لوتھر)

ہو کر رہ جاؤں گا کہ پھر آزادی ناممکن ہے۔ بلکہ مجھے خوشی تھی کہ میری مُردہ آرزوؤں کو پھر نئی زندگی ملنے والی ہے۔

اور اسی لیے میں نئے جذبات لیے پلیٹ فارم پر ماموں جان اور نسرین کا منتظر تھا۔ کہ آنے والی ٹرین اندھیرے کے لیے اپنے ساتھ اُجالا لائے گی۔ اجنبی آواز پھر کانوں میں شہد بھرے گی۔ پھر دل کے ویرانہ میں بہار آ جائے گی ـــــ لینن آرزوؤں کے داغ دے کر محبت کا ساتھ چھوڑ گئی تھی لیکن نسرین ایک بے داغ کلی ہوگی۔ میرے اپنے چمن میں مسکراتی ہوئی۔

میں سوچتا رہا اور خیالی تصویروں میں نئے نئے رنگ بھرتا رہا ـــ اچانک خیال آیا ـــ لیکن میں نسرین کو کیسے پہچان سکوں گا۔ اور نسرین بھی مجھے کیسے پہچان سکے گی کہ میں ہی وہ شخص ہوں جو خزاں آشنا ہونے کے بعد پھر پُر بہار ہے اور اُس کے قدموں میں تازہ پھول بکھیر دے گا لیکن ـــــ میں نسرین کو نہ پہچان سکا تو ـــ ماموں جان کو ضرور پہچان جاؤں گا ـــ مگر ہاں یاد آیا ـــ

تو جان نے ایک دن کہا تھا کہ وہ میری ہر بات مانتی ہے ایک بار نسرین کو ساتھ لیکر ادھر آ چکے ہیں۔
تو جان نے نسرین کے چہرے کی تعریف کی تھی، بڑی بڑی غزالی آنکھیں بھرے بھرے رخسار متناسب نقش و نگار ۔۔۔۔ یہی وہ لڑکی نسرین ہوگی، لیکن ایسی تو بہت سی لڑکیاں ہو سکتی ہیں۔
میں یہی قیاس آرائیاں کر رہا تھا کہ ٹرین آ گئی۔

میری پُر اشتیاق نظریں نسرین کو تلاش کر رہی تھیں۔ اچانک میری نظر میں ایک مناسب قد والی لڑکی پر ٹھہر گئیں جو کسی کے اترنے کا انتظار کر رہی تھی۔ "نسرین!" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ہاں یہی نسرین ہے میں اُسکے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ ایک لمحہ سوچا۔ کوئی غیر تو نہیں۔ لیکن جب اُس نے مجھے دیکھا تو اُس کی آنکھوں میں اجنبیت کے سائے پھیلے ہوئے تھے۔
یہ لڑکی نسرین نہیں ہو سکتی۔ وہ یقیناً مشرقی تہذیب کے نقاب میں چھپی ہوگی۔ میں آگے بڑھ گیا۔ کوئی ایسا وجود نظر نہ آیا جس پر مجھے یقین ہوتا کہ وہ نسرین ہے۔ میں مضطرب سا ہو گیا تھا اور میری بے چین نظریں اب بھی چاروں طرف دوڑ رہی تھیں۔
اچانک ہی ایک باوقار آدمی ہنستا ہوا میرے قریب آکر بولا۔
"ارے بیٹا نسیم تم مجھے نہیں پہچان سکے۔ اتنی جلد بھول گئے؟"
اور دوسرے لمحے میں ماموں جان کے سینے سے چمٹا ہوا یہ اندازہ لگا رہا تھا کہ ان کے دل میں میرے لئے کتنی جگہ ہے۔ آگے قریب ہی کھڑی ایک لڑکی مجھے استعجاب بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ جیسے اُس نے پہلے بھی مجھے کہیں دیکھا تھا ۔۔۔ کہاں دیکھا تھا؟ یہی یاد کرنے کے لئے جیسے حافظہ پر زور ڈال رہی تھی۔ یہ وہی لڑکی تھی جسے میں پہلے نسرین سمجھ بیٹھا تھا لیکن اب یقین ہو گیا تھا کہ یہی وہ نسرین ہے۔ میرے خیالوں سے بھی کہیں آگے میرے تصورات سے بھی کہیں زیادہ خوبصورت! میں نے اُسے ایک نظر دیکھ کر یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ حسن جس پیکر کو میں اپنی نظموں، غزلوں اور فن کی روح تصور کرتا رہا ہوں وہ اُس سے بھی کہیں زیادہ حسین ہے!
برق ایک بار پوری قوت سے کوندی اور آسمان کے سینے پر لہراتی چلی گئی۔
اور میں ڈائری کے اوراق اُلٹتا رہا۔
۔۔۔۔۔ میں محسوس کرنے لگا تھا کہ میری بے کیف اور بے نور زندگی میں پھر اُجالے پھیل گئے ہیں۔ میں ان خیالات سے دور تھا کہ نئی زندگی کی یہ نئی کروٹ اتنی روح پرور ہوگی کہ ماضی کا ہلکا سا عکس بھی دل پر نہ رہے گا۔ میرے فطری ذوق کو ایک اچھوتی تازگی مل جائے گی۔ اور وہ سب کچھ بھی ملنے کی توقع ہوگی جس کے لئے ابا جان مجھے سول سرجن یا انجینئر بنانا چاہتے تھے۔ یہ سن کر میں حیران تھا کہ ماموں جان کی لکھنؤ جیسے شہر میں دو کوٹھیاں ہیں۔ وہ محکمہ جنگلات کے ایک بڑے آفیسر ہیں۔ تقریباً ایک ہزار روپیہ مہینہ کی آمدنی ہے۔ مجھے اپنی قسمت پر فخر ہونے لگا تھا کہ ماموں جان نے مجھے بیٹا کہہ کر سینے سے لگا لیا تھا ۔۔۔ اب مجھے اور ابا جان کو کس بات کی کمی تھی۔ امی جان کی خواہش تھی کہ چاند کی طرح خوبصورت اور کلی کی طرح پاکیزہ بیوی اُن کے گھر کو جنت بنا دے گی۔ وہ خواہش بھی پوری ہونے والی تھی۔ اور میں اُن لمحوں کا شدت سے انتظار کر رہا تھا جب ایک رات میری قسمت کے دروازے پھر کھلیں گے۔ اُس رات کا مجھے اتنی ہی شدت سے انتظار تھا جتنی شدت سے ایک بچے کو دن نکلنے کا اور ایک مسافر کو منزل کا انتظار ہوتا ہے۔
میں نے ڈائری کا ورق پھر اُلٹا۔
اُس صفحہ پر لیتھو مارک کی ایک تصویر تھی جو میں نے آسٹریلیا سے فکر کرتے ہوئے بنائی تھی۔ اس کے چہرے پر میں نے کئی زخموں کے نشان نہ جانے کیوں بنا دئے تھے۔
پھر ایک ورق اور اُلٹا۔
یہ نسرین کی تصویر ہے ۔۔۔۔ جو ایک بے داغ کلی تھی۔
میرے لرزتے کانپتے ہاتھوں نے ایک ورق اور اُلٹ دیا۔
یہ ایک خط ہے۔

ڈیر جاوید!

تم سے بچھڑنے کے بعد جو دن اور جو لمحے میں نے یہاں گزارے ہیں، وہ میرے قلب و جگر پر پتھر کی طرح بھاری تھے لیکن ۔۔۔ اُس وقت میں مجبور تھی ورنہ تم سے ملنے ضرور آتی لیکن یہاں بھی تمہاری یاد سے فرصت کہاں ملی یہاں ایک عجیب انسان سے واسطہ پڑا۔ کہہ نہیں سکتی کہ ابا جان نے اس بدھو میں کونسی خوبی دیکھی تھی جو اس کے ساتھ میری شادی کرنے پر رضامند ہو گئے۔ آسٹریلیا جیسے ملک میں رہ کر بھی تمیز نہیں سیکھی۔ آج تک اُس سے بات کرنے میں لطف نہ آیا جب بھی بات کرتا ہے جیسے کنویں میں ڈوب جاتا ہے۔ بے حد سنجیدہ ہے۔ اور مجھے سنجیدگی سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ادب اور آرٹ سے حضرت کو کافی دلچسپی ہے۔ اور مجھے صرف آرٹ سے دلچسپی ہے اور وہ بھی اسلئے کہ تم ایک آرٹسٹ ہو۔ تمہاری شوخیاں مجھے کتنی پسند ہیں۔ لیکن جب اُس کی صورت دیکھتی ہوں تو میرا موڈ بگڑ جاتا ہے اور یقین جانو کہ مرد کے بارے میں میرے خیالات یکسر بدل جاتے ہیں اور سوچنے لگتی ہوں کہ دنیا میں کوئی شے قابلِ نفرت ہے تو وہ صرف مرد کی ذات ہے لیکن ڈیر! جب چاند پر نظر پڑتی ہے تو اُس میں تمہارا چہرہ نظر آتا ہے ۔۔۔ میں نے ابا جان سے کہہ دیا ہے کہ میں نسیم سے شادی نہیں کروں گی اُس سے تو ہمارا ملازم محمود بھی اچھا ہے۔ میں نے تمہارے بارے میں بھی ابا جان کو سب کچھ بتا دیا ہے پہلے تو انھوں نے میرے خیال سے اتفاق نہیں کیا لیکن میرے آنسوؤں اور سسکیوں نے اُن کے دل کو موم کر دیا۔ اور اس رشتے سے صاف صاف انکار کر دیا۔ اس خط کی ایک کاپی حضرت نسیم بدھو صاحب کے پاس بھی پہنچ چکی ہے۔ دیکھئے کیا ردعمل ہوتا ہے وہ رود او وہیں آکر بتاؤں گی۔ اس ہفتے میں ہم لکھنؤ پہنچ رہے ہیں۔ پلیٹ فارم پر میری نگاہیں تمہاری مشتاق رہیں گی ۔۔۔۔ تمہاری ۔۔۔۔ نسرین

برق پھر شدت سے کوندی جیسے آسمان کے سینے کو چیرتی چلی گئی ہو۔ بارش کے پانی کے ساتھ ہوا کا ایک تیز جھونکا کمرے میں آیا۔ کھڑکیاں جھنجنائیں۔ شمع کی لو تیزی سے تھرتھرائی ۔۔۔۔ اور پھر دور تک مہیب اندھیرا تھا ۔۔۔!

غزل

الطاف مشہدی

اک صحیفہ ہے اک کتاب ہے یہ
نام کو ساغرِ شراب ہے یہ

وہم ہے خوف ہے خدا ہے وہ
حسن ہے جام ہے رباب ہے یہ

اک تجلی کرے کہیں جس کو
بارگاہوں کا آفتاب ہے یہ

سیمگوں سیمگوں جبینوں پر
عنبریں عنبریں سحاب ہے یہ

اُن سے مل کر جو زخم ہاتھ لگا
اک مہکتا ہوا گلاب ہے یہ

چاند تاروں پہ لڑکھڑاتا ہے
آدمی صاحبِ شراب ہے یہ

مست و سرشار و خوش خیال الطاف
بالیقیں شاعرِ شباب ہے یہ

ایڈیٹر "خلوص" بلاک نمبر ۱۸ سرگودھا (پاکستان)
۲۰ جون ۱۹۶۴ء

برادرِ محترم! سلام خلوص و محبت

افسانہ نمبر کی دو کاپیاں موصول ہوئیں۔ ایک رجسٹرڈ پوسٹ سے اور ایک عام ڈاک سے۔ شکریہ ادا کرنا تو یقیناً آپ کے خلوص کی توہین ہے۔ آپ کی محبت تو آسمانی محبت ہے۔ دنیا میں اس کی مثال کہاں۔ یہ افسانہ نمبر افسانوی شہزادیوں کی طرح بے حد دلکش و دلفریب ہے۔ جوگیش کرشن چندر، نریش کمار شاد، ڈاکٹر عندلیب شادانی، کنہیا لال کپور، جمیل مظہری، راجہ مہدی علی خاں اور کشمیری لال ذاکر کی تحریریں بے حد پسند آئیں۔ یوں تو افسانہ نمبر کے تمام مضامین نظم و نثر مثالی ہیں۔ لیکن مندرجہ بالا فنکاروں نے تو خصوصاً اپنے محبوب بیسویں صدی کو اپنے شاہکار فن پاروں کے عقیدت مندانہ پھول نذر کئے ہیں۔ آپ کی خدمت میں عریضۂ محبت رقم کرتے وقت خدا جانے کتنی ہی کتنی دلنواز یادیں سامنے آ کھڑی ہوتی ہیں۔ کشمیری لال ذاکر کا ذکر آیا تو اُن کی انسان دوستی کا ایسا واقعہ ذہن و دل کی وسعتوں پر ابھر آیا۔ جو عمر بھر نہ بھول سکے گا۔ قیامِ پاکستان سے پہلے جموں میں اکثر مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ قیس شیروانی اور کشمیری لال ذاکر ان تقریبات کی روحِ رواں تھے۔ تقسیم سے بہت پہلے کا ذکر ہے کہ مجھے ایک مشاعرہ میں شمولیت کی دعوت موصول ہوئی۔ مگر جموں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ مشاعرہ بوجوہ معرضِ التوا میں پڑ گیا ہے۔ میں لوٹنے والا تھا کہ دوستوں نے روک لیا اور دوست احباب کی قیام گاہوں پر مشاعروں کی محفلیں منعقد ہونے لگیں۔ صبح کہیں شام کہیں۔ میں اسی دوران میں میعادی بخار کا شکار ہو گیا اور دل کے دوروں نے اور بھی حالت تشویشناک بنا دی۔ کچھ دن تو میرا قیام ایک بیٹھک میں رہا جو شاید شعرا کے لئے مہمان خانہ کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ مگر جب میرے میزبان میری حالت سے مایوس ہو گئے۔ اور تھک بھی گئے تو کشمیری لال ذاکر مجھے اٹھا کر اپنے گھر لے آئے۔ ذاکر کی شادی انہیں دنوں ہوئی تھی۔ بھابی کے ہاتھوں کی مہندی ابھی بالکل تر و تازہ تھی اور عروسانہ کروفر ابھی پوری طرح موجود تھا۔ جب ذاکر بھائی میری سانس لیتی ہوئی نعش کو اٹھا کر اپنے گھر لے گئے تو عالم یہ تھا کہ ڈاکٹر کا جو نسخہ مجھے استعمال کرایا جاتا۔ فوراً حلق سے باہر آ جاتا اور میں بیہوش ہو جاتا۔ لیکن جب کبھی چند لمحوں کے لئے ہوش میں آتا تو یہ منظر دیکھ کر انسانی اخلاق کا ایک بلند مقام میری آنکھوں میں اُجاگر ہوا تھا کہ بھابی اپنے مہندی رنگے ہاتھوں سے میرا کمرہ صاف کر رہی ہیں اور ذاکر بھائی رات رات بھر پاؤں داب رہے ہیں۔ زندگی میں ساتھیوں کے پیار اور خلوص نے اکثر متاثر کیا۔ مگر ذاکر کا ذکر ایک جداگانہ حیثیت رکھتا ہے اور میں جب تک زندہ ہوں۔ کشمیری لال ذاکر کی محبت میری دنیائے تصور کو تاباں و درخشاں رکھے گی ——— میں شرمندہ ہوں کہ مجھے خط کے آغاز ہی میں اس سانحۂ عالمگیر کا ذکر کرنا تھا جس نے انسانیت کی تابناک پیشانی پر ظلمتوں کو پوری شدت کے ساتھ مل دیا ہے "آہ جواہر لال نہرو" انسانیت کی سربلندی کا واحد نقیب و داعی جا رہا۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا کے لئے امن کا دیوتا اور دہشت و بربریت کا قاتل۔ جو انسانیت کی تکمیل کو ادھورا چھوڑ کر چلا گیا۔ ہمیشہ کے لئے کبھی واپس نہ آنے کے لئے۔ آہ!

زخم انسانیت کے چہرے پہ — پھول کی طرح مسکراتا ہے
کون انساں کو ظلمتیں دے گا — مجھ کو اکثر خیال آتا ہے

آپ کا بھائی
الطاف مشہدی

It's love at first sip !

موہنز

جنجر ٹانک

ایک حیرت انگیز پینے کی چیز - جس سے
آپ کی بھوک بڑھتی ہے -
قوتِ ہاضمہ مضبوط ہوتی ہے -
اور کھانے کی رغبت بڑھتی ہے -
معدہ کے جملہ امراض میں اس کا
استعمال ایک یقینی علاج ہے -

گولڈ کائین

سیبوں کا
اصلی رس

عمدہ ترین سیبوں سے تیار شدہ
گولڈ کوئین خوش ذائقہ اور صحتمند
ڈرنک ہے - جو ہمیشہ آپ کو
پُرسکون اور تازہ رکھتا ہے
ایک بار کا ذائقہ آپ کو ہمیشہ
کے لئے گرویدہ بنا دے گا -

ڈائر میکن بریوریز لمیٹڈ

قائم شدہ ۱۸۵۵

موہن نگر ، غازی آباد (یو پی)

افسانہ

پرستش

حنیف چودھری

کچہری روڈ، ملتان (مغربی پاکستان)

۲۸، مئی ۱۹۶۴ء قبلہ خوشتر صاحب! سلام مسنون

... تمت کے بعد آپ کے حضور میں ایک افسانہ "پرستش" لے کر آیا ہوں۔ افسانہ کے بارے میں میں خود کیا عرض کروں۔ آپ کی بلند نگاہیں ہی بتا سکیں گی کہ افسانہ کیسا ہے ——— "بیسویں صدی" کا حسنِ طباعت اور حسنِ ترتیب ہی محویت بنا دیتا ہے افسانے تو پھر پڑھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ پاکستان میں "بیسویں صدی" کے معیار کا شاید ہی کوئی صحیفہ ہو۔ اس لئے اس میں لکھتے وقت بڑی سوجھ بوجھ سے کام لینا پڑتا ہے ...

نیاز آگیں ——— حنیف چودھری

پگھلے ہوئے موم کے سے شفاف آنسو اُس کی آنکھوں سے رخساروں پر ڈھلک آئے جو رخساروں کی قدرتی سُرخی میں سفید کی بجائے گلابی معلوم ہو رہے تھے۔ اُس نے میز سے رومال اُٹھا کر انھیں پونچھ ڈالا۔ اور ایک نظر اُس لفافے پر ڈالی جو ابھی ابھی ڈاک سے ملا تھا۔ جس میں اُس کے شوہر پرویز کے اچانک حادثے کی خبر تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ پنکھ لگا کر فوراً پرویز کے پاس پہنچ جائے ——— ابھی! اور اُس کی گود میں سر رکھ کر روئے اور پوچھے کہ وہ کس طرح حادثے کی لپیٹ آگئے؟ انھیں زیادہ چوٹیں تو نہیں آئیں؟ وہ اُن کے پاؤں دباتے ہوئے خدا سے دعا کرے کہ اُن کی بجائے وہ حادثے کا شکار ہو جاتی! ابھی تو اُس کے کانوں میں سہاگ کی شہنائیوں کے گیت بھی مدھم نہ ہوئے تھے۔ ابھی تو وہ ان گیتوں کا خمار محسوس کر رہی تھی۔ اگر وہ کسی امیر گھرانے کی لڑکی ہوتی تو کبھی ملازمت نہ کرتی۔ اور ملازمت کی آہنی زنجیریں اُسے پرویز سے دور نہ کر سکتیں۔ اُس کے سامنے پرویز کا مستقبل مسکرا رہا تھا۔ وہ اُس مسکراہٹ کی روشنی میں پرویز کی جُدائی کے اندھیروں کو بھی منور محسوس کر رہی تھی۔

وہ سوچتی رہی کہ اب اُسے کیا کرنا چاہیئے؟

سوچ نے اُس کے ذہن کو آتش کدہ بنا دیا۔

اُس کے خیال جلتے رہے!

اُس کا سارا جسم جلتا رہا!!

وہ منیجر چُگ مانک جی انشورنس کمپنی میں ٹائپسٹ تھی۔ اُسے یہاں ٹرانسفر ہو کر آئے ایک ہفتہ بھی نہ ہوا تھا کہ اس حادثے کی خبر پا کر پھر اچانک جانا پڑ گیا۔ اُسکی کولیگ مس مسرت بھی رخصت پر تھی اور صاحب بھی دورے پر تھے۔ ورنہ وہ سارا کام ہی مسرت کے سپرد کر کے فوراً واپس گھر چلی جاتی۔ اب وہ کیا کرے؟ وہ سامنے رکھے ہوئے ٹائپ رائٹر بکھرے ہوئے کاربن اور بوسیدہ فائلوں کو دیکھ کر اس طرح محسوس کرنے لگی جیسے وہ خود بھی ایک کرم خوردہ فائل کا ورق ہو گھسے ہوئے کاربن کا ٹکڑا ہو اور "رائٹنگ ٹی رائٹر" کا ایک پرزہ ہو جو چند سال بعد بے کار ہو جائے گا۔ بار بار اُس کے خیالوں میں پرویز کی پرچھائیں اُبھر آتی اور اُس کے سرخ رخساروں سے ڈھلکتے ہوئے آنسو سُرخ قمیص کے دامن میں گر کر لہو رنگ بنتے جا رہے تھے۔ اُس کے بال پنکھے کی ہوا سے بے ترتیب ہو کر اُس کی پیشانی اور گالوں پر اُتر آئے تھے۔ روتے روتے ناک کی نوک ہونٹوں کی مانند سُرخ ہو گئی تھی۔

وہ سوچ رہی تھی کہ اب کیا کرے؟

پھر اپنا بوجھل سر ٹائپ رائٹر کے "بار" پر رکھ کر سسکنے لگی۔

اور جب سوچ کی سب راہیں اندھیروں میں ڈوب گئیں اور اُسے اُمید کی روشنی کہیں نظر نہ آئی تو اپنا سارا کام چھوڑ کر اپنے فلیٹ میں آگئی۔ بغیر اجازت! کسی کو بتائے بغیر!!

رات کے بارہ بج گئے۔ سارا فلیٹ چاندنی کا کفن اوڑھے اُونگھ رہا تھا۔ نیند اُس کی پلکوں میں کسمسا رہی تھی لیکن سوچ کے نوکیلے کانٹے اُسے سونے نہ دیتے تھے۔ وہ سوچ کی پُرپیچ راہوں پر چلتی اور اندھیروں کے جزیروں میں گُم ہو جاتی۔ جب وہاں اُسے کچھ سجھائی نہ دیتا تو گھبرا کر فوراً لوٹ آتی۔

رات کے الاؤ جلتے رہے۔

وہ جاگتی رہی لیکن خیالات کے تاج محل میں کہیں روشنی نہ پا سکی۔
صبح وہ دیر سے اٹھی۔ طبیعت مضمحل تھی اس لئے دفتر بھی لیٹ پہنچی۔ جب وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئی تو اپنی سیٹ پر مس مسرت کو بیٹھے پا کر ایک گونہ طمانیت سی ہوئی کہ آج وہ مس مسرت سے مشورے سے رخصت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ اور کبھی نہ کسی طرح ضرور پرویز کے پاس پہنچ جائے گی۔ مس مسرت کاغذ ہاتھ میں لئے پڑھنے میں منہمک تھی۔ اُس نے اُس کے قریب جا کر آہستہ سے اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ انہماک کی وادیوں سے چونک گئی۔ اور سر اُٹھا کر اوپر دیکھا۔
"ہیلو شہناز! آج لیٹ آئی ہو؟"
جواب دینے کی بجائے شہناز شاخ سے ٹوٹے ہوئے زرد پتے کی مانند کرسی پر گر پڑی۔ مس مسرت نے جواب نہ پا کر شہناز کے چہرے کو بغور دیکھا۔ سوجی ہوئی آنکھیں اُترا ہوا چہرہ، بجھے بجھے نقوش اور پریشان بال دیکھ کر مضطرب ہو کر پوچھا۔
"شازی! کیا بات ہے خیر تو ہے؟"
اور جواب میں شہناز نے پرویز کا لفافہ آگے بڑھا دیا۔ اور خود آنکھوں میں اُمڈتے [illegible] آنسوؤں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔
مس مسرت خط پڑھ کر ایکدم بجھ سی گئی۔ اُس کی سرمگیں آنکھوں کی چمک دھندلا گئی۔ اور گمبھیر آواز میں بولی۔
"تمہیں تو فوراً چلے جانا چاہئے تھا۔"
"لیکن صاحب یہاں نہ تھے۔" جیسے کہیں دُور سے آواز اُبھری۔ اور ڈوب گئی۔
پھر مس مسرت کاغذ ہاتھوں میں لئے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔
شہناز ایک بار پھر سوچ کے اتھاہ سمندر میں ڈوب گئی۔
آنسوؤں کا آبشار پھر خشک رخساروں پر لکیریں بکھیرتا ہوا دامن میں جذب ہو گیا۔
اب اُس نے دل میں تہیہ کر لیا کہ اُسے فوراً نوکری چھوڑ کر چلے جانا چاہئے۔ اُس نے پرس سے پین نکالا۔ اور کاغذ پر استعفیٰ لکھنے لگی۔ لکھتے لکھتے اُس کے ذہن میں پرویز کے الفاظ گونجنے لگے۔ "جب تک میں ایم بی بی ایس نہ کر لوں اُس وقت تک تم میرا ہاتھ بٹاؤ شہناز! والدین جہاں تک مجھے تعلیم دلوا سکتے تھے اُنھوں نے دریغ نہیں کیا۔ اب ہم دونوں مل کر خود اپنے مستقبل کے خوشنما تاج محل کو مکمل کریں گے۔ میں پارٹ ٹائم کام کر کے خود اپنے اخراجات پورے کروں گا اور تم اپنے والدین کو سہارا دو۔ میں جانتا ہوں کہ تمھیں اِس راہ میں مشکلیں بھی پیش [illegible]

میں ہو ــــــ وہ شادی کے بعد پہلی بار میکے گئی تھی [illegible] گزر چکا ہے دُور ہوتے ہوئے صرف پرویز کی خاطر ــــــ اُس کے [illegible]
اب حادثے کی دل خراش خبر نے اُس کے دماغ کی تمام رگوں کو [illegible] حالت میں پرویز سے کس طرح دُور رہ سکتی ہے جو ضرور جائے گی۔۔۔
اُس نے یہ سوچ کر استعفیٰ لکھا کہ نوکری تو پھر بھی مل سکتی ہے۔ [illegible]
اُس نے استعفیٰ بوڑھے ہیڈ کلرک کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔
"میرے گھریلو حالات کچھ ایسے ہیں کہ میں فوراً گھر جانا چاہتی ہوں۔"
"ہمیشہ کے لئے؟" بوڑھی آنکھیں حیرانی سے پھیل گئیں۔
"جی نہیں۔"
"تو پھر آپ چھٹی کیوں نہیں لے لیتیں؟" اور ہیڈ کلرک نے عینک درست کرتے ہوئے شہناز کو بغور دیکھا۔
"صاحب دورے پر ہیں جانے کب لوٹیں۔"
یہ کہتے کہتے شہناز کی آواز بھرا گئی۔ اور آنکھوں میں آنسوؤں کے طوفان اُمڈ آئے۔
"تین دن بعد تو ضرور آ جائیں گے۔ پھر چلی جانا۔"
"لیکن میں آج ہی جانا چاہتی ہوں۔ چاہے کچھ بھی ہو۔"
شہناز اپنے آنسوؤں کو نہ چھپا سکی اور دو آنسو اُس کے رخساروں سے ڈھلک کر فرش پر گر پڑے۔
بوڑھا کمزور دل ہیڈ کلرک اِن آنسوؤں کی تاب نہ لا سکا۔ فوراً کرسی سے اُٹھا اور مشفق ہاتھ شہناز کے سر پر پھیرنے لگا۔ "کیا بات ہے بیٹی؟ کسی نے کچھ کہا ہے؟ مجھے بتاؤ!"
اور سسکتی شہناز نے پرویز کا خط آگے بڑھا دیا۔
خط پڑھ کر واپس کرتے ہوئے اُنھوں نے کہا۔
"واقعی آپ کو جانا چاہئے۔ مگر صاحب کی عدم موجودگی میں میں چھٹی دینے کا مجاز نہیں ہوں۔"
"لیکن آج میں ضرور جانا چاہتی ہوں۔ ہر قیمت پر۔۔۔ [illegible] خط۔۔۔ مجھے تو اُسی وقت جانا چاہئے تھا۔"

گُل و قند

م۔ش۔ عالیؔ بی۔ اے

۹۹۔ ٹوپ محلہ، ہیرآباد، حیدرآباد (مغربی پاکستان)

۲۵ مارچ ۱۹۶۲ء

محترم خوشتر بھائی! تسلیم

کئی دنوں سے حکیم جہانگیر صاحب کے ایک انشائیہ ـــــ ایک تصحیح" پر لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا عجب اتفاق ہے کہ وہی الفاظ جو میرے ذہن میں تھے نرش نگار شادؔ صاحب کے قلم سے ادا ہوتے ہیں آپ نے اور قارئین "بیسویں صدی" نے اُن کے اپریل کے شمارہ میں شائع شدہ خط سے بخوبی اندازہ لگا لیا ہوگا کہ حکیم جہانگیر صاحب کا بیان کہاں تک درست تھا۔ اس بارے میں اب کچھ تحریر کرنا مناسب نہیں سمجھتا میری گلوخلاصی تو ہو چکی ہے۔ شادؔ صاحب کا بہر حال ممنون ہوں ـــــ اِس بار آپ کی اور شائقین کی خدمت میں "گُل و قند" حاضر ہے ... آپکا ـــــ م۔ش۔ عالیؔ

سردی کا عالم

ایک بار غالبؔ کے ایک شاگرد کہیں پہاڑ پر برف باری کا منظر دیکھنے گئے۔ جب واپس آئے تو غالبؔ سے کہنے لگے: "وہاں اتنی ٹھنڈ تھی کہ موم بتی کا شعلہ منجمد ہو کر رہ جاتا تھا اور ہم پھونک مار کر بجھا نہیں سکتے تھے۔"

"یہ تو کچھ نہیں،" غالبؔ نے کہا۔ "جہاں ہم گئے تھے وہاں سردی کا یہ عالم تھا کہ الفاظ منہ سے برف کی ڈلیوں کی طرح نکلتے تھے اور ہم انھیں چمچ میں ڈال کر گرم کر کے اُن پر کان دھرتے تھے کہ کہنے والے نے کیا کہا۔"

شیطان

ایک دن داغؔ نماز پڑھ رہے تھے۔ اُن کے ایک دوست آئے اور انھیں نماز میں مشغول دیکھ کر واپس ہو لیے۔ اُسی وقت داغؔ نے سلام پھیرا تو نوکر نے بتایا "فلاں صاحب آئے تھے۔"

داغؔ نے کہا: "بھاگ کر اُنھیں بلا لاؤ۔"

نوکر اُنھیں واپس لے آیا۔

داغؔ نے پوچھا "کیوں صاحب! آپ چلے کیوں گئے؟"

وہ بولے "آپ نماز پڑھ رہے تھے۔"

داغؔ نے کہا: "ارے میاں! نماز پڑھ رہا تھا، لاحول تو نہیں پڑھ رہا تھا!"

تلخ و شیریں

دِلّی میں ایک مشہور طوائف رہتی تھی جس کا نام شیریں تھا۔ شیریں جتنی سڈول اور خوش رو تھی اُس کی ماں اُتنی ہی بے ڈول اور بدرُو۔ ایک مجلس میں شیریں اپنی ماں کے ساتھ مجرے کو آئی۔ سرسید بھی وہاں موجود تھے اور اُن کے برابر ایک ایرانی دوست بیٹھے تھے۔ وہ شیریں کی ماں دیکھ کر کہنے لگے "مادرِ شیریں بسیار تلخ است!"

سرسید نے جواب دیا "گرچہ تلخ است و لیکن بر شیریں دارد!"

حالی یا ہالی

مولانا حالیؔ ایک بار سہارنپور گئے اور وہاں ایک معزز رئیس کے ہاں ٹھہرے۔ گرمی کے دن تھے اور مولانا کمرے میں لیٹے ہوئے تھے۔ اتفاق سے ایک کسان آگیا۔ رئیس نے اُس سے مولانا کو پنکھا جھلنے کو کہا۔ وہ بیچارا پنکھا جھلنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد اُس نے اُن رئیس سے پوچھا "یہ بزرگ جو سو رہے ہیں کون ہیں؟"

رئیس نے جواب دیا "تو ان بزرگ کو نہیں جانتا؟ سارے ہندوستان میں ان کا شہرہ ہے!"

وہ کسان بولا "میں نے تو انھیں پہلی بار دیکھا ہے۔"

"ارے یہ مولوی حالیؔ ہیں۔" اُن صاحب نے بتایا۔

اُس کسان کو بہت تعجب ہوا اور کہنے لگا "جی کہیں ہالی بھی مولوی ہوسکتے ہیں؟!"

وہ کسان حالیؔ کو ہالی سمجھا جس کے معنی ہیں ہل چلانے والا۔

افسانہ

روشنی کہاں پہنچی

شکیل جاوید امروہوی

۱۲۴ گنبدی۔ امروہہ (یو۔پی)

۱۵ اپریل ۹۳ء

گرامی قدر خوشتر صاحب! تسلیم و نیاز

..." نور" کی رسید مجھے بہاؤ نہیں تھی اور چوپال صاحب کی زبانی مل گئی تھی ــــــ اور پھر اوھر آپ کا مکتوب گرامی بھی آ پہنچا

کہانی کی پسندیدگی کے لئے بہت بہت شکریہ! ــــــ اس بار "روشنی کہاں پہنچی" ارسال خدمت ہے۔ کہانی کے مرکزی خیال

کے بارے میں کیا عرض کروں؟ آپ کی فن شناس نگاہیں خود اس کا فیصلہ کر دیں گی۔ مجھے آپ کے ہر فیصلے سے اتفاق ہے۔

کسی نامعلوم شاعر کے اس شعر نے مجھے اس درجہ متاثر کیا کہ میں نے یہ کہانی تخلیق کی۔ آپ بھی سماعت فرمائیں ؎

دلوں کی بات نگاہوں کے درمیاں پہنچی
کہاں چراغ جلے، روشنی کہاں پہنچی

خلوص کار ــــــ شکیل جاوید امروہوی

یوں تو منّے کا نام سنتے ہی کچھ ہلکی سی مسرت کا احساس بیدار ہو جاتا ہے۔ لیکن میں آج بھی اتنی ہی مصروف تھی اور ایک لمحے کے لئے بھی اپنا خیال پڑھنے کے سوا کسی دوسری طرف منتقل نہ کر سکتی تھی۔ مسلسل لکھتے رہنے سے انگلیاں درد کرنے لگی تھیں۔ آنکھوں میں ہلکی ہلکی چبھن اور سر میں درد ہونے لگا تھا۔ لیکن "ہوم ورک" تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ اور کام بھی اتنا ضروری کہ اگر پورا نہ کیا جاتا تو بس شامت آجاتی۔ پروفیسر رضوی کوئی بہانہ سننے کو تیار نہیں۔ میں اپنے کام میں ہمہ تن مصروف تھی۔ یکایک پشت کی طرف سے کسی نے اپنے ہاتھوں سے میری آنکھیں بند کر لیں۔ خوف کے مارے قلم ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا اور دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ ایک تو کام کا بوجھ اور اوپر سے یہ نازیبا حرکت۔ دیکھے بغیر کسی کو برا بھلا کہنا بھی تو اچھا نہیں۔ میں آنکھیں بند کرنے والے ہاتھوں کو ٹٹول کر ان کا جائزہ لینے لگی اور پھر مجھے پہچاننے میں دیر نہ لگی کہ یہ ہاتھ زہرہ کے سوا کسی اور کے نہیں ہو سکتے۔

"زہرہ! پریشان نہ کرو ابھی بہت کام باقی ہے۔ جانتی ہو اگر کام پورا نہ ہوا تو پروفیسر صاحب نہ صرف کلاس سے نکال دیں گے بلکہ فائن بھی ہوگا اور ان کی ڈانٹ الگ سننا پڑے گی۔"

زہرہ نے میرے کندھے پر ہاتھ ہٹائے اور میرے سامنے آکر میز پر ایک لفافہ ڈال دیا۔

"کوئی نیا خط ہوگا؟" کہتے ہوئے میں نے لفافہ کھولا اور آواز کے ساتھ پڑھنے لگی۔

زہرہ! ... خلوص بیکراں

تمہارا شہد میں ڈوبا ہوا خط کیا ملا جیسے میرے بے قرار دل کو تقویت سکون نصیب ہوا۔ دل میں خوشی کی شہنائیاں بجنے لگیں۔ بے چین آنکھوں میں جن سے نیند دور ہو گئی تھی صرف تمہارا حسین و جمیل پیکر رقص کرنے لگا۔ دل میں سوئے ہوئے تار جھنجھنا اٹھے۔ ہر طرف تمہاری محبت کا نغمہ ابل رہا تھا۔ تم سے مل کر جو کیفیت ہوتی ہے اس سے کہیں زیادہ تمہارا محبت بھرا خط پاکر بے قرار ہو جاتا ہوں جس کا اظہار ساحر نے اس طرح کیا ہے۔

چند کلیاں نشاط کی چن کر ــــ مدتوں محو یاس رہتا ہوں
تیرا ملنا خوشی کی بات سہی ــــ تجھ سے مل کر اداس رہتا ہوں

اچھی زہرہ! کبھی کبھی تو میں یہ سوچنے لگتا ہوں میرے پنکھ لگ جائیں اور میں پلک جھپکتے ہی تمہارے پاس پہنچ جاؤں۔ لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے احساس ہوتا ہے کہ یہ ناممکن ہے... یہ صرف میرا خیال ہے۔ تم مجبوریوں کی دیواروں کو عبور کر سکتی ہو اور نہ میں ان اونچی دیواروں کو پھاند سکتا ہوں۔ تیرے پاس نہیں

مجھے چکر دیں بھر کر اوپر اٹھا لیا۔ میں سوچ رہی تھی کہ اگر اس نے خوشی میں پاگل ہو کر ایسے ہی چکر دیا تو میری تو ہڈی پسلی ٹوٹ جائے گی۔

"بہت اہم کام کرنا ہوگا۔ یہ خط انھیں دے دینا۔" اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک تھی۔

"مگر میں۔۔۔"

"اچھا ٹھہرو۔۔۔ ایک ترکیب ہے۔"

میری بات کاٹ کر اُس نے اپنی جیب سے ایک چھوٹے سائز والا لفافہ نکالا اور میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اِس لفافہ کے اندر ایک تصویر ہے۔ اس کے ذریعہ تم انھیں پہچان لو گی۔"

اب میں مجبور تھی کوئی بہانہ اُس کے آگے نہ چل سکتا تھا۔۔۔ مجبوراً مجھے وہ تصویر والا لفافہ لینا پڑا۔ میں نے اُسے اپنی کتاب میں رکھ لیا۔ کالج جاتے ہوئے میں نے راستہ میں سوچا زہرہ کے محبوب کی تصویر دیکھوں تو وہ کیسا ہے۔ اور میں نے تصویر والا لفافہ کھول لیا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا اُس تصویر کو دیکھ کر! یہ تو وہی لڑکا عمران علی ہے جو میرے ساتھ سیکنڈ ایئر میں پڑھتا ہے۔ میں راستے بھر عمران کے بارے میں سوچتی رہی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ عمران جیسا پڑھا لکھا خوبصورت لڑکا اِس موٹی بھینس پر کیسے فریفتہ ہو گیا۔ مجھے یہ سب ایک خواب سا معلوم ہو رہا تھا۔ لیکن میں نے اپنے دل کو یہ کہہ کر مطمئن کرنا چاہا "دل ہی تو ہے"۔۔۔ اور میں سوچوں کے بھنور میں پھنسی ہوئی کالج آگئی۔

فرسٹ پیریڈ میں عمران نے کئی بار میری طرف دیکھا۔ میرے دل میں شک پیدا ہوا۔ اور میں نے زہرہ کی دی ہوئی تصویر سے عمران کو ملایا۔ وہ تصویر عمران ہی کی تھی۔

کتنے ہی ارادوں کے باوجود میں زہرہ کا خط عمران کو نہ دے سکی۔ آخر بڑی کشمکش کے بعد فورتھ پیریڈ میں گیلری سے گزرتے ہوئے عمران کو دیکھ لیا۔ یہ موقع بہت اچھا تھا۔

"مسٹر عمران!۔۔۔ یہ آپ کی کتاب۔"

میں نے بڑی جسارت سے اپنی کتاب کو عمران کی کتاب بتا کر اُسے دے دی کہیں کالج کے لڑکے اور لڑکیاں مجھ پر شک نہ کر لیں۔ اُسی کتاب کے اندر زہرہ کا خط عمران کے لئے تھا۔

"او تھینکس!" کہتے ہوئے عمران نے تیز نگاہوں سے مجھے گھورتے ہوئے کتاب لے لی۔ اچانک اُس کا ہاتھ میرے ہاتھ سے مَس ہو گیا۔ میرے جسم میں ایک بجلی سی دوڑ گئی۔ اور دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ جیسے میں چوری کرتے ہوئے پکڑی گئی ہوں!

نہ جانے کیوں تمام وقت میں عمران کے بارے میں سوچتی رہی!!

اگلے دن آخری پیریڈ میں عمران مجھے لائبریری کی سیڑھیاں عبور کرتے ہوئے مل گیا۔

"مس روفیہ تجمی!۔۔۔ یہ آپ کی کتاب۔"

اور میں نے لرزتے کانپتے ہاتھوں سے اُس سے کتاب لے لی۔ اُس کی آنکھوں میں ایک خاص چمک تھی اور اُس کے لبوں پر سدا بہار مسکراہٹ! وہ میری آنکھوں میں نہ جانے کیا ڈھونڈ رہا تھا۔ جیسے میں نے اُس کی کوئی چیز چرا کر اپنی آنکھوں میں چھپا لی تھی۔

نہ جانے کیوں مجھے اُس کا یہ انداز بہت پیارا معلوم ہوا۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ اور میں کتاب لئے مرگھٹ بدحواسی میں اُسے تھینکس بھی کہے بغیر گھر آگئی تھی میں نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔

میں چاہتی تھی کہ زہرہ کو عمران کا خط دینے سے پہلے ایک بار ضرور پڑھوں کہ اُس نے اِس خط کے جواب میں کیا لکھا ہے۔ میں نے حواس پر قابو پانے کی سعی کرتے ہوئے عمران کی دی ہوئی کتاب سے لفافہ نکالا۔ لیکن یہ کیا؟۔۔۔ لفافہ پر میرا نام تحریر تھا۔ میں نے یہ سوچتے ہوئے لفافہ چاک کر لیا کہ کیئرلیس ہونے کی وجہ سے میرا ایڈریس لکھ دیا ہوگا۔ لیکن نہیں۔۔۔ میرا خیال غلط ثابت ہوا! عمران نے خط میں مجھے مخاطب کیا تھا۔

میں نے پریشانی کے عالم میں دھڑکتے دل کے ساتھ خط کی تحریر پر نگاہیں جما دیں اور ایک بار پھر دروازے کی لگی چٹخنی کا جائزہ لیا۔

روفیہ تجمی صاحبہ!

میں تمھیں کب سے اپنے خیالوں میں پوج رہا ہوں اِس کا مجھے صحیح اندازہ نہیں، البتہ اِتنا ضرور یاد ہے کہ میں نے جب سے تمھیں دیکھا ہے اپنے دل کے نہاں خانے میں تمھاری محبت کے چراغ جلائے ہیں۔ میں نے کالج کے خوشگوار ماحول میں بارہا یہ خیال کیا کہ میں تم سے کسی طرح بات کروں لیکن اپنے شکست خوردہ خیال کو تقویت نہ دے سکا۔ آخر آج زہرہ کے سہارے میں تم سے ہمکلام ہوں۔ یہ میری خوش نصیبی ہے۔ زہرہ سے جس خیال کو لے کر میں نے محبت کا جھوٹا ناٹک رچایا تھا وہ صحیح نکلا۔ یہ میرا خیال تھا کہ میں اِس ناٹک کے ذریعہ تم تک ضرور پہنچ جاؤں گا۔

میری روفیہ! میں آج تمھیں اپنی کہہ کر یہ محسوس کر رہا ہوں جیسے کسی مصور نے قوسِ قزح کی رنگینیاں، اُفق کی سُرخیاں لے کر ایک شاہکار تخلیق کیا ہے اور وہ تخلیق میں نے حاصل کر لی ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے تم چاند ستاروں کی دنیا میں کہکشاں کی سیڑھیاں پر میرے

افسانہ

تین خط

سلام مچھلی شہری

کوارٹر نمبر ۷۹۶، سیکٹر — ۳، راما کرشنا پورم، نئی دہلی نمبر ۲۲

۱۵ جون ۶۴ء

ڈیر خوشتر!

کیسے ہو؟ "افسانہ نمبر" کے تو بہت چرچے ہیں۔ جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ کاش اُردو کے دوسرے جرائد تم سے معیاری ادبی رسالہ نکالنا سیکھ سکیں۔ خدا تمھیں اور تمھاری دولت "بیسویں صدی" کو اور بھی فروغ دے

"خوشتر" —— زندہ باد!

"بیسویں صدی" —— پائندہ باد!

تمھارا پرانا —— سلام (مچھلی شہری)

"—— تمھارا نام؟"

"زلیخا ناہید!"

"کیا چاہتی ہو؟"

"میں آپ کی تصویروں کے لئے ماڈل بننا چاہتی ہوں۔"

"لیکن اب میں نے ماڈل رکھنا چھوڑ دیا ہے۔"

"ایسا نہ کہئے محترم مصور! میں بڑی اُمیدوں کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی تھی۔"

"میں تمھارے جذبات سمجھ سکتا ہوں لیکن کیا کروں مجبور ہوں، اب تو میں پہلی سی تصویریں بھی نہیں بناتا۔"

"خدارا میری آس نہ توڑئیے، میں بھی مجبوراً ہی حاضر ہوئی ہوں۔"

"تم ابھی بہت کم عمر ہو زلیخا! یہ تمھارے پڑھنے لکھنے، کھیلنے کودنے اور ساتھ ہی گھریلو کام کاج سیکھنے کے دن ہیں۔"

"یہ میں جانتی ہوں لیکن میرے حالات کا تقاضا یہ ہے کہ میں کچھ پیسے کمانے لگوں۔"

"تو پھر تم کوئی اور کام کرو۔ دلکش تصویروں کا ماڈل بننا اچھا نہیں ہے۔"

"لیکن مجھے یہی پیشہ اختیار کرنا ہے۔"

"یہ کیوں؟"

"اس لئے کہ میں خوبصورت ہوں۔"

"شاید کسی غلط قسم کی سہیلی نے تمھیں بھڑکا دیا ہے۔ میرا کہا مانو فوراً یہ ارادہ چھوڑ دو۔"

"یقین کیجئے میں آپ کے لئے بہت مفید ثابت ہو سکتی ہوں۔"

"زلیخا! تمھارا یہ اندازِ خیال صحیح نہیں ہے۔ میں تم سے پھر کہتا ہوں تم مجھے اپنا بہی خواہ سمجھو۔"

"لیکن اس طرح میری ضرورت تو پوری نہیں ہو سکتی۔"

"تمھیں مالی مدد چاہئے، میں اس کے لئے تیار ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ تم باقاعدہ تعلیم حاصل کروگی اور سماج کے لئے اچھے کام کروگی۔"

"لیکن میں بھیک نہیں چاہتی۔"

"تم فرصت کے لمحوں میں بطور اسسٹنٹ میرے اسٹوڈیو میں کام کر سکتی ہو۔"

"کیوں؟"

"ٹھیک ہے! لیکن میری کم عمری اور میرا حسن مجھ سے کچھ اور تقاضا کرتا ہے —— خیر یہ بتائیے آپ نے ہوش ربا تصویروں کے لئے ماڈل رکھنا کیوں چھوڑ دیا؟"

"یہ سب جان کر تم کیا کرو گی؟"

"مجھے [illegible] ہوگی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں اپنا خیال بدل دوں۔"

[illegible] جانے دیا؟ اس لئے زلیخا کسی گہری فکر میں ڈوب گئی تھی۔ اُس کی آنکھوں کا جادو [illegible] تھا اور ہونٹوں کا تبسم خشک آنسوؤں میں ڈھل کر پلکوں کو چھو کر رہ گیا تھا۔
[illegible] ایک نتیجے پر پہنچ گیا۔ وہ پاس ہی رکھی ہوئی الماری کی طرف مڑا۔ اور پھر [illegible] سے تین بھرے لفافے نکال کر یہ کہتے ہوئے زلیخا کی طرف بڑھائے "یہ تینوں [illegible] بہت مختصر ہیں اور تم دس منٹ میں انھیں پڑھ سکتی ہو۔ ان خطوں سے تمھیں یہ پتہ [illegible] گا کہ میں نے ماڈل رکھنا کیوں چھوڑ دیا ہے۔"

زلیخا نے پُراشتیاق اضطراب کے ساتھ پہلا خط اٹھایا اور پڑھنے لگی۔

میرے محسن! آج میں بہت خوش ہوں۔ آپ نے واقعی مجھے نئی زندگی دی ہے ——— وہ پوز جس کے لئے میں پچھلے ہفتے تیار نہیں ہو رہی تھی، حیرتناک طور پر مقبول ہوا ہے۔ میں نے دیکھا میرے محلے ہی کے کئی لوگوں نے اُس تصویر کو اپنے کمرے کی دیواروں پر آویزاں کر رکھا ہے۔ جب عوام کا یہ حال ہے تو خواص میں تو وہ پوز اور بھی پسند کیا گیا ہوگا۔

آج میں محسوس کر رہی ہوں کہ آپ نے واقعی ٹھیک ہی کہا تھا کہ حُسن اور آرٹ کیا کچھ نہیں کر سکتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے میری دُنیا بدل گئی۔ ماں تو ہر دم میرے حُسن کی بلائیں لیتی ہے۔ وہ تو مجھے ایک سونے کی چڑیا سمجھنے لگی ہے اور ہر وقت میری صحت اور آرائش کی فکر میں لگی رہتی ہے۔ کیوں نہ ہو، میرے گھر کی غریبی اور فاقہ کشی کو، آپ کے بخشے ہوئے الہ دین کے چراغ نے یک لخت ختم جو کر دیا ہے۔

اب مجھے آئینے پر غصہ نہیں آتا۔ اب سنگھار کے لئے جب میں آئینے کے سامنے کھڑی ہوتی ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے قدرت نے زندگی کی ساری بہاریں صرف میرے لئے بنائی ہیں۔

ہاں! آج ایک نئی بات ہوئی۔ میرے مکان کے سامنے [illegible] ڈاکٹر صاحب رہتے ہیں، انھوں نے اپنے نوکر سے کہلا بھیجا کہ میرے [illegible] ٹیلیفون آیا ہے۔ گئی تو کوئی خورشید صاحب باتیں کرنے لگے۔ وہ [illegible] چاہتے ہیں کہ میں کسی دن اُن سے اُن کی فرم میں ملوں۔ وہ سونے چاندی کی ایک بڑی فرم کے مالک ہیں۔ آپ کو بتاؤں، میں نے اُن صاحب کو جواب دیا؟ میں نے بڑی بے اعتنائی سے کہہ دیا کہ "میں کسی سے نہیں ملتی۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔" اُمید ہے آپ میرے اس جواب سے خوش ہوں گے۔

اب [illegible] کیا عرض کروں۔ بس آپ کے [illegible] ہے خدا آپ کو خوش رکھے۔

آپ کی ——— ناہید

دوسرا خط پڑھنے کے لئے زلیخا کا اشتیاق کچھ اتنا زیادہ تھا کہ اُس نے لکھنے والی کے نام پر بھی غور نہیں کیا۔ مصور اُس کے چہرے کا بغور جائزہ لیتا رہا۔ اس بار [illegible] فنکار کو کچھ اس انداز سے دیکھا جیسے وہ اُس کی عظمت کا دل ہی دل میں احترام کر رہی ہو۔ پھر کسی برقی احساس کے تحت وہ دوسرا خط پڑھنے لگی۔

عظیم فنکار! زندہ باد!

میں نے ماں کے اصرار پر اپنا پُرانا مکان چھوڑ دیا ہے اور اب روپ نگر کے ایک خوبصورت فلیٹ میں آگئی ہوں۔ ماں میری تازہ پُربہار زندگی کو غریبی کے دَور کی یاد سے وابستہ نہیں رکھنا چاہتی تھی اور یہ ٹھیک بھی ہے، جب مجھے زندگی کی تمام نعمتیں حاصل ہیں تو اُن کا زیادہ سے زیادہ فائدہ کیوں نہ اُٹھایا جائے۔

"پُراسرار حسینہ" کی تصویروں کی نمائش کی انتہائی کامیابی کے لئے آپ مجھے کیوں مبارک باد دے رہے ہیں۔ نمائش کی کامیابی کا سہرا تو آپ کے سر ہے۔ نہ جانے کیوں، ان دنوں میں یہ سوچا کرتی ہوں کہ آخر آپ مجھے پردۂ راز میں کیوں رکھے ہوئے ہیں لیکن خیر، آپ جو بہتر سمجھیں۔ مجھے تو آپ کی مرضی پر چلنا ہے۔ کبھی یہ ضرور سوچئے گا کہ میں اپنے جاننے والوں کی نظروں میں تو راز نہیں رہ سکتی ——— اب تو ایسی ایسی نگاہیں مجھ پر اُٹھنے لگی ہیں کہ کچھ نہ پوچھئے۔ سہیلیاں ایسے ایسے سوالات کرنے لگی ہیں کہ توبہ ہی بھلی! ہاں، یاد نہیں آتا، میں نے آپ کو پہلے بتایا ہے یا نہیں ———

وہ میرے پہلے مکان کے سامنے جو ڈاکٹر صاحب رہتے تھے نا، انھوں نے کچھ دن ہوتے مجھے ایک مشورہ دیا تھا۔ میں خوبصورتی اور صحت کے لئے اُن کے مشورے پر عمل کرنے لگی ہوں۔ اُمید ہے آپ میرا اشارہ سمجھ گئے ہوں گے۔ لیکن یہ سوچ کر ڈرتی بھی ہوں کہ کہیں میں اس "آبِ نشاط انگیز" کی عادی نہ ہو جاؤں۔ آثار بھی اچھے نہیں ہیں۔ رات بھر جاگنا اور دن بھر سونا۔ ایک سہیلی کہہ رہی تھی کہ میں کچھ موٹی ہوتی جا رہی ہوں۔ خیر اگلی بار آپ سے ملوں گی تو اس سلسلے میں آپ کا مشورہ بھی لوں گی۔

میں نے آپ سے جن خورشید صاحب کا ذکر کیا تھا، اب وہ میرے رفیقِ خاص ہو گئے ہیں۔ اُن کا زیادہ وقت میرے ہی فلیٹ میں گزرتا ہے۔ "آبِ نشاط انگیز" کی بیماری اُن کی وجہ سے اور بھی بڑھتی

جا رہا ہے ـــــ لیکن مجھے یہ سب ماں کی وجہ سے برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔ خورشید صاحب کے حوالے سے وہ طرح طرح کے خیالی پلاؤ پکانے لگی ہیں۔ بعض دن تو ایسے بھی گزرتے ہیں جب وہ مجھے گھر گرہستی کے نقشے دکھانے میں اس طرح کھو جاتی ہیں جیسے میں سچ مچ دلہن بن گئی ہوں۔ میں بھی سوچتی ہوں کہ ماں بہرحال ماں ہے، ٹھیک ہی کہہ رہی ہے۔ آخر عورت ماں بھی تو ہوتی ہے ـــــ یہ سب سوچتے وقت میں اپنے اندر ایک لطیف سی پاکیزگی محسوس کرنے لگتی ہوں۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے فلیٹ کی بالکونی میں عشق پیچاں کی بیلیں پھیل گئی ہیں۔ موتیا کی شاخیں جھومنے لگی ہیں اور ان پر ننھے ننھے پرندے سرمدی گیت گانے لگے ہیں ـــــ لیکن شاید یاں یہی مبارک بات نہیں جیا ہتی۔ اس لئے کہ جب میں اس طرح سوچنے لگتی ہوں تو وہ خورشید کی دولت کی باتیں کرنے لگتی ہے ـــــ جہاں تک میرا سوال ہے میں اتنی خودغرض نہیں ہوسکتی۔ میں خورشید کو اپنانا چاہتی ہوں، اُسے برباد کرنا نہیں چاہتی۔ خود خورشید کا کیا خیال ہے یہ میں نہیں جانتی ـــــ اگر آپ اسے بُرا نہ سمجھیں تو میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ میں اپنے وجود کو خورشید کے وجود میں سمو بھی چکی ہوں، اس بھروسے پر کہ وہ بہرحال میرا ہے۔

میں ایک ماہ کے لئے پہاڑ پر جا رہی ہوں۔ واپس آتے ہی آپ سے ملوں گی۔

آپ کی ـــــ ناہید

مُصوّر بُت کی طرح بیٹھا تھا۔ زلیخا کی آنکھوں میں اچانک مئی جون کی دوپہریں رقص کرنے لگیں۔ لیکن یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کر رہی ہے۔ فوراً ہی سنبھل کر وہ تیسرا اور آخری خط پڑھنے لگی۔ یہ خط پڑھتے وقت اس کی آواز تھرتھرانے لگی تھی۔ تحریر یہ تھی

قابلِ فخر مُصوّر!

میں بہرحال آپ کی احسان مند ہوں۔ میں جب خوش قسمت تھی اُس وقت بھی آپ کا احسان تھا اور آج میری بربادی میں بھی آپ ہی کا احسان ہے۔ دُنیا والوں کی نظر میں تو میری بربادی کی اصل وجہ یہ ہے کہ میں زندگی میں عیش و نشاط کی غلام ہو گئی تھی۔ کچھ میری ماں کو قصوروار بتاتے ہیں اور کچھ میری بربادی کو خورشید کی خودغرضی سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن اصل وجہ آپ جانتے ہیں یا میں ـــــ اگر آپ بھول گئے ہوں تو یاد دلا دوں۔ ابھی زیادہ دن نہیں گزرے

یاد کیجئے، جب میں انتہائی پریشانی میں آپ سے منتیں کر رہی تھی کہ جس زاویئے سے بھی چاہئے، میری تصویر لے لیجئے لیکن خدا کے لئے مجھے ایک بےکار ماڈل نہ کہئے۔ تو آپ نے اپنے ہونٹوں پر ایک پُروقار تبسم بکھیرتے ہوئے بڑی بےدردی سے فرمایا تھا: "سچ کہتا ہوں ناہید! اب تمہارے کسی پوز میں بھی کوئی دلکشی نہیں پیدا ہو سکتی۔ اس لئے کہ گناہ نے تمہیں مکروہ اور فن کی لطافت کے لئے ناقابلِ قبول بنا دیا ہے۔" میں آپ کی زبان سے "گناہ" کا لفظ سُن کر کانپ سی گئی تھی۔ میرا دل بےاختیار پکار اُٹھا تھا کہ میں آپ کو آئینہ دکھاتے ہوئے بہت ادب سے یہ پوچھوں کہ گنہگار کون ہے؟ لیکن یہ سوچ کر کہ آپ بھی خورشید کا نام لیں گے، میں چُپ رہی۔ اجازت ہو تو اُس رات کا حوالہ بھی دے دوں جب آپ نے ایک شاعر کی طرح آدم کے اوّلین گناہ کو کائنات کی بہاروں کا سبب بتایا تھا۔ لیکن اب ان باتوں سے کیا فائدہ۔ مجھے برباد ہونا تھا اور ہو گئی۔ ماں بھی اپنی تمام خودغرض تمناؤں کے ساتھ آسمان پر اُڑ گئی، ڈاکٹر بھی مجھے دیکھ کر نظریں بچا جاتا ہے، خورشید تو کافی دن ہوئے یورپ سدھار گیا۔ میں اپنے اُسی پرانے مکان کی چہار دیواریوں میں چڑھتی اُترتی دھوپ سے نشیب و فرازِ ہستی کی باتیں کر لیا کرتی ہوں۔

آپ پوچھیں گے آخر یہ خط کس لئے؟ میرے محسن مُصوّر! حالات چاہے جیسے بھی رہے ہوں، میری رگوں میں ایک شریف خون ہے۔ میں کسی سے بھی آپ کا راز افشا نہ کروں گی، یہ میرا وعدہ ہے۔

اگر آپ کے دل میں میرے لئے، اب بھی کوئی جگہ ہو تو میری صرف ایک استدعا ہے اور وہ یہ کہ اب آپ اپنے فن کو زندگی کے تلخ حقائق کی عکاسی کے لئے وقف کر دیجئے۔ عورت کی عظمت کو اندر سے جھانک کر دیکھنے کی کوشش کیجئے۔ اس طرح آپ کے فن کو اور بھی عروج حاصل ہوگا۔

رہی یہ حقیقت کہ میں ایک بچی کی ماں بن گئی ہوں، تو اس کے لئے میں شرمندہ نہیں ہوں۔ ہم غریبوں میں سب کچھ چل جاتا ہے۔ کچھ دنوں تک لوگ اس کے باپ کا نام پوچھیں گے پھر خود ہی بھول جائیں گے۔

ناردرن ریلوے

نوٹس

مسافروں کی آگاہی کے لئے مشتہر کیا جاتا ہے کہ ۱۲ مئی ۱۹۶۴ء سے انڈین ریلویز ایکٹ کے موجودہ قواعد میں حسب ذیل اہم تبدیلیاں نافذ کی گئیں ہیں:

۱۔ یک طرفہ سفر کا ہر وہ ٹکٹ جس پر ریزرویشن کرایا گیا ہے کسی اور کو منتقل نہ ہو سکے گا۔

۲۔ کسی ریلوے ملازم، یا اس خصوص میں ریلوے ایڈمنسٹریشن کے مختار کردہ ایجنٹ (مثلاً تسلیم شدہ ٹریول ایجنٹ سٹی بکنگ ایجنٹ، آؤٹ ایجنٹ وغیرہ) کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے ٹکٹ فروخت نہیں کئے جا سکتے نہ کسی ریلوے ملازم یا ریلوے ایڈمنسٹریشن کے مختار کردہ ایجنٹ کے علاوہ کسی اور سے ٹکٹ خریدنے چاہئیں۔

۳۔ مندرجہ بالا قواعد میں سے کسی کی خلاف ورزی کے لئے انڈین ریلویز ایکٹ کی دفعہ ۱۴۱ کے تحت تعزیری قاعدے بنائے گئے ہیں۔

۴۔ برتھوں اور سیٹوں کے رزرویشن کے لئے موجودہ طریق کار جاری رہے گا، اور برتھ یا سیٹ کے رزرویشن کی ایک فریق سے دوسرے فریق کو منتقلی کی سخت ممانعت کی جاتی ہے۔ جب کوئی رزرویشن یا تو منسوخ کرایا جاتا یا اسے استعمال نہ کیا جائے، تو خالی ہونے والی برتھ یا سیٹ کو صرف ریلوے اسٹاف موجودہ قواعد کے بموجب دوبارہ الاٹ کر سکتا ہے۔

R. O. No. 154

میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ اب نہیں ملوں گی ــــــ خدا حافظ!

آپ کی ــــــ ناہید

زلیخا چکرا کے گرنے ہی والی تھی کہ مصوّر نے اُسے اپنی باہوں میں سنبھال لیا اور دوسرے کمرے میں پڑی ہوئی ایک مسہری پر لٹا دیا۔ ٹھنڈے پانی کے چھینٹوں سے جب اُس کی طبیعت کچھ سنبھلی تو مصوّر نے پوچھا۔

"اب کیا خیال ہے؟"

"میں تم سے اپنی ماں کا انتقام لوں گی!"

"بیٹی ــــــ!" مصوّر بس اتنا ہی کہہ سکا۔ اُسی وقت ہوا کے ایک تیز جھونکے سے اُس کے اسٹوڈیو کی تمام تصویریں زمین پر بکھر گئیں۔

غزل

سجّاد سخن

اپنے دیوانوں سے کب تک یہ حجاب آرائیاں

عام کر دو حُسنِ عالمتاب کی رعنائیاں

پھر مجھے وہ چاندنی راتوں میں یاد آنے لگے

پھر عروسِ زندگی لینے لگی انگڑائیاں

چپکے چپکے آنکھوں آنکھوں میں محبت کے سلام

اللہ اللہ یہ کسی کی حوصلہ افزائیاں

میری چشمِ شوق ہے اور کائناتِ رنگ و نور

ایک میں ہوں اور اُن کی انجمن آرائیاں

ہوش کھو کر پا لیا کیفِ محبت کا سُراغ

تیرے دیوانے سے شرمانے لگیں دانائیاں

غزل

روحی کنجاہی

ترکِ اُلفت ہو چکا لیکن یقیں آتا نہیں

تُو مجھے بھولا نہیں ہے میں تجھے بھولا نہیں

وہ ہماری زندگی اور زندگی بھی لازوال

اُس ستم گر سے ہمارا کون سا رشتا نہیں

ہم نے دیکھے ہیں تہ و بالا زمین و آسماں

کون سا عالم نگاہِ ناز کا دیکھا نہیں

سرسری سی اِک نظر اور جلوہ ہائے رنگ رنگ

آنکھ بھر کر بھی ابھی ہم نے اُسے دیکھا نہیں

سوچتا ہوں اے خیالِ یار! میری زیست کی

شام کیسے ہو گئی سورج ابھی ڈوبا نہیں

ناردرن ریلوے

نوٹس

مسافروں کی آگاہی کے لئے مشتہر کیا جاتا ہے کہ ۱۲ مئی ۱۹۶۴ء سے انڈین ریلویز ایکٹ کے موجودہ قواعد میں حسب ذیل اہم تبدیلیاں نافذ کی گئیں ہیں :

۱- یک طرفہ سفر کا ہر وہ ٹکٹ جس پر ریزرویشن کرایا گیا ہے کسی اور کو منتقل نہ ہو سکے گا۔

۲- کسی ریلوے ملازم، یا اس خصوص میں ریلوے ایڈمنسٹریشن کے مختار کردہ ایجنٹ (مثلاً تسلیم شدہ ٹریول ایجنٹ، سٹی بکنگ ایجنٹ، آؤٹ ایجنٹ وغیرہ) کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے ٹکٹ فروخت نہیں کئے جا سکتے۔ کسی ریلوے ملازم یا ریلوے ایڈمنسٹریشن کے مختار کردہ ایجنٹ کے علاوہ کسی اور سے ٹکٹ خریدنے چاہئیں۔

۳- مندرجہ بالا قواعد میں سے کسی کی خلاف ورزی کے لئے انڈین ریلویز ایکٹ کی دفعہ ۱۱۴ کے تحت تعزیری قاعدے بنائے گئے ہیں۔

۴- برتھوں اور سیٹوں کے رزرویشن کے لئے موجودہ طریق کار جاری رہے گا، اور برتھ یا سیٹ کے رزرویشن کی ایک فریق سے دوسرے فریق کو منتقلی کی سخت ممانعت کی جاتی ہے۔ جب کوئی رزرویشن یا تو منسوخ کرایا جائے یا اسے استعمال نہ کیا جائے، تو خالی ہونے والی برتھ یا سیٹ کو صرف ریلوے اسٹاف موجودہ قواعد کے بموجب دوبارہ الاٹ کر سکتا ہے۔

R.O. No.:150

صدر دہلی

میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ اب نہیں ملوں
گی ـــــ خدا حافظ!

آپ کی ـــــ ناہید

زلیخا بکھر کے گرنے ہی والی تھی کہ مصوّر نے اُسے اپنی باہوں میں سنبھال
دوسرے کمرے میں پڑی ہوئی ایک مسہری پر لٹا دیا۔ ٹھنڈے پانی کے چھینٹوں
حسن کی طبیعت کچھ سنبھلی تو مصوّر نے پوچھا۔

"اب کیا خیال ہے؟"

"میں تم سے اپنی ماں کا انتقام لوں گی!"

"بیٹی ـــــ!!" مصوّر بس اتنا ہی کہہ سکا۔ اُسی وقت ہوا کے
ایک تیز جھونکے سے اُس کے اسٹوڈیو کی تمام تصویریں زمین پر بکھر
گئی تھیں!

غزل ـــــ سجّاد سخن

دیوانوں سے کب تک یہ حجاب آرائیاں
عام کر دو حُسنِ عالمتاب کی رعنائیاں

وہ چاندنی راتوں میں یاد آنے لگے
پھر عروسِ زندگی لینے لگی انگڑائیاں

لے آنکھوں آنکھوں میں محبت کے سلام
اللہ اللہ یہ کسی کی حوصلہ افزائیاں

بزمِ شوق ہے اور کائناتِ رنگ و نُور
ایک میں ہوں اور اُن کی انجمن آرائیاں

ہوش کھو کر پا لیا کیفِ محبت کا سُراغ
تیرے دیوانے سے شرمانے لگیں دانائیاں

غزل ـــــ روحی کنجاہی

ترکِ اُلفت ہو چکا لیکن یقیں آتا نہیں
تُو مجھے بھولا نہیں ہے میں تجھے بھولا نہیں

وہ ہماری زندگی اور زندگی بھی لازوال
اُس ستم گر سے ہمارا کوئی رشتہ نہیں

ہم نے دیکھے ہیں تہ و بالا زمین و آسماں
کونسا عالم نگاہِ ناز کا دیکھا نہیں

سرسری سی اِک نظر اور جلوہ ہائے رنگ رنگ
آنکھ بھر کر بھی ابھی ہم نے اُسے دیکھا نہیں

سوچتا ہوں اے خیالِ یار! میری زیست کی
شام کیسے ہو گئی سورج ہی جب ڈوبا نہیں

افسانہ

سانپ کی من

سید یحییٰ حسن نقوی ایم۔ اے، بی۔ ٹی

محلہ گذری، امروہہ

۱۴ نومبر ۶۳ء

مکرمی خوشتر صاحب! تسلیم

بہت دنوں کے بعد "بیسویں صدی" کی بزم میں شرکت کا ارادہ کر رہا ہوں ——— میں افسانے کے بارے میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہنا چاہتا ——— قبل از وقت کچھ کہنے سے اُس کا لطف جاتا رہے گا۔۔۔

مخلص ——— یحییٰ حسن

جب میں رات کے بارہ بجے جلسے میں سے لوٹا تو بہت تھکا ہوا تھا۔ واقعی [دن] بھر بہت محنت کی تھی۔ اپنے تازہ افسانے کو ترتیب دیا۔ اسکے درمیان [ل]وں سے ملاقاتیں بھی کیں، زندگی کے روزمرہ کے فرائض بھی انجام دیے۔ [ب]معمول بچوں کو پڑھایا، اور ٹھیک آٹھ بجے جلسے میں پہنچ گیا۔ وہاں اپنا [افسانہ پڑھ]ا، اور جب میں پڑھ چکا اور جلسے کی روایات کے مطابق افسانے پر [تب]صرے ہونے لگے تو سب نے دل کھول کر مجھے داد دی۔ حاضرین میں [سے کوئی] بھی اُس کی فنی یا لفظی گرفت نہ کر سکا۔ مختلف لوگوں نے مختلف باتیں [کہیں۔ ا]یک صاحب کہنے لگے "کتنا کامیاب نفسیاتی مطالعہ ہے!" ایک دوسرے [صاحب] نے فرمایا "کردار بہت واضح ہیں اور سیرت نگاری مکمل ہے" ایک تیسرے [صاحب] نے خیال ظاہر کیا "لوگ افسانے کو حقیقت بناتے ہیں آپ نے حقیقت [کو افسا]نہ بنا دیا ہے" لیکن ایک بات پر سب ہی لوگ متفق تھے ——— کہ "افسانہ [بہت خو]ب ہے!" اِس پر میں واقعی بہت خوش تھا۔ اور رات کے بارہ بجے گھر [پہنچ کر ج]ب میں کپڑے بدلنے لگا تو میں اپنی تمام تھکن کو اُس خوشی کے نشے میں جو [مجھے افسا]نے کی کامیابی پر حاصل ہوئی تھی، اِس طرح بھول چکا تھا جس طرح کوئی [دلہن دوس]ری شادی ہوتے ہی اپنے پہلے شوہر کے غم کو بھول جاتی ہے۔

دسمبر کا پہلا ہفتہ تھا جس میں رات کے بارہ بجے عموماً خنکی ہو جاتی ہے، [د]ن میں سخت آندھی کے بعد تھوڑی سی بارش بھی ہو گئی تھی اِس لئے [خ]نکی نے خاصی سردی کی شکل اختیار کر لی تھی، چاندنی چٹکی ہوئی تھی جاڑے کے موسم کی دودھ میں دھلی ہوئی چاندنی جس کا حُسن جنگل میں ناچنے والے مور کی طرح ہوتا ہے۔ میرے کمرے کی پُشت پر کُھلنے والی کھڑکی اُس وقت کُھلی ہوئی تھی جس کے نیچے کا نصف حصہ ہمیشہ پردے سے ڈھکا رہتا تھا۔ یہ کھڑکی ایک تنگ سڑک پر کُھلتی ہے جو عام شاہراہ نہیں ہے۔ سڑک کے دوسری طرف ٹھیک میرے کمرے کے مقابل ایک کھنڈر ہے جس میں خودرو برساتی جھاڑ جھنکاڑ کا پتہ پتہ چاندنی میں نہایا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ تمام محلے کے کوڑے کرکٹ نے جس میں پڑوس کی کھنڈر ساری کی کلیوں کے ٹھیکرے بھی شامل ہیں، اِس کھنڈر کو ایک ٹیلے میں تبدیل کر دیا ہے جس پر بچوں کو آنے جانے سے اِس لئے روکا جاتا ہے کہ اُس میں کیڑے مکوڑے، سانپ بچھو، اور اِسی قسم کی دوسری خطرناک چیزیں ہو سکتی ہیں۔

میں نے کوٹ پتلون اُتار کر ہینگر پر لٹکائے اور سلیپنگ سُوٹ پہننے میں مصروف ہو گیا جو اُس زمانے میں ایک پھٹے ہوئے بنیان اور ایک میلی کچیلی تہمد پر مشتمل تھا۔ بیگم پڑی ہوئی خرّاٹے لے رہی تھیں۔ تہمد باندھنے کے بعد جب قمیص اُتارنے لگا تو معاً میری نگاہ کھڑکی سے باہر اُس ٹیلے کے ایک نقطے پر جم کر رہ گئی جو بعد[؟] چمک رہا تھا۔

"سانپ کی من!" میں چونک پڑا، اور گھبرا کر بتی گل کر دی جیسے سانپ نے مجھے دیکھ لیا ہو، اور پرنالے کے ذریعے کمرے میں گھس کر اپنی من پر نگاہ ڈالنے کے جرم میں مجھے ڈسنے والا ہو۔ کمرہ تاریک ہو گیا تو میں نے ہمت کر کے کھڑکی سے باہر

آنکھیں

وہ آنکھ چرا کے جانے والے!
ہم بھی تھے کبھی تری نظر میں ——— جلیلؔ

او چشمِ بے نیاز! ذرا دیکھ تو سہی
کیا حال ہو گیا ہے ترے مبتلا کا ——— ذکیؔ دہلوی

اُن کی مست آنکھوں کا عالم
مد میں ڈوبی برساتیں ہیں ——— ضیاؔ فتح آبادی

کیا جانئے کہ دل پہ گزرتی ہے میرؔ کیا کیا
کرتا ہے بات کوئی آنکھیں پُر آب کر کے ——— میرؔ

ستمگر آنکھ، نگہ بے قرار، چتون شوخ
تم اپنی شکل تو پیدا کرو حیا کے لئے ——— داغؔ

(مرسلہ: ست نام سنگھ مہنگاری۔ ایم۔ اے، کلکتہ)

لے کی طرف دیکھا۔ وہ نقطہ برابر چمک رہا تھا ——— انگارے کی طرح سرخ! اور
کیں اس طرح شعاعیں چھوٹ رہی تھیں جیسی کالی رات میں ستاروں سے پھوٹتی ہیں۔

"ہو نہ ہو یہ سانپ کی مَن ہے!" میں نے سوچا اور اس کے بعد وہ تمام
کہانیاں جو سانپ کی مَن سے وابستہ ہیں میرے ذہن میں گردش کرنے لگیں۔
سنے سوچا بیگم میری اس عجیب و غریب دریافت سے خوش ہو کر ضرور مجھے داد
گی" اس لئے میں نے انھیں سوتے سے جگانے کی ٹھان لی۔ لیکن ایک بار پھر
اطمینان کے لئے میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔

"یہ روشنی جگنو کی نہیں ہو سکتی!" میں نے وثوق کے ساتھ سوچا اور
کی روشنی اتنی دیر ایک ہی مقام پر تسلسل کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتی۔ جگنو ایک
سے دوسری جگہ ادھر اُدھر اُڑتا پھرتا ہے۔ اُس کی روشنی تھوڑی تھوڑی دیر بعد
ائی دیتی ہے، اُس چاند کی طرح جو رہ رہ کر بادلوں کے گھونگٹ میں اپنا منہ
پا لیتا ہے، ذرا سی دیر کے لئے منہ دکھاتا ہے، اور پھر غائب ہو جاتا ہے۔ اُس
ـ میں جو ٹیلے پر دکھائی دے رہی تھی یہ کیفیت نہ تھی۔ اس کے علاوہ جگنو برسات
پیدا ہوتے ہیں، اور برسات کے بعد اُن کا نام و نشان باقی نہیں رہتا، اور
تو نومبر کی پہلی تاریخ تھی۔ پھر یہ روشنی جو دکھائی دے رہی تھی جگنو کی روشنی
جسامت میں بھی زیادہ تھی۔ جگنو کی روشنی میں مرکری بلب جیسی نورانی کیفیت

ہوتی ہے۔ لیکن اس روشنی میں جو ٹیلے پر دکھائی دے رہی تھی یہ نورانیت نہ تھی
البتہ اتنی تیز چمک تھی کہ معلوم ہوتا تھا کوئی ستارہ آسمان سے ٹوٹ کر ٹیلے پر
آگرا ہے۔

"یہ جگنو نہیں ہے!" میں نے فیصلہ کیا اور بیگم کو سوتے سے جگا دیا۔
"ارے دیکھو یہ کیا ہے!"
بیگم گھبرا کر آنکھیں ملتی ہوئی اٹھیں۔ میں نے بازو پکڑ کر انھیں گھسیٹا
اور کھڑکی کے سامنے لا کھڑا کیا۔

"دیکھو یہ کیا چمک رہا ہے!" میں نے بے تابانہ کہا۔

"ہاں ہے!" انھوں نے نیند کے نشے میں میری تائید کی "مگر ہے کیا؟"
اُن کی سمجھ میں نہ آیا۔ انھیں اس عجیب و غریب اور انوکھی شے سے بہرحال دلچسپی
ہوئی۔ اور میں اس بات پر خوش تھا کہ انھوں نے آدھی رات میں جگائے جانے
پر مجھ سے مطلق شکایت نہ کی۔

"بلی کی آنکھ تو نہیں چمک رہی ہے!" دماغ پر کافی زور دینے کے بعد
اُن کی سمجھ میں یہی آسکا۔

"اگر یہ بلی ہے تو یقیناً کانی ہے!" میں نے مزاح کیا "پھر بلی کس قدر
سے مبتلی ہے کہ اس کی آنکھ، بشرطیکہ وہ ایک ہی آنکھ کی بلی ہے، زمین سے
بالکل متصل ہو گئی ہے۔"

"یہ بلی نہیں ہے! ——— پھر کیا ہے؟ ——— تو جگنو ہوگا!" ——— اور
ذرا سے تامل کے بعد ——— "نہیں نہیں یہ جگنو بھی نہیں ہے! ——— آہا! ———
یہ سانپ کی مَن ہے! اس کے سوا کچھ اور ہو نہیں سکتا!" انھوں نے فیصلہ کن
انداز میں اظہار رائے کیا، اور جب انھوں نے دیکھا کہ میں اثبات میں سر ہلا
رہا ہوں تو وہ پھولی نہ سمائیں جیسے سانپ کی مَن اُن کے قبضے میں آگئی ہو اور وہ
"قارون کے خزانے" کی مالک ہو گئی ہوں۔

"تو جا کر اٹھا لاؤں؟"

"ضرور!" بیگم نے ترکی بہ ترکی میرے طنز کا جواب دیا ——— "لیکن ———"
وہ کہنے لگیں "اس پر کیسے قبضہ کیا جائے؟" میں سونے کا لباس پہن چکا تھا اس
لئے مجھے وہ اس خنکی میں گرم گرم کمرے سے باہر بھیجنے کے لئے تیار نہ تھیں۔ دوسرے
سردی لگ جانے کے اندیشے کے علاوہ، سانپ کی مَن پر یونہی ایکا ایکی ہاتھ ڈال دینا
خطرے سے خالی نہیں تھا۔ سانپ کہیں قریب ہی ادھر اُدھر اُس کی تاک میں رہتا ہوگا،
اور جیسے ہی کوئی مَن اُٹھانے جائے گا سانپ جھپٹ کر اُس "کوئی" کو ڈس لے گا۔
وہ دراصل مَن اُٹھانے والے کو خود سے نسبت دینے کے لئے بھی تیار نہ تھیں۔

...ن قدرت سے سانپ آگئیں۔ وہ ایک ترحم پرست خاتون ہیں۔ معجزوں کی بہت پرست
...وہ نے، اور چھوٹے مزاروں کی بہت قائل ہیں۔ وہ سانپ کی مَن اور اُس کی افادیت
...یا مان گئی ہیں۔ اُن کا اعتقاد ہے جس کے پاس سانپ کی مَن ہوتی ہے وہ مالا مال
...ہو جاتا ہے۔

"پھر کون لائے اُٹھا کر؟"

یہ ایک ٹیڑھا سوال تھا۔ وہ سوچتی رہیں۔ اُن کی نیند رفوچکر ہو چکی تھی۔ یہ
...ب عجیب بات تھی، اُس مَن سے بھی زیادہ عجیب۔ جو ٹیلے پر دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے
...ایک ثانیے میں اُنھوں نے گرم چادر اوڑھی اور اُس دروازے سے جو اُسی
...ڑک پر باہر کی طرف کھلتا ہے باہر جانے کے لئے تیار ہونے لگیں۔

"یہ کیا کرتی ہو؟" میں نے ذرا سنجیدہ ہو کر انھیں پھر ٹوکا "جانتی ہو اِس کا
...جام کیا ہوگا؟"

"جانتی ہوں" اُنھوں نے بہت مایوسی کے عالم میں کہا "مگر پھر
...ن لائے؟"

"سانپ کی مَن حاصل کرنے کی ایک ترکیب ہے!" میں نے ٹالنے کی
...شش کی، اور اُس چمکتے ہوئے نقطے کی طرف پھر نگاہ ڈالی، اور میرے ساتھ بیگم نے بھی۔
...ل اپنی اُسی آب و تاب کے ساتھ باقی تھی۔ غالباً ہم دونوں نے ایک ساتھ سوچنا
...روع کیا ــــــ بس اب سانپ اوس چاٹ کر آجائے گا، اور اپنی مَن اپنے
...نہ میں رکھ لے گا اور ہم دونوں یونہی، بیوقوفوں کی طرح، دیکھتے کے دیکھتے
...رہ جائیں گے۔

"اچھا کیا ترکیب ہے؟" بیگم نے ہار مانتے ہوئے میری منت کی۔

"اِس کی ترکیب یہ ہے کہ ایک کوری ناند لے کر ایک ثانیے میں مَن پر
...ھک دیتے ہیں۔ وہ ناند مَن کی گرمی اور آنچ سے لال انگارہ ہو جاتی ہے۔ سانپ
...بِن چاٹ کر واپس آتا ہے تو مَن کو نہ پا کر اپنا سر ناند سے پٹک پٹک کر مارتا ہے،
...یہاں تک کہ جان دے دیتا ہے۔ لوگ دُور سے کھڑے یہ تماشہ دیکھتے رہتے ہیں، اور
...سانپ کے مرنے کے بعد مَن اُٹھا لاتے ہیں۔"

"مَن والا سانپ بہت زہریلا ہوتا ہے؟"

"ہاں!"

"اور اُس کے سر پر تاج ہوتا ہے؟"

"ہاں!"

کہیں دور سے جاگتے رہو کی بھیانک آواز نے ہم دونوں کو چونکا دیا۔
...ت کا تقریباً ایک بج رہا تھا۔ نقطہ اُسی طرح چمک رہا تھا۔ رات کا خاموش سناٹا

فسانۂ ہجر

بیقرار ہی تھی سب اُمیدِ ملاقات کے ساتھ
اب وہ اگلی سی درازی شبِ ہجراں میں نہیں ــــــ حالی

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے
ہم تو کل خوابِ عدم میں شبِ ہجراں ہوں گے ــــــ مومن

کچھ مجھ کو کیا تھا جو برسوں ہجر میں تڑپا کئے
تام سے کیا تیرا مر جانا تو کچھ مشکل نہ تھا ــــــ ناصری

خفا نہ ہو تو یہ پوچھوں اگر تیری جان سے دور
جو تیرے ہجر میں جیتا ہے مر بھی سکتا ہے ــــــ فانی

بے خبر انجمنِ ناز میں سونے والے
رات بھر تجھ کو پکارا مری تنہائی نے ــــــ آسی الدنی

تمام ماحول پر محیط تھا، اور ہم دونوں میاں بیوی سانپ، اُس کی مَن، اور اُس کے حصول کی تدابیر پر غور کر رہے تھے۔

"سنتے ہو!" بیگم نے رازدارانہ انداز میں مجھ سے کہا "ناند واند تو اس وقت ملنی مشکل ہے، بلکہ ناممکن۔ اِس وقت کمہار کہاں ناندوں کی دُکان لگائے بیٹھا ہوگا۔ لیکن یہ موقعے روز روز ہاتھ نہیں آتے۔ برسوں سے سنتے چلے آرہے ہیں کہ یہاں ایک پُرانا سانپ رہتا ہے۔ اُس کی آواز اکثر رات کو میں نے سُنی ہے۔ ہو نہ ہو یہ وہی سانپ ہے۔ اور آج معلوم ہوا کہ یہ مَن والا سانپ ہے۔ آج ہی اُس نے مَن اُگلی ہے۔ اب یہ موقع شاید ہی کبھی ہاتھ آئے۔ پھر کیا ہو اس وقت؟ دن ہوتا تو سب کچھ ممکن تھا۔ کل رات تک کیسے انتظار کیا جائے؟ کل رات کو سانپ اپنی مَن چھوڑ کر اوس چاٹنے نکلے یا نہ نکلے! ــــ مگر اِس وقت کیا کیا جا سکتا ہے؟"

بیگم جیسے عاجز آ کر مایوس ہو گئیں۔

میں نے موقعے کو غنیمت جانا۔ میں نے کہا "بھئی اب تم سو رہو۔ میں دن بھر کا تھکا ہوا ہوں۔ یہ مَن آج ہم نے دیکھ لی ہے۔ آج بہر حال یہ راز ہمیں معلوم ہو گیا، جو اب تک معلوم نہ تھا کہ ہمارا یہ پُرانا سانپ مَن والا سانپ ہے۔ ہو سکتا ہے آئندہ پھر اسی طرح وہ مَن چھوڑ کر اوس چاٹنے نکلے۔ اس لئے اس وقت صبر کرو کیونکہ صبر کا پھل ہمیشہ میٹھا ہوتا ہے۔ کل سویرے ناند وغیرہ کا انتظام کر لیں گے، اور کسی اور دن جب بھی موقع

آنکھیں

او آنکھ چرا کے جانے والے!
ہم بھی تھے کبھی تری نظر میں ——— جلیل

او چشمِ بے نیاز! ذرا دیکھ تو سہی
کیا حال ہو گیا ترے امیدوار کا ——— ذکی دہلوی

اُن کی مست آنکھوں کا عالم
مدھ میں ڈوبی برساتیں ہیں ——— ضیا فتح آبادی

کیا جانئے کہ دل پر گزرے ہے میر کیا کیا
کرتا ہے بات کوئی آنکھیں پُرآب کر کے ——— میر

شریر آنکھ، نگہ بے قرار، چتون شوخ
تم اپنی شکل تو پیدا کرو حیا کے لئے ——— داغ

(مرسلہ: ست نام سنگھ ہنکاری۔ ایم۔ اے، کلکتہ)

ہتھیلی کی طرف دیکھا۔ وہ نقطہ برابر چمک رہا تھا ——— انگارے کی طرح سرخ! اور اُس میں سے اس طرح شعاعیں پھوٹ رہی تھیں جیسی کالی رات میں ستاروں سے پھوٹتی ہیں۔

"ہو نہ ہو یہ سانپ کی مَن ہے!" میں نے سوچا، اور اس کے بعد وہ تمام قصے کہانیاں جو سانپ کی مَن سے وابستہ ہیں میرے ذہن میں گردش کرنے لگیں۔ میں نے سوچا بیگم میری اس عجیب و غریب دریافت سے خوش ہو کر ضرور مجھے داد دیں گی، اس لئے میں نے انھیں سوتے سے جگانے کی ٹھان لی۔ لیکن ایک بار پھر مزید اطمینان کے لئے میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔

"یہ روشنی جگنو کی نہیں ہو سکتی!" میں نے وثوق کے ساتھ سوچا اور جگنو کی روشنی اتنی دیر ایک ہی مقام پر تسلسل کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتی۔ جگنو ایک جگہ سے دوسری جگہ ادھر اُدھر اُڑتا پھرتا ہے۔ اُس کی روشنی تھوڑی تھوڑی دیر بعد دکھائی دیتی ہے، اُس چاند کی طرح جو رہ رہ کر بادلوں کے گھونگٹ میں اپنا منہ چھپا لیتا ہے، ذرا سی دیر کے لئے منہ دکھاتا ہے، اور پھر غائب ہو جاتا ہے۔ اُس چمک میں جو ہتھیلی پر دکھائی دے رہی تھی یہ کیفیت نہ تھی۔ اِس کے علاوہ جگنو برسات میں پیدا ہوتے ہیں، اور برسات کے بعد اُن کا نام و نشان باقی نہیں رہتا، اور آج تو نومبر کی پہلی تاریخ تھی۔ پھر یہ روشنی جو دکھائی دے رہی تھی جگنو کی روشنی سے جسامت میں بھی زیادہ تھی۔ جگنو کی روشنی میں مرکری بلب جیسی نورانی کیفیت ہوتی ہے۔ لیکن اِس روشنی میں جو ہتھیلی پر دکھائی دے رہی تھی یہ بات نہ تھی، البتہ اتنی تیز چمک تھی کہ معلوم ہوتا تھا کوئی ستارہ آسمان سے ٹوٹ کر زمین پر آگرا ہے۔

"یہ جگنو نہیں ہے!" میں نے فیصلہ کیا، اور بیگم کو سوتے سے جگا دیا۔

"ارے دیکھو یہ کیا ہے!"

بیگم گھبرا کر آنکھیں ملتی ہوئی اُٹھیں۔ میں نے بانہہ پکڑ کر انھیں گھسیٹا، اور کھڑکی کے سامنے لا کھڑا کیا۔

"دیکھو یہ کیا چمک رہا ہے!" میں نے بے تابانہ کہا۔

"ہاں ہے!" انھوں نے نیند کے نشے میں میری تائید کی۔ "مگر ہے کیا؟" اُن کی سمجھ میں نہ آیا۔ انھیں اِس عجیب و غریب اور انوکھی شے سے بہرحال دلچسپی ہوئی۔ اور میں اس بات پر خوش تھا کہ انھوں نے آدھی رات میں جگائے جانے پر مجھ سے مطلق شکایت نہ کی۔

"بلّی کی آنکھ تو نہیں چمک رہی ہے!" دماغ پر کافی زور دینے کے بعد اُن کی سمجھ میں یہی آسکا۔

"اگر یہ بلّی ہے تو یقیناً کانی ہے!" میں نے مزاح کیا۔ "پھر بلّی کس آسن سے بیٹھی ہے کہ اُس کی آنکھ، بشرطیکہ وہ ایک ہی آنکھ کی بلّی ہے، زمین سے بالکل متصل ہو گئی ہے۔"

"یہ بلّی نہیں ہے! ——— پھر کیا ہے؟ ——— تو جگنو ہوگا!" ——— اور ذرا سے تامّل کے بعد ——— "نہیں نہیں یہ جگنو بھی نہیں ہے! ——— آہا! ——— یہ سانپ کی مَن ہے! اس کے سوا کچھ اور ہو نہیں سکتا!" انھوں نے فیصلہ کُن انداز میں اظہار رائے کیا، اور جب انھوں نے دیکھا کہ میں اثبات میں سر ہلا رہا ہوں تو وہ پھولی نہ سمائیں جیسے سانپ کی مَن اُن کے قبضے میں آگئی ہو اور وہ "قارون کے خزانے" کی مالک ہو گئی ہوں۔

"تو جا کر اُٹھا لاؤں؟"

"ضرور!" بیگم نے ترکی بہ ترکی میرے طنز کا جواب دیا ——— "لیکن" ——— وہ کہنے لگیں: "اِس پر کیسے قبضہ کیا جائے؟" میں سونے کا لباس پہن چکا تھا، اِس لئے مجھے وہ اِس خنکی میں گرم گرم کمرے سے باہر بھیجنے کے لئے تیار نہ تھیں۔ دوسرے سردی لگ جانے کے اندیشے کے علاوہ سانپ کی مَن پر یونہی ایکا ایکی ہاتھ ڈال دینا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ سانپ کہیں قریب ہی اِدھر اُدھر اوس چاٹ رہا ہوگا، اور جیسے ہی کوئی مَن اُٹھانے جائے گا سانپ جھپٹ کر اُس کو ڈس لے گا۔ وہ دراصل مَن اُٹھانے والے کو موت سے نسبت دینے کے لئے بھی تیار نہ تھیں۔

[illegible] اب اُٹھیں۔ ایک تو ہم بہت خوش ہوئے [illegible] بہت پہت [illegible] اور [illegible] بہت سی [illegible] ہیں۔ وہ سانپ کی مَن [illegible] کی قدرت پر [illegible] ہیں۔ اُن کا اعتقاد ہے جس کے پاس سانپ کی مَن ہوتی ہے مالا مال ہو جاتا ہے۔

"پھر کون لائے اُٹھا کر؟"

یہ ایک ٹیڑھا سوال تھا۔ وہ سوچتی رہیں۔ اُن کی نیند رفو چکر ہو چکی تھی۔ یہ ایک عجیب بات تھی‘ اُس مَن سے بھی زیادہ عجیب جو ٹیلے پر دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے دیکھا ایک لمحے میں اُنھوں نے گرم چادر اوڑھی اور اُس دروازے سے جو اُس طرف باہر کی طرف کھلتا ہے باہر جانے کے لئے تیار ہونے لگیں۔

"یہ کیا کرتی ہو؟" میں نے ذرا سنجیدہ ہو کر انھیں جھڑکا۔ "جانتی ہو اس کا انجام کیا ہوگا؟"

"جانتی ہوں۔" اُنھوں نے بہت مایوسی کے عالم میں کہا۔ "مگر پھر کون لائے؟"

"سانپ کی مَن حاصل کرنے کی ایک ترکیب ہے!" میں نے ٹالنے کی کوشش کی‘ اور اُس چمکتے ہوئے نقطے کی طرف پھر نگاہ ڈالی‘ اور میرے ساتھ بیگم نے بھی۔ چمک اپنی اُسی آب و تاب کے ساتھ باقی تھی۔ غالباً ہم دونوں نے ایک ساتھ سوچنا شروع کیا ——— بس اب سانپ اوس چاٹ کر آجائے گا‘ اور اپنی مَن اپنے منہ میں رکھ لے گا اور ہم دونوں یونہی‘ بیوقوفوں کی طرح‘ دیکھتے کے دیکھتے رہ جائیں گے۔

"اچھا کیا ترکیب ہے؟" بیگم نے ہار مانتے ہوئے میری منت کی۔

"اِس کی ترکیب یہ ہے کہ ایک کوری ناند لے کر ایک ثانیے میں مَن پر ڈھک دیتے ہیں۔ وہ ناند مَن کی گرمی اور آنچ سے لال انگارہ ہو جاتی ہے۔ سانپ اوس چاٹ کر واپس آتا ہے تو مَن کو نہ پا کر اپنا سر ناند سے پٹک پٹک کر مارتا ہے‘ یہاں تک کہ جان دے دیتا ہے۔ لوگ دُور سے کھڑے یہ تماشہ دیکھتے رہتے ہیں‘ اور سانپ کے مرنے کے بعد مَن اُٹھا لاتے ہیں۔"

"مَن والا سانپ بہت زہریلا ہوتا ہے؟"

"ہاں!"

"اور اُس کے سر پر تاج ہوتا ہے؟"

"ہاں؟"

کہیں دور سے جاگتے رہو! کی بھیانک آواز نے ہم دونوں کو چونکا دیا۔ رات کا تقریباً ایک بج رہا تھا۔ نقطہ اُسی طرح چمک رہا تھا۔ رات کا خاموش سناٹا

فسانۂ ہجر

بیقراری تھی سب اُمیدِ ملاقات کے ساتھ
اب وہ اگلی سی درازی شبِ ہجراں میں نہیں ——— حالی

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے
ہم تو کل خوابِ عدم میں شبِ ہجراں ہوں گے ——— مومن

کچھ ہو کیا تھا جو برسوں ہجر میں تڑپا کئے
ہم سے کیونکر مر جانا تو کچھ مشکل نہ تھا ——— ناصری

خفا ہو تو یہ پوچھوں کہ تیری جان سے دور
جو تیرے ہجر میں جیتا ہے مر بھی سکتا ہے ——— فانی

بے خبر انجمنِ ناز میں سونے والے
رات بھر تجھ کو پکارا مری تنہائی نے ——— [illegible]

تمام ماحول پر محیط تھا‘ اور ہم دونوں میاں بیوی سانپ‘ اُس کی مَن‘ اور اُس کے حصول کی تدابیر پر غور کر رہے تھے۔

"سُنتے ہو!" بیگم نے رازدارانہ انداز میں مجھ سے کہا۔ "ناند واند تو اِس وقت ملنی مشکل ہے‘ بلکہ ناممکن۔ اِس وقت کمہار کہاں ناندوں کی دُکان لگائے بیٹھا ہوگا۔ لیکن یہ موقعے روز روز ہاتھ نہیں آتے۔ برسوں سے سُنتے چلے آئے ہیں کہ یہاں ایک پُرانا سانپ رہتا ہے۔ اُس کی آواز اکثر رات کو میں نے سُنی ہے۔ ہو نہ ہو یہ وہی سانپ ہے۔ اور آج معلوم ہوا کہ یہ مَن والا سانپ ہے۔ آج ہی اُس نے مَن اُگلی ہے۔ اب یہ موقع شاید ہی کبھی ہاتھ آئے۔ پھر کیا ہو اِس وقت؟ دن ہوتا تو سب کچھ ممکن تھا۔ کل رات تک کیسے انتظار کیا جائے؟ کل رات کو سانپ اپنی مَن چھوڑ کر اوس چاٹنے نکلے یا نہ نکلے ——— مگر اِس وقت کیا کیا جا سکتا ہے؟"

بیگم جیسے عاجز آ کر مایوس ہو گئیں۔

میں نے موقعے کو غنیمت جانا۔ میں نے کہا: "بھئی اب تم سو رہو۔ میں [illegible] تھکا ہوا ہوں۔ یہ مَن آج ہم نے دیکھ لی ہے۔ آج بہرحال یہ راز ہمیں معلوم ہو گیا جو اب تک معلوم نہ تھا کہ ہمارا یہ پُرانا سانپ مَن والا سانپ ہے۔ ہو سکتا ہے آئندہ پھر اِسی طرح وہ مَن چھوڑ کر اوس چاٹنے نکلے۔ اِس لئے اِس وقت صبر کرو کیونکہ صبر کا پھل ہمیشہ میٹھا ہوتا ہے۔ کل سویرے ناند وغیرہ کا انتظام کر لیں گے‘ اور کسی اور دن جب بھی موقع

[illegible] بہت [illegible] ہوگئے۔

میری اس تقریب [illegible] ہوئی۔ لیکن وہ اسوقت [illegible]
[illegible] گھروں میں خزانے کی امانت [illegible]
[illegible] ہو کر وہ بستر پہ بیٹھ کے [illegible] خوش قسمتی سے نیند
[illegible] وقت [illegible] منٹ میں خزانے
[illegible] سلسلہ ٹوٹتا ہوا گیا۔

مجھے [illegible] نے [illegible] میں نے سانپوں کے متعلق بہت
[illegible] ان کے [illegible] کے طریقے اور اُن سے
[illegible] دولت کے قصے [illegible] ہیں۔ لیکن میں اچھی طرح جانتا ہوں یہ
[illegible] صاحب "جو بڑے دولت مند تھے" لوگ کہتے ہیں اُن کے
[illegible] کی من تھی۔ لیکن وہ اتنے بخیل بھی تو تھے کہ اُن کے ہاں ایندھن کے لئے سوختہ
[illegible] جاتا تھا۔ بلکہ سنگھاڑوں کے چھلکے، گنے کی کھوئیاں اور گھوڑے
[illegible] پہ سُکھائی جاتی تھیں اور سوختے کا کام ان سے لیا جاتا تھا۔ سالن
[illegible] وہ شوربے میں پانی ڈلوا دیتے "لیکن پھیکا ہوتا تو گھر والوں کو ہمیشہ
پھیکا سالن کھانے کی ہدایت کرتے اور نمک ہرگز نہ ڈالنے دیتے" اور اپنے خرچ میں
وہ روتی نمک کی بچت کر کے اس طرح فخر کرتے جیسے سرکار پوسٹ کارڈ کی قیمت میں ایک
نئے پیسے کا اضافہ کر کے کر رہی ہے۔ وہ اُن لوگوں میں تھے جو گھی کا لوٹا قریب میں رکھ
لیتے ہیں، سوکھے گھی کو دکھا دکھا کر کھاتے ہیں تاکہ گھی کے ذائقے سے دور سے لطف
اندوز ہوتے رہیں اور گھی اپنی جگہ اُتنے کا اُتنا ہی باقی ہے۔ اگر وہ اتنے کنجوس نہ ہوتے
تو سانپ کی من کی برکتوں سے اُن کی دولت کو وابستہ کیا جا سکتا تھا۔ یہ سب کہنے
کی باتیں ہیں۔ میں جھنجلا اٹھا۔ وہ بے چارے مر گئے۔ اُن کی دولت کے حصے بخرے
ہو گئے۔ آج اُن کی اولاد فاقے کر رہی ہے۔ وہ من کہاں گئی؟ کس کے حصے میں آئی؟
اب اُن کی تمام برکتیں کہاں چلی گئیں؟ من کے یہ سب قصے من گھڑت ہیں۔ ان باتوں کی
کوئی اصلیت نہیں ہے۔ نہ سانپ کی من ہوتی ہے نہ اُس میں یہ برکتیں۔

اگر من کا وجود واقعی دُنیا میں ہوتا تو ہندوستان کے نہیں، دُنیا کے کسی
نہ کسی عجائب گھر میں آج وہ سانپ ضرور موجود ہوتا، یا کم از کم اُس کی من کسی شوکیس
کی زینت بن گئی ہوتی۔ حکومتوں کے لئے اس قسم کی چیزوں کا دستیاب کر لینا کسی قیمت
پر بھی ناممکن نہیں ہوتا۔ آج امریکہ کا شمار دنیا کے سب سے زیادہ مال دار ملک کی
حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ حلیفوں کی تلاش میں وہ اپنی فاضل دولت غریب اور
پس ماندہ ملکوں میں بے حساب بانٹ رہا ہے۔ کیا اُس کے پاس سانپ کی من ہے ——؟
ہندوستان میں لاکھوں قسم کے سانپ پائے جاتے ہیں۔ ہماری سرکار امریکہ سے

قرض لینے کی بجائے سانپ کی [illegible] کی تلاش [illegible]
کی من کے ان افسانوں میں ذرا بھی حقیقت ہوتی تو ہماری سرکار سانپ کی ایک ایسی
من کو کیوں نہیں حاصل کر کے کسی عجائب گھر کی بجائے سرکاری خزانے میں رکھوا دیتی جو
ہندوستان کو بغیر کسی وقت کے اپنے افلاس، بیکاری اور غذائی مسائل کا ایک
مستقل حل، اور منصوبہ بندی کے آئے دن کے تمام جھنجھٹوں سے ہمیشہ کے لئے
چھٹکارا مل جاتا۔

لیکن میرے نزدیک اُسوقت اہم سوال من کی برکتوں کا نہیں اُس کے
وجود کا تھا۔ میں کوئی جاہل آدمی نہیں ہوں۔ میں ان تمام باتوں کو عقل کی کسوٹی پر
کسنے اور کتابوں میں اُن کی تائید ڈھونڈھنے کا عادی ہوں۔ میں نے کتابوں میں پڑھا
ہے سانپ کی من جیسی کسی چیز کا وجود دُنیا میں نہیں ہے۔ میں نے اس موضوع پر
اخباروں میں مضامین پڑھے ہیں، اور اخبارات میں شائع کئے گئے قارئین کے تمام
خطوط کا مطالعہ کیا ہے، جن کے تراشے اب تک میرے پاس موجود ہیں۔ ان سب میں
اسی ایک بات پر زور دیا گیا ہے کہ سانپ کی من جیسی کوئی چیز دنیا میں نہیں پائی جاتی
اور یہ کہ وہ "الہ دین کے چراغ" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔

لیکن اُس وقت میری یہ ساری ہوشمندی جواب دے رہی تھی۔ میں اِسی
اُلجھن میں تھا کہ یہ اتنی چمکتی ہوئی چیز، یہ شعلے کی مانند آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی شے
جو میری نظروں کے سامنے اِسوقت موجود ہے، آخر کیا ہو سکتی ہے؟ کسی نے انگارہ ڈالا
ہوتا تو کبھی کا بجھ چکا ہوتا۔ یہ جگنو کی روشنی نہیں ہے! نہ یہ بلّی کی آنکھ ہے! —— پھر
آخر کیا ہے ——؟ نہیں نہیں —— یہ سانپ کی من ہے، میں نے فیصلہ کیا۔
ہو سکتا ہے یہ سب کتابی باتیں یکسر غلط ہوں۔ سائنسداں روز نئے نئے تجربے
کرتے رہتے ہیں۔ اُن کے نظریات آئے دن بدلتے رہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے سانپ کی
من اُن کے تجربے میں نہ آئی ہو۔

یہ سوچتے سوچتے میں پھر بستر پر لیٹ گیا۔ لیکن میری نیند میلوں کوسوں
دور تھی۔ میں اپنی تھکن، اور چند گھنٹے پہلے اپنے افسانے کی کامیابی، داد و تحسین کے
وہ تمام خوبصورت جملے جو مجھ پر ابھی تھوڑی دیر پہلے نچھاور کئے گئے تھے، سب بھول
چکا تھا۔ میں سوچتا رہا۔ ہو سکتا ہے یہ دریافت کرنے والا میں ہی پہلا آدمی ہوں کہ
سانپ کی من کا وجود دُنیا میں ہے۔ اس میں وہ اثرات جو اُس سے وابستہ کئے جاتے
ہیں نہ سہی، لیکن یہ کہ سانپ کی من کا وجود ہے، یہ ایک اہم دریافت ہوگی اور اس کا
سہرا، اگر میں اسے کسی طرح اُٹھا لانے میں کامیاب ہو گیا، تو یقیناً میرے ہی
سر رہے گا۔

میں بستر سے اُٹھ گیا۔ کھڑکی سے باہر دیکھا۔ چمکدار نقطہ اُسی طرح

[illegible] سانپ اُس بات کو [illegible] میں نے اپنے دل میں کہا [illegible] کی کوشش کی۔ ایک دو کروٹیں بدلیں لیکن بیکار۔ بیگم کو [illegible] تھا۔ اور میں نیند کی خوشامد کر رہا تھا، اور نیند مجھ سے [illegible]

چاندنی اپنے شباب پر تھی۔ رات کا سناٹا زیادہ پُرہیبت ہو گیا تھا اور [illegible] کہ سب سے پہلا کام یہ کروں گا کہ اخبارات میں مضمون [illegible] کہ سانپ کی مَن بیچ میں ہے۔ اس کے بعد یہ نظریہ کہ سانپ کی مَن سے [illegible] نہیں ایک علم باطل ہو جائے گا۔ میری دریافت دُنیا میں ہل چل مچا دے گی تمام سابقہ نظریات کا شیرازہ بکھر جائے گی۔ دنیا مجھے ایک محقق کی حیثیت سے یاد [illegible]۔ میں نے اطمینان کے لئے ایک بار پھر اُس عجوبہ کو دیکھا۔ وہی چمک [illegible] اُسی میں موجود تھی ——— یقیناً سانپ کی مَن ہے ——— اور [illegible] حاصل کروں گا ——— ابھی ابھی!

"تم ابھی تک سوئے نہیں؟" بیگم غالباً کوئی بھیانک خواب دیکھ کر جاگ اُٹھی تھیں۔

"نہیں!" میں نے مختصر جواب دیا، اور بڑے فیصلہ کُن انداز میں ایک [illegible] کی طرف کا دروازہ کھول ایک ثانئے میں باہر نکل گیا۔

بیگم نے ڈر کے مارے چیخنا شروع کر دیا ہوتا اگر انھیں یہ خیال نہ ہوتا کہ گھر والے جاگ اُٹھیں گے اور بچے، جو قریب کے کمرے میں سو رہے تھے، خواہ مخواہ بے چین ہو جائیں گے۔ اُن کا دل دھڑک رہا تھا جس کی آواز میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ اُن کا بدن کانپ رہا تھا، اور چہرہ خوف سے پیلا پڑ گیا تھا لیکن انھیں میرے بے پناہ عزم کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑ گئے، اور وہ مجبوراً میری نقل و حرکت کا جائزہ لینے کھڑکی میں آ کھڑی ہوئیں، لیکن مجھے میرے ارادے سے باز نہ رکھ سکیں۔

"اُف اللہ! اب کیا ہوگا!" اُن کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی جب انھوں نے دیکھا کہ میں ٹیلے پر چڑھنے کے لئے آمادہ کھڑا ہوں۔

ٹیلہ بہت ڈھلوان ہے جیسے چھوٹی سی پہاڑی ہو۔ اور سانپ کی مَن [illegible] پر رکھی تھی۔ بس ٹیلے پر چڑھنا تھا، اور مَن میرے قبضے میں تھی۔ یقیناً سانپ بھی بڑا بے وقوف تھا کہ اپنی مَن میرے ہاتھ کے داؤ چھوڑ گیا۔ نیچے ہی کھڑے کھڑے ایک لمحے کے لئے میں نے حالات کا جائزہ لیا۔ کہیں دور تک سرسراہٹ کی آواز نہیں سُنائی دے رہی تھی۔ سانپ غالباً اُوس چاٹتا ہوا کہیں دور نکل گیا تھا۔ میں ٹیلے پر پہنچتے ہی جھپٹ کر مَن پر ہاتھ ڈالتا اور چشم زدن میں اُسے اُٹھا کر پلٹتا اور بس! سانپ دیکھنے کا دیکھتا رہ جائے گا۔ اگر سانپ نے میرا تعاقب کیا تو میں اپنی لاٹھی کو کام میں لاؤں گا۔ اِس طرح ڈرامائی انداز میں مَن کا حاصل کر لینا اب تک کی رائج الوقت روایات کو توڑنے کا ایک نیا ریکارڈ ہوگا۔ ساری دنیا میں میری بہادری کا ڈنکا بج جائے گا" اور سب سے کارناموں میں چار چاند لگ جائیں گے۔

بیگم قریب قریب مُردہ ہو گئی تھیں۔ وہ کھڑکی میں کھڑی اُمید و بیم کے جھولے میں جھول رہی تھیں۔ انھوں نے خوف سے آنکھیں بند کر لی تھیں وہ سر سے پاؤں تک لرز رہی تھیں۔ یک لخت انھوں نے ایک آواز سُنی۔ یہ میری آواز تھی۔

"مل گئی!" اور انھوں نے دیکھا میں ٹیلے سے اُتر رہا ہوں۔ میں بڑے [illegible] انداز میں سڑک [illegible] والے دروازے سے کمرے میں داخل ہوا۔ مجھے سانپ نے نہیں ڈسا۔ نہ میرا تعاقب کیا۔ لاٹھی نے مجھے صرف ٹیلے پر چڑھنے اور اُترنے میں مدد دی۔ بیگم کی مارے خوشی کے بُری حالت ہو رہی تھی۔ یہ خوشی مَن حاصل کرنے سے زیادہ غالباً اِس بات پر تھی کہ میں صحیح سلامت واپس آ گیا اور سانپ میرا بال بیکا نہ کر سکا۔

ہم دونوں نے بجلی کی روشنی میں بڑے اشتیاق سے اُسے دیکھا۔ لیکن وہ مَن نہ تھی بلکہ ایک ٹین کا ٹکڑا تھا جو ایک خاص زاویے سے چاندنی میں چمک رہا تھا!

آزادی خطرے میں ہے
اپنی پوری طاقت سے اس کی حفاظت کیجئے
جواہر لال نہرو

ہمیں واقعی خطرہ درپیش ہے

ہماری آزادی خطرے میں ہے۔ سرحد پار دشمن کھڑا ہے۔ ذرا بھی غفلت نہ ہو۔ ملک کی حفاظت کے لئے نظم و ضبط کی پابندی اور محنت کریں۔

بھرپور کوششوں سے کام لیں

شب بخیر

ایم کوٹھیالوی راہی

قاضی پور خورد، گورکھپور (یوپی)

۲۷ اپریل ۱۹۶۴ء برادرم محترم خوشتر صاحب! آداب

ریاض خیرآبادی مرحوم کا یہ شعر ؎

ہم اپنے خواب تمنا سے سینچ آئے ہیں
حسیں لگائیں مگر گرحنائے گورکھپور

گنگناتے جائیے اور میری یہ کہانی پڑھتے جائیے۔ پھر دیکھیے بات کہاں پہنچی۔ بڑے اور شریف گھرانوں کی پڑھی لکھی لڑکیاں شادی کے لیے خواب دیکھتی ہیں کسی آئی سی ایس کا اور رومان لڑاتی ہیں اُن نامرادوں سے جن کے پاس کچھ نہیں ہوتا۔ "شب بخیر" میں ایک ایسی ہی "نیک بخت" کا قصہ ہے۔ کہانی مکالماتی ہے۔ مجھے خود اس کا احساس ہے کہ بعض مکالمے حد سے تجاوز کر گئے ہیں مگر اتنا بھی نہیں کہ عریانیت کی حدود میں داخل ہو گئے ہوں۔ میرے بڑے منٹو مرحوم ہوتے تو یہ کہانی خالص جنسی کہانی بن کر رہ جاتی مگر میں نے "بیسویں صدی" کی روش کو ملحوظ رکھتے ہوئے حتی الامکان ایسا نہیں ہونے دیا ہے... آپ کا بھائی ——— ایم کوٹھیالوی راہی

"آپ اطمینان رکھیے صبح ہوتے ہی چلی جاؤں گی۔"
"کہاں چلی جائیں گی؟"
"جہاں سے آئی ہوں۔"
"نصیب دشمناں طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"
"ہاں ٹھیک ہے۔"
"پھر وہاں جانے کے لیے کیا ٹھہرے کر آئی ہیں؟"
"آپ تمیز سے بات کیجیے۔"
"آپ برہم نہ ہوئیے۔"
"رات اسٹیشن پر بھی بسر کر سکتی تھی۔"
"تو جائیے میرا گھر کوئی مسافر خانہ نہیں ہے۔"
"اور کیا ہے؟"
"پری خانہ۔"
"پری خانہ کہیں کہا اس قید خانے کو۔"

"آپ کے آجانے سے۔"
"دیکھیے میں دیکھ رہی ہوں۔ آپ اسٹیشن ہی سے بنائے چلے آرہے ہیں۔ تنگ
ہی کرنا تھا تو کیوں ترس آیا میری شرافت پر۔"
"اور آپ کو اعتبار کیوں آیا میری حماقت پر۔"
"اس لیے کہ مجھے آپ شریف نظر آئے۔"
"پھر شریفوں کی طرح بات کیجیے۔"
"میں کب غیر شریفوں کی طرح بات کرتی ہوں۔"
"اچھا بابا جائیے اُدھر پلنگ ہے۔ اِدھر باتھ روم۔ اور وہ رکھے شیلف میں
موجود ہے۔ نیند نہ آئے کسی کی یاد ستائے تو جاسوسی ناول موجود ہیں۔"
"میں جاسوسی ناول نہیں پڑھتی۔"
"کیا رومانی پڑھتی ہیں؟"
"نہیں۔"
"کیا جنسی کا پڑھتی ہیں؟"

[illegible]
[illegible] ہے
[illegible] ہیں
[illegible] ہی
"بکواس ہے"
"شاعر کہتا ہے کہ گورکھپور کے لوگ بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں"
"اب کیا خیال ہے؟"
"دیکھ رہا ہوں یہ محض بکواس ہے"
"بکواس یا شعر؟"
"میں شعر کی بات نہیں کرتی"
"کہئے تو میں ہی کروں"
"اب کچھ نہیں کہوں گی۔ کچھ نہیں کہوں گی"
"حسین گالیں مت لگا رہنا کے گورکھپور"
"میں مہندی نہیں لگاتی"
"کنواری ہیں؟"
"اب آپ کیا کریں بکواس۔ میں نے تو ہونٹ سی لئے"
"تم لڑکیوں کو سلائی کڑھائی کے سوا اور آتا ہی کیا ہے"
"کیوں نہیں آتا۔ کیوں نہیں آتا"
"کیا آتا ہے۔ میں بھی تو سنوں"
"اب کیسے بتاؤں"
"بلاوجہ سی لئے ہونٹ"
"بکواس ہی کرنا ہے تو ذرا قاعدے کی کرو"
"تمہاری قاعدے کی؟"
"نہیں معیاری؟"
"معیاری اپنے مقدر میں کہاں"
"کیا اکیلے ہو؟"
"نہیں"
"کیا گھر والے کہیں اور رہتے ہیں؟"
"نہیں"
"کہاں ہیں؟"
"[illegible]"

پھر [illegible]
"ہاں وہی۔ سب کچھ وہی۔ وہی زندگی۔ وہی چاند۔ وہی باغ دیوار۔ ایک گھر والے کی زندگی میں سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ صبح بکواس۔ شام بکواس۔ رات بکواس... ماں کو گاؤں راس آیا ہوا ہے۔ بہنوں کو اپنا اپنا گھر۔ بھائی کو پردیس۔ باپ کو آسمان... اور اب کچھ تم کہو"
"بات کرتے کرتے سنجیدہ کیوں ہو گئے؟"
"کیا تمہیں میری سنجیدگی اچھی نہیں لگتی؟"
"نہیں"
"معلوم ہوتا ہے نیند واقعی آنے لگی ہے۔ اچھا ہے سو رہو۔ ایک ساتھی کا قول ہے اگر کسی دوشیزہ کو نیند آنے لگے تو اُسے سونے دینا چاہئے ورنہ... خیر"
"لیکن سنو تو ___ کے بجے ہوں گے"
"ابھی ابھی گجر نے دو بجائے ہیں"
"کیا تم فٹ پاتھ پر اکڑ نہیں جاؤ گے؟"
"فٹ پاتھ پر نہیں سوؤں گا۔ یہیں پڑ رہوں گا"
"پھر آ گئے اسی ضد پر"
"نہیں"
"یہاں کیوں؟"
"یہاں سے مراد اس کمرے کے باہر دالان میں"
"زمین پر؟"
"پلنگ صرف ایک ہے۔ آج کی رات تمہارے لئے ہے"
"اور بستر؟"
"وہ بھی اکیلا ہے"
"جیسے تم اکیلے ہو۔ ہے نا؟"
"ہاں"
"تو اُسے اپنے پاس ہی رکھو۔ میں بغیر بستر کے بھی سو سکتی ہوں۔ لیکن میرا خیال ہے سونے کی کیا ضرورت ہے۔ کیوں نہ باتیں کر کے کاٹ دیں رات"
"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ سوال یہ ہے کہ تم ناراض نہ ہو جاؤ"
"ناراض کیوں ہونے لگی"
"بات کرتے کرتے سنجیدہ ہو جاتا ہوں۔ اور کبھی شوخ۔ اور کبھی کبھی سنک سی جاتا ہوں"
"تو آپ میں تینوں صفتیں پائی جاتی ہیں"

"کھولوں"

"چلیے ٹھیک ہے۔ کھولیں گے"

"نہیں رہنے دیجیے۔ نیند اب مجھ کو آنے لگی ہے۔ دروازہ بند کر کے چٹخنی
لیجیے ان گلی کے کتّے پھر شور کر رہے ہیں"

"کیا سو گئے؟"

"جاگ رہا ہوں"

"ذرا اندر تو آئیے"

"کیا بات ہے؟"

"ایک کام ہے"

"وہیں سے حکم دیجیے"

"نہیں نہیں۔ آئیے ذرا"

"کیسے آؤں۔ بات تو آپ دروازہ بند کر کے کر رہی ہیں"

"اوہ معاف کیجیے گا۔ میں نے سمجھا کھلا ہے"

"معلوم ہوتا ہے آپ بھی اکثر بات کرتے کرتے سنک جایا کرتی ہیں"

"جی نہیں یہ غلط ہے"

"خیر ہوگا غلط۔ فرمائیے کیوں یاد کیا؟"

"کیا باہر آپ کو ٹھنڈ نہیں لگتی؟"

"جی نہیں"

"میں تو یہاں شملہ بنی جا رہی ہوں"

"دیکھیے شاید کھڑکی کھلی رہ گئی ہے"

"جی نہیں بند ہے"

"اچھا تو کمبل بھی لے لیجیے۔ لحاف پتلا ہے۔ ساتھ لیجیے"

"اور آپ؟"

"میرے لئے یہ اوورکوٹ ہی کافی ہے"

"کے بجے ہوں گے"

"ابھی ابھی گجر نے تین بجائے ہیں"

"کیا سو گئے؟"

"جی ہاں"

"بول کون رہا ہے؟"

"میرا جنون"

"شاعر لوگ ایسے ہی ہیں کیا؟"

"جی ہاں"

"کوئی شعر سنائیے"

"چھٹی ہے میری جوانی خدائے گور کو چھوڑ
کدھر سے آئے گی آواز ہائے گور کو چھوڑ"

"یہ شعر کس کا ہے؟"

"بوجھیے تو جانوں"

"آپ ہی کا ہوگا"

"جی نہیں۔ نہ میرا ہے۔ نہ کسی مستند کا۔ یہ کسی اقبالیے کا۔ یا کسی خیر آبادی کا
کہا ہے"

"اقبالیے کسے کہتے ہیں؟"

"علامہ اقبال کے نقالوں کو۔ شیطان کی مجلس شوریٰ کو ابلیس کا خطبہ
صدارت بنا کر پیش کرنے والوں کو۔ وقت گزارنے کے لئے کہیے تو ہنس اور کوّے کا لطیفہ
سناؤں"

"یہ لطیفہ سنا ہوا ہے۔ اپنا کوئی شعر سنائیے"

"میں شاعر نہیں ہوں"

"ابھی کہہ رہے تھے شعر کہہ رہا ہوں"

"یہ ضروری نہیں کہ شاعر ہی شعر کہے"

"کہیے تو دروازہ کھول دوں"

"کیا ضرورت ہے؟"

"ابھی تھوڑی رات رہ گئی ہے۔ کچھ باتیں کر لیں"

"باتیں دروازے کے پیچھے سے بھی ہو سکتی ہیں"

"یہ اچھا نہیں لگتا"

"معلوم ہوتا ہے آپ بھی بات کرتے کرتے اکثر سنجیدہ ہو جاتی ہیں"

"جی ہاں"

"مگر یہ آپ کو زیب نہیں دیتا"

"کیوں؟"

"آپ کی سنجیدگی لوگوں کو خوش فہمی میں مبتلا کر سکتی ہے"

"میں دروازہ کھول رہی ہوں"

"خیر؟"

[illegible]

[illegible]

"[illegible]"

"سمجھا۔"

"[illegible]"

"مشکل بات ہے۔ کوشش کروں گا۔"

"کس کا خیال آپ کر رہے ہیں؟"

"جس کا آپ ہیں۔"

"کیا خوب بات۔"

"[illegible]"

"کس کو؟"

"دل تم زندہ کرو۔"

"مجھے لگتا ہے کہ تم زندہ دل سے ہمدردی ہے۔"

"اس ہمدردی کا شکریہ۔"

"میرا پتہ نوٹ کر لیجئے۔"

"کیوں؟"

"کبھی جی چاہے تو خط لکھنے کے لئے۔"

"وہ آپ بھی لکھ سکتی ہیں۔"

"شکریہ۔ لکھوائیے۔"

"لکھیے۔"

"کبھی لکھنؤ آنا ہو تو میرے ہاں ضرور آئیے گا۔"

"جی ہاں ضرور۔"

"آپ سچ کہتی ہوں میرے لئے بہت دلچسپ ثابت ہوئے۔ جی چاہتا ہے آپ کے کمرے میں لوٹ چلوں۔ اب اسٹیشن اچھا نہیں لگتا۔ افسوس ٹرین آنے والی ہے۔ کیا آپ کا دل نہیں چاہتا کہ میں ابھی نہ جاؤں۔"

"اگر میرے روکنے سے آپ رک سکتیں تو ضرور کہتا جائیے نہ جائیے۔"

"کہہ کر تو دیکھئے۔"

"اب کیا کہوں۔"

"خیر! میں آپ کو یاد کروں گی۔ ابو سے آپ کا ذکر کروں گی۔ سہیلیوں سے آپ کا تعارف کروں گی۔ مجھے آپ کے خط کا انتظار رہے گا۔ آپ کا انتظار

بہرحال:

"اس حوصلہ افزائی کا شکریہ۔"

"نسیم صاحب! جب سے یہاں آئی ہوں آپ بار بار یاد آتے ہیں۔ اور اکثر بیٹھی بیٹھی مسکرا دیتی ہوں۔ آپ کے مختصر سے ساتھ کی کئی یادیں اکثر دل کو تڑپا جاتی ہیں۔ آپ کی باتیں، آپ کی شوخیاں، آپ کی سنجیدگی اور آپ کی تنہائی نگاہیں مجھے یاد آنے لگی ہیں۔ ابو جی بہت پریشان ہوئے تھے۔ گھر پہنچنے سے چند گھنٹے پہلے ہی میری خیریت کا ٹیلیگرام مل گیا تھا۔ اس کے لئے اور مجھے پناہ دینے کے لئے وہ آپ کے بے حد ممنون ہیں۔ اور اکثر آپ کی شرافت کا ذکر کرتے ہوئے آپ کو یاد کیا کرتے ہیں۔ میری سہیلیاں بھی آپ سے ملنے کی بے حد مشتاق ہیں۔ اکثر یہ کہہ کر مجھے چھیڑا کرتی ہیں کہ آپ کو مجھ سے اور مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہو گی۔ خط کے جواب میں خود آ کر ان بے مجنوؤں کی لیلاؤں کے کان کاٹ جائیے۔ اور ہاں وہ مصرعہ "حسین آنکھیں مدھر گانے" کو ذرا پورا کر کے دوسرا مصرعہ کیا ہے۔ ذرا لکھئے۔ اور اگر ہو سکے تو اپنے ہاں کی مہندی بھجوا دیجئے۔ یا آئیے تو ساتھ ہی لیتے آئیے۔ آپ کو یہ سن کر مسرت ہو گی کہ چند ہفتوں میں میری میرج ہونے والی ہے۔ میرے [illegible] نے اس سال آئی سی ایس کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ ان کو آپ سے مل کر بہت خوشی ہو گی۔ ہو سکے تو اسی تقریب کے بہانے چلے آئیے۔ فقط آپ کی پرستار [illegible]"

مضمون نگار حضرات سے

درخواست ہے کہ مضمون حاشیہ چھوڑ کر خوشخط لکھا کریں۔ دو سطروں کے درمیان کافی جگہ چھوڑا کریں۔ بعض اچھے مضامین محض بدخط ہونے کی وجہ سے چھپنے سے رہ جاتے ہیں۔ ہمیشہ غیر مطبوعہ مضامین بھیجیں اور ایڈیٹر کی اطلاع کے لئے مضمون کے خاتمے پر غیر مطبوعہ لکھیں۔ بعض مضمون نگار مطبوعہ مضامین بھیج دیتے ہیں یہ نہایت نامناسب اور غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے۔ اپنے پاس اپنے مضامین کی نقل ضرور رکھیں۔ کیونکہ ناقابلِ اشاعت مضامین ضائع کر دیئے جاتے ہیں۔ مضمون کے خاتمے پر اپنا پورا پتہ لکھ دیا کریں۔ نو آموز حضرات مضامین بھیجنے سے پہلے کسی استاد سے مشورہ لے لیا کریں۔ اگر وہ چاہیں کہ مرسلہ مضامین ناقابلِ اشاعت ہونے کی صورت میں انہیں واپس کر دیئے جائیں تو مضمون کے ساتھ ٹکٹ بھیجنے کی بجائے اپنا پتہ لکھا ہوا پوسٹ آفس کا لفافہ ارسال فرمائیں۔ ورنہ ہم مضمون کی واپسی سے قاصر رہیں گے۔ (ایڈیٹر)

طنز و مزاح

لطائف اقبال

رشید الدین بی۔ اے

مددگار مترجم (اردو) محکمۂ ترجمہ حکومت آندھرا پردیش۔ طالب ان صاحب حیدرآباد ۲۸

۱۳ اپریل ۱۹۷۰ء

خورشید صاحب! تسلیم

... شاعرِ مشرق علامہ اقبال عام طور پر بہت ہی سنجیدہ اور متین انسان سمجھے جاتے ہیں لیکن اس بات سے بہت کم لوگ واقف ہیں کہ اُن کی شخصیت میں سنجیدگی اور متانت کے ساتھ ساتھ بذلہ سنجی اور ظرافت بھی تھی۔ وہ بلا کے حاضر جواب، تیز ذہن، طرار اور معاملہ فہم تھے۔ اُن کی شخصیت کی اِنہی خوبیوں کی بنا پر عطیہ فیضی نے انھیں حاضر جواب، بذلہ سنج اور طرار کہا ہے۔ غالب کی طرح اُن سے بھی بہت سے لطائف منسوب ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ غالب کے لطائف زبان زدِ خاص و عام ہیں اور اقبال کے لطائف سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ آج اقبال کے کچھ لطائف پیش کر رہا ہوں۔ یہ تمام لطائف مستند ہیں اور مولانا عبدالمجید سالک کی کتاب "ذکرِ اقبال" سے ماخوذ ہیں۔ لطائف کی ترتیب میں نے ویسی ہی رکھی ہے جس ترتیب سے یہ وقوع پذیر ہوئے ہیں ــــــ اُمید ہے کہ آپ کو اور قارئینِ "بیسویں صدی" کو یہ لطائف پسند آئیں گے۔

مخلص ــــــ رشید الدین

بچپن میں اقبال کو بٹیریں پالنے، کبوتر اڑانے اور اکھاڑے میں ورزش کرنے کا بہت شوق تھا۔ اُن کے اُستاد مولانا میر حسن بھی منع نہ کرتے تھے۔ ایک دن مولانا نے دیکھا کہ اقبال سبق پڑھ رہے ہیں اور ایک ہاتھ میں بٹیر تھام رکھی ہے۔ مولانا نے فرمایا: "کم بخت اس میں تجھے کیا ملتا ہے؟" اقبال نے برجستہ جواب دیا: "حضرت ذرا اسے پکڑ کر دیکھیے!"

اقبال کے قیامِ انگلستان میں اکثر ہندوستانیوں اور غیر ہندوستانیوں کے ہاں دعوتیں ہوتی تھیں جن میں دوست احباب جمع ہوتے تھے۔ ایک بار اسی طرح کی ایک پارٹی ایک معزز انگریز خاتون [illegible] نے دی جس میں اقبال بھی مدعو تھے۔ دفعتاً ایک ہندوستانی خاتون مس سروجنی داس نہایت پُر تکلف لباس اور جھلملاتے ہوئے زیورات پہنے سامنے آ موجود ہوئیں۔ لوگ اُن کے اس پست قد [illegible] کو دیکھ کر حیران ہو رہے تھے کہ انھوں نے اقبال کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا: "میں تو صرف آپ سے ملنے کے لیے یہاں آگئی ہوں۔" اقبال کی ظرافت کا شعلہ لپکا۔ انھوں نے فوراً جواب دیا: "[illegible] میں نہیں سمجھتا کہ میں اس کمرے سے باہر جا سکوں گا۔" اور دوسرے [illegible]

اپنے قیامِ جرمنی کے دوران میں اقبال اپنے جرمن اور ہندوستانی دوستوں کے ساتھ اکثر گھومنے پھرنے جایا کرتے تھے۔ ایک بار یہ قافلہ جرمنی کے ایک تاریخی مقام "آسمان باغ" گیا۔ اُس باغ میں کسی پرانے بادشاہ نے مختلف مذاہب کی عبادت گاہیں بنا رکھی تھیں جن میں ایک مسجد بھی تھی جس کی دیواروں پر قرآنی آیات لکھی ہوئی تھیں۔ سب نے چاہا کہ اقبال انھیں اُن آیات کا مطلب سمجھائیں۔ اس پر اقبال نے نہایت سنجیدگی سے یہ قصہ سنایا:

"ایک تھا بادشاہ۔ اُسے ایک دن جنت کی ایک حور نظر آئی جس پر وہ دل و جان سے فریفتہ ہو گیا اور اُس سے کہنے لگا کہ تم میری ملکہ بن جاؤ۔ حور نے کہا میں تمھاری ملکہ بننے کو تیار ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ تم مسلمان ہو جاؤ اور ایک مسجد تعمیر کرو بس اُسی مسجد میں میں تم سے نکاح پڑھوں گی۔ بادشاہ نے حور کے حکم کی تعمیل کی، مسجد تعمیر ہوئی، بادشاہ کا حور سے نکاح ہو گیا۔ یہی وہ مسجد ہے۔"

اس پر [illegible]

رہے کہ جرمن طالبات [illegible]

[illegible]

سانولی

شاد عزمی ایم اے
اشرف گنگری روڈ۔ پورنیا

محترمی خورشید بھائی! آداب

ایک نہایت مختصر کہانی ارسالِ خدمت کر رہا ہوں۔ اگر پسند آئے تو شائع فرما کر شکریہ کا موقع دیں ——————
حافظ شیرازی کا ایک شعر ہے ؎

ہر کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برد
گیر و دار و حاجب و درباں دریں درگاہ نیست

ایک وہ بزم تھی جہاں ہر خاص و عام کو بلا روک ٹوک آنے جانے کی اجازت تھی اور ایک "بیسویں صدی" کی بزم ہے جہاں بڑے بڑوں کی رسائی نہیں۔ ہر ہر قدم پر گیر و دار کے مرحلے ہیں پھر بھی قسمت آزما رہا ہوں ———— کہانی کی رسید اور اپنی رائے سے نوازیں۔

ناچیز ———— شاد عزمی

ماما جی کو عرصے سے میری شادی کی فکر تھی۔
ان کا بچہ جوان ہو گیا تھا۔ اور برسوں سے کما کما کر گھر بھر رہا تھا۔ انہیں اب ہمہ وقت یہی فکر رہتی کہ کس طرح بچے کا گھر بسایا جائے۔ ہر آنے جانے والے سے اٹھتے بیٹھتے یہی پوچھا کرتیں کہ فلاں کی لڑکی کیسی ہے۔ فلاں کا خاندان کیسا ہے۔ ہمیں ایک پڑھی لکھی خاندانی بہو کی ضرورت ہے۔ لڑکی باکردار ہو بھولی بھالی سانولی سلونی ہو۔ گوری لڑکیوں سے انہیں چڑ تھی۔ بھلا وہ بھی کوئی رنگ ہے۔ اُن کا اپنا رنگ بھی سانولا تھا۔

اگلے وقت کے لوگوں کی یہی ریت رہی تھی کہ ادھر لڑکا سیانا اور کمانے کھانے کے قابل ہوا اور اُدھر اُس کی شادی رچا دی۔ لوگ شادی میں تاخیر کو بُرا سمجھتے تھے۔ ماما جی اس زمانے کی عورت تھیں پھر بھی ان کے سوچنے سمجھنے کا ڈھنگ کافی بدل گیا تھا۔ وہ ایک آئیڈیل بہو کی تلاش میں ہر وقت پریشان رہتیں۔ گھر گھر رشتہ ڈھونڈتی پھرتیں۔ ہر کس و ناکس سے تذکرہ کرتیں۔ لیکن اب تک کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا۔

اُس دن میرے آفس میں چھٹی تھی۔ موسم بے حد خوشگوار تھا۔ شگفتہ لہجہ میں ماما جی سے میں نے ہنستے ہوئے کہا۔
"بہو گھر گھر کہاں ڈھونڈتی پھریں گی ماما جی۔ اخباروں میں اشتہار چھپوا دیجئے۔ پھر دیکھئے ایک سے ایک لڑکی آپ کے سامنے آئے گی۔"
میری تجویز پر ماما جی تقریباً اُچھل پڑیں۔
"ٹھیک ہی کہتے ہو بیٹا۔ مُوا زمانہ بدل گیا ہے۔ اب گھر گھر پیغام بھجوانے کے بجائے اخباروں ہی میں چھپوانا چاہئے۔"
دوسرے دن مقامی اخباروں میں یہ اشتہار شائع ہو گیا۔
"ایک پڑھے لکھے خاندانی لڑکے کے لئے رشتے کی ضرورت ہے۔ لڑکی پڑھی لکھی خوبصورت اور خاندانی ہو۔ بھولی بھالی سانولی سلونی لڑکی کو ترجیح دی جائے گی۔"
ماما جی اشتہار کو بار بار پڑھتی تھیں اور دل ہی دل میں خوش تھیں کہ اُنکی دیرینہ آرزو اب پوری ہونے والی ہے۔

ایک ہفتہ کے بعد خطوط آنے لگے۔ ماما جی ہر خط کو غور سے پڑھتیں اور تصویروں کو تنقیدی نگاہوں سے دیکھتیں اور ایک دوسرے سے موازنہ کرتی جاتیں۔

شاید کوئی لڑکی پسند نہیں آئی۔ میں نے ماما جی سے پوچھا۔

"کوئی لڑکی پسند ہی نہیں آئی۔ پھر اشتہار چھپوانا ہے؟"

ماما جی آئی ہوئی تصویروں سے اپنی بہو کی نظریں تلاش کرتی ہوئی بولیں۔

"پسند آ بھی جائے لیکن خاندان وغیرہ کا پتہ بھی تو لگانا ہے۔"

میں نے کرید لگانے کی غرض سے پوچھا۔

"میں بھی تو دیکھوں آخر آپ کون سی لڑکی کو بہو بنا رہی ہیں۔"

"بے شرم کہیں کا؟" ماما جی نے بہت پیار سے مجھے دھتکارا۔

"دیکھو یہ لڑکی میں نے پسند کی ہے تیرے لئے؟" ماما جی نے ایک تصویر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"تصویر کچھ دھندلی سی تھی۔ قد کا تو کوئی پتہ نہیں چلا۔ البتہ آنکھیں بہت پیاری پیاری تھیں۔

میں نے ماما جی سے کہا۔

"تصویر سے تو رنگ کا پتہ چلانا مشکل ہے۔ اگر یہ بھی گوری ہوئی تو؟!!

میں نے ماما جی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

ماما جی ایکدم سخت ہو گئیں: "تو میں اِسے بھی رد کر دوں گی؟"

ماما جی اس سے پہلے کئی لڑکیوں کو صرف اس لئے بہو بنانے پر رضامند نہیں ہوئیں کہ اُن کا رنگ صاف تھا۔

دوسرے ہی دن ماما جی محلے کی ایک جہاں دیدہ محترمہ کے ساتھ سفر کے لئے نکل پڑیں۔

ماما جی کے جانے کے بعد مجھے ایکا ایکی شیلا یاد آگئی۔ وہ میری کالج کی فرینڈ تھی۔ سرو قد، نازک اندام، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں۔ اُس کا حسن ہی کچھ اور تھا۔ وہ ساری لڑکیوں میں ممتاز تھی۔ وہ کئی برس تک میرے ساتھ پڑھتی رہی تھی۔ لیکن اُن دنوں میں نے کبھی ایسا محسوس نہیں کیا کہ اُس کے بغیر میری زندگی بے معنی ہے۔ لیکن آج نہ جانے کیوں وہ مجھے بار بار یاد آتی۔ اُس کی چھوٹی بڑی باتیں یاد کر کے مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے شیلا کو میں دل کی گہرائیوں سے چاہتا ہوں۔ اور شیلا بھی مجھ سے پیار کرتی ہے۔

جب ماما جی سفر سے لوٹیں تو اُن کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ اور ناکامی اور تھکن کے احساس سے وہ اپنی عمر سے زیادہ بوڑھی معلوم ہو رہی تھیں۔

میں نے ماما جی سے پوچھا۔

"سفر کیسا رہا؟"

ماما جی سرد آہ بھر کر بولیں: "جانے کس کمبخت کی نظر لگ گئی ہے۔ [illegible] یار کوئی لڑکی پسند نہ آئی۔"

میں نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا: "کوئی بات نہیں [illegible] اور تصویریں آئی ہوئی ہیں۔ انہیں بھی دیکھ لو۔ شاید کوئی پسند آ جائے۔"

جب ماما جی ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو گئیں تو میں نے دوسری تصویروں کے ساتھ ساتھ شیلا کی تصویر بھی ماما جی کے سامنے رکھ دی۔ ماما جی حسبِ عادت باری باری تنقیدی نظروں سے تصویریں دیکھتی جاتی تھیں اور ایک دوسرے سے موازنہ کرتی جاتی تھیں۔

میں نے شیلا کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تصویر تمھیں کیسی لگی ماں؟"

ماما جی نے کچھ جواب دینے کے بجائے مجھ سے پوچھا۔

"تمھیں کیسی لگی؟"

"بس کچھ یونہی سی ہے۔ البتہ دوسری تصویروں کے مقابلے میں غنیمت ہے۔"

میرے دل کی بات بے ساختہ زبان پر آگئی۔ اِدھر کچھ عجیب حالت ہو گئی تھی دل کی۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا جیسے شیلا میری سب کچھ ہے۔ اُسکے بغیر میری زندگی ادھوری ہے۔

ماما جی نے پھر سفر کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اِس بار میں نے بھی اُن کے سفر کی تیاریوں میں ہاتھ بٹایا۔ شیلا کے گھر جا رہی تھیں نا!

ماما جی کے جانے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے شیلا دلہن بن کر میرے گھر آگئی ہو! وہ لمحات کتنے حسین تھے جب میرا دل پیار کے مقدس جذبے سے سرشار ہو اُٹھا تھا اور میں جھومنے لگا تھا۔ شیلا کی ایک ایک بات مجھے شدت سے یاد آنے لگی تھی۔ وہ بے حد شوخ و شنگ لڑکی تھی۔ ہر وقت ننھے ننھے [illegible] کرتی۔ اُس کی بات بات سے شوخی ٹپکتی تھی۔ سب سے خندہ پیشانی سے ملتی۔ بات کرنے کا سلیقہ کتنا پیارا تھا۔ مسکراتی تو ایسا معلوم ہوتا جیسے [illegible]۔ وہ واقعی سراپا غزل تھی!

شیلا کے پیار نے میری زندگی کی کایا پلٹ دی۔ میرے دل [illegible]

[illegible] ہوگیا۔ چاروں طرف رنگین انوکھی روشنیاں بکھر گئیں۔ بہار آگئی۔ اور [illegible] جیسے آنکھوں کو واپسی کا انتظار کرنے لگا۔

[illegible] کے بعد ممی نے مجھ سے اٹھیں۔ اس وقت ان کے ہونٹوں پر معنی خیز [illegible] مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

میں نے ماما سے بہت دیر بعد سے پوچھا۔

"میری ممی کیسی ہیں ماما؟"

"ان کی طبیعت اچھی ہے بیٹا۔ لیکن ......" ماما میری طرف دیکھتی ہوئی ایکدم چپ ہو گئیں۔

"لیکن کیا ماں؟" میں نے تقریباً بیتاب ہوتے ہوئے پوچھا۔

"لیکن وہ سانولی نہیں ہے بیٹا!"

ماما کی آواز مجھے دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اور دفعتہً میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اور اس گھپ اندھیرے میں شیلا کا سراپا ڈوبتا چلا گیا۔

ماما میرے جذبات سے بے نیاز نہایت ثابت قدمی سے دروازے کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

ایک نہایت مفید و کار آمد کتاب

بیسویں صدی کی کشیدہ کاری وہ کتاب جو یورپ کی بہترین کتب کے مقابلہ میں پیش کی جا سکتی ہے۔ اِس مفید کتاب میں کشیدہ کاری کے وہ تمام نمونے پیش کئے گئے ہیں جو ہندوستان اور ولایت میں رائج ہیں۔ اور جنھیں ہندوستانی اور یورپین عورتیں بہت پسند کرتی ہیں۔ اونچے گھرانے کی معزز خواتین اور چوٹی کے زنانہ رسائل کی رائے ہے کہ کشیدہ کاری پر اِس سے بہتر کتاب آج تک مارکیٹ میں پیش نہیں کی گئی۔ اُردو ہندی مشترکہ زبانوں میں شائع کی گئی ہے تحفے میں دینے کے لئے بہترین چیز ہے۔ معزز گھرانے کی خواتین یہ مفید کتاب اپنی پیاری لڑکیوں کو جہیز میں دیتی ہیں۔ قیمت فی جلد صرف چار رُوپے

پتہ :۔ رسالہ بیسویں صدی۔ دہلی نمبر ۶

جواب طلب امور کے لئے ہمیشہ اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ یا پوسٹ کارڈ بھیجئے۔ ورنہ ہم جواب دینے سے قاصر رہیں گے۔ پاکستانی ٹکٹ ہندوستان میں کار آمد نہیں ہیں صرف پاکستانی بھائی اور بہنیں اس شرط سے مستثنیٰ ہیں۔ (منیجر بیسویں صدی دہلی)

دلچسپ نئی کتابیں

سنگ و خشت اُردو ادب میں طنز نگاری کے میر کارواں پروفیسر کنہیا لال کپور کے طنزیہ مضامین کا مجموعہ۔ قیمت صرف دو روپے ۵۰ نئے پیسے۔

چنگ و رباب پروفیسر کنہیا لال کپور کے مزاحیہ اور طنزیہ مضامین کا دوسرا مجموعہ قیمت صرف دو روپے ۵۰ نئے پیسے۔

ابراہیم لنکن امریکہ کے محبوب ترین صدر کی سوانح عمری جس نے غلامی کا قلع قمع کیا اور مساوات اور آزادی کو انسان کا پیدائشی حق قرار دیا۔ قیمت ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے

رُوبرُو جسمانی معذوریوں پر قوت عمل کی فتحیابی کی کہانی۔ ایک نابینا بچے کی قابل ستائش کوششوں کا مرقع۔ قیمت تین رُوپے ۲۵ نئے پیسے۔

نُور ایک قاصد کو اپنے اندر جاذبیت اور دلکشی پیدا کرنے کے لئے کیا کیا لا مثال قربانیاں دینی پڑیں۔ قیمت صرف دو رُوپے ۵۰ نئے پیسے۔

آرزو کی کلیاں امریکہ کے شہرۂ آفاق ناول نگار جان سٹین بیک کے دو مختصر ناولوں کا حسین ترجمہ۔ قیمت ایک روپیہ پچھتر نئے پیسے۔

دُنیا کے مشہور سائنس داں یہ کتاب آپ کو اُن سائنس دانوں کی زندگیوں سے رُوشناس کرائے گی جنھوں نے نسلِ آدم کو ترقی کے موجودہ زینے پر پہنچایا۔ قیمت صرف دو رُوپے پچیس نئے پیسے۔

اپنی منزل اپنی راہیں ولیم سرویان کا منفرد ناول جس کی فلم نے تو ساری دُنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ انسان کے دُکھ سُکھ کی کہانی۔ قیمت صرف دو روپے ۵۰ نئے پیسے

شکستِ ظلمت یہ ایک اندھی عورت ہیلن کیلر کا افسانۂ زندگی ہے جس نے اپنی انگلیوں سے آنکھوں کا کام لیا اور دُنیا سے اپنی ذہانت کا لوہا منوایا۔ قیمت ایک رُوپیہ ۵۰ نئے پیسے۔

مابی ڈک ہرمن میلول کا مایۂ ناز شاہکار۔ آسمانِ ادب کا جگمگاتا تارا۔ قیمت چار رُوپے

سائنس کی دُنیا یہ کتاب آپ کو سائنس کی ہر پیچیدگی کو سمجھنے میں مدد دے گی۔ آج دُنیا میں کوئی بھی انسان سائنس سے بے بہرہ نہیں رہ سکتا۔ مصنف ولیم اینگ کروزر۔ مترجم ایم ایم بیگ۔ قیمت فی جلد صرف تین رُوپے۔

ملنے کا پتہ :۔ رسالہ بیسویں صدی دہلی نمبر ۶

شاکر سوہاروی

ملتفت رسم و روایات سے آگے نہ بڑھی
دوستی پرسشِ حالات سے آگے نہ بڑھی

ملنے والوں نے کئے وعدہ و پیماں تو بہت
ایک بھی بات مگر بات سے آگے نہ بڑھی

گردشِ وقت کی آہستہ خرامی کے نثار
میرے الجھے ہوئے حالات سے آگے نہ بڑھی

دل کے غم میں نے زمانے سے چھپا تو رکھا
آگ بھڑکی تو مری ذات سے آگے نہ بڑھی

بیتاب بیلی بھیتی ایم اے

زندگی کے سفر میں ہیں ہر گام پر
کچھ نئی الجھنیں کچھ نئے مرحلے

جب نظر سے نظر کا تصادم ہوا
قربتیں بڑھ گئیں مٹ گئے فاصلے

دل میں امید کی ہلکی ہلکی کرن
دور جیسے کہیں کوئی دیپک جلے

جوشِ عزم و عمل اور بڑھتا گیا
جتنے رستے گئے پاؤں کے آبلے

چندر پرکاش جوہر بجنوری

بہارِ زندگی و کیفِ جاوداں نہ رہے
تخیلات کی دنیا اگر جواں نہ رہے

زہے خلوصِ محبت، خوشا غمِ جاناں
کہ ہم زمانے میں مٹ کر بھی بے نشاں نہ رہے

بظاہر ان کو نہیں مجھ سے کوئی ربط مگر
شریک وہ مرے غم میں کہاں کہاں نہ رہے

وفورِ شوق کا پیہم یہی تقاضا ہے
کہ اب حجابِ من و تو بھی درمیاں نہ رہے

راہی قریشی ایم اے

یہ دیکھ کر تو مری آنکھ جیسے بھر آئی
کہ وہ نگاہ مرے غم کی رازداں بھی نہیں

یہی مقام، یہی میکدہ تھا بزمِ نشاط
مگر سکونِ دلِ زار اب یہاں بھی نہیں

زیادہ سے زیادہ آرام
کم سے کم پریشانی

FOOD IS PRECIOUS
MAKE THE MOST OF IT!
TUE
WED
THU
FRI
SAT

●● آئیے ہم مل کر بھارت کے لئے جذبہ پیدا کریں۔ ملک اور اس کے تمام باشندوں کی ترقی کے لئے کام کریں یہی ایک طریقہ ہے ملک کی خدمت کا، اسے عظیم، متحد اور مضبوط بنانے کا۔ ●●

— جواہر لال نہرو

ایک قوم، ایک مُلک

●● مُلک کے مختلف حصّوں میں رہنے والے عوام کو، خواہ بعض معاملوں میں اُن کے خیالات کتنے ہی مختلف ہوں، یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ وہ اوّلاً ہندوستانی ہیں، اور یہ کہ اُنہیں اپنے تمام اختلافات قوم اور مُلک کے ناقابلِ تبدیل ڈھانچے ہی میں رہتے ہوئے دُور کرنے ہیں۔ ●●

— لال بہادر شاستری
وزیر اعظم

بھارت کو مضبوط کرنے اور اُس کے سبھی باشندوں کے لئے آزادی و خوشحالی کو یقینی بنانے کا ہمارا راستہ صاف اور سیدھا ہے۔ قدم ملا کر چلیں۔ ایک قوم کی طرح مل کر کام کریں۔ اپنے اندر حوصلہ، عزم، خیر سگالی کا جذبہ اور بُردباری پیدا کریں۔ آج جو چیلنج ہمیں درپیش ہے اس کا صحیح جواب نظم و ضبط و مُتحدہ عمل ہے۔

ہند

ایکتا بنائے رکھیے۔ آزادی کی حفاظت کیجیے

اجازت ہو تو میں تصدیق کروں تیری زلفوں سے

تیر و نشتر

خوشتر گرامی

"حکومت نے قیمتوں کو نیچے لانے کے لیے کوئی بھی قدم نہیں اٹھایا" ایک خبر ـــــ کیا وزیر خوراک کے دورے، بیانات اور تقریریں بے عمل کارروائیاں ہیں۔

"یو پی میں ایک شخص بھی بھوک سے مرنے نہیں دیا جائیگا" سچیتا کرپلانی کا اعلان ـــــ جو مرے گا اپنی آئی سے مرے گا۔ اُس کی ذمہ داری سچیتا سرکار پر نہ ہوگی۔

"مرکز میں کانگریس سرکار کو چلتا کرو" جن سنگھی لیڈروں کی اپیل ـــــ اور فرصت ملتے ہی جن سنگھیوں کو اقتدار کی باگ ڈور دیدو۔

"سوشلزم کو کامیاب بنانے کے لئے تعمیری کاموں میں حصہ لینا ہوگا" ڈیفنس منسٹر کی تقریر ـــــ یعنی سب کو راج مزدور بننا ہوگا۔

"باعزت زندگی بسر کرنے کے لئے مسلم لیگ کو اپنایئے" صدر مسلم لیگ کی اپیل ـــــ اچھا موقعہ ہے جن سنگھ ہندوؤں کی عزت کا ٹھیکہ لے لے۔

"نفع خوروں کے خلاف سخت اقدامات کی تیاریاں مکمل" ایک خبر ـــــ گھڑی جیتا ہے قدم اٹھنے تک۔

"مظاہروں سے غذائی مسئلہ حل نہ ہوگا" سردار دربارہ سنگھ کا بیان ـــــ لیکن آئندہ الیکشن کے لئے میدان تو بن جائیگا۔

"تیموری خاندان کی ملکیت والے سینما سے متعلق اہم فائل غائب" ایک خبر ـــــ غنیمت سمجھو اور شکر ادا کرو کہ سینما ہی نہیں غائب ہو گیا۔

بھارت کے صدر ناصر کو راکھی [illegible]۔

امریکہ کے دورے سے واپس آنے پر شری پاٹل کا شاندار استقبال

"انگلستان کا وہ کالج جہاں کوئی طالب علم نہیں" - ایک خبر ——— دلی میونسپل کارپوریشن کو الزام نہیں دیا جا سکتا جس کے ایسے ہی اسکولوں کے متعلق پچھلے دنوں انکشاف ہوا تھا۔

"ویتنام میں جنگ کے بادل" - ایک عنوان ——— امریکی اور چینی گھنگھور گھٹاؤں کی گرج۔

"بڑھتی ہوئی گرانی سے ملک کا اقتصادی ڈھانچہ خطرے میں" - ایک عنوان ——— صرف جنتا کا - ذخیرہ اندوزوں، منافع خوروں اور سرمایہ داروں کا نہیں۔

"ہم ایسی ہر تجویز کا خیر مقدم کریں گے جس سے مسائل حل ہو سکیں" - صدر ایوب ——— لیکن ہند اور پاکستان دونوں میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو ہر تجویز کو تارپیڈو کریں گے۔

"شری شاستری کو گھریلو کام بہت زیادہ ہیں" - ایک عنوان ——— اس لئے وزارتیں، سفارتیں، گورنریاں اور ممبریاں اوروں میں تقسیم کیجئے۔ اُنھیں ان سے دلچسپی نہیں۔ اُٹھالو پاندان اپنا۔

"پنجاب میں کرتوڑ گرانی" - ایک سرخی ——— اس کا علاج ممکن ہے کہ زندہ لوٹ سے تو نجات مل گئی۔

"برطانوی فوج کے ہر کتے پر چودہ ہزار روپیہ سالانہ خرچ آتا ہے" - ایک خبر ——— ہندوستانی کتوں نے خبر پڑھی تو منہ میں پانی بھر آیا۔

"ضبطِ تولید کے لئے مختلف طریقے اپنائے جائیں" - ایک سرخی ——— اور ان میں سے ایک طریقہ غذائی قحط ہے۔ نہ کھانے کو ملے نہ ماں تولید پیدا ہو۔

"سات ناکتخدا بچے پیدا ہوئے" - ایک خبر ——— اُن کو ملا کر کُل کر لیجئے ساڑھے تین تو بن ہی جائیں گے۔

"کانگرس کے اختلافات کا سبب" - ایک عنوان ——— عہدے، ممبریاں اور کوٹے کے پرمٹ۔

• [illegible] صداقت [illegible]: ایک عنوان —— مطلب [illegible] کام [illegible]۔

• [illegible] انتخابات قریب آتے ہی مخالف پارٹیوں میں صلح ہو گئی: ایک خبر —— اس لئے کہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔

• لوگوں کے صبر کا پیمانہ لبریز: ایک سرخی —— لوگوں کی غلطی ہے وہ [illegible] رکھیں۔

• ہندی کو بھارت میں اہم پوزیشن دلا کر رہیں گی: سچیتا کرپلانی کی تقریر —— مگر اُردو کی مخالفت کر کے نہیں۔

• مادھو سنگھ کی طاقت میں اضافہ: ایک خبر —— کیا انہوں نے بھی [illegible] ٹانک کا استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔

• وزیر غذا کی اُمیدیں: ایک سرخی ——

کوئی اُمید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

• مجھے معلّم کی حیثیت سے یاد کیا جائے: ڈاکٹر ذاکر حسین —— شاید ڈاکٹر صاحب اس زمانے کے معلّموں کی حالت سے باخبر نہیں جن کی داڑھی ہر وقت شاگردوں کے ہاتھ میں رہتی ہے ورنہ بھول کر یہ بات نہ کہتے۔

• نامور ادیب راجہ مہدی علی خاں کے غسل خانہ اور بیڈ روم سے سوا دو لاکھ روپے نکلے۔ ان کا لاکر سر بمہر کر دیا گیا: ایک افواہ —— راجہ صاحب کہتے ہوں گے کہ کوئلوں کی دلالی میں خواہ مخواہ ہاتھ کالے کئے۔

• انتہائی ترقی پسند کہانی: ایک عنوان —— جس کا عنوان ہی عنوان ہے متن غائب۔

پاکستان میں صدارتی انتخاب لڑنے والوں کو ایک لاکھ روپیہ گورنمنٹ کی طرف سے دیا جائے گا۔

[illegible] صرف دل کے درد کی بپتا [illegible] کے رونا
[illegible] مسکرائی کہ ساحر و عاشق صادق کے بس کا روگ نہیں۔ دیکھئے یہ
[illegible] مسکرانے پر مجبور کیجئے۔ تھوڑی سی دیر کے
[illegible] باقاعدہ شروع ہو جاتے ہیں۔ اور میرے زخموں کو تو
[illegible] کے سالوں [illegible] مسکراتی رہی۔ آپ سے مل کر اور آپ سے
[illegible] ہو کے اور آپ کی بے رُخی سے اُداس ہو کے
[illegible] مسکرائی تھی کہ مجھے اُس لمحے کی آس تھی جس لمحے کا انتظار تھا جو میری
[illegible] سکتا تھا جو میری بے معنی کہانی کو عنوان دے سکتا تھا۔ جس ایک لمحے کی راحت
[illegible] آگ میں جلنے کے لئے تیار تھی۔ جس لمحے کے لئے میں ان پانچ سالوں
[illegible] کے سناٹے میں اپنے تکئے بھگوتی رہی۔

مگر وہ لمحہ آیا۔

[illegible] تصور میں وہ لمحہ کبھی مجھ سے دور نہیں رہا۔ میرے چاروں طرف وہ یوں پھیلا تھا [illegible] تھا اور کچھ نہیں۔ لیکن کیا تمام عمر تصور کی دیواروں سے سر پھوڑتی رہوں گی؟ [illegible] کوئی دروازہ میرے لئے نہ کھلے گا؟

ہاں حقیقت کا دروازہ کھلا تو تھا ——— پھر بند ہو گیا۔ وہ لمحہ آیا تھا۔ پورے ستائیس [illegible] تک آس پاس منڈلاتا رہا۔ اشارے کرتا رہا۔ لیکن میں اُسے ہمیشہ کی طرح [illegible] سیاہ اسٹیریم لینڈ کے پہیوں کے نیچے کچل گیا، اور اُس نے دم توڑ دیا۔

کل صبح آٹھ بج کر دس منٹ پر میں نے آپ کو اسٹیشن سے فون کیا۔ کیا آپ کو احساس [illegible] میری آواز کانپ رہی تھی؟ شاید نہ ہو۔ کیونکہ جب بھی آپ سے فون پر بات کرتی ہوں آواز تھرتھرانے لگتی ہے۔ جسے چھپانے کے لئے میں کم سے کم الفاظ میں بات ختم کر دیتی [illegible] کل بھی میں نے صرف اتنا کہا۔

میں آ گئی ہوں۔ اور اسٹیشن پر ہوں۔

لیکن ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یہ لرزش یہ ارتعاش کیوں؟ جب آپ سامنے ہوتے ہیں تو یہ نہیں ہوتا۔ شاید اس لئے کہ سامنے آپ ہوتے ہیں۔ ایک حقیقت جو میری نہیں اور [illegible] ہے۔

لیکن فون پر صرف میں ہوتی ہوں اور میرا تصور جو بے حد پُرکیف ہے۔ اور جو سارے [illegible] شل کر دیتا ہے۔

لیکن آپ نے اتنا مختصر جواب کیوں دیا۔ "میں ابھی گاڑی لے کے آتا ہوں۔"

اس "کیوں" کا جواب تو مجھے پچھلے پانچ سالوں میں ملا اور نہ پچھلے اکتیس گھنٹوں میں۔

بہرحال آپ کے اس جواب سے خوشی کی وہ کیسی انجانی لہر دوڑی تھی۔ اگر ریسیور [illegible] کس کے پکڑا ہوتا تو یقیناً ایک جھٹکے سے گر جاتا۔ اور تب وہ لہر ٹوٹ جس نے

پہلے شاید [illegible] دروازہ کھولا تھا۔ پھر جھک کے [illegible] تھا اس نے مجھے کیا سمجھا۔ میرے دل کی دھڑکن اتنی تیز ہو گئی کہ اُس پر واقعی آواز [illegible] ہو سکتا تھا۔ میرا چہرہ ایک دم تپنے لگا۔ اور پہلی بار مجھے اپنے گہرے سانولے رنگ کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہوا۔ اگر رنگ صاف ہوتی تو تمتماہٹ اور سرخی بہت پیش [illegible] پہلے کھل چکی تھی۔

لیکن یہ سرشاری یہ مسرت، یہ دل کی دھڑکن، یہ تمتماہٹ یہ کیفیت تو ایک پندرہ سولہ سال کی الھڑ معصوم لڑکی پر طاری ہو سکتی ہے جس کے دل میں پہلی بار پیار کا [illegible] پھوٹا ہو ——— وہی اس طرح ڈر سکتی ہے۔ اس طرح انجانی مسرت سے دیوانی ہو سکتی ہے۔ میں تو اس عمر سے بہت آگے نکل چکی ہوں۔ پھر یہ ہماری پہلی ملاقات بھی نہیں۔

تب یہ الھڑ جذبہ کیوں؟

شاید اس لئے کہ پیار کی دھڑکن ایک سی ہوتی ہے۔ چاہے دل الگ الگ ہوں ڈھانچے الگ۔ وقت الگ الگ۔ لیکن پیار وہی ہے جو جونک کے دل کو گرماتا رہا اور جو آج میرے دل میں اُسی طرح جوان ہے، اُسی طرح پُرکیف ہے۔ یا شاید اس لئے کہ پانچ سال کی اس مدت میں پہلی بار ہم تنہا ملنے والے تھے۔ ویسے یہ محض اتفاق تھا کسی کوشش کا نتیجہ نہیں۔ شاید یہی اتفاق اس انجانی خوشی کا سرچشمہ بن گیا ہو۔

جب آپ سامنے آئے تو میں ہمیشہ کی طرح اپنی الھڑ اداؤں پر قابو پا چکی تھی [illegible] کی طرح پُرسکون انداز میں اِدھر اُدھر کی باتیں کیں۔ وہ مکان دیکھا جس میں سب کی نظروں سے چھپ کر میں ایک اپنائیت محسوس کر رہی تھی۔ ناشتہ کیا اور اُس کام سے نکل گئی جس کے لئے میں آپ کے شہر آئی تھی۔

دوپہر کا کھانا کھا کے ہم اس طرح اس کمرے میں آئے تو دھوپ کی تیزی سے یوں بچا جا رہا تھا جیسے کوئی ماں اپنے یتیم بچے کو اپنے آنچل میں لپیٹ کے زمانے کے حوادث سے دور رکھنا چاہتی ہو۔ کمرہ ٹھنڈا تھا۔ پُرسکون تھا اور نیم تاریک تھا۔

اُس تاریکی نے تنہائی کا ہلکا سا احساس جگا دیا۔ صبح سے ہم تنہا تھے لیکن اُس وقت ہمارے ساتھ روشنی تھی اس لئے ہمارے ساتھ زمانہ تھا۔ اب روشنی اور زمانہ دونوں کھڑکی کے دروازوں کے باہر موٹے موٹے پردوں کے پیچھے رُک گئے تھے۔

شاید میری نظریں انہیں ڈھونڈ رہی تھیں۔

یا شاید رخصت کر رہی تھیں۔

بہرحال بہت دیر بعد جب میں نے نظریں اُٹھائیں۔ آپ صوفے پر اطمینان سے بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے۔ جیسے اندھیرے اُجالے کے کھیل سے بے خبر ہوں۔ میں آپ سے ذرا دور قالین پر بیٹھی تھی۔ ہم ایک دوسرے کے کتنے قریب تھے۔

دوپہر کا سناٹا تھا۔

تنہائی تھی۔
نیم تاریکی تھی۔
آپ تھے۔
میں تھی۔
جذبات تھے۔
ہلچل تھی۔

آپ چاہتے تو میرے بالکل قریب قالین پر آ سکتے تھے۔ میں چاہتی تو آپ کے پاس صوفے پر پہنچ جاتی۔ آپ کیا چاہتے تھے مجھے نہیں معلوم لیکن میں بہت کچھ چاہتی تھی۔

لیکن میں تو پھر جادو کے زور سے پتھر بن گئی۔

بالکل ساکت ہو گئی۔ میرا دماغ سُن ہو گیا۔ دل کی دھڑکن بھی شاید تھم گئی ہو گی۔ صرف سانس کبھی کبھی زندگی کا ثبوت دے رہی تھی۔ زبان میرے پاس تھی۔ لیکن روح وہاں نہیں تھی۔ وہ تو آپ کا طواف کر رہی تھی۔ کبھی قدموں پر رُک جاتی کبھی بانہوں میں۔ اور میں بے جان مورت بنی اپنی روح کو تڑپتی بھٹکتی دیکھتی رہی۔ اور چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کر سکی۔ کسی ایسے لمحے کا انتظار کرتی رہی۔ وہ لمحہ جو وہیں اُسی نیم تاریک کمرے میں چھپا تھا۔ لیکن ملت [illegible] دبے پاؤں گزر گئی۔

اُمید کا ایک دیا بجھ گیا۔

آرزو کا ایک کنول مرجھا گیا۔

شام کو میں نہانے گئی۔ بال سکھانے پنکھے کے نیچے صوفے پر بیٹھ گئی۔ پاس پڑا ہوا البم اُٹھا لیا۔ آپ تصویروں کا تعارف کروانے قریب آ گئے۔ بالکل قریب۔ میرے بالشت بھر کے بال اُڑ اُڑ کر آپ کے چہرے کو چوم رہے تھے۔ میں اُن پر نمی کے باوجود آپ کی سانسوں کی گرمی محسوس کر رہی تھی۔ اور آنے والے لمحے کے تصور سے میری سانس رُک رُک گئی۔ لیکن ہاتھ مشینی انداز سے صفحے اُلٹتے رہے۔

جسموں کا فاصلہ ایک انچ بھی نہ بڑھا۔

اور دلوں کا فاصلہ ذرہ برابر بھی کم نہ ہوا۔

البم ختم ہو گیا۔

بال سوکھ گئے۔

اور وہ لمحہ قریب آ کے پلٹ گیا۔

پھر ہم پکچر دیکھنے گئے۔ جانے کس خیال سے میرا دل دھڑک دھڑک اُٹھتا تھا۔ پکچر بالکل بیکار تھی۔ دل کی دھڑکنوں کو دبائے چھپائے ہم (COMMENTS) اور فقرے بازی کر رہے تھے۔ لیکن پھر بھی ہر رومانی سین پر بار بار میرے ہاتھ پاؤں سنسنانے لگتے اور میں مجسم طلب ہو کے کسی ہلکی سی دستک کا انتظار کرنے لگتی۔ لیکن کوشش کے باوجود آپ کی طرف نہ دیکھ پائی۔

لیکن اس دلِ زار کے پاس کوئی نہ آیا۔
ایوان میں چراغ تھرتھرا کے چمک اُٹھے۔
اور وہ اندھیرا جس سے کیسے کیسے تصورات وابستہ تھے ختم ہو گیا۔

ہوٹل کے کیبن میں خاصی دیر تک ہم خاموش بیٹھے رہے۔ فضا کچھ اُداس کچھ بوجھل ہو رہی تھی۔ اُس شہنائی کی طرح جو لڑکی کی رخصت کے وقت بجائی جاتی ہے۔ اپنے لمبے سفر کی وجہ سے جس سے آپ پچھلی رات ہی لوٹے تھے تھک گئے تھے اور خاموش۔ اور میں اُس کربناک لمحے کے خیال سے اداس تھی جو مجھے آپ سے جدا کرنے کے لئے تیزی سے آ رہا تھا۔ ۹ بج چکے تھے اور ٹھیک ساڑھے بارہ بجے میری گاڑی جاتی تھی۔

صرف تین گھنٹے۔

یوں تین گھنٹے بہت ہیں — اور کچھ بھی نہیں۔ تین گھنٹوں میں زندگیاں بن بھی اور بگڑ بھی سکتی ہیں۔ یہی تین گھنٹے سمٹ جائیں تو سینما کے ایک شو، تاش کے ایک میچ اور ایک بازی سے زیادہ نہیں۔

اور پھیلیں تو زمانہ بن جائیں!

وقت کی گردش تھم جائے تو یہی تین گھنٹے زندگی بن سکتے ہیں۔ لیکن وقت کے قدم تھامنے کے لئے جس ہمت کی ضرورت ہے وہ میرے پاس نہیں۔ اور شاید آپ کے پاس بھی نہیں۔ یا شاید ہے۔ اور آپ نے اُسے کسی بہتر موقع کے لئے اُٹھا رکھا ہے۔

آپ گاڑی چلا رہے تھے۔ میں قریب ہی سمٹی سکڑی بیٹھی تھی۔ رات بھیگ چکی تھی۔

راستہ سُنسان تھا اور فاصلہ طویل۔
اور گاڑی کی رفتار بہت دھیمی۔
جب وقت کی رفتار سو جاتی ہے تو ارمان جاگ اُٹھتے ہیں۔

جانے کتنی بار میرے تصور نے آپ کے ہاتھ کو کرسی پر پھیلتے دیکھا۔ آپ کو ادھر جھکتے دیکھا۔ لیکن جاگتے ارمان اور سوئی رفتار کچھ نہ کر سکی۔ اور گاڑی گھر پہنچ گئی۔

سوا گھنٹہ اور گزر چکا تھا۔ اب میرے لئے ایک گھنٹہ پینتالیس منٹ باقی تھے۔ میں جانتی تھی کہ یہ ایک سو پانچ منٹ میری زندگی میں پھر کبھی نہ آئیں گے۔ یا یوں کہیے کہ سو پانچ منٹوں کے بعد میری زندگی میرے پاس شاید پھر کبھی نہ آئے گی!

میرے سوا اِن لمحوں کی قیمت کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ اور میں [illegible] ان موتیوں کو ایک ایک کر کے بکھرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

ہر گزرتے ہوئے لمحے کے قدموں کی آواز طبلے پر چوٹ سے برس رہی تھی۔ وہ لمحہ جو بارہ بج کے بیس منٹ پر آنے والا تھا، وہ لمحہ پھانسی کا پھندا بنا میری آنکھوں [illegible]

[illegible] تھا [illegible] رات [illegible] تھی جسے اب بج کر [illegible] منٹ پر پھانسی [illegible] ایک [illegible] کی طرح تھا [illegible] ہو۔ جس کی [illegible] [illegible] [illegible] رہی ہو۔

[illegible] کے [illegible] [illegible] اور [illegible] بھی۔ لیکن میں تو تڑپ کے [illegible] آپ کے پلنگوں کے درمیان تھا۔ آج مجھے [illegible] کا فاصلہ [illegible] سے [illegible] جا سکے!

آپ کا [illegible] سگریٹ میری طرح سلگ رہا تھا۔ وہ وقت قریب تھا کہ [illegible] آ سکتا تھا۔

لیکن [illegible] کہ زنجیروں میں جکڑی تھی اور کس زنداں میں قید تھی کہ ذرا سی [illegible] کے لئے بھی اپنی راہوں کے چراغ نہ جلا سکی!

"ساڑھے گیارہ!" آپ نے لیٹے لیٹے اعلان کیا۔

[illegible] وقت دوسروں کی زندگیوں میں انقلاب لاتا ہے وہ میرے لئے کیوں [illegible]

"بارہ!" آپ نے ایک اور سگریٹ سلگایا۔

ایک شعلہ بھڑکا اور بجھ گیا۔

پھانسی کا پھندا تیزی سے جھولنے لگا۔

"سوا بارہ"

پھندا میری گردن سے لپٹ گیا۔

"اُٹھئے!" ——— آپ نے رسّی کو جھٹکا دیا۔

اور میں نے سچ مچ محسوس کیا کہ میری جان نکل گئی۔ گردن ڈھلک کے ایک طرف کو [illegible] اور میں پلنگ سے چپک گئی۔ بے روح بے جان سی۔ اُس آخری لمحے میں بھی آپ [illegible] پیار کے چھینٹوں سے مجھے زندہ کر سکتے تھے۔ اعجازِ مسیحائی۔ روایت کو تازہ کر سکتے تھے۔ [illegible] زندگی لینے والے زندگی دیتے کب ہیں؟

اور خود اپنی موت پر کون تڑپ سکتا ہے۔

گاڑی نے شاید میری تڑپ کو محسوس کر لیا۔ وہ اس طرح تڑپی کہ ٹھنڈی ہو گئی۔ مجھ سے [illegible] آزاد، مجھ سے زیادہ باہمت تو گاڑی ہے۔ میں تو چاہتے ہوئے بھی نہ رک سکی تھی۔ گاڑی [illegible] میری مشکل آسان کر دی۔

لیکن وقت جو رک گیا تھا آگے میں کیسے مناتی۔

اور شاید وہ پھندا، وہ جھٹکا جس نے سوا بارہ بجے اپنی گردن پر اپنی روح پر محسوس کیا [illegible] اس پھندے نے میرے سارے ارمانوں کا، ساری آرزوؤں کا گلا گھونٹ دیا۔ جو طوفان [illegible] سے میرے اندر اتھل پتھل مچا رہا تھا۔ وہ طوفان تھک کے خاموش ہو گیا تھا۔ میرے دل کی [illegible]

ساری شراب بہہ گئی تھی۔

اور وہ خالی شیشے کی طرح اندھا پڑا تھا۔

اُس سوکھی ڈال کی طرح لرز رہا تھا جس پر سے پیار کا پنچھی چہک [illegible] اور میں کروٹ بدل کر سو گئی۔

دوسرے دن گاڑی سرتی رہی۔ گو میری آنکھیں کھلی تھیں۔ میں چل بھی رہی تھی اور کھا پی بھی رہی تھی۔ لیکن میرے دل پر، میری روح پر ایسی نیند طاری تھی جسے موت کی نیند کہا جاتا ہے۔

ارے میرے کپڑوں سے یہ کیسی خوشبو ہے ———

یہ تو وہ سگریٹ ہے جو آپ پیتے ہیں ——— ہاں ——— کھانا کھا کے ہم پھر اُسی نیم تاریک، خاموش کمرے میں آ گئے تھے۔ اور آپ مسلسل سگریٹ پی رہے تھے۔

یہ وہ خوشبو ہے جو مجھے اُن دو گھنٹوں میں ملی۔ لیکن صرف خوشبو۔

کیا میری قسمت میں اس اُڑی اُڑی خوشبو کے سوا کچھ نہیں ——— یہ خوشبو بھی ابھی غائب ہو جائے گی۔ یہ مجھ سے اتنی قریب ہے پھر بھی میری نہیں۔

کاش آپ مجھے یہی بتا دیتے کہ خوشبو کیسے قید کی جا سکتی ہے۔ کیسے اپنائی جا سکتی ہے، لیکن آپ نے تو کچھ بھی نہ بتایا۔ بس صوفے پہ بیٹھے سگریٹ پھونکتے رہے۔ باتیں کرتے رہے۔ اور یک جہتی کا نا سب خاصا قیامت خیز سمجھا جاتا ہے آپ کے قدموں سے صرف ڈیڑھ بالشت کے فاصلے پہ بیٹھا تڑپتا رہا۔ آج بھی آپ کے پاؤں اور میرے ہونٹوں میں ڈیڑھ بالشت سے زیادہ کا فاصلہ نہیں تھا۔

ہائے! میرا کیسا جی چاہا کہ آپ کے قدموں پہ اپنا سر رکھ دوں اُس خاک کو جو آپ کے پاؤں کے نیچے ہے اُٹھا کے اپنی مانگ میں بھر لوں۔

لیکن میرے لئے تو خاک بھی آسمان بن گئی!

ٹھیک تین بج کر اٹھارہ منٹ پر ناگن سی لہراتی سیاہ اسٹریم لینڈ دروازے پر آ گئی۔

آپ نے ہاتھ ہلایا۔

میں نے ہاتھ ہلایا۔

اُس کے پیچھے گھروٹ۔

اور میں جانے کب کی پیاس لئے واپس آ گئی!!

اُڑی اُڑی سی خوشبو اب بھی کمرے کی فضا میں تیر رہی تھی۔

مدیرِ "بیسویں صدی" کے نام خطوط لکھتے وقت جہاں تک ہو سکے اختصار سے کام لیکر ہمیں تا کہ آپ کے ارشاد کی فوراً تعمیل ہو سکے۔ طویل خطوط مصروفیت کے باعث فوراً نہیں پڑھے جاتے۔ (منیجر ماہنامہ بیسویں صدی دہلی)

الوداع

"الوداع" ہے محترمہ ڈاکٹر [illegible] صاحبہ [illegible] کی [illegible]
[illegible] محبت کرتی ہے [illegible] [illegible] [illegible] ہے [illegible]
بالکل مختلف ہے ہم اسے اس یقین کے ساتھ پیش کر رہے ہیں کہ قارئین اس کے حسن خیال اور حسن بیان کو [illegible] دیں گے
ڈاکٹر صاحبہ کو زبان و بیان پر عمدہ قدرت حاصل ہے [illegible] شاعرہ [illegible]

پروفیسر ڈاکٹر منوہر سہائے انور، ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی

ہائے اب میں کیا کروں، رخصت کی ساعت آگئی ⭑ جس کے ڈر سے دل دھڑکتا تھا وہ آفت آگئی

باجے والے آگئے، سکھپال والے آگئے ⭑ مجھ کو لینے کے لئے سسرال والے آگئے

عورتوں سے ہوگیا پر صحن بھی، دالان بھی ⭑ اور باہر گاڑیوں پر لد گیا سامان بھی

ہائے اب ہوتا ہے گھر سے کوچ میرا ہائے ہائے ⭑ چھوٹتا ہے مجھ سے یہ میرا بسیرا ہائے ہائے

ہائے اماں بے ترے جی بے طرح گھبرائے گا ⭑ باپ، بھائی کا تصور رات دن تڑپائے گا

ہائے اب مجھ سے جدا ہوتی ہیں سب ہمجولیاں ⭑ یہ خدا جانے کہاں ہوں گی جب آؤں گی یہاں

ڈار سے بچھڑے ہرن پھر اس میں آملتے نہیں ⭑ جیسے پتے پیڑ سے ہو کر جدا ملتے نہیں

رنج ہے ماں باپ کو بے حد، مگر خاموش ہیں ⭑ میں سمجھتی ہوں وہ کیوں، کیا سوچ کر خاموش ہیں

آرہے ہیں مجھ کو سینے سے لگانے کے لئے ⭑ پیار کرکے اور میرا دل دکھانے کے لئے

یوں نہ روئے آٹھ آٹھ آنسو تو بھائی کیا کرے ⭑ کل کا بچہ چارۂ دردِ جدائی کیا کرے

آدمی تو آدمی، اشجار تک مغموم ہیں ⭑ منظر و بام و در و دیوار تک مغموم ہیں

لے چلا گلشن سے مجھ کو آب و دانہ، کیا کروں ⭑ اب کہاں میں اور میرا آشیانہ، کیا کروں

الوداع اے جنت، اے ماں باپ کے گھر الوداع

الوداع اے صحن، اے دالان، اے در الوداع

پتہ: ۱۲۴ ایسٹ پٹیل نگر، نیو دہلی

افسانہ

خاک ہو جائیں گے ہم...

ناز چکدیوی

اے ۳۱۔ اے۔ جی۔ آفس پوسٹ ہیٹو۔ رانچی

۱۶ مئی ۶۴ء

برادرم! تسلیم

ایک طویل خاموشی کے بعد ایک بار پھر بزمِ "بیسویں صدی" میں شریک ہونے کی جرأت کر رہا ہوں ——— "خاک ہو جائیں گے ہم..." ایک ایسی کہانی ہے جسے میں نے پورے اعتماد کے ساتھ لکھا ہے ——— اب اسے آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ آپ اسے پڑھئے اور پسند آئے تو "بیسویں صدی" کی کسی قریبی اشاعت میں شریک کر لیجئے...

آپ کا ——— ناز چکدیوی

نہ جانے یہ ڈائری میرے پاس کہاں سے آپہنچی ہے ——— ! اس کا پہلا صفحہ اُلٹ کر میں تو خوبصورت حروف میں "خیالاتِ پریشاں" لکھا ہوا پاتا ہوں جس کے نیچے ایک لڑکی کا نام لکھا ہے ——— "روبی" ——— دماغ پر زور دینے کے باوجود کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ لڑکی [illegible] دلچسپی بڑھتی ہے اور میں ڈائری پڑھنا شروع کر دیتا ہوں۔

اکیلی راتیں اداس منظر یہ ٹھنڈی سانسیں یہ گرم آنسو
کوئی نہیں ہے تو یادِ ماضی اب آ، تجھی کو گلے لگا لوں

اُف! یہ رات کتنی تاریک ہے ——— آسمان کے ان چمکتے ہوئے ستاروں کو آج کیا ہے۔ آخر یہ مدھم مدھم سے کیوں دکھائی دے رہے ہیں۔ میرے سرہانے ٹیبل لیمپ جل رہا ہے اور میری میز پر ایک تصویر رکھی ہے۔ یہ تصویر کتنی حسین ہے! ——— ایک خوبصورت لڑکی جس کے مسکراتے ہوئے چہرے پر کتنی رعنائی اور کشش ہے ——— ! میں اس تصویر کو اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیتی ہوں۔ میری آنکھوں کے کونوں میں چھلکے سے آنسوؤں کے قطرے آجاتے ہیں۔ میں اپنی آنکھوں کی نمی کو پونچھنے کی کوشش کرتی ہوں تو ایسا معلوم ہونے لگتا ہے جیسے میری آنکھیں میری اس کوشش پر احتجاج کر رہی ہیں ——— مجھے گرنے دو روبی ——— ناہید کو فراموش کر دیا ہے نا ——— شاید تم نے خود پر قابو پا لیا ہے لیکن تمہیں اپنے دل پر تو کوئی اختیار نہیں۔ جو جذباتی آنسو بن کر تمہاری آنکھوں سے ٹپک پڑنا چاہتا ہے ——— نہیں ——— میں اپنے دل کی اس آواز پر جھنجھلا اٹھتی ہوں ——— میں نے ناہید کو فراموش کیا ہے ——— ناہید تو میری زندگی ہے اس کی یاد تو میری زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔ میں تصویر سے مخاطب ہو جاتی ہوں ——— تم ہی جواب دو ناہید۔ میں نے تمہیں کب فراموش کیا ہے؟ کیا میری دوستی کی جڑ اتنی کھوکھلی تھی کہ زمانے کے انقلابات کے ہاتھوں اکھڑ جاتی؟ میں تو تمہیں اپنے جسم اپنی زندگی کا ایک اٹوٹ حصہ سمجھتی تھی اور آج تم نہیں ہو تو کیا ہوا ——— تمہاری ایک ایک بات، تمہاری ایک ایک ادا تمہاری ایک ایک چیز میرے سامنے آج بھی اسی طرح ناچ رہی ہے۔ تمہیں یہ کمرہ تو یاد ہوگا نا۔ جہاں تم پہلی بار مجھ سے ملی تھیں۔

مجھے آج بھی وہ دن یاد ہے جب میں اس محلے میں تمہارے گھر کے بغل میں آکر رہنے لگی تھی۔ تم تو اس گھر کو پہچان ہی رہی ہوگی۔ یہ میری خالہ کا گھر ہے۔ جہاں میں اس لئے آگئی تھی کہ یہاں کے کالج میں مجھے نام لکھانا تھا اور تم رات کو مجھ سے ملنے آئی تھیں ——— "مجھے ناہید کہتے ہیں اور میں بغل کے مکان میں رہتی ہوں اور بی۔ اے کے پہلے سال میں پڑھتی ہوں ———" اور میں تمہیں دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ کیا واقعی حسن کی یہ حد بھی ہو سکتی ہے ——— تمہیں دیکھنے کے بعد تم سے مرعوب ہو کر اچانک سب سے پہلا یہی سوال میرے دماغ میں ابھرا تھا ——— "آپ مجھے اپنی دوست سمجھئے۔ میں روبینہ ہوں ———" اور پھر ہم دونوں دوست ہی نہیں رہے میں تمہیں اپنی بہن سمجھنے لگی۔ ایک ہی کالج اور ایک ہی کلاس میں پڑھنے کے بعد میری دوستی مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی۔

اُف! آنکھوں کی یہ نمی کچھ لکھنے ہی نہیں دیتی۔ آج تو ایک ایک واقعہ ایک ایک بات اس طرح یاد آرہی ہے جیسے کل ہی کی بات ہے۔ لیکن یہ باتیں تو اب بہت پرانی ہو چکی ہیں ——— ماضی کی وہ شام بھی کتنی دلگداز اور ہنگامہ پرور تھی۔ کالج کا سالانہ پروگرام تھا۔ تم ایک ادبی مباحثہ میں حصہ لے رہی تھیں۔ موضوع تھا ——— "تعلیم انسان کو مکمل انسان بناتی ہے۔ تعلیم غرض اور ذاتی مفاد سے بالاتر ہے ———" کتنی [illegible] تھی اس جلسے میں اور ہم لوگ ان

[illegible] بے اختیار ناہید کو [illegible] ناہید اب بات آگے بڑھانے [illegible] ہیں [illegible] بات [illegible] آواز میں ناہید کو ٹوکا کر [illegible] ڈال دیتی ہے۔ [illegible] ہے ۔۔۔ میں [illegible] لئے [illegible] کوشش کرتی ہوں ۔۔۔ شہاب [illegible] ناہید کے خوابوں کا [illegible] تھا ۔۔۔ دیکھنا ناہید [illegible] زندگی [illegible] کیا تھا سامنے آگیا ہے ۔۔۔ وہ [illegible] کر اپنی [illegible] ہوں ۔۔۔ لیکن پھر [illegible] محبت کی [illegible] ہے ۔۔۔ میں خود اپنے آپ سے سوال کرتی ہوں ۔۔۔ یہ تو خوشیوں [illegible] ہے میری [illegible] پیاری [illegible] دلہن بنی ہوئی ہے اور میرا دل جیسے کھنچا جا رہا ہے۔ یہ انجانا سا خوف کیوں مجھ پر طاری ہوتا جا رہا ہے ۔۔۔ میں خود پر جھنجلا اٹھتی ہوں۔

اور اپنے بابل کا گھر سونا چھوڑ کر ۔۔۔ مجھے روتی چھوڑ کر ۔۔۔ ناہید خود روتی ہوئی ایک اجنبی کے ساتھ چلی جاتی ہے ۔۔۔ میں آج بھی ناہید کے اُن آنسوؤں کو اپنے کاندھے پر محسوس کر رہی ہوں جو اُس نے مجھ سے لپٹ کر بہائے تھے ۔۔۔ اور ان گیت سے پہلے ماحول پر ایک اداسی چھا گئی تھی۔ پھر ایک دل دوز سناٹا چھا گیا ۔۔۔ ناہید رخصت ہو گئی۔ وہ ایک نئی زندگی بسانے کی آرزو لے مجھے تنہا چھوڑ کر چلی گئی۔

اور آج تین دن کے بعد ناہید پھر اپنے میکے واپس آ رہی تھی۔ صبح ہی سے تیاریاں ہو رہی تھیں ۔۔۔ میری بے چین نگاہیں اُس راستے پر لگی ہوئی تھیں جس سے ناہید کا ڈولا آنے والا تھا ۔۔۔ میرا دل دھڑک رہا تھا ۔۔۔ یہ دھڑکنیں بار بار مجھے کیوں پریشان کرنے لگتی رہیں۔ دل کے اندر بے شمار سوالات مچل رہے تھے جو میں ناہید سے پوچھنے والی تھی ۔۔۔ اور پھر ناہید کا ڈولا آگیا۔ ایک بار پھر اُس سونے گھر میں زندگی کے سارے ہنگامے جاگ اٹھے ۔۔۔ میں دوڑ کر جاتی ہوں اور اُسے ڈولے سے اُتار کر لاتی ہوں۔ میں بے اختیار اُس کی بلائیں لینے لگتی ہوں اور دیوانہ وار اُسے اپنے سینے سے لپٹا لیتی ہوں۔ پھر اچانک اُس ہنگامے کے بیچ سے پھسلتی ہوئی ایک جانی پہچانی سی آواز آتی ہے ۔۔۔ دولہا نہیں آیا ۔۔۔ اور میں چونک اٹھتی ہوں۔ چاروں طرف یہی سرگوشی ہے ۔۔۔ دولہا کیوں نہیں آیا ۔۔۔؟ اور میں چاروں طرف پاگل سی دوڑتی پھرتی ہوں۔ سب کے ہونٹوں پر ایک ہی جملہ ہے ۔۔۔ دولہا نہیں آیا ۔۔۔ سب کے چہرے پر ایک گہری اداسی چھائی ہے ۔۔۔ آخر ایسا کیوں ہوا؟ ۔۔۔ دولہا بھائی کیوں نہیں آئے ۔۔۔؟ میں سب سے بے تکانہ سوال کرتی ہوں لیکن میری تسلی نہیں ہوتی ۔۔۔ میں ناہید کے پاس جاتی ہوں۔ اُسے غور سے دیکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ بظاہر کوئی دکھ اُس کے چہرے پر نظر نہیں آتا۔ وہ مطمئن نظر آتی ہے۔ اُس کے چہرے کا [illegible] نکھر آیا ہے [illegible] کچھ اور حسین نظر آ رہی ہے۔ میں اُس سے پوچھتی ہوں ۔۔۔ دولہا بھائی کیسے آدمی لگتے ہیں ۔۔۔؟ وہ خاموشی سے مجھے دیکھتی ہے۔ اُس کی آنکھیں سوئی سوئی سی ہیں۔ مسکرانے کی کوشش کرتی ہے اور میں بار بار سوچتی ہوں کہ اس مسکراہٹ میں کوئی جان نہیں ہے کیا ناہید خوش نہیں ہے ۔۔۔؟ پھر میں خود پر جھنجلا اٹھتی ہوں ۔۔۔ یہ کیسی باتیں میں کیوں سوچنے لگی ہوں ۔۔۔ شہاب تو ناہید کے خوابوں کی تعبیر ہے اور ناہید تو ایک ایسی مثالی لڑکی تھی جسے پسند نہ کئے جانے کا سوال ہی نہیں اُٹھتا۔ پھر یہ بدشگونی کیوں ۔۔۔؟ شہاب کیوں نہیں آیا ۔۔۔؟ لیکن اُس دن میری لاکھ کوشش کے باوجود اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملا۔

لیکن دوسرے دن ساری باتیں سامنے آجاتی ہیں اور جب یہ باتیں میرے کانوں میں پہنچتی ہیں تو میں حیرت کے سمندر میں غرق ہو جاتی ہوں ۔۔۔ ناہید کے خوابوں کی یہ کیسی تعبیر ہے ۔۔۔؟ کیا یہ انقلاب ہے ۔۔۔؟ شہاب کے نہ آنے کی وجہ یہ تھی کہ شادی میں اُس نے جو کچھ چاہا تھا وہ اُسے نہیں ملا تھا ۔۔۔ وہ ایک ریڈیو گرام، صوفہ سیٹ اور ایک کار چاہتا تھا جو ناہید اپنے ساتھ نہیں لا سکی تھی۔ ناہید کے پورے گھر میں ایک سناٹا طاری تھا، ایک عجیب سی اداسی چھائی ہوئی تھی۔ اُس کے ضعیف والد نے اس غم میں بستر پکڑ لیا تھا ۔۔۔ میرے سینے پر غم کا ایک بوجھ آپڑا ہے۔ میں دولہا بھائی سے ملنے کی کتنی مشتاق تھی اور میرے دل میں کیا کیا خیالات تھے۔ میں جانتی ہوں کہ ناہید کے والد کسی زمانے میں ایک زمیندار تھے لیکن زمینداری چھن جانے کے بعد اب اُن کی حالت ایک متوسط درجے کے کسان جیسی سی رہ گئی تھی اور اب ۔۔۔ وہ اس قابل تھے ہی نہیں کہ اپنے داماد کی ان بھاری فرمائشوں کو پورا کر سکتے۔

تو کیا شہاب نے یہ توقع اسی بھروسے پر لگا رکھی تھی کہ اُس کے ہونے والے سسر کسی زمانے میں زمیندار تھے ۔۔۔ ایک سوال میرے ذہن میں اٹھتا ہے اور جب میں ناہید کے پاس جاتی ہوں تو اُسے خاموش بیٹھی ہوئی پاتی ہوں ۔۔۔ ارے تم [illegible] ؟ تم میرے پاس کیوں نہیں رہتی ہو ۔۔۔؟ اُس کے اس سوال میں کتنی حسرت اور کتنا درد پوشیدہ تھا ۔۔۔ میں دولہا بھائی سے بہت رنجیدہ ہوں ناہید۔ وہ آئے کیوں نہیں ۔۔۔؟ میرے الفاظ میں ایک شکایت پوشیدہ ہے ۔۔۔ تم مجھ سے تو ناراض نہیں ہو رنو آپا ۔۔۔؟ میرے پاس بیٹھو ۔۔۔ میں اُس کے چہرے کو اٹھاتی ہوں۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے اور جب میں اُس کی آنکھوں میں جھانکتی ہوں تو وہاں بے بسی کے ڈورے تیرتے نظر آتے ہیں ۔۔۔ چار دن کی یہ نئی نویلی دلہن ۔۔۔ بظاہر ہنسنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اپنے دل کے درد کو چھپانے میں ناکام تھی۔ یہ دن تو اُس کی امنگوں کے دن تھے ۔۔۔ انہی دنوں کے انتظار میں ہر لڑکی کی امنگیں اور تمناؤں کے ننھے ننھے دیپ جلائے رہتی ہے اور ایسے ہی دنوں کی مشتاق تو لڑکیاں اپنے ہوش سنبھالنے کے وقت ہی سے رہنے لگتی ہیں جب اُن کے جسم کے ہر حصے سے مہندی اور اُبٹن کی بھینی بھینی اور مست کر دینے والی خوشبو اُٹھتی ہے اور اُن کی نس نس میں خوشیوں کے ننھے ننھے شگوفے کھلتے ہیں۔ لیکن

زکام کا مقابلہ کرنے کے لئے
واٹربریز کمپاؤنڈ لیجئے

Waterbury's

غزل

عبدالحمید عدم

ساز ہستی بجا رہا ہوں میں
جشن مستی منا رہا ہوں میں

کیا ادا ہے شمار ہونے کی
اُن سے پہلو بچا رہا ہوں میں

کیسی بے ساختہ مسرت ہے
بے سبب مسکرا رہا ہوں میں

انتہا ہے خدا شناسی کی
بے نیازِ خدا رہا ہوں میں

رہنما کچھ پتا تو چلنے دے
آ رہا ہوں کہ جا رہا ہوں میں

کتنی مبہم ہے میری نادانی
تجھکو تجھ سے چھپا رہا ہوں میں

تجھکو اوہام بخشنے والے
تجھ پہ ایمان لا رہا ہوں میں

ناخدا تجھکو ساتھ لپٹا کر
قعر دریا میں جا رہا ہوں میں

علم خود تھک گیا مگر اب تک
پڑھ رہا ہوں پڑھا رہا ہوں میں

دل ڈبوتا ہوں چشم ساقی میں
مے کو غم میں ملا رہا ہوں میں

تجھکو کیا علم کتنی مدت سے
تیرے لیے چرا رہا ہوں میں

آپ کو جیتنے کے دھوکے میں
جان کی بازی لگا رہا ہوں میں

اُن سے ملنے کی آرزو میں عدمؔ
اپنے نزدیک آ رہا ہوں میں

یزدانی جالندھری

ابھی سعی پرواز ہے آسماں تک
یہ انساں خدا جانے پہنچے کہاں تک

ترا حسن ہے میرے حسن بیاں تک
تری بزم ہے عشق کی داستاں تک

زمانے میں دیر و حرم کے علاوہ
کئی لوگ پہنچے ترے آستاں تک

تُو میرا فسانہ میں تیری حقیقت
ہے تیری حقیقت مری داستاں تک

وہ دل اب ہے اپنے غم سے گریزاں
سمایا تھا جس میں غمِ دو جہاں تک

کہا کیا اسیروں سے موجِ صبا نے
کئی بار نظریں گئیں آشیاں تک

کسی ہم سفر کا نشاں کیا ملے گا
کہ گم ہے غبارِ رہِ کارواں تک

جہاں گردشِ جام کا ذکر آیا
وہیں رک گئی گردشِ آسماں تک

کہاں کوئی خانہ برانداز ہم سا
کہ پھونکا ہے ہم نے غمِ آشیاں تک

روایاتِ اسلاف زندہ ہیں جس سے
وہ محفل ہے یزدانیؔ خوش بیاں تک

گھر میں دُھلی
سرف
سے دُھلی
Surf

خاص آپ کے لئے
نیا لائف بوائے
LIFEBUOY
for health
خوشنما نیا سرورق
نئی پکڑنے میں آسان ٹکیہ
دیکھئے، اپنے دلپسند لائف بوائے کی نئی شان:
خوشنما رنگین سرورق، اور نئی سڈول ٹکیہ پکڑنے
میں ایسی آسان جیسے خاص آپ کے لئے بنائی
گئی ہو! نئے لائف بوائے سے نہائیے اور طبیعت میں وہی تازگی پائیے
جس کی بدولت لائف بوائے آپ کا برسوں سے پسندیدہ صابن
ہے۔ آج ہی نیا لائف بوائے صابن لائیے!
لائف بوائے ہے جہاں، تندرستی ہے وہاں
ہندوستان لیور کا تیار کردہ

شاید جانتے ہو گی!"
بیوی: "نہیں"
سپرنٹنڈنٹ: "تم اتنی اُداس کیوں ہو؟ خیریت تو ہے، نریندر تو اچھا ہے؟"
بیوی: "بالکل اچھا ہے"
سپرنٹنڈنٹ: "پھر کیا بات ہے؟"
بیوی: (ایکدم پھوٹ کر روتے ہوئے) "نریندر کامنی سے شادی کر رہا ہے"
سپرنٹنڈنٹ: "ہمارا بیٹا نریندر شادی کر رہا ہے؟"
بیوی: "کامنی سے!"
سپرنٹنڈنٹ: "کامنی یعنی وہی اپنے یار جوگندر سنگھ کی لڑکی، ہنہ! نریندر اس سے شادی کر رہا ہے تو کرنے دو، اس میں ایسی گھبرانے کی کیا بات ہے؟ ڈارلنگ!
میں تو ڈر گیا تھا"
بیوی: "سماج کیا کہے گا"
سپرنٹنڈنٹ: "تمہارا مطلب ہے ذات برادری کا فرق ہے۔ میں نہیں مانتا ذات برادری کے ڈھکوسلوں کو"
بیوی: "نہیں، تم سمجھے کیوں نہیں۔ وہ دونوں سگے بہن بھائی ہیں!"
سپرنٹنڈنٹ: "کیا کہا؟ تو کیا نریندر میرا بیٹا نہیں ہے؟ اس کا مطلب ہے کہ تم بھی مجھ سے دغابازی کرتی رہی ہو۔ تم میرے دوست جوگندر سنگھ کے ساتھ گلچھرے اُڑاتی رہی ہو! میں برداشت نہیں کر سکتا۔ (چیخ کر) نکل جاؤ! نکل جاؤ! میرے سامنے سے دُور ہو جاؤ! میں کہتا ہوں چلی جاؤ!!"
بیوی: "میں تم سے کچھ بھی چھپانا نہیں چاہتی۔ میں اور جوگندر کالج کے زمانے سے ایک دوسرے سے پریم کرتے تھے۔
سپرنٹنڈنٹ: (بات کاٹ کر) "بند کرو یہ پریم کہانی۔ میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔ نکل جاؤ!"
بیوی: "میں سچ سچ کہہ رہی ہوں میں نے زندگی میں کبھی تم سے محبت نہیں کی۔ میں تمہاری محبت کے قابل نہیں تھی۔ میں نے ہر بار تمہیں فریب دینے کی کوشش کی۔ میرے جوگندر سے پریم کیا۔ میں نے تمہیں دھوکا دیا ہے۔ میں نے ایک لمحے کے لئے بھی تمہیں نہیں چاہا۔ میں دھوکے باز ہوں۔ مجھے سزا دو! بھگوان کی قسم میں سچ کہہ رہی ہوں، بالکل سچ کہہ رہی ہوں"
سپرنٹنڈنٹ: "سچ سے مجھے نفرت ہے، سُنا تم نے؟ مجھے سچ سے نفرت ہے۔ سچ بولنے والوں سے نفرت ہے۔ سچ زہریلا ناگ ہے۔ جو زندگی بھر کے سکھ اور شانتی کو ڈسے لے رہا ہے۔ (زور سے گھنٹی بجاتا ہے اور چیختا ہے) اردلی! اردلی!!"
اردلی: "جی سرکار!"

غزل

امتیاز علی عرشی

آس کے سہارے پر زندگی گنواتا گیا
کہہ کے جو مکرتا تھا، اُس کو آزماتا گیا
بارِ غم سے دل ہی کو خون کیوں نہ کر ڈالوں
آنسوؤں کو پی پی کر آنکھ کا جلاتا گیا
عہدِ تازہ پر کیسے دل کو اعتبار آئے
تم سے ہو نہیں سکتا پھر کوئی بہانا گیا
خود فسانۂ الفت ہیں، کہہ کر کٹ جائے
زیبِ داستاں کرتا قیس کا فسانا گیا
رنگ و بو کے شیدائی دل کلی کا پیدا کر!
گُل کے چاکِ داماں کو سونگھتا سنگھاتا گیا

سپرنٹنڈنٹ: "میم صاحب کو لے جاؤ۔ ان کا بیان قلم بند کرو ——— لے جاؤ!!"
اردلی: "بہت اچھا حضور!" (دونوں چلے جاتے ہیں)
سپرنٹنڈنٹ: "تو یہ ہے اس ڈرامے کا انجام! میں یہ توہین برداشت نہیں کروں گا۔ اس کا علاج موت ہے صرف موت!!" (وقفہ)
ہیرالال: "حوالات میں کوئی جگہ خالی ہوئی کپتان صاحب! اگر کوئی کوٹھڑی ہوتی ہے تو ارے یہ کیا؟ کپتان صاحب! کپتان صاحب! آپ نے یہ کیا کیا۔ آتم ہتیا۔۔۔ ارے! یہ کیا ہو! کپتان صاحب نے خود کشی کر لی۔۔۔ پستول سے گولی مار لی!! دیکھئے یہ سچائی کیسی بھیانک ہے، کیسی خطرناک ہے۔۔۔۔ اعلان کر دو آج سے کوئی سچ نہ بولے۔۔۔ آج سے کوئی جھوٹ کو بُرا نہ کہے۔۔۔۔ سچائی بڑی بھیانک ہے!!

(پردہ)

دلکش نفیس ایمبرائیڈری
چکن اور ایمبرائیڈ
کپڑے
نیفی کارپوریشن لمیٹڈ

رشی پٹیالوی

قلب کی بے قراریاں اور ہجر میں قرار سے
آتش دل بھڑک اٹھی اور دیدۂ اشکبار سے

جانِ الم نصیب نے ہجر کا غم اٹھا لیا
آپ کے اعتبار پر آپ کے اعتبار سے

تیغِ نگاہِ دل رُبا اُٹھ کے یہ خوب کر گئی
رُوح الگ سکون سے قلب جدا قرار سے

شاخِ امید پر کبھی جب کوئی پھول کھل گیا
غنچۂ دل اُلجھ گیا درد و الم کے خار سے

جب سے کوئی بچھڑ گیا گلشنِ دل اُجڑ گیا
آئے نہ اب بہار بھی کہہ دے کوئی بہار سے

آپ کی ہے یہی خوشی وعدۂ حشر ہی سہی
جانِ حزیں تو بچ گئی روز کے انتظار سے

سینۂ داغ دار میں ہُوک سی اُٹھ کے رہ گئی!
اور نہ کچھ بھی ہو سکا میرے لئے بہار سے

پھول ہی پھول کھل گئے گلشنِ اشتیاق میں
یاد کسی کی چھو گئی دامنِ دل کے تار سے

اپنائی کے صدق کا جائزہ کچھ انہیں کو ہے
وہ جو خوشی کے وقت بھی رہتے ہیں سوگوار سے

اپنے لئے قفس میں بھی جشنِ بہار ہے رشی
داغِ جگر بھرے ہوئے دیدۂ اشکبار سے

اخگر مشتاق رحیم آبادی

جلوہ ہو یا حجاب مجھے سب قبول ہے
اے حسنِ لاجواب مجھے سب قبول ہے

جینے کے واسطے کوئی اُمید چاہیئے
دریا ہو یا سراب مجھے سب قبول ہے

تخصیصِ صبح و شام غلط عہدِ قرب میں
مہتاب و آفتاب مجھے سب قبول ہے

بزمِ ادا و نازِ نگاراں میں دوستو!
کیا کیجئے انتخاب مجھے سب قبول ہے

کس نے یہ کہہ کے آپ کو بہکا دیا حضور
جو کچھ ہو دستیاب مجھے سب قبول ہے

یہ شرط ہے کہ اپنے ہی ہاتھوں سے دیجئے
پھر سم ہو یا شراب مجھے سب قبول ہے

اپنے قریب اُن کو دوبارہ بھی دیکھ لوں
ہو واقعہ کہ خواب مجھے سب قبول ہے

سب کچھ اگر ہے خاص اور اسے خلوص سے
پھر تو مری جناب مجھے سب قبول ہے

اخگر چمن میں فرقہ پرستی کی بات کیا
کانٹا ہو یا گلاب مجھے سب قبول ہے

اُف! اتنی تکلیف دہ کھانسی!
لیجیے!
ٹسانول استعمال کیجیے

ٹسانول

TUSSANGE

افسانہ

جستجو نظر کی

شکیل جاوید امروہوی

۱۲۷ گذری، امروہہ (یوپی)

۲۱ مئی ۱۹۶۳ء

محترمی خوشتر صاحب! تسلیم

آپ کا مکتوب گرامی مجھے اُس وقت ملا تھا جب میں عید الضحیٰ کی نماز سے فارغ ہو کر گھر آ رہا تھا۔ دیکھئے کیسا عجیب اتفاق ہے... میں آپ سے شکر گزار ہونے کے بجائے آپ کے خلوص بھرے نامہ سے ہم آغوش ہوں! "شکست" کے بعد ڈائری پر مشتمل کہانی "جستجو نظر کی" ارسال کر رہا ہوں —— میں نے اپنی اس کہانی میں وہ سب کچھ کرنے کی کوشش کی ہے جو ایک کامیاب تخلیق میں ہونا چاہئے۔ اگر میں یہ کہوں تو خود ستائی نہ ہوگی کہ بھائی رئیس مجھی امروہوی نے بھی اس کہانی کو بے حد پسند کیا ہے۔ دیکھئے آپ کیا فرماتے ہیں۔

نیک خواہشات کے ساتھ —— شکیل جاوید امروہوی

اپنے شوہر کی لکھنے کی میز پر رکھی ہوئی ڈائری پر عظمیٰ کی نگاہیں کئی دن سے جمی ہوئی تھیں۔

اُسے پڑھنے کا اشتیاق اُس کے دل میں کئی دن سے سر ابھار رہا تھا لیکن اُسے کوئی ایسا موقع نہ مل رہا تھا جو وہ آزادی کے ساتھ اس ڈائری کو پڑھ سکے یوں تو وہ شوہر کی اجازت سے بھی پڑھ سکتی تھی لیکن وہ چاہتی تھی کہ اپنے شوہر کی لاعلمی میں اُس کی ڈائری پڑھے۔ اُس کی شادی کو دن ہی کتنے گزرے ہیں؟ —— اس قلیل عرصہ میں کسی کے بارے میں سب کچھ جان سکنا ناممکن سی بات تھی۔ اُس ڈائری کا تعلق اُس کے شوہر سے تھا اور ہر بیوی اپنے شوہر کی ہر اچھی بری بات جاننا چاہتی ہے۔

آخر کار بڑی جدوجہد —— اور انتظار کے بعد اُسے موقع مل ہی گیا۔

اُس کا شوہر ریاض اپنے ایک قریبی دوست کے یہاں کسی تقریب کے سلسلہ میں مدعو تھا عظمیٰ نے اپنی طبیعت کی ناسازی کا بہانہ کر کے ریاض سے معذرت چاہ لی تھی۔ ریاض کی عدم موجودگی میں اُسے ڈائری پڑھنے کے لئے اس سے اچھا موقع نہیں مل سکتا تھا۔

اُس نے گھبراہٹ اور مسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ ڈائری اٹھائی۔

کسی کی ڈائری پڑھنا اور وہ بھی اُس کی اجازت کے بغیر چوری چھپے پڑھنا اخلاقی جرم ہے۔ اس خیال سے اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے کئی ورق سرسری نظر سے دیکھتے ہوئے ایک صفحہ پر اپنی نگاہیں جمادیں۔

۳۱ مارچ ۱۹۶۳ء

ہر انسان کی زندگی میں کچھ لمحات ایسے بھی آتے ہیں جب وہ اُن کے بیت جانے پر اُن کے بارے میں سوچتا ہے تو اُسے اُن پر کسی معجزہ کا گمان ہونے لگتا ہے۔ اور تب اُن لمحات کا گداز اور لطیف احساس اُس کی رگ و پے میں محبت کی میٹھی میٹھی لہریں دوڑا دیتا ہے اور اُسے اُن گزرے لمحات کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

مجھے بھی اپنی زندگی میں ایسے بہت سے لمحات سے دوچار ہونا پڑا۔ اب مجھے اُن بیتے لمحات کی یاد آتی ہے تو دل میں میٹھا میٹھا درد سا ہونے لگتا ہے اور میں گھنٹوں اپنے ماضی کے آئینہ میں اپنے کھوئے ہوئے لمحات کے اُس لطیف لمس کو ڈھونڈنے لگتا ہوں جس کا احساس دل و دماغ پر جم کر رہ گیا ہے۔ کاش! —— وہ دن، وہ لطیف جذبے پھر لوٹ آئیں اور میں اُن کے ذریعہ اپنی اُس کھوئی ہوئی منزل کو پالینے میں کامیاب ہو جاؤں جس کی گرد بھی اب مجھ سے کوسوں دور ہے۔

"میں کیا کروں؟ —— میں کیا کروں؟؟"

یہی ایک خیال بار بار میرے ذہن کے پردوں سے ٹکرا کر میرے دل میں سوئے ہوئے درد کو بیدار کرنے لگتا ہے۔ جیسے ظلمت کدہ میں کوئی شمع تھرتھرا کر اندھیروں کے بحرِ بیکراں میں مدغم ہو جاتی ہے اور میں اپنے ماضی کے مرغزاروں میں بھٹک جاتا ہوں۔ گل مہر! —— جو میری ویران اور پژمردہ زندگی میں بوئے گل کی طرح داخل ہوئی جسے دیکھ کر میں اپنے آپ سے بھی بیگانہ ہو جایا کرتا۔ گھنٹوں اُس کی صبیح پیشانی پر بکھری زلفوں کی مہک اور جھیل ایسی گہری اور خاموش آنکھوں میں ڈوبا رہتا ——

تو زبیدہ کی بھی عادت ہے۔ آج جب شوہر سے کسی بات پر ... میں کھڑکی کے پاس اپنی ٹیبل پر
بیٹھا ہوا کسی کتاب کے مطالعہ میں منہمک تھا کہ زبیدہ بیگم صاحبہ بپھری ہوئی آئیں اور کھڑکی بند کرتے
ہوئے ... بولیں:
"کھلی کھڑکی ہوا آپ کی صحت کے لئے مضر ہے۔ آپ کو ہر وقت کھڑکی کھلی نہ
رکھنی چاہئے"
کیا کمال کی بات ہے ... سے آخر عورت پہچانے کے ... ہیں ہے ... اب میں یہ محسوس کر رہا ہوں گا
جیسے کھڑکی کھلی رکھنا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ میرے اور گل مہر کے بارے میں سب
کچھ جانتی ہیں۔ شاید اسی لئے انہوں نے کھڑکی بند کی تھی۔ لیکن میں خاموش رہا۔ صرف یہ
سوچا کہ اگر میں کھڑکی کھلی رکھنے پر احتجاج کروں گا تو اُن کا شک یقین تک پہنچ جائے گا اور ہمارے
خوشگوار تعلقات کے مابین تلخی پیدا ہو جائے گی۔ میں نہیں چاہتا کہ اس سلسلے میں میری طرف سے
میری شریک حیات کو مجھ سے شکایت کا موقع ملے۔ وہ میری زندگی ہے اور اُسے ہمیشہ خوش
رکھنا میرا فرض ہے۔

اس خیال کے زیر اثر آج میں نے جان بوجھ کر ہزاروں ارادوں کے باوجود اُس کی موجودگی
میں کھڑکی نہیں کھولی۔ پھر بھی میں اپنے دل کی کھڑکی سے گل مہر کو برابر دیکھتا رہا۔ اُن سے پیار بھری
باتیں کرتا رہا۔ نہ معلوم کب مجھے نیند کی دیوی نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ اور جب میں بیدار ہوا
تو شام کی چائے میرے لکھنے کی میز پر رکھی ہوئی تھی۔ جس سے گرم گرم بھاپ اٹھ رہی تھی۔ جسے دیکھ کر
میں اپنی شریک حیات کی معصومیت اور شوہر پرستی پر ہزار جان سے فریفتہ ہو گیا۔ اور چائے کی
چسکیوں کے ساتھ ساتھ گل مہر سے اپنی شریک حیات کا موازنہ کرتا رہا۔
عظمیٰ کا جسم عالم شباب پر تھا۔ اُس کا دل اُس کے پہلو میں زور زور سے
دھڑک رہا تھا۔
اُس نے اضطرابی کیفیت میں اگلے صفحہ پر اپنی بے چین نگاہیں پھیلا دیں۔

۱۸ مئی ۱۹۶۳ء

آخر آج گل مہر کا دیدار ہو ہی گیا ------!
گل مہر سے مل کر مجھے جتنی مسرت ہوئی اُس سے کہیں زیادہ اُس کے حالات جان کر
اذیت پہنچی ہے۔
اُس نے مجھے بتایا کہ وہ اپنی ازدواجی زندگی سے کسی طرح مطمئن نہیں ... ویسے مجبوری
کا دوسرا نام شکر ہے! پہلے تو اُس نے مجھ سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کی۔ شکایتوں کے انبار لگاتے
ہوئے میرے سامنے میں پوچھنے لگی اور جب میں نے اُسے اپنی شادی کے بارے میں بتایا تو اُس کے چہرے پر
مسرت و انبساط کی لہریں مچل اٹھیں۔ اور اُس نے مجھ سے میری شریک حیات سے ملنے کی خواہش کا
اظہار کیا۔ وہ تو یہاں تک تیار تھی کہ دو چار دن کے اندر ہی میرے یہاں بن بلائے مہمان کی طرح
آ دھمکے گی۔ لیکن میں نے اُسے سمجھا بجھا کر منع کر دیا۔

میں نے سوچا ------
اگر میں اُسے اپنی شریک حیات سے ملاتا ہوں تو اُس کا شک اور پختہ ہو جائے گا اور
میری طرف سے اُس کے احساسات و جذبات کو ٹھیس پہنچے گی۔
لیکن میں نے گل مہر سے وعدہ کیا ہے کہ میں کبھی کبھی پہلے کی طرح اُس سے ملا کرتا رہوں گا۔
وہ میرے پاس دیر تک بیٹھی رہی۔ اپنے شوہر کے بارے میں کچھ اپنے بارے میں بتاتی رہی۔ اور میں اُس کی
خوبصورت آوارہ زلفوں سے کھیلتا رہا۔ حالانکہ اُس وقت مجھے ہلکا سا احساس بھی ہوا کہ اگر ایسے
وقت میں میری شریک حیات آ جائے اور مجھے اس حالت میں گل مہر کے ساتھ دیکھ لے تو خدا جانے
وہ کیا کر بیٹھے ------ میری شریک حیات ہی نہیں کوئی بھی عورت یہ برداشت نہیں کر سکتی۔
پھر بھی میں اس بات کو ذہن سے نکال کر اُس سے ملتا رہا۔
کبھی پلنگ میں ------!
کبھی بچھے بازوؤں میں ------!!
ہر خیال اور فلسفے سے دور ------!!!
میں گل مہر کو ایک بار پھر اپنے اتنا قریب پا کر سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ میں اُس کے
بغیر زندہ بھی رہ سکوں گا کہ نہیں؟؟؟
بہت سوچنے کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ گل مہر کے بغیر میری زندگی کی راتیں
اندھیری اور سونی ہیں۔
اور مجھے جینے کے لئے مجھے گل مہر کے سہارے کی اشد ضرورت ہے۔
مگر ------ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ وہ شادی شدہ ہے اور ادھر میری شادی
بھی ہو چکی ہے۔
"ایک نیام میں دو تلواریں کس طرح رہ سکتی ہیں؟ ------ میں تو پاگل سا ہوا جا رہا
ہوں یہ سب سوچ کر ------ کیا کروں؟"
ابھی ڈائری میں اور بہت کچھ تھا۔
لیکن عظمیٰ میں اتنی سکت کہاں تھی کہ وہ اُس سے آگے کچھ اور پڑھ سکتی۔
اُس کا تنفس تیز ہو گیا تھا۔
اُس کا شوہر ریاض اب تک اُسے بے وقوف بنائے ہوئے تھا۔ اب اُس کا اصلی آئینہ
بن کر اُس کے سامنے آ گیا ہے۔
اب وہ جان بوجھ کر اپنی زندگی کے دامن کو خاروں سے اُلجھانا نہیں چاہتی!!
اب باقی ہی کیا رہا ہے شک کرنے کے لئے؟؟
اُس کی آنکھیں شبنمی قطروں سے بھری ہوئی تھیں۔ اُس نے پیڈ اٹھا کر لکھنا شروع کیا۔
میرے سرتاج!
تمہاری ڈائری کے ذریعہ مجھے تمہارے اور گل مہر کے بارے میں سب کچھ معلوم

فنکار

نجمی نصیر آبادی

۲۶۷۸۔ ساگر والی اسٹریٹ۔ نصیر آباد (راجستھان)

۲؍جولائی ۹۳ء — محترم و مکرم بھائی خوشتر گرامی! گلہائے عقیدت

نصیر آباد آ گیا ہوں لیکن دل ابھی تک دلّی ہی میں ہے۔ دلّی جو دلی ہے دلّی۔ دلّی دل یعنی ہو یا نہیں لیکن وہاں کے لوگ ضرور دل لے لیتے ہیں۔ اور جب میں اُن دلّی والوں کا خیال کرتا ہوں تو آپ کا بے حد مصروف لیکن خلوص و محبت کے نور سے جگمگاتا ہوا چہرہ بار بار ذہن پر چھا جاتا ہے۔ آپ سے ملاقات کا ایک ایک لمحہ میرے دل و دماغ پر نقش ہو کر رہ گیا ہے۔ سچے خلوص اور سچی محبت کی یہی تو عظمت ہے کہ ایسے لوگ دل و دماغ میں اپنا گھر کر کے ہمیشہ کے لئے زندۂ جاوید ہو جاتے ہیں۔ جب بھی دلّی جانا ہوتا ہے اور آپ کی پُر لطف صحبت اور محبت و خلوص کا مزہ لینا ہوتا ہے تو اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ دوسرے ہی لمحہ "بیسویں صدی" کے دفتر اور وہاں سے آپ کی کار میں ——— اور پھر واقعات کا ایک لا متناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

جب میں دلّی میں تھا تو آپ کی بے پناہ مصروفیت بھی دیکھی تھی اور افسانہ نمبر کی تیاریاں بھی۔ سچ کہتا ہوں آپ ہی ہیں جو اتنا کام کر لیتے ہیں اور اس دور میں اتنے شاندار خاص نمبر پیش کر سکتے ہیں ——— "افسانہ نمبر" دیکھ کر طبیعت باغ باغ ہو گئی۔ گویا رنگ رنگ کا حسین و جمیل گلدستہ دیکھتے ہی روح میں ایک خوشبو کا ریلا بس گیا۔ میں جب کوئی خوبصورت اور حسین و جمیل چیز دیکھ لیتا ہوں تو یہی عالم ہو جاتا ہے۔ دیکھئے تا ابھی تک مدہوش ہوں اور نہ جانے کب تک رہوں گا۔ میری طرف سے اُن ہاتھوں کو چوم لیجئے جو اتنے شاندار خاص نمبر پیش کر کے اپنی جدت و ندرت اور عظمت و فن سے لاکھوں کے دلوں کو مسخر کر لیتے ہیں۔ میں جادو اور جادوگری میں یقین نہیں رکھتا لیکن آپ کو اور "بیسویں صدی" کو دیکھ کر دل اس بات کو مان لینے پر مجبور کرتا ہے۔

ایک افسانہ "فنکار" بھیج رہا ہوں۔ آپ کے کردار نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ میں 'فنکار' لکھنے پر مجبور ہو گیا لیکن یہ ایک طویل افسانے کا ایک حصہ ہے لیکن یہ بھی مکمل افسانہ ہے۔ اور ایک فنکار کی قربانی کا مُرقع ہے۔ اس حقیقت کا مظہر ہے کہ کوئی کبھی فنکار کو نہ خرید سکتا ہے نہ بیچ سکتا ہے اور نہ ہر پلو ہی پکڑ سکتا ہے پیسہ اور بات ہے کہ اُس نے عظمت ہی ایسی پائی ہے کہ خود ہی بخوشی لُٹ جانا پسند کرتا ہے۔ اور یہی اُس کی عظمت کا راز ہے!

خلوص کیش ——— نجمی نصیر آبادی

اشرف پروفیسر صدیقی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا اُن کا انتظار کر رہا تھا اُس کی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اُس نے اپنا سلا اوور کرسی پر ڈال دیا تھا اور اپنے بدن کا سہارا دے کر قریب قریب دراز ہو گیا تھا۔ کرسی اپنے پچھلے دو پایوں پر پیچھے کی جانب جھکی ہوئی تھی کہ اگر کوئی اُسے تھوڑا سا بھی پیچھے کی طرف اور جھکا دیتا تو وہ اپنا توازن نہ رکھ سکتا تھا بلکہ کرسی سمیت فرش پر ڈھیر ہو جاتا۔

رخسانہ ڈرائنگ روم کے اندرونی دروازے پر کھڑی ہوئی بہت دیر سے تک اشرف کو اسی عالم میں دیکھتی رہی لیکن جب بہت دیر تک اشرف کی محویت میں کوئی فرق نہ آیا اور اُس نے رخسانہ پر کوئی توجہ نہ دی تو رخسانہ جھنجھلا اُٹھی۔ معاً اُسے شرارت سوجھی اور وہ دبے پاؤں اشرف کی پشت پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ اشرف اپنے خیالات کی دنیا میں مستغرق تھا۔ اُس نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ اُسے پتہ بھی نہ چلا کہ رخسانہ اُس کے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ اپنا منہ اشرف کے کان

"تم نے پروفیسر جمالی سے کالج کے لئے ڈراما لکھنے سے کیوں انکار کر دیا؟"

"تم سے کس نے کہا؟"

"پروفیسر صاحب خود ڈیڈی سے ملنے آئے تھے اور مجھ سے بھی شکایت کر رہے تھے کہ تم بہت مغرور ہو گئے ہو۔ انھوں نے چاہا تھا کہ اس سال باہر کے کسی ڈراما نگار کی تخلیق کو اسٹیج کرنے کے بجائے وہ تم سے کوئی ڈراما لکھوالیں اور اُسے پیش کریں . . . ."

"یہ سب تو مجھے معلوم ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جمالی صاحب کی خواہش ہے کہ اس سال ڈراما اپنے کالج کا ہو اور کالج کے طلباء و طالبات ہی کے ذریعہ اسٹیج کیا جائے۔ میں نے ان کے اس خیال کو سراہا تھا۔ انھوں نے مجھے بتایا تھا کہ کالج میں کو ایجوکیشن نہ ہونے کی وجہ سے انھیں ہر سال زنانہ کردار باہر سے لانے پڑتے تھے لیکن اس سال کالج میں بی اے کی کلاس کھل جانے سے اور اس میں لڑکیوں کے داخل ہو جانے سے یہ مشکل حل ہو جانے کی اُمید ہے لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ میری مصروفیت مجھے اتنا وقت نہیں دیتی کہ میں ڈراما لکھ سکوں اور نہ میرا کوئی اور ڈراما ایسا ہے جو کالج کے معیار پر پورا اتر سکے۔"

"میں کچھ نہیں جانتی، ڈراما تمھیں لکھنا پڑے گا اور کالج کے معیار کو دیکھ کر لکھنا پڑے گا۔" رخسانہ بضد ہو گئی۔

"کیا یہ تمھارا حکم ہے؟!"

"ایسا ہی سمجھو۔ ڈیڈی بھی آتے ہی تمھیں اس بات پر مجبور کریں گے!"

"معلوم ہوتا ہے پروفیسر صاحب نے باپ بیٹی کو کوئی زبردست رشوت دے دی ہے!" اشرف نے ہنس کر کہا۔

"میں ڈیڈی کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتی لیکن مجھے ہیروئن بنانے کا وعدہ کیا گیا ہے۔"

"ہوں! پروفیسر صاحب بہت چالاک آدمی ہیں لیکن تم اداکاری کیا کر سکو گی؟"

"کیوں، تم ہی تو کہتے رہتے ہو کہ مجھ میں آرٹسٹ ہونے کے اوصاف موجود ہیں۔"

"یہ منہ اور مسور کی دال! وہ تو میں تمھارا دل رکھنے کو کہہ دیتا ہوں!!"

"ٹھیک ہے۔ اگر اب تمھیں میرا دل رکھنا ہے تو ڈراما لکھو۔ میں سنجیدگی سے کہہ رہی ہوں۔" رخسانہ نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا۔ اُس کے اس اٹل فیصلہ پر اشرف گھبرا گیا۔

"رخسانہ میں بے موت مر جاؤں گا۔ کُل ایک مہینہ کا وقت ہے اور اسی میں سب کچھ ہونا ہے۔ پروفیسر صاحب اب تک امریکہ کے مزے لُوٹتے رہے اور اب یہاں آ کر یہ حکم صادر فرما دیا۔ تم خود سوچو میری صحت پہلے ہی کام کی زیادتی سے خراب رہتی ہے اور آئے دن قلبی دورے پڑتے رہتے ہیں۔"

"تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ تم ڈراما نہیں لکھو گے۔" رخسانہ نے شکست خوردہ آواز میں کہا۔ "میں نے خواہ مخواہ جمالی صاحب سے وعدہ کر لیا کہ میں اشرف سے ڈراما لکھواؤں گی۔" پھر

جب روز کسی اور پہ بیداد کرو گے
یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کرو گے ـــــــــ سودا

ذکرِ شراب و حُور کلامِ خدا میں دیکھ
مومن میں کیا کہوں مجھے کیا یاد آ گیا ـــــــــ مومن

میں ترکِ رہ و رسمِ جنوں کر ہی چکا تھا
کیوں آ گئی ایسے میں تری لغزشِ پا یاد ـــــــــ جگر مرادآبادی

اُجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے ـــــــــ بشیر بدر

کیا جانے دل ہی دل میں وہ کرتا تھا کس کا ذکر
ہر دم زبانِ یار پہ یادش بخیر تھا ـــــــــ مونس

وہ جیسے پھوٹ پڑی۔ "سوچو اشرف! انھوں نے کچھ سمجھ کر ہی مجھ سے سفارش کرائی تھی۔ ہمارے تعلقات کوئی ڈھکی چھپی بات تو نہیں۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں اُن کی نظروں میں گر جاؤں۔ ٹھیک ہے یونہی سہی لیکن مجھے ملال اس کا ہے کہ میں نے تمھیں سمجھنے میں بھول کی اور تمھارے اوپر غلط اعتماد کر بیٹھی۔ میں تو سمجھتی تھی کہ میرا تم پر اتنا تو حق ہے!"

رخسانہ کی آواز گلوگیر ہو گئی اور وہ برہم و کبیدہ خاطر سی اُٹھ کر اندر چلی گئی۔ اشرف کو اپنا دل ڈوبتا ہوا نظر آیا۔ رخسانہ تھوڑی دیر بعد جب کافی لے کر لوٹی تو اس نے اُس کی آنکھوں سے صاف اندازہ لگا لیا کہ وہ رو کر آئی ہے۔ اشرف کٹ کر رہ گیا لیکن پھر وہ زیرِ لب مسکرانے لگا اور جب رخسانہ نے چُپ چاپ کافی کا پیالہ بنا کر اُس کی طرف بڑھا دیا تو وہ بولا۔

"یوں نہیں! ـــــــ مسکرا کر دو گی تو لوں گا۔ مجھے ایسی کافی نہیں چاہئے جس میں تمھارے آنسو شامل ہوں۔"

"اب لینا ہے تو لو ورنہ یہ بھی نہ دوں گی۔" رخسانہ نے بگڑ کر کہا۔ "ماریں اور رونے نہ دیں، یہ کہاں کا انصاف ہے!"

"ناراض ہو گئیں! اچھا بھئی میں ڈراما لکھوں گا اور ضرور لکھوں گا۔"

"سچ! او اشرف تم کتنے اچھے ہو!" رخسانہ بچوں کی طرح خوش ہو کر چہک اُٹھی۔

"لیکن ایک شرط پر! اور وہ یہ کہ ہیروئن کا کردار تم ہی کو ادا کرنا پڑے گا . . ."

"لیکن ابھی تو تم کہہ رہے تھے . . . ."

سامان کم

آرام زیادہ

نادرن ریلوے

کم سامان لے کر سفر کیجئے۔ بہت آرام رہے گا
کم سامان خوشگوار سفر کی ایک خاص بات
غیر ضروری سامان ایسا بوجھ ہے، جسے ڈھونا
ہی کیا ہے؟ پھر آپ اسے کیوں لے جاتے ہیں؟ یہ آپ
باندھے رکھتا ہے اور اس سے دوسروں کو بھی بے آرامی ہوتی ہے

جاری کردہ:۔ نادرن ریلوے

"وہ بات اپنی جگہ ہے۔ میں تمھارے کردار کو مدِنظر رکھ کر ہی اپنے ڈرامے کی ہیروئن کا ڈائیلاگ لکھوں گا۔"

"لیکن پھر بھی مجھے کچھ تو اداکاری کرنی ہی پڑے گی!"

"وہ تو تم ابھی خاصی کر لیتی ہو ——!" اشرف نے پُرمعنی لہجہ میں کہا اور رخسانہ اس طرح چونک پڑی جیسے اس کی کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔ سٹپٹا کر بولی۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ابھی جو تم نے شاندار ایکٹنگ کر کے مجھے کس خوبی سے ڈراما لکھنے پر مجبور کیا۔ کیا یہ کم ہے؟"

"اشرف میں سچ کہتی ہوں کہ مجھے بڑا ملال گزر رہا تھا جب تم نے ...؟"

"ارے جانِ من! اب صفائی مت پیش کرو اور کافی دو، ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"

"کیا ٹھنڈی ہو رہی ہے بھئی؟!" اچانک پروفیسر صدیقی باہر سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے اور اشرف کا ادھورا جملہ سُن کر کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھ بیٹھے۔

"کافی!" رخسانہ نے بُری طرح گھبرا کر کہا۔

"تو لاؤ پھر مجھے دے دو، خواہ مخواہ ٹھنڈی کرنے سے فائدہ؟" پروفیسر رخسانہ کے پاس آ بیٹھے اور رخسانہ نے ہنستے ہوئے انھیں بھی ایک کپ کافی بنا کر دے دی۔ پروفیسر نے کافی کا ایک گھونٹ لے کر اشرف سے کہا۔

"کیوں حضرت! یہ کیا نالائقی ہے؟"

یہ سُن کر اشرف بُری طرح بوکھلا اُٹھا۔ اُسے خیال گزرا کہ پروفیسر نے یقیناً اس کی کوئی ایسی ویسی حرکت دیکھ لی ہے۔ اُس نے گھبرا کر رخسانہ کی طرف دیکھا اور اشاروں ہی اشاروں میں پروفیسر کی بات کا مطلب پوچھا لیکن رخسانہ کے چہرے کا رنگ پہلے ہی اُڑا اُڑا ہو رہا تھا۔ اُس نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔ مجبوراً اشرف نے دبی دبی آواز میں کہا۔

"جی میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا!"

"سُنا ہے تم نے پروفیسر جمالی کی اُس فرمائش کو ٹھکرا دیا ہے جس میں انھوں نے تم سے ڈراما لکھنے کی خواہش کی تھی۔"

رخسانہ اور اشرف کی جان میں جان آئی اور اشرف نے بڑی صفائی کے ساتھ اپنی مجبوری بیان کی پھر نہایت چالاکی سے انکار کر دیا۔ لیکن پروفیسر نے ایک نہ مانی اور کہہ دیا کہ اُسے ڈراما لکھنا ہی پڑے گا۔

"اگر آپ حکم دیتے ہیں تو لکھنا ہی پڑے گا۔" اشرف نے مکاری کے ساتھ کہا۔

"جیتے رہو.... مجھے تمھاری یہ سعادت مندی بہت پسند ہے۔" وہ اُٹھتے ہوئے بولے۔ "آج مجھے ڈاکٹر شرما کے یہاں کافی وقت لگ گیا۔" انھوں نے جیب سے کچھ سامان نکال کر رخسانہ کو دے دیا۔ "بیٹی یہ دوا اور یہ گولیاں میری خوابگاہ میں رکھ دینا۔ اب مجھے کالج چلنا چاہیے۔ وقت ہو چکا ہے۔ کیوں اشرف! تم تو غالباً دیر سے آؤ گے؟"

"جی ہاں میرے پہلے دو پیریڈ وکینٹ ہیں۔" اشرف نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ تم رخسانہ کے ساتھ آ جانا۔ اس کی بسنی یونٹ کا وقت بھی آجکل بارہ بجے ہی کا ہو گیا ہے۔"

پروفیسر چلے گئے تو رخسانہ اشرف پر اُلٹ پڑی۔

"کیوں جناب! ڈیڈی سے اس طرح باتیں کیوں کر رہے تھے جبکہ مجھ سے وعدہ کر چکے تھے کہ ڈراما لکھ دیا جائے گا؟"

"اے تم نہیں سمجھو گی یہ راز کی باتیں ہیں!!"

"میں سب سمجھتی ہوں ——!"

"کیا سمجھتی ہو ——؟"

"بقول تمھارے میدان بنا رہے تھے ——!" رخسانہ نے جلے کٹے لہجہ میں کہا۔

"ارے کمال کر دیا بھئی تم نے۔ کتنے صحیح نتیجے پر پہنچی ہو۔ دیکھ لو بھئی! تمھاری خاطر کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں؟"

"تم کچھ بھی کرو۔ اور کتنا ہی میدان ہموار کرو۔ دیکھ لینا میں آخر میں تمھیں بالکل ناپسند کر دوں گی!"

"میدان ہموار ہو جانے دو پھر تمھاری پسند ناپسند کو دیکھ لوں گا!" اشرف نے چڑانے والے انداز میں کہا۔

"کیا مطلب ——؟!" رخسانہ نے بھڑک کر کہا۔

"مطلب یہ کہ اگر میدان صاف ہو گا تو تمھیں زبردستی اُٹھا کر لے جاؤں گا!"

"ذرا میں بھی دیکھوں گی کہ کیسے زبردستی اُٹھا کر لے جاؤ گے۔ باپ کا مال ہے؟!" رخسانہ نے اشرف کو انگوٹھا دکھا دیا۔

"بیشک تمھارے ڈیڈی کو میں اپنا باپ سمجھتا ہوں۔ اور اب رہا سوال یہ کہ تمھیں اُٹھا کر کیسے لے جاؤں گا تو وہ .... ایسے!"

اچانک اشرف نے رخسانہ کو اپنی گود میں اُٹھا لیا۔

"اُوئی! کیا کرتے ہو۔ کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا؟!"

"کون دیکھے گا، تمھارے علاوہ بھی کوئی اور رہتا ہے کیا اس بنگلہ میں؟!"

"ہاں، رہتا ہے۔"

"کون ....؟"

"ڈیڈی ——!"

"وہ تو ابھی کالج گئے ہیں۔ اور اب تم اور میں ...."

"چھوڑو بھی کیا بے شرمی ہے۔ ارے یہ کون کھڑا ہے دروازے میں!" رخسانہ نے ور واتھے

کی طرف جونہی دیکھا تو چونک پڑی اور اشرف نے گھبرا کر اُسے نیچے اُتار دیا۔ نیچے اُترتے ہی رخسانہ اندر کی طرف بھاگی کیونکہ اُس نے اشرف کو مطب کیا تھا۔ دروازے میں کوئی نہ تھا۔ اشرف اُٹھ کر اُس کے پیچھے دوڑ پڑا لیکن پھر بُری طرح دل کو دباتے ہوئے فرش پر بیٹھ گیا۔ رخسانہ کی تمام شوخی شرارت ہوا ہو گئی اور وہ اشرف کی طرف لپکی۔

"پھر دورہ......؟" اُس نے اشرف کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

اشرف نے کہا۔

"رخسانہ...... مجھے...... ذرا...... صوفہ پر...... بٹھا دو...... ذرا سی محنت کی اور اس نے حملہ کیا۔"

رخسانہ نے اشرف کو سہارا دے کر صوفہ پر لا بٹھایا۔ اشرف نے آرام سے بیٹھ کر جیب سے گولی نکالی اور پھر اُسے منہ میں رکھ کر نگل گیا۔ اس وقت اُس کے سارے جسم پر لرزہ طاری تھا اور درد کی وجہ سے اُس کے مُنہ سے کراہنے کی آواز بار بار نکل رہی تھی۔

رخسانہ سے اُس کی یہ حالت نہ دیکھی گئی اور اُس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ جب اشرف نے درد کی شدت سے تڑپ کر آنکھیں بند کر لیں تو وہ چپکے چپکے رونے لگی۔ اُس کی ہچکیوں کی آواز سن کر اشرف نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

"یہ کیا؟...... ارے تم رو رہی ہو...... پگلی!" اشرف اپنے درد کو بھول کر رخسانہ کو سنبھالنے لگا۔

"یہ کیا ہو جاتا ہے تمھیں!" رخسانہ نے بے حد غمگین اور متاسف لہجہ میں کہا اور نڈھال ہو کر اپنا سر اشرف کے شانے پر رکھ دیا۔

"پریشانی کی کوئی بات نہیں میں ابھی ٹھیک ہو جاؤں گا" اشرف نے اُس کا سر سہلاتے ہوئے کہا "بہت بڑے خاندان کی ذمہ داریاں ہیں مجھ پر۔ یہ اُسی کا نتیجہ ہے۔ رات دن کی محنت اور مسلسل جسمانی و دماغی کام کرنے کی وجہ سے میرے دل و دماغ کمزور ہو گئے ہیں۔"

"تم اتنا کام مت کیا کرو۔ بھلا تین چار گھنٹے بمشکل سوتے ہو گے۔ ہر وقت کام! دن ہو یا رات۔ کیا کرو گے اتنی دولت پیدا کر کے۔ خدا کا دیا سب ہی کچھ تو ہے تمھارے پاس!"

"سب اسی کام کی بدولت ہے۔ اگر آج میں کام کرنا بند کر دوں تو کچھ عرصے بعد کچھ نہ رہے۔ میں فاقے کرنے پر مجبور ہو جاؤں۔ پھر نہ جانے اس خاندان کا کیا ہو جو میرے سہارے زندہ ہے۔"

"اور اگر خدانخواستہ تمھیں کچھ ہو جائے، تو کیا ہوگا، یہ بھی سوچا ہے کبھی تم نے۔ جان ہے تو جہان ہے!"

"اس جان کے لئے تو سینکڑوں روپے برباد کرتا ہوں۔ اور یہ دوائیں ہی ہیں جو مجھے زندہ رکھے ہوئے ہیں۔"

"لیکن تمھیں آرام کی سخت ضرورت ہے اشرف!"

"وہ میری قسمت میں نہیں۔ کوشش کرتا ہوں لیکن اب میری زندگی بھی میری اپنی نہیں رہی۔ ایسے دوسرے لوگ دوسروں کے لئے چلاتے ہیں۔ وہ انھیں کبھی اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ میں انسان ہوں مشین نہیں ہوں۔"

"اچھا...... اچھا...... تم کالج نہیں جاؤ گے۔ یہیں آرام کرو گے۔ اور وہ جو نیا منظر نامہ لکھنے کیلئے کہا تھا نا اُس کا۔ ان کوئی خیال نہ کرنا۔ میں ایسا ڈرامہ نہیں چاہتی جس میں تمھارا خون شامل ہو۔ میں نے یہ غلط کہا تھا کہ پروفیسر جمالی نے مجھے ہیروئن کی پیشکش کی تھی۔ میں خود ہی پروفیسر جمالی کو سمجھا دوں گی۔"

"اوہ، رخسانہ تم کتنی اچھی ہو! سچ کہتا ہوں اگر تم میری زندگی میں نہ آتیں تو اب تک موت مر جاتا۔"

اچانک اشرف نے بے چینی سے پہلو بدلا اور اپنا سینہ سہلانے لگا۔ رخسانہ نے فوراً اُس کے دل پر ہاتھ رکھ دیا۔

"زیادہ تکلیف ہے؟" اُس کے لہجے میں بلا کا رنج و غم رچا ہوا تھا۔

"اب تکلیف کیسی؟ تم نے اپنا ہاتھ جو رکھ دیا ہے۔" اشرف نے مسکرا کر کہا اور رخسانہ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنے ہونٹوں پر رکھ لیا "یہ ہاتھ جیسے چھو لیں مُردہ سے زندہ ہو جائے۔" اور اُس نے رخسانہ کے ہاتھ کو چوم لیا۔ رخسانہ نے شرما کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"چلو ہٹو۔ ایسی حالت میں بھی تمھیں مذاق سوجھ رہا ہے۔ ٹھہرو میں تمھارے لئے اوولٹین کا ایک گلاس بنا کر لاتی ہوں۔"

اشرف رخسانہ کو اندر جاتے ہوئے دیکھتا رہا اور جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو اُس نے آرام سے پھیل کر بیٹھتے ہوئے اطمینان کی گہری سانس لی۔ اور زیر لب مسکرا کر بڑبڑایا۔

"میری جان تم کتنی بھولی ہو تمھیں کیا معلوم کہ تمھارے اس فنکار کو آرام کی تلاش میں کبھی کبھی فن کے ایسے نمونے بھی پیش کرنے پڑتے ہیں لیکن تو بہ اب کبھی میں تمھارے سامنے ایسا نمونہ پیش نہیں کروں گا تم تو......"

اور پھر وہ رخسانہ کی پریشانی اور بے بسی پر بے اختیار ہنس دیا۔

چندہ

پروفیسر غلام احمد فرقت کاکوروی ایم اے

۵۰۷ پہاڑی بھوجلہ، دلّی

۲۷ جولائی ۶۴ء

ڈیر خوشتر گرامی!

یہ خط لکھنؤ سے لکھ رہا ہوں مگر خط پر پتہ دلّی کا لکھا ہے۔ اس دو عملی کی وجہ یہ ہے کہ اس خط کے ہمراہ جو مضمون ہے وہ عالم برزخ یعنی لکھنؤ اور دلّی کے دوران سفر میں لکھا ہے۔ اس مرتبہ چھٹیوں میں تنفّس کا ایسا زور رہا کہ دو ماہ تک پھیپھڑوں کے ہارمونیم پہ سارے گاما پادھانیسا کی مشق کرتا رہا اور دو ایک مرتبہ تو اس ہارمونیم کے پردوں پر ایسی تیس مار خانی تان ماری کہ ملک الموت تک اُس سے دلچسپی لینے پہنچ گئے۔ اس کے بعد چھٹیاں ختم کر کے جب جولائی میں دلّی آیا تو تازہ ولایت عاشقوں کی طرح ایک آدھ مرتبہ بے ہوش بھی ہو گیا۔ بلکہ ایک مرتبہ تو ایسا حیات شکن دورہ پڑا کہ اگر دس منٹ قبل ڈاکٹر امین حسین نہ پہنچ جاتے اور فوری انجکشن نہ دیتے تو شاید یہ مضمون جوں کا توں میرے پیچھے یا چالیسویں کے فاتحہ کے موقع پر پڑھا جاتا۔ بہر صورت بال بال بچے بلکہ سوا ہاتھ بچ گئے۔ ملک الموت کی آمد و رفت کا کرایہ جن صاحب نے بھی دیا ہو مجھے معلوم نہیں البتہ دوسرے روز میرے اوپر یہ مصیبت ضرور نازل ہوئی کہ میرے چھوٹے بھائی توفیق مجھے جبراً لکھنؤ ڈاکٹر فریدی کی عدالت میں لے آئے اور اُس وقت سے تا ایندم گھر میں نظر بند ہوں۔ ڈاکٹر فریدی کے دو ہی روز کے علاج میں وہ تندرستی محسوس کر رہا ہوں جو اسّی سال کی عمر میں گاما پہلوان کو نصیب نہ ہو سکی۔ کئی "ہارس پاور" وزن بڑھتا محسوس ہوتا ہے اگر تندرستی کی یہی رفتار رہی تو دوسرے اتوار صابری کی دلّی میں گنجائش کیسے نکلے گی اللہ مجھ پر رحم کرے اور دنیا کے بقیہ رہنے والوں کی تندرستیوں کو مجھ سے محفوظ رکھے — یہاں ڈاک بھی کم آتی ہے۔ کاش "بیسویں صدی" کے بیشتر افسانہ نگاروں کی طرح میرے بھی ایک ایک مضمون یا کہانی پر اتنے خطوط آتے کہ اگر میرے پوتے پر پوتے اُن خطوط کا جواب دینے پر اپنی عمریں بسر کرنے کا فیصلہ کر لیتے تو بھی کئی لاکھ خطوط ملائکہ کے جواب دینے کے لئے بچ جاتے۔ میرے پاس کبھی کبھی کوئی "بدمذاق" ایک آدھ خط لکھ دیتا ہے جس کا جواب نہ دے کر میں اپنے کو گالیوں کا مستحق قرار دے لیتا ہوں چنانچہ انگلینڈ سے خلیل احمد قریشی اور جسونت سنگھ نے لکھا ہے کہ ہم لوگ برمنگھم (انگلینڈ) سے ایک معیاری اردو ماہنامہ نکال رہے ہیں آپ کے مزاحیہ مضامین "بیسویں صدی" میں پڑھتے رہتے ہیں اور بے حد متاثر ہیں۔ ہم آپ کو اس کا معقول معاوضہ دیں گے۔" اِس خط سے مجھے اندازہ ہوا کہ "ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں" انگلینڈ میں بھی آپ نے اپنے دو چار قدردان پیدا کر رکھے ہیں۔ بہر حال از راہ کرم اس وقت چونکہ میں بیکار ہوں لہٰذا آپ اپنے اس قسم کے افسانہ نگاروں کو بذریعہ اعلان تاکید فرما دیں کہ وہ اپنے لاکھوں خطوط میں سے چند ہزار خطوط مجھے بھیج دیں تاکہ میں اُن کے کام میں تھوڑا بہت ہاتھ بٹا کر اپنی عاقبت درست کر سکوں ..... مخلص: فرقت کاکوروی

بھیک مانگنے والوں سے چندہ مانگنے والوں تک اور سڑکوں پر دوا بیچنے والوں سے ریل کے ڈبوں میں چنا جور گرم، منجن اور چورن بیچنے والوں تک داؤں پیچ اور ہتھکنڈوں کا ایک سلسلہ

ہوتا ہے جیسا کہ بزرگی شخص اس قسم کا کاروبار کامیابی کے ساتھ نہیں چلا سکتا۔ ان میں چندہ لینے والوں کا کام اور بھی بڑے کٹھن ہیں۔ کیونکہ انہیں پاس سے کوئی چیز دیئے بغیر دوسرے سے پیسہ وصول کرنا ہوتا ہے۔ لہٰذا اس میں چرب زبانی اور قیافہ شناسی کے علاوہ انسانی نفسیات یعنی سائیکالوجی کا سمجھنا ضروری ہے، اور بے غیرتی تو بہر حال اس کام کی شرط ہے۔ اس میں بڑے بڑے سارے اصولی گُروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی وہ گُر ہے جس کے بارے میں چچا غالب فرما گئے ہیں۔

ہ۔ "گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہُوا"

اگر کسی شخص میں یہ ساری خوبیاں موجود ہیں تو اُسے ساری زندگی چندہ جمع کرنے میں صرف کر دینی چاہیئے۔ چنانچہ "اس چندہ بازی" کے سلسلے میں ایک آپ بیتی ملاحظہ ہو:

ایک دن ہم اور ہمارے دو دوست جو ہماری ہی طرح عرصے سے بیکار تھے، بیٹھے گپ بازی میں مصروف تھے کہ ایک صاحب جو آپ ماشاء اللہ چوٹی کے شاعر، ادیب اور قومی کارکن ہیں اور جن سے اُس وقت ہماری بے تکلفی بھی تھی۔ آ گئے اور بولے "اماں، کہو۔ کیا کر رہے ہو؟" ..... ہم نے کہا۔

ہ۔ "وہی رفتار بے ڈھنگی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے"

وقت ضائع کر رہے ہیں۔ صبح سے چار پیکٹ سگریٹ اور مبلغ ایک عدد دیا سلائی کا بکس پھونک چکے ہیں۔ اور اب۔

ہ۔ صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا"

بولے "تو چلو۔ ہم ایک کام دلاتے ہیں۔" ہم نے کہا، "مگر کام تو آج تک ہم نے کوئی کیا ہی نہیں؟ اس لئے پہلے کام کی نوعیت بتاؤ۔" بولے، "کام وہ ہے جس میں ہلدی لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے۔" ہم نے کہا "شہتیر تو نہیں اُٹھواؤ گے؟" بولے۔ "بالکل نہیں۔" دوسرے صاحب بولے۔ "سڑک کی بجری تو نہیں کوٹنا پڑیگی۔" بولے۔ "نہیں۔" تیسرے صاحب نے پوچھا "گرہ کٹی؟" بولے ــــ "تقریباً ایسا بھی نہیں۔ مگر اس سے کچھ ملتا جلتا کام ضرور ہے۔" ہم نے کہا "تو ترسا کیوں رہے ہو بتاتے کیوں نہیں؟" بولے۔ "ذرا چھری کے نیچے دم لو" اس کے بعد سگریٹ کا ایک لمبا کش لیتے ہوئے بولے ــــ "بھائی! بات یہ ہے کہ ہم لوگ چندہ سے ایک مشاعرہ کر رہے ہیں۔ اور اس کے لئے چندہ جمع کرنا ہے۔" اس پر ہم نے کہا کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ آج کل آپ بھی ہماری طرح بیکار ہیں۔ بولے۔ ایسا تو نہیں ہے۔ میں اس کا باتنخواہ سکریٹری ہوں۔ ہم نے کہا۔ خیر تمہارا معاملہ تو ٹھیک ہے۔ مگر ہم لوگوں کی کیا پوزیشن ہوگی؟ بولے ــــ یہی، جو اس وقت ہے۔ ہم نے کہا۔ یعنی چندہ جمع کرنے کے بعد بھی مُفلس کے مُفلس رہیں گے۔

بولے ..... روپیہ وصول ہو گیا تو روزی نہیں تو روزہ ..... پچاس پچاس فیصدی بے کاری اور بالکاری کے امکانات ہیں مگر چندہ وصول ہونے پر پچیس فیصدی کمیشن گلے گلے پانی تک لے گا۔ ..

ہم نے کہا چندہ وصول نہ ہونے کی صورت میں کیا پوزیشن رہے گی؟ بولے کھانا پینا اور جیب خرچ ہمارے ذمے۔

ہم نے کہا۔ نہ لینے کے امکانات تو چندہ دینے ہی کے ہیں ــــ بولے ــــ یہ بات نہیں کیونکہ جو صاحب یہ مشاعرہ کر رہے ہیں اُن پر عوام کو بہت اعتماد ہے۔ اس لئے چندہ نہ ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ شہر کے لئے تو انتظام ہو گیا۔ جناب قریب کے دو شہروں میں کام کرنا ہے۔ امید ہے وہاں سے بھی کافی چندہ جمع ہو جائے گا۔ لیکن روانگی سے قبل آپ حضرات کو اس سلسلے میں کچھ باتیں نوٹ کرانا ضروری ہیں کیونکہ چندہ لینے سے پہلے کچھ داؤں پیچ دکھانا ہوتے ہیں۔ اس کے بعد کہیں حرفِ مدعا زبان پر لانا ہوتا ہے۔ اس پر ہمارے دوست بولے۔ پھر اُس کا ریہرسل کیوں نہ کر لیا جائے؟ بولے جی ہاں۔ روانگی سے پہلے کان دھر کر سن لیجئے کہ سب سے پہلے تو آپ کو یہ دیکھنا ہوگا کہ جس کے پاس آپ گئے ہیں اور جس سے آپ مخاطب ہیں۔ اُس کی مزاجی کیفیت کیا ہے؟ مقصد یہ کہ وہ اپنی بیوی سے لڑ کر تو نہیں بیٹھا ہے۔ اگر اس کا پتہ چل جائے تو مناسب ہے آپ ایسے کیس کو چھوڑ دیں کیونکہ اُس سے بات کرنے میں خطرہ ہے۔ ایسے لوگ اگر دھوبی سے نہیں جیت پاتے تو گدھے کے کان اینٹھنے پر اُتر آتے ہیں۔ دوسری بات یہ دیکھنا ہوتی ہے آپ جس شکار کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں اُس کا لباس اور شکل و صورت کیسی ہے؟ مثلاً آپ کسی داڑھی والے کے پاس گئے ہیں تو آپ کو داڑھی کی افادیت پر گفتگو کرنا ہوگی۔ اگر داڑھی خضاب زدہ ہے تو خضاب کی خوبیوں پر روشنی ڈالنا ہوگی اور دو چار ایسے خضابوں کے نام گنانا ہوں گے جن سے زندگی بھر کے لئے بال سیاہ ہو جاتے ہیں۔ اِسی طرح اگر وہ شخص تہمد باندھتا ہے تو تہمد کی تاریخی اہمیت اور اُس کے باندھنے والے کی صحت اور بعض رشی اور صوفی بزرگوں کے تہمدوں کی خوبیوں کا ذکر کرنا ہوگا۔ آخر میں اُسے پانی پلاتے پلاتے چندہ تک لانا ہوگا۔ یاد رکھیئے کہ آخر میں آپ کو نہایت رقت آمیز لہجے میں اپنی تان چندے پر توڑنا ہوگی۔ اب یوں سمجھ لیجئے کہ جیسے آپ کو کسی ادبی کانفرنس کے سلسلے میں چندہ لینا ہے اور آپ ایک ایسے صاحب کے پاس گئے ہیں جو نیا جوتا پہنے بیٹھا ہے تو آپ علیک سلیک اور مزاج پرسی کے بعد کلام کو دلچسپ بنانے کے لئے کہہ سکتے ہیں کہ صاحب محاورات بھی بعض اوقات مزہ دے جاتے ہیں۔ اب دیکھئے نا! جوتوں کے بارے میں وضع کرنے والوں نے کیا کیا محاورات وضع کر دئے ہیں "جوتا چلنا۔ جوتے چرانا۔ جوتیوں میں دال بٹنا۔ جوتے کھانا وغیرہ وغیرہ" اس کے علاوہ مخاطب کو شاعروں اور ادیبوں سے کتنی ہی نفرت کیوں نہ ہو آپ کو اس کی ادبی خوبیوں کی ایسی تعریف کرنا ہوگی کہ وہ خود اپنے بارے میں شک و شبہ میں مبتلا ہو جائے۔ مثلاً اگر وہ کہے کہ میں اخبار پڑھنا تضیع اوقات سمجھتا ہوں تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ قبلہ صاحب اب آپ تضیع اوقات نہ سمجھیں گے تو کیا ہم سمجھیں گے آپ جوانی میں اتنے اخبارات پڑھ بیٹھے ہیں کہ اب آپ کو اس ضعیفی میں اخبار پڑھنے کی ضرورت ہی کیا ہے مگر وہ کہیں کہ میں سال اور نگین ہیں بہ روپیہ نہیں ضائع کرتا تو آپ فوراً کہیں کہ آجکل کے غیر معیاری رسائل اسی قابل ہیں

بسمل [illegible] صدیقی

کون سا پیشہ آپ کے لئے موزوں ہوگا؟

دی فارسٹ آفیسر
دی سول انجینیئر
دی الیکٹریکل انجینیئر
دی ٹیلی کمیونی کیشن انجینیئر
دی پبلک ہیلتھ انجینیئر
دی ڈرافٹس مین (سول انجینیئرنگ)
دی ڈرافٹس مین (الیکٹریکل انجینیئرنگ)
دی ٹریسر
دی آئی۔ سی۔ انجن میکینک
دی مل رائٹ
دی مشین ڈرلر
دی مشینسٹ
دی ریڈیو ٹیکنیشن

دی کمپوزیٹر
دی پروف ریڈر
دی ڈینٹل سرجن
دی ویکسی نیٹر
دی میڈیکل لیبارٹری ٹیکنیشن
دی ٹیچر (پرائمری اسکول)
دی ریڈیوگرافر
دی گرام سیوک
دی سوشل ویلفیئر ورکر
دی کاسٹ اکاؤنٹنٹ
دی میٹیورولوجسٹ
کیریئرز ان نرسنگ اینڈ
الائیڈ ہیلتھ آکوپیشنز

ہندی اور انگریزی میں یہ کتابچے ایمپلائمنٹ ایکسچینج
اور سرکاری کتب فروشوں سے مل سکتے ہیں

ڈائریکٹوریٹ جنرل آف
ایمپلائمنٹ اینڈ ٹریننگ
بھارت سرکار

DA 64/174

آواز و موسیقی
کے نئے افق پر!
شارپ
Sharp
جھنکار
JHANKAR
ٹرانسسٹرز، ریڈیو اور ریڈیو گرام
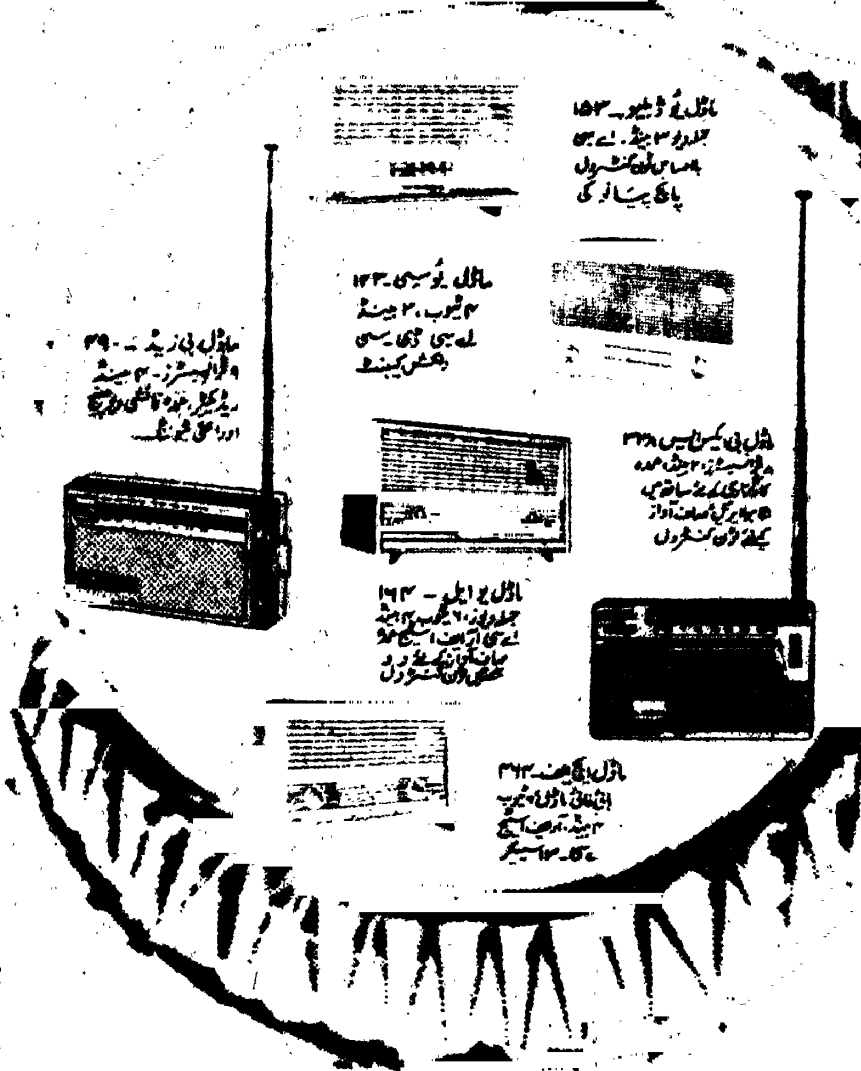
کبھی کبھی ہم لوگ ایسے اشعار پر بات بھی کرتے تھے کہ طرف اشارہ کرکے میں نے کہا کہ یہاں ایسے بہت سے لطیفے ہیں ... شعر کا اسلوب ہوتا ہے۔ اس پر ... صاحب نے کہا ... سنتے ہی میں نے عرض کیا۔

تیس کہاں سے ... عشق کرتے ہیں
کتنا ... ہیں ... خواب نازیں

واہ واہ کا شور ابھی ختم بھی نہ ہوا تھا کہ اسٹیشن آگیا۔ جب ہم لوگ شعر سنانے میں مصروف تھے ہمارے ایک ساتھی نے بیرے کو نہ جانے کس وقت اشارہ کر دیا اور وہ دو بڑی کیتلی چائے اور دو تین پلیٹوں میں کئی طرح کے حلوے اور مٹھائیاں لے کر آگیا۔ ایک صاحب چائے بنا کر تقسیم کرنے لگے اور ہم نے چائے کی پیالیاں اور پلیٹیں تمام بیٹھنے والوں میں ایک ایک کے سامنے پیش کرنا شروع کر دیں۔ اس کے بعد گاڑی ہمارے دوست کے گنگنانے ہی کی حالت میں چلی۔ اتنے میں وہ اوپر والی برتھ کے صاحب بولے۔ "اس کی رسید کاٹ دیجئے" اور ہمارے قومی کارکن صاحب جب ان سے پانچ روپے کا نوٹ وصول کر رہے تھے تو ہمارے دوسرے ساتھی ایک صاحب کو جو اونگھ رہے تھے۔ "صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں" والی حالت میں آدھی آنکھیں کھولے اور آدھی بند کئے دیکھے سُروں میں خراٹے لے رہے تھے دیکھ کر پہلے منظر کشی کا ایک شعر پیش کرتا ہوں ملاحظہ ہو۔

افسوس کہ دُنیا سے سفر کر گئے بُدھو
آنکھیں تو کھُلی رہ گئیں اور مر گئے بُدھو

واہ واہ اور قہقہوں میں سونے والے صاحب کی آنکھ کھل گئی۔ اور ہمارے دوست جھوم جھوم کر پھر اس شعر کو مکرر پڑھنے میں مصروف ہو گئے اتنے میں جس جگہ ہم کو جانا تھا، وہ اسٹیشن آگیا۔ اور جب ہم لوگ ڈبے سے اُتر رہے تھے تو ایک صاحب جو اونگھنے والے صاحب کے داہنی جانب بیٹھے مسکرا رہے تھے قومی کارکن صاحب کی طرف ایک روپیہ کا نوٹ بڑھاتے ہوئے بولے۔ "یہ چندہ میری طرف سے قبول فرمائیے۔ رسید کی ضرورت نہیں۔"

شہر میں جہاں جہاں ہم لوگ گئے اور جس قدر کامیابی ہوئی اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ جب واپسی پر ہم لوگ اسٹیشن کے ریسٹوران میں پانچویں مرتبہ چائے پینے بیٹھے تو قومی کارکن نے مُردہ آواز میں کہا۔ "خدا سوچ سمجھ کر آرڈر دیجئے گا کیونکہ اس چائے کے دام ہمیں اپنی گرہ سے ادا کرنا پڑیں گے.....!!"

جوابِ طلب امور کے لئے ہمیشہ اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ یا پوسٹ کارڈ بھیجئے ورنہ ہم جواب دینے سے قاصر رہیں گے۔

غزل

خمار انصاری ایم۔ اے

دلِ گرفتہ ہوں، مگر چاک گریباں تو نہیں
میرا عالم تری رسوائی کا ساماں تو نہیں

آپ بے وجہ ہوئے ترکِ ستم پر مائل
میں ابھی اپنی وفاؤں پہ پشیماں تو نہیں

مسلکِ اہلِ وفا یوں نہیں بدلا کرتا
مسلکِ اہلِ وفا ہے، ترا پیماں تو نہیں

کتنے غم مانگ رہے ہیں لبِ گویا ہم سے
ہم فقط نغمہ سرائے غمِ جاناں تو نہیں

سارا الزام حریفوں پہ لگانے والو
اِس تباہی کا سبب سازشِ یاراں تو نہیں

ہم بھی ہیں مدح سرائے قدِ گیسو لیکن
رسن و دار کی منزل سے گریزاں تو نہیں

غزل

چندر پرکاش جوہر بجنوری

رنگِ بہار و نکہتِ گل ہائے تر لئے
آئی شمیمِ دوست پیامِ سحر لئے

پیہم نوازشِ غمِ جاناں کے باوجود
بارِ غمِ حیات بھی ہوں دوش پر لئے

بزمِ خیال سے کوئی ہو کر گزر گیا
ناکامِ دید، رہ گئے تابِ نظر لئے

تیرے کرم کی آس پہ اے رحمتِ تمام
دانستہ جو گناہ نہ کرنے تھے کر لئے

ہر ذرہ ایک منزلِ مقصود بن گیا
گزرا ہوں جس مقام سے ذوقِ سفر لئے

جوہر برائے خاطرِ جاناں بصد خلوص
بیٹھا ہوں آج دل کو سرِ رہگزر لئے

ایک آرزو بے نام سی

اختر عابد نوگانوی

گیر مناف۔ امروہہ (یو۔ پی)

۱۰ اپریل ۱۹۶۲ء   محترم! تسلیم

اس بار ڈائری کے چند اوراق کو افسانہ کا نام دیکر حاضرِ خدمت کر رہا ہوں۔ نہیں کہہ سکتا کہاں تک کامیاب ہوں۔ آپ کی استادانہ رائے کا منتظر رہوں گا..... اس رات کی تحریروں کی اشاعت کے لیے شکریہ۔ نصرت کی آواز کی رسید بھی مل گئی ہے۔ افسانہ نمبر میں شریک ہونے کی خواہش تھی لیکن مجھے آپ سے اتفاق ہے۔ آپ کی محبت ساتھ رہی تو یقیناً ابھی کہانیاں تخلیق کرتا رہوں گا ——— اور بھی نہ جانے کتنے افسانہ نمبر اور سالنامے آپ کے ہاتھوں سے مرتب ہوں گے۔ میری نیک تمنائیں آپ سے ہمیشہ وابستہ رہیں گی۔ آپ کا   عابد

لطیف احساس اور جذبات بیدار کرنے والی ——— پہلی ملاقات ۲۰ مارچ ۱۹۶۲ء

وہ ایک پُر شباب شام تھی۔ سمندر کی چنچل موجوں کے ساتھ مسکراتی اور انگڑائیاں لیتی ہوئی۔

میں حسبِ معمول گیٹ وے آف انڈیا سیر و تفریح کے لئے گیا ہوا تھا اور ساحل سے دور تک پھیلے ہوئے حسین نظاروں کو اپنی نیم وا آنکھوں میں سمیٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ نظارے جہاں بھی مجھے ملتے ہیں میں اُن کی چاہت میں دیوانہ سا ہو جاتا ہوں ——— اُس دن اچانک کسی مقناطیسی کشش نے مجھے اپنی جانب کھینچ لیا تھا۔ یہ ایک حسین اتفاق تھا کہ وہ تمام نظاروں کا محور بن کر میرے قریب ہی آکر بیٹھ گئی تھی اور اُس کے بیٹھتے ہی مجھے محسوس ہوا تھا کہ جیسے کا رُخ میری جانب ہو گیا ہے اور میری سانسوں میں اُس کے تقدس کی خوشبو تحلیل ہونے لگی ہے۔ میں نے چور نگاہوں سے اُس کے سراپا کا جائزہ لیا۔ دل ہی دل میں میں نے اُسے کئی حسین عنوانات سے پکارا۔ اُس کی غزالی آنکھیں جیسے محبت کی روشنی پھیلاتے ہوئے دو چراغ ہوں۔ کتابی چہرہ جیسے کسی حسین نظم کی طرح۔ سفید ساری کا آسمانی رنگ کا بلاؤز ان تمام خوبیوں سے ظاہر ہو رہا تھا جیسے کسی چابکدست مصور کا شاہکار ہو، جس میں قدرت نے روح ڈال کر اُسے اور بھی حسین بنا دیا ہے۔

مجھ سے بے خبر جانے کن خیالات کی وادیوں میں کھوئی بھٹک رہی تھی اور میں برابر اپنی نگاہوں سے اُسے چرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ پہلا اتفاق تھا کہ میں نے کسی لڑکی کو محبت بھرے جذبات کے ساتھ دیکھا تھا اور اپنی گزشتہ سیاہ کاریوں کو بھول گیا تھا۔

میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ میری زندگی کو کسی ایسی لڑکی کی ضرورت بھی ہے جس کی مسکراہٹ سے کلیاں چٹکتی رہیں اور میرے احساس مہکتے رہیں۔ میں نے خود بھی اس کی ضرورت نہ سمجھی تھی کیونکہ ہر لڑکی میری زندگی میں آوارہ بدلی کی طرح آتی، دل بہلاتی چلی جاتی۔ میرے دل میں نہ پھر کوئی آرزو ہوتی اور نہ کوئی یاد ہوتی۔ لیکن وہ پہلی لڑکی تھی جسے دیکھ کر میرا دل اُس کی جانب کھنچا چلا جا رہا تھا اور میں محسوس کر رہا تھا کہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی میں کتنا تہی دامن ہوں، میری زندگی کتنی اُداس اور سوگوار ہے!

وہ اُس دن دیر تک بیٹھی رہی، لیکن میں چاہتا تھا کہ وہ زندگی کی آخری دھڑکنوں تک یوں ہی میرے قریب بیٹھی رہے اور میں اُسے دیکھتا رہوں لیکن جب میں نے یہ سوچا تو وہ جانے لگی۔ نہ جانے کیوں اچانک ہی اُس کے لبوں پر ایک لطیف سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ایسی مسکراہٹ جو لطیف ہونے کے ساتھ ہی دل کی گہرائیوں تک چبھتی محسوس ہوئی۔ جیسے اُس نے میرے دل کے آئینے میں جھانک کر میری تمام کمزوریاں، میری ساری بُرائیوں کو دیکھ لیا ہو اور یوں ہی مسکراہٹ کی بجلی میرے دل پر گرا دینا چاہتی ہو۔

اُس نے چند ہی قدم اُٹھائے تھے کہ میں نے جسارت سے کہا۔

"ٹھہریئے!"

اُس کے قدم ٹھہر گئے جیسے میری آواز کے منتظر تھے۔ پھر وہ کچھ عجیب انداز سے مخاطب ہوئی۔

کتنی خوبیاں ہیں ان آنکھوں میں تیری
قدرت جو شے ہے وہ کم دیکھتے ہیں ——— غالب

وہ چیز کہتے ہیں فردوسِ گم شدہ جس کو
کبھی کبھی تری آنکھوں میں پائی جاتی ہے ——— جگر مرادآبادی

دور میں اُس کی مست آنکھوں کے
محتسب بھی شراب خوار ہوا ——— راسخ

وہ خمار آلودہ آنکھیں دیکھ کر
موج مے لینے لگی انگڑائیاں ——— اثر لکھنوی

ہائے وہ مستی بھری ساقی کی آنکھ
ہائے وہ جلوے چھلکتے جام کے ——— وفا

(مرسلہ، سید احمد عمر دی فرخ آباد)

"کہیے؟"

"جی... جی کچھ نہیں۔" میں کچھ نہ کہہ پایا۔

میں اپنے شکستہ ارادے لئے بیٹھا رہ گیا ——— اور وہ اپنے نہ مٹنے والے نقوش میرے دل پر اُتارتی چلی گئی۔

حسنِ اتفاق سے دوسری حسین ملاقات ۱ مارچ ۶۲ء

میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے دل نے نجانے کیوں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہی لڑکی میری بہتر رفیقِ حیات بن سکتی ہے۔ اور اُس کے بغیر زندگی سمندر میں پڑے ہوئے اُس بھاری پتھر کی طرح ہے جس سے اکثر موجیں چھیڑ چھاڑ اور اٹھکیلیاں تو کر سکتی ہیں لیکن اپنی جگہ سے اُسے جنبش نہیں دے سکتیں۔ میں نے جب تک اُسے نہ دیکھا تھا ایک پتھر کا انسان تھا جس کے سینے میں پتھر کا دل تھا۔ لیکن اُس کی آنکھوں کی کشش نے میرے پتھر دل کو موم کا بنا دیا تھا۔

میں اپنے موم کے دل میں اُس کی یاد لئے، اُس کی خیالی تصویر لئے، پھر گیٹ وے آف انڈیا پہنچ گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ پھر مجھے ملے گی۔ میرا دل کہتا تھا، دل کی آواز یہی تھی۔ شاید اُس کا بھی یہی معمول ہوگا۔ اُسے بھی یہی رومانی جگہ پسند ہوگی کیونکہ اتوار کے دن بمبئی میں اتوار کا پارٹ ہی آزاد معلوم ہوتا ہے۔ شاید وہ دن بھی اتوار کا دن تھا جب ہندوستان نے آزادی حاصل کی تھی۔ اگر وہ دن اتوار کا نہ تھا تو میرے خیال کے مطابق اور بمبئی کے ماحول کو مدِنظر رکھتے ہوئے اتوار ہی کا دن ہونا چاہئے تھا ——— میں پھر اُسی جگہ بیٹھا اُس کا منتظر تھا۔ میری نظریں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں۔ اشتیاق بھری نظریں ——— لیکن وہ ابھی نہیں آئی تھی۔ اُس دن مجھے اُس سے بہت کچھ کہنا تھا۔ اور جو کچھ کہنا تھا وہ میں نے پہلے ہی سے ذہن کے ایک گوشے میں چھپا لیا تھا۔ اُس سے پہلے میں نے کسی لڑکی کے بارے میں اتنی شدت سے نہیں سوچا تھا کہ لڑکی کو خود ہی میرے بارے میں سوچنا پڑا تھا۔ اُس دن دل و دماغ کی اس تبدیلی پر میں خود ہی حیران تھا۔

وہ نہیں آئی۔ کیوں نہیں آئی؟ شاید اب نہ آسکے گی۔ لیکن نہیں اُسے آنا چاہئے۔ وہ آئے گی۔ اِسی کشمکش سے اُلجھتے اُلجھتے مجھے ایک گھنٹہ گزر گیا۔ میں نے اتنی شدت سے کبھی کسی کا انتظار نہیں کیا تھا اکثر میرے ہی کانوں میں یہ شکایت گونجی تھی۔

"مسٹر دیال آپ کس قدر ویٹ کراتے ہیں!"

"اوہ ڈونٹ کیر ڈیر!" اِس سے زیادہ مجھے کہنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔

ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کرانے کے بعد بھی وہ نہ آئی ——— لیکن اُس نے مجھ سے پھر ملنے کا وعدہ بھی تو نہیں کیا تھا۔ یہ سوچ کر میرا دل مُرجھا گیا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد میرے دل میں، میری بے چین آنکھوں میں سرمستی کی لہریں دوڑ گئیں۔ وہ ساحل کے قریب کھڑی دھانی رنگ کی ساڑی میں ملبوس بڑی محویت سے سطحِ سمندر پر تیرتی کشتیوں کو اور اُن کشتیوں میں سیر کرنے والے مرد اور عورتوں کو دیکھ رہی تھی۔ ہوا کی شوخی نے اُس کی زلفوں کی حسین لٹیں پیشانی تک بکھیر دی تھیں۔

مہک مہک سی گئی ہے فضا دو عالم کی
جو تیری زلف معنبر ہوا میں لہرائی

میں نے یہ شعر پڑھا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے وہ بھی کسی ہمسفر کو تلاش کر رہی ہے ——— ایسے ہمسفر کو جو اُسے سمندر کی بیکراں وسعتوں تک لیجائے۔ اور دل کے تاروں پر ایسا نغمہ چھیڑے جو اُس کے منجمد جذبات میں بھی سمندر کی سی روانی پیدا کر دے۔

چند منٹ بعد میں اُس کے قریب تھا۔

اُس نے استعجاب بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔

میں نے کچھ نہیں کہا۔

"شاید آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں" وہ اچانک خود ہی مجھ سے مخاطب ہوئی۔

اُس کی آواز نے میرے کانوں میں شہنائیوں کا ترنم سا بھر دیا۔

میں نے اپنی مدعا کو تشنہ محسوس کرتے ہوئے کہا "اگر آپ اجازت دیجئے تو ــــ"
وہ ٹھیک سے مسکرائی۔
"میں آپ کا نام جان سکتا ہوں ؟"
"آپ کو کس نام کی تلاش ہے ؟ ویسے مجھے شاردا کہتے ہیں"
"تلاش تو قریب ہی ہے ــــ مجھے دیپک کہتے ہیں"
"کہئے کیا خدمت کر سکتی ہوں ؟"
"آپ تنہا ہیں ــــ ؟" میں نے پھر ایک سوال کیا۔
"فی الحال" اُس نے مختصر جواب دیا۔
"تنہائی کا احساس دونوں طرف ہے۔ اگر آپ چاہیں تو یہ احساس مٹ بھی سکتا ہے" میں نے اپنی گزشتہ روش کے رُخ سے پردہ ہٹانے کی کوشش کی۔
"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی"
"آپ یہ ساحل کے قریب خالی کشتی دیکھ رہی ہیں ؟"
"جی ہاں!"
"شاید یہ آپ کا اور میرا ہی انتظار کر رہی ہے"
وہ صرف مسکرا دی ــــ اور ــــ
اُس نے چند لمحوں تک کچھ سوچا۔ پھر نجانے کونسی طاقت تھی جس نے اُسے میرے قریب کر دیا۔ کشتی موجوں سے سرگوشیاں کرتی ہوئی سطح سمندر پر آگے بڑھتی رہی اور میں اُس کی آنکھوں میں چھپے سمندر کی گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔
خاموش لمحات ڈوبتے سورج کے ساتھ پھر ساحل تک لے آئے۔
"سامنے تاج ہوٹل ہے، چلئے گا ؟" میں نے اُسے دعوت دی۔
وہ حسب عادت جواب میں مسکرا دی۔ اُس کی اُس مسکراہٹ ہی میں جیسے میری آرزو کی منزل تھی۔

کچھ دیر تاج ہوٹل میں بیٹھ کر کافی پی۔ میں نے اُس سے اور کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ تعارف صرف ایک دوسرے کے نام تک محدود رہا۔ اگرچہ وہ میرے لئے سراپا سوال تھی۔ ایسا سوال جس کا حل کرنا میرے لئے دشوار تھا۔ اور نہ اُس نے ہی میرے بارے میں کچھ جاننا چاہا کہ میں کیا ہوں، کیا کرتا ہوں ؟ اُس سے کیا چاہتا ہوں اور کیوں مجھے اُس کی ذات سے اتنی دلچسپی ہو گئی ہے اور کیوں ایک بزنس مین دیال شو مینوفیکچررس کمپنی کا مالک ہونے کے باوجود اُس کی سادگی کا شیدائی ہو گیا ہوں۔

مجھے اے نظر نواب تو یہ دکھا حسین نظارے
میں انہیں کی جستجو میں یہیں گردہ رہ گیا ہوں

زُلف

میں نہ کہتا تھا کہ سلجھا لو یہ زلف منتشر
اب تمہیں دیکھو زمانہ کتنا اُلجھا جائے ہے ــــ سلام مچھلی شہری

کلیوں کو کون صحن چمن میں جگائے گا
خود سو گئی صبا تری زلفوں کی چھاؤں میں ــــ کیف

کہتے ہیں شب ہجر جسے عشق کے مارے
تیری ہی کہیں زُلف پریشاں تو نہیں ہے ــــ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

تری خامشی کو دیکھا تو جھنک گئے شگوفے
ترے گیسوؤں کو دیکھا تو جھنک گئیں گھٹائیں ــــ ماہر القادری

کسی کی زلف کے سائے میں یہ محسوس ہوتا ہے
کہ جیسے چھا گئیں رنگینیاں سارے زمانے میں ــــ تابش

(مرسلہ: ایل۔ آر چودھری نئی دہلی)

بیزار لمحات کو سکون کی لوریاں دینے کے لئے تیسری ملاقات کی جستجو [illegible]
آج وہ آئے گی اپنی مسکراہٹوں کے پھول بکھیرتی ہوئی۔ دل میں ننھے جذبات سے آنکھوں میں محبت کی روشنی چھپائے، وہ آئے گی میری آخری آرزو بنکر اور میری روح کی گہرائی میں اتر جائے گی، وہ آئے گی میری راہ سے چلکر اور ٹھہر جائے گی میری منزل بنکر ــــ آج میں اُس سے کہہ دوں گا کہ میری زندگی کی کشتی ساحل کے قریب تمہارے بغیر سُونی نظر آتی ہے۔
میں ساحل پر کھڑا آج بھی اُس کا انتظار کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا، میں اپنے دل کی ہر بات اُس سے کہہ دوں گا۔ ہر راز اُس پر عیاں کر دوں گا ــــ مسلسل سوچنے کے بعد میں نے اور میرے دل نے یہی فیصلہ کیا تھا، وہ قدرت کا ایسا حسین شاہکار ہے جسے قدرت نے بھی تخلیق کر کے اُس پر فخر کیا ہوگا۔ کائنات کی ہر قیمتی شے اُس پر قربان کی جا سکتی ہے۔ ایک کاروباری انسان کے ذہن کو ایک اجنبی لڑکی کے تصور نے حُسن و محبت کی دلفریبیوں میں بھٹکا دیا تھا وہ ایک شاعر بن گیا تھا۔ وہ انسان جس نے ہمیشہ پیار، محبت، انسان اور اُس کی عظمت کو صرف دولت کی نگاہوں سے دیکھا تھا، اب اُس کی آنکھوں کو صرف ایک سادہ طبیعت لڑکی کے الطاف کی تمنا تھی۔ جسے وہ دولت سے نہیں صرف محبت سے حاصل کرنا چاہتا تھا۔
مجھے اپنی قسمت پر ناز تھا کہ زندگی میں جس شے کی بھی میں نے تمنا کی وہ مجھے حاصل ہو گئی۔ اب میں نے چاہا تھا کہ شاردا کا پیار مجھے مل جائے تو اُس سے بھی مجھے محرومی نہ ہوئی۔

[illegible] میں اُس نے میرے جذبات اور احساسات کو پرکھ لیا تھا
[illegible] کے ملتے برسوں سے کہیں بچھڑے نہ تھے۔ اُس نے وعدہ کیا
[illegible] بھی بھٹک گیا اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ ہمیشہ کے لئے میری
زندگی میں [illegible] ہاتھ پکڑ چلی آئے گی۔ کیونکہ اُس نے بھی یہی فیصلہ کر لیا ہوگا۔

میں نے ریسٹ واچ پر نظر ڈالی، پانچ بج چکے تھے۔ شاید میں جلد چلا آیا ہوں میں نے خود کو تسلی دی۔ لیکن جب میں یہاں آیا تھا تو چار بجے تھے۔ اسی خیال کے ساتھ مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ شاردا کے انتظار میں پورا ایک گھنٹہ گزر چکا ہے۔ لیکن پانچ بجے تک اُسے آ جانا چاہئے تھا۔ شاید کسی وجہ سے دیر ہوگئی ہوگی۔ لیکن یہ لمحہ اتنی طویل کیوں ہے؟ اتنا فاصلہ کیوں ہے؟ کاش وقت یہ سمٹ کر اتنا مختصر ہو جائے کہ . . . دُور سے کوئی آ رہا تھا۔ شاردا ۔ ہاں، شاردا ۔ اور جب وہ قریب سے گزری تو وہ شاردا نہ تھی بلکہ ایک فریب تھی جو میری نگاہوں کو بھی فریب دے گئی تھی۔

پھر کئی بار میں نے فریب کھایا ۔۔۔ چند لمحات خوشگوار گزرے ۔۔۔ پھر کچھ اُلجھن بڑھی، پھر اُداسی، پھر محرومی ۔۔۔ لیکن فوراً ہی خیال آیا شاید وہ تاج ہوٹل میں میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ پھر اُمید کی ایک کرن نظر آئی ۔۔۔ میں بھی کتنا بے وقوف ہوں۔ پھر میرے قدم تاج ہوٹل کی جانب اُٹھ گئے۔ شاردا وہاں بھی نہ تھی تقریباً آدھ گھنٹہ میں نے وہاں بھی اُس کا انتظار کیا۔ کافی پی اور تلخ ذائقے کے ساتھ پھر اُسی جگہ چلا آیا جہاں آنکھوں کو شاردا کی تلاش تھی لیکن نیلم، مسز میسی، مسز ڈینزی، اور مسز چیٹنس جیسی عورتوں سے ملاقات ہوئی بمشکل تمام اُن سے دامن چھڑایا۔ لیکن شاردا کہیں نظر نہ آئی۔ چاروں طرف اُجالے تھرکنے لگے تھے۔ لیکن مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میری اُمیدوں کی شمع گُل ہو چکی ہے اور ہر طرف اندھیرا ہے جس میں تنہا بھٹک رہا ہوں ۔۔۔ کیا شاردا بھی ایک فریب تھی؟ نہیں! نجانے کیوں میرا دل اُن کے بارے میں غلط فیصلہ کرنے پر آمادہ نہ ہوتا تھا۔

اگلے دن میں نے پھر شاردا کو اُسی جگہ تلاش کیا۔ پھر مسلسل میری آنکھیں اُسے ڈھونڈتی رہیں ۔۔۔ زندگی میں یہ پہلی ناکامی تھی جس نے میرے جذبات اور احساسات کو مجروح کر دیا تھا۔ مجھے وہ غم دیا تھا جس کا کبھی گمان بھی نہ تھا اور جسے سہہ لینے کی میں نے اپنے وجود میں کبھی طاقت نہ پائی تھی۔

آخری اتفاق ۔ ۱۰ اپریل ۶۲ء

مجھے زندگی کی اِس تلخ کروٹ نے بہت زیادہ بدل دیا تھا۔ میں اِس پہلی ناکامی سے اتنا متاثر ہو چکا تھا کہ اپنی بھی خبر نہ تھی کہ اِس احساس کو بھلانے کے لئے میں کیا کیا گناہ کر بیٹھا ہوں۔ دل میں ایک ایسی طوفانی کیفیت جاگ چکی تھی کہ اُن چند ہی دنوں میں میں نے اپنی فرم کے کئی پرانے اور تجربے کار کاریگروں اور کئی کلرکوں کو بغیر کسی وجہ کے نکال دیا تھا۔ میری عادت تھی کہ بیئر کے دو گھونٹ پی کر ہی سو جایا کرتا تھا لیکن اب مجھے اسکاچ، ڈرائجن، شیمپین اور برانڈی پی کر بھی نیند نہ آتی تھی۔ جدھر بھی سکون کی تلاش میں قدم اٹھتا غموں کے سائے میرے پیچھے رہتے۔ میں جھنجلاتا۔ اپنے وجود پر اپنے کردار پر اپنی اس بدلی ہوئی فطرت پر ۔۔۔ اپنے زخم آپ ہی نوچ کر پھر درد کی شدت سے کراہنے لگتا۔

اُس دن میرا جسم نڈھال تھا۔ دماغ کھویا کھویا تھا۔ مجھے کچھ خبر نہ تھی کہ میری کونسی راہ ہے۔ بس اپنی کار کو کس منزل کی جستجو میں دوڑا رہا ہوں۔ مجھے کہاں ٹھہر کر دم لینا ہے۔

اچانک ہی ایک دلخراش چیخ کی آواز نے میرے کانوں میں جیسے آہنی سلاخیں سی ٹھونس دیں۔

"ایکسیڈنٹ لڑکی کا ایکسیڈنٹ!!" بہت سی آوازیں ایک ساتھ گونج اٹھیں۔ ٹریفک جام ہو گیا۔

"آنکھیں کھول کر کار ڈرائیو نہیں کرتے!!" کسی نے کار کی کھڑکی کے شیشے کی کرچیں بکھیر دیں۔

"سالا لوگ اِس چھکڑے میں بیٹھ کر بھول جاتا ہے کہ یہ روڈ اُس کے باپ کا نہیں ہے!"

"حضرت اِس ہوائی جہاز سے نیچے اُتر آئیے۔ کیا شراب کے نشے نے بہت زیادہ مدہوش کر دیا ہے؟" یہ کسی شائستہ اور شاعر قسم کے انسان کی آواز معلوم ہوتی تھی۔

بہت سی گالیاں، لعنتیں ۔۔۔ جو جس کے جی میں آ رہا تھا میرے استقبال میں مجھ پر نچھاور کر رہا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور اِن تمام باتوں کا خیال لئے بغیر کار سے نیچے اُتر آیا۔ خیر ہوئی کہ جوتے اور چپلوں سے عزت افزائی نہیں کی گئی۔ یا تو سب میری شخصیت سے مرعوب ہو گئے تھے یا پھر میرا اُداس چہرہ اُن سب کے لئے قابلِ رحم بن گیا تھا۔ لیکن یہ دیکھ کر میرے استعجاب کی انتہا نہ رہی کہ وہ لڑکی کوئی اور نہیں تھی شاردا تھی! جو بے ہوش اور زخمی حالت میں میرے سامنے سڑک پر پڑی تھی۔ آج شاردا سے ملاقات ہوئی بھی تو کتنے عجیب ڈھنگ سے! یہ کتنا عجیب اتفاق تھا کہ اُسے دیکھ کر میری آنکھیں بھیگ گئیں ۔۔۔ میں پھر کہیں کھو سا گیا۔

"اب دیکھ کیا رہے ہو بابو جی اِسے ہوسپٹل لے جاؤ" ۔۔۔ ایک شخص نے میرے کھوئے اوسان مجھے لوٹاتے ہوئے راہ دکھائی۔

پھر میں نے کانپتے ہاتھوں سے ایک دوسرے شخص کا سہارا لے کر شاردا کو پچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔

ابھی کار اسٹارٹ کرنے بھی نہ پایا تھا کہ ایک شخص نے مجھ سے کہا۔

"ٹھہرئے بابو جی یہ فائل بھی شاید اسی کا ہے۔"

جانا ہو گر یا چین کھینچ کر آپ نکل آئیں گے۔ لیکن ہماری گاڑی کے لیٹ ہونے کی
وجہ سے جو زبردست قومی نقصان ہوگا، اسے کون پورا کرے گا؟ پھر اپنے ہمسفروں
کے بارے میں بھی تو سوچئے۔ فرض کیجئے "الف" کسی انٹرویو کے لئے سفر کر رہا ہے
گاڑی لیٹ ہونے سے آپ نے اس کے مستقبل کو بہتر بنانے کا موقع ہی ختم کر دیا۔
اور شاید "ب" اپنے اکلوتے قریب المرگ بیٹے کے علاج کے لئے ڈاکٹر کے
پاس جا رہا ہو۔ آپ نے اسے دوا لانے کا وقت بھی نہیں دیا۔ لہذا انسانیت برتئے
اور اپنی ذمہ داریوں کو سمجھئے۔ جہاں تک ہو سکے گاڑی ٹھہرانے کیلئے خطرے کی زنجیر کا استعمال نہ کریں۔

کیا آپ

یہ غلطی کریں گے؟

نادرن ریلوے

شاردا کا خط ... سے ہاتھ لیتے ہوئے سوچا۔ پھر اُسے کھولا۔ اُس میں سے ... ایک درخواست تھی جو ہندی میں لکھی ہوئی تھی لیکن وہ اس ... معلوم ہوتی تھی۔ نہ جانے کیوں سب کچھ بھول کر میری ... ہو گئیں۔

"شریمان ... جی!

... کے قریب ہو ... آپ سے دُور رہی یہ کوئی نئی بات نہیں۔ میری ... نا مناسب نہیں ہے۔ آپ مجھے ان ملاقاتوں سے پہلے نہیں جانتے تھے لیکن میں آپ کو بہت پہلے سے جانتی تھی۔ یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ بمبئی میں لوگ ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہوئے بھی دُور اور اجنبی رہتے ہیں۔ لیکن آپ سے ملاقات ہوئی کتنا ناممکن تھا ... کہ آپ سے متعارف ہونا چاہتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ آپ ... تفریح کے لئے جایا کرتے ہیں اس لئے میں نے بھی آپ سے ملاقات کے لئے اُسی جگہ کو بہتر سمجھا اور میری آرزو پوری ہو گئی۔ تیسری بار میں حسبِ وعدہ آپ سے نہ مل سکی مجھے اس کا سخت افسوس ہے اُس دن تو میں آپ سے کچھ کہنا بھی چاہتی تھی لیکن کچھ مجبوریاں تھیں کہ وہ نہ مل سکی۔ اس سے پہلے بھی میں نے آپ سے کچھ کہنا چاہا تھا لیکن جرأت ہی نہ ہو سکی تھی۔ شاید آپ نہیں جانتے کہ میں آپ کی فرم کے ایک بہترین کاریگر مسٹر شرما کی بیوی ہوں جب سے اُن کا ایکسیڈینٹ ہوا ہے وہ مفلوج ہو کر رہ گئے ہیں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں ایک عورت کو اپنے شوہر سے کتنی محبت ہوتی ہے۔ اب اس کے سوا کوئی راہ سامنے نہ تھی کہ میں کہیں کہیں ملازمت کروں میں نے انٹر پاس کیا تھا اس لئے مجھے بھروسہ تھا کہ کہیں نہ کہیں نوکری مل سکتی ہے۔ اس لئے سب سے پہلے میری نظر آپ ہی پر گئی آپ اپنی فرم میں ایک ٹائپسٹ کی جگہ دے سکتے ہیں کیونکہ آپ نے اُس خالی جگہ کا اشتہار بھی دیا تھا۔ لیکن کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ آپ اچھے کردار کے انسان نہیں ہیں اس لئے میں نے پہلے خفیہ ملاقات کو بہتر سمجھا اس بات کو آپ چاہے ایک عورت کی گری ہوئی فطرت تصور کریں لیکن یہ میری ایک بڑی کمزوری تھی۔ آپ کا کردار جتنا بلند ہے اُس کا اظہار لفظوں میں نہیں کر سکتی مجھے شرمندگی ہے کہ میں نے آپ کے بارے میں غلط سوچا ہی کیوں تھا اور کیوں دوسروں کی باتوں پر کچھ یقین سا آ گیا تھا۔ اب یہ درخواست لے کر آپ کے آفس میں آئی ہوں اسے منظور کیجئے اور میرے شوہر کی خدمات کو نظر انداز نہ کرتے ہوئے مجھے وہ جگہ دے دیجئے جو حال ہی میں خالی ہوئی ہے۔

آپ کی سیوک ——— شاردا

میں نے یہ درخواست پڑھنے کے بعد بمشکل تمام کار اسٹارٹ کی کیونکہ بہت سے لوگ مجھے حیرت بھری نظروں سے گھور رہے تھے، کچھ سوچ رہے ہوں گے کہ میں بیہوش شاردا کو اسی سڑک پر ڈال کر فرار ہو جاؤں گا۔ لیکن ہاں! میں یہ ضرور سوچ رہا تھا کہ ہوسپٹل پہنچتے پہنچتے نہ جانے کتنے ایکسیڈنٹ اور ہو جائیں گے!

غزل

شاکر سوہاردی

کبھی تو آئیں گے پیغام زندگی لے کر
جو دل کے ساتھ گئے ہیں قرار بھی لے کر

تمہارے غم میں جوانی اداس رہتی ہے
اب آ بھی جاؤ بہاروں کی تازگی لے کر

نظر کے سامنے رہتا ہے جلوۂ تاباں
کسی کی بزم سے آیا ہوں روشنی لے کر

نہ وہ لبوں پہ تبسم نہ گفتگو میں وہ لوچ
تم آج آئے ہو یہ کیسی برہمی لے کر

ترا خیال ہے اور زندگی کی راہیں ہیں
بھٹک رہا ہوں اندھیرے میں روشنی لے کر

غزل

بسمل کپور تھلوی

اے ضبطِ الم تُو نے یہ کیا کام کیا ہے
ہر ایک تمنا کا گلا گھونٹ دیا ہے

کچھ دل میں تری یاد کی قندیل تھی روشن
کچھ میں نے تصور کا سہارا بھی لیا ہے

اے دل یہ چراغِ شبِ غم کم تو نہیں کچھ
روشن ہو تو ہر داغِ تمنا بھی دیا ہے

ہیں تیرے ستم میں بھی عنایات کے پہلو
اے دوست کبھی تُو نے یہ محسوس کیا ہے

بھٹکے گا نہ اب راہ روِ عشق کہ ہم نے
ہر گام پہ سجدے کا نشاں چھوڑ دیا ہے

جدید نسل کی نامور افسانہ نگار خاتون

واجدہ تبسّم سے انٹرویو

نریش کمار شاد

۱۵-الف۔ موتی باغ۔ ۲۱ نئی دہلی

۱۰ اگست ۱۹۹۳ء

محبیّ خوشتر صاحب!

آئندہ شمارے کے لئے مریزہ واجدہ تبسّم سے انٹرویو حاضر ہے۔ واجدہ کو "بیسویں صدی" کی بزمِ رنگا رنگ میں لانے کا شرف آپ کے اسی نیازمند کو حاصل ہے۔ یاد رہے بات ہے کہ اب، جب دہلی میں وہ آپ کی مہمان ہوتی ہیں تو میں "نقشِ طاقِ نسیاں" ہوتا ہوں۔ آپ دونوں کی رگِ التفات کو چھیڑنے کے لئے عصمت چغتائی کے بھائی عظیم بیگ چغتائی مرحوم کا ایک شعر یاد آ رہا ہے۔

> ٹھکانا ہی کیا اُس کی مایوسیوں کا زمانہ جسے جیتے جی بھول جائے

مجھے افسوس ہے کہ ستمبر کے شمارے میں شائع ہونے والا منظوم انٹرویو "بیسویں صدی" میں چھپنے سے پہلے ہی منظرِ عام پر آ گیا حالانکہ نگار صاحب سے یہ بات طے تھی کہ یہ انٹرویو صرف "بیسویں صدی" کے لئے نظم کیا جا رہا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ مطبوعہ مضامین نظم و نثر کی اشاعت "بیسویں صدی" کی روایت کے خلاف ہے۔ باور کیجئے نگار کی اس غیر ذمہ دارانہ حرکت کے باعث میں آپ سے نادم ہوں۔ انٹرویو مکمل ہونے کے بعد نگار نے جب خواہش ظاہر کی کہ وہ اسے تعارف کے طور پر اپنے زیرِ طبع مجموعہ کلام میں بھی شامل کرنا چاہتا ہے تو میں نے اس ضمن میں ٹیلیفون پر آپ سے مشورہ کیا اور آپ کی رضامندی سے اُسے اس کی اجازت دے دی۔ لیکن اس ستم ظریف "نوجوانِ خوش اطوار" نے انٹرویو کو دو آنے کے پمفلٹ کی صورت میں شائع کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "بیسویں صدی" میں اشاعت سے پہلے ہی چند اخبارات و رسائل میں اس پمفلٹ سے یہ انٹرویو نقل ہو گیا۔ یقین کیجئے کہ نگار کا یہ اقدام میرے لئے بھی اتنا ہی تکلیف دہ ہے جتنا آپ کے لئے۔ لیکن۔

> قاعدہ ہے کہ دوستوں کے قصور دوست ہنس کر معاف کرتے ہیں

—— نریش کمار شاد

شاد۔ آپ کی ولادت کب اور کہاں ہوئی؟

واجدہ۔ اور کیوں ہوئی، کیا یہ بھی بتانا پڑے گا؟

شاد۔ نہیں۔ اس کا جواب آپ کے علاوہ بھی ہر شخص دے سکتا ہے۔

واجدہ۔ تو سنئے! ۱۶ مارچ ۱۹۳۵ء کو امراؤتی میں پیدا ہوئی۔

شاد۔ ابتدائی تعلیم کہاں حاصل کی اور آپ کی ادبی زندگی پر اس کا کیا اثر پڑا؟

واجدہ۔ ابتدائی تعلیم نویں کلاس تک امراؤتی ہی میں پائی۔ پھر جب ۱۹۴۷ء میں ہنگامے ہوئے تو ہم سب خاندان برباد ہو کر حیدرآباد دکن چلے آئے۔ یہاں میں نے پرائیوٹ طور پر بی۔ اے کیا۔ پھر ناگپور یونیورسٹی سے ایم۔ اے کیا۔ میری افسانہ نگاری پر میری تعلیم کا بے حد اثر ہے۔ جیسے ہی میں نے اردو سیکھی، فکشن پڑھنا اور ساتھ ہی کہانیاں لکھنا شروع کر دیا۔

شاد۔ آپ نے کس عمر میں افسانہ نگاری شروع کی؟

واجدہ۔ آپ ہنسیں گے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں نے اپنی پہلی کہانی تقریباً آٹھ برس کی عمر میں لکھی تھی۔

شاد۔ ہنسنے کی نہیں، یہ تو حیران ہونے کی بات ہے۔ خیر یہ فرمائیے کہ آپ نے اپنی

... ہم ... پاس ہو کافی کی پیالی دھری ہو۔ ایسے میں لکھنے کے لئے فضا اور ماحول بن جاتا ہے۔ میری یہ عادت ہے کہ میں کہانی جب تک ایک ہی سٹنگ میں مکمل نہ کروں ادھوری کہیں نہیں رکھتی تھی۔

شاد۔ تھی، یعنی کیا؟

واجدہ۔ اب لیکن شادی ہو جانے اور بچے کے بعد تو ایک سٹنگ کا سوال ہی باقی نہیں رہا۔ کنوارپن میں تو سترہ سترہ صفحے کی کہانیاں بھی ایک ہی نشست میں لکھی ہیں، اور اب تو دو صفحے کی کہانی میں بھی کئی کئی بار رکنا پڑتا ہے۔ کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ ابھی ... سے کہانی لکھ رہی ہوں کہ میاں آفس سے آگئے۔ چائے بنانے کے لئے اٹھنا پڑا۔ ملنے والے آگئے تو باورچی خانے میں ملا کے فرائض انجام دینے پڑ گئے۔

شاد۔ جی ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے۔

واجدہ۔ آپ کچھ اداس ہو کر میری بات کی تائید کر رہے ہیں نریش صاحب! کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیے۔ میں آپ کو بتاؤں کہ اشفاق میرا اتنا خیال کرتے ہیں شاید ہی کوئی شوہر کسی بیوی کا کرتا ہوگا اور خصوصیت سے جب میں کہانی لکھ رہی ہوتی ہوں، سارے بکھیڑے اپنے سر لے لینا چاہتے ہیں لیکن ہوتا یہ ہے کہ اچھے خاصے کاموں کو چوپٹ کر کے رکھ دیتے ہیں اور میرے لئے دوہری جھنجھٹ ہو جاتی ہے۔ دراصل نریش صاحب! یہ اصولوں وصولوں کے نخرے سب کنوارپن کے چونچلے ہیں۔

شاد۔ ترقی پسند ادب کے بارے میں آپ کی ذاتی رائے کیا ہے؟

واجدہ۔ اگر میں اس کا جواب نہ دینا چاہوں تو ---؟

شاد۔ تو بھی کیا ہے

جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

لیکن کیا آپ اس سوال کا جواب دینا بھی پسند نہ کریں گی کہ ہر ادیب کو زندگی کے بارے میں کوئی مخصوص نظریہ اختیار کرنا چاہیئے۔؟

واجدہ۔ میرے خیال میں یہ ضروری نہیں۔

شاد۔ آپ کے نزدیک ہندوستان میں اردو زبان کا مستقبل کیا ہے؟

واجدہ۔ ساحر لدھیانوی کا ایک بے حد خوب صورت شعر ہے۔ آپ نے بھی سنا ہوگا یہی اس کا جواب ہے ؎

ہزار برق گرے، لاکھ آندھیاں اُٹھیں
وہ پھول کھل کے رہیں گے جو کھلنے والے ہیں

شاد۔ بڑی رجائیت پسند ہیں آپ! غالباً یہ بھی تسلیم نہ کریں گی کہ ہمارا موجودہ ادب جمود کا شکار ہے۔

واجدہ۔ قطعاً نہیں۔ چند لوگ ہیں جو محض فیشن میں یہ کہتے پھرتے ہیں کہ ہمارا ادب جمود کا شکار ہے۔ دراصل وہ بے چارے خود جمود کے شکار ہیں ....

شاد۔ کیا ہر اچھا ادیب اچھا انسان بھی ہوتا ہے؟ آپ کا تجربہ کیا ہے؟

واجدہ۔ نریش صاحب! میں تو اب تک جن جن ادیبوں سے ملی ہوں وہ سب بہت ہی مخلص اور اچھے انسان ہیں اور ایک اچھے ادیب کو اچھا انسان ہونا ہی چاہیئے۔ لیکن کچھ سال پہلے جب میں انڈو پاک کلچرل کانفرنس میں حفیظ جالندھری سے ملی تو انہوں نے میرے سر پہ ہاتھ رکھ کر بہت ہی پیار سے کہا کہ بیٹی! ہم سب ادیب اور شاعر جو دیکھنے میں، سننے میں پڑھنے میں بہت اچھے معلوم ہوتے ہیں دراصل بہت ہی نیچ اور کمینے ہوتے ہیں۔ ہمیں صرف دور دور سے دیکھو سنو۔ پڑھو لیکن ہمارے قریب آنے کی کوشش نہ کرو۔ میری اس نصیحت کو گرہ میں باندھ لو ---- اُس دن سے میں سوچتی ہوں کہ اپنے تجربے کو صحیح مانوں یا حفیظ صاحب کی بزرگانہ نصیحت کو۔ اگرچہ نریش صاحب! یہ ایک حقیقت ہے کہ اچھائیاں اور برائیاں سبھی میں ہوتی ہیں۔ پھر ادیب بھی تو آخر انسان ہی ہے۔ فرشتہ تو نہیں۔ آپ کیا سوچتے ہیں؟

شاد۔ میرے سوچنے کی بات چھوڑئیے کیوں کہ اس وقت آپ مجھ سے نہیں میں آپ سے انٹرویو لے رہا ہوں۔ یہ فرمائیے کہ اچھے افسانے کی آپ کے نزدیک کیا خصوصیات ہیں ---؟

واجدہ۔ رواں دواں ہو اور پڑھنے کے بعد ذہن میں اس کا اثر باقی رہ جائے اچھے افسانے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ہر لمحہ قاری کی دلچسپی برقرار

- بُرا کام کرنا ذلالت ہے بغیر خطرہ مول لئے اچھا کام کرنا معمولی بات ہے لیکن بڑا کام بڑے انسان ہی کرتے ہیں، چاہے اُسے کرنے کے لئے سب کچھ خطرے میں ڈال دینا پڑے۔ (پلوٹارک)
- بچوں میں کچھ سیکھنے کی خواہش پیدا کئے بغیر اُنہیں پڑھانے کی کوشش کرنا ٹھنڈے لوہے پر ہتھوڑا مارنے کے برابر ہے۔ (ایچ۔ مان)
- سب سے خندہ پیشانی سے ملو۔ نہ جانے کس بھیس میں نراین مل جائے۔ (تلسی داس)
- جہاں کرم ہے وہاں ایمان ہے، جہاں حرص ہے وہاں معصیت ہے، جہاں غصہ ہے وہاں تباہی ہے۔ (تلسی داس)
- رحیم! اللہ کہ بھلائی کرو۔ بُرا اپنی سرشت نہ بدلے گا۔ سانپ کا ناشتا ہے، دودھ پیتا ہے پھر بھی موقع پانے پر ڈس لیتا ہے۔ (عبدالرحیم خانخاناں)

شاد۔ کیا ادب آدمی کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے؟

واجدہ۔ ضرور ـــــ آپ کی خوبصورت شاعری خود اس کی زندہ مثال ہے۔

شاد صاحب ـــــ آپ کے زرلش صاحب جان بوجھ کر نہیں کہہ رہی تھی۔

شاد۔ افسانے کے علاوہ ادب کی دوسری اصناف سے آپ کو کس حد تک دلچسپی ہے؟

واجدہ۔ ناول اور شخصیات پر لکھے گئے مضامین مجھے بہت اپیل کرتے ہیں۔ اس معاملے میں کافی بدذوق ہوں کہ شاعری سے بہت کم لگاؤ ہے۔ ویسے مشاعرے بہت شوق سے سنتی ہوں۔

شاد۔ کیا افسانہ لکھنے سے پہلے افسانے کا خاکہ آپ کے ذہن میں موجود ہوتا ہے؟

واجدہ۔ میرے ذہن میں صرف ہلکا سا پلاٹ ہوتا ہے جس پر میں بہت تیزی سے پوری کہانی لکھ لیتی ہوں۔ خاکہ کا میرے ذہن میں نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی تو کسی کے منہ سے نکلے ایک آدھ جملے ہی پر مکمل کہانی لکھ لیتی ہوں۔ میں نے ایک ناولٹ "جلاوطن" صرف ایک جملے پر لکھا تھا جو میرے بھانجے منے میاں نے اپنی اماں سے کہا تھا کہ نانی اماں! خدا کے لیے دروازہ بند کر دیجئے۔ اس جملے میں کیا خاص بات ہے؟

شاد۔ پتہ نہیں [illegible]
ہونے کے باوجود آپ کبھی کبھی بالکل ایک چھوٹی سی بچی [illegible]
[illegible]

واجدہ۔ باتیں نہ بنایئے اور کوئی کام کی بات کیجئے زرلش صاحب!

شاد۔ اوہ! یہ تو میں بھول ہی گیا کہ ایک سلسلہ [illegible] کے علاوہ آپ ایک ماں بھی ہیں جس پر ادب کے ساتھ ساتھ کچھ گھریلو ذمہ داریاں بھی ہیں۔ خیر! آخر میں صرف اتنا پوچھ کر اجازت چاہوں گا کہ اس وقت تک آپ کے خیال میں آپ کا بہترین افسانہ کون سا ہے؟

واجدہ۔ بے شک میں ایک ماں بھی ہوں اور یہ میرے لئے فخر کا باعث ہے۔ اسی لئے میرے خیال میں اس وقت تک میرا بہترین افسانہ "وقار" ہے۔ میرا ایک سال کا پیارا پیارا بیٹا۔ میری حسین ترین تخلیق آپ تو نہیں سمجھے ہیں۔ کیوں کیا آپ اسے میری حسین تخلیق نہیں کہیں گے۔ اتنا بہترین مکمل اور خوبصورت افسانہ میں نے پہلے تو کبھی نہیں لکھا تھا۔ اس افسانے کی وجہ سے میری اپنی شخصیت کی بھی تکمیل ہوئی ہے۔ کیوں ٹھیک نہیں کہہ رہی ہوں کیا؟

افسانہ

دیوانگی و فرزانگی

ایم کوٹھیاوی راہی

قاضی پور خورد گورکھپور (یوپی)

٢٩ اکتوبر ١٩٦٣ء

برادرِ محترم خوشتر صاحب! آداب

... یہ ایک عجیب و غریب کہانی ہے۔ کاش ہمارے ملک کے "ان داتا" ایک غیر معینہ مدت کے لئے کہیں چلے جاتے۔ اور پھر [illegible] رام مورت سیٹھ کے روپ میں نمودار ہوتے۔ میرے خیال میں ہندوستان میں کسی ایسے "استھان" کی اشد ضرورت ہے جس کی نشاندہی میں نے اس کہانی میں کی ہے۔ ہمارے سربرآوردہ لوگ جو بڑے بڑے پلان تیار کرنے میں یدِطولیٰ رکھتے ہیں انھیں متوجہ ہو جانا چاہئے۔ یہ ان کے لئے ایک دعوتِ فکر ہے۔ اگر ہمارے "برگزیدہ ان داتا" جنھیں دوسرے ملکوں میں اپنے ملک کی نمائندگی کرنے کا حق حاصل ہے وہ اس "دعوت" کو قبول کر لیں تو پھر سمجھ لیجئے بیڑا پار ہے۔ مسلسل محرومی و ناکامی انسان کو پستی کے غار میں دھکیل دیتی ہے لیکن مجھے دیکھ کر آپ مسکراتے ہوں گے۔ کتنا تلخ ہوتا جا رہا ہوں۔ قلم خود بخود طنز کی طرف مائل ہوتا جا رہا ہے...

آپ کا بھائی — ایم کوٹھیاوی راہی

شہر میں جگہ جگہ یہی چرچے تھے۔

"رام مورت سیٹھ رات کی گاڑی سے واپس آ رہے ہیں۔"

حویلی سجائی جا رہی ہے۔ جشن کی تیاریاں بڑے زور و شور سے ہو رہی ہیں۔ بڑے بڑے لوگ مدعو ہیں۔

"تعجب ہے۔ کیسے واپس آ رہے ہیں۔ اتنی جلدی کسی کو امید نہ تھی۔"

"بھگوان کی لیلا ہے۔"

"انقلابات ہیں زمانے کے!"

[illegible] جگمگا رہا تھا۔

سیٹھ جی کی خوبصورت بیٹی اوشا اور اس کا انگلینڈ ریٹرن منگیتر جگدیو، سیٹھانی اور سیٹھ جی کے دوست احباب، نوکر چاکر انھیں لینے اسٹیشن گئے ہوئے تھے۔ سب کے ہاتھوں میں سیٹھ جی کے گلے میں ڈالنے کے لئے پھولوں کی مالائیں تھیں۔ اوشا اور اس کا منگیتر جگدیو سب سے الگ کھڑے تھے۔ [illegible] کے انداز میں بولا۔

"[illegible] اب انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ ڈیڈی پہلا کام یہی کریں گے کہ..."

"تمھیں دلہن اور مجھے دولہا بنا دیں گے!" جگدیو نے مسکرا کر کہا۔

"پھر تو کشمیر جانے میں بڑا مزہ آئے گا!" اوشا اٹھلا کر بولی۔

"کشمیر ہی کیوں؟" جگدیو نے کہا۔ "ہنی مون منانے انگلینڈ چلیں گے!"

"تم انگلینڈ کی بات کرتے ہو۔" وہ منہ بنا کر بولی۔ "ڈیڈی کا تو خیال امریکہ بھیجنے کا ہے۔"

"خیر امریکہ ہی سہی۔"

"لیکن ذرا یہ تو کہو شادی کے بعد بدل تو نہ جاؤ گے۔"

"تمھارا کیا خیال ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ بدل جاؤ گے۔ انگلینڈ کی فضا میں صبح و شام گزارنے والے کا کیا اعتبار!"

"بہت عجیب خیالات ہیں تمھارے۔" جگدیو سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔ "فرض کر لو اگر میں نے کسی اور میں دلچسپی لی بھی تو تمھارا کیا جاتا ہے۔ تم بھی اس معاملے میں آزاد رہو گی۔ مجھے خوشی ہو گی تمھارے بوائے فرینڈ سے مل کر۔"

"سچ جگدیو؟" اوشا مسکرانے لگی۔

"بائی گاڈ اوشا!" اس نے ہاتھ ملا کر کہا۔

باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک وحشی صورت نوجوان آیا اور آتے ہی بولا۔

"آداب عرض اُوشا صاحبہ؟"

"یہ کون صاحب ہیں اُوشا؟"

"یہ...... یہ......" وہ ہنستی ہوئی بولی "میرے ہونے والے فرینڈ مسٹر رشی دگیر۔ بہترین مصور۔ ان کی بنائی ہوئی تصویریں غالب آرٹسٹوں کے آرٹ سے بھی بلند ہوتی ہیں۔ یہ اور بات ہے اندھے لوگ قدر نہیں کرتے۔"

"کیوں طنز فرما رہی ہو اُوشا صاحبہ!" دگیر تلخ ہنسی ہنستے ہوئے بولا "یہ کیوں نہیں کہتیں میرا آرٹ بدصورتی کا بہترین شاہکار ہے۔"

"اس میں کیا شک ہے" جگدیو نے چوٹ کی "اپنا نام آپ نے بور کیوں نہیں رکھا؟"

"آپ کے لئے چھوڑ رکھا تھا۔ کہئے کیا خیال ہے؟" دگیر نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

- جہاں اُمید نہیں ہوتی، وہاں کوشش بھی نہیں ہوتی۔ (جانسن)
- بعض لوگ ادنیٰ مشکلات کو بھی صبر و سکون سے برداشت نہیں کرتے اگر ہم چاہیں تو یہی مشکلات زندگی کا بہت بڑا حصہ بن جائیں۔ (برٹرنڈ رسل)
- کسی کے ساتھ فراخ دلی سے کام لیا جائے تو نہ صرف اُسے خوشی ہوتی ہے بلکہ اپنے آپ کو بھی خوشی کا احساس ہوتا ہے۔ (برٹرنڈ رسل)
- یہ غلط ہے کہ وقت گزر جاتا ہے وقت ٹھہرا رہتا ہے ہم گزر جاتے ہیں۔ (آسٹن ڈابسن)
- جس نے آپ کا وقت لیا ہے وہ خود کو آپ کا مقروض سمجھنے کو تیار نہ ہوگا لیکن یہ ایسا قرض ہے جو کبھی ادا نہیں ہو سکتا۔ (سینیکا)
- وقت سونے کی طرح گراں ہے۔ (عربی ادب)

جگدیو جھینپ گیا۔

اُوشا ہنستی ہوئی بولی۔

"کہئے دگیر صاحب! آجکل کہاں رہے؟"

"آپ کے ڈیڈی کی تیمارداری کرتا رہا۔"

"یہ کیا مذاق فرما رہے ہیں آپ؟"

"جی نہیں۔ سچ کہہ رہا ہوں۔ ایک ہفتہ ہوا اُن کا ساتھ چھوڑے۔ وعدہ کر آیا تھا۔ اسٹیشن پر استقبال کرنے والوں میں مجھے بھی پائیں گے۔"

"آپ وہاں سے چھوٹے کیسے؟" جگدیو نے پھر چوٹ کی "آپ کا مرض تو لاعلاج تھا!"

"آپ درست فرماتے ہیں۔ دراصل میرا کوٹا پورا ہو چکا تھا۔ میری کیبن کے دائمی حقوق کسی انگلینڈ ریٹرن نے اپنے لئے وقف کرا لئے ہیں۔ غالباً وہ آپ ہی ہیں۔"

اُوشا قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔ جگدیو جھینپ گیا۔

"کیا بور ہو گئے جگدیو؟" اُوشا نے پوچھا۔

"ہاں۔ بور ہی سمجھو" جگدیو سگریٹ کا دھواں اُڑا کر بولا۔

"میرے لئے کوئی حکم اُوشا صاحبہ؟" دگیر بولا "کیوں نہ ہم کچھ وقت ساتھ مل کر پاس کریں۔ ٹرین پورے دو گھنٹے لیٹ ہے۔ نو بجے آئے گی۔ ابھی آٹھ بجے ہیں۔"

"چلو جگدیو چائے پئیں۔"

"میں چائے نہیں پیتا۔"

"اور کافی؟" دگیر نے ہاتھ ہلا کر پوچھا۔

"دیکھئے مسٹر! آپ حد سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ آپ اُوشا کے فرینڈ نہ ہوتے تو میں......"

"خودکشی کر لیتا!" جملہ دگیر نے پورا کر دیا۔

"یو...... یو...... ایڈیٹ!" جگدیو بگڑ گیا۔

"دگیر صاحب! آپ کا دماغ تو صحیح ہے؟" اُوشا بولی۔

"جی ہاں۔ سو فیصدی صحیح۔ اپنے ڈیڈی سے دریافت کر لیجئے گا۔ وہ آپ کو سب کچھ بتا دیں گے۔ میں اُن کے کافی قریب رہا ہوں۔"

اور پھر دگیر نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ اُس کے بکھرے ہوئے بال اور بکھر گئے۔ وہ اُوشا کے حُسن سے بے نیاز ہو کر بُک اسٹال کی طرف بڑھ گیا۔

ٹرین آتے ہی سب لوگ فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ کی طرف لپکے۔ انہی لوگوں میں دگیر بھی تھا۔ سیٹھ جی گیٹ پر کھڑے مسکرا رہے تھے۔ اُن کے ساتھ فرم کا منیجر گردھاری لال بھی تھا۔ اور چپراسی رامو بغل میں لگے سرونٹ کلاس سے اُتر رہا تھا۔

سب کے ہاتھ کی مالائیں سیٹھ جی کے گلے میں پڑنے لگیں۔ جگدیو کی مالا، اُوشا کی مالا، سیٹھانی کی مالا۔ لیکن دگیر کے پاس مالا نہ تھی۔ سیٹھ جی بڑھ کر اُس سے بغل گیر ہو گئے۔ لوگ حیرت سے تکنے لگے۔ لوگوں کو شک ہوا کہیں یہ غلطی سے تو نہیں چھوڑ دئے گئے کہیں ان کا دماغ ابھی تک نہ خراب ہو۔ سیٹھانی کو تو بالکل یقین نہ تھا۔ منیجر کو کنارے لے جا کر پوچھنے لگیں۔

"ٹھیک ہو گیا دماغ؟"

"جی ہاں، جی ہاں۔ بالکل ٹھیک۔ ایکدم ٹھیک!" منیجر نے زور دے کر کہا۔

سیٹھ جی نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور حاضرین سے مخاطب ہو گئے۔

"اب میں پاگل نہیں ہوں۔ اب میرا دماغ ٹھیک ہو گیا ہے۔ بالکل ٹھیک۔ آپ لوگ اپنے اپنے گھر جائیے۔ میں اپنے گھر خود جا سکتا ہوں۔ آؤ اُوشا کی ماں۔ آؤ اُوشا۔ آؤ گردھاری۔ اور تم ـــــ تم بھی تو آخر گھر ہی کے ہو دگیر! تم بھی چلو میرے ساتھ۔ اور باقی لوگوں کا۔ باقی

ہم نوالہ کا شکریہ ....

تک سیٹھ جی کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ اُوشا کا انگیجمنٹ رِنگ منگیتر جلد لوٹ بھی دکھیارہ گیا۔
لیکن سیٹھ جی نے گھر کا سہارا لے کے بھی پیٹ فارم ہی پر چھوڑ دیا۔

ملازموں کو بھاگتا دیکھ کر سیٹھ جی نے سیٹھانی سے پوچھا۔

"یہ کیا؟ یہ روشنیاں، یہ سجاوٹیں، یہ دھوم دھام کیسی؟ کیا اُوشا کی سگائی آج ہی کر رہی ہو؟"

"یہ سب آپ کے آنے کی خوشی میں ہے۔"

"پگلی کہیں کی۔ تیرتھ یاترا کر کے آ رہا تھا جو تم نے اتنا اہتمام کر ڈالا! کیا بھول گئی تھیں کہ میں پاگل خانے سے پلٹ رہا ہوں۔" کار سے نکلتے ہوئے سیٹھ جی بولے۔

سیٹھانی کو یقین اب بھی نہیں آ رہا تھا کہ سیٹھ جی کا دماغ ٹھیک ہو گیا ہے۔ وہ انہیں حیرت سے تکے جا رہی تھیں۔ اُوشا بھی گم سم تھی۔ لیکن دگمبر ہنس رہا تھا کیونکہ پاگل خانے میں وہ بھی اُن کے ساتھ ہی تھا۔ ان کے ایک ماہ بعد وہ بھی لے جایا گیا تھا۔ اور ایک ہفتہ پہلے ہی چھوڑ دیا گیا تھا۔

دوسرے دن سیٹھ جی اپنے کمرے میں دگمبر کے ساتھ بیٹھے تھے۔ جو بھی آتا منیجر سے کہلوا دیتے ملنے کا موقع نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اپنے ہم مشربوں سے بھی نہیں ملے۔ سیٹھانی نے آکر وجہ پوچھی تو مسکراتے ہوئے بولے "میرا دماغ درست ہو گیا ہے۔ ماڈرن سوسائٹی کے لائق نہیں رہا۔"

شام کو جگدیو آیا اور اُوشا کو لے کر "ایوننگ واک" کیلئے چلا تو سیٹھ جی اٹھ کر باہر آئے اور دونوں کو قریب بلایا۔

"تم اُوشا کے کون ہو؟"

"فرینڈ۔"

"تڑاق، تڑاق!"

"ای، ای.... یہ کیا....؟" وہ چانٹے کھاتے ہی بوکھلا گیا۔ اُوشا کو چکر سا آگیا۔

سیٹھ جی نے ہنس کر پوچھا۔

"بیٹی! یہ تمہارا کون ہے؟"

اُوشا چالاک تھی۔ بولی۔

"کوئی نہیں۔"

"شاباش!" اُوشا کو انھوں نے سینے سے لگا لیا۔

جگدیو ٹوٹ پٹکتا ہوا باہر نکل گیا۔

دوسرے دن اُوشا بن سنور کر کالج کے لئے کار کی طرف بڑھی سیٹھ جی برآمدہ میں بیٹھے دگمبر کے ساتھ چائے پی رہے تھے۔ آواز دی۔

"بیٹی اُوشا!"

"جی ڈیڈی!"

"ڈیڈی نہیں پتاجی کہو!"

"جی پتا....؟!"

"ہاں بیٹی، ادھر تو آؤ۔"

"جی۔"

"کہاں چلیں؟"

"کالج!"

- حوادثِ روزگار کا مقابلہ جم کر کرو۔ (ابن یمین)
- انسان جتنا زیادہ ایثار سے شرمسار ہوتا ہے اُتنا ہی زیادہ عزت کے قابل بن جاتا ہے۔ (برناڈ شا)
- زندگی میں کامیابی کا واحد گر یہ ہے کہ آدمی موقع سے فائدہ اُٹھانے کے لئے ہر وقت تیار رہے۔ (ایک مغربی دانشور)
- تمہاری شادمانی دراصل تمہارا غم ہے جسے بے نقاب کر دیا گیا ہے۔ (خلیل جبران)
- صاف اور اچھے ہی چشموں کے پیچھے نہ لگے رہو جہاں سے بھی اپنا ڈول بھر سکتے ہو بھر لو۔ (ایک مشرقی دانشور)
- ذلت ہی زندگی ہے۔ (عربی ادب)

"شرم نہیں آتی بیٹی؟"

"جی.... جی ڈیڈی؟"

"ڈیڈی نہیں پتاجی کہو!"

"جی پتا...."

"بیٹی! یہ کھلی کھلی بانہیں.... بازو.... بال.... اور یہ.... چھی چھی.... شرم نہیں آتی بیٹی....؟!"

"جی ڈیڈی!"

"ڈیڈی نہیں پتاجی کہو!"

"جی پتا...."

"جاؤ جاؤ، کپڑے پہنو۔ کپڑے بیٹی!"

[illegible] میں [illegible] ہیں۔

"واہ صاحب! آپ کو پاگل خانے والوں نے آزاد کیسے کر دیا؟"

"وہ تو آپ جیسے لوگوں کو پاگل [illegible]؟"

"کیسی آنکھیں [illegible] جاتے ہیں۔"

"[illegible] ہیں [illegible]"

"مگر وہ فرم کے سامنے نوکروں کو نکال دیا ہے، نئے نوکر رکھ لئے ہیں جو ان کو پاگل ہیں، ہاں ملتے ہیں۔ جو دن کو دن کہتے ہیں، رات کو رات کہتے ہیں۔ اچھا خاصا سنگیت تھا ان کی بیٹی کا۔ اُسے بھگا دیا ہے۔ دستگیر نام کے ایک دیوانے سے بیاہ دیا ہے بیٹی کو۔ ان کی پوری حویلی ایک خاموش پاگل خانہ بن گئی ہے۔ مگر اُن کے اِس پاگل پن کا اثر اُن کی فرم پر نہیں پڑا ہے۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ ترقی پر ہے....!"

"انقلابات ہیں مقدر کے!!"

غزلیں

سعادت نظیر ایم۔ اے

ستم ظریفیٔ آدابِ شوق کیا کہئے
گنہ نظر کا تھا، الزام دل کے سر دیکھا

وہ بے نیازِ دو عالم سے ہو گیا جس نے
تمہارے جلوۂ رنگیں کو اک نظر دیکھا

مجالِ دید کہاں، زعمِ آگہی کیسا!
نقاب اُٹھی تو زمانے کو بے خبر دیکھا

بجھے بجھے سے نظر آئے آرزو کے چراغ
نظیرؔ! آتشِ غم کو جو تیز تر دیکھا

حفیظ مالیگانوی

گھر سے نکلے سامنا ان کا ہوا
پھر نہ جانے حال کیا اپنا ہوا

آپ کے وحشی کو آخر کیا ہوا
دامنِ صحرا سے ہے لپٹا ہوا

ہے وہی محفل، وہی سامانِ عیش
وقت کیا پھر آ گیا گزرا ہوا

بجھنے ہی والی تھی شمعِ زندگی
آ گئے محفل میں تم اچھا ہوا

افضل منہاس

خدا جانے یہ کیسی بیکلی ہے
سحر کی بات لب پر آ گئی ہے

ابھی کچھ دیر آنسو روک لیجے
ابھی دنیا کا منظر دیدنی ہے

غموں کا کارواں اُترا ہے شاید
کوئی آواز دل میں گونجتی ہے

مری خاموش نظریں کہہ رہی ہیں
کہ دل کی داستاں ناگفتنی ہے

طنزیہ

افواہیں

جہاں گرد کے قلم سے

جہاں گرد چاروں کھونٹ گھومتا ہے۔ افواہیں جمع کرتا ہے۔ اُسے افواہیں جمع کرنے کا جنون ہے۔ یہ جنون اس لئے ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ جنون کے پیچھے پرستش ہوتا ہے۔ افواہوں کے پیچھے تلخ حقیقتیں ہوتی ہیں۔

بھوکا ہے بنگال....

افواہ ہے کہ بنگال میں عوام کی طرف سے ایک دستخطی مہم چلائی جا رہی ہے۔ جس کے تحت ایک کروڑ بنگالیوں کے دستخط اکٹھے کئے جائیں گے۔ اور پھر یہ ایک کروڑ دستخط ہند سرکار کی خدمت میں پیش کرکے یہ مطالبہ کیا جائے گا کہ جس طرح انگریزوں کے عہد حکومت میں ۱۹۴۳ء میں ایک زبردست قحط پیدا کیا گیا تھا، اُسی طرح کا ایک قحط کانگرس کے عہد حکومت میں بھی پیدا کیا جائے۔ کیونکہ بنگال میں قحط پڑے ایک عرصہ گذر گیا ہے اور ہم بنگالی لوگ قحط کے نہ صرف عادی ہیں بلکہ شوقین بھی ہیں۔

جب جہاں گرد نے ایک بنگالی سے پوچھا کہ یہ مطالبہ تو بڑا مضحکہ خیز ہے تو وہ بہت متانت سے بولا "نہیں! مطالبہ بے حد سنجیدہ ہے، کیونکہ ہم بنگالی لوگ یہ اندازہ لگانا چاہتے ہیں کہ ہمارے اندر قحط سے مرنے کی وہ پرانی شکتی باقی ہے یا کم ہو گئی ہے اور اس کے علاوہ ہم یہ بھی دیکھنا چاہتے ہیں کہ انگریزی راج اور قومی راج کے قحط میں کوالٹی کے اعتبار سے کتنا فرق ہے۔"

سُنا ہے اِس دستخطی مہم میں بنگالی عوام کو بنگال کے ذخیرہ بازوں اور بلیک مارکیٹروں کی زبردست حمایت حاصل ہے اور دستخطوں کے انبار میں اُن کے دستخط بھی شامل کئے جا رہے ہیں۔

وزارتوں کی خانہ جنگی

یہ افواہ ناقابلِ یقین حد تک پھیلی ہوئی ہے کہ ہندوستان کی وزارتِ زراعت اور وزارت صنعت مل کر وزارتِ صحت پر سپریم کورٹ میں مقدمہ دائر کرنے والی ہیں۔

مقدمہ کی وجوہ یہ بیان کی جاتی ہیں کہ وزارت ہائے زراعت و صنعت کے ماہرین کا خیال ہے کہ موجودہ خوفناک گرانی کی سب سے بڑی مجرم وزارتِ صحت ہے —— کیونکہ وزارتِ صحت نے میڈیکل سائنس کو غیر معمولی ترقی دے کر شرحِ اموات میں غیر معمولی کمی کر دی ہے جس سے آبادی میں بے حد اضافہ ہو گیا ہے۔ ورنہ اِس سے پہلے پچاس فیصدی بچے موت کا شکار ہو جاتے تھے۔ جس سے اشیائے ضروریہ کا قحط نہیں پڑتا تھا اور نہ وہ مہنگی ہوتی تھیں۔

وزارتِ صحت پر دُوسرا الزام یہ لگایا گیا ہے کہ وہ فیملی پلاننگ میں بُری طرح ناکام رہی ہے حالانکہ وزارتِ زراعت اور صنعت نے پیداوار کے جو نشانے بنائے تھے۔ وہ فیملی پلاننگ کو مدِ نظر رکھ کر بنائے تھے۔ لیکن چونکہ بچوں کی شرح پیدائش بدستور قائم رہی بلکہ بڑھتی چلی گئی۔ اس لئے ملک میں سخت اقتصادی بحران آ گیا ہے۔ سُنا گیا ہے کہ وزارتِ صحت بھی اپنا جواب دعویٰ داخل کرنے پر غور کر رہی ہے۔ جس میں وہ آبادی کے اضافہ کی ساری ذمہ داری وزارتِ خارجہ پر ڈالے گی اور ثابت کرے گی کہ آبادی کو کم کرنے کا قدرتی اور آزمودہ طریقہ یہ تھا کہ جنگ چھیڑ دی جائے۔ تاکہ لاکھوں لوگ جنگ میں کام آ جائیں۔ لیکن وزارتِ خارجہ نے جنگ کی بجائے امن کی پالیسی اختیار کر کے ایک تاریخی جرم کیا ہے۔ لہٰذا سزا کی مستحق وزارتِ خارجہ ہے، وزارتِ صحت نہیں۔

رُوکھی سُوکھی کھا کے

راجدھانی میں یہ افواہ گشت کر رہی ہے کہ گذشتہ دنوں ہند سرکار نے رائے عامہ معلوم کرنے کے لئے ایک خفیہ سرکلر جاری کیا تھا جس کا مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ عوام میں مہنگائی کا حملہ برداشت کرنے کی کتنی طاقت ہے۔ یعنی وہ کس حد تک قعرِ مذلت میں گر سکتے ہیں۔ سنا ہے، ہند سرکار کے پاس رائے عامہ موصول ہو چکی ہے اور عوام نے سرکار سے وعدہ کیا ہے کہ وہ رُسوائی کی اِس حد تک بھی زندہ رہ سکتے ہیں۔ کہ رُوکھی سُوکھی کھائیں اور

ادبی لطائف

دوستوں کی محفل سے

اختر بستوی بی۔ اے

روشن محل، گاندھی نگر، بستی (یوپی)

مورخہ ۲۳/۳/۱۹۶۳ء

محترم [illegible] آداب و تسلیمات

"دوستوں کی محفل سے" کے عنوان سے جو لطائف آپ شائع کرتے ہیں وہ [illegible] کے قارئین کو بہت پسند آتے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ مجھے ہر روز کئی ایک ایسے خطوط موصول ہوتے ہیں جن میں ان لطائف کی تعریف ہوتی ہے ——— لیجئے اس بار پھر چند لطائف حاضر خدمت ہیں۔ انہیں [illegible] کے چند قارئین تک پہنچا دیجئے۔ فقط ——— اختر بستوی

بُری عادت

بمبئی کے ایک فلمی ہفت روزہ کے ایڈیٹر صاحب کسی کام سے لکھنؤ آئے تو انہوں نے سوچا کہ انہوں اپنے پرچے کے لئے مجاز لکھنوی سے ایک انٹرویو بھی لیتے چلیں۔ مجاز کے روزانہ کے معمولات کا پتہ لگا کر وہ شام کے وقت اُس ہوٹل میں پہنچ گئے جہاں مجاز اکثر بیٹھا کرتے تھے۔ انہوں نے مجاز سے اُن کی پیدائش، عمر، تعلیم اور شاعری وغیرہ کے متعلق کئی سوالات کرنے کے بعد دبی زبان سے پوچھا: "میں نے سُنا ہے کہ آپ شراب بہت زیادہ پیتے ہیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟"

یہ سُن کر مجاز صاحب یکایک بھڑک اُٹھے اور تیز لہجے میں بولے: "کس نامعقول نے آپ سے کہا کہ میں شراب پیتا ہوں؟"

ایڈیٹر صاحب نے بوکھلا کر کہا: "تو کیا آپ شراب نہیں پیتے؟"

مجاز صاحب نے جواب دیا: "توبہ کیجئے حضرت۔ مجھے شراب سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔"

ایڈیٹر صاحب پر جیسے حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ چند لمحوں تک تو وہ بالکل ہی سناٹے میں رہے پھر ہکلا کر بولے: "تو پھر آپ سگریٹ کثرت سے پیتے ہوں گے؟"

مجاز نے کہا: "جی نہیں، میں سگریٹ بھی نہیں پیتا۔ شراب نوشی اور سگریٹ نوشی دونوں ہی ہیں بُری عادتیں ہیں اور میں ایسی کسی بھی بُری عادت کا شکار نہیں ہوں۔"

ایڈیٹر صاحب نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں پوچھا: "کیا واقعی آپ ایسی تمام بُری عادتوں سے مبرا ہیں؟"

مجاز نے بہت ہی سنجیدگی سے جواب دیا: "بس مجھ میں ایک ہی بُری عادت ہے اور وہ یہ کہ میں جھوٹ بہت بولتا ہوں۔" یہ سُن کر ارد گرد بیٹھے ہوئے لوگوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور ایڈیٹر صاحب جھینپ گئے۔

اپنے مُنہ میاں مٹھو

ایک محفل میں سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی اور شوکت تھانوی یکجا تھے۔ منٹو اپنے افسانے "نیا قانون" کے محاسن پر روشنی ڈال رہے تھے۔ کافی دیر تک وہ اس کی خوبیاں بیان کرتے رہے۔ اس دوران میں احمد ندیم قاسمی تو کبھی کبھی "ہوں" "ہاں" کرتے رہے لیکن شوکت تھانوی شروع سے آخر تک خاموش رہے۔ منٹو نے جب اپنی بات ختم کی تو قاسمی نے شوکت تھانوی سے پوچھا: "کیوں بھئی شوکت صاحب آپ کس غور و فکر میں ڈوبے ہوئے ہیں؟"

شوکت تھانوی نے جواب دیا: "اب تک ایک محاورہ سُنتا آیا تھا: اپنے مُنہ میاں مٹھو بننا۔ اب سوچ رہا ہوں اس محاورے کو بدل کر یوں کر دینا چاہئے "اپنے مُنہ میاں منٹو بننا"۔"

فالتو اور پالتو

ایک پُر لطف شام کو احمد جمال پاشا کے ڈرائنگ روم میں کچھ بے تکلف دوست جمع تھے۔ محفل میں علمی اور ادبی مباحثوں کے ساتھ ساتھ ہنسی مذاق کی باتیں بھی چل رہی تھیں۔ اتفاق سے وہاں ایک ایسے صاحب بھی پھنس گئے تھے جن کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ اُن کی نظر

ہوں کو تو ہم پیچاننے سے رہے ۔ مشاعرے میں پانچ سے دس ہزار تک کی تعداد ہوتی ہے کہ دوستوں کے ذوق
دوست کے گھر میں گئے ہوئے رات کے تو بجائے اس پیارے نے اُٹھنے کا نام ہی نہ لیا تو
آخر اُٹھ کر بولے "مجھے تو اب آپ لوگ اجازت دیجئے " ایک صاحب نے مُسکرا کر پوچھا "کیوں
بھائی کیا خوب فرمائے ہیں ۔ ابھی سے گھر جانے کا بھوت آپ کے سر پر کیوں سوار ہو گیا ؟"
انھوں نے جھلا کر جواب دیا : "میں کوئی آپ لوگوں کی طرح فالتو ہوں کہ ساری
رات گزار دوں ؟"
احمد جمال پاشا نے ہنس کر کہا : "جی نہیں جناب ! خدا نہ کرے کہ آپ فالتو ہوں ۔ آپ تو
ضروری ہیں ۔"

شعلۂ طور

جگر مراد آبادی کا مجموعۂ کلام "آتش گل" جس زمانے میں شائع ہوا اُن کی صحت
کافی خراب ہو چکی تھی اور انھوں نے مشاعروں میں شرکت کرنا چھوڑ دیا تھا لیکن گونڈہ کے ایک
مشاعرے میں لوگ اصرار کر کے انھیں لے ہی گئے اور مسندِ صدارت پر بٹھا دیا ۔ اُس مشاعرے میں
ایک ایسے مقامی شاعر بھی موجود تھے جو جگر صاحب کے مخالف تھے اور خود کو اُن سے بڑا شاعر
سمجھتے تھے ۔ ڈائس پر بیٹھے ہوئے لوگوں میں "آتش گل" کے چرچے ہو رہے تھے اور لوگ اس مجموعے
کی غزلوں کا موازنہ جگر صاحب کے پہلے مجموعۂ کلام "شعلۂ طور" کی غزلوں سے کر رہے تھے ۔ اُن
شاعر صاحب کو یہ باتیں بہت بُری معلوم ہو رہی تھیں اور وہ جلے بھُنے بیٹھے ہوئے تھے کچھ دیر
بعد جب اُن کے پڑھنے کا نمبر آیا اور وہ مائکروفون پر پہنچے تو اتفاق سے اُن کے سامنے لٹکتا ہوا
گیس بھبھک گیا اور اُس میں سے سُرخ رنگ کی لپٹیں نکلنے لگیں ۔ انھوں نے گیس کی طرف اشارہ
کرتے ہوئے کہا : "ارے بھئی ! ذرا کوئی اِس "آتش گل" کو میرے سامنے سے ہٹاؤ ۔ میری بوڑھی آنکھوں
کے لئے اِس کی روشنی ناکافی ہے ۔"
جگر صاحب اِس جملے میں چھپے ہوئے طنز کو سمجھ گئے لیکن اُس وقت خاموش رہے تھوڑی
دیر بعد مشاعرے کے سکریٹری صاحب ایک نیا گیس جلوا کر لے آئے اور اُن کے سامنے رکھ دیا ۔ جگر
صاحب نے اُسے دیکھ کر فرمایا : "لیجئے جناب اب لوگوں نے آپ کے سامنے "شعلۂ طور" لا کر رکھ دیا ۔
اِس سے آپ کی نگاہیں ضرور خیرہ ہو جائیں گی !"

رسالہ نہ ملنے کی شکایت

دو مرتبہ پتے چیک کرنے کے
بعد "بیسویں صدی" ہر ماہ بھیجا جاتا ہے

ہر ماہ رسالہ بہت احتیاط سے سپرد ڈاک کیا جاتا ہے ۔ اِس کے باوجود شکایتی خطوط موصول ہونے پر رسالہ
دوبارہ بھیج دیا جاتا ہے ۔ ۲۰ تاریخ کے بعد شکایتی خطوط موصول ہونے پر
دوبارہ پرچہ بھیجنے سے ہم معذور رہتے ہیں ۔ رسالہ نہ ملنے کی شکایت محکمۂ ڈاک
سے بھی کیجئے ۔ (منیجر رسالہ بیسویں صدی ۔ دریا گنج ۔ دہلی نمبر ۶)

تبصرہ

قرینے ———— مصنف : ابرار حسنی گنوری ———— قیمت تین روپے ۲۵ نئے پیسے

یہ ملک کے مستند صاحبِ نظر اُستاد علامہ ابرار حسنی کی پانچویں ادبی تصنیف ہے جو
قدیم اور جدید شاعری کا سنگم ہے جس میں ۲۲۵ غزلیں چند قطعات متروکات کی مکمل فہرست حضرت
نوح کا مقدمہ اور مصنف کی تصویر ہے ۔ ہر شعر شاعر کے دل کی دھڑکنوں کے جلترنگ سے چھیڑا ہوا
وارداتِ عشق نغمہ ہے ۔

ملنے کا پتہ : ابرار حسنی ۔ گنور ۔ ضلع بدایوں ۔ یو ۔ پی

کیلاش چندر ناز ایم ۔ اے

۲ ــــ صحت کی قدر کرو

ایک مغربی مفکر کا مقولہ ہے "سب سے زیادہ ہمدردی کا مستحق وہ شخص ہے جو اپنی صحت کی پرواہ نہیں کرتا اور معمولات میں کسی خاص ترتیب یا نظام سے کام نہیں لیتا۔"

ترتیب یا نظام سے غالباً یہ مراد ہے کہ آدمی کھانے کے وقت کھائے، سونے کے وقت سوئے، جاگنے کے وقت جاگے اور کام کرنے کے وقت پر کام کرے۔ ہر کام کے لئے ایک وقت مقرر ہو۔ صحت ٹھیک ہو تو آدمی اپنے وقت کو زیادہ قیمتی اور وصول کر لیتا ہے۔ بلکہ ورزش کے لئے وقت نکال سکتا ہے ــــ ایک اور مغربی مفکر کا کہنا ہے "معمولات میں ترتیب و توازن کا برقرار رکھنا سب سے بڑی ورزش ہے۔"

تندرستی قدرت کا بیش بہا عطیہ ہے۔ اس کی حفاظت ہر انسان کا فرض ہے۔ صحت کی طرف سے بے پرواہی زندگی سے دشمنی کے مترادف ہے۔ تو پھر ذرا سی بھی کمزوری محسوس ہو تو فوراً کسی طبیب یا ڈاکٹر سے مشورہ لینا چاہئے۔ مناسب ورزش بھی جسمانی استرخاء کو دور کرتی ہے۔ جسم کو چست اور دل و دماغ کو فرحت بخشتی ہے۔ صحت کے لئے بے حد ضروری ہے۔ جو اپنی صحت کی طرف سے غافل نہیں، ورزش ضرور کرتے ہیں۔

۳ ــــ ہنسی ــــ صحت کی علامت

ایک ماہر نفسیات کا قول ہے کہ "صحت مند آدمی کی پہچان اس کا مسکراتا ہوا چہرہ اور شگفتہ، شائستہ اور پُر مذاق گفتگو ہوتی ہے۔ مسکراتے ہوئے دوسروں کا خیر مقدم کرنا، خندہ لبی سے گفتگو کا آغاز کرنا اور شائستہ مذاق کر کے دوسروں کو ہنسانا صحت مندی اور تندرستی کی دلیل ہے۔ ایک صحت مند آدمی کے ہونٹوں ہی پر مسکراہٹ نمودار نہیں ہوتی بلکہ خندۂ زیر لب کی چھاپ اس کے دماغ پر بھی ہوتی ہے۔ شائستہ اور پُر مذاق گفتگو سے قلبی و ذہنی تبسم کا پتہ چلتا ہے۔"

۴ ــــ غصہ ــــ ایک بیماری

صحت کے لئے غصہ نہایت مُضر ہے۔ غصہ میں آدمی کی تمام تر صلاحیتیں کھو بیٹھتی ہیں۔ دماغ معطل اور حواس مسلوب ہو جاتے ہیں۔ غصے کا آنا جسمانی [illegible] کی دلیل ہے ــــ اگر غصہ بار بار آئے اور [illegible] کرنا چاہئے کیونکہ [illegible] کا سبب [illegible] اور [illegible] کبھی کبھی جگر کے عدم توازن [illegible] غصہ آنے لگتا ہے۔ اگر غصہ ہو تو تحمل سے کام لیجئے۔ کسی کام میں عجلت نہ کیجئے۔ اچھی باتیں سوچئے اور برداشت کرنے کی عادت ڈالئے ــــ ایک مقولہ ہے "اگر گفتگو کے دوران میں آپ کو غصہ آ جائے تو دماغ کو کسی [illegible] سطور جوڑیے یا گنتی گننا شروع کر دیجیے۔"

۵ ــــ کثرتِ مطالعہ ــــ مضرِ صحت ہے

پروفیسر نکلسن کے معالج ڈاکٹر ہوبرٹ نے اُن کے ذوقِ کتب بینی کو اُن کے کئی امراض کا سبب بتایا تھا۔ ڈاکٹر موصوف نے کہا تھا۔ زیادہ دیر تک بیٹھے ہوئے کتب بینی کرتے رہنا نہ صرف بینائی ہی کے لئے نہیں معدہ کے لئے بھی سخت مُضر ہے۔ ایک مغربی مصنف کا خیال ہے کہ زیادہ پڑھنے والے دماغی مریض ہوتے ہیں۔ ایک صحت مند آدمی کو زیادہ سے زیادہ چار گھنٹے تک مطالعہ کرنا چاہئے۔ صبح کے وقت تازہ ہوا اور شاداب فضا میں صحت مند کتب کا مطالعہ دل و دماغ کو فرحت بخشتا ہے۔ رومانی یا جاسوسی ناولوں کا مطالعہ صحت کے لئے مُضر ہے۔

۶ ــــ ایک مقولہ

"کھانا غذا دیتا ہے جسم کو، جسم قوت بخشتا ہے دماغ کو، دماغ صحت مند بناتا ہے روح کو اور روح زندگی بخشتی ہے تمام اعضاء کو۔"

۷ ــــ ماضی، حال، مستقبل

برنارڈ شا کا قول ہے جو لوگ اپنے ماضی اور مستقبل کے خیال میں غلطاں و پیچاں رہتے ہیں، وہی اپنے "حال" سے بے پرواہ و غافل ہوتے ہیں۔ اور جو لوگ "حال" سے بے پرواہ و غافل ہوتے ہیں، وہی مستقبل میں کچھ نہیں بن پاتے۔ مستقبل کو شاندار بنانے کے لئے "حال" کی طرف سے غافل نہ رہنا چاہئے۔ مستقبل کی بہتری کا انحصار "حال" کی طرف سے باخبر رہنے پر ہے۔ ماضی پر حال کو ترجیح دو کیونکہ حال ہی مستقبل کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ عشرتِ ماضی کی یاد کاہل بناتی ہے۔ "حال" کی سوچیں فکر و عمل کے دریچے کھولتی ہیں ــــ اور فکر و عمل سے مستقبل کی تعمیر ہوتی ہے۔

۸ ــــ غم اور خوشی

غم و خوشی، مصیبت و راحت، سکون و انتشار، نام ہیں اُن مختلف حالتوں کے جو انسانی زندگی میں اکثر و بیشتر وقوع پذیر ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن یہ حالتیں دائمی نہیں ہوتیں۔ فرض کیجئے کہ آج آپ کسی غم میں مبتلا ہیں لیکن یہ لازم نہیں کہ آپ ہمیشہ غم ہی میں مبتلا رہیں۔ اسی طرح اگر آج آپ کی زندگی مسرت و انبساط سے ہمکنار ہے تو یہ ضروری نہیں کہ ہمیشہ آپ مسرور ہی رہیں۔ ہمیشہ آپ مسرت سے ہمکنار رہیں۔ اسی لئے زندگی کے متعلق جانسن کا یہ نظریہ تھا کہ "زندگی نام ہے تغیرات اور انقلابات کا۔ غم اور خوشی کے امتزاج کا۔ دھوپ چھاؤں کا۔ جو لوگ ان مختلف حالتوں کو محض "دھوپ چھاؤں" سمجھتے ہیں، وہی زندگی کے اصل گُر سے واقف ہیں۔"

منظر مہدی دہلی

بیسویں

نومبر

Biswin Sadi

75

ع حسن خود بیتاب ہے جلوہ دکھانے کیلئے

فوٹو: محفوظ شاہد لاہور

حیرت بھی ہے تجسس بھی

ٹیلیفون دفتر ۲۷۱۶۱۲
ٹیلیفون رہائش ـــــ ۶۱۹۹۲۷

قیمت فی پرچہ
۷۵ نئے پیسے

تیر و نشتر

خوشتر گرامی

"[illegible] نہیں چاہتا" شری لال بہادر شاستری ——— اس لئے کہ
آپ کو [illegible] بس کیا ہے

"پنجاب میں گندم کی گرانی کے سابقہ تمام ریکارڈ ٹوٹ گئے" ایک خبر
——— کیا سابقہ ریکارڈ مٹی کے تھے؟

"غذائی صورت حال نے پریشانی پیدا کر دی ہے" شری گلزاری لال نندہ
——— کیا آنجناب کو بھی لائن میں لگ کر آٹا لینا پڑا ہے؟

"زندگی وبال جان بن گئی" ایک عنوان ——— تو لیڈری کا پیشہ اختیار
کیجئے تاکہ آپ قوم کے لئے وبالِ جان بن سکیں۔

"کوڑھ کی بیماری کی روک تھام" ایک خبر ——— اگر جسمانی کوڑھ ہے تو
ممکن ہے، سیاسی کوڑھ لا علاج ہے۔

"وزیروں کی جائیداد کی تحقیقات کا مطالبہ" پنجاب کونسل میں غیر سرکاری
بل ——— اس کی بجائے داس کمیشن کو مستقل کرنے کا مطالبہ ہوتا تو اچھا تھا۔

"اناج کی کمی اور مہنگائی کے لئے ہندو مہا سبھا کا نسخہ" ایک عنوان ———
آئندہ انتخابات میں ہندو مہا سبھا کو ووٹ دے کر بھاری اکثریت میں کامیاب بنا لیجئے۔

"اکثر سانپ زہریلے نہیں ہوتے" ایک خبر ——— مگر سیاسی سانپ
ایک آدھ کو چھوڑ کر سب کے سب زہریلے ہوتے ہیں۔

"چینی غائب" ایک عنوان ——— اچھا موقع ہے۔ نیفا اور لداخ کے
گھرے ہوئے علاقے واپس لے لو۔

"کانگریس سرکار کو دھکیل دو" ——— ڈاکٹر لوہیا کی تقریر
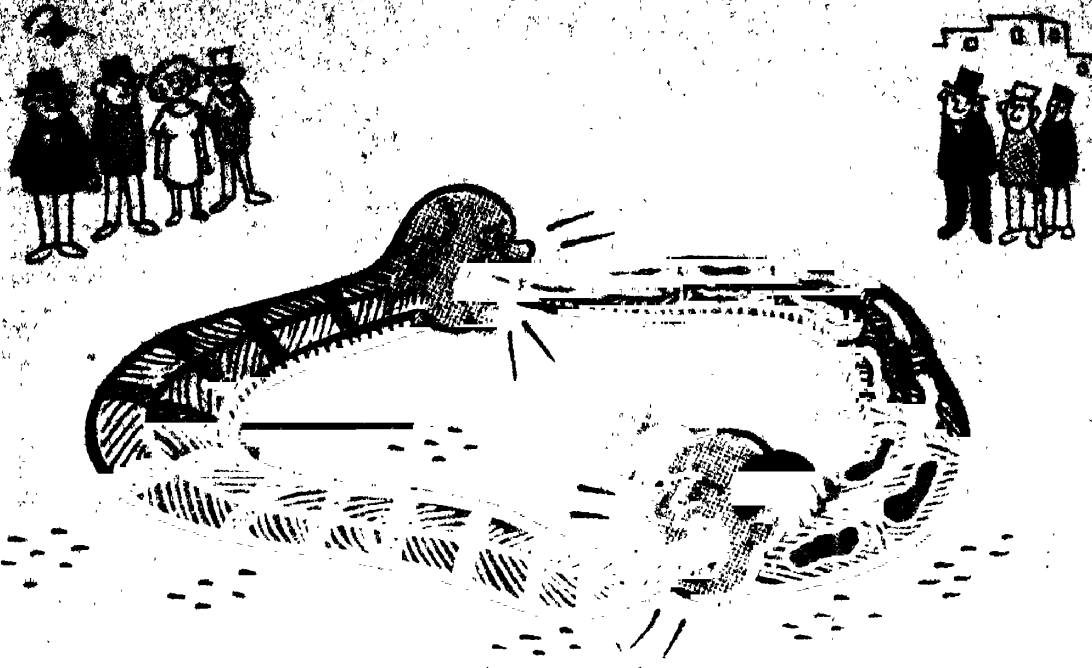
"سانپ کے پیٹ میں سانپ"۔ ایک عنوان ——— چین اور روس کا تصادم۔

"لکھنؤ میں جنسی تبدیلی کا واقعہ"۔ ایک خبر ——— وہاں وزیر ہی کو وزیر بنایا جاتا ہے۔

"دلی کے گھوسیوں کی کانفرنس کے مطالبات"۔ ایک خبر ———

۱۔ دودھ سے مکھن نکالنے کی اجازت دی جائے۔
۲۔ اور مکھن نکلے دودھ میں پانی ملانے کی اجازت دی جائے۔
۳۔ اس کے بعد بھی دودھ کو خالص سمجھا جائے۔
۴۔ کارپوریشن کے عملے کو دودھ ٹیسٹ کرنے سے منع کیا جائے۔

"وزیر خزانہ سے جھڑپیں"۔ ایک عنوان ——— خزانہ ایسی ہی بُری بلا ہے۔ اس میں جو ڈبیں کیا با تھا پانی تک ہو جاتی ہے۔

"پنجاب کے سابق ہوم منسٹر سوہن لال کی کامریڈ سرکار پہ نکتہ چینی"۔ ایک خبر ——— نئی بات نہیں، پرانی مثل ہے۔ کھسیانی بلی کھمبا نوچے۔

"کانگرس دیش کا کوئی مسئلہ حل نہ کر سکی"۔ ایک عنوان ——— اتنی ناانصافی سے کام نہ لیجئے۔ بہت سے لوگوں کو وزارتیں۔ سفارتیں اور ممبریاں دی ہیں۔ کوٹے اور پرمٹ عطا کئے ہیں۔

"کانگرس کو گدیوں سے دھکیلنے کے لئے اپوزیشن کا متحدہ محاذ بنا ؤ"۔ اچاریہ کرپلانی ——— اور اس کا افتتاح شریمتی سچیتا کرپلانی کی کانگرس سرکار کے خلاف مورچے سے کیا جائے۔

"اناج کے بیوپاری"۔ ایک عنوان ——— قومی جونکیں جو جنتا کا خون چوس رہی ہیں۔

"آج کل کے سیاسی لیڈر"۔ ایک عنوان ——— تن گورا من کالا، بگلے کا سا بھیس۔

"نیپال کے ایک وزیر کے خلاف الزامات" ایک عنوان ——— واپس کیجئے

[illegible]

"سرکار اپنی ناکامیوں کو چھپانے کے لئے بیوپاریوں کو ذمہ دار ٹھہراتی ہے" بیوپاریوں کے کنونشن میں تقریریں ——— اور بیوپاری اپنی منافع خوری کو چھپانے کے لئے سرکار کو الزام دیتے ہیں اور پس رہی ہے جنتا چکی کے ان دو پاٹوں کے بیچ۔

"ملک میں بہت کم بددیانتی ہے" شری لال بہادر شاستری ——— بے شک! مگر کانگریس میں بہت زیادہ ہے۔

"کانپور میں راشن بندی کا معقول انتظام نہیں ہے" ایک عنوان ——— راشن بند ہو گیا تو کھاؤ گے کیا۔

"جمہوریت میں عورت مرد میں فرق و امتیاز نہیں" ایک رائے ——— اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ پاکستان کے صدارتی چناؤ میں ایک عورت مرد کا مقابلہ کر رہی ہے۔

"وزیروں کے اکثر بیان ذومعنی ہوتے ہیں" ایک تبصرہ ——— اور جب تک وزارت چلتی ہے، اسی کے سہارے چلتی ہے۔

"کورپشن کو زندگی کے ہر شعبے سے ختم کرنا ہوگا" شری گلزاری لال نندہ ——— صرف جنتا کی زندگی سے، لیڈروں کی نہیں۔ یہ ان کا پیدائشی حق ہے۔

"چلتی ٹرین میں لوٹ" ایک خبر ——— کھڑی گاڑی میں کرتے تو خود لٹ جاتے۔

"دودھ کی بوتل میں ٹڈی" ایک خبر ——— پیسے دودھ کے دیئے اور ٹڈی مفت میں آئی۔

"پڑوسی پر کلہاڑی سے حملہ" ایک خبر ——— آجکل کے پڑوسی کا مثالی کردار۔
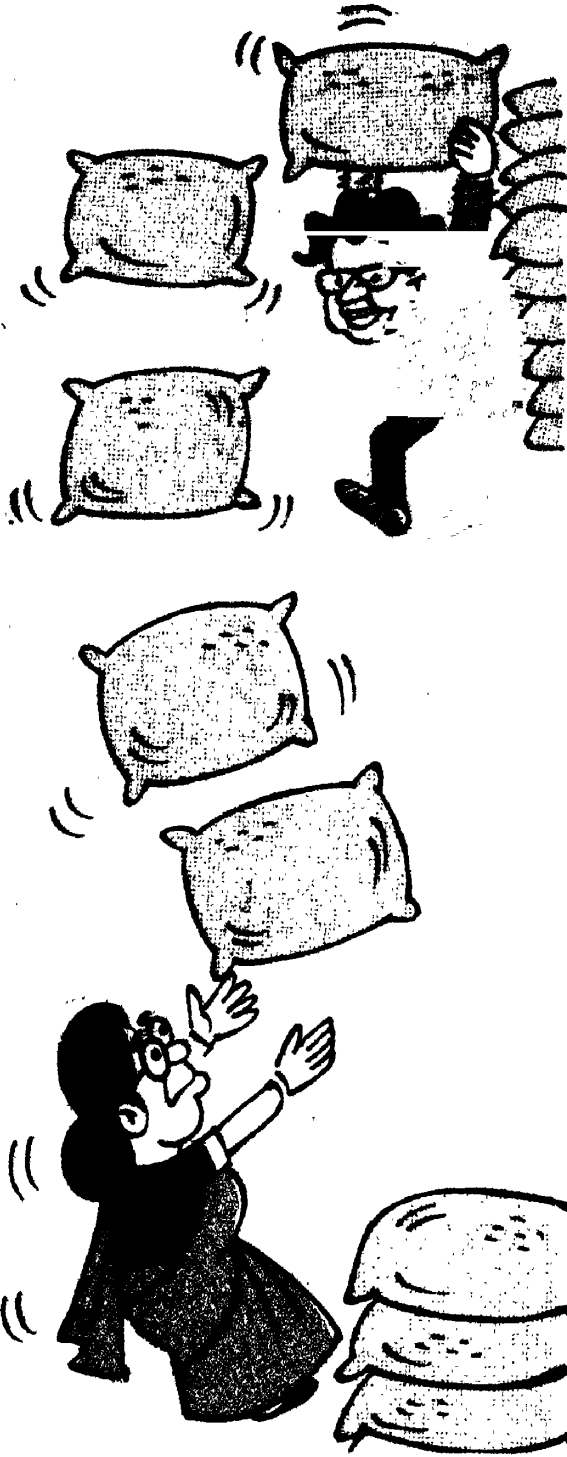
"اتر پردیش کو مرکز سے اناج کی سپلائی تیز کر دی گئی" ایک خبر

"کالا دھن ضرور برآمد کیا جائیگا" ـــــ کرشنم آچاری کا اعلان۔

"جنگ بندی لائن پر فائرنگ" ایک خبر ـــ انسانوں پر تو نہیں، شکریہ فائرنگ کرنے والوں کا۔

"راشن کارڈ ہیں مگر غلہ نہیں" ایک خبر ـــ مگر کارڈوں کے دیکھنے سے پیٹ نہیں بھرتا۔

"کامریڈ رام کشن کی ٹوپی اڑ گئی" شری کامراج کے جلوس کی جھلکیاں ـــ یہ سیاست ہے اور اس کے لئے کسی نے کہا ہے ؎

یہاں پگڑی اچھلتی ہے اسے میخانہ کہتے ہیں

"شری کامراج کو پسینے آگئے" ایک عنوان ـــ آل انڈیا کانگرس کمیٹی میں کامراج پلان پر نکتہ چینی سن کر۔

"بزم ادب کے اجلاس میں ہنگامہ" ایک خبر ـــ جی نہیں۔ یوں کہئے بزم ادب کے اجلاس میں بے ادبی۔

"مسٹر جے پرکاش نرائن پاکستان گئے" ایک خبر ـــ اور جن سنگھیوں کے پیٹ میں درد ہونے لگا۔

"گجرات میں سولہ آدمی ڈوب گئے" ایک خبر ـــ غیرت مند تھے ان سے گاندھی کے دیش کی یہ حالت نہ دیکھی گئی۔

"راجہ اور رنگا کانگرس میں نہیں جائیں گے" ایک خبر ـــ نہ جائیں، کانگرس راج میں تو رہیں گے۔

"چین نے روسی سرحدوں کی خلاف ورزی کی [illegible]" خروشچیف کی طرف ـــ اس جھگڑے [illegible]

"مرغ زردہ پکانے سے لوگوں کا مجمع کر دیا گیا": ایک تبصرہ —— اگر ذرا نمک مرچ ملا دیا جائے تو یہی مجمع نہایت لذیذ ہو سکتا ہے۔

"ڈبل روٹی بھی نایاب اور کیک بھی": ایک خبر —— تقاضے میں گلگلوں کی فہرست درست کرا دیجئے۔

"صدر ایوب نے بیماری میں تحفے سے انکار کر دیا": ایک خبر —— چاپلوسوں کو بڑی مایوسی ہوئی ہو گی۔

"بسولی میں تار چور گرفتار": ایک خبر —— اسی لئے اکثر دیکھا گیا ہے کہ خط پہنچ جاتا ہے، تار نہیں پہنچتا۔

"پندرہ پوتے پوتیوں کی دادی اماں نے جڑواں بچوں کو جنم دیا": ایک خبر —— فیملی پلاننگ کا شاندار ریکارڈ۔

"اناج کی صورتِ حال": ایک عنوان —— آپ کل دعا سے مل جاتا ہے، لائن میں لگ کر دھکے کھا کر۔

"جمہوریت کے لئے مر مٹیں گے": ایک عنوان —— بشرطیکہ کوئی وزارت بھی ہاتھ آ جائے۔

"لیبارٹریوں میں بچے پیدا ہوں گے": ایک خبر —— فیملی پلاننگ کا اگلا پروگرام۔

"اناج کے کرائسس کی ذمہ دار حکومت": ایک عنوان —— جی نہیں بیچارے کھانے والے ہیں۔

"برطانوی الیکشن کے سلسلہ میں اردو میں پوسٹر": ایک خبر —— ہندی کے ساتھ زبردست ناانصافی۔

مادرِ ملت، مس جناح صدارتی چناؤ میں۔

افسانہ

اُداس اُداس

م۔ک۔ مہتاب ایم۔ اے

[illegible]

خیر اندیش ——— م۔ک۔ مہتاب

نہ جانے کتنی دیر شاور کے نیچے بیٹھے رہنے کے بعد بھی اُس کے جسم کی داخلی تپش کم نہ ہوئی۔ غسل کے بعد وہ آئینے کے سامنے بیٹھی اسی پریشانی کے عالم میں اپنے سنہرے بالوں کو برش سے صاف کرنے لگی۔ لیکن ہاتھ بار بار رُک جاتا۔ آئینے میں سے جھانکتی ہوئی گلاب کی سی کلی اُس سے پوچھنے لگتی۔

"تم کولری میں کہاں گئی تھیں؟ بولتی کیوں نہیں! اِس سوتے فتنے کو جگانے سے فائدہ؟"

"لیکن وہ ہماری کولری ہے۔ مجھے وہاں جانا ہی چاہئے تھا۔ اپنا کام دیکھنے نہیں جاتی۔ میرے لئے وہاں کتنا کام ہے۔ مزدور عورتیں کتنی ہمدردی کی مستحق ہیں اور اُن کے بچے جنہیں یہ معلوم نہیں کہ اُن کی ماں شام کو لوٹے گی یا نہیں پیار بھرے ہاتھوں میں آکر کیسے مچلنے لگتے ہیں۔ میں بے کار گھر پر ناول پڑھا کرتی ہوں۔ مجھے تو بہت پہلے وہاں جانا چاہئے تھا۔ انسان کو سکھ ہی کی تلاش ہے نا! اگر گھر کے عیش و آرام میں سکھ ہے تو اِن بے سہارا بچوں کے خشک ہونٹوں پر دودھ کے قطرے ٹپکانے سے بھی تو من کو شانتی ملتی ہے۔

پھر مجھے یہ کیسے علم ہو سکتا تھا کہ راجندر اسی کولری میں کام کرتا ہے پانچ برس اُس سے ملنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ اگر آج مِلا بھی ہے تو کیا ہوا۔ ہر انسان پیٹ بھرنے کے لئے کہیں نہ کہیں کام کرتا ہے۔ پھر اِس میں کیا حرج ہے کہ وہ مٹھاپور کولری میں کام کرتا ہے۔ یہ تو اتفاق ہے کہ مٹھاپور کولری ہم نے خرید لی۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ میرے پتی فرم کے مینیجنگ ڈائرکٹر ہیں۔ اگر یہ سب اتفاقات ہیں تو پھر میرے بھی وہاں جانے میں کیا بُرائی ہے؟"

"اگر کوئی بُرائی نہیں تو یہ گھبراہٹ کیسی؟" آئینہ پھر سوال کر رہا تھا۔

"نہیں نہیں۔ مجھے کوئی گھبراہٹ نہیں۔ اُس نے مجھے نہیں دیکھا۔ میں نے ہی اُسے دیکھا تھا خاکی وردی پہنے اور یونانی قسم کا ایک عجیب سا ہیٹ سر پر رکھے ایک لمبا تڑنگا شخص کوئلہ توڑنے والے برمے درست کر رہا تھا۔ اُس کے ارد گرد کچھ مزدور کھڑے تھے اُس کے سر پر بلب روشن تھا۔ مجھے کان کے اندر دیکھ کر سب مرد عورتوں میں ایک ہلچل سی مچ گئی تھی۔

"میم صاحبہ آئی ہیں۔ مسز شانتی لال آئی ہیں۔" اُس کے گرد کھڑے مزدوروں نے بھی پلٹ کر دیکھا۔ اُس نے بھی میری طرف منہ پھیرا۔ میں اُس کی عجیب سی شکل کے باوجود اُسے پہلی نظر میں پہچان گئی۔ میرے قدم ایسے جیسے زنجیر پڑ گئی ہو۔ میں آگے بڑھتے بڑھتے ایک طرف ہٹ گئی۔ وہ منہ پھیر کر پھر مشینوں پر جھک گیا۔ مجھے گھبراہٹ کیسی ہے۔ میں اب کبھی وہاں نہ جاؤں گی۔ یا اُن سے کہہ دوں گی کہ وہ اِس آدمی کو ملازمت سے الگ کر دیں۔" وہ نے اپنے بالوں کو پیچھے کی طرف جھٹکا اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"چائے تیار ہے بی بی جی" ملازم نے دروازے پر دستک دی اور چلا گیا۔

[illegible] چائے [illegible] شانتی لال جی [illegible] ہاتھ میں ایک

پھول [illegible] تھے۔ اندو آئی تو انھوں نے کلی ایک طرف پھینک دی۔

"آپ نے پھول کیوں پھینک دیا؟"

"تم جو آگئی ہو!"

اندو زیرِ لب مسکرائی اور چائے دانی سے ٹکوزی اُتار کر پانی پیالوں میں انڈیلنے

لگی۔ شانتی لال جی ٹرائی فروٹ کھاتے ہوئے اندو کے چہرے کی طرف دیکھتے رہے اور کچھ

دیر کے بعد بولے۔

"اندو! آج تم کچھ پریشان سی ہو کیا بات ہے؟"

"کچھ بھی نہیں!" وہ چونک گئی۔ اُس کے ہاتھ میں چائے کا پیالہ کانپنے لگا۔ جیسے

اُس کے دل کے آئینہ پر آئی تصویر کسی اور نے بھی دیکھ لی ہو۔

"کچھ سوچ بھی تو رہی ہو۔" شانتی لال نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"نہیں تو۔ کوٹھی میں گرمی بہت تھی۔ تھکاوٹ سی ہو رہی ہے۔"

"میں تو پہلے ہی کہتا تھا محنت کا کام ہے لیکن تم ضد کر بیٹھیں۔"

"لیکن وہاں سماج سیوا کا ایسا بہت کام ہے جو آپ کے ڈائرکٹروں اور افسروں کی

بیویاں کر سکتی ہیں۔ اس سے آپ کے کام میں ترقی ہو سکتی ہے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو اندو۔ لیکن ایک ہی بار وہاں جانے سے تم تھکاوٹ محسوس کرنے لگیں۔"

"آپ کو شاید کچھ وہم ہو گیا ہے۔ میں تو بالکل چنگی ہوں۔ ہاں کاٹن کے اندر گھٹن اور گرمی

بہت تھی" اور چائے پیتے ہوئے اندو کوشش کرتی رہی کہ شانتی لال کو اُس کی باتوں اور حرکات یا لہجے سے کوئی شک نہ ہو۔ اسی انجانے خوف نے اُس کے دل کو گرفت میں لے رکھا

تھا اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی کھوئی کھوئی نظر آ رہی تھی۔

سارا ہفتہ وہ راجندر کے خیال سے پلّو چھڑانے کی کوشش کرتی رہی لیکن یہ تصویر تھی

کہ ذہن کے پردے سے کسی طرح محو ہی نہ ہوتی تھی۔ پانچ برس کی طویل مدّت کے بعد محض ایک

نظارہ اتنا گہرا نقش چھوڑ جائے گا اس کا اُسے وہم و گمان بھی نہ تھا۔

لیکن یہ تو ایک مستقل آزار تھا۔ اگر اُسے پھر کبھی کوٹھی نہ جانا ہوتا تو وہ اس نقش کو

مٹا دیتی۔ لیکن اُس نے تو وہاں سماج سیوا کا پروگرام بنا کر پیش کیا تھا وہ خود کیسے پیچھے ہٹ

سکتی تھی۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ وہ وہاں جائے اور راجندر کی طرف توجہ نہ دے لیکن اگر راجندر

نے کوئی نازیبا حرکت کر دی تو اُس کی گھریلو زندگی میں ہمیشہ کے لئے ایک تلخی بھر جائے گی۔

"اس کا ایک ہی راستہ ہے۔ صرف ایک ہی راستہ!" وہ مٹھیوں سے کنپٹیوں کو

مسلتے ہوئے کہنے لگی "صرف ایک ہی راستہ ہے کہ شانتی لال راجندر کو کوٹھی کی ملازمت

سے الگ کر دیں۔ وہ یہاں رہے گا تو اُس سے وابستہ یادیں ہمیشہ اُسے ستاتی رہیں گی

اتوار کی رات کو شانتی لال نے کوٹھی کے کچھ افسروں کو ڈنر پر بلا رکھا تھا۔ اندو چاہتی

تھی کہ شانتی لال سے کہے کہ وہ راجندر کو [illegible]

لیکن بعد میں اُسے کسی بات ہوگی۔

"آخر کس قصور پر؟" وہ خود ہی سوال کرنے لگی۔

"قصور ایک ہی ہو سکتا ہے۔ الزام ایک ہی ہے جو عورت ہمیشہ لگاتی آئی ہے"

"اس کا ثبوت؟" راجندر مجسّم سوال بن کر اُس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"کیا میرا ضمیر یہ گناہ کرنے کی اجازت دیگا۔ میں پہلے ہی اُس کی اُمیدوں کا خون

کر چکی ہوں۔ اب اُس کی روزی چھیننا کتنا بڑا ظلم ہوگا ....."

"لیکن ..... لیکن اس کا کیا بھروسہ" یہ سب کہتے ہوئے وہ خود ہی پکڑی

جائے گی۔ شانتی لال اُس کو شک کی نگاہ سے نہیں دیکھنے لگیں گے؟"

اسی الجھن میں وہ کمرے سے باہر آ گئی اور ہال کی طرف چلی گئی۔ جہاں ڈنر سے

پہلے کسی موضوع پر بحث جاری تھی۔ اُس نے کھڑکی کے شیشے میں سے دیکھا اُس کے پاؤں

تلے سے جیسے زمین نکل گئی۔ ایک لمبی میز کے گرد بہت سے مرد بیٹھے تھے۔ راجندر شانتی

لال کے عین مقابل بیٹھا تھا۔ وہ میز تھپتھپا کر کسی نکتے پر زور دے رہا تھا۔ پھر وہ کھڑا

ہو گیا۔ ڈنر سوٹ میں وہ کتنا حسین معلوم ہوتا تھا۔ وہ کمپنی کے ڈائرکٹروں اور خصوصاً

شانتی لال کے آگے ہاتھ پھیلا پھیلا کر کچھ کہہ رہا تھا۔ اندو کے کانوں میں آواز گونجنے لگی۔ جیسے

وہ کہہ رہا ہو۔ "تم نے میرا حق دبا لیا ہے۔ میرا حق مجھے دے دو۔ اندو میری ہے۔ تمہاری نہیں

ہو سکتی! اُسے واپس کر دو!"

اندو کے پاؤں کانپنے لگے۔ وہ بھاگ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ سوچتی رہی کہ

اپنی اِس کمزوری پر خود ہی نفرت کرتے ہوئے کہنے لگی "میری زندگی میں کیا کمی ہے؟ کچھ

نہیں۔ مجھے راجندر کے بارے میں سوچنا تک نہیں چاہیئے مجھے جذبات کے بہاؤ میں آ کر

اپنی زندگی برباد نہیں کر لینی چاہیئے۔ اُسے ملازمت سے نکلوا کر کیا مجھے سکون حاصل ہو جائے گا

نہیں۔ ہرگز نہیں۔ پھر ایک ہی راستہ ہے۔ میں پہلے کی طرح اُس سے کوئی واسطہ نہ رکھوں

اگر وہ کوٹھی کا ملازم ہے تو ہوا کرے۔ اگر میرا اُس سے کوئی واسطہ نہیں تو پھر یہ دماغ سوزی

کیسی؟" وہ فیصلہ کن انداز میں اُٹھی اور سونے کے لئے چلی گئی۔

صبح ناشتے پر اُس کی ملاقات پھر شانتی لال سے ہوئی۔ وہ رات کی ذہنی کشمکش کے

باعث کچھ تھکی تھکی سی تھی۔ شانتی لال اُس کی آنکھوں میں بے خوابی کے آثار دیکھ کر بولے۔

"اندو میں دیکھ رہا ہوں تم کچھ اُداس اُداس سی ہو۔ کیا بات ہے؟"

"اُداسی کس بات کی۔ کچھ بھی تو نہیں" اندو نے قہقہہ لگانے کی ناکام کوشش کی

"نہیں۔ تم مجھ سے کچھ چھپانا چاہتی ہو۔" شانتی لال نے اندو کے گال پر آئی بال

کی ایک لٹ کو اُچھالتے ہوئے کہا۔

"آپ تو یوں ہی وہم کرنے لگتے ہیں۔ آپ کی قسم میرے دل میں کوئی بات

ہے۔ یہ حالت کیسی ہے جو میں اُداس ہو گئی ہوں۔ کل آپ کے لئے لائی تھی۔"

شانتی لال کام پر چلے گئے اور اندو کافی دیر تک بیٹھی سوچتی رہی۔ پھر ایک عزم کے ساتھ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"یہ باب ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکا ہے۔ میں اب اس کتاب کو زندگی بھر نہیں کھولوں گی"

رات کو شانتی لال دیر سے آئے۔ اندو مُنّے کی اُنگلی پکڑے کوٹھی کے برآمدے میں کھڑی اُن کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ سوچوں کے ساگر میں تیرتے تیرتے تھک گئی تھی۔ چاہتی تھی کہ شانتی لال آئیں اور اُسے زندگی کے ساگر کا کنارہ مل جائے۔

لیکن جب کار دروازے پر آ کر رُکی تو اُس کے قدم خود بخود پیچھے ہٹ گئے۔ مُنّا اُس کا ہاتھ پکڑے کھینچتا رہا لیکن وہ پلو چھڑا کر دروازے کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔

کار میں شانتی لال کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔ شاید وہی خوبرو انجینئر راجندر! وہ روشنی سے ہٹ کر اندھیرے میں کھڑی ہوئی۔ مُنّا ڈیڈی کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ راجندر نے مُنّے کو اپنے توانا بازوؤں میں پکڑ کر ہوا میں اُچھال دیا اور اُس کا گال چوم لیا۔ نہ جانے کیوں یہ دیکھ کر وہ مُسکرا دی اور اندر چلی گئی۔

"آپ نے آج بہت دیر کر دی!" اندو نے شانتی لال کے اندر آتے ہی کہا۔

"میں سیٹھ اُوپر چلا گیا تھا۔ کل افسروں کی بات چیت سے معلوم ہوا ہے کہ کولری کے ملازموں میں بے اطمینانی ہے۔ میں کام کو پھر سے مرتب کرنا چاہتا ہوں۔ اِسی لئے میں پلاننگ اپریشن کے انجینئر مسٹر راجندر کو ساتھ لیتا آیا ہوں۔ آدمی کام کا نظر آتا ہے۔ ہاتھ بٹا دیا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"آپ ہر ایرے غیرے کو منہ لگا لیتے ہیں" اندو نے قدرے برہم ہو کر کہا۔

"یہ بزنس ہے بزنس ڈارلنگ! تم بیٹھ کر سنوارا کرو گیسو اپنے!"

"اور کھانا؟"

"کھانا ہم اُدھر ہی کمرے میں کھائیں گے۔"

اندو اپنے کمرے میں تنہا بیٹھی کھانا کھاتی رہی اور سوچتی رہی یہ بادل جو اب گھر تک آ پہنچا ہے اُسے برسنے سے کیسے روکا جا سکتا ہے۔

اندو کے نہ چاہتے ہوئے بھی راجندر اور شانتی لال کی واقفیت کا دائرہ وسیع ہوتا رہا تھا۔ وہ گھر پر اکثر آنے لگا تھا لیکن اندو کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی کہ وہ اُس کے سامنے نہ آئے۔ لیکن ایک شک اُس کے دل میں جاگزیں ہو گیا کہ راجندر کو ضرور اُس کی یہاں موجودگی کا علم ہو گیا ہے۔ کیا وہ محض اِسی مقصد کے لئے تو یہاں نہیں آتا؟

ایک رات راجندر اور شانتی لال ملاقاتیوں کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ اندو اُدھر سے گذری اور ٹھٹکی۔ راجندر کرسی کی پُشت پر جھکا ہوا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ بے اختیار اُس کا جی چاہا وہ اُس کے ہونٹوں سے سگریٹ چھین کر باہر پھینک دے۔ [illegible] کون ہوں؟" وہ اپنے آپ پر ملامت کرتی ہوئی لوٹ آئی۔

لیکن کچھ دن بعد جب اُس نے راجندر کو اسی کمرے میں شانتی لال کے دوستوں کے ساتھ بیٹھے شراب پیتے دیکھا تو اُس کا جی چاہا، کانوں میں اُنگلیاں دے کر چیخے "اچھائی اور نیکی کے معصوم فرشتے! یہ تمہارا راستہ نہیں ہے۔ اِس گہری کھائی میں گناہ کی آگ بھڑک رہی ہے۔ تم اِس کے اندر مت جاؤ۔ تمہارے اندر جاتے ہی ساری کائنات جل کے راکھ ہو جائے گی۔ تم کبھی اِس غار سے نہ نکل سکو گے۔" لیکن اُس کے ہونٹ نہ کھل سکے اور دنیا کا سارا زہر اُس کے سینے میں اُتر گیا۔

"وہ میرا کچھ نہیں۔ تو دلِ ناداں یہ کیا حماقت ہے؟" وہ مُٹھیاں بھینچ کر اپنے آپ کو ملامت کرنے لگی۔

"کچھ نہ سہی۔ وہ میری بے وفائی کے بعد رحم کا تو مستحق ہے۔ میں اِس ہونہار نوجوان کو شراب کے پیالوں میں غرق ہوتے کیسے دیکھ سکتی ہوں۔ یہ امیرزادے اِس غریب کو برباد کر دینا چاہتے ہیں۔"

صُبح چائے کی میز پر جب اندو کی ملاقات شانتی لال سے ہوئی تو ابھی وہ راجندر ہی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اور اُس نے جی کڑا کر کے کہہ ہی دیا۔ "کیا آپ اِس شخص انجینئر راجندر کو ملازمت سے ہٹا نہیں سکتے۔ مجھے یہ کچھ اچھا آدمی نہیں معلوم ہوتا۔"

"کیوں!" شانتی لال نے حیرت سے اندو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مزدوروں کے مسائل تم نہیں سمجھ سکتیں۔ جانتی ہو وہ کتنے کام کا آدمی ہے۔ اگر اُسے ملازمت سے الگ کر دیا جائے تو اُسی دن کان میں ہڑتال ہو جائے گی۔ اُس نے سبھی کانکنوں کے دل جیت رکھے ہیں۔ اُسے ناراض کرنے کی بجائے اُسے ساتھ ملانے میں کہیں زیادہ فائدہ ہے۔ پھر تمہاری اچھائی بُرائی کا کیا معیار ہے۔ تم تو کسی کی ناک ذرا ٹیڑھی دیکھو تو کہتی ہو اُسے ملازمت سے الگ کر دیا جائے۔" شانتی لال قدرے غصّے میں بولے۔

"لیکن یہ کہاں کی اچھائی ہے کہ دیہاتیوں کی طرح کمرے میں آ کر شراب پی جائے۔ مجھے آپ کے دوستوں کا یہ شغل پسند نہیں۔"

"کسی کی ذاتی آزادی میں دخل دینے کا تمہیں کوئی حق نہیں۔" شانتی لال جی [illegible] جھنجھلاتے ہوئے اُٹھ کر چلے گئے۔

اور وہ دن بھر بستر پر کروٹیں بدلتی اور خیالات کے طوفانوں میں چکر کھاتی رہی۔ اُسے شوہر سے پتہ چلا تھا کہ شانتی لال راجندر کو پسند کرتے ہیں۔ وہ [illegible] کیسے بچا سکتی ہے۔ کیا وہ اُس کے لئے کچھ نہیں کر سکتی؟ کیا سادہ مزاج بھولا بھالا نوجوان یونہی کانٹوں سے بھرے راستوں پر قدم رکھنے لگا ہے۔ اگر وہ کہیں پھسل گیا تو؟

اور اُسے وہ دن یاد آیا جب ندی کے کنارے بھاگتے ہوئے پھسل گئی تھی۔ [illegible]

گیا۔ چندر کی کشتی کا پتوار پھینک کر اُسے دریائی لہروں یقیناً پانی کے تیز دھارے میں بہہ گیا ہوتا شاید ایسی ہوتا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور اُن کے درمیان حائل اجنبیت کی دیوار ایکدم منہدم ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ انہیں ایک دوسرے سے جدائی شاق گزرنے لگی۔

لیکن تعلیم کا یہ سلسلہ ایک دن ختم ہونا تھا اور اس کے ساتھ ہی وہ حسین سپنا بھی ٹوٹ گیا۔

"لیکن میں یہ سب سوچ کیوں رہی ہوں۔ یہ سپنا تو ٹوٹ چکا ہے۔ سب بے کار ہے۔ کب کا ختم ہو چکا ہے۔" اندو سر کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر رہ گئی۔

"میں نے شانتی لال سے یہ کہا ہی کیوں۔ میں خود بھی تو اُسے گمنام خط لکھ کر آگاہ کر سکتی ہوں کہ وہ ان سرمایہ داروں کے چنگل میں نہ پھنسے۔ یہ ظالم اُسے برباد کر دیں گے۔ ہوتے ہیں، اس غار میں داخل ہو کر وہ کبھی صحیح سلامت باہر نہ نکل سکے گا۔"

"لیکن مجھے کیا، میں کیوں اپنے آپ کو کانٹوں میں اُلجھا رہی ہوں۔ پیار کا ایک پودا تھا جو حالات کے ایک جھکڑ میں اکھڑ چکا ہے۔ دفن ہو چکا ہے۔ اب گڑے مُردے اکھاڑنے سے فائدہ؟" ایک اور سوچ نے اُسے آ گھیرا۔ اُس نے آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کی لیکن دماغ میں جیسے سوئیاں چبھنے لگیں۔

رات تک یہی سوچیں اُس کو گھیرے رہیں۔

"راجندر تمہیں مجھ سے کون سا بدلہ لینا ہے۔ تم کیوں میرے سینے پر سوار ہو۔ تم ہار کر بھی جیتے ہو میرے دوست۔ بس اب مجھے بخش دو۔" وہ رات بھر اسی طرح بڑبڑاتی رہی۔

صبح ناشتے پر شانتی لال پھر کہہ رہے تھے۔

"اندو! تم اُداس کیوں ہو۔ دیکھو تمہاری آنکھوں کے گرد حلقے پڑنے لگے ہیں۔ کیا رات کو سوتی نہیں؟"

"آپ کو نجانے کیا وہم ہو گیا ہے۔ مجھے اُداسی کیسی؟ جم کر کھاتی ہوں۔ لمبی تان کر سوتی ہوں۔"

"تم اگر دوستوں کا گھر آنا اچھا نہیں سمجھتیں تو میں اُنہیں کلب میں بلا لیا کروں گا۔"

"کیا ضرورت ہے۔ مجھے کسی کے کام پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ آج وہ نئے تھوڑے ہی ہیں۔ میں تو جب سے آئی ہوں ایسا ہی دیکھ رہی ہوں۔"

"لیکن یہ تمہیں ناپسند جو ہیں۔"

"میری ناپسند اگر آپ کے کاروبار پر اثر انداز ہوتی ہو تو اُس کا کیا فائدہ۔" اندو انگڑائی لیتے لیتے رک گئی۔

شانتی لال کے دوستوں کا گھر آنا بند ہو گیا لیکن اندو کا قرار جو لٹ گیا تھا واپس نہ آ سکا۔ وہ تنہائی پسند ہو گئی۔ اُسے اپنے آپ سے دلچسپی کم ہونے لگی۔ شانتی لال رات دن اُس سے یہی پوچھتے۔

"اندو کیا تم بیمار ہو؟ نہیں تو یہ چپ چپ سی کیوں رہتی ہو؟"

اور وہ ہر روز پھیکے پھیکے ہونٹوں پر بناوٹی مسکراہٹیں بکھیرتی ہوئی وہی بندھا ٹکا جواب دے دیتی۔

"آپ کو تو وہم ہو گیا ہے ڈارلنگ!"

پھر بھی اُسے ڈاکٹر کے ہاں جانے کا مشورہ دیا گیا۔ ایک شام ڈاکٹر کے ہاں سے لوٹتے ہوئے اُس نے ڈرائیور سے پوچھا۔

"چندر! تم کوٹھی کے ڈرائنگ انجینئر کو جانتے ہو؟"

"ہاں مسز مہتہ! وہی خوبصورت سا نوجوان راجندر۔ جو کوٹھی میں بھی آیا کرتا ہے۔"

"وہ کیسا آدمی ہے؟"

"آدمی تو بہت اچھا تھا۔ اب شراب بہت پینے لگا ہے۔ صاحب کے دوستوں نے اُسے بگاڑ رکھا ہے۔ میں کتنی بار اُسے بے ہوشی کی حالت میں اُس کے گھر چھوڑنے گیا ہوں۔ وہ اب کوٹھی میں بھی زیادہ مقبول نہیں رہا۔ ورکروں کو گالیاں بہت دیتا ہے۔ وہ رات کو کلب میں جوا بھی کھیلنے لگا ہے۔"

"کیا تم اُسے ایسا کرنے سے روک نہیں سکتے؟" اندو نے کار کے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کہا۔

"مسز مہتہ میری کیا بساط ہے۔ وہ بڑا انجینئر ہے۔ کمپنی کے مالکوں کا دوست ہے۔"

"کیا تم اُس سے ایک بات کہہ سکتے ہو؟"

"کیا؟" شوفر نے حیرانی سے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

"اُس سے کہنا کہ ایک لڑکی اندو کہتی تھی کہ وہ اس غلط راستے کو چھوڑ دے۔ اگر نہیں چھوڑ سکتا تو یہ ملازمت چھوڑ دے۔"

"نہیں... آپ کو..." شوفر نے ایک دم بریک لگا کر کار روک دی۔ اندو کو زور سے دھچکا لگا۔ پھر سنبھل کر بولی۔

"چندر! تم اُسے یہ پیغام پہنچا دو۔ یہ مت بتانا کہ اندو کون ہے اور نہ صاحب ہی کو پتہ لگے۔ یہ لو گھڑی تمہیں انعام میں دیتی ہوں۔" اندو نے کلائی سے گھڑی اتارتے ہوئے کہا۔

گاڑی پھر چلنے لگی۔ چندر آئینے میں غور سے اندو کو دیکھتا رہا۔ جب گاڑی گھر کے قریب پہنچی تو اندو نے اُسے روک لیا۔ وہ بُری طرح گھبرائی ہوئی تھی۔ اُس نے ہاتھ سے دو طلائی چوڑیاں اُتار کر شوفر کو دیں اور بولی۔

"تم یہ چوڑیاں لے لو۔ تم راجندر سے کچھ نہ کہنا۔ تم کسی سے کچھ نہ کہنا۔" اس رات

پھر وہ سونہ سکی۔

"میں نے جان کو یہ کیا روگ لگا لیا ہے۔ وہ برباد ہوتا ہے تو ہوتا رہے۔ مجھے کیوں ہے۔ لیکن وہ میرے خیالات سے محو کیوں نہیں ہوتا۔ شاید اُس کے کچھ خطوط ابھی میرے سوٹ کیس میں رکھے ہیں اور مجھے اُن کا خیال آتا رہتا ہے" وہ سوچتے سوچتے اُٹھی اور کپڑوں کی تہہ میں سے کاغذوں کا ایک چھوٹا سا بنڈل نکال لائی۔ جن میں سے ابھی تک ایک جانی پہچانی مہک آرہی تھی۔ ہلکے رنگوں کے باریک کاغذوں پر لکھے راجندر کے خطوط جو وہ اُسے دھنباد سے لکھتا رہا تھا۔

"تم دھنباد سے امریکہ تو نہیں چلے جاؤ گے؟" اندو کے کانوں میں اپنے ہی وہ الفاظ گونجنے لگے جو اُس نے راجندر کو دھنباد کالج میں داخلہ ملنے پر الوداع کہتے ہوئے کہے تھے۔

"اور تم جبلپور میں میرا انتظار کروگی نا!" راجندر نے پہلی بار کھل کر اُس کے دونوں ہاتھ پکڑے تھے اور دل کی بات کہہ دی تھی۔

"جہاں تک ممکن ہے کوشش کروں گی" اور وہ سر جھکا کر رہ گئی۔

اندو نے ایک اور خط کھولا یہ رومانیہ سے آیا تھا۔

"مجھے سکالر شپ مل گیا ہے۔ اگر اجازت ہو تو فرانس چلا جاؤں"

ہاں! مگر کیا اُس فضا میں بھی تم مجھے یاد رکھ سکو گے؟ یہی تھے وہ الفاظ جو اُس نے جواب میں لکھے تھے۔

اور راجندر واقعی اُسے فراموش نہ کرسکا۔ یہ خطوط اس بات کا ثبوت ہیں۔ وہ رومانیہ، فرانس اور پھر کینیڈا سے آئے ہوئے کاغذوں کی انہی کشتیوں میں بیٹھی ساحل کی آمد کی منتظر تھی کہ ایک دن شانتی لال کے جہاز نے یہ چھوٹی چھوٹی کشتیاں غرق کردیں۔

اُس کے پاس اپنے والد کی تجویز رد کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں تھی۔ ایسا اونچا خاندان ایسا بے عیب تعلیم یافتہ خوبرو متمول لڑکا کوٹھی کاریں رشتے دار اور اِن کے مقابلے میں اُس کے پاس کیا تھا۔ یہی کاغذ کے چند ٹکڑے اور لمبا انتظار! وہ کیا جواب دے سکتی تھی۔ اور اُس نے بھی کوا کر کے والد صاحب کی مرضی کے آگے سر جھکا دیا۔

راجندر وعدے کے مطابق خط لکھتا رہا لیکن کوئی جواب نہ پاکر خاموش ہوگیا۔ اُس نے سمجھ لیا ہوگا کہ ایک اور لڑکی ہندوستان کی روائتی بے بسی کا شکار ہوگئی۔ اُس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ سارے خطوط نہ پڑھ سکی اور اُنہیں پھر اُسی سوٹ کیس میں دفن کرآئی۔

وہ دن رات ایک عجیب بے کلی سی محسوس کرتی رہی۔ اُس نے سارے کمروں سے اپنی تصویریں ہٹالیں تاکہ راجندر اُنہیں کہیں دیکھ نہ لے۔

دو دن بعد وہ دوپہر کے کھانے پر شانتی لال کی منتظر تھی۔ شانتی لال آئے تو وہ بہت مغموم تھے۔

"خیریت تو ہے۔ آپ پریشان سے ہیں!"

"پریشانی یہی ہے کہ تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو اندو!"

اندو رعشہ زدہ انسان کی طرح کانپنے لگی اور ہاتھ جوڑ کر بولی۔

"کچھ نہیں میرے دیوتا کچھ نہیں۔ آپ میرے لئے پریشان کیوں ہیں؟"

"اگر ایسا نہیں تو تمہاری اِس بیماری کا سبب کیا ہے۔ ان چند ہفتوں میں تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ تم اُداس کیوں ہو؟"

"اُف! آپ کے وہم کا علاج ۔۔۔"

"تم اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی دھوکے میں رکھنا چاہتی ہو؟ یہ گھڑی تمہاری ہے؟" شانتی لال نے گھڑی دکھاتے ہوئے کہا۔ اندو نے لپک کر گھڑی چھین لی اور اُسے بیڈ پر جاگری۔

"آپ کو یہ کہاں سے ملی ہے؟"

"اندو! تم اپنی جان سے دشمنی کر رہی ہو۔ ڈرائیور کہتا ہے تم بہت پریشان تھیں۔ تم گھڑی گاڑی ہی میں بھول آئیں"

"مگر میں تو تندرست ہوں"

"اگر تم بُرا نہ مانو تو میں کل کالری سے اپنا ایک فرانگ ... کو یہاں بلاؤں گا۔ وہ اچھا ماہر نفسیات ہے۔ ہوسکتا ہے وہ تمہارے مرض کی تشخیص کرسکے"

شانتی لال چلے گئے اور اندو پلنگ پر نیم جان سی پڑی رہی۔ اُسے شبہ بھی ہو رہا تھا۔

"ہے ایشور! مجھے یہ کیا ہو رہا ہے۔ شانتی لال کا دوست کہیں وہ راجندر تو نہیں۔ اُسے بھی تو سائیکالوجی میں بڑی دلچسپی تھی۔ اگر وہ آگیا تو ..... لیکن یہ راجندر کی گردان میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتی۔ کیا یہ میری جان لے کر رہے گی اکیا میری پریشانی کا سبب یہ خطوط تو نہیں۔ جو ہر لمحہ میرے ذہن پر سوار رہتے ہیں۔ میں صبح ہی اُنہیں جلادوں گی۔

شانتی لال پورٹ گئے ہوئے تھے۔ وہ صبح صبح ہی اُٹھ کر راجندر کے خطوط نکال کر بیٹھ گئی۔ ایک ایک خط پوری زندگی کی داستان تھا۔ کتنی مٹھاس تھی اِن سطور میں لیکن آج یہ شہد زہر بن گیا تھا۔

"میں اب اِنہیں کبھی نہیں پڑھوں گی" اُس نے دو خطوط نکال کر پُرزے پُرزے کردیئے۔

پھر دوسرا ۔ اور پھر دوسرا!

سندر ملازم اوپر آیا تو حیران رہ گیا۔

مالکن ابھی شب خوابی کے لباس میں تھیں۔ آنکھیں سُرخ بال پریشان تھے۔

وہ کاغذ کو پھاڑ رہی تھی۔

"بی بی جی! نیچے صاحب یاد کرتے ہیں۔"

اندو نے منہ پھیر کر سُندر کی طرف دیکھا لیکن کوئی جواب نہ دیا۔

"بی بی جی! نیچے صاحب بُلاتے ہیں" سُندر نے پھر آواز دی۔

"ہا۔ ہاہاہا!" اندو نے زور کا قہقہہ لگایا۔ سُندر ایکدم ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔

اندو کاغذ کے پُرزوں کو ہتھیلی پر رکھ کر پھونکوں سے اُڑانے لگی۔

"ہاہاہا!"

"ہاہاہا!" اندو نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر قمیص پھاڑ ڈالی۔ سُندر حواس باختہ سا نیچے بھاگا۔

"شانتی بابو۔ شانتی بابو۔ اندو بی بی پاگل.....ہاں پاگل!!"

شانتی لال نے ماتھے کو ہاتھ سے پکڑ لیا اور افسردہ ہو کر بولے۔

"افسوس! وہ ماہر نفسیات نہ جانے برسوں سے کہاں گم ہو گیا ہے۔"

غزل

الطاف مشہدی

پھولوں میں آکے دیدۂ دل باز کیجئے
اِن معبدوں سے درد کا آغاز کیجئے

دار و رکیف ہیں چاک گریباں ہیں جتنے لوگ
اِن پر درِ نگاہ و زباں باز کیجئے

گائی گئیں جو سازِ سلاسل پہ بارہا
اُن ٹھمریوں سے بزم کا آغاز کیجئے

نام و مقام ماضیٔ رفتہ کی بات ہے
اب حُسنِ کار ہی پہ فقط ناز کیجئے

زنداں میں زندگی کے ترانے رقم نہ ہوں
اتنا سا کام صاحبِ اعجاز کیجئے

اُڑیئے نہ میکدے کی فضاؤں سے دُور دُور
اِن سرخ وادیوں میں بھی پرواز کیجئے

الطاف جس قدر بھی ہیں انساں پرست لوگ
افشا انہیں پہ زندگی کا راز کیجئے

غزل

پروفیسر منشاء الرحمٰن خاں منشاء ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی

حُسن و الفت کے نیاز و ناز کی باتیں کریں
جی میں آتا ہے کہ سوز و ساز کی باتیں کریں

کچھ گھنیرے گیسوؤں کی چھاؤں کے قصے سنائیں
کچھ لبِ جاں بخش کے اعجاز کی باتیں کریں

کھنکھناتے ساغروں کی جس میں ملتی ہے جھلک
اُس حسین و دل رُبا آواز کی باتیں کریں

پہلے اپنے آپ کر لیں اعترافِ جرمِ عشق
پھر ذرا کھُل کر دلِ جانباز کی باتیں کریں

اِس سے بہتر گفتگو کا دوسرا موضوع نہیں!
رات دن بس یارِ خوش انداز کی باتیں کریں

جس کو سُن کر تیز ہو جاتی ہیں دل کی دھڑکنیں
بے محابا عشق کے اُس راز کی باتیں کریں

اچھے اچھے اہلِ ایماں کو بھی رشک آنے لگے
ہم اگر اپنے بتِ طناز کی باتیں کریں

سختیوں سے زیست کی جینا ہی مشکل ہے تو پھر
کیسے منشاؔ عیش و حرص و آز کی باتیں کریں

من کا آنگن

نور شاہ

ہسپتال روڈ۔ درگہ جن۔ سرینگر
۲۰ جولائی ۱۹۷۳ء   محترمی خوشتر گرامی صاحب! آداب

ایک بار "بیسویں صدی" کے قارئین کے لئے "من کا آنگن" ـــــــ لے آیا ہوں کہانی کے سارے واقعات اور کردار حقیقی ہیں۔ اِن کہیں کہیں تخیل سے بھی کام لیا ہے۔ اس کہانی کا ایک کردار میں خود ہوں اور کہانی کا عنوان میری اپنی ذات کی غمازی کرتا ہے۔ کہانی میں جن کرداروں کی عکاسی کی گئی ہے اُن میں سے پنجاب کے کسی دُور دراز گاؤں کی نصیب کور کو میں شاید کبھی نہ بھلا سکوں۔ اُس کی عظمت کے سامنے میرا سر جھک جاتا ہے اور میں اس کہانی کو اُسی کے نام معنون کرتا ہوں....

آپ کا بھائی ـــــــ نور شاہ

حنائی رنگ کا یہ خط جو سامنے ریڈیو والی تپائی پر پڑا ہے ابھی ابھی مجھے ملا ہے کاغذ ہلکا بسنتی اور باریک تحریر کی خوبصورتی سے ایسا معلوم ہوتا ہے، یہ خط ثبوت کے سینی نورِیم اُس ادھیڑ عمر کی سکھ خاتون نرس نے لکھا ہے جو پھولوں کا گلدستہ لئے میری منتظر ہے اپنی زندگی کے چند لمحوں کو معطر بنانے کے لئے میں نے کتنی بار اپنے من میں سوچا کہ پھر جاکر ثبوت کے سینی نوریم میں داخل ہو جاؤں۔ اُس سینی نوریم کی تصویر میری آنکھوں میں رہی ہے۔

سینی نوریم ـــــــ چیڑ اور دیودار کے درختوں میں گھری ہوئی سفید عمارت بڑے بڑے ہوادار کمرے، خاموش پُراسرار برآمدے، دیواروں پر عشق پیچاں کی ہری سنہری بیلیں دودھ کی سی نرمل چاندنی کی شیتل شیتل کرنیں جب درختوں کی شاخوں سے چھن چھن کر سینی نوریم کی سفید عمارت پہ بکھر جاتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے فضا میں ہلکی ہلکی موسیقی کھیل رہی ہو، جیسے چاندنی کی کرنیں اُس سکھ خاتون نرس کی لانبی لانبی انگلیاں ہوں اور سینی نوریم کی عمارت ستار!!

وہ سکھ خاتون نرس بھی ہیں۔ نند بھی ہے۔ اُس کا نام کرشنا ہے۔ لیکن اُس کا اب ثبوت کے سینی نوریم سے کوئی تعلق نہیں ہے وہ تو امرتسر کے بڑے ہسپتال میں کام کرتی ہے کرشنا نے پوچھا تھا۔

"اِن پھولوں میں سے تمہیں کون سا پھول پسند ہے؟"

"گلاب!"

"سُرخ یا سپید؟"

میں نے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا اور کہا۔

"سُرخ"

وہ شرمائی!

"کب سے یہاں رہ رہی ہو؟"

"جانے کتنے سال ہوئے ـــــــ کیوں؟"

"اِسی لئے کہ یہاں رہ کر بھی تمہارے لہجے میں پنجابی لوک گیتوں کا رس اور مٹھاس ہے"

"لیاب کیسے ہیں؟" اُس نے بات کا رُخ موڑ دیا۔

میں نے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا وہ مسکرا رہی تھی کرشنا نے پھولوں کا گلدستہ گلدان میں سجا کر اُسے چھوٹی سی الماری پر رکھا جو مریضوں کو ہسپتال کی طرف سے ملی ہے گلاب کے یہ سُرخ و سپید پھول ہسپتال کے آنگن میں اُگتے ہیں وہ ہسپتال کے اندر موت کے جراثیم پلتے ہیں یہی پھول جو زندگی کا پیغام دیتے ہیں اور یہی جب مرجھا جاتے ہیں تو انہیں پھینک دیا جاتا ہے مسل دیا جاتا ہے۔ بالکل زندگی کی طرح زندگی گزرتی ہے تو......

بات حنائی رنگ کے خط کی ہے!

[illegible] میں سکتا ہے۔ اب مجید میرا چچا زاد بھائی

پتا جی کے والد امرتسر کے بڑے ہسپتال میں زیر علاج ہیں اور اسی سلسلے میں

ایک سال قبل میں بھی امرتسر چلا گیا تھا۔ میں ایک مہینہ رہ کر چھ ماہ ہو گئے واپس

آیا ہوں۔ اس ایک مہینے میں بہت کچھ دیکھا، پایا اور پہچانا۔ ایک کرشنا بھی

کھو جانی اور پہچانی۔

اور شوت کے سینی ٹوریم میں زندگی کے چند لمحے گزارنے کو معنٰی بنانے کے خواب کو ہم حقیقت کا روپ بنانے دیکھا۔ لیکن شوت کے سینی ٹوریم اور امرتسر کے بڑے ہسپتال کے درمیان ایک طویل فاصلہ ہے، ایک عظیم خلا ہے۔ وہی صف بستہ بوڑھے درخت، خاموش پُراسرار راستے اور وہی شب خرام [illegible] ۔۔۔ وہ ایک خواب تھا، یہ ایک حقیقت ہے۔ دراصل یہ فاصلہ اور خلا، خواب اور حقیقت کے درمیان ہے۔ ان دیکھی [illegible] اور کرشنا کے درمیان ہے۔ فاصلے جب طے ہوتے ہیں، دوری جب قربت میں بدل جاتی ہے، رستے جب اصلیت کھو بیٹھتے ہیں تو منزل خود ہی قدم چومتی ہے۔

ایک شام میں ریلوے پل پر کھڑا ٹرین کے آنے کا انتظار کر رہا تھا اور بھی سب لوگ تھے۔ ٹرین آئی اور چلی بھی گئی۔ لوگ بھی چلے گئے اور میں یونہی کھڑا رہا۔ دفعتاً میرے کانوں سے کرشنا کی آواز ٹکرائی۔

"ٹرین تو چلی گئی اب کس کا انتظار کر رہے ہو؟"

میں نے کرشنا کی طرف دیکھا اور بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

"اپنے ساتھی کا!"

"کون ہے وہ ۔۔۔؟"

میں مُسکرایا۔ شاید وہ میری مسکراہٹ ہی میں اپنے سوال کا جواب ڈھونڈ پائی اس نے بات بدل دی۔

"ہسپتال میں بابا کے پاس کون ہے؟"

"مجید ۔۔۔"

"تم نہیں چلو گے کیا ۔۔۔؟"

"ہاں اور تم ۔۔۔؟"

"میں ہسپتال ہی جا رہی ہوں۔ آج میری ڈیوٹی ہے۔"

ریلوے پل اور ہسپتال کے درمیان تھوڑا فاصلہ ہے۔ ہم دونوں ہسپتال کی طرف چل پڑے۔ رستے میں کرشنا نے پوچھا۔

"کشمیر میں کہاں رہتے ہو؟"

"سرینگر۔"

"سرینگر۔" اس کے لہجے میں ایک آرزو تھی، تمنا تھی۔

"تم نے سرینگر دیکھا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں ایک بار۔ جب میں ٹریننگ کر رہی تھی ہم ٹور پر گئے تھے۔"

"تمہیں کیا پسند آیا؟"

اس نے ایک آہ بھر کر کہا۔ ۔۔۔ "سفیدے کے پیڑ۔"

"پیڑ؟"

"ہاں ۔۔۔!" مجھے محسوس ہوا جیسے چلتے چلتے اس کی آنکھیں خود بخود بند ہوتے ہوئے ہیں، جیسے وہ ایک دائمی خواب دیکھنے لگی ہو۔ وہ اب آہستہ آہستہ دھیمی دھیمی آواز میں بول رہی تھی۔

"یہ سفیدے کے لمبے لمبے سر اٹھائے پیڑ۔ وہ اپنی ٹہنیوں سے روئی کے گالے بکھیرتے ہیں اور جہلم کی سطح پر نرم نرم سپید سپید گالے سرکتے ہوئے حرکت کرتے ہوئے ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو وہ منظر کتنا سہانا لگتا ہے!"

وہ خاموش ہو گئی اور پھر خود ہی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"سفیدے کے پیڑوں سے میرے بچپن کا تعلق ہے۔ میرے والد گلو کے ایک چرچ کے فادر تھے ہم لوگ چرچ ہی کے ایک حصے میں رہتے تھے۔ میرے والد کے ایک دوست [illegible] وہاں، وہ چرچ کے قریب ہی رہتے تھے۔ ان کا ایک لڑکا تھا۔ میرا ہم عمر تھا وہ۔ ہمارا سارا وقت تقریباً ساتھ ہی گزر جاتا۔ ہمارے آنگن میں سفیدے کا ایک پیڑ تھا۔ میری ماں مر چکی تھی اور والد چرچ میں مصروف رہتے تھے۔ سفیدے کا وہ پیڑ ہم دونوں کا تنہا ساتھی تھا۔ ہم اس کے نیچے لیٹ جاتے اور اوپر ہی اوپر اس کے بے شمار سرسبز پتوں کو ہوا میں جھومتے لہلہاتے ہوئے دیکھتے اور ایک دن ۔۔۔!"

"اور ایک دن کیا ہوا ۔۔۔؟" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

وہ جیسے خواب سے جاگ پڑی!

"اور ایک دن میرے والد کے دوست کا تبادلہ ہو گیا۔ وہ جانے کہاں چلے گئے ان کا لڑکا بھی چلا گیا۔ میں جب سکول سے لوٹی وہ چلے گئے تھے، ٹھیک اسی دن مجھے وہ پیڑ زمین پر بیٹھا ہوا [illegible] وقت گذرتا رہا۔ ہم لوگ امرتسر آ گئے۔ میں اس بات کو بھول گئی۔ اس لڑکے کے خدوخال کو بھول گئی اور شاید اسی لئے جب میں کشمیر گئی تو مجھے [illegible] کے ۔۔۔ اس لڑکے کے خدوخال نظروں کے سامنے ابھر آئے۔"

[illegible] ۔ واقعی وہاں کی ہر چیز قابل تعریف ہے۔ قابل دید ہے۔ کشمیر ۔۔۔ ہری بھری شاداب وادی اور سُندر دھرتی، بھانت بھانت کے لوگوں کا گھر جہاں جھیلوں کے گرد سبز سبز جنگل ہیں۔ جو آگے ہی آگے پھیل کر اسی شکل میں پہاڑوں میں بدل جاتے ہیں جن پر بارہ مہینے برف کا راج رہتا ہے پہاڑ کے بہتے ہوئے پانی کا رنگ نیلا ہے ہر چیز

SUNLIGHT
Soap

گھر میں دُھلی
سَرف
سے دُھلی
Surf
AMAZING BLUE POWDER

کلائمکس

مشتاق اعظمی

معرفت ڈاکٹر شاہ محمود صاحب (ہومیوپیتھ) بکا بازار۔ آسن سول

۴ اگست ۹۳ء

تسلیم! سلام مسنون

.... بیسویں صدی میں اس کی اشاعت میرے لئے باعث افتخار ہوگی۔ میرا قیام ایک ماہ تک کلکتہ میں رہے گا۔ اس لئے میں نے جوابی لفافے پر کلکتہ کا پتہ درج کیا ہے۔

نیاز آگیں ——— مشتاق اعظمی

ماہنامہ "شبنم" کے سالنامے بابت جنوری کے اداریہ کا اقتباس ———

.... زیر نظر سالنامہ یوں تو تمام کا تمام منتخب تخلیقات پر مشتمل ہے۔ لیکن ہم "شبنم" کے قارئین کی توجہ خصوصی طور پر ملک کے مایۂ ناز افسانہ نگار اظہر تقی کے شاہکار افسانے "سوزِ ناتمام" کی جانب مبذول کرانا چاہتے ہیں۔ اس افسانے کی خاطر ہمیں سالنامہ خلافِ معمول ایک ہفتہ کی تاخیر سے شائع کرنا پڑا ہے۔ دراصل یہ افسانہ ہمیں اُس وقت موصول ہوا جب سالنامہ ترتیب دیا جا چکا تھا۔ لیکن ہم نے یہ مناسب سمجھا کہ "شبنم" کے سالنامہ اور اُس کے قارئین کو اس اچھوتے افسانے سے محروم نہ رکھا جائے۔ اس لئے ایک کتابت شدہ افسانے کی اشاعت کو روک کر ہم نے اس افسانے کو شامل کر لیا۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ افسانہ پڑھ کر "شبنم" کے قارئین کا وہ ملال دُور ہو جائے گا جو سالنامہ کے لیٹ ہو جانے کے باعث پیدا ہوا ہے۔ "سوزِ ناتمام" کے کلائمکس میں اظہر تقی نے ایک نئی تکنیک استعمال کی ہے۔ اس افسانے میں ان کا فن اپنے پورے عروج پر ہے۔ [illegible] قلم کے اعتبار سے اور فن کی ساری بلندیوں کو چھو لیا ہے۔

ماہ فروری کے "شبنم" میں سالنامہ کے متعلق اہلِ قلم حضرات نے چند خطوط سے اقتباسات۔

.... "شبنم" کا سالنامہ اپنی صوری اور معنوی خوبیوں کے لحاظ سے معیاری [illegible] کا حامل ہے۔ سالنامہ کے تمام قلم کار (میرے سوا) اپنی تخلیقات کے لئے قابلِ تحسین ہیں۔ اظہر تقی کے افسانے "سوزِ ناتمام" نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ میرے خیال میں یہ افسانہ حاصل سالنامہ ہے۔ یہ افسانہ جدید ادب کی جدید رفتار سے آگاہ کرتا ہے۔ [illegible]

افسانے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُس کے انجام پر قاری کے ذہن کو سیری کے باوجود ایک سرشار تشنگی کا احساس ہو۔ اور یہ خوبی افسانے کے کلائمکس میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

آفتاب عُمر

"شبنم" کا ہر سالنامہ دیکھ کر میں نے یہی محسوس کیا ہے کہ اب اس سے اور بہتر سالنامہ پیش نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ہر بار سال کے آغاز میں "شبنم" کا سالنامہ دیکھ کر میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ "شبنم" کا سالنامہ اس مصرع کی مکمل تشریح ہوتا ہے "ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں"۔ سالنامہ [illegible] تخلیق پر [illegible] ممکن نہیں۔ مگر عظیم افسانہ نگار اظہر تقی کو مبارکباد پیش کرنا [illegible] ممکن ہے۔ [illegible] افسانہ سالنامہ [illegible] بات ہے۔ افسانے کے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible]

.... [illegible] [illegible] وعات سے [illegible] اختتام میں [illegible] [illegible] "سوزِ ناتمام" میں انہوں نے جو نئی تکنیک استعمال کی ہے وہ [illegible] کی منہ بولتی [illegible] ہے۔ افسانہ کے غیر متوقع انجام سے ممکن ہے عام پڑھنے والے کوئی نتیجہ اخذ نہ کر سکیں لیکن اہلِ نظر

برقِ دلربائی

شہاب ملیح آبادی

اے ماہتاب رُوئے خنداں، اے برقِ دلربائی
ظلمت کدے میں میرے، یہ تو کہاں سے آئی

جلووں کا تیرے شاہد، خود شمس ہے، قمر ہے
اے دولتِ تجلّی، کچھ اور خود نمائی

شایانِ شاں نہیں ہے، یہ شانِ بے نیازی
ہمت شکن ہیں تیرے انداز آشنائی

چینِ جبیں سے تیری، سب مجھ پہ خندہ زن ہیں
ایسا نہ ہو کہ تیرے کارن ہو جگ ہنسائی

خندہ بہ لب خموشی، چھیڑے ہوئے ہے نغمے
زیبا نہیں یہ غوغا، اے سوزِ بے نوائی

وہ ہیں، چمن ہے، گل ہیں، اک دورِ سر خوشی ہے
میری شکستہ حالی! کیا تو بھی مسکرائی

جب بھی ہوائیں جھومیں، جب بھی گھٹائیں برسیں
دیرینہ اک تمنّا سینے میں کسمسائی

کتنا سکوت افزا عالم ہے غم کدے کا
کیا شے فضا میں کانپی، کیا چیز سنسنائی

تیرہ شبی کی حد ہے تیرہ شبی کہاں تک
اے صبحِ جلوہ گاہ تاباں تری دُہائی

میرے سخن کے اندر، حل ہو کے رہ گئی ہے
وہ موجِ خوش خرامی، وہ شانِ خوش ادائی

وہ حسن پر ہیں نازاں، ہم ہیں شہاب خود پر
اپنی یہ خود فریبی، اُن کی وہ خود ستائی

غزل

اخگر مشتاق رحیم آبادی

جانِ جہاں اک کام کرو
آج یہیں آرام کرو

سب کو نام بنام کرو
شوق سے قتلِ عام کرو

کون سنے گا دیوانو
کتنا ہی کہرام کرو

لو تم پر بھی حرف آیا
تردید الزام کرو

محفل محفل ذکر چھڑے
ایسا بھی اک کام کرو

فضلِ خدا ہی کافی تھا
فیضِ نظر کیوں عام کرو

مجھ سا بچارا، اور شراب
مفت میں مت بدنام کرو

کس نے کہا تھا دیوانو
وحشت ہی کے کام کرو

کانٹوں میں مشہور ہیں ہم
پھولوں میں تم نام کرو

اُلٹے سیدھے شکووں سے
اُن کو کیوں بدنام کرو

کوئی نہیں اِک پاگل تھا
اپنا اپنا کام کرو
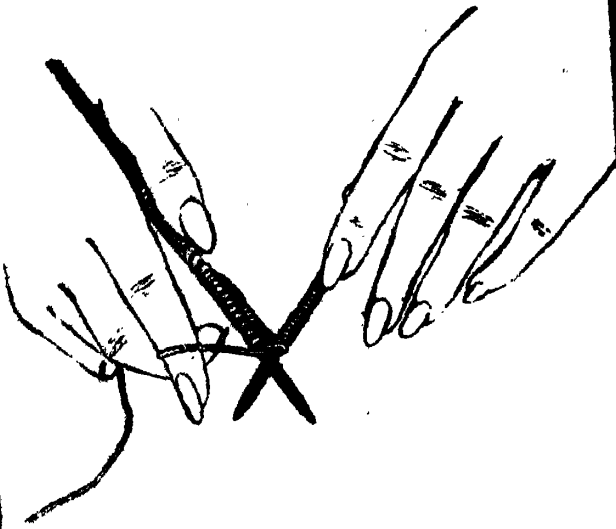
B3-MIL 2 URD
اچھی اور
جلد بُنائی
کیلئے
ملوورڈس
فینٹم
بُننے کی سلائیاں
خاص طرح کے الیمینیم مرکب سے بنائی گئی
اور ابنو ڈائز، کی گئی سلائیوں میں مندرجہ ذیل خوبیاں ہیں:-
مضبوطی
اچھی نوک
نان سٹینز ہونے کی گارنٹی (داغ دھبوں سے مبرّا)
سب سائزوں اور گیج میں ملتی ہیں۔
نقلی مال سے ہوشیار رہیے۔
نیڈل انڈسٹریز
(انڈیا) لمیٹڈ
رجسٹرڈ آفس کا پتہ:- ۲۹/۳۲ شکتی نگر، دہلی - ۶

صرف ایک بار

ظفر واسطی

۲/۳۵ ۸ بزاز محلہ صدر بازار لاہور چھاؤنی

۲۳ جولائی ۶۳ء

خوش رہو دلنواز! خدا آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔

.... "بیسویں صدی" برابر وقت کی پابندی کے ساتھ مل رہا ہے۔ ہر مہینے جب "بیسویں صدی" آتا ہے تو گردن آپ کے احسان اور محبت سے جھک جاتی ہے۔ بلاشبہ آپ اور "بیسویں صدی" اُردو کی بہت بڑی خدمت کر رہے ہیں۔ "بیسویں صدی" کی ادبی حیثیت تاریخی ہے — ایک افسانہ "صرف ایک بار" بھیج رہا ہوں۔ اُمید ہے پسند آئے گا۔ آپ کو بھی اور قارئین کو بھی .... مخلص ——— ظفر واسطی

پچھلے برس اُن دنوں جب مجھے آپ کا خط ملا تھا تو لفافے پر آپ کے ہاتھ کا لکھا ہوا پتہ دیکھ کر ایک دم مجھ پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ لفافہ ہندوستان کا تھا اور اُس پر آپ کے دستِ نازک کا لکھا ہوا پتہ تھا۔ پتہ بھی وہ تھا جو میں نے دو برس ہوئے تبدیل کر لیا تھا اس لئے لفافہ مجھے ایک دن تاخیر سے ملا تھا۔ لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ لفافہ کھول کر پڑھ لوں لفافہ پانے کی خوشی ہی اتنی زیادہ تھی کہ میں اُسے ضبط نہ کر سکتا تھا۔ حواس اختیار سے باہر ہو رہے تھے۔ لفافہ میں کیا لکھا ہوگا اس کی مجھے اُس وقت پرواہ نہ تھی۔ میرے لئے یہی بہت تھا کہ آخر آپ کا خط آ گیا آپ کے پیارے پیارے ہاتھ کا لکھا ہوا خط!! میں لفافے کو ہاتھ میں لئے جانے کس عالم میں پہنچ گیا تھا۔ ہاں! مجھے اتنا ہوش تھا کہ میرے سارے جسم پر لرزہ سا طاری تھا۔

بیوی نے میری یہ کیفیت دیکھی تو نہایت پیار سے پوچھا۔

"کس کا خط ہے۔ آپ اتنے پریشان کیوں ہو گئے؟"

میں اُسی وقت دفتر سے آیا تھا۔ اور کمرے میں قدم رکھتے ہی معمول کے مطابق کارنس پر نظر ڈالی تھی۔ میری غیر حاضری میں ڈاکیہ میرے نام کے جو خط دے جاتا ہے وہ کارنس پر ٹائم پیس کے پاس رکھ دئے جاتے ہیں اور میں دفتر سے آکر سب سے پہلے یہ دیکھتا ہوں کہ ٹائم پیس پر میرے نام کا کوئی خط رکھا ہے یا نہیں۔ آج بھی میں نے معمول کے مطابق وہاں نظر ڈالی تو آپ کا خط مل گیا ورنہ اب میرے نام شاذ ہی کوئی ایسا خط آتا ہے جو کسی رشتہ دار وغیرہ کا نہ ہو اور جو گھر والوں کے متعلق نہ ہو اور جسے وہ کھول کر نہ پڑھ لیتے ہوں۔ ابتدا میں شاید بیوی نے میرے نام کے خطوط پر کسی شک و شبہ کو جگہ دی ہو تو دی ہو لیکن اب اتنی عمر گزر جانے کے بعد وہ مجھ سے قطعی طور پر بے فکر ہو گئی ہیں۔ جس شخص نے جوانی میں کسی دیوانے پن کا مظاہرہ نہ کیا ہو وہ اب جوانی گزارنے کے بعد کیا دیوانگی دکھائے گا اور پھر اگر ان پر دیوانگی کا بھوت سوار بھی ہوا تو اب انہیں کون گھاس ڈالے گا۔

میں انہیں اپنی طرف متوجہ دیکھ کر اور زیادہ بوکھلا گیا۔ اور جلدی سے قریب کی چارپائی پر بیٹھ گیا بلکہ لیٹ گیا۔ مئی کا آخری ہفتہ تھا۔ خوب گرمی پڑ رہی تھی۔ اور میں دفتر سے اُسی وقت آیا تھا بیوی نے اُٹھ کر ٹیبل فین کا رُخ میری طرف کر دیا اور پھر پوچھا "کس کا خط ہے؟" خط ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔

میں نے کہا "دہلی کے ایک دوست کا ہے"

"تو پھر اسے کھول کر پڑھتے کیوں نہیں؟"

"پڑھتا ہوں۔ تم ذرا میرے لئے ایک گلاس شربت بنا لاؤ" میں کچھ وقفہ چاہتا تھا کہ اپنے آپ کو خط کا مضمون پڑھنے کی خوشی برداشت کرنے کے قابل بنا سکوں۔

بیوی نے بیٹے سے شربت بنا لانے کے لئے کہہ دیا۔ اور وہ فوراً اُٹھ کر چلی گئی۔

میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لفافہ کھولا۔ میں جانتا تھا کہ یہ میرے اُس خط کا جواب ہے جو دو برس ہونے میں نے آپ کے والد کے پتہ پر آپ کو لکھا تھا "عزیز ترین بہن — کیا آپ ازراہِ کرم مجھے اپنے پتہ اور خیریت سے مطلع فرمائیں گی؟" اس کے علاوہ اور میں لکھ بھی کیا سکتا تھا۔ آپ نے کبھی میرا حوصلہ نہ بڑھایا تھا اور میں ایک مہینے تک خط کے جواب کا انتظار کر کے بالکل مایوس ہو گیا تھا۔ بلکہ اُس خط کا خیال تک ذہن سے اُتر گیا تھا۔ البتہ کبھی کبھی آپ کی یاد ضرور آتی تھی اور اس شدت سے آتی تھی کہ میں بالکل بے اختیار ہو کر یہ سوچنے لگتا تھا کہ سب کچھ تیاگ کر سنیاس لے لوں۔ لیکن پھر دُنیا کا لحاظ اور سب سے زیادہ بیوی بچوں کے متعلق اپنے فرائض کی بجا آوری کا خیال کر کے خاموش ہو جاتا۔

میں نے وہ تصویر نکال کر فریم کرالی ہے۔ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا کہ آپ کسی طرح بھی نہ ملیں اور آپ کی تصویر ہر وقت نظر کے سامنے رہنے لگی۔
ایڈیٹر کو خط لکھ کر پوچھا تھا کہ یہ تصویر آپ کو کس نے اور کہاں سے بھیجی تھی؟ انہوں نے کافی دنوں کے بعد جواب دیا کہ تصویر بھیجنے والے کو بھی صاحب تصویر کا نام اور پتہ معلوم نہیں۔ لیکن میرا دل کہتا ہے ——— صرف ایک بار کہہ دیجئے کہ یہ تصویر آپ نے اشاعت کے لئے بھیجی تھی۔ صرف ایک بار!

غزل

پورن سنگھ ہنر

دِل کی دھڑکنوں نے تو بار بار سمجھایا
پھر بھی ہم نے ہر دھوکا جان بوجھ کر کھایا
وہ بھی آگئے زد میں امن کے جو مرکز تھے
حادثات کا طوفاں اِس قدر اُمنڈ آیا
خاک راس آئے گا دورِ انبساط اُس کو
غم کو جو سمجھتا ہے زندگی کا سرمایا
گفت گو تو محفل میں تھی مری وفاؤں کی
کس لئے کوئی سُن کر اپنے دل میں شرمایا
یہ ہجوم جلوہ تھا یا نگہ کی معذوری
روشنی نظر آئی وہ نظر نہیں آیا
ختم ہوتی جاتی ہیں دل میں جو اُمنگیں تھیں
دورِ زندگی ٹوٹا دورِ انحطاط آیا
کس قدر ہوئی حیرت سُن کے اے ہنر مجھ کو
فردِ تے کشاں میں جب آپ کا بھی نام آیا

غزل

نثار انصاری ایم اے

کسی کے حسن کا آئینہ دار ہو جیسے
ہمارا دل ہے کہ شہرِ نگار ہو جیسے
ترے بغیر کچھ اس طرح جی رہا ہوں میں
مری حیات ترا انتظار ہو جیسے
نفس نفس ہے تباہی سے کس قدر مانوس
نفس نفس کو تباہی سے پیار ہو جیسے
کلی کے لب کی خموشی تو ٹوٹتی ہی نہیں!
کلی کے سینے میں رازِ بہار ہو جیسے
لگائے بیٹھے ہیں سینے سے یوں غمِ ہستی
کہ عشرتوں کی کوئی یادگار ہو جیسے
بس ایک سانس کی رونق، بس اک نفس کی نمود
حیات نقشِ سرِ رہگذار ہو جیسے
ہزار جبر کے باوصف مطمئن ہوں نثار
یہ جبر جبر نہ ہو، اختیار ہو جیسے

غزل

کرشن موہن ایم اے

کہیں یہ بات نہ بڑھ جائے کیسی اَن بَن ہے
ہمارا دِل تو کدُورت سے پاک دامن ہے
کبھی جو مَولد و مَسکن تھا آرزوؤں کا
فغاں کہ آج وہ دِل حسرتوں کا مدفن ہے
ستم کہ انجمنِ ناز کے ہیں یہ انداز
زباں کو حکمِ خموشی، نظر پہ قدغن ہے
غمِ فراق میں بھی مُسکرا رہا ہوں میں
تمہاری یاد مرے دِل پہ جلوہ افگن ہے
نہ اس میں کوئی پیامِ عمل نہ رنگِ خرد
فقیہِ شہر مری شاعری سے بدظن ہے
سُہاگ نکھرا ہے دھرتی کا مست ہے سنبل
نظر فروز کسی گلبدن کا جوبن ہے
ہے اس میں ہندی کا رس فارسی کی شوکت بھی
عجیب رنگ لئے شعرِ کرشن موہن ہے

اُف! اتنی تکلیف دہ کھانسی!
لیجیے!
ٹسانول استعمال کیجیے
تکلیف دہ کھانسی سے فوری اور دیر پا آرام پانے کیلئے ٹسانول کف سیرپ استعمال کیجئے
ٹسانول آپ کے پھیپھڑے اور گلے کی سرسراہٹ کو ختم کرکے آپ کو فوری نجات دلاتا ہے
اس کے بااثر جزویات آپ کو بلغم کی حبس سے نجات دلاتے ہیں۔ اور انتہائی کم
وقت میں آپ کو کھانسی سے بالکل مکمل چھٹکارا دلاتے ہیں۔
آہ! کھانسی سے جان بچ گئی
ٹسانول
کف سیرپ
تیار کردہ: مارٹن اینڈ ہیرس (پرائیویٹ) لمیٹڈ
رجسٹرڈ آفس: مرکنٹائل بلڈنگ۔ لال بازار۔ کلکتہ ۱
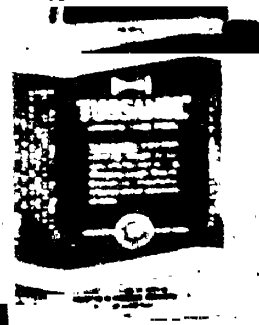
مور کے پاؤں

پروفیسر عاصی کرنالی ایم اے
۲۰۷ محلہ آباد ملتان

حضرت خوش قسمتی و تسلیمات
.... افسانہ نمبر میں "آگ" کی اشاعت کے لئے شکریہ! اب "مور کے پاؤں" حاضر ہیں۔ شاید یہ کوشش آپ کو اور قارئین کرام کو پسند آئے ــــــ بجلی کو دیا!
آپ کا ــــــ عاصی کرنالی

کچے پکے گھروندے، شکستہ جھونپڑیاں، ٹوٹے پھوٹے راستے، گندی نالیاں، تن ضعفا اور بدبودار لوگ، ان سب کا مجموعی نام بستی غریب پورہ ہے۔ یہاس شہر کی بستی ہے جس پر کلفٹن کا راج ہے۔ کلفٹن جو اس شہر کا حسین مور ہے۔ جب یہ مور شوخ اور چنچل ہو کے پنکھ پھیلا کر ناچتا ہے تو پورا شہر جھوم اٹھتا ہے۔ اس مور کا سر اس کا سینہ، اس کا ...اس کے پر، یہ سب فطرت کا خوب صورت آرٹ ہے، لیکن اس مور کے پاؤں بدنما ہیں اور ان کا دوسرا نام بستی غریب پورہ ہے۔

کلفٹن کی آغوش میں حسن کی شفق پھولتی ہے۔ جمال کی صبحیں طلوع ہوتی ہیں ...کے کنول کھلتے ہیں۔ محبت اور ارمان کی چٹکتی کلیوں سے فضا مہک اٹھتی ہے۔ کلفٹن ...میں کتنی آسودگی اور کتنا سکھ ہے۔ کلفٹن کی لہروں کے تاج میں قوس قزح ...اور کتنی روشنیاں ہیں۔ جب کوئی لہر بلند ہوتی ہے تو محبت کا تاج محل ...لیکن مور کے پاؤں کتنے بدنما ہیں، کتنے غلیظ ہیں۔ غریب پورہ کی نالیوں سے ...نہیں ہوتی۔ ان گندے پانیوں میں کیڑے پلیں گے، گندے بچوں کی غلاظتیں ...لیکن یہاں کی کوئی موج کبھی تاج محل نہ بن سکے گی!

کلفٹن رعنائیوں اور رنگینیوں کا وطن ہے۔ اس کے دامن میں گیت ہیں، رقص ...ستارے ہیں ــــــ لیکن اس بستی میں دھول ہے، سڑاند ہے ...کیڑے ہیں جن کا دوسرا نام شاید انسان ہے ــــــ گھروندوں کی لمبی ٹیڑھی ...متوازی قطاریں! ــــــ ان قطاروں کا اندر باہر یکساں ہے۔ سچائی کی ...یہاں ایک طرح یکسانیت اور ٹھہراؤ ہے۔ ازل سے ابد تک۔ مور کے ...کی طرح! ــــــ

نجی یہاں کا باشندہ نہیں۔ وہ پہلے منٹگمری میں رہتا تھا۔ اُس کے ماں باپ نے اُسے پڑھایا نہیں، اِس لئے کہ وہ خود پڑھے لکھے نہیں تھے اور اس لئے کہ وہ غریب تھے اور اُن کے بارہ بچے تھے۔ بارہ کیڑے! ایک کیڑا ذرا باغی قسم کا تھا۔ وہ تیزی سے رینگنے لگا اور سات سو میل کی مسافت طے کر کے کلفٹن کے دیس میں آ گیا اور بستی غریب پورہ کی ایک جھونپڑی کے دائرے میں رینگنے لگا ــــــ نجی نوجوان تھا۔ خوب صورت تھا اس لئے کہ فطرت بہت فیاض ہے۔ لیکن اُس کے بدن پر خوب صورت کپڑے نہیں تھے اس لئے کہ کیڑے لباس نہیں پہنا کرتے۔

نجی کے پڑوس میں دائیں ہاتھ ایک اور جھونپڑی تھی، ٹوٹی پھوٹی، خستہ جھونپڑی۔ دونوں کے بیچ میں گھاس پھوس کی ایک دیوار تھی جو جگہ جگہ سے سرک گئی تھی یا بارش سے بہ گئی تھی۔ وہاں ٹاٹ یا گندے پھٹے پرانے چیتھڑے ٹھونس دیئے گئے تھے اس لئے کہ گھاس پیسوں کی آتی ہے اور چیتھڑے تو گھروں میں ہوتے ہی ہیں۔ نجی اکیلا رہتا تھا لیکن ساتھ کی جھونپڑی میں تین افراد رہتے تھے۔ ماں، باپ اور ایک لڑکی ــــــ نجی کی جھونپڑی کے بائیں ہاتھ بھی ایک جھونپڑی ہی تھی جہاں بے شمار لوگ رہتے تھے۔ مرد ہی مرد کسی کارخانے کے مزدور۔ بے شمار کیڑے۔ دن میں مزدوری کرتے۔ رات کو تاش کھیلتے، بوتو پیتے، ایکٹریسوں کے جسموں کی باتیں کرتے اور خوش ہوتے تھے۔ نجی نے کبھی اِس طرف توجہ نہیں کی۔ وہ صرف دائیں ہاتھ والی جھونپڑی کے چیتھڑوں میں مگن رہتا۔ اُسے اِن چیتھڑوں میں کسی انجانی خوشبو اور اَن دیکھے رنگ کا احساس ہوتا تھا۔ اُس نے بڑی مہارت سے دو تین جگہ چیتھڑوں کو تھوڑا سا سرکا کر چھوٹے چھوٹے روزن بنا لئے تھے، ایسے مناسب فاصلوں سے کہ اُدھر کا ہر گوشہ نظر آ سکے۔ جب اُس نے پہلی بار ایک روزن سے دیکھا تو وہ

[illegible] ... کی طرف ... کے لیے سنہرا ... آنے لگے محسوس
ہوا۔ گلفشن کی طرف سے آئے ہیں اور خیالات میں اُس کا سنہری شہزادہ ہے۔ جو
زمین کے سمندر سے سنہرا جزیرہ اُسی کی تلاش میں بار بار اِدھر آ نکلتا ہے!

پھر جلد ہی کے بعد رضیہ [illegible] ہو گیا اور پھر اُس کی ماں ایک [illegible] ہوا
[illegible] بہت [illegible] بیٹھنے سے [illegible] وہ تجمی کے دامن پر آ گری اور وہ اُسے اپنی
جھولی میں لے آیا اور اُس کی جوتیوں پر مفت پالش کرنے لگا۔

خدا جانے کتنے دن گزر گئے۔ ایک دن رضیہ نے کہا: "تجمی! میں نے آج تک گلفشن
نہیں دیکھا۔" وہ تیار ہو گیا۔ لیکن اُس کی جیب میں صرف آٹھ آنے تھے۔ وہ پریشان
سا ہو گیا۔ پھر اُس نے ہمت باندھ کر کہا: "ذرا ٹھہرو، میں ابھی آیا!" اور وہ پالش بکس لے کر
نکل گیا!

اور دو گھنٹے بعد خوش خوش لوٹا۔ اُس کی جیب میں اب دو روپے تھے۔

وہ بستی سے نکلے۔ کچھ دور چل کر انھیں بس مل گئی۔ رضیہ کا ذہن سوچ میں گم تھا۔
ایک اُداس سوچ، جس کے جھروکوں سے اُسے ماضی کی ویرانیاں نظر آ رہی تھیں۔ پڑھی ہوئی
کہانی ایک خنجر کی طرح اُس کے دل میں پیوست تھی۔ بانسری بجاتا ہوا سنہرے جزیرے کا شہزادہ!
اُس نے چونک کر تجمی کی طرف دیکھا۔ پالش کے کالے دھبے اُس کے ناخنوں کی کوروں میں
جمے ہوئے تھے۔ اُس نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ وہ پھر سوچ میں ڈوب گئی۔ شاید آج وہ شہزادہ
آ جائے اور مجھے اِس سوچ کے غلیظ ہاتھوں سے چھین کر لے جائے۔

بس ایک جھٹکے کے ساتھ رُکی۔ اُس کی سوچ کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ وہ دونوں اُترے۔
ٹھنڈی خنک ہوا نے اُن کا استقبال کیا۔ گلفشن کے باہر ایک رنگ برنگی دنیا تھی۔ خوش
وقتی اور بے فکری کے قہقہے۔ بھڑکیلے اور شوخ و شنگ لباس، جیسے انسان نہیں ایک چلتی
پھرتی نمائش گاہ ہیں۔ وہ دونوں پختہ گزرگاہوں کو طے کرتے رہے، خاموش اور ساکت
۔۔۔ پھر ریت کی ڈھلوانی شروع ہو گئی۔ خشک ریت، پھر گیلی، وسیع اور نمناک
ریت اور پھر کنارے کی سیراب اور حسین ریت! ۔۔۔ رضیہ حیرت اور دہشت کے ساتھ
یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اُس نے ٹھنڈی ریت کا گولا بنایا۔ اُسے اپنے گال پر رکھ لیا۔
وہ گولا ٹوٹ کر بکھر گیا۔ اُسے اپنے چہرے پر خنکی اور آسودگی کا احساس ہوا۔ تجمی اُسے دیکھ کر
مسکرایا لیکن وہ اپنے حال میں مگن تھی۔

ساحل پر بے شمار لوگ بے شمار مشاغل میں مصروف تھے۔ وسیع ریت کے دامن میں
چہلیں، قہقہے، سرگوشیاں، تجلیاں اور مشاہدے۔ چلتی پھرتی مختصر دکانیں، پکوڑے،
چاٹ، پھل ۔۔۔ غرض گلفشن کی زمین پر زندگی حسین تھی اور جوان تھی۔ اور فطرت
ایک سخی بادشاہ کی طرح اپنے تمام خزانے لٹا رہی تھی۔ شام کے سورج کی کرنوں نے پانی کی سطح
کو شیشے کی سڑک بنا دیا تھا اور دور فاصلے پر سمندر کی شوخ پریوں کا رقص جاری تھا۔ رضیہ کی
نگاہیں صرف اونچی لہروں پر تھیں۔ وہ ایک ساکت مجسمے کی طرح ایک ہی طرف دیکھ رہی تھی
جیسے صدیوں تک اسی طرح تکتی رہے گی۔

تجمی نے اُس کا بازو ہلایا: "رضیہ! اُدھر کیا ہے؟"

"اُدھر؟ ۔۔۔" رضیہ نے وحشت ناک نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔
"اُدھر وہ آنے والا ہے۔"

"سنہری شہزادہ، بجرے پر بیٹھ کر بانسری بجاتا ہوا۔"

"کیوں؟ وہ کیوں آ رہا ہے آج؟"

"اپنی شہزادی کو لے جانے کے لئے سنہرے جزیرے کی طرف۔"

تجمی سب کچھ سمجھ گیا۔ اُس کے دل پر چوٹ لگی۔ غربت اُس کا منہ چڑاتی محسوس
ہوئی۔ اُس نے رضیہ کا ہاتھ پکڑ لیا: "آؤ اُدھر چلو، وہاں ریت پر، بہت سی باتیں کریں گے۔"

- بڑا وہ ہے جو اپنے نفس پر غالب آئے۔ (مہاتما بدھ)
- نظامِ حکومت اِس طرح درست رہ سکتا ہے کہ بادشاہ کو بادشاہی کی شوکتوں (ذمہ داریوں) اور وزیر کو وزارت کی مشکلات کا احساس ہو۔ (کنفیوشیس)
- اپنے آپ کو پرکھے بغیر زندگی بسر کرنا ایک بے معنی سی بات ہے۔ (سقراط)
- خوش مزاجی سے امن و سلامتی حاصل ہوتی ہے اور دوسروں کے دل میں خوش مزاجی جگہ بھی کرتی ہے۔ (سقراط)
- مخلوقِ خدا کے لئے دنیا میں کوئی چیز اِس سے بہتر و مبارک نہیں کہ بادشاہ نیک ہو اور بڑے حاکم سے بڑھ کر خلق کے لئے کوئی مصیبت نہیں۔ (ارسطاطالیس)
- خاموشی سب سے زیادہ آسان اور سب سے زیادہ نافع عادت ہے۔ (ارسطاطالیس)
- جھوٹ تمام برائیوں کی جڑ اور سچ تمام برائیوں کا علاج ہے۔ (بقراط)
- نہ زیادہ خاموشی اچھی نہ زیادہ گویائی۔ (جالینوس)

وہ غیر ارادی طور پر اُس کے ساتھ چلنے لگی۔ پھر وہ ایک تنہا گوشے میں جا بیٹھے۔ سورج
کی آخری کرنیں گلفشن کی لہروں کی پیشانی چوم رہی تھیں۔ پریوں کا رقص برابر جاری تھا!

"رجو!" تجمی نے اُس کی انگلیوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: "کوئی شہزادہ کہیں سے
نہیں آیا کرتا۔ کسی سمندر میں کوئی سنہرا جزیرہ نہیں ہے۔ کوئی سونے کا بجرا نہیں ہے۔ یہ کہانیاں
جھوٹی ہیں۔ بالکل جھوٹ!"

رضیہ اِس طرح تڑپی جیسے کسی نے زخم کو چھیڑ دیا ہو۔

"یہ جھوٹ نہیں بالکل سچ ہے۔ وہ آنے والا ہے وہ شہزادہ جو سونے کے ...."

کیا آپ خواہش کے مطابق بچاتے ہیں؟ پیسہ بچت کیسے ہوتا ہے

[illegible] نے بڑے فخر سے کہا: "ہم غریب لوگ ہیں، انہیں کے [illegible] جھونپڑیوں میں ہماری زندگی کا راج ہے، سنہرا جزیرہ ہے"

رضیہ نے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"میں بڑا آدمی بنوں گا، بہت بڑا آدمی! میں بوٹ پالش کا دھندا چھوڑ دوں گا اور تم دیکھنا بہت جلد بڑا آدمی بن جاؤں گا۔ پھر ہم ایک دن کار میں بیٹھ کر کلفٹن آئیں گے پھر میں اُن امیروں کی طرف چلا جاؤں گا اور وہاں سے شہنائی بجاتا ہوا آؤں گا اور تم مجھے اپنی آغوش میں لے لوگی۔ پھر ہم ... سنہرے جزیرے میں چلے جائیں گے وہاں میں تمہیں اپنی ملکہ بناؤں گا۔"

رضیہ نے نجمی کی پیشانی چوم لی!

[illegible] گلدستہ [illegible] اپنی جھونپڑی تک۔ اُس کے بعد نجمی نے بوٹ پالش کا پیشہ ترک کرنا چاہا لیکن پالش کا رنگ اُس کے ناخنوں سے جُدا نہ ہو سکا ملیشیا کے پاجامے سے داغ دھبے دُور نہ ہو سکے۔ دس سال بعد صرف اتنا انقلاب آیا کہ اُس کے سر کے بال سفید ہو گئے۔ اُس کی بیوی کیڑے کی طرح پتلی ہو گئی اِس لئے کہ اُس نے اپنی کوکھ سے چھ کیڑوں کو جنم دیا تھا۔ نجمی اپنی جھونپڑی کے دروازے پر پالش کا صندوقچہ جانے لگا جہاں وہ اپنے چھ بچوں کے پھٹے جوتوں کی مُفت پالش کرتا تھا! ——— کلفٹن کے بنگلے تو خوب صورت ہیں۔ لیکن مور کے پاؤں اُسی طرح بدنما ہیں!!

غزل

سعادت نظیر ایم، اے

جب تک کسی کے حسن کی جلوہ گری نہ تھی
دنیائے آب و گل میں کوئی دل کشی نہ تھی

وہ آج تیرے شہر میں انجان سے ملے
کل میری شکل جن کے لئے اجنبی نہ تھی

کچھ ایسی بات تھی کہ قدم میرے رُک گئے
ورنہ کچھ اتنی دور تو اُس کی گلی نہ تھی

جوشِ شباب، عالم مستی، و فورِ شوق
اے زندگی! یہ بات تو تجھ میں کبھی نہ تھی

اُس بزمِ دل فروز کی کیا کہیے، اے نظیر!
جس کی فضا میں روشنی تھی، تیرگی نہ تھی

محسن زیدی ایم، اے

امتحاں قد و گیسو سے گزر جاتا تھا
یوں نہ یہ دل رسن و دار سے ڈر جاتا تھا

جانے کیا ہوگا مری دشت نوردی کا مآل!
اُس نے آواز جو دی تھی تو ٹھہر جاتا تھا

عشق کی اِس کے سوا اور حقیقت کیا تھی
ایک دریا تھا جسے چڑھ کے اُتر جاتا تھا

تیری زلفیں مری تقدیر کی گرہیں تو نہ تھیں
تیری زلفوں کو بہر حال سنور جاتا تھا

اپنی ہر یاد مرے دل سے مٹا کر جاتے
جا رہے تھے تو یہ احسان بھی کر جاتا تھا

اِس سے اچھا تھا کہ آتی نہ بہاریں محسنؔ!
پھول بن کر جو شگوفوں کو بکھر جاتا تھا

مشہور و مشاق افسانہ نگار

کوثر چاندپوری سے انٹرویو

نریش کمار شاد

۱۵ ہیوٹ، موتی باغ ۔۲۔ لکھنؤ

۲۵ اگست ۹۴ء

محترم کوثر صاحب!

آئندہ شمارے کے لئے کوثر چاندپوری سے انٹرویو ارسال کر رہا ہوں۔ کوثر صاحب کے بارے میں مختصراً اتنا ہی عرض کروں گا کہ وہ ادب برائے زندگی کے ساتھ ساتھ عملی طور پر زندگی برائے ادب کے بھی پیروکار ہیں۔ اُردو کے اس انتھک خدمت گزار کی مخلصانہ کوششوں کی جتنی داد دی جائے کم ہے۔ علاوہ ازیں کوثر صاحب بقول آپ کے جتنے اچھے ادیب ہیں اتنے ہی اچھے انسان بھی ہیں اور بیک وقت ان دونوں خوبیوں کا ہونا اگر ناممکن نہیں تو نایاب ضرور ہے۔

آپ کا ——— نریش کمار شاد

شاد۔ آداب عرض کوثر صاحب!

کوثر۔ آداب عرض آیئے بیٹھئے شاد صاحب۔ میری یادداشت اگر غلط نہیں ہے تو شاید یہ آپ سے پہلی ملاقات ہے۔

شاد۔ نہیں کوثر صاحب میں اس کے بعد ایک مشاعرے کے سلسلے میں یہاں آیا تھا اور صبح سویرے بھوپال پہنچتے ہی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔

کوثر۔ جی ہاں! لیکن وہ ملاقات اتنی سرسری تھی کہ ایک دوسرے کو پتہ ہی نہ چل سکا کہ ہم میں سے کون کتنا تبدیل ہوا ہے۔ آپ فوراً ہی ایک طائر بلند پرواز کی طرح پر تول کر اُڑ گئے۔ صبح کو معلوم ہوا کہ آپ مشاعرے کے بعد رات ہی کو چلے گئے تھے۔

شاد۔ میں تو قبلہ محض اس حد تک تبدیل ہوا ہوں کہ ادیبوں کے لطیفے لکھتے لکھتے اُن سے انٹرویو لینے لگ گیا۔

کوثر۔ یہ کیا فرما رہے ہیں شاد صاحب! آپ کی بلند پایہ شاعرانہ حیثیت سے کون انکار کر سکتا ہے! مجھے معلوم ہے کہ آپ انٹرویو لے رہے ہیں۔ اِس سلسلے میں بعض بہت اچھی چیزیں پڑھنے کو ملی ہیں۔ آپ علمی ذہن آور بھی ہیں۔ کافی گہرے اور پُر مغز سوالات کرتے ہیں۔

شاد۔ یہ تو محض آپ کی شفقت اور حوصلہ افزائی ہے۔ بہرحال بطور انٹرویو ہی کے سلسلے میں آپ سے کچھ چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔

کوثر۔ اس سے پہلے آپ میرے اس سوال کا جواب دیجئے کہ میرے اور آپ کے مشترکہ کرم فرما خوشتر بھائی کا کیا حال ہے؟

شاد۔ خوشتر صاحب بظاہر تو مجھ سے بھی ایک ڈگری زیادہ خوش ہیں لیکن میرے خیال میں ہم دونوں کی خوشی برائے نام ہے۔

کوثر۔ واہ شاد صاحب! جواب نہیں آپ کی نکتہ آفرینی کا۔

شاد۔ کوثر صاحب! میری اتنی تعریف نہ کیجئے کہ میں اپنے مقصد ہی کو بھول جاؤں۔

کوثر۔ ارے بھئی، ایسی بھی کیا عجلت ہے پہلے چائے تو پی لیجئے۔

شاد۔ تکلف نہ کیجئے کوثر صاحب! یہ بتایئے آپ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

کوثر۔ میری پیدائش ۸ اگست ۱۹۱۸ء کو چاندپور ضلع بجنور (یو۔ پی) میں ہوئی۔ بعد میں بھوپال آ گیا۔ اب یہی میرا وطن ہے۔

شاد۔ تعلیم کس کس جگہ سے کہاں تک حاصل کی؟

کوثر۔ اُردو فارسی اور عربی چاندپور میں پڑھی۔ انگریزی کی استعداد اپنے طور پر سیلف اسٹڈی (Self Study) کے ذریعہ حاصل کی۔ بھوپال کے تکمیل الطب کالج سے قدیم و جدید طب کی تحصیل کی۔

شاد۔ ادبی زندگی کا آغاز کب اور کیسے ہوا؟

کوثر۔ ۱۹۳۶ء میں۔ محرک کوئی باطنی طاقت یا آواز تھی جسے فطری ذوق بھی کہا جا سکتا ہے۔ اور احساسِ جمال بھی۔ میرا ماحول بھی شروع سے ادبی رہا ہے۔ گھر پر ہر وقت شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا۔ علمی اور لسانی بحثیں بھی ہوتی تھیں۔ میرے والد حکیم علی مظفر صاحب شاعر تھے۔

شاد۔ [illegible]؟

کوثر۔ [illegible] سے [illegible] کے [illegible]

شاد۔ [illegible] کہ ہے؟

کوثر۔ [illegible] ہے لیکن میں نے اس سے [illegible] اور [illegible] گیا۔

[illegible] ہیں ۔

جس سے ہم کیا حسنِ خلق اول
[illegible] جلا

[illegible] کو کوئی پتہ نہیں تھا کہ میں نے اپنا [illegible]

[illegible]

شاد۔ آپ [illegible]؟

کوثر۔ کسی [illegible] منظر کو دیکھ کر متاثر ہوتا ہوں۔ یہ تاثر جب ذہن میں جذب ہو کر پکتا اور [illegible] ہوتا ہے۔ اس دوران میں ایک خاص قسم کا کرب محسوس کرنے لگتا ہوں اور یہ کرب مجبور کرتا ہے کہ اپنے تاثرات کو ذہن کا صفحہ [illegible] افسانے کی تکنیک میں کاغذ پر منتقل کر دوں۔ چنانچہ قلم اور کاغذ لے کر بیٹھ جاتا ہوں اور افسانے کا مسودہ تیار ہو جاتا ہے۔ [illegible] صاف کرتا ہوں۔ کوئی خاص اُلجھن محسوس ہوتی ہے تو مسودے کو دو چار دن تک [illegible] ڈالے رکھتا ہوں۔ افسانے کو صاف کرتے وقت اکثر [illegible] بدل دیتا ہوں کہ اُس کی شکل مسودے کے مقابلہ میں مختلف ہو جاتی ہے۔

شاد۔ کیا افسانہ لکھنے سے پہلے افسانے کا خاکہ آپ کے ذہن میں ہوتا ہے؟

کوثر۔ جی ہاں! افسانہ لکھنے سے پہلے میرے ذہن میں اُس کا خاکہ ضرور ہوتا ہے۔ لیکن کاغذ تک آتے آتے وہ اکثر بہت زیادہ بدل جاتا ہے لیکن موضوع وہی رہتا ہے۔

شاد۔ جب آپ نے لکھنا شروع کیا تھا اُس وقت آپ کے سامنے افسانہ نگاری کا کیا مقصد تھا؟

کوثر۔ غالباً وہاں۔ [illegible] سماج اور اخلاق کی اصلاح۔ اس کے بعد [illegible] ابتدائی مجموعوں میں اسی قسم کے افسانے ہیں۔

شاد۔ کون کون سے ملکی اور غیر ملکی افسانہ نگاروں سے آپ خاص طور پر متاثر ہیں؟

کوثر۔ ملکی افسانہ نگاروں میں نیاز فتحپوری اور منشی پریم چند سے بہت زیادہ متاثر رہا۔ غیر ملکی افسانہ نگاروں میں روس کے مشہور افسانہ نگاروں کے تراجم [illegible] سے [illegible] پڑھتا رہا۔ ان میں وہ

لوگ بھی متاثر کرتے جو زندگی کے قریب تھے اور انسانی فلاح کی تڑپ رکھتے تھے۔

شاد۔ اس وقت اُردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار آپ کسے تسلیم کرتے ہیں؟

کوثر۔ کرشن چندر کو۔

شاد۔ کرشن کے علاوہ اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں میں اور کون کون سے افسانہ نگار آپ کو پسند ہیں؟

کوثر۔ بیدی، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، شوکت صدیقی، اشفاق احمد، اقبال متین، جیلانی بانو، واجدہ تبسم، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، خواجہ احمد عباس، رام لعل، ابراہیم جلیس اور دوسرے بہت سے، نام کہاں تک گناؤں۔ یوں سمجھ لیجئے کہ ہر اچھا لکھنے والا مجھے پسند ہے۔ ناموں کی فہرست میں ترتیب بالکل نہیں ہے جو نام ذہن میں آتے گئے بولتا گیا ہوں۔

شاد۔ اچھا یہ فرمایئے کہ کرشن۔ بیدی اور منٹو میں آپ کسے بہتر افسانہ نگار سمجھتے ہیں؟

کوثر۔ اپنی اپنی خصوصیات کے لحاظ سے مجھے یہ تینوں افسانہ نگار پسند ہیں۔ اُن کی فنی خصوصیات جو اُنہیں عظیم بناتی ہیں میری رائے میں مختلف ہیں۔ اس لحاظ سے ان تینوں ناموں کی ترتیب کرشن۔ منٹو اور بیدی ہی بہتر ہے۔ کرشن کو سب سے بڑا افسانہ نگار پہلے ہی کہہ چکا ہوں اور اس کے دلائل بھی میرے پاس ہیں۔

شاد۔ کیا دلائل ہیں؟

کوثر۔ کسی افسانہ نگار کی عظمت اور اہمیت کا اندازہ زندگی پر اُس کی گرفت، مشاہدے کی قوت، فنی چابک دستی اور مقصد کی بلندی ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ کرشن میں کم و بیش یہ سب اوصاف موجود ہیں۔ وہ کہانیوں کا مواد زندگی سے حاصل کرتا ہے۔ اُس زندگی سے جو ہر لحظہ لالہ و گل کی سی نیرنگیوں کے ساتھ نئے نئے انداز اور دلفریب طریقوں سے سامنے آنے کے لئے مچلتی رہتی ہے اُس کے موضوعات میں تنوع ہے۔ کرشن زندگی کے تیز و تند قافلے کا ساتھ نہیں چھوڑتا اور وقت کی تبدیلیوں پر نظر رکھتا ہے۔ زندگی اور فن پر اپنی گرفت کبھی ڈھیلی نہیں ہونے دیتا۔ اُس نے ہر دور میں زندگی اور اُس کے تقاضوں کو سمجھنے کی مخلصانہ کوشش کی ہے اور کبھی فن کو بے قابو نہیں ہونے دیا۔ وہ فن کا غلام نہیں بنا بلکہ فن کو اپنے زیر فرمان بنانے کی نمایاں کوشش کرتا رہا ہے۔ اُس نے ماحول اور شخصیت میں ہم آہنگی برقرار رکھی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ رومان کی لچھیوں اور رعنائیوں کے سہارے افسانہ نگاری کے میدان میں آیا لیکن ماحول کی تبدیلیوں کے ساتھ اُس کے فن میں بھی تبدیلیاں آتی رہیں۔ اور بالآخر وہ حقیقت پسندی کے سانچے میں ڈھل گیا۔ اُس کا ذہنی اور فکری ارتقاء ہی اُس کی ترقی کا ضامن ہے۔ فنی ارتقاء

[illegible]

شاد۔ کیا ہر اچھا ادیب اچھا انسان بھی ہوتا ہے؟

کوثر۔ بے شک ہر اچھے ادیب کو اچھا انسان بھی ہونا چاہئے لیکن ایسا عام طور پر ہوتا نہیں۔ بد قسمتی سے دونوں قسم کی مثالیں موجود ہیں تاہم میرا عقیدہ یہی ہے کہ اچھے ادیب کا پہلے اچھا انسان ہونا ضروری ہے۔

شاد۔ کیا ادب ادیب کی شخصیت کا ترجمان ہوتا ہے؟

کوثر۔ ادب میں ادیب کی شخصیت کا عکس ضرور ہوتا ہے۔

شاد۔ آپ کے خیال میں ہمارا نظریۂ ادب کیا ہونا چاہئے؟

کوثر۔ ادب کی تخلیق کا سب سے اچھا نظریہ انسان دوستی ہے ہر ادبی شہ پارے میں یہی روح اور یہی نظریہ ہونا چاہئے۔

شاد۔ کوثر صاحب! آپ کے جوابات درست اور صحت مند ہیں لیکن میں سوالات پوچھتے پوچھتے تھک گیا ہوں۔ اب یہ فرمائیے کہ آپ کے خیال میں ہندوستان میں اُردو زبان کا کیا مستقبل ہے؟

کوثر۔ شاد صاحب! آپ کی یہ تھکن بھی صحت مندی کی دلیل ہے۔ آپ کے اس سوال کے جواب میں عرض کروں گا کہ میں ہندوستان میں اُردو کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں۔ ہندوستانی حکومت اپنے مزاج اور کردار کے لحاظ سے مجبور ہے کہ ہر زبان کو پھلنے پھولنے کا موقع دے۔ اگر آج ایسا نہیں ہو رہا تو کل ضرور ہوگا۔ حالات خراب ضرور ہیں فضا بھی تاریک ہے۔ اُردو کی ابتدائی تعلیم کا بندوبست نہیں ہے اس کی جڑیں کٹتی جا رہی ہیں لیکن فضا بدلے گی اور ضرور بدلے گی۔

شاد۔ لیکن کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہندوستان میں اُردو کی بقا کی صرف یہی صورت ہے کہ دیوناگری رسم الخط اپنا لیا جائے۔ کیا آپ اس سے اتفاق کرتے ہیں؟

کوثر۔ ہرگز نہیں۔ رسم الخط تبدیل کر دینے سے میری رائے میں اُردو ختم ہو جائے گی۔ اس کی ساری خصوصیات فنا ہو جائیں گی۔ اُردو کی ترقی اور زندگی اس کے رسم الخط ہی سے وابستہ ہے۔

شاد۔ اچھا آخر میں صرف یہ پوچھنا چاہوں گا کہ آپ اب تک کتنے افسانے لکھ چکے ہیں؟

کوثر۔ [illegible]

شاد۔ کوثر صاحب! آپ کی یہ بات سُن کر مجھے آپ کے متعلق کنہیا لال کپور کا وہ لطیفہ یاد آ گیا...

کوثر۔ کون سا؟

شاد۔ جب وہ بھوپال میں آپ کے ہاں آئے تو انہوں نے آپ کے صاحبزادے سے پوچھا کہ کیوں بھئی کیا تم بھی کچھ لکھتے ہو اور آپ کے صاحبزادے نے جواب دیا جی ہاں افسانے لکھتا ہوں تو کپور صاحب نے ہنستے ہوئے فرمایا: میاں کوئی اور چیز لکھا کرو افسانے تو تمہارے ابا نے اتنے لکھ دیئے ہیں کہ اگر اُن کی آنے والی سات پشتیں بھی افسانہ نہ لکھیں تو بھی کسی شخص کو گلہ نہیں ہونا چاہئے .... اچھا کوثر صاحب! اب چلتے چلتے اللہ [illegible]!

سیونگز
بینک
اکاؤنٹ
کھولئے

غزل

[illegible]

[illegible] نہیں کرتے

چمن کا شوق ہے [illegible] نہیں کرتے

ہمارے دوستوں کی دوستی [illegible] ہے

یہ بادل گھر کے آتے ہیں مگر برسا نہیں کرتے

مرا دل ہر نئے غم کے لئے آنکھیں بچھاتا ہے

کہ گھبرا کے جہاں کو لوٹا یا نہیں کرتے

بسا اوقات اُن سے یوں ملا کرتے ہیں خلوت میں!

کہ اپنے ساتھ ہم خود کو بھی لے جایا نہیں کرتے

جو ممکن ہو تو بھر جلووں سے دامانِ نظر عشرت

بہاروں کے زمانے لوٹ کر آیا نہیں کرتے

غزل

علی احمد جلیلی ایم۔ اے

رسن و دار کی باتیں کیجے

گل نہیں خار کی باتیں کیجے

میرِ غالب کا زمانہ گزرا

میرے اشعار کی باتیں کیجے

دلِ بیمار کا رونا کب تک

دلِ بیدار کی باتیں کیجے

لبِ گلنار کا افسانہ نہیں

چشمِ خونبار کی باتیں کیجے

اے علیؔ جس میں خلوصِ فن ہو

ایسے فنکار کی باتیں کیجے

ایم۔ اے ناز قادری مظفرپوری

جب کبھی آپ یاد آئے ہیں

تارے پلکوں پہ جھلملائے ہیں

اُف رے مجبوریاں محبت کی

چوٹ کھا کر بھی مسکرائے ہیں

ہم کو اپنی بھی کچھ خبر نہ رہی

عشق میں وہ مقام آئے ہیں

ہوگئیں تیز دھڑکنیں دل کی

آپ جب بھی قریب آئے ہیں

راہِ اُلفت کی اُلجھنیں، توبہ!

ہر قدم پر فریب کھائے ہیں

غزل

ہر بھگوان شادؔ

تیرے کوچے کی زمیں کو آسماں سمجھا تھا میں

خاک کے ذروں کو رشکِ کہکشاں سمجھا تھا میں

ہر قدم پر ہے اک آفت اک خلش اک اضطراب

اِس جہاں کو عیش و عشرت کا جہاں سمجھا تھا میں

کشتیٔ عمرِ رواں کو جلد ساحل مل گیا

شادؔ بحرِ زندگی کو بیکراں سمجھا تھا میں

تکمیل کے لئے
پی پلیز
پی ہن ـــــ لپ سٹک
ہیمنا ـــــ مہندی
شنگار ـــــ کم کم

ہیمنا
مہندی
شنگار
کم کم

ہم بھی صاحبِ جائیداد ہو گئے

پروفیسر شفیقہ فرحت ایم۔ اے

گورنمنٹ کالج بھوپال

یکم اگست ۶۳ء

محترم خوشتر گرامی صاحب تسلیم

اس بار آپ کی خدمت میں ایک مضمون بھیج رہی ہوں۔ دراصل اس طنز کا ہدف ہمارے سماج کا وہ اقتصادی نظام ہے جس میں متوسط طبقہ خصوصیت کے ساتھ پس رہا ہے ...

نیازمند —— شفیقہ فرحت

قرض کی تو نہیں البتہ چائے ضرور پیتے تھے (کیونکہ غالب سے ازلی اور ابدی رشتہ ہے!) اور جانتے تھے کہ ایک دن یہ فاقہ مستی جس میں اب مستی بھی غائب ہوتی جا رہی ہے ضرور رنگ لائے گی!

تو صاحب وہ رنگ لائی اور ایسا رنگ لائی کہ ہماری عینک زدہ آنکھیں بھی چکا چوند ہو گئیں!

واقعہ کسی سال کے کسی مہینے کی کسی تاریخ کا ہے کہ ہماری ایک دوست نے شیطانِ اعظم اردو ناول کیا [illegible] کر اپنے گھر لے گئیں۔ ابھی تصوراتی اطمینان کا اور اتنی سانس بھی نہیں پایا تھا کہ اطلاع ملی [illegible] خانے کا جسے عرفِ خاص میں دولت خانہ (اگرچہ دولت سرے سے مفقود ہے) کہا جاتا ہے تالا توڑ دیا گیا ہے۔

گھر پہنچے [illegible] پوری ایک قوم تعزیت کرنے اور پسماندگان کو صبر کی تلقین کرنے جمع ہو گئی۔ اُن سب کو ہم نے اطمینان دلایا کہ اول تو ہمارا تالا ازل ہی سے ٹوٹا ہوا تھا۔ یہ پہلے سے ہاتھ کی صفائی تھی [illegible] کا اسمِ بامسمّٰی تھا۔ یعنی اُسے ہم اِس فنکارانہ خوبی سے چپکا دیتے تھے کہ وہ بند معلوم ہونے لگتا تھا! اس لئے اس واردات کو "تالا توڑنے" کا نام نہیں دیا جا سکتا۔

اور دوسرے یہ کہ دن کو اس طرح لُٹنے سے رات کو چوری کا خدشہ بھی جاتا رہا۔ اس لئے اب ان کو دعائیں دیتے ہوئے رات کو بغیر سلیپنگ پلز کھائے چین کی نیند سوئیں گے۔

اور گھر کی یہ حالت تھی کہ جب جب کوئی آتا ہمیں نہایت ہی فلسفیانہ اور راہبانہ انداز میں [illegible] —— "آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا!"

[illegible] ایک ریڈیو تھا جس میں ہر وہ اسٹیشن لگ جاتا جسے آپ لگانا نہ چاہتے ہوں! اور جس میں بیک وقت آدھے درجن اسٹیشن سنے جا سکتے تھے۔ ریڈیو سیلون کے [illegible] فلم [illegible] کی کہانی آکاش وانی کے [illegible] رنگی پروگرام [illegible] سے نکل گئے، ریڈیو پاکستان سے عربی فارسی میں خبریں، بمبئی سے ڈرامے، مدراس سے تامل میں آ۔ آ۔ اور جالندھر سے بے سُرے [illegible]۔ اور جب یہ نقطۂ عروج پر ہوتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ کسی میدانِ جنگ سے بمباری کا آنکھوں دیکھا اور کانوں سنا حال سنایا جا رہا ہے۔

اور ایک گھڑی تھی جو ممکن ہے کسی زمانے میں گھڑی رہی ہو لیکن اب اس میں اس قسم کے کوئی جراثیم نہیں پائے جاتے تھے۔

تو صاحب جب منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد کی زبوں حالی کا یہ عالم ہو تو چوری کا کیا غم! غم تھا تو صرف اس بات کا کہ غریب نے گھر کی ایک ایک چیز اُلٹنے پلٹنے میں کتنی محنت کی اور اُسے واپسی کے لئے بس کا کرایہ تک نہ مل سکا! بھلا وہ اپنے دل میں کیا سوچتا ہوگا۔ اس سے زیادہ بے عزتی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے ——؟ کہیں کل کلاں کو وہ اُلٹا ہمیں ہی منی آرڈر بھیج دے! یا دکھی بھارتیہ چور سبھا بنا کر ہم جیسے لوگوں کی فلاح و بہبود کے ذرائع نہ سوچنے لگے۔

خیر جو ہوا سو ہوا۔ مگر اب اپنے آڑے وقتوں کے لئے کہ جب گھر کی چھت پر بہ جائے ہمیں کچھ نہ کچھ بچا کے رکھنا چاہئے تھا۔ ہماری آمدنی اور خرچ کا حساب کچھ ایسا تھا کہ چاہے ہزار اکاؤنٹنٹ رکھے جاتے اور سیکڑوں کمیشن بٹھائے جاتے تب بھی اُن کی ایک دوسرے سے دوستی نہ ہوتی۔ اس لئے حساب کتاب کرنا یا بجٹ بنانا ایسا ہی تھا جیسے یو۔ این۔ او میں کشمیر کا مسئلہ اٹھانا —— اس جھنجھٹ میں پڑنے کے بجائے ہم نے اپنے VETO پاور سے کام لیتے ہوئے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ، نہ آگا دیکھا نہ پیچھا سو روپے اٹھا کے ایسی جگہ رکھوا دئے جہاں وہ ہمارے لئے بھی اجنبی بن گئے!

چار پانچ روز بخیر و خوبی گزر گئے اور ہمیں اپنے سو روپوں کی جدائی کا قطعی احساس نہ ہوا۔ بلکہ ہم خاصا فخر سا محسوس کر رہے تھے کہ ہم بھی صاحبِ جائیداد ہو گئے۔ گردن میں ایک خاص تناؤ اور چال میں رعونت پیدا ہو گئی —— اور راوی تو یہاں تک کہتا ہے کہ لب و لہجہ میں بھی انقلاب آ گیا۔

طنز

دستِ غیب

اقبال جعفری

ریونیو سیکشن میونسپل کونسل بھوپال (ایم پی)

۲۵/۵/۱۹۷۴ء

مکرمی! تسلیم

"بیسویں صدی کے لئے ایک طنزیہ ارسالِ خدمت ہے۔ اگر معیار کے مطابق ہو تو شاملِ اشاعت کر لیجئے۔ میں نے اِس طنزیہ میں جو حقیقت پیش کی ہے اُس سے بعض دفاتر یقیناً متاثر ہوں گے۔ ایسے واقعات ہر جگہ ہوتے رہتے ہیں مگر قانون جرم سمجھتا ہے نہ قابلِ تعزیر!!

آپ کا مخلص ـــــ اقبال جعفری

میری زندگی میں ایسے کتنے واقعات گذرے ہیں جنھیں اگر میں قلمبند کروں تو ایک ضخیم کتاب بن جائے ـــــ لیکن شاید ایک مختصر سا واقعہ آپ کو اس کتاب کے نفسِ مضمون سے روشناس کرا سکے گا۔

میں بھوپال ڈویژن کے ضلع عالم پور میں ایک دفترِ تحصیل کا کلرک ہوں۔ میرے بارے میں لوگ کلرک ہاراں دیدہ کہتے ہیں تو غلط نہیں ہے۔ کئی تحصیل دار اور نائب تحصیل دار اس تحصیل پر راج کرنے آئے اور چلے گئے لیکن بندہ کے مشورے کے بغیر کسی کی بھی گاڑی آگے نہ چل سکی۔ شیطان کی عنایتوں سے دستِ غیب اِس قسم کے دفتروں میں بہت زیادہ ہوتی ہے جسے چند بے وقوف "رشوت" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ بڑی چھوٹی رقومات ہماری جیبوں میں آنے کے لئے ہمیشہ اِرد گرد بے قرار پھرتی ہیں اور موقع محل دیکھ کر جیب کے اندر آ جاتی ہیں ـــــ دستِ غیب سے ہم ہاتھ نہیں کھینچ سکتے۔ ایک یہ کہہ کر دل کو تسلی دے لیتے ہیں کہ "اللہ دے اور بندہ لے" کا مضمون ہے۔ جب خود بخود رقمیں آ رہی ہیں تو آنے دو۔ کیونکہ اُن مولوی صاحب کی مثال سامنے رہتی ہے جن کی بیوی نے ایک دن کسی پڑوسی کا مرغ چرا کر پکا ڈالا تھا۔ مولوی صاحب کھانا کھانے بیٹھے تو بیوی سے مرغ کے بارے میں استفسار کیا۔ اور جب حقیقت سامنے آئی تو بے تحاشہ لاحول اور استغفر اللہ کی گردان شروع کر دی۔ لیکن بھوک تیز تھی اس لئے فرمایا "مجھے خالی شوربہ دو ـــــ بوٹی نہ دو ـــــ" بیوی نے حکم کی تعمیل میں پتیلی میں سے طشتری میں شوربہ اُنڈیلنا شروع کیا۔ اتفاق سے شوربہ کے ساتھ ایک ٹانگ بھی طشتری میں پہنچ گئی۔ بیوی نے فوراً ٹانگ واپس اُٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ تو مولوی صاحب فرمانے لگے "اگر خود بخود آ رہی ہے تو مضائقہ نہیں ـــــ آنے دو ـــــ" ہاں تو جناب! اِس طرح ہم تحصیل کے کلرکوں کو دستِ غیب خود بخود ہوتی ہے۔ ہم کوئی کوشش نہیں کرتے۔ بالکل ہاتھ پیر نہیں ہلاتے۔ قطعی جد و جہد نہیں کرتے۔ کرسی پر بیٹھے بیٹھے رقومات آتی رہتی ہیں۔ 'دستِ غیب' سے ہم اس لئے بھی نہیں کترا سکتے کہ یہ ایک دستور سا ہے۔ بڑے بڑے افسروں سے لے کر معمولی دربان تک کو اُس کے عہدے اور کام کی نوعیت کے اعتبار سے 'دستِ غیب' ہوتی ہے۔ اور ہم اُس 'دستِ غیب' کو مختلف تاویلوں اور دلیلوں سے اپنے اوپر جائز تصور کر لیتے ہیں اور ضمیر کو مطمئن کر دیتے ہیں خواہ وہ مطمئن ہو یا نہ ہو!

خیر جناب! ـــــ جو واقعہ میں بیان کرنے والا ہوں یہ اُس زمانے کا ہے جب ایک نئے تحصیل دار صاحب تشریف لائے۔ اُن کے علم میں یہ بات بہت جلد ہی آ گئی کہ دفتر کا کون سا کلرک کس کام کے لئے مناسب ہے۔

ہماری تحصیل کے گاؤں نصرت گنج میں مویشی بکثرت ہیں لیکن اُن کے نہلانے اور پانی پلانے کا وہاں کوئی بندوبست نہیں ہے۔ اور نہ گاؤں ہی والوں کو اِس بات کی کوئی فکر ـــــ! نئے تحصیل دار صاحب نے تشریف لاتے ہی سب سے بڑا اور اہم کام یہ کیا کہ اُس گاؤں کے بسنے والوں کی آسانی اور سہولت کے لئے ضلع کے کلکٹر صاحب سے وہاں ایک تالاب بنوانے کی منظوری لے لی تاکہ مویشیوں کو پانی پلانے اور نہلانے کی آسانی فراہم کی جا سکے اور کنوؤں وغیرہ سے مویشی محفوظ رہ سکیں۔ تالاب بنانے کی منظوری کے ساتھ ساتھ چند دن بعد رقم بھی وصول ہو گئی۔ رقم بڑی تھی۔ گاؤں والوں کو تالاب کی تمنا تھی۔ اور معاملہ صرف تحصیل دار صاحب، نائب تحصیل دار صاحب اور خادم تک محدود تھا۔ نتیجہ جو ہونا تھا وہ ہوا یعنی گاؤں والوں کی فلاح و بہبود کے بجائے تحصیل دار صاحب، نائب صاحب اور خود میرے گھر کی فلاح و بہبود کا معقول انتظام ہو گیا۔

آپ جانتے ہی ہیں کہ تحصیل کے دفتروں میں تحصیل دار اور نائب تحصیل دار تو آنی جانی

افسانہ

تصویریں

پروفیسر ظفر احمد نظامی ایم۔ اے

شعبہ سیاسیات گورنمنٹ ڈگری کالج دتیا (مدھیہ پردیش)

۲۸ جولائی ۱۹۶۴ء برادر محترم! تسلیمات

"افسانہ نمبر اپنی سابقہ روایات کے مطابق اور توقعات سے بڑھ چڑھ کر اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ ہر تخلیق اپنی جگہ کامیاب ہے۔ فنکاروں کی گھریلو زندگی سے متعلق تصاویر کا سلسلہ بہت شاندار ہے۔ بیسویں صدی کے علاوہ شاید ہی کوئی جریدہ ادبی تخلیقات کے خالقوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے متعلق اتنی دلچسپی لیتا ہو۔ ———— مئی کے آخری دن بہت منحوس خبروں سے منسلک رہے جب محبوب وزیر اعظم جواہر لال نہرو چلتے پھرتے ہم سے رخصت ہو گئے۔ اردو شعراء و ادباء بھی اس موقع پر خراج عقیدت پیش کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں رہے جس کا ثبوت مختلف اخبارات و رسائل کے سیاہ صفحات کے علاوہ افسانہ نمبر کی وہ تحریریں ہیں جو شاید شمارے کی تکمیل کے بعد شریک اشاعت کی گئیں۔ ———— مصروفیتوں کے بعد جون کا آخری حصہ دوستوں کی قہقہہ بار مانوس محفلوں میں اندور میں گزارنے کے بعد تعطیلات گرما کے اختتام پر یکم جولائی کو دتیا پہنچا تو حقیقتیں خواب کا روپ بدل کر نظروں سے اوجھل ہو گئیں اور اب صرف ان کا عکس باقی رہ گیا ہے۔

آپ کا ———— ظفر احمد نظامی

ڈرائنگ روم میں ٹہلتے ٹہلتے اس کی نظر کیلنڈر پر جا پڑی اور وہ مسرور ہو اٹھا۔ دل کی دھڑکنیں تیز تر ہو گئیں۔ وہ تاریخ آ پہنچی تھی جس کا انتظار وہ کئی دن سے کر رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی لہر دوڑ گئی اور آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس کی شہناز طویل علالت کے بعد صحت یاب ہو کر واپس آ رہی تھی۔

اور پھر اس کی نظریں دیوار پر آویزاں اس کی بنائی ہوئی ان دو تصویروں پر مرکوز ہو کر رہ گئیں جن میں خزاں اور بہار کی عکاسی کی گئی تھی اور اس کے ذہن کے صحیفے میں پچھلی یادوں کے باب کھل گئے۔ وہ ایک آرٹسٹ تھا اپنے ملک کا مشہور آرٹسٹ جس کی تصویریں ہزاروں روپے میں فروخت ہوتی تھیں جس طرح حکومت اس کے فن کی قدر کرتی تھی اسی طرح عوام بھی اس کی تصویروں کے گرویدہ تھے۔ حکومت نے اسے بہت سی سہولتیں دی تھیں تاکہ وہ اپنے فن کو تکمیل کی بلندی تک پہنچائے۔ ملک کی بہت سی توقعات اس سے وابستہ تھیں۔ لوگ اس کی تصویریں خریدنے کی جرأت نہیں کرتے تھے لیکن یہ خواہش ہر شخص کو ہوتی تھی کہ جاوید کبھی اس کا اسکیچ ہی بنا دے۔ معیار کی یہ بلندی اس کے ہر شہ پارے سے نمایاں تھی۔ جب دوشیزہ کا اسکیچ وہ بنا دیتا وہ اپنی ہی نگاہوں میں حسین معلوم ہونے لگتی۔ یہی وجہ تھی کہ دوشیزائیں اس سے اپنے اسکیچ بنوانا اپنی خوش نصیبی سمجھتی تھیں۔ اس کی تصویریں نمائش کی جان ہوا کرتی تھیں۔ وہ صبح سے شام تک مصروف رہتا تھا نہ کھانے پینے کی فکر تھی نہ نہانے اور لباس تبدیل کرنے کی۔ وہ سارا وقت اپنے فن کو بلندیوں تک پہنچانے میں صرف کرتا کبھی حسین سے حسین مجسموں کو اپنے موقلم سے کاغذ پر منتقل کر کے ان میں کشش پیدا کرتا کبھی خوبصورت مناظر کی تصویر کشی کر کے قدرت کی معصوم مسکراہٹوں کو اپنی گرفت میں لانے کی کوشش کرتا۔

وہ ہر لڑکی سے تصویر بنانے کا وعدہ نہیں کیا کرتا تھا لیکن شہناز سے پہلی ہی ملاقات میں اس نے تصویر بنانے کا وعدہ کر لیا۔ وہ اسے سامنے بٹھا کر اس کی تصویر بنانا چاہتا تھا۔ شہناز بھی اچھے ذوق کی حامل تھی۔ اس میں صحیح داد دینے کا سلیقہ تھا۔ وہ شہر کے ایک معزز گھرانے کی تعلیم یافتہ لڑکی تھی۔ شہناز بیٹھ گئی، ایک دیوی کے مانند برش حرکت کرنے لگا اور رنگین نقوش ابھرتے گئے۔ وہ بڑی کوشش اور توجہ سے مختلف زاویوں کو ملا کر شہناز کے خد و خال بنانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن تصویر کی تکمیل ہونے میں نہ آتی تھی۔ وہ ہر زاویے سے فن کا ایک نادر شاہکار بنانا چاہتا تھا۔ وہ تصویر بنانے میں اتنا محو تھا کہ اپنے گرد و پیش کی بھی خبر نہیں تھی اور شہناز بھی کچھ اس طرح اس کے سامنے فنکارانہ انداز سے بیٹھی جیسے وہ کوئی دیوتا ہو اور وہ اس کی پجارن ہو۔ وہ برش انگلیوں میں تھامے اسے اس طرح گردش دے رہا تھا جیسے کوئی ستار پر کوئی دھن چھیڑ رہا ہو۔ شہناز اجنتا کے کسی بت کی طرح خاموش بیٹھی مصور کے کمال فن کا

اپنے آپ کو اور بال بچوں کو

چیچک

سے بچانے کے لئے

ٹیکا اور دوبارہ ٹیکا لگوایئے

چیچک سے موت ہوسکتی ہے * اس بیماری میں آنکھیں ضائع ہوسکتی ہیں * اس سے چہرہ بدنما ہوسکتا ہے

چیچک کے اِنسداد میں ہاتھ بٹایئے

اِنسدادِ چیچک کا قومی پروگرام ، وزارتِ صحت ، بھارت سرکار

DA 64/...

[illegible] تصویر کی بستہ [illegible] ایک دوسرے کی شبیہیں [illegible] شہناز کے حسن [illegible] اُس نے اپنے ذہن میں زندگی بھر کی محنت کی آخر کار [illegible] مسلسل محنت کے بعد تصویر مکمل ہو گئی [illegible] منظر عام پر آئی ہوئے [illegible] حقیقت [illegible] رنگوں کا ایک پیکر تھا جس میں [illegible] باقی [illegible] وقت [illegible] وہ جب کسی کی تصویر بنانے کی کوشش کرتا لیکن نہ جانے اس کا تصور شہناز کے خطوط کے گرد رقص کرتا رہتا۔ اُدھر شہناز بھی اُس کے بغیر اپنے وجود کو نامکمل سمجھتی۔ آخر کار دونوں کے درمیانی فاصلے سمٹ گئے اور دونوں ایک ہو گئے۔

دن گزرتے گئے، جاوید کی ہر تصویر حسن کاری کا بہترین نمونہ ہوتی۔ اُس کی انگلیوں میں ایسا جادو تھا کہ جس وقت برش کو رنگ میں ڈبو کر سادہ کینوس پر حرکت دیتا تو فن اپنے تمام تر لوازمات کے ساتھ تصویر میں ڈھلنے لگتا اور کوئی شاہکار عالمِ وجود میں آ جاتا۔ انھیں دنوں کی یادگار اُس کی بنائی ہوئی ایک تصویر تھی۔ جب شہناز اُس کے کام میں ہاتھ بٹایا کرتی تھی اور وہ زندگی کی راہوں پر اُس کے قدم سے قدم ملا کر ترقی کی منزل کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اچانک شہناز بیمار ہو گئی۔ وہ طول پکڑتی گئی اور اُس کی [illegible] اُس کے لیے سوہانِ روح بن گئی۔ وہ اپنے فن کو مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ علاج کے باوجود شہناز کی بیماری بڑھتی گئی، اُس کی مسکراتی آنکھیں بے کیف ہونے لگیں، چہرے کی رنگینیاں آہستہ آہستہ ماند پڑ گئیں۔ وہ بہت اُداس رہنے لگا، اُس کا جی کسی کام میں نہ لگتا، اُس نے تصویریں بنانا چھوڑ دیا؟ اب صرف ایک ہی فکر تھی اور وہ تھی شہناز کی فکر۔ جو وقت کے موذی مرض میں مبتلا ہو کر سسک رہی تھی۔ وہ اکثر راتوں کو اٹھ کر شہناز کی تصویر سے باتیں کیا کرتا تھا اور زندگی کی ہر شے اُس پر قربان کرنے کے لیے تیار تھا۔ وہی شہناز جس نے اُسے عظیم فنکار بنایا تھا۔

طبی مشورے پر وہ اُسے پہاڑ پر لے گیا جہاں علاج بہت معقول تھا لیکن وہ اُمید و یاس کی کشمکش میں جھولتا رہتا تھا۔ خوفناک تصورات کہر کی مانند اُس کے دل و دماغ پر چھائے رہتے۔ وہ اُس کی دیکھ بھال کرتا جا رہا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے شہناز نہیں وہ خود بیمار ہو۔ اور اُسے وہ دن یاد آ گیا جب وہ ایک انتہائی ضروری کام کے سلسلے میں شہر میں اپنے گھر آیا تھا۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا اگر دو روز میں طبیعت نہ سنبھلی تو شہناز کا بچنا محال ہے۔ شہناز کو ایسے نازک لمحات میں تنہا چھوڑ کر جانا اُس کے لیے ناممکن تھا لیکن جائے بغیر کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ عجیب کشمکش تھی، ایسی ذہنی اُلجھن جس کا کوئی حل نہ تھا۔ شہناز بھی کبھی نہیں چاہتی تھی کہ وہ جائے لیکن اُسے منع بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اُس کا شہر جانا ضروری تھا۔ انتہائی غمناک حالت میں سینی ٹوریم سے رخصت ہوتے وقت شہناز کی کانپتی آواز اُبھری۔

"خدا حافظ!"

"خدا حافظ شہناز۔" اُس نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔

"دیکھو دیر نہ کرنا واپسی میں!"

"ہرگز نہیں، میں پرسوں تک واپس آ جاؤں گا۔"

"لیکن میرا دل بیٹھا جا رہا ہے، ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ ہم ہمیشہ کے لیے بچھڑ رہے ہیں، اب پھر نہ مل سکیں گے۔"

"تم تو دیوانی ہو۔" اُس نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

"جاوید، یہ ہم نہیں تقدیر ہے۔" اُس نے انتہائی کرب کے عالم میں کہا۔

"نہیں شہناز، تم میرا انتظار کرو گی!"

اور وہ بھاری اور غم سے نڈھال دل لیے شہر جا پہنچا۔ اُس کی آنکھوں میں بچھڑنے کا منظر گھوم رہا تھا اور کانوں میں "خدا حافظ" کی کانپتی ہوئی آواز گونج رہی تھی۔ اُس کی نگاہیں بھٹک گئیں اور اُسے ہر شخص پریشان ہوتا نظر آیا۔ بہت سے توہم پیدا ہونے لگے، ہر آواز اُس کے لیے مایوسی کا پیغام بن گئی، ہر نظارہ بھیانک ہوتا چلا گیا۔ وہ گھر پہنچا۔ جلدی جلدی ملازموں سے حالات معلوم کرکے باہر نکل رہا تھا کہ دروازے پر تار والے سے نگاہ ملتے ہی ہوش اُڑ گئے۔ حواس ڈوبنے لگے، یقیناً یہ تار کسی حادثہ کی منحوس خبر سے منسلک ہوگا۔ اُس نے اپنا سر پکڑ لیا، اُس کے چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ اُس میں تار کھول کر پڑھنے کی ہمت نہ رہی۔ اُس نے سوچا اس میں یقیناً شہناز کے بچھڑ جانے کی بری خبر ہوگی۔ اُسے شہناز کے آخری الفاظ یاد آنے لگے: "خدا حافظ، خدا حافظ!" کی چیخوں سے سر کا گوشہ گونجنے لگا۔ آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔ وہ گھبرا اُٹھا، ہمت کرکے تار کھولا تو مایوسی کے پردے سے تبسم کی ایک جھلک نمودار ہوئی۔ تار میں ملکی نمائش میں اُس کی تصویر پر پہلے انعام کے لیے اُسے مبارکباد دی گئی تھی۔ اُسی وقت ٹیلیفون کی گھنٹی بجی جس میں ڈاکٹروں نے اُس کی بیوی کی طبیعت کے بارے میں اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے اُس کے روبصحت ہونے کی خوشخبری دی تھی۔ دشوار ترین لمحے نکل چکے تھے۔ اُس نے چلتے وقت ڈاکٹروں سے درخواست کی تھی کہ وہ شہناز کے حالات سے جلد جلد اُسے مطلع کرتے رہیں۔

وہ اپنی گھبراہٹ اور حماقت پر مسکرا اُٹھا، شرم بھی محسوس ہوئی۔ کتنا عجیب اتفاق تھا، دونوں خوشخبریاں ایک ساتھ ملیں۔ وہ اپنے ضروری کام کی تکمیل کے بعد شہناز کے پاس پہنچا تو وہ روبصحت تھی۔ انھوں نے کئی دن ساتھ گزارے، اُس نے شہناز کو تار والی بات بھی بتائی اور اپنی حماقت کا تذکرہ بھی کیا۔ شہناز نے بین الاقوامی نمائش کے لیے اُس سے تصویر بنانے کا اصرار کیا۔ قومی حکومت کی جانب سے حوصلہ افزائی کرتے ہوئے اس اُمید کا اظہار کیا گیا تھا کہ اُس کی تصویر بین الاقوامی نمائش میں بھی اول رہے گی۔ اُس نے دل و جان سے بڑی لگن کے ساتھ تصویر بنا کر بھیج دی۔

اور آج اُس کی شہناز صحت یاب ہو کر واپس آ رہی تھی۔ اُسے شہر آئے ہوئے کئی دن ہو چکے تھے۔ قومی نمائش کی تصویر پر اول انعام اور شہناز کی صحت یابی کی خبریں اُس کے دوستوں تک پہنچ گئی تھیں۔ وہ شہناز کا شاندار استقبال کرنا چاہتا تھا، اسی لیے اُس نے ایک پارٹی میں اپنے احباب کو مدعو کر لیا تھا۔ موسم کی خرابی کے باعث ٹیلیفون خراب ہو گیا تھا، ویسے اُسے اطلاع مل گئی تھی کہ شہناز ہوائی جہاز سے پہنچ رہی ہے۔ اُس کی نظریں تصویروں سے ہٹ کر [illegible] پر جا پڑیں۔ اور وہ

اپنے آپ کو اور بال بچوں کو

ٹیکا اور دوبارہ ٹیکا لگوایئے

چیچک سے موت ہو سکتی ہے * اس بیماری میں آنکھیں ضائع ہو سکتی ہیں * اس سے چہرہ بدنما ہو سکتا ہے

چیچک کے اِنسداد میں ہاتھ بٹایئے

اِنسدادِ چیچک کا قومی پروگرام ' وزارتِ صحت ' بھارت سرکار

DA 66/580

دلہن بنی ہوئی اعتراف کر رہی تھی کہ حقیقت میں شہناز کی شبیہ تصویر ہی سے بنی تھی۔ تصویر آہستہ آہستہ اُس کی تصویر کاغذ پر نہیں بلکہ ذہن کے نہاں خانے میں بن گئی۔ ایک دوسرے کی شبیہیں ترجمانی کرتی تھیں۔ شہناز کے حُسن نے اُسے تخیل کی دولت بخشی۔ اُس نے اپنے فن میں تازگی محسوس کی۔ آخر کار کئی دن کی مسلسل محنت کے بعد تصویر مکمل ہو گئی جو ایک شاہکار کے روپ میں منظرِ عام پر آئی۔ جو اُسے دیکھتا دیکھتا ہی رہ جاتا تھا۔ لیکن حقیقت تو مختلف رنگوں کا ایک پیکر تھا جس میں ابھی روح پھونکنی باقی تھی۔ اب اُس کا وقت مشکل سے کٹتا۔ وہ چاہتا کہ کسی کی بھی تصویر بنانے کی کوشش کرتا لیکن نہ جانے کیوں اُس کا تصور شہناز کے خطوط کے گرد رقص کرتا رہتا۔ اُدھر شہناز بھی اُس کے قریب ہونے کو بے چین تھی۔ آخر کار دونوں کے درمیانی فاصلے فاصلے نہ رہے اور دونوں ایک ہو گئے۔

دن گزرتے گئے۔ جاوید کی ہر تصویر حُسن کاری کا بہترین نمونہ ہوتی۔ اُس کی انگلیوں میں ایسا جادو تھا کہ جس وقت برش کو رنگ میں ڈبو کر سادہ کینوس پر حرکت دیتا تو فن اپنی تمام نزاکتوں کے ساتھ تصویر میں ڈھلنے لگتا اور کوئی شاہکار عالمِ وجود میں آجاتا۔ انھیں دنوں کی یادگار اُس کی بنائی ہوئی تصویر گہوارہ تھی۔ جب شہناز اُس کے کام میں ہاتھ بٹایا کرتی تھی اور وہ زندگی کی راہوں پر اُس کے قدم بہ قدم چل کر ترقی کی منزل کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اچانک شہناز بیمار ہو گئی۔ وہ طول پکڑنے لگی جیون ساتھی کی بیماری اُس کے لئے سوہانِ روح بن گئی۔ وہ اپنے فن کو مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ علاج کے باوجود شہناز کی بیماری بڑھتی گئی۔ اُس کی مسکراتی آنکھیں بے کیف ہونے لگیں۔ چہرے کی رنگینیاں آہستہ آہستہ غائب ہوتی گئیں۔ وہ بہت اُداس رہنے لگا۔ اُس کا جی کسی کام میں نہ لگتا۔ اُس نے تصویریں بنانا چھوڑ دیا۔ اب اُسے صرف ایک ہی فکر تھی اور وہ تھی شہناز کی فکر! جو دِق کے موذی مرض میں مبتلا ہو کر سسک رہی تھی۔ وہ اکثر راتوں کو اُٹھ کر شہناز کی تصویر سے باتیں کیا کرتا تھا اور زندگی کی ہر شے اُس پر قربان کرنے کے لئے تیار تھا۔ وہی شہناز جس نے اُسے عظیم فنکار بنایا تھا۔

طبی مشورے پر وہ اُسے پہاڑ پر لے گیا جہاں علاج بہت معقول تھا لیکن وہ اُمید و یاس کے دھندلکوں میں بھٹک رہا تھا۔ غمناک تصورات کُہر کی مانند اُس کے دل و دماغ پر چھائے رہتے۔ وہ کمزور اور نڈھال ہوتا جا رہا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے شہناز نہیں وہ خود بیمار ہو۔ اور اُسے وہ شام یاد آگئی جب وہ ایک انتہائی ضروری کام کے سلسلے میں شہر میں اپنے گھر آیا تھا۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ اگر دو روز میں طبیعت نہ سنبھلی تو شہناز کا بچنا محال ہے۔ شہناز کو ایسے نازک لمحات میں تنہا چھوڑ کر جانا اُس کے لئے ناممکن تھا لیکن جائے بغیر کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ عجیب کشمکش تھی۔ ایسی ذہنی اُلجھن جس کا کوئی حل نہ تھا۔ شہناز بھی نہیں چاہتی تھی کہ وہ جائے لیکن اُسے منع بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اُس کا شہر جانا بے حد ضروری تھا۔ انتہائی غمناک حالت میں سینی ٹوریم سے رخصت ہوتے وقت شہناز کی کانپتی ہوئی آواز اُبھری۔

"خدا حافظ!"

"خدا حافظ شہناز۔" اُس نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔

"دیکھو دیر نہ کرنا واپسی میں!"

"ہرگز نہیں میں پرسوں تک واپس آجاؤں گا۔"

"لیکن میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ ہم ہمیشہ کے لئے بچھڑ رہے ہیں۔ اب پھر نہ مل سکیں گے۔"

"تم خود بھی ہو۔" اُس نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

"جاوید! یہ وہم نہیں یقین ہے۔" اُس نے انتہائی کرب کے عالم میں کہا۔

"نہیں شہناز، تم میرا انتظار کرو گی۔"

اور وہ بھاری اور غم سے نڈھال قدموں سے شہر جا پہنچا۔ اُس کی آنکھوں میں بچھڑنے کا منظر گھوم رہا تھا اور کانوں میں "خدا حافظ" کی کانپتی ہوئی آواز گونج رہی تھی۔ اُس کی نگاہیں جھکنے لگیں اور اُسے ہر شخص پر شک ہونے لگا۔ ہر شے سے توہم برسنے لگا۔ ہر آواز اُس کے لئے مایوسی کا پیغام بن گئی۔ یہ نظارہ بھیانک ہوتا چلا گیا۔ وہ گھر پہنچا۔ جلدی جلدی ملازموں سے حالات معلوم کر کے باہر نکل ہی رہا تھا کہ دروازے پر تار پڑا ہوا دیکھا۔ نگاہ ملتے ہی ہوش اُڑ گئے۔ حواس ڈوبنے لگے۔ یقیناً یہ تار کسی حادثہ کی منحوس خبر سے منسلک ہوگا۔ اُس نے اپنا سر پکڑ لیا۔ اُس کے چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ اُس میں تار کھول کر پڑھنے کی ہمت نہ رہی۔ اُس نے سوچا اِس میں یقیناً شہناز سے بچھڑ جانے کی بُری خبر ہوگی۔ اُسے شہناز کے آخری الفاظ یاد آنے لگے: "خدا حافظ، خدا حافظ!" کی چیخوں سے سارا کمرہ گونجنے لگا۔ آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے، وہ گھبرا اُٹھا۔ ہمت کر کے تار کھولا تو مایوسی کے پردے سے تبسم کی ایک جھلک نمودار ہوئی۔ تار میں ملکی نمائش میں اُس کی تصویر پر پہلے انعام کے لئے اُسے مبارکباد دی گئی تھی۔ اُسی وقت ٹیلیفون کی گھنٹی بجی جس میں ڈاکٹروں نے اُس کی بیوی کی طبیعت کے بارے میں اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے اُس کے روبصحت ہونے کی خوشخبری دی تھی۔ دشوار ترین لمحے نکل چکے تھے۔ اُس نے چلتے وقت ڈاکٹروں سے درخواست کی تھی کہ وہ شہناز کے حالات سے جلد جلد اُسے مطلع کرتے رہیں۔

وہ اپنی گھبراہٹ اور حماقت پر مسکرا اُٹھا۔ شرم بھی محسوس ہوئی۔ کتنا عجیب اتفاق تھا۔ دونوں خوشخبریاں ایک ساتھ ملیں۔ وہ اپنے ضروری کام کی تکمیل کے بعد شہناز کے پاس پہنچا تو وہ روبصحت تھی۔ انھوں نے کئی دن ساتھ گزارے۔ اُس نے شہناز کو تار والی بات بھی بتائی اور اپنی حماقت کا تذکرہ بھی کیا۔ شہناز نے بین الاقوامی نمائش کے لئے اُس سے تصویر بنانے کا اصرار کیا۔ قومی حکومت کی جانب سے حوصلہ افزائی کرتے ہوئے اِس اُمید کا اظہار کیا گیا تھا کہ اُس کی تصویر بین الاقوامی نمائش میں بھی اوّل رہے گی۔ اُس نے دل و جان سے بڑی لگن کے ساتھ تصویر بنا کر بھیج دی۔

اور آج اُس کی شہناز صحت یاب ہو کر واپس آرہی تھی۔ اُسے شہر آئے ہوئے کئی دن ہو چکے تھے۔ قومی نمائش کی تصویر پر اوّل انعام اور شہناز کی صحت یابی کی خبریں اُس کے دوستوں تک پہنچ گئی تھیں۔ وہ شہناز کا شاندار استقبال کرنا چاہتا تھا۔ شام ہی اُس نے ایک پارٹی میں اپنے احباب کو مدعو کر لیا تھا۔ موسم کی خرابی کے باعث ٹیلیفون خراب ہو گیا تھا۔ ویسے اُسے اطلاع مل گئی تھی کہ شہناز ہوائی جہاز سے پہنچ رہی ہے۔ اُس کی نظریں تصویروں سے ہٹ کر بار بار کلینڈر پر جا پڑتی ہیں۔ اور وہ

سمجھ سکے۔

تھوڑی دیر بعد اُس کے احباب جمع ہو گئے۔ پارٹی کا انتظام کرنا ہی تھا اب وہ بہت مشتاق سے بیٹھ ... شروع ہو گئیں۔ اُس کے فن کو سراہ ... کا ذکر بھی اُس کی کامیابی ... تھا۔

"بھئی تم بہت خوش نصیب ہو" ایک دوست نے رشک سے کہا۔

"کیوں؟"

"تمہیں تو بہت ... ہو"

"یہ تو شہناز بھابی کا کرم ہے" دوسرے دوست نے چٹکی لی۔

"بات تو بالکل ٹھیک ہے" سب نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"تمہاری بنائی تصویریں بہت خوبصورت ہوتی ہیں دوست!" ایک دوست نے تعریف کرتے ہوئے کہا۔

"واقعی یہ بات تو ہے" دوسرے نے تائید کی۔

"تمہاری ہر تصویر سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ تمام فن ختم کر دیا ہے اس پر۔"

"نہیں کیا، ہر تصویر ایک شاہکار ہوتی ہے۔"

چائے آگئی سب اطمینان سے بیٹھے اور باتوں میں محو ہو گئے۔ جاوید اپنی شہناز کے خیال میں گم ہو گیا۔ وہ خود اُسے لینے کے لئے سہارنپور جانا چاہتا تھا لیکن مصروفیتوں نے مہلت نہیں دی اور شہناز کو لانے کے لئے اُس نے اپنے ایک عزیز دوست کو بھیج دیا۔

اُس کا دل اِن کی باتوں میں نہیں تھا۔ وہ تو بس اُن کا ساتھ دے رہا تھا کہ اتنے میں تار والا آپہنچا اور جاوید کو یاد آیا کہ آج بین الاقوامی نمائش کا نتیجہ آنے والا تھا۔ شہناز کی آمد کی خوشی نے سب کچھ بھلا دیا تھا۔ اُس کے دوست خوشی سے جھوم اُٹھے۔

"مبارک ہو! مٹھائی کھلاؤ!"

"اول انعام آیا ہوگا!"

"یار ہو بڑے خوش نصیب! شہناز بھابی نے اپنی آمد سے پہلے ہی تمہیں اول انعام دلا دیا۔"

اُس نے انتہائی خوشی کے عالم میں تار کھولا۔ لیکن اُس کا رنگ زرد ہو گیا۔ تار میں شہناز کی اچانک موت کی اطلاع تھی۔

خیالؔ امروہوی

قطعات

بادہ خانہ کو کوئی قدم نہ اٹھا
جانبِ کعبہ ورنگ بڑھتا جا
شیخ صاحب سے لعنتیں سُن لے
اور مسلسل درُود پڑھتا جا

★

مستی میں لاکھ بادہ گساری کے باوجود
واعظ سے رندِ شہر کا اونچا مقام ہے
آوارگی کو دیکھ کے یوں بدگماں نہ ہو
آوارگی تو پھول کی خوشبو کا نام ہے

★

انصاف کے بھی خوب طریقے ہیں ان دنوں
ظلم و ستم ہی جس کی پرانی اساس ہے
ہے کتنی دلخراش یہ تقسیم اختیار
پتھر تمہارے پاس ہیں سر میرے پاس ہے

دستورِ میکشی میں بڑی سادگی کے ساتھ
کہتے ہیں اِک حسین سی ترمیم ہو گئی
پیرِ مغاں سے جتنی ملی تھی مجھے شراب
وہ صوفیانِ شہر میں تقسیم ہو گئی

★

نجات غم سے دلانے کا جن کو دعویٰ ہے
وہ پہلے گوشۂ زنداں میں لائے جاتے ہیں
پھر اُس کے بعد اچانک یہی کرم فرما
میرِ شہر کے ایوان میں پائے جاتے ہیں

★

حُسن کا مُدعا ہے کسبِ معاش
عشق کی رگ اسی سے دُکھتی ہے
یوں تو سو بار دل لگا، لیکن
بات پیسے پہ آکے رُکتی ہے

COMET
COMET
COMET
SERVAS/DC/12

افسانہ

بزدل

شمیم جواری

لودنا کولیری، جھریا (بہار)

۶ جولائی ۱۹۶۴ء

محترم بندہ! تسلیم

آپ کا نام خورشید ہے، میں اپنے حلقے میں خوشترین سمجھا جاتا ہوں! ——— کہانیاں چار سال سے لکھ رہا ہوں اور ہند و پاک کے اکثر معیاری رسالوں میں چھپتا بھی رہتا ہوں لیکن "بیسویں صدی" میں لکھنے کی آرزو کیا کہوں کہ رسوا نہ پر تلی ہوتی ہے۔ آج ایک کہانی "بزدل" لے کر حاضر ہو رہا ہوں۔ آپ نئے ناموں سے بڑی شفقت رکھتے ہیں۔ اس لئے امید بندھی ہے کہ آپ اس کہانی کو بھی شرف قبولیت بخشیں گے...

خلوص کار ——— شمیم جواری

چنداوتی کے آخری دو خطوط جو مجھے ملے تھے ان سے بھی یہ بات ظاہر ہوتی تھی کہ وہ شدید ذہنی ہیجان میں مبتلا ہے۔ بلکہ اس نے تو یہاں تک لکھ دیا تھا کہ وہ شادی کے منڈپ سے بھاگ جائے گی۔ اس کی یہ دھمکی محض دھمکی نہ تھی کیونکہ وہ سخت ضدی اور خودسر لڑکی تھی۔ اگر وہ ایک غریب کائستھ کے گھر جنم لینے کی بجائے کسی بڑے آدمی کے گھر پیدا ہوتی تو لوگ اس کے نام سے تھر تھر کانپا کرتے۔ وہ تھی ہی ایسی۔ اور شاید اسی لئے اس کے گھر کے سارے لوگ اس سے ایک حد تک بدظن بھی رہتے تھے اور خوفزدہ بھی۔ خوفزدہ اس لئے کہ اس کی خودسری کا بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کون جانے یہ ضدی لڑکی کب کیا کر بیٹھے۔

اسی لئے جب اس کے بھائی رام دیال کا ٹیلیگرام مجھے ملا کہ چنداوتی غائب ہے تو مجھے سخت تشویش ہوئی۔ آخر وہی ہوا، وہی ہوا.... آخر اس نے سارے بندھن توڑ دیئے۔ اس نے ضابطے کو ٹھکرا دیا۔ رام دیال کے بوڑھے غریب باپ کی عزت خاک میں مل گئی۔ وہ عزت جسے وہ پشتہا پشت سے کانچ کے برتن کی طرح سنبھالے چلے آ رہے تھے!

لیکن یہ ہمارے بزرگ بھی تو عجیب لوگ ہیں۔ ساری دنیا بدل گئی ہے۔ بچے اب اپنی پسند کی بات کہنے لگے ہیں۔ اس مادی دور میں وہ صرف آنکھوں دیکھی صورتوں کے قائل ہیں لیکن یہ بزرگ ہیں کہ وہی پرانی لکیر پیٹے چلے جاتے ہیں۔ اب ذرا سوچ کر دیکھئے کیا آج کی کوئی پڑھی لکھی بالغ لڑکی کسی پچاس سال کے بوڑھے سے شادی کرنا پسند کرے گی؟ لیکن ان بزرگوں کو کون سمجھائے۔ نتیجہ ظاہر ہے جن ہاتھوں میں مہندی رچانے کی آرزو میں بہاریں سے تڑپتی رہیں وہی ہاتھ ان کے چہرے پر سیاہی پھیر کر چلے جاتے ہیں!

رام دیال کے باپ کی صورت آنکھوں کے سامنے آتی ہے تو بے حد افسوس ہوتا ہے۔ بوڑھا کم گو، وضع دار لیکن غریب! جو ساری زندگی کی محنت شاقہ کے بعد بھی بیٹی کے لئے جہیز جمع نہ سکا کہ اپنی اکلوتی بیٹی کیلئے کوئی اچھا پڑھا لکھا جیون ساتھی خرید دے سکے۔ اس کی یہ ناکامی خجالت بن کر اس کے چہرے پر ہویدا رہتی ہے۔ وہ مجبور محجوب پشیمان پشیمان دکھائی دینے والا بوڑھا اپنی لڑکی سے اتنا ڈرتا ہے جتنا وہ آفس کے بڑے بابو سے نہیں ڈرتا۔ اس ڈر کے پیچھے دراصل ایک شرمندگی کا احساس کارفرما رہتا ہے۔ لیکن چنداوتی جو ایک حوصلہ مند پڑھی لکھی لڑکی ہے اس بات کو محسوس نہیں کرتی۔ اس کا اپنا نظریہ ہے کہ جو چیز مانگنے سے نہیں ملتی اسے جیسے بھی ہو حاصل کرنا چاہئے۔ اس لئے وہ اپنے باپ کو موردِ الزام نہیں ٹھہراتی۔ اس نے ایک دن مجھ سے کہا تھا۔

"آپ کو پتہ ہے سارے لوگ میری شادی کے لئے پریشان ہیں لیکن مجھے ذرا فکر نہیں۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ میں اگر شادی کرنا چاہوں تو بہت آسانی سے کر سکتی ہوں۔"

یہ آسانی کیا ہے؟ اسے میں جانتا ہوں۔ مدن میں ایسی کوئی خاص بات نہیں لیکن یہ سچ ہے کہ چنداوتی اس سے محبت کرتی ہے۔ دونوں کی خط و کتابت بھی ہے۔ اور وہ کبھی کبھی مل بھی لیتے ہیں۔ بات کہاں تک آگے بڑھی ہے اس کا تو مجھے علم نہیں۔ لیکن چاہت کا والہانہ پن تو بہرحال ظاہر ہو ہی جاتا ہے۔

ان تمام حالات کے پیش نظر جب میں نے غور کیا تو ایسا معلوم ہوا جیسے چنداوتی ایک بہت ہی غلط کام کر چکی ہے۔ وہ یقیناً مدن کے ساتھ بھاگی ہوگی۔ اور ہو سکتا ہے اب تک انہوں نے بیاہ بھی رچا بھی کر لیا ہو۔ اس لئے تار ملنے کے کوئی ایک گھنٹہ بعد میں نے انہیں ٹرنک کال کے ذریعہ آگاہ کیا کہ میں

"[illegible] کہا لیکن کیا یہ طریقہ جو تم نے اختیار کیا درست ہے؟"

"[illegible] ہے۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ یہ شادی مجھے پسند نہیں تھی۔ میں نے [illegible] کا مقابلہ کرنا ہے۔ اب جتنی بھی گزر گئی۔ میں کوئی مٹی کی مورتی تو تھی نہیں کہ جس کے ساتھ [illegible] اُس کے ساتھ چلی جاتی۔ میں پڑھی لکھی تھی۔ میرے پاس دماغ تھا۔ میں چلتے [illegible] سکتی تھی..... اسی لئے میں نے یہ قدم اٹھایا۔"

"لیکن اب کیا کرو گی؟" میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ لیکن اُن آنکھوں میں خوف نہ تھا بلکہ ایک بے خوف بے باکی تھی۔

"میں آپ ہی کا انتظار کر رہی تھی!"

"میرا انتظار؟"

"ہاں! آپ سے کچھ چھپا ڈھکا نہیں۔ آپ مدن سے بات کیجئے۔"

مدن! میرے دل کو چوٹ سی لگی۔ دراصل جب بھی مدن کی بات چل نکلے مجھے عجیب سا محسوس ہوتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے مدن کا ذکر لوگ مجھے چڑانے کے لئے کرتے ہیں۔ شک و حسد کا یہ جذبہ کہاں سے پیدا ہوا، میں نہیں جانتا۔ اصولی مدن میرا دوست ہے۔ اور چندراوتی اُس کی بہن ہے۔ اور سالہا سال سے ہم لوگوں میں تعلقات ہیں۔ چندراوتی مجھ سے اتنی ہی بے تکلف ہے کہ مدن تک کی باتیں بتا دیتی ہے لیکن میں نے آج تک اُس سے کوئی ایسی ویسی بات نہیں کی۔ شاید وہ اسی لئے مجھ پر اس حد تک بھروسہ کرنے لگی ہے۔ لیکن جب میں اپنے دل میں جھانکتا ہوں تو خود کو اتنا پارسا نہیں پاتا جتنا اپنے تئیں سمجھتا ہوں۔ دل میں کہیں کھوٹ ہے۔ دل میں کوئی خون کا سیاہ قطرہ ہے۔ دراصل چندراوتی کی دلآویز شخصیت اور پرکشش جسم دونوں سے میں بے حد متاثر ہوں۔ اور بات ہے کہ اظہار کی جرأت مجھ میں نہیں۔ میں اُس سے کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن کھوٹ میرے دل میں بہرحال ہے.....!

"آپ کیا سوچنے لگے؟"

"ٹھیک ہے، میں مدن سے ملاقات کروں گا!" میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر کھڑا ہوا۔

مدن سے ملاقات ہوئی۔ اُس سے بہت سی باتیں بھی ہوئیں۔ لیکن اُس نے چندراوتی سے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ اُس کا کہنا تھا کہ اُس کے گھر والے کسی ایسی لڑکی کو قبول نہیں کر سکتے جو اپنے گھر سے چھ روز غائب رہی ہو۔

میں نے اُسے بہت سمجھایا کہ وہ تمہارے ہی لئے بھاگی تھی، بلکہ بھاگی بھی نہ تھی روپوش [illegible] تمہارے ہی آسرے پر بیٹھی ہے۔ لیکن وہ تیار نہ ہوا۔ اُس نے صاف لفظوں میں انکار کر دیا۔ [illegible] جس مورتی کو وہ بھگوان بنا کر پوجتی رہی ہے درحقیقت ایک پتھر [illegible]

[illegible] اُسے بہلانا چاہتا ہوں

"مدن کبھی انکار نہیں کر سکتا۔" اُس نے بڑے یقین سے کہا۔ "اُس نے کتنی بار مجھ سے بیاہ کرنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ وہ مجھ پر جان دیتا ہے۔ وہ میرے لئے ساری دُنیا کو تیاگ سکتا ہے ــــــ میں خود اُس سے ملوں گی؟"

لیکن یہ بھی بے فائدہ ثابت ہوا۔ چندراوتی گاڑی کر کے لے نکلی اور بے نیل و مرام واپس آگئی۔ اُس کے دل کا کشکول خالی تھا!

وہ انتہا سے زیادہ دل شکستہ ہو گئی تھی۔ مجھ سے ملی تو بلک بلک کر رونے لگی۔ آج پہلی بار میں نے اُسے روتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ ہر حالت میں سینہ سپر رہنے والی لڑکی آج اپنی شکست کی ہزیمت کو آنسوؤں میں غرق کرنا چاہ رہی تھی۔ میں نے شفقت سے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا تو اُس نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔

"بھگوان کے لئے مجھے تھوڑا سا زہر لا دیجئے!"

- ایسے لوگ جو اعلیٰ قابلیت رکھتے ہوئے بد اطوار و پست کردار ہوتے ہیں، اُن کی مثال اُن سڑی گلی مچھلیوں کی ہے جو چاند کی روشنی میں چمک دمک کے ساتھ بدبو اور تعفن پھیلاتی ہیں۔ (پوپ الگزانڈر)
- نیکی میرا مذہب ہے۔ (تھامس پائن)
- ایسا طریقِ تعلیم کس کام کا جو لڑکوں کو روزی کمانا سکھاتا ہے لیکن سلیقے سے زندگی بسر کرنا نہیں۔ (والیٹر)
- ارباب ستم ابھی تک ایسی بیڑیاں ایجاد نہیں کر سکے جو انسانی دماغ کو جکڑ دیں۔ (سولٹن)
- نیکی کا صلہ صرف نیکی ہے۔ (امرسن)

میں نے غور سے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ جھوٹ نہیں کہہ رہی تھی۔ اگر اُسے کہیں سے زہر مل جاتا تو وہ ضرور پی جاتی۔

"سنو!" میں نے پیار سے کہا "تم تو بہت دلیر لڑکی ہو۔ کبھی تم نے حوصلہ نہیں ہارا۔ کبھی تم نے حالات سے شکست نہیں کھائی۔ تم دھیرج سے کام لو۔ دُنیا میں خوش رہنے کے لئے اور بھی وسیلے ہیں۔ انہیں ڈھونڈو، انہیں گلے سے لگاؤ..."

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ویسے ہی سسک سسک کر بلک بلک کر روتی رہی۔

دوسری صبح جب میں اُس سے ملنے گیا تو وہ بالکل نارمل ہو چکی تھی۔ اُس رات والی جذباتی لڑکی اور اس سامنے بیٹھی ہوئی چندراوتی میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ البتہ وہ سنجیدہ دکھی اور ملول نظر آ رہی تھی۔ اُس نے چھوٹتے ہی کہا۔

[illegible]

مگر [illegible] برداشت کرو تو یہ ایک تلخ سچائی ہے۔ اپنی [illegible] لیکن اب میں تم سے نفرت کرتی ہوں کیوں کہ تم [illegible] کے ہاتھ تم آگے بڑھ کر مجھے جیت لیتے، تم پیچھے ہٹ گئے [illegible] تم مجھے چاہتے تھے لیکن تم نے کبھی اس چاہت کا اظہار نہیں کیا۔

یہاں تک کہ اُس دن بھی جس دن بالکل بے سہارا ہو کر میں نے تمہارا ہاتھ تھاما تھا تم مجھے گلے سے نہیں لگا سکے۔ مجھے پھر اُسی جہنم میں جھونک دیا جہاں سے میں بھاگ آئی تھی ....!

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے سارا کمرہ اچانک گھومنے لگا ہو۔ اور جیسے کوئی چیخ چیخ کر کان میں کہنے لگا ہو۔

بزدل، بزدل .... بزدل ....!!

غزلیں

آذرا نگار چوہدری بی اے

تجھ کو سمجھائیں تو کیونکر اے دلِ ناشاد ہم
خانماں برباد تو ہے خانماں برباد ہم

وقتِ رخصت اُن کا فرمانا تسلی کے لئے
ساتھ لے کر جا رہے ہیں اک تمہاری یاد ہم

مُسکرا کر ہر ستم اُن کا گوارا کر لیا
یہ ہمارا ظرف ہے کرتے نہیں فریاد ہم

زندگی خوش کام ہو تو کس طرح خوش کام ہو
اُس طرف ناشاد تم ہو اِس طرف ناشاد ہم

کیف احمد صدیقی

عشق میں ہوش و خرد سے مجھے پرہیز رہا
میرے سر میں وہی سودائے جنوں خیز رہا

لاکھ ہنس ہنس کے اُنہیں میں نے سُنایا لیکن
میرا افسانۂ غم پھر بھی غم انگیز رہا

اور وہ ہوں گے جو ہیں تجھ سے کرم کے طالب
میں تو وارفتۂ لُطفِ ستم آمیز رہا

کیفؔ اشکوں سے بجھائے نہ بُجھی آتشِ دل
شعلۂ سوزِ درُوں تیز جو تھا تیز رہا

قمر اقبال

بوجھل پلکیں، آنکھیں بھاری
جاگ کے جیسے رات گذاری

کوچہ کوچہ، قریہ قریہ
ذکر ہمارا بات تمہاری

رُک بھی جا اے جانے والے
رستہ سونا، رین اندھیاری

شری ویشنو دیوی یاترا

ہرے بھرے بلند قامت پہاڑوں، فردوس نگاہ نظاروں اور پہاڑی نالوں کے مترنم اور جوان گیتوں کے آغوش میں سطح سمندر سے ۵۲۰۰ فٹ کی بلندی پر ترکٹا پربت پر واقع شری ویشنو دیوی گپھا مندر ایک ایسا متبرک تیرتھ ہے جو روحانی فیض اور اسرار کا سرچشمہ ہے۔

مقدّس گپھا میں یاترا پہلے نوراترہ

۶ را کتوبر ۱۹۶۴ء سے

زور و شور سے شروع ہو رہی ہے

یاتریوں کی سہولیت کے لئے پٹھانکوٹ سے جموں اور وہاں سے کٹڑہ تک بس گاڑیوں کا معقول بندوبست کیا گیا ہے اور ان کیلئے کٹڑہ میں گھوڑے، ٹٹو اور ڈانڈیاں فراہم کرنے کیلئے بندوبست کیا گیا ہے۔

زائرین کی آرام و آسائش کے لئے جموں، کٹڑہ اور بھون میں رہائش خورد و نوش علاج و معالجہ اور دیگر سہولتوں کا بھی خاطر خواہ انتظام کیا جا چکا ہے۔

کٹڑہ میں یاتریوں کی رہائش اور باربرداری کے لئے پیشگی بندوبست کیا گیا ہے۔ خواہشمند زائرین سے درخواست ہے کہ وہ اپنی ضروریات کے بارے میں ٹورسٹ ایگزیکیٹو آفیسر کو دو ہفتے پہلے اطلاع دیں۔

یاتری ضروری معلومات اور امداد کے لئے پٹھانکوٹ، جموں اور کٹڑہ میں متعین سیاحوں کے دفاتر سے ضروری واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔

جاری کردہ:-

ڈائرکٹر ٹورازم حکومتِ جموں و کشمیر

افسانہ

سکون اور آنسو

پروفیسر وقار بن الٰہی۔ ایم۔ اے

۲۶ر چھوٹی روڈ۔ کیمبل پور

۱۰ر اگست ۶۴ء

خوشتر جی! آداب

...."افسانہ نمبر" مل گیا تھا جس کے لئے میں آپ کا شکر گذار ہوں۔ ایک مختصر کہانی "سکون اور آنسو" بھیج رہا ہوں۔ آپ جانتے ہیں میں اپنی کہانیوں کے بارے میں کبھی کچھ نہیں لکھا کرتا۔ لیکن اس بار ایک آدھ جملہ لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ ساری بات کلائمکس کے آخری جملے میں ہے۔ اگر آپ تصویر کے دونوں رُخ دیکھیں گے تو میرا مطلب آپ پر واضح ہو جائے گا۔ میں ایک آدھ جملے کا اضافہ کرکے اِسے اور واضح کر سکتا تھا لیکن قاری کو بھی آخر کچھ فیصلہ کرنے کا موقع دینا چاہیئے ــــــ پتہ نہیں کیوں، میں لمبی لمبی کہانیاں لکھنے کا عادی ہوں۔ یہ شاید "بیسویں صدی" کے لئے میری مختصر ترین کہانی ہے ....

آپ کا اپنا ــــــ وقار بن الٰہی

نہ جانے کیوں آج آفس کی یہ سیٹ کچھ زیادہ ہی کمزور سی ہو گئی تھی۔ حالانکہ یہ نئی نہ تھی اور یہ دن پہلی بار نہیں آیا تھا۔ آج سے برسوں پہلے اُس نے اِس سیٹ پر بیٹھنا شروع کیا تھا اور برسوں سے وہ اِس دن سے دو چار ہوتا آیا تھا۔ اِس کرسی سے ہمیشہ اُس نے پیار کیا تھا اور ہنسی خوشی اُس کا ساتھ دیا تھا۔ بارہا یہ دن آیا تھا جب وہ مسکراتا کھیلتا یہاں آ کے بیٹھا تھا، پل بھر میں دن گزر جاتا اور وہ مسرور و شادماں یہاں سے رُخصت ہوتا۔ لیکن آج یہ پہلا مہینہ تھا۔ پچھلے مہینے کی دس تاریخ کو تو اُس کے جذبات یہ نہ تھے ــــــ آج اُسے کیا ہو گیا ہے۔

اِس دوران میں اتنی ہی بات ہوئی ہے ناکہ اُس کا جیون ساتھی آ گیا ہے اور بس لیکن یہ بات ــــــ شاید یہی بات ہے کہ وہ اتنا بے چین ہے۔ شاید یہی معمولی سی بات ہے جس نے آج اُس کے ذہن کو بکھیر دیا ہے۔ فائل اُٹھا کر اُس نے پاس کی ٹرے میں پھینک دی دوسری اُٹھائی، ٹیپ اور فلیٹ ہٹائے، اُسے کھولا اور کاغذوں پر نظر دوڑائی ــــــ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے یک لخت اُس کی بیوی اُس کے سامنے آ گئی ہے۔ فائل پرے اُس نے فوراً توجہ ہٹائی اور اُسی تصویر میں ڈوب گیا جو ابھی ابھی اُس کی نگاہوں کے سامنے اُبھری تھی۔

چند مہینے ہی دن تو ہوتے ہیں کہ اُس کی شادی ہوئی ہے۔ ان دنوں میں وہ اپنی بیوی کو دیکھ دیکھ کے صرف احساسِ کمتری کا شکار ہوتا رہا ہے۔ بیوی اُس کی ہے بھی بہت خوبصورت! ایک دن اُس نے دیکھا، اُس نے اپنے ماتھے کے بال کاٹ رکھے ہیں اور کافی محنت کے بعد اُنہیں سنوارا ہے وہ سپرے بھی کرتی ہے، چہرے کے لئے وہ دو تین کریمیں اور روز استعمال کرتی ہے۔ آنکھوں کے گوشوں پر پنسل سے کام لیتی ہے۔ ہونٹوں کے لئے اُس کے پاس بہت سے رنگوں کی لپ اسٹک ہے جس میں بہت سے شیڈز ہیں۔ ناخنوں کے لئے سیٹ اور بے شمار رنگوں کی پالش کی شیشیاں ہیں اور ــــــ اور ــــــ جب وہ بن سنور کے نکلتی ہے تو ــــــ وہ خود بھی آنکھیں جھپکا کے رہ جاتا ہے۔ اتنی پیاری بیوی کسی اور کے حصّے میں آجاتی تو ــــــ وہ تو مر گیا ہوتا۔

دو چار دن وہ اِسی مدھر اور حسین و ملیح صورت میں کھویا رہا اور دیکھ دیکھ کے خوش ہوتا رہا لیکن ایک دن جب کوئی شے دل میں انگڑائیاں لیتی ہوئی بیدار ہوئی تو وہ کوشش کے باوجود منہ نہ چھپا سکا۔ حقیقت سے منہ نہیں چھپایا جا سکتا۔ اُس کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے وہ کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو، اُسے سینے سے لگانا ہی پڑتا ہے۔ اس کے بغیر چارا نہیں۔ حقیقت سے آنکھیں ملائے، بغیر زندگی نہیں کٹتی۔

اُس نے سوچا، کیا وہ اپنی بیوی کی یہ ساری ناز برداریاں اِس قلیل تنخواہ میں پوری کر سکے گا۔ یہ بات ہتھوڑا بن کے اُس کے ذہن پر پڑی۔ اُس نے اس ضرب کو سہ لیا۔ کچھ کو سہلایا اور سوچا، اُس کی بیوی بہت سمجھدار ہے۔ وہ یقیناً اپنے آپ کو اُس کے مزاج کے مطابق ڈھال لے گی ــــــ یقیناً ــــــ یقیناً ــــــ لیکن وہ ایسا نہ کر سکی تو ــــــ!؟

طنزیہ

افواہیں

جہاں گرد کے قلم سے

جہاں گرد چاروں کھونٹ گھومتا ہے۔ افواہیں جمع کرتا ہے۔ اُسے افواہیں جمع کرنے کا جنون ہے۔ یہ جنون اِس لئے ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ جنون کے پیچھے پوشش ہوتا ہے۔ افواہوں کے پیچھے تلخ حقیقتیں ہوتی ہیں۔

فارن ایکس چینج کی خاطر

وزارتِ خزانہ ماہرین کا ایک خاص وفد غیر ممالک کو بھیج رہی ہے۔ تاکہ وہ ہندستان کے لئے مزید فارن ایکس چینج کمانے کے لئے نئے ذرائع تلاش کر سکیں۔ وفد اپنے ساتھ ایسی اشیاء کے نمونے بھی لے جا رہا ہے۔ جو ہم نہایت آسانی سے غیر ممالک کو سپلائی کر سکتے ہیں اور اس طرح فارن ایکس چینج کما سکتے ہیں۔ اشیاء کے جو نمونے بھیجے جا رہے ہیں اُن میں سے کچھ یہ ہیں۔

چمبل سے بھوپال طوطے۔ راجستھان اور مدھیہ پردیش کا ایک ایک ڈاکو گروہ۔ ملاوٹی گھی۔ چٹ پٹے جنسی اور جاسوسی ناول۔ سمگلر۔ جیب کترے۔ فٹ پاتھ کے جیوتشی مسند شاعر پیشہ ور گداگر۔

ان چیزوں کی فہرست بہت لمبی ہے اور ان میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو ہماری قومی اور ملکی حکومت سے زائد ہیں لیکن اِن کی برآمدات ہمارے لئے نقصان دہ ہے اور غیر ممالک کے لئے فائدہ مند وفد کو یقین ہے کہ جہاں اِن اشیاء کی پیداوار نہیں ہوتی یا کم ہوتی ہے۔ وہ وہاں سے ان اشیاء کے بڑے بڑے اور مستقل آرڈر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

ایک سیلابی منصوبہ

سیلابوں سے محفوظ رہنے کے لئے ایک نیا اور مستقل منصوبہ تیار کر لیا گیا ہے۔ اِس منصوبہ کی رُو سے ہندوستان کے تمام دریاؤں کا پاٹ چار گنا کر دیا جائیگا۔ اور دریاؤں کے کنارے جتنے شہر قصبے اور گاؤں آباد ہیں انہیں اُن کی موجودہ جگہوں سے ہٹا دیا جائیگا۔ آئندہ ہندوستان کا ہر شہر دریا سے کم سے کم بیس میل کے فاصلہ پر آباد کیا جائیگا۔ ہر شہر اور قصبہ دریا کی سطح سے ایک میل کی بلندی پر تعمیر ہوگا۔ ہر سال لاکھوں ایکڑ زمین جو سیلاب میں ڈوب جاتی ہے اور فصلیں تباہ ہو جاتی ہیں، اُسے بھی موجودہ جگہوں سے منتقل کر دیا جائے گا۔ اور اُن علاقوں میں لے جایا جائیگا جہاں سیلاب نہیں آتے ——— اس کے علاوہ چھوٹے چھوٹے ندی نالوں کا رُخ بھی اُن زمینوں کی طرف موڑ دیا جائیگا۔ جو سال بھر پانی کی بوندوں کو ترستی رہتی ہیں۔ ایک تجویز یہ بھی ہے کہ سیلاب کے پانی کو زمین دوز آہنی نالیوں کے ذریعے ڈائرکٹ سمندر میں پہنچا دیا جائے۔ اِس سلسلہ میں ہمارے سادھو سماج سے بھی اپیل کی گئی ہے کہ ہر سال کم از کم دس ہزار سادھو ہمالیہ پربت پر جایا کریں اور پانی کے مالک اندر دیوتا کا غصّہ کم کرنے کے لئے ایک مہینہ تک یگیہ کیا کریں۔

سُنا ہے اِس منصوبہ کی آخری شق یعنی سادھوؤں کے یگیہ پر سب سے پہلے عمل کیا جائیگا اور یگیہ سپھل ہو گیا تو منصوبے کی باقی شقوں کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔

عورتیں دکاندار بنیں گی

انڈین کانسٹی ٹیوشن میں عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق دئے گئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مردوں نے سماج کے ہر شعبے پر قبضہ کر رکھا ہے اور عورتوں کو صرف دو چار مخصوص شعبے ہی الاٹ کئے گئے ہیں۔ مثلاً وہ یا تو ٹیچر بن سکتی ہیں یا نرسیں یا ٹائپسٹ ——— اِس سے پڑھی لکھی عورتوں میں خاص طور پر اضطراب پھیل گیا ہے اور اُن پر دامانِ حیات تنگ ہے۔

چنانچہ اطلاع ہے کہ پچھلے دِنوں عورتوں کا ایک وفد وزیرِ اعظم شری شاستری سے ملا اور مطالبہ کیا کہ ہمارے لئے دوسرے میدان بھی کھولے جائیں۔ بالخصوص تجارت کے میدان میں قدم رکھنے کی آسانیاں بہم پہنچائی جائیں۔ کیونکہ اس میدان میں عورتوں کی تعداد

[illegible]

[illegible] عورتوں کی اس تجویز پر پبلک کہا اور [illegible]
[illegible] کر دیں کہ ہندوستان میں آج کل جتنی دکانیں ہیں اُن میں سے [illegible] سے نکال کر [illegible] عورتوں کو الاٹ کر دی [illegible] ہیں تو یہ کام آغاز دہلی سے کیا جائیگا۔ اور چند ماہ بعد شہر کے بڑے بڑے [illegible] چوک، کناری بازار، صدر بازار، کناٹ پلیس وغیرہ میں آدھی دکانوں پر صرف نسوانی صنف ہی نظر آئیں گی۔

خط کبوتر لے چلا…

محکمہ ڈاک ہند ایک نئی تجویز پر غور کر رہا ہے کہ ڈاک میں جتنے محبت نامے بھیجے جاتے ہیں انہیں پوسٹ مینوں کے ذریعے تقسیم کرانے کی بجائے کبوتروں کے ذریعے تقسیم کرایا جائے۔ کیونکہ محکمہ ڈاک کو اس قسم کی شکایتیں موصول ہوئی ہیں کہ پچاس فیصدی محبت نامے مکتوب الیہ کی بجائے اُن کے والدین کو مل جاتے ہیں۔ جس سے محبت کرنے والے جوڑوں کو کئی طرح کی پیچیدگیوں اور اُلجھنوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

چنانچہ جلد ہی اس منصوبے کی تکمیل کے لئے کبوتروں کو تربیت دی جانے والی ہے اور اس کے بعد ہر محبت نامہ کبوتروں کے ذریعے ڈائرکٹ مکتوب الیہ تک پہنچنے کی [illegible] دی جائیگی۔ محبت ناموں پر شرح ٹکٹ موجودہ ریٹ سے چار گنا زیادہ ہوگا۔ اور ہر خط اُسی دن محبوبہ یا عاشق کے پاس پہنچ جایا کریگا۔ ان محبت ناموں کے اوپر یہ ضرور لکھنا پڑیگا "کبوتر پوسٹل سروس"۔

سُنا ہے کہ ممبران پارلیمنٹ جو محبت کو اینٹی سوشل حرکت سمجھتے ہیں محکمہ ڈاک کی اس تجویز کے خلاف پارلیمنٹ میں زبردست آواز اٹھانا چاہتے ہیں اور ممکن ہے، اسی سوال پر پارلیمنٹ سے استعفیٰ بھی دے دیں۔

جنوبی افریقہ میں آواگون

پچھلے دنوں جہاں گرد گھومتا گھامتا جنوبی افریقہ کی طرف جا نکلا۔ اُسے ایک گاؤں کے کسان کے گھر جانے کا بھی اتفاق ہوا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اُس کسان کا ایک بیٹا ہے جس کے نین نقش مہاتما گاندھی سے ملتے ہیں۔ لڑکا پندرہ سولہ سال کا نوجوان ہے مگر ٹھیٹ مہاتماؤں کی سی باتیں کرتا ہے۔ اپنی افریقی بھاشا بولتے بولتے کبھی کبھی غیر شعوری طور پر ہندی کے ٹوٹے پھوٹے لفظ بھی بول جاتا ہے۔ جو اُس کے ماں باپ کی سمجھ میں نہیں آتے۔ مگر لڑکا ان کا افریقی بھاشا میں اُن کے معنی سمجھا دیتا ہے۔ حالانکہ اُس نے ہندی بالکل نہیں پڑھی۔

اُس کے کسان باپ کا بیان ہے کہ یہ لڑکا اُن کے دوسرے بچوں کے مقابلہ میں

[illegible]
ایک بڑا [illegible]
[illegible]
[illegible] لیکن [illegible]
لیکن اب کبھی کبھی بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے [illegible]
مجھے اُس کے پاس جانے دو۔

جہاں گرد کا خیال ہے کہ جب وہ اپنے بچپن [illegible] لڑکا [illegible] ہے اُس کے دماغ میں پنڈت نہرو کی شبیہ ابھرتی ہے اور آواگون کی تھیوری کے مطابق پنڈت نہرو کا بھی پنر جنم ہو چکا ہے۔

آواز دے کہاں ہے؟

چند مہینے پہلے ہند سرکار نے ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی تھی جس کا کام پاگل پن کے بنیادی اسباب معلوم کرنا تھا۔ چنانچہ کمیٹی نے اپنی رپورٹ پیش کر دی ہے۔ جس میں اس نے بتایا ہے کہ پچاس فیصدی لوگ شہروں کے شور و غل کے باعث پاگل ہو جاتے ہیں۔ یہ شور و غل اخباروں کے ہاکر، موٹر گاڑیاں، جلوس اور مظاہرے [illegible] ریڈیو کے گانے، جلسوں میں تقریر کرنے والے لیڈر وغیرہ پیدا کرتے ہیں۔ جن سے عام لوگوں کے دل و دماغ میں کئی قسم کی الجھنیں اور پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور ان میں پاگل پن کے جراثیم نشوونما پانے لگتے ہیں۔

چنانچہ افواہ ہے کہ ہند سرکار اس رپورٹ کی روشنی میں شور و غل بند کرانے کے لئے جلد ہی سخت اقدامات کرنے والی ہے۔ ریڈیو اسٹیشنوں پر پانچ فیصدی گانے بند کر دیے جائیں گے۔ اونچی آواز میں ریڈیو بجانے والے کو ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت نظر بند کر دیا جائیگا۔ صرف بے آواز موٹر گاڑیوں ہی کو لائسنس دیے جائیں گے۔ جلوس اور مظاہرے کرنے والوں پر پابندی لگا دی جائے گی۔ وہ اس پابندی کی رو سے ایک مقررہ تعداد سے زیادہ نعرے نہیں لگا سکتے اور انہیں ہر نعرے پر ایک سو روپیہ ٹیکس ادا کرنا ہوگا۔ جلسوں میں تقریر کرنے والے لیڈروں پر بھی پابندی لگا دی جائیگی کہ وہ لاؤڈ اسپیکر کے بغیر تقریر کریں۔ اُمید ہے اس سے آدھے لیڈر تقریر بازی کا شوق ترک کر دیں گے۔

رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ عورتوں کی باہمی لڑائی پر بھی پابندی لگا دی جائے لیکن ہند سرکار کو خدشہ ہے کہ کہیں عورتیں اپنے لڑائی جھگڑے کے حق کی خاطر پارلیمنٹ پر دھاوا کرنے نہ پہنچ جائیں۔ اس لئے یہ ارادہ ترک کر دیا گیا ہے۔

درخت آم کا [illegible]

ہندوستان میں آئندہ درخت آم [illegible]

[illegible] کرتے جائیں گے کہ اگر یہ
[illegible] کرتے ہیں جسے کانگرس شری کامراج کی اجازت
[illegible] کانگرس [illegible] آئیگی نہیں ہوا ہی
[illegible] ہر کانگرسی [illegible] مہینے میں ایک بار گاندھی جی
کی [illegible] کا اعتراف کرتا ہے ... وغیرہ وغیرہ۔

مندرجہ بالا افواہیں [illegible] دہلی میں گشت کر رہی ہیں کہ کانگرس ہائی کمانڈ اس امر پر غور کر رہی ہے [illegible] عوام میں کانگرسی لیڈروں اور وزیروں کے متعلق [illegible] ہے۔ مندرجہ بالا تحریروں سے اس کی روک تھام کی جائے۔

چین سے ایک تھیلا آیا ———— •

چینی سفارت خانہ مقیم دہلی کے ذمہ دار افسر [illegible] قسم کے شبہ میں چند [illegible] سے بہت پریشان اور دُکھی ہیں۔

پرسوں تک یہ جو بات جانی ہے کہ پیکنگ سے انہیں ایک بہت بڑا بیگ موصول ہوا ہے جس میں کھانے پینے کی اشیا بند ہیں۔ چینی سرکار نے سفارت خانہ کو ہدایت بھیجی ہے کہ یہ بیگ ہندوستان کے سیلاب زدہ لوگوں تک پہنچا دیا جائے۔ لیکن سفارت خانہ کے حکام تذبذب میں ہیں کہ وہ کس طرح سے یہ امدادی بیگ ہندوستانی عوام کی خدمت میں پیش کریں جبکہ وہ ہندوستانی عوام کے ساتھ خون کی ہولی کھیلتے رہے ہیں —— اور سفارت خانہ کے حکام میں اتنی جرأت اور حوصلہ ہے کہ وہ یہ بیگ ہند سرکار کے حوالے کریں کیونکہ انہیں خطرہ ہے کہ ہند سرکار اُسے قبول کرنے سے صاف انکار کر دے گی۔ اور خواہ مخواہ ندامت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

سُنا ہے یہ بیگ گذشتہ ایک ماہ سے سفارت خانہ کے احاطہ میں پڑا ہے اور نا کردہ گناہوں کی سزا بھگت رہا ہے۔ اس دوران میں سفارت خانہ کے حکام کی پینتالیس میٹنگیں ہو چکی ہیں مگر ابھی تک بیگ پہنچانے کا کوئی "باعزت" طریقہ دریافت نہیں ہو سکا۔

سنسنی خیز افواہیں ———— •

۱۔ کانگرسی وزیروں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ اپنی تنخواہ میں سے صرف پانچ سو روپے ماہانہ لیا کریں گے۔ باقی تنخواہ اپنے حلقہ کے غریبوں میں بانٹ دیا کریں گے۔

۲۔ سابق نظام حیدرآباد نے ہند سرکار کو ایک خط لکھا ہے کہ کسی بہت بڑے سابق جج کے ذریعے یہ تحقیقات کرائی جائے کہ میرے پاس اتنی بڑی جائداد کیسے اکٹھی ہو گئی۔

۳۔ ماسٹر تارا سنگھ نے اعلان کیا ہے کہ اگر یکم جنوری ۱۹۶۵ء تک پنجاب میں کرپشن ختم نہ ہوگی تو میں پنجاب چھوڑ کر آندھرا پردیش چلا جاؤں گا۔

۴۔ ہند کمیونسٹ پارٹی کے لیفٹ ونگ نے پیش گوئی کی ہے کہ کانگرس کے آئندہ سالانہ سیشن میں کامریڈ ڈانگے کو کانگرس کا صدر بنایا جائے گا۔

۵۔ وزیر اعظم شری شاستری صدر کانگرس شری کامراج سے تیلگو زبان سیکھ رہے ہیں اور شری کامراج وزیر اعظم سے ہندی سیکھ رہے ہیں۔ یہ عمل امداد باہمی کے اصول پر اپنایا گیا ہے۔

[illegible] ہے۔

سُنا گیا ہے کہ [illegible] کی اس تجویز پر لبیک کہا۔ اور محکمہ صنعت تجارت کو ہدایات جاری کر دیں کہ ہندوستان میں آج کل جتنی دکانیں ہیں اُن میں سے پچاس فیصدی دکانیں مردوں سے خالی کروالی جائیں اور وہ دکانیں عورتوں کو الاٹ کر دی جائیں۔ اُمید ہے اس مہم کا آغاز جلد ہی کیا جائیگا۔ اور چند ماہ بعد شہر کے بڑے بڑے بازاروں مثلاً چاندنی چوک، کناری بازار، صدر بازار، کناٹ پلیس وغیرہ میں آدمی کم اور عورتیں زیادہ دکانوں پر بیٹھی نظر آئیں گی۔

خط کبوتر لے چلا...

محکمہ ڈاک و تار ایک نئی تجویز پر غور کر رہا ہے کہ ڈاک میں جتنے محبت نامے بھیجے جاتے ہیں اُنہیں پوسٹ مینوں کے ذریعے تقسیم کرانے کی بجائے کبوتروں کے ذریعے تقسیم کرایا جائے۔ کیونکہ محکمہ ڈاک کو اس قسم کی شکایتیں موصول ہوئی ہیں کہ پچاس فیصدی محبت نامے مکتوب الیہ کی بجائے اُن کے والدین کو مل جاتے ہیں۔ جس سے محبت کرنے والے جوڑوں کو کئی طرح کی پیچیدگیوں اور اُلجھنوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

چنانچہ جلد ہی اس منصوبے کی تکمیل کے لئے کبوتروں کو تربیت دی جانے والی ہے اور اُس کے بعد ہر محبت نامہ کبوتروں کے ذریعے ڈائرکٹ مکتوب الیہ تک پہنچنے کی کوشش کی جائیگی۔ محبت ناموں پر شرح ٹکٹ موجودہ ریٹ سے چار گنا زیادہ ہوگا۔ اور ہر خط اُسی دن محبوبہ یا عاشق کے پاس پہنچ جایا کریگا۔ اِن محبت ناموں کے اُوپر یہ ضرور لکھنا پڑیگا "کبوتر پوسٹل سروس"۔

سُنا ہے وہ ممبران پارلیمنٹ جو محبت کو اینٹی سوشل حرکت سمجھتے ہیں محکمہ ڈاک کی اس تجویز کے خلاف پارلیمنٹ میں زبردست آواز اُٹھانا چاہتے ہیں اور ممکن ہے، اسی سوال پر پارلیمنٹ سے استعفیٰ بھی دے دیں۔

جنوبی افریقہ میں آواگون

پچھلے دنوں جہاں گرد گھومتا گھامتا جنوبی افریقہ کی طرف جا نکلا۔ اُسے ایک گاؤں کے کسان کے گھر جانے کا بھی اتفاق ہوا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اُس کسان کا ایک بیٹا ہے جس کے نین نقش مہاتما گاندھی سے ملتے ہیں۔ لڑکا پندرہ سولہ سال کا نوجوان ہے۔ مگر بڑی مدبرانہ باتیں کرتا ہے۔ اپنی افریقی بھاشا بولتے بولتے کبھی کبھی غیر شعوری طور پر ہندی کے ٹوٹے پھوٹے لفظ بھی بول جاتا ہے۔ جو اُس کے ماں باپ کی سمجھ میں نہیں آتے۔ مگر لڑکا اُن کو افریقی بھاشا میں اُن کے معنی سمجھا دیتا ہے۔ حالانکہ اُس نے ہندی بالکل نہیں پڑھی۔

اُس کے کسان باپ کا بیان ہے کہ یہ لڑکا اُن کے دوسرے بچوں کے مقابلہ میں

اخلاق شریف [illegible] اور اس [illegible] ایک [illegible] ہے مرنے ایک کپڑا پہنتا ہے۔ بچپن میں کہا کرتا تھا کہ [illegible] میرا اُلّو کا پٹھا راج [illegible] کرتا ہے۔ اسی طرح دوسری کئی [illegible] جو جاری مجھ سے باہر تھیں۔ لیکن [illegible] اُس کی [illegible] لیکن اب بھی کبھی کبھی بے ساختہ کہہ اُٹھتا ہے ـــــ [illegible] مجھے اُس کے پاس جانے دو۔"

جہاں گرد کا خیال ہے کہ جب وہ اپنے بیٹے [illegible] کرتا ہے تو ممکن ہے اُس کے دماغ میں پنڈت نہرو کی شبیہ اُبھرتی ہو۔ اور آواگون کی تھیوری کے مطابق پنڈت نہرو کا بھی پُنر جنم ہو چکا ہو۔

آواز دے کہاں ہے؟

چند مہینے پہلے ہند سرکار نے ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی تھی جس کا کام پاگل پن کے بنیادی اسباب معلوم کرنا تھا۔ چنانچہ کمیٹی نے اپنی رپورٹ پیش کر دی ہے۔ جس میں اُس نے بتایا ہے کہ پچاس فیصدی لوگ شہروں کے شور غل کے باعث پاگل ہو جاتے ہیں۔ یہ شور غل اخباروں کے ہاکر، موٹر گاڑیاں، جلوس اور مظاہرے [illegible] ریڈیو کے گانے، جلسوں میں تقریریں کرنے والے لیڈر وغیرہ پیدا کرتے ہیں۔ جس سے لوگوں کے دل و دماغ میں کئی قسم کی اُلجھنیں اور پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور ان میں پاگل پن کے جراثیم نشو و نما پانے لگتے ہیں۔

چنانچہ افواہ ہے کہ ہند سرکار اس رپورٹ کی روشنی میں شور و غل بند اور کم کرانے کے لئے جلد ہی سخت اقدامات کرنے والی ہے۔ ریڈیو اسٹیشنوں پر اسّی فیصدی گانے بند کر دئے جائیں گے۔ اونچی آواز میں ریڈیو بجانے والے کو ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت نظر بند کر دیا جائیگا۔ صرف بے آواز موٹر گاڑیوں ہی کو لائسنس دئے جائیں گے۔ جلوس اور مظاہرے کرنے والوں پر پابندی لگا دی جائے گی۔ وہ اس پابندی کی رو سے ایک مقررہ تعداد سے زیادہ نعرے نہیں لگا سکتے اور انہیں ہر نعرے پر ایک سو روپیہ فیس ادا کرنا ہوگی۔ جلسوں میں تقریر کرنے والے لیڈروں پر بھی پابندی لگا دی جائیگی کہ وہ لاؤڈ اسپیکر کے بغیر تقریر کریں۔ اُمید ہے اس سے آدھے لیڈر تقریر بازی کا شوق ترک کر دیں گے۔

رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ عورتوں کی باہمی لڑائی پر بھی پابندی لگا دی جائے لیکن ہند سرکار کو خدشہ ہے کہ کہیں عورتیں اپنے لڑائی جھگڑے کے جمہوری حق کی خاطر پارلیمنٹ پر دھاوا کرنے نہ پہنچ جائیں۔ اس لئے یہ ارادہ ترک کر دیا گیا ہے۔

درخت اُگانا بند

ہندوستان میں آئندہ درخت اُگانے بند کر دئے جائیں گے [illegible]

مسدرجہ بالا اقوال کے ساتھ ... شروع کر دیے جائیں گے بلکہ یہ
ہاتھ کے ... ہیں مسدر کانگریس شری کامراج کی اجازت
کے بغیر ... ہو سکے گا۔ جہاں کانگریسیوں کی قوت عمل آ گئی تھی عوامی
خدمت کے حق سے محروم کر دیا گیا ہے ... کانگریس ... مہینہ میں ایک بار گاندھی جی
کی ... کر اُس ... کے ... کا اعتراف کرنا پڑتا ... وغیرہ وغیرہ۔

مسدرجہ بالا افواہیں آج کل دہلی میں گشت کر رہی ہیں کہ کانگریس ہائی کمانڈ
اس قسم کے سخت قدم اُٹھانے والا ہے تاکہ عوام میں کانگریسی لیڈروں اور وزیروں کے متعلق
جو بداعتمادی پھیل رہی ہے مسدرجہ بالا تجویزوں سے اُس کی روک تھام کی جائے۔

چین سے ایک تھیلا آیا ———— ●

چینی سفارت خانہ مقیم دہلی کے ذمہ دار اور غیر ذمہ دار دونوں قسم کے عہدے دار چند
دنوں سے بے حد پریشان اور دُکھی ہیں۔

پریشانی کی وجہ بتائی جاتی ہے کہ پیکنگ سے انہیں ایک بہت بڑا بیگ موصول
ہوا ہے جس میں کھانے پینے کی اشیا بند ہیں۔ چینی سرکار نے سفارت خانہ کو ہدایت بھی ہے
کہ یہ بیگ ہندوستان کے سیلاب زدہ لوگوں تک پہنچا دیا جائے۔ لیکن سفارت خانہ کے
حکام تذبذب میں ہیں کہ وہ کس طرح سے یہ امدادی بیگ ہندوستانی عوام کی خدمت
میں پیش کریں جبکہ وہ ہندوستانی عوام کے ساتھ خون کی ہولی کھیلتے رہے ہیں۔—— اور
نہ سفارت خانے کے حکام میں اتنی جرأت اور حوصلہ ہے کہ وہ یہ بیگ ہند سرکار کے حوالے کریں
کیونکہ انہیں خطرہ ہے کہ ہند سرکار اُسے قبول کرنے سے صاف انکار کر دے گی۔ اور خواہ مخواہ
ندامت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

سُنا ہے یہ بیگ گزشتہ ایک ماہ سے سفارت خانے کے احاطہ میں پڑا ہے اور ناکردہ
گناہوں کی سزا بھگت رہا ہے۔ اِس دوران میں سفارت خانہ کے علاوہ کی میٹنگیں ہو چکی
ہیں مگر ابھی تک بیگ پہنچانے کا کوئی "باعزت" طریقہ دریافت نہیں ہو سکا۔

سنسنی خیز افواہیں ———— ●

۱۔ کانگریسی وزیروں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ اپنی تنخواہ میں سے صرف پانچ سو روپے
ماہانہ لیا کریں گے۔ باقی تنخواہ اپنے حلقہ کے غریبوں میں بانٹ دیا کریں گے۔

۲۔ سابق نظام حیدرآباد نے ہند سرکار کو ایک خط لکھا ہے کہ کسی بہت بڑے سابق
جج کے ذریعے یہ تحقیقات کرائی جائے کہ میرے پاس اتنی بڑی جائداد کیسے اکٹھی ہو گئی۔

۳۔ ماسٹر تارا سنگھ نے اعلان کیا ہے کہ اگر یکم جنوری ۱۹۶۵ تک پنجاب میں کرپشن
ختم نہ ہو گی تو میں پنجاب چھوڑ کر آندھرا پردیش چلا جاؤں گا۔

۴۔ ہند کمیونسٹ پارٹی کے لیفٹ ونگ نے پیش گوئی کی ہے کہ کانگریس کے آئندہ
سالانہ سیشن میں کامریڈ ڈانگے کو کانگریس کا صدر بنایا جائے گا۔

۵۔ وزیراعظم شری شاستری صدر کانگریس شری کامراج سے تیلگو زبان سیکھ رہے
ہیں اور شری کامراج وزیراعظم سے ہندی سیکھ رہے ہیں۔ یہ عمل امداد باہمی
کے اصول پر اپنایا گیا ہے۔

یہ تیوھ رکا
مو
انہیں
اُوشا
دیـ
تحفہ دینے کا یہ وقت ہے
آپ بھی خصوصی تحفہ دیجیے،
اوشا سلائی مشین
اوشا سلائی مشین کے ۵ ماڈل
ہیں۔ ان میں سے انتخاب کیجیے
ہر ماڈل کاریگری کا اعلیٰ نمونہ اور
معیاری ہے۔ جس کے اندر بہت سی جدید
خوبیاں ہیں۔ اوشا پر
سلائی ان کے فرصت کے
اوقات کو خوشگوار بنا دیگی۔
بہترین سلائی
کیلئے اوشا ہی
استعمال کیجیے
اوشا
جے انجینیرنگ ورکس لمیٹڈ۔ کلکتہ ۳۱۔
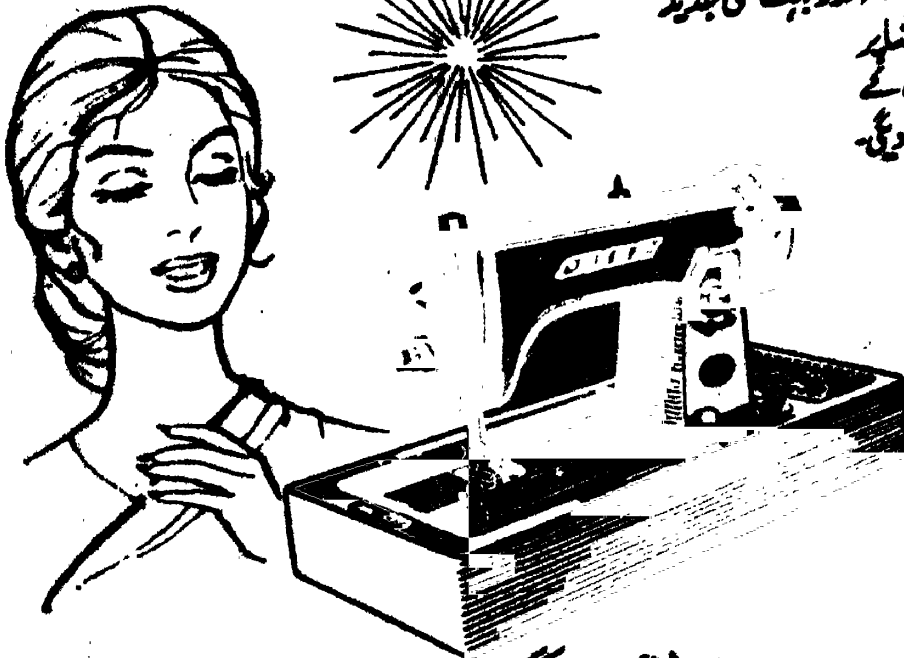
غیرت

دلیش چترکار۔ بی۔ اے

ایچ ۱/۱۸ موتی نگر (مین) نئی دہلی ۱۵

۱۰ر جون ۱۹۶۴ء   محترمی و مکرمی خوشتر صاحب! تسلیم و نیاز

اِس بار ایک نہایت ہی مختصر افسانہ (بلکہ اسے افسانچہ کہا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا) "غیرت" ارسالِ خدمت ہے۔ یہ ایک طنزیہ افسانہ ہے۔ مجھے اُمید ہے میرے دوسرے افسانوں کی طرح اسے بھی آپ اور قارئین "بیسویں صدی" پسند فرمائیں گے....

نیاز کیش ——— دلیش چترکار

نئی دہلی ۲۵ر دسمبر ۱۹۶۳ء

محترمہ! تسلیمات

ایک اجنبی کی طرف سے خط پاکر آپ کو حیرت تو ضرور ہوگی۔ لیکن جیسے ہی آپ کی نگاہیں اگلی چند سطور پر پہنچیں گی، مجھے اُمید ہے کہ یہ اجنبیت، اجنبیت نہ رہے گی۔

ہاں اس خط کے ساتھ خاص آپکی توجہ کے لئے دو غیر مطلوبہ تصویریں بھیجنے کی گستاخی ضرور کر رہا ہوں۔ آپ پوچھیں گی کیوں؟ بجواب عرض ہے کہ اسے آپ کے حُسن زیبائش یا فیشن آرائی کا کرشمہ کہا جائے یا زمانے کی ہوا کی کرامات! بہر حال اُس دن جس طور سے آپ نے اپنے جسم نازک کو جدید ترین تراش کے لباس سے آراستہ کر رکھا تھا، اُس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ یقیناً میک اپ اور جسم کو دیدہ زیب لباس سے آراستہ کرنا بھی ایک آرٹ ہے، ہُنر ہے۔ فن ہے۔ اور یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اِس فن میں آپ کو بلا کا عبور حاصل ہے۔

ایک ادنےٰ سا فنکار ہونے کے ناطے اُس دن میری فن شناس نگاہوں نے جیسا آپ کو دیکھا، بالکل ہُو بہو اُسی کا حقیقی عکس اِن دونوں خاکوں میں پیش کرنے کی گستاخی کی گئی ہے۔ اُمید ہے کہ آپ میری کاوش کی ضرور داد دیں گی۔

آپ کو کیسے یقین دلایا جائے کہ میری جن نگاہوں نے بس کا انتظار کرتے ہوئے آپ کے سراپے کو بہ غور ہم کر دیا تھا، وہ محض ایک مصوّر کی معصوم نگاہیں تھیں۔ حالانکہ اِس بات سے بھی قطعی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہر نظارہ کرنے والی نگاہ ایسی نہیں ہوا کرتی۔ ان حالات میں اکثر دیکھنے والوں کی نگاہوں میں وہ بیہودہ ہوس کی تشنگی بڑھ جانا کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی.... اِس کیفیت پر کسی کا اختیار نہیں ہوتا....!

اپنے ذاتی تعارف کو مزید آسان بنانے کے لئے یہ لکھ دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ میں ہوں:

بس اسٹینڈ کا گستاخ نگاہ باز

ایک آرٹسٹ

خط پڑھ لینے کے بعد بیلا کی تجسّس آمیز نگاہیں ایک آرٹسٹ کے ہاتھوں بنی اپنی تصویروں کا نظارہ کرنے کو بے قرار ہو گئیں۔ اُس نے فوراً تصویروں پر سے "ریپر" اُٹھایا ——— دوسرے ہی لمحہ اُس کی نگاہیں دونوں تصویروں پر جم کر رہ گئیں۔ بے شک دونوں اُسی کی تصویریں تھیں، لیکن دونوں میں ایک فرق، ایک خصوصیت صاف عیاں تھی اگرچہ دونوں تصویروں میں اُس کا "پوز" ایک ہی جیسا تھا، اُن میں بالکل اُسی انداز کی عکاسی کی گئی تھی، جس انداز سے وہ بس اسٹینڈ پر کھڑی تھی ——— پھر بھی دونوں تصویریں ایک لحاظ سے ایک دوسری سے قطعی جُدا تھیں ——— ایک تصویر صرف پنسل کی لکیروں اور شیڈ سے بنائی گئی تھی، ایسے جاذبِ نظر خطوط اور محرابوں والی جوان لڑکی کا حقیقی عکس جس کے نازک بدن پر سے حیا اور لباس کا پردہ اُٹھا دیا گیا ہو ——— مکمل "نیوڈ" ——— ! اور دوسری "واٹر کلرز" سے بنی ہوئی اور نمائشی لباس سے آراستہ رنگین تصویر ——— ایک نہایت ہی بلند پایہ فنِ تخلیق کا کرشمہ ——— ! بے ساختہ بیلا کی نگاہیں شرم و حیا سے جُھک کر پانی پانی ہو گئیں۔ اُس نے محسوس کیا جیسے اُس کے دل، اُس کے دماغ، اُس کے ضمیر کے ایک کونے میں کوئی عجیب سا جذبہ کُلبلا رہا ہے لیکن وہ یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھی کہ اِس جذبے کو کس نام سے موسوم کرے؟ ——— جذبۂ نفرت ——— خود اپنے تئیں نفرت کا جذبہ ——— یا کہ احساسِ غیرت!

خندۂ گل

پرکاش ناتھ پرویز ایم۔ اے

۲۱۴۹- کے سٹریٹ سیکٹر ۲۲-سی- چنڈی گڑھ

۱۸ مئی ۱۹۶۴ء

محترمی خوشتر صاحب آداب

"بیسویں صدی" کے لیے "خندۂ گل" حاضرِ خدمت ہے۔ رسید سے مطلع فرمائیے گا۔ اُمید کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوگا۔

خلوص کار ——— پرکاش ناتھ پرویز

نوعیتِ جرم

ڈاکٹر کانجو کی صدارت میں مشاعرہ ہو رہا تھا۔ انور صابری اپنا کلام سنانے لگے تو انھوں نے ابتدا کیا ———

"میں اور ڈاکٹر کانجو جیل میں ساتھ رہے ہیں۔ اب کانجو صاحب گورنر ہیں اور میں ..."

"مجرم علیحدہ علیحدہ ہوں گے" کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔

ایک اور دو

پروفیسر پرشوتم لال ضیا کے ایک شاگرد نے انھیں اپنی شادی کی تقریب پر مدعو کیا اور لکھا ———

"آپ کو یہ جان کر مسرت ہوگی کہ ہم ایک سے دو ہو رہے ہیں۔"

ضیا صاحب نے اپنے خط میں تحریر فرمایا ———

"میری دعا ہے کہ آپ ایک ہو کر رہیں۔"

مشورہ

انور صابری کے ایک بے تکلف دوست اُن کی شاعرانہ ہیئت کذائی کو سامانِ تفریح بنا رہے تھے۔ انور صاحب سے رہا نہ گیا اور انھوں نے یہ شعر اُن صاحب کو خطاب کرتے ہوئے پڑھ دیا ؎

مُدتے بدرنگ پہ داڑھی کے اضافے کو نہ دیکھ
میرے مضمون کو پڑھ میرے لفافے کو نہ دیکھ

وجہِ جواز

سناتن دھرم کالج لاہور کے مشاعرے میں حفیظ جالندھری نے مولانا تاجور نجیب آبادی سے کہا ———

"مولانا! آپ بوڑھے ہو گئے ہیں۔"

"شاعر کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔" مولانا تاجور نے بات سے بات پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"جبھی تو میں جوان ہوں۔"

"لیکن مریں گے ہم سے پہلے۔"

"خیر میں آپ کا مرثیہ لکھنے کے لیے زندہ نہیں رہنا چاہتا۔" حفیظ نے کہا۔

تجویز

دیویندر ستیارتھی نے اپنے ایک دوست کو اپنی اور ڈاکٹر ٹیگور کی تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔

"دیکھیے، ہم دونوں میں کتنی مشابہت ہے بالخصوص طویل داڑھیوں میں۔"

"بھئی! یوں کیجیے۔"

"فرمائیے!"

"ڈاکٹر ٹیگور کی تصویر کے نیچے لکھ دیجیے "خضاب سے پہلے" اور اپنی تصویر کے نیچے لکھیے "خضاب کے بعد"۔"

اُن کے دوست نے تجویز فرمایا۔

پھبتی

جوشؔ ملیح آبادی ایک بار مولانا ابوالکلام آزاد کے یہاں اُن سے ملنے کے لئے گئے اور اپنے نام کی چٹ اندر بھجوا دی۔ مولانا نے موصوف کام میں اُلجھے ہوئے تھے اس لئے انھیں جوشؔ صاحب کو اندر بلوانے کا خیال نہ رہا۔ جوشؔ صاحب نے پانچ سات منٹ انتظار کیا۔ جب انتظار کے لمحے اُن کی افتادِ طبیعت پر گراں گزرنے لگے تو انھوں نے حسبِ ذیل شعر مولانا صاحب کو بھجوا دیا ؎

نامناسب ہے خون کھولانا
پھر کسی اور وقت مولانا!

یہ شعر دیکھتے ہی مولانا صاحب باہر تشریف لائے لیکن جوشؔ صاحب وہاں سے جا چکے تھے۔

مشاعرے کے بعد

مشاعرے کے بعد نوحؔ ناروی سے کسی شاعر نے کہا۔

"قبلہ! مشاعرے سے پہلے منتظمین مشاعرہ ہمارے کتنی آؤ بھگت کر رہے تھے اور اب کوئی پوچھتا نہیں"

"میاں! گزرے ہوئے تعویذ، بیتی ہوئی برات اور مشاعرے کے بعد شاعر کو کوئی نہیں پوچھتا" نوحؔ صاحب نے فرمایا۔

زندگی بخش معلوماتی مقالات اور مفید کارآمد اشارات

۱ ـــ ٹماٹر ـــ ایک مفید ترین غذا

ٹماٹر ایک ایسی عام ترکاری ہے جو ہندو پاکستان کے ہر حصے میں بافراط مل جاتی ہے قیمت میں سستی اور فوائد میں اعلیٰ۔ ٹماٹر اس قدر لذیذ اور مفید ہے کہ کوئی ترکاری اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ طبی نقطۂ نظر سے ٹماٹر جتنے فوائد کا حامل ہے اتنی شاید کوئی دوسری ترکاری نہیں۔ بعض مغربی ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اگر ایک سیب روزانہ کھایا جائے تو انسان کو ڈاکٹروں کی ضرورت نہیں پڑتی ـــــ اگر اس خیال کو درست تسلیم کر لیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ ٹماٹر بھی اپنی گوناگوں خصوصیات اور صحت بخش اثرات کے لحاظ سے کم و بیش اتنا ہی اہم ہے جتنا سیب۔ لیکن سیب قیمتی پھل ہے اور اسے عام لوگ آسانی سے نہیں خرید سکتے۔ جبکہ ٹماٹر ہر کس و ناکس بہت معمولی پیسوں میں ہر روز بافراط استعمال کر سکتا ہے۔ ہمارے ملک میں عوام کی جو اقتصادی حالت ہے وہ بہت اچھی نہیں اور ہم میں سے ہر شخص روزانہ سیب نہیں کھا سکتا لیکن ہم ٹماٹر سے بڑی حد تک وہ تمام فوائد حاصل کر سکتے ہیں جن سے ہم عمدہ قسم کے مہنگے پھل خریدنے کی استطاعت نہ ہونے سے محروم رہتے ہیں۔

ٹماٹر ایک خوش ذائقہ پھل بھی ہے اور ایک قوت بخش ترکاری بھی۔ اس میں وٹامن اے، بی، سی اور فولاد کثیر مقدار میں پایا جاتا ہے۔ حفظانِ صحت کے نقطۂ نگاہ سے وہی غذا مفید کہی جاتی ہے جس میں حیاتین یا وٹامنز کثیر مقدار میں پائے جاتے ہوں۔ اس لحاظ سے ٹماٹر کا درجہ بہت اہم ہے۔ اس میں وٹامن سی، معدنی نمکیات اور فولاد کی مقدار دوسری تمام ترکاریوں کے مقابلے میں زیادہ ہے اور فولاد انسانی خون کا بیش قیمت جزو ہے۔ خون کو سرخی اور دماغ کو چستی عطا کرتا ہے۔ ٹماٹر کے استعمال سے کمزور اور اعصابی ضعف میں مبتلا لوگ دیگر مقوی ادویات کے مقابلے میں زیادہ فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ٹماٹر میں ایسے ایسڈ بھی پائے جاتے ہیں جو لیموں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ چنانچہ ٹماٹر کے استعمال سے وہ تمام فوائد بھی حاصل ہو جاتے ہیں جو لیموں کے استعمال سے ہو سکتے ہیں۔

ٹماٹر جوانوں اور بوڑھوں کے علاوہ بچوں کے لئے بھی ایک صحت بخش غذا ہے کیونکہ اس میں وہ تمام حیات بخش اجزا پائے جاتے ہیں جو بچوں کی صحت اور جسمانی نشوونما کے لئے ضروری ہیں۔ ٹماٹر کے استعمال سے بچوں کے دانت آسانی سے نکل آتے ہیں۔ ہڈیوں میں قوت اور مضبوطی آتی ہے اور بکثرت خون پیدا ہوتا ہے۔ وہ بچے جو دانت نکلنے کے دوران میں کمزور ہو گئے ہوں ان کے استعمال سے تندرست اور صحت مند ہو جاتے ہیں۔ بچوں کو ٹماٹر کھلانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انہیں ایک کچا لیکن اچھی طرح پکا ہوا ٹماٹر چوسنے کے لئے دے دیا جائے اور وہ آہستہ آہستہ اس کا رس چوستے رہیں۔

ہر روز علی الصبح دو تین ٹماٹر کھانے سے نہ صرف طاقت ہی حاصل ہوتی ہے بلکہ ہم بہت سی بیماریوں سے محفوظ رہتے ہیں۔ ٹماٹر قبض کشا ہے۔ اس سے پاخانہ کھل کر ہوتا ہے اور پیٹ خوب صاف ہو جاتا ہے۔ قبض کی شکایت نہیں ہوتی۔ دودھ پلانے والی خواتین کو خاص طور پر کچے ٹماٹر کھانے چاہئیں کیونکہ ٹماٹر میں جو ایسڈ ہوتے ہیں وہ دودھ صاف کرنے کے لئے بہت موثر ہیں۔ ٹماٹر کھانے والی عورتوں کے بچوں کو صاف ستھرا اور نقائص سے پاک دودھ حاصل ہوتا ہے۔ اور ان کو بدہضمی وغیرہ کی شکایت نہیں ہوتی۔ کچا ٹماٹر کھانے کے بعد کچھ دیر تک پانی نہ پینا چاہئے کیونکہ فوراً پانی پی لینے سے نہ صرف کھانسی وغیرہ کا اندیشہ ہے بلکہ سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ ٹماٹر کے اجزا پانی کی وجہ سے اچھی طرح معدے میں تحلیل نہیں ہوتے۔

ٹماٹر پکا کر بھی کھائے جاتے ہیں لیکن اس طرح ٹماٹر کے بہترین اجزا ضائع ہو جاتے ہیں۔ اور خاص طور پر وٹامن سی کا بہت بڑا حصہ جل جاتا ہے لہٰذا جہاں تک ممکن ہو ٹماٹر کچا ہی کھائیں یا سالم پکائیں کہ اس کے حیات بخش اجزا خراب نہ ہوں۔ ٹماٹر کا مزاج سرد ہے۔ بادی اور بلغم بڑھاتا ہے۔ اس لئے موسم گرما میں حرارت و گرمی کو کم کرنے

میرا خیال ہے اس سے طاقت کے لحاظ سے جا سکتی ہے تو سرو خالاری کی دنیا میں پہنچ سکے اور اصل طور پر اس کا اثر یہ ہوگا کہ ہم ساری خوش و خرم، مسرور و شادماں رہیں گے اطمینان و سکون کے ساتھ اپنے سب کام انجام دیں گے۔

آپ پہلے دو گہرے سانس لیجئے۔ یہ مزاج کی کیفیت پیدا ہو تو اس پر آج ہی سے عمل شروع کر دیجئے لیکن پورے یقین و اعتماد کے ساتھ۔ جاپان میں پڑھایا جاتا ہے بہت واضح ہے ہر جاپانی یہ کام کرتا ہے۔ ان کا اعتقاد ہے کہ ناک سے سانس لینے کے علاوہ ہوا میں گہرے سانس لینا بہت ضروری ہے۔ چنانچہ چھوٹے بچوں کو بچپن ہی میں گہرے سانس کی مشق کرائی جاتی ہے یہاں تک کہ ان کی عادت ہو جاتی ہے۔

۴ —— بیل —— ایک مفید پھل

بیل مشہور پھل ہے۔ پکی ہوئی بیل کے گودے میں ملائمت ہوتی ہے۔ یہ معدہ و جگر اور آنتوں کو قوت دیتا ہے اور مفرح بھی ہے۔ معدے اور آنتوں کی کمزوری سے دست آتے ہوں یا پیچش کی شکایت ہو تو بیل انہیں دور کرنے کی حیرت انگیز تاثیر رکھتی ہے۔ اسے کھانے سے معدہ اور آنتوں کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ اس طرح قبض سے آنے والے دست اور پیچش کی شکایت دور ہو جاتی ہے۔

پکی ہوئی بیل کا گودا پانی میں حل کر کے تھوڑی مصری یا چینی ملا کر پینے سے گرمی اور پیاس کو تسکین ہوتی ہے اور اگر دست آتے ہوں تو بند ہو جاتے ہیں۔

کچی بیل کے گودے میں دستوں کو روکنے کی تاثیر زیادہ قوی ہوتی ہے۔ بیل گری تین ماشہ، زیرہ سفید اور چھوٹی الائچی ایک ایک ماشہ کو پانی میں پیس چھان کر پلانے سے چھوٹے بچوں کے دست بند ہو جاتے ہیں۔

اگر آنکھیں دکھتی ہوں تو بیل کے پتے پیس کر لیپ لگانے سے آنکھوں کو آرام ہو جاتا ہے۔

۵ —— زیادہ پانی پینا مفید ہے

ہوا کے بعد پانی وہ دوسری چیز ہے جس کی ہر ذی روح کو زندہ رہنے کے لئے اشد ضرورت ہوتی ہے۔ بہت سے لوگ زیادہ پانی پینے کے عادی ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس بعض لوگ اس معاملے میں بخل سے کام لیتے ہیں۔ طب کی رو سے پانی زیادہ پینا بہت مفید ہے۔ اس سے کئی فائدے ہوتے ہیں۔

تشنگی رفع ہوتی ہے اور طبیعت ہشاش بشاش رہتی ہے۔ پسینا آتا ہے اور پیشاب زیادہ مقدار میں خارج ہوتا ہے۔ اس طرح سے جسم کے بہت سے سمی مادے خارج ہو جاتے ہیں۔ بخار کے دوران پانی پینے سے درجۂ حرارت کم ہو جاتا ہے۔ پیشاب کی زیادتی گردوں کو دھوتی ہے اور اس طرح سے سنگِ مثانہ نہیں پیدا ہونے پاتا۔ اس سلسلے میں بتا دینا ضروری ہے کہ کھانا کھانے کے دوران پانی پینے کی زیادتی نظامِ ہضم کو خراب کر دیتی ہے۔ گرم مزاج والے لوگوں کے لئے نہار منہ پانی پینا بہت فائدہ مند ہے۔ اس سے اجابت صاف ہوتی اور طبیعت ہلکی رہتی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ صبح سویرے اٹھ کر منہ ہاتھ صاف کرنے کے بعد جتنا زیادہ پانی پیا جا سکے پی لیا جائے۔ اس کے بعد کھلی جگہ یا کھلے میدان میں چہل قدمی کی جائے۔ اس سے کھل کر اجابت ہوتی ہے۔ معدے اور انتڑیوں کی صفائی ہو جاتی ہے۔

—— جو لوگ پانی پینے میں بخل سے کام لیتے ہیں اور کم پانی پیتے ہیں۔ وہ بڑی غلطی کرتے ہیں۔

جاپانی دنیا میں ایک صحت مند قوم تسلیم کی گئی ہے۔ "ہیلتھ میگزین" میں ایک مقالہ شائع ہوا ہے کہ جاپانیوں کی صحت و تندرستی کا ایک راز یہ بھی ہے کہ ہر جاپانی روزانہ ایک گیلن پانی پی جاتا ہے۔ جس سے ان کے جسم کی اندرونی صفائی روزانہ ہوتی رہتی ہے اور وہ مہلک امراض میں گرفتار نہیں ہوتے۔

۶ —— بُخل —— ایک بُری عادت

بہت سے لوگ کفایت شعاری کا غلط مطلب سمجھتے ہیں۔ کنجوسی کو کفایت شعاری سمجھتے ہیں۔ چمڑی چلی جائے لیکن دمڑی نہ جائے۔ یہ کوئی عقلمندی کی بات نہیں۔ چار آنے کے لئے پانچ روپے کھو دینا سراسر حماقت ہے۔ کفایت شعاری کے بارے میں بہت کم لوگوں کا نظریہ صحت مند ہوتا ہے۔ کفایت کے صحیح معنی سمجھنے والے بہت کم لوگ ہیں۔

ہم ایک ایسے نوجوان کو جانتے ہیں جس نے ترقی کے کئی مواقع کھو دیئے۔ کاروبار میں وہ ناکام رہا۔ اس لئے کہ وہ کپڑوں کے بارے میں نامناسب شعار رکھتا تھا۔ اس کا یقین تھا کہ جب تک کپڑے پھٹ کر بالکل جواب نہ دے دیں انہیں پہنتے رہنا چاہئے۔ اس نے اپنی دوکان پر آنے والے گاہکوں کی چائے، لیمن یا پان سگریٹ سے بھی خاطر و تواضع نہ کی۔ سیلزمین کے ساتھ کہیں جانے پر اس نے اپنے پرس کو کبھی ہوا بھی نہ لگنے دی۔ یہاں تک کہ دکان کی سجاوٹ پر بھی خرچ کرنے کو فضول خرچی سمجھا۔ اسے بے جا اسراف سمجھتا رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ اس سے لین دین اور کاروبار کرنے سے بھی کترانے لگے اور آہستہ آہستہ اس کا کام فیل ہو گیا۔ کفایت اسے بہت مہنگی پڑی۔

بہت سے لوگ کفایت کے پیچھے پاگل ہو کر اپنی صحت کو کھو بیٹھتے ہیں۔ اگر آپ کسی کام کو بہتر طور پر کرنا چاہتے ہیں یا اس کامیاب ہونا چاہتے ہیں، تو ایسی کفایت سے دور رہئے جو بعد میں مہنگی پڑے۔

اپنے لئے اچھا ہونا سب سے بڑی کفایت شعاری ہے۔ کبھی اور کسی طرح کے حالات میں بھی اپنے جسم اور دماغ کو فریب دینے والی کفایت نہ کرنی چاہئے۔ اس میں کوئی شک

ناردرن ریلوے

نوٹس

مورخہ یکم اکتوبر ۱۹۶۳ء سے ٹائم ٹیبل میں عام تبدیلیاں کی جائیں گی۔ خاص خاص تبدیلیاں حسب ذیل ہوں گی۔

۱۔ نئی گاڑیاں جو جاری کی جائیں گی

(i) دہلی اور بریلی کے مابین ہر دو اطراف سے ایک ایک گاڑی (آسام میل ۸۵ اپ / ۸۶ ڈاؤن)

(ii) کالکا اور فیروزپور کے مابین ہر دو اطراف سے ایک ایک گاڑی (چنڈی گڑھ ایکسپریس ۸۷ اپ / ۸۸ ڈاؤن)

(iii) مرادآباد اور سہارنپور کے مابین ہر دو اطراف سے ایک ایک گاڑی (پسنجر ۱ ایس ایم / ۲ ایس ایم)

(iv) دہلی اور حصار کے مابین ہر دو اطراف سے ایک ایک گاڑی (ہریانہ ایکسپریس ۹۹ اپ / ۱۰۰ ڈاؤن) اس کے نتیجے کے طور پر دہلی ریواڑی سیکشن پر ۳ بی ڈی آر / ۴ بی ڈی آر بند کر دی جائے گی۔

(v) البرٹ اور چندوسی کوٹ کے مابین ایک گاڑی (پسنجر اے ایچ ایم)

(vi) نئی دہلی اور آگرہ کے مابین ہر دو اطراف سے ایک ایک گاڑی (تاج ایکسپریس ۸۹ ڈاؤن / ۹۰ اپ)

(vii) ہاتھرس جنکشن اور ہاتھرس قلعہ کے مابین ہر دو اطراف سے ایک ایک گاڑی (پسنجر ۱۲ ایچ کے / ۱۳ ایچ کے)

(viii) ۲۱ ڈاؤن / ۲۲ اپ سلطان ایکسپریس گاڑیاں ہفتہ میں دو بار کی بجائے ہفتہ میں پانچ دن چلا کریں گی۔

۲۔ گاڑیاں جن میں توسیع کی جائے گی

(i) ۳۴۳ ڈاؤن البرٹ دہلی پسنجر چندوسی کوٹ سے چلا کرے گی۔

(ii) جانسی اور کانپور کے مابین چلنے والی ۵۲۹ ڈاؤن / ۵۳۰ اپ لکھنؤ سے اور تک بڑھا دی جائیں گی اور ان کے نئے نمبر ۱۰۵ ڈاؤن / ۱۰۶ اپ ہوں گے۔

(iii) ۱ این ایل / ۲ این ایل جو نکودر اور لوہیاں خاص کے مابین چلتی ہے وہ فیروزپور سے اور تک بڑھا دی جائیں گی اور ان کے نئے نمبر ۱ این ایل ایف / ۲ این ایل ایف ہوں گے۔

(iv) دہلی اور شکور بستی کے مابین چلنے والی اڈی ایس بی شٹل گاڑیاں بہادر گڑھ تک بڑھا دی جائیں گی۔

(v) جگراؤں اور امرتسر کے مابین چلنے والی ۱ اے جے جی / ۲ اے جے جی گاڑیاں فیروزپور سے اور تک بڑھا دی جائیں گی اور بطور فاسٹ پسنجر ان کے اوقات تبدیل کر دئے جائیں گے اور ان کے نئے نمبر ۱ اے ایل ایف / ۲ اے ایل ایف

ہوں گے۔

(VI) چنار اور جونپور کے مابین چلنے والی ا سی سی/ ۲ سی سی گاڑیاں گڑھوارو تک سے اور تک بڑھا دی جائیں گی اور ان کے نئے نمبر ا سی جی/ ۲ سی جی ہوں گے۔

۳۔ گاڑیاں جن کی رفتار تیز کی جائے گی

(I) ۹ اَپ دون ایکسپریس کی رفتار ۱۰ منٹ تیز کر دی جائے گی۔

(II) ۱۰ ڈاؤن دون ایکسپریس کی رفتار ۲۰ منٹ تیز کر دی جائے گی۔

(III) ۲۰ ڈاؤن دہرہ دون ایکسپریس کی رفتار ۱۵ منٹ تیز کر دی جائے گی۔

(IV) ۴۱ اَپ مسوری ایکسپریس کی رفتار ۱۰ منٹ تیز کر دی جائے گی۔

(V) ۴۲ ڈاؤن مسوری ایکسپریس کی رفتار ۲۵ منٹ تیز کر دی جائے گی۔

(VI) ۴۷ اَپ/ ۲۷ اَپ وارانسی ایکسپریس کی رفتار ۱۰ منٹ تیز کر دی جائے گی۔

(VII) ۵۱ اَپ پٹھانکوٹ سیالدہ ایکسپریس کی رفتار ۱۲۵ منٹ تیز کر دی جائے گی۔

(VIII) ۵۲ ڈاؤن پٹھانکوٹ سیالدہ ایکسپریس کی رفتار ۸۵ منٹ تیز کر دی جائے گی۔

(IX) ۶۲ ڈاؤن دہرہ دون ہوڑہ ہفتہ وارانہ جنتا ایکسپریس کی رفتار ۱۰ منٹ تیز کر دی جائے گی۔

(X) ۶۶ ڈاؤن دہرہ دون وارانسی ہفتہ وارانہ جنتا ایکسپریس کی رفتار ۱۰ منٹ تیز کر دی جائے گی۔

۴۔ نئے ٹھہراؤ جو مہیا کئے جائیں گے۔

(I) ا اے ٹی ایف/ ۲ اے ٹی ایف تاکھا پر

(II) ۳۰ ڈاؤن رائے والا پر

(III) ا یو این پٹیالہ چھاؤنی پر

(IV) ۱۴ ڈاؤن دہلی شاہدرہ پر

(V) ۵۱ اَپ ٹانڈہ اڑمڑ پر

(VI) ۲۳۱ اَپ پالم پر

(VII) ۳۵۹ ڈاؤن تلک برج پر

(VIII) ۲ ڈی جے پی سرگوپال پور اور کمراوڑ پر

(IX) ۳۵۴ ڈاؤن کھیڑہ کلاں پر

(X) ا ڈی جے اور ۲ ڈی آر منڈکا ہالٹ پر

(XI) ا ایل جے گورنی پر

([illegible]) [illegible] اپ بھٹنڈہ روڈ پر

۵۔ ٹرینیں جو منسوخ کر دیئے جائیں گے

(i) ۷ جے پی/۸ جے پی صاحب پور پر

(ii) ۳ آر سی/۴ آر سی کورالی پر

(iii) ۵۱ اپ/۵۲ ڈاؤن اخوان پور، مطلب پور، کاشٹھ، میوا خواد، چکر لع ل، فضل پور، چنک اور پالوالی پور تیج بھنک، راٹس پر۔

۶۔ نئے کنکشن جو مہیا کیے جائیں گے

(i) ۱ جے ایف، ۳۱ اپ کے ساتھ اور ۸ جے ایف، ۳۲ ڈاؤن کے ساتھ جالندھر شہر میں۔

(ii) ۱۳۱ اپ، ۸۷ (ایم جی) کے ساتھ ولاتی پر

(iii) ۲ پی ایس ایچ ۹۱ اپ کے ساتھ سندل پور پر

(iv) ۲ بی جی ۲۴۱ اپ کے ساتھ جیند پر

۷۔ گاڑیوں کے اوقات میں خاص خاص تبدیلیاں

(i) نمبر ۸۷ اپ چنڈی گڑھ ایکسپریس جو نئی جاری کی گئی ہے کالکا سے ۲۰۔۱۸ بجے چلا کرے گی۔ اور فیروز پور ۲۵۔۵ بجے پہنچا کرے گی۔

نمبر ۸۸ ڈاؤن چنڈی گڑھ ایکسپریس فیروز پور سے ۲۰۔۲۱ بجے چلا کرے گی اور کالکا ۴۵۔۷ بجے پہنچا کرے گی۔

(ii) ۵۱ اپ پٹھانکوٹ پر ۳۵۔۸ بجے کی بجائے ۲۰۔۶ بجے پہنچا کرے گی۔

(iii) ۵۲ ڈاؤن پٹھانکوٹ سے ۴۰۔۱۹ بجے کی بجائے ۲۵۔۲۰ بجے چلا کرے گی اور مغل سرائے ۲۰۔۲ بجے کی بجائے ۱۰۔۲ بجے پہنچا کرے گی۔

(iv) ۴۲ ڈاؤن دہرہ دون سے ۲۵۔۱۹ بجے کی بجائے ۵۔۱۹ بجے چلا کرے گی اور دہلی ۲۰۔۶ بجے پہنچا کرے گی۔

(v) ۴۱ اپ دہلی سے ۵۰۔۲۱ بجے کی بجائے ۰۰۔۲۲ بجے چلا کرے گی۔

(vi) ۲ ڈاؤن دہلی سے ۳۰۔۸ بجے کی بجائے ۲۰۔۸ بجے چلا کرے گی۔

(vii) ۹ اپ دہرہ دون پر ۴۵۔۹ بجے کی بجائے ۳۵۔۹ بجے پہنچا کرے گی۔

۱۰۔ تھرو/سیکشنل کیریجوں کا اجراء

سٹیشن مابین	گاڑی نمبر	درجہ اکوموڈیشن	تعداد کوچیاں	ہفتہ	کیفیت
(I) نئی دہلی۔ کوچین	۳۰/۲۶/۲۳/۲۲ اور ۳۱/۳۲/۲۵	I اور III	ایک	ہفتہ میں ۵ دن	ایک سادہ دن ایکسپریس ایام
(II) نئی دہلی۔ بنگلور سٹی	۲۳/۲۲ اور ۳۰/۴۰	I اور III	ایک	ہفتہ میں ۲ دن کی بجائے ہفتہ میں ۵ دن	ایک سادہ دن ایکسپریس ایام
(III) نئی دہلی۔ بنگلور	۲۹/۲۶/۲۳/۲۲ اور ۳۱/۳۲/۲۵/۳	I اور III	ایک	ہفتہ میں ۲ دن	نئی دہلی سے منگلوار اور شکروار کو بنگلور سے منگلوار اور سنیچر کو
(IV) وارانسی۔ مدراس	۲۷/۲۸/۱۶ اور ۱۵/۲۷/۲۸	I اور III	ایک	ہفتہ میں ۲ دن	مدراس اور وارانسی سے سوموار اور شکروار کو بالترتیب
(V) لکھنؤ۔ مدراس	۱۰۶/۱۶ اور ۱۵/۱۰۵	I اور III	ایک	ہفتہ میں ۲ دن	مدراس اور لکھنؤ سے بدھوار اور سنیچروار کو بالترتیب
(VI) دہلی۔ سمستی پور	۸۶/۱ ایس بی اور ۴ ایس بی/۸۵	III	ایک	روزانہ	
(VII) کالکا۔ ہندومل کوٹ	۸۷/۱ بی ایچ اور ۲ بی ایچ/۸۸	III	ایک	روزانہ	

گاڑیوں کے اوقات، تھرو کوچوں کے اجراء اور منسوخی گاڑیوں میں اکوموڈیشن کے درجوں میں ترتیب سے متعلق بالتفصیل معلومات کے لئے اکتوبر ۱۹۶۴ء کا ٹائم ٹیبل ملاحظہ فرمائیے جو مشہور سٹیشنوں کے ریلوے بکنگ ریزرویشن اور انکوائری دفاتر اور بک سٹالوں سے دستیاب ہے۔

R.O.69

قدم مِلا کے چلیں
مِل کر کام کریں

"ملک کے مختلف حصّوں میں رہنے والے عوام کو خواہ بعض معاملوں میں اُن کے خیالات کتنے ہی مختلف ہوں، یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ وہ اوّلاً ہندوستانی ہیں اور یہ کہ اُنہیں اپنے تمام اختلافات قوم اور مُلک کے نا قابلِ تبدیل ڈھانچے ہی میں رہتے ہوئے دُور کرنے ہیں۔ آیئے: ہم ایکتا کے اس احساس کو بڑھاوا دینے کی ہر ممکن کوشش کریں اور قومی یک جہتی کے کام کو آگے بڑھائیں۔"

لال بہادر شاستری
وزیر اعظم

بھارت کو مضبوط کرنے اور اُس کے سبھی باشندوں کے لئے آزادی و خوشحالی کو یقینی بنانے کا ہمارا راستہ صاف اور سیدھا ہے۔
قدم مِلا کے چلیں، ایک قوم کی طرح مِل کر کام کریں۔ اپنے اندر حوصلہ، عزم، بُردباری اور خیر سگالی کا جذبہ پیدا کریں۔

ایکتا بنائے رکھیے۔ آزادی کی حفاظت کیجئے

سوال و جواب

سرگوشیاں

اس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، علمی اور ادبی سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ مذہبی، اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات شامل اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ "بیسویں صدی" کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھیے۔ ہر سوال کے بعد جواب کیلئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھیے کہ اس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے۔

(ایڈیٹر بیسویں صدی دہلی)

عزیز انور۔ ناگپور

س۔ جب انسان بہت زیادہ اداس ہو جائے تو؟

ج۔ اپنے سے زیادہ دکھی اور اداس لوگوں کو دیکھنا چاہئے۔ اس طرح افسردگی کم ہو جائے گی۔

س۔ انسان کا مقام بیسویں صدی میں؟

ج۔ بہت بلند ہے۔ یقین نہ ہو تو ننگ انسانیت جرائم کے چاقو ماکو دیکھ لیجے۔

س۔ ذرا بتایئے تو.... مرجھائی.... کلیاں

ج۔ حسین و رنگین المیہ کہانیاں!

گوہر حشمت آرا۔ کوئی برگیا

س۔ بھائی جان! کیا دولت انسان کے لئے بے حد ضروری ہے؟

ج۔ جی ہاں۔ اور اس دور میں تو دولت ہی سب کچھ ہے۔

س۔ زندگی کیا ہے؟

ج۔ زندگی بزم طرب بھی اور رسن و دار بھی ہے!

جلیل بازید پوری۔ گلشی

س۔ خوشتر بھیا! میں چند برے دوستوں میں رہ کر بالکل تباہ و برباد ہو گیا۔ یہ لوگ اب بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑ رہے ہیں۔ میں ان سے قطع تعلق کرنا چاہتا ہوں۔ آپ بتایئے مجھے کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ ایسے دوستوں سے قطع تعلق کر لیجے۔ ان کے سائے سے بچئے۔ پھر وہ خود ہی آپ کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ آپ سے منہ موڑ لیں گے۔

س۔ یہ کس کا شعر ہے؟

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

ج۔ غالب کا۔

س۔ مجھے ایک لڑکی سے روحانی محبت ہے لیکن اس کے والدین اور میرے والدین اس محبت کے دشمن ہیں۔ مجھے کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ اس کانٹوں بھری راہ سے الگ ہو جانا چاہئے۔ دو زندگیوں کو تباہ ہونے سے بچا لینا چاہئے۔

ریاض احمد دھارواڑ۔ میسور

س۔ خوشتر بھیا! جلدی بتایئے یہ شعر درد کا ہے یا ولی کا جس کا شعر ہوتی ہے۔

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

ج۔ یہ شعر درد کا ہے۔

س۔ اردو کا سب سے پہلا شاعر کون تھا؟ محققین ادب کی رائے کے مطابق بتایئے گا۔

ج۔ حضرت امیر خسروؔ

س۔ اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

فانی کے اس نظریۂ حیات سے آپ کس حد تک متفق ہیں؟

ج۔ اپنا اپنا خیال ہے۔ ہم زندگی کو دیوانے کا خواب سمجھتے ہیں نہ فرزانے کا۔ زندگی خواب نہیں۔ روشن و تابندہ حقیقت ہے۔

احمد علی ناز سیوانی۔ کشن گنج

س۔ کیا دل بھی ایک دنیا ہے؟

ج۔ جی ہاں۔۔۔۔ دل کی بستی عجیب بستی ہے
روز اجڑتی ہے روز بستی ہے

زکی الدین برہانپور

س۔ انسان اپنے بنائے ہوئے اصولوں پر چلے تو کیا کامیاب ہو سکتا ہے؟ آپ کی کیا رائے ہے؟

ج۔ اصول اچھے ہوں گے تو یقیناً کامیاب ہوگا۔

س۔ علامہ اقبال کا کوئی شعر سنایئے جس میں ترقی کا پیغام ہو۔

ج۔ خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

س۔ کیا یہ سچ ہے کہ محبت اور خلوص لازوال تحفہ ہے؟

ج۔ جی ہاں۔

حبیب الرحمٰن خاں۔ چائباسہ

س۔ انسان اپنے آپ کو کب کامیاب محسوس کرتا ہے؟

ج۔ جب کامیاب ہوتا ہے۔

عبدالرؤف ذکی۔ ...

س۔ انسان کی زندگی کس چیز پر موقوف ہے؟

ج۔ بہت سی چیزوں پر۔ ... سب سے اہم ہیں۔

س۔ سچی خوشی انسان کب محسوس کرتا ہے؟

ج۔ اچھے کام کر کے۔

نظام الدین انصاری۔ ...

س۔ اگر جگر کی دنیا رنگ و نکہت کی دنیا ہے تو اُن کا کوئی رنگین شعر سنایئے۔

ج۔ خرام رنگیں، نظام رنگیں، کلام رنگیں، پیام رنگیں
قدم قدم پر روش روش پہ نئے نئے گل کھلا رہے ہیں

...الدین احمد۔ پورنیہ

س۔ عورت کی محبت مونگے کی وہ چٹان ہوتی ہے جو ہزاروں سال سمندر میں تھپیڑے کھانے کے بعد بھی اپنی جگہ قائم رہتی ہے، کیا آپ اس سے متفق ہیں؟

ج۔ سو فیصدی!

س۔ سچی بات کڑوی کیوں لگتی ہے؟

ج۔ جو لوگ سچائی کے پرستار، سچائی کے متلاشی ہوتے ہیں، انھیں سچی بات کڑوی نہیں لگتی۔

ایم۔ اکرام اختر

س۔ وفا اور خلوص آجکل کیوں ناپید ہے؟

ج۔ اس لئے کہ انسان انسان نہ رہا۔

س۔ انسانیت سے انسان دور کیوں ہوتا جا رہا ہے؟

ج۔ اس لئے کہ وحشت و بربریت سے نزدیک ہوتا جا رہا ہے۔

شکیل عباسی۔ برہانپور

س۔ سنجیدہ بننے کے لئے کن باتوں کا خیال ضروری ہے؟

ج۔ بے تکی باتوں سے سنجیدگی مجروح نہ ہو۔

س۔ خوشتر بھائی! کیا سماج کی پیروی ضروری ہے؟

ج۔ سماج کے دقیانوسی ضابطوں کی پیروی ضروری نہیں۔

س۔ جو اپنی ہی خواہشوں کے آگے سرنگوں ہو جائے؟

ج۔ ایسا انسان دوسروں سے بھی شکست کھا جاتا ہے۔

غلام حسن حسرت۔ ہوڑہ

س۔ جس انسان کی کوئی خواہش نہ ہو؟

ج۔ جس انسان کے دل میں کوئی خواہش نہیں ہوتی اُس کا دل بجھ جاتا ہے۔ خواہشوں سے انسان کو زندہ رہنے کی تحریک و ترغیب ملتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں زندگی ملتی ہے۔

س۔ جب انسان کو کوئی سہارا نہ ملے تو؟

ج۔ اپنا سہارا خود بن جانا چاہئے —— بن آپ اپنے سفینے کا ناخدا اے دوست!

س۔ اگر کوئی بھلائی کا بدلہ بُرائی اور بُرائی کا بدلہ بھلائی سے دے تو؟

ج۔ چین کی غداری اور بے وفائی نے بتا دیا ہے کہ بھلائی کا بدلہ بُرائی سے دینے والے کو معاف نہ کرنا چاہئے —— اور بُرائی کا بدلہ بھلائی سے دینے والا سادہ لوح ہوتا ہے۔

سعید فریدی۔ زمانیہ۔ غازی پور

س۔ پیارے خوشتر بھائی! میری زندگی ازل ہی سے خزاں رسیدہ ہے۔ کیا میں آمدِ بہار سے مایوس ہو جاؤں؟

ج۔ اُمید زندگی ہے۔ مایوسی موت۔ بہار کی اُمید

ہمارا انتظار کم کم مسرت بخش ہیں۔

س۔ آجکل کی دنیا آدمی میں کیا تلاش کرتی ہے؟

ج۔ بہت کچھ۔ ایک تو اپنے اپنے دل کی بات ہے۔

س۔ علم، دولت، شرافت، بلند اخلاق —— عظیم مرتبہ کس کا ہے؟

ج۔ علم اور شرافت و بلند اخلاق کا۔

جمیلہ پروین۔ اورنگ آباد

س۔ چاند کے داغ اور دل کے داغ میں کیا فرق ہے؟

ج۔ چاند کا داغ دنیا دیکھتی ہے۔ دل کا داغ دل ہی دیکھتا ہے۔

س۔ اُلجھن۔

ج۔ اپنی زندگی کے دامن کو ہمیشہ اُلجھن سے بچائے رکھنا چاہئے۔

محمد احمد مبارکی۔ کلکتہ

س۔ "بیسویں صدی" کے دسمبر کے شمارہ میں "سرگوشیاں" کے کالم میں آپ نے ایک نام لکھا ہے —— مس شہناز احمد —— مگر یہ احمد کیوں لگا؟ کیا آپ اس کا جواب دے سکتے ہیں؟

ج۔ یہ تو مس شہناز احمد ہی بتا سکتی ہیں۔ ہمارا خیال ہے احمد اُن کے والد کا نام ہوگا۔ ایسی کئی لڑکیاں ہیں جن کے ایسے ہی نام ہیں۔ مثلاً [illegible]، سعیدہ جلیل۔ اس سلسلے میں مشہور افسانہ نگار [illegible] مس حجاب اسمٰعیل کا نام بھی توجہ طلب ہے۔ سید امتیاز علی تاج سے شادی ہونے سے پہلے اُن کا یہی نام تھا۔

عطاء الرحمٰن احمد۔ بلیا، ویہرے

س۔ کیا ایک عورت دو مردوں سے ایک جیسی محبت کر سکتی ہے؟

ج۔ ہرگز نہیں۔ اور نہ ایک مرد دو عورتوں سے یکساں محبت کر سکتا ہے۔

س۔ اگر میں "بیسویں صدی" وی پی سے منگانا چاہوں تو کیا اُس میں کوئی شرط ہے؟

ج۔ کوئی شرط نہیں۔ صرف آپ کو اپنا اخلاقی فرض یاد رکھنا چاہئے۔ وی پی منگوا کر واپس نہ کرنا چاہئے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ وی پی منگوانے میں کچھ زیادہ خرچ ہو جاتا ہے۔ اس لئے منی آرڈر کی صورت میں سالانہ قیمت بھیجنا بہتر ہے۔

محمد اشرف۔ چکمگلیا

س۔ جاہل عالم میں کیا فرق ہے؟

ج۔ [illegible]

باشا بھاکری۔ کیرالہ

س۔ ماں کی محبت مقدم ہے یا بیوی کی؟

ج۔ ابھی بیوی کی!!

س۔ جب دوست و احباب ظاہری طور پر اچھے سلوک سے پیش آئیں اور اندر سے دشمنی سے کام لیں تو ایسی صورت میں کیا کام کریں؟

ج۔ اُن سے محتاط رہیں۔ یہ کھلا ہوا چالباز پن ہے۔

محمد عمر پہلوان۔ عادل آباد دکن

س۔ اگر بیوی پڑھی لکھی اور شوہر کندۂ ناتراش ہو تو؟

ج۔ ایسی حالت میں زندگی میں سخت مشکل سے پیدا ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں حالات سے سمجھوتہ کر لینے ہی میں بیوی کو سکھ اور سکون مل سکتا ہے۔

س۔ ہر انسان کو دولت مند ہونے کی خواہش کیوں ہوتی ہے؟

ج۔ اس لئے کہ زندگی میں دولت کی بڑی اہمیت ہے۔ کسی نے کہا ہے ؎

اے زر تو خدا نہ ولیکن بخدا
ستار عیوب و قاضی الحاجاتی

عبید صبحی۔ بنگلور

س۔ سالنامہ ہاتھ آیا تو خوشتر کا ہاتھ سمجھ کر چوم لیا لیکن ___

ج۔ یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے۔

س۔ اکبر الہ آبادی کا کوئی طنزیہ شعر سنائیے۔

ج۔ سنئے ؎

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی

ضیا جعفر بنگلوری۔ بنگلور

س۔ بعض لوگ دولت حاصل کر لیتے ہیں لیکن زندگی میں اُن کا مقام پست ہی رہتا ہے۔ ایسا کیوں؟

ج۔ دولت اُن کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔ انھیں پست و بلند نظر ہی نہیں آتا۔

س۔ جو لوگ قدم قدم پر دوسروں کا سہارا ڈھونڈتے ہیں اور خود پر اعتماد نہیں کرتے....

ج۔ دوسروں کا سہارا ڈھونڈنے والوں کی کشتی کامیابی کے ساحل سے ہمکنار نہیں ہوتی۔ آپ اپنے سفینے کا ناخدا بنئے دوست!

حشمت علی خاں شمس آبادی۔ حیدرآباد

س۔ کیا یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان جیسے سیکولر ملک میں اقلیت کو ہمیشہ خطرہ رہتا ہے؟

ج۔ اقلیت احساس کمتری کا شکار ہو کر خود اعتمادی کا دامن نہ چھوڑے تو اسے کہیں بھی خطرہ نہیں۔

س۔ غیر جانبدار ہوتے ہوئے بھی روس سے ہندوستان کے تعلقات بہت گہرے ہیں۔ کیا یہ اندیشہ نہیں کہ مستقبل میں ہندوستان کمیونسٹ ہو جائے گا۔

ج۔ روس سے گہری دوستی کے یہ معنی ہرگز نہیں۔

آصف امیر۔ کٹک

س۔ آج کل کی لڑکیاں زیادہ تعلیم پا کر چراغ خانہ سے شمع محفل بن جاتی ہیں۔ کیا ہماری سرکار کا یہ فرض نہیں ہے کہ وہ ان لڑکیوں کو شمع محفل بننے سے بچائے۔ میرے خیال میں اگر تعلیم نسواں میں سرکار کی طرف سے پابندی رکھی جائے تو کیا یہ ممکن ہے؟

ج۔ لڑکیاں زیادہ تعلیم پا کر چراغ خانہ سے شمع محفل نہیں بن جاتیں۔ غلط ماحول و معاشرت اور غلط کار مرد انھیں شمع محفل بنا دیتے ہیں۔

س۔ عورت کا دوسرا نام صنف نازک ہے لیکن وہ پھر بھی تو سنگدل کیوں ہوتی ہیں؟

ج۔ عورت سنگدل نہیں ہوتی۔ کیا آپ [illegible] عورت تھے؟ اس واثق کے [illegible] عورت ہیں؟

رحمت بیگم۔ حیدرآباد دکن

س۔ اگر انسان فانی نہ ہوتا؟

ج۔ خدائی کا دعویٰ کرنے لگتا۔

س۔ ایک امیر اور غریب آدمی کی زندگی میں کیا فرق ہے؟

ج۔ امیروں اور غریبوں کی زندگیاں آپ کے سامنے ہیں۔

ممتاز انور۔ کواتھ شاہ آباد

س۔ بھیا! آپ بیسویں صدی کا اتنا شاندار سالنامہ کیسے مرتب کر لیتے ہیں؟

ج۔ خدا کے فضل و کرم اور بیسویں صدی کے پُرخلوص فنکاروں کے تعاون سے۔

س۔ سیفی عباسی، صوفیہ عباسی برہانپور، عطاالرحمن عطا کامٹی۔ ان لوگوں سے میں ذاتی طور پر ملنا چاہتا ہوں۔ ان لوگوں کا پتہ مجھے، میرا پتہ ان لوگوں کو دے دیجئے۔ کیا یہ ممکن ہے؟

ج۔ کسی کو کسی کا پتہ بتانا اخلاق و دیانت داری کے منافی ہے۔ یہ حضرات خود توجہ فرمائیں۔

جلیس الاسلام۔ رکچھا پورنیہ

س۔ اگر خدا دنیا میں انسان کو پیدا نہ کرتا؟

ج۔ تو دنیا میں یہ کشت و خون یہ فتنہ و فساد نہ ہوتا۔

س۔ خوشتر بھیا! اقبال کا کوئی شعر سنائیے۔

ج۔ زندگی کی قوت پنہاں کو کر دے آشکار
تا یہ چنگاری فروغ جاوداں پیدا کرے

س۔ اگر انسان کو غم ہی غم نصیب ہو؟

ج۔ غم کو خوشی بنا لے۔

آنکھوں کی حفاظت زندگی کی حفاظت ہے
ریڈیم آئی ڈراپس
آنکھوں کی بہت سی بیماریوں میں مفید
لاکھوں گھروں میں استعمال ہوتی
تندرست آنکھوں والے استعمال کریں
تو بینائی بڑھاپے میں بھی تیز رہتی
Radium
EYE DROPS
THE WORLD KNOWN
باریک اور کثرت سے کام کرنیوالوں کو ریڈیم آئی ڈراپس کا استعمال ضرور کرتے رہنا چاہیے تاکہ وہ آنکھوں کی آنیوالی بیماریوں سے ہمیشہ محفوظ رہیں
کلکتہ ایجنٹس:- امین اینڈ اسمٰعیل پرائیوٹ لمیٹڈ ۸۰ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ ۱
پتہ:- ریڈیم کیمیکل ورکس پرائیویٹ لمیٹڈ پوسٹ بکس نمبر ۱۳۵۱ دہلی نمبر ۶

28 TH YEARS O
Telephones:
Office: 271
RADIUM TONIC PILLS
نئی طاقت
نیا خون
کمزوری کا زبردست علاج
ریڈیم ٹانک پلز
نیا خون بکثرت پیدا کر کے نہ صرف کمزوری دور کرتی ہیں بلکہ جسم میں زبردست طاقت بڑھاتی ہیں، وزن اور خون کئی پونڈ بڑھ جاتا ہے کھوئی ہوئی طاقت اور صحت واپس لانے کیلئے ملک کے کونے کونے میں مشہور و مقبول ہیں اور لاکھوں انسان روزانہ استعمال کرتے ہیں۔ کمزوری خواہ کسی وجہ سے ہو کمزور سے کمزور انسان کو بھی نئی طاقت حاصل ہوتی ہے تندرست نوجوان ریڈیم ٹانک پلز کے علاج سے اپنی طاقت کئی گنا بڑھا سکتے ہیں۔ قیمت مکمل علاج صرف چھ روپے محصولڈاک علاوہ۔
کلکتہ ایجنٹس
این اینڈ اسمٰعیل پرائیویٹ لیمیٹیڈ
نمبر ۸ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ ۱
ریڈیم کیمیکل ورکس پرائیویٹ لمیٹیڈ۔ پوسٹ بکس نمبر